

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ

اور ہم نے تیری طرف یہ نصیحت اتاری تاکہ تو لوگوں کے لیے کھول کر بیان کرے جو کچھ ان کی طرف اتارا گیا ہے۔ (انحل: 44)

تفسیر القرآن الحکم

حافظ عبدالسلام بن محمد رحمۃ اللہ علیہ

www.KitaboSunnat.com

جلد چہارم

سُورَةُ الْمُؤْمِنِينَ تَا سُورَةُ النَّاسِ



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
قُلْ أَطِيعُوا اللّٰهَ
وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

مجلس التحقیق الاسلامی اربعہ

معدت البریری

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب و سنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

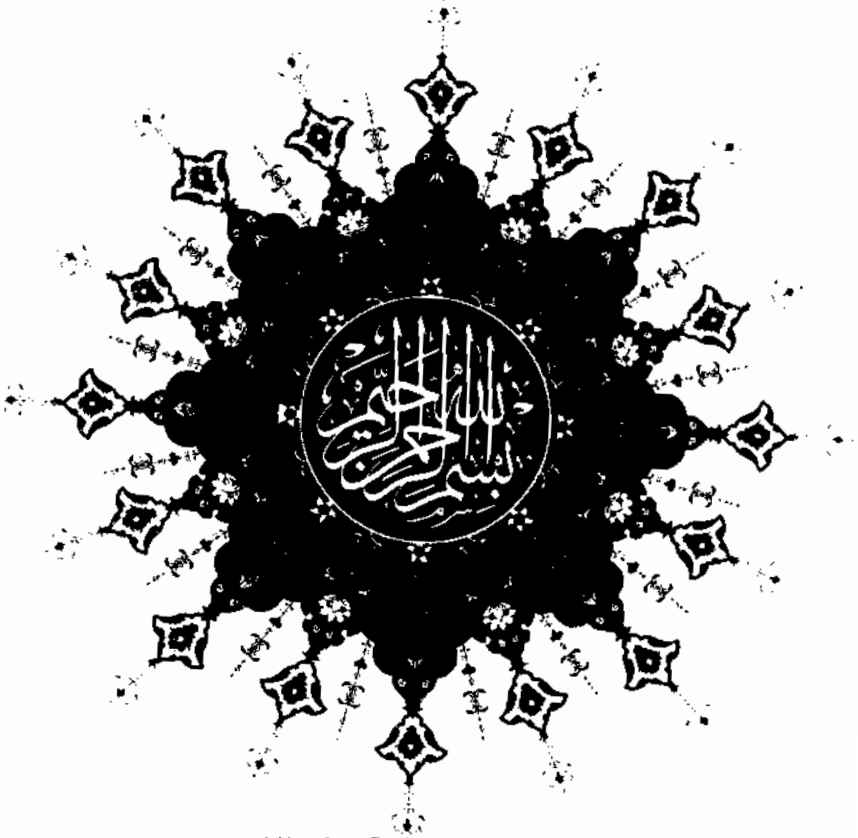
ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے
کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی
کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے
درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

✉ KitaboSunnat@gmail.com

🌐 www.KitaboSunnat.com



www.KitaboSunnat.com

جمہ حقوق
بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب

تفسیر القرآن الکریم

جلد چہارم

سُورَةُ الْبُؤْمِنِ تَا سُورَةُ النَّاسِ

ترجمہ و تفسیر

فضیلۃ الشاذ حافظ عبدالسلام بن محمد



ناشر

دارالاندلس

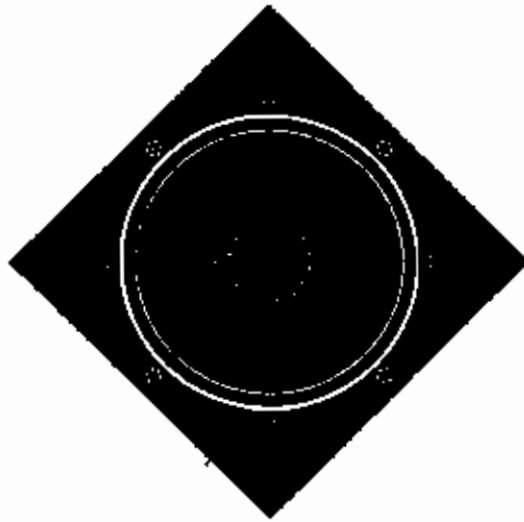
6- غزنی سٹریٹ نزد گزمن مارکیٹ اردو بازار لاہور | 4- لیک ڈاؤ چیمبرق لاہور | بیڈافس
Ph: +92-42-37150891 | +92-42-37230549 | +92-42-37242314
Fax: +92-42-37150889

﴿ وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ تَبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ ﴾

اور ہم نے آپ کی طرف یہ صحت ساری کتاب آپ لوگوں کے لیے کھول کر بیان کریں جو کچھ ان کی طرف سے آتا ہے۔ (التخل: 44)

تفسیر القرآن الکریم

فضیلۃ الشاذ حافظ عبدالسلام ابن محمد



جلد چہارم

سُورَةُ الْمُؤْمِنِ تَا سُورَةُ النَّاسِ





























ڈیپارٹمنٹ برائے اسلامیات، دارالعلوم دہلی
-92-42 37242314 342-37230549
Fax: +92-42-37151127 Phone: +92-42-37151119




















دارالادب































فہرست

7			سورة المؤمن		1
65			سورة حم السجدة		2
102			پارہ نمبر 25		3
108			سورة الشوری		4
174			سورة الزخرف		5
220			سورة الدخان		6
239			سورة الجاثیة		7
261			پارہ نمبر 26		8
261			سورة الاحقاف		9
299			سورة محمد		10
336			سورة الفتح		11
380			سورة الحجرات		12
417			سورة قی		13
437			سورة الذاریات		
451			پارہ نمبر 27		

462		سورة الطور	16
479		سورة النجم	17
508		سورة القمر	18
528		سورة الرحمن	19
551		سورة الواقعة	20
573		سورة الحديد	21
608		پارہ نمبر 28	22
608		سورة المجادلة	23
628		سورة الحشر	24
658		سورة المتحیة	25
675		سورة الصف	26
689		سورة الجمعة	27
702		سورة المائدات	28
712		سورة التغابن	29
725		سورة الطلاق	30
743		سورة التحریم	31
758		پارہ نمبر 29	32
758		سورة الملك	33
772		سورة القلم	34

788		سورة الحاقة	35
801		سورة المعارج	36
811		سورة نوح	37
820		سورة الجن	38
831		سورة المزمل	39
845		سورة المدثر	40
859		سورة القیامة	41
869		سورة الدبر	42
883		سورة المرسلات	43
889		پارہ نمبر 30	44
889		سورة النبأ	45
897		سورة النزعات	46
904		سورة جنس	47
911		سورة التکویر	48
917		سورة الانفطار	49
920		سورة المطففين	50
926		سورة الانشقاق	51
931		سورة البروج	52
936		سورة الطارق	53

940		سورة الاعلى	54
944		سورة الغاشية	55
947		سورة الفجر	56
952		سورة البلد	57
956		سورة الشمس	58
959		سورة الليل	59
962		سورة الضحى	60
965		سورة الاشرار	61
968		سورة التين	62
970		سورة العلق	63
974		سورة القدر	64
977		سورة البينة	65
981		سورة الزلزال	66
984		سورة العاديات	67
987		سورة القارعة	68
990		سورة النكاثر	69
992		سورة العصر	70
994		سورة الهنزة	71
997		سورة الفيل	72

999		سورة قریش	73
1001		سورة الماعون	74
1004		سورة الكوثر	75
1007		سورة الكافرون	76
1010		سورة النصر	77
1012		سورة الذهب	78
1015		سورة الاخلاص	79
1021		سورة الفلق	80
1028		سورة الناس	81



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴿۱﴾ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴿۱﴾ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴿۱﴾

حَمَّ ۱ تَنْزِیْلُ الْكِتَابِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ۲ غَافِرِ الذَّنْبِ ۳ وَ قَابِلِ التَّوْبِ شَدِیْدِ الْعِقَابِ ۴ ذِی الظُّلُوْمِ ۵ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۶ اِلَیْهِ النُّصُرُ ۷

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

حَمَّ ۱ اس کتاب کا اتارنا اللہ کی طرف سے ہے، جو سب پر غالب، ہر چیز کو جاننے والا ہے ۲ گناہ بخشنے والا اور توبہ قبول کرنے والا، بہت سخت سزا والا، بڑے فضل والا، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے ۳

”سورہ مؤمن“ کا ایک نام ”سورہ عافر“ بھی ہے۔

آیت 1 حَمَّ: یہ حروف مقطعات ہیں، تشریح کے لیے دیکھیے سورہ بقرہ کی پہلی آیت۔

آیت 2.3 تَنْزِیْلُ الْكِتَابِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ اس سورت میں توحید، قیامت اور اسلام کے بنیادی عقائد اور کفار کے مسلمانوں کے ساتھ ناحق جھگڑے اور کج بحثی کا ذکر ہے۔ ان دو آیات میں اس کتاب کے نازل کرنے والے کی چھ صفات اس انداز سے بیان کی گئی ہیں کہ اس کتاب پر کفار کے تمام اعتراضات کا جامع جواب آ گیا ہے۔

مفسر عبد الرحمن کیلانی فرماتے لکھتے ہیں: ”کفار کا بنیادی اعتراض یہ تھا کہ یہ کلام اللہ کی طرف سے نازل شدہ نہیں، بلکہ تمہاری اختراع ہے۔ آغاز ہی میں فرما دیا کہ یہ کتاب کسی کمزور ہستی کی طرف سے نہیں بلکہ اس اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہے جو (العزیز ہے، یعنی) کائنات کی ہر چیز پر غالب ہے اور تمہاری معاندانہ کوششوں اور سازشوں کے علی الرغم اپنے کلمہ کو سر بلند اور نافذ کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ اس کی دوسری صفت یہ ہے کہ وہ (العَلِیْمِ ہے، یعنی) ہر چیز کا براہ راست اور پورا پورا علم رکھتا ہے، لہذا اس کتاب میں اے کفار مکہ! جو (احکام اور جو) خبریں بھی دی گئی ہیں سب درست اور یقینی ہیں۔ تیسری صفت (غَافِرِ الذَّنْبِ) یہ بیان فرمائی کہ وہ اپنے فرماں بردار بندوں کے بہت سے گناہ از خود ہی بخشتا رہتا ہے۔ چوتھی صفت (قَابِلِ التَّوْبِ) یہ ہے کہ کافر توبہ کر کے حلقہ اسلام میں داخل ہو جائیں تو ان کی توبہ قبول کر کے ان کے سابقہ گناہوں کو معاف کر دینے والا ہے اور اس صفت کا تعلق صرف نومسلموں سے نہیں بلکہ جو بندہ بھی اپنے گناہوں پر نادم ہو کر اس کی طرف رجوع کر کے اپنے گناہوں کی معافی مانگے اس کے گناہ بھی معاف کر دیتا ہے۔ پانچویں صفت (شَدِیْدِ الْعِقَابِ) یہ ہے کہ وہ اپنے باغیوں کو سخت سزا دے کر ان کی اکڑی ہوئی گردنیں توڑ سکتا ہے، خواہ وہ یہ عذاب دنیا میں دے یا آخرت میں اور اس کی چھٹی صفت (ذِی الظُّلُوْمِ) یہ ہے کہ وہ کشادہ دست (کھلے ہاتھ اور بڑے فضل والا) ہے، ہر وقت انعامات کی بارش کرتا رہتا ہے اور اس سے اپنے نافرمانوں کو بھی محروم نہیں فرماتا۔ اتنی صفات بیان کرنے کے بعد ان دو بنیادی جھگڑوں کی حقیقت بیان فرمادی جو رسول اللہ ﷺ اور کفار مکہ کے درمیان چل رہے تھے، ان میں سے پہلا یہ (لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ) ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں، باقی تمام معبود جھوٹے، باطل اور بے کار ہیں اور دوسرا (اِلَیْهِ النُّصُرُ) یہ کہ روزِ آخرت کا قیام یقینی ہے اور تم سب کو یقیناً اللہ کے حضور پیش ہونا ہوگا۔“ (تیسیر القرآن)

مَا يُجَادِلُ فِي آيَاتِ اللَّهِ إِلَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَلَا يَغْرُرُكَ تَقَلُّبُهُمْ فِي الْبِلَادِ ⑤

اللہ کی آیات میں جھگڑا نہیں کرتے مگر وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، تو ان کا شہروں میں چلنا پھرنا تجھے دھوکے میں نہ ڈال دے ⑤

② اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات بیان فرماتے ہوئے رحمت و عذاب دونوں پر مشتمل صفات بیان فرمائی ہیں اور یہی اللہ تعالیٰ کا طریقہ ہے، تاکہ امید و خوف دونوں موجود رہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿يَبْقَىٰ عِبَادِيَ اتَّقِي أَنِّي أَنَا الْعَفُورُ الرَّحِيمُ﴾ وَأَنَّ عَذَابِي هُوَ الْعَذَابُ الْأَلِيمُ ﴿ [الحجر: ۴۹، ۵۰] ”میرے بندوں کو خبر دے دے کہ بے شک میں ہی بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہوں۔ اور یہ بھی کہ بے شک میرا عذاب ہی دردناک عذاب ہے۔“ یاد رہے کہ یہاں رحمت کی صفات عذاب کی صفات سے زیادہ بیان ہوئی ہیں، چنانچہ ”شَدِيدُ الْعِقَابِ“ سے پہلے بھی رحمت پر مشتمل دو صفات ”غَافِرِ الذَّنْبِ“ اور ”قَابِلِ التَّوْبِ“ ہیں اور بعد میں بھی ”ذِي الظُّلُمِ“ ہے۔ اس کی وجہ وہی ہے جو رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمائی، آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿لَمَّا قَضَى اللَّهُ الْخَلْقَ كَتَبَ فِي كِتَابِهِ، فَهُوَ عِنْدَهُ فَوْقَ الْعَرْشِ إِنَّ رَحْمَتِي غَلَبَتْ غَضَبِي﴾ [بخاری، بدء الخلق، باب ما جاء في قول الله تعالى: ﴿وهو الذي بيده الخلق...﴾ ۳۱۹۴] ”اللہ تعالیٰ نے جب مخلوق پیدا فرمائی تو اپنی کتاب میں لکھ دیا، چنانچہ وہ کتاب عرش کے اوپر اس کے پاس ہے کہ بلاشبہ میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔“

آیت 4 ① مَا يُجَادِلُ فِي آيَاتِ اللَّهِ إِلَّا الَّذِينَ كَفَرُوا: ”کفر“ کا معنی چھپانا بھی ہے اور انکار بھی اور جھگڑے سے مراد کج بحثی کر کے آیات الہی کو جھٹلانا اور انہیں رد کرنا ہے، ورنہ جس جدال اور بحث و مناظرے کا مقصد اللہ تعالیٰ کی آیات کی تصدیق اور حق بات کو ثابت کرنا ہو وہ قابل تعریف ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو حکم دیا: ﴿وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾ [النحل: ۱۲۵] ”اور ان سے اس طریقے کے ساتھ بحث کر جو سب سے اچھا ہے۔“ اور نوح ﷺ کو ان کی قوم نے کہا: ﴿يُنُوحُ قَدْ جَدَلْتَنَا فَأَكْزَرْتَ جِدَالَنَا فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا إِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ [ہود: ۳۲] ”اے نوح! بے شک تو نے ہم سے جھگڑا کیا، پھر ہم سے بہت جھگڑا کیا، پس لے آہم پر جس کی تو ہمیں دھمکی دیتا ہے، اگر تو بچوں سے ہے۔“ ابراہیم ﷺ نے اپنے وقت کے بادشاہ کے ساتھ مناظرہ کر کے اسے لاجواب کیا، فرمایا: ﴿الْمَرْءُ إِلَىٰ الَّذِي حَآجَّ رَبِّهِمْ فِي رَبِّهِ﴾ [البقرة: ۲۵۸] ”کیا تو نے اس شخص کو نہیں دیکھا جس نے ابراہیم سے اس کے رب کے بارے میں جھگڑا کیا۔“ ابراہیم ﷺ نے سورج، چاند اور ستاروں کی عبادت کرنے والوں کو لاجواب کیا (دیکھیے انعام: ۸۳ تا ۸۷) اور بت پرستوں کو لاجواب کیا۔ (دیکھیے انبیاء: ۵۱ تا ۷۰) یعنی اتنی عظیم کتاب، جس کے اتارنے والے کی صفات کا ذکر اوپر گزرا، کوئی حق بات تسلیم کرنے والا شخص اس کی آیات کو جھٹلانے کے لیے جھگڑا نہیں کرتا، صرف وہی لوگ یہ جرات کرتے ہیں جو حق کو چھپاتے اور اس کا انکار کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿الْمَرْءُ فِي الْقُرْآنِ كُفْرًا﴾ [ابو داؤد، السنن، باب النهي

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَالْأَحْزَابُ مِنْ بَعْدِهِمْ ۖ وَهَمَّتْ كُلُّ أُمَّةٍ بِرَسُولِهِمْ لِيَأْخُذُوهُ وَجَدَلُوا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوا بِهِ الْحَقَّ فَأَخَذْتُهُمْ ۗ فَكَيْفَ كَانَ

عِقَاب ۵

ان سے پہلے نوح کی قوم نے جھٹلایا اور ان کے بعد بھی کئی جماعتوں نے اور ہر امت نے اپنے رسول کے متعلق ارادہ کیا کہ اسے گرفتار کر لیں اور انہوں نے باطل کے ساتھ جھگڑا کیا، تاکہ اس کے ذریعے حق کو پھسلا دیں، تو میں نے انہیں پکڑ لیا، پھر میری سزا کیسی تھی؟ ۵

عن الجدال في القرآن : ۴۶۰۳، عن أبي هريرة رضي الله عنه ["قرآن میں جھگڑا کرنا کفر ہے۔"

۲) فَلَا يُعْزَمُكَ تَقَابُلُهُمْ فِي الْهَلَاكِ: یعنی ان لوگوں کی خوش حالی اور ان کا عیش و عشرت کے لیے یا تجارت اور دوسرے کاموں کے لیے مختلف شہروں میں پھرنا دیکھ کر کوئی شخص اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو کہ یہ اللہ کے پسندیدہ لوگ ہیں، دراصل یہ ان کے لیے مہلت ہے۔ مزید دیکھیے سورہ آل عمران (۱۹۶، ۱۹۷)۔

آیت 5 ۱) كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ: "الْأَحْزَابُ" "حِزْبٌ" کی جمع ہے، وہ جماعت جو اپنے عقیدے، عمل اور عادت میں ایک جیسی ہو۔ پچھلی آیت کے ساتھ اس کا تعلق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آیات کو رد کرنے کے لیے جو لوگ بھی جھگڑ رہے ہیں انہیں پہلی قوموں کا انجام یاد رکھنا چاہیے۔ ان سے پہلے نوح علیہ السلام کی قوم نے اور ان کے بعد عقیدہ، عمل اور عادات میں ان کے ساتھ شامل بہت سی قوموں نے اپنے اپنے پیغمبروں کو جھٹلایا۔ مثلاً عاد، ثمود، اصحاب الایکہ، قوم لوط اور آل فرعون وغیرہ۔ یہ تمام اقوام اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنے، آخرت کا انکار کرنے اور اپنے نبی کو جھٹلانے میں ایک جیسی تھیں۔

۲) وَهَمَّتْ كُلُّ أُمَّةٍ بِرَسُولِهِمْ لِيَأْخُذُوهُ: یعنی ہر امت نے صرف جھٹلانے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ انہوں نے پکارا ارادہ کر لیا کہ وہ اپنے رسول کو گرفتار کر کے اسے جلا وطن کر دیں، یا قتل کر دیں، یا قید رکھیں، جیسا کہ نوح علیہ السلام کی قوم نے کہا: ﴿لَئِنْ لَمْ تَنْتَهِ يَنْتَهِمْ لَيَكُونَنَّ مِنَ الْمَرْجُومِينَ﴾ [الشعراء : ۱۱۶] "اے نوح! یقیناً اگر تو باز نہ آیا تو ہر صورت سسکار کیے گئے لوگوں سے ہو جائے گا۔" اور صالح علیہ السلام کی قوم ثمود نے کہا: ﴿تَقَاسَمُوا بِاللَّهِ لَنُبَيِّتَنَّكَ وَأَهْلَكَ ثُمَّ لَنَنْقُولَنَّ لَوَلِيَّهِ مَا شَاءَ نَا مِنْكَ أَهْلِيهِ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ﴾ [النمل : ۴۹] "آپس میں اللہ کی قسم کھاؤ کہ ہم ضرور ہی اس پر اور اس کے گھر والوں پر رات حملہ کریں گے، پھر ضرور ہی اس کے وارث سے کہہ دیں گے ہم اس کے گھر والوں کی ہلاکت کے وقت موجود نہ تھے اور بلاشبہ یقیناً ہم سچے ہیں۔" اور لوط علیہ السلام کی قوم نے ان سے کہا: ﴿لَئِنْ لَمْ تَنْتَهِ يَلُوطُ لَيَكُونَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِينَ﴾ [الشعراء : ۱۱۶] "اے لوط! بے شک اگر تو باز نہ آیا تو یقیناً تو ضرور نکالے ہوئے لوگوں سے ہو جائے گا۔" اور رسول اللہ ﷺ کے متعلق بھی کفار نے ایسی ہی سازش کی، فرمایا: ﴿وَإِذْ يَبْغُرُكَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ وَيُبْغِرُونَ وَ

وَكَذَلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّهُمْ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ
الْعَرْشِ وَقَدْ حَوْلَهُ يَسْتَعْمِلُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُونَ بِهِ وَيَسْتَغْفِرُونَ لِلَّذِينَ آمَنُوا ۗ

اور اس طرح ان لوگوں پر تیرے رب کی بات ثابت ہوگئی جنہوں نے کفر کیا کہ وہی آگ والے ہیں ﴿۳۰﴾ وہ
(فرشتے) جو عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور وہ جو اس کے ارد گرد ہیں اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور
يَسْتَعْمِلُونَ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمُنْجِيْنَ ﴿۳۰﴾ اور جب وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، تیرے خلاف خفیہ تدبیریں کر رہے
تھے، تاکہ تجھے قید کر دیں، یا تجھے قتل کر دیں، یا تجھے نکال دیں اور وہ خفیہ تدبیر کر رہے تھے اور اللہ بھی خفیہ تدبیر کر رہا تھا اور اللہ
سب خفیہ تدبیر کرنے والوں سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔“

﴿۳﴾ وَجَدَلُوا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوا بِهِ الْحَقَّ: ”أُدْحِضُ يُدْحِضُ“ (افعال) کا معنی پھسلانا ہے، یہاں مراد حق کو باطل
ثابت کرنا ہے، یعنی ان لوگوں نے باطل کے ڈھکوسلوں کے ذریعے سے اپنے رسولوں کے ساتھ ناحق جھگڑا اور کج بحثی
کی، تاکہ وہ حق کو غلط ثابت کر سکیں۔ چنانچہ کبھی انہوں نے یہ کہا کہ تم کھاتے پیتے ہو اور بشر ہو، پھر کس طرح رسول بن
گئے؟ (دیکھیے بنی اسرائیل: ۹۳) کبھی نبوت کے ثبوت کے لیے بہت سے نامناسب مطالبات پیش کر دیتے۔ (دیکھیے بنی اسرائیل:
۹۳ تا ۹۰) کبھی مسلمانوں کے فقر اور اپنی دولت کو اپنے حق پر ہونے کی دلیل قرار دیتے۔ دیکھیے سورہ سبا (۳۵) اور
سورہ النعام: (۵۳)۔

﴿۴﴾ فَأَخَذْتُمُوهُمْ: یعنی جب ان اقوام نے اپنے اپنے پیغمبر کو گرفتار کرنے اور اسے قید یا قتل کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا تو میں نے
انہیں پکڑ لیا۔ رسول اللہ ﷺ کے متعلق ایسے ارادے کرنے والوں کو بھی اللہ تعالیٰ نے ناکام و نامراد کیا اور آپ ﷺ کو
بحفاظت مدینہ پہنچا دیا، پھر بدر اور بعد کی جنگوں میں کفر پر ڈٹے رہنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے پکڑ لیا۔

﴿۵﴾ لَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ: ”عِقَابُ“ اصل میں ”عِقَابِي“ ہے، ”یا“ کو آیات کے توالی کی موافقت کے لیے حذف کر دیا
اور ”باء“ پر کسرہ باقی رکھا، تاکہ وہ ”یا“ کے حذف ہونے پر دلالت کرے۔ اللہ تعالیٰ نے کفار مکہ کو پہلی اقوام کے انجام سے ڈرایا
کہ ان کی تباہ شدہ بستیوں کے آثار کو دیکھو کہ میں نے انہیں پکڑا تو میرا عذاب کبسا رہا؟

آیت 6 وَكَذَلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ: اس کی دو تفسیریں ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ جس طرح پہلی قوموں پر تیرے رب
کے عذاب آنے کی بات ثابت ہو چکی اور وہ تباہ و برباد کر دی گئیں، اسی طرح اب جو لوگ کفر کر رہے ہیں ان پر بھی تیرے رب
کی بات ثابت ہو چکی ہے کہ وہ آگ میں جانے والے ہیں۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ ان قوموں پر دنیا میں جو عذاب آیا اسی پر بس نہیں، بلکہ ان کے متعلق دنیا کے عذاب کی طرح
تیرے رب کی یہ بات بھی طے ہو چکی ہے کہ آخرت میں بھی وہ آگ میں رہنے والے ہیں۔

آیت 7 ۱ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الْعَرْشِ وَقَدْ حَوْلَهُ ۗ: کچھلی آیات میں کفار کا انجام بیان فرمایا، جو اللہ کی آیات ٹھکرانے

رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِينَ تَابُوا وَاتَّبَعُوا سَبِيلَكَ وَقِهِمْ
عَذَابَ الْجَحِيمِ ④

اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ان لوگوں کے لیے بخشش کی دعا کرتے ہیں جو ایمان لائے، اے ہمارے رب! تو نے ہر چیز کو رحمت اور علم سے گھیر رکھا ہے، تو ان لوگوں کو بخش دے جنہوں نے توبہ کی اور تیرے راستے پر چلے اور انہیں بھڑکتی ہوئی آگ کے عذاب سے بچا ④

کے لیے فضول جھگڑا اور کج بخشی کرتے ہیں، اب ان کے مقابلے میں ان لوگوں کا حال بیان فرمایا جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اس پر ایمان لاتے اور کج بخشی سے اجتناب کرتے ہیں۔ ان کے حق میں وہ بلند مرتبہ فرشتے استغفار اور دعائیں کرتے ہیں جو عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور جو عرش کے ارد گرد ہیں، وہ سب ”سُبْحَانَ اللَّهِ وَبِحَمْدِهِ“ اور اس سے ملتے جلتے کلمات کے ساتھ اپنے رب کی حمد اور اس کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے ہیں، یعنی اس پاک ذات کی تعریف کرتے ہیں کہ وہ تمام صفات کمال کا مالک ہے اور ہر عیب اور کمی سے پاک ہے اور اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس میں رسول اللہ ﷺ اور ایمان والوں کے لیے تسلی بھی ہے کہ ہٹ دھرمی اور کج بخشی کرنے والے کفار کے رویتے سے بد دل نہ ہوں، اگر یہ لوگ تم سے دشمنی رکھتے ہیں تو تم سے دوستی رکھنے والے بھی بہت ہیں اور بڑی اونچی شان والے ہیں۔ پھر ایسے پاک باز اور خیر خواہ دوستوں کی موجودگی میں، جو ہر وقت اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تمہارے لیے دعائیں اور بخشش کی درخواست کرتے ہیں، تمہیں کسی دشمن کی کیا پروا ہے؟

② وَيُؤْمِنُونَ بِهِ: یہاں ایک سوال ہے کہ یہ بات تو ہر ایک کو معلوم ہے کہ عرش اٹھانے والے اور دوسرے تمام فرشتے اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، پھر ان کے اللہ پر ایمان لانے کا ذکر خاص طور پر کیوں فرمایا؟ زمخشری نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ ایمان کی فضیلت و شرف کو نمایاں کرنے کے لیے اور اس کی ترغیب دینے کے لیے کیا گیا ہے، جیسا کہ سورہ بلد میں مشکل گھائی کی تفصیل بیان کرتے ہوئے گردن چھڑانے اور نیکی کے دوسرے اعمال کا ذکر کرنے کے بعد ایمان لانے کا ذکر فرمایا، تاکہ ایمان کی فضیلت ثابت ہو اور واضح ہو جائے کہ کوئی بھی نیکی اسی وقت معتبر ہے جب اس کے ساتھ ایمان ہو۔

③ عرش اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوقات میں سے سب سے بڑی مخلوق ہے، کیونکہ وہ تمام زمینوں اور آسمانوں کے اوپر ہے اور اس کے اوپر اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہے، پھر عرش کو اٹھانے والے فرشتوں کی عظمت کا کیا حال ہوگا؟! جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: «أُذِنَ لِي أَنْ أُحَدِّثَ عَنْ مَلَكٍ مِنْ مَلَائِكَةِ اللَّهِ تَعَالَى مِنْ حَمَلَةِ الْعَرْشِ، إِنَّ مَا بَيْنَ شَحْمَةِ أُذُنِهِ إِلَى عَائِقِهِ مَسِيرَةٌ سَبْعِمِائَةِ عَامٍ» [أبوداؤد، السنة، باب في الجهمية: ۴۷۲۷، وقال الألباني صحيح] ”مجھے اجازت دی گئی ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے ان فرشتوں میں سے ایک فرشتے کے متعلق بیان کروں جو عرش اٹھانے ہوئے ہیں کہ اس کے کان کی کوئیل سے اس کے کندھے تک سات سو سال کا فاصلہ ہے۔“ اب یہ معلوم نہیں کہ یہ سال دنیا والے ہیں یا وہ سال ہیں جن کا ایک دن ہمارے ایک ہزار سال کے برابر ہے، یا اس سے بھی طویل مدت والے سال مراد ہیں، کیونکہ ہمارے سورج کے دائرے کے باہر وقت کا حساب ہمارے حساب سے نہیں ہو سکتا اور اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ افلاک کی وسعت

رَبَّنَا وَادْخُلْهُمْ جَنَّاتِ عَدْنِ الَّتِي وَعَدْتَهُمْ وَمَنْ صَلَحَ مِنْ آبَائِهِمْ وَأَزْوَاجِهِمْ

اے ہمارے رب! اور انہیں ہمیشہ رہائش والی ان جنتوں میں داخل کر جن کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے اور ان کو بھی کا کچھ اندازہ نہیں، جہاں سورج بھی ایک ذرے کی حیثیت رکھتا ہے۔ غرض یہ ان فرشتوں کی عظمت کا محض ایک اندازہ ہے۔ عرش کو اٹھانے والے اتنے عظیم فرشتے اور عرش کے ارد گرد موجود اور اس کا طواف کرنے والے فرشتے جب مومنوں کے حق میں استغفار اور دعائیں کر رہے ہیں، اور ظاہر ہے کہ وہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے حکم سے کر رہے ہیں، جیسا کہ تمام فرشتوں کے متعلق فرمایا: ﴿بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُونَ ۝ لَا يَسْبِقُونَهُ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِأَمْرِهُ يَعْمَلُونَ﴾ [الانبیاء: ۲۶، ۲۷] ”بلکہ وہ بندے ہیں جنہیں عزت دی گئی ہے۔ وہ بات کرنے میں اس سے پہل نہیں کرتے اور وہ اس کے حکم کے ساتھ ہی عمل کرتے ہیں۔“ تو اس سے ایمان والوں پر اللہ تعالیٰ کی بے حد و حساب مہربانی اور رحمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مزید دیکھیے سورہ حاقہ (۱۷)۔

④ اس آیت میں توبہ کرنے والوں کے لیے صرف عرش اٹھانے والے اور اس کے ارد گرد موجود فرشتوں کے استغفار اور دعا کا ذکر ہے، دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ تمام فرشتے ان کے لیے استغفار کرتے ہیں، فرمایا: ﴿تَكَادُ السَّمَوَاتُ يَتَّقَطْنَ مِنْ فَوْقِهِنَّ وَالنَّبَلِكَةُ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُونَ لِمَنْ فِي الْأَرْضِ ۗ أَلَا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ﴾ [الشوری: ۱۰] ”آسمان قریب ہیں کہ اپنے اوپر سے پھٹ پڑیں اور فرشتے اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور ان لوگوں کے لیے بخشش کی دعا کرتے ہیں جو زمین میں ہیں، سن لو! بے شک اللہ ہی بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے۔“

⑤ رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَعِلْمًا: یہاں ”يَقُولُونَ“ (وہ فرشتے کہتے ہیں) محذوف ہے۔ یعنی تسبیح و تحمید کی طرح ایمان والوں کے لیے دعا کرنا بھی ان کے معمولات میں شامل ہے۔ اس سے ایمان کی فضیلت اور ایمان والوں کے باہمی تعلق اور محبت کا اندازہ ہوتا ہے کہ عرش کے پاس رہنے والے فرشتے زمین پر رہنے والے مومنوں کے حق میں دعائیں کرتے ہیں۔ اسی طرح اس سے دعا کا سلیقہ بھی حاصل ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو ”رَبَّنَا“ (اے ہمارے رب! اے ہمارے پالنے والے!) کہہ کر پکارتے ہیں، پھر اس سے اس کی رحمت اور اس کے علم کا واسطہ دے کر سوال کرتے ہیں، یعنی تیری رحمت ہر چیز پر وسیع ہے (دیکھیے اعراف: ۱۵۶) اور تیرا علم بھی ہر چیز پر وسیع ہے۔ (دیکھیے انعام: ۸۰۔ طلاق: ۱۲)

⑥ فَاعْفُرْ لِلَّذِينَ تَابُوا.....: اس لیے تو اپنی رحمت اور علم کے تقاضے کے مطابق ان گناہ گاروں کو بخش دے جو اپنے گناہوں سے توبہ کریں، ان سے باز آ جائیں اور تیرے راستے کی پیروی کریں، تو نے جو حکم دیا ہے اس پر عمل کریں اور جس سے منع کیا ہے اسے چھوڑ دیں اور اے اللہ! انہیں بھڑکتی ہوئی آگ کے عذاب سے بچالے۔ مزید دیکھیے سورہ شوریٰ کی آیت (۵) کی تفسیر۔

آیت 8 رَبَّنَا وَادْخُلْهُمْ جَنَّاتِ عَدْنِ الَّتِي وَعَدْتَهُمْ: یعنی گناہوں کی مغفرت اور جہنم سے نجات ہی کافی نہیں،

وَذَرِيَّتِهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿۹﴾ وَقِهِمُ السَّيِّئَاتِ ۗ وَمَنْ تَقِ السَّيِّئَاتِ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهُ ۗ وَذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿۱۰﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يُنَادُونَ لِمَقْتُ اللَّهِ أَكْبَرُ مِنْ مَقْتِكُمْ أَنْفُسَكُمْ إِذْ تُدْعَوْنَ إِلَى الْإِيمَانِ فَتَكْفُرُونَ ﴿۱۱﴾

جو ان کے باپ دادوں اور ان کی بیویوں اور ان کی اولاد میں سے لائق ہیں۔ بلاشبہ تو ہی سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ﴿۹﴾ اور انھیں برائیوں سے بچا اور تو جسے اس دن برائیوں سے بچالے تو یقیناً تو نے اس پر مہربانی فرمائی اور یہی تو بہت بڑی کامیابی ہے ﴿۱۰﴾ بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا انھیں پکار کر کہا جائے گا کہ یقیناً اللہ کا ناراض ہونا بہت زیادہ تھا تمہارے اپنے آپ پر ناراض ہونے سے، جب تمہیں ایمان کی طرف بلایا جاتا تھا تو تم انکار کرتے تھے ﴿۱۱﴾

بلکہ انھیں دائمی اقامت والی جنتوں میں داخل فرما، جن کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے۔ مزید دیکھیے سورہ آل عمران (۱۹۳)۔
 ﴿۲﴾ وَمَنْ صَلَحَ مِنْ آبَائِهِمْ وَأَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيَّتِهِمْ : اس آیت میں مذکور وعدے کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ رعد (۲۳) اور سورہ طور (۲۱)۔

﴿۳﴾ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ : یقیناً تو ہی سب پر غالب ہے، جسے تو بخشنا چاہے بخش سکتا ہے، کوئی بھی تیرا ہاتھ پکڑ نہیں سکتا اور تو کمال حکمت والا ہے، اپنی حکمت کے تحت ہی تو نے ایمان والوں کو معاف کرنے اور ان کے ساتھ ان کی پیروی کرنے والے ان کے والدین اور بیوی بچوں کو جنت میں داخل کرنے کا وعدہ کیا ہے۔

آیت 9 وَقِهِمُ السَّيِّئَاتِ : ”ق“ ”وَقِي يَقِي وَقَايَةً“ (ض) سے امر کا صیغہ ہے۔ ”السَّيِّئَاتِ“ (برائیوں) سے مراد برے اعمال و اقوال بھی ہیں اور ان کے برے نتائج بھی۔ یعنی فرشتے اللہ تعالیٰ سے ایمان والوں کو تمام برائیوں سے بچانے کی بھی دعا کرتے ہیں اور دنیا و آخرت میں ان کے برے نتائج سے محفوظ رکھنے کی بھی۔ مزید دیکھیے سورہ آل عمران (۱۸۵)۔

آیت 10 إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يُنَادُونَ : ”مَقْتُ“ شدید غصے اور ناراضی کو کہتے ہیں۔ ”يُنَادُونَ“ ”انھیں پکار کر کہا جائے گا“ انھیں کون پکارے گا؟ اس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے نہیں کیا۔ ظاہر ہے انھیں یہ کہنے والا اللہ تعالیٰ خود ہو سکتا ہے یا جہنم پر مقرر فرشتے ہو سکتے ہیں۔ اس سے پہلی آیات میں ایمان والوں کے ساتھ فرشتوں کے سلوک کا ذکر گزرا ہے کہ وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تحمید کے ساتھ ایمان والوں کے لیے استغفار اور وہ دعائیں کرتے ہیں جن کا ذکر اوپر گزرا ہے۔ اب ایمان والوں کے بعد کفار کے ساتھ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں کے سلوک کا ذکر ہوتا ہے کہ جب وہ اپنے اعمال دیکھیں گے تو اپنے آپ پر شدید غصے ہوں گے، اس وقت فرشتے انھیں پکار کر کہیں گے: ﴿لَمَقْتُ اللَّهِ أَكْبَرُ﴾ کہ اب تمہیں جہنم میں جلتے ہوئے اپنے آپ پر جتنا شدید غصہ آ رہا ہے، یقیناً جانو! دنیا میں جب تمہیں ایمان کی دعوت دی جاتی تھی اور تم کفر کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ کو تم پر اس سے بھی شدید غصہ آتا تھا۔

قَالُوا رَبَّنَا آمَنَّا اِثْنَتَيْنِ وَاٰحْيَيْتَنَا اِثْنَتَيْنِ فَاَعْتَرَفْنَا بِذُنُوبِنَا فَهَلْ اِلَىٰ خُرُوٰجٍ مِّنْ سَبِيْلِ ۝۱۱ ذٰلِكُمْ بِاَنَّهُ اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهُ كَفَرْتُمْ ۗ وَاِنْ يُشْرَكَ بِهٖ تُؤْمِنُوْا ۗ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ ۝۱۲ هُوَ الَّذِي يُرِيْكُم اٰيٰتِهٖ وَ يُنَزِّلُ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ رِزْقًا ۗ وَمَا يَتَذَكَّرُ اِلَّا مَن يُّنِيْبُ ۝۱۳

وہ کہیں گے اے ہمارے رب! تو نے ہمیں دو دفعہ موت دی اور تو نے ہمیں دو دفعہ زندہ کیا، سو ہم نے اپنے گناہوں کا اقرار کیا، تو کیا نکلنے کا کوئی راستہ ہے؟ ۱۱ یہ اس لیے کہ حقیقت یہ ہے کہ جب اس اکیلے اللہ کو پکارا جاتا تو تم انکار کرتے تھے اور اگر اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جاتا تو تم مان لیتے تھے، اب فیصلہ اللہ کے اختیار میں ہے جو بہت بلند، بہت بڑا ہے ۱۲ وہی ہے جو تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے اور تمہارے لیے آسمان سے رزق اتارتا ہے اور اس کے سوا کوئی نصیحت حاصل نہیں کرتا جو رجوع کرے ۱۳

آیت 11 قَالُوا رَبَّنَا آمَنَّا اِثْنَتَيْنِ.....: جنہی لوگ نہایت عاجزی اور ادب کے ساتھ ”رَبَّنَا“ کہہ کر اللہ تعالیٰ سے عرض کریں گے کہ اے ہمارے رب! تو نے ہمیں دو دفعہ موت دی اور دو دفعہ زندگی عطا کی، اب ہم اپنے تمام گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں کہ ہم نے تیرے ساتھ شرک کر کے اور قیامت کا انکار کر کے سخت غلطی کی، تو کیا اس بات کا کوئی امکان ہے کہ اب جب کہ ہم نے اپنے گناہوں کا اقرار کر لیا ہے، ہمارا عذر قبول کر لیا جائے اور ہمیں دوبارہ عمل کرنے کے لیے پہلی زندگی کی طرف لوٹا دیا جائے؟ یہ بات وہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے کہیں گے۔ کفار کی اس درخواست اور اس کے جواب کے لیے دیکھیے سورۃ النعام (۲۷)، سجدہ (۱۲)، فاطر (۳۷) اور سورۃ نساء (۱۸) دو موتوں اور دو زندگیوں کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۃ بقرہ کی آیت (۲۸): ﴿ كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَنْۢوَابًا فَاٰخِيَاكُمْ ۗ ثُمَّ يُمَيِّنُكُمْ لَمْ يُؤْمِنِكُمْ ۗ ﴾ کی تفسیر۔

آیت 12 ۱ ذٰلِكُمْ بِاَنَّهُ اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهُ.....: یعنی انھیں جواب ملے گا کہ آج تم جس حال میں مبتلا ہو وہ اس لیے ہے کہ دنیا میں جب اکیلے اللہ کو پکارا جاتا تو تم نہیں مانتے تھے، لیکن جب اس کے ساتھ دوسرے معبود بھی شریک کیے جاتے تو تم مان لیتے تھے۔ اکیلے اللہ کی عبادت تو درکنار، اکیلے اللہ کے ذکر پر ہی تمہارے دل تنگ پڑ جاتے تھے اور غیروں کے ذکر پر تمہارے چہرے خوشی سے چمک اٹھتے تھے۔ (دیکھیے زمر: ۳۵) اب اگر تمہیں دوبارہ دنیا میں بھیج بھی دیا جائے تو تم وہی کچھ کرو گے جو تم پہلے کرتے رہے، اس لیے تمہارے جہنم سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں۔ دیکھیے سورۃ النعام (۲۸)۔

۲ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ: تو اب فیصلے کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے جو بہت بلند اور بہت بڑا ہے۔ آج تمہارے بنائے ہوئے دیوتاؤں، داتاؤں، مشکل کشاؤں اور حاجت رواؤں کا فیصلے میں کوئی دخل نہیں۔ ان ہستیوں کا ”الْعَلِيُّ الْكَبِيْرِ“ کے فیصلے میں کیا دخل ہو سکتا ہے جن کا خیر ہی پستی اور بے بضاعتی سے اٹھایا گیا ہے۔

آیت 12 ۱ هُوَ الَّذِي يُرِيْكُم اٰيٰتِهٖ: یعنی اللہ تعالیٰ ہی ہے جو تمہیں اپنے وجود اور اپنی وحدانیت کی بے شمار نشانیاں

قَادِعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُوْنَ ﴿۱۴﴾

پس اللہ کو پکارو، اس حال میں کہ دین کو اسی کے لیے خالص کرنے والے ہو، اگرچہ کافر برائے ہیں ﴿۱۴﴾

دکھاتا ہے، جو اس وقت بھی موجود تھیں جب تمہارے بنائے ہوئے معبودوں کا وجود تک نہ تھا۔ اب بھی کوئی داتا یا دیگر یہ دعویٰ نہیں کرتا اور نہ کر سکتا ہے کہ یہ سب کچھ اس نے پیدا کیا ہے، یا اس کے پیدا کرنے میں اس کا کوئی حصہ ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ان میں سے بہت سی نشانیوں کا ذکر فرمایا ہے، وہ نشانیاں آفاق (کائنات) میں بھی ہیں اور خود انسان کی ذات میں بھی۔ دیکھیے سورہ یونس (۶)، حم السجدہ (۵۳)، روم (۲۰ تا ۲۷)، بقرہ (۱۶۳)، جاثیہ (۳۵) اور سورہ مؤمن (۷۹)، (۸۰)۔ اللہ تعالیٰ کی آیات سے مراد انبیاء علیہم السلام کو عطا کردہ معجزے بھی ہیں اور اس کی قدرت پر دلالت کرنے والے عجیب و غریب واقعات و حوادث بھی، جو وقتاً فوقتاً انسان کے سامنے آتے رہتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کے متعلق فرمایا: ﴿وَلَقَدْ آرَيْنَهُ آيَاتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَأَبَىٰ﴾ [طہ: ۵۶] ”اور بلاشبہ یقیناً ہم نے اس (فرعون) کو اپنی تمام آیات (نشانیاں) دکھائیں، پس اس نے جھٹلایا اور انکار کر دیا۔“

﴿۱۴﴾ وَيُنَزِّلُ لَكُمْ مِنَ السَّمَاءِ رِزْقًا: یہ کہنے کے بعد کہ وہی ہے جو تمہیں اپنی آیات (نشانیاں) دکھاتا ہے، اپنی ایک عظیم نشانی کا ذکر فرمایا۔ ”رِزْقًا“ سے مراد یہاں بارش ہے، کیونکہ وہ انسان کے رزق کا سبب ہے۔ تمام نباتات اسی سے آتی ہیں، جنہیں کھا کر وہ تمام جانور پلتے ہیں جو انسان کی خوراک ہیں یا اس کے کام آتے ہیں۔ دیکھیے سورہ بقرہ (۲۲)، جاثیہ (۵)، ابراہیم (۳۲)، ق (۱۱ تا ۱۱) اور سورہ نحل (۱۰، ۱۱)۔

﴿۱۵﴾ وَمَا يَتَذَكَّرُ إِلَّا مَنْ يُنِيبُ: یعنی اللہ تعالیٰ کی قدرت اور وحدانیت کی نشانیاں تو بے شمار ہیں، مگر ان سے نصیحت رجوع کرنے والے ہی کو حاصل ہوتی ہے۔ اگر آدمی اپنی روزی ہی کو دیکھ لے کہ اسے مہیا کرنے میں قدرت کی کون کون سی چیزیں مصروف عمل ہیں اور کس طرح ایک دوسرے کی موافقت کے ساتھ کام کر رہی ہیں تو کبھی شرک کی جرأت نہ کرے، کیونکہ ان تمام چیزوں کو بنانے اور چلانے والا ایک ہے۔ اگر وہ ایک نہ ہو تو کائنات ایک لمحہ کے لیے بھی باقی نہیں رہ سکتی۔ مگر جو شخص اللہ تعالیٰ سے منہ موڑ لے اور اس کی نشانیوں کی طرف توجہ ہی نہ کرے، وہ بڑی سے بڑی نشانی دیکھ کر بھی کوئی نصیحت حاصل نہیں کر سکتا، کیونکہ اس کی آنکھوں پر تقلید آباء، تعصب اور عناد کے پردے پڑے ہوئے ہوتے ہیں۔

آیت 14 ﴿۱﴾ قَادِعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ: ”الدِّيْنَ“ کا معنی عبادت بھی ہے اور اطاعت بھی۔ یعنی جب تمہاری روزی کا مالک وہی ہے تو اپنی عبادت اور اطاعت کو اسی کے لیے خالص کرتے ہوئے صرف اسی کو پکارو، اس کی بندگی میں کسی دوسرے کو شریک نہ کرو۔

﴿۲﴾ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُوْنَ: یعنی تمہارے اللہ واحد کو پکارنے سے کافر و مشرک ناک بھوں چڑھائیں گے، سو تم ایک اللہ کی عبادت و اطاعت پر قائم رہو، خواہ کافر اسے کتنا ہی ناپسند کریں۔

رَفِيعُ الدَّرَجَاتِ ذُو الْعَرْشِ، يُلْقَى الرُّوحَ مِنْ أَمْرِهِ عَلَى مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ لِيُنذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ ﴿١٥﴾ يَوْمَ هُمْ بَرْزُورُونَ هَ لَا يَخْفَى عَلَى اللَّهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ لِسَانُ الْمَلِكِ الْيَوْمَ لِلَّهِ

الوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿١٥﴾

وہ بہت بلند درجوں والا، عرش کا مالک ہے، وہ اپنے حکم سے وحی اتارتا ہے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے، تاکہ آپس کی ملاقات کے دن سے ڈرائے ﴿۱۵﴾ جس دن وہ صاف ظاہر ہوں گے، ان کی کوئی چیز اللہ پر چھپی نہ ہوگی۔ آج کس کی بادشاہی ہے؟ اللہ ہی کی جو ایک ہے، بہت دبدبے والا ہے ﴿۱۵﴾

آیت 15 ﴿١٥﴾ رَفِيعُ الدَّرَجَاتِ ذُو الْعَرْشِ: ”الدَّرَجَاتِ“ ”دَرَجَاتٌ“ کی جمع ہے، جس کا معنی مرتبہ بھی ہے اور سیزھی بھی۔ ”رَفِيعٌ“ ”رَفَعُ يَرْفَعُ“ (ف) سے ہے، لازم بھی آتا ہے اور متعدی بھی۔ لازم سے ہو تو معنی ”مُرْتَفَعُ الدَّرَجَاتِ“ ہے، اس کا اصل ”رَفِيعٌ دَرَجَاتُهُ“ ہے۔ یعنی وہ بہت بلند مراتب اور سیزھیوں والا اور عرش والا ہے، اس کی ذات مخلوق سے جدا عرش کے اوپر ہے۔ فرشتوں کو عرش تک پہنچنے کے لیے بہت سی سیزھیوں پر چڑھنا پڑتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿سَأَلْنَا عَنْ عَذَابٍ وَاقِعٍ لِلْكَافِرِينَ لَيْسَ لَهُ دَافِعٌ مِّنَ اللَّهِ ذِي الْمَعَارِجِ ۚ تَعْرُبُ الْمَلَكِئَةُ وَالرُّوحُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ﴾ [المعارج: ۱ تا ۴] ”ایک سوال کرنے والے نے اس عذاب کے متعلق سوال کیا جو واقع ہونے والا ہے۔ کافروں پر، اسے کوئی ہٹانے والا نہیں۔ اللہ کی طرف سے، جو سیزھیوں والا ہے۔ فرشتے اور روح اس کی طرف چڑھتے ہیں، (وہ عذاب) ایک ایسے دن میں (ہوگا) جس کا اندازہ پچاس ہزار سال ہے۔“ مزید وضاحت کے لیے دیکھیے سورہ معارج کی انہی آیات کی تفسیر۔

”رَفِيعُ الدَّرَجَاتِ“ میں ”رَفِيعٌ“ کو اگر متعدی مانا جائے تو معنی ہوگا، وہ درجوں کو بہت بلند کرنے والا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿تَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مِّنْ شَاءُ﴾ [یوسف: ۷۶] ”ہم جسے چاہتے ہیں درجوں میں بلند کر دیتے ہیں۔“

﴿٢﴾ يُلْقَى الرُّوحَ مِنْ أَمْرِهِ عَلَى مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ: ”الرُّوحَ“ سے مراد یہاں ”وحی“ ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿يُنزِّلُ الْمَلَائِكَةَ بِالرُّوحِ مِنْ أَمْرِهِ عَلَى مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ أَنْ أَنْذِرُوا أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاتَّقُونِ﴾ [النحل: ۲] ”وہ فرشتوں کو وحی کے ساتھ اپنے حکم سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے نازل کرتا ہے کہ خبردار کرو کہ حقیقت یہ ہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو مجھ سے ڈرو۔“ مزید تشریح سورہ نحل کی اس آیت کی تفسیر میں ملاحظہ فرمائیں۔

﴿٣﴾ لِيُنذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ: ”التَّلَاقِ“ ”لَقِي يَلْقَى“ (ع) سے باب تفاعل کا مصدر ہے، اصل میں ”تَلَاقِي“ ہے، ایک دوسرے سے ملنا۔ یعنی اللہ تعالیٰ وحی اس لیے نازل فرماتا ہے تاکہ ملاقات کے دن سے ڈرائے۔ مراد قیامت کا دن ہے، جس میں جانیں جسموں کے ساتھ ملیں گی اور سب لوگ ایک دوسرے سے ملیں گے۔ ہر عمل کرنے والا اپنے عمل کی جزا سے ملے گا، ظالم و مظلوم ملیں گے، آسمان والے فرشتے زمین کے انسانوں سے ملیں گے اور مخلوق خالق سے ملے گی، جو ان کا حساب لے گا۔

آیت 16 ﴿١٦﴾ يَوْمَ هُمْ بَرْزُورُونَ..... یعنی ساری مخلوق اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ہر وقت ظاہر ہے، کوئی چیز اس سے مخفی نہیں۔

الْيَوْمَ تُجْزَىٰ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ ۗ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ ۗ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿۱۶﴾

آج ہر شخص کو اس کا بدلہ دیا جائے گا جو اس نے کمایا، آج کوئی ظلم نہیں۔ بے شک اللہ بہت جلد حساب لینے والا ہے ﴿۱۶﴾

اگرچہ دنیا میں کچھ لوگ اپنے خیال کے مطابق اپنے آپ کو کسی مکان یا غار وغیرہ میں یا کپڑوں میں چھپا لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے چھپ گئے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿أَلَا إِنَّهُمْ يَخْتَفُونَ ضُدُورَهُمْ لِيَتَّخِفُوا آيَةَ الْآجِرِينَ يَسْتَكْفُونَ سِيَّئَهُمْ دِعْلَهُمْ مَا يَكْتُمُونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلَيْهِ يُدْأَاتُ الضُّورُ﴾ [معد: ۵] ”سن لو! بلاشبہ وہ اپنے سینوں کو موڑتے ہیں، تاکہ اس سے اچھی طرح چھپے رہیں، سن لو! جب وہ اپنے کپڑے اچھی طرح لپیٹ لیتے ہیں وہ جانتا ہے جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں۔ بے شک وہ سینوں والی بات کو خوب جاننے والا ہے۔“ مگر قیامت کے دن زمین پر کوئی اوث نہیں رہے گی، جس میں وہ چھپ سکیں، بلکہ سب کے سب صاف ظاہر ہوں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّي نَسْفًا ۖ فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ۖ لَا تَبْقَىٰ فِيهَا جَبَلًا وَلَا أَمْتًا﴾ [ضہ: ۱۰۵-۱۰۷] ”اور وہ تجھ سے پہاڑوں کے بارے میں پوچھتے ہیں تو تو کہہ دے میرا رب انہیں اڑا کر نکیر دے گا۔ پھر انہیں ایک چنیل میدان بنا کر چھوڑے گا۔ جس میں تو نہ کوئی کچی دیکھے گا اور نہ کوئی ابھری جگہ۔“ اس دن تو کسی کے جسم پر کوئی کپڑا بھی نہیں ہوگا، ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿إِنَّكُمْ تَلَاقُوا اللَّهَ حِفَاةَ عُرَاةٍ مُّشَاةٍ غُرْلًا﴾ [بخاری، لرقاق، باب کیف الحشر: ۶۵۲۴] ”تم اللہ تعالیٰ سے ننگے پاؤں، ننگے بدن، پیدل چلنے والے، بغیر ختہ کیے ہوئے ملو گے۔“ مزید دیکھیے سورۃ ابراہیم (۲۱، ۲۸) اور سورۃ حاقہ (۱۸، ۱۳)۔

﴿۱۶﴾ لَيَسَّ الْمَلِكُ الْيَوْمَ: یعنی دنیا میں بہت سے لوگ اپنی بادشاہی اور بڑائی کا ڈھنڈورا پیٹتے رہے اور بہت سے لوگ ان کی بادشاہی اور کبریائی مانتے رہے، مگر اب بتاؤ کہ آج ساری بادشاہی کا مالک کون ہے؟ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ نے فرمایا: ﴿يَقْبِضُ اللَّهُ الْأَرْضَ، وَيَطْوِي السَّمَوَاتِ بِمِجْنَبِهِ، ثُمَّ يَقُولُ أَنَا الْمَلِكُ، أَيْنَ مَلِكُكَ الْأَرْضِ؟﴾ [بخاری، التفسیر، باب قولہ: ﴿وَالْأَرْضَ جَمِيعًا مَقْبِضَةً﴾: ۴۸۱۲] ”اللہ تعالیٰ زمین کو منہی میں لے گا اور آسمان کو اپنے دائیں ہاتھ میں لپیٹ لے گا، پھر فرمائے گا، میں ہی بادشاہ ہوں، کہاں ہیں زمین کے بادشاہ؟“

﴿۱۷﴾ يَلَهُ الْوَالِدِ الْعَقْبَارُ: جب کوئی جواب دینے والا نہیں ہوگا تو اللہ تعالیٰ خود ہی یہ بات فرمائے گا، جیسا کہ پچھلے فائدے میں حدیث گزری۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ آیت میں اس وقت کا ذکر ہے جب سب لوگ میدان حشر میں صاف ظاہر ہوں گے، ان کی کوئی چیز اللہ پر چھپی نہ ہوگی، اس وقت اللہ تعالیٰ پوچھے گا: ﴿لَيَسَّ الْمَلِكُ الْيَوْمَ﴾ ”آج کس کی بادشاہی ہے؟“ ظاہر ہے اس وقت وہ سب لوگ جو وہاں جمع ہوں گے وہی یہ جواب دیں گے۔ نیک لوگ خوشی سے اور برے لوگ یہ بات بادل ناخواستہ کہیں گے، کیوں کہ کسی کے پاس اس کے سوا چارہ نہیں ہوگا۔ رہی حدیث، تو وہ اس موقع کی بات ہے جب اللہ تعالیٰ زمین و آسمان کو لپیٹے گا اور یہ بات فرمائے گا۔ گویا اللہ تعالیٰ اکیلے کی بادشاہت کا اظہار و اقرار متعدد بار ہوگا۔

﴿۱۷﴾ ﴿۱﴾ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ: آج کسی قسم کا ظلم نہیں ہوگا کہ کسی کا ثواب کم کر دیا جائے، یا کسی کو اس سے زیادہ

وَأَنْذَرَهُمْ يَوْمَ الْأَرْزَاقِ إِذِ الْقُلُوبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ كَظَبِينٍ ۗ مَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ حَمِيمٍ
وَلَا شَفِيعٍ يُطَاعُ ﴿۱۸﴾

اور انھیں قریب آنے والی گھڑی کے دن سے ڈرا جب دل گلوں کے پاس غم سے بھرے ہوں گے، ظالموں کے لیے
نہ کوئی دلی دوست ہوگا اور نہ کوئی سفارشی، جس کی بات مانی جائے ﴿۱۸﴾
عذاب دیا جائے جس کا وہ مستحق ہے۔

﴿۱۸﴾ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ: اللہ تعالیٰ کو تمام جن وانس کا حساب لینے میں کوئی دیر نہیں لگتی، اس کے لیے تمام انسانوں کا
حساب ایسے ہی ہے جیسے ایک آدمی کا حساب لینا، کیونکہ اسے ہر چیز کا علم ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ حقوق کی طرح عاجز
نہیں کہ ایک وقت میں ایک ہی مقدمہ سن سکے، یا اصل حقیقت کا علم نہ ہونے کی وجہ سے جلدی فیصلہ نہ کر سکے۔ انسان اپنے
عجز کی وجہ سے فیصلے میں دیر کرتا ہے، جب کہ فیصلے میں دیر بھی ایک طرح کا ظلم ہے۔ اللہ تعالیٰ چونکہ ہر طرح کے عجز سے پاک
ہے، اس لیے وہ ایک ہی وقت میں سب کا حساب کر کے جنت والوں کو جنت میں اور جہنم والوں کو جہنم میں بھیج دے گا، فرمایا:
﴿ مَا خَلَقَكُمْ وَلَا يَبْسُطُكُمْ إِلَّا جَنَّتَيْنِ وَاحِدَةً ﴾ [النجم: ۶۸] "نہیں ہے تمہارا پیدا کرنا اور نہ تمہارا اٹھانا مگر ایک جان کی
طرح" اور فرمایا: ﴿ وَمَا أَمَرْنَا إِلَّا وَاحِدَةً كَلْبِجٍ بِالْبَصْرِ ﴾ [الفرق: ۵۰] "اور ہمارا حکم تو صرف ایک بار ہوتا ہے، جیسے
آنکھ کی ایک جھپک۔"

آیت 18 ﴿۱۸﴾ وَأَنْذَرَهُمْ يَوْمَ الْأَرْزَاقِ: "أَرْزَقُ يَأْرِزُقُ" (اس) سے اسم فاعل ہے۔ مؤنث اس لیے
ہے کہ یہ "الْكَشَاعَةُ" کی صفت ہے۔ چنانچہ قیامت کے متعلق اکثر الفاظ مؤنث استعمال ہوئے ہیں، مثلاً "الْمَحَاقِمَةُ"،
الْقَارِعَةُ، الصَّاحِبَةُ اور "الظَّالِمَةُ" وغیرہ۔ قیامت کو "الْأَرْزَاقُ" اس لیے فرمایا کہ اس کا آنا بہت قریب ہے۔ اللہ تعالیٰ
نے متعدد مقامات پر قیامت کے قریب آنے سے لوگوں کو خبردار فرمایا ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿ أَرْزَقْتَ الْأَرْزَاقَ ۗ لَيْسَ لَهَا مِنْ
دُونِ اللَّهِ كَاشِفَةٌ ﴾ [النجم: ۵۷، ۵۸] "قریب آگئی وہ قریب آنے والی۔ جسے اللہ کے سوا کوئی بنانے والا نہیں۔"
قیامت کے قریب آنے کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۃ انبیاء کی آیت (۱): ﴿ اقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ ﴾ کی تفسیر۔

﴿۱۹﴾ إِذِ الْقُلُوبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ كَظَبِينٍ: "حَنَاجِرٌ" کی جمع ہے، حلق۔ "كَظَبِينٍ" "كَظَمَ السَّقَاءُ" کا
معنی مشکیزے کو پانی سے بھر کر اس کا منہ بند کر دینا ہے۔ یعنی شدید خوف اور غم کی وجہ سے ہجرموں کے دل حلق کو پہنچے ہوئے
ہوں گے، پھر وہ نہ تو اپنی جگہ واپس جائیں گے کہ انھیں کچھ آرام ملے اور نہ ہی ان کے بدن سے باہر نکلیں گے کہ موت آنے
کے بعد ان کی جان چھوٹے۔

﴿۲۰﴾ مَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ حَمِيمٍ: "حَمِيمٌ يَحْمِي" (ن) گرم کرنا۔ دلی دوست یا رشتہ دار کو "حَمِيمٌ" اس لیے کہتے ہیں کہ اسے
اپنے دوست یا رشتہ دار کی وجہ سے دل میں گرمی آتی ہے۔ قیامت کے دن ظالموں کا کوئی دلی دوست نہیں ہوگا، جیسا کہ فرمایا:

يَعْلَمُ خَائِبَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ ⑩

وہ آنکھوں کی خیانت کو جانتا ہے اور اسے بھی جو سینے چھپاتے ہیں ⑩

﴿الْأَخْلَاقُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ إِلَّا الْمُتَّقِينَ﴾ [الزخرف: ۶۷] ”سب دلی دوست اس دن ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے مگر متقی لوگ۔“

④ وَلَا شَفِيعَ: ”ظالمین“ سے مراد کفار و مشرکین ہیں۔ (دیکھیے انعام: ۸۲۔ لقمان: ۱۳) ان کے حق میں کوئی بھی سفارش نہیں کرے گا، کیونکہ اس دن جو سفارش کی اجازت دی جائے گی وہ انبیاء، فرشتوں اور نیک بندوں کو دی جائے گی اور وہ بھی صرف ایمان والوں کے لیے، کفار و مشرکین کا سفارشی اس دن کوئی نہیں ہوگا۔ مزید دیکھیے سورہ بقرہ (۲۸)۔

⑤ يُظَاهِرُ: ”جس کی بات مانی جائے“ یعنی اول تو کفار کے حق میں کوئی شفاعت کی جرات ہی نہیں کرے گا۔ (دیکھیے انبیاء: ۳۸) اگر لاعلمی یا کسی شبہ کی وجہ سے سفارش کی اجازت سمجھ کر کوئی نبی یا وہ کسی کافر کے حق میں سفارش کر بھی دے گا تو اس کی سفارش نہیں مانی جائے گی۔ ہاں، سفارش قبول نہ ہونے کی وجہ بتا دی جائے گی، جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام قیامت کے دن اپنے والد کے حق میں سفارش کریں گے، مگر وہ قبول نہیں ہوگی۔ اسی طرح حوض کوثر پر آنے والے بعض لوگوں کے حق میں رسول اللہ ﷺ سفارش کریں گے مگر آپ کو بتایا جائے گا کہ آپ نہیں جانتے کہ انہوں نے آپ کے بعد کیا نیا کام کیا تھا، تو آپ ﷺ سفارش سے دست بردار ہو جائیں گے۔

آیت 19 . يَعْلَمُ خَائِبَةَ الْأَعْيُنِ.....: ”خَائِبَةَ“ ”خَانَ يَخُونُ“ (ن) سے ”فَاعِلَةٌ“ کے وزن پر مصدر ہے، جیسا کہ ”غَابِيَةٌ“ ہے اور یہ اسم فاعل بھی ہو سکتا ہے۔ اسم فاعل ہونے کی صورت میں دراصل ”الْأَخْلَاقُ الْخَائِبَةُ“ تھا، پھر صفت کو موصوف کی طرف مضاف کر دیا۔ معنی ”خیانت کرنے والی آنکھیں“ ہوگا۔ مصدر ہونے کی صورت میں معنی واضح ہے اور وہ ہے ”آنکھوں کی خیانت“، یعنی اللہ تعالیٰ کفار کے حق میں سفارش قبول نہیں کرے گا۔ اگر کسی نے کسی شبہ کی بنا پر غلطی سے کر بھی دی تو مانی نہیں جائے گی، کیونکہ سفارش کرنے والے کو اس کے کفر کا پورا اندازہ نہیں ہوگا، جب کہ اللہ تعالیٰ نہ ایسے لوگوں کے حق میں سفارش کی اجازت دے گا نہ سفارش قبول کرے گا، کیونکہ وہ تو آدمی کے ظاہر اعمال ہی نہیں پوشیدہ معاملات کو بھی جانتا ہے، جن میں سے آنکھوں کی خیانت اور دلوں کی چھپائی ہوئی باتیں سب سے زیادہ مخفی چیزیں ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں بھی جانتا ہے، تو وہ کسی کے دل کے کفر و شرک کا علم رکھتے ہوئے اس کے حق میں سفارش کیسے قبول کر سکتا ہے؟ انسان کے ظاہری اعضا کے اعمال میں سب سے پوشیدہ عمل آنکھ کے مختلف اعمال ہیں۔ مثلاً لوگوں سے چوری کسی کو دیکھنا جسے دیکھنا حرام ہے اور آنکھ کے اشارے سے ناجائز تعلق قائم کر لینا وغیرہ اور باطنی اعضا میں سے دل کے وہ اعمال ہیں جن کا آدمی کبھی اظہار نہیں کرتا، بلکہ انہیں چھپا کر رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اسے آنکھوں کی خیانت اور دل کے چھپائے ہوئے سب اعمال معلوم ہیں۔ قیامت کے دن ایسی تمام خیانتیں اور دلوں میں چھپائے ہوئے اعمال سب ظاہر کر دیے جائیں گے، جیسا کہ فرمایا:

﴿يَوْمَ تُبْلَى السُّرُورُ﴾ [الطارق: ۹] ”جس دن چھپی ہوئی باتوں کی جانچ پڑتال کی جائے گی۔“

وَاللَّهُ يَقْضِي بِالْحَقِّ ۚ وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ لَا يَقْضُونَ بِشَيْءٍ ۗ إِنَّ اللَّهَ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ﴿۲۰﴾ أَوْ لَمْ يَسْزِدُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ كَانُوا مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ كَانُوا هُمْ أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَ آثَارًا فِي الْأَرْضِ فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ ۗ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ وَاقٍ ﴿۲۱﴾ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانَتْ تَأْتِيهِمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَكَفَرُوا فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ ۗ إِنَّهُ قَوِيٌّ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿۲۲﴾

اور اللہ حق کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے اور وہ لوگ جنہیں وہ اس کے سوا پکارتے ہیں کسی بھی چیز کا فیصلہ نہیں کرتے۔ بے شک اللہ ہی تو سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے ﴿۲۰﴾ اور کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے کہ ان لوگوں کا انجام کیسا ہوا جو ان سے پہلے تھے، وہ تو قوت میں ان سے بہت زیادہ سخت تھے اور زمین میں یادگاروں کے اعتبار سے بھی، پھر اللہ نے انہیں ان کے گناہوں کی وجہ سے پکڑ لیا اور انہیں اللہ سے بچانے والا کوئی نہ تھا ﴿۲۱﴾ یہ اس لیے کہ وہ لوگ، ان کے پاس ان کے رسول واضح دلیلیں لے کر آتے رہے تو انہوں نے انکار کیا تو اللہ نے انہیں پکڑ لیا۔ بے شک وہ بہت قوت والا، بہت سخت سزا دینے والا ہے ﴿۲۲﴾

آیت 20 : وَاللَّهُ يَقْضِي بِالْحَقِّ : یعنی اللہ تعالیٰ آنکھوں کی خیانت اور دلوں کے راز تک سے واقف ہے، اس لیے وہی حق کے ساتھ فیصلہ کر سکتا ہے اور کرے گا۔ اس کے سوا جنہیں یہ لوگ پکارتے ہیں وہ کوئی اختیار رکھتے ہیں اور نہ انہیں کسی کے حال کی کچھ خبر ہے، کیونکہ وہ نہ سنتے ہیں نہ دیکھتے ہیں۔ دل کے معاملات تو بہت ہی پوشیدہ ہوتے ہیں، اس لیے حق کے ساتھ فیصلہ تو دور کی بات ہے وہ کسی قسم کا فیصلہ بھی نہیں کر سکتے۔ جب کہ اللہ تعالیٰ سچ بھی ہے بصیر بھی، مخفی سے مخفی معاملات کا علیم و خبیر بھی ہے اور تمام اختیارات کا مالک بھی، اس لیے اس اکیلے کو پکارو اور اسی کی بندگی کرو۔

آیت 21 : ﴿۱﴾ أَوْ لَمْ يَسْزِدُوا فِي الْأَرْضِ : گزشتہ آیات میں کفار کو آخرت کے عذاب سے ڈرایا گیا ہے، اب دنیا میں آنے والے عذاب سے ڈرایا جا رہا ہے کہ کیا ان لوگوں نے زمین میں چل پھر کر ان قوموں کا انجام نہیں دیکھا جو ان سے پہلے انبیاء کو جھٹلانے کے جرم میں ہلاک کی گئیں؟

﴿۲﴾ كَانُوا هُمْ أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَ آثَارًا فِي الْأَرْضِ : اس کی مفصل تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ روم کی آیت (۹) کی تفسیر۔
 ﴿۳﴾ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ وَاقٍ : اصل میں ”واقی“ ہے، جو ”وَفِي بَيْتِي وَ قَابَةَ“ (ض) سے اسم فاعل ہے، بچانے والا۔ یعنی ان سے زیادہ قوت و آثار والی اقوام پر ان کے گناہوں کی وجہ سے جب اللہ تعالیٰ کی گرفت آئی تو انہیں اللہ تعالیٰ سے بچانے والا کوئی نہ تھا۔ اسی طرح جب ان لوگوں پر اللہ کا عذاب آیا تو انہیں بھی کوئی نہیں بچا سکے گا۔

آیت 22 : ﴿۱﴾ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانَتْ تَأْتِيهِمْ : ”الْبَيِّنَاتِ“ کا لفظ عام ہے، اس سے مراد معجزے بھی ہیں، روشن دلیلیں

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِينٍ ﴿۲۳﴾ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَقَارُونَ فَقَالُوا

سِحْرٌ كَذٰبٌ ﴿۲۳﴾

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے موسیٰ کو اپنی آیات اور واضح دلیل کے ساتھ بھیجا ﴿۲۳﴾ فرعون اور ہامان اور قارون کی طرف تو انھوں نے کہا جادوگر ہے، بہت جھوٹا ہے ﴿۲۳﴾

بھی اور واضح احکام و ہدایات بھی۔

آیت 23 ﴿۱﴾ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ.....: پچھلی آیات میں پہلے انبیاء علیہم السلام کو جھٹلانے والی اقوام کے انجام کے ذکر میں جہاں موجودہ جھٹلانے والوں کے لیے عبرت اور ڈرانے کا سامان ہے وہیں رسول اللہ ﷺ اور ایمان والوں کے لیے تسلی اور بشارت بھی ہے۔ اب رسول اللہ ﷺ اور اہل ایمان کی مزید تسلی کے لیے موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا واقعہ ذکر فرمایا، جس میں فرعون کا موسیٰ علیہ السلام اور ایمان والوں کو ڈرانا دھمکانا خاص طور پر نمایاں کیا ہے۔ اس کے مقابلے میں موسیٰ علیہ السلام اور اہل ایمان کی شجاعت، ثابت قدمی اور پیش آنے والی مصیبتوں پر صبر کی تفصیل بیان فرمائی ہے، ساتھ ہی فرعون اور اس کے ساتھیوں کے عبرتناک انجام کا ذکر فرمایا ہے۔ مقصد رسول اللہ ﷺ کو حوصلہ دلانا ہے کہ آپ ان کفار کے جھٹلانے سے فکر مند نہ ہوں، آخر کار موسیٰ علیہ السلام کی طرح آپ ہی کامیاب ہوں گے، میری مدد آپ کے ساتھ ہے۔

﴿۲﴾ بِآيَاتِنَا: ”آیات“ سے مراد موسیٰ علیہ السلام کے نو (۹) معجزے ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ بنی اسرائیل (۱۰۱)۔

﴿۳﴾ وَسُلْطٰنٍ مُّبِينٍ: ”سُلْطٰن“ سے مراد اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ وہ ہیبت و رعب ہے جس کی وجہ سے فرعون اپنی فوج اور تمام تر قوت کے باوجود موسیٰ علیہ السلام پر ہاتھ نہ اٹھا سکا، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَنَجْعَلُ لَكُمْ سُلْطٰنًا فَلَا يَصِلُونَ اِلَيْكُمْ﴾ [الفصص: ۳۵] ”اور ہم تم دونوں کے لیے غلبہ رکھیں گے، سو وہ تم تک نہیں پہنچیں گے۔“

آیت 24 ﴿۱﴾ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَقَارُونَ: ”فرعون“ اس زمانے میں مصر کے بادشاہ کا لقب ہوا کرتا تھا، ہامان اس کا وزیر تھا اور قارون سرمایہ دار منافق تھا، جو موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں سے ہونے کے باوجود فرعون کا ساتھی بن گیا تھا۔ (دیکھیے قصص ۷۶ تا ۸۲) موسیٰ علیہ السلام مصر کے تمام قطبیوں کی طرف بھیجے گئے تھے، مگر ان تینوں کا ذکر اس لیے فرمایا کہ یہ اپنی قوم کے سردار اور موسیٰ علیہ السلام کے خلاف سازشیں کرنے میں پیش پیش تھے، باقی لوگ ان کے پیروکار تھے۔

﴿۲﴾ فَقَالُوا سِحْرٌ كَذٰبٌ: موسیٰ علیہ السلام کے واضح معجزات عصا اور ید بیضا کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ موسیٰ علیہ السلام اور ان کے معجزات کے حق ہونے کے یقین کے باوجود ضد اور عناد کی وجہ سے انھوں نے ان کا صاف انکار کر دیا (دیکھیے بنی اسرائیل: ۱۰۲-۱۰۳) نمل: ۱۳، ۱۴ اور اپنی قوم کو دھوکا دینے کے لیے معجزوں کو جادو اور موسیٰ علیہ السلام کو جادوگر اور کذاب کہہ دیا۔ ورنہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ موسیٰ علیہ السلام جادوگر ہیں نہ جھوٹے، کیونکہ فرعون کے ملک میں جادوگر تو بے شمار تھے مگر کسی جادوگر سے یہ تو نہ ہو سکا کہ وہ اپنے جادو کے زور سے ملک بھر میں قحط مسلط کر دے اور جب اس قحط کو دور کرنے کی درخواست کی جائے تو وہ اپنے جادو

فَلَمَّا جَاءَهُمْ بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا اقْتُلُوا أَبْنَاءَ الَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ وَاسْتَحْيُوا نِسَاءَهُمْ وَمَا كَيْدُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ۝۵۱ وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْ اَقْتُلْ مُوسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهُ ۗ اِنِّىْ اَخَافُ اَنْ يُبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ ۝۵۲

پس جب وہ ہمارے ہاں سے حق لے کر ان کے پاس آیا تو انہوں نے کہا ان لوگوں کے بیٹوں کو، جو اس کے ہمراہ ایمان لائے ہیں، قتل کرو اور ان کی عورتوں کو زندہ رہنے دو اور نہیں کافروں کی چال مگر سر اسرنا کام ۵۱ اور فرعون نے کہا مجھے چھوڑ دو کہ میں موسیٰ کو قتل کر دوں اور وہ اپنے رب کو پکار لے، بے شک میں ڈرتا ہوں کہ وہ تمہارا دین بدل دے گا، یا یہ کہ اس سر زمین میں فساد پھیلا دے گا ۵۲

کے زور سے ہارٹیں برسرا قیام ختم کر دے، بلکہ جادوگروں نے تو بھرے میدان میں موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لا کر فرعون کی مکارانہ سازشوں کی قلمی کھول دی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ ذاریات میں جھٹلانے والی تمام اقوام کا یہی رویہ بیان فرمایا ہے: ﴿كَذٰلِكَ مَا اٰتٰى الْاٰلِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَمِنْ كٰسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سٰحِرٌ اَوْ جٰنُوْنٌ ۗ اَتَاكُوْنٰ اِيْهٖٓۤ اَبْلٌ لِّمَنْ قَوْمُهُمْ طٰغُوْنَ ۗ﴾ [الذاریات: ۵۲، ۵۳] ”اسی طرح ان لوگوں کے پاس جو ان سے پہلے تھے، کوئی رسول نہیں آیا مگر انہوں نے کہا یہ جادوگر ہے یا دیوانہ۔ کیا انہوں نے ایک دوسرے کو اس (بات) کی وصیت کی ہے؟ (نہیں) بلکہ یہ (خود ہی) سرکش لوگ ہیں۔“

آیت 25: ﴿فَلَمَّا جَاءَهُمْ بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِنَا.....﴾: فرعون موسیٰ علیہ السلام کی آمد سے پہلے بنی اسرائیل کے لڑکوں کو قتل کرتا اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھتا تھا۔ (دیکھیے قصص: ۴) موسیٰ علیہ السلام کی آمد پر ان کے واضح معجزات دیکھ کر اور جادوگروں کے ساتھ مقابلے میں ناکام ہو کر وہ ایسا مرعوب ہوا کہ اس نے لڑکوں کو قتل کرنے کا سلسلہ روک دیا، مگر دن بدن ایمان لانے والوں میں اضافے کو دیکھ کر اس کے سرداروں نے اسے موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے خلاف کارروائی پر بھڑکایا۔ اس سے پہلے وہ تمام بنی اسرائیل کے بیٹوں کو قتل کرتے تھے، اب انہوں نے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والوں کے بیٹوں کو قتل کرو اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھو۔ یہ بات فرعون نے نہیں بلکہ اس کے درباریوں نے کہی، فرعون نے ان سے ایسا کرنے کا وعدہ کر لیا، جیسا کہ سورۃ اعراف میں ہے: ﴿سَقَتِلْ اَبْنَاءَهُمْ وَنَسَتْنٰ نِسَاءَهُمْ﴾ [الاعراف: ۱۲۷] ”ہم ضرور ان کے بیٹوں کو بری طرح قتل کریں گے اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھیں گے۔“ مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔

آیت 26: ﴿وَمَا كَيْدُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ﴾: اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے ظاہر ہے کہ وہ اپنا ارادہ پورا نہ کر سکا اور اپنے منصوبے میں بھی ناکام رہا۔ قحط سالیوں، پیداوار کی کمی اور طوفان، ٹڈیوں، جوؤں، مینڈکوں اور خون کے پے در پے عذابوں نے اسے دم ہی نہیں لینے دیا کہ وہ دوبارہ یہ کام کر سکتا، حتیٰ کہ اسے اس کی قوم سمیت سمندر میں غرق کر دیا گیا۔ مزید دیکھیے سورۃ اعراف (۱۳۶ تا ۱۳۰)۔

آیت 26: ﴿وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْ اَقْتُلْ مُوسٰى﴾: یہ کہہ کر فرعون ظاہر یہ کرنا چاہتا تھا کہ ابھی تک اس نے جو

وَقَالَ مُوسَىٰ إِنِّي عُذْتُ بِرَبِّي وَرَبِّكُمْ مِنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ ﴿۲۷﴾

اور موسیٰ نے کہا بے شک میں نے اپنے رب اور تمہارے رب کی پناہ لی ہے ہر اس تکبر سے جو یوم حساب پر ایمان نہیں رکھتا ﴿۲۷﴾

موسیٰ (علیہ السلام) کو قتل نہیں کیا تو اپنے درباریوں اور سرداروں کے روکنے کی وجہ سے نہیں کیا۔ یہ بات اس نے محض رعب گانٹھنے کے لیے یا اپنے آپ کو ہمت دلانے کے لیے کہی، کیونکہ اندر سے وہ شدید خوف زدہ تھا اور اللہ تعالیٰ نے ”نَجْعَلُ لَكُمْ سُلْطٰنًا فَلَا يَصِلُونَ إِلَيْكُمَا“ (ہم تم دونوں کے لیے غلبہ رکھیں گے، سو وہ تم تک نہیں پہنچیں گے۔ قصص: ۳۵) کے فرمان کے ساتھ موسیٰ اور ہارون علیہ السلام کو جو غلبہ اور زعم عطا فرما رکھا تھا، اس کے ہوتے ہوئے اس کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ انھیں قتل کرے، یا کوئی اور نقصان پہنچائے۔ رہے درباری، تو وہ نہ تو فرعون کو موسیٰ علیہ السلام کے قتل سے روکتے تھے اور نہ ہی فرعون ان کی رائے کو پرکھ کر کی وقعت دیتا تھا۔ (دیکھیے مؤمن: ۲۹) اس نے اپنی پوری قوم کو اتنا بے وقعت بنا دیا تھا کہ وہ ہر بات میں اس کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے، خواہ وہ عقل سے کتنی ہی دور ہو، جیسا کہ فرمایا: ﴿فَأَسْتَحْكَمْ قَوْمَهُ فَاطَاعُوهُ ۖ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا فَاسِقِينَ﴾ [الزخرف: ۵۴] ”غرض اس نے اپنی قوم کو ہلکا (بے وزن) کر دیا تو انھوں نے اس کی اطاعت کر لی، یقیناً وہ نافرمان لوگ تھے۔“

﴿۲۷﴾ وَلْيَذُكَّرْ رَبَّنَا: یہ بھی اس کی گیدڑ بھکی تھی، ورنہ اسے اور اس کی قوم کو موسیٰ علیہ السلام کے معجزات دیکھ کر یقین ہو چکا تھا کہ وہ اللہ کے سچے پیغمبر ہیں اور اللہ تعالیٰ انھیں بے یار و مددگار نہیں چھوڑے گا۔ اگر اسے یہ یقین نہ ہو چکا ہوتا تو اتنی افواج قاہرہ کا مالک ہونے کے باوجود کس نے اس کا ہاتھ موسیٰ علیہ السلام کے قتل سے روک رکھا تھا۔

﴿۲۸﴾ إِنِّي أَخَافُ أَنْ يُبَدِّلَ دِينَكُمْ: دین سے مراد ان کا عقیدہ اور اس پر مبنی نظام سلطنت ہے، جس میں فرعون کو رب الاعلیٰ اور اس کے حکم کو واجب الطاعت مانا جاتا تھا۔ یعنی مجھے خطرہ ہے کہ یہ تمہیں تمہارے اس دین اور اعتقاد کا منکر کر دے جس کے تحت تم مجھے اپنا رب سمجھ کر میری محکومی اور فرماں برداری پر مطمئن ہو اور اس طرح ملک میں انقلاب برپا کر دے، گویا میں اسے تمہاری خاطر ہی قتل کرنا چاہتا ہوں۔

﴿۲۹﴾ أَوْ أَنْ يُظْهِرَ فِي الْأَمْثَالِ الْفَسَادَ: یعنی اگر وہ تمام اہل مصر کو آباؤی دین کا منکر نہ کر سکے تو کم از کم یہ خطرہ تو ضرور ہے کہ ان میں سے بعض لوگوں کو توحید کا قائل کر لے اور بعض میری ربوبیت اور حاکمیت کے قائل رہیں، اس سے آئے دن ملک میں فساد برپا رہے۔ یہ وہی انداز ہے جسے ہر مطلق العنان حاکم اندرونی یا بیرونی خطرے کا ہوا کھڑا کر کے اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لیے اختیار کرتا ہے۔ اس ظالم کو تو دیکھیے کہ موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کو، جس سے لوگ راہ راست پر آ رہے ہیں، فساد قرار دے رہا ہے، حالانکہ اصل فساد ہی وہ خود ہے، جیسا کہ سورہ بقرہ میں ہے: ﴿الْأَلْبَابُ هُمُ الْفٰسِدُونَ وَلٰكِنْ لَا يَشْعُرُونَ﴾ [البقرہ: ۱۲] ”سن لو! یقیناً وہی تو فساد ڈالنے والے ہیں اور لیکن وہ نہیں سمجھتے۔“

﴿۳۰﴾ وَقَالَ مُوسَىٰ إِنِّي عُذْتُ بِرَبِّي.....: موسیٰ علیہ السلام کو جب اس بات کا علم ہوا کہ فرعون مجھے قتل کرنا چاہتا ہے تو انھوں نے اس کے شر سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگی۔ اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کا یہی شیوہ ہوتا ہے کہ وہ

وَقَالَ رَجُلٌ مُؤْمِنٌ ؕ قِنِ الْإِلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ إِيمَانَهُ أَتَقْتُلُونَ رَجُلًا أَنْ يَقُولَ رَبِّي

اور فرعون کی آل میں سے ایک مومن آدمی نے کہا جو اپنا ایمان چھپاتا تھا، کیا تم اسے قتل کرتے ہو کہ

دشمنوں سے بچنے کے لیے اپنے رب کی پناہ طلب کرتے اور اسی پر بھروسہ کرتے ہیں۔ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو جب کسی قوم (کے حملے) کا ڈر ہوتا تو (اللہ تعالیٰ سے) یہ دعا کرتے: «اللَّهُمَّ إِنَّا نَجْعَلُكَ فِي نُحُورِهِمْ وَنَعُوذُ بِكَ مِنْ شُرُورِهِمْ» [ابو داؤد، الوتر، باب ما يقول الرجل إذا خاف قوماً: ۱۵۳۷، و صححه الألباني] "اے اللہ! ہم تجھے ان کے مقابلے میں کرتے ہیں اور ان کی شرارتوں سے تیری پناہ مانگتے ہیں۔" ابراہیم علیہ السلام کا آگ میں ڈالے جانے کے وقت "حَسْبِيَ اللَّهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيلُ" کہنا اور اصحاب الاخذود والے لڑکے کا "اللَّهُمَّ اكْفِنِيهِمْ بِمَا شِئْتَ" کہنا بھی دشمنوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنے کی بہت عمدہ مثالیں ہیں۔ [دیکھیے بخاری: ۴۵۶۴۔ مسلم: ۳۰۰۵]

② عُدْتُ بِرَبِّي: مطلب یہ ہے کہ میں اس ذات عالی کی پناہ لے رہا ہوں جس نے میری پرورش کی، مجھے نبوت کے مقام پر فائز کیا، تمام آفات و مصائب سے بچایا اور اتنی نعمتیں عطا کیں جن کا شمار نہیں۔ اس لیے فرعون اور ہر منکبر و جبار ظالم سے بھی مجھے وہی بچائے گا، سو میں اسی کی پناہ لیتا ہوں۔

③ وَ رَبِّكُمْ: اس میں موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو سبق دے رہے ہیں کہ ان کی طرح وہ بھی اپنے رب ہی کی پناہ مانگیں۔

④ مِنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ: صرف فرعون کے شر سے پناہ مانگنے کے بجائے ہر منکبر کے شر سے پناہ مانگی۔ اس سے معلوم ہوا کہ دعا میں وسعت اور جامعیت ہونی چاہیے، جیسا کہ اس دعا میں ہر دشمن سے پناہ کی درخواست آگئی ہے، خواہ اس کی عداوت ظاہر ہو یا مخفی اور وہ دشمن اکیلا ہو یا جماعت۔

⑤ لَا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ: اس سے معلوم ہوا کہ ظلم اور قتل ناحق وہی کرتا ہے جو منکبر ہو (یعنی حق کا انکار کرتا ہو اور لوگوں کو حقیر جانتا ہو) اور حساب کے دن کا یقین نہ رکھتا ہو۔ ورنہ جو حق قبول کرنے والا ہو اور اسے باز پرس کا یقین ہو وہ کیسے ظلم کر سکتا ہے۔

بیت 28 ① وَقَالَ رَجُلٌ مُؤْمِنٌ ؕ قِنِ الْإِلِ فِرْعَوْنَ : موسیٰ علیہ السلام نے ہر منکبر سے اللہ کی پناہ مانگی جو یوم حساب پر ایمان نہ رکھتا ہو، تو اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرماتے ہوئے ان کی حمایت میں ایک ایسے آدمی کو کھڑا کر دیا جو فرعون کی آل میں سے تھا، جو موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لا چکا تھا مگر اپنا ایمان چھپائے ہوئے تھا۔ اس نے بہت اچھے طریقے سے موسیٰ علیہ السلام کا دفاع کیا اور فرعون کو ان کے قتل سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ فرعون کے اپنے لوگوں میں سے ہونے کی وجہ سے اس نے بات کی جرأت کی اور اسی وجہ سے فرعون نے اس کی بات کے بعد اپنی قوم کو مطمئن کرنے کی کوشش کی، ورنہ اس کے دربار میں کسی اسرائیلی کی نہ یہ جرأت تھی اور نہ ہی اس کی برداشت تھی۔ یہ اللہ تعالیٰ کا عجیب تصرف ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنا معاملہ اس کے سپرد کیا تو اس نے وہاں سے حمایت کروادی جہاں سے وہم و گمان تک نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے "رَجُلٌ مُؤْمِنٌ" فرمایا ہے، یعنی وہ مردانگی اور ایمان دونوں سے متصف تھا۔ اس کے مرد کامل اور مومن کامل ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس نے افضل جہاد

اللَّهُ وَقَدْ جَاءَكُمْ بِالْبَيِّنَاتِ مِنْ رَبِّكُمْ وَإِنْ يَكْذِبُوا فَعَلَيْهِمْ كَذِبُهُمْ وَإِنْ يَكْذِبُوا فَعَلَيْهِمْ كَذِبُهُمْ وَإِنْ يَكْذِبُوا فَعَلَيْهِمْ كَذِبُهُمْ

وہ کہتا ہے ”میرا رب اللہ ہے“ حالانکہ یقیناً وہ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے واضح دلیلیں لے کر آیا ہے اور اگر وہ جھوٹا ہے تو اس کا جھوٹ اسی پر ہے اور اگر وہ سچا ہے تو تمہیں اس کا کچھ حصہ پہنچ جائے گا جس کا وہ تم سے

کیا۔ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «أَفْضَلُ الْجِهَادِ كَلِمَةُ عَدَلٍ عِنْدَ سُلْطَانٍ خَائِرٍ أَوْ أَمِيرٍ خَائِرٍ» (ابو داؤد، الملاحم، باب الأمر والنهي: ۴۳۴۴) ”افضل جہاد خالم بادشاہ یا خالم امیر کے سامنے عدل کی بات کہنا ہے۔“ بعض کہتے ہیں کہ یہ وہی شخص تھا جس نے اس سے پہلے فرعون کی مجلس میں موسیٰ علیہ السلام کے قتل کے مشورہ کی خبر انھیں پہنچائی تھی، جس پر وہ ہجرت کر کے مدین چلے گئے تھے، مگر اس بات کی تصدیق کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں، البتہ اس میں شک نہیں کہ وہ بھی مرد کالم تھا۔ دیکھیے سورہ قصص (۲۰)۔

مفسر رازی نے اپنا تجربہ لکھا ہے کہ میں نے اپنی ذات پر گزرنے والے حالات میں تجربہ کیا ہے کہ جب بھی کسی شری نے میرے متعلق شرک ارا دہ کیا اور میں نے اس سے تعرض نہیں کیا بلکہ اسے اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنے پر اکتفا کیا، تو اللہ سبحانہ نے ایسے لوگوں کو میرے دفاع کے لیے مقرر فرمادیا جنہیں میں بالکل نہیں جانتا تھا اور جنہوں نے حد سے بڑھ کر اس شرک کو دور کرنے کی کوشش کی۔

② يَكْتُمُ إِذْ أَنْتَ أَكْثَرُ: اس جملے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ فرعون کی تختیوں کے باوجود موسیٰ علیہ السلام کی دعوت ہر جگہ پہنچ گئی تھی، حتیٰ کہ فرعون کے خاندان کے کچھ لوگ بھی اس سے متاثر ہو چکے تھے، اگرچہ اظہار نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ یہ مرد مومن بھی اس سے پہلے ایمان چھپاتا تھا، مگر جب بات موسیٰ علیہ السلام کے قتل تک پہنچ گئی تو اس کے ایمان نے اسے خاموش نہیں رہنے دیا۔ اس نے بات کا آغاز تو ایک غیر جانبدار آدمی کی طرح کیا، مگر آخر میں اس نے اپنے ایمان کا صاف اظہار کر دیا اور اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا، جیسا کہ آگے آ رہا ہے، جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے اسے فرعون اور اس کے ساتھیوں کے ظلم و ستم سے محفوظ رکھا ہے۔ اب تک ایمان چھپانے رکھنے کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اسے مومن فرمایا، اس سے معلوم ہوا کہ مجبوری میں ایمان چھپانے کے باوجود آدمی مومن رہتا ہے۔ مزید دیکھیے سورہ نحل (۱۰۶)۔

③ أَتَقْتُلُونَ رَجُلًا أَنْ يَقُولَ رَبِّيَ اللَّهُ.....: اس جملے میں اس مرد مومن نے تین حقیقتیں بیان کر دیں، پہلی یہ کہ رب صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ چنانچہ اس نے کہا کہ کیا تم ایک آدمی کو اس بات پر قتل کرنا چاہتے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب (میرا پالنے والا مالک) صرف وہ پاک ذات ہے جس کا نام اللہ تعالیٰ ہے۔ یعنی وہ فرعون کو اپنا رب نہیں مانتا، بلکہ اس کو مانتا ہے جس نے فرعون اور اس کے باپ دادا کو اور زمین و آسمان سمیت ساری مخلوقات کو پیدا فرمایا ہے، تو اس پر اسے داؤد علی اور اس کی تعلیم و تکریم کرنی چاہیے یا اسے قتل کر دینا چاہیے؟ دوسری حقیقت (وَقَدْ جَاءَكُمْ بِالْبَيِّنَاتِ) یہ بیان فرمائی کہ وہ تمہارے پاس اپنے رب کی طرف سے بھیجے جانے کی واضح دلیلیں لے کر آیا ہے، جنہیں جھٹلانے کا تمہارے پاس کوئی جواز ہی نہیں، پورے ملک کے جاؤگر اس کے مقابلے میں ناکام ہو کر اس کے حق پر ہونے کا اعتراف کر چکے ہیں اور اس پر ایمان لا چکے

صَادِقًا يُصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِي يَعِدُكُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ﴿۱۸﴾

وعدہ کر رہا ہے۔ بے شک اللہ اس شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو حد سے بڑھنے والا، سخت جھوٹا ہو ﴿۱۸﴾

ہیں۔ تیسری حقیقت (مِنْ زَيْكُمْ) یہ کہ اسے جس مالک کی طرف سے پیغام پہنچانے کے لیے بھیجا گیا ہے وہ تمہارا بھی رب ہے، یہ تمہاری جہالت ہے کہ تم اس کے سوا کسی اور کو اپنا رب بنائے بیٹھے ہو۔

④ موسیٰ علیہ السلام کو جس قسم کی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا اور جو جو حالات پیش آئے ہمارے نبی کریم ﷺ کو بھی اسی قسم کے حالات پیش آئے۔ ان واقعات میں آپ ﷺ کے لیے تسلی کا سامان ہے کہ آپ ہی کو نہیں، پہلے پیغمبروں کو بھی ایسی ہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

⑤ مفسر ابن کثیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”فرعون کے سامنے یہ کہنا ”اَتَقْتُلُونَ رَجُلًا اَنْ يَقُولَ رَبِّيَ اللَّهُ“ (کیا تم ایک آدمی کو اس لیے قتل کرتے ہو کہ وہ کہتا ہے، میرا رب اللہ ہے) بہت بڑی بات ہے (اس سے بڑی دلیری ہو ہی نہیں سکتی)۔“ ہاں، بخاری رضی اللہ عنہ نے اپنی صحیح بخاری میں ابو بکر رضی اللہ عنہ کا جو واقعہ بیان کیا ہے وہ اس سے بھی بڑی بات ہے۔ عروہ بن زبیر کہتے ہیں کہ میں نے عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے کہا کہ مشرکین نے رسول اللہ ﷺ کو سب سے زیادہ جو ایذا پہنچایا وہ مجھے بتائیں، تو انھوں نے فرمایا: «بَيْنَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّي بِفِنَاءِ الْكَعْبَةِ إِذْ أَقْبَلَ عُقْبَةُ بْنُ أَبِي مُعَيْطٍ فَأَخَذَ بِمَنْكِبِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَوَى تَوْبَهُ فَبِي عُقْبَةَ فَخَنَقَهُ خَنَقًا شَدِيدًا فَأَقْبَلَ أَبُو بَكْرٍ فَأَخَذَ بِمَنْكِبِهِ وَدَفَعَ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَالَ: ﴿اَتَقْتُلُونَ رَجُلًا اَنْ يَقُولَ رَبِّيَ اللَّهُ وَقَدْ جَاءَكُمْ بِالْبَيِّنَاتِ مِنْ رَبِّكُمْ﴾» [بخاری، التفسیر، سورة المؤمن: ۴۸۱۵] ”ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کعبہ کے صحن

میں نماز پڑھ رہے تھے کہ عقبہ بن ابی معیط آیا، اس نے آپ ﷺ کا کندھا پکڑ لیا اور اپنا کپڑا آپ ﷺ کے گلے میں ڈال کر اسے بہت سختی کے ساتھ گھونٹ دیا، تو ابو بکر رضی اللہ عنہ آئے اور اسے کندھے سے پکڑ کر رسول اللہ ﷺ سے دھکا دے کر پیچھے ہٹا اور کہا: ﴿اَتَقْتُلُونَ رَجُلًا اَنْ يَقُولَ رَبِّيَ اللَّهُ وَقَدْ جَاءَكُمْ بِالْبَيِّنَاتِ مِنْ رَبِّكُمْ﴾ ”کیا تم ایک آدمی کو اس لیے قتل کرتے ہو کہ وہ کہتا ہے، میرا رب اللہ ہے، حالانکہ یقیناً وہ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے واضح دلیلیں لے کر آیا ہے۔“ اہل علم فرماتے ہیں کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ اس مرد مومن سے بھی زیادہ شجاع تھے، کیونکہ وہ اپنا ایمان چھپاتا تھا، جبکہ ابو بکر رضی اللہ عنہ کھلم کھلا مومن تھے، جو سب سے پہلے ایمان لائے تھے اور رسول اللہ ﷺ کی حمایت اور دفاع میں ان کے لیے اس مرد مومن سے زیادہ خطرہ تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے یہ بات صرف زبان سے نہیں کہی بلکہ عملاً عقبہ کو دھکا دے کر پیچھے بھی ہٹا دیا۔

⑥ وَإِنْ يَكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهُ: وہ مرد مومن موسیٰ علیہ السلام کو کاذب نہیں سمجھتا تھا، یہ بات اس نے ایک غیر جانبدار شخص کی حیثیت سے ایک مفروضہ کے طور پر کہی کہ اگر یہ جھوٹا ہے تب بھی اس کے جھوٹ کا وبال اسی پر ہے، تمہارے لیے مناسب یہی ہے کہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ موسیٰ علیہ السلام نے بھی ان سے کہا تھا: ﴿وَإِنْ لَمْ تُوْمِنُوا لِي فَأَعْتَزَلُونِ﴾ [الدخان: ۲۱]

يَقَوْمٍ لَكُمْ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ظَاهِرِينَ فِي الْأَرْضِ فَمَنْ يَنْصُرُنَا مِنَ بَأْسِ اللَّهِ إِنَّ جَاءَنَا
قَالَ فِرْعَوْنُ مَا أُرِيكُمْ إِلَّا مَا أَرَىٰ وَمَا أَهْدِيكُمْ إِلَّا سَبِيلَ الرَّشَادِ ﴿۲۹﴾

اے میری قوم! آج تمھی کو بادشاہی حاصل ہے، اس حال میں کہ تم (میں) اس سر زمین میں غالب ہو، پھر اللہ کے عذاب سے کون ہماری مدد کرے گا، اگر وہ ہم پر آ گیا؟ فرعون نے کہا میں تو تمہیں وہی رائے دے رہا ہوں جو خود رائے رکھتا ہوں اور میں تمہیں بھلائی کا راستہ ہی بتا رہا ہوں ﴿۲۹﴾

”اور اگر تم میری بات نہیں مانتے تو مجھ سے الگ رہو۔“

﴿۷﴾ وَ إِنَّ يَكُ صَادِقًا يُصِيبُكُمْ : ”اور اگر یہ سچا ہے تو تمہیں ان میں سے کوئی نہ کوئی چیز پہنچ جائے گی جن کا وہ تم سے وعدہ کرتا ہے۔“ اس مرد مومن نے یہاں ”یَعِدُكُمْ“ کا لفظ استعمال کیا جو وعدے کے لیے استعمال ہوتا ہے، ”يُوعِدُكُمْ“ استعمال نہیں کیا جو وعید کے لیے ہے۔ کیونکہ وعدے میں دونوں چیزیں آ جاتی ہیں، یعنی اگر وہ سچا ہوا اور تم نے اس کی اطاعت کی تو اس کا وعدہ ہے کہ تمہیں دنیا و آخرت دونوں کی بھلائیاں حاصل ہوں گی، اس کے مطابق تمہیں ان میں سے کچھ نہ کچھ ضرور حاصل ہو جائے گا، اگر وہ دنیا میں حاصل نہ ہوئیں تو آخرت میں یقیناً حاصل ہو جائیں گی اور اگر تم سچا ہونے کے باوجود اس پر ایمان نہ لائے، یا تم نے اسے قتل کر دیا تو اس نے تمہارے کفر کی صورت میں دنیا کے اندر جن جن عذابوں کا وعدہ کیا ہے ان میں سے کوئی نہ کوئی ضرور تم پر آ جائے گا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے امت محمد ﷺ کو پہلی امتوں کے مختلف قسم کے عذابوں سے ڈرایا، فرمایا:

﴿فَكُلًّا أَخَذْنَا بِذُنُوبِهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَنْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۖ وَمِنْهُمْ مَنْ أَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۖ وَمِنْهُمْ مَنْ حَسَفْنَا لَهُ الْأَرْضَ ۖ وَمِنْهُمْ مَنْ أَعْرَقْنَا﴾ [العنكبوت : ۴۰] ”تو ہم نے ہر ایک کو اس کے گناہ میں پکڑ لیا، پھر ان میں سے کوئی وہ تھا جس پر ہم نے پھراؤ والی ہوا بھیجی اور ان میں سے کوئی وہ تھا جسے چیخ نے پکڑ لیا اور ان میں سے کوئی وہ تھا جسے ہم نے زمین میں دھنسا دیا اور ان میں سے کوئی وہ تھا جسے ہم نے غرق کر دیا۔“ اور اگر دنیا میں کوئی عذاب نہ آیا تو آخرت کے عذاب سے بچنے کی تو کوئی صورت ہی نہیں۔

﴿۸﴾ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ : اس جملے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں اور ہو سکتا ہے اس عظیم شخص نے دونوں مراد لیے ہوں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو راہِ راست کی ہدایت نہیں دیتا جو حد سے بڑھنے والا سخت جھوٹا ہو، جب کہ موسیٰ (علیہ السلام) میں حد سے بڑھنے کی کوئی بات نہیں ہے، پھر کذاب تو بہت دور کی بات ہے اس پر جھوٹ کا الزام ایک بار بھی نہیں لگا۔ اس کی واضح دلیلوں اور معجزوں سے اس کا سچا ہونا ثابت ہو رہا ہے، کسی مُسْرِفِ و کذاب پر اللہ تعالیٰ کا اتنا فضل و کرم کیسے ہو سکتا ہے اور ایسے شخص کو قتل کرنا کیسے روا ہو سکتا ہے۔ دوسرا مطلب یہ کہ یہ دونوں اوصاف بیان کرتے ہوئے درحقیقت وہ فرعون پر طعن کر رہا تھا، جو رب ہونے کا دعویٰ کر کے اپنی حد سے بے حساب تجاویز بھی کر رہا تھا اور زبردست جھوٹ بھی بول رہا تھا، اس کی طرف سے قتل کا ارادہ بھی اس کے مُسْرِفِ و کذاب ہونے کا نتیجہ تھا کہ ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ صحیح فیصلے کی توفیق نہیں دیتا۔

﴿۱﴾ يَقَوْمٍ لَكُمْ الْمُلْكُ الْيَوْمَ : اس مرد مومن نے ”اے میری قوم!“ کہہ کر ان کے ساتھ اپنے اس تعلق کا

وَقَالَ الَّذِي آمَنَ يَوْمَ يَقَوْمِ اِنِّي اَخَافُ عَلَيْكُمْ وَمَثَلُ الْاِحْزَابِ ۝۳۰

اور اس شخص نے کہا جو ایمان لایا تھا، اے میری قوم! بے شک میں تم پر (گزشتہ) جماعتوں کے دن کی مانند سے ڈرتا ہوں ۝۳۰

اظہار کیا جو وہ فرعون کے خاندان کا ایک قبلی فرد ہونے کی بنا پر ان سے رکھتا تھا اور ”الْيَوْمَ“ (آج) کہہ کر اس نے انھیں زمانے کے انقلابات کی طرف توجہ دلائی کہ یہ غلبہ و اقتدار دائمی چیز نہیں، اگر یہ کل یوسف (علیہ السلام) اور ان کے جانشین اسرائیلیوں کے پاس تھا اور آج اس سرزمین مصر میں تمہارے پاس ہے اور تم اسرائیلیوں پر غالب ہو تو اسرائیلیوں کی طرح تم سے بھی چھن سکتا ہے اور کفر و شرک اور ظلم و تعدی کی وجہ سے پہلی اقوام کی طرح تم بھی اللہ کے عذاب کا نشانہ بن سکتے ہو۔ تو اگر وہ آ گیا تو ہمیں اس سے کون بچائے گا؟ ”الْاٰخِرٰضِ“ میں ”الف لام“ عہد کا ہونے کی وجہ سے ترجمہ ”اس سرزمین“ کیا گیا ہے، مراد مصر ہے۔

۝۳۱ قَالَ فِرْعَوْنُ مَا اُرِيكُمْ اِلَّا مَا اَرٰى: بعض مفسرین کا خیال ہے کہ فرعون کو پتا نہیں چل سکا کہ موسیٰ (علیہ السلام) کے قتل کے فیصلے کے خلاف رائے دینے والا شخص حقیقت میں ان پر ایمان لا چکا ہے، اس لیے فرعون نے اس کی اس جرأت پر کوئی گرفت نہیں کی۔ مگر زیادہ قرین قیاس بات یہ ہے کہ وہ پہلے ہی موسیٰ (علیہ السلام) کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ معجزوں اور ہیبت کی وجہ سے خوف زدہ تھا، جس کی دلیل اس کا یہ کہنا ہے: ﴿ذُرُوْنِيْ اَقْتُلْ مُوْسٰى﴾ [المؤمن: ۲۶] ”مجھے چھوڑ دو کہ میں موسیٰ کو قتل کر دوں“ اب اس نے دیکھا کہ اس کے خاص لوگوں میں بھی موسیٰ (علیہ السلام) کی حمایت آگئی ہے تو اسے جرأت ہی نہیں ہوئی کہ اس مرد مؤمن کو کچھ کہے اور نہ ہی وہ اس کی کسی دلیل کا جواب دے سکا، بلکہ اس نے جواب سے گریز اختیار کیا اور اپنے سرداروں اور قوم کے لیے اپنے اخلاص کا اظہار کیا کہ میں تمہارے لیے وہی سوچتا ہوں جو اپنے لیے سوچتا ہوں اور تمہارے سامنے وہی رائے پیش کرتا ہوں جو میری بہترین سوچ کا نتیجہ ہے۔ مگر اس سُرف و کذاب کا یہ کہنا سراسر جھوٹ تھا، کیوں کہ وہ دل سے موسیٰ (علیہ السلام) کو سچا جان چکا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا جھوٹ متعدد آیات میں بیان فرمایا ہے۔ (دیکھیے نمل: ۱۴، ۱۳۔ بنی اسرائیل: ۱۰۲) اس کا مقصد اپنی قوم کو بے وقوف بنانا تھا اور واقعی اس نے انھیں بے وقوف بنا لیا، جیسا کہ سورہ زخرف میں ہے: ﴿فَاَسْتَحَفَّتْ قَوْمَهُ فَاَطَاعُوْهُۥۗۙ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ﴾ [الزخرف: ۵۴] ”غرض اس نے اپنی قوم کو ہلکا (بے وزن) کر دیا تو انھوں نے اس کی اطاعت کر لی، یقیناً وہ نافرمان لوگ تھے۔“

اس کے علاوہ اس کا یہ کہنا کہ ”میں تمہارے لیے وہی سوچتا ہوں جو اپنے لیے سوچتا ہوں“ اس لیے بھی صاف جھوٹ تھا کہ اپنے لیے تو وہ رب الاعلیٰ سے نیچے کسی مقام پر قناعت کے لیے تیار نہ تھا، مگر قوم کے لیے اس کے پاس انھیں اپنا غلام بنا کر رکھنے کے سوا کچھ نہ تھا۔ آج کے حکمرانوں کے قول و عمل کا بھی یہی حال ہے۔

۝۳۲ وَمَا اٰهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشٰوٰةِ: اللہ تعالیٰ نے متعدد آیات میں واضح فرمایا کہ اس کا یہ کہنا بھی غلط تھا کہ ”میں تمہیں بھلائی کا راستہ ہی بتا رہا ہوں۔“ دیکھیے سورہ ہود (۹) اور سورہ طہ (۷)۔

آیت 30: وَقَالَ الَّذِي آمَنَ يَوْمَ يَقَوْمِ: ”یَوْمَ“ سے مراد کوئی نادر واقعہ ہوتا ہے جو کسی قوم کو کسی ہولناک عذاب

مِثْلَ دَابِّ قَوْمِ نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ وَالَّذِينَ مِنْ بَعْدِهِمْ ۗ وَمَا اللَّهُ يُرِيدُ ظَلْمًا لِلْعِبَادِ ﴿۳۱﴾
وَيَقَوْمِ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ ﴿۳۲﴾

نوح کی قوم اور عاد اور ثمود اور ان لوگوں کے حال کی مانند سے جو ان کے بعد تھے اور اللہ اپنے بندوں پر کسی طرح کے ظلم کا ارادہ نہیں کرتا ﴿۳۱﴾ اور اے میری قوم! یقیناً میں تم پر ایک دوسرے کو پکارنے کے دن سے ڈرتا ہوں ﴿۳۲﴾

یا اعلیٰ درجے کی نعمت کی صورت میں پیش آیا ہو، مثلاً یوم بدر مسلمانوں کے لیے نعمت اور کفار کے لیے عذاب تھا۔ ”الْأَحْزَابِ“ ”جہزت“ کی جمع ہے، وہ جماعتیں جو کسی کی مخالفت میں اکٹھی ہوئی ہوں۔ مرد مومن نے جب فرعون کا موسیٰ علیہ السلام کے قتل کی رائے پر اصرار اور تمام سرداروں کا خاموش رہ کر اس کی تائید کرنا دیکھا تو اس نے مصلحت کا لبادہ اتار کر صریح الفاظ میں ان سے کہا، اے میری قوم! اگر تم نے اللہ کے رسول کو قتل کرنے یا کوئی نقصان پہنچانے کا ارادہ ترک نہ کیا تو میں ڈرتا ہوں کہ تم پر ان جماعتوں پر آنے والے عذابوں جیسا عذاب آجائے گا جو اپنے انبیاء کے خلاف اکٹھی ہوئیں اور انہیں جھٹلایا، پھر تمہاری یہ شان و شوکت اور لاؤ لشکر تمہارے کسی کام نہ آسکیں گے۔

آیت 31 ﴿۳۱﴾ مِثْلَ دَابِّ قَوْمِ نُوحٍ: ”ذَابٌ يَذَابُ ذَابًا“ (ذ) کسی کام میں مسلسل لگے رہنا۔ ”ذَابٌ“ اصل میں عادت کو کہتے ہیں، کیونکہ اس میں بیٹھتی ہوتی ہے، پھر کسی کے حال یا معاملے کے معنی میں بھی استعمال ہونے لگا۔ یعنی میں تمہارے بارے میں ڈرتا ہوں کہ تمہارا حال قوم نوح، عاد و ثمود اور ان لوگوں جیسا نہ ہو جو ان کے بعد تھے، مثلاً قوم لوط اور قوم شعیب وغیرہ، جنہوں نے اپنے پیغمبروں کو جھٹلایا اور انہیں ایذا پہنچانے کی کوشش کی تو ان پر اللہ تعالیٰ کا ایسا عذاب آیا جس نے انہیں بری طرح تباہ و برباد کر دیا۔

﴿۳۲﴾ وَمَا اللَّهُ يُرِيدُ ظَلْمًا لِلْعِبَادِ: ”ظَلْمًا“ کی تینوں تکمیر کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ ”کسی طرح کا ظلم“ کیا گیا ہے۔ یعنی ان اقوام پر جو عذاب آیا وہ ان کے اپنے اعمالی بد کا نتیجہ تھا، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر کسی طرح کے ظلم کا ارادہ تک نہیں کرتا تو وہ ظلم کیوں کرے گا، پھر ظلم بھی اپنے بندوں پر؟ یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَلَٰكِنَّ النَّاسَ أَنفُسُهُمْ يَظْلِمُونَ﴾ (یوسف: ۴۴) ”بے شک اللہ لوگوں پر کچھ بھی ظلم نہیں کرتا اور لیکن لوگ اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں۔“

آیت 32 ﴿۳۲﴾ وَيَقَوْمِ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ: ”تَنَادٌ“ ”بِنَادٍ“ سے باب تفاعل ہے، ایک دوسرے کو آواز دینا۔ دنیوی عذاب سے ڈرانے کے بعد اس نے آخرت کے عذاب سے ڈرایا۔ ”يَوْمَ التَّنَادِ“ (ایک دوسرے کو پکارنے کے دن) سے مراد قیامت کا دن ہے۔ اس دن اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو صحبت سے آواز دیں گے اور مشرکین کو اپنے شرکاء پیش کرنے کے لیے آواز دیں گے۔ اس دن اس کے فرشتے نیک و بد کو ان کی حیثیت کے مطابق آواز دیں گے۔ جنتی ایک دوسرے کو آواز دیں گے، اسی طرح جہنمی ایک دوسرے کو آواز دیں گے۔ اہل جنت جنہیوں کو اور وہ جنتیوں کو

يَوْمَ تَوَلَّوْنَ مُذْبِرِينَ ؕ فَالْتَكُفْرَ فِىنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِرٍ ؕ وَمَنْ يُضِلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ ۝۳۰

جس دن تم پیٹھ پھرتے ہوئے بھاگو گے، تمہارے لیے اللہ سے کوئی بچانے والا نہ ہوگا اور جسے اللہ گمراہ کر دے پھر اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں ۳۰

آواز دیں گے۔ حق لینے والے حق دینے والوں کو اور مظلوم ظالموں کو آوازیں دے رہے ہوں گے۔ جہنمی آگ کے خازن کو پکاریں گے، پھر رب تعالیٰ کو آواز دیں گے۔ جنت و جہنم بھی آواز دے رہی ہوں گی۔ موت کو ذبح کر دیا جائے گا اور جنتیوں اور جہنمیوں کو آواز دی جائے گی کہ اب بھگتی ہے، موت نہیں۔ غرض، اس دن ایک دوسرے کو پکارنے کا عجیب عالم ہوگا۔ یہاں قرآن مجید سے اس ”يَوْمَ التَّنَادِ“ کے بارے میں چند مقامات درج کیے جاتے ہیں، احباب تھوڑی سی محنت فرما کر تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔ دیکھیے سورہ اعراف (۵۰ تا ۵۳)، زخرف (۷۷)، حدید (۱۳)، قصص (۶۲، ۶۵، ۷۴)، کہف (۵۲)، مؤمن (۱۰)، حم مجدہ (۴۳)، ق (۴۱)، بنی اسرائیل (۷۲، ۷۱)، لیس (۵۲، ۶۰)، حاقہ (۱۹ تا ۳۲)، بحس (۳۳ تا ۳۷) اور سورہ معارج (۱۷)۔

۱۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ ”يَوْمَ التَّنَادِ“ سے جو مراد ہے وہی ”يَوْمَ التَّنَادِ“ سے مراد ہے، یعنی ”يَوْمَ التَّنَادِ“ سے بھی وہی دنیا میں آنے والا عذاب مراد ہے کہ جب وہ دن آئے گا تو تم ایک دوسرے کو مدد کے لیے آواز دو گے، مگر کوئی مدد کو نہیں آئے گا اور تم عذاب سے بچنے کے لیے بھاگو گے، مگر تمہیں اللہ تعالیٰ سے کوئی نہیں بچائے گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿قَلْنَا اَحْسُوا يٰۤاٰنْسَا اِذَا هُمْ فَنَهَا يَرْكُضُوْنَ ۗ لَا تَرَكَضُوْا وَاِزْجِعُوْا اِلٰى مَا اُتِيتُمْ فِىْهِ وَاَسْكِنُوْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ [الانبیاء: ۱۲، ۱۳] ”تو جب انھوں نے ہمارا عذاب محسوس کیا اچانک وہ ان (بستیوں) سے بھاگ رہے تھے۔ بھاگو نہیں اور ان (جگہوں) کی طرف واپس آؤ جن میں تمہیں خوش حالی دی گئی تھی اور اپنے گھروں کی طرف، تاکہ تم سے پوچھا جائے۔“ اگرچہ اکثر مفسرین نے ”يَوْمَ التَّنَادِ“ سے مراد قیامت کا دن لیا ہے، مگر آیات کے سیاق کے لحاظ سے اس تفسیر کی بھی گنجائش ہے۔ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں: ”(يَوْمَ التَّنَادِ) ہانک پکار کا دن ان پر آیا جس دن فرق ہوئے قلم میں، ایک دوسرے کو پکارنے لگے ڈوبتے ہیں۔“

آیت 33 ﴿۱﴾ يَوْمَ تَوَلَّوْنَ مُذْبِرِينَ: اس میں ”يَوْمَ التَّنَادِ“ کی کیفیت بیان کی گئی ہے کہ یہ وہ دن ہے جس میں تم اللہ کے عذاب سے پیٹھ پھرتے ہوئے بھاگو گے۔

۲ ﴿۲﴾ فَالْتَكُفْرَ فِىنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِرٍ: مگر تمہیں اللہ سے، یعنی اس کے عذاب سے بچانے والا کوئی نہیں ہوگا، جیسا کہ فرمایا: ﴿يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ اَيْنَ الْمَقْرَبُ ۗ كَلَّا لَا وَاَمْرًا ۗ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمُسْتَقْرٰٓءُ﴾ [القیامہ: ۱۰ تا ۱۲] ”انسان اس دن کہے گا کہ بھاگنے کی جگہ کہاں ہے؟ ہرگز نہیں، پناہ کی جگہ کوئی نہیں۔ اس دن تیرے رب ہی کی طرف جا ٹھہرنا ہے۔“

۳ ﴿۳﴾ وَمَنْ يُضِلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ: یعنی میں نے تمہیں نصیحت کر دی، مگر تمہاری ضد اور عناد کی وجہ سے اگر اللہ تعالیٰ کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

وَلَقَدْ جَاءَكُمْ يُوسُفُ مِنْ قَبْلِ بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا زِلْتُمْ فِي شَكٍّ مِمَّا جَاءَكُمْ بِهِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَن يَبْعَثَ اللَّهُ مِنْ بَعْدِهِ رَسُولًا ۚ كَذَلِكَ يُضِلُّ اللَّهُ مَن هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابٌ ﴿۳۱﴾

اور بلاشبہ یقیناً اس سے پہلے تمہارے پاس یوسف واضح دلیلیں لے کر آیا تو تم اس کے بارے میں شک ہی میں رہے، جو وہ تمہارے پاس لے کر آیا، یہاں تک کہ جب وہ فوت ہو گیا تو تم نے کہا اس کے بعد اللہ کبھی کوئی رسول نہ بھیجے گا۔ اسی طرح اللہ ہر اس شخص کو گمراہ کرتا ہے جو حد سے بڑھنے والا، شک کرنے والا ہو ﴿۳۱﴾

نے تمہیں گمراہی میں ہی پڑا رہنے کا ارادہ کر لیا ہے تو جسے اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے پھر اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔ دیکھیے سورۃ بقرہ (۲۶، ۲۷)۔

آیت 34 ﴿۱﴾ وَلَقَدْ جَاءَكُمْ يُوسُفُ مِنْ قَبْلِ: ”تمہارے پاس“ سے مراد تمہارے آبا و اجداد کے پاس ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے کے بنی اسرائیل کو فرمایا: ﴿وَإِذْ نَجَّيْنَكُمْ مِنْ آلِ فِرْعَوْنَ﴾ [البقرہ: ۴۹] ”اور جب ہم نے تمہیں فرعون کی قوم سے نجات دی۔“ ظاہر ہے اس سے مراد ان کے آبا و اجداد کو نجات دینا ہے۔ مرد مومن نے قبیلوں کو نصیحت کرتے ہوئے ان کے آبا و اجداد کے زمانے کا حال یاد دلایا کہ موسیٰ (علیہ السلام) سے پہلے تمہارے پاس یوسف (علیہ السلام) آئے، اس وقت بھی تمہارا حال یہی تھا۔

﴿۲﴾ بِالْبَيِّنَاتِ: اپنی رسالت کی واضح دلیلوں کے ساتھ۔ ”واضح دلیلوں“ میں یوسف علیہ السلام کا صدق و ایقانے عہد، ان کی امانت اور کمال درجے کی پاک دامنی، مصر کی عورتوں کی طرف سے ان کی عفت کی شہادت، قید میں ان کا صبر، قید کے ساتھیوں اور بادشاہ کے خواب کی تعبیر، سات سالہ خوفناک قحط کی یقینی اطلاع، اس کے لیے پہلے سات سالوں میں غلے کو محفوظ رکھنے اور بعد کے سات سالوں میں ان کی نہایت درست طریقے سے عادلانہ تقسیم کی تدبیر، بے مثال عدل و انصاف، موقع ملنے پر قید کے ساتھیوں کو ناقابل تردید دلائل کے ساتھ توحید کی دعوت، یعنی: ﴿أَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۗ مَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِهِ إِلَّا أَسْمَاءُ سَيَّسْتُمُوهَا أَنْتُمْ وَآبَاءُكُمْ مِمَّا أَنْزَلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ ۗ إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ ۗ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ۗ ذَلِكَ الَّذِي يُقِيمُ ۗ وَلَكِنْ أَكْثَرُ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ﴾ [یوسف: ۳۹، ۴۰] ”کیا الگ الگ رب بہتر ہیں یا اللہ، جو اکیلا ہے، نہایت زبردست ہے؟ تم اس کے سوا عبادت نہیں کرتے مگر چند ناموں کی، جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں، اللہ نے ان کے بارے کوئی دلیل نہیں اتاری۔ حکم اللہ کے سوا کسی کا نہیں، اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا اور کسی کی عبادت مت کرو، یہی سیدھا دین ہے اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔“ اور تہمت کی صفائی تک قید سے نہ نکلنا اور دیگر بہت سی چیزیں شامل ہیں جن سے ان کا اللہ تعالیٰ کا برگزیدہ رسول ہونا ثابت ہوتا ہے۔

﴿۳﴾ فَمَا زِلْتُمْ فِي شَكٍّ مِمَّا جَاءَكُمْ بِهِ: یعنی اس سے پہلے یوسف علیہ السلام جب مصر میں آئے تو غلام تھے، جنہیں عزیز مصر نے بیٹا بنا لیا، پھر بہت سی آزمائشوں اور امتحانوں کے بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں حکومت کے ساتھ رسالت سے بھی سرفراز فرمایا، انہیں

الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ اللَّهِ بِغَيْرِ سُلْطَانٍ أَتَاهُمْ ذُكْرٌ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ وَعِنْدَ الدِّينِ
 آمَنُوا ذَٰلِكَ يُطْبِعُ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ قَلْبٍ مُّتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ﴿۳۵﴾

وہ لوگ جو اللہ کی آیات میں جھگڑتے ہیں، بغیر کسی دلیل کے جو ان کے پاس آئی ہو، بڑی ناراضی کی بات ہے اللہ کے نزدیک اور ان کے نزدیک جو ایمان لائے۔ اسی طرح اللہ ہر متکبر، سرکش کے دل پر مہر لگا دیتا ہے ﴿۳۵﴾

نبوت و رسالت کے ثبوت کے لیے کئی دلائل اور معجزے عطا فرمائے۔ تم ان پر ایمان لائے، مگر شک کے ساتھ۔ تمہارا ان پر ایمان ایسا ہی تھا جیسا کسی فقیر کا دولت مند پر یا کمزور کا طاقتور پر ہوتا ہے۔ اس میں یقین کی قوت نہ تھی، بلکہ تمہیں ان کی رسالت میں شک ہی رہا۔

﴿۳۵﴾ حَتَّىٰ إِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَنْ يَبْعَثَ اللَّهُ فَوْقَ بَعْدِهِ رَسُولًا: ان کی زندگی میں تمہیں ان کی لائی ہوئی شریعت پر شک رہا، مگر جب وہ فوت ہوئے تو تم ان کی تعریف میں اس حد تک بڑھ گئے کہ تم نے کہا، اب ان کے بعد اللہ تعالیٰ کوئی رسول نہیں بھیجے گا، اب اس شان کا رسول کہاں آئے گا؟ یہ کہہ کر بعد میں رسولوں کے آنے ہی کا انکار کر دیا۔ یا ان کی بے قدری کی وہ انتہا کہ ان کی نبوت پر مسلسل شک کرتے رہے، یا ان کی تعریف کی یہ انتہا کہ ان کے بعد کسی کو رسول ماننے کے لیے تیار ہی نہیں۔ اس سے پہلے تم نے یوسف علیہ السلام کے ساتھ یہ معاملہ کیا، دیکھنا! اب موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بھی یہ معاملہ نہ کرنا کہ جیتے جی ان پر ایمان نہ لاؤ اور مرنے کے بعد انہیں ان کی حد سے بڑھا دو۔ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں: ”حضرت یوسف (علیہ السلام) کی زندگی میں قائل نہ ہوئے، بعد ان کی موت کے جب سلطنت کا بندوبست بگڑ گیا تو کہنے لگے، یوسف کا قدم اس شہر پر کیا مبارک تھا، ایسا نبی کوئی نہ ہوگا۔ یا وہ انکار یا یہ اقرار، یہی یا وہ گوئی ہے۔“ مرد مومن کا مطلب یہ تھا کہ نعمت کی قدر زوال کے بعد ہوتی ہے، فی الحال تمہیں موسیٰ (علیہ السلام) کی قدر نہیں۔

﴿۳۵﴾ كَذَٰلِكَ يُضِلُّ اللَّهُ مَنِ هُوَ مُسْرِفٌ مُّزْتَابٌ: ”مُزْتَابٌ“ ”زَيْبٌ“ سے ”اِرْتَابٌ يَرْتَابُ اِرْتِيَابًا“ (افتعال) کا اسم فاعل ہے، شک کرنے والا۔ یعنی اللہ تعالیٰ گمراہی میں انہی لوگوں کو مبتلا کرتا ہے جن میں تین صفات پائی جاتی ہیں، ایک ”مُسْرِفٌ“ یعنی جو اپنی بد اعمالی، اللہ کی نافرمانی اور کبر و غرور میں حد سے بڑھنے والے ہوں۔ دوسرے ”مُزْتَابٌ“ یعنی اللہ کی آیات اور اس کے رسولوں کی کہی ہوئی باتوں میں شک کرنے والے ہوں۔

آیت 35 ﴿۳۵﴾ ۱ الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ اللَّهِ : یہ ان لوگوں کی تیسری صفت ہے جنہیں اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا، بلکہ انہیں ضلالت میں مبتلا کر دیتا ہے، یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی واضح اور روشن آیات پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے اور انہیں سعادت مندی کے ساتھ تسلیم کرنے کے بجائے انہیں ٹھکرانے کے لیے صحیح عقل یا نقل سے آنے والی کسی دلیل کے بغیر جھگڑتے اور کج بحثی کرتے ہیں۔ فرمایا، ان کا کل سرمایہ شور و فحوا، استہزا اور ہٹ دھرمی ہوتا ہے۔ یہ تین عیوب جن لوگوں میں پیدا ہو جاتے ہیں انہیں اللہ تعالیٰ بھی گمراہی کے گڑھے میں پھینک دیتا ہے۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يَهَانُنِ ابْنِ لِي صَرَحًا تَعَلَّى أَبْلَغُ الْأَسْبَابِ ۝

اور فرعون نے کہا اے ہامان! میرے لیے ایک بلند عمارت بنا، تاکہ میں راستوں پر پہنچ جاؤں ۝

② گِبْرَ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ وَعِنْدَ الَّذِينَ آمَنُوا: ”گِبْر“ کا قائل وہ جدال ہے جو ”يُجَادِلُونَ“ کے ضمن میں بطور مصدر موجود ہے، ”مَقْتًا“ تیز ہے۔ یعنی بلا دلیل جھگڑا اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی اور ایمان والوں کے ہاں بھی سخت ناپسندیدگی، نفرت اور ناراض ہونے کے لحاظ سے بہت بڑا ہے۔

③ بلا دلیل جھگڑا اللہ تعالیٰ اور مومنوں کے نزدیک سخت ناپسندیدہ بتلانے میں اہل ایمان کو تلقین ہے کہ ایسے جھگڑے سے اجتناب کریں، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَإِذَا سَبَعُوا اللَّغْوَ اعْرَضُوا عَنْهُ﴾ [الفصص: ۵۵] ”اور جب وہ لغوبات سنتے ہیں تو اس سے کنارہ کرتے ہیں۔“ اور فرمایا: ﴿وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا﴾ [الفرقان: ۶۳] ”اور جب جاہل لوگ ان سے بات کرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں سلام ہے۔“ اور فرمایا: ﴿وَإِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَامًا﴾ [الفرقان: ۷۲] ”اور جب بے ہودہ کام کے پاس سے گزرتے ہیں تو باعزت گزر جاتے ہیں۔“ ناحق جھگڑے سے اپنی شدید نفرت کے ذکر کے ساتھ ایمان والوں کی شدید نفرت کا تذکرہ بھی فرمایا، اس سے ایمان والوں کی شان کی عظمت کا اظہار مقصود ہے۔

④ كَذَلِكَ يَضَعُ اللَّهُ عَلَى كُلِّ قَلْبٍ مُّكْتَبٍ جَبَّارٍ: معلوم ہوتا ہے کہ ”كَذَلِكَ يُضِلُّ اللَّهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابٍ“ سے یہاں تک چند فقرے آل فرعون کے کلام کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے ارشاد فرمائے گئے ہیں اور ان میں اللہ کے رسول ﷺ کے زمانے کے متکبر و جبار کفار کے کفر پر اصرار کا باعث بیان کیا گیا ہے۔ یعنی نبی کریم ﷺ جن لوگوں کی طرف مبعوث کیے گئے ہیں ان میں سے بھی کوئی شخص جب تکبر اور سرکشی میں حد سے گزر جاتا ہے اور کوئی صحیح بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا تو اس کے دل پر اسی طرح مہر لگا دی جاتی ہے جس طرح آل فرعون کے دل پر مہر لگا دی گئی، پھر اس کا کام اسراف (زیادتی)، ارتیاب (شک) اور جدال بالباطل (ناحق جھگڑا) ہی رہ جاتا ہے، کوئی صحیح بات یا نصیحت اس پر اثر نہیں کرتی اور نہ ہی اللہ تعالیٰ اسے ہدایت کی توفیق دیتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿فَلَمَّا زَاغُوا أَزَاغَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ﴾ [الصف: ۵] ”پھر جب وہ میڑھے ہو گئے تو اللہ نے ان کے دل میڑھے کر دیے۔“ اور فرمایا: ﴿وَنَقَلْبِ أَفْئِدَتَهُمْ وَأَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوا بِهِ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَنَدَّرَهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ﴾ [الأنعام: ۱۱۰] ”اور ہم ان کے دلوں اور ان کی آنکھوں کو پھیر دیں گے، جیسے وہ اس پر پہلی بار ایمان نہیں لائے اور انھیں چھوڑ دیں گے، اپنی سرکشی میں بھٹکتے پھریں گے۔“

بیت 36 وَقَالَ فِرْعَوْنُ يَهَانُنِ ابْنِ لِي صَرَحًا.....: ”صَرَحًا“ بلند و بالا عمارت جو دور سے صاف نظر آئے۔ ”صراحت“

کسی بات کے خوب ظاہر اور واضح ہونے کو کہتے ہیں۔ ”الْأَسْبَابُ“ ”سَبَبٌ“ کی جمع ہے، کسی چیز تک پہنچنے کا ذریعہ، مراد راستے اور دروازے ہیں۔ فرعون نے جب دیکھا کہ اس کے پاس اس مرد مومن کی کسی بات کا جواب نہیں تو اس نے اس کی نصیحت کا اثر ختم کرنے اور مذاق اڑانے کے لیے اپنے وزیر ہامان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ میرے لیے ایک بلند و بالا

أَسْبَابِ السَّلَوَاتِ فَأَكْلَعَهُ إِلَى اللَّهِ مُوسَى وَإِنِّي لَأَكْظُمُهُ كَاذِبًا ۖ وَكَذَلِكَ نُرِيَنَّ لِفِرْعَوْنَ سُوءَ عَمَلِهِ وَصَدَّ عَنِ السَّبِيلِ ۖ وَمَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ إِلَّا فِي تَبَابٍ ﴿۳۷﴾

آسمانوں کے راستوں پر، پس موسیٰ کے معبود کی طرف جھانکوں اور بے شک میں اسے یقیناً جھوٹا گمان کرتا ہوں۔ اور اس طرح فرعون کے لیے اس کا برا عمل خوش نما بنا دیا گیا اور وہ سیدھی راہ سے روک دیا گیا اور فرعون کی تدبیر تباہی ہی میں تھی ﴿۳۷﴾

عمارت بناؤ، تاکہ میں راستوں تک پہنچ جاؤں۔

آیت 37 ﴿۱﴾ أَسْبَابِ السَّلَوَاتِ فَأَكْلَعَهُ إِلَى اللَّهِ مُوسَى: فرعون نے پہلے صرف یہ کہا: ”تاکہ میں اسباب تک پہنچ سکوں“ مقصد تجسس پیدا کرنا تھا کہ وہ کس چیز کے اسباب تک پہنچنا چاہتا ہے۔ چنانچہ اس نے دوبارہ وضاحت کی، تاکہ میں آسمانوں کے راستوں اور دروازوں تک پہنچ جاؤں، جہاں سے آسمانوں تک رسائی ہوتی ہے، پھر موسیٰ کے معبود کی طرف جھانکوں، جو اس کے کہنے کے مطابق آسمانوں کے اوپر ہے۔

﴿۲﴾ وَ إِنِّي لَأَكْظُمُهُ كَاذِبًا: ”اِنِّ“ اور ”لام“ کے ساتھ تاکید کی وجہ سے یہاں ظن (گمان) یقین کے معنی میں ہے، یعنی موسیٰ جو دعویٰ کرتا ہے کہ وہ اللہ کا رسول ہے، یا یہ کہ اس کا رب آسمانوں کے اوپر عرش پر ہے، تو مجھے یقین ہے کہ وہ جھوٹا ہے۔ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں سے اوپر عرش پر ہے، اس پر تمام انبیاء و رسل، صحابہ و تابعین اور ائمہ دین کا اتفاق ہے۔ افسوس! اس مقام پر کئی مفسرین نے، جو یونان کے مشرک فلسفیوں سے متاثر ہیں، اللہ تعالیٰ کے آسمان پر یا بلندی کی طرف یا عرش پر ہونے کا انکار کیا ہے، بلکہ بعض نے تو اتنی جرأت کی ہے کہ اسے فرعون کا عقیدہ قرار دیا ہے، حالانکہ وہ موسیٰ علیہ السلام کا عقیدہ ہے جس کا فرعون انکار کر رہا ہے اور اس میں موسیٰ علیہ السلام کو جھوٹا کہہ رہا ہے، اس کے علاوہ قرآن مجید کی ”ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ“ والی تمام آیات اس بات کی واضح دلیل ہیں۔ اسی طرح وہ آیات بھی جن میں اللہ تعالیٰ کے آسمانوں کے اوپر ہونے کا ذکر ہے۔ دیکھیے سورہ ملک (۱۶، ۱۷)، حاقہ (۱۷) اور طہ (۵) کی تفسیر۔

﴿۳﴾ وَكَذَلِكَ نُرِيَنَّ لِفِرْعَوْنَ سُوءَ عَمَلِهِ : یعنی اس طرح فرعون کے لیے اس کا برا عمل، یعنی اللہ تعالیٰ کے وجود کا انکار، اپنے رب الاعلیٰ ہونے پر اصرار، موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب اور بنی اسرائیل پر ظلم و ستم خوش نما بنا دیا گیا اور وہ ان کاموں کو اچھا سمجھ کر ان پر چلتا رہا۔ خوش نمابانے والا کون تھا؟ تو یہ اس کی خواہش نفس، شیطان، برے ساتھی (دیکھیے انعام: ۱۲۲، ۱۳۷۔ انفال: ۴۸) اور خود اللہ تعالیٰ تھا، کیونکہ ہر چیز کا خالق وہی ہے۔ (دیکھیے انعام: ۱۰۸۔ نمل: ۴) اور جو مخالفت پر کمر باندھ لے تو اللہ تعالیٰ اسے اس کی مرضی پر چھوڑ دیتا ہے۔ دیکھیے سورہ نساء (۱۱۵)۔

﴿۴﴾ وَمَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ إِلَّا فِي تَبَابٍ: ”تَبَابٍ“ ”تَبَّ يَتَبُّ“ (ن) کا مصدر ہے، ہلاکت، تباہی اور خسارہ۔ یہ لازم و متعدی دونوں معنوں میں آتا ہے۔ یعنی اس نے جتنی چالیں چلیں سب اس کی تباہی کا سبب بنتی چلی گئیں، بالآخر وہ اپنے لشکروں

وَقَالَ الَّذِي آمَنَ يَقَوْمِ اتَّبِعُونِ أَهْدِكُمْ سَبِيلَ الرَّشَادِ ﴿۳۸﴾ يَقَوْمِ إِنَّمَا هَذِهِ الْحَيَاةُ
الدُّنْيَا مَتَاعٌ وَإِنَّ الْآخِرَةَ هِيَ دَارُ الْقَرَارِ ﴿۳۹﴾ مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا يُجْزَى إِلَّا مِثْلَهَا
وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ يُزْمَرُونَ
فِيهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۴۰﴾

اور اس شخص نے کہا جو ایمان لایا تھا، اے میری قوم! میرے پیچھے چلو، میں تمہیں بھلائی کا راستہ بتاؤں گا ﴿۳۸﴾ اے میری قوم! یہ دنیا کی زندگی تو معمولی فائدے کے سوا کچھ نہیں اور یقیناً آخرت، وہی رہنے کا گھر ہے ﴿۳۹﴾ جس نے کوئی برائی کی تو اسے ویسا ہی بدلا دیا جائے گا اور جس نے کوئی نیک عمل کیا، مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہو تو یہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے، اس میں بے حساب رزق دیے جائیں گے ﴿۴۰﴾

سمیت سمندر میں غرق کر دیا گیا۔ یہی حال ہر جھوٹے اور مکار آدمی کا ہوتا ہے۔

﴿۳۸﴾ فرعون نے وہ محل بنایا نہیں، اس کی وضاحت اور ان دونوں آیتوں کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ قصص (۲۸ تا ۴۰)۔

آیت 38 وَقَالَ الَّذِي آمَنَ يَقَوْمِ اتَّبِعُونِ : مرد مومن نے فرعون کے استہزاء سے صرف نظر کرتے ہوئے قوم کو نصیحت جاری رکھی اور کہا کہ اے میری قوم! ”سَبِيلَ الرَّشَادِ“ (بھلائی کا راستہ) وہ نہیں جو فرعون بتلاتا ہے، بلکہ تم میری بات مانو، میں تمہیں بھلائی کا راستہ بتاتا ہوں۔

آیت 39 يَقَوْمِ إِنَّمَا هَذِهِ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا مَتَاعٌ : مرد مومن نے اپنی بات کی دلیل بیان کرتے ہوئے کہا کہ میں تمہیں جو راستہ بتاتا ہوں حقیقت میں صحیح راستہ وہی ہے، کیونکہ فرعون اور اس کے ساتھیوں کا مٹح نظر اور ساری تنگ و دو صرف دنیا کے لیے ہے، انہوں نے آخرت کی زندگی سے بالکل آنکھیں بند کر رکھی ہیں، حالانکہ دنیا کی زندگی معمولی سا فائدہ ہے، (متاع کی تینون تحقیر کے لیے ہے) جو بہت تھوڑی مدت کے لیے ہے۔ عیش و آرام سے گزرے تو حاصل کچھ نہیں، کیونکہ ناپائیدار ہے اور تنگی ترشی سے گزرے تب بھی گزر ہی جائے گی۔ فکر تو آخرت کی زندگی کی کرنی چاہیے جو دائمی اور لازوال ہے، جہاں ہمیشہ رہنا ہے۔ وہاں دنیا کا یہ حقیر سامان کسی کام نہیں آئے گا، بلکہ صالح اعمال کام آئیں گے۔

آیت 40 مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا يُجْزَى إِلَّا مِثْلَهَا : یہ دنیا دار الامتحان ہے، اس کے باوجود رحمان و رحیم رب تعالیٰ نے اتنی زبردست رعایت رکھی ہے کہ جو شخص کوئی برائی کرے، اسے صرف اس ایک برائی ہی کا بدلا دیا جائے گا، مگر جو شخص ایمان لا کر کوئی صالح عمل کرے تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور اس میں انہیں بے حساب رزق دیا جائے گا، انہیں نیکیوں کی جزا بھی دس گنا سے سات سو گنا بلکہ حساب و شمار سے بھی زیادہ دی جائے گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ برائی کی جزا اتنی ہی دی جائے گی جتنی کسی نے برائی کی ہے اور یہ کہ کافر کبھی جنت میں داخل نہیں ہوگا، کیونکہ اگر اس نے اپنے خیال میں کوئی

و يَقَوْمَ مَا لِي اَدْعُوْكُمْ اِلَى النَّجْوٰى وَ تَدْعُوْنِنِىْ اِلَى النَّارِ ۗ تَدْعُوْنِنِىْ لِاَكْفَرِ بِاللّٰهِ
وَ اَشْرِكْ بِهٖ مَا لَيْسَ لِىْ بِهٖ عِلْمٌ ۗ وَ اَنَا اَدْعُوْكُمْ اِلَى الْعَزِيْزِ الْغَفَّارِ ﴿۳۶﴾

اور اے میری قوم! مجھے کیا ہے کہ میں تمہیں نجات کی طرف بلاتا ہوں اور تم مجھے آگ کی طرف بلاتے ہو ﴿۳۶﴾ تم مجھے بلاتے ہو کہ میں اللہ کا انکار کروں اور اس کے ساتھ اسے شریک ٹھہراؤں جس کا مجھے کچھ علم نہیں اور میں تمہیں سب پر غالب، بے حد بخشنے والے کی طرف بلاتا ہوں ﴿۳۶﴾

نیکی کی بھی ہے تو اس کا اعتبار ایمان کے بغیر نہیں کیا جائے گا۔ عمل صالح کی قبولیت کے لیے ایمان شرط ہے اور عمل صالح وہ ہے جس میں نیت درست ہو، یعنی وہ خالص اللہ تعالیٰ کے لیے ہو اور طریقہ درست ہو، یعنی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق کیا جائے۔ دیکھیے سورہ کہف کی آخری آیت کی تفسیر۔

آیت 41 ﴿۴۱﴾ وَ يَقَوْمَ : یہاں زخشری نے ایک سوال اور اس کا جواب ذکر کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس نے بار بار ”يَقَوْمَ“ کیوں کہا اور کیا وجہ ہے کہ اس نے تیسری دفعہ ”واو“ کے اضافے کے ساتھ ”وَ يَقَوْمَ“ کہا، جب کہ دوسری دفعہ ”واو“ کے بغیر ”يَقَوْمَ“ کہا ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ بار بار ”يَقَوْمَ“ کہنے کا مقصد ایک تو انہیں خبردار اور خواب غفلت سے بیدار کرنا ہے، دوسرا اس بات کا اظہار ہے کہ تم میری قوم اور میرا خاندان ہو، اس لیے مجھ پر واجب ہے کہ میں تمہاری خیر خواہی کروں۔ چنانچہ وہ ان سے نہایت نرمی اور محبت کے ساتھ بات کرتا ہے، ان کے بارے میں اپنے غم کا اظہار کرتا ہے، تاکہ وہ اس کی نیت پر شک نہ کریں، کیونکہ ان کی خوشی اس کی خوشی اور ان کا غم اس کا غم ہے، جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کو نصیحت کرتے ہوئے ہر جملے کی ابتدا ”يٰٓاَبَتِ“ (اے میرے باپ!) سے کی۔ (دیکھیے مریم: ۳۱ تا ۳۵) اور تیسری دفعہ ”واو“ لانے اور دوسری دفعہ ”واو“ نہ لانے کی وجہ یہ ہے کہ اس نے دوسری دفعہ ”يَقَوْمَ“ والے جملے کے ساتھ اس سے پہلے جملے ہی کی وضاحت کی ہے، جب کہ تیسری دفعہ اس نے ایک نئی بات کی ہے۔

آیت 42 ﴿۴۲﴾ مَا لِي اَدْعُوْكُمْ اِلَى النَّجْوٰى ... : قوم سے یہ سوال اظہار تعجب کے لیے ہے، یعنی یہ تمہاری کس قسم کی قوم پروری اور حق شناسی ہے کہ میں تو تمہیں اللہ کی توحید اور اس کے رسول پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہوں، جس کا نتیجہ آگ سے نجات ہے اور تم مجھے اللہ کے ساتھ شرک اور رسول کی تکذیب پر قہم رہنے کے لیے اصرار کرتے ہوئے آگ کی دعوت دے رہے ہو۔

آیت 43 ﴿۴۳﴾ قرآن مجید کے رسم الخط میں ”نَجَاةٌ“ کے الف کو واو کی شکل میں ”النَّجْوٰى“ لکھا گیا ہے، اس کی وجہ اس بات کی طرف توجہ دلانا ہے کہ یہ الف واو سے بلا ہوا ہے، جیسا کہ ”ضَلَاةٌ“ اور ”زَسَاةٌ“ کو ”ضَلُوۡةٌ“ اور ”زَسُوۡةٌ“ لکھا جاتا ہے۔

آیت 42 ﴿۴۲﴾ تَدْعُوْنِنِىْ لِاَكْفَرِ بِاللّٰهِ : یعنی میں تو اللہ پر ایمان لے آیا ہوں اور مجھے یقینی علم حاصل ہے کہ اس کا کوئی شریک نہیں اور تم مجھے دعوت دیتے ہو کہ میں اللہ کے ساتھ کفر کروں اور اس کے ساتھ ان ہستیوں کو شریک مانوں جن کا مجھے علم ہی نہیں۔ علم نہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ کہیں ہیں ہی نہیں تو میں ایسوں کو آنکھیں بند کر کے کیسے مان لوں۔

لَا جَرَمَ أَنَّمَا تَدْعُونَنِي إِلَيْهِ لَيْسَ لَكَ دَعْوَةٌ فِي الدُّنْيَا وَلَا فِي الْآخِرَةِ وَأَنْ مَرَدَّنَا إِلَى اللَّهِ وَأَنَّ الْمُسْرِفِينَ هُمْ أَصْحَابُ النَّارِ ﴿۳۷﴾ فَسْتَذَكِّرُونَ مَا أَلْفَوْا لَكُمْ وَأَفْوَضَ أَمْرِي إِلَى اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ ﴿۳۸﴾

کوئی شک نہیں کہ تم مجھے جس کی طرف بلا تے ہو اس کے لیے کسی طرح پکارنا نہ دنیا میں (درست) ہے اور نہ آخرت میں اور یہ کہ ہمارا لوٹنا اللہ کی طرف ہے اور یہ کہ حد سے بڑھنے والے، وہی آگ میں رہنے والے ہیں ﴿۳۷﴾ پس عنقریب تم یاد کرو گے جو میں تم سے کہہ رہا ہوں اور میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں، بے شک اللہ بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے ﴿۳۸﴾

﴿۳۷﴾ وَأَنَا أَدْعُوكُمْ إِلَى الْعَزِيزِ الْعَقَّابِ: اور میں تمہیں اس ذات عالی کی طرف دعوت دیتا ہوں جو سب پر غالب ہے، کوئی اس کی گرفت سے نکل نہیں سکتا۔ اس کے باوجود وہ ظالم و جابر نہیں، بلکہ اپنے فرماں بردار بندوں کے گناہوں پر بہت پردہ ڈالنے والا اور انہیں بخش دینے والا ہے، اس لیے عبادت کا حق دار وہی ہے۔

بیت 43 ﴿۱﴾ لَا جَرَمَ أَنَّمَا تَدْعُونَنِي إِلَيْهِ: یہاں ”أَنَّمَا“ کلمہ رخص نہیں، جو اکٹھا لکھا جاتا ہے، بلکہ ”أَنَّ“ الگ ہے اور ”مَا“ موصولہ الگ ہے، معنی ”وہ جو۔“ قرآن مجید کے اولین کاتبوں نے اسے یہاں اکٹھا لکھا، اس لیے اسے اکٹھا لکھا جاتا ہے۔ ﴿۲﴾ ”لَيْسَ لَكَ دَعْوَةٌ“ (اس کے لیے کوئی دعوت نہیں) کے کئی معانی ہو سکتے ہیں اور سب درست ہیں۔ ایک یہ کہ نہ دنیا میں اس کا حق ہے کہ اسے پکارا جائے نہ آخرت میں۔ دوسرا یہ کہ نہ دنیا میں اسے پکارنے کا کوئی فائدہ ہے نہ آخرت میں۔ تیسرا یہ کہ نہ وہ دنیا میں کسی کی دعا قبول کر سکتا ہے نہ آخرت میں۔ گویا یہ وہی بات ہے جو سورہ احناف میں فرمائی ہے: ﴿وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّن يَدْعُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ مَنْ لَا يَسْتَجِيبُ لَهُ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَهُمْ عَنِ دُعَائِهِمْ غَفُلُونَ﴾ [الاحقاف: ۱۵] ”اور اس سے بڑھ کر کون گمراہ ہے جو اللہ کے سوا انہیں پکارتا ہے جو قیامت کے دن تک اس کی دعا قبول نہیں کریں گے اور وہ ان کے پکارنے سے بے خبر ہیں۔“ مزید دیکھیے سورہ فاطر (۱۳)۔

﴿۳﴾ وَأَنْ مَرَدَّنَا إِلَى اللَّهِ: یعنی آخر کار ہم سب کو اللہ تعالیٰ کے پاس واپس جانا ہے جو ہر ایک کو اس کے عمل کی جزایا سزا دے گا۔ ﴿۴﴾ وَأَنَّ الْمُسْرِفِينَ هُمْ أَصْحَابُ النَّارِ: یہاں ”الْمُسْرِفِينَ“ (حد سے بڑھنے والوں) سے مراد کافر و مشرک ہیں، کیونکہ ہمیشہ آگ میں رہنے والے وہی ہیں، فرمایا: ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ﴾ [النسا: ۴۸، ۱۱۶] ”بے شک اللہ اس بات کو نہیں بخشے گا کہ اس کا شریک بنایا جائے اور بخش دے گا جو اس کے علاوہ ہے، جسے چاہے گا۔“

بیت 44 ﴿۱﴾ فَسْتَذَكِّرُونَ مَا أَلْفَوْا لَكُمْ: معلوم ہوتا ہے کہ وہ مرد مومن اس تقریر کے دوران فرعون کی گفتگو سن کر اور

فَوَقَّهٗ اللّٰهُ سَيِّئَاتِ مَا مَكَرُوْا وَحَاقَ بِآلِ فِرْعَوْنَ سُوءُ الْعَذَابِ ﴿۴۵﴾

تو اللہ نے اسے ان کے برے نتائج سے بچالیا جو انھوں نے تدبیریں کیں اور آل فرعون کو برے عذاب نے گھیر لیا ﴿۴۵﴾

قوم کا رویہ دیکھ کر ان کے ایمان لانے اور موسیٰ علیہ السلام کے متعلق قتل کا فیصلہ بدلنے سے مایوس ہو گیا تھا اور اپنے متعلق بھی اسے پورا یقین ہو گیا تھا کہ یہ لوگ مجھے بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اس لیے اس نے آخری فقرہ اس شخص کے لہجے میں کہا جو اللہ کی راہ میں جان دینے کے لیے تیار کھڑا ہو اور جسے اللہ کی مدد پر پورا یقین ہو۔

﴿۲﴾ وَأَفْوُضُ أَمْرِي إِلَى اللّٰهِ: یہی وہ بات ہے جو اللہ کے خاص بندے اس وقت بھی کہتے ہیں جب تمام ظاہری اسباب ختم ہو جائیں، اس وقت بھی ان کا اللہ تعالیٰ پر بھروسہ پوری طرح قائم رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ بھی ان کے اعتماد کو کبھی نہیں توڑتا، بلکہ جس طرح چاہتا ہے انھیں بچالیتا ہے۔ اللہ کے ان بندوں کے الفاظ مختلف ہو سکتے ہیں مگر مفہوم ایک ہی ہوتا ہے کہ ہم نے اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کیا، وہی ہمارے لیے کافی ہے۔ چنانچہ ابراہیم علیہ السلام نے آگ میں گرائے جانے کے وقت ”حَسْبِيَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ“ کہا۔ [بخاری، التفسیر، باب قوله تعالى: ﴿الَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِلّٰهِ.....﴾ ۴۵۶۴] جنگ اُحد کے بعد زخم خوردہ ہونے کے باوجود دشمنوں کی آمد کی خبر سن کر ایمان والوں نے یہ بات ان الفاظ میں کہی: ﴿حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾ [آل عمران: ۱۷۳] ”ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ اچھا کارساز ہے۔“ اور اصحاب الاخذود والے لڑکے نے یہی بات ان الفاظ میں کہی تھی: ﴿اللّٰهُمَّ اَكْفِنِيْهِمْ بِمَا شِئْتَ﴾ [مسلم، الزهد، باب قصة أصحاب الاخذود.....: ۳۰۰۵] ”اے اللہ! مجھے ان سے کافی ہو جا جس طرح تو چاہے۔“ اور آل فرعون کے مومن نے کہا: ﴿وَأَفْوُضُ أَمْرِي إِلَى اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ بِصِيْرَةِ الْعِبَادِ﴾ ”میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں، کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے۔“

﴿۳﴾ اِنَّ اللّٰهَ بِصِيْرَةِ الْعِبَادِ: یعنی وہ تمہارے کفر و شرک اور ظلم و ستم پر اصرار کو اور میری بے چارگی اور اس کی خاطر استقامت کو خوب دیکھ رہا ہے، وہ خود ہی فیصلہ فرمادے گا۔

آیت 45 ﴿۱﴾ فَوَقَّهٗ اللّٰهُ سَيِّئَاتِ مَا مَكَرُوْا: فرعون اس مرد مومن کی واٹکاف الفاظ میں نصیحت پر جتنا بھی غضب ناک ہوا ہو اللہ تعالیٰ کی حفاظت کی وجہ سے علی الاعلان اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کر سکا، بلکہ اس نے اور اس کے دربار والوں نے اس کے خلاف کارروائی کے لیے کئی خفیہ منصوبے طے کیے، مگر اللہ تعالیٰ نے اسے ان کے برے نتائج سے بھی بچالیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں یہ نہیں بتایا کہ کس طرح بچایا۔ بعض مفسرین نے بیان کیا کہ وہ ان سے بچ کر پہاڑوں کی طرف نکل گیا۔ بعض نے کہا کہ اس واقعہ کے بعد جلد ہی موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر نکلے تو وہ بھی ان کے ساتھ سمندر پار ہو گیا۔ ہمارے پاس یہ معلوم کرنے کا کوئی یقینی ذریعہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اسے کس طرح بچایا۔ شاید اللہ تعالیٰ کے یہ بات نہ بتانے میں یہ حکمت ہو کہ تم اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر دو، پھر یہ اس کا کام ہے کہ وہ تمہیں کس طرح بچاتا ہے۔ اس کے بچانے کے طریقے تمہاری سوچ سے بہت بلند ہیں۔

الْقَارِ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَعَشِيًّا ۖ وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ أَدْخِلُوا آلَ فِرْعَوْنَ
جو آگ ہے، وہ اس پر صبح و شام پیش کیے جاتے ہیں اور جس دن قیامت قائم ہوگی، آل فرعون کو

② وَحَاقَىٰ بِآلِ فِرْعَوْنَ سُوءُ الْعَذَابِ: وہ مردوسوں تو آل فرعون کی سازشوں کے برے نتائج سے بچ کر دنیا اور آخرت میں کامیاب ہو گیا، مگر آل فرعون کو دنیا اور آخرت کے دوہرے عذاب نے گھیر لیا۔ دنیا میں وہ سمندر میں غرق ہوئے۔

آیت 46 ① الْقَارِ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَعَشِيًّا: سمندر میں غرق کیے جانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں گھیرنے والے دو بدترین عذابوں کا ذکر فرمایا ہے۔ ایک قیامت تک ہونے والا عذاب، عذاب قبر یا عذاب برزخ ہے، جو موت اور آخرت کے درمیانے وقفے میں انہیں آگ کی صورت میں ہو رہا ہے، جس پر وہ صبح و شام پیش کیے جاتے ہیں۔ خواہ ان کے جسم سمندری جانوروں کی خوراک بنے ہوں یا کسی عجائب گھر میں محفوظ ہوں، یا خاک میں مل گئے ہوں، ان کا ہر ذرہ جہاں بھی ہے وہی اس کی قبر ہے اور قیامت تک اسے یہ عذاب ہوگا۔ صبح و شام سے مراد ہر وقت ہے اور یہ محاورہ عربی ہی نہیں ہرزبان میں بولا جاتا ہے۔ (دیکھیے سورہ مریم (۶۲)۔)

② وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ أَدْخِلُوا آلَ فِرْعَوْنَ أَشَدَّ الْعَذَابِ: یہ دوسرا عذاب ہے جو قیامت کے دن شروع ہوگا۔ یہ آیت عذاب قبر کی واضح دلیل ہے۔ بعض لوگوں نے واضح آیات و احادیث کے باوجود عذاب قبر کا انکار کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت دے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح بخاری میں ”کِتَابُ الْجَنَائِزِ“ کے تحت ”بَابُ مَا جَاءَ فِي عَذَابِ الْقَبْرِ“ میں عذاب قبر ثابت کرنے کے لیے تین آیات اور متعدد احادیث ذکر فرمائی ہیں۔ پہلی آیت: ﴿إِذِ الظَّالِمُونَ فِي غَمَرَاتِ الْمَوْتِ وَالْمَلَائِكَةُ بَاسِطُوا أَيْدِيهِمْ أخرجُوا أَنفُسَكُمْ أَيُّومَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ﴾ [الأنعام: ۹۳] ”جب ظالم لوگ موت کی غمخیزیوں میں ہوتے ہیں اور فرشتے اپنے ہاتھ پھیلائے ہوئے ہوتے ہیں، نکالو اپنی جانیں، آج تمہیں ذلت کا عذاب دیا جائے گا۔“ دوسری آیت: ﴿سَعَدَ بِهِمْ قَرَئِينَ ثُمَّ يُرْدُونَ إِلَىٰ عَذَابٍ عَظِيمٍ﴾ [التوبة: ۱۰۱] ”عنقریب ہم انہیں دو بار عذاب دیں گے، پھر وہ بہت بڑے عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے۔“ تیسری یہ آیت جو یہاں زیر تفسیر ہے۔

عذاب قبر سے متعلق صحیح بخاری میں مذکور احادیث میں سے چند یہاں درج کی جاتی ہیں۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا وُضِعَ فِي قَبْرِهِ، وَتَوَلَّىٰ عَنْهُ أَصْحَابُهُ، وَإِنَّهُ لَيَسْمَعُ قَرْعَ نِعَالِهِمْ، أَنَاهُ مَلَكَانِ فَيَقْعَدَانِهِ فَيَقُولَانِ مَا كُنْتَ تَقُولُ فِي هَذَا الرَّجُلِ لِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ فَأَمَّا الْمُؤْمِنُ فَيَقُولُ أَشْهَدُ أَنَّهُ عَبْدُ اللَّهِ وَرَسُولُهُ فَيَقَالُ لَهُ انظُرْ إِلَىٰ مَقْعَدِكَ مِنَ النَّارِ، قَدْ أَبَدَلْنَاكَ اللَّهُ بِهِ مَقْعَدًا مِنَ الْجَنَّةِ، فَيَرَاهُمَا جَمِيعًا، قَالَ فَتَادَةٌ وَذُكْرٌ لَنَا أَنَّهُ يُفْسَخُ لَهُ فِي قَبْرِهِ ثُمَّ رَجَعَ إِلَىٰ حَدِيثِ أَنَسِ قَالَ وَأَمَّا

أَشَدَّ الْعَذَابِ ❸

سخت ترین عذاب میں داخل کرو ❸

الْمَنَافِقُ وَالْكَافِرُ يُقَالُ لَهُ مَا كُنْتَ تَقُولُ فِي هَذَا الرَّجُلِ؟ فَيَقُولُ لَا أُدْرِي، كُنْتُ أَقُولُ مَا يَقُولُ النَّاسُ، فَيُقَالُ لَا ذَرْبَ لَكَ وَلَا تَلَيْتَ وَ يُضْرَبُ بِمِطْرَاقٍ مِنْ حَدِيدٍ ضَرْبَةً، فَيَصْبِحُ صَنِيعَةً يَسْمَعُهَا مَنْ يَلِيهِ، غَيْرَ الثَّقَلَيْنِ (بخاری، الحناجر، باب ما جاء في عذاب النفر: ۱۳۷۴) آدمی جب اپنی قبر میں رکھا جاتا ہے اور اس کے ساتھی اس سے واپس لوٹتے ہیں اور وہ ان کے جوتوں کی آواز سن رہا ہوتا ہے، تو اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں اور اسے بٹھا دیتے ہیں اور کہتے ہیں: ”تو اس آدمی محمد ﷺ کے بارے میں کیا کہتا تھا؟“ تو جو مومن ہے وہ کہتا ہے: ”میں شہادت دیتا ہوں کہ وہ اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہے۔“ تو اس سے کہا جاتا ہے: ”آگ میں اپنے ٹھکانے کو دیکھ لے، اللہ تعالیٰ نے اس کے بدلے میں تجھے جنت میں ٹھکانا دے دیا ہے۔“ تو اسے وہ دونوں ٹھکانے اکٹھے دکھائے جاتے ہیں۔ قتادہ نے کہا: ”ہمیں بتایا گیا کہ پھر اس کی قبر کشادہ کر دی جاتی ہے۔“ پھر قتادہ نے انس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث آگے بیان فرمائی: ”اور جو منافق یا کافر ہے، اس سے کہا جاتا ہے: ”تو اس آدمی کے بارے میں کیا کہتا تھا؟“ وہ کہتا ہے: ”میں نہیں جانتا، میں وہی کہتا تھا جو لوگ کہتے تھے۔“ تو اس سے کہا جاتا ہے: ”نہ تو نے جانا اور نہ کسی کے پیچھے چلا۔“ پھر اسے لوہے کے ہتھوڑوں سے ایک ایسی ضرب ماری جاتی ہے، جس سے وہ ایسی چیخ مارتا ہے جسے انسانوں اور جنوں کے سوا اس کے آس پاس کے سب سنتے ہیں۔“

ابو ایوب رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ سورج غروب ہونے کے بعد باہر نکلے، آپ ﷺ نے ایک آواز سنی، تو فرمایا: ﴿يَهْوَدُ نُعْدَابٌ فِي قُبُورِهَا﴾ (بخاری، الحناجر، باب النعود من عذاب النفر: ۱۳۷۵) ”یہود کو ان کی قبروں میں عذاب ہو رہا ہے۔“ ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ دو قبروں کے پاس سے گزرے تو فرمایا: ﴿إِنَّهُمَا لَيُعَذَّبَانِ، وَمَا يُعَذَّبَانِ فِي كِبِيرٍ، ثُمَّ قَالَ بَنِي، أَمَّا أَحَدُهُمَا فَكَانَ يَسْعَىٰ بِالنَّمِيمَةِ، وَأَمَّا أَحَدُهُمَا فَكَانَ لَا يَسْتَتِرُ مِنْ بَوْلِهِ﴾ (بخاری، الحناجر، باب عذاب النفر من العيبة والبول: ۱۳۷۸) ”بلاشبہ یقیناً ان دونوں کو عذاب دیا جا رہا ہے اور کسی بڑی چیز کی وجہ سے عذاب نہیں دیا جا رہا۔“ پھر آپ نے فرمایا ”کیوں نہیں! (وہ واقعی بڑی ہیں) ان میں جو ایک ہے وہ چغلی کھایا کرتا تھا اور دوسرا اپنے پیشاب سے نہیں بچتا تھا۔“ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ دعا کیا کرتے تھے: ﴿اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ، وَمِنْ عَذَابِ النَّارِ، وَمِنْ قَسْطِ الْمُخَلَّبِ وَالْمَمَاتِ، وَمِنْ قَسْطِ الْعَسْبِجِ الذُّجَالِ﴾ (بخاری، الحناجر، باب النعود من عذاب النفر: ۱۳۷۷) ”اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں قبر کے عذاب سے اور آگ کے عذاب سے اور زندگی اور موت کے قسطنے سے اور مسج و جال کے قسطنے سے۔“

وَإِذْ يَتَحَاجُّونَ فِي النَّارِ فَيَقُولُ الضُّعْفُو لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا إِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ أَنْتُمْ مُغْنُونَ عَنَّا نَصِيبًا مِنَ النَّارِ ﴿۴۸﴾ قَالَ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا إِنَّا كُلٌّ فِيهَا إِنَّ اللَّهَ قَدْ حَكَمَ بَيْنَ الْعِبَادِ ﴿۴۹﴾ وَقَالَ الَّذِينَ فِي النَّارِ لِخَزَنَتِهِمْ جَهَنَّمَ ادْعُوا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا مِنَ الْعَذَابِ ﴿۵۰﴾ قَالُوا أَوْ لَمْ تَكُنْ تَأْتِيكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَيِّنَاتِ ۖ قَالُوا بَلَىٰ ۖ قَالُوا

اور جب وہ آگ میں ایک دوسرے سے جھگڑیں گے تو کمزور لوگ ان سے کہیں گے جو بڑے بنے ہوئے تھے کہ بے شک ہم تمہارے ہی پیچھے چلنے والے تھے، تو کیا تم ہم سے آگ کا کوئی حصہ ہٹانے والے ہو؟ ﴿۴۸﴾ وہ لوگ کہیں گے جو بڑے بنے تھے بے شک ہم سب اس میں ہیں، بے شک اللہ نے بندوں کے درمیان فیصلہ کر دیا ہے ﴿۴۹﴾ اور وہ لوگ جو آگ میں ہوں گے جہنم کے گمرانوں سے کہیں گے اپنے رب سے دعا کرو، وہ ہم سے ایک دن کچھ عذاب ہٹا کر دے ﴿۵۰﴾ وہ کہیں گے اور کیا تمہارے پاس تمہارے رسول واضح دلیلیں لے کر نہیں آیا کرتے تھے؟ کہیں گے

آیت 48-47 ﴿۱﴾ وَإِذْ يَتَحَاجُّونَ فِي النَّارِ فَيَقُولُ الضُّعْفُو..... : فرعون اور آنکھیں بند کر کے اس کے پیچھے چنے

والوں کا انجام آگ اور قیامت کے دن "أَشَدَّ الْعَذَابِ" بیان فرمانے کے بعد بتایا کہ صرف فرعون ہی نہیں، ہر منکر اور اس کے اندھا دھند پیروکار جہنم میں جائیں گے اور وہاں ایک دوسرے سے جھگڑیں گے۔ "يَتَحَاجُّونَ" (ایک دوسرے سے جھگڑیں گے) کے لفظ سے ظاہر ہے کہ کمزور لوگوں کا بڑا بننے والوں سے کہنا: ﴿۱﴾ إِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ أَنْتُمْ مُغْنُونَ عَنَّا نَصِيبًا مِنَ النَّارِ ﴿۴۸﴾ (کہ ہم دنیا میں تمہارے تابع تھے، تو کیا تم ہم سے آگ کا کوئی حصہ ہٹاؤ گے؟) ان سے آگ ہٹانے کی درخواست کے لیے نہیں ہوگا، بلکہ انھیں ذلیل کرنے کے لیے اور اپنے دل کا اہل نکالنے کے لیے ہوگا۔ ان بڑے بننے والوں کے پاس بھی یہ کہنے کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ ہم خود آگ میں ہیں، تمہارے کس کام آسکتے ہیں؟! اس پر وہ ایک دوسرے کو لعنت کریں گے، مگر کسی کو کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس جھگڑے کا کئی مقامات پر ذکر فرمایا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ بقرہ (۱۶۶، ۱۶۷)، سورہ ابراہیم (۲۲، ۲۱)، سورہ اعراف (۳۸، ۳۹) اور سورہ سبا (۳۱، ۳۲)۔

﴿۲﴾ إِنَّ اللَّهَ قَدْ حَكَمَ بَيْنَ الْعِبَادِ : یعنی اللہ تعالیٰ کا فیصلہ نازل ہو چکا، اب تم اپنی سزا جھگڑو ہم اپنی جھگڑت رہے ہیں، اس عذاب میں کسی بیشی ہمارے بس میں نہیں ہے۔

آیت 49 ﴿۱﴾ وَقَالَ الَّذِينَ فِي النَّارِ لِخَزَنَتِهِمْ جَهَنَّمَ..... : یعنی آپس کے جھگڑے کو بے سود سمجھ کر سردار اور پیروکار سب جہنم

کے دربانوں سے کہیں گے کہ اپنے رب سے ہمارے لیے بھی دعا کرو کہ کسی ایک دن ہی ہمارے عذاب میں تخفیف کر دے۔

آیت 50 ﴿۱﴾ قَالُوا أَوْ لَمْ تَكُنْ تَأْتِيكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَيِّنَاتِ..... : جہنم کے دربان ان پر واضح کرنے کے لیے کہ تم اس قابل ہی

فَادْعُوا ۚ وَمَا دَعَا الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ۭۭۗۢۙ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ۝۱

کیوں نہیں، وہ کہیں گے پھر دعا کرو اور کافروں کی دعا تو بالکل ہی بے کار ہے ۝۱ بے شک ہم اپنے رسولوں کی اور ان لوگوں کی جو ایمان لائے ضرور مدد کرتے ہیں دنیا کی زندگی میں اور اس دن بھی جب گواہ کھڑے ہوں گے ۝۱

نہیں کہ تمہاری بات سنی جائے یا تمہاری سفارش کی جائے، ان سے کہیں گے، کیا تمہارے رسول تمہارے پاس واضح دلیلیں لے کر نہیں آیا کرتے تھے؟ وہ کہیں گے، کیوں نہیں! اس پر فرشتے ان سے کہیں گے، پھر جب تم نے ان کی پکار پر لبیک نہیں کہا تو تمہاری پکار بھی کوئی نہیں سنے گا، سو پکارتے رہو، کافروں کی پکار بالکل بے سود اور بے کار ہے۔ شاہ عبد القادر لکھتے ہیں: ”دوزخ کے فرشتے کہیں گے، سفارش ہمارا کام نہیں، ہم تو عذاب پر مقرر ہیں۔ سفارش کام ہے رسولوں کا، سو رسولوں سے تو تم برخلاف ہی تھے۔“ (موضح) دوسری جگہ فرمایا کہ وہ مالک (یعنی جہنم کے بڑے دربان) کو پکار کر کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ وہ ہمارا کام ہی تمام کر دے، مگر وہ کہے گا، تمہیں یہیں رہنا ہے۔ (دیکھیے زخرف: ۷۷) اور وہ رب تعالیٰ سے بھی جہنم سے نکالنے کی درخواست کریں گے، مگر وہاں سے بھی انہیں دھکا کر کہا جائے گا کہ مجھ سے بات مت کرو۔ دیکھیے سورہ مومنون (۱۰۷، ۱۰۸)۔

آیت 51 ۝۱ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا..... : سورت کی ابتدا سے یہاں تک آیات کا حاصل یہ تھا کہ نوح علیہ السلام کی قوم نے اور ان کے بعد آنے والے رسولوں کی امتوں نے اپنے رسولوں کو جھٹلایا، حق کو شکست دینے کے لیے باطل طریقے سے کج بخشی کی اور ہر ایک نے اپنے رسول کو گرفتار کرنے کا ارادہ کیا، مگر وہ اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا میں ہلاک کیا اور آخرت میں ان کے لیے شدید ترین عذاب رکھا۔ موسیٰ علیہ السلام اور ان کا دفاع کرنے والے مومن کی بھی اسی طرح مدد فرمائی، مگر اللہ تعالیٰ کی اپنے لوگوں کے ساتھ امداد مخفی ہوتی ہے۔ پہلے کئی طرح سے ان کی آزمائش ہوتی ہے، پھر انجام ان کے حق میں ہوتا ہے۔ اکثر لوگوں کی نظر چونکہ ظاہری اسباب پر ہوتی ہے اور وہ ایمانی فرست سے محروم ہوتے ہیں، اس لیے وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی مدد نہیں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے ان واقعات کے ذکر کے بعد جن میں ”اِنَّا“ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی نصرت کا بیان ہے، اب ”اِنَّا“ اور لام تاکید کے ساتھ اور اپنی عظمت کے اظہار کے لیے اپنا ذکر جمع متکلم کے صیغے کے ساتھ کرتے ہوئے نہایت زور دار الفاظ میں فرمایا: ﴿ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ کہ بے شک ہم اپنے رسولوں کی اور ان لوگوں کی جو ایمان لائے ضرور مدد کرتے ہیں، خواہ وہ کسی کی سمجھ میں آرہی ہو یا نہ، ہمارا قاعدہ یہی ہے۔

۲ ﴿ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ﴾ : یہاں ایک سوال ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ کئی رسول دنیا میں اپنی قوم پر غالب نہ آسکے، کئی انبیاء قتل ہوئے، ایمان والوں کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ پھر اتنی تاکید کے ساتھ یہ کہنے کا کیا مطلب ہے کہ ہم اپنے رسولوں کی اور ان لوگوں کی جو ایمان لائے ضرور مدد کرتے ہیں، دنیا کی زندگی میں اور اس دن بھی جب گواہ کھڑے ہوں گے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ دنیا کی زندگی میں رسولوں اور مومنوں کی مدد کئی صورتیں ہیں۔ سب سے بڑی مدد تو یہ ہے کہ وہ ہر قسم کے حالات میں

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظَّالِمِينَ مَعَذِرَتُهُمْ وَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَ لَهُمْ سُوءُ الدَّارِ ﴿۵۲﴾

جس دن ظالموں کو ان کا عذر کرنا کوئی فائدہ نہ دے گا اور انہی کے لیے لعنت ہے اور انہی کے لیے بدترین گھر ہے ﴿۵۲﴾

حق پر ثابت قدم رہتے ہیں، بڑے سے بڑے لالچ یا بڑی سے بڑی آزمائش، حتیٰ کہ شہادت کی صورت میں بھی ان کے قدم ایمان سے نہیں ڈگمگاتے۔ یہ استقامت اللہ تعالیٰ کی خاص نصرت کے بغیر کبھی حاصل نہیں ہو سکتی، جیسا کہ فرمایا: ﴿إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبَّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَفْأَمُوا سَتَزَلُّنَ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ إِلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ ﴿۵۱﴾ نَحْنُ أَوْلَىٰ بِكُمُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْآخِرَةِ ﴿﴾ [ختم السجدة: ۳۰، ۳۱] ”بے شک وہ لوگ جنہوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے، پھر خوب قائم رہے، ان پر فرشتے اترتے ہیں کہ نہ ڈرو اور نہ غم کرو اور اس جنت کے ساتھ خوش ہو جاؤ جس کا تم وعدہ دیے جاتے تھے۔ ہم تمہارے دوست ہیں دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں بھی۔“ اس نصرت کی ایک مثال اصحاب الاخذود ہیں۔ ایک صورت مدد کی یہ ہے کہ دلیل و برہان کے لحاظ سے وہ ہمیشہ اپنے دشمنوں پر غالب رہتے ہیں، جیسا کہ فرعون نے اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود دلیل کے میدان میں شکست کھائی، حتیٰ کہ وہ جادوگر جو مقابلے پر لائے گئے تھے، سجدے میں گر گئے اور ایمان لے آئے۔ ایک صورت مدد کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں ایسی ذہنی اور قلبی برتری عطا فرماتا ہے کہ ہر قسم کی قوت و شوکت اور ملک و سلطنت کے باوجود ان کی نظر میں کفار کی حیثیت گھاس کے ایک تھکے سے بھی کم ہوتی ہے۔ ایک صورت مدد کی یہ ہے کہ ان کے دشمنوں سے دنیا میں ان زیادتیوں کا بدلہ لیا جاتا ہے جو وہ رسولوں اور ایمان والوں پر کرتے رہے۔ (دیکھیے روم: ۴۷) پھر خواہ وہ بدلا رسول کی موجودگی میں لیا جائے، جیسا کہ قوم نوح اور عاد و ثمود کے ساتھ ہوا، خواہ رسول کے بعد لیا جائے، جیسا کہ بنی اسرائیل کے اپنے بعض رسولوں کو قتل کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنے سخت لڑائی والے بندے مسلط کر کے انہیں نہایت عبرت ناک سزا دی، جیسا کہ سورہ بنی اسرائیل کے شروع میں مذکور ہے، اور جن یہودیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو سولی دینے کا منصوبہ بنایا ان پر رومیوں کو مسلط کیا گیا، جنہوں نے انہیں ہر طریقے سے ذلیل و خوار کیا اور وہ دنیا میں ایسے منتشر ہوئے کہ آج تک کسی نہ کسی قوم کی پناہ کے بغیر کسی جگہ ان کا قیام مشکل ہے۔ (دیکھیے سورہ بنی اسرائیل: ۷۴) اور مدد کی ایک صورت یہ ہے کہ انہیں دنیا میں مادی لحاظ سے فتح و نصرت اور حکومت و سلطنت عطا کر دی جائے، جیسا کہ داؤد اور سلیمان علیہما السلام کی مدد ہوئی۔ ان صورتوں میں سے کسی نبی کو صرف ایک قسم کی مدد حاصل ہوئی، کسی کو دو قسم کی اور کسی کو زیادہ کی۔ ہمارے نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہر قسم کی مدد سے فیض یاب ہوئے۔

﴿۵۲﴾ وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ: ”الْأَشْهَادُ“ ”شَهِيدٌ“ کی جمع بھی ہو سکتی ہے، جیسے ”صَاحِبٌ“ کی جمع ”أَصْحَابٌ“ ہے اور ”شَهِيدٌ“ کی بھی، جیسے ”شَرِيْفٌ“ کی جمع ”أَشْرَافٌ“ ہے۔ یعنی اس دن بھی ہم اپنے رسولوں کی اور ان لوگوں کی مدد کریں گے جب گواہ کھڑے ہوں گے۔ مراد قیامت کا دن ہے جب انبیاء، فرشتے، اہل ایمان، زمین اور انسان کے اعضا آدمی کے حق میں یا اس کے خلاف گواہی دیں گے۔ اس دن اللہ تعالیٰ مومنوں کو جنت عطا فرما کر اور ان کے دشمنوں کو جہنم میں پھینک کر اپنے رسولوں اور ایمان والوں کی مدد فرمائے گا۔ (دیکھیے سورہ مطففين ۳۶ تا ۳۹)۔

آیت 52 ﴿۵۲﴾ وَيَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظَّالِمِينَ مَعَذِرَتُهُمْ: ”الظَّالِمِينَ“ سے مراد مشرک ہیں۔ (دیکھیے انعام: ۸۲) انہیں

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْهُدَىٰ وَأَوْحَيْنَا بِنَبِيِّ إِسْرَائِيلَ الْكِتَابَ ۗ هُدًى وَذِكْرَىٰ لِأُولِي الْأَلْبَابِ ﴿۵۳﴾

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے موسیٰ کو ہدایت دی اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب کا وارث بنایا ﴿۵۳﴾ جو عقلموں والوں کے لیے ہدایت اور نصیحت تھی ﴿۵۳﴾

ان کی معذرت اس لیے فائدہ نہیں دے گی کہ ان کے پاس کوئی صحیح عذر ہو گا ہی نہیں۔ رسولوں کے پیغام پہنچانے کی وجہ سے لاعلمی کا عذر وہ کر نہیں سکیں گے۔ اس دن ان کے پاس عذر یا تو صریح جھوٹ ہو گا کہ وہ کہیں گے: ﴿وَاللّٰهُ مَرِيئًا مَا كُنَّا مَشْرِكِيْنَ﴾ [الانعام: ۲۳] "اللہ کی قسم جو بہار رب ہے! ہم مشرک نہیں تھے۔" یا تقدیر کا عذر کر کے اپنے آپ کو بے قصور ثابت کرنے کی کوشش کریں گے، جیسا کہ سورہ مومنوں میں ان کا قول ہے: ﴿رَبَّنَا عَلَّمْنَا شَقْوَىٰئُنَا﴾ [المومنوں: ۱۰۶] "اے ہمارے رب! ہم پر بھاری بدبختی غالب آگئی۔" ظاہر ہے ان میں سے کوئی عذر اس قابل ہی نہیں کہ سنا جائے، فائدہ پہنچانا تو بہت دور کی بات ہے۔

﴿۵۳﴾ وَلَقَدْ آتَيْنَا سُلَيْمَانَ سُلَيْمَانَ الْمَلِكِ وَنَهْنَهُمْ سُلَيْمَانَ الْمَلِكِ: "لَقَدْ" کو پہلے لانے سے حصر کا مقبوض پیدا ہو رہا ہے، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے: "اور انھی کے لیے لعنت ہے اور انھی کے لیے بدترین گھر ہے۔" یہ اللہ تعالیٰ کی نصرت کا نتیجہ ہے کہ اللہ کے رسول اور ایمان والے اس دن لعنت اور بدترین گھر دونوں سے محفوظ رہیں گے۔

آیت 53 ﴿۱﴾ وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْهُدَىٰ: اس آیت میں اس نصرت کا بیان ہے جس کا ذکر پچھلی آیت "إِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا" میں ہوا۔ واو کے ساتھ عطف اس بات پر ہے جس کا ذکر پچھلے آیتوں میں ہوا اور جو یہاں مقدر ہے کہ "ہم نے موسیٰ اور ایمان والوں کی مدد فرمائی اور اس کے لشکروں کو غرق کر کے انھیں نجات دینے کے ساتھ کی" اور یقیناً ہم نے موسیٰ کو ہدایت عطا فرمائی۔ اس ہدایت میں نبوت، معجزات، تورات اور ہر مشکل میں رہنمائی سب شامل ہیں۔

﴿۲﴾ وَأَوْحَيْنَا بِنَبِيِّ إِسْرَائِيلَ الْكِتَابَ: نبوت تو موسیٰ علیہ السلام کو ملی اور وہ صرف نبی ہی کو ملتی ہے، البتہ اس کی کتاب اور اس کے علوم کی وارث اس کی امت بنتی ہے، جیسا کہ ابودرداء رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ فرماتے تھے: ﴿إِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرِثَةُ الْأَنْبِيَاءِ، وَإِنَّ الْأَنْبِيَاءَ لَمْ يُوْرَثُوا دِينًا زَا وَلَا دِرْهَمًا، وَرِثُوا الْعِلْمَ، فَمَنْ أَخَذَهُ أَخَذَ بِحِطِّ وَافِرٍ﴾ [ابودرداء، شعبہ، باب فی فضل العلم: ۳۶۴۱] "علماء ہی انبیاء کے وارث ہیں اور انبیاء نے کسی کو دینار اور درہم کا وارث نہیں بنایا، انھوں نے صرف علم کا وارث بنایا۔ تو جس نے اسے حاصل کر لیا، اس نے بہت زیادہ حصہ حاصل کر لیا۔" اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو منے والی کتاب تورات کا وارث بنی اسرائیل کو بنایا، وہ نسلًا بعد نسل اسے پڑھتے پڑھاتے اور اس پر عمل کرتے رہے۔

آیت 54 ﴿۱﴾ هُدًى وَذِكْرَىٰ: "هُدًى" اور "ذِكْرَىٰ" دونوں مصدر بمعنی اسم فاعل برائے مبالغہ ہیں، یعنی ایسی

ہدایت دینے والی اور نصیحت کرنے والی کہ اس کا وجود ہی سراسر ہدایت اور نصیحت تھی۔ "ذِكْرَىٰ" کا معنی نصیحت بھی ہے اور

قَاضِيًا إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ ﴿۵۵﴾

پس صبر کر، یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے اور اپنے گناہ کے لیے بخشش مانگ اور دن کے پچھلے اور پہلے پہر اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کر ﴿۵۵﴾

یاد دہانی بھی، یعنی وہ کتاب انہیں پیش آنے والے معاملات میں رہنمائی بھی کرتی تھی اور بھولی ہوئی چیزیں مثلاً موت، قبر، آخرت اور جنت و جہنم وغیرہ یاد دلا کر نصیحت بھی کرتی تھی۔ دوسری جگہ تورات کے متعلق فرمایا: ﴿إِنَّا أَنْزَلْنَا التَّوْرَةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ الَّذِينَ آسَلُوا لِلَّذِينَ هَادُوا وَالرَّبَّيِّنُونَ وَالْأَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِنْ كِتَابِ اللَّهِ وَكَانُوا عَلَيْهِ شُهَدَاءً﴾ | السائدة: ۴۴ | ”بے شک ہم نے تورات اتاری، جس میں ہدایت اور روشنی تھی، اس کے مطابق فیصلہ کرتے تھے انبیاء جو فرماں بردار تھے، ان لوگوں کے لیے جو یہودی بنے اور رب والے اور علماء، اس لیے کہ وہ اللہ کی کتاب کے محافظ بنائے گئے تھے اور وہ اس پر گواہ تھے۔“

﴿۱﴾ لِأُولِي الْأَلْبَابِ: ”الْأَلْبَابِ“ ”لُبِّ“ کی جمع ہے، عقل۔ یعنی اس کتاب سے ہدایت اور نصیحت صرف عقلوں والوں کو حاصل ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں ہر جگہ ”الْأَلْبَابِ“ کا لفظ جمع ہی آیا ہے۔ یعنی اللہ کی کتاب میں ان لوگوں کے لیے ہدایت اور نصیحت نہیں جو عقل نہیں رکھتے، یا جو صرف دنیا کے ظاہری معاملات کی عقل رکھتے ہیں، جیسا کہ کفار کے متعلق فرمایا: ﴿وَلَكِنْ أَكْثَرُ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ﴾ ﴿يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ غٰفِلُونَ﴾ | الروم: ۶، ۷ | ”اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ وہ دنیا کی زندگی کے کچھ ظاہر کو جانتے ہیں اور وہ آخرت سے، وہی غافل ہیں۔“ بلکہ اس میں ان کے لیے ہدایت و نصیحت ہے جو ہر قسم کی عقل رکھتے ہیں، دنیا کے ظاہری اور حقیقی معاملات کی بھی اور آخرت کی بھی۔ میں نے ہر جگہ قرآن کے الفاظ کے مطابق ”أُولُو الْأَلْبَابِ“ کا ترجمہ ”عقلوں والے“ کیا ہے، جب کہ عام طور پر اس کا ترجمہ ”عقل والے“ کیا جاتا ہے۔ یقیناً قرآن مجید کے الفاظ پر غور کرنے سے عجیب اسرار کھلتے ہیں۔

آیت 55 ﴿۱﴾ قَاضِيًا إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ: موسیٰ علیہ السلام کو فرعون اور آل فرعون کی طرف سے جو ایذا میں پہنچیں، جن پر انہوں نے صبر کیا اور اس کے انعام کے طور پر اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی تائید و نصرت سے نوازا، اس کے ذکر کے بعد اب ہمارے نبی کریم ﷺ کو اور آپ ﷺ کے واسطے سے امت کے ہر آدمی کو تلقین کی جا رہی ہے کہ وہ دعوت حق میں پیش آنے والی مشکلات اور کفار کی طرف سے ملنے والی ایذاؤں پر صبر کریں، یقیناً اللہ تعالیٰ کا مدد کا وعدہ حق ہے، اس لیے بے صبری یا جلد بازی مت کریں، جیسا کہ فرمایا: ﴿قَاضِيًا كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعُرْوَةِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَهُمْ﴾ [الأحقاف: ۳۵] ”پس صبر کر جس طرح پختہ ارادے والے رسولوں نے صبر کیا اور ان کے لیے جلدی کا مطالبہ نہ کر۔“

﴿۲﴾ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ: اس میں آپ ﷺ کو اور امت کے ہر فرد کو استغفار کا حکم ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ فرماتے تھے: ﴿وَاللَّهِ! إِنِّي لَأَسْتَغْفِرُ اللَّهَ وَأَتُوبُ إِلَيْهِ فِي الْيَوْمِ أَكْثَرَ مِنْ سَبْعِينَ مَرَّةً﴾ | بخاری، الدعوات، باب استغفار النبي ﷺ في اليوم والليلة: ۶۳۰۷ | ”اللہ کی قسم! میں ہر روز ستر (۷۰) سے زیادہ

إِنَّ الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ اللَّهِ بِغَيْرِ سُلْطَانٍ أَتَمُّهُمْ إِنْ فِي صُدُورِهِمْ إِلَّا كِبْرٌ مَّا

بے شک وہ لوگ جو اللہ کی آیات میں کسی دلیل کے بغیر جھگڑتے ہیں جو ان کے پاس آئی ہو، ان کے سینوں

مرتبہ اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتا ہوں اور اس کی طرف توبہ کرتا ہوں۔“

یہاں ایک سوال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو رسول اللہ ﷺ کے پہلے اور پچھلے گناہ معاف فرما دیے تھے، جیسا کہ سورہ فتح (۲) میں ہے، پھر استغفار کا حکم کیوں دیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ سورہ مومن کی سورت ہے، جو اس بشارت سے پہلے کی ہے، اس لیے اس پر یہ سوال وارد ہی نہیں ہوتا، جب کہ سورہ فتح ۶ ہجری میں اتری۔ البتہ سورہ نصر میں مذکور آیت (۳): ﴿فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْ لَهُ﴾ پر یہ سوال وارد ہوتا ہے، کیونکہ یہ سورت فتح مکہ کے بعد نبی ﷺ کی وفات کے قریب اتری۔ ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: «كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُكْثِرُ أَنْ يَقُولَ فِي رُكُوعِهِ وَسُجُودِهِ سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ رَبَّنَا وَبِحَمْدِكَ، اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِي، يَا تَأْوِيلُ الْقُرْآنِ» [بخاری، الأذان، باب التسيب والدعاء في السجود: ۸۱۷] ”رسول اللہ ﷺ اپنے رکوع اور سجود میں کثرت سے کہا کرتے تھے: ”سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ رَبَّنَا وَبِحَمْدِكَ، اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِي“ ”اے اللہ! اے ہمارے پروردگار! تو (ہر عیب سے) پاک ہے اور اپنی تعریف کے ساتھ، اے اللہ! مجھے بخش دے“ آپ قرآن کے حکم پر عمل کرتے تھے۔“ جواب اس کا یہ ہے کہ ہر آدمی کا گناہ اس کے مرتبہ کو پیش نظر رکھ کر ہوتا ہے، سید الانبیاء ﷺ معمولی سی غفلت کے لیے بھی استغفار ضروری سمجھتے تھے۔ انحرافی بیانیہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّهُ لَيَغَانُ عَلَى قَلْبِي وَإِنِّي لَأَسْتَغْفِرُ اللَّهَ فِي الْيَوْمِ مِائَةَ مَرَّةٍ» [مسلم، الذكر والدعاء، باب استحباب الاستغفار والاستكثار منه: ۲۷۰۲] ”میرے دل پر ہلکا سا پردہ آجاتا ہے اور میں دن میں سو مرتبہ اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتا ہوں۔“ شاہ عبد القادر لکھتے ہیں: ”حضرت رسول خدا (ﷺ) دن میں سو سو بار گناہ سے استغفار کرتے تھے۔ ہر بندے سے تقصیر ہوتی ہے، اس کے موافق ہر کسی کو استغفار ضروری ہے۔“ (موضح)

③ بعض حضرات کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں جہاں بھی رسول اللہ ﷺ کو اپنے گناہوں سے استغفار کا حکم ہے، اس سے مراد امت کے گناہوں کے لیے استغفار ہے، مگر یہ بات درست نہیں، کیونکہ سورہ محمد (ﷺ) میں یہ تاویل ممکن نہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَاعْلَمْ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَمَثْوَلَكُمْ﴾ [محمد: ۱۹] ”بس جان لے کہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اپنے گناہ کی معافی مانگ اور مومن مردوں اور مومن عورتوں کے لیے بھی اور اللہ تعالیٰ تمہارے چلنے پھرنے اور تمہارے ٹھہرنے کو جانتا ہے۔“

④ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْجَارِ: اللہ تعالیٰ کی مدد کے وعدے کا حق دار بننے کے لیے صبر اور استغفار کے ساتھ ساتھ صبح و شام رب تعالیٰ کی تسبیح و تحمید کرتے رہنے کا حکم دیا۔ اس میں ہر وقت اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا بھی شامل ہے اور نماز بھی، کیونکہ صبر اور نماز ہی اللہ تعالیٰ سے استعانت کا ذریعہ ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ﴾ [البقرة: ۴۵] ”اور صبر اور نماز کے ساتھ مدد طلب کرو۔“ تسبیح و تحمید سے مراد نماز ہونے کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ طہ (۱۳۰) کی تفسیر۔

آیت 56 ﴿إِنَّ الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ اللَّهِ.....﴾ اس میں رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کو تسلی دی ہے کہ جو لوگ

هُم بِبَالِغِيهِ ۱۰ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ۱۱ لَخَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ
أَكْبَرَ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۱۲

میں ایک بڑائی کے سوا کچھ نہیں، جس تک وہ ہرگز پہنچنے والے نہیں ہیں، سو اللہ کی پناہ مانگ۔ بے شک وہی سب کچھ
سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے ۱۰ یقیناً آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا لوگوں کے پیدا کرنے سے زیادہ بڑا (کام)
ہے اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ۱۲

اللہ تعالیٰ کی آیات کو ٹھکرانے کے لیے جھگڑتے اور کج بحثی کرتے ہیں اس کا سبب یہ نہیں کہ ان آیات کو سمجھنا کچھ مشکل ہے، یا
ان کے مضامین (توحید، قیامت اور رسالت وغیرہ) کے لیے بیان کردہ دلائل کم یا کمزور ہیں، بلکہ اس کا باعث ان لوگوں کا
اپنے آپ کو بڑا سمجھنا اور اپنے مقام سے بہت اونچا بننے کی خواہش و کوشش ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکنے کے لیے تیار نہیں
اور نہ ہی رسول پر ایمان لاکر اس کے تابع فرمان ہونا انھیں گوارا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی جھوٹی بڑائی برقرار رکھنے کے لیے رسول کو
جھٹلاتے ہیں، حق کا انکار کرتے ہیں، مسلمانوں کو فخارت سے دیکھتے ہیں اور انھیں نیچا دکھانے کے لیے ہر ذلیل سے ذلیل حربہ
اختیار کرتے ہیں۔

۱۰ مَا هُمْ بِبَالِغِيهِ: ”باء“ کے ساتھ ”مَا“ نافیہ کی تاکید ہو رہی ہے، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے ”جس تک وہ ہرگز پہنچنے
والے نہیں۔“ یعنی ان جھوٹے اور حقیر لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول کے مقابلے میں اپنے لیے جو بڑائی سوچ رکھی ہے وہ
انھیں ہرگز میسر نہیں ہو سکے گی اور نہ ہی وہ کسی صورت اس مقام تک پہنچنے والے ہیں۔

۱۱ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ: یعنی جس طرح موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کی طرف سے قتل کی دھمکی پر ہر منکر سے رب تعالیٰ کی پناہ مانگی، جو
یوم حساب پر ایمان نہ رکھتا ہو، اسی طرح آپ بھی ایسے تمام منکروں اور ان کی ظاہری مخالفت اور پوشیدہ سازشوں سے اللہ تعالیٰ
کی پناہ مانگیں۔

۱۲ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ: وہی ہے جو ہر بلند اور آہستہ بات کو سنتا اور ہر ظاہر اور پوشیدہ کو دیکھتا ہے۔ وہی آپ کو ہر قسم
کے نقصان سے بچا سکتا ہے اور بچائے گا۔

آیت 57 لَخَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ أَكْبَرَ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ.....: یہاں سے ان بنیادی عقائد کو ایک بار پھر دلائل
سے ثابت کیا جا رہا ہے جن کا انکار کرتے اور اس مقصد کے لیے کج بحثی اور جھگڑا کرتے تھے۔ کفارِ قریش اور ان کے
ہم خیال لوگ قیامت کا انکار کرتے ہوئے کہتے تھے کہ جب ہم مرکز ملی ہو گئے تو کیسے ہو سکتا ہے کہ دوبارہ زندہ ہوں۔ ان کے
مطابق یہ ممکن ہی نہیں اور عقل کسی صورت اسے تسلیم نہیں کرتی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، یقیناً آسمانوں اور زمین کو کسی نمونے اور
پہلے سے موجود کسی مادے کے بغیر پیدا کرنا انسانوں کو پہلی دفعہ پیدا کرنے سے یاد دہرا پیدا کرنے سے بہت ہی بڑا کام ہے۔
تو جس نے اتنے بلند اور وسیع و عریض آسمانوں کو ان میں موجود بے شمار مخلوقات، لامحدود کھلشائوں اور سیاروں سمیت پیدا کر دیا

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَلَا النُّسُقَاءُ ۗ قَلِيلًا
مَا تَتَذَكَّرُونَ ﴿۵۸﴾

اور نہ اندھا اور دیکھنے والا برابر ہوتا ہے اور نہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے اور نہ وہ جو برائی کرنے والا ہے، بہت کم تم نصیحت حاصل کرتے ہو ﴿۵۸﴾

ہے اور اتنی بڑی زمین اور اس میں موجود بے شمار مخلوق پیدا کر دی ہے، اس کے لیے انسانوں کو دوبارہ زندہ کر دینا کیا مشکل ہے۔ ظاہر ہے بڑی چیز بنانے والے کے لیے چھوٹی چیز بنانا بالکل آسان ہے، مگر اکثر لوگ اتنی واضح اور آسان بات کو بھی نہیں جانتے اور یہی کہے جاتے ہیں کہ مٹی ہو کر ہم کیسے زندہ ہو سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کی پیدائش کو انسان کی دوبارہ پیدائش کی دلیل کے طور پر متعدد مقامات پر ذکر فرمایا ہے۔ دیکھیے سورہ لیس (۸۱)، صافات (۱۱)، نبی اسرائیل (۹۹)، انعام (۳۳) اور نازعات (۲۷ تا ۳۳)۔

آیت 58 ﴿۱﴾ وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ : یہ بھی قیامت کی دلیل ہے۔ سب جانتے ہیں کہ اندھا اور بینا برابر نہیں، اسی طرح وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے صالح عمل کیے اور جنہوں نے کفر کیا اور برے عمل کیے، دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ تو اگر قیامت کا انکار کیا جائے اور اس دن پر ایمان نہ رکھا جائے جس میں سب لوگ دوبارہ زندہ ہو کر اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہوں گے اور ہر نیک و بد کو اس کی جزایا سزا ملے گی، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ بینا و نابینا ایک ہیں اور نیک و بد برابر ہیں۔ بلکہ ایک حساب سے برے اعمال کرنے والا زندہ فائدے میں ہے کہ وہ ساری عمر من مانی بھی کرتا رہا، دل میں آنے والی ہر بری خواہش بھی پوری کرتا رہا، اس کے باوجود کسی نے نہ اسے پوچھنا پوچھے گا کہ تم نے یہ ظلم و تعدی کیوں اختیار کیے رکھی۔ ظاہر ہے ایسا نہیں ہو سکتا، عقل سلیم اس کا انکار کرتی ہے۔ اس لیے لازم ہے کہ قیامت قائم ہو اور بینا و نابینا برابر نہ ہوں اور نہ ہی نیک و بد یکساں ہوں۔

﴿۲﴾ یہاں ایک سوال ہے کہ ”وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ“ جمع ہے، جب کہ اس کا مقابل ”وَالَّذِينَ آمَنُوا“ واحد ہے، اس میں کیا حکمت ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ یہ قرآن مجید کے بیان کا حسن ہے کہ ایک لمبی بات کو مختصر الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے۔ اس کے لیے ایک جانب کے الفاظ ذکر کیے گئے ہیں اور ان کے مقابلہ حذف کر دیے گئے ہیں۔ اسے بلاغت کی اصطلاح میں احتجاک کہتے ہیں۔ گویا پوری عبارت یہ تھی: ”وَمَا يَسْتَوِي الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَعَمِلُوا الْقَبَائِحَ وَلَا الْمُسْبِيءُ وَالْمُحْسِنُ“ یعنی وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے صالح عمل کیے اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور قبیح عمل کیے، وہ برابر نہیں اور نہ ہی برائی کرنے والا اور نیکی کرنے والا برابر ہیں۔ (مہاشی، کچھ تفصیل کے ساتھ)

﴿۳﴾ قَلِيلًا مَا تَتَذَكَّرُونَ: منکرین قیامت کو فرمایا، تم بہت ہی کم نصیحت حاصل کرتے ہو، حالانکہ قیامت کے دلائل بالکل واضح ہیں۔

إِنَّ السَّاعَةَ لَأْتِيَةٌ لَا رَيْبَ فِيهَا وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿۵۹﴾ وَقَالَ رَبُّكُمْ

بے شک قیامت ضرور آنے والی ہے، اس میں کوئی شک نہیں اور لیکن اکثر لوگ نہیں مانتے ﴿۵۹﴾ اور تمہارے رب نے

آیت 59 ﴿۱﴾ إِنَّ السَّاعَةَ لَأْتِيَةٌ لَا رَيْبَ فِيهَا: وہ بات جو اس سے پہلے دو آیات میں دلیلوں کے ساتھ بیان فرمائی، اب نہایت صریح الفاظ میں "إِنَّ" اور "لَا رَيْبَ" کی تاکید کے ساتھ بیان فرمائی۔ ان دونوں لفظوں کا اکٹھا آنا اہل عرب کے ہاں تاکید کی قوت میں قسم کے برابر ہے۔ پچھلی آیات میں قیامت کے حق ہونے کی دلیلیں ذکر فرمائیں، اب کائنات کے خالق و مالک نے قسم کھا کر فرمایا کہ قیامت آنے والی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قسم کھا کر یہ بات کہنا بجائے خود دلیل ہے اور سب سے بڑی دلیل ہے۔

﴿۲﴾ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ: اور لیکن اکثر لوگ اتنی واضح اور سچی بات ماننے کے لیے تیار نہیں، کیونکہ اسے ماننے کے بعد انہیں اپنی سرکش خواہشوں اور لذتوں کو ترک کرنا پڑتا ہے، جس کے لیے وہ تیار نہیں ہیں۔ مزید دیکھیے سورہ قیامت (۵)۔

آیت 60 ﴿۱﴾ وَقَالَ رَبُّكُمْ اذْعُوْنِي اَنْتُمْ جِبْتٌ لَكُمْ : آخرت کی یاد دہانی کے ساتھ ہی توحید کی تاکید فرمائی، جو رسول اللہ ﷺ اور کفار کے درمیان جھگڑے کی سب سے بڑی وجہ تھی۔ آیت کے آخر میں جہنم کے ذکر کی صورت میں آخرت کا تذکرہ بھی فرمادیا۔

﴿۲﴾ "دعا" کا واحد حق وار ہونے کی دلیل کے طور پر اپنا تعارف "رَبُّكُمْ" (تمہارا رب) کے لفظ کے ساتھ کروایا کہ "اذْعُوْنِي" (مجھے پکارو) کا حکم تمہیں وہ دے رہا ہے جو ہر لمحے کسی کی شرکت کے بغیر تمہاری پرورش کر رہا ہے اور تمہاری ہر ضرورت پوری کر رہا ہے۔

﴿۳﴾ تمہارے رب نے فرمایا، تم مجھے پکارو، مجھ سے مانگو، میں تمہاری دعا قبول کروں گا، میں تمہیں دوں گا۔ نہ مجھ سے بدگمان ہو، نہ کسی اور کو پکارتے یا اس سے مانگتے پھر، یہ سمجھ کر کہ وہ تمہیں کچھ دے گا، یا تمہاری درخواستیں میرے دربار سے منظور کروادے گا۔

﴿۴﴾ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مطلقاً دعا قبول کرنے کا وعدہ فرمایا ہے، مگر دوسری جگہ قبولیت کے وعدے کے ساتھ کچھ شرطیں بھی ذکر فرمائیں، فرمایا: ﴿وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۖ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ۗ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ﴾ [الأنفحة: ۱۸۶] "اور جب میرے بندے تجھ سے میرے بارے میں سوال کریں تو بے شک میں قریب ہوں، میں پکارنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے، تو لازم ہے کہ وہ میری بات مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں، تاکہ وہ ہدایت پائیں۔" اور رسول اللہ ﷺ نے وضاحت فرمائی کہ دعا تین صورتوں میں سے کسی ایک صورت میں ضرور قبول ہوتی ہے، یا تو اللہ تعالیٰ اس کی دعا جلد قبول کر لیتا ہے، یا آخرت میں اس کا ذخیرہ کر لیتا ہے، یا اس سے اتنی برائی نال دیتا ہے۔ [دیکھیے مسند احمد: ۱۸۷۳، ج: ۱، ص: ۱۱۳۹، صحیح] دعا کی قبولیت کی شرطوں اور صورتوں کی

ادْعُوْنِيْ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ۗ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ ذٰلِخِيْنَ ۝۱۵

فرمایا مجھے پکارو، میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔ بے شک وہ لوگ جو میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں عنقریب ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے ۱۵

تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ بقرہ (۱۸۶) کی تفسیر۔

۱۵ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ : یہ جملہ دلیل ہے کہ دعا ہی عبادت اور پکارنا ہی بندگی ہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کو پکارتا ہے، اس سے مانگتا ہے اور اس سے فریاد کرتا ہے وہ اس کی عبادت کرتا ہے اور جو مافوق الاسباب اشیاء کے لیے اس کے سوا کسی اور کو پکارتا ہے، یعنی ”یا علی مدد“ کہتا ہے، ”یا شَيْخُ عَبْدَ الْقَادِرِ جَبَلَانِيْ شَيْئًا لِلّٰهِ“ کہتا ہے، بہاؤ الحق یا کسی خود ساختہ داتا، دستگیر، گنج بخش یا غریب نواز کو پکارتا ہے اور ذہنی کشتی کو کنارے لگانے کی درخواست کرتا ہے، درحقیقت وہ اس کی عبادت کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کے جرم کا ارتکاب کرتا ہے، جو اس کے ہاں ناقابل معافی ہے۔ یہ کہنا کہ ہم ان بزرگ ہستیوں کو صرف پکارتے ہیں، ان کی عبادت نہیں کرتے، سراسر دھوکا ہے، جو مشرک اپنے آپ کو اور اللہ کے بندوں کو دے رہے ہیں، کیونکہ پکارنا ہی تو عبادت ہے۔ نعمان بن بشیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: ﴿ وَقَالَ رَبُّكُمْ ادْعُوْنِيْ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ﴾ کے متعلق نبی ﷺ سے روایت کی کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿ اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ ﴾ ”پکارنا ہی بندگی ہے۔“ اور آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ وَقَالَ رَبُّكُمْ ادْعُوْنِيْ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ۗ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ ذٰلِخِيْنَ ﴾ [ترمذی، تفسیر القرآن، باب ومن سورة البقرة: ۲۹۶۹، وقال الألبانی صحیح]

۱۶ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ : اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنی آیات کے منکروں کے جھگڑے اور کج بحثی کا سبب بیان فرمایا تھا کہ وہ محض ان کے دلوں کا کبر اور جھوٹی بڑائی ہے جو انہیں کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اب فرمایا کہ جو لوگ اس کبر میں مبتلا ہیں، میری آیات اور میرے رسولوں پر ایمان نہیں لاتے اور مجھ سے دعا نہیں کرتے وہ ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔ دنیا میں وہ جس قدر اونچے بنتے تھے قیامت کے دن اتنے ہی ذلیل و حقیر ہوں گے۔ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں: ”بندگی کی شرط ہے اپنے رب سے مانگنا، نہ مانگنا غرور ہے۔ اگر دنیا نہ مانگے تو مغفرت ہی مانگے۔“ (موضح)

عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ﴿ يُحَسِّرُ الْمُتَكَبِّرُونَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ امْتَالِ الدَّرْفِيْ صَوْرِ الرِّجَالِ يَغْشَاهُمْ الدُّلُّ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ فَيَسَافُونَ اِلَى سِجْنٍ فِيْ جَهَنَّمَ يُسْمَى بُوْلَسَ تَعْلُوْهُمْ نَارُ الْاَنْبِيَارِ يُسْقَوْنَ مِنْ غُصَاوَةِ اَهْلِ النَّارِ طِيْنَةَ الْحَبَالِ ﴾ [ترمذی، صفة القيامة والرفائق، باب ما جاء في شدة الوعيد للمتكبرين: ۲۴۹۲، وقال الألبانی حسن] ”تکبر کرنے والوں کو قیامت کے دن چیونٹیوں کی طرح آدمیوں کی شکل میں اٹھایا جائے گا، ہر طرف سے ذلت انہیں ڈھانک رہی ہوگی، پھر انہیں جہنم میں ایک قید خانے کی طرف ہانک کر لے جایا جائے گا، جس کا نام ”بؤلس“ ہے۔ ان پر آگوں کی آگ چڑھ رہی ہوگی، انہیں جہنمیوں کے جسموں سے نکلنے والا ہوا اور پیپ پلائی جائے گی۔“

اللَّهُ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا إِنَّ اللَّهَ لَدُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ﴿۶۱﴾

اللہ وہ ہے جس نے تمہارے لیے رات بنائی، تاکہ تم اس میں آرام کرو اور دن کو روشن (بنایا)۔ بے شک اللہ یقیناً لوگوں پر بڑے فضل والا ہے اور لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے ﴿۶۱﴾

اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب ہے کہ اس سے مانگا جائے، ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّهُ مَنْ لَمْ يَسْأَلِ اللَّهَ يَغْضَبْ عَلَيْهِ» [ترمذی، الدعوات، باب منہ: ۳۲۷۲، وحسنہ الألبانی] ”جو اللہ تعالیٰ سے نہ مانگے اللہ تعالیٰ اس پر غصے ہو جاتا ہے۔“ کیا خوب کہا ہے کہنے والے نے ۔

اللَّهُ يَغْضَبُ إِنْ تَرَكْتَ سُؤَالَهُ وَ تَرَى ابْنَ آدَمَ حِينِ يُسْأَلُ يَغْضَبُ
”اللہ تعالیٰ غصے ہوتا ہے اگر تو اس سے مانگنا چھوڑ دے اور تو ابن آدم کو دیکھے گا کہ جب اس سے مانگا جائے غصے ہوتا ہے۔“

آیت 61 ﴿۱﴾ اللَّهُ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ: ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا بیان کرتے ہوئے توحید اور آخرت دونوں مضامین ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

﴿۲﴾ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا: اس جملے میں احتیاج ہے، یعنی دو جملوں کا ایک ایک حصہ دوسرے جملے کے قرینے کی وجہ سے حذف کر دیا ہے، جو کلام کے کمال جامعیت اور بلاغت کا آئینہ دار ہے۔ مفصل عبارت یوں تھی: ”اللَّهُ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ اللَّيْلَ مُظْلِمًا لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا لِتَعْمَلُوا فِيهِ“ یعنی ”اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے رات کو تاریک بنا دیا، تاکہ تم اس میں آرام کرو اور دن کو روشن بنایا، تاکہ تم اس میں کام کرو۔“ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یہ نعمت متعدد مقامات پر مختلف طریقوں سے یاد کروائی ہے۔ دیکھیے سورہ یونس (۶۷)، فرقان (۳۷)، بنی اسرائیل (۱۲)، قصص (۷۱ تا ۷۳) اور لقمان (۲۹)۔

﴿۳﴾ إِنَّ اللَّهَ لَدُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ: ”لَدُو فَضْلٍ“ پر تنوین تعظیم کے لیے ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو جو کچھ عطا فرمایا ہے (زمین و آسمان، رات دن، سورج، چاند اور خود ان کا وجود وغیرہ) وہ ان کا اللہ پر کوئی حق یا قرض نہیں بلکہ محض اس کا فضل ہے اور فضل بھی بہت بڑا کہ اس نے انہیں ضرورت کی ہر چیز بخشی، فرمایا: ﴿وَأَشْكُرْ فَبِئْسَ مَا سَأَلْتَهُمْ ۗ وَإِنْ تَعَدَّوْا نِعْمَتَ اللَّهِ لَا تَحْصُوهَا﴾ [ابراہیم: ۳۴] ”اور تمہیں ہر اس چیز میں سے دیا جو تم نے اس سے مانگی اور اگر تم اللہ کی نعمت شمار کرو تو اسے شمار نہ کر پاؤ گے۔“ پھر انہیں عقل و تمیز عطا فرما کر مہلت بخشی اور نافرمانیوں کے باوجود فوراً گرفت نہیں فرمائی۔ مومن و کافر سب کو نعمتوں سے نوازتا ہے۔ یہ سب اس اکیلے کی پیدا کردہ اور عطا کردہ نعمتیں ہیں۔

﴿۴﴾ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ: جب اس اکیلے نے رات دن کا یہ سلسلہ قائم کیا ہے اور یہ تمام نعمتیں عطا فرمائی ہیں، کسی اور کا ان میں ذرہ برابر دخل نہیں، تو حق تو یہ تھا کہ اس کا شکر ادا کرتے، صرف اسی کو اپنا رب مانتے، اسی سے دعا

ذَلِكُمْ اللَّهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۗ مَلَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۗ قَالَتِي تُوَفَّقُونَ ﴿۳۶﴾

یہی ہے اللہ تمہارا رب، ہر چیز کا پیدا کرنے والا، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، پھر تم کہاں بہکائے جاتے ہو ﴿۳۶﴾

کرتے اور اس کی آیات اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے، مگر ایسے لوگ بہت کم نکلے۔ اکثر لوگ ان نعمتوں کی قدر نہیں کرتے، بلکہ مالک کے ساتھ شریک بنا کر اس کی ناشکری اور غداری کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اسی طرح ہر روز انہیں نیند اور بیداری کی صورت میں موت کے بعد زندگی کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ حق یہ تھا کہ اس روزانہ کے موت و حیات کے مشاہدے کے بعد قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے تمام مخلوق کو زندہ کرنے کی قدرت پر ایمان رکھتے اور اس دن کے لیے تیاری کرتے، مگر انھوں نے اللہ کی نعمتوں کا شکر نہیں کیا، بلکہ ناشکری کی اور قیامت کے انکار پر جے رہے۔

آیت 62 ① ذَلِكُمْ اللَّهُ: ”ذَلِكُمْ“ اسم اشارہ بعید کے لیے استعمال ہوتا ہے، مگر یہاں قریب کے لیے استعمال ہوا ہے۔ قریب کے لیے اسم اشارہ بعید لا کر اس ذات کی عظمت و بلندی اور اس کے انسانی سوچ سے بے حساب بالاتر ہونے کا اظہار مقصود ہے، اور ”ذَلِكْ“ کے بجائے ”ذَلِكُمْ“ کے استعمال کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ یوسف کی آیت (۳۲): ﴿كَانَتْ فَذَلِكُنَّ الَّذِي لُمْتُنَّنِي فِيهِ﴾ کی تفسیر۔

② خبر معرفہ ہو تو کلام میں حصر پیدا ہوتا ہے، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے ”یہی ہے اللہ تمہارا رب۔“ یہاں ”ذَلِكُمْ“ مبتدا ہے، جس کے بعد چار خبریں ہیں، یعنی وہ جس کے متعلق تم نے ابھی سنا کہ وہ آسمان و زمین کو پیدا کرنے والا ہے، جو رات کو سکون کے لیے تاریک اور دن کو حرکت و عمل کے لیے روشن بنانے والا ہے، اسی کا نام اللہ ہے (جس میں تمام صفات کمال جمع ہیں)، کوئی اور اللہ ہونے کا دعوے دار ہے تو لاؤ۔ زمین و آسمان اور لیل و نہار کو پیدا کرنے اور چلانے والے کے سوا کوئی نہیں کہہ سکے گا کہ میں اللہ ہوں۔

③ رَبُّكُمْ: یہی تمہارا رب ہے، تمہاری پرورش کرنے والا اور تمہیں ضرورت کی ہر چیز مہیا کرنے والا۔ اس کے علاوہ اور کوئی تمہارا رب نہیں۔

④ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ: زمین و آسمان اور دن رات ہی کا نہیں بلکہ وہ ہر چیز کا خالق ہے، اس کے سوا کسی نے ایک ذرہ بھی پیدا نہیں کیا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ حج (۷۳، ۷۴)۔

⑤ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ: یہ چوتھی خبر ہے جو پہلے سارے کلام کا خلاصہ ہے کہ (یہ جو رات کو سکون والا اور دن کو روشن بنانے والا ہے) ① یہی اللہ (تمام صفات کمال کا جامع) ہے۔ ② یہی رب ہے۔ ③ یہی ہر چیز کا خالق ہے۔ ④ اور اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔

⑥ قَالَتِي تُوَفَّقُونَ: ”اُنَّی“ اصل میں جگہ کے متعلق استفہام کے لیے آتا ہے، یعنی ”کہاں ہے؟ کس جگہ سے؟“ مگر موقع محل کے مطابق کیفیت کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، یعنی ”کس طرح؟ کیسے؟“ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اکیلا مستحق عبادت اور کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

كَذَلِكَ يُؤْفِكُ الَّذِينَ كَانُوا بِآيَاتِ اللَّهِ يُبْحَدُونَ ﴿۱﴾ اللَّهُ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ الْأَرْضَ
قَرَارًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً وَصَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ صُورَكُمْ وَرَزَقَكُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ ۚ ذَلِكُمْ اللَّهُ
رَبُّكُمْ ۚ فَتَبَرَّكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ ﴿۲﴾

اسی طرح وہ لوگ بہکائے جاتے تھے جو اللہ کی آیات کا انکار کیا کرتے تھے ﴿۱﴾ اللہ وہ ہے جس نے تمہارے لیے
زمین کو رہنے کی جگہ اور آسمان کو چھت بنایا اور تمہاری صورت بنائی تو تمہاری صورتیں اچھی بنائیں اور تمہیں پاکیزہ
چیزوں سے رزق دیا، یہ ہے اللہ تمہارا رب، سو بہت برکت والا ہے اللہ جو تمام جہانوں کا رب ہے ﴿۲﴾

پکارنے کے لائق ہونا ان دلائل کی روشنی میں بالکل واضح ہے، پھر وہ کون سا مقام ہے جہاں سے کسی نے تمہیں اس کی عبادت
سے پھیر کر اس مخلوق کی عبادت اور اسے پکارنے کی طرف لگا دیا جس کا اپنا وجود اس کے اختیار میں نہیں؟ اور تم کس طرح اس
واضح اور روشن راستے سے بھٹک کر شرک و ضلالت کے اندھیروں میں گم ہو رہے ہو؟

آیت 63 كَذَلِكَ يُؤْفِكُ الَّذِينَ كَانُوا : اُرچہ "اُفِک" کا معنی جھوٹ اور بہتان بھی ہے، مگر یہاں "اُفِک"
یُؤْفِکُ اُنْفِکًا" (ض) (ہمزہ کے فتح کے ساتھ) سے ہے، جس کا معنی "پھیرنا" ہے، جیسا کہ سورہ احقاف میں ہے: ﴿كَانُوا
اٰجِنْتَنَا لِتِافِكُنَا عَنِ الْاٰهِنْتَنَا ۚ فَاٰتَيْنَا هِمًا نَّعْتَدُنَا اِنْ كُنْتُمْ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ [احقاف: ۲۲] "انہوں نے کہا کیا تو ہمارے
پاس اس لیے آیا ہے کہ ہمیں ہمارے معبودوں سے بنا دے، سو ہم پر وہ (عذاب) لے آ جس کی تو ہمیں دھمکی دیتا ہے، اگر تو
جہنم سے ہے۔" "كَانُوا بِآيَاتِ اللَّهِ يُبْحَدُونَ" میں "سکان" کی وجہ سے استمرار ہے، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے: "اللہ کی
آیات کا انکار کیا کرتے تھے۔" "تُخَذُ يُخَذُ لُجُؤُذًا" (ف) جاننے کے باوجود انکار کر دینا۔ یہ اس سوال کا جواب ہے
کہ اتنے واضح دلائل کے باوجود آخر ان لوگوں کے حق سے انحراف کا اصل باعث کیا ہے اور یہ کہ ان سے پہلے بھی کسی نے یہ
زور اختیار کیا ہے یا یہ صرف انہی کا کام ہے؟ فرمایا، یہ لوگ ہی نہیں بلکہ ان سے پہلے وہ سب لوگ بھی انہی کی طرح حق سے
پھیر دیے جاتے رہے ہیں جو علم کے باوجود اللہ کی آیات کا ضد اور عناد کی وجہ سے انکار کر دیا کرتے تھے۔ تکبر و تجوہ ان کی
بیاری ہے، یہی بیاری پہلوں کی بھی تھی۔ اب جو طے کر لے کہ اس نے ماننا ہی نہیں، اسے کون منوائے؟ جس طرح سوئے
ہوئے کو تو ڈگایا جا سکتا ہے، لیکن جو جاگتا ہونے کے باوجود آنکھیں بند کرنے پر ڈٹ جائے اسے کون ڈگائے؟

آیت 64 ﴿۱﴾ اللَّهُ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ الْأَرْضَ قَرَارًا : اس سے پہلے لیل و نہار کے ذکر کے ساتھ زمانی نعمتوں
کا ذکر فرمایا، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے انسان پر اپنی بے شمار نعمتوں میں سے مزید پانچ نعمتوں کا ذکر فرما کر اپنے اکیلے رب
ہونے کی یاد دہانی فرمائی۔ ان نعمتوں کا تعلق مکان سے ہے یا انسان کی ذات سے۔ پہلی نعمت زمین کو رہنے کی جگہ بنانا ہے۔
اس میں کئی چیزیں شامل ہیں، ایک یہ کہ اس نے زمین کو پیدا کیا تو وہ ہچکولے لکھاتی تھی، پھر اس میں ایسے توازن و تناسب سے

هُوَ الْحَيُّ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ فَادْعُوهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۗ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۵۹﴾

وہی زندہ ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، سوا سے پکارو، اس حال میں کہ اسی کے لیے دین کو خالص کرنے والے ہو، سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے ﴿۵۹﴾

پہاڑ گاڑ دیے کہ وہ انسانوں اور تمام جانداروں کے لیے جائے قرار بن گئی۔ اگر اس میں مسلسل زلزلے کی کیفیت رہتی تو کوئی تنفس اس پر نہ بس سکتا۔ (دیکھیے نخل: ۱۵۔ انبیاء: ۳۱۔ لقمان: ۱۰) دوسری یہ کہ زمین انسان کو اور تمام جانداروں کو زندگی میں بسیرا مہیا کرتی ہے اور مرنے کے بعد بھی انھیں سمیٹتی ہے، اگر اس میں یہ وصف نہ ہوتا تو تعفن کی وجہ سے کوئی جاندار زندہ و سلامت نہ رہتا۔ (دیکھیے مرسلات: ۲۵، ۲۶) اور تیسری یہ کہ انسان کی تمام ضروریات کھانا پینا اور لباس وغیرہ سب زمین سے وابستہ ہیں، اگر اللہ تعالیٰ اس میں یہ صفت نہ رکھتا تو کوئی جاندار یہاں زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر یہ بات بیان ہوئی ہے۔ دوسری نعمت آسمان کو چھت بنانا ہے، چھت بھی ستونوں کے بغیر اور گرنے سے اور ہر قسم کی آفات سے محفوظ۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۃ انبیاء (۳۲)، رعد (۲) اور لقمان (۱۰)۔

تیسری نعمت انسان کی صورت بنانا ہے، وہ بھی نہایت اہتمام کے ساتھ اپنے ہاتھوں سے۔ (دیکھیے سورۃ ص: ۳۸) چوتھی نعمت انسان کی صورت اچھی بنانا ہے، دوسرے جانوروں کے برعکس وہ سیدھے قد کے ساتھ دو پاؤں پر چلتا ہے اور ہاتھ کے ساتھ کھاتا پیتا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے سورۃ بنی اسرائیل کی آیت (۷۰): ﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْوَجْدِ وَالْبَحْرِ.....﴾ کی تفسیر دیکھیں۔ پانچویں نعمت ”طیبات“ (پاکیزہ چیزیں) بطور رزق عطا کرنا ہے۔ ”الطَّيِّبَاتُ“ کا لفظ حرام و حلال کے سلسلے میں آئے تو مراد حلال چیزیں ہوتی ہیں اور انعام کے طور پر ذکر کیا جائے تو اس سے مراد لذیذ چیزیں ہوتی ہیں۔ یہاں یہی مراد ہے، کیونکہ تمام جانوروں کے برعکس انسان کی خوراک ہر چیز میں سے اس کا لذیذ ترین حصہ ہے۔ خوراک کے علاوہ اس میں نکاح، لباس، زینت اور یوڈو باش کی بے شمار طیبات شامل ہیں۔

﴿ذَلِكُمْ اللَّهُ رَبُّكُمْ﴾ اس کی تفسیر پچھلی آیات میں گزر چکی ہے۔

﴿فَتَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ﴾: ”تبارک“ کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۃ ملک کی پہلی آیت۔

آیت 65: ﴿هُوَ الْحَيُّ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ﴾: ”الْحَيُّ“ خبر پر الف لام نے کلام میں حصر کا مفہوم پیدا کر دیا ہے کہ وہی زندہ ہے، یعنی ہمیشہ سے زندہ اور ہمیشہ زندہ رہنے والا وہی ہے، تو عبادت کے لائق بھی وہی ہے۔ اس کے سوا سب موت کی وادی سے وجود میں آئے ہیں اور موت کی آغوش میں جانے والے ہیں۔ تو مرنے والے عبادت کے حق دار کیسے بن گئے؟ مزید دیکھیے آیت النوری (بقرہ: ۲۵۵) اور سورۃ نحل (۲۱) کی تفسیر۔

﴿فَادْعُوهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ﴾: تفصیل کے لیے دیکھیے سورۃ اعراف (۲۹) اور سورۃ مؤمن (۱۳) کی تفسیر۔

﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾: یعنی جب یہ سب نعمتیں اس کیلئے عطا کردہ ہیں اور یہ سب اوصاف اور خوبیاں اس کیلئے

قُلْ اِنِّیْ نُهَیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَمَّا جَاءَنِی الْبَیِّنَاتُ مِنْ رَبِّیْ
وَ اُمِرْتُ اَنْ اُسَلِّمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱﴾ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُطْفَةٍ

کہہ دے بے شک مجھے منع کیا گیا ہے کہ میں ان کی عبادت کروں جنہیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، جب میرے پاس میرے رب کی طرف سے واضح دلیلیں آئیں اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمام جہانوں کے رب کا فرماں بردار ہو جاؤں ﴿۱﴾ وہی ہے جس نے تمہیں کچھ مٹی سے پیدا کیا، پھر ایک قطرے سے، پھر ایک جے ہوئے خون سے، پھر وہ تمہیں

میں پائی جاتی ہیں جو رب العالمین ہے، تو کسی اور کا حق نہیں کہ اس کی تعریف کی جائے اور شکر ادا کرنے کے لیے اس کی عبادت کی جائے، بلکہ یہ حق صرف اللہ تعالیٰ کا ہے جو رب العالمین ہے۔

آیت 66 ﴿۱﴾ قُلْ اِنِّیْ نُهَیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ : اکیلے اللہ کی عبادت کے حکم کے بعد صریح الفاظ میں یہ اعلان کرنے کا حکم دیا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا جن کو بھی تم پکارتے ہو مجھے ان کی عبادت کرنے سے منع کر دیا گیا ہے، یعنی انہیں پکارنے سے منع کر دیا گیا ہے۔ کفار کی خواہش اور مطالبہ تھا کہ کچھ عبادت اللہ کی کر لی جائے اور کچھ ان کے مشکل کشاؤں کی۔ فرمایا، ان سے کہہ دو کہ مجھے ان سب کی عبادت سے منع کر دیا گیا ہے جنہیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، اللہ کی توحید کے خلاف نہ تمہاری کوئی بات مانی جاسکتی ہے اور نہ ہی اس پر کوئی سمجھوتہ ہو سکتا ہے۔ مزید دیکھیے سورہ قلم (۹) اور سورہ کافرون۔

﴿۲﴾ لَمَّا جَاءَنِی الْبَیِّنَاتُ مِنْ رَبِّیْ : ان ”الْبَیِّنَاتُ“ میں اللہ تعالیٰ کی توحید کی وہ نقلی دلیلیں بھی شامل ہیں جو رب تعالیٰ کی طرف سے قرآنی آیات اور احادیث کی صورت میں آپ ﷺ پر نازل ہوئیں اور وہ بے شمار عقلی دلائل اور نشانیاں بھی جو کائنات کی ہر چیز میں سلیم الفطرت انسان کے لیے موجود ہیں۔ یعنی اتنے واضح نقلی و عقلی دلائل کے ہوتے ہوئے تم مجھ سے یہ توقع کیوں رکھتے ہو کہ میں تمہارا کہنا مانوں گا اور تمہارے ان جھوٹے معبودوں کی بندگی کرنے لگوں گا؟

﴿۳﴾ وَ اُمِرْتُ اَنْ اُسَلِّمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ : اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اپنا آپ مکمل طور پر رب العالمین کے سپرد کر دوں اور اسی کا تابع فرمان ہو جاؤں۔ دیکھیے سورہ انعام (۱۶۱ تا ۱۶۳)۔

آیت 67 ﴿۱﴾ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِنْ تُرَابٍ : یہ آیت بھی اللہ تعالیٰ کے وجود، اس کی توحید اور قیامت قائم ہونے کی دلیل ہے۔ اس کی تفسیر سورہ حج (۵) اور سورہ مومنون (۱۴ تا ۱۳) میں تفصیل سے گزر چکی ہے۔ البتہ یہاں چند الفاظ کی مختصر تشریح کی جاتی ہے۔

﴿۲﴾ ”ثُمَّ لَتَبْلُوَنَّا اَشْدَّكُمْ“ اور ”ثُمَّ لَتَكُوْنُوْنَ اَشْيُوْحًا“ دونوں میں ”لام کی“ فعل محذوف کے متعلق ہے جو خود بخود سمجھ میں آ رہا ہے: ”ثُمَّ لَتَبْلُوَنَّكُمْ“ یعنی پھر وہ تمہاری پرورش کرتا رہتا ہے (تاکہ تم اپنی جوانی کو پہنچ جاؤ، پھر تاکہ تم بوڑھے ہو جاؤ) یا ”ثُمَّ لَتَبْلُوَنَّكُمْ“ ہے، یعنی پھر وہ تمہیں باقی رکھتا ہے (تاکہ تم اپنی جوانی کو پہنچ جاؤ، پھر تاکہ تم بوڑھے ہو جاؤ)۔

ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشْدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُونُوا شُيُوخًا ۚ وَمِنْكُمْ
 فَن يُتَوَفَّى مِنْ قَبْلُ وَلِتَبْلُغُوا أَجَلًا مُّسَمًّى ۖ وَلَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿۵۶﴾ هُوَ الَّذِي يُحْيِي
 وَيُمِيتُ ۚ فَإِذَا قُضِيَ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ﴿۵۷﴾

ایک بچہ بنا کر نکالتا ہے، پھر تاکہ تم اپنی جوانی کو پہنچ جاؤ، پھر تاکہ تم بڑھے ہو جاؤ اور تم میں سے بعض وہ ہے جو اس سے پہلے قبض کر لیا جاتا ہے اور تاکہ تم ایک مقرر وقت کو پہنچ جاؤ اور تاکہ تم سمجھو ﴿۵۶﴾ وہی ہے جو زندگی بخشتا ہے اور موت دیتا ہے، پھر جب وہ کسی کام کا فیصلہ کرتا ہے تو اسے صرف یہ کہتا ہے کہ ”ہو جا“ تو وہ ہو جاتا ہے ﴿۵۷﴾

﴿۵۶﴾ وَمِنْكُمْ فَن يُتَوَفَّى مِنْ قَبْلُ: یعنی کوئی پیدا ہونے سے پہلے (اسقاط کی صورت میں)، کوئی جوانی کو پہنچنے سے پہلے اور کوئی بڑھا ہونے سے پہلے فوت کر لیا جاتا ہے۔

﴿۵۷﴾ وَلِتَبْلُغُوا أَجَلًا مُّسَمًّى: اس ”لِتَبْلُغُوا“ کا تعلق پہلے ”لِتَبْلُغُوا“ کے لیے مقدر فعل کے ساتھ نہیں ہوگا، بلکہ اس کے لیے الگ فعل مقدر ماننا پڑے گا، مثلاً ”وَفَعَلَ لَكُمْ ذَلِكَ لِتَبْلُغُوا أَجَلًا مُّسَمًّى“ اور اس نے تمہارے ساتھ یہ معاملہ اس لیے کیا ہے کہ تم موت کے اس وقت تک پہنچ جاؤ جو تم میں سے ہر ایک کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ یعنی کوئی علقہ بننے تک، کوئی مضغ یا عظام بننے تک، کوئی ولادت تک، کوئی لڑکپن تک، کوئی جوانی تک اور کوئی بڑھاپے تک پہنچ کر مرے۔ (ابن جزئی)

﴿۵۷﴾ وَلَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ: یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں زندگی کے ان مختلف مراحل سے اس لیے گزارتا ہے کہ جب تم اس حیرت انگیز نظام پر غور کرو تو سمجھ جاؤ کہ کوئی خالق ہے جس نے یہ سب کچھ پیدا فرمایا ہے اور وہ ایک ہی ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ ورنہ کائنات کے اس سلسلے میں ہر چیز کی ایک دوسرے کے ساتھ نہ اتنی زبردست موافقت و مناسبت ہوتی اور نہ ہی یہ نظام ایک لمحے کے لیے چل سکتا یا باقی رہ سکتا۔ اور تاکہ یہ بھی سمجھ جاؤ کہ یہاں ہر مرحلے کے بعد اگلا مرحلہ ہے، مٹی اور نطفے سے پیدا کرنے والے اور اسے ایک وقت تک پہنچانے کے بعد قبض کر لینے والے کے لیے کچھ مشکل نہیں کہ وہ تمہیں دوبارہ زندہ کر لے اور تمہارا حساب لے۔ یعنی اگر غور کرو تو پیدائش کے اس سلسلے سے اللہ تعالیٰ کا وجود، اس کی وحدانیت اور تمہیں دوبارہ زندہ کرنے پر اس کا قادر ہونا آسانی سے سمجھ میں آ سکتا ہے۔ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں: ”یعنی اتنے احوال تم پر گزرے، شاید ایک حال اور بھی گزرے (اور) وہ (ہے) مر کر جینا۔“ (موضح)

آیت 68: ﴿۱﴾ هُوَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ: توحید اور آخرت کو ثابت کرنے کے لیے اپنی نعمتوں اور قدرتوں کے تذکرے سے بھرپور آیات کے اس سلسلے کو اس آیت پر ختم فرمایا کہ ”وہی ہے جو (جسے چاہتا ہے) زندگی عطا کرتا ہے اور (جسے چاہتا ہے) موت دیتا ہے۔“ موت و حیات مکمل طور پر اس کے ہاتھ میں ہے، کسی دوسرے کا اس میں کچھ دخل نہیں۔

﴿۲﴾ فَإِذَا قُضِيَ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ: یعنی اسے پہلی مرتبہ یا دوبارہ کوئی چھوٹی یا بڑی چیز بنانے میں، یا کسی کو مارنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنے اور قیامت برپا کرنے میں کیا مشکل ہو سکتی ہے؟ وہ تو جب کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو بس

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ اللَّهِ ۖ أَلَىٰ يُضْرَفُونَ ﴿٦٩﴾ الَّذِينَ كَذَبُوا بِالْكِتَابِ
وَبِمَا أُرْسِلْنَا بِهِ رُسُلَنَا ۖ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ﴿٧٠﴾ إِذِ الْأَغْلُلُ فِي أَعْنَاقِهِمْ وَ السَّلْسِلُ
يُسْحَبُونَ ﴿٧١﴾ فِي الْحَبِيدِ ۖ ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُونَ ﴿٧٢﴾

کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اللہ کی آیات کے بارے میں جھگڑتے ہیں، کہاں پھیرے جا رہے ہیں ﴿٦٩﴾ وہ لوگ جنہوں نے کتاب کو اور جو کچھ ہم نے اپنے رسولوں کو دے کر بھیجا اسے جھٹلایا، سو عنقریب جان لیں گے ﴿٧٠﴾ جب طوق ان کی گردنوں میں ہوں گے اور زنجیریں، گھسیٹے جا رہے ہوں گے ﴿٧١﴾ کھولتے پانی میں، پھر آگ میں جھونکے جائیں گے ﴿٧٢﴾

”گن“ (ہو جا) کہتا ہے تو وہ کام ہو جاتا ہے۔ وہ اسباب کا محتاج نہیں، بلکہ اسباب اس کے حکم سے وجود میں آتے ہیں۔

آیت 69 ﴿٦٩﴾ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يُجَادِلُونَ اس سورت میں شروع سے یہاں تک کفار کے ناحق جدال کا اور اس کی مذمت کا پانچ مرتبہ ذکر آیا ہے۔ دیکھیے آیت (۴، ۵، ۳۵، ۵۶، ۶۹) یہاں نبی ﷺ کو اور ان آیات کے سننے یا پڑھنے والے ہر شخص کو فرمایا کہ (سورت کے شروع سے یہاں تک کی تقریر سے) کیا تمہیں معلوم نہیں ہوا کہ اللہ کی آیات میں ناحق جھگڑا اور کج بحثی کرنے والے لوگ ان کے صحیح ہونے کے دلائل جاننے کے باوجود کہاں سے ٹھوکر کھا کر گمراہی کے گڑھے میں گر رہے ہیں؟

آیت 70 ﴿٧٠﴾ الَّذِينَ كَذَبُوا بِالْكِتَابِ یعنی ان کے اللہ کی کتاب اور اس کے رسولوں کی لائی ہوئی تعلیمات (توحید، رسالت اور آخرت وغیرہ) پر ایمان لانے کے بجائے ان کے بارے میں جھگڑنے کی اصل وجہ یہ ہے کہ انہوں نے قبول کرنے کے ارادے سے ان پر سنجیدگی سے غور ہی نہیں کیا، بلکہ ہمیشہ جھگڑا لوپن سے ان کا مقابلہ کرنے اور انہیں جھٹلانے کا راستہ اختیار کیے رکھا۔ سو وہ اپنے اس عمل کا انجام بہت جلد جان لیں گے۔

آیت 71-72 ﴿٧١﴾ إِذِ الْأَغْلُلُ فِي أَعْنَاقِهِمْ : ”الْأَغْلُلُ“ ”غُلٌّ“ (غین کے ضمہ کے ساتھ) کی جمع ہے، طوق۔ ”السَّلْسِلُ“ ”سِلْسِلَةٌ“ کی جمع ہے، زنجیریں۔ ان آیات کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ رعد (۵)۔

﴿٧٢﴾ ”يُسْحَبُونَ“ ”سَحَبَ يَسْحَبُ سَحْبًا“ (ف) گھیٹ کر لے جانا۔ ”يُنْجَرُونَ“ ”سَجَرَ يَسْجُرُ سَجْرًا“ (ن) ”النَّوْرُ“ نور میں ایندھن جھونکنا۔ یعنی اللہ کی آیات کو جھٹلانے اور ان کے بارے میں کج بحثی کرنے والے ان کفار کو جب پیاس لگے گی تو فرشتے انہیں گھیٹتے ہوئے اس جگہ لے جائیں گے جہاں شدید گرم پانی اُبل رہا ہوگا۔ وہاں سے گرم پانی پلانے کے بعد انہیں پھر ان کی اصل جگہ جہنم میں ایندھن کی طرح جھونک دیا جائے گا۔ دیکھیے سورہ صافات (۶۶ تا ۶۸) کی تفسیر۔

ثُمَّ قِيلَ لَهُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ تُشْرِكُونَ ﴿۷۳﴾ بَيْنَ دُونِ اللَّهِ ۗ قَالُوا ضَلُّوا عَنَّا بَلْ لَمْ نَكُنْ
نَدْعُوا مِنْ قَبْلُ شَيْئًا ۗ كَذَلِكَ يَضِلُّ اللَّهُ الْكَافِرِينَ ﴿۷۴﴾

پھر ان سے کہا جائے گا کہاں ہیں وہ جو تم شریک ٹھہراتے تھے؟ ﴿۷۳﴾ اللہ کے سوا۔ کہیں گے وہ ہم سے تم ہو گئے، بلکہ ہم اس سے پہلے کسی چیز کو نہیں پکارتے تھے۔ اسی طرح اللہ کافروں کو گمراہ کرتا ہے ﴿۷۴﴾

آیت 73-74: ﴿۱﴾ ثُمَّ قِيلَ لَهُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ تُشْرِكُونَ ﴿۷۳﴾ بَيْنَ دُونِ اللَّهِ: پھر انہیں دلیل کرنے کے لیے اور ان کے خود ساختہ مشکل کشاؤں اور حاجت رواؤں کی بے بسی واضح کرنے کے لیے ان سے کہا جائے گا کہ کہاں ہیں وہ جنہیں تم اللہ کے سوا شریک بناتے تھے؟ اگر وہ واقعی شریک تھے اور تم اس لیے ان کی عبادت کرتے تھے کہ وہ مشکل وقت میں تمھاری دیکھ بھری کریں گے تو لاؤ، وہ کہاں ہیں، تمھاری مدد کیوں نہیں کر رہے؟

﴿۲﴾ قَالُوا ضَلُّوا عَنَّا: یہ انسانی ضمیر کا اصل سچ ہے، اس کے مطابق پہلے وہ بے اختیار اقرار کریں گے کہ وہ ہم سے گم ہو گئے، نہ کہیں ملتے ہیں نہ دکھائی دیتے ہیں۔

﴿۳﴾ بَلْ لَمْ نَكُنْ نَدْعُوا مِنْ قَبْلُ شَيْئًا: پھر یہ سوچیں گے کہ یہ کہنا کہ وہ ہم سے گم ہو گئے ہیں، یہ تو اعتراف ہے کہ واقعی ہم اللہ کے سوا کسی کو پکارتے رہے ہیں اور ہمارا یہ اعتراف ہمارے خلاف شہادت بن رہا ہے۔ پتا چلے طبیعت کی کمینگی اور جھوٹ کی عادت کی وجہ سے اسی قدم پر اس اعتراف سے پھر جائیں گے اور صاف جھوٹ بول دیں گے اور کہیں گے کہ یہ بات تو ویسے ہی ہمارے منہ سے نکل گئی، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ اس سے پہلے ہم کسی بھی چیز کو نہیں پکارتے تھے۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ اللہ کی قسم کھا کر دنیا میں اپنے شرک کرنے سے انکار کر دیں گے، فرمایا: ﴿۴﴾ وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَنِينًا ﴿۷۴﴾ ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا أَيْنَ شُرَكَائِكُمْ الَّذِينَ كُنْتُمْ تُشْرِعُونَ ﴿۷۵﴾ ثُمَّ لَمْ يَكُنْ فِتْنَتُهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا وَاللَّهِ رَبَّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ ﴿۷۶﴾ أَنْظِرْ كَيْفَ كَذَبُوا عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَاصْلَ عَنَهُمْ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ﴿۷۷﴾ (الأنعام: ۲۶ تا ۲۹) اور جس دن ہم ان سب کو جمع کریں گے، پھر ہم ان لوگوں سے کہیں گے جنہوں نے شریک بنائے، کہاں ہیں تمھارے وہ شریک جنہیں تم گمان کرتے تھے۔ پھر ان کا فریب اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ کہیں گے اللہ کی قسم! جو ہمارا رب ہے، ہم شریک بنانے والے نہ تھے۔ دیکھ انھوں نے کیسے اپنے آپ پر جھوٹ بولا اور ان سے گم ہو گیا جو وہ جھوٹ بنایا کرتے تھے۔

﴿۴﴾ كَذَلِكَ يَضِلُّ اللَّهُ الْكَافِرِينَ: ایسے ہی اللہ کافروں کو گمراہ اور حواس باختہ کر دیتا ہے، ان کے منہ سے کبھی کچھ نکلتا ہے کبھی کچھ۔ وہ ایک بات کہتے ہیں پھر خود ہی اس سے منکر جاتے ہیں۔ شاہ عبدالقادر زنی نے ایک اور تفسیر کی ہے، وہ بھی بہت عمدہ ہے، فرماتے ہیں: ”اول منکر ہو چکے تھے کہ ہم نے شریک نہیں پکڑا۔ اب گھبرا کر منہ سے نکل جاوے گا، پھر سنبھل کر انکار کریں گے تو وہ انکار ان کا اللہ نے بچلا دیا (پھسلا دیا، بھلا دیا) اپنی حکمت سے۔“ (موضح) یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے انہیں ان کے انکار سے پھسلا کر ان کے منہ سے شرک کرنے کا اقرار کروا لیا۔

ذَلِكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَفْرَحُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَمْرَحُونَ ﴿۷۵﴾

یہ اس لیے ہے کہ تم زمین میں حق کے بغیر خوش ہوتے تھے اور اس لیے تم اگڑتے تھے ﴿۷۵﴾

﴿۷۵﴾ ایک تفسیر اس آیت کی یہ ہے کہ وہ پہلے نہیں گئے کہ ہم جنھیں پکارتے تھے وہ ہم سے گم ہو گئے، پھر کہیں گے، اصل بات یہ ہے کہ ہم جنھیں پکارتے رہے وہ کوئی شے ہی نہ تھی، نہ کہیں ان کا وجود تھا، بلکہ ہم محض "لا شئی" کو اور اپنے وہم و گمان کو پوجتے اور پکارتے رہے ہیں۔ اگر فی الواقع ان کا وجود ہوتا تو آج وہ کہیں مل جاتے یا ہمارے کام آتے۔ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ شُرَكَاءَ - إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ﴾ [یونس: ۶۶] "اور جو لوگ اللہ کے غیر کو پکارتے ہیں وہ کسی بھی قسم کے شریکوں کی پیروی نہیں کر رہے۔ وہ بیروی نہیں کرتے مگر گمان کی اور وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ انکس دوڑاتے ہیں۔" اور فرمایا: ﴿إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَ مَا يَتَّبِعُونَ إِلَّا نَفْسُ﴾ [الحج: ۲۳] "یہ لوگ صرف گمان کے اور ان چیزوں کے پیچھے چل رہے ہیں جو ان کے دل چاہتے ہیں۔" "لا شئی" کی ایک اور مثال اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَسْتُمْ عَلَى شَيْءٍ حَتَّى تُبَيِّنُوا الْقَوْلَ وَ الْإِنْجِيلَ وَ مَا أَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ فِين رَبِّكُمْ﴾ [المائدة: ۶۸] "کہہ دے اے اہل کتاب! تم کسی چیز پر نہیں ہو، یہاں تک کہ تم تورات اور انجیل کو قائم کرو اور اس کو جو تمہارے رب کی جانب سے تمہاری طرف نازل کیا گیا۔"

آیت 75 ﴿ذَلِكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَفْرَحُونَ فِي الْأَرْضِ﴾: "فرح" "خوشی سے پھول جانا" یہ دل کی حالت کا نام ہے اور "مَرَحٌ" "اگڑنا" یہ اس خوشی کے نتیجے میں اعضائے بدن سے ظاہر ہونے والے تکبر کا نام ہے، جیسا کہ سورہ بنی اسرائیل میں ہے: ﴿وَ لَا تَمَسَّ فِي الْأَرْضِ فَرَحًا﴾ [بنی اسرائیل: ۳۷] "اور زمین میں اگڑ کر نہ چل۔" یعنی قیامت کے دن تمہاری اس ساری رسوائی اور عذاب کا باعث دنیا میں تمہارا اپنے پاس موجود نعمتوں اور اپنے دنیوی علوم پر پھول جانا، اگڑنا اور تکبر کرنا ہے، جیسا کہ آگے فرمایا: ﴿فَلَمَّا جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَرِحُوا بِمَا عِنْدَهُمْ مِنَ الْعِلْمِ﴾ [المؤمن: ۸۳] "پھر جب ان کے رسول ان کے پاس واضح دلیلیں لے کر آئے تو وہ اس پر پھول گئے جو ان کے پاس کچھ علم تھا۔"

﴿بِغَيْرِ الْحَقِّ﴾: یعنی تم ناحق زمین میں خوشی سے پھولتے تھے۔ "فی الأرض" کے لفظ سے ظاہر ہے کہ دنیا خوشی کا مقام نہیں، خوشی کا مقام صرف جنت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿الْدُّنْيَا بَسَجَةٌ الْمُؤْمِنِ وَ خِجَّةُ الْكَافِرِ﴾ [مسلم، الزهد والرقائق: ۲۹۵۶] "دنیا مومن کے لیے قید خانہ ہے اور کافر کے لیے جنت۔" کافر اس میں اس لیے خوش ہوتا ہے کہ اس کی جنت یہی ہے مگر اس کی یہ خوشی ناحق ہے، کیونکہ ناپائیدار چیز اس قابل نہیں کہ آدمی اس پر خوش ہو۔ اور تم ناحق اگڑتے اور بڑے بنتے تھے، حالانکہ بڑائی صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے، تمہارا یا کسی اور مخلوق کا حق نہیں۔ تمہارا حق اللہ کے سامنے عاجز ہونا اور اس کی آیات کے مقابلے میں جھگڑنے کے بجائے انھیں تسلیم کرنا تھا۔ پھر تم زمین پر رہ کر، جو پستی کی انتہا ہے، عرش والے کے سامنے اگڑتے تھے، جس کی بلندی کی کوئی انتہا نہیں۔

أَدْخُلُوا أَبْوَابَ جَهَنَّمَ خَلِيدِينَ فِيهَا فَمَنْ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِينَ ﴿۷۶﴾ فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ ۚ
فَأَمَّا نُرُيِّنُكَ بَعْضَ الَّذِي نَعُدُّهُمْ أَوْ تَتَوَفَّيْنَاكَ فَأَلَيْنَا يَرْجِعُونَ ﴿۷۷﴾ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا
مِّن قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّن قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّن لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ

جنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ، اس میں ہمیشہ رہنے والے ہو، پس وہ تکبر کرنے والوں کا برا ٹھکانا ہے ﴿۷۶﴾ پس صبر کر، یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے، پھر اگر کبھی ہم واقعی تجھے اس کا کچھ حصہ دکھا دیں جس کا ہم ان سے وعدہ کرتے ہیں، یا تجھے اٹھا ہی لیں تو یہ لوگ ہماری ہی طرف لوٹائے جائیں گے ﴿۷۷﴾ اور بلاشبہ یقیناً ہم نے تجھ سے پہلے کئی رسول بھیجے، ان میں سے کچھ وہ ہیں جن کا حال ہم نے تجھے سنایا اور ان میں سے کچھ وہ ہیں جن کا حال ہم نے تجھے نہیں سنایا۔

آیت 76 اَدْخُلُوا أَبْوَابَ جَهَنَّمَ خَلِيدِينَ فِيهَا... : "أَدْخُلُوا" کی مناسبت سے "فَمَنْ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِينَ" (تکبروں کے داخل ہونے کی جگہ بری) ہونا چاہیے تھا، مگر "خَلِيدِينَ فِيهَا" کی مناسبت سے "فَمَنْ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِينَ" فرمایا، یعنی وہ تکبرین کے رہنے کی بری جگہ ہے۔ "مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِينَ" کے لفظ سے یہ بھی ظاہر ہے کہ جنم میں ہمیشہ کے لیے داخل ہونے کا باعث تکبر ہے، جس نے انہیں اللہ کی آیات کو جھٹلانے پر اور ان کے بارے میں جدال پر ابھارا، جس جدال کی مذمت اس سورت کا ایک بنیادی موضوع ہے۔

آیت 77 ① فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ : یعنی یہ لوگ جو آپ کو نیچا دکھانے کے لیے اوجھے جھٹکنڈے استعمال کر رہے ہیں، آپ ان کی ایذا پر صبر کا دامن تھامے رکھیں، کیونکہ اللہ کا وعدہ یقیناً سچا ہے (کہ ہم دنیا اور آخرت میں اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی مدد فرماتے ہیں)۔ ہاں، اس میں کچھ تاخیر ہو سکتی ہے اور اس تاخیر میں بھی ہماری کئی حکمتیں ہیں۔ ہمارا یہ وعدہ دو طرح سے پورا ہو سکتا ہے۔

② فَأَمَّا نُرُيِّنُكَ بَعْضَ الَّذِي نَعُدُّهُمْ... : ایک یہ کہ ہم آپ کو اس عذاب کا کچھ حصہ دکھا ہی دیں جس کا ہم ان سے وعدہ کرتے ہیں۔ اگر ایسا ہو تو پھر آپ دنیا ہی میں ہماری مدد کا نقشہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے اور ان کا عبرتناک انجام دیکھ کر آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں گی، جیسا کہ بدر اور فتح مکہ میں ہوا۔ "فَأَمَّا نُرُيِّنُكَ" کا یہ جواب یہاں مقدر ہے اور سیاق سے خود بخود سمجھ میں آ رہا ہے۔ دوسرا یہ کہ ہم تجھے دنیا میں ان کا انجام دکھانے سے پہلے اٹھا لیں، تب بھی یہ لوگ کہیں بھاگ کر نہیں جا سکتے، بلکہ انھیں ہمارے پاس ہی واپس لایا جائے گا اور وہاں ان پر عذاب کا وعدہ پورا ہوگا جو آپ کی اور اہل ایمان کی نصرت کا ایک اظہار ہوگا۔

آیت 78 ① وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّن قَبْلِكَ : کفار نے آپ ﷺ کو پریشان کرنے اور نیچا دکھانے کے لیے اور اللہ کی آیات کا مقابلہ کرنے اور ان کے بارے میں کج بحثی کے لیے جو ناجائز مطالبے کیے ان میں سے ایک مطالبہ ان کی

أَنْ يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۖ فَإِذَا جَاءَ أَمْرُ اللَّهِ فُضِيَ بِالْحَقِّ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْبَاطِلُونَ ﴿٤٤﴾

اور کسی رسول کا اختیار نہ تھا کہ اللہ کے اذن کے بغیر کوئی نشانی لے آئے، پھر جب اللہ کا حکم آ گیا تو حق کے ساتھ فیصلہ کر دیا گیا اور اس موقع پر باطل خسارے میں رہے ﴿۴۴﴾

طلب اور تقاضے کے مطابق عجیب و غریب نشانیاں اور معجزے دکھانا تھا، جیسا کہ سورہ بنی اسرائیل (۹۰-۹۳) میں گزرا۔ اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو صبر کی تلقین کرتے ہوئے بطور اسوہ و نمونہ پہلے رسولوں کا ذکر فرمایا کہ آپ ان کے ایسے مطالبوں سے پریشان یا غم زدہ نہ ہوں، آپ سے پہلے بہت سے رسول گزرے، مگر معجزہ دکھانا ان میں سے بھی کسی کے اختیار میں نہ تھا۔ سو اگر آپ انہیں ان کی طلب کے مطابق معجزہ نہ دکھائیں تو اس سے آپ کی رسالت کے سچا ہونے میں کوئی خلل نہیں آتا، جیسا کہ پہلے رسولوں کی رسالت میں کوئی خلل نہیں آیا۔

﴿۴۴﴾ مِنْهُمْ مَن قَصَصْنَا عَلَيْكَ: ان کثیر بڑے: ان کثیر بڑے نے فرمایا کہ جن انبیاء کا بیان نہیں ہوا وہ تعداد میں ان پیغمبروں سے بہت ہی زیادہ ہیں جن کا قرآن میں ذکر ہوا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ نساء (۱۶۳) کی تفسیر۔

﴿۴۵﴾ ہمارے استاذ محمد عبدالعزیز لکھتے ہیں: ”کسی قوم کے قدیم رہنما کے متعلق (جو ہمارے رسول ﷺ سے پہلے ہو گزرے ہیں) قطعی طور پر یہ کہنا صحیح نہیں کہ وہ نبی نہ تھا، ممکن ہے کہ وہ نبی ہو اور اس نے توحید ہی کی دعوت پیش کی ہو، مگر بعد کے لوگوں نے اس کی تعلیمات کو مسخ کر دیا ہو۔“ (اشرف الحواشی) ایسی کسی شخصیت کو یقین سے نبی بھی نہیں کہا جاسکتا۔

﴿۴۶﴾ وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَنْ يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ: مطلب یہ ہے کہ معجزہ کوئی کھیل نہیں کہ کافروں نے جب چاہا نبی سے اس کا مطالبہ کر دیا اور نبی نے جب چاہا اسے دکھا دیا، کسی رسول کے پاس اللہ کے اذن کے بغیر کوئی معجزہ بھی لانے کا اختیار نہیں۔ اس میں ان لوگوں کا واضح رد ہے جو انبیاء تو ایک طرف اولیاء کے متعلق بھی یہ دعویٰ رکھتے ہیں کہ وہ کمان سے نکلے ہوئے تیر کو بھی واپس لانے کی قدرت رکھتے ہیں اور جو چاہیں کر سکتے ہیں۔

﴿۴۷﴾ فَإِذَا جَاءَ أَمْرُ اللَّهِ فُضِيَ بِالْحَقِّ: یعنی مطالبے پر جو معجزہ پیش کیا جاتا ہے اس کی حیثیت اللہ تعالیٰ کے دونوں فیصلے کی ہوتی ہے، اگر کوئی قوم اس کے بعد بھی ایمان نہ لائے تو اس کی ہلاکت یقینی ہوتی ہے۔

﴿۴۸﴾ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْبَاطِلُونَ: ”هُنَالِكَ“ زمان و مکان دونوں کے لیے آتا ہے، ”اس جگہ“، ”اس وقت“ اور ”اس موقع پر“ کے الفاظ میں دونوں معانی آجاتے ہیں۔ یعنی عذاب کی آمد کے موقع پر ایمان والے نجات پا جاتے ہیں اور باطل والے خسارے میں رہ جاتے ہیں اور ان کا نام و نشان مٹا دیا جاتا ہے۔

اللَّهُ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ الْأَنْعَامَ لِتَرْكَبُوا مِنْهَا وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ ﴿٤٠﴾ وَلَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ
وَلِتَبْلُغُوا عَلَيْهَا حَاجَةً فِي صُدُورِكُمْ وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُونَ ﴿٤١﴾ وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ ۖ

قَاتَى آيَاتِ اللَّهِ تَنْكُرُونَ ﴿٤١﴾

اللہ وہ ہے جس نے تمہارے لیے چوپائے بنائے، تاکہ ان میں سے بعض پر تم سوار ہو اور انہی میں سے بعض کو تم کھاتے ہو ﴿۴۰﴾ اور تمہارے لیے ان میں بہت سے فائدے ہیں اور تاکہ تم ان پر اس حاجت تک پہنچو جو تمہارے سینوں میں ہے اور انہی پر اور کشتیوں پر تم سوار کیے جاتے ہو ﴿۴۱﴾ اور وہ تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے، پھر تم اللہ کی کون کون سی نشانوں کا انکار کرو گے ﴿۴۱﴾

آیت 79-81: ① اللَّهُ الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ الْأَنْعَامَ لِتَرْكَبُوا.....: ”جَعَلَ“ یہاں ”خَلَقَ“ کے معنی میں ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمَاتِ وَالنُّورَ﴾ [الأنعام: ۱] ”سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور اندھیروں اور روشنی کو بنایا۔“ ”الْأَنْعَامَ“ ”نَعَم“ (نون اور عین کے فتح کے ساتھ) کی جمع ہے، اونٹ، گائے، بھیڑ اور بکریاں، نروادہ دونوں۔ (دیکھیے انعام: ۱۴۲، ۱۴۳) یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمتیں ہیں۔ عموماً یہ لفظ اونٹوں پر بولا جاتا ہے۔ اس آیت میں مذکور زیادہ تر فوائد اونٹوں کے بیان ہوئے ہیں۔ ان آیات کی مفصل تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ نحل (۸۵، ۶۶، ۸۰) اور سورہ مؤمنون (۲۱، ۲۲)۔

② ”لِتَرْكَبُوا مِنْهَا“ میں جانوروں پر سواری کا ذکر فرمایا، پھر اس سے اگلی آیت میں کشتیوں کے ساتھ ساتھ دوبارہ ان پر سواری کا ذکر فرمایا۔ بعض مفسرین نے اس میں یہ حکمت بیان فرمائی ہے کہ ”لِتَرْكَبُوا مِنْهَا“ میں عام شہروں اور بستیوں کے درمیان معمول کی سواری مراد ہے اور ”تُحْمَلُونَ“ سے مراد دور دراز کے سفر ہیں۔ (ابن عطیہ) (واللہ اعلم)

③ مفسر عبد الرحمن کیلانی لکھتے ہیں: ”کفار مکہ رسول اللہ ﷺ سے طرح طرح کے جتنی معجزات کا مطالبہ کیا کرتے تھے، جس کا ایک جواب تو سابقہ آیت میں دیا گیا ہے کہ ایسا معجزہ پیش کرنا رسول کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ ان آیات میں کفار کے اسی مطالبے کا دوسرا جواب دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نشانیاں تمہیں اپنے دائیں بائیں، اندر باہر اور پر نیچے ہر طرف ہی مل سکتی ہیں۔ اگر تم سوچو تو تمہارے راہ راست کو قبول کرنے کے لیے راہنمائی ان میں بھی موجود ہے۔ مثلاً جو مویشی تم پالتے ہو ان پر بھی نظر ڈال کر دیکھ لو، ان کی ساخت اور ان کی فطرت ہی ہم نے ایسی بنا دی ہے کہ وہ فوراً تمہارے تابع بن جاتے ہیں، پھر ان سے تم ہزاروں قسم کے فوائد حاصل کرتے ہو۔ ان کے دودھ سے بالائی، مکھن، پنیر، گھی اور لسی بناتے ہو اور یہ چیزیں تمہارے جسم کا انتہائی اہم جزو ہیں۔ پھر تم ان پر سواری کرتے ہو۔ تمہارے بوجھل سامان کو یہ اٹھاتے ہیں، تمہاری کھیتی میں ہل یہ چلاتے ہیں، کنویں سے پانی یہ کھینچتے ہیں، تم مشقت کے سب کام ان سے لیتے ہو۔ پھر ان کو ذبح کر کے ان کا گوشت بھی کھاتے ہو، ان کے بالوں سے پوشاک تیار کرتے ہو اور مرنے کے بعد ان کی ہڈیوں، کھالوں اور دانتوں تک کو اپنے کام میں

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ كَانُوا أَكْثَرًا مِنْهُمْ
وَأَشَدَّ قُوَّةً وَآثَارًا فِي الْأَرْضِ فَمَا آغْنَى عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿۷۳﴾ فَلَمَّا جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ
بِالْبَيِّنَاتِ فَرَحُوا بِهَا عِنْدَهُمْ مِنَ الْعِلْمِ وَحَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ﴿۷۴﴾

تو کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے ان لوگوں کا انجام کیسا ہوا جو ان سے پہلے تھے، وہ (تعداد میں) ان سے زیادہ تھے اور قوت میں اور زمین میں یادگاروں کے اعتبار سے ان سے بڑھ کر تھے، تو ان کے کسی کام نہ آیا، جو وہ کہتے تھے ﴿۷۳﴾ پھر جب ان کے رسول ان کے پاس واضح دلیلیں لے کر آئے تو وہ اس پر پھول گئے جو ان کے پاس کچھ علم تھا اور انھیں اس چیز نے گھیر لیا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے ﴿۷۴﴾

لاتے ہو۔ ان مویشیوں میں انسان کے لیے یہ خوئے غلامی کس نے پیدا کی؟ تمہاری پیدائش سے بھی پہلے تمہاری ضروریات کا اس قدر خیال رکھنے والا کون ہے؟

اب دوسری طرف نظر ڈالو، زمین کے تین چوتھائی حصے پر پانی یا سمندر پھیلے ہوئے ہیں، خشکی صرف چوتھا حصہ ہے، جس پر تم اور تمہارے مویشی سب رہتے ہیں۔ اتنے سے خشکی کے حصے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اتنا بڑا پانی کا ذخیرہ کیوں پیدا کر دیا؟ کیا کبھی تم نے اللہ کی اس نشانی پر غور کیا؟ پھر پانی اور ہواؤں کو ایسے طبعی قوانین کا پابند کر دیا کہ تم دریاؤں اور سمندروں میں کشتی بنی اور جہاز رانی کے قابل ہو گئے۔ اگر اللہ تعالیٰ ان کے لیے طبعی قوانین ہی بدل ڈالے اور وہ ہر چیز کا خالق ہے اور اس میں جیسے چاہے تصرف کر سکتا ہے، تو کیا تم جہاز رانی کر سکتے تھے، یا اس زمین پر زندہ رہ سکتے تھے؟ پھر یہ بھی سوچو کہ جس حکمتوں والے پروردگار نے اپنی اتنی بے شمار چیزیں تمہارے تصرف میں دے رکھی ہیں، کیا وہ انسان کو اتنے اختیارات دے کر اس کو یونہی چھوڑ دے گا اور اس سے اپنی نعمتوں کا کبھی حساب نہ لے گا؟ اور یہ نہ پوچھو گے کہ جس رحیم پروردگار نے تمہاری جملہ ضروریات کا اس قدر خیال رکھا، پھر اس کے ساتھ اپنی رحمتیں بھی نازل فرماتا رہا تو کیا انسان نے اللہ کی ان نعمتوں کی قدر کی اور اس کا شکر یہ ادا کیا، یا وہ نمک حرام اور ناشکرانا ثابت ہوا اور اپنی نیاز مندیاں اللہ کے بجائے دوسروں کے سامنے نچھاور کرنے لگا۔“ (تیسیر القرآن)

آیت 82 ﴿۱﴾ أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ روم کی آیت (۹) کی تفسیر۔

﴿۲﴾ فَمَا آغْنَى عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ: یعنی جب ان پر اللہ کا عذاب آیا تو ان کے قد و قامت، جسمانی قوت، مال و دولت کی کثرت، فنِ تعمیر کے عظیم الشان نمونے اور دوسری فنی مہارتیں ان کے کسی کام نہ آسکیں، پھر اے اہل مکہ! تم جو ہر لحاظ سے ان سے کمزور اور کمتر ہو، اللہ کا عذاب آنے پر کس طرح بچ سکو گے؟

آیت 83 ﴿۱﴾ فَلَمَّا جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ : ”مِنَ الْعِلْمِ“ میں ”مِنَ“ جمعیت کے لیے ہے، یعنی علم کا وہ

معمولی سا حصہ جو ان کے پاس تھا۔ اس علم سے مراد دو چیزیں ہو سکتی ہیں، ایک اللہ تعالیٰ کے متعلق ان کے وہ عقائد و رسوم جو

فَلَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا قَالُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَحَدَهُ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهِ مُشْرِكِينَ ﴿۸۴﴾ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ إِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا سُنَّتَ اللَّهُ الَّتِي قَدْ خَلَتْ فِي عِبَادِهِ ۗ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكَافِرُونَ ﴿۸۵﴾

پھر جب انھوں نے ہمارا عذاب دیکھا تو انھوں نے کہا ہم اس اکیلے اللہ پر ایمان لائے اور ہم نے ان کا انکار کیا جنہیں ہم اس کے ساتھ شریک ٹھہرانے والے تھے ﴿۸۴﴾ پھر یہ نہ تھا کہ ان کا ایمان انھیں فائدہ دیتا، جب انھوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا۔ یہ اللہ کا طریقہ ہے جو اس کے بندوں میں گزر چکا اور اس موقع پر کافر خسارے میں رہے ﴿۸۵﴾

ان کے فلسفیوں نے یا ان کے مذہبی پیشواؤں نے گھڑ رکھے تھے، جن کی بنیاد ہی اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک پر تھی، جیسا کہ یونانیوں اور ہندوؤں کا دیوی دیوتاؤں پر مبنی سلسلہ تھا اور جیسا کہ نوح، ہود، صالح، ابراہیم اور دوسرے انبیائے کرام ﷺ کی بت پرست اقوام کا عقیدہ تھا، جسے وہ علم سمجھتے تھے، حالانکہ وہ سراسر جہل تھا۔ چنانچہ جب ان کے رسول ان کے پاس اللہ تعالیٰ کے متعلق خود اس کے عطا کردہ توحید و آخرت کے واضح عقائد اور ان کے حق ہونے کے روشن دلائل لے کر آئے تو وہ انسانی دماغوں کے گھڑے ہوئے عقائد و رسوم کو برتر علم سمجھ کر انھی پر پھولے اور اکڑے رہے اور انھوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والے واضح عقائد اور ان کے روشن دلائل کو ٹھکرا دیا۔

دوسرا مطلب ”مِنَ الْعِلْمِ“ کا دنیوی علم و فن ہے، جس میں وہ مہارت رکھتے تھے، جو درحقیقت علم کا ایک معمولی اور حقیر سا حصہ ہے، کیونکہ اس کا تعلق صرف اس ناپائیدار دنیا کے چند دنوں یا لمحوں کے ساتھ ہے۔ حقیقی اور ابدی علم، یعنی آخرت کے علم سے وہ بالکل بے بہرہ تھے۔ (دیکھیے روم: ۶، ۷) چنانچہ رسولوں کی تشریف آوری پر ایمان لانے اور اطاعت کے بجائے وہ دنیا کے اس حقیر علم پر پھولے اور اکڑے رہے جو انھیں حاصل تھا اور جسے وہ بہت بڑی بات سمجھتے تھے۔ یہ معنی الفاظ کے زیادہ قریب ہے۔

﴿۸۴﴾ وَحَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ: یعنی انھیں اسی عذاب نے چاروں طرف سے گھیر لیا، جس سے رسول انھیں ڈراتے تھے تو وہ اس کا مذاق اڑاتے تھے اور اسے جلد از جلد لانے کا مطالبہ کرتے تھے۔

آیت 84، 85: ﴿۸۴﴾ فَلَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا قَالُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَحَدَهُ..... ان دونوں آیات کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ نساء (۱۸)، انعام (۱۵۸) اور سورہ یونس (۵۱، ۹۰، ۹۱)۔





حَمَّ ۱ تَنْزِيلٌ مِّنَ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ۝ كِتَابٌ فُصِّلَتْ آيَاتُهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۝

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

حَمَّ ۱ اس بے حد رحم والے، نہایت مہربان کی طرف سے اتاری ہوئی ہے ۝ ایسی کتاب جس کی آیات کھول کر بیان کی گئی ہیں، عربی قرآن ہے، ان لوگوں کے لیے جو جانتے ہیں ۝

”سورہ حم السجدة“ کا ایک نام ”سورہ فصلت“ بھی ہے۔

آیت 1: حَمَّ: حروف مقطعات کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ بقرہ کی پہلی آیت کی تفسیر۔

آیت 2: ۱ تَنْزِيلٌ مِّنَ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ: ”تَنْزِيلٌ“ کا معنی ”تھوڑا تھوڑا کر کے اتارنا“ ہے۔ قرآن مجید کو ایک ہی دفعہ نازل کرنے کے بجائے تیس (۲۳) برس میں نازل کرنے کی حکمتوں کے لیے دیکھیے سورہ بنی اسرائیل کی آیت (۱۰۶) کی تفسیر۔ ”الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ“ کا مفہوم اور باہمی فرق سورہ فاتحہ کی تفسیر میں دیکھیے۔ کفار قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ کتاب نہیں مانتے تھے، بلکہ اسے رسول اللہ ﷺ کا خود ساختہ کلام کہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں یقین دلانے کے لیے کہ یہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے نازل شدہ ہے، اس بات کو متعدد مقامات پر مختلف انداز سے بیان فرمایا۔ پچھلی سورت میں یہ بات اپنی صفات ”عزیز وعلیم“ کے ذکر کے ساتھ بیان فرمائی، یہاں ”رحمان ورحیم“ کے ساتھ ذکر فرمائی۔

۲ ”الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ“ کا ذکر اس لیے فرمایا کہ ساری مخلوق محتاج ہے، جس کی ہر ضرورت پوری کرنے والا رحمان ورحیم ہے۔ وہ سب ضعیف اور بیمار ہیں، ان کی غذا اور ہر ضرورت کا اہتمام اور ان کی بیماریوں اور کمزوریوں کا مداوا وہی کرتا ہے جو رحمان ہے، جس کی رحمت کی کوئی حد نہیں اور رحیم بھی ہے کہ اس کی رحمت دائمی ہے، جسے کبھی زوال نہیں۔ اس نے رحم کرتے ہوئے یہ کتاب نازل فرمائی ہے، تاکہ لوگ ضلالت کی تاریکیوں سے ہدایت کی روشنی میں آجائیں اور دنیا اور آخرت دونوں میں اس بہت بڑی ہلاکت سے بچ جائیں جو مشرکین کا مقدر ہے، جس کا ذکر آیت (۶) میں آ رہا ہے۔ کتاب کا اتارنا اس کی صفت رحمت کا اظہار ہے۔ دیکھیے سورہ انعام (۱۵۷) اور سورہ عنکبوت (۵۱)۔

آیت 3: ۱ كِتَابٌ فُصِّلَتْ آيَاتُهُ: ”فُصِّلَتْ“ کا کچھ بیان سورہ ہود کی پہلی آیت کی تفسیر میں گزر چکا ہے۔ یہاں ہمارے استاذ محمد عبدہ لکھتے ہیں: ”یعنی ان میں مختلف مضامین عقائد، حرام و حلال، گزشتہ اقوام کے واقعات اور مثالیں وغیرہ کھول کھول کر واضح انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔“ (اشرف الحواشی) یہ ”کِتَابٌ“ کی پہلی صفت ہے۔

۲ قُرْآنًا عَرَبِيًّا: یہ دوسری صفت ہے۔ تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ یوسف (۲) اور سورہ شعراء (۱۹۵)۔

بَشِيرًا وَنَذِيرًا ۚ فَأَعْرَضَ أَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ﴿۴﴾

بشارت دینے والا اور ڈرانے والا، تو ان کے اکثر نے منہ موڑ لیا، سو وہ نہیں سنتے ﴿۴﴾

﴿۴﴾ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ: یہ تیسری صفت ہے۔ ”لِقَوْمٍ“ کا لام ”تَنْزِيلٍ“ کے متعلق بھی ہو سکتا ہے اور ”فُضِّلَتْ“ کے بھی۔ یعنی یہ کتاب ان لوگوں کے لیے نازل کی گئی ہے اور انہی کے لیے اس کی آیات کھول کھول کر بیان کی گئی ہیں جو جانتے ہیں، یا جاننا اور سمجھنا چاہتے ہیں۔ گویا یہ ان کے لیے ہے ہی نہیں جو علم کے بجائے اپنی خواہش نفس یا آباؤ اجداد کی تقلید کے پیروکار ہیں، کیونکہ ان کا عناد اور تعصب انہیں سوچنے سمجھنے حتیٰ کہ سننے کی بھی اجازت نہیں دیتا (دیکھیے حم السجدة: ۲۶) اور نہ سننا اور نہ سمجھنا ہی لوگوں کو جہنم میں لے جائے گا، جیسا کہ سورہ ملک میں ہے: ﴿وَقَالُوا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ﴾ [الملك: ۱۰] ”اور وہ کہیں گے اگر ہم سنتے ہوتے یا سمجھتے ہوتے تو بھڑکتی ہوئی آگ والوں میں نہ ہوتے۔“ یہی بات متعدد آیات میں بیان فرمائی، فرمایا: ﴿وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ لَضَرِبُهَا لِلنَّاسِ ۖ وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُونَ﴾ [العنكبوت: ۴۳] ”اور یہ مثالیں ہیں جو ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں اور انہیں صرف جاننے والے ہی سمجھتے ہیں۔“ اور فرمایا: ﴿بَلْ هُوَ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ فِي صُدُورِ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ﴾ [العنكبوت: ۴۹] ”بلکہ یہ تو واضح آیات ہیں ان لوگوں کے سینوں میں جنہیں علم دیا گیا ہے۔“ اور فرمایا: ﴿إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْعَالِمِينَ﴾ [الروم: ۲۲] ”بے شک اس میں جاننے والوں کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں۔“ اور فرمایا: ﴿إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ﴾ [يوسف: ۲] ”بے شک ہم نے اسے عربی قرآن بنا کر نازل کیا ہے، تاکہ تم سمجھو۔“

آیت 4 ﴿۴﴾ بَشِيرًا وَنَذِيرًا: یہ چوتھی اور پانچویں صفت ہے کہ یہ کتاب ایمان لانے والوں کو دنیا اور آخرت دونوں جہاں میں بہترین انجام کی بشارت دیتی ہے اور جھٹلانے والوں کو دنیا اور آخرت کے بدترین انجام سے ڈراتی ہے۔

﴿۲﴾ فَأَعْرَضَ أَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ: قرآن مجید کی صفات بیان کرنے کے بعد اس پر لوگوں کا رد عمل بیان فرمایا کہ ان میں سے اکثر نے منہ موڑ لیا، سو وہ سنتے ہی نہیں۔ اکثر سے مراد یہاں کفار ہیں۔ نہ سننے سے مراد یہ ہے کہ وہ سرے سے سنتے ہی نہیں، بلکہ مجلس سے اٹھ جاتے ہیں (دیکھیے ص: ۶) یا کانوں میں انگلیاں ڈال لیتے ہیں اور کپڑے اوڑھ لیتے ہیں۔ (دیکھیے نوح: ۷) یا شور و غل ڈال کر نہ خود سنتے ہیں نہ کسی کو سننے دیتے ہیں، جیسا کہ اسی سورہ حم السجدة کی آیت (۲۶) میں ہے اور نہ سننے سے مراد یہ بھی ہے کہ وہ اسے قبول نہیں کرتے، کیونکہ جب ماننا ہی نہیں تو سننا نہ سننا برابر ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالإِنسِ ۖ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا ۖ وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا ۖ وَلَهُمْ أُذُنٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا ۖ أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۖ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ﴾ [الأعراف: ۱۷۹] ”اور بلاشبہ یقیناً ہم نے بہت سے جن اور انسان جہنم ہی کے لیے پیدا کیے ہیں، ان کے دل ہیں جن کے ساتھ وہ سمجھتے نہیں اور ان کی آنکھیں ہیں جن کے ساتھ وہ دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں جن کے ساتھ وہ سنتے نہیں، یہ لوگ چوپاؤں جیسے ہیں، بلکہ یہ زیادہ بھٹکے

وَقَالُوا قُلُوبُنَا فِيْ اَكْثٰنَةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ وَفِيْ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَمِنْ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ

اور انھوں نے کہا ہمارے دل اس بات سے پردوں میں ہیں جس کی طرف تو ہمیں بلاتا ہے اور ہمارے کانوں میں ہوئے ہیں، یہی ہیں جو بالکل بے خبر ہیں۔ اور اسی سورت کی اگلی آیت: ﴿ وَقَالُوا قُلُوبُنَا فِيْ اَكْثٰنَةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ وَفِيْ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَمِنْ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ فَاَعْمَلْنَا لِمَنَّا عَمَلُوْنَ ﴾ (حجۃ السجدہ: ۵) ”اور انھوں نے کہا ہمارے دل اس بات سے پردوں میں ہیں جس کی طرف تو ہمیں بلاتا ہے اور ہمارے کانوں میں ایک بوجھ ہے اور ہمارے درمیان اور تیرے درمیان ایک حجاب ہے، پس تو عمل کر، بے شک ہم بھی عمل کرنے والے ہیں۔“

❶ قرآن مجید نے لوگوں کی اکثریت کے متعلق فرمایا: ﴿ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴾ [البقرة: ۱۰۰] ”ان کے اکثر ایمان نہیں رکھتے۔“ اور فرمایا: ﴿ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ [الانعام: ۳۷] ”ان کے اکثر نہیں جانتے۔“ اور فرمایا: ﴿ اَكْثَرُهُمْ يَجْحَدُوْنَ ﴾ [الانعام: ۱۱۱] ”ان کے اکثر جہالت برتتے ہیں۔“ اور فرمایا: ﴿ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ﴾ [الاعراف: ۱۷] ”اور تو ان کے اکثر کو شکر کرنے والے نہیں پائے گا۔“ اور فرمایا: ﴿ وَ اِنْ اَكْثَرُهُمْ لَفٰسِقِيْنَ ﴾ [الاعراف: ۱۰۲] ”اور بے شک ہم نے ان کے اکثر کو فاسق ہی پایا۔“ اور فرمایا: ﴿ وَمَا يَتَّبِعُهُمْ اِلَّا ظُلْمًا ﴾ [يونس: ۳۶] ”اور ان کے اکثر پیروی نہیں کرتے مگر ایک گمان کی۔“ اور فرمایا: ﴿ وَلٰكِنْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴾ [يونس: ۶۰] ”اور لیکن ان میں سے اکثر شکر نہیں کرتے۔“ اور فرمایا: ﴿ وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴾ [يوسف: ۱۰۶] ”اور ان میں سے اکثر اللہ پر ایمان نہیں رکھتے، مگر اس حال میں کہ وہ شریک بنانے والے ہوتے ہیں۔“ اور فرمایا: ﴿ اِنْ فِيْ ذٰلِكَ لٰآيَةٌ مِّمَّا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾ [الشعراء: ۸] ”بے شک اس میں یقیناً عظیم نشانی ہے اور ان کے اکثر ایمان لانے والے نہیں تھے۔“ جب کہ ایمان والوں اور شکر گزار بندوں کے متعلق فرمایا کہ وہ بہت تھوڑے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ ﴾ [ص: ۲۴] ”مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے اور یہ لوگ بہت ہی کم ہیں۔“ اور فرمایا: ﴿ وَ قَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيّ السّٰكِنُوْنَ ﴾ [سبا: ۱۳] ”اور بہت تھوڑے میرے بندوں میں سے پورے شکر گزار ہیں۔“

ان آیات سے کفار کے رائج کردہ نظام جمہوریت کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے، جس کی بنیاد ہی عوام کی اکثریت پر ہے، وہ مسلم ہوں یا کافر، متقی ہوں یا فاسق۔ پھر اس اکثریت کو دستور اور قانون سازی کا بھی اختیار ہے، خواہ وہ اللہ کے دین کے مطابق ہو یا اس سے متصادم۔ اس لیے دنیا بھر کے کفار تمام مسلمان ملکوں میں جمہوریت رائج کرنے کے لیے اپنی پوری کوشش استعمال کرتے ہیں، کیونکہ اسی کے ذریعے سے وہ ان ملکوں میں اللہ اور اس کے رسول کے احکام کو نافذ ہونے سے روک سکتے ہیں اور اپنا دخل جاری رکھ سکتے ہیں۔

آیت 5 ﴿ وَقَالُوا قُلُوبُنَا فِيْ اَكْثٰنَةٍ ”اَكْثٰنَةٍ“ ”سَکٰنٍ“ کی جمع ہے، پردہ، جیسا کہ ”عِظَةٌ“ کی جمع ”اَعْظِيَةٌ“

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَهُمُ اللَّهُ وَاحِدٌ فَاسْتَقِيمُوا إِلَيْهِ
وَاسْتَغْفِرُوا لَهُ ۚ وَوَيْلٌ لِلْمُشْرِكِينَ ۝ الَّذِينَ لَا يُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ بِالْآخِرَةِ

کہہ دے میں تو تمہارے جیسا ایک بشر ہی ہوں، میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود صرف ایک ہی معبود ہے، سو اس کی طرف سیدھے ہو جاؤ اور اس سے بخشش مانگو اور مشرکوں کے لیے بڑی ہلاکت ہے ۝ وہ جو زکوٰۃ نہیں

آئیں گے۔“ اور ضد اور عناد کی وجہ سے مخالفت پر ڈٹ جانے والوں کے متعلق اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے، فرمایا: ﴿وَمَنْ يُفَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصَلِّهِ جَهَنَّمَ ۚ وَسَاءَتْ لَصَيرًا﴾ | النساء: ۱۱۵ | اور جو کوئی رسول کی مخالفت کرے، اس کے بعد کہ اس کے لیے ہدایت خوب واضح ہو چکی اور مومنوں کے راستے کے سوا (کسی اور) کی پیروی کرے ہم اسے اسی طرف بھیر دیں گے جس طرف وہ پھرے گا اور ہم اسے جہنم میں جھونکیں گے اور وہ بری کونے کی جگہ ہے۔“ اور فرمایا: ﴿فَلَمَّا زَاغُوا أَزَاغَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ﴾ | العنكبوت: ۱۷ |

”پھر جب وہ ٹیزھے ہو گئے تو اللہ نے ان کے دل ٹیزھے کر دیے۔“

۝ فَاغْمَلْنَا إِيَّانَا عَمَلُونَ : بار بار دعوت اور نصیحت سے امید ہوتی ہے کہ شاید کسی وقت ہی اثر کر جائے، اس لیے کفار نے رسول اللہ ﷺ کو پوری طرح مایوس کرنے کے لیے یہ جملہ کہہ، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا کہ کفار کو ”لَكُمْ دِينُكُمْ وَدِينِ الَّذِينَ“ (تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین ہے) کہہ کر اس بات سے پوری طرح مایوس کر دیں کہ آپ ان کے معبودوں کی کبھی کسی صورت میں بھی عبادت کر سکتے ہیں۔ (دیکھیے کافرون: ۶)

آیت 76 ۝ قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ : یعنی مجھ سے تمہاری اس قدر دوری کی کوئی وجہ نہیں، کیونکہ نہ تو میں فرشتہ یا جن یا نظر نہ آنے والی کوئی اور مخلوق ہوں کہ میرے اور تمہارے درمیان کوئی پردہ ہو، جس کی وجہ سے تم مجھے دیکھ نہ سکو یا میری بات سن نہ سکو، بلکہ میں ایک بشر ہی ہوں جو تم میں پیدا ہوا، پلا بڑھا اور نبوت سے سرفراز ہوا۔ نہ یہ بات ہے کہ میری زبان تم سے مختلف ہے، بلکہ تمہاری طرح عرب ہوں، کھانے پینے، سونے جاگنے، سندرستی، بیماری، شادی، غمی اور آل اولاد، غرض تمام انسانی صفات میں تمہارے جیسے ہوں، پھر مجھ سے یہ اہتمام اور ایسی دوری کیوں؟

۝ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَهُمُ اللَّهُ وَاحِدٌ : دوری کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ میں اپنی کوئی ذاتی بات تمہارے سامنے پیش کر کے اسے منوانا چاہتا ہوں۔ ایسا بھی نہیں، بلکہ میں تو تمہارے پاس وحی الہی کی بات لے کر آیا ہوں اور یہی میرا امتیاز ہے، اور یہ بھی نہیں کہ وہ وحی الہی کوئی چھیدہ یا عقل میں نہ آنے والی بات ہو، یا اس کے تم سے بے شمار مطالبات ہوں جنہیں پورا کرنے سے تم قاصر ہو، بلکہ وہ صاف، سچی اور عقل کے عین مطابق ہے اور وہ ہے صرف ایک مختصر سی بات کہ تمہاری عبادت کا

هُمُ كَفَرُونَ ﴿۷﴾

دیتے اور آخرت کا انکار کرنے والے بھی وہی ہیں ﴿۷﴾

حق دار صرف ایک معبود ہے۔ ایسی واضح اور مختصر بات نہ سننے یا نہ سمجھنے کا اور اس کے کہنے والے کو نہ دیکھنے کا تمہارے پاس کوئی عذر نہیں، تمہیں روکنے والی چیز صرف تمہارا کفر پر اصرار ہے۔ سوا سے چھوڑو، تاکہ تم بھی وہ حقیقت سمجھ سکو جو تمہارے جیسا ایک بشر ہو کر میں سمجھتا ہوں اور تمہیں سمجھا رہا ہوں، لہذا اپنا رخ اپنے واحد معبود کی طرف بانٹ کر سیدھا کر لو۔

﴿۳﴾ فَاسْتَقِمْ وَالْاِيْمُو: استقامت کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ ہود (۱۱۲)۔ یعنی جب تمہاری عبادت کا حق دار صرف ایک معبود ہے تو تمام معبودان باطلہ سے منہ پھیر کر اپنا رخ پوری طرح اس کی طرف سیدھا کر لو اور صرف اسی کی عبادت کرو، جیسا کہ ظلیل اللہ ﷺ نے کہا تھا: ﴿اِنِّیْ وَجْهٌ وَجْهٌی الَّذِیْ قَطَرَ السَّنُوْبَ وَ الْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّ مَا اَنَا مِنَ الشِّرْکِیْنَ﴾ (الانعام: ۷۹) ”بے شک میں نے اپنا چہرہ اس کی طرف متوجہ کر لیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے، ایک (اللہ کی) طرف ہو کر اور میں مشرکوں سے نہیں۔“

﴿۴﴾ وَاسْتَغْفِرُوْا: یعنی اس سے پہلے اس کی جو، شکری اور اس کے ساتھ شرک کرتے رہے ہو اس کی اس سے معافی مانگو اور اس کا حق ادا کرنے میں جو کوتاہی پہلے ہوئی یا آئندہ ہوگی سب کی بخشش کی دعا کرتے رہو۔

﴿۵﴾ آیت کی جو تفسیر اوپر بیان کی گئی ہے یہ بھلائی اور کچھ اور مفسرین کے مطابق ہے۔ ایک اور تفسیر یہ ہے: ”میں تو تمہارے جیسا ایک انسان ہوں، تمہارے کانوں اور آنکھوں کو کھولنا اور دلوں کے پردے دور کرنا تمہارے اختیار میں ہے اور نہ ہی میں اس کا مکلف ہوں، میری ذمہ داری وہ وحی الہی تم تک پہنچا دینا ہے جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے میری طرف کی جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ تمہارا سچا معبود بس ایک ہے۔ سوا اس کی طرف پوری طرح سیدھے ہو جاؤ اور اپنی گزشتہ اور موجودہ نافرمانیوں اور لغزشوں کی اس سے معافی مانگو۔“ (ابن عاشور) یہ تفسیر بھی بہت عمدہ ہے۔

﴿۶﴾ وَوَيْلٌ لِّلشِّرْکِیْنَ ۙ الَّذِیْنَ لَا یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوٰةَ: یعنی جو لوگ اللہ واحد اور اس کے رسول پر ایمان نہیں لاتے ان کے لیے بہت بڑی ہلاکت ہے۔ اگرچہ ان کی ہلاکت کے بے شمار اسباب ہیں، مگر یہاں ان میں سے تین بنیادی اسباب ذکر فرمائے، کیوں کہ سعادت کے بنیادی اسباب بھی تین ہیں، یعنی اللہ کا حق ادا کرنا، مخلوق کا حق ادا کرنا اور آخرت کا یقین رکھ کر اپنے اعمال کی جواب دہی کے لیے تیاری رکھنا۔ جس طرح سب سے اونچے اعمال یہ ہیں اسی طرح سب سے بڑی خیریت اور کمینگی بھی ان کا ادا نہ کرنا ہے۔ فرمایا، ان لوگوں کے لیے بہت بڑی ہلاکت ہے جو مشرک ہیں، اپنے مالک کے خدار ہیں، اللہ کی طرف سے مخلوق کے لیے عائد ہونے والا کم از کم فریضہ بھی ادا نہیں کرتے اور آخرت کے سرے ہی سے منکر ہیں، جس میں حساب ہوگا اور جس کے بعد زندگی دائمی اور ابدی ہے۔

﴿۷﴾ یہاں ایک سوال ہے کہ یہ سورت کئی ہے، جب کہ زکوٰۃ مدینہ میں فرض ہوئی۔ اس کے جواب میں بعض مفسرین نے فرمایا کہ

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ﴿۸﴾

بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے ان کے لیے ختم نہ کیا جانے والا اجر ہے ﴿۸﴾

زکوٰۃ کا لفظی معنی پاکیزگی ہے، اس لیے یہاں توحید کے اقرار کے ساتھ نفس کی پاکیزگی مراد ہے کہ مشرک کلمہ توحید کے ساتھ اپنے آپ کو پاک نہیں کرتے۔ مگر اس میں یہ اشکال ہے کہ اگر آیت کے الفاظ ”لَا يَأْتُونَ الزَّكَاةَ“ ہوتے تو اس معنی کی گنجائش تھی، ”لَا يُؤْتُونَ“ میں اس کی گنجائش مشکل ہے، کیونکہ اس کا معنی ہے ”وہ زکوٰۃ نہیں دیتے۔“ اس لیے طبری اور اکثر مفسرین بظن نے اسی معنی کو ترجیح دی ہے کہ وہ زکوٰۃ نہیں دیتے۔ رہا یہ سوال کہ مکہ میں تو زکوٰۃ فرض ہی نہیں ہوئی تھی، تو جواب اس کا یہ ہے کہ اگرچہ زکوٰۃ کا نصاب اور دورانیہ مدینہ میں مقرر ہوا مگر اصل زکوٰۃ اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ابتدائے اسلام ہی میں فرض تھا۔ ہرقل نے جب ابوسفیان سے پوچھا کہ وہ نبی تمہیں کیا حکم دیتا ہے تو انھوں نے کہا تھا: «يَأْمُرُنَا بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ وَالصَّبْرِ وَالْعِفَافِ» [بخاری، الزکوٰۃ، باب وجوب الزکوٰۃ، قول ج: ۱۳۹۵، تہذیباً] ”وہ نبی ہمیں نماز، زکوٰۃ، صلہ رحمی اور پاک دامنی کا حکم دیتا ہے۔“ اور ظاہر ہے کہ ابوسفیان نے وہی احکام ذکر کیے جو مکہ میں اس نے سنے۔ علاوہ ازیں مکی سورتوں میں جا بجا صدقے، زکوٰۃ اور کھتی میں سے حق ادا کرنے کا ذکر ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَأَتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ﴾ [الأعداء: ۱۴۱] ”اور اس کا حق اس کی کٹائی کے دن ادا کرو۔“ اور فرمایا: ﴿وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى ﴿۱﴾ الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّى ﴿۲﴾﴾ [تلاذ: ۱۷، ۱۸] ”اور عقرب اس سے وہ بڑا پرہیزگار دور رکھا جائے گا۔ جو اپنا مال (اس لیے) دیتا ہے کہ پاک ہو جائے۔“ اور فرمایا: ﴿وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّغْلُوبٌ ﴿۱﴾ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْزُورِ ﴿۲﴾﴾ [المعارج: ۲۴، ۲۵] ”اور وہ جن کے مالوں میں ایک مقرر حصہ ہے۔ سوال کرنے والے کے لیے اور (اس کے لیے) جسے نہیں دیا جاتا۔“ اور فرمایا: ﴿وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ مَا آتَوْا وَقُلُوبُهُمْ وَجَلَةٌ ﴿۱﴾ أَنَّهُمْ إِلَىٰ رَبِّهِمْ رَاجِعُونَ ﴿۲﴾﴾ [المؤمنون: ۶۰] ”اور وہ کہ انھوں نے جو کچھ دیا اس حال میں دیتے ہیں کہ ان کے دل ڈرنے والے ہوتے ہیں کہ یقیناً وہ اپنے رب ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔“ اور یہ تمام آیات مکی سورتوں کی ہیں۔ سورہ مزمل ابتدا میں اترنے والی مکی سورت ہے، اس کی آخری آیت میں اس کا صراحتاً ذکر ہے۔

معلوم ہوا کہ کفار توحید و رسالت پر ایمان کے علاوہ زکوٰۃ اور دوسرے احکام پر عمل کے بھی مکلف ہیں اور ان کی عدم ادائیگی پر بھی ان کو عذاب ہوگا۔ رہی یہ بات کہ ان کی نماز اور زکوٰۃ تو ایمان لانے کے بعد ہی معتبر ہوگی، پہلے اس کا فائدہ ہی نہیں، تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ انھیں نماز یا زکوٰۃ کا حکم نہیں، جیسا کہ نماز اسی وقت درست ہوگی جب وضو ہوگا، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ جب تک وضو نہ ہو نماز کا حکم ہی نہیں۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ مدثر (۳۹) کی تفسیر۔

آیت 8 إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ.....: ”مَمْنُونٍ“ ”مَنْ يَسُرُّ مَنَّا“ (ن) ”الْحَبْلُ“ ری کو کاٹ دینا۔ کفار کے ساتھ ہی ایمان اور عمل صالح والوں کا انجام ذکر فرمایا کہ ان کے لیے ایسا اجر ہے جو کبھی قطع نہیں کیا جائے گا۔ مراد جنت اور اس کی نعمتیں ہیں جو کبھی ختم یا کم ہونے والی نہیں، بلکہ دائمی اور ہر دن زیادہ ہونے والی ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿لَا

قُلْ اٰیٰتُكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَ تَجْعَلُوْنَ لَهَا اٰنْدَادًا ۗ ذٰلِكَ سَرَابٌ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۹﴾

کہہ کیا بے شک تم واقعی اس کا انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو دن میں پیدا کیا اور اس کے لیے شریک بناتے ہو؟ وہی سب جہانوں کا رب ہے ﴿۹﴾

نَفْطُوْعَةٍ وَّ لَا مَمْنُوْعَةٍ ﴿۱﴾ [الواقعة : ۳۳] ”(جنت کے پھل) نہ کبھی ختم ہوں گے اور نہ ان سے کوئی روک ٹوک ہوگی۔“ اور فرمایا: ﴿عَطَاءٌ غَيْرٌ مَّجْذُوْبٌ﴾ [ہود: ۱۰۸] ”ایسا عطیہ جو قطع کیا جانے والا نہیں۔“ اور فرمایا: ﴿اِنَّ هٰذَا لَیْرٰثُنَا مَا لٰهٖ مِنْ نَّفَاۡءٍ﴾ [ص: ۵۴] ”بلاشبہ یقیناً یہ ہمارا رزق ہے، جس کے لیے کسی صورت ختم ہونا نہیں ہے۔“

بعض مفسرین نے اس لفظ کو ”مَنْ یُّمْنُ مَنْتًا“ (احسان جتاناً) سے قرار دے کر مطلب یہ کیا ہے کہ جنت کی نعمتوں کا ان پر احسان نہیں جتایا جائے گا۔ مگر ابن کثیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ معنی درست نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ تو احسان جتلاتا ہے اور جتلانے کا اور یہ اس کا حق ہے، کیونکہ ایمان کی ہدایت اور توفیق اس نے عطا فرمائی، فرمایا: ﴿بِیْلِ اللّٰهِ یَمُنُّ عَلَیْكُمْ اَنْ هٰذٰلِکُمْ لِلْاٰیٰتِیْنَ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ﴾ [الحجرات : ۱۷] ”کہہ دے مجھ پر اپنے اسلام کا احسان نہ رکھو، بلکہ اللہ تم پر احسان رکھتا ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کے لیے ہدایت دی، اگر تم سچے ہو۔“ اور جنتی کہیں گے: ﴿فَمَنْ اللّٰهُ عَلَیْنَا وَ وَقَدْ نَا عَذَابَ السُّوْرِ﴾ [الطور : ۲۷] ”پھر اللہ نے ہم پر احسان کیا اور ہمیں زہریلی لو کے عذاب سے بچالیا۔“

آیت 9 : ﴿۱﴾ قُلْ اٰیٰتُكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ : مشرکین کا آخرت کا انکار ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے اس پر قادر ہونے، بلکہ ہر چیز پر قادر ہونے کے دلائل کا ذکر شروع فرمایا اور دلیل میں ان چیزوں کے پیدا کرنے کا ذکر فرمایا جو ان کی آنکھوں کے سامنے تھیں اور جن کا خالق وہ خود اللہ تعالیٰ کو مانتے تھے۔ بات کا آغاز ہمزہ استفہام، ”اِنَّ“ اور لام کی تاکید کے ساتھ ہوا ہے۔ اس میں ان کے شرک پر تعجب اور ڈانٹ بھی ہے اور اس بات کا اظہار بھی کہ یقیناً تم شرک کی کمینی حرکت کرتے ہو، حالانکہ کوئی عقل مند سوچ بھی نہیں سکتا کہ کوئی انسان زمین و آسمان کے خالق کے ساتھ کفر کرے گا اور اس کے ساتھ شریک بنائے گا۔ تعجب اور ڈانٹ کے ساتھ ساتھ زمین و آسمان کی تخلیق کی تاریخ بھی بیان فرمادی ہے۔ ہمزہ استفہام اور تاکید کے دونوں حرفوں کو ملحوظ رکھ کر ترجمہ کیا گیا ہے: ”کہہ کیا بے شک تم واقعی اس کا انکار کرتے ہو.....۔“

﴿۲﴾ لَتَكْفُرُوْنَ: یہاں ماضی کا صیغہ ”کَفَرْتُمْ“ (تم نے انکار کیا) لانے کے بجائے فعل مضارع ”لَتَكْفُرُوْنَ“ کا لفظ اس لیے استعمال فرمایا کہ صرف یہ نہیں کہ تم اس سے پہلے کفر کر بیٹھے جو کر بیٹھے، بلکہ اتنے دلائل دیکھ اور سن کر بھی کفر سے باز نہیں آئے، بلکہ کفر کرتے ہی چلے جاتے ہو۔

﴿۳﴾ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ: جب زمین و آسمان کو پیدا فرمایا اس وقت سورج کا وجود ہی نہیں تھا جس سے دن

وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبَرَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ
سَوَاءً لِنَسَائِلِنِ ⑩

اور اس نے اس میں اس کے اوپر سے گڑے ہوئے پہاڑ بنائے اور اس میں بہت برکت رکھی اور اس میں اس کی غذائیں اندازے کے ساتھ رکھیں، چار دن میں، اس حال میں کہ سوال کرنے والوں کے لیے برابر (جواب) ہے ⑩ رات وجود میں آتے ہیں، تو پھر دونوں سے کیا مراد ہے؟ اس کے لیے دیکھیے سورۃ اعراف کی آیت (۵۳) کی تفسیر۔

آیت 10 ⑩ وَ جَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ: "رَوَاسِيَ" کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۃ حجر (۱۹) اور سورۃ انبیاء (۳۱)۔

⑫ مِنْ فَوْقِهَا: اللہ تعالیٰ نے پہاڑ پورے کے پورے زمین کے اندر گاڑ دینے کے بجائے ان کا ایک حصہ زمین کے اوپر رکھا۔ اس میں بے شمار کھستیں اور آدمی کے لیے فائدے ہیں، کیونکہ اگر پہاڑ پورے ہی زمین کے اندر ہوتے تو آدمی برف کے ان ذخیروں سے فیض یاب نہ ہو سکتا جو پہاڑ محفوظ رکھتے ہیں اور نہ ہی جنگلوں اور دریاؤں کے یہ سلسلے ہوتے۔ اس کے علاوہ بے شمار سونے، چاندی اور دوسری دھاتوں، گیہوں اور ہیرے جو اہرات سے محروم رہتا جو وہ پہاڑوں کے زمین سے اوپر ہونے کی وجہ سے نکالتا ہے۔

⑬ وَ بَرَكَ فِيهَا: یعنی اس میں خیر کی بے شمار اشیاء کے خزانے رکھ دیے، جن میں درخت اور پودے بھی شامل ہیں۔ مٹی، پتھر، دھاتیں، گیہیں اور دوسرے وہ بے شمار عناصر بھی جو زمین میں موجود ہیں۔ چرند پرند، درندے اور آبی جانور بھی، پوری زمین کو گھیرے ہوئے ہوا بھی اور اس کے تقریباً ستر (۷۰) فی صد حصے پر مشتمل پانی بھی، جن پر زندگی کا دار و مدار ہے اور جن پر ہزاروں لاکھوں سال گزرنے کے باوجود کوئی کمی نہیں آئی، بلکہ ہر دن نئی سے نئی برکت کا ظہور ہوتا ہے۔ بتاؤ، اللہ کے سوا کون ہے جس نے ان میں سے ایک چیز ہی پیدا کی ہو، جس کی وجہ سے تم نے اسے اپنا حاجت روا اور خدا بنا لیا؟

⑭ وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا: "أَقْوَات" کی جمع ہے، غذا، خوراک اور روزی۔ زمین کی غذاؤں سے مراد اس میں رہنے والی تمام مخلوقات کی غذائیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کے لیے اس کے حسبِ حال اس کی ضرورت کے مطابق پورے اندازے کے ساتھ رکھ دیں، کسی مخلوق کی غذا کی کمی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دیکھیے سورۃ حجر (۱۹) (۲۱۵)۔

⑮ فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ: یہاں ایک سوال ہے کہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر مذکور ہے کہ زمین و آسمان کی پیدائش چھ دنوں میں ہوئی ہے۔ (دیکھیے اعراف: ۵۴، یونس: ۳، ہود: ۷، فرقان: ۵۹، سجدہ: ۳، ق: ۳۸، حدید: ۴) جب کہ ان آیات سے ان کی پیدائش آٹھ دنوں میں ظاہر ہو رہی ہے، اس لیے کہ پہلے زمین کو دو دنوں میں پیدا کرنے کا ذکر فرمایا، پھر چار دنوں میں اس کے اوپر پہاڑ گاڑنے اور اس میں غذائیں رکھنے کا ذکر فرمایا، اس کے بعد والی آیات میں دو دنوں میں آسمانوں کو پورا کرنے کا ذکر فرمایا، تو یہ کل آٹھ دن بنتے ہیں۔ جواب اس کا یہ ہے کہ زیر تفسیر آیت میں مذکور "أَرْبَعَةُ أَيَّامٍ" (چار دن) میں پہلے دو دن بھی شامل ہیں، یعنی زمین کی پیدائش اور اس میں پہاڑ گاڑنے اور غذائیں رکھنے کا مکمل چار دن میں ہوا۔ اس

ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ كَرْهًا قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ ﴿۱۱﴾ فَقَضَيْنَ سَبْعَ سِنَوَاتٍ فِي يَوْمَيْنِ وَأَوْحَىٰ فِي كُلِّ سَمَاءٍ أَمْرَهَا وَرَبُّنَا

پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ ایک دھواں تھا تو اس نے اس سے اور زمین سے کہا کہ آؤ خوشی سے یا مجبوری سے۔ دونوں نے کہا ہم خوشی سے آگئے ﴿۱۱﴾ تو اس نے انہیں دو دنوں میں سات آسمان پورے بنا دیا اور ہر آسمان میں اس کے کام کی وحی فرمائی اور ہم نے قریب کے آسمان کو چراغوں کے ساتھ زمینت دی اور خوب محفوظ کر دیا۔ یہ

کے بعد دو دنوں میں آسمانوں کی پیدائش کا کام پورا ہوا، یہ کل چھ دن بنتے ہیں۔ مفسر شنفیلڈ نے فرمایا: ”اس آیت کی یہ تفسیر جو ہم نے کی ہے اس کے علاوہ کوئی تفسیر کسی طرح بھی درست نہیں۔“

﴿۱۱﴾ سَوَاءٌ لِّلسَّامِيِّينَ: یعنی اللہ تعالیٰ نے روزی کا سوال کرنے والوں کے لیے، خواہ وہ زبان حال سے مانگیں یا زبان قال سے، ان کی خوراکیں پورے اندازے کے ساتھ زمین میں رکھ دی ہیں اور اس کا اندازہ کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔ مزید دیکھیے سورہ ابراہیم کی آیت (۳۳): ﴿وَإِنَّكُمْ فِينَا لَأَشْكُورٌ﴾ کی تفسیر۔ زمین و آسمان کی تمام مخلوق اپنی ہر ضرورت کا سوال اللہ تعالیٰ سے کر رہی ہے اور وہ ہر لمحے اسے پورا کر رہا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿يَسْأَلُهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلُّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ﴾ [الرحمن: ۲۹] ”اسی سے مانگتا ہے جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہے، ہر دن وہ ایک (نئی) شان میں ہے۔“

آیت ۱۱ ﴿۱۱﴾ ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ.....: ”استوای“ کے بعد ”إلى“ ہو تو اس کا معنی قصد کرنا ہوتا ہے۔ یعنی پھر اللہ نے آسمان کی طرف توجہ فرمائی، وہ اس وقت دھوئیں کی صورت میں تھا، تو اسے یعنی آسمان اور زمین دونوں سے کہا ”اِئْتِيَا“ (آ جاؤ) یعنی میرے حکم کی اطاعت کرو، خوشی سے کرو یا مجبوری سے، ہر حال میں کرنا پڑے گی۔

﴿۱۲﴾ قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ: ان دونوں نے کہا، ہم خوشی سے حاضر ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ کائنات میں جو چیزیں طبعی طور پر اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتی ہیں، مثلاً فرشتے اس کے حکم کے بغیر کوئی بات کرتے ہیں نہ کوئی کام، اسی طرح سورج، چاند، ستارے، بادل، ہوائیں، سمندر، نباتات اور حیوانات و جمادات، غرض ہر چیز اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق چل رہی ہے، ذرہ برابر ادھر ادھر نہیں ہوتی، تو یہ سب چیزیں مجبور ہو کر نہیں بلکہ اپنی رضا اور خوش دلی سے مالک کے حکم پر چل رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی فطرت ہی اسلام (فرماں برداری اور اطاعت) بنائی ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ زمین و آسمان کی ہر چیز اپنے رب کے احکام سننے، سمجھنے، ان کا جواب دینے اور ان پر عمل کرنے کی پوری سمجھ رکھتی ہے، خواہ ہم اسے ”لَا يَعْقِلُ“ (بے سمجھ) خیال کرتے رہیں، کیونکہ لفظ ”طَائِعِينَ“ (جمع مذکر سالم) عربی لغت میں ذوی العقول کے لیے آتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ ہم ان کی گفتگو یا تسبیح نہ سمجھ سکیں۔ مزید دیکھیے سورہ بنی اسرائیل (۴۳)۔

آیت ۱۲ ﴿۱۲﴾ فَقَضَيْنَ سَبْعَ سِنَوَاتٍ فِي يَوْمَيْنِ: یعنی اللہ تعالیٰ نے آسمان کو جو دخان کی صورت میں تھا، دو دنوں میں پورے سات آسمان بنا دیا۔

السَّمَاءِ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحٍ ۙ وَحِفْظًا ۚ ذَلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ﴿۱۳﴾ فَإِنْ أَعْرَضُوا
فَقُلْ أَنْذَرْتُكُمْ ضِعْفَةً مِثْلَ ضِعْفَةِ عَادٍ وَثَمُودَ ﴿۱۴﴾

اس کا اندازہ ہے جو سب پر غالب، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۱۳﴾ پھر اگر وہ منہ موڑ لیں تو کہہ دے میں نے تمہیں ایک ایسی کڑک سے خبردار کر دیا جو عاد اور ثمود کی کڑک جیسی ہوگی ﴿۱۴﴾

﴿۲﴾ وَ أَوْحَىٰ فِي كُلِّ سَمَاءٍ أَمْرَهَا: یعنی کائنات کے اس نظام میں ہر آسمان کی اور اس میں رہنے والی ہر مخلوق کی جو ذمہ داری تھی وہ اس کی طرف وحی فرمادی کہ تمہیں یہ کام کرنا ہے اور اس طرح کرنا ہے۔

﴿۳﴾ وَ زَيْنًا السَّمَاءِ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحٍ ۙ وَ حِفْظًا: ”حِفْظًا“ کا مفعول مطلق ہے جو یہاں مقدر ہے، اور اس کا عطف لفظ مقدر ”زِينَةٌ“ پر ہے جو ”زَيْنًا السَّمَاءِ الدُّنْيَا“ کا مفعول مطلق ہے۔ گویا اصل جملہ یہ تھا: ”وَ زَيْنًا السَّمَاءِ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحٍ زِينَةٌ وَ حِفْظًا بِهَا حِفْظًا.“ لفظ ”زَيْنًا“ کی دلالت کی وجہ سے ”زِينَةٌ“ کو حذف کر دیا اور ”حِفْظًا“ کی دلالت کی وجہ سے ”حِفْظًا بِهَا“ کو حذف کر دیا۔ اس طرح نہایت خوب صورتی کے ساتھ ایک ایسی بات مختصر لفظوں میں سمیٹ دی۔ یہ قرآن کی بلاغت ہے اور اسے احتیاط کہتے ہیں۔ (بہائی) ”حِفْظًا“ کے مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے ترجمہ کیا گیا ہے ”خوب محفوظ کر دیا۔“ اس زینت و حفاظت کی تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں سورہ حجر (۱۶ تا ۱۸)، صافات (۶ تا ۱۰) اور سورہ ملک (۵)۔ یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ ان آیات میں اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنا ذکر غالب کے صیغے ”بِالَّذِي خَلَقَ الْأَرْضَ“ کے ساتھ کیا ہے، ”زَيْنًا السَّمَاءِ“ میں متکلم کے صیغے کے ساتھ اور ”ذَلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ“ میں پھر غالب کے ساتھ فرمایا ہے، اسے التفات کہتے ہیں، اس سے کلام میں حسن پیدا ہوتا ہے اور کی حکمتیں بھی ملحوظ ہوتی ہیں۔

﴿۴﴾ ذَلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ: یہ سب اس ہستی کا اندازہ اور مقرر کردہ نظام ہے جو عزت و علم کے ساتھ پوری طرح موصوف ہے۔ وہ سب پر غالب ہے، کوئی اس پر غالب نہیں، وہ سب کچھ جاننے والا ہے۔ گزشتہ، موجودہ یا آئندہ کوئی بھی چیز اس سے مخفی نہیں، اس لیے اس کے اس نظام میں کوئی غلطی، کوئی حادثہ نہیں اور کسی اور کا اس نظام میں ذرہ برابر دخل نہیں۔ سلسلہ کلام ”قُلْ أَنْذَرْتُكُمْ لَتَكْفُرُونَ بِالَّذِي خَلَقَ الْأَرْضَ فِي يَوْمَيْنِ“ سے شروع ہوا تھا اور ”ذَلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ“ پر ختم ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ پوری کائنات جس نے چھ دن میں پیدا فرمائی، اس میں موجود ہر چیز حتیٰ کہ تمہیں اور ان چیزوں کو بھی پیدا کیا جنہیں تم نے معبود بنا رکھا ہے، کیا تم اس عظیم ہستی کے ساتھ کفر کرتے ہو اور اس کے ساتھ شریک بناتے ہو جس نے یہ سب کچھ کیا ہے؟

آیت 13 : فَإِنْ أَعْرَضُوا فَقُلْ أَنْذَرْتُكُمْ : ”ضِعْفَةً“ کی وضاحت کے لیے دیکھیے سورہ رعد (۱۳)۔ سورت کی

إِذْ جَاءَهُمُ الرُّسُلُ مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَ مِنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ ۖ قَالُوا لَوْ
شَاءَ رَبُّنَا لَأَنْزَلَ مَلَكًا فَأِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُمْ بِهِ كَافِرُونَ ﴿۱۴﴾ فَأَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوا فِي الْأَرْضِ
بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوا مَنْ أَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ۖ أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللَّهَ الَّذِي خَلَقَهُمْ هُوَ
أَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً ۖ وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يَجْحَدُونَ ﴿۱۵﴾

جب ان کے پاس ان کے رسول ان کے سامنے سے اور ان کے پیچھے سے آئے کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت مت
کرو، انھوں نے کہا اگر ہمارا رب چاہتا تو ضرور کوئی فرشتے نازل کر دیتا، پس بے شک ہم اس سے جو دے کر تم بھیجے
گئے ہو، منکر ہیں ﴿۱۴﴾ پھر جو عادت تھے وہ زمین میں کسی حق کے بغیر بڑے بن بیٹھے اور انھوں نے کہا ہم سے قوت میں
کون زیادہ سخت ہے؟ اور کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ وہ اللہ جس نے انھیں پیدا کیا، قوت میں ان سے کہیں زیادہ
سخت ہے اور وہ ہماری آیات کا انکار کیا کرتے تھے ﴿۱۵﴾

ابتدائی آیات (۳، ۵) میں اللہ کی کتاب سے اکثر لوگوں کے اعراض کا ذکر فرمایا، اس کے بعد چھ دنوں میں زمین و آسمان کی
تخلیق کی تفصیل بیان فرمائی، اب فرمایا کہ اگر یہ لوگ اب بھی نہ مانیں کہ معبود برحق صرف ایک ہے، جس نے یہ زمین و آسمان
اور ساری کائنات بنائی ہے اور اس حقیقت سے اعراض پراڑے رہیں، تو ان سے کہہ دیں کہ تم سے پہلے بھی کئی اقوام نے یہ
روش اختیار کی جو تم اختیار کر رہے ہو۔ سو میں تمہیں اس جیسے عذاب اور کڑکنے والی بجلی سے ڈراتا ہوں جو تم سے پہلی اقوام عادی
شمود پر گری تھی۔ عاد و ثمود کے تعارف کے لیے دیکھیے سورۃ اعراف (۶۵ تا ۷۹)۔

آیت 14 ﴿۱۴﴾ إِذْ جَاءَهُمُ الرُّسُلُ مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَ مِنْ خَلْفِهِمْ : دونوں قوموں کی طرف آنے والے دو رسولوں
ہو اور صالح عليه السلام کے لیے جمع کا لفظ استعمال فرمایا ہے، یا مراد دونوں پیغمبروں میں سے ہر ایک کے ساتھ پیغام حق پہنچانے والے
مومن بھی ہیں، جنھوں نے ہر طرح اور ہر جانب سے آکر انھیں اللہ کا پیغام پہنچایا۔ آگے پیچھے سے مراد ہر طرف سے اور ہر
طرح سے آکر سمجھانا ہے، جیسا کہ ایلین نے کہا تھا: ﴿ثُمَّ لَا تَبَيِّنُهُمْ مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَ مِنْ خَلْفِهِمْ وَ عَنْ أَيْمَانِهِمْ وَ
عَنْ شَمَائِلِهِمْ وَ لَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِينَ﴾ [الأعراف: ۱۷] ”پھر میں ہر صورت ان کے آگے سے اور ان کے
پیچھے سے اور ان کی دائیں طرفوں سے اور ان کی بائیں طرفوں سے آؤں گا اور تو ان کے اکثر کو شکر کرنے والے نہیں پائے گا۔“
﴿۱۵﴾ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ : ”اَلَا“ ”أَنْ لَا“ ہے، اس میں ”أَنْ“ تفسیر یہ ہے، یعنی تمام رسولوں کی دعوت یہ تھی کہ اللہ کے سوا
کسی کی عبادت مت کرو۔

﴿۱۴﴾ قَالُوا لَوْ شَاءَ رَبُّنَا لَأَنْزَلَ مَلَكًا : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۃ ابراہیم (۱۰، ۹) اور سورۃ بنی اسرائیل (۹۳، ۹۵)۔
آیت 15 ﴿۱۵﴾ فَأَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوا فِي الْأَرْضِ : اللہ تعالیٰ نے قوم عاد کو ایسے لمبے قد، جسمانی قوت اور دنیوی

فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا فِي أَيَّامٍ نَحْسَاتٍ لِنَدْرِقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَعَذَابَ الْآخِرَةِ أَخْزَىٰ وَهُمْ لَا يُنصَرُونَ ﴿۱۶﴾

تو ہم نے ان پر ایک سخت تند ہوا چند منحوس دنوں میں بھیجی، تاکہ ہم انہیں دنیا کی زندگی میں ذلت کا عذاب چکھائیں اور یقیناً آخرت کا عذاب زیادہ رسوا کرنے والا ہے اور ان کی مدد نہیں کی جائے گی ﴿۱۶﴾

ترقی کے اسباب عطا فرماتے تھے کہ اس کے فرمان کے مطابق اس جیسی کوئی قوم پیدا ہی نہیں کی گئی، فرمایا: ﴿اللَّهُ تَزَكَّىٰ كَيْفَ صَلَّىٰ رَبُّكَ بِعَادِ ۖ إِزْمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۖ الَّتِي لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ﴾ [الصحر: ۶ تا ۸] ”کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے رب نے عاد کے ساتھ کس طرح کیا۔ (وہ عاد) جو ارم (قبیلہ کے لوگ) تھے، ستونوں والے۔ وہ کہ ان جیسا کوئی شہروں میں پیدا نہیں کیا گیا۔“ اور فرمایا: ﴿اَتَّبَعُونَ بِكُلِّ رِيحٍ آيَةً تَعْبَثُونَ ۖ وَ تَتَّخِذُونَ تَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَتَّخِذُونَ ۖ وَإِذَا بَطِشْتُمْ بَطِشْتُمْ جَبَّارِينَ﴾ [الشعراء: ۱۲۸ تا ۱۳۰] ”کیا تم ہر اونچی جگہ پر ایک یادگار بناتے ہو؟ اس حال میں کہ لا حاصل کام کرتے ہو۔ اور بڑی بڑی عمارتیں بناتے ہو، شاید کہ تم ہمیشہ رہو گے۔ اور جب تم پکڑتے ہو تو بہت بے رحم ہو کر پکڑتے ہو۔“ جب ہو دیکھا، نے انہیں توحید کی دعوت دی تو انہوں نے یہ جان لینے کے باوجود کہ وہ اللہ کے سچے رسول ہیں، محض اپنی بڑائی اور سرداری کے گمان میں انہیں جھٹلا دیا، کیونکہ انہیں رسول ماننے کی صورت میں ان کی اطاعت اختیار کرنا پڑتی تھی، جس کے لیے وہ تیار نہ تھے۔

﴿۱۶﴾ وَ قَالُوا مَنْ أَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً: جب ہو دیکھا، نے انہیں اللہ کے عذاب سے ڈرایا تو وہ کہنے لگے کہ ہم سے زیادہ قوت والا کون ہے جس سے ہم خوف کھائیں؟ ہم آنے والا ہر عذاب بنا سکتے ہیں۔ آج کل بھی ملحد لوگ آسمانی آفات کے متعلق کہتے ہیں کہ ہم ان کا مقابلہ کریں گے۔ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں: ”ان کے جسم بڑے بڑے ہوتے تھے، بدن کی قوت پر غرور آیا، غرور کا دم بھرنا اللہ کے ہاں وبال لاتا ہے۔“ (موضح)

﴿۱۷﴾ أَوْ لَمْ يَرَوْا أَنَّ اللَّهَ الَّتِي خَلَقَهُمْ : ”أَوْ لَمْ يَرَوْا“ کا معنی ”أَوْ لَمْ يَعْلَمُوا“ ہے، یہ روایت علمی ہے۔ یعنی کیا انہیں معلوم نہ تھا کہ وہ کتنی قوت والے تھے، اس اللہ سے زیادہ قوت والے نہیں ہو سکتے جس نے انہیں پیدا کیا؟ یقیناً انہیں یہ معلوم تھا، استفہام انکاری ہے۔

﴿۱۸﴾ وَ كَانُوا يَأْتِيَنَّا يَجْعَلُونَ: ”جَعْلُونَ“ کا معنی ”جاننے کے باوجود انکار کرنا“ ہے۔ یعنی دل میں ان کا حق ہونا سمجھتے تھے، مگر ضد اور عناد کی وجہ سے انکار کرتے چلے جاتے تھے۔ آیات سے مراد انبیاء پر نازل ہونے والی آیات بھی ہیں، ان کے معجزات بھی اور کائنات میں اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی قدرت کی پھیلی ہوئی بے شمار نشانیاں بھی۔

آیت 16 ﴿۱﴾ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا: ”صَرْصَرًا“ (صاد پر کسرہ) سے ہے، سردی کی شدت جو

بدن سکیز کر رکھ دے، یعنی شدید ٹھنڈی ہوا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿كَشَّالٌ رِيحٌ فِيهَا صَرْصَرٌ﴾ [آل عمران: ۱۱۷]

وَأَمَّا شُمُودٌ فَهَدَيْنَهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَنَىٰ عَلَى الْهُدَىٰ فَأَخَذَتْهُمُ صِعْقَةُ الْعَذَابِ الْهُونِ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿۱۷﴾

اور جو شمود تھے تو ہم نے انھیں سیدھا راستہ دکھایا مگر انھوں نے ہدایت کے مقابلہ میں اندھا رہنے کو پسند کیا تو انھیں ذلیل کرنے والے عذاب کی کڑک نے پکڑ لیا، اس کی وجہ سے جو وہ کماتے تھے ﴿۱۷﴾

”اس ہوا کی مثال جیسی ہے جس میں سخت سردی ہے۔“ یا ”صَرَوة“ سے ہے، جس کا معنی ”خوفناک چیخ“ ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿فَأَقْبَلَتْ امْرَأَتُهُ فِي صَرَوةٍ﴾ [الذاریات : ۲۹] ”تو اس کی بیوی چیختی ہوئی آگے بڑھی۔“ یہاں دونوں معنی اکٹھے ملحوظ ہیں کہ وہ ہوانہایت ٹھنڈی اور خوفناک چیخ جیسی آواز والی تھی۔ ”صَرَوة“ میں حروف مکرر ہونے سے معنی میں مبالغہ پیدا ہو گیا ہے، یعنی ہم نے ان پر نہایت خوفناک آواز والی شدید ٹھنڈی تیز و تند آندھی بھیجی اور اسی ہوا کو جو ان کی زندگی کے قیام اور دل کی راحت کا باعث تھی اور جسے وہ بالکل معمولی اور بے ضرر سمجھتے تھے، ان کی ہلاکت کا سامان بنا دیا اور ان کی کوئی قوت انھیں بچانہ سکی۔

﴿۲﴾ فِي أَيَّامٍ نَّحْسَاتٍ: ”نَحْسَاتٍ“ ”نَحْسُ“ (نون کے فتح اور حاء کے سکون کے ساتھ) کی جمع ہے، جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿فِي يَوْمٍ نَّحْسٍ مُّسْتَبْرَءٍ﴾ [القمر : ۱۹] ”ایسے دن میں جو دائمی نحوست والا تھا۔“ ”نَحْسُ“ اور ”مَنْحُوسٌ“ (بد قسمتی والا) ”سَعْدٌ“ (خوش قسمتی والا) کی ضد ہے۔ فی الحقیقت اپنی ذات میں کوئی چیز منحوس نہیں، یہ صرف اضافی چیز ہے، یعنی ایک ہی شے کسی کے حق میں خوش قسمتی کا باعث ہوتی ہے اور کسی کے حق میں بد قسمتی کا، جیسا کہ آندھی کے یہ ایام قوم عاد کے حق میں منحوس تھے مگر ہود علیہ السلام اور ایمان والوں کے لیے ان دنوں سے زیادہ خوش قسمتی والا دن اور کون سا ہو گا۔ اس آندھی کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ اعراف (۷۲)، قمر (۱۸)، ذاریات (۴۱، ۴۲) اور سورہ حاقہ (۸۲۶)۔ بعض مسلمان کہلانے والے بھی بعض دنوں کو منحوس سمجھتے ہیں، جیسے دس محرم، کیونکہ اس میں حسین رضی اللہ عنہ شہید ہوئے، حالانکہ اس دس محرم کو موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو نجات حاصل ہوئی، جس کی خوشی میں رسول اللہ ﷺ روزہ رکھتے تھے۔ بعض لوگ صفر کے کچھ دنوں کو منحوس سمجھتے ہیں، حالانکہ ایسا عقیدہ باطل ہے۔

﴿۳﴾ لِيَذُنَّ يَوْمَهُمْ عَذَابَ الْغِيظِ فِي الْحَيَوةِ الدُّنْيَا: یہ ذلت و رسوائی ان کے غرور اور تکبر کا جواب تھا کہ وہی زمین جس پر وہ بڑے بنے ہوئے تھے اسی پر ان کے بے جان لاشے کھجور کے کھوکھلے تنوں کی طرح گرے پڑے تھے۔

﴿۴﴾ وَالْعَذَابُ الْآخِرَةُ أَكْزَرَىٰ : یقیناً آخرت کا عذاب زیادہ رسوائی والا ہے، اس لیے کہ وہ تمام پہلے اور پچھلے لوگوں کے سامنے ہوگا، پھر دنیا میں تو ظاہری اسباب کے ساتھ شاید کوئی مدد کے لیے پہنچ جائے، وہاں اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر دنیا کی رسوائی تو ایک وقت تک ہے، جب کہ وہاں کی رسوائی ہمیشہ کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس ذلت و رسوائی سے محفوظ رکھے۔ آمین!

آیت 17 ﴿۱۷﴾ وَأَمَّا شُمُودٌ فَهَدَيْنَهُمْ : قوم شمود کے تعارف کے لیے دیکھیے سورہ اعراف (۷۲-۷۳)۔ ہدایت کی

وَنَجِّنَا الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ﴿۱۸﴾ وَيَوْمَ يُحْشَرُ أَعْدَاءُ اللَّهِ إِلَى النَّارِ فَهُمْ
يُوزَعُونَ ﴿۱۹﴾

اور ہم نے ان لوگوں کو بچالیا جو ایمان لائے اور بچا کرتے تھے ﴿۱۸﴾ اور جس دن اللہ کے دشمن آگ کی طرف اکٹھے کیے جائیں گے، پھر ان کی الگ الگ قسمیں بنائی جائیں گی ﴿۱۹﴾

تفسیر کے لیے سورہ فاتحہ کی آیت: ﴿إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔ یعنی ہم نے انہیں راہِ حق دکھا دیا، مگر انہوں نے ہدایت قبول کرنے کے بجائے اندھا اور گمراہ رہنے کو ترجیح دی۔

﴿۲﴾ فَأَخَذْتَهُمْ صِيعَةً الْعَذَابِ الْهُونِ.....: ”الْهُونُ“ اور ”الْهَوَانُ“ معنی ذلت، یہ مصدر بمعنی اسم فاعل برائے مبالغہ ہے۔ غم و پر آنے والے عذاب کو کہیں ”الرَّجْفَةُ“ (زلزلہ) کہا گیا ہے، کہیں ”الصَّيْحَةُ“ (سخت چیخ) یہاں اسے بجلی کی کڑک کہا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ ایک سخت چیخ تھی جس میں بجلی کی کڑک اور شعلہ تھا، ساتھ ہی شدید زلزلہ تھا جس سے ان کے جگر پھٹ گئے اور سب کے سب ہلاک ہو گئے۔ یہ ذلت کا عذاب ان کے اعمالِ بد کا انجام تھا۔

آیت 18 : ﴿وَنَجِّنَا الَّذِينَ آمَنُوا.....﴾: یہ اللہ تعالیٰ کی عجیب و غریب قدرت ہے کہ اتنے شدید عذاب، زلزلے، خوف ناک چیخ اور بجلیاں چمکنے اور گرنے کے باوجود کسی مسلمان کا بال تک بیکار نہیں ہوا، وہ سب اللہ کے فضل سے صحیح سلامت رہے۔

آیت 19 : ﴿۱﴾ وَيَوْمَ يُحْشَرُ أَعْدَاءُ اللَّهِ إِلَى النَّارِ : لفظ ”يَوْمَ“ ”أَذْكَرُ“ کا مفعول ہے جو یہاں مقدر ہے۔ یہاں ایک سوال ہے کہ واؤ کا عطف کس پر ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ اس سے پہلے انبیاء کو جھٹلانے والے مکرمین پر دنیا میں آنے والے عذابوں کا ذکر فرمایا تھا، اب آخرت میں ان کے ہونے والے حال کا ذکر فرمایا۔ چنانچہ آخرت کا حال یاد دلانے والے اس جملے کا عطف اس مقدر جملے پر ہے جس میں ان پر دنیا میں آنے والے عذاب یاد دلانے گئے ہیں۔ گویا اصل عبارت یہ تھی: ”أَذْكَرُ أَيَّامَ أَعْدَاءِ اللَّهِ فِي الدُّنْيَا فِي أَنْزَالِ الْعَذَابِ لَهُمْ وَأَذْكَرُ يَوْمَ يُحْشَرُونَ إِلَى النَّارِ.“ یعنی ”انہیں اللہ کے دشمنوں پر دنیا میں آنے والے عذابوں کی یاد دہانی کرو اور انہیں وہ دن یاد دلا جب وہ آگ کی طرف اکٹھے کیے جائیں گے۔“ آیات کی ابتدا میں آنے والی واؤ عاطفہ کی مناسبت ہر جگہ ”نَظْمُ الدَّرَجِ فِي تَنَاسُبِ الْآيَاتِ وَالسُّورِ“ کے مصنف نے نہایت عمدہ بیان فرمائی ہے۔ میں نے اختصار کے پیش نظر صرف چند ایک مقامات پر اس کا ذکر کیا ہے، اصحابِ ذوقِ اصل کتاب سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

﴿۲﴾ فَهُمْ يُوزَعُونَ: ”وَزَعٌ يَزْعُ“ کا اصل معنی روکنا، ترتیب دینا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن اللہ کے دشمنوں کو آگ کی طرف اکٹھا کر کے لے جایا جائے گا اور انہیں اس طرح اکٹھا کیا جائے گا کہ آگے والوں کو آگے جانے سے اور پیچھے والوں کو پیچھے جانے سے روک کر اکٹھا کر لیا جائے گا، پھر ان کی الگ الگ ترتیب لگائی جائے گی، ان کے جرائم کے مطابق ان کی

حَتَّىٰ إِذَا مَا جَاءُوهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَأَبْصَارُهُمْ وَجُلُودُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۲۰﴾
 وَقَالُوا لِيُجُودَهُمْ لِمَ شَهِدْتُمْ عَلَيْنَا ۗ قَالُوا أَنْطَقَنَا اللَّهُ الَّذِي أَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَهُوَ
 خَلَقَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿۲۱﴾ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَرْوْنَ أَنْ يَشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ
 وَلَا أَبْصَارُكُمْ وَلَا جُلُودُكُمْ وَلَكِنْ ظَنَنْتُمْ أَنَّ اللَّهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيرًا مِمَّا تَعْمَلُونَ ﴿۲۲﴾

یہاں تک کہ جوں ہی اس کے پاس پہنچیں گے ان کے کان اور ان کی آنکھیں اور ان کے چمڑے ان کے خلاف اس کی شہادت دیں گے جو وہ کیا کرتے تھے ﴿۲۰﴾ اور وہ اپنے چمڑوں سے کہیں گے تم نے ہمارے خلاف شہادت کیوں دی؟ وہ کہیں گے ہمیں اس اللہ نے بلوایا جس نے ہر چیز کو بلوایا اور اسی نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا اور اسی کی طرف تم واپس لائے جا رہے ہو ﴿۲۱﴾ اور تم اس سے پردہ نہیں کرتے تھے کہ تمہارے خلاف تمہارے کان گواہی دیں گے اور نہ تمہاری آنکھیں اور نہ تمہارے چمڑے اور لیکن تم نے گمان کیا کہ بے شک اللہ بہت سے کام، جو تم کرتے ہو، نہیں جانتا ﴿۲۲﴾

تولیاں بنائی جائیں گی اور انہیں دھکیل کر جہنم کی طرف لے جایا جائے گا۔ دیکھیے سورہ حم السجدہ (۱۹) اور سورہ صافات (۲۲ تا ۲۶)۔

آیت 20 ﴿ حَتَّىٰ إِذَا مَا جَاءُوهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ ﴾: زخشری نے فرمایا: ”إِذَا“ کے بعد لفظ ”فَا“ اس کی تاکید کے لیے ہے، تاکید کا مطلب یہ ہے کہ آگ کے پاس پہنچنے کا وقت ہی ان پر شہادت کا وقت ہوگا، یہ نہیں کہ کچھ وقت شہادت سے خالی ہو۔“ (کشاف) اس لیے میں نے ”إِذَا مَا“ کا ترجمہ ”جوں ہی“ کیا ہے۔ یعنی آگ کے پاس پہنچنے پر جب وہ اپنے جرائم سے انکار کریں گے تو فوراً ہی ان کے کان، آنکھیں اور چمڑے ان کے خلاف شہادت دیں گے۔ اس کی تفصیل سورہ لیس کی آیت (۶۵): ﴿ أَلَيْسَ نَحْنُ عَلَىٰ أَفْوَاهِهِمْ ﴾ میں گزر چکی ہے۔

آیت 21 ﴿ ۱ ﴾ ﴿ وَقَالُوا لِيُجُودَهُمْ لِمَ شَهِدْتُمْ عَلَيْنَا: اپنے چمڑوں سے یہ بات وہ پوچھنے کے لیے نہیں بلکہ تعجب کے اظہار اور ملامت کے لیے کہیں گے کہ تمہیں کو بچانے کے لیے تو ہم اللہ تعالیٰ سے جھوٹ بول رہے تھے اور تمہی ہمارے خلاف شہادت دے رہے ہو۔

﴿ ۲ ﴾ ﴿ قَالُوا أَنْطَقَنَا اللَّهُ الَّذِي أَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ: اعضا ان کے تعجب اور ملامت دونوں کا جواب دیں گے۔ تعجب کا جواب تو یہ دیں گے کہ ہمارا بولنا کوئی تعجب کی بات نہیں، زبان بولتی تھی تو اللہ کے حکم سے اور اس کے گویائی عطا کرنے سے بولتی تھی، اسی

طرح ہر بولنے والی چیز اسی کے حکم سے بولتی ہے، تو اب اس نے ہمیں بلوایا تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے؟

﴿ ۳ ﴾ ﴿ وَهُوَ خَلَقَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ: یہ چمڑوں کا کلام بھی ہو سکتا ہے اور آخرت کے منکروں سے اللہ تعالیٰ کا خطاب بھی ہو سکتا ہے۔

آیت 22 ﴿ ۱ ﴾ ﴿ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَرْوْنَ أَنْ يَشْهَدَ عَلَيْكُمْ ﴾: یہ ان کی ملامت کا جواب ہے کہ تم گناہ کا کام

وَذَلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِي ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ أَرْدَاكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ مِنَ الْخَاسِرِينَ ﴿۲۲﴾

اور یہی تمہارا گمان تھا جو تم نے اپنے رب کے بارے میں کیا، اسی نے تمہیں ہلاک کر دیا، سو تم خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہو گئے ﴿۲۲﴾

کرتے ہوئے لوگوں سے چھپنے اور پردہ کرنے کا تو پورا اہتمام کرتے تھے، مگر تمہیں اس بات کا خوف نہ تھا کہ تمہارے کان، آنکھیں اور چمڑے ہی تمہارے خلاف تمہارے اعمال بد کی شہادت دیں گے۔ اگر تمہیں اس بات کا خوف ہوتا تو تم برے اعمال کر ہی نہیں سکتے تھے، کیونکہ انہی اعضا کے ساتھ ہی تو تم نے اللہ کی نافرمانی کرنا تھی۔

﴿۲﴾ وَلَكِنْ ظَنَنْتُمْ أَنَّ اللَّهَ لَا يَعْلَمُ یعنی بات صرف اتنی نہ تھی کہ تمہیں یقین نہ تھا کہ قیامت قائم ہو سکتی ہے اور تمہارے اعضا تمہارے خلاف گواہی دے سکتے ہیں، بلکہ اصل بات یہ تھی کہ تم اللہ تعالیٰ کے علم کے بھی منکر تھے، تم نے سمجھا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے بہت سے اعمال کو جانتا ہی نہیں۔ ورنہ اگر تمہیں یقین ہوتا کہ تم جو کچھ کر رہے ہو اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہے، تمہاری ہر بات سن رہا ہے اور تمہارے ہر حال کا علم رکھتا ہے تو تم گناہ پر اتنے دلیر نہ ہوتے۔ مشرکین قریش کی اس نادانی کا ذکر عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے، وہ فرماتے ہیں: «اجْتَمَعَ عِنْدَ النَّبِيِّ قُرَيْشِيَّانِ وَتَقَفِيَّ، أَوْ تَقَفِيَّانِ وَقُرَيْشِيَّ، كَثِيرَةٌ شَحْمٌ بَطُونِيهِمْ، قَلِيلَةٌ فِغْفَةٌ قَلْبُونِيهِمْ، فَقَالَ أَحَدُهُمْ أَتُرَوْنَ أَنَّ اللَّهَ يَسْمَعُ مَا نَقُولُ؟ قَالَ الْآخَرُ يَسْمَعُ إِنْ جَهَرْنَا وَلَا يَسْمَعُ إِنْ أَخْفَيْنَا، وَقَالَ الْآخَرُ إِنْ كَانَ يَسْمَعُ إِذَا جَهَرْنَا فَإِنَّهُ يَسْمَعُ إِذَا أَخْفَيْنَا، فَأَنْزَلَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ: ﴿وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُونَ أَنْ يَشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ وَلَا أَبْصَارُكُمْ وَلَا جُلُودُكُمْ وَلَكِنْ ظَنَنْتُمْ أَنَّ اللَّهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيرًا مِمَّا تَعْمَلُونَ﴾» [بخاری، التفسیر، سورة حم السجدة، باب: ﴿وَذَلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِي ظَنَنْتُمْ أَنَّ اللَّهَ لَا يَعْلَمُ﴾ ۴۸۱۷]۔

”بیت اللہ کے پاس دو قریشی اور ایک ثقفی یا دو ثقفی اور ایک قریشی جمع ہوئے، جن کے پیٹ کی چربی بہت تھی، (مگر) دلوں کی سمجھ بہت کم تھی۔ تو ان میں سے ایک نے کہا: ”کیا تمہارا خیال ہے کہ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں اسے اللہ تعالیٰ سن رہا ہے؟“ دوسرے نے کہا: ”اگر ہم اونچی آواز سے کہیں تو وہ سنتا ہے اور اگر آہستہ کہیں تو نہیں سنتا۔“ ایک اور بولا: ”اگر وہ اس وقت سنتا ہے جب ہم اونچی آواز سے بات کریں تو یقیناً وہ اس وقت بھی سنتا ہے جب ہم آہستہ بات کریں۔“ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتار دی: ”اور تم اس سے پردہ نہیں کرتے تھے کہ تمہارے خلاف تمہارے کان گواہی دیں گے اور نہ تمہاری آنکھیں اور نہ تمہارے چمڑے اور لیکن تم نے گمان کیا کہ بے شک اللہ بہت سے کام، جو تم کرتے ہو، نہیں جانتا۔“

یاد رہے کہ اس بات کا مطلب کہ یہ آیت فلاں موقع پر اتری، یہ ہوتا ہے کہ یہ واقعہ بھی انہی دنوں میں ہوا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں موقع پر یہ آیت پڑھی، یا یہ کہ وہ آیت اس واقعہ پر بھی منطبق ہوتی ہے، جیسا کہ اصول تفسیر میں واضح کیا گیا ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ آیات کا سیاق تو قیامت کے دن کے متعلق ہے۔

﴿۲۲﴾ وَذَلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِي ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ: ”ذَلِكُمْ“ کی خبر ”ظَنُّكُمْ“ معرف ہونے کی وجہ سے ترجمہ

فَإِنْ يَصْبِرُوا فَالْتَأَرْ مَثْوَى لَهُمْ وَإِنْ يَسْتَعْتَبُوا فَمَا هُمْ مِنَ الْمُعْتَبِينَ ﴿۲۴﴾ وَقَيِّضْنَا لَهُمْ قُرَنَاءَ فَزَيَّنُوا لَهُمْ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ إِنَّهُمْ كَانُوا خَاسِرِينَ ﴿۲۵﴾

پس اگر وہ صبر کریں تو آگ ان کے لیے ٹھکانا ہے اور اگر وہ معافی کی درخواست کریں تو وہ معاف کیے گئے لوگوں سے نہیں ہیں ﴿۲۴﴾ اور ہم نے ان کے لیے کچھ ساتھی مقرر کر دیے تو انھوں نے ان کے لیے ان کے سامنے اور ان کے پیچھے جو کچھ تھا، خوش نما بنا دیا اور ان پر بات ثابت ہوگئی، ان قوموں کے ساتھ ساتھ جو جنوں اور انسانوں میں سے ان سے پہلے گزر چکی تھیں، بے شک وہ خسارہ اٹھانے والے تھے ﴿۲۵﴾

”یہی تمہارا گمان تھا“ کیا گیا ہے۔ ”أَزْدَى يُرْدَى“ (افعال) ہلاک کرنا۔ یعنی تمہارے اسی باطل گمان اور غلط عقیدے نے کہ اللہ تعالیٰ کو تمہارے بہت سے اعمال کا علم نہیں ہوتا، تمہیں ہلاک کر دیا، کیونکہ اس سے تم اس کی نافرمانی پر دلیر ہو گئے اور خسارہ پانے والوں میں سے ہو گئے۔

یاد رہے کہ گمراہی کے اسباب میں سے بہت بڑا سبب صحیح غور و فکر نہ کرنا اور محض گمان کے پیچھے چلتے رہنا ہے۔ مشرکین کی اصل گمراہی بھی یہی تھی، جیسا کہ فرمایا: ﴿إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ﴾ [الأنعام: ۱۱۶] ”وہ تو گمان کے سوا کسی چیز کی پیروی نہیں کرتے۔“ اور فرمایا: ﴿يُظَاهِنُونَ بِاللَّهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ﴾ [آل عمران: ۱۵۴] ”وہ اللہ کے بارے میں ناحق جاہلیت کا گمان کر رہے تھے۔“

آیت 24 : فَإِنْ يَصْبِرُوا فَالْتَأَرْ مَثْوَى لَهُمْ : یعنی دنیا میں کئی مصیبتیں صبر کرنے سے ٹل جاتی ہیں یا آسان ہو جاتی ہیں اور بعض مصیبتیں نہیں کرنے سے ٹل جاتی ہیں، لیکن وہاں کا فر صبر کریں یا نہ کریں ان کے لیے جہنم ٹھکانا طے ہو چکا اور منتیں جتنی چاہیں کریں کوئی قبول نہیں ہوگی۔

آیت 25 : ﴿۱﴾ وَقَيِّضْنَا لَهُمْ قُرَنَاءَ.....: ”قُرَنَاءَ“ ”قَرِينٌ“ کی جمع ہے، ساتھ رہنے والا۔ ”الْقَبِيضُ“ انڈے کے چھلکے کو کہتے ہیں۔ یعنی جس طرح چھلکا انڈے کے ساتھ پیوست ہوتا ہے اسی طرح ہم نے ایسے برے لوگ ان مشرکین کے ساتھ لگا دیے جو ان کے ساتھ اس طرح چمٹے رہتے ہیں جس طرح انڈے کا چھلکا چمٹا رہتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ اگر انسان برا ہو تو اسے ساتھی بھی برے میسر آتے ہیں، جو اسے سبز باغ دکھاتے رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ انسان برائیوں میں گن ہو جاتا ہے اور آخر کار خود کو اپنے ساتھیوں سمیت لے ڈرتا ہے۔ مزید دیکھیے سورۃ زخرف (۳۶) اور سورۃ ق (۲۳/۲۴)۔

﴿۲﴾ فَزَيَّنُوا لَهُمْ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ.....: ”مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ“ سے مراد وہ اعمال ہیں جو وہ دنیا میں کر رہے تھے اور ”وَمَا خَلْفَهُمْ“ سے مراد وہ اعمال بد ہیں جو اس سے پہلے کر چکے تھے۔ یعنی وہ برے ساتھی ان کے لیے ان کے موجودہ اور

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَسْمَعُوا لِهَذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۲۶﴾

اور ان لوگوں نے کہا جنھوں نے کفر کیا، اس قرآن کو مت سنو اور اس میں شور کرو، تاکہ تم غالب رہو ﴿۲۶﴾

گزشتہ تمام برے اعمال کو خوش نما بنا کر پیش کرتے رہتے ہیں، جس کے نتیجے میں وہ ابھی پر جتے رہتے ہیں اور ان لوگوں میں شامل ہو جاتے ہیں جن کے اعمال بدی و بد سے ان پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان صادق آتا ہے: ﴿لَا نَسْأَلُكَ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ﴾ [احود: ۱۱۹] ”میں جہنم کو جنوں اور انسانوں سب سے ضرور ہی بھروں گا۔“

بعض مفسرین نے ”مَا يَنْبَغُ أَيْدِيَهُمْ“ سے مراد دینا اور ”وَمَا خَلَقَهُمْ“ سے مراد آخرت لی ہے۔ یعنی ان کے برے ساتھی آخرت کے متعلق بھی انھیں خوش گمانی میں مبتلا رکھتے ہیں کہ اول تو وہ ہوگی ہی نہیں اور اگر ہوئی بھی تو جس طرح اللہ تعالیٰ نے تمہیں دنیا میں نعمتوں سے نوازا ہے وہاں بھی نوازے گا۔ مزید دیکھیے سورہ مریم (۷۷)۔

آیت 26: ﴿وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَسْمَعُوا...﴾ : کفار قرآن کی تاثیر سے واقف تھے کہ جو شخص عناد سے خالی ہو کر اسے سن لے وہ یقیناً اس سے متاثر ہوتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے فیصلہ کیا کہ نہ خود قرآن سنو، نہ کسی کو سننے دو۔ یہ ان کا واضح اعتراف شکست تھا، وہ اس جیسی ایک سورت بھی بنا کر نہ لاسکتے تو حق یہ تھا کہ اس پر ایمان لے آتے، مگر وہ اس کی مخالفت پر ڈٹ گئے اور ہر طریقے سے لوگوں کو اس سے روکنے کی کوشش کرنے لگے۔

﴿لِهَذَا الْقُرْآنِ﴾ : یعنی پہلی کتابیں پڑھنے سننے پر کوئی پابندی نہیں، کیونکہ اس سے ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ قرآن جو محمد (ﷺ) لے کر آئے ہیں، یہ مت سنو، کیونکہ یہ دلوں کو کھینچتا ہے۔

﴿وَالْغَوَا فِيهِ﴾ : ”لَغِيًّا يَلْعَنُ“ (س، ف) بغیر سوچے سمجھے بولنا، شور مچانا۔ یعنی اگر کبھی سننے کا اتفاق ہو تو اس میں شور ڈال دو، تاکہ تم غالب رہو۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ مان رہے تھے کہ اگر نبی ﷺ یا مسلمان قرآن سنانے میں کامیاب ہو گئے تو وہی غالب رہیں گے۔ عربی مقولہ ہے: ”وَالْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْأَعْدَاءُ“ ”اصل برتری وہ ہے جس کی شہادت دشمن دیں۔“ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے کفار کی اس بات کے برعکس فرمایا: ﴿وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ﴾ [الاعراب: ۲۰: ۴] ”اور جب قرآن پڑھا جائے تو اسے کان لگا کر سنو اور چپ رہو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔“ یعنی جعلی غلبے کے بجائے حقیقی رحمت کے طلب گار بنو۔

﴿کفار کی یہ بدتمیزی صرف اس وقت نہیں تھی جب رسول اللہ ﷺ انھیں قرآن سنانے کی کوشش کرتے، بلکہ جب آپ ﷺ اپنے ساتھیوں کو قرآن سنارہے ہوتے، یا انھیں نماز پڑھاتے ہوئے بلند آواز سے قراءت کرتے تو وہ اس وقت بھی بدزبانی اور گالی گلوچ شروع کر دیتے، جس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿وَلَا تَجْهَرُ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافُتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذَلِكَ سَبِيلًا﴾ [سی اسرائیل: ۱۱۰] ”اور اپنی نماز نہ بلند آواز سے پڑھ اور نہ اسے پست کر اور اس کے درمیان کوئی راست اختیار کر۔“ تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ بنی اسرائیل کی اسی آیت کی تفسیر۔

فَلَنْذِيَقَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا عَذَابًا شَدِيدًا ۚ وَ لَنْجَزِيَنَّهُمْ اَسْوَا الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۲۷﴾
 ذَلِكْ جَزَاءُ اَعْدَاءِ اللّٰهِ النَّارُ ۗ لَهُمْ فِيْهَا دَارُ الْخُلْدِ ۗ جَزَاءُ ۙ بِمَا كَانُوا بِاٰيٰتِنَا
 يَبْحَدُوْنَ ﴿۲۸﴾ وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا رَبَّنَا اَرِنَا الَّذِيْنَ اَصْلٰنَا مِنْ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ
 جُعِلْهُمَا تَحْتَ اَقْدَامِنَا لِيَكُوْنَا مِنَ الْاَسْفَلِيْنَ ﴿۲۹﴾

سو یقیناً ہم ان لوگوں کو جنہوں نے کفر کیا، ضرور بہت سخت عذاب چکھائیں گے اور یقیناً ہم انہیں ان بدترین اعمال کا
 بدلہ ضرور دیں گے جو وہ کیا کرتے تھے ﴿۲۷﴾ یہ اللہ کے دشمنوں کی جزا آگ ہی ہے، انہی کے لیے اس میں ہمیشہ رہنے
 کا گھر ہے، اس کی جزا کے لیے جو وہ ہماری آیات کا انکار کیا کرتے تھے ﴿۲۸﴾ اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، کہیں گے
 اے ہمارے رب! تو ہمیں جنوں اور انسانوں میں سے وہ دونوں دکھا جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا، ہم انہیں اپنے
 قدموں کے نیچے ڈالیں، تاکہ وہ سب سے نچلے لوگوں سے ہو جائیں ﴿۲۹﴾

آیت 27 ﴿۱﴾ فَلَنْذِيَقَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا عَذَابًا شَدِيدًا: چونکہ یہ ان کا صریح ظلم اور عناد تھا اور ان کی ہدایت کی
 امید ہی نہ تھی، اس لیے عبرت ناک سزا اور عذاب کے سوا ان کی کوئی جزا نہ تھی۔ "فَلَنْذِيَقَنَّ" کی فاعل تعلیل کے لیے ہے، یعنی
 ان کے قرآن سننے سے روکنے کی وجہ سے ہم انہیں شدید عذاب چکھائیں گے۔

﴿۲﴾ "فَلَنْعَذِبُنَّ" (ہم انہیں ضرور عذاب دیں گے) کے بجائے "فَلَنْذِيَقَنَّ" (ہم انہیں ضرور چکھائیں گے) کا لفظ استعمال
 فرمایا، کیونکہ جو چیز چکھی جاتی ہے وہ معمولی سی زبان پر لگتی ہے، تو جس کا معمولی سا لگنا اتنا سخت ہوگا وہ پورا عذاب کس قدر سخت ہوگا۔
 ﴿۳﴾ وَ لَنْجَزِيَنَّهُمْ اَسْوَا الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُونَ: کفار نے اگرچہ بے شمار گناہ کیے ہوں گے، مثلاً چوری، زنا وغیرہ، مگر ان
 کے سب سے برے اعمال کفر و شرک اور دوسروں کو ایمان سے روکنا تھے۔ چنانچہ انہیں ملنے والی سزا کفر و شرک اور ایمان سے
 روکنے کے پیمانے کے مطابق ہوگی، جس کے مقابلے میں دوسرے گناہوں کی سزا کی کچھ حقیقت نہیں ہوگی۔

آیت 28 ﴿۱﴾ ذَلِكْ جَزَاءُ اَعْدَاءِ اللّٰهِ النَّارُ.....: اللہ کے دشمنوں کی یہی جزا، یعنی آگ ہے، جنہوں نے کفر و
 شرک کیا، زبان اور ہاتھ کو ہر طرح سے اس کی کتاب سننے سے روکا، اس کے نبی اور ایمان والوں کا مقابلہ کیا، ان سے جنگ کی
 اور دشمنی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

﴿۲﴾ بِاٰيٰتِنَا يَبْحَدُوْنَ: یعنی اس جزا کی وجہ یہ ہے کہ وہ جانتے تھے کہ ہماری آیات حق ہیں، پھر جان بوجھ کر خدا اور عناد کی وجہ
 سے ان کا انکار کرتے تھے، پھر اللہ ایسے دشمنوں کو سزا دینے میں کیوں کمی کرے گا؟ "جُحُوْدٌ" کا معنی جانتے ہوئے انکار کرنا ہے۔

آیت 28 ﴿۱﴾ وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا رَبَّنَا اَرِنَا.....: اس سے پہلے آیت (۲۵): ﴿۲۵﴾ وَ قِيْلْنَا لَهُمْ قُرْاٰءٌ..... میں

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا

بے شک وہ لوگ جنہوں نے کہا ہمارا رب صرف اللہ ہے، پھر خوب قائم رہے، ان پر فرشتے اترتے ہیں کہ نہ ڈرو اور کفار کے اعمال بد کی وجہ سے ان پر جن وانس کے وہ قرین مسلط کرنے کا ذکر ہے جو ان کے لیے ان کے برے اعمال خوش نما بنا کر پیش کرتے رہے، حتیٰ کہ ان پر جہنمی ہونے کا ٹھہرا پکا ہو گیا۔ اب جہنم میں کفار کی اپنے ان دوستوں کے متعلق خواہش اور اللہ تعالیٰ سے درخواست کا ذکر ہے۔

② کفار یہ بات جہنم میں جانے کے بعد کہیں گے، مگر اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے ماضی کا صیغہ "قَالَ" استعمال فرمایا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی بات اتنی یقینی ہے کہ سمجھو یہ کام ہو چکا۔

③ قیامت کے دن جہنمی اپنے گمراہ کرنے والے جن وانس میں سے شیاطین و دوستوں پر سخت ناراض ہوں گے اور ان کی خواہش ہوگی کہ انہیں زیادہ سے زیادہ عذاب ہو۔ "أمرئنا" کا لفظی معنی "اگرچہ ہمیں دکھا" ہے، مگر مراد یہ ہے کہ پروردگار! تو انہیں ہمارے حوالے کر، تاکہ ہم انہیں اپنے قدموں کے نیچے روندیں، تاکہ وہ سب سے نیچے لوگوں میں شامل ہوں۔ ہر کافر خود گمراہ ہونے کے ساتھ دوسروں کو گمراہ کرنے کا مجرم بھی ہے۔ کفار کی یہ خواہش پوری ہوگی یا نہیں، اس کے لیے دیکھیے سورہ اعراف (۳۸، ۳۹) اور سورہ بقرہ (۶۱، ۶۲)۔

④ اس سے معلوم ہوا کہ قیامت کے دن صرف ایمان والوں کی دوستی باقی رہے گی، دوسرے سب ایک دوسرے میں سے دشمن ہو جائیں گے۔ مزید دیکھیے سورہ بقرہ (۱۶۲، ۱۶۳) اور سورہ زمر (۲۸)۔

آیت 30 ① إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا... کفار کے برے عقیدہ و عمن کی وجہ سے ان پر جن وانس میں سے شیاطین مسلط کرنے اور ان کے برے انجام کے ذکر کے بعد ایمان اور اس پر استقامت اختیار کرنے والوں کی تائید و نصرت کے لیے فرشتے نازل کرنے کا اور ان کے حسن انجام کا ذکر فرمایا۔

② رَبُّنَا اللَّهُ: "ہمارا رب صرف اللہ ہے" یہ مختصر سا جملہ معانی کا سمندر ہے۔ مبتدأ کے بعد خبر معرفہ ہو تو کلام میں حصر پیدا ہو جاتا ہے، کتب بلاغت میں اس کی مشہور مثال "صدیقی زینب" ہے، یعنی "میرا دوست صرف زینب ہے"۔ اس لیے "رَبُّنَا اللَّهُ" کا معنی ہے "ہمارا رب صرف اللہ ہے"۔ یہ بات دل سے کہہ لینے کے بعد آدمی کسی اور کو داتا، دشمن، حجاج بخش، غریب نواز، بڑی بنانے والا اور دوستوں کو پار لگانے والا نہیں مان سکتا۔ پھر اس کی قولی، بدئی اور مالی عبادت، بلکہ پوری زندگی اور موت صرف اللہ کے لیے ہوتی ہے، وہ صرف اسی سے مانگتا اور اسی کے صدم پر چلتا ہے۔ جو وہ کہے کرتا ہے، جس سے روک دے رک جاتا ہے۔ عمل میں کوتاہی ہو سکتی ہے اور سناہ کا ارتکاب بھی ہو سکتا ہے، مگر وہ اسی کے دروازے پر رہتا اور اسی سے معافی مانگتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: "قُلْ إِنِّي هَدَيْتُ رَبِّيَ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۗ وَبَيْنَا قِيمَةٌ ۗ لَأُبْرِزِيَنَّ حَقِيقًا"

تَحَزُّنُوا وَابْشُرُوا بِالْبَحَّةِ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ ﴿۳۰﴾

نغم کرو اور اس جنت کے ساتھ خوش ہو جاؤ جس کا تم وعدہ دیے جاتے تھے ﴿۳۰﴾

وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿۳۰﴾ قُلْ إِنْ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۳۱﴾ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَبِذَلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ ﴿۳۲﴾ قُلْ أَعْبُدُوا اللَّهَ أُنْبِيَاءَ رَبَّانًا وَهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ ﴿۳۳﴾ [الأنعام: ۱۶۱ تا ۱۶۴] ”کہہ دے بے شک مجھے تو میرے رب نے سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کر دی ہے، جو مضبوط دین ہے، ابراہیم کی ملت، جو ایک ہی طرف کا تھا اور مشرکوں سے نہ تھا۔ کہہ دے بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت اللہ کے لیے ہے، جو جہانوں کا رب ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے اور میں حکم ماننے والوں میں سب سے پہلا ہوں۔ کہہ دے کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور رب تلاش کروں، حالانکہ وہ ہر چیز کا رب ہے۔“

”رَبُّنَا اللَّهُ“ کہنے کے بعد کسی اور کی عبادت، اس کا دین یا اس کا بتایا ہوا زندگی گزارنے کا طریقہ اختیار کرنے کی گنجائش ختم ہو جاتی ہے۔ اقبال نے اسی لیے کہا ہے۔

چوں می گویم مسلمانم بلرزم کہ دائم مشکلات لا الہ را

”جب میں کہتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں تو لرز جاتا ہوں، کیونکہ میں ”لا الہ“ کی مشکلات کو جانتا ہوں۔“

﴿۳۱﴾ قُلْ اسْتَغْفِرُوا: اس میں سین اور تاء مبالغے کے لیے ہے، یعنی پھر اس پر خوب قائم رہے اور موت تک ڈٹے رہے، کوئی خوف یا لالچ انھیں اس عقیدے اور عمل سے نہ پھیر سکے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَاعْبُدُوا رَبَّكُمُ حَتَّىٰ يَأْتِيَكُمُ الْيَقِينُ﴾ [الحجر: ۹۹] ”اور اپنے رب کی عبادت کر، یہاں تک کہ تیرے پاس یقین آجائے۔“

طبری نے اسود بن ہلال سے روایت کی ہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہما نے یہ آیت پڑھی: ﴿إِنَّ الدِّينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا﴾ اور فرمایا: ”اس آیت کے متعلق تم کیا کہتے ہو؟“ لوگوں نے کہا: ﴿قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا مِنْ ذَنْبٍ﴾ ”انہوں نے ”رَبُّنَا اللَّهُ“ کہا، پھر گناہ سے بچنے پر ڈٹے رہے۔“ تو انہوں نے فرمایا: ﴿لَقَدْ حَمَلْتُمُوهُ عَلَىٰ غَيْرِ الْمَحْمَلِ، قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا ثُمَّ لَمْ يَلْتَفِتُوا إِلَىٰ آلِهِ غَيْرِهِ﴾ [طبری: ۳۰۷۷] ”تم نے اسے اس کے اصل محل کے غیر پر محمول کیا ہے، مقصد ”قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا“ کا یہ ہے کہ پھر انہوں نے اس کے سوا کسی اور معبود کی طرف جھانک کر نہیں دیکھا۔“ حاکم نے بھی اسے اسود بن ہلال کے طریق سے روایت کیا ہے اور اسے صحیح کہا ہے۔ ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے۔ دیکھیے مستدرک حاکم میں ”سورۃ حم السجدة“ کی تفسیر۔ طبری نے علی بن ابی طلحہ کی معتبر سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے، فرماتے ہیں: ”قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا عَلَىٰ آذَانٍ فَرِيقِهِ“ یعنی ”ثُمَّ اسْتَقَامُوا“ کا

مطلب یہ ہے کہ وہ اس کے فرائض کی ادائیگی پر خوب قائم رہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ”ثُمَّ اسْتَقَامُوا“ کا مطلب یہ ہے کہ وہ موت تک توحید پر خوب قائم رہ کر رسول اللہ ﷺ کے بتائے ہوئے سیدھے راستے پر چلتے رہے اور فرائض ادا کرتے رہے، اگر کوئی کوتاہی یا گناہ ہوا بھی ہو تو انہوں نے توحید و سنت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

④ سفیان بن عبد اللہ ثقفی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا: « يَا رَسُولَ اللَّهِ! حَدِّثْنِي بِأَمْرٍ أُعْتَصِمُ بِهِ، قَالَ قُلْ رَبِّيَ اللَّهُ، ثُمَّ اسْتَقِمْ، قَالَ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ! مَا أَخَوْفُ مَا تَخَافُ عَلَيَّ؟ قَالَ فَأَخَذَ بِلِسَانِ نَفْسِهِ، ثُمَّ قَالَ هَذَا» [مسند أحمد: ۴۱۳/۳، ج: ۱۵۴۲۵] ”یا رسول اللہ! آپ مجھے ایسا کام بتائیں جسے میں مضبوطی سے پکڑ لوں۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”تو کہہ، میرا رب صرف اللہ ہے، پھر اس پر خوب قائم رہ۔“ میں نے کہا: ”یا رسول اللہ! سب سے خوف ناک چیز جس سے آپ میرے بارے میں ڈرتے ہوں، کیا ہے؟“ تو آپ ﷺ نے اپنی زبان مبارک پکڑ کر فرمایا: ”یہ (زبان)۔“ مسند احمد کے محقق حضرات نے اسے صحیح کہا ہے۔ صحیح مسلم میں ہے، سفیان بن عبد اللہ ثقفی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا: « يَا رَسُولَ اللَّهِ! قُلْ لِي فِي الْإِسْلَامِ قَوْلًا لَا أَسْأَلُ عَنْهُ أَحَدًا بَعْدَكَ، وَفِي حَدِيثِ أَبِي أُسَامَةَ غَيْرِكَ، قَالَ قُلْ آمَنْتُ بِاللَّهِ ثُمَّ اسْتَقِمْتُ» [مسلم، الإیمان، باب جامع أوصاف الإسلام: ۳۸] ”یا رسول اللہ! آپ مجھے اسلام میں ایسی بات بتادیں کہ میں اس کے متعلق آپ کے بعد کسی سے نہ پوچھوں۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”تو کہہ، میں اللہ پر ایمان لایا، پھر اس پر خوب قائم رہ۔“

اس سے معلوم ہوا کہ ”رَبِّيَ اللَّهُ“ اور ”آمَنْتُ بِاللَّهِ“ کا مفہوم ایک ہے اور یہ جامع کلمہ ہے، جس میں اسلام کے تمام ارکان آگئے ہیں، جیسا کہ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کے صحیح مسلم پر باب کے الفاظ سے ظاہر ہے۔

⑤ تَتَزَكَّى عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ.....: ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں کہ نہ ڈرو اور نہ غم کرو۔ بہت سے مفسرین نے فرمایا کہ ”رَبَّنَا اللَّهُ“ کہہ کر استقامت اختیار کرنے والوں پر فرشتوں کا نزول موت کے وقت ہوتا ہے، پھر قبر میں اور آخر میں حشر کے دن ہوگا، حالانکہ آیت کے الفاظ عام ہیں۔ ان حضرات کی اس تفسیر کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں ایمان والوں پر فرشتوں کا نزول نظر نہیں آتا، وہ موت کے وقت نظر آنا شروع ہوتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ وہ نظر نہیں آتے، مگر یقیناً دنیا میں بھی اہل استقامت پر فرشتوں کا نزول ہوتا ہے، جس سے ان کے دلوں میں سکون و اطمینان پیدا ہوتا ہے، ایمان اور میدان میں انہیں استقامت اور ثابت قدمی حاصل ہوتی ہے اور وہ ان کے دلوں میں نیکی کی رغبت، برائی سے نفرت اور بہترین خیالات پیدا ہونے کا باعث بنتے ہیں، جیسا کہ بدر میں فرشتے نازل ہوئے، فرمایا: ﴿إِذْ اسْتَعِينُونَ رَبَّنَا فَأَنْزَلْنَا لَهُمْ أَنْفَ الْمَلَائِكَةِ مُرَدِّفِينَ ۝ وَمَا جَعَلَهُ اللَّهُ إِلَّا بُشْرَىٰ وَنَظْمِينَ بِهٖ فَلُوْبَكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾ [الأنفال: ۹، ۱۰] ”جب تم اپنے رب سے مدد مانگ رہے تھے تو اس نے تمہاری دعا قبول کر لی کہ بے شک میں ایک ہزار فرشتوں کے ساتھ تمہاری مدد کرنے والا ہوں، جو ایک دوسرے کے پیچھے

آنے والے ہیں۔ اور اللہ نے اسے نہیں بنایا مگر ایک خوش خبری اور تاکہ اس کے ساتھ تمہارے دل مطمئن ہوں اور مدد نہیں ہے مگر اللہ کے پاس سے۔ بے شک اللہ سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے۔“ اور فرمایا: ﴿إِذْ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلَائِكَةِ أَنِّي مَعَكُمْ فَثَبِّثُوا الَّذِينَ آمَنُوا ۚ سَأُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوا فَوْقَ الْأَعْنَاقِ وَاضْرِبُوا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ﴾ | الأنفال: ۱۲۰ | ”جب تیرا رب فرشتوں کی طرف وحی کر رہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، پس تم ان لوگوں کو جمائے رکھو جو ایمان لائے ہیں، عنقریب میں ان لوگوں کے دلوں میں جنھوں نے کفر کیا، رعب ڈال دوں گا۔ پس ان کی گردنوں کے اوپر ضرب لگاؤ اور ان کے ہر ہر پور پر ضرب لگاؤ۔“

فرشتے ایمان والوں پر اترتے ہیں مگر ایک آدھ اشتنائی صورت کے علاوہ رسول کے سوا کسی کو نظر نہیں آتے اور جب تک یہ مادی زندگی ختم نہیں ہو جاتی اور مادیت کے پردے چاک نہیں ہو جاتے تب تک فرشتوں کا نزول اسی صورت میں ہوتا ہے۔ البتہ مرنے کے ساتھ ہی جب یہ پردے اور حجاب اٹھ جائیں گے تو فرشتے موت کے وقت، پھر قبر میں، پھر قیامت میں ہر جگہ یقیناً انسانوں کو نظر آئیں گے اور ایمان والوں کو ان الفاظ میں تسلی دیں گے جن کا ان آیات میں ذکر ہے۔ دنیا میں اگر فرشتے نظر آنا لگ جائیں تو امتحان کا مقصد فوت ہو جاتا ہے، اس لیے یہاں وہ اسی وقت عام لوگوں کو نظر آتے ہیں جب وہ عذاب لے کر آتے ہیں اور امتحان کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ دیکھیے سورہ حجر کی آیت (۸) کی تفسیر۔

فرشتوں کا ایمان والوں پر اترنا ایسے ہی ہے جیسے کفار اور ضعیف لوگوں پر شیاطین کا نزول ہے کہ وہ ان کے دلوں میں گندے خیالات اور فاسد عقائد ڈالتے اور برائی پر ابھارتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلَىٰ مَن تَنَزَّلُ الشَّيَاطِينُ ۖ تَنَزَّلُ عَلَىٰ كُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ ۚ يُنْقُونَ السَّمْعَ وَكَتَبُوا كَذِبُونَ﴾ | الشعراء: ۲۲۱ تا ۲۲۳ | ”کیا میں تمہیں بتاؤں شیاطین کس پر اترتے ہیں۔ وہ ہر زبردست جھوٹے، سخت گناہ گار پر اترتے ہیں۔ وہ سنی ہوئی بات لا ڈالتے ہیں اور ان کے اکثر جھوٹے ہیں۔“ اور فرمایا: ﴿وَإِنَّ الشَّيَاطِينَ لَيُوحُونَ إِلَىٰ أَوْلِيَائِهِمْ لِيُجَادِلُوكُمْ﴾ | الأنعام: ۱۲۱ | ”اور بے شک شیطان اپنے دوستوں کے دلوں میں ضرور باتیں ڈالتے ہیں، تاکہ وہ تم سے جھگڑا کریں۔“ اور فرمایا: ﴿وَإِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْنَاقَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمْ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَإِنِّي جَارٌ لَّكُمْ﴾ | الأنفال: ۴۸ | ”اور جب شیطان نے ان کے لیے ان کے اعمال خوش نما بنا دیے اور کہا آج تم پر لوگوں میں سے کوئی غالب آنے والا نہیں اور یقیناً میں تمہارا حمایتی ہوں۔“

⑥ **الَّا تَحْقِرُوا وَلَا تَحْزَنُوا:** مفسر عبد الرحمن کیلانی لکھتے ہیں: ”یعنی جب فرشتے ڈٹ جانے والوں پر نازل ہوتے ہیں تو انھیں یہ تلقین کرتے ہیں یا ان کے دل میں یہ بات ڈالتے ہیں کہ باطل کی طاقتیں خواہ کتنی ہی چیرہ دست ہوں ان سے خوف زدہ ہونے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں اور حق پرستی کی وجہ سے جو مظالم تم پر ڈھائے جا رہے ہیں ان پر رنج نہ کرو، کیونکہ اللہ نے تمہارے لیے ایسی جنت تیار کر رکھی ہے جس کے مقابلے میں دنیا کی سب نعمتیں بیچ ہیں۔ اور موت کے وقت بھی فرشتے ہر

نَحْنُ أَوْلَىٰ بِكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ۗ وَلَكُمْ فِيهَا مَا نَشْتَهَىٰ أَنفُسُكُمْ
وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدْعُونَ ﴿۳۱﴾ نَزْلًا مِّنْ عَفْوٍ ۖ تَرَجِّحِمْ ﴿۳۱﴾

ع
ج
۳۱

ہم تمہارے دوست ہیں دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں بھی اور تمہارے لیے اس میں وہ کچھ ہے جو تمہارے دل چاہیں گے اور تمہارے لیے اس میں وہ کچھ ہے جو تم مانگو گے ﴿۳۱﴾ یہ بے حد بخشش والے، نہایت مہربان کی طرف سے مہمانی ہے ﴿۳۱﴾

مومن سے یہی کلمات کہتے ہیں، اس وقت وہ فرشتوں کو دیکھتا بھی ہے اور ان کی بات سمجھتا بھی ہے، تو اس وقت ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آگے جس منزل کی طرف تم جا رہے ہو اس سے خوف زدہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں، کیونکہ جنت تمہاری منتظر ہے اور دنیا میں جنھیں تم چھوڑ کر جا رہے ہو ان کے لیے بھی رنجیدہ ہونے کی ضرورت نہیں، کیونکہ ہم تمہارے ولی اور رفیق ہیں۔“ (تیسیر القرآن)

﴿۳۱﴾ دنیا میں انسانوں کے ساتھ کسی طرح کے فرشتے مقرر ہیں۔ جن میں کرنا، کاتبین بھی ہیں (دیکھیے انفطار ۱۰ تا ۱۳) اور آفات و مصائب سے حفاظت کرنے والے فرشتے بھی۔ (دیکھیے رعد: ۱۱) یہ فرشتے مومن و کافر سب کے ساتھ ہیں، مگر جن فرشتوں کا ان آیات میں ذکر ہے یہ صرف اہل ایمان و استقامت کے ساتھ خاص ہیں، انھی پر اترتے ہیں اور انھی کو حوصد دیتے، نیکیوں کی روایت دلاتے اور خیر کا الہام کرتے ہیں۔

آیت 31 ﴿۳۱﴾ نَحْنُ أَوْلَىٰ بِكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ۗ دُنْيَا میں دوستی یہ کہ ہم تمہارے لیے دعائیں کرتے ہیں (دیکھیے مومن: ۷)، تمہیں کسی کا الہام کرتے ہیں اور دشمنوں کے مقابلے میں تمہاری مدد کرتے ہیں اور آخرت میں یہ کہ جب متعلق لوگوں کے سوا سب ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں گے تو ہماری دوستی تمہارے ساتھ قائم رہے گی، ہم آنے والے ہر مرحلے میں تمہارے ساتھی اور مددگار رہیں گے اور تمہیں حفاظت سے جنت میں پہنچائیں گے۔ فرشتے ہر مومن کو اس کی موت کے وقت یہ بشارت دیتے ہیں۔

﴿۳۲﴾ ﴿۳۲﴾ نَحْنُ أَوْلَىٰ بِكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ۗ دُنْيَا میں دوستی یہ کہ ہم تمہارے لیے دعائیں کرتے ہیں (دیکھیے مومن: ۷)، تمہیں کسی کا الہام کرتے ہیں اور دشمنوں کے لیے دیکھیے سورہ سجدہ کی آیت (۱۷) کی تفسیر۔ ”مَا نَشْتَهَىٰ أَنفُسُكُمْ“ (جو تمہارے دل چاہیں گے) سے مراد وہ چیزیں ہیں جو ان کی ذاتی خواہش ہوں گی اور ”مَا تَدْعُونَ“ (جو تم مانگو گے) کا لفظ عام ہے، اس میں ذاتی خواہش کی اشیا بھی شامل ہیں اور وہ بھی جو ان کی ذاتی خواہش نہیں بلکہ مثال کے طور پر کسی اور کی خاطر طلب کریں گے۔ (ابو السعود)

آیت 32 ﴿۳۲﴾ نَزْلًا مِّنْ عَفْوٍ ۖ تَرَجِّحِمْ ﴿۳۲﴾ اس آیت کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ سجدہ کی آیت (۱۹) کی تفسیر۔

وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ إِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِينَ ﴿۳۱﴾

اور بات کے اعتبار سے اس سے اچھا کون ہے جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے اور کہے کہ بے شک میں فرماں برداروں میں سے ہوں ﴿۳۱﴾

آیت 33 ﴿۱﴾ مَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا إِلَى اللَّهِ..... : کچھلی آیات میں ایمان لا کر اس پر استقامت اختیار

کرنے والوں کو فرشتوں کے نزول، دنیا و آخرت میں ان کی دوستی، جنت میں داخلے اور غفور و رحیم کی مہمانی کی بشارت دے کر ان کے قلبیں سکون و اطمینان اور ولی راحت کا سامان فرمایا، اب ایک ایسے کام کا ذکر فرمایا جو ”رَبَّنَا اللَّهُ“ کہنے کا فطری تھننا ہے کہ وہ اس نعمت کو اپنے تک محدود نہیں رکھتے، بلکہ ان کی کوشش سے دنیا کے تمام لوگوں تک پہنچانے کی ہوتی ہے۔ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ جو نعمت انہیں عطا ہوئی ہے وہ ہر شخص کو عطا ہو جائے۔ یہ کام سرانجام دیتے ہوئے جب وہ تین باتوں کا اہتمام کریں تو بات میں ان سے بہتر اور درجے میں ان سے بلند کوئی نہیں ہو سکتا۔ پہلی بات ”دَعَا إِلَى اللَّهِ“ یعنی وہ صرف اللہ کی طرف بلائیں۔ نہ اپنی ذات کی طرف، نہ کسی شخصیت کی طرف اور نہ کسی قبیلے، جماعت، نسل یا وطن کی طرف، بلکہ ان کی دعوت صرف اللہ تعالیٰ کی طرف ہو کہ سب اسی کے بندے اور فرماں بردار بن جاؤ، جیسا کہ فرمایا: ﴿قُلْ هَذَا بَسْمِلِيٍّ اذْعُوا إِلَى اللَّهِ لَعَلِّي بَصِیْرٌ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعْتَنِي ۚ وَ سُبْحٰنَ اللَّهِ وَ مَا اَنَا مِنَ الشّٰرِکِیْنَ﴾ ۱۰۸ : ”کہہ دے یہی میرا راستہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، پوری بصیرت پر، میں اور وہ بھی جنہوں نے میری پیروی کی ہے اور اللہ پاک ہے اور میں شریک بنانے والوں سے نہیں ہوں۔“ یہ پیغمبروں کا اور ان کے جانشینوں کا کام ہے اور اتنا عظیم کام ہے کہ ان کی دعوت سے جو لوگ راہ ہدایت اختیار کریں گے ان کا اجر ان کے علاوہ انہیں بھی ملے گا۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿مَنْ دَعَا إِلَى هُدًى سَكَانَ لَهُ مِنَ الْاٰخِرِ مِثْلُ اُجُوْرٍ مَنْ تَبِعَهُ، لَا يَنْفَعُ ذٰلِكَ مِنَ الْاُجُوْرِهِمْ شَيْئًا، وَمَنْ دَعَا إِلَى ضَلٰلَةٍ، سَكَانَ عَلَيْهِ مِنَ الْاِثْمِ مِثْلُ اِثْمِ مَنْ تَبِعَهُ، لَا يَنْفَعُ ذٰلِكَ مِنَ اِثْمِهِمْ شَيْئًا﴾ ۱ مسلم، العمہ، باب من من سنة حسنة أو سيئة : ۶۶۷۴ | ”جو شخص ہدایت کی کسی بات کی طرف دعوت دے اس کے لیے ان لوگوں کے اجر میں جیسا اجر ہوگا جو اس کی پیروی کریں گے، یہ ان کے اجر میں کوئی کمی نہیں کرے گا اور جو شخص گمراہی کی کسی بات کی طرف دعوت دے اس پر ان لوگوں کے گناہوں جیسا گناہ ہوگا جو اس کی پیروی کریں گے، یہ ان کے گناہوں میں کوئی کمی نہیں کرے گا۔“

یہی وجہ ہے کہ پوری امت مل کر بھی رسول کریم ﷺ کے درجے کو نہیں پاسکتی، نہ ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد آنے والے ان کے درجے تک پہنچ سکتے ہیں، یہی حال بعد میں دعوت الی اللہ دینے والوں کا ہے۔ پھر بات میں ان سے بہتر کون ہو سکتا ہے جسے ان اعمال کا اجر بھی مل رہا ہو جو اس نے نہیں کیے۔ کوئی شخص خود کتنا بھی عمل کر لے یہ مقام کیسے حاصل کر سکتا ہے؟

﴿اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت زبان کے ساتھ بھی ہے اور ہاتھ کے ساتھ بھی۔ ہمارے نبی ﷺ کو قرآن کے ساتھ تلوار دے کر

لَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ ادْفَع بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ

وہ نیکی برابر ہوتی ہے اور نہ برائی۔ (برائی کو) اس (طریقے) کے ساتھ ہٹا جو سب سے اچھا ہے، تو اچانک وہ

جا گیا، آپ کے اصحاب نے آپ کا ساتھ دیا، پھر زبانی دعوت اور جہاد فی سبیل اللہ کے ساتھ اسلام مشرق سے مغرب
- پھیل گیا۔ یہی مناسبت ہے: ﴿هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدُّنْيَا كُلِّهَا ۚ وَكَفَىٰ
لَهُ عَظِيمًا﴾ [الفتح: ۲۸] کے بعد: ﴿مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ ۚ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ ۖ.....﴾
فتح: ۲۹] میں۔ مزید دیکھیے سورہ آل عمران (۱۰۴، ۱۱۰)۔

قول میں سب سے بہتر ہونے کے لیے دوسری ضروری بات ”وَعَمِلَ صَالِحًا“ ہے، یعنی اللہ کی طرف دعوت دینے کے
تھ وہ خود بھی عمل صالح کریں۔ صالح عمل کا مطلب یہ ہے کہ وہ خالص اللہ کے لیے ہو اور رسول اللہ ﷺ کے بتائے ہوئے
یقے کے مطابق ہو۔ (دیکھیے سورہ کہف کی آخری آیت) جو شخص دوسروں کو دعوت دے مگر خود اس کے خلاف عمل کرے اس
لیے شدید وعید آئی ہے۔ دیکھیے سورہ بقرہ (۴۴)۔

تیسری بات ”وَقَالَ إِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ“ یعنی وہ ڈنکے کی چوٹ یہودی، نصرانی، ہندو، سکھ، کیونٹ، ڈیوکریٹ
لبرل وغیرہ ہونے کے بجائے اپنے مسلم ہونے کا اعلان کرے، اس پر فخر کرے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروا نہ
رے۔ ”مِنَ الْمُسْلِمِينَ“ یعنی مسلمانوں کی جماعت کا فرد ہونے پر اسے خوشی ہو اور کسی دین، مذہب، ملت یا معاشرے کو
سلام اور مسلمانوں سے بہتر نہ سمجھے۔ آج کل کے بعض طہروں کی طرح نہیں جو مسلمانوں میں پیدا ہو گئے، مگر وہ کفار سے اس قدر
مربوب ہیں کہ بعض اوقات یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ ہم بد قسمتی سے مسلمانوں میں پیدا ہو گئے۔ ایک شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

نہ بہ نظم شاعر خوش غزل، نہ بہ نثر ناثر بے بدل بہ غلامی شہ عزوجل و بعاشقی نبی خوشم

”نہ کسی خوب صورت غزل والے شاعر کی نظم پر اور نہ کسی بے مثال نثر لکھنے والے کی نثر پر، بلکہ میں کائنات کے
بادشاہ عزوجل کی غلامی پر اور نبی ﷺ کی محبت پر خوش ہوں۔“

عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا: ﴿ذَاقَ طَعْمَ الْإِيمَانِ مَنْ رَضِيَ
لِلَّهِ رَبًّا وَبِالْإِسْلَامِ دِينًا وَبِمُحَمَّدٍ رَسُولًا﴾ (مسلم، الإيمان، باب الدليل على أن من رضي بالله رباً..... : ۳۴۔
مذی: ۲۶۲۳) ”اس شخص نے ایمان کا ذائقہ چکھ لیا جو اللہ کے رب ہونے پر، اسلام کے دین ہونے پر اور محمد ﷺ کے
رسول ہونے پر راضی ہو گیا۔“

ت 34 ﴿۱﴾ وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ : اس آیت میں دعوت کے مخاطب لوگوں کی زیادتی اور برائی کا جواب
دینے کا طریقہ سکھایا گیا ہے۔ عام طور پر ”وَلَا السَّيِّئَةُ“ کے ”لا“ کو زائد کہہ کر ترجمہ کیا جاتا ہے کہ ”نیکی اور برائی برابر

وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ﴿۳۳﴾

شخص کہ تیرے درمیان اور اس کے درمیان دشمنی ہے، ایسا ہوگا جیسے وہ دلی دوست ہے ﴿۳۳﴾

نہیں۔“ بعض حضرات اسے زائد برائے تاکید کہہ دیتے ہیں، حالانکہ قرآن مجید کے کسی لفظ بلکہ حرف کو زائد کہنے کے بجائے وہ فائدہ سمجھنے کی کوشش ضروری ہے جس کے لیے وہ لفظ لایا گیا ہے، جو بظاہر زائد ہے۔ کیونکہ یہ اللہ کا کلام ہے اور اللہ تعالیٰ بہت بلند ہے اس بات سے کہ بلا ضرورت کوئی لفظ لائے۔ اصل میں یہاں بات بیان ہو رہی ہے کہ نیکی برابر نہیں، نہ اپنی جنس کے افراد کے لحاظ سے، کیونکہ نیکیوں کے بے شمار درجے ہیں، کوئی کمتر درجے کی نیکی، کوئی اس سے برتر اور کوئی سب سے برتر، جیسا کہ حدیث میں ہے: «فَأَذَانَهَا إِمَاطَةُ الْأَذَى عَنِ الطَّرِيقِ وَأَرْفَعُهَا قَوْلُ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ» | ترمذی، الإیمان، باب فی استكمال الإیمان...: ۲۶۱۴ | ”سب سے کمتر نیکی راستے سے تکلیف دہ چیز ہٹانا اور سب سے اونچی لا الہ الا اللہ کہنا ہے۔“ اور نہ ہی ایک نیکی اپنے درجات کے اعتبار سے برابر ہے، مثلاً کسی کے ساتھ حسن سلوک کے کئی درجے ہیں۔ اسی طرح ایک ہی نیکی اپنے کرنے والوں کے مختلف ہونے کے لحاظ سے بھی برابر نہیں، کوئی اسے خالص نیت سے کرتا ہے اور کوئی ریا سے، کوئی پوری کوشش سے کرتا ہے، کوئی درمیانی کوشش سے اور کوئی بے دلی سے۔ غرض کوئی بھی نیکی نہ دوسری نیکیوں کے ساتھ برابر ہے، نہ اپنی ذات میں برابر ہے اور نہ کرنے والوں کے لحاظ سے برابر ہے۔

﴿۳۳﴾ وَلَا السَّيِّئَةُ: برائی کا بھی یہی حال ہے کہ وہ برابر نہیں۔ زبانی دشمنی اور تیر تلوار کے ساتھ دشمنی میں فرق ہے، ابوطالب اور ابو جہل کے کفر میں فرق ہے۔ اس لیے آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ ”اور نہ نیکی برابر ہوتی ہے اور نہ برائی۔“ شاہ عبد القادر اور شاہ رفیع الدین دونوں کے ترجمہ میں یہ بات ملحوظ رکھی گئی ہے۔

﴿۳۴﴾ إِذْ فَعَرَ بِالْبَنِي هِيَ أَحْسَنُ.....: یعنی برائی کا جواب صرف یہ نہیں کہ نیکی کے ساتھ دو، بلکہ اس طریقے سے دو جو سب سے اچھا ہے اور نیکی کا سب سے اونچا درجہ ہے۔ یہ سب سے اچھا طریقہ بعض اوقات اچھی بات اور اچھا لہجہ ہوتا ہے، جیسا کہ طبری نے علی بن ابی طلحہ کی معتبر سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل فرمایا ہے: «أَمَرَ اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ بِالصَّبْرِ عِنْدَ الْغَضَبِ، وَالْحِلْمِ وَالْعَفْوِ عِنْدَ الْإِسَاءَةِ، فَإِذَا فَعَلُوا ذَلِكَ عَصَمَهُمُ اللَّهُ مِنَ الشَّيْطَانِ، وَخَضَعَ لَهُمْ عَدُوَّهُمْ، كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ» | طبری: ۳۰۷۹۴۔ السنن الکبری للبیہقی: ۴۵۷۷، ج: ۱۳۶۸۰ | ”اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو غصے کے وقت صبر کا اور بدسلوکی کے وقت حلم اور عفو کا حکم دیا، تو جب وہ ایسا کریں گے اللہ تعالیٰ انہیں شیطان سے بچائے گا اور ان کا دشمن ان کے لیے زیر ہو جائے گا، گویا کہ وہ دلی دوست ہے۔“ اور بعض اوقات سب سے اچھا طریقہ خوش اخلاقی اور بہترین بات کے ساتھ ساتھ جہاد بالید ہوتا ہے، جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کو سب سے بہتر امت قرار دیا (دیکھیے آل عمران: ۱۱۰) اور جس کی وجہ سے بڑے بڑے دشمن دلی دوست بن جاتے ہیں، جیسے ثمامہ بن اثال، ابوسفیان، صفوان بن امیہ، حارث بن ہشام رضی اللہ عنہم، اور بے شمار کفار جو جہاد کی برکت سے جگری دوست بن گئے۔ آج بھی جب تک کافر ملکوں کے فرماؤں کی

وَمَا يُلْقِيهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا ۚ وَمَا يُلْقِيهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ ﴿۳۵﴾ وَإِنَّمَا يَنزَعَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْعٌ قَلِيلٌ ۖ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ ۚ إِنَّكَ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿۳۶﴾ وَمِنَ آيَاتِهِ الْاَيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۚ لَا تَسْجُدُوا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوا لِلَّهِ الَّذِي خَلَقَهُنَّ إِن كُنتُمْ إِيَادًا تَعْبُدُونَ ﴿۳۷﴾

یہ چیز نہیں دی جاتی مگر انہی کو جو صبر کریں اور یہ نہیں دی جاتی مگر اسی کو جو بہت بڑے نصیب والا ہے ﴿۳۵﴾ اور اگر کسی شیطان کی طرف سے کوئی اکساہٹ تھے ابھار ہی دے تو اللہ کی پناہ طلب کر، بلاشبہ وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۳۶﴾ اور اسی کی نشانیوں میں سے رات اور دن، اور سورج اور چاند ہیں، نہ سورج کو سجدہ کرو اور نہ چاند کو اور اس اللہ کو سجدہ کرو جس نے انہیں پیدا کیا، اگر تم صرف اس کی عبادت کرتے ہو ﴿۳۷﴾

گردنوں کے سرینے کاٹ کر انہیں شرمہ بن اجمال بنیو کی طرح مسجد نبوی کے ستون سے باندھ کر اسلام کی تعلیمات کا آنکھوں سے مشاہدہ نہ کروایا جائے ان کا مسلمان ہونا دینی دوست بننا مشکل ہے۔ (مزید دیکھیے: عدد: ۲۲) مومن زرم دم آنگھلو، زرم دم جنتو ہوتا ہے۔

آیت 35 ﴿۳۵﴾ وَمَا يُلْقِيهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا ۚ یعنی برائی کا جواب سب سے اچھے طریقے کے ساتھ دینے کی توفیق انہی لوگوں کو عطا کی جاتی ہے جنہوں نے اس سے پہلے بھی صبر کی بات اپنائی ہوتی ہے۔ ”صَبَرُوا“ ماضی کا صیغہ ہے۔

﴿۳۶﴾ وَمَا يُلْقِيهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ: جینی یہ خوبی کہ برائی کا جواب سب سے اچھے طریقے کے ساتھ دیں، صرف انہی لوگوں کو عطا کی جاتی ہے جو بہت بڑے نصیب والے ہوں۔ معصوم ہوا یہ حوصلہ انسان کے بس کی بات نہیں، محض اللہ تعالیٰ کی عطا ہے اس لیے اپنی کوشش کے ساتھ ساتھ اس سے صبر اور توسل کی دعا کرنا لازم ہے۔

آیت 36 ﴿۳۶﴾ وَإِنَّمَا يَنزَعَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْعٌ قَلِيلٌ ۖ کا اظہار معنی ”نزع“ کسی سوئی یا نوک دار چیز کے ساتھ چوکا مارنا ہے، مراد شیطان کا غصہ دلا کر برا چھیننا کر دینا ہے۔ اس آیت کی تفسیر سورۃ اعراف (۲۰۰) اور سورۃ مومنون (۹۸۴-۹۹۲) میں گزر چکی ہے۔

آیت 37 ﴿۳۷﴾ وَمِنَ آيَاتِهِ الْاَيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۚ: اس سے پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت کو سب سے اچھی بات قرار دیا، اب اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت کے لیے چند اور چیزیں بطور دلیل ذکر فرمائیں، جن میں سے بعض آسمان سے تعلق رکھتی ہیں اور بعض زمین سے اور واضح فرمایا کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی قدرت کی نشانیاں ہیں۔

﴿۳۸﴾ انسان کو نظر آنے والی اشیا میں سے سب سے عقیم اور سب سے روشن چیزیں سورج اور چاند ہیں، اس لیے بہت سے لوگ انہی کو رب تعالیٰ سمجھ بیٹھے۔ بعض نے انہیں اللہ تعالیٰ کا مظہر سمجھا کہ اللہ تعالیٰ ان کی صورت میں ظاہر ہوا ہے اور ان کی پرستش

﴿إِنِ اسْتَكْبَرُوا فَالَّذِينَ عِنْدَ رَبِّكَ يُسَبِّحُونَ لَهُ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَهُمْ لَا يَسْأَمُونَ﴾

پھر اگر وہ تکبر کریں تو وہ (فرشتے) جو تیرے رب کے پاس ہیں وہ رات اور دن اس کی تسبیح کرتے ہیں اور وہ نہیں اکتاتے ﴿۳۸﴾

اور انھیں سجدہ کرنے لگے، جیسے صابئی اور پارسی لوگ ہیں۔ (ابراہیم علیہ السلام) کی قوم شرک کی متعدد صورتوں میں مبتلا تھی، وہ دیگر چیزوں کے ساتھ ساتھ سورج، چاند اور ستاروں کی بھی پرستش کرتی تھی۔ ابراہیم علیہ السلام نے نہایت حکمت کے ساتھ ان کا بے اختیار ہونا اور رب نہ ہونا واضح فرمایا۔ دیکھیے سورۃ انعام: ۷۶ تا ۸۲) زیر تفسیر آیات سے ان مشرکین کا رد مقصود ہے۔ چنانچہ بتایا کہ رات اور سورج چاند اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی قدرت کی نشانیوں اور دلیلوں میں سے ہیں۔ سورج اور چاند سے پہلے رات اور دن کا ذکر اس لیے فرمایا کہ رات کو سورج کا چھینا اور چاند کا نکل آنا اور دن کو چاند کا چھینا اور سورج کا نمودار ہو جانا صاف دلالت کر رہا ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی رب یا رب تعالیٰ کا مظہر نہیں کہ اس کی صورت میں وہ خود ظاہر ہو رہا ہے، بلکہ یہ دونوں مجبور اور لاچار پیدا کیے گئے ہیں، جو رب تعالیٰ کے فرمان کے تحت مسخر ہیں اور اپنی گردش اور طلوع و غروب میں اس کے حکم کے پابند ہیں۔ اگر یہ خود رب ہوتے تو دن کے وقت کا سورج رات اور چاند کو نہ آنے دیتا، اسی طرح رات دن کے مقابلے میں ڈٹ جاتی اور اسے قدم نہ رکھنے دیتی، مگر ان سب کا بے اختیار ہو کر گردش کرتے چلے جانا اور ان میں کبھی کسی حادثے کا رونما نہ ہونا اکیلے رب تعالیٰ کے وجود کی دلیل ہے، جو ہر چیز کو اپنی حکمت کے تحت چلا رہا ہے۔

﴿۳۸﴾ رات دن کے اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہونے اور ان آیات کے حوالے کے لیے جن میں اس کی تفصیل ہے، دیکھیے سورۃ بنی اسرائیل کی آیت (۱۲) کی تفسیر۔

﴿۳۹﴾ لَا تَسْجُدُوا لِلشَّمْسِ وَ لَا لِلْقَمَرِ : اس سے معلوم ہوا کہ مخلوق کو سجدہ کرنا حرام ہے، سجدہ صرف اللہ کے لیے ہے جس نے یہ سب کچھ پیدا فرمایا۔

﴿۴۰﴾ إِنْ كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ : کچھ لوگ عقلی ڈھکوسلے گھڑتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم ان چیزوں کو سجدہ نہیں کرتے بلکہ ان کے واسطے سے اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں، جیسا کہ مشرکین کہتے تھے: ﴿فَمَا تَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَى﴾ [الزمر: ۲۳] ”ہم ان کی عبادت نہیں کرتے مگر اس لیے کہ یہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں۔“ اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا، اگر تم واقعی اللہ ہی کی عبادت کرتے ہو تو ان واسطوں کی کیا ضرورت ہے، سیدھے اسی کو سجدہ کیوں نہیں کرتے!؟

﴿۴۱﴾ سجدہ عبادت اور سجدہ تعظیم میں فرق اور سجدہ تعظیم کی حرمت کے لیے دیکھیے سورۃ بقرہ (۳۳) اور سورۃ یوسف (۱۰۰)۔

آیت 38 ﴿۱﴾ ﴿إِنِ اسْتَكْبَرُوا﴾ ”پھر اگر وہ تکبر کریں“ یعنی یہ سب کچھ سن کر بھی اگر وہ اپنی بات چھوڑنے کو ذلت سمجھیں، سورج، چاند اور مخلوق کو سجدہ کرنے پر اڑے رہیں اور اپنی جھوٹی عزت اور بڑائی کی وجہ سے جہالت اور شرک پر اصرار کرتے چلے جائیں۔

﴿۲﴾ یعنی اگر مشرکین اس قدر مغرور اور متکبر ہو گئے ہیں کہ اکیلے اللہ کو سجدہ کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں تو سمجھتے رہیں، اللہ تعالیٰ ان کا محتاج نہیں۔ اس کی عظمت کا تو یہ عالم ہے کہ وہ مقرب ترین فرشتے جو اس کے پاس ہیں، اس کا عرش اٹھائے

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ تَرَى الْأَرْضَ خَاشِعَةً فَإِذَا أَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ
 إِنَّ الَّذِي أَحْيَاهَا لُمُجِي الْمَوْتَى إِنَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۳۹﴾ إِنَّ الَّذِينَ يُلْحِدُونَ
 فِي آيَاتِنَا لَا يَخْفَوْنَ عَلَيْنَا ۚ أَفَمَنْ يُلْقَى فِي النَّارِ خَيْرٌ أَمْ مَنْ يَأْتِيَّ آمِنًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ
 اعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ ۚ إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿۴۰﴾

اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ تو زمین کو دبی ہوئی (نخچر) دیکھتا ہے، پھر جب ہم اس پر پانی اتارتے ہیں تو وہ لہلہاتی ہے اور پھولتی ہے۔ بے شک وہ جس نے اسے زندہ کیا، یقیناً مردوں کو زندہ کرنے والا ہے، یقیناً وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے ﴿۳۹﴾ بے شک وہ لوگ جو ہماری آیات کے بارے میں ٹیڑھے چلتے ہیں، وہ ہم پر مخفی نہیں رہتے، تو کیا وہ شخص جو آگ میں پھینکا جائے بہتر ہے، یا جو امن کی حالت میں قیامت کے دن آئے؟ تم کرو جو چاہو، بے شک وہ اسے جو تم کر رہے ہو خوب دیکھنے والا ہے ﴿۴۰﴾

ہوئے ہیں، یا عرش کے ارد گرد یا اس کے نیچے عاجزی سے کھڑے ہیں۔ (دیکھیے مومن : ۷) جن کے ذریعے سے ساری کائنات کے معاملات کی تدبیر ہو رہی ہے۔ وہ سب دن رات اس کی تسبیح کر رہے ہیں، یعنی اس بات کی شہادت دے رہے ہیں اور اس بات کا اعلان کر رہے ہیں کہ ان کا مالک اس سے پاک ہے کہ اس کے رب ہونے میں یا اس کے معبود برحق ہونے میں کوئی اس کا شریک ہو۔ مزید دیکھیے سورۃ انبیاء (۱۹، ۲۰) اور سورۃ اعراف (۲۰۶)۔ اب اگر چند احمق سمجھانے پر نہیں سمجھتے اور ساری کائنات کی شہادت کو رد کر کے اپنی عزت اور بڑائی کے جھوٹے گمان پر اڑے ہوئے ہیں تو وہ اپنا ہی نقصان کریں گے، اللہ تعالیٰ کا کچھ نہیں بگاڑیں گے۔ اس میں رسول اللہ ﷺ کے لیے تسلی بھی ہے۔

﴿۳۹﴾ جو لوگ عرش الہی کے منکر ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ذات کو کائنات سے الگ سب سے بلندی پر نہیں مانتے اور کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نہ اوپر ہے نہ نیچے، نہ کائنات کے اندر ہے نہ اس سے باہر، وہ لفظ "قَالَتِ الَّذِينَ عِنْدَ سَرَابِكَ" (وہ فرشتے جو تیرے رب کے پاس ہیں) کی عجیب و غریب تاویلیں کرتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ رب تعالیٰ کے ہاں بڑا مقام و مرتبہ رکھتے ہیں، کبھی کچھ کہتے ہیں کبھی کچھ، مگر جن جن کے عرش کو فرشتوں کے اٹھائے ہونے کے صریح الفاظ ان کی ایسی تمام تاویلیوں کا تار و پود بکھیر دیتے ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورۃ مومن (۷) اور سورۃ حاقہ (۱۷)۔

آیت 39 : وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ تَرَى الْأَرْضَ خَاشِعَةً : اس آیت کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۃ نحل (۶۵) اور سورۃ حج (۵۷)۔ یہاں نخچر زمین کے لیے "خَاشِعَةً" (دبی ہوئی، عاجز) کا لفظ استعمال ہوا ہے، کیونکہ بات ایک اللہ کو حمد کی ہو رہی ہے، یعنی خشوع کی ہو رہی ہے، جب کہ سورۃ حج میں اسی نخچر زمین کے لیے "هَامِدَةً" (مردہ) کا لفظ استعمال ہوا ہے، کیونکہ وہاں مرنے کے بعد زندگی کی بات ہو رہی ہے۔ (طباطبائی)

آیت 40 : ﴿۱﴾ إِنَّ الَّذِينَ يُلْحِدُونَ فِي آيَاتِنَا : "يُلْحِدُونَ" کا مادہ "لَحَدٌ" ہے۔ لحد اس قبر کو کہتے ہیں جو نیچے

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَاءَهُمْ ۗ وَإِنَّ لَهُمْ لَكِتَابًا عَزِيزًا ﴿۹۶﴾

بے شک وہ لوگ جنہوں نے اس نصیحت کے ساتھ کفر کیا، جب وہ ان کے پاس آئی (وہ بھی ہم پر مخفی نہیں ہیں) اور بلاشبہ یہ یقیناً ایک باعزت کتاب ہے ﴿۹۶﴾

سیدھی کھودنے کے بجائے کچھ نیچے جا کر ایک طرف کھود کر بنائی جاتی ہے۔ "إِنْخَاذٌ" کا معنی ہے سیدھے راستے سے انحراف، یعنی ایک طرف کو ہٹ جانا، کج روی اور نیزہا چھنا، یعنی جو لوگ حق سے ہٹ کر نیزہی راہ اختیار کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی آیات میں الخاد (نیزہا چھنا) یہ ہے کہ ان کا انکار کر دے، یا ان کا سیدھا سادا اور واضح مطلب لینے کے بجائے غیر متعلق بحثیں کرے اور انہیں غلط مطلب پہننے کی کوشش کرے۔ جو لوگ مسلمان ہو کر باطل نظریات مثلاً مشرکانہ عقائد، بدعت، انکار حدیث، اشتراکیت، سرمایہ داری اور دہریت وغیرہ کے حامی بن جاتے ہیں وہ یہی طرز اختیار کرتے ہیں، خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔ یہاں آیات الہی میں کج روی اختیار کرنے والوں کے لیے وعید آئی ہے اور سورہ اعراف کی آیت (۱۸۰) میں اسمائے الہی میں کج روی اختیار کرنے والوں سے علیحدگی کا حکم اور ایسے لوگوں کا انجام بیان فرمایا ہے۔

﴿لَا يَخْفَوْنَ عَلَيْنَا﴾ یہ پہلی شدید وعید ہے جو یہاں آیات الہی میں نیزہا چھنے والوں کے لیے آئی ہے کہ یہ لوگ ہم پر مخفی نہیں ہیں، بلکہ ہر لمحے ہماری نگاہ میں ہیں اور ہماری گرفت سے بچ کر کہیں نہیں جاسکتے۔ ہم اگر ان کے عذاب میں تاخیر کر رہے ہیں اور انہیں مہلت دے رہے ہیں تو اس لیے کہ جلدی تو وہ کرے جسے خطرہ ہو کہ مجرم روپوش ہو جائے گا اور قابو سے نکل جائے گا۔ مطلب یہ کہ ہم انہیں اس الخاد کی سزا ضرور دیں گے۔

﴿أَفَمَنْ يُنْفِ فِي النَّارِ خَيْرٌ أَمْ مَنْ يَأْتِي آمِنًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾ یہ دوسری دھمکی ہے کہ آیات الہی کا مطلب توڑنے مروڑنے والے اور ان کے بارے میں نیزہے چلنے والے آگ میں پھینکے جائیں گے اور آیات الہی میں الخاد سے اجتناب کرنے والے قیامت کے دن امن کی حالت میں آئیں گے۔ تو بتاؤ، جو آگ میں پھینکا جائے گا وہ بہتر ہے یا وہ جو قیامت کے دن امن کی حالت میں آئے گا؟

﴿إِعْتَلُوا مَا بُنِيَتْ لَهُمْ﴾ یہ تیسری دھمکی ہے، "کرو جو چاہو" کا مطلب اپنی مرضی کرنے کی اجازت دینا نہیں بلکہ ڈانٹ ہے کہ اس مہلت میں تم جو چاہو کرو، پھر اس کی سزا کے لیے ہم جو چاہیں گے کریں گے۔ تمہارے ہر عمل کو ہم خوب دیکھ رہے ہیں، یہ خیال نہ کرنا کہ تم اپنے کسی عمل بد کی سزا سے اس لیے بچ جاؤ گے کہ وہ ہماری نگاہ سے اوجھل ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی عظیم فرماں روا اپنے کچھ غلاموں پر، راض ہو کر شدید غصے سے کہے، جو چاہو کرو۔

آیت ۹۶ ﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَاءَهُمْ ۗ وَإِنَّ لَهُمْ لَكِتَابًا عَزِيزًا﴾ زخمی نے فرمایا: "یہ جملہ" "إِنَّ الَّذِينَ يُلْجِدُونَ فِي آيَاتِنَا" سے بدل ہے۔" (کشاف) اس لیے اس کی خبر وہی ہے جو پہلے جملے کی خبر ہے اور وہ ہے "لَا يَخْفَوْنَ عَلَيْنَا" اس صورت میں محذوف خبر نکالنے کی ضرورت نہیں، گویا عبارت اس طرح ہوئی کہ "یقیناً وہ لوگ جو ہماری آیات کے بارے میں

لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ ۖ تَنْزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَبِيدٍ ﴿۴۲﴾

اس کے پاس باطل نہ اس کے آگے سے آتا ہے اور نہ اس کے پیچھے سے، ایک کمال حکمت والے، تمام خوبیوں والے کی طرف سے اتاری ہوئی ہے ﴿۴۲﴾

میڑھے چلتے ہیں، جنہوں نے اس نصیحت کا اسی وقت انکار کر دیا جب وہ ان کے پاس آئی، وہ ہم پر مخفی نہیں ہیں۔“ بعض مفسرین نے فرمایا ”إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَاءَهُمْ“ کی خبر محذوف ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں، مقام کی مناسبت سے محذوف خبر ”يُجْزُونَ عَلَىٰ كُفْرِهِمْ“ یا اس سے ملتی جلتی ہوگی۔ یعنی وہ لوگ جنہوں نے اس نصیحت کے ساتھ کفر کیا جب وہ ان کے پاس آئی انہیں ان کے کفر کی جزا دی جائے گی۔

② ”بِالذِّكْرِ“ سے مراد قرآن کریم ہے، جیسا کہ آگے اس کی صفات بیان ہو رہی ہیں۔

③ لَمَّا جَاءَهُمْ: یعنی انہوں نے قرآن مجید کی آیات کا نزول ہوتے ہی ان کا انکار کر دیا، غور سے سننے اور سوچنے سمجھنے کی زحمت ہی نہیں کی۔

④ وَإِنَّهُ لَكِتَابٌ عَزِيزٌ: ”عَزِيزٌ“ کے دو معنی ہیں، ایک یہ کہ یہ سب پر غالب ہے، زبان و بیان میں، دلیل و برہان میں، علم و حکمت میں، صدق و حقانیت میں، غرض ہر لحاظ سے یہ دوسری ہر کتاب پر غالب اور زبردست ہے، دوسری سب کتب اس کے مقابلے میں زیر ہیں۔ ”عَزِيزٌ“ کا دوسرا معنی ہے عدیم النظر، بے مثال، کیونکہ پوری کائنات اس کی ایک سورت کی مثال لانے سے عاجز ہے۔

آیت 42 ﴿۱﴾ لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ: اس کے پاس نہ آنے کا مطلب یہ ہے کہ باطل آ کر اس پر غلبہ نہیں پاسکتا، یعنی باطل کی مجال نہیں کہ کسی پہلو سے آ کر اس پر غلبہ پاسکے، نہ کھلم کھلا سامنے آ کر اور نہ چوری چھپے سے۔ یہ مطلب بھی ہے کہ پہلے کی کوئی کتاب یا تحقیق اس قرآن کی کسی بات کو غلط یا باطل ثابت نہیں کر سکتی اور نہ ہی بعد کی کوئی کتاب یا تحقیق اس کی کسی بات کو غلط ثابت کر سکے گی، اور یہ مطلب بھی ہے کہ اس میں باطل کی آمیزش نہ کوئی کھلم کھلا کر سکتا ہے نہ چوری چھپے، جیسا پہلی کتابوں کے ساتھ ہوا، بلکہ اس کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لیا ہے، فرمایا: ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾ [الحجر: ۹] ”بے شک ہم نے ہی یہ نصیحت نازل کی ہے اور بے شک ہم اس کی ضرور حفاظت کرنے والے ہیں۔“

② تَنْزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَبِيدٍ: قرآن مجید کی کوئی بات غلط نہیں ہو سکتی، اس میں کسی باطل کی آمیزش نہیں ہو سکتی اور نہ ہی دلیل میں باطل کسی طرح اس پر غالب آسکتا ہے، کیونکہ یہ حکیم و جمید کی طرف سے تنزیل ہے۔ ”تَنْزِيلٌ“ کے مفہوم کے لیے دیکھیے سورہ بنی اسرائیل کی آیت (۱۰۶)۔ یعنی یہ کتاب اس نے تھوڑی تھوڑی کر کے نازل فرمائی ہے جو کمال حکمت والا ہے، ہر تعریف کا مستحق اور ہر خوبی کا مالک ہے۔ ”حَكِيمٌ“ وہ جس کی کسی تدبیر میں خطا نہ ہو اور ”حَبِيدٌ“ وہ جس کے کسی فعل کی مذمت نہ ہو سکے۔

مَا يُقَالُ لَكَ إِلَّا مَا قَدْ قِيلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ إِنَّ رَبَّكَ لَذُو مَغْفِرَةٍ وَذُو عِقَابٍ أَلِيمٍ ﴿۴۳﴾ وَ لَوْ جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا أَعْجَبِيًّا لَقَالُوا لَوْلَا فُضِّلَتْ آيَاتُهُ أَءَعْجَبِيٌّ وَعَرَبِيٌّ ۗ قُلْ

تھے نہیں کہا جائے گا مگر وہی جو ان رسولوں سے کہا گیا جو تمھ سے پہلے تھے اور بے شک تیرا رب یقیناً بڑی بخشش والا اور بہت دردناک عذاب والا ہے ﴿۴۳﴾ اور اگر ہم اسے عجبی قرآن بنا دیتے تو یقیناً وہ کہتے اس کی آیات کھول کر کیوں نہ بیان کی گئیں، کیا عجبی زبان اور عربی (رسول)؟ کہہ دے یہ ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے ہدایت اور

آیت 43 ﴿۴۳﴾ مَا يُقَالُ لَكَ إِلَّا مَا قَدْ قِيلَ لِلرُّسُلِ اس میں رسول اللہ ﷺ کو تسلی دی ہے کہ اگر کفار مکہ آپ کو جا دوں، شاعر، کاہن، دیوانہ، کذاب، متکبر یا اس قسم کے دوسرے ناموں سے یاد کر کے آپ کو ایذا دیتے ہیں تو آپ اطمینان رکھیں، ان کے رکھے ہوئے ناموں میں سے کوئی ایسی چیز نہیں جس کا طعن آپ سے پہلے رسولوں کو نہ مل چکا ہو، نہ آپ پہلے رسول ہیں جسے جھٹلایا گیا ہو اور نہ پہلے شخص ہیں جسے اللہ تعالیٰ کی خاطر تکلیف اٹھانا پڑی ہو۔ سورہ ذاریات میں فرمایا: ﴿كَذَلِكَ مَا آتَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا قَالُوا سَاحِرٌ أَوْ مُجْنُونٌ ۗ أَتَوَلَّوْنَا بِهِۦٓ بَنَ لِحُمْ قَوْمٌ طَآغُوتٌ﴾ [الذاریات: ۵۲، ۵۳] ”اسی طرح ان لوگوں کے پاس جو ان سے پہلے تھے، کوئی رسول نہیں آیا مگر انھوں نے کہا یہ جادوگر ہے، یا دیوانہ۔ کیا انھوں نے ایک دوسرے کو اس (بات) کی وصیت کی ہے؟ (نہیں) بلکہ یہ (خود ہی) سرکش لوگ ہیں۔“ کفار کی ایسی تمام باتوں پر رسولوں نے صبر کیا اور پوری ہمت سے اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچاتے رہے، یہی فریضہ آپ کا ہے، فرمایا: ﴿قَاضِيَةٌ كَمَا صَبَرَ أَوْلَاؤُا الْعَرْشِ مِنَ الرُّسُلِ وَ لَا تَسْتَعْجِلْ لَهُمْ﴾ [الأحقاف: ۳۵] ”پس صبر کر جس طرح پختہ ارادے والے رسولوں نے صبر کیا اور ان کے لیے جلدی کا مطالبہ نہ کر۔“

﴿۴۴﴾ إِنَّ رَبَّكَ لَذُو مَغْفِرَةٍ وَ ذُو عِقَابٍ أَلِيمٍ : یعنی اتنی ایذا اور بدزبانی کے باوجود اگر یہ لوگ توبہ کر کے ایمان لے آئیں تو تیرا رب بڑی مغفرت والا ہے (مَغْفِرَةٍ کی تینوں تعظیم کے لیے ہے) اور اگر اپنے کفر پر اصرار کریں تو وہ نہایت دردناک عذاب والا بھی ہے۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ انھیں ان کی اس بدزبانی کا بدلہ دینا آپ کا کام نہیں ہے، یہ ہمارا اختیار اور ہماری مرضی ہے کہ ہم انھیں ایمان کی توفیق سے نواز کر بخش دیں یا انھیں کفر پر رہنے دیں اور عذاب الیم چکھائیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَالِمُونَ﴾ [آل عمران: ۱۲۸] ”تیرے اختیار میں اس معاملے سے کچھ بھی نہیں، یا وہ ان پر مہربانی فرمائے یا انھیں عذاب دے، کیوں کہ بلاشبہ وہ ظالم ہیں۔“

آیت 44 ﴿۴۴﴾ وَ لَوْ جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا أَعْجَبِيًّا : سورت کے شروع میں ذکر فرمایا کہ ”رحمان و رحیم کی طرف سے یہ ایسی کتاب نازل کی گئی ہے جس کی آیات کھول کر بیان کی گئی ہیں، جو عربی قرآن ہے، ان لوگوں کے لیے جو جانتے ہیں۔“ مشرکین مکہ جو عرب تھے ان کا حق تھا کہ اپنی زبان میں اترنے والی کتاب کو سنتے اور اس پر غور و فکر کرتے، تو اس کے نتیجے میں انھیں ایمان کی دولت بھی نصیب ہو جاتی، مگر انھوں نے اپنی زبان میں ہونے کے باوجود اپنے کانوں، آنکھوں اور دلوں کے

هُوَ لِلَّذِينَ آمَنُوا هُدًى وَ شِفَاءً ۚ وَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ فِي آذَانِهِمْ وَقْرٌ وَهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى ۚ أُولَٰئِكَ يُنَادُونَ مِنْ مَكَانٍ بَعِيدٍ ﴿۳۱﴾

شفا ہے اور وہ لوگ جو ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں بوجھ ہے اور یہ ان کے حق میں اندھا ہونے کا باعث ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں بہت دور جگہ سے آواز دی جاتی ہے ﴿۳۱﴾

در سچے اس کے لیے بند کر دیے اور کہنے لگے: ﴿قُلُوبُنَا فِي أَكْتَابٍ مِمَّا تَدْعُونَا إِلَيْهِ وَ فِي آذَانِنَا وَقْرٌ وَ مِنْ بَيْنِنَا وَ بَيْنِكَ حِجَابٌ﴾ [حجۃ السجدۃ: ۵] ”ہمارے دل اس بات سے پردوں میں ہیں جس کی طرف تو ہمیں دعوت دیتا ہے اور ہمارے کانوں میں بھاری بوجھ ہے اور ہمارے درمیان اور تیرے درمیان بھاری پردہ ہے۔“ بلکہ انھوں نے عملاً طے کر لیا کہ یہ عربی قرآن نہ خود سنیں گے اور نہ کسی کو سننے دیں گے، جیسا کہ اسی سورت میں ہے: ﴿وَ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَسْمَعُوا لِهَذَا الْقُرْآنِ وَالنَّوَىٰ فَيَذَرُهَا قُلُوبُكُمْ لَغْوَٰنٌ﴾ [حجۃ السجدۃ: ۲۶] ”اور ان لوگوں نے کہا جنہوں نے کفر کیا، اس قرآن کو مت سنو اور اس میں شور کرو، تاکہ تم غالب رہو۔“

اب انھیں قائل کرنے کے لیے ایک صورت رہ جاتی تھی کہ قرآن عربی زبان کے بجائے کسی اور زبان میں اتارا جاتا، جس سے انھیں یقین ہو جائے کہ یہ عربی رسول جو عجیبی زبان جانتا ہی نہیں، عجیبی قرآن لے کر آیا ہے، تو یہ اللہ کی طرف سے معجزہ ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر ایسا ہوتا، پھر بھی یہ لوگ ایمان نہ لاتے، بلکہ نہ ماننے کے لیے ایک اور بہانہ پیش کر دیتے، کیونکہ جو طے کر چکا ہو کہ میں نے ماننا ہی نہیں اسے منوانے کی کوئی صورت نہیں۔

ہمارے شیخ محمد عبیدہ رضی اللہ عنہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: ”یہ کفار مکہ بھی عجیب شے ہیں، اگر ان کے پاس انھی میں سے ایک آدمی عربی میں قرآن لے کر آیا ہے تو کہتے ہیں کہ ایک عرب کا عربی قرآن پیش کرنا کوئی کمال نہیں، کمال تو اس وقت ہوتا جب یہ شخص کسی عجیبی زبان فارسی، رومی یا ترکی میں قرآن پیش کرتا۔ حالانکہ اگر ہم ان کا مطالبہ مان لیتے اور آپ ﷺ پر کسی عجیبی زبان میں قرآن نازل کر دیتے تو یہی لوگ اس وقت اعتراض کرتے کہ یہ عجیب معاملہ ہے کہ پیغمبر تو عربوں کو دعوت دینے کے لیے بھیجا گیا ہے، لیکن قرآن ایسی زبان میں لے کر آیا ہے جسے عرب سمجھ بھی نہیں سکتے۔“ (اشرف الحواشی)

﴿۳۱﴾ قُلْ هُوَ لِلَّذِينَ آمَنُوا هُدًى وَ شِفَاءً: اس کی تفسیر گزرجلی ہے، دیکھیے سورۃ یونس (۵۷) اور سورۃ بنی اسرائیل (۸۲)۔
 ﴿۳۲﴾ وَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ فِي آذَانِهِمْ وَقْرٌ: یعنی قرآن اگرچہ رشد و ہدایت کا سرچشمہ ہے، لیکن وہ ان کافروں کے حق میں کانوں کا بوجھ اور آنکھوں کا پردہ ہے۔ اس کی وجہ ان کی اپنی ہٹ دھرمی اور تعصب ہے، اس میں قرآن کا کوئی تصور نہیں ہے، بالکل اسی طرح جسے سورج روشنی دینے والی چیز ہے، لیکن اس کے طلوع ہوتے ہی چوگاڑ کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔

﴿۳۳﴾ أُولَٰئِكَ يُنَادُونَ مِنْ مَكَانٍ بَعِيدٍ: یہ ایک محاورہ ہے اور اس شخص کے حق میں استعمال ہوتا ہے جو کوئی بات نہ سمجھتا ہو۔ (قرطبی) یعنی یہ لوگ قرآن کو دل سے سننے کی کوشش نہیں کرتے، صرف اوپرے دل سے سنتے ہیں، اس لیے اس سے کوئی

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ فَاخْتَلَفَ فِيهِ دُولُو لَا كَلِمَةً سَبَقَتْ مِنْ مَرَاتِكَ لَقَضِي
بَيْنَهُمْ وَإِنَّهُمْ لَفِي شَكٍّ مِنْهُ مُرِيبٍ ﴿۴۵﴾

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تو اس میں اختلاف کیا گیا اور اگر وہ بات نہ ہوتی جو تیرے رب کی طرف سے پہلے طے ہو چکی تو ان کے درمیان ضرور فیصلہ کر دیا جاتا اور بلاشبہ وہ اس کے متعلق یقیناً ایسے شک میں ہیں جو بے چین رکھنے والا ہے ﴿۴۵﴾

ہدایت نہیں پاتے۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی شخص کو دور سے پکارا جائے اور وہ آواز تو محسوس کرے مگر مطلب مراد کچھ نہ سمجھے۔

آیت 45 ﴿۱﴾ وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ فَاخْتَلَفَ فِيهِ: اس سے بھی مقصود رسول اللہ ﷺ کو تسلی دینا ہے، یعنی اس سے پہلے موسیٰ ﷺ پر تورات نازل کی گئی، مگر لوگوں نے اس کے ماننے اور نہ ماننے میں اختلاف کیا، اسی طرح اگر یہ کفار مکہ قرآن کی مخالفت کر رہے ہیں تو آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں؟ (قرطبی)

﴿۲﴾ وَلَا كَلِمَةً سَبَقَتْ مِنْ مَرَاتِكَ لَقَضِي بَيْنَهُمْ: یعنی اگر پہلے یہ طے نہ ہو چکا ہوتا کہ کفار کے اعمال بد پر فوری گرفت کے بجائے دنیا میں ایک وقت تک انھیں مہلت دی جائے گی اور اصل فیصلہ آخرت میں ہوگا، تو ان کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ دیکھیے سورۃ ابراہیم (۳۲)، نمل (۶۱) اور فاطر (۳۵)۔

”لَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ مَرَاتِكَ“ میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے یہ طے نہ کر دیا ہوتا کہ ان کفار سے پیدا ہونے والی نسلیں مسلمان ہوں گی، جو اسلام کا علم بلند کریں گی تو ان کا قصہ تمام کر دیا گیا ہوتا، جیسا کہ طائف میں ہونے والی بدسلوکی پر اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی دل جوئی کے لیے ملک الجبال (پہاڑوں کے فرشتے) کو بھیجا اور اس نے آپ کو رسول اللہ ﷺ کو پیش کش کی کہ اگر آپ کہیں تو میں ان کفار پر اٹھسبیں (دو پہاڑوں) کو ملا دوں۔ (یہ مکہ کے دو پہاڑ ہیں، ایک ابو قیس ہے اور دوسرا اس کے بالمقابل قیقان ہے) تو آپ ﷺ نے فرمایا: «بَلِ أَرِجُو أَنْ يُخْرِجَ اللَّهُ مِنْ أَصْلَابِهِمْ مَنْ يَعْبُدُ اللَّهَ وَحْدَهُ لَا يُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا» [بخاری، بد الخلق، باب إذا قال أحدكم آمین..... : ۳۲۳۱، عن عائشة رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا] بلکہ میں امید رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی پشتوں سے ان لوگوں کو نکالے گا جو اکیلے اللہ عزوجل کی عبادت کریں گے، اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں بنائیں گے۔“

”لَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ مَرَاتِكَ“ میں یہ بات بھی شامل ہے کہ فرعون کے غرق ہونے کے بعد طے کر دیا گیا کہ اب پہلی اقوام پر آنے والے عذابوں کے بجائے دنیا میں کفار کو جہاد کے ذریعے سے مسلمانوں کے ہاتھوں سزا دی جائے گی اور آخری فیصلہ قیامت کے دن ہوگا۔ یہ پوری آیت اور اس کی تفسیر سورۃ ہود کی آیت (۱۱۰) میں گزر چکی ہے، وہاں ملاحظہ فرمائیں۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِلْعَبِيدِ ﴿۱۰۱﴾

جس نے نیک عمل کیا سو اپنے لیے اور جس نے برائی کی سو اسی پر ہوگی اور تیرا رب اپنے بندوں پر ہرگز کوئی ظلم کرنے والا نہیں ﴿۱۰۱﴾

﴿۱۰۱﴾ وَ إِنظَمَ نَفِي شَاكٍ فَمَنْهُ مُرِيْبٌ: "شَاكٍ" اور "مُرِيْبٌ" کی لغوی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۃ ہود (۶۲)۔

تہ 46 ﴿۱﴾ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ..... : اس میں رسول اللہ ﷺ اور اہل ایمان کے لیے تسلی ہے کہ اگر یہ لوگ ایمان نہیں لاتے تو آپ پر اس کا کوئی وبال نہیں۔ جو صالح عمل کرے گا اس کا فائدہ اسی کو ہے اور جو برائی کرے گا اس کا وبال اسی پر ہے۔

﴿۲﴾ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِلْعَبِيدِ: اور اللہ بندوں پر کچھ بھی ظلم کرنے والا نہیں کہ کسی کو اس کی نیکی کا بدلہ نہ دے، یا ایک کی بدی دوسرے پر ڈال دے۔

﴿۳﴾ یہاں لفظ "بِظَلَّامٍ" پر ایک مشہور سوال ہے، اس سوال اور اس کے جواب کے لیے دیکھیے سورۃ آل عمران (۱۸۲)، انقل (۵۱) اور سورۃ حج (۱۰) کی تفسیر۔



إِلَيْهِ يُرَدُّ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَمَا تَخْرُجُ مِنْ ثَمَرَاتٍ مِنْ أَكْمَامٍهَا وَمَا تُحْمَلُ مِنْ أُنْثَىٰ وَلَا تَضَعُ
الْإِبِلُوهٗ ۚ وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ إِيْن شُرَكَآئِي ۙ قَالُوا اذْكَ لَا مَا مِنَّا مِنْ شَهِيدٍ ﴿٤٧﴾

اسی کی طرف قیامت کا علم لوٹایا جاتا ہے اور کسی قسم کے پھل اپنے غلافوں سے نہیں نکلتے اور نہ کوئی مادہ حاملہ ہوتی ہے اور نہ بچہ جنمتی ہے مگر اس کے علم سے۔ اور جس دن وہ انھیں پکارے گا کہاں ہیں میرے شریک؟ وہ کہیں گے ہم نے تجھے صاف بتا دیا ہے، ہم میں سے کوئی (اس کی) شہادت دینے والا نہیں ﴿۴۷﴾

آیت 47 ① إِلَيْهِ يُرَدُّ عِلْمُ السَّاعَةِ: پچھلی آیت کے ضمن میں ہر نیک و بد عمل کی جزا کا ذکر ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں اکثر لوگ جزا کے بغیر فوت ہو جاتے ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن کا وعدہ فرما رکھا ہے۔ اسی کا نام ہی ”یوم الدین“ (جزا کا دن) ہے، کیونکہ اگر وہ نیک و بد کو جزا نہ دے تو یہ ظلم ہے، جب کہ وہ اپنے بندوں پر ذرہ برابر ظلم کرنے والا نہیں۔ کفار چونکہ قیامت قائم ہونے اور اس پر اللہ تعالیٰ کے پوری طرح قادر ہونے کی بات کو دلیل کے ساتھ نہیں جھٹلا سکتے تھے، اس لیے انھوں نے جھٹلانے کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ بار بار پوچھتے، قیامت کب ہوگی؟ گویا ان کی فرمائش پر وہ فوراً قائم نہ ہوئی تو کہہ سکیں گے کہ قیامت ہوتی تو آ جاتی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ قیامت کا علم اسی کی طرف لوٹایا جاتا ہے۔ یعنی انسان، جن اور فرشتے، غرض جس کسی سے قیامت کے متعلق پوچھو وہ بے خبر ہوگا۔ کسی دوسرے سے پوچھنے کو کہے گا تو وہ بھی بے خبر ہوگا۔ پوچھتے پوچھتے سبھی جس کی طرف لوٹائیں گے کہ وہی بتا سکتا ہے وہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہے، باقی سب بے خبر ہیں۔ مزید دیکھیے سورۃ نازعات (۴۲ تا ۴۴)، انعام (۵۹) اور سورۃ اعراف (۱۸۷) جبریل علیہ السلام نے انسانی شکل میں آ کر نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ قیامت کب ہوگی؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: «مَا الْمَسْئُولُ عَنْهَا بِأَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ» [بخاری، الإیمان، باب سؤال جبریل النبی ﷺ.....: ۵۰] ”جس سے اس کے متعلق پوچھا گیا ہے وہ پوچھنے والے سے زیادہ نہیں جانتا۔“ مطلب یہ ہے کہ تم جس بات کے پیچھے پڑے ہو تمہیں اس سے کچھ حاصل نہیں، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو معلوم ہی نہیں، اس لیے تم یہ فکر کرو کہ اس دن تمہارا بنے گا کیا اور تم نے اس کے لیے تیاری کیا کی ہے؟

② وَمَا تَخْرُجُ مِنْ ثَمَرَاتٍ مِنْ أَكْمَامٍهَا: ”اَكْمَامٌ“ ”كِمٌّ“ (کاف کے کسرہ کے ساتھ) کی جمع ہے، وہ غلاف یا پردہ جس کے اندر شروع میں پھل چھپا ہوتا ہے۔ ”ثَمَرَاتٍ“ جمع ہے اور کمرہ ہے، اس پر ”هِن“ آنے سے عموم میں اضافہ ہو گیا ہے۔ ان سب باتوں کو ملحوظ رکھ کر ترجمہ کیا گیا ہے ”کسی قسم کے پھل اپنے غلافوں سے نہیں نکلتے۔“ مطلب یہ ہے کہ صرف قیامت کا علم ہی نہیں، غیب کے متعلق جتنے بھی امور ہیں ان سب کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے، کسی نبی، ولی یا فرشتے کو غیب کے معاملات کا علم اسی حد تک ہو سکتا ہے جس حد تک اللہ تعالیٰ نے اسے خبر دی ہوتی ہے۔ مزید دیکھیے سورۃ انعام (۵۹) اور سورۃ اعراف (۱۸۷)۔

③ وَمَا تُحْمَلُ مِنْ أُنْثَىٰ وَلَا تَضَعُ إِلَّا بِعِلْمِهِ: دیکھیے سورۃ رعد (۸) اور سورۃ فاطر (۱۱)۔ یعنی قیامت کے علاوہ کسی پھل کے

وَصَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَدْعُونَ مِنْ قَبْلُ وَظَنُوا مَا لَهُمْ قِنٌ فُحِيصٌ ﴿۴۸﴾

اور ان سے غائب ہو جائیں گے وہ جنہیں وہ اس سے پہلے پکارتے تھے اور سمجھ لیں گے کہ ان کے لیے بھاگنے کی کوئی جگہ نہیں ﴿۴۸﴾

اپنے خلاف سے نکلنے یا کسی مادہ کے حاملہ ہونے یا بچہ جننے کے وقت کا علم بھی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں، تو کیا آج تک تم نے اس وجہ سے کسی پھل کے اپنے خلاف سے نکلنے یا کسی مادہ کے حاملہ ہونے یا بچہ جننے سے اور دوسری بے شمار چیزوں کے واقع ہونے سے اس لیے انکار کیا ہے کہ اس کا متعین وقت تمہیں نہیں بتایا گیا، تو قیامت کا انکار صرف اس لیے کیوں کہ تمہیں اس کے پتا ہونے کا وقت نہیں بتایا گیا؟

﴿۴۸﴾ وَ يَوْمَ يَنْذِرُ الَّذِينَ كَفَرُوا أَذْكَرٌ كَمَا مَفْعُولٌ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ قیامت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ دن یاد کرو جب اللہ تعالیٰ مشرکین کو پکار کر کہے گا، کہاں ہیں میرے شریک؟ ”شُرَكَاءَئِي“ (میرے شریک) سے مراد وہ ہیں جو انہوں نے بنا رکھے تھے، ورنہ اللہ تعالیٰ کا شریک کون ہو سکتا ہے! اللہ تعالیٰ کا انہیں یہ کہنا صرف انہیں ذلیل کرنے کے لیے ہوگا، کیونکہ وہ خوب جانتا ہے کہ اس کا کوئی شریک نہیں جسے وہ لے آئیں گے۔

﴿۴۹﴾ قَالُوا اذْذِكْ فَا مِمَّا مِنْ شَهِيدٍ: یعنی وہ اپنے مشرک ہونے کا انکار کر دیں گے اور کہیں گے کہ ہم نے تجھے صاف بتا دیا ہے کہ ہم میں سے کوئی اس کی شہادت دینے والا نہیں کہ تیرا کوئی شریک ہے، یعنی ہم نے تیرے ساتھ کبھی شرک کیا ہی نہیں۔ (دیکھیے انعام: ۲۲ تا ۲۳) حقیقت یہ ہے کہ قیامت کے دن وہ کبھی اپنے مشرک ہونے سے انکار کریں گے، کبھی بے اختیار اس کا اقرار کریں گے، پھر انکار کریں گے۔ (دیکھیے مومن: ۷۳، ۷۴) پھر شہادتیں پیش ہونے پر اقرار کے سوا کچھ چارہ نہ ہوگا۔

آیت 48 ﴿۴۸﴾ وَ صَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَدْعُونَ مِنْ قَبْلُ: یعنی پریشانی کے عالم میں وہ چاروں طرف نظر دوڑائیں گے کہ عمر بھر جنہیں پکارتے رہے، شاید ان میں سے کوئی مدد کو آجائے، انہیں عذاب سے چھڑا لے، یا اس میں کچھ کمی ہی کروا دے، مگر کوئی مددگار نظر نہیں آئے گا۔

﴿۴۹﴾ وَ ظَنُّوا مَا لَهُمْ قِنٌ فُحِيصٌ: ”خاصّ یحییصُ حیصاً“ (ض) بھاگنا۔ ”فُحِيصٌ“ مصدر مسی ہے یا ظرف۔ مصدر کا معنی ہوگا بھاگنے کی کوئی صورت اور ظرف کا معنی ہے بھاگنے کی کوئی جگہ۔ ”قِنٌ“ کا لفظ گمان کے علاوہ یقین کے معنی میں بھی آتا ہے۔ (دیکھیے بقرہ: ۳۶) یہاں بھی ”ظَنُّوا“ یقین کے معنی میں ہے، کیونکہ قیامت کے دن تمام حقیقتیں کھل کر سامنے آجائیں گی اور کسی کو کوئی شک باقی نہیں رہے گا، حتیٰ کہ کفار خود کو یقین ہو جانے کا اقرار کریں گے، فرمایا: ﴿رَبَّنَا اَبْرَأْنَا وَ سَبَعْنَا فَا زَجَعْنَا لَعْنَتَ صَالِحًا اِنَّا فُوقِنُونَ﴾ [السجدہ: ۱۲] ”اے ہمارے رب! ہم نے دیکھ لیا اور ہم نے سن لیا، ایسا ہمیں واپس بھیج کہ ہم نیک عمل کریں، بے شک ہم یقین کرنے والے ہیں۔“ اور دیکھیے سورہ مریم (۳۸)، سورہ ق (۲۲) اور سورہ انعام (۳۰)۔ مطلب یہ ہے کہ کفار کے حاجت رواؤں اور مشکل کشاؤں میں سے کوئی انہیں نظر نہیں آئے گا اور انہیں

لَا يَسْمَعُ الْإِنْسَانُ مِنْ دُعَاءِ الْخَيْرِ وَإِنْ مَسَّهُ الشَّرُّ فَيُؤَسِّ قَنُوطٌ ۝

انسان بھلائی مانگنے سے نہیں آکتاتا اور اگر اسے کوئی برائی آچپے تو بہت مایوس، نہایت ناامید ہوتا ہے ۝

یقین ہو جائے گا کہ ان کے پاس اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بھاگ نکلنے کی کوئی جگہ ہے نہ اس کی کوئی صورت۔

آیت 49 ﴿ لَا يَسْمَعُ الْإِنْسَانُ ﴾: یہاں سے انسانی طبیعت پر کفر و شرک اور قیامت کے انکار کا ایک بہت برا اثر ذکر فرمایا۔ ”الإنسان“ سے مراد عام انسان ہے جو ایمان و یقین کی دولت سے خالی ہو، اس میں طبعی طور پر یہ کمزوری رکھی گئی ہے۔ توحید و رسالت اور آخرت پر ایمان کے بعد اس کی اس کمزوری کا علاج ہو جاتا ہے اور ایمان جس قدر قوی ہوتا ہے اتنا ہی وہ اس کمزوری سے پاک ہوتا جاتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ إِنَّ الْإِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا ۚ إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا ۚ وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا ۚ إِلَّا الْمُسْلِمِينَ ۗ وَالَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ ۗ ... أُولَٰئِكَ فِي جَنَّاتٍ مُّكْرَمُونَ ۗ ﴾ [المعارج: ۱۹-۲۵] بلاشبہ انسان تھمز دلا بنایا گیا ہے۔ جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو بہت گھبرا جانے والا ہے۔ اور جب اسے بھلائی ملتی ہے تو بہت روکنے والا ہے۔ سوائے نماز ادا کرنے والوں کے۔ وہ جو اپنی نماز پر پیشگی کرنے والے ہیں ... یہی لوگ جنتوں میں عزت دیے جانے والے ہیں۔“ مزید دیکھیے سورہ ہود (۱۱ تا ۹) کی تفسیر۔

﴿ مِنْ دُعَاءِ الْخَيْرِ : ”الْخَيْرِ“ سے مراد دنیوی بھلائی ہے جس میں مال، اولاد، عزت، صحت اور قوت سبھی کچھ شامل ہے۔ ”دُعَاءُ“ سے مراد خیر کی طلب ہے، یعنی انسان دنیوی بھلائی کی طلب سے نہ آکتاتا ہے اور نہ تھکتا ہے، خواہ اسے اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ فرما رہے تھے: ﴿ لَوْ كَانَ لِإِنْسَانٍ أَذَمٌ وَادِيَانِ مِنْ مَّالٍ لَا يَنْتَعِي نَالِيَهُمْ وَلَا يَمْلَأُ حَوْفَ ابْنِ آدَمَ إِلَّا التُّرَابُ، وَ يَتَوَبُّ اللَّهُ عَلَىٰ مَنْ تَابَ ﴾ [بخاری، الرقاق، باب ما ينفع من فتنه المال: ۶۴۳۶] ”اگر ابن آدم کے پاس مال کی دو وادیاں ہوں تو وہ کوئی تیسری تلاش کرے گا اور ابن آدم کے پیت کو مٹی کے سوا کوئی چیز نہیں بھرتی اور اللہ اس پر پھر مہربان ہو جاتا ہے جو واپس پلٹ آئے۔“

﴿ وَإِنْ مَسَّهُ الشَّرُّ فَيُؤَسِّ قَنُوطٌ : ”مَسَّ يَمَسُّ“ (س) چھونا۔ ”فَيُؤَسِّ“ ”يَمَسُّ يَمَسُّ يَأْسًا“ (س، ح) سے مبالغے کا صیغہ ہے، بہت ناامید۔ ”قَنُوطٌ“ ”قَنَيْطٌ يَقْنُطُ قَنُوطًا“ (س، ن) سے مبالغے کا صیغہ ہے، بہت ناامید۔ بعض مفسرین نے فرمایا ”فَيُؤَسِّ“ اور ”قَنُوطٌ“ دونوں کا معنی ایک ہے، تاکید کے لیے ”فَيُؤَسِّ“ کے بعد ”قَنُوطٌ“ لایا گیا ہے اور بعض نے فرمایا، دونوں کے معنی میں فرق ہے۔ ابو حیان نے فرمایا: ”يَأْسٌ“ دل کی حالت ہے کہ آدمی کا دل خیر کی امید سے خالی ہو جائے اور ”قَنُوطٌ“ یہ ہے کہ ناامیدی کے آثار اس کے چہرے اور بدن پر بھی ظاہر ہو جائیں۔“ ظاہر ہے یہ فرق اس وقت ہے جب یہ دونوں لفظ اکٹھے آئیں، ورنہ یاں اور قنوط دونوں میں قلبی اور بدنی ہر طرح کی ناامیدی مراد ہوتی ہے، جیسا کہ ایمان و اسلام کا معاملہ ہے۔ ”مَسَّ“ (چھونے) کے لفظ سے معلوم ہوا کہ کافر اتنا بے حوصلہ ہوتا ہے کہ برائی چھو جانے ہی سے آخری حد تک امید توڑ بیٹھتا ہے۔ مومن ایسا نہیں ہوتا، یہ صرف کافر کا حال ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ إِنَّهُ لَا يَأْتِيَنَّكَ

وَلَيْنٌ أَذَقْتَهُ رَحْمَةً فَنَأَىٰ مِنْ بَعْدِ ضَرَاءَ مَسَّهُ لِيَقُولَنَّ هَذَا لِي دَوْمًا أَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً ۗ
 وَلَيْنٌ رُجِعْتُ إِلَىٰ رِيقِي إِنْ لِي عِنْدَهُ لِلْحُسْنَىٰ ۗ فَلَتَنَبِّئَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِهَا عِبْلَاءُ
 وَلَنُذِيقَنَّهُمْ قِينَ عَذَابٍ غَلِيظٍ ۝۵۰ وَإِذَا أَنْعَمْنَا عَلَى الْإِنْسَانِ أَعْرَضَ وَنَأَىٰ بِجَانِبِهِ ۗ وَإِذَا
 مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُو دُعَاءٍ عَرِيضٍ ۝۵۱

اور یقیناً اگر ہم اسے کسی تکلیف کے بعد جو اسے پہنچی ہو، اپنی طرف سے کسی رحمت کا مزہ چکھائیں تو ضرور ہی کہے گا یہ میرا حق ہے اور میں گمان نہیں کرتا کہ قیامت قائم ہونے والی ہے اور اگر واقعی مجھے اپنے رب کی طرف واپس لے جایا گیا تو یقیناً میرے لیے اس کے پاس ضرور بھلائی ہے۔ پس ہم یقیناً ان لوگوں کو جنہوں نے کفر کیا ضرور بتائیں گے جو کچھ انہوں نے کیا اور یقیناً ہم انہیں ایک سخت عذاب میں سے ضرور چکھائیں گے ۵۰ اور جب ہم انسان پر انعام کرتے ہیں وہ مزہ موڑ لیتا ہے اور اپنا پہلو دور کر لیتا ہے اور جب اسے مصیبت پہنچتی ہے تو (لمبی) چوڑی دعا والا ہے ۵۱

مَنْ زُوجَ اللَّهُ إِلَّا الْقَوْمَ الْكَافِرُونَ ﴿۱۸۷﴾ | يوسف : ۸۷ | ”بے شک حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی رحمت سے ناامید نہیں ہوتے مگر وہی لوگ جو کافر ہیں۔“

آیت 50 ① وَلَيْنٌ أَذَقْتَهُ رَحْمَةً فَنَأَىٰ ... : یعنی ایک طرف وہ ناامیدی کہ شر کے چھو جانے ہی سے آخری حد تک ناامید ہوتا ہے، دوسری طرف یہ احسان فراموشی کہ مصیبت کے بعد کسی رحمت کا ذائقہ چکھتے ہی پھول جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے لاتعلق ہو جاتا ہے، حالانکہ نہ وہ شر اور مصیبت دائمی تھی نہ اس دنیوی نعمت کو دوام ہے۔ پھر یہ نعمت اس کی محنت کا نتیجہ نہیں کہ اس پر پھول جائے، بلکہ یہ محض ہماری عطا ہے۔ ”رَحْمَةً فَنَأَىٰ“ کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ ہود (۱۰۹) کی تفسیر۔

② لِيَقُولَنَّ هَذَا لِي : یعنی کافر آدمی دنیوی نعمت کا ذائقہ چکھتے ہی تین کفریہ باتیں کہے گا، اس کے دل میں یہی باتیں ہوں گی اور زبان سے بھی یہی کہے گا۔ پہلی بات یہ کہ یہ نعمت میری جدوجہد کا نتیجہ اور میرا حق ہے، جیسا کہ فرعون کے لوگ کہتے تھے (دیکھیے اعراف: ۱۳۰، ۱۳۱) اور جیسا کہ قارون نے کہا تھا (دیکھیے قصص: ۷۸) حالانکہ یہ اللہ تعالیٰ کی صریح ناشکری اور احسان فراموشی ہے۔

③ وَنَأَىٰ أَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً ۗ : وَلَيْنٌ رُجِعْتُ إِلَىٰ رِيقِي إِنْ لِي عِنْدَهُ لِلْحُسْنَىٰ : ان دونوں باتوں کی تفصیل سورہ کہف کی آیت (۳۶) کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

آیت 51 ④ وَإِذَا أَنْعَمْنَا عَلَى الْإِنْسَانِ أَعْرَضَ وَنَأَىٰ بِجَانِبِهِ : ”نَأَىٰ يَنْأَىٰ نَأً“ (ف) دور ہونا۔ یہ فعل لازم ہے، ”بجانبہ“ پر آنے والی ”ہاء“ کے ساتھ متعدی ہو گیا، اس لیے ”نَأَىٰ بِجَانِبِهِ“ کا معنی ہے اپنا پہلو دور کر لیتا ہے۔ پچھلی آیت

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ ثُمَّ كَفَرْتُمْ بِهِ مَنْ أَضَلُّ مِنْهُ هُوَ فِي شِقَايَ بَعِيدٍ ﴿۵۲﴾
 سُنُّرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْأَفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ۗ أَوَلَمْ يَكْفِ
 بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ﴿۵۳﴾

کہہ دے کیا تم نے دیکھا اگر وہ اللہ کی طرف سے ہوا، پھر تم نے اس کا انکار کر دیا تو اس سے زیادہ کون گمراہ ہو گا جو بہت دور کی مخالفت میں پڑا ہو ﴿۵۲﴾ عنقریب ہم انہیں اپنی نشانیاں دنیا کے کناروں میں اور ان کے نفسوں میں دکھلائیں گے، یہاں تک کہ ان کے لیے واضح ہو جائے کہ یہی حق ہے اور کیا تیرا رب کافی نہیں اس بات کے لیے کہ وہ ہر چیز پر گواہ ہے ﴿۵۳﴾

میں کافر انسان کا قول بیان ہوا ہے، اس آیت میں اس کا حال بیان ہوا ہے۔ اس آیت کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۃ یونس (۱۲)، ہود (۱۰، ۱۱) اور سورۃ زمر (۲۹)۔

آیت 52 قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ ثُمَّ كَفَرْتُمْ بِهِ : یہ پوری سورت قرآن کریم، توحید و رسالت اور قیامت کے حق ہونے کے دلائل سے بھری ہوئی ہے، جنہیں کفار نہ صرف یہ کہ مانتے نہیں تھے بلکہ سننے پر بھی تیار نہیں تھے، جیسا کہ آیت (۵) میں گزرا: ﴿وَقَالُوا فَلَوْلَنَّا فِي آكِنَاتٍ﴾ "اور انہوں نے کہا ہمارے دل اس بات سے پردوں میں ہیں۔" اور آیت (۲۶) میں ہے: ﴿وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَسْعُوا لِهَذَا الْقُرْآنِ﴾ "اور ان لوگوں نے کہا جنہوں نے کفر کیا، اس قرآن کو مت سنو۔" تو سورت کے آخر میں نبی ﷺ کو حکم ہوا کہ ان سے کہیں کہ تم جو قرآن کو سننے تک کے لیے تیار نہیں اسے باطل یا جھوٹ کیسے کہہ سکتے ہو؟ کیونکہ اسے غلط تو تب کہہ سکتے ہو کہ اسے سنو، پھر حق ہو تو قبول کر دو، ورنہ دلیل سے اسے باطل قرار دو، اتنا تم میں حوصلہ نہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ تمہیں اس کے باطل ہونے کا یقین نہیں، ورنہ ایسی چیز جس کا غلط ہونا بالکل واضح ہو، اس کے سننے پر اتنی شدید پابندی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس سے ظاہر ہے کہ تمہارے ذہن میں بھی اس کے حق ہونے کا امکان موجود ہے۔ اس لیے یہ بتاؤ کہ یہ قرآن جسے تم سننے ہی کے روادار نہیں، اگر واقعی اللہ کی طرف سے حق ہوا، پھر سننے سمجھنے بغیر تم نے اسے جھٹلایا اور اسی حالت میں تمہاری موت آگئی، پھر حشر پیا ہوا تو اس وقت تو تم اتنی دور کی مخالفت میں پڑ چکے ہو گے جو بہت دور کی مخالفت ہے، جس سے واپسی تم چاہو گے بھی تو ممکن نہیں۔ پھر جو خواہ مخواہ کی ایسی غلط مخالفت پر ڈٹ جائے، جس سے واپسی ممکن نہ ہو، اس سے زیادہ گمراہ کون ہو سکتا ہے؟ آیت کا مقصد کفار کو سننے اور سوچنے پر آمادگی کی ترغیب اور اس وقت سے ڈرانا ہے جب ان کی مخالفت کے نقصان کا مداوا نہیں ہو سکے گا۔

آیت 53 ﴿سُنُّرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْأَفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ : "الْأَفَاقِ" "الْأَفَاقِ" کی جمع ہے، کنارے۔ دور وہ جگہ جہاں آسمان و زمین ملتے ہوئے نظر آتے ہیں، افق کہلاتی ہے۔ مفسرین نے اس آیت کی تفسیر دو طرح سے کی ہے، ایک یہ کہ

۱۰۷. اَلَا اِنَّهُمْ فِي مَرِيَّةٍ مِّنْ نَّفَاۗءٍ رَبِّهِمْ ؕ اِلَّا اِنَّهٗ يُجِنُّ شَيْۡءًا مَّحِيۡطًا ۝۵۴

بے یقینا یہ لوگ اپنے رب سے ملنے کے بارے میں شک میں ہیں۔ سن لو! یقیناً وہ ہر چیز کا احاطہ کرنے والا ہے ۵۴

”اِنَّهُمْ“ کی ضمیر سے مراد قرآن اور نبی کریم ﷺ ہیں۔ یعنی ہم انھیں دنیا بھر میں اور خود ان میں اپنی ایسی نشانیاں دکھا دیں گے جن سے ثابت ہو جائے گا کہ آپ ﷺ کی نبوت اور قرآن حق ہے۔ نشانیوں سے مراد ظاہری اسباب کی قلت کے باوجود اسلام کی فتوحات ہیں۔ ”الْاَفَاقِ“ سے مراد مکہ کے گرد و پیش میں اسلام کا غلبہ ہے جو بدر، أُحُد، خندق اور دوسرے معرکوں کے ساتھ جزیرہ عرب پر اور آخر کار پوری زمین کے مشرقی اور مغربی کناروں تک پھیل گیا اور ”اَنْفُسِهِمْ“ سے مراد مکہ کی فتح ہے جو بجائے خود اسلام کے حق ہونے کی بہت بڑی دلیل تھی، جس کے بعد لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہو گئے۔ مطلب یہ کہ مغرب جب گرد و پیش کے ممالک اور خود ان (قریش) پر فتوحات حاصل ہوں گی جو آپ ﷺ اور خلفائے اسلام کے عہد میں حاصل ہوئیں، تب انھیں یقین حاصل ہو گا کہ قرآن اور پیغمبر حق تھے اور یہ ناحق انھیں جھٹلاتے رہے۔

دوسری تفسیر یہ کہ ”اِنَّهُمْ“ کی ضمیر سے مراد اللہ تعالیٰ ہے، مطلب یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی وحدانیت کے دلائل پر غور کریں گے، جو تمام آفاق یعنی زمین و آسمان میں پائے جاتے ہیں، مثلاً سورج چاند، نباتات و جمادات و حیوانات وغیرہ اور جو خود ان کی ذات میں پائے جاتے ہیں، مثلاً لطف سے لے کر پیدائش تک، پھر بچپن سے لے کر موت تک، پھر ان کے وجود کی حیرت انگیز بناوٹ پر، جن کے عجائبات کے متعلق ہر روز نئے سے نئے انکشافات ہوتے رہیں گے، تو انھیں یقین ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ ہی حق ہے۔ پہلے مطلب کو ابن جریر طبری نے ترجیح دی ہے، جبکہ دوسرا مطلب بعض تابعین نے اختیار فرمایا ہے۔ دونوں مطلب بیک وقت بھی مراد ہو سکتے ہیں۔

② اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ : یعنی مسلمانوں کی کمزوری کو دیکھتے ہوئے اگر کوئی کہے کہ اسلام اور مسلمانوں کا غلبہ کفار قریش پر اور کل عالم پر کیسے ممکن ہے تو اسے کہو، کیا تمہارا رب یہ کام کرنے کے لیے اکیلا کافی نہیں؟ اس لیے کہ وہ اکیلا ہر چیز اور ہر کام کا نگران اور اس پر شاہد ہے، اسے کسی کی مدد یا مشورے کی کوئی حاجت نہیں۔

ت 54 : ① اَلَا اِنَّهُمْ فِي مَرِيَّةٍ مِّنْ نَّفَاۗءٍ رَبِّهِمْ : یعنی یہ لوگ قرآن اور اللہ کے رسول کو اس لیے جھٹلاتے رہے ہیں کہ انھیں قیامت کا یقین نہیں، بلکہ وہ اپنے رب کی ملاقات کے بارے میں شک میں مبتلا ہیں۔

② اَلَا اِنَّهٗ يُجِنُّ شَيْۡءًا مَّحِيۡطًا : یعنی وہ یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا احاطہ کرنے والا ہے، کوئی چیز اس کے علم اور قدرت سے باہر نہیں، اس لیے وہ اس کی گرفت سے کسی طرح نہیں بچ سکتے۔



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حَمْدٌ ۱ عَسَقٌ ۲ كَذٰلِكَ يُوَجِّىۡ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۙ اللّٰهُ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

حَمْدٌ ۱ عَسَقٌ ۲ اسی طرح وحی کرتا ہے تیری طرف اور ان لوگوں کی طرف جو تجھ سے پہلے تھے، وہ اللہ جو سب پر

غالب، کمال حکمت والا ہے ۳

آیت 2.1 حَمْدٌ ۱ عَسَقٌ ۲: یہ حروف مقطعات ہیں، ان کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ بقرہ کی پہلی آیت کی تفسیر۔

آیت 3 ۱ كَذٰلِكَ يُوَجِّىۡ اِلَيْكَ (اسی طرح) سے مراد ایک تو وہ مضامین و معانی ہیں جو اس قرآن یا

اس سورت میں ہیں، یعنی آپ کی طرف توحید، آخرت، نبوت اور دوسرے عقائد و اعمال اور واقعات پر مشتمل جو وحی کی گئی ہے

یہ کوئی زالی نہیں کہ کفار کو اس پر تعجب ہو رہا ہے، بلکہ ایسے ہی مضامین کی وحی اللہ تعالیٰ آپ کی طرف اور آپ سے پہلے پیغمبروں

کی طرف کرتا چلا آیا ہے۔ بعض وقتی احکام میں فرق ہو سکتا ہے، مگر اصل دعوت جس کے لیے آپ کو اور پہلے تمام پیغمبروں کو

مبعوث کیا گیا ایک ہی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیۡۤ اِلَيْهِۭ اَنْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اَنَاۤ

فَاَعْبُدُوْنِ﴾ [الانبیاء: ۲۵] ”اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف یہ وحی کرتے تھے کہ حقیقت یہ

ہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو میری عبادت کرو۔“ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿اَلْاَنْبِیَآءُ

اِخْوَةٌ لِّعٰلَمٍ، اُمَّهَاتُهُمْ شَتٰی وَ دِیْنُهُمْ وَاِحَدٌ﴾ [بخاری، احادیث الانبیاء، باب قول اللہ تعالیٰ: ﴿واذکر فی الكتاب

مریم.....﴾ [۳۴:۴۳] ”انبیاءِ عِلّاتی (مختلف ماؤں سے پیدا ہونے والے) بھائی ہیں، ان کی مائیں الگ الگ ہیں اور ان کا

دین ایک ہے۔“ اور ”كَذٰلِكَ“ (اسی طرح) سے مراد وحی کرنے کا طریقہ بھی ہے، یعنی جس طرح یہ سورت یا یہ کتاب آپ

کی طرف وحی کی جا رہی ہے، اللہ تعالیٰ اسی طرح آپ سے پہلے پیغمبروں کی طرف بھی وحی کرتا چلا آیا ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے

اپنی رسالت کے لیے جن لیتا ہے، پھر اس کے ساتھ وحی کی ان صورتوں میں سے کسی صورت کے ساتھ کلام کرتا ہے جو اس نے

اس سورت کے آخر میں کسی بھی بشر کے ساتھ کلام کرنے کی بیان فرمائی ہیں۔ (دیکھیے شوریٰ: ۵۱، ۵۲) کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ

اللہ تعالیٰ نے مجھ پر وحی کیوں نازل نہیں کی، یا مجھ سے کلام کیوں نہیں فرمایا۔

عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: ”یا رسول اللہ! آپ کے پاس وحی کس

طرح آتی ہے؟“ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿اَحْیَانًا یَاْتِیْنِیْ مِثْلَ صَلْصَلَةِ الْجَرَسِ وَهُوَ اَشَدُّ عَلَیَّ فِیْقَصُّمُ عَلَیَّ

وَ قَدْ وَعِیْتُ عَنْهُ مَا قَال، وَاَحْیَانًا یَنْمَثَلُ لِی الْمَلٰٓئِكَةُ رَجُلًا فِیْکَلِّمُنِیْ فَاَعْنِیْ مَا یَقُوْلُ قَالَتْ عَائِشَةُ رَضِیَ اللّٰهُ

عَنْهَا وَلَقَدْ رَاٰیْتُهُ یَنْزِلُ عَلَیْهِ الْوَحْیُ فِی الْیَوْمِ الشَّدِیْدِ الْبَرْدِ، فِیْقَصُّمُ عَنْهُ وَاِنَّ جَبِیْنَهُ لَیَنْفَضُّ عَرَقًا﴾ [بخاری،

لَهُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ ﴿۱۰﴾ تَكَادُ السَّمَوَاتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْ

ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور وہی بے حد بلند، بڑی عظمت والا ہے ﴿۱۰﴾ آسمان قریب

بند الوحي إلى الرسول ﷺ، باب ۲۱ | ”میرے پاس وحی کبھی تو گھنٹی کی مسلسل آواز کی طرح آتی ہے جو مجھ پر وحی کی سب سے زیادہ سخت صورت ہے، پھر وہ مجھ سے اس حال میں ختم ہوتی ہے کہ جو کچھ مجھے کہا ہے وہ میں یاد کر چکا ہوتا ہوں اور کبھی فرشتہ ایک آدمی کی شکل میں میرے پاس آتا ہے اور مجھ سے کلام کرتا ہے، تو جو کچھ وہ کہتا ہے میں یاد کر لیتا ہوں۔“ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ”میں نے آپ کو سخت سردی والے دن میں آپ پر وحی اترنے کی حالت میں دیکھا کہ وہ کیفیت آپ سے ختم ہوتی تو آپ کی پیشانی پسینے سے ٹپک رہی ہوتی تھی۔“

﴿۱۰﴾ وَ إِلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكَ : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ نساء کی آیات (۱۶۳ تا ۱۶۵)۔

﴿۱۱﴾ اللَّهُ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ : سورہ نساء کی آیات، جن کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے، ان میں پیغمبروں کی طرف وحی کا ذکر فرما کر بات کا خاتمہ اپنے ہمیشہ سے عزیز و حکیم ہونے کے ساتھ کیا، چنانچہ فرمایا: ﴿وَ كَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا﴾ [النساء: ۱۶۵] ”اور اللہ ہمیشہ سے سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے۔“ قرآن مجید میں جہاں جہاں وحی نازل کرنے کا ذکر ہے اس کے بعد مقام کی مناسبت سے اللہ تعالیٰ کے بعض اسماء و صفات کا ذکر بھی ہے۔ کتاب اللہ نازل کرنے کے ساتھ عزیز و حکیم کے ذکر کی مناسبت کے لیے دیکھیے سورہ زمر کی پہلی آیت کی تفسیر، ساتھ سورہ مومن کی پہلی آیت کی تفسیر بھی ملاحظہ فرمائیں۔

ت 4 ﴿۱﴾ لَهُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ : یہ اس سوال کا جواب ہے کہ اگر محمد ﷺ پر یہ کتاب پہلے پیغمبروں کی طرح نازل ہوئی ہے تو ہوتی رہے، ہم پر کیوں لازم ہے کہ ہم اس کے احکام کی پابندی کریں اور اپنی مرضی پر عمل نہ کریں؟ فرمایا، اس لیے کہ آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے سب کا مالک اللہ تعالیٰ ہے، خود تم بھی اس کی ملکیت ہو۔ بھلا وہ مالک برداشت کر سکتا ہے کہ اس کی ملکیت میں کسی اور کی خدائی چلے اور اس کا مملوک ہو کر کوئی اپنی مرضی کرتا پھرے اور اس کے بھیجے ہوئے احکام پر عمل نہ کرے۔ مزید دیکھیے آیت الکرسی یعنی سورہ بقرہ کی آیت (۲۵۵) میں اس جملے کی تفسیر۔

﴿۱۲﴾ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ : بے حد بلندی اور بے انتہا عظمت والا صرف وہی ہے (الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ) خبر پر الف لام آنے سے قمر پیدا ہو گیا کہ وہی علی و عظیم ہے) تو وہ کیسے گوارا کر سکتا ہے کہ اس کی بنائی ہوئی مخلوق اس کے مقابلے میں بے حد پست اور بے انتہا حقیر ہو کر اس کے احکام نہ مانے۔

ت 5 ﴿۱﴾ تَكَادُ السَّمَوَاتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْ قُبُورِهِنَّ : ”وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ“ کے بعد یہ فرمانے کا ایک مطلب یہ ہے کہ آسمان قریب ہیں کہ اپنے اوپر سے پھٹ پڑیں، یعنی اللہ تعالیٰ کے علی و عظیم ہونے کی وجہ سے اس کے رعب اور جلال کا یہ عالم ہے کہ آسمان اس کی ہیبت و قوت برداشت نہ کرتے ہوئے پھٹ جائیں۔ اللہ تعالیٰ کی عظمت و ہیبت کا آسمانوں پر جو اثر ہے اس کا کچھ اندازہ اس حدیث سے ہوتا ہے جو ابو ذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿إِنِّي أُرَى مَا

فَوَقَّهِنَّ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ يَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ ۗ اَلَا اِنَّ اللّٰهَ

ہیں کہ اپنے اوپر سے پھٹ پڑیں اور فرشتے اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور ان لوگوں کے لیے بخشش کی دعا

لَا تَرَوْنَ وَاَسْمَعُ مَا لَا تَسْمَعُوْنَ اَطَلَّتِ السَّمَاءُ وَحَقَّ لَهَا اَنْ تَنْطَبَّ مَا فِيهَا مَوْضِعُ اُرْبَعِ اَصْبَاعٍ اِلَّا وَ مَلَكٌ وَاَضَعُ جِبْهَتَهُ سَاجِدًا لِلّٰهِ، وَاللّٰهُ! لَوْ تَعْلَمُوْنَ مَا اَعْلَمَ لَضَحِكْتُمْ قَلِيْلًا وَّلَبَكَيْتُمْ كَثِيْرًا وَمَا تَلَدَّدْتُمْ بِالنِّسَاءِ

عَلَى الْمُرْشِ وَاَلْخَرَجْتُمْ اِلَى الصُّعْدَاتِ تَجَارُوْنَ اِلَى اللّٰهِ [ترمذی، الزهد، باب فی قول النبی ﷺ لو تعلمون..... :

۲۳۱۲، و حسنہ الترمذی، و قال الالبانی حسن] ”میں وہ کچھ دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے اور وہ سنتا ہوں جو تم نہیں سنتے۔

آسمان چر چرا رہا ہے اور اس کا حق ہے کہ چر چرائے، اس میں چار انگلیوں کی جگہ نہیں مگر کوئی نہ کوئی فرشتہ اپنی پیشانی رکھ کر اللہ

کے لیے سجدے میں ہے۔ اللہ کی قسم! اگر تم وہ جان لو جو میں جانتا ہوں تو بہت کم ہنسو اور بہت زیادہ روؤ، اور تم بستروں پر

عمورتوں سے لذت حاصل نہ کرو اور تم اللہ کی طرف گڑ گڑاتے ہوئے بیابانوں کی طرف نکل جاؤ۔“ اور ایک مطلب یہ ہے کہ اس

عزیز و حکیم اور علیٰ و عظیم مالک کی نازل کردہ کتاب پر ایمان لانے اور اس اکیلے کی عبادت کے بجائے کسی مخلوق کو، جس کے

اختیار میں کچھ بھی نہیں، مشکل کشا، حاجت روا، داتا، دنگیر، غریب نواز، بگڑی بنانے والا اور ڈوبتے ہوئے کو پار لگانے والا مان

لینا، یا اسے اللہ تعالیٰ کی بیوی یا بیٹا یا اس کے ذاتی نور کا ٹکڑا قرار دے کر اس کی عبادت اور اس سے مانگنا شروع کر دینا کوئی معمولی

بات نہیں، بلکہ اتنی خوفناک بات ہے کہ قریب ہے یہ بات کہنے پر آسمان اپنے اوپر سے گر پڑیں، زمین شق ہو جائے اور پہاڑ

ڈھے کر گر پڑیں۔ سورہ مریم کی آیات (۹۵ تا ۸۸) میں یہ بات تفصیل سے بیان ہوئی ہے، وہ آیات مع تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔

② **مِنْ فَوَقَّهِنَّ** : آسمانوں کے اپنے اوپر سے پھٹنے کا مطلب یہ ہے کہ قریب ہے کہ یہ آسمان اپنے اوپر کی جانب سے پھٹ

جائیں۔ چنانچہ سب سے اوپر والا آسمان پھٹ کر نیچے والے آسمان پر گرے، وہ اس سے نچلے پر گرے، اس طرح تمام آسمان

پھٹیں اور نیچے والوں کے اوپر گر جائیں۔ آسمانوں کے اپنے اوپر سے پھٹنے کی وجہ وہاں بے شمار فرشتوں کا سجدہ ریز ہونا اور

عرش الہی کے قریب ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے جلال اور اس کی ہیبت کے آثار کا بہت زیادہ ہونا ہے۔

③ **وَالْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ** : تسبیح سے مراد اللہ تعالیٰ کو ہر عیب اور ہر کمی سے پاک قرار دینا اور حمد سے مراد اسے ہر

خوبی کا مالک قرار دینا ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی توحید ہے اور اس کی طرف منسوب کیے جانے والے تمام عیوب میں

سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ کوئی اس کا شریک ہے یا اس کی اولاد یا بیوی ہے۔ سب سے بڑا عیب اس لیے کہ یہ مان لینے کی

صورت میں اس کا محتاج اور عاجز ہونا ثابت ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے لیے کالی قرار دیا۔ فرشتے ہر وقت اللہ تعالیٰ کی

صفات جمال و جلال اور صفات کمال کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔

④ **وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ** : اکثر مفسرین فرماتے ہیں کہ ”لِمَنْ فِي الْاَرْضِ“ سے مراد مومن ہیں اور فرشتے

زمین والوں میں سے صرف ایمان والوں کے لیے استغفار کرتے ہیں، کیونکہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿الَّذِيْنَ يَخْلُوْنَ الْعَرْشِ

هُوَ الْعَفْوُ الرَّحِيمُ ⑤

کرتے ہیں جو زمین میں ہیں، سن لو! بے شک اللہ ہی بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ⑤

وَمَنْ حَوْلَهُ يُسَبِّحُونَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُونَ بِهِ وَيَسْتَغْفِرُونَ لِلَّذِينَ آمَنُوا ۗ رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً ۖ وَعِلْمًا ۖ فَاغْفِرْ لِلَّذِينَ تَابُوا وَاتَّبَعُوا سَبِيلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيمِ ﴿۷﴾ [المؤمن : ۷] ”وہ (فرشتے) جو عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور وہ جو اس کے ارد گرد ہیں اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ان لوگوں کے لیے بخشش کی دعا کرتے ہیں جو ایمان لائے، اے ہمارے رب! تو نے ہر چیز کو رحمت اور علم سے گھیر رکھا ہے، تو ان لوگوں کو بخش دے جنہوں نے توبہ کی اور تیرے راستے پر چلے اور انہیں بھڑکتی ہوئی آگ کے عذاب سے بچا۔“ مگر بعض مفسرین نے فرمایا: ”آیت کے الفاظ یہ ہیں کہ (فرشتے ان لوگوں کے لیے استغفار کرتے ہیں جو زمین میں ہیں) اس میں مومن و کافر دونوں شامل ہیں اور فرشتوں کے مسلم و کافر سب کے لیے استغفار کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمام زمین والوں کے لیے دعا کرتے رہتے ہیں، خواہ مومن ہوں یا کافر کہ اے اللہ! ان کے لیے ایسے اسباب مہیا فرما جن کی بدولت ان سے عذاب ٹلے، کافر ہیں تو ایمان لائیں، فاسق ہیں تو توبہ کریں، تاکہ ان کی بخشش ہو جائے۔“ قرطبی نے اس بات کو راجح قرار دیا ہے۔

اس تفسیر پر ایک سوال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ اور ایمان والوں کو مشرکین کے لیے استغفار سے منع فرمایا ہے، آپ استغفار کا کوئی بھی معنی کر لیں فرشتوں کا کفار و مشرکین کے لیے استغفار ممکن ہی نہیں، کیونکہ وہ اپنے رب کے کسی حکم کی نافرمانی کرتے ہی نہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ﴾ [التحریم: ۶] ”وہ اللہ کی نافرمانی نہیں کرتے جو وہ انہیں حکم دے اور وہ کرتے ہیں جو حکم دیے جاتے ہیں۔“ اس سوال کا جواب اسی آیت میں موجود ہے جس میں مشرکین کے لیے استغفار سے منع کیا گیا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَاللَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولِي قُرْبَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُمْ الْأَصْحَابُ الْجَحِيمِ﴾ [التوبة: ۱۱۳] ”اس نبی اور ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے، کبھی جائز نہیں کہ وہ مشرکوں کے لیے بخشش کی دعا کریں، خواہ وہ قرابت دار ہوں، اس کے بعد کہ ان کے لیے صاف ظاہر ہو گیا کہ یقیناً وہ جہنمی ہیں۔“ معلوم ہوا مشرکین کے لیے استغفار اس وقت منع ہے جب ان کا جہنمی ہونا واضح اور یقینی ہو جائے اور ظاہر ہے کسی کے جہنمی ہونے کا یقین اس کے کفر پر مرنے کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ جب تک کوئی زندہ ہے کسی وقت بھی اسے ایمان کی توفیق عطا ہو سکتی ہے اور یہ علم کہ کس نے کفر پر مرنا ہے کسی انسان، جن یا فرشتے کو نہیں، اس لیے کفار کے لیے ہدایت کی دعا کرنا، جس سے ان کی بخشش ہو جائے، جائز بلکہ سنت ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ طفیل بن عمرو دوسی رضی اللہ عنہما اور ان کے ساتھی رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور کہنے لگے: ”یا رسول اللہ! دوس قبیلے نے نافرمانی کی ہے اور ایمان لانے سے انکار کر دیا ہے، آپ ان پر بددعا کریں۔“ لوگوں نے کہا: ”دوس قبیلہ ہلاک ہو گیا۔“ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿اللَّهُمَّ اهْدِ دَوْسًا وَأَتِ بِهِمْ﴾ [بخاری، الجہاد، باب الدعاء للمشرکین بالهدی لئلا نفهم: ۲۹۳۷] ”اے اللہ! دوس قبیلے کو ہدایت دے اور انہیں لے آ۔“

وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ اللَّهُ حَفِيفٌ عَلَيْهِمْ ۖ وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيلٍ ①
وَكَذَلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لِتُنذِرَ أُمَّ الْقُرَىٰ وَمَنْ حَوْلَهَا وَتُنذِرَ يَوْمَ الْجُمُعِ

اور وہ لوگ جنہوں نے اس کے سوا کوئی اور کارساز بنا لیے اللہ ان پر نگران ہے اور تو ہرگز ان کا کوئی ذمہ دار نہیں ① اور اسی طرح ہم نے تیری طرف عربی قرآن وحی کیا، تاکہ تو بستیوں کے مرکز (مکہ) کو ڈرائے اور ان لوگوں کو بھی جو اس کے ارد گرد ہیں اور تو اکٹھا کرنے کے دن سے ڈرائے جس میں کوئی شک نہیں، ایک گروہ جنت

⑤ اس آیت سے فرشتوں کی صاف دلی اور زمین والوں کے لیے خیر خواہی کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھی انسانوں کے باپ کو سجدے کے حکم سے انکار پر ابلیس ملعون ٹھہرا تھا، جب کہ اللہ کے حکم سے فرشتوں نے سجدہ بھی کیا اور ان کے حق میں دعائیں بھی کرتے چلے جا رہے ہیں۔ وہ متکبر تھا ملعون ٹھہرا، یہ متواضع تھے مقرب ٹھہرے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ایسی ہی صاف دلی عطا فرمائے اور ہماری طرف سے فرشتوں کو بہترین بدعا عطا فرمائے۔ (آمین)

⑥ اَلَا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَفُوُّ الرَّحِيْمُ : خبر ”الْعَفُوُّ الرَّحِيْمُ“ پر الف لام اور ضمیر فصل ”هُوَ“ سے قصر کا مفہوم پیدا ہو رہا ہے، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے: ”سن لو! بے شک اللہ تعالیٰ ہی بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے۔“ یعنی کسی اور میں یہ صفات نہیں ہیں۔ اس میں مشرکین کو تنبیہ ہے کہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے، اگر یہ بات فرشتوں کے اختیار میں ہوتی تو وہ اللہ تعالیٰ سے اس کی درخواست کیوں کرتے؟

آیت 6 ① وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ اللَّهُ..... اس جملے میں مشرکین کے لیے بہت شدید ڈانٹ اور دھمکی ہے کہ اوپر آیات میں جس اللہ کا ذکر ہوا، جو عزیز و حکیم اور علی و عظیم ہے، جس کی ہیبت سے آسمان چھٹنے کے قریب رہتے ہیں اور جس کی تسبیح و حمد تمام فرشتے کرتے ہیں، جن لوگوں نے اس اللہ کے سوا کسی قسم کے کارساز بنائے، جو ان کے خیال میں فوق الفطرت طریقے سے ان کی حاجتیں و مرادیں بر لاتے اور ان کی دستگیری و فریادرسی کرتے ہیں، ان کے ایک ایک عمل کو اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے، وہ سب اس کے پاس محفوظ ہیں اور بہت جلد وہ انہیں ان کا بدلہ دے گا۔

② وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيلٍ : ”مَا“ نافیہ کی تاکید ”بِوَكِيلٍ“ کی باء کے ساتھ ہو رہی ہے اور ”بِوَكِيلٍ“ کی توہین تکلیف کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ ”تو ہرگز ان کا کوئی ذمہ دار نہیں“ کیا گیا ہے۔ ”وَسَكَلٌ بِسَكَلٍ“ (ض) سپرد کرنا۔ ”وَكَيْلٌ“ جس کے سپرد کوئی کام کر دیا جائے، ذمہ دار، یعنی ان کفار و مشرکین کی نگرانی اور ان کے اعمال کی جزا اللہ تعالیٰ کا کام ہے، آپ انہیں ہدایت دینے کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ اس لیے آپ کو زیادہ پریشان یا غمزدہ ہونے کی ضرورت نہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِنَّمَا اَنْتَ نَذِيْرٌ ۗ وَاللّٰهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ وَكِيْلٌ ﴾ [ہود: ۱۲] ”تو تو صرف ڈرانے والا ہے اور اللہ ہر چیز پر نگران ہے۔“ مزید دیکھیے سورہ یونس (۱۰۰، ۹۹) اور سورہ انعام (۳۵)۔

آیت 7 ① وَكَذَلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ قُرْآنًا عَرَبِيًّا : قرآن عربی زبان میں نازل کرنے کی چند حکمتوں کے جاننے کے

وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَهُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً ۗ وَ لَٰكِن يُدْخِلُ مَن يَشَاءُ فِي رَحْمَتِهِ ۗ وَالظَّالِمُونَ مَا لَهُم مِّن وَّرَثٍ ۚ وَلَا يُصِيرُ ۝

اور اگر اللہ چاہتا تو ضرور انہیں ایک امت بنا دیتا اور لیکن وہ اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور جو ظالم ہیں ان کے لیے نہ کوئی دوست ہے اور نہ کوئی مددگار ۝

حَوْلَهَا“ اور ”وَتُنذِرَ يَوْمَ الْجُمُعِ“ دو جملے ہیں، دونوں میں ”تُنذِرَ“ کے دو مفعول ہیں۔ پہلے جملے میں پہلا مفعول ذکر فرمایا اور دوسرا حذف کر دیا، جو آیت کے الفاظ سے ظاہر ہو رہا ہے: ”أَيُّ لِنُذِرَ أُمَّ الْقُرَىٰ وَمَنْ حَوْلَهَا الْعَذَابَ“ ”یعنی تاکہ تو ام القرئی اور اس کے اردگرد کے لوگوں کو عذاب سے ڈرادے۔“ دوسرے جملے میں پہلا مفعول حذف کر دیا اور دوسرا ذکر فرمایا: ”أَيُّ لِنُذِرَ أُمَّ الْقُرَىٰ وَمَنْ حَوْلَهَا يَوْمَ الْجُمُعِ“ ”یعنی تاکہ تو ام القرئی اور اس کے اردگرد کی بستیوں کو یوم الجمع سے ڈرادے۔“ مطلب یہ ہے کہ اسی طرح ہم نے تیری طرف عربی قرآن وحی کیا، تاکہ تو بستیوں کے مرکز اور اس کے اردگرد کے لوگوں کو گزشتہ اقوام پر آنے والے عذاب سے ڈرائے اور تاکہ تو ام القرئی اور اس کے اردگرد کی بستیوں کو گزشتہ اقوام جیسے عذاب کے ساتھ ساتھ یوم الجمع سے بھی ڈرائے۔ اتنی لمبی بات کو ان مختصر الفاظ میں سمیٹ دیا: ﴿لَتُنذِرَ أُمَّ الْقُرَىٰ وَمَنْ حَوْلَهَا وَتُنذِرَ يَوْمَ الْجُمُعِ﴾ اسے احتیاط کہتے ہیں اور اس سے کلام میں اختصار، جامعیت اور حسن پیدا ہوتا ہے۔

۵ ”يَوْمَ الْجُمُعِ“ قیامت کے دن کو کہتے ہیں، کیونکہ اس دن سب پہلے پچھلے جمع ہوں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿يَوْمَ يَجْعَلُكُمْ لِيَوْمِ الْجُمُعِ ذَلِكَ يَوْمُ الثَّغَابِينَ﴾ [التغابین: ۹] ”جس دن وہ تمہیں جمع کرنے کے دن کے لیے جمع کرے گا، وہی ہار جیت کا دن ہے۔“

۶ لَا رَيْبَ فِيهِ: ”جس میں کوئی شک نہیں“ کیونکہ یہ بات فطرت میں رکھ دی گئی ہے کہ مالک اپنے غلاموں کو کسی کام پر مقرر کرے، پھر وہ ایک دوسرے پر ظلم و زیادتی کریں تو ضروری ہے کہ وہ کسی دن انہیں اکٹھا کر کے مظلوم کو ظالم سے انصاف دلائے، اگر ایسا نہیں کرے گا تو بے انصاف شمار ہوگا۔ تو احکم الحاکمین کے سب کو جمع کرنے کے دن میں کیا شک ہو سکتا ہے؟ رہی یہ بات کہ کچھ لوگ اس میں شک کرتے ہیں، تو ان کے شک کو کالعدم قرار دیا کہ اس کا کچھ اعتبار نہیں۔

۷ فَرِيقٌ فِي الْجَنَّةِ وَ فَرِيقٌ فِي السَّعِيرِ: یہ ”يَوْمَ الْجُمُعِ“ کا انجام ہے کہ ایک گروہ جنت میں جائے گا اور ایک گروہ بھڑکتی ہوئی آگ میں جائے گا۔

آیت 8 ﴿ 1 ۝ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَهُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً ۗ﴾: یہ اس سوال کا جواب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک فریق جنتی اور ایک جہنمی کیوں بنایا، سبھی کو ایک جیسا کیوں نہیں بنا دیا۔ یعنی اللہ تعالیٰ چاہتا تو جس طرح اس نے کائنات کی تمام چیزوں کو بے اختیار بنایا ہے وہ جن دنس کو بھی کسی قسم کا اختیار نہ دیتا۔ اگر وہ ایسا کرتا تو وہ سب دین حق پر ہوتے، مگر اس نے انہیں اختیار اور ارادہ میں آزادی دے کر پیدا فرمایا، تاکہ ان کا امتحان ہو اور اس کی صفات رحمت، غضب اور عدل کا ظہور ہو۔ یہ اس کی

﴿۱﴾ **أَمَّا اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ ۗ قَالَ اللَّهُ هُوَ الْوَلِيُّ وَهُوَ يُحْيِي الْمَوْتَىٰ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ** ﴿۱﴾
 یا انہوں نے اس کے سوا اور کارساز بنا رکھے ہیں؟ سو اللہ ہی اصل کارساز ہے اور وہی مردوں کو زندہ کرے گا اور وہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے ﴿۱﴾

مشیت ہے، جس میں بے شمار حکمتیں ہیں، جنہیں پوری طرح وہی جانتا ہے، انسان چاہے بھی تو ان کی تک نہیں پہنچ سکتا، وہ اتنا ہی جان سکتا ہے جتنا پروردگار چاہے۔

﴿۲﴾ **وَلٰكِنْ يُذْخِلْ مَنْ يَشَاءُ فِي رَحْمَتِهِ**: نیکی و بدی کی تمیز اور ان میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کی آزادی دینے کے بعد وہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کر لیتا ہے، مگر اس کی یہ مشیت اندھی نہیں کہ اس کا کوئی قاعدہ نہ ہو، بلکہ اس سے اگلے جہنم سے ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جو اللہ کی رحمت کے حق دار بنتے ہیں اور وہ کون ہیں جو اس سے محروم رہتے ہیں۔

﴿۳﴾ **وَ الظَّالِمُونَ مَا لَهُمْ مِنْ وَلِيٍّ وَّ لَا نَصِيرٍ**: قرآن مجید کی اصطلاح میں ”ظلم“ اور ”ظالمین“ کا لفظ شرک اور مشرکین کے لیے استعمال ہوتا ہے (دیکھیے انعام: ۸۴) اور ”قسط“ اور ”عدل“ کا لفظ توحید کے لیے آیا ہے، کیونکہ سب سے بڑا ظلم شرک ہے اور سب سے بڑا عدل توحید ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۖ وَ الْوَلِيُّ الْعَلِيمُ ۖ قَالِمًا بِالْقِسْطِ﴾ [آل عمران: ۱۸] ”اللہ نے گواہی دی کہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتوں نے اور علم والوں نے بھی، اس حال میں کہ وہ انصاف پر قائم ہے۔“ ارادہ و عمل کا اختیار ملنے کے بعد جن لوگوں نے اپنی جان پر ظلم کیا، اپنے خالق و مالک اور رازق کو اکیلا معبود بنانے اور اسی کی عبادت پر قائم رہنے کے بجائے غیروں کو معبود بنایا، جن کے اختیار میں کچھ بھی نہیں، تو ان کا نہ کوئی دوست ہے اور نہ کوئی مددگار۔ معلوم ہوا ایسے لوگ اللہ کی رحمت میں داخل نہیں ہوں گے، کیونکہ انہیں اپنی رحمت میں داخل کرنا اللہ تعالیٰ کے عدل اور مشیت کے خلاف ہے اور وہ خود بھی اللہ کی رحمت سے ناامید ہیں، ورنہ کبھی غیروں کی طرف نہ جاتے، جیسا کہ فرمایا: ﴿أُولَٰئِكَ يَسْتَوُونَ مِنْ رَحْمَتِي﴾ [العنکبوت: ۲۳] ”وہ میری رحمت سے ناامید ہو چکے ہیں۔“ یہی بات نہایت وضاحت کے ساتھ سورہ دہر (۳۰، ۲۹) میں بیان فرمائی گئی ہے۔ ہاں، جو لوگ ایمان لائے اور اس میں ظلم عظیم یعنی شرک کی آمیزش نہیں کی وہی اللہ تعالیٰ کی رحمت میں داخل ہوں گے اور وہی اس کی امید رکھ سکتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ﴾ [البقرہ: ۲۱۸] ”وہی اللہ کی رحمت کی امید رکھتے ہیں۔“

﴿۴﴾ اس آیت میں رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کو تسلی بھی دی گئی ہے کہ اگر کچھ لوگ حق واضح ہونے کے بعد بھی ایمان نہیں لاتے اور کفر و شرک پر اڑے رہتے ہیں تو آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں، اللہ تعالیٰ چاہتا تو سب لوگوں کو ہدایت دے دیتا، مگر یہ جبر ہوتا جو اللہ تعالیٰ کی مشیت نہیں۔ اس نے اپنی حکمت اور مشیت کے تحت انسان کو اختیار دے رکھا ہے، جو چاہے ایمان لائے جو چاہے کفر کرے، اس لیے لوگوں میں یہ اختلاف ہمیشہ رہے گا۔ یہ مضمون متعدد آیات میں بیان ہوا ہے، دیکھیے سورہ یونس (۱۰۰، ۹۹)، ہود (۱۱۸، ۱۱۹) اور سورہ سجدہ (۱۳)۔

﴿۵﴾ **أَمَّا اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ**..... کچھلی آیت میں جو فرمایا کہ ظالموں کے لیے نہ ولی (دوست) ہے نہ

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ ذَلِكُمُ اللَّهُ سَمِيَّ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۗ

اور وہ چیز جس میں تم نے اختلاف کیا، کوئی بھی چیز ہو تو اس کا فیصلہ اللہ کے سپرد ہے، وہی اللہ میرا رب ہے، اسی پر

کوئی مددگار، یہ اس کی تفصیل ہے کہ آیا انھوں نے اللہ کو چھوڑ کر کوئی اولیاء، کارساز اور دوست بنا رکھے ہیں۔ سو اصل دوست جو فی الواقع کارساز اور مدد کر سکتا ہے وہ تو صرف اللہ ہے۔ ساتھ ہی اس کی دوزبردست دلیلیں بیان فرمائیں کہ وہی مردوں

فوزندنی بخشا ہے اور جیسے گا اور وہی ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے، لیونکہ اس کا حق وہی رکھتا ہے جس میں یہ صفات ہوں۔

پھر اس سے بڑا ظلم کیا ہو گا کہ ایسی ہستیوں کو اولیاء اور کارساز بنا لیا جائے جو کسی کو زندگی بخشا تو درکنار خود مرنے والے ہیں، فرمایا: ﴿أَمْوَاتٌ غَيْرُ أَحْيَاءٍ ۚ وَمَا يَطْعُمُونَ ۚ أَيَّانَ يُبْعَثُونَ﴾ [النحل: ۶۱] "مردے ہیں، زندہ نہیں ہیں اور وہ نہیں جانتے کب اٹھائے جائیں گے۔" ہر چیز پر قدرت تو بہت دور، ایک دڑے کے بھی مالک نہیں ہیں۔ دیکھیے سورہ سبأ (۲۴)۔

آیت 10 ﴿۱﴾ وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ ۖ ... : یہ آیت اگرچہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے مگر یہ بات رسول اللہ ﷺ کی زبان سے کہلوائی گئی ہے، جیسا کہ سورہ فاتحہ بندوں کی زبانی کہلوائی گئی ہے۔

② اس سے پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ کی جو صفات بیان ہوئی ہیں کہ وہ زمین و آسمان کی ہر چیز کا مالک اور ولی و کارساز ہے، موت و حیات اس کے ہاتھ میں ہے اور وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے، ان صفات سے خود بخود وہ بات ثابت ہو رہی ہے جو اس آیت میں فرمائی ہے کہ جب مالک وہ ہے تو حاکم بھی وہی ہے اور انسانوں کے درمیان پیدا ہونے والے اختلافات کا فیصلہ بھی اسی کا کام ہے۔ وہ اختلاف عقیدہ میں ہو یا عمل میں، عبادت میں ہو یا معاملات میں، نیکی و بدی قرار دینے میں ہو یا حلال و حرام ٹھہرانے میں، غرض ہر بات میں فیصلہ اسی کا چلے گا۔ کسی اور کو یہ حق دینا کہ وہ شریعت سازی کرے یا حلال و حرام کا فیصلہ کرے درحقیقت اس کی عبادت اور اسے اللہ تعالیٰ کا شریک بنانا ہے، فرمایا: ﴿إِن الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ۚ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ﴾ [یوسف: ۹۰] "حکم اللہ کے سوا کسی کا نہیں، اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا اور کسی کی عبادت مت کرو۔" مزید دیکھیے سورہ یوسف (۶۷)، انعام (۵۷)، مائدہ (۴۴)، کہف (۲۶) اور سورہ قصص (۷۰، ۸۸)۔

رسول اللہ ﷺ ہر فیصلہ اللہ تعالیٰ کی وحی کے ذریعے سے اور اس کے حکم کے تحت کرتے، اس لیے آپ ﷺ کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہر تنازع کا فیصلہ اللہ اور اس کے رسول کے سپرد کرنے کو ایمان کی شرط قرار دیا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿فَإِن تَنَادَرْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ﴾ [النساء: ۵۹] "پھر اگر تم کسی چیز میں جھگڑا پڑو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ، اگر تم اللہ اور یوم آخِر پر ایمان رکھتے ہو۔" اور فرمایا: ﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ لَهُ لَا يَخْلُفُونَ فِيهِمْ حَرَجًا مِّنَّا فَضَيْتَ ۚ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾ [النساء: ۶۵] "پس نہیں! تیرے رب کی قسم ہے! وہ مومن نہیں ہوں گے، یہاں تک کہ تجھے اس میں فیصلہ کرنے والا مان لیں جو ان کے درمیان جھگڑا پڑ جائے، پھر اپنے دلوں میں اس سے کوئی ٹھگی محسوس نہ

وَإِلَيْهِ أُنِيبُ ﴿۱۵﴾

میں نے جھرو سا کیا اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں ﴿۱۵﴾

کریں جو تو فیصلہ کرے اور تسلیم کر لیں، پوری طرح تسلیم کرنا۔“

۳) یہود و نصاریٰ نے اپنے احبار و رہبان کو حلال و حرام کے فیصلے کا اختیار دیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ انہوں نے اپنے احبار و رہبان کو ”أَزْبَابًا مِّنْ دُونِ اللَّهِ“ بنا لیا۔ دیکھیے سورہ توبہ (۳۱) کی تفسیر۔

۴) یہود و نصاریٰ نے ایک مدت تک حلال و حرام قرار دینے کا اختیار آسمانی شریعت کے بجائے اپنے احبار و رہبان کو دے رکھا، آخر کار انہوں نے یہ تکلف بھی برطرف کیا اور اپنی آسمانی کتاب یا احبار و رہبان کے جوئے جمہوریت کے نام پر یہ اختیار خود سنبھال لیا کہ عوام کی اکثریت جو فیصلہ کرے وہ حق ہے، ان کے منتخب نمائندے اپنی اکثریت کے ساتھ جسے حلال کہہ دیں وہ حلال اور جسے حرام کہہ دیں وہ حرام ہے۔ آج اگر اکثریت کسی چیز کو حلال کہہ رہی ہے تو وہ حلال ہے، کچھ دن بعد اکثریت اگر حرام کہہ دے تو وہ حرام ہے۔ اب تو رات کی ہر قید جو طبیعتوں پر گراں تھی توڑ دی گئی، یا نبی رضا سے زنا جائز قرار دیا گیا، رجم کو کالعدم کر دیا گیا، قوم لوط کا عمل جائز قرار دیا گیا، قتل اور قطع اعضا میں قصاص ختم کر دیا گیا اور سود حلال ٹھہرا۔ غرض جمہوریت کے نام پر ایک نئی شریعت ایجاد کی گئی جس کا رب، رسول اور شریعت سب کچھ انسان قرار پائے، اس طرح بندوں کو مالک کی گدی پر بٹھا دیا گیا۔

۵) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: ﴿لَتَسْمَعَنَّ مَسْنَنَ مَنْ سَكَانَ قَبْلَكُمْ شَيْبًا شَيْبًا وَذِرَاعًا ذِرَاعًا، حَتَّىٰ لَوْ دَخَلُوا حُجْرًا صَبَّ تَبَعْتُمُوهُمْ، فَلَمَّا بَا رَسُوْنَا اللّٰهُ! الْيَهُودُ وَالنَّصَارَىٰ؟ قَالَ فَمَنْ؟﴾ [بخاری، الاعتصام بالكتاب والسنة، باب فون النسي ۱۱۱۱۱]: ”تسمن سن من كان قبكم“: ۷۳۶۰، عن ابي سعيد الخدري رَضِيَ اللهُ عَنْهُ: ”تم ہر صورت اپنے سے پہلے لوگوں کے طریقوں پر چل پڑو گے، جیسے باشت باشت کے ساتھ اور ہاتھ ہاتھ کے ساتھ برابر ہوتا ہے، حتیٰ کہ اگر وہ گوہ کے بل میں داخل ہوئے تو تم ان کی پیروی کرو گے۔“ ہم نے کہا: ”یا رسول اللہ! یہود و نصاریٰ کے طریقوں پر؟“ آپ نے فرمایا: ”تو اور کون؟“

مسلمان خیر القرون میں اور اس کے کچھ عرصہ بعد تک صرف اور صرف قرآن و سنت پر کار بند رہے، یہ اسلام کی ترقی و عروج کا دور ہے، پھر بعض ائمہ کی تقلید شروع ہوئی اور ان کے نام پر ایسی گروہ بندی اور فرقہ سازی ہوئی کہ بعض لوگ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان کے امام کا قول اللہ اور اس کے رسول کے صریح خلاف ہے، اپنے امام کے قول پر اڑ گئے۔ احبار و رہبان کو ارباب بنانے کا نقشہ اہل کتاب کی طرح اہل اسلام میں بھی نظر آنے لگا، حتیٰ کہ یہ دین حق کئی مذہبوں میں تقسیم ہو گیا۔ ہر کسی کی مساجد الگ، عدالتیں اور قاضی الگ ہو گئے، امت کی وحدت جو صرف کتاب و سنت کو حاکم ماننے سے حاصل ہوتی تھی پارہ پارہ ہو گئی، مسلمانوں کی توانائیاں کفار کے ساتھ جہاد اور اس کی تیاری کے بجائے ایک دوسرے کے خلاف صرف ہونے لگیں۔ یہی لوگ حاکم تھے یہی قاضی، اصلاح کی آوازیں اٹھتی رہیں، مگر بے سود۔ چنانچہ کچھ مدت تک تو کتاب و سنت سے انحراف

کے باوجود الگ الگ سلطنتوں کی شکل میں مسلمانوں کی حکمرانی کا سلسلہ چلتا رہا، پھر باہمی فساد اور ترک جہاد کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو چار ملکوں کے سوا تمام مسلم ممالک نصرانی یا کیونٹ کفار کے قبضے میں چلے گئے، جنہوں نے جبراً ان ممالک میں اپنے کفریہ احکام نافذ کر دیے، پھر نہ کتاب و سنت کے احکام باقی رہے نہ ائمہ کے مذاہب۔ ہر جگہ کفار کا حکم چلنے لگا اور بنی اسرائیل کی طرح مسلمانوں پر بھی اللہ کے عذاب کا کوڑا کفار کی غلامی کی صورت میں برسے لگا۔ مسلمان آزادی حاصل کرنے کے لیے مسلسل جدوجہد اور دعائیں کرتے رہے، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر رحم فرمایا اور ان کی آزادی کے لیے جدوجہد اور کفار کی باہمی جنگ عظیم کے نتیجے میں بہت سے مسلم ممالک کو آزادی ملی۔ اس کے بعد جہاد کے نتیجے میں بہت سے ممالک کیونٹوں کے تسلط سے بھی آزاد ہوئے، مگر تمام ممالک میں برسر اقتدار طبقے نے کفر کا وہی نظام حکومت برقرار رکھا جو کفار کے زمانے میں تھا، جس میں فیصلہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے مطابق نہیں بلکہ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق ہوتا ہے۔ اس طرح مسلمانوں کے اہل کتاب کے نقش قدم پر چلنے کی پیش گوئی پوری ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ کا دین صرف نماز روزے وغیرہ کے لیے باقی رہ گیا، گھروں، بازاروں، عدالتوں اور حکومت کے ایوانوں سے اللہ تعالیٰ کے حکم کو جلا وطن کر کے اس کی جگہ جمہوریت کے بت کی پرستش شروع کر دی گئی۔ البتہ بعض ملکوں میں یہ تکلف کیا گیا کہ اس کا نام اسلامی جمہوریت رکھ دیا گیا، حالانکہ اسلام میں حکم اللہ کا ہوتا ہے اور جمہوریت میں بندوں کا، دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں، کبھی جمع نہیں ہو سکتے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے شراب کو اسلامی شراب اور سو کو اسلامی سود کہہ کر حلال کر لیا جائے، جیسا کہ یہ ظلم بھی اس سے پہلے مسلمان اپنی جانوں پر کر چکے ہیں۔ ان کے بہت سے برسر اقتدار طبقوں نے ان علماء کے اقوال کو اپنی مملکتوں میں نافذ کیا جنہوں نے صرف انکو اور کھجور کی شراب کو حرام قرار دے کر دوسرے تمام نشہ آور مشروبات پینے پر حد ختم کر دی، خواہ ان سے نشہ بھی آجائے۔ جس کے نتیجے میں مسلمانوں کی عظیم سلطنتیں شراب کے سمندر میں غرق ہو گئیں کہ حکمران بھی پیتے تھے اور رعایا بھی اور جائز سمجھ کر پیتے تھے۔ اسی طرح سو کی بہت سی قسموں کو جائز قرار دے کر اسلامی سود رائج ہونے کے نتیجے میں طمع و ہوس کے طوفان نے ہمدردی و ایثار کا سلسلہ ختم کر دیا اور حرام ہونے والے مسلمانوں کو آخرت سے غافل کر دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اب بھی دنیا اور آخرت دونوں میں مسلمانوں کی نجات اسی میں ہے کہ وہ دوبارہ اللہ اور اس کے رسول کے فیصلے کی طرف واپس پلٹیں اور اپنی پوری زندگی میں اس کی اطاعت اختیار کریں۔ ان شاء اللہ وہ وقت آنے والا ہے جب دوبارہ خلافت علیٰ منہاج النہج قائم ہوگی، جس میں اللہ کی زمین پر صرف اللہ کا حکم چلے گا۔ یہ رسول صادق ﷺ کی پیش گوئی ہے اور ہر صورت پوری ہوگی۔ ہمارا کام جدوجہد ہے، اللہ چاہے گا تو ہم اپنی آنکھوں سے وہ مبارک دن دیکھیں گے، ورنہ ہمارے بعد آنے والے اسے ضرور دیکھیں گے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اپنے ان بندوں میں شامل فرمائے جو قیامت تک دین حق قائم رکھنے کے لیے لڑتے رہیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «لَنْ يَبْرَحَ هَذَا الدِّينُ قَائِمًا يُفَانِلُ عَلَيْهِ عِصَابَةٌ مِنَ الْمُسْلِمِينَ حَتَّى تَقُومَ السَّاعَةُ» (مسلم، الإمارة، باب قوله ﷺ: «لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ أُمَّتِي ظَاهِرِينَ عَلَى الْحَقِّ.....» ۶۹۲۲، عن جابر بن سمرة رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ) "یہ دین ہمیشہ قائم رہے گا، مسلمانوں کی ایک جماعت اس پر لڑتی رہے گی،

فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِۗ جَعَلْ لَكُمْ مِنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا ۗ وَ مِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا ۗ

(وہ) آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے، اس نے تمہارے لیے تمہارے نفسوں سے جوڑے بنائے اور جانوروں سے

یہاں تک کہ قیامت قائم ہو۔“

① فَخَلَقْنَا إِلَى اللّٰهِ: ہر جھگڑے کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہونے میں شرعی احکام کا فیصلہ بھی شامل ہے، جیسا کہ اوپر گزرا اور یہ بھی کہ دنیا میں لوگوں کے درمیان جتنے جھگڑے ہیں ان کا واضح فیصلہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ہی فرمائے گا۔ دنیا میں کفار اپنے آپ کو حق پر کہتے رہیں، مگر وہاں انبیاء اور ان کے متبعین کا حق پر ہونا اور کفار کا باطل پر ہونا سب کے سامنے واضح ہو کر آجائے گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَقُلِ اللّٰهُمَّ فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عَلِمْتَ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ اَنْتَ تَخْلُقُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْ مَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ﴾ [الرؤسہ: ۶۶] ”تو کہہ اے اللہ! آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والے! ہر چھپی اور کھلی کو جاننے والے! تو ہی اپنے بندوں کے درمیان اس چیز کا فیصلہ کرے گا جس میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے۔“

② ذٰلِكُمْ اللّٰهُ سَرِيْفٌ: یعنی وہی اللہ جس کی چند صفات اوپر کی آیات میں بیان ہوئیں، جنھیں تم بھی مانتے ہو، جو مختصراً یہ ہیں کہ وہ عزیز و حکیم ہے، علی و عظیم ہے، غفور و رحیم ہے، حقیقی ولی ہے، مردوں کو زندہ کرنے والا اور ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے، تمام اختلافات کا فیصلہ کرنے والا ہے، وہی اللہ میرا رب ہے، ان میں سے ایک بھی صفت جب کسی اور میں پائی ہی نہیں جاتی تو میں کسی اور کو اپنا رب کیسے مان لوں؟

③ ”عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ“ (اسی پر میں نے بھروسہ کیا) فعل ماضی ہے اور ”وَ اِلَيْهِ اُنِيْبُ“ (اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں) فعل مضارع ہے، جس میں استمرار اور پختگی پائی جاتی ہے۔ ”عَلَيْهِ“ اور ”اِلَيْهِ“ پہلے آنے سے قصر کا معنی پیدا ہوا، اس لیے ترجمہ ”اسی پر“ اور ”اسی کی طرف“ کیا گیا ہے۔ یعنی میں شروع سے اسی پر بھروسہ کر چکا اور اب ہر بات میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں، ہر مسئلے کا حکم اسی سے لیتا ہوں، ہر جھگڑے کا فیصلہ اسی سے کرتا ہوں اور ہر گناہ پر اسی سے معافی مانگتا ہوں اور اسی کو حق سمجھتا ہوں۔

آیت 11: ① فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ : یہ اللہ ہی کو رب ماننے، اسی پر توکل اور اسی کی طرف رجوع کی مزید دلیلیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہی کسی نمونے اور مادے کے بغیر آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کرنے والا ہے، جب کہ تمہارے بنائے ہوئے معبودوں نے نہ ایک ذرہ پیدا کیا نہ کر سکتے ہیں۔ مزید دیکھیے سورہ حج (۷۳)۔

② جَعَلْ لَكُمْ مِنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا : آسمان و زمین کو پیدا کرنے کے بعد اس نے تمہارے لیے خود تمھی میں سے تمہارے جوڑے بنائے، تاکہ تمہاری نسل جاری ہو اور مسلسل چلتی رہے۔ اپنی جنس سے جوڑے بنانے سے جو باہمی انس حاصل ہوتا ہے وہ کسی اور جنس سے جوڑا بنانے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ ابن عاشور نے فرمایا کہ عربوں میں جنتیوں وغیرہ سے نکاح کی جتنی داستانیں مشہور ہیں سب جھوٹی اور خود ساختہ ہیں، کچھ لوگوں کے تخیل نے انھیں ایسا دکھایا، ورنہ حقیقت میں ان کا

يَذُرُوْكُمْ فِيْهِ لَيْسَ كَيْفَ شَيْءٍ ؕ وَهُوَ السَّبِيْعُ الْبَصِيْرُ ۝۱۱

بھی جوڑے۔ وہ تمہیں اس (جہاں) میں پھیلاتا ہے، اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے ۝۱۱

کوئی وجود نہیں۔ اور تمہاری ضروریات کے لیے چوپاؤں کے جوڑے بنائے، تاکہ وہ بڑھتے پھلتے رہیں اور تم ان سے اپنی ضروریات پوری کرتے رہو۔

۱۱ يَذُرُوْكُمْ فِيْهِ : یعنی جوڑے اس لیے بنائے تاکہ تو والد و تاسل کا سلسلہ قائم رہے اور تمہاری نسل پھلتی پھولتی اور پھیلتی رہے۔

۱۲ لَيْسَ كَيْفَ شَيْءٍ : انسانوں کے درمیان اگرچہ رنگوں اور زبانوں کا اختلاف پایا جاتا ہے اور ہر انسان دوسرے سے الگ تشخص رکھتا ہے، اس کے باوجود وہ بہت سی چیزوں میں ایک دوسرے کے مشابہ اور ایک دوسرے کے مثل ہیں۔ چوپاؤں اور دوسرے حیوانات کا بھی یہی حال ہے۔ صرف اللہ تعالیٰ کا امتیاز ہے کہ کوئی چیز اس کی ذات یا صفات کی مثل کسی طرح بھی نہیں۔

۱۳ لَيْسَ كَيْفَ شَيْءٍ : اپنے سلسلہ ازدواج اور سلسلہ تولد و تاسل کو دیکھ کر یہ نہ سمجھ بیٹھنا کہ اللہ تعالیٰ بھی تمہاری طرح ہے۔ نہیں، خالق و مخلوق ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔ اس جیسی کوئی چیز نہیں، نہ ذات میں، نہ صفات میں اور نہ افعال و حقوق میں۔ اس کا کوئی جوڑا نہیں اور وہ نہ کسی کی اولاد ہے، نہ کوئی اس کی اولاد ہے اور نہ کوئی اس کا شریک و ہمسر ہے۔ مزید دیکھیے سورہ اخلاص۔

۱۴ ”لَيْسَ كَيْفَ شَيْءٍ“ پر ایک مشہور سوال ہے کہ جب کہنا یہ مقصود ہے کہ اللہ کی مثل کوئی چیز نہیں تو ”لَيْسَ وَمِثْلُهُ شَيْءٍ“ کا کافی تھا، ”کاف“ لانے کی کیا ضرورت تھی؟ ”کاف“ لانے سے تو بظاہر ایسا معنی پیدا ہو رہا ہے جو محال ہے، کیونکہ ”لَيْسَ كَيْفَ شَيْءٍ“ کا ترجمہ ہو گا ”اس کی مثل جیسی کوئی چیز نہیں“ جب کہ اس ترجمے سے دو محال باتیں لازم آتی ہیں، پہلی یہ کہ اللہ کی مثل کوئی ہے جب کہ یہ محال ہے۔ دوسری یہ کہ اس کی مثل جیسی کوئی چیز نہیں، حالانکہ جب وہ اللہ کی مثل ہے تو ظاہر ہے اللہ تعالیٰ اس جیسا ہے، تمہی وہ اس کی مثل ہے۔ اس سوال کا حل اہل علم نے مختلف طریقوں سے کیا ہے، ایک یہ ہے کہ اس میں ”کاف“ زائد ہے۔ زائد کا یہ مقصد نہیں کہ بے فائدہ ہے، بلکہ وہ ”مِثْلُ“ کی تاکید اور اس میں مبالغہ کے لیے لایا گیا ہے۔ گویا یہ بات کہ ”اللہ تعالیٰ جیسی کوئی چیز نہیں“ دو دفعہ کہی گئی ہے، ایک ”کاف“ کے ساتھ اور ایک ”مِثْلُ“ کے ساتھ، مگر مثلث کے معنی میں یہ مبالغہ عمل نظر ہے۔

دوسرا حل یہ ہے کہ عرب کلام میں زور پیدا کرنے کے لیے ”مِثْلُ“ کا لفظ کسی جیسے کے لیے نہیں بلکہ اس کی ذات اور شخصیت کے لیے استعمال کرتے ہیں، مثلاً ”مِثْلِي لَا يَكْذِبُ“ سے مراد یہ نہیں کہ میرے جیسا شخص جھوٹ نہیں بولتا، بلکہ یہ ہے کہ ”میں جھوٹ نہیں بولتا۔“ اسی طرح ”مِثْلُهُ لَا يُعْبَوُ بِهِ“ کا معنی یہ نہیں کہ اس جیسے شخص کی پروا نہیں کی جاتی، بلکہ مراد یہ ہے کہ ”اس کی کوئی پروا نہیں کی جاتی۔“ اسی طرح ”لَيْسَ كَيْفَ شَيْءٍ“ کا معنی یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مثل جیسی کوئی چیز نہیں، بلکہ یہ ہے کہ ”اللہ تعالیٰ کی ذات جیسی کوئی چیز نہیں۔“ یہاں ”کاف“ کا اضافہ اس لیے کیا گیا ہے کہ اگر ”کاف“ نہ لایا جاتا تو

عربی محاورہ ذہن میں آنے سے خیال ایک غلط مفہوم کی طرف جاسکتا تھا، جیسے "مِثْلَهُ لَا يُعْتَبَرُ بِهِ" کا معنی ہے کہ فلاں شخص کی کوئی پروا نہیں کی جاتی۔ اسی طرح "کاف" کے بغیر "لَيْسَ مِثْلَهُ شَيْءٌ" کا معنی یہ ہو سکتا تھا کہ (معاذ اللہ) اس کی ذات کوئی شے نہیں، یا اس کی کچھ حیثیت نہیں۔ اب "لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ" کہنے سے یہ ائمہ یثرب دور ہو گیا اور بات صاف ہو گئی کہ اس کی ذات جیسی کوئی چیز نہیں۔ طبری، بغدادی، ابن ہشام اور بہت سے ائمہ نے یہاں "مِثْلٌ" کو شخص، ذات یا نفس کا ہم معنی قرار دے کر اس کے شواہد پیش فرمائے ہیں۔ یہ حل معنوی طور پر بہت مضبوط ہے۔

تیسرا حل یہ ہے کہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر "مِثْلٌ" کا لفظ صفت شان کے معنی میں آیا ہے، جیسے یہ آیت: ﴿مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وُعدَ الْمُتَّقُونَ فِيهَا أَنْهَارٌ مِنْ مَاءٍ غَيْرِ آسِنٍ﴾ | محمد: ۱۵ | "اس جنت کی صفت جس کا تعلق لوگوں سے وعدہ کیا گیا ہے، یہ ہے کہ اس میں کئی نہریں ایسے پانی کی ہیں جو بگڑنے والا نہیں۔" اسی طرح یہ آیت: ﴿وَلَهُ الْمَثَلُ الْأَعْلَىٰ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾ | الروم: ۲۷ | "اور آسمانوں اور زمین میں سب سے اونچی صفت (شان) اسی کی ہے۔" اس لیے "لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ" کا معنی یہ ہے کہ "اللہ کی صفت جیسی کوئی چیز نہیں۔" یہ حل سمجھنے میں سب سے آسان ہے، معنوی طور پر بالکل درست ہے اور ائمہ تفسیر سے منقول ہے۔ سیاق کے لحاظ سے بھی بہت مناسب ہے، کیونکہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کی بہت سی صفات بیان فرمائی گئی ہیں، پھر فرمایا کہ اس کی صفت جیسی کوئی چیز نہیں۔

﴿وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾: "السَّمِيعُ الْبَصِيرُ" "هُوَ" مبتدا کی خبر ہے۔ خبر پر الف لام لانے سے قصر کا مفہوم پیدا ہو گیا، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے "اور وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے۔" یہ "لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ" (اس کی ذات و صفات جیسی کوئی چیز نہیں) سے پیدا ہونے والے ایک سوال کا جواب ہے کہ "لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ" کے باوجود یہ کیا بات ہے کہ اللہ تعالیٰ سمیع و بصیر ہے اور انسان بھی سمیع و بصیر ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا﴾ | الدھر: ۱۲ | "سو ہم نے اسے خوب سننے والا، خوب دیکھنے والا بنا دیا۔" بلکہ سمیع و بصیر انسان کے علاوہ جانوروں میں بھی موجود ہیں اور حناہ کے واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جمادات بھی سمیع و بصیر سے بے بہرہ نہیں ہیں، تو اللہ تعالیٰ بے مثل کیسے ہوا؟ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا، کامل اور اصل سمیع و بصیر صرف اللہ تعالیٰ ہے، کسی اور میں پائی جانے والی یہ صفات اللہ تعالیٰ کی صفات سے کچھ مشابہت نہیں رکھتیں اور ان کے مقابلے میں کوئی حقیقت رکھتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی صفات کے متعلق بہت سے لوگوں کو ایسے اشکالات پیدا ہوئے کہ بے شمار مخلوق گمراہ ہو گئی، انہوں نے دیکھا کہ وہی الفاظ اللہ تعالیٰ کے متعلق آ رہے ہیں اور وہی مخلوق کے متعلق، مثلاً اللہ تعالیٰ کے متعلق آیا ہے: ﴿قُلْ أَسْتَوِي عَلَى الْعَرْشِ﴾ | الاعراف: ۵۴ | (پھر وہ عرش پر بلند ہوا) اور مخلوق کے متعلق الفاظ ہیں: ﴿لَتَسْتَوِي عَلَى ظُهُورِهِ﴾ | الزمر: ۱۳ | (تاکہ تم ان کی پیٹھوں پر جم کر بیٹھو) اور یہ الفاظ: ﴿وَإِذَا اسْتَوَيْتَ أَنْتَ وَرَبُّكَ عَلَى الْعَرْشِ﴾ | المؤمنون: ۲۸ | (پھر جب تو اور جو تیرے ساتھ ہیں، کشتی پر چڑھ جاؤ)۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ﴾ | الفتح: ۱۰ | (اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے) میں لفظ "يد" اللہ تعالیٰ اور بندوں دونوں کے لیے آیا ہے، یہی حال سمیع و بصیر

کا ہے۔ اب کچھ لوگ اس وجہ سے گمراہ ہو گئے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی صفات کو مخلوق کی صفات کے مشابہ قرار دیا۔ اس کے استواء، اس کے ید، اس کے سمع و بصر اور اس کی دوسری صفات کو مخلوق کے استواء، اس کے ید، اس کے سمع و بصر اور اس کی دوسری صفات کی طرح سمجھ بیٹھے، ان لوگوں کو ”مشبہہ“ کہتے ہیں اور کچھ اس وجہ سے گمراہ ہو گئے کہ انھوں نے یہ کہہ کر کہ اللہ کی مثل کوئی چیز نہیں، اس کی ان صفات کا بھی انکار کر دیا جو اس نے خود اپنی بیان فرمائی ہیں۔ انھوں نے کہا، اللہ تعالیٰ نہ عرش پر مستوی ہے، نہ اس کا ہاتھ ہے، نہ اس کا سمع و بصر ہے، نہ وہ کلام کرتا ہے، کیونکہ اگر ہم اس کے لیے یہ چیزیں تسلیم کریں تو وہ مخلوق جیسا ٹھہرتا ہے۔ ان منکرین صفات کو ”معتلہ“ کہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تشبیہ و تعطیل دونوں سے بلند و برتر ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی صفات کا مسئلہ انتہائی وضاحت کے ساتھ بیان فرما دیا ہے، اس میں کوئی پیچیدگی یا اشکال باقی نہیں رہنے دیا۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ آیات صفات میں حق دو چیزوں سے مرکب ہے، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کو مخلوق کی صفات کی مشابہت سے پاک سمجھا جائے۔ دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اپنی جو بھی صفت بیان فرمائی ہے، یا اس کے رسول ﷺ نے اس کی جو بھی صفت بیان فرمائی ہے اس پر مکمل ایمان رکھا جائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی صفت اس سے بڑھ کر کوئی نہیں جانتا، جیسا کہ فرمایا: ﴿قُلْ أَعْلَمُ أَمْرَ اللَّهِ﴾ [البقرہ: ۱۷۰] ”کیا تم زیادہ جاننے والے ہو یا اللہ؟“ اور اللہ تعالیٰ کے بعد رسول اللہ ﷺ سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا علم رکھنے والا کوئی نہیں۔ آپ ﷺ کے متعلق خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَا يَنْطَلِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۗ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ﴾ [النجم: ۴۰۳] ”اور نہ وہ اپنی خواہش سے بولتا ہے۔ وہ تو صرف وحی ہے جو نازل کی جاتی ہے۔“ اب جو شخص کسی ایسی صفت کی نفی کرے جو خود اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اپنے لیے بیان فرمائی ہے، یا اس کے رسول ﷺ نے بیان فرمائی ہے، یہ کہہ کر کہ یہ صفت اللہ تعالیٰ کے لائق نہیں، تو وہ اپنے آپ کو اللہ اور اس کے رسول سے بھی زیادہ علم رکھنے والا سمجھتا ہے کہ اللہ کی شان کے لائق کون سی بات ہے اور کون سی نہیں۔ اور جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات مخلوق کی صفات کے مشابہ ہیں وہ بھی ملحد اور گمراہ ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور یہ اللہ کی صفات کو مخلوق کی صفات کے مشابہ سمجھتا ہے۔ ہاں، جو شخص اللہ تعالیٰ کے لیے ان تمام صفات کو مانتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے خود اپنے لیے بیان کی ہیں، یا اس کے رسول نے اس کے لیے بیان کی ہیں اور ساتھ ہی اللہ عز و جل اور اس کی صفات کو مخلوق کی مشابہت سے پاک قرار دیتا ہے، یہ صحیح مومن ہے جو اللہ تعالیٰ کی صفات کمال پر بھی ایمان رکھتا ہے اور اس کی مخلوق کی مشابہت سے پاک ہونے پر بھی ایمان رکھتا ہے۔ زیر تفسیر آیت: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ نے اس حقیقت کو خوب واضح فرما دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ سمع و بصر کی صفات بھی رکھتا ہے اور کوئی چیز اس کی مثل اور مشابہ بھی نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ”وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ“ کے بجائے ”وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ“ اس لیے فرمایا کہ سمع و بصر کی دونوں صفات تمام حیوانات میں بھی پائی جاتی ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ یہ دونوں صفات رکھتا ہے، لیکن

اس کی ان صفات کی بنیاد اس بات پر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات اور مخلوق کی صفات میں کوئی مماثلت نہیں، اس لیے ”وَ هُوَ التَّسْمِينُ الْبَصِيْرُ“ کا لفظ ”لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ“ کہنے کے بعد ارشاد فرمایا۔ جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی صفات کا اس لیے انکار کیا ہے کہ صفات کے لیے وہی الفاظ مخلوق پر بھی آئے ہیں، انہیں لازم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات، اس کے وجود اور اس کی حیات کا بھی انکار کر دیں، کیونکہ مخلوق کی بھی ذات ہے، وہ بھی وجود رکھتی ہے اور اس میں بھی حیات پائی جاتی ہے، مگر جس طرح خالق اور مخلوق میں کوئی مماثلت نہیں اور دونوں کی ذات، وجود اور حیات میں کوئی مماثلت نہیں، اسی طرح خالق و مخلوق کی کسی صفت میں بھی کوئی مماثلت نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی صفات کامل اور حقیقی ہیں۔ مخلوق کی صفات اگرچہ ان کے حسب حال موجود ہیں مگر اللہ تعالیٰ کی صفات کے مقابلے میں کالعدم ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴾ وہی سميع و بصير ہے اور کوئی نہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے خود ہی انسان کو سميع و بصير بتایا ہے۔

اس کی تھوڑی سی تفصیل سنیے، متکلمین اللہ تعالیٰ کی بے شمار صفات میں سے سات صفات کو صفات معانی کہتے ہیں، وہ ہیں حیات، قدرت، ارادہ، علم، سمع، بصر اور کلام۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت حیات خود بیان فرمائی، فرمایا: ﴿ هُوَ الْحَيُّ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ﴾ [المؤمن : ۶۵] ”وہی زندہ ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔“ اور فرمایا: ﴿ وَ تَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ ﴾ [الفرقان : ۵۸] ”اور اس زندہ پر بھروسا کر جو نہیں مرے گا۔“ اور دوسری بہت سی آیات۔ مخلوق کی صفت بھی حیات بیان فرمائی، فرمایا: ﴿ وَ سَلِّمْ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَ يَوْمَ يَمُوتُ وَ يَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ﴾ [مریم : ۱۵] ”اور سلام اس پر جس دن وہ پیدا ہوا اور جس دن فوت ہوگا اور جس دن زندہ ہو کر اٹھایا جائے گا۔“ اور فرمایا: ﴿ وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيًّا ﴾ [الانبیاء : ۳۰] ”اور ہم نے پانی سے ہر زندہ چیز بنائی۔“ اور فرمایا: ﴿ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ يُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ﴾ [الروم : ۱۹] ”وہ زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے۔“ یہاں دیکھیے ”هُوَ الْحَيُّ“ (صرف وہ زندہ ہے) کہنے کے باوجود مخلوق کی حیات کا بھی ذکر فرمایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حقیقی اور کامل حیات صرف اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، مخلوق کو بھی اس کے حسب حال ایک طرح کی حیات حاصل ہے، مگر خالق و مخلوق کی حیات میں اتنی ہی منافات ہے جتنی دونوں کی ذات میں ہے، خالق والی حیات کا ایک شتہ بھی مخلوق کو حاصل نہیں۔

دوسری صفت قدرت ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنی یہ صفت خود بیان فرمائی ہے، فرمایا: ﴿ وَ اللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ [البقرة : ۲۸۴] ”اور اللہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔“ مخلوق کے متعلق بھی یہ لفظ استعمال فرمایا: ﴿ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ قَبْلِ أَنْ تَقْرَأُوا عَلَيْهِمْ ﴾ [المائدة : ۳۴] ”مگر جو لوگ اس سے پہلے توبہ کر لیں کہ تم ان پر قابو پاؤ۔“ اللہ تعالیٰ کی قدرت حقیقی، کامل اور اس کی شان کے لائق ہے، جبکہ مخلوق کی قدرت صرف اس کے حسب حال ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور مخلوق کی قدرت میں اتنی منافات ہے جتنی دونوں کی ذات میں ہے۔

تیسری صفت ارادہ ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے متعلق فرمایا: ﴿ فَعَالَمٌ لِمَا يُرِيدُ ﴾ [هود : ۱۰۷] ”کر گزرنے والا ہے جو چاہتا ہے۔“ اور فرمایا: ﴿ إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ﴾ [يس : ۸۲] ”اس کا حکم تو، جب وہ کسی

چیز کا ارادہ کرتا ہے، اس کے سوا نہیں ہوتا کہ اسے کہتا ہے ”ہو جا“ تو وہ ہو جاتی ہے۔“ اور فرمایا: ﴿يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ [البقرة: ۱۸۵] ”اللہ تمہارے ساتھ آسانی کا ارادہ رکھتا ہے اور تمہارے ساتھ تنگی کا ارادہ نہیں رکھتا۔“ اور دوسری آیات۔ مخلوق کے ارادے کا بھی ذکر کیا، فرمایا: ﴿تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا﴾ [الأنفال: ۶۷] ”تم دنیا کا سامان چاہتے ہو۔“ اور فرمایا: ﴿إِن يُرِيدُونَ إِلَّا فِرَاقًا﴾ [الأحزاب: ۱۳] ”وہ بھاگنے کے سوا کچھ چاہتے ہی نہیں۔“ اور فرمایا: ﴿يُرِيدُونَ لِيُظَفَّرُوا نُورَ اللَّهِ﴾ [الصف: ۸] ”وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو بجھادیں۔“ اور دوسری آیات۔ یہاں اللہ تعالیٰ کا ارادہ حقیقی، کامل اور اس کی ذات کے لائق ہے، جبکہ مخلوق کا ارادہ اس کے حسب حال ہے۔ دونوں کے ارادوں میں اتنا ہی فرق ہے جتنا دونوں کی ذات میں ہے۔

چوتھی صفت علم ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے متعلق فرمایا: ﴿وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾ [البقرة: ۲۸۲] ”اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔“ اور فرمایا: ﴿لَكِنَّ اللَّهَ يَشْهَدُ بِمَا أَنْزَلَ إِلَيْكَ أَنْزَلَهُ بِعِلْمِهِ﴾ [النساء: ۱۶۶] ”لیکن اللہ شہادت دیتا ہے اس کے متعلق جو اس نے تیری طرف نازل کیا ہے کہ اس نے اسے اپنے علم سے نازل کیا ہے۔“ اور مخلوق کے متعلق فرمایا: ﴿وَإِنَّهُ لَدُوٌّ عَلِيمٌ لِمَا عَلَنَّا﴾ [يوسف: ۶۸] ”اور بلاشبہ وہ یقیناً بڑے علم والا تھا، اس وجہ سے کہ ہم نے اسے سکھایا تھا۔“ اور اس جیسی آیات۔ تو اللہ تعالیٰ کا علم کامل، حقیقی اور اس کے کمال و جلال کے لائق ہے، جب کہ مخلوق کا علم اس کے حال کے مناسب ہے۔ خالق و مخلوق کے علم میں اتنی ہی منافات ہے جتنی خالق و مخلوق کی ذات میں ہے۔

پانچویں اور چھٹی صفت سمع و بصر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے متعلق فرمایا: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ [الشوزی: ۱۱] ”اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے۔“ اور فرمایا: ﴿وَإِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ﴾ [الحج: ۶۱] ”اور اللہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے۔“ اور مخلوق کے متعلق فرمایا: ﴿إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ نُطْفَةٍ مِنْ نَسَائِكَ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا﴾ [الدھر: ۲] ”بلاشبہ ہم نے انسان کو ایک طے جلے قطرے سے پیدا کیا، ہم اسے آزماتے ہیں، سو ہم نے اسے خوب سننے والا، خوب دیکھنے والا بنا دیا۔“ اور فرمایا: ﴿أَسْمِعُ بِهِمْ وَأَبْصُرُ يَوْمَ يَأْتُونَنَا﴾ [مریم: ۳۸] ”کس قدر سننے والے ہوں گے وہ اور کس قدر دیکھنے والے، جس دن وہ ہمارے پاس آئیں گے۔“ اور اس جیسی آیات۔ تو اللہ عز و جل کے سمع و بصر حقیقی، کامل اور اس کی شان کے لائق ہیں اور مخلوق کے سمع و بصر ان کے حال کے مناسب ہیں۔ جس طرح خالق و مخلوق کی ذات میں کوئی مماثلت نہیں، ان کے سمع و بصر میں بھی کوئی مماثلت نہیں۔

ساتویں صفت کلام ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے متعلق فرمایا: ﴿وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَى تَكْلِيمًا﴾ [النساء: ۱۶۴] ”اور اللہ نے موسیٰ سے کلام کیا، خود کلام کرنا۔“ اور فرمایا: ﴿إِنِّي اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسَالَتِي وَ بِكَلَامِي﴾ [الأعراف: ۱۴۴] ”بے شک میں نے تجھے اپنے پیغامات اور اپنے کلام کے ساتھ لوگوں پر چن لیا ہے۔“ اور فرمایا: ﴿فَأَجْرُهُ حَتَّى يَسْمَعَ كَلِمَ اللَّهِ﴾ [التوبة: ۶] ”تو اسے پناہ دے دے، یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سنے۔“ اور مخلوق کے متعلق فرمایا:

لَهُ مَقَالِيدُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ وَيَقْدِرُ ۗ إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿۱۲﴾

اسی کے پاس آسمانوں کی اور زمین کی کنجیاں ہیں، وہ رزق فراخ کر دیتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے اور تنگ کر دیتا ہے، بے شک وہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے ﴿۱۲﴾

﴿قُلْنَا كَلِمَةً قَالَ إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِينٌ أَمِينٌ﴾ [یوسف : ۵۱] پھر جب اس نے اس سے بات کی تو کہا بلاشبہ تو آج ہمارے ہاں صاحب اقتدار، امانت دار ہے۔“ اور فرمایا: ﴿الْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَىٰ أَفْوَاهِهِمْ وَتُخْفِتُ أَيْدِيهِمْ﴾ [سن : ۶۵] ”آج ہم ان کے منہوں پر مہر لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے باتیں کریں گے۔“ اور فرمایا: ﴿قَالُوا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَن كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا﴾ [مرج : ۲۹] ”انہوں نے کہا ہم اس سے کیسے بات کریں جو ابھی تک گود میں بچہ ہے۔“ تو اللہ تعالیٰ کا کلام حقیقی، کامل اور اس کی شان کے لائق ہے اور مخلوق کی صفت بھی کلام ہے جو اس کے حسب حال ہے اور خالق و مخلوق کے کلام میں اتنی ہی منافات ہے جتنی ان دونوں کی ذات میں ہے۔ اہل علم یہ بحث تفصیل سے پڑھنا چاہیں تو مفسر شعلی کی ”أَصْوَاتُ الْبَنَانِ“ میں سورہ اعراف کی آیت (۵۳): ﴿ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ﴾ کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔ تعجب ہوتا ہے کہ اتنی واضح بات بڑے بڑے مفسر اور مصنف نہیں سمجھ سکے۔ وہ جہاں ”استواء علی العرش“ کا لفظ آئے گا اس کا انکار کرتے ہوئے کہیں گے اس سے مراد حکومت کرنا ہے، سب و بصر آئے گا تو کہیں گے اس سے مراد علم ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی محبت، رضا، غضب، انتقام، اس کے نزول اور دوسری صفات کا مطلب کچھ اور ہی بیان کرتے ہوئے اصل صفات کا انکار کر دیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہدایت محض اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، وہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ سلف صالحین اور محدثین ہی اس مقام پر سلامت رہے ہیں، ان کی ترجمانی امام مالک رضی اللہ عنہ نے فرمائی، جب ان سے اللہ تعالیٰ کے عرش پر استواء کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: ”الْإِسْتِوَاءُ مَعْلُومٌ وَالْكَفَيْتُ مَنْجُوهٌ وَالسُّؤَالُ عَنْهُ بِذَعَّةٍ“ ”اللہ تعالیٰ کا عرش پر مستوی ہونا معلوم ہے اور یہ بات کہ کیسے مستوی ہے، کسی کو معلوم نہیں اور یہ پوچھنا کہ کیسے مستوی ہے بدعت ہے۔“ بالکل اسی طرح ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ سب سے بڑا، بصیر ہے، اس کے ہاتھ ہیں، آنکھیں ہیں، چہرہ ہے، وہ محبت کرتا ہے، ناراض ہوتا ہے، کلام کرتا ہے، بنتا ہے، اترتا ہے اور قیامت کے دن زمین پر آئے گا، مگر ہمیں ان صفات کی کیفیت معلوم نہیں، نہ ہم عاجز مخلوق اس بے نہایت خالق کی ذات یا صفات کی حقیقت یا کیفیت کو سمجھ سکتے ہیں۔ ہم اس کی ان تمام صفات کو انھی الفاظ و معانی میں مانتے ہیں جو خود اس نے یا اس کے نبی مکرم ﷺ نے بیان فرمائی ہیں اور ان تمام لوگوں کی باتوں سے بری ہونے کا اعلان کرتے ہیں جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی یہ صفات نہیں ہیں، یا کہتے ہیں کہ مخلوق جیسی ہیں، یا کہتے ہیں کہ ہمیں ان صفات کے معنی ہی کا علم نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں حق پر استقامت عطا فرمائے۔ (آمین)

ت ۱۲ ﴿۱﴾ لَهُ مَقَالِيدُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ زمر (۶۳)۔

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَضَىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ
اس نے تمہارے لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا جس کا تاکید ہم نے نوح کو دیا اور جس کی وحی ہم نے تیری

﴿ 2 ﴾ يَنْسُطُ الزُّنُوقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ عنکبوت (۶۲)۔

آیت 13 ﴿ 1 ﴾ شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَضَىٰ بِهِ نُوحًا : سورت کے شروع میں جو بات فرمائی : ﴿ كَذَلِكَ

يُوحَىٰ إِلَيْكَ وَ إِلَى الدِّينِ مِنْ قَبْلِكَ ۗ اللَّهُ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴾ (اسی طرح وحی کرتا ہے تیری طرف اور ان لوگوں کی طرف جو تجھ سے پہلے تھے، وہ اللہ جو سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے) یہاں سے وہی بات مزید تفصیل کے ساتھ بیان ہو رہی ہے۔ ”لَكُمْ“ سے خطاب ہماری امت کو ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے کوئی اجنبی یا انوکھا دین مقرر نہیں فرمایا، یہ وہی دین ہے جو اس نے پہلے تمام انبیاء کے لیے مقرر فرمایا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ تمام انبیاء کا دین ایک ہے اور وہ ہے اسلام، جیسا کہ فرمایا: ﴿ إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ ﴾ [آل عمران : ۱۹] ”بے شک دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔“ جس کا معنی مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کے تابع فرمان ہو جانا ہے۔ اس دین کا عنوان ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ یعنی اللہ واحد کی عبادت و اطاعت ہے۔ تمام انبیاء و رسل کی طرف سے ایک ہی دین کی وحی کی گئی ہے، فرمایا: ﴿ وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا نُوحِيَ إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ ﴾ [الأنبياء : ۲۰] ”اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف یہ وحی کرتے تھے کہ حقیقت یہ ہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو میری عبادت کرو۔“ سورہ انعام میں توحید کی تاکید اور شرک کا رد کرنے کے بعد نوح اور ابراہیم علیہما السلام سمیت اٹھارہ پیغمبروں کا ذکر ان کا نام لے کر فرمایا، پھر ان کے آباء، اولاد اور بھائیوں کا ذکر کر کے فرمایا کہ اگر یہ لوگ شرک کرتے تو ان کا وہ سب کچھ ضائع ہو جاتا جو وہ کرتے رہے تھے۔ اس کے بعد آپ ﷺ کو ان کے طریقے پر چلنے کا حکم دیا اور فرمایا: ﴿ أُولَئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ فَبِهِدَاهُمُ اقْتَدِبْ ﴾ [الأنعام : ۹۰] ”یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت دی، سو تو ان کی ہدایت کی پیروی کر۔“

﴿ 2 ﴾ دین کن چیزوں کا نام ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۗ حُنَفَاءَ وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ وَ ذَلِكَ دِينُ الْقَيِّمَةِ ﴾ [البینة : ۵] ”اور انہیں اس کے سوا حکم نہیں دیا گیا کہ وہ اللہ کی عبادت کریں، اس حال میں کہ اس کے لیے دین کو خالص کرنے والے، ایک طرف ہونے والے ہوں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور یہی مضبوط ملت کا دین ہے۔“ اس سے معلوم ہوا کہ اخلاص کے ساتھ اللہ واحد کی عبادت کرنا، نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا دین ہے، جس کا پہلی امتوں کو بھی حکم تھا۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں مروی مشہور حدیث جبریل میں رسول اللہ ﷺ نے اسلام، ایمان اور احسان کی تفصیل فرمائی، پھر قیامت اور اس کی چند علامات کا ذکر فرمایا، جب جبریل علیہ السلام چلے گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿ فَإِنَّهُ جِبْرِيلُ أَتَاكُمْ يُعَلِّمُكُمْ دِينَكُمْ ﴾ [مسلم، الإيمان، باب بیان الإيمان و الإسلام : ۵۰] ”وہ جبریل (علیہ السلام) تھے، تمہارے پاس آئے تھے، تمہیں تمہارا دین سکھا رہے تھے۔“ اس سے معلوم ہوا کہ

إِبْرَاهِيمَ وَ مُوسَىٰ وَ عِيسَىٰ أَنْ أَقْبَلُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ
طرف کی اور جس کا تاکید حکم ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا، یہ کہ اس دین کو قائم رکھو اور اس میں جدا جدا نہ

سلام کے پانچوں ارکان دین ہیں، اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں، اس کے رسولوں، اس کی کتابوں، یومِ آخرت اور تقدیر پر ایمان
دین ہے، عمل میں اخلاص اور احسان دین ہے، قیامت کے معاملات کی فکر دین ہے۔ پھر جب ایمان دین ہے تو ایمان میں
شامل وہ تمام چیزیں بھی دین ہیں جنہیں قرآن مجید یا حدیث میں ایمان یا ایمان کی شاخ قرار دیا گیا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے
”بابُ اَنْوَارِ الْاِيْمَانِ“ میں قرآن مجید کی دو آیات نقل فرمائی ہیں، ایک سورہ بقرہ کی آیت: ﴿لَيْسَ الْبِرُّ اَنْ تُوَلُّوا وُجُوْهُكُمْ
قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيِّنَ ۗ وَ اتَى
الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالسَّبِيْلَ ۗ وَالْبِنٰى وَالصَّوْمَ ۗ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ ۗ وَ اتَى
الزَّكٰوةَ ۗ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۗ وَالصَّوْمَ فِي الْبِنٰىءِ وَالصَّرَآءِ ۗ وَ حٰنِنِ الْبٰسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۗ
وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ﴾ [البقرہ: ۱۷۷] ”مگر یہ نہیں کہ تم اپنے منہ مشرق اور مغرب کی طرف پھیرو اور لیکن اصل نیکی
اس کی ہے جو اللہ اور یومِ آخرت اور فرشتوں اور کتاب اور نبیوں پر ایمان لائے اور مال دے اس کی محبت کے باوجود قرابت
والوں اور قریبوں اور مسکینوں اور مسافروں اور مانگنے والوں کو اور گردنیں چھڑانے میں۔ اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے اور جو اپنا
عہد پورا کرنے والے ہیں جب عہد کریں اور خصوصاً جو تنگی اور تکلیف میں اور لڑائی کے وقت صبر کرنے والے ہیں، یہی لوگ
ہیں جنہوں نے سچ کہا اور یہی سچے والے ہیں۔“ اور سورہ مومنوں کی ابتدائی آیات: ﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۗ الَّذِيْنَ هُمْ
فِي صَلٰتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۗ وَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنِ النَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۗ وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ ۗ وَ الَّذِيْنَ هُمْ
لِعٰزَّتِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۗ اِلَّا عَلَىٰ اُزْرٰجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمٰنُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مُلٰمِئِيْنَ ۗ فَمَنْ اِنْتَبٰى وَ رَآءَ
ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۗ وَ الَّذِيْنَ هُمْ لِآمٰنِيَّتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۗ وَ الَّذِيْنَ هُمْ عَلَىٰ صَلٰوٰتِهِمْ يُحٰفِظُوْنَ ۗ اُولٰٓئِكَ
هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۗ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ [المؤمنون: ۱۱۱] ”یقیناً کامیاب ہو گئے مومن۔
وہی جو اپنی نماز میں عاجزی کرنے والے ہیں۔ اور وہی جو لغو کاموں سے منہ موڑنے والے ہیں۔ اور وہی لوگ جو (ہر عمل)
پاک ہونے ہی کے لیے کرتے والے ہیں۔ اور وہی جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ مگر اپنی بیویوں، یا ان
(مورتوں) پر جن کے مالک ان کے دائیں ہاتھ بنے ہیں تو بلاشبہ وہ ملامت کیے ہوئے نہیں ہیں۔ پھر جو اس کے سوا تلاش کرے
تو وہی لوگ حد سے بڑھنے والے ہیں۔ اور وہی جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا لحاظ رکھنے والے ہیں۔ اور وہی جو اپنی نمازوں
کی خوب حفاظت کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو وارث ہیں۔ جو فردوس کے وارث ہوں گے، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے
ہیں۔“ اس کے بعد یہ حدیث بیان فرمائی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿اَلْاِيْمَانُ بِطَمَعٍ وَسُخْبَةٍ وَالْحَيٰةُ

مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ اللَّهُ يَجْتَبِي إِلَيْهِ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ يُنِيبُ ﴿۱۳﴾

ہو جاؤ۔ مشرکوں پر وہ بات بھاری ہے جس کی طرف تو انہیں بلاتا ہے، اللہ اپنی طرف جن لیتا ہے جسے چاہتا ہے اور اپنی طرف راستہ اسے دیتا ہے جو رجوع کرے ﴿۱۳﴾

شُعْبَةُ مِنَ الْإِيمَانِ» [بخاری، الإیمان، باب أمور الإیمان : ۹۔ مسلم : ۳۵] ”ایمان کی ساٹھ (۶۰) سے کچھ زیادہ شاخیں ہیں اور حیا بھی ایمان کا جزو ہے۔“ اس کے بعد مختلف ابواب میں امور دین کا بیان فرمایا ہے۔

خلاصہ یہ کہ تمام انبیاء کا اصل دین ایک ہے، البتہ کسی عمل کی ادائیگی کی کیفیت میں فرق ہو سکتا ہے۔ مثلاً نماز ہر امت پر فرض تھی، اس کے اوقات اور رکعات کی تعداد وغیرہ میں فرق ہو سکتا ہے۔ روزہ سب پر فرض تھا، مگر اس کی کیفیت میں اختلاف معلوم ہے۔ زکوٰۃ ہر امت پر فرض تھی، مگر اس کے نصاب اور مقدار وغیرہ میں فرق ہو سکتا ہے۔ اسی طرح مختلف اقوام اور اوقات کے لحاظ سے بعض اشیاء کی تطہیل و تحریم میں اللہ تعالیٰ کی وحی کے مطابق نسخ ہو سکتا ہے، تبدیلی ہو سکتی ہے اور ہوتی ہے۔ بعض امتوں میں کئی معاملات میں تخفیف اور بعض میں سختی ہو سکتی ہے، مگر اصل دین ایک ہے۔ یہی مطلب ہے اس حدیث کا جو اس سورت کی تیسری آیت کی تفسیر میں گزر چکی ہے: «الْأَنْبِيَاءُ إِخْوَةٌ لِعَلَّاتِ» [بخاری : ۳۴۴۳] ”انبیاء عطا کی مختلف ماؤں سے پیدا ہونے والے (بھائی ہیں)۔“ یہاں تک کہ خاتم النبیین ﷺ پر اللہ تعالیٰ نے اپنا دین مکمل فرمادیا، فرمایا: ﴿أَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَاتَّمَنْتُمْ عَلَيْنَا نَفْسِي وَرَضَيْتُمْ لَكُمْ الْإِسْلَامَ دِينًا﴾ [المائدة : ۳] ”آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کر لیا۔“

﴿۳﴾ وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ..... : اگرچہ تمام انبیاء کا دین ایک تھا، مگر یہاں صرف پانچ پیغمبروں کا ذکر فرمایا اور ان کی ترتیب بھی ان کے زمانے کے حساب سے نہیں رکھی۔ مفسرین فرماتے ہیں تمام انبیاء کا نام لینا تو ممکن نہ تھا اور نہ ہی اس کی ضرورت تھی (دیکھیے مومن : ۷۸) اس لیے ہر مقام پر اس کے مناسب انبیاء کا ذکر فرمایا۔ یہاں پہلے دو رسولوں کا ذکر فرمایا جن میں سے نوح علیہ السلام زمین والوں کی طرف سب سے پہلے رسول تھے، جیسا کہ حدیث شفاعت میں ہے۔ [دیکھیے بخاری : ۳۳۴۰] اس سے پہلے آدم علیہ السلام بے شک نبی تھے، مگر انہیں کسی امت کی طرف مبعوث نہیں کیا گیا تھا۔ سب سے پہلے رسول کے ساتھ ہی سب سے آخری نبی ﷺ کا ذکر کیا گیا، مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ دین پہلے رسول سے آخری رسول تک ایک ہی ہے۔ اس کے بعد تین طویل القدر رسولوں کا ذکر فرمایا، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری کے وقت آسمانی مذاہب میں سے انہی تینوں کے پیروکار ہونے کے مدعی تمام دنیا میں پائے جاتے تھے۔ عرب کے مشرکین ابراہیمی ہونے کے دعوے دار تھے، یہودی موسیٰ علیہ السلام اور نصرانی عیسیٰ علیہ السلام کے امتی کہلاتے تھے۔ ان کے علاوہ کسی پیغمبر کی طرف منسوب کوئی قابل ذکر قوم نہ تھی۔ اس لیے فرمایا کہ ان سب کا دین ایک ہے، جو محمد ﷺ لے کر آئے ہیں۔ سورہ احزاب میں بھی ان پانچ انبیاء کا ذکر ایک آیت میں آیا ہے۔ دیکھیے سورہ احزاب (۷)۔

﴿۴﴾ أَنْ أَقْبِلُوا إِلَيْهِ: یعنی اللہ تعالیٰ نے ان تمام پیغمبروں کو حکم دیا کہ دین قائم کرو۔ دین قائم کرنے میں خود اس پر عمل کرنا

بھی شامل ہے، اس کی دعوت و تبلیغ بھی اور عملاً اسے نافذ کرنا بھی۔ دعوت کے ساتھ ساتھ حسب استطاعت کفار سے جنگ کا بھی حکم دیا، اس وقت تک کہ وہ کلمہ پڑھیں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ سورہ توبہ میں مشرکین کے متعلق حکم دیا کہ انھیں چار ماہ تک مکہ میں آنے جانے کی اجازت ہے، فرمایا: ﴿فَإِذَا انسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ وَخُذُواهُمْ وَاحْضَرُوهُمْ وَأَقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصِدٍ، فَإِن تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ [التوبة: ۵] ”بیں جب حرمت والے مہینے نکل جائیں تو ان مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کرو اور انھیں پکڑو اور انھیں گھیرو اور ان کے لیے ہر گھات کی جگہ بیٹھو، پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو ان کا راستہ چھوڑ دو۔ بے شک اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے۔“ ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿أَمَرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتَّى يَشْهَدُوا أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنْ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ، وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ، وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ، فَإِذَا فَعَلُوا ذَلِكَ غَضَمُوا مِنِّي دِمَاءَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ إِلَّا بِحَقِّ الْإِسْلَامِ، وَجَسَائِهِمْ عَلَى اللَّهِ﴾ [بخاری، الإيمان، باب: ﴿فان تابوا واقاموا الصلاة...﴾ : ۲۵] ”مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے لڑوں، یہاں تک کہ وہ شہادت دیں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں، تو جب وہ ایسا کریں تو انھوں نے مجھ سے اپنے خون اور اموال محفوظ کر لیے، مگر اسلام کے حق کے ساتھ اور ان کا حساب اللہ پر ہے۔“

اہل کتاب میں سے جو لوگ دین حق قبول نہیں کرتے ان سے جزیہ وصول کرنے تک لڑتے رہنے کا حکم دیا، فرمایا: ﴿كَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ﴾ [التوبة: ۲۹] ”لڑو ان لوگوں سے جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ یوم آخر پر اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کی ہیں اور نہ دین حق کو اختیار کرتے ہیں، ان لوگوں میں سے جنھیں کتاب دی گئی ہے، یہاں تک کہ وہ ہاتھ سے جزیہ دیں اور وہ حقیر ہوں۔“ ظاہر ہے دین کا قیام اور اس پر پوری طرح عمل اسی وقت ہو سکتا ہے جب وہ دوسرے تمام ادیان پر غالب ہو، جیسا کہ فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَكَفَى بِاللَّهِ تَعَالَى﴾ [الفتح: ۲۸] ”وہی ہے جس نے اپنا رسول ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا، تاکہ اسے ہر دین پر غالب کر دے اور اللہ گواہ کے طور پر کافی ہے۔“

دین اسلام میں نماز پڑھنا اور اپنی زکوٰۃ دے دینا کافی نہیں، اللہ کی زمین پر اس کا نظام قائم کرنا بھی ضروری ہے کہ ہر شخص مسجد میں آکر نماز پڑھے اور زکوٰۃ ادا کرے، فرمایا: ﴿وَلِيُخْضِرَنَّ اللَّهُ مَن يَنْصُرُهُ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ۝ الَّذِينَ إِن مَنَكُم فِي الْأَرْضِ آقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَآمَنُوا بِالمُعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۚ وَ لِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ﴾ [الحج: ۴۰، ۴۱] ”اور یقیناً اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کرے گا، بے شک اللہ یقیناً بہت قوت والا، سب پر غالب ہے۔ وہ لوگ کہ اگر ہم انھیں زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور اچھے کام کا حکم دیں گے اور برے کام سے روکیں گے، اور تمام کاموں کا انجام اللہ ہی کے قبضہ میں ہے۔“ اسلام کا بہت بڑا حصہ وہ ہے جس پر عمل

اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب حکومت کی باگ ڈور ایمان والوں کے ہاتھ میں ہو، اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب نازل کرنے کا مقصد بیان فرمایا: ﴿إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ﴾ [النساء: ۱۰۵] ”بے شک ہم نے تیری طرف یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی، تاکہ تو لوگوں کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کرے جو اللہ نے تجھے دکھایا ہے۔“ ظاہر ہے لوگوں کے درمیان اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ تبھی ہو سکے گا جب اس کے مطابق فیصلہ کرنے والوں کی حکومت ہوگی، کفار کی سلطنت میں نماز کا وہ نظام جس میں ہر مسلم حتیٰ کہ منافقین بھی مسجد میں آکر نماز پڑھتے ہیں، خواہ سست کھڑے ہو کر پڑھیں یا دکھاوے کے لیے پڑھیں، قائم ہو ہی نہیں سکتا۔ (دیکھیے نساء: ۱۳۳) زکوٰۃ کی تحصیل (توبہ: ۱۰۳) اور اس کی اللہ کے حکم کے مطابق تقسیم (توبہ: ۶۰) مسلمانوں کی اپنی حکومت کے علاوہ ممکن نہیں۔ سود کو بند کرنے کا حکم اور سود خوری جاری رکھنے والوں کے خلاف اعلان جنگ اسی وقت عمل میں آ سکتا ہے کہ ملک کی حکومت اور معیشت ایمان والوں کے ہاتھ میں ہو۔ کتاب اللہ میں قتل اور جراحات کے قصاص کا حکم (بقرہ: ۱۷۸-۱۷۹) چوری پر ہاتھ کاٹنے کا حکم (مائدہ: ۳۸) اور زنا اور قذف پر حد جاری کرنے کا حکم (نور: ۳۳۲) مسلم حکام کو دیا گیا ہے، کفار کی عدالت اور ان کی پولیس کو نہیں دیا گیا اور نہ ہی وہ کبھی اسے نافذ کریں گے۔ اس کتاب میں مسلمانوں پر کفار سے قتال اس لیے فرض نہیں کیا گیا (بقرہ: ۱۹۰، ۲۱۶) کہ وہ کفار کی حکومت میں رہ کر ان کی فوج میں بھرتی ہو کر کفر کی خاطر لڑیں گے اور کفار سے جزیہ لینے کا حکم (توبہ: ۲۹) اس مفروضے کے ساتھ نہیں دیا گیا کہ مسلمان کفار کے محکوم رہ کر ان سے جزیہ وصول کریں گے۔ اسلامی احکام کا یہ نقشہ صرف مدینہ میں جا کر ہی پیش نہیں ہوا، کئی سورتوں میں بھی یہی بات سمجھائی گئی ہے۔ دیکھیے سورۃ بنی اسرائیل (۸۱، ۸۰)، قصص (۸۵)، روم (۷۱)، صافات (۱۷۳ تا ۱۷۷)، ص (۱۱)، قمر (۳۳ تا ۳۵) اور سورۃ مزمل (۲۰)۔

رسول اللہ ﷺ کی زندگی اقامت دین کا بہترین نمونہ ہے۔ آپ ﷺ نے دین قائم کرنے کے لیے دعوت و تبلیغ اور تلوار دونوں سے پورے عرب کو حلقہ بگوش اسلام کیا اور ایسی حکومت قائم کر دی جو اللہ تعالیٰ کے پورے دین پر عمل کی ضامن تھی۔ آپ ﷺ کے بعد خلفائے اسلام نے اس فریضہ کی تکمیل کی، حتیٰ کہ اللہ کا دین زمین کے مشرق و مغرب میں قائم ہو گیا۔ پھر مسلمان اپنی نااہلی اور کتاب اللہ کے تقاضوں کو نہ سمجھنے یا جان بوجھ کر اسے پس پشت پھینک کر جہاد ترک کر دینے کے نتیجے میں کفار کے محکوم ہو گئے۔ اب ان میں سے کسی کے ہاتھ میں اسلام کی دو چار چیزیں ہیں اور کسی کے ہاتھ میں پانچ دس یا کم و بیش۔ ان کی باقی ساری زندگی کفر کے نظام کی پابند ہے اور افسوس یہ کہ وہ اس پر قانع ہیں اور کفر کے نظام کے پرزے بن چکے ہیں اور ان کے بہت سے لوگ دین اسلام کے غلبے سے مایوس ہو کر جمہوریت اور کفر کے دوسرے نظاموں کو توڑنے کی کوشش کے بجائے انھیں اسلام ثابت کرنے کی جدوجہد میں لگ گئے ہیں۔ ہاں! رسول اللہ ﷺ کی بشارت کے مطابق ایک مجاہدین کی جماعت ”طائفہ منصورہ“ باقی ہے اور ہمیشہ رہے گی، جو کبھی کفر کی بالادستی قبول نہیں کرے گی اور دین کے غلبے کے لیے زبانی کلامی فلسفوں کے بجائے دعوت کے ساتھ ساتھ قتال کا فریضہ بھی سرانجام دیتی رہے گی اور ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی نصرت سے بہرہ یاب رہے گی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اس مبارک طائفہ میں شامل فرمادے۔ (آمین)

﴿ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ ﴾ : دین میں جدا جدا ہونے کی کئی صورتیں ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ اہل کتاب کی طرح بعض باتوں میں کتاب اللہ پر عمل کیا جائے اور بعض میں کتاب اللہ کے بجائے اپنی مرضی پر عمل کیا جائے، جیسا کہ اہل کتاب کے متعلق فرمایا: ﴿ أَقْتُوهُمْ نُونًا بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَحْفُزُونَ بِبَعْضٍ ﴾ [البقرة : ۸۵] ”پھر کیا تم کتاب کے بعض پر ایمان لاتے ہو اور بعض کے ساتھ کفر کرتے ہو؟“ ایک صورت یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے جو بات ثابت نہیں اسے دین بنا لیا جائے۔ اسے بدعت کہتے ہیں۔ سنت ہمیشہ ایک ہوگی، کیونکہ جس کی سنت ہے وہ ایک ہے، جبکہ بدعات کا شمار نہیں ہوگا، کیونکہ انہیں ایجاد کرنے والوں کا شمار نہیں ہو سکتا۔ پھر جب آدمی اصل سنت سے بہکتا ہے تو ایک بدعت پر نہیں رہتا بلکہ بدعات اس کے رگ و ریشہ میں سرایت کر جاتی ہیں اور اس کے ساتھ ہی وہ اپنا الگ فرقہ بنا لیتا ہے۔ اسے معلوم ہو بھی جائے کہ اس کی یا اس کے فرقے یا پیشوا کی فلاں بات کتاب اللہ یا حدیث رسول ﷺ کے خلاف ہے پھر بھی وہ اپنے دھڑے کی غلط بات پر اڑا رہے گا، حق کی طرف رجوع نہیں کرے گا اور اپنی یا اپنے امام کی بات کو کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کے تابع کرنے کے بجائے آیات و احادیث کے معانی میں تحریف کر کے انہیں اپنے مطابق ثابت کرے گا۔ نام اس کا تاویل رکھے گا اور کہے گا کہ بروہ آیت یا حدیث جو ہمارے فرقے کے بزرگوں کے خلاف ہے اس کی تاویل ہوگی یا وہ منسوخ ہے۔ حالانکہ وہ آیت یا حدیث اس کے بزرگوں کے خلاف نہیں، کیونکہ وہ تو ان بزرگوں سے بہت پہلے نازل ہو چکی ہیں، بلکہ اس کے بزرگوں کی بات آیت یا حدیث کے خلاف ہے کہ انہیں اس کا علم نہیں ہو سکا، یا ان کے ذہن میں نہیں رہی۔ معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ ہم میں کھڑے ہوئے اور فرمایا: ﴿ أَلَا يَأْنِي مَن قَبْلَكُمْ مَن أَهْلَ الْكِتَابِ افْتَرَقُوا عَلَى ثِنْتَيْنِ وَسَبْعِينَ مَلَّةً وَإِنَّ هَذِهِ الْمَلَّةَ سَنَفْتَرِقُ عَلَى ثَلَاثٍ وَسَبْعِينَ، نِثْنَانِ وَ سَبْعُونَ فِي النَّارِ وَ وَاحِدَةً فِي الْجَنَّةِ وَ هِيَ الْجَمَاعَةُ، وَإِنَّهُ سَيَخْرُجُ مِن أُمَّتِي أَقْوَامٌ تَجَازَى بِهِمْ تِلْكَ الْأَهْوَاءُ كَمَا يَتَجَازَى الْكَلْبُ لِصَاحِبِهِ لَا يَبْقَى مِنْهُ عِرْقٌ وَلَا مَفْصِلٌ إِلَّا دَخَلَهُ ﴾ [ابوداؤد، النسہ، باب شرح السنہ : ۴۵۹۷] ”سنو! تم سے پہلے اہل کتاب کے لوگ بہتر (۷۳) ملتوں میں جدا جدا ہو گئے اور یہ ملت تہتر (۷۳) ملتوں میں جدا جدا ہو جائے گی، بہتر (۷۳) آگ میں اور ایک جنت میں ہوگی اور وہی ”الجماعۃ“ ہے اور حقیقت یہ ہے کہ میری امت میں کئی اقوام نکلیں گی جن میں یہ خواہشات (بدعات) اس طرح سرایت کر جائیں گی جیسے کتے کے ہکاؤ کی بیماری اس کے مریض میں سرایت کر جاتی ہے، نہ اس کی کوئی رگ باقی رہتی ہے اور نہ کوئی جوڑ گروہ اس میں داخل ہو جاتی ہے۔“ مزید دیکھیے سورۃ النعام کی آیت (۱۵۹): ﴿ إِنَّ الَّذِينَ فَزَقُوا دِينَهُمْ وَ كَانُوا شَيْعًا ﴾ کی تفسیر۔

﴿ كَبُرَ عَلَى النَّاسِ كَيْفَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ ﴾ : وہ بات جس کی دعوت آپ مشرکین کو دیتے ہیں وہ ان پر بہت بھاری ہے، مراد اس سے ایک اللہ کی عبادت کی دعوت ہے۔ کفار پر یہ دعوت اس قدر بھاری ہے کہ اس کا ماننا تو درکنار وہ اس کا سنا بھی برداشت نہیں کرتے فرمایا: ﴿ وَإِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَحْدَهُ اشْمَأَزَّتْ قُلُوبُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ ۖ وَإِذَا ذُكِرَ الَّذِينَ مِنْ

دُونَهُ إِذَا هُمْ يَنْتَبِرُونَ ﴿ [الزمر : ۴۵] ” اور جب اس اکیلے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان لوگوں کے دل تنگ پڑ جاتے ہیں جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے اور جب ان کا ذکر ہوتا ہے جو اس کے سوا ہیں تو اچانک وہ بہت خوش ہو جاتے ہیں۔“ وہ اس مجلس سے اٹھ جاتے ہیں جس میں ایک معبود کی بات ہو، فرمایا: ﴿ اَجْعَلِ الْاِلٰهَةَ الْغَاوِجِدًا ۚ اِنَّ هَذَا الشَّقِيۡءَ ۙ مُجَلَّبٌ ۙ وَاَنْطَلِقَ الْاَمْلَاۗءُ مِنْهُمْ اَنْ اَمْشُوْا وَاَصْبِرُوْا عَلٰی الْاِهْتِكُمْ ۙ اِنَّ هَذَا الشَّقِيۡءَ ۙ يُرٰدُ ﴿ [ص : ۶، ۵] ” کیا اس نے تمام معبودوں کو ایک ہی معبود بنا ڈالا؟ بلاشبہ یہ یقیناً بہت عجیب بات ہے۔ اور ان کے سر کردہ لوگ چل کھڑے ہوئے کہ چلو اور اپنے معبودوں پر ڈٹے رہو، یقیناً یہ تو ایسی بات ہے جس کا ارادہ کیا جاتا ہے۔“ مزید تفصیل کے لیے مذکورہ بالا آیات کی تفسیر پر بھی نظر ڈال لیں۔

⑦ اللّٰهُ يَجِيۡبُ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ : ” يَجِيۡبُ“ ”جَبْنِيْ يَجِيۡبِيْ جِبَابَةً“ (ض) سے باب افتعال ہے، جس کا معنی ”کھینچ کر لے جانا“ ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اَوْلَمْ لِمُنۡكِنۡ لَهُمْ حَرَمًا اَمِنًا يُجۡبٰى اِلَيْهِ ثَمَرَتُ كُلِّ شَیۡءٍ ﴿ [القصص : ۵۷] ” اور کیا ہم نے انہیں ایک با امن حرم میں جگہ نہیں دی؟ جس کی طرف ہر چیز کے پھل کھینچ کر لائے جاتے ہیں۔“ باب افتعال کی وجہ سے معنی میں اضافہ ہو گیا، یعنی مشرکین پر یہ دعوت جتنی بھی بھاری ہو وہ یہ نہ سمجھیں کہ وہ اسے پھیلنے اور غالب آنے سے روک سکیں گے۔ نہیں، ایسا نہیں ہوگا، مشرکین کی ناگواری کے باوجود یہ دین حق تمام دینوں پر غالب آ کر رہے گا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ هُوَ الَّذِيۡۤ اَزۡسَلۡ رَسُوۡلُهٗۙ بِالۡهُدٰى وَاِلٰى دِيۡنِ الْحَقِّ لِيُظۡهِرَہٗۙ عَلٰی الدِّيۡنِ كُلِّہٖۙ وَاَلُوۡكُوۡرَةَ الشُّرۡكُوۡنِ ﴿ [التوبة : ۳۳] ” وہی ہے جس نے اپنا رسول ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا، تاکہ اسے ہر دین پر غالب کر دے، خواہ مشرک لوگ برا جانیں۔“ یہی لوگ جن پر ایک اللہ کی طرف دعوت بھاری گزر رہی ہے ان میں سے اور ان کی اولادوں میں سے اللہ جسے چاہے گا جن لے گا اور اپنی طرف کھینچ کر لے جائے گا۔ اور واقعی ایسا ہی ہوا، ابو جہل کا بیٹا عکرمہ اور بھائی حارث بن ہشام مسلمان ہو گئے، ابوسفیان خود اور اس کے بیٹے مسلمان ہو گئے، ولید کا بیٹا خالد مسلمان ہو گیا۔ غرض جو ضد پراڑ گئے ان کا اللہ تعالیٰ نے صفایا کر دیا اور جن کی طبیعت میں ضد اور عناد کے بجائے اتابت اور حق کی طرف رجوع تھا وہ اللہ تعالیٰ کی خاص توفیق سے حلقہ بخش اسلام ہو گئے اور رسول اللہ ﷺ کی زندگی ہی میں پورے جزیرہ عرب سے شرک اور مشرکین کا خاتمہ ہو گیا۔

⑧ وَاِلٰى يَہۡدٰىۤ اِلَيْهِ مَنۡ يَّشَآءُ : اس میں اللہ تعالیٰ کے ہدایت دینے کا قانون بیان ہوا ہے کہ وہ اندھے کی لائچی کی طرح نہیں، بلکہ وہ انھی کو ہدایت دیتا ہے جن میں قبول حق کی استعداد اور خواہش ہوتی ہے اور اس بات کا علم بھی اسی کو ہے کہ اتابت کس میں موجود ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اِنَّكَ لَا تَهۡدٰىۤ اِلٰى مَنۡ اَخۡبَتَ وَاَلۡكِنَ اللّٰهُ يَهۡدٰىۤ اِلٰى مَنۡ يَّشَآءُ ۗ وَهُوَ اَعۡلَمُ بِالۡمُهۡتَدِيۡنَ ﴿ [القصص : ۵۶] ” بے شک تو ہدایت نہیں دیتا جسے تو دوست رکھے اور لیکن اللہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور وہ ہدایت پانے والوں کو زیادہ جاننے والا ہے۔“

وَمَا تَفْرَقُوا إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَيْنَهُمْ ۚ وَلَوْ لَا كَلِمَةُ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى لَفُضِيَ بَيْنَهُمْ ۚ وَإِنَّ الَّذِينَ أُورِثُوا الْكُتُبَ مِنْ بَعْدِهِمْ لَفِي شَكٍّ مِنْهُ مُرِيبٌ ﴿۱۴﴾

اور وہ جدا جدا نہیں ہوئے مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس علم آ گیا، آپس کی ضد کی وجہ سے اور اگر وہ بات نہ ہوتی جو تیرے رب کی طرف سے ایک مقرر وقت تک پہلے طے ہو چکی تو ضرور ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا اور بے شک وہ لوگ جو ان کے بعد اس کتاب کے وارث بنائے گئے وہ اس کے متعلق یقیناً ایسے شک میں مبتلا ہیں جو بے چین رکھنے والا ہے ﴿۱۴﴾

آیت 14 ﴿۱﴾ وَمَا تَفْرَقُوا إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ : یعنی ان کے فرقوں میں بٹ جانے کا باعث یہ نہیں تھا کہ انھیں اللہ اور اس کے رسول کے احکام کا علم نہیں تھا اور لاعلمی کی وجہ سے انھوں نے اپنے اپنے الگ مذاہب اور مکاتب فکر بنا لیے، بلکہ یہ تفرقہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے علم آ جانے کے بعد پیدا ہوا۔

﴿۲﴾ بَيْنَهُمْ : یعنی الگ الگ گروہ اور فرقے بنانے کا باعث ان کا باہمی حسد، ضد اور عناد تھا، جس کی وجہ سے اللہ کے حکم کے سامنے سر جھکانے کے بجائے انھوں نے اپنے اپنے قیاس و آراء کی بنیاد پر الگ الگ فرقے بنائے اور کتاب اللہ میں تحریف تک سے گریز نہ کیا، حتیٰ کہ نوبت باہمی اختلاف سے بڑھ کر ایک دوسرے کی مخالفت اور پھر جنگ و جدل تک پہنچ گئی۔ مزید دیکھیے سورہ بقرہ (۲۱۳) کی تفسیر۔

﴿۳﴾ وَلَوْ لَا كَلِمَةُ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ حم سجدہ (۴۵) کی تفسیر۔

﴿۴﴾ وَإِنَّ الَّذِينَ أُورِثُوا الْكُتُبَ مِنْ بَعْدِهِمْ : یعنی شروع میں فرقے بنانے والوں نے علم ہونے کے باوجود حق سے انحراف کیا اور اللہ کی کتاب میں ایسی لفظی و معنوی تحریضیں کیں کہ بعد میں آنے والے لوگ، جو اس کتاب کے وارث بننے کے قابل تو نہ تھے مگر انھیں اس کا وارث بنا دیا گیا، وہ اس کتاب میں کی گئی لفظی اور معنوی تحریفات کی وجہ سے اس کی حقانیت کے متعلق ایسے شک میں مبتلا ہو گئے جو انھیں شدید مضطرب اور بے چین رکھتا تھا۔ انھیں اپنی کتابوں کے الہامی ہونے کا یقین باقی نہ رہا، بلکہ وہ کسی دلیل و برہان کے بغیر محض آنکھیں بند کر کے آبا و اکاہ برکی تقلید کرتے چلے گئے۔

﴿۵﴾ مفسر عبدالرحمن کیلانی لکھتے ہیں: ”ان وارثوں کے اپنی الہامی کتابوں کے بارے میں شک میں پڑنے کی کئی وجوہ تھیں، جن میں سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کتابوں کی اصل زبان اور اصل عبارت کو محفوظ رکھ کر آنے والی نسلوں تک نہ پہنچایا گیا، صرف تراجم سے کام لیا جانے لگا اور ان تراجم کو ہی الہامی کتاب سمجھا جانے لگا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ بزرگوں کے اقوال اور الحاقی مضامین ان میں شامل کر دیے گئے، حتیٰ کہ ان دونوں قسم کی عبارتوں میں تمیز کرنا مشکل ہو گیا اور تیسری وجہ یہ تھی کہ ان کی

فَلِذَلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ ۚ وَقُلْ أَمَدْتُ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنْ كِتَابٍ ۚ وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ إِنَّا أَعْمَلْنَا وَلكُمْ أَعْمَالِكُمْ ۚ

سو تو اسی کی طرف پھر دعوت دے اور مضبوطی سے قائم رہ، جیسے تجھے حکم دیا گیا ہے اور ان کی خواہشوں کی پیروی مت کر اور کہہ دے کہ اللہ نے جو بھی کتاب نازل فرمائی میں اس پر ایمان لایا اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان انصاف کروں۔ اللہ ہی ہمارا رب اور تمہارا رب ہے، ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لیے

تاریخی سند بھی ضائع کر دی گئی (بلکہ سند رکھی ہی نہیں گئی)۔ ان سب باتوں کا اثر یہ ہوا کہ بعد میں آنے والے علماء خود اس کتاب سے شک میں پڑ گئے کہ کون سا حصہ درست اور الہامی ہے اور کون سی عبارت بزرگوں کے اقوال وغیرہ ہیں اور کسی بات کا صحیح فیصلہ کرنے میں یہی شک و شبہ انہیں اضطراب میں ڈالے رکھتا تھا۔“ (تیسیر القرآن)

آیت 15 ① **فَلِذَلِكَ فَادْعُ** : مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا: ”یہ آیت کریمہ دس جملوں پر مشتمل ہے، جن میں سے ہر جملہ اپنی جگہ مستقل مضمون ہے۔ آیت الکرسی کے سوا کوئی اور آیت ایسی نہیں۔“ (ابن کثیر) ”فَلِذَلِكَ“ جار مجرور ”فَادْعُ“ کے متعلق ہے، پہلے لانے سے اس میں اختصاص پیدا ہو گیا، یعنی لوگوں کو کسی اور نہیں بلکہ دین کے اسی طریقے کی دعوت دیں جو اس نے وحی کے ذریعے سے تمام انبیاء کے لیے مقرر فرمایا ہے اور وہ ہے ایک اللہ کی عبادت۔ اس کے دین کو قائم کرنا اور اس میں جدا جدا نہ ہو جانا، بلکہ اکٹھے ہو کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لینا۔

② **وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ** : دوسروں کو دعوت کے لیے خود اس پر عمل اور استقامت ضروری ہے، اس لیے اس پر مضبوطی سے قائم رہنے کا حکم دیا۔ ”وَاسْتَقِمْ“ اور ”كَمَا أُمِرْتَ“ کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ ہود (۱۱۲)۔

③ **وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ** : یعنی آپ اس کی پیروی کریں جس کا اللہ کی طرف سے آپ کو حکم دیا گیا ہے، اس کے سوا جو کچھ ہے محض خواہشات ہیں۔ اس لیے ان لوگوں کو خوش کرنے کے لیے یا ان سے صلح کی خاطر ان کی خواہشات کی پیروی مت کریں اور نہ دین میں کسی قسم کی مدافعت سے کام لیں۔ مزید دیکھیے سورہ بقرہ (۱۳۵) اور سورہ مائدہ (۴۹)۔

④ **وَقُلْ أَمَدْتُ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنْ كِتَابٍ** : اہل کتاب چونکہ کسی آسمانی کتاب کو مانتے اور کسی کو نہیں مانتے تھے، اسی طرح اپنی کتاب کے بھی بعض حصوں کو مانتے تھے اور بعض کو نہیں مانتے تھے۔ (دیکھیے بقرہ: ۸۵) حالانکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی ہر کتاب اور اس کی ہر بات پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اس لیے فرمایا، ان سے کہہ دیں کہ میں فرقہ پرستوں کی طرح نہیں جو مرضی کی بات مانتے ہیں دوسری نہیں، بلکہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ ہر کتاب پر ایمان رکھتا ہوں، وہ خواہ کوئی ہو۔ میں پہلے انبیاء کی تکذیب کے لیے نہیں بلکہ ان کی تصدیق کے لیے آیا ہوں۔ تم پر بھی لازم ہے کہ تمہاری کتابوں میں میری اور قرآن کی جو تصدیق موجود ہے اس پر بھی ایمان لاؤ، تاکہ تمہارا ایمان بھی اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ ہر کتاب پر ہو۔

لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ - اللَّهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۖ وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ ﴿۱۵﴾

تمہارے اعمال۔ ہمارے درمیان اور تمہارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں، اللہ ہمیں آپس میں جمع کرے گا اور اسی کی طرف لوٹ کر جاتا ہے ﴿۱۵﴾

مزید دیکھیے سورہ بقرہ کی آیت (۱۳۶): ﴿لَا نَفْزِي بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ﴾ کی تفسیر۔

﴿۱۵﴾ وَأَمِزْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمْ: عدل کا معنی انصاف اور برابری ہے، اس کے مقابلے میں ظلم ہے۔ یعنی مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمہارے درمیان عدل کروں، تمام لوگوں کو انصاف مہیا کروں، دنیا میں جو ظلم و زیادتی ہو رہی ہے اس کا خاتمہ کروں اور فیصلہ کرتے ہوئے اپنے پرانے میں فرق نہ کروں، بلکہ سب کو برابر رکھوں۔ اسی طرح چھوٹے و بڑے، کمزور و طاقتور اور امیر و غریب کے درمیان فرق نہ کروں۔ اس جملے میں اس غلبہ و اقتدار کی طرف بھی اشارہ ہے جو مدینہ جا کر حاصل ہونے والا تھا، کیونکہ بے اختیار شخص کیا عدل کرے گا اور اس کے پاس عدل طلب کرنے کے لیے کون جائے گا۔

﴿۱۶﴾ اللَّهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ: تمام بندوں میں عدل کا حکم اس لیے ہے کہ اللہ ہی ہمارا رب ہے اور وہی تمہارا رب ہے، ہم تم سب اس کے بندے ہیں۔ سو عدل کا حکم بھی سب کے لیے ہے، خواہ اپنا ہو یا پرانا، ضعیف ہو یا شریف، حکمران ہو یا رعایا۔

﴿۱۷﴾ نَأْتِ أَعْمَالُنَا وَأَعْمَالَكُمْ: اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک اظہارِ براءت، جیسے فرمایا: ﴿لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ﴾ [الکافرون: ۶] ”تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین ہے۔“ اور جیسا کہ سورہ انعام (۱۳۵)، ہود (۹۳، ۱۲۱) اور سورہ زمر (۳۹) میں اظہارِ براءت فرمایا ہے۔ دوسرا مطلب یہ کہ ہمارے اچھے یا برے اعمال تمہارے لیے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لیے ہیں، نہ ہمارے اچھے اعمال تمہیں دیے جائیں گے اور نہ تمہارے اچھے اعمال ہمیں دیے جائیں گے۔ اسی طرح نہ تم ہمارے بد اعمال میں کچڑے جاؤ گے اور نہ ہم تمہارے بد اعمال میں کچڑے جائیں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَأَلْمَأْ عَلَيْهِ مَا خَبِلَ وَعَلَيْكُمْ مَا خَبِلْتُمْ﴾ [النور: ۵۴] ”تو اس کے ذمے صرف وہ ہے جو اس پر بوجھ ڈالا گیا ہے اور تمہارے ذمے وہ جو تم پر بوجھ ڈالا گیا۔“ مزید دیکھیے سورہ بقرہ (۱۳۹)، یونس (۴۱)، ہود (۳۵) اور قصص (۵۵)۔

﴿۱۸﴾ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ: یعنی جھگڑا کرنے کی ضرورت نہیں، جو بات حق تھی وہ ہم نے دلائل کے ساتھ واضح کر دی، ہمیں تمہارے باطل پر اور اپنے حق پر ہونے کا پورا یقین ہے۔ تم اپنی بات پر اڑے ہوئے ہو، اس لیے جھگڑے کا کوئی فائدہ نہیں، تم جھگڑو بھی تو ہم جھگڑنے کے لیے تیار نہیں، اب تلوار کے ساتھ فیصلہ باقی رہ جاتا ہے، وہ اپنے وقت پر ہو جائے گا۔

﴿۱۹﴾ اللَّهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا: باطل پر جسے رہتے اور اس پر ناحق جھگڑا کرنے سے ڈراتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمہیں جمع کرے گا، کیا تمہیں اس بات سے خوف نہیں آتا کہ ناحق جھگڑے کا وہاں کیا جواب دو گے؟

﴿۲۰﴾ وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ: اسی کی طرف سب کو لوٹ کر جانا ہے، وہاں پورا انصاف ہو جائے گا۔

وَالَّذِينَ يُحَاجُّونَ فِي اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا اسْتَجِيبَ لَهُ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةً عِنْدَ رَبِّهِمْ
وَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ وَ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ﴿۱۶﴾

اور جو لوگ اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں، اس کے بعد کہ اس کی دعوت قبول کر لی گئی، ان کی دلیل ان کے رب کے نزدیک باطل ہے اور ان پر بڑا غضب ہے اور ان کے لیے بہت سخت سزا ہے ﴿۱۶﴾

آیت 16 ﴿۱﴾ وَالَّذِينَ يُحَاجُّونَ فِي اللَّهِ مِنْ بَعْدِ: "دَاحِضَةً" "دَحَضَ يَدْحِضُ دَحْضًا وَ دُحُوضًا" (ف) "دَحَضَتِ الْحُجَّةُ" دلیل باطل ہونا اور "دَحَضَتِ الرَّجُلُ" پاؤں کا پھسل جانا۔ "حُجَّةٌ" کا معنی جھگڑا بھی ہے اور دلیل بھی۔ پچھلی آیت میں فرمایا: ﴿لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ﴾ کہ "ہمارے درمیان اور تمہارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں" کیونکہ جو بات حق تھی وہ ہم نے تمہیں پہنچا دی، اب جھگڑے کا کوئی فائدہ نہیں، اس آیت میں فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کی بات قبول کر لی گئی، اس کا حق ہونا واضح ہو گیا، حتیٰ کہ بہت سے سمجھ دار لوگ اسے قبول کر چکے اور بہت سے دل میں تسلیم کر چکے ہیں تو لوگ اب بھی اللہ تعالیٰ کے بارے میں خواہ مخواہ جھگڑ رہے ہیں اور اپنے خیال میں بڑی مضبوط دلیلیں لا رہے ہیں، کبھی اس کی توحید میں بحث کرتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿اجْعَلِ الْاِلَهَةَ الْاِلٰهًا وَّاحِدًا﴾ [ص: ۱۰] "کیا اس نے تمام معبودوں کو ایک ہی معبود بنا ڈالا؟" کبھی اس کی دوبارہ زندہ کرنے کی قدرت کے بارے میں جھگڑتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿فَن يُنْفِخِ الْعِظَامَ وَ هِيَ رَیْبٌ﴾ [یس: ۷۸] "کون ہڈیوں کو زندہ کرے گا، جب کہ وہ بوسیدہ ہوں گی؟" کبھی اس کے انسان کو رسول بنا کر بھیجنے کے بارے میں جھگڑتے ہیں، فرمایا: ﴿وَ قَالُوا مَا لِ هَذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَ يَنْسِي فِي الْاَسْوَابِ﴾ [الفرقان: ۷] "اور انہوں نے کہا اس رسول کو کیا ہے کہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔" کبھی اس کے شرکاء بنانے کے جواز میں اپنے معبودوں کو اللہ کے ہاں سفارشی اور اس کے قریب کرنے والے قرار دیتے ہیں، فرمایا: ﴿هُوَ لَا يَشْفَعَا وْنَا عِنْدَ اللّٰهِ﴾ [یونس: ۱۸] "یہ لوگ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔" اور فرمایا: ﴿مَا نَعْبُدُ هُمْ اِلَّا لِيَقْرَبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰی﴾ [الزمر: ۳] "ہم ان کی عبادت نہیں کرتے مگر اس لیے کہ یہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں۔" ان کی مزعومہ یہ اور اس جیسی سب دلیلیں اللہ تعالیٰ کے ہاں باطل اور بے کار ہیں، انہیں اس جھگڑے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

﴿۲﴾ وَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ: "غَضَبٌ" پر توین تعظیم کی ہے، یعنی ان پر بھاری غضب ہے۔

﴿۳﴾ وَ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ: جس کا دنیا میں مظاہرہ الہی مکہ پر مسلط خوف، قحط، جنگ بدر اور دوسرے معرکوں میں ہوا اور جس کی شدت قیامت کے دن نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ ﷺ سے نقل فرمائی، آپ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّ أَهْلَ النَّارِ عَذَابًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ لَرَجُلٌ تُوَضَعُ فِيهِ أَحْمَصُ قَدَمَيْهِ جَمْرَةٌ يَغْلِي مِنْهَا دِمَاعُهُ» [بخاری، الرقاق، باب صفة الجنة والنار: ۶۵۶۱] "قیامت کے دن آگ والوں میں سب سے ہلکے عذاب والا شخص وہ ہوگا جس کے دونوں پاؤں کے تلووں میں ایک انگارا رکھا جائے گا، جس سے اس کا دماغ کھول رہا ہوگا۔"

اللَّهُ الَّذِي أَنْزَلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ وَالْمِيزَانَ ۚ وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيبٌ ﴿۱۷﴾

اللہ وہ ہے جس نے حق کے ساتھ یہ کتاب نازل کی اور میزان بھی، اور تجھے کون سی چیز آگاہ کرتی ہے، شاید کہ قیامت قریب ہو ﴿۱۷﴾

آیت ۱۷ ﴿۱﴾ اللَّهُ الَّذِي أَنْزَلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ وَالْمِيزَانَ: ”الکتاب“ میں الف لام جنس کا ہو تو مراد تمام روحانی کتابیں ہیں اور اگر عہد کا ہو تو مراد یہ کتاب یعنی قرآن مجید ہے۔ یعنی کیا جانتے بھی ہو کہ جس اللہ کے بارے میں تم جھگڑ رہے ہو وہ کون ہے اور اس کی صفات اور اس کے احکام کیسے معلوم ہو سکتے ہیں؟ فرمایا اللہ وہی ہے جس نے یہ کتاب یعنی قرآن مجید حق کے ساتھ نازل فرمایا ہے، اس کی ہر بات حق ہے، اس میں باطل کی آمیزش ہو ہی نہیں سکتی، جیسا کہ فرمایا: ﴿لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ﴾ [حکم السحرة: ۴۲] ”اس کے پاس باطل نہ اس کے آگے سے آتا ہے اور نہ اس کے پیچھے سے۔“ اور اسی نے میزان اتارا ہے جس کے ساتھ لوگ اپنے تمام معاملات میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کر سکیں۔ ”المیزان“ سے مراد اکثر مفسرین نے عدل و انصاف لیا ہے، بعض نے اس سے مراد دین حق اور بعض نے جزا و سزا کا قانون لیا ہے۔ ان میں سے جو بھی مراد لیں بات ایک ہی ہے اور اس میزان سے مراد اللہ کے دین اور اس کی شریعت پر مشتمل یہ کتاب ہی ہے جو خالق و مخلوق کے درمیان معاملات اور مخلوق کے باہمی معاملات اور تمام تنازعات کے لیے میزان ہے، جو ہر بات ترازو کی طرح تول کر صحیح یا غلط اور حق یا باطل کا فیصلہ کر دیتی ہے۔ اوپر فرمایا تھا: ﴿وَأَمْزَنَ لِأَعْدَائِنَا فِيكُمْ﴾ [الشوریٰ: ۱۵] (اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان انصاف کروں) اور اس آیت میں بتا دیا کہ اس کتاب پاک کی صورت میں میزان آگئی ہے، جس کے ساتھ وہ عدل قائم کیا جائے گا۔ یہ کتاب دوسرے معاملات کی طرح پہلی کتابوں کے لیے بھی میزان اور ان کی نگران ہے کہ ان میں کون سی باتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور کون سی ملادی گئی ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيِّمًا عَلَيْهِ﴾ [المائدة: ۴۸] ”اور ہم نے تیری طرف یہ کتاب حق کے ساتھ بھیجی، اس حال میں کہ اس کی تصدیق کرنے والی ہے جو کتابوں میں سے اس سے پہلے ہے اور اس پر محافظ ہے۔“

﴿۲﴾ یہاں ایک سوال ہے کہ آیت میں ”الکتاب“ اور ”المیزان“ کے درمیان واؤ عطف ہے جو مغایرت کے لیے ہوتی ہے، جس سے ظاہر ہے کہ کتاب اور میزان الگ الگ چیزیں ہیں، اب اگر میزان سے مراد کتاب ہی ہو تو مغایرت ختم ہو جاتی ہے، اسی طرح اگر میزان سے مراد عدل و انصاف لیں تب بھی کتاب اور میزان کے درمیان مغایرت نہیں رہتی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی تمام کتابیں عین عدل و انصاف ہیں؟ جواب اس کا یہ ہے کہ ایک ہی چیز کا ذکر جب اس کی مختلف صفات کے ساتھ کیا جائے تو اس کا عطف خود اس پر ہو سکتا ہے، کیونکہ صفات کے تغیر کو ذوات کے تغیر کی طرح قرار دے لیا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں اس کی مثالوں میں سے ایک مثال یہ ہے: ﴿سَبِّحْ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى ۚ الَّذِي خَلَقَ فَسَوَّى ۚ وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَى ۚ﴾

يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِهَا وَالَّذِينَ آمَنُوا مُشْفِقُونَ مِنْهَا وَيَعْلَمُونَ أَنَّهَا
الْحَقُّ ۚ أَلَا إِنَّ الَّذِينَ يُبَارُونَ فِي السَّاعَةِ لَفِي ضَلَالٍ بَعِيدٍ ﴿۱۸﴾

اسے وہ لوگ جلدی مانگتے ہیں جو اس پر ایمان نہیں رکھتے اور وہ لوگ جو ایمان لائے، وہ اس سے ڈرنے والے ہیں اور جانتے ہیں کہ وہ حق ہے۔ سنو! بے شک وہ لوگ جو قیامت کے بارے میں شک کرتے ہیں یقیناً وہ بہت دور کی گمراہی میں ہیں ﴿۱۸﴾

وَالَّذِي أَخْرَجَ الْمَرْعَىٰ ﴿۱﴾ [الأعلى: ۱ تا ۴] ان آیات میں ”الَّذِي“ (وہ ذات) کو عطف کے ساتھ الگ الگ بیان کیا گیا ہے، حالانکہ وہ ایک ہی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہر جملے میں وہ الگ الگ صفت کے ساتھ مذکور ہے۔ کلام عرب میں سے اس کی مثال یہ شعر ہے۔

إِلَى الْمَلِكِ الْقَرْمِ وَابْنِ الْهَمَامِ وَ لَيْثِ الْكَنْبِيَةِ فِي الْمُزْدَحِمِ

[أضواء البيان]

﴿۱﴾ وَمَا يُذَرِّكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيبٌ: اور تجھے کیا چیز آگاہ کرتی ہے شاید کہ وہ قیامت بالکل نزدیک ہو اور جو سانس تم لے رہے ہو یہی آخری ہو، اس لیے اس فکر میں مت پڑو کہ وہ کب ہے، بلکہ یہ فکر کرو کہ تم نے اس کے لیے کیا تیاری کی ہے۔ انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ بادیہ والوں میں سے ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا: «يَا رَسُولَ اللَّهِ! مَتَى السَّاعَةُ قَائِمَةٌ؟ قَالَ وَبِئْنَاكَ وَمَا أَعْدَدْتُ لَهَا؟ قَالَ مَا أَعْدَدْتُ لَهَا إِلَّا أَنِّي أَحْبَبْتُ اللَّهَ وَرَسُولَهُ، قَالَ إِنَّكَ مَعَ مَنْ أَحْبَبْتِ، فَقُلْنَا وَنَحْنُ كَذَلِكَ؟ قَالَ نَعَمْ، فَفَرِحْنَا يَوْمَئِذٍ فَرَحًا شَدِيدًا، فَمَرَّ غُلَامٌ لِلْمَغِيرَةِ وَكَانَ مِنْ أَقْرَانِي فَقَالَ إِنَّ أَخْرَ هَذَا فَلَنْ يُدْرِكَهُ الْهَرَمُ حَتَّى تَقُومَ السَّاعَةُ» [بخاری، الأدب، باب ما جاء في قول الرجل وبيك: ۶۱۶۷] ”یا رسول اللہ! قیامت کب قائم ہونے والی ہے؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”افسوس تم پر! تم نے اس کے لیے تیاری کیا کی ہے؟“ اس نے کہا: ”میں نے اس کے لیے اس کے سوا کوئی تیاری نہیں کی کہ میں اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہوں۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”تم یقیناً اس کے ساتھ ہو گے جس سے تمہیں محبت ہوگی۔“ تو ہم نے کہا: ”اور ہمارے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوگا؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”ہاں!“ تو ہم اس دن بہت زیادہ خوش ہوئے۔ مغیرہ کا ایک غلام وہاں سے گزرا، وہ میرا ہم عمر تھا، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”اگر اس کی عمر دراز ہوئی تو اسے سخت بڑھاپا آنے سے پہلے پہلے قیامت قائم ہو جائے گی۔“ مراد اس وقت موجود لوگوں کی قیامت ہے۔ حدیث میں قابل توجہ بات یہ ہے کہ آپ ﷺ نے ہر آدمی کی موت کو اس کے لیے قیامت قرار دیا، کیونکہ اس کے ساتھ اس کے لیے عمل کی مہلت ختم ہو جاتی ہے۔

﴿۲﴾ یہاں ایک مشہور سوال ہے کہ ”السَّاعَةُ“ مَوْنُثٌ ہے، اس کی خبر ”قَرِيبٌ“ مذکر ہے، حالانکہ دونوں میں مطابقت ہونی چاہیے؟ جواب کے لیے دیکھیے سورہ اعراف کی آیت (۵۶): ﴿إِنَّ رَحْمَتَ اللَّهِ قَرِيبٌ مِنَ الْمُحْسِنِينَ﴾ کی تفسیر۔

آیت 18 ﴿يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِهَا: ”اسْتَعْجَلُ“ کا معنی ہے کسی چیز کے وقت سے پہلے اس کے لانے کا مطالبہ۔ رسول اللہ ﷺ قیامت سے اور اس کے قریب ہونے سے ڈراتے تو کفار اسے جلد از جلد لانے کا مطالبہ

اللَّهُ لَطِيفٌ بِعِبَادِهِ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ ، وَهُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيزُ ﴿۱۹﴾

اللہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے، رزق دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور وہی بہت قوت والا، سب پر غالب ہے ﴿۱۹﴾

کرتے۔ مقصد ان کا صرف قیامت کا انکار اور اس کا مذاق اڑانا ہوتا تھا کہ جب وہ ان کے مطالبے پر فوراً پنا نہیں ہوگی تو وہ اسے جھٹلائیں گے اور اس کا مذاق اڑائیں گے کہ اگر قیامت ہوتی تو ہمارے مطالبے پر آجاتی، حالانکہ وہ ان کی فرمائش پر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ وقت پر آئے گی جس کا اس کے سوا کسی کو علم نہیں۔ اس آیت میں ان کی اس جرأت کی وجہ بیان فرمائی کہ ان کے اس مطالبے کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ قیامت کے دن پر یقین نہیں رکھتے جس میں اعمال کی باز پرس ہوگی۔ اگر انہیں اس بات کا یقین ہوتا تو وہ کبھی اس کے لیے جلدی نہ مچاتے، بلکہ اس کی تیاری کی فکر کرتے۔

﴿۱۹﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا مُشْفِقُونَ مِنْهَا: یعنی منکرین قیامت کے برعکس جو لوگ اس پر یقین و ایمان رکھتے ہیں وہ ہر وقت اس بات سے سخت ڈرتے رہتے ہیں کہ کب موت آکر عمل کی مہلت ختم کر دے، پھر قیامت کبریٰ پانا ہونے پر حساب کے وقت ان کا کیا حال ہو۔ (دیکھیے انبیاء: ۳۹۔ نور: ۳۷۔ دہر: ۷) کیونکہ انہیں یقین ہے کہ وہ ہو کر رہنے والی ہے۔

﴿۲۰﴾ أَلَا إِنَّ الَّذِينَ يُمَارُونَ فِي السَّاعَةِ لَبِئْسَ بِعَبِيدٍ: ”يُمَارُونَ“ کا معنی ”شک کرتے ہیں“ بھی ہے اور ”جھگڑتے ہیں“ بھی۔ یعنی قیامت کا یقین ہو تو انسان اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اور حق واضح ہونے پر اسے قبول بھی کر لیتا ہے، مگر جسے اس کے آنے ہی میں شک ہو اور وہ اس کے متعلق جھگڑا کرتا رہتا ہو وہ ایمان لانے اور نیک اعمال اختیار کرنے کو بے کار سمجھے گا اور محاسبے کا خوف نہ ہونے کی وجہ سے ہر گناہ پر دلیر ہوگا اور بڑے سے بڑے ظلم سے بھی گریز نہیں کرے گا، ایسے لوگ راہِ حق سے بہت دور جا چکے ہیں، جہاں سے ان کی واپسی ممکن نہیں۔ ”صَلِّ بِعَبِيدٍ“ میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ سیدھے راستے سے اتنے دور جا چکے ہیں کہ ان کی آنکھیں قیامت کے دن ہی کھلیں گی، جب واپس پلٹنا ممکن نہیں ہوگا۔ دیکھیے سورہ سبأ (۵۱ تا ۵۳)۔

آیت 19: ﴿۱۹﴾ اللَّهُ لَطِيفٌ بِعِبَادِهِ: ”لَطِيفٌ“ ایسی چیز جو گرفت میں نہ آسکے۔ اللہ تعالیٰ کی صفت ”لطیف“ اس لحاظ سے ہے کہ وہ باریک سے باریک چیز کی خبر رکھنے والا ہے اور اس لحاظ سے بھی کہ اس کی تدبیر نہایت باریک ہوتی ہے جو نظر نہیں آتی۔ اس لحاظ سے اس کا معنی لطف و کرم کرنے والا بھی ہے کہ وہ ایسے باریک طریقے سے مہربانی فرماتا ہے کہ نظر ہی نہیں آتا کہ یہ کیسے ہوگئی۔ (مفردات) گویا ”لَطِيفٌ“ میں دو صفتیں جمع ہیں، ایک نہایت باریک بین اور دوسری نہایت مہربانی والا۔ ان کے ضمن میں کمال علم بھی ہے جس کے بغیر باریک بینی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بندوں پر لطیف ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس سے ان کی کوئی چھوٹی سے چھوٹی مادی یا روحانی ضرورت پوشیدہ نہیں اور وہ اپنی کمال مہربانی اور باریک طریقوں سے ایسے انتظام فرماتا ہے کہ ہر بندے کی بلکہ ہر مخلوق کی ضرورت جو اس کے حسبِ حال ہو، پوری ہو اور اسے خبر بھی نہ ہو کہ وہ کیسے پوری ہوگئی۔ بعض اہل علم نے فرمایا کہ ”بِعِبَادِهِ“ کا لفظ اگرچہ عام ہے مگر اس سے مراد یہاں اللہ کے مومن بندے ہیں اور بعض نے فرمایا کہ ”بِعِبَادِهِ“ میں مومن و کافر دونوں شامل ہیں، دنیا میں دونوں اس کے لطف عام سے فائدہ اٹھا رہے ہیں، البتہ آخرت میں اس کا لطف و کرم مومنوں کے لیے خاص ہوگا۔

مَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الْآخِرَةِ نَزِدْ لَهُ فِي حَرْثِهِ ، وَمَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا ، وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ نَصِيبٍ ⑤

جو کوئی آخرت کی کھیتی چاہتا ہے ہم اس کے لیے اس کی کھیتی میں اضافہ کریں گے اور جو کوئی دنیا کی کھیتی چاہتا ہے اسے ہم اس میں سے کچھ دے دیں گے اور آخرت میں اس کے لیے کوئی حصہ نہیں ⑤

② يَزْرَعُوْنَ مِنْ نَيْسَاءٍ : اسی لیے ان میں سے بے شمار لوگوں کو جھٹلانے اور مذاق اڑانے کے باوجود بھوکا نہیں مارتا، بلکہ ان کی تمام ضرورتیں اپنے لطف و کرم سے پوری کرتا ہے۔ مگر جسے چاہتا ہے اور جتنا چاہتا ہے رزق دیتا ہے اور جس کی روزی کا دفتر بند کرنا چاہتا ہے کر دیتا ہے۔ یہ بات یہاں ذکر کرنے کی مناسبت یہ ہے کہ اکثر لوگ رزق کے پیچھے رزاق کو بھول جاتے ہیں۔

③ وَ هُوَ الْقَوِيُّ : یعنی وہ جو کرنا چاہے، جسے جتنا رزق دینا چاہے اس کی پوری قوت رکھتا ہے، کسی کام میں کسی کا محتاج نہیں۔

④ الْعَزِيزُ : یعنی دوسرے تمام معاملات کی طرح رزق کے معاملے میں بھی کسی کا اس پر زور نہیں کہ وہ دینا چاہے تو کوئی اسے روک سکے، یا نہ دینا چاہے تو کوئی اس سے لے سکے۔ خبر ”الْقَوِيُّ الْعَزِيزُ“ پر الف لام سے قصر پیدا ہو گیا ہے، یعنی دونوں صفتیں صرف اس میں ہیں، کسی اور میں نہیں، جیسا کہ فرمایا: «اللَّهُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا أَعْطَيْتَ ، وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ» [بخاری، القدر، باب لا مانع لما أعطى الله : ۶۶۱۵] ”اے اللہ! تو جو دے اسے کوئی روکنے والا نہیں اور جو تو روک دے وہ کوئی دینے والا نہیں۔“

آیت 20 ① مَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الْآخِرَةِ : اللہ تعالیٰ نے دنیا کو آدمی کے لیے کھیت بنایا ہے، وہ اس میں جو بوئے گا وہی کاٹے گا اور جس چیز کا ارادہ کرے گا وہی ملے گی۔ اسی طرح اس نے دنیا کو تجارت کی جگہ بنایا ہے، اگر خیر کا سودا کرے گا تو نفع میں خیر ملے گی، اگر شر کا سودا کرے گا تو نتیجہ میں شر پائے گا۔ اسی طرح دنیا کو آخرت کا راستہ بنایا ہے، اگر خیر کے راستے پر چلے گا تو منزل مراد پالے گا اور ہمیشہ کی جنت میں پہنچ جائے گا، اگر شر کے راستے پر چلے گا تو ہمیشہ کے عذاب اور دائمی غم میں جا پڑے گا۔ اس تجارت کے نفع و نقصان کا کئی آیات میں ذکر فرمایا ہے، فرمایا: ﴿إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنْ لَهُمُ الْجَنَّةُ﴾ [التوبة : ۱۱۱] ”بے شک اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے اموال خرید لیے ہیں، اس کے بدلے کہ ان کے لیے جنت ہے۔“ اور فرمایا: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ﴾ [البقرة : ۲۰۷] ”اور لوگوں میں سے بعض وہ ہے جو اللہ کی رضا مندی تلاش کرنے کے لیے اپنی جان بیچ دیتا ہے۔“ اور فرمایا: ﴿أُولَئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ﴾ [البقرة : ۸۶] ”یہی لوگ ہیں جنہوں نے دنیا کی زندگی آخرت کے بدلے خریدی۔“

② پچھلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے رزق کا قانون بیان فرمایا کہ وہ سب کے لیے یکساں نہیں، وہ جسے چاہتا ہے اور جتنا چاہتا ہے دیتا ہے اور اس میں اس کی بے شمار حکمتیں ہیں۔ (دیکھیے زخرف : ۳۲) اس آیت میں فرمایا کہ آدمی کی کوشش اور نیت کے مختلف ہونے کے لحاظ سے بھی اسے ملنے والا رزق مختلف ہے۔

أَمْ لَهُمْ شُرَكَاؤُا شَرَعُوا لَهُمْ مِمَّا يَدْعُونَ بِهِ اللَّهُ دَوْلًا كَلِمَةُ الْفَصْلِ

لَقَضَىٰ بَيْنَهُمْ ۖ وَإِنَّ الظَّالِمِينَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۳۱﴾

یا ان کے لیے کچھ ایسے شریک ہیں جنہوں نے ان کے لیے دین کا وہ طریقہ مقرر کیا ہے جس کی اللہ نے اجازت نہیں دی اور اگر فیصلہ شدہ بات نہ ہوتی تو ضرور ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا اور بے شک ان ظالموں کے لیے دردناک عذاب ہے ﴿۳۱﴾

﴿۳۱﴾ آخرت کی کھیتی کا ارادہ رکھنے والے کے متعلق یہ نہیں فرمایا کہ اسے دنیا میں کچھ نہیں ملے گا۔ دنیا تو نیک ہو یا بد ہر ایک کو توڑی یا زیادہ ملنی ہی ملتی ہے، آخرت کے متعلق بشارت دی کہ ہم اس کے لیے اس کی کھیتی میں اضافہ کریں گے، کیونکہ اس کی نیت اور کوشش اسی کی ہے۔ اضافہ یہ ہے کہ دنیا میں اسے مزید نیکیوں کی توفیق دیں گے اور آخرت میں ایک نیکی کو دس گنا سے ہزاروں لاکھوں تک بلکہ شمار سے بھی زیادہ بڑھائیں گے اور دائمی نعمتیں عطا کریں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَشْكُورًا﴾ [نبی اسرائیل : ۱۹] ”اور جس نے آخرت کا ارادہ کیا اور اس کے لیے کوشش کی جو اس کے لائق کوشش ہے، جب کہ وہ مومن ہو تو یہی لوگ ہیں جن کی کوشش ہمیشہ سے قدر کی ہوئی ہے۔“

﴿۳۲﴾ وَمَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا..... ”وَمِنْهَا“ میں ”مِنْ“ جمعیت کے لیے ہے۔ یعنی جو شخص دنیا کی کھیتی کا ارادہ کرے گا اور دنیا ہی کے لیے کوشش اور محنت کرے گا، ایک تو یہ کہ اسے وہ نہیں ملے گا جو وہ چاہتا ہے بلکہ ہم اسے اس میں سے کچھ حصہ ہی دیں گے، دوسرا یہ کہ وہ حصہ بھی ہم دنیا ہی میں دے دیں گے، آخرت میں اس کے لیے کوئی حصہ نہیں، کیونکہ آخرت کی نیت سے اس نے کچھ کیا ہی نہیں۔ یہی بات ایک اور آیت میں یوں بیان فرمائی: ﴿مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِنَمُنُّ بِكَ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ يَصْلَاهَا مَذْمُومًا مَذْحُورًا﴾ [نبی اسرائیل : ۱۸] ”جو شخص اس جلدی والی (دنیا) کا ارادہ رکھتا ہو ہم اس کو اس میں جلدی دے دیں گے جو چاہیں گے، جس کے لیے چاہیں گے، پھر ہم نے اس کے لیے جہنم بنا رکھی ہے، اس میں داخل ہوگا، مذمت کیا ہوا، دھنکارا ہوا۔“ اور فرمایا: ﴿فَمَنْ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ﴾ [البقرة : ۲۰۰] ”پھر لوگوں میں سے کوئی تو وہ ہے جو کہتا ہے اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں دے دے اور آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔“

ت 21 ﴿۳۱﴾ أَمْ لَهُمْ شُرَكَاؤُا شَرَعُوا لَهُمْ : ظاہر ہے اس آیت میں ”شُرَكَاؤُا“ سے مراد وہ شریک نہیں ہیں جن سے لوگ دعائیں مانگتے یا جن کی نذر و نیاز چڑھاتے اور پوجا پاٹ کرتے ہیں، کیونکہ وہ دین کا کوئی طریقہ مقرر کر سکتے ہیں نہ حلال و حرام قرار دینے میں ان کا کوئی دخل ہے اور نہ وہ کوئی قانون یا ضابطہ مقرر کر سکتے ہیں۔ لامحالہ اس سے مراد کوئی انسان یا

تَرَى الظَّالِمِينَ مُشْفِقِينَ مِمَّا كَسَبُوا وَهُوَ وَاقِعٌ بِهِمْ ۗ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا

تو ان ظالموں کو دیکھے گا کہ اس سے ڈرنے والے ہوں گے جو انہوں نے کمایا، حالانکہ وہ ان پر آ کر رہنے والا ہے اور انسانوں کی کوئی جماعت ہی ہے جنہوں نے اللہ کی شریعت کے مقابلے میں اپنی شریعت چلا رکھی ہو، حرام و حلال قرار دینے کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے رکھے ہوں اور لوگوں کے لیے ایسے نظام اور قانون مقرر کرتے ہوں جو اللہ تعالیٰ کی شریعت کے خلاف ہوں، پھر انہیں لوگوں میں رائج اور نافذ بھی کرتے ہوں۔ ایسے لوگ پارلیمنٹ یا ایوانوں کے ممبر بھی ہو سکتے ہیں، خود سر حکمران بھی، آستانوں اور مزاروں کے مجاور اور متولی بھی اور گمراہ قسم کے فلسفی اور مصنف بھی۔ علاوہ ازیں یہ شرکاء ایسے صالح اور متقی ائمہ بھی ہو سکتے ہیں جو اللہ کے مقابلے میں قانون سازی کا سوچ بھی نہ سکتے ہوں مگر لوگوں نے ان کے نام پر قرآن و سنت کے بالمقابل شریعت سازی کر کے انہیں اللہ کا شریک بنا رکھا ہو۔ شرک کسی بھی طرح کا ہو ظلم عظیم ہے، خواہ شرک فی العبادۃ ہو یا شرک فی الحکم۔ جس طرح وہ شخص مشرک ہے جو اللہ کے سوا کسی کی پوجا کرتا ہے، اس کی نذر و نیاز دیتا ہے، مصیبت کے وقت اسے پکارتا ہے، اسے حاجت روا یا مشکل کشا سمجھتا ہے، خواہ کسی زندہ کی پوجا کرے یا مردہ کی، جن کی کرے یا انسان یا فرشتے کی، قبر کی پوجا کرے یا بت کی، اسی طرح جو شخص اللہ تعالیٰ کے سوا کسی انسان کو اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں زندگی کا نظام بنانے کا یا قانون بنانے کا یا حلال و حرام قرار دینے کا اختیار دیتا ہے وہ بھی مشرک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان میں سے کسی قسم کا بھی شریک بنانے کی اجازت نہیں دی۔

② **وَلَوْلَا كَلِمَةُ الْفَصْلِ لَفُتِنَ بَيْنَهُمْ**: یعنی یہ شرک اللہ کے غضب کو دعوت دینے والی ایسی جسارت ہے کہ اگر لوگوں کو مہلت دینے کا فیصلہ نہ ہوتا اور یہ طے نہ کر دیا گیا ہوتا کہ فیصلے قیامت کے دن ہوں گے تو دنیا ہی میں ان لوگوں پر عذاب آجاتا جو اللہ کے دین کے مقابلے میں اپنی شریعت اور قانون بناتے ہیں، یا ایسی شریعت کو قبول کر کے شرک کا ارتکاب کرتے ہیں۔

③ **وَإِنَّ الظَّالِمِينَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ**: ”الظَّالِمِينَ“ میں الف لام عہد کا ہے، یعنی ان ظالموں کے لیے عذاب الیم ہے جو شرک کے ظلم عظیم کا ارتکاب کرتے ہیں اور وہ عذاب الیم جہنم ہے جس میں ہمیشہ رہیں گے اور جنت ان پر ہمیشہ کے لیے حرام ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿إِنَّهُ مَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ حَزَمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَأْوَاهُ النَّارُ ۚ وَقَالَ لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ﴾ [المائدة: ۷۲] ”بے شک حقیقت یہ ہے کہ جو بھی اللہ کے ساتھ شریک بنائے سو یقیناً اس پر اللہ نے جنت حرام کر دی اور اس کا ٹھکانا آگ ہے اور ظالموں کے لیے کوئی مدد کرنے والے نہیں۔“

آیت 22 ﴿تَرَى الظَّالِمِينَ مُشْفِقِينَ مِمَّا كَسَبُوا.....﴾ : ”الظَّالِمِينَ“ سے یہاں بھی وہی ظالم یعنی کافر و مشرک مراد ہیں جن کا اوپر ذکر ہوا ہے، کیونکہ کوئی اسم معرف باللام ہو کر دوبارہ آئے تو اس سے پہلا ہی مراد ہوتا ہے اور اس لیے کہ ان کے مقابلے میں ایمان اور عمل صالح والے لوگوں کا ذکر آ رہا ہے، یعنی ”وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ.....“ اس آیت میں قیامت کے دن ان مشرکین کی حالت کا نقشہ کھینچا ہے۔ عذاب سے پہلے اس کا شدید خوف بجائے خود ایک بڑا عذاب ہے، پھر ہر حال میں ان کے کفر و شرک کا وبال ان پر آ کر رہنے والا ہے، خواہ ڈریں یا نہ ڈریں۔ دنیا میں کفار قیامت

صَلِحَاتٍ فِي رَوْضَةِ الْجَنَّةِ ۗ لَهُمْ مَا يَشَاءُونَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۗ ذَلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيرُ ﴿۳۲﴾

وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے، وہ جنتوں کے باغوں میں ہوں گے۔ ان کے لیے جو وہ چاہیں گے ان کے رب کے پاس ہوگا، یہی بہت بڑا فضل ہے ﴿۳۲﴾

سے بے خوف تھے اور اس کا مذاق اڑاتے تھے، جیسا کہ پیچھے گزرا ہے: ﴿يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِهَا﴾ [الشوریٰ: ۱۸] ”اے وہ لوگ جلدی مانگتے ہیں جو اس پر ایمان نہیں رکھتے“ تو قیامت کے دن وہی کافر سخت خوف زدہ ہوں گے۔ ان کے برعکس ایمان والے دنیا میں قیامت سے سخت خوف زدہ رہتے تھے، جیسا کہ پہلے گزرا ہے: ﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا مُتَشَفِقُونَ وَنَهَا﴾ [الشوریٰ: ۱۷] ”اور وہ لوگ جو ایمان لائے، وہ اس (قیامت) سے ڈرنے والے ہیں“ سواب وہ جنتوں کے باغوں میں بے خوف ہوں گے۔

﴿۲﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فِي رَوْضَةِ الْجَنَّةِ: ”رَوْضَةٌ“ کا معنی ہے ”الْمَوْضِعُ النَّزِيهُ الْكَثِيرُ الْخَضِرَاءُ“ کہ نہایت صاف ستھری اور بہت سرسبز جگہ۔ ”رَوْضَةِ الْجَنَّةِ“ سے ظاہر ہے کہ جنتیں بھی بہت سی ہیں اور روضات بھی بہت سے ہیں، یعنی (مومن کسی درجے کے بھی ہوں جنت میں ہوں گے، مگر) ایمان اور عمل صالح والے جنت کے بھی پاکیزہ ترین اور سب سے سرسبز مقامات میں ہوں گے۔ جن میں سب سے عالی مقام رسول کریم ﷺ کا ہوگا، جیسا کہ سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے ایک طویل خواب روایت کیا ہے، جس میں ہے کہ دو فرشتوں نے پہلے آپ ﷺ کو مختلف گناہوں کے عذاب کا منظر دکھایا، اس کے بعد ان دونوں نے آپ ﷺ کو آگے چلنے کے لیے کہا، آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿فَانْطَلَقْنَا حَتَّىٰ انْتَهَيْنَا إِلَىٰ رَوْضَةٍ خَضِرَاءَ، فِيهَا شَجَرَةٌ عَظِيمَةٌ، وَفِي أَصْلِهَا شَيْخٌ وَصَيِّبَانٌ، وَإِذَا رَجُلٌ قَرِيبٌ مِنَ الشَّجَرَةِ بَيْنَ يَدَيْهِ نَارٌ يُوقِدُهَا، فَصَعِدَا بِي فِي الشَّجَرَةِ، وَأَدْخَلَانِي دَارًا لَمْ أَرُ قَطُّ أَحْسَنَ مِنْهَا، فِيهَا رِجَالٌ شَبُوحٌ وَشَبَابٌ، وَنِسَاءٌ وَصَيِّبَانٌ، ثُمَّ أَخْرَجَانِي مِنْهَا فَصَعِدَا بِي الشَّجَرَةَ فَأَدْخَلَانِي دَارًا هِيَ أَحْسَنُ وَأَفْضَلُ، فِيهَا شَبُوحٌ وَشَبَابٌ، فَقُلْتُ طَوْفُتْمَانِي اللَّيْلَةَ، فَأَخْبِرَانِي عَمَّا رَأَيْتُ؟ قَالَا نَعَمْ، (فَذَكَرَ الْحَدِيثَ حَتَّىٰ قَالَ) وَالشَّيْخُ فِي أَصْلِ الشَّجَرَةِ إِبْرَاهِيمُ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَالصَّيِّبَانُ حَوْلُهُ فَأَوْلَادُ النَّاسِ، وَالَّذِي يُوقِدُ النَّارَ مَلِكٌ خَازِنُ النَّارِ، وَالذَّارُ الْأُولَىٰ الَّتِي دَخَلْتُ، دَارُ عَامَّةِ الْمُؤْمِنِينَ، وَأَمَّا هَذِهِ الدَّارُ، فَدَارُ الشُّهَدَاءِ، وَأَنَا جِبْرِيلُ، وَهَذَا مِيكَائِيلُ، فَارْفَعْ رَأْسَكَ، فَرَفَعْتُ رَأْسِي، فَإِذَا فَوْقِي مِثْلُ السَّحَابِ، قَالَا ذَاكَ مَنْزِلُكَ، قُلْتُ دَعَانِي أَدْخُلْ مَنْزِلِي، قَالَا إِنَّهُ بَقِيَ لَكَ عُمْرٌ لَمْ تَسْتَكْمِلْهُ، فَلَوْ اسْتَكْمَلْتَ أَتَيْتَ مَنْزِلَكَ﴾ [بخاری، الجنائز، باب ما قبل في أولاد المشرکین: ۱۳۸۶] ”پھر ہم چل پڑے یہاں تک کہ ہم ایک سرسبز روضہ (باغ) میں پہنچے جس میں ایک بہت بڑا درخت تھا، اس کی جڑ (تنے) کے پاس ایک بزرگ اور کچھ بچے تھے اور اس درخت کے قریب ایک آدمی تھا جس کے سامنے آگ تھی، جسے وہ بھڑکا رہا تھا، پھر وہ دونوں مجھے لے کر درخت پر چڑھ گئے اور مجھے ایک ایسے گھر کے اندر لے گئے جس سے خوبصورت گھر میں نے نہیں دیکھا، اس میں کچھ بزرگ اور جوان آدمی اور عورتیں اور بچے تھے، پھر انھوں نے مجھے اس

ذَلِكَ الَّذِي يُبَشِّرُ اللَّهُ عِبَادَهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ - قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا

یہ ہے وہ چیز جس کی خوش خبری اللہ اپنے ان بندوں کو دیتا ہے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے۔ کہہ دے میں تم سے اس پر کوئی اجرت نہیں مانگتا مگر رشتہ داری کی وجہ سے دوستی۔ اور جو کوئی نیک کمائے گا ہم اس کے

گھر سے نکالا اور مجھے لے کر اس درخت کے اور اوپر چڑھے اور ایک گھر کے اندر لے گئے جو پہلے سے زیادہ خوبصورت اور برتر تھا، اس میں کچھ بزرگ تھے اور کچھ جوان۔ میں نے کہا: ”تم دونوں نے آج رات مجھے خوب گھمایا ہے، اب جو کچھ میں نے دیکھا ہے مجھے اس کی حقیقت بتاؤ؟“ تو انھوں نے کہا: ”ہاں، ٹھیک ہے (پھر انھوں نے عذاب والے مناظر کی حقیقت بتانے کے بعد کہا) اور درخت کی جڑ کے پاس جو بزرگ تھے وہ ابراہیم علیہ السلام تھے اور ان کے ارد گرد بیچے لوگوں کی اولاد تھے اور جو آگ بھڑکا رہا تھا وہ آگ کا خازن مالک تھا اور پہلا گھر جس میں آپ داخل ہوئے عام ایمان والوں کا گھر تھا۔ رہا یہ گھر تو یہ شہداء کا گھر ہے اور میں جبریل ہوں اور یہ میکائیل ہے، اب سراٹھاؤ!“ میں نے سراٹھایا تو اچانک میرے اوپر بادل کی طرح کی چیز تھی۔ دونوں نے کہا: ”وہ تمہارا گھر ہے۔“ میں نے کہا: ”مجھے چھوڑو میں اپنے گھر جاؤں۔“ انھوں نے کہا: ”آپ کی کچھ عمر باقی ہے جو آپ نے پوری نہیں کی، اگر پوری کر لو گے تو اپنے گھر میں آ جاؤ گے۔“ اس حدیث سے ”رَوْضَاتِ الْجَنَّةِ“ کا مفہوم بھی اچھی طرح سمجھ میں آ جاتا ہے اور یہ بھی کہ ”رَوْضَاتِ الْجَنَّةِ“ میں سب سے اعلیٰ ”رَوْضَةُ الْجَنَّةِ“ ہمارے نبی کریم ﷺ کے لیے خاص ہے۔

③ ان آیات میں متعدد وجہوں سے مومنوں کو ملنے والے ثواب کی عظمت بیان کی گئی ہے، ایک یہ کہ وہ ”رَوْضَاتِ الْجَنَّةِ“ میں ہوں گے، دوسری یہ کہ ”لَهُمْ فِيهَا نِسَاءٌ مُّحَنَّنَاتٌ“ یعنی انھیں وہاں جو چاہیں گے ملے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ انھیں حاصل ہونے والی نعمتوں کی انتہا نہیں ہوگی، کیونکہ آدمی ہر نعمت کے بعد اس سے اعلیٰ نعمت کا خواہش مند ہوتا ہے۔ تیسری ”عِنْدَهُ رِزْقُهُمْ“ کہ ان کی رہائش گاہیں ان کے رب کے پڑوس میں ہوں گی۔ یہ وہ چیز ہے جس کی دعا فرعون کی بیوی نے کی تھی: ﴿رَبِّ اٰیْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ﴾ [التحریم: ۱۱] ”اے میرے رب! میرے لیے اپنے پاس جنت میں ایک گھر بنا۔“ چوتھی یہ کہ انھیں عطا ہونے والی نعمتوں کو اللہ تعالیٰ نے فضل کبیر قرار دیا ہے، فرمایا: ﴿ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ﴾ پھر جسے اللہ تعالیٰ اکبر اور کبیر قرار دے اس کی عظمت کا کیا ٹھکانا ہوگا۔ پانچویں وجہ سے انھیں ملنے والے ثواب کی عظمت کا بیان اگلی آیت میں ہے۔

④ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ: اس سے معلوم ہوا کہ جنت محض اللہ تعالیٰ کا فضل ہے، اس پر کسی کا حق واجب نہیں۔

آیت 23 ﴿ذٰلِكَ الَّذِي يُبَشِّرُ اللَّهُ عِبَادَهُ﴾: یہ پانچویں وجہ ہے۔ ”ذٰلِكَ“ اسم اشارہ بعید اس ثواب کی عظمت کے بیان کے لیے ہے۔ جنتوں کے بانحوں اور ان کی نعمتوں کی طرف اشارہ کر کے ان کی طرف دوبارہ توجہ دلانے سے مقصود ان کی عظمت کا اظہار ہے اور ساتھ ہی ایمان اور عمل صالح کا ذکر اس لیے ہے کہ اتنی بڑی نعمتوں کے حصول کے لیے ایمان اور عمل صالح ضروری ہے۔

إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ وَمَنْ يَقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهُ فِيهَا حُسْنًا إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ شَكُورٌ ﴿۳۲﴾

لیے اس میں خوبی کا اضافہ کریں گے۔ یقیناً اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت قدردان ہے ﴿۳۲﴾

﴿۳۲﴾ قُلْ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ: "قَرَبٌ يَقْرَبُ قُرْبًا وَقُرْبَانًا وَقَرَبَانًا" (س، ک) قریب ہونا۔ "قُرْبَىٰ" اور "قَرَابَةٌ" بھی مصدر ہیں، جیسے "بُشْرَىٰ" اور "رُجْعَىٰ" ہیں۔ ان کا معنی رشتہ داری اور قرابت ہے۔ رشتہ دار اور قرابت دار کے لیے "ذوالقربیٰ" (قرابت والا) کا لفظ استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَأَتِذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ﴾ [بنی اسرائیل: ۲۶] "اور رشتہ دار کو اس کا حق دے۔" "فِي الْقُرْبَىٰ" میں "فِي" تعلق کے لیے ہے: "أُنِي مِنْ أُجْلِ الْقُرْبَىٰ" یعنی رشتہ داری کی وجہ سے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «عُدَّتْ امْرَأَةٌ فِي هِرَّةٍ حَبَسَتْهَا، حَتَّىٰ مَاتَتْ جُوعًا، فَدَخَلَتْ فِيهَا النَّارَ» [بخاری، المسافاة، باب فضل سفي الماء: ۲۳۶۵] "ایک عورت کو ایک بلی کی وجہ سے عذاب دیا گیا۔ اس نے اسے باندھ کر رکھا، یہاں تک کہ وہ بھوک سے مر گئی، تو اس کی وجہ سے وہ آگ میں داخل ہو گئی۔" یعنی آپ کہہ دیں کہ میں اس تبلیغ دین پر تم سے کوئی مزدوری نہیں مانگتا، سوائے رشتہ داری کی وجہ سے دوستی کے کہ کچھ نہ سہی، کم از کم میرے اور تمہارے درمیان جو قرابت اور رشتہ داری ہے اس کی وجہ سے میرا حق ہے کہ مجھ سے دوستی رکھو، اس حق کا مطالبہ میں تم سے ضرور کرتا ہوں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ تم میری بات مان لیتے، اگر نہیں مانتے تو سارے عرب میں سب سے بڑھ کر دشمنی تو نہ کرو۔ کم از کم اس قرابت کا تو خیال رکھو جو میرے اور تمہارے درمیان ہے۔ جیسا کہ ابوطالب اگرچہ ایمان نہیں لایا مگر وہ قرابت کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کی حمایت اور آپ ﷺ کا دفاع کرتا رہا۔

آیت کا یہی مطلب ترجمان القرآن ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ طاؤس فرماتے ہیں کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے "إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ" کے متعلق سوال کیا گیا تو سعید بن جبیر کہنے لگے کہ اس سے مراد "قُرْبَىٰ آلِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ" (آل محمد ﷺ کی قرابت) ہے، تو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: «عَجَلْتُ، إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ يَكُنْ يَطْلُقُ مِنْ قُرْبَىٰ إِلَّا سَكَانَ لَهُ فِيهِمْ قَرَابَةٌ فَقَالَ: إِلَّا أَنْ تَصِلُوا مَا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ مِنَ الْقَرَابَةِ» [بخاری، التفسیر، باب قوله: ﴿إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ﴾: ۴۸۱۸] "تم نے جلدی کی، قریش کا کوئی خاندان ایسا نہ تھا جس میں نبی ﷺ کی قرابت اور رشتہ داری نہ ہو، تو آپ ﷺ نے فرمایا: "میں تم سے اس پر کسی مزدوری کا سوال نہیں کرتا، مگر یہ کہ تم اس رشتہ داری کو ملاؤ جو میرے اور تمہارے درمیان ہے۔"

﴿۳۳﴾ بعض لوگ خصوصاً شیعہ اس آیت کا یہ مطلب بیان کرتے ہیں کہ آپ کہہ دیں کہ میں تم سے اس پر کسی مزدوری کا سوال نہیں کرتا مگر قرابت والوں سے دوستی کا، یعنی میں تم سے اس پر اس کے سوا کچھ نہیں مانگتا کہ تم میرے قرابت داروں سے دوستی رکھو۔ نبی کریم ﷺ کے مومن قرابت داروں سے دوستی اپنی جگہ مسلمہ ہے، جو دوسرے دلائل سے ثابت ہے، مگر اس آیت کا وہ مطلب ہرگز نہیں جو ان لوگوں نے بیان کیا ہے، کیونکہ "الْقُرْبَىٰ" کا معنی رشتہ داری ہے، رشتہ دار نہیں۔ رشتہ داروں کے لیے

”ذَوِی الْقُرْبٰی“ کا لفظ آتا ہے۔ اگر ”الْقُرْبٰی“ کا معنی رشتہ دار ہو بھی تو آیت کے الفاظ یہ ہونے چاہئیں: ”اِلَّا مَوَدَّةَ الْقُرْبٰی“ مگر رشتہ داروں کی دوستی کا۔ جب کہ الفاظ ہیں: ﴿اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی﴾ ان الفاظ کا وہ معنی ہو ہی نہیں سکتا جو یہ حضرات بیان کرتے ہیں۔ پھر دیکھیں کہ آپ ﷺ یہ سوال کن لوگوں سے کر رہے ہیں، ظاہر ہے کفار سے کر رہے ہیں جو آپ کے شدید مخالف تھے، جو آپ سے بھی دوستی کے روادار نہیں تھے، آیا ممکن بھی ہے کہ آپ ان سے کہیں کہ میرے رشتہ داروں سے دوستی کرو۔ اگر مان بھی لیں کہ آپ ان سے اپنے رشتہ داروں کے ساتھ دوستی کا سوال کر رہے ہیں تو وہ رشتہ دار کون سے ہیں؟ کیا آپ ﷺ اپنے پورے قبیلہ قریش کے ساتھ دوستی کا سوال کر رہے ہیں یا اپنے قریب ترین خاندان بنو عبدالمطلب کے ساتھ؟ دونوں میں مخلص مسلمانوں کے علاوہ ابو جہل اور ابولہب جیسے آپ کے بدترین دشمن بھی موجود تھے، جن کے ساتھ دوستی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور اگر اس سے مراد علی وفاطمہ اور حسن و حسینؑ ہیں، جیسا کہ شیعہ حضرات کہتے ہیں، تو یہ سورت مکی ہے اور مکہ میں فاطمہ اور علیؑ جو کچھ کا نکاح تک نہیں ہوا تھا اور نہ ہی حسن و حسینؑ پیدا ہوئے تھے، لہذا اس سے یہ لوگ مراد ہو ہی نہیں سکتے۔

۴ بعض مفسرین نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کا یہ کہنا کہ میں تم سے صرف رشتہ داری کی وجہ سے دوستی کا سوال کرتا ہوں، یہ دین کی تبلیغ کی اجرت یا مزدوری نہیں جو آپ ان سے مانگ رہے ہیں، بلکہ آپ اپنے اس حق کا مطالبہ کر رہے ہیں جو تمام دنیا کے ہاں مسلم ہے، خواہ آپ تبلیغ کریں یا نہ کریں۔ غرض اس آیت میں بھی وہی بات بیان ہوئی ہے جو تمام انبیاء نے اپنی اپنی قوم سے کہی کہ میں تم سے اس تبلیغ دین پر کسی قسم کی مزدوری کا سوال نہیں کرتا، کیونکہ میری مزدوری صرف اللہ تعالیٰ کے ذمے ہے، جیسا کہ سورہ شعراء میں ہے: ﴿وَمَا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِيْ اِلَّا عَلَى رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ [الشعراء: ۱۰۹] ”اور میں اس پر تم سے کسی اجرت کا سوال نہیں کرتا، میری اجرت تو رب العالمین ہی کے ذمے ہے۔“ تو اعدائے حق میں یہ بات ان الفاظ میں بیان کی جائے گی کہ یہاں استثناء متصل نہیں منقطع ہے، یعنی صلہ رحمی کے سوال کا تبلیغ دین پر اجرت سے کوئی تعلق نہیں۔

۵ وَ مَنْ يَّقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّوَدَّ لَهَا فِيْهَا حُسْنًا: ”حَسَنَةً“ میں تعویذ تکبیر کے لیے ہے۔ جو شخص کوئی بھلائی کرے گا، خواہ کتنی معمولی ہو، ہم اس کے لیے اس کے حسن و خوبی میں اضافہ کر دیں گے۔ یہ اضافہ کئی طرح سے ہے، ایک تو وہ جتنی نیکی کرے گا اللہ تعالیٰ اسے اس سے زیادہ نیکی کی توفیق دے گا۔ دوسرا جو لوگ اسے دیکھ کر وہ نیکی کریں گے ان سب کے اجرا سے بھی ملیں گے جس سے اس کی نیکی میں اضافہ ہوگا۔ تیسرا اللہ تعالیٰ ہر نیکی کو دس گنا سے سات سو گنا بلکہ شمار سے زیادہ تک بڑھا دیتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ اِنْ تَكَ حَسَنَةً يُّضْعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا﴾ [النساء: ۱۰۰] ”اگر ایک نیکی ہوگی تو وہ اسے کئی گنا کر دے گا اور اپنے پاس سے بہت بڑا اجر عطا کرے گا۔“ چوتھا یہ کہ نیکیوں کے ساتھ گناہ معاف ہوتے ہیں، فرمایا: ﴿اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ الشَّرَّاتِ﴾ [مائدہ: ۱۱۶] ”بے شک نیکیاں برائیوں کو لے جاتی ہیں۔“

۶ اِنَّ اللّٰهَ شَفِیْقٌ رَّحِيْمٌ: ”اِنَّ“ تعلیل کے لیے آتا ہے، یعنی نیکی کرنے والے کی نیکی میں ہم اضافہ اس لیے کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ گناہوں پر بہت پردہ ڈالنے والا اور نیک عمل کی بے حد قدر کرنے والا ہے۔

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَى عَلَى اللَّهِ كَذِبًا ۗ فَإِن يَشَاءِ اللَّهُ يَخْتِمْ عَلَى قَلْبِكَ ۖ وَبِئْسَ اللَّهُ
الْبَاطِلَ وَ يُحَقِّقُ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ ۖ إِنَّكَ عَلَيْهَا بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿۳۷﴾

یادہ کہتے ہیں کہ اس نے اللہ پر جھوٹ باندھا ہے، سو اگر اللہ چاہے تو تیرے دل پر مہر کر دے اور اللہ باطل کو مٹا دیتا ہے اور حق کو اپنی باتوں کے ساتھ ثابت کر دیتا ہے، یقیناً وہ سینوں کی بات کو خوب جاننے والا ہے ﴿۳۷﴾

آیت 24: ﴿۱﴾ أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَى عَلَى اللَّهِ كَذِبًا: ”اُم“ کے لفظ سے پہلے ایک جملہ ظاہر یا مقدر ہوتا ہے جو ہمزہ استفہام سے شروع ہوتا ہے۔ یہاں یہ بات واضح کرنے کے بعد کہ تمہیں دین کی دعوت دینے سے مقصود سراسر تمہارا فائدہ اور تمہاری نجات ہے، اس میں تم سے میری کوئی ذاتی غرض نہیں، نہ ہی میں اس پر تم سے کسی مزدوری کا سوال کرتا ہوں۔ ہاں یہ ضرور کہتا ہوں کہ کم از کم رشتہ داری کی وجہ سے میرا دوستی کا حق تو ادا کرو۔ اس سے آگے اس مفہوم کی عبارت مقدر مانی جائے گی کہ آیا وہ یہ دعوت قبول کرتے ہوئے آپ پر ایمان لاتے ہیں ”أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَى“ یا ضد اور عناد پر قائم رہ کر یہی بات کہتے ہیں کہ اس نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھا ہے۔

﴿۲﴾ فَإِن يَشَاءِ اللَّهُ يَخْتِمْ عَلَى قَلْبِكَ: مفسرین نے اس کی تفسیر کئی طرح سے کی ہے، زیادہ واضح دو تفسیریں یہاں درج کی جاتی ہیں۔ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ”اگر تو نے اللہ پر جھوٹ باندھا ہو، جیسا کہ یہ جاہل کہہ رہے ہیں تو اگر وہ چاہے تو ”يَخْتِمْ عَلَى قَلْبِكَ“ وہ تیرے دل پر مہر لگا دے اور جتنا قرآن تجھے عطا کیا ہے وہ تجھ سے سلب کر لے، جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: ﴿وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضُ الْأَقَاوِيلِ ۚ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ۚ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ ۚ فَمَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ﴾ [الحاقة: ۴۴ تا ۴۷] ”اور اگر وہ ہم پر کوئی بات بنا کر لگا دیتا۔ تو یقیناً ہم اس کو دائیں ہاتھ سے پکڑتے۔ پھر یقیناً ہم اس کی جان کی رگ کاٹ دیتے۔ پھر تم میں سے کوئی بھی (ہمیں) اس سے روکنے والا نہ ہوتا۔“ یعنی ہم اس سے شدید ترین انتقام لیں اور کوئی شخص اسے بچانہ سکے۔ (ابن کثیر) مزید تفصیل سورہ حاقہ کی تفسیر میں ملاحظہ فرمائیں۔ مفسر قاسمی نے فرمایا: ”یہ قرآنی آیات کی تفسیر قرآن کی آیات کے ساتھ ہے، جہاں ممکن ہو یہ تفسیر سب سے بہتر ہوتی ہے، کیونکہ قرآنی آیات ایک دوسری کی تفسیر کرتی ہیں۔ اس مفہوم کے مطابق آیت کا مال جیسا کہ ابو السعود نے وضاحت فرمائی کفار کی بات کی تردید ہے، یعنی اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ گھڑتے تو اللہ آپ کو ہر حال میں اس سے روک دیتا اور آپ کے دل پر ایسی مہر لگاتا کہ نہ آپ کی زبان پر وحی کا کوئی لفظ آتا اور نہ آپ کے دل میں اس کا کوئی مفہوم آتا، جب ایسا نہیں ہوا بلکہ وحی تو اتر کے ساتھ جاری رہی تو ثابت ہو گیا کہ وہ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔“

دوسری تفسیر مفسر شہاب کے الفاظ میں یہ ہے: ”اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ چاہے تو تیرے دل پر مہر لگا دے، جیسے اس نے ان (بہتان لگانے والے کافروں) کے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔ اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دلائی ہے اور آپ پر اپنا احسان و اکرام یاد دلایا ہے (کہ اس نے آپ کے دل پر مہر نہیں لگائی) تاکہ آپ اس کی وجہ سے شکر ادا کریں اور ان لوگوں کے حال پر

وَهُوَ الَّذِي يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ وَيَعْفُو عَنِ السَّيِّئَاتِ وَيَعْلَمُ مَا تَفْعَلُونَ ﴿۲۵﴾

اور وہی ہے جو اپنے بندوں سے توبہ قبول کرتا ہے اور برائیوں سے درگزر کرتا ہے اور جانتا ہے جو تم کرتے ہو ﴿۲۵﴾

ترس کھائیں جن کے دل پر اللہ تعالیٰ نے مہر لگا دی اور وہ اپنے رب کے غضب کے حق دار بن گئے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ کبھی یہ جرات نہ کرتے کہ آپ پر یہ بہتان باندھیں کہ آپ نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ گھڑا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اگر ان پر گمراہی کی مہر نہ لگ گئی ہوتی تو وہ یہ محال بات کہنے کی جرات نہ کرتے۔“ (منقول از قاسمی)

﴿۳﴾ وَيَنْسَخُ اللَّهُ الْبَاطِلَ... : ”يَنْسَخُ“ اصل میں ”يَمْحُو“ ہے۔ اس کا عطف ”يَمْحُوهُ“ پر نہیں اور نہ ہی حالت جزم میں ہونے کی وجہ سے اس کی ”واو“ گری ہے، بلکہ یہ نیا جملہ ہے اور فعلی حالت میں ہونے کی وجہ سے ”واو“ اپنی جگہ قائم ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے رسم الخط میں یہاں ”واو“ نہیں لکھی گئی، کیونکہ بعض مقامات پر پڑھنے میں جو حروف نہیں آتے تھے انہوں نے وہ لکھنے میں بھی حذف کر دیے ہیں، جیسا کہ سورہ بنی اسرائیل کی آیت (۱۱) : ﴿وَيَذُرُ الْإِنْسَانَ بِالضَّمِّ دُعَاءَهُ بِالْعَنِينِ﴾ اور سورہ علق کی آیت (۱۸) : ﴿سَنَذُرُ الرَّبَّانِيَّةَ﴾ میں ”واو“ نہیں لکھی گئی۔ مسلمانوں نے بعد میں قرآن مجید کے لیے اسی رسم الخط کو محفوظ رکھا۔ بعض اہل علم نے ”يَنْسَخُ“ کی واو حذف کرنے میں یہ نکتہ نکالا ہے کہ باطل کو مٹانے اور محو کرنے میں مبالغے کے اظہار کے لیے ”يَمْحُو“ کی ”واو“ کو بھی محو کر دیا ہے۔

﴿۴﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کا دستور ہے کہ وہ باطل کو مٹاتا ہے اور حق کو اپنے کلمات کے ساتھ ثابت کر دیتا ہے، تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ اللہ پر جھوٹ گھڑیں اور اللہ تعالیٰ اسے نہ مٹائے، بلکہ آپ کو ہر قدم پر اپنی فتح و نصرت کے ساتھ نوازتا جائے۔ یہ دلیل ہے کہ آپ حق لے کر آئے ہیں اور وہ شخص بدترین بہتان باز ہے جو کہتا ہے کہ آپ نے اللہ پر جھوٹ گھڑا ہے۔

﴿۵﴾ إِنَّكَ عَلَيْهِمْ بِذَاتِ الصُّدُورِ : یعنی اسے سینوں میں چھپی ہوئی نیتوں اور ارادوں کا خوب علم ہے، وہ اپنی رسالت کے ساتھ کبھی بھی بدظنیت و جھوٹ گھڑنے والوں کو نہیں نوازتا، جیسا کہ فرمایا : ﴿اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ﴾ [الانعام : ۱۲۴] ”اللہ زیادہ جانتے والا ہے جہاں وہ اپنی رسالت رکھتا ہے۔“ اس نے اپنے کامل علم ہی کی بنا پر آپ کو اس منصب کے لیے منتخب فرمایا ہے۔

آیت ۲۵ ﴿۱﴾ وَهُوَ الَّذِي يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ : پچھلی آیت میں ان لوگوں کا ذکر فرمایا جو رسول اللہ ﷺ کو جھٹلاتے تھے اور کہتے تھے کہ آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھا ہے، اب اپنی توبہ قبول کرنے کی صفت فرمائی کہ توبہ قبول کرنا اور گناہوں سے درگزر کرنا صرف اللہ تعالیٰ کی شان ہے (دیکھیے توبہ : ۱۰۴) اور یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے، کیونکہ اگر وہ چاہے تو مجرم کے معافی مانگنے پر بھی اسے معاف نہ کرے۔ مقصود انھیں توبہ کی ترغیب دلانا اور کفر پر اصرار کے انجام بد سے ڈرانا ہے۔ کفر سے توبہ اسلام قبول کرنے سے ہوتی ہے اور گناہ سے توبہ میں تین چیزیں شامل ہیں، ایک پچھلے گناہ پر تادمت، دوسرا اسے ترک کر دینا، تیسرا آئندہ وہ گناہ نہ کرنے کا عزم اور اگر گناہ کا تعلق بندوں کے حق سے ہے تو حسب استطاعت

اسے ادا کر دینا اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنا۔ اگر آئندہ وہ گناہ نہ کرنے کا عزم نہ ہو تو توبہ کا کچھ مطلب نہیں۔ ایک فارسی شاعر نے کہا ہے۔

سجدہ رکف، توبہ، برب، دل پر از ذوقی گناہ معصیت را خندہ سے آیدز استغفار ما

”ہاتھ میں تسبیح ہے، زبان پر توبہ اور دل گناہ کی لذت سے بھرا ہوا ہے، گناہ کو ہمارے استغفار پر ہنسی آتی ہے۔“

② عَنْ عَبَّادٍ: اس میں توبہ قبول کرنے کی ایک وجہ بیان فرمائی ہے کہ گناہ کر کے توبہ کرنے والے اس کے اپنے بندے ہیں اور وہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے۔ دیکھیے سورۃ بقرہ (۳۷)، آل عمران (۱۳۵) اور سورۃ نساء (۱۱۰)۔

③ وَيَعْفُوا عَنِ السَّيِّئَاتِ: توبہ مستقبل کے لیے قبول ہوتی ہے اور برائیاں گزشتہ معاف کر دی جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسا کریم ہے کہ توبہ پر گزشتہ تمام گناہ معاف فرما دیتا ہے، بلکہ سورۃ فرقان کی آیت (۷۰) کے مطابق توبہ کرنے والوں کے گناہوں کو نیکیوں میں بدل دیتا ہے۔ بندے کی توبہ پر اللہ تعالیٰ کس قدر خوش ہوتا ہے، اس کی تفصیل انس رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے بیان فرمائی، آپ ﷺ نے فرمایا: «لَلَّهِ أَشَدُّ فَرَحًا بِتَوْبَةِ عَبْدِهِ حِينَ يَتُوبُ إِلَيْهِ، مِنْ أَشَدِّكُمْ سَكَانِ عَلِيِّ رَاحِلَتِهِ بِأَرْضِ فَلَاةٍ، فَاَنْفَلَتَتْ مِنْهُ، وَعَلَيْهَا طَعَامُهُ وَشَرَابُهُ فَأَيْسَ مِنْهَا، فَأَتَى شَجْرَةً فَاضْطَجَعَ فِي ظِلِّهَا، قَدْ أَيْسَ مِنْ رَاحِلَتِهِ، فَبَيْنَا هُوَ كَذَلِكَ إِذَا هُوَ بِهَا قَائِمَةٌ عِنْدَهُ، فَاُخِذَ بِحِطَامِهَا ثُمَّ قَالَ مِنْ شِدَّةِ الْفَرَحِ أَلَلَّهُمْ أَنْتَ عَبْدِي وَأَنَا رَبُّكَ، أَخْطَأَ مِنْ شِدَّةِ الْفَرَحِ» [مسند، التوبة، باب في النحر عسى التوبة والفرح بها: ۲۷۶۷] ”یقیناً اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ پر، جب وہ اس کی طرف توبہ کرتا ہے، اس سے بھی زیادہ خوش ہوتا ہے جتنا تم میں سے کوئی شخص خوش ہوتا ہے، جو کسی بیابان میں اپنی اونٹنی پر سوار تھا تو وہ اس سے چھوٹ کر نکل گئی، اس کا کھانا اور پانی بھی اسی پر تھا۔ تو وہ اس سے ناامید ہو گیا اور ایک درخت کے پاس جا کر اس کے سائے میں لیٹ گیا۔ حال اس کا یہ تھا کہ وہ اپنی اونٹنی سے مایوس ہو چکا تھا، وہ اسی حال میں تھا کہ اچانک اس نے اسے دیکھا کہ وہ اونٹنی اس کے پاس کھڑی تھی، چنانچہ اس نے اس کی مہار پکڑ لی، پھر شدید خوشی میں کہنے لگا: ”اے اللہ! تو میرا بندہ اور میں تیرا رب۔“ خوشی کی شدت سے غلطی کر بیٹھا۔“

④ اللہ تعالیٰ اتنا مہربان ہے کہ بعض اوقات توبہ کے بغیر بھی گناہ معاف فرما دیتا ہے، جیسا کہ ہجرت کے بعد پہلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، حج مرور کے بعد پہلے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں، شہادت فی سبیل اللہ سے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور نیکیوں کی کثرت سے گناہ مٹ جاتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ﴾ [ہود: ۱۱۸] ”بے شک نیکیاں برائیوں کو لے جاتی ہیں۔“ اور کبیرہ گناہوں کے اہتمام سے صغیرہ گناہ خود بخود معاف ہو جاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ کبیرہ گناہ کے مرتکب مومن کو، اگر وہ توبہ نہ کرے تو کافر یا ابدی جہنمی قرار دیتے ہیں، ان کی بات درست نہیں۔

⑤ وَيَعْلَمُ مَا تَفْعَلُونَ: اس جملے میں بشارت بھی ہے اور نذارت بھی۔ عمل کا دار و مدار دل کی حالت پر ہے، اگر اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے اخلاص سے توبہ کی گئی ہے تو اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے اور اسے قبولیت سے نوازے گا اور اگر توبہ اپنے

وَيَسْتَجِيبُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَيَزِيدُهُمْ مِنْ فَضْلِهِ ۗ وَالْكَافِرُونَ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ ﴿۲۶﴾ وَلَوْ بَسَطَ اللَّهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهِ لَبَغَّوْا فِي الْأَرْضِ وَلَكِنْ يُنَزِّلُ بِقَدَرٍ

اور ان لوگوں کی دعا قبول کرتا ہے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے اور انھیں اپنے فضل سے زیادہ دیتا ہے اور جو کافر ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے ﴿۲۶﴾ اور اگر اللہ اپنے بندوں کے لیے رزق فراخ کر دیتا تو یقیناً وہ

کسی دنیوی مقصد کے لیے کی گئی ہو، مثلاً ریا کے طور پر یا آئندہ توڑ ڈالنے کے ارادے سے، یا کسی دنیوی فائدے کے لیے، مثلاً صحت و قوت کے لیے زنا، سگریٹ یا شراب کو ترک کیا گیا ہے تو وہ اسے بھی جانتا ہے۔

آیت 26 ﴿۱﴾ وَيَسْتَجِيبُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ: اجابت کا معنی قبول کرنا ہے اور استجابت میں ”سین“

مبالغے کے لیے ہے۔ یہ لفظ کسی حکم پر بہت جلد عمل کرنے یا کسی دعوت پر بہت جلدی لیک کہنے یا کسی دعا کو بہت جلدی قبول کرنے کے لیے آتا ہے۔ (ابن عاشور) یعنی اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی دعا بہت جلد اور خوشی سے قبول فرماتا ہے جو ایمان اور عمل صالح سے متصف ہوتے ہیں۔ (دیکھیے بقرہ: ۱۸۶، ۲۱۸) ان معنوں میں کفار کی دعا قبول ہوتی ہی نہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَمَا دُعَاءُ الْكَافِرِينَ إِلَّا فِي ضَلَالٍ﴾ [الرعد: ۱۴] ”اور نہیں ہے کافروں کا پکارنا مگر سراسر بے سود۔“ ہاں، رسی دراز کرنے کے لیے اور حجت تمام کرنے کے لیے کفار کی بھی دعائیں قبول ہوتی ہیں، مگر وہ استجابت نہیں استدرج ہے اور ناراضی کی علامت ہے، جیسا کہ ابلیس نے آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد کو گمراہ کرنے کے لیے مہلت مانگی تو اسے دے دی گئی۔

﴿۲﴾ وَيَزِيدُهُمْ مِنْ فَضْلِهِ: اس میں دو چیزیں شامل ہیں، ایک یہ کہ صالح اعمال والے مومن اپنی دعا اور عمل صالح سے جو امید رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ انھیں وہ بھی دیتا ہے اور ان کی امید سے کہیں زیادہ بھی عطا فرماتا ہے۔ اسی طرح ان کا ہر عمل قبول بھی کرتا ہے اور اسے دس گنا سے سات سو گنا تک یا بلا حساب تک بڑھا بھی دیتا ہے۔ دوسری یہ کہ انھیں اپنے فضل سے مزید وہ کچھ بھی عطا کرتا ہے جس کی درخواست انھوں نے نہیں کی ہوتی، کیونکہ وہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے اور ان کی ضروریات سے پوری طرح آگاہ ہے۔

﴿۳﴾ وَالْكَافِرُونَ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ: یہ قرآن مجید کا عام طریقہ ہے کہ ترغیب کے ساتھ ترہیب بھی ہوتی ہے۔ یعنی جو لوگ توبہ کے بجائے کفر پر اصرار کرتے اور اسی حالت میں مر جاتے ہیں ان کے لیے شدید عذاب ہے۔

آیت 27 ﴿۱﴾ وَلَوْ بَسَطَ اللَّهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهِ لَبَغَّوْا فِي الْأَرْضِ: یہ ایک سوال کا جواب ہے جو یہاں ذہن میں پیدا

ہو سکتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ ایمان اور عمل صالح والوں کی دعا بہت جلدی قبول فرماتا ہے تو یہ لوگ تو رزق کی فراخی کی دعا بھی کرتے ہیں، اس کے باوجود ان پر رزق کی تنگی کیوں ہے؟ ابتدائے اسلام میں ایمان والوں پر رزق کی بہت تنگی آئی، خصوصاً جب کفار نے ان کے ساتھ میل جول اور خرید و فروخت، غرض تمام چیزوں کا بائیکاٹ کر دیا۔ جواب یہ دیا گیا کہ ایسا نہیں ہے کہ وہ جتنا رزق مانگیں انھیں اتنا ہی دے دیا جائے، بلکہ اللہ تعالیٰ ان کا رزق ان کی مصلحت کے مطابق ایک اندازے کے ساتھ

مَا يَشَاءُ إِنَّهُ بِعِبَادِهِ خَبِيرٌ بَصِيرٌ ﴿۷۵﴾

زمین میں سرکش ہو جاتے اور لیکن وہ ایک اندازے کے ساتھ اتارتا ہے، جتنا چاہتا ہے، یقیناً وہ اپنے بندوں سے
 محبوب باخبر، خوب دیکھنے والا ہے ﴿۷۵﴾

جتنا چاہتا ہے نازل فرماتا ہے۔ اگر وہ ان کے تقاضے کے مطابق ان کے لیے رزق فراخ کر دیتا تو یقیناً وہ زمین میں سرکش ہو
 جاتے، کیونکہ عام طور پر آدمی جب غنی ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کو بھول جاتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿كَلَّا إِنَّ الْإِنْسَانَ لِكَفْرٍ أَذِيٌّ ۗ أَنْ
 زَاكَ اسْتَفْتَنِي﴾ [العلق: ۷۰، ۷۱] ”ہرگز نہیں، بے شک انسان یقیناً حد سے نکل جاتا ہے۔ اس لیے کہ وہ اپنے آپ کو دیکھتا
 ہے کہ غنی ہو گیا ہے۔“ اور مال و دولت کی کثرت اسے لوگوں پر زیادتی پر ابھارتی ہے۔ قارون اور فرعون کا حال دیکھ لو! اگر ان
 کے پاس اتنی دولت نہ ہوتی تو اس طرح برباد نہ ہوتے۔ اس لیے مومنوں کے حق میں خیر یہی ہے کہ ان کا رزق زیادہ فراخ نہ
 کیا جائے، اگرچہ اس کے خیر ہونے کا پورا ادراک انھیں دیر سے یعنی قیامت کے دن ہوگا۔ اس کے علاوہ مال کی کمی کا مومن کو
 ایک اور فائدہ بھی ہے کہ اسے عمل صالح کے لیے فراغت حاصل رہتی ہے اور وہ زیادہ سے زیادہ دنیا کمانے میں مشغول رہ کر
 آخرت کی تیاری سے غافل نہیں ہوتا، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ ابو عبیدہ رضی اللہ عنہما بحرین سے جزیے کا مال لے کر آئے تو انصار صحیح
 کی نماز میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ شامل ہوئے اور بعد میں آپ کے سامنے آ بیٹھے، آپ ﷺ انھیں دیکھ کر مسکرائے اور
 فرمایا: ﴿أَطْنُكُمْ قَدْ سَمِعْتُمْ أَنَّ أَبَا عُبَيْدَةَ قَدْ جَاءَ بِشَيْءٍ؟ قَالُوا أَجَلُ يَا رَسُولَ اللَّهِ! قَالَ فَأَبَشِرُوا وَأَمْلُوا مَا
 يَسُرُّكُمْ، فَوَاللَّهِ! لَا الْفَقْرَ أَحْسَنِي عَلَيْكُمْ، وَلَكِنْ أَحْسَنِي عَلَيْكُمْ أَنْ تُبْسَطَ عَلَيْكُمُ الدُّنْيَا كَمَا بُسِطَتْ عَلَيَّ
 مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ، فَتَنَافَسُوهَا كَمَا تَنَافَسُوهَا وَتُهْلِكُكُمْ كَمَا أَهْلَكْتُمْ﴾ [بخاری، الحزبية والموادعة، باب الحزبية
 والموادعة مع أهل الذمة والحرب: ۳۱۵۸] ”میرا خیال ہے تم نے سنا ہے کہ ابو عبیدہ کچھ لے کر آئے ہیں؟“ انھوں نے کہا:
 ”جی ہاں، یا رسول اللہ!“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”تو خوش ہو جاؤ اور خوش کرنے والی چیزوں کی امید رکھو، پس اللہ کی قسم! میں تم
 پر فقیری سے تو ڈرتا ہی نہیں، بلکہ تم پر اس بات سے ڈرتا ہوں کہ تم پر دنیا فراخ کر دی جائے، جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر فراخ
 کر دی گئی، تو تم ایک دوسرے سے زیادہ اس میں رغبت کرنے لگو، جیسا کہ انھوں نے ایک دوسرے سے بڑھ کر اس میں رغبت
 کی اور وہ تمہیں اسی طرح ہلاک کر دے جس طرح اس نے انھیں ہلاک کر دیا۔“

﴿۷۵﴾ ”وَلَوْ بَسَطَ اللَّهُ الْبَرِّقَ لِعِبَادِهِ لَبَغَوْا فِي الْأَرْضِ“ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر اپنا احسان بھی بتلایا ہے کہ اگر وہ
 چاہتا تو یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ لوگ زمین میں سرکشی کریں گے ان کا رزق فراخ کر دیتا، جیسا کہ اس نے فرعون کا رزق یہ
 جاننے کے باوجود فراخ کر دیا۔ چنانچہ اگر اسے ملک مصر نہ ملتا تو وہ کبھی خدائی کا دعویٰ نہ کرتا۔ لہذا رزق کی تنگی بھی اہل ایمان
 کے لیے ایک انعام ہے جس کا شکر ان پر واجب ہے۔

﴿۷۶﴾ آیت کے الفاظ ”وَلَوْ بَسَطَ اللَّهُ الْبَرِّقَ لِعِبَادِهِ“ مومن و کافر دونوں کے لیے عام ہیں۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی
 نکوئی تدبیر کا بھی ذکر فرمایا ہے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ نے مومن ہوں یا کافر سب کا رزق برابر نہیں رکھا، کسی کا زیادہ ہے کسی کا

وَهُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْ بَعْدِ مَا قَطَطُوا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهُ ۗ وَهُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيدُ ﴿۷۸﴾

اور وہی ہے جو بارش برساتا ہے، اس کے بعد کہ وہ ناامید ہو چکے ہوتے ہیں اور اپنی رحمت پھیلا دیتا ہے اور وہی مدد کرنے والا ہے، تمام تعریفوں کے لائق ہے ﴿۷۸﴾

کم، تاکہ لوگ ایک دوسرے کے محتاج رہیں اور ایک دوسرے سے کام لے سکیں۔ (دیکھیے زخرف: ۳۲) اسی طرح اس نے کسی کو ایک حد سے زیادہ رزق نہیں دیا، ورنہ لوگ زیادہ روزی پا کر زمین میں سرکشی اور فساد کرتے۔ رہے وہ لوگ جو رزق کی فراخی کی وجہ سے زمین میں فساد کرتے ہیں ان کا فساد اس فساد کے مقابلے میں کچھ حیثیت نہیں رکھتا جو وہ اپنی مرضی کے مطابق مال ملنے کی صورت میں برپا کرتے۔ اب اگر کوئی فساد فی الارض کرتا ہے تو وہ ایک حد سے نہیں بڑھ سکتا۔ کوئی کتنا بھی بڑا باغی ہو سب اپنی حد میں رہنے پر مجبور ہیں۔

﴿۷۸﴾ وَلَٰكِن يُنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَاءُ: اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ حجر (۲۱)، رعد (۸) اور سورہ قمر (۴۹) کی تفسیر۔

﴿۷۹﴾ إِنَّكَ بِعِبَادِهِ خَبِيرٌ بَصِيرٌ: اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ بنی اسرائیل کی آیت (۳۰) کی تفسیر۔

آیت 28 ﴿۱﴾ وَهُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْ بَعْدِ مَا قَطَطُوا: ”الْغَيْثُ“ وہ بارش جو خشک سالی کے بعد آئے، کیونکہ اس کے ذریعے سے لاچار اور بے بس انسانوں اور جانوروں کی مدد ہوتی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ عَامٌ فِيهِ يُغَاثُ النَّاسُ﴾ [یوسف: ۴۹] ”پھر اس کے بعد ایک سال آئے گا جس میں لوگوں پر بارش ہوگی۔“ یہ بیان کرنے کے بعد کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو ان کی ضرورت سے زیادہ نہیں دیتا، کیونکہ اسے معلوم ہے کہ ان کے تقاضے کے مطابق رزق میں اضافہ ان کی سرکشی اور نظام عالم کی خرابی کا باعث ہے، یہ ذکر فرمایا کہ اگر انھیں بارش کی ضرورت ہو، جس پر تمام جانداروں کی زندگی کا دار و مدار ہے، خواہ انسان ہوں یا حیوان، چرند پرند ہوں یا درندے یا حشرات الارض ہوں تو وہ انھیں اپنی رحمت سے ضرور نوازتا ہے۔ چنانچہ فرمایا، اور وہی ہے جو بارش برساتا ہے۔

﴿۲﴾ مِنْ بَعْدِ مَا قَطَطُوا: ”قَطَطُوا“ کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ حم السجدہ کی آیت (۴۹) کی تفسیر۔ اس کے بعد کہ وہ ناامید ہو چکے ہوتے ہیں اور اس ناامیدی کے آثار ان کے چہروں پر ظاہر ہو چکے ہوتے ہیں، یعنی وہ ایک مدت کی قحط سالی کی وجہ سے بارش برسنے سے ناامید ہو چکے ہوتے ہیں۔ اس آیت میں مادہ پرستوں کا رد بھی ہے جن کا کہنا ہے کہ دنیا میں اسباب کے مطابق سب کچھ خود بخود ہو رہا ہے، نہ اس کائنات کا کوئی پیدا کرنے والا ہے اور نہ کوئی اسے اپنی مرضی کے مطابق چلانے والا ہے۔ رد اس طرح ہے کہ ان لوگوں کے کہنے کے مطابق طبعی طور پر سورج کی تپش کے ساتھ سمندر سے بخارات اٹھتے ہیں جو بادلوں کی صورت اختیار کرتے اور زمین پر برستے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ پھر ایک زمین، ایک سمندر، ایک سورج اور تمام اسباب یکساں ہونے کے باوجود ہر جگہ ہمیشہ ایک جیسی بارش کیوں نہیں ہوتی؟ یقیناً یہ سب کچھ ان تمام چیزوں کے مالک کے اختیار میں ہے، وہ جہاں چاہتا ہے سالہا سال تک قحط اور خشک سالی مسلط کر دیتا ہے، پھر جب چاہتا ہے دوبارہ بارش کا سلسلہ شروع فرما دیتا ہے۔

وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ نَصِيبَةٍ فِيمَا كَسَبْتُمْ أَيْدِيَكُمْ وَيَعْفُوا عَنْ كَثِيرٍ ﴿۳۰﴾

اور جو بھی تمہیں کوئی مصیبت پہنچی تو وہ اس کی وجہ سے ہے جو تمہارے ہاتھوں نے کمایا اور وہ بہت سی چیزوں سے درگزر کر جاتا ہے ﴿۳۰﴾

ساتھ ساتھ چل بھی سکتے ہیں، مگر ان تالیوں کی ضرورت تب ہے جب آسمانوں میں جانوروں کا وجود ناممکن ہو۔ جب اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ اللہ کی نشانیوں میں سے وہ جانور بھی ہیں جو اس نے زمین و آسمان میں پھیلا دیے ہیں تو ہمیں یہ بات ماننے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے کہ آسمانوں میں بھی جانور موجود ہیں، خصوصاً جنت میں جہاں ہر نعمت موجود ہے، اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہاں کتنی قسم کے خوبصورت جانور موجود ہیں۔

﴿۳۰﴾ وَهُوَ عَلَىٰ جَنبِهِمْ إِذَا يَشَاءُ قَدِيرٌ: جس طرح زمین و آسمان کے جانوروں کو پیدا کرنا اور پھیلانا اللہ تعالیٰ کی نشانی ہے اسی طرح انہیں جمع کرنے پر قدرت بھی بہت بڑی نشانی ہے۔ انسان کا حال تو یہ ہے کہ وہ پرندوں کے ایک جھنڈ کے نکھرنے والے پرندوں کو جمع نہیں کر سکتا، نہ شہد کے کسی چھتے سے نکھرنے والی مکھیوں کو جمع کر سکتا ہے، حتیٰ کہ اپنے ہم سبق ساتھیوں کو اکٹھا نہیں کر سکتا، خواہ وہ زندہ ہی ہوں۔ یہ رب تعالیٰ ہی ہے جو تمام جانوروں کو، زندہ ہوں یا مردہ، جمع کرنے پر پوری طرح قادر ہے۔ چنانچہ قیامت کے دن وہ انسانوں کے ساتھ جانوروں کو بھی دوبارہ زندہ فرمائے گا، فرمایا: ﴿يَوْمَ يُجْعَلُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذَلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ﴾ [التعابن: ۹] ”جس دن وہ تمہیں جمع کرنے کے دن کے لیے جمع کرے گا، وہی ہار جیت کا دن ہے۔“

آیت 30 ﴿۳۰﴾ وَ مَا أَصَابَكُمْ مِنْ نَصِيبَةٍ فِيمَا كَسَبْتُمْ أَيْدِيَكُمْ: اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور نشانیوں کا تذکرہ ہو رہا ہے، اس سلسلے میں لوگوں کے بارش سے ناامید ہونے کے بعد بارش برسانے کا ذکر ہوا ہے۔ اس پر سوال ہو سکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ اس قدر مہربان ہے تو وہ بارش روک کیوں دیتا ہے؟ فرمایا، تم پر جو مصیبت بھی آتی ہے وہ تمہاری کمائی کا نتیجہ ہے۔ وہ گناہ بھی ہو سکتے ہیں اور اونچی شان والے حضرات پر اللہ تعالیٰ کے جس قدر انعامات ہیں ان کا حق ادا کرنے میں کسی طرح کی کمی بھی۔ اس لیے تیسرے بھی اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتے ہیں۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿وَاللَّهِ! إِنِّي لَأَسْتَغْفِرُ اللَّهَ وَ أَتُوبُ إِلَيْهِ فِي الْيَوْمِ أَكْثَرَ مِنْ سَبْعِينَ مَرَّةً﴾ [بخاری، الدعوات، باب استغفار النبي ﷺ فِي الْيَوْمِ وَاللَّيْلَةِ: ۶۳۰۷] ”اللہ کی قسم! میں دن میں ستر (۷۰) بار سے زیادہ اللہ سے استغفار اور اس کی طرف توبہ کرتا ہوں۔“ انسان پر آنے والی ان مصیبتوں کا انجام مومن و کافر کے حق میں ایک جیسا نہیں ہوتا، بلکہ وہ کافر کے لیے عذاب ہوتی ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِنَ الْعَذَابِ الْأَلَذِيِّ ذُوقًا فَالَّذِي كَفَرُوا لَعَلَّهُمْ يُرْجَعُونَ﴾ [السجدة: ۲۶] ”اور یقیناً ہم انہیں قریب ترین عذاب کا کچھ حصہ سب سے بڑے عذاب سے پہلے ضرور چکھائیں گے، تاکہ وہ پلٹ آئیں۔“ اور مومن کے لیے گناہوں کی معافی، اجر اور درجات کی بلندی کا باعث بنتی ہیں۔ ابو سعید خدری اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ

وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ فِي الْأَرْضِ ۚ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ﴿۳۱﴾
وَمِنْ آيَاتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْأَعْلَامِ ﴿۳۲﴾

اور نہ تم زمین میں (اللہ کو) کسی صورت عاجز کرنے والے ہو اور نہ اللہ کے علاوہ تمہارا کوئی دوست ہے اور نہ کوئی مددگار ﴿۳۱﴾ اور اسی کی نشانیوں سے سمندر میں چلنے والے جہاز ہیں، جو پہاڑوں جیسے ہیں ﴿۳۲﴾

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «مَا يُصِيبُ الْمُسْلِمَ مِنْ نَصَبٍ، وَلَا وَصَبٍ، وَلَا هَمٍّ، وَلَا حُزْنٍ، وَلَا أَذًى، وَلَا غَمٍّ، حَتَّى الشُّوْكَةِ يُشَاكُهَا، إِلَّا كَفَّرَ اللَّهُ بِهَا مِنْ خَطَايَاهُ» [بخاری، المرضی، باب ما جاء في كفارة المرض: ۵۶۴۱، ۵۶۴۲] ”مومن کو جو بھی دکھ یا چوٹ یا فکر یا حزن یا تکلیف یا غم پہنچتا ہے، حتیٰ کہ کانٹا بھی جو اسے لگتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے سے اس کے کچھ گناہ دور فرمادیتا ہے۔“

یہاں ایک مشہور سوال ہے کہ بچے اور دیوانے پر آنے والی مصیبتیں بھی کیا ان کے اعمال کا نتیجہ ہیں؟ جواب یہ ہے کہ آیت میں خطاب ان لوگوں سے ہے جو مکلف ہیں، بچے اور دیوانے مکلف ہی نہیں، نہ ان پر آنے والی مصیبتیں ان کے گناہوں کی وجہ سے آتی ہیں، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے تحت آتی ہیں، جسے وہی بہتر جانتا ہے۔

بیماری اور مصیبت کے اجر اور درجات کی بلندی کا باعث بننے کی دلیل قرآن مجید کی آیات، مثلاً سورہ توبہ کی آیت (۱۲۰) کے علاوہ بہت سی احادیث بھی ہیں۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں، میں رسول اللہ ﷺ کے پاس گیا، آپ ﷺ بخار میں تپ رہے تھے۔ میں نے کہا: ”یا رسول اللہ! آپ کو بہت سخت بخار ہوتا ہے۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: «أَجَلٌ، إِنِّي أُوعِكَ كَمَا يُوعِكَ رَجُلَانِ مِنْكُمْ، قُلْتُ ذَلِكَ بَأَنَّ لَكَ أَجْرَيْنِ؟ قَالَ أَجَلٌ ذَلِكَ كَذَلِكَ، مَا مِنْ مُسْلِمٍ يُصِيبُهُ أَذًى، شَوْكَةٌ فَمَا فَوْقَهَا إِلَّا كَفَّرَ اللَّهُ بِهَا سَيِّئَاتِهِ، كَمَا تَحُطُّ الشَّجَرَةُ وَرَقَهَا» [بخاری، المرضی، باب أشد الناس بلاء الأنبياء، ثم الأمثل فالأمثل: ۵۶۴۸] ”ہاں، مجھے اتنا بخار ہوتا ہے جتنا تم میں سے دو آدمیوں کو ہوتا ہے۔“ میں نے کہا: ”یہ اس لیے کہ آپ کو دو اجر ملتے ہیں؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”ہاں! یہی بات ہے، جس مسلم کو بھی کوئی تکلیف پہنچے، کانٹا ہو یا اس سے اوپر، اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ اس کی برائیاں گرا دیتا ہے جیسے درخت اپنے پتے گرا دیتا ہے۔“

﴿وَيَنْفَعُوا عَنِ كَثِيرٍ﴾: اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ نحل (۶۱) اور سورہ فاطر (۴۵) کی تفسیر۔

آیت 31 ﴿وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ فِي الْأَرْضِ ۚ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ﴾ اور سورہ عنکبوت (۲۲) کی تفسیر۔

آیت 32 ﴿وَمِنْ آيَاتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْأَعْلَامِ﴾: ”الْجَوَارِ“ (چلنے والی) کی جمع ہے، یعنی کشتی یا بحری جہاز، جیسا کہ فرمایا: ﴿إِنَّا لَنَّا طَعْنَا النَّاءَ حَمَلْنَاكُمْ فِي الْجَارِيَةِ﴾ [الحاقة: ۱۱] ”بے شک ہم نے ہی جب پانی حد سے تجاوز کر گیا تمہیں کشتی میں سوار کیا۔“ ”الْأَعْلَامُ“ ”علمت“ کی جمع ہے، پہاڑ۔ اصل میں کوئی نشان جس سے کسی چیز کا علم ہو،

إِنْ يَشَأْ يُسْكِنَ الرِّيحَ فَيَظْلَنَ رَوَاكِدَ عَلَى ظَهْرِهِ ۗ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ ﴿۳۳﴾ أَوْ يُوقِفَهُنَّ بِمَا كَسَبُوا وَيَعْفُ عَنْ كَثِيرٍ ﴿۳۴﴾

اگر وہ چاہے ہوا کو ٹھہرا دے تو وہ اس کی سطح پر کھڑے رہ جائیں۔ بے شک اس میں ہر ایسے شخص کے لیے یقیناً کئی نشانیاں ہیں جو بہت صبر کرنے والا، بہت شکر کرنے والا ہے ﴿۳۳﴾ یا وہ انہیں اس کی وجہ سے ہلاک کر دے جو انہوں نے کمایا اور (چاہے تو) بہت سے لوگوں سے درگزر کر دے ﴿۳۴﴾

مثلاً جھنڈا وغیرہ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے سمندر میں چلنے والے بحری جہاز بھی ہیں جو پہاڑوں کی طرح بلند ہیں اور دور سے نظر آتے ہیں۔ پانی میں مخصوص حجم اور وزن والی چیز کو اٹھائے رکھنے کی خاصیت اللہ واحد کی پیدا کردہ ہے، جس کی وجہ سے وہ ہزاروں لاکھوں ٹن کے بحری جہازوں کو اپنے سینے پر اٹھائے رکھتا ہے، جن سے تم بے شمار منافع حاصل کرتے ہو۔ یہاں جہازوں کے لیے ”الْفُلُكُ“ کے بجائے ”الْجَوَارِ“ کے لفظ کے ساتھ اس نعمت کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ ان جہازوں کو پانی میں ڈوبنے سے بچائے رکھنے کے ساتھ انہیں پانی میں چلانے کی نعمت پر بھی غور کرو، اگر یہ نعمت نہ ہوتی تو جس طرح خشک زمین پر کھڑی عمارتیں اگرچہ زمین میں نہیں دھنستیں، مگر جتنی بھی تیز ہوا آ جائے ایک انچ بھی ادھر سے ادھر نہیں ہوتیں، اسی طرح یہ جہاز بھی پانی پر کھڑے رہتے۔ تو کوئی اور ہے تو لاؤ جو کہے کہ میں نے سمندر کو پیدا کیا، یا پانی میں یہ تاثیر رکھی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید و قدرت کی اس نشانی اور عظیم نعمت کا متعدد مقامات پر ذکر فرمایا ہے۔ دیکھیے سورہ یس (۳۱ تا ۳۴)، بقرہ (۱۶۳)، نحل (۱۳) اور سورہ فاطر (۱۲)۔

آیت 34. 33 ﴿۱﴾ إِنْ يَشَأْ يُسْكِنَ الرِّيحَ : ”رَوَاكِدَ“ ”رَكْدَ يَرُكُدُ رُكُودًا“ (ن) سے اسم فاعل ”رَاكِدَةٌ“ کی جمع ہے۔ نزول قرآن کے وقت سمندر میں بادبانی کشتیاں اور جہاز چلتے تھے، جن کے چلنے نہ چلنے کا اور ست یا تیز رفتار سے چلنے کا دارو مدار ہوا پر ہوتا تھا۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے سمندروں میں جہازوں کو چلانے والی ہواؤں کی تین حالتیں بیان فرمائی ہیں، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ ہوا کو ساکن کر دے اور جہاز جہاں کھڑے ہیں وہیں کھڑے رہ جائیں، پھر اللہ تعالیٰ کے سوا کون ہے جو اس ہوا کو چلا دے؟

﴿۲﴾ أَوْ يُوقِفَهُنَّ بِمَا كَسَبُوا: اس کا عطف ”يُسْكِنَ الرِّيحَ“ پر ہے، گویا عبارت اس طرح ہے: ”إِنْ يَشَأْ يُسْكِنَ الرِّيحَ أَوْ إِنْ يَشَأْ يُوقِفَهُنَّ بِمَا كَسَبُوا“ یعنی ”اگر وہ چاہے تو ہوا کو ساکن کر دے یا اگر وہ چاہے تو ان کے اعمال بد کی وجہ سے تند و تیز طوفانی ہوا کے ساتھ انہیں ہلاک کر دے۔“ یہ ہوا کی دوسری حالت ہے، تفصیل کے ساتھ اس کا ذکر ایک اور آیت میں ہے، فرمایا: ﴿حَقِّي إِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلِكِ وَجَرَيْنَ بِيَمِينِ طَبِيبٍ وَفَرَحُوا بِمَا جَاءَ نَهَا رِيحٌ عَاصِفٌ﴾ [یونس: ۲۲] ”یہاں تک کہ جب تم کشتیوں میں ہوتے ہو اور وہ انہیں لے کر عمدہ ہوا کے ساتھ چل پڑتی ہیں اور وہ اس پر خوش ہوتے ہیں تو ان (کشتیوں) پر سخت تیز ہوا آ جاتی ہے۔“

فَمَا أُوْتِيْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۗ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ ۗ وَ اَبْقٰ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
وَ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۳۶﴾

پس تمہیں جو بھی چیز دی گئی ہے وہ دنیا کی زندگی کا معمولی سامان ہے اور جو اللہ کے پاس ہے وہ بہتر اور زیادہ باقی رہنے والا ہے، ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے اور صرف اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں ﴿۳۶﴾

آئیں۔ بعض مفسرین نے محذوف جملے کے لیے اس سے مختلف الفاظ بھی ذکر فرمائے ہیں، مقصد سب کا یہی ہے کہ ”وَ يَتَعَلَّمُ
الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْ اٰيٰتِنَا“ میں گزشتہ چیزوں کی علت بیان ہوئی ہے۔ علت والے جملے کے حذف کی قرآن مجید میں کئی
مثالیں ملتی ہیں، جیسے فرمایا: ﴿وَلِنَجْعَلَ لَهَا آيَةً لِّلنَّاسِ﴾ [مریم: ۲۱] ”اور تاکہ ہم اسے لوگوں کے لیے بہت بڑی نشانی
بنائیں۔“ اور جیسے فرمایا: ﴿وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَ لِيُبْجِزَ كُلَّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ﴾ [الحانبیہ: ۲۲] ”اور
اللہ نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا اور تاکہ ہر شخص کو اس کا بدلہ دیا جائے جو اس نے کمایا۔“

آیت 36 ﴿۱﴾ فَمَا أُوْتِيْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا: ”متاع“ وہ چیز جس سے فائدہ اٹھایا جائے، برتنے
کی چیز جو جلدی ختم ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید اور قدرت و سلطنت کے دلائل مثلاً بندوں کے لیے بارش برسائے،
انہیں حسب حکمت رزق عطا فرمانے، آسمان و زمین کو پیدا کرنے، ان میں بے شمار جانداروں کو پھیلانے، سمندروں میں
پہاڑوں جیسے بلند جہازوں کے چلنے اور انہیں پیش آنے والے احوال ذکر کرنے کے بعد دنیا کی زندگی کے ساز و سامان کے بے وقعت
اور عارضی ہونے کا ذکر فرمایا، کیونکہ دنیا کی زیب و زینت ہی انسان کو دلائل پر غور و فکر کرنے میں رکاوٹ بنتی ہے۔ جب وہ اس کی
حقیقت سے آگاہ ہوگا اور وہ اس کی نگاہ میں حقیر ہوگی تو اسے آخرت کی طرف توجہ کا موقع ملے گا اور وہ دلائل پر غور بھی کرے گا۔
﴿۲﴾ دنیا میں انسان کو جو چیز بھی دی گئی ہے، وہ خواہ کتنی زیادہ ہو یا کتنی قیمتی ہو، اس میں سے کوئی بھی ایسی نہیں جس پر انسان
پھول جائے اور آخرت سے بے پروا ہو جائے، کیونکہ ایک تو وہ بہت تھوڑی مدت کے لیے اس کے استعمال میں آتی ہے، پھر وہ
سب کچھ چھوڑ کر خالی ہاتھ یہاں سے رخصت ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی ملکیت میں خواہ کتنی لمبی چوڑی جائداد یا دولت
ہو عملاً اس کے استعمال میں اس کا معمولی سا حصہ ہی آتا ہے۔ اے انسان! تیرے لیے اس لمبی چوڑی جائداد میں سے کوئی
ہے: ﴿مَا اَكَلْتُمْ فَاَقْبَيْتُمْ اَوْ لَبَسْتُمْ فَاَنْبَلَيْتُمْ﴾ [مسلم، الزهد و الرقائق، باب: ۲۹۵۸] ”جو تو نے کھالیا اور فنا کر دیا، یا جو
پہن لیا اور پرانا کر دیا۔“ ایسی ناپائیدار چیز کے پیچھے اپنی عمر عزیز وہ شخص کبھی برباد نہیں کر سکتا جو اس کی حقیقت سے آگاہ ہو۔
مزید دیکھیے سورہ رعد (۲۶)۔

﴿۳﴾ وَ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ ۗ وَ اَبْقٰ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
پائیدار اور لازوال بھی۔

﴿۴﴾ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ: یہاں سے ان لوگوں کی صفات بیان فرمائیں جو اللہ تعالیٰ کے ہاں آخرت میں
کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

وَالَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبِيرَ الْإِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ ﴿۳۷﴾

اور وہ لوگ جو بڑے گناہوں سے اور بے حیائیوں سے بچتے ہیں اور جب بھی غصے ہوتے ہیں وہ معاف کر دیتے ہیں ﴿۳۷﴾

لئے والی نعمتوں کے حق دار ہوں گے۔ ان میں سب سے پہلی صفت ”امُّنُوا“ ماضی کے صیغے کے ساتھ ہے اور ”يَتَوَكَّلُونَ“ مضارع کے صیغے کے ساتھ کا مطلب یہ ہے کہ وہ خوب سوچ سمجھ کر ایمان لا چکے اور ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں، اس کے رسولوں، اس کی کتابوں، اس کی تقدیر اور اس کے روز جزا پر پورا یقین آچکا، اب ان کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے ہر کام میں ہمیشہ صرف اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں، کسی اور سے انھیں نفع کی امید ہے نہ کسی نقصان کا خوف۔ ”يَتَوَكَّلُونَ“ مضارع کا صیغہ بیٹھکی پر دلالت کرتا ہے۔

آیت ۳۷ : ﴿۳۷﴾ وَالَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبِيرَ الْإِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ : ایمان و توکل کے بعد پہلے ان چیزوں کا ذکر فرمایا جن سے اجتناب ضروری ہے، وہ ہیں کبائر و فواحش اور غضب۔ ”کبائر“ کی تعریف کے لیے دیکھیے سورہ نساء کی آیت (۳۱)۔ ”الْفَوَاحِشُ“ ”فاحشۃ“ کی جمع ہے، کوئی بھی قول یا فعل جس کی قباحت حد سے بڑھی ہوئی ہو، مثلاً زنا، قوم لوط کا عمل اور شدید بخل وغیرہ۔ (دیکھیے سورہ بقرہ: ۲۶۸) آیت میں ”کبائر“ کا لفظ عام ہے، جس میں فواحش بھی آجاتے ہیں، مگر ”فواحش“ کا ذکر ان سے نفرت دلانے کے لیے خاص طور پر الگ بھی فرمایا۔ شیخ عبدالرحمان السعدی نے فرمایا کہ فواحش ان بڑے گناہوں کو کہتے ہیں جن کی رغبت انسانی طبیعت میں پائی جاتی ہو۔ مزید دیکھیے سورہ بنی اسرائیل (۳۲)۔

﴿۳۷﴾ وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ : غصے کی حالت میں معاف کر دینے کا ذکر خاص طور پر فرمایا، کیونکہ یہ کام وہی لوگ کر سکتے ہیں جو نہایت مضبوط ارادے کے مالک ہوں، کیونکہ عموماً غصے میں آدمی عقل و ہوش سے عاری ہو جاتا ہے۔ اس حال میں اپنے آپ پر قابو رکھنا آدمی کی کمال عقل اور ضبط نفس کی دلیل ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿لَيْسَ الشَّدِيدُ بِالصُّرْعَةِ إِنَّمَا الشَّدِيدُ الَّذِي يَمْلِكُ نَفْسَهُ عِنْدَ الْغَضَبِ﴾ [بخاری، الأدب، باب الحدیث من الغضب: ۶۱۱۹] ”پہلوان وہ نہیں جو دوسروں کو پھینچاڑ دے، پہلوان صرف وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے آپ پر قابو رکھے۔“ نبی کریم ﷺ میں عقو و درگزر کی خوبی بدرجہ اتم پائی جاتی تھی۔ (دیکھیے آل عمران: ۱۵۹) عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ﴿مَا أَنْتَقَمَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِنَفْسِهِ فِي شَيْءٍ يُؤْتِيهِ حَتَّى يَنْتَهَكَ مِنْ حُرْمَاتِ اللَّهِ فَيَنْتَقِمُ لِلَّهِ﴾ [بخاری، الحدود، باب كذب التعزير و الأدب: ۶۸۵۳] ”رسول اللہ ﷺ نے اپنی ذات کے لیے کسی معاملے کا انتقام نہیں لیا جو آپ سے کیا گیا۔ ہاں! اللہ تعالیٰ کی حرمتوں میں سے کسی کو توڑا جاتا تو آپ اللہ کی خاطر انتقام لیتے۔“ مزید دیکھیے سورہ آل عمران (۱۳۳، ۱۳۴) خلفائے راشدین میں بھی یہ وصف بدرجہ کمال موجود تھا، جیسا کہ ان کی سیرت سے ظاہر ہے۔

وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَمْرُهُمْ شُرَىٰ بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ

يُنْفِقُونَ ﴿۳۸﴾

اور وہ لوگ جنہوں نے اپنے رب کا حکم مانا اور نماز قائم کی اور ان کا کام آپس میں مشورہ کرنا ہے اور ہم نے انہیں کچھ دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں ﴿۳۸﴾

آیت 38 ﴿۳۸﴾ وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ : واجب الاجتناب چیزوں کے بعد ان اوصاف کا ذکر فرمایا جن سے آراستہ ہونا ضروری ہے۔ وہ چار ہیں، جن پر عمل اتحاد امت کا اور دنیا و آخرت میں کامیابی کا ضامن ہے۔ اجابت اور استجابت دونوں کا معنی ”قبول کرنا“ ہے، مگر استجابت میں حروف زائد ہونے کی وجہ سے معنی میں مبالغہ پیدا ہو گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کا رب انہیں جس کام کے لیے بلاتا ہے وہ فوراً اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں، نہ دیر کرتے ہیں نہ ٹال منول سے کام لیتے ہیں اور ان کے رب کا ان سے تقاضا بھی یہی ہے۔ دیکھیے سورہ انفال (۲۳)۔

﴿۳۹﴾ وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ : ان چار اوصاف میں سے سب سے پہلے نماز قائم کرنے کا ذکر فرمایا، کیونکہ اسلام قبول کرنے کے بعد سب سے پہلا اور سب سے اہم فریضہ یہی نماز قائم کرنا ہے جو سب کے سامنے مسلم و کافر کے درمیان خط امتیاز کھینچ دیتا ہے۔ دیکھیے سورہ توبہ (۱۱، ۵)۔

﴿۴۰﴾ وَأَمْرُهُمْ شُرَىٰ بَيْنَهُمْ : ”شَارَ يَشُورُ شُورًا“ (ن) ”وَأَشْتَارَ الْعَسَلُ“ چھتے سے شہد نکالنا۔ مشورے کو مشورہ اور شوریٰ اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ بہت سے لوگوں کی رائے حاصل کرنے کا نام ہے۔ یہ دوسرا وصف ہے۔ وہ کام جن میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے واضح احکام موجود ہیں ان میں مشورے کی ضرورت ہے نہ اجازت کی، ان میں استجابت کے علاوہ کوئی راستہ نہیں۔ ان کے علاوہ مسلمانوں کے ایک دوسرے سے تعلق رکھنے والے تمام معاملات باہمی مشورے سے طے پاتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ تمام لوگوں کی بہتر سے بہتر رائے سے آگاہ ہو کر بہترین بات تک پہنچ جاتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی شخص اپنے آپ کو عقل کل نہیں سمجھتا کہ اپنی رائے کو حرف آخر قرار دے کر اس پر اصرار کرے اور فرعون کی طرح کہے: ﴿مَا أُرِيكُمْ إِلَّا مَا أَرَىٰ وَمَا أَهْدِيكُمْ إِلَّا سَبِيلَ الرَّشَادِ﴾ [المؤمن : ۲۹] ”میں تو تمہیں وہی رائے دے رہا ہوں جو خود رائے رکھتا ہوں اور میں تمہیں بھلائی کا راستہ ہی بتا رہا ہوں۔“ کیونکہ یہ رویہ کوئی متکبر شخص ہی اختیار کرتا ہے، جو دوسروں کو اور ان کی رائے کو کوئی وزن نہ دے، مومن کا معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا﴾ [الفصص : ۸۳] ”یہ آخری گھر، ہم اسے ان لوگوں کے لیے بناتے ہیں جو نہ زمین میں کسی طرح اونچا ہونے کا ارادہ کرتے ہیں اور نہ کسی فساد کا۔“ مومن ہمیشہ خائف رہتا ہے کہ اس سے فہم کی غلطی ہو جائے یا لاعلمی کی وجہ سے یا شیطان یا نفس کے دخل سے غلط فیصلہ کر بیٹھے، اس لیے وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں

وَالَّذِينَ إِذَا أَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُونَ ﴿۳۹﴾

اور وہ لوگ کہ جب ان پر زیادتی واقع ہوتی ہے وہ بدلالتے ہیں ﴿۳۹﴾

سے مشورہ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرم ﷺ کو بھی اپنے صحابہ سے مشورے کا حکم دیا اور آپ ﷺ نے ہمیشہ ان امور میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا جن میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے صریح حکم نہیں تھا۔

﴿۴﴾ آج کل بہت سے لوگ ”شوریٰ“ سے مراد جمہوریت اور ووٹ لیتے ہیں، حالانکہ مشورہ تو خلیفہ بھی کرتا ہے، بادشاہ بھی، جیسے ملکہ سب نے کیا اور چھوٹے سے چھوٹے کنبے کا سربراہ بھی، کیونکہ اس کے بغیر کوئی کام درست طریقے سے چل ہی نہیں سکتا۔ اگر نہ کرنا چاہے تو جمہوری وزیر اعظم بھی مشورے کے بجائے اپنی پارٹی کے ارکان کو اپنی استبدادی رائے پر مجبور کر سکتا ہے، جیسا کہ ہم اپنے ملک میں مشاہدہ کر رہے ہیں۔ مشورے اور جمہوریت کے فرق کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ آل عمران کی آیت (۱۵۹): ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾ کی تفسیر۔ سورہ نمل کی آیت (۳۲) کی تفسیر پر بھی نظر ڈال لیں۔

﴿۵﴾ وَمِنَّا زَكَرِيَّا إِذْ دَعَا رَبَّهُ يَحْضُرُهُمْ يُنْفِقُونَ: یہ تیسرا وصف ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ بقرہ کی آیت (۳) کی تفسیر۔

آیت 39 وَالَّذِينَ إِذَا أَصَابَهُمُ الْبَغْيُ : یہ چوتھا وصف ہے۔ یہاں ایک سوال ہے کہ اس سے پہلے ان کا وصف غصے کے وقت معاف کر دینا ذکر فرمایا ہے اور یہاں انتقام کو ان کی خوبی قرار دیا ہے، تطبیق کیا ہے؟ اس کا بہترین جواب مشہور تابعی ابراہیم نخعی نے دیا ہے، انھوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طرز عمل بیان کرتے ہوئے فرمایا: ”كَانَ الْمُؤْمِنُونَ يَكْرَهُونَ أَنْ يَسْتَدِلُّوا وَكَانُوا إِذَا قَدَرُوا عَفْوًا“ [ابن کثیر بحوالہ ابن ابی حاتم: ۱۸۴۸۶، وقال حکمت بن بشیر سندہ صحیح] ”مومن یہ بات ناپسند کرتے تھے کہ ذلت قبول کریں، مگر جب قدرت پاتے تو معاف کر دیتے تھے۔“ خلاصہ یہ ہے کہ اگر معاف کرنا مجرم کے جرم سے باز آنے کا باعث ہو تو عفو افضل ہے، لیکن اگر معاف کرنے سے اس کی سرکشی میں اور جرم پر جرأت میں اضافہ ہو تو انتقام لینا چاہیے۔ دلیل اس کی لفظ ”الْبَغْيُ“ (سرکشی) ہے۔ ایک شاعر نے کہا ہے ۔

إِذَا أَنْتَ أَكْرَمْتَ الْكَرِيمَ مَلَكَتَهُ وَ إِنْ أَنْتَ أَكْرَمْتَ اللَّئِيمَ تَمَرَّدَا

”جب تم کسی معزز آدمی کی عزت کرو گے تو اس کے مالک بن جاؤ گے اور اگر تم کینے کی عزت کرو گے تو وہ سرکش ہو جائے گا۔“

ابن کثیر نے فرمایا، یعنی ان میں اس شخص سے انتقام لینے کی قوت ہوتی ہے جو ان پر ظلم اور زیادتی کرے، نہ وہ عاجز ہوتے ہیں نہ ذلیل، بلکہ جو سرکشی کرے اس سے انتقام کی قدرت رکھتے ہیں، اس کے باوجود جب قابو پالیتے ہیں تو معاف کر دیتے ہیں، جیسا کہ یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے کہا: ﴿لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمْ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللهُ لَكُمْ﴾ [یوسف: ۹۲]

وَجَزَاءٌ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةً مِّثْلَهَا ۗ فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ ۗ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ

اور کسی برائی کا بدلہ اس کی مثل ایک برائی ہے، پھر جو معاف کر دے اور اصلاح کر لے تو اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے۔

”آج تم پر کوئی ملامت نہیں، اللہ تمہیں بخشے۔“ حالانکہ وہ ان کے مواخذے پر اور اس سلوک کا بدلہ لینے پر پوری قدرت رکھتے تھے جو انہوں نے ان کے ساتھ کیا تھا اور جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر ان لوگوں سے فرمایا جنہوں نے آپ سے دشمنی کی انتہا کر دی تھی اور جن کی گردنیں آپ کے ایک اشارے سے تن سے جدا ہو سکتی تھیں: «لَا تَنْزِيلَ عَلَيْكُمْ الْيَوْمَ» [السنن الکبریٰ لسنائی: ۱۱۶۹۸] اور جیسا کہ آپ ﷺ نے ان اسی (۸۰) آدمیوں کو معاف کر دیا جو کوہ عظیم سے آپ پر حملہ آور ہونے کے لیے اترے تھے۔ جب آپ ﷺ نے ان پر قابو پا لیا تو قدرت کے باوجود ان پر احسان فرمادیا۔ اسی طرح آپ ﷺ نے غورث بن حارث کو معاف کر دیا، جس نے آپ کو اچانک قتل کرنے کا ارادہ کیا، جب آپ ﷺ سوائے ہوئے تھے تو اس نے آپ کی تلوار میان سے نکال لی، آپ بیدار ہوئے تو وہ غلی اس کے ہاتھ میں تھی، آپ ﷺ نے اسے جھڑکا تو اس نے نیچے رکھ دی، رسول اللہ ﷺ نے اپنے اصحاب کو بلا کر ساری بات بتائی اور اسے معاف کر دیا۔ (دیکھیے بخاری: ۴۱۳۶) اسی طرح لبید بن اعصم کو معاف کر دیا جس نے آپ پر جادو کیا تھا، اس سے باز پرس بھی نہیں فرمائی۔ (دیکھیے بخاری: ۵۷۶۵) اسی طرح اس یہودی عورت زینب کو معاف فرما دیا جو خیر کے یہودی مرحب کی بہن تھی، جسے محمد بن مسلمہ نے قتل کیا تھا، جس نے خیر کے موقع پر بکری کے بازو میں زہر ملا دیا تھا، بکری کے اس بازو نے آپ کو اس کی اطلاع دے دی، آپ ﷺ نے اس عورت کو بلایا تو اس نے اعتراف کر لیا۔ آپ نے اس سے کہا کہ تمہیں اس کام پر کس چیز نے آمادہ کیا؟ اس نے کہا، میرا ارادہ یہ تھا کہ اگر آپ نبی ہوئے تو یہ آپ کو نقصان نہیں دے گی اور اگر نبی نہ ہوئے تو ہماری جان چھوٹ جائے گی۔ آپ ﷺ نے اسے چھوڑ دیا، مگر جب اس زہر کی وجہ سے بشر بن براء جیٹو فوت ہو گئے تو آپ ﷺ نے ان کے قصاص میں اسے قتل کر دیا۔ (دیکھیے بخاری: ۳۱۶۹۔ ابوداؤد: ۴۵۰۹، ۴۵۱۱) ایسی احادیث اور بھی بہت ہیں۔ (و اللہ الحمد) یہ تمام واقعات بخاری و مسلم دونوں میں یا ان میں سے ایک میں موجود ہیں۔

آیت 40 ﴿وَجَزَاءٌ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةً مِّثْلَهَا﴾ سرکشی کرنے والوں سے انتقام کا ذکر مدح کے انداز میں کرنے پر خطرہ تھا کہ انتقام میں حد سے تجاوز نہ ہو جائے، اس لیے اس آیت میں کئی طرح سے زیادتی سے باز رکھنے کا اہتمام فرمایا۔ سب سے پہلے تو یہ کہہ کر کہ ”جَزَاءٌ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةً“ (برائی کا بدلہ برائی ہے) حالانکہ بدلہ تو برائی نہیں، مگر دونوں کی صورت ایک ہونے کی وجہ سے بدلے پر بھی ”سَيِّئَةً“ کا لفظ بولا۔ پھر یہ پابندی لگائی کہ انتقام زیادتی کے عین برابر ہو، اس سے زیادہ نہ ہو، جیسا کہ فرمایا: ﴿فَمَنْ اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ﴾ [البقرة: ۱۹۴] ”جس جو تم پر زیادتی کرے سو تم اس پر زیادتی کرو، اس کی مثل جو اس نے تم پر زیادتی کی ہے۔“ اور فرمایا: ﴿وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ بِهِ﴾ [النحل: ۱۲۶] ”اور اگر تم بدلا لو تو اتنا ہی بدلا لو جتنی تمہیں تکلیف دی گئی ہے۔“

الظَّالِمِينَ ﴿۴۰﴾

بے شک وہ ظالموں سے محبت نہیں کرتا ﴿۴۰﴾

﴿۴۰﴾ ”وَ جَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا“ سے جو احکام حاصل ہوتے ہیں ان میں سے چند کے لیے دیکھیے سورہ نحل کی آیت (۲۶) کی تفسیر۔

﴿۴۱﴾ ”فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ“: ظاہر ہے انتقام لیتے ہوئے اس زیادتی سے ذرہ برابر اضافہ نہ ہونے دینا جو کسی گئی ہے محال نہیں تو بہت مشکل ضرور ہے، اس لیے آخر میں پھر عفو و اصلاح کی طرف توجہ دلاتے ہوئے اس کا اجرا اپنے ذمے لیا۔ ”فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ“ (تو اس کا اجر اللہ پر ہے) اس جملے میں اجر کی جو عظمت بیان ہوئی ہے وہ کسی بھی تفصیل سے اس طرح بیان نہیں ہو سکتی۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «مَنْ نَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِنْ مَالٍ وَمَا زَادَ اللَّهُ عَبْدًا بِعَفْوٍ إِلَّا عِزًّا، وَمَا تَوَاضَعَ أَحَدٌ لِلَّهِ إِلَّا رَفَعَهُ اللَّهُ» [مسلم، البر والصلة، باب استحباب العفو والنواضع: ۲۵۸۸] ”صدقہ کسی مال میں کمی نہیں کرتا اور اللہ تعالیٰ معاف کر دینے کی وجہ سے بندے کی عزت ہی میں اضافہ کرتا ہے اور جو بھی اللہ تعالیٰ کی خاطر نیچا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اسے اونچا کر دیتا ہے۔“

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ کا بہت عمدہ کلام نقل فرمایا ہے، جس میں انہوں نے دو آیات کے حوالے سے اور طبعی و عقلی حوالے سے عفو کی فضیلت بیان کی ہے۔ انہوں نے فرمایا: ”جب کوئی شخص تمہارے پاس کسی شخص کی شکایت لے کر آئے تو اسے کہو، میرے بھائی! اسے معاف کر دو، کیونکہ عفو تقویٰ کے زیادہ قریب ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ أَنْ تَغْفِرُوا أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ﴾ [البقرہ: ۲۳۷] ”اور یہ (بات) کہ تم معاف کر دو تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔“ اگر وہ کہے میرا دل معاف کرنے کو برداشت نہیں کرتا، میں تو انتقام لوں گا، جیسے مجھے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے تو اسے کہو، اگر تم اچھے طریقے سے انتقام لے سکتے ہو تو ٹھیک ہے ورنہ عفو کی طرف پلٹ آؤ، یہ بہت وسعت والا دروازہ ہے، کیونکہ جو معاف کر دے اور اصلاح کرے اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے، فرمایا: ﴿فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ﴾ [الشوریٰ: ۴۰] ”پھر جو معاف کر دے اور اصلاح کر لے تو اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے۔“ اور معاف کر دینے والا رات سکون سے بستر پر سو جاتا ہے، جبکہ انتقام لینے والا مختلف معاملات کی وجہ سے پہلو بدلتا رہتا ہے۔“ [ابن ابی حاتم: ۱۰ / ۲۲۸۰، ح: ۱۸۴۸۸، قال المحقق سندہ صحیح]

﴿۴۲﴾ ”إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ“: سب سے پہلے تو ظالم وہ ہے جو ظلم کرنے میں پہل کرتا ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «الْمُسْتَبَانَ مَا قَالَا فَعَلَى الْبَادِي مَا لَمْ يَعْتَدِ الْمَظْلُومُ» [مسلم، البر والصلة، باب النهي عن السباب: ۲۵۸۷] ”دو گالی گلوچ کرنے والے جو کچھ بھی کہیں وہ پہل کرنے والے پر ہے، جب تک مظلوم زیادتی نہ کرے۔“ پھر مظلوم اگر انتقام میں حد سے بڑھ جائے تو ظالم شمار ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی محبت سے محروم ہوگا۔

﴿۴۳﴾ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بدلے کے تین مراتب بیان فرمائے ہیں، عدل، فضل اور ظلم۔ عدل کا مرتبہ ”جَزَاءُ سَيِّئَةٍ

وَلَكِنْ اَنْتَصَرَ بَعْدَ ظَلْمِهِ فَأُولَٰئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِنْ سَبِيلٍ ﴿۴۱﴾ اِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَظْلِمُونَ النَّاسَ وَيَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۗ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۴۲﴾ وَ لَكِنْ صَبْرًا وَ عَفْرًا اِنَّ ذٰلِكَ لَيْنُ عَزْمِ الْأُمُورِ ﴿۴۳﴾

اور بے شک جو شخص اپنے اوپر ظلم ہونے کے بعد بدلے لے تو یہ وہ لوگ ہیں جن پر کوئی راستہ نہیں ﴿۴۱﴾ راستہ تو انھی پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں حق کے بغیر سرکشی کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے دردناک عذاب ہے ﴿۴۲﴾ اور بلاشبہ جو شخص صبر کرے اور معاف کر دے تو بے شک یہ یقیناً بڑی ہمت کے کاموں سے ہے ﴿۴۳﴾

سَبِيْلَةٌ فَبِئْسَ مَا كَانَتْ مِنْ اَمْرِ اُولَٰئِكَ اِنَّهُمْ كَانُوْا فِيْ عَذَابٍ مُّضْمَرٍ ﴿۴۱﴾ میں بیان ہوا ہے کہ بدلے میں نہ زیادتی ہو نہ کمی، جان کے بدلے جان، ہر عضو کے بدلے اس کے برابر عضو، اسی طرح مال پر زیادتی کا معاملہ ہے۔ فضل کا مرتبہ زیادتی کرنے والے سے عنوا اور اس کی اصلاح ہے۔ ”قَدْ كُنَّ عَفَا وَ اَصْلَحَ فَاَجْرُهَا عَلَى اللّٰهِ“ اس جملے میں عنفو کی ترغیب ہے کہ جس طرح تم اللہ تعالیٰ سے معافی کے خواہش مند اور امید وار ہو اسی طرح تم بھی عنفو و درگزر سے کام لو، فرمایا: ﴿وَلْيَعْفُوا وَيَصْفَحُوا اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يُعْفَرَ اللّٰهُ لَكُمْ﴾ [النور: ۲۲] ”اور لازم ہے کہ معاف کر دیں اور درگزر کریں، کیا تم پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمہیں بخشے۔“ اگر عنفو سے مجرم کی اصلاح نہیں ہوتی بلکہ اس کی سرکشی میں اضافہ ہوتا ہے تو مصلحت عنفو نہیں انتقام ہے۔ اور ظلم کا مرتبہ یہ ہے کہ اس پر جتنی زیادتی کی گئی تھی اس سے بڑھ کر زیادتی کرے۔ پہلے مظلوم تھا اب ظالم بن جائے گا اور اللہ کی محبت سے محروم ہو جائے گا۔ (سعدی)

آیت 41 وَلَكِنْ اَنْتَصَرَ بَعْدَ ظَلْمِهِ.....: یعنی مظلوم ظالم سے بدلے لے تو اس پر کوئی مواخذہ یا ملامت نہیں، کیونکہ اس نے اپنا حق لیا ہے، کوئی زیادتی نہیں کی، بشرطیکہ اتنا ہی بدلے جتنا اس پر ظلم ہوا ہے۔

آیت 42 اِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَظْلِمُونَ النَّاسَ.....: یعنی مواخذہ اور ملامت ان لوگوں پر ہے جو ظلم کی ابتدا کرتے ہیں، لوگوں کی جان و مال اور عزت و آبرو پر دست درازی کرتے ہیں اور اگر بدلا لیں تو بدلا لینے میں حد سے بڑھ جاتے ہیں۔ اس طرح زمین میں سرکشی اور تکبر سے فساد پھیلاتے ہیں، جس کا انھیں کوئی حق نہیں۔ ان لوگوں کے لیے سخت درد پہنچانے والا عذاب ہے۔

آیت 42 وَ لَكِنْ صَبْرًا وَ عَفْرًا اِنَّ ذٰلِكَ لَيْنُ عَزْمِ الْأُمُورِ: ”عَزْمٌ“ کا معنی ہے کسی کام کا پختہ ارادہ کر لینا، اسے اپنے آپ پر واجب کر لینا کہ میں یہ کام ضرور کروں گا۔ ”عَزْمٌ“ مصدر بمعنی اسم مفعول ہے جو اپنے موصوف کی طرف مضاف ہے: ”أَيُّ الْأُمُورِ الْمَعْرُومَةُ“ یعنی یہ کام ان امور میں سے ہے جن کا بڑی ہمت سے عزم کیا جاتا ہے۔ یقیناً جو شخص صبر کرے اور معاف کر دے، جب کہ معاف کرنے میں ظلم اور سرکشی کی حوصلہ افزائی نہ ہو تو یہ بڑی ہمت کا کام ہے، جو ہر عقل مند کو اپنے آپ پر واجب کر لینا چاہیے۔ مزید دیکھیے سورہ لقمان (۱۷)۔

وَمَنْ يُضَلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ وَبِيٍّ مِّنْ بَعْدِهِ ۖ وَتَرَى الظَّالِمِينَ لَمَّا رَأَوْا الْعَذَابَ يَقُولُونَ هَلْ إِلَىٰ مَرَدٍّ مِّنْ سَبِيلِ ۙ وَتَرَهُمْ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا خَشِيعِينَ مِنَ الدَّلِّ يَنْظُرُونَ مِنْ طَرْفِ حَفِيٍّ ۚ وَقَالَ الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ الْخٰسِرِينَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ وَآهْلِيَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ أَلَا إِنَّ الظَّالِمِينَ فِي عَذَابٍ مُّقِيمٍ ﴿۴۵﴾

اور جسے اللہ گمراہ کر دے، پھر اس کے بعد اس کا کوئی مددگار نہیں اور تو ظالموں کو دیکھے گا کہ جب وہ عذاب کو دیکھیں گے تو کہیں گے کیا واپس جانے کی طرف کوئی راستہ ہے ﴿۴۵﴾ اور تو انہیں دیکھے گا کہ وہ اس (آگ) پر پیش کیے جائیں گے، ذلت سے جھکے ہوئے، چھپی آنکھ سے دیکھ رہے ہوں گے اور وہ لوگ جو ایمان لائے، کہیں گے اصل خسارے والے تو وہ ہیں جنہوں نے قیامت کے دن اپنی جانوں اور اپنے گھر والوں کو خسارے میں گنوا دیا۔ سن لو! بے شک ظالم لوگ ہمیشہ رہنے والے عذاب میں ہوں گے ﴿۴۵﴾

تیت 44 ﴿۱﴾ وَمَنْ يُضَلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ وَبِيٍّ مِّنْ بَعْدِهِ ۖ: یعنی جس شخص کی ضد اور ہٹ دھرمی کا یہ حال ہو کہ نہ وہ غنودرگزر کا اعلیٰ درجہ اختیار کرنے کا حوصلہ رکھتا ہو اور نہ کم از کم عدل و انصاف سے کام لینے پر تیار ہو تو ظاہر ہے کہ وہ خیر سے محروم اور محض شر ہے، ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ بھی خیر کی توفیق نہیں دیتا، بلکہ گمراہی میں دکھیل دیتا ہے اور جسے اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے پھر اس کا کوئی مددگار نہیں جو اسے ہدایت پر لے آئے۔ مزید دیکھیے سورہ اعراف (۱۴۸، ۱۸۶) اور سورہ کہف (۱۷)۔

﴿۲﴾ وَتَرَى الظَّالِمِينَ: اور تو ان ظالموں کو دیکھے گا جو عذاب دیکھنے سے پہلے ظلم و فساد اور زمین میں سرکشی سے باز آنے پر کسی طرح تیار نہیں تھے، اس لیے یہ ظالم نہ اپنے مالک کی گرفت سے ڈرتے تھے اور نہ انہیں حساب کتاب کا کوئی خوف تھا۔ ”الظَّالِمِينَ“ سے مراد یہاں کفار و مشرکین ہیں، کیونکہ قرآن کی اصطلاح میں انہی کے لیے یہ لفظ آتا ہے۔ یہاں اس کی دلیل ایک تو یہ ہے کہ آگے ان کے متعلق فرمایا: ﴿الَّذِينَ الظَّالِمِينَ فِي عَذَابٍ مُّقِيمٍ﴾ [الشوری: ۴۵] ”سن لو! بے شک ظالم لوگ ہمیشہ رہنے والے عذاب میں ہوں گے۔“ اور یہ بات طے شدہ ہے کہ دائمی عذاب کفار و مشرکین ہی کو ہوگا۔ دوسری دلیل یہ کہ ان کے قول کے مقابلے میں مومنوں کا قول ذکر فرمایا: ﴿وَقَالَ الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ الْخٰسِرِينَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنفُسَهُمْ وَآهْلِيَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾ [الشوری: ۴۵] ”اور وہ لوگ جو ایمان لائے، کہیں گے اصل خسارے والے تو وہ ہیں جنہوں نے قیامت کے دن اپنی جانوں اور اپنے گھر والوں کو خسارے میں گنوا دیا۔“

﴿۳﴾ لَمَّا رَأَوْا الْعَذَابَ يَقُولُونَ: وہی منکبر اور ظالم لوگ جو پہلے نہ رب تعالیٰ سے ڈرتے تھے اور نہ اس کے عذاب یا حساب کتاب سے ڈرتے تھے، جب عذاب دیکھیں گے تو ان کی ساری اکڑ ختم ہو جائے گی اور کہیں گے، کیا واپس جانے کا کوئی راستہ ہے کہ ہم دنیا میں جا کر اپنی کوتاہی کی تلافی کر لیں؟ مزید دیکھیے سورہ انعام (۲۷، ۲۸) اور سورہ اعراف (۵۳)۔

تیت 45 ﴿۱﴾ وَتَرَهُمْ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا خَشِيعِينَ مِنَ الدَّلِّ يَنْظُرُونَ: آگ پر حاضری کے وقت ان کی حالت

وَمَا كَانَ لَهُمْ مِنْ أَوْلِيَاءَ يَنْصُرُوهُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَمَنْ يُضِلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ سَبِيلٍ ﴿١٥﴾ اسْتَجِيبُوا لِرَبِّكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمًا لَا مَرَدَ لَهُ مِنَ اللَّهِ مَا لَكُمْ مِنْ مَلْجَأٍ يَوْمَئِذٍ وَمَا لَكُمْ مِنْ نَكِيرٍ ﴿١٦﴾

اور ان کے لیے کوئی حمایتی نہیں ہوں گے جو اللہ کے سوا ان کی مدد کریں۔ اور جسے اللہ گمراہ کر دے، پھر اس کے لیے کوئی بھی راستہ نہیں ﴿۱۵﴾ اپنے رب کی دعوت قبول کرو، اس سے پہلے کہ وہ دن آئے جس کے ٹلنے کی اللہ کی طرف سے کوئی صورت نہیں، اس دن نہ تمہارے لیے کوئی جائے پناہ ہوگی اور نہ تمہارے لیے انکار کی کوئی صورت ہوگی ﴿۱۶﴾ کا نقشہ کھینچا ہے کہ وہ ذلت سے سر جھکائے ہوئے چھپی آنکھ سے دیکھ رہے ہوں گے، جیسے کسی کے ہاتھ پاؤں باندھ کر تلوار سے مارنے لگیں تو وہ ڈر کے مارے آنکھیں بند کر لیتا ہے، پھر کبھی کبھی تھوڑی سی آنکھ کھول کر دیکھتا ہے کہ تلوار کب اس پر گرتی ہے۔ خوف کے مارے پوری طرح آنکھیں کھول کر دیکھنے کی ہمت نہیں پڑتی۔

﴿١٥﴾ وَقَالَ الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ الْخُسُوفَ : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ زمر کی آیت (۱۵) کی تفسیر۔

﴿١٦﴾ الْآيَاتِ الظَّالِمِينَ فِي عَذَابٍ مُقِيمٍ : یہ ایمان والوں کے کلام کا آخری حصہ بھی ہو سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا فرمان بھی۔ دائمی عذاب میں رہنے والے ظالم کافر و مشرک ہی ہیں، فرمایا: ﴿إِنَّهُ مَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ حَزَمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَأْوَاهُ النَّارُ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ﴾ [المائدة: ۷۲] ”بے شک حقیقت یہ ہے کہ جو بھی اللہ کے ساتھ شریک بنائے سو یقیناً اس پر اللہ نے جنت حرام کر دی اور اس کا ٹھکانا آگ ہے اور ظالموں کے لیے کوئی مدد کرنے والے نہیں۔“

آیت 46 ﴿١٥﴾ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِنْ أَوْلِيَاءَ : اس آیت میں مشرکوں کا رد ہے جو اپنے بنائے ہوئے داتاؤں اور مشکل کشاؤں کے بارے میں عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ ان کے حمایتی اور مددگار ہیں، سختی اور مصیبت کے وقت ان کے کام آئیں گے اور انھیں اللہ کے عذاب سے بچالیں گے۔ اس امید پر یہ ان کی عبادت کرتے اور انھیں پکارتے ہیں، حالانکہ یہ اعتقاد سراسر گمراہی ہے اور جسے اللہ گمراہ کر دے پھر اس کے لیے کوئی بھی راستہ نہیں۔

﴿١٦﴾ وَمَنْ يُضِلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ سَبِيلٍ : اور جسے اللہ گمراہ کر دے پھر اس کے لیے کوئی بھی راستہ نہیں، نہ دنیا میں ہدایت پانے کا اور نہ آخرت میں عذاب سے نجات کا۔

آیت 47 ﴿١٦﴾ اسْتَجِيبُوا لِرَبِّكُمْ مِنْ قَبْلِ : ”مَرَدٌ“ ”رَدٌّ يَرُدُّ رَدًّا“ (ن) سے مصدر میسی بھی ہو سکتا ہے، ظرف زمان بھی اور ظرف مکان بھی، ہٹانے یا نالنے کی کوئی صورت یا کوئی وقت یا کوئی جگہ۔ اس جملے میں اللہ تعالیٰ کی دعوت کو جلد از جلد قبول کرنے کی تاکید کئی طرح سے فرمائی ہے۔ سب سے پہلے ”أَجِيبُوا“ کے بجائے ”اسْتَجِيبُوا“ کے لفظ کے ساتھ۔ تفصیل کے لیے دیکھیے اسی سورت کی آیت (۲۸) کی تفسیر۔ پھر اپنی ربوبیت کے احسان کی یاد دہانی کے ساتھ اور آخر

فَإِنْ أَعْرَضُوا قَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا ۖ إِنَّ عَلَيْكَ إِلَّا الْبَلْغُ ۖ وَإِنَّا إِذَا أَذَقْنَا الْإِنْسَانَ

پھر اگر وہ منہ پھیر لیں تو ہم نے تجھے ان پر کوئی نگران بنا کر نہیں بھیجا، تیرے پیچھے دینے کے سوا کچھ نہیں اور بے شک ہم، جب ہم انسان کو اپنی طرف سے کوئی رحمت چکھاتے ہیں وہ اس پر خوش ہو جاتا ہے اور اگر ہمیں اس کی

میں اس دن سے ڈرانے کے ساتھ جس کے آنے کے بعد نہ اس کے ٹالے جانے کی کوئی صورت ہے، نہ وہ کسی وقت ٹالا جا سکے گا اور نہ کسی مقام پر ٹلے گا۔

② لَا مَرَدَ لَهَا مِنَ اللَّهِ: اس کے دو مطلب ہیں، ایک یہ کہ اس کے آنے کے بعد اللہ کی طرف سے اسے ہٹانے کی کوئی صورت نہیں، یعنی اللہ تعالیٰ اسے کسی صورت نہیں ہٹائے گا۔ دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے آنے کے بعد کوئی ایسی ہستی نہیں جو اسے ہٹا سکے۔

③ وَمَالِكُهُمْ مِنْ يَكْفِيهِ: ”يَكْفِيهِ“ مصدر ہو تو اس کا معنی انکار بھی ہے اور نکرہ (اجنبی اور بے پہچان) ہونا بھی اور اگر ”فَعِيلٌ“ بمعنی اسم فاعل ہو یعنی ”مُنْكَرٌ“ تو معنی ”بدلنے والا“ ہوگا۔ یعنی قیامت کے دن تم اپنے جرائم کا کسی طرح انکار نہیں کر سکو گے، بلکہ نامہ اعمال اور فرشتوں کی شہادتوں حتیٰ کہ اپنے اعضا کی گواہی کی وجہ سے تمہارے پاس انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔ ”مَالِكُهُمْ مِنْ يَكْفِيهِ“ کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ تمہیں جو سزا دی جائے گی تم اس پر کوئی احتجاج نہیں کر سکو گے، نہ کوئی انکار کہ ہم یہ سزا قبول نہیں کرتے، نہ ہی تم یا کوئی اور اس حالت کو بدلنے والا ہوگا جس میں تم مبتلا ہو گے اور یہ بھی نہیں ہوگا کہ تمہاری پہچان نہ ہو سکے اور تم اجنبی اور غیر معروف بن کر چھوٹ جاؤ یا بھیس بدل کر چھپ جاؤ۔

آیت 48 ① فَإِنْ أَعْرَضُوا قَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا: پچھلی آیت میں کفار کو مخاطب کر کے فرمایا تھا کہ قیامت کے دن سے پہلے جلد از جلد اپنے رب کی دعوت قبول کر لو، اب ان کے کفر پر اصرار کی صورت میں رسول اللہ ﷺ کو تسلی دینے کے لیے آپ ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اگر یہ آپ کی دعوت سے منہ موڑیں تو ہم نے آپ کو ان کا نگران اور ذمہ دار نہیں بنایا کہ ہر حال میں انہیں منوا کر چھوڑیں اور نہ آپ سے اس بات کی باز پرس ہوگی کہ یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لائے۔

② إِنَّ عَلَيْكَ إِلَّا الْبَلْغُ: آپ کا کام صرف پہنچانا دینا ہے (جو آپ سرانجام دے چکے ہیں)۔ ان الفاظ میں نبی ﷺ کے لیے سند موجود ہے کہ آپ نے پیغام واقعی پہنچا دیا ہے اور آپ اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو چکے ہیں۔

③ وَإِنَّا إِذَا أَذَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً فَحَرَبَهَا: اس آیت میں آپ کو تسلی دلائی ہے کہ ان کفار کا صرف آپ کے ساتھ یہ سلوک نہیں بلکہ ان کا ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ ہے۔ یاد رہے کہ دنیا کی تمام نعمتیں خواہ کتنی بڑی ہوں آخرت کے مقابلے میں چکھنے سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتیں۔ پھر ”رَحْمَةً“ پر تمہیں بھی تکلیف اور تقلیل کے لیے ہے۔ فرمایا، انسان ایسا کم ظرف ہے کہ جب ہم اسے تھوڑی سی رحمت چکھا بھی دیتے ہیں تو یہ پھول جاتا ہے اور آپ سے باہر ہو جاتا ہے، ہمیں بھول کر اپنے آپ ہی کو سب کچھ سمجھ لیتا ہے۔ یہاں نعمت چکھانے کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف فرمائی ہے، کیونکہ نعمت صرف اللہ تعالیٰ

وَمَا رَحْمَةً فَرِحَ بِهَا، وَإِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ فَإِنَّ الْإِنْسَانَ كَفُورٌ ﴿۴۹﴾ لِلَّهِ
مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ ۖ يَهَبُ لِمَنْ يَشَاءُ إِنْ شَاءَ ۖ وَيَهَبُ لِمَنْ يَشَاءُ

وجہ سے کوئی مصیبت پہنچتی ہے جو ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجا تو بے شک انسان بہت ناشکرا ہے ﴿۴۹﴾ آسمانوں اور
زمین کی بادشاہی اللہ ہی کی ہے، وہ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے، جسے چاہتا ہے بیٹیاں عطا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے

کی عطا ہے، کسی کے استحقاق کی وجہ سے اسے نہیں ملتی اور لفظ ”إِذَا“ (جب) استعمال فرمایا، کیونکہ دنیا میں رحمت ہر انسان کو ملتی ہے۔
﴿۴۹﴾ وَإِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ : اور اگر انھیں ان کے اپنے اعمال کے نتیجے میں کوئی برائی یا مصیبت
آپنچے تو یقیناً انسان بہت ناشکرا ہے، پھر اسے ہماری کوئی نعمت یاد نہیں رہتی، بلکہ اس ایک مصیبت کی وجہ سے ہماری تمام
نعمتوں کا صاف انکار کر دیتا ہے۔ جس طرح خاوند ساری عمر بیوی پر احسان کرے، پھر اس سے اس کے مزاج کے خلاف کوئی
بات ہو جائے تو کہتی ہے: «مَا رَأَيْتُ مِنْكَ خَيْرًا قَطُّ» [بخاری، الإيمان، باب كفران العشير و كفر دون كفر : ۲۹]
”میں نے تم سے کبھی کوئی خیر نہیں دیکھی۔“ یہاں برائی کی نسبت اللہ کی طرف نہیں فرمائی، حالانکہ سبھی کچھ اللہ کی طرف سے
ہے، کیونکہ اس کا باعث ان کے اعمالی بد بنتے ہیں اور ”إِنْ“ (اگر) کا لفظ استعمال فرمایا ہے جس میں مصیبت پہنچنے یا نہ پہنچنے
دونوں کا امکان ہے، کیونکہ رحمت کے مقابلے میں انسان پر آنے والی مصیبتیں بہت کم ہیں۔

﴿۵﴾ اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو کفار کے آپ کی دعوت سے اعراض سے بھی بڑی بات کے ارتکاب کا ذکر کر کے تسلی دلائی
ہے کہ جن کا مالک کے ساتھ یہ حال ہے وہ آپ سے کیا کچھ نہیں کریں گے، جیسا کہ دوسرے مقام پر یہود کے موسیٰ علیہ السلام کے
ساتھ سلوک کا ذکر کر کے آپ ﷺ کو تسلی دلائی ہے۔ دیکھیے سورہ نساء (۱۵۳)۔

﴿۶﴾ یہاں ”الْإِنْسَانَ“ سے بعض مفسرین نے کافر انسان مراد لیا ہے، کیونکہ مومن ایسا نہیں ہوتا اور بعض نے فرمایا، مطلب یہ
ہے کہ انسان پیدائشی طور پر ایسا ہی ہے، مگر ایمان اور عمل صالح میں جیسے جیسے ترقی ہوتی ہے آدمی اس خصلت سے چھٹکارا
حاصل کرتا جاتا ہے، ایمان کے کمال کے ساتھ وہ پوری طرح اس سے پاک ہو جاتا ہے اور مصیبت پر صبر اور نعمت پر شکر
اس کی طبیعت بن جاتے ہیں، جو دونوں اس کے حق میں خیر ہی ہوتے ہیں، مگر کافر کا حال وہی رہتا ہے۔ اسی طرح کمزور
ایمان کی حالت میں بھی اس بد خصلت کا اثر باقی رہتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿إِنَّ الْإِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا ۖ إِذَا مَسَّهُ
الْفُرُّ جَزُوعًا ۖ وَإِذَا مَسَّهُ الْغَيْظُ مُنُوعًا ۖ إِلَّا الْمَصْلِين ۖ أُولَٰئِكَ فِي جَذْبٍ مُّكْرَمُونَ﴾ [المعارج : ۱۹ تا ۳۵]
”بے شک انسان تھردلا پیدا کیا گیا ہے۔ جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو بہت گھبرا جانے والا ہے۔ اور جب اسے خیر پہنچتی ہے تو
بہت روکنے والا ہے۔ سوائے نماز ادا کرنے والوں کے..... یہی لوگ جنہوں میں عزت دیے جانے والے ہیں۔“ یہ دوسرا قول
بہتر معلوم ہوتا ہے۔

﴿۱﴾ لِلَّهِ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ : اس سے پہلی آیت میں انسان کا ذکر فرمایا کہ اگر اسے

الذُّكُورُ ﴿۳۱﴾ أَوْ يُرْزِقُهُمْ ذُكْرًا وَ إِنَاثًا ۚ وَيَجْعَلُ مَن يَشَاءُ عَاقِبَتًا ۗ إِنَّكَ عَلِيمٌ قَدِيرٌ ﴿۳۰﴾

بٹے عطا کرتا ہے ﴿۳۱﴾ یا انھیں ملا کر بیٹے اور بیٹیاں عطا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے بانجھ کر دیتا ہے، یقیناً وہ سب کچھ جاننے والا، ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے ﴿۳۰﴾

اس کے اپنے اعمال بد کے نتیجے میں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو انسان بہت ناشکرا ہے، وہ فوراً اللہ تعالیٰ کا شکوہ شروع کر دیتا ہے کہ اس نے مجھ سے نعمت چھین لی اور مجھ پر ظلم کیا، حالانکہ اللہ تعالیٰ کسی پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا۔ اس کی طرف ظلم کی نسبت سے بڑا ظلم کوئی نہیں، کیونکہ ایک تو انسان کو پہنچنے والی مصیبت اس کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہے، دوسرے اللہ تعالیٰ آسمان و زمین یعنی پوری کائنات اور اس میں موجود ہر نعمت کا بادشاہ اور مالک ہے۔ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، اپنی جو نعمت جسے چاہے دیتا ہے، جسے چاہے نہیں دیتا یا چھین لیتا ہے۔ بندے پر اس کے اعمال کے نتیجے میں جو مصیبت آئی ہے زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی کوئی نعمت نہیں دی، یا آئندہ کے لیے روک لی ہے، مثلاً صحت، دولت یا ایمان وغیرہ۔ ظلم تو تب ہوتا جب وہ اس کی ملکیت والی کوئی چیز اسے نہ دیتا یا اس سے لے لیتا۔ جب ہر چیز اس کی ملکیت ہے تو اس کی مرضی، جسے چاہے دے جسے چاہے نہ دے، کسی کے پاس شکوے اور ناشکری کا کیا موقع ہے۔ ایمان کی نعمت سے نوازا نہ بھی اس کی مرضی پر موقوف ہے، وہ چاہتا تو سب کو یہ نعمت دے دیتا مگر یہ نعمت بھی وہ اسی کو دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔ اس حقیقت کو سمجھ لینے سے تقدیر کے بہت سے مسئلے حل ہو جاتے ہیں اور آدمی اللہ تعالیٰ کے شکوے، اس کی ناشکری اور اسے ظالم کہنے سے بچ جاتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدًا ۗ وَ لَٰكِن يُذْخِلُ مَن يَشَاءُ فِي رَحْمَتِهِ ۗ وَالظَّالِمُونَ مَا لَهُمْ مِّن وَرَاقٍ ۗ وَلَا تَصْبِرْ﴾ [الشوریٰ: ۸] اور اگر اللہ چاہتا تو انھیں ایک ہی امت بنا دیتا اور لیکن وہ اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور جو ظالم ہیں ان کے لیے نہ کوئی دوست ہے اور نہ کوئی مددگار۔“

﴿يَهَبُ لِمَن يَشَاءُ إِنَاثًا.....﴾ : یہ اس بات کی مثال ہے کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہے دیتا ہے اور جو چاہے دیتا ہے، چنانچہ وہ جسے چاہتا ہے لڑکیاں دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے لڑکے دیتا ہے، یا لڑکے لڑکیاں دونوں عطا کر دیتا ہے اور جسے چاہے مرد ہو یا عورت عقیم (بانجھ) بنا دیتا ہے، کسی کو اس پر اعتراض یا شکوے کا کوئی حق نہیں۔

﴿إِنَّكَ عَلِيمٌ قَدِيرٌ﴾ : مخلوق کو نعمت عطا کرنے میں یہ تقوت انہی تقسیم نہیں بلکہ اس لیے ہے کہ وہ ہر چیز کا علم اور پوری قدرت رکھنے والا ہے، اس کا ہر فعل اس کے علم و قدرت کے تحت ہے اور اسی علم و قدرت کے ساتھ اس نے بعض کو اولاد سے محروم رکھا، کسی کو ہدایت سے اور کسی کو لڑکی یا لڑکے یا دونوں کی نعمت سے نوازا دیا، کسی کو ہدایت کے تمام مرتبوں سے اونچے مرتبے نبوت سے نوازا دیا، جس کا ذکر اگلی آیت میں ہے اور یہ سب کچھ اس کی مشیت کے تحت ہے، فرمایا: ﴿اللَّهُ يَخْتِمْ لِيَوْمِ تَمُوتُ مَن يَشَاءُ ۗ وَيَهْدِي لِمَن يَشَاءُ ۗ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ خَبِيرٌ﴾ [الشوریٰ: ۱۳] ”اللہ اپنی طرف چاہتا ہے اور اپنی طرف راست اسے دیتا ہے جو رجوع کرے۔“

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَائِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ

بِأَذْنِهِ مَا يَشَاءُ إِنَّهُ عَلَىٰ حَكِيمٍ ۝۵۱

اور کسی بشر کے لیے ممکن نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر وحی کے ذریعے، یا پردے کے پیچھے سے، یا یہ کہ وہ کوئی رسول بھیجے، پھر اپنے حکم کے ساتھ وحی کرے جو چاہے، بے شک وہ بے حد بلند، کمال حکمت والا ہے ۝۵۱

۴ اس آیت میں یہ حقیقت واضح الفاظ میں بیان کر دی گئی ہے کہ زمین و آسمان کی بادشاہی دنیا کے نام نہاد بادشاہوں، جباروں اور سرداروں کے حوالے نہیں کر دی گئی اور نہ ہی اس میں کسی نبی یا ولی، داتا، دستگیر یا دیوی دیوتا کا کوئی حصہ ہے، اس کا مالک اکیلا اللہ تعالیٰ ہے۔ کتنے جابر بادشاہ اور سپہ سالار، کتنے انبیاء و اولیاء اور کتنے ماہر ڈاکٹر اور حکیم اولاد سے محروم رہے، کتنے لڑکے کو ترستے رہے اور کتنے لڑکی کی خواہش دل میں لیے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اگر مشرکین اس حقیقت کو سمجھ لیں تو کبھی شرک کی حماقت نہ کریں۔

۵ ”يَهَبُ لِمَنْ يَشَاءُ إِنْ شَاءَ“ میں لڑکیوں کو اللہ تعالیٰ کا عطیہ قرار دیا ہے۔ جو لوگ لڑکیوں کو نخواست یا عار کا باعث سمجھتے ہیں انھیں ان الفاظ پر غور کرنا چاہیے اور کسی ایسے جوڑے کے احساسات معلوم کرنے چاہئیں جنہیں لڑکی بھی عطا نہیں ہوئی۔

آیت 51 ۱ وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ: کفار کا کہنا تھا: ﴿لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللَّهُ﴾ [البقرة: ۱۱۸] ”اللہ ہم سے

(خود) کلام کیوں نہیں کرتا؟“ بلکہ ان کی خواہش تھی کہ جس طرح نبی ﷺ کو کتاب عطا ہوئی ہم میں سے ہر ایک کو اسی طرح کتاب ملے، جیسا کہ فرمایا: ﴿بَلْ يُرِيدُ كُلُّ الْفَرِيقِ أَنْ يُوقِنُوا صُفْحًا مُنْشَرًّا﴾ [المدثر: ۵۲] ”بلکہ ان میں سے ہر آدمی یہ چاہتا ہے کہ اسے کھلے ہوئے صحیفے دیے جائیں۔“ اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ ہر ایک سے کلام نہیں کرتا، بلکہ وہ اس کے لیے فرشتوں اور انسانوں میں سے انتخاب کرتا ہے، فرمایا: ﴿اللَّهُ يَضْطَرُّ مِنَ الْمَلَائِكَةِ رَسُولًا وَ مِنْ النَّاسِ﴾ [الحج: ۷۵] ”اللہ فرشتوں میں سے پیغام پہنچانے والے چنتا ہے اور لوگوں سے بھی۔“ اس نعمت سے بھی وہ جسے چاہتا ہے نوازتا ہے، کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے یہ نعمت کیوں نہیں ملی۔ اس آیت میں فرمایا کہ وہ اپنے ان پنے ہوئے بندوں کے ساتھ بھی آمنے سامنے کلام نہیں کرتا اور نہ ہی یہ بات دنیا میں کسی بشر کے لیے ممکن ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «حِجَابُ النُّورِ وَ فِي رِوَايَةِ أَبِي بَكْرٍ النَّارُ، لَوْ كَشَفَهُ لَأُخْرِقَتْ سُبْحَاتُ وَجْهِهِ مَا أَنْتَهَى إِلَيْهِ بَصَرُهُ مِنْ خَلْفِهِ» [مسلم، الإيمان، باب في قوله ﷺ "إِنَّ اللَّهَ لَا يَنَامُ".....: ۱۷۹] ”اللہ تعالیٰ کا حجاب ”نور“ ہے۔“ ابو بکر کی روایت میں ہے کہ ”نار“ ہے ”اگر وہ اسے ہٹا دے تو اس کے چہرے کی شعائیں جہاں تک اس کی نگاہ پہنچتی ہے اس کی مخلوق کو جلا دیں۔“ ہاں آخرت میں ایمان والوں کو اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ قیامہ (۲۲، ۲۳)۔

۲ إِلَّا وَحْيًا: فرمایا اللہ تعالیٰ انسانوں سے ان تین طریقوں کے علاوہ کلام نہیں کرتا، ایک وحی کے ذریعے سے، یعنی یہ کہ وہ اپنے بندے کے دل میں کسی واسطے کے بغیر کوئی بات ڈال دے جس سے اسے یقین ہو جائے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، خواہ

كَذَلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ وَلَكِن

اور اسی طرح ہم نے تیری طرف اپنے حکم سے ایک روح کی وحی کی، تو نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے اور نہ یہ کہ

روح کی حالت میں ہو یا نیند میں، کیونکہ انبیاء کے خواب بھی وحی ہوتے ہیں۔ دیکھیے سورۃ صافات (۱۰۲)۔

﴿ أَوْ يَنزِيلَ فُرْقَانٍ ﴾: یا یہ کہ وہ پردے کے پیچھے سے کلام کرے، جیسے اس نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا، مگر جب انہوں نے دیکھنے کی درخواست کی تو وہ قبول نہیں ہوئی۔

﴿ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا ﴾: یا اللہ تعالیٰ کوئی فرشتہ بھیج کر جو بات پہنچانا چاہے پہنچا دے، جیسے جبریل علیہ السلام یا دوسرے فرشتوں کے ذریعے سے آپ کے پاس وحی آتی تھی۔

﴿ إِنَّا نَقَلْنَا عَلَىٰ حِكْمَةٍ ﴾: یعنی وہ اس سے بہت بلند ہے کہ کسی بشر سے زور زور کلام کرے، یا ہر ایک اس کے کلام کا شرف حاصل کر سکے اور وہ کمال حکمت والا ہے، جس کے تحت وہ ہر بشر سے کلام نہیں کرتا۔

﴿ ۵۲ ﴾ وَكَذَلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا: "رُوحًا" سے مراد وحی ہے، خواہ قرآن کی صورت میں ہو یا

سنت کی صورت میں، کیونکہ وہ دونوں وحی ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَمَا يَنْطَلِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۗ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۗ ﴾ [النجم: ۱۰]۔

اور وہ اپنی خواہش سے نہیں بولتا۔ وہ تو صرف وحی ہے جو نازل کی جاتی ہے۔ "اسے" روح" اس لیے کہا گیا ہے کہ

مقتل زندگی اسی کے ذریعے سے حاصل ہوتی ہے، دل کی زندگی بھی اور آخرت کی زندگی بھی، جیسے فرمایا: ﴿ يُنَزِّلُ الْمَلَائِكَةَ

الْمُرْسَلِينَ مِنْ أَمْرِهِ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ﴾ [النحل: ۲] "وہ فرشتوں کو وحی کے ساتھ اپنے حکم سے بندوں میں سے

اس پر چاہتا ہے نازل کرتا ہے۔"

﴿ مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ ﴾: اس فرمان میں ایک تو نعمت کی یاد دہانی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وہ علم عطا

مایا جو آپ پہلے نہیں جانتے تھے۔ دوسرا یہ آپ کے نبی برحق ہونے کی دلیل ہے کہ اُمی ہونے اور کتاب و ایمان کا علم نہ

کھنے کے باوجود آپ کا قرآن کریم جیسی عظیم کتاب لانا محض اللہ تعالیٰ کی عنایت اور اس کی وحی ہی کے ذریعے سے ہو سکتا ہے۔

﴿ یہاں ایک سوال ہے کہ اس بات میں تو کوئی اشکال نہیں کہ آپ ﷺ کو اس سے پہلے کتاب کا علم نہ تھا، مگر یہ بات قابل

تأمل ہے کہ آپ کو ایمان کا علم بھی نہیں تھا، کیونکہ انبیاء علیہم السلام کا نبوت ملنے سے پہلے کم از کم اللہ تعالیٰ اور اس کی وحدانیت پر ایمان

ہوتا ہے، جیسا کہ صحیح بخاری وغیرہ میں آپ ﷺ کے غار حرا میں جا کر عبادت کرنے کا ذکر موجود ہے۔ جواب اس کا یہ ہے

کہ آپ ہی نہیں سارے عرب اُمی ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے تھے اور یہ بھی مانتے تھے کہ وہی زمین و آسمان کا

خالق ہے اور پوری کائنات کی تدبیر کرنے والا ہے، مگر وہ شرک کی بیماری میں مبتلا تھے۔ انبیاء کی فطرت نہایت سلیم ہوتی ہے

اور ہمارے نبی ﷺ کا بھی اللہ پر ایمان تھا۔ نبوت سے پہلے بھی آپ ﷺ سے شرک یا کبارک ادرکاب نہیں ہوا، مگر یہ ایمان

جہالتی تھا۔ تفصیل کے ساتھ ایمان جو حدیث جبریل کے مطابق اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں،

جَعَلْنَاهُ نُورًا نَهْدِي بِهِ فَمَنْ نَشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿۱۷۲﴾

ایمان کیا ہے اور لیکن ہم نے اسے ایک ایسی روشنی بنا دیا ہے جس کے ساتھ ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں راہ دکھاتے ہیں اور بلاشبہ تو یقیناً سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے ﴿۱۷۲﴾

یومِ آخرت اور تقدیر پر ایمان کا نام ہے، اس کی تفصیلات آپ کو وحی کے بعد ہی معلوم ہوئیں۔ اس کے علاوہ جب لفظ ایمان اکیلا بولا جائے تو اس میں تصدیق، قول اور عمل تینوں چیزیں شامل ہوتی ہیں، جیسا کہ وفد عبد القیس کی مشہور حدیث میں ہے اور جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورہ بقرہ کی آیت (۱۳۳): ﴿وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضَيِعَ آيَاتِكُمْ﴾ میں نماز کو ایمان قرار دیا ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿الْإِيمَانُ بَضْعٌ وَ سَبْعُونَ أَوْ بَضْعٌ وَ سِتُونَ شُعْبَةً فَأَفْضَلُهَا قَوْلُ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ أَذَانُهَا إِطَاعَةُ الْأُذَى عَنِ الطَّرِيقِ﴾ [مسلم، الإيمان، باب بيان عدد شعب الإيمان..... : ۳۵] [ایمان کی ستر (۷۰) (فرمایا) ساٹھ (۶۰) سے زیادہ شاخیں ہیں، ان میں سب سے افضل "لا الہ الا اللہ" کہنا ہے اور سب سے کم راستے سے تکلیف دہ چیز دور کرنا ہے۔" ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز، زکوٰۃ، حج اور دوسری ایمانیات کی تفصیلات وحی الہی سے پہلے نہیں جانتے تھے۔

۴) یہاں جو فرمایا کہ آپ ﷺ ان معاملات کو نہیں جانتے تھے، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی فرمائی اور کتاب اللہ کے ذریعے سے آپ کو ہدایت کا نور عظیم عطا فرمایا، یہ بات اللہ تعالیٰ نے متعدد مقامات پر بیان فرمائی ہے، جیسے فرمایا: ﴿وَ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُن تَعْلَمُ﴾ [النساء: ۱۱۳] "اور اللہ نے تجھ پر کتاب اور حکمت نازل فرمائی اور تجھے وہ کچھ سکھایا جو تو نہیں جانتا تھا۔" اور فرمایا: ﴿وَ إِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهِ لَمِنَ الْغَافِلِينَ﴾ [یوسف: ۳] "اور بے شک تو اس سے پہلے یقیناً بے خبروں سے تھا۔" اور فرمایا: ﴿وَ مَا كُنْتَ تَشْتَلُونَ مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتَابٍ وَ لَا تَخْطُلُهُ بَيْمِينُكَ وَ إِنْ لَأَنْتَابَ الْمُبْطِلُونَ﴾ [العنکبوت: ۴۸] "اور تو اس سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھتا تھا اور نہ اسے اپنے دائیں ہاتھ سے لکھتا تھا، اس وقت باطل والے لوگ ضرور شک کرتے۔" اور فرمایا: ﴿وَ مَا كُنْتَ تَرْجُوا أَنْ يُنْفَخَ إِلَيْكَ الْكِتَابُ إِلَّا رَحْمَةً مِنْ رَبِّكَ﴾ [الفصص: ۸۶] "اور تو امید نہ رکھتا تھا کہ تیری طرف کتاب نازل کی جائے گی مگر تیرے رب کی طرف سے رحمت کی وجہ سے (یہ نازل ہوئی)۔" اور فرمایا: ﴿تِلْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا إِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَا أَنْتَ وَ لَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هَذَا﴾ [ہود: ۴۹] "یہ غیب کی خبروں سے ہے جنہیں ہم تیری طرف وحی کرتے ہیں، اس سے پہلے نہ تو انہیں جانتا تھا اور نہ تیری قوم۔" ان آیات کی تفسیر پر بھی ایک نظر ڈال لیں۔

۵) وَلَٰكِنْ جَعَلْنَاهُ نُورًا: "نُورًا" میں تینوں تعظیم کے لیے ہے اور "جَعَلْنَاهُ" میں "ہ" ضمیر وحی الہی کی طرف جاری ہے، جس کا ذکر "رُوحًا مِنْ أَمْرِنَا" میں ہے۔ یعنی ہم نے اس وحی کو جو قرآن اور سنت کی صورت میں ہے، عظیم نور بنا دیا۔ نور اس لیے فرمایا کہ اس کے ساتھ حق روشن ہوتا ہے اور جہالت، شک اور شرک کے اندھیرے دور ہوتے ہیں۔

صَرَاطِ اللَّهِ الَّتِي لَهَا مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ إِلَّا إِلَى اللَّهِ تُصِيرُ الْأُمُورُ ﴿۵۳﴾

اس اللہ کے راستے کی طرف کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اسی کا ہے، سن لو! تمام معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹتے ہیں ﴿۵۳﴾

﴿۵۳﴾ تَهْدِي بِهِنَّ نَفْسًا مِّنْ بَعَادِنَا : یعنی ہم نے اس وحی کو ایسا نور بنایا جس کے ساتھ ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو متعدد مقامات پر نور ہدایت قرار دیا ہے۔ دیکھیے سورہ نساء (۱۶۴)، اعراف (۱۵۷)، مائدہ (۱۶، ۱۵) اور سورہ تغابن (۸)۔

﴿۷﴾ وَ إِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَى صَرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ : ہدایت اور صراطِ مستقیم کی تفسیر کے لیے سورہ فاتحہ کا مطالعہ فرمائیں۔

آیت 53 ﴿۱﴾ صَرَاطِ اللَّهِ الَّتِي لَهَا مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ : یعنی سیدھا راستہ وہ ہے جس پر چل کر انسان زمین و آسمان کے مالک اللہ تعالیٰ تک پہنچ جاتا ہے اور وہ صرف وحی الہی کے ذریعے سے معلوم ہوتا ہے۔ اس کے سوا جتنے راستے ہیں سب شیطان کے راستے ہیں، جو اللہ تعالیٰ سے ہٹے ہوئے ہیں۔ دیکھیے سورہ نحل (۹)۔

﴿۲﴾ إِلَّا إِلَى اللَّهِ تُصِيرُ الْأُمُورُ : یعنی دنیا اور آخرت کے تمام امور کی تدبیر اللہ ہی کی طرف لوتی ہے، بظاہر کسی کام کی تدبیر کوئی کر رہا ہو، ظاہر میں لوگ اسے کسی کا کارنامہ سمجھیں، مگر حقیقت میں تمام امور کی تدبیر اللہ ہی کا کام ہے۔ دیکھیے سورہ یونس (۳)، ﴿۳۱﴾، رعد (۲) اور سجدہ (۵)۔ ”تمام امور اللہ ہی کی طرف لوٹتے ہیں“ میں یہ بھی شامل ہے کہ قیامت کے دن بندوں کے نیک و بد تمام کام اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہوں گے، وہی ان کا فیصلہ فرمائے گا اور نیکیوں کو ثواب اور بدوں کو عذاب دے گا۔

| اللَّهُمَّ احْشُرْنَا فِي رُؤْمَةِ الصَّالِحِينَ |



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حَمْدٌ ۱ وَالْكِتٰبِ الْمُبِیْنِ ۱۱ اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۱۲ وَ اِنَّهٗ فِی الْاِنْشٰءِ لَحَكِیْمٌ ۱۳

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

حَمْدٌ ۱ اس کتاب کی قسم جو کھول کر بیان کرنے والی ہے! ۱۱ بے شک ہم نے اسے عربی قرآن بنایا، سمجھو ۱۲ اور بے شک وہ ہمارے پاس اصل کتاب میں یقیناً بہت بلند، کمال حکمت والا ہے ۱۳

آیت 1 : حَمْدٌ : حروف مقطعات کی بحث کے لیے دیکھیے سورہ بقرہ کی آیت (۱) کی تفسیر۔

آیت 2 : وَالْكِتٰبِ الْمُبِیْنِ : قسم اس بات کا یقین دلانے کے لیے اٹھائی جاتی ہے جو اس کے جواب میں کہی جاتی ہے پھر بعض اوقات کسی چیز کی قسم اس کی عظمت کے پیش نظر کھائی جاتی ہے، تاکہ مخاطب کو بات کا یقین آ جائے، مثلاً اللہ تعالیٰ قسم اور بعض اوقات قسم جواب قسم کی دلیل ہوتی ہے۔ قرآن مجید کی اکثر قسمیں ایسی ہی ہیں۔ ”الْكِتٰبِ“ پر الف لام عہد لیے ہے، اس لیے ترجمہ ”اس کتاب کی قسم“ کیا گیا ہے۔ یہاں قرآن مجید کی صفت ”الْمُبِیْنِ“ کو اس بات کی دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے کہ اسے عربی قرآن بنا کر نازل کرنے والے ہم ہیں۔ اس کا ہر بات کو اتنے عمدہ طریقے سے کھول کر بیان کرنا شاہد ہے کہ یہ کسی انسان یا دوسری مخلوق کا کلام نہیں بلکہ رب العالمین کا نازل کردہ ہے۔

آیت 2 : اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا : اس آیت میں یہ یقین دلانے کے ساتھ کہ اس کتاب کو ہم نے ہی نازل کیا ہے، اسے عربی قرآن بنا کر نازل کرنے کی حکمت بیان فرمائی ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ یوسف کی آیت (۲) کی تفسیر۔

آیت 4 : ۱۱ وَ اِنَّهٗ فِی الْاِنْشٰءِ لَحَكِیْمٌ : ”اَفْرِ الْكِتٰبِ“ کا معنی ہے ”کتاب کا اصل“۔ اکثر مفسرین نے اس سے مراد لوح محفوظ لیا ہے، جہاں سے تمام آسمانی کتابیں نازل ہوئی ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِیْدٌ ۙ فِیْ نُوْحٍ مَّحْفُوْظٍ﴾ [البروج : ۲۱، ۲۲] ”بلکہ وہ ایک بڑی شان والا قرآن ہے۔ اس سختی میں (لکھا ہوا) ہے جس کی حفاظت کی گئی ہے۔“ اور فرمایا: ﴿اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِیْمٌ ۙ فِیْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۙ لَا یَبْسُطُهٗ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۙ تَنْزِیْلٌ مِّنْ عَرَبٍ عَلَیْمِیْنَ﴾ [الواقعة : ۷۷ تا ۸۰] ”کہ بلاشبہ یہ یقیناً ایک باعزت پڑھی جانے والی چیز ہے۔ ایک ایسی کتاب میں جو چھپا کر رکھی ہوئی ہے۔ اسے کوئی ہاتھ نہیں لگا تا مگر جو بہت پاک کیے ہوئے ہیں۔ تمام جہانوں کے رب کی طرف سے اتاری ہوئی ہے۔“

بعض مفسرین نے فرمایا کہ ”اَفْرِ الْكِتٰبِ“ سے مراد اللہ تعالیٰ کا علم ہے جو ہر آسمانی کتاب کا اصل ہے۔ لوح محفوظ کا اصل بھی وہی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ اِنَّكَ لَتَكَلِّمُ الْقُرْاٰنَ مِنْ لَدُنْ حَكِیْمٍ عَلِیْمٍ﴾ [النمل : ۶] ”اور بلاشبہ یقیناً تجھے یہ قرآن ایک کمال حکمت والے، سب کچھ جاننے والے کے پاس سے عطا کیا جاتا ہے۔“

آیت 2 : لَدُنَّا لَعَلَّیْ حَكِیْمٌ : ”لَدُنَّی“ اور ”عِنْدَ“ دونوں کا معنی ”کسی کے پاس“ ہونا ہے، مگر ”لَدُنَّی“ خاص قرب کے لیے ہے۔

أَفَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا أَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُسْرِفِينَ ۝

تعمیلاً ہم تم سے اس نصیحت کو ہٹالیں، اعراض کرتے ہوئے، اس وجہ سے کہ تم حد سے بڑھنے والے لوگ ہو ۝

اور ”عِنْدَ“ عام کے لیے۔ چنانچہ ”الْمَالُ عِنْدَ زَيْدٍ“ (مال زید کے پاس ہے) اس مال کے لیے بھی آتا ہے جو اس کے پاس حاضر ہو اور اس مال کے لیے بھی جو اس کے خزانے میں ہو، جبکہ ”الْمَالُ لَدَيْ زَيْدٍ“ صرف اس مال کے لیے آتا ہے جو اس کے پاس حاضر ہو۔ (تفسیر ثنائی) ”لَعَلِّي“ یعنی یہ قرآن ہمارے علم میں (یا لوح محفوظ میں) ہمارے پاس یعنی ہمارے خاص قرب میں بہت بلند مرتبے والا ہے، ملاءِ اعلیٰ میں اس کا بہت اونچا مقام ہے، تمام کتابوں اور تمام علوم سے برتر اور بلند ہے۔ ”حَكِيمٌ“ یعنی کمال حکمت اور دانائی کی باتوں سے بھرا ہوا ہے، اس کی ہر بات دانائی پر مشتمل اور صحیح عقل کے عین مطابق ہے۔ ”حَكِيمٌ“ کا معنی محکم بھی ہے، یعنی یہ قرآن ایسا مضبوط و محکم ہے کہ نہ اس میں کسی طرح باطل کی آمیزش ہو سکتی ہے نہ باطل اس کے مقابلے میں ٹھہر سکتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلًا مِّنْ حَكِيمٍ حَبِيدٍ﴾ [ختم السجدة: ۴۲] ”اس کے پاس باطل نہ اس کے آگے سے آتا ہے اور نہ اس کے پیچھے سے، ایک کمال حکمت والے، تمام خوبیوں والے کی طرف سے اتاری ہوئی ہے۔“ مزید دیکھیے سورہ ہود (۱) مراد اس آیت سے اللہ تعالیٰ کے ہاں اس قرآن کی قدر و منزلت ذہن نشین کروانا ہے، تاکہ کوئی شخص اسے معمولی سمجھ کر اس پر ایمان لانے اور اس سے فائدہ اٹھانے سے محروم نہ رہے۔ اسی بلند مرتبے کا اظہار ”إِنَّكَ لَقَرَّانٌ كَرِيمٌ“ اور ”بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيدٌ“ کے الفاظ کے ساتھ فرمایا ہے۔ دیکھیے سورہ واقعہ (۷۷) اور سورہ بروج (۲۱)۔

ت 5 ۱) أَفَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا: ”ضَرَبَ“ کا صلہ جب ”عَنْ“ آئے تو اس کا معنی ”صَرَفَ عَنْهُ“ (پہرنا، اعراض کرنا) آتا ہے۔ ”صَفْحًا“ ”صَفَحَ عَنْهُ“ کا مصدر ہے، اس کا معنی بھی اعراض کرنا ہے۔ اب ”أَفَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا“ کی کئی ترکیبیں ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ یہ مصدر مفعول مطلق ہے تاکید کے لیے، کیونکہ ”أَفَضْرِبُ عَنْكُمُ“ کا معنی بھی اعراض کرنا ہے اور ”صَفْحًا“ کا بھی یہی معنی ہے۔ گویا یہ مصدر مفعول مطلق فعل کے ہم معنی لفظ کے ساتھ ہے، جیسے ”فَعَدْتُ جُلُوسًا“ ہے۔ معنی یہ ہو گا کہ ”کیا ہم یہ نصیحت تم سے ہٹالیں، بالکل ہٹالینا؟“ اور ایک یہ کہ ”صَفْحًا“ مفعول لہ یا حال ہے، یعنی ”کیا ہم تم سے یہ نصیحت اپنے اعراض کی وجہ سے یا اعراض کرتے ہوئے ہٹالیں؟“

۲) أَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُسْرِفِينَ: ”أَنْ“ سے پہلے لام جارہ محذوف ہے اور ”كُنْتُمْ“ میں استمرار ہے: ”أَيُّ لَأَنْ كُنْتُمْ“ ”اس لیے کہ تم حد سے بڑھنے والے لوگ چلے آئے ہو۔“ آیت کا مطلب یہ ہوا کہ ہم نے اتنا بلند مرتبہ قرآن تمہاری زبان میں تمہارے سمجھانے کے لیے نازل کیا، مگر تم زیادتی اور اسراف پر ڈٹے رہے اور مسلسل انکار کرتے رہے، تو کیا تمہارے اس مسلسل اسراف و انکار کی وجہ سے ہم اعراض کرتے ہوئے تم سے اس نصیحت کو ہٹالیں اور تمہیں سمجھانا چھوڑ دیں؟ یعنی ہم ایسا نہیں کریں گے اور نہ یہ ہماری رحمت کا تقاضا ہے، کیونکہ تمہارا اسراف اور گمراہی تو قرآن اتارے جانے کا اصل سبب ہے۔

وَكَمْ أَرْسَلْنَا مِنْ نَبِيِّ فِي الْأَوَّلِينَ ① وَمَا يَأْتِيهِمْ مِنْ نَبِيٍّ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ②
فَأَهْلَكْنَا أَشَدَّ مِنْهُمْ بَطْشًا ③ وَمَضَى مَثَلُ الْأَوَّلِينَ ④ وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ لَنْ نَخْلُقَ السَّمَوَاتِ
وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ خَلَقْنَاهُنَّ الْعَزِيزُ الْعَلِيمُ ⑤

اور کتنے ہی نبی ہم نے پہلے لوگوں میں بھیجے ① اور ان کے پاس کوئی نبی نہیں آتا تھا مگر وہ اس کا مذاق اڑاتے تھے ② تو ہم نے ان سے زیادہ سخت پکڑ والوں کو ہلاک کر دیا اور پہلے لوگوں کی مثال گزر چکی ④ اور بلاشبہ اگر تو ان سے پوچھے کہ آسمانوں کو اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو یقیناً ضرور کہیں گے کہ انھیں سب پر غالب، سب کچھ جاننے والے نے پیدا کیا ہے ⑤

چنانچہ ان کے انکار کے باوجود قرآن تکبیس برس تک اترتا رہا، بے شمار سعید روہیں اس پر ایمان لائیں اور جو کفر پر ڈٹے رہے ان پر جہت قائم ہو گئی اور ان کی پشتوں سے بھی لاتعداد لوگ اسلام کے حلقہ بگوش ہوئے۔

آیت 7.6 وَكَمْ أَرْسَلْنَا مِنْ نَبِيٍّ فِي الْأَوَّلِينَ اس میں رسول اللہ ﷺ کے لیے تسلی ہے اور جھٹلانے والوں کے لیے تنبیہ۔ یعنی آپ پہلے نبی نہیں جسے جھٹلایا گیا ہو اور جس کا مذاق اڑایا گیا ہو اور نہ یہ پہلے مذاق اڑانے والے ہیں، بلکہ آپ سے پہلے لوگوں میں ہم نے کتنے ہی نبی بھیجے، ان کا حال بھی یہی تھا کہ ان کے پاس جو نبی آتا وہ اس کا مذاق اڑاتے تھے، مگر نہ ہم نے نصیحت کا سلسلہ ترک کیا اور نہ پیغمبروں کا سلسلہ بند کیا، تو ان کے مسرف و منکر ہونے کی وجہ سے ہم انھیں نصیحت کرنا کیوں چھوڑیں گے؟

آیت 8 ① فَأَهْلَكْنَا أَشَدَّ مِنْهُمْ بَطْشًا: یعنی ان کفار کہہ کی کیا حیثیت ہے، جو لوگ توت اور گرفت میں ان سے کہیں زیادہ تھے ہم نے انھیں ہلاک کر دیا۔ اگر یہ اپنی روش سے باز نہ آئے تو انھیں بھی اپنا انجام سوچ لینا چاہیے۔ "أَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا فَسْرِفِينَ" میں جن قریش کہہ کو مخاطب کیا تھا اب "أَشَدَّ مِنْهُمْ بَطْشًا" میں ان کا ذکر غائب کے صیغے کے ساتھ ہے، یہ التفات ہے، مقصود ناراضی کا اظہار ہے۔

② وَمَضَى مَثَلُ الْأَوَّلِينَ: یعنی قرآن میں ایسے پہلے لوگوں کی مثال گزر چکی ہے۔ "مَثَلٌ" کا معنی صفت اور حال بھی ہوتا ہے، یعنی پہلے لوگوں کا حال گزر چکا ہے، جیسے قوم نوح اور عاد و ثمود وغیرہ۔ "مَضَى يَمْضِي" کا معنی ہے جاری ہونا، یعنی پہلے لوگوں کی مثال چل پڑی اور ان کے قصے مشہور ہو گئے، جنھیں لوگ نسل در نسل بیان کرتے چلے آئے۔

آیت 9 ① وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ لَنْ نَخْلُقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ: یہاں سے کفار کے قول و فعل کا تضاد واضح کیا جا رہا ہے کہ یہ لوگ اللہ کے ساتھ شرک کرتے ہیں، نبی کریم ﷺ کی رسالت کا انکار کرتے ہیں اور قیامت کے دن دوبارہ زندہ ہو کر پیش ہونے کو ناممکن قرار دیتے ہیں، حالانکہ اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمانوں کو اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو وہ یقیناً کہیں کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ مَهْدًا وَجَعَلَ لَكُمْ فِيهَا سُبُلًا لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿۱۰﴾

وہ جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا بنایا اور اس میں تمہارے لیے راستے بنائے، تاکہ تم راہ پاؤ۔ ﴿۱۰﴾

گے کہ اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔ تو پھر یہ کیا ستم ہے کہ یہ لوگ اس ذات کے ساتھ جس نے آسمان و زمین اور پوری کائنات کو پیدا کیا، ایسی ہستیوں کو شریک کر رہے ہیں جنہوں نے ایک ذرہ بھی پیدا نہیں کیا۔ پھر ظاہر ہے کہ یہ بات کہ آسمانوں اور زمین کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے، پہلے رسولوں کے بتانے ہی سے لوگوں کو معلوم ہوئی۔ اہل عرب کو بھی اس بات کا علم ابراہیم اور اسماعیل علیہم السلام کے بتانے سے ہوا، کیونکہ عوام الناس اتنی اہلیت ہی نہیں رکھتے کہ کائنات کی حقیقتیں خود معلوم کر سکیں۔ تو جب یہ پہلے رسولوں کو مانتے ہیں تو انہی کی تعلیم لے کر آنے والے اس پیغمبر پر کیوں ایمان نہیں لاتے؟ ایک طرف تو یہ اللہ تعالیٰ کو اس وقت آسمان و زمین پیدا کرنے پر قادر مانتے ہیں جب ان کا وجود ہی نہیں تھا تو دوسری طرف اسے اتنا بے بس قرار دیتے ہیں کہ وہ اس چیز کو دوبارہ نہیں بنا سکتا جو اس نے پہلے بنائی تھی۔

﴿۲﴾ لِيَقُولُنَّ خَلَقْنَاهُنَّ الْعَزِيزُ الْعَلِيمُ: مشرکین عرب کی طرف سے اس سوال کا جواب کہ آسمان و زمین کو کس نے پیدا کیا یہی تھا کہ انہیں ”اللہ“ نے پیدا کیا ہے، جیسا کہ سورہ لقمان (۲۵) اور سورہ زمر (۳۸) میں فرمایا: ﴿وَلَيْسَ سَأَلْتَهُمْ فَن خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لِيَقُولُنَّ اللّٰهُ﴾ ”اور بلاشبہ اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمانوں کو اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو وہ ضرور ہی کہیں گے کہ اللہ نے۔“ یہاں اسی بات کو ان الفاظ میں ادا فرمایا کہ وہ کہیں گے کہ انہیں اسی عزیز و علیم نے پیدا کیا ہے۔ کیونکہ ان کے اس اعتراف کا کہ ”انہیں اللہ نے پیدا کیا“ لازمی تقاضا ہے کہ وہ یہ اعتراف بھی کریں کہ وہ عزیز و علیم ہے، کیونکہ کامل غلبے اور کمال علم کے بغیر آسمان و زمین کا پیدا کرنا ممکن نہیں۔

آیت 10 ﴿۱﴾ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ مَهْدًا: یہاں سے اللہ تعالیٰ نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے اپنے احسانات گوانے شروع فرمائے۔ چنانچہ یہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے، ان کا قول نہیں، ورنہ الفاظ یہ ہوتے: ”الَّذِي جَعَلَ لَنَا الْأَرْضَ مَهْدًا.....“ ”وہ جس نے ہمارے لیے زمین کو بچھونا بنا دیا.....“

﴿۲﴾ ”مَهْدًا“ کا معنی بچھونا بھی ہے اور بچے کا گہوارہ بھی، یعنی جس طرح آدمی بچھونے میں آرام سے لیٹتا ہوتا ہے ایسے ہی تمہارے لیے اس عظیم الشان کمرے کو آرام کی جگہ بنا دیا، جو فضا میں مطلق ہے، جو ایک طرف اپنے محور پر ایک ہزار (۱۰۰۰) میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گھوم رہا ہے اور دوسری طرف چھیا سٹھ ہزار چھ سو (۶۶۶۰۰) میل فی گھنٹہ کی رفتار سے رواں دواں ہے، جس کے پیٹ میں پتھروں تک کو پگھلا دینے والی اور شدید زلزلے پیدا کرنے والی آگ موجود ہے، جو کبھی کبھی آتش فشاں کی شکل میں لاوا اگل کر تمہیں بھی اپنے وجود سے آگاہ کرتی ہے، مگر اس کے باوجود تمہارے مالک نے پہاڑوں کے ساتھ اسے ایسا متوازن اور پُر سکون بنا دیا ہے کہ تم آرام سے اس پر چلتے پھرتے، سو تے اور آرام کرتے ہو۔ تمہیں معمولی جھٹکا بھی نہیں لگتا اور احساس تک نہیں ہوتا کہ تم ہندو کی گولی سے بھی تیز رفتار گاڑی پر سوار ہو۔ ہاں، کبھی کبھی اس کی کوئی ہلکی

وَالَّذِي نَزَّلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً بِقَدَرٍ فَأَنْشَرْنَا بِهِ بَلْدَةً مَّيْتًا، كَذَلِكَ تُخْرَجُونَ ﴿۱۱﴾
وَالَّذِي خَلَقَ الْأَزْوَاجَ كُلَّهَا وَجَعَلَ لَكُم مِّنَ الْفُلْكِ وَالْأَنْعَامِ مَا تَرْكَبُونَ ﴿۱۲﴾

اور وہ جس نے آسمان سے ایک اندازے کے ساتھ پانی اتارا، پھر ہم نے اس کے ساتھ ایک مردہ شہر کو زندہ کر دیا، اسی طرح تم نکالے جاؤ گے ﴿۱۱﴾ اور وہ جس نے سب کے سب جوڑے پیدا کیے اور تمہارے لیے وہ کشتیاں اور چوپائے بنائے جن پر تم سوار ہو گے ہو ﴿۱۲﴾

ی جہر جہری زلزلے کی شکل میں تمہیں آگاہ کرتی ہے کہ کتنی خوفناک بلا کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے تابع فرمان کر رکھا ہے۔ مزید دیکھیے سورہ فجر (۱۹)، رعد (۳) اور سورہ نحل (۱۵)۔

﴿۱۱﴾ وَجَعَلَ لَكُمْ فِيهَا سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ: اللہ تعالیٰ نے یہاں زمین میں راستے بنانے کو اپنا احسان قرار دیا۔ پہاڑوں کے اندر رزے اور میدانوں اور پہاڑوں میں دریاؤں کے کنارے وہ قدرتی راستے ہیں جن کی مدد سے انسان ساری زمین پر پھیلا ہے اور ایک دوسرے کے پاس آمد و رفت رکھتا ہے۔ ان کے علاوہ صحراؤں اور میدانوں میں امتیازی نشانات آدمی کو راستے مقرر کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ اگر پہاڑ ٹھوس دیوار کی شکل میں ہوتے یا میدانوں اور صحراؤں میں راستوں کی علامات نہ ہوتیں تو آدمی جہاں پیدا ہوا تھا وہیں مقید ہو کر رہ جاتا۔ مزید دیکھیے سورہ نحل (۱۵)، ﴿۱۶﴾۔

آیت 11 ﴿۱﴾ وَالَّذِي نَزَّلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً بِقَدَرٍ: اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ مومنون کی آیت (۱۸) کی تفسیر۔

﴿۲﴾ فَأَنْشَرْنَا بِهِ بَلْدَةً مَّيْتًا: ”وَالَّذِي نَزَّلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً بِقَدَرٍ“ میں اپنا ذکر غائب کے صیغے سے کیا اور ”فَأَنْشَرْنَا بِهِ“ میں جمع حکم کے صیغے کے ساتھ فرمایا، اس سے مقصود اپنی شہنشاہی اور عظمت کا اظہار ہے کہ ہم ہیں جو بارش کے ساتھ مردہ شہر کو زندہ کر دیتے ہیں، کسی دوسرے میں نہ یہ طاقت ہے اور نہ ہی کوئی دوسرا اس میں شریک ہے۔

﴿۳﴾ كَذَلِكَ تُخْرَجُونَ: بارش کے ساتھ مردہ زمین زندہ کر دینے کو قیامت کی دلیل کے طور پر پیش فرمایا کہ جس طرح ہم مردہ زمین کو بارش کے ساتھ زندہ اور آباد کر دیتے ہیں ایسے ہی تمہیں زندہ کر کے قبروں سے نکال کھڑا کریں گے۔ مزید دیکھیے سورہ نحل (۶۵)، حج (۶۵)، روم (۵۰)، فاطر (۹) اور سورہ لیس (۳۳، ۳۴)۔

آیت 12 ﴿۱﴾ وَالَّذِي خَلَقَ الْأَزْوَاجَ كُلَّهَا: تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ لیس کی آیت (۳۶) کی تفسیر۔

﴿۲﴾ وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَالْأَنْعَامِ مَا تَرْكَبُونَ: اس سے پہلے زمین میں راستے بنانے کا ذکر فرمایا ہے جن کے ذریعے سے لوگ مختلف جگہوں کی طرف اپنی ضروریات کے لیے سفر کرتے ہیں، اب یہ نعمت یاد دلائی کہ شہروں، میدانوں، صحراؤں اور پہاڑوں میں سفر کے لیے اللہ تعالیٰ نے چوپائے پیدا فرمائے اور سمندروں میں قریب و دور سفروں کے لیے کشتیاں اور بڑے بڑے جہاز بنائے۔ بقائے نے ”خَلَقَ الْأَزْوَاجَ كُلَّهَا“ کے ساتھ چوپاؤں اور کشتیوں کے ذکر کی بھی ایک مناسبت

لِنَسْتَوِيَ عَلَى ظُهُورِهِ ثُمَّ تَذَكَّرُوا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ إِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَ تَقُولُوا سُبْحَانَ
الَّذِي سَخَّرَ لَنَا هَذَا وَمَا كُنَّا لَهُ مُقْرِنِينَ ﴿۱۳﴾ وَإِنَّا إِلَىٰ رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُونَ ﴿۱۴﴾

ان کی پشتوں پر جم کر بیٹھو، پھر اپنے رب کی نعمت یاد کرو، جب ان پر جم کر بیٹھ جاؤ اور کہو پاک ہے وہ جس
کے ہمارے لیے بیچ کر دیا، حالانکہ ہم اسے قابو میں لانے والے نہیں تھے ﴿۱۳﴾ اور نہ ہی شک ہم اپنے رب کی
نعمت ضرور لوٹ کر جانے والے ہیں ﴿۱۴﴾

ذکر فرمائی ہے کہ "الْأَزْوَاجُ" سے ذہن مختلف جوڑوں کی طرف منتقل ہوتا ہے، مثلاً نر اور مادہ، اس لیے یہ واضح کرنے کے
لیے کہ "الْأَزْوَاجُ" سے مراد صرف جوڑے ہی نہیں بلکہ وہ تمام اصناف ہیں جن کی ایک دوسرے سے مناسبت یا موافقت یا
مخالفت ہوتی ہے، جیسے زمین و آسمان، شب و روز، نیک و بد اور جنت و جہنم وغیرہ، اللہ تعالیٰ نے چوپاؤں اور کشتیوں کا ذکر فرمایا
کہ دونوں کی بناوت ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے، مگر مقصود دونوں سے ایک ہے "مَا تَرْكِبُونَ" یعنی انسان کے لیے
بحر و بر میں سواری مہیا کرنا۔

آیت 14-13 ﴿۱۳﴾ لِنَسْتَوِيَ عَلَى ظُهُورِهِ : انسان جب گھوڑوں، گدھوں، فخریوں، اونٹوں یا کشتیوں پر سوار ہوتا ہے
اور جم کر بیٹھ جاتا ہے تو عام عادت بن جانے کی وجہ سے اسے احساس ہی نہیں ہوتا کہ اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان
سواریوں کو تابع کر دیے جانے کی کتنی بڑی نعمت عطا ہوئی ہے۔ ذرا کسی شیر یا چیتے یا کسی اور جنگلی جانور پر اس طرح جم کر بیٹھے،
پھر اسے اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کی قدر ہوگی۔ یہی حال سمندر میں پہاڑوں جیسی موجوں کے درمیان بحری جہازوں پر سکون و
اطمینان کے ساتھ سواری کا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس نے کشتیوں اور چوپاؤں میں سے تمہارے لیے سواریاں
عائیں، تاکہ ان کی پشتوں پر جم کر بیٹھو، پھر جب ان پر جم کر بیٹھ جاؤ تو اپنے رب کی انہیں تمہارے لیے مسخر کرنے کی نعمت یاد کرو۔
﴿۱۴﴾ وَ تَقُولُوا سُبْحَانَ الَّذِي سَخَّرَ لَنَا هَذَا : اور دل میں یاد کرنے کے ساتھ زبان سے بھی اللہ تعالیٰ کی تسبیح ان
الفاظ میں بیان کرو، تاکہ تمہیں احساس رہے اور اقرار بھی ہوتا رہے کہ ان سواریوں کو قابو میں لانا کبھی ہمارے بس کی بات نہ
تھی اور یہ بھی کہ اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے ان سواریوں کی محتاجی ہم مجبور بندوں کی ضرورت ہے۔ ہمارا مالک ہر قسم
کے احتیاج اور مجبوری سے پاک ہے۔ اگر انسان سوچے تو سواریوں سے پہلے زمین کی پشت بھی چوپاؤں اور کشتیوں کی پشت
کی طرح ہے، جس پر سوار وہ زمانے کے حوادث اور تھپیڑوں کے درمیان جم کر محسوس فرمے۔ سو ہماری ابتدا ہمارے رب کی طرف
سے ہوئی، اس نے زندگی بسر کرنے کے لیے زمین کی پشت کو ہمارے لیے بچھونا بنا دیا، پھر اس نے چوپاؤں اور کشتیوں کی پشت
کو ہمارے لیے جائے سکون بنا دیا، اب ساری عمر ہم ان پر سکون و اطمینان کے ساتھ سوار ہوتے رہتے ہیں۔

﴿۱۵﴾ وَإِنَّا إِلَىٰ رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُونَ : اور یہ بات یقینی ہے کہ ہم دنیا کی زندگی کا سفر پورا کرنے کے بعد اپنے رب کی طرف واپس

وَجَعَلُوا لَهُ مِنْ عِبَادِهِ جُزْءًا إِنَّ الْإِنْسَانَ لَكَفُورٌ مُّبِينٌ ﴿۱۵﴾

اور انھوں نے اس کے لیے اس کے بعض بندوں کو جز بنا ڈالا، بے شک انسان یقیناً صریح ناشکر ہے ﴿۱۵﴾

پلٹنے والے ہیں۔ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا: ”اس میں دنیا کے سفر سے آخرت کے سفر کی طرف تشبیہ ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے دنیوی زاد سے آخرت کے زاد کی طرف تشبیہ فرمائی، فرمایا: ﴿وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوَى﴾ [البقرہ: ۱۹۷] ”اور زادِ راہ لے لو کہ بے شک زادِ راہ کی سب سے بہتر خوبی (سوال سے) چٹا ہے۔“ اور دنیوی لباس کے ساتھ آخرت کے لباس کی طرف تشبیہ فرمائی ہے، فرمایا: ﴿وَرِيثًا وَيَأْسُ التَّقْوَى ذَٰلِكَ خَيْرٌ﴾ [الأعراف: ۲۶] ”اور زینت بھی اور تقویٰ کا لباس! وہ سب سے بہتر ہے۔“

﴿۱۵﴾ ”عَلَى ظُهُورِهِ“ میں ”ذ“ ضمیر ”مَا تَزْكِيُونَ“ میں اسم موصول کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اگرچہ اس کے معنی میں عموم ہے، مگر لفظ واحد ہونے کی وجہ سے ضمیر واحد لائی گئی ہے۔

﴿۱۵﴾ یہ دعا سواری پر سوار ہونے کے بعد کی ہے، سوار ہوتے وقت ”بِسْمِ اللّٰهِ“ پڑھنا چاہیے، جیسا کہ نوح علیہ السلام نے اپنے ساتھ کشتی میں سوار ہونے والوں کو فرمایا تھا: ﴿وَقَالَ اٰزْكُبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ وَخَرْتَهَا وَمُرْسَهَا اِنَّ لِيْ بِعَفْوْرِ مَّحِيْمٍ﴾ [ہود: ۴۱] ”اور اس نے کہا اس میں سوار ہو جاؤ، اس کا چلنا اور اس کا ٹھہرنا اللہ ہی کے نام کے ساتھ ہے، بے شک میرا رب یقیناً بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے۔“

علی ازدی کہتے ہیں کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے انھیں سکھایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی سفر کی طرف نکلتے ہوئے سواری پر جم کر بیٹھ جاتے تو تین دفعہ ”اللّٰهُ اَكْبَرُ“ کہتے، پھر کہتے: ﴿سُبْحٰنَ الَّذِي سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ وَاِنَّا اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ، اللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْأَلُكَ فِيْ سَفَرِنَا هٰذَا الْبِرَّ وَالتَّقْوٰى وَمِنَ الْعَمَلِ مَا تَرْضٰى، اللّٰهُمَّ هَوِّنْ عَلَيْنَا سَفَرِنَا هٰذَا وَاطْوِ عَلَيْنَا بُعْدَهٗ، اللّٰهُمَّ اَنْتَ الصّٰحِبُ فِي السَّفَرِ وَالْخَلِيْفَةُ فِي الْاَهْلِ، اللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ وُعْنَاءِ السَّفَرِ وَكٰتِبَةِ الْمُنْظَرِ وَسُوْءِ الْمُنْقَلَبِ فِي الْمَالِ وَ الْاَهْلِ﴾ ”پاک ہے وہ جس نے اسے ہمارے لیے تابع کر دیا، حالانکہ ہم اسے قابو میں لانے والے نہ تھے اور بے شک ہم اپنے رب کی طرف ضرور لوٹ کر جانے والے ہیں۔ اے اللہ! ہم اپنے اس سفر میں تجھ سے نیکی اور تقویٰ کا سوال کرتے ہیں اور عمل میں سے ایسے عمل کا جسے تو پسند فرمائے۔ اے اللہ! ہم پر ہمارا یہ سفر آسان کر دے اور اس کی دوری کو ہم سے لپیٹ دے۔ اے اللہ! تو ہی سفر میں ساتھی اور گھر والوں میں جانشین ہے۔ اے اللہ! میں سفر کی مشقت اور غم ناک منظر دیکھنے سے اور مال اور اہل میں ناکام لوٹنے کی برائی سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔“ اور جب سفر سے واپس لوٹتے تو یہی الفاظ کہتے اور یہ الفاظ مزید کہتے: ﴿اَيُّوْنَ تَأْتِيُوْنَ عَابِدُوْنَ لِرَبِّنَا حَامِدُوْنَ﴾ [مسلم، الحج، باب استحباب الذکر اذا ركب دابته : ۱۳۴۲] ”ہم واپس لوٹنے والے، توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، اپنے رب کی حمد کرنے والے ہیں۔“ کتب احادیث میں سفر کی اور دعائیں بھی مذکور ہیں۔

آیت 15 ﴿۱۵﴾ وَجَعَلُوا لَهُ مِنْ عِبَادِهِ جُزْءًا: اس آیت کا تعلق آیت (۹): ﴿وَلَيْن سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ﴾ کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

أَمَّا اتَّخَذَ مِنَّا يَخْلُقُ بِنْتٍ وَأَصْفُكُمْ بِالْبَنِينَ ﴿۱۶﴾ وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُم بِمَا صَرَبَ
لِلزَّخْنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهَهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ ﴿۱۷﴾

یا اس نے اس (مخلوق) میں سے جسے وہ پیدا کرتا ہے (خود) بیٹیاں رکھ لیں اور تمہیں بیٹوں کے لیے جن لیا؟ ﴿۱۶﴾
حالانکہ جب ان میں سے کسی کو اس چیز کی خوش خبری دی جائے جس کی اس نے رحمان کے لیے مثال بیان کی ہے تو
اس کا منہ سارا دن سیاہ رہتا ہے اور وہ غم سے بھرا ہوتا ہے ﴿۱۷﴾

وَالْأَرْضُ لِيَقُولُنَّ خَلَقْتُنَّ الْعَزِيزُ الْعَلِيمُ ﴿۱۸﴾ کے ساتھ ہے، اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو مشرکین کی جہالت پر تعجب دلاتے
ہوئے فرما رہے ہیں کہ دیکھو یہ لوگ مانتے ہیں کہ آسمان و زمین کا خالق اور ان کی ہر چیز کا مدبر اللہ تعالیٰ ہے، جو مخلوق سے جدا
ہے اور کسی طرح محتاج نہیں، پھر اس کے لیے شریک اور اس کی اولاد بناتے ہیں۔ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ جو آسمان و زمین کو پیدا
کرنے کی طاقت رکھتا ہے وہ مدد کے لیے یا دل لگانے کے لیے کسی کا محتاج نہیں، کیونکہ یہ دونوں نقص کی علامتیں ہیں۔ پھر ظلم
دیکھو کہ عباد (غلاموں) کو اولاد قرار دے رہے ہیں، جب کہ اولاد غلام ہو ہی نہیں سکتی، کیونکہ وہ تو باپ کا جزد ہوتی ہے۔ جب
کوئی اللہ کا جزد ثابت ہو گیا تو اللہ تعالیٰ کا اس کا محتاج ہونا بھی ثابت ہو گیا۔ ”عبادۃ“ میں فرشتے، جن اور انسان سبھی داخل
ہیں۔ یہود و نصاریٰ نے عزیر و مسیح کو ابن اللہ قرار دیا، تو کچھ نام نہاد مسلمانوں نے رسول اللہ ﷺ کو اللہ کے نور کا ٹکڑا قرار دیا
اور بعض نے کہا کہ حج تن اللہ کے نور سے پیدا ہوئے ہیں۔ دیکھیے سورہ توبہ کی آیت (۳۰) کی تفسیر۔ مشرکین فرشتوں کو اللہ تعالیٰ
کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ انھوں نے ان کے بت عورتوں کی شکل میں بنا رکھے تھے۔ یہی دیویاں تھیں جن کی وہ عبادت کرتے تھے۔

﴿۱۸﴾ إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُفُورٌ ﴿۱۹﴾ صریح ناشکر اس لیے کہ جس پروردگار نے اسے پیدا کیا، زمین و آسمان اور کل کائنات پیدا
فرمایا، اس کا شکر ادا کرتے ہوئے اس کو ایک مان کر اس کیلئے کی بندگی کرنے کے بجائے اس نے اس کے بندوں کو اس کی
اولاد قرار دے کر صفات ہی میں نہیں اس کی ذات میں بھی شریک ٹھہرا دیا۔

آیت 16: أَمَّا اتَّخَذَ مِنَّا يَخْلُقُ بِنْتٍ ان کی ناشکری کی انتہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اولاد ٹھہرائی تو بیٹیاں جو بیٹوں سے
کم تر ہوتی ہیں، جب کہ اپنے لیے وہ بیٹوں کے خواہش مند ہیں۔ ”اُھْر“ (یا) سے پہلے ایک جملہ محذوف ہے، یعنی (کیا اسے زبردستی
لڑکیاں دے دی گئی ہیں جنہیں وہ بنائیں گا) یا خود ہی اپنی ساری قدرت و اختیار کے باوجود لڑکیاں لینے پر راضی ہو گیا اور تمہیں
بیٹے دینے کے لیے چن لیا، حالانکہ کم تر چیز پر تو کوئی بے خوف ہی راضی ہوتا ہے۔ سو چو! تم اللہ کی کتنی بڑی گستاخی کر رہے ہو۔

آیت 17: وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُم بِمَا صَرَبَ لِلزَّخْنِ مَثَلًا کتنی بڑی ناشکری ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ذمے وہ
چیز لگا دی جس سے وہ خود شہید نفرت اور کراہت کرتے ہیں۔ بیٹیوں سے ان کی نفرت کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ نعل
کی آیات (۵۸، ۵۹) کی تفسیر۔ ”ظَلَّ وَجْهَهُ مُسْوَدًّا“ (اس کا منہ سارا دن سیاہ رہتا ہے) اس لیے فرمایا کہ چہرے کی
سیاہی دن کو نظر آتی ہے، ورنہ چہرہ تو رات کو بھی سیاہ رہتا ہے۔

أَوْ مَنْ يُنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ ۝۱۸ وَجَعَلُوا الْمَلَائِكَةَ الَّذِينَ هُمْ
عِبُدُ الرَّحْمَنِ إِنَاثًا ۚ أَشْهَدُوا خَلْقَهُمْ ۖ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْأَلُونَ ۝۱۹

اور کیا (اس نے اسے رحمان کی اولاد قرار دیا ہے) جس کی پرورش زیور میں کی جاتی ہے اور وہ جھگڑے میں باہر
واضح کرنے والی نہیں؟ ۱۸ اور انھوں نے فرشتوں کو، وہ جو رحمان کے بندے ہیں، عورتیں بنا دیا، کیا وہ ان کی پیدائش
کے وقت حاضر تھے؟ ان کی گواہی ضرور لکھی جائے گی اور وہ پوچھے جائیں گے ۱۹

آیت 18 ① أَوْ مَنْ يُنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ : اس آیت میں دو دھجوں سے لڑکیوں کا لڑکوں سے کم تر ہونا بیان فرمایا
ہے، ایک یہ کہ عورتوں کا حسن زیور وغیرہ کی زینت کا محتاج ہے، اس لیے بچپن ہی سے ان کی پرورش زیور میں کی جاتی ہے،
جب کہ مرد کو اس کی ضرورت نہیں، اس کا حسن ویسے ہی کامل ہے۔ دوسری یہ کہ مرد مضبوط، دلیر اور شجاع ہوتا ہے جو نم ٹھونک کر
دشمن کے مقابلے میں اترتا ہے، جب کہ عورت نرم و نازک اور کمزور ہوتی ہے جس کی بہادری یہ ہے کہ جب بس نہ چلے تو رو کر
دکھا دے۔ فرمایا ایسی کمزور جنس کو اللہ تعالیٰ کی اولاد قرار دیتے ہو اور لڑکے جو مرد میدان اور صاحب عزم و ہمت ہوتے ہیں
اپنے لیے پسند کرتے ہو۔

② اس آیت سے عورتوں کے لیے زیور کا جواز ثابت ہوتا ہے، اس لیے ان کے لیے سونا اور ریشم پہننا حلال کر دیا گیا جو مردوں
کے لیے حرام ہے اور یہ بھی کہ مردوں کو نسوانی آرائش اختیار کرنے سے اجتناب لازم ہے۔ دونوں مسئلوں کی احادیث معروف ہیں۔

آیت 18 ① وَجَعَلُوا الْمَلَائِكَةَ الَّذِينَ هُمْ عِبُدُ الرَّحْمَنِ إِنَاثًا : فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دینے میں
انھوں نے دو ظلم کیے، ایک یہ کہ فرشتے جو اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں انھیں ان کے مرتبے سے بڑھا کر اللہ تعالیٰ کی اولاد بنا دیا
جو صریح شرک ہے اور عبودیت اور ولدیت کسی صورت جمع نہیں ہو سکتیں۔ دوسرا ظلم یہ کہ فرشتے جو مذکورہ تائید سے بلند و برتر
ہیں اور جن کی پیدائش ہی انسانوں سے مختلف ہے، انھیں اتنا گرایا کہ ان کے لیے برتر جنس مرد کے بجائے کمزور جنس عورت ہونا
تجویز کیا۔ جھوٹے اور بہتان باز لوگوں کا جھوٹ ایسے ہی تناقض سے ظاہر ہوا کرتا ہے۔

② أَشْهَدُوا خَلْقَهُمْ : اس کے دو معانی ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو پیدا کیا، کیا اس وقت یہ لوگ
حاضر تھے کہ انھیں ان کا مؤنث ہونا معلوم ہو گیا۔ دوسرا یہ کہ کیا انھوں نے ان کے جسم کی ساخت کو دیکھا ہے کہ انھیں عورت
قرار دے رہے ہیں۔ ظاہر ہے ان میں سے کوئی بات بھی نہیں تو پھر ان کے پاس اس دعویٰ کی کیا دلیل ہے؟

③ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْأَلُونَ : یعنی یہ جو فرشتوں کے عورت ذات ہونے کی جھوٹی شہادت دے رہے ہیں اسے ان
کے نامہ اعمال میں لکھ لیا جائے گا اور قیامت کے دن ان سے ان کی جھوٹی شہادت کے متعلق باز پرس کی جائے گی۔

④ شاہ عبد القادر لکھتے ہیں: ”یہ جو فرمایا کہ بندے رحمان کے ہیں یعنی بیٹیاں نہیں اور معلوم ہوا کہ فرشتے اگرچہ نہ مرد نہ عورت
مگر ان کے لیے الفاظ مردوں والے بولنے چاہئیں۔“ (موضح)

وَقَالُوا لَوْ شَاءَ الرَّحْمَنُ مَا عَبَدْنَاهُمْ مَا لَهُمْ بِذَلِكَ مِنْ عِلْمٍ إِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ ﴿۲۰﴾
 أَمْ أُنزِلَتْهُمْ كِتَابًا مِنْ قَبْلِهِ فَهُمْ بِهِ مُتَمَسِكُونَ ﴿۲۱﴾

اور انہوں نے کہا اگر رحمان چاہتا تو ہم ان کی عبادت نہ کرتے۔ انہیں اس کے بارے میں کچھ علم نہیں، وہ تو صرف
 کھنسی دوڑا رہے ہیں ﴿۲۰﴾ یا کیا ہم نے انہیں اس سے پہلے کوئی کتاب دی ہے؟ پس وہ اسے مضبوطی سے تھامنے
 والے ہیں ﴿۲۱﴾

آیت 20 ﴿۱﴾ وَقَالُوا لَوْ شَاءَ الرَّحْمَنُ مَا عَبَدْنَاهُمْ: یہ اچی گمراہی اور مشرکانہ گستاخی پر کفار مکہ کا ایک اور استدلال
 تھا، یعنی وہ اپنے آپ کو مجرم سمجھنے کے بجائے سارا الزام تقدیر الہی پر دھرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ہی کی یہ مشیت تھی اور اس نے
 ہماری قسمت میں لکھ دیا تھا کہ ہم فرشتوں کو دیویاں سمجھ کر ان کی پرستش کریں۔ تقدیر الہی سے اس قسم کا غلط استدلال باطل
 پرستوں کا ہمیشہ سے شیوہ رہا ہے اور آج بھی ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور چیز ہے اور اس کی پسند دوسری چیز ہے۔ اگر
 ایسا ہی ہوتا جیسے یہ مشرک کہتے تھے تو اللہ تعالیٰ کو پیغمبر بھیج کر اور کتابیں نازل فرما کر شرک سے روکنے کی کیا ضرورت تھی۔
 (ابن کثیر) مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ انعام (۱۳۸) اور سورہ نحل (۳۵) کی تفسیر۔

﴿۲﴾ مَا لَهُمْ بِذَلِكَ مِنْ عِلْمٍ: یعنی وہ تقدیر کی حقیقت کو نہیں سمجھتے اور اللہ تعالیٰ کی مشیت کو غلط معنی پہناتے ہیں۔ شاہ
 عبد القادر لکھتے ہیں: ”یعنی یہ تو جگ ہے کہ بن چاہے خدا کے کوئی چیز نہیں، پر اس کا بہتر ہونا نہیں نکلتا۔ اس نے قوت (خوراک)
 بھی پیدا کی اور زہر بھی، پر زہر کون کھاتا ہے۔“ (موضع)
 www.KitaboSunnat.com
 ﴿۱﴾ إِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ: یعنی جہالت کی وجہ سے ایسی باتیں بناتے ہیں جن کا کوئی سرچر نہیں ہے۔

آیت 21 ﴿۱﴾ أَمْ أُنزِلَتْهُمْ كِتَابًا مِنْ قَبْلِهِ: ”اور“ سے پہلے ہمزہ استنہام پر مشتمل کوئی جملہ ہوتا ہے جو بعض اوقات
 مذکور اور بعض اوقات محذوف ہوتا ہے۔ یہاں ذکر یہ ہو رہا ہے کہ مشرکین نے فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دے کر انہیں
 اللہ تعالیٰ کا شریک بنا لیا، اللہ تعالیٰ نے ان کی اس بات کا رد فرمایا۔ ظاہر ہے فرشتوں کے مؤنث ہونے کا علم یا تو مشاہدے
 سے ہو سکتا ہے یا اللہ تعالیٰ کے بتانے سے، جو اس کی نازل کردہ کسی کتاب میں موجود ہو۔ ”أَشْهَدُوا خَلْقَهُمْ“ (کیا وہ ان
 کی پیدائش کے وقت حاضر تھے) میں پہلی صورت کا رد اور ان کے مشاہدے کی نفی ہے، یعنی انہوں نے ان کی پیدائش کو نہیں
 دیکھا کہ وہ مذکر ہیں یا مؤنث اور ”أَمْ أُنزِلَتْهُمْ كِتَابًا مِنْ قَبْلِهِ“ (یا کیا ہم نے انہیں اس سے پہلے کوئی کتاب دی ہے) میں
 دوسری صورت کا رد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے پاس فرشتوں کے مؤنث ہونے کی اور ان کی پرستش کی کوئی لفظی دلیل بھی
 نہیں ہے۔ کسی آسانی کتاب میں انہیں یہ لکھا ہوا نہیں ملے گا کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں یا اس کی بادشاہت میں ان کا
 کوئی حصہ ہے۔ یہ بات اللہ تعالیٰ نے متعدد مقامات پر دہرائی ہے۔ دیکھیے سورہ روم (۳۵)، قاطر (۴۰)، صافات (۱۵۶)،
 احقاف (۳)، نمل (۶۳)، حج (۸) اور انعام (۲۸)۔

بَلْ قَالُوا إِنْكَا وَجَدْنَا أَبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ آثَرِهِمْ مُّقْتَدُونَ ﴿۲۲﴾ وَكَذَٰلِكَ مَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ فِي قَرْيَةٍ مِّن نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا إِنَّا وَجَدْنَا أَبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ آثَرِهِمْ مُّقْتَدُونَ ﴿۲۳﴾

بلکہ انھوں نے کہا کہ بے شک ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک راستے پر پایا ہے اور بے شک ہم انھی کے قدموں کے نشانوں پر راہ پانے والے ہیں ﴿۲۲﴾ اور اسی طرح ہم نے تجھ سے پہلے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا نہیں بھیجا مگر اس کے خوش حال لوگوں نے کہا کہ بے شک ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک راستے پر پایا اور بے شک ہم انھی کے قدموں کے نشانوں کے پیچھے چلنے والے ہیں ﴿۲۳﴾

آیت ۲۲ بَلْ قَالُوا إِنْكَا وَجَدْنَا أَبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ : یعنی ایسا نہیں کہ ان کے پاس اپنی گمراہی کے لیے اللہ تعالیٰ کی کسی کتاب کی کوئی دلیل یا سند موجود ہے، بلکہ ان کی دلیل اور سند یہی ہے کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی راہ پر پایا ہے اور ہم انھی کے قدموں کے نشانوں پر راہ پانے والے ہیں۔ اس کی ہم معنی آیت کے لیے دیکھیے سورہ ذاریات (۵۲، ۵۳)۔ باطل اور ناحق باتوں (شک و بدعت اور رسوم) میں بڑوں اور بزرگوں کی پیروی کو دلیل بنانا وہ گمراہی ہے جو قدیم زمانے سے چلی آئی ہے اور کفار کا شیوہ رہا ہے کہ وہ انبیاء کے مقابلے میں اس کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں، قرآن نے متعدد آیات میں ان کی مذمت فرمائی ہے۔ معلوم ہوا کہ جس بات میں اللہ اور رسول کی کوئی سند نہ ہو اس میں باپ دادا یا کسی امام، مرشد یا بزرگ کی تقلید کرنا اور یہ کہنا کہ ہمارے بزرگ چونکہ ایسے ہی کرتے چلے آئے ہیں، لہذا ہم بھی اسی راہ پر چلیں گے، سراسر باطل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مقلدین کی یہ تقلید صرف دین کے معاملے میں ہوتی ہے، اگر انھیں اپنے باپ دادا کے کسی دنیوی کاروبار میں روپے پیسے کا نقصان نظر آئے تو کبھی ان کی پیروی نہیں کریں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان کے نزدیک دین اور آخرت کا خسارہ کچھ خسارہ ہی نہیں، ورنہ وہ کبھی ایسا نہ کریں۔

آیت ۲۳ ﴿۱﴾ وَكَذَٰلِكَ مَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ فِي قَرْيَةٍ : اس میں رسول اللہ ﷺ کو تسلی دی ہے کہ اس سفارت و حمایت میں یہی لوگ بتلا نہیں، بلکہ ان سے پہلے لوگ بھی اپنے رسولوں کو یہی کہتے چلے آئے ہیں، اس لیے آپ ان کی باتوں پر صبر کریں۔

﴿۲﴾ مفسر کیلانی لکھتے ہیں: ”اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ تقلید آباء کے سب سے زیادہ مؤید اور اس پر اصرار کرنے والے کھاتے پیتے یعنی آسودہ حال اور چودھری قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اگر وہ رسول کی بات مان لیں تو انھیں اپنی اس چودھراہٹ کے منصب سے نیچے اتر کر عام لوگوں کی صف میں شامل ہونا اور رسول کا مطیع بن کر رہنا پڑتا ہے اور اس کی دوسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ رسول ان کے کسب معاش کے طریقوں پر بھی کئی طرح کی پابندیاں لگاتا ہے، مال و دولت

ع ۸

قُلْ أَوْلُو جِنَّتِكُمْ يَأْهُدِي مَنَا وَجَدْتُمْ عَلَيْهِ آبَاءَكُمْ قَالُوا إِنْ مَا أُرْسِلْتُمْ بِهِ كُفْرُونَ ﴿۳۳﴾

فَانتَقَبْنَا مِنْهُمْ فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكْذِبِينَ ﴿۳۴﴾ وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ إِنَّنِي

بِرَاءٌ مِمَّا تَعْبُدُونَ ﴿۳۵﴾ إِلَّا الَّذِي فَطَرَنِي فَإِنَّهُ سَيَهْدِينِ ﴿۳۶﴾

اس نے کہا اور کیا اگر میں تمہارے پاس اس سے زیادہ سیدھا راستہ لے آؤں جس پر تم نے اپنے باپ دادا کو پایا؟ انہوں نے کہا بے شک ہم اس سے جو دے کر تم بھیجے گئے ہو، منکر ہیں ﴿۳۳﴾ تو ہم نے ان سے بدلا لیا، سو دیکھ جھٹلانے والوں کا انجام کیسا ہوا ﴿۳۴﴾ اور جب ابراہیم نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا بے شک میں ان چیزوں سے بالکل بری ہوں جن کی تم عبادت کرتے ہو ﴿۳۵﴾ سوائے اس کے جس نے مجھے پیدا کیا، پس بے شک وہ مجھے ضرور راستہ دکھائے گا ﴿۳۶﴾

کمانے پر بھی اور اس کے خرچ کرنے پر بھی۔ اگر وہ یہ پابندیاں قبول کر لیں تو ان کی آسودہ حالی ہی خطرے میں پڑ جاتی ہے، لہذا وہ اپنی عاقبت اس میں سمجھتے ہیں کہ تقلید آباء پر ڈٹ جائیں اور عوام کو اپنے ساتھ ملائے رکھیں۔“ (تیسیر القرآن)

ت 24 ﴿۱﴾ قُلْ أَوْلُو جِنَّتِكُمْ يَأْهُدِي مَنَا وَجَدْتُمْ عَلَيْهِ آبَاءَكُمْ : یعنی پہلے آنے والے رسول نے کہا کہ کیا اگر

میں تمہارے پاس اس سے زیادہ سیدھا راستہ لے آؤں تو پھر بھی تم میری بات نہ مانو گے اور اسی ڈگر پر چلتے رہو گے؟ ﴿۲﴾ قَالُوا إِنْ مَا أُرْسِلْتُمْ بِهِ كُفْرُونَ : یعنی انہوں نے کہا کہ اگر تم ہمارے آباء سے زیادہ سیدھا راستہ لے آؤ تب بھی یقیناً ہم اس سے منکر ہیں جو دے کر تم بھیجے گئے ہو، تمہارے لائے ہوئے حق کو بھی ہم نہیں مانتے۔

ت 24 ﴿۳﴾ فَانتَقَبْنَا مِنْهُمْ فَانظُرْ كَيْفَ : یعنی جب وہ ضد اور عناد میں اس حد تک پہنچ گئے کہ رسولوں کی بات حق بھی ہے تو ہم ماننے والے نہیں، تو ہم نے ان سے انتقام لیا، پھر دیکھو ان جھٹلانے والوں کا انجام کیسا ہوا۔

ت 27 26 ﴿۱﴾ وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ : یہاں ابراہیم علیہ السلام کے قصے کی مناسبت یہ ہے کہ قریش اور قوم عرب سے کہا جا رہا ہے کہ تمہارے پیشوا اور جد امجد نے باپ کی راہ غلط دیکھ کر چھوڑ دی تھی، تم بھی ایسا ہی کرو۔

﴿۲﴾ إِنَّنِي بِرَاءٌ مِمَّا تَعْبُدُونَ : ”برآء“ مصدر ہے، واحد، شنیہ، جمع اور مذکر و مؤنث کے لیے یہی لفظ استعمال ہوتا ہے، جو ”برّی“ کے معنی میں ہے، مگر اس میں مبالغہ ہے، جیسے ”زَيْدٌ عَادِلٌ“ میں وہ زور نہیں جو ”زَيْدٌ عَدْلٌ“ (زید اتقا عادل ہے کہ سراپا عدل ہے) میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا کہ میں تمہارے تمام معبودوں سے سراپا براءت ہوں، دل، زبان اور عمل کے ساتھ۔ غرض ہر طرح سے ان سے براءت کا اعلان کرتا ہوں، سوائے اس معبود کے جس نے مجھے پیدا کیا۔

﴿۳﴾ إِلَّا الَّذِي فَطَرَنِي : اپنے اس کلام میں ابراہیم علیہ السلام نے صرف اللہ واحد کی عبادت کی دلیل بھی بیان فرمائی ہے۔ وہ ہے :

بَلْ مَتَّعْتُ هَؤُلَاءِ وَآبَاءَهُمْ حَتَّىٰ جَاءَهُمُ الْحَقُّ وَرَسُولٌ مُّبِينٌ ﴿۲۹﴾

میں نے انہیں اور ان کے باپ دادا کو برتنے کا سامان دیا، یہاں تک کہ ان کے پاس حق آ گیا اور وہ رسول جو
کریاں کرنے والا ہے ﴿۲۹﴾

کریں۔ اور دعا کی: ﴿رَبِّ اجْعَلْنِي نَقِيمَ الصَّلَاةِ وَرِينَ ذُرِّيَّتِي﴾ [ابراہیم : ۴۰] ”اے میرے رب! مجھے نماز قائم کرنے والا بنا اور میری اولاد میں سے بھی۔“ اور ابراہیم اور اسماعیل علیہ السلام نے دعا کی: ﴿رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمِينَ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ﴾ [البقرہ : ۱۲۸] ”اے ہمارے رب! اور ہمیں اپنے لیے فرماں بردار بنا اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک امت اپنے لیے فرماں بردار بنا۔“ اور یہ دعا بھی کی: ﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ﴾ [البقرہ : ۱۲۹] ”اے ہمارے رب! اور ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیج جو ان پر تیری آیتیں پڑھے اور انہیں کتاب و حکمت سکھائے اور انہیں پاک کرے۔“

اور اگر ”جَعَلْنَا“ میں ضمیر فاعل سے مراد اللہ تعالیٰ ہو تو مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کلمے کو ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں باقی رہنے والا بنا دیا اور ان میں ہمیشہ اس کلمے پر ایمان رکھنے والے اور اس کی دعوت دینے والے موجود رہے اور رہیں گے۔ چنانچہ ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام کی دعا قبول فرما کر مکہ میں محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿أَنَا دَاعِيَةُ أَبِي إِبْرَاهِيمَ﴾ [سلسلة الأحاديث الصحيحة، ج : ۱۵۴۶] ”میں اپنے باپ ابراہیم کی دعا ہوں۔“ اسی طرح ان کی اولاد میں اسحاق، یعقوب اور بہت سے انبیاء علیہم السلام مبعوث فرمائے، فرمایا: ﴿وَوَهَبْنَا لَكَ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَجَعَلْنَا فِي ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتَابَ﴾ [العنكبوت : ۲۷] ”اور ہم نے اسے اسحاق اور یعقوب عطا کیے اور اس کی اولاد میں نبوت اور کتاب رکھ دی۔“

● **لَعَلَّكُمْ يَزْجَعُونَ** : یعنی اگر ان میں سے کچھ لوگ گمراہ ہو کر شرک کرنے لگیں تو توحید پرستوں کی دعوت پر اللہ تعالیٰ کی طرف پلٹ آئیں۔ اس میں مکہ والوں کو تشبیہ ہے کہ نبی کریم ﷺ وہی کلمہ لے کر آئے ہیں جو ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد میں سنائی چھوڑا تھا، اس لیے تم ان کی دعوت قبول کرو اور شرک سے باز آ جاؤ۔ قرآن مجید نے بتایا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی ساری اولاد ایمان والی نہیں ہوئی بلکہ ان میں نیک و بد ہر قسم کے لوگ رہے ہیں۔ دیکھیے سورہ بقرہ (۱۲۳)، صافات (۱۱۳)، نساء (۵۴، ۵۵) اور سورہ حدید (۲۶) اگلی آیت میں یہی بات بیان ہوئی ہے۔

بَلْ مَتَّعْتُ هَؤُلَاءِ وَآبَاءَهُمْ : یہ اس سوال کا جواب ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد میں جو کلمہ اس لیے چھوڑا تھا کہ شرک میں گرفتار واپس پلٹ آئیں تو کیا وہ واپس پلٹے؟ فرمایا نہیں، وہ سب لوگ واپس نہیں پلٹے، بلکہ ان لوگوں یعنی قریش اور ان کے آباء کو ان کے کفر و شرک پر فوراً پکڑنے کے بجائے میں نے واپس پلٹنے کے لیے مہلت دی اور دنیا کا ساز و سامان اور مال و متاع کچھ وقت تک رہنے اور فائدہ اٹھانے کے لیے دیا، مگر وہ ان دنیوی لذتوں ہی کو اپنا مقصد سمجھ

وَلَمَّا جَاءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوا هَذَا سِحْرٌ وَإِنَّا بِهِ كَافِرُونَ ﴿٣٠﴾ وَقَالُوا لَوْلَا نُنزِّلُ هَذَا الْقُرْآنَ

عَلَى رَجُلٍ مِّنَ الْقُرَيْتَيْنِ عَظِيمٍ ﴿٣١﴾

اور جب ان کے پاس حق آیا تو انھوں نے کہا یہ جادو ہے اور بے شک ہم اس سے منکر ہیں ﴿٣٠﴾ اور انھوں نے کہا قرآن ان دو بستیوں میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہ کیا گیا؟ ﴿٣١﴾

بیٹھے اور ان میں ایسے بدست ہوئے کہ ابراہیم علیہ السلام کی راہ کو بھول گئے، حتیٰ کہ ان کے پاس یہ حق اور رسول مبین آ گیا۔ ”الْحَقُّ“ سے مراد قرآن ہے اور ”رَسُولٌ مُّبِينٌ“ کا معنی کھول کر بیان کرنے والا رسول بھی ہے اور واضح رسول بھی، یعنی جس کا رسول برحق ہونا بالکل واضح ہے۔

آیت 30 . وَلَمَّا جَاءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوا هَذَا سِحْرٌ : جب ان کے پاس حق یعنی قرآن آیا تو کہنے لگے، یہ جادو ہے اور ہم اسے نہیں مانتے۔ قرآن مجید کی دلوں پر زبردست تاثیر کا جب وہ کوئی تُوڑ نہ کر سکے، جس کی وجہ سے اس پر ایمان لانے والا اپنے رشتہ داروں کو تو چھوڑ سکتا تھا مگر ایمان سے کبھی پیچھے نہ ہٹتا تھا اور نہ ہی وہ اس پر ایمان لانے والوں کو روک سکے، تو بجائے اس کے کہ اس پر ایمان لے آتے اسے جادو کہہ کر جھٹلا دیا کہ یہ سب اثر جادو کا ہے۔ حالانکہ ظالم جانتے تھے کہ کہاں جادو جیسی پلید چیز اور جادو گردوں جیسے خبیث لوگ اور کہاں اللہ کا پاکیزہ کلام اور رسول اللہ ﷺ جیسا پاکیزہ اور بلند اخلاق والا شخص۔ محض عناد اور ضد کی وجہ سے انھوں نے یہ بات کہی۔

آیت 31 . وَقَالُوا لَوْلَا نُنزِّلُ هَذَا الْقُرْآنَ : پچھلی آیت میں ان کے قرآن پر طعن کا ذکر تھا تو اس آیت میں قرآن لانے والے پر اعتراض کا ذکر ہے۔ کفار پہلے تو کسی بشر کا رسول ہونا ہی ماننے کے لیے تیار نہ تھے، ان کا مطالبہ تھا کہ رسول فرشتہ ہونا چاہیے۔ جب ناقابل تردید دلائل سے انھیں بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے تمام رسول بشر ہی بھیجے ہیں، تمہارے جد امجد ابراہیم و اسماعیل علیہ السلام اور دوسرے پیغمبر، مثلاً موسیٰ علیہ السلام، سب بشر ہی تھے، تو فرشتہ رسول کا مطالبہ چھوڑ کر یہ مطالبہ داغ دیا کہ یہ قرآن دو بستیوں میں سے کسی عظیم آدمی پر کیوں نازل نہیں کیا گیا۔ دو بستیوں سے مراد مکہ اور طائف ہیں، کیونکہ ان کی مرکزی بستیاں یہ دو ہی تھیں۔ ”عَظِيمٌ“ سے مراد دنیاوی مال و دولت اور جاہ و مرتبہ کے لحاظ سے عظیم ہے۔ مفسرین مکہ کے ان عظیم آدمیوں میں سے ولید بن مغیرہ یا عتبہ بن ربیعہ کا اور طائف کے عظماء میں سے عرودہ بن مسعود، حبیب بن عمرو یا کنانہ بن عبد یلیل یا اس قبیل کے دوسرے لوگوں کا ذکر کرتے ہیں۔ کفار کے خیال میں مال کی کثرت اور قوم کے سردار ہونے کی وجہ سے یہ لوگ نبوت کے حق دار تھے۔ محمد ﷺ مال و جاہ کی کمی کی وجہ سے اس کے اہل نہیں تھے، کیونکہ آپ کے پاس دولت کی کثرت تھی نہ کسی قبیلے کی سرداری۔ یہ کفار کی جہالت اور سخت نادانی تھی کہ انھوں نے نبوت کے منصب کے لیے مال و جاہ کو شرط قرار دیا۔

أَلَمْ يَفْسُقُونَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ۗ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا

یاد وہ تیرے رب کی رحمت تقسیم کرتے ہیں؟ ہم نے خود ان کے درمیان ان کی معیشت دنیا کی زندگی میں تقسیم کی

ت 32 ﴿۱﴾ أَلَمْ يَفْسُقُونَ رَحْمَتَ رَبِّكَ : یہ ان کے اعتراض کا جواب ہے۔ ”رَحْمَتَ“ کا لفظ اگرچہ عام ہے، جس

میں ہر رحمت شامل ہے، مگر یہاں اس سے مراد نبوت و رسالت ہے، کیوں کہ ان کا اعتراض اسی پر تھا۔ ”رَحْمَتَ رَبِّكَ“

(تیرے رب کی رحمت) کے الفاظ میں رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کرنے میں آپ ﷺ کی شان کی بلندی کا اظہار ہو رہا ہے۔

یعنی کیا تیرے رب کی رحمت نبوت و رسالت کی تقسیم ان کے ہاتھوں میں ہے کہ جسے چاہیں دیں اور جسے چاہیں نہ دیں؟ نہیں،

یہ اختیار اللہ ہی کے پاس ہے اور وہی جانتا ہے کہ یہ رحمت کسے عطا کرنی ہے۔ یہ جاہل اپنی حیثیت کو بھول کر اس قدر دھوکے

میں پڑے ہوئے ہیں کہ ان کا ہر شخص چاہتا ہے کہ اللہ کی کتاب اسی کو دی جائے، فرمایا: ﴿بَلْ يُرِيدُ كُلُّ الْفَرِيقِ أَنْ

يَأْتِيَهُمْ كِتَابًا مِنْ سَمَوَاتِنَا﴾ [النمل: ۱۵۲] ”بلکہ ان میں سے ہر آدمی یہ چاہتا ہے کہ اسے کھلے ہوئے صحیفے دیے جائیں۔“

حتیٰ کہ انھوں نے ایمان لانے کی شرط ہی نبوت دیا جانا ٹھہرائی، فرمایا: ﴿وَإِذَا جَاءَتْهُمْ آيَةٌ قَالُوا لَنْ نُؤْمِنَ بِهَا حَتَّىٰ نُؤْتَىٰ

بِهَا مِثْلَ مَا أُوتِيَ رُسُلُ اللَّهِ ۗ اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ ۗ سَيُصِيبُ الَّذِينَ أَجْرَمُوا صَغَارٌ عِنْدَ اللَّهِ وَعَذَابٌ

شَدِيدٌ ۚ إِنَّمَا يَنْتَكِرُونَ كِتَابَ اللَّهِ ۗ﴾ [الأنعام: ۱۶۴] ”اور جب ان کے پاس کوئی نشانی آتی ہے تو کہتے ہیں ہم ہرگز ایمان نہیں

لاٹیں گے، یہاں تک کہ ہمیں اس جیسا دیا جائے جو اللہ کے رسولوں کو دیا گیا۔ اللہ زیادہ جاننے والا ہے جہاں وہ اپنی رسالت

دکھاتا ہے۔ عنقریب ان لوگوں کو جنھوں نے جرم کیے، اللہ کے ہاں بڑی ذلت پہنچے گی اور بہت سخت عذاب، اس وجہ سے کہ وہ

فریب کیا کرتے تھے۔“

خلاصہ یہ کہ تیرے رب کی رحمت کی تقسیم اسی کے پاس ہے اور وہی جانتا ہے کہ کون اس کے قابل ہے۔ یہ کافر دنیا کے

مال و جاہ کی وجہ سے ان لوگوں کو رسالت کے قابل سمجھ رہے ہیں جو اللہ کے ہاں ایک سٹکے کا وزن نہیں رکھتے اور مال نہ ہونے

کی وجہ سے اس شخص کو نبوت کے لیے نااہل قرار دے رہے ہیں جو سب سے زیادہ پاکیزہ قلب و نفس والا، خاندانی شرافت میں

سب سے بلند اور انسانی خوبیوں میں سب سے ممتاز ہے۔

﴿نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا﴾: یعنی نبوت و رسالت تو بہت ہی بلند چیز ہے، ہم نے تو دنیا میں ان

کی روزی کی تقسیم کا اختیار بھی ان کو یا کسی دوسرے کو نہیں دیا، بلکہ اسے خود تقسیم کیا ہے، حالانکہ وہ ہمارے نزدیک مجھ کے پر

کے برابر بھی نہیں، تو قرآن نازل کرنے کا اختیار انھیں کیسے دے سکتے ہیں!؟

﴿وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ﴾: اس مختصر سے جملے میں اللہ تعالیٰ نے کئی حقیقتیں بیان فرمادی ہیں۔ پہلی یہ کہ اللہ

تعالیٰ نے صلاحیتوں اور روزیوں کی تقسیم میں برابری نہیں رکھی، بلکہ ان میں درجات رکھے ہیں۔ کسی کو غنی بنا دیا کسی کو فقیر، کوئی

ذہین ہے کوئی کند ذہین، کوئی بے وقوف ہے کوئی عقل مند اور کوئی اس سے بڑھ کر عقل مند، کوئی طاقتور ہے کوئی کمزور، کوئی خادم

بَعْضُهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُلْعِيًّا ۗ وَرَحِمْتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِمَّا يَجْمَعُونَ ﴿۲۳﴾

اور ان میں سے بعض کو بعض پر درجوں میں بلند کیا، تاکہ ان کا بعض، بعض کو تابع بنالے اور تیرے رب کی رحمت اور چیزوں سے بہتر ہے جو وہ جمع کرتے ہیں ﴿۲۳﴾

ہے کوئی مخدوم، کوئی مالک ہے کوئی مملوک، کوئی اندھا ہے کوئی بینا، کوئی باعزت ہے کوئی ذلیل اور کوئی حاکم کوئی محکوم۔ کیونستوں کا نعرہ کہ ہم تمام لوگوں میں دولت کی مساوات پیدا کریں گے، سخت دھوکا تھا۔ یہ اللہ کے فیصلے کے خلاف ہے، نہ ایسا ہو سکتا ہے نہ کیونستوں سے ہو سکا۔ رزق اور اللہ تعالیٰ کی دوسری عنایتوں کی عطا میں یکسانیت کے بجائے درجات کی کمی بیشی ناقابل تردید حقیقت ہے۔ دنیا میں اس کا مقصد آزمائش ہے۔ (دیکھیے انعام: ۱۶۵) درجات کا یہ فرق آخرت میں اس سے بھی زیادہ ہوگا۔ (دیکھیے سورہ نحل (۷۱)، بنی اسرائیل (۲۱) اور سورہ روم (۲۸)۔

دوسری حقیقت یہ کہ یہ کمی بیشی اللہ تعالیٰ نے رکھی ہے، کسی دوسرے کا اس میں کوئی دخل نہیں اور اللہ تعالیٰ نے جسے جس درجے میں رکھا ہے اس پر قناعت کے سوا اس کے پاس کوئی راستہ نہیں۔ کسی کو خوبصورت بنایا یا بدصورت، قوی بنایا یا ضعیف، عقل مند بنایا یا بے وقوف، آنکھیں عطا کر دیں یا ناپینا کر دیا، ہر ایک کو اسی طرح رہنا پڑے گا جس طرح خلاق عالم نے اس کے لیے طے کر دیا ہے۔

﴿۱﴾ لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُلْعِيًّا: "اِتَّخَذَ فُلَانٌ فُلَانًا سُلْعِيًّا" یعنی فلاں نے فلاں کو اپنا تابع بنا لیا، یا اپنے کام یا خدمت میں لگا لیا۔ یہ تیسری حقیقت ہے، کسی مال دار کا مال یا دیوبی عترت جاہ اس بات کی دلیل نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس پر خوش ہے اور نہ ہی کسی فقیر کا فقر اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پر ناراض ہے، بلکہ درجات کا یہ تفاوت اللہ تعالیٰ نے اس لیے رکھا ہے کہ لوگوں کو ایک دوسرے کی ضرورت رہے اور وہ ایک دوسرے سے کام لے سکیں، کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو دنیا کا نظام معطل ہو جائے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے کہ اس نے ایک شخص کو مال نہیں دیا، مگر اسے کسی کام کی صلاحیت اور قوت بخش دی، دوسرے کو کمزور بنا دیا جو خود نہ کام کر سکتا ہے نہ محنت، مگر اسے دولت بخش دی جس کے ساتھ وہ ان لوگوں کو مزدور رکھ سکتا ہے جن کے پاس مال نہیں۔ اسی طرح کسی کے پاس ایک ہنر ہے دوسرے کے پاس دوسرا، دونوں ایک دوسرے سے کام لیتے ہیں۔ ان میں ضروری نہیں کہ کام لینے والا مرتبے میں بھی اس سے اونچا ہو جس سے کام لے رہا ہے۔ کتنے ہی ڈاکٹر، انجینئر اور دوسرے کمالات کے مالک ان لوگوں کے پاس ملازمت کر رہے ہیں جو مطلق جاہل ہیں۔ یہاں کوئی بڑے سے بڑا ایسا نہیں جو چھوٹے سے چھوٹے کا محتاج نہ ہو، حتیٰ کہ بادشاہ بھی حجام، باورچی اور دوسرے خدمت گاروں کا محتاج ہے اور خدمت گاروں کے محتاج ہیں، اسی سے نظام عالم چل رہا ہے۔ اگر سب برابر ہو جائیں تو وہ ایک قدم نہیں چل سکتا۔

﴿۲﴾ وَرَحِمْتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِمَّا يَجْمَعُونَ: "رَحِمْتُ رَبِّكَ" کے متعلق دو قول ہیں، ایک یہ کہ اس سے مراد نبوت ہے، یعنی کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

وَلَوْ لَا أَنْ يَكُونَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً لَجَعَلْنَا لِمَنْ يَكْفُرُ بِالرَّحْمَنِ لِيُوتِيَهُمْ سُقْفًا مِّنْ فَضَّةٍ وَمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُونَ ﴿۳۳﴾ وَلِيُوتِيَهُمْ أَبْوَابًا وَسُرُرًا عَلَيْهَا يَتَكَبَّرُونَ ﴿۳۴﴾ وَزُخْرُقًا ۖ وَإِنْ كُلُّ ذَلِكَ لَمَتَاعٌ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۗ وَالْآخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِينَ ﴿۳۵﴾

مگر یہ نہ ہوتا کہ سب لوگ ایک ہی امت ہو جائیں گے تو یقیناً ہم ان لوگوں کے لیے جو رحمان کے ساتھ کھرتے ہیں، ان کے گھروں کی چھتیں چاندی کی بنا دیتے اور میزھیاں بھی، جن پر وہ چڑھتے ہیں ﴿۳۳﴾ اور ان کے گھروں کے دروازے اور تخت بھی، جن پر وہ تکیہ لگاتے ہیں ﴿۳۴﴾ (چاندی کے بنا دیتے) اور سونے اور یہ سب کچھ دنیا کی زندگی کے سامان کے سوا کچھ نہیں اور آخرت تیرے رب کے ہاں متقی لوگوں کے ہے ﴿۳۵﴾

نبوت و رسالت کا شرف تو دنیوی مال و جاہ اور ساز و سامان سے کہیں اعلیٰ ہے۔ جب دنیا کی دولت اس نے ان کی تقسیم پر نہیں رکھی تو رسالت ان کی تجویز پر کیسے دے گا؟! دوسرا یہ کہ اس سے مراد آخرت کی وہ نعمتیں ہیں جو اس نے اپنے بندوں کے لیے تیار کر رکھی ہیں، یعنی یہ لوگ دنیا کے جس فانی مال و متاع اور عرز و جاہ کو سینے کی تگ و دو میں دن رات لگے ہوئے ہیں، تیرے رب کی رحمت یعنی آخرت کی دائمی نعمتیں ان سے بدرجہا بہتر ہیں۔

۳۳-۳۵ ﴿۱﴾ وَلَوْ لَا أَنْ يَكُونَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً : "سُقْفًا" "سُقْفٌ" کی جمع ہے، چھتیں۔ "مَعَارِجَ" (میزھیاں) "مِعْرَجٌ" یا "مِعْرَاجٌ" کی جمع ہے، جیسے "مَفَاتِحُ" اور "مَفَاتِيحُ" "مِفْتَاحٌ" کی جمع ہیں۔ "سُرُرًا" "سُرِيرٌ" کی جمع ہے، چار پائیاں، تخت۔ "زُخْرُقًا" کا معنی سونا ہے، جیسا کہ کفار نے نبی ﷺ سے کہا تھا: ﴿أَوْ يَكُونَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُقٍ﴾ [سبی اسرائیل: ۹۳] "یا تیرے لیے سونے کا ایک گھر ہو۔" اس کا معنی زمینت و آرائش بھی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿حَتَّىٰ إِذَا أَخَذَتِ الْأَرْضُ زُخْرُقَهَا وَأَذَىٰ نَّتْ﴾ [یونس: ۲۴] "یہاں تک کہ جب زمین نے اپنی آرائش حاصل کر لی اور خوب مزین ہو گئی۔" "زُخْرُقًا" منصوب ہونے کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ یہ اصل میں "سُقْفًا مِّنْ فَضَّةٍ وَمِنْ زُخْرُقٍ" ہے، حرف جار حذف ہونے کی وجہ سے منصوب ہو گیا، یعنی "ہم ان کے گھروں کی چھتیں چاندی کی بنا دیتے اور سونے کی۔" دوسری وجہ یہ کہ یہ "لَجَعَلْنَا" کے مفعول "سُقْفًا" پر عطف ہے، یعنی "لَجَعَلْنَا لِيُوتِيَهُمْ سُقْفًا مِّنْ فَضَّةٍ وَ لِيُوتِيَهُمْ زُخْرُقًا" کہ "ہم ان کے گھروں کی چھتیں چاندی کی بنا دیتے اور ہم ان کے لیے سونا مہیا کر دیتے۔" "وَإِنْ كُلُّ ذَلِكَ لَمَتَاعٌ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا" میں "إِنْ" نافیہ ہے اور "لَمْنَا" بمعنی "إِلَّا" ہے، جیسے فرمایا: ﴿إِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمْنَا حَافِظٌ﴾ [الطارق: ۴] "نہیں کوئی جان مگر اس کے اوپر ایک حفاظت کرنے والا ہے۔"

آیات کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب "وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّنَّا يَحْمَعُونَ" (اور تیرے رب کی رحمت اس سے

وَمَنْ يَعِشْ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمَنِ نَقِيضًا لَهُ شَيْطَانًا فَهُوَ لَهُ قَرِينٌ ﴿۳۶﴾

اور جو شخص رحمن کی نصیحت سے اندھا بن جائے ہم اس کے لیے ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں، پھر وہ اس کے ساتھ رہنے والا ہوتا ہے ﴿۳۶﴾

بہتر ہے جو وہ جمع کر رہے ہیں) میں آخرت کی عظمت و شان اور دنیا کی حقارت بیان فرمائی تو ساتھ ہی بیان فرمایا کہ اس کے نزدیک دنیا بالکل ہی حقیر اور بے قدر و قیمت ہے، اس کے ہاں کوئی قیمت ہے تو صرف آخرت کی، اس لیے اس نے آخرت کی نعمتیں صرف مسلمانوں کے لیے خاص کر رکھی ہیں، کفار کا ان میں کوئی حصہ نہیں۔ دنیا کی نعمتوں میں اس نے مومن و کافر سب کو شریک رکھا ہے اور دونوں کو ان نعمتوں میں شریک رکھنے کی حکمت بیان فرمائی کہ اگر ہمیں یہ بات ناپسند نہ ہوتی کہ تمام لوگ ایک ہی امت یعنی بھی کافر ہو جائیں گے تو ہم دنیا کی زیب و زینت کی تمام اشیاء کفار کو دے دیتے، لیکن چونکہ ہمیں معلوم ہے کہ لوگوں کے دلوں میں دنیوی زیب و زینت کی شدید رغبت اور محبت موجود ہے، اگر ہم نے یہ سبھی کچھ کفار کو دے دیا تو دنیا کی رغبت کے نتیجے میں سبھی لوگ کافر ہو جائیں گے، (جب کہ یہ بات ہماری رحمت کو منظور نہیں) اس لیے ہم نے کافر و مومن دونوں میں غنی بھی رکھے ہیں، فقیر بھی اور دنیا کی زندگی کے ساز و سامان میں دونوں کو شریک رکھا ہے۔ آیت کے آخری جملوں ﴿وَإِنْ كُلُّ ذَلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِينَ﴾ (اور یہ سب کچھ دنیا کی زندگی کے سامان کے سوا کچھ نہیں اور آخرت تیرے رب کے ہاں متقی لوگوں کے لیے ہے) میں بیان فرمایا کہ آخرت صرف ایمان والوں کے لیے ہے۔ یہی مضمون سورہ اعراف (۳۲) میں بیان ہوا ہے۔ اہل بن سعد رضی اللہ عنہم بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ﴿لَوْ كَانَتِ الدُّنْيَا تَعْدِلُ عِنْدَ اللَّهِ جَنَاحَ بَعُوضَةٍ مَا سَفَى كَافِرًا مِنْهَا شَرْبَةَ مَاءٍ﴾ [ترمذی، الزهد، باب ما جاء في هوان الدنيا على الله عز وجل : ۲۳۲۰] ”اگر دنیا اللہ کے ہاں مچھر کے ایک پر کے برابر ہوتی تو وہ اس میں سے کسی کافر کو پانی کا ایک گھونٹ پینے کو نہ دیتا۔“

آیت 36 ﴿۱﴾ وَمَنْ يَعِشْ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمَنِ: زخرفی نے فرمایا، ”عِشِّي يَعِشِي“ (ع) جب نظر میں خرابی آجائے اور ”عِشًّا يَعِشُو“ (ان) جب اس شخص کی طرح دیکھے جس کی نظر خراب ہے، حالانکہ اس میں کوئی خرابی نہ ہو۔ دونوں میں وہی فرق ہے جو ”عَمِي“ (اندھا ہو گیا) اور ”نَعَامِي“ (اندھا بن گیا) میں ہے۔ ”ذِكْرِ الرَّحْمَنِ“ کا معنی رحمان کی یاد بھی ہے، اس کی طرف سے آئی ہوئی نصیحت بھی اور یہ قرآن بھی۔ دنیا کی زیب و زینت میں ہمہ تن مشغول ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی اللہ کے ذکر سے غافل ہو جاتا ہے، جس کی وجہ سے فرشتے اس سے نفرت کرتے ہیں اور شیطان اس سے چٹ جاتے ہیں، جو اسے ہر برائی میں مبتلا کرنے کی سر توڑ کوشش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالِكُمْ وَلَا أَوْلَادِكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ، وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَأُولَئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ﴾ [المنافقون : ۹] ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تمہارے مال اور تمہاری اولاد تمہیں اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں اور جو ایسا کرے تو وہی لوگ خسارہ

وَأَنَّهُمْ لِيَصُدُّوهُمْ عَنِ السَّبِيلِ وَيَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ مُّقْتَدُونَ ﴿۳۷﴾ حَتَّىٰ إِذَا جَاءَنَا قَالَ يَلَيْتَ
بَيْنِي وَبَيْنَكَ بَعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَيَسَّ الْقَرِينُ ﴿۳۸﴾

اور بے شک وہ ضرور انہیں اصل راستے سے روکتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ بے شک وہ سیدھی راہ پر چلنے والے ہیں ﴿۳۷﴾
یہاں تک کہ جب وہ ہمارے پاس آئے گا تو کہے گا اے کاش! میرے درمیان اور تیرے درمیان دو مشرقوں کا فاصلہ
ہوتا، پس وہ براساچی ہے ﴿۳۸﴾

اٹھانے والے ہیں۔ اور جو شخص خواہش نفس پر قابو رکھ کر دنیا کے فتنوں سے بچے اور اللہ کے ذکر پر دوام کرے تو شیطان اس
سے دور ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ فرشتہ مقرر کر دیتے ہیں جو اس کی مدد کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے ذکر سے
جان بوجھ کر غفلت کے لیے اندھا بننے کا لفظ استعمال فرمایا اور لفظ ”الزَّخْفَنُ“ اس لیے ذکر فرمایا کہ انسان کے لائق نہیں کہ
اس بے حد رحم والے کے ذکر سے غفلت کرے۔

﴿لَقَدْ يَسَّرْنَا لَهُ شَيْطَانًا فَهُوَ لَهُ قَرِينٌ﴾ اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ حم السجدہ (۲۵)۔ ”شَيْطَانًا“ نکرہ ہے، کوئی نہ کوئی
شیطان، وہ انسانوں میں سے ہو یا ابلیس کی اولاد میں سے۔ شیطان مقرر کرنے کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف فرمائی،
حالانکہ یہ انسان کے اللہ کے ذکر سے غافل ہونے کا نتیجہ ہوتا ہے، کیونکہ ہر کام کا خالق اللہ تعالیٰ ہے اور تمام امور اسی کی طرف
لوٹتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ﴾ [البقرة: ۲۱۰] ”اور سب کام اللہ ہی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں۔“
﴿۳۷﴾ وَأَنَّهُمْ لِيَصُدُّوهُمْ عَنِ السَّبِيلِ: ”لَا أَنَّهُمْ“ میں ضمیر شیاطین کی طرف اور ”لِيَصُدُّوهُمْ“ میں ضمیر
”مَنْ“ رحمان کے ذکر سے غفلت کرنے والوں کی طرف جا رہی ہے، حالانکہ پچھلی آیت میں دونوں کا ذکر واحد کی ضمیر کے
ساتھ آیا ہے، لیکن وہاں بھی لفظ ”مَنْ“ واحد ہونے کے باوجود معنی کے لحاظ سے جمع ہے۔ یعنی اس کی یاد سے جان بوجھ کر
غفلت کرنے والوں کو کوئی نہ کوئی شیطان چٹ جاتے ہیں، خواہ انسانی شیطان ہوں یا ابلیس کی اولاد، وہ ان کے لیے گناہوں
کو خوبصورت کر کے دکھاتے ہیں، ان کی نفسانی خواہشات کو ابھارتے اور انہیں اللہ کی نافرمانی میں مشغول کر دیتے ہیں، حتیٰ کہ
انہیں صراطِ مستقیم سے بالکل روک دیتے ہیں اور جہنم میں پہنچا کر چھوڑتے ہیں۔

﴿وَيَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ مُّقْتَدُونَ﴾: یعنی راہِ راست سے رک جانے والے وہ غافل سراسر گمراہ ہونے کے باوجود اپنے بارے
میں سمجھتے ہیں کہ وہ سیدھے راستے پر ہیں۔ یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے گمراہ کرنے والے شیاطین کے متعلق سمجھتے ہیں کہ وہ
سیدھے راستے پر ہیں، اس لیے آنکھیں بند کر کے ان کے پیچھے چلتے چلے جاتے ہیں۔

﴿۳۸﴾ حَتَّىٰ إِذَا جَاءَنَا قَالَ ﴿۱﴾ دُنْيَا مِیں ہر وقت شیطان کے ساتھ رہنے کے بعد قیامت کے دن اللہ کے
فکر سے اندھا بننے والا انسان جب اپنے قرین کے ہمراہ اللہ تعالیٰ کے پاس حاضر ہوگا تو حسرت و افسوس کے ساتھ اس سے

وَلَنْ يَنْفَعَكُمْ الْيَوْمَ اِذْ ظَلَمْتُمْ اَنْكُمُ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُونَ ﴿۳۹﴾ اَفَاَنْتُمْ تُسْمِعُ الصُّمَّ اَوْ تَهْدِي الْعُمْىَ وَمَنْ كَانَ فِي ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۴۰﴾

اور آج یہ بات تمہیں ہرگز نفع نہ دے گی، جب کہ تم نے ظلم کیا کہ بے شک تم (سب) عذاب میں شریک ہو ﴿۳۹﴾ کیا تو بیہوشوں کو سنائے گا، یا وہ سوں کو براہ دکھائے گا اور ان کو جو صاف گمراہی میں پڑے ہیں ﴿۴۰﴾

کہے گا، کاش! میرے اور تیرے درمیان دو مشرقوں کی دوری ہوتی۔ دو مشرقوں سے مراد مشرق و مغرب ہیں۔ دونوں کو ”مشرقین“ کہہ دیا ہے، جیسے ابو بکر و عمر (رضی اللہ عنہما) کو ”عمرین“ کہہ دیتے ہیں اور کعبہ اور پانی کو ”اسودین“ کہہ دیتے ہیں۔ دو مشرق بھی مراد ہو سکتے ہیں، کیونکہ سردیوں میں سورج طلوع ہونے کی جگہ اور گرمیوں میں طلوع ہونے کی جگہ کے درمیان بہت فاصلہ ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ﴾ [الرحمان: ۱۷] ”وہ (وہ) دونوں مشرقوں کا رب ہے اور دونوں مغربوں کا رب۔“ ﴿۳۹﴾ فَبَسَّ الْقَرْيُنَ: ”اُمی بَسَّ الْقَرْيُنَ اَنْتَ“ یعنی تو برا ساتھی ہے، جس نے دوست بن کر مجھے خراب و برباد کیا اور ہمیشہ کے عذاب میں پھنسا دیا۔ بعض مفسرین نے اسے اللہ تعالیٰ کا کلام قرار دے کر معنی کیا ہے: ”فَبَسَّ الْقَرْيُنَ هُوَ“ یعنی پس وہ برا ساتھی ہے۔

آیت 39 وَلَنْ يَنْفَعَكُمْ الْيَوْمَ : دنیا میں اگر کوئی شخص کسی مصیبت میں گرفتار ہو تو اسے اس بات سے کچھ تسلی ہوتی ہے کہ وہ اکیلا نہیں بلکہ اس کے ساتھ اور لوگ بھی اس مصیبت میں گرفتار ہیں۔ اس کے علاوہ دوستوں کی صحبت کے احساس سے بھی تکلیف میں کچھ کمی ہو جاتی ہے، کیونکہ وہ مصیبت میں ایک دوسرے کی مدد کرتے اور حوصلہ دلاتے ہیں۔ عام مقولہ ہے: ”ہمہ یاراں دوزخ، ہمہ یاراں بہشت“ کہ دوزخ میں گئے تو سب دوست اکٹھے جائیں گے اور بہشت میں گئے تو بھی اکٹھے جائیں گے۔

قرین کی مناسبت سے فرمایا کہ اگر تم اس بات سے کچھ تسلی حاصل کرنا چاہو کہ میں عذاب میں ہوں تو میرا قرین بھی تو عذاب میں ہے تو تمہارا یہ خیال غلط ہے، جب تم دنیا میں ظلم کرتے رہے تو آج تمہیں اس بات سے ہرگز کوئی فائدہ نہیں ہوگا کہ تم عذاب میں ایک دوسرے کے ساتھ شریک ہو، کیونکہ وہ عذاب ہی اتنا سخت ہے کہ کسی کو کسی کا ہوش نہیں ہوگا، بلکہ مجرم اپنے تمام خویش و اقارب فدیے میں دے کر اس عذاب سے نجات پانے کی خواہش کرے گا۔ (دیکھیے معارج: ۱۱ تا ۱۳) شاہ عبد القادر لکھتے ہیں: ”یعنی کافر کہیں گے خوب ہوا کہ انھوں نے ہمیں عذاب میں ڈلویا، یہ بھی نہ بچے، لیکن اس کا کیا فائدہ اگر دوسرا پکڑا گیا۔“ (موضح)

آیت 40 اَفَاَنْتُمْ تُسْمِعُ الصُّمَّ : رحمن کے ذکر سے دانستہ آنکھیں بند کرنے کی سزا شیطان کو ایسے لوگوں کا ساتھی بنانے کی صورت میں دی جاتی ہے جو انھیں راوح حق سے اس طرح روکتے ہیں کہ وہ حق سننے سے بہرے اور اس کی نشانیاں دیکھنے سے اندھے ہو جاتے ہیں۔ اس آیت سے مقصود نبی ﷺ کو تسلی دینا ہے کہ ان کافروں کے ایمان نہ لانے پر آپ غمزدہ

فَإِمَّا نَذْهَبَنَّ بِكَ فَإِنَّا مِنْهُمْ مُنْتَقِمُونَ ﴿۳۳﴾ أَوْ نُرِيَنَّكَ الَّذِي وَعَدْنَاهُمْ فَإِنَّا عَلَيْهِمْ مُقْتَدِرُونَ ﴿۳۴﴾ فَاسْتَنْسِكَ بِالَّذِي أَوْحَىٰ إِلَيْكَ ۖ إِنَّكَ عَلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿۳۵﴾ وَإِنَّهُ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ ۖ وَسَوْفَ تُسْأَلُونَ ﴿۳۶﴾

پس اگر کبھی ہم تجھے لے ہی جائیں تو بے شک ہم ان سے انتقام لینے والے ہیں ﴿۳۳﴾ یا ہم واقعی تجھے وہ (عذاب) دکھادیں جس کا ہم نے ان سے وعدہ کیا ہے تو بے شک ہم ان پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں ﴿۳۴﴾ پس تو اس کو مضبوطی سے پکڑے رکھ جو تیری طرف وحی کیا گیا ہے، یقیناً تو سیدھے راستے پر ہے ﴿۳۵﴾ اور بلاشبہ وہ یقیناً تیرے لیے اور تیری قوم کے لیے ایک نصیحت ہے اور عنقریب تم سے پوچھا جائے گا ﴿۳۶﴾

تہوں، کیونکہ ایسے لوگوں کو راہِ راست پر لے آنا آپ کے بس میں نہیں، آپ ان تک اللہ کا پیغام پہنچاتے رہیں اور ہدایت کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیں۔

آیت 42-41 : **فَإِمَّا نَذْهَبَنَّ بِكَ فَإِنَّا مِنْهُمْ مُنْتَقِمُونَ** : یہ بھی رسول اللہ ﷺ کو ایک اور طرح سے تسلی دلائی ہے کہ یہ کفار جو آپ کی موت کے منتظر ہیں اور ہر وقت آپ کو کسی نہ کسی طرح قتل کرنے کی کوشش اور مشورہ کرتے رہتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ آپ کی موت سے ان کی مشکل ختم ہو جائے گی اور سب کچھ ان کے حق میں ہو جائے گا۔ فرمایا ان کا یہ خیال غلط ہے، کیونکہ اگر ہم آپ کو اپنے پاس لے جائیں تو پھر بھی یہ لوگ سزا سے بچ نہیں سکیں گے، بلکہ ہم ہر حال میں ان سے انتقام لینے والے ہیں، یا آپ کی زندگی میں آپ کو اس سزا کا کچھ حصہ دکھا دیں جس کا ہم نے ان سے وعدہ کیا ہے تو یہ بھی کچھ بعید نہیں، کیونکہ ہم ان پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، اللہ تعالیٰ نے بدر اور دوسرے معرکوں میں کفار کو ہلنے والی سزا آپ ﷺ کو آنکھوں سے دکھادی۔ مزید دیکھیے سورہ مومن (۷۷)۔

آیت 43 : **فَاسْتَنْسِكَ بِالَّذِي أَوْحَىٰ إِلَيْكَ** : یعنی آپ کو ان کافروں کی مخالفت سے دل برداشتہ نہیں ہونا چاہیے، آپ کے لیے یہ اطمینان کافی ہے کہ آپ راہِ حق پر ہیں، اس لیے نتائج سے بے فکر ہو کر دعوت کا کام جاری رکھیں اور خود اس پر پوری طرح کار بند رہیں۔

آیت 44 : **وَإِنَّهُ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ** : ذکر کا معنی نصیحت و یاد دہانی بھی ہے اور عز و شرف اور شہرت و ناموری بھی، یہاں دونوں مراد ہیں۔ یعنی یہ قرآن آپ کے لیے اور آپ کی قوم کے لیے نصیحت اور یاد دہانی ہے اور آپ کے لیے اور آپ کی قوم قریش اور عرب کے لیے عز و شرف کا باعث بھی ہے۔ یہ عربی زبان میں نازل ہوا اور اس کے اولین مخاطب اور سب سے پہلے عمل کرنے والے قریش اور عرب ہیں۔ جو غبی تو میں اس پر ایمان لائیں گی ان کو قرآن کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے عربی زبان سیکھنا پڑے گی اور عربوں کا شاگرد بننا پڑے گا۔ قریش اور عربوں کے لیے یہ عز و شرف کیا کم ہے کہ بعد میں آنے

وَسَأَلُ مَنْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُسُلِنَا أَجَعَلْنَا مِنْ دُونِ الرَّحْمَنِ إِلَهًا يُعْبَدُونَ ﴿۴۴﴾

اور ان سے پوچھ جنہیں ہم نے تجھ سے پہلے اپنے رسولوں میں سے بھیجا، کیا ہم نے رحمان کے سوا کوئی معبود بنا دیا ہے، جن کی عبادت کی جائے؟ ﴿۴۴﴾

والے تمام لوگ ان کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔ زمین کے مشرق و مغرب ان کے جہاد کے ساتھ فتح اور حلقہ بگوش اسلام ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی خلافت ان میں رکھی جب تک انہوں نے دین کو قائم رکھا، کیونکہ قرآن شرف کا باعث اسی کے لیے ہے جو اس پر عمل کرے، اس کے لیے محض عرب یا قریش ہونا کافی نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «وَالْقُرْآنُ حُجَّةٌ لَكَ أَوْ عَلَيْنِكَ» (مسلم، الطہارۃ، باب فضل الوضوء، ۲۲۳، عن أبي مالك الأشعري رَضِيَ اللهُ عَنْهُ) «قرآن تیرے حق میں حجت ہے یا تیرے خلاف حجت ہے۔»

آیت سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ نیک نامی کی خواہش اچھی چیز ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ اس کا ذکر اپنے نبی محمد ﷺ پر احسان کے طور پر نہ فرماتے اور ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے یہ دعائے کرتے: ﴿وَاجْعَلْ لِي لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْآخِرِينَ﴾ [الشعراء: ۸۴] «اور پیچھے آنے والوں میں میرے لیے سچی ناموری رکھ۔»

﴿۴۴﴾ وَسَأَلُ مَنْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُسُلِنَا أَجَعَلْنَا مِنْ دُونِ الرَّحْمَنِ إِلَهًا يُعْبَدُونَ: یعنی قیامت کے دن تم سے سوال کیا جائے گا کہ تم نے اپنے عز و شرف کا باعث بننے والی نصیحت کی اس کتاب کی کیا قدر کی، اس پر کہاں تک عمل کیا اور اسے تمام اقوام عالم تک پہنچانے کی ذمہ داری کہاں تک ادا کی؟

آیت 45 ﴿۴۵﴾ ۱ ﴿۴۵﴾ وَسَأَلُ مَنْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُسُلِنَا : یہاں ایک سوال ہے کہ پہلے رسول تو فوت ہو چکے، ان سے کس طرح پوچھا جاسکتا ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ رسولوں سے پوچھنے سے مراد ان کی کتابوں سے معلوم کرنا ہے، جیسا کہ اللہ کے فرمان: ﴿فَإِنْ تَنَادَرْتُمْ عَتَمَةً فِي شَيْءٍ فَحَرُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ﴾ [النساء: ۵۹] (پھر اگر تم کسی چیز میں جھگڑا پڑو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ) کا مطلب اب یہ نہیں کہ اگر تمہارا کسی معاملے میں تنازع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کے پاس لے جاؤ، بلکہ یہ ہے کہ کتاب اللہ اور سنت رسول کی طرف رجوع کرو۔ اسی طرح اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ پہلے تمام رسولوں کی تعلیمات کا مطالعہ کر کے دیکھ لو، کیا کسی میں یہ بات ملتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رحمان کے سوا بھی کوئی ہستیاں مقرر کی ہیں کہ ان کی عبادت کی جائے اور کیا کسی بھی پیغمبر نے شرک کی اجازت دی ہے؟ ظاہر ہے اس کا جواب نفی میں ہے۔ شرک کے حق میں نہ کوئی عقلی دلیل موجود ہے نہ نقلی۔ (دیکھیے احقاف: ۴) آیت سے مقصود قریش کو باور کروانا ہے کہ تمام انبیاء اللہ واحد کی عبادت کے داعی تھے، شرک کسی بھی شریعت میں جائز نہیں رہا، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا لُوَجِّهَ إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ﴾ [الانبیاء: ۲۵] «اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف یہ وحی کرتے تھے کہ حقیقت یہ ہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو میری عبادت کرو۔» اور جیسا کہ فرمایا: ﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا أَنْ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ﴾ [النحل: ۳۶] «اور بلاشبہ یقیناً ہم نے ہر امت

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَ مَلَآئِهِ فَقَالَ إِنِّي رَسُولُ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۴۶﴾ فَلَمَّا جَاءَهُمْ بِآيَاتِنَا إِذَا هُمْ مِنْهَا يَضْحَكُونَ ﴿۴۷﴾

بلاشبہ یقیناً ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانوں کے ساتھ فرعون اور اس کے سرداروں کے پاس بھیجا تو اس نے کہا بے شک میں تمام جہانوں کے رب کا بھیجا ہوا ہوں ﴿۴۶﴾ تو جب وہ ان کے پاس ہماری نشانیاں لے کر آیا، اچانک وہ ان کے ہرے میں ہنس رہے تھے ﴿۴۷﴾

میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو۔“

بعض مفسرین نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ جب آپ کی انبیاء سے ملاقات ہو، جیسے معراج کی رات ہوئی تو آپ ان سے یہ سوال کریں، مگر قرآن یا حدیث میں کہیں ذکر نہیں کہ آپ ﷺ نے شبِ معراج یا کسی اور موقع پر کسی پیغمبر سے یہ سوال کیا ہو۔ اگر آیت کا یہ مطلب ہوتا تو آپ ﷺ ان سے ضرور سوال کرتے۔ کسی ضعیف روایت میں اگر آپ ﷺ کے پیغمبروں سے اس سوال کا ذکر مل بھی جائے تو اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

آیت 46 ﴿۴۶﴾ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَ مَلَآئِهِ: یہاں موسیٰ ﷺ کے ذکر کی مناسبت کئی طرح سے ہے، جن میں سے ایک یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو اپنے سے پہلے رسولوں سے سوال کا حکم دیا کہ کیا اس نے اپنے سوا کوئی معبود مقرر کیے ہیں جن کی عبادت کی جائے، تو جن رسولوں کی کتابوں یا پیروکاروں سے یہ معلومات حاصل کی جاسکتی تھیں ان میں سب سے پہلے موسیٰ ﷺ تھے، کیونکہ ان کی کتاب موجود تھی اور ان کی امت کے لوگ بھی موجود تھے۔ دوسری مناسبت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کرنے والے قوم کے سردار تھے، جو حق واضح ہونے کے باوجود اپنے مال و جاہ کی وجہ سے آپ کو حقیر کہہ کر آپ ﷺ کو رسالت کا اہل ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسلی دلانے کے لیے یہ واقعہ ذکر فرمایا کہ یہی معاملہ موسیٰ ﷺ کے ساتھ فرعون اور اس کے سرداروں کا تھا۔ فرعون نے بھی معجزات دیکھے اور موسیٰ ﷺ کی نبوت دل سے ماننے کے باوجود ملک مصر کا مالک ہونے پر فخر کیا اور موسیٰ ﷺ کو ذلیل و حقیر قرار دے کر ان پر ایمان لانے سے انکار کر دیا۔ جس کے نتیجے میں وہ اللہ کے غضب کا نشانہ بنا اور اپنے لشکروں سمیت سمندر میں غرق کر دیا گیا۔ مقصد قریش اور عربوں کو فرعون جیسے برے انجام سے ڈرانا ہے۔

﴿۴۶﴾ ”بِآيَاتِنَا“ میں آیات سے مراد عصا اور یو بیضا ہیں، کیونکہ سب سے پہلے موسیٰ ﷺ فرعون کے پاس گئے تو ان کے پاس یہی نشانیاں تھیں۔

﴿۴۷﴾ فَقَالَ إِنِّي رَسُولُ رَبِّ الْعَالَمِينَ: موسیٰ ﷺ نے وہ نشانیاں پیش کر کے فرعون کو رب ہونے کے دعوے سے منع کیا، اسے تمام پیغمبروں کی طرح توحید کی دعوت دی اور اکیلے رب العالمین پر ایمان لانے کا حکم دیا۔

آیت 47 ﴿۴۷﴾ فَلَمَّا جَاءَهُمْ بِآيَاتِنَا إِذَا هُمْ مِنْهَا يَضْحَكُونَ: ”إِذَا“ اچانک کے معنی میں ہے۔ یہاں کچھ عبارت

وَمَا نُرِيهِمْ مِنْ آيَةٍ إِلَّا هِيَ أَكْبَرُ مِنْ أُخْتِهَا ۚ وَأَخَذْنَاهُمْ بِالْعَذَابِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿۴۷﴾
 وَقَالُوا يَا أَيُّهَا الشَّجَرُ اذْعُرْ لَنَا رَبِّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۖ إِنَّا لَمُهْتَدُونَ ﴿۴۸﴾

اور ہم انھیں کوئی نشانی نہیں دکھلاتے تھے مگر وہ اپنے جیسی (پہلی نشانی) سے بڑی ہوتی اور ہم نے انھیں عذاب میں پکڑا، تاکہ وہ لوٹ آئیں ﴿۴۷﴾ اور انھوں نے کہا اے جادوگر! ہمارے لیے اپنے رب سے اس کے ذریعے دعا کر کہ اس نے تجھ سے عہد کر رکھا ہے، بے شک ہم ضرور ہی سیدھی راہ پر آنے والے ہیں ﴿۴۸﴾

مخروف ہے جو خود سمجھ میں آ رہی ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور اس کے سرداروں کو رب العالمین کی توحید اور اپنی رسالت پر ایمان لانے کی دعوت دی تو انھوں نے کوئی نشانی پیش کرنے کا مطالبہ کیا۔ جب انھوں نے ان کے سامنے ہماری عطا کردہ نشانیاں عصا اور ید بیضا پیش کیں تو بجائے اس کے کہ وہ ان پر غور و فکر کرتے اور ایمان لے آتے، فوراً ہی ان پر ہنسنے اور ان کا مذاق اڑانے لگے۔ اس میں رسول اللہ ﷺ کو تسلی دی ہے، کیونکہ قریش کے سردار بھی آپ کی پیش کردہ نشانیاں دیکھ کر مذاق اڑاتے تھے، جیسا کہ فرمایا: ﴿بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُونَ ۚ وَإِذَا دُكِرُوا لَا يَدْرِكُونَ ۚ وَإِذَا رَأَوْا آيَةً يَسْتَسْخَرُونَ﴾ [الصافات: ۱۲ تا ۱۴] ”بلکہ تو نے تعجب کیا اور وہ مذاق اڑاتے ہیں۔ اور جب انھیں نصیحت کی جائے وہ قبول نہیں کرتے۔ اور جب کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو خوب مذاق اڑاتے ہیں۔“

آیت 48 وَمَا نُرِيهِمْ مِنْ آيَةٍ إِلَّا هِيَ أَكْبَرُ مِنْ أُخْتِهَا : فرعون اور اس کے سرداروں نے جب موسیٰ علیہ السلام کو جادوگر کہا اور ان کے معجزوں کو جادو قرار دے کر اپنے تمام ماہر جادوگر جمع کر کے ان کا مقابلہ کیا اور صاف شکست کے باوجود اپنے کفر پر اڑے رہے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر قحط مسلط کر دیا۔ اس پر انھوں نے موسیٰ علیہ السلام سے عذاب ہٹانے کی دعا کی درخواست کی اور قحط دور ہونے پر ایمان لانے کا اور بنی اسرائیل کو آزادی دینے کا وعدہ کیا۔ جب قحط دور ہوا تو وعدے سے مکر گئے، اس پر اللہ تعالیٰ نے ان پر یکے بعد دیگرے کئی عذاب بھیجے، جن میں سے ہر ایک پہلے سے بڑی نشانی تھا اور ان عذابوں کا مقصد یہ تھا کہ وہ کفر و تکبر سے پلٹ آئیں اور ایمان قبول کر لیں۔ تفصیل اس کی سورہ اعراف (۱۳۳) میں ملاحظہ فرمائیں۔

آیت 49 ﴿۱﴾ وَقَالُوا يَا أَيُّهَا الشَّجَرُ اذْعُرْ لَنَا رَبِّكَ : یہاں یہ بات اختصار کے ساتھ ذکر ہوئی ہے، سورہ اعراف میں تفصیل کے ساتھ ہے، فرمایا: ﴿وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوا لِنُؤْسَى اذْعُرْ لَنَا رَبِّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ ۚ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِي إِسْرَائِيلَ﴾ [الأعراف: ۱۳۴] ”اور جب ان پر عذاب آتا تو کہتے اے موسیٰ! اپنے رب سے ہمارے لیے اس عہد کے واسطے سے دعا کر جو اس نے تیرے ہاں دے رکھا ہے، یقیناً اگر تو ہم سے یہ عذاب دور کر دے تو ہم ضرور ہی تجھ پر ایمان لے آئیں گے اور تیرے ساتھ بنی اسرائیل کو ضرور ہی بھیج دیں گے۔“

﴿۲﴾ یہاں ایک سوال ہے کہ اتنی مشکل گھڑی میں جب وہ عذاب میں گرفتار تھے اور موسیٰ علیہ السلام سے دعا کی درخواست کر رہے تھے اس وقت بھی وہ موسیٰ علیہ السلام کو ”يَا أَيُّهَا الشَّجَرُ“ (اے جادوگر!) کے ساتھ مخاطب کر رہے ہیں، حالانکہ اس وقت تو انھیں کسی

فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمْ الْعَذَابَ إِذَا هُمْ يَنْكُثُونَ ﴿۵۰﴾

پھر جب ہم ان سے عذاب ہٹالیتے، اچانک وہ عہد توڑ دیتے تھے ﴿۵۰﴾

اچھے لفظ سے مخاطب کرنا چاہیے تھا۔ پھر موسیٰ علیہ السلام یہ صریح بہتان سن کر بھی انھیں کچھ نہیں کہتے، بلکہ ان کے لیے دعا کر کے انھیں عذاب سے نجات دلواتے ہیں۔ مفسرین نے اس کے کئی جواب دیے ہیں، یہاں ان میں سے دو جواب ذکر کیے جاتے ہیں۔ ابن کثیر نے فرمایا: ”ساحر سے مراد عالم ہے، یہی ابن جریر نے فرمایا ہے۔ ان کے زمانے کے علماء جادوگر ہی تھے اور ان کے ہاں جادو بری چیز نہ تھا، اس لیے انھوں نے یہ الفاظ تنقیص کے لیے نہیں کہے، کیونکہ ان کی مجبوری کی حالت اس سے مناسبت نہیں رکھتی، بلکہ ان کے گمان کے مطابق یہ تعظیم کا لفظ تھا۔“ (ابن کثیر)

دوسرا جواب یہ ہے کہ انھوں نے خطاب ”یا مؤمنی“ کے الفاظ کے ساتھ ہی کیا تھا، جیسا کہ سورہ اعراف کی آیت (۱۳۴) میں ہے، مگر وہ دل سے انھیں جادوگر سمجھتے تھے اور وہ جادو اور جادوگروں کو مذموم ہی سمجھتے تھے، جیسا کہ اس سے پہلے فرعون اور اس کے درباریوں نے صاف الفاظ میں کہا تھا: ﴿فَقَالُوا سِحْرٌ كَذَّابٌ﴾ [المومن: ۲۴] ”تو انھوں نے کہا جادوگر ہے، بہت جھوٹا ہے۔“ اب ان کا حال دیکھیے کہ وہی شخص جسے وہ جادوگر سمجھتے تھے نہایت عاجزی کے ساتھ اسی سے دعا کی درخواست کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی درخواست کا ذکر فرماتے ہوئے ان کے دل کی حالت کا ذکر اپنے الفاظ میں فرمایا ہے۔ مقصود ان پر طعن ہے کہ جب جادوگر سمجھتے ہو اور ہمیشہ اسے اسی لفظ سے یاد کرتے ہو تو اس سے دعا کی درخواست کیسی؟ اور اگر مستجاب الدعاء کہتے ہو تو جادوگر کیوں سمجھتے ہو؟ یہ ایسے ہی ہے کہ قریش جو رسول اللہ ﷺ کو جادوگر کہتے تھے اور آپ ﷺ کا مذاق اڑاتے تھے، مشکل وقت میں وہ رسول اللہ ﷺ سے دعا کی درخواست بھی کیا کرتے تھے، جیسا کہ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما نے ان کا حال بیان کیا ہے، فرماتے ہیں: «وَإِنْ قُرَيْشًا أَنْطَلُوا عَنِ الْإِسْلَامِ فَدَعَا عَلَيْهِمُ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اللَّهُمَّ أَعِنِّي عَلَيْهِمْ بِسَبْعِ كَسْبَعِ يَوْسُفَ، فَأَخَذْتَهُمْ سَنَةً حَتَّى هَلَكُوا فِيهَا، وَأَكَلُوا الْمَيْتَةَ وَالْعِظَامَ وَبَرَى الرَّجُلُ مَا بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ كَهَيْئَةِ الدُّحَانِ، فَجَاءَهُ أَبُو سُفْيَانَ فَقَالَ يَا مُحَمَّدُ! جِئْتَ تَأْمُرُنَا بِصَلَةِ الرَّحِمِ، وَإِنْ قَوْمُكَ قَدْ هَلَكُوا فَأَدْعُ اللَّهَ» [بخاری، التفسیر، سورة الروم: ۴۷۷۴] ”قریش نے اسلام قبول کرنے میں دیر کی تو رسول اللہ ﷺ نے ان پر بددعا کی: ”اے اللہ! ان کے خلاف یوسف (علیہ السلام) کے قحط والے سات سالوں جیسے سات سالوں کے ساتھ میری مدد فرما۔“ تو انھیں قحط نے آیا، یہاں تک کہ وہ اس میں برباد ہو گئے اور مردار اور ہڈیاں کھا گئے اور آدمی کو آسمان و زمین کے درمیان دھواں سا نظر آتا تھا۔ تو آپ ﷺ کے پاس ابوسفیان آیا اور کہنے لگا: ”اے محمد! آپ ہمیں صلہ رحمی کا حکم دیتے ہیں اور حال یہ ہے کہ آپ کی قوم برباد ہو گئی ہے، اس لیے اللہ سے دعا کیجیے۔“ اس حدیث میں ہے کہ جب آپ ﷺ کی دعا سے قحط دور ہوا تو پھر منکر ہو گئے۔ مجھے یہ دوسرا جواب بہتر معلوم ہوتا ہے۔ (واللہ اعلم)

وَنَادَى فِرْعَوْنُ فِي قَوْمِهِ قَالَ يَا قَوْمِ أَلَيْسَ لِي مُلْكُ مِصْرَ وَهَذِهِ الْأَنْهَارُ تَجْرِي مِن تَحْتِي ۚ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ﴿٥١﴾

اور فرعون نے اپنی قوم میں منادی کی، اس نے کہا اے میری قوم! کیا میرے پاس مصر کی بادشاہی نہیں ہے؟ اور یہ نہریں میرے تحت نہیں چل رہیں؟ تو کیا تم نہیں دیکھتے؟ ﴿۵۱﴾

بہتے ہی فوراً عہد توڑ دیتے۔ نہ سوچنے کی زحمت کرتے، نہ عہد توڑنے میں انھیں کوئی حیا مانع ہوتی تھی۔

آیت 51 ﴿ 1 ﴾ وَنَادَى فِرْعَوْنُ فِي قَوْمِهِ: فرعون اور اس کے سرداروں نے موسیٰ علیہ السلام کے معجزات اپنی آنکھوں سے دیکھے، جن سے انھیں ان کی نبوت کا یقین ہو گیا، اس کے باوجود وہ ایمان نہ لائے، بلکہ مقابلے میں جادوگروں کو لے آئے۔ اس میں منہ کی کھائی پھر بھی ایمان نہ لائے، پھر بطور نشانی کتنے عذاب ان پر آئے جو اس وعدے کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام سے دعا کروانے پر دور ہوئے کہ ہم عذاب دور ہونے پر ایمان لے آئیں گے اور تمہارے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دیں گے، مگر وہ کسی صورت موسیٰ علیہ السلام کو رسول ماننے پر تیار نہ تھے۔ ادھر انھیں خطرہ تھا کہ عوام ان معجزات کے نتیجے میں ان کی طرف مائل ہو جائیں گے، اس لیے فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کے رسالت کے اہل نہ ہونے کے اپنے خیال میں کئی دلائل گھڑے اور ابلاغ کے جتنے وسائل ہو سکتے تھے ان کے ساتھ پوری قوم میں ان کی منادی کروائی، جیسا کہ اس نے عصائے موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے کے لیے تمام شہروں میں آدمی بھیج کر جادو گراکٹھے کیے تھے، فرمایا: ﴿فَأَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِي الْمَدَائِنِ حَاشِرِينَ﴾ [الشعراء: ۵۳] ”تو فرعون نے شہروں میں اکٹھا کرنے والے بھیج دیے۔“ ”فِي قَوْمِهِ“ کے الفاظ اس منادی کی وسعت پر دلالت کر رہے ہیں۔ ہمارے نبی کریم ﷺ کو یہ قصہ سنانے کا مقصد یہ ہے کہ آپ ﷺ کی رسالت کو تسلیم نہ کرنے کے لیے کفار نے جو دلائل تصنیف کیے ہیں وہ سبھی اس سے پہلے فرعون بھی پیش کر چکا ہے۔ وہ دلائل نہ اسے عذاب سے بچا سکے اور نہ ان لوگوں کو کفر پر اصرار کی صورت میں بچا سکیں گے۔

﴿ 2 ﴾ قَالَ يَقَوْمِ أَلَيْسَ لِي مُلْكُ مِصْرَ وَهَذِهِ الْأَنْهَارُ تَجْرِي مِن تَحْتِي: یعنی برتری اور افضلیت کا پیمانہ دنیاوی مال و دولت اور حکومت و اقتدار ہے، جو موسیٰ کے پاس نہیں میرے پاس ہے۔ کیا میں مصر کے اقتدار کا مالک نہیں ہوں؟ دریائے نیل سے نکالی ہوئی نہروں کے ذریعے سے آب پاشی کا نظام میرے احکام کے تحت چل رہا ہے۔ یہی بات کفار مکہ نے کہی تھی: ﴿لَوْلَا نُزِّلَ هَذَا الْقُرْآنُ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنَ الْقُرَيْشِيِّينَ عَظِيمٍ﴾ [الزخرف: ۲۱] کہ قرآن ان دو بستیوں میں سے کسی عظیم آدمی پر اترا نا چاہیے تھا۔ ﴿ 3 ﴾ أَفَلَا تُبْصِرُونَ: مصر کے لوگ جو موسیٰ علیہ السلام کے کمالات اور معجزات دیکھ کر متاثر ہو رہے تھے، فرعون انھیں اپنی مادی اور دنیوی شان و شوکت کی طرف متوجہ کر رہا ہے۔ حقیقت میں یہ اس کی شکست خوردگی کی دلیل ہے، کیونکہ یہ سب کچھ تو وہ مدت سے دیکھتے چلے آ رہے تھے۔

أَمْ أَنَا خَيْرٌ مِّنْ هَذَا الَّذِي هُوَ مَهِينٌ ۗ وَلَا يُكَادُّ يٰبِئْسَ

بلکہ میں اس شخص سے بہتر ہوں، وہ جو حقیر ہے اور قریب نہیں کہ وہ بات واضح کرے ﴿۵۲﴾

ت 52 : ﴿۱﴾ اَمْ أَنَا خَيْرٌ مِّنْ هَذَا الَّذِي هُوَ مَهِينٌ : ”مَهْنٌ يُمَهُنُّ مَهَانَةً“ (ک) کے معنی ہیں ”حَقَّرَ وَضَعُفَ.“ ”مَهِينٌ“ بروزن ”فَعِيلٌ“ حقیر، ضعیف۔ ”اَمْ“ سے پہلے ایک جملہ ہمزہ استفہام پر مشتمل ہوتا ہے، جو یہاں اس مفہوم کا ہوگا کہ ”کیا یہ شخص یعنی موسیٰ (علیہ السلام) بہتر ہے یا میں بہتر ہوں.....؟“ ”اَمْ“ ”بَلْ“ کے معنی میں بھی آتا ہے، اس صورت میں معنی یہ ہوگا: ”بلکہ میں بہتر ہوں.....“

﴿۲﴾ فرعون موسیٰ (علیہ السلام) کی حقیر کے لیے زیادہ سے زیادہ جو الفاظ استعمال کر سکتا تھا اس نے وہ کیے۔ ان میں سے لفظ ”هَذَا“ بھی حقارت کے اظہار کے لیے ہے، یعنی ”اس شخص سے جو حقیر ہے۔“ وہ موسیٰ (علیہ السلام) کو اس لیے حقیر کہہ رہا تھا کہ ان کے پاس اس جیسی نہ دولت تھی نہ قوت و سلطنت، بلکہ وہ اس کی غلام قوم کے ایک فرد تھے اور غلام تو حقیر ہی سمجھا جاتا ہے۔ مگر یہ عجیب حقیر شخص تھا جس سے فرعون بھی شدید خوف زدہ تھا، ہر عذاب پر اس کے سامنے دعا کے لیے منت و سماجت کرتا تھا، اپنی ساری شان و شوکت، قوت و اقتدار اور افواج قاہرہ کے باوجود اسے اپنے دربار میں داخل ہونے سے نہیں روک سکتا تھا، جب کہ اس کے پاس فوج تھی نہ اسلحہ، صرف ایک عصا ہاتھ میں لیے جب چاہتا اس کے سر پر پہنچ جاتا۔ اور یہ عجیب حقیر شخص تھا جس کے متعلق وہ اپنے سرداروں سے کہتا تھا: ”مجھے چھوڑ دو کہ میں موسیٰ کو قتل کر دوں۔“ (دیکھیے مومن: ۲۶) حالانکہ کسی نے اسے قتل کرنے سے نہیں روکا تھا اور فرعون میں یہ جرأت نہیں تھی کہ انھیں ہاتھ بھی لگا سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کا مال یا اقتدار حقارت یا عظمت کا پیمانہ ہے ہی نہیں اور نہ ہی موسیٰ (علیہ السلام) حقیر تھے، بلکہ وہ ظالم خود ہی حقیر و ذلیل تھا جو دنیا کے عارضی متاع پر مغرور ہو کر حق سے انکار پر اڑا ہوا تھا۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زمانے کے کفار بھی دنیا کی دولت نہ ہونے کی وجہ سے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو نبوت عطا ہونا قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

﴿۳﴾ وَلَا يُكَادُّ يٰبِئْسَ : بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اس کا اشارہ اس لکنت کی طرف تھا جو موسیٰ (علیہ السلام) کی زبان میں پائی جاتی تھی، مگر یہ بات درست نہیں۔ موسیٰ (علیہ السلام) کی دعا کے بعد وہ لکنت دور ہو گئی تھی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ موسیٰ! تمہاری دعا قبول کر لی گئی ہے۔ (دیکھیے طہ: ۳۶) قرآن مجید میں فرعون کے ساتھ موسیٰ (علیہ السلام) کے کئی مناظرے مذکور ہیں، جن میں انھوں نے نہایت فصیح و بلیغ الفاظ میں اپنا مدعا بیان فرمایا اور ہر موقع پر فرعون کو لاجواب کیا۔ اگرچہ انھوں نے اپنی مدد کے لیے ہارون (علیہ السلام) کو زیادہ فصیح اللسان ہونے کی وجہ سے مانگ کر لیا تھا، مگر کہیں بھی انھیں اظہار مقصد کے لیے ہارون (علیہ السلام) کی ضرورت نہیں پڑی۔ رہا فرعون کا ان کے متعلق کہنا کہ ”قریب نہیں کہ وہ اپنی بات واضح کر سکے“ تو اس کی وجہ یہ تھی کہ کفار و مشرکین کی سمجھ میں بیخبروں کی بات آتی ہی نہیں، جیسا کہ شعب (علیہ السلام) جیسے زبردست خطیب کو ان کی قوم نے کہا: ﴿يٰشُعَيْبُ مَا نَفَقَهُ كَبِيرًا مِمَّا تَقُولُ وَإِنَّا لَنَرِيكَ فِينَا ضِعْفًا﴾ [ہود: ۹۱] ”اے شعب! ہم اس میں سے بہت سی باتیں نہیں سمجھتے جو تو

فَلَوْلَا أَلْقَىٰ عَلَيْهِ آسُورَةٌ فَمِنْ ذَهَبٍ أَوْ جَاءَ نَعَهُ الْمَلِكَةُ مُقْتَرِنِينَ ﴿۵۳﴾

پس اس پر سونے کے ننگن کیوں نہیں ڈالے گئے، یا اس کے ہمراہ فرشتے مل کر کیوں نہیں آئے؟ ﴿۵۳﴾

کہتا ہے اور بے شک ہم تو تجھے اپنے درمیان بہت کمزور دیکھتے ہیں۔“ فرعون موسیٰ علیہ السلام پر وہی دوطن کر رہا تھا جو اس سے پہلے شعیب علیہ السلام پر ان کی قوم نے کیے تھے کہ بات سمجھ میں نہ آنا اور ان کی نگاہ میں ان کا حقیر اور ضعیف ہونا۔ ہمارے نبی ﷺ کی بات بھی مشرکین کی سمجھ میں نہیں آتی تھی، نہ ہی وہ اپنے جیسے دولت مندوں کی موجودگی میں آپ ﷺ کو نبی ماننے کے لیے تیار تھے، فرمایا: ﴿وَعَجِبُوا أَنْ جَاءَهُمْ مُنذِرٌ مِنْهُمْ ۖ وَقَالَ الْكٰفِرُونَ هٰذَا سِحْرٌ كٰذٰبٌ ۗ اٰجَعَلِ الْاٰلِهَةَ الْاٰهًا وَّاحِدًا ۗ اِنْ هٰذَا لَشَيْءٌ عَجَلٌ ۗ وَاَنْطَلَقَ الْاِنۡلَا مِنْهُمۡ اَنْ اَمۡشُوا وَاَصۡبِرُوا عَلٰی اٰلِهَتِكُمْ ۗ اِنْ هٰذَا لَشَيْءٌ نِّرَاۗءٌ ۗ مَا سَبَعْنَا هٰذَا فِی الْاٰلِهَةِ الْاٰخِرَةِ ۗ اِنْ هٰذَا اِلَّا اِخۡتِلَافٌ ۗ ۙ اُنۡزِلَ عَلَیۡهِ الذِّكۡرُ مِنْ بَیۡنِنَا ۗ بَلْ هُمْ فِیۡ شَكٍّ مِّنۡ ذِكۡرِنَا ۗ بَلْ لَمَّا يَنْذَرُكُمۡا عَذَابٌ ۗ اَمۡرٌ عِنۡدَهُمۡ عَزَآءٌ رَّحِمَةً رَبِّنَا ۗ اَلۡعَزِیۡزُ الْوَهَّابُ﴾ [ص : ۹ تا ۱۰] ” اور انھوں نے اس پر تعجب کیا کہ ان کے پاس انھی میں سے ایک ڈرانے والا آیا اور کافروں نے کہا یہ ایک سخت جھوٹا جادوگر ہے۔ کیا اس نے تمام معبودوں کو ایک ہی معبود بنا ڈالا؟ بلاشبہ یہ یقیناً بہت عجیب بات ہے۔ اور ان کے سر کردہ لوگ چل کھڑے ہوئے کہ چلو اور اپنے معبودوں پر ڈٹے رہو، یقیناً یہ تو ایسی بات ہے جس کا ارادہ کیا جاتا ہے۔ ہم نے یہ بات آخری ملت میں نہیں سنی، یہ تو محض بنائی ہوئی بات ہے۔ کیا ہمارے درمیان میں سے اسی پر نصیحت نازل کی گئی ہے؟ بلکہ وہ میری نصیحت سے شک میں ہیں، بلکہ انھوں نے ابھی تک میرا عذاب نہیں چکھا۔ کیا انھی کے پاس تیرے رب کی رحمت کے خزانے ہیں، جو سب پر غالب ہے، بہت عطا کرنے والا ہے۔“

آیت 53 فَلَوْلَا أَلْقَىٰ عَلَيْهِ آسُورَةٌ فَمِنْ ذَهَبٍ : ”آسورۃ“ ”سوار“ کی جمع ہے، ننگن۔ مقصد اس کا یہ تھا کہ نہ

موسیٰ علیہ السلام سونے کے ننگن پہنیں گے، نہ ان کے ساتھ فرشتے آئیں گے اور نہ ہمیں ان پر ایمان لانا پڑے گا۔ ہمارے نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے کے لیے بھی کفار نے دوسری بہت سی چیزوں کے ساتھ سونے کے مکان اور اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کو سامنے لانے کی شرط عائد کی تھی، فرمایا: ﴿وَقَالُوا اِنْ نُّؤۡمِنُ لَكَ حَتّٰی تَفۡجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرۡضِ یٰۤاٰیۡتُوۡنَا ۗ اَوْ تَكُوۡنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنۡ نَّحِیۡلٍ وَّعَنۡبٍ فَتَفۡجُرَ الْاَنْهٰرَ خَلۡفَهَا تَفۡجُرًا ۗ اَوْ تَسۡقُطَ السَّمَاۗءُ کَمَا زَعَمَتۡ عَلَیۡنَا کِیۡفًا اَوْ تَاۡتِیَ بِاللّٰهِ وَالۡمَلٰٓئِکَةِ قَبِیۡلًا ۗ اَوْ یۡکُوۡنَ لَكَ بَیۡتٌ مِّنۡ زُخۡرِفٍ اَوْ تَرۡزُقَ فِی السَّمَاۗءِ﴾ [بنی اسرائیل : ۹۰ تا ۹۳] ” اور انھوں نے کہا ہم ہرگز تجھ پر ایمان نہ لائیں گے، یہاں تک کہ تو ہمارے لیے زمین سے کوئی چشمہ جاری کرے۔ یا تیرے لیے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو، پس تو اس کے درمیان نہریں جاری کر دے، خوب جاری کرنا۔ یا آسمان کو ٹکڑے کر کے ہم پر گرا دے، جیسا کہ تو نے دعویٰ کیا ہے، یا تو اللہ اور فرشتوں کو سامنے لے آئے۔ یا تیرے لیے سونے کا ایک گھر ہو، یا تو آسمان میں چڑھ جائے۔“ حقیقت یہ ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کی دعوت ایک تھی اور سبھی کو دعوت کے سلسلے میں ایک جیسے مراحل سے گزرنا پڑا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے پہلے پیغمبروں خصوصاً موسیٰ علیہ السلام کے واقعات بار بار بیان فرمائے ہیں، تاکہ آپ ﷺ کو تسلی ہو اور آپ صبر و استقامت

فَاسْتَحَفَّ قَوْمَهُ فَأَطَاعُوهُ ۖ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا فَسِيقِينَ ﴿۵۴﴾ فَلَمَّا أَسْفُونَا ائْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَأَغْرَقْنَاهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿۵۵﴾ فَجَعَلْنَاهُمْ سَلَفًا وَمَثَلًا لِّلْآخِرِينَ ﴿۵۶﴾

پھر اس نے اپنی قوم کو ہلکا (بے وزن) کر دیا تو انھوں نے اس کی اطاعت کر لی، یقیناً وہ نافرمان لوگ تھے ﴿۵۴﴾ پھر سب انھوں نے ہمیں سخت غصہ دلایا تو ہم نے ان سے انتقام لیا، پس ہم نے ان سب کو غرق کر دیا ﴿۵۵﴾ پس ہم نے ان میں پیچھے آنے والوں کے لیے پیش رو اور مثال بنا دیا ﴿۵۶﴾

سے کام لیں اور آپ کے زمانے کے کفار کو پہلی کافرا توام کے انجام سے عبرت ہو اور وہ کفر سے باز آ جائیں۔

ت 54 ﴿۱﴾ فَاسْتَحَفَّ قَوْمَهُ فَأَطَاعُوهُ: لفظی معنی ہے ”اس نے اپنی قوم کو ہلکا (بے وزن) کر دیا۔“ یعنی اس نے اپنی قوم کے لوگوں کی رائے کو کوئی وزن نہ دیا اور نہ ہی انھیں اپنی عقل سے سوچنے سمجھنے کا موقع دیا، بلکہ انھیں مجبور کیا کہ وہ اس کی ہاں میں ہاں ملا لیں۔ (دیکھیے مومن: ۲۹) چنانچہ وہ انھیں پھسلانے اور اُلُو بنانے میں کامیاب ہو گیا اور وہ سب اس کے پیچھے لگ گئے۔

﴿۱﴾ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا فَسِيقِينَ: ”اِن“ تعلیل کے لیے ہوتا ہے، یعنی انھوں نے اس کی اطاعت اس لیے اختیار کی کہ فسق و فجور ان کی سرشت بن چکا تھا۔ وہ گمراہی کے راستے پر ہی چل سکتے تھے، سیدھی راہ پر چلنا ان کے بس کی بات ہی نہ تھی، جیسا کہ فرمایا: ﴿سَأَصْرِفُ عَنِ آلِيقِي الَّذِينَ يَتَّكِبُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۖ وَإِنْ يَرَوْا كَلِمًا لَا يُؤْمِنُونَ بِهَا ۖ وَإِنْ يَرَوْا سَبِيلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوهُ سَبِيلًا ۖ وَإِنْ يَرَوْا سَبِيلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوهُ سَبِيلًا ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَكَانُوا عَنْهَا غَافِلِينَ﴾ [الأعراف: ۱۴۶] ”غفیریہ میں اپنی آیات سے ان لوگوں کو پھیر دوں گا جو زمین میں حق کے بغیر بڑے بنتے ہیں اور اگر ہر نشانی دیکھ لیں تو بھی اس پر ایمان نہیں لاتے اور اگر بھلائی کا راستہ دیکھ لیں تو اسے راستہ نہیں بناتے اور اگر گمراہی کا راستہ دیکھیں تو اسے راستہ بنا لیتے ہیں، یہ اس لیے کہ انھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور وہ ان سے غافل تھے۔“

ت 55 ﴿۱﴾ فَلَمَّا أَسْفُونَا ائْتَقَمْنَا مِنْهُمْ: اس آیت سے ظاہر ہے کہ غصے ہونا اور انتقام لینا بھی اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں، جیسا کہ راضی ہونا اور انعام دینا اس کی صفات ہیں۔ اللہ تعالیٰ کسی اور عذاب کے ساتھ بھی انھیں ہلاک کر سکتا تھا، مگر فرعون نے نہروں کے اپنے تخت چلنے پر فخر کیا تھا، تو اللہ تعالیٰ نے اسے پانی ہی میں غرق کر کے انتقام لیا۔ عموماً انسان جس چیز پر فخر کرتا ہے اللہ کی طرف سے وہی چیز اس کی ہلاکت کا سامان بن جاتی ہے۔

ت 56 ﴿۱﴾ فَجَعَلْنَاهُمْ سَلَفًا وَمَثَلًا لِّلْآخِرِينَ: ”سَلَفًا“ کی جمع ہے، جیسے ”خَادِمٌ“ اور ”خَارِسٌ“ کی جمع ”خَادِمٌ“ اور ”خَارِسٌ“ ہے۔ ”سالف“ اسے کہتے ہیں جو وجود میں یا کسی عمل یا کسی جگہ میں دوسرے سے پہلے ہو۔ چونکہ

وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا إِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّونَ ﴿۵۷﴾

اور جب ابن مریم کو بطور مثال بیان کیا گیا، اچانک تیری قوم (کے لوگ) اس پر شور مچا رہے تھے ﴿۵۷﴾

یہاں ذکر انتقام کا آیا ہے، اس لیے ”مَثَلًا“ سے مراد وہ ہیں جو انتقام میں پہلے ہیں، یعنی ان کے بعد والوں کو بھی ان جیسے انتقام کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ”مَثَلًا“ کا معنی مشابہ چیز ہے، مراد عبرت ہے جو اپنے جیسے لوگوں کو دیکھ کر لی جاتی ہے کہ اگر ہم نے ان جیسے عمل جاری رکھے تو ہمارا انجام بھی وہی ہوگا۔ ”لِلْآخِرِينَ“ وہ لوگ جو اس کلام میں مذکور آل فرعون کے ساتھ آخری مشابہ ہیں۔ مراد رسول اللہ ﷺ کو جھٹلانے والے مشرکین ہیں، کیونکہ بت پرستی اور رسول کو جھٹلانے میں ان کے آخری مشابہ وہی ہیں۔ مطلب یہ کہ ہم نے انہیں ان آخری مشرکوں کے لیے عبرت بنا دیا، اس لیے ان پر لازم ہے کہ ان کے انجام سے نصیحت حاصل کریں۔

آیت 57 وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا ... : رسول اللہ ﷺ جس طرح تمام پیغمبروں کا ذکر عزت و اکرام کے ساتھ کرتے تھے، عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر بھی ہمیشہ عزت و تکریم کے ساتھ کرتے اور ان کی مثال آدم علیہ السلام کے ساتھ دیا کرتے تھے کہ جس طرح ماں باپ کے بغیر آدم علیہ السلام کی پیدائش اللہ تعالیٰ کی قدرت کا عجیب و غریب کرشمہ ہے اسی طرح باپ کے بغیر عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش بھی اس کی قدرت کا عجیب و غریب کرشمہ ہے۔ مدینہ جانے کے بعد وفد نجران کی آمد پر سورہ آل عمران میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِنْدَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ مَخْلُوقًا مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَكُنْ فَتَكُونُ﴾ [آل عمران: ۵۹] ”بے شک عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی مثال کی طرح ہے کہ اسے تھوڑی سی مٹی سے بنایا، پھر اسے فرمایا ہو جا، سو وہ ہو جاتا ہے۔“

پچھلی آیات میں مشرکین مکہ کے فرشتوں کی عبادت پر رو کے بعد فرمایا تھا: ﴿وَسَلِّ مِّنْ أَرْضِنَا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَا أَجْعَلْنَا مِنْ دُونِ الرَّحْمَنِ إِلَهًا يُعْبَدُونَ﴾ [الزخرف: ۱۷] ”اور ان سے پوچھ جنہیں ہم نے تجھ سے پہلے اپنے رسولوں میں سے بھیجا، کیا ہم نے رحمان کے سوا کوئی معبود بنائے ہیں جن کی عبادت کی جائے؟“ اس پر مشرکین میں سے کسی نے عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کے معبود ہونے کا اعتراض جز دیا۔ ساتھ ہی دوسرے مشرکین نے شور مچانا شروع کر دیا کہ مسیح (علیہ السلام) کو دیکھو! نصرانی ان کی عبادت کرتے ہیں، پھر بھی مسلمان ان کا نام عزت سے لیتے ہیں۔ ہمارے بت اور دیوی دیوتا فرشتے ہیں، کیا ہمارے معبود فرشتے بہتر ہیں یا نصرانیوں کے معبود عیسیٰ (علیہ السلام) بہتر ہیں؟ پھر ان کا نام عزت کے ساتھ کیوں لیا جاتا ہے اور ہمارے بتوں کو بُرا کیوں کہا جاتا ہے؟ میں نے بہت غور و فکر اور متعدد تفاسیر کے مطالعہ کے بعد آیات کے الفاظ اور سیاق و سباق کو ملحوظ رکھ کر جو تفسیر سمجھی ہے ذکر کر دی ہے۔ (واللہ اعلم) ابن عاشور نے فرمایا: ”یہ مقام قرآن مجید کے مشکل ترین مقامات میں سے ہے۔“ شاہ عبد القادر لکھتے ہیں: ”یعنی قرآن میں ان کا ذکر آوے تو اعتراض کرتے ہیں کہ ان کو بھی خلق پوجتے ہیں، انہیں کیوں خوبی سے یاد کرتے ہو اور ہمارے پوجوں (معبودوں، بتوں) کو برا کہتے ہو۔“ (موضح)

وَقَالُوا أَلَهْتُمْ خَيْرٌ أَمْرُهُمْ مَا صَرَّبُوهُ لَكَ إِلَّا جَدَلًا بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُونَ ﴿۳۳﴾

لوگوں نے کہا کیا ہمارے معبود بہتر ہیں یا وہ؟ انہوں نے تیرے لیے یہ (مثال) صرف جھگڑنے ہی کے لیے ہے، بلکہ وہ جھگڑالو لوگ ہیں ﴿۳۳﴾

58 ﴿۳۳﴾ وَقَالُوا أَلَهْتُمْ خَيْرٌ أَمْرُهُمْ : اس جملے کی وضاحت اور پرکی تفسیر میں بیان ہو چکی ہے۔

﴿۳۳﴾ مَا صَرَّبُوهُ لَكَ إِلَّا جَدَلًا بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُونَ : یعنی ان مشرکین نے مسیح بیٹا، کا ذکر محض جھگڑے کے لیے کیا ہے، بندہ وہ خوب جانتے ہیں کہ مسلمان ان کا عزت و تکریم سے ذکر معبود ہونے کے لحاظ سے نہیں کرتے، بلکہ اللہ تعالیٰ کا پرگزیدہ ہونے کے لحاظ سے کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ ہیں ہی سخت جھگڑالو کہ مکالم کی مراد اپنے پاس سے گھڑ کر جھگڑنا شروع کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

اکثر مفسرین نے ان آیات کی شان نزول یہ بیان فرمائی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی: ﴿إِنَّمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ حَصَبَ جَهَنَّمَ﴾ [الانبیاء: ۹۸] (بے شک تم اور جنہیں تم اللہ کے سوا پوجتے ہو، جہنم کا ایندھن ہیں) تو عبد اللہ بن زبیر نے کہا کہ اللہ کے سوا تو عیسیٰ ابن مریم کی پوجا بھی کی جاتی ہے، اگر وہ جہنم میں گئے تو ہمیں اپنے معبودوں کا جہنم میں بھی منظور ہے۔ یہ سنتے ہی مشرکین نے بہت شور مچایا کہ محمد (ﷺ) لا جواب ہو گئے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿إِنَّ الَّذِينَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِنَّا الْحُسْنَىٰ أُولَٰئِكَ عَنْهَا يُعْذَرُونَ﴾ [الانبیاء: ۱۰۱] "بے شک وہ لوگ جن کے لیے ہماری طرف سے پہلے بھلائی ملے ہو چکی وہ اس سے دور رکھے گئے ہوں گے۔" اور اس سورت کی آیت (۵۷) نازل ہوئی: ﴿وَلَقَدْ صَرَّبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا إِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّونَ﴾ اور جب ابن مریم کو بطور مثال بیان کیا گیا، اچانک تیری قوم کے دل اس پر شور مچا رہے تھے۔ [زبیری] زاء کے کسرہ، ہاء کے فتح اور عین کے سکون کے ساتھ ہے، راء کے بعد الف آ رہا ہے، یہ عبد اللہ بن زبیری بعد میں مسلمان ہو گئے تھے۔ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ [

یہ تفسیر عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے حسن سند کے ساتھ مروی ہے۔ | دیکھیے مشکوٰۃ الانوار، باب بیان مشکوٰۃ ماروی عن رسول اللہ ﷺ فی الشراء بقول اللہ عزوجل: ﴿إِنَّمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ حَصَبَ جَهَنَّمَ﴾، ح: ۹۸۶ | مسند احمد میں یہ حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ان الفاظ میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قریش سے کہا: ﴿يَا مَعْشَرَ قُرَيْشِ! إِنَّهُ لَيْسَ أَخَذَ مِنْكُمْ دُونَ اللَّهِ فِيهِ خَيْرٌ﴾ "اے جماعت قریش! حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کی جاتی جس میں کوئی خیر انہوں نے کہا: "اے محمد! کیا تم یہ نہیں کہتے کہ عیسیٰ نبی تھا اور اللہ کے بندوں میں سے نیک بندہ تھا، تو اگر تم سچے ہو تو مسیح اور ابن عبد ایک جیسے ہو گئے۔" (یہ کہہ کر انہوں نے شور مچانا شروع کر دیا) تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿وَلَقَدْ صَرَّبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا إِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّونَ﴾ [الزخرف: ۵۷] "جب ابن مریم کو بطور مثال بیان کیا گیا، اچانک تیری قوم اس پر شور مچا رہے تھے۔" | مسند احمد: ۳۱۸۸۱، ح: ۲۹۶۲۹ | مسند کے محققین نے اس کی سند کو حسن کہا ہے۔

إِنْ هُوَ إِلَّا عَبْدٌ أَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنَاهُ مَثَلًا لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ ﴿۵۹﴾ وَلَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ
فَلَاقَةً فِي الْأَرْضِ يَخْلُفُونَ ﴿۶۰﴾

نہیں ہے وہ مگر ایک بندہ جس پر ہم نے انعام کیا اور ہم نے اسے بنی اسرائیل کے لیے ایک مثال بنا دیا ﴿۵۹﴾ اور اگر ہم چاہیں تو ضرور تمہارے عوض فرشتے بنا دیں، جو زمین میں جاٹھیں ہوں ﴿۶۰﴾

واضح رہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی یہ تفسیر اس تفسیر کے خلاف نہیں جو آیات کے سیاق کے لحاظ سے اوپر کی گئی ہے، کیونکہ اصولی تفسیر میں یہ بات مسلم ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم "تَوَزَّكَتُ فِي سَكَاةٍ" (یہ آیت فلاں کے بارے میں نازل ہوئی) ان واقعات کے متعلق بھی فرمادیتے ہیں جن پر کوئی آیت منطبق ہوتی ہو۔ رسول اللہ ﷺ بھی ایسے مواقع پر پہلے اتری ہوئی کوئی آیت پڑھ دیتے تھے۔ ظاہر ہے مشرکین جن کی عادت ہی جھگڑنا اور کج بحثی کرنا تھا، جھگڑنے کا کوئی موقع کم ہی ہاتھ سے جانے دیتے تھے۔ ان مواقع میں سے ایک موقع: ﴿إِنَّمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ حَصَبَ جَهَنَّمَ﴾ (الانبیاء: ۹۸) کا نزول بھی تھا، اس پر غار نے جو شور مچایا، آیت: ﴿وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا إِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّونَ﴾ اس پر پوری طرح منطبق ہوتی ہے، جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا۔

آیت 59 ﴿۱﴾ إِنَّ هُوَ إِلَّا عَبْدٌ..... یعنی مسیح علیہ السلام کا اکرام ان کے معبود ہونے کی وجہ سے نہیں، کیونکہ نہ وہ رب تھے نہ رب کے بیٹے، بلکہ صرف عبد یعنی اللہ کا غلام اور اس کی بندگی کرنے والا ہونے کی وجہ سے ہے۔ یہ قصر قلب ہے، یعنی مسیح کو کچھ نہیں جو نصاریٰ یا دوسرے مشرک کہہ رہے ہیں، بلکہ وہ صرف بندہ ہے جس پر ہم نے انعام کیا ہے۔

﴿۲﴾ أَنْعَمْنَا عَلَيْهِ: ان انعامات میں سے چند انعامات کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورہ مائدہ کی آیات (۱۱۰، ۱۱۵) میں اور سورہ آل عمران کی آیات (۳۵، ۳۶) میں اور دوسری آیات میں فرمایا ہے۔

﴿۳﴾ وَجَعَلْنَاهُ مَثَلًا لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ: بنی اسرائیل کے لیے مثال بنانے سے مراد ان کے لیے نمونہ قدرت بنانا ہے کہ انھیں باپ کے بغیر پیدا کیا اور انھیں ایسے معجزات عطا فرمائے جو ان کے زمانے میں کسی کو نہیں ملے، جنہیں دیکھ کر لوگوں کو ان کی نبوت کا یقین ہوتا تھا۔

آیت 60 ﴿۱﴾ وَلَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ فَلَاقَةً: یعنی اس زمین پر انسان باپ اور ماں سے پیدا ہوتے ہیں، عیسیٰ علیہ السلام باپ کے بغیر پیدا ہوئے تو اس سے وہ معبود نہیں بن گئے، بلکہ وہ دوسرے انسانوں کی طرح مخلوق ہیں، جیسا کہ فرشتے ماں باپ کے بغیر پیدا ہونے اور آسمانوں پر رہنے کے باوجود مخلوق ہیں، معبود نہیں بن گئے۔ بلکہ اگر ہم چاہیں تو تمہاری جگہ ان کو زمین پر لا کر تمہارے جاٹھیں بنا دیں، نہ تم انکار کر سکتے ہو نہ انھیں انکار کی مجال ہے، تو وہ معبود کیسے بن گئے۔ اس آیت کی ایک تفسیر یہ بھی کی گئی ہے کہ اگر ہم چاہیں تو تمہیں ہلاک کر دیں اور تمہاری جگہ فرشتوں کو لے آئیں جو زمین کو آباد کریں اور تمہاری عبادت کریں۔

وَإِنَّكَ لَعَلَّمٌ لِلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرَنَّ بِهَا وَاتَّبِعُونِ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ﴿۱۱﴾

مکاشفہ وہ یقیناً قیامت کی ایک نشانی ہے تو تم اس میں ہرگز شک نہ کرو اور میرے پیچھے چلو، یہ سیدھا راستہ ہے ﴿۱۱﴾

ت 61 : ﴿۱۱﴾ وَإِنَّكَ لَعَلَّمٌ لِلسَّاعَةِ: ”علمتہ“ سے مراد علم کا ذریعہ اور نشانی ہے، یعنی عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش اور پہلی مرتبہ دنیا میں آنا تو خاص بنی اسرائیل کے لیے ایک نشان تھا، دوبارہ آنا قیامت کا نشان ہوگا۔ ان کے نزول سے لوگ معلوم کریں گے کہ اب قیامت بالکل قریب آگئی ہے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا: ”اس سے مراد قیامت سے پہلے ان کا نزول ہے، جیسا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَإِنْ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا لِيُؤْمِنَنَّ بِهِ قَبْلَ مَوْتِهِ﴾، وَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكُونُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا ﴿۱﴾۔ [النساء: ۱۵۹] اور اہل کتاب میں سے کوئی نہیں مگر اس کی موت سے پہلے اس پر ضرور ایمان لائے گا اور وہ قیامت کے دن ان پر گواہ ہوگا۔“ اس معنی کی تائید دوسری قراءت ”وَإِنَّكَ لَعَلَّمٌ لِلسَّاعَةِ“ سے بھی ہوتی ہے، یعنی وہ قیامت واقع ہونے کا ایک نشان اور دلیل ہے۔ مجاہد رحمہ اللہ نے فرمایا، ”وَإِنَّكَ لَعَلَّمٌ لِلسَّاعَةِ“ یعنی قیامت کی ایک نشانی عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کا قیامت سے پہلے نکلنا ہے۔ ایسے ہی ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، ابن عباس رضی اللہ عنہما، ابو العالیہ، ابو مالک، مکرّم، حسن، قتادہ اور ضحاک رحمہم وغیرہ سے مروی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متواتر احادیث آئی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت سے پہلے عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کے عادل و منصف امام بن کر نازل ہونے کی خبر دی۔“ (ابن کثیر)

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ، لَيُؤْتِيَنَّكُمْ أَنْ تَنْزِلَ فِيكُمْ ابْنُ مَرْيَمَ حَكَمًا عَدْلًا، فَيَكْسِرُ الصُّلْبَ، وَيَقْتُلُ الْخَنَازِيرَ، وَيَضَعُ الْجُزْيَةَ، وَيَقْبِضُ الْمَالَ حَتَّى لَا يَقْبَلَهُ أَحَدٌ، حَتَّى تَكُونَ السُّجْدَةُ الْوَاحِدَةَ خَيْرًا مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيهَا، ثُمَّ يَقُولُ أَبُو هُرَيْرَةَ وَأَقْرَبُ: وَإِنْ شِئْتُمْ: ﴿۱﴾ وَإِنْ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا لِيُؤْمِنَنَّ بِهِ قَبْلَ مَوْتِهِ﴾، وَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكُونُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا ﴿۱﴾ [النساء: ۱۵۹]۔ [بخاری، أحاديث الأئمة، باب نزول عيسى ابن مريم عليهما السلام: ۳۴۴۸] ”اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! یقیناً قریب ہے کہ تم میں ابن مریم (علیہ السلام) انصاف کرنے والا حاکم بن کر نازل ہو، پھر وہ صلیب توڑ دے گا اور خنزیر کو قتل کرے گا اور جزیہ ختم کرے گا اور مال عام ہو جائے گا، حتیٰ کہ اسے کوئی قبول نہیں کرے گا، حتیٰ کہ ایک عہدہ دنیا و مافیہا سے بہتر ہوگا۔“ پھر ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے: ”اور اگر تم چاہو تو یہ آیت پڑھ لو: ”اور اہل کتاب میں سے کوئی نہیں مگر وہ اس کی موت سے پہلے اس پر ضرور ایمان لائے گا اور وہ قیامت کے دن ان پر گواہ ہوگا۔“ سورہ نساء کی آیت (۱۵۸، ۱۵۹) کی تفسیر پر بھی نگاہ ڈال لیں۔

﴿۱۱﴾ وَإِنَّكَ لَعَلَّمٌ لِلسَّاعَةِ“ کا مطلب یہ بھی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کا وجود قیامت قائم ہونے کی نشانی اور دلیل ہے، کیونکہ وہ عام دستور کے خلاف باپ کے بغیر پیدا ہوئے، پھر وہ اللہ کے اذن سے مردوں کو زندہ کرتے تھے۔ یہ دونوں باتیں اللہ تعالیٰ کی فرمودت قدرت کا نشان ہیں کہ وہ قیامت برپا کرنے پر بھی یقیناً قادر ہے۔

بعض مفسرین نے ”ہ“ ضمیر سے مراد قرآن لیا ہے۔ ابن عاشور نے فرمایا: ”وَإِنَّكَ لَعَلَّمٌ لِلسَّاعَةِ“ کا عطف ”وَإِنَّكَ

وَلَا يَصُدُّكُمْ الشَّيْطَانُ ۚ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿۱۷﴾ وَ لَمَّا جَاءَ عِيسَى بِالْبَيِّنَاتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَ لِأَبِينَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي تَخْتَلِفُونَ فِيهِ ۚ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَ أَطِيعُوا ۚ ﴿۱۸﴾

اور کہیں شیطان تمہیں روک نہ دے، بے شک وہ تمہارے لیے کھلا دشمن ہے ﴿۱۷﴾ اور جب عیسیٰ واضح دلیل لے کر آیا تو اس نے کہا بے شک میں تمہارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں اور تاکہ میں تمہارے لیے بعض وہ باتیں واضح کر دوں جن میں تم اختلاف کرتے ہو، سو اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو ﴿۱۸﴾

لَذِكْرُكَ لَكَ وَ لِقَوْمِكَ“ پر ہے، یعنی یہ قرآن تمہارے لیے قیامت کا علم حاصل ہونے کا ذریعہ ہے، جس سے تمہیں اس کے قیام اور اس میں پیش آنے والے معاملات سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔“ ابن کثیر نے قتادہ، حسن بصری اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہم کا یہی قول بیان کیا ہے کہ ”۱۷“ ضمیر سے مراد قرآن ہے۔

﴿۱۷﴾ فَلَا تَمْتَرْنَ بِهَا.....: یعنی قرآن تمہیں قیامت کے وقوع سے آگاہ کرتا ہے، اس لیے تم اس میں ہرگز شک نہ کرو اور میری پیروی کرو، یہ صراط مستقیم ہے جس کی میں تمہیں دعوت دیتا ہوں۔

آیت 62 ﴿۱۸﴾ وَلَا يَصُدُّكُمْ الشَّيْطَانُ.....: یعنی دیکھنا شیطان اپنے ہتھکنڈوں کے ساتھ تمہیں قیامت پر ایمان سے روک نہ دے، کیونکہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ اس نے کبھی اپنی عداوت کو چھپایا نہیں، بلکہ ڈنکے کی چوٹ آدم (علیہ السلام) اور اس کی اولاد کو گمراہ کرتے رہنے کا اعلان کیا، اس لیے تم بھی اسے دشمن سمجھو اور اس سے خبردار رہو۔ (دیکھیے فاطر: ۶۔ کہف: ۵۰) معلوم ہوا جو شخص قیامت کے بارے میں شک کرتا ہے وہ شیطان کے ہتھے چڑھ چکا ہے۔ شیطان کی بہت بڑی دشمنی اور گمراہ کرنا یہ ہے کہ وہ کسی شخص کو قیامت پر یقین سے محروم کر دے۔ شیطان سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہدایات پر سیدھا چلتا جائے، ادھر ادھر بالکل توجہ نہ دے۔ موسیٰ علیہ السلام کی طرف پہلی وحی میں اللہ تعالیٰ نے انہیں قیامت کے آنے سے آگاہ کرنے کے ساتھ ہی تاکید فرمائی کہ دیکھنا، وہ لوگ جو اس پر ایمان نہیں رکھتے تمہیں اس پر ایمان سے روک نہ دیں، ورنہ انجام ہلاکت ہوگا۔ دیکھیے سورہ طہ (۱۵، ۱۶)۔

آیت 63 ﴿۱۹﴾ وَ لَمَّا جَاءَ عِيسَى بِالْبَيِّنَاتِ: ”الْبَيِّنَاتُ“ ”بَيِّنَةٌ“ کی جمع ہے، واضح، روشن چیز۔ یہ محذوف موصوف کی صفت ہے جو معجزات بھی ہیں، دلائل بھی اور آیات بھی۔ یعنی جب عیسیٰ علیہ السلام واضح اور روشن معجزات، توحید الہی اور اپنی رسالت کے واضح دلائل اور اللہ تعالیٰ کی واضح اور روشن آیات لے کر آئے۔

﴿۱۹﴾ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ: ”الْحِكْمَةُ“ حکم اور کئی بات، دانائی کی بات جو صحیح عقل کے عین مطابق ہو۔

﴿۲۰﴾ وَ لِأَبِينَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي تَخْتَلِفُونَ فِيهِ.....: یعنی جب عیسیٰ علیہ السلام بیانات لے کر بنی اسرائیل کے پاس آئے تو انہیں بتایا کہ میں تمہارے پاس اللہ کی شریعت لے کر آیا ہوں، جو نہایت حکم اور مضبوط ہے اور سراسر دانائی پر مشتمل ہے، تاکہ وہ تمہیں سکھاؤں اور تاکہ بعض باتیں جن میں تمہارے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا ہے ان میں حکم اور پختہ بات کے ساتھ حق

إِنَّ اللَّهَ هُوَ سَمِيٌّ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ ۗ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ ﴿۳۳﴾ فَأَخْتَلَفَ الْأَحْزَابُ مِنْ بَيْنِهِمْ ۖ قَوْلٌ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْ عَذَابٍ يَوْمَ إِلِيمٍ ﴿۳۴﴾

بے شک اللہ ہی میرا رب اور تمہارا رب ہے، پس اس کی عبادت کرو، یہ سیدھا راستہ ہے ﴿۳۳﴾ پھر کئی گروہوں نے جس میں اختلاف کیا، سوان لوگوں کے لیے جنہوں نے ظلم کیا ایک دردناک دن کے عذاب سے بڑی ہلاکت ہے ﴿۳۴﴾

واضح کر دوں۔ بعض اس لیے فرمایا کہ پیغمبر کا کام دینی احکام کی رہنمائی ہے، دنیوی معاملات مثلاً تجارت، زراعت اور صنعت وغیرہ کو لوگوں کے تجربہ و عقل پر رہنے دیا گیا ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «أَنْتُمْ أَعْلَمُ بِأَمْرِ دُنْيَاكُمْ» [مسلم، الفضائل، باب وجوب امتثال ما قاله شرعا.....: ۲۳۶۳] "اپنا دنیاوی معاملہ تم بہتر جانتے ہو۔" یا بعض اس لیے فرمایا کہ بعض کا فیصلہ آخری پیغمبر کے آنے پر چھوڑ دیا گیا۔

واضح رہے کہ بنی اسرائیل میں توحید، قیامت اور مختلف اشیاء کی حلت و حرمت کے بارے میں کئی طرح کا اختلاف پیدا ہو گیا تھا، مثلاً ان میں سے کچھ حق پر قائم تھے تو بعض غزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہنے لگ گئے تھے۔ قیامت کے متعلق انہوں نے ایسے عقائد گھڑ لیے تھے جن سے اللہ تعالیٰ کے ہاں جو اب دہی کا معاملہ ہی ختم ہو جاتا تھا۔ مثلاً ان کا کہنا: ﴿لَحْنُ أَبْنَاءِ اللَّهِ وَأَحِبَّاؤُهُمْ﴾ [المائدة: ۱۸] "ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں۔" یعنی ہم بنی اسرائیل اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں (جس طرح مسلمانوں میں کئی سید بادشاہ اپنے بارے میں باور کرواتے ہیں) اور یہ کہ جنت ہمارا حق ہے، اگر جہنم میں گئے بھی تو چند روز کے لیے جائیں گے۔ کچھ چیزیں ان کی سرکشی اور نافرمانی کی وجہ سے ان پر حرام کی گئی تھیں، کچھ ان کے احبار و رہبان نے حرام کر دی تھیں۔ عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ میں تمہارے ان اختلافات میں حق واضح کرنے کے لیے آیا ہوں، اس لیے تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

ت: 64 ﴿۱﴾ إِنَّ اللَّهَ هُوَ سَمِيٌّ وَرَبُّكُمْ: یہ ہے وہ حکمت جس کے لیے تمام انبیاء مبعوث ہوئے۔ "سَمِيٌّ وَرَبُّكُمْ" خبر معرفہ ہونے کی وجہ سے حصر پیدا ہو رہا ہے اور ضمیر فصل "هُوَ" لانے سے تاکید مزید ہو گئی ہے کہ میرا رب اور تمہارا رب صرف اللہ ہے، کوئی فرشتہ یا پیغمبر یا کوئی اور رب نہیں۔

﴿۱﴾ فَاعْبُدُوهُ: فاء تعلیل کے لیے ہے، یعنی جب "رب" (پرورش کرنے والا) صرف اللہ تعالیٰ ہے تو عبادت بھی اسی کی کرو، یہ سیدھا راستہ ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کا یہ کلام نقل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ انہوں نے کبھی نہیں کہا کہ میں خود اللہ ہوں یا اللہ تعالیٰ کا بیٹا ہوں، اس لیے تم میری عبادت کرو، بلکہ ان کی دعوت وہی تھی جو تمام انبیاء (علیہم السلام) کی تھی اور جس کی طرف محمد (ﷺ) تمہیں بلا رہے ہیں۔

ت: 65 ﴿۱﴾ فَأَخْتَلَفَ الْأَحْزَابُ مِنْ بَيْنِهِمْ: عیسیٰ علیہ السلام کے اس ارشاد کے باوجود بنی اسرائیل اختلاف سے باز نہیں آئے، بلکہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کی ذات کے بارے میں مزید گروہوں میں بٹ گئے۔ بعض نے انہیں سچا رسول تسلیم کر لیا اور بعض نے انہیں جھوٹا اور مکار قرار دیا۔ پھر انکار کرنے والے کئی اس حد تک جا پہنچے کہ ان کی والدہ پر تہمت لگا کر انہیں ولد الزنا

هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا السَّاعَةَ أَنْ تَأْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿٦٦﴾ الْأَخْلَاءِ يَوْمَئِذٍ
بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ إِلَّا السَّاعِينَ ﴿٦٧﴾

وہ قیامت کے سوا کس چیز کا انتظار کر رہے ہیں کہ وہ ان پر اچانک آجائے اور وہ سوچتے بھی نہ ہوں ﴿۶۶﴾ سب دوست اس دن ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے مگر متقی لوگ ﴿۶۷﴾

قرار دیا اور اس قدر مخالفت کی کہ اپنے گمان میں صلیب پر چڑھا کر دم لیا۔ اور ایمان لانے والے اگر کچھ راہ راست پر رہے تو بعض نے انہیں اللہ تعالیٰ کا بیٹا، بعض نے تین خداؤں میں سے ایک اور بعض نے اللہ ہی قرار دے لیا اور ہر فرقے نے الٰہی ہٹ دھرمی سے کام لیا کہ بے شمار فرقے وجود میں آ کر ایک دوسرے سے جھگڑنے لگے۔ ”مِنْ بَيْنِهِمْ“ کا مطلب یہ ہے کہ اختلاف کا باعث بیرونی نہیں تھا بلکہ وہ خود ہی تھے۔

﴿۶۷﴾ قَوْلِ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْيَوْمِ : ظلم کرنے والوں سے مراد وہ گروہ ہیں جنہوں نے انہیں جھوٹا قرار دیا اور وہ بھی جنہوں نے ان کی عقیدت میں غلو اختیار کرتے ہوئے انہیں اللہ کا بیٹا یا خود اللہ قرار دے کر شرک کا ارتکاب کیا۔ ”يَوْمِ الْيَوْمِ“ سے مراد قیامت کا دن ہے۔

آیت 66 : ﴿۶۶﴾ هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا السَّاعَةَ أَنْ تَأْتِيَهُمْ بَغْتَةً : یہ اس سوال کا جواب ہے جو پچھلی آیت کے آخری جملے سے پیدا ہو سکتا ہے کہ ظالموں کے لیے ”ویل“ (ہلاکت) کا وہ دن کب ہو گا اور اس عذاب الیم کی کیفیت کیا ہو گی؟ جواب یہ ہے کہ اس کا آنا یقینی ہے، جلدی آئے یا دیر سے، اس لیے اس کی تیاری کرو، اس بحث میں مت پڑو کہ وہ کب آئے گی۔ ”بَغْتَةً“ (اچانک) کا مطلب ہی یہ ہے کہ تمہیں اس کے آنے کا وقت معلوم نہیں ہو سکتا، کیونکہ جس کے آنے کا وقت معلوم ہو جائے وہ اچانک نہیں ہوتی۔ دیکھیے سورہ اعراف (۱۸۷) اور سورہ لیس (۵۰، ۴۹)۔

﴿۶۷﴾ وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ : یہاں ایک سوال ہے کہ ”بَغْتَةً“ (اچانک) کے لفظ کے بعد ”وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ“ کی کیا ضرورت ہے؟ جواب یہ ہے کہ بعض اوقات ایسی چیزیں بھی اچانک آ جاتی ہیں جن کے متعلق انسان سوچ رہا ہوتا ہے اور ایک جواب یہ ہے کہ یہ ”بَغْتَةً“ کی تاکید ہے۔

آیت 67 : ﴿۶۷﴾ الْأَخْلَاءِ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ : یہ اس دن کے عذاب الیم کی ہولناکی کا کچھ بیان ہے۔ اس دن متقین کے سوا تمام دلی دوستوں کے ایک دوسرے کے دشمن ہو جانے کا خاص طور پر ذکر کرنے کی مناسبت یہ ہے کہ مشرکین نے دنیا میں ایک دوسرے کی دوستی ہی کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کی دشمنی میں ایکا کیا ہوا تھا اور باہمی گٹھ جوڑ ہی کی وجہ سے شرک پر جمے ہوئے تھے۔ یہی دوستی قیامت کے دن دشمنی میں بدل جائے گی اور ہر شخص دوسرے کو اپنی بربادی کا باعث قرار دے گا اور کہے گا: ﴿يُونِذَرْتَنِي لِيَتَّبِعَنِي لَئِمَّا أَخَذْنَا خُلَيْلًا﴾ [الفرقان: ۲۸] ”ہائے میری بربادی! کاش کہ میں فلاں کو دلی دوست نہ بناتا۔“ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کا اپنی قوم سے خطاب نقل فرمایا: ﴿وَقَالَ إِنَّمَا

يُعْبَادِ لَا خَوْفَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَا أَنتُمْ تَحْزَنُونَ ﴿۶۸﴾ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْبَيْتَةِ وَكَانُوا سُلَاطِينًا ﴿۶۹﴾
 اَدْخُلُوا الْجَنَّةَ أَنتُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ تُخْبَرُونَ ﴿۷۰﴾

اے میرے بندو! آج نہ تم پر کوئی خوف ہے اور نہ تم غمگین ہو گے ﴿۶۸﴾ وہ لوگ جو ہماری آیات پر ایمان لائے اور وہ فرماں بردار تھے ﴿۶۹﴾ جنت میں داخل ہو جاؤ تم اور تمہاری بیویاں، تم خوش کیے جاؤ گے ﴿۷۰﴾

اَلْحَدِيثُ مِنْ ذُوْنِ اللّٰهِ اَوْلَا كَالْمَوْدَّةِ بَيْنَكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا، ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَ يَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا، وَ مَا لَكُمْ النَّاسُ وَ مَا لَكُمْ الْفَارِسُ وَ مَا لَكُمْ مِنْ نٰصِرِيْنَ ﴿﴾ [العنكبوت : ۲۵] "اور اس نے کہا بات یہی ہے کہ تم نے اللہ کے سوا بت بنائے ہیں، دنیا کی زندگی میں آپس کی دوستی کی وجہ سے، پھر قیامت کے دن تم میں سے بعض بعض کا انکار کرنے گا اور تم میں سے بعض بعض پر لعنت کرے گا اور تمہارا ٹھکانا آگ ہی ہے اور تمہارے لیے کوئی مدد کرنے والے نہیں۔"

﴿۶۹﴾ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ : متقین کی دوستی اس دن بھی قائم رہے گی، کیونکہ اس کا باعث اللہ کی رضا کا حصول ہوتا ہے جو ہمیشہ باقی رہنے والی چیز ہے۔ دوسرے تمام دوستوں کی دوستی کا باعث کوئی نہ کوئی دنیوی مفاد ہوتا ہے جس کے ختم ہونے کے ساتھ دوستی بھی ختم ہو جائے گی بلکہ دشمنی میں بدل جائے گی، کیونکہ وہ دوستی ہی اس دن کے عذاب کا باعث بنی۔

آیت 68 ﴿يُعْبَادِ لَا خَوْفَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ﴾ : قیامت کے دن باہمی محبت کرنے والے متقین کو ملنے والی نعمتوں کا ذکر ہے، جن میں سے سب سے پہلی اللہ تعالیٰ کا "اے میرے بندو!" کہہ کر محبت سے خطاب ہے، پھر خوف اور غم سے کھل نجات ہے۔ دیکھیے سورہ یونس (۶۲)۔

آیت 69 ﴿الَّذِينَ آمَنُوا بِالْبَيْتَةِ﴾ : اس میں ان لوگوں کی چند صفات بیان فرمائیں جو قیامت کے دن خوف اور غم سے آزاد ہوں گے۔ آیت کے الفاظ سے یہاں ایمان اور اسلام کا الگ الگ ہونا ظاہر ہے۔ (دیکھیے حجرات : ۱۳) البتہ جب کہیں اکیلے ایمان یا اسلام کا ذکر آئے تو دونوں ایک ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ ہماری آیات پر یقین کے ساتھ ساتھ عملی طور پر بھی پوری طرح تابع فرمان تھے۔

آیت 70 ﴿۱﴾ اَدْخُلُوا الْجَنَّةَ أَنتُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ : "اَزْوَاجُكُمْ" کی تفسیر میں دو وجہیں ہیں، ایک یہ کہ اس سے مراد ایسے لوگ ہیں جو دنیا میں ان کے ہم مشرب اور ساتھی رہے۔ دوسری یہ کہ مراد ان کی بیویاں ہیں جنہوں نے نیک اعمال میں ان کا ساتھ دیا تھا۔ دونوں بیک وقت بھی مراد ہو سکتے ہیں، مگر بیویاں مراد لینا زیادہ قریب ہے، کیونکہ قرآن مجید میں ان کا بار بار بار ذکر ہے اور ان کے ساتھ مل کر جانے میں جو لذت اور خوشی ہے وہ دوسرے ہم مشرب ساتھیوں کے ساتھ نہیں۔ دیکھیے سورہ لیس (۵۵، ۵۶)، دخان (۵۳)، واقعہ (۲۲، ۲۳)، رحمان (۷۰ تا ۷۷)، صافات (۲۸) اور سورہ ص (۵۲)۔

﴿تُخْبَرُونَ﴾ : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ روم کی آیت (۱۵) کی تفسیر۔

يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِصَافٍ مِّنْ ذَهَبٍ وَ أَكْوَابٍ ۖ وَ فِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنْفُسُ وَ تَلَذُّ الْأَعْيُنُ ۗ
وَ أَنْتُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٧١﴾ وَ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٧٢﴾ لَكُمْ فِيهَا فَاكِهَةٌ
كَثِيرَةٌ مِّنْهَا تَأْكُلُونَ ﴿٧٣﴾ إِنَّ الْمُجْرِمِينَ فِي عَذَابٍ بِحَسْبِهِمْ خَالِدُونَ ﴿٧٤﴾

ان کے گرد سونے کے تھال اور پیالے لے کر پھرا جائے گا اور اس میں وہ چیز ہوگی جس کی دل خواہش کریں گے اور
آنکھیں لذت پائیں گی اور تم اس میں ہمیشہ رہنے والے ہو ﴿٧١﴾ اور یہی وہ جنت ہے جس کے تم وارث بنائے گئے ہو،
اس کی وجہ سے جو تم عمل کرتے تھے ﴿٧٢﴾ تمہارے لیے اس میں بہت سے میوے ہیں، جن سے تم کھاتے ہو ﴿٧٣﴾
بے شک مجرم لوگ جہنم کے عذاب میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ﴿٧٤﴾

آیت 71 ﴿٧١﴾ يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِصَافٍ مِّنْ ذَهَبٍ وَ أَكْوَابٍ: ”صِصَافُ“ کی جمع ہے، تھال جو بہت بڑا
نہ ہو، رکابیاں۔ ”اَكْوَابُ“ ”كُؤُبُ“ کی جمع ہے، پینے کا برتن جس کی دتی نہ ہو، ایسے برتن دتی نہ ہونے کی وجہ سے زیادہ
صاف ہوتے ہیں۔ تھالوں میں طرح طرح کے کھانے اور میوے ہوں گے اور پیالوں میں طرح طرح کی پینے کی چیزیں۔
بعض مفسرین نے فرمایا: ”صِصَافُ“ جمع کثرت ہے اور ”اَكْوَابُ“ جمع قلت، کیونکہ کھانے کے برتن پینے کے برتنوں سے
زیادہ ہوتے ہیں۔

﴿٧٢﴾ وَ فِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنْفُسُ: اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ حم سجدہ (٣١) اور سورہ سجدہ (١٤)۔

﴿٧٣﴾ وَ تَلَذُّ الْأَعْيُنُ: آنکھوں کی لذت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار جنت کی تمام نعمتوں سے بڑی نعمت ہے۔

آیت 72 ﴿٧٢﴾ وَ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي أُورِثْتُمُوهَا.....: اس آیت کی وضاحت کے لیے دیکھیے سورہ اعراف (٣٣)، مومنون
(١١، ١٠) اور سورہ مریم (٦٣)۔

آیت 73 ﴿٧٣﴾ لَكُمْ فِيهَا فَاكِهَةٌ كَثِيرَةٌ مِّنْهَا تَأْكُلُونَ: انسان کی مطلوبہ چیزوں یعنی کھانے پینے، نکاح اور آرام و آسائش
وغیرہ میں سب سے عام ضرورت اور طلب کھانے کی چیزوں کی ہوتی ہے، جن میں پھلوں کو خاص مقام حاصل ہے، کیونکہ
لذت میں انھیں بہت برتری حاصل ہے۔ ”فَاكِهَةٌ“ کے لفظ ہی میں لذت کا مفہوم شامل ہے۔ دنیا میں فواکہ جتنے بھی ہوں کم
ہیں، جبکہ آخرت میں مسلمانوں کے لیے فواکہ کثیر تعداد میں ہوں گے، جو اتنے وافر ہوں گے کہ وہ ان میں سے کچھ ہی کھا سکیں
گے، یعنی ”مِنْهَا تَأْكُلُونَ“ اور وہ کبھی ختم نہیں ہوں گے، فرمایا: ﴿لَا مَقْطُوعَةٌ وَ لَا مَنُوعَةٌ﴾ [الواقعة: ٣٣] ”جو نہ کبھی ختم
ہوں گے اور نہ ان سے کوئی روک ٹوک ہوگی۔“

آیت 74 ﴿٧٤﴾ إِنَّ الْمُجْرِمِينَ فِي عَذَابٍ بِحَسْبِهِمْ خَالِدُونَ: ایمان والوں کا حسن انجام بیان کرنے کے بعد کفار کا انجام بد بیان
فرمایا۔ یہاں ”الْمُجْرِمِينَ“ سے مراد کفار ہیں، کیونکہ ان کا ذکر ”مُسْلِمِينَ“ کے مقابلے میں آیا ہے اور جہنم میں ہمیشہ رہنے

لَا يُقْتَرُ عَنْهُمْ وَهُمْ فِيهِ مُبْلِسُونَ ﴿۷۵﴾ وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ وَلَكِنْ كَانُوا هُمُ الظَّالِمِينَ ﴿۷۶﴾ وَنَادَوْا
يٰۤاٰلِڪُلُّبِ لِيُقِضَ عَلَيْنَا رَبُّكَ ۗ قَالَ اِنَّا لَمَكْمُكُونَ ﴿۷۷﴾

وہ ان سے ہلکا نہیں کیا جائے گا اور وہ اسی میں ناامید ہوں گے ﴿۷۵﴾ اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا اور لیکن وہ خود ہی ظالم تھے ﴿۷۶﴾ اور وہ پکاریں گے اے مالک! تیرا رب ہمارا کام تمام ہی کر دے۔ وہ کہے گا بے شک تم (یہیں) ٹھہرنے والے ہو ﴿۷۷﴾

والے کفار ہی ہیں۔ سورہ مطففین میں بھی کفار کے لیے ”الَّذِينَ اجْرَمُوا“ کا لفظ استعمال ہوا ہے، فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اجْرَمُوا كَانُوا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا يٰضَحْكُونَ﴾ [المطففين: ۲۹] ”بے شک وہ لوگ جنہوں نے جرم کیے، ان لوگوں پر جو ایمان لائے، ہنسا کرتے تھے۔“

آیت 75 ﴿لَا يُقْتَرُ عَنْهُمْ﴾ ”قُتِرَ“ کسی چیز میں وقفہ یا ٹھہراؤ آنا، یا اس کی قوت یا رفتار میں آہستہ آہستہ کمی آتے جانا، جیسے کہا جاتا ہے: ”فَقَرَبَتِ الْحُمَى“ ”بخار میں کمی یا وقفہ آ گیا۔“ ”لَا يُقْتَرُ“ (باب تفعیل) کا مطلب یہ ہے کہ ان کے عذاب میں کسی قسم کا وقفہ یا کمی نہیں آنے دی جائے گی۔

﴿۷۶﴾ وَهُمْ فِيهِ مُبْلِسُونَ: مصیبت سے نجات کی امید بھی کچھ نہ کچھ راحت کا باعث ہوتی ہے، یہ کہہ کر امید کی بھی نفی فرمادی کہ وہ اسی جہنم میں مایوس اور ناامید ہو کر رہنے والے ہیں۔

آیت 76 ﴿وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ وَلَكِنْ كَانُوا.....﴾: یہاں خیال ہو سکتا تھا کہ اتنی بڑی اور دائمی سزا تو ظلم ہے، اس لیے فرمایا کہ ہم نے ان پر کسی طرح کا ظلم نہیں کیا، کیونکہ یہ محال ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم کرے، بلکہ وہ خود ہی ظلم کرنے والے تھے، حتیٰ کہ ظالم ہونا ان کی صفت اور پہچان بن گیا، کیونکہ ظلم ان کا دائمی عمل اور ان کی عادت اور جبلت بن چکا تھا، ان کی نیت اور ارادہ یہی تھا کہ جب تک رہیں گے اسی پر قائم رہیں گے، اگر ان کے بس میں ہوتا تو وہ کبھی نہ مرتے اور ہمیشہ ظلم و شرک پر جے رہتے۔ چونکہ اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے، اس لیے انہیں ہمیشہ ظلم کی نیت پر ہمیشہ کا عذاب دیا گیا اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود ظالم تھے۔

آیت 77 ﴿وَنَادَوْا يٰۤاٰلِڪُلُّبِ لِيُقِضَ عَلَيْنَا رَبُّكَ.....﴾: ”قَضَى عَلَيْهِ“ کا معنی کام تمام کرنا، یعنی موت دے دینا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿فَوَكَرَهُ مُوسَى فَقَضَى عَلَيْهِ﴾ [الفصص: ۱۵] ”تو موسیٰ نے اسے گھونسا مارا تو اس کا کام تمام کر دیا۔“ ”مالک“ جہنم کے خازن (در بان) فرشتے کا نام ہے۔ سرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے مروی طویل حدیث میں ہے کہ خواب میں جبریل اور میکائیل رضی اللہ عنہما نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت سی چیزوں کا مشاہدہ کروایا اور بعد میں ان کی حقیقت بیان کی۔ اس میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿فَانطَلَقْنَا فَاتَيْنَا عَلٰی رَجُلٍ كَرِيْهِهٖ الْمَرْأَةُ كَا كَرِهَ مَا اَنْتَ رَاۤءِ رَجُلًا مَّرَاةً، فَاِذَا عِنْدَهُ نَارٌ يُّحْسِنُهَا وَيَسْغِي حَوْلَهَا، قَالَ قُلْتُ لَهَا مَا هٰذَا؟﴾ ”پھر ہم آگے بڑھے تو ایک آدمی کے پاس پہنچے جو دیکھنے میں

لَقَدْ جَنَّبَكُمْ بِالْحَقِّ وَلَكِنَّ أَكْثَرَكُمْ لِلْحَقِّ كُرْهُونَ ﴿۷۸﴾ أَمْ أَبْرَمُوا أَمْرًا فَإِنَّا مُبْرِمُونَ ﴿۷۹﴾

بلاشبہ ہم تو تمہارے پاس حق لے کر آئے ہیں اور لیکن تم میں سے اکثر حق کو ناپسند کرنے والے ہیں ﴿۷۸﴾ یا انہوں نے کسی کام کی پختہ تدبیر کر لی ہے؟ تو بے شک ہم بھی پختہ تدبیر کرنے والے ہیں ﴿۷۹﴾

بہت بد صورت تھا، اتنا جتنا کہ کوئی دیکھنے میں زیادہ سے زیادہ بد صورت ہو سکتا ہے۔ اس کے پاس آگ ہے، وہ اسے بھڑکا رہا ہے اور اس کے ارد گرد دوڑ رہا ہے۔“ نبی ﷺ نے فرمایا کہ میں نے ان دونوں سے پوچھا: ”یہ کون ہے؟“ حدیث کے آخر میں جب فرشتے نے سب چیزوں کے متعلق بتایا تو کہا: «وَأَمَّا الرَّجُلُ الْكُرْبِيُّ الْمَرَاةُ الَّذِي عِنْدَ النَّارِ يُحْسِنُهَا وَيَسْغِي خَوْلَهَا فَإِنَّهُ مَالِكُ نَخَارِذِ جَهَنَّمَ» [بخاری، التعمیر، باب تعیر المرء بعد صلاة الصبح : ۷۰، ۷۱] ”آگ کے پاس دیکھنے میں جو بد صورت آدمی تم نے دیکھا جو اسے بھڑکا رہا تھا اور اس کے گرد دوڑ رہا تھا وہ جہنم کا خازن مالک ہے۔“ کفار جہنم کے فرشتوں کو اللہ سے ان کے عذاب میں کچھ نہ کچھ تخفیف کرنے کی دعا کے لیے کہیں گے۔ جب اس سے ناامید ہوں گے تو جہنم کے خازن مالک کو آواز دیں گے کہ اپنے رب سے دعا کر کہ ہمیں موت دے دے۔ وہ کہے گا تم یہیں رہنے والے ہو۔ غرض وہ اس عذاب سے کسی طرح نجات نہیں پائیں گے۔ دوسری جگہ فرمایا: «وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ لَا يُقْضَىٰ عَلَيْهِمْ فَيَمُوتُوا وَلَا يُخَفَّفَ عَنْهُمْ مِنْ عَذَابِهَا كَذَلِكَ نَجْزِي كُلَّ كَافِرٍ» [فاطر : ۳۶] ”اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ان کے لیے جہنم کی آگ ہے، ان کا کام تمام کیا جائے گا کہ وہ مرجائیں اور ان سے اس کا کچھ عذاب ہی ہلکا کیا جائے گا۔ ہم ایسے ہی ہر ناشکرے کو بدلا دیا کرتے ہیں۔“

آیت 78 لَقَدْ جَنَّبَكُمْ بِالْحَقِّ وَلَكِنَّ أَكْثَرَكُمْ... : اس آیت میں اللہ تعالیٰ کا خطاب اہل جہنم سے بھی مراد ہو سکتا ہے اور دنیا میں قریش اور دوسرے کفار سے بھی۔ پہلی صورت میں جو فرمایا کہ تم میں سے اکثر حق کو ناپسند کرنے والے تھے تو اس لیے کہ ان کے قلیل لوگ حق کو ناپسند کرنے والے نہیں تھے، وہ تو اپنے اکابر و سادات کی اندھا دھند پیروی کرنے کی وجہ سے کفر پر قائم رہنے والے تھے۔ اکثر وہی تھے جو حق کو پہچانتے تھے مگر اپنے مفادات اور خواہشات سے متصادم ہونے کی وجہ سے اس سے نفرت کرتے تھے۔ دوسری صورت میں دنیا میں کفار کا حال بیان فرمایا کہ ان کے اکثر حق آنے کے بعد اپنی خواہشات کے خلاف ہونے کی وجہ سے اسے ناپسند کرنے والے ہوتے ہیں۔ رہے کم لوگ تو وہ پسند یا ناپسند کی وجہ سے نہیں بلکہ عقیدہ کی وجہ سے کفر پر جمے رہتے ہیں۔

آیت 79 : أَمْ أَبْرَمُوا أَمْرًا فَإِنَّا مُبْرِمُونَ : ”اِبْرَامٌ“ کا معنی کسی چیز کو پختہ اور مضبوط کرنا ہے۔ اصل میں یہ رسی کو مضبوطی کے ساتھ جینے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے: ”اَبْرَمَ فُلَانٌ الْخَبْلَ“ ”فلان نے رسی کو خوب مضبوط کیا۔“ یعنی کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

أَمْ يَحْسَبُونَ أَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُمْ ۗ بَلَىٰ وَرُسُلْنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُونَ ﴿۸۰﴾ قُلْ إِنْ كَانَ
لِلزَّخْرَيْنِ وَلَدٌ ۗ فَأَنَا أَوَّلُ الْعَابِدِينَ ﴿۸۱﴾

یاد رہے کہ ہم ان کا راز اور ان کی سرگوشی نہیں سنتے، کیوں نہیں اور ہمارے بھیجے ہوئے ان کے پاس لکھتے رہتے ہیں ﴿۸۰﴾ کہہ دے اگر رحمان کی کوئی اولاد ہو تو میں سب سے پہلے عبادت کرنے والا ہوں ﴿۸۱﴾

یا انھوں نے کسی کام کی پختہ تدبیر اور اس کا پکا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس سے مراد کفار کی خفیہ مجلسوں میں ان کے طے کردہ فیصلے ہیں جو وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کرتے تھے، حتیٰ کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو قید یا قتل کرنے یا مکہ سے نکالنے کا پکا فیصلہ کر لیا۔ (دیکھیے انفال: ۳۰) فرمایا، انھوں نے ایسے کسی کام کا پختہ ارادہ کر لیا ہے تو ہم بھی کچی تدبیر کرنے والے ہیں۔ پھر سب نے دیکھا کہ وہ کس طرح ناکام و نامراد ہوئے اور اللہ کا دین کس طرح غالب رہا۔

ت 80 ﴿۱﴾ أَمْ يَحْسَبُونَ أَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُمْ : یہاں ”سِرَّهُمْ“ سے مراد وہ باتیں ہیں جو وہ راز کے طور پر ایک دوسرے کے ساتھ خفیہ طور پر آہستہ آواز میں کرتے ہیں، کیونکہ اگر ”سیر“ سے دل میں موجود بات مراد ہو تو وہ سنی نہیں جاتی، بلکہ اس کا علم ہوتا ہے اور ”نَجْوَاهُمْ“ سے مراد ان کی مجلس مشاورت کی باتیں ہیں۔

﴿۲﴾ بَلَىٰ وَرُسُلْنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُونَ : یعنی صرف یہی نہیں کہ ہم سنتے ہیں، بلکہ ہرے فرشتے ثبوت کے طور پر لکھ بھی لیتے ہیں۔ (دیکھیے ق: ۱۷، ۱۸) یعنی ان کی خفیہ تدبیریں تو ہمیں رہے ہوتے ہیں، پھر وہ ان کی کامیابی کی کیا توقع رکھ سکتے ہیں۔

ت 81 قُلْ إِنْ كَانَ لِلزَّخْرَيْنِ وَلَدٌ : کفار فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے، بھجیلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے اس کا رد فرمایا۔ اب رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا کہ ان سے کہہ دیں کہ اگر رحمان کی کوئی اولاد ہو تو میں سب سے پہلے اس کی عبادت کرنے والا ہوں۔ مطلب یہ کہ میرا اللہ تعالیٰ کی اولاد نہ ماننا اور جنہیں تم اللہ کی اولاد قرار دیتے ہو ان کی عبادت سے انکار کسی ضد یا بٹ دھری کی بنا پر نہیں، بلکہ اس وجہ سے ہے کہ ممکن ہی نہیں کہ اس ذات پاک کی اولاد ہو جس کا نام رحمان ہے۔ تفصیل کے لیے سورہ مریم کی آیات (۲۸۸ تا ۲۹۸) کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر رحمان کی کوئی اولاد ہو، جیسا کہ کفار کہتے ہیں، تو سب سے پہلے اس اولاد کی عبادت کرنے والا میں ہوں، کیونکہ میرا اس کے ساتھ بندگی کا تعلق سب سے زیادہ ہے، جیسا کہ بادشاہ کے نوکر چاکر بادشاہ کی اولاد کی تعظیم ان کے والد کی تعظیم کی وجہ سے کرتے ہیں، لیکن رحمان کی اولاد ہے ہی نہیں، اس لیے میں اللہ واحد کے سوا کسی کی عبادت کرنے والا نہیں۔

یاد رہے کہ یہ جملہ شرطیہ ہے، اس میں شرط کا وجود بلکہ اس کا امکان بھی ضروری نہیں ہوتا۔ بعض اوقات ناممکن چیز کو بھی بعض محال شرط کے طور پر ذکر کر دیا جاتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿لَوْ أَرَادَ اللَّهُ أَنْ يَتَّخِذَ وَلَدًا لَاضْطَلَفْنَا بِمَا يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ﴾ سُبْحٰنَكَ هُوَ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۱﴾ الزمر: ۶۱ ”اگر اللہ چاہتا کہ (کسی کو) اولاد بنائے تو ان میں سے جنہیں وہ پیدا کرتا ہے جسے چاہتا ضرور چن لیتا، وہ پاک ہے۔ وہ تو اللہ ہے، جو اکیلا ہے، بہت نعلیے والا ہے۔“ اور فرمایا: ﴿لَوْ كَانَ فِيهِمَا

سُبْحٰنَ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۳۷﴾ فَذَرَهُمْ يَحْوِضٰوًا وَيَلْعَبُوْا حَتّٰى يَلْتَقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِى يُوْعَدُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَ هُوَ الَّذِى فِى السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَ فِى الْاَرْضِ اِلٰهٌ وَ هُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ﴿۳۹﴾ وَ تَبٰرَكَ الَّذِى لَهٗ نٰلِكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا وَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ؕ وَ اِلَيْهٖ تُرْجَعُوْنَ ﴿۴۰﴾

پاک ہے آسمانوں اور زمین کا رب، جو عرش کا رب ہے، اس سے جو وہ بیان کرتے ہیں ﴿۳۷﴾ پس انہیں چھوڑ دو۔ فضول بحث کرتے رہیں اور کھیلنے رہیں، یہاں تک کہ اپنے اس دن کو جا ملیں جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے اور وہی ہے جو آسمانوں میں معبود ہے اور زمین میں بھی معبود ہے اور وہی کمال حکمت والا، سب کچھ جاننے والا ہے اور بہت برکت والا ہے وہ جس کے پاس آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہی ہے اور اس کی بھی جو ان دونوں کے درمیان ہے اور اسی کے پاس قیامت کا علم ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے ﴿۴۰﴾

اِيْهٰٓءَ الْاِلٰهٰتِهٖ تَقْسَدٰتًا ﴿۱﴾ | الانبياء: ۲۲ | ”اگر ان دونوں میں اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہوتے تو وہ دونوں ضرور بگڑ جاتے۔“

آیت 82 سُبْحٰنَ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ : یعنی اولاد ہونا کمزوری، محتاجی اور محزنی دلیل ہے۔ (دیکھیے بنی اسرائیل: ۱۱۱) جب کہ اللہ تعالیٰ محز اور احتیاج سے پاک ہے۔ وہ آسمانوں کا، زمین کا اور عرش کا مالک اور پروردگار اولاد سے اور ان تمام کمزوریوں اور تیبوں سے پاک ہے جو مشرک لوگ اس کے لیے بیان کرتے ہیں۔

آیت 83 : فَذَرَهُمْ يَحْوِضٰوًا وَيَلْعَبُوْا : یعنی اگر یہ ہدایت کا راستہ اختیار نہیں کرتے تو انہیں ان کی فضول بحث اور کھیل کود میں لگا رہنے دیں، یہاں تک کہ وہ اپنے اس دن کو جا ملیں جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے۔ اس وقت ان پر سب حقیقت کھل جائے گی۔ اس دن سے مراد قیامت کا دن ہے یا موت کا دن یا دنیا میں عذاب کا دن۔

آیت 84 : ﴿۱﴾ وَ هُوَ الَّذِى فِى السَّمَآءِ اِلٰهٌ : مشرکوں نے کچھ معبود آسمان میں بنا رکھے تھے، مثلاً فرشتے، سورج، چاند اور بعض ستارے اور کچھ زمین میں، جیسے انبیاء، اولیاء، ان کی قبریں اور بت، درخت اور پتھر وغیرہ۔ فرمایا، زمین اور آسمان میں الگ الگ معبود نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ ہی دونوں کا بلا شرکت غیرے مالک ہے۔ دونوں جگہ اسی کی عبادت ہوتی ہے اور دونوں جگہ عبادت اسی کا حق ہے۔

آیت 85 : وَ تَبٰرَكَ الَّذِى لَهٗ نٰلِكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ : یہ بھی اللہ تعالیٰ کے اکیلا معبود ہونے کی دلیل ہے کہ بے شمار خیر و خوبی کا مالک ہے وہ کہ آسمانوں میں اور زمین میں ہر جگہ اسی کی بادشاہی ہے۔ قیامت کا علم بھی اسی کے پاس ہے اور تم اسی

وَلَا يَبْلُغُكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿۸۶﴾

وَلَكِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ فَأَنَّى يُؤْفَكُونَ ﴿۸۷﴾

اور وہ لوگ جنہیں یہ اس کے سوا پکارتے ہیں، وہ سفارش کا اختیار نہیں رکھتے مگر جس نے حق کے ساتھ شہادت دی اور وہ جانتے ہیں ﴿۸۶﴾ اور یقیناً اگر تو ان سے پوچھے کہ انہیں کس نے پیدا کیا تو بلاشبہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے، پھر کہاں بہکائے جاتے ہیں ﴿۸۷﴾

کی طرف لوٹائے جاؤ گے، نہ کہ کسی اور کی طرف۔ لہذا وہی ہے جو تمہیں تمہارے نیک یا بد اعمال کا بدلہ دے گا۔

آیت 86 ﴿۸۶﴾ وَلَا يَبْلُغُكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ الشَّفَاعَةَ پچھلے آیت میں ”من دون اللہ“ کے پاس آسمانوں اور زمین کی اور ان کے درمیان کی کسی بھی چیز کی ملک ہونے کی نفی تھی، اس آیت میں ان سے شفاعت کی ملکیت کی بھی نفی فرمادی۔

﴿۸۶﴾ اس آیت کی دو تفسیریں ہیں، دونوں مراد ہو سکتی ہیں اور یہ قرآن کا اعجاز ہے۔ پہلی یہ کہ مشرکین جن ہستیوں کو یہ سمجھ کر پکارتے ہیں کہ وہ ان کی شفاعت کریں گی ان کے پاس شفاعت کا کوئی اختیار نہیں، مگر وہ لوگ جنہوں نے کلمہ حق یعنی ”لا الہ الا اللہ“ کی شہادت دی اور صرف زبانی نہیں بلکہ وہ اس کا یقین رکھتے تھے، مثلاً فرشتے، عیسیٰ علیہ السلام اور اللہ کے دوسرے مقرب بندے۔ وہ چونکہ حق (توحید) کا یقین رکھ کر اس کی گواہی دیتے تھے اور انہوں نے کبھی لوگوں کو اپنی عبادت کا حکم نہیں دیا، اس لیے وہ اللہ کے اذن سے سفارش کر سکیں گے۔ رہے بت اور دوسرے جھوٹے مشکل کشا اور حاجت روا، جن کی مشرکین پوجا کرتے ہیں، وہ تو اپنے آپ کو نہیں پجاسکیں گے بلکہ دوزخ کا ایندھن بنیں گے، کسی کی سفارش کیا کریں گے؟ دوسری تفسیر یہ ہے کہ ”مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ“ سے پہلے لام جارہ محذوف ہے: ”أَنِّي إِلَّا لِمَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ“ یعنی سفارش کرنے والوں کو صرف ان لوگوں کے حق میں سفارش کا اختیار دیا جائے گا جنہوں نے حق یعنی کلمہ ”لا الہ الا اللہ“ کی شہادت دی اور صرف زبانی نہیں بلکہ اس کا علم اور یقین بھی رکھتے تھے۔ رہے کفار یا منافقین، تو ان کے حق میں کوئی شفاعت نہیں کرے گا۔ شفاعت کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے آیت الکرسی، سورہ مریم (۸۷)، انبیاء (۲۸)، سبأ (۲۳)، نجم (۲۶) اور سورہ نبا (۳۸)۔

﴿۸۷﴾ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شہادت وہی معتبر ہے جو علم کے ساتھ دی جائے۔ دنیا میں اگرچہ ہر اس شخص کو مسلمان تصور کر لیا جاتا ہے جو زبانی کلمہ ”لا الہ الا اللہ“ کی شہادت دے، مگر قیامت کے دن اسی کی شہادت معتبر ہوگی جس نے دل کے یقین کے ساتھ یہ شہادت دی ہوگی۔

آیت 87 ﴿۸۷﴾ ﴿۸۷﴾ وَلَكِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَهُمْ اس آیت میں مشرکین کے قول و فعل کا تضاد واضح فرمایا ہے، یعنی جب مانتے ہیں کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے تو پیدا کرنے والے کو چھوڑ کر دوسروں کی پوجا کیوں کرتے ہیں؟ مالک کو

چھوڑ کر ان کو مشکل کشا اور حاجت روا کیسے مان بیٹھے ہیں جنہوں نے کچھ پیدا ہی نہیں کیا؟

وَقِيلَ يَا رَبِّ إِنَّ هَؤُلَاءِ قَوْمٌ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿۸۸﴾

قسم ہے رسول کے ”یارب“ کہنے کی! کہ بے شک یہ ایسے لوگ ہیں جو ایمان نہیں لائیں گے ﴿۸۸﴾

﴿۸۸﴾ قَائِلٌ يُؤْفَكُونَ: یعنی پھر بہکانے والے انھیں بہکا کر کہاں لے جا رہے ہیں؟ ایک معنی ”قَائِلٌ يُؤْفَكُونَ“ کا یہ بھی ہے ”مَنْ أُنِيبُ يُؤْفَكُونَ“ کہ پھر وہ کہاں سے بہکائے جاتے ہیں، کون سی دلیل یا کیا سبب ہے جس کی وجہ سے یہ بہکائے جاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان اصل میں توحید پر ہوتا ہے، پھر شیاطین انسان ہوں یا جن اسے توحید سے بہکا کر شرک میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ اس لیے ایسے لوگوں سے بہت ہوشیار اور خبردار رہنا چاہیے، جیسا کہ عیاض بن حماد الجاشمی رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دن اپنے خطبہ میں فرمایا: «أَلَا إِنَّ رَبِّي أَمَرَنِي أَنْ أُعَلِّمَكُم مَّا خَهِلْتُمْ وَمَا عَلَّمَنِي يَوْمِي هَذَا، كُلُّ مَا لَمْ يَخْلُقْهُ عَبْدًا خَلَقَ وَإِنِّي خَلَقْتُ عَبَادِي خُلَفَاءَ كُفُوهُمْ وَإِنَّهُمْ أَتَتْهُمْ الشَّيَاطِينُ فَاجْتَالَتْهُمْ عَنْ دِينِهِمْ وَحَرَمَتْ عَلَيْهِمْ مَا أَحَلَّكَ لَهُمْ وَأَمَرْتَهُمْ أَنْ يُشْرِكُوا بِي مَا لَمْ أَنْزَلْ بِهِ سُلْطَانًا» [مسلم، الحجۃ و صفا صیمہا و أهلہا، باب الصفات الہی يعرف بها فی الدنیا أهل الحجۃ و أهل النار : ۲۸۶۵] ”سنا! میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہیں وہ باتیں سکھاؤں جن سے تم ناواقف ہو، ان باتوں میں سے جو اس نے مجھے آج سکھائی ہیں۔ (وہ فرماتا ہے کہ) ہر وہ مال جو میں نے کسی بندے کو عطا کیا (وہ اس کے لیے) حلال ہے اور میں نے اپنے تمام بندوں کو حنفاء (ایک اللہ کی طرف ہو جانے والے) پیدا کیا، لیکن ان کے پاس شیاطین آئے تو انھوں نے انھیں ان کے دین سے بہکا دیا اور ان پر وہ چیزیں حرام کر دیں جو میں نے ان کے لیے حلال کی تھیں اور انھیں حکم دیا کہ میرے ساتھ ان چیزوں کو شریک بنائیں جن کی میں نے کوئی دلیل نہیں اتاری۔“

آیت 88 وَقِيلَ يَا رَبِّ إِنَّ هَؤُلَاءِ قَوْمٌ لَا يُؤْمِنُونَ : ”قِيلَ، قَائِلٌ“ اور ”قَوْلٌ“ ”قَوْلٌ“ ”قَوْلٌ“ ”قَوْلٌ“ ”قَوْلٌ“ کے مصدر ہیں، معنی ہے کہنا۔ ”قِيلَ“ میں ضمیر ”ہ“ رسول اللہ ﷺ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اس آیت کی متعدد تفسیریں کی گئی ہیں، ان میں سب سے واضح تین ہیں۔ پہلی یہ کہ ”وَقِيلَ يَا رَبِّ“ قسم ہے: ”أَيُّ أُمَّسِمٍ بِقَوْلِهِ يَا رَبِّ“ اور ”إِنَّ هَؤُلَاءِ قَوْمٌ لَا يُؤْمِنُونَ“ جواب قسم ہے۔ یہ تفسیر زمخشری نے کی ہے اور ترجمہ اسی کے مطابق کیا گیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں رسول کے ”یَا رَبِّ“ یا ”رَبِّ“ کہنے کی قسم کھاتا ہوں کہ یقیناً یہ ایسے لوگ ہیں جو ایمان نہیں لائیں گے۔ اگلی آیت میں فرمایا: ﴿فَاذْفَعُوا عَنْهُمْ وَقُلْ سَلَامٌ﴾ اس لیے ان سے درگزر کرو اور کہہ سلام ہے، پس عنقریب وہ جان لیں گے۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ یہ ساری آیت قسم ہے، جواب اس کا محذوف ہے جو قرینے سے معلوم ہو رہا ہے۔ قرینے کے پیش نظر قسم کا جواب حذف کرنا کلام عرب میں عام ہے۔ یعنی میں رسول کے ”اے میرے رب! یہ تو ایسے لوگ ہیں جو ایمان لاتے ہی نہیں“ کہنے کی قسم کھاتا ہوں کہ میں ضرور کافروں کے اس رویے کے خلاف اس کی مدد کروں گا۔ قرینہ اگلی آیت ہے کہ پس تو ان سے درگزر کرو اور کہہ سلام ہے، کیونکہ وہ بہت جلد جان لیں گے کہ رسول کی مدد کیسے ہوتی ہے اور ان لوگوں سے انتقام

فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلَامٌ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ﴿۸۹﴾

پس ان سے درگزر کر اور کہہ سلام ہے، پس عنقریب وہ جان لیں گے ﴿۸۹﴾

یہ لیا جاتا ہے۔ تیسری تفسیر یہ ہے کہ واو بمعنی ”ذت“ ہے جو حرف جار ہے، ”قِيلَہ“ اس کے ساتھ مجرور ہے۔ یعنی کئی دفعہ قول کا حسرت و انسوؤں کے ساتھ کہنا یہ ہوتا ہے کہ اے میرے رب! یہ تو ایسے لوگ ہیں جو ایمان لاتے ہی نہیں۔

ایک تفسیر یہ بھی کی گئی ہے کہ ”وَقِيلَہ“ میں ”قِيلَ“ کا عطف اور پرگزری ہوئی آیت ”وَاعْتَدْنَا لِلشَّاعِرَةِ“ میں لفظ ”الشَّاعِرَةِ“ پر ہے، یعنی ”وَاعْتَدْنَا لِلشَّاعِرَةِ وَاعْلَمْنَا قَبْلَہِ يَا رَبِّ هُوَلَاءِ قَوْمٌ لَا يُؤْمِنُونَ“ یعنی ”اسی کے پاس امت کا علم ہے اور رسول کے اس قول کا بھی کہ اے میرے رب! یہ تو ایسے لوگ ہیں جو ایمان نہیں لاتے۔“ مگر معطوف علیہ معطوف کے درمیان اتنا لمبا فاصلہ بعید بات ہے۔

تے 89 : فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلَامٌ . . . : یعنی آپ کی فریاد ہم نے سن لی، اب ہم جانیں اور وہ، آپ ان سے درگزر کریں اور ان سے براءت اور قطع تعلق کے اظہار کے لیے کہہ دیں کہ سلام ہے۔ چنانچہ وہ بہت جلد جان لیں گے کہ ان کے ایمان نہ لانے کا انجام کیا ہوتا ہے۔



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴿١﴾

حَمْدٌ ۙ وَ الْكِتٰبِ الْمُبِیْنِ ﴿٢﴾ اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ فِی لَیْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِیْنَ ﴿٣﴾ فِیْهَا یُفْرَقُ

كُلُّ اَمْرٍ حَكِیْمٌ ﴿٤﴾

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

حَمْدٌ ﴿١﴾ اس بیان کرنے والی کتاب کی قسم! ﴿٢﴾ بے شک ہم نے اسے ایک بہت برکت والی رات میں

بے شک ہم ہی ڈرانے والے تھے ﴿٣﴾ اسی میں ہر محکم کام کا فیصلہ کیا جاتا ہے ﴿٤﴾

ت 3-1 ﴿١﴾ حَمْدٌ ۙ وَ الْكِتٰبِ الْمُبِیْنِ ﴿٢﴾ اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ : اللہ تعالیٰ نے اس کتاب میں کی قسم کھا کر فرمایا کہ یقیناً ہم

ہی اسے نازل فرمایا ہے۔ یعنی یہ کتاب میں خود اس بات کی شاہد ہے کہ یہ محمد ﷺ یا کسی اور کی تصنیف نہیں، بلکہ اسے ہم ہی نازل کیا ہے۔ اگر کوئی اسے مخلوق کی تصنیف کہتا ہے تو وہ اس کی ایک سورت کی مثل ہی تصنیف کر کے لے آئے۔

﴿٢﴾ فِی لَیْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ : کتاب کی عظمت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ رات بڑی خیر و برکت والی ہے جس میں ہم نے اسے

نازل فرمایا۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے خود بیان فرمادیا کہ وہ مبارک رات لیلۃ القدر ہے، جیسا کہ سورہ قدر میں ہے: ﴿١﴾

اَنْزَلْنٰهُ فِی لَیْلَةِ الْقَدْرِ ﴿١﴾ [القدر : ١] "بلاشبہ ہم نے اسے قدر کی رات میں اتارا۔" اور وہ ماہ رمضان میں ہے، جیسا

فرمایا: ﴿٢﴾ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنزِلَ فِیْهِ الْقُرْآنُ ﴿٢﴾ [البقرہ : ١٨٥] "رمضان کا مہینا وہ ہے جس میں قرآن انا

گیا۔" کتاب اتارنے سے مراد اتارنے کی ابتدا ہے جو غار حرا میں ماہ رمضان کی اس مبارک رات میں ہوئی۔ کچھ لوگ کہتے

ہیں کہ وہ رات نصف شعبان کی رات ہے، مگر یہ بات سراسر غلط ہے، کیونکہ یہ قرآن مجید کے صریح خلاف ہے۔ قاضی ابوبکر

العربی نے "احکام القرآن" میں لکھا ہے کہ نصف شعبان کی رات سے متعلق کوئی روایت قابل اعتماد نہیں، نہ اس کی فضیلت

کے بارے میں اور نہ اس بارے میں کہ اس رات قسمتوں کے فیصلے ہوتے ہیں۔ مفسر شنیطلی نے فرمایا: "ابن العربی کے

دوسرے محققین کا بھی یہی فیصلہ ہے کہ ایسی روایات کی کوئی بنیاد نہیں، نہ ان میں سے کسی کی سند صحیح ہے۔"

﴿٣﴾ "لَیْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ" کی برکات کی تفصیل سورہ قدر میں ملاحظہ فرمائیں۔

﴿٤﴾ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِیْنَ : یعنی ہم نے یہ کتاب اس لیے نازل کی کہ بندوں کو اچھے اور برے کاموں سے آگاہ کر دیا جا

اور نافرمانی کی صورت میں انہیں ان کے انجام بد سے ڈرا دیا جائے، تاکہ ان کے پاس یہ عذر باقی نہ رہے کہ ہمیں خبردار

کیا گیا۔ یہاں صرف ڈرانے کا ذکر فرمایا بشارت کا نہیں، کیونکہ اکثر لوگوں کے حسب حال یہی ہوتا ہے۔ ویسے ڈرانے کے

میں بشارت بھی ہوتی ہے، اس شخص کے لیے جو ڈر جائے۔

ت 4 ﴿١﴾ فِیْهَا یُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِیْمٌ : "فَرَقٌ" کا معنی فیصلہ ہے، اسی لیے قرآن کو "فرقان" کہا جاتا ہے۔ "حَكْمٌ

أَفْرَأَيْنَ عِنْدَنَا إِذَا كُنَّا مُرْسِلِينَ ﴿٥﴾ رَحْمَةً مِنْ رَبِّكَ إِذْ أَنْتَ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٦﴾

طرف سے حکم کی وجہ سے۔ بے شک ہم ہی بھیجنے والے تھے ﴿٥﴾ تیرے رب کی رحمت کے باعث، یقیناً وہی
کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ﴿٦﴾

کے مفہوم میں دو باتیں شامل ہیں، ایک یہ کہ وہ حکم حکمت اور دانائی پر مبنی ہوتا ہے، اس میں کسی غلطی یا خامی کا امکان نہیں ہوتا۔
دوسری یہ کہ وہ حکم حکم اور پختہ ہوتا ہے جسے کوئی بدل نہیں سکتا۔ یعنی ہم نے اسے خاص طور پر اس بابرکت رات میں اس لیے
نازل کیا کہ یہ قرآن ایک امر حکیم ہے اور اسی رات میں ہر امر حکیم کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ سورہ قدر میں یہی مضمون ان الفاظ میں
موجود ہے: ﴿ تَنْزِيلَ الْمَلَكَةِ وَالزُّوْحِرِ فِيهَا بِأَذْنِ رَبِّهِمْ مِنْ مَلَكِنِ آمُرُ ﴾ [القدر : ٤] ”اس میں فرشتے اور روح
جبریل امین) اپنے رب کے حکم سے ہر امر کے متعلق اترتے ہیں۔“ اس سے معلوم ہوا کہ وہ ایسی رات ہے جس میں اللہ
تعالیٰ آئندہ سال سے متعلق افراد و اقوام کی قسمتوں کے تمام فیصلے فرشتوں کے حوالے کر دیتے ہیں، مثلاً زندگی، موت، بیماری،
رق، عروج و زوال اور ہدایت و گمراہی وغیرہ، پھر وہ ان پر عمل درآمد کرتے رہتے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ﴿ إِنَّكَ
رَبِّي الرَّحْمَلُ يَمْشِي فِي الْأَسْوَاقِ، وَقَدْ وَقَعَ اسْمُهُ فِي الْعَوْتَى، ثُمَّ قُرَأَ: ﴿ إِذَا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةٍ مُبَارَكَةٍ إِنَّا كُنَّا مُنذِرِينَ ﴾
﴿ تَنْزِيلَ مَلَكِنِ آمُرُ ﴾ [الدخان : ٣، ٤] ”یعنی لیلۃ القدر ففینا تلک اللیلۃ یفرق أمر الدنیا إلی مثلہا من
السموات“ [مستدرک حاکم، تفسیر سورۃ الدخان : ٤٤٨/٢، ح : ٣٦٧٨] ”تم آدمی کو بازاروں میں چلتا پھرتا دیکھتے ہو، حالانکہ
اس کا نام مردوں میں درج ہو چکا ہوتا ہے۔ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ إِذَا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةٍ مُبَارَكَةٍ إِنَّا كُنَّا مُنذِرِينَ ﴾ ﴿ فِيهَا
نُنزِّلُ كُلَّ أَمْرٍ حَكِيمٍ ﴾ کہ اس سے مراد لیلۃ القدر ہے، اس رات میں دنیا کے معاملات کا آئندہ سال کی اسی رات تک
مقرر کر دیا جاتا ہے۔“ حاکم اور ذہبی نے اسے صحیح کہا اور بیہقی نے ”شعب الایمان“ میں اسے حاکم سے روایت کیا ہے اور اس
کے محقق نے کہا کہ اس کی سند کے راوی ثقہ ہیں۔

5 ﴿٥﴾ أَفْرَأَيْنَ عِنْدَنَا: یعنی یہ سارے فیصلے ہمارے حکم سے ہوتے ہیں۔ مراد ان فیصلوں کی اہمیت اور عظمت پر
تنبیہ کرنا ہے کہ وہ فیصلے کسی معمولی ہستی کے نہیں ہوتے، بلکہ کائنات کے مالک کی طرف سے صادر ہوتے ہیں۔

﴿٦﴾ كُنَّا مُرْسِلِينَ: یعنی ہم یہ کتاب نازل کرتے وقت رسول کو بھیجنے والے تھے۔

6 ﴿٦﴾ رَحْمَةً مِنْ رَبِّكَ: یہ ”مُرسِلین“ کا مفعول لہ ہے۔ یعنی ہم تیرے رب کی رحمت کی وجہ سے رسول کو بھیجنے

کے لیے اور کتاب کو نازل کرنے والے تھے۔ ”اپنی رحمت“ کے بجائے ”تیرے رب کی رحمت“ کا لفظ رسول اللہ ﷺ کے شرف
کا تھا۔ ہمارے لیے ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ صرف آپ ﷺ ہی کا نہیں بلکہ کل کائنات کا رب ہے، جیسا کہ آگے یہ بات آ بھی رہی
ہے: ﴿ رَبُّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا إِنَّ كُنُتُمْ فَوْقَهُمْ ﴾ ”آسمانوں اور زمین اور ان چیزوں کا رب جو ان دونوں کے
میان ہیں، اگر تم یقین کرنے والے ہو۔“ ”رَحْمَةً مِنْ رَبِّكَ“ میں لفظ ”رَبِّ“ کا مطلب یہ ہے کہ بندوں پر یہ رحمت

رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا اِنْ كُنْتُمْ مُّوقِنِيْنَ ۝ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيِ وَيُمِيْتُ ۝ رَبُّكَ
 وَ رَبُّ اَبَابِكُمْ الْاَوَّلِيْنَ ۝ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ يَّلْعَبُوْنَ ۝

آسمانوں اور زمین اور ان چیزوں کا رب جو ان دونوں کے درمیان ہیں، اگر تم یقین کرنے والے ہو ۴ اس کے
 کوئی معبود نہیں، وہ زندگی بخشتا اور موت دیتا ہے، تمہارا رب ہے اور تمہارے پہلے باپ دادا کا رب ہے ۵ بلکہ
 ایک شک میں کھیل رہے ہیں ۶

ہمارے رب ہونے کا تقاضا ہے، کیونکہ ”رَبُّ“ کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے جسم کی پرورش کا انتظام کیا جائے اور ان کی روح
 پرورش کا انتظام نہ کیا جائے، بلکہ انہیں گمراہی میں بھٹکتا چھوڑ دیا جائے۔

۲ اِنَّ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ : ”اِنْ“ پہلے جملے کی علت بیان کرنے کے لیے ہوتا ہے، یعنی ہم نے رسول اس لیے بھیجا کہ تم
 رب خوب سننے اور جاننے والا تھا کہ کس طرح مشرکین بتوں اور باطل معبودوں کی پرستش کر رہے ہیں، کفر کے امام لوگوں
 گمراہ کر رہے ہیں اور طاقتور کمزوروں پر ظلم کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ لوگوں کے تمام اقوال و افعال اور نیتوں کو جانتا
 اور سن رہا تھا، اس لیے اس نے ان کی اصلاح کے لیے رسولوں کو بھیجا۔

آیت 7 رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا : بھجلی آیت میں رسول اللہ ﷺ سے خطاب تھا۔ کفار مکہ یہ اقرار کرتے
 تھے کہ زمین و آسمان اور ساری کائنات کا رب اللہ تعالیٰ ہے، اس لیے اب ان سے دوبارہ خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ
 تمہیں اس بات کا یقین ہے کہ کائنات میں موجود ساری مخلوق کی ربوبیت اور پرورش کی ذمہ دار صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے
 پھر تمہیں یہ بھی یقین کر لینا چاہیے کہ یہ رسول فی الواقع اللہ تعالیٰ ہی نے تمہاری ہدایت کے لیے بھیجا ہے، کیونکہ وہ صرف
 تمہاری جسمانی پرورش ہی کا ذمہ دار نہیں بلکہ تمہاری روحانی پرورش اور تمہیں سیدھا راستہ بتانا بھی اسی کے ذمے ہے۔

آیت 8 لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ : یہ بھجلی آیت کا نتیجہ ہے کہ جب آسمان و زمین اور ساری کائنات کا مالک اور رب اللہ تعالیٰ
 ہے تو پھر معبود بھی وہی ہے۔

۲ يُحْيِ وَيُمِيْتُ رَبُّكَ وَ رَبُّ اَبَابِكُمْ الْاَوَّلِيْنَ : یہ دونوں جملے اللہ تعالیٰ کے معبود واحد ہونے کی مزید تاکید کے لیے
 فرمائے کہ معبود اسی کو مانو جو زندگی بخشتا اور موت دیتا ہے اور جو تمہارا اور تمہارے پہلے آباء کا رب ہے۔

آیت ۵ : بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ يَّلْعَبُوْنَ : اس مختصر فقرے میں ایک بڑی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ دہریے
 یا مشرکین، ان سب پر وقتاً فوقتاً ایسی ساتھیں آتی رہتی ہیں جب ان کا دل اندر سے کہتا ہے کہ جو کچھ تم سمجھے بیٹھے ہو اس
 کہیں نہ کہیں جھول موجود ہے۔ دہریہ اپنے انکار خدا میں بظاہر کتنا ہی سخت ہو، کسی نہ کسی وقت اس کا دل یہ شہادت دے گا
 ہے کہ خاک کے ایک ذرے سے لے کر کہکشاؤں تک اور گھاس کی ایک پتی سے لے کر انسان کی تخلیق تک، یہ حیرت انگیز
 حکمت سے لبریز نظام کسی صنّاع حکیم کے بغیر وجود میں نہیں آسکتا۔ اسی طرح ایک مشرک انسان اپنے شرک میں خواہ کتنا

فَاذْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُحَانٍ مُّبِينٍ ﴿۱۰﴾ يُعْشى النَّاسُ هَذَا عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۱۱﴾

سوا انتظار کر جس دن آسمان ظاہر دھواں لائے گا ﴿۱۰﴾ جو لوگوں کو ڈھانپ لے گا۔ یہ دردناک عذاب ہے ﴿۱۱﴾

مہرا ڈوبا ہوا ہو، کبھی نہ کبھی اس کا دل بھی پکار اٹھتا ہے کہ جنہیں میں معبود بنائے بیٹھا ہوں یہ خدا نہیں ہو سکتے۔ لیکن اس قلبی شہادت کا نتیجہ نہ تو یہ ہوتا ہے کہ انہیں خدا کے وجود اور اس کی توحید کا یقین حاصل ہو جائے اور نہ یہی ہوتا ہے کہ انہیں اپنے شرک اور اپنی دہریت میں کامل یقین اور اطمینان حاصل رہے۔ اس کے بجائے اس کا دین درحقیقت شک پر قائم ہوتا ہے، خواہ اس میں یقین کی کتنی ہی شدت وہ دکھا رہے ہوں۔ اب رہا یہ سوال کہ پھر وہ سنجیدگی کے ساتھ حقیقت کی جستجو کیوں نہیں کرتے کہ شک کی بے چینی سے نکل کر یقین و اطمینان کے سکون سے بہرہ ور ہو سکیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دین کے معاملے میں سنجیدگی ہی سے تو وہ محروم ہوتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں اصل اہمیت صرف دنیا کی کمائی اور اس کے عیش کی ہوتی ہے، جس کی فکر میں وہ اپنے دل و دماغ اور جسم کی ساری طاقتیں خرچ کر ڈالتے ہیں۔ رہے دین کے مسائل، تو وہ حقیقت میں ان کے لیے ایک کھیل، ایک تفریح اور ایک ذہنی عیاشی کے سوا کچھ نہیں ہوتے، جن پر وہ سنجیدگی کے ساتھ چند لمحے بھی صرف نہیں کر سکتے۔ مذہبی مراسم ہیں تو تفریح کے طور پر ادا کیے جا رہے ہیں، انکار و دہریت کی بحیثیت ہیں تو تفریح کے طور پر کی جا رہی ہیں۔ دنیا کے مشاغل سے اتنی فرصت کسے ہے کہ بیٹھ کر یہ سوچے کہ کہیں ہم حق سے منحرف تو نہیں ہیں اور اگر حق سے منحرف ہیں تو اس کا انجام کیا ہے۔ (تفسیر القرآن بادنی تصرف)

﴿۱۰﴾ فَاذْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُحَانٍ مُّبِينٍ اس میں رسول اللہ ﷺ کو تسلی دلائی ہے کہ اگر یہ لوگ ایمان نہیں لاتے تو آپ پریشان نہ ہوں، بلکہ اس دن کا انتظار کریں جس میں آسمان کی جانب سے ایک واضح دھواں ان لوگوں کو ڈھانپ لے گا جو نہایت تکلیف دہ عذاب ہوگا۔ واضح ہونے اور ڈھانپ لینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ خیالی دھواں نہیں ہوگا بلکہ حقیقی ہوگا اور سب لوگوں کو اپنی پیٹ میں لے لے گا۔ ”یَوْمَ“ سے مراد وہ وقت ہے جس میں دھواں رہا، کیونکہ وہ دھواں ایک دن تو نہیں رہا، بلکہ کئی دن اور مہینے رہا۔ اس دھوئیں سے کیا مراد ہے؟ ظاہر ہے اس سے قیامت کے دن کا دھواں مراد نہیں ہو سکتا، کیونکہ ان آیات میں کفار کو اسے دور کرنے کی دعا کے بعد اسے کچھ دور کرنے اور ان کے دوبارہ کفر کی طرف لوٹنے کا ذکر ہے، جب کہ قیامت کے دن کا عذاب کسی صورت دور ہونے والا نہیں۔ اس لیے اس سے مراد ایسا دھواں ہے جو جلد ہی دنیا میں انہیں ڈھانپنے والا ہے۔ اس دھوئیں کے متعلق دو قول ہیں، عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما نہایت جزم کے ساتھ اسے اس قحط کے نتیجے میں پھیلنے والا دھواں قرار دیتے ہیں جو ہجرت کے بعد رسول اللہ ﷺ کی بددعا سے مکہ میں واقع ہوا۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں: «إِنَّمَا كَانَ هَذَا لِأَنَّ قُرَيْشًا لَمَّا اسْتَعْصَمُوا عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَعَا عَلَيْهِمْ بِسِنِينَ كَسِينِي يُؤُسَفُ، فَأَصَابَهُمْ قَحْطٌ وَجَهْدٌ حَتَّى أَكَلُوا الْعِظَامَ، فَجَعَلَ الرَّجُلُ يَنْظُرُ إِلَى السَّمَاءِ فَيَرَى مَا بَيْنَهُ وَبَيْنَهَا كَهَيْئَةِ الدُّحَانِ مِنَ الْجَهْدِ، فَأَنْزَلَ اللَّهُ تَعَالَى: ﴿فَاذْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُحَانٍ مُّبِينٍ﴾ يُعْشى النَّاسُ»

هَذَا عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۱۰﴾ قَالَ فَاتَّبِعْ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَيَقِيلُ يَا رَسُولَ اللَّهِ! اسْتَسْقِ اللَّهَ لِمُضَرَ، فَإِنَّهَا قَدْ هَلَكَتْ، قَالَ لِمُضَرَ؟ إِنَّكَ لِحَرِيٌّ، فَاسْتَسْقِ فَسُقُوا فَتَزَلَّتْ: ﴿إِذْ كَفَرُوا بِالَّذِينَ لَهُمْ أَنْصَابُهُمْ الرِّقَابِيَّةَ عَادُوا إِلَىٰ حَالِهِمْ، حِينَ أَنْصَابُهُم الرِّقَابِيَّةَ، فَأَنْزَلَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ: ﴿يَوْمَ نَبِّطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرَىٰ إِيَّاكُمْ مِنْهُمْ﴾ قَالَ يَعْنِي يَوْمَ بَدْرٍ | بحاری، التفسیر، سورة الدخان: ۱۰، ۱۱ | اس کی وجہ یہ تھی کہ قریش نے جب رسول اللہ ﷺ کے خلاف سخت سرکشی کی تو آپ ﷺ نے ان پر قحط سالیوں کی بددعا کی، جیسے یوسف علیہ السلام کے قحط کے سال تھے۔ تو انھیں قحط اور بھوک نے آلیا، حتیٰ کہ وہ ہڈیاں کھا گئے۔ آدمی آسمان کی طرف دیکھنے لگتا تو بھوک کی وجہ سے اسے اپنے اور آسمان کے درمیان دھواں سا نظر آتا، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری: ﴿كَانَ تَحْتَهَا يَوْمَ تَقْبَلُ السَّمَاءُ بِالدَّخَانِ فَيُنْفِثُ النَّاسَ هَذَا عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ | الدخان: ۱۰، ۱۱ | ”سو انتظار کرو جس دن آسمان ظاہر دھواں لائے گا۔ جو لوگوں کو ذواہنپ لے گا۔ یہ دردناک عذاب ہے۔“ تو ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور آپ سے کہا: ”یا رسول اللہ! مضر (قیلیے) کے لیے بارش کی دعا کریں، کیونکہ وہ تو ہلاک ہو گئے۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”مضر کے لیے (وہ تو سخت کافر و مشرک ہیں)؟ تو بڑا جرات والا ہے۔“ خیر، آپ ﷺ نے بارش کے لیے دعا کر دی اور ان پر بارش ہو گئی تو یہ آیت اتری: ﴿إِذْ كَفَرُوا بِالَّذِينَ لَهُمْ أَنْصَابُهُمْ الرِّقَابِيَّةَ عَادُوا إِلَىٰ حَالِهِمْ، حِينَ أَنْصَابُهُم الرِّقَابِيَّةَ، فَأَنْزَلَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ: ﴿يَوْمَ نَبِّطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرَىٰ إِيَّاكُمْ مِنْهُمْ﴾ | الدخان: ۱۰، ۱۱ | ”بے شک تم دوبارہ وہی کچھ کرنے والے ہو۔“ پھر جب انھیں خوش حالی ملی تو وہ اپنی پہلی حالت کی طرف پلٹ گئے، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿يَوْمَ نَبِّطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرَىٰ إِيَّاكُمْ مِنْهُمْ﴾ | الدخان: ۱۰، ۱۱ | ”جس دن ہم بڑی کپڑ پکڑیں گے، بے شک ہم انتقام لینے والے ہیں۔“ ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ”اس سے مراد یوم بدر ہے۔“ ابن مسعود رضی اللہ عنہما کی تفسیر کو امام طبری اور بہت سے مفسرین نے راجح قرار دیا ہے۔ اس کے مطابق یہ عذاب گزر چکا ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد وہ دھواں ہے جو قیامت کے قریب نکلے گا۔ حذیفہ بن اسید غفاری رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ آپس میں کسی بات کا ذکر کر رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ آ گئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿مَا تَذَكَّرُونَ؟ قَالُوا نَذَكَّرُ السَّاعَةَ، قَالَ إِنَّهَا لَنْ تَقُومَ حَتَّىٰ تَرَوْنَ قَبْلَهَا عَشْرَ آيَاتٍ فَذَكَّرَ الدَّخَانَ وَالدَّجَانِ وَالذَّائِبَةَ وَطُلُوعَ الشَّمْسِ مِنْ مَغْرِبِهَا وَنُزُولَ عِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَيَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ وَثَلَاثَةَ خُسُوفٍ، خُسُوفٍ بِالنَّمِطِيقِ وَخُسُوفٍ بِالمَغْرِبِ وَخُسُوفٍ بِحَزْرَةَ الْعَرَبِ وَآخِرُ ذَلِكَ نَارٌ تَخْرُجُ مِنَ اليمَنِ نَطْرُذُ النَّاسِ إِلَىٰ مَحْشَرِهِمْ﴾ | مسلم، الفتن و أشراط الساعة، باب في الآيات التي تكون قبل الساعة: ۲۹، ۱۰ | ”تم کس بات کا ذکر کر رہے ہو؟“ ہم نے کہا: ”ہم قیامت کا ذکر کر رہے ہیں۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”وہ اس وقت تک قائم نہیں ہوگی کہ تم اس سے پہلے دس نشانیاں دیکھ لو۔“ تو آپ ﷺ نے ان نشانیوں کا ذکر فرمایا، (جو یہ ہیں) دھواں، دجال، دابہ، سورج کا مغرب سے طلوع ہونا، عیسیٰ ابن مریم ﷺ کا نزول، یاجوج و ماجوج، تین خسف (زمین میں دھنس جانا) ایک خسف مشرق میں، ایک خسف مغرب میں اور ایک خسف جزیرہ عرب میں اور ان سب کے آخر میں ایک آگ ہوگی جو یمن سے نکلے گی اور لوگوں کو ان کے حشر کے مقام کی طرف ہانک کر لے جائے گی۔“ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ إِنَّا مُؤْمِنُونَ ﴿۱۲﴾ أَلَيْسَ لَكُمْ الذِّكْرَىٰ وَقَدْ جَاءَهُمْ رَسُولٌ مُّبِينٌ ﴿۱۳﴾
 ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَقَالُوا مُعَلَّمٌ مَّجْنُونٌ ﴿۱۴﴾

اے ہمارے رب! ہم سے یہ عذاب دور کر دے، بے شک ہم ایمان لانے والے ہیں ﴿۱۲﴾ ان کے لیے نصیحت کہاں؟
 حالانکہ یقیناً ان کے پاس بیان کرنے والا رسول آچکا ﴿۱۳﴾ پھر انھوں نے اس سے منہ پھیر لیا اور انھوں نے کہا سکھایا
 جوا ہے، دیوانہ ہے ﴿۱۴﴾

﴿بَادِرُوا بِالْأَعْمَالِ يَتَاءَمُّوا طُلُوعِ الشَّمْسِ مِنْ مَغْرِبِهَا أَوْ الذُّخَانِ أَوْ الدَّخَانِ أَوْ الذَّائِبَةِ أَوْ خَاصَّةِ أَحَدِكُمْ أَوْ
 أَمْرِ الْعَاقِبَةِ﴾ [مسلم، الفتن و اشراط الساعة، باب في نفي من أحاديث الدجال : ۲۹۴۷] ”چھ چیزیں ظاہر ہونے سے پہلے
 اعمال میں جلدی کر لو، سورج کا مغرب سے طلوع ہونا یا دھواں یا دجال یا داب یا تم میں سے کسی پر انفرادی عذاب یا سب پر
 اجتماعی عذاب۔“

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اس دوسرے قول کو ترجیح دی ہے کہ اس دخان سے مراد قیامت کے قریب نمودار ہونے والا دھواں ہے،
 جس کا ابھی انتظار ہے، مگر ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی بات ہی صحیح ہے، کیونکہ آیات میں اس دھوئیں کا ذکر ہے جو تھوڑا سا دور کیا جائے
 گا اور اس میں کفار کے لیے ایمان لانے کا موقع ہوگا، جب کہ قیامت کے قریب والی نشانیوں کے بعد ایمان لانے کا کوئی
 فائدہ نہیں ہوگا، جیسا کہ فرمایا: ﴿يَوْمَ يَأْتِي بَعْضُ آيَاتِ رَبِّنَا لَا يَنْفَعُ نَفْسًا إِيمَانُهَا لَمْ تَكُنْ آمَنَتْ مِنْ قَبْلُ أَوْ
 كَسَبَتْ فِي إِيمَانِهَا خَيْرًا﴾ [الأنعام : ۱۱۵] ”جس دن تیرے رب کی کوئی نشانی آئے گی کسی شخص کو اس کا ایمان فائدہ
 نہ دے گا، جو اس سے پہلے ایمان نہ لایا تھا، یا اپنے ایمان میں کوئی نیکی نہ کمائی تھی۔“ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے یہ بات بھی
 بطور دلیل پیش فرمائی کہ بھلا قیامت کا عذاب بھی دور ہو سکتا ہے؟

آیت 12 : رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ إِنَّا مُؤْمِنُونَ : یعنی کفار عذاب دیکھ کر یہ بات کہیں گے، جیسا کہ فرعون کی قوم ہر
 عذاب آنے پر یہی وعدہ کرتی رہی۔

آیت 13، 14 : أَلَيْسَ لَكُمْ الذِّكْرَىٰ وَقَدْ جَاءَهُمْ رَسُولٌ مُّبِينٌ : یعنی انھیں دھوئیں کے عذاب کی دلیل سے نصیحت
 کیسے ہوگی جب کہ ان کے پاس اس سے بہت ہی بڑی دلیل پہلے آچکی اور وہ ہے رسول مبین، جس کا رسول ہونا بالکل واضح
 ہے اور جس نے ہر بات کھول کر بیان کر دی ہے۔ اس کے باوجود انھوں نے منہ موڑ لیا اور کہنے لگے کہ یہ کسی کا سکھایا ہوا ہے،
 دیوانہ ہے۔ ”کُفَّ“ (پھر) کا لفظ ان کے حال پر تعجب کے اظہار کے لیے ہے کہ رسول مبین کا آنا اس قدر واضح اور روشن نشانی
 تھی کہ اسے نہ ماننے کی گنجائش ہی نہ تھی، پھر بھی انھوں نے اس پر معتمد اور مجنون کا بہتان لگا کر ایمان لانے سے انکار کر دیا۔
 یہاں اللہ تعالیٰ نے کلام مختصر کر دیا ہے، ورنہ یہ ایک شخص یا ایک جنس کی بات نہیں بلکہ کسی شخص نے معتمد کہا اور کسی نے مجنون،
 کسی مجلس میں ایک تہمت جڑی گئی تو کسی میں دوسری۔ کفار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ تہمت لگاتے تھے کہ کوئی آدمی آپ کو یہ قرآن

إِنَّا كَاشِفُو الْعَذَابِ قَلِيلًا إِنَّكُمْ عَائِدُونَ ﴿۱۵﴾ يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرَىٰ إِنَّا مُنْتَقِمُونَ ﴿۱۶﴾
وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَجَاءَهُمْ رَسُولٌ كَرِيمٌ ﴿۱۷﴾

بے شک ہم یہ عذاب تھوڑی دیر کے لیے دور کرنے والے ہیں، بے شک تم دوبارہ وہی کچھ کرنے والے ہو ﴿۱۵﴾ جس دن ہم بڑی پکڑ پکڑیں گے، بے شک ہم انتقام لینے والے ہیں ﴿۱۶﴾ اور بلاشبہ یقیناً ہم نے اس سے پہلے فرعون قوم کو آزمایا اور ان کے پاس ایک بہت باعزت رسول آیا ﴿۱۷﴾

سکھا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کا رد فرمایا۔ (دیکھیے نحل: ۱۰۳-۱۰۴، فرقان: ۶۳-۶۴) انہیں اس شخص کو دیوانہ کہتے ہوئے جانیں آتی تھی جو اس سے پہلے چالیس برس ان میں رہا اور وہ اسے صادق اور امین کہتے رہے۔ پھر وہ ایسی کتاب لے کر آیا جس کی چھوٹی سے چھوٹی سورت کا جواب لانے سے بھی وہ عاجز رہے اور رہیں گے۔ بھلا دیوانے ایسے ہوتے ہیں!؟

آیت 15 ﴿إِنَّا كَاشِفُو الْعَذَابِ قَلِيلًا.....﴾ : یعنی ہم تمہارے رسول کی دعا سے عذاب کو تھوڑی مدت کے لیے ہٹانے والے ہیں، تاکہ تمہارے ایمان لانے کے وعدے کی حقیقت سامنے آجائے اور تم پر حجت پوری ہو جائے، اگرچہ ہم جانتے ہیں کہ عذاب ہٹنے پر تم دوبارہ وہی کچھ کر دو گے جو پہلے کرتے تھے۔

آیت 16 ﴿يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرَىٰ إِنَّا مُنْتَقِمُونَ﴾ : ”اِن“ علت بیان کرنے کے لیے ہے۔ یعنی یہ قحط کا عذاب تو ہم نے ہٹا لیا مگر قیامت کے دن جب ہم تمہیں بڑی گرفت میں پکڑیں گے تو وہ کسی صورت دور نہیں ہوگی، کیونکہ ہم انتقام لے رہے ہوں گے۔ دنیا کی گرفت تمہیں کفر سے واپس لانے کے لیے تھی، اس لیے اس کے بعد تمہیں رجوع کا موقع ملتا تھا، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَلَنذَنِّقَنَّهُمْ مِنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ﴾ [السجدة: ۲۱] ”اور یقیناً ہم انہیں قریب ترین عذاب کا کچھ حصہ سب سے بڑے عذاب سے پہلے ضرور چکھائیں گے، تاکہ وہ پلٹ آئیں۔“ لیکن قیامت کے دن کی بڑی گرفت انتقام کے لیے ہوگی، اس کے بعد تمہیں مہلت نہیں ملے گی۔ طبری نے اپنی سند کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ﴿قَالَ ابْنُ مَسْعُودٍ ”الْبَطْشَةُ الْكُبْرَى“ يَوْمُ بَدْرٍ، وَ أَنَا أَقُولُ هِيَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ﴾ [الطبري: ۲۷/۲۱، ح: ۳۱۳۳۸] ”ابن مسعود رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ”الْبَطْشَةُ الْكُبْرَى“ (بڑی پکڑ) یوم بدر ہے اور میں کہتا ہوں کہ وہ قیامت کا دن ہے۔“ ابن کثیر رضی اللہ عنہ نے اس قول کی سند کو صحیح کہا ہے۔ ان کی تفسیر کے محقق دکتور حکمت بن بشیر نے بھی اس قول کی سند کو صحیح کہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی بات قوی ہے۔

آیت 17 ﴿وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ﴾ : یعنی ان کفار مکہ سے پہلے ہم نے فرعون کی قوم کو آزمایا، کبھی وسعت اور فراخی دے کر اور کبھی کوئی عذاب بھیج کر۔ ان کا بھی یہی حال تھا کہ جب ان پر خوش حالی آتی تو کہتے، یہ ہمارے ہنر کا کمال ہے اور جب ان پر عذاب آتا تو اسے موسیٰ علیہ السلام کی نحوست قرار دیتے، مگر پھر انہی سے درخواست کرتے کہ اپنے رب سے دعا کر، اگر اس نے یہ عذاب ہم سے ہٹا دیا تو ہم تجھ پر ایمان لے آئیں گے اور تیرے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دیں گے۔ مگر

أَنْ أَدُّوا إِلَيَّ عِبَادَةَ اللَّهِ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ﴿۱۸﴾

یہ کہ اللہ کے بندوں کو میرے حوالے کر دو، بے شک میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں ﴿۱۸﴾

جب ان کی دعا سے وہ عذاب دور ہوتا تو فوراً عہد توڑ ڈالتے۔ آخر انجام ان کا یہ ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام کی بددعا سے ہم نے انہیں سمندر میں غرق کر دیا۔ (دیکھیے اعراف: ۱۳۰ تا ۱۳۶) مقصود ان آیات سے رسول اللہ ﷺ کو تسلی اور کفار کو عبرت دلانا ہے۔

﴿۲﴾ وَجَاءَهُمْ رَسُولٌ كَرِيمٌ: ”کریم“ کا لفظ کسی بھی چیز میں سے اعلیٰ درجے کی چیز پر بولا جاتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کو کریم اس لیے فرمایا کہ وہ حسب نسب میں ان سب سے اونچے اور اخلاق و صفات میں نہایت بلند تھے اور اللہ کے ہاں اتنے عالی مرتبے والے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے خود ان سے کلام فرمایا۔

آیت 18 ﴿۱﴾ أَنْ أَدُّوا إِلَيَّ عِبَادَةَ اللَّهِ.....: یہاں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ موسیٰ علیہ السلام کے جو اقوال یہاں نقل ہوئے ہیں وہ ایک وقت کے نہیں بلکہ کئی سالوں میں مختلف مواقع پر انہوں نے فرعون اور اس کے درباریوں سے جو کچھ کہا اس کا خلاصہ چند فقروں میں بیان کیا گیا ہے۔

﴿۲﴾ أَنْ أَدُّوا إِلَيَّ عِبَادَةَ اللَّهِ: اس جملے کی تفسیر دو طرح سے ہو سکتی ہے، ایک یہ کہ ”عِبَادَةَ اللَّهِ“ کا لفظ ”أَدُّوا إِلَيَّ“ کا مفعول بہ ہے، یعنی موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا کہ اللہ کے بندوں کو میرے حوالے کر دو۔ ”عِبَادَةَ اللَّهِ“ (اللہ کے بندوں) سے مراد بنی اسرائیل ہیں، جنہیں فرعون نے غلام بنا رکھا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کا مقصد فرعون اور اس کی قوم کو اسلام کی دعوت کے ساتھ ساتھ بنی اسرائیل کو اس کی غلامی سے نجات دلانا بھی تھا۔ اس تفسیر کی تائید اس آیت سے ہوتی ہے: ﴿فَأَنبِئْهُمْ قَوْلَ إِقْرَأْ سُوْرَةَ رَبِّكَ فَارْسِلْ مَعَنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ﴾ [طہ: ۷۷] ”تو اس کے پاس جاؤ اور کہو بے شک ہم تیرے رب کے بھیجے ہوئے ہیں، پس تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے اور انہیں عذاب نہ دے۔“ یہاں بنی اسرائیل کو ”عِبَادَةَ اللَّهِ“ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کے بندے اور غلام ہیں، تمہیں کوئی حق نہیں کہ انہیں غلام بنا کر رکھو۔ یہی بات جنگ قادسیہ کے موقع پر ربیع بن عامر رضی اللہ عنہما نے ایرانیوں کے سردار رستم سے کہی تھی، جب اس نے ان سے پوچھا: ﴿مَا جَاءَ بِكُمْ؟﴾ ”تمہیں کیا چیز لے کر آئی ہے؟“ تو انہوں نے جواب میں جو تقریر کی اس کے چند جملے یہ ہیں: ﴿اللَّهُ ابْتَعَنَّا لِنُخْرَجَ مِنْ شَاءَ مَنْ عِبَادَةِ الْعِبَادِ إِلَى عِبَادَةِ اللَّهِ وَمِنْ صِيقِ الدُّنْيَا إِلَى سَعَتِهَا وَمِنْ جَوْرِ الْأَذْيَانِ إِلَى عَذْلِ الْإِسْلَامِ﴾ [البدایة والنہایة: ۷/۷۷، سن ۱۴ ہجری کے واقعات] ”اللہ تعالیٰ نے ہمیں بھیجا ہے تاکہ ہم جسے وہ چاہے اسے بندوں کی غلامی سے نکال کر اللہ کی غلامی کی طرف اور دنیا کی تنگی سے نکال کر اس کی وسعت کی طرف اور تمام دینوں کے ظلم و جور سے نکال کر اسلام کے عدل کی طرف لے آئیں۔“

دوسری تفسیر یہ ہے کہ ”عِبَادَةَ اللَّهِ“ سے پہلے حرف ندا ”یا“ محذوف ہے اور وہ منادئ مضاف ہونے کی وجہ سے منسوب ہے اور ”أَدُّوا إِلَيَّ“ کا مفعول محذوف ہے: ”أَيُّ أَدُّوا إِلَيَّ مَا وَجِبَ عَلَيْكُمْ يَا عِبَادَ اللَّهِ!“ ”یعنی اے اللہ کے بندو!

وَأَنْ لَا تَعْلُوا عَلَى اللَّهِ ۗ إِنِّي آتَيْتُكُمْ بِسُلْطَنِ مُبِينٍ ﴿۱۹﴾ وَإِنِّي عُدْتُ بِرَبِّي وَرَبِّكُمْ أَنْ تَرْجُمُونِ ﴿۲۰﴾

اور یہ کہ اللہ کے مقابلے میں سرکشی نہ کرو، بے شک میں تمہارے پاس واضح دلیل لانے والا ہوں ﴿۱۹﴾ اور بے شک میں اپنے رب اور تمہارے رب کی پناہ پکڑتا ہوں، اس سے کہ تم مجھے سنگسار کرو دو ﴿۲۰﴾

جو حقوق تم پر واجب ہیں وہ مجھے ادا کرو۔ یعنی مجھ پر ایمان لاؤ اور میری اطاعت کرو۔ اس تفسیر کے مطابق ”عِبَادَةُ اللَّهِ“ سے مراد قبلی ہیں۔ یہ تفسیر بھی درست ہے، بعد کا جملہ ”إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ“ اس تفسیر سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ حرف ندا کا حذف کلام عرب میں عام ہے، جیسا کہ عزیز مصر نے کہا تھا: ﴿يُوسُفُ أَخْرِضْ عَنْ هَذَا﴾ | يوسف: ۲۹ | ”أَيُّ يَا يُوسُفُ! أَخْرِضْ عَنْ هَذَا“ یعنی اے یوسف! اس معاملے سے درگزر کر۔

﴿۳﴾ **إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ**: یہ پہلے جملے کی علت ہے، یعنی میرے حقوق جو تم پر واجب ہیں ادا کرو، کیونکہ میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں، تمہیں اللہ کا پیغام ٹھیک ٹھیک کسی کمی یا زیادتی کے بغیر پہنچاتا ہوں۔ یہ الفاظ اس وقت کے ہیں جب موسیٰ علیہ السلام نے شروع میں اپنی دعوت پیش فرمائی۔

آیت ۱۹ ﴿۱﴾ وَأَنْ لَا تَعْلُوا عَلَى اللَّهِ: اور اللہ کے سامنے اونچے مت بنو، اس کے مقابلے میں سرکشی مت کرو۔ یعنی تمہارا مجھ پر ایمان نہ لانا دراصل اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں سرکشی ہے، کیونکہ مجھے بھیجنے والا وہ ہے اور جو کچھ میں نے تمہیں کہا ہے وہ میری بات نہیں بلکہ اللہ کی بات ہے جو میں پوری امانت کے ساتھ تمہیں پہنچا رہا ہوں۔ دوسری بات یہ کہ کسی دوسرے کے غلام کو اپنا غلام بنا لینا بہت بڑی سرکشی ہے جو تم نے اللہ کے بندوں کو اپنا غلام بنا کر اس کے مقابلے میں اختیار کر رکھی ہے، اس لیے یہ سرکشی چھوڑ کر انہیں آزاد کر دو۔

﴿۲﴾ **إِنِّي آتَيْتُكُمْ بِسُلْطَنِ مُبِينٍ**: یعنی اگر تمہیں شک ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے نہیں بھیجا تو میں اللہ کی طرف سے اپنے رسول ہونے کی واضح دلیل پیش کرنے والا ہوں جس سے تمہیں میری رسالت میں کوئی شبہ باقی نہیں رہے گا۔ ”بِسُلْطَنِ مُبِينٍ“ اگرچہ نکرہ ہے مگر اسم جنس ہونے کی وجہ سے اس سے مراد صرف ایک دلیل نہیں بلکہ عصائے موسیٰ سے لے کر وہ تمام معجزے ہیں جو موسیٰ علیہ السلام پہلی مرتبہ فرعون کے پاس آنے سے لے کر مصر میں قیام کے آخری وقت تک دکھاتے رہے۔

آیت ۲۰ ﴿۲﴾ وَإِنِّي عُدْتُ بِرَبِّي وَرَبِّكُمْ أَنْ تَرْجُمُونِ: یہ اس وقت کی بات ہے جب موسیٰ علیہ السلام کی دعوت اندر ہی اندر دور تک پھیل گئی، حتیٰ کہ فرعون کی قوم کے کئی آدمی بھی پوشیدہ طور پر ان پر ایمان لے آئے، اس وقت فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ جب موسیٰ علیہ السلام کو معلوم ہوا کہ فرعونوں کا ارادہ انہیں سنگسار کر کے بدترین طریقے سے قتل کرنے کا ہے، تو اس وقت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ میں اس بات سے اپنے اور تمہارے رب کی پناہ پکڑتا ہوں کہ تم مجھے سنگسار کرو، کیونکہ وہ میرا ہی نہیں تمہارا بھی مالک ہے، تم اس سے زبردست ہو کر مجھے رجم نہیں کر سکتے۔ سورہ مؤمن (۲۶، ۲۷) میں فرعون کے قتل کے

وَإِنْ لَمْ تُؤْمِنُوا لِي فَاعْتَرِلُونِ ﴿۲۱﴾ قَدَعَا رَبَّهُ أَنْ هُوَلَاءَ قَوْمٌ مُّجْرِمُونَ ﴿۲۲﴾ فَأَسْرِبَعِبَادِي ﴿۲۳﴾
لَيْلًا إِيَّاكُمْ مُّتَّبِعُونَ ﴿۲۴﴾

اور اگر تم میری بات نہیں مانتے تو مجھ سے الگ رہو ﴿۲۱﴾ آخر اس نے اپنے رب کو پکارا کہ یہ مجرم لوگ ہیں ﴿۲۲﴾ پس میرے بندوں کو رات کے کسی حصے میں لے جا، بے شک تم پیچھا کیے جانے والے ہو ﴿۲۴﴾

اعلان اور موسیٰ علیہ السلام کی دعا اور اللہ کی پناہ میں جانے کا مفصل ذکر ہے۔

آیت 21: وَإِنْ لَمْ تُؤْمِنُوا لِي فَاعْتَرِلُونِ: یعنی اگر تم مجھ پر ایمان نہیں لاتے تو مجھے میرے حال پر چھوڑ دو، مجھے ایذا نہ پہنچاؤ اور بنی اسرائیل کو میرے ہمراہ جانے سے نہ روکو۔

آیت 22: قَدَعَا رَبَّهُ أَنْ هُوَلَاءَ قَوْمٌ مُّجْرِمُونَ: یہاں ایک لمبا قصہ حذف کر دیا گیا ہے جو کئی سال تک موسیٰ علیہ السلام کی دعوت، ہر طرح کی آزمائشوں کے باوجود فرعون کی سرکشی، بنی اسرائیل پر بے پناہ مظالم اور ان کے بے مثال صبر پر مشتمل ہے۔ ”قَدَعَا رَبَّهُ“ کے ساتھ اس قصے کا انجام بیان کیا گیا ہے کہ جب انھوں نے تمام معجزے دیکھنے، ہر بار ایمان لانے کا عہد کرنے اور اسے توڑ دینے کے بعد صاف لفظوں میں کہہ دیا: ﴿مَهْمَا تَأْتِنَا بِهِ مِنْ آيَةٍ لِنُتَعَرِكَنَّ بِهَا لِأَقِمْنَا نَحْنُ لَكَ يَوْمَ هُنَّ مِينٌ﴾ [الأعراف: ۱۳۲] ”تو ہمارے پاس جو ناشانی بھی لے آئے، تاکہ ہم پر اس کے ساتھ جادو کرے تو ہم تیری بات ہرگز مانتے والے نہیں۔“ تو ان کے ایمان لانے سے پوری طرح مایوس ہونے کے بعد نوح علیہ السلام کی طرح موسیٰ علیہ السلام نے بھی ان کے خلاف اپنے رب سے دعا کی کہ یہ لوگ مجرم ہیں، کسی طرح ماننے والے نہیں۔ سورہ یونس میں ہے: ﴿وَقَالَ مُوسَى رَبَّنَا إِنَّكَ آتَيْتَ فِرْعَوْنَ فَزَعُونَ وَمَلَآ ذُرِّيَّتَهُ وَأَمْوَالًا فِي الْعَالَمِينَ لِيُؤْتُوا حَتْفِي يَوْمَ يُخَالَفُوكَ فَاعْبُودُوا غَيْرَكَ يَا رَبَّنَا إِنَّكَ لَمُطَّلِبٌ إِيَّاهُمْ يَوْمَ يَخْرُجُ الَّذِينَ كَفَرُوا﴾ [يونس: ۸۸] ”اور موسیٰ نے کہا اے ہمارے رب! بے شک تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو دنیا کی زندگی میں بہت سی زینت اور اموال عطا کیے ہیں، اے ہمارے رب! تاکہ وہ تیرے راستے سے گمراہ کریں، اے ہمارے رب! ان کے مالوں کو مٹا دے اور ان کے دلوں پر سخت گروہ ڈال دے، پس وہ ایمان نہ لائیں، یہاں تک کہ دردناک عذاب دیکھ لیں۔“

آیت 23: ﴿۱﴾ فَأَسْرِبَعِبَادِي لَيْلًا.....: موسیٰ علیہ السلام کی دعا قبول ہوئی اور حکم ہوا کہ میرے بندوں کو راتوں رات لے کر نکل جاؤ، تاکہ فرعون کو فوری خیر نہ ہو سکے اور یاد رکھو! تمہارا تعاقب کیا جائے گا، اس لیے تمہیں ہجرت کا یہ سفر پوری احتیاط کے ساتھ ہوشیار رہ کر کرنا ہوگا۔

﴿۲﴾ ”بعبادی“ (میرے بندوں) سے مراد بنی اسرائیل ہیں اور ان کے ساتھ قبیلوں کے وہ لوگ بھی جو ایمان لا چکے تھے۔

اس واقعہ کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ شعراء (۶۸۳-۵۲)، یونس (۹۳-۸۸) اور سورہ طہ (۷۷-۷۸)۔

وَأَتْرَكَ الْبَحْرَ زَهُوًّا ۖ إِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُونَ ﴿۲۴﴾ كَمْ تَرَكُوا مِنْ جَنَّتٍ وَعُيُونٍ ﴿۲۵﴾ وَ زُرُوعٍ
 وَ مَقَامِرٍ كَرِيمٍ ﴿۲۶﴾ وَ نَعْمَ كَانُوا فِيهَا فُكْهِينَ ﴿۲۷﴾ كَذَلِكَ ۖ وَ أَوْزُنُهَا قَوْمًا آخِرِينَ ﴿۲۸﴾ فَمَا بَكَتْ
 عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَ الْأَرْضُ وَ مَا كَانُوا مُنظَرِينَ ﴿۲۹﴾

اور سمندر کو اپنے حال پر ٹھہرا ہوا چھوڑ دے، بے شک وہ ایسا لٹکر ہیں جو غرق کیے جانے والے ہیں ﴿۲۴﴾ کتنے ہی
 چھوڑ گئے باغات اور چشمے ﴿۲۵﴾ اور کہیتیاں اور عمدہ مقام ﴿۲۶﴾ اور خوش حالی، جن میں وہ مزے اڑانے والے تھے ﴿۲۷﴾ اسی طرح
 ہوا اور ہم نے ان کا وارث اور لوگوں کو بنا دیا ﴿۲۸﴾ پھر نہ ان پر آسمان وزمین روئے اور نہ وہ مہلت پانے والے ہوئے ﴿۲۹﴾

آیت 24 . وَأَتْرَكَ الْبَحْرَ زَهُوًّا : "زَهُوًّا، يَزْهُوُ زَهُوًّا" (ن) "الْبَحْرُ" سمندر کا ساکن ہوتا۔ "زَهُوًّا الزُّجْلُ
 زَهُوًّا" جب آدمی دونوں ٹانگیں کھول لے اور انھیں الگ الگ کر لے۔ یہاں اس قصے کا وہ حصہ حذف کر دیا ہے جس میں ذکر
 ہے کہ بنی اسرائیل سمندر پر پہنچے تو پیچھے سے فرعون بھی پہنچ گیا، بنی اسرائیل سخت خوف زدہ ہو گئے کہ اب دوبارہ پکڑے جائیں
 گے، تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو وحی کی کہ اپنی لاشی سمندر پر نہر۔ انھوں نے ایسا کیا تو سمندر پھٹ گیا اور پانی کا ہر حصہ اپنی
 جگہ ایک بڑے پہاڑ کی شکل میں کھڑا ہو گیا۔ موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل خیریت سے گزر گئے تو موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا: ﴿وَأَتْرَكَ الْبَحْرَ
 زَهُوًّا﴾ "اور سمندر کو اپنے حال پر ٹھہرا ہوا چھوڑ دے۔" دیکھیے سورہ شعراء (۶۸:۵۲) سمندر سے پار ہونے پر موسیٰ علیہ السلام کو
 حکم ہوا کہ سمندر کو اسی حالت میں ٹھہرا ہوا چھوڑ دین کہ اس میں الگ الگ راستے کھلے ہوں، تقاب کی عُزْمَت کریں، اس لٹکر
 کو اسی سمندر میں غرق کیا جاتا ہے۔

آیت 25-28 : كَمْ تَرَكُوا مِنْ جَنَّتٍ وَعُيُونٍ . . . : ان آیات کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ شعراء کی آیات کی (۲۵۵-۲۵۹) کی تفسیر۔

آیت 29 ﴿۱﴾ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَ الْأَرْضُ : اس آیت کی تفسیر میں تین قول ہیں، تینوں میں سے جو بھی مراد لے لیں
 درست ہے۔ ایک یہ کہ "السَّمَاءُ" سے پہلے لفظ "أَهْلٌ" محذوف ہے، جیسے یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے والد کو جا کر بتایا کہ
 آپ کے بیٹے نے چوری کی ہے، جس کی وجہ سے عزیز مصر نے اسے اپنے پاس روک لیا ہے۔ پھر یقین دلانے کے لیے
 کہا: ﴿وَسْأَلُ الْقَرْيَةَ الَّتِي كُنَّا فِيهَا وَالْعِيرَ الَّتِي أَقْبَلْنَا فِيهَا﴾ [یوسف : ۸۲] "اور آپ اس بستی سے پوچھ لیں جس میں
 ہم تھے اور اس قافلے سے بھی جس میں ہم آئے ہیں۔" مطلب یہ ہے کہ اس بستی والوں سے پوچھ لیں۔ اسی طرح یہاں
 مطلب یہ ہے کہ نہ ان پر آسمان والے روئے اور نہ زمین والے، بلکہ ہر ایک نے اطمینان کا سانس لیا اور ہر ظالم حکمران
 نو لے کا یہی حشر ہوتا ہے۔

دوسرا قول یہ کہ اس سے مراد ان کی تحقیر اور ان کا مذاق اڑانا ہے۔ عرب کے ہاں جب کوئی بڑا آدمی فوت ہوتا تو وہ اس کی

لَقَدْ جَعَلْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ مِنَ الْعَذَابِ الْمُهِينِ ﴿۳۰﴾ مِنْ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ كَانَ عَلِيًّا قَوِّمًا
السُّرِفِينَ ﴿۳۱﴾ وَ لَقَدْ اخْتَرْنَا لَهُمْ عَلَىٰ عِلْمٍ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿۳۲﴾

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے بنی اسرائیل کو ذلیل کرنے والے عذاب سے نجات دی ﴿۳۰﴾ فرعون سے، بے شک وہ حد سے
بڑھنے والوں میں سے ایک سرکش شخص تھا ﴿۳۱﴾ اور بلاشبہ یقیناً ہم نے انھیں علم کی بنا پر جہانوں سے چن لیا ﴿۳۲﴾

بت کو بہت بڑا حادثہ بتانے کے لیے کہتے کہ اس پر آسمان رویا، زمین روئی اور پہاڑ لرز اٹھے۔ مطلب یہ کہ اتنی شان و شوکت
لے اور خدائی کا ڈنکا بجانے والے مرے تو ان لوگوں کی طرح جن کی نہ کوئی حیثیت ہوتی ہے اور نہ کسی کو ان کے مرنے کی
واہوتی ہے۔ تیسرا قول یہ کہ آیت کے ظاہر الفاظ کے مطابق آسمان وزمین نیک لوگوں کے مرنے پر روتے ہیں، مگر ان کے
رنے پر نہ آسمان رویا نہ زمین۔ یہ معنی بھی کچھ بعید نہیں، جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے ڈر سے پتھروں سے نہریں پھونٹے، ان
کے پھٹ جانے اور اللہ کے خوف سے گر پڑنے کا ذکر فرمایا ہے (دیکھیے بقرہ: ۷۴) اور جس طرح کھجور کے درخت کا تنا (حنانہ)
سول اللہ ﷺ کے اسے چھوڑ کر منبر پر خطبہ دینے کے وقت رویا تھا۔

﴿۳۰﴾ وَمَا كَانُوا نُنظَرِينَ: اور نہ وہ مہلت پانے والے ہوئے کہ توبہ کر لیتے، بلکہ آن کی آن میں ڈبو دیے گئے۔

﴿۳۰﴾ لَقَدْ جَعَلْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ مِنَ الْعَذَابِ الْمُهِينِ: موسیٰ ﷺ کے واقعہ میں فرعون اور آل فرعون کو غرق کرنے کا
ذکر کرنے کے بعد بنی اسرائیل پر اپنے انعامات کا ذکر فرمایا۔ اس میں قریش کے جباروں کو فرعون اور آل فرعون کے انجام سے
رایا گیا ہے اور رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کو تسلی دی گئی ہے کہ نہ کفر کے یہ سردار فرعون جیسی قوت و شوکت کے مالک ہیں نہ
مسلمان بنی اسرائیل جتنے مظلوم اور بے بس۔ تو جب فرعون کی قوت و شوکت کا یہ حال ہوا تو یہ بے چارے کیا حیثیت رکھتے
ہیں اور جب بنی اسرائیل جیسے بے بس اور مظلوم ظلم سے نجات پاسکتے ہیں تو مسلمانوں کو بھی اس کی امید رکھنی چاہیے۔

”لام“ اور ”قذ“ تاکید کے لیے قسم کا مفہوم رکھتے ہیں۔ یقین دلانے کے لیے قسم کی ضرورت اس وقت ہوتی ہے جب
کوئی کسی بات کا منکر ہو، یہاں یہ بات اتنی تاکید کے ساتھ اس لیے فرمائی کہ ماننے میں نہیں آتا کہ ظلم میں اس قدر جکڑی ہوئی
قوم، جن کے لڑکے ذبح کیے جا رہے ہوں، لڑکیوں کو زندہ رکھ کر ان سے ہر خدمت لی جا رہی ہو اور وہ اُن تک نہ کر سکتے ہوں
اور دنیا میں کہیں سے انھیں مدد مل سکتی ہو نہ کوئی ان کے حق میں آواز اٹھانے والا ہو، انھیں بھی اتنی ذلت سے نجات مل سکتی
ہے؟ فرمایا، ہاں، ہاں! ایسا ہوا ہے اور یقیناً ہوا ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل کو ذلیل کرنے والے عذاب سے نجات دی۔

﴿۳۱﴾ مِنْ فِرْعَوْنَ: وہ عذاب کیا تھا؟ وہ فرعون تھا، اس کی ذات ہی بنی اسرائیل کے لیے جسم عذاب تھی۔

﴿۳۲﴾ إِنَّهُ كَانَ عَلِيًّا قَوِّمًا: اس کی سرکشی اور زیادتی کے لیے دیکھیے سورہ قصص کی آیت (۴) کی تفسیر۔

﴿۳۲﴾ وَ لَقَدْ اخْتَرْنَا لَهُمْ: ”اخترنا“ ”اخْتَارَ يَخْتَارُ اخْتِيَارًا“ (افتعال) سے جمع متکلم ماضی معلوم ہے۔ یہاں

بھی ”لقد“ لانے کا مقصد یہی ہے کہ اتنی پس ہوئی قوم کو یکا یک تمام دنیا پر برتری کیسے مل سکتی ہے؟ فرمایا تم ہے کہ ہم نے

وَآتَيْنَهُمْ مِنَ الْآيَاتِ مَا فِيهِ بَلَاغٌ مُبِينٌ ﴿۳۳﴾ إِنَّ هَؤُلَاءِ لَيَقُولُونَ ﴿۳۴﴾ إِنَّ هِيَ إِلَّا مَوْتَتُنَا
الْأُولَىٰ وَ مَا نَحْنُ بِمُنشَرِينَ ﴿۳۵﴾

اور ہم نے انھیں وہ نشانیاں دیں جن میں واضح آزمائش تھی ﴿۳۳﴾ بے شک یہ لوگ یقیناً کہتے ہیں ﴿۳۴﴾ کہ ہماری اس پہلی موت کے سوا کوئی (موت) نہیں اور نہ ہم کبھی دوبارہ اٹھائے جانے والے ہیں ﴿۳۵﴾

انھیں تمام جہانوں پر چن لیا، پھر ہمارے چنے ہوؤں کو برتری کیوں حاصل نہ ہوگی۔

﴿۳۳﴾ علیٰ علیہم: یعنی ہم نے بلاوجہ ان کا انتخاب نہیں کیا، بلکہ ہمیں ان کی خوبیوں اور صلاحیتوں کا علم تھا اور ہم ان کی خامیوں اور کمزوریوں سے بھی واقف تھے۔ اس علم ہی کی بنا پر ہم نے ان کے زمانے کی تمام قوموں میں سے ان کا انتخاب کیا۔

﴿۳۴﴾ عَلَى الْعَالَمِينَ: "الْعَالَمِينَ" سے مراد ان کے زمانے کے جہان ہیں، کل جہان نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہؐ کو: ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ﴾ | ان عمران: ۱۱۰ | کہہ کر تمام امتوں سے بہتر قرار دیا ہے، کیونکہ "سکھان" استمرار پر دلالت کر رہا ہے۔ ہاں بعض جزوی فضائل بنی اسرائیل میں ایسے ہیں جو انھی کی خصوصیت ہیں، مثلاً اتنے انبیاء کا ان میں مبعوث ہونا، مگر مجموعی اور کلی لحاظ سے امت محمدیہؐ افضل ہے۔

آیت 33 ﴿وَآتَيْنَهُمْ مِنَ الْآيَاتِ.....﴾: "بَلَاغٌ" کا معنی آزمائش ہے، یہ لفظ مصیبت اور انعام دونوں معنوں میں آتا ہے، کیونکہ آزمائش دونوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ یہاں مراد ان پر کیے جانے والے احسانات ہیں، جن میں آزادی، صحرا میں کھانے پینے اور دھوپ سے بچنے کی تمام ضرورتوں کا انتظام اور پھر ارض مقدس کی تولیت کا شرف سب چیزیں شامل ہیں۔ مزید دیکھیے سورہ بقرہ (۳۹)۔

آیت 34 ﴿إِنَّ هَؤُلَاءِ لَيَقُولُونَ﴾: یہاں موکلین کا قصہ ختم ہوا جو جملہ معترضہ کے طور پر درمیان میں آ گیا تھا اور دوبارہ سلسلہ کلام کفار قریش کے ساتھ جوڑ دیا گیا، جو پہلے سے چلا آ رہا تھا اور کفار سے فرمایا تھا: ﴿لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ﴾ ﴿ذِكْرَهُمْ رَبُّهُمُ ابْنُ آدَمَ﴾ ﴿بَلْ هُمْ فِي شَكٍّ يَلْعَبُونَ﴾ | الدخان: ۸، ۹ | "اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ زندگی بخشتا اور موت دیتا ہے، تمہارا رب ہے اور تمہارے پہلے باپ دادا کا رب ہے۔ بلکہ وہ ایک شک میں کھیل رہے ہیں۔" ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے زندگی بخشے اور موت دینے کو قیامت کی دلیل کے طور پر پیش فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ کفار شک ہی میں پڑے ہوئے ہیں۔ فرعون کی سرکشی اور غرقابی کے ذکر کے بعد کفار قریش کا ذکر "هَؤُلَاءِ" (یہ لوگ) کہہ کر حقارت کے ساتھ فرمایا کہ فرعون جیسے قوت و شوکت اور رعب و دہد بے والے منکروں کا انجام سن چکے، اب ان لوگوں کی بات سنو جو اس کے مقابلے میں کچھ قوت نہیں رکھتے، یہ بھی ہمارے دوبارہ زندہ کرنے کی قدرت کو ماننے کے لیے تیار نہیں بلکہ کہتے ہیں۔

آیت 35 ﴿إِنَّ هِيَ إِلَّا مَوْتَتُنَا الْأُولَىٰ وَ مَا نَحْنُ بِمُنشَرِينَ﴾: کہتے ہیں کہ پہلی دفعہ ہم مریں گے تو قصہ ختم، پھر کوئی

فَاتُوا بِآبَائِنَا إِن كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۳۶﴾ أَهْمُ خَيْرٌ أَمْ قَوْمٌ تُبْعِ لَوَ الدِّينِ مِن قَبْلِهِمْ أَهْلَكْتُمْ
إِنَّهُمْ كَانُوا مُجْرِمِينَ ﴿۳۷﴾

تو ہمارے باپ دادا کو لے آؤ، اگر تم سچے ہو ﴿۳۶﴾ کیا یہ لوگ بہتر ہیں، یا تبع کی قوم اور وہ لوگ جو ان سے پہلے تھے؟
م نے انہیں ہلاک کر دیا، بے شک وہ مجرم تھے ﴿۳۷﴾

زندگی نہیں اور نہ ہمیں اٹھایا جائے گا۔

ت 36 ﴿۳۶﴾ فَاتُوا بِآبَائِنَا إِن كُنْتُمْ صَادِقِينَ: یعنی ہم نے آج تک کسی فوت شدہ کو زندہ ہوتے نہیں دیکھا، اگر تمہارا دعویٰ
ہے کہ دوسری زندگی ہے تو ہمارے آبا و اجداد کو قبروں سے اٹھاؤ، اگر تم سچے ہو، ورنہ ہم تمہیں جھوٹا سمجھیں گے۔ وہ اپنی اس
دلیل کو بہت مضبوط سمجھتے تھے! حالانکہ یہ کئی جہوں سے بالکل فضول ہے، کیونکہ انہیں یہ کس نے کہا کہ وہ اسی دنیا میں آئے گی؟
وہ تو ایک نئی دنیا ہوگی جس میں تمام مردے بیک وقت اٹھ کھڑے ہوں گے۔ پھر انہیں یہ کس نے کہا ہے کہ مردوں کا زندہ کرنا
منہجبر کے اختیار میں ہے؟ اس کا کام تو صرف پیغام پہنچانا ہے، مردے زندہ کرنا یا مجزوں کے مطالبے پورے کرنا نہیں اور
قبری وجہ یہ ہے کہ قیامت کا ایک وقت مقرر ہے جسے صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے، وہ اسی وقت آئے گی جو اللہ تعالیٰ نے مقرر
فرمایا ہے۔ اب قیامت سے پہلے قیامت کا مطالبہ کون سی دانش مندی ہے؟ اگر کسی کو آئندہ ہونے والے کسی کام کی اطلاع دی
جائے تو کیا یہ کہہ کر اسے جھٹلایا جاسکتا ہے کہ یہ کام فوراً کر کے دکھاؤ، اگر ابھی نہیں ہوتا تو کبھی بھی نہیں ہوگا۔ ظاہر ہے یہ نہایت
بے عقلی کی بات ہے۔

ت 37 ﴿۳۷﴾ أَهْمُ خَيْرٌ أَمْ قَوْمٌ تُبْعِ: شیخ یمن کے قبیلہ جمیر کے بادشاہوں کا لقب تھا، جیسے کسری ایران کے بادشاہوں
کا، قیصر روم کے بادشاہوں کا، فرعون مصر کے بادشاہوں کا اور نجاشی حبشہ کے بادشاہوں کا لقب ہوتا تھا۔ یہ جمیر کا بادشاہ شیخ
مومن تھا اور اس کی قوم کا فرقی، اس لیے اس کی قوم کی مذمت کی ہے، اس کی نہیں۔

﴿۳۶﴾ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ: پہلے لوگوں سے مراد عاد و ثمود، قوم ابراہیم، قوم لوط، اصحاب مدین اور قوم فرعون وغیرہ ہیں۔

﴿۳۷﴾ أَهْلَكْتُمْ إِنَّهُمْ كَانُوا مُجْرِمِينَ: یہ کفار کے اعتراض کا تاریخ سے جواب ہے کہ جو شخص یا قوم آخرت کا انکار کرے گی
اسے کوئی چیز مجرم بننے سے روک نہیں سکتی، کیونکہ اسے باز پرس کی فکر ہی نہیں ہوتی، وہ اپنی خواہشات کے پیچھے بے لگام
چلے جاتے ہیں۔ پھر ان کی سرکشی، ظلم و زیادتی اور حد سے بڑھنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انہیں حرف غلط کی طرح مٹا دیا
جاتا ہے۔ رہی یہ بات کہ ”یہ لوگ بہتر ہیں یا قوم شیخ اور اس سے پہلے کے لوگ“ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کفار مکہ تو اس
سینچڑ حالی اور قوت و شوکت کو پہنچ ہی نہیں سکے جو شیخ کی قوم اور اس سے پہلے کی اقوام کو حاصل رہی ہے، جب ان کی خوش حالی
میں اس زوال سے نہیں بچا سکی جو قیامت کے انکار کی وجہ سے ان پر آیا تو ان بے چاروں کی کیا حیثیت ہے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لِعَيْنٍ ﴿۳۸﴾ مَا خَلَقْنَاهَا إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَكِنْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۳۹﴾ إِنَّ يَوْمَ الْفُضْلِ مِنْقَاتَهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿۴۰﴾ يَوْمَ لَا يُغْنِي قَوْلِي عَنْ قَوْلِي شَيْئًا وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ﴿۴۱﴾ إِلَّا مَنْ رَحِمَ اللَّهُ إِنَّهُ هُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿۴۲﴾

ع
۱۶

اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کھیلے ہوئے نہیں بنایا ﴿۳۸﴾ ہم نے ان دونوں کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے اور لیکن ان کے اکثر نہیں جانتے ﴿۳۹﴾ یقیناً فیصلے کا دن ان سب کا مقرر وقت ہے ﴿۴۰﴾ جس کو کوئی دوست کسی دوست کے کچھ کام نہ آئے گا اور نہ ان کی مدد کی جائے گی ﴿۴۱﴾ مگر جس پر اللہ نے رحم کیا، بے شک وہی سب پر غالب، نہایت رحم والا ہے ﴿۴۲﴾

آیت 38-39: وَمَا خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ : یہ منکرین قیامت کے اعتراض کا عقلی جواب ہے کہ اگر سب لوگوں کو زندہ کر کے ان سے باز پرس کا اور نیک و بد کی جزا و سزا کا کوئی دن نہیں تو اس کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اتنی عظیم کائنات محض کھیلنے کے لیے بنائی ہے، اس کا کوئی مقصد نہیں، اس کے ہاں نیک و بد اور ظالم و مظلوم برابر ہیں، نہ اس کے ہاں عدل ہے نہ حکمت۔ فرمایا ایسا نہیں ہے، ہم نے آسمان و زمین کو حق ہی کے ساتھ پیدا کیا ہے اور قیامت قائم کرنا ہماری حکمت اور عدل کا تقاضا ہے، مگر اکثر لوگ نہیں جانتے، اس لیے آخرت کی تیاری سے غافل ہیں۔ یہ مضمون قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بیان ہوا ہے، دیکھیے سورہ انبیاء (۱۸ تا ۱۶)، مومنون (۱۱۵، ۱۱۶) اور سورہ قیامہ (۳۶ تا ۴۰)۔

آیت 40: إِنَّ يَوْمَ الْفُضْلِ مِنْقَاتَهُمْ أَجْمَعِينَ: یہ ان کے اس مطالبے کا جواب ہے کہ ”ہمارے باپ دادا کو لے آؤ اگر تم سچے ہو۔“ فرمایا، موت کے بعد زندگی کوئی کھیل نہیں کہ جب کوئی اس کا مطالبہ کرے اسے کوئی مردہ زندہ کر کے دکھا دیا جائے۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک وقت مقرر فرما رکھا ہے جس میں وہ سب کو جمع کر کے ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا۔

آیت 41: ﴿۱﴾ يَوْمَ لَا يُغْنِي قَوْلِي عَنْ قَوْلِي شَيْئًا: ”قَوْلِي“ کا معنی دوست بھی ہے، قریبی رشتہ دار بھی، غلام بھی اور غلام کا مالک بھی۔ یعنی قیامت کے دن کوئی شخص کسی ایسے شخص کے کام نہیں آسکے گا جس سے اس کی دوستی یا رشتہ داری یا اس کی حمایت حاصل کرنے کا کوئی تعلق ہو۔ دیکھیے سورہ مومنون (۱۰۱) اور سورہ معارج (۱۰، ۱۱)۔

﴿۲﴾ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ: اور نہ کسی اور طرف سے مدد مل سکے گی۔

آیت 42: ﴿۱﴾ إِلَّا مَنْ رَحِمَ اللَّهُ: یعنی جس پر اللہ نے رحم فرما دیا وہی بچے گا، جیسا کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «لَنْ يُنَجِّي أَحَدًا مِنْكُمْ عَمَلَهُ، قَالُوا وَلَا أَنْتَ يَا رَسُولَ اللَّهِ؟ قَالَ وَلَا أَنَا، إِلَّا أَنْ يَتَعَمَّدَنِي اللَّهُ بِرَحْمَةٍ» [بخاری، الرقاق، باب الفصد والمداومة على العمل: ۶۶۳] ”تم میں کسی کو اس کا عمل نجات نہیں دلائے گا۔“ صحابہ نے کہا: ”یا رسول اللہ! کیا آپ کو بھی نہیں؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”مجھے بھی نہیں، الا یہ کہ اللہ مجھے

إِنَّ شَجَرَتَ الرَّقُومِ ﴿۳۳﴾ طَعَامُ الْأَثِيمِ ﴿۳۴﴾ كَالنَّهْلِ يُغَلِي فِي الْبُطُونِ ﴿۳۵﴾ كَغَلِي الْعَيْمِ ﴿۳۶﴾ خُدُوهُ فَاعْتَلُوهُ إِلَى سَوَاءِ الْجَحِيمِ ﴿۳۷﴾ ثُمَّ صُبُّوا فَوْقَ رَأْسِهِ مِنْ عَذَابِ الْحَمِيمِ ﴿۳۸﴾

جبے شک زقوم کا درخت ﴿۳۳﴾ سخت گناہ گار کا کھانا ہے ﴿۳۴﴾ پھلے ہوئے تانبے کی طرح، پیٹوں میں کھولتا ہے ﴿۳۵﴾ گرم پانی کے کھولنے کی طرح ﴿۳۶﴾ اسے پکڑو، پھر اسے بھرتی آگ کے درمیان تک گھیٹ کر لے جاؤ ﴿۳۷﴾ پھر کھولتے پانی کا کچھ عذاب اس کے سر پر اٹھایو ﴿۳۸﴾

ایما رحمت کے ساتھ ڈھاپ لے۔“

﴿۳۳﴾ إِنَّهُ هُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ : یہ اس بات کا جواب ہے کہ کوئی کسی کی مدد کیوں نہیں کر سکے گا؟ فرمایا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ہی سب پر غالب ہے، وہ جو فیصلہ کر دے گا وہ نافذ ہو کر رہے گا۔ کسی میں اسے روکنے یا بدلنے کی یا اس کی مرضی کے بغیر سفارش کرنے کی جرأت نہیں ہوگی۔ ”الرَّحِيمُ“ کا مطلب یہ ہے کہ وہ سب پر غالب ہونے کے باوجود بے حد مہربان ہے، کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ وہ چاہے تو قصور وار کی سزا معاف کر دے یا اس میں کمی کر دے یا کسی کو اس عمل سے بہت زیادہ جزا دے دے، مگر وہ جرم کے بغیر کسی کو سزا نہیں دیتا۔

آیت 43 : إِنَّ شَجَرَتَ الرَّقُومِ : ”الرَّقُومِ“ کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ صافات (۶۲-۶۳)۔

آیت 44 : طَعَامُ الْأَثِيمِ : ”الْأَثِيمِ“ سے مراد یہاں کافر و مشرک اور قیامت کا منکر ہے، کیونکہ پیچھے انھی کا ذکر آ رہا ہے اور آگے آیت (۵۰) : ﴿إِنَّ هَذَا مِمَّا كُنْتُمْ بِهِ تَمْتَرُونَ﴾ (یہ ہے جس میں تم شک کیا کرتے تھے) سے بھی ظاہر ہے کہ یہ لوگ مومن نہیں ہوں گے، کیونکہ ایمان تو یقین کا نام ہے۔ سورہ قلم میں بھی ”اشیم“ کا لفظ کافر کے متعلق آیا ہے، فرمایا: ﴿مَنَازِعِ الَّذِينَ مُعْتَبِرِ الْأَثِيمِ﴾ (الفہم: ۱۲) ”خیر کو بہت روکنے والا، حد سے بڑھنے والا، سخت گناہ گار ہے۔“ سورہ جاثیہ میں فرمایا: ﴿وَيُنزَلُ لَكُمْ أَقَالِكُمْ﴾ (النحلیہ: ۱۷) ”بڑی بلاکت ہے ہر سخت جھوٹے، گناہ گار کے لیے۔“

آیت 45 : كَالنَّهْلِ يُغَلِي فِي الْبُطُونِ : ”النَّهْلُ“ کے کئی معنی ہیں، گھلا ہوا تانبا، لوہا یا کوئی دھات، گرم تیل کی تلچھٹ، پیپ اور لہو۔ مزید دیکھیے سورہ کہف (۲۹)۔

آیت 45 : كَغَلِي الْعَيْمِ : ”الْعَيْمِ“ نہایت گرم پانی۔

آیت 47 : خُدُوهُ فَاعْتَلُوهُ إِلَى سَوَاءِ الْجَحِيمِ : ”عَتَلٌ يُغَلِي“ (ض، ن) سختی سے گھیٹ کر لے جانا۔ ”سَوَاءٌ“ کا معنی درمیان ہے، کیونکہ درمیان کی چیز ہر طرف سے برابر ہوتی ہے۔

آیت 48 : ثُمَّ صُبُّوا فَوْقَ رَأْسِهِ مِنْ عَذَابِ الْحَمِيمِ : اس آیت کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ حج کی آیت (۱۹، ۲۰) کی تفسیر۔

ذُقْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْكَرِيمُ ﴿۴۹﴾ إِنَّ هَذَا مَا كُنْتُمْ بِهِ تَمْتَرُونَ ﴿۵۰﴾ إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي مَقَامٍ أَمِينٍ ﴿۵۱﴾ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ﴿۵۲﴾ يَلْبَسُونَ مِنْ سُنْدُسٍ وَإِسْتَبْرَقٍ مُتَّكِلِينَ ﴿۵۳﴾ كَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿۵۴﴾

چکھ، بے شک تو ہی وہ شخص ہے جو بڑا زبردست، بہت باعزت ہے ﴿۴۹﴾ بے شک یہ ہے جس میں تم شک کیا کرتے تھے ﴿۵۰﴾ بے شک متقی لوگ امن والی جگہ میں ہوں گے ﴿۵۱﴾ باغوں اور چشموں میں ﴿۵۲﴾ وہ باریک ریشم اور گاڑھے ریشم کا لباس پہنیں گے، اس حال میں کہ آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے ﴿۵۳﴾ اسی طرح ہوگا اور ہم ان کا نکاح سفید جسم، آنکھوں والی عورتوں سے کر دیں گے، جو بڑی آنکھوں والی ہیں ﴿۵۴﴾

آیت 49 ذُقْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْكَرِيمُ: ”ذُقْ“ ”ذائقِ بِنْدُوْقٍ ذُوْقًا“ (ن) سے امر ہے، چکھو۔ یہ بات ان سے طور اور مذاق کے طور پر کہی جائے گی، کیونکہ وہ دنیا میں اپنے آپ کو ایسا ہی سمجھتے اور باور کرواتے تھے۔ جملے کی خبر ”الْعَزِيزُ الْكَرِيمُ“ پر الف لام اور ضمیر فصل ”اَنْتَ“ سے حصر کا مضموم پیدا ہو رہا ہے کہ تو ہی وہ شخص ہے جو عزیز و کریم ہے۔

آیت 50 إِنَّ هَذَا مَا كُنْتُمْ بِهِ تَمْتَرُونَ: یعنی یہ ہے وہ جہنم جس کا تمہیں یقین نہیں تھا۔ فرشتے انہیں جہنم کی ماروں سے دے کر جتنا کس گئے کہ یہ وہ آگ ہے جس میں تم شک کرتے تھے اور جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔ دیکھیے سورہ طور (۱۵۲-۱۵۳)۔

آیت 51 إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي مَقَامٍ أَمِينٍ: کفار کے برے انجام کے ذکر کے بعد متقین کے حسن انجام کا ذکر فرمایا۔ ”مَقَامٍ أَمِينٍ“ (امن والی جگہ) سے مراد وہ جگہ جہاں نہ موت کا کھٹکا ہے نہ نکالے جانے کی فکر، نہ کوئی غم نہ پریشانی اور محنت نہ مشقت۔ ابوسعید خدری اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «بِنَادِيٍّ مُنَادٍ إِنَّ لَكُمْ أَنْ نَصَحُوا فَلَا تَسْقُمُوا أَبَدًا وَإِنَّ لَكُمْ أَنْ تَحْبُوا فَلَا تَمُوتُوا أَبَدًا وَإِنَّ لَكُمْ أَنْ تَسْتَبِقُوا فَلَا تَهْرَمُوا أَبَدًا وَإِنَّ لَكُمْ أَنْ تَنَعَمُوا فَلَا تَبْأَسُوا أَبَدًا» (مسب، الجنة و صفة عبيها، باب في دولة نبي أهل الجنة: ۲۸۳۷ | (اہل جنت کو) ایک آواز دینے والا آواز دے گا کہ تمہیں یہ نعمت حاصل ہے کہ تم تندرست رہو گے کبھی بیمار نہ ہو گے اور تمہیں یہ نعمت حاصل ہے کہ زندہ رہو گے کبھی نہیں مرو گے اور تمہیں یہ نعمت حاصل ہے کہ جوان رہو گے کبھی بوڑھے نہیں ہو گے اور تمہیں یہ نعمت حاصل ہے کہ خوش حال رہو گے کبھی خستہ حال نہیں ہو گے۔“

آیت 52 فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ: یہ امن والی جگہ کا بیان ہے۔ تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ حجر (۲۵)۔

آیت 52 يَلْبَسُونَ مِنْ سُنْدُسٍ وَإِسْتَبْرَقٍ مُتَّكِلِينَ: ”سُنْدُسٍ“ باریک ریشمی کپڑا۔ ”اِسْتَبْرَقِ“ گاڑھے ریشم کا کپڑا۔ ”مُتَّكِلِينَ“ آمنے سامنے، کسی کی پشت دوسرے کی طرف نہیں ہوگی۔

آیت 50 كَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ: ”كَذَلِكَ“ ”أَيُّ الْأَمْرِ كَذَاكَ“ یا ”يَكُونُ كَذَاكَ“ یعنی ایسے ہی ہوگا، نہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

يَدْعُونَ فِيهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ أَمِينٍ ﴿۵۵﴾ لَا يَذُوقُونَ فِيهَا الْمَوْتَ إِلَّا الْمَوْتَةَ الْأُولَىٰ
وَوَقَّهْمُ عَذَابَ الْجَحِيمِ ﴿۵۶﴾

وہ اس میں ہر پھل بے خوف ہو کر منگوار ہے ہوں گے ﴿۵۵﴾ وہ اس میں موت کا مزہ نہیں چکھیں گے، مگر وہ موت جو پہلی تھی اور وہ انھیں بھڑکتی آگ کے عذاب سے بچائے گا ﴿۵۶﴾

﴿۵۵﴾ وَذُوقْتُمْ بِخُورٍ عَيْنٍ: "خُورٌ" "خُورًا" کی جمع ہے، نہایت گوری عورت جس کی آنکھوں کی سیاہی بہت سیاہ اور سفیدی بہت سفید ہو، جسے دیکھتے ہی بندہ حیران رہ جائے۔ بعض نے معنی کیا، سیاہ آنکھ والی عورت جس کی آنکھ میں سفیدی کا مزہ بہت کم ہو۔ "عَيْنٌ" "عَيْنًا" کی جمع ہے، بڑی آنکھوں والی عورت۔

آیت 55 يَدْعُونَ فِيهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ أَمِينِينَ: بے خوف ہو کر منگوانے کا مطلب یہ ہے کہ نہ انھیں یہ لگے ہو گا کہ وہ چیز موجود نہ ہو، نہ یہ کہ قیمت کہاں سے ادا کریں گے، نہ یہ کہ ختم ہو جائے گی، نہ یہ کہ کھانے سے بدبھٹی نہ ہو جائے، پھر نہ قبض کا خوف نہ اسہال کا۔ غرض جو چاہیں گے بے لگے ہو کر جنت کے خادموں کو لانے کا حکم دیں گے۔

آیت 56 ﴿۱﴾ لَا يَذُوقُونَ فِيهَا الْمَوْتَ إِلَّا الْمَوْتَةَ الْأُولَىٰ: ابو سعید خدری رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «يُؤْتَى بِالْمَوْتِ كَهَيْئَةِ كَنْبَسٍ أَمْلَحَ فَيُنَادِي مُنَادٍ يَا أَهْلَ الْحَنَةِ افْيَسْرِيئُونَ وَ يَنْظُرُونَ فَيَقُولُ هَلْ تَعْرِفُونَ هَذَا؟ فَيَقُولُونَ نَعَمْ، هَذَا الْمَوْتُ وَ كُنْهَمُ قَدْ رَأَوْهُ، ثُمَّ يُنَادِي يَا أَهْلَ النَّارِ! فَيَسْرِيئُونَ وَ يَنْظُرُونَ فَيَقُولُ هَلْ تَعْرِفُونَ هَذَا؟ فَيَقُولُونَ نَعَمْ، هَذَا الْمَوْتُ وَ كُنْهَمُ قَدْ رَأَوْهُ، فَيَذْبَحُ ثُمَّ يَقُولُ يَا أَهْلَ الْحَنَةِ اخْبُودُوا فَلَا مَوْتَ وَ يَا أَهْلَ النَّارِ! اخْبُودُوا فَلَا مَوْتَ، ثُمَّ قَرَأَ: ﴿وَ أَنْذَرَهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ إِذْ قُضِيَ الْأَمْرُ وَ هُمْ فِي غَفْلَةٍ﴾ هُوَ لَا فِي غَفْلَةِ أَهْلِ الدُّنْيَا ﴿وَ هُمْ لَا يُؤْمِنُونَ﴾» [بخاری، التفسیر، باب قوله عز وجل: ﴿وَ أَنْذَرَهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ﴾: ۱۷۳]

”موت کو ایک چستکبرے میں ڈھکی شکل میں لایا جائے گا، پھر ایک آواز دینے والا آواز دے گا: ”اے جنت والو!“ اور وہ سرائٹھائیں گے اور دیکھیں گے۔ وہ کہے گا: ”کیا تم اسے پہچانتے ہو؟“ وہ کہیں گے: ”ہاں! یہ موت ہے۔“ اور وہ سب سے دیکھ چکے ہوں گے، پھر وہ آواز دے گا: ”اے آگ والو!“ تو وہ سرائٹھائیں گے اور دیکھیں گے، وہ کہے گا: ”کیا تم اسے پہچانتے ہو؟“ وہ کہیں گے: ”ہاں! یہ موت ہے۔“ اور وہ سب اسے دیکھ چکے ہوں گے، تو اسے ذبح کر دیا جائے گا۔ پھر وہ کہے گا: ”اے جنت والو! (اب) بیٹھتی ہے، کوئی موت نہیں اور اے آگ والو! (اب) بیٹھتی ہے، کوئی موت نہیں۔“ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی: ﴿وَ أَنْذَرَهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ إِذْ قُضِيَ الْأَمْرُ وَ هُمْ فِي غَفْلَةٍ﴾ [مریم: ۳۹] اور انھیں بچھتاوے کے دن سے ڈرا جب فیصلہ کر دیا جائے گا اور وہ سراسر غفلت میں ہیں۔ یعنی وہ سراسر دنیا کی غفلت میں ہیں اور وہ ایمان نہیں لاتے۔“ مزید دیکھیے سورہ مریم (۳۹)۔

فَضْلًا مِّن تَرَبِّكَ ۖ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿۵۷﴾ فَاِنَّمَا يَسِّرُنَا لِبَلْسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ
فَاَرْتَقِبْ اِنَّهُمْ مُّرْتَقِبُوْنَ ﴿۵۸﴾

۲۳

تیرے رب کی طرف سے فضل کی وجہ سے، یہی بہت بڑی کامیابی ہے ﴿۵۷﴾ سو حقیقت یہی ہے کہ ہم نے اسے تجھ
زبان میں آسان کر دیا، تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں ﴿۵۸﴾ پس انتظار کر، بے شک وہ بھی انتظار کرنے والے ہیں ﴿۵۸﴾

﴿۵۷﴾ وَوَقَّهٖمُ عَذَابَ الْجَحِيْمِ: یہاں ایک سوال ہے کہ جو شخص جنت میں داخل ہو گیا اس کا جہنم سے بچنا تو خود بخود نکلا
ہے، پھر یہ کہنے کی کیا ضرورت ہے کہ وہ انھیں بھڑکتی آگ سے بچالے گا۔ جواب اس کا یہ ہے کہ جنت کی قدر پوری طرح اس
وقت معلوم ہوتی ہے جب اس کے پیش نظر یہ بات بھی ہو کہ اگر میں جہنم میں ہوتا تو میرا کیا حال ہوتا۔

آیت 57 ﴿۵۷﴾ فَضْلًا مِّن تَرَبِّكَ ۖ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ: یعنی جنت میں داخلہ کسی کے استحقاق یا اعمال کی وجہ سے نہیں
ہوگا بلکہ محض اللہ کے فضل سے ہوگا، کیونکہ آدمی جتنے اعمال بھی کرے وہ اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت کا بدل نہیں ہو سکتے۔ اس سے
پہلے آیت (۳۲) کی تفسیر میں رسول اللہ ﷺ کی حدیث گزر چکی ہے کہ کسی بھی شخص کو اس کا عمل جنت میں داخل نہیں کرے گا
وہاں ملاحظہ فرمائیں۔

آیت 58 ﴿۵۸﴾ فَاِنَّمَا يَسِّرُنَا لِبَلْسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ: سورت کی ابتدا قرآن کریم کی عظمت و اہمیت کے بیان سے
ہوئی تھی، آخر میں پھر اسی کی طرف توجہ دلائی کہ ہم نے یہ قرآن آپ کی زبان عربی میں آسان کر دیا ہے، تاکہ عرب لوگ اسے
اپنی زبان میں ہونے کی وجہ سے آسانی کے ساتھ سمجھ لیں اور غیر عرب لوگوں کو سمجھائیں۔ مزید دیکھیے سورہ مریم کی آیت
(۹۷) کی تفسیر۔

آیت 59 ﴿۵۹﴾ فَاَرْتَقِبْ اِنَّهُمْ مُّرْتَقِبُوْنَ: یعنی اگر قرآن آسان ہونے کے باوجود یہ لوگ نصیحت حاصل نہیں کرتے تو آپ
انتظار کیجئے کہ کب اللہ کی پکڑ ان پر آتی ہے۔ یہ لوگ بھی انتظار کر رہے ہیں کہ آپ کب زمانے کی کسی گردش میں آتے ہیں اور
کب ان کی جان چھوٹی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿اَمْ يَقُولُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُّ بِهٖ مَّرِيْبَ الْمُنُوْنِ ﴿۱﴾ قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّي مَعَكُمْ مِنَ
الْمُنْتَرَبِّصِيْنَ ﴿۲﴾ [الطور: ۳۰، ۳۱] ”یا وہ کہتے ہیں کہ یہ ایک شاعر ہے جس پر ہم زمانے کے حوادث کا انتظار کرتے ہیں؟ کہہ
دے انتظار کرو، پس بے شک میں (بھی) تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں سے ہوں۔“



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حَمْدٌ ۱ تَنْزِیْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْحَكِیْمِ ۲ اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لٰاٰیٰتٍ
لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ۳

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

حَمْدٌ ۱ اس کتاب کا اتارنا اللہ کی طرف سے ہے جو سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ۲ بلاشبہ آسمانوں اور
زمین میں ایمان والوں کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں ۳

آیت 1 حَمْدٌ: حروف مقطعات کی وضاحت کے لیے دیکھیے سورہ بقرہ کی پہلی آیت۔

آیت 2 تَنْزِیْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْحَكِیْمِ: اس آیت میں دو باتیں بیان کی گئی ہیں، ایک یہ کہ یہ کتاب محمد ﷺ
کی تصنیف نہیں بلکہ یہ آپ ﷺ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بتدریج نازل کی گئی ہے، کیونکہ ”تَنْزِیْلُ“ کے مفہوم میں تھوڑا تھوڑا
کر کے نازل کرنا بھی ہے۔ دوسری یہ کہ اسے نازل کرنے والی کوئی معمولی ہستی نہیں کہ چاہو تو اس کی بات مان لو، چاہو تو نہ
مانو، بلکہ اسے نازل کرنے والا وہ ہے جو سب پر غالب ہے، کوئی اس کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتا اور اگر کرتا ہے تو اس کی سزا
سے بچ کر نہیں نہیں جاسکتا۔ وہ کمال حکمت والا ہے، اس کے کسی کام میں غلطی نہیں نکالی جاسکتی۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے
سورہ زمر اور سورہ مومن کی ابتدا۔

آیت 3 اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لٰاٰیٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ: سورہ بقرہ (۱۶۳) میں ”اِنَّ فِی خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ“ فرمایا،
جبکہ یہاں ”اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ“ فرمایا، تو یہ اس سے عام ہے، کیونکہ اس میں آسمان و زمین کی پیدائش بھی شامل ہے
اور ان کی ذات بھی۔ یہاں سوالیہ پیدا ہوتا ہے کہ آسمانوں اور زمین میں اور ان کے بعد مذکور چیزوں میں کس چیز کی نشانیاں
ہیں؟ جواب یہ ہے کہ یہ بات معلوم تھی کہ مشرکین اللہ تعالیٰ کی توحید کو اور قیامت کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھے، کچھ دہریے بھی
تھے جو اللہ تعالیٰ کے وجود ہی کو نہیں مانتے تھے، جیسا کہ اسی سورت کی آیت (۲۳) میں آرہا ہے: ﴿وَقَالُوا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا
النَّٰثِرَاتُ نُوْتٌ وَنَحْنَا اَوْ مَا يَهْدِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ﴾ ”اور انھوں نے کہا ہماری اس دنیا کی زندگی کے سوا کوئی (زندگی) نہیں، ہم
(ہمیں) مرتے اور جیتے ہیں اور ہمیں زمانے کے سوا کوئی بلاک نہیں کرتا۔“ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے وجود، اپنی توحید اور
قیامت پر دلالت کرنے والی بہت سی نشانیاں کا ذکر فرمایا۔ جن میں سب سے پہلے آسمان و زمین کا ذکر فرمایا کہ ان کے وجود
میں ایمان والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں، کیونکہ نشانوں کا قاعدہ انھی کو ہوتا ہے جو ماننے کے لیے تیار ہوں، غفلت میں
پڑے ہوئے لوگ اور بہت دھرم لوگ، جنہوں نے طے کر رکھا ہے کہ ماننا ہی نہیں ان کے لیے ان نشانوں کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔

وَفِي خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُتُّ مِنْ دَابَّةٍ آيَاتٌ لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ ﴿٤﴾

اور تمہارے پیدا کرنے میں اور ان جاندار چیزوں میں جنہیں وہ پھیلاتا ہے، ان لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جو یقین رکھتے ہیں ﴿۴﴾

یہ بات کہ آسمان و زمین میں اللہ تعالیٰ کے وجود، اس کی توحید اور قیامت کی نشانیاں کس طرح ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ کائنات اور اس کا نظام شاید ہے کہ یہ سب کچھ خود-خود نمود نہیں بن گیا، بلکہ اسے کسی بنانے والے نے بنایا ہے اور وہ ایک ہی ہے، کیونکہ اس میں الگ الگ خداؤں کی خدائی چلنے کی گنجائش ہی نہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا﴾ [الانبیاء: ۲۲] ”اگر ان دونوں میں اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہوتے تو وہ دونوں ضرور بگڑ جاتے۔“ اس آیت کی تفسیر پر نظر ڈال لیں۔ آسمان و زمین کا وجود اس بات کی بھی شہادت دے رہا ہے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ نے بے مقصد پیدا نہیں کیا، بلکہ اس نے یہ سب کچھ انسان کے فائدے کے لیے پیدا کیا ہے اور قیامت کے دن ہر ایک کو اس کے اعمال کی جزا دی جائے گی، جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالاختلافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَبْصَارِ﴾ [الذین ۱-۲] ”الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَمًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَرَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا ۖ مُّبِينًا فَصَبِّرْنَا عِدَابَ النَّارِ﴾ [آل عمران: ۱۹۰، ۱۹۱] ”بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے اور رات اور دن کے بدلنے میں عقلوں والوں کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں۔ وہ لوگ جو کھڑے اور بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور و فکر کرتے ہیں، اسے ہمارے رب اتونے یہ بے مقصد پیدا نہیں کیا، تو پاک ہے، سو ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔“ اور جیسا کہ اسی سورت میں آگے آرہا ہے: ﴿وَخَلَقَ اللَّهُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ وَالتَّوْبَتِ كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ﴾ [الحاشیہ: ۲۲] ”اور اللہ نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا اور تاکہ ہر شخص کو اس کا بدلہ دیا جائے جو اس نے کیا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔“

آیت ۴: ﴿۱﴾ وَفِي خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُتُّ مِنْ دَابَّةٍ : یعنی جو لوگ انسان کی پیدائش میں اور خشکی اور سمندر میں پھیلائی ہوئی جاندار مخلوقات میں، جن کا شمار نہیں، غور کریں گے انہیں بے شمار ایسی نشانیاں ملیں گی جنہیں دیکھ کر کوئی شبہ باقی نہیں رہے گا کہ یقیناً یہ سب کچھ ایک ہی خالق و مالک کا بنایا ہوا ہے اور وہی اسے چلا رہا ہے اور سب کچھ بے مقصد پیدا نہیں کیا گیا، بلکہ یقیناً ایک دن ہر ایک کو اس کے اعمال کی جزا ملنے والی ہے۔

﴿۲﴾ آيَاتٌ لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ : یعنی جو لوگ شک کی پھولوں میں بھٹکتے رہنے کا یا انکار کا فیصلہ کر چکے ہوں ان کی بات دوسری ہے، مگر جو لوگ بات ثابت ہو جانے پر یقین کرنے والے ہیں ان کے لیے انسان کی پیدائش میں اور زمین میں پھیلی ہوئی بے شمار جاندار مخلوقات میں اللہ تعالیٰ کے وجود، اس کی توحید اور قیامت کی بہت سی نشانیاں ہیں۔

وَإِخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ رِزْقٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِيفِ الرِّيحِ آيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿٥﴾ تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ تَنْزِيلُهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ،
فَبِآيَاتٍ حَدِيثِهَا بَعَدَ اللَّهُ وَآيَاتِهِ يُؤْمِنُونَ ﴿٦﴾

اور رات اور دن کے بدلنے میں اور اس رزق میں جو اللہ نے آسمان سے اتارا، پھر اس کے ساتھ زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کر دیا اور ہواؤں کے پھیرنے میں ان لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جو سمجھتے ہیں ﴿۵﴾ یہ اللہ کی آیات ہیں، ہم انہیں تجھ پر حق کے ساتھ پڑھتے ہیں، پھر اللہ اور اس کی آیات کے بعد وہ کس بات پر ایمان لائیں گے؟ ﴿۶﴾

ت 5 ﴿۵﴾ وَ إِخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ : اس میں دن کے بعد رات اور رات کے بعد دن کا آنا بھی شامل ہے، رات کا دن سے لمبا ہونا اور دن کا رات سے لمبا ہونا بھی اور سارا سال ہر روز طلوع و غروب کی جگہوں کا مختلف ہونا بھی۔

﴿۶﴾ وَمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ رِزْقٍ ... : یہاں آسمان سے نازل کی جانے والی چیز کے لیے ”مَاءٌ“ (پانی) کے بجائے ”رِزْقٍ“ کا لفظ استعمال فرمایا، کیونکہ آسمان سے بارش کے علاوہ بھی بہت کچھ اترتا ہے جس سے تمام جانداروں کے رزق کا اہتمام ہوتا ہے۔ مثلاً سورج اور چاند کی کرنیں اور روشنی، ہوائیں اور بہت سی چیزیں جو نظر نہیں آتیں مگر موجود ہیں اور اوپر کی جانب سے نازل ہوتی ہیں۔

﴿۷﴾ وَ تَصْرِيفِ الرِّيحِ : ہواؤں کی تقسیم بھی کئی طرح کی ہے، مثلاً مشرقی، مغربی، جنوبی یا شمالی یا ان کے درمیان کی ہوائیں، ٹھنڈی یا گرم یا معتدل ہوائیں، بار آور یا عقیم ہوائیں اور فائدہ پہنچانے والی یا نقصان پہنچانے والی ہوائیں وغیرہ۔ یاد رہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ کی جن نشانوں کا ذکر ہوا ہے سورہ بقرہ (۱۶۴) میں یہی نشانیاں زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہیں۔

﴿۸﴾ آيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ : مفسر قالی نے فرمایا: ”منصف لوگ جب آسمان و زمین کو دیکھیں گے تو ایمان لے آئیں گے کہ یقیناً انہیں ایک بنانے والا ہے، اس لیے وہاں فرمایا: ﴿لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُهُ﴾ [الجماعیہ : ۳] ”ایمان والوں کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں۔“ پھر جب اپنی پیدائش اور دوسرے جانداروں میں غور کریں گے تو ان کے ایمان میں اضافہ ہوگا اور وہ یقین کر لیں گے، اس لیے وہاں فرمایا: ﴿آيَاتٍ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ﴾ [الجماعیہ : ۴] ”ان لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جو یقین رکھتے ہیں۔“ پھر دوسری تمام مخلوقات پر غور و فکر کریں گے تو بہت اچھی طرح سمجھ جائیں گے، اس لیے یہاں فرمایا: ﴿آيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ﴾ ”ان لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جو سمجھتے ہیں۔“ (نظم الدرر)

ت 6 ﴿۶﴾ ﴿٥﴾ تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ تَنْزِيلُهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ : یعنی یہ اللہ تعالیٰ کی آیات ہیں جو ہم تجھے حق کے ساتھ پڑھ کر سنارہے ہیں، ان میں کوئی بات باطل نہیں، نہ ان میں کوئی جھوٹ ہے نہ جاود اور نہ یہ محض خیالی باتیں ہیں۔

وَيُنْزِلُ لِكُلِّ أَقْوَامٍ آيَاتِهِ ۗ يَسْمَعُ آيَاتِ اللَّهِ تُثَلِّىٰ عَلَيْهِ ثُمَّ يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا كَأَن لَّمْ يَسْمَعْهَا ۗ

فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ①

بڑی ہلاکت ہے ہر سخت جھوٹے، گناہ گار کے لیے ① جو اللہ کی آیات سنتا ہے، جبکہ اس کے سامنے پڑھی جاتی ہیں، پھر وہ تکبر کرتے ہوئے اڑا رہتا ہے، گویا اس نے وہ نہیں سنی، سوائے دردناک عذاب کی بشارت دے دے ①

② فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَ اللَّهِ وَآيَاتِهِ يُؤْمِنُونَ: یہاں ایک لمبی بات کو مختصر فرما دیا ہے کہ اگر یہ لوگ اللہ کی آیات سن کر بھی ایمان نہیں لاتے تو پھر اللہ کے بعد کون سی ہستی ہے اور اس کی آیات کے بعد کون سی بات ہے جس پر وہ ایمان لائیں گے؟

آیت 7: ① وَيُنْزِلُ لِكُلِّ أَقْوَامٍ آيَاتِهِ: آیات سن کر ان کا اثر قبول کرنے کے لحاظ سے لوگوں کی دو قسمیں ہیں۔ اس سے پہلے ان لوگوں کا ذکر تھا جو ایمان و یقین اور عقل سے بہرہ ور ہوتے ہیں، اب ان لوگوں کا ذکر ہے جو تکبر کی وجہ سے اللہ کی آیات کے انکار پر اصرار کرنے والے ہیں۔

② "وَيُنْزِلُ" کے لیے دیکھیے سورہ بقرہ کی آیت (۷۹) "إِنْفِكٌ" بدترین جھوٹ، بہتان۔ "أَقْوَامٍ" مبالغے کا صیغہ ہے، سخت جھوٹا۔ "آيَاتِهِ" سخت گناہ گار۔ یعنی ہر ایسے انسان کے لیے بہت بڑی ہلاکت اور بربادی ہے جو قول میں سخت جھوٹا اور فعل میں سخت گناہ گار ہے۔

آیت 8: ① يَسْمَعُ آيَاتِ اللَّهِ تُثَلِّىٰ عَلَيْهِ.....: جو اللہ کی آیات سنتا ہے، جو اس کے سامنے پڑھی جاتی ہیں، پھر تکبر کرتے ہوئے اپنے کفر و شرک پر ڈنار ہتا ہے جیسے اس نے انھیں سنا ہی نہیں، سوائے دردناک عذاب کی بشارت دے دے۔

② ثُمَّ يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا: یہاں "ثُمَّ" کا لفظ اظہارِ تعجب کے لیے ہے کہ اگر اس نے اللہ کی آیات نہ سنی ہوتیں تو الگ بات تھی، تعجب اس بات پر ہے کہ اللہ کی آیات اس کے سامنے پڑھی جاتی ہیں پھر وہ تکبر کرتے ہوئے کفر پر اصرار کرتا ہے، حالانکہ انسان کو تکبر زیب ہی نہیں دیتا، کیونکہ بڑائی تو صرف اللہ کی شان ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے سورہ انعام کے شروع میں فرمایا: ﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّورَ ۗ ثُمَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ يُعٰدِلُوْنَ﴾ [الانعام: ۱] "سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور اندھیروں اور روشنی کو بنایا، پھر (بھی) وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، اپنے رب کے ساتھ برابر ٹھہراتے ہیں۔"

③ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ: بشارت خوش خبری کو کہتے ہیں، یعنی خوشی کی وہ خبر جس کے آثار بشرہ پر ظاہر ہو جائیں۔ یہاں یہ لفظ تکلم یعنی استہزا کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اس آیت میں عذاب الیم کا ذکر فرمایا، اگلی آیت میں عذاب مہین کا اور اس سے اگلی آیت میں عذاب عظیم کا۔ اس آیت میں کفر پر اصرار اور استکبار کی مناسبت سے عذاب الیم کی بشارت سنائی ہے۔

وَإِذَا عَلِمَ مِنَ آيَتِنَا شَيْئًا اتَّخَذَهَا هُزُوًا وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ ۝۹ مِّنْ وَرَائِهِمْ جَهَنَّمُ ۖ وَلَا يُغْنِي عَنْهُمْ مَا كَسَبُوا شَيْئًا وَلَا مَا اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ أَوْلِيَاءَ ۗ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝۱۰

اور جب وہ ہماری آیات میں سے کوئی چیز جان لیتا ہے تو اسے مذاق بنا لیتا ہے، یہی لوگ ہیں جن کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے ۹ ان کے آگے جہنم ہے اور نہ وہ ان کے کچھ بھی کام آئے گا جو انہوں نے کمایا اور نہ وہ جو انہوں نے اللہ کے سوا حمایتی بنائے اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے ۱۰

آیت ۹ ﴿۹﴾ وَإِذَا عَلِمَ مِنَ آيَتِنَا شَيْئًا اتَّخَذَهَا هُزُوًا: ”اتَّخَذَهَا“ میں ضمیر ”ہا“ ”شَيْئًا“ کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے، کیونکہ ”شَيْئًا“ کا لفظ اگرچہ مذکر ہے مگر اس سے مراد کوئی ”آیۃ“ (آیت) ہے، اس لیے ضمیر مؤنث ”ہا“ استعمال فرمائی ہے اور ”آيَتِنَا“ کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے۔ پہلی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ جب وہ ہماری آیات میں سے کوئی آیت معلوم کر لیتا ہے (نئے وہ صحیح طور پر سمجھ نہیں پاتا یا جس کا مطلب الٹا نکال لیتا ہے) تو اسے مذاق بنا لیتا ہے۔ دوسری صورت میں مطلب یہ ہے کہ جب وہ ہماری آیات میں سے کوئی آیت معلوم کر لیتا ہے تو صرف اس کا مذاق اڑانے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ ہماری تمام آیات کو مذاق بنا لیتا ہے۔ مثلاً جب اس کے ہاتھ قرآن مجید کی کوئی ایسی بات آتی ہے جس کا مطلب توڑ مروڑ کر اس کا مذاق اڑا سکتا ہے تو تمام آیات کا مذاق اڑاتے ہوئے کہتا ہے کہ قرآن کی سبھی آیات ایسی ہیں۔ یہ اس کے بدترین ”افاک“ و ”اشیم“ ہونے کا بیان ہے کہ آیات الہی سن کر وہ کفر پر اصرار ہی نہیں کرتا بلکہ ناحق ان کا مذاق بھی اڑاتا ہے اور اتنا کہ انہیں مذاق بنا لیتا ہے۔

﴿۱۰﴾ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ: آیات الہی کی اہانت کے بدلے میں ان کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ اس آیت میں آیات سے استہزا اور ان کی توہین کی مناسبت سے ان کے لیے عذاب مہین کی خبر دی۔

آیت ۱۰ ﴿۱۰﴾ مِّنْ وَرَائِهِمْ جَهَنَّمُ: ”وَرَاءُ“ کا معنی ”پچھے“ بھی ہے اور ”آگے“ بھی۔ (دیکھیے کہف: ۷۹) کیونکہ یہ لفظ اس چیز کے لیے استعمال ہوتا ہے جو نگاہ سے اوجھل ہو۔ یعنی جہنم ان کے تعاقب میں ہے، یا جہنم ان کے آگے تیار ہے۔ دونوں معنی درست ہیں۔

﴿۱۰﴾ وَلَا يُغْنِي عَنْهُمْ مَا كَسَبُوا شَيْئًا: یعنی نہ ان کا مال ان کے کام آئے گا، نہ ان کی آل اولاد (دیکھیے آل عمران: ۱۰) اور نہ ان کے اچھے اعمال، کیونکہ انہوں نے دنیا میں اگر کچھ اچھے اعمال کیے بھی ہوں گے تو صرف دنیا کی نیت سے کیے جانے کی وجہ سے آخرت میں کام نہیں آسکیں گے، بلکہ برباد ہو جائیں گے۔ مزید دیکھیے سورہ فرقان (۲۳) اور سورہ کہف (۱۰۶ تا ۱۰۳)۔

﴿۱۰﴾ وَلَا مَا اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ أَوْلِيَاءَ.....: یعنی ان کے وہ داتا و دستگیر جنہیں وہ قیامت کے دن عذاب سے بچانے کی امید پر پکارتے رہے اور ان کی پوجا کرتے رہے، وہ ان کے کسی کام نہیں آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک ظلم عظیم ہے، فرمایا:

هَذَا هُدًى ۚ وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَهُمْ عَذَابٌ قَرِيبٌ ۖ إِنَّ اللَّهَ الَّذِي سَخَّرَ لَكُمْ الْبَحْرَ لِيَتَّخِرَ مِنْهُ الْفُلُكُ فِيهِ بِأَمْرِهِ ۖ وَارْتَبِعُوا مِنْ فَضْلِهِ ۖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۱۱﴾
 وَسَخَّرَ لَكُمْ قَا فِي السَّلْوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا قِنَّهُ ۖ إِنَّ فِي ذَلِكَ لآيَاتٍ لِقَوْمٍ
 يَتَّقُونَ ﴿۱۲﴾

یہ سراسر ہدایت ہے اور وہ لوگ جنہوں نے اپنے رب کی آیات کا انکار کیا ان کے لیے عذاب میں سے دردناک عذاب ہے ﴿۱۱﴾ اللہ ہی ہے جس نے تمہاری خاطر سمندر کو مسخر کر دیا، تاکہ جہاز اس میں اس کے حکم سے چلیں اور تاکہ تم اس کا کچھ فضل تلاش کرو اور تاکہ تم شکر کرو ﴿۱۲﴾ اور اس نے تمہاری خاطر جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو اپنی طرف سے مسخر کر دیا، بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں جو غور و فکر کرتے ہیں ﴿۱۳﴾

﴿إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ﴾ [نعمان: ۱۳] ”بے شک شرک یقیناً بہت بڑا ظلم ہے۔“ اسی مناسبت سے ان کے لیے عذاب عظیم سنایا۔

آیت 11 ﴿هَذَا هُدًى﴾: یعنی یہ قرآن سراسر ہدایت ہے۔ ”ہُدًى“ مصدر بمعنی اسم فاعل برائے مبالغہ ہے، جیسے ”زَيْدٌ عَدْلٌ“ کا مطلب یہ ہے کہ زید اتنا عادل ہے کہ سراپا عدل ہے۔ ”هَذَا هُدًى“ کے معنی کی ایک تعبیر یہ ہے کہ ”یہ قرآن ہدایت میں کامل ہے۔“ زبخشری نے فرمایا: ”هَذَا هُدًى“ کا مطلب یہ ہے کہ یہ قرآن ہدایت میں کامل ہے، جیسے تم کہتے ہو ”زَيْدٌ رَجُلٌ“ یعنی ”زید رُجُولیت میں کامل ہے۔“

﴿وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ﴾ : ”رَبُّهُمْ“ کا لفظ عذاب کی سخت ترین صورتوں پر بولا جاتا ہے۔

آیت 12 ﴿اللَّهُ الَّذِي سَخَّرَ لَكُمْ الْبَحْرَ﴾: اس سے پہلی آیات میں کائنات کی تخلیق اور اس میں موجود بہت سی چیزوں کا ذکر اس لحاظ سے ہوا ہے کہ وہ سب اللہ تعالیٰ کے وجود، اس کی وحدانیت اور قیامت پر دلالت کرتی ہیں۔ یہاں سے سمندر کی تغیر اور دوسری چیزوں کا اس لحاظ سے ذکر شروع ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ انسان پر اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں، جن کا شکر اس پر واجب ہے، مگر انہوں نے اسے چھوڑ کر ایسی ہستیوں کو اپنا داتا و دستگیر، مشکل کشا اور حاجت روا بنا رکھا ہے جن کا ان نعمتوں میں کوئی دخل نہیں اور اس طرح وہ یہ تمام نعمتیں عطا کرنے والے کے شکر کے بجائے اس کی نعمتوں کا صاف انکار اور ناشکری کر رہے ہیں۔

﴿اللَّهُ﴾ مبتدا اور ”الَّذِي سَخَّرَ لَكُمْ الْبَحْرَ“ اس کی خبر ہے، جو معرفہ ہے، اس سے کلام میں حصر پیدا ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے تمہاری خاطر سمندر کو مسخر کر رکھا ہے۔ اس آیت کی مزید تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ نحل کی آیت (۱۳) کی تفسیر۔

آیت 13 ﴿وَسَخَّرَ لَكُمْ قَا فِي السَّلْوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا قِنَّهُ﴾: بچھلی آیت اور اس آیت میں ”سَخَّرَ لَكُمْ“ کا

قُلْ لِلَّذِينَ آمَنُوا يَغْفِرُوا لِلَّذِينَ لَا يَرْجُونَ أَيَّامَ اللَّهِ لِيَجْزِيَ قَوْمًا بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿۱۴﴾

ان لوگوں سے جو ایمان لائے کہہ دے کہ وہ ان لوگوں کو معاف کر دیں جو اللہ کے دنوں کی امید نہیں رکھتے، تاکہ وہ کچھ لوگوں کو اس کا بدلہ دے جو وہ کماتے رہے تھے ﴿۱۴﴾

”لام“ انتفاع کے لیے ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے سمندر کو اور آسمان و زمین میں موجود ہر چیز کو تمہارے فائدے کے لیے مسخر اور اپنا تابع فرمان بنا دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس نے یہ سب کچھ تمہارے تابع فرمان بنا دیا ہے۔ آسمان و زمین، سورج چاند اور سمندر تو بہت دور کی بات ہے انسان کا اپنا سانس اور دل کی دھڑکن اس کے اپنے تابع فرمان نہیں، پھر اس کا تسخیر کائنات کا دعویٰ دیوانے کی بڑکے سوا کیا ہو سکتا ہے۔ لفظ ”بِحِينَعَا فَنَّهُ“ اس بات کی تصریح کے لیے ہے کہ ان تمام چیزوں کو تمہارے فائدے کے لیے کام میں لگا دینا صرف اس کا کام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بات متعدد مقامات پر فرمائی ہے کہ اس نے زمین و آسمان کی ہر چیز کو انسان کے فائدے کے لیے مسخر کر رکھا ہے۔ دیکھیے سورہ حج (۶۵) اور سورہ لقمان (۲۰)۔

﴿۱۴﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ: یعنی جو بھی اپنے آپ کو خدا اور ہٹ دھرمی سے الگ کر کے غور و فکر سے کام لے گا، وہ یہ دیکھ کر کہ یہ تمام نعمتیں عطا کرنے والا تو صرف اللہ تعالیٰ ہے، اس کا شکر کرے گا اور اس اکیلے کی عبادت کرے گا۔

ت 14 ﴿۱﴾ قُلْ لِلَّذِينَ آمَنُوا يَغْفِرُوا لِلَّذِينَ لَا يَرْجُونَ: ”رَجَا يَرْجُو رَجَاءً“ (ن) کا معنی امید کرنا ہے۔ اس کے ضمن میں خوف بھی ہوتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ امید پوری نہ ہو۔ غرض اس کے معنی امید اور خوف دونوں کر لیے جاتے ہیں۔

﴿۲﴾ ”اَيَّامَ اللَّهِ“ (اللہ کے دنوں) سے مراد کسی قوم کے یادگار تاریخی دن ہیں، جن میں اللہ تعالیٰ اپنے دشمنوں کو خاص سزا دیتا ہے، یا اپنے فرماں بردار بندوں کو خاص انعام و اکرام سے نوازتا ہے۔ بعض اوقات ایسا ایک ہی دن کچھ لوگوں کے لیے سزا اور کچھ لوگوں کے لیے عطا کا دن ہوتا ہے، جیسے آل فرعون کا غرق ہونا ان کے لیے سزا کا دن تھا اور بنی اسرائیل کے لیے نجات کا۔ صحیح مسلم میں ابی بن کعب رضی اللہ عنہما سے مروی ایسی حدیث ہے، جس کے شروع میں ہے: «سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ إِنَّهُ بَيْنَمَا مَوْسَى عَلَيْهِ السَّلَامُ فِي قَوْمِهِ يُدْكِرُهُمْ بِأَيَّامِ اللَّهِ، وَأَيَّامِ اللَّهِ نِعْمَاؤُهُ وَبَلَاؤُهُ» [مسلم، الفضائل، باب من فضائل الخضر رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ: ۱۷۲/۲۳۸] ”میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ فرما رہے تھے: ”ایک دفعہ موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم میں انھیں اللہ کے ایام کے ساتھ نصیحت کر رہے تھے اور ایام اللہ سے مراد اس کی نعمتیں اور اس کی مصیبتیں ہیں۔“ لہذا ”جو لوگ اللہ کے دنوں کی امید نہیں رکھتے“ یا ”جو لوگ اللہ کے دنوں کا خوف نہیں رکھتے“ سے مراد کفار ہیں جو اس کی رحمت سے مایوس اور اس کی گرفت سے بے خوف ہیں۔ مومن تو ہر وقت اللہ کی رحمت کے امیدوار اور اس کے غضب سے ڈرتے رہتے ہیں۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ ۖ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا ۖ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُمْ تُرْجَعُونَ ﴿۱۵﴾

جس نے کوئی نیک عمل کیا تو وہ اسی کے لیے ہے اور جس نے برائی کی سو اسی پر ہے، پھر تم اپنے رب ہی کی طرف لوٹائے جاؤ گے ﴿۱۵﴾

③ یعنی ایمان والوں سے کہہ دے کہ اللہ تعالیٰ کے دنوں سے بے خوف لوگ یعنی کفار ان پر جو زیادتی کریں یا تکلیف پہنچائیں تو اس کے بدلے کی فکر کے بجائے ان سے درگزر کریں اور انہیں معاف کر دیں۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ حکم مکہ معظمہ میں دیا گیا تھا جب کفار کے مقابلے میں تلوار اٹھانے کی اجازت نہیں تھی، بعد میں جب قتال کی اجازت مل گئی تو یہ حکم منسوخ ہو گیا اور بعض نے فرمایا کہ یہ حکم منسوخ نہیں ہے، کیونکہ زیادتی برداشت کرنے کی تلقین اب بھی باقی ہے۔ رہی اسلام کی بنا پر کفار سے جنگ، تو اس کا معاملہ دوسرا ہے۔ یہی بات درست معلوم ہوتی ہے، کیونکہ ہجرت اور کفار سے لڑائی کی اجازت کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہی حکم دیا، جیسا کہ فرمایا: ﴿لَتَبْلُغْنَ فِيٰ أَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ ۖ وَتَسْمَعْنَ مِنَ الَّذِينَ أَوْتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا أَذًى كَثِيرًا ۚ وَإِنْ تَصُدُّوا عَنْتُمْ فَاِنَّ ذَلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ﴾ [آل عمران: ۱۸۶] ”یقیناً تم اپنے مالوں اور اپنی جانوں میں ضرور آزمائے جاؤ گے اور یقیناً تم ان لوگوں سے جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی اور ان لوگوں سے جنہوں نے شرک کیا، ضرور بہت سی ایذا سنو گے اور اگر تم صبر کرو اور متقی بنو تو بلاشبہ یہ ہمت کے کاموں سے ہے۔“ خود رسول اللہ ﷺ نے مدینہ جا کر بھی، جب آپ کے پاس قوت و سلطنت موجود تھی، کبھی اپنی ذات پر ہونے والی کسی زیادتی کا انتقام نہیں لیا۔ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: ﴿مَا أَنْتَقَمَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِنَفْسِهِ فِي شَيْءٍ يُؤْتَىٰ إِلَيْهِ حَتَّىٰ يُنْتَهَكَ مِنْ حُرْمَاتِ اللَّهِ فَيَنْتَقِمَ لِلَّهِ﴾ [بخاری، الحدود، باب كم التعزير والأدب؟: ۶۸۵۳] ”رسول اللہ ﷺ نے اپنی ذات کے لیے کسی چیز کا انتقام نہیں لیا، جس کا آپ سے معاملہ کیا گیا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی حرمتوں کو چاک کیا جاتا تو آپ ﷺ اللہ کے لیے انتقام لیتے تھے۔“

④ لِيَجْزِيَ قَوْمًا بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ: ”قَوْمًا“ سے مراد کافر ہوں تو مطلب یہ ہے کہ ایمان والوں سے کہہ دے کہ ان لوگوں کی زیادتی اور اذیت رسائی کو معاف کر دیں جو اللہ کی گرفت کے ایام کی توقع نہیں رکھتے، تاکہ بجائے اس کے کہ وہ ان سے بدلائیں خود اللہ تعالیٰ انہیں ان کے اعمال کا بدلہ دے جو وہ کماتے رہے تھے۔ ”قَوْمًا“ کمرہ ہے، اس لیے ترجمہ ”کچھ لوگوں کو“ کیا گیا ہے۔ اور اگر ”قَوْمًا“ سے مراد مومن ہوں تو مطلب ہوگا کہ ایمان والوں سے کہہ دے کہ وہ ان لوگوں کی زیادتی اور تکلیف کو معاف کر دیں جو اللہ کی گرفت کے ایام کی توقع نہیں رکھتے، تاکہ اللہ تعالیٰ انہیں اس صبر اور غنم و درگزر کا بدلہ عطا فرمائے جو وہ کفار کی اذیت رسائی کے مقابلے میں کرتے رہے تھے۔

آیت 15 ﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ.....﴾ : اس آیت کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ حم سجدہ کی آیت (۳۶) کی تفسیر۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الظَّيْتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿۱۶﴾ وَآتَيْنَاهُمْ بَيِّنَاتٍ مِنَ الْأَمْرِ فَمَا اخْتَلَفُوا إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ لَا بَغْيًا بَيْنَهُمْ إِنَّ رَبَّكَ يَقْضِي بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿۱۷﴾

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب اور حکم اور نبوت دی اور انھیں پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور انھیں جہانوں پر فضیلت بخشی ﴿۱۶﴾ اور ہم نے انھیں (دین کے) معاملے میں واضح احکام عطا کیے، پھر انھوں نے اختلاف نہیں کیا مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس علم آ گیا، آپس میں ضد کی وجہ سے، بے شک تیرا رب ان کے درمیان قیامت کے دن اس کے بارے میں فیصلہ کرے گا جس میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے ﴿۱۷﴾

آیت 16 ﴿۱۶﴾ وَلَقَدْ آتَيْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ الْكِتَابَ.....: پچھلی آیات ”اللَّهُ الَّذِي سَخَّرَ لَكُمْ الْبَحْرَ“ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی چند نعمتوں کا ذکر فرمایا جو اس نے تمام انسانوں پر فرمائی ہیں، تاکہ وہ اس کا شکر ادا کریں اور کفر و شرک سے اجتناب کریں اور اس آیت میں ان نعمتوں کا ذکر فرمایا جو اس نے خصوصاً بنی اسرائیل پر کیں۔ ”الْكِتَابَ“ سے مراد کوئی ایک کتاب نہیں بلکہ جس کتاب ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل میں بہت سے صاحب کتاب انبیاء مبعوث فرمائے۔ تورات، انجیل اور زبور تو عام معروف ہیں، ان کے علاوہ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ اس نے انھیں کتنی کتابیں عطا فرمائیں۔

﴿۱۷﴾ وَالْحُكْمَ : ”الْحُكْمَ“ کا معنی فیصلہ اور قوت فیصلہ ہے۔ یہاں مراد یہ ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل کو آزادی اور حکومت بخشی، جس میں وہ اپنے فیصلے خود کر سکتے تھے، کیونکہ اپنی حکومت کے بغیر اسلام پر پوری طرح عمل ہو ہی نہیں سکتا۔ موسیٰ ﷺ نے فرعون سے نجات اور آزادی ملنے پر بنی اسرائیل کو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں بادشاہ بنا دیا، کیونکہ آزاد قوم کا ہر فرد ہی بادشاہ ہوتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ يُقَوْمِ اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَعَلَ فِيكُمْ أَنْبِيَاءَ وَجَعَلَكُمْ مُلُوكًا وَآتَاكُمْ مَا أَمْرَأَتُهُمْ يُوتِيهِنَّ يَوْمَ الْآخِرَةِ إِذْ هُنَّ حَائِمَاتٌ﴾ العنکبوت: ۲۰ اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم! اپنے اوپر اللہ کی نعمت یاد کرو، جب اس نے تم میں انبیاء بنائے اور تمہیں بادشاہ بنا دیا اور تمہیں وہ کچھ دیا جو جہانوں میں سے کسی کو نہیں دیا۔ بعد میں داؤد علیہ السلام اور دوسرے اسرائیلی حکمرانوں کی حکومتیں بھی انھیں اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ اس ”الْحُكْمَ“ میں شامل ہیں۔

﴿۱۸﴾ وَالنُّبُوَّةَ: بنی اسرائیل میں جتنے نبی مبعوث ہوئے کسی اور قوم میں اتنے زیادہ نبیوں کے آنے کا کہیں ذکر نہیں۔

﴿۱۹﴾ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الظَّيْتِ: ان طیبات میں صحرا کے اندر کھانے کے لیے من و سنونی، پینے کے لیے بارہ چشمے اور بادلوں کا سایہ بھی شامل ہے اور بعد میں شام و مصر کی زرخیز و بارکت زمین کی حکومت اور وہاں سے حاصل ہونے والی بے شمار نعمتیں بھی شامل ہیں۔

﴿۲۰﴾ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ: اس کی وضاحت کے لیے دیکھیے سورہ بقرہ (۲۷) اور سورہ دخان (۳۲)۔

آیت 17 ﴿۱۷﴾ وَآتَيْنَاهُمْ بَيِّنَاتٍ مِنَ الْأَمْرِ: یعنی ہم نے انھیں دین کے بارے میں واضح احکام دیے، جن میں کوئی ابہام

ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِيعَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۱۸﴾ إِنَّهُمْ لَن يُغْنُوا عَنْكَ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا ۚ وَإِنَّ الظَّالِمِينَ لَبَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِينَ ﴿۱۹﴾

پھر ہم نے تجھے (دین کے) معاملے میں ایک واضح راستے پر لگا دیا، سو اسی پر چل اور ان لوگوں کی خواہشات پیچھے نہ چل جو نہیں جانتے ﴿۱۸﴾ بلاشبہ وہ اللہ کے مقابلے میں ہرگز تیرے کسی کام نہ آئیں گے اور یقیناً ظالم لوگ، کے بعض بعض کے دوست ہیں اور اللہ متقی لوگوں کا دوست ہے ﴿۱۹﴾

یا بچھڑی کی نہیں تھی، نہ ان سے اختلاف یا ان سے فرار کی کوئی صورت تھی۔

﴿۱۸﴾ فَمَا اخْتَلَفُوا إِلَّا مِمَّا بَعْدَ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ : یعنی ان میں جو اختلاف زورنا ہوا وہ جہل یا نادانیت کی بنا پر نہ تھا، بلکہ وہ انبیاء علیہ السلام کے ذریعے سے صحیح راستے کا علم آ جانے کے بعد ہوا اور اس کی بنیاد سراسر ضد اور خود پسندی پر تھی۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ یونس (۹۳) اور سورہ شوریٰ (۱۵) کی تفسیر۔ اس آیت میں ہماری امت کے لیے بھی زبردست تشبیہ ہے کہ اگر انھوں نے اللہ کی طرف سے آنے والے علم یعنی قرآن و سنت کے ساتھ وہی برتاؤ کیا جو یہود و نصاریٰ نے کیا تھا تو ان کا انجام بھی انہی جیسا ہوگا۔

آیت 18 : ﴿۱﴾ ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِيعَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ : ”شَرِيعَةٌ“ کا معنی صاف راستہ اور واضح طریقہ ہے۔ ”الْأَمْرُ“ سے مراد ”امر دین“ ہے۔ یعنی بنی اسرائیل جب اپنی سرکشی، ضد اور عناد کی وجہ سے دین کے واضح احکام پر قائم نہ رہے بلکہ بہت سے گمراہ فرقوں میں بٹ گئے اور واضح اور صحیح دین کی دعوت دینے والوں سے عداوت اور گمراہی میں اس حد تک بڑھ گئے کہ انھوں نے مسیح علیہ السلام جیسے برگزیدہ پیغمبر کو بھی قتل کرنے سے دریغ نہ کیا، بلکہ اپنے گمان میں انھیں صلیب پر چڑھا کر دم لیا۔ جب وہ سرکشی کی اس حد تک آ پہنچے تو اس فضیلت سے محروم کر دیے گئے جو انھیں دنیا کی اہمیت کی صورت میں حاصل تھی۔ پھر اے محمد! ہم نے تجھے اس امر (یعنی دین) کے واضح راستے اور طریقے پر لگا دیا اور وہ خدمت جو پہلے پیغمبروں کے سپرد تھی وہ آپ کے سپرد کر دی۔

﴿۲﴾ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ : اس لیے آپ ہمارے مقرر کردہ طریقے پر چلیں اور ہمارے نازل کردہ احکام کی پیروی کریں اور ان لوگوں کی خواہشات کے پیچھے نہ چلیں جو نہیں جانتے، یعنی وحی الہی کا علم نہیں رکھتے، یا علم کے باوجود اس پر عمل نہیں کرتے، کیونکہ وہ بھی انھی لوگوں میں شامل ہیں جو نہیں جانتے۔ ان سے مراد اہل کتاب اور مشرکین عرب ہیں۔ صرف اللہ کے نازل کردہ احکام کی پیروی کی تاکید اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر فرمائی ہے، تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ مائدہ (۵۰+۲۸) اور سورہ اعراف (۳)۔

آیت 19 : ﴿۱﴾ إِنَّهُمْ لَن يُغْنُوا عَنْكَ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا : ”إِنَّ“ تعلیل یعنی کسی بات کی وجہ بیان کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ پچھلی آیت میں فرمایا کہ آپ اللہ کی نازل کردہ شریعت کی پیروی کریں اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کریں جو نہیں

هَذَا بَصَائِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ ﴿۲۰﴾ أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَحُوا
السَّيِّئَاتِ أَنْ نَجْعَلَهُمْ كَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَوَاءً فَعْيَاهُمْ وَصَمَائِهِمْ سَاءَ
مَا يَجْعَلُونَ ﴿۲۱﴾

یہ لوگوں کے لیے سبھ کی باتیں ہیں اور ان لوگوں کے لیے جو یقین رکھتے ہیں ہدایت اور رحمت ہے ﴿۲۰﴾ یا وہ لوگ
جنہوں نے برائیوں کا ارتکاب کیا، انہوں نے گمان کر لیا ہے کہ ہم انہیں ان لوگوں کی طرح کر دیں گے جو ایمان لائے
اور انہوں نے نیک اعمال کیے؟ ان کا جینا اور ان کا مرنا برابر ہوگا؟ برا ہے جو وہ فیصلہ کر رہے ہیں ﴿۲۱﴾

جاتے۔ اب فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر آپ انہیں خوش کرنے کے لیے ان کی خواہشات کے پیچھے چلیں گے اور دین میں کسی
تعمیر کا رد و بدل کریں گے تو اپنے اللہ کو ناراض کر لیں گے، پھر یہ لوگ آپ کو اللہ تعالیٰ کی گرفت سے کسی طرح نہ بچاسکیں گے۔

﴿۲﴾ وَإِنَّ الظَّالِمِينَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ : یہ ایسے لوگوں کی خواہشات کی پیروی سے منع کرنے کی دوسری وجہ ہے کہ
اللہ تعالیٰ کی شریعت کی پیروی متقی لوگوں کا کام ہے اور اس کے غیر کی خواہشات کی پیروی ظالموں کا کام ہے، کیونکہ ظلم کسی کا
حق دوسرے کو دینے کا نام ہے اور وہ اللہ کا حق دوسروں کو دے رہے ہیں۔ ایسے ظالم لوگ اپنے دنیوی مفادات کی خاطر ایک
دوسرے کے دوست اور ان کے کہنے پر چلنے والے ہوتے ہیں۔ (دیکھیے عنکبوت: ۲۵) جب کہ متقی اللہ تعالیٰ کے دوست اور وہ
ان کا دوست ہے۔ (دیکھیے بقرہ: ۲۵۷) اب اگر آپ نے اللہ کی شریعت کے بجائے کسی اور کی خواہشات کی پیروی کی تو آپ
دوستی کا رشتہ اپنے مالک سے توڑ کر ظالموں کے ساتھ جوڑ لیں گے، پھر اس سے بڑھ کر خسار کیا ہوگا؟

آیت 20 ﴿۱﴾ هَذَا بَصَائِرُ لِلنَّاسِ: ”بَصَائِرُ“ ”بَصِيرَةٌ“ کی جمع ہے، سمجھ میں آنے والی بات۔ ”لِلنَّاسِ“ کا لفظ
عام ہے جس میں مسلم و کافر سب شامل ہیں۔ یعنی قرآن کریم کی باتیں ایسی ہیں جو سب لوگوں کی سمجھ میں آنے والی ہیں اور
انہیں ان کے نفع و نقصان سے آگاہ کرنے والی ہیں، خواہ وہ انہیں مانیں یا نہ مانیں۔

﴿۲﴾ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ: یعنی اگرچہ قرآن کی باتیں ایسی ہیں جو سب لوگوں کی سمجھ میں آنے والی ہیں مگر اس سے
فائدہ وہی اٹھاتے ہیں جو اس پر یقین رکھتے ہوں اور انہی کے لیے یہ ہدایت و رحمت ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَنُنَزِّلُ
مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شَفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ وَلَا يَزِيدُ الظَّالِمِينَ إِلَّا خَسَارًا﴾ [بنی اسرائیل: ۸۲] ”اور ہم قرآن
میں سے تمہوڑا تھوڑا نازل کرتے ہیں جو ایمان والوں کے لیے سراسر شفا اور رحمت ہے اور وہ ظالموں کو خسارے کے سوا کسی چیز
میں زیادہ نہیں کرتا۔“

آیت 21 ﴿۱﴾ أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئَاتِ : توحید کی دعوت کے بعد یہاں سے آخرت پر کلام شروع ہو رہا
ہے اور یہ آیت آخرت کے حق ہونے کی دلیل ہے۔ تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ ص (۲۸) اور سورہ قلم (۳۳-۳۸)۔

وَخَلَقَ اللَّهُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ وَ لِيُجْزِيَ كُلَّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿۲۲﴾
 أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ وَ أَضَلَّهُ اللَّهُ عَلَى عِلْمٍ وَ خَتَمَ عَلَى سَمْعِهِ وَ قَلْبِهِ وَ جَعَلَ
 عَلَى بَصَرِهِ عَشُوًّا ؕ فَمَنْ يَهْدِيهِ مِنْ بَعْدِ اللَّهِ ؕ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿۲۳﴾

اور اللہ نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا اور تاکہ ہر شخص کو اس کا بدلا دیا جائے جو اس نے کمایا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا ﴿۲۲﴾ پھر کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنا معبود اپنی خواہش ہی کو بنالیا اور اللہ نے اسے علم کے باوجود گمراہ کر دیا اور اس کے کان اور اس کے دل پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا۔ پھر اللہ کے بعد اسے کون ہدایت دے، تو کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے ﴿۲۳﴾

﴿۲۲﴾ سَوَاءٌ مَعْبُودُهُمْ وَ مَسَاءِلُهُمْ یعنی کفار زندگی میں اپنی مرضی کرتے رہے اور بے لگام ہو کر اپنی خواہشات پوری کرتے رہے، جس کے نتیجے میں انہوں نے زمین میں فساد برپا کیے رکھا اور لوگوں پر اور اپنی جانوں پر بے حساب ظلم کرتے رہے، جب کہ مومن اپنی خواہشات کو روک کر رب تعالیٰ کے احکام کے پابند رہے۔ اب اگر مرنے کے بعد بھی کفار کو ان کے جرائم کی سزا اور ایمان والوں کو ان کے اعمال صالحہ کی جزا نہ ملے تو یہ اللہ تعالیٰ کی صفت عدل اور صفت حکمت دونوں کے خلاف ہے۔ جو لوگ آخرت کا انکار کرتے ہیں وہ ایمان و کفر، نیکی و بدی اور ظلم و عدل کو برابر قرار دے رہے ہیں جو ان کا بہت برا فیصلہ ہے۔

آیت ۲۲ : وَ خَلَقَ اللَّهُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ : یہ آخرت کے حق ہونے کی دوسری دلیل ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ ص (۲۷) کی تفسیر۔

﴿۲۳﴾ ۱) أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ : سلسلہ کلام سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ آخرت کا انکار وہی لوگ کرتے ہیں جو اپنے نفس کی ہر جائز و ناجائز خواہش پوری کرنا چاہتے ہیں۔ آخرت کا عقیدہ ان کی آزادی کی راہ میں رکاوٹ ہوتا ہے، اس لیے وہ آخرت کا انکار کر دیتے ہیں، پھر ان کے دل میں جو آتا ہے کرتے چلے جاتے ہیں۔ جس طرح ایک مومن اپنے رب کو اپنا معبود مانتا ہے، اسی کے حکم پر چلتا ہے، اس کے حلال کردہ کو حلال اور حرام کردہ کو حرام سمجھتا ہے۔ اسی طرح آخرت کے منکروں کا معبود ان کے نفس کی خواہش ہی ہوتا ہے، وہ جو چاہے ان کے لیے حلال اور جو نہ چاہے ان کے ہاں حرام ہوتا ہے۔ پھر جب وہ آخرت کی باز پرس سے بے فکر ہو جاتے ہیں تو ان کی گمراہی بڑھتی ہی جاتی ہے، نہ کوئی چیز انہیں برائی سے روکنے والی ہوتی ہے نہ نیکی پر مائل کرنے والی۔

﴿۲﴾ تفسیر قرطبی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جہاں بھی ”ہوئی“ (خواہش نفس) کا ذکر فرمایا ہے، مذمت ہی کے طور پر فرمایا ہے، مثلاً فرمایا: ﴿وَلِكَيْلَا أَخْلَدَ إِلَى الْأَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوَاهُ، فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ الْكَلْبِ﴾ [الأعراف: ۱۷۶] ”مگر وہ زمین کی طرف چمٹ گیا اور اپنی خواہش کے پیچھے لگ گیا، تو اس کی مثال کتے کی مثال کی طرح ہے۔“ اور فرمایا:

وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ وَمَا لَهُم بِذَلِكَ

اور انہوں نے کہا ہماری اس دنیا کی زندگی کے سوا کوئی (زندگی) نہیں، ہم (میں) مرتے اور جیتے ہیں اور ہمیں زمانے

﴿ وَلَا تَطْعَمُ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطًا ﴾ [الکہف: ۲۸] "اور اس شخص کا کہنا مت مان

جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا اور وہ اپنی خواہش کے پیچھے چلا اور اس کا کام ہمیشہ حد سے بڑھا ہوا ہے۔" اور

فرمایا: ﴿ بَلِ اتَّبَعَ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَهْوَاءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَمَنْ يَهْدِي مَنْ أَضَلَّ اللَّهُ ﴾ [الروم: ۲۹] "بلکہ وہ لوگ

جنہوں نے ظلم کیا وہ جانے بغیر اپنی خواہشوں کے پیچھے چل پڑے، پھر اسے کون راہ پر لائے جسے اللہ نے گمراہ کر دیا ہو۔" اور

فرمایا: ﴿ وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِنَ اللَّهِ ﴾ [القصص: ۵۰] "اور اس سے بڑھ کر گمراہ کون ہے جو اللہ

کی طرف سے کسی ہدایت کے بغیر اپنی خواہش کی پیروی کرے۔" اور فرمایا: ﴿ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ﴾

[ص: ۲۶] "اور خواہش کی پیروی نہ کر، ورنہ وہ تجھے اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گی۔" اور فرمایا: ﴿ وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ

وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ ۗ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَىٰ ﴾ [النازعات: ۴۰، ۴۱] "اور رہا وہ جو اپنے رب کے سامنے کھڑا

ہونے سے ڈر گیا اور اس نے نفس کو خواہش سے روک لیا۔ تو بے شک جنت ہی (اس کا) ٹھکانا ہے۔"

﴿ أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ ﴾ کی مزید تشریح کے لیے دیکھیے سورہ فرقان (۲۳) کی تفسیر۔

﴿ وَأَضَلَّهُ اللَّهُ عَلَىٰ عِلْمِهِ ﴾ اس کی تفسیر دو طرح سے ہے، ایک یہ کہ ازل سے اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ وہ راہ راست پر

آنے والا نہیں بلکہ اپنی خواہش نفس ہی کو اپنا معبود بنانے والا اور آخرت کے انکار پر اصرار کرنے والا ہے، اس لیے اس نے

اپنے علم کی بنا پر اسے گمراہی میں پھینک دیا۔ دوسری یہ کہ وہ یہ جاننے کے باوجود کہ اللہ تعالیٰ ہی معبود برحق ہے اور قیامت یقیناً

قائم ہونے والی ہے فسق و فجور کی آزادی کے لیے قیامت کے انکار پر اڑ گیا۔ (دیکھیے قیامت: ۶۲۱) تو اللہ تعالیٰ نے بھی اسے

گمراہی میں پھینک دیا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ

النُّورِ مَبِينٍ نُورِهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصِّلِهِ جَهَنَّمَ ۗ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ﴾ [النساء: ۱۱۵] "اور جو کوئی رسول کی مخالفت کرے، اس

کے بعد کہ اس کے لیے ہدایت خوب واضح ہو چکی اور مومنوں کے راستے کے سوا (کسی اور) کی پیروی کرے، ہم اسے اسی

طرف پھیر دیں گے جس طرف وہ پھرے گا اور ہم اسے جہنم میں جھونکیں گے اور وہ بری لوٹنے کی جگہ ہے۔"

﴿ وَخَتَمَ عَلَىٰ سَمْعِهِ وَقَلْبِهِ ﴾ اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ بقرہ کی آیت (۷) کی تفسیر۔

﴿ فَمَنْ يَهْدِيهِ مِنْ بَعْدِ اللَّهِ ۗ ﴾ "اُمِّي مِنْ بَعْدِ مَا أَضَلَّهُ اللَّهُ" یعنی جب اللہ تعالیٰ ہی نے اسے گمراہ کر دیا تو اب کون اسے

ہدایت دے گا۔

﴿ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ۗ ﴾ "تَذَكَّرُونَ" اصل میں "تَذَكَّرُونَ" ہے، ایک تاء تخفیف کے لیے حذف کر دی ہے۔

﴿ وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا ﴾ اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ مومنون (۳۷)، یہاں

مِنْ عِلْمٍ إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ﴿۱۰﴾

کے سوا کوئی ہلاک نہیں کرتا، حالانکہ انھیں اس کے بارے میں کچھ علم نہیں، وہ محض گمان کر رہے ہیں ﴿۱۰﴾

ایک سوال ہے کہ یہ کہنے کے بجائے کہ ”نَحْنَا وَ نَمُوْتُ“ (ہم جیتے ہیں اور مرتے ہیں) یہ کیوں کہا: ﴿نَمُوْتُ وَ نَحْنَا﴾ ”ہم مرتے ہیں اور جیتے ہیں؟“ اس کا جواب کئی طرح سے ہے، ایک تو یہ کہ ”واو“ میں ترتیب ضروری نہیں ہوتی اور یہاں ان کی بات نقل کرتے ہوئے کلام کے حسن کے لیے ایسا کیا گیا ہے، کیونکہ ”فَاَمِنَ (اَلَا حَيَاتِنَا اَلذُّنُوبَا)“ کے بعد ”نَمُوْتُ وَ نَحْنَا“ کے جملے میں جو حسن اور موافقت ہے وہ ”نَحْنَا وَ نَمُوْتُ“ میں نہیں۔ دوسرا جواب یہ کہ ”نَمُوْتُ وَ نَحْنَا“ کا مطلب یہ ہے کہ ہم مر جاتے ہیں اور ہماری اولادیں رہتی ہیں، یا ہم میں سے کچھ مر جاتے ہیں کچھ جیتے رہتے ہیں اور تیسرا جواب یہ کہ ”نَمُوْتُ“ کا مطلب ہے کہ پہلے ہم عدم اور موت کی حالت میں ہوتے ہیں اور ”نَحْنَا“ کا مطلب ہے کہ پھر ہم دنیا کی حیات کی حالت میں آ جاتے ہیں، سو زندگی ہے تو بس یہی دنیا کی زندگی ہے، اس کے بعد اور کوئی زندگی نہیں۔

﴿۱۰﴾ وَمَا يَفْلِكُنَا إِلَّا اللَّهُ: ان کی اس بات سے ظاہر ہے کہ وہ یہ مانتے ہیں کہ انھیں ہلاک کرنے والا کوئی ہے اور ظاہر ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ ہے، کیونکہ وہی پوری کائنات کا خالق و مالک اور مدبر ہے، مگر چونکہ ان کی بے قید خواہشات کی راہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے سامنے پیش ہونے کا عقیدہ زبردست رکاوٹ ہے، اس لیے انھوں نے آخرت کی زندگی ہی کا انکار کر دیا اور یہ مانتے کے بجائے کہ موت و حیات اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، وہ جب چاہے پہلے کی طرح انھیں دوبارہ زندہ کر سکتا ہے اور کرے گا، یہ کہہ دیا کہ زمانے کے سوا کوئی نہیں جو ہمیں ہلاک کرے، بس یہ دن رات کی گردش ہی ہے جو ہمیں فنا کر دیتی ہے۔ درحقیقت یہ ان کا اپنے آپ کو فریب دینا ہے، کیونکہ زمانہ اور دن رات کی گردش اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کر سکتے، ان کی ڈور تو ایک مالک کے ہاتھ میں ہے جو اللہ تعالیٰ ہے، جس کا نام وہ نہیں لیتا چاہتے، اس کے بجائے زمانے کا نام لیتے ہیں۔ اس کی ایک مثال ہمارے زمانے کے طحہ مسلمان ہیں جو خود بد کردار ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی حدود کو وحشیانہ سزائیں قرار دیتے ہیں، مگر کھل کر یہ کہہ نہیں سکتے، اس لیے مولوی کو گالی دیتے ہیں کہ مولوی لوگوں کو وحشیانہ سزائیں دلانا چاہتے ہیں، چوروں کے ہاتھ کٹوانا، زانی کو دزے مردانا اور قاتل کو قتل کروانا چاہتے ہیں۔ حالانکہ بے چارے مولوی کا اس میں کیا قصور ہے؟ اس نے تو وہ حکم سنایا جو اس کے مالک نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے۔ اسی طرح وہ مشرک اپنی ہلاکت اور فنا کا باعث زمانے کو قرار دے رہے ہیں، حالانکہ بے چارہ زمانہ تو اللہ تعالیٰ کے حکم کا پابند ہے، اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے زمانے کو برا بھلا کہنے سے منع فرمایا۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿قَالَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ يُؤَدِّبُنِي اَللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ بِاَللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ﴾ اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے بیان کیا، آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿لَا تَسُبُّوا اللّهَ فَإِنَّ اللّهَ هُوَ اللّهُ﴾ | مستمب، الألفاظ من الأدب وغيرها، باب النهي عن سب اللّٰه: ۲۲۶/۵ | زمانے کو برا بھلا

وَإِذَا تَشَلَّى عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ مَّا كَانَ مُجْتَهِمًا إِلَّا أَنْ قَالُوا إِنَّمَا آيَاتُنَا بِآبَائِنَا إِن كُنْتُمْ

صِدِّقِينَ ﴿۲۵﴾

اور جب ان کے سامنے ہماری واضح آیات پڑھی جاتی ہیں تو ان کی دلیل اس کے سوا کچھ نہیں ہوتی کہ کہتے ہیں ہمارے باپ دادا کو لے آؤ، اگر تم سچے ہو ﴿۲۵﴾

مت کہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی زمانہ ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «قَالَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ يُؤَدِّبُنِي رَبُّ آدَمَ، يَقُولُ يَا خَيِّبَةَ الدَّهْرِ! فَلَا يَقُولُونَ أَحَدُكُمْ يَا خَيِّبَةَ الدَّهْرِ! فَإِنِّي أَنَا الدَّهْرُ أَقْلَبُ لَيْلَةً وَنَهَارَهُ فَإِذَا شِئْتُ قَبَضْتُهُمَا» مسلم، الألفاظ من الأدب وغيره، باب تنهيه عن سب الدهر: ۱۶۲۶/۳ | "اللہ عزوجل نے فرمایا، ابن آدم مجھے ایذا دیتا ہے۔ کہتا ہے، ہائے زمانے کی ناکامی! سو تم میں سے کوئی یہ نہ کہے کہ ہائے زمانے کی ناکامی! کیونکہ میں ہی تو زمانہ ہوں۔ اس کے رات دن کو لٹ پیٹ میں کرتا ہوں، پھر جب چاہوں گا دونوں کو قبض کر لوں گا۔" ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: "شامی، ابو سعیدہ اور کنی اور امہ رضی اللہ عنہا نے "لَا تَسُبُّوا الدَّهْرَ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ الدَّهْرُ" (زمانہ کو برا بھلا نہ کہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی زمانہ ہے) کی تفسیر میں فرمایا: "عرب اپنی جاہلیت میں جب انھیں کوئی شدت یا بلا یا تکلیف پہنچتی تو کہتے تھے: "يَا خَيِّبَةَ الدَّهْرِ!" (ہائے زمانے کی ناکامی!) چنانچہ وہ ان کاموں کو زمانے کی طرف منسوب کرتے اور اسے برا بھلا کہتے، حالانکہ وہ سب کام کرنے والا تو اللہ تعالیٰ تھا، تو گویا انھوں نے اللہ تعالیٰ ہی کو برا بھلا کہا، کیونکہ حقیقی قائل وہی ہے۔ اس لیے اس اعتبار سے زمانے کو برا بھلا کہنے سے منع فرمادیا، کیونکہ وہ جسے مراد لے رہے ہیں وہ اللہ تعالیٰ ہے۔" اس کی یہ شرح سب سے اچھی ہے اور یہی مراد ہے۔ (واللہ اعلم) اور ابن حزم اور ابن کے طریقے پر چلے ہوئے جن لوگوں نے اس حدیث کو لے کر اللہ تعالیٰ کے اسمے حسنیٰ میں سے "الدَّهْرُ" (زمانہ) کو شمار کیا ہے انھوں نے غلطی کی ہے۔" (ابن کثیر)

﴿۲۵﴾ وَمَا لَهُمْ بِذَلِكَ مِنْ عِلْمٍ إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ: یعنی وہ یہ بات کہ "اس زندگی کے بعد کوئی زندگی نہیں" اور یہ کہ "انسان کو فوت کرنے والا اللہ تعالیٰ نہیں بلکہ زمانہ ہی اسے ہلاک کرتا ہے" کسی علم کی بنا پر نہیں کہہ رہے، بلکہ صرف گمان کی بنا پر کہہ رہے ہیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ "ہم نہیں جانتے کہ مرنے کے بعد کوئی زندگی ہے یا نہیں اور ہم نہیں جانتے کہ روح کیسے نکلتی ہے اور ہمیں کون ہلاک کرتا ہے۔" کیونکہ جب وہ آئندہ ہونے والی کسی بات کا علم ہی نہیں رکھتے تو وہ یہ بات یقین سے کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اس زندگی کے بعد کوئی زندگی نہیں۔ دراصل ان کی خواہش یہ ہے کہ نہ موت کے بعد کوئی زندگی ہو اور نہ ان سے کوئی پوچھنے والا ہو کہ تم نے کیا کیا، تاکہ وہ اپنی من مانی کرتے رہیں۔ اس طرح انھوں نے اپنی خواہش نفس ہی کو اپنا معبود بنا رکھا ہے اور جانتے بوجھتے ہوئے اپنے مالک سے اور قیامت کے دن کی باز پرس سے آنکھیں اور کان بند کر رکھے ہیں۔

۲۵ ﴿۱﴾ وَإِذَا تَشَلَّى عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا ... یہ کفار کی سب سے وزنی دلیل تھی جو وہ آخرت کی نفی کے لیے پیغمبروں

کے سامنے پیش کرتے تھے کہ "اگر تم اپنے اس عقیدہ میں سچے ہو کہ مرنے کے بعد ہم پھر جی نہیں گے تو ہمارے آبا و اجداد

قُلِ اللَّهُ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ يُمَيِّتُكُمْ ثُمَّ يُبْعَثُكُمْ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَا رَيْبَ فِيهِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۲۶﴾ وَ لِلَّهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضِ وَ يَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُؤْمِرُ بِأَعْيُنِنَا

يَخْسِرُ الْبٰطِلُونَ ﴿۲۷﴾

کہہ دے اللہ ہی تمہیں زندگی بخشتا ہے، پھر تمہیں موت دیتا ہے، پھر تمہیں قیامت کے دن کی طرف (لے جا کر) جمع کرے گا، جس میں کوئی شک نہیں اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ﴿۲۶﴾ اور اللہ ہی کے لیے آسمانوں اور زمین بادشاہی ہے اور جس دن قیامت قائم ہوگی اس دن باطل والے خسارہ پائیں گے ﴿۲۷﴾

میں سے کسی کو لے آؤ۔“ حالانکہ قیامت سے پہلے فرداً فرداً اس دنیا میں زندہ ہو کر واپس آنے کو قرآن نے محال اور ناممکن بتایا ہے، جبکہ قیامت کے دن دوبارہ زندگی کے امکان پر عقلی دلائل قائم کیے ہیں جو اہل اور ناقابل انکار ہیں۔ رہا آخرت پر ایمان، تو اس کا انحصار سراسر انبیاء علیہم السلام کی تصدیق پر ہے۔ اس آیت کی مفصل تفسیر سورہ دخان کی آیت (۳۶) کے تحت گزر چکی ہے۔ ﴿۲۷﴾ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ إِلَّا أَن قَالُوا..... ظاہر ہے کہ ان کا یہ کہنا کہ ”اگر تم سچے ہو کہ قیامت آئے گی تو ابھی ہمارے آبا و اجداد کو زندہ کر کے لاؤ“ کوئی حجت یا دلیل نہیں، بلکہ نہایت فضول بات ہے، جیسا کہ سورہ دخان (۳۶) میں تفصیل گزری۔ یہاں اسے حجت کہا گیا تو یہ واضح کرنے کے لیے کہ ان کے پاس کوئی حجت ہے ہی نہیں، کیونکہ اپنے گمان میں وہ جسے حجت سمجھ رہے ہیں فی الواقع اس کا حجت اور دلیل سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔ اسے ان کی حجت کہنے میں ان سے جہلم اور استہزا بھی مراد ہے کہ ان عقل مندوں کی حجت اور دلیل اس طرح کی ہوتی ہے۔

آیت ۲۶ ﴿۱﴾ قُلِ اللَّهُ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ يُمَيِّتُكُمْ ثُمَّ يُبْعَثُكُمْ: یہ ان کی مزعومہ حجت کا جواب ہے کہ تم اپنے اختیار سے اتفاقاً پیدا نہیں ہو گئے، نہ تمہاری موت تمہارے اختیار سے یا اتفاقاً واقع ہوتی ہے، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ ہے جو تمہیں زندگی بخشتا ہے اور تمہیں موت دیتا ہے۔ پھر جب چاہے گا دوبارہ زندہ کر دے گا، اس میں تمہارا کوئی اختیار یا عمل دخل نہیں ہوگا۔

﴿۲﴾ ثُمَّ يُبْعَثُكُمْ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ..... یعنی تمہیں الگ الگ زندہ نہیں کرے گا کہ کچھ لوگوں کو ایک وقت زندہ کیا، دوسروں کو کسی اور وقت اور باقی کو کسی تیسرے وقت، بلکہ سب اگلے پچھلوں کو قیامت کے دن تک لے جا کر ایک ہی وقت میں جمع کر دے گا۔ مزید دیکھیے سورہ بقرہ (۲۸)۔

﴿۳﴾ لَا رَيْبَ فِيهِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ: یعنی قیامت واقع ہونے میں تو کوئی شک نہیں، مگر اکثر لوگ اس کا انکار اس لیے کرتے ہیں کہ وہ جاہل ہیں۔ وہ حقیقت کو نہ جانتے ہیں نہ جاننا چاہتے ہیں اور اپنی خواہش کے خلاف نہ کسی کی بات سنتے ہیں نہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَقَالُوا لَوْلَا كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ﴾ [الملك: ۱۰] ”اور وہ کہیں گے اگر ہم سنتے ہوتے، یا سمجھتے ہوتے تو بھڑکتی ہوئی آگ والوں میں نہ ہوتے۔“

آیت ۲۷ ﴿۱﴾ وَ لِلَّهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضِ: پچھلی آیت میں جہلی دفعہ زندگی بخشنے اور موت دینے کو قیامت کے دن

وَتَرَىٰ كُلَّ أُمَّةٍ جَائِيَةً ۖ كُلُّ أُمَّةٍ تُدْعَىٰ إِلَىٰ كِتَابِهَا ۗ الْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۲۸﴾

اور تو ہر امت کو گھنٹوں کے بل گری ہوئی دیکھے گا، ہر امت اپنے اعمال نامہ کی طرف بلائی جائے گی، آج تمہیں اس کا بدلہ دیا جائے گا جو تم کیا کرتے تھے ﴿۲۸﴾

دوبارہ زندہ کرنے کی دلیل کے طور پر پیش فرمایا، اس آیت میں آسمان و زمین یعنی ساری کائنات کے اکیلے مالک ہونے کی قیامت کی دلیل کے طور پر ذکر فرمایا کہ وہ اپنی ملکیت میں جو چاہے کر سکتا ہے۔ وہ ساری کائنات بنا سکتا ہے، اسے فنا بھی کر سکتا ہے اور پھر دوبارہ بھی بنا سکتا ہے۔ اس کے بعد قیامت کے کچھ احوال ذکر فرمائے۔

﴿۲۹﴾ وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يُحْسِرُ الْمُنْظِلُونَ: جس طرح کوئی تاجر اپنے سرمائے کے ذریعے سے نفع حاصل کرنے کے لیے محنت کرتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے دنیا میں انسان کو زندگی، صحت اور عقل کا سرمایہ عطا فرما کر آخرت کی کامیابی کا نفع حاصل کرنے کے لیے محنت کرنے کا حکم دیا۔ اہل باطل یعنی کفار نے اپنے اس عزیز سرمائے کے ذریعے سے نفع حاصل کرنے کے بجائے اسے اللہ کے ساتھ شریک، اس کی نافرمانی اور قیامت کا انکار کرنے میں صرف کر دیا اور صریح خسارے میں رہے۔ اس خسارے کا پوری طرح اظہار اس وقت ہوگا جب قیامت قائم ہوگی، کیونکہ دنیا میں تو اس خسارے کی تلافی کا پھر بھی موقع موجود ہے مگر اس وقت بازارِ عمل میں واپس جانے کی اجازت ہی نہیں ہوگی کہ وہ اپنے خسارے کی تلافی کر سکیں۔ خسارے کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ عصر کی تفسیر۔

آیت 28 ﴿۱﴾ وَتَرَىٰ كُلَّ أُمَّةٍ جَائِيَةً: ”جَائِيَةً“ ”جَنَا يَجْتُو جُنُودًا“ (ن) یا ”جَنْبِي يَنْجِي جُنُبًا“ (ض) سے اسم فاعل ہے، گھنٹوں کے بل گری ہوئی۔ یعنی میدانِ حشر کا ایسا ہول اور رعب ہوگا کہ ہر امت شدید خوف زدہ ہو کر گھنٹوں کے بل گری ہوئی ہوگی۔ نیک ہوں یا بد، سب خوف و دہشت کے ساتھ اسی حالت میں فیصلے کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اس وقت بڑے سے بڑے تکبر کی بھی ساری شیخی اور اکڑ ختم ہو جائے گی۔

﴿۳۰﴾ كُلُّ أُمَّةٍ تُدْعَىٰ إِلَىٰ كِتَابِهَا: ”کِتَابًا“ سے مراد کتابِ اعمال ہے، جس میں ان کی زندگی کی ساری روداد حرف بحرف لکھی ہوگی، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَوَضِعَ الْكِتَابَ فَتَرَىٰ الْمُنْجِرِينَ مُشْفِقِينَ مِمَّا فِيهِ وَيَقُولُونَ يَا وَيْلَتَنَا مَالِ هَذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَوْفِيَّةً وَلَا كَبِيرَةً إِلَّا أُخْضِبَهَا﴾ [الکہف: ۴۹] ”اور کتاب رکھی جائے گی، پس تو مجرموں کو دیکھے گا کہ اس سے ڈرنے والے ہوں گے جو اس میں ہوگا اور کہیں گے ہائے ہماری بربادی! اس کتاب کو کیا ہے، نہ کوئی چھوٹی بات چھوڑتی ہے اور نہ بڑی مگر اس نے اسے ضبط کر رکھا ہے۔“ بعض نے فرمایا، اس کتاب سے مراد وہ کتاب ہے جو ہر امت کی طرف ان کے پیغمبر کے ذریعے سے بھیجی گئی، یعنی ہر امت کو اس کی کتاب کی طرف بلایا جائے گا، تاکہ وہ دیکھے کہ اس نے اس پر کہاں تک عمل کیا اور اس کے مطابق اسے جزا دی جائے۔ سیاق کی مناسبت سے پہلا معنی زیادہ درست ہے۔ مزید دیکھیے سورہ نبی اسرائیل (۱۲، ۱۳)۔

هَذَا كِتَابَنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ۚ إِنْ كُنَّا نَسْتَسْخِرُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۲۹﴾ فَأَمَّا الَّذِينَ
آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَيُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِي رَحْمَتِهِ ۚ ذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِينُ ﴿۳۰﴾

یہ ہماری کتاب ہے جو تم پر حق کے ساتھ بولتی ہے، بے شک ہم لکھواتے جاتے تھے، جو تم عمل کرتے تھے ﴿۲۹﴾ پھر جو
لوگ تو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے سو انھیں ان کا رب اپنی رحمت میں داخل کرے گا، یہی واضح
کامیابی ہے ﴿۳۰﴾

﴿۳۰﴾ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ: اس سے پہلے کچھ الفاظ محذوف ہیں: "أَيُّ يُقَالُ لَهُمْ" یعنی ان سے یہ بات کہی
جائے گی۔

آیت 29 ﴿۱﴾ هَذَا كِتَابَنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ: اس میں "يَنْطِقُ" کا لفظ قابل توجہ ہے، کیونکہ کتاب تو پڑھی جاتی
ہے مگر وہ کتاب بول کر سب کچھ ٹھیک ٹھیک بتائے گی۔ عموماً مفسرین لکھتے آئے ہیں کہ یہ استعارہ ہے، مگر اب ثابت ہو رہا ہے
کہ یہ استعارہ نہیں بلکہ حقیقت ہے اور وہ کتاب فی الواقع بولے گی۔ اللہ تعالیٰ کی شان تو بہت ہی بلند ہے اور قیامت کا معاملہ
دنیا سے بہت مختلف ہے، مگر اب انسان نے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ عقل سے ایسی ایسی چیزیں ایجاد کر لی ہیں جو وہ سب کچھ دکھا
اور سنا دیتی ہیں جو انسان کرتا ہے یا بولتا ہے۔ البتہ وہ کسی کی نیت کو سامنے نہیں لاسکتیں، مگر اللہ تعالیٰ کی تیار کردہ ہوئی وہ
کتاب لوگوں کے افعال، اقوال، احوال اور نیتیں سب کچھ سامنے لے آئے گی۔

﴿۲﴾ إِنْ كُنَّا نَسْتَسْخِرُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ: یہ اس سوال کا جواب ہے کہ اس دن وہ کتاب اتنی مدت بعد کیسے بول کر بتائے گی؟
انھوں نے تو وہ اعمال دنیا میں کیے تھے جو دنیا کے ساتھ ہی ختم ہو گئے۔ فرمایا اس لیے کہ تم جو کچھ کیا کرتے تھے ہم فرشتوں
کے ذریعے سے لکھوا لیا کرتے تھے، تاکہ وہ سند رہیں اور قیامت کے دن تم پر حجت قائم ہو سکے، ورنہ ہمیں تو ہر چیز کا پہلے ہی
سے علم ہے۔

آیت 30 ﴿۱﴾ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ: یہاں بشارت کا ذکر پہلے فرمایا، کیونکہ اس سے بشارت میں مزید
خوشی شامل ہوئی ہے۔ عمل صالح سے مراد وہ عمل ہے جو خالص اللہ تعالیٰ کے لیے کیا گیا ہو، ہر قسم کے شرک حتیٰ کہ ریا سے بھی
پاک ہو اور سنت کے مطابق ہو۔ مزید دیکھیے سورہ کہف کی آخری آیت۔

﴿۲﴾ فَيُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِي رَحْمَتِهِ: انھیں ان کا رب اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔ "رَبُّهُمْ" کے لفظ میں ان کے ساتھ
اپنے تعلق اور اپنی محبت کا اظہار ہے اور "اپنی رحمت" سے مراد یہاں جنت ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ کے
رسول ﷺ نے فرمایا: « قَالَ اللَّهُ تَبَارَكَ وَتَعَالَى لِلْجَنَّةِ أَنْتِ رَحْمَتِي أَرْحَمُ بِكَ مِنْ أُمَّةٍ مِنْ عِبَادِي وَقَالَ لِلنَّارِ
إِنَّمَا أَنْتِ عَذَابٌ أَعْدَدْتُ بِكَ مِنْ أُمَّةٍ مِنْ عِبَادِي » [بخاری، التفسیر، باب قوله: ﴿ وَتَقُولُ هَلْ مِنْ مَزِيدٍ ﴾ :
۴۸۰] "اللہ تبارک و تعالیٰ نے جنت سے فرمایا، تو میری رحمت ہے، میں اپنے بندوں میں سے جس پر چاہوں گا تیرے

وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَوَيْلٌ لَهُمْ لِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ﴿۳۱﴾

تُجْرِمِينَ ﴿۳۱﴾

اور رہے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا تو کیا میری آیات تمہارے سامنے نہ پڑھی جاتی تھیں؟ پھر تم نے تکبر کیا اور تم مجرم لوگ تھے ﴿۳۱﴾

ذریعے سے رحم کروں گا اور آگ سے فرمایا، تو محض عذاب ہے، میں اپنے بندوں میں سے جسے چاہوں گا تیرے ذریعے سے عذاب دوں گا۔“

﴿۳۱﴾ ذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِينُ: جیسا کہ فرمایا: ﴿فَمَنْ يُخْرِجْ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ﴾ [آل عمران: ۱۸۵] ”پھر جو شخص آگ سے دور کر دیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا تو یقیناً وہ کامیاب ہو گیا اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کے سامان کے سوا کچھ نہیں۔“

آیت 31 ﴿۳۱﴾ وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَوَيْلٌ لَهُمْ لِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ: ”وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا“ کے بعد کچھ الفاظ محذوف ہیں، کیونکہ ”وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا“ جملہ خبریہ کا ایک حصہ ہے اور ”أَفَلَمْ تَكُنْ آيَاتِنَا تُنذِرُكَ“ خطاب اور استفہام ہے جو جملہ انشائیہ ہے۔ وہ محذوف الفاظ کچھ پچھلی آیت سے واضح ہو رہے ہیں اور کچھ بعد کے الفاظ ”أَفَلَمْ تَكُنْ...“ سے سمجھ میں آرہے ہیں، جو اس طرح کے ہو سکتے ہیں: ”وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَيُدْخِلُهُمْ فِي عَذَابِهِ وَيَقُولُ أَفَلَمْ تَكُنْ آيَاتِنَا تُنذِرُكَ“ ”یعنی رہے کافر تو وہ انہیں اپنے عذاب میں داخل کرے گا اور فرمائے گا، تو کیا میری آیات تمہارے سامنے نہ پڑھی جاتی تھیں؟“ (واللہ اعلم) مطلب یہ ہے کہ جہنم کے عذاب کے ساتھ وہ اللہ تعالیٰ کا عتاب اور اس کی ڈانٹ بھی سنیں گے جو اپنی جگہ بہت بڑا عذاب ہوگا۔

﴿۳۲﴾ فَاسْتَكْبَرْتُمْ وَكُنْتُمْ قَوْمًا تُجْرِمُونَ: قرآن میں ”مجرم“ کا لفظ ”مسلم“ کے مقابلے میں آیا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿أَفَتَجْعَلُ السُّلَيْمِينَ كَالْمُجْرِمِينَ﴾ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ﴿[القصم: ۳۵، ۳۶] ”تو کیا ہم فرماں برداروں کو جرم کرنے والوں کی طرح کر دیں گے؟ کیا ہے تمہیں، تم کیسے فیصلے کرتے ہو؟“ یعنی تم نے میری آیات سننے کے باوجود اپنے آپ کو میرا تابع فرمان بنانے سے بڑا اور اونچا سمجھا اور مسلم بننے کے بجائے مجرم بننے پر اڑے رہے، جب کہ یہ بات مجھے کسی طرح گوارا نہیں۔ مزید دیکھیے سورہ جاثیہ (۱۱ تا ۱۷) اور سورہ اعراف (۳۶، ۴۰) کی تفسیر۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿قَالَ اللَّهُ تَعَالَى: الْكِبْرِيَاءُ رِدَائِي وَالْعَظَمَةُ إِزَارِي فَمَنْ نَارَ عَنِّي وَاحِدًا مِنْهُمَا قَدَفْتُهُ فِي النَّارِ﴾ [ابو داؤد، اللباس، باب ما جاء في الكبر: ۴۰۹۰، وقال الألباني صحيح] ”اللہ تعالیٰ نے فرمایا، کبریائی میری اوپر کی چادر ہے اور عظمت میری ازار ہے تو جو کوئی ان میں سے ایک بھی مجھ سے چھیننے کی کوشش کرے گا میں اسے آگ میں پھینکوں گا۔“ اور عبد اللہ بن

وَإِذَا قِيلَ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَالسَّاعَةُ لَا رَيْبَ فِيهَا قُلْتُمْ مَا نَدْرِي مَا السَّاعَةُ ۗ
إِنْ نَظُنُّ إِلَّا ظَنًّا وَمَا نَحْنُ بِمُتَّبِعِينَ ﴿۳۲﴾

اور جب کہا جاتا تھا کہ یقیناً اللہ کا وعدہ حق ہے اور جو قیامت ہے اس میں کوئی شک نہیں تو تم کہتے تھے ہم نہیں جانتے قیامت کیا ہے، ہم تو محض معمولی سا گمان کرتے ہیں اور ہم ہرگز پورا یقین کرنے والے نہیں ﴿۳۲﴾

مسعودی رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِنْ خُرْدٍ مِنْ كِبَرٍ، وَلَا يَدْخُلُ النَّارَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِنْ خُرْدٍ مِنْ إِيمَانٍ» | ابن ماجہ، المعجم، باب فی الإیمان : ۵۹۹، قال الألبانی صحیح [وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر کبر ہوگا اور وہ شخص جہنم میں نہیں جائے گا جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر ایمان ہوگا۔ اور رسول اللہ ﷺ نے کبر کی وضاحت خود فرمائی کہ وہ خوبصورت کپڑے یا خوبصورت جوتے پہننے کا نام نہیں، بلکہ فرمایا: «الْكِبْرُ بَطْرُ الْحَقِّ وَعَظْمُ النَّاسِ» | مسلم، الإیمان، باب تحريم الكبر وبيانہ : ۹۱] ”تکبر حق سے انکار کر دینے اور لوگوں کو حقیر سمجھنے کا نام ہے۔“

آیت 32 ﴿۳۲﴾ وَإِذَا قِيلَ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَالسَّاعَةُ : اللہ تعالیٰ کفر کے جرائم بیان کرتے ہوئے فرمائیں گے کہ جب تم سے کہا جاتا تھا کہ یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے اور قیامت میں کوئی شک نہیں تو تم یہ کہہ کر اس کا مذاق اڑاتے اور انکار کرتے تھے کہ ہم نہیں جانتے قیامت کیا چیز ہے؟ جیسے فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کا انکار کرتے ہوئے کہا تھا: ﴿وَمَا رَبُّ الْعَالَمِينَ﴾ [الشعراء : ۲۳] ”اور رب العالمین کیا چیز ہے؟“ یہ جھٹلانے کا بدترین انداز ہے جس میں انکار کے ساتھ استہزا بھی شامل ہے۔

﴿۳۲﴾ **إِنْ نَظُنُّ إِلَّا ظَنًّا**: یہاں ایک سوال ہے کہ اس جملے کا لفظی معنی ہے ”ہم نہیں گمان کرتے مگر گمان کرنا“ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی کہے ”اِنْ نَأْكُلُ إِلَّا أُمُكُلًا“ ”ہم نہیں کھاتے مگر کھانا۔“ ظاہر ہے اس سے کوئی مفید مطلب بات حاصل نہیں ہوتی۔ جواب اس کا یہ ہے کہ ”ظنًّا“ پر متوین تقلیل و تحقیر کے لیے ہے، یعنی ہم گمان نہیں کرتے مگر ہلکا اور معمولی سا گمان، یعنی پیغمبروں کے وعظ اور لوگوں کے کہنے کی وجہ سے ہمیں اس کا معمولی سا گمان ہوتا ہے جس کی کچھ حیثیت نہیں۔ واضح رہے کہ قرآن مجید میں بعض مقامات پر ظن یقین کے معنی میں آیا ہے، مگر یہاں شک کے معنی میں ہے، کیونکہ وہ یقین کے مقابلے میں آ رہا ہے۔

﴿۳۳﴾ **وَمَا نَحْنُ بِمُتَّبِعِينَ**: ”ہاں نفی کی تاکید کے لیے ہے اور ”مُسْتَبِقِينَ“ میں سین اور تاء مبالغہ کے لیے ہے، یعنی ہم پورا یقین کرنے والے ہرگز نہیں ہیں، کبھی معمولی سا گمان یا دھندلا سا خیال آ جائے تو وہ الگ بات ہے۔

﴿۳۴﴾ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اگر کسی کو اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں، اس کے رسولوں، اس کی کتابوں، یوم آخرت اور تقدیر میں سے کسی چیز میں شک ہو (گو انکار نہ بھی ہو) تو وہ کافر ہے۔ ایمان نام ہی یقین یعنی زوالِ شک کا ہے، کیونکہ انسان کو اللہ کے احکام کا پابند بنانے والی چیز ہے ہی یقین۔ آگے یقین کے درجات مختلف ہو سکتے ہیں اور ایمان میں کمی بیشی ہو سکتی ہے۔

وَبَدَا لَهُمْ سَيِّئَاتٌ مَّا عَمِلُوا وَحَاقَ بِهِم مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ﴿۳۳﴾ وَقِيلَ الْيَوْمَ
نَنْسِكُمْ كَمَا نَسَيْتُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَذَا وَمَأْوَأَكُمْ النَّارُ وَمَا لَكُمْ فِئِن تُصِرُّونَ ﴿۳۴﴾ ذَلِكَ
بِأَنَّكُمْ اتَّخَذْتُمْ آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًّا وَغَرَبْتُمْ حَيٰوةَ الدُّنْيَا ۗ فَالْيَوْمَ لَا يُخْرَجُونَ مِنْهَا وَلَا
هُم يُسْتَعْتَبُونَ ﴿۳۵﴾ فَلِلَّهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۶﴾

اور ان کے لیے ان اعمال کی برائیاں ظاہر ہو جائیں گی جو انھوں نے کیے اور انھیں وہ چیز گھبر لے گی جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے ﴿۳۳﴾ اور کہہ دیا جائے گا کہ آج ہم تمہیں بھلا دیں گے جیسے تم نے اپنے اس دن کے ملنے کو بھلا دیا اور تمہارا ٹھکانا آگ ہے اور تمہارے کوئی مدد کرنے والے نہیں ﴿۳۴﴾ یہ اس لیے کہ تم نے اللہ کی آیات کو مذاق بنالیا اور تمہیں دنیا کی زندگی نے دھوکا دیا، سو آج نہ وہ اس سے نکالے جائیں گے اور نہ ان سے توبہ کا مطالبہ کیا جائے گا ﴿۳۵﴾ پس اللہ ہی کے لیے سب تعریف ہے جو آسمانوں کا رب اور زمین کا رب، تمام جہانوں کا رب ہے ﴿۳۶﴾

جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام کے چار پرندوں والے واقعہ سے ظاہر ہے۔

آیت 33 ﴿۳۳﴾ وَبَدَا لَهُمْ سَيِّئَاتٌ مَّا عَمِلُوا..... : یعنی ان کے سامنے ان کے اعمال کے برے نتائج ظاہر ہو جائیں گے اور وہی قیامت اور جہنم جن کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے، وہ انھیں اپنے گھبرے میں گھبر لیں گے۔

آیت 34 ﴿۳۴﴾ وَقِيلَ الْيَوْمَ نَنْسِكُمْ كَمَا نَسَيْتُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَذَا..... : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ اعراف (۵۱) کی تفسیر۔

آیت 34 ﴿۳۴﴾ وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُونَ : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ نحل (۸۳) کی تفسیر۔

آیت 36 ﴿۳۶﴾ ﴿۱﴾ فَلِلَّهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ..... : یہ ان تمام باتوں کا خلاصہ اور نتیجہ ہے جو اس سے پہلے سورت میں بیان ہوئی ہیں۔ جن میں اس اکیلے کا کائنات کو پیدا کرنا، اسے مسخر کرنا، اسے نہایت اعلیٰ انتظام اور عدل کے ساتھ چلانا، مسلمانوں کو دنیا اور آخرت میں اپنے انعامات سے نوازنا، کفار کے آیات الہی سے اعراض کی مذمت، نہایت مضبوط دلائل کے ساتھ ان کے کفر و شرک کی تردید اور آخرت میں انھیں ان کے نہایت برے انجام کی وعید سنانا سب کچھ شامل ہے۔ یہ آیات اور ان میں مذکور حقائق اس بات کی دلیل ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی تمام خوبیوں اور صفات کمال کا مالک ہے اور وہ اکیلا تمام نعمتیں عطا فرمانے والا ہے۔ اس بات کو بطور نتیجہ بیان فرمایا۔ ”فَلِلَّهِ الْحَمْدُ“ میں ”لِلَّهِ“ کو پہلے لانے سے کلام میں حصر پیدا ہو گیا اور ”فاء“ کے ساتھ پچھلی ساری سورت کے ساتھ کلام کا تعلق قائم ہو گیا کہ جب وہ سب کچھ ثابت ہوا جو پہلے مذکور ہے تو ثابت ہو گیا کہ تمام حمد صرف اللہ کے لیے خاص ہے۔ اب ”فَلِلَّهِ الْحَمْدُ“ سے تین معنی مراد ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ اس میں خبر دی جا رہی ہے کہ تمام حمد اللہ ہی کے لیے ہے، دوسرا یہ کہ حکم دیا جا رہا ہے کہ تم اللہ ہی کی حمد کرو اور تیسرا یہ کہ اس میں حمد

وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿۳۷﴾

اور اسی کے لیے آسمانوں اور زمین میں سب بڑائی ہے اور وہی سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ﴿۳۷﴾

کی انشاء ہے، یعنی اللہ تعالیٰ اپنی حمد فرما رہا ہے جس کا وہ یقیناً حق دار ہے اور اکیلا حق دار ہے۔ پچھلے کلام کا خلاصہ اور نتیجہ ہونے میں اس آیت کی مثال یہ آیت بھی ہے: ﴿فَقَطَّعَ دَائِرَ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ [الأعام: ۴۰] ”تو ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی گئی جنہوں نے ظلم کیا تھا اور سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو سب جہانوں کا رب ہے۔“ (ابن عاشور)

﴿۳۷﴾ رَبِّ السَّمَوَاتِ: یہاں ”رَبِّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ“ بھی کہا جا سکتا تھا، مگر حمد کا مستحق ہونے میں رب ہونے کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے اسے تین دفعہ دہرایا: ﴿رَبِّ السَّمَوَاتِ وَرَبِّ الْأَرْضِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفت ربوبیت ہماری حمد کا مستحق ہونے کی سب سے بڑی وجہ ہے، کیونکہ ہمارا وجود، ہماری بقا، ہماری زندگی کا ہر لمحہ اور دنیا اور آخرت میں ہمیں ملنے والی ہر نعمت اسی کا نتیجہ ہے، یہ نہ ہو تو ہمارا وجود تک نہ ہو۔ اس لیے قرآن مجید کی سب سے عظمت والی اور پہلی سورت کی ابتدا اسی کے ساتھ فرمائی: ﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ [الفاتحة: ۱] ”سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو سارے جہانوں کا پالنے والا ہے۔“ سورہ صافات اور زیر تفسیر سورت کا خاتمہ اس کے ساتھ فرمایا اور جنتیوں کے متعلق بتایا: ﴿دَعْوُهُمْ فِيهَا سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَامٌ وَأُخِرْ دَعْوُهُمْ أَنْ يَحْمَدُوا رَبَّ الْعَالَمِينَ﴾ [یونس: ۱۰] ”ان کی دعا ان میں یہ ہوگی ”پاک ہے تو اے اللہ!“ اور ان کی آپس کی دعا ان (باغات) میں سلام ہوگی اور ان کی دعا کا خاتمہ یہ ہوگا کہ سب تعریف اللہ کے لیے جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے۔“

آیت 37 ﴿۳۷﴾ وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ: یہ جملہ لانے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے بندوں کو اپنی حمد کی تلقین و تاکید انھی کے فائدے کے لیے کی ہے، ورنہ وہ خود نہ ان کی تعریف کا محتاج ہے، نہ اسے اس کی ضرورت ہے اور نہ ان کی تعریف سے اس کی شان میں کوئی اضافہ ہوتا ہے، کیونکہ وہ پہلے سے اور ہمیشہ سے ساری بڑائی اور عظمت کا اکیلا مالک ہے، کوئی اور اس کی بڑائی میں کیا اضافہ کرے گا۔

﴿۳۷﴾ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ: یہ دو صفات اس بات کی دلیل کے طور پر ذکر فرمائیں کہ وہ اکیلا ہر کبریائی اور عظمت کا مالک ہے، کیونکہ وہی عزیز ہے اور وہی حکیم ہے (خبر پر الف لام سے حصر کا معنی پیدا ہو رہا ہے)، دوسرا کوئی نہ عزیز ہے نہ حکیم، تو اس میں کبریائی کیا ہوگی؟ ”العزیز“ میں قدرت و اختیار کی ہر صورت آجاتی ہے اور ”الحکیم“ میں علم کا ہر مفہوم آجاتا ہے۔ وہ ”العزیز“ (سب پر غالب) ہے، جو چاہے کر سکتا ہے، کوئی کام ایسا نہیں جو وہ نہ کر سکے اور کوئی ہستی ایسی نہیں جو اسے روک سکے اور وہ ”الحکیم“ (کمال حکمت والا) ہے، جو کرتا ہے عین حکمت اور بالکل درست ہوتا ہے، کوئی اس میں نہ غلطی نکال سکتا ہے نہ اس سے بہتر کی نشان دہی کر سکتا ہے۔



حَمْدٌ ۱ تَنْزِيلُ الْكِتَابِ مِنَ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ ۱ مَا خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

حَمْدٌ ۱ اس کتاب کا اتارنا اللہ کی طرف سے ہے جو سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ۱ ہم نے آسمانوں اور زمین

آیت 1 : حَمْدٌ : حروف مقطعات کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ بقرہ کی پہلی آیت کی تفسیر۔

آیت 2 : تَنْزِيلُ الْكِتَابِ مِنَ اللَّهِ : اس آیت کی وضاحت کے لیے دیکھیے سورہ زمر، سورہ مؤمن اور سورہ جاثیہ کی ابتدائی آیات کی تفسیر۔

آیت 3 : ۱ مَا خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ : قرآن مجید کے بنیادی مضامین میں سب سے اہم

مضمون توحید اور آخرت ہیں۔ ان دونوں کو دلائل کے ساتھ ثابت کرنے کے لیے ”تَنْزِيلُ الْكِتَابِ مِنَ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ“

کو بطور تمہید ذکر فرمایا۔ اس کے بعد ایک متفق علیہ بات کا ذکر فرمایا کہ یہ سب مانتے ہیں کہ آسمان و زمین اور ان کے درمیان

کی تمام چیزوں کو پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ یہ تسلیم کر لینے کے بعد اس کائنات کے متعلق کوئی بھی بات اسی کی معتبر ہوگی

جس نے اسے بنایا ہے۔ چنانچہ اس کا فرمان ہے کہ ہم نے آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کو حق ہی کے ساتھ پیدا

فرمایا ہے۔ ان میں سے کوئی چیز باطل نہیں کہ اس میں کوئی خامی یا غلطی ہو یا وہ بے مقصد ہو یا محض کھیل کے لیے بنائی گئی ہو،

بلکہ ان کے پیدا کرنے میں بہت سی حکمتیں ہیں۔ قرآن مجید نے آسمان و زمین کی پیدائش میں ملحوظ بہت سی حکمتیں بیان فرمائی

ہیں، جن میں سب سے بڑی اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی توحید پر دلالت ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَالْهٰكُمُ اللّٰهُ وَاحِدٌ ۙ لَا اِلٰهَ

اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ۝ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ

بِهَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَّاءٍ فَاَحْیَا بِهٖ الْاَرْضَۤ ثُمَّ یُعَدُّ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ ۝

وَتَصْرِیْفِ الرِّیْطِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ لَآیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ﴿ [البقرہ: ۱۶۳، ۱۶۴] ”اور

تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔ بے شک آسمانوں اور زمین

کے پیدا کرنے اور رات اور دن کے بدلنے میں اور ان کشتیوں میں جو سمندر میں وہ چیزیں لے کر چلتی ہیں جو لوگوں کو نفع دیتی

ہیں اور اس پانی میں جو اللہ نے آسمان سے اتارا، پھر اس کے ساتھ زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کر دیا اور اس میں ہر قسم

کے جانور پھیلا دیے اور ہواؤں کے بدلنے میں اور اس بادل میں جو آسمان و زمین کے درمیان مسخر کیا ہوا ہے، ان لوگوں کے

لیے یقیناً بہت سی نشانیاں ہیں جو سمجھتے ہیں۔“ یعنی یہ حقیقت کہ معبود برحق اکیلا اللہ تعالیٰ ہی ہے، عقل والوں کو زمین و آسمان کی

پیدائش اور ان دونوں میں پائی جانے والی مذکورہ اشیاء پر غور کرنے سے معلوم ہو جاتی ہے۔ قرآن مجید نے یہ حقیقت بار بار

دہرائی ہے کہ عبادت کا حق دار ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ اس بات پر ہوتا ہے کہ پیدا کرنے والا کون ہے؟ جو پیدا کرنے والا ہے

سچا معبود وہی ہے، جو کچھ پیدا ہی نہیں کر سکتا وہ معبود بھی نہیں ہو سکتا۔ خالق ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے اکیلے مستحق عبادت

بَيْنَهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ وَاجِلٍ مُّسْتَسِيٍّ وَالَّذِينَ كَفَرُوا عَنَّا أُنْذِرُوا مُعْرِضُونَ ﴿۳۱﴾

کو اور جو ان دونوں کے درمیان ہے حق اور مقررہ میعاد ہی کے ساتھ پیدا کیا ہے اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اس چیز سے جس سے وہ ڈرائے گئے، منہ پھرنے والے ہیں ﴿۳۱﴾

ہونے کی متعدد آیات میں سے چند آیات ملاحظہ فرمائیں، سورہ بقرہ (۲۲، ۲۱)، اعراف (۱۹۱)، ہود (۷)، رعد (۱۶)، سورہ نحل (۳ تا ۲۰) ان آیات میں ”خلق“ کے بار بار دہرانے کو ملحوظ رکھیں، سورہ حج (۷۳)، فرقان (۳، ۲) اور سورہ اعلیٰ (۲۱)۔

زمین و آسمان کی پیدائش میں ایک حکمت ان کی اللہ تعالیٰ کے علم اور اس کی قدرت کے کمال پر دلالت ہے، جیسا کہ فرمایا:

﴿اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ وَمِنَ الْأَرْضِ مِثْلَهُنَّ يَتَنَزَّلُ الْأَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ وَأَنَّ اللَّهَ قَدْ أَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا﴾ [الطلاق: ۱۲] ”اللہ ہی ہے جس نے سات آسمان پیدا کیے اور زمین سے بھی ان کی مانند۔ ان کے درمیان حکم نازل ہوتا ہے، تاکہ تم جان لو کہ اللہ ہر چیز پر خوب قدرت رکھنے والا ہے اور یہ کہ اللہ نے یقیناً ہر چیز کو علم سے گھیر رکھا ہے۔“ سورہ طلاق کی اس آیت میں ”لِتَعْلَمُوا“ (تاکہ تم جان لو) کا ”لام“ ”خَلَقَ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ“ کے متعلق ہے۔

آسمان و زمین کو حق کے ساتھ پیدا کرنے میں ایک حکمت ظلوک کی آزمائش ہے کہ ان میں سے عمل کے لحاظ سے بہتر کون ہے، جیسا کہ فرمایا:

﴿وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ فِي يَوْمٍ ثَلَاثِينَ وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا﴾ [ہود: ۲۷] ”اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا اور اس کا عرش پانی پر تھا، تاکہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل میں زیادہ اچھا ہے۔“ یہی بات سورہ کہف (۷) اور سورہ ملک (۳، ۲) میں فرمائی۔ اسی کی وضاحت سورہ زاریات میں فرمائی:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ﴿۱۷﴾ مَا أُرِيدُ مِنْكُمْ مِن زُرْقٍ وَمَا أُرِيدُ أَن يُطِيعُونِ﴾ [المداریات: ۱۷، ۱۶] ”اور میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا نہیں کیا مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں۔ نہ میں ان سے کوئی رزق چاہتا ہوں اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں۔“

حق کے ساتھ پیدا کرنے میں ایک حکمت ان کی اس بات پر دلالت ہے کہ ہر شخص کو اس کے عمل کی جزا ملے گی، جیسا کہ فرمایا:

﴿وَلِيُوَفِّيَ قَافِي السَّمَوَاتِ وَمَافِي الْأَرْضِ لِيَجْزِيَ الَّذِينَ أَسَاءُوا بِمَا عَمِلُوا وَيَجْزِيَ الَّذِينَ أَحْسَنُوا بِالْحُسْنَىٰ﴾ [النجم: ۳۱] ”اور جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے اللہ ہی کا ہے، تاکہ وہ ان لوگوں کو جنہوں نے برائی کی اس کا بدلہ دے جو انہوں نے کیا اور ان لوگوں کو جنہوں نے بھلائی کی بھلائی کے ساتھ بدلہ دے۔“ اس کی وضاحت سورہ یونس کی آیت (۳) سے بھی ہوتی ہے۔ کفار چونکہ سمجھتے تھے کہ آسمان و زمین کی پیدائش کا کوئی مقصد نہیں، نہ اللہ کی طرف سے ان پر کوئی ذمہ داری عائد ہوئی ہے، نہ حساب ہوگا اور نہ جزا و سزا کا کوئی معاملہ ہے۔ ان کے مطابق تو زمین و آسمان کا یہ سب سلسلہ باطل اور بے مقصد ہوا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے کفار کی اس بات کی سخت تردید فرمائی، فرمایا:

﴿وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بِإِطْلَافٍ ذَٰلِكَ ظَنُّ الَّذِينَ كَفَرُوا ﴿۱۰﴾ قَوْلِهِمْ لِيَلْزَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن النَّارِ﴾ [حز: ۲۷] ”اور ہم نے آسمان و زمین کو اور ان دونوں کے درمیان کی

قُلْ أَرَأَيْتُمْ مَا تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَرُونِي مَاذَا خَلَقُوا مِنَ الْأَرْضِ أَمْ لَهُمْ شِرْكٌ

کہہ دے کیا تم نے دیکھا جن چیزوں کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، مجھے دکھاؤ انھوں نے زمین میں سے کون سی چیز پیدا

چیزوں کو بے کار پیدا نہیں کیا۔ یہ ان لوگوں کا گمان ہے جنہوں نے کفر کیا، سو ان لوگوں کے لیے جنہوں نے کفر کیا آگ کی صورت میں بڑی ہلاکت ہے۔“ یہی بات سورہ مومنون (۱۱۵، ۱۱۶)، آل عمران (۱۹۰، ۱۹۱) اور سورہ دخان (۳۸، ۳۹) میں بیان ہوئی ہے۔

② **وَاجَل مُسَمًّى**: یعنی ہم نے کائنات کا یہ نظام دائمی اور ابدی نہیں بنایا، بلکہ اس کا ایک وقت مقرر ہے، جس کے بعد ہر شخص کو اس کے عمل کا بدلہ ملے گا۔

③ **وَالَّذِينَ كَفَرُوا عَتَا أُنذِرُوا نِعْرُضُونَ**: ”انداز“ کا معنی آگاہ کرنا ہے جس کے ساتھ ڈرانا بھی ہو۔ یعنی اگرچہ کفار کو آگاہ کر دیا گیا کہ زمین و آسمان کی پیدائش بے مقصد نہیں، نہ یہ سلسلہ دائمی ہے بلکہ یہ تمہاری آزمائش کے لیے ہے اور ایک مقرر وقت پر تم سب اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کیے جاؤ گے، اس کے باوجود جس آخرت اور جس آخری عذاب سے انہیں ڈرایا گیا وہ اس سے منہ پھیرنے والے ہیں، نہ اس پر ایمان لاتے ہیں اور نہ اس سے بچنے کی تیاری کرتے ہیں۔

آیت 4 ① **قُلْ أَرَأَيْتُمْ مَا تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ.....** جیسا کہ کچھلی آیت کی تفسیر میں تفصیل سے بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اکیلے معبود ہونے کی اور اس کے سوا تمام معبودوں کے باطل ہونے کی سب سے بڑی اور واضح دلیل اس کا کائنات کو پیدا کرنا ہے۔ یہ عقلی دلیل ہے جسے کوئی صاحب عقل رد نہیں کر سکتا، کفار کی اس کے جواب سے بے بسی واضح کرنے کے لیے اسے مناظرانہ انداز میں پیش کرنے کا حکم دیا کہ آپ ان سے کہیں کہ مجھے بتاؤ کہ اللہ کے سوا جن ہستیوں کو تم پکارتے ہو، ذرا مجھے دکھاؤ زمین کی وہ کون سی چیز ہے جو انھوں نے پیدا کی ہے، یا آسمانوں میں ان کا کوئی حصہ ہے تو وہ دکھاؤ؟ ظاہر ہے وہ ایسی کوئی چیز دکھائی نہیں سکتے، تو پھر کسی اور معبود کی عبادت کیوں کرتے ہیں۔ یہاں ایک لمبی بات کو مختصر کر دیا ہے، اصل یہ تھا کہ مجھے دکھاؤ کہ زمین و آسمان کی کون سی چیز ہے جو پوری کی پوری انھوں نے پیدا کی ہو، یا زمین و آسمان کی کوئی چیز دکھاؤ جو پوری نہ سہی اس کے بنانے یا چلانے میں ان کا کچھ حصہ ہی ہو۔ پہلے جملے میں سے صرف زمین کا ذکر فرمایا آسمان کو حذف کر دیا، دوسرے جملے میں آسمانوں کا ذکر فرمایا زمین کو حذف کر دیا۔ یہ بات خود بخود سمجھ میں آ رہی ہے کہ دونوں جملوں میں دونوں مراد ہیں، اسے بلاغت کی اصطلاح میں احتباك کہتے ہیں۔

بعض مفسرین نے یہاں لکھا ہے کہ آیت میں زمین کی کسی چیز کو پیدا کرنے کی نفی اور آسمانوں کی چیز میں شرکت کی نفی اس لیے فرمائی ہے کہ بظاہر زمین کی بعض اشیاء میں ان کی شرکت ہے جو آسمانوں میں بظاہر بھی نہیں۔ مگر یہ درست نہیں، کیونکہ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے صاف الفاظ میں زمین و آسمان دونوں کی کسی چیز میں ان کی شرکت کی نفی فرمائی ہے۔ اس لیے وہی تفسیر درست ہے جو اوپر کی گئی ہے۔ دیکھیے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿قُلْ ادْعُوا الَّذِينَ رَعَيْنَا مِنْ دُونِ اللَّهِ ۗ لَا يَخْلُقُونَ ۖ وَإِنَّمَا كُنَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيهَا مِنْ شِرْكٍ وَمَا لَهُ مِنْهُمْ مِنْ ظٰلِمٍ﴾ [سبا: ۲۲]

فِي السَّمَوَاتِ اِنْ يَتُونِي يَكْتُبْ مِنْ قَبْلِ هَذَا اَوْ اَثَرَةٍ مِنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۳۰﴾

کی ہے، یا آسمانوں میں ان کا کوئی حصہ ہے؟ لاؤ میرے پاس اس سے پہلے کی کوئی کتاب، یا علم کی کوئی نقل شدہ بات، اگر تم سچے ہو ﴿۳۰﴾

”کہہ دے پکارو ان کو جنہیں تم نے اللہ کے سوا گمان کر رکھا ہے، وہ نہ آسمانوں میں ذرہ برابر کے مالک ہیں اور نہ زمین میں اور نہ ان کا ان دونوں میں کوئی حصہ ہے اور نہ ان میں سے کوئی اس کا مددگار ہے۔“

﴿۳۰﴾ اِنْ يَتُونِي يَكْتُبْ مِنْ قَبْلِ هَذَا اَوْ اَثَرَةٍ مِنْ عِلْمٍ : ”اَثَرَةٍ“ ”اَثَرٌ يَأْتُرُ اَثْرًا وَ اَثَارَةٌ وَ اَثَرَةٌ“ (ض، ان) الحدیث ”بات کو نقل کرنا۔ ”مَثْوُورٌ“ بمعنی ”منقول“۔ ”اَثَرَةٍ مِنْ عِلْمٍ“ نقل شدہ یا پہلے لوگوں کا باقی ماندہ علم۔ یہ شرک کی تردید کی نقلی دلیل ہے، یعنی شرک کی عقلی دلیل پیش نہیں کر سکتے تو کوئی معتبر نقلی دلیل ہی لے آؤ۔ قرآن سے پہلے کی کسی آسمانی کتاب مثلاً تورات یا انجیل وغیرہ سے شرک کا ثبوت لے آؤ، جو کسی قابل اعتماد طریقے سے ہم تک پہنچی ہو، کیونکہ اس کے بغیر اس کا آسمانی کتاب ہونا ثابت ہی نہیں ہوتا۔ یا پہلے انبیاء کی احادیث میں سے منقول کوئی حدیث لے آؤ، جو محض ظن و تخمین سے منقول نہ ہو بلکہ اس سے علم و یقین حاصل ہوتا ہو۔ اس طرح کہ وہ صحیح سند یا تواتر کے ساتھ نقل ہوئی ہو، کیونکہ وہم و گمان پر مبنی چیز کو علم نہیں کہا جاتا، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَمَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ اِنْ يَتَّبِعُونَ اِلَّا الظَّنَّ : وَ اِنْ الظَّنُّ لَا يُفِيقُ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا﴾ [النجم : ۲۸] ”حالانکہ انھیں اس کے متعلق کوئی علم نہیں، وہ صرف گمان کے پیچھے چل رہے ہیں اور بے شک گمان حق کے مقابلے میں کسی کام نہیں آتا۔“ مگر تمہیں ایسی کوئی معتبر قدیم آسمانی کتاب یا کسی نبی کی حدیث نہیں ملے گی جس میں شرک کا شائبہ تک موجود ہو، کیونکہ ہر رسول نے توحید ہی کی تعلیم دی، فرمایا: ﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ اُمَّةٍ رَسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الصّٰغٰتِ﴾ [النحل : ۳۶] ”اور بلاشبہ یقیناً ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو۔“ اور فرمایا: ﴿وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْ اِلَيْهِ اَنَّهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدُوْنِ﴾ [الانبیاء : ۲۵] ”اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف یہ وحی کرتے تھے کہ حقیقت یہ ہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو میری عبادت کرو۔“

بعض اہل علم نے فرمایا کہ ”اگر یہاں کتاب سے مراد کتاب الہی اور بقیہ علم سے مراد انبیاء و صلحاء کا چھوڑا ہوا علم نہ بھی لیا جائے تو دنیا کی کسی علمی کتاب اور دینی یا دنیوی علوم کے کسی ماہر کی تحقیقات میں بھی آج تک اس امر کی نشاندہی نہیں کی گئی ہے کہ زمین یا آسمان کی فلاں چیز کو خدا کے سوا فلاں بزرگ یا دیوتا نے پیدا کیا ہے، یا انسان جن نعمتوں سے اس کائنات میں متبع ہو رہا ہے ان میں سے فلاں نعمت خدا کے بجائے فلاں معبود کی آفریدہ ہے۔“ مگر یہ بات کلی طور پر درست نہیں، کیونکہ کئی دہریہ سائنسدان اپنی تحقیق کے ذریعے سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ کائنات خود بخود پیدا ہوئی اور خود بخود ہی چل رہی ہے۔ زمانے کو خالق و مالک قرار دینے والے لوگ اپنی اس جہالت کو تحقیق ہی کہتے ہیں۔ اس لیے کتاب سے مراد آسمانی

وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنْ يَدْعُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ مَنْ لَا يَسْتَجِيبُ لَهُ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَهُمْ
عَنْ دُعَائِهِمْ غَفُلُونَ ﴿۵﴾

اور اس سے بڑھ کر کون گمراہ ہے جو اللہ کے سوا انھیں پکارتا ہے جو قیامت کے دن تک اس کی دعا قبول نہیں کریں
گے اور وہ ان کے پکارنے سے بے خبر ہیں ﴿۵﴾

کتاب ہی لینا چاہیے، کیونکہ دوسری آیت سے صاف ظاہر ہے کہ کتاب سے مراد اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب ہے، جیسا کہ
فرمایا: ﴿قُلْ أَرَأَيْتُمْ شُرَكَاءَكُمُ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَرُونِي مَاذَا خَلَقُوا مِنَ الْأَرْضِ أَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي
السَّمَوَاتِ أَمْ أُنزِلَتْهُمْ كُتُبًا فهُمْ عَلَىٰ بَيِّنَاتٍ مِنْهُ ۚ بَلْ إِنْ يَعِدُ الظَّالِمُونَ بَعْضُهُمَ بَعْضًا إِلَّا غُرُورًا﴾ [فاطر: ۱۷۰] ”کہہ
دے کیا تم نے اپنے شریکوں کو دیکھا، جنہیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو؟ مجھے دکھاؤ زمین میں سے انھوں نے کون سی چیز پیدا کی
ہے، یا آسمانوں میں ان کا کوئی حصہ ہے، یا ہم نے انھیں کوئی کتاب دی ہے کہ وہ اس کی کسی دلیل پر قائم ہیں؟ بلکہ ظالم لوگ،
ان کے بعض بعض کو دھوکے کے سوا کچھ وعدہ نہیں دیتے۔“ ان آیات سے معلوم ہوا کہ دین میں دلیل کے طور پر آسمانی کتاب
پیش کی جاسکتی ہے یا آسمانی وحی پر مشتمل احادیث، ان کے علاوہ کسی کی تصنیف کو یا اس کے اقوال کو بطور دلیل پیش نہیں کیا جاسکتا۔

آیت ۵: ﴿وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنْ يَدْعُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ.....﴾ : یہ استفہام انکار کے لیے ہے، یعنی اس سے بڑھ کر کوئی گمراہ
نہیں جو اللہ کو چھوڑ کر ایسی ہستیوں کو پکارے جو قیامت کے دن تک ان کی دعا قبول نہیں کر سکتے، کیونکہ ان کے پاس یہ اختیار
ہی نہیں، بلکہ انھیں ان کے پکارنے کی خبر ہی نہیں۔ عام طور پر ان سے مراد پتھر اور بت لیے جاتے ہیں، مگر لفظ ”مَنْ“ ذوی العقول
کے لیے آتا ہے، اس لیے اس سے مراد وہ سب ہستیاں ہیں جنہیں لوگ اللہ کے سوا پکارتے ہیں، جن میں انسان، جن، فرشتے،
نبی، ولی، نیک، بد، زندہ، مردہ سب شامل ہیں۔ رہے پتھر، بت اور قبریں وغیرہ تو انھیں پکارتے اور پوجتے وقت بھی مشرکین
دراصل ان بتوں یا قبروں کے بجائے ان ہستیوں ہی کو پکار رہے ہوتے ہیں جن کے وہ بت یا قبریں ہیں، ورنہ انھیں بت
بنانے کی ضرورت کیا تھی، کسی بھی پتھر کی پوجا کر لیتے۔ چنانچہ مشرکین عرب نے بین کعب کے اندر ابراہیم اور اسماعیل علیہم السلام کی
صورتیں بنا کر رکھی ہوئی تھیں، جنہیں فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کے حکم سے کعبہ سے نکالا گیا۔ (دیکھیے بخاری: ۳۲۸۸)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی کسی کی پکار نہ سکتا ہے نہ اس کی مدد کو پہنچ سکتا ہے۔ قرآن مجید نے یہ
بات بار بار برائی ہے، فرمایا: ﴿وَالَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ مَا يَمْلِكُونَ مِنْ قِطْمِيرٍ ﴿۱۶﴾ إِنْ تَدْعُوهُمْ لَا يَسْمَعُوا دُعَاءَكُمْ
وَلَوْ سَمِعُوا مَا اسْتَجَابُوا لَكُمْ ۗ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكْفُرُونَ بِشِرْكِكُمْ ۗ وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيرٍ ﴿۱۷﴾﴾ [فاطر: ۱۶، ۱۷] ”اور
جن کو تم اس کے سوا پکارتے ہو وہ کھجور کی گٹھلی کے ایک چھلکے کے مالک نہیں۔ اگر تم انھیں پکارو تو وہ تمھاری پکار نہیں سنیں گے
اور اگر وہ سن لیں تو تمھاری درخواست قبول نہیں کریں گے اور قیامت کے دن تمھارے شرک کا انکار کر دیں گے اور تجھے ایک
پوری خبر رکھنے والے کی طرح کوئی خبر نہیں دے گا۔“ اور فرمایا: ﴿إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ عِبَادًا أَشْأَلَكُمْ

وَإِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوا لَهُمْ أَعْدَاءً وَكَانُوا بِعِبَادَتِهِمْ كُفْرِينَ ① وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ هَذَا سِحْرٌ مُّبِينٌ ②

اور جب سب لوگ اکٹھے کیے جائیں گے تو وہ ان کے دشمن ہوں گے اور ان کی عبادت سے منکر ہوں گے ① اور جب ان کے سامنے ہماری واضح آیات پڑھی جاتی ہیں تو وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا حق کے بارے میں، جب وہ ان کے پاس آیا، کہتے ہیں یہ کھلا جادو ہے ②

فَازْعُوهُمْ فَيَنْتَجِبُوا لَكُمْ إِن كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿ [الأعراف : ۱۹۴] ”بے شک جنہیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو وہ تمہارے جیسے بندے ہیں، پس انہیں پکارو تو لازم ہے کہ وہ تمہاری دعا قبول کریں، اگر تم سچے ہو۔“ اور فرمایا: ﴿لَا دَعْوَةَ الْحَقِّ وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِهِ لَا يَسْتَجِيبُونَ لَهُمْ بِشَيْءٍ إِلَّا كِبَاسٌ مِّنْ عَيْنِهَا إِلَىٰ الْمَاءِ لِيَلْبِغُوا فِيهِ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهِ وَمَا دَعَا الْكُفْرِينَ إِلَّا فِي ضَلَالٍ ﴿ [الرعد : ۱۴] ”برحق پکارنا صرف اسی کے لیے ہے اور جن کو وہ اس کے سوا پکارتے ہیں وہ ان کی دعا کچھ بھی قبول نہیں کرتے، مگر اس شخص کی طرح جو اپنی دونوں ہتھیلیاں پانی کی طرف پھیلانے والا ہے، تاکہ وہ اس کے منہ تک پہنچ جائے، حالانکہ وہ اس تک ہرگز پہنچنے والا نہیں اور نہیں ہے کافروں کا پکارنا مگر سر اسر بے سود۔“ قارئین ”لَا يَسْتَجِيبُ“ کا مفہوم سمجھنے کے لیے تھوڑی زحمت کر کے ان مذکورہ بالا مقامات کی تفسیر پر بھی نظر ڈال لیں۔

آیت 6 وَإِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوا لَهُمْ أَعْدَاءً : یعنی قیامت کے دن جب انہیں بتایا جائے گا کہ یہ لوگ تمہیں پکارتے رہے اور تم سے فریاد کرتے رہے تو وہ صاف کہہ دیں گے کہ ہمیں اس بات کی کوئی خبر نہیں کہ یہ ہمیں پکارتے رہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا مَا كُنْتُمْ أَن تُمْ وَشُرَكَاءُكُمْ فَزَلِنَا بَيْنَهُمْ وَقَالَ شُرَكَاءُهُمْ مَا كُنْتُمْ إِنَّا نَتَعْبُدُونَ ③ فَلَئِن يَأْتِيَنَّكُمْ مِنَّا آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ وَمِنكُمْ أَن كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغْفِيلِينَ ﴿ [يونس : ۲۸، ۲۹] ”اور جس دن ہم ان سب کو اکٹھا کریں گے، پھر ہم ان لوگوں سے جنہوں نے شریک بنائے تھے، کہیں گے اپنی جگہ ٹھہرے رہو، تم اور تمہارے شریک بھی، پھر ہم ان کے درمیان علیحدگی کر دیں گے اور ان کے شریک کہیں گے تم ہماری تو عبادت نہیں کیا کرتے تھے۔ سو اللہ ہمارے درمیان اور تمہارے درمیان کافی گواہ ہے کہ بے شک ہم تمہاری عبادت سے یقیناً بے خبر تھے۔“ اور دیکھیے سورہ قصص (۶۳) اور سورہ نحل (۸۶) صبح ﷺ بھی اپنی عبادت کرنے والوں سے اپنے بے خبر ہونے کی صراحت فرمادیں گے (دیکھیے مادہ: ۱۱۶، ۱۱۷) اور فرشتے بھی۔ (دیکھیے فرقان: ۱۷، ۱۸، سبا: ۴۰، ۴۱) بلکہ اللہ تعالیٰ کے سوا جن کی بھی پوجا کی گئی وہ پوجا کرنے اور پکارنے والوں کے شدید مخالف اور دشمن بن جائیں گے۔ (دیکھیے سورہ مریم (۸۱، ۸۲)۔

آیت 7 وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالُوا هَذَا سِحْرٌ مُّبِينٌ ﴿ (جب ان کے سامنے ہماری واضح آیات پڑھی جاتی ہیں تو کہتے ہیں یہ کھلا جادو ہے) مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ إِنْ افْتَرَيْتُهُ فَلَا تَمْلِكُونَ لِي مِنَ اللَّهِ شَيْئًا هُوَ أَعْلَمُ بِمَا تُفْعِلُونَ فِيهِ دَغْفَىٰ بِهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ وَهُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴿۸﴾

یادہ کہتے ہیں کہ اس نے اسے خود گھڑ لیا ہے، کہہ دے اگر میں نے اسے خود گھڑ لیا ہے تو تم میرے لیے اللہ کے مقابلے میں کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتے، وہ ان باتوں کو زیادہ جاننے والا ہے جن میں تم مشغول ہوتے ہو، وہی میرے درمیان اور تمہارے درمیان گواہ کے طور پر کافی ہے اور وہی بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے ﴿۸﴾

بَيِّنَاتٍ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ هَذَا سِحْرٌ مُّبِينٌ ﴿۸﴾ اور جب ان کے سامنے ہماری واضح آیات پڑھی جاتی ہیں تو وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا حق کے بارے میں، جب وہ ان کے پاس آیا، کہتے ہیں یہ کھلا جادو ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اختصار کے بجائے تین باتوں ”قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا“، ”لِلْحَقِّ“ اور ”لَمَّا جَاءَهُمْ“ کی صراحت فرمائی۔ ”قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا“ کا مقصد یہ ہے کہ ان کے جھٹلانے کا اصل باعث ان کا کفر و انکار ہے، جب کوئی طے کر لے کہ ماننا ہی نہیں تو بڑی سے بڑی دلیل بھی اس کے لیے بے کار ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ﴾ [البقرة: ۶] ”بے شک جن لوگوں نے کفر کیا ان پر برابر ہے، خواہ تو نے انہیں ڈرایا ہو یا انہیں نہ ڈرایا ہو، ایمان نہیں لائیں گے۔“ ”لِلْحَقِّ“ کہہ کر آیات عینات کی عظمت و اہمیت اور کفار کی بد نصیبی نمایاں فرمائی کہ دیکھو وہ اس چیز کو جادو کہہ رہے ہیں جو حق ہے، جب کہ جادو سراسر باطل ہوتا ہے اور ”لَمَّا جَاءَهُمْ“ کا مطلب یہ ہے کہ اگر ان کے پاس حق نہ آتا تو انہیں معذور سمجھا جاتا، حق آنے کے بعد اسے جادو کہنا بہت بڑی جرأت ہے۔ ”وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ“ اور ”لَمَّا جَاءَهُمْ“ سے یہ بات بھی واضح ہو رہی ہے کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی آیات پر غور و فکر کی زحمت ہی نہیں کرتے، بلکہ سنتے ہی انہیں جھٹلا دیتے ہیں اور جب جھٹلانے کے لیے کوئی معقول وجہ نہیں پاتے تو اس کی شدت تاثر کی وجہ سے اسے جادو کہہ کر جان چھڑا لیتے ہیں، حالانکہ کہاں جادو اور کہاں یہ پاکیزہ اور عظیم الشان کلام، جس کی ایک سورت کی مثال وہ نہ لاسکے نہ لاسکتے ہیں اور کہاں نجس اور پلید جادوگر اور کہاں محمد رسول اللہ ﷺ جیسا پاک باز اور صادق و امین انسان، جس کی پاک بازی اور صدق و امانت کا انہیں نبوت سے چالیس برس پہلے کا بھی تجربہ تھا۔

آیت 8 ﴿۸﴾ ۱ ﴿۸﴾ أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ: یہ ایمان نہ لانے کا ایک اور بہانہ ہے۔ ”واو“ کے ساتھ عطف کے بجائے حرف ”أَمْ“ لایا گیا ہے، یعنی ان کی یہ بات کہ یہ جادو ہے ایک طرف رہی، اس سے بھی عجیب بات سنو، وہ کہتے ہیں کہ اس نے قرآن خود تصنیف کیا ہے اور جھوٹ باندھتے ہوئے کہہ دیا ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ حالانکہ اس میں وہ اپنی ہی بات کی نفی کر رہے ہیں، کیونکہ اگر یہ جادو ہے تو آپ ﷺ کا اپنا کلام نہیں اور اگر آپ ﷺ کا کلام ہے تو جادو نہیں۔

﴿۸﴾ قُلْ إِنْ افْتَرَيْتُهُ فَلَا تَمْلِكُونَ لِي مِنَ اللَّهِ شَيْئًا: ”إِنْ افْتَرَيْتُهُ“ کا جواب محذوف ہے جو ”فَلَا تَمْلِكُونَ لِي“ سے سمجھ میں آ رہا ہے: ”أني إن افتريتني عاقبتني الله على الإفتراء فلا تملكون لي من الله شيئاً“ ”یعنی آپ ان سے

قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا قَبْلَ الرُّسُلِ وَمَا أَدْرِي مَا يُفْعَلُ بِي وَلَا بِكُمْ ۚ إِنَّ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُؤْتَىٰ

کہہ دے میں رسولوں میں سے کوئی انوکھا نہیں ہوں اور نہ میں یہ جانتا ہوں کہ میرے ساتھ کیا کیا جائے گا اور نہ کہہ دیں کہ اگر میں نے جھوٹ گھڑنے کا جرم کیا ہے تو یقیناً اللہ تعالیٰ مجھے جھوٹ گھڑنے کی سزا دے گا، پھر تم اللہ تعالیٰ سے چھڑانے کے لیے میرے کسی کام نہ آؤ گے۔“ ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضُ الْأَقَاوِيلِ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ۚ لَقَدْ لَطَمْنَا مِنْهُ الْفُتَيْنِ ۚ فَمَا مَنَعَكُمْ مِنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ﴾ [الحاقہ: ۴۴ تا ۴۷] ”اور اگر وہ ہم پر کوئی بات بنا کر لگا دیتا۔ تو یقیناً ہم اس کو دائیں ہاتھ سے پکڑتے۔ پھر یقیناً ہم اس کی جان کی رگ کاٹ دیتے۔ پھر تم میں سے کوئی بھی (ہمیں) اس سے روکنے والا نہ ہوتا۔“

③ **هُوَ أَعْلَمُ بِمَا تُفِيضُونَ فِيهِ.....** : یعنی جب تم اس حد تک آگے کہ اس کلام کو افترا اور انسانی کلام کہنے لگے جس کی چھوٹی سے چھوٹی سورت کی مثال لانے سے بھی تم قاصر رہے اور سب کے سامنے واضح ہو گیا کہ وہ انسان کا کلام نہیں اور نہ کوئی انسان ایسا کلام کر سکتا ہے تو اب تم سے بحث کا کوئی فائدہ نہیں، میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں، وہ ان باتوں کو خوب جانتا ہے جو تم بناتے رہتے ہو۔ کبھی اسے جادو کہتے ہو، کبھی کہانت، کبھی شعر اور کبھی خود تصنیف کر کے اللہ تعالیٰ پر بانٹھا ہوا طوفان۔ وہی میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے کافی ہے، کیونکہ وہ ہم دونوں کی ہر بات سے واقف اور ہر موقع کا گواہ ہے۔

④ **وَهُوَ الْعَفْوَ الرَّحِيمُ** : اس جملے کی مناسبت اس مقام پر دو طرح سے ہے، ایک یہ کہ تمہارا قرآن کو افترا اور نبی کو مفتری کہنا اتنا بڑا جرم ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ غفور و رحیم نہ ہوتا، بلکہ کوئی بے رحم اور سخت گیر مالک ہوتا تو تمہیں ایک سانس کی مہلت بھی نہ ملتی۔ یہ اس کی مغفرت اور رحمت ہی ہے کہ ایسی گستاخیوں کے باوجود وہ تمہیں فوراً نہیں پکڑتا، بلکہ مہلت دیتا ہے کہ تم کسی وقت ہی پلٹ آؤ۔ دوسری مناسبت یہ ترغیب ہے کہ اب بھی اس ہٹ دھرمی سے باز آ جاؤ تو اللہ تعالیٰ کی مغفرت و رحمت تمہارا انتظار کر رہی ہیں، کیونکہ وہ غفور بھی ہے اور رحیم بھی۔ نہ اس کی مغفرت کی کوئی انتہا ہے نہ رحمت کی، تم نے جو کچھ کیا وہ اب بھی معاف کر دے گا۔ ”الْعَفْوَ الرَّحِيمُ“ ضمیر ”هُوَ“ کی خبر ہے، جس پر الف لام آنے سے کلام میں حصر پیدا ہو گیا ہے، یعنی غفور و رحیم بس وہی ہے اور کوئی ہے ہی نہیں جو تمہارے گناہوں پر پردہ ڈال دے اور تم پر بے حد رحم کرنے والا ہو، پھر اس سے بھاگ کر کہاں جاؤ گے؟

آیت 9: ① **قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا قَبْلَ الرُّسُلِ**: ”بَدْعٌ يَبْدَعُ بَدْعًا“ (ف) ”الْشَيْءُ“ کسی چیز کو ایجاد کرنا، کسی پہلی مثال کے بغیر بنانا۔ سورہ بقرہ (۱۱۷) اور سورہ انعام (۱۰۱) میں ”بَدِيعُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ“ اسی سے ہے۔ ”بَدْعٌ يَبْدَعُ بَدْعًا وَبَدَاعَةٌ وَبُدُوعَةٌ“ (ک) نیا ہونا، جس کی پہلے کوئی مثال نہ ہو۔ ”بَدْعًا“ صفت مشبہ فعل لازم سے بمعنی اسم فاعل ہے، جیسے ”خِفْتُ“ بمعنی خفیف ہے، یا فعل متعدی سے بمعنی اسم مفعول ہے، جیسے ”جَبْتُ“ بمعنی محبوب ہے۔ ”بَدْعًا قَبْلَ الرُّسُلِ“ نیا

إِنِّي وَمَا أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ①

(یہ کہ) تمہارے ساتھ (کیا)، میں تو بس اسی کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے اور میں تو بس واضح ڈرانے والا ہوں ①

یا انوکھا رسول۔ کفار ایمان نہ لانے کے لیے جو بہانے اور اعتراض کرتے تھے ان میں سے چند کا ذکر اور ان کا جواب پچھلی دو آیات میں گزرا۔ اس آیت میں ان کے بہت سے اعتراضات کا صرف جواب ذکر کیا گیا ہے، اعتراضات کا ذکر نہیں کیا گیا، کیونکہ وہ خود بخود جواب سے سمجھ میں آرہے ہیں۔ قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر ان کا ذکر صراحت کے ساتھ بھی موجود ہے، جن میں سے ایک یہ تھا کہ ہمارے جیسا ایک بشر رسول کیسے بن گیا، جو ہماری طرح کھاتا پیتا، بازاروں میں چلتا پھرتا اور بیوی بچے رکھتا ہے۔ ایک اعتراض یہ کرتے کہ تو حید کی جو تعلیم یہ نبی پیش کرتا ہے ہم نے اپنے آبا و اجداد میں نہیں سنی۔ (دیکھیے ص: ۸۲۴۔ فرقان: ۷) ایک یہ کہ اگر یہ رسول ہے تو ہمارے مطالبے کے مطابق معجزے کیوں پیش نہیں کرتا، مثلاً پہاڑ ہٹا دے، دریا بہا دے، سونے کا مکان بنالے، آسمان پر چڑھ جائے اور وہاں سے کتاب لا کر دکھائے وغیرہ۔ (دیکھیے بنی اسرائیل: ۹۰۔ ۹۳) اور ایک یہ کہ غیب کی خبریں ہمارے مطالبے کے مطابق کیوں نہیں بتاتا، تم از کم یہ ہی بتا دے کہ قیامت کب ہوگی۔ (دیکھیے اعراف: ۱۸۷) اللہ تعالیٰ نے ان سب کے جواب میں یہ کہنے کا حکم دیا کہ میں کوئی پہلا رسول نہیں جو بشر ہو، مجھ سے پہلے تمام رسول بشر ہی تھے، وہ کھاتے پیتے، بازاروں میں چلتے پھرتے اور بیوی بچوں والے تھے۔ ان پر انسانی عوارض آتے تھے، سب کی تعلیم تو حید تھی، وہ خدائی اختیارات نہیں رکھتے تھے اور نہ ہی وہ اپنی مرضی سے معجزے پیش کر سکتے تھے۔ پھر اگر وہ سب، جن میں تمہارے جد امجد ابراہیم اور اسماعیل علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے بہت سے انبیاء شامل ہیں، رسول اور نبی ہو سکتے ہیں اور تم انہیں نبی مانتے ہو تو میرا رسول ہونا کون سی انوکھی بات ہے؟

② وَمَا أَدْرِي مَا يَفْعَلُ بِي وَلَا يَفْعَلُ بِي : یہ ان کے اس مطالبے کا جواب ہے کہ یہ ہمیں ہمارے مطالبے کے مطابق غیب کی خبریں کیوں نہیں دیتا۔ فرمایا ان سے کہہ دو کہ میں خود کچھ بھی نہیں جانتا، نہ یہ جانتا ہوں کہ میرے ساتھ کیا کیا جائے گا اور نہ یہ کہ تمہارے ساتھ کیا کیا جائے گا، تو میں تمہیں اپنے پاس سے تمہاری طلب کردہ باتیں کیسے بتا سکتا ہوں؟ ”مَا يَفْعَلُ“ فعل مجہول اس لیے لایا گیا تاکہ فاعل عام رہے، یعنی اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ کیا کرے گا اور لوگ کیا کریں گے۔ پھر یہ ذکر نہیں کیا گیا کہ کس وقت کیا کیا جائے گا، تاکہ عام رہے کہ ہمارے ساتھ دنیا میں کیا کیا جائے گا اور آخرت میں کیا کیا جائے گا۔

یہاں ایک مشہور سوال ہے کہ رسول اللہ ﷺ یقیناً جانتے تھے کہ دنیا اور آخرت میں آپ کے ساتھ کیا کیا جائے گا اور آپ پر ایمان لانے والوں یا نہ لانے والوں کے ساتھ کیا کیا جائے گا، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے کہ آپ کے پہلے اور پچھلے تمام گناہ معاف کر دیے گئے اور صحابہ کرام کے تمام گناہ معاف کر کے انہیں جنت میں داخل کیا جائے گا اور کفار و منافقین کو جہنم کا عذاب دیا جائے گا۔ (دیکھیے فتح: ۲۲۱) دنیا میں بھی آپ کو اور ایمان والوں کو عزت و غلبہ اور کفار کو ذلت و رسوائی ملے گی

اور آپ کا دین تمام دینوں پر غالب آئے گا۔ دیکھیے سورہ مجادلہ (۲۱)، فتح (۲۸)، صف (۸، ۹) اور دوسری متعدد آیات۔ پھر یہ کہنے کا حکم کیوں دیا کہ میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا کیا جائے گا اور نہ یہ جانتا ہوں کہ تمہارے ساتھ کیا کیا جائے گا؟ اہل علم نے اس سوال کے مختلف جواب دیے ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ آپ اجمالی طور پر تو یہ جانتے تھے مگر تفصیلی طور پر آپ کو معلوم نہ تھا کہ آپ کے ساتھ یا آپ کے مخاطبین کے ساتھ دنیا یا آخرت میں کیا ہوگا۔ ایک جواب یہ دیا گیا ہے کہ پہلے آپ کو یہ معلوم نہ تھا بعد میں معلوم ہو گیا، مگر حقیقت یہ ہے کہ اس سوال کا جواب اس آیت کے جملہ ”وَمَا أَدْرِي مَا يُفْعَلُ بِي وَلَا بِكُمْ“ میں اور اگلے جملہ ”إِن أَنْتُمْ إِلَّا مَأْيُوتِحِي إِلَيَّ“ میں موجود ہے۔

❶ **إِن أَنْتُمْ إِلَّا مَأْيُوتِحِي إِلَيَّ**: یعنی میں خود آئندہ کی کوئی بات نہیں جانتا، نہ یہ کہ میرے ساتھ کیا ہوگا اور نہ یہ کہ تمہارے ساتھ کیا ہوگا، میں تو بس اسی کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے۔ یعنی میں صرف اتنا بتا سکتا ہوں جو مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کی جاتی ہے اور واقعی اللہ تعالیٰ نے دنیا میں آئندہ ہونے والی جو بات رسول اللہ ﷺ کو بتائی وہ آپ جان گئے اور جو نہیں بتائی وہ آپ کو معلوم نہیں ہوئی۔ اس کی دلیل سیکڑوں واقعات ہیں، مثلاً واقعہ افاک، بزم معونہ کے شہداء اور آپ ﷺ کا چند کفار کا نام لے کر ایک ماہ تک قنوت میں ان پر لعنت کرنا، مگر اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ کہنا کہ یہ آپ کے اختیار میں نہیں اور پھر ان سب کا مسلمان ہو جانا وغیرہ۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ نمل کی آیت (۶۵): ﴿قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللَّهُ﴾ کی تفسیر۔ سورہ اعراف میں فرمایا: ﴿قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ ۗ وَلَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْتَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۗ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوءُ ۗ إِنْ أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ﴾ [الاعراف: ۱۸۸] ”کہہ دے میں اپنی جان کے لیے نہ کسی نفع کا مالک ہوں اور نہ کسی نقصان کا، مگر جو اللہ چاہے اور اگر میں غیب جانتا ہوتا تو ضرور بھلائیوں میں سے بہت زیادہ حاصل کر لیتا اور مجھے کوئی تکلیف نہ پہنچتی، میں نہیں ہوں مگر ایک ڈرانے والا اور خوش خبری دینے والا ان لوگوں کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں۔“ اسی طرح آخرت کے متعلق جو بات بتائی وہ آپ جان گئے جو نہیں بتائی وہ نہیں جانتے تھے، جیسا کہ حدیث شفاعت میں ہے کہ میں عرش کے نیچے سجدے میں گر جاؤں گا اور اللہ تعالیٰ مجھے وہ تعریفیں الہام کرے گا جو اب مجھے یاد نہیں۔ [دیکھیے بخاری، النوحد، باب کلام الرب عزوجل يوم القيامة مع الأنبياء وغيرهم: ۷۵۱۰]

الغرض، رسول اللہ ﷺ اور پہلے تمام انبیاء ﷺ کو آئندہ کی کسی بات کا نہ اجمالی علم تھا اور نہ تفصیلی، صرف ان باتوں کا علم تھا جو اللہ تعالیٰ نے انہیں بتائیں، خواہ اجمالی بتائیں یا تفصیلاً۔ یوسف اور یعقوب ﷺ کا واقعہ اس کی بہترین مثال ہے۔ دیکھیے سورہ یوسف کی آیت (۹۳) کی تفسیر۔ اسی طرح ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کے تمام واقعات اس بات کی دلیل ہیں کہ پیغمبر کو آنے والے واقعات کا صرف اتنا علم ہوتا ہے جتنا اسے بتا دیا جائے۔ اگر کہا جائے کہ وہ سب کچھ جانتے ہوتے ہیں تو ابراہیم علیہ السلام کے آگ میں پھینکے جانے، بیٹے کو ذبح کرنے کے حکم، ہجرت میں بیوی کی عزت خطرے میں پڑنے، بیوی بچے کو بے آب و گیاہ

كُلُّ أُمَّةٍ يَنْتَظِرُ إِذْ كَانَ مِنَ عِنْدِ اللَّهِ وَكَفَرْتُمْ بِهِ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِنْ بَنِي

کہہ دے کیا تم نے دیکھا اگر یہ اللہ کی طرف سے ہوا اور تم نے اس کا انکار کر دیا اور بنی اسرائیل میں سے ایک شہادت

وادی میں چھوڑنے، غرض کسی بھی امتحان میں سرخرو ہونے کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہتی۔

خلاصہ یہ کہ آیت کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ اے نبی! کہہ دے تہ میں رسولوں میں سے کوئی الوکھا ہوں اور نہ میں یہ جانتا ہوں کہ میرے ساتھ کیا کیا جائے گا اور نہ یہ کہ تمہارے ساتھ کیا کیا جائے گا، مجھے تو صرف اس بات کا پتا چلتا ہے اور میں اسی کی پیروی کرتا ہوں جس کی میری طرف وحی کی جاتی ہے، اس کے سوا میں اپنے یا تمہارے متعلق آئندہ کی کوئی بات نہیں جانتا۔ اس لیے مجھ سے قیامت کے وقت یا آئندہ کی دوسری کسی بات کے متعلق بتانے کا مطالبہ مت کرو، کیونکہ یہ میرے دائرہ اختیار میں نہیں ہیں۔

④ وَمَا أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ مُبِينٌ: یعنی میرا کام یہ نہیں کہ میں تمہیں بتاؤں کہ قیامت کب آئے گی، یا اپنے پاس سے تمہیں آئندہ کی خبریں بتاؤں۔ میرا کام صرف یہ ہے کہ میں اللہ کا عذاب آنے سے پہلے تمہیں اس سے واضح طور پر ڈرا دوں۔

⑤ مفسر علی بن احمد مہاشی نے اپنی تفسیر ”نبصیر الرحمان“ میں اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے نہایت عمدہ الفاظ میں بحث کا خلاصہ بیان فرما دیا ہے، وہ لکھتے ہیں: ”﴿قُلْ مَا كُنْتُ بِدَعَاةِ قَوْمِ الرَّسُولِ﴾ آتَيْكُمْ بِالْمُؤَاخَذَةِ الْآخِرُونِيَّةِ ﴿و﴾ مِنْ أَيْنَ لِي نَعْبُودُ وَقَتِيهَا مَعَ أُنِي ﴿مَا أَذْرِي مَا يَفْعَلُ بِي وَلَا يَكْفُرُ﴾ فِيمَا لَمْ يُؤَخَّ إِلَيَّ وَالْوَحْيِي يَبْعُضُ الْأُمُورِ لَا يَسْتَلْزِمُ الْعِلْمَ بِالْبَاقِي وَلَمْ يَكُنْ لِي أَنْ أَضْمَّ إِلَيَّ الْوَحْيِي كَذِبًا مِنْ عِنْدِي ﴿إِنْ أَتَيْتُمْ﴾ فِي تَقْرِيرِ الْأُمُورِ النَّبِيَّةِ ﴿إِلَّا مَا يُؤْتَى إِلَيَّ﴾ مَعَ ذَلِكَ لَا يُفَوِّضُ إِلَيَّ شَيْءٌ مِمَّا يُؤَخَّ إِلَيَّ مِنْ نَعْدِيْبٍ مَنْ لَا يُؤْمِنُ بِي نَبِي ﴿مَا أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ﴾ عَنْهُ ﴿هُمِينٌ﴾ لَهُ بِاللَّذَلِ الْفَطْمِيَّةِ.“ (کہہ دے میں رسولوں میں سے کوئی الوکھا نہیں) کہ تم پر آخرت کا عذاب لے آؤں (اور) میں اس کے وقت کی تعیین کیسے کر سکتا ہوں جب کہ (میں جانتا ہی نہیں کہ میرے ساتھ کیا کیا جائے گا اور نہ یہ کہ تمہارے ساتھ کیا کیا جائے گا) ان معاملات میں جن کی میری طرف وحی نہیں کی گئی اور بعض معاملات کے وحی کیے جانے سے لازم نہیں آتا کہ مجھے تمام معاملات کا بھی علم ہو گیا اور یہ مجھ سے ہو نہیں سکتا کہ باقی معاملات میں وحی کے ساتھ اپنے پاس سے جھوٹ ملا دوں۔ (میں پیروی نہیں کرتا) نہیں معاملات بیان کرنے میں (مگر اسی کی جو میری طرف وحی کی جاتی ہے اور) اس کے ساتھ یہ کہ مجھے جو وحی کی جاتی ہے اس میں مجھ پر ایمان نہ لانے والوں کو عذاب دینے میں کسی چیز کا معاملہ میرے سپرد نہیں کیا جاتا، بلکہ (میں نہیں ہوں مگر ڈرانے والا) اس کی طرف سے (بالکل واضح) جو اپنے ڈرانے کو قلعی دلائل کے ساتھ واضح کر کے بیان کرنے والا ہوں۔“

تے 10: ﴿قُلْ أُمَّةٍ يَنْتَظِرُ إِذْ كَانَ مِنَ عِنْدِ اللَّهِ.....﴾: ”اُمَّةٍ يَنْتَظِرُ“ کا لفظ معنی ہے ”کیا تم نے دیکھا۔“ اہل عرب

اسے ”اُخْبِرُونِي“ (مجھے بتاؤ) کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ یعنی کیا تم نے دیکھا؟ اگر دیکھا ہے تو مجھے بتاؤ۔

إِسْرَائِيلَ عَلَىٰ وَثْقِهِ قَامِنًا وَاسْتَكْبَرْتُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿۱۱﴾

دینے والے نے اس جیسے (قرآن) کی شہادت دی، پھر وہ ایمان لے آیا اور تم نے تکبر کیا (تو تم سے بڑھ کر ظالم کون ہے) بے شک اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا ﴿۱۱﴾

”شَهِدَ شَاهِدٌ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَىٰ وَثْقِهِ“ میں ”اس جیسے کی شہادت“ سے مراد یہ ہے کہ اگر بنی اسرائیل میں سے ایک شہادت دینے والے نے اس کی شہادت دی ہو۔ کیونکہ بعض اوقات کسی چیز کی مثل سے مراد خود وہ چیز ہوتی ہے، جیسے کہتے ہیں: ”مِثْلَكَ لَا يَفْعَلُ هَذَا“ ”تیرے جیسا یہ کام نہیں کرتا“ یعنی تو یہ کام نہیں کرتا۔ اس لیے آگے ”قَامِنًا وَاسْتَكْبَرْتُمْ“ کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اس جیسے پر ایمان لایا، بلکہ اس کا مطلب ہے ”پھر وہ اس پر ایمان لے آیا اور تم نے تکبر کیا۔“ لفظ ”مِثْلًا“ کو خود کسی کی ذات کے لیے استعمال کرنے کی ایک مثال ایک تفسیر کے مطابق اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿وَأَمَّنْ كَان مِثْلًا فَأَخِيذُهُ وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَتَّبِعُهُ فِي الْغَاسِقِ كَمَا فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِنْهَا﴾ [الأنعام: ۱۱۲] ”أُنِي تَكْمُرُ هُوَ (نَفْسُهُ) فِي الظُّلُمَاتِ“ یہاں ”اس شخص کی طرح ہے جس کی مثل اندھیروں میں ہے“ سے مراد ہے ”اس شخص کی طرح ہے جو (خود) اندھیروں میں ہے۔“ اسی طرح: ﴿فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدْ اهْتَدَوْا﴾ [البقرة: ۱۳۷] (پس اگر وہ اس جیسی چیز پر ایمان لائیں جس پر تم ایمان لائے ہو تو یقیناً وہ ہدایت پا گئے) سے مراد یہ ہے کہ ”اگر وہ اس چیز پر ایمان لے آئیں جس پر تم ایمان لائے ہو۔۔۔۔۔“ (اضواء البیان) مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ شوریٰ کی آیت (۱۱): ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ کی تفسیر۔

اس آیت میں ”إِنْ كَانِ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ“ سے لے کر ”وَاسْتَكْبَرْتُمْ“ تک شرط ہے، جس کی جزا محذوف ہے اور وہ بعد والے جملے ”إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ“ سے ظاہر ہو رہی ہے: ”أُنِي فَمَنْ أَظْلَمُ مِنْكُمْ“ ”تو تم سے بڑھ کر ظالم کون ہے۔“ اس کی تائید سورہ حم السجدہ (۵۲) سے بھی ہوتی ہے۔

قرآن کو جھٹلانے کے لیے کفار کے مختلف اعتراضات اور ان کے جوابات ذکر کرنے کے بعد اب انھیں اس پر ایمان نہ لانے کے انجام بد سے ڈرایا جا رہا ہے کہ یہ بتاؤ کہ اگر یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو اور تم اس کا انکار کرو، حالانکہ بنی اسرائیل میں سے ایک شہادت دینے والا بھی اس کے حق ہونے کی شہادت دے چکا ہو، پھر وہ خود بھی اس پر ایمان لے آیا ہو مگر (تم یہ جان لینے کے باوجود کہ یہ حق ہے) محض تکبر اور جھوٹی بڑائی قائم رکھنے کے لیے اسے۔ نئے سے انکار کر دو (تو یقیناً تم ظالم ہو گئے اور اللہ تعالیٰ تمہیں ہدایت کی توفیق نہیں دے گا) کیونکہ جو لوگ تکبر کرتے ہوئے حق سے انکار کر دیں ایسے ظالموں کو اللہ تعالیٰ بھی سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق نہیں دیتا۔

﴿۱۱﴾ اس آیت میں ”شَهِدَ شَاهِدٌ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَىٰ وَثْقِهِ“ سے کون مراد ہے؟ مفسرین کے اس کے متعلق مختلف اقوال ہیں۔ سب سے مشہور قول یہ ہے کہ اس سے مراد عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ ہیں۔ اس کی دلیل سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے، وہ

فرماتے ہیں: «مَا سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ لِأَحَدٍ يَمْسِيهِ عَلَى الْأَرْضِ إِنَّهُ مِنْ أَهْلِ الْحَجَّةِ إِلَّا لِعَبْدِ اللَّهِ بْنِ سَلَامٍ قَالَ وَ فِيهِ نَزَلَتْ هَذِهِ الْآيَةُ: ﴿وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَى وَجْهِهِ﴾» [بخاری، مناقب الأنصار، مناقب عبد الله بن سلام رضی اللہ عنہ: ۳۸۱۲] ”میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے سوا کسی ایسے شخص کے بارے میں جو زمین پر چل پھر رہا ہو یہ کہتے ہوئے نہیں سنا کہ وہ جنتیوں میں سے ہے۔“ سعد رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ انھی کے بارے میں یہ آیت اتری: ﴿وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَى وَجْهِهِ﴾ [الأحقاف: ۱۱] ”اور بنی اسرائیل میں سے ایک شہادت دینے والے نے اس جیسے (قرآن) کی شہادت دی۔“ مگر اس میں یہ اشکال ہے کہ یہ سورت کئی ہے جب کہ عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ مدینہ میں مسلمان ہوئے۔ جو حضرات اس ”شاہد“ سے مراد عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ لیتے ہیں وہ اس کا حل یہ بتاتے ہیں کہ بے شک سورت کئی ہے مگر یہ آیت مدنی ہو سکتی ہے، یا ہو سکتا ہے کہ مکہ میں پہلے ہی بنی اسرائیل میں سے عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے کا پیش گوئی کے طور پر ذکر کر دیا گیا ہو۔ مگر زیادہ قرین قیاس بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ سعد رضی اللہ عنہ کے قول کا مطلب یہ ہے کہ عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ بھی ان لوگوں میں شامل ہیں جنہوں نے بنی اسرائیل میں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق ہونے کی شہادت دی اور آپ پر ایمان لائے۔ کیونکہ اصول تفسیر میں یہ بات طے ہے کہ بعض اوقات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت فلاں مسئلے یا فلاں شخص کے بارے میں اتری، حالانکہ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ آیت اس شخص یا اس مسئلے پر منطبق ہوتی اور صادق آتی ہے۔

دوسرا اور تیسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد موسیٰ علیہ السلام یا بقول بعض عیسیٰ علیہ السلام ہیں، کیونکہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق ہونے کی شہادت تورات اور انجیل میں دی۔ خصوصاً عیسیٰ علیہ السلام نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لے کر آپ کی آمد کی بشارت دی اور آپ پر ایمان لانے سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے آپ کی تصدیق کی، فرمایا: ﴿وَ إِذْ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدٌ﴾ [الصف: ۶] ”اور جب عیسیٰ ابن مریم نے کہا اے بنی اسرائیل! بلاشبہ میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں، اس کی تصدیق کرنے والا ہوں جو مجھ سے پہلے تورات کی صورت میں ہے اور ایک رسول کی بشارت دینے والا ہوں، جو میرے بعد آئے گا، اس کا نام احمد ہے۔“ تورات و انجیل میں تحریف کے باوجود اب بھی ان میں ایسی آیات موجود ہیں جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی بشارت دی گئی ہے اور آپ کی تصدیق کی گئی ہے۔ مزید دیکھیے سورہ صف (۶) اور سورہ اعراف (۱۵۷) کی تفسیر۔

چوتھا قول جو زیادہ قوی معلوم ہوتا ہے، یہ ہے کہ مشرکین مکہ کا تجارت کے سلسلے میں مدینہ، خیبر اور شام میں آنا جانا عام تھا جس کا اللہ تعالیٰ نے سورہ قریش میں بھی ذکر فرمایا ہے۔ ان سفروں میں ان کی ملاقات اہل کتاب یہود و نصاریٰ سے بھی ہوتی تھی اور وہ ان سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پوچھتے تھے اور ان میں سے منصف لوگ حق بات کی شہادت سے گریز نہیں کرتے تھے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر کئی سورتوں میں بھی اس بات کا ذکر فرمایا ہے کہ اہل کتاب کے اہل علم بھی اس پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کتاب کی تصدیق کرتے اور اس پر ایمان لاتے ہیں، اس لیے ”شَهِدَ شَاهِدٌ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ“ میں

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُونَا إِلَيْهِ ۖ وَإِذْ لَمْ يَهْتَدُوا بِهِ
فَسَيَقُولُونَ هَذَا إِفْكٌ قَدِيمٌ ﴿۱۱﴾

اور ان لوگوں نے جنہوں نے کفر کیا، ان لوگوں کے بارے میں کہا جو ایمان لائے اگر یہ کچھ بھی بہتر ہوتا تو یہ ہم سے پہلے اس کی طرف نہ آتے اور جب انہوں نے اس سے ہدایت نہیں پائی تو ضرور کہیں گے کہ یہ پرانا جھوٹ ہے ﴿۱۱﴾

لفظ ”شَاهِدٌ“ جیسا کہ حافظ ابن کثیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اسم جنس ہے اور اس سے مراد ان تمام لوگوں میں سے کوئی بھی شخص ہو سکتا ہے جس نے آپ ﷺ کے مکہ میں موجود ہونے کے وقت آپ کے سچائی ہونے کی شہادت دی، جیسا کہ نجاشی رضی اللہ عنہ کا آپ پر ایمان لانا اور آپ کے حق ہونے کی شہادت دینا سب کو معلوم ہے، اگرچہ مدینہ میں ایمان لانے والے اسرائیلی صحابہ بھی اس سے باہر نہیں ہیں۔ اب کئی سورتوں کی وہ آیات ملاحظہ فرمائیں جن میں اہل کتاب کی شہادت کو بطور تائید ذکر کیا گیا ہے: ﴿قُلْ كَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ ۗ وَمَنْ يَمُنَّ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يَحِبَّ إِلَىٰ آيَاتِهِ وَمَا يُلَاقُهَا الْقَوْمُ الْكَافِرُونَ﴾ [الرعد: ۴۳] ”کہہ دے میرے درمیان اور تمہارے درمیان اللہ کافی گواہ ہے اور وہ شخص بھی جس کے پاس کتاب کا علم ہے۔“ اور فرمایا: ﴿إِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهِ إِذَا يُنشَلُ عَلَيْهِمْ يَخِرُّونَ لِلْآذِقَانِ خِرًّا ۗ وَيَكْفُرُونَ سُبحٰنَ رَبِّنَا إِن كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُولًا﴾ [نبی اسرائیل: ۱۰۷، ۱۰۸] ”بے شک جن لوگوں کو اس سے پہلے علم دیا گیا، جب ان کے سامنے اسے پڑھا جاتا ہے وہ ٹھوڑیوں کے ٹل سجدہ کرتے ہوئے گر جاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں ہمارا رب پاک ہے، بے شک ہمارے رب کا وعدہ یقیناً ہمیشہ پورا کیا ہوا ہے۔“ اور فرمایا: ﴿وَإِذَا يُنشَلُ عَلَيْهِمْ قَالُوا آمَنَّا بِهِ إِنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّنَا إِذْ كُنَّا مِن قَبْلِهِ مُسْلِمِينَ﴾ [التقصص: ۲۳] ”اور جب ان کے سامنے اس کی تلاوت کی جاتی ہے تو کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے، یقیناً یہی ہمارے رب کی طرف سے حق ہے، بے شک ہم اس سے پہلے فرماں بردار تھے۔“ اور فرمایا: ﴿أَوَلَمْ يَكُنْ لَهُمُ آيَةٌ أَن يَنْزِلَ عَلَيْهِمُ الْكِتَابُ مِمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ﴾ [النمل: ۱۶۷] ”اور کیا ان کے لیے یہ ایک نشانی نہ تھی کہ اسے بنی اسرائیل کے علماء جانتے ہیں۔“

آیت ۱۱ ﴿۱۱﴾ وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا لَوْ كَانَ خَيْرًا : ”الَّذِينَ آمَنُوا“ میں ”لام“ کا مطلب یہ نہیں کہ ان سے مخاطب ہو کر کہا، بلکہ یہ ہے کہ ان کے بارے میں کہا۔ کچھلی آیت میں مشرکین کے ایمان نہ لانے کا باعث ان کا تکبر ذکر فرمایا تھا، اب ان کے تکبر اور خود پسندی کی ایک مثال ذکر فرمائی جس کی بنا پر وہ ایمان کی نعمت سے محروم رہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی دنیا کی نعمتوں پر اس قدر مغرور ہیں کہ اس کی ہر نعمت کا مستحق صرف اپنے آپ ہی کو سمجھتے ہیں۔ بلال، عمار، عبد اللہ بن مسعود، شمیہ اور زقیہ رضی اللہ عنہم جیسے مسکین اور ضعیف مسلمانوں کو وہ اللہ تعالیٰ کے کسی انعام کے قابل ہی نہیں سمجھتے تھے، اس لیے انہوں نے اسلام کے ہر خیر سے خالی ہونے کی دلیل یہ تصنیف کی کہ اگر اسلام میں کوئی خوبی ہوتی تو یہ لوگ ہم سے پہلے اس کی طرف نہ آتے۔ رسول اللہ ﷺ نے تکبر کی تعریف ان الفاظ میں فرمائی: ﴿الْكِبْرُ بَصْرُ الْحَقِّ وَغَمَطُ النَّاسِ﴾ [مسئم، الإیمان، باب تحريم الكبر و بيانہ: ۹۱] ”تکبر حق کے انکار اور لوگوں کو حقیر جاننے کا نام ہے۔“ مشرکین مسلمانوں کو

وَمِنْ قَبْلِهِ كِتَابُ مُوسَى إِمَامًا وَرَحْمَةً ۗ وَهَذَا كِتَابٌ مُصَدِّقٌ لِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ
الَّذِينَ ظَلَمُوا ۗ وَبُشْرَى لِلْمُحْسِنِينَ ﴿۱۲﴾

اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب پیشوا اور رحمت تھی اور یہ ایک تصدیق کرنے والی کتاب عربی زبان میں ہے، تاکہ ان لوگوں کو ڈرائے جنہوں نے ظلم کیا اور نیکی کرنے والوں کے لیے بشارت ہو ﴿۱۲﴾

کس قدر حقیر جانتے تھے، اس کا اندازہ اس آیت سے ہوتا ہے: ﴿وَكَذَلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لِيَقُولُوا أَهَذَا كَلِمَةُ اللَّهِ عَلَيْهِمْ مِنْ بَيْنِنَا﴾ [الانعام: ۵۳] ”اور اسی طرح ہم نے ان میں سے بعض کی بعض کے ساتھ آزمائش کی ہے، تاکہ وہ کہیں کیا یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے ہمارے درمیان میں سے احسان فرمایا ہے؟“ نوح علیہ السلام کی قوم کے سرداروں کا اندازہ تحقیر ملاحظہ فرمائیں، انہوں نے نوح علیہ السلام سے کہا: ﴿مَا تَزْكُ إِلَّا بَشَرًا مِثْلَنَا وَمَا تَزْكُ إِلَّا الَّذِينَ هُمْ أَرَادُوا بِادْوَى الرَّأْيِ، وَمَا نَرَى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كَاذِبِينَ﴾ [مود: ۲۷] ”ہم تجھے نہیں دیکھتے مگر اپنے جیسا ایک بشر اور ہم تجھے نہیں دیکھتے کہ ان لوگوں کے سوا کسی نے تیری پیروی کی ہو جو ہمارے سب سے رذیل ہیں، سٹی رائے کے ساتھ اور ہم تمہارے لیے اپنے آپ پر کوئی برتری نہیں دیکھتے، بلکہ ہم تمہیں جھوٹے گمان کرتے ہیں۔“

﴿۱۲﴾ وَإِذْ لَمْ يَهْتَدُوا بِهِ فَيَقُولُونَ: کفار کے جن اقوال کا یہاں ذکر ہوا ان سب کا مقصد رسول اللہ ﷺ اور قرآن کو جھٹلانا تھا، مثلاً یہ کہنا کہ یہ سحر ہے، افترا ہے، اس میں کوئی خیر نہیں وغیرہ۔ فرمایا، جب وہ اس قرآن کے ذریعے سے سیدھا راستہ حاصل نہ کر سکے تو وہ یہی کہتے رہیں گے کہ یہ قدیم جھوٹ ہے۔ یعنی اگر وہ ضد اور عناد پر اڑے رہے تو کسی صورت ایمان نہیں لائیں گے اور نہ کوئی عقلی یا نقلی دلیل تسلیم کریں گے، بلکہ ان کے سامنے پہلے انبیاء اور اہل علم کی شہادت پیش کی گئی تو وہ تمام پیغمبروں اور کتابوں کو بھی یہ کہہ کر رد کر دیں گے کہ یہ قدیم جھوٹ ہے جو پہلے سے چلا آ رہا ہے۔ ان کے اس رویے کے باعث صرف ان کا کفر اور تکبر ہے، جب تک وہ اس پر قائم رہیں گے یہی بات کہتے رہیں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَذَا إِلَّا إِفْكٌ افْتَرَاهُ وَأَعَانَهُ عَلَيْهِ قَوْمٌ آخَرُونَ ۖ فَقَدْ جَاءُوا ظُلْمًا وَزُورًا ۗ وَقَالُوا آسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ۚ أَلَمْ يَكْتُمْنَا فِيهِ نَسْلًا عَلَيْهِ بَكْرًا ۗ وَأَصِيلًا﴾ [الفرقان: ۴، ۵] ”اور ان لوگوں نے کہا جنہوں نے کفر کیا، یہ نہیں ہے مگر ایک جھوٹ، جو اس نے گھڑ لیا اور کچھ دوسرے لوگوں نے اس پر اس کی مدد کی، سو بلاشبہ وہ بھاری ظلم اور سخت جھوٹ پر اتر آئے ہیں۔ اور انہوں نے کہا یہ پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں، جو اس نے لکھوالی ہیں، تو وہ پہلے اور پچھلے پہر اس پر بڑھی جاتی ہیں۔“

آیت ۱۲ ﴿۱۲﴾ وَمِنْ قَبْلِهِ كِتَابُ مُوسَى إِمَامًا وَرَحْمَةً: ”كِتَابُ مُوسَى“ کا عطف ”شَاهِدٌ“ پر ہے اور ”قَبْلِهِ“ کی ضمیر اس ”شَاهِدٌ“ کی طرف جارہی ہے: ”أَيُّ شَهِدٍ شَاهِدٌ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَى مِثْلِهِ وَ شَهِدٌ مِنْ قَبْلِهِ كِتَابُ مُوسَى عَلَى مِثْلِهِ“ یعنی بنی اسرائیل کے ایک شہادت دینے والے نے اس کی شہادت دی اور اس سے پہلے موسیٰ علیہ السلام کی کتاب نے بھی اس کے حق ہونے کی شہادت دی جو لوگوں کی پیشوائی کرنے والی تھی۔ لوگ اس کی پیروی اور اس کے احکام پر

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۱۴﴾ أُولَٰئِكَ
أَصْحَابُ الْجَنَّةِ خَالِدِينَ فِيهَا جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۵﴾ وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ

بے شک وہ لوگ جنہوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے، پھر خوب قائم رہے، تو ان پر کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے ﴿۱۴﴾ یہ لوگ جنت والے ہیں، ہمیشہ اس میں رہنے والے، اس کے بدلے کے لیے جو وہ کیا کرتے تھے ﴿۱۵﴾ اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنے کی تاکید کی، اس کی ماں نے اسے ناگواری کی حالت میں اٹھائے

عمل کرتے تھے (دیکھیے ماخذہ: ۴۳) اور وہ لوگوں کے لیے سراسر رحمت تھی۔

② اکثر مفسرین نے ”قَبِيلَهُ“ کی ضمیر کا مرجع قرآن کو قرار دیا ہے، یعنی اس قرآن سے پہلے موسیٰ علیہ السلام کی کتاب پیشوا اور رحمت تھی، لیکن مجھے وہ ترکیب بہتر معلوم ہوتی ہے جو اوپر ذکر ہوئی۔

③ وَهَذَا كِتَابٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ اور یہ کتاب یعنی قرآن موسیٰ علیہ السلام کی کتاب کی تصدیق کرتی ہے، یعنی یہ عین ان پیش گوئیوں کے مطابق ہے جو تورات میں کی گئی تھیں، جس سے اس کی تصدیق ہوتی ہے اور دونوں کی بنیادی تعلیم بھی یک ہے۔ حالانکہ وہ عبرانی زبان میں تھی اور یہ عربی زبان میں ہے اور ایسے شخص پر نازل ہوئی جو عبرانی جانتا ہی نہیں بلکہ اتنی ہے، عربی بھی نہیں پڑھ سکتا۔ یہ دلیل ہے کہ دونوں اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ ہیں جو تمام زبانیں پیدا کرنے والا اور ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔

④ لِيُنذِرَ الَّذِينَ ظَلَمُوا..... تاکہ یہ ان لوگوں کو ان کے برے انجام سے ڈرائے جنہوں نے کفر و شرک کا ارتکاب کر کے اپنی جانوں پر ظلم ڈھایا ہے اور نیک عمل کرنے والوں کے لیے عظیم خوش خبری ہو۔

آیت 14.13 ﴿۱۴﴾ إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا..... ان آیات کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ حم مجدہ (۳۱، ۳۰) کی تفسیر۔

آیت 15 ﴿۱۵﴾ وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا: سورت کے شروع سے یہاں تک اللہ تعالیٰ کی توحید، اس کی نازل کردہ کتاب کے حق ہونے اور اس کی عبادت پر استقامت کا بیان فرمایا، اب ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کا بیان ہے۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اللہ تعالیٰ کے حق توحید اور اخلاص عبادت کے ساتھ ماں باپ کے حق کا ذکر فرمایا ہے۔ اس جملے کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ بقرہ (۸۳)، بنی اسرائیل (۲۳، ۲۴)، عنکبوت (۸) اور سورہ لقمان (۱۳، ۱۵)۔

② حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا: ”كُرْهًا يَكْرَهُ كُرْهًا وَ شَكْرَهَا وَ شَكْرَاهَا وَ كُرْهِيَةً“ (ع) ”الشَّيْءُ“ یہ ”أَحَبُّ الشَّيْءِ“ کی ضد ہے، ناپسند کرنا۔ ”الْكُرْهُ“ اور ”الْكُرْهُ“ کا معنی انکار اور مشقت بھی ہے۔ ”كُرْهًا“ حال ہے: ”أُمِّي حَمَلْتَنِي ذَاتَ كُرْهٍ“ یعنی اس کی ماں نے اسے اس حالت میں اٹھائے رکھا کہ وہ ناگواری یا مشقت والی تھی۔ یا اس سے پہلے حرف جار باء محذوف ہے، جس کے حذف کرنے سے اس پر نصب آیا ہے: ”أُمِّي حَمَلْتَنِي أُمُّهُ بِكُرْهِ“ یعنی اس کی ماں نے اسے ناگواری یا مشقت کے ساتھ اٹھایا، ”وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا“ اور اسے ناگواری اور مشقت کے ساتھ جنا۔

③ آیت میں اگرچہ ماں اور باپ دونوں کے ساتھ احسان کی تاکید کی گئی ہے، مگر ماں کی تین قربانیوں کا ذکر خاص طور پر کیا

إِحْسَانًا حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا وَحَمَلُهُ وَفِصْلُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا حَتَّىٰ

رکھا اور اسے ناگواری کی حالت میں جتا اور اس کے حمل اور اس کے دودھ چھڑانے کی مدت تیس مہینے ہے، یہاں تک کہ

گیا ہے۔ پہلی یہ کہ وہ حمل کی پوری مدت اسے اپنے پیٹ میں اٹھائے پھرتی ہے، اس دوران اس پر کئی ناگوار حالتیں گزرتی ہیں، مثلاً تلی، بے چینی، تھکاوٹ، بیماری کی سی حالت، دن بدن بڑھتی ہوئی کمزوری، جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ فرمایا: ﴿حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ﴾ (نعمان: ۱۶) "اس کی ماں نے اسے کمزوری پر کمزوری کی حالت میں اٹھائے رکھا۔" خصوصاً حمل کے آخری ایام میں تو یہ بوجھ اس کی جان کا روگ بنا ہوتا ہے۔ حقیقت ہے کہ کوئی شخص اگر اپنی ماں کا حق ادا کرنے کے لیے اسے کمزوری کی حالت میں اٹھا کر لیے پھرے تب بھی وہ اس کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ کہاں پوری مدت حمل مسلسل اپنے شکم میں اٹھائے پھرنا اور کہاں کسی وقت کچھ دیر کے لیے اٹھا لینا۔ پھر ماں ان سب ناگوار کیفیتوں کو آنے والے فرزند کی امید پر خوشی سے برداشت کرتی ہے، جب کہ اولاد اسے بوجھ سمجھ کر یا صرف اللہ کا حکم سمجھ کر اٹھاتی ہے، دونوں میں کوئی نسبت ہی نہیں۔ دوسری قربانی وضع حمل کا نہایت تکلیف دہ مرحلہ ہے جس میں اس کی جان داؤ پر لگی ہوتی ہے، کتنی مائیں اس مرحلے میں جان سے گزر جاتی ہیں، وہ اپنے فرزند کی امید پر اس ناگوار مرحلے کو بھی برداشت کرتی ہے۔ تیسری قربانی دو سال تک اس کی پرورش، اپنے آرام کی قربانی دے کر اس کے لیے ہر آسائش مہیا کرنا اور اپنا خون دودھ کی صورت میں دو سال تک پلاتے جانا ہے۔ ان تین قربانیوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ماں کا حق باپ سے تین گنا زیادہ رکھا ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا، کہنے لگا: «يَا رَسُولَ اللَّهِ! مَنْ أَحَقُّ النَّاسِ بِحَسَنِ صَحَابَتِي؟ قَالَ أُمَّتُكَ، قَالَ ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ ثُمَّ أُمَّتُكَ، قَالَ ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ ثُمَّ أَبُوكَ» (بخاری، الادب، باب من أحق الناس بحسن الصحبة: ۵۹۷۱) "یا رسول اللہ! لوگوں میں سے میرے حسنِ محبت کا زیادہ حق دار کون ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "تمھاری ماں۔" اس نے کہا: "پھر کون؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "پھر تمھاری ماں۔" اس نے کہا: "پھر کون؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "پھر تمھاری ماں۔" اس نے کہا: "پھر کون؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "پھر تمھاری ماں۔" اس نے کہا: "پھر تمھاری ماں۔"

④ وَحَمَلُهُ وَفِصْلُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا: اس آیت کو اور سورۃ لقمان کی آیت (۱۳): ﴿وَفِصْلُهُ فِي ثَلَاثِينَ﴾ (اور اس کا

دودھ چھڑانا دو سال میں ہے) اور سورۃ بقرہ کی آیت (۲۳۳): ﴿وَالْوَالِدَاتُ يُرْضَعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِيَنظُرْنَ أَرَادَ أَنْ يُنْفَعْنَ الرِّضَاعَةَ﴾ (اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں، اس کے لیے جو چاہے کہ دودھ کی مدت پوری کرے) ان تینوں آیتوں کو ملانے سے ثابت ہوتا ہے کہ حمل کی کم از کم مدت چھ ماہ ہے، کیونکہ تیس ماہ میں سے دودھ پلانے کی مدت دو سال نکالی جائے تو باقی چھ ماہ بچتے ہیں۔ ابن کثیر نے سورۃ زخرف کی آیت (۸۱): ﴿قُلْ إِنْ كَانَ لِلرِّضْعَيْنِ وَوَالِدَاتِهِمْ حَقٌّ فَأَوْفُوا لَهُنَّ بِحَقِّنَّاهُنَّ فِي سِنِّهِنَّ ثَلَاثِينَ شَهْرًا مُّبْرَأًا﴾ کی تفسیر میں ابن جریر طبری سے نقل فرمایا ہے: «عَنْ نَعْمَةَ بِنِ زَيْدِ الْجُهَنِيِّ، أَنَّ امْرَأَةً مِنْهُمْ دَخَلَتْ عَلَى زَوْجِهَا، وَهُوَ رَجُلٌ مِنْهُمْ أَيْضًا، فَوَلَدَتْ لَهُ فِي سِنِّهِ أَشْهُرًا، فَذَكَرَ ذَلِكَ زَوْجِهَا

إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَ بَلَغَ أَرْبَعِينَ سَنَةً لَا قَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِي

جب وہ اپنی پوری قوت کو پہنچا اور چالیس برس کو پہنچ گیا تو اس نے کہا اے میرے رب! مجھے توفیق دے کہ میں
لِعُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ فَأَمَرَ بِهَا أَنْ تُرْجَمَ، فَدَخَلَ عَلَيْهِ عَلِيُّ بْنُ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ فَقَالَ
إِنَّ اللَّهَ تَبَارَكَ وَتَعَالَى يَقُولُ فِي كِتَابِهِ: ﴿وَحَمَلُهُ وَفِضْلُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا﴾ وَقَالَ: ﴿وَفِضْلُهُ فِي عَامَيْنِ﴾
قَالَ قَوْلَ اللَّهِ! مَا عَبْدَ عُثْمَانَ أَنْ نَعَتَ إِلَيْهَا نُزُودًا [الطبري: ۱/۲۰، ۶۵۷، ج: ۳/۱۲۷۰] ”عجیب بن یزید جہنی کہتے ہیں کہ
ان کے قبیلے کی ایک عورت اپنے خاوند کے پاس آئی، وہ آدمی بھی اسی قبیلے کا تھا، تو اس عورت نے چھ مہینے میں بچے کو جنم دیا۔
اس کے خاوند نے عثمان بن عفان رضی اللہ عنہما سے اس بات کا ذکر کیا تو انھوں نے اسے رجم کرنے کا حکم دیا۔ اس پر علی بن ابی
طالب رضی اللہ عنہ ان کے پاس آئے اور کہا: ”اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتے ہیں: ﴿وَحَمَلُهُ وَفِضْلُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا﴾ (کہ
اس کے حمل اور اس کے دودھ چھڑانے کی مدت تیس ماہ ہے) اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَفِضْلُهُ فِي عَامَيْنِ﴾ (اور اس کا
دودھ چھڑانا دو سال میں ہے)۔ ”عجیب بن یزید کہتے ہیں: ”تو اللہ کی قسم! عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کی بات کا کوئی انکار نہیں کیا اور فوراً
آدمی بھیجا کہ اسے واہیں لایا جائے۔“

ابن کثیر کے محقق حکمت بن بشر نے فرمایا، اس کی سند صحیح ہے۔ یہ استدلال نہایت مضبوط ہے، علی اور عثمان رضی اللہ عنہما کے علاوہ
صحابہ کی ایک جماعت نے ان کی موافقت کی ہے۔ (ابن کثیر) ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ”عورت جب نو (۹) ماہ میں بچہ جنم
تو اسے اکیس (۲۱) ماہ دودھ پلانا کافی ہے، جب سات (۷) ماہ میں جنم تو اسے تیس (۳۳) ماہ دودھ پلانا کافی ہے اور
جب چھ (۶) ماہ میں جنم تو پورے دو سال دودھ پلائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿وَحَمَلُهُ وَفِضْلُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا﴾
”اس کے حمل اور دودھ چھڑانے کی مدت تیس ماہ ہے۔“ [ابن ابی حاتم: ۱۸۵۶۷۔ ابن کثیر وقال المحقق سید حسن]

﴿حَقِّي إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَ بَلَغَ أَرْبَعِينَ سَنَةً﴾ : یہاں سے اللہ تعالیٰ نے والدین کا حق بیچانے کے اعتبار سے دو قسم
کے آدمیوں کا ذکر فرمایا ہے۔ اس آیت میں اس آدمی کا ذکر ہے جو اپنی جوانی کو پہنچتا ہے تو اپنے والدین کا حق بیچتا ہے اور یہ
بیچان اسے اپنے اصل مالک اور مربی کی بیچان اور اس کا شکر ادا کرنے تک پہنچا دیتی ہے۔ ”بَلَغَ أَشُدَّهُ“ کی تشریح کے لیے
دیکھیے سورۃ یوسف (۲۴) کی تفسیر۔ اس سلسلے میں چالیس سال کی عمر کا ذکر بلوغت کی آخری حد کے طور پر فرمایا ہے، کیونکہ اس
عمر میں آدمی کی توفیق اپنے کمال کو پہنچ جاتی ہے۔ اس کے بعد انحطاط کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ اس آیت میں ہر جوان کو عموماً
اور چالیس برس والے آدمی کو خصوصاً خبردار کیا گیا ہے کہ اسے چاہیے کہ اپنی پرورش کرنے والے والدین کا اور اپنے اور اپنے
والدین کے اصل مربی اور مالک کا حق بیچانے اور اپنے والدین پر اپنے رب کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کے لیے
اس سے توفیق مانگتا رہے، کیونکہ اس کی توفیق کے بغیر کوئی نیکی نہیں ہو سکتی اور ساتھ ہی اپنی اولاد کی اصلاح کی دعا بھی کرتا
رہے۔ اس طرح والدین کے حقوق کی بیچان اور ان کی ادائیگی اس کے لیے اپنے رب کے حقوق کی بیچان، اس کی توحید پر

أَعْنَتَ عَلَيَّ وَعَلَى وَالِدَيَّْ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ وَأَصْلِحَ لِي فِي ذُرِّيَّتِي ۗ
إِنِّي تَوَكَّلْتُ عَلَى اللَّهِ وَإِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ ﴿۱۵﴾

حیرتی اس نعمت کا شکر کروں جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر انعام کی ہے اور یہ کہ میں وہ نیک عمل کروں جسے تو پسند کرتا ہے اور میرے لیے میری اولاد میں اصلاح فرما دے، بے شک میں نے تیری طرف توبہ کی اور بے شک میں حکم ماننے والوں سے ہوں ﴿۱۵﴾

استقامت، اس کی عبادت میں اخلاص اور اس کی نعمتوں پر شکر کا ذریعہ بن جائے گی، جو انسان کی زندگی کا اصل مقصود ہے۔

﴿۱۵﴾ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ: عمل اگرچہ وہی صالح ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہو اور اخلاص کے ساتھ ہو، مگر اخلاص نیت اور ریا سے پاک ہونے کی اہمیت ظاہر کرنے کے لیے اس کا الگ بھی ذکر فرمایا۔ یعنی مجھے ایسے عمل کی توفیق دے جو ظاہر میں درست یعنی تیری کتاب اور تیرے نبی ﷺ کی سنت کے مطابق ہو اور حقیقت میں بھی تیری رضا کے مطابق اور تیری جناب میں قبول ہونے کے لائق ہو، یعنی اخلاص نیت پر مبنی اور ریا سے پاک ہو۔

﴿۱۶﴾ وَأَصْلِحَ لِي فِي ذُرِّيَّتِي: اس دعا میں دو الفاظ قابل غور ہیں، ایک ”بی“ اور دوسرا ”فی“۔ ”أَصْلِحَ لِي“ (میرے لیے اصلاح فرما دے) کا مطلب یہ ہے کہ ان کی ایسی اصلاح فرما جس کا فائدہ مجھے بھی حاصل ہو۔ ”فِي ذُرِّيَّتِي“ یہاں بظاہر ”أَصْلِحَ لِي ذُرِّيَّتِي“ (میرے لیے میری اولاد کی اصلاح فرما دے) کا لفظ تھا، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَأَصْلِحْنَا لَكَ زَوْجًا﴾ [الانبیاء: ۹۰] ”اور ہم نے اس کے لیے اس کی بیوی کی اصلاح فرمادی۔“ مگر ”فی“ لانے کا مطلب یہ ہے کہ میری اولاد میں اصلاح کا عمل جاری و ساری فرما دے جو آگے تک چلتا رہے، جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام کے متعلق فرمایا: ﴿وَجَعَلَهَا كَلِمَةً بَاقِيَةً فِي عَقْبِهِ﴾ [الزحرف: ۲۸] ”اور اس نے اس (توحید کی بات) کو اپنے بچپلوں میں باقی رہنے والی بات بنا دیا۔“

﴿۱۷﴾ إِنِّي تَوَكَّلْتُ عَلَى اللَّهِ وَإِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ: یعنی میں اپنی جوانی کی سرکشی اور جہالت سے اور تیری ہر قسم کی نافرمانی سے باز آیا اور میں تیرے مکمل فرماں برداروں سے ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ خصوصی اہتمام کے ساتھ چالیس (۴۰) برس کی عمر میں اور اس کے بعد توبہ کی تجدید کرتے رہنا چاہیے۔

﴿۱۸﴾ یہ دعا اولاد کی اصلاح کے لیے اکسیر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود اس کی تعلیم دی ہے اور یہ مقبول دعاؤں میں سے ہے، کیونکہ اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس کے قبول ہونے کی بشارت دی ہے، فرمایا: ﴿تَنْتَقِبُ عَنْهُمْ﴾ ”ہم ان سے قبول کرتے ہیں۔“ جیسا کہ سورہ فاتحہ ہے اور سورہ بقرہ کی آخری آیات والی دعائیں ہیں۔ اس لیے کسی صاحب اولاد کو، خصوصاً جو چالیس سال یا اس سے اوپر ہو اسے اس دعا سے غافل نہیں رہنا چاہیے۔ تفسیر قرطبی میں ہے کہ مالک بن مغول نے طلحہ بن مصرف کے پاس اپنے بیٹے کی شکایت کی تو انھوں نے فرمایا: ”اس کے لیے اس دعا سے مدد حاصل کر دو۔“ [قرطبی: ۱۶/۱۹۰]

أُولَئِكَ الَّذِينَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّئَاتِهِمْ فِي أَصْحَابِ الْجَنَّةِ ۖ وَعَدَ الصِّدْقِ الَّذِي كَانُوا يُوعَدُونَ ﴿۱۶﴾ وَالَّذِي قَالَ لِوَالِدَيْهِ أُفٍّ لَكُمَا أَتَعِدُنِي أَنْ أُخْرَجَ وَقَدْ خَلَتِ الْقُرُونُ مِنْ قَبْلِي ۗ وَهُمَا يَسْتَعْجِلَانِ اللَّهَ وَبِكَ آمِنٌ ۖ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ ۖ فَيَقُولُ مَا هَذَا إِلَّا آسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ﴿۱۷﴾

یہی وہ لوگ ہیں کہ ہم ان سے وہ سب سے اچھے عمل قبول کرتے ہیں جو انہوں نے کیے اور ان کی برائیوں سے درگزر کرتے ہیں، جنت والوں میں، سچے وعدے کے مطابق جو ان سے وعدہ کیا جاتا تھا ﴿۱۶﴾ اور وہ جس نے اپنے ماں باپ سے کہا اُف ہے تم دونوں کے لیے! کیا تم مجھے دھمکی دیتے ہو کہ مجھے (قبر سے) نکالا جائے گا، حالانکہ مجھ سے پہلے بہت سی قومیں گزر چکیں۔ جب کہ وہ دونوں اللہ سے فریاد کرتے (ہوئے کہتے) ہیں تجھے ہلاکت ہوا ایمان لے آ، بے شک اللہ کا وعدہ حق ہے۔ تو وہ کہتا ہے یہ پہلے لوگوں کی فرضی کہانیوں کے سوا کچھ نہیں ﴿۱۷﴾

آیت 16 ﴿۱۶﴾ أُولَئِكَ الَّذِينَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا ... : آیت کے ضمن میں یہ مفہوم موجود ہے کہ ماں باپ کے ساتھ احسان، ان کے لیے دعا، اللہ تعالیٰ سے شکر اور عمل صالح کی توفیق مانگنا اور اولاد کے لیے اصلاح کی دعا انسان کے سب سے اچھے اعمال میں سے ہے اور اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ جو لوگ یہ عمل کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے اس بہترین عمل کو قبول فرمائے گا اور ان کی برائیوں سے درگزر فرمائے گا۔

﴿۲﴾ فِي أَصْحَابِ الْجَنَّةِ : یہ ”أُولَئِكَ“ سے حال کی جگہ میں ہے: ”أَيُّ كَمَا فِيهِمْ فِي أَصْحَابِ الْجَنَّةِ“ بہترین اعمال کی قبولیت اور گناہوں سے درگزر کے ساتھ یہ تیسرا انعام ہے کہ انہیں اصحاب الجنۃ میں شامل کیا جائے گا جو بہترین ساتھی ہیں۔ کیونکہ ان میں شامل ہونا بجائے خود بہت بڑا اعزاز ہے، جس کی دعا انبیاء علیہم السلام کرتے رہے ہیں، جیسا کہ سلیمان علیہ السلام کی دعا ہے: ﴿وَأَدْخِلْنِي بِرَحْمَتِكَ فِي عِبَادِكَ الصَّالِحِينَ﴾ [النمل: ۱۶] ”اور اپنی رحمت سے مجھے اپنے نیک بندوں میں داخل فرما۔“ یوسف علیہ السلام کی دعا ہے: ﴿تَوَفَّنِي مُسْلِمًا وَأَلْحِقْنِي بِالصَّالِحِينَ﴾ [یوسف: ۱۰۱] ”مجھے مسلم ہونے کی حالت میں فوت کرا اور مجھے نیک لوگوں کے ساتھ ملا دے۔“ اور ہمارے نبی کریم ﷺ کے آخری وقت کے الفاظ ہیں: ﴿فِي الرَّزِيقِ الْأَعْلَى﴾ [بخاری، المغازی، باب مرض النبی ﷺ ووفاته: ۴۴۳۶] ”مجھے بلند ترین ساتھیوں میں شامل فرما۔“ [اللَّهُمَّ اجْعَلْنَا مِنْهُمْ بِفَضْلِكَ وَرَحْمَتِكَ]

﴿۳﴾ وَعَدَ الصِّدْقِ الَّذِي كَانُوا يُوعَدُونَ : یعنی اس سچے وعدے کے مطابق جو قرآن و حدیث میں والدین سے احسان کرنے والوں کے ساتھ کیا جاتا تھا اور اللہ تعالیٰ کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا۔

آیت 17 ﴿۱۷﴾ وَالَّذِي قَالَ لِوَالِدَيْهِ أُفٍّ لَكُمَا : ”اُف“ کا لفظ اکثرت اور تنگی پڑ جانے کے موقع پر بولا جاتا ہے۔

أُولَئِكَ الَّذِينَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ ۗ

إِنَّهُمْ كَانُوا خَسِرِينَ ﴿۱۸﴾

یہی وہ لوگ ہیں جن پر بات ثابت ہوگئی ان امتوں سمیت جو جن و انس میں سے ان سے پہلے گزر چکیں، یقیناً وہ خسارہ پانے والے تھے ﴿۱۸﴾

پچھلی آیت میں ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرنے والی سعادت مند مومن اولاد کا اور ان کے حسن انجام کا ذکر تھا، اس آیت میں ان کے مقابلے میں اس بد بخت اور نافرمان اولاد کا اور ان کے برے انجام کا ذکر ہے جس کے والدین مومن ہیں اور وہ اس کوشش میں ہیں کہ ان کی اولاد ایمان لے آئے، مگر ان کی اولاد اس دعوت پر شدید اکتاہٹ کا اظہار کرتے ہوئے انہیں کہتی ہے، تم دونوں کے لیے ”اف“ ہے، تم نے مجھے تنگ کر دیا۔ مکہ میں ایسے بہت سے خاندان تھے جن میں والدین ایمان لے آئے تھے مگر اولاد مشرک اور قیامت کی منکر تھی، یا اولاد ایمان لے آئی تھی اور والدین مشرک تھے۔

﴿۲﴾ اتَّوَدُّنِي أَنْ أُخْرَجَ وَقَدْ خَلَّتِ الْقُرُونُ مِنْ قَبْلِي: کیا تم مجھے ڈراتے ہو کہ مجھے دوبارہ قبر سے زندہ کر کے نکالا جائے گا جب میں مٹی اور ہڈیوں کی صورت ہو چکا ہوں گا؟ حالانکہ مجھ سے پہلے صدیاں گزر چکیں، آج تک کوئی واپس نہیں آیا۔ یہاں اس بد بخت کی اس بات کا جواب ذکر نہیں فرمایا، کیونکہ قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر اس کا جواب آچکا ہے۔

﴿۳﴾ وَهَذَا يَسْتَفْهِمُ اللَّهُ: اور وہ دونوں اس کی اتنی گستاخانہ اور کفریہ بات کے شر سے پناہ مانگنے کے لیے فریاد کرتے ہیں کہ یا اللہ! ہمیں اس کے شر سے بچا اور اسے ہدایت دے۔

﴿۴﴾ وَيَاكَ أَمِنُ ۗ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ: ”وَيْلَكَ“ کا لفظ اگرچہ بدعا ہے، مگر بعض دفعہ اسے نہایت محبت و شفقت اور دردمندی کے اظہار کے لیے بولا جاتا ہے، جیسے ”تَكَلَّمَ النَّوَّاسُ بِاللَّيْلِ“ (تجھے گم کرنے والیاں گم پائیں)۔ یعنی ماں باپ اسے سمجھاتے ہوئے کہتے ہیں، تیرا استیانتاں ہو، ایمان لے آ اور آخرت کا انکار نہ کر، کیونکہ اللہ کا وعدہ سچا ہے، مگر وہ نہایت نفرت کے ساتھ انہیں جھڑک دیتا ہے۔

﴿۵﴾ فَيَقُولُ مَا هَذَا إِلَّا آسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ: اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ انفال (۳۱)، مومنون (۸۳) اور نمل (۶۸)۔

آیت 18 ﴿۱﴾ أُولَئِكَ الَّذِينَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ: یعنی والدین کے گستاخ اور آخرت کے منکر ہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کی بات ثابت ہو چکی، جو اس نے پہلے فرمادی تھی: ﴿لَا تَلْعَنَ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ﴾ [ہود: ۱۱۹] ”کہ میں جہنم کو جنوں اور انسانوں سب سے ضرور ہی بھروں گا۔“ مزید دیکھیے سورہ اعراف (۱۸)۔

﴿۲﴾ فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ: یعنی جنوں اور انسانوں کے ان گروہوں میں شامل ہو کر جو اہل جہنم میں سے ان سے پہلے گزرے۔ ان بدترین لوگوں کا ساتھ خود بدترین سزا ہے۔

﴿۳﴾ إِنَّهُمْ كَانُوا خَسِرِينَ: ”إِنْ“ تعلیل کے لیے ہے، یعنی ان کا یہ انجام اس لیے ہوا کہ انہیں جو سرمایہ حیات دنیا میں

وَلِكُلِّ دَرَجَتٍ مَنَاعِلُهَا ۖ وَيُؤْفِقُهُمُ أَعْمَالُهُمْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿۱۹﴾ وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى النَّارِ أَلْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا ۖ فَالْيَوْمَ تُجْرَوْنَ

اور ہر ایک کے لیے الگ الگ درجے ہیں، ان اعمال کی وجہ سے جو انھوں نے کیے اور تاکہ اللہ انھیں ان کے اعمال پورا بدلا دے اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا ﴿۱۹﴾ اور جس دن وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، آگ پر پیش کیے جائیں گے آخرت کی تیاری کے لیے دیا گیا تھا انھوں نے اس سے نفع حاصل کرنے کے بجائے اصل راس المال بھی گنوا دیا اور یہی حقیقی خسارہ ہے جو انھوں نے اٹھایا۔

آیت 19 وَلِكُلِّ دَرَجَتٍ مَنَاعِلُهَا..... : اس آیت سے پہلے مضمون کی تاکید مقصود ہے، یعنی ہر ایک کو، وہ مومن ہو یا کافر، اس کے اعمال کے مطابق جزا یا سزا ملے گی۔ یہ نہیں ہوگا کہ بروں پر ایسے گناہ لا دے جائیں جو انھوں نے نہ کیے ہوں، یا نیکوں کو ان کی نیکی سے محروم کر دیا جائے۔ واضح رہے یہاں مومن و کافر سب کے لیے ”دَرَجَتٍ“ کا لفظ تغلیباً استعمال ہوا ہے، ورنہ تو اصل میں منازل جنت کو ”درجات“ اور منازل جہنم کو ”درکات“ کہا جاتا ہے، جس طرح منافقوں کے بارے میں ”فِي الدَّرَكِ الاسْفَلِ مِنَ النَّارِ“ آیا ہے۔ (روح المعانی)

آیت 20 ﴿۱﴾ وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى النَّارِ: پچھلی آیات سے اس کا ربط دو طرح سے ہے، ایک یہ کہ والدین سے بدسلوکی کرنے والے قیامت کے منکر کے انجام کے ذکر کے بعد تمام کفار کا انجام بیان فرمایا۔ دوسرا یہ کہ پچھلی آیت میں ذکر ہوا کہ مومن ہوں یا کافر سب کو ان کے اعمال کے مطابق جزا ملے گی اور کسی پر ظلم نہیں کیا جائے گا، تو اب اس سوال کا جواب دیا کہ کفار دنیا میں جو نیکیاں کرتے رہے ان کا کیا بنے گا؟ کم از کم ان کا بدلا تو ضرور ملنا چاہیے، اگر انھیں ان کی جزا نہ دی گئی تو یہ ظلم ہے۔ فرمایا اس وقت کو یاد کرو جب وہ لوگ جنھوں نے حق قبول کرنے سے انکار کیا، آگ پر پیش کیے جائیں گے۔

﴿۲﴾ اَلْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا: کفار چونکہ اپنے تکبر اور فسق کی وجہ سے ایمان قبول کرنے اور اپنے آپ کو مکمل طور پر اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا پابند کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے اور نہ ہی آخرت ان کا مقصود ہوتی ہے، اس لیے انھیں ان کے نیک اعمال کا بدلا دنیا ہی میں دے دیا جاتا ہے۔ ان میں سے جو اعمال انھوں نے دنیا کے کسی مفاد مثلاً شہرت وغیرہ کے لیے کیے تھے ان کا تو آخرت سے کوئی تعلق ہی نہیں، البتہ جو اعمال انھوں نے اللہ کے لیے کیے ہوتے ہیں ان کا بدلا بھی انھیں یہیں دنیا میں دے دیا جاتا ہے، جو اور کچھ نہ ہو تو اتنا ہی بہت زیادہ ہے کہ ان کے کفر و شرک پر فوری گرفت نہیں ہوتی، بلکہ انھیں مہلت دی جاتی ہے اور اس کے ساتھ یہ کہ انھیں دنیا کی کئی نعمتیں بھی دی جاتی ہیں۔ (دیکھیے ہود: ۱۵، ۱۶) انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ مَوْمِنًا حَسَنَةً، يُعْطِي بِهَا فِي الدُّنْيَا وَيُجْزِي بِهَا فِي الآخِرَةِ، وَأَمَّا الْكَافِرُ فَيُطْعَمُ بِحَسَنَاتٍ مَا عَمِلَ بِهَا لِلَّهِ فِي الدُّنْيَا حَتَّى إِذَا أَفْضَى إِلَى الآخِرَةِ لَمْ تَكُنْ لَهُ حَسَنَةً يُجْزَى بِهَا﴾ [مسلم، صفات المنافقين، باب جزاء المؤمن بحسناته في الدنيا والآخرة.....]

عَذَابِ الْهُونِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُونَ ﴿۲۸﴾

تم اپنی نیکیاں اپنی دنیا کی زندگی میں لے جا چکے اور تم ان سے فائدہ اٹھا چکے، سو آج تمہیں ذلت کے عذاب کا بدلا دیا جائے گا، اس لیے کہ تم زمین میں کسی حق کے بغیر تکبر کرتے تھے اور اس لیے کہ تم نافرمانی کیا کرتے تھے ﴿۲۸﴾

[۲۸۰۸] ”اللہ تعالیٰ کسی مومن کی کسی ایک نیکی میں بھی کمی نہیں کرے گا، اسے اس کے عوض دنیا میں بھی دیا جائے گا اور آخرت میں بھی اس کی جزا دی جائے گی۔ رہا کافر تو اسے ان نیکیوں کے عوض جو اس نے اللہ کے لیے کی ہوتی ہیں دنیا میں کھلایا جاتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ آخرت میں پہنچے گا تو اس کے پاس کوئی نیکی نہیں ہوگی جس کی اسے جزا دی جائے۔“

﴿۲۸﴾ قَالِيَوْمَ تَجْزُونَ عَذَابِ الْهُونِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ..... : اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر نیکی کی جزا اور ہر بدی کی سزا اس نیکی یا بدی کی مناسبت سے دی جائے گی، جیسا کہ روزہ داروں کے لیے ”باب الریان“ سے داخلہ ہوگا۔ تو کفار کو ذلیل کرنے والا عذاب اس تکبر کی مناسبت سے ہوگا جو انہوں نے کیا، وہ اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتے تھے، ان کی عزت انھیں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرنے کی اجازت نہیں دیتی تھی، لامحالہ انھیں ایسا عذاب دیا جائے گا جو ان کے تکبر کا بدلا ہو۔ قیامت کے بعض مواقع میں ان کی ذلت کا نقشہ اس حدیث میں بیان ہوا جو عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «يُحْشَرُ الْمُتَكَبِّرُونَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَمْثَالَ الذَّرِّ فِي صُورِ الرِّجَالِ يَغْشَاهُمْ الذُّلُّ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ فَيَسْأَفُونَ إِلَى سَحْنٍ فِي جَهَنَّمَ يُسْمَى بُولَسَ تَغْلُوهُمْ نَارُ الْأَنْبَارِ يُسْقَوْنَ مِنْ غَضَارَةِ أَهْلِ النَّارِ طِينَةَ الْخَبَالِ» [ترمذی، صفة القيامة، باب ما جاء في شدة الوعيد للمتكبرين : ۲۴۹۲، قال الألباني حسن] ”تکبر لوگ قیامت کے دن آدمیوں کی شکل میں چیونٹیوں کی طرح اٹھائے جائیں گے، ہر جگہ سے ذلت انھیں ڈھانپ رہی ہوگی۔ پھر انھیں ہانک کر جہنم کے ایک قید خانے کی طرف لے جایا جائے گا جس کا نام ”بولس“ ہے۔ ان پر آگوں کی آگ چڑھ رہی ہوگی، انھیں جہنمیوں کا نچوڑ پلایا جائے گا، جو تباہ کن کچڑ ہوگا۔“ رہی یہ بات کہ تکبر کیا ہے؟ تو اس کی تفصیل عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ كِبَرٍ، قَالَ رَجُلٌ إِنَّ الرَّجُلَ يُحِبُّ أَنْ يَكُونَ ثَوْبُهُ حَسَنًا وَتَعَلُّهُ حَسَنَةً، قَالَ إِنَّ اللَّهَ جَمِيلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ، الْكِبَرُ بَطْرُ الْحَقِّ وَغَمَطُ النَّاسِ» [مسلم، الإيمان، باب تحريم الكبر و بيانه : ۹۱] ”وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں ذرہ برابر تکبر ہوگا۔“

ایک آدمی نے کہا: ”آدمی پسند کرتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے ہوں اور اس کا جوتا اچھا ہو (تو کیا یہ تکبر ہے)؟“ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”بے شک اللہ جمیل ہے، جمال کو پسند کرتا ہے، تکبر تو حق کو ٹھکرا دینے اور لوگوں کو حقیر سمجھنے کا نام ہے۔“

﴿۲۹﴾ تَسْتَكْبِرُونَ فِي الْأَرْضِ: ”تم زمین میں بڑے بنتے تھے“ اگرچہ بڑائی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا حق نہیں خواہ وہ زمین میں ہو یا آسمانوں میں، مگر زمین کے رہنے والوں کو تو بدرجہ اولیٰ اپنی حیثیت مد نظر رکھنی چاہیے۔ پستی کے مکین کو بلندی کی ہوس کسی طرح بھی زیب نہیں دیتی، فرمایا: ﴿وَلَا تَنْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا﴾

وَأَذْكَرَ أَخَا عَادٍ إِذْ أَنْذَرَ قَوْمَهُ بِالْأَحْقَافِ وَقَدْ خَلَّتِ النَّدْرُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ

اور عاد کے بھائی کو یاد کر جب اس نے اپنی قوم کو احقاف میں ڈرایا، جب کہ اس سے پہلے اور اس کے بعد کسی

۱ بنی اسرائیل: ۲۷] ”اور زمین میں اذکر نہ چل، بے شک تو نہ کبھی زمین کو پھاڑے گا اور نہ کبھی لمبائی میں پہاڑوں تک پہنچے گا۔“

۵ بغیر الحق: اس کے دو مطلب ہیں، ایک یہ کہ اس کی صراحت اس لیے فرمائی کہ تکبر اللہ کے سوا کسی کا حق ہے ہی نہیں جو بھی تکبر کرتا ہے ناحق کرتا ہے۔ دوسرا یہ کہ ناحق تکبر حرام ہے، جس کا ذکر اوپر گزرا، البتہ جہاد فی سبیل اللہ کرتے ہوئے کفار کے مقابلے میں تکبر حق ہے اور اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔

۶ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُونَ: استکبار سے مراد ایمان سے انکار اور فسق سے مراد دوسرے گناہ ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ذلت کے عذاب کے دو سبب ہوں گے، ایک زمین میں ناحق تکبر، یعنی ایمان لانے سے انکار اور دوسرا فسق، یعنی معاصی اور نافرمانیاں اور یہ دونوں کفار کا شیوہ ہیں، مسلمانوں کو اس سے پناہ مانگی چاہیے۔

۷ واضح رہے کہ اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے لکھا ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کو دنیا کی نعمتیں کم از کم استعمال کرنی چاہئیں، تاکہ ان کی آخرت کی نعمتوں میں کمی نہ ہو اور یہاں عمر بن خطابؓ اور دوسرے صحابہ کے زہد اور سادہ زندگی اور دنیا کی لذتوں سے اجتناب کے واقعات لکھے ہیں۔ مگر حق یہ ہے کہ یہ آیت مسلمانوں کے بارے میں ہے ہی نہیں اس کا تعلق کفار سے ہے۔ کفار کے لیے صرف دنیا کی نعمتیں ہیں جبکہ ایمان والوں کے لیے دنیا اور آخرت دونوں کی نعمتیں ہیں،

جیسا کہ فرمایا: ﴿قُلْ مَنْ حَزَنَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّشْقِ قُلْ هِيَ لِلَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾ [الأعراف: ۳۲] ”تو کہہ کس نے حرام کی اللہ کی زینت جو اس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی اور کھانے پینے کی پاکیزہ چیزیں؟ کہہ دے یہ چیزیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے دنیا کی زندگی میں (بھی) ہیں، جبکہ قیامت کے دن (ان کے لیے) خالص ہوں گی۔“ سو من کو اس کی ٹیکوں کا بدلا دینا اور آخرت دونوں جگہ ملتا ہے، جیسا کہ اس آیت کے فائدہ (۲) میں حدیث گزری ہے۔ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا دنیا کی لذتوں سے اجتناب اس آیت کی بنا پر نہ تھا، کیونکہ یہ کفار کے لیے ہے، ان کا اجتناب اس لیے تھا کہ وہ دنیا کی لذتوں میں منہمک ہو کر آخرت سے غافل نہ ہو جائیں اور اس صبر و زہد پر انھیں زیادہ ثواب حاصل ہو۔ (خلاصہ انشاء البیان)

آیت 21 ۱ وَأَذْكَرَ أَخَا عَادٍ: ”اذکر“ سے ہو تو مطلب یہ ہے کہ اپنی قوم کے سامنے اس کا ذکر کرو، تاکہ انھیں نصیحت ہو اور اگر ”ذکر“ سے ہو تو مطلب یہ ہے کہ اسے یاد کرو، تاکہ تمہیں اس سے تسلی حاصل ہو۔ دونوں باتیں یک وقت بھی مراد ہو سکتی ہیں، کیونکہ ”اذکر“ دونوں سے فعل امر ہے۔ قیامت کے دن تکبر کرنے والوں کا حال بیان کرنے کے بعد دنیا میں چند تکبر اقوام کا ذکر فرمایا، جن میں سے عاد کا ذکر کچھ تفصیل کے ساتھ اور دوسری اقوام کا حال آیت (۲۷):

﴿وَلَقَدْ أَهَلَّكُمَا مَا حَمَلَكُمُ مِنَ الْعْرَى﴾ میں اجمال کے ساتھ بیان فرمایا۔ عاد کے بھائی سے مراد ہود علیہ السلام ہیں، جیسا کہ

حَلْفَةُ إِلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ - إِيَّيْهِ أَحَافٌ عَلَيْكُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿۲۱﴾

والے گزر چکے کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو، بے شک میں تم پر ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں ﴿۲۱﴾

فرمایا: ﴿وَإِلَىٰ عَادِ آخَاهُمْ هُوَذَا﴾ [الأعراف: ۶۵] ”اور عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو (بھیجا)۔“ تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ اعراف (۶۵) کی تفسیر۔ ہود علیہ السلام کو قوم عاد کا بھائی اس لیے فرمایا کہ وہ ان کے ایک فرد تھے۔ عاد کا تفصیلی ذکر اس لیے فرمایا کہ عرب اقوام میں سے یہ پہلی قوم ہے جس کے پاس نوح علیہ السلام کی عام رسالت کے بعد کوئی رسول آیا۔ ہود اور صالح علیہ السلام کا زمانہ ابراہیم علیہ السلام سے پہلے کا ہے۔ سردارانِ قریش جو اپنی بڑائی کا زعم رکھتے تھے، انھیں قوم عاد کا قصہ سنایا جو ان کی سرزمین کی سب سے طاقتور قوم تھی۔

﴿۲۱﴾ إِذْ أَنْذَرْنَا قَوْمَهُ بِالْأَحْقَافِ: ”الْأَحْقَافُ“ ”حَقْفٌ“ کی جمع ہے، ریت کے بلند اور مستطیل ٹیلے کو ”حَقْفٌ“ کہتے ہیں، جو کچھ نیزھا ہو۔ ”الْحَقْوُفُ الشَّيْءُ“ جب کوئی چیز نیزھی ہو۔ یہاں ”أَحْقَافُ“ سے مراد یمن کے مشرق میں حضرموت کا وہ علاقہ ہے جو عرب کے صحرائے اعظم (ربع خالی) کا حصہ ہے۔ ہود علیہ السلام کی قوم وہاں آباد تھی اور اس زمانے میں وہ نہایت زرخیز اور ترقی یافتہ علاقہ تھا، جس میں چشمے، باغات اور مال مویشی کثرت کے ساتھ موجود تھے، جیسا کہ سورہ شعراء (۱۳۲ تا ۱۳۳) میں مذکور ہے۔ اللہ تعالیٰ کے عذاب کے بعد وہ علاقہ ایسا برباد ہوا کہ اب تک وہاں آبادی کا نام و نشان نہیں، ہر طرف ریگستان ہے اور ریت کے لمبے چوڑے ٹیلے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقے کو ”أَحْقَافُ“ اس کی موجودہ حالت کے اعتبار سے کہا گیا ہے۔

تفسیر القرآن میں ہے: ”أَحْقَافُ کی موجودہ حالت دیکھ کر کوئی شخص یہ گمان بھی نہیں کر سکتا کہ کبھی یہاں ایک شاندار تمدن رکھنے والی ایک طاقتور قوم آباد ہوگی۔ اغلب یہ ہے کہ ہزاروں برس پہلے یہ ایک شاداب علاقہ ہو گا اور بعد میں آب و ہوا کی تبدیلی نے اسے ریگزار بنا دیا ہو گا۔ آج اس کی یہ حالت ہے کہ وہ ایک لٹق و دق ریگستان ہے، جس کے اندرونی حصوں میں جانے کی بھی کوئی ہمت نہیں رکھتا۔ ۱۸۳۳ء میں یورپ کا ایک فوجی آدمی اس کے جنوبی کنارے پر پہنچ گیا تھا، وہ کہتا ہے کہ حضرموت کی شمالی سطح مرتفع پر سے کھڑا ہو کر دیکھا جائے تو یہ صحرا ایک ہزار فٹ نشیب میں نظر آتا ہے، اس میں جگہ جگہ ایسے سفید خٹے ہیں جن میں اگر کوئی چیز گر جائے تو ریت میں غرق ہوتی چلی جاتی ہے اور بالکل بوسیدہ ہو جاتی ہے۔ عرب کے بدو اس علاقے سے بہت ڈرتے ہیں اور کسی قیمت پر وہاں جانے پر راضی نہیں ہوتے۔ ایک موقع پر جب بدو اسے وہاں لے جانے پر راضی نہ ہوئے تو وہ اکیلا وہاں گیا۔ اس کا بیان ہے کہ یہاں کی ریت بالکل باریک سفوف کی طرح ہے، میں نے دور سے ایک شاقول اس میں پھینکا تو وہ پانچ منٹ کے اندر اس میں غرق ہو گیا اور اس رسی کا سرا گل گیا جس کے ساتھ وہ بندھا ہوا تھا۔

مفصل معلومات کے لیے ملاحظہ ہو:

Arabia and the Isles By Harold Ingrams, London 1946.

The Unveiling of Arabia. By Reginald Hugh Kiernan, London 1937.

The Empty Quarter By st. john philby, London 1933.”

قَالُوا أَجِئْتَنَا لِنَأْفِكَنَا عَنِ الْهِتَابِ ؕ فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا ۖ إِنْ كُنْتُمْ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۲۱﴾ قَالَ لَكُمْ

الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَابْلِغْكُمْ مَا أُرْسِلْتُ بِهِ وَلَكِنِّي أَرٰكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُونَ ﴿۲۲﴾

انہوں نے کہا کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ ہمیں ہمارے معبودوں سے ہٹا دے، سو ہم پر وہ (عذاب) آجس کی تو ہمیں دھمکی دیتا ہے، اگر تو سچوں سے ہے ﴿۲۱﴾ اس نے کہا یہ علم تو اللہ ہی کے پاس ہے اور میں تمہیں پیغام پہنچاتا ہوں جو مجھے دے کر بھیجا گیا ہے اور لیکن میں تمہیں ایسے لوگ دیکھتا ہوں کہ تم جہالت برتتے ہو ﴿۲۲﴾

﴿۲۱﴾ وَقَدْ خَلَّتِ النَّذْرُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ : اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ ہود علیہ السلام سے پہلے بھی کئی ڈرانے والے گزرے اور ان کے بعد بھی اپنی اپنی قوم کو ڈرانے والے کئی پیغمبر گزر چکے، سب کی تعلیم یہی تھی کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ ڈرانے والوں کا ذکر اس لیے فرمایا کہ بشارت ماننے والوں کو دی جاتی ہے۔ اس سورت کی ابتدا بھی اسی بات سے ہوئی ہے، فرمایا: ﴿وَالَّذِينَ كَفَرُوا عَمَّا أُذُنُوا نَعَرُضُونَ﴾ [الأحقاف: ۳] ”اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اس چیز سے جس سے وہ ڈرائے گئے، منہ پھیرنے والے ہیں۔“

﴿۲۲﴾ اِلٰى اَخَافِ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ : ”عَظِيْمٍ“ ”يَوْمٍ“ کی صفت ہے۔ اس عظیم دن سے مراد آخرت کا دن بھی ہو سکتا ہے اور دنیا میں آنے والے تباہ کن عذاب کا دن بھی، جو قوم عاد پر آمدگی کی صورت میں آیا۔ یوم (دن) کو ان عظیم واقعات کی وجہ سے عظیم کہا ہے جو اس میں واقع ہوں گے۔

آیت 22 ﴿قَالُوا أَجِئْتَنَا لِنَأْفِكَنَا عَنِ الْهِتَابِ : اس آیت کی وضاحت کے لیے دیکھیے سورہ ہود (۳۲) کی تفسیر۔

آیت 22 ﴿۱﴾ قَالَ لَكُمْ الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ : ہود علیہ السلام نے ان کے اس گستاخانہ مطالبے پر کسی تلخی کے اظہار کے بجائے انہیں مزید سمجھانے کی کوشش فرمائی۔ چنانچہ فرمایا، عذاب کا علم تو صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، اس کا اختیار بھی وہی رکھتا ہے، وہی جانتا ہے کہ تم پر دنیا میں عذاب آئے گا یا آخرت میں اور یہ بھی وہی جانتا ہے کہ تمہیں کب تک مہلت دی جائے گی۔ میرے پاس نہ اس کا اختیار ہے کہ جب چاہوں تم پر عذاب لے آؤں اور نہ ہی مجھے اس کے وقت کا علم ہے۔

﴿۲﴾ وَابْلِغْكُمْ مَا أُرْسِلْتُ بِهِ : میرا کام وہ پیغام تم تک پہنچانا دینا ہے جو دے کر مجھے بھیجا گیا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿فَإِنْ أَعْرَضُوا فَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا ۖ إِنْ عَلَيْكَ إِلَّا الْبَلَاغُ﴾ [الشوری: ۴۸] ”پھر اگر وہ منہ پھیر لیں تو ہم نے تجھے ان پر کوئی نگران بنا کر نہیں بھیجا، تیرے ذمے پہنچانے کے سوا کچھ نہیں۔“

﴿۳﴾ وَلَكِنِّي أَرٰكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُونَ : ”جہل“ اکھڑ پن کو بھی کہتے ہیں اور لاعلمی کو بھی۔ اگر پہلا معنی ہو تو جہالت برتنے کا مطلب یہ ہو گا کہ ایک تم کفر پر اصرار کر رہے ہو، اچھی بات قبول کرنے کے بجائے عذاب مانگ رہے ہو اور دوسرے مجھ سے ایسی چیز کا مطالبہ کر رہے ہو جو میرے اختیار میں نہیں ہے، اور اگر یہ جہل علم کے مقابلے میں ہو تو مطلب یہ ہے کہ تمہیں علم ہی

فَلَمَّا رَأَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ أُوْدِيَّتِهِمْ ۖ قَالُوا هَذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا ۗ بَلْ هُوَ مَا
اسْتَعْجَلْتُمْ بِهِ ۗ رِيحٌ فِيهَا عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۳۶﴾

تو جب انھوں نے اسے ایک بادل کی صورت میں اپنی وادیوں کا رخ کیے ہوئے دیکھا تو انھوں نے کہا یہ بادل ہے جو ہم پر مینہ برسانے والا ہے۔ بلکہ یہ وہ (عذاب) ہے جو تم نے جلدی مانگا تھا، آندھی ہے، جس میں دردناک عذاب ہے ﴿۳۶﴾

نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب کیا ہوتا ہے اور وہ تمہارے کس قدر قریب آچکا ہے اور نہ یہ علم ہے کہ رسول پیغام پہنچانے کے لیے آتے ہیں، عذاب لانا ان کے اختیار میں نہیں ہوتا۔

آیت 24 ﴿۱﴾ فَلَمَّا رَأَوْهُ عَارِضًا : ”رَأَوْهُ“ کی ضمیر عذاب کی طرف لوٹ رہی ہے جس کا وہ مطالبہ کرتے آتے تھے۔ ”عَرَضٌ يَغْرَضُ“ سامنے آنا۔ ”عَارِضٌ“ عظیم بادل جو پہاڑوں کی طرح افق پر سامنے آیا ہوا ہو۔ قوم کے ہود علیہ السلام کو جھلانے اور ان پر عذاب کے درمیان کا لمبا قصہ مختصر کر کے نتیجہ بیان فرمایا ہے۔ اس آیت میں ان کے الفاظ ”هَذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا“ (یہ بادل ہے جو ہم پر مینہ برسانے والا ہے) سے ظاہر ہے کہ اس عذاب سے پہلے مدت تک بارش بند رہی۔ ہود علیہ السلام نے کفر و شرک سے توبہ اور اللہ تعالیٰ سے استغفار پر انھیں بارش کی بشارت بھی دی۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَيَقَوْمِ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُؤْوُوا إِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا وَيَزِدْكُمْ قُوَّةً إِلَىٰ قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا الْكُفْرَ مِينًا﴾ [ہود : ۵۲] ”اور اے میری قوم! اپنے رب سے بخشش مانگو، پھر اس کی طرف پلٹ آؤ، وہ تم پر بادل بھیجے گا، جو خوب برسنے والا ہوگا اور تمہیں تمہاری قوت کے ساتھ اور قوت زیادہ دے گا اور مجرم بنتے ہوئے منہ نہ موڑو۔“ اس سے ظاہر ہے کہ انھیں بارش کی شدید ضرورت تھی، لیکن اس کے باوجود وہ اپنے کفر پر جسے رہے اور یہ کہہ کر عذاب لانے کا مطالبہ کرتے رہے کہ اگر سچے ہو تو عذاب لے آؤ، یعنی اگر فوراً عذاب نہیں لاتے تو تم جھوٹے ہو۔ ہود علیہ السلام کا جواب پیچھے گزر چکا ہے۔ آخر عذاب کا وقت آ پہنچا اور اس نے بادل کی صورت میں ان کی وادیوں کی طرف بڑھنا شروع کیا، جب انھوں نے اس عذاب کو بادل کی صورت میں اپنی وادیوں کی طرف آتے ہوئے دیکھا تو بہت خوش ہوئے کہ یہ بادل ہم پر بارش برسانے گا۔

﴿۲﴾ بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهِ : ممکن ہے کہ انھیں یہ جواب ہود علیہ السلام نے دیا ہو یا صورت حال انھیں پکار کر کہہ رہی ہو۔

﴿۳﴾ رِيحٌ فِيهَا عَذَابٌ أَلِيمٌ : ”ريح“ میں توین تہویل کے لیے ہے، بلکہ یہ وہ ہے جسے تم نے جلدی طلب کیا ہے، یہ خوفناک آندھی ہے جس میں عذابِ الیم ہے۔ اس کی کیفیت سورہ قمر (۱۹، ۲۰) اور سورہ حاقہ (۶، ۸) میں تفصیل سے بیان ہوئی ہے۔ قوم عاد آندھی والے بادلوں کو بارش برسانے والے سمجھتے رہے، حالانکہ وہ ان پر آنے والا عذاب تھا۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ جب بادل اٹھتے یا ہوا تیز چلتی تو پریشان ہو جاتے تھے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ﴿مَا رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ضَاحِكًا حَتَّىٰ أَرَىٰ مِنْهُ لَهَوَاتِيهِ، إِنَّمَا كَانَ يَتَبَسَّمُ، قَالَتْ وَكَانَ إِذَا رَأَىٰ غَيْمًا أَوْ رِيحًا عَرَفَ فِي وَجْهِهِ، قَالَتْ يَا رَسُولَ اللَّهِ! إِنَّ النَّاسَ إِذَا رَأَوْا الْغَيْمَ فَرِحُوا، رَجَاءَ أَنْ يَكُونَ فِيهِ الْمَطَرُ، وَأُرَاكَ

تُدْفِرُ كُلَّ شَيْءٍ بِأَمْرِ رَبِّهَا فَأَصْبَحُوا لَا يُرَى إِلَّا مَسَكِنَتُهُمْ - كَذَلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ

النَّجْرَمِينَ ﴿۲۵﴾

جو ہر چیز کو اپنے رب کے حکم سے برباد کر دے گی، پس وہ اس طرح ہو گئے کہ ان کے رہنے کی جگہوں کے سوا کوئی چیز دکھائی نہ دیتی تھی، اسی طرح ہم مجرم لوگوں کو بدلا دیتے ہیں ﴿۲۵﴾

إِذَا رَأَيْتَهُ عُرِفَتْ فِيهِ وَجْهَتُ الْكِرَاهِيَةِ، فَقَالَ يَا عَائِشَةُ! مَا يُؤْمِنُ أَنْ يَكُونَ فِيهِ عَذَابٌ، عَذَّبَ قَوْمَ بِالرِّيْحِ، وَقَدْ رَأَى قَوْمَ الْعَذَابِ فَقَالُوا: ﴿هَذَا عَارِضٌ مُنْظَرٌ﴾ | بحاري، التفسير، تفسير سورة الأحقاف: ۲۸۲۸ء۔
 ۱۸۲۹ء میں نے رسول اللہ ﷺ کو اس طرح ہنستے ہوئے نہیں دیکھا کہ مجھے آپ کا تالو میں لٹکا ہوا گوشت کا ٹکڑا نظر آ جائے، آپ صرف مسکراتے تھے۔“ فرماتی ہیں: ”اور آپ ﷺ جب بادل یا ہوا دیکھتے تو وہ آپ کے چہرے میں پہچانی جاتی۔“ انھوں نے کہا: ”یا رسول اللہ! لوگ جب بادل دیکھتے ہیں تو خوش ہو جاتے ہیں، اس امید پر کہ اس میں بارش ہوگی اور میں آپ کو دیکھتی ہوں کہ آپ جب اسے دیکھتے ہیں تو آپ کے چہرے میں ناگواری پہچانی جاتی ہے؟“ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”اے عائشہ! مجھے اس سے کیا چیز بے خوف کرتی ہے کہ اس میں کوئی عذاب ہو؟ ایک قوم کو آدمی کے ساتھ عذاب دیا گیا اور ایک قوم نے عذاب دیکھا تو کہنے لگے: ”یہ بادل ہم پر بارش برسانے والا ہے۔“ عائشہ بیچنا ہی بیان کرتی ہیں: ﴿سَكَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا سَكَانَ يَوْمَ الرِّيحِ وَالنَّعِيمِ عُرِفَتْ ذَلِكَ فِي وَجْهِهِ وَأَقْبَلُ وَأَذْبَرُ، فَإِذَا مَطَرَتْ سُرَّ بِهِ وَذَهَبَ عَنْهُ ذَلِكَ، قَالَتْ عَائِشَةُ فَسَأَلْتُهُ فَقَالَ إِنِّي خَشِيتُ أَنْ يَكُونَ عَذَابًا سَلَطَ عَلَيَّ أُتَيْتِي، وَيَقُولُ إِذَا رَأَى الْمَطَرَ، رَحْمَةً﴾ | مسلم، صلاة الاستسقاء، باب التعمد عند رؤية الريح: ... ۸۹۹ء | جب ہوا اور بادل والا دن ہوتا تو وہ رسول اللہ ﷺ کے چہرے میں پہچانا جاتا اور آپ (بے چینی کے عالم میں) کبھی اندر آتے کبھی باہر جاتے، جب بارش برسنے لگتی تو خوش ہو جاتے اور آپ کی وہ کیفیت ختم ہو جاتی۔“ عائشہ بیچنا نے فرمایا، میں نے آپ سے اس بارے میں پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”میں ڈرتا ہوں کہیں وہ عذاب نہ ہو جو میری امت پر مسلط کیا گیا ہو۔“ اور جب آپ ﷺ بارش کو دیکھتے تو کہتے: ”(یا اللہ! اسے) رحمت (بنا)۔“

آیت 25 ﴿۱﴾ تَدْفِرُ كُلَّ شَيْءٍ بِأَمْرِ رَبِّهَا: یہاں ایک مشہور سوال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”وہ ہر چیز کو اپنے رب کے حکم سے برباد کر دے گی“ حالانکہ کئی چیزیں اس کے بعد بھی موجود رہیں، جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ نے سورہ ہود (۵۸) میں فرمایا ہے کہ ہود علیہ السلام اور ان پر ایمان لانے والے اس عذاب سے محفوظ رہے۔ اہل علم نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ لفظ ”كُلُّ“ سے کائنات کی ہر چیز مراد نہیں ہوتی، بلکہ ہر مقام پر اس کی مناسبت سے کل چیزیں مراد ہوتی ہیں، جیسا کہ ہد ہد نے ملک سبا کے متعلق کہا تھا: ﴿وَأُوْتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ﴾ | النمل: ۲۳ء | ”اور اسے ہر چیز میں سے حصہ دیا گیا ہے۔“ ظاہر ہے اس

وَلَقَدْ مَكَّنَّهُمْ فِيمَا آتَيْنَا مِنْ مَكَّنِّكُمْ فِيهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَنَعًا وَابْصَارًا وَآفِدَةً ۗ قَمَا
 أَغْنَىٰ عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَا أَبْصَارُهُمْ وَلَا آفِدَتُهُمْ مِنْ شَيْءٍ ۚ إِذْ كَانُوا يَجْحَدُونَ ۗ
 بِآيَاتِ اللَّهِ وَحَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ﴿۲۶﴾

۲۶

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے انہیں ان چیزوں میں قدرت دی جن میں ہم نے تمہیں قدرت نہیں دی اور ہم نے ان کے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنائے تو نہ ان کے کان ان کے کسی کام آئے اور نہ ان کی آنکھیں اور نہ ان کے دل، کیونکہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے اور انہیں اس چیز نے گھیر لیا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے ﴿۲۶﴾

سے مراد وہ تمام چیزیں ہیں جن کی حکومت کے لیے ضرورت ہوتی ہے، ورنہ ہر چیز میں سے تو اسے حصہ نہیں دیا گیا تھا۔ اسی طرح یہاں ہر چیز کو بر باد کرنے سے مراد ہر اس چیز کو بر باد کرنا ہے جسے بر باد کرنے کا اسے حکم دیا گیا تھا، جیسا کہ ”یَا مُرْزِقُهَا“ (اپنے رب کے حکم کے ساتھ) کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ چنانچہ ہود علیہ السلام اور ان پر ایمان لانے والوں کو اس آندھی نے کوئی نقصان نہیں پہنچایا، کیونکہ اسے یہی حکم تھا، جیسا کہ سورہ ہود (۵۸) میں ہے۔

﴿۲۶﴾ فَاصْبَحُوا لَا يَزِيءُ إِلَّا مَسْكِنُهُمْ... : ”فَاصْبَحُوا“ سے مراد یہاں ”انہوں نے صبح کی“ نہیں، بلکہ یہاں ”أَصْبَحَ“ ”صَبَرَ“ کے معنی میں ہے، یعنی ”وہ اس طرح ہو گئے“ کیونکہ وہ ہوا صرف ایک رات نہیں چلی کہ صبح ان کی یہ حالت ہوئی ہو، بلکہ سات راتیں اور آٹھ دن چلتی رہی اور ایسی تند و تیز اور غضب ناک ہو کر چلی کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿مَا تَذَرُ مِنْ شَيْءٍ أَتَتْ عَلَيْهِ إِلَّا جَعَلْنَاهُ كَالرَّيِّبِ﴾ [الذاریات: ۴۲] ”جو کسی چیز کو نہ چھوڑتی تھی جس پر سے گزرتی مگر اسے بوسیدہ ہڈی کی طرح کر دیتی تھی۔“ درخت، آدمی، جانور، مکان، غرض ہر چیز ہوانے اکھاڑ پھینگی۔ آخر مکانوں کے کھنڈروں یا گری ہوئی کھوکھلی کھجوروں کے تنوں جیسے لاشوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا، جو نشانِ عبرت بنے ہوئے تھے کہ اللہ کے مجرموں کا یہ حال ہوتا ہے۔ مراد کفار مکہ کو سمجھانا ہے کہ کفر پر اصرار کے نتیجے میں تمہارا بھی یہ حال ہو سکتا ہے۔

آیت 26 ﴿۱﴾ وَلَقَدْ مَكَّنَّهُمْ فِيمَا آتَيْنَا مِنْ مَكَّنِّكُمْ فِيهِ : ”مَكَّنَّ يُمَكِّنُ تَمَكِّنًا“ کسی چیز پر قدرت دینا۔ ”إِنْ مَكَّنَّكُمْ“ میں ”إِنْ“ شرطیہ نہیں بلکہ نافیہ ہے، یعنی ”اگر“ کے بجائے ”نہیں“ کے معنی میں ہے۔ قریش مکہ کو یہ بات کہی جا رہی ہے کہ جسمانی ذیل ڈول، مال، اولاد، قوت، سلطنت، غرض وہ دنیوی اسباب جن پر ہم نے قوم عاد کو قدرت عطا کی تھی تمہیں ان پر قدرت عطا نہیں کی، جب اللہ کے عذاب کے سامنے ان کی تمام تر قوت و شوکت ٹکوں کی طرح اڑ گئی تو تمہاری کیا بھلائی ہے؟ یہ بات اللہ تعالیٰ نے متعدد مقامات پر فرمائی ہے، دیکھیے سورہ روم (۹) اور سورہ مؤمن (۲۱)۔

﴿۲۶﴾ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَنَعًا وَابْصَارًا وَآفِدَةً... : دوسری جگہ ان کے متعلق فرمایا: ﴿وَكَانُوا مُسْتَبْصِرِينَ﴾ [العنکبوت: ۳۸] ”حالانکہ وہ بہت سمجھ دار تھے۔“ یعنی ہم نے انہیں سننے کے لیے کان، دیکھنے کے لیے آنکھیں اور سوچ بچار کے لیے دل دیے تھے، مگر انہوں نے اللہ تعالیٰ کی آیات کو سننے، اس کی نشانیوں کو عبرت کے لیے دیکھنے اور آخرت کی زندگی کے متعلق غور و

وَلَقَدْ أَهَلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِنَ الْقَرْيِ وَصَرَفْنَا الْآيَاتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿۲۷﴾ فَلَوْ لَا نَصَرَهُمُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ قُرْبَانًا آلِهَةً ۗ بَلْ ضَلُّوا عَنْهُمْ ۗ وَذَلِكَ إِفْكُهُمْ وَمَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿۲۸﴾

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے تمہارے اردگرد کی بستیوں کو ہلاک کر دیا اور ہم نے پھیر پھیر کر آیات بیان کیں، شاید وہ لوٹ آئیں ﴿۲۷﴾ پھر ان لوگوں نے ان کی مدد کیوں نہ کی جنہیں انہوں نے قرب حاصل کرنے کے لیے اللہ کے سوا معبود بنایا؟ بلکہ وہ ان سے گم ہو گئے اور یہ ان کا جھوٹ تھا اور جو وہ بہتان باندھتے تھے ﴿۲۸﴾

فکر کے بجائے ان سے اتنا ہی کام لیا جو دنیا کے مال و متاع کے حصول کے لیے مفید ہو۔ دنیا کے کام میں عقل مند تھے، لیکن وہ عقل نہ آئی جس سے آخرت درست ہو، آیات الہی سنتے وقت ان کے کان بہرے ہو جاتے تھے اور آیات الہی دیکھنے کے لیے ان کی آنکھیں بند ہی رہتی تھیں۔ پھر جب ان پر اللہ کا عذاب آیا تو ان کی عقل مندی ان کے کسی کام نہ آسکی، کیونکہ وہ اللہ کی آیات تسلیم کرنے سے صاف انکار کیا کرتے تھے۔

﴿۳﴾ وَحَاقَّ بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ: یعنی وہ عذاب جس کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ جس عذاب سے ہمیں ڈراتے ہو وہ کب آ رہا ہے، اسی عذاب نے انہیں گھیر لیا اور ایسا گھیرا کہ پھر اس سے نکل نہ سکے۔

آیت 27 ﴿۱﴾ وَلَقَدْ أَهَلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِنَ الْقَرْيِ: انسان کی فطرت ہے کہ وہ دوسروں کو دیکھ کر عبرت حاصل کرتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اہل مکہ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تم اپنے اردگرد کی بستیوں پر نظر ڈالو اور دیکھو کس قدر تو میں نیست و نابود کر دی گئیں اور کس طرح انہوں نے اپنے کرتوتوں کے بدلے پائے ہیں۔ اردگرد سے مراد احقاف ہے جو یمن کے حضرموت کے علاقے میں ہے، وہاں کے بسنے والے عادیوں کے انجام پر نظر ڈالو۔ تمہارے اور شام کے درمیان مقام حجر میں شمود کا جو حشر ہوا اسے دیکھو، یمن کی قوم سبا کے انجام پر غور کرو، مدین جو تمہارے اور غزہ کے درمیان ہے، تم وہاں آتے جاتے رہتے ہو اور قوم لوط کی بستیاں بھی تمہارے راستے میں پڑتی ہیں، ان سب کے واقعات عرب میں مشہور و معروف تھے۔ (ابن کثیر)

﴿۲﴾ وَصَرَفْنَا الْآيَاتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ: اس کی تفسیر دو طرح سے ہو سکتی ہے، ایک یہ کہ ہم نے ان بستیوں کے رہنے والوں کے لیے آیات کو پھیر پھیر کر اور کئی طرح سے کھول کر بیان کیا، تاکہ وہ پلٹ آئیں۔ دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ کفار مکہ کے متعلق فرما رہے ہیں کہ ہم نے ان کے لیے آیات کو پھیر پھیر کر بیان کیا، تاکہ وہ کفر و شرک سے پلٹ آئیں۔ اس صورت میں کلام میں التفات ہے کہ جھپٹے جملے ”وَلَقَدْ أَهَلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِنَ الْقَرْيِ“ میں کفار مکہ کو مخاطب فرمایا، پھر ”وَصَرَفْنَا الْآيَاتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ“ میں ناراضی کے اظہار کے لیے ان کا ذکر غائب کے صیغے کے ساتھ فرمایا۔

آیت 28 ﴿۱﴾ فَلَوْ لَا نَصَرَهُمُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ قُرْبَانًا آلِهَةً.....: حال ہے یا مفعول لہ ہے، ترجمہ مفعول لہ کے مطابق کیا

وَإِذْ صَرَفْنَا إِلَيْكَ نَفْرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُونَ الْقُرْآنَ ۖ فَلَمَّا حَضَرُوهُ قَالُوا أَنصِتُوا ۖ فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا إِلَىٰ قَوْمِهِمْ مُنْذِرِينَ ﴿۲۹﴾

اور جب ہم نے جنوں کے ایک گروہ کو تیری طرف پھیرا، جو قرآن غور سے سنتے تھے تو جب وہ اس کے پاس پہنچے تو انھوں نے کہا خاموش ہو جاؤ، پھر جب وہ پورا کیا گیا تو اپنی قوم کی طرف ڈرانے والے بن کر واپس لوٹے ﴿۲۹﴾

گیا ہے۔ اہل مکہ اور ان کے ارد گرد کی قوموں کا سب سے بڑا اور مشرک جرم یہ تھا کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا کئی ایسے الہ بنا رکھے تھے جن کے متعلق وہ سمجھتے تھے کہ وہ مصیبت کے وقت ان کے کام آتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کی سفارش کرتے ہیں، اس کے پاس ان کی فریادیں پہنچاتے ہیں اور انھیں اللہ تعالیٰ کے قریب کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ سورہ زمر میں گزر چکا ہے کہ مشرکین مکہ بھی اپنے پیش رو لوگوں کی طرح کہا کرتے تھے: ﴿مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ﴾ [الزمر: ۲۳] ”ہم ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں۔“ اور سورہ یونس میں ہے: ﴿هُوَ الَّذِي شَفَعَآؤُنَا عِندَ اللَّهِ﴾ [یونس: ۱۸] ”یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔“ پھر چاہیے تو یہ تھا کہ جب اس جرم کی پاداش میں ان پر عذاب آیا تو وہ ان کی مدد کو پہنچتے، مگر کوئی ان کی مدد کو نہ پہنچا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ پھر ان کے ان داتاؤں، حاجت رواؤں اور مشکل کشاؤں نے ان کی مدد کیوں نہ کی جنھیں ان لوگوں نے قرب حاصل کرنے کے لیے اللہ کے سوا معبود بنایا ہوا تھا؟

﴿۲۹﴾ بَلْ صَلَّوْا عَنْهُمْ: یعنی جب وہ وقت آیا جس کے لیے ان کی پوجا کی جاتی تھی اور ان کے سامنے نذرانے پیش کیے جاتے تھے، تو وہ معبود یوں غائب ہو گئے کہ کہیں ان کا سراغ نہ ملا۔

﴿۳۰﴾ وَذَٰلِكَ إِفْكُهُمْ وَمَا كَانُوا يَفْتَرُونَ: معلوم ہوا کہ ان کی وہ باتیں جو انھوں نے اپنے معبودوں کی دھاک بٹھانے کے لیے گھڑ رکھی تھیں سب جھوٹ تھیں اور وہ سراسر بہتان تھیں جو وہ باندھتے رہتے تھے۔

آیت 29 ﴿۱﴾ وَإِذْ صَرَفْنَا إِلَيْكَ نَفْرًا مِّنَ الْجِنِّ.....: ”اِذْ“ سے پہلے ”اُدْحٰكُرُ“ محذوف ہے جس کا عطف اس سے پہلے مذکور آیت ”وَإِذْ كُرَّ أَحَا عَادُ“ پر ہے۔ یعنی کفار مکہ کے لیے ہو دینا اور ان کی قوم عاد کا ذکر کیجیے جو ان سے کہیں زیادہ قوت و شوکت والے تھے کہ اپنے رسول کو جھٹلانے پر ان کا کیا حال ہوا، اسی طرح اہل مکہ کے ارد گرد کی بستیوں کے کفر پر اصرار کا انجام کیا ہوا، تاکہ اہل مکہ کو ان کے انجام سے عبرت ہو اور وہ کفر و شرک سے باز آجائیں۔ ”وَإِذْ صَرَفْنَا إِلَيْكَ نَفْرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُونَ الْقُرْآنَ“ اور ان کفار کے لیے اس وقت کا ذکر کیجیے جب ہم نے جنوں کے ایک گروہ کا رخ آپ کی طرف پھیرا اور انھوں نے آپ سے قرآن سنا۔ مقصد کفار مکہ کو شرم دلانا ہے کہ اپنی جنس انسان، اپنی نسل عرب، اپنی قوم قریش اور اپنے شہر مکہ میں معوث رسول کی زبان سے ان پر نازل شدہ قرآن جیسی فصیح و بلیغ اور معجز کتاب مدت سے سننے کے باوجود نہ تم پر قرآن کا کچھ اثر ہوا، نہ تم رسول پر ایمان لائے اور نہ شرک کی نجاست سے پاک ہو سکے، ذرا جنوں کے اس گروہ کو بھی دیکھو جو چاکل اس موقع پر پہنچا جب رسول اللہ ﷺ قرآن پڑھ رہے تھے، وہ رسول اللہ ﷺ کی جنس یا قوم کے فرد نہیں تھے

قَالُوا يَقَوْمَنَا إِنَّا سَبِعْنَا كِتَابًا أُنزِلَ مِنْ بَعْدِ مُوسَى مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ
يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ وَإِلَى طَرِيقٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿۳۰﴾

انہوں نے کہا اے ہماری قوم! بے شک ہم نے ایک ایسی کتاب سنی ہے جو موسیٰ کے بعد نازل کی گئی ہے، اس تصدیق کرنے والی ہے جو اس سے پہلے ہے، وہ حق کی طرف اور سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرتی ہے ﴿۳۰﴾

بلکہ ایک الگ جنس سے تھے، شہر بھی ان کا کوئی اور تھا، راستے میں انھیں قرآن سننے کا اتفاق ہوا۔ رسول اللہ ﷺ کو علم بھی نہ تھا کہ جنوں کا کوئی گروہ میرا قرآن سن رہا ہے، اس کے باوجود ان کے طرز عمل اور اپنے طرز عمل کا موازنہ کر لو۔

﴿۳۰﴾ فَلَمَّا حَضَرُوهُ قَالُوا أَنْصَبُوا: جب وہ اس موقع پر حاضر ہوئے تو ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ خاموش ہو جاؤ، تاکہ ہم غور سے قرآن سن سکیں۔ ان جنوں کو دیکھو کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ توفیق سے خود ہی اس حکم پر عمل کر رہے ہیں جو سورۃ اعراف میں ہے: ﴿وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ﴾ [الأعراف: ۲۰۴] ”اور جب قرآن پڑھا جائے تو اسے کان لگا کر سنو اور چپ رہو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔“ اور اپنے آپ کو دیکھو، تمہاری روش وہ ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے تم اسجدہ میں فرمایا ہے: ﴿وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَسْمَعُوا هَذَا الْقُرْآنَ وَالنُّفُوفِ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْلَمُونَ﴾ [ختم السجدة: ۲۶] ”اور ان لوگوں نے کہا جنہوں نے کفر کیا، اس قرآن کو مت سنو اور اس میں شور کرو، تاکہ تم غالب رہو۔“ وہ ایک دوسرے کو خاموش رہ کر سننے کی تلقین کر رہے ہیں اور تم ایک دوسرے کو سننے سے روک رہے ہو۔ کم از کم سن تو لو، تاکہ ان کی طرح رحم کا دروازہ تمہارے لیے بھی کھل سکے، صرف تکبر اور غلبے کی ہوس میں نہ پڑے رہو، ایسا نہ ہو کہ یہ ہوس قوم عادی طرح تمہیں بھی برباد کر دے۔

﴿۳۱﴾ فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا إِلَىٰ قَوْمِهِمْ مُنْذِرِينَ: جب قرآن کی قراءت پوری ہو چکی تو وہ نہ صرف یہ کہ خود ایمان لے آئے بلکہ اپنی قوم کو بھی کفر کے انجام سے خبردار کرنے کے لیے ان کی طرف واپس پلٹ گئے، کیونکہ ایمان کی تکمیل اسی سے ہوتی ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما کو رسول اللہ ﷺ نے چند نصیحتیں فرمائیں، ان میں سے ایک یہ تھی: ﴿وَ أَحِبِّ لِلنَّاسِ مَا نَحِبُّ لِنَفْسِكَ، تَكُنْ مُؤْمِنًا﴾ [ابن ماجہ، الزهد، باب الورع والتقوى: ۴۲۱۷] ”لوگوں کے لیے وہی پسند کرو جو اپنے لیے پسند کرتے ہو، مومن بن جاؤ گے۔“

﴿۳۲﴾ طبری نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ انہوں نے ”وَ إِذْ صَرَفْنَا إِلَيْكَ نَفْرًا مِنَ الْجِبْنِ“ کے بارے میں فرمایا: ”یہ اہل نصیبین میں سے سات (مرد جن) تھے، رسول اللہ ﷺ نے انہیں اپنی قوم کی طرف پیغام پہنچانے والا بنا کر بھیجا۔“ [الطبري: ۳۱۵۷۴] ابن کثیر کے محقق نے اس کی سند کو حسن کہا ہے۔

﴿۳۳﴾ جنوں کا یہ گروہ کس موقع پر آیا؟ اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۃ جن کی شان نزول اور اس کی ابتدائی آیات کی تفسیر۔

بیت 30 ﴿۱﴾ قَالُوا يَقَوْمَنَا إِنَّا سَبِعْنَا كِتَابًا أُنزِلَ مِنْ بَعْدِ مُوسَى: جنوں نے نازل کردہ کتابوں میں سے آخری

يَقَوْمَنَا أَجِيبُوا دَاعِيَ اللَّهِ وَآمِنُوا بِهِ يَغْفِرَ لَكُمْ قِنْدُؤُوكُمْ وَ يُجْزِكُمْ قِنْدُ عَذَابٍ

الْيَوْمِ ﴿۳۱﴾

اے ہماری قوم! اللہ کی طرف بلائے والے کی دعوت قبول کرو اور اس پر ایمان لے آؤ، وہ تمہیں تمہارے گناہ معاف کر دے گا اور تمہیں دردناک عذاب سے پناہ دے گا ﴿۳۱﴾

کتاب انجیل کا نام لینے کے بجائے تورات کا نام لیا۔ بعض مفسرین کے مطابق اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ وہ یہود کے دین پر تھے، یا انہیں انجیل کے نزول کا علم نہیں تھا، مگر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ قرآن سے پہلے آخری کتاب جو شریعت کے احکام پر مشتمل تھی وہ تورات تھی۔ داؤد علیہ السلام کی زبور اور عیسیٰ علیہ السلام کی انجیل اس کی تکمیل یا تفسیر و تبیین کرنے والی کتابیں تھیں۔ موسیٰ علیہ السلام کے بعد آنے والے تمام انبیاء حتیٰ کہ عیسیٰ علیہ السلام بھی تورات ہی پر عمل کے پابند تھے۔ (دیکھیے مادہ: ۴۴) اسی سورہ احقاف میں بھی قرآن سے پہلے موسیٰ علیہ السلام کی کتاب کا ذکر ہے، فرمایا: ﴿وَمِنْ قَبْلِهِ كِتَابُ مُوسَىٰ أَمَلًا وَرَحْمَةً﴾ [الأحْقَافُ: ۱۲] ”اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب پیشوا اور رحمت تھی۔“ رسول اللہ ﷺ پر غار حرا میں پہلی وحی کے نزول پر جب ام المؤمنین خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کو لے کر ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں تو انھوں نے آپ ﷺ سے سارا معاملہ سن کر کہا تھا: ﴿هَذَا النَّامُوسُ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَىٰ مُوسَىٰ﴾ [بخاری، التعمیر، باب أول ما بدئ به رسول الله ﷺ : ۶۹۸۲] ”یہ وہی صاحب راز فرشتہ ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل کیا گیا۔“ حالانکہ ورقہ بن نوفل اس سے پہلے عیسیٰ علیہ السلام کا دین قبول کر چکے تھے اور انجیل کے عالم تھے۔

② مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ: یعنی یہ کتاب اس سے پہلی تمام آسمانی کتابوں کو سچا ثابت کرنے والی ہے کہ اس کتاب کے ذریعے سے وہ تمام باتیں اور پیش گوئیاں سچ ثابت ہوئیں جو ان کتابوں میں کی گئی ہیں، جن میں نبی کریم ﷺ کی آمد کی پیش گوئی بھی شامل ہے۔

③ يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ وَإِلَى طَرِيقِ مُسْتَقِيمٍ: ابن کثیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”یعنی عقائد و اخبار میں حق اور اعمال میں سیدھے راستے کی طرف راہ نمائی کرتی ہے، کیونکہ قرآن خبر اور طلب دو چیزوں پر مشتمل ہے۔ اس کی خبر صدق اور طلب عدل ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا﴾ [الأنعام: ۱۱۵] ”اور تیرے رب کی کتاب صدق اور عدل کے اعتبار سے پوری ہو گئی۔“ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَ دِينِ الْحَقِّ﴾ [التوبة: ۳۳] ”وہی ہے جس نے اپنا رسول ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا۔“ چنانچہ ہدایت علم نافع ہے اور دین حق عمل صالح ہے اور جنوں نے بھی یہی بات کہی کہ ”يَهْدِي إِلَى الْحَقِّ“ (اعقادات میں حق کی راہ نمائی کرتی ہے) ”وَ إِلَى طَرِيقِ مُسْتَقِيمٍ“ (اور عملیات میں سیدھے راستے کی)۔“

31 ① يَقَوْمَنَا : ”يَقَوْمَنَا“ کے ساتھ دوبارہ مخاطب کرنے کا مقصد اس بات کے اہم ہونے کی طرف متوجہ کرنا ہے جو اس آیت میں بیان کی گئی ہے۔ جس طرح خطیب کسی اہم بات کی طرف متوجہ کرنے کے لیے اشارے کلام میں ”إِنِّهَا النَّاسُ“ کہتا ہے۔ (ابن عاشور)

وَمَنْ لَا يُجِبْ دَاعِيَ اللَّهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْأَرْضِ وَلَيْسَ لَهُ مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءُ ۗ
أُولَٰئِكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿۳۶﴾

اور جو اللہ کی طرف بلانے والے کی دعوت قبول نہ کرے گا تو نہ وہ زمین میں کسی طرح عاجز کرنے والا ہے اور نہ ہی اس کے سوا اس کے کوئی مددگار ہوں گے، یہ لوگ کھلی گمراہی میں ہیں ﴿۳۶﴾

﴿۳۶﴾ اَجِبْنُوا دَاعِيَ اللَّهِ: ”دَاعِيَ اللَّهِ“ سے مراد رسول اللہ ﷺ ہیں، کیونکہ آپ ﷺ کی دعوت اپنی ذات یا کسی بھی مخلوق کے بجائے صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اسی کی اطاعت کی طرف تھی، جیسا کہ فرمایا: ﴿قُلْ هَذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي وَسُبْحَانَ اللَّهِ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ﴾ [یوسف: ۱۰۸] ”کہہ دے یہی میرا راستہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، پوری بصیرت پر، میں اور وہ بھی جنہوں نے میری پیروی کی ہے اور اللہ پاک ہے اور میں شریک بنانے والوں سے نہیں ہوں۔“ یہاں ایک سوال ہے کہ جنوں نے نبی ﷺ کی صبح کی نماز کے دوران قرآن مجید کی جو تلاوت سنی آپ نے اس میں کون سی آیات پڑھیں، جن میں وہ باتیں موجود تھیں جن کی تلقین جنوں نے اپنی قوم کو کی؟ جواب اس کا یہ ہے کہ اگر ہمیں اور کوئی آیات معلوم نہ ہو سکیں تو سورہ فاتحہ کی قراءت تو یقینی ہے جو قرآن مجید کے تمام مضامین کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔

﴿۳۷﴾ يَغْفِرْ لَكُمْ فَنِ دُنُوبِكُمْ وَيَجْزِئَكُمْ فَنِ عَذَابِ الْيَوْمِ: ”يَغْفِرُ“ اور ”يُجِزُ“ ”اَجِبْنُوا“ اور ”اٰمِنُوا“ (فعل امر) کا جواب ہونے کی وجہ سے مجزوم ہیں۔ ”يُجِزُ“ اصل میں ”يَجِيزُ“ ہے، جو باب افعال کا مضارع معلوم ہے۔ راء پر جزم آنے کی وجہ سے یاء اور راء دوساکن جمع ہونے پر یاء کو حذف کر دیا گیا تو ”يُجِزُ“ ہو گیا۔

﴿۳۸﴾ يَغْفِرْ لَكُمْ فَنِ دُنُوبِكُمْ“ میں ”فِنِ“ لانے کا کیا فائدہ ہے؟ اس کے لیے دیکھیے سورہ نوح (۴) کی تفسیر۔

﴿۳۹﴾ اللہ کے داعی کی دعوت قبول کرنے اور اس پر ایمان لانے پر دو بشارتیں دیں، ایک اس فائدے کے حصول کی بشارت جو تمہیں ایمان لانے سے حاصل ہوگا کہ وہ تمہارے گناہ بخش دے گا اور دوسری ناقابلِ تلافی نقصان سے بچنے کی بشارت کہ وہ تمہیں عذابِ الیم سے پناہ دے گا۔

آیت ۳۲: ۱ وَمَنْ لَا يُجِبْ دَاعِيَ اللَّهِ.....: بشارت کے بعد یہ نذارت ہے، جس میں اس کتاب پر ایمان نہ لانے والوں کو ڈرایا گیا ہے۔ یہ وہی بات ہے جو سورہ جن میں ان الفاظ کے ساتھ بیان ہوئی ہے: ﴿وَأَقَا ظَلَمْنَا أَنْ لَنْ نُعْجِزَ اللَّهُ فِي الْأَرْضِ وَلَنْ نُعْجِزَهُ هَرَبًا﴾ [الحج: ۱۲] ”اور یہ کہ ہم نے یقین کر لیا کہ بے شک ہم کبھی اللہ کو زمین میں عاجز نہیں کر سکیں گے اور نہ ہی بھاگ کر کبھی اسے عاجز کر سکیں گے۔“

﴿۴۰﴾ وَلَيْسَ لَهُ مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءُ: یعنی اللہ تعالیٰ کی دعوت قبول نہ کرنے والا نہ خود دنیا یا آخرت میں اللہ تعالیٰ کی گرفت سے بھاگ کر کہیں جاسکتا ہے اور نہ ہی کسی طرح کے مددگار اس کی مدد کو پہنچ سکتے ہیں۔

وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى النَّارِ أَلَيْسَ هَذَا بِالْحَقِّ ۗ قَالُوا بَلَىٰ وَرَبِّنَا ۗ قَالَ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿۳۱﴾

اور جس دن وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، آگ پر پیش کیے جائیں گے، کیا یہ حق نہیں ہے؟ کہیں گے کیوں نہیں، ہمارے رب کی قسم! وہ کہے گا پھر چکھو عذاب اس کے بدلے جو تم کفر کیا کرتے تھے ﴿۳۱﴾

آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا لوگوں کے پیدا کرنے سے زیادہ بڑا (کام) ہے اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

﴿۳۱﴾ وَلَمْ يَنْفَعِي بِمَعْنَاهُمْ: یہود و نصاریٰ کی الہامی کتاب تورات کی دوسری کتاب "خروج" میں مذکور ہے: "چھ دن میں خداوند نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا اور ساتویں دن آرام کیا اور تازہ دم ہوا۔" [خروج، باب: ۳۱، فقرہ ۱۷] تازہ دم وہ ہوتا ہے جو تھکے اور تھکنا نقصان قدرت پر مبنی ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ میں کسی قسم کا نقصان نہیں، اس لیے تورات کی اس عبارت کی اصلاح اور یہودیوں عیسائیوں کے عقیدے کی غلطی کا اظہار کرنے کو قرآن مجید کی اس آیت میں فرمایا: ﴿وَلَمْ يَنْفَعِي بِمَعْنَاهُمْ﴾ اللہ آسمان و زمین کو پیدا کر کے تھکا نہیں، یہ تمہارا خیال غلط ہے۔ (تفسیر ثنائی) دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ۚ وَفَاَتَيْنَاهُنَّ نُجُومًا﴾ [فی: ۳۸] "اور بلاشبہ یقیناً ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے چھ دنوں میں پیدا کیا اور ہمیں کسی قسم کی تھکاوٹ نے نہیں چھوا۔"

﴿۳۲﴾ "بِقَدْرِ" میں "باء" لانے کی توجیہ ابن ہشام نے بہت عمدہ فرمائی ہے، وہ فرماتے ہیں: "بعض اوقات کسی چیز کو اس کے معنی یا لفظ میں یا دونوں میں مشابہ چیز کا حکم دے دیا جاتا ہے۔ پہلی کی کئی صورتیں ہیں، جن میں سے ایک اللہ تعالیٰ کے فرمان "أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللَّهَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَلَمْ يَنْفَعِي بِمَعْنَاهُمْ بِقَدْرِ" میں "أَنَّ" کی خبر "قَدْرِ" پر بقاء کا داخل ہونا ہے، کیونکہ یہ "أَوَلَيْسَ اللَّهُ بِقَادِرٍ" کے معنی میں ہے۔ یہ "باء" اس لیے آئی ہے کہ "أَنَّ" کے اسم اور خبر میں بہت فاصلہ ہے۔ اسی لیے دوسری آیت: ﴿أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللَّهَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ قَادِرٌ عَلَىٰ أَنْ يَخْلُقَ لَهُمْ﴾ [سبحہ اسرائیل: ۹۹] میں "قَادِرٌ" پر بقاء نہیں آئی۔ اسی کی ایک مثال "كَلْفِي بِاللَّهِ شَهِيدًا" ہے، کیونکہ اس میں "اِكْتَفَبِ بِاللَّهِ شَهِيدًا" کا معنی پایا جا رہا ہے۔" (اعراب القرآن از درویش)

"أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللَّهَ..." کے جواب میں "بَلَىٰ" آنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ یہ "أَوَلَيْسَ اللَّهُ بِقَادِرٍ" کے معنی میں ہے، کیونکہ "بَلَىٰ" سابقہ نئی کی تردید کے لیے لایا جاتا ہے، جب کہ "نَعَمْ" پہلی نئی کی تاکید کے لیے لایا جاتا ہے۔

آیت 34: ﴿۳۴﴾ وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى النَّارِ قیامت کے حق ہونے کو دلیل کے ساتھ ذکر کرنے کے بعد اس دن کا ایک منظر پیش فرمایا، یعنی وہ دن یاد کرو جب ان لوگوں کو جو قیامت اور جہنم کا انکار کرتے تھے آگ پر پیش کیا جائے گا (اور کہا جائے گا) کیا یہ حق نہیں؟ سوال کا مقصد پوچھنا نہیں ہوگا بلکہ انھیں دلیل کرنا اور وہ دنیا میں جہنم اور قیامت کا جو مذاق اڑاتے رہے اس کے بدلے میں ان کا مذاق اڑانا ہوگا۔ جہنم کے عذاب کے ساتھ ملامت، ڈانٹ ڈپٹ اور طنز و جہم کا

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَهُمْ كَأَنَّهُمْ يَوْمَ يَرُونَ مَا

پس صبر کر جس طرح پختہ ارادے والے رسولوں نے صبر کیا اور ان کے لیے جلدی کا مطالبہ نہ کر، جس دن وہ اس چیز

یہ عذاب بجائے خود بہت بڑی سزا ہوگی، دوسری جگہ فرمایا: ﴿يَوْمَ يُدْعَوْنَ إِلَىٰ تَارِحَتِهِمْ دَعَا ۖ هَذِهِ النَّارُ الَّتِي كُنْتُمْ

بِهَا تُكذَّبُونَ ۖ أَفَسِحْرٌ هَذَا أَمْ أَنْتُمْ لَا تُبْصِرُونَ﴾ [الطور: ۱۳ تا ۱۵] ”جس دن انھیں جہنم کی آگ کی طرف دھکیلا

جائے گا، سخت دھکیلا جانا۔ یہی ہے وہ آگ جسے تم جھٹلاتے تھے۔ تو کیا یہ جادو ہے، یا تم نہیں دیکھ رہے؟“

﴿قَالُوا بَلَىٰ وَرَبِّنَا: دُنْيَا مِثْلِ جَهَنَّمَ كَانَارًا كَرْتِي تَهْ وَأَسْ كَانَارًا كَرْتِي تَهْ﴾ اب اس کا اقرار ہی نہیں کریں گے بلکہ اس کے حق ہونے پر قسم کھائیں گے، کیونکہ اس کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ ہی نہیں ہوگا۔

﴿فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ﴾ مگر اس وقت کا اقرار و اعتراف انھیں کچھ فائدہ نہیں دے گا، بلکہ ان سے کہا جائے گا کہ اگر یہ حق ہے تو پھر اس حق کو نہ ماننے کی وجہ سے اس کی سزا کا مزہ چکھو۔

آیت 35: ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ توحید و رسالت اور قیامت کو دلائل سے ثابت کرنے اور

کفار کے شہادت کا جواب دینے کے بعد رسول اللہ ﷺ کو صبر و استقامت کی نصیحت فرمائی، کیونکہ آپ کو دعوت الی اللہ کے جواب میں کفار کی بدزبانی، استہزاء اور اذیت رسانی سے شدید قلق اور سخت تکلیف ہوتی تھی، اس لیے فرمایا کہ اے نبی! جس طرح پختہ ارادے اور مضبوط عزم و ہمت والے رسولوں نے صبر کیا، آپ بھی صبر کریں۔ رہی یہ بات کہ ان اولو العزم رسولوں

سے مراد کون ہیں؟ تو عموماً پانچ رسولوں کو اولو العزم کہا جاتا ہے جن میں نوح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ ﷺ کے ساتھ پانچویں خود رسول اللہ ﷺ ہیں، کیونکہ ان کا اکٹھا ذکر قرآن مجید میں دو مقامات پر آیا ہے، ایک سورہ احزاب میں ہے، فرمایا: ﴿وَإِذْ

أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ ۖ وَمِنْ نُوْحٍ وَإِبْرَاهِيمَ ۖ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ ابْنِ مَرْيَمَ ۖ وَأَخَذْنَا مِنْهُم مِّيثَاقًا غَلِيظًا﴾ [الاحزاب: ۷] ”اور جب ہم نے تمام نبیوں سے ان کا پختہ عہد لیا اور تجھ سے اور نوح اور ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ ابن مریم

سے بھی اور ہم نے ان سے بہت پختہ عہد لیا۔“ اور دوسری آیت سورہ شوریٰ کی ہے، فرمایا: ﴿شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقْبِلُوا الدِّينَ وَلَا تَتَّبِعُوا فِيهِ

[الشوریٰ: ۱۳] ”اس نے تمہارے لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا جس کا تاکیدی حکم اس نے نوح کو دیا اور جس کی وحی ہم نے تیری طرف کی اور جس کا تاکیدی حکم ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا، یہ کہ اس دین کو قائم رکھو اور اس میں جدا جدا نہ

ہو جاؤ۔“ مگر ان آیات میں نہ ان پیغمبروں کے اولو العزم ہونے کا ذکر ہے اور نہ دوسرے پیغمبروں کے اولو العزم نہ ہونے کا، اس لیے اسے عام رکھا جائے اور ”مِن“ کو بیان یہ قرار دیا جائے تو بہتر ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ اس طرح صبر کر جس طرح پختہ

ارادے والوں نے کیا، جو رسول تھے، جیسا کہ فرمایا: ﴿فَأَجْتَنَّبُوا الزُّجَاجَ مِنَ الْأَوْثَانِ﴾ [الحج: ۳۰] ”پس گندگی سے بچو، جو بت ہیں۔“ مطلب یہ ہے کہ آپ سے پہلے پیغمبر اپنی قوم کی بے رخی، مخالفت اور ایذا رسانیوں کا جس طرح عزم و ہمت

اور صبر و استقامت کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے اسی طرح آپ بھی کریں۔

يُوعَدُونَ لَمْ يَلْبَثُوا إِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ ۗ بَلَّغْ ۗ فَهَلْ يُهْلِكُ إِلَّا الْقَوْمَ الْفَاسِقُونَ ﴿٢٦﴾

کو دیکھیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے تو گویا وہ دن کی ایک گھڑی کے سوا نہیں رہے۔ یہ پہنچا دینا ہے، پھر کیا نافرمان لوگوں کے سوا کوئی اور ہلاک کیا جائے گا؟ ﴿۲۶﴾

بعض مفسرین نے فرمایا کہ اولو العزم سے تمام رسول مراد لینا درست نہیں، کیونکہ بعض رسولوں کے متعلق عزم کی نفی آئی ہے، جیسا کہ آدم علیہ السلام کے متعلق فرمایا: ﴿فَتَنِيَّ وَكَلِمَةَ عَزْمًا﴾ [طہ: ۱۱۵] ”پھر وہ بھول گیا اور ہم نے اس میں ارادے کی کچھ پختگی نہ پائی۔“ اور یونس علیہ السلام کے متعلق فرمایا: ﴿وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوتِ﴾ [القلم: ۴۸] ”اور تو مچھلی والے کی طرح نہ ہو۔“ اس لیے اولو العزم سے اونچے درجے کے صاحب عزم رسول مراد ہیں، اگرچہ ان کی تعیین مشکل ہے۔ مگر ان مفسرین کی یہ بات اس لیے درست نہیں کہ اگرچہ آدم علیہ السلام سے یہ فعل سرزد ہو گیا مگر بعد میں ان کا درجہ پہلے سے بھی اونچا ہو گیا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ثُمَّ اجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدَىٰ﴾ [طہ: ۱۲۲] ”پھر اس کے رب نے اسے چن لیا، تو اس پر مہربانی فرمائی اور ہدایت دی۔“ اور یونس علیہ السلام کے متعلق فرمایا: ﴿فَاجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَجَعَلَهُ مِنَ الصَّالِحِينَ﴾ [القلم: ۵۰] ”پھر اس کے رب نے اسے چن لیا، پس اسے نیکوں میں شامل کر دیا۔“ اس لیے توبہ کے بعد ان دونوں پیغمبروں کے بھی اولو العزم ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

﴿وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَهُمْ﴾ صبر کے حکم کے ساتھ ہی جلد بازی سے منع فرمایا، یعنی ان کے لیے جلدی کا مطالبہ نہ کریں کہ یہ لوگ جلدی ایمان کیوں نہیں لاتے، یا ایمان نہ لانے کی وجہ سے ان پر جلدی عذاب کیوں نہیں آجاتا۔

﴿كَأَنَّهُمْ يَوْمَ يَرُونَ مَا يُوعَدُونَ.....﴾ یعنی جب وہ اللہ کا عذاب دیکھیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے تو انہیں ایسا معلوم ہوگا کہ وہ دنیا میں ایک ساعت سے زیادہ نہیں رہے، کیونکہ عذاب کی شدت انہیں سال و ماہ کی وہ مدت فراموش کروا دے گی جو انہوں نے دنیا میں بسر کی، جیسا کہ فرمایا: ﴿فَلْ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْأَرْضِ عَدَدَ سِنِينَ ﴿۱۱۲﴾ قَالُوا لَبِثْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَسَلِّ الْعَازِذِينَ ﴿۱۱۳﴾ فَلْ إِنْ لَبِثْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا لَّوْ أَكَلْتُمْ كُنُفَكُمْ تَعْلَمُونَ﴾ [المؤمنون: ۱۱۲ تا ۱۱۴] ”فرمائے گا تم زمین میں سالوں کی گنتی میں کتنی مدت رہے؟ وہ کہیں گے ہم ایک دن یا دن کا کچھ حصہ رہے، سو شمار کرنے والوں سے پوچھ لے۔“ فرمائے گا تم نہیں رہے مگر تھوڑا ہی، کاش کہ واقعی تم جانتے ہوتے۔“ کبھی انہیں وہ مدت ایک پہر معلوم ہوگی (دیکھیے نازعات: ۳۶) اور کبھی وہ قسمیں کھا کر کہیں گے کہ وہ دنیا میں صرف ایک گھڑی رہے ہیں۔ دیکھیے سورہ روم (۵۵)۔

﴿بَلَّغْ﴾: یہ ”ہذا“ کی خبر ہے، یعنی یہ قرآن تو پیغام کا پہنچا دینا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿هَذَا بَلَّغٌ لِّلنَّاسِ وَ لِيُنذِرَ رُوَاهِبَهُ﴾ [ابراہیم: ۵۲] ”یہ لوگوں کے لیے ایک پیغام ہے اور تاکہ انہیں اس کے ساتھ ڈرایا جائے۔“

﴿فَهَلْ يُهْلِكُ إِلَّا الْقَوْمَ الْفَاسِقُونَ﴾: یعنی قرآن کے پہنچ جانے کے بعد حجت تمام ہوگئی، اب بھی اگر کوئی فسق اور نافرمانی میں پڑا رہتا ہے تو وہ اپنی شامت کو خود دعوت دے رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی کو بے قصور نہیں پکڑا جاتا، وہاں وہی لوگ ہلاک کیے جاتے ہیں جو فاسق اور نافرمان ہوں۔

الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ أَضَلَّ أَعْمَالَهُمْ ①

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستے سے روکا، اس نے ان کے اعمال برباد کر دیے ①

اس سورت کا نام سورہ محمد (مٹینڈا) ہے، کیونکہ اس میں آپ کا اسم گرامی آیا ہے۔ اس کے علاوہ اس کا نام سورہ قتال بھی ہے، کیونکہ اس میں لفظ قتال دو مرتبہ آیا ہے اور اس کا مرکزی مضمون کفار کے ساتھ قتال ہے۔

آیت 1: **الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ.....** : چونکہ اس سورت کا اکثر حصہ مشرکین کے خلاف جنگ کے لیے ابھارنے پر مشتمل ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے سورت کا آغاز کفار پر اپنے غضب اور ایمان والوں پر اپنی رحمت کے اظہار کے ساتھ کیا ہے، تاکہ ان کے کفر اور اللہ کی راہ سے روکنے کے جرم کی بنا پر مسلمانوں کو ان سے لڑنے کی ترغیب دی جاسکے۔ چنانچہ اس تمہید کے بعد فرمایا: ﴿فَإِذَا لَقِيتُمْ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبِ الرِّقَابِ﴾ [محمد: 4] "تو جب تم ان لوگوں سے ملو جنہوں نے کفر کیا تو خوب گردنیں مارتا ہے۔"

2 **صَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ أَضَلَّ أَعْمَالَهُمْ** : "صَدُّوا" "صَدَّ يَصُدُّ" (ن) لازم بھی آتا ہے "اعراض کرنا" اس کا مصدر "صَدُّوْا" ہے اور متعدی بھی "روکنا" اس کا مصدر "صَدَّ" ہے، یہاں دوسرا معنی مراد ہے، کیونکہ خود اعراض کرنے کی بات تو "الَّذِينَ كَفَرُوا" میں آگئی، بلکہ کفر اعراض سے زیادہ سخت ہے۔ اس لیے مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں نے ایمان لانے سے انکار کر دیا اور دوسرے لوگوں کو بھی اللہ کے راستے یعنی اسلام قبول کرنے سے روکا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اعمال ضائع اور برباد کر دیے۔ یعنی کافر رہتے ہوئے ان لوگوں نے جو بظاہر اچھے کام کیے تھے، جیسے صدقہ و خیرات، مہمان نوازی، صلہ رحمی، خانہ کعبہ کی مرمت اور اس کا حج، مظلوم کی مدد وغیرہ، ان پر اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کو کوئی اجر نہیں ملے گا، کیونکہ ایمان کے بغیر کسی عمل کی کوئی قیمت نہیں۔ مزید دیکھیے سورہ فرقان (۲۳) کی تفسیر۔ کافروں کے اعمال برباد کرنے کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے وہ تمام اعمال یعنی سازشیں اور منصوبے ناکام کر دیے جو وہ اسلام کو نچا دکھانے کے لیے کام میں لاتے تھے۔

3 **صَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ** : اللہ تعالیٰ کے راستے سے روکنے کی صورتیں ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ آدمی کسی کو زبردستی ایمان لانے سے روک دے۔ دوسری یہ کہ وہ ایمان لانے والوں پر ایب ظلم و ستم ڈھائے کہ ان کے لیے ایمان پر قائم رہنا مشکل ہو جائے اور ان کی حالت زار دیکھ کر ایمان لانے کا ارادہ رکھنے والے ایمان لانے کی جرأت نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے لفظ "فَتَنَّا" استعمال فرمایا ہے۔ تیسری یہ کہ وہ مختلف طریقوں سے اسلام کے خلاف لوگوں کو ورغلائے اور ان کے دلوں میں ایسے وسوسے ڈالے کہ وہ دین اسلام سے بدظن ہو جائیں۔ چوتھی یہ کہ ہر کافر اپنے بچوں اور زیر کفالت لوگوں کی تربیت کفر پر کرتا ہے جس سے ان کے لیے دین حق قبول کرنا مشکل ہوتا ہے، اس طرح وہ اللہ کے راستے سے روکنے کا مجرم بنتا

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَآمَنُوا بِمَا نُزِّلَ عَلَىٰ مُحَمَّدٍ وَهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَأَصْلَحَ بَالَهُمْ ①

اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے اور اس پر ایمان لائے جو محمد پر نازل کیا گیا اور وہی ان کے رب کی طرف سے حق ہے، اس نے ان سے ان کی برائیاں دور کر دیں اور ان کا حال درست کر دیا ①

ہے۔ اللہ کے راستے سے روکنے کی ان تمام صورتوں کو ختم کرنے کے لیے کفار سے لڑنے کا حکم دیا۔

آیت 2 ① وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ : ”آمَنُوا“ میں اگرچہ عمل صالح بھی شامل ہے، کیونکہ عمل بھی ایمان کا جزو ہے، مگر اس کی اہمیت کا احساس دلانے کے لیے اسے علیحدہ بھی ذکر فرمایا۔ دیکھیے سورہ عصر کی تفسیر۔ اسی طرح ”آمَنُوا“ میں اگرچہ دوسری ایمانیاں کے ساتھ محمد ﷺ اور آپ پر نازل شدہ وحی پر ایمان بھی شامل ہے مگر اس کا شرف نمایاں کرنے کے لیے اس کا الگ بھی ذکر فرمایا۔ خصوصاً اس لیے کہ مدینہ میں کچھ ایسے یہود موجود تھے جو ایمان بالغیب کی تمام جزئیات پر ایمان رکھتے تھے اور نیک اعمال بھی بجالاتے تھے مگر نبی کریم ﷺ کو نبی ماننے کے باوجود یہ کہہ کر ایمان لانے سے انکار کر دیتے تھے کہ آپ امیوں کے نبی ہیں۔ اب بھی کئی لوگ کہتے ہیں کہ کوئی یہودی رہے یا نصرانی یا مسلمان، اگر اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اچھے عمل کرتے ہیں تو سب ٹھیک ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، اب ایمان وہی معتبر ہو گا جس میں ہمارے نبی محمد ﷺ پر ایمان اور آپ کی اطاعت کا عہد شامل ہو۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ لَا يَسْمَعُ بِي أَحَدٌ مِنْ هَذِهِ الْأُمَّةِ يَهُودِيٍّ وَلَا نَصْرَانِيٍّ ثُمَّ يَمُوتُ وَلَمْ يُؤْمِنْ بِالَّذِي أُرْسِنْتُ بِهِ إِلَّا كَانَ مِنَ أَصْحَابِ النَّارِ» [مسلم، الإيمان، باب وجوب الإيمان برسالة نبينا محمد ﷺ: ۱۵۳] ”قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد ﷺ کی جان ہے! اس امت میں سے کوئی بھی شخص، یہودی ہو یا نصرانی، جو میرے بارے میں سنے، پھر اس حال میں فوت ہو کہ مجھے جو کچھ دے کر بھیجا گیا ہے اس پر ایمان نہ لایا ہو تو وہ آگ والوں میں سے ہو گا۔“ مزید دیکھیے سورہ سبأ (۲۸)۔

② وَهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ : ”الْحَقُّ“ جو واقع میں ثابت ہو اور کسی چیز کے اصل کے عین مطابق ہو۔ ”الْحَقُّ“ خبر پر الف لام لانے سے حصر پیدا ہو گیا۔ ”وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَآمَنُوا بِمَا نُزِّلَ عَلَىٰ مُحَمَّدٍ“ مبتدا ہے اور ”كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَأَصْلَحَ بَالَهُمْ“ اس کی خبر ہے اور ”وَهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ“ درمیان میں جملہ معترضہ ہے جو محمد ﷺ پر نازل شدہ وحی پر ایمان کی مزید تاکید کے لیے لایا گیا ہے۔ یعنی محمد ﷺ پر نازل کردہ وحی ہی کامل حق ہے جو رب تعالیٰ کی طرف سے آیا ہے۔

③ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ : ایمان اور عمل صالح کی بدولت اللہ تعالیٰ پہلے تمام گناہ معاف فرما دیتا ہے۔ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: «فَلَمَّا جَعَلَ اللَّهُ الْإِسْلَامَ فِي قَلْبِي أَنْبِئْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ ابْسُطْ يَمِينَكَ

ذَلِكَ بِأَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا اتَّبَعُوا الْبَاطِلَ وَأَنَّ الَّذِينَ آمَنُوا اتَّبَعُوا الْحَقَّ مِنْ رَبِّهِمْ ۗ
كَذَلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ لِلنَّاسِ أَمْثَالَهُمْ ۝

یہ اس لیے کہ جن لوگوں نے کفر کیا انھوں نے باطل کی پیروی کی اور جو لوگ ایمان لائے وہ اپنے رب کی طرف سے حق کے پیچھے چلے۔ اسی طرح اللہ لوگوں کے لیے ان کے حالات بیان کرتا ہے ۝

فَلَا يَأْبَعُكَ فَنَيْسَطَ يَمِينُهُ قَالَ فَمَبْصُتُ يَدِي، قَالَ مَا لَكَ يَا عَمْرُو!؟ قَالَ قُلْتُ أَرَدْتُ أَنْ أُشْتَرِطَ قَالَ تَشْتَرِطُ بِمَاذَا؟ قُلْتُ أَنْ يُغْفَرَ لِي قَالَ أَمَا عَلِمْتَ أَنَّ الْإِسْلَامَ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهُ؟ وَأَنَّ الْهَجْرَةَ تَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهَا؟ وَأَنَّ الْحَجَّ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهُ؟» [مسلم، الإيمان، باب كون الإسلام يهدم ما قبله..... : ۱۶۱] ”جب اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں اسلام کا خیال ڈالا تو میں نبی ﷺ کے پاس آیا اور میں نے کہا: ”اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھائیں تاکہ میں آپ سے بیعت کروں۔“ آپ ﷺ نے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھایا تو میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”عمرو! تمہیں کیا ہوا؟“ میں نے کہا: ”میں شرط کرنا چاہتا ہوں۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”کس بات کی شرط کرتے ہو؟“ میں نے کہا: ”یہ کہ مجھے بخش دیا جائے۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اسلام اسے مٹا دیتا ہے جو اس سے پہلے ہو اور ہجرت اسے مٹا دیتی ہے جو اس سے پہلے ہو اور حج اسے مٹا دیتا ہے جو اس سے پہلے ہو۔“

④ وَأَصْلَحَ بِالْهَجْرِ: طبری نے فرمایا: ”بِالْ“ مصدر کی طرح ہے، جیسا کہ ”شأن“ ہے، اس سے کوئی فعل نہیں بنایا جاتا۔ ضرورت شعری کے بغیر عرب اس کی جمع استعمال نہیں کرتے، اگر جمع بنائیں تو ”بالاٹ“ بناتے ہیں۔“ شہاب نے فرمایا: ”بِالْ“ حال اور شان کے معنی میں ہوتا ہے، بعض اوقات کسی عظیم معاملے کے ساتھ خاص ہوتا ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿كُلُّ أَمْرٍ ذِي بَالٍ﴾ [ابن ماجہ: ۱۸۹۴] ”ہر بڑی شان والا کام۔“ اور کبھی دلی خیال کے لیے آتا ہے، مجازاً دل کو بھی کہہ لیا جاتا ہے۔“ اگر یہاں اس کی یہ تفسیر کی جائے تو یہ بھی اچھی تفسیر ہے۔ سفاقی نے اس کی تفسیر فکر (سوچ) کے ساتھ کی ہے، کیونکہ جب دل اور سوچ درست ہو جائیں تو عقیدہ اور عمل سب درست ہو جاتے ہیں۔“ (تفسیر قاسمی)

مطلب یہ ہے کہ کفار کے اعمال کو اللہ تعالیٰ ضائع اور برباد کر دیتا ہے، اس کے برعکس ایمان اور عمل صالح والوں کے گناہ معاف کر دیتا ہے، ان کا حال درست کر دیتا ہے اور ان کے دل اور سوچ کی اصلاح کر دیتا ہے اور انہیں شرک کے بجائے توحید کی، نافرمانی کے بجائے اتباع سنت کی اور گناہوں کے بجائے اعمالِ صالحہ کی توفیق سے نوازتا ہے، حتیٰ کہ ان کے گزشتہ گناہوں کو بھی نیکیوں میں بدل دیتا ہے۔ دیکھیے سورہ فرقان (۷۰)۔

بیت 3 ① ذَلِكَ بِأَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا اتَّبَعُوا الْبَاطِلَ..... : یعنی کفار کے اعمال برباد کرنے اور ایمان والوں کے گناہ دور کرنے اور ان کا حال درست کرنے کی وجہ یہ ہے کہ کفار نے باطل کی پیروی اختیار کی اور اس کے پیچھے چل پڑے، جبکہ ایمان والے اس حق پر چلتے رہے جو ان کا اپنا طے کردہ نہیں تھا، بلکہ ان کے رب کی طرف سے نازل کیا ہوا تھا۔ دونوں

فَإِذَا لَقِيتُمْ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتَّىٰ إِذَا أَثْخَنْتُمُوهُمْ فَشُدُّوا الْوَتَاقَ ۚ فَلَمَّا

تو جب تم ان لوگوں سے ملو جنہوں نے کفر کیا تو گردنیں مارنا ہے، یہاں تک کہ جب انہیں خوب قتل کر چکو تو (ان کو) کے راتے مختلف تھے، اس لیے ان کا انجام بھی مختلف ہوا۔

② كَذَلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ لِلنَّاسِ أَمْثَالَهُمْ: "أَمْثَالٌ" "مَثَلٌ" کی جمع ہے، اس کا معنی مثال بھی ہے اور کسی چیز کا حال اور وصف بھی، جیسا کہ آگے آ رہا ہے، فرمایا: ﴿مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وَعَدَ الْمُتَّقُونَ فِيهَا أَنْهَارٌ مِنْ مَاءٍ غَيْرِ آسِنٍ﴾ [محمد: ۱۵] "اس جنت کا حال اور وصف جس کا متقی لوگوں سے وعدہ کیا گیا ہے، یہ ہے کہ اس میں کئی نہریں ایسے پانی کی ہیں جو گزرنے والا نہیں۔" یعنی اللہ تعالیٰ ایسے ہی سب لوگوں کے احوال بیان فرماتا ہے۔

آیۃ 4: ① فَإِذَا لَقِيتُمْ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ: "فَإِذَا" میں فاء کا تعلق پہلے کلام سے ہے کہ جب کفار باطل کے پیروکار اور مومن حق کے پیروکار ہیں تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ حق کے پیروکار باطل کے پیروکار کو یہ موقع نہ دیں کہ وہ زمین میں فساد پھیلاتے پھریں، لہذا جب تم (میدان جنگ میں) ان لوگوں سے ملو جنہوں نے کفر کیا تو ان کی گردنیں خوب اڑاؤ۔

② "فَإِذَا لَقِيتُمْ" کا لفظی معنی اگرچہ "جب تم ملو" ہے، مگر اس سے مراد یہ ہے کہ جب تمہارا ان سے مقابلہ ہو۔ یہ مطلب نہیں کہ جب کوئی کافر سامنے آ جائے تو اسے قتل کر دو، کیونکہ قرآن مجید اور کلام عرب میں "لقاء عدو" سے مراد دشمن سے مقابلہ لیا جاتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿يَأْيُهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَيْفَ بَرَأَ لَكُمْ تَفَالِحُونَ﴾ [الأنفال: ۴۵] "اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم کسی گروہ کے مقابل ہو تو جتے رہو اور اللہ کو بہت زیادہ یاد کرو، تاکہ تم فلاح پاؤ۔"

③ "فَضْرِبَ الرِّقَابِ" اصل میں "فَأَضْرِبُوا الرِّقَابَ ضَرْبًا" ہے، فعل امر "فَأَضْرِبُوا" کو حذف کر کے مفعول مطلق "ضَرْبًا" کو اس کے قائم مقام کر دیا اور اسے مفعول بہ "الرِّقَابِ" کی طرف مضاف کر دیا۔ اس سے اختصار کے علاوہ کلام میں ہیبت اور زور بھی پیدا ہو گیا کہ کفار سے مقابلے کی صورت میں بس ایک ہی کام ہے اور وہ ہے گردنیں مارنا۔ "ضرب" کا لفظ عربی زبان میں تلوار کی کاٹ کے لیے استعمال ہوتا ہے، نیزے کے لیے "طعن" اور تیر کے لیے "رمی" کا لفظ آتا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ قوت و شجاعت اور ہیبت کا مظاہرہ آنے سے پہلے تیغ زنی میں ہے، خصوصاً جب تلوار گردن پر پڑے، اس لیے "فَضْرِبَ الرِّقَابِ" فرمایا، کیونکہ جو زور بیان اس لفظ میں ہے کسی اور میں نہیں۔ ورنہ مراد کسی بھی طریقے سے قتل کرنا ہے، تلوار سے ہو یا تیر سے یا نیزے سے یا کسی جدید اسلحہ سے اور اس اسلحہ کی چوٹ خواہ گردن پر پڑے یا جسم کے کسی اور حصے پر۔ یا بلا اسلحہ ہی دشمن کو قتل کر دیا جائے، خواہ گلا گھونٹ کر، مکا مار کر یا جسم کے کسی نازک حصے پر چوٹ مار کر، غرض مقصد دشمن کو کسی بھی طریقے سے قتل کرنا ہے۔

④ حَتَّىٰ إِذَا أَثْخَنْتُمُوهُمْ فَشُدُّوا الْوَتَاقَ: "أَثْخَنْ يُثْخِنُ إِثْخَانًا" (افعال) قتل اور خون ریزی میں مبالغہ کرنا۔

"شَدَّ يَشُدُّ شِدًّا" (ن) "الشَّيْءُ" کسی چیز کو باندھنا۔ "شَدَّ الْعُقْدَةَ أَوْ الْوَتَاقَ" گرہ یا رسی کو مضبوطی سے باندھنا۔

مَّا بَعْدُ وَإِنَّا فِدَاءٌ حَتَّى تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا ۗ ذَٰلِكَ وَلَوْ يَشَاءُ اللَّهُ لَانتَصَرَ مِنْهُمْ لَوْلَا

پھر بعد میں یا تو کسی طرح احسان کرنا ہے اور یا کسی طرح فدیہ لے لینا، یہاں تک کہ لڑائی اپنے
 ”الْوَقَافِي“ ہی وغیرہ جس کے ساتھ باندھا جائے۔ یعنی جنگ کا اصل ہدف دشمن کی جنگی قوت کو توڑنا ہے، اس لیے جنگ کی
 ابتدا ہی میں دشمن کے آدمیوں کو گرفتار کرنے میں نہیں لگ جانا چاہیے، بلکہ زیادہ سے زیادہ خونریزی اور قتل کے بعد جب ان کا
 اچھی طرح قلع قمع ہو جائے اور لڑائی اختتام کو پہنچ چکی ہو تو پھر بچے کھچے لوگوں کو قیدی بنانا چاہیے، تاکہ ان میں دوبارہ مقابلے
 کی نکت باقی نہ رہے۔ جنگ بدر میں مسلمانوں نے دشمن کو اچھی طرح تیر تیر کرنے سے پہلے ہی اس کے آدمیوں کو قیدی بنایا تو
 اللہ تعالیٰ نے اس پر ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: ﴿مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّى يُفْجِرَ فِي الْأَنْهَارِ
 تُرِيدُونَ عَرَصَ الدُّنْيَا ۗ وَاللَّهُ يُرِيدُ الْأُخْرَىٰ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾ [الأنفال: ۶۷] ”کبھی کسی نبی کے لائق نہیں کہ
 اس کے ہاں قیدی ہوں، یہاں تک کہ وہ زمین میں خوب خون بہالے، تم دنیا کا سامان چاہتے ہو اور اللہ آخرت کو چاہتا ہے
 اور اللہ سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے۔“

﴿إِنَّمَا مَّا بَعْدُ وَإِنَّا فِدَاءٌ﴾: ”مَّا“ اور ”فِدَاءٌ“ مفعول مطلق ہیں جن کا فعل حذف کر دیا گیا ہے اور تحوین تکمیل کے لیے
 ہے: ”أَبِي بَشِيرٍ تَمْتَنُونَ عَلَيْهِمْ مِّنَّا بَعْدَ ذَٰلِكَ وَبِمَا تَقَدَّسُوا لَهُمْ فِدَاءٌ“ ”یعنی اس کے بعد یا تو ان پر احسان کر دو، کسی طرح
 احسان کرنا یا ان سے فدیہ لے لو، کسی طرح فدیہ لینا۔“

کسی طرح احسان کرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ انھیں قتل نہ کیا جائے، بلکہ ان کی جان بخشی کر کے انھیں لوٹدی و غلام بنا
 کر مسلمان افراد کے حوالے کر دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ دائمی قید یا قتل کے مقابلے میں غلام بنالینا کوئی کم احسان نہیں،
 خصوصاً اسلام میں لوٹدی و غلام سے جس حسن سلوک کی تاکید کی گئی ہے اس کے ہوتے ہوئے دائمی قید یا قتل کے مقابلے میں
 یہ بہت بڑی نعمت ہے، کیونکہ بہت سے کاموں کے کفارے کی صورت میں اور مکاتبت یعنی کمائی کر کے اپنی قیمت ادا کرنے کی
 صورت میں ان کی آزادی کے مواقع موجود ہیں۔ رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم سے متوج لوگوں کو لوٹدی و غلام
 بنانا تو اتارے سے ثابت ہے اور قرآن مجید میں متعدد مقامات پر لوٹدیوں اور غلاموں کا ذکر موجود ہے۔ دیکھیے سورہ نساء (۴: ۲۴)،
 ۳۶)، مومنون (۵، ۶)، احزاب (۵۰)، نحل (۱)، روم (۲۸)، نور (۳۱، ۳۳، ۵۸) اور دوسری متعدد آیات۔ ان آیات و
 احادیث اور خلفائے راشدین کے عمل کے ہوتے ہوئے اسلام میں غلامی سے انکار کوئی لمحہ ہی کر سکتا ہے، یا کوئی جاہل جسے
 کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کا علم نہ ہو۔

قیدیوں پر کسی طرح احسان کرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ انھیں بلا معاوضہ رہا کر دیا جائے۔ یہ اس وقت ہوتا ہے
 جب ایسا کرنا مصلحت کا تقاضا ہو، مثلاً امید ہو کہ وہ مسلمان ہو جائیں گے، یا اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سرگرمیوں
 سے باز آ جائیں گے، جیسا کہ آپ ﷺ نے نجد کے سردار ثمامہ بن اثال بنی تہانہ کو بلا معاوضہ رہا کر دیا۔ (دیکھیے بخاری: ۴۳۷۴)

وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوْا بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ ۗ وَالَّذِيْنَ قَتَلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُضِلَّ اَعْمَالُهُمْ ۝

تھمیا رکھ دے، (بات) یہی ہے۔ اور اگر اللہ چاہے تو ضرور ان سے انتقام لے لے اور لیکن تاکہ تم میں سے بعض کو بعض کے ساتھ آزمائے۔ اور جو لوگ اللہ کے راستے میں قتل کر دیے گئے تو وہ ہرگز ان کے اعمال ضائع نہیں کرے گا ۝

جنگ حنین کے کئی ہزار قیدیوں کو احسان فرما کر رہا کر دیا۔ (دیکھیے بخاری: ۴۳۱۸، ۴۳۱۹) صلح حدیبیہ کے موقع پر اسی (۸۰) آدمی تنعیم کی طرف سے آئے اور فجر کی نماز کے قریب انھوں نے آپ ﷺ پر شب خون مارنے کا ارادہ کیا، مگر وہ سب کے سب پکڑ لیے گئے، پھر آپ نے سب کو چھوڑ دیا، تاکہ یہ معاملہ لڑائی کا باعث نہ بن جائے۔ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ وَهُوَ الَّذِي لَغَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ اَنْظَرَكُمْ عَلَيْهِمْ ﴾ [الفتح: ۲۴]

”اور وہی ہے جس نے مکہ کی وادی میں ان کے ہاتھ تم سے اور تمہارے ہاتھ ان سے روک دیے، اس کے بعد کہ تمہیں ان پر فتح دے دی۔“ [دیکھیے مسلم، الجہاد، باب قول اللہ تعالیٰ: ﴿ وَهُوَ الَّذِي كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ﴾ ۱۸۰۸ | فتح مکہ کے موقع پر آپ ﷺ نے چند آدمیوں کو مستثنیٰ کر کے تمام اہل مکہ کو بطور احسان معاف فرما دیا۔ غزوہ بنی مصطلق کے بعد جب اس قبیلے کے قیدی لائے گئے اور لوگوں میں تقسیم کر دیے گئے، تو اس وقت جو یہ پہنچا جس شخص کے حصے میں آئی تھیں اسے ان کا معاوضہ ادا کر کے آپ ﷺ نے خریدا اور آزاد کر کے ان سے نکاح کر لیا۔ اس پر تمام مسلمانوں نے اپنے حصے کے قیدی یہ کہہ کر رہا کر دیے کہ یہ اب رسول اللہ ﷺ کے سسرالی رشتہ دار بن چکے ہیں۔ [دیکھیے مسند احمد: ۲۷۷/۶، ح: ۲۶۶۱۹]

قیدیوں کے ساتھ احسان کی ایک صورت یہ ہے کہ ان پر جزیہ لگا کر انھیں مسلمانوں کا ذمی بنا لیا جائے، جیسا کہ فرمایا:

﴿ حَتّٰى يُعْطُوْا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ ﴾ [النوبة: ۲۹] ”یہاں تک کہ وہ ہاتھ سے جزیہ دیں اور وہ حقیر ہوں۔“

قیدیوں پر احسان میں یہ بھی شامل ہے کہ جب تک وہ قید میں رہیں ان سے اچھا سلوک کیا جائے، ان کے کھانے پینے، لباس اور صحت وغیرہ کا خیال رکھا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی بہت تاکید فرمائی ہے۔ دیکھیے سورہ دہر کی آیت (۸): ﴿ وَاِيۡدِيۡنَاۤ اَعۡمٰنًا وَاِنۡنَاۤ اَعۡمٰنًا فَاَدۡءَاۡءٌ ۗ فَاِنۡ يۡرۡوۡا كٰفۡرًا مِّنۡكُمْ فَاۡمۡرٌۢ بۡنَاۤ اِلٰهِيۡنَاۤ اَنۡ يۡقۡتُلُوۡهُ ۗ وَۡاِنۡ يۡرۡوۡا مۡسِيۡمًا مِّنۡكُمْ فَاۡمۡرٌۢ بۡنَاۤ اِلٰهِيۡنَاۤ اَنۡ يۡعۡزۡبُوۡا عَلٰۤى حۡنَتِهٖۡ ۗ سۡبۡكِنَاۤ اَوۡ يَتۡبِنَاۤ ۗ وَاَسِيۡرًا ۗ ﴾ کی تفسیر۔

”وَ اِنَّا فَاَدءَاءٌ“ فدیہ لینے کی ایک صورت یہ ہے کہ ان سے کچھ مال لے کر انھیں آزاد کر دیا جائے، جیسا کہ بدر کے قیدیوں سے فدیہ لیا گیا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ انفال (۷۰) کی تفسیر۔ اور فدیہ کی ایک صورت یہ ہے کہ رہائی کی شرط کے طور پر کوئی خاص خدمت لینے کے بعد ہی انھیں رہا کیا جائے، مثلاً وہ ان لوگوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں جو ان کے سپرد کیے جائیں۔ اور فدیہ کی ایک صورت یہ ہے کہ کفار کے ہاتھوں گرفتار کسی مسلم قیدی کی رہائی کے بدلے میں انھیں رہا کر دیا جائے جیسا کہ سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ: بنو فزارہ پر حملے میں جو قیدی آئے امیر لشکر ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ان میں سے ایک نہاے حسین لونڈی انھیں زائد عطیہ کے طور پر دی، جب وہ مدینہ آئے تو رسول اللہ ﷺ نے ان سے وہ لونڈی اصرار کے ساتھ

کے طور پر مانگ لی، انھوں نے وہ آپ ﷺ کو دے دی، تو: «فَبَعَثَ بِهَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَى أَهْلِ مَكَّةَ فَذَفَى بِهَا نَاسًا مِنَ الْمُتَسَبِّمِينَ كَانُوا أُسْرُوا بِمَكَّةَ» [مسلم، الجهاد و السير، باب التفتيل و فداء المسعفين بالاسارى: ۱۷۵۵] "رسول اللہ ﷺ نے اس لوٹدی کو کچھ مسلمانوں کے ذدیے کے طور پر اہل مکہ کی طرف بھیج دیا، جو مکہ میں قید کیے ہوئے تھے۔"

⑤ اس آیت کے الفاظ سے ظاہر یہی ہوتا ہے کہ کفار کو قیدی بنا لینے کے بعد احسان یا فدیہ ہی میں سے کوئی ایک صورت اختیار کی جائے گی، انھیں قتل نہیں کیا جائے گا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے امیر کو انھیں قتل کرنے کا بھی اختیار ہے، جیسا کہ حدیث اور سیرت کی کتابوں میں مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بدر کے قیدیوں میں سے نصر بن حارث اور عقبہ بن ابی معیط کو قتل کیا۔ بنو قریظہ کے قیدیوں کو، جو سعد بن معاذ رضی اللہ عنہما کے فیصلے پر اپنے قلعوں سے نیچے اترے انھیں قتل کیا۔ فتح مکہ کے دن ابن حطل اور مقیس بن صباہ کو قتل کیا اور احد کے بعد ابو عزہ شاعر کو قتل کیا۔ رسول اللہ ﷺ سے ثابت شدہ عمل کے بعد کسی کو یہ کہنے کا اختیار نہیں کہ کافر کو قید کرنے کے بعد کسی صورت قتل نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ آپ سے بڑھ کر کوئی شخص قرآن مجید کا مطلب نہیں سمجھ سکتا۔ اگر کوئی شخص آیت کے الفاظ پر غور کرے تو خود اس میں قیدیوں کو قتل کرنے کا اختیار موجود ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قیدیوں کو مغربیوں سے باندھنے کے حکم کے بعد فرمایا: ﴿فَلَمَّا مَكَأَ بَعْدَ وَإِنَّا فِدَاءٌ﴾ "مکاً" کا معنی انعام و احسان ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ایک "الْمَنَّانُ" بھی ہے اور یہ سب جانتے ہیں کہ انعام کرنے والے پر لازم نہیں ہوتا کہ وہ انعام کرے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر جو انعام کیے ہیں وہ نہ اللہ پر واجب تھے نہ بندوں کا حق تھے، جسے ادا کرنا اللہ کے ذمے لازم ہو۔ اس لفظ "مکاً" (انعام و احسان) سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مسلمانوں کا قیدیوں کو زندہ رکھنا ان کی طرف سے قیدیوں کے لیے انعام ہے۔ اگر انھیں قتل کرنے کا اختیار ہی نہ ہو بلکہ انھیں ہر حال میں زندہ رکھنا ان پر واجب ہو تو انھیں چھوڑ دینا ان پر کوئی احسان و انعام نہیں ہوگا، بلکہ انھیں چھوڑ کر ان کا حق ادا کیا جائے گا جو مسلمانوں کے ذمے واجب تھا۔ اس لیے "مکاً" اور "فدائاً" کے دو الفاظ میں وہ چاروں صورتیں آجاتی ہیں جن کا مسلمانوں کے امیر کو اختیار ہے اور وہ ہے قتل کرنا یا غلام بنانا یا بلا معاوضہ چھوڑنا یا فدیہ لے کر چھوڑنا۔ (بقائے صحیح بخاری میں ثمامہ بن اخیل رضی اللہ عنہما کے قول سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قیدی کو چھوڑنا اس کا استحقاق نہیں، اس پر انعام ہے۔ چنانچہ اس نے کہا: «إِنْ نَقَلْتَنِي نَقَلْتُ دَا دِمَ، وَإِنْ تَعَمَّ تَعَمَّ عَلَيَّ شَاكِرٌ، وَإِنْ كُنْتُ تُرِيدُ الْمَالَ فَسَلْ مِنْهُ مَا شِئْتَ» [بخاری، المغاری، باب وفد بني حنيفة: ۴۳۷۲-مسلم: ۱۷۶۴] "(اے محمد!) اگر تم مجھے قتل کرو تو ایک خون والے کو قتل کرو گے اور اگر انعام کرو تو ایک شکر گزار پر انعام کرو گے اور اگر مال چاہتے ہو تو مانگو جتنا چاہتے ہو۔"

⑥ حَفِي تَضَمَّ الْعَرَبُ أَوْزَانَهَا: "أَوْزَانَهَا" "وِزْرٌ" کی جمع ہے جس کا معنی بوجھ ہے، مراد اس سے لڑائی کے ہتھیار ہیں، کیونکہ جب لڑائی باقی رہے ہتھیار اٹھانا پڑتے ہیں جو اٹھانے والوں کے لیے بوجھ ہوتے ہیں، یعنی کفار کی گردنیں مارتے

رہو اور ان سے لڑائی جاری رکھو، حتیٰ کہ لڑائی ختم ہو جائے اور کسی کافر میں مسلمانوں کے ساتھ لڑنے کی جرأت اور طاقت نہ رہے۔ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب مسلمان پوری زمین پر غالب ہوں اور کفار میں ان کے مقابل آنے کی اور ان کے حکم سے سر پھیرنے کی جرأت و ہمت باقی نہ رہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كَلِمَةً تَبْلُغُ﴾ [الأنفال: ۳۹] ”اور ان سے لڑو، یہاں تک کہ کوئی فتنہ نہ رہے اور دین سب کا سب اللہ کے لیے ہو جائے۔“ رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق کفر و اسلام کا یہ معرکہ قیامت تک جاری رہے گا۔ جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿لَنْ يَبْرَحَ هَذَا الدِّينُ قَائِمًا، يُقَاتِلُ عَلَيْهِ عِصَابَةٌ مِنَ الْمُسْلِمِينَ حَتَّى تَقُومَ السَّاعَةُ﴾ [مسلم، الإمارة، باب قوله ﷺ: ”لا تزال طائفة من امتي ظاهرين على الحق.....“: ۱۹۲۲] ”یہ دین ہمیشہ قائم رہے گا، مسلمانوں کی ایک جماعت اس پر لڑتی رہے گی، یہاں تک کہ قیامت قائم ہو۔“

⑧ ذَلِكْ: یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے: ”أَيُّ الْأَمْرِ ذَلِكْ“ یعنی بات یہی ہے جو گردنیں مارنے، قید کرنے، احسان کرنے اور فدیہ لینے کی تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی، یا یہ فعل محذوف کا مفعول بہ ہے: ”أَيُّ أِفْعَلُوا ذَلِكْ“ یعنی یہ کام کرو۔ یہ مختصر سا لفظ گزشتہ پوری تفصیل کو ذہن میں پختہ کرنے اور اس کی تاکید کے لیے لایا گیا ہے۔

⑨ وَ لَوْ يَشَاءُ اللَّهُ لَانتَصَرَ مِنْهُمْ: یہ اس سوال کا جواب ہے کہ اگر کفار اتنے ہی برے ہیں تو اللہ تعالیٰ خود انہیں سزا کیوں نہیں دیتا؟ یعنی اللہ تعالیٰ نے گردنیں مارنے اور دوسری باتوں کا حکم تمہیں دیا ہے، حالانکہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو وہ خود کفار سے انتقام لے سکتا ہے۔ اس کے لیے اس کی طرف سے زلزلے کا ایک جھٹکا، بجلی کی ایک کڑک، سیلاب کا ایک ریلایا آندھی کا ایک جھونکا کافی ہے، جیسا کہ اس نے گزشتہ کئی کافر اقوام کے ساتھ کیا۔ (دیکھیے عنکبوت: ۴۰) لیکن اگر وہ ایسا کرتا تو سب لوگ ہلاکت سے بچنے کے لیے ایمان لے آتے جو جبری اور اضطراری ہوتا، اپنی مرضی اور اختیار سے نہ ہوتا، اس طرح آزمائش اور امتحان کا مقصد فوت ہو جاتا۔

⑩ وَ لَكِن لِّيَبْلُؤُوا بَعْضَكُمْ بَعْضٌ: ”لِّيَبْلُؤُوا“ فعل محذوف کے متعلق ہے: ”أَيُّ وَلَكِنَّهُ أَمَرَكُمْ بِالْجِهَادِ لِيَبْلُؤُوا بَعْضَكُمْ بَعْضٌ“ یعنی لیکن اس نے تمہیں جہاد کا حکم اس لیے دیا ہے کہ تمہارے بعض کو بعض کے ساتھ آزمائش اور ظاہر ہو جائے کہ کون مخلص مومن ہے اور کون منافق، جیسا کہ فرمایا: ﴿أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُدْخَلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَ يَعْلَمَ الصَّابِرِينَ﴾ [آل عمران: ۱۴۲] ”یا تم نے گمان کر لیا کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ ابھی تک اللہ نے ان لوگوں کو نہیں جانا جنہوں نے تم میں سے جہاد کیا اور تاکہ وہ صبر کرنے والوں کو جان لے۔“ ایمان والوں کو جہاد کا حکم دینے میں اللہ تعالیٰ کی بے شمار حکمتوں میں سے چند حکمتیں اس آیت میں بیان ہوئی ہیں، فرمایا: ﴿قَاتِلُوهُمْ يُعَذِّبَهُمُ اللَّهُ بِأَيْدِيكُمْ وَ يَخْزِهِمْ وَ يَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَ يَشْفِ صُدُورَ قَوْمٍ مُؤْمِنِينَ ۗ وَ يَذْهَبَ غِيظَ قُلُوبِهِمْ وَ يُتُوبُ اللَّهُ عَلَى مَنْ يَشَاءُ ۗ وَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ حَكِيمٌ﴾ [التوبة: ۱۰، ۱۴] ”ان سے لڑو، اللہ انہیں تمہارے ہاتھوں

سَيَهْدِيهِمْ وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ ۝ وَيُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَفَافًا لَهُمْ ①

وہ ضرور انھیں راستہ دکھائے گا اور ان کا حال درست کر دے گا ⑤ اور انھیں اس جنت میں داخل کرے گا جس کی اس نے انھیں پہچان کروادی ہے ⑥

سے عذاب دے گا اور انھیں رسوا کرے گا اور ان کے خلاف تمھاری مدد کرے گا اور مومن لوگوں کے سینوں کو شفا دے گا۔ اور ان کے دلوں کا غصہ دور کرے گا اور اللہ توبہ کی توفیق دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے۔“ اس کی تفصیل سورہ توبہ کی مذکورہ بالا آیات میں ملاحظہ فرمائیں۔

① وَالَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَلَنْ يُضِلَّ أَعْيُنُهُمْ: یعنی شہداء کے اللہ کی راہ میں قتل کیے جانے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنی جان سے گئے، انھیں کچھ بھی نہ ملا اور ان کی قربانی سے فائدہ ان لوگوں نے اٹھایا جو اس دنیا میں زندہ رہے۔ فرمایا ایسا ہرگز نہیں، اللہ تعالیٰ ان کے اعمال ہرگز ضائع نہیں کرے گا، بلکہ اس سودے کا اصل نفع خود انھی کو حاصل ہوگا۔ مزید دیکھیے سورہ توبہ (۱۱۱) کی تفسیر۔ شہداء کو ملنے والی چند نعمتوں کا ذکر اس آیت کے بعد متصل آیات میں بھی آ رہا ہے۔

آیت 5: سَيَهْدِيهِمْ وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ: یعنی اللہ تعالیٰ ان کی محنت ٹھکانے لگائے گا، انھیں جنت کے راستے پر لے جائے گا اور آخرت میں پیش آنے والے تمام مراحل میں ان کی حالت کو درست رکھے گا۔ عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «يُغْفَرُ لِلشَّهِيدِ كُلِّ ذَنْبٍ إِلَّا الذَّنْبَ» [مسلم، الإمامة، باب من قتل في سبيل الله كفرت خطاياہ الا الذنوب: ۱۸۸۶] ”قرض کے سوا شہید کے تمام گناہ بخش دیے جاتے ہیں۔“ شہادت اور شہداء کے مزید بہت سے فضائل کی تفصیل کے لیے کتب احادیث میں سے جہاد کے ابواب ملاحظہ فرمائیں۔

آیت 6: وَيُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَفَافًا لَهُمْ: یعنی اللہ تعالیٰ انھیں اس جنت میں داخل کرے گا جس کی پہچان اس نے قرآن کی آیات اور رسول اللہ ﷺ کی زبانی بہت اچھی طرح کروادی ہے۔ اس سورت کی آیت (۱۵) میں بھی اس کی کچھ شناخت آ رہی ہے۔ جب وہ اس جنت میں جائیں گے تو وہ ان کے لیے اجنبی نہیں ہوگی، بلکہ عین اس وعدے اور شناخت کے مطابق ہوگی جو اللہ تعالیٰ نے انھیں کروا رکھی ہے۔ ”عَرَفَافًا لَهُمْ“ میں یہ بات بھی شامل ہے کہ کسی جنتی کو جنت میں اپنے گھر جانے کے لیے کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «يَخْلُصُ الْمُؤْمِنُونَ مِنَ النَّارِ، فَيُحْبَسُونَ عَلَى قَنْطَرَةٍ بَيْنَ الْجَنَّةِ وَالنَّارِ، فَيَقْصُ لِبَعْضِهِمْ مِّنْ بَعْضِ مَطَالِمِ كَانَتْ بَيْنَهُمْ فِي الدُّنْيَا، حَتَّى إِذَا هُدُّوا وَقَرُّوا أَذِنَ لَهُمْ فِي دُخُولِ الْجَنَّةِ، فَوَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ لَا خَدُّهُمْ أَهْدَى بِمَنْزِلِهِ فِي الْجَنَّةِ مِنْهُ بِمَنْزِلِهِ كَانَ فِي الدُّنْيَا» [بخاری، الرقاق، باب القصاص يوم القيامة: ۶۵۳۵]

”مومن آگ سے بچ کر نکلیں گے تو انھیں ایک بُل پر روک لیا جائے گا، جو جنت اور آگ کے درمیان ہے، پھر انھیں ایک دوسرے سے ان زیادتیوں کا قصاص دلایا جائے گا جو دنیا میں ہوئیں، یہاں تک کہ جب وہ خوب صاف ستھرے ہو جائیں گے تو

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَنصُرُوا اللَّهَ يَنصُرْكُمْ وَيُغَيِّثْ أَقْدَامَكُمْ ① وَالَّذِينَ كَفَرُوا فَتَعَسَا لَهُمْ وَأَضَلَّ أَعْمَالَهُمْ ②

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم جمادے گا ① اور جن لوگوں نے کفر کیا سو ان کے لیے ہلاکت ہے اور اس نے ان کے اعمال برباد کر دیے ②

انہیں جنت میں داخل ہونے کی اجازت دی جائے گی۔ سو اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے! ان میں سے ہر ایک کو جنت میں اپنے گھر کا راستہ اس سے زیادہ معلوم ہوگا جتنا اسے دنیا میں اپنے گھر کا راستہ معلوم تھا۔

آیت 7 ① يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَنصُرُوا اللَّهَ: اللہ کی مدد کرنے سے مراد اللہ کے دین اور اللہ کے دوستوں کی مدد کرنا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ تو غنی ہے، اسے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں، جیسا کہ اس سے پہلی آیت میں فرمایا: ﴿وَلَوْ يَشَاءُ اللَّهُ لَأُنْتَصِرُ مِنْهُمْ﴾ [محمد: ۴] "اور اگر اللہ چاہے تو ضرور ان سے انتقام لے لے۔" اللہ کے دین کی مدد اس کی راہ میں جہاد اور جان و مال کی قربانی سے بھی ہوتی ہے اور اس کے دشمنوں پر دین حق کے دلائل و براہین قائم کرنے کے ساتھ بھی۔

② يَنصُرْكُمْ: اللہ تعالیٰ کی مدد و طرح سے آتی ہے، ایک یہ کہ وہ ہمیں دنیا میں دشمنوں پر فتح اور غلبہ عطا فرمادے، مگر ایسا کبھی ہوتا ہے کبھی نہیں ہوتا۔ دوسری یہ کہ وہ ہمیں آخرت عطا فرمادے، خواہ دنیا میں کسی موقع پر شکست سے بھی دوچار ہونا پڑے۔

③ وَيُغَيِّثْ أَقْدَامَكُمْ: یعنی وہ تمہیں دین پر قائم رکھے گا کسی شک و شبہ کا شکار نہیں ہونے دے گا، جنگ میں ثابت قدمی عطا فرمائے گا کبھی فرار کا خیال تک نہیں آنے دے گا، خواہ دشمن کتنی زیادہ تعداد میں ہوں اور قیامت کے دن "صراط" پر تمہارے قدم جمائے رکھے گا اور پھسلنے اور جہنم میں گرنے سے محفوظ رکھے گا، جب سب لوگ "اللَّهُمَّ سَلِّمْ سَلِّمْ" (اے اللہ! سلامت رکھنا، سلامت رکھنا) کہہ رہے ہوں گے۔ [دیکھیے بخاری: ۶۵۷۳]

آیت 8 ① وَالَّذِينَ كَفَرُوا فَتَعَسَا لَهُمْ وَأَضَلَّ أَعْمَالَهُمْ: "تَعَسَا" کا معنی ٹھوکر کھا کر گرنا اور پھر اٹھ نہ سکتا ہے، یا کسی گڑھے میں گر کر ہلاک ہو جانا ہے۔ (مفردات) گویا اللہ کے دین کی مدد کرنے والوں کے تو اللہ تعالیٰ پاؤں جمادیتا ہے، اس کے برعکس منکروں کو منہ کے بل گر کر ہلاک کر دیا جاتا ہے اور مومنوں کی تو مدد کی جاتی ہے جب کہ کافروں کے تمام اعمال برباد اور ان کے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا جاتا ہے۔ (کیلانی)

② "تَعَسَا" کا فعل "تَعَسَّ" اور "تَعَسَّ" مصدر مفعول مطلق ہے جس کا فعل حذف ہونا واجب ہے: "أَيُّ تَعَسَوْا تَعَسَا"۔ پھر "تَعَسَوْا" کو حذف کر کے "تَعَسَا" مصدر کو اس کے قائم مقام کر دیا اور فعل کے فاعل جمع مذکر غائب کی ضمیر کو ظاہر کر دیا۔ ابن ہشام نے فرمایا کہ "لَقَدْ" میں لام تہمین کا ہے جو "تَعَسَا" کے فاعل کے بیان کے لیے ہے۔ معنی یہی ہے کہ وہ ہلاک ہوئے، بری طرح ہلاک ہونا۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوا مَا اَنْزَلَ اللهُ فَاحْبَطْ اَعْنَاقَهُمْ ۝ اَقْلَمَ يَسِيرُوا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوا
 كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۝ ذَمَرَ اللهُ عَلَيْهِمْ ۝ وَ لِلْكَافِرِيْنَ اَمْثَالُهَا ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّهُ
 اللهُ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ ۝

یہ اس لیے کہ انہوں نے اس چیز کو ناپسند کیا جو اللہ نے نازل کی تو اس نے ان کے اعمال ضائع کر دیے ④ تو کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے ان لوگوں کا انجام کیسا ہوا جو ان سے پہلے تھے؟ اللہ نے ان پر تباہی ڈال دی اور ان کافروں کے لیے بھی اسی جیسی (سزائیں) ہیں ⑤ یہ اس لیے کہ اللہ ان لوگوں کا مددگار ہے جو ایمان لائے اور (اس لیے کہ) جو کافر ہیں ان کا کوئی مددگار نہیں ⑥

آیت 9 ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَرِهُوا مَا اَنْزَلَ اللهُ : یعنی اس انجام کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ ہدایت کو ناپسند کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اعمال برباد کر دیے، کیونکہ اعمال کے بار آور ہونے کی شرط ان کا اللہ کی نازل کردہ ہدایت کے مطابق ہونا ہے۔ مزید دیکھیے اسی سورت کی پہلی آیت کی تفسیر۔

آیت 10 ① اَقْلَمَ يَسِيرُوا فِي الْاَرْضِ : یہ ”فَتَمَّتْ اَنْفُسُهُمْ“ ہی کی وضاحت ہے کہ کیا ان لوگوں نے زمین میں چل پھر کر پہلی تباہ شدہ قوموں کے آثار دیکھ کر ان کی ہلاکت کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا؟ نزول قرآن کے وقت ان میں سے بہت سے آثار موجود تھے اور بعض اب بھی باقی ہیں۔ ”اَقْلَمَ يَسِيرُوا“ کی وضاحت کے لیے دیکھیے سورہ روم (9) اور سورہ مؤمن (21)۔

② ذَمَرَ اللهُ عَلَيْهِمْ : ”ذَمَرَ“ ہلاک کر دیا۔ ”الذَّمَاؤُ“ ہلاکت۔ ”ذَمَرُوْا“ خود بھی متعدی ہے، اصل میں ”ذَمَرَهُمُ اللهُ“ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ہلاک کر دیا۔ مگر ”عَلَيْهِمْ“ لانے سے ہلاک کرنے میں مبالغے کا اظہار مقصود ہے: ”اَيُّ الْاَغْنٰى عَلَيْهِمُ الذَّمَاؤُ“ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان پر ہلاکت اور تباہی ڈال دی۔

③ وَ لِلْكَافِرِيْنَ اَمْثَالُهَا : ”اَمْثَالُهَا“ میں ضمیر ”ہا“ ”عَاقِبَةُ“ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ ”اَمْثَالُ“ کو جمع اس لیے لایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پاس اس جیسے بے شمار عذاب موجود ہیں۔ ”و لِلْكَافِرِيْنَ اَمْثَالُهَا“ کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ پہلی قوموں نے پیغمبروں کو جھٹلایا اور سرکشی کی راہ اختیار کی تو اللہ تعالیٰ نے مختلف قسم کے عذاب بھیج کر انہیں تباہ و برباد کر دیا اور ان موجودہ کافروں کے لیے بھی سرکشی اختیار کرنے کی صورت میں اس جیسے بے شمار عذاب تیار ہیں۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے گزشتہ اقوام پر رسولوں کی نافرمانی کی پاداش میں دنیا میں تباہی اور بربادی نازل کی، جس کا سبب ان کا کفر تھا اور ان کافروں کے لیے دنیا کے علاوہ آخرت میں بھی ایسے کئی عذاب تیار ہیں۔

آیت 11 ذٰلِكَ بِاَنَّهُ اللهُ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا..... : یعنی کافروں پر ہلاکت نازل کرنے کا باعث یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ

إِنَّ اللَّهَ يُدْخِلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ
وَالَّذِينَ كَفَرُوا يَتَمَتَّعُونَ وَيَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَهُمْ ﴿۱۲﴾

یقیناً اللہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے ان جنتوں میں داخل کرے گا جن کے تلے نہریں بہتی ہیں اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا فائدہ اٹھاتے اور کھاتے ہیں، جس طرح چوپائے کھاتے ہیں اور آگ ان کا ٹھکانا ہے ﴿۱۲﴾

ایمان والوں کا مددگار ہے اور کافروں کا کوئی مددگار نہیں جو انہیں ہلاکت سے بچا سکے۔ جب جنگِ اُحد میں ابو سفیان نے اپنی عارضی فتح پر مغرور ہو کر نعرہ لگایا: «إِنَّ لَنَا الْعُزَّىٰ وَلَا عُزَّىٰ لَكُمْ» (ہمارا مددگار عزریٰ ہے اور تمہارا کوئی بھی مددگار نہیں) تو رسول اللہ ﷺ نے جواب میں یہ کہنے کا حکم دیا: «اللَّهُ مَوْلَانَا وَلَا مَوْلَىٰ لَكُمْ» (بخاری، الجہاد، باب ما بکرہ من التنازع : ۳۰۳۹) "اللہ ہمارا مددگار ہے اور تمہارا کوئی مددگار نہیں۔" یہ جواب اسی آیت سے ماخوذ ہے۔

آیت 12 ﴿۱۲﴾ إِنَّ اللَّهَ يُدْخِلُ الَّذِينَ آمَنُوا : دنیا میں پہلی قوموں پر آنے والے عذابوں کا اور ایمان والوں کی نصرت کا ذکر فرمانے کے بعد آخرت میں دونوں کا انجام ذکر فرمایا۔ چونکہ مومن اپنے ایمان اور عمل صالح کے تقاضوں کے پابند رہے، انہوں نے دنیا کی نعمتوں اور لذتوں سے فائدہ اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے احکام کا پابند رہ کر اٹھایا۔ وہی کھایا اور پہنا جو ان کے رب نے ان کے لیے حلال فرمایا، وہ تمام حرام کردہ اشیاء سے بچے۔ شراب، ریشم اور سونے کے استعمال سے پرہیز کرتے رہے۔ زنا، چوری، دوسرے کا حق کھانے، غرض ہر معصیت سے اجتناب کیا۔ ان کی لذتیں اٹھانے کی بے شمار حسرتیں ان کے دل میں رہ گئیں اور انہوں نے یہاں ایک قیدی کی سی زندگی گزاری، جو صرف انھی سہولتوں سے فائدہ اٹھا سکتا ہے جو انہیں قید کرنے والا مہیا کرے۔ اس کے صلے میں اللہ تعالیٰ انہیں عظیم الشان باغات میں داخل کرے گا جن کے تلے نہریں بہتی ہیں اور فرمائے گا کہ یہاں تمہارے دل کی ہر خواہش اور ہر طلب پوری ہوگی، بلکہ وہ کچھ ملے گا جو نہ تمہاری آنکھوں نے دیکھا نہ کانوں نے سنا اور نہ ہی کسی انسان کے دل میں اس کا خیال ہی آیا۔ یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں اور اکثر جگہ باغات اور نہروں ہی کا ذکر فرمایا ہے، اس لیے کہ دنیا کے مکانوں اور کوشیوں کا ایک حصہ گھر کے چمن پر مشتمل ہوتا ہے، اس لیے کہ پودوں، چشموں اور نہروں سے انسان کو فطری طور پر محبت ہے، مگر اصل مکان ان سے کہیں وسیع، خوبصورت اور قیمتی ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان مکانات اور ان میں موجود رہنے سہنے، کھانے پینے، بیوی بچوں اور دوسری بے شمار اشیاء کی عظمت و شوکت کا اندازہ ان باغوں اور نہروں سے لگا لو جو بطور چمن ان مکانوں کے ساتھ ہیں۔

﴿۱۲﴾ وَالَّذِينَ كَفَرُوا يَتَمَتَّعُونَ وَيَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ : ایمان والوں کے برعکس کفار کھانے پینے اور دنیا کی لذتیں اٹھانے میں کسی پابندی کی پروا نہیں کرتے، انہیں حلال و حرام، اپنے یا دوسرے کے حق سے کوئی غرض نہیں، وہ خنزیر، مردار اور ہر حرام چیز کھاتے، شراب پیتے، زنا کرتے، غرض دل کا ہر ارمان پورا کرتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ مہیا نہ ہو سکنے کی وجہ سے وہ کسی

وَكَأَيِّن مِّن قُرْبَىٰ هِيَ أَشَدُّ قُوَّةً مِّن قُرْبَيْكَ الْبَلَىٰ أَخْرَجْتكَ ؕ أَهْلَكْتَهُمُ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ ﴿۱۳﴾

اور کتنی ہی بستیاں ہیں جو تیری اس ہستی سے قوت میں زیادہ تھیں جس نے تجھے نکالا، ہم نے انہیں ہلاک کر دیا، پھر کوئی ان کا مددگار نہ تھا۔ ﴿۱۳﴾

لذت سے فائدہ نہ اٹھا سکیں، کیونکہ دنیا میں ہر شخص کو اتنا ہی ملتا ہے جو مالک نے لکھ دیا ہے، مگر اپنی حسرتیں پوری کرنے میں وہ کوئی کسر باقی نہیں رہنے دیتے۔ دنیا ان کے لیے جنت ہے جہاں وہ ہر قید اور پابندی سے آزاد زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کا حال ہو بہو جانوروں جیسا ہے جو کھانے پینے، رہنے سہنے اور اپنی جنسی خواہش کی تکمیل میں کسی قید کے پابند نہیں ہیں، ان میں سے ہر طاقتور کمزور سے اس کا حق بھی چھین لیتا ہے۔ انہیں نہ عاقبت یاد ہے نہ باز پرس کی کوئی فکر ہے۔

﴿۱۳﴾ وَالنَّارُ مَشْوَىٰ لَهُمْ: چونکہ انہوں نے اپنے رب سے کفر کیا، نہ ایمان لائے نہ عمل صالح کیا، نہ اس کے احکام کی پابندی کی، اس لیے ان کا مستقل ٹھکانا آگ ہے۔

﴿۱۴﴾ بعض لوگ اس آیت کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ جانور کھڑے ہو کر کھاتے پیتے ہیں، اس لیے کھڑے ہو کر کھانا پینا منع ہے، مگر اس مقصد کے لیے اس آیت کے بجائے احادیث سے استدلال کرنا چاہیے اور اس مسئلے میں اتنی ہی سختی کرنی چاہیے جتنی احادیث سے ثابت ہے، کیونکہ ضرورت کے وقت سنت سے اس کی اجازت بھی ثابت ہے۔

﴿۱۵﴾ چونکہ جانوروں کی ساری جدوجہد ہی کھانے پینے کے لیے ہوتی ہے اس لیے رسول اللہ ﷺ نے ان کی مشابہت سے بچنے کے لیے کم کھانے پر زور دیا ہے۔ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «الْمُؤْمِنُ يَأْكُلُ فِي مَعْنَى وَاحِدٍ وَالْكَافِرُ يَأْكُلُ فِي سَبْعَةِ أُمَّعَاءٍ» [بخاری، الأطعمة، باب المؤمن يأكل في معنى واحد.....: ۵۳۹۳] "مومن ایک آنت میں کھاتا ہے اور کافر سات آنتوں میں کھاتا ہے۔" اور مقدم بن معدیکرب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «مَا مَلَأَ آدَمِيٌّ وَعَاءً شَرًّا مِنْ بَطْنٍ، بِحَسْبِ ابْنِ آدَمَ أَكْثَلَاتُ يُقْمَنُ صَلْبَهُ، فَإِنْ كَانَ لَا مَحَالَةَ فَتَلَّتْ لِبَطْعَامِهِ وَتَلَّتْ لِشَرَابِهِ وَتَلَّتْ لِنَفْسِهِ» [ترمذی، الزهد، باب ما جاء في كراهية كثرة الأكل: ۲۳۸۰، وقال الألبانی صحیح] "کسی آدمی نے پیٹ سے بڑا برتن نہیں بھرا۔ ابن آدم کو چند لقمے کافی ہیں جو اس کی پیٹھ کو سیدھا رکھیں۔ سواگر کوئی چارہ نہیں تو تیسرا حصہ اس کے کھانے کے لیے، تیسرا اس کے پینے کے لیے اور تیسرا سانس کے لیے ہے۔" جس طرح شریعت نے ہر بات میں انسانی فطرت کا خیال رکھا ہے اسی طرح یہاں بھی اگر کبھی پیٹ بھر کر کھالے تو اس کی گنجائش ہے، جیسا کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا رسول اللہ ﷺ کے بار بار اصرار پر دودھ پینا ہے، حتیٰ کہ انہیں کہنا پڑا کہ اب میرے پیٹ میں اس کی گنجائش نہیں۔ [دیکھیے بخاری، الرقاق، باب کیف كان عيش النبي ﷺ.....: ۶۶۵۲]

آیت ۱۳ ﴿۱۳﴾ وَكَأَيِّن مِّن قُرْبَىٰ هِيَ أَشَدُّ قُوَّةً.....: اس کا عطف "أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا" پر ہے، درمیان میں بات سے بات نکلتی گئی ہے، دوبارہ پھر وہی سلسلہ کلام شروع فرمایا ہے۔ اس میں کفار مکہ کے لیے وعید اور رسول اللہ ﷺ

أَقْنَنَّ كَانَ عَلَى بَيْنَتِهِ مَن رَّبِّهِ كَمَنْ رُبِّينَ لَهُ سُوءُ عَمَلِهِ وَ اتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُمْ ﴿۱۴﴾

تو کیا وہ شخص جو اپنے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل پر ہے اس شخص کی طرح ہے جس کے لیے اس کے برے اعمال حزن کر دیے گئے اور انہوں نے اپنی خواہشوں کی پیروی کی؟ ﴿۱۴﴾

کے لیے تسلی ہے کہ اہل مکہ جنھوں نے آپ کو اپنی بستی سے نکلنے پر مجبور کر دیا، اپنی قوت و شوکت پر مغرور نہ ہوں اور آپ ان کی قوت دیکھ کر دل برداشتہ نہ ہوں، ان بے چاروں کی کیا حیثیت ہے۔ ان سے پہلے کتنی ہی بستیاں تھیں جو قوت میں ان سے کہیں زیادہ تھیں، ہم نے انھیں ہلاک کر دیا، پھر ان کی مدد کرنے والا کوئی نہ تھا۔ دیکھیے سورہ روم (۱۰، ۹) اور سورہ مؤمن (۲۱)۔

② ”قُرَيْبَةَ“ سے مراد قریہ والے ہیں، جیسا کہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اپنے والد ماجد سے کہا: ﴿وَسَلِّ الْقُرَيْبَةَ النَّبِيُّ كُنَّا فِيهَا وَالْعَيْرَ الْبَقِيَ أَقْبَلْنَا فِيهَا﴾ [یوسف: ۸۲] ”اور اس بستی سے پوچھ لے جس میں ہم تھے اور اس قافلے سے بھی جس میں ہم آئے ہیں۔“ اس لیے آگے ”أُهْلِكْنَا هَا“ کے بجائے ”أُهْلِكْتُمْ هَا“ (ہم نے انھیں ہلاک کر دیا) فرمایا، یعنی اس بستی والوں کو ہلاک کر دیا۔ پوری بستی کو نکالنے والا قرار دینے میں ناراضی کا اظہار ہے، کیونکہ کچھ نکالنے والے تھے اور کچھ خاموش رہ کر ان کا ساتھ دینے والے، جیسا کہ قوم عاد کے متعلق فرمایا: ﴿فَكَذَّبُوهُ فَعَقَرُوها﴾ [الشمس: ۱۴] ”تو انہوں نے اسے جھٹلایا، پس اس (اوشی) کی کوچیوں کاٹ دیں۔“ حالانکہ اوشی کو کانٹے والا تو ایک ہی شخص تھا۔

③ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو یہ تسلی اس لیے بھی دی کہ آپ ﷺ کو مکہ سے نکلنے کا شدید رنج اور صدمہ تھا۔ عبد اللہ بن عدی بن حمراء الزہری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ”حزوة“ مقام پر کھڑے ہوئے دیکھا، آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿وَاللَّهِ! إِنَّكَ لَحَئِيرُ أَرْضِ اللَّهِ وَأَحَبُّ إِلَيَّ إِلَى اللَّهِ وَ لَوْ لَا أَنِّي أُخْرِجْتُ مِنْكَ مَا خَرَجْتُ﴾ [ترمذی، المناقب، باب فی فضل مکة: ۳۹۲۵، وقال الألبانی صحیح] ”اللہ کی قسم! تو اللہ کی زمین میں سب سے بہتر ہے اور اللہ کی زمین میں سے اللہ کے ہاں سب سے زیادہ محبوب ہے اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ مجھے تجھ سے نکال دیا گیا تو میں نہ نکلتا۔“

آیت 14 ﴿۱﴾ أَقْنَنَّ كَانَ عَلَى بَيْنَتِهِ مَن رَّبِّهِ : اس آیت میں مؤمن و کافر کے درمیان ایک اور فرق بیان فرمایا ہے جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ ایمان اور عمل صالح والوں کو جنت میں داخل فرمائے گا اور کفر کرنے والوں کا ٹھکانا آگ ہوگا۔ ”بَيْنَتِهِ مَن رَّبِّهِ“ (اپنے رب کی طرف سے دلیل) سے مراد ایک تو انسانی فطرت میں رکھی ہوئی اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کی توحید ہے اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب سے حاصل ہونے والی ہدایت اور علم ہے جس کی وجہ سے مؤمن کو اپنے حق پر ہونے کا پورا یقین ہوتا ہے۔ وہ زندہ رہتا ہے تو اس یقین کے ساتھ کہ میں حق پر ہوں اور دشمن کے مقابلے میں لڑتا اور شہید ہوتا ہے تو اسی یقین کے ساتھ۔ وہ جس راستے پر چل رہا ہے اس کی رات بھی دن کی طرح روشن ہے۔ فرمایا کیا یہ شخص اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جس کے لیے اس کے برے اعمال خوش نما بنا دیے گئے ہیں، حتیٰ کہ رسول اور مسلمانوں کو ان کے گھروں سے نکالنا بھی اسے اچھا کام نظر آتا ہے اور وہ وحی اور ہدایت کے نور سے منہ موڑ کر کفر و شرک اور اندھا دھند اپنی

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وَعَدَ الْمُتَّقُونَ فِيهَا أَنْهَارٌ مِنْ مَاءٍ غَيْرِ آسِنٍ وَأَنْهَارٌ مِنْ لَبَنٍ لَمْ يَتَغَيَّرْ

اس جنت کا حال جس کا وعدہ متقی لوگوں سے کیا گیا ہے، یہ ہے کہ اس میں کئی نہریں ایسے پانی کی ہیں جو بگڑنے والا

خواہش کی پیروی کی راہ پر چل نکلا ہے جس سے اس کا نور فطرت بھی بچھ چکا ہے؟ جواب ظاہر ہے کہ یہ دونوں ہرگز برابر نہیں ہو سکتے۔ تو ظاہر ہے کہ ان کا انجام بھی کسی صورت ایک جیسا نہیں ہو سکتا۔ یہ بات اللہ تعالیٰ نے متعدد مقامات پر بیان فرمائی ہے، دیکھیے سورہ رعد (۱۹)، سورہ ص (۲۸) اور سورہ جاثیہ (۲۱)۔

② احسن التفاسیر میں ہے: ”حاصل مطلب ان آیتوں کا یہ ہے کہ جو لوگ خالص اللہ کی عبادت کرتے ہیں ان کے پاس یہ سند (بینہ اور دلیل) ہے کہ انسان کو اور انسان کی سب ضرورتوں کو اس طرح اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے کہ اس میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے تو لائق تعظیم و عبادت بھی وہی وحدہ لا شریک لہ ہے اور جو لوگ اللہ کی عبادت میں غیروں کو شریک کرتے ہیں ان کے پاس کوئی شرعی یا عقلی دلیل نہیں ہے۔ بت پرستی جیسی بری چیز کو شیطان نے ان کی نظر میں اچھا کر کے دکھا دیا ہے، اس لیے وہ لوگ اسی شیطانی وسوسے کے سبب اپنی خواہش پر چلتے ہیں۔ اسی کو ”وَ اتَّبِعُوا أَهْوَاءَهُمْ“ فرمایا۔“ (مختصراً)

③ ”مَنْ زَيْنَ لَهُ سُوءَ عَمَلِهِ“ (اس کے لیے اس کے برے اعمال مزین کر دیے گئے) میں برے اعمال مزین کرنے والے کا ذکر مجہول رکھا ہے، کیونکہ آدمی کے لیے اس کے اعمالی بد کو مزین کرنے والی بہت سی چیزیں ہوتی ہیں جن میں اس کی خواہش نفس بھی ہے، انسانی اور جنی شیطان بھی اور اس کے اعمالی بد کی نحوست بھی۔ فعل مجہول (مزین کر دیے گئے) میں مزین کرنے والی یہ سب اشیاء آجاتی ہیں۔

آیت 15 ﴿ ۱ ﴾ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وَعَدَ الْمُتَّقُونَ : ”مَثَلُ“ کا معنی یہاں حال یا صفت ہے۔ اس سے پہلے مومنوں کو جنتوں میں داخل کرنے کا ذکر فرمایا، جن کے تلے نہریں بہتی ہیں اور کفار کا ٹھکانا آگ بیان فرمایا۔ اب اس جنت اور جہنم کا کچھ مزید حال بیان فرمایا، خصوصاً جنت کی نہروں کا، کیونکہ قرآن مجید میں اکثر جنت کے ساتھ اس کی نہروں کا ذکر بھی آتا ہے۔ اس آیت میں جنت کی چار قسم کی نہروں کا ذکر فرمایا ہے۔ واضح رہے کہ جنت کی تمام نہروں کا سرچشمہ عرش کے نیچے جنت الفردوس ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «فَإِذَا سَأَلْتُمُ اللَّهَ فَسَلُّوهُ الْفِرْدَوْسَ، فَإِنَّهُ أَوْسَطُ الْجَنَّةِ وَأَعْلَى الْجَنَّةِ، وَفَوْقَهُ عَرْشُ الرَّحْمَنِ، وَمِنْهُ تَفَجَّرُ أَنْهَارُ الْجَنَّةِ» [بخاری، التوحید، باب: ﴿وكان عرشه على الماء﴾ : ۷۴۲۳] ”تو جب تم اللہ تعالیٰ سے سوال کرو تو فردوس کا سوال کرو، کیونکہ وہ جنت کا افضل اور جنت کا سب سے بلند مقام ہے اور اس سے اوپر رحمان کا عرش ہے اور اسی سے جنت کی نہریں پھوٹی ہیں۔“ اور معاویہ بن حیدہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: «إِنَّ فِي الْجَنَّةِ بَحْرَ الْمَاءِ وَبَحْرَ الْعَسَلِ وَبَحْرَ اللَّبَنِ وَبَحْرَ الْحَمْرِ ثُمَّ تَشْفَقُ الْأَنْهَارُ بَعْدَهُ» [ترمذی، صفة الجنة، باب ما جاء في صفة أنهار الجنة : ۲۵۷۶، وقال الترمذی والألبانی صحیح] ”جنت میں پانی کا سمندر ہے اور شہد کا سمندر ہے اور دودھ کا سمندر ہے اور شراب کا سمندر ہے، پھر بعد میں نہریں پھوٹی ہیں۔“

طَعْمُهُ، وَأَنْهَرُ مَنْ خَبِرَ لَذَّةَ لِلشَّرْبِ بَيْنَهُ وَأَنْهَرُ مَنْ عَسَلٍ مُصَفًّى، وَ لَهُمْ فِيهَا

نہیں اور کئی نہریں دودھ کی ہیں، جس کا ذائقہ نہیں بدلا اور کئی نہریں شراب کی ہیں، جو پینے والوں کے لیے لذیذ ہیں اور کئی نہریں خوب صاف کیے ہوئے شہد کی ہیں اور ان کے لیے اس میں ہر قسم کے پھل اور ان کے رب کی طرف

② فِيهَا أَنْهَرُ قَيْنَ مَاءٍ غَيْرِ آسِنٍ : "آسِن" "آسِنُ يَأْسِنُ" سے اسم فاعل ہے، جس طرح "أَمِنُ يَأْمِنُ" سے "أَمِنٌ" اسم

فاعل ہے۔ یہ باب "ضَرَبَتْ" اور "نَضَرَ" کے وزن پر بھی آتا ہے: "أُنِي مُنْعِثُ الْمَوْتِ وَالزَّيْجِ وَالطَّعْمِ" "جس کا رنگ، بو اور ذائقہ بدلا ہوا ہو۔" یعنی جنت میں ایسے پانی کی نہریں ہیں جو ایسا صاف ہے کہ اس کے ذائقے یا رنگ یا بو میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں آتی، بخلاف دنیا کے پانی کے جو کچھ عرصہ گزرنے پر اپنے رنگ، ذائقہ اور بو کی صفائی کھو بیٹھتا ہے، اس پر کافی آجاتی ہے، گرد و غبار کے ساتھ گندا ہو جاتا ہے اور اس میں پیدا ہونے والے جراثیم اور دوسری چیزیں اسے پینے کے قابل نہیں چھوڑتیں۔

③ وَأَنْهَرُ مَنْ لَبِنٍ لَمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهُ: دنیا میں جانوروں کے تھنوں سے جو دودھ نکلتا ہے اس میں کچھ تو تھنوں کی آلائش کی

آمیزش ہو جاتی ہے اور کچھ دوہنے والے کے ہاتھوں اور ماحول کے گرد و غبار کی، پھر اگر دودھ کچھ دیر پڑا رہے تو پھٹ جاتا ہے، اس کا ذائقہ کڑھ اور بد مزہ ہو جاتا ہے اور اس میں سے بد بو آئے لگتی ہے۔ جنت میں دودھ تھنوں سے نہیں نکلے گا بلکہ پانی کی طرح چشموں سے رواں ہوگا اور اپنی اصلی حالت میں بدستور قائم رہے گا، اس کے ذائقے میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔

④ وَأَنْهَرُ مَنْ خَبِرَ لَذَّةَ لِلشَّرْبِ بَيْنَهُ : "لَذَّةٌ" کی مؤنث ہے، کیونکہ یہ "خَبِرَ" کی صفت ہے جو مؤنث سماعی

ہے۔ "لَذَّةٌ" اور "الذَّيْذُ" دونوں صفت مطبوعہ ہیں اور دونوں کا معنی ایک ہے۔ دنیا میں لوگ شراب صرف اس سرور کے لیے پیتے ہیں جو اس کے پینے سے حاصل ہوتا ہے اور وہ اس سرور کی خاطر شراب کی ان تمام قباحتوں کو برداشت کرتے ہیں جو اس میں پائی جاتی ہیں، جن میں سے چند یہ ہیں کہ وہ نہایت بدبودار ہوتی ہے، تلخ اور بدذائقہ ہوتی ہے۔ اس کے پینے سے آدمی عقل کھو بیٹھتا ہے، اُلٹیاں آتی ہیں اور جب نشتر ٹوٹتا ہے تو سر پھکانا اور درد شروع ہو جاتا ہے۔ جنت کی شراب میں دنیا کی شراب کی کوئی خرابی نہیں ہوگی، نہ درد، نہ پھکر، نہ بدبو اور نہ ذائقے کی تلخی، بلکہ وہ نہایت لذیذ ہوگی اور فرحت و سرور لائے گی، عقل پر پروہ یا کوئی اور خرابی نہیں لائے گی۔

⑤ وَأَنْهَرُ مَنْ عَسَلٍ مُصَفًّى: دنیا کا شہد کھسی کے پیٹ سے نکلتا ہے، اسے حاصل کرتے وقت کھیوں اور اس کے بچوں

کے کچھ اجزا، موم، گرد و غبار اور جھکے وغیرہ لازماً شامل ہو جاتے ہیں، پھر دیر تک پڑا رہنے سے کھٹا ہو جاتا ہے، اسی میں خمیر پیدا ہو جاتا ہے۔ غرض اس کے پوری طرح صاف ہونے اور رہنے کی کوئی صورت ہی نہیں، جب کہ جنت کی نہروں کا شہد کھیوں کے پیٹ کا مریوں منت نہیں بلکہ براہ راست شہد کے سمندر سے نکل کر ہر جنتی کے گھر پہنچتا ہے اور ہمیشہ نہایت صاف شفاف اور ہر قسم کی کدورت سے پاک رہتا ہے۔

صاحب احسن التفسیر لکھتے ہیں: "اگرچہ جنت میں کھانے پینے، پہننے، برتنے کی جتنی چیزیں ہیں ان کے فقط نام دنیا کی

مِنْ كُلِّ الشَّرَاتِ وَمَغْفِرَةٌ مِّن رَّبِّهِمْ ۚ كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ وَسُقُوا مَاءً حَمِيماً فَقَطَّعَ

أَمْعَاءَهُمْ ﴿۱۵﴾

سے بڑی بخشش ہے۔ (کیا یہ متقی لوگ) ان جیسے ہیں جو ہمیشہ آگ میں رہنے والے ہیں اور جنہیں کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا، تو وہ ان کی انتزیاں ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا ﴿۱۵﴾

چیزوں سے ملتے ہیں، لیکن جنت کی چیزوں اور دنیا کی چیزوں میں بڑا فرق ہے۔ مثلاً دنیا میں ایسا دودھ کہاں ہے جس کی ہمیشہ نہر بہتی ہو اور پھر دوسرے دن ہی وہ کھٹانہ ہو جائے۔ وہ شہد کہاں ہے جس کی نہر بہتی ہو اور کھیسوں کی بھنکار اس میں جم جم کر نہ مرے اور ہوا سے خاک اور کوڑا کرکٹ اس پر نہ پڑے۔ وہ شراب کہاں ہے جس کی نہر ہو اور بدبو کے سبب اس نہر کے آس پاس کا راستہ کچھ دنوں میں بند نہ ہو جائے۔“

﴿۱۵﴾ وَ لَهُمْ فِيهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ : پینے کی چیزوں کے بعد کھانے کی چیزوں کا اختصار کے ساتھ ذکر فرمایا اور ان میں سے بھی آناج وغیرہ کے بجائے پھلوں کا ذکر فرمایا، کیونکہ جنت کے کھانے بھوک مٹانے کے لیے نہیں بلکہ محض لذت کے لیے ہوں گے، فرمایا: ﴿إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرَىٰ﴾ [ظہ: ۱۱۸] ”بے شک تیرے لیے یہ ہے کہ تو اس میں نہ بھوکا ہوگا اور نہ ننگا ہوگا۔“ اور لذت میں پھلوں کا مقام سب جانتے ہیں۔

﴿۱۶﴾ وَمَغْفِرَةٌ مِّن رَّبِّهِمْ : ”مَغْفِرَةٌ“ میں تین تعظیم کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ ”بڑی یا عظیم مغفرت“ ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت یہ ہوگی کہ انہیں عظیم مغفرت سے نوازا جائے گا۔ ”غَفَرَ يَغْفِرُ“ کا اصل معنی پردہ ڈالنا ہے، یعنی جنت میں ان کے گناہوں پر ان کے رب کی طرف سے ایسا عظیم پردہ ڈالا جائے گا کہ ان کا ذکر تک ان کے سامنے نہیں آئے گا کہ وہ کہیں شرمندہ نہ ہوں۔

﴿۱۷﴾ كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ : یہ مبتدا مخدوف کی خبر ہے جو پچھلی آیت: ﴿أَكْفَنَ كَانَ عَلَىٰ بَيْنَتِهِ مِّن رَّبِّهِ كَمَنْ زُيِّنَ لَهُ سُوءُ عَمَلِهِ وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُمْ﴾ سے سمجھ میں آ رہا ہے: ”أَيُّ أَفْمَنٌ هُوَ مِنْ أَهْلِ هَذِهِ الْجَنَّةِ كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ“ ”یعنی تو کیا وہ شخص جو ان اوصاف والی جنت والوں میں سے ہے اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو ہمیشہ آگ میں رہنے والا ہے؟“

﴿۱۸﴾ وَسُقُوا مَاءً حَمِيماً : اور جنہیں کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا۔ اس سے پہلے جملے ”كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ“ میں لفظ ”مَنْ“ کے مفرد ہونے کی وجہ سے اس کے ساتھ واحد کا صیغہ ”هُوَ“ استعمال ہوا ہے اور اس جملے میں ”مَنْ“ کے معنی کے عام ہونے کو ملحوظ رکھتے ہوئے جمع کا صیغہ ”سُقُوا“ استعمال ہوا ہے۔

﴿۱۹﴾ فَقَطَّعَ أَمْعَاءَهُمْ : ”قَطَّعَ يَقَطِّعُ قَطْعًا“ (ف) کا ثنا۔ ”قَطَّعَ يَقَطِّعُ تَقْطِيعًا“ (تفعیل) میں مبالغہ ہے، ٹکڑے ٹکڑے کرنا۔ ”أَمْعَاءُ“ ”مِعَى“ کی جمع ہے جو اصل میں ”مِعَى“ بروزن ”عَنْبُ“ ہے۔ یاءِ پر ضمہ ثقیل ہونے کی وجہ سے گرا

وَمِنْهُمْ مَن يَسْتَعِرُّ إِلَيْكَ ۖ حَتَّىٰ إِذَا حَرَجُوا مِنْ عِنْدِكَ قَالُوا لِلَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ أَنفَاهُ
 أُولَٰئِكَ الَّذِينَ طَبَعَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُمْ ﴿۱۵﴾

اور ان میں سے کچھ وہ ہیں جو تیری طرف کان لگاتے ہیں، یہاں تک کہ جب وہ تیرے پاس سے نکلے ہیں تو ان لوگوں سے جنہیں علم دیا گیا ہے، کہتے ہیں ابھی اس نے کیا کہا تھا؟ یہی لوگ ہیں جن کے دلوں پر اللہ نے مہر لگا دیا اور وہ اپنی خواہشوں کے پیچھے چل پڑے ﴿۱۵﴾

دیا، یا، اور نون توین دو ساکن جمع ہونے کی وجہ سے یا کو گرا دیا تو ”معنی“ ہو گیا، جس کا تثنیہ ”مغنیان“ اور ”مغنیین“ آتا ہے۔ اس جیسا ایک اور لفظ ”آنا“ ہے جو ”ابنی“ کی جمع ہے۔ ”آناة السَّيْلِ وَالشَّهَارِ“ ”دن رات کی گھڑیاں۔“ یعنی جنہیوں کو انتہا درجے کا گرم کھونٹا ہوا پانی پلایا جائے گا جو ان کی اعتریوں کو نکتے نکتے کر دے گا۔

آیت 16 ﴿۱۶﴾ وَمِنْهُمْ مَن يَسْتَعِرُّ إِلَيْكَ ۖ مُشْرِكِينَ ۚ وَإِن كَانَ لَمَنْ يَسْتَعِرُّ إِلَيْكَ مَن يَحْتَسِبُ أَنَّهُ يَلْعَابُ اللَّهَ عَبَثًا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ لَذُو فَهْمٍ لِّمَنِ عَبَسَ ۚ وَلَٰكِن مَّا أَكْثَرُ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۱۶﴾

بدرتین قسم متافہمین کا ذکر فرمایا جو آپ ﷺ کی مجلس میں حاضر ہوتے، آپ کی باتیں کان لگا کر سنتے، مگر ماننے کے لیے نہیں، بلکہ اپنی مفید مطلب باتیں ڈھونڈنے کے لیے، جن کے ساتھ وہ لوگوں کو اسلام سے بدظن کرتے۔ چونکہ ان کے دل و دماغ پر کفر حاوی تھا، قیامت پر ایمان وہ نہیں رکھتے تھے، اس لیے ان کے لیے رسول اللہ ﷺ کی باتیں اجنبی تھیں، ان کے دل میں وہ مفہوم بیٹھتا ہی نہیں تھا جو رسول اللہ ﷺ کی زبان سے ادا ہوتا تھا۔ وہ سمجھ ہی نہیں سکتے تھے کہ کوئی شخص ان کے خیال میں مہربوم آخرت کے لیے اپنی دنیا کا نقصان بھی کر سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس شخص کی ساری نگ و دوئی دنیا کے لیے ہو وہ پیغمبروں کی بات سمجھ ہی نہیں سکتا، جیسا کہ شعیب رضی اللہ عنہ کی قوم نے کہا تھا: ﴿يَسْعَيْبُ مَا نَفَقَهُ كَثِيرًا مِّمَّا نَقُولُ﴾ ﴿۱۶﴾ اہود: ۱۶

”اے شعیب! ہم اس میں سے بہت سی باتیں نہیں سمجھتے جو تو کہتا ہے۔“

﴿۱۶﴾ حَتَّىٰ إِذَا حَرَجُوا مِنْ عِنْدِكَ قَالُوا لِلَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ : ”لُوتُوا الْعِلْمَ“ سے مراد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی ذات و صفات، اپنے پیغمبروں، اپنی کتابوں، اپنے فرشتوں، یوم آخرت اور تقدیر کے علم اور ان سب پر ایمان کی روشنی عطا فرما رکھی تھی۔ یعنی جب وہ آپ ﷺ کی مجلس سے نکلے ہیں تو آپ کی باتوں کی تحقیر کرتے ہوئے اور ان کا مذاق اڑاتے ہوئے علم و ایمان سے آراستہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کہتے ہیں کہ ہماری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا کہ ابھی ابھی اس نے کیا کہا ہے، کیا آپ لوگوں کی سمجھ میں کچھ آیا ہے؟

﴿۱۷﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ طَبَعَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ ۖ : فرمایا ان کے نہ سمجھنے کی دو وجہیں ہیں، ایک تو یہ کہ ان کے کفر پر اصرار اور عناد کی وجہ سے اللہ نے ان کے دلوں پر مہر کر دی ہے، اس لیے وہ سمجھ سکتے ہی نہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَقَوْلِهِمْ قُلُوبُنَا غُلْفٌ مِّبَلٌ طَبَعَ اللَّهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُونَ إِلَّا قَلِيلًا﴾ [النساء: ۱۵۵] ”اور ان کے یہ کہنے کی وجہ سے کہ ہمارے دل غلاف میں محفوظ ہیں، بلکہ اللہ نے ان پر ان کے کفر کی وجہ سے مہر کر دی تو وہ ایمان نہیں لاتے مگر بہت کم۔“

وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَآتَاهُمْ تَقْوَاهُمْ ﴿۱۷﴾ قَبَلٌ يَنْظُرُونَ إِلَّا السَّاعَةَ أَنْ تَأْتِيَهُمْ بَغْتَةً ۖ فَكَذَّبَتْ إِثْرًا ۚ وَإِنَّمَا يَأْتِيهِمْ إِذَا جَاءَتْهُمْ ذِكْرُهُمْ ﴿۱۸﴾

اور وہ لوگ جنہوں نے ہدایت قبول کی اس نے انہیں ہدایت میں بڑھا دیا اور انہیں ان کا تقویٰ عطا کر دیا ﴿۱۷﴾ تو وہ کس چیز کا انتظار کر رہے ہیں سوائے قیامت کے کہ وہ ان پر اچانک آجائے، پس یقیناً اس کی نشانیاں آچکیں، پھر ان کے لیے ان کی نصیحت کیسے ممکن ہوگی، جب وہ ان کے پاس آجائے گی ﴿۱۸﴾

﴿۱۷﴾ وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا هُمْ: یہ نہ سمجھنے کی دوسری وجہ ہے کہ وہ کوئی عقلی دلیل سننے کے لیے تیار نہیں، بلکہ صرف وہ کام کرنا چاہتے ہیں جو ان کی خواہش کے مطابق ہوں اور مرضی کے خلاف وہ کوئی پابندی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ جب کسی کی یہ حالت ہو جائے تو فی الواقع اس کی خواہش کے خلاف کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی، نہ ہی وہ اسے سننے کے لیے تیار ہوتا ہے، خواہ وہ کتنی اچھی ہو۔

آیت 17 وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى: یعنی وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے سیدھے راستے پر چل پڑتے ہیں تو وہی باتیں ان کی ہدایت میں اضافے کا باعث بن جاتی ہیں جو منافقین کی سمجھ میں نہیں آتیں اور اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے سے انہیں مزید ہدایت عطا فرماتا ہے اور انہیں ان کاموں کی توفیق عطا فرماتا ہے جن کے ذریعے سے وہ جہنم کی آگ سے بچ جاتے ہیں۔

آیت 18 ﴿۱﴾ قَبَلٌ يَنْظُرُونَ إِلَّا السَّاعَةَ أَنْ تَأْتِيَهُمْ بَغْتَةً: یعنی کون سی نصیحت اور کون سی وعید ہے جو انہیں نہیں سنائی گئی اور کون سی دلیل ہے جو ان کے سامنے پیش نہیں کی گئی، مگر وہ اتنے بد بخت ہیں کہ جب تک قیامت کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں ایمان لانے کے لیے تیار نہیں۔ اس لیے گویا اسی کا انتظار کر رہے ہیں کہ وہ اچانک ان کے سامنے آکھڑی ہو، نہ پہلے علم ہونے کی وجہ سے اس پر ایمان لاسکیں نہ اس کی تیاری کر سکیں۔

﴿۲﴾ فَكَذَّبَتْ إِثْرًا ۚ: یعنی جس قیامت کا انتظار کر رہے ہیں اس کے آنے میں دیر بھی کیا رہ گئی ہے، اس کی نشانیاں تو آ ہی چکی ہیں، اب اس کے آنے میں کیا شبہ باقی ہے؟ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں: ”بڑی نشانی قیامت کی ہمارے نبی ﷺ کا پیدا ہونا ہے۔ سب نبی خاتم النبیین کی راہ دیکھتے تھے، جب وہ آچکے تو قیامت ہی آئی رہ گئی ہے۔“ (موضح) ابوہریرہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «بُعِثْتُ أَنَا وَالسَّاعَةَ كَهَاتَيْنِ» (بخاری، الرفاع، باب قول النبي ﷺ: «بعثت أنا والساعة كهاتين»: ۱۶۵۰) ”میں اور قیامت اس طرح بھیجے گئے ہیں جس طرح یہ (دو انگلیاں) ہیں۔“ یعنی جس طرح شہادت کی انگلی اور درمیانی انگلی ایک دوسری سے ملی ہوئی ہیں اسی طرح قیامت میرے بعد متصل آ رہی ہے۔ قیامت کی بڑی نشانیوں میں سے شق قمر کی نشانی بھی رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں ظاہر ہو چکی تھی، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَإِذَا فَتَرَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ﴾ (القدر: ۱) ”قیامت بہت قریب آگئی اور چاند پھٹ گیا۔“ آلوسی نے فرمایا: ”ظاہر یہ ہے کہ ان نشانیوں سے

فَاعْلَمْ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ؕ وَاللَّهُ يَعْلَمُ

پس جان لے کہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اپنے گناہ کی معافی مانگ اور مومن مردوں اور مومن
وہی نشانیاں مراد ہیں جو اس آیت کے نزول کے وقت نمودار ہو چکی تھیں۔“

③ فَاَلَيْ لَكُمْ اِذَا جَاءَتْهُمْ ذِكْرُهُمْ : ”ذِكْرُهُمْ“ مبتدا ہے اور ”فَاَلَيْ لَكُمْ“ اسم استفہام خبر مقدم ہے۔ ”فَاَلَيْ لَكُمْ اِذَا جَاءَتْهُمْ ذِكْرُهُمْ“ پھر جب وہ ان کے پاس آگئی تو ان کے لیے ان کی نصیحت کیسے ممکن ہوگی، ”اِذَا جَاءَتْهُمْ“ میں ”جَاءَتْ“ کا فاعل ”السَّاعَةِ“ کی ضمیر ہے۔ (التسہیل) یعنی جب ان کے پاس قیامت آگئی تو نصیحت قبول کرنے یا مان لینے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ یہی بات اس آیت میں بیان ہوئی ہے: ﴿يَوْمَئِذٍ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَ اَنَّى لَهٗ الذِّكْرٰى﴾ [الفجر : ۲۳]
”اس دن انسان نصیحت حاصل کرے گا اور (اس وقت) اس کے لیے نصیحت کہاں۔“ مزید دیکھیے سورہ سبا (۵۱، ۵۲) اور سورہ مومن (۸۳، ۸۵)۔

آیت 19 ﴿ ۱۹ ﴾ فَاَعْلَمْ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ : اس فاء کو نصیحہ (اظہار کرنے والی) کہتے ہیں، یعنی اس سے اس شرط کا اظہار ہوتا ہے جو گزشتہ کلام سے معلوم ہوتی ہے۔ اس آیت کا تعلق سورت کی گزشتہ تمام آیات کے ساتھ ہے، یعنی جب تم کفار اور ایمان والوں کا حال جان چکے اور یہ بھی کہ بھلائی اور کامیابی کا دار و مدار تو حید اور اطاعت پر ہے اور برائی اور ناکامی کا دار و مدار شرک اور نافرمانی پر ہے تو یہ بات بھی جان لو کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ (ابو السعود) ابو العالیہ اور ابن عیینہ نے فرمایا کہ اس کا تعلق اس سے پہلی آیت کے ساتھ ہے، یعنی جب ان کے پاس قیامت آگئی تو جان لو کہ اس کے قائم ہونے پر اللہ کے سوا بھاگنے یا پناہ حاصل کرنے کی کوئی جگہ نہیں (کیونکہ معبود برحق وہی ہے)۔ (بنغوی)

② یہاں ایک سوال ہے کہ رسول اللہ ﷺ تو اس حقیقت کو پہلے ہی جانتے تھے کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، جیسا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ اَتَقَاكُمُ وَاَعْلَمَكُم بِاللّٰهِ اَنَا ﴾ [بخاری، الإيمان، باب قول النبی ﷺ : ” اَنَا اَعْلَمُكُمْ بِاللّٰهِ : ۲۰] ”یقیناً میں تم سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا اور تم سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کا علم رکھنے والا ہوں۔“ پھر یہ کہنے کا کیا مطلب ہے کہ ”جان لو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔“ اہل علم نے اس کے متعدد جوابات دیے ہیں اور وہ سب درست ہیں۔ ایک یہ کہ ”فَاعْلَمْ“ کے مخاطب اگرچہ بظاہر رسول اللہ ﷺ ہیں مگر خطاب امت کے ہر فرد کو ہے۔ دلیل اس کی آیت کے آخری الفاظ ہیں جن میں صراحتاً سب کو مخاطب فرمایا ہے: ﴿ وَ اَللّٰهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَاْمَثَلِكُمْ ﴾ ”اور اللہ تمہارے چلنے پھرنے کو اور تمہارے ٹھہرنے کو جانتا ہے۔“ جیسا کہ سورہ طلاق کے شروع میں فرمایا: ﴿ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا ظَلَمْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِقُوهُنَّ لِوَعْدِهِنَّ وَاَحْضُوا الْوِعْدَةَ وَاَتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ لَا تُخْرِجُوهُنَّ مِنْ بَيْوتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ اِلَّا اَنْ يَأْتِيَنَّ بِغَايِبَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ﴾ [الطلاق : ۱] ”اے نبی! جب تم عورتوں کو طلاق دو تو انہیں ان کی عدت کے وقت طلاق دو اور عدت کو گنو اور اللہ سے ڈرو جو تمہارا رب ہے، نہ تم انہیں ان کے گھروں سے نکالو اور نہ وہ نکلیں مگر یہ کہ کوئی

مُتَقَلِّبَكُمْ وَ مَثُوكُمْ ﴿۱۹﴾

مورتوں کے لیے بھی اور اللہ تمہارے چلنے پھرنے اور تمہارے ٹھہرنے کو جانتا ہے ﴿۱۹﴾

کھلی بے حیائی (عمل میں) لائیں۔“

دوسرا جواب یہ ہے کہ ”فَاعَلَمَ“ کا معنی یہ ہے کہ ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ“ کے علم پر ثابت اور قائم رہو، جیسا کہ فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَ الْكِتَابِ الَّذِي آتَيْنَا مِن قَبْلُ﴾ [النساء: ۱۳۶] ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر نازل کی اور اس کتاب پر جو اس نے اس سے پہلے نازل کی۔“ اکثر مفسرین نے یہاں ”فَاعَلَمَ“ کا یہی معنی بیان فرمایا ہے۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ کسی حقیقت کے علم کی ابتدا اس کی معرفت سے ہوتی ہے کہ دل اسے جان لے، پھر اس کے یقین کا مرتبہ آتا ہے اور اس علم کی تکمیل اس سے ہوتی ہے کہ اس کے تقاضے کے مطابق عمل کرے۔ مطلب یہ ہے کہ ”لا الہ الا اللہ“ کی معرفت اور اس کا یقین حاصل کرو اور اس کے تقاضوں پر عمل کرو۔ ظاہر ہے کہ علم اور یقین کے بے شمار درجے ہیں اور عمل کے لحاظ سے درجوں کا بھی کوئی شمار نہیں۔ ابراہیم علیہ السلام کا قول: ﴿وَلَكِنْ لِّيَطْمَئِنُّ قَلْبِي﴾ [البقرة: ۲۶۰] (اور لیکن اس لیے کہ میرا دل پوری تسلی حاصل کر لے) اس کی دلیل ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو حکم دیا: ﴿وَقُلْ رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا﴾ [طہ: ۱۱۴] ”اور تو کہہ اے میرے رب! مجھے علم میں زیادہ کر۔“ اور کہنے والے نے کیا خوب کہا ہے۔

چوں می گویم مسلمانم بلرزم کہ دانم مشکلات لا الہ را

”جب میں کہتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں تو لرز جاتا ہوں، کیونکہ میں ”لا الہ“ کی مشکلات کو جانتا ہوں۔“

سورہ نساء کی آیت (۱۳۶): ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ﴾ کا ایک معنی یہ بھی کیا گیا ہے کہ اپنے ایمان کے تقاضے کے مطابق عمل کرو۔ خلاصہ یہ کہ ہر لمحے ”لا الہ الا اللہ“ کی معرفت، اس کے یقین اور اس پر عمل میں اضافے کی کوشش کرتے رہو۔ چوتھا یہ کہ ہر وقت اس حقیقت کو یاد اور نظر کے سامنے رکھو کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، گویا ”اعْلَمَ“ بمعنی ”أَذْكَرُ“ ہے۔

③ اس آیت سے علم کی فضیلت ثابت ہوتی ہے، کیونکہ ہر قول اور عمل سے پہلے علم کا حصول لازم ہے، جیسا کہ فرمایا:

﴿اعْلَمُوا أَنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَ لَهْوٌ﴾ [الحديد: ۲۰] ”جان لو کہ دنیا کی زندگی اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک کھیل ہے۔“ اس کے بعد فرمایا: ﴿سَابِقُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاءِ وَ الْأَرْضِ﴾ [الحديد: ۲۱] ”اپنے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف ایک دوسرے سے آگے بڑھو جس کی چوڑائی آسمان اور زمین کی چوڑائی کی طرح ہے۔“ اور امام بخاری رحمہ اللہ نے صحیح بخاری میں فرمایا: ”بَابُ الْعِلْمِ قَبْلَ الْقَوْلِ وَ الْعَمَلِ لِقَوْلِ اللَّهِ تَعَالَى :

﴿عَلَّمَ آتَاكَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ﴾ فَبَدَأَ بِالْعِلْمِ“ [بخاری، العلم، قبل ح: ۶۸] ”علم مقدم ہے قول اور عمل پر، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے (سورہ محمد میں) فرمایا: ”پس تو جان لے کہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔“ اس آیت میں اللہ نے علم کو پہلے بیان کیا ہے۔“

④ **وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ** : قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اللہ تعالیٰ نے استغفار کا حکم دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر عمل کرتے رہے اور امت کو بھی اس کی تاکید فرماتے رہے۔ چنانچہ اس سے متعلق یہاں دو احادیث نقل کی جاتی ہیں، ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ یہ دعا کیا کرتے تھے: ﴿اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِي خَطِيئَتِي وَجَهْلِي وَعَسْرَاتِي فِي أَمْرِي وَمَا أَنْتَ أَعْلَمُ بِهِ مِنِّي، اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِي جِدِّي وَهَزْلِي وَخَطِيئِي وَعَمْدِي وَكُلُّ ذَلِكَ عِنْدِي، اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِي مَا قَدَّمْتُ وَمَا أَخَّرْتُ وَمَا أَسْرَرْتُ وَمَا أَعْلَنْتُ وَمَا أَنْتَ أَعْلَمُ بِهِ مِنِّي، أَنْتَ الْمُقَدِّمُ وَأَنْتَ الْمُؤَخِّرُ وَأَنْتَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ [مسلم، الذكر والدعاء، باب في الأدعية: ۲۷۱۹] ”اے اللہ! میری خطا کو، میرے جہل کو، میرے کام میں میری زیادتی کو اور ان تمام گناہوں کو میرے لیے بخش دے جنہیں تو مجھ سے زیادہ جانتا ہے۔ اے اللہ! میرے سنجیدگی سے کیے ہوئے کاموں کو، میرے مذاق سے کیے ہوئے کاموں کو، میرے بھول کر کیے ہوئے اور جان بوجھ کر کیے ہوئے گناہوں کو میرے لیے بخش دے اور یہ سب میرے پاس موجود ہیں۔ اے اللہ! تو مجھے وہ سب گناہ بخش دے جو میں نے پہلے کیے اور جو میں نے بعد میں کیے اور جو چھپا کر کیے اور جو علانیہ کیے اور جنہیں تو مجھ سے زیادہ جاننے والا ہے۔ تو ہی آگے کرنے والا ہے اور تو ہی پیچھے کرنے والا ہے اور تو ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔“ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا: ﴿وَاللَّهِ! إِنِّي لَأَسْتَغْفِرُ اللَّهَ وَأَتُوبُ إِلَيْهِ فِي الْيَوْمِ أَكْثَرَ مِنْ سَبْعِينَ مَرَّةً﴾ [بخاری، الدعوات، باب استغفار النبي ﷺ في اليوم والليلة: ۶۳۰۷] ”اللہ کی قسم! میں دن میں ستر (۷۰) بار سے زیادہ اللہ سے استغفار کرتا ہوں اور اس کی طرف توبہ کرتا ہوں۔“

⑤ **وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ** : یہ حکم نبی ﷺ کو بھی ہے اور امت کے تمام افراد کو بھی کہ وہ اپنے علاوہ دوسرے تمام مومن مردوں اور عورتوں کے لیے بھی استغفار کریں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایمان والوں پر اپنے مومن بھائیوں کے لیے استغفار واجب ہے۔ پہلے جلیل القدر انبیاء علیہم السلام کا بھی یہی عمل رہا ہے، جیسا کہ نوح علیہ السلام نے دعا کی: ﴿رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِئِن دَخَلْتُ بَيْتِي مُؤْمِنًا وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ دُونَ ذَلِكَ الظَّالِمِينَ إِلَّا تَبَأْتِ﴾ [نوح: ۲۸] ”اے میرے رب! مجھے بخش دے اور میرے ماں باپ کو اور اس کو جو مومن بن کر میرے گھر میں داخل ہو اور ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں کو اور ظالموں کو ہلاکت کے سوا کسی چیز میں نہ بڑھا۔“ اور ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی: ﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَالْمُؤْمِنِينَ يَوْمَ يَقُومُ الْحِسَابُ﴾ [ابراہیم: ۴۱] ”اے ہمارے رب! مجھے بخش دے اور میرے ماں باپ کو اور ایمان والوں کو، جس دن حساب قائم ہوگا۔“

وَيَقُولُ الَّذِينَ آمَنُوا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُورَةٌ ۚ فَإِذَا أُنزِلَتْ سُورَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَذُكِرَ فِيهَا
الْقِتَالُ رَأَيْتَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ يَنْظُرُونَ إِلَيْكَ نَظَرَ الْعُشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۗ
فَأُولَئِكَ لَهُمْ ۝

اور وہ لوگ جو ایمان لائے کہتے ہیں کوئی سورت کیوں نازل نہیں کی گئی؟ پھر جب کوئی محکم سورت نازل کی جاتی ہے اور اس میں لڑائی کا ذکر کیا جاتا ہے تو تو ان لوگوں کو دیکھے گا جن کے دلوں میں بیماری ہے، وہ تیری طرف اس طرح دیکھیں گے جیسے اس شخص کا دیکھنا ہوتا ہے جس پر موت کی غشی ڈالی گئی ہو۔ پس ان کے لیے بہتر ہے ۝

۶ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ اور تمام ایمان والوں کو مومن مردوں اور عورتوں کے لیے استغفار کا جب خود حکم دیا تو یہ دلیل ہے کہ وہ اسے قبول بھی فرمائے گا۔ ظاہر ہے کہ ہر مومن، مرد ہو یا عورت، زندہ ہو یا فوت شدہ، استغفار کی ان دعاؤں میں شامل ہے جو رسول اللہ ﷺ سے لے کر امت کے آخری آدمی نے ایمان والوں کے حق میں کی ہیں اور جس کے حق میں نبی کریم ﷺ اور اللہ تعالیٰ کے بے شمار مقبول بندوں کی مغفرت کی دعائیں ہوتی ہوں اس کی مغفرت سے ناامید ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ اس لیے کسی بھی مومن کے متعلق یہ کہنا درست نہیں کہ وہ جہنمی ہے، یا اللہ تعالیٰ اسے معاف نہیں کرے گا، خواہ وہ کتنا زیادہ گناہ گار ہو۔ شرط یہ ہے کہ وہ ایمان کی دولت اپنے دامن میں رکھتا ہو اور شرک کی نجاست سے آلودہ نہ ہو۔

۷ وَاللَّهُ يَسْمَعُ مُتَقَلِّبِكُمْ وَ مُؤْمِنِكُمْ : ”مُتَقَلِّبٌ“ اور ”مُؤْمِنٌ“ (تَقَلُّبٌ) اور ”تَوْبٌ يَتَوْبُنِي“ (ض) سے مصدر بھی ہو سکتے ہیں اور ظرف مکان بھی۔ پہلی صورت میں معنی ہے تمہارا چلنا پھرنا اور تمہارا ٹھہرنا اور دوسری صورت میں معنی ہے ”تمہارے چنتے پھرنے کی جگہ اور تمہارے ٹھہرنے کی جگہ۔“ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری نقل و حرکت کو اور تمہارے ٹھہرنے کو اور تمہارے چنتے پھرنے کے اور تمہارے ٹھہرنے کے مقامات کو خوب جانتا ہے۔ اس میں کفار اور نافرمانوں کے لیے وعید ہے اور اللہ کے فرماں بردار بندوں کے لیے بشارت ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری جائز یا ناجائز ہر حرکت و سکون سے واقف ہے اور واقف ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ فرماں برداروں کو انعام دے گا اور نافرمانوں کو سزا دے گا۔

آیت 20 : ۱ وَيَقُولُ الَّذِينَ آمَنُوا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُورَةٌ : اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے منافقوں اور ایمان والوں کا حال ان آیات کو سننے کے وقت فرمایا جو توحید، قیامت اور دوسرے اعتقادی معاملات سے تعلق رکھتی ہیں۔ چنانچہ ”وَمِنْهُمْ مَّنْ يَنْتَحِرُ إِلَيْكَ“ میں منافقین کا حال بیان فرمایا اور ”وَالَّذِينَ اهْتَنُوا وَ زَادَهُمْ هُدًى“ میں ایمان والوں کا حال بیان فرمایا۔ اب عمل سے تعلق رکھنے والی آیات مثلاً جہاد، نماز اور زکوٰۃ وغیرہ کے متعلق ان کا طرزِ عمل بیان فرمایا۔ وہ یہ کہ مخلص مومن ہمیشہ ایسے کاموں کے بارے میں وحی کے نزول کے منتظر اور امیدوار رہتے، تاکہ ان پر عمل کر کے زیادہ سے زیادہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کر سکیں، جب اس کے نزول میں تاخیر ہوتی تو کہتے کہ ایسی کوئی آیت یا سورت کیوں نازل نہیں کی گئی اور منافقین کا یہ حال تھا کہ جب مشقت والی ایسی کوئی سورت یا آیت اترتی تو ان پر بہت شاق گزرتی، خصوصاً جہاد کا ذکر آنے پر تو خوف

طَاعَةٌ وَ قَوْلٌ نَعْرُوفٌ فَإِذَا عَزَمَ الْأَمْرُ فَلَوْ صَدَقُوا اللَّهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّأَقْرَبُ ۝

حکم ماننا اور اچھی بات کہنا، پھر جب حکم لازم ہو جائے تو اگر وہ اللہ سے سچے رہیں تو یقیناً ان کے لیے بہتر ہو ۝

اور دہشت کے مارے ان کی آنکھیں کھلی رہ جاتیں۔

۲۱ ﴿وَيَقُولُ الَّذِينَ آمَنُوا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُورَةٌ:﴾ ہجرت کے بعد اگرچہ سورہ حج کی آیت (۳۹): ﴿أَذِنَ لِلَّذِينَ يُقَتِّلُونَ بِأَنفُسِهِمْ ظُلْمًا﴾ (ان لوگوں کو جن سے لڑائی کی جاتی ہے، اجازت دے دی گئی ہے، اس لیے کہ ان پر ظلم کیا گیا) کے ساتھ کفار سے قتال کی اجازت ہو چکی تھی، مگر اس کی فرضیت کا واضح حکم ابھی نہیں آیا تھا۔ مخلص مومن جو کفار کے ظلم و ستم سے شدید تک دل تھے اور فتح یا شہادت کے متنی تھے، کہتے رہتے تھے کہ جہاد کے حکم والی کوئی سورت کیوں نازل نہیں کی گئی۔

۲۲ ﴿وَإِذَا نُزِّلَتْ سُورَةٌ فَخُكِّمْنَا وَذُكِّرْنَا فِيهَا الْقِتَالَ:﴾ محکمہ سورت سے مراد ایسی سورت ہے جس میں دیا جانے والا حکم واضح ہو، جس میں کوئی تاویل نہ کی جاسکے اور نہ وہ منسوخ ہو۔ مراد اس سے یہی سورہ محمد (سنبھلا) ہے جس کا نام سورہ قتال بھی ہے، کیونکہ اس میں ”سَخِّهِدُوا“ (جہاد کرو) یا ”فَاتْلُوا“ (لڑو) کے بجائے قتال کا حکم ”فَضْرِبِ الرِّقَابَ“ کے بالکل صریح الفاظ کے ساتھ دیا گیا کہ کفار سے مذہبی طور پر لڑو اور ان کی گردنیں اڑا دو اور خوب خون ریزی کے بعد انہیں قیدی بناؤ وغیرہ۔

۲۳ ﴿رَأَيْتَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ...﴾: یعنی جب قتال کے واضح حکم والی سورت نازل کی گئی تو منافقین کا یہ حال ہوا۔ شاہ عبد القادر لکھتے ہیں: ”مسلمان سورت مانگتے تھے، یعنی کافروں کی ایذا سے عاجز ہو کر آرزو کرتے کہ اللہ جہاد کا حکم دے تو جو ہم سے ہو سکے کر گزریں۔ جب جہاد کا حکم آیا تو منافق اور کچے لوگوں پر بھاری ہوا، خوف زدہ اور بے رونق آنکھوں سے پیغمبر کی طرف دیکھنے لگے کہ کاش! ہم کو اس حکم سے معاف رکھیں۔ بے حد خوف میں بھی آنکھ کی رونق نہیں رہتی، جیسے مرتے وقت آنکھوں کا نور جاتا رہتا ہے۔“ (موضع) اس مضمون کی آیات کے لیے دیکھیے سورہ نساء (۷۷) اور سورہ الزاب (۱۹)۔

۲۴ ﴿فَأُولَىٰ لَهُمْ:﴾ مفسرین نے اس لفظ کی مختلف تفسیریں کی ہیں جن میں سب سے واضح اور تکلف سے خالی یہ ہے کہ یہ ”وَلِيٌّ بِنَبِيِّ وَلِيًّا“ (اس) سے اسم تفضیل ہے، جس کا معنی ہے زیادہ لائق، زیادہ قریب، بہتر۔ اب اس کی ترکیب دو طرح سے ہو سکتی ہے، ایک یہ کہ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے جو اس سے پہلے جملے سے معلوم ہو رہا ہے، یعنی ”فَأُولَىٰ لَهُمْ“ ”بئس موت ہی ان کے لیے بہتر ہے، یا موت ہی ان کے لائق ہے۔“ دوسری تفسیر حافظ ابن کثیر نے فرمائی ہے کہ ”فَأُولَىٰ لَهُمْ“ خبر مقدم ہے اور اگلی آیت میں ”طَاعَةٌ وَ قَوْلٌ نَعْرُوفٌ“ مبتدا مؤخر ہے۔ ان کے الفاظ میں عبارت یوں ہے: ”طَاعَةٌ وَ قَوْلٌ نَعْرُوفٌ أُولَىٰ لَهُمْ، أَي وَ كَانَ الْأُولَىٰ لَهُمْ أَنْ يُسْتَعَاوُوا وَيُطِيعُوا“ یعنی ان کے لیے بہتر تھا کہ وہ سنتے اور اطاعت کرتے۔

آیت 21 ﴿طَاعَةٌ وَ قَوْلٌ نَعْرُوفٌ﴾: اس کا تعلق یا تو پچھلی آیت کے آخری لفظ ”فَأُولَىٰ لَهُمْ“ کے ساتھ ہے، جیسا کہ گزرا اور اسے نیا جملہ سمجھا جائے تو اس کی ترکیب دو طرح سے ہو سکتی ہے، ایک یہ کہ یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر ”خَيْرٌ لَهُمْ“ محذوف ہے، یعنی حکم ماننا اور اچھی بات کہنا ان کے لیے بہتر ہے۔ دوسرا یہ کہ یہ مبتدا محذوف ”أَمْرُنَا“ کی خبر ہے، یعنی وہ

فَقُلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُمْ ﴿۲۲﴾ أُولَئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فَأَصَمَّهُمْ وَأَعَمَّى أَبْصَارَهُمْ ﴿۲۳﴾

پھر یقیناً تم قریب ہو اگر تم حاکم بن جاؤ کہ زمین میں فساد کرو اور اپنے رشتوں کو بالکل ہی قطع کر دو ﴿۲۲﴾ یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی۔ پس انہیں بہرا کر دیا اور ان کی آنکھیں اندھی کر دیں ﴿۲۳﴾

کہتے ہیں کہ ہمارا کام تو طاعت کرنا اور اچھی بات کہنا ہے۔

﴿۲۲﴾ فَلَمَّا عَزَمَ الْأَمْرُ فَلَوْ صَدَقُوا اللَّهَ : یعنی کہتے تو وہ یہی ہیں کہ ہمارا کام ”سَمِعْنَا وَ أَطَعْنَا“ یعنی حکم ماننا اور اچھی بات کہنا ہے، مگر جب جہاد کا قطعی اور لازمی حکم آجائے تو وہ اپنی بات میں جھوٹے نکلنے ہیں، اگر وہ اس وقت اپنی بات میں اللہ سے سچے رہیں تو یقیناً ان کے لیے بہتر ہے۔

آیت 22 : ﴿فَقُلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ : ”ہل“ کے معنی کی تحقیق کے لیے دیکھیے سورہ دہر کی پہلی آیت: ﴿هَلْ أَتَى عَلَى الْإِنْسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ﴾ کی تفسیر۔ یہاں یہ ”قَدْ“ (یقیناً) کے معنی میں ہے۔ ”عَسَيْتُمْ“ تم قریب ہو، تم سے امید ہے۔ ”تَوَلَّيْتُمْ“ یا تو ”نَوَلَّى الْوِلَايَةَ“ سے ہے، حاکم یا صاحب اقتدار ہونا، یا ”تَوَلَّى عَنْهُ“ سے ہے، منہ موڑنا، اعراض کرنا۔ اگر حاکم ہونے سے ہو تو آیت کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ طاعت اور قول معروف اختیار کرو، کیونکہ اگر تم اسی نفاق کی حالت میں حکومت پر متمسک ہو جاؤ تو یقیناً تم قریب ہو کہ ایمان سے خالی ہونے کی وجہ سے اسلام سے پہلے والی حالت کی طرف پلٹ جاؤ گے، اپنی خواہشات نفس پوری کرنے کے لیے زمین میں فساد کرو گے اور اپنی رشتہ داریاں بری طرح قطع کر دو گے۔ اور اگر ”تَوَلَّيْتُمْ“ کا معنی اعراض اور منہ موڑنا ہو تو مطلب یہ ہے کہ تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ جب جہاد کا حکم قطعی اور لازمی ہو جائے تو اپنا صدق ثابت کرتے ہوئے اللہ کی راہ میں جہاد کرو، کیونکہ اگر تم نے جہاد سے منہ موڑا تو ہرگز امن و امان سے نہیں رہو گے، بلکہ نافرمانی اور قطع رحمی کرو گے، جس کے نتیجے میں خانہ جنگی، نافرمانی اور لوٹ مار کی وہی حالت لوٹ آئے گی جو اسلام سے پہلے تھی۔ ”تُقَطِّعُوا“ (تفعیل) میں مبالغہ ہے، یعنی تم اپنی رشتہ داریاں بری طرح قطع کرو گے، یا بالکل قطع کر دو گے۔

آیت 23 : ﴿أُولَئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ : یعنی یہ لوگ جو قریب تھے کہ حکومت میں آجائیں تو اندھے بہرے ہو کر ظلم و فساد پھیلائیں اور قطع رحمی کرنے لگیں، یا قریب تھے کہ طاعت اور جہاد سے منہ موڑیں تو زمین میں فساد پھیلائیں اور رشتہ داریوں کو بری طرح قطع کر دیں، اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت کی اور انہیں ایسا بہرا، اندھا اور سنگ دل بنا دیا کہ وہ جہاد کی برکات سمجھ ہی نہ سکے کہ اس کی بدولت مسلمانوں کی پریشانیاں اور مصیبتیں ختم ہوتی ہیں، انہیں عزت اور سر بلندی ملتی ہے، فتنہ و فساد اور شرک و کفر ختم ہوتا ہے اور زمین امن کا گہوارہ بن جاتی ہے۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا فَطُبِعَ عَلَى قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُونَ﴾ [المنافقون: ۳] ”یہ اس لیے کہ وہ ایمان لائے، پھر انہوں نے کفر کیا تو

أَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَى قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا ﴿۲۴﴾ إِنَّ الَّذِينَ ارْتَدُّوا عَلَىٰ أَدْبَارِهِمْ مِن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَىٰ ۖ الشَّيْطَانُ سَوَّلَ لَهُمْ ۚ وَأَمْلَىٰ لَهُمْ ۗ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لِلَّذِينَ كَرِهُوا مَا نَزَّلَ اللَّهُ سَنُطِيعُكُمْ فِي بَعْضِ الْأَمْرِ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِسْرَارَهُمْ ﴿۲۵﴾

تو کیا وہ قرآن میں غور نہیں کرتے، یا کچھ دلوں پر ان کے قفل پڑے ہوئے ہیں؟ ﴿۲۴﴾ بے شک وہ لوگ جو اپنی بیٹیوں پر پھر گئے، اس کے بعد کہ ان کے لیے سیدھا راستہ واضح ہو چکا، شیطان نے ان کے لیے (ان کا عمل) مزین کر دیا اور ان کے لیے مہلت لمبی بتائی ﴿۲۵﴾ یہ اس لیے کہ انھوں نے ان لوگوں سے کہا جنھوں نے اس چیز کو ناپسند کیا جو اللہ نے نازل کی، عنقریب ہم بعض کاموں میں تمہارا کہا مانیں گے اور اللہ ان کے چھپانے کو جانتا ہے ﴿۲۵﴾

ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی، سو وہ نہیں سمجھتے۔“

آیت 24 ﴿۲۴﴾ أَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ الْقُرْآنَ : اوپر کی آیت کے سیاق کو ملحوظ رکھا جائے تو مطلب یہ ہو گا کہ یہ لوگ ملعون ہونے کی وجہ سے یا تو قرآن پر غور و تدبر ہی نہیں کرتے، یا کرتے ہیں تو اس کے معانی و مطالب ان کی سمجھ میں نہیں آتے، کیونکہ ان کے دلوں پر کفر و نفاق کے قفل چڑھے ہوتے ہیں۔ ہاں، اگر صدق نیت سے غور کرتے تو ضرور سمجھ لیتے کہ جہاد میں کس قدر دیوبی اور اخروی فوائد ہیں۔

آیت 25 ﴿۲۵﴾ ﴿۱﴾ إِنَّ الَّذِينَ ارْتَدُّوا عَلَىٰ أَدْبَارِهِمْ : ان سے مراد منافقین ہی ہیں جنھوں نے راہِ حق واضح ہونے اور اسلام کا اقرار کرنے کے بعد جہاد سے گریز کرتے ہوئے کفر و ارتداد کی راہ اختیار کی۔

﴿۲﴾ الشَّيْطَانُ سَوَّلَ لَهُمْ ۚ وَأَمْلَىٰ لَهُمْ : یعنی شیطان نے ان کے لیے ان کے کفر و ارتداد اور جہاد سے فرار کو خوش نما بنا دیا اور ان کے لیے مہلت لمبی بتائی، یعنی ان کے دلوں میں ڈال دیا کہ اگر جہاد نہ کر دے گا تو لمبی مدت تک زندہ رہو گے اور دنیا کے عیش و آرام سے فائدہ اٹھاؤ گے۔ شیطان کا کام ہی خواہش اور آرزوئیں دلا کر گمراہ کرنا ہے۔ (دیکھیے نساء: ۱۱۹، ۱۲۰) حالانکہ انھیں سمجھنا چاہیے تھا کہ موت اپنے وقت پر آتی ہے، اس میں لمحہ بھر تقدیم و تاخیر نہیں ہوتی، پھر جہاد سے بھاگنے کا کیا فائدہ؟

آیت 26 ﴿۲۶﴾ ﴿۱﴾ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لِلَّذِينَ كَرِهُوا مَا نَزَّلَ اللَّهُ : ”یہ اس لیے کہ انھوں نے اس چیز کو ناپسند کیا جو اللہ نے نازل کی تو اس نے ان کے اعمال ضائع کر دیے۔“

﴿۲﴾ سَنُطِيعُكُمْ فِي بَعْضِ الْأَمْرِ : بعض کاموں سے مراد رسول اللہ ﷺ کی مخالفت اور عداوت ہے اور یہ کہ جب جنگ کا موقع آئے مسلمانوں کو دھوکا دیا جائے اور ہر طریقے سے ان کے دشمنوں کی مدد کی جائے۔ یعنی ان کے ایمان قبول کرنے کے

فَكَيْفَ إِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ يَضْرِبُونَ وُجُوهُهُمْ وَ أَدْبَارَهُمْ ﴿۲۷﴾ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ اتَّبَعُوا مَا
 أَسْحَطَ اللَّهُ وَ كَرِهُوا رِضْوَانَهُ فَ أَحْبَبَ أَعْيُنَهُمْ ﴿۲۸﴾

تو کیا حال ہو گا جب فرشتے ان کی روح قبض کریں گے، ان کے چہروں اور ان کی پیٹھوں پر مارے ہوں گے ﴿۲۷﴾ یہ
 اس لیے کہ انھوں نے اس چیز کی پیروی کی جس نے اللہ کو ناراض کر دیا اور اس کی خوشنودی کو برا جانا تو اس نے ان
 کے اعمال ضائع کر دیے ﴿۲۸﴾

بعد کفر و ارتداد کی طرف پلٹنے، جہاد سے فرار اور منافقت اختیار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ دوسرے مخلص
 مسلمانوں کی طرح وہ تمام کاموں میں رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرتے، انھوں نے اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ دین کو ناپسند
 کرنے والے کفار سے کہا کہ ہم اسلام قبول کرنے اور مسلمانوں میں رہنے کی وجہ سے تمہاری ہر بات نہیں مان سکتے، نہ
 کھلم کھلا اپنے کفر کا اظہار کر سکتے ہیں، مگر ہم کچھ کاموں میں تمہاری اطاعت ضرور کریں گے۔ وہ اس طرح کہ جنگ کے
 موقع پر تمہاری مدد کریں گے، جیسا کہ رئیس المنافقین عبد اللہ بن ابی احد کے موقع پر عین میدان جنگ سے تین سو
 آدمیوں کو واپس لے گیا اور جس طرح منافقین نے بنو نضیر کے یہودیوں کو ہلا شیری دی کہ رسول اللہ ﷺ کے خلاف
 ڈٹے رہو، اگر تمہیں نکالا گیا تو ہم تمہارے ساتھ نکلیں گے اور اگر تم سے جنگ کی گئی تو ہم تمہارے ساتھ مل کر لڑیں گے۔
 دیکھیے سورہ حشر (۱۱)۔

﴿۲۷﴾ وَاللَّهُ يَعْلَمُ أَسْرَارَهُمْ : اور اللہ تعالیٰ ان کی سرگوشیوں اور سازشوں کو جو وہ چھپ کر کرتے ہیں خوب جانتا ہے۔ مطلب یہ
 ہے کہ وہ انھیں اس کی سزا ضرور دے گا۔ اس آیت کا مضمون سورہ نساء کی آیت (۸۱) میں بھی بیان ہوا ہے۔

آیت 28-27 ﴿۱﴾ فَكَيْفَ إِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ : یعنی دنیا میں تو انھوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد کفار کا ساتھ
 اس لیے دیا کہ کفر و اسلام کی جنگ میں دونوں جانب سے مفادات حاصل کر سکیں، اپنے آپ کو جنگ کے نقصانات اور خطرات
 سے بچائیں اور اپنے چہروں اور پیٹھوں کو تیر و تلوار کی مار سے بچائے رکھیں، مگر مرتے وقت ان کے چہروں اور پیٹھوں کو فرشتوں
 کی مار سے کون بچائے گا؟

﴿۲۸﴾ فَ أَحْبَبَ أَعْيُنَهُمْ : یعنی وہ تمام اعمال جو مسلمان بن کر وہ انجام دیتے رہے، مثلاً ان کی نماز، ان کے روزے، زکوٰۃ اور
 تمام عبادتیں جو بظاہر نیکیاں تھیں، اللہ تعالیٰ نے برباد کر دیے، کیونکہ یہ سب کچھ تب قبول ہوتا جب وہ اللہ تعالیٰ کو راضی
 کرنے کے لیے ہوتا۔ جب اسلام اور مسلمانوں سے بے وفائی اور غداری کر کے وہ چل ہی اس راستے پر پڑے جو اللہ تعالیٰ
 کو ناراض کرنے والا ہے اور انھیں اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا ہی پسند نہ رہا تو ان کے نماز روزے، صدقات اور دوسری نیکیوں
 سے کیا حاصل۔

أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ أَنْ لَنْ يُخْرِجَ اللَّهُ أَضْغَانَهُمْ ۖ وَلَوْ نَشَاءُ لَأَرَيْنَاكَهُمْ فَاعْرِفْتَهُمْ بِسِينِهِمْ ۖ وَ لَتَعْرِفَنَّهُمْ فِي لَحْنِ الْقَوْلِ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ

یا ان لوگوں نے جن کے دلوں میں کوئی بیماری ہے، یہ خیال کر لیا ہے کہ اللہ ان کے کینے کبھی ظاہر نہیں کرے گا ۲۹ اور اگر ہم چاہیں تو ضرور تجھے وہ لوگ دکھادیں، پھر یقیناً تو انہیں ان کی نشانی سے پہچان لے گا اور تو انہیں بات کے

آیت 29 : أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ : "أَضْغَانٌ" "ضِعْفٌ" کی جمع ہے، شدید کینہ، مراد اس سے وہ شدید حسد اور عداوت ہے جو منافقین رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کے خلاف دلوں میں رکھتے تھے۔ یعنی کیا ان منافقین نے گمان کر رکھا ہے کہ انھوں نے اپنے دل میں مسلمانوں کے خلاف جو شدید حسد اور بغض کی بے شمار باتیں چھپا رکھی ہیں اللہ تعالیٰ انہیں ظاہر نہیں کرے گا اور ان پر پردہ ہی پڑا رہے گا؟ نہیں، ایسا نہیں ہوگا، بلکہ اللہ تعالیٰ ان کے خجستہ باطن کو ضرور ظاہر کرے گا۔ چنانچہ سورہ توبہ میں منافقین کی سازشوں، عداوتوں اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ان کی زہریلی باتوں کو "وَمِنْهُمْ" "وَمِنْهُمْ" کہہ کر اس طرح کھول کر رکھ دیا کہ ان کی پہچان میں کوئی مشکل باقی نہ رہی۔ اس لیے سورہ توبہ کا نام سورہ فاضحہ یعنی منافقین کو رسوا کرنے والی سورت بھی ہے۔

آیت 30 : ① وَلَوْ نَشَاءُ لَأَرَيْنَاكَهُمْ فَاعْرِفْتَهُمْ بِسِينِهِمْ : "سِينًا" علامت۔ پچھلی آیت سے ظاہر ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ منافقین کی دلی عداوتوں اور ان کے نفاق کو ظاہر کر دے گا۔ اس پر سوال پیدا ہوا کہ پھر اس نے منافقین کا نام لے کر یا ان پر کوئی علامت لگا کر انہیں کیوں ظاہر نہیں کیا؟ اس کے جواب میں فرمایا کہ اس کی وجہ منافقین کا خوف یا کوئی اور خطرہ نہیں بلکہ محض ہماری مشیت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بات لفظ "لَوْ" کے ساتھ بیان فرمائی ہے، جس کا استعمال ایسی شرط کے لیے ہوتا ہے جو واقع نہیں ہوتی، اس لیے اس کی جزا بھی واقع نہیں ہوتی۔ یعنی اگر ہم چاہتے تو ہر منافق کا نام لے کر یا اس پر خاص نشانی لگا کر اسے شخصی طور پر آپ کو دکھا دیتے، جس کے ساتھ آپ ان سب کو صاف پہچان لیتے، مگر ہم نے یہ چاہا نہ کوئی ایسی علامت مقرر کر کے شخصی طور پر آپ کو ان کی پہچان کروائی، کیونکہ ہماری مصلحت و حکمت اور ہمارے ستر و حلم کا تقاضا یہی تھا کہ ان کو اس طرح رسوا نہ کیا جائے کہ کوئی توبہ کرنا چاہے تو نہ کر سکے، کیونکہ ہمارے ہاں منافقین کے لیے بھی توبہ کا دروازہ کھلا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿لِيَجْزِيَ اللَّهُ الصَّادِقِينَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنَافِقِينَ إِنْ شَاءَ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا﴾ [الأحزاب : ۲۴] "تا کہ اللہ بچوں کو ان کے سچ کا بدلہ دے اور منافقوں کو عذاب دے اگر چاہے، یا ان کی توبہ قبول فرمائے۔ بلاشبہ اللہ ہمیشہ سے بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے۔" اور اس میں اللہ تعالیٰ کی یہ بھی حکمت تھی کہ لوگ ظاہر کے مطابق فیصلہ کریں اور باطن کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیں۔

② وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِي لَحْنِ الْقَوْلِ : "وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ" تاکید کا لام اور نون ثقیلہ قسم کے جواب میں آتا ہے، یعنی اگرچہ اللہ تعالیٰ

اعمالکم ۳۰

انداز سے ضرور ہی پہچان لے گا اور اللہ تمہارے اعمال جانتا ہے ۳۰

نے آپ ﷺ کو منافقین کا نام لے کر یا ان کے چہروں پر کوئی نشانی لگا کر ان کی اطلاع نہیں دی مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ انہیں بالکل نہیں پہچانتے تھے، اللہ تعالیٰ نے قسم کھا کر فرمایا کہ آپ ان کی بات کے لہجے اور انداز سے یقیناً انہیں پہچان لیں گے۔ سورہ توبہ میں منافقین کے بہت سے اقوال و احوال اور افعال ذکر فرمائے ہیں جن سے ان کی شناخت میں کچھ مشکل پیش نہیں آتی۔ ایسی ہی باتوں کا حوالہ دے کر عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کو عبد اللہ بن ابی کا جنازہ پڑھنے سے روکنے کی کوشش کی تھی، جس کے بعد اللہ تعالیٰ نے منافقین کا جنازہ پڑھنے یا ان کی قبر پر کھڑے ہونے سے صراحت کے ساتھ منع فرما دیا۔ منافقین کی یہ پہچان بھی اللہ تعالیٰ نے ان کا نام لے کر یا ان پر نشانی لگا کر نہیں کروائی بلکہ بلا عذر جنگ تبوک سے پیچھے رہنے کو ان کی شناخت بنا دیا۔ چنانچہ جہاں ان پر جنازہ پڑھنے یا ان کی قبر پر کھڑا ہونے سے منع فرمایا ہے اس سے پہلے ان کا جرم بیان فرمایا ہے: ﴿قَرِحَ الْمُخَلَّفُونَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلْفَ رَسُولِ اللَّهِ وَكَرِهُوا أَنْ يُجَاهِدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَقَالُوا لَا تَنْفِرُوا فِي الْحَرِّ﴾ [التوبة: ۸۱] ”وہ لوگ جو پیچھے چھوڑ دیے گئے وہ اللہ کے رسول کے پیچھے اپنے بیٹھ رہنے پر خوش ہوئے اور انہوں نے ناپسند کیا کہ اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کے راستے میں جہاد کریں اور انہوں نے کہا اس گرمی میں مت نکلو۔“ پھر فرمایا: ﴿فَإِنْ رَجَعَكَ اللَّهُ إِلَى طَائِفَةٍ مِنْهُمْ فَاسْتَأْذِنُوا لِيُخْرُجَ فَقُلْ لَنْ تَخْرُجُوا مَعِيَ أَبَدًا وَ لَنْ تُقَاتِلُوا مَعِيَ عَدُوًّا إِنَّكُمْ رَضِيتُمْ بِالْقُعُودِ أَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوا مَعَ الْخُلَفَاءِ ۗ وَلَا تُصَلِّ عَلَى أَحَدٍ مِنْهُمْ مَاتَ أَبَدًا وَلَا تَقُمْ عَلَى قَبْرِهِ ۗ إِنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَمَاتُوا وَهُمْ فَسِقُونَ﴾ [التوبة: ۸۳، ۸۴] ”پس اگر اللہ تجھے ان میں سے کسی گروہ کی طرف واپس لے آئے، پھر وہ تجھ سے (جنگ کے لیے) نکلنے کی اجازت طلب کریں تو کہہ دے تم میرے ساتھ کبھی نہیں نکلو گے اور میرے ساتھ مل کر کبھی کسی دشمن سے نہیں لڑو گے۔ بے شک تم پہلی مرتبہ بیٹھ رہنے پر خوش ہوئے، سو پیچھے رہنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو۔ اور ان میں سے جو کوئی مر جائے اس کا کبھی جنازہ نہ پڑھنا اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہونا، بے شک انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا اور اس حال میں مرے کہ وہ نافرمان تھے۔“ منافقین کی ایسی ہی حرکتوں اور باتوں سے رسول اللہ ﷺ کو ان کی پہچان ہو جاتی تھی اور کئی مواقع پر آپ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بعض منافقین کے بارے میں آگاہ بھی فرمایا۔ صحیح مسلم کی ”کِتَابُ صِفَاتِ الْمُنَافِقِينَ وَ أَحْكَامِهِمْ“ میں مذکور احادیث میں ایسے کئی منافقین کا ذکر ہے۔

۳ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کو بعض منافقوں کے بارے میں جو آگاہ فرمایا مولانا ثناء اللہ امرتسری رضی اللہ عنہ نے اس کی اور توجیہ فرمائی ہے، وہ لکھتے ہیں: ”اس آیت کے نزول تک آں حضرت ﷺ کو منافقین کی تشخص کا علم نہ تھا، بعد اس کے کرایا گیا، جیسا کہ

وَلَنْبَلُوَكُمْ حَتَّى نَعْلَمَ الْمُجْهِدِينَ بِكُمْ وَالصَّابِرِينَ ۖ وَنَبَلُوا أَخْبَارَكُمْ ﴿۳۱﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا
وَصَدُّوا عَنِ سَبِيلِ اللَّهِ وَشَاقُّوا الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَىٰ ۖ لَنْ يَضُرُّوا اللَّهَ
شَيْئًا وَ سَيُحِيطُ أَعْمَالُهُمْ ﴿۳۲﴾

اور ہم ضرور ہی تمہیں آزمائیں گے، یہاں تک کہ تم میں سے جہاد کرنے والوں کو اور صبر کرنے والوں کو جان لیں اور
تمہارے حالات جانچ لیں ﴿۳۱﴾ بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور اللہ کی راہ سے روکا اور رسول کی مخالفت کی،
اس کے بعد کہ ان کے لیے سیدھا راستہ صاف ظاہر ہو گیا، وہ ہرگز اللہ کا کچھ نقصان نہ کریں گے اور عنقریب وہ ان
کے اعمال ضائع کر دے گا ﴿۳۲﴾

حدیثوں سے ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت حذیفہ صحابی کو بتا دیا تھا: ”(تفسیر ثنائی)

﴿۳۱﴾ وَاللَّهُ يَعْلَمُ أَعْمَالَكُمْ: یعنی ممکن ہے بندوں کو کسی کے نفاق کا علم نہ ہو سکے مگر اللہ تعالیٰ تمہارے سب کام جانتا ہے،
اس سے کوئی بات مخفی نہیں رہ سکتی۔

آیت 31 ﴿۳۱﴾ وَلَنْبَلُوَكُمْ حَتَّى نَعْلَمَ الْمُجْهِدِينَ بِكُمْ: یہ مسلمانوں سے عام خطاب ہے کہ منافقوں کے ذکر سے
یہ خیال نہ کرنا کہ تم امتحان سے مستثنیٰ ہو۔ ہرگز نہیں، بلکہ ہم ہر حال میں مختلف احکام کے ساتھ تمہاری آزمائش کریں گے، حتیٰ کہ
تم میں سے جہاد کرنے والوں اور صبر کرنے والوں کو جان لیں اور تمہارے حالات کی خوب جانچ پڑتال کر لیں۔

﴿۳۲﴾ یہاں ایک سوا ہے کہ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو جس طرح گزشتہ اور موجودہ کاموں کا علم ہے وہ ان
کاموں کو بھی جانتا ہے جو آئندہ ہونے والے ہیں، پھر اس بات کا کیا مطلب کہ یہاں تک کہ ہم تم میں سے جہاد کرنے
والوں اور صبر کرنے والوں کو جان لیں؟ حافظ ابن کثیر نے فرمایا: ”مراد یہ ہے کہ ہم اس بات کا واقعہ جانتا جاں لیں۔ اس لیے
ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس جیسے الفاظ کے بارے میں فرمایا کہ ”نَعْلَمُ“ کا معنی ”نہی“ ہے، یعنی حتیٰ کہ ہم دیکھ لیں۔“ (ابن کثیر)
یعنی بے شک اللہ تعالیٰ پہلے جانتا ہے کہ آئندہ کیا ہوگا، مگر یہ بات کہ وہ کام واقع ہو چکا ہے اس کے علم میں اسی وقت
آتی ہے جب وہ کام واقع ہو اور اس وقت ہی وہ اس کے واقع ہونے کو جانتا اور دیکھتا ہے۔ جو کام واقع ہی نہیں ہوا اس کے
متعلق کیسے کہا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ وہ واقع ہو چکا ہے۔ مزید دیکھیے سورہ آل عمران (۱۳۲)۔

آیت 32 ﴿۳۲﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنِ سَبِيلِ اللَّهِ: یعنی منافقین اور یہود جنہیں یہ معلوم ہو چکا کہ آپ ﷺ
واقعی اللہ کے رسول ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ پہلی کتابوں میں آپ ﷺ کی بشارتیں موجود ہیں مگر انہوں نے ضد اور عناد کی
وجہ سے آپ کی مخالفت کی، وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے، نہ اللہ کے رسول اور اللہ کے بندوں کا کچھ نقصان کر سکیں گے، بلکہ
وہ سراسر اپنا ہی نقصان کر رہے ہیں، کیونکہ اپنے خیال میں وہ جو اچھے کام کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں برباد کر دے گا اور

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَلَا تُبْطِلُوا أَعْمَالَكُمْ ﴿۳۳﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا
وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ مَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ ﴿۳۴﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کا حکم مانو اور اس رسول کا حکم مانو اور اپنے اعمال باطل مت کرو ﴿۳۳﴾ بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور اللہ کی راہ سے روکا، پھر اس حال میں مر گئے کہ وہ کافر تھے تو انہیں اللہ کبھی معاف نہیں کرے گا ﴿۳۴﴾ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے اور لوگوں کو اللہ کے دین سے روکنے کے لیے وہ جو سازشیں اور منصوبے تیار کرتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں ناکام بنا دے گا۔ مزید دیکھیے اسی سورت کی پہلی آیت میں ”أَصْلًا أَعْمَانَهُمْ“ کی تفسیر۔

آیت 33 يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ : یعنی اعمال کے قبول ہونے کی شرط یہ ہے کہ آدمی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا پابند رہے۔ اگر کوئی شخص اطاعت سے نکل کر مخالفت پر اتر آئے اور دشمنوں کے ساتھ ساز باز شروع کر دے تو اس کے سارے اعمال باطل ہیں، خواہ وہ اپنے خیال میں کتنے اچھے عمل کرتا رہے، جیسا کہ منافقین تھے کہ انہوں نے ایمان لانے کے بعد کفر اور عہد اطاعت کے بعد مخالفت کا راستہ اختیار کیا۔ یہاں آیت سے یہی مراد ہے، کیونکہ اس سے پہلے بھی منافقین کا ذکر ہے اور بعد میں بھی۔ گویا آیت کا مطلب یہ ہوا: ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور ان لوگوں کی طرح اپنے اعمال باطل مت کرو جن کے اعمال ان کے کفر اور اللہ کے راستے سے روکنے اور رسول کی مخالفت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے برباد کر دیے۔“ آیت کا یہ مطلب نہیں کہ اگر آدمی کسی نافرمانی یا کبیرہ گناہ کا ارتکاب کر بیٹھے تو اس کے پہلے تمام اعمال باطل ہو گئے، کیونکہ یہ اس آیت کے خلاف ہے: ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ﴾، وَ مَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ افْتَرَىٰ إِثْمًا عَظِيمًا ﴿۴۸﴾ [النساء: ۴۸] ”بے شک اللہ اس بات کو نہیں بخشنے گا کہ اس کا شریک بنایا جائے اور وہ بخش دے گا جو اس کے علاوہ ہے، جسے چاہے گا اور جو اللہ کا شریک بنائے تو یقیناً اس نے بہت بڑا گناہ گھڑا۔“ ہاں، آیت کا یہ مطلب ضرور ہو سکتا ہے کہ ہر عمل جس میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت نہ ہو اور وہ ان کے بتائے ہوئے طریقے پر نہ ہو وہ باطل ہے، کیونکہ عمل کی قبولیت کے لیے اخلاص اور اتباع سنت شرط ہے، جیسا کہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «مَنْ عَمِلَ عَمَلًا لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ» [مسلم، الأفضية، باب نقض الأحكام الباطلة و رد محدثات الأمور: ۱۷۱۸/۱۸] ”جو شخص وہ عمل کرے جس پر ہمارا عمل نہیں وہ مردود ہے۔“ بعض لوگوں نے اس آیت سے یہ بات نکالی ہے کہ کوئی نفل عمل، نماز ہو یا روزہ یا کوئی اور، اگر شروع کرے تو اسے پورا کرنا واجب ہے، کیونکہ اگر اسے پہلے چھوڑ دے گا تو اس نے عمل باطل کر دیا مگر یہ بات درست نہیں نہ آیت سے اس کا کوئی تعلق ہے۔ نفل پہلے بھی نفل ہوتا ہے بعد میں بھی۔ جس کا شروع کرنا واجب نہیں اسے پورا کرنا بھی واجب نہیں۔ تفصیل امہات الکتب میں دیکھیں۔

آیت 34 إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ : اس آیت میں کفار و منافقین کے لیے ترغیب ہے کہ کفر و

فَلَا تَهِنُوا وَتَدْعُوا إِلَى السَّلْمِ ۗ وَ أَنْتُمْ الْآفِلُونَ ۗ وَاللَّهُ مَعَكُمْ وَ لَنْ يَبْرِكُمْ

پس نہ کمزور بنو اور نہ صلح کی طرف بلاؤ اور تم ہی سب سے اونچے ہو اور اللہ تمہارے ساتھ ہے اور وہ ہرگز تم

نفاق اور اسلام کی مخالفت سے مرنے سے پہلے پہلے توبہ کر لو تو اللہ تعالیٰ تمہارے گزشتہ گناہ معاف کر دے گا، ورنہ اگر اسی حالت میں موت آگئی تو تمہاری بخشش کی کوئی صورت نہیں۔ یہ بات اللہ تعالیٰ نے متعدد آیات میں دہرائی ہے، دیکھیے سورۃ آل عمران (۹۱)، بقرہ (۱۶۱، ۱۶۲، ۲۱۷) اور سورۃ نساء (۱۸)۔

آیت 35 ① **فَلَا تَهِنُوا**: ”فَلَا تَهِنُوا“ کی فاء فصیحہ کہلاتی ہے۔ دیکھیے اسی سورت کی آیت (۱۹): ﴿فَاعْلَمْ أَنكَلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ﴾ کی تفسیر۔ یعنی جب تم منافقین کا جہاد سے فرار اختیار کرنا اور دوسروں کو بھی اس سے روکنا، کفار کے ساتھ دوستی اور اسلام اور مسلمانوں سے بے وفائی کرنا، رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کرنا، اس کے نتیجے میں ان پر لعنت ہونا اور ان کے اعمال برباد ہونا جان چکے تو تم وہ کام نہ کرنا جن کے نتیجے میں ان کا یہ انجام ہوا۔

② **فَلَا تَهِنُوا وَتَدْعُوا إِلَى السَّلْمِ**: منافقین چونکہ بزدلی اور موت کے خوف کی وجہ سے جنگ کا حوصلہ نہیں رکھتے تھے اس لیے صلح اور سمجھوتے کی باتیں بہت کرتے تھے، وہ مسلمانوں کو بھی مشورہ دیتے رہتے تھے کہ جنگ کے بجائے صلح سے معاملات طے کرنے چاہئیں۔ حالانکہ ان کی صلح جوئی کے پیچھے ان کی بے ہمتی، بزدلی اور کمزوری کے سوا کچھ نہیں تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان کی راہ اختیار کرنے سے منع فرما دیا۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یہ آیات اس زمانے میں نازل ہوئیں جب مدینہ ایک چھوٹی سی بستی تھی، جس میں مہاجرین و انصار کی مٹھی بھر جماعت اسلام کا جھنڈا اٹھائے ہوئے تھی اور اس کا مقابلہ صرف عرب کے سب سے طاقتور قبیلے قریش کے ساتھ نہیں تھا بلکہ پورے عرب کے کفار و مشرکین اور یہود کے ساتھ تھا۔ اس حالت میں فرمایا کہ ہمت ہار کر دشمنوں سے صلح کی درخواست مت کرو، بلکہ سردھڑکی بازی لگا دینے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ بدر و احد اور خندق میں تعداد کی کمی، بے حد کمزوری اور بے سروسامانی کے باوجود مسلمانوں نے نہ ہمت ہاری، نہ کمزوری دکھائی، نہ صلح کی پیش کش کی، بلکہ ڈٹ کر لڑے، یہاں تک کہ جب جنگ خندق کی گرد چھٹی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿الآن نَغْزُوهُمْ وَلَا يَغْزُونَنَا، نَحْنُ نَسِيرُ إِلَيْهِمْ﴾ [بخاری، المغازی، باب غزوة الخندق وهي الأحزاب: ۱۱۰] ”اب ہم ان پر حملے کے لیے جائیں گے، وہ ہم پر حملے کے لیے نہیں آئیں گے، ہم ہی ان پر فوج کشی کیا کریں گے۔“ طاوت و جالوت کی جنگ بھی اس کی واضح مثال ہے۔

③ **فَلَا تَهِنُوا** کے بعد ”تَدْعُوا“ بھی نہیں کے اس ”لَا“ کی وجہ سے مجزوم ہے جو ”تَهِنُوا“ پر آیا ہے اور اسی کی وجہ سے اس سے نون اعرابی گرا ہے، کیونکہ یہ اصل میں ”تَدْعُونَ“ تھا، لائے نہیں کی وجہ سے نون گر گیا تو ”تَدْعُوا“ رہ گیا۔ گویا اصل کلام ”فَلَا تَهِنُوا وَلَا تَدْعُوا إِلَى السَّلْمِ“ ہے، واو عطف کی وجہ سے ”لَا“ کو دوبارہ لانے کی ضرورت نہ رہی، اس لیے ترجمہ ہوگا: ”پس تم نہ کمزور بنو (نہ ہمت ہارو) اور نہ صلح کی طرف دعوت دو۔“ اس کی ایک مثال یہ آیت ہے: ﴿وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ

اعمالکم ﴿۳۵﴾

سے تمہارے اعمال کم نہ کرے گا ﴿۳۵﴾

يَا بَاطِلُ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَ أَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۳۵﴾ [البقرہ: ۲۴۲] اور حق کو باطل کے ساتھ خط ملط نہ کرو اور نہ حق کو چھپاؤ، جب کہ تم چہنتے ہو۔“ مطلب یہ ہے کہ دشمن سے جنگ میں ہمت نہ ہارو اور نہ ان کا خوف تم پر مسلط ہو بلکہ صبر کرو، ثابت قدم رہو، اپنے آپ کو لڑائی اور مقابلے پر جمائے رکھو اور صلح اور جنگ بندی کے سمجھوتے کی دعوت مت دو۔

﴿۳۶﴾ وَأَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ وَاللَّهُ مَعَكُمْ : ”لَنْ يَزِيْرَكُمْ“ ”وَلَنْ يَنْزِلَ“ ”وَلَنْ يَنْزِلَ“ ”وَلَنْ يَنْزِلَ“ کسی کا حق مارنا، اس میں کمی کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے ہمت نہ ہارنے اور دشمن کو صلح کی دعوت نہ دینے کی تین وجہیں بیان فرمائی ہیں، جن میں سے پہلی وجہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اگر تم نے ہمت نہ ہاری تو تم ہی غالب رہو گے، جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿۳۷﴾ وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿۳۷﴾ [ان عمران: ۱۳۹] ”اور نہ کمزور بنو اور نہ غم کرو اور تم ہی غالب ہو، اگر تم مؤمن ہو۔“ دوسری وجہ ”وَاللَّهُ مَعَكُمْ“ ہے کہ اللہ تمہارے ساتھ ہے اور جس کے ساتھ اللہ ہو کوئی وجہ نہیں کہ وہ ہمت ہارے اور صلح کی پیش کش کرے۔ اسی حوصلے پر رسول اللہ ﷺ نے کفار مکہ کے مقابلے میں اس وقت بھی ہمت نہیں ہاری جب آپ ﷺ دو میں سے دوسرے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿۳۸﴾ إِلَّا تَنْصُرُوهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللَّهُ إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا فَأَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ وَأَيَّدَهُ بِجُنُودٍ لَمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلَىٰ ۗ وَكَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۳۸﴾ [التوبة: ۲۵] ”اگر تم اس کی مدد نہ کرو تو بلاشبہ اللہ نے اس کی مدد کی، جب اسے ان لوگوں نے نکال دیا جنہوں نے کفر کیا، جب کہ وہ دو میں دوسرا تھا، جب وہ دونوں غار میں تھے، جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا غم نہ کر، بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ تو اللہ نے اپنی سکینت اس پر اتار دی اور اسے ان لشکروں کے ساتھ قوت دی جو تم نے نہیں دیکھے اور ان لوگوں کی بات نیچی کر دی جنہوں نے کفر کیا اور اللہ کی بات ہی سب سے اونچی ہے اور اللہ سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے۔“ تیسری وجہ ”وَلَنْ يَزِيْرَكُمْ أَعْمَالُكُمْ“ ہے کہ وہ ہرگز تم سے تمہارے اعمال کم نہیں کرے گا۔ مطلب یہ ہے کہ جہاد میں تم جو عمل بھی سرانجام دو گے تمہیں اس کا پورا پورا اجر ملے گا، اس میں کسی قسم کی کمی نہیں کی جائے گی۔ تمہارے اور تمہارے دشمن کے درمیان یہ بنیادی فرق ہے کہ تمہیں اس پر اللہ تعالیٰ سے اجر و ثواب، شہادت اور جنت کی امید ہے جب کہ کفار اس سے محروم ہیں۔ پھر ہمت ہارنے یا صلح کی پیش کش کا کیا مطلب ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿۳۹﴾ وَلَا تَهِنُوا فِي ابْتِغَاءِ الْقَوْمِ ۗ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ آلَافِيَهُمْ يَأْتِيَهُمْ كَمَا تَأْتِيَكُمْ ۗ وَ تَرْجُونَ مِنَ اللَّهِ مَا لَا يَرْجُونَ ﴿۳۹﴾ [الاسد: ۱۰۴] ”اور اس قوم کا پیچھا کرنے میں ہمت نہ ہارو، اگر تم تکلیف اٹھاتے ہو تو یقیناً وہ بھی تکلیف اٹھاتے ہیں، جیسے تم تکلیف اٹھاتے ہو اور تم اللہ سے وہ امید رکھتے ہو جو وہ امید نہیں رکھتے۔“ اور فرمایا: ﴿۴۰﴾ مَا كَانَ لِأَهْلِ الْمَدْيَنَةِ وَ مَنْ حَوْلَهُمْ مِنَ الْأَعْرَابِ أَنْ يَتَخَلَّفُوا عَنِ رَسُولِ اللَّهِ وَلَا يُرِغِبُوا بِأَنْفُسِهِمْ

عَنْ نَفْسِهِ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ لَا يُصِيبُهُمْ ظَمَأٌ وَلَا نَصَبٌ وَلَا مَخْمَصَةٌ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَطْنُونَ مَوْطِئًا يُغَيِّظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَمَانُونَ مِنَ عَدُوٍّ نِيْلًا إِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهِ عَمَلٌ صَالِحٌ إِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ۝ وَلَا يُنْفِقُونَ نَفَقَةً صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً وَلَا يَقْطَعُونَ وَادِيًا إِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللَّهُ أَحْسَنَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۶۱﴾

۱۔ النبیہ : ۱۶۱، ۱۶۲ | ”مدینہ والوں کا اور ان کے ارد گرد جو بدوی ہیں، ان کا حق نہ تھا کہ وہ رسول اللہ سے پیچھے رہتے اور نہ یہ کہ اپنی جانوں کو اس کی جان سے زیادہ عزیز رکھتے۔ یہ اس لیے کہ وہ اللہ کے راستے میں انھیں نہ کوئی پیاس پہنچتی ہے اور نہ کوئی تکان اور نہ کوئی بھوک اور نہ کسی ایسی جگہ پر قدم رکھتے ہیں جو کافروں کو غصہ دلائے اور نہ کسی دشمن سے کوئی کامیابی حاصل کرتے ہیں، مگر اس کے بدلے ان کے لیے ایک نیک عمل لکھ دیا جاتا ہے۔ یقیناً اللہ سب سے بہتر ہے اور ان کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ اور نہ وہ خرچ کرتے ہیں کوئی چھوٹا خرچ اور نہ کوئی بڑا اور نہ کوئی وادی طے کرتے ہیں، مگر وہ ان کے لیے لکھ لیا جاتا ہے، تاکہ اللہ انھیں اس عمل کی بہترین جزا دے جو وہ کیا کرتے تھے۔“

۵۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے دشمن کو صلح کی دعوت دینے سے منع فرمایا ہے، جبکہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَإِنْ جَاءَحُوا لِلْسَّلَامِ فَأَجْزِهِمْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ﴾ : الانعام : ۶۱ | ”اور اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تو بھی اس کی طرف مائل ہو جا اور اللہ پر بھروسہ کر۔“ ان دونوں آیت میں کوئی تعارض نہیں، اللہ تعالیٰ نے بہت بار کہ دشمن کو صلح کی پیشکش کرنے سے منع فرمایا ہے اور اگر دشمن صلح کی طرف مائل ہوں تو اس کی طرف مائل ہو جانے کا حکم دیا ہے، کیونکہ یہ پیشکش دشمن کی طرف سے ہے۔

۶۔ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے: ”پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کو حکم دیا: ﴿فَلَا تَهِنُوا﴾ یعنی دشمن کے مقابلے میں کمزور مت بنو اور: ﴿وَادْعُوا إِلَى السَّلَامِ﴾ یعنی کفار کو صلح کی اور ایک دوسرے سے جنگ ترک کرنے کی دعوت مت دو، اس حال میں کہ تمہاری قوت، تعداد اور تیاری دشمن سے زیادہ ہو۔ اسی لیے فرمایا: ﴿فَلَا تَهِنُوا وَادْعُوا إِلَى السَّلَامِ﴾ وَاَنْتُمْ الْاَهْلُونَ﴾ یعنی دشمن پر تمہارے نبلے کی حالت میں انھیں صلح کی دعوت مت دو۔ لیکن جب کفار تمام مسلمانوں کے مقابلے میں قوت و کثرت میں زیادہ ہوں اور اہم صلح اور جنگ بندی میں مصلحت دیکھے تو وہ ایسا کر سکتا ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس وقت کیا جب کفار قریش نے آپ کو مکہ جانے سے روک دیا اور انھوں نے آپ ﷺ کو صلح کی اور آپس میں دس سال تک جنگ ختم کرنے کی دعوت دی تو آپ ﷺ نے ان کی دعوت قبول فرمائی۔“ (ابن کثیر) مفسر شافعی نے اعضاء البیان میں وہ تفسیر جو پہلے ذکر ہوئی ہے، بیان کرنے کے بعد فرمایا: ”یہ معنی جو ہم نے اس آیت کا بیان کیا ہے اس تفسیر سے بہتر اور زیادہ درست ہے جو ابن کثیر نے کی ہے کہ اس وقت صلح اور سمجھوتے کی دعوت مت دو جب تم غالب ہو، یعنی تم جہاد کی قوت و طاقت رکھتے ہو۔ یعنی اگر تم کمزور ہو اور طاقت نہیں رکھتے تو اس بات سے کوئی مانع نہیں کہ تم صلح اور سمجھوتے کی دعوت دو۔“ شافعی کے ابن کثیر سے اتفاق نہ کرنے کی کئی وجہیں ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ ابن کثیر نے صرف ”وَادْعُوا إِلَى السَّلَامِ“ کو حل بنا دیا ہے، حالانکہ یہاں تین چیزیں بیان ہوئی ہیں: ﴿وَادْعُوا إِلَى السَّلَامِ﴾ وَاِنَّ اللَّهَ مَعَكُمْ وَلَنْ يَبْرُكَنَّ اَعْمَالُكُمْ﴾ دوسری یہ ہے کہ حدیبیہ کے زمانے میں مسلمان قوت میں کفار پر غالب تھے، جیسا کہ پیچھے صحیح بخاری کی حدیث ”الآن

إِنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَ لَهْوٌ وَإِنْ تُؤْمِنُوا وَ تَتَّقُوا يُؤْتِكُمْ أَجْرَكُمْ وَ لَا يَسْئَلُكُمْ
أَمْوَالَكُمْ ﴿۳۶﴾

دنویا کی زندگی تو ایک کھیل اور دل گلی کے سوا کچھ نہیں اور اگر تم ایمان لاؤ اور بچے رہو، تو وہ تمہیں تمہارے اجر دے گا
حجور تم سے تمہارے اموال نہیں مانگے گا ﴿۳۶﴾

نَعْرُوهُمْ“ گزری۔ آپ نے انہیں صلح کی پیش کش اپنے کمزور ہونے کی وجہ سے نہیں کی تھی، ورنہ آپ اس سے بہت پہلے بدر و
احد اور خندق میں صلح کی پیش کش کرتے۔ رسول اللہ ﷺ کا انہیں صلح کی پیش کش کا مطلب یہ تھا کہ آپس کے میل جول سے
اسلام کی تعلیم پھیلے گی تو یہ لوگ اسلام لے آئیں گے۔ کفار پہلے لڑائی پر آمادہ تھے مگر جب انہوں نے بیعت رضوان کے متعلق
سنا تو ڈر گئے اور صلح پر آمادہ ہو گئے، جیسا کہ صحیح بخاری کی مفصل حدیث میں ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ ابن کثیر نے فرمایا کہ صلح
کی دعوت کفر کی طرف سے تھی جو رسول اللہ ﷺ نے قبول فرمائی۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر یہ واقعہ اس مقصد کی دلیل کے طور پر پیش
نہیں کیا جاسکتا کہ مسلمان کمزور ہوں تو ان کا امام صلح کی دعوت دے سکتا ہے، کیونکہ ابن کثیر کے اس قول کے مطابق تو صلح کی
دعوت کفر کی طرف سے تھی، رسول اللہ ﷺ نے صرف اسے قبول فرمایا تھا، حالانکہ حقیقت یہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خود
صلح کا پیغام بھیجا تھا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے صحیح بخاری کی ”کِتَابُ النَّشْرُوطِ، نَابُ النَّشْرُوطِ فِي الْجِهَادِ وَالْمُضَالَمَةِ
مَعَ أَهْلِ الْحَرْبِ وَ كِتَابَةُ النَّشْرُوطِ“ کی حدیث (۲۷۳۱، ۲۷۳۲)۔

﴿۳۶﴾ یہاں ایک سوال ہے کہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ ”تم صلح کے لیے دعوت مت دو“ تو رسول اللہ ﷺ نے
حدیبیہ کے موقع پر صلح کی دعوت کیوں دی؟ جواب اس کا یہ ہے کہ صلح کی دعوت دینے کی ممانعت اس وقت ہے جب مسلمان
ہمت ہارتے ہوئے اور بزدلی اور ذلت اختیار کرتے ہوئے صلح کی دعوت دیں، جیسا کہ ”فَلَا يَهْتَدُوا وَ تَدْعُوا إِلَى السَّلْمِ“ (جس
ہمت نہ ہارو اور نہ صلح کی طرف دعوت دو) کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ حدیبیہ کی صلح کی دعوت دشمن کی طاقت توڑنے کے بعد
اسلام اور مسلمانوں کی مصلحت کی خاطر دی گئی اور اللہ تعالیٰ نے اسے فتح سمین قرار دیا، جیسا کہ آگے سورہ فتح میں آ رہا ہے۔
بھلا جو صلح دشمن کے غالب اور مسلمانوں کے مغلوب ہونے کی صورت میں کی جائے اسے فتح سمین کہا جاسکتا ہے؟ اگر ایسا کرنا
فتح سمین ہوتا تو یہ کام رسول اللہ ﷺ بدر و احد سے بہت پہلے کر لیتے۔ پھر نہ ہجرت کی نوبت آتی، نہ جنگیں لڑنا پڑتیں اور نہ ہی
اتنی شہادتیں ہوتیں، مگر یاد رکھیں! پھر مشرق سے مغرب تک اسلام کا پھر یہاں بھی نہیں لہرا سکتا تھا۔

﴿۳۷﴾ ان آیات میں ان مسلمانوں کا ذکر ہے جو میدان قتال میں اتر چکے ہیں، جو مسلمان کفار کے زور سے نکل ہی نہ سکیں کہ
ہجرت کے بعد جہاد کر سکیں، اللہ تعالیٰ نے انہیں مستضعفین کہہ کر معذور قرار دیا ہے۔ (دیکھیے نساء: ۹۷-۹۹) اور ایسے مستضعفین کو
آزادی دلانے کے لیے تمام مسلمانوں کو لڑنے کا حکم دیا ہے۔ دیکھیے سورہ نساء: (۷۵)۔

آیت 36 ﴿۱﴾ إِنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَ لَهْوٌ اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ عنکبوت کی آیت (۶۳) کی تفسیر۔

إِنْ يَسْأَلْكُمْوهَا فَيُحْفِكُمْ تَبَخَّلُوا وَ يُخْرِجْ أَصْغَانَكُمْ ۝۳۷

اگر وہ تم سے ان کا مطالبہ کرے، پھر تم سے اصرار کرے تو تم بخل کرو گے اور وہ تمہارے کہنے ظاہر کر دے گا ۳۷

جہاد سے روکنے والی سب سے بڑی چیز دنیا کی زندگی، اس کے مال و دولت اور اس کی دل فریبیوں سے محبت ہے، کیونکہ جہاد میں جان و مال دونوں کی قربانی دینا پڑتی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آخرت کے مقابلے میں دنیا کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ یہ چند دن کا کھیل اور دل لگی ہے، اس کی محبت میں پھنس کر اللہ کی راہ میں جان و مال کی قربانی سے دریغ نہ کرو اور یقین رکھو کہ اگر تم ایمان اور تقویٰ اختیار کرو گے، جس میں جان و مال پیش کر دینا بھی شامل ہے تو اللہ تعالیٰ تمہیں تمہارے اجر پورے پورے دے گا اور تم سے تمہارے سارے اموال کا مطالبہ نہیں کرے گا بلکہ ان میں سے معمولی حصے پر اکتفا کرے گا۔ مثلاً سال کے بعد اموال میں سے چالیسواں حصہ، کھیتی میں سے بیسواں یا دسواں حصہ، جنگ کے بعد غنیمت میں سے پانچواں حصہ اور دوسرے پیش آنے والے مواقع پر ضرورت کے مطابق مال کا کچھ حصہ۔ لیکن اگر تم نے ایمان و تقویٰ کے بجائے کفر و عناد پر اصرار کیا تو وہ اپنے مجاہد بندوں کے ذریعے تم سے تم سے تمہارے سارے اموال چھین لے گا۔ ایمان و تقویٰ کے تقاضے کے مطابق وہ معمولی حصہ جو تم نے خرچ کیا ہے اس کا بھی پورا پورا بدلہ تمہیں دینا اور آخرت میں دے دے گا۔ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں: ”حق تعالیٰ نے ملک فتح کر دیے، مسلمانوں کو تھوڑے ہی دن مال خرچ کرنا پڑا، سو جتنا خرچ کیا تھا اس سے سو سو گنا ہاتھ لگا۔ اسی لیے (قرآن کریم میں کئی جگہ) فرمایا ہے کہ اللہ کو قرض دو۔“

② وَلَا يَسْأَلْكُمْ أَمْوَالَكُمْ : ”اور تم سے تمہارے اموال نہیں مانگے گا“ کا مطلب یہ ہے کہ وہ تم سے تمہارے اموال پورے کے پورے نہیں مانگے گا۔ ہاں، وہ تمہارے اموال میں سے ایک حصہ خرچ کرنے کی دعوت ضرور دیتا ہے۔ اس مطلب کے کئی قرینے ان آیات میں موجود ہیں جن میں سے ایک قرینہ ”أَمْوَالٌ“ کی اضافت ضمیر ”كُمْ“ کی طرف ہے۔ ظاہر ہے ”تمہارے اموال“ میں وہ تمام اموال آجاتے ہیں جو تمہاری ملکیت ہیں۔ دوسرا قرینہ ”يُؤْتِكُمْ أَجُورَكُمْ“ ہے، کیونکہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ تمہیں تمہارے اجر پورے پورے دے گا۔ تو جس طرح ”أَجُورَكُمْ“ سے پورے اجر مراد ہیں اسی طرح ”أَمْوَالَكُمْ“ سے بھی پورے اموال مراد ہیں۔ تیسرا قرینہ اس آیت سے اگلی آیت میں لفظ ”فَيُحْفِكُمْ“ ہے، جس سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں سے ان کے اموال کا ”إِحْفَاءٌ“ نہیں چاہتا، یعنی پورے نہیں مانگتا۔ ان تمام قرآن کی وجہ سے ”لَا يَسْأَلْكُمْ أَمْوَالَكُمْ“ کا واضح مطلب یہ ہے کہ وہ تم سے تمہارے سارے اموال نہیں مانگے گا۔

آیت 37 ﴿إِنْ يَسْأَلْكُمْوهَا فَيُحْفِكُمْ تَبَخَّلُوا : ”فَيُحْفِكُمْ“ ”أُحْفِي يُحْفِي إِحْفَاءً“ (افعال) کا معنی کسی چیز کو سمیٹ کر پوری کی پوری لے لینا، یا کسی چیز کا اصرار کے ساتھ مطالبہ کرنا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ تم سے تمہارے سارے اموال مانگ لے تو یہ اس کا حق ہے، کیونکہ وہ سب اسی کے دیے ہوئے ہیں مگر یہ اس کا کرم ہے کہ وہ تم سے تمہارے اموال پورے کے پورے نہیں مانگتا، کیونکہ اگر وہ سب کے سب اصرار کے ساتھ مانگ لے تو تم بخل کرو گے اور تمہارا بخل تمہارے دل میں

هَآأَنْتُمْ هَؤُلَاءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ ؕ فَمِنْكُمْ مَنْ يَبْغِلُ ؕ وَمَنْ يَبْغِلْ فَلْيَمَّا
يَبْغِلْ عَن نَّفْسِهِ ؕ وَاللَّهُ الْعَنِيُّ وَأَنْتُمْ الْفُقَرَاءُ ؕ وَإِن تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ
ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ ﴿٣٨﴾

ع ۸

سنو! تم وہ لوگ ہو کہ تم بلائے جاتے ہو، تاکہ اللہ کی راہ میں خرچ کرو، تو تم میں سے کچھ وہ ہیں جو بخل کرتے ہیں اور جو بخل کرتا ہے تو وہ درحقیقت اپنے آپ ہی سے بخل کرتا ہے اور اللہ ہی بے پردا ہے اور تم ہی محتاج ہو اور اگر تم پھر جاؤ گے تو وہ تمہاری جگہ تمہارے سوا اور لوگوں کو لے آئے گا، پھر وہ تمہاری طرح نہیں ہوں گے ﴿۳۸﴾

پیدا ہونے والے تمام کینے ظاہر کر دے گا، جو سارا مال مانگنے کی وجہ سے تمہارے دل میں پیدا ہوں گے، کیونکہ مال تمہارا محبوب ہے اور جس کے محبوب کو اس سے مانگا جائے اس کے دل میں مانگنے والے کے خلاف کینہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے تم سے مطالبہ ہی اتنا کیا ہے جس سے تم اتنی سخت آزمائش میں نہ پڑو اور اگر کسی دل میں نفاق یا اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کینے کی کوئی بات ہو بھی تو اس پر پردہ پڑا ہے۔ آیات کا مقصد اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب اور یہ حوصلہ دلانا ہے کہ تم سے کوئی مشکل مطالبہ نہیں کیا جا رہا جو تم پورا نہ کر سکو، اس لیے خوش دلی کے ساتھ جہاد میں اپنے اموال خرچ کرو۔

آیت 38 ﴿٣٨﴾ هَآأَنْتُمْ هَؤُلَاءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوا ... : ”ہا“ حرف تشبیہ ہے، خیر دار، یاد رکھو، سن لو۔ ”اَنْتُمْ“ مبتدا اور ”هَؤُلَاءِ“ اس کی خبر ہے جو ”الَّذِينَ“ کے معنی میں ہے اور ”تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ“ ”هَؤُلَاءِ“ کا صلہ ہے۔ یعنی یاد رکھو! تم وہ لوگ ہو کہ تمہیں دعوت دی جاتی ہے کہ اللہ کے راستے میں خرچ کرو تو تم میں سے کچھ وہ ہیں جو بخل کرتے ہیں۔ ﴿٢﴾ وَمَنْ يَبْغِلْ فَلْيَمَّا يَبْغِلْ عَن نَّفْسِهِ : یعنی جو شخص اللہ کے راستے میں خرچ کرنے سے بخل کرتا ہے وہ اپنے خیال میں سمجھتا ہے کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے بخل کیا ہے اور اسے مال نہیں دیا، حالانکہ درحقیقت وہ اپنے آپ ہی سے بخل کر رہا ہے اور اپنے آپ پر وہ مال خرچ نہیں کر رہا، کیونکہ اگر وہ اللہ تعالیٰ کے کہنے پر خرچ کرتا تو اس کا سارا فائدہ اسی کو ہونا تھا۔ اب اس نے بخل کیا تو اپنی ذات سے بخل کیا اور خود ہی محروم رہا۔

﴿٣﴾ وَاللَّهُ الْعَنِيُّ وَأَنْتُمْ الْفُقَرَاءُ : ”الْعَنِيُّ“ اور ”الْفُقَرَاءُ“ پر الف لام آنے سے حصر پیدا ہو گیا، یعنی اللہ ہی غنی ہے اور کوئی غنی نہیں اور تم ہی محتاج ہو اللہ تعالیٰ کو کوئی محتاجی نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں خرچ کرنے کا حکم اپنی کسی ضرورت کے لیے نہیں دیا، وہ تو غنی ہے، محتاج تم ہی ہو اور تم جو کچھ خرچ کرو گے وہ بے حساب اضافے کے ساتھ تمہی کو لوٹا دے گا، جیسا کہ فرمایا: ﴿مَنْ ذَا الَّذِي يُقرضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضْعِفُهُ لَهٗ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ۗ وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَ يَقْبِضُطَسُّ وَيَاْتِيهِ تَرْجِعُوْنَ﴾ ﴿١﴾ البقرة: ۲۴۵۔ ”کون ہے وہ جو اللہ کو قرض دے، اچھا قرض، پس وہ اسے اس کے لیے بہت زیادہ گن بڑھا دے اور اللہ بندہ کو لوٹتا ہے اور تم اسی کی طرف لوٹاؤ جاؤ گے۔“

﴿٤﴾ وَإِن تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ : اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ بقرہ کی آیت (۵۳) کی تفسیر۔

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ۝

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

بے شک ہم نے تجھے فتح دی، ایک کھلی فتح ①

یہ سورت اس وقت نازل ہوئی جب رسول اللہ ﷺ حدیبیہ سے واپس آ رہے تھے۔ یہ ذوالقعدہ سنہ ۶ ہجری کی بات ہے، آپ ﷺ چودہ سو صحابہ کے ساتھ عمرہ کے لیے روانہ ہوئے، حدیبیہ کے مقام پر پہنچے تو مشرکین نے آپ کو عمرہ ادا کرنے سے روک دیا۔ قصہ لمبا ہے، مختصر یہ کہ دونوں طرف سے بار بار سفیروں کی آمد و رفت کے بعد دس سال کے لیے صلح اور جنگ بندی کا معاہدہ ہو گیا۔ اس کی کچھ شروط مسلمانوں کو پسند نہیں تھیں، مگر رسول اللہ ﷺ نے صلح کی مصلحتوں کے پیش نظر انہیں قبول فرمایا۔ بعد میں مسلمانوں نے صلح کے خوشگوار اثرات دیکھے تو وہ بھی مطمئن ہو گئے۔

آیت 1: ① **إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا:** لفظ ”فَتْحًا“ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد فتح مکہ اور اس کے قریب ہونے والی فتوحات ہیں اور یقیناً یہ الفاظ فتح مکہ پر بھی صادق آتے ہیں، مگر صحابہ کرام اور محقق اہل علم نے اس کا سبب نزول صلح حدیبیہ بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ قنادہ بیان کرتے ہیں کہ انس رضی اللہ عنہ نے ”إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا“ کے متعلق فرمایا کہ اس سے مراد صلح حدیبیہ ہے۔ [بخاری، التفسیر، سورة الفتح: ۴۸۳۴] اور براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”تم فتح مکہ کو فتح سمجھتے ہو اور واقعی فتح مکہ فتح تھی مگر ہم حدیبیہ کے دن بیعت رضوان کو فتح شمار کرتے ہیں۔“ [بخاری، المغازی، باب غزوة الحديبية: ۴۱۵۰] زید بن اسلم اپنے والد سے بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنے ایک سفر میں چل رہے تھے، رات کو عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بھی آپ کے ساتھ چل رہے تھے۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے کسی چیز کے متعلق سوال کیا تو آپ ﷺ نے انہیں جواب نہ دیا، انہوں نے پھر سوال کیا تو آپ ﷺ نے جواب نہ دیا، انہوں نے پھر آپ ﷺ سے سوال کیا تو آپ ﷺ نے جواب نہ دیا۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا: ”عمر! تیری ماں تجھے گم پائے، تو نے اصرار کے ساتھ رسول اللہ ﷺ سے تین مرتبہ سوال کیا، لیکن ہر بار آپ نے جواب نہیں دیا۔“ عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، چنانچہ میں اپنی اونٹنی کو حرکت دے کر مسلمانوں سے آگے نکل گیا، اس خوف سے کہ کہیں میرے بارے میں قرآن نازل نہ ہو جائے۔ کچھ دیر بعد ہی اچانک سنا تو ایک اعلان کرنے والا میرا نام لے کر بلانے کے لیے اعلان کر رہا تھا، میں واپس رسول اللہ ﷺ کے پاس گیا اور میں یہی سمجھ رہا تھا کہ میرے بارے میں قرآن نازل ہوا ہے۔ میں نے سلام کہا تو آپ ﷺ نے فرمایا: «لَقَدْ أَنْزَلْتُ عَلَيْكَ اللَّيْلَةَ سُورَةَ لِيَهِيَ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا طَلَعَتْ عَلَيْهِ الشَّمْسُ، ثُمَّ قَرَأَ: ﴿إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا﴾» [بخاری، المغازی، باب غزوة الحديبية: ۴۱۷۷] ”رات مجھ پر وہ سورت اتری ہے جو مجھے ہر اس چیز سے زیادہ محبوب ہے جس پر سورج طلوع ہوتا ہے۔ پھر آپ ﷺ نے پڑھا: ﴿إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا﴾ ”بے شک ہم نے تجھے فتح دی، ایک کھلی فتح۔“

لِيُغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَيَهْدِيكَ

تاکہ اللہ تیرے لیے بخش دے تیرا کوئی گناہ جو پہلے ہوا اور جو پیچھے ہوا اور اپنی نعمت تجھ پر پوری کرے اور

سبل بن حنیف رضی اللہ عنہما سے مروی ایک لمبی حدیث کے آخر میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر سورہ فتح نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے عمر رضی اللہ عنہما کی طرف پیغام بھیجا اور انھیں سورہ فتح پڑھوائی۔ انھوں نے کہا: «يَا رَسُولَ اللَّهِ! أَوْفَّحَ هُوَ؟» «اے اللہ کے رسول! کیا یہ فتح ہے؟» آپ ﷺ نے فرمایا: «نَعَمْ» «ہاں!» تو ان کا دل خوش ہو گیا اور وہ چلے گئے۔ [مسند، الجہاد والنسر، باب صلح احدیہ: ۱۷۸۵۰]

② حقیقت یہ ہے کہ صلح حدیبیہ اسلام اور مسلمانوں کی عظیم فتح تھی، کیونکہ اس کے ساتھ مسلمانوں کو بے شمار فوائد حاصل ہوئے۔ جن میں سے ایک یہ تھا کہ قریش نے مسلمانوں کا وجود تسلیم کر لیا، جو اس سے پہلے وہ کسی صورت تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ایک یہ کہ دشمن کی حقیقی قوت کا اندازہ ہو گیا اور یہ کہ وہ کس حد تک مزاحمت کر سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس میں مخلص ایمان والوں اور منافقین کی پہچان ہو گئی، کیونکہ منافقین رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نکلنے کی جرأت ہی نہیں کر سکتے تھے، جیسا کہ آگے «سَيَقُولُ الْمُخَلَّفُونَ» میں آ رہا ہے۔ ایک یہ کہ جزیرہ عرب میں امن قائم ہو جانے سے کفار اور مسلمانوں کا ایک دوسرے سے میل جول شروع ہو گیا۔ کفار نے رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کی بات سنی، ان کے اخلاق دیکھے، آپس میں بحث و مناظرہ ہوا اور دعوت کا دائرہ وسیع ہوا، جس کے نتیجے میں بہت بڑی تعداد نے اسلام قبول کر لیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ اس سے پہلے حدیبیہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ چودہ سو صحابہ آئے تھے، لیکن صرف دو سال بعد فتح مکہ کے سال آپ ﷺ دس ہزار صحابہ کے ساتھ فاتحانہ شان سے مکہ میں داخل ہوئے۔

③ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تین طرح کی تاکید کے ساتھ اس فتح کی اہمیت بیان فرمائی، ایک اس کی عظمت کے اظہار کے لیے اس کی نسبت اپنی طرف و دو دفعہ جمع شکلم کے صیغے کے ساتھ فرمائی، ایک «لَاكَا» اور دوسرا «فَتَحْنَا» اور دوسری یہ کہ «فَتَحْنَا» کی تاکید مفعول مطلق «فَتَحْنَا» کے ساتھ فرمائی اور تیسری یہ کہ اسے «فَتَحْنَا يُبَيِّنَا» (فتح ہمیں) قرار دیا، یعنی بے شک ہم نے تیرے لیے فتح دی، ایک کھلی فتح۔

④ «لَاكَا فَتَحْنَا لَكَ» میں «لَكَ» (تیرے لیے) کے الفاظ میں رسول اللہ ﷺ کی تکریم و تشریف کا اظہار ہو رہا ہے، جس سے امت کو آپ ﷺ کی قدر پہچاننے اور آپ ﷺ کی اطاعت اور اتباع کی تعلیم دینا مقصود ہے۔

آیت 2: ① لِيُغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ: «لِيُغْفِرَ» کا لام «لام عاقبت» ہے، یعنی ہم نے آپ کو یہ فتح ہمیں عطا فرمائی تاکہ آپ کو اس کے نتیجے میں چار عظیم نعمتیں حاصل ہوں۔ گویا اللہ تعالیٰ اپنے رسول ﷺ کو فرما رہے ہیں کہ آپ نے اپنی رسالت کا حق ادا کیا، میرا پیغام پہنچایا، جان مار کر محنت کی، اپنی زبان اور لہوار کے ساتھ جہاد کیا، مسلمانوں کی ایک مخلص ترین جماعت تیار کی، حقیقی کے موقع پر خنجر اور زہری کے موقع پر زہری کی اور مختصر سے عرصے میں وہ کامیابی حاصل کی

وَرَاكًا نُسْتَقِيْنَا ۝۲۱

تجے سیدھے راستے پر چلائے ۝۲۱

جو طویل مدتوں میں کوئی حاصل نہ کر سکا، حتیٰ کہ وہ کام پورا کر دکھایا جو ہم نے آپ کے ذمے لگایا تھا۔ اب آپ اپنی محنت کا پھل اٹھائیں گے، جس سے دنیا اور آخرت میں آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی، چنانچہ ہم نے آپ کے لیے واضح فتح عطا کی، جس کے نتیجے میں پہلی نعمت آپ کو یہ ملی کہ نبوت سے پہلے اور بعد کے گناہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بخش دیے۔

② یہاں ایک مشہور سوال ہے کہ کیا نبی سے بھی گناہ کا صدور ہو سکتا ہے؟ بعض حضرات نے انبیائے کرام علیہم السلام سے گناہ صادر ہونے کو ناممکن قرار دیا ہے، کیونکہ ان کے نزدیک نبی سے گناہ کا صدور ہونا اس کی شان کے خلاف ہے، مگر اس کا کیا کیا جائے کہ قرآن مجید نے آپ ﷺ کے متعلق لفظ ”ذَنْبٌ“ استعمال کیا ہے، جس کا معروف و مشہور معنی ”گناہ“ ہے۔ اس لیے فارسی اور اردو تقریباً تمام مترجمین نے یہاں ”ذَنْبٌ“ کا معنی گناہ کیا ہے۔ رہی یہ بات کہ آپ کی طرف لفظ گناہ کی نسبت سے آپ کی شان میں کمی کا اظہار ہوتا ہے، تو جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ انبیاء کے گناہوں کو اپنے گناہوں کی طرح سمجھ لیتے ہیں۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو جتنا عظیم اور بلند مرتبہ عطا فرمایا ہے اسے ملحوظ رکھتے ہوئے وہ اپنی معمولی کوتاہیوں اور لغزشوں کو گناہ قرار دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ بھی انہیں ”ذنوب“ کہہ کر ان سے استغفار کا حکم دیتا ہے، اسی لیے وہ اللہ تعالیٰ کی جناب میں استغفار کرتے ہیں جس سے ان کا مرتبہ پہلے سے بھی بلند ہو جاتا ہے۔ مثلاً موسیٰ علیہ السلام سے خطا کے ساتھ قبلی قتل ہو گیا تو انہوں نے دعا کی: ﴿رَبِّ اِنِّی ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْ لِیْ فَعَفَّرَ لَہٗ﴾ [القصص : ۱۶] ”اے میرے رب! میں نے اپنی جان پر ظلم کیا، سو تو مجھے بخش دے، تو اللہ نے اسے بخش دیا۔“ آدم علیہ السلام منع کرنے کے باوجود بھول کر اس پودے میں سے کھا بیٹھے تو کہا: ﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَاۤ-ۙ وَاِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ﴾ [الاعراف : ۲۳] ”اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو نے ہمیں نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ کیا تو یقیناً ہم ضرور خسارہ پانے والوں سے ہو جائیں گے۔“ تو اللہ تعالیٰ نے اس استغفار کے نتیجے میں انہیں ”مجتبیٰ“ بنا لیا، فرمایا: ﴿ثُمَّ اجْتَبٰہُ رَبُّہٗ فَکَتٰبَ عَلَیْہٖ وَہَدٰی﴾ [طہ : ۱۲۲] ”پھر اس کے رب نے اسے چن لیا، تو اس پر مہربانی فرمائی اور ہدایت دی۔“ یونس علیہ السلام بغیر اجازت قوم کو چھوڑ کر چلے گئے تو مچھلی کے پیٹ سے اللہ تعالیٰ کو پکارا: ﴿لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحٰنَکَ ۙ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ﴾ [الانبیاء : ۸۷] ”تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو پاک ہے، یقیناً میں ظلم کرنے والوں سے ہو گیا ہوں۔“ اس استغفار کے نتیجے میں انہیں وہ مقام حاصل ہوا جو خطا نہ ہونے اور استغفار نہ کرنے کی صورت میں کبھی حاصل نہ ہوتا، فرمایا: ﴿فَاَجْتَبٰہُ رَبُّہٗ فَجَعَلٰہُ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ﴾ [القلم : ۵۰] ”پھر اس کے رب نے اسے چن لیا، پس اسے نیکوں میں شامل کر دیا۔“

نبی آدم کا فرشتوں سے یہی فرق ہے کہ فرشتوں سے نہ خطا ہوتی ہے، نہ انہیں استغفار کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ وہ

استغفار سے حاصل ہونے والا بلند مقام حاصل کر سکتے ہیں۔ انبیاء کرام ﷺ ہماری طرح کبیرہ گناہوں کا ارتکاب یا دیدہ و دانستہ نافرمانی نہیں کرتے، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے چپے ہوئے فرماں بردار بندے ہوتے ہیں، البتہ ان سے بشری تقاضوں کے پیش نظر کوئی معمولی کوتاہی یا اجتہادی خطا ہو جاتی ہے۔ انبیاء کی خصوصیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں اس خطا یا کوتاہی پر قائم نہیں رہنے دیتا، بلکہ وحی کے ذریعے سے فوراً اصلاح فرما دیتا ہے، انبیاء کے معصوم ہونے کا یہی مطلب ہے۔ کسی امتی کو، خواہ وہ کتنے بلند منصب پر فائز ہو یہ امتیاز حاصل نہیں کہ اس کی خطا کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کے ذریعے سے اصلاح کی جائے۔ انبیاء سے سرزد ہونے والی یہ معمولی کوتاہیاں یا اجتہادی خطائیں بھی ان کے مقام کے پیش نظر خود انھیں اتنی بڑی نظر آتی ہیں کہ وہ بار بار اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعا کرتے ہیں۔ ہمارے نبی مکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ”ذنب“ سے مغفرت مانگنے کا حکم دیا، جس پر عمل کرتے ہوئے آپ بے حد استغفار کرتے تھے۔ دیکھیے سورہ محمد کی آیت (۱۹) کی تفسیر۔ استغفار کی وہ مختلف دعائیں جو رسول اللہ ﷺ اللہ کی جناب میں کیا کرتے تھے ان تمام دعاؤں میں لفظ ”ذنب“ استعمال ہوا ہے۔ ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کا اور اس کے رسول کا معاملہ ہے کہ آپ ﷺ ذنب کا اقرار کر کے استغفار کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو پہلے اور پچھلے ذنب کی مغفرت کی خوش خبری دے رہے ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی اس بات کا حوالہ دیا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے آپ کے پہلے اور پچھلے ذنب کو معاف فرمادیا ہے، جیسا کہ ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں: «أَنَّ نَبِيَّ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَقُومُ مِنَ اللَّيْلِ حَتَّى تَنْفَطِرَ قَدَمَاهُ، فَقَالَتْ عَائِشَةُ لِمَ تَصْنَعُ هَذَا يَا رَسُولَ اللَّهِ! وَقَدْ غَفَرَ اللَّهُ لَكَ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ؟ قَالَ أَفَلَا أُحِبُّ أَنْ أَكُونَ عَبْدًا شَكُورًا؟» [بخاری، التفسیر، باب قوله: ﴿يَغْفِرُ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ﴾: ۴۸۳۷] ”نبی ﷺ رات اتنا قیام کرتے حتیٰ کہ آپ کے قدم پھٹ جاتے تو عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ”یا رسول اللہ! آپ اس طرح کیوں کرتے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے آپ کے پہلے اور پچھلے گناہ بخش دیے ہیں؟“ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”تو کیا میں شکر گزار بندہ بنا پسند نہ کروں؟“

یہی وجہ ہے کہ پہلے تقریباً سبھی ترجمہ کرنے والوں نے ”ذنب“ کا معنی گناہ کیا ہے۔ یہ ترجمہ کرنے والے قرآن مجید کے سب خدام کیا نعوذ باللہ رسول اللہ ﷺ کے گستاخ اور رسول اللہ ﷺ کے مقام سے نا آشنا تھے؟ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اس سے تو رسول اللہ ﷺ گناہ گار ٹھہرتے ہیں۔ آپ ان حضرات سے پوچھیں کہ آپ ”ذنب“ کا ترجمہ کر کے بتائیے، ان میں سے ایک صاحب نے ”لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ“ کا ترجمہ کیا ہے: ”تا کہ اللہ تعالیٰ آپ کی اگلی پچھلی سب خطائیں معاف فرمادے۔“ ایک اور صاحب نے ترجمہ کیا ہے: ”تا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری اگلی پچھلی ہر کوتاہی سے درگزر فرمائے۔“ اپنے خیال میں ان حضرات نے نبی ﷺ کو گناہ گار ہونے سے تو بچا لیا مگر انھیں خطا کار اور کوتاہی کا مرتکب ہونے سے تو نہ بچا سکے، بتائیے آپ نے کون سا معرکہ سر کیا؟ حقیقت یہ ہے کہ ایک آدھ معمولی گناہ و خطا سے آدمی نہ گناہ گار کے لقب کا حق دار بنتا ہے اور نہ ہی اسے خطا کار یا کوتاہ کار کہہ سکتے ہیں۔

بعض حضرات نے یہاں ذنب کا معنی الزام کیا ہے اور ترجمہ کیا ہے: ”تا کہ اللہ تعالیٰ آپ پر لگائے گئے پہلے پچھلے تمام

الزامات دور کر دے۔“ ان حضرات سے کوئی پوچھے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی جن کاموں پر باز پرس فرمائی اور ساتھ ہی انہیں معاف کر دینے کی بشارت بھی دے دی، کیا وہ سب الزامات تھے جو اللہ تعالیٰ نے غلط قرار دے کر دور فرما دیے؟ مثلاً فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَذِرُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ، تَبْتَغِي مَرْضَاتَ أَوْلَادِكَ، وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾ [التحریم: ۱] ”اے نبی! تو کیوں حرام کرتا ہے جو اللہ نے تیرے لیے حلال کیا ہے؟ تو اپنی بیویوں کی خوشی چاہتا ہے، اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے۔“ اور فرمایا: ﴿عَفَا اللَّهُ عَنْكَ، لِمَ أَذْنُتْ لَهُمْ حَتَّىٰ يَتَّبِعَنَ لَكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَتَعْلَمَ الْكَاذِبِينَ﴾ [التوبة: ۴۳] ”اللہ نے تجھے معاف کر دیا، تو نے انہیں کیوں اجازت دی، یہاں تک کہ تیرے لیے وہ لوگ صاف ظاہر ہو جاتے جنہوں نے سچ کہا اور تو جھوٹوں کو جان لیتا۔“ اور فرمایا: ﴿مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ لَهُ أَتَىٰ حَتَّىٰ يُفْخِرَ فِي الْأَرْضِ، تُرِيدُونَ عَرَصَ الدُّنْيَا، وَاللَّهُ يُرِيدُ الْأُخْرَةَ، وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾ [الأنفال: ۶۷] ”کبھی کسی نبی کے لائق نہیں کہ اس کے ہاں قیدی ہوں، یہاں تک کہ وہ زمین میں خوب خون بہا لے، تم دنیا کا سامان چاہتے ہو اور اللہ آخرت کو چاہتا ہے اور اللہ سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے۔“ اور فرمایا: ﴿وَتَخَشَى النَّاسَ، وَاللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَاهُ﴾ [الأحزاب: ۳۷] ”اور تو لوگوں سے ڈرتا تھا، حالانکہ اللہ زیادہ حق دار ہے کہ تو اس سے ڈرے۔“

اصل بات یہ ہے کہ ایسے حضرات غلو کی وجہ سے ہر اس شخص کو گستاخ رسول قرار دینے پر تلے ہوئے ہیں جو ان کی طرح نبی ﷺ کو خدائی صفات کا مالک قرار نہ دے، آپ کو عالم الغیب نہ مانے، مختار کل تسلیم نہ کرے، یا یہ نہ مانے کہ آپ ﷺ سے خطا ہو سکتی ہی نہیں۔ ان میں سے بعض حضرات نے اس مقام پر ذنب کا معنی تو گناہ ہی کیا ہے، مگر اس آیت کے ترجمے میں تحریف قرآن کے اتنے بڑے جرم کا ارتکاب کیا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا اس امت کو مہلت دینے کا فیصلہ نہ ہوتا تو ان کا نام و نشان مٹا دیا جاتا۔ چنانچہ ان میں سے ایک صاحب نے ”لِيُغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ“ کا ترجمہ کیا ہے: ”تا کہ اللہ تمہارے سب سے گناہ بخشے تمہارے اگلوں کے اور تمہارے پچھلوں کے۔“ ایک اور صاحب نے ترجمہ کیا ہے: ”تا کہ آپ کی خاطر اللہ آپ کی امت (کے ان تمام افراد) کی اگلی پچھلی خطائیں معاف فرمادے (جنہوں نے آپ کے حکم پر جہاد کیے اور قربانیاں دیں)۔“ ان لوگوں کی تحریف پر جرأت دیکھیے، لفظ ”ذَنْبِكَ“ کا معنی ”تیرے گناہ“ کے علاوہ ہو ہی نہیں سکتا، مگر یہ لوگ اس کا ترجمہ ”تیری امت کے اگلے پچھلے گناہ“ کر رہے ہیں اور حسب رسول کے اتنے بڑے اجارہ دار بنے ہوئے ہیں کہ جو ان کی طرح تحریف نہ کرے، یا ان کی تحریف پر شہابش نہ کہے وہ ان کی نظر میں حسب رسول سے آشنا ہی نہیں۔ ان لوگوں کے ترجمے کے مطابق تو تمام امتیوں کے اگلے پچھلے گناہ معاف ہو چکے ہیں، اب اگر کوئی قتل یا زانیہ چوری کرتا ہے تو اس پر حد کیسی؟ اسے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے معافی مل چکی ہے۔ یہ سب نتیجہ اسی غلو کا ہے جس سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو منبر پر یہ فرماتے ہوئے سنا: ﴿لَا تَطْرُقُونِي كَمَا أَطْرَقَتِ النَّصَارَىٰ ابْنِ مَرْيَمَ، فَإِنَّمَا أَنَا عَبْدُهُ، فَقُولُوا عَبْدُ اللَّهِ وَرَسُولُهُ﴾ [بخاری، أحاديث الأنبياء، باب قول الله تعالى: ﴿وَأذْكَرُ فِي الْكِتَابِ مَرْيَمَ...﴾: ۳۴۴۵] ”مجھے حد سے مت بڑھاؤ جس طرح نصاریٰ نے مسیح ابن مریم کو حد سے بڑھا دیا، کیونکہ میں تو صرف اس کا بندہ ہوں، سو تم ”اللہ کا بندہ اور اس کا رسول“ کہو۔“

وَيَنْصُرَكَ اللَّهُ نَصْرًا عَزِيمًا ③

اور (تاکہ) اللہ تیری مدد کرے، زبردست مدد ③

③ اس مقام پر اکثر مفسرین نے نبی کریم ﷺ کے متعلق لفظ ذنب کی توجیہ کرتے ہوئے ایک جملہ مسلم قول کے طور پر ذکر فرمایا ہے: ”حَسَنَاتُ الْأَبْرَارِ سَيِّئَاتُ الْمُفْرَبِينَ“ ”نیک لوگوں کی نیکیاں مقرب لوگوں کی برائیاں ہوتی ہیں۔“ یہ جملہ اللہ تعالیٰ یا اس کے رسول ﷺ کا تو ہرگز نہیں، اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ یہ بات کہنے والا کون ہے، مگر اکثر مفسر اور مصنف اسے اندھا دھند بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ نہ یہ سوچتے ہیں کہ نیکی بڑی کیسے بن سکتی ہے اور نہ یہ خیال فرماتے ہیں کہ قرآن مجید کے مطابق ابرار و مقررین کی یہ تقسیم سرے سے غلط ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر کون مقرب ہوگا؟ اور آپ ﷺ پچھلی رات اٹھ کر جن آیات کی تلاوت کیا کرتے تھے ان میں مذکور دعاؤں میں سے ایک دعا یہ ہے: ﴿وَتَوْفَقْنَا مَعَ الْأَبْرَارِ﴾ [آل عمران: ۱۹۳] ”اور ہمیں ابرار کے ساتھ فوت کر۔“ پھر وہ کون سے ابرار ہیں جن کی نیکیاں مقررین کی بدیاں ہیں؟

④ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ: یہ دوسری نعمت ہے جو صلح حدیبیہ کے نتیجے میں حاصل ہونے کی خوش خبری دی گئی۔ اس سے مراد وہ بہت سی نعمتیں عطا کرنا ہے جو اس سے پہلے آپ کو عطا نہیں کی گئی تھیں، مثلاً قریش، اہل مکہ اور دوسرے لوگوں کا فوج در فوج اسلام میں داخل ہونا، تمام دشمنوں اور مخالفوں کا زیر ہو جانا، پورے ملک عرب کا آپ کے زیر نگیں ہو جانا اور دین کی تکمیل وغیرہ، جن کا اس موقع پر آپ ﷺ سے وعدہ کیا گیا اور کچھ ہی عرصہ بعد پورا کر دیا گیا اور اعلان ہو گیا: ﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا﴾ [المائدة: ۳] ”آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین کمال کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کر لیا۔“

⑤ وَيَهْدِيكَ صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا: یہ تیسری نعمت کا وعدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے احکام پر عمل، ان کی تبلیغ و جہاد، سلطنت کے معاملات اور فتح و کامرانی کے حصول کے بارے میں آپ کو بالکل سیدھے راستے پر چلائے گا۔ اگرچہ یہ سب کچھ پہلے بھی آپ کو حاصل تھا، مگر اس کے بعد جس وسعت کے ساتھ حاصل ہوا وہ پہلے حاصل نہ تھا۔ مزید دیکھیے سورہ فاتحہ کی آیت: ﴿إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ کی تفسیر۔

آیت 3 وَيَنْصُرَكَ اللَّهُ نَصْرًا عَزِيمًا: چوتھی اور آخری نعمت یہ ہے کہ ”نصرِ عزیز“ کا ذکر اپنے سب سے باعظمت نام ”اللہ“ کے ساتھ فرمایا، تاکہ اس کی اہمیت واضح ہو۔ یعنی اللہ تعالیٰ آپ کی ایسی مدد فرمائے گا جس سے آپ کو عزت و قوت اور غلبہ حاصل ہوگا اور آپ کے دشمن عاجز اور مغلوب ہو جائیں گے۔ یہاں مبالغے کے لیے ”عزیز“ کی نسبت ”نصر“ کی طرف فرمائی ہے، ورنہ عزیز تو اس کے نتیجے میں رسول اللہ ﷺ نے ہونا ہی ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کہتے ہیں: ”فُلَانٌ نَهَارُهُ صَائِمٌ وَلَيْلُهُ فَائِمٌ“ ”فلاس کا دن روزہ رکھنے والا اور رات قیام کرنے والی ہے۔“

هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ السَّكِينَةَ فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ لِيَزْدَادُوا إِيمَانًا مَعَ إِيْمَانِهِمْ ۗ وَاللَّهُ جُنُودُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلَيْنَا حَكِيمًا ۝

وہی ہے جس نے ایمان والوں کے دلوں میں سکینت نازل فرمائی، تاکہ وہ اپنے ایمان کے ساتھ ایمان میں زیادہ ہو جائیں اور آسمانوں اور زمین کے لشکر اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہمیشہ سے سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے ۝

آیت 4: ﴿هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ السَّكِينَةَ فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ﴾: ”السَّكِينَةَ“ سے مراد وہ سکون و اطمینان اور ثبات قلب ہے جس کا اتارنا اللہ تعالیٰ نے مدینہ سے نکلنے سے لے کر اس فتح مبین کے حصول تک مومنوں کے دلوں پر مسلسل جاری رکھا اور جو اس فتح کا اہم سبب بنا، ورنہ اگر مسلمان مدینہ سے عمرہ کے لیے نکلنے وقت منافقین کی طرح سوچنے لگتے کہ یہ تو صریحاً موت کے منہ میں جانا ہے، یا راستے میں جب اطلاع ملی کہ قریش لڑنے مرنے پر تلے ہوئے ہیں تو ہمت ہار جاتے، یا حدیبیہ میں پہنچنے پر جس طرح کفار نے مسلمانوں کو مسجد حرام سے روکا اور چھاپے اور شب خون مار مار کر انھیں اشتعال دلانے کی کوشش کی، پھر جب عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر پھیلی، ان میں سے کسی موقع پر اگر مسلمان اپنے آپ پر قابو نہ رکھتے اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت پر قائم نہ رہتے تو یہ فتح مبین کبھی حاصل نہ ہوتی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ سکینت ہی تھی جس نے ہر موقع پر انھیں اطاعت پر ثابت قدم رکھا۔ پھر جب صلح کی وہ شرائط ان کے سامنے آئیں جو مسلمانوں کو سخت ناپسند اور ان کے خیال میں ان کی ذلت کا باعث تھیں، خصوصاً ابو جندل رضی اللہ عنہ مظلومیت کی تصویر بنے ہوئے مجمع عام میں آکھڑے ہوئے، اس موقع پر اس سکینت ہی کی برکت تھی کہ سب نے رسول اللہ ﷺ کے فیصلے پر سر تسلیم خم کر دیا۔

﴿لِيَزْدَادُوا إِيمَانًا مَعَ إِيْمَانِهِمْ﴾: یعنی ایمان انھیں پہلے بھی حاصل تھا مگر ان تمام آزمائشوں میں ثابت قدم رہنے کی وجہ سے ان کے ایمان میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور جب اس ثابت قدمی کے خوش گوار نتائج سامنے آئے تو ان کا ایمان مزید بڑھ گیا۔ یہ آیت بھی ان بہت سی آیات و احادیث میں سے ایک ہے جو ایمان میں زیادتی اور کمی کی دلیل ہیں۔ امام بخاری رضی اللہ عنہ نے متعدد آیات و احادیث کے ساتھ اس مسئلے کو مدلل ذکر فرمایا ہے۔ روح المعانی میں ہے: ”بخاری نے فرمایا، میں بہت سے شہروں میں ایک ہزار سے زائد علماء سے ملا، میں نے ان میں سے ایک شخص بھی نہیں دیکھا جو اس بات سے اختلاف کرتا ہو کہ ایمان قول اور عمل ہے اور اس میں زیادتی اور کمی ہوتی ہے اور انھوں نے اس کی عقلی اور نقلی دلیلیں بیان کی ہیں۔ عقلی دلیل تو یہ ہے کہ ایمان کی حقیقت میں تفاوت نہ ہو تو امت کے عام آدمیوں کا ایمان، جو فسق و فجور میں منہمک رہتے ہیں، انبیاء کے ایمان کے برابر ہوگا اور یہ لازم باطل ہے، سوا مظلوم بھی ایسا ہی ہے اور نقلی دلیل یہ کہ اس مفہوم کی آیات و احادیث بہت زیادہ ہیں جن میں سے ایک یہ آیت ہے جو زیر تفسیر ہے۔“ (ملخصاً) یہ بھی معلوم ہوا کہ ایمان میں زیادتی کا مطلب اعمال کے لحاظ سے زیادتی ہی نہیں بلکہ دل کی تصدیق اور اس کے یقین میں بھی زیادتی اور کمی ہوتی ہے۔ کبھی یقین کا یہ حال ہوتا ہے کہ آدمی اپنی جان، مال اور ہر چیز اللہ کی راہ میں لٹانے پر تیار ہو جاتا ہے اور کبھی اس یقین میں ایسی کمی ہوتی ہے کہ اسلام قبول کرتے

لِيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَ لَا يُكْفَرُ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ ۗ وَ كَانَ ذَلِكَ عِنْدَ اللَّهِ فَوْزًا عَظِيمًا ۝

تاکہ وہ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ان باغوں میں داخل کرے جن کے تلے تہریں چلتی ہیں، ہمیشہ ان میں رہنے والے اور ان سے ان کی برائیاں دور کرے اور یہ ہمیشہ سے اللہ کے نزدیک بہت بڑی کامیابی ہے ۝

وقت ایمان کا جو سرمایہ اسے حاصل ہوا تھا وہ بھی خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ تعجب اور افسوس ہے ان بڑے بڑے شیوخ الحدیث پر جو اتنی صریح آیات و احادیث کے باوجود یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ ایمان میں زیادتی اور کمی ہوتی ہے، ان کے علم کا کمال یہی ہے کہ وہ تاویل کے ذریعے سے ثابت کر دیتے ہیں کہ تمام مسلمانوں کا ایمان برابر ہے۔ وجہ صرف یہ ہے کہ ان کے دھڑے کے کسی بزرگ نے کہہ دیا ہے کہ ایمان میں نہ زیادتی ہوتی ہے نہ کمی۔

۝ وَاللَّهُ جُنُودُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ: یعنی آپ کو ظاہری اسباب کی کمی کے باوجود یہ فتح مبین آپ کی جدوجہد یا ذاتی کمال کی وجہ سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی مدد کی بدولت حاصل ہوئی، کیونکہ وہی آسمانوں کے اور زمین کے بے شمار لشکروں کا مالک ہے، جس کی چاہتا ہے جس لشکر کے ساتھ چاہتا ہے مدد کر دیتا ہے۔ آسمانوں کے لشکروں کی مثال بدر میں نازل ہونے والے فرشتے، احزاب میں آنے والی آندھی اور بدر میں اترنے والی بارش ہیں اور زمین کے لشکروں کی مثال فتح مکہ کے موقع پر آنے والے دس ہزار مجاہدین کا عظیم الشان لشکر ہے۔ ”یَللَّهُ“ کو پہلے لانے سے حصر پیدا ہوا، جس کا مطلب ہوا کہ اللہ تعالیٰ مانتا ہی نہیں کہ آسمانوں اور زمین میں اس کے علاوہ بھی کسی کے پاس کوئی لشکر ہے، کیونکہ اس کے سامنے کسی کی کوئی حیثیت نہیں۔

۝ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا: یعنی اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کے لشکروں کا اکیلا مالک ہے اور لشکر بھی ایسے کہ ان میں سے کسی لشکر کا ایک فرد اگر اللہ کا حکم ہو تو تمام کفار کو نیست و نابود کر دے، مگر اس نے یہ فتح مبین اور نصر عزیز صلح کی صورت میں عطا فرمائی، کیونکہ اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے۔ اس کے علم میں یہ بات تھی اور اس کی حکمت کا تقاضا تھا کہ اب کفار کو تلوار کی مار کے بجائے اسلام اور مسلمانوں کو سمجھنے اور ان کی دعوت سننے کا موقع دیا جائے، تاکہ کافر مسلمان ہو جائیں اور دشمن دوست بن جائیں۔ واضح رہے، یہاں ”عَلِيمًا حَكِيمًا“ فرمایا ہے، جبکہ آگے جہاں کفار و منافقین کے لیے عذاب اور لعنت کا ذکر فرمایا ہے وہاں ”عَزِيزًا حَكِيمًا“ فرمایا ہے، کیونکہ عذاب و غضب کے ذکر کے مناسب صفت علم کے بجائے صفت عزیز ہے۔

ت 5: ﴿۱﴾ لِيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِينَ..... : سب سے واضح اور صحیح بات یہی ہے کہ ”لِيُدْخِلَ“ کا لام ”هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ السَّكِينَةَ“ کے متعلق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ”وہی ہے جس نے مومنوں کے دلوں میں سکینت نازل فرمائی، تاکہ وہ اپنے ایمان کے ساتھ ایمان میں اور زیادہ ہو جائیں (اور) تاکہ اس سکینت اور ایمان کی زیادتی کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ان باغوں میں داخل کرے جن کے تلے نہریں چلتی ہیں۔“

وَيُعَذِّبُ الْمُنَافِقِينَ وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْمُشْرِكِينَ وَالْمُشْرِكَاتِ الظَّالِمِينَ بِاللَّهِ ظَنَّ السُّوءِ عَلَيْهِمْ دَابِئْرُ السُّوءِ وَغَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ وَلَعَنَهُمْ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ

مَصِيْرًا ①

اور (تاکہ) ان منافق مردوں اور منافق عورتوں اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو مزادے جو اللہ کے بارے میں گمان کرنے والے ہیں، براگمان، انھی پر بری گردش ہے اور اللہ ان پر غصے ہوا اور اس نے ان پر لعنت کی اور ان کے لیے جہنم تیار کی اور وہ لوٹنے کی بری جگہ ہے ①

② وَالْمُؤْمِنَاتِ: مومن عورتوں کا ذکر خاص طور پر یہاں اس لیے فرمایا کہ جہاد کا اجر صرف مردوں کے ساتھ خاص نہ سمجھ لیا جائے، کیونکہ مومن عورتیں بھی جہاد میں شریک ہوتی ہیں۔ وہ اپنے بھائیوں، خاندانوں، بیٹوں، باپوں اور دوسرے عزیزوں کے جہاد پر نکلنے میں رکاوٹ نہیں بنتیں، بلکہ ان کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں، ان کی عدم موجودگی میں تنہائی اور دوسری پریشانیوں پر صبر کرتی ہیں اور ان کی شہادت کی صورت میں بیوہ ہونے اور بچوں کے یتیم ہونے پر صبر کرتی ہیں۔ ان میں سے کئی لشکر کے ساتھ جا کر کھانا پکانے، کپڑے دھونے، صفائی کرنے کی اور دوسری خدمات سرانجام دیتی ہیں۔ لڑائی کی صورت میں مجاہدوں کو پانی پلانے، زخمیوں کی مرہم پٹی اور بیماریوں کی تیمارداری کا اہتمام کرتی ہیں۔ (ابن عاشور)

③ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ...: جنتوں میں داخل کرنے سے مراد یہاں خاص داخلہ ہے جو مجاہدین کے ساتھ خاص ہے، وہ داخل نہیں جو محض ایمان اور عمل صالح کی بدولت حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے ساتھ ہی فرمایا: ﴿وَيُكَفِّرُ عَنْهُمْ سَوِيئَاتِهِمْ﴾ ”اور تاکہ وہ ان سے ان کی برائیاں دور کرے۔“ (ابن عاشور) ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿إِنَّ فِي الْجَنَّةِ مِائَةَ ذَرْجَةٍ أُعِدَّتْهَا اللَّهُ لِلْمُجَاهِدِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ مَا بَيْنَ الدَّرَجَتَيْنِ كَمَا بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ فَإِذَا سَأَلْتُمُ اللَّهَ فَاسْأَلُوهُ الْبَرُّ ذُوْسُ فَإِنَّهُ أَوْسَطُ الْجَنَّةِ وَأَعْلَى الْجَنَّةِ - أَرَاهُ قَالَ وَ قَوْفُهُ عَرْشُ الرَّحْمَنِ - وَمِنْهُ تَفَحَّرُ أَنْهَارُ الْجَنَّةِ﴾ [بخاری، الجهاد والسر، باب درحات المجاہدین فی سبیل اللہ : ۲۷۹۰]

”جنت میں سو درجے ہیں جو اللہ نے مجاہدین فی سبیل اللہ کے لیے تیار فرمائے ہیں، ہر دو درجوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا آسمان و زمین کے درمیان ہے، تو جب تم اللہ تعالیٰ سے مانگو تو فردوس کا سوال کرو، کیونکہ وہ جنت کا افضل اور جنت کا اعلیٰ حصہ ہے۔ (یحییٰ بن صالح نے کہا) میں سمجھتا ہوں یوں کہا کہ اس کے اوپر رحمان کا عرش ہے اور اسی سے جنت کی نہریں پھوٹی ہیں۔“

آیت 6 ① وَيُعَذِّبُ الْمُنَافِقِينَ وَالْمُنَافِقَاتِ.....: اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ سکینت کی بدولت ایمان والے مجاہد مردوں اور عورتوں کے جنت میں داخلے کے ذکر کے بعد ان لوگوں کو عذاب دینے کا ذکر فرمایا جو اس غزوہ کے نتیجے میں اللہ کے غضب اور لعنت کا نشانہ بنے اور جہنم ان کا ٹھکانا بنی۔ منافقین و کفار کو یہ عذاب مسلمانوں کی تلواروں کے ساتھ بھی دیا گیا، جیسا کہ

وَاللَّهُ جُنُودُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ﴿۷﴾ إِنْكَأَ أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ﴿۸﴾

اور اللہ ہی کے لیے آسمانوں اور زمین کے لشکر ہیں اور اللہ ہمیشہ سے سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ﴿۷﴾
بے شک ہم نے تجھے گواہی دینے والا اور خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے ﴿۸﴾

فرمایا: ﴿فَقَاتِلْهُمْ يَعْذِبُهُمُ اللَّهُ بِأَيِّدِيكُمْ﴾ [التوبة: ۱۴] ”ان سے لڑو، اللہ انھیں تمہارے ہاتھوں سے عذاب دے گا۔“
اور مسلسل خوف اور رسوائی کے ساتھ بھی اور مسلمانوں کی کامیابیاں اپنی آنکھوں کے ساتھ دیکھنے کی صورت میں بھی۔ آخرت کا
عذاب اس کے علاوہ اور ان سب سے بڑھ کر ہے۔ یہاں منافقین کا ذکر کفار سے پہلے کرنے کا مقصد مسلمانوں کو آگاہ کرنا
ہے کہ منافقین کا کفر پوشیدہ ہے، اس لیے وہ زیادہ نقصان پہنچا سکتے ہیں، لہذا مسلمانوں کو نہ انھیں بھولنا چاہیے اور نہ ان سے کبھی
غافل ہونا چاہیے۔ منافق اور مشرک مردوں کے ساتھ منافق اور مشرک عورتوں کا ذکر اس لیے فرمایا کہ وہ بھی ان کی پوری طرح
راز دار، ہر طرح سے معاون اور تمام سازشوں میں شریک ہیں۔

﴿الظَّالِمِينَ بِاللَّهِ ظَنَّ السُّوءِ﴾ ”منافقین“ سے مراد مدینہ منورہ کے منافقین ہیں اور ”مشرکین“ سے مراد مکہ معظمہ کے
مشرکین۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو ذلت و رسوائی کا عذاب دیا، اس لیے کہ منافقین کا اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ غلط گمان تھا کہ
رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو عمرہ حدیبیہ ادا کرنے کے لیے آپ کے ساتھ گئے ہیں وہ واپس مدینہ نہیں آسکیں گے،
مشرکین انھیں وہیں تباہ و برباد کر دیں گے اور مشرکین نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ اللہ تعالیٰ ہرگز اپنے دین کو منٹنے سے نہیں بچا سکے گا
اور کفر کا کلمہ بلند ہو کر رہے گا۔ (قرطبی وغیرہ)

﴿عَلَيْهِمْ ذَائِرَةُ السُّوءِ﴾: اس جملے کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ توبہ کی آیت (۹۸) کی تفسیر۔ یہاں کچھ عبارت محذوف ہے
جو خود بخود سمجھ میں آ رہی ہے: ”أَيُّ الظَّالِمِينَ بِاللَّهِ ظَنَّ السُّوءِ وَالْمُتَرَبِّصِينَ لَكُمْ الدَّوَائِرَ، عَلَيْهِمْ ذَائِرَةُ السُّوءِ“
” (تاکہ ان منافقین و منافقات اور مشرکین و مشرکات کو عذاب دے) جو اللہ کے متعلق برا گمان کرنے والے اور تم پر زمانے کی
گردشوں کا انتظار کرنے والے ہیں، بری گردش خود انھی پر آنے والی ہے۔“

آیت 7: ﴿وَاللَّهُ جُنُودُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾: یہ جملہ پہلے بھی گزر چکا ہے، یہاں اللہ کے جنود سے ڈرانا اور کفار و
منافقین کو عذاب، غضب اور لعنت کی وعید سنانا مقصود ہے، جس کے ساتھ عزیز کی صفت مناسبت رکھتی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ جسے
عذاب دینا چاہے یا ذلیل و رسوا کرنا چاہے کوئی اسے روک نہیں سکتا اور نہ ہی کوئی اس کے مقابلے میں غالب آسکتا ہے، مگر وہ
حکیم بھی ہے، اس لیے اپنی حکمت کے تقاضے کے مطابق نافرمانوں کو فوراً نہیں پکڑتا، بلکہ انھیں مہلت دیتا ہے، تاکہ وہ باز
آجائیں، مگر جب پکڑتا ہے تو اس کی گرفت بہت سخت ہوتی ہے جس سے بچ کر کوئی نکل نہیں سکتا۔

آیت 8: ﴿إِنْكَأَ أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَ مُبَشِّرًا وَ نَذِيرًا﴾: سورت کے شروع سے یہاں تک رسول اللہ ﷺ اور مومنوں کے

تَوَكَّرُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتَعَزَّوْهُ وَتُوقِرُوهُ ۖ وَتَسْبِخُوهُ بَكْرَةً وَأَصِيلًا ۝

تا کہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس کی مدد کرو اور اس کی تعظیم کرو اور دن کے شروع اور آخر میں اس کی تسبیح کرو ۝

لیے فتح و نصرت، مغفرت، تکفیر سیئات اور جنت میں داخلے کی بشارت اور وعدے کا بیان ہے، جس کے ساتھ منافقین و کفار کے لیے عذاب، غضب، لعنت اور جہنم میں داخلے کی وعید کا بیان ہے۔ اب یہاں سے اس فتح مبین کے مختلف پہلوؤں کی تفصیل کا آغاز ہوتا ہے جس کی تمہید کے طور پر رسول اللہ ﷺ کا مقام و منصب بیان فرمایا، تا کہ مسلمان اسے پہچانیں اور آپ ﷺ کی اطاعت اور جاں نثاری میں کوئی دریغ نہ کریں۔ چنانچہ فرمایا کہ ہم نے آپ کو دنیا میں لوگوں کے سامنے حق کی شہادت دینے والا، اسے تمام لوگوں تک پہنچا دینے والا، آخرت میں ان پر پیغام حق پہنچا دینے کی شہادت دینے والا، فرماں برداروں کو بشارت دینے والا اور نافرمانوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ اس مقام پر اصل مقصود فتح کی بشارت اور اس سے متعلقہ معاملات ہیں، اس لیے آپ ﷺ کی تعریف میں صرف تین الفاظ ”شَاهِدًا“، ”مُبَشِّرًا“ اور ”كَذِّبًا“ بیان فرمائے، جبکہ سورہ احزاب میں مقصود رسول اللہ ﷺ کے اپنے متبنی زید بن حارثہ کی مطلقہ زینب بنت جحش سے نکاح اور دوسرے معاملات پر منافقین کی اڑائی ہوئی گرد سے آپ ﷺ کا دامن پاک کرنا ہے، اس لیے وہاں سورہ احزاب (۳۶) میں آپ ﷺ کی زیادہ تعریف فرمائی اور ان تینوں اوصاف کے ساتھ ”وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ بِأَذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا“ (اور اللہ کی طرف بلانے والا اس کے اذن سے اور روشنی کرنے والا چراغ) بھی فرمایا۔ (ابن عاشور) ”شَاهِدًا“ کی تفسیر کے لیے مزید دیکھیے سورہ احزاب (۳۵)، بقرہ (۱۴۳) اور سورہ نساء (۴۱)۔

آیت 9 : تَوَكَّرُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتَعَزَّوْهُ وَتُوقِرُوهُ : ”تعزیر“ کا معنی ہے تعظیم کے ساتھ مدد کرنا۔ (راغب) اور ”توقیر“ وقار سے نکلا ہے، تعظیم کرنا۔ اس بات پر تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ ”تَسْبِخُوهُ“ (اس کی تسبیح کرو) سے مراد اللہ تعالیٰ کی تسبیح ہے، کیونکہ تسبیح اللہ کے سوا کسی کی ہو ہی نہیں سکتی۔ اکثر مفسرین کے مطابق اس سے پہلے دونوں الفاظ ”تَعَزَّوْهُ“ اور ”تُوقِرُوهُ“ میں بھی ضمیر غائب کا مرجع اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ہونا چاہیے، تا کہ تمام ضمیروں میں موافقت رہے۔ مطلب یہ ہوگا: ”تا کہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس (اللہ) کی مدد کرو اور اس کی تعظیم کرو اور دن کے شروع اور آخر میں اس کی تسبیح کرو۔“ اللہ کی مدد سے مراد اس کے دین کی مدد ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿إِنْ تَنْصُرُوا اللَّهَ يَنْصُرْكُمْ﴾ [محمد: ۷] ”اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا۔“

بعض مفسرین نے فرمایا کہ ”وَتَعَزَّوْهُ وَتُوقِرُوهُ“ میں ضمیر غائب اس سے پہلے ”تَوَكَّرُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ“ میں مذکور ”رَسُولِهِ“ کی طرف لوٹ رہی ہے، کیونکہ وہ ”تَعَزَّوْهُ“ کے قریب تر ہے، اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے ذکر کے ساتھ آپ کی تعزیر و توقیر کا حکم دے کر آخر میں اپنی تسبیح کا حکم دیا۔ اس مقام پر رسول اللہ ﷺ کی توقیر و تعزیر کے بیان کی مناسبت

يُنَكِّثُ عَلَى نَفْسِهِ ۚ وَمَنْ أَوْقَى بِمَا عَاهَدَ عَلَيْهِ اللَّهُ فَيَسُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ۝

کے اوپر ہے، پھر جس نے عہد توڑا تو درحقیقت وہ اپنی ہی جان پر عہد توڑتا ہے اور جس نے وہ بات پوری کی جس پر اس نے اللہ سے عہد کیا تھا تو وہ اسے جلد ہی بہت بڑا اجر دے گا ۝

تو بے شک اس نے اللہ کی اطاعت کی۔“ کیونکہ رسول، اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ ہے، اس لیے اس کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے اور اس کے ہاتھ پر بیعت اس کے واسطے سے اللہ تعالیٰ سے بیعت ہے۔

② **يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ:** ”يَدُ اللَّهِ“ کا لفظی معنی ہے ”اللہ کا ہاتھ“ اور اللہ کے ہاتھ کی کیفیت مخلوق کے علم و ادراک سے بلند ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کے فرمائے ہوئے الفاظ پر اکتفا کرنا چاہیے کہ ”اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے۔“ رہی یہ بات کہ کیسے ہے؟ تو یہ بات اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ مفسرین نے یہاں مختلف تاویلیں کی ہیں اور سب تاویلوں کا باعث یہ ہے کہ انھوں نے اللہ کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں جیسا سمجھا اور اس کا ہاتھ اوپر ہونے کو اپنا ہاتھ اوپر ہونے کی طرح سمجھا، اس لیے اس کا انکار کر دیا یا تاویل کر دی۔ حالانکہ یہ بات بہت سی آیات و احادیث سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہے اور یہ بھی طے شدہ بات ہے کہ اس کی مثل کوئی چیز نہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی یہ آیات سنیں، کسی نے تاویل کی ضرورت محسوس نہیں فرمائی، نہ کسی نے انکار کیا، جو الفاظ جس طرح آئے اسی طرح مان لیے۔ ہمیں بھی اس پکڑ میں نہیں پڑنا چاہیے کہ اللہ کا ہاتھ کیسا ہے اور ان کے ہاتھوں کے اوپر کس طرح ہے۔

③ بیعت رضوان وہ بیعت ہے جو حدیبیہ کے مقام پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ایک درخت کے نیچے رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر کی تھی۔ ان کی تعداد اکثر صحیح روایات کے مطابق چودہ سو تھی، بعض صحابہ نے پندرہ سو بھی بیان کی ہے۔ جابر رضی اللہ عنہ سے صحیح سند کے ساتھ چودہ سو اور پندرہ سو دونوں روایتیں موجود ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تطبیق یہ دی ہے کہ ان کی تعداد چودہ سو اور پندرہ سو کے درمیان تھی، بعض اوقات زائد کو چھوڑ کر چودہ سو بیان کر دیے اور بعض اوقات درمیان کا عدد پورا کر کے پندرہ سو بیان کر دیے۔ احادیث میں ہے کہ ان تمام صحابہ نے یہ بیعت کی، صرف جد بن قیس نامی شخص نے بیعت نہیں کی۔

اس بیعت کا باعث یہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو حدیبیہ سے اہل مکہ کی طرف بات چیت کے لیے بھیجا کہ وہ مسلمانوں کو بیعت اللہ کا عمرہ ادا کرنے سے نہ روکیں۔ عثمان رضی اللہ عنہ کے واپس آنے میں دیر ہوئی تو انہوں نے پھیل گئی کہ انھیں قتل کر دیا گیا ہے، اس پر رسول اللہ ﷺ نے لڑنے کا پختہ ارادہ فرمایا اور صحابہ کو بیعت کی دعوت دی۔ سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ نے حدیبیہ میں درخت کے نیچے رسول اللہ ﷺ سے دو دفعہ بیعت کرنے کا ذکر کیا تو (ان کے شاگرد) یزید نے پوچھا: ”اے ابو مسلم! آپ اس دن کس چیز پر بیعت کرتے تھے؟“ انھوں نے فرمایا: ”موت پر۔“ بخاری، الجهاد والنسر، باب التبعة فی الحرب علی ابن لا یغروا: ۱۲۹۶ | جبکہ جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”ہم نے آپ ﷺ سے موت پر بیعت نہیں کی بلکہ اس بات پر بیعت کی کہ ہم بھاگیں گے نہیں۔“ مسلم، الإمارة، باب استنحاب مباہیة لإمام الجیش : ۱۸۵۶/۶۸ | اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض صحابہ نے موت پر بیعت کی اور بعض نے اس بات پر کہ ہم کسی صورت میدان سے فرار اختیار نہیں کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

کریں گے اور دونوں کی حقیقت ایک ہی ہے، کیونکہ کسی صورت نہ بھاگنے کا مطلب موت کے لیے تیار رہنا ہی ہے۔ چونکہ عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر یقینی نہیں تھی، بلکہ ان کے زندہ ہونے کا بھی امکان تھا، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے ان کو بھی اس بیعت میں شریک فرمایا۔ چنانچہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: «فَلَوْ كَانَ أَحَدًا أَعَزَّ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْ عُثْمَانَ لَبَعَثَهُ مَكَانَهُ، فَبَعَثَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عُثْمَانَ وَكَانَتْ بَيْعَةُ الرُّضْوَانِ بَعْدَ مَا ذَهَبَ عُثْمَانُ إِلَى مَكَّةَ، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِيَدِهِ الْيُمْنَى هَذِهِ يَدُ عُثْمَانَ فَضْرَبَ بِهَا عَلَى يَدِهِ، فَقَالَ هَذِهِ لِعُثْمَانَ» [بخاری، فضائل أصحاب النبی ﷺ، باب مناقب عثمان بن عفان أبي عمرو القرشي رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ: ۳۶۹۹] "اگر وادی مکہ میں عثمان رضی اللہ عنہ سے زیادہ کوئی شخص عزت والا ہوتا تو رسول اللہ ﷺ اس کے بجائے اسے بھیجتے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے عثمان رضی اللہ عنہ کو مکہ بھیجا اور بیعت رضوان عثمان رضی اللہ عنہ کے مکہ جانے کے بعد ہوئی، تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے دائیں ہاتھ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: "یہ عثمان کا ہاتھ ہے۔" پھر اسے دوسرے ہاتھ پر مار کر فرمایا: "یہ عثمان کی بیعت ہے۔" کفار کو جب اس بیعت کے متعلق پتا چلا تو وہ ڈر گئے اور انھوں نے عثمان رضی اللہ عنہ کو واپس بھیج دیا اور صلح کی کوششیں شروع کر دیں جس کے نتیجے میں صلح حدیبیہ ہوئی۔

④ فَمَنْ نَكَتْ فَلَا تَمَّا يَنْكُتْ عَلَى نَفْسِهِ: یہ بات مسلم ہے کہ ان صحابہ میں سے کسی نے اس بیعت میں کیا ہوا عہد نہیں توڑا، خصوصاً اس لیے کہ یہ بیعت خون عثمان کے قصاص کے لیے لڑائی کے متعلق لی گئی تھی اور اس کا دورانیہ بیعت سے لے کر صلح ہونے تک تھا۔ اس بیعت سے حاصل شدہ رضوان الہی کے لیے اتنا ہی کافی ہے، اگرچہ بعد میں بھی ان صحابہ میں سے کسی سے میدان جہاد سے فرار ثابت نہیں۔

⑤ وَمَنْ آوَى بِمَا عَهَدَ عَلَيْهِ اللَّهُ.....: اللہ تعالیٰ کے اس عہد کو پورا کرنے والوں کے لیے اجر عظیم ہے اور جیسا کہ آگے آ رہا ہے اللہ تعالیٰ کے راضی ہو جانے کی بشارت کے بعد جو لوگ ان مبارک ہستیوں سے بغض یا عداوت رکھیں ان کی بد نصیبی میں کیا شک ہے۔

⑥ بِمَا عَهَدَ عَلَيْهِ اللَّهُ: جمہور قراء نے "عَلَيْهِ" کی "ہاء" پر کسرہ پڑھا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ضمیر اصل میں "هُوَ" ہے، واو حذف کرنے کے بعد بھی یہ مضموم ہی رہتی ہے، جیسے "نَه" اور "ضَرَبْتُهُ" میں ہے، البتہ اس سے پہلے "يَاء" ہو تو اس کی رعایت سے اس پر کسرہ پڑھا جاتا ہے، جیسے "فِيهِ، إِلَيْهِ، عَلَيْهِ" وغیرہ میں ہے۔ یہاں خفض نے جو اس پر ضمہ پڑھا ہے آلوئی نے اس کی دو مناسبتیں بیان کی ہیں، ان میں سے ایک کی تفصیل یہ ہے کہ اس مقام پر اللہ تعالیٰ کے ساتھ بیعت اور عہد کا ذکر ہے جو لفظ "اللَّهُ" کو ایسے طریقے سے ادا کرنے کا تقاضا کرتا ہے جس سے اس کی عظمت اور جلال کا اظہار ہوتا ہو کہ کتنی عظیم ہستی سے عہد کیا گیا ہے اور معلوم ہے کہ لفظ "اللَّهُ" سے پہلے اگر کسرہ ہو تو اس کے لام کو باریک پڑھا جاتا ہے، اسے تقصیم کے ساتھ (پڑ کر کے) نہیں پڑھا جاتا۔ اس لیے "عَلَيْهِ" کی "ہاء" پر کسرہ کے بجائے ضمہ لایا گیا ہے، تاکہ لفظ "اللَّهُ" کی ادائیگی پوری شان و شوکت اور جلال و عظمت کے اظہار کے ساتھ ہو۔ دوسری مناسبت یہ ہے کہ "عَلَيْهِ" میں "ہاء" اصل میں "هُوَ" ہے، جیسا کہ پیچھے گزرا، لہذا اس کا اصل اعراب ضمہ ہے نہ کہ کسرہ، اس لیے اصل ضمہ کو باقی رکھنا اصل عہد کے قائم رکھنے اور پورا

سَيَقُولُ لَكَ الْمُخَلَّفُونَ مِنَ الْأَعْرَابِ شَغَلْنَا أَمْوَالَنَا وَ أَهْلُونَا فَاسْتَغْفِرْ لَنَا ، يَقُولُونَ بِآلِسْتِهِمْ مَا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ ، قُلْ فَمَنْ يَمْلِكُ لَكُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا إِنْ أَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا أَوْ أَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا ، بَلْ كَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ۝

عقرب بدویوں میں سے پیچھے چھوڑ دیے جانے والے تھے سے کہیں گے کہ ہمارے اموال اور ہمارے گھر والوں نے ہمیں مشغول رکھا، سو تو ہمارے لیے بخشش کی دعا کر۔ وہ اپنی زبانوں سے کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں۔ کہہ دے پھر کون ہے جو اللہ سے تمہارے لیے کسی چیز کا اختیار رکھتا ہو، اگر وہ تمہارے بارے میں کسی نقصان کا ارادہ کرے، یا وہ تمہارے ساتھ کسی فائدے کا ارادہ کرے، بلکہ اللہ اس سے جو تم کرتے ہو، ہمیشہ سے پورا باخبر ہے ۝

کرنے کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

آیت 11 ۝ سَيَقُولُ لَكَ الْمُخَلَّفُونَ مِنَ الْأَعْرَابِ : رسول اللہ ﷺ نے جب عمرہ کے لیے جانے کا ارادہ فرمایا تو مدینہ کے اردگرد کے اعراب کو ساتھ چلنے کے لیے کہا، تاکہ اہل مکہ مسلمانوں کی تعداد دیکھ کر انھیں عمرہ سے نہ روکیں، مگر ان میں سے اکثر لوگ جان بوجھ کر پیچھے رہ گئے۔ یہ لوگ اگرچہ منافق نہیں تھے مگر ابھی تک ایمان ان کے دلوں میں پوری طرح جاگزیں نہیں ہوا تھا۔ اس کی دلیل آگے آنے والی آیات ”قُلْ لِلْمُخَلَّفِينَ مِنَ الْأَعْرَابِ“ ہیں۔ جب رسول اللہ ﷺ مظفر و منصور واپس روانہ ہوئے تو ان لوگوں نے اپنے دلوں میں عذر بہانے تیار کیے جو وہ آپ کی آمد پر آپ کے سامنے پیش کرنے والے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو پہلے ہی راستے میں ان کے بہانوں کی اطلاع دے دی جو وہ پیش کرنے والے تھے اور ان کے پیچھے رہنے کا حقیقی سبب بھی بتا دیا۔ یہ قرآن مجید کے معجزات میں سے ہے کہ اس نے وہ بات پہلے ہی بتا دی جو بعد میں ہونے والی تھی۔

2 ”الْمُخَلَّفُونَ“ کا لفظی معنی ”پیچھے چھوڑ دیے جانے والے“ ہے، جبکہ یہ لوگ جان بوجھ کر خود پیچھے رہے تھے، تو بظاہر ان کے لیے لفظ ”مُتَخَلَّفُونَ“ (پیچھے رہنے والے) استعمال ہونا چاہیے تھا، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ”الْمُخَلَّفُونَ“ کا لفظ استعمال فرمایا۔ یعنی ان کی بدینتی اور شامت اعمال کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انھیں ساتھ جانے کی توفیق ہی نہیں دی، بلکہ انھیں پیچھے چھوڑ دیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آدمی کا نیک اعمال سے محروم رہنا اللہ تعالیٰ کے ناراض ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے، کیونکہ وہ اس کے اعمالی بد کی وجہ سے نیک اعمال کی توفیق سلب کر لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جنگ تبوک کے خلفین کے متعلق فرمایا:

﴿ وَ تَوَّأَرَدُوا الْخُرُوجَ لَا عُدَّةَ لَهُ عُدَّةٌ وَ لَكِنَّ كَرِيهَةَ اللَّهِ إِلَيْهِمْ فَنَبَذَهُمْ وَ قِيلَ افْعَدُوا مَعَ الْفَاعِلِينَ ﴾

[النوبة : ۶۶] ”اور اگر وہ نکلنے کا ارادہ رکھتے تو اس کے لیے کچھ سامان ضرور تیار کرتے اور لیکن اللہ نے ان کا اٹھنا ناپسند کیا تو انھیں روک دیا اور کہہ دیا گیا کہ بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو۔“ مزید دیکھیے سورہ توبہ (۸۱)۔

بَلْ كُنْتُمْ أَنْ كُنْ يَنْقَلِبَ الرَّسُولُ وَ الْمُؤْمِنُونَ إِلَىٰ أَهْلِيهِمْ أَبَدًا وَ زَيْنَ ذَلِكَ فِي قُلُوبِكُمْ
وَ كُنْتُمْ ظَنَ السَّوءِ ۖ وَ كُنْتُمْ قَوْمًا بُورًا ﴿۱۷﴾

بلکہ تم نے گمان کیا کہ رسول اور ایمان والے کبھی اپنے گھر والوں کی طرف واپس نہیں آئیں گے اور یہ بات تمہارے دلوں میں خوش نما بنا دی گئی اور تم نے گمان کیا، برا گمان اور تم ہلاک ہونے والے لوگ تھے ﴿۱۷﴾

﴿۳﴾ شَعَلْتُمْ مَوَالِنَا وَ أَهْلُونَا فَاسْتَغْفِرْنَا : یعنی یہ اعراب کہیں گے کہ ہمارے مال مویشی اور بیوی بچے ہمارے آپ کے ساتھ طے کی راہ میں رکاوٹ بن گئے، کیونکہ ان کی دیکھ بھال اور حفاظت کرنے والا کوئی نہ تھا، اس لیے ہماری اس کوتاہی پر آپ ہمارے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کیجیے کہ وہ ہمیں معاف فرمادے۔

﴿۴﴾ يَقُولُونَ بِآلِئِهِمْ قَالِيْسٌ فِي قُلُوبِهِمْ : یعنی یہ لوگ تمہارے مدینہ پہنچنے پر اپنی زبانوں سے وہ باتیں کہیں گے جو ان کے دلوں میں نہیں ہیں۔ مال مویشی اور اہل و عیال کی رکاوٹ ان کا جھوٹا بہانہ ہے۔ اسی طرح ان کا استغفار کے لیے کہنا محض بناوٹ ہے، ورنہ گناہ کا ایسا ہی احساس ہوتا تو ساتھ کیوں نہ جاتے۔ ان کے نہ جانے کا اصل سبب اللہ علام الغیوب نے اگلی آیت میں بیان فرمایا ہے۔

﴿۵﴾ قُلْ فَمَنْ يَمْلِكُ لَكُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا : یہ ان کی دونوں باتوں کا جواب ہے، فرمایا تم جو اپنے کہنے کے مطابق اپنے مال و اہل کی دیکھ بھال اور حفاظت کی وجہ سے ساتھ نہیں گئے، بتاؤ اگر اللہ تعالیٰ تمہیں کوئی نقصان پہنچانا چاہے اور تمہارے جہاد سے پیچھے رہنے پر گھر میں موجود ہونے کے باوجود تمہارے اموال اور گھر والوں کو تباہ و برباد کر دے تو تمہیں اس سے کون بچا سکتا ہے؟ یا اگر وہ تمہیں کوئی فائدہ پہنچانا چاہے اور تمہارے جہاد پر جانے کے باوجود تمہارے اموال اور گھر والوں کی حفاظت کرے اور ان میں برکت اور اضافہ فرمادے تو کون اسے روک سکتا ہے؟ جب نفع و نقصان کو کوئی روک نہیں سکتا تو اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے مقابلے میں ان چیزوں کی پروا کیوں کرتے ہو؟ اور تم نے جو استغفار کے لیے کہا ہے، اگر تم فی الواقع اپنے کیے پر نادم ہو اور اللہ تعالیٰ تمہیں معاف کرنا چاہے تو کون اسے روک سکتا ہے؟ پھر اگر میں تمہارے لیے استغفار نہ بھی کروں تو تمہارا کچھ نقصان نہیں اور اگر تم نادم نہیں ہو، صرف بناوٹ کے طور پر استغفار کے لیے کہہ رہے ہو تو اس صورت میں اگر میں تمہارے لیے استغفار کر بھی دوں اور اللہ تعالیٰ تمہیں معاف نہ کرنا چاہے، بلکہ سزا دینا چاہے تو کون اسے روک سکتا ہے؟

﴿۶﴾ بَلْ كَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا : یعنی بات وہ نہیں جو تم نے سمجھ رکھی ہے کہ ہم زبان سے جو کچھ کہہ دیں گے مان لیا جائے گا اور ہمارے دل کا حال چھپا رہے گا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف موجود وقت ہی میں نہیں بلکہ ہمیشہ سے ان تمام اعمال سے پورا باخبر ہے جو تم کرتے ہو۔ بیشکی کا مفہوم ”کان“ ادا کر رہا ہے۔ مفسر طبری کے الفاظ ہیں: ”بَلْ لَمْ يَزَلِ اللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مِنْ خَيْرٍ وَ شَرِّ خَيْرًا“ ”بلکہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ ان کے تمام اچھے اور برے اعمال کی پوری خبر رکھنے والا رہا ہے۔“

آیت ۱۲ ﴿۱﴾ بَلْ كُنْتُمْ أَنْ كُنْ يَنْقَلِبَ الرَّسُولُ وَ الْمُؤْمِنُونَ : یعنی تمہارے پیچھے رہنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ تم

وَمَنْ لَّمْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ فَإِنَّا أَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ سَعِيرًا ﴿۳۴﴾ وَ لِلَّهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ
وَ الْاَرْضِ وَيَغْفِرُ لِمَن يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ ۗ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۳۵﴾

اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول پر ایمان نہ لایا تو یقیناً ہم نے کافروں کے لیے بھڑکتی آگ تیار کر رکھی ہے ﴿۳۴﴾ اور آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کی ہے، وہ بخش دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور سزا دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور اللہ ہمیشہ سے بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۳۵﴾

نے سمجھا تھا کہ رسول اللہ ﷺ اور مسلمان، جو احرام باندھ کر جا رہے ہیں، پورا اسلحہ بھی ساتھ لے کر نہیں جا رہے اور اس دشمن کے پاس جا رہے ہیں جس نے سیکڑوں میل دور سے آ کر مدینہ میں ان کے کئی آدمی قتل کر دیے اور سخت نقصان پہنچایا، یہ وہیں کاٹ ڈالے جائیں گے، کوئی بچ کر واپس نہیں آئے گا۔

﴿۳۵﴾ وَ ذٰلِكَ فِیْ قُلُوْبِكُمْ : یعنی تمہیں اپنے پیچھے رہنے پر کوئی ندامت بھی نہ تھی، بلکہ دل میں خوش تھے کہ ہم نے بہت اچھا کیا کہ ساتھ نہیں گئے۔ ”یہ بات تمہارے دلوں میں مزین کر دی گئی“ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے فعل مجہول ”ذٰلِكَ“ کا لفظ استعمال فرمایا۔ مزین کس نے کیا، اس کی صراحت نہیں فرمائی، کیونکہ وہ متعدد چیزیں ہیں، مثلاً دنیا کی مرغوبات، آدمی کا نفس، شیطان اور برے ساتھی وغیرہ۔

﴿۳۶﴾ وَ كُنْتُمْ قَوْمًا بُورًا : ”بُورًا“ ”بَابُرًا“ کی جمع ہے جو ”بَارٌ بُورٌ بُورًا“ (ن) سے اسم فاعل ہے، ہلاک ہونے والے۔ یعنی اصل بات یہ ہے کہ تم شروع سے اپنی نامردی اور بزدلی کی وجہ سے تھے ہی ہلاک ہونے والے، کیونکہ بہادر مومن تو ایک دفعہ مرتا ہے جبکہ بزدل منافق ہر گھڑی مرتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿يَخْبُتُونَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ﴾ [المنافقون : ۴] ”(ایسے بزدل ہیں کہ) ہر اونچی آواز کو اپنے آپ پر آنے والی (آفت) ہی سمجھتے ہیں۔“

آیت 13 : وَمَنْ لَّمْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ : اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص اللہ اور اس کے رسول کے متعلق برا گمان رکھے، مسلمان ہونے کے باوجود مسلمانوں کے نقصان پر اور اپنی جان بچانے پر خوش ہو وہ مومن نہیں بلکہ کافر ہے اور اللہ تعالیٰ نے ایسے کافروں کے لیے بھڑکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کلمہ اسلام کہنے اور مسلمانوں کے ساتھ مسلمان بن کر رہنے کی وجہ سے دنیوی احکام میں انہیں مسلمان ہی سمجھا جائے گا، مگر آخرت میں ان کے لیے کھلے کافروں سے بھی سخت عذاب تیار ہے، فرمایا: ﴿إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الذِّكْرِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ﴾ [النساء : ۱۴۵] ”بے شک منافق لوگ آگ کے سب سے نچلے درجے میں ہوں گے۔“

آیت 13 : ﴿۱﴾ وَ لِلَّهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ : یہ ان پیچھے چھوڑ دیے جانے والے اعراب کو فرمایا جن کا اوپر ذکر ہے کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے، اگر تم نے نفاق پر اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جہاد پر جانے سے گریز پر اصرار کیا تو کسی میں طاقت نہیں کہ وہ جو عذاب دینا چاہے اس سے تمہیں بچا سکے، یا اگر وہ تمہاری ندامت اور توبہ پر

سَيَقُولُ الْمُخَلَّفُونَ إِذَا انطَلَقْتُمْ إِلَى مَغَائِمٍ لِأَخْذِهَا ذُرُوقًا تَتَّبِعُكُمْ ۚ يُرِيدُونَ أَنْ يُبَدِّلُوا كَلِمَ اللَّهِ ۗ قُلْ لَنْ تَتَّبِعُونَا كَذَلِكُمْ قَالَ اللَّهُ مِنْ قَبْلُ ۗ فَسَيَقُولُونَ بَلْ تَحْسُدُونَنَا ۗ
بَلْ كَانُوا لَا يَفْقَهُونَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿۱۵﴾

غریب پیچھے چھوڑ دیے جانے والے لوگ کہیں گے جب تم کچھ غنیمتوں کی طرف چلو گے، تاکہ ہمیں لے لو، ہمیں چھوڑ دو کہ ہم تمہارے ساتھ چلیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے کلام کو بدل دیں۔ کہہ دو تم ہمارے ساتھ کچھ نہیں جاؤ گے، اسی طرح اللہ نے پہلے سے کہہ دیا ہے۔ تو وہ ضرور کہیں گے بلکہ تم ہم سے حسد کرتے ہو۔ بلکہ وہ نہیں سمجھتے تھے مگر بہت سمجھو! ﴿۱۵﴾

تمہیں معاف کر دے تو کوئی اسے روک نہیں سکتا۔

﴿۱۵﴾ يَغْفِرُ لِمَن يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ : اس میں ان اعراب کو توبہ کی اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کی طرف پلٹ آنے کی ترغیب دی ہے کہ اب بھی وقت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پیچھے بیٹھ رہنے سے توبہ کر لو، کیونکہ اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں کو معاف کرنے والا اور ان پر رحم کرنے والا ہے اور اس کی یہ صفت آج نہیں بلکہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ کے لیے ہے۔
﴿۱۶﴾ "يَغْفِرُ لِمَن يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ" کی تقسیم سے معلوم ہوا کہ پیچھے رہنے والوں میں سے کچھ ایسے ہوں گے جو نفاق سے توبہ کر کے اخلاص کی نعمت سے سرفراز ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کی مغفرت و رحمت سے فیض یاب ہوں گے اور کچھ ایسے بھی ہوں گے جو نفاق سے توبہ نہیں کریں گے اور اللہ تعالیٰ انہیں عذاب دے گا۔ آگے آیت: ﴿قُلْ لِلْمُخَلَّفِينَ مِنَ الْأَعْرَابِ ...﴾ سے بھی یہ بات واضح ہو رہی ہے۔

آیت 15 ﴿۱﴾ سَيَقُولُ الْمُخَلَّفُونَ إِذَا انطَلَقْتُمْ إِلَى مَغَائِمٍ : اللہ تعالیٰ نے بیعت رضوان میں شریک صحابہ پر اپنے بہت سے انعامات کے علاوہ، جن کا ذکر آیت (۱۸، ۱۹) میں آ رہا ہے، انہیں ایک بہت جلدی حاصل ہونے والی فتح کا وعدہ بھی فرمایا جس میں انہیں بہت سی غنیمتیں حاصل ہوں گی۔ مقصد ان کی اس دل کھنی کا ازالہ تھا جو حدیبیہ کے موقع پر ہوئی، اس کے علاوہ ان اطاعت، وفاداری اور جاں فروشی کا انعام دینا بھی تھا جس کا مظاہرہ انہوں نے اس سارے غزوہ کے دوران کیا۔ ان غنیمتوں سے مراد خیر ہے جس کا فتح کرنا یہودیوں کی مسلسل شرارتوں اور عہد شکنیوں کی وجہ سے نہایت ضروری تھا، مگر قریش کی حمایت کی وجہ سے اس میں مشکلات درپیش تھیں۔ اب قریش کی طرف سے بے فکری ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے خیر پر چڑھائی کا ارادہ فرمایا۔ اس مہم میں مسلمانوں کی فتح اور بے شمار غنیمتوں کا حصول سب کو صاف نظر آ رہا تھا اور ایسے ہی ہوا کہ صلح حدیبیہ کے تین ماہ بعد ہی رسول اللہ ﷺ نے خیر پر چڑھائی کی اور بڑی آسانی سے اسے فتح فرمایا، بلکہ خیر کے اردگرد کی یہودیوں کی بہت سی بستیاں بھی کسی خاص مزاحمت کے بغیر مسلمانوں کے ہاتھ آ گئیں۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی آگاہ فرما دیا کہ جب

قُلْ لِلْمُخَلَّفِينَ مِنَ الْأَعْرَابِ سُدُّعُونَ إِلَىٰ قَوْمٍ أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ تُقَاتِلُونَهُمْ أَوْ

بدویوں میں سے پیچھے چھوڑے جانے والوں سے کہہ دے عنقریب تم ایک سخت لڑنے والی قوم کی طرف بلائے جاؤ

تم خیبر کی طرف غنیمتیں حاصل کرنے کے لیے روانہ ہو گے تو یہ پیچھے رہنے والے کہیں گے، ہمیں بھی اپنے ساتھ چلنے کی اجازت دو۔

② **يُرِيدُونَ أَنْ يُبَدِّلُوا كَلِمَةَ اللَّهِ**: یعنی اللہ تعالیٰ نے تو ان غنیمتوں کا وعدہ اس درخت کے نیچے بیعت کرنے والوں سے کیا تھا اور یہ چاہتے ہیں کہ وہ غنیمتیں ان لوگوں کو بھی مل جائیں جو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جانے کے لیے گھر ہی سے نہیں نکل سکے، بیعت انھوں نے خاک کرنا تھی۔ اب ان کی بات مان لی جائے تو اللہ کی بات تو اپنی جگہ نہ رہی۔

③ **قُلْ لَنْ تَكْفُرُونَا**: آپ ان سے کہیے، تم ہمارے ساتھ ہرگز نہیں جاؤ گے، کیونکہ یہ ان لوگوں کا حق ہے جنھوں نے اس وقت رسول اللہ ﷺ کا ساتھ دیا جب موت آنکھوں کے سامنے نظر آ رہی تھی۔

④ **كَذَلِكَ قَالَ اللَّهُ مِنْ قَبْلُ**: یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ پہلے ہی کر دیا ہے کہ فتح کے ثمرات کے حق دار بھی صرف وہ ہیں جنھوں نے اس وقت ساتھ دیا جب جان و مال کی بازی لگانے کا وقت تھا۔

⑤ **فَسَيَقُولُونَ بَلْ تَحْسُدُونَنَا**: فرمایا، یہ لوگ ساتھ جانے کی اجازت نہ ملنے پر کہیں گے، بلکہ تم لوگ ہم پر حسد کرتے ہو کہ ان غنیمتوں کے حصول سے ہماری مالی حالت اچھی نہ ہو جائے۔

⑥ **بَلْ كَانُوا لَا يَفْقَهُونَ إِلَّا قَلِيلًا**: فرمایا، مسلمانوں کو ان پر کوئی حسد نہیں اور نہ ان کی پاک فطرت میں اس کی گنجائش ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ مسلمانوں کو خواہ مخواہ مورد الزام ٹھہرا رہے ہیں، اپنے قصور کی سمجھ نہ انھیں پہلے آئی نہ اب تک اسے سمجھ رہے ہیں، (کائنات میں استمرار ہے) کہ جب اس سے پہلے وہ کوئی جانی و مالی خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں ہوئے تو اب آسانی سے ہاتھ آنے والے مال غنیمت میں انھیں کیسے حصے دار بنایا جاسکتا ہے اور جب پہلے ان کے اموال اور گھر والوں نے انھیں گھر سے نکلنے سے روک رکھا تو اب وہ انھیں نکلنے سے کیوں نہیں روک رہے؟ بہت کم سمجھنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ بالکل نہیں سمجھتے۔ قرآن مجید اور کلام عرب میں قلیل کا لفظ مطلق نفی کے لیے عام استعمال ہوا ہے۔

آیت 16 ① **قُلْ لِلْمُخَلَّفِينَ مِنَ الْأَعْرَابِ**..... : اس آیت میں پیچھے رہنے والے اعراب کو تسلی دلائی ہے کہ آئندہ

غزوات میں انھیں شرکت کا اور غنیمتیں حاصل کرنے کا پورا پورا موقع دیا جائے گا، تاکہ انھیں اطمینان ہو جائے کہ انھیں اسلامی لشکر کے ساتھ خیبر میں جانے سے اس لیے منع نہیں کیا گیا کہ وہ اسلام سے نکل گئے ہیں، بلکہ اس کا ایک خاص سبب ہے جس کا ذکر پیچھے گزر چکا ہے۔ چنانچہ آئندہ جس طرح دوسرے مسلمانوں کو کفار سے لڑنے کی دعوت دی جائے گی انھیں بھی دی جائے گی۔ اس آیت میں ان کی اس دل شکنی کا مداوا فرمایا ہے جو خیبر میں شریک نہ کیے جانے سے ہوئی اور ان کے حق میں یہ عظیم خوش خبری بھی دی کہ وہ خیبر سے پیچھے رہ جانے کی کوتاہی کی تلافی کر سکتے ہیں اور تاریخ شاہد ہے کہ حدیبیہ سے پیچھے رہنے والے اعراب کے یہ قبائل آئندہ جنگوں مثلاً فتح مکہ، جنگ حنین، جنگ تبوک اور جنگ یمامہ میں شریک ہوئے، ان میں سے کم

يُسْلِمُونَ ، فَإِنْ تَطِيعُوا يُؤْتِكُمْ اللَّهُ أَجْرًا حَسَنًا ، وَإِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ①

گے، تم ان سے لڑو گے، یا وہ تابع فرمان ہو جائیں گے، پھر اگر تم حکم مانو گے تو اللہ تمہیں اچھا اجر دے گا اور اگر پھر جاؤ گے، جیسے تم اس سے پہلے پھر گئے تو وہ تمہیں سزا دے گا، دردناک سزا ①

ہی کوئی شخص ان جنگوں سے پیچھے رہا۔ یہ آیت اس بات کی بھی دلیل ہے کہ یہ لوگ ایمان سے محروم نہیں ہوئے تھے، کیونکہ اس کے بعد جنگ تبوک سے پیچھے رہنے والے منافقین، جو دل میں کفر چھپائے ہوئے تھے، ان کے ساتھ یہ معاملہ نہیں کیا گیا، نہ انہیں آئندہ کسی جنگ میں شرکت کی دعوت دی گئی اور نہ ان کے حق میں یہ اجازت ملی، بلکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَإِنْ رَجَعَكَ اللَّهُ إِلَى طَائِفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَأْذِنُوا لَكَ لِيُخْرُجَ فِقْطٌ لَّنْ تَخْرُجُوا مَعِيَ أَبَدًا وَلَنْ تُهَاتِلُوا مَعِيَ عَدُوًّا إِنَّكُمْ رَضِيتُمْ بِالْقُعُودِ أَوْلَىٰ مَرَرًا فاقْعُدُوا مَعَ الْخَلِيفِينَ ② وَلَا تُصَلِّ عَلَىٰ أَحَدٍ مِّنْهُمْ مَاتَ أَبَدًا وَلَا تَقُمْ عَلَىٰ قَبْرِهِ إِنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَمَاتُوا وَهُمْ فَسِقُونَ ﴾ [التوبة : ۸۳، ۸۴] ”پس اگر اللہ تجھے ان میں سے کسی گروہ کی طرف واپس لے آئے، پھر وہ تجھ سے (جنگ کے لیے) نکلنے کی اجازت طلب کریں تو کہہ دے تم میرے ساتھ کبھی نہیں نکلو گے اور میرے ساتھ مل کر کبھی کسی دشمن سے نہیں لڑو گے۔ بے شک تم پہلی مرتبہ بیٹھ رہنے پر خوش ہوئے، سو پیچھے رہنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو۔ اور ان میں سے جو کوئی مر جائے اس کا کبھی جنازہ نہ پڑھنا اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہونا، بے شک انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا اور اس حال میں مرے کہ وہ نافرمان تھے۔“

② سَتُدْعُونَ إِلَىٰ قَوْمٍ أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ: جنگ تبوک سے پیچھے رہنے والے منافقین کے برعکس غزوہ حدیبیہ سے پیچھے رہنے والے اعراب کے متعلق فرمایا کہ آئندہ تمہیں سخت لڑائی والے لوگوں سے جنگ کے لیے بلایا جائے گا۔ ”سَتُدْعُونَ“ (مغزیرب تمہیں بلایا جائے گا) کا لفظ عام ہے، تاکہ اس میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ آپ ﷺ کے خلفاء کا جنگ کے لیے دعوت دینا بھی شامل ہو جائے۔ ان سخت لڑائی والے لوگوں کے بارے میں مفسرین کے چار اقوال ہیں، ایک یہ کہ اس سے مراد ثقیف و ہوازن ہیں جن کے ساتھ جنگ خنین ہوئی۔ دوسرا یہ کہ اس سے مراد رومی ہیں جن سے جنگ کے لیے رسول اللہ ﷺ نے غزوہ تبوک میں سب لوگوں کو ساتھ جانے کی دعوت دی اور بعد میں ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے زمانے میں بھی ان سے جنگ ہوئی۔ تیسرا یہ کہ اس سے مراد بنو حنیفہ کے مرتدین ہیں جن سے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جنگ کی اور چوتھا قول یہ ہے کہ اس سے مراد اہل فارس ہیں جن کے ساتھ ابوبکر صدیق اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے زمانے میں جنگ ہوئی۔ امام طبری رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نے اعراب کے ان خلفین کے متعلق فرمایا کہ انہیں سخت لڑائی والے اور بہادر لوگوں سے لڑنے کی دعوت دی جائے گی اور کسی عقلی یا نقلی دلیل سے ثابت نہیں ہوتا کہ اس سے مراد خاص ہوازن ہیں یا بنو حنیفہ یا فارس یا روم۔ ہو سکتا ہے ان سے مراد ان میں سے بعض ہوں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے علاوہ کوئی اور لوگ ہوں۔ اور اس قول سے زیادہ کوئی قول صحیح نہیں

لَيْسَ عَلَى الْأَعْمَى حَرْجٌ وَلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرْجٌ وَلَا عَلَى الْمَرِيضِ حَرْجٌ ۚ وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ يُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۚ وَمَنْ يَتَوَلَّ يُعَذِّبْهُ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿١٧﴾

نہیں ہے اندھے پر کوئی سختی اور نہ لنگڑے پر کوئی سختی اور نہ بیمار پر کوئی سختی اور جو اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانے گا وہ اسے ان باغوں میں داخل کرے گا جن کے تلے نہریں بہتی ہیں اور جو پھر جائے گا وہ اسے سزا دے گا، دردناک سزا ﴿۱۷﴾

ہوسکتا جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ انہیں ایک سخت لڑنے والی قوم کی طرف بلایا جائے گا، سو اسی پر اکتفا ہونا چاہیے۔“

﴿۳﴾ تَهَاتِلُوا لَهُمْ أَوْ يُسَلِّمُوا: یعنی تم ان سے لڑو گے یا وہ لڑائی کے نتیجے میں یا لڑائی کے بغیر ہی تابع فرمان ہو جائیں گے، یا جزیہ دینا قبول کر لیں گے۔ بعض مفسرین نے ”أَوْ يُسَلِّمُوا“ کا معنی کیا ہے ”یا وہ مسلمان ہو جائیں گے۔“ ان کے مطابق اس آیت میں ان لوگوں سے جنگ کی پیش گوئی ہے جن سے جزیہ لینے کی اجازت نہیں تھی، بلکہ ان کے لیے دو ہی راستے تھے کہ یا مسلمان ہو جائیں یا جنگ کے لیے تیار رہیں۔ یہود و نصاریٰ سے بلا تفاق جزیہ لینا درست ہے، ہجر کے مجوس سے بھی رسول اللہ ﷺ کا جزیہ لینا ثابت ہے۔ البتہ مشرکین عرب کے متعلق سورہ توبہ (۵) میں یہ حکم اترا کہ ان سے اس وقت تک جنگ کی جائے جب تک وہ مسلمان نہ ہو جائیں، ان میں سے کسی سے رسول اللہ ﷺ نے جزیہ نہیں لیا۔ ان مفسرین کے قول کے مطابق اس آیت سے مراد ثقیف و ہوازن ہو سکتے ہیں جو جنگ حنین میں قتل ہو گئے یا گرفتار ہونے کے بعد سب کے سب مسلمان ہو گئے، یا بنو حنیفہ کے مرتدین ہیں جن سے اس وقت تک جنگ کی گئی جب تک وہ دوبارہ مسلمان نہیں ہو گئے۔ البتہ پہلے قول کے مطابق ”تَهَاتِلُوا لَهُمْ أَوْ يُسَلِّمُوا“ (تم ان سے لڑو گے یا وہ تابع فرمان ہو جائیں گے) سے مراد ہوازن، روم و فارس، مرتدین اور وہ تمام کفار ہو سکتے ہیں جن سے مسلمان آئندہ جنگ کرنے والے تھے اور یہ قول زیادہ جامع ہے۔

﴿۴﴾ فَإِنْ تُطِيعُوا يُؤْتِكُمُ اللَّهُ أَجْرًا حَسَنًا: یعنی اگر تم ان جنگجو لوگوں سے لڑنے کے حکم کی اطاعت کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں بہت اچھا بدلہ دے گا، دنیا میں فتح و نصرت اور عزت و نعمت سے نوازے گا اور آخرت میں جنت عطا کرے گا۔

﴿۵﴾ وَإِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا: اور اگر اطاعت سے پھر جاؤ گے، جیسا کہ اس سے پہلے حدیث کے موقع پر پھر گئے تھے تو تمہیں دردناک سزا دے گا کہ دنیا میں ذلت کی زندگی بسر کرو گے اور آخرت میں جہنم میں جاؤ گے۔

آیت ۱۷ ﴿۱﴾ لَيْسَ عَلَى الْأَعْمَى حَرْجٌ : ان تینوں میں سے اندھے اور لنگڑے کا عذر دائمی ہے اور بیمار کا عارضی، جو بیماری ختم ہونے پر ختم ہو جاتا ہے۔ جہاد سے پیچھے رہنے والوں پر عتاب کے بعد فرمایا کہ نابینا، لنگڑا اور بیمار اگر جہاد کے

لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ
 بلاشبہ یقیناً اللہ ایمان والوں سے راضی ہو گیا، جب وہ اس درخت کے نیچے تجھ سے بیعت کر رہے تھے، تو اس نے
 لیے نہ نکلیں تو ان پر کوئی حرج نہیں۔

② وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ..... : جو شخص واقعی عذر کی وجہ سے جہاد کے لیے نہ نکل سکے مگر خلوص دل کے ساتھ اللہ اور
 اس کے رسول کا مطیع اور خیر خواہ ہو تو اللہ تعالیٰ اسے بھی ان جنتوں میں داخل کرے گا جن کے تلے نہریں بہتی ہیں۔ ایسے لوگ
 پیچھے رہنے کے باوجود جہاد میں شریک ہی سمجھے جائیں گے۔ مزید دیکھیے سورہ توبہ کی آیت (۹۱): ﴿مَا عَلَى الْمُضْطَرِّينَ مِنْ
 سَبِيلٍ﴾ کی تفسیر میں مذکور حدیث۔

③ وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ..... : بھائی نے اس کی تفسیر یہ فرمائی ہے کہ واؤ عطف کا مطلب یہ ہے کہ اس سے پہلے ایک
 جملہ محذوف ہے: ”أَمَّنْ تَخَلَّفَ مِنَ الضُّعْفَاءِ فَلَا حَرَجَ عَلَيْهِ وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ.....“ یعنی پھر اندھے،
 لنگڑے اور مریض میں سے جو شخص پیچھے رہ جائے اس پر کوئی حرج نہیں اور جو پیچھے نہ رہے بلکہ اللہ اور اس کے رسول کی
 اطاعت کرتے ہوئے عذر کے باوجود نکل پڑے تو اللہ تعالیٰ اسے ان جنتوں میں داخل کرے گا جن کے تلے نہریں بہتی ہیں
 اور جو عذر کی وجہ سے نہیں بلکہ اطاعت سے جی چراتے ہوئے جہاد سے متنبہ پھیرے گا اللہ تعالیٰ اسے عذاب الیم دے گا۔ جہاد
 کے لیے نہ نکلنے کے بعض مقبول عذر اس سے پہلے سورہ توبہ (۹۱، ۹۲) میں بیان ہو چکے ہیں۔

آیت 18: ① لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ..... : اس سے پہلے ”إِنَّ الدِّينَ يُبَايِعُوكَ يَا أَيُّهَا رَسُولَ اللَّهِ“ میں
 حدیبیہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کو اللہ تعالیٰ سے بیعت قرار دینے کے بعد اس سے پیچھے رہنے والوں کا
 حال بیان فرمایا، اب دوبارہ بیعت کرنے والوں پر اپنی رضا کا اور دوسری بشارتوں کا ذکر فرمایا۔

② اس درخت کے نیچے بیعت کرنے والے صحابہ کرام کو بیعت کے وقت ہی کائنات کی سب سے بڑی نعمت مل گئی اور وہ ہے
 اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی، کیونکہ اس سے بڑی نعمت کوئی نہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَرِضْوَانٌ مِنَ اللَّهِ أَكْبَرُ﴾ (التوبہ:
 ۷۲) ”اور اللہ کی طرف سے تھوڑی سی خوشنودی سب سے بڑی ہے۔“ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ
 الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ﴾ ”بلاشبہ یقیناً اللہ ایمان والوں سے اس وقت راضی ہو گیا جب وہ اس درخت
 کے نیچے تجھ سے بیعت کر رہے تھے۔“ اس رضا ہی کی وجہ سے اس کا نام بیعت رضوان ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ کی رضا اور جنت کا
 داخلہ لازم و ملزوم ہیں۔ (دیکھیے مجاہدہ: ۲۲- توبہ: ۷۲) جب ان صحابہ کرام رضوانہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے شہادت دے دی
 کہ وہ ان پر راضی ہو گیا تو کس قدر بد نصیب ہے وہ گروہ جو ان مقبول بندوں سے ناراض اور ان سے بغض و عداوت رکھے اور
 کہے کہ وہ بعد میں نعوذ باللہ مرتد ہو گئے۔ کیا اللہ تعالیٰ کو آئندہ کا غم نہیں تھا اور وہ رضا کیسی ہے جس کے باوجود وہ بندے مرتد
 ہو جائیں جن پر وہ راضی ہے؟ اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کے علاوہ مزید حاصل ہونے والی نعمتوں کا بیان آگے آ رہا ہے۔

فَأَنْزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ وَأَنْابَهُمْ فَتَحًا قَرِيبًا ۝۱۸

جان لیا جو ان کے دلوں میں تھا، پس ان پر سکینت نازل کر دی اور انھیں بدلے میں ایک قریب فتح عطا فرمائی ۝۱۸

قرآن مجید کے علاوہ صحیح احادیث میں بھی بیعت رضوان میں شریک صحابہ کی بہت زیادہ فضیلت آئی ہے۔ عمرو بن دینار کہتے ہیں کہ میں نے جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے سنا، وہ بیان کرتے ہیں: ”حدیبیہ کے دن رسول اللہ ﷺ نے ہم سے فرمایا: «أَنْتُمْ خَيْرُ أَهْلِ الْأَرْضِ» «تم زمین والوں میں سب سے بہتر ہو۔» اور (اس وقت) ہم چودہ سو تھے اور اگر آج مجھے دکھائی دیتا ہوتا تو میں تمہیں اس درخت کی جگہ دکھاتا۔» [بخاری، المغازی، باب غزوة الحديبية: ۴۱۵۴] ام ہشرون رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ انھوں نے ہضصہ رضی اللہ عنہا کے پاس رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا: «لَا يَدْخُلُ النَّارَ، إِنْ شَاءَ اللَّهُ مِنْ أَصْحَابِ الشَّجَرَةِ أَحَدٌ الَّذِينَ بَايَعُوا تَحْتَهَا» [مسلم، فضائل الصحابة، باب من فضائل أصحاب الشجرة.....: ۲۴۹۶] ”ان شاء اللہ اس درخت والوں میں سے کوئی بھی آگ میں داخل نہیں ہوگا جنھوں نے اس کے نیچے بیعت کی۔“ جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حاطب رضی اللہ عنہ کا ایک غلام حاطب رضی اللہ عنہ کی شکایت لے کر آیا اور کہنے لگا: ”یا رسول اللہ! حاطب ضرور آگ میں داخل ہوگا۔“ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «كَذَبْتَ لَا يَدْخُلُهَا فَإِنَّهُ شَهِدَ بَدْرًا وَالْحُدَيْبِيَةَ» [مسلم، فضائل الصحابة، باب من فضائل حاطب بن أبي بلتعة.....: ۲۴۹۵] ”تو نے غلط کہا، وہ آگ میں داخل نہیں ہوگا، کیونکہ اس نے تو بدر اور حدیبیہ میں شرکت کی ہے۔“

③ جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: «كُنَّا يَوْمَ الْحُدَيْبِيَةِ أَلْفًا وَأَرْبَعِ مِائَةٍ فَبَايَعَنَا وَعَمْرٌ آخِذٌ بِيَدِهِ تَحْتَ الشَّجَرَةِ وَهِيَ سَمْرَةٌ» [مسلم، الإمارة، باب استحباب مبايعة الإمام الجيـش.....: ۱۸۵۶] ”ہم حدیبیہ کے دن چودہ سو تھے، ہم نے آپ ﷺ سے بیعت کی اور عمر رضی اللہ عنہ درخت کے نیچے آپ ﷺ کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے اور وہ کیکر کا درخت تھا۔“

④ طارق بن عبد اللہ نے بیان کیا کہ میں حج کرنے کے لیے گیا تو میں نے کچھ لوگوں کو دیکھا کہ نماز پڑھ رہے ہیں، میں نے پوچھا: ”کیا یہ نماز کی جگہ ہے؟“ انھوں نے کہا: ”یہ وہ درخت ہے جہاں رسول اللہ ﷺ نے بیعت رضوان لی تھی۔“ میں سعید ابن مسیب کے پاس آیا اور انھیں بتایا تو سعید نے فرمایا: ”میرے والد نے مجھے بتایا کہ وہ بھی ان لوگوں میں شامل تھے جنھوں نے درخت کے نیچے رسول اللہ ﷺ سے بیعت کی، تو جب ہم اگلے سال آئے تو ہمیں وہ درخت بھلا دیا گیا، ہم اسے پاسی نہ سکے۔“ سعید نے فرمایا: ”اصحاب محمد ﷺ کو تو وہ معلوم نہ ہوا اور تم نے اسے جان لیا، پھر تم زیادہ جاننے والے ہوئے؟“

[بخاری، المغازی، باب غزوة الحديبية: ۴۱۶۳] عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: «رَجَعْنَا مِنَ الْعَامِ الْمُقْبِلِ فَمَا اجْتَمَعَ مِنَّا اثْنَانِ عَلَى الشَّجَرَةِ الَّتِي بَايَعْنَا تَحْتَهَا، كَانَتْ رَحْمَةً مِّنَ اللَّهِ» [بخاری، الجهاد والسير، باب البيعة في الحرب أن لا يفروا: ۲۹۵۸] ”ہم آئندہ سال دوبارہ آئے تو ہم میں سے دو شخص بھی اس درخت پر شفق نہ ہو سکے جس کے نیچے ہم نے بیعت کی تھی، یہ اللہ کی طرف سے رحمت تھی۔“ فتح الباری میں اس کی شرح کرتے ہوئے حافظ ابن حجر رضی اللہ عنہ نے

وَمَغَانِمَ كَثِيرَةً يَأْخُذُونَهَا ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ﴿۱۹﴾

اور بہت سی غنیمتیں، جنہیں وہ حاصل کریں گے اور اللہ ہمیشہ سے سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ﴿۱۹﴾

فرمایا: ”اس میں حکمت یہ تھی کہ اس درخت کے نیچے خیر کے اس کام کی وجہ سے لوگ فتنے میں مبتلا نہ ہو جائیں، کیونکہ اگر اس کی پہچان باقی رہتی تو بعض جاہل لوگوں سے اس کی تعظیم کا خطرہ تھا، حتیٰ کہ ممکن تھا کہ وہ یہ عقیدہ رکھ لیتے کہ اس درخت میں نفع اور نقصان پہنچانے کی طاقت ہے، جیسا کہ اب اس سے بھی معمولی چیزوں میں اس کا مشاہدہ ہو رہا ہے۔“ ابن حجر نے اپنے زمانے کی بات کی ہے، ہمارے دور میں تو آثار پرستی کا معاملہ اس سے بھی کہیں دور پہنچ چکا ہے۔ آج کل جو لوگ پیروں فقیروں کے آستانوں کے درختوں، پتھروں اور قبروں کو پوجنے سے نہیں چوکتے اگر انہیں وہ درخت مل جاتا تو وہ کیا کچھ نہ کرتے۔

﴿۵﴾ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنْزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ: یعنی اللہ تعالیٰ نے اس صدق، اخلاص اور سچ و طاعت کو جان لیا جس کی وجہ سے انہوں نے دشمن کے اعتبار سے تعداد میں بہت کم ہونے اور تقریباً نہتے ہونے کے باوجود آخر دم تک میدان میں جے رہنے کی بیعت کی اور اس سخت اضطراب اور بے قراری کو بھی جو ان کے دل میں صلح کی ناگوار شرطوں پر پیدا ہوئی، جس کا باعث کوئی نافرمانی نہ تھی بلکہ اللہ تعالیٰ، اس کے رسول ﷺ اور اسلام کی محبت اور ان کی عزت اور سر بلندی کا جذبہ تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کے صدق و اخلاص کی بدولت ان کے دل پر سکینت نازل فرمائی، جس کی بدولت انہیں رسول اللہ ﷺ کے ہر حکم پر دلی اطمینان اور سکون حاصل ہو گیا اور وہ جس طرح موت تک لڑنے کے لیے تیار تھے رسول اللہ ﷺ کی قبول کردہ شرطوں پر صلح کے لیے بھی تیار ہو گئے۔

﴿۶﴾ یہ آیت بیعت رضوان والے صحابہ کے مخلص مومن ہونے کی واضح دلیل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خود ان کے دلوں کے اخلاص کی شہادت دی ہے۔ نہایت بد نصیب ہیں وہ لوگ جو ایسے مخلص ایمان والوں کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ منافق تھے۔ [نَعُوذُ بِاللَّهِ مِنْ ذَلِكَ]

﴿۷﴾ وَآكَابَهُمْ قَتَحًا قَرِيبًا: عام مفسرین اس ”فتح قریب“ سے مراد فتح خیبر لیتے ہیں اور یہ کچھ بعید بھی نہیں، مگر اہل علم کا ایک قول اس کے بارے میں یہ بھی ہے کہ اس سے مراد صلح حدیبیہ ہے، کیونکہ بیعت رضوان کے بعد یہی وہ بنیادی اور اہم فتح تھی جس سے مسلمانوں کے لیے دوسری تمام فتوحات کے راستے کھل گئے اور اس کے کچھ ہی عرصہ بعد خیبر فتح ہوا، پھر مکہ مکرمہ کی فتح ہوئی، حتیٰ کہ پورا جزیرہ عرب رسول اللہ ﷺ کی زندگی ہی میں اسلام کے زیر نگیں آ گیا۔ اس سورت کی ابتدا میں اس صلح ہی کو فتح تبوک فرمایا ہے۔

آیت ۱۹ ﴿۱۹﴾ وَمَغَانِمَ كَثِيرَةً يَأْخُذُونَهَا: اس سے مراد خیبر اور یہود کی دوسری بستیاں ہیں جو کسی خاص مزاحمت کے بغیر مسلمانوں کو حاصل ہوئیں۔ صفی الرحمن مبارک پوری لکھتے ہیں: ”خیبر مدینہ سے شمال کی طرف اسی (۸۰) میل کے فاصلے پر ایک بہت بڑا شہر تھا، جس میں کئی قلعے اور بہت سے باغات تھے۔ ابن اسحاق نے فرمایا، رسول اللہ ﷺ حدیبیہ سے واپس آ کر

وَعَدَّكُمْ اللَّهُ بَعَاثَهُ كَثِيرَةً تَأْخُذُونَهَا فَعَجَلَ لَكُمْ هَذِهِ وَكَفَّ أَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ
وَإِتَّكُونَ آيَةً لِلْمُؤْمِنِينَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا ﴿۲۰﴾

اللہ نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ کیا جنہیں تم حاصل کرو گے، پھر اس نے تمہیں یہ جلدی عطا کر دی اور لوگوں کے ہاتھ تم سے روک دیے اور تاکہ یہ ایمان والوں کے لیے ایک نشانی بنے اور (تاکہ) وہ تمہیں سیدھے راستے پر چلائے ﴿۲۰﴾

مدینہ میں ذوالحجہ اور محرم کا کچھ حصہ ٹھہرے، پھر محرم کے باقی دنوں میں خیبر کی طرف نکلے۔ (الریح الختموم) ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: «افْتَحْنَا خَيْبَرَ، وَنَمَّ نَعْنَمٌ ذَهَبًا وَلَا فِضَّةً، إِنَّمَا عِنَّمَا الْبَقَرُ وَالْإِبِلُ وَالْمَتَاعُ وَالْخَوَالِطُ» [بخاری، المغازی، باب غزوة خيبر: ۴۲۳۴] "ہم نے خیبر فتح کیا اور ہمیں سونا چاندی غنیمت میں نہیں ملا، ہمیں صرف گائے، بیل، اونٹ، سامان اور باغات غنیمت میں ملے۔" خیبر کی فتح کے نتیجے میں مسلمانوں کو حاصل ہونے والی غنیمتوں کا اندازہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی ایک روایت سے ہوتا ہے، انہوں نے فرمایا: «مَا شَبِعْنَا حَتَّى فَتَحْنَا خَيْبَرَ» [بخاری، المغازی، باب غزوة خيبر: ۴۲۴۳] "ہم نے سیر ہو کر نہیں کھایا حتیٰ کہ خیبر فتح کیا۔" اور عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: «لَمَّا فُتِحَتْ خَيْبَرُ قُلْنَا الْآنَ نَشْبَعُ مِنَ الثَّمَرِ» [بخاری، المغازی، باب غزوة خيبر: ۴۲۴۲] "جب خیبر فتح ہوا تو ہم نے کہا، اب ہم کھجوریں پیٹ بھر کر کھائیں گے۔" الریح الختموم میں ہے: "اس فتح کے نتیجے میں مہاجرین کے حصے میں اتنی زمین اور باغات آئے کہ انہوں نے کھجوروں کے وہ درخت انصار کو واپس کر دیے جو انصار نے مدینہ میں انہیں دے رکھے تھے۔"

﴿۲۰﴾ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا: چونکہ کفار کی تعداد اور ساز و سامان کی کثرت اور مسلمانوں کی قلت کے پیش نظر یہ بات ممکن نظر نہیں آتی تھی، اس جملے کے ساتھ اس فتح و غنیمت کا سبب بیان فرمایا۔ بقائے نے فرمایا: "اس واؤ کے ساتھ مقدر جملے پر عطف ہے: «أَيُّ بَعَاثَهُ اللَّهُ وَحِكْمَتِهِ وَتَكْوَانِ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا» یعنی یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی عزت و حکمت کی بدولت ہوا اور اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے۔ نہ اس پر کوئی غالب آسکتا ہے، نہ اس کی تدبیر میں کسی خطا کی نشاندہی کر سکتا ہے۔"

آیت 20 ﴿۲۰﴾ وَعَدَّكُمْ اللَّهُ بَعَاثَهُ كَثِيرَةً تَأْخُذُونَهَا: ان بہت سی غنیمتوں سے مراد صلح حدیبیہ، خیبر اور اس کے ارد گرد کے علاقوں اور بستیوں کی فتح ہے، کیونکہ اس سے پہلے گزر چکا ہے: «سَيَقُولُ الْمُخَلَّفُونَ إِذَا انْطَلَقْتُمْ إِلَى مَغَابِرِمْ لَتَأْخُذُواهَا حَرْوًا تَنْهَعُكُمْ» يُرِيدُونَ أَنْ يُبَدِّلُوا كَلِمَةَ اللَّهِ - قُلْ لَنْ تَنْهَعُونَا كَذَلِكَ قَالَ اللَّهُ مِنْ قَبْلِ - فَمَيَقُولُونَ بَلْ تَخْسُدُونَ مُتَابِلًا بَلْ كَانُوا لَا يَفْقَهُونَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿۱۵﴾ [الفتح: ۱۵] "معتزرب پیچھے چھوڑ دیے جانے والے لوگ کہیں گے جب تم

کچھ غنیمتوں کی طرف چلو گے، تاکہ انہیں لے لو، ہمیں چھوڑو کہ ہم تمہارے ساتھ چلیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے کلام کو بدل کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

وَ أُخْرَى لَمْ تَقْدِرُوا عَلَيْهَا قَدْ أَحَاطَ اللَّهُ بِهَا وَ كَانَ اللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا ﴿۲۱﴾

اور کئی اور (غیبتوں کا بھی)، جن پر تم قادر نہیں ہوئے۔ یقیناً اللہ نے ان کا احاطہ کر رکھا ہے اور اللہ ہمیشہ سے ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے ﴿۲۱﴾

دیں۔ کہہ دے تم ہمارے ساتھ کبھی نہیں جاؤ گے، اسی طرح اللہ نے پہلے سے کہہ دیا ہے۔ تو وہ ضرور کہیں گے بلکہ تم ہم سے حسد کرتے ہو۔ بلکہ وہ نہیں سمجھتے تھے مگر بہت تھوڑا۔“

﴿۲﴾ فَعَجَلَ لَكُمْ هَذِهِ: تو اس نے تمہیں ان غیبتوں میں سے یہ صلح حدیبیہ جلدی عطا فرمادی جس میں تمہارے اور قریش کے درمیان معاہدہ ہو گیا کہ دس سال تک جنگ بند رہے گی اور مسلمان آئندہ سال اسی ماہ آ کر عمرہ ادا کریں گے۔ اس کے نتیجے میں مسلمانوں اور قریش کا ایک دوسرے کے پاس آنا جانا، ملنا جلنا شروع ہو گیا اور بے شمار لوگ مسلمان ہوئے، خیبر اور دوسرے علاقوں کی فتح کا دروازہ کھل گیا، غرض یہ صلح فتح بھی تھی اور اپنے بے شمار فوائد کے لحاظ سے غنیمت بھی۔ بعض مفسرین نے اس سے مراد فتح خیبری ہے، یہ بھی ممکن ہے، مگر پہلی تفسیر زیادہ واضح ہے، کیونکہ یہ آیات حدیبیہ سے وابہی پر اتری ہیں۔

﴿۳﴾ وَ كَفَّ أَيْدِي النَّاسِ عَنْكُمْ: مسلمانوں سے لوگوں کے ہاتھ روک دینے میں مسلمانوں کی قلت کے باوجود قریش مکہ کو لڑائی سے روک دینا بھی شامل ہے اور خیبر اور دوسرے علاقوں کے یہود کو مدینہ پر حملہ آور ہونے سے روک دینا بھی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ رعب تھا کہ جب مسلمانوں کی پوری جنگی قوت مدینہ سے باہر تھی، اگر اس وقت یہود اپنے حلیفوں اور منافقین کے ساتھ مل کر مدینہ پر حملہ آور ہوتے تو ان کے لیے میدان خالی تھا، کیونکہ وہاں عورتوں، بچوں اور معذوروں کے سوا کوئی موجود نہ تھا، مگر یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا کرشمہ تھا کہ کسی کو یہ جرأت ہی نہیں ہونے دی۔

﴿۴﴾ وَ لَتَكُونُنَّ آيَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ: اس جملے کا واؤ کے ساتھ مقدر جملے پر عطف ہے اور اسے مقدر اس لیے رکھا گیا ہے کہ وہ کئی جملوں میں سے کوئی ایک جملہ ہو سکتا ہے، مثلاً: ”فَعَجَلَ لَكُمْ هَذِهِ وَ كَفَّ أَيْدِي النَّاسِ عَنْكُمْ لِيَشْكُرُوهُ وَ لَتَكُونُنَّ الْمَعْجَلَةَ وَ كَفَّ أَيْدِي النَّاسِ عَنْكُمْ آيَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ“ ”یعنی اس نے یہ غنیمت تمہیں جلدی دے دی اور لوگوں کے ہاتھ تم سے روک دیے، تاکہ تم اس کا شکر ادا کرو اور تاکہ جلد عطا کی جائے والی یہ غنیمت اور لوگوں کے ہاتھوں کا تم سے روک دیا جانا ایمان والوں کے لیے ایک نشانی بن جائے (کہ آئندہ بھی اللہ تعالیٰ اسی طرح ہماری مدد فرمائے گا)۔“ ”لِيَشْكُرُوهُ“ کے بجائے مقدر جملہ ”لَتَكُونُنَّ آيَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ“ یا ”لَتَكُونُنَّ آيَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ“ وغیرہ بھی ہو سکتا ہے اور اسے حذف اسی لیے کیا گیا ہے کہ اگر ذکر کیا جاتا تو ایک آدھ بات ذکر ہو سکتی تھی، حالانکہ وہ بہت سی چیزیں ہیں جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ غنیمت پہلے عطا کر دی۔

﴿۵﴾ وَ يَضْرِبُكُمْ صَرَاظًا مُّسْتَقِيمًا: یہ جملہ بھی قرآن مجید کے معجزات میں سے ایک معجزہ ہے، کیونکہ اہل حدیبیہ میں سے کوئی ایک شخص بھی صراطِ مستقیم سے ادھر ادھر نہیں ہوا، بلکہ سب کے سب آخردم تک اسلام پر قائم رہے۔

﴿۲۱﴾ ۱: وَ أُخْرَى لَمْ تَقْدِرُوا عَلَيْهَا.....: ”اُخْرَى“ ”مَعَانِمَ“ کی صفت ہے جو یہاں معذوف ہے اور اس کا

وَلَوْ قَاتَلَكُمْ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوَلَّوْا الْأَذْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُونَ وِلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ﴿۲۲﴾

اور اگر وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا تم سے لڑتے تو یقیناً پیٹھ پھیر جاتے، پھر وہ نہ کوئی حمایتی پائیں گے اور نہ کوئی مددگار ﴿۲۲﴾

عطف ”مَعَانِمَ كَثِيرَةً“ پر ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان غنیمتوں کے علاوہ، جن کا اوپر ذکر ہوا، کئی اور غنیمتوں کا بھی وعدہ فرمایا ہے جن پر تم قادر نہیں ہوئے، مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں گھیرے میں لے لیا ہے۔ اس سے مراد سب سے پہلے فتح مکہ ہے جو فتح الفتوح تھی۔ مسلمان حدیبیہ والے سال اور اس سے اگلے سال اسے حاصل نہیں کر سکے مگر اللہ تعالیٰ کے علم میں اس کا فیصلہ ہو چکا تھا، چنانچہ صلح حدیبیہ ہی اس کا پیش خیمہ بنی۔ اس صلح کی ایک شرط یہ تھی کہ جو قبیلہ چاہے مسلمانوں کا حلیف بن جائے اور جو چاہے قریش مکہ کا حلیف بن جائے اور کوئی کسی کے خلاف یا اس کے حلیف کے خلاف جنگ نہ کرے۔ اس موقع پر بنو خزاعہ رسول اللہ ﷺ کے حلیف اور بنو بکر قریش مکہ کے حلیف بن گئے۔ مشرکین صلح کے بعد صرف دو سال تک معاہدہ پر قائم رہے، پھر ان کے حلیف قبیلہ بنو بکر نے رسول اللہ ﷺ کے حلیف بنو خزاعہ پر حملہ کر دیا، جس میں قریش نے اسلحے اور آدمیوں کے ساتھ ان کی مدد کی اور کعبہ میں پناہ لینے کے باوجود انہیں قتل کیا۔ رسول اللہ ﷺ کو ان کے معاہدہ توڑنے کی اطلاع ملی تو آپ نے نہایت اخفا کے ساتھ دس ہزار صحابہ کرام کے ساتھ مکہ کی طرف کوچ فرمایا اور اللہ تعالیٰ نے مکہ فتح فرمادیا۔ لفظ عام ہونے کی وجہ سے فتح مکہ کے علاوہ وہ تمام فتوحات ”وَ الْأَخْزَى لِمَنْ تَقَدَّرُوا عَلَيْهِمْ“ میں داخل ہیں جو اس کے بعد مسلمانوں کو حاصل ہوئیں، جن میں ثقیف و ہوازن کی فتح اور تبوک وغیرہ کی فتح بھی شامل ہیں۔ روم و فارس، مصر و شام، ہند و سندھ اور زمین کے مشرق و مغرب کے وہ تمام ممالک بھی جو قیامت تک مسلمانوں کے قبضے میں آنے والے تھے۔

﴿۲۲﴾ قَدْ أَحَاطَ اللَّهُ بِهَا وَ كَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا: یہ اس سوال کا جواب ہے جو یہاں پیدا ہو سکتا تھا کہ مدینہ کی بستی کے یہ چودہ پندرہ سو آدمی، جن کے پاس اسلحہ اور دوسری ضروریات حتیٰ کہ سامان خورد و نوش کی بھی کمی ہے، اتنی کثیر فتوحات اور غنیمتیں کیسے حاصل کر سکتے ہیں، جب کہ پورا عرب ان کے خلاف ہے، جن کے پاس آدمیوں، اسلحے اور ساز و سامان کی فراوانی ہے؟ فرمایا یہ لوگ واقعی وہ فتوحات اور غنیمتیں حاصل نہیں کر سکتے، مگر جب اللہ تعالیٰ نے ان کا گھبرا کر لیا ہو اور انہیں مسلمانوں کو عطا فرمانا چاہتا ہو تو پھر کون ہے جو اسے روک سکے؟ اور اللہ تعالیٰ تو ہمیشہ سے ہر چیز پر پوری طرح قدرت رکھنے والا ہے۔

آیت 22: ﴿۱﴾ وَلَوْ قَاتَلَكُمْ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوَلَّوْا الْأَذْبَارَ: اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا کہ اس نے کفار کے ہاتھ تم سے روک دیے کہ وہ لڑائی سے باز رہے، اب فرمایا کہ حدیبیہ کے مقام پر بظاہر دب کر جو صلح کی جا رہی تھی وہ بزدلی کی بنا پر یا اس خطرے کے پیش نظر نہیں تھی کہ مسلمانوں کو شکست ہو جائے گی، بلکہ اس میں بہت سی حکمتیں ملحوظ تھیں، جن میں بعض

سُنَّةَ اللَّهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۖ وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا ﴿۲۳﴾ وَ هُوَ الَّذِي كَفَّ
أَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَ أَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْ بَعْدِ أَنْ أَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ ۗ وَ كَانَ

اللہ کے اس طریقے کے مطابق جو پہلے سے گزر چکا ہے اور تو اللہ کے طریقے میں ہرگز کوئی تبدیلی نہیں پائے گا ﴿۲۳﴾ اور وہی ہے جس نے مکہ کی وادی میں ان کے ہاتھ تم سے اور تمہارے ہاتھ ان سے روک دیے، اس کے بعد کہ تمہیں کا ذکر گزر چکا اور کچھ آگے بیان ہو رہی ہیں۔ چنانچہ فرمایا کہ اگر اس موقع پر کفار تم سے لڑ پڑتے تو یقیناً تمہیں پھیر کر بھاگ جاتے اور مکہ اسی وقت فتح ہو جاتا مگر یہ مصلحت کے خلاف تھا۔

﴿۲۳﴾ ثُمَّ لَا يَجِدُونَ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا: ”ثُمَّ“ (پھر) کے لفظ کا مطلب یہ ہے کہ اس کے بعد خواہ کتنی مدت گزر جائے اور خواہ ان مشرکین کی تعداد کتنی ہو جائے کسی وقت بھی انہیں کوئی حمایتی ملے گا نہ کوئی مددگار۔

آیت 23 ﴿۲۳﴾ سُنَّةَ اللَّهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ : مراد اللہ تعالیٰ کی وہ سنت ہے جو اس کے انبیاء کو جھٹلانے والی اقوام کے بارے میں ہمیشہ سے جاری ہے کہ جب وہ حد سے گزر جاتی ہیں تو انہیں ایسی سزا دی جاتی ہے کہ انہیں کوئی حمایتی ملتا ہے نہ مددگار اور اللہ تعالیٰ کی اس سنت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ ہاں عذاب کئی طرح سے آسکتا ہے، قدرتی آفات کے ساتھ بھی، جیسا کہ قوم نوح، عاد و ثمود اور آل فرعون پر آیا اور مومن بندوں کے ہاتھوں بھی، جیسا کہ فرمایا: ﴿قَاتِلُوهُمْ يُعَذِّبَهُمُ اللَّهُ بِأَيْدِيكُمْ﴾ [التوبة: ۱۴] ”ان سے لڑو، اللہ انہیں تمہارے ہاتھوں سے عذاب دے گا۔“

آیت 24 ﴿۲۴﴾ ﴿۱﴾ وَ هُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَ أَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ : جب رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حدیبیہ میں تھے تو صلح کی بات چیت کے دوران اور صلح ہو جانے کے بعد بھی مشرکین نے کوششیں کیں کہ کسی طرح لڑائی چھڑ جائے اور صلح نہ ہو سکے۔ ان کے متعدد گروہ چھپ کر رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کے خلاف کارروائی کے لیے آئے، مگر کوئی نقصان نہ پہنچا سکے، بلکہ ہر مرتبہ مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے۔ انہیں قتل بھی کیا جاسکتا تھا مگر رسول اللہ ﷺ نے انہیں چھوڑ دیا، کیونکہ سزا دینے کی صورت میں جنگ ناگزیر ہو جاتی جب کہ مسلمانوں کی مصلحت صلح میں تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اپنے اس احسان کی یاد دہانی کروائی ہے۔ یہاں کفار کی ان کوششوں کے تین واقعات درج کیے جاتے ہیں:

① سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، میں طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہتا تھا، ان کے گھوڑے کو پانی پلاتا، اس کی مالش کرتا، ان کی خدمت کرتا اور انھی کے ہاں کھانا کھایا کرتا تھا اور میں اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کرتے ہوئے اپنا اہل و مال چھوڑ آیا تھا۔ پھر جب ہماری اور اہل مکہ کی صلح ہو گئی اور ہم ایک دوسرے سے ملنے جلنے لگے تو میں ایک درخت کے نیچے کانٹے وغیرہ صاف کر کے اس کے سائے میں لیٹ گیا۔ اہل مکہ میں سے چار مشرک میرے پاس آئے اور رسول اللہ ﷺ کے متعلق بدزبانی کرنے لگے۔ میں ان سے نفرت کی وجہ سے ایک اور درخت کے نیچے چلا گیا اور وہ اپنا اسلحہ درخت کے ساتھ لٹکا کر لیٹ

اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا ﴿۲۴﴾

ان پر فتح دے دی اور اللہ اس کو جو تم کرتے ہو، ہمیشہ سے خوب دیکھنے والا ہے ﴿۲۴﴾

گئے۔ اسی دوران وادی کے نیچے سے کسی نے آواز دی: ”او مہاجر و! ابن زُئیم کو قتل کر دیا گیا۔“ میں نے اپنی تلوار لی اور ان چاروں پر حملہ کر دیا، وہ سوئے ہوئے تھے، میں نے ان کا اسلحہ لے کر اپنی مٹی میں اکٹھا کر لیا اور ان سے کہا: ”قسم اس ذات کی جس نے محمد ﷺ کے چہرے کو عزت بخشی ہے! تم میں سے جو بھی سر اٹھائے گا میں اس کا سر اڑا دوں گا جس میں اس کی آنکھیں ہیں۔“ خیر میں انھیں ہانکتا ہوا رسول اللہ ﷺ کے پاس لے آیا اور میرا چچا عامر غنبلت میں سے ”مکرز“ نامی ایک مشرک کو کھینچتا ہوا لایا۔ یہاں تک کہ ہم نے انھیں ستر (۷۰) مشرکین سمیت رسول اللہ ﷺ کے سامنے لا کھڑا کیا۔ آپ ﷺ نے ان کی طرف دیکھا اور فرمایا: ﴿دَعُوهُمْ يَكْفُرُ لَهُمْ بَدُءُ الْفُجُورِ وَنِسَاءَهُ﴾ ”انھیں چھوڑ دو، تاکہ عہد شکنی کی ابتدا اور دہرائی انہی کے ذمے رہے۔“ غرض رسول اللہ ﷺ نے انھیں معاف کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری: ﴿وَهُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَائْيَدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْ بَعْدِ أَنْ أَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ﴾ [الفتح: ۲۴] ”اور وہی ہے جس نے مکہ کی وادی میں ان کے ہاتھ تم سے اور تمہارے ہاتھ ان سے روک دیے، اس کے بعد کہ تمہیں ان پر فتح دے دی۔“ [مسلم، الجہاد، باب غزوة ذي قرد وغیرھا: ۱۸۰۷]

﴿۲۴﴾ انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اہل مکہ میں سے اسی (۸۰) مسلح آدمی جبل تنعیم سے اتر کر آئے۔ وہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کی غفلت سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے، مگر آپ نے انھیں زندہ سلامت گرفتار کر لیا۔ پھر انھیں زندہ ہی رہنے دیا تو اللہ عز و جل نے یہ آیت اتاری: ﴿وَهُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَائْيَدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْ بَعْدِ أَنْ أَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ﴾ [الفتح: ۲۴] ”اور وہی ہے جس نے مکہ کی وادی میں ان کے ہاتھ تم سے اور تمہارے ہاتھ ان سے روک دیے، اس کے بعد کہ تمہیں ان پر فتح دے دی۔“ [مسلم، الجہاد، باب قول اللہ تعالیٰ: ﴿وَهُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ﴾: ۱۸۰۸]

﴿۲۴﴾ عبد اللہ بن مغفل مزنی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حدیبیہ میں اس درخت کے نیچے موجود تھے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے۔ اس کی ٹہنیاں رسول اللہ ﷺ کی کمر سے لگ رہی تھیں اور علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور سمیل بن عمرو آپ کے سامنے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ”لکھو، بسم اللہ الرحمن الرحیم۔“ تو سمیل نے مان کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا: ”ہم نہیں جانتے رحمان کیا ہوتا ہے، ہمارے معاملے میں وہی لکھو جو ہمارے ہاں معروف ہے۔“ اس نے کہا: ”یہ لکھو: ”بِسْمِكَ اللَّهُمَّ“۔ پھر انھوں نے لکھا: ”یہ وہ ہے جس پر محمد رسول اللہ ﷺ نے اہل مکہ سے صلح کی ہے۔“ تو سمیل بن عمرو نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا: ”اللہ کی قسم! اگر آپ اللہ کے رسول ہوں تو ہم نے آپ پر ظلم کیا، ہمارے معاملے میں وہ لکھو جو ہمارے ہاں معروف ہے۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”لکھو، یہ وہ ہے جس پر محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب نے صلح کی ہے اور میں اللہ کا رسول بھی ہوں۔“ یہ معاملہ ہو رہا تھا کہ تیس مسلح نوجوان نکل کر ہمارے سامنے آگئے اور ہمارے سامنے آ کر

مَعْرَةً بِغَيْرِ عِلْمٍ لِيُدْخَلَ اللَّهُ فِي رَاحَتِهِ مَن يَشَاءُ ۚ لَوْ تَزَيَّلُوا لَعَذَّبْنَا الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿۵۰﴾

(اگر یہ نہ ہوتا) کہ تم انہیں روند ڈالو گے تو تم پر لاعلمی میں ان کی وجہ سے عیب لگ جائے گا (تو ان پر حملہ کر دیا جاتا) تاکہ اللہ اپنی رحمت میں جسے چاہے داخل کر لے، اگر وہ (مومن اور کافر) الگ الگ ہو گئے ہوتے تو ہم ضرور ان لوگوں کو جنھوں نے ان میں سے کفر کیا تھا، سزا دیتے، دردناک سزا ﴿۵۰﴾

منسوب ہے، یعنی یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے کفر کیا اور تمہیں مسجد حرام سے روکا اور قربانی کے جانوروں کو بھی روک دیا، اس حال میں کہ وہ اپنے حلال ہونے کی جگہ پہنچنے سے روکی ہوئی تھیں۔ یعنی قربانیوں کو بھی مکہ میں داخل نہیں ہونے دیا جو عمرہ اور حج کی قربانیوں کے حلال ہونے کی اصل جگہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ اپنے ساتھ ہدی یعنی قربانی کے اونٹ لے کر آئے تھے، جب کفار نے اس سال مکہ میں داخلے اور عمرہ کرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا اور اسے آئندہ سال کے لیے مؤخر کر دیا تو رسول اللہ ﷺ نے حدیبیہ کے مقام پر وہ جانور قربان کر دیے اور سر منڈا کر احرام کھول دیا۔

﴿۵۰﴾ وَ لَوْلَا رِجَالُ قُورَيْشٍ وَ نِسَاءُ مُؤْمِنَاتٍ.....: ”وَلَطَىٰ يَطَّىٰ وَ طَأًا“ (س) روندنا، پامال کرنا۔ یہ مضارع معلوم سے جمع مذکر حاضر ہے۔ ”مَعْرَةً“ عیب، گناہ، نقصان۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اس موقع پر جنگ نہ ہونے دینے کی دو وجہیں بیان فرمائی ہیں، ایک یہ کہ مکہ میں مشرکین کے ساتھ کئی مومن مرد اور مومن عورتیں بھی موجود تھیں، جن کا مسلمانوں کو علم نہیں تھا۔ ان میں سے کچھ وہ تھے جو مسلمان ہو چکے تھے مگر انھوں نے اپنا ایمان چھپا رکھا تھا اور کچھ وہ تھے جو کھلم کھلا مسلمان ہو چکے تھے مگر بے بسی کی وجہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت نہیں کر سکتے تھے اور کفار کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے ہوئے تھے۔ اگر مکہ پر حملہ ہوتا تو مشرکین کے ساتھ وہ مومن مرد اور مومن عورتیں بھی روند دیے جاتے جو مسلمانوں کے لیے عیب کا باعث ہوتا کہ انھوں نے اپنے ہی بھائی بہنوں کو قتل کر دیا، حالانکہ ان کا یہ قتل لاعلمی کی بنا پر ہوتا۔ عیب کا باعث ہونے سے مراد کفار کی طرف سے عیب لگانا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے ہی بھائی مار دیے اور وہ رنج و الم بھی جو اپنے بھائیوں کو قتل کرنے سے مسلمانوں کے دلوں میں پیدا ہوتا، ورنہ جنگ کے دوران کفار میں رہنے والے کسی مسلمان کو قتل کرنے پر نہ دیت ہے نہ کفارہ اور نہ ہی ملامت۔ اللہ تعالیٰ نے جنگ روک کر یہ نوبت ہی نہ آنے دی کہ مسلمانوں پر کوئی الزام آسکے۔ واضح رہے کہ ”وَلَوْلَا رِجَالُ قُورَيْشٍ“ سے ”بِغَيْرِ عِلْمٍ“ تک جملہ شرط ہے، جزا اس کی محذوف ہے، کیونکہ وہ خود واضح ہو رہی ہے، یعنی اگر یہ مانع نہ ہوتا ”تو تمہارے ہاتھ نہ روکے جاتے، بلکہ اہل مکہ پر حملہ کر دیا جاتا۔“

﴿۵۱﴾ لِيُدْخَلَ اللَّهُ فِي رَاحَتِهِ مَن يَشَاءُ: یہ اس وقت جنگ سے مسلمانوں کے ہاتھ روک دینے کی دوسری وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مشرکین میں سے بہت سے لوگوں کو ایمان کی توفیق عطا فرما کر اپنی رحمت میں داخل کرنا چاہتا تھا، جو کفار اور مسلمانوں کی

لَقَدْ صَدَقَ اللَّهُ رَسُولَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ لَتَدْخُلَنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِنْ شَاءَ اللَّهُ إِمْنِينَ ۝

بلاشبہ یقیناً اللہ نے اپنے رسول کو خواب میں حق کے ساتھ سچی خبر دی کہ تم مسجد حرام میں ضرور بالضرور داخل ہو گے، بھی جاہلیت کی ضد تھی، مثلاً یہ کہنا کہ ”بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ“ کے بجائے ”بِاسْمِكَ اللَّهُمَّ“ لکھو اور ”محمد رسول اللہ“ کے بجائے ”محمد بن عبد اللہ“ لکھو اور کوئی شخص مسلمان ہو کر تمہارے پاس جائے تو اسے واپس کرو، لیکن اگر کوئی مرتد ہو کر ہمارے پاس آئے تو ہم اسے واپس نہیں کریں گے۔ اسی طرح سہیل بن عمرو کا اپنے مسلمان ہو جانے والے بیٹے ابو جندل کو عین معاہدے کے درمیان آ کر اپنی حالت زار دکھانے کے باوجود مسلمانوں کے ساتھ جانے کی اجازت دینے سے انکار اور سب کے سامنے اس پر تشدد بھی جاہلیت کی ضد تھی۔

③ فَأَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَى رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ: سکینت سے مراد وہ تحمل و حوصلہ اور صبر و وقار ہے جس کے ساتھ نبی ﷺ اور مسلمانوں نے کفار کے کہہ جانے کا مقابلہ کیا کہ نہ مشتعل ہوئے، نہ کوئی ناسخ بات زبان سے کہی اور نہ اپنے کسی عمل سے کفار کو لڑائی چھیڑنے کا موقع دیا۔

④ اس آیت کے الفاظ پر غور کریں تو کفار اور مسلمانوں کے طرز عمل کے درمیان اور اللہ تعالیٰ کے ان کے ساتھ معاملے کے درمیان فرق کا اندازہ ہوتا ہے: ① کفار نے اپنے دلوں میں حیثیت یعنی ضد رکھ لی، سوچے سمجھے بغیر یہ ضد رکھنے والے وہ خود تھے۔ اس کے مقابلے میں رسول اللہ ﷺ اور مومنوں کے دلوں میں سکینت تھی، جو اپنے خزانے سے نازل کرنے والا اللہ تعالیٰ تھا۔ ② کفار کے دلوں میں موجود ضد جاہلیت کی ضد تھی، جبکہ رسول اللہ ﷺ اور مومنوں کے دلوں میں سکینت ربانی سکینت تھی۔

⑤ وَالرَّمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوَى: وہ تقویٰ کی بات یہ تھی کہ مسلمان تنگی ترشی، جوش، غضب، غرض ہر طرح کے حالات میں اپنے آپ کو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا پابند بنائے رکھیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل تھا کہ اس نے اپنے رسول ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مشتعل جذبات کو سکون بخش کر اور اپنے حکم کی پابندی پر قائم رکھ کر صلح کا کام پایہ تکمیل تک پہنچا دیا۔

⑥ وَكَانُوا أَحَقَّ بِهَا وَأَهْلَهَا: اور وہ اس کے زیادہ حق دار اور اس کے اہل تھے، کیونکہ وہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے تھے اور انھیں رسول اللہ ﷺ کی صحبت اور آپ کی تربیت پانے کا شرف حاصل تھا۔

⑦ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا: اور اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے ہر چیز کو پوری طرح جاننے والا ہے۔ اس علم ہی کے ساتھ اس نے ان پاکیزہ ہستیوں کو تقویٰ کے سب سے زیادہ حق دار اور اہل جان کر اپنے رسول کی صحبت کے لیے چنا، اس کی اطاعت کی توفیق بخشی اور انھیں تقویٰ کی بات پر قائم رکھا۔

آیت 27 ① لَقَدْ صَدَقَ اللَّهُ رَسُولَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ: اس کی ترکیب دو طرح سے کی جاتی ہے، ایک یہ کہ ”صَدَقَ اللَّهُ“ فعل اور فاعل ہے، ”رَسُولُهُ“ اس کا مفعول بہ ہے اور ”الرُّؤْيَا“ سے پہلے حرف جار ”فِي“ محذوف ہے، جس کے حذف کی وجہ سے ”الرُّؤْيَا“ منصوب ہے، اسے منصوب بزرع الخافض کہتے ہیں: ”أَيُّ فِي الرُّؤْيَا.“ ترجمہ اسی ترکیب کے مطابق کیا

مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا

محمد اللہ کا رسول ہے اور وہ لوگ جو اس کے ساتھ ہیں کافروں پر بہت سخت ہیں، آپس میں نہایت رحم دل ہیں، تو

جائے گا۔ تفسیر قاسمی میں ہے، ابن تیمیہ نے فرمایا: ”بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اس دین کو علم، حجت اور بیان کے ساتھ ہر دین پر غالب فرمادیا، جیسا کہ اسے قوت، نصرت اور تائید کے ساتھ غالب فرمایا اور پوری زمین اس دین سے اور آپ ﷺ کی امت سے مشرق و مغرب تک بھر گئی۔ اہل اسلام کی سلطنت دائمی ہے، کوئی اسے اس طرح ختم نہیں کر سکتا جس طرح یہود کی سلطنت ختم ہو گئی اور ان کے بعد کتنی ہی قوموں کا اقتدار زمین کے بہترین علاقوں سے مٹ گیا۔“ یہ آیت اس سے پہلے سورہ توبہ (۳۳) میں گزر چکی ہے، وہاں اس کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔ تیسری بار سورہ صف (۹) میں آئے گی۔

آیت 29 ﴿١﴾ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ: ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ”لفظ ”مُحَمَّدٌ“ مبتدا اور ”رَسُولُ اللَّهِ“ خبر ہے۔ محمد ﷺ کو ”رسول اللہ“ کہنے کے بعد اور کسی تعریف کی ضرورت نہیں سمجھی، کیونکہ اس میں تمام انسانی کمال اور خوبیاں آ جاتی ہیں۔ اس لیے آگے ”وَالَّذِينَ مَعَهُ“ کی صفت بیان فرمائی ہے۔“ اس مقام پر اس جملے سے کئی باتیں واضح ہو رہی ہیں، ایک یہ کہ قرآن مجید میں عموماً آپ ﷺ سے خطاب یا آپ کا ذکر خیر آپ کے نام کے بجائے آپ کے القاب کے ساتھ ہوا ہے، مثلاً ”يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ“، ”يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ“، ”شَاهِدًا“، ”مُبَشِّرًا“، ”نَذِيرًا“، ”ذَاعِيًا إِلَى اللَّهِ“ اور ”سِرَاجًا مُنِيرًا“ وغیرہ۔ آپ ﷺ کا اسم گرامی ”محمد“ صرف چار جگہ آیا ہے، دیکھیے سورہ آل عمران (۱۳۳)، احزاب (۴۰)، سورہ محمد (۲) اور زیر تفسیر آیت۔ ان چاروں مقامات میں آپ کا نام لانے میں کوئی نہ کوئی حکمت ہے۔ یہاں حکمت یہ ہے کہ اس بات کا اعلان کر دیا جائے کہ اگر کفار مکہ نے حیثیت جاہلیت میں آ کر اصرار کیا ہے کہ معاہدے میں ”محمد رسول اللہ“ نہ لکھو اور ان کے اصرار پر صلح کی خاطر ”محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب“ لکھ دیا گیا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ اللہ کے رسول نہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ”محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، کفار کے نہ ماننے سے حقیقت نہیں بدل سکتی۔ دوسرا مقصد اس سوال کا جواب دینا ہے کہ تمام ادیان پر یہ دین کیسے غالب ہوگا؟ فرمایا محمد ﷺ کا تمام دینوں پر غلبہ اپنے ذاتی کمال یا ذاتی جدوجہد کی وجہ سے نہیں ہوگا بلکہ اس لیے ہوگا کہ محمد ﷺ ”رسول اللہ“ ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے ہیں، جنہیں اس نے بھیجا ہی اس دین کو تمام دینوں پر غالب کرنے کے لیے ہے، پھر اللہ کے بھیجے ہوئے کو غالب آنے سے کون روک سکتا ہے؟

﴿٢﴾ وَالَّذِينَ مَعَهُ: اس میں ان پاکباز ہستیوں کا ذکر فرمایا جن کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ اس ہدایت اور دین حق کو روئے زمین پر غالب کرنے والا تھا۔ ”وَالَّذِينَ مَعَهُ“ (وہ لوگ جو آپ کے ساتھ ہیں) اس لفظ میں تمام صحابہ کرام شامل ہیں، خواہ انہیں آپ کے ساتھ رہنے کی لمبی مدت ملی ہو یا تھوڑی۔ حدیبیہ میں جو لوگ آپ کے ساتھ تھے وہ اس لفظ کا اولین مصداق ہیں۔ نبی کریم ﷺ کی صحبت ایسی آسیر تھی کہ جس مومن کو حاصل ہو گئی اس کی طبیعت کا رنگ ہی بدل گیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں شہادت اور جنت کا ایسا شوق عطا فرمایا، انہیں ایسی شجاعت بخشی اور ان میں ایسی برکت رکھی کہ جب وہ حملہ آور ہوتے تو دشمن چند لمحوں

يَتَّبِعُونَ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا سِيبَا هُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ ۚ ذَٰلِكَ

انہیں اس حال میں دیکھے گا کہ رکوع کرنے والے ہیں، سجدے کرنے والے ہیں، اپنے رب کا فضل اور (اس کی)

میں بھاگ کھڑا ہوتا، کسی لشکر میں ایک صحابی کی موجودگی اس کی فتح کی ضمانت سمجھی جاتی۔ ان سے ملنے والوں میں بھی یہی برکت تھی۔ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «يَأْتِي زَمَانٌ يَغْزُو فِقَامَ مِنَ النَّاسِ، فَيَقَالُ فِيكُمْ مَنْ صَحِبَ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ فَيَقَالُ نَعَمْ، فَيَفْتَحُ عَلَيْهِ، ثُمَّ يَأْتِي زَمَانٌ فَيَقَالُ فِيكُمْ مَنْ صَحِبَ أَصْحَابَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ فَيَقَالُ نَعَمْ، فَيَفْتَحُ عَلَيْهِ، ثُمَّ يَأْتِي زَمَانٌ فَيَقَالُ فِيكُمْ مَنْ صَحِبَ صَاحِبِ أَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ فَيَقَالُ نَعَمْ، فَيَفْتَحُ عَلَيْهِ» [بخاری، الجهاد والسير، باب من استعان بالضعفاء، والصلحين في الحرب: ۲۸۹۷] ”لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا کہ لوگوں کی ایک جماعت جنگ کرے گی تو کہا جائے گا: ”کیا تم میں کوئی شخص ہے جو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہا ہو؟“ وہ کہیں گے: ”ہاں!“ تو انہیں فتح عطا کی جائے گی۔ پھر لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا کہ لوگوں کی ایک جماعت جنگ کرے گی تو کہا جائے گا: ”کیا تم میں کوئی ہے جو رسول اللہ ﷺ کے ساتھیوں کے ساتھ رہا ہو؟“ وہ کہیں گے: ”ہاں!“ تو انہیں فتح عطا کی جائے گی۔ پھر لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا کہ لوگوں کی ایک جماعت جنگ کرے گی تو کہا جائے گا: ”کیا تم میں کوئی ہے جو اس کے ساتھ رہا ہو جو اصحاب رسول ﷺ کے ساتھ رہا ہو؟“ وہ کہیں گے: ”ہاں!“ تو انہیں فتح عطا کی جائے گی۔“

③ وَالَّذِينَ مَعَهُ: جیسا کہ پچھلے فائدے میں گزرا کہ ”وَالَّذِينَ مَعَهُ“ (وہ لوگ جو اس کے ساتھ ہیں) سے مراد سب سے پہلے وہ صحابہ ہیں جنہوں نے بیعت رضوان کی، پھر تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں خواہ انہیں ایک لمحہ کے لیے آپ ﷺ کے ساتھ رہنے کا شرف حاصل ہوا ہو۔ مفسر بقاعی نے فرمایا: ”وَالَّذِينَ مَعَهُ“ میں وہ تمام مسلمان بھی شامل ہیں جنہیں احسان اور نیکی کے ساتھ آپ ﷺ کی اتباع کرنے کی وجہ سے آپ کے ساتھ ہونے کا شرف حاصل ہے۔“ پچھلے فائدے میں مذکور حدیث سے مفسر بقاعی کی اس بات کی تائید ہوتی ہے اور قرآن مجید میں صاف الفاظ میں احسان اور نیکی کے ساتھ اتباع کرنے والوں کو سابقون اولون کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا اور جنت میں داخلے کی بشارت دی ہے۔ مزید وضاحت کے لیے سورہ توبہ کی آیت (۱۰۰): ﴿وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَمَرْضَوْا عَنْهُمْ﴾ کی تفسیر پر نظر ڈال لیں۔ زیر تفسیر آیت میں کھتی کی مثال صحابہ کے ساتھ قیامت تک ان کے پیروکاروں کو بھی ملانے سے پوری طرح مکمل ہوتی ہے۔

④ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ: ان الفاظ میں صحابہ کرام اور امت مسلمہ کی تعریف فرمائی ہے کہ ان کا اللہ اور اس کے رسول پر ایسا ایمان ہے کہ ان کی دوستی اور دشمنی کے جذبات بھی ان کے ایمان کے تابع ہو گئے ہیں۔ کوئی کافر ہے تو وہ اس کے دشمن اور اس کے مقابلے میں نہایت سخت ہیں اور اگر کوئی مومن ہے تو وہ اس کے دلی دوست اور اس پر بے حد مہربان ہیں۔

مَثَلُهُمْ فِي التَّوَارِيثِ ۖ وَكَانَ لِمَنْ فِي الْأَنْجِيلِ مِنْ كَزْرٍ أَخْرَجَ شَطْرَهُ فَآزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ

رضا ڈھونڈتے ہیں، ان کی شناخت ان کے چہروں میں (موجود) ہے، بعد سے کہنے کے اثر سے۔ یہ ان کا وصف تورات میں ہے اور انجیل میں ان کا وصف اس سمجھتی کی طرح ہے جس نے اپنی کونیل نکالی، پھر اسے مضبوط کیا، پھر وہ

اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی کریم ﷺ کو کفار پر سختی کرنے اور ان کے ساتھ جہاد کا حکم دیا، فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفْرَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۚ وَمَأْوَهُمْ جَهَنَّمُ﴾ [التوبة: ۷۳] "اے نبی! کافروں اور منافقوں سے جہاد کرو اور ان پر سختی کرو اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔" اور مسلمانوں کو بھی یہی حکم دیا، فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كَاتِبُوا الَّذِينَ يَلُوكُمْ مِنَ الْكُفَّارِ وَلِيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً﴾ [التوبة: ۱۲۳] "اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ان لوگوں سے لڑو جو کافروں میں سے تمہارے قریب ہیں اور لازم ہے کہ وہ تم میں کچھ سختی پائیں۔" اور اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرمادیا کہ ایمان والوں کا کفار کے ساتھ تعلق ان کے ایمان لانے تک ابدی عداوت و بغض کا ہے، خواہ وہ کفار ان کے باپ، بیٹے، بھائی یا قریبی رشتہ دار ہوں۔ دیکھیے سورہ ممتحنہ کی پہلی چار آیات اور سورہ مجادلہ کی آخری آیت۔

اس کے مقابلے میں ایمان والوں پر ہمارے نبی ﷺ بے حد مہربان اور شفیق تھے، جیسا کہ فرمایا: ﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَؤُوفٌ رَّحِيمٌ﴾ [التوبة: ۱۲۸] "بلاشبہ یقیناً تمہارے پاس تمہی سے ایک رسول آیا ہے، اس پر بہت شاق ہے کہ تم مشقت میں پڑو، تم پر بہت حرص رکھنے والا ہے، مومنوں پر بہت شفقت کرنے والا، نہایت مہربان ہے۔" اور ایمان والوں کی صفت بھی یہی ہے، فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنكُمْ عَن دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهَ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ ۗ أَذِلَّةٌ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٌ عَلَى الْكُفْرَانِ ۗ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَتَعَاقُونَ لَوْمَةً لَّا يُؤْمِنُونَ ۗ ذَلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ﴾ [السناءة: ۵۴] "اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے تو اللہ عنقریب ایسے لوگ لائے گا کہ وہ ان سے محبت کرے گا اور وہ اس سے محبت کریں گے، مومنوں پر بہت نرم ہوں گے، کافروں پر بہت سخت، اللہ کے راستے میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے، وہ اسے دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور اللہ وسعت والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔" نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «تَرَى الْمُؤْمِنِينَ فِي تَرَاحِبِهِمْ وَتَوَادِهِمْ وَتَعَاطُفِهِمْ كَمَثَلِ الْجَسَدِ إِذَا اشْتَكَى عُضْوًا تَدَاعَى لَهُ سَائِرُ جَسَدِهِ بِالشَّهْرِ وَالْحَنَى» [بخاری، الأدب، باب رحمة الناس والنهائم: ۶۰۱۱] "تو ایمان والوں کو ان کے ایک دوسرے پر رحم، ایک دوسرے سے دوستی اور ایک دوسرے پر شفقت میں ایک جسم کی طرح دیکھے گا، جب اس کا کوئی عضو بیمار ہوتا ہے تو سارا جسم اس کی وجہ سے بیدارگی اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔" اور ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «الْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبُنْيَانِ يَشُدُّ بَعْضُهُ بَعْضًا» [بخاری، المعظائم، باب نصر المظلوم: ۲۴۴۶] "مومن مومن کے

فَأَسْتَوَىٰ عَلَىٰ سُوْقِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ۗ وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا

خوب موٹی ہوئی، پھر اپنے تئیں پر سیدھی کھڑی ہو گئی، کاشت کرنے والوں کو خوش کرتی ہے، تاکہ وہ ان کے ذریعے کافروں کو غصہ دلائے، اللہ نے ان لوگوں سے جو ان میں سے ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے

لیے ایک دیوار کی طرح ہے، جس کا ایک حصہ دوسرے حصے کو مضبوط کرتا ہے۔“

⑤ واضح رہے کہ کافروں پر سخت ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ کبھی کسی کافر پر رحم نہیں کرتے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس موقع پر اللہ اور اس کے رسول کا حکم کفار پر سختی کرنے کا ہوتا ہے وہاں ان کو رشتے ناتے یا دوستی وغیرہ کے علاقے اس کام میں مانع نہیں اور جہاں تک ان کے ساتھ رحم و کرم کے معاملے کا تعلق ہے تو خود قرآن نے اس کا فیصلہ کر دیا ہے، فرمایا: ﴿لَا يَنْهَكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَ لَمْ يُخْرِجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوهُمْ وَ تُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ۝ إِنَّمَا يَنْهَكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ قَاتَلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَ أَخْرَجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ وَ ظَهَرُوا عَلَىٰ إِخْرَاجِكُمْ أَنْ تَوْلَوْهُمْ ۗ وَ مَنْ يَتَوَلَّهُمْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ﴾ [المستحقة: ۹۰، ۸] ”اللہ تمہیں ان لوگوں سے منع نہیں کرتا جنہوں نے نہ تم سے دین کے بارے میں جنگ کی اور نہ تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا کہ تم ان سے نیک سلوک کرو اور ان کے حق میں انصاف کرو، یقیناً اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ اللہ تو تمہیں انھی لوگوں سے منع کرتا ہے جنہوں نے تم سے دین کے بارے میں جنگ کی اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا اور تمہارے نکالنے میں ایک دوسرے کی مدد کی کہ تم ان سے دوستی کرو۔ اور جو ان سے دوستی کرے گا تو وہی لوگ ظالم ہیں۔“ یعنی جو کفار مسلمانوں کے لیے باعث آزار اور ان کے ساتھ برسر جنگ نہیں ان کے ساتھ احسان اور حسن سلوک کرنے سے اللہ تعالیٰ منع نہیں کرتا۔ چنانچہ نبی ﷺ اور صحابہ کرام کے بے شمار واقعات ہیں جن میں ضعیف و مجبور یا ضرورت مند کفار کے ساتھ احسان و کرم کے معاملات کیے گئے ہیں۔ ان کے معاملہ میں عدل و انصاف کو برقرار رکھنا تو اسلام کا عام حکم ہے، عین میدان کارزار میں بھی عدل و انصاف کے خلاف کوئی کارروائی جائز نہیں۔

⑥ ﴿تَرَاهُمْ لَعَنًا سَجْدًا﴾: پچھلے جملے ”أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رِضْوَانًا بَيْنَهُمْ“ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھیوں کا لوگوں کے ساتھ معاملہ ذکر فرمایا اور اس جملے میں ان کا اللہ کے ساتھ تعلق بیان فرمایا کہ تو انھیں رکوع کرتے ہوئے اور سجدہ کرتے ہوئے دیکھے گا۔ ان کے اکثر اوقات نماز کے مبارک عمل میں گزرتے ہیں جو آدمی کو اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ قریب کرنے والا عمل ہے، کیونکہ ان کے نبی ﷺ نے فرمایا ہے: ﴿أَقْرَبُ مَا يَكُونُ الْعَبْدُ مِنْ رَبِّهِ وَهُوَ سَاجِدٌ فَأَكْبِرُوا الدُّعَاءَ﴾ [مسلم، الصلاة، باب ما يقال في الركوع والسجود: ۴۸۲] ”بندہ اپنے رب کے سب سے قریب اس وقت ہوتا ہے جب وہ سجدے میں ہوتا ہے۔ تو بہت زیادہ دعا کیا کرو۔“ ان کے دل مسجد کے ساتھ ہی مُتَّعِق ہوتے ہیں، روزانہ پانچ مرتبہ اللہ کے گھر میں آ کر یہ فریضہ سرانجام دیتے ہیں اور وہاں سے نکلتے ہیں تو دھیان ادھر ہی رہتا ہے، پھر رات کو بھی قیام کرتے ہیں۔

الصَّالِحَاتِ مِنْهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا ﴿۳۹﴾

بڑی بخشش اور بہت بڑے اجر کا وعدہ کیا ہے ﴿۳۹﴾

﴿۷﴾ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا: چونکہ رکوع و سجود ریا کے لیے بھی ہو سکتے ہیں اس لیے اس جملے میں صحابہ کرام اور رسول اللہ ﷺ کے پیروکار ساتھیوں کے اخلاص کی شہادت دی ہے کہ ان کے رکوع و سجود ریا یا دکھلاوے کے لیے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی مزید نعمتوں اور اس کی رضا کی طلب کے لیے ہوتے ہیں۔ اس میں ان کی ہمت کی بلندی کا بھی بیان ہے کہ وہ اعلیٰ چیز کے طلب گار ہیں جس سے بڑی کوئی چیز نہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَرِضْوَانٌ مِنَ اللَّهِ أَكْبَرُ﴾ [التوبة: ۷۲] ”اور اللہ کی طرف سے تھوڑی سی خوشنودی و رضا سب سے بڑی چیز ہے۔“ دنیائے دنی یا دوسری ادنیٰ چیزیں ان کی بلند نگاہ میں کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتیں۔

﴿۸﴾ سَيَسْأَلُهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِنْ أَمْرِ السُّجُودِ: بعض لوگوں نے سجدے کے اثر سے مراد پیشانی پر پڑنے والا گنا لیا ہے، جسے عام طور پر محراب کہا جاتا ہے۔ کسی مخلص مسلمان کے ماتھے پر سجدے کی رگڑ سے پڑنے والا نشان بھی یقیناً اس شناخت میں شامل ہے، مگر یہاں اس سے مراد وہ رونق اور حسن و شرافت کے آثار ہیں جو اخلاص، حسن نیت، خشیت و خشوع اور نماز کی کثرت سے چہرے پر نمایاں ہوتے ہیں۔ اگر دو آدمی رات بھر بیدار رہیں، ایک شراب نوشی اور گناہ کے کاموں میں مصروف رہے، دوسرا نماز یا قرآن کی تلاوت اور ذکر میں مصروف رہے تو صبح دونوں کے چہروں میں صاف فرق نظر آئے گا۔ یہی فرق سچے و جھوٹے، دعا باز و باوفا، ظالم و عادل، بدکار و پاک دامن اور متکبر و متواضع کے چہروں پر نمایاں ہوتا ہے۔ طبری نے علی بن ابی طلحہ کی معتبر سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے: «سَيَسْأَلُهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ» يَعْنِي السَّمْتُ الْحَسَنُ [طبری: ۳۱۸۹۱] ”یعنی اس سے مراد خوب صورت انداز اور ہیئت ہے۔“ ابن کثیر میں ہے، منصور نے مجاہد سے سنا کہ اس سے مراد خشوع ہے۔ منصور کہتے ہیں، میں نے کہا، میں تو اس سے مراد وہی نشان سمجھتا تھا جو چہرے پر پڑ جاتا ہے، تو انھوں نے فرمایا: ”وہ نشان تو بعض اوقات ایسے لوگوں کے ماتھے پر بھی ہوتا ہے جو فرعون سے بھی زیادہ سنگ دل ہوتے ہیں۔“ خلاصہ یہ کہ محمد رسول اللہ ﷺ کے ساتھیوں کے چہروں پر، صحابہ ہوں یا ان کے تابعین، خاص قسم کا نور اور رونق ہوتی ہے جس سے وہ دوسرے تمام لوگوں سے الگ پہچانے جاتے ہیں۔ یہاں بعض مفسرین نے ایک روایت رسول اللہ ﷺ کے حوالے سے نقل کی ہے: «مَنْ كَثُرَ صَلَاتُهُ بِاللَّيْلِ حَسَنٌ وَجْهُهُ بِالنَّهَارِ» ”جو شخص رات کو کثرت سے نماز پڑھے دن کو اس کا چہرہ خوبصورت ہوگا۔“ مگر اہل علم کا اتفاق ہے کہ یہ بات رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں، بلکہ یہ ایک راوی شریک کا قول ہے۔

﴿۹﴾ ذَلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَةِ: ”مثلاً“ کا معنی مثال بھی ہوتا ہے اور وصف بھی، یہاں مراد وصف ہے، یعنی ان کا یہ وصف کہ سجدے اور عبادت کی تاثیر سے ان کی شناخت ان کے چہروں سے ظاہر ہوتی ہے، یہ تو رات میں بیان ہوا ہے۔ اس وقت یہود و نصاریٰ کے ہاتھ میں جو تورات ہے اگرچہ انھوں نے اس میں کئی طرح کی تحریف کی ہے، رسول اللہ ﷺ اور آپ کی امت کی

صفات اکثر حذف کر دی ہیں اور بعض میں تبدیلی کر دی ہے، اس کے باوجود اس کی پانچویں کتاب ”استثنا“ کے باب (۳۳) اور فقرہ (۲) میں ہے: ”خداوند سینا سے آیا اور سیر سے ان پر طلوع ہوا، فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا، دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشیں شریعت ان کے لیے تھی۔“ اس پیش گوئی کا مصداق رسول اللہ ﷺ کے سوا کوئی ہو ہی نہیں سکتا، کیونکہ اس میں جمیل فاران سے جلوہ گر ہونے اور دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آنے کا صاف حوالہ موجود ہے اور یہ مسلم بات ہے کہ فاران جاز کے ایک پہاڑ کا نام ہے اور فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ دس ہزار صحابہ کے ساتھ آئے تھے۔ ظاہر ہے قدوسیوں سے مراد اللہ تعالیٰ کے پاکیزہ صفات اور عبادت گزار بندے ہیں، قرآن مجید میں اس کی جگہ ”تَرَاهُمْ لَعَنًا سَجْدًا يَتَّبِعُونَ مُضِلًّا مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا مِّنَّا هُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِّنْ أَكْثَرِ الشُّجُودِ“ کے الفاظ ہیں اور آتشیں شریعت کے بجائے ”أَشْهَادًا عَلَى الْكَلْبَارِ“ کہہ کر جہادی شریعت کا ذکر فرمایا ہے۔

تنبیہ: ”دس ہزار“ کے الفاظ بائبل کے سابقہ ایڈیشنوں میں موجود ہیں، حالیہ ایڈیشنوں میں تحریف کر کے بعض سے یہ عدد نکال دیا گیا ہے اور بعض میں اسے ”لاکھوں“ میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔

❶ وَكَلَّمَهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ بِمُكْرَمَاتٍ أَنْحَرَجَ.....: تورات میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھیوں کے تقویٰ و تقدس، جہادی شریعت اور ان کے غلبہ و اقتدار کی صفت بیان ہوئی ہے اور انجیل میں امت محمد ﷺ کے بتدریج قلت سے کثرت کی طرف اور کمزوری سے قوت کی طرف بڑھنے کو مثال کے ساتھ واضح فرمایا ہے کہ ان کی ابتدا اگرچہ کمزور ہوگی لیکن آخر کار وہ ایسے تاور درخت کی شکل اختیار کر جائیں گے جس کے سائے میں بڑی بڑی قومیں پناہ لیں گی۔ چنانچہ انجیل متی، باب (۱۳)، فقرہ (۹۲۳) میں یہ مثال اس طرح بیان ہوئی ہے: ”اس (مسح) نے ایک اور تمثال ان کے سامنے پیش کر کے کہا کہ آسمان کی بادشاہت اس رائی کے دانے کی مانند ہے جسے کسی آدمی نے لے کر اپنے کھیت میں بویا، وہ سب بیجوں سے چھوٹا تو ہے لیکن جب بڑھ جاتا ہے تو سب ترکاریوں سے بڑا ہوتا ہے اور ایسا درخت ہو جاتا ہے کہ ہوا کے پرندے اس کی ڈالیوں پر بسیرا کرتے ہیں۔“ یہی مثال الفاظ کی معمولی تبدیلی کے ساتھ انجیل مرقس، باب (۴)، فقرہ (۳-۹) اور انجیل لوقا، باب (۱۳)، فقرہ (۱۸-۲۱) میں بھی آئی ہے۔ (منقول از تفسیر ثنائی)

قرآن مجید میں کھیتی کی مثال دینے کا مطلب یہ ہے کہ اگر حدیبیہ والے سال تم مکہ میں داخل نہیں ہو سکتے تو اس میں بہت سی حکمتیں پوشیدہ ہیں اور تمہیں یہ سبق سکھانا بھی مقصود ہے کہ اسلام کا عروج و کمال یک لخت نہیں بلکہ تدریج کے ساتھ ہوگا، جیسا کہ کھیتی بتدریج کمال کو پہنچتی ہے۔ پہلے وہ بیج سے نازک سی کوئیل یا سوئی نکالتی ہے، پھر اسے مضبوط کرتی ہے، پھر خوب موٹی ہو جاتی ہے، پھر اس کا پودا اپنے تنے پر سیدھا کھڑا ہو جاتا ہے، پھر اس کے ساتھ اور پودے اگتے چلے جاتے ہیں اور کھیت بھر جاتا ہے جس سے کاشت کرنے والوں کا دل خوش ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک دن آنے والا ہے کہ ہدایت اور دین حق کی یہ کھیتی جو ازل اول سرزمین عرب میں کاشت کی گئی، اپنے کمال کو پہنچے گی، مشرق و مغرب اس سے بھر جائیں گے، اپنی آبیاری اور دیکھ بھال کرنے والوں کے دلوں کو خوش کرے گی اور ان لوگوں کے دلوں کو غم و غصہ سے جلانے لگی جنہوں نے

اس کی نشوونما کو روکنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔

﴿لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ﴾: ”لِيَغِيظَ“ کا لام فعل مقدر کے متعلق ہے جو گزشتہ عبارت سے خود بخود سمجھ میں آ رہا ہے: ”اَيُّ جَعَلَهُمُ اللَّهُ كَذَلِكَ لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ“ یعنی اللہ تعالیٰ صحابہ کرام اور ان کے تبعین کو اس طرح بتدریج کمال و عروج تک پہنچائے گا، تاکہ ان کے ساتھ کفار کو غصہ دلائے اور ان کے دلوں کو جلانے۔ تاریخ شاہد ہے کہ رسول اللہ ﷺ جو دعوت حق لے کر آئے اسے قبول کرنے والے اور اسے پوری دنیا پر غالب کرنے کے لیے اپنی جان، اپنا مال اور سب کچھ قربان کرنے والے صحابہ کرام تھے اور ان کے بعد ان سے محبت رکھنے والے اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے تابعین اور بعد کے لوگ تھے جن کے ذریعے سے یہ دین حق ساری دنیا میں پھیلا اور غالب ہوا۔ ایمان والوں کے دل صحابہ کرام اور ان کے تبعین کے حالات دیکھ کر اور سن کر خوش ہوتے ہیں اور کفار کے دل انھیں دیکھ کر اور ان کے حالات سن کر غصے سے بھر جاتے ہیں اور جل اٹھتے ہیں۔ تفسیر التحریر والتبیین (۱۷۷/۲۶) میں ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا: ﴿مَنْ أَصْبَحَ مِنَ النَّاسِ فِي قَلْبِهِ غَيْظٌ غَنَى أَحَدٍ مِّنْ أَصْحَابِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَدْ أَصَابَتْهُ هَذِهِ الْآيَةُ﴾ ”لوگوں میں سے جس شخص کے دل میں اصحاب رسول ﷺ میں سے کسی ایک پر بھی غصہ اور جلن ہو، یہ آیت اس پر یقیناً لاگو ہوتی ہے۔“ ابن عاشور نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ امام مالک پر رحم کرے، ان کا استنباط کس قدر ہار یک ہے۔“

﴿وَعَدَّ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْهُمْ...﴾: شاہ عبد القادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”اور کھیتی کی کہاوت یہ کہ اول ایک آدمی تھا اس دین پر، پھر دو ہوئے پھر قوت بڑھتی گئی حضرت ﷺ کے وقت اور خلیفوں کے اور یہ وعدہ دیا ان کو جو ایمان لائے اور بھلے کام کرتے ہیں۔ حضرت ﷺ کے سب اصحاب ایسے ہی تھے، مگر خاتمہ کا اندیشہ رکھا۔ حق تعالیٰ بندوں کو ایسی خوش خبری نہیں دیتا کہ نذر ہو جائیں، مالک سے اتنی شاباش بھی نسیمت ہے۔“





يَأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْدِمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ سَبِيعٌ عَلِيمٌ ①

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ اور اس کے رسول سے آگے نہ بڑھو اور اللہ سے ڈرو، یقیناً اللہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے ①

آیت 1: ① يَأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا: رازی نے فرمایا: ”اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو مکارم اخلاق کا سبق دیا ہے، ان کا تعلق یا تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملے میں ہو گا یا اس کے رسول کے ساتھ یا فاسق لوگوں کے ساتھ یا ان ایمان والوں کے ساتھ جو حاضر ہوں یا ان ایمان والوں کے ساتھ جو غائب ہوں اور پانچوں قسموں میں سے ہر ایک کی ابتدا ”يَأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا“ کے ساتھ کی ہے۔“

② لَا تَقْدِمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ: ”لَا تَقْدِمُوا“ باب تفعیل ہے، جس کا مجرد ”قَدَّمَ يَقْدُمُ“ (ن) آتا ہے، جس کا معنی ”دوسرے کے آگے چلنا“ ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرعون کے متعلق فرمایا: ﴿يَقْدُمُ قَوْمَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾ [مرد: ۹۸] ”وہ قیامت کے دن اپنی قوم کے آگے ہو گا۔“ ”تَقَدَّمَ يَتَقَدَّمُ“ (تفعل) کا معنی بھی ”آگے بڑھنا“ ہے۔ باب تفعیل کے لحاظ سے اس کا معنی ”آگے کرنا“ ہو گا، یعنی اپنی کوئی بات یا کوئی فعل اللہ اور اس کے رسول سے آگے نہ کرو۔ بعض اوقات ”قَدَّمَ“ ”تَقَدَّمَ“ کے معنی میں بھی آجاتا ہے، یعنی وہ آگے بڑھا، جیسے ”كَانَتْ قَدَّمَ نَفْسُهُ“ ”گو یا اس نے اپنے آپ کو آگے بڑھا لیا۔“ اس صورت میں آیت کا معنی ہو گا: ”اللہ اور اس کے رسول سے آگے مت بڑھو۔“ اور یہاں یہی معنی راجح ہے۔ اسی سے ”مُقَدَّمَةُ الْحَيْشِ“ (شکر کا سب سے اگلا حصہ) ہے۔ باب تفعیل باب تفضل کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، جیسے ”وَجْهٌ أَيْ تَوَجَّهَ“ اور ”بَيْنَ أَي تَبَيَّنَ“۔ آیت میں اس شخص کو جو اللہ اور اس کے رسول کی اجازت یا حکم کے بغیر کوئی کام یا بات کرتا ہے اس شخص کی حالت کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو کسی دوسرے کو پیچھے چھوڑ کر اس سے آگے بڑھ جاتا ہے۔ (ابن عاشور)

③ ”لَا تَقْدِمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ“ میں اللہ اور اس کے رسول کو اکٹھا ذکر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ رسول سے آگے بڑھنا درحقیقت اللہ تعالیٰ سے آگے بڑھنا ہے، کیونکہ رسول وہی کہتا اور کرتا ہے جس کی وحی اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے، فرمایا: ﴿وَمَا يَنْطَلِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۗ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ﴾ [النجم: ۴۳] ”اور نہ وہ اپنی خواہش سے بولتا ہے۔ وہ تو صرف وحی ہے جو نازل کی جاتی ہے۔“

④ اس آیت میں اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے کا بنیادی تقاضا بیان کیا گیا ہے کہ جب تم اللہ کو اپنا رب اور رسول کو اپنا ہادی اور رہبر مانتے ہو تو پھر ان کے پیچھے چلو، آگے مت بڑھو! اپنے فیصلے خود ہی نہ کر لو، بلکہ پہلے یہ دیکھو کہ اللہ اور اس کے رسول کا حکم کیا ہے۔ یہ حکم سورہ احزاب میں موجود حکم سے بھی ایک قدم آگے ہے، فرمایا: ﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّ لَا مُؤْمِنَةٍ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنی آوازیں نبی کی آواز کے اوپر بلند نہ کرو اور نہ بات کرنے میں اس کے لیے آواز ادا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْراً أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ صُلْبًا مَفِينًا ﴿۱﴾ الاحزاب : ۳۶ اور کبھی بھی نہ کسی مومن مرد کا حق ہے اور نہ کسی مومن عورت کا کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے کا فیصلہ کریں کہ ان کے لیے ان کے معاملے میں اختیار ہو اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے سو یقیناً وہ گمراہ ہو گیا، واضح گمراہ ہونا۔ یعنی سورہ احزاب میں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے کا فیصلہ کریں تو کسی ایمان والے مرد یا ایمان والی عورت کو خود کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار باقی نہیں رہتا اور یہاں فرمایا کہ ایمان والوں کو پہل کرتے ہوئے اپنے فیصلے خود نہیں کر لینے چاہئیں، بلکہ پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ ان کے متعلق اللہ اور اس کے رسول کا حکم کیا ہے۔ یہ حکم مسلمانوں کے انفرادی معاملات میں بھی ہے اور اجتماعی معاملات میں بھی۔ کسی بھی شخص کو خواہ وہ کوئی علم ہو یا امام یا پیر فقیر، یہ حق حاصل نہیں اور نہ ہی کسی جماعت یا پارلیمنٹ کا حق ہے کہ وہ اپنی طرف سے شریعت بتائے، کسی کام کو حلال یا حرام کہے، یا باعث ثواب یا گناہ قرار دے۔ اگر کوئی کسی کو یہ حق دیتا ہے تو وہ اسے اپنا رب بناتا ہے۔ مزید دیکھیے سورہ توبہ کی آیت (۳۱):

﴿ اِتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ ﴾ کی تفسیر۔

۵ اللہ اور اس کے رسول سے آگے نہ بڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ کتاب و سنت سے آگے مت بڑھو، ان کے پیچھے پیچھے چلو۔ چنانچہ طبری نے علی بن ابی طلحہ کی معتبر سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر نقل فرمائی ہے: ﴿ لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيْ اللَّهِ وَرَسُولِهِ ﴾ بقول لا نقولوا جلافت الكتاب والسنة (طبری : ۳۱۹۲۷) یعنی اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ کتاب و سنت کے خلاف کوئی بات نہ کہو۔ بعض مفسرین نے اس آیت کی شان نزول رمضان سے ایک دو دن پہلے روزہ رکھنا بیان کی ہے اور بعض نے عید الاضحیٰ کی نماز سے پہلے قربانی کرنا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے تمام کام اس آیت کے مضمون میں شامل ہیں، البتہ یہ بات ثابت نہیں کہ یہ آیت خاص ان کے بارے میں اتری ہے۔

۶ وَأَقْفُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ ۗ ۱۰۰ ﴿۱۰﴾ تَعْلِيلُ يَعْنِي سَبِيلُ بَاتِ كِي وَجِبَ بِيَانِ كَرْنِ كِ لِيْ يَ هُوَ تَا هِ۔ يَعْنِي اللّٰهُ سَ ذُرْتِ رِ هُو، كِي وَنَكْ اللّٰهُ تَعَالَى بَر بَاتِ كُو سَنَنْ دَالَا اُو رِ كَامُ كُو جَانَنْ دَالَا هِ، خَوَاهِ وَو سَبِ كِ سَا سَنْ كِيَا جَانَنْ يَا حِصْبِ كَر، عَمَلِ مِ نْ آچَا هُو يَادِلِ مِ نْ اِسْ كَا اِرَادَه هُو، اُكْرَمَ اللّٰهُ اُو رِ اِسْ كِ رَسُوْلِ سَ آگَ بَر هُو كَ تُو اُسْ سَ تَحْمَارَا جَرَمِ حِصْبَا نَيْسِ رَ هِ كَا اُو رُو هِ تَحْمِيْسِ اِسْ كِي سَزَادَ سَ كَا۔

آیت ۲ ﴿۱﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ: اولیٰ نے فرمایا کہ بھچھلی آیت میں ایمان والوں کو اپنے قول یا فعل میں رسول اللہ ﷺ سے آگے بڑھنے سے منع فرمایا، اس آیت میں آپ کے سامنے بولنے کی کیفیت میں بھی آپ سے بڑھنے کو منع فرما دیا۔ چنانچہ فرمایا کہ آپ ﷺ کی موجودگی یا آپ کی مجلس میں ایک دوسرے سے بات کرتے ہوئے بھی اپنی آوازیں آپ ﷺ کی آواز سے اونچی نہ کریں۔ صحیح بخاری میں اس آیت کا سبب نزول بیان ہوا ہے، ابن ابی ملیکہ فرماتے ہیں: «كَأَدِ الْخَيْرَانِ أَنْ يَهْلِكَا، أَبَا نَكْرٍ وَعُمَرُ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، رَفَعَا أَصْوَاتَهُمَا عِنْدَ

بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ ﴿۵﴾

اونچی کرو، تمہارے بعض کے بعض کے لیے آواز اونچی کرنے کی طرح، ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال برباد ہو جائیں۔ تم شعور نہ رکھتے ہو ﴿۵﴾

النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جِئْنَا قَدِيمَ عَلَيْهِ رَكْبٌ بَنِي تَمِيمٍ، فَأَشَارَ أَحَدُهُمَا بِالْأَفْرَعِ بْنِ حَابِسٍ أُخِيَّ بَنِي مُجَاشِعٍ وَأَشَارَ الْآخَرُ بِرَجُلٍ آخَرَ قَالَ نَافِعٌ لَا أَحْفَظُ اسْمَهُ، فَقَالَ أَبُو بَكْرٍ لِعُمَرَ مَا أَرَدْتَ إِلَّا جَلَّافِي قَالَ مَا أَرَدْتُ جَلَّافَكَ، فَارْتَفَعَتْ أَصْوَاتُهُمَا فِي ذَلِكَ فَانزَلَ اللَّهُ: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ﴾ الآية، قَالَ ابْنُ الزُّبَيْرِ فَمَا سَكَانَ عُمَرُ يُسْمِعُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعْدَ هَذِهِ الْآيَةِ حَتَّى يَسْتَفْهِمَهُ «بخاری، النفساء، باب: ﴿لا ترفعوا أصواتكم فوق صوت النبي﴾: [۱: ۱۸۴۵] ”دوسب سے بہتر آدمی قریب تھے کہ ہلاک ہو جاتے، ابو بکر اور عمرؓ، دونوں نے اپنی آوازیں بلند کیں جب بنو تمیم کے شترسوار آپ ﷺ کے پاس آئے۔ تو ان دونوں (بہترین آدمیوں) میں سے ایک نے بنی مجاشع کے افرع بن حابس (کو بنو تمیم کا امیر مقرر کرنے) کا اشارہ کیا اور دوسرے نے ایک اور کا اشارہ کیا۔ نافع نے کہا، مجھے اس کا نام یاد نہیں۔ تو ابو بکرؓ نے عمرؓ سے کہا: ”تم نے صرف میری مخالفت کا ارادہ کیا ہے۔“ انھوں نے کہا: ”میں نے آپ کی مخالفت کا ارادہ نہیں کیا۔“ اس میں دونوں کی آوازیں بلند ہو گئیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ﴾ ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنی آوازیں نبی کی آواز کے اوپر بلند نہ کرو۔“ ابن زبیرؓ نے فرمایا، پھر اس آیت کے بعد عمرؓ کی آواز رسول اللہ ﷺ کو سنائی نہیں دیتی تھی جب تک کہ آپ ﷺ ان سے دوبارہ پوچھتے نہیں تھے۔“

﴿۵﴾ کسی مجلس میں رسول اللہ ﷺ کی حدیث بیان ہو تو آپ ﷺ کے ادب کا تقاضا ہے کہ اس کے مقابلے میں کسی شخص کا قول ذکر نہ کیا جائے اور نہ اسے رد کرنے کے لیے کسی قسم کے عقلی دھکولے پیش کیے جائیں، کیونکہ یہ بھی آپ ﷺ کی آواز سے اپنی آواز کو اونچا کرنا ہے، بلکہ مخالفت کی وجہ سے یہ اس سے بھی سنگین بے ادبی ہے۔

﴿۶﴾ بعض لوگوں کا معاملہ بڑا عجیب ہے کہ وہ لوگوں کو باور کرواتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ان کی مجلس میں موجود ہیں، پھر اتنی اونچی آواز سے بولتے ہیں کہ سننے والوں کے کانوں کے پردے پھٹنے کے قریب ہوتے ہیں، اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ سے محبت کے واحد اجارہ دار بھی بنے ہوئے ہیں۔ حالانکہ نہ رسول اللہ ﷺ اب کسی مجلس میں موجود ہوتے یا تشریف لاتے ہیں اور نہ ہی آپ کو موجود سمجھتے ہوئے آپ کی محبت یا ادب میں اتنی بلند آواز کے ساتھ بولنے کی کوئی ممانعت ہے۔

﴿۷﴾ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ: اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو اس ادب کی تعلیم اس لیے دی کہ بعض اکھڑا عربی آپ سے اسی طرح اونچی آواز میں بات کرتے اور آپ کو اسی طرح نام لے کر خطاب کرتے جس طرح وہ ایک دوسرے کے ساتھ بات کرتے یا مخاطب کرتے تھے۔ چنانچہ فرمایا، اور نہ آپ ﷺ سے اس طرح اونچی آواز میں بات کرو جس طرح ایک دوسرے

سے اونچی آواز میں بات کرتے ہو اور نہ ہی اس طرح آپ کو نام لے کر مخاطب کرو۔ جس طرح ایک دوسرے کو مخاطب کرتے ہو، بلکہ ”اے محمد“ کہنے کے بجائے ”اے اللہ کے رسول“ یا ”اے اللہ کے نبی“ وغیرہ کہا کرو۔ یہ ادب سورہ نور میں بھی سکھایا گیا ہے، فرمایا: ﴿لَا تَجْعَلُوا دُعَاءَ الرَّسُولِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا﴾ [النور: ۶۳] ”رسول کے بلانے کو اپنے درمیان اس طرح نہ بناو جیسے تمہارے بعض کا بعض کو بلانا ہے۔“ خود اللہ تعالیٰ نے پورے قرآن مجید میں کسی جگہ آپ ﷺ کو نام کے ساتھ مخاطب نہیں فرمایا، بلکہ مختلف القاب کے ساتھ ہی مخاطب فرمایا ہے، جیسے ”يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ“، ”يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ“، ”يَا أَيُّهَا الْمُرْسَلُ“ اور ”يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ“ وغیرہ۔ حالانکہ دوسرے انبیاء کو نام لے کر خطاب فرمایا ہے، جیسے ”يَا آدَمُ“، ”يَا نُوحُ“، ”يَا إِبْرَاهِيمَ“، ”يَا مُوسَى“، ”يُؤَيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ“ اور ”يَا دَاوُدَ“ وغیرہ۔ اس کے باوجود اکثر جاہل ”یا محمد“ کہنے اور لکھنے پر اصرار کرتے ہیں اور دعویٰ آپ ﷺ سے محبت کا رکھتے ہیں۔ اس آیت سے آپ ﷺ کی توقیر و تعظیم کا اندازہ ہوتا ہے۔

⑤ أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ: اس سے معلوم ہوا کہ نبی ﷺ کی موجودگی میں آپ کی آواز سے آواز اونچی کرنا یا آپ سے ایسے لہجے میں بات کرنا جس سے آپ کی توقیر و تکریم میں فرق آتا ہو اعمالِ ضائع ہو جانے کا موجب ہے، خواہ یہ کام کوئی مومن ہی کیوں نہ کرے، کیونکہ ساتھ ہی فرمایا: ﴿وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ﴾ ”اور تم شعور نہ رکھتے ہو۔“ منافقین تو ایمان سے خالی تھے، اس لیے وہ جان بوجھ کر آپ سے گستاخی کے ساتھ پیش آتے تھے اور انھیں اپنے اعمال کے ضائع ہونے کی کوئی فکر بھی نہیں تھی۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض اعمال ایسے منحوس ہیں کہ وہ اعمالِ صالحہ کو بھی ضائع کرنے کا باعث بن جاتے ہیں، خصوصاً جن میں اللہ تعالیٰ یا رسول کریم ﷺ کی بے ادبی پائی جائے، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے غضب کا موجب ہوتے ہیں۔ ابن کثیر نے فرمایا: ”﴿أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ﴾ یعنی ہم نے تمہیں آپ ﷺ کے پاس آواز بلند کرنے سے اس لیے منع کیا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ اس کی وجہ سے آپ ﷺ غصے ہو جائیں تو آپ کے غصے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ بھی غصے ہو جائے اور اس شخص کے اعمال برباد کر دے جس نے آپ کو غصہ دلایا اور اسے معلوم بھی نہ ہو، جیسا کہ صحیح حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿إِنَّ الْعَبْدَ لَيَتَكَلَّمُ بِالْكَلِمَةِ مِنْ رِضْوَانِ اللَّهِ لَا يُلْقِي لَهَا بَالًا يَرْفَعُ اللَّهُ بِهَا دَرَجَاتٍ وَإِنَّ الْعَبْدَ لَيَتَكَلَّمُ بِالْكَلِمَةِ مِنْ سَخَطِ اللَّهِ لَا يُلْقِي لَهَا بَالًا يَهْوِي بِهَا فِي جَهَنَّمَ﴾ [بخاری، الرقاق، باب حفظ اللسان: ۶۴۷۸] ”بندہ اللہ کو راضی کرنے والی کوئی بات کرتا ہے، جس کا وہ کوئی دھیان نہیں کرتا، تو اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے اسے کئی درجے بلند کر دیتا ہے اور بندہ اللہ کو غصہ دلانے والی کوئی بات کرتا ہے، جس کا وہ کوئی دھیان نہیں کرتا، تو اس کی وجہ سے وہ جہنم میں گر جاتا ہے۔“

⑥ اس آیت کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ ﷺ کے پاس آواز بلند کرنے سے کس قدر ڈرتے اور اس سے بچتے تھے اس کا اندازہ ایک تو عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے عمل سے ہوتا ہے جس کا تذکرہ اسی آیت کی تفسیر کے پہلے فائدے میں ہوا ہے، اس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کے خطیب ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کا رویہ بھی اس کی ایک مثال ہے۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”جب یہ آیت

إِنَّ الَّذِينَ يَعْضُونَ أَصْوَابَهُمْ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ أُولَئِكَ الَّذِينَ امْتَحَنَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ
لِيَتَّقُوا لَهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرٌ عَظِيمٌ ﴿۳﴾

بے شک وہ لوگ جو اللہ کے رسول کے پاس اپنی آوازیں پست رکھتے ہیں یہی لوگ ہیں جن کے دل اللہ نے تقویٰ کے لیے آزما لیے ہیں، ان کے لیے بڑی بخشش اور بہت بڑا اجر ہے ﴿۳﴾

اتری: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَابَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَن تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنتُمْ لَا تَشْعُرُونَ﴾ اب ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہما کی آواز بہت بلند تھی تو وہ کہنے لگے: ”میں ہی اپنی آواز رسول اللہ ﷺ کی آواز سے بلند کیا کرتا تھا، میرا عمل تو ضائع ہو گیا، میں اہل نار سے ہوں۔“ اور وہ غمگین ہو کر گھر میں بیٹھ گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں نہ دیکھا تو ان کے بارے میں پوچھا۔ کچھ لوگ ان کے پاس گئے اور ان سے کہا: ”رسول اللہ ﷺ تمہیں تلاش کر رہے تھے، تمہیں کیا ہوا؟“ کہنے لگے: ”میں ہی ہوں جو اپنی آواز نبی ﷺ کی آواز سے بلند کرتا تھا اور اونچی آواز سے بات کرتا تھا، میرا عمل ضائع ہو گیا اور میں اہل نار سے ہوں۔“ لوگوں نے آ کر رسول اللہ ﷺ کو ان کی بات بتائی تو نبی ﷺ نے فرمایا: ﴿لَا، بَلْ هُوَ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ﴾ ”نہیں، بلکہ وہ اہل جنت سے ہے۔“ انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”پھر ہم انہیں اپنے درمیان چلتا پھرتا دیکھتے تھے اور جانتے تھے کہ وہ جنتی ہیں۔ تو جب یمامہ (مسئلہ کذاب سے جنگ) کا دن ہوا تو ہم میں پیچھے ہٹنے کے کچھ آثار ظاہر ہوئے۔ ایسے میں ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہما آئے، انھوں نے میت والی خوشبو لگا رکھی تھی اور کفن پہنا ہوا تھا۔ کہنے لگے: ”تم نے اپنے ساتھیوں کو (پیچھے ہٹنے کی) بہت بری عادت ڈال دی ہے۔“ یہ کہہ کر لڑنے لگے، حتیٰ کہ قتل کر دیے گئے۔“ [مسند احمد: ۱۳۷/۳، ح: ۱۲۴۰۸] اس کی سند صحیح ہے۔ تفسیر ابن کثیر کے محقق لکھتے ہیں کہ ثابت بن قیس رضی اللہ عنہما کو یہ خیال اس لیے ہوا کہ بنو تمیم (جن کے بارے میں یہ آیات اتریں) ان کے سامنے (رسول اللہ ﷺ کی طرف سے) انھوں نے ہی خطبہ دیا تھا۔ دیکھیے البدایہ والنہایہ (۲۲/۵) اور فتح الباری (۵۹۱/۸)۔

آیت 3 ﴿إِنَّ الَّذِينَ يَعْضُونَ أَصْوَابَهُمْ.....﴾ اس میں ان لوگوں کی تعریف ہے جو رسول اللہ ﷺ کی تعظیم و تکریم کا خیال رکھتے ہوئے آپ کے پاس اپنی آوازیں پست رکھتے تھے، جیسا کہ عمر رضی اللہ عنہما کے متعلق گزرا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کے تقویٰ کا امتحان کر کے دیکھ لیا کہ وہ پرہیزگاری کے امتحان میں پوری طرح کامیاب ہیں، جیسے سونے کو آگ میں ڈال کر دیکھا جاتا ہے اور وہ خالص نکلتا ہے، تو کہا جاتا ہے کہ ہم نے اس کے خالص ہونے کی آزمائش کر لی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کے سامنے اپنی آواز پست نہیں رکھتا اس کا دل تقویٰ سے خالی ہے، پھر جو شخص آپ ﷺ کی حدیث سننے کے بعد اس کے خلاف آواز اٹھائے وہ تقویٰ اور ایمان سے کس قدر دور ہوگا۔

إِنَّ الَّذِينَ يُنَادُونَكَ مِنْ وَرَاءِ الْحُجُرَاتِ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ﴿۴﴾

بے شک وہ لوگ جو تجھے دیواروں کے باہر سے آوازیں دیتے ہیں ان کے اکثر نہیں سمجھتے ﴿۴﴾

آیت 4 ﴿۱﴾ إِنَّ الَّذِينَ يُنَادُونَكَ مِنْ وَرَاءِ الْحُجُرَاتِ: ”حُجْرَةٌ“ زمین کا وہ قطعہ جس کے گرد دیوار بنی ہوئی ہو، گھر کے صحن کی چار دیواری۔ طبری نے فرمایا: ”حُجْرَةٌ“ کی جمع ”حُجُرَاتُ“ ہے اور اس کی جمع ”حُجْرَاتُ“ ہے۔ ”روح المعانی میں ان حجرات کی کیفیت بیان کی گئی ہے: ”یہ نوحجرے تھے، ہر بیوی کے پاس ایک حجرہ تھا اور جیسا کہ ابن سعد نے عطاء خراسانی سے روایت کی ہے، یہ کھجور کی ٹہنیوں سے بنے ہوئے تھے، ان کے دروازوں پر سیاہ بالوں کے ٹاٹ کے پردے تھے۔ بخاری نے ”الادب المفرد“ میں اور ابن ابی الدنیا اور بیہقی نے داؤد بن قیس سے بیان کیا ہے، انھوں نے فرمایا: ”میں نے وہ حجرے دیکھے ہیں، کھجور کی ٹہنیوں سے بنے ہوئے تھے، جنھیں باہر کی جانب سے بالوں کے ٹاٹوں سے ڈھانپا ہوا تھا اور میرا گمان ہے کہ صحن کے دروازے سے کمرے کے دروازے تک چھ یا سات ہاتھ (نو یا ساڑھے دس فٹ) کا فاصلہ تھا اور کمرے کا اندرونی حصہ دس ہاتھ (پندرہ فٹ) تھا اور میرا گمان ہے کہ گھر کی چوڑائی سات آٹھ ہاتھ (ساڑھے دس بارہ فٹ) کے درمیان تھی۔“ اور حسن سے بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا: ”میں عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی خلافت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کے کمروں میں جایا کرتا تھا تو ان کی چھت کو ہاتھ لگا لیتا تھا۔ ولید بن عبد الملک رضی اللہ عنہ کے عہد میں ان کے حکم سے ان گھروں کو مسجد نبوی میں شامل کر دیا گیا جس پر لوگ بہت روئے۔“ اور سعید بن مسیب نے فرمایا: ”اللہ کی قسم! مجھے پسند تھا کہ ان حجروں کو ان کی حالت پر رہنے دیا جاتا، تاکہ اہل مدینہ کے بچے بڑے ہوتے اور تمام دنیا سے آنے والے آتے تو دیکھتے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں کیسے گھروں پر اکتفا کیا ہے۔ اس سے ان کے دلوں میں ایک دوسرے سے بڑھ کر دنیا حاصل کرنے کی حرص اور اس پر فخر کے بجائے زہد اور دنیا سے بے رغبتی پیدا ہوتی۔“ اور ابوامامہ بن سہل بن حنیف نے بھی ایسی ہی بات فرمائی۔“ (روح المعانی)

گزشتہ آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں آپ کے ادب کا بیان تھا، ان آیات میں اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب کو ملحوظ رکھنے کا بیان ہے جب آپ گھر میں ہوں۔ آیت کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ کچھ اعرابی لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں کی چار دیواری کے باہر کھڑے ہو کر آپ کو بلانے کے لیے آوازیں دیں، تو اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کو ”لَا يَعْقِلُونَ“ قرار دیا۔ ”لَا يَعْقِلُونَ“ قرار دینے سے مقصود انھیں ڈانٹنا اور تمام مسلمانوں کو آپ کے ادب کی تعلیم دینا ہے۔ ﴿۲﴾ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ: ابن جرّی (صاحب التہسیل) نے فرمایا: ”اس میں دو وجہیں ہیں، ایک یہ کہ ان میں کچھ لوگ عقل رکھنے والے بھی تھے، اس لیے ان کے اکثر کو ”لَا يَعْقِلُونَ“ فرمایا، سب کو نہیں۔ دوسری یہ کہ مراد سب ہی کو ”لَا يَعْقِلُونَ“ قرار دینا ہے، عقل والوں کو کم قرار دینے سے مراد ان کی نفی ہے۔ الفاظ کے مطابق پہلی وجہ زیادہ ظاہر ہے، دوسری میں زیادہ بلیغ طریقے سے سب کی مذمت کا بیان ہے۔“

وَلَوْ أَنَّهُمْ صَبَرُوا حَتَّى تَخْرُجَ إِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٥﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوا أَن تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْحَبُوا عَلَى مَا

اور اگر وہ صبر کرتے، یہاں تک کہ تو ان کی طرف نکلتا تو یقیناً ان کے لیے بہتر ہوتا اور اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۵﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق کوئی خبر لے کر آئے تو اچھی طرح تحقیق کرو،

آیت 5 ﴿٥﴾ وَلَوْ أَنَّهُمْ صَبَرُوا حَتَّى تَخْرُجَ إِلَيْهِمْ : یعنی اگر وہ آوازیں دینے کے بجائے صبر کرتے اور آپ ﷺ

کے تشریف لانے کا انتظار کرتے تو ان کے لیے بہتر ہوتا، کیونکہ اس صبر و انتظار میں اور آپ ﷺ کا ادب ملحوظ رکھنے میں انھیں اجر و ثواب ملتا، رسول اللہ ﷺ زیادہ خوش دلی کے ساتھ ان سے ملتے اور زیادہ بہتر طریقے سے ان کی ضرورتیں پوری فرماتے۔ ظاہر ہے جس شخص پر پوری امت کی ذمہ داری کا بوجھ ہے اور وہ ہر وقت اسی فکر و عمل میں مصروف ہے، اگر اس وقت جب وہ گھر میں ہے یہ خیال کیے بغیر کہ اس وقت وہ آرام کر رہا ہے یا گھر کے کسی کام میں مصروف ہے، آوازیں دینا شروع کر دیا جائے تو اس خیر کی توقع نہیں رکھی جاسکتی جو صبر و انتظار کے ساتھ اس سے حاصل ہونا تھی۔ اس سے اساتذہ کرام، اہل علم اور مسلمانوں کے امراء و اکابر کے اکرام کی بھی تعلیم ملتی ہے۔

﴿٥﴾ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ : یعنی حق تو یہ تھا کہ ان لوگوں کو ان کی اس بے ادبی پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی نہ کوئی سزا ملتی، مگر چونکہ ان سے یہ نفل بے عقلی کی وجہ سے سرزد ہوا تھا، بدینیتی کی وجہ سے نہیں، اس لیے آخر میں اپنے غفور و رحیم ہونے کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی مغفرت کا اشارہ فرما دیا۔

﴿٦﴾ رسول اللہ ﷺ جب زندہ تھے اور دیوار کے باہر سے آپ تک آواز بھی پہنچتی تھی اس وقت آپ کو آواز دینے والوں کو اللہ تعالیٰ نے بے عقل قرار دیا تو اب جبکہ رسول اللہ ﷺ فوت ہو چکے اور یہ ممکن ہی نہ رہا کہ آپ ﷺ ہماری بات سنیں یا ہم آپ ﷺ کی بات سنیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَمِنْ ذَرَأِهِمْ بَنُو نَجْرَانَ يَزُورُ يَعْثُونَ﴾ [المؤمنون: ۱۰۰] "اور ان کے پیچھے اس دن تک جب وہ اٹھائے جائیں گے، ایک پردہ ہے۔" تو جو لوگ اب ہزاروں میل دور سے آپ ﷺ کو آوازیں دیتے ہیں اور آوازیں بھی اس مقصد کے لیے دیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی پورا نہیں کر سکتا، تو ان کے "لَا يَعْثَلُونَ" (بے عقل) ہونے میں کیا شبہ ہے۔

آیت 6 ﴿٦﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوا : "فَاسِقٌ" جو دین کی کسی حد سے یا تمام حدوں سے

نکل جائے، جن کی پابندی لازم ہے۔ اس کا اشتقاق "فَسَقَ الرُّطْبُ" (تازہ کھجور چھلکے سے باہر نکل گئی، یعنی پھٹ گئی) سے ہے۔ اس کا اکثر استعمال نافرمانی کے مرتکب مسلمان پر ہوتا ہے، کافر پر بھی یہ لفظ بول لیا جاتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿أَقْبَنُ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا لَا يَسْتَوُونَ﴾ [السجدة: ۱۸] "تو کیا وہ شخص جو مومن ہو وہ اس کی طرح ہے جو نافرمان ہو؟ برابر نہیں ہوتے۔" "نَبَأٌ" کوئی اہم خبر۔ راغب نے فرمایا: "خبر کو 'نبا' اس وقت کہتے ہیں جب اس سے کوئی عظیم فائدہ

فَعَلْتُمْ ذُلْمِينَ ①

ایسا نہ ہو کہ تم کسی قوم کو لاعلمی کی وجہ سے نقصان پہنچا دو، پھر جو تم نے کیا اس پر پشیمان ہو جاؤ ①

حاصل ہوتا ہو، ایسی ہی خبر سے کسی بات کا یقین یا غلبہ نظر حاصل ہوتا ہے۔ ”فَتَبَيَّنُوا“، ”تَبَيَّنَ يَبِينُ“ (تفطیل) لازم بھی آتا ہے، یعنی کسی چیز کا خوب واضح ہو جانا اور متعدی بھی، یعنی کسی چیز پر پوری طرح غور و فکر اور اس کی تحقیق کرنا، اس کی حقیقت معلوم کر لینا، یہاں متعدی کے معنی میں ہے۔ اکثر قراءتوں میں ”فَتَبَيَّنُوا“ ہے، حمزہ اور کسائی کی قراءت میں ”فَتَبَيَّنُوا“ ہے، معنی دونوں کا ایک ہی ہے۔

② اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ایسے ادب کی تعلیم دی ہے جس کا اہتمام ان کے دین و دنیا کے معاملات میں نہایت ضروری ہے اور جس کی پابندی نہ کرنے سے بے پناہ نقصان کا اندیشہ ہے۔ وہ یہ کہ جب ان کے پاس کوئی فاسق، جو کھلم کھلا دین کی جد پامال کرنے والا ہے، کوئی اہم خبر لے کر آئے تو اسے سنتے ہی سچا نہ سمجھ لیں اور نہ ہی پوری تحقیق کے بغیر اس کی بات کا اعتبار کریں، کیونکہ جو فسق سے پرہیز نہیں کرتا وہ جھوٹ بھی بول سکتا ہے۔

③ اَنْ تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ: اس سے معلوم ہوا کہ فاسق کی خبر پر بلا تحقیق عمل کرنا جہالت ہے، جو خطا سے بڑھ کر ہے، کیونکہ جہتہد اگر غلطی کرے تو اسے مٹھی کہہ سکتے ہیں، جاہل نہیں، جب کہ بلا تحقیق فاسق کے قول پر فیصلہ کرنے والا اگر غلط فیصلہ کرے تو وہ جاہل ہے۔ (رازی) یعنی ایسا نہ ہو کہ تم کسی فاسق کی خبر پر بلا تحقیق کوئی کارروائی کر گزرو اور لاعلمی میں کچھ لوگوں کو نقصان پہنچا دو، ان پر حملہ کر کے انھیں زخمی یا قتل کر دو، ان کی غیبت کر بیٹھو یا ان سے قطع تعلق کر لو، غرض تمھاری طرف سے انھیں کوئی بھی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ کتنے ہی فتنے اور فساد ہیں جو بلا تحقیق ایسی خبروں پر عمل کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں اور بات بگڑ کر کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے۔

④ فَتَضْحَكُوا عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ ذُلْمِينَ: پھر تم اس پر پشیمان ہو جاؤ، کیونکہ جلد بازی اور بلا تحقیق کام کا نتیجہ پشیمانی ہی ہے۔

⑤ یہ آیت اس عظیم الشان علم کی بنیاد ہے جسے اصول حدیث کہا جاتا ہے، جو ہماری امت کی خصوصیت ہے اور جس کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کے افعال و اقوال اور احوال و تقریرات محفوظ طریقے سے ہم تک پہنچے ہیں اور قیامت تک پہنچتے جائیں گے۔ اس علم کی تکمیل کے لیے امت مسلمہ نے ایک لاکھ سے زیادہ راویوں کے حالات زندگی، ان کا صدق و کذب، عدالت و فسق، حافظ ہونا یا نہ ہونا وغیرہ سب کچھ محفوظ کر دیا ہے۔ اس میں سب سے پہلے دیکھا جاتا ہے کہ کوئی خبر بیان کرنے والا فاسق ہے یا عادل، اگر فاسق ہے تو اس کی خبر کی تحقیق کی جائے گی، اگر کسی دوسرے ذریعے سے اس کا درست ہونا ثابت ہو جائے تو اسے مان لیا جائے گا ورنہ اسے قبول نہیں کیا جائے گا اور اگر خبر دینے والا عادل ہے تو مزید تحقیق کی ضرورت نہیں اور اس کی خبر قبول کی جائے گی، خواہ خبر دینے والا ایک ہی ہو۔ اصطلاح میں کہا جاتا ہے کہ خبر واحد حجت ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مجہول آدمی کی خبر بھی بلا تحقیق قبول نہیں کی جائے گی، کیونکہ اس کے فاسق ہونے کا احتمال ہے۔

⑥ آیت کے الفاظ میں ”فَاسْبِقُوا“ اور ”هَيِّئُوا“ دونوں کمرہ ہیں، اس میں کسی خاص شخص کو متعین نہیں کیا گیا، بلکہ ایک عام قاعدہ بیان کیا گیا ہے کہ کوئی فاسق شخص کوئی بھی خبر لے کر تمہارے پاس آئے تو اس کی تحقیق کر لو۔ بہت سے مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ آیت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی، جنہیں رسول اللہ ﷺ نے قبیلہ بنو مصطلق سے زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے بھیجا۔ یہ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے ماں کی طرف سے بھائی تھے۔ بنو مصطلق اور ان کے قبیلہ میں اسلام سے پہلے سے دشمنی چلی آ رہی تھی، وہ لوگ مسلح ہو کر استقبال کے لیے آئے، تو یہ ڈر گئے کہ شاید یہ لوگ مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں اور وہیں سے واپس آ کر رسول اللہ ﷺ سے شکایت کی کہ بنو مصطلق نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا ہے، بلکہ وہ مجھے قتل کرنا چاہتے تھے۔ آپ ﷺ نے یہ سن کر بنو مصطلق کی طرف ایک لشکر روانہ فرمایا، ابھی یہ لشکر راستے میں تھا کہ ادھر سے بنو مصطلق کے سردار حارث بن ضرار رضی اللہ عنہ (ام المؤمنین جویریہ رضی اللہ عنہا کے والد) اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ آتے نظر آئے۔ قریب پہنچ کر انھوں نے لشکر والوں سے دریافت کیا کہ آپ لوگ کدھر جا رہے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ تمہاری طرف ہی جا رہے ہیں۔ انھوں نے سب پوچھا تو لشکر والوں نے بتایا کہ آپ ﷺ نے ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو تمہارے پاس بھیجا اور تم نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا، بلکہ اسے قتل کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ انھوں نے کہا، اس ذات کی قسم جس نے آپ ﷺ کو حق دے کر مبعوث کیا ہے! ولید نہ ہمارے پاس آیا اور نہ ہم نے اس کی شکل دیکھی۔ پھر یہی بات انھوں نے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہی اور مزید کہا کہ ہم تو خود آپ کی خدمت میں اس لیے حاضر ہوئے ہیں کہ آپ کی طرف سے کوئی زکوٰۃ وصول کرنے نہیں پہنچا اور ہم ڈر گئے کہ کہیں آپ ہم سے ناراض نہ ہو گئے ہوں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ یہ ان روایات کا خلاصہ ہے جو ابن کثیر وغیرہ نے نقل فرمائی ہیں۔

⑦ عام مفسرین نے اس واقعہ کو بنیاد بنا کر ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کو فاسق اور ان کی خبر کو تحقیق کے بغیر ناقابل قبول قرار دیا ہے۔ بعض کج دماغوں نے اسے اس مسلم قاعدے پر طعن کا ذریعہ بنایا ہے کہ اصحاب رسول ﷺ سب کے سب عادل ہیں اور کسی سے رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ ثابت نہیں، اس لیے رسول اللہ ﷺ کا صحابی کوئی بھی ہو اس کی بیان کردہ ہر روایت معتبر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس آیت کو ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ سے متعلق قرار دینے والی کسی بھی روایت کی سند صحیح نہیں۔ ابن کثیر رضی اللہ عنہ نے اس مقام پر چار روایتیں نقل کی ہیں اور ان میں سب سے بہتر حارث بن ضرار رضی اللہ عنہ کی روایت کو قرار دیا ہے۔ اس کی سند یہ ہے: ”قَالَ الْإِمَامُ أَحْمَدُ فِي مُسْنَدِهِ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سَابِقٍ حَدَّثَنَا عَيْسَى بْنُ دِينَارٍ حَدَّثَنَا أَبِي أَنَّهُ سَمِعَ الْحَارِثَ بْنَ ضَرَّارٍ الْخَزَاعِمِيَّ قَالَ“ [مسند احمد: ۲۷۹/۴، ح: ۱۷۸۴۵۹] تفسیر ابن کثیر کے محقق سامی بن محمد سلامہ لکھتے ہیں: ”بہت سے مفسرین اس قول کی طرف گئے ہیں (کہ یہ آیت ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے) حالانکہ اس قول میں نظر ہے، کیونکہ جتنی بھی روایات میں یہ قصہ بیان ہوا ہے وہ سب معلول ہیں (ان میں خرابی ہے)، ان میں سب سے بہتر امام احمد کی حارث بن ضرار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ اس کی سند میں ایک مجہول راوی ہے اور

قاضی ابوبکر بن العربی نے اپنی کتاب ”العواصم من القواصم (ص: ۱۰۲)“ میں اس قصے کا انکار کیا ہے۔“

تفسیر ابن کثیر کی تخریج ”هدایۃ المستنیر“ (تالیف ابو عبد الرحمن عادل بن یوسف العزازی) میں ہے: ”اس روایت میں دینار کوئی ہے، حافظ نے فرمایا، مقبول ہے، یعنی جب اس کی کوئی متابعت موجود ہو۔“ ظاہر ہے یہاں کسی نے اس کی متابعت نہیں کی، اس لیے اس کی یہ روایت قبول نہیں۔ مسند احمد کے محققین نے اس روایت پر لکھا ہے: ”حارث بن ضرار کے اسلام کا قصہ چھوڑ کر باقی روایت اپنے شواہد کی وجہ سے حسن ہے اور یہ سند ضعیف ہے، کیونکہ عیسیٰ کا والد دینار مجہول ہے۔ وہ کوفے کا رہنے والا ہے اور عمرو بن حارث کا مولیٰ ہے، اس سے اس کے بیٹے عیسیٰ نے اکیلے ہی یہ روایت بیان کی ہے اور ابن المدینی نے فرمایا: ”لَا أُعْرِفُهُ“ (میں اسے نہیں پہچانتا) اس کے باوجود ابن حبان نے اس کا ذکر ”الثقات“ میں کیا ہے۔“

اس آیت کے ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کے متعلق نازل ہونے کی دوسری روایت ابن کثیر نے ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی بیان کی ہے۔ ابن کثیر (طبع دار ابن الجوزی) کے محقق دکتور حکمت بن بشر نے فرمایا: ”اس کی سند موسیٰ بن عبیدہ کے ضعیف ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے۔“ ابن کثیر میں اس مفہوم کی تیسری روایت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، جو عوفی کی وجہ سے ضعیف ہے۔ چوتھی روایت مجاہد اور قتادہ نے بیان کی ہے جو تابعی ہیں اور ان کی روایت مرسل ہے جو حجت نہیں۔ آپ غور فرمائیں! یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس کی سب سے بہتر روایت کو حسن کہنے والے بھی اس کی سند کے ضعیف ہونے کا اعتراف کرتے ہیں، حسن صرف شواہد کی وجہ سے کہتے ہیں اور شواہد بھی ایسے کہ سب کی سند ضعیف ہے۔ ایسی کمزور روایت کے ساتھ ایک صحابی کو فاسق قرار دینا کیسے درست ہو سکتا ہے، جو اس جماعت کا فرد ہے جسے اللہ تعالیٰ کی رضا کی سند حاصل ہو چکی ہے۔

⑧ اگر اس قصے کو درست مان لیا جائے تو بھی اس سے ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کا فاسق ہونا لازم نہیں آتا۔ سب سے پہلے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صدقات کی وصولی کے لیے ان کا انتخاب ان کے فاسق ہونے کی نفی کرتا ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسے اعمال کو صدقات وغیرہ کی وصولی پر مقرر فرماتے تھے جو نہایت امین ہوتے تھے، جیسا کہ ابو عبیدہ امین بذہ الامہ کو یمن کی طرف بھیجنے سے ظاہر ہے۔ پھر ولید رضی اللہ عنہ کا یہ کہنا کہ بنو مطلق نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا ہے اور میرے قتل کا ارادہ کیا ہے، اس کی وجہ خود اس روایت میں موجود ہے کہ ان کے درمیان سابقہ دشمنی موجود تھی اور مسلح افراد کی بہت بڑی تعداد کو دیکھ کر ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ یہ مجھے قتل کرنے آئے ہیں اور زکوٰۃ دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ایسا گمان پیدا ہونا فطری بات ہے۔ آپ اسے گمان کی غلطی کہہ سکتے ہیں مگر جھوٹ یا فسق نہیں کہہ سکتے۔ رہا آیت کا نزول تو اس میں نہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ولید فاسق ہے نہ اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا۔ آیت میں مسلمانوں کو ایک حکم دیا گیا ہے کہ ان کے پاس کوئی فاسق کوئی خیر لے کر آئے تو اس کی تحقیق کر لیا کریں، اندھا دھند اس پر کارروائی نہ کریں۔

⑨ شیخ عبد الرحمن معلیٰ یمانی نے ”الانوار الکاشفہ (ص: ۲۶۳)“ میں ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث منقول ہی نہیں، اس لیے اس واقعہ سے کسی صحابی کی نقل کردہ روایت کا مردود ہونا لازم ہی نہیں آتا، کیونکہ انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی روایت نقل ہی نہیں کی۔ شیخ معلیٰ نے ان سے مروی

دوسری روایات کے علاوہ اس روایت کی بھی نفی کی ہے جو مسند احمد میں ہے کہ ولید بن عتبہ بیان کرتے ہیں: «لَمَّا فَتَحَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَكَّةَ حَضَرَ أَهْلَ مَكَّةَ يَأْتُونَهُ بِصِنَابِيهِمْ فَيَمْسَحُ عَلَى رُؤُوسِهِمْ وَيَدْعُو لَهُمْ، فَجِيءَ بِهِ إِلَيْهِ وَإِنِّي مُصِيبٌ بِالْخَلْقِ، فَلَمْ يَمْسَحْ عَلَى رَأْسِي، وَلَمْ يَمْنَعَهُ مِنْ ذَلِكَ إِلَّا أَنْ أُمِنِي حَلَقَتْنِي بِالْخَلْقِ فَلَمْ يَمْسَحْنِي مِنْ أَهْلِ الْخَلْقِ» (مسند احمد: ۳۲۴، ج: ۱۶۳۷۹) "جب رسول اللہ ﷺ نے مکہ فتح کیا تو اہل مکہ اپنے بچے لے کر رسول اللہ ﷺ کے پاس آنے لگے، آپ ان کے سر پر ہاتھ پھیرتے اور ان کے لیے برکت کی دعا کرتے۔ مجھے بھی آپ کے پاس لایا گیا مگر آپ نے میرے سر پر ہاتھ نہیں پھیرا اور آپ کے ہاتھ نہ پھیرنے کی وجہ یہی تھی کہ میری ماں نے مجھے خنوق (زعفران سے مرکب ایک خوشبو) لگائی تھی تو آپ ﷺ نے خنوق کی وجہ سے مجھے ہاتھ نہیں لگایا۔" مسند احمد کے محققین نے لکھا ہے: "اس کی سند عبد اللہ ہمدانی کے مجہول ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے، کثیت اس کی ابوسوی ہے۔ اس سے روایت میں ثابت بن حجاج الکلابی مفرد ہے اور ذہبی اور ابن حجر نے تقریب میں اسے مجہول کہا ہے۔ بخاری نے "تاریخ کبیر" (۲۲۳/۵) میں کہا ہے: "أَلَا يَصِحُّ حَدِيثُهُ" (اس کی حدیث صحیح نہیں) اور ابن عبد البر نے کہا ہے کہ یہ ابوسوی مجہول ہے اور یہ خبر منکر ہے، صحیح نہیں۔" اگر اس روایت کو صحیح مانا جائے تو ولید بن عتبہ رضی اللہ عنہما کو فاسق کہنے کی بنیاد ہی ختم ہو جاتی ہے، کیونکہ اس سے فتح مکہ کے موقع پر ولید کا بچہ ہونا ثابت ہوتا ہے، جسے صدقات کا عامل بنا کر بھیجے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

⑩ بعض لوگوں نے صحیح مسلم (۱۷۰۷) وغیرہ کی اس روایت کی وجہ سے ولید بن عتبہ رضی اللہ عنہما کو فاسق قرار دیا ہے جس میں ہے کہ انھوں نے شراب پی کر صبح کی جماعت دو رکعتیں پڑھانے کے بعد کہا کہ مزید پڑھاؤں، جس پر عثمان رضی اللہ عنہما نے ان پر شراب کی حد لگائی۔ واضح رہے کہ بعض روایات میں دو کے بجائے چار رکعتیں پڑھانے کا ذکر ہے مگر ان میں سے کوئی روایت بھی صحیح نہیں۔ بعض اہل علم نے لکھا ہے: "علامہ آلوسی نے روح المعانی میں فرمایا: "اس معاملے میں حق بات وہ ہے جس کی طرف جمہور علماء گئے ہیں کہ صحابہ کرام معصوم نہیں ہیں، ان سے گناہ کبیرہ بھی سرزد ہو سکتا ہے جو نسیق ہے اور اس گناہ کے وقت ان کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے گا جس کے وہ مستحق ہیں، یعنی شرعی سزا جاری کی جائے گی، لیکن اہل سنت والجماعہ کا عقیدہ قرآن و سنت کی نصوص کی بنا پر یہ ہے کہ صحابی سے گناہ تو ہو سکتا ہے مگر کوئی صحابی ایسا نہیں جو گناہ سے توبہ کر کے پاک نہ ہو گیا ہو۔ قرآن کریم نے نبی الاطلاق ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی رضا کا فیصلہ فرمایا ہے، فرمایا: ﴿رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ﴾ النورہ: ۱۰۰ | "اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اس سے راضی ہو گئے اور اس نے ان کے لیے ایسے باغات تیار کیے ہیں جن کے تلے نہریں بہتی ہیں، ان میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ہمیشہ۔ یہی بہت بڑی کامیابی ہے۔" اور اللہ تعالیٰ کی رضا گناہ کے معاف ہونے کے بغیر نہیں ہوتی، جیسا کہ قاضی ابویعلیٰ نے فرمایا: "رضا اللہ تعالیٰ کی ایک صفت قدیر ہے، وہ اپنی رضا کا اعلان صرف انھی کے لیے فرماتے ہیں جن کے متعلق وہ جانتے ہیں کہ ان کی وفات ان کاموں پر ہوگی جن پر اللہ تعالیٰ راضی ہے۔"

[كُذِّبَ فِي الضَّارِمِ الْمَسْلُوبِ لِابْنِ تَيْمِيَّةَ] خلاصہ یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عظیم الشان جماعت میں سے اگر کسی سے کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

وَأَعْلَمُوا أَنَّ فِيكُمْ رَسُولَ اللَّهِ لَوْ يُطِيعُكُمْ فِي كَثِيرٍ مِنَ الْأَمْرِ لَعَنِتُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَزَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ وَكَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعُصْيَانَ أُولَٰئِكَ

اور جان لو کہ تم میں اللہ کا رسول ہے، اگر وہ بہت سے کاموں میں تمہارا کہا مان لے تو یقیناً تم مشکل میں پڑ جاؤ اور لیکن اللہ نے تمہارے لیے ایمان کو محبوب بنا دیا اور اسے تمہارے دلوں میں مزین کر دیا اور اس نے کفر اور گناہ اور

کبھی کوئی گناہ سرزد ہوا بھی ہے تو اسے فوراً توبہ کی توفیق نصیب ہوئی ہے۔ حق تعالیٰ نے ان کو رسول کریم ﷺ کی صحبت کی برکت سے ایسا بنا دیا تھا کہ شریعت ان کی طبیعت بن گئی تھی، خلاف شرع کوئی کام یا گناہ سرزد ہونا انتہائی شاذ و نادر تھا۔ ان کے اعمال صالحہ، نبی کریم ﷺ اور اسلام پر اپنی جانیں قربان کرنا اور ہر کام میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے اتباع کو وظیفہ زندگی بنانا اور اس کے لیے ایسے مجاہدات کرنا جن کی نظیر کبھی امتوں میں نہیں ملتی، ان بے شمار اعمال صالحہ اور فضائل و کمالات کے مقابلے میں عمر بھر میں کسی گناہ کا سرزد ہو جانا اس کو خود ہی کالعدم کر دیتا ہے۔ دوسرے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت و عظمت اور ادنیٰ سے گناہ کے وقت ان کا خوف، خشیت اور فوراً توبہ کرنا بلکہ اپنے آپ کو سزا کے لیے خود پیش کر دینا روایات حدیث میں مشہور و معروف ہے اور بحکم حدیث گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہو جاتا ہے جیسے گناہ کیا ہی نہیں۔ تیسرے قرآن کے ارشاد کے مطابق اعمال صالحہ اور حسنات خود بھی گناہوں کا کفارہ ہو جاتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ الشَّرَّاتِ﴾ [ہود: ۱۱۴] ”بے شک نیکیوں برائیوں کو لے جاتی ہیں۔“ خصوصاً جب ان کی حسنات عام لوگوں کی طرح نہیں، بلکہ ان کا حال وہ ہے جو ابوداؤد اور ترمذی نے سعید بن زید رضی اللہ عنہما سے (جو عشرہ مبشرہ میں سے ایک ہیں) نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں: ﴿لَمُنْهَدُ رَجُلٌ مِنْهُمْ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعْبَرُ فِيهِ وَجْهُهُ خَيْرٌ مِنْ عَمَلِي أُخِدْتُكُمْ غُمْرَةً وَلَوْ غُمِرَ عُمَرُ نُوحٌ﴾ [ابوداؤد، السنن، باب في الحفصاء: ۴۶۵۰، قال الألبانی صحیح] ”اللہ کی قسم! ان میں سے کسی شخص کا نبی کریم ﷺ کے ساتھ کسی جہاد میں شریک ہونا جس میں ان کے چہرے پر خہار پڑ گیا ہو، تم میں سے کسی شخص کی عمر بھر کی عبادت و اطاعت سے افضل ہے۔ اگرچہ اس کو نوح علیہ السلام کی عمر دے دی گئی ہو۔“ اس لیے ان سے صدور گناہ کے وقت اگرچہ سزا وغیرہ میں معاملہ وہی کیا گیا جو اس جرم کے لیے مقرر تھا، مگر اس کے باوجود بعد میں کسی کے لیے جائز نہیں کہ ان میں سے کسی کو فاسق قرار دے۔ اس لیے اگر نبی کریم ﷺ کے عہد میں کسی صحابی سے کوئی گناہ موجب فسق سرزد بھی ہو اور اس وقت ان کو فاسق کہا بھی گیا ہو تو اس سے یہ جائز نہیں ہو جاتا کہ اس فسق کو ان کے لیے ہمیشہ کا حکم سمجھ کر معاذ اللہ فاسق کہا جائے۔“ (کذافی الروح)

آیت 7 ﴿وَأَعْلَمُوا أَنَّ فِيكُمْ رَسُولَ اللَّهِ﴾ ظاہر ہے کہ ہر صحابی یہ جانتا تھا کہ اللہ کا رسول ہم میں موجود ہے، اس کے باوجود فرمایا: ”اور جان لو کہ تم میں اللہ کا رسول ہے۔“ اس کی وجہ یہ ہے کہ زندگی میں رسول اللہ ﷺ کے نفسِ نفیس موجود

هُمُ الرِّشْدُونَ ﴿۷﴾

نافرمانی کو تمہارے لیے ناپسندیدہ بنا دیا، یہی لوگ ہدایت والے ہیں ﴿۷﴾

ہونے اور آپ کی وفات کے بعد کتاب و سنت کے موجود ہونے کے باوجود جو شخص اپنی رائے پر اصرار کرتا ہے اور آپ ﷺ اور آپ کی حدیث سے رہنمائی حاصل کرنے کے بجائے اپنی بات منوانا چاہتا ہے درحقیقت وہ اس بات سے جاہل ہے کہ ہم میں اللہ کا رسول موجود ہے، ہمیں ہر معاملے میں ان کی بات ماننی چاہیے، کیونکہ اگر اسے یہ بات معلوم ہوتی تو وہ رسول کی اطاعت کرتا اور رسول کو اپنی اطاعت کروانے کی کوشش نہ کرتا۔ سو جس طرح وہ شخص جاہل ہے جو چار دیواری کے باہر سے آپ کو آوازیں دیتا ہے اور وہ شخص جاہل ہے جو کسی فاسق کی لائی ہوئی خبر پر بلا تحقیق کا روایتی کرگزرتا ہے، اسی طرح وہ شخص بھی جاہل ہے جو رسول اللہ ﷺ اور آپ کی حدیث کے ہوتے ہوئے اپنی بات منوانا چاہتا ہے۔ اس لیے اسے یہ بتانے کی شدید ضرورت ہے کہ جان لو! تم میں اللہ کا رسول موجود ہے۔

﴿۷﴾ لَوْ يُطِيعُكُمْ فِي كَثِيرٍ مِّنَ الْأَمْرِ لَعَنِتُّمْ : یعنی رسول کے احکام چونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ عليم و حکيم ہے اور اس کا ہر حکم علم و حکمت اور رحمت و مصلحت پر مبنی ہے اس لیے رسول کی اطاعت کرنے سے تم ہر طرح کی مشقت اور مصیبت سے بچے رہو گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿يُرِيدُ اللَّهُ يَتُوبَ الْغَافِلِينَ وَلَا يُرِيدُ اللَّهُ الْعُسْرَ﴾ [البقرة: ۱۸۵] ”اللہ تمہارے ساتھ آسانی کا ارادہ رکھتا ہے اور تمہارے ساتھ تنگی کا ارادہ نہیں رکھتا۔“ اور رسول کو بھی تمہارا مشقت میں پڑنا کسی صورت گوارا نہیں، فرمایا: ﴿عَزَّيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ﴾ [التوبة: ۱۲۸] ”اس پر بہت شاق ہے کہ تم مشقت میں پڑو، تم پر بہت حرص رکھنے والا ہے۔“ اس کے برعکس اگر رسول تمہاری اطاعت کرے تو تم مشقت میں پڑ جاؤ گے، کیونکہ اول تو تمہاری سب کی بات ایک نہیں ہوگی، ہر شخص وہ بات منوانے کی کوشش کرے گا جو اس کے خیال میں اس کے فائدے کی ہے، تو رسول کس کس کی بات مانے گا اور کس کی بات کا امت کو حکم دے گا؟ پھر تمہارا علم ناقص ہے، نہ تمہیں مستقبل کی کوئی خبر ہے نہ تم غیب کا علم رکھتے ہو، تمہیں کیا معلوم کہ تم جسے اپنے لیے فائدہ مند سمجھ رہے ہو وہ انجام کے لحاظ سے کس قدر نقصان دہ ہے۔ اس لیے جس طرح کائنات کا نظام درست اس لیے چل رہا ہے کہ وہ ایک اللہ کے حکم کے مطابق چل رہا ہے اسی طرح شریعت کا نظام بھی صرف رسول کی اطاعت سے صحیح چل سکتا ہے، کیونکہ اس کی اطاعت درحقیقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے، فرمایا: ﴿وَلَوْ أَنبَغِ الْحَقَّ أُهَوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمَوَاتُ وَالْأَرْضُ وَمَن فِيهِنَّ﴾ [المؤمنون: ۷۱] ”اور اگر حق ان کی خواہشوں کے پیچھے چلے تو سب آسمان اور زمین اور جو کوئی ان میں ہے، یقیناً بگڑ جائیں۔“

﴿۸﴾ لَوْ يُطِيعُكُمْ فِي كَثِيرٍ مِّنَ الْأَمْرِ : میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ رسول بعض تدبیری امور میں تمہارا مشورہ مان بھی لیتا ہے، کیونکہ اسے اللہ کی طرف سے مشورے کا حکم دیا گیا ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾ [آل عمران: ۱۵۹] ”سو ان سے درگزر کر اور ان کے لیے بخشش کی دعا کر اور کام میں ان سے

فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَ نِعْمَةً مِّنَ اللَّهِ عَلَيْهِمْ حَكِيمٌ ①

اللہ کی طرف سے فضل اور نعمت کی وجہ سے اور اللہ سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے ①

مشورہ کر۔“ مگر یاد رکھو! تمہارا کام حکم دینا نہیں، مشورہ دینا ہے، رسول مناسب سمجھے تو مان لے مناسب نہ سمجھے تو نہ مانے، آخری فیصلہ اللہ تعالیٰ کی راہنمائی کے ساتھ اسی نے کرنا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ﴾ [آل عمران: ۱۵۹] ”پھر جب تو پختہ ارادہ کرے تو اللہ پر بھروسہ کر۔“

④ وَلَكِنَّ اللَّهَ حَبَبَ إِلَيْكُمْ الْإِيمَانَ: ایمان سے مراد یہاں رسول اللہ ﷺ کی اطاعت ہے جس میں تصدیق بالقلب، اقرار باللسان اور عمل بالا ارکان تینوں شامل ہیں۔ یعنی اگر رسول بہت سی باتوں میں تمہاری اطاعت کرے تو یقیناً تم مشکل میں پڑ جاؤ، لیکن اللہ تعالیٰ نے (تمہیں مشکل میں پڑنے سے بچالیا اور) ایمان یعنی رسول ﷺ کی اطاعت کو تمہارے لیے محبوب بنا دیا اور اسے تمہارے دلوں میں ایسا مزین کر دیا کہ تم خوش دلی سے رسول کی اطاعت پر کار بند ہو گئے۔ اس لیے بعض اوقات بتقاضائے بشریت تم سے غلطی ہو جاتی ہے مگر ایمان کی محبت اور کفر سے نفرت کی بدولت تم جلد ہی اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہو اور گناہوں سے باز رہتے ہو۔

⑤ وَ كَرِهَ إِلَيْكُمْ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ: یعنی کفر، فسوق اور عصیان کو تمہارے لیے ناپسندیدہ بنا دیا۔ رازی نے فرمایا: ”ایمان میں تصدیق بالقلب، اقرار باللسان اور عمل بالا ارکان تینوں شامل ہیں۔ کفر دل کی تصدیق نہ ہونا ہے، فسوق زبان سے اقرار نہ کرنا ہے اور عصیان عمل نہ کرنا ہے۔“ شیخ عبدالرحمان السعدی نے فرمایا: ”(کفر کا معنی تو ظاہر ہے) فسوق سے مراد بڑے گناہ (کبائر) اور عصیان سے مراد ان سے کم تر درجے کے گناہ ہیں۔“ (واللہ اعلم)

⑥ أُولَئِكَ هُمُ الزَّاشِقُونَ: یعنی یہ لوگ جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایمان کو محبوب بنا دیا ہے اور اسے ان کے دلوں میں مزین کر دیا ہے اور کفر و فسوق و عصیان کو ان کے لیے ناپسندیدہ بنا دیا ہے، یہی لوگ ہیں جو کامل ہدایت والے ہیں۔ ”الف لام“ بیان کمال کے لیے ہے اور حصر کا فائدہ بھی دے رہا ہے کہ صحابہ ہی ہدایت پر ہیں، ان کے دشمن اور مخالف گمراہ ہیں۔ اس آیت میں صحابہ کرام کی بے حد فضیلت بیان ہوئی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ان کے وہ اوصاف حمیدہ بیان کیے جو اس نے انہیں عطا فرمائے اور آخر میں صریح الفاظ میں ان کے راہ راست پر ہونے کی شہادت دی۔

آیت 8 ﴿فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَ نِعْمَةً﴾: یہ ”الزَّاشِقُونَ“ کا مفعول لہ ہے، یعنی یہ لوگ اللہ کے فضل اور اس کی نعمت کی وجہ سے کامل ہدایت والے ہیں۔ یہ ”حَبَبٌ“ اور ”كَرِهَةٌ“ کا مفعول لہ بھی ہو سکتا ہے۔

② وَاللَّهُ عَلَيْهِمْ حَكِيمٌ: یعنی اللہ تعالیٰ نے اندھا دھند نہیں بلکہ اپنے کمال علم و حکمت کی بنا پر انہیں اپنے نبی ﷺ کی صحبت کے لیے منتخب فرمایا۔ ان کے دلوں میں ایمان کو محبوب و مزین کر دیا، کفر و فسوق اور عصیان کو ناپسندیدہ بنا دیا اور انہیں راہ راست پر گامزن فرمایا، کیونکہ وہ ان کی استعداد و اہلیت پوری طرح جانتا تھا اور اس کی حکمت کا تقاضا تھا کہ وہ انہیں اس مقام پر فائز فرمائے۔

وَإِنْ طَافْتُمْ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ فَاصْلِحُوا بَيْنَهُمَا ۚ فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَهُمَا عَلَى الْأُخْرَى

اور اگر ایمان والوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو دونوں کے درمیان صلح کرا دو، پھر اگر دونوں میں سے ایک

آیت 9 ﴿وَإِنْ طَافْتُمْ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ فَاصْلِحُوا بَيْنَهُمَا﴾: فاسق لوگوں کی خبر پر بلا تحقیق اعتماد کر لینے سے

کئی دفعہ آپس میں لڑائی ہو جاتی ہے اور کئی دفعہ ہر قسم کی پیش بندی کے باوجود لڑائی ہو جاتی ہے۔ اس آیت میں یہ بتایا کہ مسلمانوں کی باہمی لڑائی کے موقع پر ان لوگوں پر لازم ہے جو اس لڑائی میں شریک نہیں کہ لڑنے والوں کے درمیان صلح کرا دیں۔ ان کے لیے جائز نہیں کہ مسلمانوں کو لڑتے ہوئے ان کے حال پر چھوڑ دیں اور تماشا دیکھتے رہیں۔

﴿سہل بن سعد رضی اللہ عنہما سے روایت ہے: «أَنَّ أَهْلَ قَبَاءَ افْتَلَوْا حَتَّى تَرَامُوا بِالْحِجَارَةِ فَأُخْبِرَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِذَلِكَ فَقَالَ أَذْهَبُوا بِنَا نُصَلِّحْ بَيْنَهُمْ» [بخاری، الصلح، باب قول الإمام لأصحابه اذهبوا.....: ۲۶۹۳]

”قباء میں رہنے والے لڑ پڑے، حتیٰ کہ انھوں نے ایک دوسرے پر پتھر پھینکے۔ رسول اللہ ﷺ کو خبر ملی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

”ہمارے ساتھ چلو، تاکہ ہم ان کے درمیان صلح کرا سکیں۔“ اور انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا گیا کہ

اگر آپ عبد اللہ بن ابی کے پاس جائیں تو بہتر ہے، تو آپ ﷺ گدھے پر سوار ہو کر گئے، مسلمان بھی آپ کے ساتھ پیدل

چلنے لگے۔ وہ زمین شور والی تھی، جب رسول اللہ ﷺ اس کے پاس آئے تو وہ کہنے لگا: ”مجھ سے دور رہو، اللہ کی قسم! تمہارے

گدھے کی بدبو سے مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔“ ایک انصاری صحابی نے کہا: ”اللہ کی قسم! رسول اللہ ﷺ کے گدھے کی خوشبو تجھ

سے اچھی ہے۔“ عبد اللہ بن ابی کی طرف سے اس کی قوم کا ایک آدمی غصے میں آ گیا اور دونوں نے ایک دوسرے کو برا بھلا کہا،

پھر دونوں طرف سے دونوں کے حمایتی مشتعل ہو گئے اور چھڑی، ہاتھوں اور جوتوں کے ساتھ ایک دوسرے کو مارنے لگے۔

ہمیں یہ بات پہنچی ہے کہ یہ آیت اس موقع پر نازل ہوئی: ﴿وَإِنْ طَافْتُمْ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ فَاصْلِحُوا بَيْنَهُمَا﴾

[بخاری، الصلح، باب ما جاء في الإصلاح بين الناس: ۲۶۹۱]

﴿قرطبی نے فرمایا: ”طائفہ کا لفظ ایک آدمی پر، دو پر اور زیادہ پر بھی بولا جاتا ہے۔“ ”طائفین“ میں لڑنے والے دو آدمی بھی

شامل ہیں اور دو جماعتیں بھی، چھوٹی ہوں یا بڑی۔ آیت میں لڑنے والے فریقوں کے درمیان صلح کروانے کا حکم ہے، خواہ دو

مسلمان آپس میں لڑ رہے ہوں یا زیادہ۔“

﴿بعض احادیث میں کسی مسلمان سے لڑنے کو کفر اور لڑنے والوں کو کافر کہا گیا ہے، جیسا کہ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما بیان کرتے

ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: «سَبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوقٌ وَقِتَالُهُ كُفْرٌ» [بخاری، الإيمان، باب خوف المؤمن من أن يحبط

عمله.....: ۴۸] ”مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اس سے لڑنا کفر ہے۔“ اور عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے

نبی ﷺ سے سنا: «لَا تَرْجِعُوا بَعْدِي كُفَّارًا يَضْرِبُ بَعْضُكُمْ رِقَابَ بَعْضٍ» [بخاری، الفتن، باب قول النبي ﷺ:

”لا ترجعوا بعدي كفارا.....:“ [۷۰۷۷] ”میرے بعد پھر کافر نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگوں۔“

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

فَقَاتِلُوا الَّذِينَ تَبَغُّوا حَتَّى تَقْتُلُوا أَوْ إِلَى أَمْرِ اللَّهِ ۗ فَإِنْ فَاتَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ

دوسرے پر زیادتی کرے تو اس (گروہ) سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ

امام بخاری اور دوسرے ائمہ کرام نے فرمایا کہ آیت: ﴿وَإِنْ ظَلَمْتُمْ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ﴾ دلیل ہے کہ مسلمان ایک دوسرے سے لڑنے کے باوجود مسلمان ہی رہتے ہیں، اسلام سے خارج یا مرتد نہیں ہو جاتے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے لڑنے والے دونوں فریقوں کو مومن قرار دیا ہے اور اس سے اگلی آیت میں بھی فرمایا: ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَعْوَابِهِمْ﴾ [الحجرات: ۱۰] "مومن تو آپس میں (بھائی ہی ہیں، سو اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کرا دو۔" اسی طرح آیت قصاص میں قتال کو متول کے وارث کا بھائی قرار دیا، فرمایا: ﴿كَمَنْ عَفَىٰ لَدُنَّ مِنْ أَخِيهِ شَيْءًا قَاتِلًا بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءً إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ﴾ [النقرة: ۱۷۸] "پھر جسے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ بھی معاف کر دیا جائے تو معروف طریقے سے چھپا کرنا اور اچھے طریقے سے اس کے پاس پہنچا دینا (لازم) ہے۔" راہ حدیث میں مسلمان سے لڑائی کو کفر قرار دینا تو اس سے وہ کفر مراد نہیں جس کی وجہ سے آدمی اسلام سے خارج ہو جاتا ہے، بلکہ اس سے مراد "کفر دون کفر" یعنی کفر اکبر (جس سے انسان اسلام سے خارج ہوتا ہے) سے کم تر درجے کا کفر ہے، کیونکہ گناہ کے تمام کام کفر اور جاہلیت ہیں اور ایسے شخص کو کافر کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے کفر کے کام کا ارتکاب کیا ہے، اس کا ایمان کامل نہیں بلکہ وہ ناقص الایمان مومن ہے، یہ نہیں کہ وہ ملت اسلام سے خارج ہو گیا۔ دلیل اس کی زیر تفسیر آیت اور دوسری بہت سی آیات و احادیث ہیں جو امام بخاری نے اپنی صحیح کی "کتاب الایمان" میں اور دوسرے ائمہ نے اپنی تصانیف میں بیان فرمائی ہیں۔ اس آیت سے خوارج کے عقیدے کی نفی ہوتی ہے جو کسی بھی کبیرہ گناہ کے مرتکب کو، جس نے توبہ نہ کی ہو، کافر اور ابدی جہنمی سمجھتے ہیں اور معتزلہ کے عقیدے کی بھی جو کہتے ہیں کہ کبیرہ گناہ کا مرتکب نہ مومن ہے نہ کافر۔ انجام کے لحاظ سے وہ بھی اسے ابدی جہنمی قرار دیتے ہیں۔

﴿وَإِنْ بَعَثْنَا إِخْلُفْنَا عَلَى الْأَخْضَرِي: "بَعَثْنَا" یعنی "بَعَثْنَا" (ض) سے واحد مؤنث غائب ماضی معلوم ہے۔ اگر ان دو فریقوں میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرے، یعنی وہ کتاب و سنت کے فیصلے کے مطابق صلح پر اور اختلاف دور کرنے پر آمادہ ہی نہ ہو، بلکہ دوسرے پر چڑھتا چلا جائے اور ظلم و زیادتی پر کمر باندھ لے۔

﴿فَقَاتِلُوا الَّذِينَ تَبَغُّوا﴾: تو اس گروہ سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے، کیونکہ اس لڑائی کا حکم اللہ نے دیا ہے، اس لیے یہ واجب ہے اور جہاد کے حکم میں ہے۔ اس حکم کے مخاطب وہ لوگ ہیں جو طاقت استعمال کر کے زیادتی کا ازالہ کرنے پر قادر ہوں۔

﴿حَتَّى تَقْتُلُوا أَوْ إِلَى أَمْرِ اللَّهِ﴾: "تَقْتُلُوا" "فَاءٌ يَنْفِي؛ فَيُنَادِي" (ض) (لون، پلٹنا۔ یہ واحد مؤنث غائب مضارع معلوم ہے۔ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آنے کا مطلب یہ ہے کہ جو بات کتاب و سنت کی رو سے حق ہے باغی گروہ اسے قبول کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ باغی گروہ سے لڑتے وقت یہ بات مد نظر رکھنی چاہیے کہ لڑنے سے مقصود انھیں صلح پر مجبور کرنا ہے، انھیں ختم کرنا یا ان کا نام و نشان مٹانا مقصود نہیں۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا﴾: یہ آیت مسلمانوں کی باہمی جنگ کے بارے میں شرعی فیصلوں کی بنیاد ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں مسلمانوں کی

وَأَقْسَطُوا لِرَنِّ اللّٰهِ يُحِبُّ الْمَقْسِطِينَ ①

آئے، پھر اگر وہ پلٹ آئے تو دونوں کے درمیان انصاف کے ساتھ صلح کرادو اور انصاف کرو، بے شک اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے ④

آپس میں کوئی بڑی لڑائی نہیں ہوئی، چند موقعوں پر جھگڑا ہوا مگر نوبت ہاتھ پائی اور چھڑی جوتے سے آگے نہیں بڑھی۔ ان آیات کی عملی تفسیر اس وقت سامنے آئی جب علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں مسلمانوں کی آپس میں لڑائیاں ہوئیں۔ اس وقت چونکہ رسول اللہ ﷺ کے تربیت یافتہ صحابہ کرام کثیر تعداد میں موجود تھے، جو قرآن و سنت کا علم بعد میں آنے والے کسی بھی شخص سے زیادہ رکھتے تھے، اس لیے ان کے عمل اور ان کے بیان کردہ احکام سے قیامت تک کے مسلمانوں کے لیے ایک اسوہ اور ضابطہ مرتب ہو گیا۔ اس طرح یہ جنگیں ناگوار اور نہایت تکلیف دہ ہونے کے باوجود خیر سے خالی نہیں رہیں، کیونکہ اگر یہ نہ ہوتیں تو اللہ بہتر جانتا ہے کہ بعد میں آنے والے مسلمان آپس کی لڑائیوں میں ایک دوسرے پر کیا کیا ظلم و ستم کرتے۔ اس ضابطے کا ضروری خلاصہ یہ ہے:

① جب لڑنے والے دو گروہ کسی مسلم حکومت کی رعایا ہوں اور عام مسلمان انھیں صلح پر آمادہ نہ کر سکیں تو ان کے درمیان صلح کرانا یا یہ فیصلہ کرنا کہ ان میں زیادتی کرنے والا گروہ کون ہے، پھر طاقت کے ذریعے سے اس کو حق پر مجبور کرنا حکومت کا فریضہ ہے۔
② لڑنے والے دونوں فریق بہت بڑے طاقتور گروہ ہوں، یا دو مسلمان حکومتیں ہوں اور دونوں کی لڑائی دنیا کی خاطر ہو تو اس صورت میں اہل ایمان کا کام یہ ہے کہ اس فتنے میں حصہ لینے سے قطعی اجتناب کریں اور دونوں فریقوں کو اللہ کا خوف دلا کر جنگ سے باز رکھنے کی کوشش کرتے رہیں۔

③ مسلم حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے رعایا کا کوئی گروہ اگر اس کے خلاف خروج کرے تو اس کی کئی قسمیں ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ مسلمانوں کا متفقہ حکمران موجود ہو اور اس کے خلاف خروج کرنے والوں کے پاس خروج کے لیے شرعی دلیل اور حکمران کا کفر بواح یعنی کھلم کھلا کافر ہو جانا موجود نہ ہو، ایسے گروہ کے خلاف حکومت کی جنگ بالاتفاق جائز ہے اور اس کا ساتھ دینا ایمان والوں پر واجب ہے۔ قطع نظر اس سے کہ حکومت عادل ہو یا نہ ہو، کیونکہ عادل نہ ہونے کا بہانہ بنا کر کوئی بھی گروہ کسی بھی وقت حکومت کے خلاف خروج کر سکتا ہے، جس کا نتیجہ افتراق و انتشار اور کفار کو مسلمانوں پر حملے کی جرأت دلانے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

دوسری قسم ظالم حکمران کے خلاف خروج ہے، جس کی امارت جبراً قائم ہوئی ہو اور جس کے امراء فاسق ہوں اور خروج کرنے والا گروہ عدل اور حدود اللہ کی اقامت کے لیے اٹھا ہو اور اس کا ظاہر حال یہ بتا رہا ہو کہ وہ نیک لوگ ہیں۔ اہل سنت کا موقف یہ ہے کہ جس امیر کی امارت ایک دفعہ قائم ہو چکی ہو اور مملکت کا امن و امان اور نظم و نسق اس کے انتظام میں چل رہا ہو اس کے خلاف خروج کرنا حرام ہے، الا یہ کہ وہ کفر بواح کا ارتکاب کرے، یعنی کھلم کھلا کافر ہو جائے۔ امام نووی نے اس پر

اجماع کا ذکر فرمایا ہے۔ بعض لوگ ایسے حکمران کے خلاف خروج کو جائز قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں اور اس سلسلے میں اہل بیت کے بعض خروج کرنے والے حضرات کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں اور بعض فقہاء کا نام بھی لیا جاتا ہے جنہوں نے مسلم حکمرانوں کے خلاف تلوار اٹھانے کو جائز قرار دیا، مگر محدثین اور جمہور فقہاء ان کے اس موقف کو غلط قرار دیتے ہیں، بلکہ اسے یہ موقف رکھنے والوں کے لیے باعث طعن قرار دیتے ہیں کہ ”فَلَا تَكُنَّ سَكَّانَ يَرَى السَّيْفَ“ کہ فلاں صاحب مسلمانوں کے خلاف تلوار اٹھانے کو جائز قرار دیتے تھے۔ امام احمد ابن حنبل اور دوسرے محدثین نے حکمرانوں کے بے حد ظلم و ستم کے باوجود ان کے خلاف نہ خروج کیا نہ خروج کو جائز رکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ پوری تاریخ اسلام پڑھ جائیں کسی خروج کے نتیجے میں مسلمانوں کو تشقت و انتشار اور کفار سے جہاد کے رک جانے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا، خواہ حکمران عادل تھا یا ظالم۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے حکمرانوں کے سامنے حق کہنے اور ان کو نصیحت کرنے کی تلقین فرمائی، مگر ان کے خلاف خروج سے سختی کے ساتھ منع فرمادیا۔ چند احادیث ملاحظہ فرمائیں، ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «مَنْ رَأَى مِنْ أَمِيرِهِ شَيْئًا يَكْرَهُهُ فَلْيَصْبِرْ، فَإِنَّهُ لَيْسَ أَحَدٌ يُفَارِقُ الْجَمَاعَةَ شَبْرًا فَيَمُوتُ إِلَّا مَاتَ مَيِّتَةً جَاهِلِيَّةً» [بخاری، الأحكام، باب السمع والطاعة للإمام ما لكم نكن معصية: ۷۱۴۳] ”جو شخص اپنے امیر میں کوئی چیز دیکھے جو اسے بری لگے تو وہ صبر کرے، کیونکہ جو بھی شخص جماعت سے ایک باشت جدا ہوا پھر فوت ہو تو وہ جاہلیت کی موت مرے گا۔“

عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: «دَعَانَا النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَبَايَعَنَا فَقَالَ فِيمَا أَخَذَ عَلَيْنَا أَنْ بَايَعَنَا عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِي مَنْشَطِنَا وَمَكْرَهِنَا وَعُسْرِنَا وَيُسْرِنَا وَأَثَرَةَ عَلَيْنَا، وَأَنْ لَا نُنَازِعَ الْأَمْرَ أَهْلَهُ إِلَّا أَنْ تَرَوْا كُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَكُمْ مِنَ اللَّهِ فِيهِ بُرْهَانٌ» [بخاری، الفتن، باب قول النبي ﷺ: ”سترون بعدي أمور تنكرونها“: ۷۰۵۶، ۷۰۵۵] ”رسول اللہ ﷺ نے ہمیں دعوت دی تو ہم نے آپ سے بیعت کی۔ آپ نے ہم سے جو عہد لیا اس میں یہ تھا کہ ہم نے بیعت کی سننے اور اطاعت کرنے پر، اپنی خوشی اور ناخوشی میں اور اپنی تنگی اور آسانی میں اور اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دینے پر بھی اور اس بات پر کہ ہم صاحب امر (حکمران) سے امارت میں جھگڑا نہیں کریں گے، الا یہ کہ تم صریح کفر دیکھو، جس کے متعلق تمہارے پاس اللہ کے ہاں واضح دلیل ہو۔“

۵) علی رضی اللہ عنہ کا عمل اپنے خلاف جنگ کرنے والوں کو باغی سمجھنے اور ان سے لڑنے کے باوجود یہ تھا کہ وہ مسلمان ہیں، ان کے زخموں کو قتل نہیں کیا جائے گا، ان کے بھاگنے والوں کا پیچھا نہیں کیا جائے گا، ان کے اسیروں کو قتل نہیں کیا جائے گا، ان کی عورتوں اور بچوں کو لوٹڈی و غلام نہیں بنایا جائے گا، بلکہ ان کی آبرو کی حفاظت کی جائے گی اور ان کا مال غنیمت کے طور پر تقسیم نہیں کیا جائے گا۔ جنگ جمل اور جنگ صفین میں دونوں فریق ایک دوسرے کو مسلمان سمجھتے اور ایک دوسرے کا جنازہ پڑھتے تھے۔ احکام کی تفصیل اور دلائل کے لیے دیکھیے ”المغنی“ از ابن قدامہ میں ”کِتَابُ قِتَالِ أَهْلِ الْبَغْيِ“ اور دوسری کتب فقہ۔

۶) فَإِنْ قَاءَتْ قَائِلُهُمْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ: زیادتی کرنے والے گروہ کے اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آنے پر دونوں

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿۱۰﴾

مومن تو بھائی ہی ہیں، پس اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کرو اور اللہ سے ڈرو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے ﴿۱۰﴾

گروہوں کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کروانے کا حکم دیا، یہ نہیں کہ کسی فریق کی بے جا رعایت کر کے اور دوسرے کو دبا کر صرف لڑائی روکنے کے لیے صلح کروائی جائے، کیونکہ ایسی صلح نہ پائیدار ہوتی ہے، نہ اس سے آئندہ کے لیے لڑائی کا دروازہ بند ہوتا ہے۔ اس لیے ایک فریق پر دوسرے کا جوتی ثابت ہوتا ہے وہ اسے دلا کر عدل کے ساتھ صلح کروائی چاہیے۔

﴿۱۰﴾ **أَقِصُوا:** یہاں ایک سوال ہے کہ اس سے پہلے فرمایا، دونوں کے درمیان انصاف کے ساتھ صلح کرو اور، پھر دوبارہ ”أَقِصُوا“ کہنے میں کیا حکمت ہے؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ لڑائی کے موقع پر بعض لڑنے والوں کے خلاف دل میں شدید نفرت پیدا ہو جاتی ہے، جس کی وجہ سے انسان درست فیصلہ نہیں کر سکتا، اس لیے تاکید کے لیے دوبارہ انصاف کا حکم دیا اور انصاف کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی محبت کی نوید سنائی۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ پہلے جملے میں لڑنے والوں کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کروانے کا حکم ہے اور ”أَقِصُوا“ میں اپنے تمام معاملات میں انصاف سے کام لینے کا حکم ہے۔ انصاف کیا ہے؟ اس کے لیے دیکھیے سورہ نحل (۹۰) کی تفسیر۔

﴿۱۱﴾ **إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ:** ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «سَبْعَةٌ يُظِلُّهُمُ اللَّهُ تَعَالَى فِي ظِلِّهِ يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلُّهُ، إِمَامٌ عَدْلٌ.....» [بخاری، الزکوٰۃ، باب الصدقة باليمين: ۱۴۲۳] ”سات آدمی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ اپنے سائے میں جگہ دے گا جس دن اس کے سائے کے سوا کوئی سایہ نہیں ہوگا۔ (سب سے پہلے جس کا ذکر فرمایا وہ عادل حکمران.....“ عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «إِنَّ الْمُقْسِطِينَ عِنْدَ اللَّهِ عَلَى مَنَابِرٍ مِنْ نُورٍ عَنْ يَمِينِ الرَّحْمَنِ عَزَّ وَجَلَّ وَكَلَّمْنَا يَدَيْهِ يَمِينِ الَّذِينَ يَعْدِلُونَ فِي حُكْمِهِمْ وَأَهْلِيهِمْ وَمَا وَكَلَّمْنَا» [مسلم، الإمارة، باب فضيلة الإمام العادل.....: ۱۸۲۷] ”انصاف کرنے والے اللہ کے پاس نور کے منبروں پر رحمان عزوجل کی دائیں جانب ہوں گے اور اس کے دونوں ہاتھ دائیں ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے فیصلوں میں اور اپنے گھر والوں میں اور جس کے ذمہ دار ہیں سب میں انصاف کرتے ہیں۔“

آیت 10 ﴿۱﴾ **إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ:** لڑائی سے باز رکھنے کا سب سے مؤثر ذریعہ لڑنے والوں کو قربت کا احساس دلانا ہے کہ دیکھو تم کس سے لڑ رہے ہو؟ اپنے ہی بھائی سے، یہ کتنی بری بات ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان کی دینی قربت کا احساس دلایا، جو نسبی قربت سے بھی زیادہ مضبوط ہے۔ اسلام کی آمد سے پہلے جو لوگ نسبی قربت کے باوجود ایک دوسرے کے شدید دشمن تھے، جیسا کہ اوس اور خزرج کا معاملہ تھا، اللہ کی نعمت سے اسلام کی بدولت بھائی بھائی بن گئے۔ (دیکھیے آل عمران: ۱۰۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «الْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ لَا يَظْلِمُهُ وَلَا يُسْلِمُهُ» [بخاری،

المظالم، باب لا يظلم المسلم المسلم ولا يسلمه: ۲۴۴۲، عن ابن عمر رضی اللہ عنہما] ”مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس پر ظلم کرتا کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِنْ قَوْمٍ عَلَىٰ أَنْ يَكُونُوا خَيْرًا مِنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِنْ
اے لوگو جو ایمان لائے ہو! کوئی قوم کسی قوم سے مذاق نہ کرے، ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں، اور نہ کوئی
ہے اور نہ اسے بے یار و مددگار چھوڑتا ہے۔“

② فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخْوَيْنِكُمْ: ”اُخ“ کا تشبیہ ”اُخْوَانِ“ اور ”اُخْوَيْنِ“ ہے جو ”كُفْم“ کی طرف مضاف ہوا تو نون اعرابی
گر گیا اور ”اُخْوَيْنِ“ باقی رہا جو ”كُفْم“ کے ساتھ مل کر ”اُخْوَيْنِكُمْ“ ہو گیا، سو اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کروادو، وہ دو
خواہ ایک ایک فرد ہوں یا ایک ایک جماعت ہوں۔

③ وَ اتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ: یعنی صلح کرواتے وقت اس بات کو ملحوظ رکھو کہ تم اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کروا
رہے ہو، جن کا تمہارے ساتھ بھی اخوت کا رشتہ ہے۔ لہذا اس رشتے کا خیال رکھو اور پوری طرح عدل و انصاف کے ساتھ اللہ تعالیٰ
سے ڈرتے ہوئے اس طرح صلح کروادو کہ نہ کسی فریق کی حق تلفی ہو اور نہ کسی پر زیادتی ہو۔ اگر تم اللہ سے ڈرتے ہوئے یہ
فریضہ سرانجام دو گے تو یقیناً اللہ تعالیٰ تم پر رحم فرمائے گا۔ ”لَعَلَّ“ کا لفظ امید دلانے کے لیے ہوتا ہے، مگر بڑے لوگوں کے کلام
میں اس سے یقین حاصل ہوتا ہے، کیونکہ امید دلا کر اسے پورا نہ کرنا ان کی شان کے لائق نہیں ہوتا۔ پھر جو شاہوں کا شاہ اور
ساری کائنات کا مالک ہے وہ امید دلائے تو اس کے یقینی ہونے میں کیا شبہ ہے؟ اس کے علاوہ ”لَعَلَّ“ کا لفظ ”تا کہ“ کے معنی
میں بھی آتا ہے۔ مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ کا رحم انہی لوگوں پر ہوتا ہے جو اس سے ڈرتے ہیں، اس لیے بھائیوں کے درمیان صلح
کرواتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور عدل کے ساتھ صلح کروادو، تا کہ تم پر اللہ کا رحم ہو۔

④ یہ آیت دنیا بھر کے مسلمانوں کو ایک برادری میں منسلک کر دیتی ہے۔ مسلمان خواہ دنیا کے کسی دوسرے کونے میں ہو،
دوسرے سب مسلمان اسے بھائی سمجھتے ہیں۔ اسلام کے سوا ایسا رشتہ اور کہیں نہیں پایا جاتا۔ (کیلانی)

بیت 11 ① يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا..... : گزشتہ آیات میں مسلمانوں کے آپس میں لڑنے کی صورت میں ان کے
درمیان صلح کروانے کا حکم دیا، اس سے پہلے بلا تحقیق خبر پر عمل سے منع فرمایا تھا، کیونکہ اس سے لڑائی پیدا ہو سکتی ہے اور لاعلمی
میں نقصان پہنچانے کا باعث بن سکتی ہے۔ یہاں سے مزید ان چیزوں سے منع فرمایا جو اسلامی اخوت کو نقصان پہنچاتی ہیں اور
باہمی عداوت اور لڑائی کا باعث بنتی ہیں۔ اس آیت میں ایسی تین چیزیں ذکر فرمائیں: ① کسی کا مذاق اڑانا۔ ② کسی پر عیب
لگانا۔ ③ کسی کو برے لقب سے پکارنا۔

② لَا يَسْخَرُ قَوْمٌ مِنْ قَوْمٍ: ”سَخِرَ يَسْخَرُ سَخْرًا وَسَخْرًا وَسَخْرًا وَسَخْرًا وَسَخْرًا وَسَخْرًا وَسَخْرًا وَسَخْرًا وَسَخْرًا وَسَخْرًا“
(ع) استہزا، مذاق اڑانا، ٹھنکھا کرنا، وہ ہنسی جس سے دوسرے کی تحقیر اور دل آزاری ہو۔ وہ ہنسی جس سے دوسرے کا دل خوش
ہو وہ مزاح کہلاتی ہے، وہ جائز ہے بلکہ مسنون ہے۔ کشف میں ہے: ”قوم کا لفظ مردوں کے ساتھ خاص ہے، کیونکہ مرد
عورتوں کے ”قوم“ ہوتے ہیں، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔“

نِسَاءً عَلَيَّ أَنْ يَكُنَّ خَيْرًا مِنْهُنَّ، وَلَا تَلْمِزُوا أَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَرُوا بِالْأَلْقَابِ مَيْسٌ

عورتیں دوسری عورتوں سے، ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں، اور نہ اپنے لوگوں پر عیب لگاؤ اور نہ ایک دوسرے کو

وَلَا أُذْرِي وَ سَوَفَ إِخَالُ أُذْرِي أَقَوْمَ آلِ حِصْنِ أُمِّ نِسَاءً

”اور میں نہیں جانتا اور میرا خیال ہے کہ میں جلد ہی جان لوں گا کہ آلِ حِصْنِ قوم (یعنی مرد) ہیں یا عورتیں۔“

یہ آیت بھی اس بات کی دلیل ہے، کیونکہ قوم کو ٹھٹھا کرنے سے منع کرنے کے بعد عورتوں کو اس سے منع فرمایا ہے۔ ری یہ بات کہ قرآن میں مذکور قوم فرعون اور قوم ثمود وغیرہ میں مرد اور عورتیں دونوں شامل ہیں تو اصل یہ ہے کہ وہاں مردوں کے ذکر پر اکتفا کیا گیا ہے، کیونکہ عورتیں ان کے تابع ہیں۔

③ پہلی چیز جس سے منع فرمایا وہ کسی کا مذاق اڑانا یا تمسخر ہے، کیونکہ اس سے دلوں میں شدید بغض پیدا ہوتا ہے۔ جس کا مذاق اڑایا جائے وہ اسے اپنی تذلیل سمجھ کر ہر وقت انتقام کے موقع کی تلاش میں رہتا ہے اور ظاہر ہے انتقام میں بات کہاں سے کہاں تک جا پہنچتی ہے۔ کوئی شخص کسی کا ٹھٹھا اسی وقت اڑاتا ہے جب وہ اپنے آپ کو اس سے بہتر اور اس کو اپنے سے حقیر اور کمتر سمجھتا ہے اور یہ سمجھنا تکبر ہے، جس پر شدید وعید آئی ہے۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ كِبَرٍ، قَالَ رَجُلٌ إِنَّ الرَّجُلَ يُحِبُّ أَنْ يَكُونَ نُؤْبَةً حَسَنًا وَنَعْلَةً حَسَنَةً، قَالَ إِنَّ اللَّهَ جَمِيلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ، الْكِبَرُ بَطْرُ الْحَقِّ وَغَمَطُ النَّاسِ» [۹۱] ”وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں ذرہ برابر تکبر ہوگا۔“ ایک آدمی نے کہا: ”آدمی پسند کرتا ہے کہ اس کا پڑا اچھا ہو اور اس کا جوتا اچھا ہو (تو کیا یہ بھی تکبر ہے)؟“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”بے شک اللہ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے۔ تکبر تو حق کے انکار اور لوگوں کو حقیر جاننے کا نام ہے۔“ یہاں قوم کو قوم کا مذاق اڑانے سے منع فرمایا، کیونکہ عموماً کسی مجلس ہی میں کسی کا مذاق اڑایا جاتا ہے، ورنہ اکیلے کا مذاق اڑانا بھی منع ہے۔

④ عَلَيَّ أَنْ يَكُونُوا خَيْرًا مِنْهُنَّ: مذاق اڑانے سے منع کرنے کی وجہ بیان فرمائی کہ جسے تم حقیر سمجھ کر ذلیل کر رہے ہو، ہو سکتا ہے وہ اللہ کے ہاں تم سے بہتر ہو، کیونکہ اچھا یا برا ہونے کا دار و مدار ظاہری شکل و صورت پر نہیں، بلکہ دل کے تقویٰ پر ہے اور اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ پھر دار و مدار موجودہ حالت پر نہیں بلکہ خاتمے پر ہے، تمہیں کیا معلوم کہ اس کا خاتمہ تم سے اچھا ہو جسے تم حقیر سمجھ کر ذلیل کر رہے ہو۔

⑤ وَلَا نِسَاءً مِنْ نِسَاءٍ عَلَيَّ أَنْ يَكُنَّ خَيْرًا مِنْهُنَّ: قرآن مجید میں عموماً احکام کے لیے مردوں ہی کو مخاطب کیا گیا ہے، عورتوں کا ذکر تابع ہونے کی وجہ سے الگ نہیں کیا گیا۔ یہاں عورتوں کو الگ بھی خطاب فرمایا، اس سے ظاہر ہے کہ عورتوں کو اس گناہ سے روکنے کی خاص ضرورت ہے۔ یہاں ایک سوال ہے کہ اس آیت میں مردوں کو مردوں سے اور عورتوں کو عورتوں سے ٹھٹھا کرنے سے منع فرمایا تو کیا مرد عورتوں سے یا عورتیں مردوں سے ٹھٹھا کر سکتی ہیں؟ جواب اس کا یہ ہے کہ مسلم

الِاسْمُ الْفُسُوقُ بَعْدَ الْإِيْمَانِ ۚ وَمَنْ لَمْ يَتَّبِعْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۝۱۱

برے ناموں کے ساتھ پکارو، ایمان کے بعد فاسق ہونا برائنام ہے اور جس نے توبہ نہ کی اور وہی اصل ظالم ہیں ۝۱۱

معاشرہ میں مردوں اور عورتوں کے ملے جلے معاشرے کی گنجائش ہی نہیں، جس میں وہ ایک دوسرے کا بے تکلف مذاق اڑا سکیں۔ یہاں مردوں اور عورتوں کی مجلسیں الگ الگ ہوتی ہیں، اس لیے دونوں کو الگ الگ منع فرمایا۔

۶ مذاق خواہ زبان کے ساتھ اڑایا جائے یا کسی کے نقص کی طرف اشارہ کر کے یا نقل اتار کر، ہر طرح کا مذاق حرام ہے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے نبی ﷺ سے کہا: «حَسْبُكَ مِنْ صَفِيَّةَ كَذَا وَكَذَا، قَالَ غَيْرُ مُسَدَّدٍ تَعْنِي قَصِيْرَةً، فَقَالَ لَقَدْ قُلْتَ كَلِمَةً لَوْ مَرَّجَتْ بِمَاءِ الْبَحْرِ لَمَزَجَتْهُ قَالَتْ وَحَكِيْتُ لَهُ إِنْسَانًا فَقَالَ مَا أَحْبَبْتُ أَنِّي حَكِيْتُ إِنْسَانًا وَأَنْ لِي كَذَا وَكَذَا» | ابوداؤد، الأدب، باب في الغيبة : ۴۸۷۵، وقال الألباني صحيح [آپ کو صفیہ سے یہی کچھ کافی ہے کہ وہ ایسے ایسے ہے۔“ مسدد کے علاوہ دوسرے راوی نے وضاحت کی کہ مراد ان کے قد کا چھوٹا ہونا تھا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”یقیناً تم نے ایسی بات کہی ہے کہ اگر سمندر کے پانی میں ملا دی جائے تو سارے پانی کو خراب کر دے۔“ عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا: ”اور میں نے آپ کے سامنے کسی انسان کی نقل اتاری (تو اس کا کیا حکم ہے)؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”میں پسند نہیں کرتا کہ میں کسی انسان کی نقل اتاروں، خواہ مجھے یہ یہ کچھ مل جائے۔“

۷ وَلَا تَلْمِزُوا أَنْفُسَكُمْ : «لَمْ يَلْمِزْ لَمْزًا» (ض، ن) کسی پر عیب لگانا، خفی کلام کے ساتھ آنکھ کا اشارہ کرنا، دھکا دینا، مارنا۔ مزید دیکھیے سورہ ہمزہ کی آیت (۱): ﴿وَيَلْ لَكِنْ هُنَزَةٌ لَمْزَةٌ﴾ کی تفسیر۔ اللہ تعالیٰ نے یہ کہنے کے بجائے کہ کسی پر عیب نہ لگاؤ، یہ فرمایا کہ اپنے آپ پر عیب نہ لگاؤ، جیسا کہ فرمایا: ﴿لَا تَقْسَلُوا أَنْفُسَكُمْ﴾ [النساء: ۲۹] ”اپنے آپ کو قتل نہ کرو۔“ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ تمام مسلمان ”كُلُّ الْجَسَدِ الْوَاحِدِ“ (ایک جسم کی مانند) ہیں، عیب لگانے والے کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جب وہ کسی مسلم بھائی پر عیب لگا رہا ہے تو درحقیقت وہ اپنے آپ ہی پر عیب لگا رہا ہے، سوا سے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جب یہ دوسروں پر عیب لگائے گا تو عیب سے خالی تو یہ بھی نہیں اور دوسروں کی آنکھیں بھی ہیں اور زبان بھی، پھر اس کے عیوب بھی ظاہر کیے جائیں گے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”اپنے آپ پر عیب مت لگاؤ۔“ اس آیت میں لوگوں کے سامنے کسی کے عیب ظاہر کرنے اور ان کا طعنہ دینے سے منع فرمایا، اگلی آیت میں کسی کی عدم موجودگی میں اس کے عیب ذکر کرنے یعنی غیبت سے بھی منع کیا۔ صرف ایک بات کی اجازت ہے اور وہ ہے نصیحت کہ اپنے بھائی کو الگ لے جا کر اسے اس کی غلطی بتا کر درست کرنے کی نصیحت کرے، جس طرح آئینہ غلطی بتاتا ہے مگر شور نہیں ڈالتا۔ لوگوں کے سامنے کسی مسلم کے منہ پر یا اس کی عدم موجودگی میں اس کے عیب کا اظہار کرنے کے بجائے اس پر پردہ ڈالنے کا حکم ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «الْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ، لَا يَظْلِمُهُ وَلَا يُسْلِمُهُ، وَمَنْ كَانَ فِي حَاجَةِ أَخِيهِ كَانَ اللَّهُ فِي حَاجَتِهِ، وَمَنْ فَرَّجَ عَنْ مُسْلِمٍ كُرْبَةً فَرَّجَ اللَّهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِّنْ كُرْبَاتِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ، وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا

سَنَرُهُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ» [بخاری، المغالہ، باب لا یظلم المسلم المسلم ولا ینسہ : ۲۶۴۲] عن ابن عمر رضی اللہ عنہما |
 ”مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اسے بے یار و مددگار چھوڑتا ہے اور جو شخص اپنے بھائی کے کام میں ہو
 اللہ اس کے کام میں ہوتا ہے اور جو کسی مسلم سے کوئی تکلیف دور کرے اللہ تعالیٰ قیامت کی تکلیفوں میں سے کوئی تکلیف اس
 سے دور فرمائے گا اور جو کسی مسلم پر پردہ ڈالے، اللہ تعالیٰ اس پر پردہ ڈالے گا۔“

⑧ وَلَا تَتَّبِعُوا بِاللَّغَابِ: ”الْتَبِيزُ“ (نون اور باء کے فتح کے ساتھ) برے لقب کو کہتے ہیں، مثلاً لَنْزَار، لَوْلَا، اَنْدَهَا، كَالَا،
 لَهْلَهَا، كَبْرَا، گدھا، لومڑ یا کوئی بھی نام جس سے کسی کو تکلیف ہوتی ہو، مثلاً کسی سے کوئی گناہ ہوا ہو، تائب ہونے کے بعد عار
 دلانے کے لیے اسے چور یا زانی یا شرابی کہہ کر پکارنا۔ لقب ایسے نام کو کہتے ہیں جس سے کسی خوبی یا خامی کا اظہار ہوتا ہو، خواہ
 آدمی نے خود اپنے لیے رکھ لیا ہو یا کسی دوسرے نے رکھ دیا ہو۔ یہاں ”لَا تَتَّبِعُوا بِاللَّغَابِ“ کے قرینے سے لقب سے مراد برا نام
 ہے، کیونکہ اچھے القاب سے پکارنا تو قابل تعریف ہے، جیسے ابوبکر صدیق، عمر فاروق، حمزہ اسد اللہ، خالد سیف اللہ، ابو عبیدہ
 امین الامت، حذیفہ صاحب سر رسول اللہ، عبد اللہ بن مسعود صاحب المطهرة والوسادة والنعلمین (عجائب)۔ اس کے علاوہ عرب کا
 طریقہ اکرام کرتے ہوئے کنیت کے ساتھ پکارنے کا تھا، جسے اسلام نے برقرار رکھا۔ مومن کا حق یہ ہے کہ اسے اس نام سے
 پکارا جائے جو اسے اپنے لیے سب سے زیادہ پسند ہو، کیونکہ یہ محبت پیدا کرنے اور اسے قائم رکھنے کا باعث ہے۔ ”وَلَا تَتَّبِعُوا
 بِاللَّغَابِ“ یعنی کوئی شخص کسی دوسرے کا برا نام نہ رکھے جس سے وہ ناراض ہو، یا اس کی توہین و تذلیل ہوتی ہو اور نہ ایسے نام
 کے ساتھ اسے آواز دے کر پکارے۔ جاہلیت میں یہ بات عام تھی کہ ایک شخص نے دوسرے کا برا لقب رکھا تو اس نے اس کا
 رکھ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمادیا۔

ابو جیرہ بن ضحاک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ”آیت: ﴿وَلَا تَتَّبِعُوا بِاللَّغَابِ﴾ بِئْسَ الْإِسْمُ الْفُسُوقُ بَعْدَ الْإِيمَانِ﴾
 ہم بنو سلمہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ مدینہ میں آئے تو ہم میں سے ہر آدمی کے دو دو، تین تین نام تھے۔
 نبی ﷺ کسی کو کوئی نام لے کر بلاتے تو لوگ کہتے: ”یا رسول اللہ! اسے اس نام سے نہ بلائیں، کیونکہ وہ اس سے ناراض ہوتا
 ہے۔“ تو اس پر یہ آیت: ﴿وَلَا تَتَّبِعُوا بِاللَّغَابِ﴾ اتری۔ [ابوداؤد، الأدب، باب ہی الالقاب: ۱۹۶۶]

⑨ اس حکم سے وہ القاب مستثنیٰ ہیں جو کسی کی پہچان بن چکے ہوں، نہ اس نام والا اسے برا سمجھتا ہو اور نہ اس سے مقصود تحقیر یا
 تذلیل ہو، بلکہ مقصود صرف تعارف ہو، جیسے سلیمان الاعمش (چندھیائی ہوئی آنکھوں والا)، واصل الاحدب (کبڑا)، حمید
 الطویل (لمبا)، ابو ہریرہ اور ذوالیدین وغیرہ۔

⑩ بِئْسَ الْإِسْمُ الْفُسُوقُ بَعْدَ الْإِيمَانِ: اس سے معلوم ہوا کہ اوپر جن چیزوں سے روکا گیا ہے وہ سب فسوق ہیں۔ مقصد
 یہ ہے کہ جو شخص ان کاموں کا ارتکاب کرے وہ مومن ہونے کے باوجود فاسق ہے اور یہ بہت بری بات ہے کہ آدمی کا نام
 فاسق رکھا جائے، اس کے بعد کہ اس کا نام مومن ہے۔ ”بَعْدَ الْإِيمَانِ“ (ایمان کے بعد) اس لیے فرمایا کہ اگر تم ایمان کا

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَلَا تَجَسَّسُوا

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! بہت سے گمان سے بچو، یقیناً بعض گمان گناہ ہیں اور نہ جاسوسی کرو اور نہ تم میں سے کوئی

شرف حاصل نہ کر چکے ہوتے تو فاسق یا بد معاش کہلانے میں عاری کوئی خاص بات نہ تھی، لیکن اب ایمان لے آنے کے بعد یہ نام تم پر آنا بہت بری بات ہے۔ تمہیں یہ بات مد نظر رکھنی چاہیے کہ اب تم وہ ہو جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلَكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَزَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ وَكَوَّزَةَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالرِّضْيَانَ﴾ [الحجرات: ۷] ”اور لیکن اللہ نے تمہارے لیے ایمان کو محبوب بنا دیا اور اسے تمہارے دلوں میں مزین کر دیا اور اس نے کفر اور گناہ اور نافرمانی کو تمہارے لیے ناپسندیدہ بنا دیا۔“ تو تمہیں ہر ایسے کام سے اجتناب کرنا چاہیے جس سے تم پر فسق کا نام آئے۔

﴿وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ﴾ ”الف لام“ کمال کا ہے، یعنی اگرچہ جو بھی گناہ کرے ظالم ہے مگر توبہ سے اس ظلم کی تلافی ہو جاتی ہے۔ اصل ظالم وہی ہیں جو گناہوں پر اصرار کرتے ہیں اور توبہ کیے بغیر فوت ہو جاتے ہیں۔

آیت 12 ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا.....﴾: پچھلی آیت میں مسلمانوں کے باہمی تعلقات خراب کرنے والی ایسی چیزوں سے منع فرمایا تھا جو ایک دوسرے کے سامنے ظاہر ہوتی ہیں، یعنی مذاق اڑانا، عیب لگانا اور برے نام سے پکارنا، اب ان تین چیزوں سے منع فرمایا جو دوسرے بھائیوں سے تعلق رکھتی ہیں مگر انہیں ان کی خبر ہی نہیں ہوتی۔ وہ ہیں بدگمانی، جاسوسی اور غیبت۔ یہ تینوں کام انتہائی کینگی اور بزدلی کے کام ہیں، کیونکہ انہیں کرنے والے میں جرأت ہی نہیں ہوتی کہ وہ لوگوں کے سامنے آسکے۔ یہ اس سورت کی پانچویں آیت ہے جس کا آغاز ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا“ سے ہوا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ یہ تینوں کام ایمان اور اس کے دعوے کے منافی ہیں، اس لیے ان سے بچ جاؤ۔

2 ﴿اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ.....﴾: پہلی بات یہ فرمائی کہ اس چیز سے بچو کہ کسی کے متعلق جو سنو یا دیکھو اس سے اس کے متعلق برا گمان ہی قائم کر لو، بلکہ جہاں تک ہو سکے مومن کے تمام اقوال و اعمال کے متعلق اچھا گمان رکھنے کی کوشش کرو، کیونکہ بعض گمان بالکل بے بنیاد اور گناہ ہوتے ہیں۔ اس لیے زیادہ گمان سے بچو، کیونکہ اس کا نتیجہ ایسے گمانوں میں پڑ جانا ہے جو گناہ ہیں۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے بعض گمانوں کو گناہ قرار دیا ہے، سب گمانوں کو نہیں، کیونکہ ظن کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک ظن غالب ہے، جو کسی دلیل یا مضبوط علامت کے ساتھ قوی ہو جائے، اس پر عمل کرنا درست ہے۔ شریعت کے اکثر احکام اس پر مبنی ہیں اور دنیا کے تقریباً تمام کام اسی پر چلتے ہیں، مثلاً عدالتوں کے فیصلے، گواہوں کی گواہی، باہمی تجارت، ٹیلی فون اور خطوط کے ذریعے سے اطلاعات اور خبر واحد کے رادویوں کی روایات۔ ان سب چیزوں میں غور و فکر، جانچ پڑتال اور پوری کوشش سے حاصل ہونے والا علم بھی ظن غالب ہے، مگر اس پر عمل واجب ہے۔ اسے ظن اس لیے کہتے ہیں کہ اس کی مخالف جانب کا یعنی اس کے درست نہ ہونے کا نہایت ادنیٰ سا امکان رہتا ہے، مثلاً ہو سکتا ہے کہ گواہ کی گواہی درست نہ ہو، اطلاع دینے والا جھوٹ بول رہا ہو، یا راوی کو غلطی لگی ہو، مگر اس امکان کا کوئی اعتبار نہیں۔ اس امکان پر جائیں تو دنیا کا کوئی کام ہو ہی نہ سکے۔

وَلَا يَغْتَبُ بَعْضُكُم بَعْضًا ۗ أَيُّبُ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ ۗ
دوسرے کی غیبت کرے، کیا تم میں سے کوئی پسند کرتا ہے کہ اپنے بھائی کا گوشت کھائے، جب کہ وہ مردہ ہو، سو تم

اس لیے اپنی پوری کوشش کے بعد دلائل سے جو علم حاصل ہو اس پر بھی اگر چہ ظن کا لفظ بول لیا جاتا ہے مگر درحقیقت یہ علم ہی ہے اور اس پر عمل واجب ہے۔

ظن کی ایک قسم یہ ہے کہ کسی وجہ سے دل میں ایک خیال آ کر ٹھہر جاتا ہے مگر اس کی کوئی دلیل نہیں ہوتی۔ دلیل نہ ہونے کی وجہ سے دل میں اس کے ہونے یا نہ ہونے کا امکان برابر ہوتا ہے، اسے شک بھی کہتے ہیں، یا اس کے ہونے کا امکان اس کے نہ ہونے کے امکان سے کم ہوتا ہے، یہ وہم کہلاتا ہے۔ ظن کی یہ صورتیں مذموم ہیں اور ان سے اجتناب واجب ہے۔ ”إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ“ (بے شک بعض گمان گناہ ہیں) سے یہی مراد ہیں اور اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا﴾ [یونس: ۳۶] (بے شک گمان حق کے مقابلے میں کچھ فائدہ نہیں دیتا) اور اللہ کے فرمان: ﴿إِنَّ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْأَنْفُسُ﴾ [النجم: ۲۳] (یہ لوگ صرف اپنے گمان کی اور اپنی خواہشات کی پیروی کر رہے ہیں) میں اسی ظن کا ذکر ہے اور اسی کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّمَا كُفُّوا وَالظَّنُّ، فَإِنَّ الظَّنَّ أَكْذَبُ الْحَدِيثِ» [بخاری، الأدب، باب: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ...﴾: ۶۰۶۶] ”گمان سے بچو! کیونکہ گمان سب سے جھوٹی بات ہے۔“ اسے سب سے جھوٹی بات اس لیے کہا گیا کہ جب کوئی شخص کسی کے متعلق بدگمانی کرتا ہے تو وہ دلیل کے بغیر فیصلہ کر لیتا ہے کہ وہ شخص ایسا ایسا ہے۔ چونکہ حقیقت میں وہ شخص ایسا نہیں ہوتا، اس لیے اس کے اس فیصلے کو جھوٹ کہا گیا ہے اور سب سے بڑا جھوٹ اس لیے کہ اس نے بغیر کسی قرینے یا سبب کے محض نفس یا شیطان کے کہنے پر اسے برا قرار دے لیا، جب کہ اس کے برے ہونے کی کوئی بنیاد ہی نہیں۔

③ آیت میں ایسے گمان سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے جو بے دلیل ہو، مثلاً ایک آدمی جو ظاہر میں صالح ہے، اس کے عیوب پر اللہ کی طرف سے پردہ پڑا ہوا ہے، عام مشاہدہ میں وہ عقیف اور امانت دار ہے اور اس کے بددیانت یا گناہ گار ہونے کی کوئی دلیل یا علامت موجود نہیں، اس کے متعلق بدگمانی کرنا حرام ہے۔ ہاں، اگر گمان کرنے کی کوئی واقعی دلیل یا علامت موجود ہے تو اس وقت گمان منع نہیں۔ مثلاً ایک شخص کا اٹھنا بیٹھنا ہی ان لوگوں کے ساتھ ہے جو چوری یا زنا کے ساتھ معروف ہیں، یا رات کو وہاں پھرتا ہے جہاں اس کا کوئی کام نہیں، اس کے متعلق گمان پیدا ہونا فطری بات ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ہر گمان سے منع نہیں فرمایا، بلکہ فرمایا: ﴿اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ ۗ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ﴾ ”بہت سے گمان سے بچو، کیونکہ بعض گمان گناہ ہیں۔“

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح بخاری میں فرمایا: ”بَابُ مَا يَجُوزُ مِنَ الظَّنِّ“ ”وہ گمان جو جائز ہیں۔“ اور اس باب میں عائشہ رضی اللہ عنہا سے حدیث ذکر کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «مَا أَظُنُّ فُلَانًا وَفُلَانًا يَغْرَفَانِ مِنْ دِينِنَا شَيْئًا قَالَ الْكَيْتُ

وَ اتَّقُوا اللَّهَ مِنْ أِنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ رَحِيمٌ ﴿۱۷﴾

اسے ناپسند کرتے ہو اور اللہ سے ڈرو، یقیناً اللہ بہت توبہ قبول کرنے والا ہے اور بخیر فرماتا ہے ﴿۱۷﴾

كَانُوا رُحُلِينَ مِنَ الْمُشَافِقِينَ | بخاری، الأدب، باب ما يجوز من النظر : ۶۷، ۶۸ | ”میں قلاں اور فلاں کے متعلق گمان نہیں کرتا کہ وہ ہمارے دین میں سے کچھ بھی جانتے ہیں۔“ لیث نے فرمایا: ”یہ دونوں آدمی منافق تھے۔“ اس جائز گمان سے مراد وہ گمان ہے جس کی علامات یا دلیلیں واضح ہوں۔

④ جس طرح دوسرے مسلمان کے حق میں بدگمانی کرنا منع ہے اسی طرح خود مسلمان کو بھی لازم ہے کہ ایسے ہر کام سے احتیاط کرے جس سے کسی کے دل میں اس کے متعلق برا گمان پیدا ہو۔ علی بن حسین بیان کرتے ہیں کہ انھیں رسول اللہ ﷺ کی بیوی صفیہ بنتہ نے خبر دی کہ نبی ﷺ مسجد میں تھے اور آپ ﷺ کی بیویاں بھی آپ کے پاس تھیں۔ وہ جانے لگیں تو آپ ﷺ نے صفیہ بنتہ سے فرمایا: ”جلدی نہ کرنا، یہاں تک کہ میں تمہارے ساتھ جاؤں۔“ ان کا مکان اسامہ کی حویلی میں تھا۔ چنانچہ نبی ﷺ ان کے ساتھ نکلے تو آپ کو دو انصاری ملے، انھوں نے نبی ﷺ کو دیکھا اور آگے بڑھ گئے۔ آپ ﷺ نے ان دونوں سے فرمایا: ﴿تَعَالَىٰ إِلَٰهًا ضَعِيفَةٌ بِنْتُ حُصَيْنٍ﴾ ”ادھر آؤ! یہ (میری بیوی) صفیہ بنت جحش ہے۔“ انھوں نے کہا: ”سبحان اللہ! یا رسول اللہ! (بھلا ہم آپ کے متعلق برا گمان کر سکتے ہیں)۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿إِنَّ الشَّيْطَانَ يَجْرِي مِنَ الْإِنْسَانِ فَجَرَى الدَّمِ، وَإِنِّي خَشِيتُ أَنْ يُلْقِيَنِي فِي أَنْفُسِكُمْ شَيْئًا﴾ | بخاری، الاعتكاف، باب زيارة المرأة رجها من اعتكافه : ۲۰۳۸ | ”شیطان انسان میں خون کے پھرنے کی طرح پھرتا ہے، تو میں ڈرا کہ وہ تمہارے دلوں میں کوئی بات ڈال دے۔“

⑤ وَلَا تَجَسَّسُوا: ”جَسَّسٌ يَجَسُّسُ جَسًّا“ (ان) کسی چیز کو معلوم کرنے کے لیے ہاتھ سے ٹونکا، تجسس، جاسوسی کرنا، نفیہ باتیں معلوم کرنے کی کوشش کرنا۔ جاسوسی برے گمان کا لازمی نتیجہ ہے، کیونکہ آدمی جب کسی کے متعلق دل میں برا گمان قائم کر لیتا ہے تو اسے جہت کرنے کے لیے اس کی جاسوسی کرتا ہے اور اس کے ان عیوب کی ٹوہ لگا تا رہتا ہے جن پر اللہ تعالیٰ نے پردہ ڈال رکھا ہے، تاکہ یہ اپنے گمان کو سچا ثابت کر سکے۔ یہ ایرانی مودت و اخوت کے سراسر خلاف ہے۔ جب مسلمان بھائی کے ان عیوب پر بھی پردہ ڈالنے کا حکم ہے جو آدمی کو معلوم ہوں تو ان عیوب کی ٹوہ لگانا کیسے جائز ہو سکتا ہے جو محض اس کے گمان کی پیداوار ہیں، یا جن پر اللہ نے پردہ ڈال رکھا ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿إِنَّا كُنْمُ وَالظُّلْمُ فَإِنَّ الظُّلْمَ أَكْذَبُ الْكَلِمَاتِ، وَلَا تَجَسَّسُوا، وَلَا تَخَاسِبُوا، وَلَا تَخَاسَبُوا، وَلَا تَبَاغَضُوا، وَلَا تَنَابَزُوا، وَكُونُوا عِبَادَ اللَّهِ إِخْوَانًا﴾ | بخاری، الفرائض، باب تعليم الفرائض : ۶۷۲۴، ۶۷۲۶ | ”گمان سے بچو! کیونکہ گمان سب سے جھوٹی بات ہے اور نہ ٹوہ لگاؤ، نہ جاسوسی کرو، نہ جھوٹے سے (خرید و فروخت میں) بولی بڑھاؤ، نہ ایک دوسرے پر حسد کرو، نہ ایک دوسرے سے دل میں کینہ رکھو، نہ ایک دوسرے سے قطع تعلق کرو اور اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن جاؤ۔“ ابوہریرہ

اسلمی ﷺ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «يَا مَعْشَرَ مَنْ آمَنَ بِلِسَانِهِ وَلَمْ يَدْخُلِ الْإِيمَانُ قَلْبَهُ! لَا تَعْتَابُوا الْمُسْلِمِينَ وَلَا تَتَّبِعُوا عَوْرَاتِهِمْ فَإِنَّهُ مَنْ اتَّبَعَ عَوْرَاتِهِمْ يَتَّبِعِ اللَّهُ عَوْرَتَهُ، وَمَنْ يَتَّبِعِ اللَّهُ عَوْرَتَهُ يَفْضَحْهُ فِي بَيْتِهِ» [أبوداؤد، الأدب، باب في الغيبة : ۴۸۸۰، قال الألباني حسن صحيح] ”اے ان لوگوں کی جماعت جو اپنی زبان کے ساتھ ایمان لائے ہیں اور ایمان ان کے دلوں میں داخل نہیں ہوا! مسلمانوں کی غیبت مت کرو اور نہ ہی ان کے چھپے ہوئے عیبوں کا پیچھا کرو، کیونکہ جو شخص مسلمانوں کے عیبوں کا پیچھا کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے عیبوں کا پیچھا کرے گا اور جس کے عیبوں کا پیچھا اللہ تعالیٰ کرے وہ اسے اس کے گھر میں رسوا کر دے گا۔“

بعض اوقات آدمی اصلاح کی نیت سے جاسوسی کرتا ہے، مگر یہ اصلاح کا طریقہ نہیں، اس سے باہمی عداوت پیدا ہوتی ہے اور خرابی بڑھتی ہے، اصلاح نہیں ہوتی۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا، میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ فرماتے تھے: «إِنَّكَ إِذَا تَتَّبَعْتَ عَوْرَاتِ النَّاسِ أَفْسَدْتَهُمْ أَوْ كَذَبْتَ أَنْ تُفْسِدَهُمْ» ”یقیناً جب تو لوگوں کے عیبوں کا پیچھا کرے گا تو انھیں خراب کر دے گا“ یا فرمایا: ”قریب ہے تو انھیں خراب کر دے۔“ ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”یہ ایسی بات تھی جو معاویہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے سنی اور اللہ تعالیٰ نے انھیں اس کے ساتھ نفع دیا (کہ انھوں نے بیس سال شام کی امارت کی اور بیس سال پورے عالم اسلام پر خلافت کی اور رعایا کو ان سے کوئی خاص شکایت پیدا نہیں ہوئی)۔“ [أبوداؤد، الأدب، باب في النهي عن التجسس : ۴۸۸۸، وقال الألباني صحيح]

⑥ جس طرح کوئی دلیل یا قریب موجود ہو تو بدگمانی کی گنجائش ہے اسی طرح اسلام کے دشمنوں کی جاسوسی یا امن و امان کی خرابی کا باعث بننے والوں کی جاسوسی بھی جائز ہے، بلکہ مسلم حکمران پر لازم ہے کہ وہ اپنی رعایا کے حالات سے واقف رہے اور اللہ کی حدود کو پامال کرنے والوں کا سدباب کرتا رہے، مگر اس کے لیے کسی طرح جائز نہیں کہ محض گمان کی بنا پر تجسس یا کوئی کارروائی کرے۔

⑦ وَلَا يَغْتَبِ بَعْضُكُم بَعْضًا: ”لَا يَغْتَبِ“ (غ، ی، ب) سے باب افتعال ہے: ”اِغْتَابَ يَغْتَابُ اِغْتَابًا“ کسی کے غائب ہونے کی حالت میں اس کی وہ بات کرنا جس کا ذکر اسے ناپسند ہو۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «أَتَدْرُونَ مَا الْغَيْبَةُ؟» ”کیا تم جانتے ہو غیبت کیا ہے؟“ انھوں نے کہا: ”اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: «ذِكْرُكَ أَخَاكَ بِمَا يَكْرَهُ» ”تمہارا اپنے بھائی کا ذکر ایسی چیز کے ساتھ کرنا جسے وہ ناپسند کرتا ہے۔“ عرض کیا گیا: ”آپ یہ بتائیں کہ اگر میرے بھائی میں وہ چیز موجود ہو جو میں کہہ رہا ہوں (تو کیا پھر بھی غیبت ہے؟)“ آپ ﷺ نے فرمایا: «إِنْ كَانَ فِيهِ مَا تَقُولُ فَقَدْ اغْتَبْتَهُ وَإِنْ لَمْ يَكُنْ فِيهِ فَقَدْ بَهْتَهُ» [مسلم، البر والصلة، باب تحريم الغيبة : ۲۵۸۹] ”اگر اس میں وہ چیز موجود ہے جو تم کہہ رہے ہو تو تم نے اس کی غیبت کی اور اگر وہ چیز اس میں موجود نہیں تو تم نے اس پر بہتان لگایا۔“

⑧ اَيُّوبُ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ آخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ: اس جملے میں غیبت سے کئی طریقوں سے شدید نفرت دلائی گئی

ہے۔ چنانچہ اس میں غیبت کے ساتھ کسی بھائی کی عزت و آبرو تار تار کرنے کو انسان کا گوشت کھانا قرار دیا، پھر کسی دوسرے انسان کا نہیں بلکہ اپنے بھائی کا اور وہ بھی زندہ کا نہیں بلکہ مردہ بھائی کا۔ پھر ایسی شدید قابلِ نفرت چیز سے محبت کرنے کی عار دلاتے ہوئے پوچھا کہ اتنی گندی اور مکروہ چیز سے تو شدید نفرت ہونی چاہیے تھی، تو کیا تم نفرت کے بجائے اس سے محبت کرتے ہو۔ پھر ”أَحَدُكُمْ“ فرمایا کہ کیا تم میں سے کوئی ایک یہ پسند کرتا ہے؟ مطلب یہ کہ لاکھوں کروڑوں میں سے کوئی ایک بھی یہ پسند نہیں کرے گا تو تم میں سے کوئی ایک یہ کام کیوں کرے؟!

۹ ﴿فَكَوْهَتُمُوْا﴾: یعنی اگر تمہارے سامنے یہ چیز پیش کی جائے تو یقیناً تم اس سے نفرت کرو گے۔

۱۰ غیبت کو مردہ بھائی کا گوشت کھانے کے ساتھ تشبیہ اس لیے دی ہے کہ جس طرح مردہ اپنا گوشت کھانے سے کسی کو ہٹا نہیں سکتا اسی طرح جس کی غیبت کی جارہی ہے وہ پاس موجود نہ ہونے کی وجہ سے اپنا دفاع نہیں کر سکتا۔

۱۱ جس طرح غیبت کرنا حرام ہے اسے سننا بھی حرام ہے، کیونکہ سننے والا بھی غیبت میں برابر کا شریک ہے، اگر وہ خاموش رہ کر تائید نہ کرے تو غیبت کرنے والے کو اس کام کی جرأت ہو ہی نہیں سکتی۔ دونوں ہی اپنے مردہ بھائی کے گوشت سے لذت حاصل کر رہے ہیں، ایک غیبت کر کے اور دوسرا اسے سن کر۔ اس لیے غیبت سننے سے بھی بہت پرہیز کرنا چاہیے، بلکہ اپنے مسلم بھائی کی عزت کا دفاع کرتے ہوئے غیبت کرنے والے کو اس سے منع کرنا چاہیے۔

۱۲ ﴿وَالْتَقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ﴾: یعنی اللہ کا ڈر ہی ہے جو ان کاموں سے آدمی کو باز رکھ سکتا ہے جن سے ان آیات میں منع فرمایا گیا ہے، وہ نہ ہو تو کچھ بھی نہیں۔ اس لیے اللہ سے ڈرو اور ان تمام گناہوں سے توبہ کرو، یقیناً اللہ بہت توبہ قبول کرنے والا اور نہایت رحم والا ہے۔

۱۳ نووی نے ”الاذکار“ میں غیبت کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرمایا: ”خواہ وہ چیز اس کے بدن سے تعلق رکھتی ہو یا دین سے یا دنیا سے، اس کی شکل و صورت کے بارے میں ہو یا اخلاق کے، اس کے مال، اولاد، والدین اور بیوی بچوں کے متعلق ہو یا اس کے لباس، چال ڈھال، بول چال، خندہ پیشانی یا ترش روئی کے متعلق، غرض اس سے تعلق رکھنے والی کسی بھی چیز کا ذکر جو اسے ناپسند ہو غیبت ہے۔ پھر خواہ یہ ذکر زبان سے کیا جائے یا تحریر سے، اشارے سے ہو یا کنائے سے، تمام صورتوں میں غیبت ہے۔ اشارہ خواہ آنکھ سے ہو یا ہاتھ سے، سر کے ساتھ ہو یا جسم کے کسی حصے کے ساتھ، غیبت میں شامل ہے۔“

بدن کی غیبت مثلاً اس کی تنقیص کے لیے اندھا، لنگڑا، کانا، گنجا، گھلنا، لمبوتر، کالا، کبڑا یا اس قسم کا کوئی اور لفظ استعمال کرے۔ دین کے بارے میں غیبت یہ ہے کہ اسے فاسق، چور، خائن، ظالم، نماز میں سست، پلید، ماں باپ کا نافرمان یا بد معاش وغیرہ کہے۔ دنیا کے بارے میں مثلاً اسے نکما، باتونی، پیڑ وغیرہ کہے۔ اخلاق کے متعلق مثلاً اسے بدخلق، متکبر، ریاکار، جلد باز، بزدل یا سٹرل قرار دے۔ اس کے والد کے متعلق مثلاً جو لہا، موچی، کالا، حبشی وغیرہ کہہ کر اس کی تنقیص کرے۔ پھر زبان، ہاتھ اور جسم کے ساتھ غیبت کی ایک صورت اس کی نقل اتارنا ہے، مثلاً اس کے انک انک کر بات کرنے یا ناک میں

بولنے کی، لنگڑا کر چلنے کی، کبڑا ہونے کی یا چھوٹے قد کا ہونے کی نقل اتارے۔ غرض قاعدہ یہ ہے کہ کوئی بھی حرکت جس کا مقصد کسی مسلم بھائی کی تنقیص ہو غیبت ہے اور حرام ہے۔

④ بعض اوقات کسی مسلم بھائی کی غیبت جائز بھی ہو جاتی ہے اور اس کی عدم موجودگی میں اس کا عیب بیان کیا جا سکتا ہے۔ قاعدہ اس کا یہ ہے کہ جب دین کا کوئی ضروری مقصد اس کے بغیر حاصل نہ ہو سکتا ہو تو اس وقت یہ جائز ہے۔ نووی نے اور ان سے پہلے غزالی نے غیبت کے جواز کے چھ مواقع گنوائے ہیں: ① ظلم پر فریاد، یعنی مظلوم کو حق ہے کہ ظالم کے خلاف بات کرے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَا يُحِبُّ اللَّهُ الْجَهْرَ بِالسُّوِّءِ مِنَ الْقَوْلِ إِلَّا مَنْ ظَلِمَ﴾ | النساء: ۱۴۸ | ”اللہ بری بات کے ساتھ آواز بلند کرنا پسند نہیں کرتا سوائے اس کے جس پر ظلم کیا جائے۔“ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «فَبِأَنَّ لِصَاحِبِ الْحَقِّ مَقَالًا» | بخاری، الاستقراض، باب استقراض الإبل: ۲۳۹۰ | ”یقیناً حق والے کو بات کرنے کی گنجائش ہے۔“ بہتر یہ ہے کہ وہ بادشاہ یا قاضی یا کسی ایسے شخص کے پاس اپنی مظلومیت کا تذکرہ کرے جو اس کی مدد کر سکتا ہو۔ ② کسی گناہ یا برے کام سے روکنے کے لیے ایسے لوگوں کو اطلاع دینا جو اس کے ساتھ مل کر یا خود اسے روک سکیں۔ اگر مقصد صرف اس کام کرنے والے کی تذلیل ہو تو یہ جائز نہیں۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی آیات و احادیث اس کی دلیل ہیں۔ ③ فتویٰ لینے کے لیے مفتی کے سامنے کسی کا نقص ذکر کرے تو یہ جائز ہے، مثلاً ہندو بت متبہ بنجنا نے اپنے خاندان ابو سفیان بنی نضیر کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے پوچھا تھا: ”ابو سفیان بنجیل آدمی ہے (مجھے اتنا خرچ نہیں دیتا جو میرے اور میرے بچوں کے لیے کافی ہو) تو کیا مجھ پر کوئی گناہ تو نہیں اگر میں اس کے ظلم کے بغیر اس کے مال میں سے کچھ لے لوں؟“ آپ نے فرمایا: «خُذِي أَنْتِ وَ بَنُوكِ مَا يَكْفِيكِ بِالْمَعْرُوفِ» | بخاری، البيوع، باب من أجزى أمر الأمصار.....: ۵۳۶۴، ۲۲۱۱ | ”تمہارے اور تمہارے بچوں کے لیے جتنا کافی ہو معروف طریقے کے ساتھ لے لیا کرو۔“ رسول اللہ ﷺ نے ہندو بنجنا کو اپنے خاندان کا عیب بیان کرنے پر منع نہیں فرمایا، کیونکہ اس کا مقصد مسئلہ پوچھنا تھا۔

⑤ مسلمانوں کی خیر خواہی کے لیے اور انھیں شر سے بچانے کے لیے کسی کی برائی سے آگاہ کرے تو یہ جائز ہے۔ عائشہ بنی نضیر فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک شخص آیا، آپ نے فرمایا: «إِذْذُنَا لَهٗ، بِئْسَ أَخُو الْعَشِيرَةِ» | بخاری، الأدب، باب ما يجوز من اغتياب.....: ۶۰۵۴ | ”اسے اجازت دے دو، یہ خاندان کا برا آدمی ہے۔“ رسول اللہ ﷺ نے عائشہ بنی نضیر کو اس شخص کی برائی سے آگاہ کرنا ضروری خیال کیا۔ مسلمانوں کی خیر خواہی میں اور انھیں شر سے بچانے میں بہت سی چیزیں آ جاتی ہیں، مثلاً حدیث کے راویوں پر اور مقدمے کے گواہوں پر جرح جائز بلکہ واجب ہے اور اس پر امت کا اتفاق ہے۔ دوسرے جب کوئی شخص کسی کے ساتھ رشتہ کرنے یا امانت رکھنے یا مشارکت کرنے یا ہمسائیگی اختیار کرنے، کاروبار یا کوئی اور معاملہ کرنے کے متعلق مشورہ پوچھے تو صحیح صحیح بات بتا دے۔ فاطمہ بنت قیس بنی نضیر نے معاویہ اور ابوہریرہ بنی نضیر سے کسی ایک کے ساتھ نکاح کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: «أَمَا أَبُو جَهْمٍ فَلَا يَضَعُ عَصَاهُ عَنْ عَاتِقِهِ،

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۗ إِنَّ

اے لوگو! بے شک ہم نے تمہیں ایک نر اور ایک مادہ سے پیدا کیا اور ہم نے تمہیں قومیں اور قبیلے بنا دیا، تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، بے شک تم میں سب سے عزت والا اللہ کے نزدیک وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے،

وَأَمَّا مُعَاوِيَةُ فَمَضَعُونَا لَا مَالَ لَهُ، انكحى أسامة بن زيد)) مسند، الطلاق، السطفة الباش لا نفقة لها : ۱۶۸۰]

”ابو جہم تو عورتوں کو بہت مارتا ہے اور معاویہ کنگال آدمی ہے، اس کے پاس کچھ نہیں ہے، تم اسامہ بن زید سے نکاح کر لو۔“ اور صحیح مشورہ دینا مومن کا حق ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «وَإِذَا اسْتَنْصَحَكَ فَانصَحْ لَهُ» | مسند، السلام، باب من

حذر المسلم المسلم رد السلام ۲۱۶۲/۵ | ”اور جب وہ تم سے مشورہ مانگے تو اس کی خیر خواہی کر۔“

⑤ جو شخص کھلم کھلا اللہ کی نافرمانی کرتا ہو، لوگوں کو لوٹتا ہو، علانیہ شراب پیتا ہو تو اس کے ان گناہوں کا ذکر جائز ہے جن کو چھپانے کی وہ ضرورت ہی محسوس نہیں کرتا اور جن کا ذکر کیا جائے تو اسے برا محسوس ہی نہیں ہوتا، کیونکہ غیبت ان چیزوں کا ذکر ہے جسے وہ ناپسند کرے۔ ⑥ کوئی شخص کسی لقب کے ساتھ مشہور ہو، اس کے بغیر اس کی پہچان نہ ہوتی ہو اور وہ اسے برا بھی نہ جانتا ہو تو اسے اس لقب سے ذکر کرنا جائز ہے، خواہ اس میں اس کا کوئی نقص ہی بیان ہو رہا ہو، مثلاً اعمش (جس کی آنکھیں چندھیائی ہوئی ہوں)، امرج (انگڑا)، اصم (بہرا) اور امی (مایننا) وغیرہ۔ شرط یہ ہے کہ مقصد اس کی تنقیص نہ ہو۔

⑬ قرآن مجید کی اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلَا يَنْتَبِ بِعَضُّكُمْ بَعْضًا﴾ کہ مسلمان ایک دوسرے کی غیبت نہ کریں۔ اسی طرح ”ذخیرۃ احکام ہما بکرمۃ“ سے بھی ظاہر ہے کہ صرف مسلمان کی غیبت ناجائز ہے، کیونکہ کافر ہمارا دینی بھائی نہیں، اس لیے اس کی غیبت میں کوئی گناہ نہیں۔

آیت 13 ① يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ : پچھلی آیات میں جن چھ گناہوں سے منع فرمایا ان کا

بنیادی سبب اپنے آپ کو اونچا اور دوسروں کو نیچا سمجھنا ہے۔ جاہلیت میں اپنے قبیلے کی خوبیوں پر فخر اور دوسروں کو حقیر سمجھنے کی بیماری عام تھی۔ اس کی وجہ سے ہر قبیلے کے شاعر اور خطیب اپنے قبیلے کی برتری ثابت کرنے کے لیے دوسرے قبیلے کو استہزاء، تمسخر اور ملین و تشنیع کا نشانہ بناتے، اس کے لیے وہ ان کے عیب تلاش کرتے، جاسوسی کرتے، غیبت، بہتان اور جھوٹے بازار گرم رکھتے تھے، حتیٰ کہ انھوں نے کئی قبیلوں کو بالکل ہی لوگوں کی نگاہوں سے گرا دیا۔ دنیا میں اپنی برتری پر فخر کا باعث کسی خاص قبیلے یا قوم میں پیدا ہونا ہی نہیں رہا، اس کے علاوہ بھی کئی چیزوں کو اپنے لیے باعث فخر اور دوسروں پر برتری کی دلیل قرار دیا گیا۔ چنانچہ رنگ، نسل، وطن اور زبان کی بنا پر نوح انسان تقسیم ہوئی اور ہر طبقے نے اپنے آپ کو دوسروں سے برتر اور دوسروں کو حقیر قرار دیا، جس کے نتیجے میں بے شمار جنگیں ہوئیں اور لاکھوں کروڑوں لوگ ہلاک یا زخمی ہوئے۔ وطن سے بے وطن ہوئے، غربت، بیماری اور بے آروائی کا نشانہ بنے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے پانچ آیات میں ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا“ کے ساتھ خطاب کے بعد یہاں تمام انسانوں کو مخاطب کر کے فرمایا ”يَا أَيُّهَا النَّاسُ“ کہ اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک

اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ اتَّقَىٰ ۖ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ﴿۱۳﴾

بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا، پوری خبر رکھنے والا ہے ﴿۱۳﴾

عورت (آدم وحواءؑ) سے پیدا کیا ہے، اس لیے انسان ہونے میں تم سب برابر ہو۔ کسی خاص قوم، قبیلے یا ملک میں پیدا ہونے کی وجہ سے، یا کسی رنگ یا زبان کی وجہ سے کسی کو کسی پر کوئی برتری حاصل نہیں، کیونکہ اصل سب کی ایک ہے۔ پھر کسی قوم، ملک یا قبیلے میں پیدا ہونے یا کسی رنگ یا زبان والا ہونے میں کسی کا اپنا کوئی دخل یا اختیار نہیں، یہ سب کچھ صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ اس لیے ان میں سے کوئی چیز اللہ تعالیٰ کی نعمت یا عطیہ تو ہو سکتی ہے، جس پر اسے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے، مگر دوسروں پر برتری کا باعث نہیں ہو سکتی، کیونکہ برتری اس چیز میں کامیابی کی بدولت حاصل ہوتی ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے اسے اختیار دے کر دنیا میں بھیجا ہے اور وہ ہے اللہ کا تقویٰ۔ اس لیے سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہاں عزت والا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے۔ اس کے بغیر کسی عربی کو عجمی پر یا گورے کو کالے پر یا آزاد کو غلام پر کوئی برتری حاصل نہیں۔ ہاں، تقویٰ کے ساتھ فضیلت کی کوئی اور وجہ بھی جمع ہو جائے تو اسے برتری حاصل ہوگی، جیسے کسی کو متقی ہونے کے ساتھ قریشی یا ہاشمی ہونے کا شرف بھی حاصل ہو، یا ایسی قوم کا فرد ہونے کا جو شجاعت یا ذہانت یا کسی اور خوبی میں معروف ہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے دو آدمی قرآن کی قراءت میں برابر ہوں تو امامت کے وقت ان میں سے بڑی عمر والے کو جو ان پر مقدم کیا جائے گا۔

﴿۱۳﴾ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ: ”شُعُوبًا“ ”شَعْبٌ“ (شعین کے فتح کے ساتھ) کی جمع ہے، بہت بڑا قبیلہ، جیسے ربیعہ، مضر، اوس اور خزرج وغیرہ۔ یہ ان چھ طبقوں میں سب سے پہلا طبقہ ہے جن میں عرب تقسیم ہوتے ہیں۔ وہ چھ طبقے یہ ہیں: ① شعب ② قبیلہ ③ عمارہ ④ بطن ⑤ فخذ ⑥ فصیلہ۔ شعب میں کئی قبائل ہوتے ہیں، قبیلہ میں کئی عمار، عمارہ میں کئی بطون، بطن میں کئی فخاذ، اور فخذ میں کئی فصائل ہوتے ہیں۔ چنانچہ عرب میں خزیمہ شعب، کنانہ قبیلہ، قریش عمارہ، قصی بطن، ہاشم فخذ اور عباس فصیلہ ہیں۔ بعض اوقات ان میں سے ایک لفظ دوسرے کی جگہ بھی استعمال کر لیا جاتا ہے۔ شعب کا معنی شاخ ہے، اسے شعب اس لیے کہا جاتا ہے کہ ان سے قبائل کی شاخیں نکلتی ہیں۔ قرآن مجید میں ان چھ طبقوں میں سے تین کا ذکر آیا ہے، دو کا اس آیت میں اور ایک کا سورہ معارج میں، فرمایا: ﴿وَفَصِيلَتِهِ الَّتِي تُؤْتِيهِ﴾ [المعارج: ۱۳] اور اپنے خاندان کو جو اسے جگہ دیا کرتا تھا، ”(قرطبی و شافعی)

﴿۱۴﴾ لِمَعَارِفُهَا: یعنی قوموں، قبیلوں یا خاندانوں میں تقسیم کا مطلب کسی کی برتری نہیں، بلکہ ہم نے یہ تقسیم تمہاری ایک دوسرے سے پہچان کے لیے بنائی ہے۔ مثلاً عبد اللہ نام کے کئی آدمی ہیں، ان میں سے ایک کی تعین قریشی، اس کے بعد ہاشمی اور اس کے بعد عباسی کے ساتھ ہو سکتی ہے۔ اس پہچان ہی کے ذریعے سے آدمی اپنی رشتہ داری سے آگاہ ہوتا ہے اور رشتہ داروں کے حقوق ادا کرتا اور صلہ رحمی کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿تَعَلَّمُوا مِنْ أُنْسَابِكُمْ مَا تَصِلُونَ بِهِ أَرْحَامَكُمْ، فَإِنَّ

صَلَّةَ الرَّحِمِ مَحَبَّةً فِي الْأَهْلِ، مَثْرَاءَ فِي الْمَالِ، مَنْسَأَةً فِي الْأَثَرِ» [ترمذی، البر والصلۃ، باب ما جاء فی تعلیم النسب: ۱۹۷۹، عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ، وقال الألبانی صحیح] ”اپنے نسب سیکھو، جن کے ذریعے سے تم اپنی رشتہ داریاں ملاؤ، کیونکہ رشتہ داری کو ملانا رشتہ داروں میں محبت، مال میں ثروت اور زندگی میں اضافے کا باعث ہے۔“

④ **إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ**: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «إِنَّ اللَّهَ قَدْ أَذْهَبَ عَنْكُمْ عُبِّيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ وَفَخَّرَهَا بِالْأَبَاءِ، مُؤْمِنٌ تَقِيٌّ وَفَاجِرٌ شَقِيٌّ، أَنْتُمْ بَنُو آدَمَ وَآدَمُ مِنْ تُرَابٍ لَيَدَعَنَّ رِجَالَ فَخْرَهُمْ بِأَقْوَامٍ إِنَّمَا هُمْ فَحْمٌ مِنْ فَحْمِ جَهَنَّمَ، أَوْ لَيَكُونُنَّ أَهْوَنَ عَلَى اللَّهِ مِنَ الْجِجَلَانِ الَّتِي تَذْفَعُ بِأَنْفِهَا النَّسْنَ» [ابو داؤد، الأدب، باب فی التفاخر بالأحساب: ۵۱۱۶، عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ، وقال الألبانی صحیح] ”اللہ تعالیٰ نے تم سے جاہلیت کی نخوت اور اس کے آباد اجداد پر فخر کو ختم کر دیا ہے۔ (آدی دوسری قسم کے ہیں) متقی مومن ہے یا بد بخت فاجر۔ تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے تھے۔ کچھ آدمی ایسے لوگوں پر اپنا فخر ترک کر دیں گے جو جہنم کے کونکوں میں سے محض ایک کونکہ ہیں، یا پھر وہ (فخر کرنے والے) اللہ تعالیٰ کے سامنے پاخانے کے کیڑوں سے بھی زیادہ ذلیل ہوں گے، جو گندگی کو اپنی ناک کے ساتھ دھکیلتے رہتے ہیں۔“ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: «أَيُّ النَّاسِ أَكْرَمُ؟» «لوگوں میں سب سے عزت والا کون ہے؟» آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «أَكْرَمُهُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاهُمْ» ”ان میں سب سے زیادہ عزت والا اللہ کے نزدیک وہ ہے جو ان میں سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے۔“ انھوں نے کہا: ”ہم آپ سے اس کے متعلق نہیں پوچھ رہے۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «فَأَكْرَمُ النَّاسِ يُوسُفُ نَبِيُّ اللَّهِ ابْنُ نَبِيِّ اللَّهِ ابْنِ خَلِيلِ اللَّهِ» ”تو سب سے زیادہ عزت والے یوسف علیہ السلام ہیں جو اللہ کے نبی ہیں، نبی کے بیٹے ہیں، دادا بھی نبی ہے اور پردادا اللہ کا خلیل ہے۔“ انھوں نے کہا: ”ہم آپ سے اس کے متعلق بھی نہیں پوچھ رہے۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «فَعَنْ مَعَادِنِ الْعَرَبِ تَسْأَلُونَنِي؟» ”تو پھر تم مجھ سے عرب کے خاندانوں کے متعلق پوچھ رہے ہو؟“ انھوں نے کہا: ”جی ہاں!“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «فَخِيَارُكُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُكُمْ فِي الْإِسْلَامِ إِذَا فَهَمْتُمْ» [بخاری، التفسیر، باب قوله: ﴿لَقَدْ كَانَ فِي يُوسُفَ وَإِخْوَتِهِ﴾: ۴۶۸۹] ”تو جاہلیت میں جو تم میں سب سے بہتر تھے وہی اسلام میں تم سب سے بہتر ہیں، جب وہ (دین کی) سمجھ حاصل کر لیں۔“ ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ مجھے اس صحابی نے بیان کیا جس نے ایام تشریق کے درمیان والے دن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «يَا أَيُّهَا النَّاسُ! أَلَا إِنَّ رَبَّنَا وَاحِدٌ، وَإِنَّ آبَاءَكُمْ وَاحِدٌ، أَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلَى أَعْجَمِيٍّ، وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلَى عَرَبِيٍّ، وَلَا لِأَحْمَرَ عَلَى أَسْوَدَ، وَلَا لِأَسْوَدَ عَلَى أَحْمَرَ، إِلَّا بِالتَّقْوَى» [مسند احمد: ۴۱۱/۵، ح: ۲۳۴۸۹، قال شعيب الأرنؤوط إسناده صحيح] ”اے لوگو! سن لو! تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ ایک ہے۔ سن لو! نہ کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی برتری حاصل ہے اور نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر، نہ کسی سرخ کو کسی کالے پر اور نہ کسی کالے کو کسی سرخ پر، مگر تقویٰ کی بنا پر۔“ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «إِنَّ اللَّهَ لَا يَنْظُرُ إِلَى صُورِكُمْ وَأَمْوَالِكُمْ

قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوا وَلَكِنْ قَوْلُوا أَسَلْنَاكُمْ وَإِنَّمَا كُنْتُمْ مَلَائِكَةً مِّنْ قَبْلُ وَإِنَّمَا اتَّخَذْتُم مِّن دُونِ اللَّهِ حُمْرًا بُرُوقًا ۚ قُلْ إِنَّمَا أَدْرَأْتُكُمْ الْبَاءَ لَوْلَا أَن يَأْتِيَنَّكُمْ رَسُولٌ مِّنْ بَيْنِ أَيْدِيكُمْ أَوْ مِن وَرَائِكُمْ أَتَأْتُونَ بِالْبَيِّنَاتِ ۚ قُلْ إِنَّمَا أُوْحِيَ إِلَيَّ أَن تَوَاضَعُوا خِلَافِي أَتَأْتُونَ بِلَايِحَاتِي ۚ قُلْ إِنَّمَا أَسْأَلُكَمُ اتَّقِ اللَّهَ تَعَالَىٰ ۚ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ ۚ إِنَّمَا أُوتِيَ السُّرَّةَ أُولُو الْأَلْبَابِ ۚ قُلْ اللَّهُ عَالِمُ الْغُيُوبِ ۚ

وَلَكِنْ يَنْظُرُ إِلَيْهِ قُلُوبُكُمْ وَأَعْمَالُكُمْ» | مسطورہ نمبر و نصفہ، باب تحریرہ صفہ اللہ : ۲۵۶، ۲۵۷ | "اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور تمہارے مالوں کو نہیں دیکھتا، بلکہ وہ تمہارے دلوں اور تمہارے عملوں کو دیکھتا ہے۔" عیض بن حمار مجاشع بن جهمون نے ایک لمبی حدیث میں بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «وَأَنَّ اللَّهَ يُوحِي إِلَيَّ أَن تَوَاضَعُوا خِلَافِي لَا يَنْفَخِرَ أَحَدٌ عَلَيَّ عَلَيَّ وَلَا يَنْبَغِي أَحَدٌ عَلَيَّ أُخِيذُ» | مسطورہ نمبر و نصفہ، باب تصدقات النبی عرفی عرفی : ۲۵۶، ۲۵۷ | "اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی فرمائی کہ آپس میں تواضع اختیار کرو، حتیٰ کہ ت کوئی کسی پر فخر کرے اور نہ کوئی کسی پر زیادتی کرے۔"

5 اہل علم نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ نکاح میں شو (جوز) ہونے کے لیے اسلام کے علاوہ کوئی شرط معتبر نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی پھوپھی کی بیٹی زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کا نکاح اپنے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے کر دیا۔ اس لیے یہ جو مشہور ہے کہ سید لڑکی کا نکاح غیر سید سے نہیں ہو سکتا، درست نہیں۔ ویسے فاضلہ رحمہا کی اولاد کو لفظ "سید" کے ساتھ خاص کرنا بھی محض رواج ہے۔ یہاں رسول اللہ ﷺ کا بیچا ہونے کے باوجود ابولہب جنہمی ہے اور غلام ہونے کے باوجود ہاں رضی اللہ عنہ کے جوتوں کی آواز جنت میں رسول اللہ ﷺ کے آگے (بظور خادم) سنائی دے رہی ہے اور جابر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: «أَبُو بَكْرٍ سَيِّدُنَا، وَأَعْتَقَ سَيِّدُنَا يَعْجَبِي بِلَايَا» | بحاری، فضائل الصحابة النبی ﷺ، باب مسند نلال بن رباح : ۳۷۵۴ | "ابو بکر ہمارا سید ہے اور اس نے ہمارے سید بلال کو آزاد کیا۔"

6 إِنْ اللَّهُ عَلَيْهِمْ حَظِيرًا : یعنی اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا، پوری خبر رکھنے والا ہے۔ وہی جانتا ہے کہ کس کے دل میں تقویٰ زیادہ ہے، جس کی وجہ سے اسے سب سے زیادہ معزز ہونے کا شرف حاصل ہے۔ تو جب کسی کو دلوں کا حال معلوم ہی نہیں تو کوئی کسی پر فخر کیسے کر سکتا ہے اور کسی کو حقیر کیوں جانتا ہے؟

آیت 14 1 قَالَتِ الْأَعْرَابُ : "الْأَعْرَابُ" کی تشریح کے لیے دیکھیں سورہ توبہ (۹۷) کی تفسیر۔ یہاں "الْأَعْرَابُ" پر الف لام جنس کا نہیں بلکہ عہد کا ہے اور اس سے مراد تمام اعراب نہیں، کیونکہ ان میں کئی مخلص مومن بھی تھے۔ (دیکھیے توبہ: ۹۹) بلکہ مراد وہ بعض اعراب ہیں جو مدینہ کے گرد رہتے تھے اور اسلام کی قوت کو دیکھ کر مسلمان ہو گئے تھے، دل میں تکذیب بھی نہیں تھی کہ انھیں منافق کہہ جاسکے مگر ابھی تک کچھ تردد باقی تھا اور ایمان و یقین پوری طرح دل میں داخل نہیں ہوا تھا، اس لیے یہ عمرہ حدیبیہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نہیں گئے۔ ان کا ذکر اس سے پہلے سورہ فتح کی آیت (۱۱) : ﴿سَيَقُولُ لَكَ اللَّهُ خَلْفُونَ مِنَ الْأَعْرَابِ﴾ میں بھی کر رہا ہے۔

2 أمّا: سورت کی ابتدا میں ان اعراب کا ذکر ہے جو نئے نئے مسلمان ہوئے تھے اور ابھی تک رسول اللہ ﷺ کے آداب

قُلُوبِكُمْ ۚ وَإِنْ تُطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَا يَلِكُمْ مِنْ أَعْمَالِكُمْ شَيْئًا ۚ إِنَّ اللَّهَ عَفُوفٌ

نَحِيمٌ ﴿۱۳﴾

تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانو گے تو وہ تمہیں تمہارے اعمال میں کچھ کمی نہیں کرے گا، بے شک اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۱۳﴾

اور اسلام کے دوسرے احکام سے پوری طرح واقف نہیں تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان آداب و احکام کی تلقین فرمائی اور جاہلیت کے فخر و غرور اور اس سے پیدا ہونے والی قباحتوں سے منع فرمایا۔ اس سلسلے میں واضح فرمایا کہ آدمی کو دوسروں پر فخر کا حق ہی نہیں، کیونکہ وہ عزت جو دوسروں پر برتری دلاتی ہے وہ صرف تقویٰ سے حاصل ہوتی ہے، جس کا تعلق دل سے ہے اور دل کا حال صرف عظیم و خمیر جانتا ہے۔ یہاں سے ان اعراب کے کچھ دعوے ذکر فرما کر، جن سے ان کے فخر کا اظہار ہوتا تھا، ان کی تردید فرمائی۔ سب سے پہلے ان کے اس دعوے کا ذکر فرما کر کہ ہم ایمان لے آئے ہیں، اس کی نفی فرمائی۔

﴿۱۳﴾ قُلْ لَمْ نُؤْمِنُوا وَلَكِنْ قَوْلُوا أَسَلْنَا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا، ان سے کہو کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ یوں کہو کہ ہم اسلام لے آئے۔ واضح رہے کہ قرآن و حدیث میں عام طور پر ایمان اور اسلام ایک ہی معنی میں استعمال ہوئے ہیں، جس میں دل کا یقین اور ظاہری فرماں برداری دونوں شامل ہیں، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے بنو عبدالمطلب کو ایمان کی تشریح کرتے ہوئے بتایا کہ ایمان کلمہ شہادت، نماز، روزے، زکوٰۃ، حج اور غنیمت میں سے جس ادا کرنے کا نام ہے اور اللہ تعالیٰ نے ”إِنَّ الَّذِينَ عِنْدَ اللَّهِ الْأِسْلَامُ“ کہہ کر اپنی جناب میں معتبر دین اسلام کو قرار دیا اور ظاہر ہے وہاں وہی دین معتبر ہے جو دل کے یقین سے ہو، صرف ظاہری اعمال تو وہاں کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔ بعض اوقات اسلام سے مراد ظاہری احکام کی پابندی اور ایمان سے مراد قلبی یقین ہوتا ہے، جیسا کہ حدیث جبریل میں ہے۔ یہاں بھی ایسا ہی ہے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہمیشہ ایمان سے مراد دلی یقین اور اسلام سے مراد ظاہری اعمال ہوتے ہیں، بلکہ بعض اوقات اسلام سے مراد دل سے مان لینا ہوتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿فَمَنْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ يَهْدِيَهُ يَفْرَحْهُ صَدْرَةَ لِلْإِسْلَامِ﴾ [الأنعام: ۱۲۵] ”تو وہ شخص جسے اللہ چاہتا ہے کہ اسے ہدایت دے، اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے۔“ جس طرح بعض اوقات ایمان سے مراد صرف زبانی کلمہ پڑھنا ہوتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ﴾ [النساء: ۱۳۶] ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! (یعنی جنھوں نے ایمان کا اقرار کیا ہے) ایمان لے آؤ (یعنی دل سے مان لو)۔“ یہاں فرمایا، ان سے کہو کہ تم ایمان نہیں لائے، بلکہ یوں کہو کہ ہم اسلام لے آئے ہیں۔ یعنی ہم کلمہ پڑھ کر اسلام میں داخل ہو گئے ہیں اور اس کے ظاہری احکام پر عمل شروع کر دیا ہے۔ یہاں الفاظ پر غور فرمائیں، اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ ”قُلْ لَمْ نُؤْمِنُوا وَلَكِنْ أَسَلْنَا“ ”ان سے کہو کہ تم ایمان نہیں لائے، بلکہ تم مسلم ہو گئے ہو۔“ بلکہ فرمایا: ﴿لَمْ نُؤْمِنُوا وَلَكِنْ قَوْلُوا أَسَلْنَا﴾ ”تم ایمان نہیں لائے، بلکہ یوں کہو کہ ہم اسلام لے آئے ہیں۔“ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کے مومن ہونے کی نفی کے بعد ان کے مسلم ہونے کو تسلیم نہیں کیا، بلکہ یہ فرمایا

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ
وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۗ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ ﴿۱۵﴾

مومن تو وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے، پھر انھوں نے شک نہیں کیا اور انھوں نے اپنے مالوں
اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ یہی لوگ سچے ہیں ﴿۱۵﴾

کہ تم مسلم ہونے کا دعویٰ کر سکتے ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مسلم وہی تسلیم ہو سکتا ہے جو مومن بھی ہو۔ اس کے ہاں اگر کسی
کے دل میں یقین نہیں تو ظاہری اعمال کا بھی کچھ اعتبار نہیں۔ ہاں، ظاہری طور پر اسلامی احکام کی پابندی کرنے والے کو اللہ
تعالیٰ کی طرف سے اسلام کا دعویٰ کرنے کی اجازت ہے۔

﴿۱۴﴾ وَ لَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ : ”اور ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا“ اس جملے سے ظاہر ہے کہ
یہ لوگ اگرچہ بچے مومن نہیں تھے مگر منافق بھی نہیں تھے، کیونکہ وہ دل سے رسول اللہ ﷺ کو جھوٹا نہیں جانتے تھے۔ ان کے
شک کی وجہ سے ان کے ایمان کی نفی کی گئی اور اگلی آیت میں مومن ان لوگوں کو قرار دیا جو ایمان لائے پھر انھوں نے شک نہیں
کیا۔ ”لَمَّا“ کے لفظ سے ظاہر ہے کہ اگرچہ وہ ابھی تک ایمان نہیں لائے تھے، مگر آئندہ ان کے دلوں کے اندر ایمان داخل
ہونے کی امید تھی۔

﴿۱۵﴾ وَإِنْ تُطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَا يَلِتْكُمْ : ”لَا يَلِتْ“ اصل میں ”لَا يَلِيتُ“ تھا، ”إِنْ تُطِيعُوا“ شرط کا جواب
ہونے کی وجہ سے تاء پر جزم آگئی، تو تاء اور تاء دوساکن جمع ہونے کی وجہ سے یاء گر گئی۔ ”لَا يَلِيتُ“ کسی کے حق میں کمی
کرنا۔ یعنی اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال میں کچھ کمی نہیں کرے گا۔ ظاہر ہے ان
دونوں کی اطاعت کی شرط اول ان پر سچے دل سے ایمان و یقین رکھنا ہے۔ اس میں انھیں اخلاص و یقین کی ترغیب دلائی ہے،
یعنی اسلام کے احکام پر ثواب کی امید بھی اس وقت ہو سکتی ہے جب ظاہر و باطن سے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت ہو۔
یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے بعد اعمال کا پورا ثواب دینا اور اس میں کمی نہ کرنا صرف
اللہ کا کام ہے، رسول کا نہیں۔ اس لیے ”لَا يَلِيتُ“ واحد کا صیغہ استعمال فرمایا۔

﴿۱۶﴾ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ : یعنی اطاعت کے بعد پہلی کوتاہیوں کو اللہ معاف کر دے گا، کیونکہ وہ گناہوں پر بے حد پردہ
ڈالنے والا اور نہایت رحم والا ہے۔

آیت 15 ﴿۱۵﴾ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ : ”لَمْ يَرْتَابُوا“ ”رَبْت“ سے باب افتعال ہے۔ اعراب
(بدویوں) کے ایمان کے دعوے کی نفی کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایمان کی ایک باطنی اور ایک ظاہری شرط بیان فرمائی۔ چنانچہ فرمایا
مومن تو صرف وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے، پھر شک میں مبتلا نہیں ہوئے اور انھوں نے اپنے ایمان و یقین کا ثبوت مال و
جان کے ساتھ اللہ کے راستے میں جہاد کرنے کے ساتھ دیا۔ یہی لوگ ہیں جو ایمان کے دعوے میں سچے ہیں۔ رہے وہ لوگ
کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

قُلْ أَتَعْلَمُونَ اللَّهَ بِدِينِكُمْ ۖ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿۱۶﴾ يَمُنُونَ عَلَيْكَ أَنْ أَسْلَمُوا ۗ قُلْ لَا تَمُنُوا عَلَيَّ إِلَّا بِإِسْلَامِكُمْ ۗ بَلِ اللَّهُ يَمُنُ عَلَيْكُمْ

أَنْ هَدَيْتُمْ لِلْإِيمَانِ إِنَّ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۱۶﴾

کہہ دے کیا تم اللہ کو اپنے دین سے آگاہ کر رہے ہو، حالانکہ اللہ جانتا ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے ﴿۱۶﴾ وہ تجھ پر احسان رکھتے ہیں کہ وہ اسلام لے آئے، کہہ دے مجھ پر اپنے اسلام کا احسان نہ رکھو، بلکہ اللہ تم پر احسان رکھتا ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کے لیے ہدایت دی، اگر تم سچے ہو ﴿۱۶﴾

جو دعویٰ ایمان کا کرتے ہیں مگر جب جہاد کا موقع آتا ہے تو اس سے جان بچاتے ہیں، وہ اپنے دعویٰ میں جھوٹے ہیں۔

آیت 16 : قُلْ أَتَعْلَمُونَ اللَّهَ بِدِينِكُمْ : "تَعْلَمُونَ" "عَلِمَ يَعْلَمُ تَعْلِيمًا" (تفعیل) کا معنی سکھانا پڑھانا ہے۔ تعلیم کسی کو کوئی بات بتانے کا سب سے مضبوط اور پختہ طریقہ ہوتا ہے۔ چونکہ وہ بار بار اپنے ایمان کا اور دین دار ہونے کا دعویٰ کرتے تھے، ان کے بار بار دعویٰ کو اللہ تعالیٰ نے سکھانا پڑھانا قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ کیا تم اللہ تعالیٰ کو سکھانے چلے ہو کہ تم کے مومن اور دین دار ہو اور یہ سمجھے بیٹھے ہو کہ اسے تمہارے دل کا حال معلوم نہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ تو آسمانوں کی ہر چیز کو اور زمین کی ہر چیز کو جانتا ہے اور اللہ ہر چیز کو پوری طرح جاننے والا ہے۔ اس آیت میں قابل توجہ بات لفظ "اللہ" کا بار بار ذکر ہے : ﴿أَتَعْلَمُونَ اللَّهَ بِدِينِكُمْ ۖ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾ اپنا نام بار بار ذکر کرنے سے مقصود اپنی ہیبت اور عظمت کا احساس دلانا ہے کہ سوچو تم بار بار ایمان کا دعویٰ کر کے کسی عام ہستی کو نہیں بلکہ کائنات کے خالق و مالک کو سکھانے جا رہے ہو، جس کا نام "اللہ" ہے اور جس سے کوئی چیز مخفی نہیں۔

آیت 17 : ﴿يَمُنُونَ عَلَيْكَ أَنْ أَسْلَمُوا ۗ اعراب یہ کہتے ہوئے کہ "أَمَنَّا" (ہم ایمان لے آئے) دراصل رسول اللہ ﷺ پر اپنے مسلمان ہونے کا احسان جتلا رہے تھے۔ ان کے خیال میں یہ ان کا رسول اللہ ﷺ پر احسان تھا جس کا آپ ﷺ کو خیال رکھنا چاہیے تھا اور اس کے بدلے میں ان کے تقاضے اور فرمائشیں پوری کرنی چاہیے تھیں، جیسے چودھری اور سردار کسی سیاسی پارٹی میں شامل ہو کر اس پر احسان رکھتے ہیں اور پارٹی کے سربراہ سے اپنے مفادات حاصل کرتے ہیں۔

﴿قُلْ لَا تَمُنُوا عَلَيَّ إِلَّا بِإِسْلَامِكُمْ﴾ : اللہ تعالیٰ نے فرمایا، ان سے کہہ دیجیے کہ اپنے اسلام کا مجھ پر احسان مت رکھو، کیونکہ کوئی مسلمان ہوتا ہے تو اس کا فائدہ اسی کو ہے، اگر نہیں ہوتا تو اس کا نقصان بھی اسی کو ہے، جیسا کہ فرمایا : ﴿مَنْ عَمِلْ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ ۖ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا﴾ [ختم السجدة : ۴۶] "جس نے کوئی نیک عمل کیا تو وہ اس کے لیے ہے اور جس نے برائی کی تو وہ اسی پر ہے۔" تمہارے اسلام لانے یا نہ لانے سے میرا کوئی مفاد وابستہ نہیں۔

﴿بَلِ اللَّهُ يَمُنُ عَلَيْكُمْ أَنْ هَدَيْتُمْ﴾ : یہاں بظاہر یہ کہنا چاہیے تھا کہ تم مجھ پر اپنے اسلام کا احسان مت رکھو، بلکہ میرا تم پر

إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿۱۸﴾

بے شک اللہ آسمانوں اور زمین کی چھپی چیزوں کو جانتا ہے اور اللہ خوب دیکھنے والا ہے جو کچھ تم کر رہے ہو ﴿۱۸﴾

احسان ہے کہ میری وجہ سے تم اسلام لائے، مگر اللہ تعالیٰ نے یہ کہنے کی تعلیم دی کہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنا احسان جتلاتا اور یاد کروانا ہے کہ اس نے تمہیں ایمان لانے کی ہدایت دی، یعنی اس کی توفیق بخشی، کیونکہ رسول اللہ ﷺ بھی اگرچہ ہدایت دیتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ﴾ [الشوری: ۵۲] ”اور بلاشبہ تو یقیناً سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔“ مگر آپ صرف صراطِ مستقیم کی راہنمائی کر سکتے ہیں، وہ ہدایت جو صراطِ مستقیم پر چلنے کا نام ہے اس کی توفیق صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، اس لیے فرمایا: ﴿إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَ لَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ﴾ [الفصل: ۵۶] ”بے شک تو ہدایت نہیں دیتا جسے تو دوست رکھے اور لیکن اللہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔“ اور اگر اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایمان کی توفیق دی تو اس میں سراسر تمہارا فائدہ ہے، اللہ تعالیٰ کو تم کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے، نہ نقصان پہنچا سکتے ہو۔ تم ہی کیا، اگر ساری مخلوق بھی جمع ہو جائے تو نہ اللہ تعالیٰ کو کوئی فائدہ پہنچا سکتی ہے اور نہ اسے کوئی نقصان پہنچا سکتی ہے، پھر اس پر یا اس کے رسول پر احسان رکھنے کا کیا مطلب؟

﴿۴﴾ **إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ**: یعنی اللہ تعالیٰ کا ایمان کی ہدایت دینے کا احسان بھی تم پر اسی صورت میں ہے اگر تم اپنے ایمان کے دعوے میں سچے ہو، ورنہ ابھی تک تمہارے دعوے کی تصدیق نہیں ہوئی۔

آیت 18 إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ..... : اس سے پہلے یہ ذکر ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ وہ تمام چیزیں جانتا ہے جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو پوری طرح جاننے والا ہے۔ اس آیت میں اسی کی مزید تاکید فرمائی کہ یہ نہ سمجھنا کہ وہ آسمان و زمین کی انہی اشیاء کو جانتا ہے جو ظاہر ہیں، بلکہ وہ ان اشیاء کو بھی جانتا ہے جو نگاہوں سے غائب ہیں، خواہ پہلے گزر چکی ہیں یا اب موجود ہیں یا آئندہ ہوں گی اور تم جو کچھ کر رہے ہو یا آئندہ کرو گے اللہ تعالیٰ اسے خوب دیکھنے والا ہے۔ نظم الدرر میں ہے، قُشَيْرِي نے کہا: ”جو شخص یہاں ٹھہر کر تھوڑا سا غور و فکر کرے گا اس کا عیشِ مکرر ہو جائے گا، کیونکہ کسی کو خبر نہیں کہ اس کے غیب میں کیا لکھا ہے اور اس کا انجام کیا ہونے والا ہے اور ایمان کی نعت اس کے پاس موت تک رہے گی یا نہیں۔ پھر دعویٰ کس بات کا اور احسان کیسا؟ یہی معنی اس شعر میں ادا ہوا ہے۔“

أُبْكِي وَ هَلْ تَذَرِينِ مَا يُبْكِينِي أُبْكِي حَذْرًا أَنْ تُفَارِقِينِي
وَ تَقْطَعِي حَبْلِي وَ تَهْجُرِينِي

”میں روتی ہوں اور کیا تو جانتی ہے کہ مجھے کیا چیز رلاتی ہے؟ میں اس ڈر سے روتی ہوں کہ تو مجھ سے جدا نہ ہو جائے، مجھ سے قطع تعلق نہ کر لے اور مجھے چھوڑ نہ دے۔“

ق ق ۵۰ وَ الْقُرْآنِ الْمَجِيدِ ①

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

ق۔ قسم ہے قرآن کی جو بہت بڑی شان والا ہے! ①

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بڑے مجموعوں کے مواقع پر عموماً اس سورت کی تلاوت فرمایا کرتے تھے، مثلاً عید اور جمعہ۔ اس کے علاوہ فجر کی نماز میں بھی اس کی قراءت فرمایا کرتے تھے، کیونکہ یہ ابتدائے خلق، بعثت، نشور، معاد، قیام، حساب، جنت، جہنم، ثواب، عقاب اور ترغیب و ترہیب پر مشتمل ہے۔“ (ابن کثیر) عبید اللہ بن عبد اللہ بیان کرتے ہیں کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ابو واقد لیشی رضی اللہ عنہ سے پوچھا: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید الاضحیٰ اور عید الفطر میں کیا پڑھا کرتے تھے؟“ تو انھوں نے کہا: ”آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان دونوں نمازوں میں ”ق ق ۵۰ وَالْقُرْآنِ الْمَجِيدِ“ اور ”اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ“ پڑھا کرتے تھے۔“ [مسلم، صلاة العیدین، باب ما یقرأ بہ فی صلاة العیدین : ۸۹۱] ام ہشام بنت حارثہ بن نعمان رضی اللہ عنہما فرماتی ہیں: ”میں نے سورۃ ق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سن کر ہی یاد کی ہے، آپ ہر جمعہ کو منبر پر خطبہ دیتے ہوئے اسے پڑھا کرتے تھے۔“ [مسلم، الجمعة، باب تخفیف الصلاة و الخطبة : ۸۷۳] جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: «إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَقْرَأُ فِي الْفَجْرِ بِ (ق ق ۵۰ وَالْقُرْآنِ الْمَجِيدِ) وَكَانَ صَلَاتُهُ بَعْدَ تَخْفِيفًا» [مسلم، الصلاة، باب القراءة في الصبح : ۴۵۸] ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی نماز میں سورۃ ق پڑھا کرتے تھے، اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز ہلکی ہوتی تھی۔“ بعض علماء نے ”وَكَانَ صَلَاتُهُ بَعْدَ تَخْفِيفًا“ کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ اس کے بعد کی باقی نمازیں ہلکی ہوتی تھیں۔

آیت ۱ ① ق : مفسر ابن کثیر نے فرمایا: ”ق“ ان حروف تہجی میں سے ہے جو سورتوں کی ابتدا میں مذکور ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”ص“، ”ن“، ”الو“، ”حم“، ”طس“ وغیرہ۔ یہ مجاہد کا قول ہے۔ ہم سورۃ بقرہ کے شروع میں اس پر کلام کر چکے ہیں جسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ (ہماری اس تفسیر میں بھی سورۃ بقرہ کے شروع میں اس پر کلام گزر چکا ہے) بعض سلف سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا ”ق“ ایک پہاڑ ہے جو ساری زمین کو گھیرے ہوئے ہے، اسے جبل قاف کہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے (واللہ اعلم) کہ یہ بنی اسرائیل کی خرافات سے ہے جو بعض لوگوں نے یہ سمجھ کر لے لی ہیں کہ بنی اسرائیل سے وہ روایات لینا جائز ہیں جنہیں ہم نہ سچا کہیں نہ جھوٹا۔ میرے نزدیک یہ اور اس جیسی دوسری باتیں بنی اسرائیل کے دشمن دین اور زندیق لوگوں کی گھڑی ہوئی ہیں، جن کے ذریعے سے وہ لوگوں کے دلوں میں ان کے دین کے بارے میں شکوک پیدا کرنا چاہتے تھے۔ جیسا کہ ہماری امت میں بڑے بڑے جلیل القدر علماء و حفاظ اور ائمہ کی موجودگی کے باوجود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جھوٹی روایات گھڑ کر بیان کی گئی ہیں، حالانکہ کوئی زیادہ مدت بھی نہیں گزری۔ تو اتنی لمبی مدت میں بنی اسرائیل کا کیا حال ہوگا جن میں تنہید کرنے والے حفاظ بہت کم تھے، شرابیں پی جاتی تھیں اور ان کے علماء اللہ کے کلام اور اس کی آیات

میں لفظی اور معنوی تحریف اور تبدیلی کیا کرتے تھے۔ شارع نے یہ کہہ کر کہ ”حَدِّثُوا عَنِّي بِسَرَاتِي وَلَا حَرَجَ“ (بنی اسرائیل سے بیان کرو اور کوئی حرج نہیں) صرف ان روایات کی اجازت دی ہے جنہیں عقل ممکن قرار دیتی ہو، رہی وہ باتیں جو عقلاً محال اور واضح طور پر باطل ہیں، وہ اس فرمان میں شامل نہیں ہیں۔“ (ابن کثیر) ”حَدِّثُوا عَنِّي بِسَرَاتِي وَلَا حَرَجَ“ کی تفسیر جو ابن حبان رضی اللہ عنہ نے فرمائی ہے، اس تفسیر کے مقدمہ میں اسرائیلیات پر کلام میں ملاحظہ فرمائیں۔

اس کے بعد ابن کثیر نے ابن ابی حاتم کے حوالے سے ایک روایت نقل فرما کر اس کی تردید کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس زمین کے پیچھے ایک سمندر پیدا فرمایا ہے جو اسے گھیرے ہوئے ہے، پھر اس کے پیچھے ایک پہاڑ پیدا فرمایا ہے جسے ”کوہ قاف“ کہا جاتا ہے، جس کے اوپر آسمان دنیا ہے۔ اسی طرح سات زمینیں ہیں جن میں ہر ایک کے پیچھے ایک سمندر اور ایک کوہ قاف ہے۔ غرض لمبی روایت ہے جو عقل و نقل اور مشاہدے کے صریح خلاف ہے۔ اگر واقعی قاف کسی پہاڑ کا نام بھی ہوتا تو اسے ”قی“ کے بجائے ”قاف“ لکھا جاتا۔ معلوم ہوتا ہے مسلمانوں میں کوہ قاف اور اس کی پریوں کے افسانے ایسی ہی روایتوں سے رائج ہوئے ہیں اور کتب تفسیر میں نقل ہونے کی وجہ سے طحہ اور بے دین لوگوں کو اسلام اور قرآن و سنت پر اعتراض کا موقع مل گیا ہے، حالانکہ قرآن و سنت دونوں ایسی فضول باتوں سے پاک ہیں۔ غیر محتاط اور مکھی پر مکھی مارنے والے مفسرین کی باتوں کو لے کر اسلام پر اعتراض صرف بد باطن اور بدنیت لوگ ہی کرتے ہیں، اہل تحقیق کا یہ شیوہ نہیں۔

② وَالْقُرْآنَ الْمَجِيدَ : قسم کسی بات کی تاکید کے لیے اٹھائی جاتی ہے، وہ تاکید یا تو اس چیز کی عظمت کی بنا پر ہوتی ہے جس کی قسم اٹھائی گئی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ اور اس کے اسمائے حسنیٰ کی قسم ہے، یا قسم کے اس بات کی دلیل اور شاہد ہونے کی بنا پر ہوتی ہے جو قسم کے جواب میں آ رہی ہو۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے قرآن کی قسم اس کے عظیم مجد و شرف کی بنا پر اٹھائی ہے اور اس بنا پر بھی کہ قرآن آپ ﷺ کے رسولِ برحق ہونے کی دلیل ہے۔ اس کا جواب قسمِ محذوف ہے جو اگلی آیت: ﴿بَلْ عَجَبُوا أَنْ جَاءَهُمْ مُنذِرٌ مِنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُونَ هٰذَا سَمِيٌّ وَعَجِيْبٌ﴾ سے سمجھ میں آ رہا ہے۔ اگلی آیت میں پہلی بات جس پر کفار کے تعجب کا ذکر ہے، یہ ہے کہ ان کی طرف خود ان میں سے ایک پیغمبر کیسے مبعوث ہو گیا؟ وہ تو کوئی فرشتہ ہونا چاہیے تھا۔ جواب قسم اس مفہوم کا جملہ ہوگا: ”إِنَّكَ رَسُولُ اللَّهِ حَقًّا وَمَا رَدُّوْا أَمْرَكَ بِسُحْتَةٍ وَلَا كَذَّبُوْكَ بِبُرْهَانٍ“ یعنی یہ عظیم الشان قرآن اس بات کی دلیل ہے کہ آپ اللہ کے سچے رسول ہیں اور کفار نے آپ کی نبوت کا انکار کسی دلیل یا حجت کی بنا پر نہیں کیا بلکہ محض اس تعجب کی بنا پر کیا ہے کہ ان کے پاس ان میں سے ایک ڈرانے والا کیسے آ گیا؟ سورہ یس میں اس قسم کا جواب محذوف نہیں بلکہ مذکور ہے، فرمایا: ﴿يٰۤسَ ۙ وَالْقُرْآنَ الْحَكِيْمَ ۙ إِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ﴾ [یس: ۱ تا ۳] ”یس۔ اس حکمت سے بھرے ہوئے قرآن کی قسم! بلاشبہ تو یقیناً بھیجے ہوئے لوگوں میں سے ہے۔“ اللہ تعالیٰ نے متعدد مقامات پر کفار کے اس تعجب اور شبہ کا ذکر فرما کر اس کا رد فرمایا ہے۔ (دیکھیے بنی اسرائیل: ۹۴) سورہ ص میں بھی ”وَالْقُرْآنَ ذِي الذِّكْرِ“ کا جواب محذوف ہے جو اس سے اگلی آیت: ﴿بَلِ الدِّیْنِ كَفْرًا فِي عِرْزَةٍ وَشِقَاقٍ﴾ سے معلوم ہو رہا ہے۔

بَلْ عَجِبُوا أَنْ جَاءَهُمْ مُنْذِرٌ مِنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُونَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيبٌ ﴿۱۰﴾ ءِ إِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ؕ ذٰلِكَ رَجْعٌ بَعِيدٌ ﴿۱۱﴾

بلکہ انھوں نے تعجب کیا کہ ان کے پاس انھی میں سے ایک ڈرانے والا آیا، تو کافروں نے کہا یہ ایک عجیب چیز ہے ﴿۱۰﴾ کیا جب ہم مر گئے اور ہم مٹی ہو گئے؟ یہ واپس لوٹنا بہت دور ہے ﴿۱۱﴾

آیت ۲ ﴿۱۰﴾ بَلْ عَجِبُوا أَنْ جَاءَهُمْ مُنْذِرٌ مِنْهُمْ: ”عَجِبُوا“ (انھوں نے تعجب کیا) میں ضمیر کفارِ قریش کے لیے ہے اور ڈرانے والے سیدنا محمد ﷺ ہیں۔ بعض نے کہا کہ ضمیر سے مراد تمام لوگ ہیں اور ”ان میں سے“ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ ان کی جنس سے ایک انسان ہیں۔ اور آپ ﷺ کی صفات میں سے ”مُنْذِرٌ“ کا ذکر اس لیے فرمایا کہ آپ انھیں دوبارہ زندہ کیے جانے، اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے اور اس کے عذاب سے ڈراتے تھے۔

آیت ۳ ﴿۱۱﴾ فَقَالَ الْكٰفِرُونَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيبٌ: یہ دوسری بات ہے جسے کفار نے عجیب قرار دیا اور وہ ہے مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا۔ یہاں ”فَقَالُوا“ کہنے کے بجائے جو یہ فرمایا ”فَقَالَ الْكٰفِرُونَ“ تو لفظ ”الْكٰفِرُونَ“ ان کی مذمت کے اظہار کے لیے ہے کہ اس تعجب کی بھی کوئی معقول وجہ نہیں، کیونکہ جس نے پہلی دفعہ انھیں پیدا کیا، جب ان کا نام و نشان تک نہ تھا، وہ دوبارہ بھی پیدا کر سکتا ہے، بلکہ یہ تعجب محض ان کے کفر اور ”میں نہ مانوں“ کی ضد کی وجہ سے ہے۔

آیت ۳ ﴿۱۱﴾ ءِ إِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا: ”إِذَا“ فعل محذوف کا ظرف ہے: ”أَيُّ أَنْزَجِعُ إِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا“ یعنی کیا ہم اس وقت دوبارہ لوٹیں گے جب ہم مر گئے اور مٹی ہو گئے۔“ مزید دیکھیے سورہ رعد (۵) اور سورہ صافات (۱۶)۔

آیت ۳ ﴿۱۱﴾ ذٰلِكَ رَجْعٌ بَعِيدٌ: یہ لوٹنا تو عقل سے بہت دور ہے، یعنی ان کے خیال میں ممکن ہی نہیں۔

آیت ۳ ﴿۱۱﴾ حقیقت یہ ہے کہ کفار نے جن باتوں کو باعث تعجب قرار دیا وہ قابل تعجب نہیں، بلکہ قابل تعجب کفار کی باتیں ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اس بات کو قابل تعجب قرار دیا کہ انھیں خبردار کرنے اور ڈرانے والا خود ان میں سے آیا، حالانکہ اپنی جنس کا فرد ڈرانے اور آگاہ کرنے میں زیادہ مخلص اور خیر خواہ ہوتا ہے۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ انسانوں کو خبردار کرنے کے لیے کوئی فرشتہ آتا، یا عربوں کی طرف کوئی چینی آتا۔ پھر وہ اس بات پر تعجب کر رہے ہیں کہ انسان رسول کیسے ہو گیا اور انھیں اس بات پر کوئی تعجب نہیں ہوتا کہ وہ پتھر کو رب مان کر اس کی پرستش کر رہے ہیں۔ پھر وہ مٹی ہو جانے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے کو عجیب کہہ رہے ہیں اور انھیں اس بات پر تعجب نہیں ہوتا کہ پہلی مرتبہ اسی مٹی سے انھیں پیدا کیا گیا اور زندگی عطا کی گئی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے قیامت کے انکار کی بات کو عجیب قرار دیا، فرمایا: ﴿وَإِنْ تَعَجَّبْتَ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءِ إِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ؕ إِنْكَارًا لِّقَوْلِ حٰنِئِ بْنِ يَدْنَظَرَ﴾ [الرعد: ۵] ”اور اگر تو تعجب کرے تو ان کا یہ کہنا بہت عجیب ہے کہ کیا جب ہم مٹی ہو جائیں گے تو کیا واقعی ہم یقیناً ایک نئی پیدائش میں ہوں گے۔“ (نہائی)

قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْأَرْضُ مِنْهُمْ، وَعِنْدَنَا كِتَابٌ حَفِيظٌ ﴿۱﴾ بَلْ كَذَّبُوا بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ فَهُمْ فِي أَمْرٍ مَرِيحٍ ﴿۵﴾

بے شک ہم جان چکے ہیں جو کچھ زمین ان میں سے کم کرتی ہے اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے جو خوب محفوظ رکھنے والی ہے ﴿۱﴾ بلکہ انہوں نے سچ کو جھٹلادیا جب وہ ان کے پاس آیا۔ پس وہ ایک اچھے ہوئے معاملے میں ہیں ﴿۵﴾

آیت 4 ﴿۱﴾ قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْأَرْضُ مِنْهُمْ: وہ دوبارہ زندہ ہونے کو اس لیے بعید کہہ رہے تھے کہ مٹی ہونے کے بعد اس کے ذرات تو سب ایک جیسے ہو جاتے ہیں، پھر جب ان کی مٹی کی دوسری مٹی سے پہچان ہی ختم ہو گئی تو وہ دوبارہ کیسے زندہ ہو سکتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس شبہ کو رد کرتے ہوئے فرمایا: ﴿قَدْ عَلِمْنَا﴾ ”یقیناً ہم جان چکے“ یعنی ہمیں پہلے ہی سے معلوم ہے کہ مرنے کے بعد زمین ان کے جسم میں سے جن جن اجزا کو کم کرے گی اور انہیں مٹی میں بدلتی جائے گی وہ کہاں کہاں ہوں گے، ہمارے علم سے ایک ذرہ بھی باہر نہیں ہے۔ ”مَنْهُمْ“ میں لفظ ”مِنْ“ تعبیض کے لیے ہے، اس میں اشارہ ہے کہ انسان کے تمام اجزا مٹی نہیں ہوتے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «لَيْسَ مِنَ الْإِنْسَانِ شَيْءٌ إِلَّا يَبْلَى إِلَّا عَظْمًا وَاحِدًا وَهُوَ عَجْبُ الدَّنْبِ وَمِنْهُ يُرَكَّبُ الْخَلْقُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ» [مسلم، الفتن، باب ما بين الفتحين: ۲۹۵۵، عن أبي هريرة رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ] ”انسان کی ہر چیز بوسیدہ ہو جاتی ہے سوائے ایک ہڈی کے جو ذم کی ہڈی ہے اور قیامت کے دن مخلوق کو اسی سے جوڑا جائے گا۔“

آیت 2 ﴿۲﴾ وَعِنْدَنَا كِتَابٌ حَفِيظٌ: ”حَفِيظٌ“ مبالغے کا صیغہ ہے۔ چونکہ لوگ لکھی ہوئی بات کو زیادہ معتبر سمجھتے ہیں اس لیے ان کی عام عادت کو مد نظر رکھتے ہوئے فرمایا، ان کا ذرہ ذرہ ہمارے علم میں ہونے کے علاوہ اس کتاب میں بھی درج ہے جو خوب محفوظ رکھنے والی ہے۔ پھر ہمارے لیے ان ذرات کو دوبارہ زندہ کرنا کیا مشکل ہے؟ ”كِتَابٌ حَفِيظٌ“ سے اکثر مفسرین نے لوح محفوظ مراد لی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی وہ سب کچھ لکھ دیا ہے جو آئندہ ہونے والا ہے، اس میں ان کے ہر ذرے کے متعلق بھی درج ہے کہ وہ کہاں ہوگا۔ ”كِتَابٌ حَفِيظٌ“ سے مراد ایسی کتاب بھی ہو سکتی ہے جس میں ہر انسان کا نام، اس کے اعمال اور اس پر زندگی میں اور موت کے بعد گزرنے والے تمام احوال ساتھ ساتھ درج ہوتے جاتے ہوں، حتیٰ کہ یہ بھی کہ مرنے کے بعد اس کے جسم کا کوئی بھی ذرہ کہاں کہاں منتقل ہوا اور کہاں موجود ہے۔ اس لیے قیامت کا انکار اس بنا پر درست نہیں کہ مٹی ہو جانے کے بعد وہ ذرات کیسے جمع کیے جائیں گے۔ کفار کو دوبارہ زندگی کا یقین دلانے کے لیے ”كِتَابٌ حَفِيظٌ“ کا یہ مفہوم الفاظ کے زیادہ قریب ہے۔ (واللہ اعلم)

آیت 5 ﴿۱﴾ بَلْ كَذَّبُوا بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ: یعنی صرف یہی نہیں کہ ان لوگوں نے اپنی جنس میں سے رسول کی آمد کو اور دوبارہ زندہ کیے جانے کو عجیب قرار دیا، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ جب ان کے پاس حق آیا تو اسے سنتے ہی کسی غور و فکر کے بغیر جھٹلادیا۔

أَفَلَمْ يَنْظُرُوا إِلَى السَّمَاءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنَاهَا وَزَيَّلْنَاهَا وَمَا لَهَا مِنْ قُرُوجٍ ①

تو کیا انھوں نے اپنے اوپر آسمان کی طرف نہیں دیکھا کہ ہم نے کیسے اسے بنایا اور اسے سجایا اور اس میں کوئی درزیں نہیں ہیں ①

② فَهَوَّ فِي أَهْلِ قُرَيْشٍ: ”مَرَجَ الْأَمْزُ، أَيْ اضْطَرَّتْ وَالنَّبَسُ وَفَسَدٌ“ ”أَهْلُ قُرَيْشٍ“ الجھا ہوا معاملہ۔ یعنی سوچے سمجھے بغیر جھٹلا دینے کے بعد اب رسول اللہ ﷺ اور قرآن کے بارے میں ان کی سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ وہ انھیں جھٹلانے کا کیا جواز پیش کریں، اس لیے وہ کبھی ایک بات کرتے ہیں کبھی دوسری۔ ایک بات پر انھیں قرار نہیں ہے اور وہ سخت ذہنی الجھن میں پڑے ہوئے ہیں۔ کبھی رسول اللہ ﷺ کو شاعر کہتے ہیں، کبھی کاہن، کبھی مجنون (پاگل) اور کبھی ساحر۔ اسی طرح قرآن کو کبھی نبی ﷺ کا اپنا تصنیف کیا ہوا کلام کہتے ہیں، کبھی کہتے ہیں کہ کوئی عجمی شخص انھیں سکھا جاتا ہے اور کبھی اسے جادو کہہ دیتے ہیں۔ الغرض، ہر موقع پر کوئی نہ کوئی بات گھڑ لیتے ہیں۔

آیت 6 ① أَفَلَمْ يَنْظُرُوا إِلَى السَّمَاءِ: کفار نے جن چیزوں کو جھٹلایا ان میں سے ایک اہم چیز دوبارہ زندگی تھی، اس لیے یہاں سے اس کے کچھ مزید دلائل بیان فرمائے۔ ”أَفَلَمْ يَنْظُرُوا“ میں ”نظر“ کا معنی اگرچہ غور و فکر بھی ہے، مگر اولین معنی دیکھنا ہے اور اس میں زیادہ زور ہے کہ ان مخلوقات کے دوبارہ زندگی پر دلالت کے لیے انھیں صرف آنکھوں کے ساتھ دیکھ لینا ہی کافی ہے۔ یعنی آسمانوں کا بنانا، انھیں ستاروں کے ساتھ سجانا اور زمین کو پیدا کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ انھیں بنانے والا انسان کو دوبارہ پیدا کرنے پر بھی قادر ہے۔ دوسری جگہ یہی بات زیادہ صریح الفاظ میں بیان فرمائی ہے: ﴿أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللَّهَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَالَّذِي يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ يَفْقَهُ هُوَ الْغَيْبُ وَمَا لَهُ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا لِمَا شَاءَ﴾ ﴿قَدِيرٌ﴾ [الاحقاف: ۳۳] ”اور کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ وہ اللہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور وہ ان کے پیدا کرنے سے تھکا نہیں، وہ اس بات پر قادر ہے کہ مردوں کو زندہ کر دے؟ کیوں نہیں! یقیناً وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔“

② فَوْقَهُمْ: یہ ”السَّمَاءُ“ سے حال ہے، یعنی ان کے لیے آسمان کو دیکھنا کچھ مشکل نہیں، نہ اس کے لیے کسی سفر کی ضرورت ہے، نہ دور میں یا کسی آلے کی، بس اوپر سر اٹھائیں اور اللہ تعالیٰ کی اس عظیم مخلوق کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔

③ كَيْفَ بَنَيْنَاهَا وَزَيَّلْنَاهَا: ”السَّمَاءُ“ سے مراد پورا عالم بالا ہے، جس میں فضا، چاند، تارے، سورج اور خیمے کی طرح چاروں طرف سے زمین کو گھیرے میں لیے ہوئے نیلا آسمان کبھی کبھی شامل ہے۔ ”كَيْفَ“ کے ساتھ انھیں بنانے اور مزین کرنے کی کیفیت کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ان کی بلندی، ان کی عظمت، ان کی مضبوطی، خوب صورتی اور ان کا کسی بھی خرابی یا خامی سے پاک ہونا سب ایسی چیزیں ہیں جنھیں دیکھ کر آدمی حیران رہ جاتا ہے اور اسے یقین ہو جاتا ہے کہ انھیں بنانے والا ہر چیز پر قادر ہے، وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ پھر آسمان، سورج، چاند اور ستاروں کے اس نظام کو دیکھنے اور ان پر غور و فکر کرنے میں لوگوں کے اپنی عقل اور علم کے لحاظ سے مختلف درجے ہیں، آیت میں تمام طبقات کے لیے ہدایت کی روشنی موجود ہے۔

وَ الْأَرْضَ مَدَدْنَهَا وَ أَلْقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ وَ أَلْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ ﴿۵﴾

اور زمین، ہم نے اسے پھیلا یا اور اس میں گڑے ہوئے پہاڑ رکھے اور اس میں خوبی والی ہر قسم اگائی ﴿۵﴾

تفہیم القرآن میں ہے: ”اس نظام کو آدمی کسی آلے کے بغیر اپنی آنکھ ہی سے دیکھ لے تو اس پر حیرت طاری ہو جاتی ہے، لیکن اگر دور بین لگا لے تو ایک ایسی وسیع و عریض کائنات اس کے سامنے آتی ہے جو ناپید آکنار ہے۔ ہماری زمین سے لاکھوں گنا بڑے سیارے اس کے اندر گیندوں کی طرح گھوم رہے ہیں۔ ہمارے سورج سے ہزاروں درجہ زیادہ روشن تارے اس میں چمک رہے ہیں۔ ہمارا یہ پورا نظام شمسی اس کی صرف ایک کہکشاں (Galaxy) کے ایک کونے میں پڑا ہوا ہے۔ تنہا اسی ایک کہکشاں میں ہمارے سورج جیسے کم از کم تین ارب دوسرے تارے (ثوابت) موجود ہیں اور اب تک کا انسانی مشاہدہ ایسی دس لاکھ کہکشاؤں کا پتہ دے رہا ہے۔ ان لاکھوں کہکشاؤں میں سے ہماری قریب ترین ہمسایہ کہکشاں اتنے فاصلے پر واقع ہے کہ اس کی روشنی ایک لاکھ چھیالیس ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے چل کر دس لاکھ سال میں زمین تک پہنچتی ہے۔ یہ تو کائنات کے صرف اس حصے کی وسعت کا حال ہے جو اب تک انسان کے علم اور مشاہدے میں آئی ہے، خدا کی خدائی کس قدر وسیع ہے اس کا کوئی اندازہ ہم نہیں کر سکتے۔ ہو سکتا ہے کہ انسان کی معلوم کائنات اس کے مقابلے میں وہ نسبت بھی نہ رکھتی ہو جو قطرے کو سمندر سے ہے۔ اس عظیم کارگاہ ہست و بود کو جو خدا وجود میں لایا ہے اس کے بارے میں زمین پر ریٹکنے والا یہ چھوٹا سا حیوان ناطق، جس کا نام انسان ہے، اگر یہ حکم لگائے کہ وہ اسے مرنے کے بعد دوبارہ پیدا نہیں کر سکتا تو یہ اس کی اپنی ہی عقل کی تنگی ہے، کائنات کے خالق کی قدرت اس سے کیسے تنگ ہو جائے گی؟“

﴿۵﴾ وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوجٍ: ”فُرُوج“ کی جمع ہے، شکاف، دراڑ، درز۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ ملک (۳، ۴) کی تفسیر۔ تفہیم القرآن میں ہے: ”یعنی اپنی اس حیرت انگیز وسعت کے باوجود یہ عظیم الشان نظام کائنات ایسا مسلسل اور مستحکم ہے اور اس کی بندش اتنی چست ہے کہ اس میں کسی جگہ کوئی دراڑ یا شکاف نہیں اور اس کا تسلسل کہیں جا کر ٹوٹ نہیں جاتا۔ اس چیز کو ایک مثال سے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ جدید زمانے کے ریڈیائی ہیٹ دانوں نے ایک کہکشائی نظام کا مشاہدہ کیا ہے جسے وہ ”منبع ۳ ج ۲۹۵“ (Source 3c, 285) کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کے متعلق ان کا اندازہ یہ ہے کہ اس کی جو شعاعیں اب ہم تک پہنچ رہی ہیں وہ چار ارب سال سے بھی زیادہ مدت پہلے اس میں سے روانہ ہوئی ہوں گی۔ اس بعید ترین فاصلے سے ان شعاعوں کا زمین تک پہنچنا آخر کیسے ممکن ہوتا اگر زمین اور اس کہکشاں کے درمیان کائنات کا تسلسل کسی جگہ سے ٹوٹا ہوا ہوتا اور اس کی بندش میں کہیں شکاف پڑا ہوا ہوتا۔ اللہ تعالیٰ اس حقیقت کے اظہار کے لیے ﴿۱﴾ ﴿۲﴾ ﴿۳﴾ ﴿۴﴾ ﴿۵﴾ ﴿۶﴾ ﴿۷﴾ ﴿۸﴾ ﴿۹﴾ ﴿۱۰﴾ ﴿۱۱﴾ ﴿۱۲﴾ ﴿۱۳﴾ ﴿۱۴﴾ ﴿۱۵﴾ ﴿۱۶﴾ ﴿۱۷﴾ ﴿۱۸﴾ ﴿۱۹﴾ ﴿۲۰﴾ ﴿۲۱﴾ ﴿۲۲﴾ ﴿۲۳﴾ ﴿۲۴﴾ ﴿۲۵﴾ ﴿۲۶﴾ ﴿۲۷﴾ ﴿۲۸﴾ ﴿۲۹﴾ ﴿۳۰﴾ ﴿۳۱﴾ ﴿۳۲﴾ ﴿۳۳﴾ ﴿۳۴﴾ ﴿۳۵﴾ ﴿۳۶﴾ ﴿۳۷﴾ ﴿۳۸﴾ ﴿۳۹﴾ ﴿۴۰﴾ ﴿۴۱﴾ ﴿۴۲﴾ ﴿۴۳﴾ ﴿۴۴﴾ ﴿۴۵﴾ ﴿۴۶﴾ ﴿۴۷﴾ ﴿۴۸﴾ ﴿۴۹﴾ ﴿۵۰﴾ ﴿۵۱﴾ ﴿۵۲﴾ ﴿۵۳﴾ ﴿۵۴﴾ ﴿۵۵﴾ ﴿۵۶﴾ ﴿۵۷﴾ ﴿۵۸﴾ ﴿۵۹﴾ ﴿۶۰﴾ ﴿۶۱﴾ ﴿۶۲﴾ ﴿۶۳﴾ ﴿۶۴﴾ ﴿۶۵﴾ ﴿۶۶﴾ ﴿۶۷﴾ ﴿۶۸﴾ ﴿۶۹﴾ ﴿۷۰﴾ ﴿۷۱﴾ ﴿۷۲﴾ ﴿۷۳﴾ ﴿۷۴﴾ ﴿۷۵﴾ ﴿۷۶﴾ ﴿۷۷﴾ ﴿۷۸﴾ ﴿۷۹﴾ ﴿۸۰﴾ ﴿۸۱﴾ ﴿۸۲﴾ ﴿۸۳﴾ ﴿۸۴﴾ ﴿۸۵﴾ ﴿۸۶﴾ ﴿۸۷﴾ ﴿۸۸﴾ ﴿۸۹﴾ ﴿۹۰﴾ ﴿۹۱﴾ ﴿۹۲﴾ ﴿۹۳﴾ ﴿۹۴﴾ ﴿۹۵﴾ ﴿۹۶﴾ ﴿۹۷﴾ ﴿۹۸﴾ ﴿۹۹﴾ ﴿۱۰۰﴾ ﴿۱۰۱﴾ ﴿۱۰۲﴾ ﴿۱۰۳﴾ ﴿۱۰۴﴾ ﴿۱۰۵﴾ ﴿۱۰۶﴾ ﴿۱۰۷﴾ ﴿۱۰۸﴾ ﴿۱۰۹﴾ ﴿۱۱۰﴾ ﴿۱۱۱﴾ ﴿۱۱۲﴾ ﴿۱۱۳﴾ ﴿۱۱۴﴾ ﴿۱۱۵﴾ ﴿۱۱۶﴾ ﴿۱۱۷﴾ ﴿۱۱۸﴾ ﴿۱۱۹﴾ ﴿۱۲۰﴾ ﴿۱۲۱﴾ ﴿۱۲۲﴾ ﴿۱۲۳﴾ ﴿۱۲۴﴾ ﴿۱۲۵﴾ ﴿۱۲۶﴾ ﴿۱۲۷﴾ ﴿۱۲۸﴾ ﴿۱۲۹﴾ ﴿۱۳۰﴾ ﴿۱۳۱﴾ ﴿۱۳۲﴾ ﴿۱۳۳﴾ ﴿۱۳۴﴾ ﴿۱۳۵﴾ ﴿۱۳۶﴾ ﴿۱۳۷﴾ ﴿۱۳۸﴾ ﴿۱۳۹﴾ ﴿۱۴۰﴾ ﴿۱۴۱﴾ ﴿۱۴۲﴾ ﴿۱۴۳﴾ ﴿۱۴۴﴾ ﴿۱۴۵﴾ ﴿۱۴۶﴾ ﴿۱۴۷﴾ ﴿۱۴۸﴾ ﴿۱۴۹﴾ ﴿۱۵۰﴾ ﴿۱۵۱﴾ ﴿۱۵۲﴾ ﴿۱۵۳﴾ ﴿۱۵۴﴾ ﴿۱۵۵﴾ ﴿۱۵۶﴾ ﴿۱۵۷﴾ ﴿۱۵۸﴾ ﴿۱۵۹﴾ ﴿۱۶۰﴾ ﴿۱۶۱﴾ ﴿۱۶۲﴾ ﴿۱۶۳﴾ ﴿۱۶۴﴾ ﴿۱۶۵﴾ ﴿۱۶۶﴾ ﴿۱۶۷﴾ ﴿۱۶۸﴾ ﴿۱۶۹﴾ ﴿۱۷۰﴾ ﴿۱۷۱﴾ ﴿۱۷۲﴾ ﴿۱۷۳﴾ ﴿۱۷۴﴾ ﴿۱۷۵﴾ ﴿۱۷۶﴾ ﴿۱۷۷﴾ ﴿۱۷۸﴾ ﴿۱۷۹﴾ ﴿۱۸۰﴾ ﴿۱۸۱﴾ ﴿۱۸۲﴾ ﴿۱۸۳﴾ ﴿۱۸۴﴾ ﴿۱۸۵﴾ ﴿۱۸۶﴾ ﴿۱۸۷﴾ ﴿۱۸۸﴾ ﴿۱۸۹﴾ ﴿۱۹۰﴾ ﴿۱۹۱﴾ ﴿۱۹۲﴾ ﴿۱۹۳﴾ ﴿۱۹۴﴾ ﴿۱۹۵﴾ ﴿۱۹۶﴾ ﴿۱۹۷﴾ ﴿۱۹۸﴾ ﴿۱۹۹﴾ ﴿۲۰۰﴾ ﴿۲۰۱﴾ ﴿۲۰۲﴾ ﴿۲۰۳﴾ ﴿۲۰۴﴾ ﴿۲۰۵﴾ ﴿۲۰۶﴾ ﴿۲۰۷﴾ ﴿۲۰۸﴾ ﴿۲۰۹﴾ ﴿۲۱۰﴾ ﴿۲۱۱﴾ ﴿۲۱۲﴾ ﴿۲۱۳﴾ ﴿۲۱۴﴾ ﴿۲۱۵﴾ ﴿۲۱۶﴾ ﴿۲۱۷﴾ ﴿۲۱۸﴾ ﴿۲۱۹﴾ ﴿۲۲۰﴾ ﴿۲۲۱﴾ ﴿۲۲۲﴾ ﴿۲۲۳﴾ ﴿۲۲۴﴾ ﴿۲۲۵﴾ ﴿۲۲۶﴾ ﴿۲۲۷﴾ ﴿۲۲۸﴾ ﴿۲۲۹﴾ ﴿۲۳۰﴾ ﴿۲۳۱﴾ ﴿۲۳۲﴾ ﴿۲۳۳﴾ ﴿۲۳۴﴾ ﴿۲۳۵﴾ ﴿۲۳۶﴾ ﴿۲۳۷﴾ ﴿۲۳۸﴾ ﴿۲۳۹﴾ ﴿۲۴۰﴾ ﴿۲۴۱﴾ ﴿۲۴۲﴾ ﴿۲۴۳﴾ ﴿۲۴۴﴾ ﴿۲۴۵﴾ ﴿۲۴۶﴾ ﴿۲۴۷﴾ ﴿۲۴۸﴾ ﴿۲۴۹﴾ ﴿۲۵۰﴾ ﴿۲۵۱﴾ ﴿۲۵۲﴾ ﴿۲۵۳﴾ ﴿۲۵۴﴾ ﴿۲۵۵﴾ ﴿۲۵۶﴾ ﴿۲۵۷﴾ ﴿۲۵۸﴾ ﴿۲۵۹﴾ ﴿۲۶۰﴾ ﴿۲۶۱﴾ ﴿۲۶۲﴾ ﴿۲۶۳﴾ ﴿۲۶۴﴾ ﴿۲۶۵﴾ ﴿۲۶۶﴾ ﴿۲۶۷﴾ ﴿۲۶۸﴾ ﴿۲۶۹﴾ ﴿۲۷۰﴾ ﴿۲۷۱﴾ ﴿۲۷۲﴾ ﴿۲۷۳﴾ ﴿۲۷۴﴾ ﴿۲۷۵﴾ ﴿۲۷۶﴾ ﴿۲۷۷﴾ ﴿۲۷۸﴾ ﴿۲۷۹﴾ ﴿۲۸۰﴾ ﴿۲۸۱﴾ ﴿۲۸۲﴾ ﴿۲۸۳﴾ ﴿۲۸۴﴾ ﴿۲۸۵﴾ ﴿۲۸۶﴾ ﴿۲۸۷﴾ ﴿۲۸۸﴾ ﴿۲۸۹﴾ ﴿۲۹۰﴾ ﴿۲۹۱﴾ ﴿۲۹۲﴾ ﴿۲۹۳﴾ ﴿۲۹۴﴾ ﴿۲۹۵﴾ ﴿۲۹۶﴾ ﴿۲۹۷﴾ ﴿۲۹۸﴾ ﴿۲۹۹﴾ ﴿۳۰۰﴾ ﴿۳۰۱﴾ ﴿۳۰۲﴾ ﴿۳۰۳﴾ ﴿۳۰۴﴾ ﴿۳۰۵﴾ ﴿۳۰۶﴾ ﴿۳۰۷﴾ ﴿۳۰۸﴾ ﴿۳۰۹﴾ ﴿۳۱۰﴾ ﴿۳۱۱﴾ ﴿۳۱۲﴾ ﴿۳۱۳﴾ ﴿۳۱۴﴾ ﴿۳۱۵﴾ ﴿۳۱۶﴾ ﴿۳۱۷﴾ ﴿۳۱۸﴾ ﴿۳۱۹﴾ ﴿۳۲۰﴾ ﴿۳۲۱﴾ ﴿۳۲۲﴾ ﴿۳۲۳﴾ ﴿۳۲۴﴾ ﴿۳۲۵﴾ ﴿۳۲۶﴾ ﴿۳۲۷﴾ ﴿۳۲۸﴾ ﴿۳۲۹﴾ ﴿۳۳۰﴾ ﴿۳۳۱﴾ ﴿۳۳۲﴾ ﴿۳۳۳﴾ ﴿۳۳۴﴾ ﴿۳۳۵﴾ ﴿۳۳۶﴾ ﴿۳۳۷﴾ ﴿۳۳۸﴾ ﴿۳۳۹﴾ ﴿۳۴۰﴾ ﴿۳۴۱﴾ ﴿۳۴۲﴾ ﴿۳۴۳﴾ ﴿۳۴۴﴾ ﴿۳۴۵﴾ ﴿۳۴۶﴾ ﴿۳۴۷﴾ ﴿۳۴۸﴾ ﴿۳۴۹﴾ ﴿۳۵۰﴾ ﴿۳۵۱﴾ ﴿۳۵۲﴾ ﴿۳۵۳﴾ ﴿۳۵۴﴾ ﴿۳۵۵﴾ ﴿۳۵۶﴾ ﴿۳۵۷﴾ ﴿۳۵۸﴾ ﴿۳۵۹﴾ ﴿۳۶۰﴾ ﴿۳۶۱﴾ ﴿۳۶۲﴾ ﴿۳۶۳﴾ ﴿۳۶۴﴾ ﴿۳۶۵﴾ ﴿۳۶۶﴾ ﴿۳۶۷﴾ ﴿۳۶۸﴾ ﴿۳۶۹﴾ ﴿۳۷۰﴾ ﴿۳۷۱﴾ ﴿۳۷۲﴾ ﴿۳۷۳﴾ ﴿۳۷۴﴾ ﴿۳۷۵﴾ ﴿۳۷۶﴾ ﴿۳۷۷﴾ ﴿۳۷۸﴾ ﴿۳۷۹﴾ ﴿۳۸۰﴾ ﴿۳۸۱﴾ ﴿۳۸۲﴾ ﴿۳۸۳﴾ ﴿۳۸۴﴾ ﴿۳۸۵﴾ ﴿۳۸۶﴾ ﴿۳۸۷﴾ ﴿۳۸۸﴾ ﴿۳۸۹﴾ ﴿۳۹۰﴾ ﴿۳۹۱﴾ ﴿۳۹۲﴾ ﴿۳۹۳﴾ ﴿۳۹۴﴾ ﴿۳۹۵﴾ ﴿۳۹۶﴾ ﴿۳۹۷﴾ ﴿۳۹۸﴾ ﴿۳۹۹﴾ ﴿۴۰۰﴾ ﴿۴۰۱﴾ ﴿۴۰۲﴾ ﴿۴۰۳﴾ ﴿۴۰۴﴾ ﴿۴۰۵﴾ ﴿۴۰۶﴾ ﴿۴۰۷﴾ ﴿۴۰۸﴾ ﴿۴۰۹﴾ ﴿۴۱۰﴾ ﴿۴۱۱﴾ ﴿۴۱۲﴾ ﴿۴۱۳﴾ ﴿۴۱۴﴾ ﴿۴۱۵﴾ ﴿۴۱۶﴾ ﴿۴۱۷﴾ ﴿۴۱۸﴾ ﴿۴۱۹﴾ ﴿۴۲۰﴾ ﴿۴۲۱﴾ ﴿۴۲۲﴾ ﴿۴۲۳﴾ ﴿۴۲۴﴾ ﴿۴۲۵﴾ ﴿۴۲۶﴾ ﴿۴۲۷﴾ ﴿۴۲۸﴾ ﴿۴۲۹﴾ ﴿۴۳۰﴾ ﴿۴۳۱﴾ ﴿۴۳۲﴾ ﴿۴۳۳﴾ ﴿۴۳۴﴾ ﴿۴۳۵﴾ ﴿۴۳۶﴾ ﴿۴۳۷﴾ ﴿۴۳۸﴾ ﴿۴۳۹﴾ ﴿۴۴۰﴾ ﴿۴۴۱﴾ ﴿۴۴۲﴾ ﴿۴۴۳﴾ ﴿۴۴۴﴾ ﴿۴۴۵﴾ ﴿۴۴۶﴾ ﴿۴۴۷﴾ ﴿۴۴۸﴾ ﴿۴۴۹﴾ ﴿۴۵۰﴾ ﴿۴۵۱﴾ ﴿۴۵۲﴾ ﴿۴۵۳﴾ ﴿۴۵۴﴾ ﴿۴۵۵﴾ ﴿۴۵۶﴾ ﴿۴۵۷﴾ ﴿۴۵۸﴾ ﴿۴۵۹﴾ ﴿۴۶۰﴾ ﴿۴۶۱﴾ ﴿۴۶۲﴾ ﴿۴۶۳﴾ ﴿۴۶۴﴾ ﴿۴۶۵﴾ ﴿۴۶۶﴾ ﴿۴۶۷﴾ ﴿۴۶۸﴾ ﴿۴۶۹﴾ ﴿۴۷۰﴾ ﴿۴۷۱﴾ ﴿۴۷۲﴾ ﴿۴۷۳﴾ ﴿۴۷۴﴾ ﴿۴۷۵﴾ ﴿۴۷۶﴾ ﴿۴۷۷﴾ ﴿۴۷۸﴾ ﴿۴۷۹﴾ ﴿۴۸۰﴾ ﴿۴۸۱﴾ ﴿۴۸۲﴾ ﴿۴۸۳﴾ ﴿۴۸۴﴾ ﴿۴۸۵﴾ ﴿۴۸۶﴾ ﴿۴۸۷﴾ ﴿۴۸۸﴾ ﴿۴۸۹﴾ ﴿۴۹۰﴾ ﴿۴۹۱﴾ ﴿۴۹۲﴾ ﴿۴۹۳﴾ ﴿۴۹۴﴾ ﴿۴۹۵﴾ ﴿۴۹۶﴾ ﴿۴۹۷﴾ ﴿۴۹۸﴾ ﴿۴۹۹﴾ ﴿۵۰۰﴾ ﴿۵۰۱﴾ ﴿۵۰۲﴾ ﴿۵۰۳﴾ ﴿۵۰۴﴾ ﴿۵۰۵﴾ ﴿۵۰۶﴾ ﴿۵۰۷﴾ ﴿۵۰۸﴾ ﴿۵۰۹﴾ ﴿۵۱۰﴾ ﴿۵۱۱﴾ ﴿۵۱۲﴾ ﴿۵۱۳﴾ ﴿۵۱۴﴾ ﴿۵۱۵﴾ ﴿۵۱۶﴾ ﴿۵۱۷﴾ ﴿۵۱۸﴾ ﴿۵۱۹﴾ ﴿۵۲۰﴾ ﴿۵۲۱﴾ ﴿۵۲۲﴾ ﴿۵۲۳﴾ ﴿۵۲۴﴾ ﴿۵۲۵﴾ ﴿۵۲۶﴾ ﴿۵۲۷﴾ ﴿۵۲۸﴾ ﴿۵۲۹﴾ ﴿۵۳۰﴾ ﴿۵۳۱﴾ ﴿۵۳۲﴾ ﴿۵۳۳﴾ ﴿۵۳۴﴾ ﴿۵۳۵﴾ ﴿۵۳۶﴾ ﴿۵۳۷﴾ ﴿۵۳۸﴾ ﴿۵۳۹﴾ ﴿۵۴۰﴾ ﴿۵۴۱﴾ ﴿۵۴۲﴾ ﴿۵۴۳﴾ ﴿۵۴۴﴾ ﴿۵۴۵﴾ ﴿۵۴۶﴾ ﴿۵۴۷﴾ ﴿۵۴۸﴾ ﴿۵۴۹﴾ ﴿۵۵۰﴾ ﴿۵۵۱﴾ ﴿۵۵۲﴾ ﴿۵۵۳﴾ ﴿۵۵۴﴾ ﴿۵۵۵﴾ ﴿۵۵۶﴾ ﴿۵۵۷﴾ ﴿۵۵۸﴾ ﴿۵۵۹﴾ ﴿۵۶۰﴾ ﴿۵۶۱﴾ ﴿۵۶۲﴾ ﴿۵۶۳﴾ ﴿۵۶۴﴾ ﴿۵۶۵﴾ ﴿۵۶۶﴾ ﴿۵۶۷﴾ ﴿۵۶۸﴾ ﴿۵۶۹﴾ ﴿۵۷۰﴾ ﴿۵۷۱﴾ ﴿۵۷۲﴾ ﴿۵۷۳﴾ ﴿۵۷۴﴾ ﴿۵۷۵﴾ ﴿۵۷۶﴾ ﴿۵۷۷﴾ ﴿۵۷۸﴾ ﴿۵۷۹﴾ ﴿۵۸۰﴾ ﴿۵۸۱﴾ ﴿۵۸۲﴾ ﴿۵۸۳﴾ ﴿۵۸۴﴾ ﴿۵۸۵﴾ ﴿۵۸۶﴾ ﴿۵۸۷﴾ ﴿۵۸۸﴾ ﴿۵۸۹﴾ ﴿۵۹۰﴾ ﴿۵۹۱﴾ ﴿۵۹۲﴾ ﴿۵۹۳﴾ ﴿۵۹۴﴾ ﴿۵۹۵﴾ ﴿۵۹۶﴾ ﴿۵۹۷﴾ ﴿۵۹۸﴾ ﴿۵۹۹﴾ ﴿۶۰۰﴾ ﴿۶۰۱﴾ ﴿۶۰۲﴾ ﴿۶۰۳﴾ ﴿۶۰۴﴾ ﴿۶۰۵﴾ ﴿۶۰۶﴾ ﴿۶۰۷﴾ ﴿۶۰۸﴾ ﴿۶۰۹﴾ ﴿۶۱۰﴾ ﴿۶۱۱﴾ ﴿۶۱۲﴾ ﴿۶۱۳﴾ ﴿۶۱۴﴾ ﴿۶۱۵﴾ ﴿۶۱۶﴾ ﴿۶۱۷﴾ ﴿۶۱۸﴾ ﴿۶۱۹﴾ ﴿۶۲۰﴾ ﴿۶۲۱﴾ ﴿۶۲۲﴾ ﴿۶۲۳﴾ ﴿۶۲۴﴾ ﴿۶۲۵﴾ ﴿۶۲۶﴾ ﴿۶۲۷﴾ ﴿۶۲۸﴾ ﴿۶۲۹﴾ ﴿۶۳۰﴾ ﴿۶۳۱﴾ ﴿۶۳۲﴾ ﴿۶۳۳﴾ ﴿۶۳۴﴾ ﴿۶۳۵﴾ ﴿۶۳۶﴾ ﴿۶۳۷﴾ ﴿۶۳۸﴾ ﴿۶۳۹﴾ ﴿۶۴۰﴾ ﴿۶۴۱﴾ ﴿۶۴۲﴾ ﴿۶۴۳﴾ ﴿۶۴۴﴾ ﴿۶۴۵﴾ ﴿۶۴۶﴾ ﴿۶۴۷﴾ ﴿۶۴۸﴾ ﴿۶۴۹﴾ ﴿۶۵۰﴾ ﴿۶۵۱﴾ ﴿۶۵۲﴾ ﴿۶۵۳﴾ ﴿۶۵۴﴾ ﴿۶۵۵﴾ ﴿۶۵۶﴾ ﴿۶۵۷﴾ ﴿۶۵۸﴾ ﴿۶۵۹﴾ ﴿۶۶۰﴾ ﴿۶۶۱﴾ ﴿۶۶۲﴾ ﴿۶۶۳﴾ ﴿۶۶۴﴾ ﴿۶۶۵﴾ ﴿۶۶۶﴾ ﴿۶۶۷﴾ ﴿۶۶۸﴾ ﴿۶۶۹﴾ ﴿۶۷۰﴾ ﴿۶۷۱﴾ ﴿۶۷۲﴾ ﴿۶۷۳﴾ ﴿۶۷۴﴾ ﴿۶۷۵﴾ ﴿۶۷۶﴾ ﴿۶۷۷﴾ ﴿۶۷۸﴾ ﴿۶۷۹﴾ ﴿۶۸۰﴾ ﴿۶۸۱﴾ ﴿۶۸۲﴾ ﴿۶۸۳﴾ ﴿۶۸۴﴾ ﴿۶۸۵﴾ ﴿۶۸۶﴾ ﴿۶۸۷﴾ ﴿۶۸۸﴾ ﴿۶۸۹﴾ ﴿۶۹۰﴾ ﴿۶۹۱﴾ ﴿۶۹۲﴾ ﴿۶۹۳﴾ ﴿۶۹۴﴾ ﴿۶۹۵﴾ ﴿۶۹۶﴾ ﴿۶۹۷﴾ ﴿۶۹۸﴾ ﴿۶۹۹﴾ ﴿۷۰۰﴾ ﴿۷۰۱﴾ ﴿۷۰۲﴾ ﴿۷۰۳﴾ ﴿۷۰۴﴾ ﴿۷۰۵﴾ ﴿۷۰۶﴾ ﴿۷۰۷﴾ ﴿۷۰۸﴾ ﴿۷۰۹﴾ ﴿۷۱۰﴾ ﴿۷۱۱﴾ ﴿۷۱۲﴾ ﴿۷۱۳﴾ ﴿۷۱۴﴾ ﴿۷۱۵﴾ ﴿۷۱۶﴾ ﴿۷۱۷﴾ ﴿۷۱۸﴾ ﴿۷۱۹﴾ ﴿۷۲۰﴾ ﴿۷۲۱﴾ ﴿۷۲۲﴾ ﴿۷۲۳﴾ ﴿۷۲۴﴾ ﴿۷۲۵﴾ ﴿۷۲۶﴾ ﴿۷۲۷﴾ ﴿۷۲۸﴾ ﴿۷۲۹﴾ ﴿۷۳۰﴾ ﴿۷۳۱﴾ ﴿۷۳۲﴾ ﴿۷۳۳﴾ ﴿۷۳۴﴾ ﴿۷۳۵﴾ ﴿۷۳۶﴾ ﴿۷۳۷﴾ ﴿۷۳۸﴾ ﴿۷۳۹﴾ ﴿۷۴۰﴾ ﴿۷۴۱﴾ ﴿۷۴۲﴾ ﴿۷۴۳﴾ ﴿۷۴۴﴾ ﴿۷۴۵﴾ ﴿۷۴۶﴾ ﴿۷۴۷﴾ ﴿۷۴۸﴾ ﴿۷۴۹﴾ ﴿۷۵۰﴾ ﴿۷۵۱﴾ ﴿۷۵۲﴾ ﴿۷۵۳﴾ ﴿۷۵۴﴾ ﴿۷۵۵﴾ ﴿۷۵۶﴾ ﴿۷۵۷﴾ ﴿۷۵۸﴾ ﴿۷۵۹﴾ ﴿۷۶۰﴾ ﴿۷۶۱﴾ ﴿۷۶۲﴾ ﴿۷۶۳﴾ ﴿۷۶۴﴾ ﴿۷۶۵﴾ ﴿۷۶۶﴾ ﴿۷۶۷﴾ ﴿۷۶۸﴾ ﴿۷۶۹﴾ ﴿۷۷۰﴾ ﴿۷۷۱﴾ ﴿۷۷۲﴾ ﴿۷۷۳﴾ ﴿۷۷۴﴾ ﴿۷۷۵﴾ ﴿۷۷۶﴾ ﴿۷۷۷﴾ ﴿۷۷۸﴾ ﴿۷۷۹﴾ ﴿۷۸۰﴾ ﴿۷۸۱﴾ ﴿۷۸۲﴾ ﴿۷۸۳﴾ ﴿۷۸۴﴾ ﴿۷۸۵﴾ ﴿۷۸۶﴾ ﴿۷۸۷﴾ ﴿۷۸۸﴾ ﴿۷۸۹﴾ ﴿۷۹۰﴾ ﴿۷۹۱﴾ ﴿۷۹۲﴾ ﴿۷۹۳﴾ ﴿۷۹۴﴾ ﴿۷۹۵﴾ ﴿۷۹۶﴾ ﴿۷۹۷﴾ ﴿۷۹۸﴾ ﴿۷۹۹﴾ ﴿۸۰۰﴾ ﴿۸۰۱﴾ ﴿۸۰۲﴾ ﴿۸۰۳﴾ ﴿۸۰۴﴾ ﴿۸۰۵﴾ ﴿۸۰۶﴾ ﴿۸۰۷﴾ ﴿۸۰۸﴾ ﴿۸۰۹﴾ ﴿۸۱۰﴾ ﴿۸۱۱﴾ ﴿۸۱۲﴾ ﴿۸۱۳﴾ ﴿۸۱۴﴾ ﴿۸۱۵﴾ ﴿۸۱۶﴾ ﴿۸۱۷﴾ ﴿۸۱۸﴾ ﴿۸۱۹﴾ ﴿۸۲۰﴾ ﴿۸۲۱﴾ ﴿۸۲۲﴾ ﴿۸۲۳﴾ ﴿۸۲۴﴾ ﴿۸۲۵﴾ ﴿۸۲۶﴾ ﴿۸۲۷﴾ ﴿۸۲۸﴾ ﴿۸۲۹﴾ ﴿۸۳۰﴾ ﴿۸۳۱﴾ ﴿۸۳۲﴾ ﴿۸۳۳﴾ ﴿۸۳۴﴾ ﴿۸۳۵﴾ ﴿۸۳۶﴾ ﴿۸۳۷﴾ ﴿۸۳۸﴾ ﴿۸۳۹﴾ ﴿۸۴۰﴾ ﴿۸۴۱﴾ ﴿۸۴۲﴾ ﴿۸۴۳﴾ ﴿۸۴۴﴾ ﴿۸۴۵﴾ ﴿۸۴۶﴾ ﴿۸۴۷﴾ ﴿۸۴۸﴾ ﴿۸۴۹﴾ ﴿۸۵۰﴾ ﴿۸۵۱﴾ ﴿۸۵۲﴾ ﴿۸۵۳﴾ ﴿۸۵۴﴾ ﴿۸۵۵﴾ ﴿۸۵۶﴾ ﴿۸۵۷﴾ ﴿۸۵۸﴾ ﴿۸۵۹﴾ ﴿۸۶۰﴾ ﴿۸۶۱﴾ ﴿۸۶۲﴾ ﴿۸۶۳﴾ ﴿۸۶۴﴾ ﴿۸۶۵﴾ ﴿۸۶۶﴾ ﴿۸۶۷﴾ ﴿۸۶۸﴾ ﴿۸۶۹﴾ ﴿۸۷۰﴾ ﴿۸۷۱﴾ ﴿۸۷۲﴾ ﴿۸۷۳﴾ ﴿۸۷۴﴾ ﴿۸۷۵﴾ ﴿۸۷۶﴾ ﴿۸۷۷﴾ ﴿۸۷۸﴾ ﴿۸۷۹﴾ ﴿۸۸۰﴾ ﴿۸۸۱﴾ ﴿۸۸۲﴾ ﴿۸۸۳﴾ ﴿۸۸۴﴾ ﴿۸۸۵﴾ ﴿۸۸۶﴾ ﴿۸۸۷﴾ ﴿۸۸۸﴾ ﴿۸۸۹﴾ ﴿۸۹۰﴾ ﴿۸۹۱﴾ ﴿۸۹۲﴾ ﴿۸۹۳﴾ ﴿۸۹۴﴾ ﴿۸۹۵﴾ ﴿۸۹۶﴾ ﴿۸۹۷﴾ ﴿۸۹۸﴾ ﴿۸۹۹﴾ ﴿۹۰۰﴾ ﴿۹۰۱﴾ ﴿۹۰۲﴾ ﴿۹۰۳﴾ ﴿۹۰۴﴾ ﴿۹۰۵﴾ ﴿۹۰۶﴾ ﴿۹۰۷﴾ ﴿۹۰۸﴾ ﴿۹۰۹﴾ ﴿۹۱۰﴾ ﴿۹۱۱﴾ ﴿۹۱۲﴾ ﴿۹۱۳﴾ ﴿۹۱۴﴾ ﴿۹۱۵﴾ ﴿۹۱۶﴾ ﴿۹۱۷﴾ ﴿۹۱۸﴾ ﴿۹۱۹﴾ ﴿۹۲۰﴾ ﴿۹۲۱﴾ ﴿۹۲۲﴾ ﴿۹۲۳﴾ ﴿۹۲۴﴾ ﴿۹۲۵﴾ ﴿۹۲۶﴾ ﴿۹۲۷﴾ ﴿۹۲۸﴾ ﴿۹۲۹﴾ ﴿۹۳۰﴾ ﴿۹۳۱﴾ ﴿۹۳۲﴾ ﴿۹۳۳﴾ ﴿۹۳۴﴾ ﴿۹۳۵﴾ ﴿۹۳۶﴾ ﴿۹۳۷﴾ ﴿۹۳۸﴾ ﴿۹۳۹﴾ ﴿۹۴۰﴾ ﴿۹۴۱﴾ ﴿۹۴۲﴾ ﴿۹۴۳﴾ ﴿۹۴۴﴾ ﴿۹۴۵﴾ ﴿۹۴۶﴾ ﴿۹۴۷﴾ ﴿۹۴۸﴾ ﴿۹۴۹﴾ ﴿۹۵۰﴾ ﴿۹۵۱﴾ ﴿۹۵۲﴾ ﴿۹۵۳﴾ ﴿۹۵۴﴾ ﴿۹۵۵﴾ ﴿۹۵۶﴾ ﴿۹۵۷﴾ ﴿۹۵۸﴾ ﴿۹۵۹﴾ ﴿۹۶۰﴾ ﴿۹۶۱﴾ ﴿۹۶۲﴾ ﴿۹۶۳﴾ ﴿۹۶۴﴾ ﴿۹۶۵﴾ ﴿۹۶۶﴾ ﴿۹۶۷﴾ ﴿۹۶۸﴾ ﴿۹۶۹﴾ ﴿۹۷۰﴾ ﴿۹۷۱﴾ ﴿۹۷۲﴾ ﴿۹۷۳﴾ ﴿۹۷۴﴾ ﴿۹۷۵﴾ ﴿۹۷۶﴾ ﴿۹۷۷﴾ ﴿۹۷۸﴾ ﴿۹۷۹﴾ ﴿۹۸۰﴾ ﴿۹۸۱﴾ ﴿۹۸۲﴾ ﴿۹۸۳﴾ ﴿۹۸۴﴾ ﴿۹۸۵﴾ ﴿۹۸۶﴾ ﴿۹۸۷﴾ ﴿۹۸۸﴾ ﴿۹۸۹﴾ ﴿۹۹۰﴾ ﴿۹۹۱﴾ ﴿۹۹۲﴾ ﴿۹۹۳﴾ ﴿۹۹۴﴾ ﴿۹۹۵﴾ ﴿۹۹۶﴾ ﴿۹۹۷﴾ ﴿۹۹۸﴾ ﴿۹۹۹﴾ ﴿۱۰۰۰﴾

تَبَصَّرَةً وَ ذِكْرَى لِكُلِّ عَبْدٍ مُنِيبٍ ۝ وَ نَزَّلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً مُبَارَكًا فَأَنْبَتْنَا بِهِ
جَبَلَتٍ وَ حَبَّ الْحَصِيدِ ۝ وَ النَّخْلَ بَسِقَتٍ لَهَا طَلْعٌ نَضِيدٌ ۝

ہر اس بندے کو دکھانے اور یاد دلانے کے لیے جو رجوع کرنے والا ہے ۝ اور ہم نے آسمان سے ایک بہت بابرکت پانی اتارا، پھر ہم نے اس کے ساتھ باغات اور کاٹی جانے والی (کھیتی) کے دانے اگائے ۝ اور کھجوروں کے درخت لیے لیے، جن کے تہ بہ تہ خوشے ہیں ۝

دیکھیے سورہ حجر (۱۹)، نحل (۱۵)، طہ (۵۳)، نمل (۶۰، ۶۱)، لقمان (۱۰)، زخرف (۱۰، ۱۱) اور سورہ مہملات (۲۷، ۲۸)۔

آیت ۸ : تَبَصَّرَةً وَ ذِكْرَى "تَبَصَّرَةً" اور "ذِكْرَى" یہ دونوں مفعول لہ ہیں، یعنی ہم نے یہ سب کچھ بتایا اور اس کا یہاں ذکر کیا ہے ہر اس آدمی کو دکھانے اور یاد دلانے کے لیے جو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والا ہے، کیونکہ وہی ان سے نصیحت حاصل کرتا ہے۔ جو دھیان ہی نہ کرے اس کے لیے یہ سب کچھ بے فائدہ ہے۔

انہی نوں بازار پھرایا، سارا شہر دکھلایا آخر اتے آکھن لگا کچھ نہیں نظری آیا

"یعنی اندھے کو بازار دکھلایا اور سارے شہر کی سیر کروائی، مگر اس نے آخر میں یہی کہا کہ مجھے کچھ دکھائی نہیں دیا۔"

آیت ۹ : ۝ وَ نَزَّلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً مُبَارَكًا : "مَاءً مُبَارَكًا" وہ پانی جس میں بہت برکت یعنی خیر کثیر رکھی گئی ہے۔ یہاں باب مفاعلہ مشارکت کے لیے نہیں بلکہ مبالغے کے لیے ہے۔ جس پانی کو اللہ تعالیٰ مبارک فرمائے اس کی خیر کی کثرت کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے۔ موت کے بعد زندگی کے اثبات کے لیے زمین و آسمان اور ان کے درمیان کی چیزوں کی پیدائش کا ذکر کرنے کے بعد اب بارش کا اور اس کی برکت سے زمین سے پیدا ہونے والی چیزوں کا ذکر فرمایا۔ مقصود اس سے بھی موت کے بعد زندگی کا اثبات ہے، چنانچہ آخر میں فرمایا: ﴿كَذَلِكَ الْخُرُوجُ﴾ [ق: ۱۱] "اسی طرح (دوبارہ زندہ ہو کر) نکلنا ہے۔" آسمان سے پانی اتارنے کے لیے باب تفعیل "نَزَّلْنَا" استعمال فرمایا جس میں تدریج ہوتی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ بارش کے قطروں کے بجائے کروڑوں اربوں ٹن پانی دفعتاً گرا دے تو زمین پر کوئی چیز باقی ہی نہ رہے۔

آیت ۱۰ : فَأَنْبَتْنَا بِهِ جَبَلَتٍ وَ حَبَّ الْحَصِيدِ : "حَصَدٌ يَحْصُدُ حَصْدًا وَ حِصَادًا" (ن) کھیتی کا ٹائ۔ "الْحَصِيدِ" بمعنی "الْمَحْصُودُ" کاٹی ہوئی کھیتی۔ بارش سے پیدا ہونے والی چیزیں دو قسم کی ہیں، کچھ وہ جن کے درخت باقی رہتے ہیں اور ان کے پھل پھول، گوند، پتوں، ٹہنیوں اور لکڑی وغیرہ سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے اور کچھ وہ جنھیں کاٹ کر ان سے غلہ، دالیں، سبزیاں، ادویات اور بے شمار مفید چیزیں حاصل کی جاتی ہیں۔ یہاں خصوصاً پھل دار درختوں اور عمدہ جات کا ذکر فرمایا، کیونکہ یہ دوسری اشیاء پر برتری رکھتے ہیں اور انسان اور اس کے پالتو جانوروں کی خوراک بنتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿مَتَاعًا لَّكُمْ وَلَا تَعْمَلُكُمْ﴾ [الانعام: ۳۳] "تمہاری اور تمہارے چوپاؤں کی زندگی کے سامان کے لیے۔"

آیت ۱۰ : ۝ وَ النَّخْلَ بَسِقَتٍ : "النَّخْلَ" اسم جنس ہے جو کھجور کے درختوں پر بولا جاتا ہے، زیادہ ہوں یا ایک۔ اگر

رِزْقًا لِلْعِبَادِ وَأَحْيَيْنَا بِهِ بَلَدَةً مَّيِّتًا كَذَلِكَ الْخُرُوجُ ۝ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ
وَأَصْحَابُ الرَّسِّ وَثَمُودُ ۝ وَعَادٌ وَفِرْعَوْنُ وَإِخْوَانُ لُوطٍ ۝ وَأَصْحَابُ الْأَيْكَةِ
وَقَوْمُ تَبَعٍ ۝ كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيدِ ۝

بندوں کو روزی دینے کے لیے اور ہم نے اس کے ساتھ ایک مردہ شہر کو زندہ کر دیا، اسی طرح لکنا ہے ۱۱ ان سے پہلے نوح کی قوم نے جھٹلایا اور کنویں والوں نے اور ثمود نے ۱۲ اور عاد اور فرعون نے اور لوط کے بھائیوں نے ۱۳ اور درختوں کے جھنڈ والوں نے اور تبع کی قوم نے، ان سب نے رسولوں کو جھٹلایا تو میرے عذاب کا وعدہ ثابت ہو گیا ۱۴

کھجور کا ایک درخت ہو تو اسے ”نُخْلَةٌ“ کہتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿فَأَجَاءَهَا الْمَخَاضُ إِلَى جِذْعِ النَّخْلَةِ﴾ [مریم: ۲۳] ”پھر درد زہ اسے کھجور کے تنے کی طرف لے آیا۔“ ”بَسَقٌ يَسْبِقُ بُسُوقًا“ (ن) ”السَّخْلُ“ کھجور کے درختوں کا لہبا اور بلند ہونا۔ چنانچہ زمین پر پڑے ہوئے کھجور کے لمبے تنے کو ”باسق“ نہیں کہتے۔

۲ ﴿لَهَا ظَلَمٌ مُّضَيِّدٌ: ”ظَلَمٌ“ کھجور کے پھل کا خوشہ جو شروع میں طلوع ہوتا ہے اور اس پر پردہ ہوتا ہے۔ ”مُضَيِّدٌ“ بمعنی ”مَنْصُودٌ“ تہ بہ تہ۔ یعنی پردے کے اندر انار کے دانوں کی طرح کھجور کے دانوں کی ابتدا تہ بہ تہ قطاروں کی شکل میں ہوتی ہے، جب غلاف سے باہر نکل آئیں تو ”مُضَيِّدٌ“ نہیں رہتے، بلکہ الگ الگ ہو جاتے ہیں۔

آیت 11: ﴿وَأَحْيَيْنَا بِهِ بَلَدَةً مَّيِّتًا كَذَلِكَ الْخُرُوجُ﴾: یعنی مرنے کے بعد دوبارہ زندہ اٹھنے میں تعجب کی کون سی بات ہے؟ کیا تم اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھتے کہ ایک زمین بارش نہ ہونے کی وجہ سے بخر پڑی ہوتی ہے، جیسے اس میں زندگی کے کوئی آثار ہی نہیں، پھر یکا یک بارش ہوتی ہے تو اس میں کھیتیاں لہلہانے لگتی ہیں اور درخت اگتے ہیں، گویا مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہو جاتی ہے۔ اسی طرح تم مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جاؤ گے۔

آیت 12: ﴿كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ﴾ : یعنی یہ آپ کو جھٹلانے والے پہلے لوگ نہیں جنہوں نے ہمارے کسی رسول کو جھٹلایا ہو، بلکہ اس سے پہلے کئی اقوام نے ہمارے رسولوں کو جھٹلایا اور ہمارے عذاب کا نشانہ بنے۔ اس میں رسول اللہ ﷺ کے لیے تسلی اور آپ ﷺ کو جھٹلانے والوں کے لیے تنبیہ ہے۔ آیت میں مذکور اکثر اقوام کا ذکر متعدد مقامات پر گزر چکا ہے۔ اصحاب الرس کا ذکر سورہ فرقان (۳۸) میں، اصحاب الایکہ کا ذکر سورہ حجر (۷۸) اور سورہ شعراء (۱۷۶) میں اور قوم تبع کا ذکر سورہ دخان (۳۷) میں دیکھیے۔

۲ ﴿كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ﴾: ان سب قوموں نے تمام رسولوں کو جھٹلایا، کیونکہ یہ سب نہ اپنی طرح کے کسی انسان کو رسول ماننے کے لیے تیار تھے اور نہ دوبارہ زندہ ہو کر اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے کو۔ اس لیے ان میں سے ہر ایک کو تمام رسولوں کو جھٹلانے والا قرار دیا۔

أَفَعَيَّبْنَا بِالْخَلْقِ الْأَوَّلِ بَلْ هُمْ فِي لَبْسٍ مِنْ خَلْقٍ جَدِيدٍ ﴿١٥﴾ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ

وَنَعَلَّمْ مَا تَوْسُوْسُ بِهِ نَفْسُهُ ۖ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ ﴿١٦﴾

تو کیا ہم پہلی دفعہ پیدا کرنے کے ساتھ تھک کر رہ گئے ہیں؟ بلکہ وہ ایک نئے پیدا کیے جانے کے متعلق شک میں مبتلا ہیں ﴿۱۵﴾ اور بلاشبہ یقیناً ہم نے انسان کو پیدا کیا اور ہم ان چیزوں کو جانتے ہیں جن کا دوسرا اس کا نفس ڈالتا ہے اور ہم اس کی رگ جان سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں ﴿۱۶﴾

﴿۳﴾ فَحَقِّ وَعَيْدِي: ”وَعَيْدِي“ اصل میں ”وَعَيْدِي“ ہے۔ آیات کے فواصل کی مطابقت کے لیے یا، کو حذف کر دیا، دال پر کسرہ یا، کے حذف ہونے کی دلیل ہے، ورنہ ”حَقِّ“ کا قائل ہونے کی وجہ سے ”وَعَيْدِي“ کے دال پر ضمہ ہونا چاہیے تھا۔

آیت 15 ﴿۱﴾ أَفَعَيَّبْنَا بِالْخَلْقِ الْأَوَّلِ: یہ خلاصہ اور نتیجہ ہے اس دلیل کا جس کی تفصیل سورت کے شروع سے آرہی ہے کہ جب ہم نے اس وقت جب کچھ بھی نہیں تھا آسمان و زمین، بارش اور اوپر مذکور تمام چیزیں پیدا کر لیں اور ہمیں ان کے پیدا کرنے سے کوئی تھکاوٹ لاحق نہیں ہوئی تو کیا یہ بے چارہ انسان ضعیف البنیان ہی ایسی مخلوق ہے جسے پہلی دفعہ پیدا کر کے ہم تھک گئے ہیں اور اسے دوبارہ زندہ نہیں کر سکتے، حالانکہ ہمارا تخلیق کا عمل مسلسل جاری ہے اور دوبارہ زندگی تو پہلی دفعہ کے مقابلے میں معمولی بات ہے۔ یہ بات اللہ تعالیٰ نے مختلف انداز سے کئی جگہ بیان فرمائی ہے، دیکھیے سورہ روم (۲۷)، یس (۷۸، ۷۹)، نازعات (۲۷) اور سورہ ق (۳۸)۔

﴿۲﴾ بَلْ هُمْ فِي لَبْسٍ مِنْ خَلْقٍ جَدِيدٍ: یعنی یہ اس چیز کے منکر نہیں ہیں کہ ان کو پہلی بار ہم نے ہی پیدا کیا اور یہ کہ پہلی بار پیدا کر کے ہم تھک کر نہیں رہ گئے، لیکن اس کے باوجود انہیں شک ہے کہ ہم دوبارہ بھی پیدا کر سکیں گے یا نہیں، حالانکہ معمولی غور و فکر سے یہ بات سمجھی جاسکتی ہے کہ اگر ہمیں دشواری پیش آتی تو پہلی دفعہ آتی، دوسری بار پیدا کرنے کا کام تو پہلی بار کی بہ نسبت کہیں آسان ہے۔

آیت 15 ﴿۱﴾ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَنَعَلَّمْ مَا تَوْسُوْسُ بِهِ نَفْسُهُ: دوسرے کا اصل معنی وہ بلی کی یا دبی ہوئی حرکت یا آواز ہے جو عام طور پر محسوس نہ ہوتی ہو۔ اس سے مراد وہ بات بھی ہوتی ہے جو بالکل آہستہ آواز سے کسی کے کان میں کہی جائے اور صرف اسی کو سنائی دے اور وہ بات بھی جو بغیر آواز کے کسی کے دل میں ڈال دی جائے، جیسے شیطان یا نفس انسان کے دل میں دوسرے ڈالتا ہے۔ قیامت کے منکروں کے اس شبہ کا جواب کہ جب ہم مر کر مٹی ہو گئے تو دوبارہ کیسے زندہ کیے جائیں گے، اس سے پہلے گزر چکا ہے کہ ہم انسان کے مٹی ہو جانے والے ہر ذرے کو جانتے ہیں کہ وہ کہاں ہے، وہ نہ ہمارے علم سے باہر ہے اور نہ ہماری دسترس اور قدرت سے، ہم جب چاہیں گے اسے دوبارہ زندہ کر دیں گے، اب فرمایا خاک کے ذرات کا وجود تو پھر بھی باقی رہتا ہے اور نظر آتا ہے، ہم تو انسان کی وہ چیزیں بھی جانتے ہیں جو اس سے بھی زیادہ مخفی ہیں اور بظاہر ان کا وجود بھی باقی نہیں رہتا، کیونکہ ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے تو ہم سے بڑھ کر اسے کون جان سکتا ہے؟ فرمایا: ﴿الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ مَنْ خَلَقَهُ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ﴾ [الملک: ۱۴] ”کیا وہ نہیں جانتا جس نے پیدا کیا ہے اور وہی تو ہے جو

إِذْ يَتَلَفَّى الْمُتَلَقِينَ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيدٌ ﴿١٦﴾

جب (اس کے ہر قول و فعل کو) دو لینے والے لیتے ہیں، جو دائیں طرف اور بائیں طرف بیٹھے ہیں ﴿۱۶﴾

نہایت باریک بین ہے، کامل خبر رکھنے والا ہے۔ ”چنانچہ ہم اس کے اقوال و افعال ہی کو نہیں اس کی ان باتوں کو بھی جانتے ہیں جن کا خیال اور وسوسہ اس کا نفس اس کے دل میں ڈالتا ہے۔ سو ہم صرف اسے زندہ ہی نہیں کریں گے، بلکہ زندہ کرنے کے بعد اس کے تمام اعمال کا محاسبہ بھی کریں گے اور محاسبے کے لیے اگرچہ ہمارا علم ہی کافی ہے، مگر ہم نے حجت پوری کرنے کے لیے اس کے ہر قول و فعل کو فرشتوں کے ذریعے سے لکھ کر محفوظ کرنے کا بھی بندوبست کیا ہے۔

﴿۱۶﴾ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ: ”الْوَرِيدُ“ دل سے نکلنے والی رگ جس کے کٹنے سے انسان مر جاتا ہے۔ دل میں اس کا نام ”وتمین“ ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ﴾ [المحاقة: ۶۶] ”پھر ہم اس کی جان کی رگ کاٹ دیتے۔“ اور گردن میں اس کا نام ”ورید“ ہے، جو ”وَرَدَ يَرِدُ“ سے ”فَعِيلٌ“ کے وزن پر ہے، کیونکہ خون دل سے اس میں وارد ہوتا ہے۔ ”حَبْلٌ“ کا معنی بھی رگ ہے۔ ”حَبْلٌ“ کی اضافت ”الْوَرِيدِ“ کی طرف بیانہ ہے، یعنی وہ رگ جو ورید ہے، جیسا کہ مسجد الجامع کی اضافت ہے۔ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں: ”گردن کی رگ مراد ہے جس میں جان پھرتی ہے دل سے دماغ تک۔ اس کے کٹنے سے موت ہے۔“

﴿۱۷﴾ ”ہم اس کی رگ جاں سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں“ کیونکہ انسان کے جسم کے حصے تو ایک دوسرے کو چھپائے ہوئے ہوتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز چھپ نہیں سکتی۔ مفسر ابن کثیر نے یہاں ”نَحْنُ“ سے مراد فرشتے لیے ہیں، جیسا کہ سورہ واقعہ کی آیت (۸۵): ﴿وَ نَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْكُمْ وَ لَكِنْ لَا تَبْصُرُونَ﴾ (اور ہم تم سے زیادہ اس کے قریب ہوتے ہیں اور لیکن تم نہیں دیکھتے) میں بعض ائمہ نے فرشتوں کا قریب ہونا مراد لیا ہے۔ اگرچہ اس معنی کی بھی گنجائش ہے، مگر الفاظ کے ظاہر کا تقاضا یہی ہے کہ یہ بات اللہ تعالیٰ اپنے متعلق فرما رہے ہیں اور اس بات کا یقین اور احساس کہ میرا رب میری رگ جاں سے بھی زیادہ مجھ سے قریب ہے، انسان کو گناہوں کے ارتکاب سے زیادہ باز رکھنے والا اور اس سے محبت پیدا کرنے کا زیادہ باعث ہے۔ فتح البیان میں ہے، قشیری نے فرمایا: ”فِي هَذِهِ الْآيَةِ هَيْبَةٌ وَ فَرَعٌ وَ خَوْفٌ لِقَوْمٍ وَ رَوْحٌ وَ أُنْسٌ وَ سُكُونٌ قَلْبٍ لِقَوْمٍ“ ”اس آیت میں کچھ لوگوں کے لیے ہیبت، گھبراہٹ اور خوف کا اور کچھ لوگوں کے لیے راحت، انس اور سکون قلب کا سامان موجود ہے۔“

﴿۱۸﴾ قرآن مجید نے صریح الفاظ میں اللہ تعالیٰ کا عرش پر ہونا بیان فرمایا ہے: ﴿الرَّحْمَنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَى﴾ [طہ: ۵] ”وہ بے حد رحم والا عرش پر بلند ہوا۔“ پھر اس کا انسان کے قریب ہونے کا کیا مطلب ہے؟ یہ بحث ان شاء اللہ سورہ حدید کی آیت (۴): ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ﴾ میں آئے گی۔

آیت 17 ﴿۱﴾ إِذْ يَتَلَفَّى الْمُتَلَقِينَ عَنِ الْيَمِينِ: ”تَلَفَّى يَتَلَفَّى“ (تفعل) لینا، استقبال کرنا۔ ”يَتَلَفَّى“ اور ”الْمُتَلَقِينَ“

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ ﴿۱۸﴾

وہ کوئی بھی بات نہیں بولتا مگر اس کے پاس ایک تیار مگران ہوتا ہے ﴿۱۸﴾

کا مفعول محذوف ہے: ”أُنِي جَمِيعُ أَقْوَالِهِ وَ أَعْمَالِهِ.“ ”إِذَا“ بھجلی آیت میں ”أَقْرَبُ“ کا ظرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب انسان کے دامن اور بائیں جانب بیٹھے ہوئے دو فرشتے اس کے ہر قول و فعل کو لے کر لکھ رہے ہوتے ہیں تو اس وقت ہم اس کی رُک جانا سے بھی زیادہ اس کے قریب ہوتے ہیں اور اس کے دل میں آنے والے دسو سے اور سینے کے راز بھی خوب جانتے ہوتے ہیں۔

﴿۱۸﴾ ”عَتِيدٌ“ بمعنی ”مُفَاعِدٌ“ ہے، جیسے ”جَلِيسٌ“ بمعنی ”مُجَالِسٌ“ ہے۔ یعنی وہ انسان کے ساتھ لازم رہتے ہیں۔ ”عَتِيدٌ“ (ساتھ بیٹھے ہوئے) کا لفظ ان کے بیدار اور ہشیار رہنے کی کیفیت کے بیان کے لیے ہے کہ وہ انسان سے سرزد ہونے والے کسی بھی قول یا فعل کو لکھنے کے لیے ہر وقت تیار بیٹھے ہیں، کسی لمحے بھی ان کے الگ ہونے یا غفلت یا نیند کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

﴿۱۹﴾ یہاں ایک سوال ہے کہ فرشتے تو دو ہیں مگر ان کی کیفیت بیان کرنے کے لیے لفظ ”عَتِيدٌ“ لایا گیا ہے جو واحد ہے، اسے تشبیہ بنا کر ”عَتِيدَانِ“ کیوں نہیں کہا گیا؟ مفسرین نے اس کے دو جواب دیے ہیں، ایک یہ کہ اس سے مراد ”كُلٌّ وَ اَجِبٌ مِّنْهُمَا“ ہے، یعنی ان دونوں میں سے ہر ایک تیار بیٹھا ہے۔ دوسرا یہ کہ ”عَتِيدٌ“ ”فَعِيلٌ“ کے وزن پر صفت کا صیغہ ہے اور ”فَعِيلٌ“ اور ”فَعُولٌ“ واحد، تشبیہ، جمع اور مذکر و مؤنث سب کے لیے اسی طرح استعمال کر لیا جاتا ہے۔ دونوں جواب درست ہیں۔

آیت 18: مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ: ”رَقِيبٌ“ مگرانی کرنے والا اور ”عَتِيدٌ“ تیار۔ اس آیت کے

مفہوم کے قریب یہ آیات ہیں: ﴿وَ اِنَّ عَلَيْنَكُمْ لَحَفِيزِيْنَ ۙ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۙ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ﴾ [الانفطار: ۱۰]

تا ۱۲: ”حالانکہ بلاشبہ تم پر یقیناً نگہبان (مقرر) ہیں۔ جو بہت عزت والے ہیں، لکھنے والے ہیں۔ وہ جانتے ہیں جو تم کرتے ہو۔“ اگرچہ انسان کا ہر قول و فعل اور ارادہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے، مگر فرشتوں کے ذریعے سے کتاب اعمال کی تیاری قیامت کے دن اس پر حجت قائم کرنے کے لیے ہے، فرمایا: ﴿وَ نُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَابًا يَلْقَاهُ مَنْشُورًا ۙ اِقْرَأْ كِتَابَكَ ۙ كَفَىٰ بِسَفِيكِ الْيَوْمِ عَلِيْكَ حَسِيْبًا﴾ [سی اسرئیل: ۱۳، ۱۴] ”اور قیامت کے دن ہم اس کے لیے ایک کتاب نکالیں گے، جسے وہ کھولی ہوئی پائے گا۔ اپنی کتاب پڑھ، آج تو خود اپنے آپ پر بطور محاسب بہت کافی ہے۔“ آج کل آڈیو اور وڈیو کے ذریعے سے انسان کے تقریباً ہر قول و فعل کا کھل نقشہ محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ انسانی ایجادات کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتوں کو عطا کردہ صلاحیتوں کے ساتھ کوئی نسبت ہی نہیں ہو سکتی۔ اس کتاب کو دیکھ کر بندوں کا جو حال ہوگا وہ اللہ تعالیٰ نے سورہ کہف میں بیان فرمایا ہے: ﴿وَ وُضِعَ الْكِتَابُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُسْتَقِيْمِيْنَ وَمَنَافِيْهِ وَ يَفْوُوْنَ يُوْبِيْنَتْنَا مَالِ هٰذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّ لَا كَبِيْرَةً اِلَّا اُخْصِنَا ۗ وَ وَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۗ وَ لَا يَظْلُمُ سَرَابِكْ اَحَدًا﴾

وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ۖ ذَٰلِكَ مَا كُنْتُمْ مِنْهُ تَعْبُدُونَ ﴿۱۹﴾ وَنُفِخَ فِي الصُّورِ ۖ ذَٰلِكَ

يَوْمَ الْوَعِيدِ ﴿۲۰﴾

اور موت کی بے ہوشی حق کے ساتھ آگئی۔ یہ ہے وہ جس سے تو بھاگتا تھا ﴿۱۹﴾ اور صور میں پھونکا گیا، یہی عذاب کے وعدے کا دن ہے ﴿۲۰﴾

[الکہف : ۴۹] ”اور کتاب رکھی جائے گی، پس تو مجرموں کو دیکھے گا کہ اس سے ڈرنے والے ہوں گے جو اس میں ہوگا اور کہیں گے ہائے ہماری بربادی! اس کتاب کو کیا ہے، نہ کوئی چھوٹی بات چھوڑتی ہے اور نہ بڑی مگر اس نے اسے ضبط کر رکھا ہے، اور انہوں نے جو کچھ کیا اسے موجود پائیں گے اور تیرا رب کسی پر ظلم نہیں کرتا۔“

آیت 19 ﴿۱۹﴾ وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ: یہ ذکر کرنے کے بعد کہ انسان جو کچھ کرتا ہے سب اللہ کو معلوم ہے اور انسان کی کتاب اعمال میں بھی لکھا ہوا اور محفوظ ہے اور اس کے سامنے پیش آنے والا ہے، اب اس حقیقت کے سامنے آنے کے دو وقت بیان فرمائے، پہلا موت کا وقت اور دوسرا قیامت کا وقت۔ اس آیت میں موت کا ذکر ہے، موت کی بے ہوشی سے مراد اس کی سختی اور شدت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں موت اور قیامت کے لیے ماضی کے صیغے استعمال فرمائے ہیں، یعنی ”وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ“ (اور موت کی بے ہوشی آگئی) اور ”وَنُفِخَ فِي الصُّورِ“ (اور صور میں پھونکا گیا) حالانکہ یہ کام آئندہ ہونے والے ہیں، تو مقصد وہ نقشہ سامنے لانا اور یہ باور کروانا ہے کہ ان کا آنا اتنا یقینی ہے کہ سمجھو وہ آچکے۔

② عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ کے آخری وقت کا حال بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ ﷺ کے سامنے پانی کا ایک پیالہ تھا، آپ ﷺ اپنے دونوں ہاتھ اس میں ڈالتے اور انہیں چہرے پر پھیرتے جاتے تھے اور ساتھ یہ فرماتے تھے: «لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، إِنَّ لِلْمَوْتِ سَكْرَاتٍ» [بخاری، المغازی، باب مرض النبی ﷺ ووفاته : ۴۴۴۹] «لا اله الا الله، یقیناً موت کی بہت سختیاں ہیں۔“

③ بِالْحَقِّ: موت کی بے ہوشی کے حق کو لے کر آنے کا مطلب یہ ہے کہ جان نکلنے کی سختی کے ساتھ ہی وہ حقیقت سامنے آجائے گی جس پر دنیا میں پردہ پڑا ہوا ہے اور آدمی آنکھوں سے دیکھ لے گا کہ رسولوں نے جو بات بتائی تھی وہ حق اور سچ تھی۔

④ ذَٰلِكَ مَا كُنْتُمْ مِنْهُ تَعْبُدُونَ: ”حَادٍ يَحِينِدُ حَيْدَةً“ (بَاعَ يَبِيعُ) کسی چیز سے کسی کترانا، بیچ کر نکلنا، دور بھاگنا۔ ہر انسان ہی طبعی طور پر موت سے بھاگتا ہے، مگر اس سے چارہ نہیں اور نہ ہی انسان کی سدا زندہ رہنے کی خواہش پوری ہو سکتی ہے۔ دیکھیے سورہ جمعہ (۸) اور سورہ اتراب (۱۶) کی تفسیر۔ یعنی یہ وہ حقیقت ہے جس کا سامنا کرنے سے تو پہلو تہی کرتا اور کئی کتراتا تھا اور چاہتا تھا کہ اس سے بچ کر اپنی من مانی کرتا رہے۔

آیت 20 ﴿۲۰﴾ وَنُفِخَ فِي الصُّورِ: موت کے بعد یہ دوسرا موقع ہے جب انسان کے سامنے یہ حقیقت کھل کر آجائے گی کہ وہ جو کچھ کرتا تھا سب اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا اور کرنا کاتبین کے ذریعے سے محفوظ ہو رہا تھا۔ یہاں صور میں پھونکے جانے

وَجَاءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَعَهَا سَائِقٌ وَشَهِيدٌ ﴿۲۱﴾ لَقَدْ كُنْتُمْ فِي عَفْوَةٍ مِّنْ هَذَا فَكَشَفْنَا
عَنْكَ غَطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ ﴿۲۲﴾ وَقَالَ قَرِينُهُ هَذَا مَا لَدَىٰ عَتِيدٍ ﴿۲۳﴾

اور ہر شخص آئے گا، اس کے ساتھ ایک ہانکنے والا اور ایک گواہی دینے والا ہے ﴿۲۱﴾ سائِق یعنی اس سے بڑی غفلت
میں تھا، سو ہم نے تجھ سے تیرا پردہ دور کر دیا، تو تیری نگاہ آج بہت تیز ہے ﴿۲۲﴾ اور قَرِينُہ یعنی اس کے ساتھ ایک گواہی دینے والا ہے ﴿۲۳﴾
ہے وہ جو میرے پاس تیار ہے ﴿۲۳﴾

سے مراد دوسری دفعہ پھونکا جانا ہے، جب ہر آدمی قبر سے نکل کر اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہو جائے گا۔ ”وعید“ دھمکی اور سزا کے
وعدے کو کہتے ہیں، یعنی تمہیں نافرمانی پر جو وعید سنائی گئی تھی یہ اس کے پورے ہونے کا دن ہے۔ ”نسخ صور“ کے لیے دیکھیے
سورہ ابراہیم (۵۱ تا ۵۱۲)، طہ (۱۰۲)، حج (۱)، لیس (۵۱) اور سورہ زمر (۶۸)۔

آیت 21 : ﴿وَجَاءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَعَهَا سَائِقٌ وَشَهِيدٌ﴾: ”سَائِقٌ“ ”سَائِقٌ يَسُوْقُ سَوْقًا“ سے اسم فاعل ہے، ہانکنے والا
جو جانوروں کو یا کسی گروہ کو ہانک کر کسی جگہ پہنچاتا ہے۔ ”شَهِيدٌ“ شہادت دینے والا۔ یعنی قبر سے نکلتے ہی ہر کافر کے ساتھ
ایک فرشتہ ہانکنے والا ہوگا جو اسے ہانک کر محشر کی طرف لے جائے گا اور ایک اس کے اعمالِ بد کی شہادت دینے والا ہوگا۔ یہ
فرشتہ کرانا کاتبین میں سے بھی ہو سکتا ہے جو اس کا نامہ اعمال لے کر شہادت کے لیے حاضر ہوگا۔ گویا مجرم بھی حاضر ہوگا اور
اس کے خلاف مکمل شہادتیں بھی حاضر ہوں گی۔ ”كُلُّ نَفْسٍ“ سے مراد یہاں ہر کافر و مشرک ہے، کیونکہ اس اہانت اور تذلیل
کے ساتھ کفار ہی کو لے جایا جائے گا۔ بعد کی آیات سے بھی یہ بات واضح ہو رہی ہے۔

آیت 22 : ﴿لَقَدْ كُنْتُمْ فِي عَفْوَةٍ مِّنْ هَذَا﴾: ”عَفْوَةٍ“ میں توین تعظیم کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ ”بڑی غفلت“
کیا گیا ہے۔ یہاں یہ الفاظ محذوف ہیں کہ ”ہر کافر و مشرک سے کہا جائے گا کہ.....“ یہ آیت بھی دلیل ہے کہ ”كُلُّ نَفْسٍ“
سے مراد کفار ہیں، کیونکہ وہی آخرت سے غافل ہیں، مومن تو آخرت کا یقین رکھتے ہیں اور اس کی فکر میں رہتے ہیں۔ کفار کو یہ
بات ذلیل کرنے کے لیے طنز کے طور پر کہی جائے گی۔

آیت 23 : ﴿فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ﴾: یعنی تیری آنکھوں پر پڑا ہوا غفلت کا پردہ، جس کی وجہ سے تو آخرت کا انکار کرتا تھا، وہ
پردہ اب ہم نے دور کر دیا ہے، اس لیے تیری نظر تیز ہو چکی ہے اور تو اپنی آنکھوں کے ساتھ ان تمام حقیقتوں کو دیکھ سکتا ہے جن کا
انکار کرتا تھا۔

آیت 23 : ﴿وَقَالَ قَرِينُهُ هَذَا مَا لَدَىٰ عَتِيدٍ﴾: ”قَرِينٌ“ ساتھی۔ یعنی وہ فرشتہ جو اسے ہانک کر محشر میں لانے پر مقرر
تھا کہے گا، اے رب! وہ مجرم جسے لانے پر تو نے مجھے مقرر فرمایا تھا یہ میرے پاس حاضری کے لیے تیار ہے اور وہ فرشتہ جو
شہادت کے لیے ساتھ تھا کہے گا، اس کے متعلق جس جس شہادت کی ضرورت ہے وہ یہ ہے جو میرے پاس تیار ہے۔

أَلْقِيَا فِي جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيدٍ ﴿۳۶﴾ مَنَاعٍ لِلْخَيْرِ مُعْتَدٍ مُّرِيْبٍ ﴿۳۷﴾ الَّذِي جَعَلَ مَعَ اللَّهِ
إِلَهًا آخَرَ فَالْقِيَةُ فِي الْعَذَابِ الشَّدِيدِ ﴿۳۸﴾ قَالَ قَرِينُهُ رَبَّنَا مَا أَطْعَمْتُهُ وَلَكِنْ كَانَ فِي
صَلِّي بَعِيدٍ ﴿۳۹﴾ قَالَ لَا تَخْصِمُونَا لِذِيٍّ وَ قَدْ قَدَّمْتُ إِلَيْكُمْ بِالْوَعِيدِ ﴿۴۰﴾

جہنم میں پھینک دو تم دونوں (فرشتے) ہر زبردست ناشکرے کو، جو بہت عناد رکھنے والا ہے ﴿۳۶﴾ جو خیر کو بہت روکنے والا،
حد سے گزرنے والا، شک کرنے والا ہے ﴿۳۷﴾ جس نے اللہ کے ساتھ دوسرا معبود بنا لیا، سو دونوں اسے بہت سخت عذاب
میں ڈال دو ﴿۳۸﴾ اس کا ساتھی (شیطان) کہے گا اے ہمارے رب! میں نے اسے سرکش نہیں بنایا اور لیکن وہ خود ہی دور کی
گمراہی میں تھا ﴿۳۹﴾ فرمایا میرے پاس جھگڑا مت کرو، حالانکہ میں نے تو تمہاری طرف ڈرانے کا پیغام پہلے بھیج دیا تھا ﴿۴۰﴾

آیت 24-26: ﴿۲۶﴾ أَلْقِيَا فِي جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيدٍ.....: اللہ تعالیٰ ان دونوں فرشتوں سے فرمائے گا کہ ہر ایسے شخص کو جہنم
میں پھینک دو جو سخت ناشکرا، بہت عناد رکھنے والا، خیر کو بہت روکنے والا، حد سے گزرنے والا اور شک کرنے والا ہے، جس نے
اللہ کے ساتھ اور معبود بنا رکھا تھا، سوا سے شدید عذاب میں پھینک دو۔ اس میں اسے جہنم میں پھینکنے کے فیصلے کے ساتھ اس
فیصلے کی وجہ اور اس کے دلائل بھی بیان فرمادیے ہیں اور یہ بھی کہ صرف ایک کو نہیں بلکہ ان جرائم کے مرکب تمام مجرموں کو جہنم
میں پھینک دو۔

آیت 27: ﴿۲۷﴾ قَالَ قَرِينُهُ رَبَّنَا مَا أَطْعَمْتُهُ.....: کافر جب یہ حکم سنے گا تو کہے گا، اے میرے رب! میرا کوئی گناہ نہیں،
مجھے تو میرے قرین (ساتھی) نے گمراہ کیا۔ اس کے جواب میں اس کا قرین (ساتھی) کہے گا، اے ہمارے رب! میں نے اسے
سرکش نہیں بنایا، بلکہ یہ خود ہی بہت دور کی گمراہی میں مبتلا تھا، میں نے اس پر کوئی زبردستی نہیں کی۔ اگر یہ خود انتہائی گمراہ نہ ہوتا
تو میرے کہنے سے کبھی سرکشی اختیار نہ کرتا۔ ”قرین“ سے مراد وہ شیطان بھی ہے جو انسان کے ساتھ رہ کر اسے گمراہ کرتا رہتا
ہے اور انسانوں میں سے برے ساتھی بھی جو اسے برائی کا درس دیتے اور اس پر ابھارتے رہتے ہیں۔ قیامت کے دن جب
مجرم یہ بہانہ بنائے گا کہ ان لوگوں نے مجھے گمراہ کیا تو وہ اس سے صاف براءت کا اظہار کر دیں گے۔ ان گمراہ کرنے والے
شیاطین الانس والجن کے اپنے گمراہ کردہ لوگوں سے بری ہونے کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ بقرہ (۱۶۷)، اعراف، (۳۸)،
۳۹)، ابراہیم (۲۱)، سبا (۳۱ تا ۳۳) اور سورہ ص (۶۱ تا ۵۵)۔

آیت 28: ﴿۲۸﴾ قَالَ لَا تَخْصِمُونَا لِذِيٍّ وَ قَدْ قَدَّمْتُ إِلَيْكُمْ بِالْوَعِيدِ: اللہ تعالیٰ ان کا جھگڑا سن کر فرمائے گا، اب
یہاں میرے پاس مت جھگڑو، اس جھگڑے سے تمہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا، کیونکہ میں نے تو تمہیں پہلے ہی رسول بھیج کر
نافرمانی کی سزا سے آگاہ کر دیا تھا، مگر تم نے پروا نہیں کی، اب اپنے کفر و عناد کی سزا جھگڑو۔

مَا يُبَدِّلُ الْقَوْلَ لَدَيَّ وَمَا أَنَا بِظَالِمٍ لِّلْعَبِيدِ ﴿۲۹﴾ يَوْمَ نَقُولُ لِبَعْضِهِمْ هَلْ أَتَاكَتِ وَ نَقُولُ هَلْ مِنْ فَرْيِدٍ ﴿۳۰﴾ وَ أَرْزَقْنَا لِّلْمُتَّقِينَ غَيْرَ بَعِيدٍ ﴿۳۱﴾

میرے ہاں بات بدلی نہیں جاتی اور میں بندوں پر ہرگز کوئی ظلم ڈھانے والا نہیں ﴿۲۹﴾ جس دن ہم جہنم سے کہیں گے کیا تو بھرگئی؟ اور وہ کہے گی کیا کچھ مزید ہے؟ ﴿۳۰﴾ اور جنت پر ہیزگاروں کے لیے قریب کر دی جائے گی، جو کچھ دور نہ ہوگی ﴿۳۱﴾

آیت 29 ﴿۱﴾ مَا يُبَدِّلُ الْقَوْلَ لَدَيَّ: یعنی میں نے جو تمہیں جہنم میں ڈالنے کا فیصلہ کر دیا ہے وہ اب بدل نہیں سکتا۔ مزید دیکھیے سورہ ص (۸۴، ۸۵) کی تفسیر۔ اس کی ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ میرے پاس کوئی بات کو بدل نہیں سکتا اور نہ یہاں کسی کا جھوٹ چل سکتا ہے، کیونکہ میں تمام باتیں جانتا ہوں۔ اس کے مطابق اشارہ قرین کے یہ کہنے کی طرف ہوگا: ﴿مَا أَظْفَيْتُهُ﴾ ”میں نے اسے سرکش نہیں بنایا۔“ (التسہیل) یعنی یہاں نہ مجرم کا جھوٹ چل سکتا ہے نہ اس کے قرین کا، دونوں ”کفار عنید“ ہیں اور ”کفار عنید“ جو بھی ہے اسے جہنم میں ڈالا جائے گا۔

﴿۲﴾ وَمَا أَنَا بِظَالِمٍ لِّلْعَبِيدِ: یعنی اگر میں نے پہلے نہ بتایا ہوتا اور تمہیں جہنم میں ڈالتا تو یہ شدید ظلم ہوتا جو میں اپنے بندوں پر کسی صورت کرنے والا نہیں۔ مزید دیکھیے سورہ آل عمران (۱۸۲) اور سورہ حج (۱۰)۔

آیت 29 ﴿۳﴾ يَوْمَ نَقُولُ لِبَعْضِهِمْ هَلْ أَتَاكَتِ : یعنی یہ سب کچھ اس دن واقع ہوگا جب ہم جہنم سے کہیں گے کیا تو بھرگئی۔ اس کی سب سے صحیح تفسیر وہ ہے جو انس رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے نقل کی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: «يُلْقَى فِي النَّارِ وَ نَقُولُ هَلْ مِنْ فَرْيِدٍ حَتَّى يَضَعَ قَدَمَهُ فَتَقُولُ قَطُ قَطُ» [بخاری، التفسیر، سورہ ق، باب قولہ: ﴿وَنَقُولُ هَلْ مِنْ فَرْيِدٍ﴾: ۴۸۴۸] ”جہنم میں لوگ ڈالے جائیں گے اور وہ یہی کہتی رہے گی، کیا کچھ اور بھی ہے؟ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس میں اپنا قدم رکھ دے گا تو وہ کہہ اٹھے گی، بس بس۔“ بعض لوگوں کے کہنے کے مطابق جہنم یہ بات زبان حال سے کہے گی، مگر اس تاویل کی ضرورت وہاں ہوتی ہے جہاں حقیقت ممکن نہ ہو اور یہاں تو ہر چیز کو اللہ تعالیٰ نے زبان دے رکھی ہے جس کی بولی اگر ہم نہیں سمجھتے تو پیدا کرنے والا خوب سمجھتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَكِنْ لَّا تُفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ﴾ [بنی اسرائیل: ۴۴] ”اور کوئی بھی چیز نہیں مگر اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتی ہے اور لیکن تم ان کی تسبیح نہیں سمجھتے۔“ اور فرمایا: ﴿وَكَأَنَّا لَجُلُودُهُمْ لِمَ شَهِدْتُمْ عَلَيْنَا مَا كَانُوا أَنْطَقْنَا اللَّهُ الَّذِي أَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ﴾ [حجۃ السجدہ: ۲۱] ”اور وہ اپنے جڑوں سے کہیں گے تم نے ہمارے خلاف شہادت کیوں دی؟ وہ کہیں گے ہمیں اس اللہ نے بلوا دیا جس نے ہر چیز کو بلوایا۔“

آیت 31 ﴿۳﴾ وَ أَرْزَقْنَا لِّلْمُتَّقِينَ غَيْرَ بَعِيدٍ: قرآن کے عام اسلوب کے مطابق جہنمیوں کے ساتھ اہل جنت کا ذکر بھی فرمایا۔ یعنی متقی لوگوں کی تکریم کے لیے جنت ان کے قریب لائی جائے گی، تاکہ انہیں چلنے کی تکلیف نہ اٹھانا پڑے۔

هَذَا مَا تُوْعَدُونَ لِكُلِّ أَوَّابٍ حَفِيظٍ ﴿۳۲﴾ مَنْ خَشِيَ الرَّحْمَنَ بِالْغَيْبِ وَجَاءَ بِقَلْبٍ مُنِيبٍ ﴿۳۳﴾ ادْخُلُوهَا بِسَلَامٍ - ذَلِكَ يَوْمُ الْخُلُودِ ﴿۳۴﴾

یہ ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا، ہر اس شخص کے لیے جو بہت رجوع والا، خوب حفاظت کرنے والا ہو ﴿۳۲﴾ جو رحمان سے بغیر دیکھے ڈر گیا اور رجوع کرنے والا دل لے کر آیا ﴿۳۳﴾ اس میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ، یہی ہمیشہ رہنے کا دن ہے ﴿۳۴﴾

”غَيْرِ بَعِيدٍ“ کا لفظ تاکید کے لیے ہے، جیسے فرمایا: ﴿وَأَصْلًا فِرْعَوْنَ قَوْمًا وَمَاهِدِي﴾ [صہ: ۷۹] اور فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ کیا اور سیدھے راستے پر نہ ڈالا۔“ اور رسول اللہ ﷺ نے بارش کی دعائیں فرمایا: ﴿نَافِعًا غَيْرَ ضَارٍّ عَاجِلًا غَيْرَ أَجَلٍ﴾ [ابو داؤد، صلاة الاستسقاء، باب رفع اليبين في الاستسقاء: ۱۱۶۹] ”(اے اللہ! وہ بارش) نفع آور ہو، کسی ضرر کا باعث نہ بنے اور جلدی آئے، دیر نہ کرے۔“

آیت 32: هَذَا مَا تُوْعَدُونَ لِكُلِّ أَوَّابٍ حَفِيظٍ: ”اَوَّابٍ“ ”آبٌ يُّؤْتِبُ أُوْبًا“ (ان) سے مبالغے کا صیغہ ہے، بہت رجوع کرنے والا، جو ہر معاملے میں اللہ کی طرف بہت رجوع کرے اور کوئی قدم اپنی خواہش کی بنا پر نہ اٹھائے، اسی طرح ہر لغزش کے بعد اللہ کی طرف رجوع کر کے توبہ و استغفار کرے۔ ”حَفِيظٍ“ جو اللہ کے احکامات کی خوب حفاظت اور پابندی کرنے والا ہو۔ یعنی جنتیوں سے کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ جنت جس کا تم سے ہر ایسے شخص کے لیے وعدہ کیا جاتا تھا جو اللہ کی طرف بہت رجوع کرنے والا ہو، اس کے احکام کی خوب پابندی کرنے والا ہو۔

آیت 33: ﴿۱﴾ مَنْ خَشِيَ الرَّحْمَنَ بِالْغَيْبِ: یعنی رحمان کو دیکھے بغیر اس سے ڈرتا ہے اور اس وقت بھی ڈرتا ہے جب وہ لوگوں سے غائب ہوتا ہے، کوئی اس کے پاس نہیں ہوتا۔ یہاں ایک سوال ہے کہ خشیت کے ساتھ لفظ ”رحمان“ لانے میں کیا حکمت ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ رحمان کا لفظ لانے میں اس شخص کی تعریف مقصود ہے کہ وہ اللہ کی رحمت اور اس کے معاف کر دینے کی صفت کا عم رکھنے کے باوجود اس سے ڈرتا ہے۔ (زمخشری) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿سَبْعَةٌ يُظِلُّهُمُ اللَّهُ تَعَالَى فِي ظِلِّهِ يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلُّهُ﴾ ”سات آوی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ اپنے سائے میں جگہ دے گا جب اس کے سائے کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا۔“ ان میں سے پانچویں کے بارے میں فرمایا: ﴿وَرَجُلٌ دَعَتْهُ امْرَأَةٌ ذَاتُ مَنْصِبٍ وَجَمَالٍ فَقَالَ إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ﴾ ”اور وہ آوی ہے جسے اونچے سب اور جمال والی عورت نے دعوت دی تو اس نے کہا میں اللہ سے ڈرتا ہوں۔“ اور آخر میں فرمایا: ﴿وَرَجُلٌ ذَكَرَ اللَّهَ خَائِبًا فَفَاضَتْ عَيْنَاهُ﴾ [بخاری، الزكاة، باب الصلغة باليمين: ۱۴۲۳] ”اور ایک وہ آوی جس نے اکیلے ہونے کی حالت میں اللہ کو یاد کیا تو اس کی آنکھیں یہ پڑیں۔“

﴿۲﴾ وَجَاءَ بِقَلْبٍ مُنِيبٍ: یعنی اس کے دل کا رجوع اللہ ہی کی طرف رہتا ہے۔

آیت 34: ادْخُلُوهَا بِسَلَامٍ...: یعنی ان کی عزت افزائی کے لیے کہا جائے گا کہ سلام کے ساتھ اس میں داخل ہو جاؤ۔

لَهُمْ قَا يَشَاءُونَ فِيهَا وَلَدَيْنَا مَزِيدٌ ﴿۳۵﴾ وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ أَشَدُّ مِنْهُمْ

بَطْشًا فَنَقَّبُوا فِي الْبِلَادِ ه هَلٌ مِّنْ فُحْيِص ﴿۳۶﴾

ان کے لیے جو کچھ وہ چاہیں گے اس میں ہوگا اور ہمارے پاس مزید بھی ہے ﴿۳۵﴾ اور ہم نے ان سے پہلے کتنی ہی نسلیں ہلاک کر دیں، جو پکڑنے میں ان سے زیادہ سخت تھیں۔ پس انھوں نے شہروں کو چھان مارا، کیا بھانگنے کی کوئی جگہ ہے؟ ﴿۳۶﴾

سلام کا مطلب یہ ہے کہ ہر قسم کے خوف، غم اور فکر سے سلامت رہ کر اس میں داخل ہو جاؤ اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ اس میں اس حال میں داخل ہو جاؤ کہ تم پر فرشتوں اور پروردگار کی طرف سے سلام ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿سَلَامٌ قَوْلًا مِّنْ رَبِّنَا لِمَنْ يَّزِيهِمْ﴾ [بقرہ: ۵۸] "سلام ہو۔ اس رب کی طرف سے کہا جائے گا جو بے حد مہربان ہے۔" اب تم ہمیشہ یہاں رہو گے، کبھی اس سے نکالے نہیں جاؤ گے۔

آیت 35 ﴿۳۵﴾ لَهُمْ قَا يَشَاءُونَ فِيهَا: اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ حم السجده (۳۱) اور سورہ زخرف (۷۱)۔

﴿۳۶﴾ وَلَدَيْنَا مَزِيدٌ: یعنی جو کچھ وہ چاہیں گے وہ بھی ملے گا اور ہمارے پاس مزید بھی بہت کچھ ہے، جس میں وہ چیزیں ہیں جن کا خیال تک کسی کو نہیں آیا۔ (دیکھیے سجدہ: ۱۷) اور سب سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کا دیدار بھی۔ دیکھیے سورہ یونس (۲۶)۔

آیت 36 ﴿۳۶﴾ وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ.....: "فَنَقَّبُوا" نقب کا معنی سوراخ ہے۔ "نَقَبَ (ن) فِي الْأَرْضِ" زمین میں گھوما پھرا۔ "نَقَبَ تَنْقِيًا" (تفہیل) میں حروف زیادہ ہونے کی وجہ سے معنی میں مبالغہ ہے، خوب گھوما پھرا۔ نقب (سوراخ) کی مناسبت سے "فَنَقَّبُوا فِي الْبِلَادِ" کا ترجمہ کیا گیا ہے: "پس انھوں نے شہروں کو چھان مارا۔" اس سے پہلے کفار کو آخرت میں دیے جانے والے عذاب کا ذکر فرمایا، درمیان میں ایمان والوں کے حسن انجام کا ذکر کرنے کے بعد اب کفار کو دنیا میں دیے جانے والے ہولناک عذابوں کا ذکر فرمایا۔ مقصود کفار کو ڈرانا اور رسول اللہ ﷺ اور ایمان والوں کو تسلی دلانا ہے کہ وہ کفار کی شان و شوکت سے مرعوب نہ ہوں۔

﴿۳۶﴾ یعنی ہم نے ان کفار سے پہلے بہت سی نسلیں ہلاک کر دیں جو گرفت میں ان سے بہت سخت اور ان سے زیادہ قوت والی تھیں، جیسا کہ قوم نوح، عاد، ثمود اور قوم فرعون وغیرہ۔ تو ان کے مقابلے میں ان بے چاروں کی کیا بساط ہے؟ مزید دیکھیے سورہ روم (۹)۔

﴿۳۶﴾ فَنَقَّبُوا فِي الْبِلَادِ: یعنی وہ اہل مکہ سے تجارت اور کاروبار میں بھی بہت آگے تھے، چنانچہ انھوں نے اس مقصد کے لیے دنیا کے شہروں کو چھان مارا تھا۔ بعض اہل علم نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ وہ اپنے ملک ہی پر قوت و گرفت نہیں رکھتے تھے بلکہ دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی جا گئے تھے۔

إِنَّ فِي ذَلِكَ لَذِكْرَى لِمَنْ كَانَ لَهُ قَلْبٌ أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ ﴿۳۷﴾ وَ لَقَدْ خَلَقْنَا
السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ۚ وَمَا سَأَلْنَا مِنْ نُجُوبٍ ﴿۳۸﴾

بلاشبہ اس میں اس شخص کے لیے یقیناً نصیحت ہے جس کا کوئی دل ہو، یا کان لگائے، اس حال میں کہ وہ (دل سے) حاضر ہو ﴿۳۷﴾ اور بلاشبہ یقیناً ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے چھ دنوں میں پیدا کیا اور ہمیں کسی قسم کی تھکاوٹ نے نہیں چھوا ﴿۳۸﴾

﴿۳۷﴾ هَلْ مِنْ مَّجْنُونٍ: ”مَجْنُونٍ“ ”حَاصِصٌ بِحَيْضِ حَيْضًا“ سے ظرف ہے، بھاگنے کی جگہ۔ یعنی جب ان پر عذاب آیا تو وہ اس سے بھاگنے کی جگہ ڈھونڈتے پھرے کہ کیا بھاگنے کی کوئی جگہ ہے، مگر انہیں کہیں جائے پناہ نہ ملی۔

آیت 37 ﴿۳۷﴾ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَذِكْرَى لِمَنْ كَانَ لَهُ قَلْبٌ: ”قَلْبٌ“ کمرہ ہے، اس لیے ترجمہ ”کوئی دل“ کیا گیا ہے۔ نصیحت حاصل کرنے کے دو ہی ذریعے ہیں، یا تو آدمی خود غور و فکر کرے اور عقل سے کام لے یا کسی خیر خواہ کی بات توجہ سے سن کر اس پر عمل کر لے۔ یعنی اس سورت میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے نصیحت وہی حاصل کر سکتا ہے جو کوئی دل رکھتا ہو جس کے ساتھ اس پر غور و فکر کرے۔ ”کوئی دل“ کا مطلب یہ ہے کہ وہ دل کے ساتھ معمولی سا غور و فکر بھی کرے، یا دل کی حاضری کے ساتھ ان آیات کو سن لے۔ مگر کفار کا حال یہ ہے: ﴿لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا ۖ وَ لَهُمْ آذَانٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا ۖ وَ لَهُمْ آفَانٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا﴾ [الاعراف: ۱۷۹] ”ان کے دل ہیں جن کے ساتھ وہ سمجھتے نہیں اور ان کی آنکھیں ہیں جن کے ساتھ وہ دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں جن کے ساتھ وہ سنتے نہیں۔“ اور قیامت کے دن وہ خود تسلیم کریں گے: ﴿لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ﴾ [السلک: ۱۰] ”اگر ہم سنتے ہوتے یا سمجھتے ہوتے تو ہم بھڑکتی ہوئی آگ والوں میں سے نہ ہوتے۔“

آیت 38 ﴿۳۸﴾ وَ لَقَدْ خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ: قیامت کی دلیل کے طور پر آسمان و زمین کے پیدا کرنے کا دوبارہ ذکر فرمایا کہ بلاشبہ یقیناً ہم نے یہ سارے آسمان اور زمین چھ دن میں پیدا کیے اور ہمیں کسی قسم کی تھکاوٹ نے چھوا تک نہیں، تو ہم انسان کو دوبارہ کیوں زندہ نہیں کر سکتے؟ یہی بات پہلے فرمائی تھی: ﴿أَفَعَبَّبْنَا بِالْمَخْلُوقِ الْأَوَّلِ﴾ [ق: ۱۵] ”تو کیا ہم پہلی دفعہ پیدا کرنے کے ساتھ تھک کر رہ گئے ہیں؟“ دوبارہ اس لیے ذکر فرمائی کہ بار بار دہرانے سے بات ذہن میں بیٹھ جاتی ہے۔

﴿۳۸﴾ وَمَا سَأَلْنَا مِنْ نُجُوبٍ: اس میں یہود و نصاریٰ کا رد بھی ہے جنہوں نے اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھا کہ اس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا فرمایا اور ساتویں دن آرام کیا۔ کتاب مقدس میں تورات کے سفر التکوین (۲:۲) کے الفاظ ہیں: ”فَأَسْتَرَّاحَ فِي الْيَوْمِ السَّابِعِ“ یعنی ”ساتویں دن میں آرام کیا۔“

قَاصِبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوبِ ﴿۳۹﴾ وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَآذِنًا لِلشُّجُودِ ﴿۴۰﴾ وَاسْتَبِغْ يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْمُنَادِ مِن فُكَّانٍ قَرِيبٍ ﴿۴۱﴾

سواں پر صبر کر جو وہ کہتے ہیں اور سورج طلوع ہونے سے پہلے اور غروب ہونے سے پہلے اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کر ﴿۳۹﴾ اور رات کے کچھ حصے میں پھر اس کی تسبیح کر اور سجدے کے بعد کے اوقات میں بھی ﴿۴۰﴾ اور کان لگا کر سن جس دن پکارنے والا ایک قریب جگہ سے پکارے گا ﴿۴۱﴾

آیت 39-40: ﴿۱﴾ قَاصِبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ..... اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ طہ (۱۳۰) کی تفسیر۔

﴿۲﴾ وَآذِنًا لِلشُّجُودِ: صحیح بخاری میں ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: «أَمْرُهُ أَنْ يُسَبِّحَ فِي آذِنَاتِ الصَّلَاةِ كُلِّهَا بِغَيْرِ قَوْلِهِ: ﴿وَآذِنًا لِلشُّجُودِ﴾» | بخاری، التفسیر، باب قوله: ﴿وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ﴾ [۴۸۵۲] «وَآذِنًا لِلشُّجُودِ» کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو حکم دیا کہ آپ تمام نمازوں کے بعد تسبیح پڑھا کریں۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «جو شخص ہر نماز کے بعد تینتیس (۳۳) دفعہ سبحان اللہ، تینتیس (۳۳) دفعہ الحمد للہ اور تینتیس (۳۳) دفعہ اللہ اکبر کہے تو یہ ننانوے (۹۹) ہو گئے اور سو (۱۰۰) پورا کرنے کے لیے کہے: «لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، اللَّهُ أَلَمُّ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ، اللَّهُ أَلَمُّ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ، اللَّهُ أَلَمُّ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ» تو اس کے گناہ بخش دیے جاتے ہیں، خواہ سمندر کی جھاگ کے برابر ہوں۔» [مسلم، المساجد، باب استحباب التذکر بعد الصلاۃ...: ۵۹۷]

آیت 41: ﴿۱﴾ وَاسْتَبِغْ.....: کھجلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے کفار کی بے ہودہ گوئی پر صبر اور اپنی تسبیح و تحمید کا حکم دیا، اس

آیت میں آپ کی تسلی کے لیے قیامت کے دن کا ذکر فرمایا کہ تھوڑا صبر کریں ان کی جزا کے لیے قیامت کا دن آیا ہی چاہتا ہے۔ ابن عطیہ نے "استبغ" کا معنی "انتظر" کیا ہے، یعنی صبر کے ساتھ اس دن کا انتظار کریں... اگر اس کا لفظی معنی "کان لگا کر سن" کیا جائے تو اس سے مراد بھی آپ کو تسلی دینا ہے کہ قیامت اتنی قریب ہے گویا اس میں پکارنے والے کی منادی کی آواز آپ کے کانوں میں آرہی ہے۔ زمخشری نے فرمایا: «وَاسْتَبِغْ يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْمُنَادِ» کا مطلب یہ ہے کہ کان لگا کر سن قیامت کے دن کا حال جو میں تمہیں بتانے لگا ہوں۔»

﴿۲﴾ يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْمُنَادِ: اس سے مراد صور میں دوسری دفعہ پھونکے جانے کا وقت ہے، جب فرشتہ صور میں پھونک مار کر سب لوگوں کو قبروں سے نکل کر محشر میں جمع ہو جانے کے لیے آواز دے گا۔ دیکھیے سورہ قمر (۸۳۶)۔

﴿۳﴾ مِن فُكَّانٍ قَرِيبٍ: یعنی قبروں میں پڑے ہوئے ہر شخص کو وہ آواز بالکل قریب سے آتی ہوئی سنائی دے گی۔ موجودہ سائنسی ایجادات سے یہ بات سمجھنا بہت آسان ہو گیا ہے۔

يَوْمَ يَسْعَوْنَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ ۚ ذَلِكَ يَوْمُ الْخُرُوجِ ﴿۳۲﴾ اِنَّا نَحْنُ نُحْيِي وَنُمِيتُ وَاِلَيْنَا الْمَصِيرُ ﴿۳۳﴾ يَوْمَ تَشَقُّقُ الْاَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا ۚ ذَلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيرٌ ﴿۳۴﴾ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُولُونَ ۚ وَمَا اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ فَذَكَرْ بِالْقُرْآنِ مَنْ يَخَافُ وَعَبِيدٌ ﴿۳۵﴾

جس دن وہ چیخ کو حق کے ساتھ سنیں گے، یہ نکلنے کا دن ہے ﴿۳۲﴾ یقیناً ہم ہی زندہ کرتے ہیں اور ہم ہی مارتے ہیں اور ہماری ہی طرف لوٹ کر آتا ہے ﴿۳۳﴾ جس دن زمین ان سے پھٹے گی، اس حال میں کہ وہ تیز دوڑنے والے ہوں گے، یہ ایسا اکٹھا کرنا ہے جو ہمارے لیے نہایت آسان ہے ﴿۳۴﴾ ہم اسے زیادہ جاننے والے ہیں جو یہ کہتے ہیں اور تو ان پر کوئی زبردستی کرنے والا نہیں، سو قرآن کے ساتھ اس شخص کو نصیحت کر جو میرے عذاب کے وعدے سے ڈرتا ہے ﴿۳۵﴾

آیت 42 ﴿يَوْمَ يَسْعَوْنَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ.....﴾: یعنی تمام لوگ وہ ہولناک آواز سنیں گے۔ ”بالْحَقِّ“ کا مطلب یہ ہے کہ یہ بات مجازاً نہیں کہی جا رہی بلکہ وہ اس ہولناک چیخ کو حقیقتاً، فی الواقع اور یقیناً سنیں گے۔ یہ بات اتنی تاکید کے ساتھ اس لیے فرمائی کہ کفار اس کا انکار کرتے تھے اور اسے ناممکن قرار دیتے تھے۔

آیت 43 ﴿اِنَّا نَحْنُ نُحْيِي وَنُمِيتُ.....﴾: یعنی دنیا میں مسلسل زندگی اور موت کا سلسلہ صرف ہمارے ہاتھ میں ہے، کسی اور کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ چنانچہ ہم بے شمار لوگوں کو زندگی بخشتے ہیں اور موت دے دیتے ہیں، پھر اور لوگوں کو زندگی عطا کرتے ہیں اور موت بھی دیتے ہیں۔ اسی طرح لاتعداد مخلوقات پیدا ہوتی اور مرتی چلی جا رہی ہیں اور آخر کار ان سب کو ہماری طرف ہی واپس آنا ہے۔

آیت 44 ﴿۱﴾ يَوْمَ تَشَقُّقُ الْاَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا: ”سِرَاعًا“ ”سَرِيعًا“ کی جمع ہے۔ ”يَوْمَ“ ”اِلَيْنَا الْمَصِيرُ“ کا ظرف ہے، یعنی ہماری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے اس دن جب زمین ان سے پھٹے گی اور وہ اس سے نکل کر تیزی سے دوڑتے ہوئے نکلیں گے۔

﴿۲﴾ ذَلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيرٌ: یہ کفار کی اس بات کا جواب ہے کہ جب ہم مر کر مٹی ہو چکے تو کیا اس وقت ہمیں زندہ کر کے اٹھا کھڑا کیا جائے گا؟ یہ تو عقل سے بعید اور ناممکن ہے۔ فرمایا یہ حشر یعنی سب اگلے پچھلے انسانوں کو ایک آواز کے ساتھ اکٹھا کر لینا ہمارے لیے بالکل آسان ہے۔

آیت 45 ﴿۱﴾ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُولُونَ: یہ جملہ کفار کے لیے وعید اور دھمکی ہے اور رسول اللہ ﷺ کے لیے تسلی و تسفی کا باعث ہے۔

﴿۲﴾ وَمَا اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ: یعنی آپ کا کام یہ نہیں کہ انہیں زبردستی مسلمان بنا لیں، آپ کا کام صرف پیغام پہنچانا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿اِنَّمَا اَنْتَ مُذَكِّرٌ ۚ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِبَصِيْرٍ﴾ [الغاشیة: ۲۱، ۲۲] ”تو صرف نصیحت کرنے والا

وَالذَّارِيَّتِ ذَرَوْا ۝۱ قَالَحَمِلَتْ وِقْرًا ۝۲

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

قسم ہے ان (ہواؤں) کی جو اڑا کر بکھیرنے والی ہیں! ۱ پھر ایک بھاری بوجھ (بادل) کو اٹھانے والی ہیں ۲

ہے۔ تو ہرگز ان پر کوئی مسلط کیا ہوا نہیں ہے۔“

۱ فَذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ مَنْ يَخَافُ وَعَبِيدِ: ”وَعَبِيدِ“ اصل میں ”وَعَبِيدِي“ ہے، میری وعید۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ دوسروں کو نصیحت نہ کریں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ آپ کی نصیحت سے فائدہ وہی اٹھائے گا جو میری وعید سے ڈرتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿لَمَّا تُنذِرُ الَّذِينَ يُعْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ﴾ [فاطر: ۱۸] ”تو تو صرف ان لوگوں کو ڈراتا ہے جو دیکھے بغیر اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں۔“

سورة الذاريات

آیت ۱: ۱ وَالذَّارِيَّتِ ذَرَوْا: قسم کا مقصد کسی بات کی تاکید اور اسے سچا ثابت کرنا ہوتا ہے۔ قرآن مجید کی قسمیں دراصل اپنے جواب قسم کی دلیل اور شاہد ہیں جنہیں قسم کی صورت میں لایا گیا ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے قیامت کے حق ہونے کی دلیل کے طور پر چار قسمیں اٹھائی ہیں۔

۲ وَالذَّارِيَّتِ ذَرَوْا: ”الذَّارِيَّتِ“ ”ذَرَا يَذُرُو ذَرْوًا“ سے اسم فاعل ”ذَارِيَّةٌ“ کی جمع ہے۔ اس کا معنی ”ہوا کا کسی چیز کو اڑانا اور بکھیرنا“ ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَأَضْبَعُ حَيْثُمَا تَذُرُوهُ الزِّيْفُ﴾ [الکہف: ۴۵] ”پھر وہ چورین گئی، جسے ہوائیں اڑائے پھرتی ہیں۔“ ”ذَرَوْا“ مفعول مطلق ہے جو ”الذَّارِيَّتِ“ کی تاکید کے لیے لایا گیا ہے۔ ”الذَّارِيَّتِ“ کا لفظی معنی ہے اڑانے والیاں۔ اب ان اڑانے والیوں سے مراد کیا ہے؟ مفسرین کا اتفاق ہے کہ ان سے مراد ہوائیں ہیں جو تیز چلتی ہیں تو گرد و غبار اور خس و خاشاک کو اڑا کر بکھیرتی چلی جاتی ہیں۔

آیت ۲: ۲ قَالَحَمِلَتْ وِقْرًا: ”وِقْرًا“ بوجھ، اس پر تمہیں تعظیم کے لیے ہے، بھاری بوجھ۔ یہ بھی ہواؤں ہی کی صفت ہے کہ پھر وہ ہوائیں سورج کی حرارت کے ساتھ سمندر سے اٹھنے والے آبی بخارات سے بننے والے کروڑوں اریوں ٹن وزنی بھاری بادلوں کو اٹھاتی ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ عربی زبان میں عام طور پر جب صفات کا عطف فاء کے ساتھ ہو تو ایک تو وہ سب ایک ہی موصوف کی صفتیں ہوتی ہیں، دوسرا ان میں ترتیب ہوتی ہے، جیسا کہ سورۃ عادیات میں ہے: ﴿وَالْعُدِيَّتِ صَبْحًا ۝۱ فَالْمُورِيَّتِ قَدْحًا ۝۲ فَالْمُغِيْرِيَّتِ صَبْحًا ۝۳ فَالْحَزْنُ بِهِ نَفْعًا ۝۴ فَالسَّطْنُ بِهِ سَعْنًا﴾ [العادیات: ۱ تا ۴] ”قسم ہے ان (گھوڑوں) کی جو پیٹ اور سینے سے آواز نکالتے ہوئے دوڑنے والے ہیں! پھر جو سم مار کر چنگاریاں نکالتے والے

فَالْجُرِيَّتِ يُسْرًا ۝ قَالَتْ قَسَيْتِ أَمْرًا ۝ إِنَّمَا تُوعَدُونَ لَصَادِقٌ ۝ وَإِنَّ الدِّينَ لَوَاقِعٌ ۝

پھر آسانی سے چلنے والی ہیں ۝ پھر ایک بڑے کام (بارش) کو تقسیم کرنے والی ہیں ۝ کہ بلاشبہ جو تم سے وعدہ کیا جاتا ہے یقیناً سچا ہے ۝ اور بلاشبہ جزا یقیناً واقع ہونے والی ہے ۝

ہیں! پھر جو صبح کے وقت حملہ کرنے والے ہیں! پھر اس کے ساتھ غبار اڑاتے ہیں۔ پھر وہ اس کے ساتھ بڑی جماعت کے درمیان جاگھتے ہیں۔ ”یہاں فاء کے ساتھ عطف سے ظاہر ہے کہ یہ اور اس کے بعد آیات میں مذکور سب صفات ہواؤں ہی کی ہیں۔

آیت 3 : فَالْجُرِيَّتِ يُسْرًا: یہ بھی ان ہواؤں ہی کی صفت ہے کہ پھر وہ اتنے بے حساب وزنی بادلوں کو اٹھا کر آسانی کے ساتھ چلتی ہیں، انھیں اس بوجھ کی وجہ سے چلنے میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آتی۔

آیت 4 : قَالَتْ قَسَيْتِ أَمْرًا: یہ بھی وہ ہوائیں ہی ہیں جو بھاری بادلوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے انھیں اللہ کے حکم سے زمین کے مختلف حصوں میں لے جا کر ان کے حصے کی بارش برساتی ہیں، جس سے مردہ زمین زندہ ہوتی ہے اور ہر علاقے کے لوگوں میں ان کا رزق تقسیم ہوتا ہے۔

آیت 5 6 : ① إِنَّمَا تُوعَدُونَ لَصَادِقٌ..... : یہاں ”إِنَّمَا“ اکٹھا لفظ نہیں جو کلمہ حصر ہے اور جس کا معنی ہے ”اس کے سوائے“ بلکہ اس میں ”إِنَّ“ حرف تاکید الگ ہے اور ”مَّا“ الگ ہے جو اسم موصول ہے اور اس کا معنی ہے ”وہ جو۔“ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے میں رسم الخط پوری طرح ضبط نہیں ہوا تھا، انھوں نے ان دونوں کو اکٹھا لکھ دیا، تو بعد میں امت نے قرآن مجید کی حفاظت کا اتنا زبردست اہتمام کیا کہ صحابہ نے جو لفظ جس طرح لکھا تھا قرآن مجید کے رسم الخط میں اسے اسی طرح باقی رکھا گیا۔

② یعنی ان چاروں صفات کی حامل ہوائیں شاہد ہیں کہ تم سے دوبارہ زندہ کیے جانے اور قبروں سے نکل کر اللہ کے سامنے پیش ہونے کا جو وعدہ کیا جاتا ہے وہ یقیناً سچا ہے اور ہر عمل کی جزا بلاشبہ یقیناً واقع ہونے والی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان ہواؤں کی مُردوں کے زندہ کرنے پر دلالت کو ایک اور آیت میں خوب واضح فرمایا ہے، فرمایا: ﴿وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيحَ بُهْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا أَقْلَّتْ سَحَابًا بِثِقَالٍ إِنفَالًا سُقْنَاهُ لِبَلَدٍ مَّيْتٍ فَأَنْزَلْنَا بِهِ الْمَاءَ فَأَخْرَجْنَا بِهِ مِنْ تَحْتِ الشَّجَرِ ۖ كَذَٰلِكَ نُفْرِجُ الْمَوْتَىٰ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ﴾ [الأعراف: ۵۷] ”اور وہی ہے جو ہواؤں کو اپنی رحمت سے پہلے بھیجتا ہے، اس حال میں کہ خوش خبری دینے والی ہیں، یہاں تک کہ جب وہ بھاری بادل اٹھاتی ہیں تو ہم اسے کسی مردہ شہر کی طرف ہانکتے ہیں، پھر اس سے پانی اتارتے ہیں، پھر اس کے ساتھ ہر قسم کے کئی پھل پیدا کرتے ہیں۔ اسی طرح ہم مُردوں کو نکالیں گے، تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔“ قرآن مجید نے بارش کے ساتھ مردہ زمین کے زندہ کرنے کو قیامت کے دن مُردوں کو زندہ

وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْحُبُكِ ۝۷ إِنَّكُمْ لَفِي قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ ۝۸

تم ہے آسمان کی جو راستوں والا ہے ۷ کہ بلاشبہ تم یقیناً ایک اختلاف والی بات میں پڑے ہوئے ہو ۸

کرنے کی دلیل کے طور پر بار بار بیان فرمایا ہے، مثلاً دیکھیے سورۃ فاطر (۹) اور سورۃ روم (۳۸) (۵۰۳)۔

آیت 7 وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْحُبُكِ: ”حُبُكُ الْحُبُكُ حَبْكًا“ (ن، ض) کسی چیز کو بانہٹنا، مضبوط بنانا، جولاہے کا کپڑے کو مضبوطی اور خوبصورتی کے ساتھ بنانا۔ ”الْحُبُكُ“ ”حَبْكَةٌ“ کی جمع ہے۔ ”حُبُكُ الرَّمْلِ وَالْمَاءِ وَالشَّعْرِ“ ٹھہرے ہوئے پانی یا ریت پر ہوا سے جو لہریں ہی بن جاتی ہیں، گھونگھریالے بالوں کی لہریں۔ ”حُبُكُ السَّمَاءِ“ آسمان میں ستاروں کے راستے۔ (قاموس)

آیت 8 إِنَّكُمْ لَفِي قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ: یعنی یہ آسمان جو نہایت مضبوط و مستحکم اور بے حد خوبصورت ہے، جس میں ستاروں کے راستے ہیں اور جو بادلوں کی لہروں سے آرامت ہے، شاید ہے کہ تم ایسی بات میں پڑے ہوئے ہو جس میں تمہارا بہت اختلاف ہے۔ یہاں سوال یہ ہے کہ اس میں آسمان کی شہادت کیسے ہے اور یہ کہنے سے حاصل کیا ہے کہ تم ایسی بات میں پڑے ہوئے ہو جس میں بہت اختلاف ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ اتنا مستحکم و مضبوط، بلند و بالا، خوبصورت اور مزین آسمان شاید ہے کہ اس کے بنانے والے کے لیے قیامت برپا کرنا اور تمہیں دوبارہ زندہ کرنا کچھ مشکل نہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿عَآئِنْتُمْ أَشَدَّ خَلْقًا أَوْ السَّمَاءِ بِنَاهَا﴾ [الذّارعت : ۲۷] ”کیا پیدا کرنے میں تم زیادہ مشکل ہو یا آسمان؟ اس نے اسے بنایا۔“ رہا یہ سوال کہ جواب تم ”إِنَّكُمْ لَفِي قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ“ کی مناسبت تم کے ساتھ کیا ہے؟ تو جواب اس کا یہ ہے کہ دراصل یہاں بات مختصر کی گئی ہے، تفصیل اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مضبوط و مستحکم آسمان کی قسم کھا کر فرمایا کہ اے گروہ کفار! اس آسمان کی قسم ہے کہ قیامت کے متعلق اللہ کا قول حق اور تمہارا قول باطل ہے، کیونکہ تم ایسے قول میں پڑے ہوئے ہو جو باہم مختلف اور متناقض ہے، جب کہ حق میں اختلاف نہیں ہوتا، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَلَوْ كَانُوا مِنْ عِنْدِ عَذِيبِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ لَفِتْلَافًا كَثِيرًا﴾ [الاسراء : ۸۲] ”اور اگر وہ غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے۔“ چنانچہ تم میں سے کوئی تو کہتا ہے کہ یہ دنیا ایسے ہی چلی آئی ہے، کچھ لوگ مرتے ہیں اور دوسرے پیدا ہوتے ہیں، نہ آج تک کوئی دوبارہ آیا نہ کوئی دوبارہ زندگی ہے۔ کوئی تنازع کا قائل ہے اور کہتا ہے کہ اچھے اور برے اعمال کا بدلا تو لازم ہے مگر اس کے لیے کوئی دن مقرر نہیں، بلکہ انسان دنیا میں بار بار اچھی یا بری مخلوق کی صورت میں جنم لیتا رہتا ہے۔ کوئی آخرت کو تو مانتا ہے مگر کچھ ہستیوں کے متعلق یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ وہ ایسی زور آور ہیں کہ اپنی شفاعت کے ساتھ اس دن اپنے نام لیواؤں کو زبردستی چھڑا لیں گی۔ یہ اختلاف دلیل ہے کہ قیامت کے متعلق تمہارا قول باطل ہے۔ قیامت کے متعلق کفار کے اختلاف کا ذکر سورۃ نبا کے شروع میں بھی فرمایا: ﴿عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ ۝ عَنِ الْقَبْرِ الْعَظِيمِ ۝ الَّذِي هُمْ فِيهِ مُخْتَلِفُونَ﴾ [النبأ : ۳] ”کس چیز کے بارے میں وہ آپس میں سوال کر رہے ہیں؟ (کیا) اس بڑی قبر کے بارے میں؟ وہ کہ جس میں وہ اختلاف کرنے والے ہیں۔“

يُؤْفِكُ عَنْهُ مَنْ أُوْفِكَ ۙ قُبُلَ الْخَرْصُونَ ۙ الَّذِينَ هُمْ فِي غَمْرَةٍ سَاهُونَ ﴿۱۱﴾
يَسْتَأْنُونَ أَيَّانَ يَوْمُ الدِّينِ ﴿۱۲﴾

اس (قیامت) سے وہی بہکایا جاتا ہے جو (پہلے سے) بہکایا گیا ہے ﴿۹﴾ اٹکل لگانے والے مارے گئے ﴿۱۰﴾ وہ جو خود بڑی غفلت میں بھولے ہوئے ہیں ﴿۱۱﴾ پوچھتے ہیں جزا کا دن کب ہے؟ ﴿۱۲﴾

آیت 9 ﴿يُؤْفِكُ عَنْهُ مَنْ أُوْفِكَ﴾: ”عَنْهُ“ کی ضمیر کا مرجع یا تو ”إِنَّ الدِّينَ لَوَاقِعٌ“ میں لفظ ”الدِّينَ“ ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہے کہ اس (قیامت) سے وہی بہکایا جاتا ہے جو (پہلے ہی) بہکایا گیا ہو، کسی صحیح الدماغ آدمی کو اس سے پھیرا اور بہکایا نہیں جاسکتا۔ یا ”عَنْهُ“ کی ضمیر کا مرجع ”قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ“ ہے، اس صورت میں ”عَنْ“ تغلیل کے معنی میں ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ یقیناً تم ایک اختلاف والی بات میں پڑے ہوئے ہو جس کی وجہ سے وہی آدمی بہکایا جاتا ہے جو (پہلے ہی) بہکایا گیا ہو، ایسی مختلف باتوں کی وجہ سے کسی صحیح الدماغ والے کو بہکایا نہیں جاسکتا ہے۔ یاد رہے کہ ”عَنْ“ کے معانی میں سے تغلیل مسلم معنی ہے، اس معنی کی مثال یہ آیت ہے: ﴿وَمَا نَحْنُ بِتَارِكِي آلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ﴾ [ہود: ۵۳] ”اور ہم اپنے معبودوں کو تیرے کہنے کی وجہ سے ہرگز چھوڑنے والے نہیں۔“

آیت 10 ﴿قُبُلَ الْخَرْصُونَ﴾: ”خَرَصٌ يَخْرُصُ خَرَصًا“ (ن) اندازہ لگانا، اٹکل لگانا، جیسا کہ فرمایا: ﴿إِنَّ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ﴾ [الزخرف: ۲۰] ”وہ تو صرف اٹکلیں دوڑا رہے ہیں۔“ ”خَرَصٌ“ مبالغے کا صیغہ ہے، بہت اٹکل لگانے والا۔ کفار کے پاس آسمانی ہدایت کی روشنی نہیں اس لیے وہ علم اور یقین سے محروم ہیں، ان کا سارا دار و مدار ظن و تخمین اور وہم و گمان پر ہے۔ چنانچہ شرک کی بنیاد سراسر گمان اور اندازوں پر ہے (دیکھیے نجم: ۲۳، ۲۸) اور قیامت کا انکار بھی محض خرص و تخمین (اٹکل اور اندازوں) پر ہے۔ ظاہر ہے اٹکل اور اندازوں کا انجام ہلاکت کے سوا کچھ نہیں، اس لیے فرمایا، اٹکل لگانے والے مارے گئے۔

آیت 11 ﴿الَّذِينَ هُمْ فِي غَمْرَةٍ سَاهُونَ﴾: ”عَمْرٌ يَعْمُرُ عَمْرًا“ (ن) ”الْمَاءُ“ کا معنی ”پانی“ کا کسی چیز کو ڈھانپ لینا ہے، اس لیے گہرے پانی کو ”عَمْرَةٌ“ کہتے ہیں۔ سختی اور موت کو اور جہالت و غفلت کو بھی ”عَمْرَةٌ“ کہتے ہیں، کیونکہ وہ بھی آدمی کی عقل کو ڈھانپ لیتی ہیں۔ ”عَمْرَةٌ“ پر توین تعظیم کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ ”بڑی غفلت“ کیا گیا ہے۔ ”سَاهُونَ“ ”سَهَا يَسْهُوُ سَهْوًا“ (ن) سے اسم فاعل کی جمع ہے، بھولے ہوئے۔ یعنی انھوں نے آخرت کا انکار محض خیال اور اندازے کی بنا پر کیا ہے، جس کی وجہ سے وہ اس کی تیاری سے بہت بڑی غفلت میں مبتلا ہو کر اپنے خوفناک انجام کو بھولے ہوئے ہیں۔

آیت 12 ﴿يَسْتَأْنُونَ أَيَّانَ يَوْمُ الدِّينِ﴾: یعنی جب انھیں قیامت کے انکار کی کوئی معقول دلیل نہیں ملتی تو وہ کہتے ہیں، اچھا یہ بتاؤ جزا کا دن کب ہے؟ ظاہر ہے ان کا یہ سوال محض انکار اور استہزا کے لیے ہے، کیونکہ تاریخ کا تعین کوئی دلیل نہیں

يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُونَ ﴿۱۳﴾ ذُوقُوا فِتْنَتَكُمْ ۗ هَذَا الَّذِي كُنْتُمْ بِهِ تَسْتَعْجِلُونَ ﴿۱۴﴾
 إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ﴿۱۵﴾ اخْذِينَ مَا آتَاهُمْ رَبُّهُمْ ۗ إِنَّهُمْ كَانُوا قَبْلَ ذَلِكَ
 مُجْسِبِينَ ﴿۱۶﴾

جس دن وہ آگ پر تپتے جائیں گے ﴿۱۳﴾ اپنے جلنے کا مزہ چکھو، یہی ہے جسے تم جلدی مانگتے تھے ﴿۱۴﴾ بے شک متقی لوگ باغوں اور چشموں میں ہوں گے ﴿۱۵﴾ لینے والے ہوں گے جو ان کا رب انھیں دے گا، یقیناً وہ اس سے پہلے نیکی کرنے والے تھے ﴿۱۶﴾

جس سے کوئی منکر اقرار پر آمادہ ہو جائے، بلکہ اس کے بعد ان کا اگلا سوال یہ ہوگا کہ اس کے آنے سے پہلے آخر ہم یہ یقین کیسے کر لیں کہ اس دن وہ واقعی آجائے گی؟ اس لیے اللہ تعالیٰ نے قیامت کا وقت نہیں بتایا۔

آیت 13 ﴿يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُونَ﴾: ”فَتَنَ يَفْتَنُ“ (ن، ض) کا معنی آزمانا بھی ہے اور جلانا بھی۔ کھرے یا کھوٹے کی پہچان کے لیے سونے کو آگ میں گھلایا جائے تو کہتے ہیں: ”فَتَنَتِ الذَّهَبُ“۔ فرمایا، وہ روز جزا اس دن ہوگا جب انھیں آگ پر رکھ کر تپایا اور جلایا جائے گا۔

آیت 14 ﴿ذُوقُوا فِتْنَتَكُمْ﴾: یہ بات انھیں ذلیل کرنے کے لیے بطور طنز کہی جائے گی۔

آیت 13 ﴿إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ﴾: مکذبین کے بعد متقین کا ذکر فرمایا۔ اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ حجر کی آیت (۳۵) کی تفسیر۔ آیت کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ جنتوں میں داخلے کا سبب تقویٰ ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي نُورِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا﴾ [مریم: ۶۳] ”یہ ہے وہ جنت جس کا وارث ہم اپنے بندوں میں سے اسے بناتے ہیں جو بہت بچنے والا ہو۔“

آیت 14 ﴿اخْذِينَ مَا آتَاهُمْ رَبُّهُمْ﴾: اس کے لفظی معنی اگرچہ یہی ہیں کہ ”وہ لینے والے ہوں گے جو ان کا رب انھیں دے گا“، مگر موقع و محل کی مناسبت اور ”آتَاهُمْ رَبُّهُمْ“ کے لفظ کے تقاضے سے ظاہر ہے کہ یہاں صرف لینا ہی مراد نہیں بلکہ مراد ان کے رب کا انھیں بے حساب دینا اور ان کا اس سے جی بھر کر خوشی خوشی لینا ہے۔ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿إِنَّ اللَّهَ يَقُولُ لِأَهْلِ الْجَنَّةِ يَا أَهْلَ الْجَنَّةِ! فَيَقُولُونَ لَبَّيْكَ رَبَّنَا وَسَعْدَيْكَ وَالْخَيْرُ فِي يَدَيْكَ، فَيَقُولُ هَلْ رَضِينُمْ؟ فَيَقُولُونَ وَمَا لَنَا لَا نَرْضَىٰ يَا رَبَّ! وَقَدْ أُعْطِينَا مَا لَمْ نَطْغُلْ أَحَدًا مِّنْ خَلْقِكَ؟ فَيَقُولُ أَلَا أُعْطِيَكُمْ أَفْضَلَ مِنْ ذَلِكَ؟ فَيَقُولُونَ يَا رَبَّ! وَأَيُّ شَيْءٍ أَفْضَلُ مِنْ ذَلِكَ؟ فَيَقُولُ أَجَلُ عَلَيْكُمْ رِضْوَانِي فَلَا أُسْخَطُ عَلَيْكُمْ بَعْدَهُ أَبَدًا﴾ [بخاری، التوحيد، باب كلام الرب مع أهل الجنة: ۷۵۱۸] ”اللہ تعالیٰ اہل جنت سے کہے گا: ”اے جنت والو!“ وہ کہیں گے: ”ہم حاضر ہیں اے ہمارے پروردگار! ہم حاضر ہیں اور ساری خیر

كَانُوا قَلِيلًا مِّنَ الَّذِينَ مَا يَهْجَعُونَ ﴿۱۷﴾

وہ رات کے بہت تھوڑے حصے میں سوتے تھے ﴿۱۷﴾

تیرے ہی ہاتھ میں ہے۔“ فرمائے گا: ”کیا تم راضی ہو گئے؟“ وہ کہیں گے: ”ہمیں کیا ہے کہ ہم راضی نہ ہوں جب کہ تو نے ہمیں وہ کچھ عطا فرمایا جو اپنی مخلوق میں سے کسی کو عطا نہیں کیا۔“ فرمائے گا: ”کیا میں تمہیں اس سے بھی افضل چیز نہ دوں؟“ وہ کہیں گے: ”اے ہمارے رب! بھلا اس سے افضل چیز کیا ہے؟“ فرمائے گا: ”میں تمہیں اپنی رضا اور خوشنودی عطا کرتا ہوں، سو اس کے بعد میں کبھی تم پر ناراض نہیں ہوں گا۔“

﴿۱۷﴾ لَئِنَّمْ كَانَوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّذِيْنَ مَا يَهْجَعُوْنَ: ”اِنّ“ تعلیل کے لیے ہوتا ہے، یعنی یہ نعمت انہیں اس لیے ملے گی کہ وہ اس سے پہلے دنیا میں احسان کرنے والے تھے۔ احسان کی تعریف رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمائی ہے: ﴿اَنْ تَعْلُدَ اللّٰهُ سَكَانَتِكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَهِيَ اَنْ يَزَاكَ﴾ [بخاری، الإیمان، باب سؤاں جبریل السی یسئو: ۵۰] ”(احسان یہ ہے) کہ تو اللہ کی عبادت اس طرح کرے گویا تو اسے دیکھ رہا ہے، سو اگر تو اسے نہیں دیکھتا تو یقیناً وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔“ ”مُحْسِنِيْنَ“ کا لفظی معنی ”عَامِلِيْنَ اَلْحَسَنَاتِ“ ہے، یعنی وہ نیکیاں کرنے والے تھے۔ آگے ان نیکیوں کی کچھ تفصیل ہے۔

آیت ۱۷ كَانُوا قَلِيلًا مِّنَ الَّذِينَ مَا يَهْجَعُونَ: ”هَجَعَ يَهْجَعُ هَجْجًا“ (ف) سونا، رات کا سونا، بکا سا سونا، تینوں معنوں میں آتا ہے۔ ”مَا يَهْجَعُونَ“ کے دو معنی کیے گئے ہیں، ایک یہ کہ ”مَا“ مصدر یہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ وہ رات میں سے بہت تھوڑا حصہ سوتے تھے۔ ابن کثیر نے یہ مطلب احنف بن قیس، حسن بصری اور زہری سے نقل فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورہ مزمل میں فرمایا: ﴿يَأْتِيهَا الْمَرْمِلُ ﴿۱۷﴾ فَمِمَّا يَنْزُلُ إِلَّا قَلِيلًا ﴿۱۸﴾ نَضْفَةٌ أَوْ انْقُصٌ مِنْهُ قَلِيلًا ﴿۱۹﴾ أَوْ يَزِدُّ عَلَيْهِ ﴿۲۰﴾ وَ رَتِيلَ الْقُرْآنِ تَرْتِيْلًا﴾ [المزمل: ۱۷-۲۰] ”اے کپڑے میں لپٹنے والے! رات کو قیام کر مگر تھوڑا۔ آدھی رات (قیام کر)، یا اس سے تھوڑا کم کر لے۔ یا اس سے زیادہ کر لے اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھ۔“ ان آیات کے نازل ہونے پر آپ ﷺ اور آپ کے صحابہ میں سے کچھ لوگ ایک سال تک اس پر عمل کرتے رہے، پھر اللہ تعالیٰ نے سورہ مزمل کا آخری حصہ نازل کیا، جس میں فرمایا: ﴿إِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُومُ أَدْنَىٰ مِن ثُلُثِي النَّيْلِ وَ نَضْفَةٌ وَ ثُلُثُهُ وَ ظِلْفَةٌ مِّنَ الَّذِينَ مَعَكَ ۗ وَ اللَّهُ يَقْدِرُ النَّيْلَ وَ الْفَهَارَ ۗ عَلِمَ أَنْ لَنْ تُحْصَوْهُ فَتَأْتِيكَمْ عَلَيْهِمْ فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ ۗ عَلَيْهِمْ أَنْ سَيَكُونُ مِنْكُمْ مَّرْضَىٰ ۗ وَ أَخْرُونَ يُضْرِبُونَ فِي الْأَرْضِ يَلْبَثُونَ مِّنْ فَضْلِ اللَّهِ ۗ وَ أَخْرُونَ يَقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۗ فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ﴾ [المزمل: ۲۰] ”بلاشبہ تیرا رب جانتا ہے کہ تو رات کے دو تہائی کے قریب اور اس کا نصف اور اس کا تیسرا حصہ قیام کرتا ہے اور ان لوگوں کی ایک جماعت بھی جو تیرے ساتھ ہیں اور اللہ رات اور دن کا اندازہ رکھتا ہے۔ اس نے جان لیا کہ تم ہرگز اس کی طاقت نہیں رکھو گے، سو اس نے تم پر مہربانی فرمائی تو قرآن میں سے جو میسر ہو پڑھو، اس نے جان لیا کہ یقیناً تم میں سے کچھ بیمار ہوں گے اور کچھ دوسرے زمین میں سفر کریں گے، اللہ کا فضل تلاش کریں گے اور کچھ دوسرے اللہ کی راہ میں لڑیں گے، پس اس میں سے جو میسر ہو پڑھو۔“ تو صحیح مسلم (۷۳۶) میں مذکور

عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کے مطابق قیام اللیل جو فرض تھا، نفل ہو گیا اور اس میں تخفیف ہو گئی اور رات کے اکثر حصے کے بجائے علم ہوا: ﴿فَأَقْرَهُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ﴾ کہ جتنا قیام آسانی سے کر سکتے ہو کر لو۔ اس آیت کی تفسیر اور قیام اللیل کی فضیلت کے لیے سورہ مزمل کی ابتدائی اور آخری آیات کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔

”كَانُوا قَلِيْلًا مِّنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُونَ“ کا مطلب اگر یہ کیا جائے کہ جنت میں وہ متقی جائیں گے جو رات کا تھوڑا حصہ سوتے تھے تو رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دائمی عمل سے اس مطلب کی تائید نہیں ہوتی۔ ہاں، مندرجہ ذیل حدیث کو سامنے رکھا جائے تو ”مَا يَهْجَعُونَ“ کا یہ مطلب بالکل درست ہے۔ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے فرمایا، میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا: ﴿مَنْ صَلَّى الْعِشَاءَ فِي جَمَاعَةٍ فَكَأَنَّمَا قَامَ نِصْفَ اللَّيْلِ، وَمَنْ صَلَّى الصُّبْحَ فِي جَمَاعَةٍ فَكَأَنَّمَا صَلَّى اللَّيْلَ كُلَّهُ﴾ [مسلم، المساجد و مواضع الصلاة، باب فصل صلاة العشاء والصبح في جماعة: ۶۵۶] ”جو شخص عشاء کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھے تو گویا اس نے نصف رات قیام کیا اور جو شخص صبح کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھے تو گویا اس نے ساری رات قیام کیا۔“ مزید بحث سورہ سجدہ کی آیت (۱۶): ﴿تَتَجَافَى جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ﴾ کی تفسیر میں ملاحظہ فرمائیں۔

”مَا يَهْجَعُونَ“ کا دوسرا معنی یہ ہے کہ اس میں ”مَا“ نافیہ ہے۔ ابن کثیر نے یہ مطلب ابن عباس، مطرف بن عبد اللہ اور مجاہد سے نقل فرمایا ہے اور تفسیر ابن کثیر کے محقق و کورحمت بن بشر نے طبری اور دوسری کتابوں میں مذکور ان کی سندوں کو حسن یا صحیح قرار دیا ہے۔ انس رضی اللہ عنہ اور ابو جعفر باقر کے اقوال بھی اسی پر مبنی ہیں کہ ”مَا“ نافیہ ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ﴿لَمْ نَكُنْ نَمُضِي عَلَيْهِمْ لَيْلَةً إِلَّا يَأْخُذُونَ مِنْهَا وَ لَوْ شِئْنَا﴾ [ابن کثیر: ۴۱۷/۷] ”یعنی ان پر جو رات بھی گزرتی تھی اس میں سے کچھ نہ کچھ حصہ لیتے تھے خواہ تھوڑا ہی ہو۔“ مطرف بن عبد اللہ نے فرمایا: ”قُلْ لَيْلَةً لَا تَأْتِي عَلَيْهِمْ إِلَّا يُضَلُّونَ فِيهَا لِلَّهِ عَزَّ وَجَلَّ، إِثْمًا مِنْ أَوْلَئِهَا وَإِثْمًا مِنْ أَوْسَطِهَا“ [ابن کثیر: ۴۱۷/۷] ”ان پر کم ہی کوئی رات آتی تھی مگر وہ اس میں اللہ عز و جل کے لیے نماز پڑھتے تھے، یا اس کے شروع میں یا اس کے درمیان میں۔“ مجاہد نے فرمایا: ”قُلْ مَا يَرْقُدُونَ لَيْلَةً حَتَّى الصَّبَاحِ لَا يَنْهَجُونَ“ [ابن کثیر: ۴۱۷/۷] ”کم ہی کوئی رات ہوتی تھی جس میں وہ صبح تک سوئے رہیں اور تہجد نہ پڑھیں۔“ انس بن مالک اور ابو العالیہ نے فرمایا: ”كَانُوا يُضَلُّونَ بَيْنَ الْمَغْرِبِ وَالْعِشَاءِ“ [ابن کثیر: ۴۱۷/۷] ”وہ مغرب اور عشاء کے درمیان نماز پڑھتے تھے۔“ اور ابو جعفر باقر نے فرمایا: ”كَانُوا لَا يَنَامُونَ حَتَّى يُصْبُوا الْعَتَمَةَ“ [ابن کثیر: ۴۱۷/۷] ”وہ جب تک عشاء نہ پڑھ لیتے سوتے نہیں تھے۔“

”مَا يَهْجَعُونَ“ میں ”مَا“ کو نافیہ ماننے کی صورت میں ترجمہ ہوگا ”وہ سوتے نہیں تھے“ یعنی جاگتے تھے۔ اس کے مطابق آیت کا ترجمہ، تفسیر اور اس پر حاشیہ تفسیر ثنائی سے نقل کیے جاتے ہیں۔ ترجمہ ہے: ”یہ لوگ راتوں کو کسی قدر جاگا کرتے اور صبح کے وقت خدا سے بخشش مانگا کرتے تھے۔“ تفسیر ہے: ”ان کی نیکی کا نمونہ یہ ہے کہ یہ لوگ راتوں کو بغرض عبادت کسی قدر جاگا کرتے اور تہجد کے بعد یا شب خیزی کے بعد صبح کے وقت خدا سے بخشش مانگا کرتے تھے۔ یعنی صبح سے پہلے تھوڑی رات رتے اٹھتے تھے اور خدا کی یاد جتنی بھی ہو سکے کر کے صبح سویرے اپنے لیے اور اپنے ماں باپ کے لیے بلکہ جملہ مومنین کے لیے استغفار کرتے تھے۔“ حاشیہ ہے: ”مَا يَهْجَعُونَ“ میں دو لفظ ہیں۔ ”هَجَعَ“ کے معنی ہیں رات کی نیند۔

وَبِالْأَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُونَ ﴿۱۸﴾ وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُورِ ﴿۱۹﴾ وَفِي الْأَمْزِجِ
أَيْتٌ لِّلْمُؤَقِنِينَ ﴿۲۰﴾

اور رات کی آخری گھڑیوں میں وہ بخشش مانگتے تھے ﴿۱۸﴾ اور ان کے مالوں میں سوال کرنے والے اور محروم کے لیے ایک حصہ تھا ﴿۱۹﴾ اور زمین میں یقین کرنے والوں کے لیے کئی نشانیاں ہیں ﴿۲۰﴾

قاموس میں ہے: "الْمُجُوعُ النَّوْمُ لَيْلًا." "مَا" نافیہ ہے، پس معنی یہ ہیں "رات کو تھوڑا سا وقت نیند ترک کر دیتے تھے۔" وہ تھوڑا سا وقت چاہے نماز تہجد کا ہو، جیسے سورہ بنی اسرائیل میں ہے: ﴿وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَجَدَ لَهُ﴾ انبی اسرائیل . ۱۷۹ یا نماز عشاء کا ہو، جیسے: ﴿وَاقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفِي النَّهَارِ وَرُفُقًا مِنَ اللَّيْلِ﴾ اٰھود: ۱۱۴ میں "رُفُقًا" سے مراد عشاء کی نماز ہے، ممکن ہے یہی مراد "مَا يَهْجَعُونَ" سے ہو۔ (واللہ اعلم) (ثالثی)

معارف القرآن میں ہے: ﴿كَأَنَّا قَلِيلًا مِّنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُونَ﴾ میں "يَهْجَعُونَ" "مُجُوعٌ" سے مشتق ہے، جس کے معنی رات کو سونے کے آتے ہیں۔ اس میں موثقیں متقیین کی یہ صفت بیان فرمائی ہے کہ وہ رات کو اللہ تعالیٰ کی عبادت میں گزارتے ہیں، سوتے کم ہیں جاگتے زیادہ ہیں اور یہ وقت نماز و عبادت میں گزارتے ہیں۔ یہ تفسیر ابن جریر نے اختیار کی ہے اور حسن بھری سے یہی منقول ہے کہ متقیین حضرات رات کو جاگنے اور عبادت کرنے کی مشقت اٹھاتے ہیں اور بہت کم سوتے ہیں۔ اور ابن عباس اور قتادہ وغیرہ انکو تفسیر نے اس جملے کا مطلب حرف "مَا" کو اس میں نفی کے لیے قرار دے کر یہ بتلایا ہے کہ "رات کو تھوڑا سا حصہ ان پر ایسا بھی آتا ہے جس میں وہ سوتے نہیں، بلکہ عبادت و نماز وغیرہ میں مشغول رہتے ہیں۔ اس مفہوم کے اعتبار سے وہ سب لوگ اس کا مصداق ہو جاتے ہیں جو رات کے کسی بھی حصہ میں عبادت کر لیں، خواہ شروع میں یا آخر میں یا درمیان میں۔ اسی لیے انس اور ابو العالیہ نے اس کا مصداق ان لوگوں کو قرار دیا جو مغرب و عشاء کے درمیان نماز پڑھتے ہیں اور امام ابو جعفر باقر نے فرمایا کہ جو لوگ عشاء کی نماز سے پہلے نہ سوئیں وہ بھی اس میں داخل ہیں۔ (ابن کثیر)

آیت 18 ﴿وَبِالْأَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُونَ﴾: "أَسْحَارٌ" "سَحَرٌ" (سین اور حاء کے فتح کے ساتھ) رات کا آخری حصہ۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿يُنزَلُ رَبُّنَا تَنَزُّكًا وَتَعَالَى كُلُّ نَبَلَةٍ إِلَى السَّمَاءِ الدُّنْيَا حِينَ يَبْقَى لَكَ اللَّيْلُ الْأَخِيرُ يَقُولُ مَنْ يَدْعُونِي فَأَسْتَجِيبُ لَهُ؟ مَنْ يَسْأَلُنِي فَأَعْطِيهِ؟ مَنْ يَسْتَغْفِرُنِي فَأَغْفِرُ لَهُ؟﴾ [بخاری، التَّهَجُّد، باب الدُّعَاءِ وَالصَّلَاةِ مِنْ آخِرِ اللَّيْلِ: ۱۱۴۵] "ہمارا رب تبارک و تعالیٰ ہر رات، جب رات کا آخری ٹکٹ باقی رہ جاتا ہے، آسمان دنیا کی طرف اترتا ہے اور فرماتا ہے: "کون ہے جو مجھ سے دعا کرے تو میں اس کی دعا قبول کروں؟ کون ہے جو مجھ سے مانگے تو میں اسے عطا کروں؟ کون ہے جو مجھ سے بخشش مانگے تو میں اسے بخشوں؟"

آیت 19 ﴿وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُورِ﴾: اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ معارج (۲۳، ۲۵) کی تفسیر۔

آیت 20 ﴿وَفِي الْأَمْزِجِ أَيْتٌ لِّلْمُؤَقِنِينَ﴾: شروع سورت میں چار طرح کی ہواؤں کی قسم اٹھا کر فرمایا کہ قیامت حق

وَفِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ﴿۱۱﴾

اور تمہارے نفسوں میں بھی، تو کیا تم نہیں دیکھتے؟ ﴿۱۱﴾

ہے، پھر اس پر آسمان کی قسم اٹھائی۔ اب ”واؤ“ کے ذریعے سے اسی کے ساتھ سلسلہ کلام جوڑ کر فرمایا: ”اور زمین میں بھی یقین کرنے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔“ یہ وہی استدلال ہے جو قرآن میں قیامت حق ہونے کے لیے جا بجا موجود ہے۔ مثلاً فرمایا: ﴿وَمِن آيَاتِهِ أَنْ تَرَى الْأَرْضَ خَاشِعَةً فَإِذَا أَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ إِنَّ الَّذِي أَحْيَاهَا لَبِئْسَ الْمَوْتِيُّ﴾ [حَبَّ السَّجْدَةِ : ۳۹] ”اور اس کی نشانیاں میں سے ایک یہ ہے کہ تو زمین کو دبی ہوئی (منجر) دیکھتا ہے، پھر جب ہم اس پر پانی اتارتے ہیں تو وہ اہلہاتی ہے اور پھوٹتی ہے۔ بے شک وہ جس نے اسے زندہ کیا، یقیناً مردوں کو زندہ کرنے والا ہے۔“ مطلب یہ ہے کہ زمین کی پہلی ساری کھیتی چوراہن کر ختم ہو جاتی ہے، پھر دوبارہ نئی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ ایسی چیز ہے جو ہر شخص کے مشاہدے میں آتی ہے، اس پر بہت زیادہ غور و فکر کی ضرورت نہیں، صرف یقین کی ضرورت ہے۔ اس لیے اس آیت میں غور و فکر کی دعوت نہیں دی، جس طرح اس کے بعد والی آیت میں ”أَفَلَا تُبْصِرُونَ“ فرمایا ہے، بلکہ فرمایا: ”زمین میں یقین کرنے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔“ یہ اس لیے فرمایا کہ ان نشانوں سے فائدہ ہی اٹھاتے ہیں جو یقین کرتے ہیں۔

﴿۱۲﴾ ”وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِلْمُؤْمِنِينَ“ (اور زمین میں یقین کرنے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں) اس میں صریح الفاظ میں یہ نہیں بتایا کہ کس چیز کی نشانیاں ہیں، کیونکہ اس میں صرف قیامت حق ہونے ہی کی نشانیاں نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے وجود، اس کی وحدانیت اور اس کی لامحدود قدرت کی بھی بے شمار نشانیاں ہیں۔ زخمی نے فرمایا: ”اور زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں جو صانع اور اس کی قدرت و حکمت اور تدبیر پر دلالت کرتی ہیں، چنانچہ زمین اپنے اوپر والی چیزوں کے لیے بچھونے کی طرح ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿الَّذِي جَعَلَ لَكُمْ الْأَرْضَ مَهْدًا﴾ [طہ : ۵۳] ”وہ جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا بنایا۔“ اور چلنے والوں کے لیے اس میں راستے اور وسیع شاہراہیں ہیں جو اس کے کندھوں پر چلتے پھرتے ہیں اور اس کے مختلف حصے ہیں، جیسے میدان، پہاڑ، ریگستان، سمندر وغیرہ اور کئی نکلے ہیں، مثلاً سخت، نرم، زرخیز، شور وغیرہ۔ وہ حاملہ جانور کی طرح ہے جس کے پیٹ سے بے شمار پودے، درخت اور پھل پیدا ہوتے ہیں، جن کے رنگ، خوشبو اور ذائقے مختلف ہیں، حالانکہ کبھی ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ ایک دوسرے پر برتری رکھتے ہیں اور یہ سب کچھ زمین پر رہنے والوں کی ضروریات، ان کی صحت و بیماری کی مصلحتوں کے عین موافق ہے۔ پھر اس میں پھونٹنے والے چشمے، رنگا رنگ معدنیات اور خشکی، ہوا اور سمندر میں پھیلے ہوئے مختلف شکلوں، صورتوں اور کاموں والے وحشی، پالتو، مفید اور زہریلے جانور اور اس کے علاوہ شمار سے باہر چیزیں ہیں جن میں یقین کرنے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں، کیونکہ وہی دیکھنے والی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔“

﴿۱۱﴾ ”وَفِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ“ یعنی خود تمہارے نفسوں میں دوبارہ زندہ ہونے کی بے شمار نشانیاں موجود

وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ ﴿۳۲﴾

اور آسمان ہی میں تمہارا رزق ہے اور وہ بھی جس کا تم وعدہ دیے جاتے ہو ﴿۳۲﴾

ہیں کہ مٹی اور نطفے سے لے کر موت تک ہر لمحہ موت کے بعد زندگی کا شاہد ہے، کیونکہ جسم کا ہر خلیہ جو موجود ہوتا ہے فنا ہوتا اور اس کی جگہ نیا خلیہ وجود میں آتا رہتا ہے اور یہ عمل مسلسل جاری رہتا ہے، جس کے دوران انسان بچپن، جوانی اور بڑھاپے کی طرف بھی منتقل ہوتا رہتا ہے، مگر موت و حیات کے اس سلسلے پر غور کرنے والے بہت ہی کم ہیں۔ یہ بحث تفصیل کے ساتھ سورہ مومنون (۱۶ تا ۱۲) کی تفسیر میں ملاحظہ فرمائیں۔

② انسان کی ذات میں قیامت کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے وجود، اس کی وحدانیت، حکمت، تدبیر، صنعت، قدرت اور دوسری صفات کی بھی بے شمار نشانیاں موجود ہیں۔ مفسر کیلانی لکھتے ہیں: ”انسان کا اپنا وجود اور اس کی مشینری کا کائنات اصغر ہے اور اس میں جو نشانیاں ہیں وہ کائنات اکبر کی نشانوں سے کسی طرح کم نہیں۔ انسان کا معدہ ایک چکی کی طرح دن رات کام میں لگا رہتا ہے، جو غذا کو پس کر ایک ملغوبہ تیار کرنے میں مصروف رہتا ہے۔ جب یہ فارغ ہو جائے تو اور غذا طلب کرتا ہے جسے ہم بھوک کہتے ہیں۔ اس ملغوبہ کی تیاری میں اگر پانی کی کمی ہو تو ہمیں پیاس لگ جاتی ہے اور ہم کھانے پینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ پھر اس کے اندر چھلنی بھی ہے جس سے چھن کر یہ ملغوبہ جگر میں چلا جاتا ہے، جہاں اچھالنے والی، دفع کرنے والی، صاف کرنے والی، کھینچنے والی مشینیں اور قوتیں کام کر رہی ہیں۔ یہیں دوسری اخلاط بنتی ہیں۔ فالٹو پانی کو گردے پیشاب کے راستے خارج کر دیتے ہیں۔ قوت و دفعہ فالٹو مواد یا فضلہ کو خارج کرنے کا کام کرتی ہے اور جس طرح انسان کھانے پینے پر مجبور ہوتا ہے اسی طرح رفع حاجت پر مجبور ہو جاتا ہے اور اگر روکے تو بیمار پڑ جاتا ہے۔ پھر انسان کے جسم میں اتنی باریک نالیاں ہیں جن کا سوراخ خوردبین کے بغیر نظر ہی نہیں آ سکتا، انھی کے ذریعے انسان کے جسم کے ہر حصے کو خون پہنچتا ہے۔ اس سلسلہ میں انسان کا دل پمپ کا کام کرتا ہے جو ایک منٹ بھی ٹھہر جائے تو موت واقع ہو جاتی ہے۔ پھر انسان کا سانس لینا بھی ایک الگ پورا نظام ہے۔ سب سے زیادہ باریک آنکھ کے طبقے اور جھلیاں ہیں جو ایسی لطافت کے ساتھ بنائی گئی ہیں کہ اگر ذرا سا فتور آ جائے تو بینائی جواب دے جاتی ہے۔ (پھر سننے، سونگھنے، چکھنے، سوچنے، سمجھنے، یاد رکھنے، محسوس کرنے، سونے، جاگنے، بولنے اور دوسرے بے شمار افعال کے نظام ہیں جن میں سے ہر ایک پر غور کیا جائے تو آدمی حیرت کے سمندر میں غرق ہو جاتا ہے) انسان کا جسم ابتدا ہی سے حکیموں اور ڈاکٹروں کی تحقیق کا مرکز بنا ہوا ہے، مگر اس کے بیشتر اسرار آج تک پردہ راز ہی میں ہیں۔“ (تیسیر القرآن)

③ ”وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ“ میں آفاقی آیات کا ذکر ہے اور ”وَفِي أَنْفُسِكُمْ“ میں انفسی آیات کا۔ مزید دیکھیے حم السجدہ (۵۳)۔

آیت 22 ﴿۱﴾ وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ : اکثر مفسرین نے یہاں رزق سے مراد بارش لی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِي يُرِيكُمْ آيَاتِهِ وَيُنَزِّلُ لَكُمْ مِنَ السَّمَاءِ رِزْقًا﴾ [المومن : ۱۳] ”وہی ہے جو تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے اور تمہارے لیے آسمان سے رزق اتارتا ہے۔“ مگر لفظ عام ہیں، اس لیے رزق سے مراد وہ سب کچھ ہے جو دنیا میں انسان کو جینے، کھانے پینے

قَوْرَبِ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَا أَكَلْتُمْ تَتَطَّقُونَ ﴿۲۳﴾

سو آسمان و زمین کے رب کی قسم ہے! بلاشبہ یہ (بات) یقیناً حق ہے اس (بات) کی طرح کہ بلاشبہ تم بولتے ہو ﴿۲۳﴾

اور کام کرنے کے لیے دیا جاتا ہے۔ یعنی تمہیں جو کچھ دیا جا رہا ہے وہ آسمان میں اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے اور تمہیں وہیں سے عطا ہوتا ہے۔ ”فی السماء“ مقدم لانے سے کلام میں حصر پیدا ہو گیا، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے ”تمہارا رزق آسمان ہی میں ہے۔“ تو جب تمہارا رزق آسمان ہی میں ہے تو پھر کمائی کے لیے اتنی فکر کیوں کہ جائز و ناجائز کی تمیز بھی نہ کی جائے اور حق والوں کو حق بھی نہ دیا جائے؟ پھر مسائل اور محروم پر فرج کرنے میں بخل اور دریغ کیسا؟ اور جب آتا آسمان سے ہے تو کسی پر فرج کر کے اپنا احسان بتلانے کی کیا وجہ؟

﴿۲۳﴾ وَمَا تَوْعَدُونَ: یعنی حشر و نشر، جزا و سزا اور جنت و دوزخ وغیرہ، جن کے رد و نما ہونے کا وعدہ تمام انبیاء کی زبانی اور تمام آسمانی کتابوں کے ذریعے سے کیا گیا ہے، ان سب کا حکم آسمان ہی سے ہے۔ شاہ عبد القادر لکھتے ہیں: ”آنے والی جو بات ہے اس کا حکم آسمان ہی سے اترتا ہے۔“ (موضح)

﴿۲۴﴾ اس مقام پر بعض مفسرین نے کچھ لوگوں کے واقعات لکھے ہیں جنہوں نے یہ آیت سن کر کمائی ترک کر دی اور اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے جنگل بیابان کی راہ لی اور وہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں تازہ کھجوریں اور رزق ملنے لگا۔ چنانچہ طبری نے سفیان ثوری کی زبانی نقل کیا ہے کہ واصل احدب نے یہ آیت ”وَفِي السَّمَاءِ رِزْقًا لَّكُمْ وَمَا تَوْعَدُونَ“ پڑھی تو کہنے لگے: ”میرا رزق تو مجھے آسمان میں نظر آ رہا ہے اور میں اسے زمین میں ڈھونڈتا پھرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ ایک خرابے میں چلے گئے۔ تین دن تک کھانے کو کچھ نہ ملا، جب تیسرا دن ہوا تو اچانک ان کے پاس تازہ کھجوروں کی ایک ٹوکری آگئی۔ ان کا ایک بھائی تھا، جو ان سے بھی اچھی نیت والا تھا، وہ بھی اس خرابے میں ان کے ساتھ آگیا تو ٹوکریاں دو ہو گئیں۔ ان کا یہی حال رہا، یہاں تک کہ موت نے ان کے درمیان جدائی ڈال دی۔

حقیقت یہ ہے کہ ایسی ہی کہانیوں نے اسلام کا رخ روشن مسخ کیا ہے۔ آسمان میں رزق ہونے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ آدمی کماتا ترک کر دے۔ یہ رہبانیت ہے جس کی اسلام میں گنجائش ہی نہیں، یہاں تو محنت کر کے کمانے اور دوسروں پر فرج کرنے کی تلقین ہے، جنگلوں، بیابانوں یا خانقاہوں میں بیٹھ کر لوگوں کی طرف سے یا غیب سے آنے والے رزق کے انتظار کے بجائے جہاد فی سبیل اللہ کے ذریعے سے پاکیزہ ترین رزق حاصل کرنے کی ترغیب ہے۔ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی پوری زندگی اس کی شاہد ہے۔ آسمان میں رزق ہونے کا یقین دلانے کا مطلب صرف یہ ہے کہ آدمی اپنی ساری جدوجہد کے باوجود بھروسہ صرف آسمان والے پر رکھے اور ایک لمحہ کے لیے بھی رزق کی خاطر اس کے حکم سے سرتابی نہ کرے۔ تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ ابن کثیر رضی اللہ عنہ جیسے محقق نے کسی تنقید کے بغیر یہ کہانی نقل کر دی ہے، حالانکہ طبری میں اس روایت کے راوی طبری کے استاد محمد بن حمید رازی ہیں، جن کا ضعیف ہونا معروف ہے۔

﴿۲۳﴾ قَوْرَبِ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ لَحَقٌّ : کسی بات کا یقین دلانے کے لیے اس کی تشبیہ ایسی چیز کے ساتھ

هَلْ أَتَاكَ حَدِيثٌ ضَيْفَ إِبْرَاهِيمَ الْمُكْرَمِينَ ﴿۲۴﴾ اِذْ دَخَلُوا عَلَيْهِ فَقَالُوا سَلَامًا ۗ قَالَ سَلَامٌ ؕ
قَوْمٌ مُّكْرُونَ ﴿۲۵﴾

کیا تیرے پاس ابراہیم کے معزز مہمانوں کی بات آئی ہے؟ ﴿۲۴﴾ جب وہ اس پر داخل ہوئے تو انہوں نے سلام کہا۔
اس نے کہا سلام ہو، کچھ اجنبی لوگ ہیں ﴿۲۵﴾

دی جاتی ہے جو مخاطب کے نزدیک یقینی ہو، مثلاً کہا جاتا ہے: "كَمَا أَنْتَ هَهُنَا" کہ یہ بات ایسے ہی یقینی ہے جیسے تم یہاں
موجود ہو، یا "كَمَا أَنْتَ تَسْمَعُ وَ تَرَى" جیسے یہ یقینی ہے کہ تم سن رہے ہو اور دیکھ رہے ہو۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے ان باتوں کا
یقین دلانے کے لیے جو اس سے پہلے گزری ہیں آسمان و زمین کے رب کی قسم کھا کر فرمایا کہ یہ سب کچھ ایسے ہی حق اور یقینی ہے
جیسے تمہیں یقین ہے کہ تم بولتے ہو۔ اس سے پہلے مذکور چیزوں میں سب سے قریب یہ ہے کہ تمہارا رزق اور وہ تمام چیزیں جن
کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے آسمان ہی میں ہیں۔ اس لیے مطلب یہ ہوا کہ تمہارے رزق کا اور تم سے وعدہ کردہ چیزوں کا آسمان
ہی میں ہونا ایسے ہی یقینی ہے جیسے تمہارا بولنا یقینی ہے اور تمہیں کوئی شک نہیں کہ تم واقعی بولتے ہو۔ "إِنَّهُ لَحَقُّ" (بلاشبہ یقیناً
یہ حق ہے) سے مراد سورت کے شروع سے یہاں تک مذکور تمام چیزیں بھی ہو سکتی ہیں کہ بلاشبہ یقیناً تم سے کیے گئے وعدے،
قیامت، جزا و سزا، جنت و جہنم، تمہارے رزق کا اور تم سے وعدہ کردہ چیزوں کا آسمان ہی میں ہونا ایسے ہی حق ہے جیسے یہ حق ہے
کہ تم بول رہے ہو اور تمہیں اپنے بولنے میں شک نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سننے یا دیکھنے وغیرہ کے بجائے بولنے کا ذکر اس لیے فرمایا کہ
سننے یا دیکھنے میں بعض اوقات شبہ بھی پڑ جاتا ہے، مگر آدمی کو اپنے بولنے میں کبھی شبہ نہیں ہوتا کہ میں بول رہا ہوں اور بات کر رہا ہوں۔
آیت 24 ﴿ ۱ ﴾ هَلْ أَتَاكَ حَدِيثٌ ضَيْفَ إِبْرَاهِيمَ : یہاں سے رسول اللہ ﷺ کی تسلی کے لیے چند انبیاء کی مدد کا
اور انہیں جھٹلانے والی اقوام پر آنے والے عذابوں کا ذکر فرمایا۔ ابراہیم اور لوط علیہم السلام کے واقعات اور ان کے تفسیری فوائد سورہ
ہود (۸۳ تا ۶۹)، حجر (۷۵ تا ۷۷) اور سورہ عنکبوت (۳۵ تا ۱۶) میں تفصیل سے گزر چکے ہیں۔ اس مقام سے تعلق رکھنے والی
چند باتیں یہاں ذکر کی جاتی ہیں۔

﴿۲﴾ کیا تیرے پاس ابراہیم کے معزز مہمانوں کی خبر آئی ہے؟ سوال سے مقصود اس واقعہ کی عظمت و شان اور اہمیت کا
احساس دلانا ہے اور یہ بھی کہ آپ کو اس بات کی خبر نہ تھی، یہ ہم ہیں جو وحی کے ذریعے سے آپ کو اس سے آگاہ کر
رہے ہیں۔

﴿۳﴾ "الْمُكْرَمِينَ" (معزز) اس لیے فرمایا کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کے ہاں معزز ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُونَ﴾
[الانبیاء: ۲۶] "بلکہ وہ بندے ہیں جنہیں عزت دی گئی ہے۔" اور ہمارے نبی ﷺ کا بھی حکم ہے: ﴿مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ
وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهُ﴾ [بخاری، الأذب، باب من كان يؤمن بالله..... : ۶۰، ۱۸] "جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر
ایمان رکھتا ہے وہ اپنے مہمان کا اکرام کرے۔"

آیت 25 ﴿ ۱ ﴾ اِذْ دَخَلُوا عَلَيْهِ فَقَالُوا سَلَامًا ۗ "سَلَامًا" اور "سَلَامٌ" کے فرق کے لیے دیکھیے سورہ ہود (۶۹) کی تفسیر۔

فَرَاخًا إِلَىٰ أَهْلِهِ فَجَاءَ بِعَجَلٍ سَيِّئٍ ۖ فَقَرَّبَهُ إِلَيْهِمْ قَالَ أَلَا تَأْكُلُونَ ﴿۲۶﴾ فَأَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيفَةً ۗ قَالُوا لَا تَخَفْ ۗ وَبَشَرُوا بَعْضُهُمْ عَلَيْهِمْ ﴿۲۷﴾

پس چپکے سے اپنے گھر والوں کی طرف گیا، پس (بمنا ہوا) موٹا تازہ پھنڑا لے آیا ﴿۲۶﴾ پھر اسے ان کے قریب کیا کہا کیا تم نہیں کھاتے؟ ﴿۲۶﴾ تو اس نے ان سے دل میں خوف محسوس کیا، انھوں نے کہا مت ڈر! اور انھوں نے اسے ایک بہت علم والے لڑکے کی خوش خبری دی ﴿۲۷﴾

﴿۲۶﴾ قَوْمٌ نُّنَكِرُونَ: یہ بات دل میں کہی یا گھر والوں سے کہی اور ممکن ہے انسانی شکل میں آنے والے فرشتوں سے کہی ہو کہ آپ اس علاقے میں نئے تشریف لائے ہیں، پہلے بھی آپ کو یہاں نہیں دیکھا۔

آیت 26 ﴿۱﴾ فَرَاخًا إِلَىٰ أَهْلِهِ: ”زَاغٌ يَزُوعٌ رَوْعًا“ (ان) کا معنی خفیہ طور پر جانا، حیلے کے ساتھ تیزی سے نکل جانا ہے۔ یہ ”رَوْعَانُ النَّعْلَبِ“ سے ہے، لومڑی کا خفیہ طریقے سے آنا جانا۔ مطلب یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام مہمانوں کے لیے کھانے کا انتظام کرنے کے لیے خاموشی سے گئے، تاکہ انھیں خبر نہ ہو سکے اور وہ جاتے ہوئے دیکھ کر مہمانی لانے سے منع نہ کر دیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مہمانوں سے پوچھنا کہ کیا آپ کھانا کھائیں گے تو ایک طرف، انھیں تو مہمانی کے اہتمام کا حتمی الوسع پتا بھی نہیں لگنے دینا چاہیے۔

﴿۲۷﴾ فَجَاءَ بِعَجَلٍ سَيِّئٍ: سورۃ ہود میں ”بِعَجَلٍ حَيْنِيذٍ“ (بمنا ہوا پھنڑا) آیا ہے۔ معلوم ہوا موٹا تازہ پھنڑا بھون کر لائے تھے۔ بعض مفسرین نے ”سَيِّئٍ“ کا معنی ”گھی میں تلا ہوا“ کیا ہے، کیونکہ ”سمن“ کا معنی موٹا پا بھی ہے اور گھی بھی۔ اس کے مطابق ”سَيِّئٍ“ کا معنی موٹا بھی ہو سکتا ہے اور گھی میں تلا ہوا بھی۔ مگر ”حَيْنِيذٍ“ کے ساتھ ”سَيِّئٍ“ کا معنی ”موٹا“ زیادہ مناسب ہے، کیونکہ ”حَيْنِيذٍ“ گرم پتھروں یا کونکے پر بھنے ہوئے کو کہتے ہیں۔

آیت 27 ﴿۱﴾ فَقَرَّبَهُ إِلَيْهِمْ قَالَ أَلَا تَأْكُلُونَ: اس سے معلوم ہوا کہ یہ بھی مہمان نوازی کے آداب میں سے ہے کہ جہاں تک ہو سکے مہمانوں کو کھانے تک جانے کی زحمت دینے کے بجائے اسے ان کی خدمت میں پیش کرنا چاہیے اور یہ بھی کہ اگر وہ کھانے میں تامل کریں تو شائستہ طریقے سے کھانے کی درخواست کرنی چاہیے۔

آیت 28 ﴿۱﴾ فَأَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيفَةً...: اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۃ ہود (۷۰) کی تفسیر۔

﴿۲۷﴾ وَبَشَرُوا بَعْضُهُمْ عَلَيْهِمْ: سورۃ ہود میں اس لڑکے کا نام اسحاق آیا ہے، وہ ”غلامِ علیم“ تھے اور اسما علیہ السلام ”غلامِ علیم“ ان کا ذکر سورۃ صافات (۱۰۱) میں ہے۔ اسحاق علیہ السلام کو ”بَعْضُهُمْ عَلَيْهِمْ“ فرمایا، حالانکہ ”عَلَيْهِمْ“ تو انھوں نے جوانی میں بننا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ جو بچے حفظ شروع کر دیں انھیں آئندہ کا لحاظ کرتے ہوئے حافظ کہا جاسکتا ہے۔ (والفہم علم)

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ أَيُّهَا الْمُرْسَلُونَ ﴿۳۱﴾ قَالُوا إِنَّا أُرْسِلْنَا إِلَى قَوْمٍ مُّجْرِمِينَ ﴿۳۲﴾ لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّن طِينٍ ﴿۳۳﴾ فُسَوَّمَتْهُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِينَ ﴿۳۴﴾ فَأَخْرَجْنَا مَن كَانَ فِيهَا مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۳۵﴾ فَمَا وَجَدْنَا فِيهَا غَيْرَ بَنِيٍّ مِنَ الْمُسْلِمِينَ ﴿۳۶﴾

کہا تو اے بھیجے ہوئے (اصدوا) تمہارا معاملہ کیا ہے؟ ﴿۳۱﴾ انہوں نے کہا بے شک ہم کچھ گناہ کار لوگوں کی طرف بھیجے گئے ہیں ﴿۳۲﴾ تاکہ ہم ان پر مٹی کے پتھر (مٹھر) پھینکیں ﴿۳۳﴾ جن پر تیرے رب کے ہاں حد سے بڑھنے والوں کے لیے نشان لگائے ہوئے ہیں ﴿۳۴﴾ سو ہم نے اس (بستی) میں ایمان والوں سے جو بھی تھا نکال لیا ﴿۳۵﴾ تو ہم نے اس میں مسلمانوں کے ایک گھر کے سوا کوئی نہ پایا ﴿۳۶﴾

آیت 31 ﴿۳۱﴾ قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ أَيُّهَا الْمُرْسَلُونَ: جب ابراہیم علیہ السلام مہمانوں کے کھانا نہ کھانے پر خوف زدہ ہوئے اور صاف اظہار بھی کر دیا: ﴿۳۱﴾ إِنَّا وَمَنْكُم مَّوَدَّعُونَ ﴿۳۱﴾ [الحجر: ۵۲] ”ہم تو تم سے ڈرنے والے ہیں۔“ کیونکہ انہیں ان کے فرشتہ ہونے کا اندازہ ہو گیا تھا اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ فرشتوں کا اس طرح آنا معمولی بات نہیں ہوتی، جیسا کہ فرمایا: ﴿۳۱﴾ فَمَا نُؤْتُونَكَ إِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوا إِذًا مُّنظَرِينَ ﴿۳۱﴾ [العنکبوت: ۸] ”ہم فرشتوں کو نہیں اتارتے مگر حق (عذاب) کے ساتھ اور اس وقت وہ مہلت دیے گئے نہیں ہوتے۔“ اس لیے وہ شدید ڈر گئے، تو فرشتوں نے ان کا خوف دور کرنے کے لیے ان سے دو باتیں کہیں، ایک یہ: ﴿۳۱﴾ لَا تَحْزَنْ إِنَّا أُرْسِلْنَا إِلَى قَوْمٍ لُّوطِيٍّ ﴿۳۱﴾ [ہود: ۷۰] ”ڈرو نہیں، کیونکہ ہم لوط کی قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں۔“ یعنی آپ کو ڈرنے کی ضرورت نہیں، ہماری منزل مقصود دوسری ہے۔ دوسری بات انہوں نے یہ کہ ہم آپ کو بیٹے اور پوتے اسحاق و یعقوب کی بشارت دینے آئے ہیں۔ (دیکھیے ہود: ۸۱) جب ابراہیم علیہ السلام کو اطمینان ہو گیا تو انہوں نے پوچھا، تو اے بھیجے جانے والے فرشتو! (قوم لوط کے ساتھ) تمہارا معاملہ کیا ہے اور تم ان کے متعلق کیا کرنا چاہتے ہو؟ یاد رہے! ”خَطْبُ“ کا لفظ عموماً کسی اہم یا سخت معاملے کے متعلق ہی استعمال کیا جاتا ہے۔

﴿۳۲﴾ اس سارے واقعہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ انبیاء علیہم السلام عالم الغیب نہیں ہوتے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ حجر (۲۲) کی تفسیر۔

آیت 32-34 ﴿۳۲﴾ قَالُوا إِنَّا أُرْسِلْنَا إِلَى قَوْمٍ مُّجْرِمِينَ: ان آیات کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ ہود (۸۳)، حجر (۷۸، ۷۹) اور سورہ عنکبوت (۳۱-۳۵)۔

آیت 35 ﴿۳۵﴾ فَأَخْرَجْنَا مَن كَانَ فِيهَا مِنَ الْمُؤْمِنِينَ: عذاب آنے سے پہلے لوط علیہ السلام کے گھر والوں کو اس بستی سے نکالنے کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ ہود (۸۱) اور سورہ حجر (۲۵)۔

آیت 36 ﴿۳۶﴾ فَمَا وَجَدْنَا فِيهَا غَيْرَ بَنِيٍّ مِنَ الْمُسْلِمِينَ: یعنی اس بستی میں مسلمانوں کا صرف ایک گھر تھا اور وہ لوط علیہ السلام

وَتَرَكْنَا فِيهَا آيَةً لِلَّذِينَ يَخَافُونَ الْعَذَابَ الْأَلِيمَ ﴿۳۷﴾ وَ فِي مُوسَىٰ إِذْ أَرْسَلْنَاهُ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيۡنٍ ﴿۳۸﴾ فَتَوَلَّىٰ بِرُكْبٰنِهِ وَ قَالَ سِحْرٌ اَوْ مَجْنُوۡنٌ ﴿۳۹﴾ فَاَخَذْنَاهُ وَ جُنُوۡدَهُ فَبَدَّلْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ وَ هُوَ مُلِيۡمٌ ﴿۴۰﴾

اور ہم نے اس میں ان لوگوں کے لیے ایک نشانی چھوڑ دی جو دردناک عذاب سے ڈرتے ہیں ﴿۳۷﴾ اور موسیٰ میں (بھی ایک نشانی ہے) جب ہم نے اسے فرعون کی طرف ایک واضح دلیل دے کر بھیجا ﴿۳۸﴾ تو اس نے اپنی قوت کے سبب منہ پھیر لیا اور اس نے کہا یہ جادوگر ہے، یا دیوانہ ﴿۳۹﴾ پس ہم نے اسے اور اس کے لشکروں کو پکڑ لیا، پھر انہیں سمندر میں پھینک دیا، اس حال میں کہ وہ قابل ملامت کام کرنے والا تھا ﴿۴۰﴾

کا گھر تھا، جنہیں بیوی کے سوا اس کے تمام افراد کو ساتھ لے کر نکل جانے کا حکم ہوا۔

ان دونوں آیات سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ جب اسلام حقیقی اور سچا ہو تو وہی ایمان بھی ہے، اس صورت میں اسلام و ایمان اور مسلم و مؤمن ایک ہی چیز ہیں۔ ہاں جب اسلام حقیقی نہ ہو، بلکہ صرف ظاہری اعمال پر مشتمل ہو تو اسلام اور ایمان میں فرق ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور محدثین یہی فرماتے ہیں۔ مزید دیکھیے سورہ حجرات (۱۵، ۱۴) کی تفسیر۔

آیت 37 ﴿۳۷﴾ وَ تَرَكْنَا فِيهَا آيَةً لِلَّذِينَ يَخَافُونَ الْعَذَابَ الْأَلِيمَ : اس بستی کو عذاب الیم سے ڈرنے والوں کے لیے نشانی اس لیے قرار دیا کہ وہی اس سے عبرت حاصل کرتے اور فائدہ اٹھاتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو ڈرنے کے بجائے سرکشی اختیار کرتے اور خواہش نفس کے پیچھے چلے ہیں ان کے لیے ہر نشانی کفر اور سرکشی میں اضافے کا باعث ہی بنتی ہے۔ مزید دیکھیے سورہ حجر (۷۷ تا ۷۸) اور سورہ عنکبوت (۳۵)۔

آیت 38 ﴿۳۸﴾ وَ فِي مُوسَىٰ إِذْ أَرْسَلْنَاهُ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيۡنٍ : یعنی لوط علیہ السلام کی بستی کے علاوہ موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں بھی ان لوگوں کے لیے بڑی عبرت ہے جو عذاب الیم سے ڈرتے ہیں، جب ہم نے انہیں صریح معجزات دے کر بھیجا، جو ان کے اللہ کا پیغمبر ہونے کی واضح دلیل تھے۔

آیت 39 ﴿۳۹﴾ فَتَوَلَّىٰ بِرُكْبٰنِهِ وَ قَالَ سِحْرٌ اَوْ مَجْنُوۡنٌ : ”پرکبائے“ میں ”باء“ سییہ ہے۔ ”رُكْبٰنٌ“ کسی چیز کا سہارا اور آسرا، قوت۔ یعنی اس نے اپنی سلطنت اور فوجوں کی قوت کی وجہ سے ان واضح دلائل سے منہ پھیر لیا اور حق پہچان لینے کے باوجود ایمان لانے سے انکار کر دیا اور لوگوں کو موسیٰ علیہ السلام سے برگشتہ کرنے کے لیے کہنے لگا کہ یہ جادوگر ہے یا دیوانہ ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ اور ان کی فرعون کے ساتھ تفصیلی گفتگو، جس میں فرعون نے انہیں دیوانہ اور پھر جادوگر قرار دیا سورہ شعراء (۳۵ تا ۱۰) میں ملاحظہ فرمائیں۔

آیت 40 ﴿۴۰﴾ فَاَخَذْنَاهُ وَ جُنُوۡدَهُ فَبَدَّلْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ : ”الَامُ يُلِيۡمٌ“ (افعال) ایسا کام کرنا جس پر ملامت کی

وَفِي عَادٍ إِذْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الزَّبْحَ الْعَقِيمَ ﴿۴۱﴾ مَا تَذَرُ مِنْ شَيْءٍ أَتَتْ عَلَيْهِ إِلَّا جَعَلْنَاهُ كَالرَّيْمِ ﴿۴۲﴾ وَفِي ثَمُودَ إِذْ قِيلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوا حَتَّىٰ حِينٍ ﴿۴۳﴾ فَعْتَوْا عَنْ أَمْرِ رَبِّهِمْ فَأَخَذْنَا مِنْهُمُ الضُّعْفَةَ وَهُمْ يَنْظُرُونَ ﴿۴۴﴾

اور عاد میں، جب ہم نے ان پر بانجھ (خیر و برکت سے خالی) آندھی بھیجی ﴿۴۱﴾ جو کسی چیز کو نہ چھوڑتی تھی جس پر سے گزرتی مگر اسے بوسیدہ ہڈی کی طرح کر دیتی تھی ﴿۴۲﴾ اور ثمود میں، جب ان سے کہا گیا کہ ایک وقت تک فائدہ اٹھا لو ﴿۴۳﴾ پھر انھوں نے اپنے رب کے حکم سے سرکشی کی تو انھیں کڑک نے پکڑ لیا اور وہ دیکھ رہے تھے ﴿۴۴﴾

جائے۔ ”فُلَيْمَةَ“ مستحق ملامت، ایسا کام کرنے والا جس پر اسے ملامت کی جائے۔ یعنی وہ ایسا ظالم و سرکش تھا کہ اس کے سمندر میں لشکر سمیت غرق ہونے پر کسی نے اس کے حق میں کوئی کلمہ خیر نہیں کہا، بلکہ ہر شخص کے منہ سے اس کے لیے ملامت اور پھنکار ہی نکلی، جس نے سنا یہی کہا کہ ان کے ساتھ ایسے ہی ہونا چاہیے تھا۔ خس کم جہاں پاک۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ التَّمَّاءُ وَالْأَرْضُ﴾ [الدخان: ۲۹] ”پھر نہ آسمان ان پر رویا نہ زمین۔“ سمندر میں پھینکے جانے کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ یونس (۹۳ تا ۹۰)، طہ (۷۷، ۷۸) اور سورہ شعراء (۶۷ تا ۷۵)۔

آیت 41 وَفِي عَادٍ إِذْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الزَّبْحَ الْعَقِيمَ: یعنی قوم عاد میں بھی ہم نے ایک نشانی اور بڑی عبرت چھوڑی۔ ”العَقِيمَ“ وہ رحم یا عورت جس سے بچہ پیدا نہ ہو، ایسے مرد کو بھی ”عقیم“ کہتے ہیں، پھر ہر اس چیز کو بھی جو خیر و برکت سے خالی ہو۔ قوم عاد پر جو آندھی مسلط کی گئی وہ بھی ہر خیر و برکت سے خالی اور سراسر بربادی اور تباہی تھی، اس لیے اسے ”العَقِيمَ“ فرمایا۔ اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ حاقہ (۸۳ تا ۸۶)، قمر (۱۹، ۲۰) اور سورہ احقاف (۲۳، ۲۵)۔

آیت 42 مَا تَذَرُ مِنْ شَيْءٍ أَتَتْ عَلَيْهِ.....: ”الرَّيْمِ“ بوسیدہ، پرانی، گلی ہوئی ہڈی۔

آیت 43, 44 وَفِي ثَمُودَ إِذْ قِيلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوا حَتَّىٰ حِينٍ.....: اس کی تفسیر میں دو قول ہیں، ایک یہ کہ جب انھوں نے اونٹنی کو کاٹ دیا تو ان سے کہا گیا کہ تین دن تک خوب فائدہ اٹھا لو، اس کے بعد تم پر عذاب آجائے گا۔ ان تین دنوں میں وہ تائب ہو سکتے تھے، مگر وہ اپنی سرکشی پر اور صالح علیہ السلام کی تکذیب پر اڑے رہے، تو تیسرے دن ان کے دیکھتے دیکھتے ایک ہولناک چیخ بلند ہوئی (ہود: ۶۷) جس کے ساتھ نہایت خوفناک کڑک والی بجلی گری، جس نے انھیں بھسم کر دیا اور وہ اس طرح نیست و نابود ہوئے جیسے کبھی ان کا وجود ہی نہ تھا۔ فرمایا: ﴿كَأَن لَّمْ يَخْتَفُوا فِيهَا﴾ [ہود: ۶۸] ”جیسے وہ ان میں رہے ہی نہ تھے۔“ دوسرا قول یہ ہے کہ اس ”تَمَتَّعُوا حَتَّىٰ حِينٍ“ (ایک وقت تک خوب فائدہ اٹھا لو) کہنے سے مراد صالح علیہ السلام کا ان کی طرف مبعوث ہونے کے وقت کا خطاب ہے کہ دنیا میں تمہیں موت تک مہلت ہے، اس میں خوب فائدہ اٹھا لو، مگر اس اونٹنی کو نقصان نہ پہنچانا ورنہ تم پر عذاب آجائے گا، مگر انھوں نے اپنے رب کے حکم سے سرکشی کی اور اونٹنی کو کاٹ دیا تو انھیں صاعقہ نے پکڑ لیا۔ آیت کے الفاظ میں دونوں معنوں کی گنجائش ہے اور دونوں بیک وقت بھی مراد ہو سکتے ہیں۔

فَمَا اسْتَطَاعُوا مِنْ قِيَامٍ وَمَا كَانُوا مُتَصِرِينَ ﴿۴۵﴾ وَقَوْمٌ نُوحٍ مِنْ قَبْلُ ۗ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا فَسِيقِينَ ﴿۴۶﴾ وَالسَّمَاءَ بَنَيْنَاهَا بِأَيْدٍ وَإِنَّا لَمُوسِعُونَ ﴿۴۷﴾

پھر نہ انھوں نے کسی طرح کھڑے ہونے کی طاقت پائی اور نہ وہ بدلا لینے والے تھے ﴿۴۵﴾ اور اس سے پہلے نوح کی قوم کو، یقیناً وہ نافرمان لوگ تھے ﴿۴۶﴾ اور آسمان، ہم نے اسے عظیم قوت کے ساتھ بنایا اور بلاشبہ ہم یقیناً وسعت والے ہیں ﴿۴۷﴾

آیت 45 ﴿۴۵﴾ فَمَا اسْتَطَاعُوا مِنْ قِيَامٍ : ”مُتَصِرِينَ“ ”اِتِّصَارًا“ کے لفظ میں اپنے آپ کو کسی سے بچانے کا مفہوم بھی شامل ہے اور بدلا لینے کا بھی۔ یعنی جب وہ عذاب کے تھپڑے سے زمین پر گرے تو پھر نہ کسی طرح اٹھ سکے اور نہ اس سے بچاؤ کر سکے، بدلا لینا تو بہت دور کی بات ہے۔

آیت 46 ﴿۴۶﴾ وَقَوْمٌ نُوحٍ مِنْ قَبْلُ : رازی نے یہاں ایک نکتہ بیان فرمایا ہے کہ ان پانچ اقوام کے ذکر میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں انھی چیزوں کے ساتھ عذاب دیا جو ان کے وجود اور قیام کا باعث تھیں۔ وہ چار چیزیں ہیں، مٹی، پانی، ہوا اور آگ۔ قوم لوط کھنگر مٹی کے پتھروں کے ساتھ ہلاک ہوئی، فرعون اور قوم نوح پانی کے ساتھ، عاد ہوا کے ساتھ اور ثمود آگ کے ساتھ تباہ و برباد کیے گئے۔

آیت 47 ﴿۴۷﴾ ۱ وَالسَّمَاءَ بَنَيْنَاهَا بِأَيْدٍ : سورت کی ابتدا سے قیامت اور جزا و سزا کے حق ہونے کا بیان چلا آ رہا ہے، اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے کئی قسمیں کھائیں اور دوبارہ زندہ کرنے پر اپنے قادر ہونے کے بہت سے دلائل پیش فرمائے، جن میں آسمان و زمین کا خصوصاً ذکر فرمایا۔ درمیان میں رسول اللہ ﷺ کی تسلی اور کفار کو تنبیہ کے لیے قیامت اور پیغمبروں کو جھٹلانے والی اقوام کے انجامِ بد کا ذکر فرمایا۔ منکرین قیامت کا سب سے بڑا شبہ یہ ہے کہ مرنے اور بوسیدہ ہو جانے کے بعد دوبارہ زندگی کیسے ممکن ہے؟ اس لیے اللہ تعالیٰ اس شبہ کے رد کے لیے آسمان و زمین کا خاص طور پر ذکر فرماتے ہیں، کیونکہ انسان کو نظر آنے والی مخلوقات میں یہ سب سے بڑے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّٰسِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّٰسِ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ [المومن: ۵۷] ”یقیناً آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنا لوگوں کو پیدا کرنے سے بہت بڑا ہے اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔“ یہاں آخرت کے حق میں تاریخی دلائل ذکر کرنے کے بعد دوبارہ پھر اس کے ثبوت میں آفاقی دلائل پیش کیے جا رہے ہیں۔ قرآن مجید اسی طرح بات کو مختلف انداز سے پھیر پھیر کر بیان کرتا ہے، تاکہ وہ اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے۔

۲ ”اُیْدٍ“ ”یَدٌ“ کی جمع کے طور پر بھی آتا ہے جس کا معنی ہاتھ ہے اور اگر یہ معنی کیا جائے کہ ”ہم نے آسمان کو ہاتھوں کے ساتھ بنایا“ تو اس سے کوئی خرابی لازم نہیں آتی، کیونکہ قرآن و حدیث سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ ہیں اور اس طرح ہیں جس طرح اس کی شان کے لائق ہے، ہم نہیں جانتے نہ جان سکتے ہیں کہ کیسے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایلیس سے فرمایا: ﴿مَا مَعَكُمْ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتَ بِیَدَیْكَ﴾ [ص: ۷۵] ”تجھے کس چیز نے روکا کہ تو اس کے لیے سجدہ کرے جسے میں نے اپنے

دونوں ہاتھوں سے بنایا؟“ مگر یہاں ”بِأَيْدِي“ ”أَذْيَبِيذُ“ (قوی ہونا) کا مصدر ہے اور معنی اس کا ”قوت“ ہے، تینوں اس میں تعظیم کی ہے اور ﴿وَإَيْدِيَهُمْ يُرْزِقُ الْقُدْسِ﴾ [البقرة: ۲۵۳] (اور ہم نے اسے روح القدس کے ساتھ قوت بخشی) بھی اسی سے مشتق ہے۔ اس مقام پر ”بِأَيْدِي“ کا یہ معنی طبری نے علی بن ابی طلحہ کی معتبر سند کے ساتھ ترجمان القرآن ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَإِذْ كَرَّمْنَا دَاوُدَ ذَا الْأَيْدِي﴾ [ص: ۱۷] ”اور ہمارے بندے داؤد کو یاد کر جو قوت والا تھا۔“ یعنی اتنا عظیم آسمان بنانا معمولی کام نہیں، یہ ہماری ہی قوت ہے جس کے ساتھ ہم نے اسے اس وقت بنایا جب کچھ بھی نہیں تھا، تو ہم تمہیں دوبارہ کیوں نہیں بنا سکتے؟ آسمان کے لیے ”خَلَقْنَاَهَا“ کے بجائے ”بَنَيْنَاهَا“ کا لفظ استعمال فرمایا، کیونکہ دیکھنے میں وہ ایک خیمے کی مانند نظر آتا ہے، جس کے لیے لفظ ”بِنَاءُ“ استعمال کیا جاتا ہے۔ پھر لفظ ”بِنَاءُ“ میں بناوٹ پر غور کرنے کی دعوت بھی ہے کہ اتنے عظیم آسمان کو ستونوں کے بغیر بنانے والے کے متعلق تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ وہ انسان ضعیف البنیان کو دوبارہ نہیں بنا سکے گا۔ پھر یہ کہنے کے بجائے کہ ”وَ بَنَيْنَا السَّمَاءَ“ (اور ہم نے آسمان کو بنایا) یہ فرمایا: ﴿وَ السَّمَاءَ بَنَيْنَاهَا﴾ (اور آسمان، ہم نے اسے بنایا) اتنے سے لفظوں میں آسمان کا ذکر دو دفعہ فرمادیا۔ ایک لفظ ”السَّمَاءُ“ کے ساتھ اور دوسرا اس کی ضمیر ”ہا“ کے ساتھ، مقصد آسمان اور اس کی بناوٹ کی طرف اچھی طرح متوجہ کرنا ہے۔

③ وَإِنَّا لَنُوسِعُونَ: ”مُوسِعٌ“ ”أَوْسَعُ يُوسِعُ“ (افعال) سے اسم فاعل ہے، جب کوئی وسعت والا ہو، جیسا کہ فرمایا: ﴿عَلَى الْمَوْسِعِ قَدْرَةٌ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدْرَةٌ﴾ [البقرة: ۲۳۶] ”وسعت والے پر اس کی طاقت کے مطابق اور تنگی والے پر اس کی طاقت کے مطابق ہے۔“ وسعت کا لفظ قدرت اور فراخی دونوں معنوں کے لیے آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ”وَاسِعٌ“ بھی ہے، فرمایا: ﴿إِنَّ اللَّهَ وَاسِعٌ عَلِيمٌ﴾ [البقرة: ۱۱۵] ”بے شک اللہ وسعت والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔“ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کی وسعت کی کوئی حد نہیں، اس کا وجود، حیات، علم، قدرت، حکمت وغیرہ سب لامحدود ہیں۔ ”وَإِنَّا لَنُوسِعُونَ“ ”إِنَّ“ اور ”لَامُ“ (تاکید کے دو حرفوں) کے ساتھ اس لیے فرمایا کہ قیامت کا منکر دراصل اللہ تعالیٰ کی قدرت و وسعت کا منکر ہے اور بلاغت کا قاعدہ ہے کہ مخاطب جس قدر کسی بات کا منکر ہوتی ہی زیادہ تاکید کے ساتھ بات کی جاتی ہے۔

④ ”أَوْسَعُ يُوسِعُ“ کا ایک معنی وسیع کرنا بھی ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہو گا کہ ”آسمان، ہم نے اسے بنایا اور یقیناً ہم وسیع کرنے والے ہیں۔“ مفسر کیلانی لکھتے ہیں: ”کائنات میں بے شمار چیزیں ایسی ہیں جن میں آج تک تخلیق اور توسیع کا عمل جاری ہے اور آئندہ بھی جاری رہے گا۔ (بلکہ ہر چیز کا یہی حال ہے) سب سے پہلے انسان ہی کو لیجیے، اس کی نسل بڑھ رہی ہے، تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے اور یہی کائنات کا شاہکار ہے۔ پھر زمین کی پیداوار بھی اللہ تعالیٰ اسی نسبت سے بڑھاتے جا رہے ہیں۔ اس آیت میں بالخصوص آسمان کا ذکر ہے، تو آسمان کی پیدائش کا بھی یہی حال ہے، آسمان میں لاتعداد مجمع انجم اور کہکشاں بیت دانوں کو وسط حیرت میں ڈال کر ان کے علم کو ہر آن چیلنج کر رہی ہیں۔ مزید حیرت کی بات یہ ہے کہ بیت دان جوں جوں پہلے سے زیادہ طاقت ور اور جدید قسم کی دوربینیں ایجاد کر رہے ہیں توں توں اس بات کا بھی انکشاف ہو رہا ہے کہ کائنات میں ہر

وَالْأَرْضَ فَرَشْنَاهَا فَنِعْمَ الْهُدُودُونَ ﴿۴۸﴾ وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴿۴۹﴾
فَفَرِّقُوا إِلَى اللَّهِ إِنِّي لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيرٌ مُّبِينٌ ﴿۵۰﴾

اور زمین، ہم نے اسے بچھا دیا، سو (ہم) اچھے بچھانے والے ہیں ﴿۴۸﴾ اور ہر چیز سے ہم نے دو قسمیں بنائیں، تاکہ تم نصیحت حاصل کرو ﴿۴۹﴾ پس دوڑو اللہ کی طرف، یقیناً میں تمہارے لیے اس کی طرف سے کھلا ڈرانے والا ہوں ﴿۵۰﴾

آن مزید وسعت پیدا ہو رہی ہے۔ سیاروں کے درمیانی فاصلے بھی بڑھ رہے ہیں اور نئے نئے اجرام بھی مشاہدہ میں آرہے ہیں۔“

آیت 48 ﴿۱﴾ وَالْأَرْضَ فَرَشْنَاهَا: آسمان بنانے کی طرح زمین بچھانے کو بھی دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہونے کی دلیل کے طور پر ذکر فرمایا ہے اور ”وَفَرَشْنَا الْأَرْضَ“ کے بجائے ”وَالْأَرْضَ فَرَشْنَاهَا“ میں بھی وہی بات ملحوظ ہے جو ”وَالسَّمَاءَ بَنَيْنَاهَا“ میں ملحوظ ہے۔ زمین کی پیدائش میں اس کے گول ہونے کے ذکر کے بجائے، جو ہر ایک کی سمجھ میں آنے والی بات نہیں تھی، اس بات کا ذکر فرمایا جو ہر شخص کے مشاہدے اور استعمال میں ہے اور جس سے سب فائدہ اٹھاتے ہیں، کیونکہ اگر وہ ناہموار اور اونچی نیچی ہوتی تو اس پر ان کا اور ان کے جانوروں کا رہنا ہی ممکن نہ ہوتا، نہ وہ اس پر بیٹھ سکتے، نہ لیٹ سکتے اور نہ چل پھر سکتے اور اس خوشگوار زندگی اور آسائش کا تصور تک نہ ہوتا جو زمین کو بچھا کر اللہ تعالیٰ نے بندوں کو عطا فرما رکھی ہے۔

آیت 49 ﴿۲﴾ فَنِعْمَ الْهُدُودُونَ: ”أَيُّ نَحْنُ“ یعنی ہم بہت اچھے بچھانے والے ہیں۔ ان آیات میں جمع متکلم (ہم) کا صیغہ اللہ تعالیٰ کی عظمت کے اظہار کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

آیت 49 ﴿۱﴾ وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ: آسمان و زمین کی پیدائش کے بعد تمام موجودات کو پیدا کرنے کی کیفیت بیان فرمائی کہ جس طرح آسمان کے مقابلے میں زمین ہے اسی طرح ہم نے ہر چیز کی دو قسمیں بنائی ہیں، ہر ایک کے مقابلے میں دوسری چیز موجود ہے۔ چنانچہ آسمان و زمین، دن رات، خشکی و تری، اندھیرا و اجالا، موت و حیات، نیکی و بدی، جنت و دوزخ، یہاں تک کہ نباتات و حیوانات کے بھی جوڑے ہیں۔

آیت 50 ﴿۲﴾ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ: تاکہ تم نصیحت حاصل کرو، توحید کو سمجھو اور جان لو کہ مخلوق جو بھی ہے اس کے مقابلے میں دوسری موجود ہے، مگر ان سب کا خالق ایک اللہ ہے، اس کا کوئی جوڑ ہے نہ ہمسر، نہ شریک اور نہ اس کے مقابلے میں کوئی ہستی ہے اور یہ بھی سمجھ لو کہ اتنی عظیم الشان کائنات کو بنانے والا تمہیں دوبارہ پیدا کرنے پر بھی قادر ہے اور تمہیں دوبارہ زندہ ہو کر اس کے حضور پیش ہونا ہے۔

آیت 50 ﴿۱﴾ فَفَرِّقُوا إِلَى اللَّهِ: یعنی جب آسمان و زمین اور کائنات کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کے ایک ہونے پر اور تمہیں دوبارہ پیدا کرنے کی قدرت پر دلالت کر رہی ہے تو تم پر لازم ہے کہ اللہ کی طرف دوڑو، کفر کو ترک کر کے توحید کی طرف آؤ اور گناہوں سے توبہ کر کے اس کی رحمت کی پناہ میں آ جاؤ۔

آیت 50 ﴿۲﴾ إِنِّي لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيرٌ مُّبِينٌ: ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «مَنْ لِيَّ وَ مَثَلُ مَا بَعَثَنِي اللَّهُ كَمَثَلِ رَجُلٍ أَتَى قَوْمًا فَقَالَ رَأَيْتُمُ الْحَيْشَ بَعِينِي، وَإِنِّي أَنَا النَّذِيرُ الْعُرْيَانُ فَالنَّجَاةُ النَّجَاةُ فَأَطَاعَتْهُ طَائِفَةٌ

وَلَا تَجْعَلُوا مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ إِنِّي لَكُمْ مِنْهُ نَذِيرٌ مُبِينٌ ﴿٥١﴾ كَذَلِكَ مَا آتَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَبْلَ رَسُولٍ إِلَّا قَالُوا سَاحِرٌ أَوْ مُجْتَوٍ ﴿٥٢﴾ اتَّوَصَوْا بِهِ ۗ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَافُونَ ﴿٥٣﴾

اور اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود نہ بناؤ، بلاشبہ میں تمہارے لیے اس کی طرف سے کھلا ڈرانے والا ہوں ﴿۵۱﴾ اسی طرح ان لوگوں کے پاس جو ان سے پہلے تھے، کوئی رسول نہیں آیا مگر انہوں نے کہا یہ جادوگر ہے، یا دیوانہ ﴿۵۲﴾ کیا انہوں نے ایک دوسرے کو اس (بات) کی وصیت کی ہے؟ (نہیں) بلکہ یہ (خود ہی) سرکش لوگ ہیں ﴿۵۳﴾

فَأَذْنَبُوا عَلَيَّ فِيهِمْ فَجَاءُوا وَكَذَّبْتُهُ طَائِفَةٌ فَصَبَّحَهُمُ النَّجِيشُ فَأَجْتَابَهُمْ ﴿٥٤﴾ [بخاری، الترقی، باب الانہاء، عن السعاصی: ۱۶۸۲] ”میری مثال اور اللہ تعالیٰ نے جو کچھ دے کر مجھے بھیجا ہے اس کی مثال اس آدمی کی سی ہے جو ایک قوم کے پاس آیا اور کہنے لگا، میں نے لشکر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور میں ننگا ڈرانے والا ہوں، (عرب کا قدیم دستور تھا کہ دشمن کے حملے سے خیردار کرنے والا شخص کپڑے اتار دیتا اور ننگا ہو کر چیخ چیخ کر حملے سے ڈراتا) اس لیے دوڑو، دوڑو۔ تو ایک گروہ نے اس کی بات مان لی اور آرام کے ساتھ اندھیرے میں چل پڑے اور بیچ کر نکل گئے اور ایک گروہ نے اسے جھٹلایا تو لشکر نے صبح صبح ان پر حملہ کیا اور انہیں تباہ و برباد کر دیا۔“

آیت 51 وَلَا تَجْعَلُوا مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ : یعنی صرف اللہ کی طرف رجوع کافی نہیں بلکہ اس کے سوا ہر معبود سے براءت بھی ضروری ہے، اس لیے اس کے ساتھ کسی اور کو معبود مت بناؤ۔ تاکید کے لیے دوبارہ فرمایا کہ میں اس کی طرف سے تمہیں کھلا ڈرانے والا ہوں۔

آیت 52 كَذَلِكَ مَا آتَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَبْلَ رَسُولٍ : اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ یہ معاملہ آپ ہی کے ساتھ پیش نہیں آیا کہ توحید اور آخرت کی دعوت سن کر جھٹلایا گیا ہو اور جادوگر یا دیوانہ کہا گیا ہو، بلکہ آپ سے پہلے جس قوم کے پاس بھی کوئی رسول آیا اس کے جاہلوں نے یہی کہا کہ یہ جادوگر ہے یا دیوانہ ہے۔ وہ سب جب معجزوں کے سامنے لاجواب ہوتے تو انہیں جادو کہہ کر جھٹلا دیتے، جب رسول کے کلام کی بے پناہ تاثیر دیکھتے تو اسے جادوگر کہہ کر لوگوں کو اس سے دور رکھنے کی کوشش کرتے اور جب دیکھتے کہ اکیلا شخص پوری قوم کے خلاف توحید اور آخرت کی بات کر رہا ہے، نہ اپنے کسی دنیوی مفاد کی پروا کرتا ہے اور نہ ساری قوم کی مخالفت، استہزاء اور اذیت رسانی کے باوجود اپنی دعوت سے باز آتا ہے تو اسے دیوانہ قرار دیتے۔

www.KitaboSunnat.com

آیت 53 ۱ اتَّوَصَوْا بِهِ : ”تواصی بتواصی“ باب تقاعل میں تشارک پایا جاتا ہے، ایک دوسرے کو وصیت کرنا۔ یعنی جب سب نے ایک ہی بات کہی تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہ سب ایک دوسرے کو اس بات کی وصیت کر گئے ہیں؟ ۲ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَافُونَ : یعنی یہ تو ممکن نہیں کہ انہوں نے ایک دوسرے کو اس بات کی وصیت کی ہو، کیونکہ ان کے درمیان مدتوں کا فاصلہ ہے، علاقے بھی ایک نہیں، تو اصل بات یہ ہے کہ یہ سرکش لوگ ہیں، پہلے لوگ بھی سرکش تھے اور اپنی خواہش نفس

فَتَوَاتَّ عَنْهُمْ فَمَا أَنْتَ بِمَلُومٍ ﴿۵۴﴾ وَذَكَرْنَا لِلذِّكْرِ فَإِنَّ الذِّكْرَى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۵۵﴾ وَ مَا خَلَقْتُ
الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ﴿۵۶﴾

سو تو ان سے منہ پھیر لے، کیونکہ تو ہرگز کسی طرح ملامت کیا ہوا نہیں ﴿۵۴﴾ اور نصیحت کر، کیونکہ یقیناً نصیحت ایمان والوں کو نفع دیتی ہے ﴿۵۵﴾ اور میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا نہیں کیا مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں ﴿۵۶﴾

پر کوئی پابندی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ دونوں کی سرکشی ان کے لیے رسول کی اطاعت اور حق بات تسلیم کرنے کی راہ میں رکاوٹ بنی، اس لیے پچھلوں نے بھی وہی بات کہی جو ان کے پہلوں نے کہی۔

آیت 54 ﴿فَتَوَاتَّ عَنْهُمْ فَمَا أَنْتَ بِمَلُومٍ﴾: یعنی جب وہ سرکشی پر اڑے ہوئے ہیں اور حق واضح ہونے کے باوجود اسے قبول کرنے پر تیار نہیں تو آپ کی ذمہ داری یہ نہیں کہ انہی کے پیچھے پڑے رہیں، بلکہ آپ ان سے کنارہ کشی اختیار کریں۔ آپ کا کام حق کا پیغام پہنچا دینا ہے، وہ آپ نے پہنچا دیا، اب اگر وہ اسے قبول نہیں کرتے تو آپ پر کوئی ملامت نہیں۔ دیکھیے سورہ شوریٰ (۲۸) کی تفسیر۔

آیت 55 ﴿وَذَكَرْنَا لِلذِّكْرِ فَإِنَّ الذِّكْرَى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِينَ﴾: ”ذَكَرْنَا يُذَكِّرُ تَذَكُّرًا“ کا معنی نصیحت بھی ہے اور یاد دہانی بھی۔ یعنی سرکشوں سے منہ پھیرنے کا مطلب یہ نہیں کہ آپ انہیں یاد دہانی اور نصیحت کرنا بھی چھوڑ دیں، بلکہ آپ انہیں یاد دہانی اور نصیحت کرتے رہیں، کیونکہ نصیحت ایمان والوں کو نفع دیتی ہے اور چونکہ آپ کو معلوم نہیں کہ کون ہے جو ایمان لے آئے گا اور کون ہے جو اس سے محروم رہے گا، اس لیے آپ ایمان لانے والی سعید روحوں کی تلاش میں ہر نیک و بد، موافق و مخالف کو نصیحت جاری رکھیں، بالآخر وہ لوگ جن کی فطرت مسخ نہیں ہوئی، اس نصیحت سے فائدہ اٹھائیں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿سَيَذَكِّرُ مَنْ يَخْشَى ۗ وَيَتَجَبَّبَهَا الْأَشْقَى﴾ [الأعلى: ۱۰، ۱۱] ”عنقریب نصیحت حاصل کرے گا جو ڈرتا ہے۔ اور اس سے علیحدہ رہے گا جو سب سے بڑا بد نصیب ہے۔“

آیت 56 ﴿۱﴾ ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾: اس آیت میں بتایا کہ نصیحت کیا کرنی ہے اور کون سی بات یاد دلانی ہے۔ فرمایا انہیں یاد دلاؤ کہ میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔

② عبادت کا معنی بندگی ہے۔ غلام کو عربی میں عبد اور فارسی میں بندہ کہتے ہیں۔ عبادت وہ تعلق ہے جو غلام کا اپنے مالک یا عبد کا اپنے رب کے ساتھ ہوتا ہے۔

③ کائنات کی ہر چیز رب تعالیٰ کے حکم کی پابند ہے، کسی کی مجال نہیں کہ ذرہ برابر سرتابی کر سکے۔ وہ جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اسے ”سُئِنٌ“ کہتا ہے اور وہ ہو جاتی ہے۔ اس ارادے کو ارادہ کونیہ اور اس حکم کو تکوینی حکم کہتے ہیں، فرمایا: ﴿إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ﴾ [یس: ۸۲] ”اس کا حکم تو، جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے، اس کے سوا نہیں ہوتا کہ اسے کہتا ہے ”ہو جا“ تو وہ ہو جاتی ہے۔“

④ اکثر معاملات میں انسان اور جن بھی اللہ تعالیٰ کے اس ارادہ کونیہ اور تکوینی حکم کے اسی طرح پابند ہیں جس طرح دوسری

مَا أُرِيدُ مِنْهُمْ مِنْ رِزْقٍ وَمَا أُرِيدُ أَنْ يُطْعَمُونَ ﴿۵۷﴾

نہ میں ان سے کوئی رزق چاہتا ہوں اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں ﴿۵۷﴾

تمام چیزیں، ان کی پیدائش، عمر، رزق، صحت، مرض اور ان کے اعضا کے افعال اور صلاحیتوں میں ان کی مرضی کا کچھ دخل نہیں۔ البتہ ان دونوں کو امتحان کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک حد تک اختیار عطا فرمایا ہے اور زندگی گزارنے کے لیے اپنے رسولوں کے ذریعے سے کچھ احکام دیے ہیں کہ میں تمہارا رب ہوں اور تم میرے بندے ہو، میں تمہارا مالک ہوں اور تم میرے غلام ہو، لہذا تم نے میری غلامی اور بندگی میں زندگی بسر کرنی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس حکم کو حکم شرعی اور اس ارادے کو ارادہ شرعیہ کہتے ہیں۔ انسان اس حکم کی تعمیل اور اس ارادے کو پورا بھی کر سکتا ہے اور اسے اس حکم کی نافرمانی اور اس ارادے کو پورا نہ کرنے کا بھی اختیار ہے۔ اسی اختیار پر اس سے باز پرس ہوگی اور وہ ثواب یا عذاب کا مستحق بنے گا، فرمایا: ﴿اللّٰہِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِيَبْلُوْکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ [الملك : ۲] ”وہ جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا، تاکہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل میں زیادہ اچھا ہے۔“ اللہ تعالیٰ نے اس کی یاد دہانی کے لیے پیغمبر بھیجے اور فرمایا: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ﴾ ”اور میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا نہیں کیا مگر اس لیے کہ وہ میری عبادت کریں۔“ یعنی ان دونوں کو پیدا کرنے سے میرا مقصد اور ارادہ شرعیہ یہی ہے کہ وہ میری عبادت اور میری بندگی و غلامی کریں اور اپنی پوری زندگی میرے احکام کے مطابق گزاریں۔

۵ بعض لوگوں نے رکوع و سجود، قیام، ذکر، نماز، روزے، زکوٰۃ اور حج وغیرہ ہی کو عبادت سمجھ رکھا ہے، بے شک یہ بھی عبادت ہیں، مگر صرف یہی عبادت نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے جو حکم بھی دیا ہے اس کی اطاعت کرنا عبادت ہے، کیونکہ بندگی اور عبادت کا مطلب ہی مالک کے حکم بلکہ اشارے پر چلنا ہے۔ جو مالک کا حکم نہ مانے وہ غلام کیسا اور جو اپنے رب کے حکم پر نہ چلے وہ عبد کیسا؟ جو شخص مسجد میں تو نماز پڑھتا ہے مگر گھر، بازار اور عدالت میں اپنی مرضی پر چلتا ہے وہ نہ رب کا بندہ ہے اور نہ اس کا عبد۔ ہاں، اگر وہ ہر کام میں اس کے حکم پر چلتا ہے تو اس کا ہر کام عبادت ہے، حتیٰ کہ نماز ہی نہیں، اس کا کھانا پینا، سونا اور بیوی سے صحبت بھی عبادت ہے، کیونکہ رب کے حکم پر عمل کرتے ہوئے اس نے مالک کے منع کیے ہوئے حرام سے اجتناب کیا اور اپنی خواہش پوری کی تو اپنے مالک کے حکم پر چلتے ہوئے پوری کی، یہی بندگی اور یہی عبادت ہے۔

۶ رب تعالیٰ کا اپنے بندوں سے سب سے پہلا تقاضا یہ ہے کہ وہ اس اکیلے کو اپنا رب اور مالک مانیں، اس کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ کریں۔ اس لیے عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے سورہ بقرہ کی آیت (۲۱): ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ﴾ کی تفسیر فرمائی: ”أَيُّ وَحْدُوا رَبَّكُمْ“ ”یعنی اپنے رب کو ایک مانو۔“ (طبری بسند حسن) اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُولٍ اِلَّا نُوْحِیْ اِلَيْهِ اِنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدُوْنَ﴾ [الانبیاء : ۲۰] ”اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف یہ وحی کرتے تھے کہ حقیقت یہ ہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو میری عبادت کرو۔“

آیت 57 ﴿ مَا أُرِيدُ مِنْهُمْ مِنْ رِزْقٍ : یہ کلام انسان کی عام عادت کے مطابق کیا گیا ہے، کیونکہ انسان جو کچھ بناتا

إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ ﴿۵۸﴾

بے شک اللہ ہی بے حد رزق دینے والا، طاقت والا، نہایت مضبوط ہے ﴿۵۸﴾

ہے اپنے کسی فائدے کے لیے بناتا ہے اور جو غلام خریدتا اور اپنی ملکیت میں رکھتا ہے اس سے مقصد اپنی ضروریات کے لیے ان سے کام لینا اور ان کی کمائی کھانا ہوتا ہے۔ فرمایا جن و انس سے نہ میں کسی طرح کا رزق چاہتا ہوں اور نہ میرا یہ مقصد ہے کہ وہ مجھے کھانے کو کچھ دیں۔ ان کے پیدا کرنے سے میرا اپنا کوئی نفع مقصود نہیں، میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ وہ میری بندگی کریں، میرے غلام بن کر رہیں اور اس میں انھی کا فائدہ ہے۔ آیت میں اپنے لیے پہلے رزق کی نفی کی جس میں انسان کی ہر ضرورت آتی ہے، اس کے بعد رزق میں سے انسان کے لیے سب سے ضروری چیز کھانے کی نفی فرمائی۔

آیت 58 ﴿۱﴾ إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ: ”هُوَ“ ضمیر فصل لانے سے اور ”الرَّزَّاقُ“ خبر پر ”الف لام“ لانے سے کلام میں حصر پیدا ہو گیا کہ رزاق صرف اللہ تعالیٰ ہے، اور کوئی نہیں۔ ”الرَّزَّاقُ“ مبالغے کا صیغہ ہے، بے حد رزق دینے والا۔ ”إِنَّ“ تعلیل (علت بیان کرنے) کے لیے ہوتا ہے، اس میں پچھلی بات کی علت بیان فرمائی۔ یعنی میں نہ جن و انس سے کسی طرح کا رزق چاہتا ہوں اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں، کیونکہ رزق دینے والا تو صرف میں ہوں، میرے سوا کوئی رزق دینے والا ہے ہی نہیں اور میں کھانے پینے اور ہر ضرورت سے نفی ہوں، تو میں جن و انس سے رزق کا یا کھلانے کا ارادہ کیوں کروں گا؟ دوسری جگہ فرمایا: ﴿قُلْ أَعْيَبَ اللَّهُ أَنْجِدُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُهُ وَلَا يُطْعَمُ﴾ [الأنعام: ۱۷] ”کہہ دے کیا میں اللہ کے سوا کوئی مالک بناؤں جو آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والا ہے، حالانکہ وہ کھلاتا ہے اور اسے نہیں کھلایا جاتا۔“

﴿۲﴾ سیاق کا تقاضا یہ تھا کہ کہا جاتا: ”إِنِّي أَنَا الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ“ کہ (نہ میں ان سے کسی رزق کا ارادہ کرتا ہوں اور نہ یہ ارادہ رکھتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں) کیونکہ میں ہی تو بے حد رزق دینے والا، طاقت والا، نہایت مضبوط ہوں۔ رسول اللہ ﷺ سے اس طرح پڑھنا بھی ثابت ہے، چنانچہ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے اس طرح پڑھایا: ﴿إِنِّي أَنَا الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ﴾ [أبو داؤد، الحروف والقرارات، باب: ۳۹۹۳۔ ترمذی: ۲۹۴۰، و صححه للألبانی] مصحف امام میں ”إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ“ ہے اور متواتر قراءت یہی ہے۔ ”إِنِّي أَنَا الرَّزَّاقُ“ کے بجائے ”إِنَّ اللَّهَ هُوَ الرَّزَّاقُ“ کہنے میں لفظ ”اللہ“ میں آنے والی تمام صفات، مثلاً اس کے جلال، اس کی کبریائی اور عظمت کا اظہار مقصود ہے۔

﴿۳﴾ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ: ”ذُو الْقُوَّةِ“ ”ذُو“ کا لفظ کسی اہم چیز کا مالک ہونے کے لیے آتا ہے، مثلاً ”ذُو مَالٍ“ اور ”ذُو شَرَفٍ“ یعنی ساری قوت کا مالک۔ ”الْمَتِينُ“ نہایت مضبوط۔ جسے کوئی نہ اس کے ارادے سے ہٹا سکتا ہے اور نہ اس کا مقابلہ کر سکتا ہے۔

فَإِنَّ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا ذُنُوبًا مِثْلَ ذُنُوبِ أَصْحَابِهِمْ فَلَا يَسْتَعْجِلُونَ ﴿۵۹﴾ فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ

كَفَرُوا مِنْ يَوْمِهِمُ الَّذِي يُوعَدُونَ ﴿۶۰﴾

۲۷

پس یقیناً ان لوگوں کے لیے جنھوں نے ظلم کیا، ان کے ساتھیوں کی باری کی طرح (عذاب کی) ایک باری ہے، سو وہ مجھ سے جلدی (عذاب) نہ مانگیں ﴿۵۹﴾ پھر بڑی ہلاکت ہے ان لوگوں کے لیے جنھوں نے کفر کیا، ان کے اس دن سے جس کا وہ وعدہ دیے جاتے ہیں ﴿۶۰﴾

آیت 59 ﴿۱﴾ فَإِنَّ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا ذُنُوبًا : ”ذُنُوبًا“ (ذال کے فتح کے ساتھ) اصل میں بڑے ڈول کو کہتے ہیں اور ”ذُنُوبٌ“ (ذال کے ضم کے ساتھ) ”ذُنْبٌ“ کی جمع ہے، گناہ۔ پہلے لوگ ایک ہی کنوئیں سے پانی لینے کے لیے آتے تو ہر ایک اپنا ڈول ساتھ لاتا تھا، پھر باری باری اپنا ڈول ڈالتے اور پانی بھر کر لے جاتے، اس لیے ”ذُنُوبٌ“ (ڈول) کا لفظ باری کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ سورت کے آخر میں کفار قریش کے متعلق فرمایا کہ جس طرح ان سے پہلے ان کے ساتھیوں پر عذاب باری باری آیا اسی طرح ان مشرکین پر عذاب کی نوبت (باری) بھی آ رہی ہے جنھوں نے ظلم کیا۔ ظلم سے مراد اللہ کے ساتھ شُرک ہے۔ باری آنے میں کچھ انتظار کرنا پڑتا ہے۔

﴿۲﴾ فَلَا يَسْتَعْجِلُونَ : یہ اصل میں ”فَلَا يَسْتَعْجِلُونِي“ تھا، ”یاء“ حذف ہو گئی، نون و قافیہ پر کسرہ یہ بتانے کے لیے باقی رہا کہ یہاں سے ”یاء“ حذف ہوئی ہے۔ سو وہ مجھ سے عذاب جلدی لانے کا مطالبہ نہ کریں، باری آنے پر ان کا یہ مطالبہ بھی پورا ہو جائے گا۔

آیت 60 ﴿۱﴾ فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ كَفَرُوا : ”فَوَيْلٌ“ پر تین تہویل کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ ”بڑی ہلاکت“ کیا گیا ہے۔ ”جس دن کا وہ وعدہ دیے جاتے ہیں“ سے مراد قیامت کا دن ہے، جس کا سورت کے شروع میں ذکر ہے، فرمایا: ﴿إِنَّا تُوَاعَدُونَ لَصَادِقٌ ۚ وَإِنَّ الَّذِينَ لَوَاقِعٌ﴾ [الذَّارِبَاتِ : ۵، ۶] ”کہ بلاشبہ جو تم سے وعدہ کیا جاتا ہے یقیناً سچا ہے۔ اور بلاشبہ جزا یقیناً واقع ہونے والی ہے۔“ سورہ معارج میں قبروں سے نکلنے کے دن کے متعلق فرمایا: ﴿ذَلِكَ الْيَوْمُ الَّذِي كَانُوا يُوعَدُونَ﴾ [المعارج : ۴۴] ”یہی وہ دن ہے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا تھا۔“



وَالطُّورِ ۱ وَكِتَابٍ مَسْطُورٍ ۲ فِي رَقٍ مَنَشُورٍ ۳

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

قسم ہے طور کی! ① اور ایک کتاب کی جو لکھی ہوئی ہے! ② ایسے ورق میں جو کھلا ہوا ہے ③

آیت 1 ① وَالطُّورِ : اللہ تعالیٰ نے یہاں اپنی پانچ عظیم الشان مخلوقات کی قسم اٹھائی ہے، اس بات کا یقین دلانے کے لیے کہ اس کا عذاب قیامت کے دن اس کے دشمنوں پر واقع ہو کر رہنے والا ہے، اسے کوئی ہٹانے والا نہیں۔ یہ پانچوں مخلوقات اللہ تعالیٰ کی عظیم اور لامحدود قوت و قدرت کی شاہد ہیں اور اس بات کی دلیل ہیں کہ ان عظیم مخلوقات کے خالق کے لیے قیامت برپا کرنا اور اپنے منکروں کو عذاب دینا معمولی بات ہے۔

آیت 2 ② ”الطُّور“ کا معنی وہ پہاڑ جس پر پودے اگتے ہوں۔ ایک خاص پہاڑ کا نام بھی ”طور“ ہے جس کے دامن میں اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا اور اگر اس پر ”الف لام“ جنس کا ہو تو تمام پہاڑ مراد ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی عظمت کی طرف توجہ دلانے کے لیے متعدد مقامات پر پہاڑوں کا ذکر فرمایا ہے۔ ان کا زمین میں گڑا ہوا ہونا، آسمان کی طرف بلند ہونا، سمندر سے ہزاروں فٹ بلند ہونے کے باوجود ان پر چشموں، پودوں اور درختوں کا اور اتنی بلندی پر گلشیروں کی صورت میں پانی کے بے حساب ذخیروں کا موجود ہونا، ان کے اندر چھپے ہوئے معدنیات کے بے شمار خزانے، اتنے بلند اور ٹھوس ہونے کے باوجود ان میں راستوں کا موجود ہونا، غرض پہاڑوں میں اللہ تعالیٰ کی قدرت و عظمت کی بے شمار نشانیاں ہیں۔ مزید دیکھیے سورہ رعد (۳)، حجر (۱۹)، نحل (۸۱، ۸۵)، لقمان (۱۰)، فاطر (۲۷)، مرسلات (۲۷)، نبا (۷)، نازعات (۳۲) اور سورہ غاشیہ (۱۹)۔

آیت 3 ③ وَكِتَابٍ مَسْطُورٍ ② فِي رَقٍ مَنَشُورٍ ③ : ”مَسْطُورٍ“ ترتیب اور خوب صورتی کے ساتھ سطر میں لکھی ہوئی کتاب۔ ”رَقٍ“ کا مادہ رقت اور باریکی کے لیے استعمال ہوتا ہے، مراد باریک چڑیا جھلی ہے جو مضبوط اور دیرپا ہونے کی وجہ سے لکھنے کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ کاغذ یا کسی طرح کا باریک ورق بھی ”رَقٍ“ ہے۔ ”مَنَشُورٍ“ کھلا ہوا، جسے کھول کر پڑھا جاسکے۔ اس ”کتاب مسطور“ کے متعلق مفسرین کے متعدد اقوال ہیں، لوح محفوظ، اعمال نامے، تورات، آسمانی کتابیں اور قرآن مجید وغیرہ۔ لفظ عام ہونے کی وجہ سے ”کتاب مسطور“ میں یہ تمام کتابیں اور انسان، جن یا فرشتے جو کچھ لکھتے ہیں وہ سب کچھ شامل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لکھنا اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے بہت بڑی نشانی ہے، خواہ اس نے خود لکھا ہو، جیسے لوح محفوظ ہے، یا اس کے فرشتوں نے لکھا ہو، جیسے نامہ ہائے اعمال ہیں، یا اس کے سکھانے سے انسانوں نے لکھا ہو۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے ”اکرم“ ہونے کا ذکر لکھنے کی تعلیم دینے کے حوالے سے فرمایا: ﴿اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ۝ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ﴾ [العلق: ۳، ۴] ”پڑھ اور تیرا رب ہی سب سے زیادہ کرم والا ہے۔ وہ جس نے قلم کے ساتھ سکھایا۔“ اور سورہ قلم میں تمام لکھنے والوں کی لکھی ہوئی تحریروں کو شاہد کے طور پر پیش کرنے کے لیے ان کی قسم کھائی، جیسا کہ فرمایا: ﴿يَوْمَ نَبِّئُ

وَالْبَيْتِ الْمَعْمُورِ ﴿۵﴾ وَالسَّنْفِ الْمَرْفُوعِ ﴿۶﴾

اور آباد گھر کی! ﴿۵﴾ اور اونچی اٹھائی ہوئی چھت کی! ﴿۶﴾

وَالْقَلْبِ وَ مَا يَنْظُرُونَ ﴿۱﴾ [القلم : ۱] ”ن۔“ قسم ہے قلم کی! اور اس کی جو وہ لکھتے ہیں!“ یہاں قیامت کے قیام اور اس میں عذاب واقع ہونے کا ایک شاہد ”کتاب مسطور“ کو قرار دیا ہے۔

آیت 4 ﴿۴﴾ وَالْبَيْتِ الْمَعْمُورِ : آباد گھر۔ اس کے متعلق بھی مفسرین کے مختلف اقوال ہیں، بعض نے فرمایا، اس سے مراد حدیث میں مذکور ساتویں آسمان پر موجود ایک مکان ہے۔ اُس جہنم نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے معراج کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ﴿ثُمَّ عَرَجَ بِنَا إِلَى السَّمَاءِ السَّابِعَةِ فَاسْتَفْتَحَ جِبْرِيْلُ فَيَقِيْلُ مَنْ هَذَا؟ قَالَ جِبْرِيْلُ، قِيْلَ وَمَنْ مَعَكَ؟ قَالَ مُحَمَّدٌ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قِيْلَ وَقَدْ بُعِثَ إِلَيْهِ؟ قَالَ قَدْ بُعِثَ إِلَيْهِ، فَفَتِيْحَ لَنَا فَاِذَا اُنَا بِاَبْرَاهِيْمَ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُسْتَبِدًا ظَهْرَهُ اِلَى الْبَيْتِ الْمَعْمُورِ وَاِذَا هُوَ يَدْخُلُهُ كُلُّ يَوْمٍ سَبْعُوْنَ اَلْفَ مَلَكٍ لَا يَعُوْدُوْنَ اِلَيْهِ﴾ [مسلم، الإيمان، باب الإسراء برسول الله ﷺ إلى السموات..... : ۱۶۲] ”پھر ہمارے ساتھ ساتویں آسمان کی طرف چڑھے تو جبریل نے دروازہ کھولنے کے لیے کہا، کہا گیا: ”کون ہے؟“ کہا: ”جبریل ہوں۔“ کہا گیا: ”اور آپ کے ساتھ کون ہے؟“ کہا: ”محمد ﷺ ہیں۔“ کہا گیا: ”کیا ان کی طرف پیغام بھیجا گیا ہے؟“ کہا: ”ہاں، پیغام بھیجا گیا ہے۔“ تو ہمارے لیے دروازہ کھول دیا گیا تو میں نے ابراہیم ﷺ کو دیکھا کہ وہ اپنی پیٹھ کی ٹیک بیت المعمور (آباد گھر) کے ساتھ لگا کر بیٹھے ہوئے تھے اور اس گھر میں ہر روز ستر ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں، (اور جو ایک دفعہ داخل ہو جاتے ہیں وہ) پھر دوبارہ کبھی اس میں داخل نہیں ہوتے۔“

بعض مفسرین نے فرمایا اس سے مراد کعبہ ہے جو ہر وقت عمرہ، حج، قیام اور طواف کرنے والوں کے ساتھ آباد رہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ”الْبَيْتِ الْمَعْمُورِ“ کے لفظ میں ان دونوں عظیم الشان گھروں کے علاوہ ہر آباد گھر بھی شامل ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی زبردست قدرت کا کھلا نشان ہے کہ اس نے زمین کے ہر حصے کو آباد کر دیا ہے۔ شہروں، بستوں، میدانوں، صحراؤں، پہاڑوں، سمندروں غرض زمین کے جس حصے کو دیکھو وہیں آبادی نظر آئے گی۔ حتیٰ کہ قطب شمالی، جہاں ہر طرف برف ہی برف ہے، وہاں بھی آبادی ملے گی۔ یعنی یہ آباد گھر (زمین) شاید ہے کہ جس نے ابتداء اتنی آبادی پھیلا دی ہے جب کچھ بھی نہیں تھا، تو وہ انھیں دوبارہ زندہ کر کے مجرموں کو عذاب دے سکتا ہے اور یقیناً دے گا، کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرے تو انسان کو پیدا کرنا بے مقصد ٹھہرتا ہے، جبکہ ایسا نہیں، فرمایا: ﴿اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُتْرَكَ سُدًى﴾ [القيامة : ۳۶] ”کیا انسان گمان کرتا ہے کہ اسے بغیر پوجتے ہی چھوڑ دیا جائے گا؟“

آیت 5 ﴿۵﴾ وَالسَّنْفِ الْمَرْفُوعِ : اس سے مراد آسمان ہے جو زمین کے لیے چھت کی طرح ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ سَفْكًَا مَّحْفُوظًا ۗ وَهُمْ عَنْ اَيِّهَا مُعْرِضُونَ﴾ [الانباء : ۲۲] ”اور ہم نے آسمان کو محفوظ چھت بنایا اور

وَ الْبَحْرِ الْمَسْجُورِ ۖ إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۚ مَالَهُ مِنْ دَافِعٍ ۗ

اور لبالب بھرے ہوئے سمندر کی! ① کہ یقیناً تیرے رب کا عذاب ضرور واقع ہونے والا ہے ② اسے کوئی ہٹانے والا نہیں ③

وہ اس کی نشانیوں سے منہ پھیرنے والے ہیں۔“ جسے اللہ تعالیٰ نے اتنی بلندی پر کسی ستون کے بغیر محض اپنے حکم کے ساتھ تھام کر رکھا ہوا ہے، فرمایا: ﴿اللَّهُ الَّذِي مَرَّفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا﴾ [الرعد : ۲] ”اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں کو بلند کیا بغیر ستونوں کے، جنہیں تم دیکھتے ہو۔“ اور فرمایا: ﴿وَيُنسِكُ السَّمَاءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ﴾ [الحج : ۶۵] ”اور وہ آسمان کو تھام کر رکھتا ہے اس سے کہ زمین پر گر پڑے مگر اس کے اذن سے۔“ پھر اس بلند چھت کو سورج، چاند اور ستاروں کے ساتھ سجا رکھا ہے، فرمایا: ﴿وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحٍ﴾ [الملك : ۵] ”اور بلاشبہ یقیناً ہم نے قریب کے آسمان کو چراغوں کے ساتھ زینت بخشی۔“ اللہ تعالیٰ نے متعدد مقامات پر آسمان کے پیدا کرنے کو انسان کی دوبارہ پیدائش کی دلیل کے طور پر ذکر فرمایا ہے، فرمایا: ﴿ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمْ السَّمَاءُ بَدُنْهَا﴾ [سورة النازعات : ۲۷ تا ۲۹] ”کیا پیدا کرنے میں تم زیادہ مشکل ہو یا آسمان؟ اس نے اسے بنایا۔ اس کی چھت کو بلند کیا، پھر اسے برابر کیا۔ اور اس کی رات کو تاریک کر دیا اور اس کے دن کی روشنی کو ظاہر کر دیا۔“

آیت 6 ﴿وَالْبَحْرِ الْمَسْجُورِ﴾: ”سَجَرَ يَسْجُرُ“ (ن) کئی معنوں میں آتا ہے۔ ”سَجَرَ التَّنُوْرُ“ ”اس نے تنور ایندھن سے بھر کر بھڑکا دیا۔“ ”سَجَرَ الْمَاءِ النَّهْرِ“ ”پانی نے نہر کو بھر دیا۔“ ”سَجَرَ الْكَلْبِ (سَدَّهٖ بِالْمَسْجُورِ)“ ”اس نے کتے کو پٹے کے ساتھ باندھ دیا۔“ اس آیت میں زمین کی سطح پر پائی جانے والی سب سے عظیم مخلوق سمندر کی قسم کھا کر اسے قیامت کے دن عذاب دینے پر قادر ہونے کی دلیل کے طور پر پیش فرمایا ہے۔ لفظ ”الْمَسْجُورُ“ لغت کے لحاظ سے جن کیفیتوں کا اظہار کرتا ہے وہ تینوں یہاں مراد لی جاسکتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ لبالب بھرا ہوا ہے، مدتیں گزرنے کے باوجود اس کی لبریزی میں کوئی کمی نہیں آئی۔ قنادہ نے فرمایا: ”الْمُسْتَلْبِي“۔ [طبری: ۳۲۵۹۴، بسند صحیح] ”بھرا ہوا۔“ پھر وہ ساکن نہیں بلکہ اس میں ہر وقت اُلٹنے اور جوش مارنے کی سی کیفیت جاری رہتی ہے۔ مجاہد نے فرمایا: ”الْمَوْقَدُ“ [طبری: ۳۲۵۹۲، بسند حسن] ”بھڑکایا ہوا۔“ مزید دیکھیے سورہ تکویر کی آیت (۶): ﴿وَ اِذَا الْاِحْاٰرُ سُجِّرَتْ﴾ کی تفسیر۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اسے خشکی پر چڑھ دوڑنے سے باندھ کر رکھا ہوا ہے۔ اگر کبھی اسے طوفان کی صورت میں نکلنے کی تھوڑی سی اجازت ملتی ہے تو شہروں کے شہر صفحہ ہستی سے ناپید ہو جاتے ہیں۔ طبری نے علی بن ابی طلحہ کی معتبر سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے: ﴿”الْبَحْرِ الْمَسْجُورِ“

الْمَحْبُوسُ﴾ [طبری: ۳۲۵۹۶]

آیت 7 ﴿اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ﴾: یہ جواب قسم ہے، جس کا یقین دلانے کے لیے پانچوں قسمیں کھائی گئی ہیں۔

آیت 8 ﴿مَالَهُ مِنْ دَافِعٍ﴾: اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ روم (۴۳) اور سورہ معارج (۲۱) کی تفسیر۔

يَوْمَ تَمُورُ السَّمَاءُ مَوْرًا ۙ وَ تَسِيرُ الْجِبَالُ سَيْرًا ۝ فَوَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ ۝ الَّذِينَ هُمْ فِي خَوْضٍ يَلْعَبُونَ ۝ يَوْمَ يُدْعَوْنَ إِلَى نَارٍ جَهَنَّمَ دَعَا ۙ هَذِهِ النَّارُ الَّتِي كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُونَ ۝ أَفَسِحْرٌ هَذَا أَمْ أَنْتُمْ لَا تُبْصِرُونَ ۝

جس دن آسمان لرزے گا، سخت لرزنا ۙ اور پہاڑ چلیں گے، بہت چلنا ۝ تو اس دن جھٹلانے والوں کے لیے بڑی ہلاکت ہے ۝ وہ جو فضول بحث میں کھیل رہے ہیں ۝ جس دن انہیں جہنم کی آگ کی طرف دھکیلا جائے گا، سخت دھکیلا جانا ۝ یہی ہے وہ آگ جسے تم جھٹلاتے تھے ۝ تو کیا یہ جادو ہے، یا تم نہیں دیکھ رہے؟ ۝

آیت 9 ۝ يَوْمَ تَمُورُ السَّمَاءُ مَوْرًا: "مَارَ يَمُورُ مَوْرًا" (ن) کسی چیز کا تیزی سے حرکت کرنا اور آگے پیچھے اور دائیں بائیں زور سے ہلنا، الٹ پلٹ ہونا، چکر کھانا۔ "مَوْرًا" مصدر تاکید کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ "سخت لرزنا" کیا گیا ہے۔ "يَوْمَ" "لَوَاقِعُ" کا ظرف ہے، یعنی تیرے رب کا عذاب اس دن واقع ہونے والا ہے جب آسمان میں سخت لرزہ پیدا ہوگا اور وہ نہایت تیزی سے چکر کھائے گا اور آخر کار پھٹ جائے گا۔ قیامت کے دن آسمان پر گزرنے والے احوال کے لیے دیکھیے سورہ فرقان (۲۵)، رحمن (۳۷)، حاقہ (۱۶)، معارج (۸)، مزل (۱۸)، مرسلات (۹)، نبا (۱۹)، تکویر (۱۱)، انفطار (۱)، انشقاق (۱)، ابراہیم (۳۸)، انبیاء (۱۰۳) اور سورہ زمر (۶۷)۔

آیت 10 ۝ وَ تَسِيرُ الْجِبَالُ سَيْرًا: قیامت کے دن پہاڑوں پر گزرنے والے احوال کے لیے دیکھیے سورہ نبا (۲۰) کی تفسیر۔

آیت 11-12 ۝ فَوَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ ۝ الَّذِينَ هُمْ فِي خَوْضٍ يَلْعَبُونَ: "خَاَصٌ يَلْعَبُونَ خَوْضًا" (ن) اصل میں پانی کے اندر داخل ہونے کو کہتے ہیں، پھر یہ لفظ فضول اور بے ہودہ اقوال و اعمال میں مشغولیت کے معنی میں استعمال ہونے لگا کہ جس طرح پانی میں جانے والے کو معلوم نہیں ہوتا کہ اس کا پاؤں کہاں پڑے گا، فضول کام یا بات کرنے والا بھی اس سے بے خبر ہوتا ہے کہ اس کا پاؤں کہاں پڑ رہا ہے۔ مزید دیکھیے سورہ مدثر (۳۵) کی تفسیر۔

آیت 13 ۝ يَوْمَ يُدْعَوْنَ إِلَى نَارٍ جَهَنَّمَ دَعَا: "دَعَّ يَدْعُ" سختی کے ساتھ دھکیلنا۔ "دَعَا" مصدر مجہول برائے تاکید ہے، بری طرح دھکیلا جانا۔ یعنی فرشتے انہیں نہایت سختی کے ساتھ بری طرح دھکیلتے ہوئے جہنم کی آگ کی طرف لے جائیں گے۔ مزید دیکھیے سورہ دخان (۴۷)، رحمان (۴۱)، قمر (۳۸) اور سورہ مومن (۷۰ تا ۷۲)۔

آیت 14 ۝ هَذِهِ النَّارُ الَّتِي كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُونَ: یعنی فرشتے انہیں ذلیل کرنے کے لیے کہیں گے، یہی وہ جہنم ہے جسے تم دنیا میں مسلسل جھٹلاتے رہے۔ "كَانَ" استمرار کے لیے ہے۔

آیت 15 ۝ أَفَسِحْرٌ هَذَا أَمْ أَنْتُمْ لَا تُبْصِرُونَ: یعنی جس طرح تم دنیا میں ہر معجزے کو جادو کہہ کر جھٹلا دیتے تھے، اب اس آگ کو بھی جادو کہہ کر جھٹلا دو، تو بتاؤ کیا یہ جادو ہے؟ یا جس طرح تم دنیا میں کہتے تھے: ﴿مِنْ بَيْنِنَا وَ بَيْنِكَ حِجَابٌ﴾

إِضْلَوْهَا فَاصْبِرُوا أَوْ لَا تَصْبِرُوا سَوَاءٌ عَلَيْكُمْ إِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۱۶﴾ إِنَّ
 الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَنَعِيمٍ ﴿۱۷﴾ فَكِهِينَ بِمَا آتَاهُمْ رَبُّهُمْ ۖ وَوَقَّهْمُ رَبُّهُمْ عَذَابَ
 الْجَحِيمِ ﴿۱۸﴾ كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۱۹﴾

اس میں داخل ہو جاؤ، پھر صبر کرو یا صبر نہ کرو، تم پر برابر ہے، تمہیں صرف اسی کا بدلہ دیا جائے گا جو تم کیا کرتے تھے ﴿۱۶﴾
 بے شک متقی لوگ باغوں اور بڑی نعمت میں ہیں ﴿۱۷﴾ لطف اٹھانے والے اس سے جو ان کے رب نے انہیں دیا اور
 ان کے رب نے انہیں بھڑکتی ہوئی آگ کے عذاب سے بچالیا ﴿۱۸﴾ کھاؤ اور پیو خوب مزے سے، اس کے بدلے جو
 تم کیا کرتے تھے ﴿۱۹﴾

[ختم السجدة: ۵۰] کہ ہمارے اور تمہارے درمیان ایک پردہ ہے، جو کچھ تم بتاتے ہو ہمیں دکھائی نہیں دیتا، تو بتاؤ کیا اب بھی تم نہیں
 دیکھ رہے؟ یہ ساری بات کفار کو دنیا میں ان کی جھٹلانے کے لیے کہی ہوئی باتیں یاد کروا کر ذلیل کرنے کے لیے کہی جائے گی۔
آیت 16 ﴿۱۶﴾ إِضْلَوْهَا: ظاہر ہے وہ یہی کہیں گے کہ پروردگار! نہ یہ جادو ہے اور نہ اسے دیکھنے سے ہم اندھے ہیں،
 بس ایک دفعہ ہمیں واپس جانے دے، ہم کبھی انکار نہیں کریں گے۔ (دیکھیے انعام: ۳۰ تا ۳۷) مگر حکم ہوگا اب اس میں داخلے
 کے بغیر چارہ نہیں، اسی میں جھپٹتے رہو۔

﴿۲﴾ فَاصْبِرُوا أَوْ لَا تَصْبِرُوا سَوَاءٌ عَلَيْكُمْ: یعنی تمہارے لیے صبر کرنا یا نہ کرنا دونوں برابر ہیں، کیونکہ نہ صبر سے تمہارے
 عذاب میں تخفیف ہوگی اور نہ جزع فزع اور واویلا کرنے سے، کیونکہ اب نہ عذاب میں کمی ہوگی، نہ اس میں وقفہ ہوگا اور نہ
 اس سے نکل سکو گے۔ مزید دیکھیے سورہ بقرہ (۱۶۲)، زخرف (۷۵) اور سورہ ابراہیم (۲۱)۔

﴿۳﴾ إِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ: یعنی جس طرح تم نے طے کر رکھا تھا کہ کسی صورت ایمان نہیں لائیں گے، اب اس کی جزا
 یہی ہے کہ کسی صورت آگ سے نکل نہیں سکو گے۔

آیت 17 ﴿۱۷﴾ إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَنَعِيمٍ: کلمتین کے برے انجام کے ذکر کے بعد متقین کے حسن انجام کا ذکر فرمایا۔
 مزید دیکھیے سورہ حجر (۲۵)۔

آیت 18 ﴿۱۸﴾ فَكِهِينَ: ”فَكِهِيْنَ“ فَكِهَةٌ فَكِهَةٌ وَفُكَاهَةٌ (ع) سے اسم فاعل ہے، خوش ہونا، لطف اٹھانا، لذت
 لینا، ظریف الطبع ہونا۔

﴿۲﴾ بِمَا آتَاهُمْ رَبُّهُمْ: اس کی وضاحت کے لیے دیکھیے سورہ ذاریات (۱۶) کی تفسیر۔

﴿۳﴾ وَوَقَّهْمُ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيمِ: اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ دخان (۵۶) کی تفسیر۔

آیت 19 ﴿۱۹﴾ كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا.....: ”هَنَاءٌ يَهْنِي وَيَهْنَأُ وَيَهْنُو الطَّعَامُ“ کا مفہوم صرف مزیدار ہونے کے لفظ سے

مُشْكِينٍ عَلَى سُرُرٍ مَّصْفُوفَةٍ، وَزَوَّجْنَاهُمْ بِحُورٍ عِينٍ ﴿۲۰﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ
بِإِيمَانٍ الْحَقَّاءُ بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَا أَلَتْهُمُ مِنْ عَمَلِهِمْ مِنْ شَيْءٍ ۚ كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ

رَهِينٌ ﴿۲۱﴾

ایسے تختوں پر بٹکی لگائے ہوئے ہوں گے جو قطاروں میں بچھائے ہوئے ہیں اور ہم نے ان کا نکاح سفید جسم، سیاہ
آنکھوں والی عورتوں سے کر دیا، جو بڑی بڑی آنکھوں والی ہیں ﴿۲۰﴾ اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد کسی بھی
درجے کے ایمان کے ساتھ ان کے پیچھے چلی، ہم ان کی اولاد کو ان کے ساتھ ملا دیں گے اور ان سے ان کے عمل
میں کچھ کمی نہ کریں گے، ہر آدمی اس کے عوض جو اس نے کمایا گروی رکھا ہوا ہے ﴿۲۱﴾

پورا ادا نہیں ہوتا، بلکہ لغت میں ”ہنسی“ سے مراد وہ چیز ہے جو کسی مشقت کے بغیر آسانی سے حاصل ہو جائے، کھانے میں
لذیذ ہو اور گلے سے آسانی سے اتر جائے۔ اس سے بدبھنی یا بیماری کا کوئی اندیشہ نہ ہو اور اس کے ساتھ کوئی غم یا فکر نہ ہو۔

آیت 20 ﴿۱﴾ مُشْكِينٍ عَلَى سُرُرٍ مَّصْفُوفَةٍ: ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ وہ تخت قطار در قطار آمنے سامنے بچھے ہوں گے،
جیسا کہ فرمایا: ﴿عَلَى سُرُرٍ مُتَقَابِلِينَ﴾ [الصافات: ۴۴] ”تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔“
﴿۲﴾ وَزَوَّجْنَاهُمْ بِحُورٍ عِينٍ: اس کے لیے دیکھیے سورہ دخان (۵۳) کی تفسیر۔

آیت 21 ﴿۱﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِإِيمَانٍ: ”بِإِيمَانٍ“ پر توین تکمیر و تقلیل کے لیے ہے، اس لیے
ترجمہ ”اور ان کی اولاد کسی بھی درجے کے ایمان کے ساتھ ان کے پیچھے چلی“ کیا گیا ہے۔

﴿۲﴾ الْحَقَّاءُ بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ: طبری نے علی بن ابی طلحہ کی معتبر سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی تفسیر نقل فرمائی ہے: ﴿إِنَّ
اللَّهَ تَبَارَكَ وَتَعَالَى يَرْفَعُ بِالْمُؤْمِنِ ذُرِّيَّتَهُ، وَإِنْ سَكَتُوا ذُوْنَهُ فِي الْعَمَلِ، يُبَيِّرُ اللَّهُ بِهِمْ عَيْنَهُ﴾ [طبری: ۲۲۶۲۲]
”اللہ تعالیٰ مومن کی خاطر اس کی اولاد کو اونچالے جائے گا، خواہ وہ عمل میں اس سے کم ہوں گے، تاکہ اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے
سے اس کی آنکھ ٹھنڈی کرے۔“ اس سے پہلے سورہ رعد (۲۳) میں بیان فرمایا کہ اہل جنت کے آباء اور بیوی بچوں میں سے جو
بھی صالح ہوں گے وہ ان کے ساتھ جنت میں جائیں گے اور سورہ مؤمن (۸) میں فرمایا کہ فرشتے اللہ تعالیٰ سے ایمان والوں
کے حق میں دعا کرتے ہیں کہ وہ انہیں اور ان کے آباء، بیویوں اور اولادوں کو جنت میں داخل کر دے۔

زیر تفسیر آیت میں جنت کے داخلے کے ساتھ ایک اور بڑی خوش خبری دی ہے کہ اگر اولاد کسی نہ کسی درجے کا ایمان لا کر
اپنے صالح آباء کے نقش قدم پر چلتی رہی ہو تو خواہ وہ ایمان یا عمل کے لحاظ سے اس بلند درجے کے مستحق نہ بھی ہوئے جو ان
کے آباء کو حاصل ہوگا، پھر بھی اللہ تعالیٰ انہیں ان کے آباء کے ساتھ ملا دے گا۔

﴿۳﴾ وَمَا أَلَتْهُمُ مِنْ عَمَلِهِمْ مِنْ شَيْءٍ: ”أَلَتْ يَأْلَتْ أَلْتَا“ (ض) ”الشيء“ کسی چیز کا کم ہونا۔ ”أَلَتْ الرَّجُلُ حَقَّهُ“

وَأَمَدَدْنَاهُمْ بِفَاكِهَةٍ وَ لَحْمٍ مِمَّا يَشْتَهُونَ ﴿۲۲﴾ يَتَنَزَّعُونَ فِيهَا كَأَنَّمَا لَا لَغْوَ فِيهَا وَلَا تَأْنِيهِمْ ﴿۲۳﴾

اور ہم انہیں پھل اور گوشت زیادہ دیں گے اس میں سے جو وہ چاہیں گے ﴿۲۲﴾ وہ اس میں ایک دوسرے سے شراب کا پیالہ چھینیں چھپٹیں گے، جس میں نہ بے ہودہ گوئی ہوگی اور نہ گناہ میں ڈالنا ﴿۲۳﴾

”کسی آدمی کے حق میں کمی کرنا، پورا نہ دینا۔“ یعنی یہ نہیں ہوگا کہ ہم آباء کو ان کے اعلیٰ درجے سے نیچے لا کر ان کی اولاد کے ساتھ ملا دیں، کیونکہ اس سے لازم آتا ہے کہ ان کے عمل کا اجر کم کر دیا جائے۔ اس لیے ہم ان کے عمل میں کسی طرح کمی نہیں کریں گے، بلکہ محض اپنے فضل سے اولاد کا درجہ بڑھا کر آباء کے اعلیٰ درجے میں پہنچادیں گے۔

④ جس طرح آباء کے عمل کی برکت سے اولاد کے درجات میں اضافہ ہوگا اسی طرح اولاد کی دعا کی بدولت اللہ تعالیٰ آباء پر بھی فضل فرمائے گا۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «إِنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ لَيَرْفَعُ الدَّرَجَةَ لِلْعَبْدِ الصَّالِحِ فِي الْحَنَّةِ، فَيَقُولُ يَا رَبِّ! أَنْتَ لِي هِدْيَةٌ؟ فَيَقُولُ بِاسْتِغْفَارٍ وَلَدَيْكَ لَكَ» [مسند احمد: ۲/۵۰۹، ح: ۱۰۶۱۰، مسند احمد کے محققین نے اس کی سند کو حسن اور ابن کثیر نے صحیح قرار دیا ہے] ”اللہ عزوجل جنت میں صالح بندے کا درجہ بلند فرمائے گا تو وہ کہے گا: ”اے میرے رب! مجھے یہ درجہ کیسے مل گیا؟“ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ”تیری اولاد کے تیرے لیے استغفار کی وجہ سے۔“ اس کی تائید اس مشہور حدیث سے ہوتی ہے جو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «إِذَا مَاتَ الْإِنْسَانُ انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ إِلَّا مِنْ ثَلَاثَةٍ إِلَّا مِنْ صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ أَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُو لَهُ» [مسلم، الوصية، باب ما يلقى الإنسان من الثواب بعد وفاته: ۱۶۳۱] ”جب انسان فوت ہو جاتا ہے تو اس کا عمل اس سے کٹ جاتا ہے، سوائے تین اعمال کے، صدقہ جاریہ یا وہ علم جس سے نفع حاصل کیا جاتا رہے یا صالح اولاد جو اس کے لیے دعا کرے۔“

⑤ «كُلُّ أُمَّرِيٍّ يَمَّا كَسَبَ رَهِينًا»: ”رَهْنٌ يَرَهُنُ رَهْنًا“ (ف) گروی رکھنا۔ ”رَهِينٌ“ گروی رکھا ہوا۔ اگر کوئی شخص کسی سے کچھ قرض لے اور قرض دینے والا اپنے حق کی وصولی کے لیے ضمانت کے طور پر اس کی کوئی چیز اپنے پاس رہن (گروی) رکھ لے تو جب تک وہ قرض ادا نہ کرے اس کی گروی رکھی ہوئی چیز چھوڑی نہیں جاتی اور اگر ادا کر ہی نہ سکے تو ضبط کر لی جاتی ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے پہلے اپنا فضل بیان فرمایا کہ صالح اولاد کے اعمال ان کے آباء کے درجے کے لائق نہ بھی ہوئے تو انہیں ان کے آباء کے ساتھ ملا دیا جائے گا۔ اب اپنے عدل کا بیان فرمایا کہ کسی شخص کو دوسرے کے گناہ میں پکڑا جائے گا، بلکہ ہر آدمی اپنے کمائے ہوئے عمل کے بدلے ہی گرفتار ہوگا، خواہ وہ باپ ہو یا بیٹا۔ پھر یا تو آدمی وہ عمل پیش کر کے چھوٹ جائے گا جس کی ادائیگی اس کے ذمے تھی یا پیش نہ کر سکنے کی وجہ سے گرفتار رہے گا۔ مزید دیکھیے سورۃ النعام (۱۶۳)، فاطر (۱۸) اور سورۃ مدثر (۳۸)۔

بیت 22 ﴿۲۲﴾ وَأَمَدَدْنَاهُمْ بِفَاكِهَةٍ اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۃ صافات (۲۲) کی تفسیر۔

بیت 23 ﴿۲۳﴾ يَتَنَزَّعُونَ فِيهَا كَأَنَّمَا: ”كَأَنَّمَا“ کی وضاحت کے لیے دیکھیے سورۃ صافات (۲۵) کی تفسیر۔ اہل جنت

وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ كَمَا لَهُمْ لَوْلُؤٌ مَّا كُنْتُمْ ۖ وَأَقْبَلُ بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ ﴿۱۹﴾
قَالُوا إِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِي أَهْلِنَا مُشْفِقِينَ ﴿۲۰﴾

اور ان پر چکر لگاتے رہیں گے انہی کے لڑکے، جیسے وہ چھپائے ہوئے موتی ہوں ﴿۱۹﴾ اور ان کے بعض بعض پر متوجہ ہوں گے، ایک دوسرے سے سوال کرتے ہوں گے ﴿۲۰﴾ کہیں گے بلاشبہ ہم اس سے پہلے اپنے گھر والوں میں ڈرنے والے تھے ﴿۲۰﴾ ایک دوسرے سے شراب کے پیالے اس لیے نہیں چھینیں چھینیں گے کہ وہاں کسی کی کا یا ختم ہونے کا اندیشہ ہوگا، بلکہ محض خوش طبعی کے طور پر ایسا کریں گے، کیونکہ چھیننے چھیننے کا الگ مزاج ہے۔

﴿۲۰﴾ لَا تَعْلَمُوهُنَّ وَلَا تَأْنِسْنَهُنَّ: دنیا کی شراب میں کئی قباحتیں ہیں، جن میں سے سب سے بڑی قباحت یہ ہے کہ آدمی کی عقل پر پردہ پڑ جاتا ہے، حالانکہ عقل ہی اسے جانوروں سے امتیاز اور ان پر برتری عطا کرتی ہے۔ پھر وہ نشے کی حالت میں بکواس کرنے لگتا ہے، گناہ کے کام کر بیٹھتا ہے، حتیٰ کہ بعض اوقات اپنی محرم عورتوں تک کی عزت برباد کر بیٹھتا ہے۔ جنت کی شراب میں دنیا کی شراب والی کوئی قباحت نہیں ہوگی، مگر اس میں وہ تمام خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہوں گی، جن کی وجہ سے یہ لوگ اس کی تلخی، بدبو اور بعد کے برے اثرات کے باوجود اسے پیتے ہیں۔ مزید دیکھیے سورۃ صافات (۴۷)۔

آیت 24: ﴿۱﴾ وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ: اس کی وضاحت کے لیے دیکھیے سورۃ دہر (۱۹) اور سورۃ واقعہ (۱۸، ۱۷) کی تفسیر۔

﴿۲﴾ كَمَا لَهُمْ لَوْلُؤٌ مَّا كُنْتُمْ: یعنی ان کی خوب صورتی، سفیدی اور پاکیزگی کا یہ عالم ہوگا جیسے موتی ابھی اپنی سیپ ہی میں محفوظ ہوں، یا جوہرات والی ڈیا میں اس طرح چھپا کر رکھے ہوئے ہوں کہ نہ ان پر گرد و غبار کا کوئی ذرہ پڑا ہو اور نہ وہ ہاتھ لگنے سے میلے ہوئے ہوں۔ دوسرے لفظوں میں وہ اتنے خوب صورت اور صاف ستھرے ہوں گے کہ چھونے سے میلے ہوتے ہوں گے۔

آیت 25: ﴿۱﴾ وَأَقْبَلُ بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ: یعنی اہل جنت ان نعمتوں سے جن کا ذکر اوپر گزرا شاد کام ہوتے ہوئے ایک دوسرے سے سوال کریں گے۔ ان میں سے ہر ایک پوچھنے والا بھی ہوگا اور دوسرے کو جواب دینے والا بھی کہ سناؤ دنیا میں تم پر کیا کچھ گزرا؟ پھر اس کی مصیبتوں اور فتنوں سے بچتے بچاتے یہاں جنت میں کیسے پہنچے؟ اس سے معلوم ہوا کہ انہیں گزشتہ تمام واقعات یاد ہوں گے، چنانچہ وہ اپنی حالت کا ذکر کرتے ہوئے کہیں گے۔ ایک دوسرے سے اس سوال و جواب میں ان کے آباء اور ان کی اولاد کی گفتگو بھی شامل ہے جو ایک درجے میں اکٹھے ہوں گے۔ تو خوشی سے ایک دوسرے سے گزرے ہوئے احوال کے متعلق سوال کریں گے اور موجودہ حالت کے بارے میں بھی کہ اللہ تعالیٰ نے ہم جیسے گناہ گاروں پر اتنا بڑا انعام کیسے کر دیا کہ ہمیں جنت میں داخل فرمایا اور پھر ہم میں سے بعض کے عمل کی کوتاہی کے باوجود سب کو یکجا کر دیا۔

آیت 26: ﴿۱﴾ قَالُوا إِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِي أَهْلِنَا مُشْفِقِينَ: یعنی وہ کہیں گے کہ ہم اس سے پہلے دنیا میں اپنے گھر والوں میں رہتے

فَمَنْ لَّهِ عَلَيْكُمُ الْعَذَابُ السَّوْمُ ۚ اِنَّا لَنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوهُ ۗ اِنَّكَ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيمُ ﴿۲۷﴾ فَذَكِّرْ

فَمَا اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّ لَا مَجْنُونٍ ﴿۲۸﴾

پھر اللہ نے ہم پر احسان کیا اور ہمیں زہریلی لو کے عذاب سے بچالیا ﴿۲۷﴾ بے شک ہم اس سے پہلے ہی اسے پکارا کرتے تھے، بے شک وہی تو بہت احسان کرنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۲۸﴾ پس نصیحت کر، کیونکہ تو اپنے رب کی مہربانی سے ہرگز نہ کسی طرح کاہن ہے اور نہ کوئی دیوانہ ﴿۲۸﴾

ہوئے ہر قسم کی آسائشوں کے باوجود ڈرتے رہتے تھے کہ کہیں ہم سے اللہ کی نافرمانی نہ ہو جائے، ہماری نیکیاں نامقبول نہ ہو جائیں اور ہمارے اعمال کی شامت سے ہمارا خاتمہ خراب نہ ہو جائے۔ ”فِيْ اَهْلِكُمْ“ (اپنے گھر والوں میں) کے مفہوم میں یہ بھی شامل ہے کہ ہم اپنے گھر والوں کے بارے میں ڈرتے رہتے تھے کہ وہ اللہ کے نافرمان نہ بن جائیں اور نافرمانی کے نتیجے میں جہنم کا اندھن نہ بن جائیں، اور یہ بھی کہ ان کی وجہ سے کہیں ہم راہِ راست سے نہ بھگ جائیں، ان کی خاطر کمائی کرتے کرتے حرام کاموں کا ارتکاب نہ کر بیٹھیں، انھیں نمازی اور رب تعالیٰ کا فرماں بردار بنانے کی کوشش میں کوتاہی نہ کر بیٹھیں اور ان کی محبت اللہ کی اطاعت پر غالب نہ آجائے۔

آیت 27 : ﴿فَمَنْ لَّهِ عَلَيْكُمُ الْعَذَابُ السَّوْمُ ۚ اِنَّا لَنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوهُ ۗ اِنَّكَ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيمُ﴾ ”سَم“ (زہر) سے مشتق ہے، زہریلی بو۔ اس کی جمع ”سَمَائِمٌ“ آتی ہے۔ بعض کہتے ہیں یہ ”مَسَامٌ“ سے ہے جو جسم کے ہر مسام میں داخل ہو جائے۔ یعنی ہم تو شدید خائف تھے کہ اپنی کوتاہیوں اور نافرمانیوں کی وجہ سے جہنم میں نہ پھینک دیے جائیں، مگر اللہ تعالیٰ نے ہم پر احسان فرمایا اور ہماری خطائیں معاف فرما کر ہمیں جہنم کی زہریلی بو سے بچالیا۔

آیت 28 : ﴿فَذَكِّرْ ۗ اِنَّا لَنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوهُ ۗ﴾ یعنی ہم اس سے پہلے دنیا میں ڈرتے تھے، مگر ڈرنے کے باوجود اس کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہوئے، بلکہ اپنی امیدیں اسی سے وابستہ رکھیں۔ اس لیے اسی کو پکارتے رہے، اسی سے دعا کرتے رہے اور اسی سے جنت میں داخلے اور جہنم سے پناہ کی درخواست کرتے رہے۔

﴿اِنَّكَ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيمُ﴾ ”اِنَّ“ تلعیل کے لیے آتا ہے، یعنی اس نے ہماری خطائیں معاف فرمائیں، ہمیں جہنم کی زہریلی بو سے بچایا، ہمیں جنت کی نعمتیں عطا کیں اور ہمارے پیاروں کو ہمارے ساتھ یکجا کر دیا، اس لیے کہ وہی ہے جو بے حد احسان کرنے والا اور نہایت رحم والا ہے، ہمیں جو کچھ عطا ہوا وہ محض اسی کے احسان اور رحم کا نتیجہ ہے۔

آیت 28 : ﴿فَذَكِّرْ ۗ اِنَّا لَنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوهُ ۗ﴾ ”کاہن“ وہ شخص جو شیاطین سے تعلق رکھتا ہے اور ان سے سن کر غیب کی خبریں دیتا ہے، جن میں ایک آدھ وہ سچی خبر بھی ہوتی ہے جو انھوں نے آسمان کے نیچے فرشتوں کی باہمی گفتگو سے چرائی ہوتی ہے، پھر اس کے ساتھ سو باتیں جھوٹی ملا کر اپنے دوستوں کو بتاتے ہیں۔

﴿سورت کے شروع سے قیامت، جزا و سزا اور جنت و جہنم کی تفصیل اور دلائل ذکر کرنے کے بعد فرمایا: ”فَذَكِّرْ“ (پس

أَمْ يَقُولُونَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهِ رَمِيْبَ الْمُنُونِ ﴿۳۰﴾ قُلْ تَرَبَّصُوا فَإِنِّي مَعَكُمْ مِنَ الْمُنْتَرَبِّصِينَ ﴿۳۱﴾

یادہ کہتے ہیں کہ یہ ایک شاعر ہے جس پر ہم زمانے کے حوادث کا انتظار کرتے ہیں؟ ﴿۳۰﴾ کہہ دے انتظار کرو، پس بے شک میں (بھی) تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں سے ہوں ﴿۳۱﴾

یعنی جب ہم نے یہ سب کچھ آپ کو وحی کے ذریعے سے بتا دیا تو اب آپ کی ذمہ داری ہے کہ اس کے ساتھ تمام لوگوں کو نصیحت کریں اور کفار و مشرکین کی بے ہودہ باتوں اور تمہوں کی پروا نہ کریں۔ وہ آپ کو کاہن کہیں یا مجنون، آپ اللہ کے فضل سے کسی طرح بھی نہ کاہن ہیں نہ مجنون۔ کہانت یا دیوانگی کی کوئی بھی بات آپ میں ہرگز نہیں پائی جاتی۔ ”فَمَا أَنْتَ بِنَبِيٍّ رَبِّكَ يُبَاطِلُ“ میں ”مَا“ نافیہ کے بعد ”بَاء“ نفی کی تاکید کے لیے ہے اور ”يُبَاطِلُ“ پر تنوین تکبیر کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے ”تو اپنے رب کی مہربانی سے ہرگز نہ کسی طرح کاہن ہے اور نہ کوئی دیوانہ۔“

﴿۳۰﴾ اللہ تعالیٰ نے اور مقامات پر بھی رسول اللہ ﷺ سے کہانت اور جنون کی نفی فرمائی ہے۔ دیکھیے سورہ حاقہ (۴۱، ۴۲)، قلم (۲) اور سورہ تکویر (۲۲)۔ سورہ شعراء میں یہ بات کہ آپ ﷺ کاہن نہیں اور یہ کہ کاہن کس طرح کے لوگ ہوتے ہیں، تفصیل سے گزر چکی ہے، دیکھیے سورہ شعراء کی آیات (۲۱۰ تا ۲۲۳) اور ان کی تفسیر۔

آیت 30: أَمْ يَقُولُونَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهِ رَمِيْبَ الْمُنُونِ: ”تَرَبَّصُ يَتَرَبَّصُ“ (تفعل) ”آنے والے کسی شریا خیر کا انتظار کرنا۔“ ”الْمُنُونِ“ ”مَنْ يَمُنُّ مَنْنًا“ (ن) کا معنی ”قطع کرنا“ ہے۔ ”الْمُنُونِ“ بروزن ”فَعُولُ“ (کانٹے والا) موت کو کہتے ہیں، کیونکہ وہ زندگی کی رسی کو کاٹ دیتی ہے، اور زمانے کو بھی، کیونکہ وہ بھی زندگی کے ایام کو کاٹتا چلا جاتا ہے۔ ”رَمِيْبَ“ کا اصل معنی شک اور بے چینی ہے، لیکن جب اس کا استعمال زمانے کے ساتھ ہو تو مراد زمانے کے حوادث ہوتے ہیں، کیونکہ وہ آدمی کو بے چین رکھتے ہیں۔

یہاں سے اللہ تعالیٰ نے انکار اور تعجب کے انداز میں ان مشرکین کی جہالت کی باتوں کا پندرہ (۱۵) دفعہ لفظ ”أَمْ“ کے ساتھ ذکر فرمایا ہے اور ہر ”أَمْ“ کے بعد سوال کرتے ہوئے ان پر الزام قائم کیا ہے، جس کا جواب ان میں سے کسی کے پاس نہیں۔ چنانچہ اس آیت میں فرمایا: ﴿أَمْ يَقُولُونَ شَاعِرٌ﴾ ”یادہ کہتے ہیں کہ یہ شاعر ہے۔“ کفار کا یہ قول نقل فرما کر تردید کی ضرورت نہیں سمجھی، کیونکہ قرآن مجید کا وجود ہی اس کی تردید کے لیے کافی ہے۔ البتہ ان کی اس بات کا جواب دیا ہے کہ ہم اس پر زمانے کے حوادث کا انتظار کرتے ہیں کہ اس پر کوئی آفت آجائے، یا اس کی موت کا وقت آجائے، جس کے ساتھ اس کی دعوت کا سلسلہ ختم ہو جائے۔

آیت 31: قُلْ تَرَبَّصُوا فَإِنِّي مَعَكُمْ مِنَ الْمُنْتَرَبِّصِينَ: اس کا یہ مطلب نہیں کہ انتظار کر کے دیکھ لو، تم ہی مرو گے میں نہیں مروں گا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ تم میرا انجام دیکھو میں تمہارا انجام دیکھتا ہوں۔ تمہارا انجام ناکامی اور ہلاکت ہے، میرا انجام کامیابی اور نجات ہے۔

أَمْ تَأْمُرُهُمْ أَخْلَامُهُمْ بِهَذَا أَمْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُونَ ﴿۳۲﴾ أَمْ يَقُولُونَ تَقْوَاهُ ۖ بَلْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿۳۳﴾ فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِثْلِهِ إِنْ كَانُوا صَادِقِينَ ﴿۳۴﴾

یا انھیں ان کی عقلیں اس بات کا حکم دیتی ہیں، یا وہ خود ہی حد سے گزرنے والے لوگ ہیں؟ ﴿۳۲﴾ یا وہ کہتے ہیں کہ اس نے یہ خود گھڑ لیا ہے؟ بلکہ وہ ایمان نہیں لاتے ﴿۳۳﴾ پس وہ اس جیسی ایک ہی بات بنا کر لے آئیں، اگر سچے ہیں ﴿۳۴﴾

آیت 32 ﴿۳۲﴾ أَمْ تَأْمُرُهُمْ أَخْلَامُهُمْ بِهَذَا ... : ”أَخْلَامٌ“ ”جِلْمٌ“ کی جمع ہے، جو دراصل غصہ بھرنے کے وقت ضبط نفس کو کہتے ہیں۔ عقل کو ”علم“ اس لیے کہتے ہیں کہ ایسے وقت میں وہی طبیعت پر ضبط کا باعث ہوتی ہے۔ مشرکین اپنے آپ کو بڑا عقل مند باور کرواتے تھے، اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کے متعلق ان کی تین باتیں ذکر فرمائیں، کاہن، مجنون اور شاعر، پھر ان کی عقلوں پر چوٹ فرمائی کہ کیا کوئی عاقل ایسی بات کہہ سکتا ہے؟ اول تو رسول اللہ ﷺ کی پوری زندگی اور آپ کا لایا ہوا قرآن سب کے سامنے ہے، کوئی شخص جس کی عقل قائم ہو وہ آپ کے متعلق یا قرآن کے متعلق ان میں سے کوئی بات بھی نہیں کہہ سکتا، کیونکہ قرآن کریم کا اور رسول کریم ﷺ کا کہانت، جنون یا شعر کے ساتھ کوئی تعلق ہی نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے متعلق جو باتیں کہہ رہے ہیں وہ آپس میں اتنی متضاد ہیں کہ ایک شخص میں جمع ہو ہی نہیں سکتیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص شاعر بھی ہو، کاہن بھی اور پھر پاگل بھی اور اس کا پیش کیا ہوا کلام شعر بھی ہو، کہانت بھی اور دیوانگی بھی؟ پھر یہ کون سی عقل مندی ہے کہ کسی شاعر یا کاہن یا دیوانے سے اتنے شدید خوف زدہ ہو جاؤ کہ کسی کو اس کی بات نہ سننے دو؟ بھلا آج تک کسی شاعر، کاہن یا دیوانے کی اتنی شدید مخالفت کی گئی ہے جتنی یہ لوگ آپ ﷺ کی کر رہے ہیں۔ فرمایا، کیا ان کی عقلیں انھیں اس کا حکم دیتی ہیں؟ جواب ذکر نہیں فرمایا، کیونکہ وہ خود بخود ظاہر ہے کہ یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ ان کی عقلوں کا فیصلہ نہیں بلکہ بات کچھ اور ہے اور وہ یہ ہے کہ دراصل یہ سرکش لوگ ہیں اور ان کی سرکشی انھیں حق قبول نہیں کرنے دیتی۔

آیت 33 ﴿۳۳﴾ أَمْ يَقُولُونَ تَقْوَاهُ ۖ بَلْ لَا يُؤْمِنُونَ: ”تَقْوَاهُ“ (تقفل) تکلف سے بات بنانا اور گھڑنا۔ ”فَلَا يُؤْمِنُونَ عَلَىٰ فُلَانٍ“ ”فلاں نے فلاں پر جھوٹ گھڑ دیا۔“ یعنی یا وہ قرآن کے متعلق کہتے ہیں کہ نبی نے یہ کلام اپنے پاس سے بنا کر اللہ کے ذمے لگا دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر یہ نہیں فرمایا کہ نہیں یہ نبی کا بنایا ہوا نہیں بلکہ اللہ کا کلام ہے، کیونکہ خود ان کا دل جانتا ہے کہ یہ آپ ﷺ کا اپنا کلام نہیں ہو سکتا۔ جو لوگ اہل زبان ہیں وہ اسے سن کر سمجھ لیتے ہیں کہ یہ انسان کا کلام نہیں ہو سکتا۔ پھر جو شخص رسول اللہ ﷺ کو جانتا ہے وہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ نبوت سے پہلے چالیس برس تک کسی انسان پر بھی جھوٹ نہ باندھنے والا شخص اللہ پر جھوٹ باندھ سکتا ہے۔ اس لیے فرمایا: ﴿بَلْ لَا يُؤْمِنُونَ﴾ یعنی ان کی مخالفت کی وجہ یہ نہیں کہ آپ ﷺ نے یہ قرآن خود گھڑ لیا ہے، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ مانتے ہی نہیں، انھوں نے فیصلہ کر رکھا ہے کہ ہم کسی صورت ایمان نہیں لائیں گے۔

آیت 34 ﴿۳۴﴾ فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِثْلِهِ إِنْ كَانُوا صَادِقِينَ: یعنی اگر یہ اسے رسول کا اپنے پاس سے گھڑا ہوا انسانی کلام سمجھتے

أَمْ خُلِقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمُ الْخَالِقُونَ ﴿۳۵﴾ أَمْ خَلَقُوا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ ۗ بَلْ لَّا يُوقِنُونَ ﴿۳۶﴾

یا وہ کسی چیز کے بغیر ہی پیدا ہو گئے ہیں، یا وہ (خود) پیدا کرنے والے ہیں؟ ﴿۳۵﴾ یا انھوں نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا ہے؟ بلکہ وہ یقین نہیں کرتے ﴿۳۶﴾

ہیں تو وہ بھی اس جیسی ایک بات ہی بنا کر لے آئیں، اگر سچے ہیں۔ آخر وہ بھی اہل زبان ہیں، انھیں اپنی فصاحت و بلاغت پر ناز ہے، پھر انھیں یہ بھی پیش کش ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ ساری کائنات کو ساتھ ملا کر اس جیسی ایک بات بنا کر لے آئیں۔ قرآن مجید کے ان مقامات پر بھی نظر ڈال لیں، سورہ بقرہ (۲۳)، یونس (۳۸)، ہود (۱۳) اور بنی اسرائیل (۸۸)۔

آیت 36-35: ﴿۳۵﴾ أَمْ خُلِقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ ۗ.....: اس سے پہلے تین سوال یہ ثابت کرنے کے لیے تھے کہ محمد ﷺ اللہ کے سچے رسول اور قرآن اللہ کی سچی کتاب ہے، اب یہاں سے اللہ تعالیٰ کے وجود، اس کی وحدانیت اور قدرت کاملہ کو ثابت کرنے کی بات کا آغاز فرمایا۔ یعنی محمد ﷺ نے ان کے سامنے جو دعوت پیش کی ہے وہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارا خالق ہے، اس لیے تمہیں اسی کی عبادت کرنی چاہیے، اس کے ساتھ کسی اور کو شریک نہیں کرنا چاہیے۔ آخر اس پر ان کے جملے کی کیا کوئی معقول وجہ ہے؟ اگر یہ رب تعالیٰ کو خالق نہیں مانتے تو بتائیں کہ کیا وہ کسی بنانے والے کے بغیر ہی بن گئے ہیں؟ ظاہر ہے یہ ہو ہی نہیں سکتا، کیونکہ سب جانتے ہیں کہ ہر نبی ہوئی چیز کا کوئی بنانے والا ضرور ہوتا ہے۔ یا پھر انھوں نے اپنے آپ کو خود بنا لیا ہے؟ یہ پہلی بات سے بھی زیادہ ناممکن بات ہے، کیونکہ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک ہی چیز خالق بھی ہو اور مخلوق بھی۔ یا پھر یہ بتائیں کہ یہ آسمان و زمین انھوں نے بنائے ہیں؟ ظاہر ہے ایسا بھی نہیں، کیونکہ یہ کائنات اس وقت کی بنی ہوئی ہے جب ان لوگوں کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔

ان دونوں آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے تین سوال کیے ہیں جن کا جواب ذکر نہیں فرمایا، کیونکہ وہ بالکل ظاہر ہے کہ نہ یہ لوگ کسی بنانے والے کے بغیر بنے ہیں، نہ یہ اپنے آپ کو خود بنانے والے ہیں اور نہ کائنات ان کی بنائی ہوئی ہے، بلکہ انھیں اور ساری کائنات کو بنانے والا کوئی اور ہے اور وہ اللہ تعالیٰ ہے۔ اس حقیقت کو وہ بھی مانتے تھے، جیسا کہ فرمایا: ﴿۳۵﴾ وَلَٰكِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ فَأَلَّىٰ يُلَاقُونَ ۗ ﴿۳۶﴾ [الزحرف ۸۷] اور یقیناً اگر تو ان سے پوچھے کہ انھیں کس نے پیدا کیا تو بلاشبہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے، پھر کہاں بہکائے جاتے ہیں۔ اور فرمایا: ﴿۳۶﴾ وَلَٰكِنْ سَأَلْتَهُمْ فَمَنْ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ [الغمان ۲۵] اور بلاشبہ اگر تو ان سے پوچھے کہ آسمانوں کو اور زمین کو کس نے پیدا کیا تو ضرور ہی کہیں گے کہ اللہ نے۔ ﴿۳۶﴾ بَلْ لَّا يُوقِنُونَ: یعنی بات یہ نہیں کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو اپنا خالق نہیں مانتے اور اس کا اقرار نہیں کرتے، بلکہ اصل یہ ہے کہ اقرار کے باوجود انھیں اس بات کا یقین نہیں ہے، کیونکہ اگر انھیں واقعی یقین ہوتا کہ ہمارا خالق اللہ تعالیٰ ہے تو اسی کی عبادت کرتے، نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک بناتے اور نہ اس کی طرف دعوت دینے والے کی اس طرح مخالفت کرتے۔

أَمْرٌ عِنْدَهُمْ خَزَائِنُ رَيْكَ أَمْ هُمُ الْمُضَيَّرُونَ ﴿۳۷﴾ أَمْ لَهُمْ سُلْمٌ يَسْتَعُونُ فِيهِ ، فَلْيَأْتِ
مُسْتَبْعُهُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِينٌ ﴿۳۸﴾ أَمْ لَهُ الْبَنَاتُ وَلَكُمْ الْبَنُونَ ﴿۳۹﴾

یا ان کے پاس تیرے رب کے خزانے ہیں، یا وہی حکم چلانے والے ہیں؟ ﴿۳۷﴾ یا ان کے پاس کوئی سیڑھی ہے جس پر وہ اچھی طرح سن لیتے ہیں؟ تو ان کا سننے والا کوئی واضح دلیل پیش کرے ﴿۳۸﴾ یا اس کے لیے تو بیٹیاں ہیں اور تمہارے لیے بیٹے؟ ﴿۳۹﴾

آیت 37 ﴿۱﴾ أَمْرٌ عِنْدَهُمْ خَزَائِنُ رَيْكَ : یہ کفار کے اس اعتراض کا جواب ہے کہ آپ ﷺ ہی کو کیوں رسول بنا یا گیا، مکہ اور طائف کے سرداروں میں سے کسی کو رسالت کے لیے کیوں نہ چنا گیا؟ فرمایا، یہ فیصلہ کرنا کہ کس کو رسول بنا کر بھیجا جائے مالک کا کام ہے۔ اب یہ لوگ اگر اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے رسول کا انکار کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یا تو تیرے رب کے خزانوں کے مالک یہ ہیں، جسے چاہیں دیں جسے چاہیں نہ دیں، یا یہ کہ مالک تو اللہ تعالیٰ ہی ہے مگر اس پر حکم انھی کا چلتا ہے۔ اب یہ خود ہی بتائیں کہ ان دونوں میں سے ان کا دعویٰ کیا ہے؟ مزید دیکھیے سورہ ص (۱۰۳۸) اور سورہ زخرف (۳۲، ۳۱)۔ خلاصہ یہ کہ کفار کے پاس رسول اللہ ﷺ کی رسالت سے انکار کی کوئی عقلی دلیل نہیں۔

آیت 38 ﴿۲﴾ آیت کی تفسیر اس طرح بھی ہو سکتی ہے کہ یا یہ لوگ اس لیے اکیلے رب کی عبادت نہیں کرتے اور محمد ﷺ کو رسول نہیں مانتے کہ تیرے رب کے خزانوں کے مالک وہی ہیں، یا ان پر انھی کا حکم چلتا ہے، اس لیے وہ اپنی مرضی کے مالک ہیں، جو چاہیں کرتے پھریں؟ ظاہر ہے ایسا بھی ہرگز نہیں۔

آیت 38 ﴿۳﴾ أَمْ لَهُمْ سُلْمٌ يَسْتَعُونُ فِيهِ : یا ان کے پاس کوئی سیڑھی ہے جس پر چڑھ کر وہ عالم بالا کی طرف کان لگائے رکھتے ہیں اور وہاں سے سن آئے ہیں کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں وہی حق ہے اور یہ بھی سن آئے ہیں کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول نہیں اور نہ اس نے انھیں بھیجا ہے، بلکہ انھوں نے قرآن خود ہی تصنیف کر کے اللہ تعالیٰ کے ذمہ لگا دیا ہے۔ اگر کسی کا یہ دعویٰ ہے تو وہ اس کی واضح دلیل پیش کرے، جس سے معلوم ہو کہ وہ واقعی آسمان تک گیا تھا اور وہاں اس نے واقعی اللہ تعالیٰ کی اور فرشتوں کی باتیں سنی ہیں۔ دیکھیے سورہ احقاف (۴) اور سورہ فاطر (۴۰) اس آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ کفار کے پاس رسول اللہ ﷺ پر ایمان نہ لانے کے لیے کوئی نقلی دلیل بھی نہیں۔

آیت 39 ﴿۴﴾ أَمْ لَهُ الْبَنَاتُ وَلَكُمْ الْبَنُونَ : پھر جب انھیں عالم بالا تک رسائی نہیں تو انھیں کیسے معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کو کائنات کا نظام چلانے کے لیے اولاد کی ضرورت ہے اور انھوں نے یہ کیسے طے کر دیا کہ اولاد بناتے وقت اس نے اپنے لیے بیٹوں کے بجائے بیٹیوں کا چناؤ کیا ہے اور انھیں بیٹوں کے لیے منتخب کیا ہے؟ حالانکہ یہ لوگ اپنے لیے کبھی بیٹیاں پسند نہیں کرتے۔ دیکھیے سورہ نحل (۶۰۳-۵۷) اور سورہ زخرف (۱۸۴-۱۶)۔

أَمْ تَسْأَلُهُمْ أَجْرًا فَهُمْ مِنْ مَغْرُورٍ مُثْقَلُونَ ﴿۴۰﴾ أَمْ عِنْدَ هُمْ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُمُونَ ﴿۴۱﴾ أَمْ يُرِيدُونَ كَيْدًا ۚ فَالَّذِينَ كَفَرُوا هُمُ الْمَكِيدُونَ ﴿۴۲﴾ أَمْ لَهُمْ آلِهَةٌ غَيْرُ اللَّهِ ۚ سُبْحَانَ اللَّهِ عَنَّا يُشْرِكُونَ ﴿۴۳﴾

یا تو ان سے کوئی اجرت مانگتا ہے؟ پس وہ تاوان سے بوجھل کیے جانے والے ہیں ﴿۴۰﴾ یا ان کے پاس غیب ہے؟ پس وہ لکھتے ہیں ﴿۴۱﴾ یا وہ کوئی چال چلانا چاہتے ہیں؟ تو جن لوگوں نے کفر کیا وہی چال میں آنے والے ہیں ﴿۴۲﴾ یا ان کا اللہ کے سوا کوئی معبود ہے؟ پاک ہے اللہ اس سے جو وہ شریک بناتے ہیں ﴿۴۳﴾

آیت 40 : أَمْ تَسْأَلُهُمْ أَجْرًا... : "الْمَغْرُمُ وَالْفِرَاقَةُ وَالْمَغْرَمُ" تاوان، جہنی، جو مال آدمی کو نہ چاہنے کے باوجود دینا پڑ جائے۔ "أَجْرًا" پر توین تکبیر کے لیے ہے، کسی بھی طرح کی اجرت۔ رسول اللہ ﷺ کی دعوت قبول نہ کرنے کی ایک وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ آپ ان سے کسی طرح کی اجرت کا مطالبہ کرتے ہوں اور وہ تاوان سمجھ کر بوجھ برداشت کرنے کے لیے تیار نہ ہوں۔ جب آپ ان سے کسی طرح کی اجرت یا معاوضے کا مطالبہ نہیں کرتے بلکہ اپنی مزدوری صرف اللہ تعالیٰ کے ذمے سمجھتے ہیں اور اپنی کمائی یا کاروبار کی بھی پروا نہ کرتے ہوئے ہر وقت ان کی خیر خواہی کے لیے ان کے پیچھے پھرتے ہیں تو پھر وہ آپ سے دور کیوں بھاگتے ہیں؟ مزید دیکھیے سورہ مومنون (۷۲)۔

آیت 41 : أَمْ عِنْدَ هُمْ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُمُونَ: "عِنْدَ هُمْ" پہلے لانے سے حصر پیدا ہو گیا ہے، اس لیے ترجمہ "یا انھیں کے پاس غیب ہے" کیا گیا ہے۔ یعنی یا پھر انھیں آپ کے اجماع کی ضرورت اس لیے نہیں کہ سارا غیب انھیں کے پاس ہے اور وہ اپنے معاملات کے فیصلے خود ہی وہاں سے لکھ لیتے ہیں، اس لیے انھیں اس کتاب کی ضرورت ہی نہیں جو آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لے کر آئے ہیں۔ یہاں بھی سوال ہی پر اکتفا فرمایا ہے، کیونکہ اس کا جواب ظاہر ہے کہ سارے غیب کا بلا شرکت غیرے مالک ہونا تو بہت ہی دور ہے، یہ تو غیب کے ایک ذرے سے بھی آگاہ نہیں۔ پھر یہ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول سے کس طرح مستغنی ہو سکتے ہیں۔

آیت 42 : "أَمْ يُرِيدُونَ كَيْدًا ۚ فَالَّذِينَ كَفَرُوا... : "الْمَكِيدُونَ" "كَيْدٌ يَكِيدُ كَيْدًا" سے اسم مفعول ہے، جو کسی کی چال میں آچکے ہوں۔ یعنی یا وہ آپ کے خلاف کوئی چال چلانا چاہتے ہیں تو سن لیں کہ وہ لوگ جو حق کا انکار کر رہے ہیں، یا اس کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں اور کئی طرح کی چالیں چل رہے ہیں وہ خود ہی چال میں آنے والے ہیں۔ چنانچہ کفار نے آپ ﷺ کی ہجرت کے وقت یا کسی بھی موقع پر آپ ﷺ کے خلاف جو بھی سازش کی وہ ناکام ہوئی اور ان کی ہر چال انھیں پر اٹنی پڑی اور کفر پر اڑنے والے بدر اور دوسرے مواقع پر بری طرح قتل ہوئے۔ سعید روحوں نے اسلام قبول کر لیا اور پورا جزیرہ عرب اسلام کے زیر نگیں آ گیا۔

آیت 43 : ﴿۱﴾ أَمْ لَهُمْ آلِهَةٌ غَيْرُ اللَّهِ : یا پھر اللہ تعالیٰ کے سوا ان کا کوئی اور معبود ہے جو عبادت کا مستحق ہے اور نفع و نقصان

وَإِنْ تَرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَاءِ سَاقِطًا يَقُولُوا سَحَابٌ مَّرْكُومٌ ﴿۳۷﴾ فَذَرَهُمْ حَتَّىٰ يُلَاقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي فِيهِ يُصْعَقُونَ ﴿۳۸﴾ يَوْمَ لَا يُغْنِي عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ﴿۳۹﴾ وَإِنَّ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا عَذَابًا دُونَ ذَلِكَ وَلَٰكِن أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۴۰﴾

اور اگر وہ آسمان سے گرتا ہوا کوئی ٹکڑا دیکھ لیں تو کہہ دیں گے یہ ایک تہ بہ تہ بادل ہے ﴿۳۷﴾ پس انہیں چھوڑ دے، یہاں تک کہ وہ اپنے اس دن کو جا لیں جس میں وہ بے ہوش کیے جائیں گے ﴿۳۸﴾ جس دن نہ ان کی چال ان کے کسی کام آئے گی اور نہ ان کی مدد کی جائے گی ﴿۳۹﴾ اور یقیناً ان لوگوں کے لیے جنہوں نے ظلم کیا، اس (آخرت) سے پہلے بھی ایک عذاب ہے، اور لیکن ان کے اکثر نہیں جانتے ﴿۴۰﴾

کا اختیار رکھتا ہے۔

﴿۲﴾ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَنَّا يُفْرِكُوْنَ: ”ما“ موصولہ بھی ہو سکتا ہے اور مصدر یہ بھی۔ موصولہ ہو تو معنی ہے ”پاک ہے اللہ اس سے جو وہ شریک بناتے ہیں۔“ مصدر یہ ہو تو معنی ہے ”پاک ہے اللہ ان کے شریک بنانے سے۔“ یعنی اللہ تعالیٰ ان کے شرک سے اور بنائے ہوئے شریکوں سے پاک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ ان لوگوں کے بنائے ہوئے معبودوں کا حقیقت میں کوئی وجود نہیں، یہ محض اپنے وہم و گمان کی پوجا کر رہے ہیں۔

آیت 44 : ﴿۴۴﴾ وَإِنْ تَرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَاءِ سَاقِطًا : ”كِسْفًا“ سین کی جزم کے ساتھ واحد ہے، ٹکڑا۔ بعض کہتے ہیں جمع ہے، جیسا کہ ”سِدْرَةٌ“ کی جمع ”سِدْرٌ“ ہے، ٹکڑے۔ (اعراب القرآن از درویش) یعنی ان لوگوں نے ہر قیمت پر انکار کا تہیہ کر رکھا ہے اور ایمان لانے کی شرط کے طور پر جن معجزات کا مطالبہ کرتے ہیں وہ صرف لاجواب کرنے کے لیے کرتے ہیں۔ اگر ان کے تمام طلب کردہ معجزات بھی دکھا دیے جائیں پھر بھی یہ ایمان نہیں لائیں گے۔ (دیکھیے انعام: ۱۱۔ یونس: ۹۶، ۹۷) پھر یا تو اسے آنکھوں پر چادو کہہ کر رد کر دیں گے (دیکھیے حجر: ۱۵) یا کوئی اور بہانہ بنا کر ایمان لانے سے انکار کر دیں گے۔ مثلاً ان کا مطالبہ ہے کہ ہم پر آسمان کو ٹکڑے کر کے گرا دے (دیکھیے بنی اسرائیل: ۹۲) اگر ہم ان کا یہ مطالبہ بھی پورا کر دیں اور آسمان کا کوئی ٹکڑا گرا دیں تو اسے تہ بہ تہ بادل کہہ کر ایمان لانے سے انکار کر دیں گے، حالانکہ وہ دیکھ رہے ہوں گے اور انہیں یقین ہوگا کہ وہ تہ بہ تہ بادل نہیں ہے۔

آیت 45، 46 : ﴿۴۵﴾ فَذَرَهُمْ حَتَّىٰ يُلَاقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي فِيهِ يُصْعَقُونَ : اس دن سے مراد قیامت کا دن ہے جب صور میں پھونک کے ساتھ سب لوگ بے ہوش ہو کر مر جائیں گے۔ (دیکھیے سورہ زمر: ۶۸) مزید دیکھیے سورہ زخرف (۸۳) اور سورہ معارج (۴۲، ۴۳)۔

آیت 47 : ﴿۴۷﴾ وَإِنَّ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا عَذَابًا دُونَ ذَلِكَ: یعنی کفار کے لیے قیامت سے پہلے بھی ایک عذاب ہے۔ اس

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِينَ تَقُومُ ﴿۱۱﴾

اور اپنے رب کا حکم آنے تک صبر کرو، پس بے شک تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے اور اپنے رب کی تعریف کے ساتھ تسبیح کر جب تو کھڑا ہو ﴿۱۱﴾

سے مراد دنیا میں آنے والے عذاب ہیں۔ دیکھیے سورۃ توبہ (۱۲۶) اور سورۃ سجدہ (۲۱) کی تفسیر۔

﴿۱۱﴾ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ: یعنی دنیا میں ان پر مختلف مصیبتیں اور عذاب آتے ہیں، جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ پلٹ آئیں اور توبہ کر لیں، مگر ان میں سے زیادہ تر لوگ نہیں جانتے کہ ہم پر یہ مصیبتیں کیوں آئیں۔ اس لیے جیسے ہی گرفت ڈھیلی ہوتی ہے پہلے کی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ نافرمان بن جاتے ہیں اور عذاب کو نہ عذاب سمجھتے ہیں نہ تنبیہ، بلکہ وہ عذاب کا کوئی سائنسی سبب اور نافرمانی پر جسے رہنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ لیتے ہیں۔ بعض اہل علم نے یہاں ”ذُنْ ذَلِكْ“ (قیامت سے پہلے) کے الفاظ میں دنیا کے عذابوں کے علاوہ موت کے فرشتوں کی مار کو اور عذاب قبر کو بھی شامل فرمایا ہے۔

آیت 48: ﴿۱﴾ وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ: یہاں ”لام“ ”غلی“ کے معنی میں ہو تو مطلب یہ ہے کہ اپنے رب کے حکم پر عمل کرنے میں صبر و استقامت اختیار کرو اور دعوت کا کام جاری رکھو، جیسے فرمایا: ﴿وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ﴾ [الزمر: ۱۰] ”اور اس پر صبر کر جو وہ کہتے ہیں۔“ اور اگر ”ہنی“ کے معنی میں ہو تو مطلب یہ ہے کہ ان ظالموں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فیصلہ آنے تک صبر کرو، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَاصْبِرْ حَتَّىٰ يَحْكُمَ اللَّهُ﴾ [ہونس: ۱۰۹] ”اور صبر کر یہاں تک کہ اللہ فیصلہ کر دے۔“ اس مقام پر حرف ”لام“ لانے سے ایسا جامع مفہوم پیدا ہو رہا ہے جو کوئی اور حرف لانے سے پیدا نہیں ہوتا۔ ”وَاصْبِرْ لِحُكْمِنَا“ (اور ہمارے حکم پر صبر کر) کے بجائے فرمایا: ﴿وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ﴾ (اور اپنے رب کے حکم پر صبر کر) مطلب یہ ہے کہ اس کے رب ہونے کا تقاضا ہے کہ وہ تیری نگہداشت اور حفاظت کرے۔

﴿۲﴾ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا: کیونکہ تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے، ہم ہر وقت تجھے دیکھ رہے ہیں اور تیری نگرانی اور حفاظت کر رہے ہیں، کسی کی مجال نہیں کہ تجھے نقصان پہنچا سکے۔ مزید دیکھیے سورۃ ہود (۳۷)۔

﴿۳﴾ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ: صبر کے ساتھ تسبیح و تحمید یعنی نماز کی تاکید فرمائی، کیونکہ ان دونوں کے ساتھ آدمی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد حاصل ہوتی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَأَسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ﴾ [البقرہ: ۱۵۰] ”اور صبر اور نماز کے ساتھ مدد طلب کرو۔“

﴿۴﴾ ”سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ“ کا لفظی معنی اگرچہ یہ ہے کہ ”اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کر“ مگر اس سے مراد نماز ہے۔ دلیل اور تفصیل کے لیے دیکھیے سورۃ طہ (۱۳۰) کی تفسیر۔

﴿۵﴾ حِينَ تَقُومُ: اکثر مفسرین نے ”سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ“ سے ”سبحان اللہ“ اور ”الحمد للہ“ کہنا مراد لیا ہے اور ”حِينَ تَقُومُ“ سے مراد بعض نے یہ لیا ہے کہ نیند کے بعد بستر سے اٹھتے وقت ”سُبْحَانَ اللَّهِ، الْحَمْدُ لِلَّهِ“ کہو۔ بعض نے اس سے مجلس

وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَإِدْبَارَ النُّجُومِ ﴿۳۹﴾

اور رات کے کچھ حصے میں پھر اس کی تسبیح کر اور ستاروں کے جانے کے بعد بھی ﴿۳۹﴾

سے اٹھتے وقت کفارہ مجلس کی دعا ”سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَ أُنُوبُ إِلَيْكَ“ مراد لی ہے اور بعض نے فرمایا کہ اس سے مراد نماز شروع کرتے وقت ”سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَبِحَمْدِكَ“ (دعائے استفتاح) ہے۔ بعض نے کہا کہ ہر خطاب کے لیے کھڑے ہوتے وقت تسبیح و تحمید کرنا مراد ہے۔ مگر اسی مفسرین نے اگلی آیت ”وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ“ میں تسبیح سے مراد نماز تہجد اور ”إِدْبَارَ النُّجُومِ“ سے مراد نماز فجر لی ہے۔ حق یہ ہے کہ ”سَبِّحْ“ کا جو معنی ”مِنَ اللَّيْلِ“ اور ”إِدْبَارَ النُّجُومِ“ کے ساتھ کیا گیا ہے وہی معنی ”حِينَ تَقُومُ“ کے ساتھ ہونا چاہیے۔ طبری نے یہاں پہلے دو قول ذکر فرمائے ہیں، ایک یہ کہ نیند سے اٹھ کر تسبیح و تحمید کرے، دوسرا یہ کہ جب فرض نماز کے لیے کھڑا ہو تو ”سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَبِحَمْدِكَ.....“ دعا پڑھے۔ پھر فرمایا: ”صواب کے سب سے زیادہ قریب ان کا قول ہے جو کہتے ہیں کہ ”سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ“ کا معنی ہے ”صَلِّ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِينَ تَقُومُ مِنْ مَنَامِكَ وَ ذَلِكَ نَوْمُ الْقَائِلَةِ، وَ إِنَّمَا عَنَى صَلَاةَ الظُّهْرِ“ یعنی اپنے رب کی حمد کے ساتھ نماز پڑھ جب تو اپنی نیند سے اٹھے۔ نیند سے مراد دوپہر کی نیند ہے اور نماز سے مراد ظہر کی نماز ہے۔“ فرماتے ہیں: ”ہم نے اس قول کو اس لیے ترجیح دی ہے کہ نماز شروع کرتے وقت ”سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ“ پڑھنا کسی کے نزدیک بھی فرض نہیں اور ہم نے دوپہر کی نیند سے اٹھنا اس لیے مراد لیا ہے کہ لوگوں کا معروف نیند سے اٹھنا یا تورات کی نیند کے بعد ہوتا ہے اور وہ نماز فجر کا وقت ہے یا دوپہر کی نیند کے بعد ہوتا ہے اور وہ نماز ظہر کا وقت ہے۔ تو جب ”سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِينَ تَقُومُ“ کے بعد ”إِدْبَارَ النُّجُومِ“ کے وقت تسبیح کا حکم دیا جو رات کی نیند سے اٹھ کر نماز فجر کی دو رکعتیں ہیں، تو معلوم ہوا کہ ”حِينَ تَقُومُ“ سے مراد وہ نماز ہے جو رات کی نیند سے اٹھنے کے علاوہ ہے اور وہ نماز ظہر ہے۔“ (طبری) بعض حضرات نے لکھا ہے کہ طبری نے اس قول کو ترجیح دی ہے کہ ”حِينَ تَقُومُ“ سے مراد نیند سے اٹھ کر تسبیح و تحمید ہے، لیکن اوپر کی تفصیل سے معلوم ہوا کہ طبری کی ترجیح یہ نہیں ہے۔

آیت 49 ﴿۱﴾ وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ: اس سے مراد مغرب اور عشاء ہے۔

﴿۲﴾ وَإِدْبَارَ النُّجُومِ: اس سے مراد فجر کی فرض نماز ہے۔ بعض حضرات نے اس سے مراد فجر کی نماز سے پہلے کی دو رکعتیں لی ہیں، مگر امام طبری فرماتے ہیں کہ یہاں ”فَسَبِّحْهُ“ امر کا صیغہ ہے جو فرض کے لیے ہے، اس لیے اس سے مراد فرض رکعتیں ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ ان آیات میں پانچوں نمازوں کا حکم ہے، اس طرح کہ ”حِينَ تَقُومُ“ میں ظہر و عصر کا، ”مِنَ اللَّيْلِ“ میں مغرب و عشاء کا اور ”إِدْبَارَ النُّجُومِ“ میں فجر کی نماز کا ذکر ہے۔ (داؤد اعلم)



وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ ۝۱ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ ۝۱

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

قسم ہے ستارے کی جب وہ گرے! ① کہ تمہارا ساتھی (رسول) نہ راہ بھولا ہے اور نہ غلط راستے پر چلا ہے ②

آیت 1 : ① وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ : ”النَّجْمِ“ ستارہ۔ ”الف لام“ تعریف کے لیے ہو تو مراد ”ثُمَّ“ ہے، کیونکہ عرب کے ہاں ”النَّجْمِ“ بول کر ”ثُمَّ“ مراد لینا معروف ہے اور اگر ”الف لام“ جنس کے لیے ہو تو ستاروں کی جنس مراد ہے، خواہ کوئی ہوں اور یہاں جنس مراد لینا زیادہ مناسب ہے۔ ”هَوَى يَهْوِي هَوِيًا“ (ض) کا معنی گرنا اور غروب ہونا بھی آتا ہے اور جڑھنا اور طلوع ہونا بھی اور ”هَوِي يَهْوِي هَوِيًا“ (س) کا معنی ہے محبت کرنا۔

② قرآن مجید کی قسمیں اپنے جواب قسم کی شہادت کے طور پر لائی جاتی ہیں اور قسم اور جواب قسم میں معنوی طور پر مناسبت ہوتی ہے۔ یہاں ”وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ“ میں مذکور قسم بعد کی آیت ”مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ“ کے دعویٰ کی شہادت کے طور پر لائی گئی ہے اور دونوں میں معنوی مناسبت ہے۔ مفسرین نے اس مناسبت کی تقریر کی طرح سے فرمائی ہے، ان میں سب سے واضح دو تقریریں یہاں درج کی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ ”النَّجْمِ“ سے مراد عام ستارے ہیں، یعنی جس طرح تمام ستارے اپنے اپنے مدار میں چلتے ہیں، اپنی مقررہ جگہ سے طلوع ہوتے اور مقررہ جگہ غروب ہوتے ہیں اسی طرح محمد ﷺ بھی اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے صراطِ مستقیم پر چل رہے ہیں، اس سے ذرہ برابر ادھر ادھر نہیں ہوتے، حتیٰ کہ وحی الہی کے بغیر بولتے بھی نہیں اور ستاروں کے احوال میں سے غروب کا وقت خاص طور پر ذکر کرنے کی مناسبت یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ عظیم مخلوق مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کے حکم کی پابند ہے۔ اپنی تمام تر وسعت، روشنی اور چمک کے باوجود اس کی مجال نہیں کہ غروب ہونے اور ڈوبنے سے انکار کر سکے۔ (واللہ اعلم) اس تقریر کی مزید تفصیل سورہ تکوین کی آیات (۱۹ تا ۱۵) : ﴿فَلَا أُقْسِمُ بِالنُّجُومِ .. إِنَّكَ لَتَقُونَ رَسُولَ كُنُوزٍ﴾ کی تفسیر میں ملاحظہ فرمائیں۔

دوسری تقریر یہ ہے کہ ستاروں سے مراد شہاب ثاقب ہیں اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر ﷺ کی طرف بھیجی جانے والی وحی کی حفاظت کا ایسا زبردست انتظام کر رکھا ہے کہ اگر کوئی شیطان آسمان کے نیچے جا کر اسے سننے کی کوشش کرتا ہے تو اس پر ہر طرف سے شہاب ثاقب پھینکے جاتے ہیں جو اسے جلا کر راکھ بنا دیتے ہیں۔ دیکھیے سورہ صافات (۱۰ تا ۶) اور سورہ جن (۹، ۸)۔ حفاظت کا یہ زبردست انتظام شاید ہے کہ رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے سیدھے راستے پر قائم ہیں اور ان پر نازل ہونے والی وحی الہی میں کسی قسم کی مداخلت یا کمی بیشی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ یہی بات سورہ واقعہ کی آیت (۷۵) : ﴿فَلَا أُقْسِمُ بِمَوْجِعِ النُّجُومِ﴾ میں بیان فرمائی گئی ہے۔

آیت 2 : ① مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ : ”ضلال“ (راہ بھولنے) سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص لاعلمی کی وجہ سے غلط

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۗ إِن هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۗ

اور نہ وہ اپنی خواہش سے بولتا ہے ﴿۳﴾ وہ تو صرف وحی ہے جو نازل کی جاتی ہے ﴿۴﴾

راستے پر چل پڑے یا اسے سیدھا سمجھ لے اور ”غواہت“ کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص جان بوجھ کر سیدھے راستے سے ہٹ جائے۔ اللہ تعالیٰ نے قسم اٹھا کر فرمایا کہ تمہارا ساتھی نہ لاعلمی میں غلط راستے پر چل رہا ہے اور نہ جان بوجھ کر سیدھے راستے سے ہٹا ہوا ہے۔ اتنی تاکید کے ساتھ نفی اس لیے فرمائی کہ مشرکین آپ کے متعلق یہ بات کہتے تھے۔

﴿۲﴾ ”صَاحِبُكُمْ“ (تمہارا ساتھی) کہہ کر رسول اللہ ﷺ کے صدق و امانت کی صفات کی طرف توجہ دلائی ہے، جو کفار کے ہاں بھی مسلم تھیں کہ نبوت سے پہلے چالیس سال اس نے تمہارے ساتھ اور تمہارے درمیان گزارے ہیں، اس کے شب و روز کے معمولات اور اخلاق و عادات تمہارے سامنے ہیں۔ جس شخص نے کبھی کسی آدمی پر جھوٹ نہیں بولا وہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ کیسے باندھ سکتا ہے؟ مزید دیکھیے سورہ یونس (۱۶)۔

آیت 3 ﴿۳﴾ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ : بھولنے یا جان بوجھ کر غلط راستے پر چلنے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ آدمی صحیح راستہ بتانے والے کے بجائے اپنے گمان یا خواہش نفس پر چل پڑتا ہے۔ مشرکین اور تمام گمراہ لوگوں کی گمراہی کا اصل باعث یہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے راستے کے بجائے گمان اور اپنی خواہش نفس پر چلتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْأَنْفُسُ ۚ وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مِنْ رَبِّهِمُ الْهُدَىٰ﴾ [النجم: ۲۳] ”یہ لوگ صرف گمان کے اور ان چیزوں کے پیچھے چل رہے ہیں جو ان کے دل چاہتے ہیں اور بلاشبہ یقیناً ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے ہدایت آچکی۔“ ہمارا رسول ضلالت و غواہت سے اس لیے محفوظ ہے کہ وہ صرف ہمارے بتائے ہوئے راستے پر چلتا ہے، اپنی خواہش اور مرضی سے کوئی کام نہیں کرتا، حتیٰ کہ اپنی خواہش سے بولتا بھی نہیں۔

آیت 4 ﴿۴﴾ ﴿۱﴾ إِن هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ : ”هُوَ“ سے مراد یا تو قرآن مجید اور دین ہے جس کے متعلق مشرکین کہتے تھے کہ آپ ﷺ نے اسے اپنے پاس سے بنا لیا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَيْنَاهُ ۚ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ﴾ [السجدة: ۳] ”یادہ کہتے ہیں کہ اس نے اسے خود گھڑ لیا ہے۔ بلکہ وہ تیرے رب کی طرف سے حق ہی ہے۔“ اس لیے قرآن اور دین کے متعلق فرمایا کہ وہ وحی کے سوا کچھ نہیں۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿فَأَنهَمْ لَا يَكْفُرُ بِتُوبَتِكَ وَلَكِنَّ الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ﴾ [الانعام: ۳۳] ”تو بلاشبہ وہ تجھے جھوٹا نہیں کہتے اور لیکن وہ ظالم اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں۔“ یا اس ”هُوَ“ سے مراد ”يَنْطِقُ“ کے ضمن میں پایا جانے والا ”منطوق بہ“ ہے، یعنی وہ بات جو وہ بولتا ہے وحی کے سوا کچھ نہیں، جو اس کی طرف کی جاتی ہے۔

یہاں ایک سوال ہے کہ کیا رسول اللہ ﷺ ہر بات وحی کے بعد ہی کرتے تھے؟ اگر ہاں کہا جائے تو ان متعدد باتوں کے متعلق کیا کہا جائے گا جن کی اللہ تعالیٰ نے اصلاح فرمائی؟ مثلاً فرمایا: ﴿عَفَا اللَّهُ عَنْكَ لِمَ أَذْنُتْ لَهُمْ﴾ [التوبة: ۴۳] ”اللہ نے تجھے معاف کر دیا، تو نے انہیں کیوں اجازت دی۔“ اور فرمایا: ﴿مَا كَانَ لِيُوعِيَ أَنْ يَكُونَ لَكَ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ

يُخَوِّنُ فِي الْأَرْضِ ﴿ [الأنفال: ۶۷] ”کبھی کسی نبی کے لائق نہیں کہ اس کے ہاں قیدی ہوں، یہاں تک کہ وہ زمین میں خوب خون بہا لے۔“ اور فرمایا: ﴿ مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلنَّاسِ كَيْفَ لَهُمْ أَنْ يَأْتِيَهَا النَّجِيُّ لِمَ تُعْذِرُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ ﴾ [التحریم: ۱] ”اے نبی! تو کیوں حرام کرتا ہے جو اللہ نے تیرے لیے حلال کیا ہے؟“ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو صحابہ جنابہ کے ساتھ مشورے کا حکم دیا، فرمایا: ﴿ وَشَاوَنَهُمْ فِي الْأَمْرِ ﴾ [آل عمران: ۱۵۹] ”اور کام میں ان سے مشورہ کر۔“ جب کہ وحی کے بعد نہ مشورے کی ضرورت ہے نہ اجازت کی۔ جواب اس سوال کا یہ ہے کہ یہاں ان باتوں کو وحی قرار دیا جا رہا ہے جو آپ ﷺ لوگوں کے سامنے قرآن مجید یا شریعت کے حکم کے طور پر بیان فرماتے تھے۔ مفسر ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا: ”إِنَّ هُوَ الْأَوْسَى يُؤْتِي“ ”أَيُّ إِنَّمَا يَقُولُ مَا أَمَرَ بِهِ، يُبَلِّغُهُ إِلَى النَّاسِ كَامِلًا مُؤَفَّرًا مِنْ غَيْرِ زِيَادَةٍ وَلَا نُقْصَانٍ“ ”یعنی ”إِنَّ هُوَ الْأَوْسَى يُؤْتِي“ کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ وہی بات کہتے تھے جس کے متعلق آپ ﷺ کو حکم دیا جاتا تھا کہ کسی کی یا زیادتی کے بغیر پوری پوری لوگوں تک پہنچادیں۔“

اس وحی میں قرآن مجید بھی شامل ہے اور حدیث بھی۔ عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ سے جو کچھ سنتا اسے حفظ کرنے کے ارادے سے لکھ لیتا تھا، تو قریش نے مجھے منع کیا اور کہا کہ تم رسول اللہ ﷺ سے جو بھی سنتے ہو لکھ لیتے ہو، حالانکہ رسول اللہ ﷺ ایک بشر ہیں، جو کبھی غصے میں بات کرتے ہیں اور کبھی خوشی میں، تو میں نے لکھنا ترک کر دیا۔ پھر میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس بات کا ذکر کیا تو آپ ﷺ نے اپنے دہن مبارک کی طرف اپنی انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: «أَكْتُبُ فَوَ الَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ! مَا يَخْرُجُ مِنْهُ إِلَّا حَقٌّ» [ابو داؤد، العلم، باب كتابة العلم: ۳۶۶۶، وقال الألباني صحيح] ”لکھو، کیونکہ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اس (منہ) سے حق کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔“ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «إِنِّي لَا أَقُولُ إِلَّا حَقًّا» ”میں حق کے سوا کچھ نہیں کہتا۔“ تو آپ کے کسی صحابی نے کہا: ”یا رسول اللہ! آپ تو ہم سے خوش طبعی بھی کر لیتے ہیں؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: «إِنِّي لَا أَقُولُ إِلَّا حَقًّا» ”بلاشبہ میں حق کے سوا کچھ نہیں کہتا۔“ [مسند أحمد: ۲/۳۴۰، ح: ۸۴۸۱] مسند احمد کے محقق نے فرمایا: ”إِسْنَادُهُ قَوِيٌّ“ کہ اس کی سند قوی ہے۔

② اس مقام پر مفسر عبدالرحمن کیلانی نے ”تیسیر القرآن“ میں رسول اللہ ﷺ کے اقوال و افعال کی حیثیت کے متعلق بہت مفید بحث لکھی ہے جس میں منکرین حدیث کے مغالطوں کا جواب بھی آ گیا ہے۔ فوائد کے پیش نظر وہ بحث یہاں درج کی جاتی ہے: ”ان آیات کے اولین مخاطب تو کفار مکہ ہیں، مگر یہ آیتیں چونکہ آپ ﷺ کے اقوال کو وحی اور واجب الاتباع قرار دیتی ہیں، لہذا منکرین حدیث ان کو مقید بھی کرتے ہیں اور ان کا مذاق بھی اڑاتے ہیں۔ مثلاً ایک صاحب نے یوں کہا کہ اگر رسول اللہ ﷺ اپنے گھر جا کر اپنی کسی زوجہ سے یہ کہتے ہیں کہ ”میرا جوتا لاؤ“ تو کیا یہ بھی وحی ہوتی تھی؟ اور اکثر منکرین اس

کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ کی طرف جو کچھ وحی کی جاتی رہی وہ سب قرآن میں آگئی ہے۔ اسی پر کفار کو اعتراض اور اسی پر آپ ﷺ سے ان کا ٹکرار اور جھگڑا رہتا تھا۔ اور آپ ﷺ کی قرآن کے علاوہ دوسری باتیں جو بحیثیت انسان کے ہیں، وہ قابلِ اتباع نہیں ہیں۔ اس طرح یہ حضرات چونکہ تمام ذخیرہ حدیث کو اور آپ ﷺ کی سنت کو دین سے خارج اور ناقابلِ اتباع بلکہ واضح الفاظ میں بے کار ثابت کرنا چاہتے ہیں، لہذا ہم اس پر ذرا تفصیل سے بات کریں گے۔ ان لوگوں کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ انھوں نے آپ ﷺ کی زندگی کے اقوال کو صرف دو حصوں میں تقسیم کر دیا، حالانکہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہونے کی حیثیت سے کتاب اللہ کے معلم، مفسر اور شارع بھی تھے اور آپ ﷺ نے قرآن کی جو تعلیم، تفسیر اور تشریح فرمائی وہ بھی دین ہی سے متعلق تھی۔ اس طرح آپ ﷺ کے اقوال دو کے بجائے تین حصوں میں تقسیم ہوئے۔ پھر آپ ﷺ صرف بولتے ہی نہ تھے، کچھ کرتے بھی تھے اور آپ ﷺ کے افعال بھی اسی طرح واجب الاتباع تھے جیسے اقوال۔ اس طرح تین کے بجائے اور بھی زیادہ حصے ہو گئے۔ مختصراً آپ ﷺ کی زندگی کے درج ذیل پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں جن سے معلوم ہو جائے گا کہ دین میں سنت کی کیا ضرورت اور کیا مقام ہے:

① تشریحی امور: قرآن میں نماز کا حکم تو بہت دفعہ آیا ہے مگر اس کی تفصیل کہیں بھی نہیں کہ اسے کیسے ادا کیا جائے، کتنی نمازیں ہوں، ان کے صحیح اوقات کیا ہیں، ہر نماز میں رکعات کی تعداد کتنی ہے اور اس کی ترکیب کیا ہے؟ اسی طرح حج کیسے ادا کیا جائے، زکوٰۃ کتنی وصول کی جائے؟ قضا یا فیصلہ کیونکر کیا جائے۔ ہر قضیہ کے لیے شہادتوں کا نصاب اور طریق کار کیا ہے، یا نکاح میں عورت کی رضامندی کا حق اور اس کی اہمیت، خلع کا حق، صلح و جنگ کے قواعد کی تفصیلات وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام امور ایسے ہیں کہ انسان سنت یا آپ ﷺ کے اقوال و افعال سے بے نیاز ہو کر انھیں بجالا ہی نہیں سکتا۔ گویا قرآن کو ماننے اور جاننے کا واحد ذریعہ آپ ﷺ کی سنت ہے۔ پھر یہ تمام مندرجہ امور ایسے ہیں جن میں آپ ﷺ نے صحابہ سے کبھی مشورہ نہیں کیا، حالانکہ آپ ﷺ کو مشورے کا تاکید حکم تھا، کیونکہ یہ امور انسانی بصیرت سے تعلق نہیں رکھتے۔ عام انسان تو کیا ایک نبی بھی ایسے امور کا فیصلہ کرنے کا مجاز نہیں۔ ایسے تمام امور آپ ﷺ کو بذریعہ وحی بتائے اور سکھائے جاتے تھے۔ خواہ یہ وحی بذریعہ القا ہو یا جبرئیل علیہ السلام کے بصورت انسان سامنے آ کر بتانے کی شکل میں ہو۔ گویا ایسے تمام امور بھی بذریعہ وحی ملے پاتے تھے جسے عرف عام میں ”وحی خفی“ کہا جاتا ہے اور یہ تو ظاہر ہے کہ ایسی تمام تفصیلات قرآن میں مذکور نہیں۔

② تدبیری امور: ایسے امور میں آپ ﷺ کو صحابہ سے مشورہ لینے کا حکم دیا گیا تھا، مثلاً جنگ کے لیے کون سا مقام مناسب رہے گا، قیدیوں سے کیا سلوک کیا جائے، نظام حکومت کیسے چلایا جائے؟ گویا یہ ایسے امور ہیں جن کا تعلق انسانی بصیرت سے بھی ہے اور تجربہ سے بھی۔ ایسے امور میں وحی کی ضرورت نہیں ہوتی، الا یہ کہ مشورہ کے بعد فیصلہ میں کوئی غلطی رہ جائے۔ ایسی صورت میں اس فیصلہ کی اصلاح بذریعہ وحی کر دی جاتی ہے، جیسے غزوہ بدر کے قیدیوں کے متعلق مشورہ کے بعد فیصلہ کے متعلق وحی قرآن میں نازل ہوئی۔

③ اجتہادی امور: اس سے مراد ایسے دینی امور ہیں جن میں کسی پیش آمدہ مسئلہ کا حل سابقہ وحی کی روشنی میں تلاش کیا

جائے۔ گو یہ معاملہ ہر ماہر علوم دین کی ذاتی بصیرت سے یکساں تعلق رکھتا ہے، تاہم آپ ﷺ اس کے سب سے زیادہ حق دار تھے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک عورت نے آپ ﷺ کے پاس آ کر مسئلہ پوچھا کہ میرے باپ پر حج فرض تھا اور وہ مر گیا ہے، کیا میں اب اس کی طرف سے حج کر سکتی ہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ”بھلا دیکھو! اگر اس کے ذمے قرض ہوتا تو تم اسے ادا نہ کرتی؟“ اس عورت نے کہا: ”مضرور کرتی۔“ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”تو پھر اللہ اس ادا انگلی کا زیادہ حق دار ہے۔“ [بخاری، جزء الصید، باب الحج والدور ... : ۱۸۵۲] آپ ﷺ کے ایسے اجتہادات اور استنباطات کی فہرست بھی طویل ہے، تاہم اس سلسلہ میں بھی جب کبھی کوئی لغزش ہوئی تو اس کی بذریعہ وحی جلی یا خفی اصلاح کر دی گئی۔

اس کی مثال وہ حدیث ہے جسے سیدنا ابوقادہ عجلتہ نے یوں روایت کیا کہ ایک آدمی نے پوچھا: ”یا رسول اللہ! بتائیے اگر میں اللہ کی راہ میں مارا جاؤں، درآن حالیکہ میں صبر کرنے والا، ثواب کی نیت رکھنے والا، آگے بڑھنے والا، پیٹھ نہ پھیرنے والا ہوں، تو کیا اللہ میرے سب گناہ معاف کر دے گا؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”ہاں!“ وہ شخص چلا گیا تو آپ ﷺ نے اسے پھر آواز دے کر بلایا اور فرمایا: ”مگر قرضہ معاف نہ ہوگا، جبریل نے ابھی مجھے اس طرح بتایا ہے۔“ [نسائی، الجہاد، باب من فانی فی سبیل اللہ تعالیٰ و علیہ دین : ۳۶۵۸ - مسلم : ۱۸۸۵] یعنی سائل کے سوال پر رسول اللہ ﷺ نے توجنت کی بشارت دے دی، کیونکہ شہادت ایسا افضل عمل ہے کہ خون کا پہلا قطرہ گرتے ہی شہید جنت کا حق دار بن جاتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اسی وقت وحی بھیج کر اس میں ترمیم فرمادی۔

⑤ طبعی امور: جس میں انسان کی روزمرہ کی بول چال، خوراک، پوشاک اور دوسرے معاملات آجاتے ہیں اور ان امور کا تعلق تمام لوگوں سے یکساں ہے۔ ایسے امور میں انسان اور ایسے ہی آپ ﷺ بھی نسبتاً وحی سے آزاد تھے، لیکن وہ کون سا پہلو ہے جس میں وحی نے ایسے معاملات پر پابندی نہ لگائی ہو؟ مثلاً انسان اس بات میں تو آزاد ہے کہ وہ چاہے تو گوشت کھائے، چاہے تو سبزی کھائے اور چاہے تو دال کھائے، لیکن وہ حلال اور پاکیزہ چیزیں ہی کھا سکتا ہے۔ پھر اسے یہ بھی ہدایت ہے کہ کھانے سے پہلے ”بسم اللہ“ پڑھے، اپنے دائیں ہاتھ سے کھائے، اپنے آگے سے کھائے، برتن کو صاف کرے اور بعد میں دُعا پڑھے۔ اسی طرح وہ اپنے لباس کے انتخاب کی حد تک تو آزاد ہے لیکن لباس کا ساثر ہونا اور ستر ڈھانکنا ضروری ہے اور عورتوں کے لیے پردہ بھی۔ عورت مردوں جیسا لباس نہ پہنے، نہ مرد عورتوں جیسا لباس پہنیں۔ وہ اپنے اہل خانہ سے گفتگو میں آزاد ہے لیکن اپنی بیوی سے حسن سلوک اور حسن معاشرت کا پابند ہے۔ وہ اپنا کاروبار اختیار کرنے میں آزاد ہے لیکن حرام کاروبار نہیں کر سکتا، نہ جائز کاروبار میں ناجائز طریقوں سے مال کما سکتا ہے۔ ماپ تول میں کمی بیشی نہیں کر سکتا۔ کسی دوسرے سے فریب سے مال نہیں بنور سکتا۔ نہ ہی سود اور اس کے مختلف طریقوں سے مال اکٹھا کر سکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ آخر وہ کون سا پہلو ہے جس میں وہ وحی سے بے نیاز ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہوتا ہے کہ تشریحی امور کا انحصار کلیتاً وحی پر ہے اور قرآن میں احکام چونکہ مجملاً مذکور ہوئے ہیں اور ان کا تعلق انسانی بصیرت سے بھی نہیں، لہذا یہ احکام سنت کے بغیر انجام پائی نہیں سکتے۔ باقی تینوں قسم کے امور میں انسان نسبتاً

عَلَيْكَ شَدِيدُ الْقُوَى ۝ ذُو مِرَّةٍ ۝ فَاسْتَوَى ۝ وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلَى ۝ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلَّى ۝
فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَى ۝

اسے نہایت مضبوط قوتوں والے (فرشتے) نے سکھایا ۝ جو بڑی طاقت والا ہے، سو وہ بلند ہوا ۝ اس حال میں کہ وہ آسمان کے مشرقی کنارے پر تھا ۝ پھر وہ نزدیک ہوا، پس اتر آیا ۝ پھر وہ دو کمانوں کے فاصلے پر ہو گیا، بلکہ زیادہ قریب ۝ آزاد ہے مگر ان تینوں پہلوؤں پر بھی وحی نے پابندیاں لگائی ہیں اور ہدایات بھی دی ہیں جن میں اکثر کا ذکر قرآن میں نہیں، تو پھر آخر سنت نبوی سے انکار کیسے ممکن ہے اور کیسے کہا جاسکتا ہے کہ ”وَمَا يَنْطَلِقُ“ کا تعلق صرف قرآن ہی سے ہے؟ اور اس نظریے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو شخص سنت کا منکر ہو وہ قرآن کا بھی منکر ہوتا ہے۔“ (تیسیر القرآن)

آیت 5 عَلَيْكَ شَدِيدُ الْقُوَى: بعض لوگ اس سے مراد اللہ تعالیٰ لیتے ہیں مگر یہ درست نہیں، بلکہ اس سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں جنہوں نے آپ ﷺ تک اللہ تعالیٰ کی وحی پہنچائی۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ دوسری جگہ واضح طور پر یہ صفت جبریل علیہ السلام کی بیان ہوئی ہے، فرمایا: ﴿إِنَّكَ لَقَوْلٌ رَسُولٌ كَرِيمٌ ۝ ذِي قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ ۝ مُطَاعٍ ثَمَّ أَمِينٍ﴾ [النکویر: ۱۹ تا ۲۱] ”بلاشبہ یقیناً یہ ایک ایسے پیغام پہنچانے والے کا قول ہے جو بہت معزز ہے۔ بڑی قوت والا ہے، عرش والے کے ہاں بہت مرتبے والا ہے۔ وہاں اس کی بات مانی جاتی ہے، نہایت امانت دار ہے۔“ ”الْقُوَى“ ”قُوَّة“ کی جمع ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جبریل علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ایک نہیں بہت سی قوتیں عطا فرمائی ہیں اور ہر قوت ہی نہایت مضبوط اور زبردست ہے، بھلا جسے اللہ تعالیٰ نہایت مضبوط قوتوں والا فرمائے اس کی قوتوں کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ سید ولد آدم ﷺ نے انہیں ان کی اصل صورت میں صرف دو دفعہ دیکھا اور اس دیکھنے سے جو کیفیت آپ ﷺ پر گزری اس سے ان کی عظمت و ہیبت، حسن و جمال اور قوت و وسعت کا تھوڑا سا اندازہ ہوتا ہے۔ پھر ہزاروں سالوں کے فاصلے لمحوں میں طے کرنے سے ان کی رفتار کی سرعت و قوت کا معمولی اندازہ ہوتا ہے۔

آیت 6: 9 ① ذُو مِرَّةٍ: طاقت، توانائی اور مضبوطی والا۔ ”مِرَّة“ کا لفظ اصل میں رسی کو بٹنے اور بل دے کر مضبوط کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ اس پر تینوں تعظیم کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ ”بڑی طاقت والا“ کیا گیا ہے۔ اس طاقت میں عملی اور علمی دونوں طاقتیں شامل ہیں۔ ”شَدِيدُ الْقُوَى“ کے بعد ”ذُو مِرَّةٍ“ کے ساتھ ان کی طاقت اور توانائی کو مزید اُجاگر فرمایا ہے۔ بعض مفسرین نے ”شَدِيدُ الْقُوَى“ سے عملی قوتیں اور ”ذُو مِرَّةٍ“ سے علمی اور عقلی قوتیں مراد لی ہیں، مگر دونوں لفظ ہر قسم کی قوتوں پر استعمال ہوتے ہیں، اس لیے تاکید مراد لینا راجح معلوم ہوتا ہے۔

② ”فَاسْتَوَى“ برابر ہوا، بلند ہوا۔ ”أَفُق“ دور سے نظر آنے والی وہ جگہ جہاں زمین و آسمان ملتے ہوئے نظر آتے ہیں اور آسمان نیلے گنبد کی طرح بلند ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ”أَفُقِ الْعَالِي“ مشرقی کنارہ، جہاں سے سورج طلوع کے وقت بلند ہوتا ہے۔ اسی کو دوسری جگہ ”الْأَفُقُ الْمُبِينُ“ فرمایا، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَلَقَدْ رَآهُ بِالْأَفُقِ الْمُبِينِ﴾ [النکویر: ۲۳] ”اور

بلاشبہ یقیناً اس نے اس (جبریل) کو (آسمان کے) روشن کنارے پر دیکھا ہے۔“

③ **فَتَدَلِّي**: یہ ”دَلْو“ سے مشتق ہے، سورہ یوسف میں ہے: ﴿فَأَذَلِّي دَلْوًا﴾ [یوسف: ۱۹] ”تو اس نے اپنا ڈول لٹکایا۔“ ”تَدَلِّي“ لٹک آیا، یعنی فضا میں رہتے ہوئے کچھ نیچے آ گیا۔ ”قَاب“ مقدار۔ ”أَوْ أَدْنَى“ یا زیادہ قریب۔ یعنی اگر آدمی اس فاصلے کو دیکھے تو اسے یہ دو کمانون کے برابر یا اس سے بھی کم نظر آئے۔ بعض اہل علم نے فرمایا، یہاں ”أَوْ“ ”بَل“ کے معنی میں ہے، یعنی دو کمانون کے برابر بلکہ اس سے بھی کم، جیسا کہ یونس عليه السلام کے متعلق فرمایا: ﴿وَأَرْسَلْنَاهُ إِلَى مِائَةِ أَلْفٍ أَوْ يَزِيدُونَ﴾ [الصافات: ۱۴۷] ”اور ہم نے اسے ایک لاکھ کی طرف بھیجا، بلکہ وہ زیادہ ہوں گے۔“

④ رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی میں جبریل عليه السلام کو دو بار ان کی اصل صورت میں دیکھا ہے۔ ان آیات میں پہلی بار دیکھنے کا ذکر ہے، جبریل عليه السلام آسمان کے مشرقی کنارے پر نمودار ہوئے، تو زمین و آسمان کا درمیانی فاصلہ ان سے بڑھ گیا، جیسا کہ جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ (پہلی وحی کے بعد) وحی کے وقفے کے متعلق بیان فرما رہے تھے: ﴿فَبَيْنَا أَنَا مُشْبِي إِذْ سَمِعْتُ صَوْتًا مِّنَ السَّمَاءِ فَرَفَعْتُ بَصَرِي قِبَلَ السَّمَاءِ فَإِذَا الْمَلَكُ الَّذِي جَاءَ نَبِي بَجْرَاهُ قَاعِدٌ عَلَى كُرْسِيِّ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ فَجِئْتُ مِنْهُ حَتَّى هَوَيْتُ إِلَى الْأَرْضِ فَجِئْتُ أَهْلِي فَقُلْتُ زَمَلُونِي زَمَلُونِي فَمَلُونِي، فَأَنْزَلَ اللَّهُ تَعَالَى: ﴿يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنْذِرْ﴾ إِلَى ﴿فَاهْجُرْ﴾ ثُمَّ حَمِي الْوُحْيِي وَتَنَابَعِ﴾ [بخاری، التفسیر، سورہ المدثر، باب: ﴿والرجز فاهجر﴾: ۴۹۲۶] ”ایک دفعہ میں چلا جا رہا تھا، اچانک میں نے آسمان سے ایک آواز سنی تو میں نے اپنی نگاہ آسمان کی طرف اٹھائی تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہی فرشتہ جو میرے پاس حرام میں آیا تھا وہ آسمان زمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہے، تو میں اس سے ڈر گیا، یہاں تک کہ میں زمین پر گر گیا، پھر میں اپنے گھر والوں کے پاس آیا اور کہا، مجھے چادر اوڑھا دو، مجھے چادر اوڑھا دو، تو انھوں نے مجھے چادر اوڑھا دی۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں: ﴿يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنْذِرْ وَرَبِّكَ فَكْثِرْ وَشِيبَاكَ فَطَهِّرْ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ﴾ پھر وحی گرما گرم ہو گئی اور پے در پے آنے لگی۔“

رسول اللہ ﷺ کے جبریل عليه السلام کو ان کی اصل صورت میں دیکھنے کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے: ﴿حَدَّثَنَا الشَّيْبَانِيُّ قَالَ سَمِعْتُ زُرَّارًا عَنْ عَبْدِ اللَّهِ ﴿فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَى﴾ فَأَوْحَى إِلَى عَبْدِهِ مَا أَوْحَى﴾ قَالَ حَدَّثَنَا ابْنُ مَسْعُودٍ أَنَّهُ رَأَى جِبْرِيلَ لَهُ سِتُّ مِائَةِ حَنَاحٍ﴾ [بخاری، التفسیر، سورہ النجم، باب: ﴿فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَى﴾: ۴۸۵۶] ”زر (بن حبیش) نے عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے ﴿فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَى﴾ فَأَوْحَى إِلَى عَبْدِهِ مَا أَوْحَى﴾ کی تفسیر روایت کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ آپ ﷺ نے جبریل کو دیکھا، ان کے چھ سو پر تھے۔“ ان آیات کا مقصد کفار کے اس الزام کی تردید ہے جو وہ رسول اللہ ﷺ پر لگاتے تھے کہ کوئی عجمی آدمی اسے قرآن کی باتیں سکھا جاتا ہے اور یہ ہمیں سنا کر کہتا ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہیں۔ اس کے جواب میں فرمایا گیا کہ کسی عجمی

فَأَوْحَىٰ إِلَىٰ عَبْدِهِ مَا أَوْحَىٰ ۖ مَا كَذَّبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَىٰ ۗ ﴿۱۱﴾

پھر اس نے وحی کی اس (اللہ) کے بندے کی طرف جو وحی کی ﴿۱۱﴾ دل نے جھوٹ نہیں بولا جو اس نے دیکھا ﴿۱۱﴾

شخص نے نہیں، بلکہ ایک نہایت مضبوط قوتوں اور بڑی طاقت والے فرشتے نے اسے اس قرآن کی تعلیم دی ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ وہ شدید القوی فرشتہ مشرقی افق پر بلند ہوا، اس وقت وہ آسمان وزمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا، پھر وہ فضا ہی میں نیچے اترتا ہوا رسول اللہ ﷺ کے اتنا قریب ہوا کہ آپ سے دو کمانوں سے بھی کم فاصلے پر آ گیا۔

آیت 10 ﴿۱۰﴾ فَأَوْحَىٰ إِلَىٰ عَبْدِهِ مَا أَوْحَىٰ: ”فَأَوْحَىٰ“ (پھر اس نے وحی کی) کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف بھی جاسکتی ہے، اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ پھر اللہ تعالیٰ نے (جبریل علیہ السلام کے واسطے سے) اپنے بندے کی طرف وحی کی اور ”فَأَوْحَىٰ“ کی ضمیر جبریل علیہ السلام کی طرف بھی جاسکتی ہے، مگر اس صورت میں ”عَبْدِهِ“ میں ضمیر غائب سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہوگی، کیونکہ ”عَبْدِهِ“ سے مراد ”اللہ کے بندے“ کے سوا کوئی ہو ہی نہیں سکتا، کیونکہ آپ ﷺ ہی نہیں آسمان وزمین کا ہر شخص اللہ کا بندہ ہے، جبریل یا کسی اور کا کوئی بندہ نہیں۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ ”پھر جبریل نے اس اللہ کے بندے کی طرف وحی کی۔“

آیت 11 ﴿۱۱﴾ ”مَا أَوْحَىٰ“ (جو وحی کی) کو مبہم رکھ کر اس کی عظمتِ شان کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ مزید دیکھیے سورہ طٰ کی آیت (۷۸): ﴿فَغَشِيَهُمْ مِنْ اللَّيْلِ مَا عَاشَيْهِمْ﴾ کی تفسیر۔ اس سے پچھلی آیات کے آخری فائدہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وحی میں ”يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ“ سے ”وَالرُّجُزَ قَاهُ جُزْ“ تک آیات بھی تھیں۔

آیت 11 ﴿۱۱﴾ مَا كَذَّبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَىٰ: ”كَذَّبَ“ کو سب سے قراءت میں دو طرح پڑھا گیا ہے۔ چنانچہ ابن عامر نے اسے ذال کی تشدید کے ساتھ ”كَذَّبَ“ پڑھا ہے، جھٹلایا۔ اس وقت معنی ہوگا کہ نبی ﷺ نے آنکھوں سے جو کچھ دیکھا دل نے اسے نہیں جھٹلایا، بلکہ اس کی تصدیق کی۔ دوسرے قراء نے ”ذال“ کو تشدید کے بغیر ”كَذَّبَ“ پڑھا ہے، جھوٹ کہا۔ یعنی دل نے جبریل علیہ السلام کو دیکھا تو جھوٹ نہیں کہا، بلکہ سچ کہا کہ اس نے جبریل کو دیکھا ہے، جیسے آنکھوں نے دیکھا تو جھوٹ نہیں کہا۔ جبریل علیہ السلام کو دیکھنے میں آنکھیں اور دل دونوں شریک تھے۔ شیخ عبدالرحمن السعدی ”تیسیر الرحمن“ میں لکھتے ہیں: ”أَيُّ اتَّفَقَ فُؤَادُ الرَّسُولِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَرُؤْيَتْهُ عَلَى الْوَحْيِ الَّذِي أَوْحَاهُ اللَّهُ إِلَيْهِ وَتَوَاطَأَ عَلَيْهِ سَمْعُهُ وَقَلْبُهُ وَبَصَرُهُ“ ”یعنی رسول اللہ ﷺ کے دل اور آپ کی رویت نے اس وحی پر اتفاق کیا جو اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف کی اور اس پر آپ کے کان، آنکھیں اور دل متفق ہو گئے۔“ سید امیر علی بلخ آبادی ”مواہب الرحمن“ میں اس جملے کی تفسیر کے آخر میں لکھتے ہیں: ”بالجملہ آں حضرت ﷺ نے جو دیکھا اس میں فواد اور آنکھ دونوں متفق و صادق ہیں۔“ بعض مفسرین نے ”كَذَّبَ“ (تشدید کے بغیر) کا معنی ”جھٹلایا“ کیا ہے، جبکہ یہ ”كَذَّبَ“ (تشدید ذال کے ساتھ) کا معنی ہے، ”كَذَّبَ“ (بلا تشدید) کا نہیں۔

اَفْتَرُونَهُ عَلَى مَا يَرَى ۝۱۲ وَ لَقَدْ رَأَاهُ نَزْلَةً اٰخَرٰی ۝۱۳

پھر کیا تم اس سے جھگڑتے ہو اس پر جو وہ دیکھتا ہے ۱۲ حالانکہ بلاشبہ یقیناً اس نے اسے ایک اور بار اترتے ہوئے بھی دیکھا ہے ۱۳

② جو کچھ آنکھ نے دیکھا وہ یہ تھا کہ اس نے جبریل علیہ السلام کو ان کی اصل صورت میں دیکھا، دن کی روشنی میں دیکھا تاریکی میں نہیں دیکھا، جاگتے ہوئے دیکھا نیند یا نیم خوابی یا اونگھ کی حالت میں نہیں دیکھا، دل نے بھی دیکھنے میں آنکھوں کی موافقت کی اور کہہ دیا کہ واقعی آپ ﷺ نے اس جبریل فرشتے ہی کو دیکھا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی لاتا ہے اور مسئلے میں کوئی شک و شبہ نہ رہا۔

آیت 12 ① اَفْتَرُونَهُ: "تَمَارُونَ" "مَارِي يُمَارِي مِرَاةً وَ مُمَارَاةً" (مفاعلہ) سے فعل مضارع معلوم جمع مذکر حاضر ہے، جھگڑا کرنا۔ یہ مشرکین مکہ سے خطاب ہے، جب رسول اللہ ﷺ نے انھیں بتایا کہ میرے پاس کوئی شیطان نہیں بلکہ جبریل فرشتہ آتا ہے اور میں اسے دیکھتا ہوں، اس کی اصل صورت میں بھی میں نے اسے دیکھا ہے تو انھوں نے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا اور جھگڑنے لگے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم اپنے صاحب کو خود صادق و امین تسلیم کرتے ہو، جب وہ تم سے کہتا ہے کہ اس کے پاس جبریل فرشتہ آتا ہے اور وہ اسے اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے تو تم اس سے جھگڑنے لگتے ہو، آخر تمہارے پاس اسے جھٹلانے اور اس پر جھگڑا کرنے کی کیا دلیل ہے؟

إِذَا لَمْ تَرَ الْهَيْلَالَ فَسَلِّمْ لِلْإِنْسَانِ رَأُوهُ بِالْأَبْصَارِ

”جب تمہیں چاند نظر نہیں آیا تو ان لوگوں کی بات مان لو جنہوں نے اسے آنکھوں سے دیکھا ہے۔“

② عَلَى مَا يَرَى: واضح رہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ ”اَفْتَرُونَهُ عَلَى مَا رَأَى“ ”پھر کیا تم اس سے اس پر جھگڑتے ہو جو اس نے دیکھا“ بلکہ فرمایا: ﴿اَفْتَرُونَهُ عَلَى مَا يَرَى﴾ ”پھر کیا تم اس سے جھگڑتے ہو اس پر جو وہ دیکھتا ہے“ اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی جس بات کو وہ جھٹلاتے تھے وہ یہ تھی کہ میں جبریل فرشتے کو دیکھتا ہوں جب وہ میرے پاس آتا ہے اور حقیقت بھی یہی تھی کہ پہلی دفعہ جب جبریل علیہ السلام عار حرا میں آپ ﷺ کے پاس آئے تو اگرچہ اصل صورت میں نہ تھے، مگر بعد میں جب وہ اپنی اصل صورت میں اس شان سے سامنے آئے کہ زمین سے آسمان تک اور دائیں سے بائیں تک پورا اُفق ان سے بھرا ہوا تھا تو آپ ﷺ فوراً پہچان گئے کہ یہ وہی فرشتہ ہے جو عار حرا میں میرے پاس آیا تھا۔ دیکھیے اسی سورت کی آیت (۹۲۶) کے آخری فائدہ میں مذکور حدیث۔ اس سے ظاہر ہے کہ جبریل علیہ السلام کے آنے پر آپ ﷺ انھیں پہچان لیتے تھے، خواہ کسی حالت میں آئیں۔

آیت 13 ① وَ لَقَدْ رَأَاهُ نَزْلَةً اٰخَرٰی: ”لام“ اور ”قَدْ“ کے ساتھ تاکید قسم کے مفہوم کا فائدہ دیتی ہے۔ مشرکین کے انکار کی وجہ سے اتنی تاکید کے ساتھ بات کی ہے۔ یعنی تم زمین پر اس کے جبریل علیہ السلام کو دیکھنے کا انکار کرتے ہو، قسم ہے کہ اس

عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهَى ﴿۱۴﴾ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَأْوَى ﴿۱۵﴾

آخری حد کی پیری کے پاس ﴿۱۴﴾ اسی کے پاس ہمیشہ رہنے کی جنت ہے ﴿۱۵﴾

نے تو اسے ایک اور بار آسمانوں کے اوپر بھی اس کی اصل صورت میں اُترتے ہوئے دیکھا ہے۔

آیت 14 عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهَى: ”سِدْرَةَ“ پیری کا درخت۔ ”الْمُنْتَهَى“ ”إِنْتَهَى يَنْتَهِي أَنْتَهَاءً“ (انتقال) سے ظرف مکان ہے، انتہا کی جگہ۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس نام کی وجہ بیان فرمائی ہے، انھوں نے فرمایا: «لَمَّا أُسْرِيَ بِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْتَهَى بِهِ إِلَى سِدْرَةِ الْمُنْتَهَى وَهِيَ فِي السَّمَاءِ السَّادِسَةِ، إِلَيْهَا يَنْتَهِي مَا يُعْرَجُ بِهِ مِنَ الْأَرْضِ فَيُقْبَضُ مِنْهَا وَإِلَيْهَا يَنْتَهِي مَا يَهْبِطُ بِهِ مِنْ فَوْقِهَا فَيُقْبَضُ مِنْهَا» [مسلم، الإيمان، باب فی ذکر سدرۃ المنتہی: ۱۷۳] ”جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رات (معراج کے لیے) لے جایا گیا تو آپ کو سدرۃ المنتہی تک پہنچایا گیا اور وہ چھٹے آسمان میں ہے۔ زمین سے اوپر جو کچھ چڑھتا ہے اس کی انتہا وہاں تک ہوتی ہے، پھر اسے وہاں سے لے لیا جاتا ہے اور اس کے اوپر سے جو کچھ اترتا ہے اس کی انتہا بھی وہیں تک ہوتی ہے، پھر اسے وہاں سے لے لیا جاتا ہے۔“ مسلم کی شرح میں نووی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ صحیح مسلم کے تمام نسخوں میں اسی طرح چھٹے آسمان ہی کا ذکر ہے، جب کہ انس رضی اللہ عنہ سے مروی دوسری روایات میں گزر چکا ہے کہ وہ ساتویں آسمان کے اوپر ہے۔ قاضی (عیاض) نے فرمایا، اس کا ساتویں آسمان پر ہونا ہی زیادہ صحیح اور اکثر کا قول ہے۔ یہی سدرۃ المنتہی کے معنی اور نام کا تقاضا ہے کہ وہ ساتویں آسمان پر ہو۔ نووی فرماتے ہیں کہ دونوں اقوال کو جمع کرنا ممکن ہے کہ اس کی جڑ چھٹے آسمان میں ہے اور زیادہ تر حصہ ساتویں آسمان میں ہے، کیونکہ سب جانتے ہیں کہ وہ بہت بڑی ہے۔

اس آیت سے جبریل علیہ السلام کو دیکھنے کا وقت اور مقام بھی معلوم ہو گیا، کیونکہ سدرۃ المنتہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کی رات دیکھی ہے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آسمانوں کی سیر کروائی گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «ثُمَّ رُفِعَتْ إِلَيَّ سِدْرَةُ الْمُنْتَهَى فَإِذَا نَبَقَهَا مِثْلُ قِلَابٍ هَجْرٍ، وَإِذَا وَرَقُهَا مِثْلُ آذَانِ الْفَيْلَةِ قَالَ هَذِهِ سِدْرَةُ الْمُنْتَهَى» [بخاری، المناقب، باب المعراج: ۳۸۸۷، عن مالک بن صعصعة رضی اللہ عنہ] ”پھر سدرۃ المنتہی میرے سامنے ظاہر ہوئی، دیکھا تو اس کے پیر (پھل) بجر شہر کے منگولوں کی طرح اور اس کے پتے ہاتھیوں کے کانوں کی طرح تھے۔“

آیت 15 عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَأْوَى: ”الْمَأْوَى“ ”أَوْي يَأْوِي أَوْيًا“ (ض) ”الْبَيْتِ وَ إِلَى الْبَيْتِ“ سے مصدر می ہے، گھر میں قیام کرنا، رہائش رکھنا۔ یعنی وہ جنت جو متقی لوگوں کے قیام اور ہمیشہ رہنے کی جگہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ جنت جس میں ایمان والوں کا دائمی قیام ہوگا آسمانوں کے اوپر سدرۃ المنتہی کے پاس ہے۔ ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سدرۃ المنتہی کے بعد جنت میں لے جایا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «حَتَّى أَنْتَهَى بِنِي إِلَيَّ سِدْرَةَ الْمُنْتَهَى، وَغَشِيَهَا الْوَأْنُ لَا أُدْرِي مَا هِيَ، ثُمَّ أُدْخِلْتُ الْجَنَّةَ، فَإِذَا فِيهَا حَبَابِلُ اللَّوْلُؤِ، وَإِذَا تَرَأَيْتُهَا

إِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشَى ﴿۱۶﴾ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَى ﴿۱۷﴾

جب اس میری کو ڈھانپ رہا تھا جو ڈھانپ رہا تھا ﴿۱۶﴾ نہ نگاہ ادھر ادھر ہوئی اور نہ حد سے آگے بڑھی ﴿۱۷﴾

المُسْتَكُ) [بخاری، الصلاة، باب كيف فرضت الصلاة في الإسراء: ۳۴۹] ”پھر مجھے سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچایا گیا اور اسے ایسے رنگوں نے ڈھانپا ہوا تھا کہ میں نہیں جانتا وہ کیا تھے۔ پھر مجھے جنت میں داخل کیا گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اس میں موتیوں کی لڑیاں ہیں اور اس کی مٹی کتوری ہے۔“

آیت 16 ﴿إِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشَى﴾: سدرۃ المنتہیٰ کے مشاہدے کے وقت اس پر انوار کی بارش، فرشتوں کے جہوم اور اس کے جلال و جمال کے منظر کی نقش کشی کے لیے انسان کے استعمال میں آنے والی زبانوں کی تنگ دامانی کی طرف اشارہ ہے۔ (دیکھیے طہ: ۷۸) حدیث میں اس کے متعلق چند اشارے آئے ہیں، ان میں سے ایک کا ذکر پچھلی آیت کی تفسیر میں گزر چکا ہے: ﴿وَعَشِيهَا الْوَأَن لَّا أُدْرِي مَا هِيَ﴾ [دیکھیے بخاری: ۳۴۹] ”اور اسے ایسے رنگوں نے ڈھانپا ہوا تھا کہ میں نہیں جانتا کہ وہ کیا تھے۔“ انس رضی اللہ عنہ نے حدیث معراج میں سدرۃ المنتہیٰ کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے یہ الفاظ بیان فرمائے: ﴿فَلَمَّا غَشِيهَا مِنْ أَمْرِ اللَّهِ مَا غَشِيَتْ تَغْيِيرَتْ فَمَا أَحَدٌ مِّنْ خَلْقِ اللَّهِ يَسْتَطِيعُ أَنْ يَتَّعْتَهَا مِنْ حُسْنِهَا فَأَوْحَى اللَّهُ إِلَيَّ مَا أَوْحَى﴾ [مسلم، الإيمان، باب الإسراء برسول اللہ ﷺ: ۱۶۲] ”پھر جب اس کو اللہ کے حکم سے ڈھانکا جس چیز نے ڈھانکا تو اس کی حالت بدل گئی، پھر اس کا یہ حال تھا کہ اللہ کی مخلوق میں سے کوئی اس کی خوب صورتی بیان نہیں کر سکتا، اس وقت اس نے میری طرف وحی کی جو وحی کی۔“ اور عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ﴿إِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشَى﴾ قَالَ فَرَأَيْتَ مِنْ دَهَبٍ﴾ [مسلم، الإيمان، باب في ذكر سدرۃ المنتہیٰ: ۱۷۳] ”سدرۃ المنتہیٰ کو ڈھانک رہا تھا جو ڈھانک رہا تھا“ سے مراد سونے کے پروانے ہیں۔“ اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے جبریل علیہ السلام کو، جو آپ ﷺ کو ساتھ لے کر گئے تھے، ان کی اصل صورت میں ایک بار پھر دیکھا۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے آیت: ﴿وَلَقَدْ رَأَاهُ نَزَّلَةً أُخْرَىٰ ۖ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهَىٰ﴾ کی تفسیر کرتے ہوئے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿رَأَيْتُ جِبْرِيْلَ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ سِتُّ مِائَةِ خَنَاحٍ، يَنْتَبِهُ مِنْ رَيْبِهِ التَّهَاقُوتِ وَالْيَأْقُوتِ﴾ [مسند احمد: ۴۶۰/۱، ح: ۴۳۹۰] ”میں نے جبریل علیہ السلام کو دیکھا، اس کے چھ سو بازو تھے اور اس کے پروں سے حیران کن رنگا رنگ موتی اور یاقوت جہر رہے تھے۔“ مسند کے تحقق نے فرمایا: ”إِسْنَادُهُ حَسَنٌ“ کہ اس کی سند حسن ہے، اور ابن کثیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”هَذَا إِسْنَادٌ حَيِّدٌ قَوِيٌّ“ کہ اس کی سند جید قوی ہے۔

آیت 17 ﴿مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَى﴾: ”زَاغٌ يَزِيغُ زَيْغًا“ میڑھا ہونا اور ”طَغَى يَطْغَى طُغْيَانًا“ حد سے بڑھنا۔ اس میں رسول اللہ ﷺ کے کمال ادب، تحمل اور استقامت کا بیان ہے کہ جبریل علیہ السلام کو اور اللہ تعالیٰ کی دوسری آیات کبریٰ کو دیکھتے ہوئے آپ کی نگاہ انہی پر مرکوز رہی، نہ دائیں یا بائیں طرف گئی اور نہ ان سے آگے بڑھی۔

لَقَدْ رَأَىٰ مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرَىٰ ﴿١٨﴾

بلاشبہ یقیناً اس نے اپنے رب کی بعض بہت بڑی نشانیاں دیکھیں ﴿۱۸﴾

آیت 18 ﴿۱﴾ لَقَدْ رَأَىٰ مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرَىٰ: ”من“ جمعیت کے لیے ہے، یعنی قسم ہے کہ آپ ﷺ نے اس موقع پر اپنے رب کی بعض بہت بڑی نشانیاں دیکھیں۔ ان بہت بڑی نشانیوں میں سب سے پہلی نشانی تو جبریل علیہ السلام ہیں، جنھیں دو دفعہ دیکھنے کے ذکر کے لیے یہ آیات نازل ہوئیں، اس کے علاوہ احادیث معراج میں اور بہت سی نشانیوں کا ذکر ہے جنھیں آپ ﷺ نے اس موقع پر دیکھا۔ ان میں براق، ساتوں آسمانوں کے عجائبات اور ان پر انبیائے کرام کی ملاقات، دجال، سدرة المنتہی، جنت و جہنم، جہنم کا خازن مالک، نہر کوثر، بیت المعمور، چار دریا، وہ (مستوی) بلند ہموار جگہ جس پر چڑھے تو قلموں کے چلنے کی آوازیں سنیں اور دوسری نشانیاں شامل ہیں، اختصار کے پیش نظر ان کی تفصیل ترک کی جاتی ہے۔

﴿۲﴾ یہ آیت واضح دلیل ہے کہ آپ ﷺ نے معراج کی رات اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھا، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو اللہ تعالیٰ ”لَقَدْ“ کے تاکید والی الفاظ کے ساتھ یہ نہ فرماتے کہ ”بلاشبہ یقیناً اس نے اپنے رب کی بعض بہت بڑی نشانیاں دیکھیں“ بلکہ یہ فرماتے کہ ”بلاشبہ یقیناً اس نے اپنے رب اعلیٰ کو دیکھا۔“

﴿۳﴾ جیسا کہ پیچھے گزرا ہے کہ ”شَهِدَ الْقَوْمُ“ اور ”ذُو مِرَّةٍ“ سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں اور ”دَنَا فَتَدَلَّىٰ“ اور ”فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ“ کی ضمیر عائشہ سے بھی وہی مراد ہیں اور ”وَلَقَدْ رَأَاهُ“ میں ضمیر ”ہُوَ“ سے مراد بھی جبریل علیہ السلام ہیں۔ قرآن مجید سے اس کی تائید اور صحیح روایات سے عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کی تفسیر بھی گزر چکی ہے۔ صحیح مسلم میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما اور عائشہ رضی اللہ عنہما سے بھی یہی تفسیر مروی ہے۔ [دیکھئے مسلم، ایمان، باب معنی قول اللہ عزوجل: ﴿وَلَقَدْ رَأَاهُ نَزْلَةَ أُخْرَىٰ﴾ : ۱۷۵، ۱۷۷]

مگر بعض مفسرین نے ان الفاظ اور ضمیروں کا مصداق اللہ تعالیٰ کو قرار دیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ ان آیات کا مطلب یہ ہے کہ نبی ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو دو دفعہ دیکھا ہے۔ اس کی تائید میں انھوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول پیش کیا ہے: «عَنْ أَبِي الْعَالِيَةِ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: ﴿مَا كَذَّبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَىٰ﴾، ﴿وَلَقَدْ رَأَاهُ نَزْلَةَ أُخْرَىٰ﴾ قَالَ رَأَاهُ بِفُؤَادِهِ مَرَّتَيْنِ» [مسلم، ایمان، باب معنی قول اللہ عزوجل: ﴿وَلَقَدْ رَأَاهُ نَزْلَةَ أُخْرَىٰ﴾ : ۱۷۶] ”ابو العالیہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ”مَا كَذَّبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَىٰ“ اور ”وَلَقَدْ رَأَاهُ نَزْلَةَ أُخْرَىٰ“ کی تفسیر میں فرمایا کہ آپ ﷺ نے اسے اپنے دل کے ساتھ دو بار دیکھا۔“ اس میں شک نہیں کہ آیات کے الفاظ میں ابن عباس رضی اللہ عنہما والی تفسیر کی گنجائش موجود ہے، مگر صحیح مسلم میں عائشہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں۔ ظاہر ہے رسول اللہ ﷺ کی صراحت کے بعد کسی اور تفسیر کا اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ اب آپ حدیث کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں، مسروق کہتے ہیں کہ میں عائشہ رضی اللہ عنہما کے ہاں ٹیک لگا کر بیٹھا ہوا تھا، انھوں نے فرمایا: «يَا أَبَا عَائِشَةَ! ثَلَاثٌ مَنْ تَكَلَّمَ بِوَأَحَدِهِ مِنْهُنَّ فَقَدْ أُعْظِمَ عَلَى اللَّهِ

الْفِرْيَةِ، قُلْتُ مَا هُنَّ؟ قَالَتْ مَنْ زَعَمَ أَنَّ مُحَمَّدًا صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَأَى رَبَّهُ فَقَدْ أُعْظِمَ عَلَى اللَّهِ الْفِرْيَةَ، قَالَ وَكُنْتُ مِنْكُمْ فَحَلَسْتُ فَقُلْتُ يَا أُمَّ الْمُؤْمِنِينَ! أَنْظِرِيَنِي وَلَا تَعَجِّلِيَنِي أَلَمْ يَقُلِ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ: ﴿وَلَقَدْ رَأَاهُ بِالْأَفْقِ الْمُبِينِ﴾ [التكوير: ۲۳]، ﴿وَلَقَدْ رَأَاهُ نَزْلَةَ أُخْرَى﴾ [النجم: ۱۳] فَقَالَتْ أَنَا أَوَّلُ هَذِهِ الْأُمَّةِ سَأَلَ عَنْ ذَلِكَ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ إِنَّمَا هُوَ جَبْرِيْلُ لَمْ أَرَهُ عَلَى صُوْرَتِهِ الَّتِي خُلِقَ عَلَيْهَا غَيْرَ هَاتَيْنِ الْمَرْتَيْنِ، رَأَيْتُهُ مُنْهَبِطًا مِنَ السَّمَاءِ سَادًا عَظِيمًا خَلَقَهُ مَا بَيْنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ، فَقَالَتْ أَوْ لَمْ تَسْمَعْ أَنَّ اللَّهَ يَقُولُ: ﴿لَا تُذْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُذْرِكُ الْأَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ﴾ [الأنعام: ۱۰۳] أَوْ لَمْ تَسْمَعْ أَنَّ اللَّهَ يَقُولُ: ﴿وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَائِي حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ إِنَّهُ عَلَىٰ حَكِيمٍ﴾ [الشورى: ۵۱] ﴿مسلم، الإيمان، باب معنى قول الله عزوجل: ﴿ولقدراه نزلة أخرى﴾.....: ۱۷۷]

”اے ابو عاصم! تین باتیں ایسی ہیں کہ جو ان میں سے ایک بات بھی کہے اس نے اللہ پر بہت بڑا بہتان باندھا۔“ میں نے کہا: ”وہ کیا ہیں؟“ انھوں نے فرمایا: ”جو شخص یہ گمان کرے کہ محمد ﷺ نے اپنے رب کو دیکھا ہے، اس نے اللہ پر بہت بڑا بہتان باندھا۔“ مسروق کہتے ہیں، میں ٹیک لگائے ہوئے تھا، یہ سن کر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور میں نے کہا: ”ام المؤمنین! مجھے کچھ مہلت دیں، جلدی نہ کریں، کیا اللہ عزوجل نے یہ نہیں فرمایا: ﴿وَلَقَدْ رَأَاهُ بِالْأَفْقِ الْمُبِينِ﴾ [التكوير: ۲۳] ”اور بلاشبہ یقیناً اس نے اس کو (آسمان کے) روشن کنارے پر دیکھا ہے۔“ اور فرمایا: ﴿وَلَقَدْ رَأَاهُ نَزْلَةَ أُخْرَى﴾ ”حالانکہ بلاشبہ یقیناً اس نے اسے ایک اور بار اترتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔“ تو انھوں نے فرمایا: ”اس امت میں جس نے آپ ﷺ سے اس کے متعلق سب سے پہلے پوچھا وہ میں ہوں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”وہ تو جبریل علیہ السلام ہیں، میں نے انھیں ان کی اس صورت میں، جس میں انھیں پیدا کیا گیا ہے، ان دو مرتبہ کے سوا نہیں دیکھا۔ میں نے انھیں آسمان سے اترتے ہوئے دیکھا، ان کے عظیم وجود نے آسمان و زمین کے مابین کو پُر کر رکھا تھا۔“ پھر ام المؤمنین رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ”کیا تم نے نہیں سنا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿لَا تُذْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُذْرِكُ الْأَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ﴾ [الأنعام: ۱۰۳] ”اسے نگاہیں نہیں پاتیں اور وہ سب نگاہوں کو پاتا ہے اور وہی نہایت باریک بین، سب خبر رکھنے والا ہے۔“ اور کیا تم نے سنا نہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَرَائِي حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ إِنَّهُ عَلَىٰ حَكِيمٍ﴾ [الشورى: ۵۱] ”اور کسی بشر کے لیے ممکن نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر وحی کے ذریعے یا پردے کے پیچھے سے، یا یہ کہ وہ کوئی رسول بھیجے، پھر اپنے حکم کے ساتھ وحی کرے جو چاہے، بے شک وہ بے حد بلند، کمال حکمت والا ہے۔“

ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا: ”ابن عباس رضی اللہ عنہما سے رسول اللہ ﷺ کو دل سے دیکھنا مروی ہے، ایک روایت میں مطلق دیکھنے کا

بھی ذکر ہے مگر اس سے مراد بھی دل سے دیکھنا ہی ہے اور جنھوں نے ان سے آنکھوں کے ساتھ دیکھنا روایت کیا ہے انھوں نے غریب بات کی ہے، کیونکہ اس (آنکھوں کے ساتھ دیکھنے) کے بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کوئی چیز ثابت نہیں اور بغوی نے اپنی تفسیر میں جو فرمایا ہے کہ ایک جماعت کا کہنا ہے کہ آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کو آنکھوں کے ساتھ دیکھا ہے اور یہ انس، حسن اور عکرمہ کا قول ہے، تو بغوی کی اس بات میں نظر ہے۔“ (ابن کثیر)

المختصر رسول اللہ ﷺ کا اللہ تعالیٰ کو آنکھوں سے دیکھنا کسی صحابی سے صحیح سند کے ساتھ مروی نہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے دل کے ساتھ دیکھنے کی جو بات کی ہے اگر ان آیات کے پیش نظر کی ہے تو وہ درست نہیں، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی تصریح کے خلاف ہے۔ ہاں، نیند کی حالت میں آپ ﷺ کا اللہ تعالیٰ کو دیکھنا صحیح سندوں کے ساتھ ثابت ہے اور یہ دیکھنا دل ہی کے ساتھ تھا، کیونکہ آپ ﷺ نے فرمایا: «يَا عَائِشَةُ! إِنَّ عَيْنَيَّ تَنَامَانِ وَلَا يَنَامُ قَلْبِي» [بخاری، صلاة التراويح، باب ففصل من قام رمضان: ۲۰۱۳] ”اے عائشہ! میری آنکھیں سوتی ہیں اور میرا دل نہیں سوتا۔“ یہاں آپ ﷺ کا حالت نیند میں اللہ تعالیٰ کو دیکھنے سے متعلق ایک حدیث درج کی جاتی ہے، معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ”ایک دن رسول اللہ ﷺ صبح کی نماز کے لیے ہمارے پاس آنے سے رکے رہے، یہاں تک کہ قریب تھا کہ ہم سورج کی نکلیا کو دیکھ لیں، تو آپ ﷺ جلدی کے ساتھ آئے، نماز کی اقامت کہی گئی۔ آپ ﷺ نے نماز پڑھائی اور نماز میں اختصار فرمایا۔ جب سلام پھیرا تو ہمیں اونچی آواز کے ساتھ فرمایا: ”اپنی اپنی صفوں میں بیٹھے رہو۔“ پھر فرمایا: «أَمَا إِنِّي سَأُحَدِّثُكُمْ مَا حَسْبُنِي عَنكُمْ الْعَدَاةُ، إِنِّي قُمْتُ مِنَ اللَّيْلِ فَتَوَضَّأْتُ وَصَلَّيْتُ مَا قَدَّرَ لِي فَتَعَسْتُ فِي صَلَاتِي حَتَّى اسْتَقَلْتُ فَإِذَا أَنَا بِرَبِّي تَبَارَكَ وَتَعَالَىٰ بِنِي أَحْسَنِ صُورَةٍ فَقَالَ يَا مُحَمَّدُ! قُلْتُ لَبَّيْكَ رَبِّ! قَالَ فَبِمَ يَخْتَصِمُ الْمَلَأُ الْأَعْمَىٰ؟ قُلْتُ لَا أَدْرِي رَبِّ! قَالَهَا ثَلَاثًا قَالَ فَرَأَيْتَهُ وَضَعُ كَفَّهُ بَيْنَ كَتِفَيْ قَدْ وَجَدْتُ بَرْدًا أَنَابِلُهُ بَيْنَ ثَدْيِي فَتَجَلَّىٰ لِي نُكْلُ شَيْءٍ وَعَرَفْتُ» [ترمذی، التفسیر، سورہ ص: ۳۲۳۵] ”سنو! میں تمہیں بتاؤں گا کہ آج صبح مجھے تمہارے پاس آنے سے کس چیز نے روک رکھا۔ آج رات میں اٹھا، وضو کیا اور جتنی میری قسمت میں نماز تھی وہ نماز میں نے پڑھی، پھر مجھے نماز میں اونگھ آگئی، یہاں تک کہ میں بھاری ہو گیا۔ اچانک دیکھتا ہوں کہ میرا رب خوب صورت ترین شکل میں میرے سامنے ہے، تو اس نے فرمایا: ”اے محمد!“ میں نے کہا: ”میں حاضر ہوں اے میرے رب!“ فرمایا: ”ملا اعلیٰ کس بات میں بحث کر رہے ہیں؟“ میں نے کہا: ”میں نہیں جانتا۔“ تمیں دفعہ فرمایا۔ (نبی ﷺ نے) فرمایا: ”تو میں نے اسے (اپنے رب کو) دیکھا کہ اس نے اپنی کف میرے کندھوں کے درمیان رکھی، تو میں نے اس کے پوروں کی ٹھنڈک اپنی دونوں چھاتیوں کے درمیان محسوس کی، تو میرے لیے (ملا اعلیٰ کی بحث کے متعلق) ہر چیز روشن ہو گئی اور میں نے اسے جان لیا۔“ آگے لمبی حدیث ہے، ترمذی نے فرمایا: ”یہ حدیث حسن صحیح ہے اور میں نے محمد بن اسماعیل بخاری سے اس حدیث کے متعلق پوچھا تو انھوں نے فرمایا: ”یہ حدیث حسن صحیح ہے۔“ امام ترمذی نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی معمولی فرق کے ساتھ یہ روایت بیان کی ہے اور شیخ البانی نے اسے صحیح کہا ہے۔

أَفَرَأَيْتُمُ اللَّاتَ وَالْعُزَّىٰ ﴿١٩﴾ وَ مَمْلُوءَةَ الثَّالِثَةِ الْآخِرَىٰ ﴿٢٠﴾ أَلَكُمُ الذَّكَرُ وَ لَهُ

بھر کیا تم نے لات اور عزیٰ کو دیکھا ﴿۱۹﴾ اور تیسری ایک اور (دبوی) مٹات کو ﴿۲۰﴾ کیا تمہارے لیے لڑکے ہیں اور

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مسند احمد (۲۸۵/۱) میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث ”رَأَيْتُ رَبِّي تَبَارَكَ وَ تَعَالَى“ (میں نے اپنے رب عزوجل کو دیکھا) اسی سند والی حدیث کا اختصار ہے، کیونکہ امام احمد نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے خواب میں دیکھنے کی مفصل حدیث بھی روایت کی ہے جو پیچھے ترمذی کے حوالے سے گزری ہے۔

صحیح بخاری میں انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں رسول اللہ ﷺ کے اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کا ذکر ہے: ﴿ وَذَنَا الْحَبَابُ رَبُّ الْأَعْرَبِ فَنَدَلْتِي حَتَّىٰ سَكَانَ مِنِّي قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أُذُنِي فَاوْحَىٰ اللَّهُ لِي مَا أُوحَىٰ إِلَيْهِ خَمْسِينَ صَلَاةً عَلَيَّ أَتَيْتُ كُلَّ يَوْمٍ وَ لَيْلَةٍ ﴾ [بخاری، مشوحد، باب ما جاء في قوله عزوجل: ﴿ وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا ﴾ : ۷۵۱۷] اور جبار رب العزت قریب آیا پھر اتر آیا، یہاں تک کہ اس سے دو کمانوں کے قاصلے پر ہو گیا یا اس سے بھی قریب۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی طرف جو وحی فرمائی، اس میں آپ کی امت پر دن رات میں پچاس نمازوں کی وحی فرمائی۔“ یہ لمبی حدیث ہے، اس حدیث کے شروع اور آخر میں یہ صراحت موجود ہے کہ یہ معاملہ نیند کا تھا اور نیند میں آپ ﷺ کے اللہ تعالیٰ کو دیکھنے میں کوئی اختلاف نہیں۔ رہی یہ بات کہ کیا معراج متعدد بار ہوا ہے، تو اہل علم نے فرمایا کہ بیداری کی حالت میں معراج ایک ہی دفعہ ہوا ہے، اس سے پہلے تمہید کے طور پر پہلے خواب میں آپ کو یہ سب کچھ دکھایا گیا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے ابن اثیر میں تفسیر سورۃ بنی اسرائیل اور فتح الباری میں شرح حدیث مذکور۔ تفسیر ہذا میں سورۃ انعام کی آیت (۱۰۳) کی تفسیر پر بھی ایک نظر ڈال لیں۔

آیت 19: 21 ﴿ ١٩﴾ أَفَرَأَيْتُمُ اللَّاتَ وَالْعُزَّىٰ : گزشتہ آیات میں رسول اللہ ﷺ کی صراطِ مستقیم پر استقامت اور آپ کی ہر بات اللہ تعالیٰ کی وحی پر موقوف ہونے کا ذکر ہوا، اس کے ساتھ آپ ﷺ کو تعلیم دینے والے فرشتے کی قوت و عظمت کا ذکر ہوا، اس کے زمین پر اور آسمانوں پر سدرة المنتہی کے پاس نزول اور رسول اللہ ﷺ کے بالکل قریب آکر وحی پہنچانے کا اور آپ ﷺ کا اسے اور اللہ تعالیٰ کی دوسری بڑی بڑی نشانیوں کو دیکھنے کا ذکر ہوا۔ ان سب باتوں سے اللہ تعالیٰ کی عظمت و قدرت، اس کا جلال اور اس کی وحدانیت خود بخود ظاہر ہو رہی ہے کہ جب اس کے رسول کا، فرشتوں کا اور اس کی زمین و آسمان پر بے شمار نشانیوں کی عظمت کا یہ عالم ہے تو وہ خود کتنی قدرتوں کا مالک ہو گا۔ اس لیے ساتھ ہی اپنی توحید کی طرف توجہ دلانے اور مشرکین کو ان کی حماقت پر متنبہ کرنے کے لیے فرمایا کہ جب تم میری قدرتوں کو سن اور دیکھ چکے تو پھر کیا تم نے لات اور عزیٰ کو بھی دیکھا ہے؟ کیا سوچا بھی جاسکتا ہے کہ یہ معبود ہیں یا اس عظیم الشان کائنات میں ان کا کوئی دخل ہے؟ یہ اندازہ بیان ان بتوں کی انتہائی حقیر اور ان پر طنز کا اظہار ہے، جیسے کوئی انتہائی کمزور اور ہاتھ پاؤں سے محذور شخص بادشاہ ہونے کا دعویٰ کر دے تو سبھی کہیں گے، اسے دیکھو یہ بادشاہ سلامت ہے۔

● طبری نے فرمایا: ”مشرکین نے اپنے بتوں اور آستانوں کے ناموں کو مومنٹ بنا کر رکھے ہوئے تھے۔

الْأُنثَى ﴿۱۱﴾

اس کے لیے لڑکیاں؟ ﴿۱۱﴾

چنانچہ انھوں نے لفظ ”اللَّه“ کے ساتھ تائے تانیث ملا کر ”اللَّاتُ“ بنا لیا، جیسے ”عَمْرُو“ مذکر کے لیے ”عَمْرَةٌ“ مؤنث اور ”عَبَّاسُ“ مذکر کے لیے ”عَبَّاسَةٌ“ مؤنث بنا لیتے ہیں اور ”عَزِيزٌ“ سے ”عَزْزَى“ بنا لیا (جو ”أَعَزُّ“ اسم تفضیل کی مؤنث ہے)۔ یہاں ایک سوال ہے کہ لفظ ”اللَّه“ کا مؤنث ”اللَّاتُ“ کیسے بن گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ لفظ ”اللَّه“ اصل میں ”الْإِلَٰهَةُ“ ہے، مؤنث اس کا ”الْإِلَٰهَةُ“ بنے گا، مگر انھوں نے تخفیف کے لیے اسے ”اللَّاتُ“ بنا لیا اور معلوم ہے کہ تخفیف کا کوئی طے شدہ قاعدہ نہیں۔ شیخ عبدالرحمن سعدی لکھتے ہیں: ”مَنَاءُ“ ”مَنَانُ“ کی مؤنث بنا لی گئی ہے۔“ ظاہر ہے یہاں بھی تخفیف کا قاعدہ ہی استعمال ہوا ہے۔

طبری نے فرمایا: ”مشرکین نے اپنے اوتان کے نام اللہ تعالیٰ کے ناموں کی مؤنث بنا کر رکھے ہوئے تھے اور دعویٰ یہ کرتے تھے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ (اللہ تعالیٰ ان کے اس بہتان سے بہت بلند ہے) تو اللہ جلّ شأه نے انھیں مخاطب کر کے فرمایا کہ لات و عززی اور تیسرے ایک اور منات کو اللہ کی بیٹیاں کہنے والو! ”الْکُمْ الذَّکُورُ“ کیا تم اپنے لیے اولاد لڑکے پسند اور لڑکیاں ناپسند کرتے ہو اور ”وَلَهُ الْاُنثَى“ اس کے لیے لڑکیاں قرار دیتے ہو، جنھیں اپنے لیے کسی صورت پسند نہیں کرتے، بلکہ ان سے اتنی شدید نفرت رکھتے ہو کہ انھیں زندہ درگور کر دیتے ہو۔“

﴿۱۱﴾ ”الْاُنثَى“ کی قراءت میں اختلاف ہے۔ اکثر قراء اسے ”تاء“ کی تشدید کے بغیر پڑھتے ہیں، اس مفہوم کے مطابق جس کا اوپر ذکر ہوا ہے اور بعض اسے ”اللَّاتُ“ (تاء کی تشدید کے ساتھ) پڑھتے ہیں، جو ”لَتَّ يَلْتُ“ (ن) بے اسم فاعل ہے، جس کا معنی بلونا اور لت پت کرنا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ﴿سَكَانَ اللَّاتِ رَجُلًا يَلْتُ سَوِيْقَ الْحَاجِّ﴾ [بخاری، التفسیر، سورة النجم: ۴۸۵۹] ”لات ایک مرد تھا جو ستو بلو کر حاجیوں کو پلاتا تھا۔“ پہلی قراءت اس لیے راجح ہے کہ اکثر قراء نے ایسے ہی پڑھا ہے اور اس لیے بھی کہ اللہ تعالیٰ نے مشرکین کو اس بات پر جھڑکا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے لیے بیٹیاں قرار دیتے ہیں، جبکہ دوسری قراءت کے مطابق ”لات“ ایک مرد تھا۔ ”لات“ کے مؤنث ہونے کی ایک دلیل صحیح بخاری (۲۷۳۱)، (۲۷۳۲) میں مذکور صلح حدیبیہ والی طویل حدیث ہے، جس میں ہے کہ جب کفار کے نمائندے سہیل بن عمرو نے کہا کہ تم مختلف لوگ اکٹھے ہو گئے ہو، جنگ ہوئی تو بھاگ جاؤ گے، تو ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ﴿أَمْضُصُ بَطْرَ اللَّاتِ أَنْحُنُ نَفْرُ عَنْهُ﴾ ”لات کی شرم گاہ کو چوس، کیا ہم آپ (ﷺ) کو چھوڑ کر بھاگ جائیں گے؟“ واضح رہے ”بَطْرُ“ عورت کی شرم گاہ کو کہا جاتا ہے۔

﴿۱۲﴾ عرب میں بتوں کے بے شمار آستانے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان میں سے ان تین کا ذکر اس لیے فرمایا کہ یہ ان کے سب سے مشہور اور بڑے بت تھے۔ مکہ، طائف، مدینہ اور حجاز کے اکثر علاقوں کے لوگ انھیں سب سے زیادہ پوجتے تھے۔ لات طائف میں تھا، بنو ثقیف اس کے پجاری اور متوتی تھے۔ عزنی قریش کی خاص دیوی تھی جس کا استہان مکہ اور طائف کے کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

تِلْكَ إِذَا قَسَمْتُ ضِيْزِي ۝

یہ تو اس وقت سخت نا انصافی کی تعظیم ہے۔

درمیان مقام نخلہ پر تھا۔ وہاں عمارت کے علاوہ درخت بھی تھے جن کی پوجا ہوتی تھی۔ قریش کے ہاں اس کی تعظیم کا اندازہ صحیح بخاری کی اس حدیث سے ہوتا ہے جس میں ہے کہ جنگ احد کے موقع پر جب کفار مسلمانوں کو کچھ نقصان پہنچانے میں کامیاب ہوئے تو پہاڑ پر چڑھ کر ابوسفیان نے فخر سے کہا: "لَنَا الْعُرْزَى وَلَا عُرْزَى لَكُمْ" (ہمارے پاس عزری ہے، تمہارے پاس کوئی عزری نہیں) تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اسے جواب دو: «اللَّهُ مَوْلَانَا وَلَا مَوْلَى لَكُمْ» "اللہ ہمارا مولیٰ ہے، تمہارا کوئی مولیٰ نہیں۔" [بخاری، الجهاد والسير، باب ما بکروہ من الشراک : ۳۰۳۹] منات کا مندر مکہ اور مدینہ کے درمیان بحر احمر کے کنارے مثلث کے قریب قدید کے مقام پر تھا۔ [دیکھیے بخاری، التفسیر، سورة النجم : ۴۸۶۱] مدینہ کے اوس و خزرج اور ان کے ہموا اس کی پوجا کرتے تھے۔ ان تمام بتوں کے مندر تھے اور ان کے باقاعدہ پروہت اور پجاری بھی تھے۔ کعب کی طرح ان پر بھی جانور لا کر قربان کیے جاتے تھے۔ ابن کثیر نے اس مقام پر سیرت ابن اسحاق سے عرب کے بتوں کا تذکرہ تفصیل سے نقل کیا ہے کہ وہ کہاں کہاں تھے، ان کی شکل کیا تھی اور کون کون سے صحابہ نے انھیں منہدم کیا۔ یہ تفصیل ان کی تفسیر میں ملاحظہ فرمائیں۔

۵ ﴿ وَمَنْوَةَ الثَّالِثَةِ الْاُخْرٰی : یہاں ایک سوال ہے کہ "الثَّالِثَةِ" (تیسرا) کہنے کے بعد "الْاُخْرٰی" (ایک اور یا بعد والا) کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ جواب اس کا یہ ہے کہ مشرکین کے ہاں بتوں اور ویویوں کے بھی درجے ہیں، لات اور عزری کو جو مقام حاصل تھا وہ منات کو حاصل نہ تھا۔ اس کا تذکرہ ان الفاظ میں یہ ظاہر کرنے کے لیے فرمایا کہ اس کا نمبر تمہارے ہاں بھی تیسرا اور دونوں کے بعد ہے۔ یہ بھی شرک پر بہت بڑی چوٹ ہے کہ وہ معبود ہی کیا ہوا جو دوسرے معبود کو برداشت کرتا ہے اور متعدد معبود اپنی اپنی حیثیت پر قناعت کرتے اور خوش رہتے ہیں، بھلا معبود برحق ایسا ہونا چاہیے؟ ابراہیم علیہ السلام کے زمانے کے بتوں میں بھی یہ تقسیم موجود تھی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ فَجَعَلْنٰهُمْ جُنْدًا اِلَّا كَهٰذَا اٰهَمُمْ ﴾ [الانبیاء : ۵۸] "پس اس نے انھیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، سوائے ان کے ایک بڑے کے۔"

۶ اس مقام پر بعض مفسرین نے ایک روایت بیان کی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ اس آیت پر پہنچے تو شیطان نے آپ ﷺ کی زبان پر یہ کلمات جاری کر دیے: "تِلْكَ الْعَزَائِقُ الْمُغَلٰی وَ اِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَنْ تُرْتَجٰی" اس روایت کی حقیقت کے لیے دیکھیے سورہ حج کی آیت (۵۲) کی تفسیر۔

آیت 22 ﴿ تِلْكَ إِذَا قَسَمْتُ ضِيْزِي : "ضِيْزِي" "ضَاوِي ضِيْزِي" (ض) سے "فُعْلِي" (فاء کے ضم کے ساتھ) کے وزن پر ہے جو "فُعْلٌ" (اسم تفضیل) کی مؤنث ہے۔ اس کا معنی "شَدِيْدُ الضِّيْزِ" (سخت نا انصافی والی) ہے۔ "ضَاوِي" کے ضمہ کو "يَا" کی موافقت کے لیے کسرہ سے بدل دیا گیا۔ یعنی ایک تو اللہ کے لیے اولاد بنانا، پھر اپنے لیے لڑکے اور اللہ تعالیٰ

إِنْ هِيَ إِلَّا أَسْمَاءٌ سَنِيْتُنْمُوهَا أَنتُمْ وَآبَاؤُكُمْ مَّا أَنْزَلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ إِنْ يَشْعُرُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوٰى الْأَنفُسُ ؕ وَ لَقَدْ جَاءَهُمْ مِنَ رَبِّهِمْ الْهُدٰى ﴿۲۴﴾
 لِلْإِنْسَانِ مَا تَمَلٰى ﴿۲۵﴾ قَلْبُهُ الْآخِرَةُ وَالْأُولٰى ﴿۲۶﴾

یہ (بت) چند ناموں کے سوا کچھ بھی نہیں ہیں، جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں، ان کی کوئی دلیل اللہ نے نازل نہیں فرمائی۔ یہ لوگ صرف گمان کے اور ان چیزوں کے پیچھے چل رہے ہیں جو ان کے دل چاہتے ہیں اور بلاشبہ یقیناً ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے ہدایت آچکی ﴿۲۴﴾ یا انسان کے لیے وہ (میسر) ہے جو وہ آرزو کرے ﴿۲۵﴾ سو اللہ ہی کے لیے پھلا اور پہلا جہان ہے ﴿۲۶﴾

کے لیے لڑکیاں پسند کرنا، یہ تو بہت ہی سخت نا انصافی کی تقسیم ہے۔

آیت 23 ﴿۲۳﴾ إِنْ هِيَ إِلَّا أَسْمَاءٌ سَنِيْتُنْمُوهَا أَنتُمْ وَآبَاؤُكُمْ : اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ اعراف (۷۱) اور سورہ یوسف (۲۰) کی تفسیر۔

﴿۲۴﴾ إِنْ يَشْعُرُونَ إِلَّا الظَّنَّ : تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ یونس (۱۰۶، ۱۰۷) کی تفسیر۔

﴿۲۵﴾ وَمَا تَهْوٰى الْأَنفُسُ ؕ وَ لَقَدْ جَاءَهُمْ : یعنی یہ لوگ ان کی پرستش صرف اپنے دلوں کی خواہشات کی پیروی میں کر رہے ہیں۔ ان کا دل چاہتا ہے کہ کوئی ایسا معبود ہو جو دنیا میں ان کے کام بناتا رہے اور آخرت آتی جائے تو وہاں بھی انہیں بخشوا دے، مگر ان پر حلال و حرام کی کوئی پابندی ہو نہ ان کی خواہشات پر کوئی قدغن ہو۔ اس لیے کبھی کسی کو اللہ کی اولاد بنا کر پوجنا شروع کر دیتے ہیں، جیسے کوئی مسیح یا عذیر علیہ السلام کو اس کا بیٹا بنا کر پوجتا ہے، جیسے یہود و نصاریٰ اور کوئی فرشتوں کو بیٹیاں بنا کر، جیسے مشرکین عرب اور کبھی کسی کو اس کا ایسا محبوب یا محبوبہ بنا کر پوجنے لگتے ہیں جس کی محبت کے ہاتھوں وہ مجبور ہے اور ان کی کوئی بات نال نہیں سکتا، جیسا کہ عام بت پرست ہیں اور کوئی جنوں نے مسلمانوں کا بھی یہی حال ہے اور دل میں امید باندھ لیتے ہیں کہ ان کے بنائے ہوئے یہ خیالی معبود قیامت کے دن انہیں اللہ تعالیٰ کی گرفت سے بچالیں گے، کیونکہ ان کا اس کے ساتھ نسب یا محبت کا رشتہ ہے جس سے مجبور ہو کر اسے ان کی شفاعت ماننا پڑے گی۔ جب کہ حقیقت میں یہ سب ان کی ناکام تمناؤں اور آرزوئیں ہیں، بات یہ ہے ﴿وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مِنْ رَبِّهِمْ الْهُدٰى﴾ اور بلاشبہ یقیناً ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے ہدایت آچکی۔ اور اصل ہدایت اور سیدھی راہ وہی ہے جو ہمارے پیغمبر ﷺ نے ان کے پاس آئے ہیں۔

آیت 24 25 ﴿۲۵﴾ أَمَرَ لِلْإِنْسَانِ مَا تَمَلٰى : یعنی انہوں نے جو آرزوئیں دل میں پال رکھی ہیں کہ ان کے معبود دنیا میں ان کے کام آئیں گے اور آخرت میں انہیں اللہ تعالیٰ کی گرفت سے بچالیں گے، یا اگر آخرت قائم ہوئی تو انہیں وہاں بھی وہی آسائشیں ملیں گی جو انہیں دنیا میں میسر ہیں، تو سب سے پہلے یہ سوچیں کہ آیا انسان کی ہر تمنا جو وہ کرے، کی پوری ہوتی ہے؟

وَكَمْ مِنْ مَلَكٍ فِي السَّمَوَاتِ لَا تُغْنِي شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا إِلَّا مِنْ بَعْدِ أَنْ يَأْذَنَ اللَّهُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَرْضَى ﴿۲۶﴾ إِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ لَيْسُوا مِنَ الْمَلَائِكَةِ تَسْبِيَةً الْأُنثَى ﴿۲۷﴾ وَمَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ ، وَإِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا ﴿۲۸﴾

اور آسمانوں میں کتنے ہی فرشتے ہیں کہ ان کی سفارش کچھ کام نہیں آتی مگر اس کے بعد کہ اللہ اجازت دے جس کے لیے چاہے اور (جسے) پسند کرے ﴿۲۶﴾ بے شک وہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے یقیناً وہ فرشتوں کے نام عورتوں کے ناموں کی طرح رکھتے ہیں ﴿۲۷﴾ حالانکہ انھیں اس کے متعلق کوئی علم نہیں، وہ صرف گمان کے پیچھے چل رہے ہیں اور بے شک گمان حق کے مقابلے میں کسی کام نہیں آتا ﴿۲۸﴾

ظاہر ہے ایسا ہرگز نہیں، کیونکہ دنیا کا مالک بھی صرف اللہ تعالیٰ ہے اور آخرت کا مالک بھی وہی ہے، اس لیے کسی اور کے چاہنے یا نہ چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا، بلکہ ہوتا وہی ہے جو مالک چاہے۔ پھر انھوں نے ان خود ساختہ معبودوں سے یہ توقع کیسے باندھ لی کہ وہ ان کی تمنائیں پوری کریں گے۔ یہاں تو بڑے سے بڑا شخص بھی خواہ اللہ کا ظلیل ہو یا اس کا حبیب، اس کی مرضی کا پابند ہے اور اس کی وہی آرزو پوری ہوتی ہے جو مالک چاہتا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کے والد کو دیکھ لو، نوح علیہ السلام کے بیٹے اور نبی کریم ﷺ کے چچا کو دیکھ لو، تم پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ کسی بھی شخص کی تمنا وہی پوری ہوتی ہے جو دنیا اور آخرت دونوں کا مالک چاہتا ہے۔ ایک شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

مَا كُنْتُ مَا يَتَمَنَّى الْمَرْءُ يُدْرِكُهُ نَجْرِي الرِّيحُ بِمَا لَا تَسْتَهَي السُّفْنُ

”ایسا نہیں کہ آدمی جو تمنا کرے اسے حاصل کر ہی لے، کیونکہ بہت دفعہ ہوائیں کشتیوں کی خواہش کے خلاف چلتی ہیں۔“

آیت 26 ﴿۲۶﴾ وَكَمْ مِنْ مَلَكٍ فِي السَّمَوَاتِ لَا تُغْنِي شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا : یعنی تمہارے یہ حاجت روا اور مشکل کشا اور فرشتوں کے ناموں پر بنائے ہوئے دیوی دیوتا تو محض تمہارے وہم و گمان کی پیداوار ہیں، حقیقت میں ان کا کہیں وجود ہی نہیں۔ یہاں تو حقیقی فرشتے جو آسمانوں میں رہتے ہیں اور انھیں اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہے، ان کا بھی یہ حال ہے کہ ان میں سے کسی کی سفارش کام نہیں آتی، سوائے اس کے جسے اللہ تعالیٰ اجازت دے اور اسی کو فائدہ دیتی ہے جس کے حق میں سفارش کو اللہ تعالیٰ پسند فرمائے اور اس کے حق میں سفارش کی اجازت دے۔ غرض سفارش کا اختیار بھی اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے، فرمایا: ﴿قُلْ لِلَّهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيعًا﴾ [الزمر: ۴۴] ”کہہ دے سفارش ساری کی ساری اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔“ پھر اسے چھوڑ کر تم کسی اور کو کیوں پکارتے اور پوجتے ہو؟ شفاعت کے متعلق مزید دیکھیے سورہ بقرہ (۲۵۵): ﴿مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ﴾ (آیت الکرسی) اور سورہ نبا (۳۸) کی تفسیر۔

آیت 27-28 ﴿۲۷﴾ إِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ : اس کی وضاحت کے لیے دیکھیے سورہ زخرف (۱۹) کی تفسیر۔

فَاعْرِضْ عَنْ قَوْمٍ تَوَلَّىٰ ۖ عَنْ ذِكْرِنَا ۚ وَلَمْ يُرِدْ إِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۗ ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ فِی الْعِلْمِ ۗ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهِ ۗ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ اهْتَدٰى ۗ وَ اِنَّهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ لَا یُجْزِی الذِّیْنَ اَسَاءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَ یَجْزِی الذِّیْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحَسَنِ ۗ ﴿۳۱﴾

سو اس سے منہ پھیر لے جس نے ہماری نصیحت سے منہ موڑا اور جس نے دنیا کی زندگی کے سوا کچھ نہ چاہا ﴿۳۱﴾ یہ علم میں ان کی انتہا ہے، یقیناً تیرا رب ہی زیادہ جانتے والا ہے اسے جو اس کے راستے سے بھٹک گیا اور وہی زیادہ جانتے والا ہے اسے جو راستے پر چلا ﴿۳۱﴾ اور جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے اللہ ہی کا ہے، تاکہ وہ ان لوگوں کو جنہوں نے برائی کی، اس کا بدلا دے جو انہوں نے کیا اور ان لوگوں کو جنہوں نے بھلائی کی، بھلائی کے ساتھ بدلا دے ﴿۳۱﴾

﴿۳۱﴾ اِنَّ الذِّیْنَ اَسَاءُوْا لَا یَسْتَمِعُوْنَ اِلَّا الْكَلْبَ: اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ یونس (۲۶، ۳۶) کی تفسیر۔

آیت 29 فَاَعْرِضْ عَنْ قَوْمٍ تَوَلَّىٰ ۖ عَنْ ذِكْرِنَا : یہاں یہ کہنے کے بجائے کہ ”فَاعْرِضْ عَنْهُمْ“ (سو ان سے منہ پھیر لے) یہ فرمایا: ﴿فَاَعْرِضْ عَنْ قَوْمٍ تَوَلَّىٰ ۖ عَنْ ذِكْرِنَا﴾ (سو اس سے منہ پھیر لے جس نے ہماری نصیحت سے منہ موڑا) تاکہ ان مشرکین سے اعراض کی وجہ بھی سامنے آجائے کہ جو شخص ہماری وحی کے ذریعے سے آنے والی نصیحت کی طرف توجہ دینے کے لیے تیار ہی نہیں، بلکہ جان بوجھ کر اس سے منہ موڑے ہوئے ہے اور دنیا کی زندگی کے سوا اس نے کچھ چاہا ہی نہیں ہے، آپ بھی اس کے پیچھے نہ پڑیں اور نہ ہی اس کی خاطر وقت ضائع کریں۔

آیت 30 ﴿۳۰﴾ ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ فِی الْعِلْمِ : ”مَبْلَغٌ“ ”بَلَّغٌ یَبْلُغُ“ (ن) سے طرف ہے، پہنچنے کی جگہ۔ ”ذٰلِكَ“ کا لفظ تحقیر کے لیے ہے کہ ان لوگوں کے علم کی پہنچ اور انتہا اس حقیر حیات دنیا تک ہی ہے، جو آخرت کے مقابلے میں قلیل بھی ہے اور ناپائیدار بھی، اس سے آگے نہ انہیں کچھ علم ہے نہ وہ اس سے آگے جاننے یا سوچنے کے لیے تیار ہیں۔ رسول اللہ ﷺ سے مروی ایک دعا میں آپ ﷺ کے یہ الفاظ آئے ہیں: « وَلَا تُحْغِلِ الدُّنْيَا اُكْحِرَ عَمَلِنَا وَلَا مَبْلَغِ عَلْمِنَا » | ترمذی، الدعوات، باب دعاء ”اللہم افسد لنا“ ۳۵۰، ۲۰، قال النابلسی حسن | ”اور دنیا کو ہماری سب سے بڑی فکر نہ بنانا اور نہ اسے ہمارے علم کی انتہا بنانا۔“

﴿۳۱﴾ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهِ : اس سے اللہ تعالیٰ کا کمال علم ثابت ہوتا ہے کہ اسے ان تمام لوگوں کا علم ہے جو اس کی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں اور ان کا بھی جو اس کی راہ پر قائم ہیں۔

آیت 31 ﴿۳۱﴾ وَ اِنَّهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ لَا یُجْزِی الذِّیْنَ اَسَاءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَ یَجْزِی الذِّیْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحَسَنِ : پہلے لانے سے حصر پیدا ہو رہا ہے۔ اس جملے میں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کے اختیار کے کمال کا ذکر ہے کہ ساری کائنات کی ہر چیز کا وہی مالک ہے۔

الَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبِيرَ الْأَثْمِ وَالْفَوَاحِشَ إِلَّا اللَّمَمَ ۗ إِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ۗ هُوَ
 أَعْلَمُ بِكُمْ إِذْ أَنْشَأَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ وَإِذْ أَنْتُمْ أَجِنَّةٌ فِي بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ ۗ فَلَا تُزَكُّوْا
 أَنْفُسَكُمْ ۗ هُوَ أَعْلَمُ بِسِنِّ النَّفْسِ ﴿۳۲﴾

۳۲

وہ لوگ جو بڑے گناہوں اور بے حیائیوں سے بچتے ہیں مگر صغیرہ گناہ، یہی تیرا رب وسیع بخشش والا ہے، وہ تمہیں زیادہ جاننے والا ہے جب اس نے تمہیں زمین سے پیدا کیا اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹوں میں بچے تھے۔ سو اپنی پاکیزگی کا دعویٰ نہ کرو، وہ زیادہ جاننے والا ہے کہ کون بچا ﴿۳۲﴾

② لِيَجْزِيَ الَّذِينَ أَسَاءُوا بِمَا عَمِلُوا.....: تو جب وہ علم اور قدرت دونوں میں کامل ہے تو اس کا نتیجہ یہی ہے کہ وہ برائی کرنے والوں کو ان کے عمل کا بلا دے گا اور بھلائی کرنے والوں کو بھلائی کے ساتھ بلا دے گا، ان میں سے کوئی بھی نہ اس کے علم سے اوجھل ہے نہ اس کی قدرت سے باہر ہے۔ اس میں برائی کرنے والوں کے لیے وعید اور بھلائی کرنے والوں کے لیے وعدہ ہے۔

آیت 32: ① الَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبِيرَ الْأَثْمِ وَالْفَوَاحِشَ.....: اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ شوریٰ (۳۷) کی تفسیر۔

② إِلَّا اللَّمَمَ: ”الْإِلْتِمَامُ“ اور ”الْلَمَمُ“ کا اصل معنی ”کسی جگہ تھوڑی دیر کے لیے اترنا“ ہے۔ ”أَلَمْ فَلَانَ بِالْمَكَانِ“ جب کوئی شخص کسی جگہ تھوڑی دیر کے لیے اترتا ہو۔ یعنی بھلائی کرنے والے لوگ جنہیں اللہ بھلائی کے ساتھ جزا دے گا، وہ ہیں جو کبیرہ گناہوں اور فواحش سے بچتے ہیں، مگر کبھی کسی وقت ان سے کوئی گناہ ہو جائے تو وہ اس پر اصرار نہیں کرتے بلکہ فوراً توبہ کر کے اس سے نکل جاتے ہیں۔ گناہ سے ان کی آلودگی تھوڑی دیر کے لیے ہوتی ہے۔ (دیکھیے نساء: ۱۸، ۱۷) طبری نے صحیح سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل فرمایا ہے: ”اس سے مراد وہ شخص ہے جو کسی فاحشہ کا ارتکاب کرتا ہے پھر توبہ کر لیتا ہے۔“ ”اللَّمَمَ“ کا معنی ”قریب ہونا“ بھی ہے، ”أَلَمْ بِالشَّيْءِ إِذَا قَارَبَهُ وَلَمْ يُخَالِطْهُ“ جب کوئی شخص کسی کام کے قریب ہوا ہو، مگر اس نے وہ کام نہ کیا ہو۔ اس لیے اکثر سلف نے ”اللَّمَمَ“ سے مراد صغیرہ گناہ لیے ہیں۔ چنانچہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ”میں نے ”اللَّمَمَ“ کے مشابہ اس سے زیادہ کوئی چیز نہیں دیکھی جو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے روایت کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿إِنَّ اللَّهَ كَتَبَ عَلَى ابْنِ آدَمَ حَقْلَهُ مِنَ الزُّنَا، أَدْرَكَ ذَلِكَ لَا مَحَالَةَ، فَرِنَا الْعَيْنِ النَّظْرُ وَ زِنَا اللِّسَانِ الْمَنْطِقُ وَالنَّفْسُ تَمَنَّى وَتَشْتَهِي وَالْفَرْجُ يُصَدِّقُ ذَلِكَ كَلْمُهُ وَ يُكْذِبُهُ﴾ [بخاری، الاستئذان، باب زنا الجوارح دون الفرج: ۶۲۴۳] ”اللہ تعالیٰ نے ابن آدم پر زنا میں سے اس کا حصہ لکھ دیا ہے، جسے لامحالہ اس نے پانا ہی پانا ہے۔ سو آنکھ کا زنا دیکھنا ہے اور زبان کا زنا بولنا ہے اور نفس تمنا کرتا اور خواہش کرتا ہے اور شرم گاہ اس سب کو سچا کر دکھاتی ہے یا چھوٹا۔“ مزید دیکھیے سورہ نساء (۳۱) کی تفسیر۔

③ إِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ: اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ”رَبُّ“ کا ذکر کر کے فرمایا کہ تیرا رب وسیع بخشش والا ہے، یعنی

أَفَرَأَيْتَ الَّذِي تَوَلَّى ۖ وَ أَعْطَى قَلِيلًا ۖ وَأَكْدَى ۖ ﴿۳۳﴾

پھر کیا تو نے دیکھا اسے جس نے منہ موڑ لیا ﴿۳۳﴾ اور تھوڑا سا دیا اور رک گیا ﴿۳۳﴾

اس کی ربوبیت کا نتیجہ ہے کہ وہ بندوں کے گناہوں پر پردہ ڈالتا ہے اور انہیں معاف فرماتا ہے، ورنہ اگر وہ ہر چھوٹے بڑے گناہ پر گرفت فرمائے تو زمین پر کوئی شخص باقی نہ چھوڑے۔ اس کی مغفرت اتنی وسیع ہے کہ وہ تو بہ کرنے والوں کا ہر گناہ حتیٰ کہ کفر و شرک بھی معاف کر دیتا ہے اور جسے چاہے کفر و شرک کے سوا تو بہ کے بغیر بھی سب کچھ معاف کر دیتا ہے۔

﴿۳۳﴾ هُوَ أَعْلَمُ بِكُمْ إِذْ أَنْشَأَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ: ”اَجَلًا“ ”خَيْرِينَ“ کی جمع ہے، بچے جب تک ماں کے پیٹ میں رہے، کیونکہ وہ وہاں چھپا ہوا ہوتا ہے۔ یعنی اس کی مغفرت کی یہ وسعت اس کے علم کی وسعت کی وجہ سے ہے، وہ تم سے بھی زیادہ تمہارا علم رکھتا ہے، اسے تمہارا اس وقت کا حال بھی معلوم ہے جب تم اس قابل ہی نہیں تھے کہ کچھ جان سکو۔ چنانچہ وہ تمہارے اس وقت کا بھی علم رکھتا ہے جب اس نے تمہیں زمین سے پیدا کیا اور اس وقت کا بھی جب تم اپنی ماؤں کے پیٹوں میں جنین کی حالت میں تھے۔ اسے تمہاری کمزوری اور گناہ کی طرف رغبت خوب معلوم ہے، اس لیے وہ چھوٹے موٹے گناہوں کو ویسے ہی معاف کر دیتا ہے۔

﴿۳۴﴾ فَلَا تُزَكُّوا أَنْفُسَكُمْ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقَى: اس لیے اگر تمہیں کسی اچھے کام کی توفیق مل جائے تو نہ اس پر فخر کرو اور نہ اپنے آپ کو پاک قرار دو۔ ہمیشہ اپنی ابتدا پر نظر رکھو اور اپنی انتہا پر بھی، کیونکہ تمہارا انجام اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ اچھا ہے یا برا۔ وہی جانتا ہے کہ حقیقی متقی کون ہے، جس کا خاتمہ تقویٰ پر ہوگا، تو جب تمہیں اپنا انجام ہی معلوم نہیں تو اپنے پاک ہونے کا دعویٰ کیسے کر سکتے ہو؟ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ نساء کی آیت (۴۹) کی تفسیر۔

﴿۳۵﴾ اس حکم کی دھڑلے کے ساتھ مخالفت سب سے زیادہ بعض صوفی حضرات نے کی ہے۔ اس کی واضح دلیل ان کا ”وحدت الوجود“ کا عقیدہ ہے، بھلا جو شخص مردہ مٹی سے بنا، پھر رحم کی تین ظلمتوں میں غلیظ خون کے ساتھ پرورش پاتا رہا اور پھر شباب کے راستوں سے دو دفعہ گزر کر وجود میں آیا، جسے اپنے انجام تک کا علم نہیں کہ جنت ہے یا جہنم، اسے خدائی کا دعویٰ کرتے ہوئے حیا نہیں آتی۔ ان لوگوں نے اپنی ”أَنَا رَبُّكُمْ الْأَعْلَى“ کی فرعونیت کو زہد و تقدس کے پردے میں چھپا رکھا ہے۔ ان میں سے کوئی کہتا ہے: ”سُبْحَانِي مَا أَعْظَمَ شَأْنِي“ ”میں پاک ہوں، میری شان کس قدر عظیم ہے۔“ کوئی کہتا ہے: ”مَلِكِي أَعْظَمُ مِنْ مُلْكِ اللَّهِ“ ”میرا ملک اللہ کے ملک سے بڑا ہے۔“ کوئی کہتا ہے: ”میرا اول چاہتا ہے دوزخ کو بچھا دوں، جنت کو جلا دوں۔“ غرض اپنی پاکبازی کے دعوے کے ساتھ جو لاف زنی اور بے ہودہ گوئی یہ لوگ کرتے ہیں آپ کو اور کسی جگہ مشکل سے ملے گی۔

آیت 33، 34 ﴿۱﴾ أَفَرَأَيْتَ الَّذِي تَوَلَّى: اس سورت کا مضمون رسالت کا اثبات، شرک اور بت پرستی کی تردید اور مشرکین مکہ کی مذمت ہے۔ پچھلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنے پاک ہونے کے گمان اور دعویٰ سے منع فرمایا۔ قریش مکہ اپنے

أَعْنَدَهُ عِلْمُ الْغَيْبِ فَهُوَ يَزَيُّ ۝

کیا اس کے پاس غیب کا علم ہے؟ پس وہ دیکھ رہا ہے ۝

بارے میں کئی طرح کے گمان اور دعوے رکھتے تھے، جنہوں نے انہیں دھوکے میں مبتلا کر رکھا تھا۔ قرآن مجید میں مختلف مقامات پر ان کے وہ گمان ذکر فرمائے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہونے کی وجہ سے اپنی برتری کا گمان تھا، اللہ تعالیٰ نے تمام لوگوں کو مٹی سے، پھر ماں کے شکم سے پیدا کرنے کا ذکر فرما کر تقویٰ کو معیار فضیلت قرار دیا۔ ایک کام ان کا یہ تھا کہ انہوں نے عین کعبہ کے اندر ابراہیم، اسمعیل علیہما السلام اور دوسرے بزرگوں کی صورتیں رکھ کر ان کی عبادت کر کے یہ سمجھ رکھا تھا کہ ہمارے یہ وکیل اور سفارشی بڑے زبردست ہیں کہ وہ اپنے نام لیواؤں کو، خواہ وہ کچھ بھی کرتے رہیں، اپنے دامن میں پناہ دیں گے۔ (دیکھیے یونس: ۱۸) ایک گمان ان کا یہ تھا کہ کفر کے باوجود انہیں جس طرح دنیا میں نعمتیں ملی ہوئی ہیں اسی طرح آخرت میں بھی ملیں گی۔ (دیکھیے مریم: ۷۷) اسی طرح وہ دوسروں کو یہ کہہ کر اسلام قبول کرنے سے روکتے تھے کہ تم ہماری راہ پر چلتے رہو، تمہارے گناہ ہم اٹھالیں گے۔ (دیکھیے عنکبوت: ۱۲) ان سارے دعوؤں اور گمانوں کا نتیجہ یہ تھا کہ آخرت کے عذاب سے بے خوف ہونے کی وجہ سے ان میں دنیا کی شدید ہوس، بغل اور کینگی آچکی تھی۔ وہ کچھ خرچ کرتے بھی تھے تو نام و نمود کی خاطر، وہ بھی بس اتنا کہ نام ہو جائے، اس سے آگے ان کے ہاتھ کھلنے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے اور اتنا خرچ کر کے بھی وہ اپنی سخاوت اور دیادگی کی لاف زنی کرتے کہ میں نے یہ کر دیا اور وہ کر دیا، جیسا کہ سورہ بقرہ میں ہے: ﴿يَقُولُونَ أَهْلَكَ مَالًا أَتَمَدًا﴾ [البقرہ: ۶] ”کہتا ہے میں نے ڈھیروں مال برباد کر ڈالا۔“ اپنے آباؤ اجداد، پیشواؤں، وکیلوں اور سفارشیوں کے بل بوتے پر یہ کہہ کر گناہ کیے جاتے ہیں کہ ہمارے گناہ وہ اٹھالیں گے، جیسے نصرانیوں کا کہنا ہے کہ ہمارے تمام گناہوں کے کفارہ میں مسیح علیہ السلام پر چڑھ گئے ہیں، ہم ان کے نام لیوا ہیں، ہمارے سارے گناہ انہوں نے اپنے ذمے لے کر بخشتوا لیے ہیں اور جیسا کہ آج کل مسلمانوں میں سے کچھ لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ حسین علیہ السلام نے شہادت پا کر اپنے نام لیواؤں کے سارے گناہ بخشتوا لیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں ایسے تمام گمانوں اور دعوؤں کی تردید فرمائی ہے۔

﴿وَاعْظِي قَلِيلًا وَالْكَذِبِيُّ: ”الْكَذِبِيُّ“ ”كُذْبِيَّةٌ“ سے ہے جس کا معنی چٹان ہے۔ کوئی شخص کسواں وغیرہ کھودنے لگے اور آگے چٹان یا پتھر آجانے کی وجہ سے کھودنے سے رک جائے تو کہا جاتا ہے: ”الْكَذِبِيُّ الرَّجُلُ“. ”یہاں ”الْكَذِبِيُّ“ سے کوئی خاص شخص مراد نہیں، بلکہ مقصود مشرک آدمی کی نفسیات اور طرز عمل کا تذکرہ ہے کہ یہ لوگ اللہ کی راہ میں دینے کا حوصلہ نہیں رکھتے، اگر کبھی دیتے بھی ہیں تو نام کے لیے، وہ بھی تھوڑا سا، پھر ان کے سامنے کجروی کی چٹان آ جاتی ہے اور وہ رک جاتے ہیں، خصوصاً جب انہیں اس سے شہرت یا دنیوی مفاد حاصل ہوتا دکھائی نہ دیتا ہو۔ فرمایا، کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جس نے حق قبول کرنے سے من موڑ لیا، کچھ تھوڑا سا مال خرچ کیا اور رک گیا۔ شاہ عبدالقادر نے فرمایا: ”یعنی تھوڑا سا ایمان لانے لگا، پھر رک گیا۔“ (موضح) اس معنی میں مراد وہ مشرک ہیں جنہوں نے کبھی رسول اللہ ﷺ یا قرآن کی تعریف کی، مگر اس کے بعد ایمان لانے سے رک گئے۔

آیت 35 ﴿أَعْنَدَهُ عِلْمُ الْغَيْبِ فَهُوَ يَزَيُّ﴾: یعنی یہ شخص ایمان سے من موڑنے اور اس تمام تر بغل اور کجروی کے باوجود جو

أَمْ لَمْ يُبْتَأَ بِسَاءٍ فِي صُحُفِ مُوسَى ۖ وَإِبْرَاهِيمَ الَّذِي وَفَّى ۖ أَلَا تَتَذَكَّرُ ۚ وَأَزْرَقَ ۚ وَزَرَ ۚ
أُخْرَى ۖ وَأَنْ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى ۖ

یا سے اس بات کی خبر نہیں دی گئی جو موسیٰ کے صحیفوں میں ہے ﴿۱﴾ اور ابراہیم کے (صحیفوں میں) جس نے (عہد) پورا کیا ﴿۲﴾ کہ کوئی بوجھ اٹھانے والی (جان) کسی دوسری کا بوجھ نہیں اٹھائے گی ﴿۳﴾ اور یہ کہ انسان کے لیے صرف وہی ہے جس کی اس نے کوشش کی ﴿۴﴾

اپنے آپ کو پاک قرار دے رہا ہے اور آخرت کے عذاب سے محفوظ رہنے اور وہاں کی نعمتوں کے حق دار ہونے کا جو گمان اس نے کر رکھا ہے، کیا اس کے پاس علم غیب کی دوربین (آلہ) ہے جس کے ساتھ وہ یہ سب کچھ دیکھ رہا ہے؟

آیت 36-37 ﴿۱﴾ اَمْ لَمْ يُبْتَأَ بِسَاءٍ فِي صُحُفِ مُوسَى : یعنی اگر وہ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کے لیے تیار نہیں اور اس کے پاس علم غیب بھی نہیں تو کیا پہلے انبیاء کی کتابوں میں جو بنیادی اصول لکھے ہیں وہ بھی کسی نے اسے نہیں بتائے؟ ان انبیاء میں سے ابراہیم اور موسیٰ ﷺ کا خاص طور پر ذکر اس لیے فرمایا کہ ابراہیم علیہ السلام کے دین پر چلنے کا وہ دعویٰ رکھتے تھے اور ابراہیم علیہ السلام کے بعد احکام کی بنیادی کتاب موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والی تورات ہی تھی جس پر بعد کے تمام انبیاء عمل کرتے تھے اور جو اس وقت بھی موجود تھی اور قریش یہودیوں سے اس کے متعلق پوچھتے رہتے تھے۔

﴿۲﴾ وَ اِبْرَاهِيمَ الَّذِي وَفَّى : ”وفی“ جس نے پورا کیا، یہ ذکر نہیں فرمایا کہ کیا پورا کیا، تاکہ وہ عام رہے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے اور بندوں سے کیا ہوا ہر عہد پورا کیا۔ (دیکھیے توبہ: ۱۱۳) اللہ تعالیٰ نے جو حکم دیا اسے پورا کیا اور جن باتوں کے ساتھ امتحان لیا سب پوری کر دکھائیں۔ (دیکھیے بقرہ: ۱۲۳) ”الَّذِي وَفَّى“ (جس نے پورا کیا) پر مفسر ثناء اللہ امرتسری لکھتے ہیں: ”میرے خیال میں ”الَّذِي“ موصول دونوں میں سے ہر ایک کی صفت ہے۔ (واللہ اعلم)“ ”أَبِي كَلْبُ وَاحِدٌ مِنْهُمَا“ یعنی ابراہیم اور موسیٰ علیہ السلام میں سے ہر ایک نے عہد پورا کیا۔

آیت 38 أَلَا تَتَذَكَّرُ ۚ وَأَزْرَقَ ۚ وَزَرَ ۚ : ”أَلَا تَتَذَكَّرُ“ اصل میں ”أَنْ لَا تَتَذَكَّرُ“ ہے، ”أَنْ“ تفسیر یہ ہے یا ”أَنْتَ“ کی تخفیف ہے۔ یہاں سے ابراہیم اور موسیٰ علیہ السلام کے صحیفوں میں سے چند احکام نقل فرمائے ہیں، ان میں سے پہلا یہ ہے کہ کوئی بوجھ اٹھانے والی (جان) کسی دوسری (جان) کا بوجھ نہیں اٹھائے گی۔ تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ انعام (۱۶۳)، بنی اسرائیل (۱۵) اور فاطر (۱۸)۔

آیت 39 وَأَنْ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى : یعنی جس طرح کسی دوسرے کے گناہوں کا بوجھ اس پر نہیں ڈالا جائے گا اسی طرح اسے اجر و ثواب بھی انہی اعمال کا ملے گا جو اس نے خود کیے ہیں۔ یہاں ایک سوال ہے کہ قرآن و حدیث سے ثابت ہے کہ آدمی کو دوسروں کے نیک اعمال سے فائدہ پہنچتا ہے، مثلاً گناہ گاروں کے لیے انبیاء، فرشتوں اور صالحین کی شفاعت، مردوں کے لیے زندوں کی دعا (دیکھیے مومن: ۷، ۸، حشر: ۱۰) اور باپ کے عمل سے اولاد کے درجوں کا بلند ہونا تو قرآن سے ثابت ہے (دیکھیے طور: ۲۱) اور میت کی طرف سے صدقہ، صیام اور حج وغیرہ کا نافع ہونا حدیث سے ثابت ہے، تو اس

وَأَنْ سَعِيَهُ سَوْفَ يُرَى ۝ ثُمَّ يُجْزَأُ الْجَزَاءَ الْأَوْفَى ۝ وَأَنْ إِلَى رَبِّكَ
الْمُنْتَهَى ۝

اور یہ کہ اس کی کوشش جلد ہی اسے دکھائی جائے گی ۵ پھر اسے اس کا بدلہ دیا جائے گا، پورا بدلہ ۶ اور یہ کہ پھر تیرے
رب ہی کی طرف آخر پہنچنا ہے ۷

آیت کے ساتھ اس کی مطابقت کیسے ہوگی؟ جواب اس کا یہ ہے کہ یہ سب کچھ اسی شخص کے لیے نافع ہوگا جو ایمان لے آیا،
کافر کو ان میں سے کوئی چیز نفع نہیں دے گی۔ ایمان کے بعد ان چیزوں کا نافع ہونا اس کی اپنی سعی یعنی ایمان ہی کی برکت اور
اسی کا نتیجہ ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ابوطالب سے کہا تھا: «أَيُّ عَمَلٍ قُلْنَا لَهُ إِلَّا اللَّهُ، كَلِمَةً أَحْسَنَ لَكَ بِهَا
عِنْدَ اللَّهِ» [بخاری، مناقب الأنصار، باب قصة أبي طالب: ۳۸۸۴] ”اے چچا! تو ”لا الہ الا اللہ“ کہہ لے، میں اس کلمے کے
ساتھ تیری خاطر اللہ تعالیٰ کے پاس جگھڑوں گا۔“ اور ابراہیم علیہ السلام نے کہا تھا: ﴿يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ إِلَّا مَنْ أَتَى
اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ﴾ [الشعراء: ۸۹، ۸۸] ”جس دن نہ کوئی مال فائدہ دے گا اور نہ بیٹے۔ مگر جو اللہ کے پاس سلامتی والا دل
لے کر آیا۔“ کفر و شرک سے سلامت دل والے کو وہاں اس کے بیٹے بھی کام آئیں گے جو اس کے بعد اعمال صالحہ کرتے رہے
اور اس کے لیے دعا کرتے رہے اور اس کا مال بھی جو صدقہ جاریہ کی صورت میں اس کے نامہ اعمال میں ثبت ہوتا رہا۔ بلند
درجے والے مومن والدین کے ساتھ ان کی اسی اولاد کو ملایا جائے گا جو ایمان کی نعمت رکھتے ہوں گے، خواہ کسی بھی درجے کا
ہو۔ دیکھیے سورہ طور (۲۱) کی تفسیر۔

آیت 40 وَأَنْ سَعِيَهُ سَوْفَ يُرَى: ”یُرَى“ ”رَأَى يُرَى رُؤْيَةً“ (ف) سے بھی فعل مجہول ہو سکتا ہے (اس کی
کوشش دیکھی جائے گی) اور ”أَرَى يُرَى إِرَاءَةً“ (افعال) سے بھی (اس کی کوشش اس کو دکھائی جائے گی)۔ تفسیر کے لیے
دیکھیے سورہ بنی اسرائیل (۱۳، ۱۴) اور سورہ کہف (۳۹)۔

آیت 41 ثُمَّ يُجْزَأُ الْجَزَاءَ الْأَوْفَى: اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ نحل (۱۱۱) اور سورہ آل عمران (۲۵) کی تفسیر۔

آیت 42 وَأَنْ إِلَى رَبِّكَ الْمُنْتَهَى: یعنی ہر شخص نے آخر کار اپنے رب ہی کے پاس پہنچنا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿كُلُّ الْإِنْسَانِ
رُجْعُونَ﴾ [الانبیاء: ۹۳] ”سب ہماری ہی طرف لوٹنے والے ہیں۔“ ایک مطلب اس کا یہ بھی ہے کہ تمام علوم و افکار کا
سلسلہ اللہ تعالیٰ پر جا کر ختم ہو جاتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿يَسْئَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسَاهَا فِيمَا أَنْتَ مِنْ ذِكْرهَا
إِلَى رَبِّكَ مُنْتَهَاهَا﴾ [النازعات: ۴۲ تا ۴۴] ”وہ تجھ سے قیامت کے متعلق پوچھتے ہیں کہ اس کا قیام کب ہے؟ اس کے
ذکر سے تو کس خیال میں ہے؟ تیرے رب ہی کی طرف اس (کے علم) کی انتہا ہے۔“

وَأَنَّهُ هُوَ أَضْحَكَ وَأَبْكَى ۖ وَأَنَّهُ هُوَ أَمَاتٌ وَأَحْيَا ۖ وَأَنَّهُ خَلَقَ الزُّوجَيْنِ الذَّكَرَ
وَالْأُنثَى ۖ مِنْ نُطْفَةٍ إِذَا تُمْنَى ۖ وَأَنَّهُ عَلَيْهِ النَّشَأَةُ الْأُخْرَى ۖ وَأَنَّهُ هُوَ أَغْنَى
وَأَقْنَى ۖ وَأَنَّهُ هُوَ رَبُّ الشِّعْرَى ۖ وَأَنَّهُ أَهْلَكَ عَادًا الْأُولَى ۖ وَثَمُودًا قَمًا
أَبْلَى ۖ

اور یہ کہ حقیقت یہ ہے کہ اسی نے ہنسایا اور رلایا ۱۳ اور یہ کہ حقیقت یہ ہے کہ اسی نے موت دی اور زندگی بخشی ۱۴ اور
یہ کہ اسی نے دو قسمیں نر اور مادہ پیدا کیں ۱۵ ایک قطرے سے، جب وہ ٹپکایا جاتا ہے ۱۶ اور یہ کہ اسی کے ذمہ
دوسری دفعہ پیدا کرنا ہے ۱۷ اور یہ کہ اسی نے غنی کیا اور خزانہ بخشا ۱۸ اور یہ کہ وہی شعرئی (ستارے) کا رب ہے ۱۹
اور یہ کہ اسی نے پہلی قوم عاد کو ہلاک کیا ۲۰ اور ثمود کو، پس (کسی کو) باقی نہیں چھوڑا ۲۱

آیت 43-49: ۱ وَأَنَّهُ هُوَ أَضْحَكَ وَأَبْكَى..... اس سے پچھلی آیات میں ان معاملات کا ذکر تھا جو انسان کے اختیار
میں ہیں، اختیار کے باوجود ان میں انسان کی کوتاہی ایک مسلم امر ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿كَأَنَّمَا يَغْنَبُ غُنَابًا﴾
[عس: ۲۳] ”ہرگز نہیں، ابھی تک اس نے وہ کام پورا نہیں کیا جس کا اس نے اسے حکم دیا۔“ پھر کسی کے پاس اپنے ترکے
کی کیا گنجائش ہے؟ اب ان مغالطات کا ذکر ہے جن میں انسان کا کچھ اختیار نہیں، مثلاً ہنسنا، رلانا، مارنا، جلانا (زندہ کرنا)،
ایک نطفہ سے کسی کو مرد اور کسی کو عورت بنا دینا، مارنے کے بعد دوبارہ زندہ کر دینا، غنی کر دینا، خزانے بخش دینا، مشرکین جن ستاروں
کو پوجتے ہیں ان سب کا، خصوصاً ”شعرئی“ کا رب ہونا اور بڑی بڑی قوت والی قوموں کو نافرمانی پر ہلاک کر دینا، یہ سب کچھ
صرف اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ پھر جب انسان اس قادر مطلق کے سامنے اتنا بے بس ہے کہ اس کا رونا، ہنسنا اور مرنا جیسا بھی اس کے
اختیار میں نہیں اور نہ ہی اسے اگلے لمحے تک کی خبر ہے کہ اسے ہنسنا ہے یا رونا، جیسا ہے یا مرنا، تو وہ اپنا ترکہ کس منہ سے کرتا ہے؟
۲ وَأَنَّهُ هُوَ أَغْنَى وَأَقْنَى.....: ”أَقْنَى“ ”قِنِيَّة“ سے ہے جس کا معنی خزانہ ہے۔ یعنی اسی نے جمع کرنے اور خزانہ بنانے
کے لیے مال عطا فرمایا۔ آیت: ﴿وَأَنَّهُ هُوَ أَضْحَكَ وَأَبْكَى﴾ اور یہ آیت: ﴿وَأَنَّهُ هُوَ أَغْنَى وَأَقْنَى﴾ دونوں میں ”أَنَّهُ“
کے بعد ”هُوَ“ ضمیر سے حصر پیدا ہو رہا ہے، یعنی وہی ہے جس نے ہنسایا اور رلایا.....

۳ وَأَنَّهُ هُوَ رَبُّ الشِّعْرَى: ہر چیز کا رب ہونے کے باوجود اس ستارے کا رب ہونے کا خاص طور پر ذکر اس لیے فرمایا کہ
بعض عرب مثلاً خزانہ وغیرہ اس کی پرستش کرتے تھے، اس لیے فرمایا کہ تم جس ستارے کی پرستش کرتے ہو تمہاری قسمیں اس
کے اختیار میں نہیں، وہ تو خود اپنی قسمت کا مالک نہیں، بلکہ اس کا رب بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

آیت 50-51: ﴿وَأَنَّهُ أَهْلَكَ عَادًا الْأُولَى.....: ”عادِ أُولَى“ وہ قدیم قوم جس کی طرف ہود علیہ السلام بھیجے گئے تھے۔ انہیں

”اولی“ یا تو ان کے قدیم ہونے کی وجہ سے کہا گیا، جیسے فرمایا: ﴿لَا تَبْرَحْنَ شِبْرًا مِنَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَى﴾ [الأحزاب:
کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

وَقَوْمٌ نُوحٍ فَمِنْ قَبْلُ ۖ إِنَّهُمْ كَانُوا هُمْ أَظْلَمَ وَأَطْغَى ۗ وَالْمُؤْتَفِكَةَ أَهْوَى ۙ
فَغَشَّيْنَا مَا غَشَّى ۙ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكَ تَتَمَارَى ۙ

اور ان سے پہلے نوح کی قوم کو، یقیناً وہی زیادہ ظالم اور زیادہ حد سے بڑھے ہوئے تھے ﴿۵۰﴾ اور الٹ جانے والی بستی کو گرامار ﴿۵۱﴾ پس ڈھانپ دیا اسے جس سے ڈھانپا ﴿۵۲﴾ پس تو اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس میں شک کرے گا؟ ﴿۵۳﴾

﴿۲۳﴾ ”پہلی جاہلیت کے زینت ظاہر کرنے کی طرح زینت ظاہر نہ کرو۔“ یا اس وجہ سے کہ ان پر عذاب آنے کے وقت جو لوگ بچ گئے ان کی نسل کو عاؤ آخری یا عاؤ ثانیہ کہا گیا۔ اکثر کے مطابق ہود علیہ السلام کی قوم کو عاؤ اولیٰ اور صالح علیہ السلام کی قوم شمود کو عاؤ آخری کہا جاتا ہے۔ قوم عادی کی ہلاکت کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۃ اعراف (۷۲)، حاقہ (۸۳-۶)، حم سجدہ (۱۵، ۱۶)، قمر (۱۸-۲۰)، ذاریات (۲۱، ۲۲)، اور انفجاف (۲۱-۲۵) اور قوم شمود کے تعارف کے لیے دیکھیے سورۃ اعراف (۳۳-۷۳)۔

آیت 52 ﴿۱﴾ وَ قَوْمٌ نُوحٍ فَمِنْ قَبْلُ: یہاں عاؤ شمود کا ذکر قوم نوح سے پہلے اس لیے فرمایا کہ یہ لوگ عرب کے رہنے والے تھے اور قریش انہیں اچھی طرح جانتے تھے۔

﴿۲﴾ إِنَّهُمْ كَانُوا هُمْ أَظْلَمَ وَأَطْغَى: ضمیر ”ہم“ حصر کا فائدہ دے رہی ہے۔ ظلم اور سرکشی میں قوم نوح ہی کو سب سے بڑھ کر اس لیے قرار دیا کہ اور کوئی قوم ایسی نہیں گزری جس کے پیغمبر نے انہیں ساڑھے نو سو سال نصیحت کی ہو اور اس کے باوجود وہ سرکشی پر اڑی رہی ہو۔

آیت 53 ﴿۱﴾ وَالْمُؤْتَفِكَةَ أَهْوَى: ”الْمُؤْتَفِكَةَ“ (انفعال) سے اسم فاعل ہے، الٹنے والی۔ مراد قوم لوط ہے۔ سورۃ حاقہ (۹) میں ”الْمُؤْتَفِكَةَ“ جمع کے ساتھ آیا ہے، مراد الٹ جانے والی بستیاں ہے۔ ”أَهْوَى“ ”هَوَى يَهْوِي“ (ض) ”گرنے۔“ ”أَهْوَى يَهْوِي“ (افعال) ”گراتا۔ ان کے اس نام کی وجہ کے لیے دیکھیے سورۃ ہود (۸۲) اور سورۃ حجر (۷۳)۔ آیت 54 ﴿۱﴾ فَغَشَّيْنَا مَا غَشَّى: ”غَشَّى يَغْشَى“ (ع) کسی چیز کا دوسری کو ڈھانپ لینا۔ ”غَشَّى يَغْشَى“ (تفعیل) کسی چیز پر ڈھانپنے والی چیز ڈال دینا، کسی چیز کو دوسری سے ڈھانپ دینا۔ یہ انداز بیان اس عذاب کی ہولناکی کے بیان کے لیے ہے۔ مزید دیکھیے سورۃ طہ (۷۸)۔

آیت 55 ﴿۱﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكَ تَتَمَارَى: ”تَتَمَارَى يَتَمَارَى“ (تفاعل) شک کرنا۔ ”الآءُ“ ”إِنِّي“ (جو اصل میں ”إِنِّي“ تھا) کی جمع ہے، نعمتیں، جیسا کہ ”یعنی“ کی جمع ”أَمْعَاءُ“ ہے، استزیاں۔ یہاں سوال ہے کہ ان اقوام کی ہلاکت کے ذکر میں کون سی نعمت بیان ہوئی ہے جس میں شک کی گنجائش ہی نہیں۔ استاد محمد عبیدہ لکھتے ہیں: ”سیاقی کلام کی بنا پر یہاں نعمت سے مراد ظالم و سرکش قوم کی تباہی ہے، معصوم ہوا کہ کسی ظالم و سرکش قوم کو تباہ کرنا بھی انسانیت پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے۔“ (اشرف الحواشی) ایک جواب اس کا یہ ہے کہ ظلم اور سرکشی کے انجام سے آگاہ کر دینا بھی بہت بڑا انعام ہے،

هَذَا نَذِيرٌ مِّنَ النَّذْرِ الْأُولَىٰ ﴿٥٦﴾ أَزِفَتِ الْأَرْزَقَةُ ﴿٥٧﴾ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُونِ اللَّهِ كَاشِفَةٌ ﴿٥٨﴾
 أَقْبِنَ هَذَا الْحَدِيثِ تَعْجِبُونَ ﴿٥٩﴾ وَ تَضْحَكُونَ وَلَا تَتَّبِعُونَ ﴿٦٠﴾

یہ پہلے ڈرانے والوں میں سے ایک نذیر ہے۔ اللہ کے قریب آگئی وہ قریب آنے والی ﴿٥٦﴾ جسے اللہ کے سوا کوئی
 ہٹانے والا نہیں ﴿٥٧﴾ اور اس نذیر سے تم قریب کہتے ہو ﴿٥٨﴾ اور ہنستے ہو اور بولتے نہیں ہو ﴿٥٩﴾

جیسا کہ سورہ رحمن میں مجرموں کے لیے جہنم کا عذاب بیان کرنے کے بعد فرمایا: ﴿فَأَنبَأِي آلَهُمْ نَكْتُمُكَذِبِينَ﴾ [الرحمن: ۴۵] "تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟"

آیت 56 هَذَا نَذِيرٌ مِّنَ النَّذْرِ الْأُولَىٰ: یعنی یہ رسول بھی ان ہلاک کی جانے والی قوموں کو ڈرانے والے پہلے رسولوں
 کی جماعت کا ایک فرد ہے، جو تمہیں ڈرانے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ اس کا آنا کوئی انوکھی بات نہیں جو تمہاری سمجھ میں نہ آ رہی ہو،
 جیسا کہ فرمایا: ﴿قُلْ مَا كُنْتُ بِدُعَاةِ النَّاسِ عَلَىٰ الْإِسْلَامِ﴾ [الأحقاف: ۹] "کہہ دے میں رسولوں میں سے کوئی انوکھا نہیں ہوں۔"

آیت 57 أَزِفَتِ الْأَرْزَقَةُ: "الْأَرْزَقَةُ" کے معنی کے لیے دیکھیے سورہ مومن (۱۸) کی تفسیر۔ یعنی یہ رسول تمہیں جس آنے
 والی قیامت سے ڈراتا ہے وہ بالکل قریب آ چکی ہے، اس لیے ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر سنبھل جاؤ، یہ مت سوچو کہ ابھی بہت
 وقت پڑا ہے، کیونکہ کسی کو خبر نہیں کہ اگلا سانس آئے گا یا نہیں اور جس کی موت آگئی اس کی قیامت تو قائم ہوگئی، کیونکہ اس
 کے ساتھ ہی عمل کی مہلت ختم ہے۔

آیت 58 لَيْسَ لَهَا مِنْ دُونِ اللَّهِ كَاشِفَةٌ: "كَاشِفَةٌ" میں "تاء" مبالغہ کی بھی ہو سکتی ہے اور تانیث کی بھی، تانیث کی
 ہو تو یہ "نَفْسٌ" کی صفت ہے۔ اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ اللہ کے سوا کوئی اسے ہٹانے والا نہیں، جیسے فرمایا:
 ﴿وَإِنْ يَسْأَلْكَ اللَّهُ بَعْضُ أَمْرِ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ﴾ [الأنعام: ۱۷] "اور اگر اللہ تجھے کوئی تکلیف پہنچائے تو اس کے سوا
 کوئی اسے دور کرنے والا نہیں۔" دوسرا یہ کہ اللہ کے سوا اسے کوئی کھولنے والا یعنی اس کا وقت جاننے اور ہٹانے والا نہیں،
 جیسا کہ فرمایا: ﴿قُلْ إِنَّمَا عَلَّمَهَا عِنْدَ رَبِّي، لَا يُجَلِّئُهَا يَوْمَئِذٍ إِلَّا هُوَ﴾ [الأعراف: ۱۸۷] "کہہ دے اس کا علم تو میرے
 رب ہی کے پاس ہے، اسے اس کے وقت پر اس کے سوا کوئی ظاہر نہیں کرے گا۔"

آیت 59 أَقْبِنَ هَذَا الْحَدِيثِ تَعْجِبُونَ: "هَذَا الْحَدِيثِ" سے مراد رسولوں کو جھٹلانے والی اقوام کے عبرتناک انجام
 کی اور قیامت قریب ہونے کی بات ہے جو ابھی بیان ہوئی ہے۔ فرمایا بھلا یہ کوئی انوکھی اور ناقابل یقین بات ہے جس پر تم
 تعجب کر رہے ہو؟

آیت 60 وَ تَضْحَكُونَ وَلَا تَتَّبِعُونَ: یعنی بجائے اس کے کہ تم یہ سن کر ڈر جاتے کہہیں ہم پر بھی ایسا عذاب نہ آ جائے
 اور رونے لگتے، الناس کا مذاق اڑاتے اور ہنستے ہو۔

وَأَنْتُمْ سَيِّدُونَ ﴿۶۱﴾ فَاسْجُدُوا لِلَّهِ وَاعْبُدُوا ﴿۶۲﴾

اور تم غافل ہو ﴿۶۱﴾ تو اللہ کو سجدہ کرو اور (اس کی) بندگی کرو ﴿۶۲﴾

آیت 61 : وَأَنْتُمْ سَيِّدُونَ: ”سَمَدٌ يَسْمُدُ سَمُودًا“ (ن) کھیل کود میں مشغول ہونا، غافل ہونا، گانا، تکبر سے سر اٹھا کر چلنا۔ یعنی بجائے رونے کے تم کھیل کود، گانے بجانے اور اپنے تکبر میں غافل رہ کر ہنستے پھرتے ہو۔

آیت 62 : ﴿۱﴾ فَاسْجُدُوا لِلَّهِ وَاعْبُدُوا: یعنی رسول کے اس ڈرانے کا حق یہ ہے کہ تم اپنا تمام تر تکبر اور غفلت ترک کر کے اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جاؤ اور اپنے بنائے ہوئے تمام شریکوں کو چھوڑ کر ایک اللہ کی عبادت کرو۔

﴿۲﴾ یہ سورت مکہ میں نازل ہونے والی ابتدائی سورتوں میں سے ہے اور پہلی سورت ہے جس میں سجدہ کی آیت نازل ہوئی۔ اس کی تاثیر اور زور بیان کا یہ عالم ہے کہ جب آپ ﷺ نے اسے عام مجمع میں پڑھا، جس میں مسلمانوں کے ساتھ مشرکین بھی موجود تھے تو مسلمانوں کے ساتھ مشرکین بھی بے اختیار سجدے میں گر گئے۔ صحیح بخاری میں اس کے متعلق دو احادیث آئی ہیں۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: «أَوَّلُ سُورَةٍ أَنْزَلَتْ فِيهَا سَجْدَةٌ وَالنَّجْمِ قَالَ فَسَجَدَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَسَجَدَ مَنْ خَلْفَهُ، إِلَّا رَجُلًا رَأَيْتُهُ أَخَذَ كَفًّا مِنْ تُرَابٍ فَسَجَدَ عَلَيْهِ فَرَأَيْتُهُ بَعْدَ ذَلِكَ قَتَلَ كَافِرًا، وَهُوَ أُمَيَّةُ بْنُ خَلْفٍ» [بخاری، التفسیر، سورة النجم، باب: ﴿فاسجدوا لله واعبدوا﴾: ۴۸۶۳] ”پہلی سورت جس میں سجدہ کی آیت نازل ہوئی ”وَالنَّجْمِ“ تھی، تو رسول اللہ ﷺ نے سجدہ کیا اور آپ کے پیچھے جتنے لوگ تھے سب نے سجدہ کیا، سوائے ایک آدمی کے۔ میں نے اسے دیکھا کہ اس نے مٹی کی ایک مٹھی پکڑی اور اس پر سجدہ کر لیا۔ پھر میں نے بعد میں دیکھا کہ وہ کافر ہونے کی حالت میں قتل ہوا اور وہ امیہ بن خلف تھا۔“ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: «سَجَدَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالنَّجْمِ وَسَجَدَ مَعَهُ الْمُسْلِمُونَ وَالْمُشْرِكُونَ وَالْحِجْرِيُّ وَالْإِنْسُ» [بخاری، التفسیر، سورة النجم، باب: ﴿فاسجدوا لله واعبدوا﴾: ۴۸۶۲] ”رسول اللہ ﷺ نے سورہ نجم میں سجدہ کیا اور آپ کے ساتھ مسلمانوں، مشرکوں اور جن وانس نے سجدہ کیا۔“



اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَاشْتَقَى الْقَمْرُ ①

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

قیامت بہت قریب آگئی اور چاند پھٹ گیا ①

عبد اللہ بن عبد اللہ بیان کرتے ہیں کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید الاضحیٰ اور عید الفطر میں کیا قراءت کرتے تھے؟“ انھوں نے کہا: ”آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان دونوں میں ”قِيَامُ وَالْقُرْآنِ الْمَجِيدِ“ اور ”اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَاشْتَقَى الْقَمْرُ“ کی قراءت کیا کرتے تھے۔“ [مسلم، صلاة العیدین، باب ما یقرأ به فی صلاة العیدین: ۸۹۱]

آیت 1 ① اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ: ”اِقْتَرَبْتُ“ ”قُرْبٌ یَقْرُبُ“ (ک، ع) میں سے باب انتقال کا ماضی معلوم ہے۔ حروف میں اضافے سے معنی میں مبالغہ پیدا ہوتا ہے، جیسے ”قَدَّرَ“ اور ”اِقْتَدَرَ“ ہے، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے ”قیامت بہت قریب آگئی ہے۔“ ویسے تو ہر آنے والی چیز قریب ہی ہے، مگر قیامت کو بہت قریب اس لیے فرمایا کہ دنیا پر گزرے ہوئے وقت کے مقابلے میں باقی رہنے والا وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ اب اس کے فنا اور قیامت کے قیام کا وقت بہت ہی قریب ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں، آپ کے بعد کوئی اور نبی نہیں، بلکہ قیامت ہی آئے گی۔ سہل بن سعد رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انگوٹھے کے ساتھ والی انگلی اور درمیانی انگلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ﴿بُعِثْتُ أَنَا وَالسَّاعَةَ كَهَاتَيْنِ﴾ [مسلم، الفتن، باب قرب الساعة: ۲۹۵۰۔ بخاری: ۶۵۰۲] ”مجھے اور قیامت کو ان دو (انگلیوں) کی طرح بھیجا گیا ہے۔“

② وَاشْتَقَى الْقَمْرُ: یعنی چاند کا پھٹنا اس بات کی علامت ہے کہ قیامت، جس کی تمہیں خبر دی جاتی رہی ہے، بہت قریب آگئی ہے، کیونکہ جب چاند جیسا عظیم کرہ پھٹ سکتا ہے تو زمین و آسمان، سورج اور ستارے بھی پھٹ کر دوسری صورت اختیار کر سکتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمَوَاتُ وَبَرَزُوا لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾ [ابراہیم: ۴۸] ”جس دن یہ زمین اور زمین سے بدل دی جائے گی اور سب آسمان بھی اور لوگ اللہ کے سامنے پیش ہوں گے، جو اکیلا ہے، بڑا زبردست ہے۔“

③ قرآن مجید میں ماضی کے صیغے مستقبل کے معنی میں بھی آتے ہیں۔ مقصد یہ بتانا ہوتا ہے کہ ان کا واقع ہونا یقینی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَقَالَ الشَّيْطَانُ لَمَّا قُضِيَ الْأَمْرُ إِنَّ اللَّهَ وَعَدَكُمْ وَعَدَ الْحَقُّ وَعَدْتُكُمْ فَأَخْلَفْتُكُمْ﴾ [ابراہیم: ۲۲] ”اور شیطان کہے گا، جب سارے کام کا فیصلہ کر دیا جائے گا کہ بے شک اللہ نے تم سے وعدہ کیا، سچا وعدہ اور میں نے تم سے وعدہ کیا تو میں نے تم سے خلاف ورزی کی۔“ اس مقام پر بھی بعض حضرات کا کہنا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ چاند پھٹ جائے گا، مگر حقیقت یہ ہے کہ قرآن و حدیث دونوں سے ثابت ہے کہ یہاں ماضی کا معنی ہی مراد ہے اور آیت کا مطلب کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

یہی ہے کہ چاند پھٹ گیا۔ ایک ہی آیت میں ایک فعل ماضی کا ترجمہ ماضی اور دوسرے فعل ماضی کا ترجمہ مستقبل کرنا ویسے ہی بے جوڑ لگتا ہے کہ کہا جائے ”قیامت بہت قریب آگئی اور چاند پھٹ جائے گا۔“ پھر اگر مراد مستقبل میں چاند کا پھटना ہوتا تو الفاظ یہ ہونے چاہئیں تھے: ”اِنْتَبِئِ السَّاعَةَ وَ انْشَقَّ الْقَمَرُ“ ”قیامت آگئی اور چاند پھٹ گیا۔“ پھر دونوں جگہ ماضی کا معنی مستقبل کرنا درست ہوتا۔ اس آیت سے بعد والی آیات سے بھی ظاہر ہے کہ یہ واقعہ ہو چکا ہے، تفصیل آگے آئے گی۔

صحیح احادیث سے بھی چاند کا پھटना ثابت ہے اور یہ واقعہ اتنی کثیر سندوں کے ساتھ بیان ہوا ہے کہ اکثر محدثین و مفسرین اسے متواتر قرار دیتے ہیں۔ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ”چاند پھٹنے کے واقعہ پر علماء کا اتفاق ہے کہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہو چکا ہے اور یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حیران کن معجزات میں سے ایک تھا۔“ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اس مقام پر بہت سی احادیث نقل فرمائی ہیں، یہاں چند احادیث نقل کی جاتی ہیں: ① عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں: «إِنْشَقَّ الْقَمَرُ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِرْقَتَيْنِ، فِرْقَةٌ فَوْقَ الْحَبْلِ وَفِرْقَةٌ دُونَهُ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اشْهَدُوا» [بخاری، التفسیر، باب: ﴿وَإِنْشَقَّ الْقَمَرُ...﴾: ۴۸۶۴] ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں چاند دو ٹکڑوں میں پھٹ گیا، ایک ٹکڑا پہاڑ کے اوپر تھا اور ایک ٹکڑا اس کی دوسری جانب۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”گواہ ہو جاؤ۔“ ② ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: «إِنْشَقَّ الْقَمَرُ فِي زَمَانِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ» [بخاری، التفسیر، باب: ﴿وَإِنْشَقَّ الْقَمَرُ...﴾: ۴۸۶۶] ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں چاند پھٹ گیا۔“ ③ انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: «سَأَلَ أَهْلُ مَكَّةَ أَنْ يُرِيَهُمْ آيَةَ فَأَرَاهُمُ انْتِشَاقَ الْقَمَرِ» [بخاری، التفسیر، باب: ﴿وَإِنْشَقَّ الْقَمَرُ...﴾: ۴۸۶۷] ”اہل مکہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی معجزہ دکھانے کا سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں چاند کا پھटना دکھایا۔“ ④ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: «إِنْشَقَّ الْقَمَرُ بِمَكَّةَ حَتَّى صَارَ فِرْقَتَيْنِ، فَقَالَ كُفَّارُ قُرَيْشٍ أَهْلُ مَكَّةَ هَذَا سِحْرٌ، يَسْحَرُكُمْ بِهِ ابْنُ أَبِي كَبِشَةَ، انظُرُوا السُّفَارَ، فَإِنْ كَانُوا زَاوُوا مَا رَأَيْتُمْ فَقَدْ صَدَقَ وَإِنْ كَانُوا لَمْ يَزُوا مِثْلَ مَا رَأَيْتُمْ فَهُوَ سِحْرٌ سَحَرَكُمْ بِهِ. قَالَ فَسُئِلَ السُّفَارُ قَالَ وَقَدِمُوا مِنْ كُلِّ وَجْهِ فَقَالُوا رَأَيْنَاهُ» [دلائل النبوة للبيهقي: ۲۶۶/۲، ۲۶۷، و سندہ صحیح] ”مکہ میں چاند پھٹ گیا، یہاں تک کہ دو ٹکڑے ہو گیا تو مکہ والے کفار قریش کہنے لگے: ”یہ جادو ہے جو ابن ابی کبشہ نے تم پر کر دیا ہے، جو لوگ سفر میں گئے ہوئے ہیں ان کا انتظار کرو، اگر انھوں نے وہ دیکھا ہے جو تم نے دیکھا ہے تو اس نے واقعی سچ کہا ہے اور اگر انھوں نے وہ نہیں دیکھا جو تم نے دیکھا ہے تو یہ جادو ہے جو اس نے تم پر کر دیا ہے۔“ فرمایا: ”تو سفر سے آنے والوں سے پوچھا گیا جو ہر جانب سے آرہے تھے تو انھوں نے بتایا کہ ہم نے اسے دیکھا ہے۔“ تفسیر ابن کثیر کے محقق حکمت بن بشیر نے اس پر لکھا ہے کہ ابن کثیر نے فرمایا: ”اسے ابن جریر نے بھی روایت کیا ہے اور یہ الفاظ زائد بیان کیے ہیں: «فَأَنْزَلَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ: ﴿إِفْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ﴾“ ”یعنی اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔“

④ بعض واعظ حضرات بیان کرتے ہیں کہ چاند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلی کے اشارے سے دو ٹکڑے ہوا، انگلی کے اشارے کا کوئی ثبوت نہیں۔ اسی طرح بعض کا کہنا ہے کہ چاند کا ایک ٹکڑا آپ کے سر بیان سے ہو کر نکل گیا، بالکل ہی لغو بات ہے۔

۵) انشاقِ قمر پر کیے جانے والے شہادت اور اعتراضات کے متعلق مفسر عبدالرحمن کیلانی کا کلام بہت عمدہ ہے، وہ یہاں نقل کیا جاتا ہے: ”آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قیامت اور انشاقِ قمر کا باہمی تعلق یہ ہے کہ انشاقِ قمر قیامت کی ایک نشانی ہے جو واقع ہو چکی ہے، لہذا اسے بس اب قریب ہی سمجھو۔ جب کفار نے اپنی آنکھوں سے یہ معجزہ دیکھ لیا تو کہنے لگے کہ یا تو چاند پر جادو کر دیا گیا ہے یا ہماری نظروں پر جو ہمیں ایسا نظر آنے لگا ہے۔ اس حیرانی میں ایک شخص نے کہا کہ اگر ہماری نظر بند کر دی گئی ہے تو آس پاس کے لوگوں سے پوچھ لو۔ چنانچہ آس پاس کے لوگوں نے اس کی تصدیق کر دی، مگر یہ کافر اپنی ہٹ دھرمی سے باز نہ آئے۔ اس آیت پر منکرین معجزات کئی طرح کے اعتراضات کرتے ہیں۔ پہلا اعتراض معنی کی تاویل سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس آیت میں صیغہ ماضی کا معنی استقبال میں لیا جائے گا اور معنی یہ ہوگا کہ ”جب قیامت قریب آجائے گی اور چاند پھٹ جائے گا۔“ جیسا کہ ”إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ“ اور اس جیسی دوسری آیات کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ تاویل اور دلیل اس لیے غلط ہے کہ جہاں قیامت کے حوادث کا ذکر آیا ہے، مثلاً آسمان پھٹ جائے گا، ستارے بے نور ہو جائیں گے اور جہزے لگیں گے، زمین پر سخت زلزلے آئیں گے، پہاڑ اڑتے پھریں گے وغیرہ، وہاں ان باتوں کو کفار کے سحر کہنے کا کوئی تعلق نہیں اور نہ قرآن میں ایسی آیات کے ساتھ سحر کا ذکر آیا ہے۔ کافروں کا چاند کے پھٹنے کو جادو کہنا اور اس پر کفار کی تکرار ہی اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ ایک حسی معجزہ تھا جو وقوع پذیر ہو چکا ہے۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اگر یہ واقعہ فی الواقع ظہور میں آچکا ہے تو لوگوں کی ایک کثیر تعداد کو اس کا علم ہونا چاہیے تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ واقعہ رات کا ہے، دن کا نہیں، جب اکثر لوگ سوئے ہوئے ہوتے ہیں۔ پھر اس وقت آدمی دنیا میں تو ویسے ہی سورج نکلا ہوا تھا جہاں یہ واقعہ نظر نہیں آسکتا تھا اور باقی آدمی دنیا میں سے بھی صرف ان مقامات پر نظر آسکتا تھا جو منیٰ کے مشرق میں واقع تھے۔ پھر اس واقعہ کا کوئی اعلان بھی نہیں ہوا تھا، جیسے آج کل جنسیوں اور اخباروں سے معلوم ہو جاتا ہے، یا رصد گاہوں کی طرف سے اعلان کیا جاتا ہے، لہذا لوگ کوئی اس بات کے منتظر بھی نہیں بنیں تھے کہ چاند پھٹے تو ہم اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ علاوہ ازیں ہم دیکھتے ہیں کہ چاند گرہن کئی گھنٹوں تک لگا رہتا ہے، لوگوں کو پہلے خبر بھی دی جا چکی ہوتی ہے لیکن لوگوں کی اکثریت چاند گرہن لگنے سے غافل ہوتی ہے اور یہ انشاقِ قمر تو صرف ایک لمحہ کے لیے واقع ہوا تھا، اسے کون دیکھتا؟ اور آس پاس کے لوگوں نے شہادت دے ہی دی تھی۔

تیسرا اعتراض یہ ہے کہ ایسے اہم واقعہ کا تاریخ میں بھی ذکر ہونا چاہیے تھا۔ اس اعتراض کے کئی جواب ہیں، پہلا یہ کہ سب سے زیادہ مستند تاریخ حدیث کی کتابوں سے ہی دستیاب ہو سکتی ہے اور ان میں یہ واقعہ موجود ہے۔ دوسرا یہ کہ اس دور میں جیسی اور جتنی توجہ تاریخ نویسی پر دی جاتی تھی وہ سب کو معلوم ہے۔ تیسرا یہ کہ جب دنیا کے لوگوں کی اکثریت اور ایسے ہی تاریخ نویسوں نے اسے دیکھا ہی نہ ہو تو لکھیں کیا؟ اور چونکہ یہ کہ تاریخ بھی اس واقعہ کے اندارج سے یکسر خالی نہیں۔ تاریخ فرشتہ میں مذکور ہے، مالی بار کے مہاراجہ نے یہ واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور بالآخر یہ واقعہ اس کے اسلام لانے کا سبب بنا تھا۔

چوتھا اعتراض یہ ہے کہ بیتِ دانوں اور نمکین نے بھی اس واقعہ کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر چاند پھٹنے سے اس کی رفتار میں فرق آتا یا وہ اپنا مدار بدل لیتا یا مدار سے ہٹ کر چلنے لگتا تو یہ باتیں اس قابل تھیں کہ بیتِ دان اس کا ذکر کرتے، لیکن جب ان میں سے کوئی چیز بھی واقع نہ ہوئی تو وہ کیا ذکر کریں؟

اور پانچواں اعتراض یہ ہے کہ یہ واقعہ خرقِ عادت ہے اور ان کا دراصل سب سے اہم یہی اعتراض ہے جو انھیں تسلیم کرنے سے روکتا ہے اور وہ ادھر ادھر ہاتھ مارتے اور مختلف قسم کے اعتراض اور شکوک پیدا کرتے ہیں اور حقیقتاً ان کا یہ انکار اللہ کی قدرتِ کاملہ کا انکار ہے۔ بہر حال یہ بات بھی آج بعید از عقل نہیں رہی۔ ہر سیارے کے پیٹ میں آتشیں مادے یا پتھلی اور کھلوتی ہوئی دھاتیں موجود ہیں جن کا درجہ حرارت ہزار ہا درجہ سنٹی گریڈ ہوتا ہے۔ یہ مہیب لاوے ان عظیم الجثہ کروں کو کسی وقت بھی دولت کر سکتے ہیں۔ پھر ان کی مرکزی مقناطیسی قوت، جسے آج کی زبان میں قوتِ ثقل کہتے ہیں وہ ان جدا شدہ ٹکڑوں کو ملا کر جوڑ بھی دیتی ہے اور ایسا عمل فضاے بسیط میں ہوتا رہتا ہے۔ یہ کہلشائیں اسی طرح وجود میں آئی ہیں اور آج بھی یہ عمل بند نہیں ہوا بلکہ بدستور جاری ہے۔ علاوہ ازیں شہابِ ثاقب کسی سیارے کے اس طرح سے جدا شدہ ٹکڑے کا نام ہے جو کبھی علیحدہ ہو کر پھر جڑ جاتا ہے، کبھی فضا میں ہی گر کر گرم ہو جاتا ہے اور کبھی کبھار زمین پر بھی آگرتا ہے۔ فضاے بسیط میں جو کچھ ہو رہا ہے اگر انسان کو اس کا صحیح طور پر علم ہو جائے تو وہ انشاقاقی قمر کے واقعہ پر کبھی تعجب نہ کرے۔ انسان کو کیا معلوم کہ اللہ کی قدرتوں کا دائرہ کتنا وسیع ہے اور وہ کس قدر حکمتِ بالغہ سے اس نظامِ کائنات کو چلا رہا ہے۔“ (تیسیر القرآن)

6 ایک اہم سوال یہاں یہ ہے کہ کفار مکہ جب اپنے سوال کے جواب میں اتنا بڑا معجزہ دیکھ کر ایمان نہیں لائے تو ان پر پہلی قوموں کی طرح عذاب آجانا چاہیے تھا جو نبیوں کے معجزے دیکھ کر ایمان نہیں لائی تھیں۔ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ پہلی امتوں کو دکھائے جانے والے معجزات ان کے ایمان لانے کی شرط کے ساتھ بطور عناد جس معجزے کا بھی مطالبہ کیا گیا ان میں سے ایک بھی پورا نہیں کیا گیا، بلکہ یہی کہنے کا حکم ہوا: ﴿فَلَنْ نُعْطِيكَ إِيَّاهُ أَبَدًا بِمَا كَفَرْتَ﴾ [سورہ بقرہ: ۲۴] ”تو کہہ میرا رب پاک ہے، میں تو ایک بشر کے سوا کچھ نہیں جو رسول ہے۔“ مزید دیکھیے سورہ بنی اسرائیل (۹۳۲-۹۳۰) کی تفسیر۔ اس مقصد کے لیے آپ کو ایک ہی معجزہ پیش کرنے کا حکم تھا اور وہ ہے قرآن مجید کہ بہت ہے تو اس جیسی ایک سورت ہی بنا کر لے آؤ۔ اور یہ اس امت پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے کہ اس معجزے یا کسی بھی معجزے پر ایمان نہ لانے والوں پر عذابِ استیصال یعنی ایسا عذاب نہیں آیا اور نہ آئے گا جو ان کا نام و نشان ہی منادے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ عنکبوت (۵۰، ۵۱) کی تفسیر۔ البتہ اس شرط کے بغیر لوگوں کی درخواست پر بہت سے معجزے صادر ہوئے ہیں، مثلاً سورہ بنی اسرائیل (۹۳۳-۹۳۰) میں جن معجزوں کا کفار نے بطور شرط مطالبہ کیا اور ان کا مطالبہ پورا نہیں کیا گیا، ان میں سے ایک یہ تھا کہ آپ ہمارے لیے زمین سے کوئی چشمہ جاری کر دیں، لیکن ایسی شرط کے بغیر یہ معجزہ متعدد بار واقع ہوا ہے، جن میں سے آپ ﷺ کی انگلیوں سے پانی جاری ہونے اور حدیبیہ کے موقع پر کنوئیں میں تیر ڈالنے سے پانی جاری ہونے کے واقعات جو سب جانتے ہیں۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ﴿إِنْ كُنْتُمْ

وَإِنْ يَرَوْا آيَةً يُعْرَضُوا وَيَقُولُوا سِحْرٌ مُّسْتَبْرَ ۝۲

اور اگر وہ کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ (یہ) ایک جادو ہے جو گزر جانے والا ہے ﴿ ۲ ﴾

تَعْدُونَ الْآيَاتِ عَذَابًا وَ إِنَّا كُنَّا نَعُدُّهَا عَلَىٰ عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَرَكَةً لَقَدْ كُنَّا نَأْكُلُ الطَّعَامَ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَنَحْنُ نَسْمَعُ تَسْبِيحَ الطَّعَامِ قَالَ وَ أَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِإِنَاءٍ فَوَضَعَ يَدَهُ فِيهِ فَجَعَلَ الْمَاءُ يَنْبُعُ مِنْ بَيْنِ أَصَابِعِهِ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَيَّ عَلَى الْوَضُوءِ الْمُبَارَكِ وَالْبَرَكَةُ مِنَ السَّمَاءِ حَتَّىٰ تَوْضَأْنَا كُلُّنَا» [ترمذی، المناقب، باب فی قول علی فی استقبال کل جبل و شجر النبوی ﷺ بالتسلیم: ۳۶۳۳، وقال حسن صحیح، وقال الألبانی صحیح] ”تم نشانیوں کو عذاب شمار کرتے ہو جبکہ ہم انھیں رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں برکت شمار کرتے تھے۔ چنانچہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کھانا کھاتے تھے اور ہم کھانے کی تسبیح سن رہے ہوتے تھے۔“ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ”اور نبی ﷺ کے پاس ایک برتن لایا گیا، آپ ﷺ نے اپنا ہاتھ اس میں رکھا تو پانی آپ ﷺ کی انگلیوں سے پھوٹنے لگا، تو نبی ﷺ نے فرمایا: ”اس بابرکت وضو کے پانی پر آ جاؤ اور برکت آسمان سے ہے۔“ یہاں تک کہ ہم سب نے وضو کر لیا۔“ انشاق قر کا مجرہ بے شک اہل مکہ کے اس سوال کے جواب میں صادر ہوا کہ ہمیں کوئی نشانی دکھائیں، مگر یہ ان کے اس مطالبے کے جواب میں نہیں ہوا کہ آپ ہمیں چاند کو دو ٹکڑے کر کے دکھائیں (جن روایتوں میں یہ بات ذکر ہوئی ہے وہ سب ضعیف ہیں) بلکہ انھیں ایک نشانی کے طور پر دکھایا گیا جسے انھوں نے جادو کہہ کر ماننے سے انکار کر دیا، فرمایا: ﴿وَإِنْ يَرَوْا آيَةً يُعْرَضُوا وَيَقُولُوا سِحْرٌ مُّسْتَبْرَ﴾ [القمر: ۲] ”اور اگر وہ کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ (یہ) ایک جادو ہے جو گزر جانے والا ہے۔“

دوسرا جواب اس کا یہ ہے کہ اس امت میں بھی معجزات دیکھ کر ایمان نہ لانے والوں پر عذاب آیا، مگر اس کا طریقہ تبدیل کر دیا گیا اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اب ایسے لوگوں کو مسلمانوں کے ہاتھوں عذاب دینے کا فیصلہ فرمایا اور فی الواقع ایسے تمام منکروں کو بدر اور دوسرے مقامات پر ذلت آمیز عذاب سے دوچار ہونا پڑا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿قَاتِلُوهُمْ يُعَذِّبُهُمُ اللَّهُ بِأَيْدِيكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُورَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِينَ ۚ وَ يُذْهِبَ غَيْظَ قُلُوبِهِمْ وَ يَتُوبَ اللَّهُ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ﴾ [التوبة: ۱۶، ۱۵] ”ان سے لڑو، اللہ انھیں تمہارے ہاتھوں سے عذاب دے گا اور انھیں رسوا کرے گا اور ان کے خلاف تمہاری مدد کرے گا اور مومن لوگوں کے سینوں کو شفا دے گا۔ اور ان کے دلوں کا غصہ دور کرے گا اور اللہ توبہ کی توفیق دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے۔“

آیت 2 ﴿وَإِنْ يَرَوْا آيَةً يُعْرَضُوا..... : ”مَرَّ“ اور ”اسْتَمَرَّ“ ”گزرنا۔“ ”مُسْتَبْرَ“ ”گزر جانے والا۔“ یعنی کفار کوئی معجزہ دیکھتے ہیں تو ایمان لانے کے بجائے منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ایک جادو ہے، جس طرح اور جادو گزر گئے ہیں یہ بھی گزر جانے والا ہے، یہ چاند بھی ہمیشہ پھٹا ہوا نہیں رہے گا۔ چنانچہ انھوں نے چاند پھٹنے کے عظیم الشان واقعہ کو بھی

وَكَذَّبُوا وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُمْ وَكُلُّ أُمَّةٍ مُّسْتَقَرٌّ ۝ وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مِنَ الْأَنْبَاءِ مَا فِيهِ

فُرُودٍ جَزْءٍ ۝

اور انھوں نے جھٹلایا اور اپنی خواہشوں کی پیروی کی اور ہر کام انجام کو پہنچنے والا ہے ۝ اور بلاشبہ یقیناً ان کے پاس کئی خبریں آئی ہیں، جن میں باز آنے کا سامان ہے ۝

رسول اللہ ﷺ کا جادو قرار دے کر ایمان لانے سے اعراض اختیار کیا۔

آیت 3 ۝ ۱ وَكَذَّبُوا وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُمْ: ”أَهْوَاءٌ“ ”هَوَى“ کی جمع ہے، خواہشات۔ یعنی کفار کے رسول اللہ ﷺ کو اور آپ کے معجزات کو جھٹلانے کا باعث کوئی معقول بات نہ تھی، بلکہ صرف اپنی خواہشات کی پیروی تھی۔ لفظ ”هَوَى“ (خواہش) اسم جنس ہے جو واحد پر صادق آتا ہے اور جمع پر بھی، مگر یہاں ”أَهْوَاءٌ“ (جمع) اس لیے ذکر فرمایا ہے کہ کفار کے رسول اللہ ﷺ کو جھٹلانے کا باعث ان کی ایک خواہش نہ تھی بلکہ بہت سی خواہشیں تھیں جو انھیں آپ کے تابع فرمان ہونے سے روکتی تھیں، مثلاً سرداری کی خواہش، حسد، آباء کی پیروی کی خواہش، اپنے داتاؤں پر جتے رہنے کی خواہش، شتر بے مہار رہنے اور کسی کے تابع فرمان نہ ہونے کی خواہش وغیرہ۔

آیت 2 ۝ ۲ وَكُلُّ أُمَّةٍ مُّسْتَقَرٌّ: ”قَرَرٌ يَقَرُّ“ (ض) قرار پکڑنا۔ ”اسْتَقَرَّ“ میں مبالغہ ہے، یعنی جس طرح ہر چلنے والا آخر کار کہیں نہ کہیں جا کر ٹھہر جاتا ہے اور ہر کام کا، خواہ وہ اچھا ہو یا برا، کوئی نہ کوئی انجام ہوتا ہے، اسی طرح یہ امت سمجھو کہ رسول اللہ ﷺ تمہیں حق کی طرف بلا تے رہیں گے اور تم انھیں جھٹلاتے رہو گے اور آپ کا حق پر ہونا اور تمہارا باطل پر ہونا کبھی ثابت نہیں ہوگا، بلکہ ایک وقت آئے گا جب ہر چیز کی حقیقت کھل کر سامنے آ جائے گی اور ثابت ہو جائے گا کہ آپ ﷺ اللہ کے سچے رسول تھے اور آپ ﷺ کو جھٹلانا اور جادوگر قرار دینا غلط تھا۔ مزید دیکھیے سورۃ النعام کی آیت (۶۷): ﴿لِكُلِّ نَبِيٍّ مُّسْتَقَرٌّ ۚ وَسَوْفَ تَعْلَمُونَ﴾ کی تفسیر۔

آیت 4 ۝ ۳ وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مِنَ الْأَنْبَاءِ.....: ”نَبَأٌ“ کسی اہم خبر کو کہتے ہیں، ”الْأَنْبَاءُ“ اس کی جمع ہے۔ ”فُرُودٍ جَزْءٍ“ ”زَجْرٌ يَزْجُرُ زَجْرًا“ (ن) (روکنا، منع کرنا، ڈانٹنا) سے بات انتقال کا مصدر یہی ہے، جس کا معنی ”باز آنا“ ہے۔ کہا جاتا ہے: ”زَجْرَتُهُ فَازَ دَجْرًا“ ”میں نے اسے منع کیا تو وہ باز آ گیا۔“ یہ اصل میں ”مُزْتَجِرٌ“ (بروزن مُفْتَعَلٌ) تھا، ”زَاء“ کی وجہ سے باب انتقال کی ”تاء“ کو دال سے بدل دیا تو ”فُرُودٍ جَزْءٍ“ ہو گیا۔ توین اس میں تعظیم کے لیے ہے۔ یعنی قرآن کی صورت میں ان کے پاس رسولوں کو جھٹلانے والی اقوام کی خبروں میں سے ایسی اہم خبریں یقیناً پہنچی ہیں جن میں آدمی کے لیے ہوائے نفس کی پیروی اور رسولوں کی تکذیب سے باز آنے کا مکمل سامان موجود ہے۔ اگلی آیات میں ان میں سے چند خبروں کا ذکر فرمایا ہے۔

حِكْمَةٌ بِاللَّغَةِ فَمَا تُغْنِ النَّذْرُ ۝ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ مِ يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ إِلَىٰ شَيْءٍ ۝ فَكُرِّ ۝
خُشَعًا أَبْصَارُهُمْ يَخْرُجُونَ مِنَ الْأَجْدَاثِ كَمَا تَهُمَّ جَرَادٌ مُنْتَشِرٌ ۝

کامل دانائی کی بات ہے، پھر (بھی) ڈرانے والی چیزیں کوئی فائدہ نہیں دیتیں ۝ سو ان سے منہ پھیر لے۔ جس دن پکارنے والا ایک ناگوار چیز کی طرف بلائے گا ۝ ان کی نظریں جھکی ہوں گی، وہ قبروں سے نکلیں گے جیسے وہ پھیلی ہوئی ٹڈیاں ہوں ۝

آیت 5: حِكْمَةٌ بِاللَّغَةِ فَمَا تُغْنِ النَّذْرُ: ”باللغة“ کا لفظی معنی پہنچنے والی ہے، مراد انتہا اور کمال کو پہنچی ہوئی حکمت ہے۔ ”النذر“ ”نذیر“ کی جمع ہے، ڈرانے والی چیزیں۔ ”نذیر“ مصدر بھی ہو سکتا ہے، جس طرح ”نکیر“ ہے، یعنی تنبیہات، ڈراوے۔ ”حکمة“ پھیلی آیت میں مذکور ”مَا فِيهِ قُرْدٌ جَرٌ“ سے بدل ہے۔ یعنی پھیلی امتوں کے واقعات میں سے وہ واقعات جن میں کفر و تکذیب سے باز آنے کا سامان موجود ہے، کامل حکمت اور دانائی کی باتیں ہیں، مگر یہ ڈرانے اور خبردار کرنے والی چیزیں نہ ماننے والوں کو کچھ فائدہ نہیں دیتیں۔ دیکھیے سورہ یونس (۱۰۱)۔

آیت 6: ۱ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ: یعنی جب ان لوگوں کو کسی تنبیہ یا ڈرانے کا کچھ فائدہ ہی نہیں ہوتا تو آپ بھی ان سے منہ پھیر لیں اور انہیں ان کے حال پر رہنے دیں۔ آپ کے ذمے پہنچانا تھا، وہ آپ نے پہنچا دیا۔

۲ يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ إِلَىٰ شَيْءٍ ۝ فَكُرِّ: ”يَوْمَ“ منصوب بزوع الخافض ہے، یعنی اس سے پہلے حرف جار ”إلى“ ہے جسے حذف کرنے کی وجہ سے یہ منصوب ہے۔ (بنغوی) آلوسی نے کہا: ”هَذَا قَوْلُ الْحَسَنِ“ کہ یہ حسن کا قول ہے یعنی ”فَتَوَلَّ عَنْهُمْ إِلَىٰ يَوْمٍ يَدْعُ الدَّاعِ فِيهِ إِلَىٰ شَيْءٍ ۝ فَكُرِّ“ ”سو ان سے منہ پھیر لے، اس دن تک جس میں پکارنے والا ایک ناگوار چیز کی طرف بلائے گا۔“ یا ”يَوْمَ“ فعل محذوف ”انظر“ کے ساتھ منصوب ہے، یعنی ”ان سے منہ پھیر لے اور اس دن کا انتظار کر جب.....“ پکارنے والے سے مراد اسرائیل علیہ السلام ہیں، جن کے نفع سے تمام لوگ قبروں سے نکل کھڑے ہوں گے۔ ”يَدْعُ“ اصل میں ”يَدْعُو“ ہے، واؤ چونکہ یہاں پڑھنے میں نہیں آتی اس لیے مصحف عثمان میں لکھی نہیں گئی۔ ”الدَّاعِ“ اصل میں ”الدَّاعِي“ ہے، ”ياء“ تخفیف کے لیے حذف کی گئی ہے اور ”شَيْءٍ ۝ فَكُرِّ“ سے مراد حساب کتاب ہے۔ ”فَكُرِّ“ بمعنی ”مُنْكَرٌ“ ہے، ناگوار، اجنبی، انوکھی چیز جو کبھی دیکھی نہ ہوگی۔

آیت 7: خُشَعًا أَبْصَارُهُمْ يَخْرُجُونَ مِنَ الْأَجْدَاثِ.....: ”خُشَعًا“ ”خاشع“ کی جمع ہے، جیسے ”زاسع“ کی جمع ”رُشَع“ ہے۔ یعنی ذلت کی وجہ سے ان کی نگاہیں جھکی ہوئی ہوں گی۔ (دیکھیے شوری: ۴۵) ”الْأَجْدَاثِ“ ”جَدَث“ (دال کے فتح کے ساتھ) کی جمع ہے، قبریں۔ ”جَرَادٌ“ اسم جمع ہے، اس کا واحد ”جَرَادَةٌ“ ہے، ٹڈیاں جو بے شمار تعداد میں زمین سے نکلتی ہیں اور ہر طرف پھیل جاتی ہیں۔ ”مُنْتَشِرٌ“ پھیلی ہوئی۔ قبروں سے نکلنے والوں کی حالت کو یہاں پھیلی ہوئی

فَطَّعِينِ إِلَى الدَّاعِ ۖ يَقُولُ الْكُفْرُونَ هَذَا يَوْمٌ عَسِرٌ ① كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمٌ نُوحٍ فَلَكَؤُوبًا
عِبْدَانَا وَ قَالُوا مَجْنُونٌ وَ اذْجِرَ ②

پکارنے والے کی طرف گردن اٹھا کر دوڑنے والے ہوں گے، کافر کہیں گے یہ بڑا مشکل دن ہے ① ان سے پہلے
نوح کی قوم نے جھٹلایا تو انھوں نے ہمارے بندے کو جھٹلایا اور انھوں نے کہا دیوانہ ہے اور جھڑک دیا گیا ②

نڈیوں کے ساتھ اور سورہ قارعہ میں ”كَانَ الْقَرَّاشِ الْمَبْنُوثِ“ بکھرے ہوئے پر دانوں کے ساتھ تشبیہ دی ہے کہ دونوں ہی
جب نکلنے ہیں تو بے شمار تعداد میں ایک دوسرے کے گرد اڑتے، گھومتے اور آپس میں ٹکراتے ہوئے تیزی سے بڑھتے چلے
جاتے ہیں، پروانے آگ کی طرف اور نڈیاں اس طرف جدھر ان کا رخ ہو جائے۔ اسی طرح قبروں سے نکلنے والے تیزی کے
ساتھ صورت کی آواز کی طرف بے شمار پھیل ہوئی نڈیوں کی طرح گرتے پڑتے، چکر کھاتے، ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوئے
بے اختیار دوڑتے چلے جا رہے ہوں گے۔

آیت 8 : ① فَطَّعِينِ إِلَى الدَّاعِ : ”أَهْطَعَ يُهْطَعُ“ (افعال) کسی چیز کی طرف ٹکلی بانٹھے یا گردن اٹھائے
ہوئے تیزی سے دوڑتا۔ (دیکھیے ابراہیم: ۳۳) ”عَسِرٌ“ ”عَسِرٌ“ سے صفت مشبہ ہے، بہت مشکل۔

② مفسر ابن عاشور نے فرمایا: ”يَوْمٌ يَذْجُرُ الدَّاعِ“ سے ”يَوْمٌ عَسِرٌ“ تک اس دن کی ہولناکی سات طرح سے ظاہر ہو رہی
ہے: ① ”يَذْجُرُ الدَّاعِ“ اسرائیل علیہ السلام کا بلاناہی اتنا ہولناک ہے جو بیان میں نہیں آسکتا۔ ② ”إِلَى شَيْءٍ“ ”شَيْءٍ“
پر توجہ تنگی سے پیدا ہونے والی تعظیم اور ابہام اس ہول میں اضافہ کر رہے ہیں۔ ③ ”مُكْرٍ“ ④ ”خُفِّعًا أَبْصَارُهُمْ“ ⑤
”جَرَادٌ مُنْتَشِرٌ“ کے ساتھ تشبیہ۔ ⑥ ”فَطَّعِينِ إِلَى الدَّاعِ“ ⑦ اور ان کا کہنا ”هَذَا يَوْمٌ عَسِرٌ“ کہ یہ بڑا مشکل دن ہے۔

آیت 9 : ① كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمٌ نُوحٍ : اس سے پہلے جو فرمایا تھا: ﴿وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مِنَ الْأَنْبَاءِ مَا فِيهِ
مُزْدَجَّرٌ ۖ لَوْ أَنَّهُمْ كَانُوا يَتَّقُونَ﴾ ان واقعات کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ ان واقعات میں جھٹلانے والوں کے لیے عبرتیں ہیں جنہیں دیکھ کر
اور سن کر وہ تکذیب سے باز آسکتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ اور اہل ایمان کے لیے تسلی اور حوصلے کا سامان ہے۔ یعنی ان اہل مکہ
سے پہلے نوح علیہ السلام کی قوم نے انھیں جھٹلایا۔

② وَ قَالُوا مَجْنُونٌ : ”مَجْنُونٌ“ جسے جنون ہو، پاگل، دیوانہ۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ مومنون (۲۵) کی تفسیر۔
③ وَ اذْجِرَ : یہ ”زَجِرٌ“ (جھڑکتا) سے باب افتعال کا ماضی مجہول ہے، اصل میں ”أَزْجِرُ“ تھا، جس میں تاء افتعال
مہالذ کے لیے ہے، یعنی اسے سخت جھڑکا گیا۔ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ نوح علیہ السلام کو
سخت جھڑکا گیا، سب دشمن کی بوچھاڑ کی گئی، ان کا مذاق اڑایا گیا اور انھیں دھمکیاں دی گئیں۔ (دیکھیے اعراف: ۶۶۔ ہود: ۳۸۔
شعراء: ۱۱۶) دوسرا مطلب یہ ہے کہ نوح علیہ السلام کی قوم نے کہا کہ یہ مجنون ہے اور اسے ہمارے معبودوں کی جھڑک پڑی
ہوئی ہے، جس سے اس کی عقل ٹھکانے نہیں رہی، جیسا کہ ہود علیہ السلام کی قوم نے کہا تھا: ﴿إِن نَّقُولُ إِلَّا اعْتَرَاكَ بَعْضُ آلِهَتِنَا

فَدَعَا رَبَّهُ أَنِّي مَغْلُوبٌ فَانْتَصِرَ ⑩ فَفَتَحْنَا أَبْوَابَ السَّمَاءِ بِمَاءٍ مُنْهَبٍ ⑪ وَفَجَّرْنَا
الْأَرْضَ عُيُونًا فَالْتَقَى الْمَاءُ عَلَى أَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ⑫ وَحَمَلْنَاهُ عَلَى ذَاتِ أَلْوَاحٍ وَدُسُرٍ ⑬
تَجْرِي بِأَعْيُنِنَا ⑭ جَزَاءً لِمَن كَانَ كُفِرًا ⑮

تو اس نے اپنے رب کو پکارا کہ میں مغلوب ہوں، سو تو بدل لے ⑩ تو ہم نے آسمان کے دروازے کھول دیے، ایسے پانی کے ساتھ جو زور سے برسنے والا تھا ⑪ اور زمین کو چشموں کے ساتھ پھاڑ دیا، تو تمام پانی مل (کراہیک ہو) گیا، اس کام کے لیے جو طے ہو چکا تھا ⑫ اور ہم نے اسے تختوں اور میخوں والی (کشتی) پر سوار کر دیا ⑬ جو ہماری آنکھوں کے سامنے چل رہی تھی، اس شخص کے بدلے کی خاطر جس کا انکار کیا گیا تھا ⑭

سُورَةُ الْقَمَرِ ﴿٥٤﴾ [مرد: ۵۴] ”ہم اس کے سوا کچھ نہیں کہتے کہ ہمارے معبودوں میں سے کسی نے تجھے کوئی آفت پہنچادی ہے۔“

آیت 10 : فَدَعَا رَبَّهُ أَنِّي مَغْلُوبٌ فَانْتَصِرَ : نوح علیہ السلام نے یہ دعا اس وقت کی جب اللہ تعالیٰ نے انھیں اطلاع دی کہ اب تیری قوم میں سے کوئی ایمان نہیں لائے گا۔ مزید دیکھیے سورۃ نوح (۲۶، ۲۷) کی تفسیر۔ ”انْتَصِرَ يَنْتَصِرُ“ انتقام لینا۔

آیت 11 : فَفَتَحْنَا أَبْوَابَ السَّمَاءِ بِمَاءٍ مُنْهَبٍ : ”مُنْهَبٍ“ (انْفَهَرَ يَنْهَبُ) سے اسم فاعل ہے، شدت اور کثرت کے ساتھ گرنے والا پانی۔

آیت 12 : ① وَفَجَّرْنَا الْأَرْضَ عُيُونًا : یعنی ہم نے زمین کو پانی کے ساتھ اس طرح پھاڑا کہ وہ ساری کی ساری جھٹے بن گئی۔

② فَالْتَقَى الْمَاءُ عَلَى أَمْرٍ قَدْ قُدِرَ : یعنی زمین اور آسمان کا پانی مل کر ایک ہو گیا، اس کام کے لیے جو طے کر دیا گیا تھا۔ مراد قوم نوح کی ہلاکت ہے۔

آیت 13 : وَحَمَلْنَاهُ عَلَى ذَاتِ أَلْوَاحٍ وَدُسُرٍ : ”الْوَاحِ“ کی جمع ہے، لکڑی وغیرہ کے تختے۔ ”دُسُرٌ“ ”دَسَارٌ“ کی جمع ہے، جیسے ”کِنَابٌ“ کی جمع ”كُنُوبٌ“ ہے، کیل یا میخیں خواہ لکڑی کی ہوں یا لوہے وغیرہ کی، جن کے ساتھ تختے جوڑے جاتے ہیں۔ مراد کشتی ہے جو نوح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق طوفان آنے سے پہلے تیار کر لی تھی۔ مزید دیکھیے سورۃ ہود (۳۱، ۳۲) کی تفسیر۔

آیت 14 : ① تَجْرِي بِأَعْيُنِنَا : جب آسمان کے دروازے پانی کے ساتھ کھلنے اور زمین کے چشموں کے ساتھ پھٹ جانے سے زمین و آسمان کا پانی ایک ہو گیا تو اس پانی کی بلندی کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔ اس کشتی میں بیٹھے ہوئے نوح علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو کچھ معلوم نہیں کہ کدھر جانا ہے اور اسے موجوں سے کس طرح بچانا ہے، نہ کشتی پر یا پانی پر ان کا کوئی اختیار ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اس وقت وہ کشتی ہماری آنکھوں کے سامنے چل رہی تھی، اس کے غمران و محافظ ہم تھے، پھر اسے کوئی گزند کیسے پہنچ سکتا تھا۔

وَلَقَدْ تَرَكْنَهَا آيَةً فَهَلْ مِنْ مُدَكِّرٍ ﴿۱۵﴾ فَكَيْفَ كَانَ عَدَابِي وَنُذْرِي ﴿۱۶﴾ وَ لَقَدْ يَسَّرْنَا
الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَكِّرٍ ﴿۱۷﴾

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے اسے ایک نشانی بنا کر چھوڑا، تو کیا ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا؟ ﴿۱۵﴾ پھر میرا عذاب اور میرا
ڈرانا کیسا تھا؟ ﴿۱۶﴾ اور بلاشبہ یقیناً ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان کر دیا، تو کیا ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا؟ ﴿۱۷﴾

﴿۱۵﴾ جَزَاءَ لِمَنْ كَانَ كُفْرًا: اس کے دو مطلب ہیں، ایک یہ کہ یہ سب کچھ اس شخص کا بدلہ لینے کی خاطر کیا گیا جس کا انکار کیا
گیا اور اسے نبی تسلیم نہیں کیا گیا۔ ”کُفْرًا“ کا دوسرا معنی ناشکری اور ناقدر شناسی ہے، یعنی نوح علیہ السلام اس قوم کے لیے اللہ تعالیٰ کی
عظیم نعمت تھے اور انھوں نے اس کی قدر نہیں کی۔ یعنی اس شخص کا انتقام لینے کی خاطر جو ایک عظیم نعمت تھا مگر اس کی قدر نہیں پہچانی گئی۔
آیت 15 ﴿۱﴾ وَ لَقَدْ تَرَكْنَهَا آيَةً: اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ ہود (۲۳) اور سورہ عنکبوت (۱۵) کی تفسیر۔

﴿۲﴾ فَهَلْ مِنْ مُدَكِّرٍ: ”مُدَكِّرٍ“ ”ذَكَرَ يَذْكُرُ“ میں سے باب افتعال کا اسم فاعل ہے، جو اصل میں ”مُدَكِّرٌ“ ہے،
تائے افتعال کو دال سے بدل دیا گیا، اسی طرح ذال کو بھی دال سے بدل کر اس میں اوغام کر دیا گیا، جیسا کہ سورہ یوسف میں
گزارا ہے: ﴿وَقَالَ الَّذِي نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ أُمَّةٍ﴾ [یوسف: ۴۵] ”اور ان دونوں میں سے جو رہا ہوا تھا
اور اسے ایک مدت کے بعد یاد آیا، اس نے کہا۔“

آیت 16 ﴿۱﴾ فَكَيْفَ كَانَ عَدَابِي وَنُذْرِي: ”نُذْرِي“ ”نُذِرُ“ ”نُذِرٌ“ اور ”نُذْرٌ“ مصدر ہیں۔ ”فُجَّ الْقَدِيرِ“ یہاں
”نُذْرِي“ اصل میں ”نُذْرِي“ (میرا ڈرانا) تھا، آیات کے فواصل کی مطابقت کے لیے ”یاء“ حذف ہو گئی، اس کی دلیل کے
طور پر ”راء“ پر کسرہ باقی رہا۔

آیت 17 ﴿۱﴾ وَ لَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ.....: یعنی ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان کر دیا ہے، اس کے الفاظ
آسان ہیں، معنی بھی آسان ہے، نہ پڑھنے میں دقت ہے نہ سمجھنے میں، تو کیا کوئی ہے جو اس سے نصیحت حاصل کرے اور نافرمانی
سے باز آجائے؟ اس میں قرآن مجید پڑھنے، پڑھانے، سمجھنے، سمجھانے اور اس سے نصیحت حاصل کرنے کی ترغیب ہے۔ اس کے
باوجود مسلمانوں میں بہت سے لوگ وہ ہیں جن کا کہنا ہے کہ قرآن و حدیث کو سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں، یہ بڑے بڑے عالم و فاضل
لوگوں کا کام ہے، جو چودہ یا اکیس علوم پڑھے ہوئے ہوں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ساری عمر متعدد مشکل سے مشکل علوم و فنون
پڑھتے رہتے ہیں، مگر قرآن کے قریب نہیں جاتے، اپنے چودہ یا اکیس علوم پورے کرتے کرتے ہی دنیا سے گزر جاتے ہیں۔ کئی تو ایسے
ظالم ہیں، جو کہتے ہیں کہ عام آدمی کے لیے قرآن کا ترجمہ پڑھنا ممنوع ہے، کیونکہ اس سے گمراہی کا خطرہ ہے۔ حالانکہ قرآن
مجید عربی بین میں اترا اور لوگوں کی ہدایت کے لیے اترا، ہر عام و خاص اور عالم و جاہل عرب نے اسے سنا، سمجھا، اس پر عمل کیا اور
آگے پہنچایا۔ ہماری زبان اردو میں قرآن مجید کے تقریباً ستر (۷۰) فیصد الفاظ موجود ہیں، تھوڑی سی توجہ کے ساتھ ہر آدمی
قرآن کا ترجمہ سمجھ سکتا ہے۔ مگر جن لوگوں نے قرآن و حدیث کے مقابلے میں نیادین بنا لیا اور توحید کے مقابلے میں شرک اور

كَذَّبَتْ عَادٌ فَكَيْفَ كَانَ عَدَابِي وَنُذْرِي ۝۱۸ إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا فِي يَوْمِ
نَحْسٍ مُّسْتَبْرَ ۝۱۹ تَنْزِعُ النَّاسَ ۝ كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ ۝۲۰ فَكَيْفَ كَانَ عَدَابِي
وَ نُذْرِي ۝۲۱ وَلَقَدْ يَتْرَنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّذَكِّرٍ ۝۲۲ كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِالنُّذْرِ ۝۲۳
فَقَالُوا أَبَشْرًا مِّمَّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهُ ۝۲۴ إِنَّا إِذَا نَفَعِي ضَلِيلٍ وَ سَعْرٍ ۝۲۵

عاد نے جھٹلایا تو میرا عذاب اور میرا ڈرانا کیسا تھا؟ ۱۸ بے شک ہم نے ان پر ایک تند آندھی بھیجی، ایسے دن میں جو
دامی نحوست والا تھا ۱۹ لوگوں کو اکھاڑ پھینکتی تھی، جیسے وہ اکھڑی ہوئی کھجوروں کے تنے ہوں ۲۰ پھر میرا عذاب اور
میرا ڈرانا کیسا تھا؟ ۲۱ اور بلاشبہ یقیناً ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان کر دیا، تو کیا ہے کوئی نصیحت حاصل
کرنے والا؟ ۲۲ ثمود نے ڈرانے والوں کو جھٹلایا ۲۳ پس انھوں نے کہا کیا ایک آدمی جو ہمیں سے ہے اکیلا، ہم
اس کے پیچھے لگ جائیں؟ یقیناً ہم تو اس وقت بڑی گمراہی اور دیوانگی میں ہوں گے ۲۴

سنت کے مقابلے میں بدعت کو اختیار کر لیا ہے، ان کی پوری کوشش ہے کہ لوگ اصل قرآن مجید اور حدیث سے آگاہ نہ ہو جائیں، ورنہ
وہ ان کے پنجے سے نکل جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہدایت دے اور مسلمانوں کو قرآن و سنت کی طرف پلٹنے کی توفیق عطا فرمائے۔
۲ قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آسان کیے جانے کا ایک کرشمہ اور معجزہ یہ ہے کہ یہ سہولت کے ساتھ حفظ ہو جاتا
ہے۔ دنیا میں کوئی کتاب نہیں جس کے ہزاروں لاکھوں حافظ ہر زمانے میں پائے گئے ہوں اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کا نبی تعریف
ہے کہ اس نے اپنی کتاب کی حفاظت کے لیے مسلمانوں کے دلوں میں اس کے حفظ کا شوق رکھ دیا ہے، گناہ گار سے
گناہ گار مسلمان کی بھی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا بچہ قرآن کا حافظ بنے۔ کیونستوں نے اپنے زیر تسلط ملکوں میں قرآن کو مٹانے
کی کوشش جتنی کر سکتے تھے کی، مگر مسلمانوں نے اپنے گھروں کے تہ خانوں میں کیونست جاسوسوں سے چھپ کر حفظ قرآن کا
سلسلہ جاری رکھا، جس کی برکت یہ ہوئی کہ کیونست قرآن کو مٹانے میں بری طرح ناکام ہوئے۔ اس وقت بھی دنیا میں قرآن کا
کے حافظ لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ (والحمد للہ) مزید دیکھیے سورہ عنکبوت (۴۹) کی تفسیر۔

آیت 19.18: كَذَّبَتْ عَادٌ فَكَيْفَ كَانَ عَدَابِي وَ نُذْرِي : ان آیات کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ حم السجدہ (۱۵)،
۱۶ کی تفسیر۔

آیت 20: تَنْزِعُ النَّاسَ ۝ كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ : ”نَزَعٌ يَنْزِعُ نَزْعًا“ (ع) ”النَّشِيءُ مِنْ مَّكَانِهِ“ کسی
چیز کو اس کی جگہ سے اکھاڑ پھینکانا۔ ”مُنْقَعِرٌ“ ”قَعْرٌ“ (گہرائی) سے ہے، اکھڑا ہوا۔ مزید دیکھیے سورہ حاقہ (۷) کی تفسیر۔

آیت 23.24: 1 كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِالنُّذْرِ : صالح علیہ السلام کی قوم ثمود نے اپنے رسول کو نہ ماننے کی تین وجہیں بیان کیں،
ایک یہ کہ یہ بشر ہے (دیکھیے بنی اسرائیل: ۹۳)، دوسری یہ کہ بشر بھی ہم جیسا عام بشر، کوئی سردار یا سرماہ دار نہیں (دیکھیے ص:
کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

ءَأُلْقِيَ الذِّكْرُ عَلَيْهِ مِنْ بَيْنِنَا بَلْ هُوَ كَذَّابٌ أَشِرٌّ ﴿٢٥﴾ سَيَعْلَمُونَ غَدًا مَنِ الْكَذَّابُ
الْأَشِرُّ ﴿٢٦﴾ إِنْكَارُ مُرْسَلِهَا فَتْنَةٌ لَهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ ﴿٢٧﴾ وَبَيْنَهُمْ أَنْ الْمَاءَ قَسَمْتُ
بَيْنَهُمْ ۚ كُلُّ شَرِبٍ مُحْتَضَرٌ ﴿٢٨﴾ فَتَادُوا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطَى فَعَقَرَ ﴿٢٩﴾

کیا یہ نصیحت ہمارے درمیان میں سے اسی پر نازل کی گئی ہے؟ بلکہ وہ بہت جھوٹا ہے، منکبتر ہے ﴿۲۵﴾ عنقریب وہ کل جان لیں گے کہ بہت جھوٹا، منکبتر کون ہے؟ ﴿۲۶﴾ بے شک ہم یہ اونٹنی ان کی آزمائش کے لیے بھیجے والے ہیں، سوان کا انتظار کر اور اچھی طرح صبر کر ﴿۲۷﴾ اور انہیں بتا دے کہ پانی ان کے درمیان تقسیم ہوگا، پینے کی ہر باری پر حاضر ہوا جائے گا ﴿۲۸﴾ تو انہوں نے اپنے ساتھی کو پکارا، سواس نے (اسے) پکڑا، پس کونچیں کاٹ دیں ﴿۲۹﴾

(۸) اور تیسری یہ کہ یہ اکیلا آدمی ہے، اس کے ساتھ کوئی جھٹایا پارٹی نہیں ہے۔

﴿۲۵﴾ إِنْكَارُ إِذَا لَقِيَ صَلَّى وَ سَعَى : ”سَعَى“ جنون، دیوانگی۔ ”صَلَّى“ اور ”سَعَى“ پر توین تعظیم کی ہے، اس لیے ترجمہ ”بڑی گمراہی اور بڑی دیوانگی“ کیا گیا ہے۔

آیت 26. 25 ﴿۱﴾ ءَأُلْقِيَ الذِّكْرُ عَلَيْهِ مِنْ بَيْنِنَا : اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ ص (۸) کی تفسیر۔

﴿۲﴾ بَلْ هُوَ كَذَّابٌ أَشِرٌّ : ”أَشِرٌّ“ ”أَشْرًا“ (ض) سے اسم فاعل ہے، منکبتر، اڑنے والا۔

آیت 27 إِنْكَارُ مُرْسَلِهَا فَتْنَةٌ لَهُمْ : اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ ہود (۶۳) اور سورہ شعراء

(۱۵۵) کی تفسیر۔ ”فَارْتَقِبْهُمْ“ ”رَقَبَ يَرْقُبُ“ (ن) سے باب انتعال ہے۔ ”وَاصْطَبِرْ“ ”صَبَرَ يَصْبِرُ صَبْرًا“ (ض)

سے باب انتعال ہے، ”تاء“ کو ”طاء“ سے بدل دیا۔ حروف کے اضافے سے معنی میں مبالغہ پیدا ہو گیا ہے، ان کا حوصلے سے

انتظار کر اور اچھی طرح صبر کر۔ یعنی اس آزمائش میں یہ لوگ کیا طرز عمل اختیار کرتے ہیں حوصلے کے ساتھ اس کا انتظار کر اور

بہت اچھے طریقے سے صبر کر۔ آزمائش اس لیے تھی کہ ان کا امتحان مقصود تھا کہ اس نشانی کو دیکھ کر وہ پیغمبر پر ایمان لاتے ہیں یا

اسے نقصان پہنچا کر عذاب کے مستحق بنتے ہیں۔

آیت 28 وَبَيْنَهُمْ أَنْ الْمَاءَ قَسَمْتُ بَيْنَهُمْ : اس کی وضاحت کے لیے دیکھیے سورہ شعراء (۱۵۵) کی تفسیر۔

آیت 29 فَتَادُوا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطَى فَعَقَرَ : ”فَتَعَاطَى“ ”عَطَا يَعْطُو عَطْوًا“ (ن) ”الْشَّيْءُ“ ”کسی چیز کو پکڑنا۔

”فَتَعَاطَى الشَّيْءُ“ ”کسی چیز کو پکڑنا اور ”فَتَعَاطَى الْأَمْرُ“ ”کسی کام کا ذمہ اٹھانا۔ ایک مدت تک یہ ایک دن کی باری کا سلسلہ

جاری رہا۔ صالح علیہ السلام نے انہیں تنبیہ کی تھی کہ اسے کسی قسم کا نقصان نہ پہنچانا، ورنہ تم پر عذاب آجائے گا۔ ایمان نہ لانے کے

باجود دل سے وہ انہیں سچا جانتے تھے، اس لیے وہ اونٹنی کو نقصان پہنچانے سے خائف تھے، لیکن آخر کار صبر نہ کر سکے اور انہوں

نے اس کا قصہ تمام کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے لیے انہوں نے اپنے ایک سردار کو ابھارا جسے اللہ تعالیٰ نے اس قوم کا سب

كَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذْرِي ﴿۳۱﴾ إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَاحِدَةً فَكَانُوا كَهَشِيمِ

الْمُحْتَظِرِ ﴿۳۲﴾ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَكِّرٍ ﴿۳۳﴾ كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوطٍ بِالذُّدْرِ ﴿۳۴﴾

إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا إِلَّا آلَ لُوطٍ نَجَّيْنَاهُمْ بِسَحَرٍ ﴿۳۵﴾

تو میرا عذاب اور میرا ڈرانا کیا تھا؟ ﴿۳۱﴾ بے شک ہم نے ان پر ایک ہی چیخ بھیجی تو وہ باڑ لگانے والے کی بجلی، روندی ہوئی باڑ کی طرح ہو گئے ﴿۳۲﴾ اور بلاشبہ یقیناً ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان کر دیا، تو کیا ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا؟ ﴿۳۳﴾ لوط کی قوم نے ڈرانے والوں کو جھٹلا دیا ﴿۳۴﴾ بے شک ہم نے ان پر پتھر برسانے والی ایک ہوا بھیجی، سوائے لوط کے گھر والوں کے، انھیں ہم نے صبح سے کچھ پہلے نجات دی ﴿۳۵﴾

سے شقی آدمی قرار دیا ہے، فرمایا: ﴿إِذِ انبَعَثَ أَشْقَاهَا﴾ [الشمس: ۱۲] ”جب اس کا سب سے بڑا بد بخت اٹھا۔“ چنانچہ سب نے مل کر اسے مدد کے لیے پکارا کہ تو بڑا بہادر اور جری ہے۔ اس نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور اس اونٹنی کی کوچیں کاٹ کر اسے مار ڈالا۔ مزید دیکھیے سورہ شمس (۱۲، ۱۱) کی تفسیر۔ ”فَتَعَاظِي“ کا مفعول محذوف ہے: ”أَبِي تَعَاظِي السَّيْفِ“ (اس نے تلوار پکڑی) ”أَوْ تَعَاظِي الْأَمْرِ“ (یا اس نے اس کام کا ذمہ اٹھایا)۔

آیت 31 ﴿۳۱﴾ إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَاحِدَةً: اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ اعراف (۷۸) کی تفسیر۔

﴿۳۲﴾ فَكَانُوا كَهَشِيمِ الْمُحْتَظِرِ: ”هَشِيمٌ يَهَيِّسُهُمْ هَشْمًا“ (ض) ”الْحَشِيَّةُ“ کسی چیز کو توڑ کر اور کچل کر ریزہ ریزہ کر دینا۔ ”هَشِيمٌ“ روندی، کچلی ہوئی۔ ”حَظِيرَةٌ“ باڑ کو کہتے ہیں جو جانوروں کے ارد گرد ٹہنیوں وغیرہ کے ساتھ بنائی جاتی ہے۔ اور ”الْمُحْتَظِرِ“ باڑ بنانے والا۔ باڑ کے پتے اور ٹہنیاں جو خشک ہو کر ٹوٹی اور نیچے گرتی ہیں اور جانوروں کے پاؤں کے نیچے آکر کچلی اور روندی جاتی ہیں اور چورا بن جاتی ہیں انھیں ”هَشِيمٌ“ کہا جاتا ہے۔ قوم ثمود کا عذاب کے ساتھ جو حال ہوا اسے ان پتوں اور ٹہنیوں کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو باڑ سے گر کر جانوروں کے پاؤں میں آکر چورا بن جاتے ہیں۔

آیت 34 ﴿۳۴﴾ إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا: قوم لوط کی بستیاں التانے کے بعد ان پر پتھروں کی جو بارش ہوئی وہ مراد ہے۔ مزید دیکھیے سورہ ہود (۸۳)۔

﴿۳۵﴾ إِلَّا آلَ لُوطٍ: لوط علیہ السلام پر ان کی قوم میں سے ایک آدمی بھی ایمان نہیں لایا، حتیٰ کہ ان کی بیوی بھی کافر ہی رہی۔ (دیکھیے ذاریات: ۳۶۔ ہود: ۸۱) اس لیے یہاں ”آل لوط“ سے مراد صرف ان کی اولاد ہے، جن کے ساتھ وہ خود بھی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے کافر کو پیغمبر کی آل اور اہل تسلیم نہیں کیا خواہ بیوی ہو، جیسے لوط علیہ السلام کی بیوی، یا بیٹا ہو جیسے نوح علیہ السلام کا بیٹا، اس کے بارے میں فرمایا: ﴿إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ﴾ [ہود: ۴۶] ”بے شک وہ تیرے گھر والوں سے نہیں۔“

﴿۳۵﴾ نَجَّيْنَاهُمْ بِسَحَرٍ: اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ ہود (۸۱) کی تفسیر۔

نِعْمَةٌ مِّنْ عِنْدِنَا ۚ كَذَلِكَ نَجْزِي مَنْ شَكَرَ ﴿۳۵﴾ وَ لَقَدْ أَنْذَرَهُمْ بَطْشَتَنَا فَتَمَارَوْا
بِالنَّذْرِ ﴿۳۶﴾ وَ لَقَدْ رَاوَدُوهُ عَنْ صَيْغِهِ فَطَسَنَّا أَعْيُنَهُمْ فَذُوقُوا عَذَابِي وَ نَذِرٌ ﴿۳۷﴾ وَ لَقَدْ
صَبَحَهُمْ بُكَرَةٌ عَذَابٌ مُّسْتَقَرٌّ ﴿۳۸﴾

اپنی طرف سے انعام کرتے ہوئے، اسی طرح ہم بدلا دیتے ہیں اسے جو شکر کرے ﴿۳۵﴾ اور بلاشبہ یقیناً اس نے انھیں ہماری پکڑ سے ڈرایا تو انھوں نے ڈرانے میں شک کیا ﴿۳۶﴾ اور بلاشبہ یقیناً انھوں نے اسے اس کے مہمانوں سے بہکانے کی کوشش کی تو ہم نے ان کی آنکھیں مٹا دیں، پس چکھو میرا عذاب اور میرا ڈرانا ﴿۳۷﴾ اور بلاشبہ یقیناً صبح سویرے ہی ان پر ایک نہ ملنے والے عذاب نے حملہ کر دیا ﴿۳۸﴾

آیت 35 ﴿ نِعْمَةٌ مِّنْ عِنْدِنَا ﴾ اس میں اپنی نعمت کی عظمت کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے۔ لوط علیہ السلام اور ان کے گھر والوں کو اس عذاب سے بچانا ہماری خاص نعمت تھی۔ اس سے اگلے جملے ”كَذَلِكَ نَجْزِي مَنْ شَكَرَ“ سے ان کے اس نعمت کا اہل بننے کی وجہ بھی معلوم ہو رہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے والے تھے، اس لیے ہم نے انھیں اس عظیم نعمت سے نوازا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ لٰكِن شَكَرْتُمْ لَّاۤزِيْدُكُمْ ﴿۷﴾ [ابراہیم: ۷] ”بے شک اگر تم شکر کرو گے تو میں ضرور ہی تمہیں زیادہ دوں گا۔“ اور صرف انھی کو نہیں بلکہ جو بھی ہماری نعمتوں کی قدر کرے ہم اسے ایسے ہی جزا دیتے ہیں۔

آیت 36 ﴿ وَ لَقَدْ أَنْذَرَهُمْ بَطْشَتَنَا فَتَمَارَوْا بِالنَّذْرِ ﴾: ”تَمَارَوْا يَتَمَارَوْنَ“ (تفاعل) شک کرنا، جھگڑنا۔ ”لام“ اور ”قَدْ“ کے ساتھ تاکید قسم کے مفہوم کی قوت رکھتی ہے، یعنی قسم ہے کہ لوط علیہ السلام نے انھیں ہماری گرفت سے ڈرایا تھا، مگر انھوں نے اس ڈرانے پر یقین نہیں کیا، بلکہ شک میں پڑے رہے اور اس کے متعلق بحث اور جھگڑا ہی کرتے رہے۔

آیت 37 ﴿ وَ لَقَدْ رَاوَدُوهُ عَنْ صَيْغِهِ ﴾: ”رَاوَدُوهُ“ باب مفاعله سے ہے۔ ”مُرَاوَدَةٌ“ نرمی اور ملائمت سے بار بار مطالبہ کرنا، پھسلانا، بہکانا، فریب سے غلط کام پر آمادہ کرنا۔ یہاں باب مفاعله مشارکت کے لیے نہیں مبالغہ کے لیے ہے۔ ”صَيْغِهِ“ سے مراد فرشتے ہیں جو خوبصورت لڑکوں کی شکل میں مہمان بن کر آئے تھے۔ قوم کو ان کے آنے کا علم ہوا تو انھوں نے لوط علیہ السلام سے مطالبہ کیا کہ انھیں ان کے حوالے کر دیں۔ ”رَاوَدُوهُ“ کے لفظ سے ظاہر ہے کہ انھوں نے لوط علیہ السلام پر دھوکے، فریب، بہکانے، پھسلانے، دھونس اور دھاندلی کا ہر طریقہ آزمایا کہ کسی طرح ہی وہ دھوکے میں آ کر انھیں ان کے حوالے کر دیں۔ وہ لوگ جو اس مقصد کے لیے آئے تھے جب حد سے بڑھ گئے اور ان لڑکوں کو زبردستی چھیننے کے لیے گھر میں داخل ہونے لگے اور لوط علیہ السلام سخت گھبرا گئے تو فرشتوں نے بتایا کہ ہم آپ کے رب کی طرف سے بھیجے ہوئے ہیں، یہ لوگ آپ تک کسی صورت نہیں پہنچ سکیں گے۔ (دیکھیے ہود: ۸۰، ۸۱) اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان کی آنکھیں مٹا دیں، انھیں اندھا کر دیا کہ بڑا عذاب آنے سے پہلے میرے اس عذاب اور میری تنبیہ کا مزا چکھو۔

آیت 38 ﴿ وَ لَقَدْ صَبَحَهُمْ بُكْرَةٌ عَذَابٌ مُّسْتَقَرٌّ ﴾: اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ ہود (۸۲، ۸۳) کی تفسیر۔

فَذُوقُوا عَذَابِي وَنُذِرٌ ﴿۴۰﴾ وَ لَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَكِّرٍ ﴿۴۱﴾ وَ لَقَدْ جَاءَ آلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ ﴿۴۲﴾ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا كُلِّهَا فَأَخَذْنَاهُمْ أَخَذَ عَزِيزٍ مُقْتَدِرٍ ﴿۴۳﴾ أَكْفَأَكُمْ حَيَّرٌ مِنْ أُولَئِكُمْ أَمْ لَكُمْ بَرَاءَةٌ فِي الزُّبُرِ ﴿۴۴﴾ أَمْ يَقُولُونَ نَحْنُ بَجِيعٌ مُنتَصِرٌ ﴿۴۵﴾

سو چکھو میرا عذاب اور میرا ڈرانا ﴿۴۰﴾ اور بلاشبہ یقیناً ہم نے قرآن کو نصیحت کے لیے آسان کر دیا، تو کیا ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا؟ ﴿۴۱﴾ اور بلاشبہ یقیناً فرعون کی آل کے پاس ڈرانے والے آئے ﴿۴۲﴾ انھوں نے ہماری سب کی سب نشانیوں کو جھٹلادیا تو ہم نے انھیں پکڑا، جیسے اس کی پکڑ ہوتی ہے جو سب پر غالب، بے حد قدرت والا ہو ﴿۴۳﴾ کیا تمہارے کفار ان لوگوں سے بہتر ہیں، یا تمہارے لیے (پہلی) کتابوں میں کوئی چمکارا ہے؟ ﴿۴۴﴾ یا وہ کہتے ہیں کہ ہم ایک مضبوط جماعت ہیں، جو بدلے کر رہنے والے ہیں؟ ﴿۴۵﴾

آیت 39-40: فَذُوقُوا عَذَابِي وَنُذِرٌ.....: یہاں قوم نوح، عاد، ثمود اور قوم لوط چاروں کے تذکرے میں یہ دونوں باتیں بار بار دہرائی ہیں، تاکہ متعدد مرتبہ ذکر کے دوران کسی باری ان کی طرف توجہ ہو جائے۔ سورہ رحمن میں ”فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ“ اور سورہ مرسلات میں ”وَيُنزلُ يُوسِفُ لِلْمُكَذِّبِينَ“ کو بار بار دہرانے میں بھی یہی حکمت ملحوظ ہے۔

آیت 41: وَ لَقَدْ جَاءَ آلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ: آل فرعون کو ڈرانے اور خبردار کرنے والوں سے مراد ان کے پاس آنے والے پیغمبر موسیٰ اور ہارون علیہ السلام بھی ہیں اور ان کو دیے جانے والے نو (۹) معجزات بھی، جنہیں اللہ تعالیٰ نے ”تِسْعَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ“ قرار دیا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ بنی اسرائیل (۱۰۱) کی تفسیر۔

آیت 42: كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا كُلِّهَا فَأَخَذْنَاهُمْ أَخَذَ عَزِيزٍ مُقْتَدِرٍ.....: ”عَزِيزٌ“ سب پر غالب، جو کرنا چاہے اسے کوئی روک نہیں سکتا۔ ”مُقْتَدِرٌ“ ”قَدْرٌ يَقْدِرُ“ (ض) سے باب افتعال ہے، حروف زیادہ ہونے کی وجہ سے ”مُقْتَدِرٌ“ میں ”قَادِرٌ“ اور ”قَدِيرٌ“ کی بہ نسبت قدرت کا معنی زیادہ ہے، یعنی جو کرنا چاہے اس کی پوری قدرت رکھتا ہے، کسی طرح عاجز نہیں۔ آل فرعون پر آنے والی گرفت کی شدت اور ہولناکی کا بیان مقصود ہے۔ مزید دیکھیے سورہ ہود (۱۰۲)۔

آیت 43: ① أَكْفَأَكُمْ حَيَّرٌ مِنْ أُولَئِكُمْ: یہ خطاب قریش کے لوگوں سے ہے کہ ان اتوام پر کفر و کذب کے نتیجے میں یہ عذاب آئے، اگر تم کفر اختیار کر دے گے تو کیا تم میں سے کفر کرنے والے کسی بھی لحاظ سے ان سے بہتر ہیں کہ ان پر عذاب نہیں آئے گا؟ استفہام انکاری ہے، یعنی ایسا نہیں ہے۔ قریش کے علاوہ قیامت تک کے تمام لوگ بھی اس کے مخاطب ہیں، کیونکہ وہ سب رسول اللہ ﷺ کی امت دعوت ہیں۔

② أَمْ لَكُمْ بَرَاءَةٌ فِي الزُّبُرِ: یا پہلی آسانی کتابوں میں تمہارے متعلق لکھا ہوا ہے کہ تم جو چاہو کرو، تم پر پہلی قوموں کی طرح عذاب نہیں آئیں گے؟ ظاہر ہے ایسا بھی نہیں۔

آیت 44: أَمْ يَقُولُونَ نَحْنُ بَجِيعٌ مُنتَصِرٌ: یہاں ”بَجِيعٌ“ ”سُكُلٌ“ (تمام) کے معنی میں نہیں بلکہ ”یاء“ کے اضافے

سَيَهْزُمُ الْجَنْعُ وَيُؤَلُّونَ الذُّبُرَ ﴿٤٥﴾ بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ أَذَىٰ وَآمُرُ ﴿٤٦﴾

عقربینہ یہ جماعت شکست کھائے گی اور یہ لوگ پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے ﴿٤٥﴾ بلکہ قیامت ان کے وعدے کا وقت ہے اور قیامت زیادہ بڑی مصیبت اور زیادہ کڑوی ہے ﴿٤٦﴾

کے ساتھ ”جَمْع“ کے معنی میں ہے، مضبوط جماعت۔ ”انْتَصَرَ يَنْتَصِرُ انتصاراً“ ظالم سے بچاؤ کرنا، دشمن سے انتقام لینا، ترمقابل پر غالب آنا۔ یا پھر ان کا کہنا یہ ہے کہ نہ ہم پہلوں سے بہتر ہیں اور نہ کسی کتاب میں ہمارے عذاب سے محفوظ رہنے کی کوئی بات موجود ہے، مگر ہم ایک مضبوط جماعت ہیں جو اپنا بچاؤ کر سکتے ہیں، بدلا بھی لے سکتے ہیں اور ترمقابل پر غالب بھی آسکتے ہیں، اس لیے ہمیں کوئی خوف نہیں۔ آیت میں التفات ہے، یعنی پچھلی آیت ”اَلْكَافِرُ كُفْرًا خَيْدًا“ میں خطاب کا صیغہ ہے اور یہاں غائب کے صیغہ کے ساتھ ان کا ذکر ہے، مراد ان کی تحقیر ہے کہ ایسی ڈیگیں مارنے والے خطاب کے قابل نہیں۔

آیت 45 سَيَهْزُمُ الْجَنْعُ وَيُؤَلُّونَ الذُّبُرَ: ”الْجَنْعُ“ پر الف لام عہد خارجی کا ہے، یعنی وہ جماعت جس کا پچھلی آیت کے لفظ ”يَجْنِعُ“ میں ذکر ہے۔ اس لیے ترجمہ ”یہ جماعت“ کیا گیا ہے۔ یعنی اگر ان کا یہ کہنا ہے تو یاد رکھیں کہ یہ جماعت اپنے خیال میں جتنی بھی زبردست ہو بہت جلد شکست کھائے گی اور یہ لوگ پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے۔ ”الذُّبُرُ“ کا لفظ واحد ہے، مراد جنس ہے: ”أَيُّ يُؤَلُّونَ كُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمْ ذُبْرَةٌ“ یعنی ان میں سے ہر ایک پیٹھ پھیر کر بھاگے گا۔ یہ آیت کے آخری حروف کی موافقت کے لیے ہے۔ یہ آیات مکہ میں نازل ہوئیں، جب مسلمان مظلوم و مقہور تھے، کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ قریش مکہ جیسے قوت و شوکت والے لوگ بھی کسی وقت ان کمزور اور بے بس مسلمانوں سے شکست کھائیں گے اور پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے۔ جن مسلمانوں میں سے کچھ جان بچا کر حبش میں پناہ لے چکے تھے، کچھ شعب ابی طالب میں محصور تھے اور قریش کے مقاطع اور محاصرے کی وجہ سے بھوکوں مر رہے تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ کے وعدے کے مطابق وہ وقت آیا اور فی الواقع تھوڑے ہی عرصے میں بدر و احزاب اور دوسری جنگوں کے موقع پر یہ پیش گوئی پوری ہوئی۔ بدر کے موقع پر معرکہ برپا ہونے سے پہلے رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت پڑھی، تب صحابہ کو معلوم ہوا کہ یہ وہ ہزیمت تھی جس کی وعید اللہ تعالیٰ نے کفار مکہ کو سنائی تھی۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ بدر کے دن رسول اللہ ﷺ اپنے خیمے میں تھے، اس وقت آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿اللَّهُمَّ إِنِّي أُنشِدُكَ عَهْدَكَ وَوَعْدَكَ، اللَّهُمَّ إِنْ تَشَاءُ لَا تُعَبِّدْ بَعْدَ الْيَوْمِ﴾ ”اے اللہ! میں تجھے تیرے عہد اور تیرے وعدے کا واسطہ دیتا ہوں۔ اے اللہ! اگر تو چاہتا ہے کہ آج کے بعد تیری عبادت نہ کی جائے (تو اس تھوڑی سی جمعیت کو مٹ جانے کے لیے بے یار و مددگار چھوڑ دے، ورنہ اس کی ضرور مدد فرما)۔“ تو ابو بکر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کا ہاتھ پکڑا اور کہنے لگے: ”اے اللہ کے رسول! بس سبھی، آپ نے اپنے رب سے نہایت اصرار کے ساتھ دعا کی ہے۔“ تو آپ ﷺ زہرہ بنت ابی سلمہ چلتے ہوئے نکلے اور آپ یہ آیت پڑھ رہے تھے: ﴿سَيَهْزُمُ الْجَنْعُ وَيُؤَلُّونَ الذُّبُرَ﴾ ”عقربینہ یہ جماعت شکست کھائے گی اور یہ لوگ پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے۔“ [بخاری، التفسیر، باب قوله: ﴿سَيَهْزُمُ الْجَمْعُ﴾: ۴۸۷۵]

آیت 46 بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ : ”ذَاهِيَةٌ“ بڑی مصیبت کو کہتے ہیں اور ”أَذَى“ زیادہ بڑی مصیبت۔ ”مُرٌّ“

إِنَّ الْمُجْرِمِينَ فِي ضَلَالٍ وَسُعْرٍ ﴿٢٤﴾ يَوْمَ يُسْحَبُونَ فِي النَّارِ عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ ذُوقُوا مَسَّ سَقَرَ ﴿٢٥﴾ إِنْ كُنَّ شَيْءٌ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ ﴿٢٦﴾

یقیناً مجرم لوگ بڑی گمراہی اور دیوانگی میں ہیں ﴿۲۴﴾ جس دن وہ آگ میں اپنے چہروں پر گھسیٹے جائیں گے، چکھو آگ کا چھونا ﴿۲۵﴾ بے شک ہم نے جو بھی چیز ہے، ہم نے اسے ایک اندازے کے ساتھ پیدا کیا ہے ﴿۲۶﴾

(میم کے ضمہ کے ساتھ) تلخ، کڑوا۔ ”مَرَّ يَمْرُؤٌ مَرَارَةً“ (ن) کڑوا ہونا۔ ”أَمْرٌ“ اس سے اسم تفضیل ہے، زیادہ تلخ۔ یعنی دنیا میں ہونے والی شکست بھی اگرچہ بڑی مصیبت اور بہت تلخ ہے کہ اس میں قتل، گرفتاری، غلامی، ذلت و رسوائی اور کئی طرح کی سزائیں ہیں، مگر اصل سزا کا وعدہ تو قیامت کے دن ہے اور قیامت دنیا کی مصیبتوں سے کہیں زیادہ بڑی مصیبت اور بہت زیادہ تلخ ہے، کیونکہ دنیا کی مصیبت اور تلخی آخر کار ختم ہونے والی ہے، مگر آخرت کی سزا کبھی ختم ہونے والی نہیں، پھر وہاں کی آگ دنیا کی آگ سے ستر (۷۰) گنا زیادہ سخت ہے۔

آیت 47: إِنَّ الْمُجْرِمِينَ فِي ضَلَالٍ وَسُعْرٍ: مجرمین سے مراد مشرکین ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿إِنَّ الَّذِينَ أُجْرِمُوا كَانُوا مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا يَضْحَكُونَ﴾ [المطففين: 29] ”بے شک وہ لوگ جنہوں نے جرم کیے، ان لوگوں پر جو ایمان لائے، ہنسا کرتے تھے۔“ اور فرمایا: ﴿هَذِهِ جَهَنَّمُ الَّتِي يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُونَ﴾ [الرحمن: 43] ”یہی ہے وہ جہنم جسے مجرم لوگ جھٹلاتے تھے۔“ یعنی مشرکین اپنی دانست میں بڑے دانا اور صحیح راستے پر چلنے والے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ بہت بڑی گمراہی اور دیوانگی میں مبتلا ہیں۔

آیت 48: يَوْمَ يُسْحَبُونَ فِي النَّارِ عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ : ”سَقَرَ“ جہنم کا علم (نام) ہے اور مؤنث سماعی ہے، اس لیے غیر منصرف ہے اور اس پر تین نہیں آتی۔ اشتقاق اس کا ”سَقَرْتُهُ النَّارُ“ (آگ نے اسے جھلس دیا) سے ہے، یعنی ان پر ان کی ضلالت اور دیوانگی اس دن واضح ہوگی جب انہیں ان کے چہروں کے بل آگ میں گھسیٹا جائے گا اور کہا جائے گا کہ جہنم کے چھونے کا مزہ چکھو۔ مزید دیکھیے سورہ فرقان (۳۴)۔

آیت 49: ① إِنْ كُنَّ شَيْءٌ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ: ”بِقَدَرٍ“ پر تین تعظیم کی ہے۔ یعنی اگر انہیں شبہ ہے کہ قیامت ابھی واقع کیوں نہیں ہوتی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے ہر چیز کو اپنے عظیم محکم اندازے کے ساتھ پیدا کیا ہے جو کبھی غلط نہیں ہو سکتا، کیونکہ ہمیں گزشتہ کی طرح آئندہ کا بھی پورا علم ہے کہ کوئی بھی چیز کس طرح ہوگی، کتنی ہوگی اور کب ہوگی؟ غرض ہم نے اس کی شکل و صورت، زمان و مکان، قوت و ضعف وغیرہ ہر چیز کا اندازہ طے کر دیا ہے، مثلاً جس کے قد کا اندازہ چھ فٹ طے کیا ہے وہ چھ فٹ ہی ہوگا، جسے سعید طے کر دیا ہے وہ سعید ہوگا اور جسے شقی طے کر دیا ہے وہ شقی ہوگا، جس کا جتنا وقت مقرر کیا ہے اس سے ایک لمحہ آگے پیچھے نہیں ہوگا۔ چنانچہ ہم نے قیامت کا بھی ایک وقت مقرر کر رکھا ہے، نہ وہ اس سے پہلے آ سکتی

وَمَا أَمْرُنَا إِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ ﴿۵۰﴾

اور ہمارا حکم تو صرف ایک بار ہوتا ہے، جیسے آنکھ کی ایک جھپک ﴿۵۰﴾

ہے نہ اس سے ایک لمحہ کی تاخیر ہوگی۔ تمہارے مطالبے کے مطابق اگر وہ ابھی واقع نہیں ہوتی تو یہ مت سمجھو کہ وہ واقع ہوگی ہی نہیں۔ اس آیت سے ملتی جلتی یہ آیت ہے: ﴿وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَنَا بِقَدَرٍ﴾ [الرعد: ۸] ”اور ہر چیز اس کے ہاں ایک اندازے سے ہے۔“ اور سورہٴ مرسلات کی یہ آیت: ﴿فَقَدَرْنَا فَنَعَمُ الْقَدَرُونَ﴾ [المرسلات: ۲۳] ”پس ہم نے اندازہ کیا تو ہم اچھے اندازہ کرنے والے ہیں۔“

﴿۵۰﴾ ”قَدَرٌ“ سے مراد تقدیر ہے جو ان چھ چیزوں میں شامل ہے جن پر ایمان کا دارومدار ہے۔ حدیث جبریل میں ہے کہ جبریل علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ مجھے ایمان کے متعلق بتائیے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: «أَنْ تُؤْمِنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَتُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ خَيْرِهِ وَشَرِّهِ» [مسلم، الإيمان، باب بیان الإيمان و الإسلام والإحسان : ۸] ”یہ کہ تو اللہ تعالیٰ پر اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور یومِ آخرت پر ایمان لائے اور تقدیر اچھی یا بری، اس پر ایمان لائے۔“ یعنی اچھی تقدیر کا خالق بھی اللہ تعالیٰ ہے اور بری کا بھی، مجوس کی طرح نہیں جو دو خالق مانتے ہیں، ایک خالق خیر اور ایک خالق شر۔ عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ ﷺ فرماتے تھے: «كَتَبَ اللَّهُ مَقَادِيرَ الْخَلَائِقِ قَبْلَ أَنْ يَخْلُقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِخَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ قَالَ وَعَرَشُهُ عَلَى الْمَاءِ» [مسلم، القدر، باب حجاج آدم و موسى صلى الله عليهما وسلم: ۲۶۵۳] ”اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات کی تقدیریں آسمان و زمین پیدا کرنے سے پچاس ہزار سال پہلے لکھ دیں۔“ فرمایا: ”اور (اس وقت) اس کا عرش پانی پر تھا۔“ عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «كُلُّ شَيْءٍ بِقَدَرٍ حَتَّى الْعَجْزِ وَالْكَيْسِ» [مسلم، القدر، باب كل شيء بقدر: ۲۶۵۵] ”ہر چیز تقدیر سے ہے، حتیٰ کہ عاجزی اور ہوشیاری بھی۔“ یعنی بعض لوگ جو بے کار اور نکٹھو ہوتے ہیں اور بعض عقل مند اور ہوشیار، تو یہ بھی تقدیر میں لکھا جا چکا ہے۔

آیت 50 ﴿۵۰﴾ ﴿۱﴾ وَمَا أَمْرُنَا إِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ: یعنی بے شک قیامت بہت بڑی چیز ہے، جس کی ہیبت سے آسمان و زمین لرزتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿تَقَلَّتْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾ [الأعراف: ۱۸۷] ”وہ آسمانوں اور زمین میں بھاری واقع ہوئی ہے۔“ مگر یہ مت سمجھو کہ ہمارے لیے اس کا قائم کرنا کچھ دشوار ہے، یا ہم لانا چاہیں تو اس کے آنے میں دیر ہو جائے گی، ہمارا تو صرف ایک حکم ہوتا ہے اور آنکھ جھپکنے میں کام ہو جاتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿إِنَّمَا أَمْرُنَا إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ لَنْ يَكُونُ﴾ [یس: ۸۲] ”اس کا حکم تو، جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے، اس کے سوانہیں ہوتا کہ اسے کہتا ہے ”ہو جا“ تو وہ ہو جاتی ہے۔“ مزید دیکھیے سورہٴ نحل (۷۷)۔

﴿۵۰﴾ یہاں ایک سوال ہے کہ ”وَمَا أَمْرُنَا“ کے بعد ”إِلَّا وَاحِدَةٌ“ ہونا چاہیے تھا، ”وَاحِدَةٌ“ کیوں فرمایا؟ جواب اس کا یہ ہے کہ اس سے مراد ”كَلِمَةٌ وَاحِدَةٌ“ ہے، یعنی ہمارا حکم صرف ایک کلمہ ”كُنْ“ ہوتا ہے۔

وَلَقَدْ أَهَلَكْنَا أَشْيَاعَكُمْ فَهَلْ مِنْ مُدَكِّرٍ ﴿۵۱﴾ وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوهُ فِي الزُّبُرِ ﴿۵۲﴾ وَكُلُّ صَغِيرٍ وَكَبِيرٍ مُسْتَظَرٌّ ﴿۵۳﴾ إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَنَهَرٍ ﴿۵۴﴾ فِي مَقْعَدٍ صَدِيقٍ عِنْدَ مَلِكٍ مُقْتَدِرٍ ﴿۵۵﴾

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے تمہارے جیسی کئی جماعتوں کو ہلاک کر ڈالا، تو کیا ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا؟ ﴿۵۱﴾ اور ہر چیز جسے انھوں نے کیا وہ دفتروں میں درج ہے ﴿۵۲﴾ اور ہر چھوٹی اور بڑی بات لکھی ہوئی ہے ﴿۵۳﴾ بے شک سچ کر چلنے والے باغوں اور نہروں میں ہوں گے ﴿۵۴﴾ صدق کی مجلس میں، عظیم بادشاہ کے پاس، جو بے حد قدرت والا ہے ﴿۵۵﴾

آیت 51 : وَلَقَدْ أَهَلَكْنَا أَشْيَاعَكُمْ : قیامت پر قادر ہونے کا ایک نمونہ پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ قسم ہے کہ ہم نے تمہارے جیسی کئی جماعتوں مثلاً عاد و ثمود وغیرہ کو ہلاک کر ڈالا۔ وہ بھی یہ بات ماننے کے لیے تیار نہیں تھے کہ ان پر عذاب آسکتا ہے، مگر جب عذاب آیا تو اچانک آیا۔ ایسے ہی قیامت بھی اچانک آئے گی، تو کیا ہے کوئی جو اپنے جیسے ان گروہوں سے عبرت حاصل کرے اور قیامت کی تیاری کرے؟ یہاں پھر التفات ہے، یعنی مشرکین کو مخاطب فرمایا ہے، کیونکہ مقصود ڈانٹنا ہے۔ ”أَشْيَاعٌ“ ”شبیعة“ کی جمع ہے، ایک جیسا عقیدہ رکھنے والی جماعت کے لوگ جو ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہوں۔ یہاں ”أَشْيَاعَكُمْ“ کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ بھی کفر و شرک میں تمہارے جیسے تھے۔

آیت 52، 53 : وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوهُ فِي الزُّبُرِ : ”مُسْتَظَرٌّ“ ”مَسْطُورٌ“ کے معنی میں ہے۔ افتعال کی تاء کی وجہ سے معنی میں مبالغہ مقصود ہے کہ ہر چھوٹی بڑی بات بہت اچھی طرح لکھی ہوئی ہے، مراد اعمال نامے ہیں۔ یعنی ان مجرموں نے جو کچھ کیا ہے سب دفتروں میں درج ہے۔ مزید دیکھیے سورہ کہف (۳۹) اور سورہ انفطار (۱۲۱۰)۔

آیت 54 : إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَنَهَرٍ : کفار کے بعد متقی لوگوں کا انجام ذکر فرمایا کہ وہ باغوں اور نہروں میں ہوں گے۔ (دیکھیے طور: ۱۷) آیات کے آخری حروف کی موافقت کے لیے ”نَهَرٍ“ کا لفظ مفرد لایا گیا، مراد جنس ہے، جس میں ہر قسم کی نہریں شامل ہیں۔ جنت کی نہروں کے لیے دیکھیے سورہ محمد کی آیت (۱۵) کی تفسیر۔

آیت 55 : ﴿۱﴾ فِي مَقْعَدٍ صَدِيقٍ عِنْدَ مَلِكٍ مُقْتَدِرٍ : یہاں ”مُقْتَدِرٌ“ بمعنی ”صَادِقٌ“ برائے مبالغہ ہے، جیسے ”عَدْلٌ“ بمعنی ”عَادِلٌ“ برائے مبالغہ ہے اور ”مَقْعَدٌ“ موصوف اپنی صفت ”صَدِيقٌ“ (بمعنی صَادِقٌ) کی طرف مضاف ہے، جیسے کہا جاتا ہے: ”مَسْجِدُ الْجَامِعِ.“ ”صَدِيقٌ“ کا اصل معنی خبر کا واقع کے مطابق ہونا ہے۔ ”فلاں شخص صادق ہے“ کا مطلب یہ ہے کہ وہ جو بات کہتا ہے وہ واقع میں اسی طرح ہوتی ہے جیسے اس نے کہا۔ پھر یہ لفظ کسی بھی چیز کی تعریف کے لیے اور اس کے اپنے اوصاف میں کامل ہونے کے لیے بولا جانے لگا۔ ”فُلَانٌ رَجُلٌ صَدِيقٌ“ یعنی وہ رجولیت میں کامل ہے۔ اردو میں کہا جاتا ہے ”فلاں سچ سچ مرد ہے۔“ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلَقَدْ بَوَّأْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ مَبْوَءَ صَدِيقٍ﴾ [یونس: ۹۳] ”اور ہم نے بنی اسرائیل کو ٹھکانا دیا جو ٹھکانا ہونے میں کامل تھا، سچ سچ کا باعزت ٹھکانا تھا۔“ اور فرمایا: ﴿وَأَجْعَلْ لِي

لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْآخِرِينَ ﴿۸۴﴾ [الشعراء: ۸۴] ”اور پیچھے آنے والوں میں میرے لیے سچی ناموری رکھ۔“ اور فرمایا: ﴿وَقُلْ رَبِّ ادْخِنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ﴾ [ہی اسرائیل: ۸۰] ”اور کہہ اے میرے رب ادخل کر مجھے سچا داخل کرنا۔“ ”فِي مَقْعِدِ صِدْقٍ“ کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایسی مجلس میں ہوں گے جو مجلس ہونے کے لحاظ سے ہر طرح کامل ہوگی، مجلس کے تمام لوازمات و مناسبات سے آراستہ ہوگی، سچ سچ کی مجلس ہوگی۔

② یاد رہے کہ یہاں ”مَقْعِدٍ“ کا ترجمہ جو ”مجلس“ کیا گیا ہے وہ اس کا پورا مفہوم ادا نہیں کرتا، کیونکہ ”مَقْعِدٌ“ اور ”جَلْسٌ“ دونوں کا معنی اگرچہ ”بیٹھنا“ ہے، مگر ”مَقْعِدٍ“ میں ٹھہرنے کا مفہوم پایا جاتا ہے جو ”مجلس“ میں نہیں پایا جاتا، مثلاً سورہ توبہ کی آیت (۸۱): ﴿فَرِحَ الْمُخَلَّفُونَ بِمَقْعِدِهِمْ جِلْفَ رَسُولِ اللَّهِ﴾ میں ”بِمَقْعِدِهِمْ“ کا معنی صرف بیٹھنا نہیں بلکہ ”بیٹھ رہنا“ ہے اور سورہ نساء کی آیت (۹۵): ﴿لَا يَسْتَوِي الْقُعُودُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ﴾ میں ”الْقُعُودُونَ“ کا معنی ”بیٹھ رہنے والے مومن“ ہے۔ اسی طرح سورہ نور کی آیت (۲۰): ﴿وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَاءِ﴾ میں ”الْقَوَاعِدُ“ کا معنی ”بیٹھ رہنے والیاں“ ہے۔ یہاں ”الْقَوَاعِدُ“ کے بجائے ”الْحَوَالِسُ“ کا لفظ استعمال نہیں ہو سکتا۔ سورہ ق کی آیت (۱۷): ﴿عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيدٌ﴾ میں فرشتوں کے مسلسل ساتھ بیٹھے ہونے کا جو مفہوم ادا ہو رہا ہے وہ ”جَلْسٌ“ میں نہیں۔ اب اس کے مقابلے میں سورہ مجادلہ کی آیت (۱۱) دیکھیے، فرمایا: ﴿إِذَا قِيلَ لَكُمْ تَقَسَّعُوا فِي الْمَجَالِسِ فَافْسَحُوا يَفْسَحِ اللَّهُ لَكُمْ وَإِذَا قِيلَ انشُرُوا فَانشُرُوا﴾ ”جب تمہیں کہا جائے کہ مجلسوں میں کھل جاؤ تو کھل جاؤ، اللہ تعالیٰ تمہارے لیے فراخی کر دے گا اور جب کہا جائے اٹھ کھڑے ہو تو اٹھ کھڑے ہو جاؤ۔“ یہاں ”تَقَسَّعُوا“ (کھل جاؤ) سے مجلس میں حرکت کا ثبوت ملتا ہے اور ”انشرُوا“ (اٹھ کھڑے ہو) سے ظاہر ہے کہ مجلس میں جلوں ترک بھی ہو سکتا ہے، لیکن ”مَقْعِدٌ“ کا معاملہ یہ نہیں۔ اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ متقی لوگ ”مقعِد صدق“ میں ہوں گے جو پائیدار ہوگی۔ ”مجلس صدق“ کے لفظ سے یہ مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ مفسر رازی نے یہ بات بہت مفصل اور مدلل لکھی ہے۔

③ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ: ”مَلِيْكٌ“ ”مُلْكٌ“ میں سے ”فَعِيلٌ“ کا وزن ہے، مُلْكٌ والا۔ اس میں ”مُلْكٌ“ سے زیادہ مبالغہ ہے، اس لیے ترجمہ ”عظیم بادشاہ“ کیا گیا ہے۔ ”مُقْتَدِرٌ“ میں ”قَادِرٌ“ یا ”قَدِيْرٌ“ سے زیادہ مبالغہ ہے، جیسا کہ پیچھے ”أَخَذَ عَزِيْزٌ مُّقْتَدِرٌ“ کے تحت گزرا ہے، اس لیے ترجمہ ”بے حد قدرت والا“ کیا گیا ہے۔ کسی بھی گھریا مکان کے مرتبے کا تعین اس جگہ سے ہوتا ہے جہاں وہ واقع ہو، فرعون کی بیوی آسیہ رضی اللہ عنہا نے دنیا کی تمام سہولتیں چھین جانے پر اللہ تعالیٰ سے اپنے پاس گھریا کرنے کی دعا کی تھی: ﴿رَبِّ اٰتِنِيْ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْبَحْرِ﴾ [التحریم: ۱۱] ”اے میرے رب! میرے لیے اپنے پاس جنت میں ایک گھریا بنا دے۔“ یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات میں سے ”مَلِيْكٌ مُّقْتَدِرٌ“ کا ذکر فرمایا ہے، کیونکہ لوگ بادشاہوں کی مجلس میں اور ان کے پڑوس میں رہنے کے خواہش مند ہوتے ہیں اور جتنا زیادہ اقتدار والا بادشاہ ہو اتنی ہی اس کے قرب کی خواہش زیادہ ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے متقین کو بشارت سنائی کہ ان کی رہائش بادشاہوں کے بادشاہ کے پاس ہوگی جو سارے اقتدار کا مالک ہے۔ پھر ان کی عزت و شوکت کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ [اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا مِنْهُمْ]

الرَّحْمَنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْآنَ ۝

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

اس بے حد رحم والے نے ① یہ قرآن سکھایا ②

اس سورت کی فضیلت میں ایک حدیث مشہور ہے: «لِكُلِّ شَيْءٍ عَرُوسٌ وَ عَرُوسُ الْقُرْآنِ الرَّحْمَنُ» ”ہر چیز کا ایک دولہا ہوتا ہے اور قرآن کا دولہا سورہہ رحمن ہے۔“ (عروس کا معنی دولہا بھی ہے اور دلہن بھی) سیوطی نے اسے ”النجاصُ الضعیفُ“ میں ”شُعَبُ الْإِيمَانِ لِلْبَيْهَقِيِّ“ کے حوالے سے علی بن ابی طالب سے روایت کیا ہے۔ علامہ البانی رحمہ اللہ نے اسے ضعیف لکھا ہے۔ دیکھیے ضعیف الجامع (۴۷۹)۔

آیت 2.1: ① الرَّحْمَنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْآنَ : اس سورت کا آغاز اللہ کے مبارک نام ”الرَّحْمَنُ“ کے ساتھ ہوا ہے اور پوری سورت اس کی بے حد و بے حساب رحمت کی تفصیل ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ہر ہر نعمت کا ذکر کر کے بار بار اپنا احسان یاد دلایا ہے۔ ان نعمتوں میں وہ نعمتیں بھی ہیں جو دنیا میں تمام لوگوں پر کی گئی ہیں اور وہ بھی جو صرف ایمان والوں پر ہیں۔ ان میں سے سب سے بڑی نعمت دین کا ذکر سب سے پہلے فرمایا ہے، کیونکہ دنیا و آخرت دونوں میں کامیابی اسی پر موقوف ہے اور دین کا مدار قرآن مجید پر ہے، اس لیے فرمایا: ﴿الرَّحْمَنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْآنَ﴾ ”اس بے حد رحم والے نے۔ یہ قرآن سکھایا۔“

② ”الرَّحْمَنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْآنَ“ میں نعمت کے بیان کے ساتھ کفار کے اس بہتان کا رد بھی ہے کہ ﴿إِنَّمَا يُعَلِّمُهُ بَشَرًا﴾ اسحٰق: ۱۰۳ یعنی آپ (ﷺ) کو کوئی بشر ہی سکھاتا ہے۔ فرمایا، آپ کو سکھانے والا کوئی بشر یا کوئی اور ہستی نہیں، بلکہ وہ رحمن ہی ہے جس نے آپ کو قرآن سکھایا۔ ابن عاشور نے اس کی وضاحت اس طرح فرمائی ہے کہ مسند کو فعل کی صورت میں مسند الیہ کے بعد تخصیص کا فائدہ دینے کے لیے لایا گیا ہے۔ کیونکہ کفار کا کہنا تھا کہ قرآن کسی اور نے آپ کو سکھایا ہے، گویا وہ یہ مان گئے کہ یہ آپ نے خود نہیں بنایا بلکہ کسی اور نے آپ کو سکھایا ہے، مگر وہ یہ نہیں مانتے تھے کہ آپ کو قرآن سکھانے والا اللہ تعالیٰ ہے، اس لیے فرمایا: ”اس رحمان ہی نے (آپ کو) یہ قرآن سکھایا ہے۔“ ”عَلَّمَ الْقُرْآنَ“ ”الرَّحْمَنُ“ مبتدا کی پہلی خبر ہے، اس کے بعد مسلسل تین خبریں ہیں جو حرف عطف کے بغیر لائی گئی ہیں۔ ان نعمتوں کے اس انداز میں ذکر کرنے سے جہاں ان نعمتوں کا اظہار ہو رہا ہے وہاں یہ بات بھی واضح ہو رہی ہے کہ یہ نعمتیں رحمان ہی نے عطا کی ہیں، انھیں عطا کرنے میں کسی اور کا نہ کوئی دخل ہے نہ کسی قسم کی شرکت ہے۔ مشرکین یہاں تک تو مانتے تھے، مگر اس سے لازم آنے والی بات ماننے کے لیے تیار نہیں تھے کہ جب یہ سب نعمتیں رحمان ہی کی ہیں تو عبادت بھی اسی کی ہے۔ گویا نعمتوں کے شمار کرنے میں مشرکین

خَلَقَ الْإِنْسَانَ ﴿۱﴾

اس نے انسان کو پیدا کیا ﴿۱﴾

کو ان کی غلطی پر متنبیہ اور اکیسے اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے۔

﴿۱﴾ "عَلَّمَ الْقُرْآنَ" میں "عَلَّمَ" کا ایک مفعول "الْقُرْآنَ" ذکر فرمایا ہے کہ اس رُحْمَن نے یہ قرآن سکھایا، دوسرا مفعول ذکر نہیں فرمایا کہ کسے سکھایا؟ یہ حذف فرما دیا ہے، تاکہ عام رہے۔ بعض مفسرین نے فرمایا، اس محذوف سے مراد نبی کریم ﷺ ہی ہیں، مگر بہتر ہے کہ اسے عام رکھا جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے نبی کریم ﷺ کو قرآن کی تعلیم دی، مگر ظاہر ہے کہ آپ کے واسطے سے اور بعد میں قرآن کے معلمین کے واسطے سے تمام لوگوں کو قرآن کی تعلیم دینے والی اصل ذات گرامی اللہ تعالیٰ کی ہے، وہ تعلیم نہ دے تو نہ نبی ﷺ تعلیم دے سکتے ہیں، نہ صحابہ اور نہ ہی بعد کا کوئی معلم۔ اس لیے تعلیم قرآن کو خاص اللہ تعالیٰ کی نعمت کے طور پر ذکر فرمایا ہے۔

﴿۲﴾ اکثر مفسرین نے چونکہ یہاں "الْقُرْآنَ" سے مراد رسول کریم ﷺ پر نازل شدہ قرآن کریم لیا ہے، اس لیے اوپر تفسیر اس کے مطابق کی گئی ہے۔ آیت کے الفاظ میں ایک اور تفسیر کی بھی گنجائش ہے، وہ یہ کہ "الْقُرْآنَ" کا لفظی معنی "قِرَاءَةٌ" (پڑھنا) ہے، جیسا کہ سورہ قیامہ (۱۸) میں فرمایا: ﴿فَإِذَا قَرَأْتَ قُرْآنًا فَاسْتَعِذْ بِحُرْمَةِ اللَّهِ﴾ "تو جب ہم اسے پڑھیں تو تو اس کے پڑھنے کی بیروی کر۔" اس تفسیر کے مطابق اللہ تعالیٰ انسان کو پڑھنے کی تعلیم کی نعمت یاد دلا رہے ہیں، یعنی "الَّذِينَ عَلَّمُوا الْقُرْآنَ" کا معنی ہے: "اس رُحْمَن ہی نے پڑھنا سکھایا۔" یاد رہے کہ رسول اللہ ﷺ پر نازل ہونے والی سب سے پہلی وحی میں لکھنے کی تعلیم کی نعمت کا ذکر خاص طور پر فرمایا تھا، فرمایا: ﴿اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ۝ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ﴾ [العلق: ۳، ۴] "پڑھ اور تیرا رب ہی سب سے زیادہ کرم والا ہے۔ وہ جس نے قلم کے ساتھ سکھایا۔" تو سورہ رُحْمَن میں پڑھنے کی تعلیم کی نعمت کا ذکر فرمایا۔ اس تفسیر کے مطابق یہ نعمت مزید عام ہو جاتی ہے، جس میں قرآن کا پڑھنا بھی شامل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لکھنا، پڑھنا اور بیان تینوں انسان پر اللہ تعالیٰ کی ان عظیم نعمتوں میں سے ہیں جو اسے جانوروں سے ممتاز کرتی ہیں۔ انھی کے ذریعے سے وہ دور و نزدیک دوسرے انسانوں سے رابطہ کرتا ہے، وحی الہی سے حاصل ہونے والے علوم کو اور انسانی عقل اور تجربے سے حاصل ہونے والے علوم و فنون کو سیکھتا سکھاتا ہے، لکھ کر محفوظ کرتا ہے اور آنے والی نسلوں کو پہنچاتا ہے۔

﴿۳﴾ خَلَقَ الْإِنْسَانَ: یہ بھی لفظ "الَّذِينَ عَلَّمُوا الْقُرْآنَ" کی خبر ہے اور اسے فعل کی صورت میں لانے سے تخصیص کا فائدہ حاصل ہو رہا ہے۔ چنانچہ اس آیت میں بھی دو باتیں بیان ہوئی ہیں، ایک یہ کہ رحمان ہی نے انسان کو پیدا کیا ہے، سو عبادت بھی اس اکیسے کی ہے۔ دوسری انسان کو پیدا کرنے کی نعمت کا بیان ہے۔ زمین و آسمان میں موجود دوسری تمام نعمتوں کا ذکر اس کے بعد فرمایا ہے، کیونکہ وہ سب انسان کی پیدائش کے بعد ہیں، اگر وہ موجود ہی نہ ہوتو کسی نعمت کا اسے کیا فائدہ۔ البتہ تعلیم قرآن کی نعمت کا ذکر اس کی اہمیت کی طرف توجہ دلانے کے لیے اس سے بھی پہلے فرما دیا۔ "رُحْمَن ہی نے انسان کو پیدا فرمایا" یہ ایسی

عَلَمَةُ الْبَيَانَ ۝ الشُّسُ وَالْقَمَرُ يُحْسَبَانِ ۝

اسے بات کرنا سکھایا ۝ سورج اور چاند ایک حساب سے (چل رہے) ہیں ۝

بات نہیں جسے مشرکین نہ مانتے ہوں، مگر اسے صریح لفظوں میں کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مشرکین فی الحقیقت یہ بات نہیں مانتے، کیونکہ اگر مانتے ہوتے تو کسی غیر کی پرستش کیوں کرتے؟

آیت 4 . عَلَمَةُ الْبَيَانَ: سکھانے میں بہت سی چیزیں شامل ہیں، یعنی اس میں بیان کی صلاحیت رکھی، اسے اپنے مطلب کے اظہار کے لیے مختلف زبانوں کے الفاظ وضع کرنے اور ان کے استعمال کا سلیقہ بخشنا، جس سے ہزاروں زبانیں وجود میں آئیں اور اسے قدرت دی کہ اپنا ما فی الضمیر نہایت وضاحت اور حسن و خوبی کے ساتھ ادا کر سکے اور دوسروں کی بات سمجھ سکے۔ اپنی اس صفت کی بدولت وہ خیر و شر، ہدایت و ضلالت، ایمان و کفر اور دنیا و آخرت کی باتیں سمجھتا اور سمجھا تا ہے اور اس کو کام میں لا کر فائدہ اٹھاتا ہے۔ مزید دیکھیے سورۃ بقرہ کی آیت (۳۱): ﴿وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا﴾ اور سورۃ روم کی آیت (۲۲): ﴿وَوَاحْتِلَافِ السِّيَلِكُمْ وَ الْوَاوَاكِفِ﴾ کی تفسیر۔ یہ جملہ بھی لفظ ”الْمُرْصَلُونَ“ کی خبر ہے اور فعل کی صورت میں آنے سے اس میں بھی پچھلے جملوں کی طرح تخصیص پیدا ہو رہی ہے۔

آیت 5 . الشُّسُ وَالْقَمَرُ يُحْسَبَانِ: ”حُسْبَانٌ“ ”حَسِبْتُ بِحَسْبٍ“ کا مصدر ہے، جس میں ”الفون“ زیادہ کر دیا گیا ہے، جس سے معنی میں اضافہ ہو گیا ہے، جیسے ”طُعْبَانٌ“ ”رُحْبَانٌ“ اور ”كُفْرَانٌ“ وغیرہ میں ہے۔ یعنی سورج اور چاند نہایت محکمہ اور باریک حساب کے ساتھ چل رہے ہیں، آسمان کے نیچے تواریخ و سیارستاروں کا کوئی شمار نہیں، جن میں سے بعض سورج اور چاند سے بھی ہزاروں گنا بڑے ہیں۔ ان کی پیدائش اور گردش میں اللہ تعالیٰ کی بے حساب حکمتوں کا بھی کچھ شمار نہیں، مگر خاص طور پر سورج اور چاند کا ذکر اس لیے فرمایا کہ نمایاں نظر آنے کی وجہ سے زمین کے رہنے والوں کے معاملات کا ان دونوں کے ساتھ زیادہ تعلق ہے۔ مفسر کیلانی لکھتے ہیں: ”سورج اور چاند کا ایک مقررہ رفتار کے مطابق چلنا، پھر اس میں ایک لحظہ کی بھی تاخیر نہ ہونا انسان کے لیے ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ سورج سے دن رات ادل بدل کر آتے رہتے ہیں اور موسموں میں بتدریج تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ نمازوں کے اوقات کا تعلق بھی سورج سے ہے، فصلوں کے پکنے کا انحصار بھی سورج سے ہے۔ چاند سے ہمیں رات کو روشنی حاصل ہوتی ہے، ہم مہینوں اور سالوں کا حساب رکھ سکتے ہیں، اور یہی حقیقی اور فطری تقویم (کیلنڈر) ہے۔ اسی لیے رمضان کے روزے، حج، عیدین اور دوسری قابل شمار مدتوں، مثلاً مدت حمل، مدت رضاعت و مدت وغیرہ کا تعلق چاند سے ہوتا ہے۔ پھر سورج اور زمین کے درمیان ایسا مناسب فاصلہ رکھا گیا ہے کہ اس میں کمی بیشی سے اس زمین پر انسان اور دوسرے سب جانداروں کی زندگی ہی ناممکن ہے اور سب فائدے اسی صورت میں حاصل ہو رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان عظیم الجذبتہ کروں کو ایسے طبعی قوانین میں جکڑ رکھا ہے، جس سے وہ ادھر ادھر ہو ہی نہیں سکتے اور اپنے مقرر مداروں پر مقررہ رفتار سے ہمہ وقت ٹھوگرش رہتے ہیں۔“ (تیسیر القرآن) مزید دیکھیے سورۃ النعام (۹۶) اور سورۃ بنی اسرائیل (۱۳)۔

وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ ① وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ ② أَلَّا تَطْغَوْا فِي

المِيزَانَ ③

اور بے تنے کے پودے اور درخت سجدہ کر رہے ہیں ① اور آسمان، اس نے اسے اونچا اٹھایا اور اس نے ترازو رکھی ② تاکہ تم ترازو میں زیادتی نہ کرو ③

آیت 6 وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ: ”النَّجْمُ“ کا معنی ستارا بھی ہے اور وہ پودے بھی جو تنے کے بغیر ہوتے ہیں، جیسے گندم، جو، پنے، جزی بوئیاں، بلیں، سبزیاں وغیرہ۔ یہاں دوسرا معنی زیادہ مناسبت رکھتا ہے، کیونکہ یہ ”الشَّجَرُ“ کے مقابلے میں آیا ہے۔ طبری نے علی بن ابی طلحہ کی معتبر سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی معنی نقل فرمایا اور اسے ترجیح دی ہے۔ ان کے سجدہ کرنے کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ حج (۱۸)۔

آیت 7 ① وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا: یہاں بھی ”رَفَعَ السَّمَاءَ“ کے بجائے ”وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا“ میں آسمان کو پہلے لا کر اس کی اہمیت کی طرف اور اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اسے بلند کرنا اس اکیلے کا کام ہے، کسی اور کا اس میں کوئی دخل نہیں، پھر کسی اور کی پرستش کیوں ہو؟ آسمان کو اونچا اٹھانے میں اس کے پیدا کرنے کا ذکر خود بخود آ گیا۔ اونچا اٹھانے کا ذکر خاص طور پر اس لیے فرمایا کہ اتنے بڑے آسمان کو اس طرح ستونوں کے بغیر پیدا کرنا اور اسے اتنا بلند بنانا بے حد تعجب انگیز ہے کہ اس کے نیچے سورج، چاند اور ان سے ہزاروں گنا بڑے سیاروں پر مشتمل کہکشائیں محو گردش ہیں، نہ انھیں راستے میں کسی ستون کی رکاوٹ پیش آتی ہے، نہ ہزاروں نوری سالوں کے فاصلے سے ان کی روشنی زمین پر آنے کے درمیان کوئی چیز حائل ہوتی ہے۔

② وَوَضَعَ الْمِيزَانَ: ”الْمِيزَانَ“ ”وَزْنَ“ سے ”مِفْعَالٌ“ کے وزن پر ہے جو اصل میں ”مِوزَانٌ“ ہے، وزن کا آلہ۔ ”وزن“ چیزوں کے ایک دوسرے کے مقابلے میں برابر یا کم و بیش ہونے کے اندازے کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک بہت بڑی نعمت یہ ہے کہ اس نے انسان کو ہر چیز کی مقدار معلوم کرنے کے لیے میزان کا طریقہ سکھایا۔ اس میزان میں ہر قسم کے پیمانے آجاتے ہیں، وزن، کیل، مساحت، حرارت، برودت، دباؤ، نمی، غرض ہزار ہا قسم کے پیمانے بنانے کا سلیقہ عطا فرمایا، جن سے وہ اپنے معاملات درست اور بہتر سے بہتر طریقے کے ساتھ چلاتا ہے۔ اس کے بغیر کوئی کام بھی درست انجام نہیں پاسکتا، پھر انھی پیمانوں کے ساتھ وہ ایک دوسرے سے لین دین کرتا ہے۔ اگر یہ نہ ہوتے تو دلی اطمینان کے ساتھ باہمی لین دین ممکن نہیں تھا۔

آیت 8 ③ أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانَ: اس سے پہلے ”لام“ جارہ محذوف ہے: ”أَلَّا لِفَتْحًا تَطْغَوْا“ یعنی اس نے میزان اس لیے بنایا ہے کہ تم ہر معاملے میں وزن کرتے ہوئے صحیح وزن کرو، کمی بیشی مت کرو، کیونکہ یہ حد سے تجاوز ہے۔

وَ أَقْبِنُوا الْوُزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْصِرُوا الْمِيزَانَ ④ وَالْأَرْضَ وَضَعَهَا لِلْأَنْعَامِ ⑤ فِيهَا فَالْكَهْتَةُ ⑥
وَ النَّخْلُ ذَاتُ الْأَكْمَامِ ⑦

اور انصاف کے ساتھ تول سیدھا رکھو اور ترازو میں کمی مت کرو ④ اور زمین، اس نے اسے مخلوق کے لیے بچھا دیا ⑤
اس میں پھل ہیں اور کھجور کے درخت جو (خوشوں پر) غلافوں والے ہیں ⑦

آیت 9 ﴿ ۱ ﴾ وَ أَقْبِنُوا الْوُزْنَ بِالْقِسْطِ : ” الْقِسْطُ ” عدل، انصاف۔ ان آیات میں ” الْمِيزَانَ ” کا لفظ تین دفعہ آیا ہے، پہلا آلہ (ترازو) کے معنی میں ہے، دوسرا مصدر (وزن) کے معنی میں اور تیسرا اسم مفعول (مَوْزُونٌ) کے معنی میں۔ (ابن عادل، اللباب) اس سے ماپ تول اور دوسرے پیمانوں میں انصاف کی تاکید مقصود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے شعیب علیہ السلام کی قوم پر عذاب کا ایک بہت بڑا باعث ماپ تول میں کمی بیشی کو قرار دیا ہے اور قرآن مجید کی ایک سورت کا نام ”مطففین“ ہے، جس میں کمی بیشی کرنے والوں کے لیے ”دیل“ کی وعید سنائی ہے۔

② بہت سے مفسرین نے فرمایا کہ ”وَ وَضَعَ الْمِيزَانَ“ میں ”وَ أَقْبِنُوا الْوُزْنَ“ سے مراد عدل ہے، جس کی ایک شاخ ماپ تول میں عدل ہے۔ اس لیے ”وَ وَضَعَ الْمِيزَانَ“ میں عام عدل کا ذکر ہے اور ماپ تول کی اہمیت کے پیش نظر ”أَقْبِنُوا الْوُزْنَ“ (تول سیدھا رکھو) میں عدل کی صورتوں میں وزن کا خاص طور پر الگ ذکر فرمایا ہے۔

آیت 10 ﴿ ۱ ﴾ وَالْأَرْضَ وَضَعَهَا لِلْأَنْعَامِ : ” الْأَنْعَامُ “ کا معنی ہر جان دار مخلوق ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے زمین کو اس طرح بنایا اور بچھایا ہے کہ مخلوق کی تمام ضروریات اس سے پوری ہوتی ہیں، ان کا پیدا ہونا، کھانا پینا، پہننا، رہنا سہنا، چلنا پھرنا، زندہ رہنا اور دفن ہونا غرض ہر ضرورت اور ہر سہولت اسی سے وابستہ ہے۔ ” الْأَنْعَامُ “ کے لفظ میں اگرچہ تمام مخلوق شامل ہے، مگر یہاں اس سے مراد جن و انس ہیں، کیونکہ محاسبہ انھی دو کا ہونا ہے اور آگے انھی پر احسانات کا ذکر ہے۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس نے زمین کی ہر چیز انسانوں کی خاطر بنائی ہے، فرمایا: ﴿ هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ فِي الْأَرْضِ جَنِينًا ﴾ [البقرة: ۲۹] ” وہی ہے جس نے زمین میں جو کچھ ہے سب تمہارے لیے پیدا کیا۔“ اور فرمایا: ﴿ وَسَخَّرَ لَكُمْ فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَنِينًا ﴾ [الحجیة: ۱۳] ” اور اس نے تمہاری خاطر ان تمام چیزوں کو مسخر کر دیا جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں۔“ زمین کو انسان کے لیے بنانے اور بچھانے کے متعلق دیکھیے سورہ رعد (۳)، نمل (۶۰، ۶۱)، لیس (۳۳، ۳۴، ۳۵)، حم السجدہ (۹)، (۱۰)، زخرف (۹، ۱۰)، جاثیہ (۲، ۳)، ق (۸، ۷)، ملک (۱۵)، مرسلات (۲۵، ۲۶)، نبا (۶) اور سورہ نازعات (۳۰، ۳۱، ۳۲)۔

آیت 11 ﴿ ۱ ﴾ فِيهَا فَالْكَهْتَةُ ⑥ وَ النَّخْلُ ذَاتُ الْأَكْمَامِ : ” فَالْكَهْتَةُ “ ان پھلوں اور چیزوں کا نام ہے جو بطور خوراک نہیں بلکہ لذت اور خوشی کے لیے کھائی جاتی ہیں۔ یہ ”فَيْكَةٌ يَفْكُهُ“ (فَرْحٌ يَفْرُحُ) سے مشتق ہے، جس کا معنی باتوں اور ہنسی وغیرہ کے ساتھ خوش وقت ہونا ہے۔ ” فَالْكَهْتَةُ “ پر تنوین نکشیر و تعظیم کے اظہار کے لیے ہے۔ ” النَّخْلُ “ کھجور کے درخت، یہ

وَالْعَبْتُ ذُو الْعَصْفِ وَالزَّيْحَانَ ﴿١٢﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ﴿١٣﴾

اور دانے جو بھس والے ہیں اور خوشبودار پھول ﴿١٣﴾ تو (اے جن و انس!) تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿١٢﴾

اسم جنس ہے، ایک درخت کہنا ہو تو "شُخْلَةٌ" کہتے ہیں۔ "الْأَكْمَلِيَّةُ" "سِجْمٌ" (کاف پر کسرہ) کی جمع ہے، گھور کے خوشے کے اوپر والا لٹاف۔ یہ غلاف کھایا نہیں جاتا، اس لیے مراد خوشوں کے حسن کا بیان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے درختوں کے اوپر اور درختوں سے اترنے کے بعد بھی پھلوں کی جس طرح پیکنگ کی ہے ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ اللہ تعالیٰ کی عظیم صنائی کا نمونہ ہے۔

آیت 12: ﴿١٢﴾ وَالْعَبْتُ ذُو الْعَصْفِ وَالزَّيْحَانَ: "العَبْتُ" دانے، جیسے گندم، چنے، چاول وغیرہ، یعنی غلہ جو انسان کی خوراک بنتا ہے۔ "الْعَصْفُ" دانوں کے اوپر کا چھلکا، بھوسا، جو جانوروں کی خوراک بنتا ہے، سورہ نمل میں ہے: ﴿كَعَصْفٍ قَامًا كَالْوَالِئِ﴾ النمل: ۵۱ "کھائے ہوئے بھوسے کی طرح۔" "الزَّيْحَانُ" خوشبودار پودے اور پھول جو آدمی کے دماغ کو معطر کرتے ہیں۔ "فَاكِهَةٌ" سے وہ پھل مراد ہیں جو صرف لذت کے لیے کھائے جاتے ہیں اور "الذَّهْنُ" سے وہ پھل مراد ہیں جو لذت اور خوراک دونوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں اور "العَبْتُ" سے مراد غلے وغیرہ ہیں جو خوراک کے لیے استعمال ہوتے ہیں اور "الزَّيْحَانُ" سے مراد خوشبو کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

آیت 12: ﴿١٣﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ: "إِلَاءُ" "إِلَى" کی جمع ہے جو اصل میں "إِلَى" ہے، جیسے "بمعنى" (انتزاعی) کی جمع "أَمْعَاءُ" ہے۔ اس کا ایک معنی نعمت ہے۔ طبری نے علی بن ابی طلحہ کی معتبر سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر نقل فرمائی ہے: "فَبِأَيِّ بِنْعْمَةِ اللَّهِ تُكَذِّبَانِ" "تم دونوں اللہ تعالیٰ کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟" اور ایک معنی قدرت ہے، چنانچہ طبری ہی نے ابن زید کی تفسیر نقل فرمائی ہے، انھوں نے فرمایا: "الْآلَاءُ الْقُدْرَةُ، فَبِأَيِّ قُدْرَةِ اللَّهِ تُكَذِّبَانِ" یعنی "تم دونوں اللہ کی کس کس قدرت کو جھٹلاؤ گے؟"

۲ مفسر سلیمان الجمل نے فرمایا، نعمتوں کے بیان اور ان کی یاد دہانی کے لیے یہ آیت یہاں آئیں (۳۱) مرتبہ و ہر آیت گنی ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی آدمی نے کسی پر احسان کیے ہوں اور وہ ان احسانوں کو نہ مانتا ہو تو اسے کہتا ہے، کیا تو فقیر نہیں تھا؟ میں نے تجھے مال دیا، کیا تو اس کا انکار کرتا ہے؟ کیا تو ننگا نہیں تھا؟ میں نے تمہیں لباس پہنایا، کیا تو اس کا انکار کرتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے آٹھ مرتبہ یہ آیت ان آیات کے بعد دہرائی جن میں اس کی مخلوق کے عجائب اور ان کی ابتدا و انتہا کا ذکر ہے، پھر جہنم کے دروازوں کی تعداد کے مطابق سات مرتبہ ان آیات کے بعد دہرائی ہے جن میں آگ اور اس کی ہولناکیوں کا بیان ہے۔ پھر جنت کے دروازوں کی تعداد کے مطابق آٹھ مرتبہ دو جنتوں کے وصف میں اسے دہرایا ہے۔ پھر ان دو جنتوں کے علاوہ دوسری دو جنتوں کے وصف میں آٹھ مرتبہ دہرایا ہے۔ تو جو شخص پہلی آٹھ چیزوں کا عقیدہ و یقین رکھے گا اور ان کے تقاضے پر عمل کرے گا وہ اللہ کی طرف سے ان آٹھ نعمتوں کا مستحق ہوگا اور اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم کے ساتھ اسے پہلی ساتوں سے محفوظ رکھیں گے۔ (ملخصاً)

خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ﴿۱۴﴾ وَخَلَقَ الْجَانَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ ﴿۱۵﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ﴿۱۶﴾ رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ ﴿۱۷﴾

اس نے انسان کو بجنے والی مٹی سے پیدا کیا، جو ٹھیکری کی طرح تھی ﴿۱۴﴾ اور جن کو آگ کے شعلے سے پیدا کیا ﴿۱۵﴾ تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۱۶﴾ (وہ) دونوں مشرقوں کا رب ہے اور دونوں مغربوں کا رب ﴿۱۷﴾

۳۔ یہاں ایک سوال ہے کہ اس سورت کی کئی آیات میں جہنم اور عذاب کا بھی ذکر ہے، تو ان کے بعد ”فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ“ کہنے میں کون سی نعمت یا دلالی جا رہی ہے؟ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ ”الْآءِ“ کا معنی قدرت بھی ہے، جیسا کہ اوپر گزرا۔ تو اللہ تعالیٰ کی صفات اور جہنم و عذاب کے بیان کے بعد کہا جا رہا ہے کہ تم دونوں اللہ تعالیٰ کی کون کون سی قدرت کو جھٹلاؤ گے؟ اور ایک جواب یہ ہے کہ عذاب آنے سے پہلے اس کے متعلق خبردار کر دینا بہت بڑی نعمت ہے، کیونکہ اس سے بندہ اس سے بچنے کی جدوجہد کر سکتا ہے، اس لیے فرمایا کہ تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

آیت 14 خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ: ”صَلْصَلَةٌ“ وہ آواز جو کسی چیز کو بجانے یا کھڑکانے سے پیدا ہوتی ہے، جیسا کہ صحیح بخاری کی حدیث (۲) میں ”صَلْصَلَةُ الْجَزَسِ“ کا ذکر ہے۔ ”صَلْصَالٍ“ بجنے والی، کھٹکینے والی (مٹی)۔ بعض کہتے ہیں یہ ”صِلُّ اللَّحْمِ“ سے مشتق ہے، جس کا معنی گوشت کا بدبودار ہونا ہے۔ مراد بدبودار مٹی ہے۔ آیت کی مزید تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ حجر (۲۶)۔

آیت 14 وَخَلَقَ الْجَانَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ: طبری نے فرمایا ”مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ“ ایک دوسرے سے ملی جلی سرخ، زرد اور سبز رنگ کی آگ۔ مراد آگ کا شعلہ اور اس کی ٹوک ہے۔ یہ ”مَرَجٌ أَمْرٌ الْقَوْمِ“ سے ہے، جس کا معنی ہے ”قوم کا معاملہ مل جل گیا۔“ اسی طرح یہ نبی ﷺ کے اس فرمان سے ہے جو آپ ﷺ نے عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کو فرمایا: «يَا عَبْدَ اللَّهِ ابْنِ عَمْرٍو! كَيْفَ بَلَكَ إِذَا بَقِيَتْ فِي حُثَالَةِ مَنِ النَّاسِ وَفِي أَبِي دَاوُدَ: قَدْ مَرَحَتْ عُهْوُ دُهُمَ وَ أَمَانَاتُهُمْ» بخاری، الصلاة، باب تشبيك الأصابع.....: ۴۸۰۔ ابو داؤد: ۴۳۴۲ [”اے عبد اللہ بن عمرو! تمہارا کیا حال ہوگا جب تم چھان بوری جیسے لوگوں میں باقی رہ جاؤ گے۔“ ابو داؤد میں ہے: ”جن کے عہد اور امانتیں مل جل گئے ہوں گے۔“ اور طبری نے علی بن ابی طلحہ کی معتبر سند کے ساتھ ”مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ“ کا معنی ”خَالِصُ النَّارِ“ نقل فرمایا ہے۔

آیت 16 فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ: جن و انس کی پیدائش میں اللہ تعالیٰ کی قدرت بھی ہے اور ان دونوں پر نعمت بھی۔

آیت 17 رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ: سورج ہمیشہ مشرقی سمت کے درمیان سے طلوع نہیں ہوتا، بلکہ گرمیوں میں اس کا مشرق شمال کی طرف سرکتا جاتا ہے اور سردیوں میں جنوب کی طرف اور ہر روز سورج کے طلوع ہونے کی جگہ الگ ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے سال بھر میں سورج کے ۳۶۵ مشرق ہوتے ہیں، یہی حال اس کے مغربوں کا ہے۔ اس کے مطابق اللہ تعالیٰ نے سورہ صافات (۵) میں اپنی صفت ”رَبُّ الْمَشَارِقِ“ اور سورہ معارج (۴۰) میں ”رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ“

فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ﴿١٨﴾ مَرَجَ الْبُحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ ﴿١٩﴾ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَا يَبْغِيَانِ ﴿٢٠﴾
 فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ﴿٢١﴾ يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ﴿٢٢﴾ فَبِأَيِّ
 آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ﴿٢٣﴾ وَ لَهُ الْجَوَارِ الْمُنشَآتُ فِي الْبَحْرِ كَالْأَعْلَامِ ﴿٢٤﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ
 رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ﴿٢٥﴾

تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿١٨﴾ اس نے دو سمندروں کو ملا دیا، جو اس حال میں مل رہے ہیں کہ ﴿١٩﴾ ان دونوں کے درمیان ایک پردہ ہے (جس سے) وہ آگے نہیں بڑھتے ﴿٢٠﴾ تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿٢١﴾ ان دونوں سے موتی اور مرجان نکلتے ہیں ﴿٢٢﴾ تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿٢٣﴾ اور اسی کے ہیں بادبان اٹھائے ہوئے جہاز سمندر میں، جو پہاڑوں کی طرح ہیں ﴿٢٤﴾ تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿٢٥﴾

بیان فرمائی ہے۔ یہاں سردی اور گرمی کے آخری دو مقامات کے اعتبار سے ”رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَ رَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ“ فرمایا ہے۔ مزید دیکھیے سورہ صافات (۵)۔

آیت 18 فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ: سورج کے طلوع و غروب، اس کی گردش اور اس کے متعدد مطالع و مغارب میں اللہ تعالیٰ کی بے شمار قدرتیں ہیں اور اس سے موسموں کے بدلنے، بارشیں برسنے، برف گرنے، بے شمار قسم کی فصلیں اُگنے اور انسان کی راحت و آرام کے بے حساب سامان مہیا کرنے کی بے شمار نعمتیں ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ یاد دلا رہے ہیں۔

آیت 19، 21 مَرَجَ الْبُحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ.....: ان آیات کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ فرقان (۵۳) کی تفسیر۔

آیت 22 يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ: مفسر کیلانی لکھتے ہیں: ”مرجان دراصل جمادات اور نباتات کے درمیان برزخی پیدائش ہے، جس طرح سب موتی پتھروں ہی کی قسم ہوتے ہیں، مرجان بھی پتھر ہی کی قسم ہے، لیکن یہ نباتات کی طرح بڑھتا ہے، جمادات کی طرح جامد نہیں۔ مرجان کا ایک چھوٹا سا پودا ہوتا ہے جس کی شاخیں بھی ہوتی ہیں۔ موتی اور مرجان عموماً کھاری پانی کی پیداوار ہیں، مگر اسی کھاری پانی کے نیچے اللہ کی قدرت سے بیٹھے پانی کے چشمے بھی ابل رہے ہوتے ہیں، یا ساتھ ساتھ رواں دواں ہوتے ہیں، اس لیے ”مِنْهُمَا“ کا لفظ ارشاد فرمایا، یعنی یہ چیزیں اللہ تعالیٰ کے حیرت انگیز تخلیقی کارناموں کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہیں جن سے انسان فائدہ اٹھا رہا ہے۔“ (تیسیر القرآن) مزید دیکھیے سورہ نحل (۱۳)۔

آیت 23 فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ: ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کا بیان بھی ہے اور نعمتوں کا بھی۔

آیت 24، 25 وَ لَهُ الْجَوَارِ الْمُنشَآتُ فِي الْبَحْرِ كَالْأَعْلَامِ.....: ”الْمُنشَآتُ“ ”أُنشِئْتُ بِنَشْئِي“ (افعال) (بنانا) سے اسم مفعول ہے، پہاڑوں جیسے لمبے چوڑے اور کئی منزلہ اونچے بحری جہاز ’جو بنائے گئے ہیں‘ اس میں بحری جہاز بنانے کا طریقہ

يَسْأَلُهُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ كُلُّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ ﴿۲۹﴾

اسی سے مانگتا ہے جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہے، ہر دن وہ ایک (نئی) شان میں ہے ﴿۲۹﴾

کی نعمت بھی ہے، کیونکہ مرنے کے بغیر کوئی شخص اس کی جنت کا وارث نہیں بن سکتا اور نہ اس کا دیدار حاصل کر سکتا ہے۔ ایک فارسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

بے فنائے خود میسر نیست دیدار شما سے فروشد خویش را اول خریدار شما

”اپنے فنا کے بغیر تمہارا دیدار میسر نہیں ہوتا، تمہیں خریدنے والے کو پہلے اپنا آپ بیچنا پڑتا ہے۔“

ت 29 ﴿۱﴾ يَسْأَلُهُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ: یہ ہر چیز کے فانی ہونے اور اللہ تعالیٰ کے باقی ہونے کی دلیل ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ ہمیشہ باقی ہے، کیونکہ وہ غنی ہے، اپنے وجود یا بقا یا کسی بھی چیز میں کسی دوسرے کا محتاج نہیں، مگر اس کے سوا جو بھی ہے خواہ آسمان ہوں یا زمین یا جو ان دونوں میں ہے، سب اپنے وجود، اپنی بقا اور اپنی ہر ضرورت کے لیے ہر لمحے اس کے محتاج ہیں۔ اپنی ہر ضرورت اسی سے مانگ رہے ہیں، کوئی زبانِ قال سے مانگ رہا ہے، کوئی زبانِ حال سے اور کوئی دونوں سے۔ جس کی زندگی کا ہر لمحہ مانگنے پر موقوف ہے وہ کیا خاک باقی رہے گا۔

﴿۲﴾ كُلُّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ: ”کُلُّ يَوْمٍ“ سے مراد ہر وقت ہے۔ ”شَأْنٍ“ میں تعوینِ تخمیر کے لیے ہے، یعنی وہ ہر لمحے ایک نئی سے نئی شان میں ہے، کسی کو پیدا کر رہا ہے اور کسی کو مار رہا ہے، کسی کو اٹھا رہا ہے اور کسی کو گر رہا ہے، کسی کو بیمار کر رہا ہے اور کسی کو شفا بخش رہا ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «يَذُ اللّٰهُ مَلَأَى لَا تَحْبِصُهَا نَفَقَةٌ سَحَاءَ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَ قَالَ أَرَأَيْتُمْ مَا أَنْفَقَ مُنْذُ خَلَقَ السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ فَإِنَّهُ لَمْ يَعْصُ مَا فِي يَدِهِ وَ كَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ وَ بِنْدِهِ الْمِيزَانُ يَحْفِضُ وَ يَرْفَعُ» [بخاری، التفسیر، سورۃ ہود، باب قولہ: ﴿وَ كَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ﴾: ۶۸۴] ”اللہ کا ہاتھ بھرا ہوا ہے، کسی قسم کا خرچ کرنا اس میں کمی نہیں لاتا، رات دن بے حساب برسنے والا ہے۔ تم نے دیکھا اس نے جب سے آسمان و زمین پیدا کیے، کیا کچھ خرچ کیا، تو اس (خرچ کرنے) نے اس میں کوئی کمی نہیں کی جو اس کے ہاتھ میں ہے اور اس کا عرش پانی پر تھا اور اس کے ہاتھ میں ترازو ہے۔ نیچے کرتا ہے اور اونچا کرتا ہے۔“ اور ابو الدرداء رضی اللہ عنہما نے نبی ﷺ سے ”کُلُّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ“ کی تفسیر کے بیان میں روایت کیا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: «مَنْ شَأْنِهِ أَنْ يَغْفِرَ ذُنُوبًا وَ يُفْرَجَ كَرْبًا وَ يَرْفَعَ قَوْمًا وَ يَحْفِضَ آخَرِينَ» [ابن ماجہ، المقدمة، باب فيما أنكرت الجهمية: ۲۰۲، وقال الألباني حسن] ”اس کی شان سے ہے کہ وہ کوئی نہ کوئی گناہ بخش رہا ہے، کوئی نہ کوئی مصیبت دور کر رہا ہے اور کسی قوم کو اونچا کر رہا ہے اور کسی کو نیچا کر رہا ہے۔“

﴿۳﴾ اس میں یہود کا بھی رد ہے جنہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے چھ دنوں میں زمین و آسمان پیدا فرمائے اور ہفتہ کے دن آرام کیا۔ فرمایا وہ ہر دن ہی نئی شان میں ہے، اسے نہ تھکاؤٹ ہوتی ہے نہ آرام کی ضرورت ہے۔

فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ﴿۳۰﴾ سَنَفْرُغُ لَكُمْ أَيُّهَ الثَّقَلَيْنِ ﴿۳۱﴾

تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۳۰﴾ ہم جلد ہی تمہارے لیے فارغ ہوں گے اے دو بھاری گروہو! ﴿۳۱﴾

۴ یونان کے فلسفی آسمانی ہدایت سے محروم تھے، انھوں نے اللہ تعالیٰ کا وجود ماننے کے باوجود اپنے دیوتاؤں کی منجائش نکالنے کے لیے ایک قاعدہ وضع کیا، جو یہ تھا کہ ”ہر محلّ حوادث حادث ہوتا ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ قدیم ہے، ہمیشہ سے ہے، اس لیے اس پر حوادث نہیں آسکتے۔“ افسوس! بعض مسلمان متکلمین نے بھی ان کا یہ قاعدہ تسلیم کر لیا۔ نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی صفات کا انکار کر دیا۔ بعض نے تاویل کی اور ایسی تاویل کی جو درحقیقت بدترین تحریف ہے۔ مثلاً اللہ کی صفت کلام ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَى تَكْلِيمًا﴾ [النساء: ۱۶۴] ”اور اللہ نے موسیٰ سے کلام کیا، خود کلام کرنا۔“ اور فرمایا: ﴿وَإِنْ أَحَدٌ مِنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّى يَسْمَعَ كَلِمَ اللَّهِ﴾ [التوبة: ۶] ”اور اگر مشرکوں میں سے کوئی تجھ سے پناہ مانگے تو اسے پناہ دے دے، یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سنے۔“ اور فرمایا: ﴿إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ﴾ [يس: ۸۲] ”اس کا حکم تو، جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے، اس کے سوا نہیں ہوتا کہ اسے کہتا ہے ”ہو جا“ تو وہ ہو جاتی ہے۔“ یہ ساری کائنات اس کے کلمہ کُن سے وجود میں آئی ہے۔ ظاہر ہے کلام کا ہر لفظ حادث ہے، پہلے موجود نہیں ہوتا، پھر وجود میں آتا ہے، اس لیے متکلمین نے اللہ تعالیٰ کے کلام کا انکار کر دیا۔ اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے، سنتا ہے، اترتا ہے، بلند ہوتا ہے، خوش ہوتا ہے، ناراض ہوتا ہے۔ ظاہر ہے یہ صفات اور اس جیسی دوسری صفات اللہ تعالیٰ میں ہمیشہ سے ہیں، ان کی انواع قدیم ہیں مگر افراد حادث ہیں، ان کا اظہار مختلف اوقات میں ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ جب چاہے کلام کرتا ہے، نیچے اترتا ہے، بلند ہوتا ہے، پیدا کرتا ہے، مارتا ہے، ہر لمحے کو ہر لمحے روزی بخشتا ہے، ہر لمحے ہر ایک کو دیکھتا ہے، اس کی سنتا ہے، اس کی ضرورت پوری کرتا ہے، مگر یونانی فلسفیوں کی تقلید میں متکلمین نے اللہ تعالیٰ کو سننے، دیکھنے، بولنے، خوش ہونے، ناراض ہونے، غرض اس طرح کی تمام صفات سے عاری قرار دیا۔ اس مقام پر بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی یہ صفت بیان فرمائی ہے کہ وہ آسمان و زمین کی ہر چیز کے سوال کو سنتا ہے اور ہر لمحے نئی سے نئی شان میں ہے؟ اب ہم یونان کے کافر فلاسفر اور ان کے مقلد بعض متکلمین کی بات مائیں کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی نئی شان وارد نہیں ہو سکتی یا اللہ تعالیٰ کی بات پر ایمان رکھیں کہ وہ ہر لمحے ایک نئی سے نئی شان میں ہے؟ ظاہر ہے جس کے دل میں ایمان ہے وہ تو اللہ تعالیٰ ہی کی بات مانے گا، خواہ کوئی فلسفی اسے مانے یا نہ مانے۔

آیت 31 سَنَفْرُغُ لَكُمْ أَيُّهَ الثَّقَلَيْنِ: ”الثَّقَلَيْنِ“ ”ثَقَلٌ“ کی جمع ہے، بھاری اور وزنی چیز۔ مراد زمین پر آباد جاندار

مخلوق میں سے دو بھاری اور کثیر التعداد جماعتیں جن و انس ہیں۔ مخلوقات میں سے شرعی احکام کی تکلیف ان دونوں ہی کو دی گئی ہے، اس لیے انھی کو مخاطب فرمایا۔ طبری نے علی بن ابی طلحہ کی معتبر سند کے ساتھ ”سَنَفْرُغُ لَكُمْ أَيُّهَ الثَّقَلَيْنِ“ کے

فَبِأَيِّ آيَةٍ رَبِّكُمْ تَكْفُرِينَ ﴿۳۲﴾ يَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ إِنَّ اسْتَطَعْتُمْ أَنْ تَنْفُذُوا مِنْ أَقْطَارِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ فَانْفُذُوا ۚ لَا تَنْفُذُونَ إِلَّا بِسُلْطَانٍ ﴿۳۳﴾

تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۳۲﴾ اے جن وانس کی جماعت! اگر تم طاقت رکھتے ہو کہ آسمانوں اور زمین کے کناروں سے نکل جاؤ تو نکل جاؤ، کسی غلبے کے سوا نہیں نکلو گے ﴿۳۳﴾

بارے میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر نقل کی ہے: ”وَعَيْدٌ مِنَ اللَّهِ لِلْعِبَادِ وَلَيْسَ بِاللَّهِ شُعْلٌ وَهُوَ قَارِعٌ“ یعنی ”یہ الفاظ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کے لیے وعید ہیں، ورنہ اللہ تعالیٰ کو دوسرے کسی کام سے روکنے والی کوئی مشغولیت نہیں اور وہ قارِع ہے۔“ امام بخاری نے فرمایا: ”سَنْفَرُغٌ لَكُمْ سَنَحَابِبُكُمْ لَا يَشْعَلُهُ شَيْءٌ عَنْ شَيْءٍ وَهُوَ مَعْرُوفٌ فِي كَلَامِ الْعَرَبِ يُقَالُ لَا تَفْرَغَنَّ لَكَ وَمَا بِهِ شُعْلٌ يَقُولُونَ لَا أُحْدِثُكَ عَنِّي غَيْرَتِكَ“ | بخاری، التفسیر، سورة الرحمن، قبل الحديث : ۴۸۷۸ | یعنی ”سَنْفَرُغٌ لَكُمْ“ (ہم جلد ہی تمہارے لیے قارِع ہوں گے) کا مطلب یہ ہے کہ ہم جلد ہی تمہارا حساب لیں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی چیز دوسری چیز سے رکاوٹ نہیں بنتی اور یہ کلام عرب میں معروف ہے۔ کہا جاتا ہے، میں تمہارے لیے قارِع ہوں گا، حالانکہ اسے کوئی مشغولیت نہیں ہوتی۔ مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں تمہاری غفلت میں تمہیں کچڑوں گا۔“ ”سَنْفَرُغٌ لَكُمْ“ کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ اے جنوں اور انسانو! ہم نے تمہارے لیے ایک نظام الاوقات طے کر دیا ہے، دنیا میں تمہارے پاس عمل کی مہلت ہے، یہاں ہم ہر لمحے تمہاری ضرورتیں پوری کر رہے ہیں، جو مانگتے ہو دے رہے ہیں، بہت جلد ہم اس مرحلے سے قارِع ہوں گے، پھر قیامت قائم ہوگی اور تمہارے مجاہدے کا مرحلہ شروع ہو جائے گا۔

آیت 32 . فَبِأَيِّ آيَةٍ رَبِّكُمْ تَكْفُرِينَ : اس نظام عالم کو درہم برہم کر کے قیامت برپا کرنا، ان دونوں جماعتوں سے حساب لینا، پھر اس کے مطابق جزا و مزا دینا اللہ تعالیٰ کے عدل اور اس کی عظیم قدرت کا اظہار بھی ہے اور اہل ایمان کے لیے بہت بڑی نعمت بھی، جس کے متعلق فرمایا: ﴿فَبِأَيِّ آيَةٍ رَبِّكُمْ تَكْفُرِينَ﴾ ”کہ تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟“

آیت 33 . يَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ إِنَّ اسْتَطَعْتُمْ : ”عَشْرٌ“ ”عَشْرٌ“ سے ”مَفْعَلٌ“ کے وزن پر ہے، کثیر التعداد جماعت کو کہتے ہیں، کیونکہ اس میں بہت سے عَشْرَات پائے جاتے ہیں، جن کا شمار یکے بعد دیگرے دہائیوں میں ہوتا ہے۔ ”أَقْطَارٌ“ ”قَطْرٌ“ کی جمع ہے، کنارے، ”سُلْطَانٌ“ قدرت اور نصیب۔ یعنی اے جنوں اور انسانوں کی جماعت! دنیا میں اگر تم موت سے بچنے کے لیے آسمانوں اور زمین کے کناروں سے نکل کر بھاگ سکتے ہو تو بھاگ جاؤ، مگر تم اللہ تعالیٰ پر غالب آ کر ہی نکل سکو گے، جس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، جیسا کہ فرمایا: ﴿أَيْنَ مَا كُنْتُمْ تُدْرِكُوا الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِي بُرُوجٍ مُّشِيدَةٍ﴾ [النساء : ۷۸] ”تم جہاں کہیں بھی ہو گے موت تمہیں پا لے گی، خواہ تم مضبوط قلعوں میں ہو۔“ اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ

فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ﴿۳۴﴾ يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ وَنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرِينَ ﴿۳۵﴾

فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ﴿۳۴﴾

تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۳۴﴾ تم پر آگ کا شعلہ اور دھواں چھوڑا جائے گا، پھر تم اپنے آپ کو بچا نہیں سکو گے ﴿۳۵﴾ تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۳۵﴾

کے محابے اور اس کی گرفت سے بچنے کے لیے اگر تم آسمانوں اور زمین کے کناروں سے نکل کر بھاگ سکتے ہو تو بھاگ جاؤ..... اس سے ملتا جلتا مفہوم اس آیت کا ہے، فرمایا: ﴿فَإِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ وَخَسَفَ الْقَمَرُ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ يَقُولُ الْإِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ أَيْنَ الْمَفْزُؤُ كَلَّا لَا وَتَرَاهُ إِلَىٰ رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمُسْتَقَرُّ﴾ [القيامة: ۱۲۷-۱۲۸] ”پھر جب آنکھ پتھرا جائے گی۔ اور چاند گہنا جائے گا۔ اور سورج اور چاند اکٹھے کر دیے جائیں گے۔ انسان اس دن کہے گا کہ بھاگنے کی جگہ کہاں ہے؟ ہرگز نہیں، پناہ کی جگہ کوئی نہیں۔ اس دن تیرے رب ہی کی طرف جا ٹھہرنا ہے۔“ آج کل راکٹ یا خلائی گاڑی کے ذریعے سے چاند پر یا کسی اور ٹرے پر جانے کے تجربات ہو رہے ہیں، بعض لوگ اس کے متعلق کہتے ہیں کہ ”لَا تَنْفُذُونَ إِلَّا بِسُلْطٰنٍ“ (تم غلبے کے بغیر نہیں نکل سکو گے) سے مراد یہ ہے کہ ان مشینوں کے ذریعے سے ”أَفْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ“ سے نکلنا ممکن ہے، حالانکہ ان کوششوں کی آیت کے مفہوم کے ساتھ کوئی نسبت ہی نہیں۔ یہ بے چارے تو زمین و آسمان کے درمیان خلا میں پھر رہے ہیں، آسمان و زمین کے کناروں تک رسائی تو بہت دور ہے۔ پھر وہ ذرہ بے مقدار، جس کا ایک سانس بھی اس کے اپنے اختیار میں نہیں، وہ اپنی قوت کے ساتھ ”أَفْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ“ سے نکلنے کی بات کرے تو یہی کہا جاسکتا ہے۔

بت کریں آرزو خدائی کی شان ہے تیری کبریائی کی

آیت 34 ﴿فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ﴾ یہاں ”الآء“ کا معنی ”قدرتیں“ واضح ہے اور وعید گناہوں سے باز آنے کا باعث ہونے کی وجہ سے عظیم نعت بھی ہے۔

آیت 35 ﴿يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ.....﴾: ”شُوَاظٌ“ آگ کا شعلہ جس میں دھواں نہ ہو اور ”نُحَاسٌ“ دھواں۔ ”نُحَاسٌ“ کا معنی تانا بھی ہے، مراد پگھلا ہوا تانا ہے۔ ”انْتَصَرَ يَنْتَصِرُ انْتِصَارًا“ اپنا بچاؤ کرنا، انتقام لینا۔ یعنی تم ہمارے قبضے سے کسی صورت بھی نکل کر بھاگ نہیں سکتے، اگر تم یہ ارادہ کرو گے تو تم پر خالص آگ کے شعلے برسائے جائیں گے، جو تمہیں جلا کر بھسم کر دیں گے اور دھواں جو تمہارے سانس تک بند کر دے گا، پھر نہ تم اپنا بچاؤ کر سکو گے اور نہ کسی طرح انتقام لے سکو گے۔ یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ تم پر آگ کے شعلوں کے ساتھ پگھلا ہوا تانا پھینکا جائے گا، جو دونوں تمہیں جلا کر راکھ بنا دیں گے۔

فَإِذَا انشَقَّتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ﴿۳۷﴾ فَبِأَيِّ آيَةٍ رَبِّكُمَا تُكذِّبِينَ ﴿۳۸﴾ فَيَوْمَئِذٍ
لَّا يُسْئَلُ عَنْ ذُنُوبِهِ إِنْسٌ وَلَا جَانٌّ ﴿۳۹﴾ فَبِأَيِّ آيَةٍ رَبِّكُمَا تُكذِّبِينَ ﴿۴۰﴾ يُعْرِفُ الْمُجْرِمُونَ
بِسِينُهُمْ فَيُؤَخِّدُهُمْ بِالنَّوَاصِي وَالْأَقْدَامِ ﴿۴۱﴾

پھر جب آسمان پھٹ جائے گا، تو وہ سرخ چیزے کی طرح گلابی ہو جائے گا ﴿۳۷﴾ تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۳۸﴾ پھر اس دن نہ کسی انسان سے اس کے گناہ کے متعلق پوچھا جائے گا اور نہ کسی جن سے ﴿۳۹﴾ تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۴۰﴾ مجرم اپنی علامت سے پہچانے جائیں گے، پھر پیشانی کے بالوں اور قدموں سے پکڑا جائے گا ﴿۴۱﴾

آیت 37 : ﴿فَإِذَا انشَقَّتِ السَّمَاءُ..... : "وَرْدَةً" گلاب کے پھول کی طرح گلابی۔ "الدَّهَانُ" میں علماء کے دوقول ہیں، ایک سرخ چیز اور دوسرا "تیل" جو ملا جاتا ہے۔ اس معنی میں بعض کہتے ہیں: "الدَّهَانُ" "ذُهْنٌ" کی جمع ہے اور بعض کہتے ہیں مفرد ہے۔ تیل کو "ذُهْنٌ" بھی کہتے ہیں اور "دِهَانٌ" بھی۔ ﴿فَإِذَا انشَقَّتِ السَّمَاءُ﴾ کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ حادہ (۱۶)، فرقان (۲۵) اور سورہ اشفاق (۲۱)۔

اگر "الدَّهَانُ" کا معنی سرخ چیز کریں تو اس وقت آیت میں آسمان کے ایک وصف کا بیان ہے کہ آسمان جو آج نیلگوں ہے اس وقت سرخ چیزے کی طرح لال گلابی ہو جائے گا اور اگر "الدَّهَانُ" کا معنی تیل کیا جائے تو آیت میں آسمان کے پھٹنے کے وقت اس کے دو وصفوں کا بیان ہوگا، ایک یہ کہ وہ حرارت کی شدت سے سرخ ہوگا اور دوسرا یہ کہ پگھل کر تیل کی طرح ہو جائے گا، جیسا کہ فرمایا: ﴿يَوْمَ تَكُونُ السَّمَاءُ كَالذَّهَبِ الْمُهْلَبِ﴾ [المعارج : ۸] "جس دن آسمان پگھلے ہوئے تانبے (یا تپھٹ) کی طرح ہو جائے گا۔" (شقیلی)

آیت 39 : ﴿فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْئَلُ عَنْ ذُنُوبِهِ إِنْسٌ وَلَا جَانٌّ﴾: یعنی اس دن یہ معلوم کرنے کے لیے کہ کون مجرم ہے اور اس نے کیا گناہ کیا ہے، کسی انسان یا جن سے پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں ہوگی، کیونکہ تمام مجرم اپنی علامت ہی سے پہچانے جائیں گے، جیسا کہ اگلی آیت میں آ رہا ہے: ﴿يُعْرِفُ الْمُجْرِمُونَ بَسِينَتِهِمْ﴾ "مجرم اپنی علامت سے پہچانے جائیں گے۔" اور جیسا کہ سورہ قصص میں فرمایا: ﴿وَلَا يُسْئَلُ عَنْ ذُنُوبِهِمُ الْمُجْرِمُونَ﴾ [القصص: ۷۸] "اور مجرموں سے ان کے گناہوں کے بارے میں پوچھا نہیں جائے گا۔" ہاں ڈانٹنے، ذلیل کرنے اور ملامت کرنے کے لیے ضرور پوچھا جائے گا، جیسا کہ فرمایا: ﴿قَوْرَبِكَ لَنَسْأَلَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ۚ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ [الحجر : ۹۲، ۹۳] "سو تیرے رب کی قسم ہے! یقیناً ہم ان سب سے ضرور سوال کریں گے۔ اس کے بارے میں جو وہ کیا کرتے تھے۔" اور فرمایا: ﴿وَقَفَّوهُمْ إِنَّهُمْ مُنْتَوُونَ﴾ [الصافات : ۲۴] "اور انھیں شہراؤ، بے شک یہ سوال کیے جانے والے ہیں۔"

آیت 41 : ﴿يُعْرِفُ الْمُجْرِمُونَ بَسِينَتِهِمْ..... : "النَّوَاصِي" "نَاصِيَةٌ" کی جمع ہے، پیشانی کے بال۔ (دیکھیے ہود:

فِي آيَةِ الْآيَةِ رَبِّكُمْ تَكْذِبِينَ ﴿۳۷﴾ هَذِهِ جَهَنَّمُ الَّتِي يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُونَ ﴿۳۸﴾ يَطُوفُونَ
بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَبِيبٍ إِنَّ ﴿۳۹﴾ فِي آيَةِ الْآيَةِ رَبِّكُمْ تَكْذِبِينَ ﴿۴۰﴾ وَلَئِن خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ

جَنَّتَن ﴿۴۱﴾

تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۳۷﴾ یہی ہے وہ جہنم جسے مجرم لوگ جھٹلاتے تھے ﴿۳۸﴾ وہ اس کے درمیان اور کھولتے ہوئے پانی کے درمیان چکر کاٹتے رہیں گے ﴿۳۹﴾ تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۴۰﴾ اور اس شخص کے لیے جو اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈر گیا، دو باغ ہیں ﴿۴۱﴾

(۵۶) یعنی ان کے چہرے سیاہ ہوں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ﴾ [آل عمران: ۱۰۶] "جس دن کچھ چہرے سفید ہوں گے اور کچھ چہرے سیاہ ہوں گے۔" آنکھیں نیلی ہوں گی، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِينَ يَوْمَئِذٍ زُرْقًا﴾ [طہ: ۱۰۲] "اور ہم مجرموں کو اس دن اس حال میں اکٹھا کریں گے کہ نیلی آنکھوں والے ہوں گے۔" اور اعمال نامے پیچھے کے پیچھے بائیں ہاتھ میں پکڑ رکھے ہوں گے۔ دیکھیے سورہ انشاق (۱۰) اور سورہ حاقہ (۲۵)۔ ﴿فِيؤْخَذُ بِالتَّوَائِيصِ وَالْأَقْدَامِ﴾: یعنی ہر مجرم کو پیشانی کے بالوں اور قدموں سے پکڑ کر جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔

آیت 43: ﴿هَذِهِ جَهَنَّمُ الَّتِي يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُونَ﴾: یہ بات مجرموں سے کہی جائے گی (دیکھیے طور: ۱۳) اور یہ بھی ہے کہ ہمیں سمجھانے کے لیے یہ بات بتائی جا رہی ہے۔

آیت 44: ﴿يَطُوفُونَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَبِيبٍ آلِي﴾: "آل" "انہی" یا "انہی" (ض) سے اسم فاعل ہے، جیسا کہ "فاض" ہے، انتہائی گرم، کھولنے والا۔ سورہ غاشیہ میں ہے: ﴿تَنْفِي مِنْ عَيْنِ آيَةٍ﴾ [الغاشیہ: ۱۰] "وہ ایک کھولتے ہوئے چشمے سے پلائے جائیں گے۔" "انہی" کھانے کا پک کر تیار ہونا، جیسے فرمایا: ﴿عَزِيزٌ نُّظْرِينَ إِنَّهُ﴾ [الاحزاب: ۵۳] "اس حال میں کہ اس کے پکنے کا انتظار کرنے والے نہ ہوں۔" "يَطُوفُونَ" کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ صافات (۶۶-۶۸)۔

آیت 46: ﴿وَلَئِن خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ جَنَّتَن﴾: "مَقَام" "قَامَ يَقُومُ قِيَامًا" (ن) سے ظرف بھی ہو سکتا ہے "کھڑا ہونے کی جگہ یا وقت" اور مصدر بھی ہو سکتا ہے "کھڑا ہونا۔" جہنم اور اہل جہنم کے تذکرے کے بعد اہل جنت کا ذکر فرمایا۔ "مَقَامَ رَبِّهِ" کے دو مطلب ہو سکتے ہیں اور دونوں قرآن مجید کی آیات میں ملتے ہیں، ایک یہ کہ جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈر گیا اس کے لیے دو باغ ہیں۔ اس صورت میں "مَقَامَ رَبِّهِ" سے مراد بندے کا اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونا ہے۔ اس کی تائید اس آیت سے ہوتی ہے، فرمایا: ﴿يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ [المطففين: ۶] "جس دن لوگ رب العالمین کے لیے کھڑے ہوں گے۔" دوسرا یہ کہ جو شخص اپنے رب کے (اپنے اوپر ہر وقت) قائم (مگران) ہونے سے ڈر گیا۔ اس معنی کی تائید اس آیت سے ہوتی ہے، فرمایا: ﴿أَفَنَنْ هُوَ قَائِمٌ عَلَى كُلِّ نَفْسٍ بِمَا

گسبث ﴿ [الرعد : ۳۳] ”تو کیا وہ جو ہر جان پر اس کا نگران ہے جو اس نے کمایا (کوئی دوسرا اس کے برابر ہو سکتا ہے؟“ آیت سے دونوں معنی بیک وقت مراد ہو سکتے ہیں اور یہ بھی قرآن مجید کا ایک کمال ہے کہ اس کا ایک ایک لفظ متعدد معانی کا حامل ہے۔ یعنی جو شخص اس بات سے ڈر گیا کہ اس نے قیامت کے دن اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونا ہے اور اس بات سے بھی ڈرتا رہا کہ اس کا رب اس کی ہر چھوٹی بڑی حرکت کو دیکھ رہا ہے، تو اس کے لیے دو باغ ہیں۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو رہی ہے کہ جنت کی وراثت کی بنیاد اللہ تعالیٰ کا ڈر ہے، کیونکہ یہی وہ جو ہر ہے جو انسان کو صراطِ مستقیم پر قائم رکھتا ہے اور اسے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچاتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو موقع میسر ہونے پر انسان کو کوئی بھی چیز کسی بھی جرم کے ارتکاب سے نہیں روک سکتی اور جب یہ موجود ہو تو آدمی کے قدم مشکل سے مشکل مقام پر نہیں ڈگمگاتے۔ صحیح بخاری (۶۶۰) میں قیامت کے دن جن سات آدمیوں کو عرش کا سایہ ملنے کی بشارت دی گئی ہے ان سب کے اعمال میں اصل اللہ تعالیٰ کا ڈر ہی ہے اور اس کفن چور کی مغفرت کا باعث بھی اللہ کا ڈر تھا جس نے وصیت کی تھی کہ مجھے جلا کر میری کچھ راگھ کو ہوا میں اڑا دیا جائے اور کچھ کو پانی میں بہا دیا جائے۔ (دیکھیے بخاری: ۳۳۵۲) ”مَقْلَعُ رَبِّهِ“ کے لفظ میں خوف کے ساتھ محبت کا پہلو بھی نمایاں ہے کہ وہ کسی اجنبی یا ظالم سے نہیں ڈرتا رہا، بلکہ اپنے مالک سے ڈرتا رہا جس نے اسے پیدا کیا، پھر ہر لمحے اس کی پرورش کر رہا ہے اور اس کی ہر ضرورت پوری کر رہا ہے۔

② جَنَّاتٍ: ”جَنَّة“ کا اصل معنی باغ ہے۔ قرآن مجید میں کہیں یہ لفظ مفرد آیا ہے اور تمام اہل ایمان کے ایک ہی جنت میں داخلے کا ذکر ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَمَنْ عَمِلْ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ اُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ قَالُوا لَكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ يُدْخِلُوكُنَّ فِيهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ [المومن : ۴۰] ”اور جس نے کوئی نیک عمل کیا، مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہو تو یہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے، اس میں بے حساب رزق دیے جائیں گے۔“ اور کہیں جمع آیا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ اَنْ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ﴾ [البقرة : ۲۵] ”اور ان لوگوں کو خوش خبری دے دے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے کہ ان کے لیے ایسے باغات ہیں جن کے تلے نہریں بہتی ہیں۔“ اس سے معلوم ہوا کہ اس بڑے باغ میں بے شمار باغات ہیں، جن میں سے ہر مومن کو دو دو باغ عطا کیے جائیں گے، جن کا وہ مالک ہوگا (لام تملیک کے لیے ہے) اور جن میں وہ سب کچھ ہوگا جس کا آگے ذکر ہو رہا ہے۔

③ ان آیات میں ہر اس شخص کو دو دو باغ ملنے کا ذکر ہے جو اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈر گیا۔ چند آیات کے بعد اور دو باغوں کا ذکر ہے، فرمایا: ﴿وَمِنْ دُونِهِنَّ جَنَّاتٍ﴾ جس کا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان دونوں کے علاوہ بھی دو باغ ہیں اور یہ بھی کہ ان دونوں سے کم درجے والے بھی دو باغ ہیں۔ دونوں آیات کو ملائیں تو مطلب یہ ہے کہ ان دونوں کے علاوہ دو اور باغ ہیں جو پہلے باغوں سے کم درجے کے ہیں۔ تحقیق یہی ہے کہ پہلے دو باغ اعلیٰ ہیں جو مقربین کے لیے ہیں اور دوسرے دو باغ ان سے کم درجے والے ہیں جو اصحابِ الیمین کے لیے ہیں۔ سورہ واقعہ میں بھی سابقین کو مقربین قرار دے کر

فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ﴿۴۸﴾ ذَوَاتَا أَفْئَانٍ ﴿۴۹﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ﴿۵۰﴾ فِيهَا

عَيْنِينَ تَجْرِيْنَ ﴿۵۱﴾

تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۴۸﴾ دونوں بہت شاخوں والے ہیں ﴿۴۹﴾ تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۵۰﴾ ان دونوں میں دو چشمے ہیں، جو بہ رہے ہیں ﴿۵۱﴾

انھیں ملنے والی نعمتوں کا پہلے الگ ذکر فرمایا ہے، اس کے بعد اصحاب الہیمن کا ذکر کر کے انھیں ملنے والی نعمتوں کا الگ ذکر فرمایا، یہاں بھی ایسے ہی ہے، تقریباً ہر نعمت میں دونوں کا فرق نمایاں ہے، تفسیر میں اس فرق کی طرف اشارہ آ رہا ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح بخاری میں یہ حدیث ذکر فرمائی ہے کہ عبد اللہ بن قیس (ابو موسیٰ اشعری) رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «جَنَّاتٍ مِنْ فِضَّةٍ، آيْتُهُمَا وَمَا فِيهِنَّ، وَجَنَّاتٍ مِنْ ذَهَبٍ آيْتُهُمَا وَمَا فِيهِنَّ، وَمَا بَيْنَ الْقَوْمِ وَبَيْنَ أَنْ يُنْظَرُوا إِلَى رَبِّهِمْ إِلَّا رِذَاءَ الْكَبِيرِ عَلَى وَجْهِهِ فِي حِنَّةٍ عَذْنٍ» [بخاری التفسیر، باب قوله: ﴿وَمِنْ دُونَهُمَا حَنَّاتٌ﴾: ۴۸۷۸] ”دو باغ ایسے ہیں جن کے برتن اور جو کچھ ان دونوں میں ہے چاندی کا ہے اور دو باغ ایسے ہیں جن کے برتن اور جو کچھ ان میں ہے سونے کا ہے۔ اور جنت عدن میں جنتیوں کے درمیان اور ان کے اپنے رب کو دیکھنے کے درمیان کبریائی کی چادر کے سوا کوئی رکاوٹ نہیں جو اس کے چہرے پر ہے۔“ صحیح بخاری میں اس کی سند اس طرح ہے: ”حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ أَبِي الْأَسْوَدِ، حَدَّثَنَا عَبْدُ الْعَزِيزِ بْنُ عَبْدِ الصَّمَدِ الْعَمِّيُّ، حَدَّثَنَا أَبُو عَمْرَانَ الْجَوْنِيُّ عَنْ أَبِي بَكْرٍ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ قَيْسٍ عَنْ أَبِيهِ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ.....“ فتح الباری (۶۲۳/۸) میں ہے کہ اسی حدیث کو ابن مردویہ نے (عبد العزیز کے بجائے) ”حَمَّادٌ عَنْ أَبِي عَمْرَانَ“ بیان کیا ہے، اس میں یہ لفظ ہے: «مِنْ ذَهَبٍ لِلْسَّابِقِينَ وَمِنْ فِضَّةٍ لِلتَّالِعِينَ» یعنی سابقین کے لیے سونے والے اور تابعین کے لیے چاندی والے باغ ہوں گے۔ اور ابوبکر سے ثابت کی روایت میں یہ الفاظ ہیں: «مِنْ ذَهَبٍ لِلْمُقَرَّبِينَ وَمِنْ فِضَّةٍ لِأَصْحَابِ الْيَمِينِ» یعنی سونے والے باغ مقربین کے لیے اور چاندی والے اصحاب الہیمن کے لیے ہیں۔ اس حدیث کے طرق سے واضح ہے کہ پہلے دو باغ مقربین کے لیے ہیں اور دوسرے دو باغ اصحاب الہیمن کے لیے ہیں۔

آیت 48 ﴿ذَوَاتَا أَفْئَانٍ﴾: ”فَنَنْ“ کی جمع ہے، سیدھی لمبی شاخ اور ”فَنْ“ کی جمع بھی ہے جس کا معنی نوع ہے۔ بہت شاخوں والے سے مراد شاخوں، پتوں اور پھلوں کی کثرت ہے، ورنہ باغوں کی ٹہنیاں تو ہوتی ہی ہیں اور اگر ”أَفْئَانٍ“ ”فَنْ“ کی جمع ہو تو مطلب یہ ہے کہ وہ دونوں باغ بہت سی قسموں کے پودوں اور درختوں والے ہیں۔

آیت 50 ﴿فِيهَا عَيْنَيْنِ تَجْرِيْنَ﴾: چشمے دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک وہ جن سے اتنا پانی نکلتا ہے جو آگے بہنے لگتا ہے اور ندی نالے کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور ایک وہ جن سے پانی نکلتا ہے مگر اتنا ہی جتنا ان میں سے نکالا جاتا ہے، جیسا کہ زمزم کا چشمہ پھوٹ کر نکلا اور ہاجرہ رضی اللہ عنہا نے اس کے گرد ریت وغیرہ کی منڈیر بنا دی تو وہ وہیں رک گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

فَبِأَيِّ آيَةٍ رَبِّكَمَّا تُكذِّبِينَ ﴿۵۱﴾ فِيهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجِينَ ﴿۵۲﴾ فَبِأَيِّ آيَةٍ رَبِّكَمَّا تُكذِّبِينَ ﴿۵۳﴾ مُتَّكِفِينَ عَلَى فُرْشٍ بَطَّانِيهَا مِنْ أَسْتَبْرَقٍ ۖ وَجَنَّاتٍ مُجْتَمِعِينَ دَانٍ ﴿۵۴﴾ فَبِأَيِّ آيَةٍ رَبِّكَمَّا تُكذِّبِينَ ﴿۵۵﴾ فِيهِنَّ قَصْرَاتُ الظَّرْفِ ۖ لَمْ يَطْبُخُنَّ إِشْنًا قَبْلَهُمْ وَلَا جَانًّا ﴿۵۶﴾

تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۵۱﴾ ان دونوں میں ہر پھل کی دو قسمیں ہیں ﴿۵۲﴾ تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۵۳﴾ ایسے بستروں پر تکیہ لگائے ہوئے، جن کے استر موٹے ریشم کے ہیں اور دونوں باغوں کا پھل قریب ہے ﴿۵۴﴾ تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۵۵﴾ ان میں چمچی نگاہ والی عورتیں ہیں، جنہیں ان سے پہلے نہ کسی انسان نے ہاتھ لگایا ہے اور نہ کسی جن نے ﴿۵۶﴾

”اللہ ام اسماعیل پر رحم فرمائے، اگر وہ اس کے گرد منڈیر نہ بناتی تو وہ ندی کی صورت میں جاری ہو جاتا۔“ (دیکھیے، بخاری: ۲۳۶۸) مطلب یہ ہے کہ ان دونوں چشموں کا پانی ایک جگہ ٹھہرا ہوا نہیں بلکہ بہ رہا ہے۔

آیت 52 ﴿فِيهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجِينَ﴾: ہر پھل کی دو قسموں سے مراد یا تو ایک وہ ہے جو دنیا میں تھی اور دوسری وہ جو نہ کسی نے سنی، نہ دیکھی اور نہ کسی کے دل میں اس کا خیال گزرا۔ یا اس سے مراد یہ ہے کہ ایک ہی پھل میں متعدد ذائقے ہوں گے، جیسا کہ دنیا میں آم ہی کو لے لیجیے، ہر آم کا ذائقہ جدا ہے۔ دنیا کے پھلوں کی جنت کے پھلوں سے کوئی نسبت ہی نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ”زَوْجِينَ“ تشبیہ کا لفظ جمع اور کثرت کے معنی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ کلام عرب میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ ”التحریر والتنوير“ میں اس کے کئی شواہد ذکر کیے گئے ہیں۔

آیت 54 ﴿۱﴾ مُتَّكِفِينَ عَلَى فُرْشٍ: ”مُتَّكِفِينَ“ ”وَسَكِيٍّ“ سے ”اتَّكَأَ يَتَّكِيْ اِتِّكَاءً“ (افتعال) سے اسم فاعل ”مُتَّكِفِيٍّ“ کی جمع ہے، پہلو پر کھنی کے سہارے لیٹے ہوئے یا ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے شخص کو کہتے ہیں۔ ”فُرْشٍ“ ”فِرَاشٍ“ کی جمع ہے، جیسے ”كِنَانٌ“ کی جمع ”كُنُوبٌ“ ہے۔ ”بَطَّانِيْنٌ“ ”بَطَّانَةٌ“ کی جمع ہے، گدے کے بیرونی حصے کو ”ظَهَارَةٌ“ اور اندرونی حصے کو ”بَطَّانَةٌ“ کہتے ہیں۔ اردو میں ”بَطَّانَةٌ“ کو استر اور ”ظَهَارَةٌ“ کو ابرا کہتے ہیں۔ ”اِسْتَبْرَقٍ“ مونث ریشم جس میں سونے کی تاریں ہوں۔ یعنی اپنے رب سے ڈرنے والے یہ جنتی بے فکری کے ساتھ ایسے بستروں پر ٹیک لگا کر بیٹھے یا لیٹے ہوں گے جن کے استر موٹے ریشم کے ہوں گے۔ جب استر ایسے ہوں گے تو ابرے کس شان کے ہوں گے۔

﴿۲﴾ وَجَنَّاتٍ مُجْتَمِعِينَ دَانٍ: ”جَنَّاتٍ مُجْتَمِعِينَ“ (ض) (پھل چننا) سے مصدر بمعنی اسم مفعول ہے، پھل۔ ”دَانٍ“ ”دَنَا يَدْنُو دُنُوًّا“ (ن) سے اسم فاعل ہے، قریب۔ یعنی دونوں باغوں کا پھل قریب ہوگا، کھڑے، بیٹھے اور لیٹے جب چاہیں گے چن سکیں گے۔

آیت 56 ﴿۱﴾ فِيهِنَّ قَصْرَاتُ الظَّرْفِ: ”فِيهِنَّ“ کی ضمیر ”فُرْشٍ“ کی طرف جارہی ہے۔ ”قَصْرَاتُ“ ”قَصَرَ يَقْصُرُ

فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ﴿۵۸﴾ كَالَّذِينَ الْأَقْوَاتِ وَالْمَرْجَانِ ﴿۵۹﴾

تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۵۸﴾ گویا وہ (عورتیں) یا قوت اور مرجان ہیں ﴿۵۹﴾

فَضْرًا“ (روکنا) سے اسم فاعل ہے، آنکھوں کو خاندنوں پر روک کر رکھنے والیاں۔ جنت کے محلوں، چشموں اور بانوں میں بچھے ہوئے بستروں میں جنتیوں کا دل لگانے والی عورتوں کے ظاہری و باطنی اوصاف اور ان کے کمال و جمال کا بیان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے ان کا معنوی حسن بیان فرمایا کہ ان کی آنکھیں خاندنوں کے سوا کسی اور کی طرف نہیں اٹھیں گے اور نہ ہی ان کی نگاہ میں ان کے خاندنوں سے بڑھ کر کوئی ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک وصف ہی ہزاروں اوصاف پر بھاری ہے، کوئی عورت کتنی ہی حسین و جمیل ہو، اس وصف سے عاری ہو تو مرد غیور کی نگاہ میں اس کی کچھ قدر و قیمت نہیں رہتی۔ عرب کا ایک شاعر کہتا ہے۔

وَ أَتْرُكُ حُبَّهَا مِنْ غَيْرِ بُغْضٍ وَ ذَاكَ لِكُفْرَةِ الشُّرَكَاءِ فِيهِ
إِذَا وَقَعَ الذُّبَابُ عَلَى طَعَامٍ رَفَعْتُ يَدِي وَ نَفْسِي تَشْتَهِيهِ
وَ تَحْتَبُّ الْأُسُودُ وَرُؤُودَ مَاءٍ إِذَا كَانَ الْبِكْلَابُ وَ لَغْنُ فِيهِ

”میں اس کی محبت کسی بغض کے بغیر ترک کر رہا ہوں، کیونکہ اس محبت میں اور بھی کئی شریک ہیں۔ جب مکھی کھانے پر آگرے تو میں اپنا ہاتھ اٹھا لیتا ہوں، حالانکہ میرا دل اسے چاہ رہا ہوتا ہے۔ اور شیر پانی پر آنے سے اجتناب کرتے ہیں، جب کتوں نے اس میں منہ ڈال دیا ہو۔“

﴿۵۸﴾ لَمْ يَطْمِئِنُّوا إِلَى قَبْلِهِمْ وَلَا جَانًا: ”طَمِئْتُ يَطْمِئُ طَمَئًا“ (ض) چھونا۔ یعنی وہ عورتیں کنواری ہوں گی، اگر دنیا میں خاندنوں کے پاس رہی ہوں گی تب بھی جنت میں آ کر نئے سرے سے کنواری ہو جائیں گی اور جنت میں ملنے والے خاندنوں سے پہلے کسی نے انھیں چھوا تک نہ ہوگا۔ اصحاب الیمین کو ملنے والی عورتوں کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَا يَأْتِيَنَّكَ أَثَرُ الْفِتَنِ إِذْ أَقْبَلْتَهُنَّ﴾ [الواقعة: ۳۵ تا ۳۸] ”بلاشبہ ہم نے ان (بستروں والی عورتوں) کو پیدا کیا، نئے سرے سے پیدا کرنا۔ پس ہم نے انھیں کنواریاں بنا دیا۔ جو خاندنوں کی محبوب، ان کی ہم عمر ہیں۔ دائیں ہاتھ والوں کے لیے۔“ پھر مقررین کو ملنے والی بیویوں کا معاملہ تو ان سے کہیں بڑھ کر ہوگا۔

﴿۵۹﴾ اس آیت سے معلوم ہوا کہ انسانوں کی طرح جن بھی جنت میں جائیں گے، وہاں انسانوں کو ان کی جنس سے بیویاں ملیں گی اور جنوں کو ان کی جنس سے، کیونکہ دوسری جنس سے نہ موافقت ہوتی ہے نہ انس، پھر ”أَثَرًا بَابًا“ (مٹی میں کھیلنے والے ہم جولی) ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

آیت 58 ﴿۵۸﴾ كَالَّذِينَ الْأَقْوَاتِ وَالْمَرْجَانِ: ”الْيَاقُوتُ“ سرخ رنگ کا پتھر جو اتنا صاف شفاف ہوتا ہے کہ اس کے درمیان سورخ میں دھاگا ڈالا جائے تو باہر سے نظر آتا ہے۔ ”الْمَرْجَانُ“ مونگے (چھوٹے موتی) کو کہتے ہیں۔ جنتی عورتوں کی سرخ و سفید رنگت، دلکشی، صفائی اور شفافیت میں انھیں یا قوت اور مرجان سے تشبیہ دی ہے۔ محمد (ابن سیرین) کہتے ہیں:

فِي أَبِي آدَمَ رَبِّكُمْ تَكْذِبِينَ ﴿۵۹﴾ هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ ﴿۶۰﴾

تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۵۹﴾ نیکی کا بدلہ نیکی کے سوا کیا ہے ﴿۶۰﴾

﴿إِنَّمَا تَفَاخَرُوا وَ إِنَّمَا تَذَاكَرُوا الرَّحَالَ فِي الْحَنَّةِ أَكْثَرُ أُمَّ النِّسَاءِ؟ فَقَالَ أَبُو هُرَيْرَةَ أَوْ لَمْ يَقُلْ أَبُو الْقَاسِمِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ أَوَّلَ زُمَرَةٍ تَدْخُلُ الْحَنَّةَ عَلَى صُورَةِ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ وَالَّتِي تَلِيهَا عَلَى أَضْوَاءِ كَوْكَبِ دُرِّيٍّ فِي السَّمَاءِ لِكُلِّ امْرِيٍّ مِنْهُمْ زَوْجَتَانِ ائْتَنَانِ يُرَى مَخُ سَوْقِهِمَا مِنْ وَرَاءِ اللَّحْمِ وَمَا فِي الْحَنَّةِ عَزَبٌ﴾ [مسلم، الجنة و صفة نعيمها، باب أول زمرة تدخل الجنة: ۲۸۳۴] ”یا تو اس بات پر کہ لوگوں نے عورتوں اور مردوں کے مابین فخر کا ذکر کیا، یا ویسے ہی گفتگو ہوئی کہ جنت میں مرد زیادہ ہوں گے یا عورتیں؟ تو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما نے کہا: ”کیا ابو القاسم رضی اللہ عنہما نے یہ نہیں فرمایا کہ پہلی جماعت جو جنت میں داخل ہوگی چودھویں کے چاند کی طرح ہوگی اور اس کے بعد والی جماعت آسمان کے سب سے زیادہ روشن چمکدار ستارے کی طرح ہوگی، ان میں سے ہر مرد کی دو بیویاں ہوں گی، جن کی پندلیوں کا مغز گوشت کے پار سے نظر آ رہا ہوگا اور جنت میں کوئی شخص بیوی کے بغیر نہیں ہوگا۔“ انس بن مالک رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿لِرَوْحَةٍ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوْ غَدَاةٍ خَيْرٌ مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيهَا، وَلَقَابٌ قَوَّسٌ أَحَدِكُمْ مِنَ الْحَنَّةِ أَوْ مَوْضِعٌ قِيدَ بَعِيٍّ سَوَاطِئُ خَيْرٌ مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيهَا وَلَوْ أَنَّ امْرَأَةً مِنْ أَهْلِ الْحَنَّةِ أَطْلَعَتْ إِلَى أَهْلِ الْأَرْضِ لِأَضَاعَتْ مَا بَيْنَهُمَا وَلَمَّا لَأَتْهُ رِيحًا، وَلَتَصِيفُهَا عَلَى رَأْسِهَا خَيْرٌ مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيهَا﴾ [بخاری، الجهاد و السير، باب حور العين و صفتن: ۲۷۹۶] ”اللہ کے راستے میں ایک شام یا ایک صبح دنیا و مافیہا سے بہتر ہے اور جنت میں تمہارے کسی ایک کی ایک کمان یا ایک کوزے کے برابر جگہ دنیا و مافیہا سے بہتر ہے اور اگر اہل جنت کی کوئی عورت زمین والوں کی طرف جھانک لے تو زمین و آسمان کے درمیان کا سارا حصہ روشن ہو جائے اور یہ سارا خلا خوشبو سے بھر جائے اور اس کے سر کا دو پٹا دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔“

آیت 60 ﴿هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ﴾: پہلے احسان کا معنی نیکی اور دوسرے احسان کا معنی اس نیکی کا نیک صلہ یعنی جنت ہے۔ حدیث جبریل میں رسول اللہ ﷺ نے احسان کا مطلب یہ بیان فرمایا: ﴿أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ كَمَا تَكُنْ تَرَاهُ، فَإِنَّكَ إِنْ لَا تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ﴾ [مسلم، الإيمان، باب الإيمان ما هو؟.....: ۹] ”تو اللہ کی عبادت اس طرح کر گویا تو اسے دیکھ رہا ہے، پھر اگر تو اسے نہیں دیکھتا تو وہ یقیناً تجھے دیکھ رہا ہے۔“ ظاہر ہے جس شخص نے اپنی زندگی اپنے پروردگار کو ہر وقت اپنے اوپر نگران ہونے کے یقین اور احتیاط کے ساتھ گزاری اس کا بدلہ بھی ایسا ہی اچھا اور خوبصورت ہونا چاہیے، جس کا بیان ان آیات میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں حصر کے ساتھ جو فرمایا کہ ”نیکی کا بدلہ نیکی کے سوا کیا ہے؟“ تو اس سے عدل و انصاف کے تقاضے کے مطابق بدلا مراد ہے، ورنہ مشرک اور ظالم تو نیکی کا بدلا برائی سے دیتے ہیں، گویا یہ ایک طرح ان پر طنز بھی ہے۔ کفار کے طرز عمل کی مثالوں کے لیے دیکھیے سورہ عنکبوت (۶۵، ۶۶)، اعراف (۱۹۰) اور سورہ واقعہ (۸۲)۔

فَبِأَيِّ آيَةِ رَبِّكُمَا تُكذِبِينَ ﴿٦١﴾ وَ مِنْ دُونِهَا جَعَلْنَا ﴿٦٢﴾ فَبِأَيِّ آيَةِ رَبِّكُمَا تُكذِبِينَ ﴿٦٣﴾ مُدْهَامَاتِنِ ﴿٦٤﴾ فَبِأَيِّ آيَةِ رَبِّكُمَا تُكذِبِينَ ﴿٦٥﴾ فِيهَا عَيْنِن نَضَاحَتِنِ ﴿٦٦﴾ فَبِأَيِّ آيَةِ رَبِّكُمَا تُكذِبِينَ ﴿٦٧﴾ فِيهَا فَآكِهَةٌ وَ نَعْلٌ وَ رُمَانٌ ﴿٦٨﴾ فَبِأَيِّ آيَةِ رَبِّكُمَا تُكذِبِينَ ﴿٦٩﴾ فِيهِنَّ خَيْرَاتٌ حِسَانٌ ﴿٧٠﴾

تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿٦١﴾ اور ان دو (باغوں) کے علاوہ اور دو باغ ہیں ﴿٦٢﴾ تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿٦٣﴾ دونوں سیاہی مائل گہرے سبز ہیں ﴿٦٤﴾ تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿٦٥﴾ ان دونوں میں جوش مارتے ہوئے دو چشمے ہیں ﴿٦٦﴾ تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿٦٧﴾ ان دونوں میں پھل اور کھجوروں کے درخت اور انار ہیں ﴿٦٨﴾ تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿٦٩﴾ ان میں کئی خوب سیرت، خوبصورت عورتیں ہیں ﴿٧٠﴾

آیت 62 وَ مِنْ دُونِهَا جَعَلْنَا: جیسا کہ ”وَلَمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ جَعَلْنَا“ کی تفسیر میں گزر چکا ہے کہ پہلی دو جنتیں جن کا ذکر اوپر گزرا، اللہ سے ہمیشہ ڈرنے والے مقررین کے لیے ہیں اور یہاں سے عام اہل ایمان یعنی اصحاب الیمین کو ملنے والی جنتوں کا ذکر ہوتا ہے، جو کئی باتوں میں پہلی دونوں جنتوں کے ساتھ مشترک اور کئی باتوں میں ان سے کم تر ہیں۔

آیت 64 ”مُدْهَامَاتِنِ: ”اِذْهَمَّ يَذْهَمُ اِذْهَمَامًا“ (افعال) سیاہ ہونا اور ”اِذْهَامٌ يَذْهَمُ اِذْهَامًا“ (افعیال) بہت سیاہ ہونا۔ یعنی وہ دونوں باغ گہرے سبز ہوں گے جیسے بہت سیاہ ہوں۔ پہلے دو باغوں میں شاخوں اور پتوں کی کثرت کا ذکر ہے جن کے ضمن میں ان کا گہرا سبز ہونا خود بخود آ جاتا ہے اور یہاں صرف ان کے گہرے سبز رنگ کا ذکر ہے۔

آیت 66 فِيهَا عَيْنِن نَضَاحَتِنِ: ”نَضَحٌ يَنْضَحُ نَضْحًا“ (ف) ”الْمَاءُ“ پانی کا جوش سے نکلنا۔ یعنی ان دونوں جنتوں میں دو جوش مارنے والے چشمے ہوں گے۔ ”عَيْنِن تَغْرِيْنِ“ اور ”عَيْنِن نَضَاحَتِنِ“ کے تقابل کے لیے دیکھیے اسی سورت کی آیت (۵۰) کی تفسیر۔

آیت 68 فِيهَا فَآكِهَةٌ وَ نَعْلٌ وَ رُمَانٌ: ”فَآكِهَةٌ“ اسم جنس ہے، اس میں ہر پھل آ جاتا ہے۔ کھجور اور انار بھی ”فَآكِهَةٌ“ میں شامل ہیں، مگر عرب میں ان کی کثرت اور ان کے پسندیدہ پھل ہونے کی وجہ سے ان کا الگ ذکر فرمایا ہے۔ مقررین کے لیے ”مِنْ مَلِيْن فَآكِهَةِ رَوْحِنِ“ اور اصحاب الیمین کے لیے ”فَآكِهَةٌ وَ نَعْلٌ وَ رُمَانٌ“ فرمایا۔ دونوں کا فرق واضح ہے۔

آیت 70 ﴿١﴾ فِيهِنَّ خَيْرَاتٌ حِسَانٌ: ”خَيْرَاتٌ“ کی جمع ہے جو اصل میں ”يَاءُ“ کی تشدید کے ساتھ ”خَيْرَاتٌ“ ہے۔ مذکر اس کا ”خَيْرٌ“ (بروزن فِيعِلٌ) ہے، جس میں ”يَاءُ“ کو تخفیف کے لیے حذف کر دیا ہے، جیسے ”هَيِّنٌ“ لَيْنٌ“ اور ”مَيْتٌ“ کو ”هَيِّنٌ، لَيْنٌ“ اور ”مَيْتٌ“ کر دیتے ہیں۔ یہ تفضیل والا ”خَيْرٌ“ نہیں جو ”شَرٌّ“ کے مقابلے میں آتا کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

فِي أَيِّ آيَةٍ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ﴿٤١﴾ حُورٌ مَّقْصُورَاتٌ فِي الْخِيَامِ ﴿٤٢﴾ فَمَا فِي آيَةٍ رَبِّكُمَا
تُكَذِّبِينَ ﴿٤٣﴾ لَمْ يَطْبُخُنَّ إِشْرًا قَبْلَهُمْ وَلَا جَانًّا ﴿٤٤﴾ فَمَا فِي آيَةٍ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ﴿٤٥﴾

تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿٤١﴾ سفید جسم، سیاہ آنکھوں والی عورتیں، جو عیموں میں روکی ہوئی ہیں ﴿٤٢﴾ تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿٤٣﴾ ان سے پہلے نہ کسی انسان نے انھیں ہاتھ لگایا ہے اور نہ کسی جن نے ﴿٤٤﴾ تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿٤٥﴾

ہے، کیونکہ اس کا اصل ”أَخْبِرُ“ (أَفْعَلُ) ہے۔ ”حَسَانٌ“ ”حَسَنَاءُ“ کی جمع ہے۔ ”حَيَاتٌ“ نیک، یعنی خوب سیرت اور ”حَسَانٌ“ خوبصورت عورتیں۔

﴿٤٢﴾ یہاں یہ بات زیر نظر رہنا ضروری ہے کہ اس جگہ یہ نہیں فرمایا کہ ”فِيهِمَا حَيَاتٌ حَسَانٌ“ (ان دونوں بانحوں میں خوب سیرت و خوبصورت عورتیں ہیں) بلکہ فرمایا: ﴿فِيهِنَّ حَيَاتٌ حَسَانٌ﴾ یعنی ان سب جنتوں میں جن کا ذکر گزرا ہے خوب سیرت اور خوبصورت عورتیں ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہاں جو اوصاف مذکور ہوئے ہیں وہ چاروں جنتوں میں سابقوں اور اصحاب الیمین دونوں کو ملنے والی عورتوں میں مشترک ہیں۔

آیت 72 ﴿١﴾ ”حُورٌ“ ”حُورَاءُ“ کی جمع ہے، مادہ اس کا ”حَوْرٌ“ ہے، ”گورے رنگ کی عورتیں“ جنھیں دیکھ کر آنکھ حیران رہ جائے اور جن کی آنکھ کی سفیدی بہت سفید اور سیاہی بہت سیاہ ہو۔ [دیکھیے بخاری: الجهاد والسير، باب الحور العين وصفتهن، قبل ح: ۱۲۱۷۵]

﴿٢﴾ مَقْصُورَاتٌ فِي الْخِيَامِ: لفظ ”حُورٌ“ میں ان کی صورت کا حُسن بیان ہوا ہے اور ”مَقْصُورَاتٌ فِي الْخِيَامِ“ میں ان کی سیرت کا حُسن بیان ہوا ہے۔ معلوم ہوا کہ عورت کی خوبی گھر رکے رہنے میں ہے۔ ان الفاظ میں ان عورتوں کے لیے ہر طرح کی خوش حالی اور نعمت میسر ہونے کا اشارہ بھی ہے، کیونکہ دنیا میں سردار عورتوں کو کسی کی نوکری یا خدمت یا کھیتوں وغیرہ میں کام کرنے کے لیے گھر سے باہر نہیں جانا پڑتا، حتیٰ کہ میل ملاقات کے لیے بھی دوسری عورتیں ہی ان کے پاس آتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ نہایت معزز اور مخدوم ہیں، جیسا کہ ابو قیس بن الاسلت نے کہا ہے۔

وَيُكْرِمُنَّهَا حَازَاتُهَا فَيَنزِلْنَهَا وَ تَعْتَلُّ عَنْ إِيَابِنَهُنَّ فَتُعَذَّرُ

”اس کی پڑوسنی اس کا اکرام کرتی ہیں، اس لیے اس سے ملنے کے لیے خود آتی ہیں اور یہ ان کے پاس آنے سے

کوئی نہ کوئی بہانہ کر دیتی ہے تو اسے قبول کر لیا جاتا ہے۔“ [التحریر والتنوير]

﴿٣﴾ فِي الْخِيَامِ: ”الْخِيَامُ“ ”خَيْمَةٌ“ کی جمع ہے، جو عموماً پشم یا بالوں کے بنے ہوئے کپڑے سے بنایا جاتا ہے۔ پھر جتنے خوشحال لوگوں کا ہوتا ہی قیمتی، اونچا اور شاندار بنایا جاتا ہے۔ جنت کے خیموں کا وصف رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا،

مُتَكِبِينَ عَلَى رَفْرَفٍ خُضِرٍ وَ عَبْقَرِيٍّ حَسَانٍ ﴿٧٦﴾ فَيَأْتِي الْآلَاءَ رَبِّكُمَا تُكَذِّبِينَ ﴿٧٧﴾
تَبَرَّكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ﴿٧٨﴾

وہ ایسے قالینوں پر تکیہ لگائے ہوئے ہیں جو سبز ہیں اور نادر، نفیس ہیں ﴿٧٦﴾ تو تم دونوں اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس کو چھلاؤ گے؟ ﴿٧٧﴾ بہت برکت والا ہے تیرے رب کا نام جو بڑی شان اور عزت والا ہے ﴿٧٨﴾

عبداللہ بن قیس (ابومویٰ اشعری) رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّ فِي الْحَبَّةِ خَيْمَةً مِنْ نُورٍ لَوْ أَنَّ مَحْوَفَةَ عَرَضُهَا سِتُونَ مِيلًا فِي كُلِّ زَاوِيَةٍ مِنْهَا أَهْلٌ مَا يَرَوْنَ الْآخِرِينَ يَطُوفُ عَلَيْهِمُ الْمُؤْمِنُونَ» [بخاری، التفسیر، باب: ﴿محور مقصورات فی الخیام﴾: ۴۸۷۹] "جنت میں ایک خولدار موتی کا خیمہ ہے جس کا عرض ساٹھ (۶۰) میل ہے، اس کے ہر کونے میں ایک گھر والے ہیں جو دوسروں کو نہیں دیکھتے، مومن ان پر چکر لگائیں گے۔"

آیت 76 ﴿مُتَكِبِينَ عَلَى رَفْرَفٍ خُضِرٍ وَ عَبْقَرِيٍّ حَسَانٍ﴾: "رَفْرَفِي" اسم جنس یا اسم جمع ہے، مفرد اس کا "رَفْرَفَةٌ" ہے، منقش قالین جو بستر پر بچھایا جائے۔ "عَبْقَرِيٍّ" کوئی بھی چیز جو اپنی جنس میں سب سے قائق اور نادر الوجود ہو۔ اس کی نسبت "عَبْقَرٌ" کی طرف ہے جو جاہلیت کے افسانوں میں جنوں کا شہر تھا، جسے اردو میں پرستان کہتے ہیں۔ عرب میں فوق العادت خوبصورت یا باکمال چیز کی نسبت اس کی طرف کر دیتے تھے، گویا یہ انسانوں کی سرزمین کی نہیں بلکہ جنوں اور پریوں کی سرزمین کی چیز ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے کنوئیں سے پانی کھینچنے والے خواب کے ذکر میں فرمایا: «لَنْ نَحْذَهَا عُمْرًا، فَاسْتَحَالَتْ بِنْدِهِ عَرَبًا، فَلَمْ أَرِ عَبْقَرِيًّا فِي النَّاسِ يُفْرِي قَرِيئَةً» [بخاری، المناقب، باب علامات النبوة فی الإسلام: ۳۶۳۴] "پھر وہ ڈول عمر (بلوغت) نے پکڑا تو وہ ایک بڑے ڈول کی شکل میں بدل گیا۔ تو میں نے کوئی نادر قوت والا شخص نہیں دیکھا جو اس جیسی کاٹ کاٹا ہو۔" اس لیے اس کا ترجمہ شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ نے "نادر" کیا ہے اور "حَسَانٍ" کا ترجمہ "نفیس" کیا ہے۔ "رَفْرَفِيٍّ" کا لفظ مفرد ہے، اس کے مطابق "عَبْقَرِيٍّ" صفت مفرد لائی گئی ہے اور اسم جنس یا اسم جمع ہونے کی وجہ سے اس میں جمع کا مفہوم پایا جاتا ہے، اس لیے اس کی صفات "خُضِرٍ" اور "حَسَانٍ" جمع لائی گئی ہیں۔

آیت 78 ﴿تَبَرَّكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ﴾: "تَبَرَّكَ" باب تفاعل ہے، جب اس میں تشارك مقصود نہ ہو تو مبالغہ مراد ہوتا ہے، یعنی بہت برکت والا ہے تیرے رب کا نام۔ پھر جب اس کا نام بہت برکت والا ہے تو اس کی ذات پاک کس قدر با برکت ہوگی۔ ثوبان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز سے فارغ ہوتے تو تین دفعہ استغفار کرتے اور یوں کہتے: «اللَّهُمَّ أَنْتَ السَّلَامُ وَ مِنْكَ السَّلَامُ تَبَارَكْتَ يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ» [مسلم، المساجد، باب استحباب الذكر بعد الصلاة: ۵۹۱] "اے اللہ! تو ہی سلامتی والا ہے اور تجھی سے سلامتی ہے اے جلال اور اکرام والے!" اس دعا میں کئی لوگ ان الفاظ کا اضافہ کرتے ہیں: "وَإِلَيْكَ يُرْجَعُ السَّلَامُ حِينَمَا رَمْنَا بِالسَّلَامِ وَ أَدْخَلْنَا دَارَ السَّلَامِ". یہ الفاظ حدیث سے ثابت نہیں ہیں۔

سُورَةُ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ①

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

جب وہ واقع ہونے والی واقع ہوگی ①

”ذی الجلالِ و الإکرام“ اللہ تعالیٰ کا ایسا بابرکت نام ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے کثرت سے پڑھنے کی تاکید فرمائی ہے۔ انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: «الْطُّوًّا يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ» [ترمذی، الدعوات، باب: ۳۵۲۴، وقال الالبانی صحیح] ”یا ذَا الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ“ سے چٹ جاؤ، اسے لازم پکڑ لو۔ ”الطُّوًّا“ ”الطُّوًّا“ سے ہے جس کا معنی ”چٹ جانا“ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے اس کو لازم پکڑنے کے حکم سے ظاہر ہو رہا ہے کہ یہ کس قدر بابرکت نام ہے۔

سورة الواقعة

عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: «یا رسولَ اللہ! قد شببت، قال شیبتی هودُ و الواقعة و المرسلات و ﴿عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ﴾ و ﴿إِذَا الشَّكُوكُ وَرَتْ﴾» [ترمذی، التفسیر، باب و من سورة الواقعة: ۳۲۹۷۔ سلسلۃ الأحادیث الصحیحة: ۹۵۵] ”یا رسول اللہ! آپ بوڑھے ہو گئے۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”مجھے ہود، واقعہ، مرسلات، نبا اور تکویر نے بوڑھا کر دیا۔“

بہت سے لوگ روزانہ سورۃ واقعہ کی تلاوت اس حدیث کی وجہ سے کرتے ہیں جو عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «مَنْ قَرَأَ سُورَةَ الْوَاقِعَةِ كُلَّ لَيْلَةٍ لَمْ تُصِبْهُ فَاقَةٌ أَبَدًا» ”جو شخص ہر رات سورۃ واقعہ پڑھے اسے کبھی فاقہ نہیں آئے گا۔“ مگر ایسی کوئی حدیث رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں ہے۔ شیخ ناصر الدین البانی رضی اللہ عنہ نے ”سلسلۃ الأحادیث الضعیفۃ و الموضوعة (ح: ۲۸۹ تا ۲۹۱)“ میں ایسی تمام روایات کا ضعف بیان فرمایا ہے۔

آیت ۱ اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ: ”الواقعة“ قیامت کے ناموں میں سے ایک نام ہے، جیسے ”الظَّامَةُ، الْأَرْزَاقُ، الصَّاحَّةُ“ اور ”الْقَارِعَةُ“ اس کے نام ہیں۔ ان میں ”تاء“ مبالغہ کے لیے ہے۔ اس کا نام ”الواقعة“ اس کے یقین ہونے کی وجہ سے رکھا گیا ہے، کیونکہ وہ ہر حال میں ہو کر رہنے والی ہے۔ یعنی جب قیامت قائم ہوگی، جیسا کہ سورۃ حاقہ میں ہے: ﴿فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ نَفْحَةٌ وَاحِدَةٌ ۗ وَ حُيِّلَتِ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَاحِدَةً ۗ فَيَوْمَئِذٍ وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ﴾ [الحاقہ: ۱۳ تا ۱۵] ”پس جب صور میں پھونکا جائے گا، ایک بار پھونکنا۔ اور زمین اور پہاڑوں کو اٹھایا جائے گا، پس دونوں ٹکرا دیے جائیں گے، ایک بار ٹکرا دینا۔ تو اس دن ہونے والی ہو جائے گی۔“

لَيْسَ لَوْفَعَتِهَا كَذِبَةٌ ۝ خَافِضَةٌ رَافِعَةٌ ۝ إِذَا رُجَّتِ الْأَرْضُ رَجًا ۝ وَ بُنِتِ الْجِبَالُ
بِنًا ۝ فَكَانَتْ هَبَاءً مُنْبَثًا ۝

اس کے واقع ہونے میں کوئی جھوٹ نہیں ۱ پست کرنے والی، بلند کرنے والی ۲ جب زمین ہلائی جائے گی، سخت ہلایا جانا ۳ اور پہاڑ ریزہ ریزہ کر دیے جائیں گے، خوب ریزہ ریزہ کیا جانا ۴ پس وہ پھیلا ہوا غبار بن جائیں گے ۵

آیت 2 لَيْسَ لَوْفَعَتِهَا كَذِبَةٌ: "كاذِبَةٌ" مصدر ہے بمعنی "كذب" جسے "العاقبة" بمعنی "مُعَاوَاةٌ" اور "العاقبة" بمعنی "عقبی" مصادر ہیں۔ یعنی اس کے واقع ہونے میں کوئی جھوٹ نہیں۔

آیت 3 خَافِضَةٌ رَافِعَةٌ: یعنی وہ بڑے بڑے سنگیوں کو جو دنیا میں معزز اور بلند مرتبہ سمجھے جاتے تھے، گرا کر جہنم میں پھینک دے گی اور مستضعفین اہل ایمان کو جو دنیا میں حقیر اور کم مرتبہ سمجھے جاتے تھے، اٹھا کر جنت کے اعلیٰ مراتب تک پہنچا دے گی۔ مزید دیکھیے سورہ مطفقین (۳۵۲۲۹)۔

آیت 4 إِذَا رُجَّتِ الْأَرْضُ رَجًا: یہ "إِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ" سے بدل ہے۔ "رَجٌّ رَجٌّ رَجًا" (ن) شدید حرکت دینا۔ "رَجًا" مصدر کے ساتھ تاکید میں مبالغہ مقصود ہے۔ یہ وہی بات ہے جو "إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا" اور "إِن زُلْزِلَتِ السَّاعَةُ سُحُبًا عَظِيمًا" میں بیان فرمائی گئی ہے۔

آیت 3 وَ بُنِتِ الْجِبَالُ بِنًا: "بِنَسٌ بِنَسٌ بِنًا" (ن) ریزہ ریزہ کرنا۔ "بِنًا" مصدر کے ساتھ پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کرنے میں مبالغہ کا اظہار مقصود ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّي نَسْفًا ۖ فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ۖ لَا تَرَى فِيهَا عِوَجًا وَلَا أَمْتًا﴾ [نہ: ۱۰۵ تا ۱۰۷] "اور وہ تجھ سے پہاڑوں کے بارے میں پوچھیں گے تو تو کہہ دے میرا رب انہیں اڑا کر بکھیر دے گا۔ پھر انہیں ایک چمیل میدان بنا کر چھوڑے گا۔ جس میں تو نہ کوئی کچی دیکھے گا اور نہ کوئی ابھری جگہ۔"

آیت 6 ۱ فَكَانَتْ هَبَاءً مُنْبَثًا: "هَبَاءٌ" غبار کے ان ذرات کو کہتے ہیں جو روشن دان سے کمرے میں آنے والی دھوپ میں چمک رہے ہوتے ہیں، پکڑنا چاہیں تو کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ "بِنٌ بِنٌ بِنًا" (ن) پھیلانا۔ "ابنك ابينانا" (انفعال) پھیلانا۔ "مُنْبَثًا" اسم فاعل ہے، پھیلنے والا۔ قیامت کے دن پہاڑوں پر گزرنے والے احوال کے لیے دیکھیے سورہ نبا کی آیت (۲۰) کی تفسیر۔

۲ ان آیات میں "إِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ" سے لے کر "وَ كُنْتُمْ أَزْوَاجًا ثَلَاثًا" تک بعض واقعات صور میں پہلے نقر کے وقت کے بیان فرمائے ہیں، جیسے "إِذَا رُجَّتِ الْأَرْضُ رَجًا" اور "بُنِتِ الْجِبَالُ بِنًا" ہے اور بعض دوسرے نقر کے وقت کے ہیں، جیسے "خَافِضَةٌ رَافِعَةٌ" اور "كُنْتُمْ أَزْوَاجًا ثَلَاثًا" اور بعض دونوں نقروں میں مشترک ہیں، جیسے "إِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ" اور "لَيْسَ لَوْفَعَتِهَا كَذِبَةٌ" ہے۔ چونکہ پہلے اور دوسرے نقر کا سارا وقت قیامت ہی کا ہے، اس لیے اس کے ہر کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

وَكُنْتُمْ أَزْوَاجًا ثَلَاثَةً ۖ فَأَصْحَابُ الْيَمِينِ ۖ مَا أَصْحَابُ الْيَمِينِ ۗ ۝۸ وَأَصْحَابُ الشُّمَالِ ۖ
مَا أَصْحَابُ الشُّمَالِ ۗ ۝۹ وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ ۖ ۝۱۰

اور تم تین قسم (کے لوگ) ہو جاؤ گے ۝۸ پس دائیں ہاتھ والے، کیا (خوب) ہیں دائیں ہاتھ والے ۝۸ اور بائیں ہاتھ والے، کیا (برے) ہیں بائیں ہاتھ والے ۝۹ اور جو پہل کرنے والے ہیں، وہی آگے بڑھنے والے ہیں ۝۱۰

جز کو ہر واقعہ کا وقت کہا جاسکتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں عموماً دونوں نفلوں کے نتیجے میں واقع ہونے والے معاملات اکٹھے ہی ذکر کیے گئے ہیں۔

آیت 7 ۝۷ وَكُنْتُمْ أَزْوَاجًا ثَلَاثَةً: یہ تمام لوگوں کو خطاب ہے، کیونکہ قیامت کے دن سب لوگ ان تین قسموں میں تقسیم ہوں گے، سابقون، اصحاب الیمین اور اصحاب الشمال۔ سورت کے آخر میں موت کے وقت بھی لوگوں کی یہی تین قسمیں بیان فرمائی ہیں۔

آیت 8-9 ۝۸ فَأَصْحَابُ الْيَمِينِ ۖ مَا أَصْحَابُ الْيَمِينِ ۗ ... : ”أَصْحَابُ الْيَمِينِ“ مبتدا ہے اور ”مَا أَصْحَابُ الْيَمِينِ“ جملہ ہو کر خبر ہے۔ دائیں ہاتھ والے جنہیں دائیں ہاتھ میں اعمال نامے دیے جائیں گے۔ (دیکھیے حاقہ: ۱۹) استفہام سے مراد ان کی عظمت شان کا اظہار ہے، یعنی وہ اتنی بلند شان والے ہیں کہ ان کے متعلق سوال کیا جاتا ہے کہ ”أَصْحَابُ الْيَمِينِ“ کیا ہیں؟ یہاں ان کی شان اجمالاً بیان ہوئی ہے، تفصیل آگے ”وَأَصْحَابُ الْيَمِينِ ۖ مَا أَصْحَابُ الْيَمِينِ“ میں آ رہی ہے۔ اسی طرح ”وَأَصْحَابُ الشُّمَالِ ۖ مَا أَصْحَابُ الشُّمَالِ“ میں بائیں ہاتھ والوں کی بری حالت کا اظہار مقصود ہے کہ وہ کیا ہی بری ہے، تفصیل اس کی ”وَأَصْحَابُ الشُّمَالِ ۖ مَا أَصْحَابُ الشُّمَالِ“ میں آ رہی ہے۔

آیت 10 ۝۱۰ وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ: اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ پہلے ”السَّابِقُونَ“ سے مراد عمل میں سبقت والے اور دوسرے ”السَّابِقُونَ“ سے مراد درجے میں سبقت لینے والے ہیں۔ یعنی جو لوگ ایمان لانے میں اور اعمال صالحہ میں دوسروں سے پہلے کرنے والے اور آگے بڑھنے والے ہیں وہ جنت کے داخلے میں بھی دوسروں سے پہلے اور اس کے مراتب میں دوسروں سے آگے ہوں گے۔ دوسرا مطلب یہ کہ دونوں ”السَّابِقُونَ“ سے مراد ایک ہی ہے اور مقصود ان کی شان کا بیان ہے، جیسے کہا جاتا ہے: ”أَنْتَ أَنْتَ“ کہ تم ہی ہو، تمہارا کیا کہنا، کوئی اور تمہارے جیسا نہیں اور جیسے شاعر نے کہا ہے :-

أَنَا أَبُو الشَّخْمِ وَ شُعْرِي شِعْرِي

”میں ابو انجم ہوں اور میرا شعر میرا ہی شعر ہے۔“

یعنی میرے شعر کی کیا بات ہے۔ یعنی سابقون سابقون ہی ہیں، کوئی اور ان کے رتبے کو نہیں پہنچ سکتا۔

أُولَئِكَ الْمُقَرَّبُونَ ﴿۱۱﴾ فِي جَنَّتِ النَّعِيمِ ﴿۱۲﴾ ثَلَاثَةٌ مِنَ الْأَوَّلِينَ ﴿۱۳﴾ وَ قَلِيلٌ مِّنَ
الْآخِرِينَ ﴿۱۴﴾

یہی لوگ قریب کے ہیں ﴿۱۱﴾ نعمت کے باغوں میں ﴿۱۲﴾ بہت بڑی جماعت پہلوں سے ﴿۱۳﴾ اور تھوڑے سے
پچھلوں سے ﴿۱۴﴾

آیت 11 12: أُولَئِكَ الْمُقَرَّبُونَ ﴿۱۱﴾ فِي جَنَّتِ النَّعِيمِ: یعنی ایمان لانے میں اور ہر خیر کے کام میں دوسروں سے سبقت
لے جانے والوں کا درجہ بھی عام اہل ایمان سے زیادہ ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کا خاص قرب بھی انہی کو حاصل ہوگا اور انہیں
ملنے والی جنت اصحاب الہیمن کو ملنے والی جنت سے درجے اور نعمتوں میں افضل ہوگی، جیسا کہ اس سے پہلے سورہ رحمان میں
گزارا ہے اور یہاں بھی ”عَلَىٰ سُرُرٍ مَّوْضُونًا“ سے اس کی تفصیل آ رہی ہے۔ ”جَنَّتِ النَّعِيمِ“ کی تفسیر کے لیے دیکھیے
سورہ صافات (۲۳)۔

آیت 13 14: ثَلَاثَةٌ مِنَ الْأَوَّلِينَ وَ قَلِيلٌ مِّنَ الْآخِرِينَ: ”ثَلَاثَةٌ“ پر تینوں تعظیم کے لیے ہے، ایک بڑی جماعت۔
اللہ تعالیٰ نے سابقوں کے متعلق ”ثَلَاثَةٌ مِنَ الْأَوَّلِينَ وَ قَلِيلٌ مِّنَ الْآخِرِينَ“ اور اصحاب الہیمن کے متعلق ”ثَلَاثَةٌ مِنَ
الْأَوَّلِينَ وَ قَلِيلٌ مِّنَ الْآخِرِينَ“ فرمایا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ دونوں جگہ ”الْأَوَّلِينَ“ اور ”الْآخِرِينَ“ سے مراد کیا ہے؟ تو
اس کے متعلق اہل علم کے دو قول ہیں، ایک یہ کہ ”الْأَوَّلِينَ“ سے مراد پہلی امتیں ہیں اور ”الْآخِرِينَ“ سے مراد ہماری امت
ہے۔ انہیں ”الْآخِرِينَ“ اس لیے کہا گیا کہ وہ تمام امتوں میں سے آخری امت ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ سابقوں پہلی امتوں
میں سے ایک بڑی جماعت ہیں اور آخری امت میں سے قلیل ہیں۔ طبری نے تفسیر میں یہی قول ذکر فرمایا ہے، کوئی اور قول ذکر
ہی نہیں کیا اور راجح قول بھی یہی معلوم ہوتا ہے، کیونکہ آدم علیہ السلام سے لے کر رسول اللہ ﷺ تک مشہور قول کے مطابق ایک لاکھ
سے زیادہ تو انبیاء ہی گزرے ہیں، انبیاء سمیت ان کی امتوں کے سابقوں یقیناً بہت بڑی جماعت ہوں گے، ان کی نسبت سے
ہماری امت کے سابقوں کی تعداد کم ہوگی۔ ہاں اصحاب الہیمن جس طرح پہلی امتوں کے بہت بڑی جماعت ہوں گے ہماری
امت کے بھی بہت بڑی جماعت ہوں گے، حتیٰ کہ ہماری امت کے افراد اہل جنت کا نصف ہوں گے، جیسا کہ ”ثَلَاثَةٌ مِنَ
الْآخِرِينَ“ کی تفسیر میں احادیث آ رہی ہیں۔

اس قول کے راجح ہونے کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ اس سورت میں قیامت کا ذکر ہو رہا ہے اور اس دن یہ تین گروہ صرف
ہماری امت کے نہیں ہوں گے بلکہ آدم علیہ السلام سے لے کر آخری ابن آدم تک سب لوگ تین گروہوں میں تقسیم ہوں گے۔ اس
اعتبار سے بھی اولین سے مراد پہلی امتیں ہیں اور آخرین سے مراد امت محمد ﷺ کے لوگ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث
سے بھی اس قول کی تائید ہوتی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: «نَحْنُ الْآخِرُونَ السَّابِقُونَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِيَدِ أَتَمِّهِمْ أَوْ تَوَا
الْكِتَابِ مِنْ قَبْلِنَا، ثُمَّ هَذَا يَوْمُهُمُ الَّذِي فُرِضَ عَلَيْهِمْ فَأَحْتَلَفُوا فِيهِ، فَهَذَا اللَّهُ، فَالْأَنْسُ لَنَا فِيهِ تَبَعٌ، الْيَهُودُ

عَلَىٰ سُرُرٍ مَّوْضُونَةٍ ﴿١٥﴾ مُتَّكِنِينَ عَلَيْهَا تُنْقِلِينَ ﴿١٦﴾ يَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُونَ ﴿١٧﴾

سونے اور جواہر سے بٹے ہوئے تختوں پر (آرام کر رہے ہوں گے) جن پر بچے لگائے ہوئے آئے
ساتنے بیٹھے والے (ہوں گے) ﴿١٥﴾ ان پر چکر لگا رہے ہوں گے وہ لڑکے جو ہمیشہ (لڑکے ہی) رکے
جائیں گے ﴿١٧﴾

عَدَا وَالنَّصَارَىٰ بَعْدَ عَدٍ ﴿﴾ [بخاری، الجمعة، باب فرض الجمعة..... : ۸۷۶، عن أبي هريرة ؓ] ”ہم آخر میں آنے
والے ہیں، قیامت کے دن پہلے ہوں گے۔ اس لیے کہ ان لوگوں کو ہم سے پہلے کتاب دی گئی، پھر یہ (جمعہ کا دن) جو ان پر
فرض کیا گیا تو انھوں نے اس میں اختلاف کیا، تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہدایت دی۔ چنانچہ لوگ اس میں ہمارے پیچھے ہیں، یہود
انگلی دن اور نصاریٰ اس سے انگلی دن۔“

دوسرا قول جسے ابن کثیر نے ترجیح دی ہے، یہ ہے کہ دونوں جگہ اولین اور آخرین سے مراد امت محمدیہ کے اولین و آخرین
ہیں اور مطلب یہ ہے کہ سابقوں اس امت کے شروع کے لوگوں میں سے ایک بہت بڑی جماعت ہوں گے اور بعد کے لوگوں
میں سے کم تعداد میں ہوں گے۔ البتہ اصحاب الیمین امت کے شروع کے لوگوں میں سے بہت بڑی جماعت ہوں گے اور آخر
حصے کے لوگوں سے بھی بہت بڑی جماعت ہوں گے۔ شروع کے لوگوں سے مراد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ان سے قریب زمانوں کے
لوگ ہیں۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «خَيْرُ النَّاسِ قَرْنِي ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ ثُمَّ
الَّذِينَ يَلُونَهُمْ ثُمَّ يَجِيءُ قَوْمٌ تَسْبِقُ شَهَادَةُ أَحَدِهِمْ يَمِينَهُ وَيَمِينُهُ شَهَادَتَهُ» [بخاری، فضائل الصحابة، باب فضائل
اصحاب النبي ﷺ..... : ۳۶۵۱] ”سب لوگوں سے بہتر میرا زمانہ ہے، پھر وہ لوگ جو ان سے ملیں گے، پھر وہ لوگ جو ان سے
ملیں گے، پھر کچھ لوگ آئیں گے جن کی شہادت ان کی قسم سے پہلے اور ان کی قسم ان کی شہادت سے پہلے ہوگی۔“ ابن کثیر رضی اللہ
نے ایک تیسرا قول ذکر فرمایا ہے کہ ہر امت کے ابتدائی لوگوں میں سابقوں کی ایک بڑی جماعت ہوئی ہے جب کہ بعد کے
لوگوں میں وہ قلیل ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان تینوں اقوال میں کوئی تعارض نہیں، اپنی اپنی جگہ تینوں درست ہیں، البتہ
آیات کے سیاق کے مطابق یہاں پہلا معنی راجح معلوم ہوتا ہے۔ (واللہ اعلم)

آیت ۱۵ ﴿عَلَىٰ سُرُرٍ مَّوْضُونَةٍ﴾: ”سُرُرٌ“ کی جمع ہے، جس کا معنی تخت بھی ہے اور چارپائی بھی اور ”وَضَنٌ
يَضْنُ وَضْنًا“ (ض) بٹنا، مضبوطی اور باریکی سے بٹنا، سونے اور جواہر کے ساتھ بٹنا۔ طبری نے مجاہد کے طریق سے صحیح سند کے
ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ذکر فرمایا ہے: ”مَرْمُؤَلَةٌ بِالذَّهَبِ، أَي مَنَسُوجَةٌ بِالذَّهَبِ“ ”یعنی سونے کے تاروں کے
ساتھ بٹے ہوئے۔“

آیت ۱۵ ﴿مُتَّكِنِينَ عَلَيْهَا تُنْقِلِينَ﴾: اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ صافات (۴۳) کی تفسیر۔

آیت ۱۷ ﴿يَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُونَ﴾: اس کے لیے دیکھیے سورہ دہر کی آیت (۱۹) کی تفسیر۔

بِأَكْوَابٍ وَ أَبَارِيقٍ ۙ وَ كَأْسٍ مِنْ مَعِينٍ ﴿۱۸﴾ لَا يُصَدَّعُونَ عَنْهَا وَ لَا يُنْزِفُونَ ﴿۱۹﴾
وَ فَالِكِهَاتٍ مِمَّا يَتَخَبِزُونَ ﴿۲۰﴾ وَ لَحْمٍ طَيْرٍ مِمَّا يَشْتَهُونَ ﴿۲۱﴾ وَ حُمْرٍ عِينٍ ﴿۲۲﴾

ایسے کوزے اور ٹوٹی والی صحاحیاں اور لہاب بھرے ہوئے پیالے لے کر جو بہتی ہوئی شراب کے ہوں گے ﴿۱۸﴾ وہ نہ اس سے درد سر میں مبتلا ہوں گے اور نہ بھکیں گے ﴿۱۹﴾ اور ایسے پھل لے کر جنہیں وہ پسند کرتے ہیں ﴿۲۰﴾ اور پرندوں کا گوشت لے کر جس کی وہ خواہش رکھتے ہیں ﴿۲۱﴾ اور (ان کے لیے وہاں) سفید جسم، سیاہ آنکھوں والی عورتیں ہیں، جو فراخ آنکھوں والی ہیں ﴿۲۲﴾

آیت 18 ۱ بِأَكْوَابٍ وَ أَبَارِيقٍ: "اَکْوَابٌ" "سُکُوت" کی جمع ہے، برتن جس کی ندہتی ہو نہ ٹوٹی۔ "أَبَارِيقٌ" "إِبْرِيقٌ" کی جمع ہے، مادہ اس کا "بَرِيقٌ" (چمک) ہے، وہ برتن جس کی ٹوٹی یا پکڑنے کی دہتی ہو یہ دونوں ہوں۔ چمک کی وجہ سے اس کا نام "إِبْرِيقٌ" رکھا گیا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ فارسی لفظ "ابریز" کا معرب ہے۔
۲ وَ كَأْسٍ مِنْ مَعِينٍ اس کے لیے دیکھیے سورہ صافات (۳۵) کی تفسیر۔

آیت 19 ۱ لَا يُصَدَّعُونَ عَنْهَا وَ لَا يُنْزِفُونَ: "الْصَدَاعُ" درد سر کو کہتے ہیں، "صُدِعَ وَ صُدِعَ فُلَانٌ" (مجبول) اسے درد سر ہو گیا۔ "يُنْزِفُونَ" سورہ صافات (۳۷) میں "زاء" کے فتح کے ساتھ مضارع مجبول ہے، یہاں "زاء" کے کسرہ کے ساتھ مضارع معلوم ہے۔ "نُرِفَ مَاءُ الْبَيْتْرِ" کنوئیں کا سارا پانی نکال لیا گیا۔ "نُرِفَ الرُّجُلُ" آدمی کی عقل جاتی رہی، وہ نشے میں مدہوش ہو گیا۔ "النُّرْفُ الرُّجُلُ" آدمی کے پاس کوئی چیز باقی نہ رہی، اس کی عقل جاتی رہی، نشے میں مدہوش ہو گیا۔ خلاصہ یہ ہے کہ "يُنْزِفُونَ" معروف و مجبول دونوں کا معنی نشے میں بے ہوش ہونا اور عقل کا راجانا ہے۔ تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ صافات (۳۷)۔

آیت 20 ۱ وَ فَالِكِهَاتٍ مِمَّا يَتَخَبِزُونَ: "فَالِكِهَاتٍ" کا عطف "بِأَكْوَابٍ" پر ہے، یعنی سونے سے بنے ہوئے تنکوں پر آمنے سامنے ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے جنتیوں پر "وَلَذَانِ مُخَلَّدُونَ" شراب کے جام اور ان کے پسند کردہ پھل اور ان کی خواہش کے مطابق پرندوں کا گوشت لے کر چکر لگا رہے ہوں گے۔ خدمت گاروں کے پھل لاکر پیش کرنے میں جو لطف ہے وہ بھی انہیں حاصل ہوگا اور اپنے ہاتھوں سے توڑ کر کھانا چاہیں گے تو وہ بھی انہیں بردت میسر ہوگا، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَجَنَّا الْجَنَّتَيْنِ دَانٍ﴾ | الرحمن : ۵۴ | "اور دونوں باغوں کا پھل قریب ہے۔" اور فرمایا: ﴿قَطُوفُهَا دَانِيَةٌ﴾ | صافات : ۲۳ | "جس کے میوے قریب ہوں گے۔" "فَالِكِهَاتٍ" کے معنی کے لیے دیکھیے سورہ صافات (۳۲)۔

آیت 21 ۱ وَ لَحْمٍ طَيْرٍ مِمَّا يَشْتَهُونَ: "يَشْتَهُونَ" "شَهْوَةٌ" (خواہش) سے باب افتعال کا مضارع معلوم ہے۔ پرندوں کا گوشت لذت، غذائیت اور قوت تینوں اعتبار سے چوپایوں کے گوشت سے اعلیٰ اور عمدہ ہوتا ہے۔

آیت 22 ۱ وَ حُمْرٍ عِينٍ: "حُمْرٌ عِينٌ" مرفوع ہے، اس کا عطف "وَلَذَانِ مُخَلَّدُونَ" پر ہے، مطلب یہ ہے کہ

كَأَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُونِ ﴿۳۳﴾ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۳۲﴾ لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَلَا تَأْتِيهَا ﴿۳۱﴾ إِلَّا قِيلًا سَلَامًا سَلَامًا ﴿۳۰﴾ مَا أَصْحَابُ الْيَمِينِ ﴿۲۹﴾ فِي سِدْرٍ مَّخْضُودٍ ﴿۲۸﴾

چمپا کر رکھے ہوئے موتیوں کی طرح ﴿۳۳﴾ اس کے بدلے کے لیے جو وہ کیا کرتے تھے ﴿۳۲﴾ وہ ان میں سے ہے جو وہ گفتگو نہیں کے اور نہ گناہ میں ڈالنے والی بات ﴿۳۱﴾ مگر یہ کہنا کہ سلام ہے، سلام ہے ﴿۳۰﴾ اور دائیں ہاتھ کی پھلے، کیا (عی اچھے) ہیں دائیں ہاتھ والے ﴿۲۹﴾ (وہ) ایسی بیویوں میں ہوں گے جن کے کانٹے دور کیے ہوئے ہیں ﴿۲۸﴾

شراب کے جام، پھل اور گوشت وغیرہ لے کر "ولدان مخلصان" ان پر چکر لگا رہے ہوں گے اور "حور عین" بھی۔ بعض نے فرمایا کہ یہ مبتدا ہے اور خبر اس کی محذوف ہے: "أَيُّ وَ لَهَا فِيهَا لَحُورٌ عَيْنٌ" یعنی ان کے لیے اس میں حوریں ہوں گی۔ ترجمہ اس کے مطابق کیا گیا ہے۔ مزید دیکھیے سورہ دخان (۵۳)۔

آیت 23 كَأَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُونِ: اس آیت کی وضاحت کے لیے دیکھیے سورہ رحمن (۵۸) اور سورہ صفات (۳۹) کی تفسیر۔

آیت 25 26 لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَلَا تَأْتِيهَا : "تَأْتِيهَا" "بِئْتَم" سے باب تفعیل کا مصدر بمعنی اسم فاعل ہے، لگنا و گار کرنے والی بات۔ "قَبِيلٌ" اور "قَوْلٌ" دونوں "قَالَ يَقُولُ" کے مصدر ہیں۔ "سَلَامًا سَلَامًا" "قِيلًا" سے بدل ہے یا اس کا مقولہ ہے۔ تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ مریم (۶۲) اور سورہ نبا (۳۵)۔

آیت 23 وَأَصْحَابُ الْيَمِينِ لَا مَا أَصْحَابُ الْيَمِينِ: سابقوں کا حال بیان کرنے کے بعد اب اصحاب الیمین یعنی عام مومنوں کی خوش حالی اور عیش و تنعم کا بیان ہے۔ "وَأَصْحَابُ الْيَمِينِ لَا مَا أَصْحَابُ الْيَمِينِ" سے وہی مراد ہیں جو "فَأَصْحَابُ الْيَمِينَةِ لَا مَا أَصْحَابُ الْيَمِينَةِ" سے ہیں۔

آیت 28 فِي سِدْرٍ مَّخْضُودٍ: "سِدْرٌ" (بیری) اسم جنس ہے جو ایک اور زیادہ سب پر بولا جاتا ہے۔ لفظ مفرد ہونے کی وجہ سے صفت "مَخْضُودٌ" مفرد آئی ہے۔ "طَلْعٌ مَخْضُودٌ" بھی اسی طرح ہے۔ ایک بیری کہنا ہو تو "سِدْرَةٌ" کہتے ہیں۔ "مَخْضُودٌ" (مخ) "السَّحَرُ" درخت کے کانٹے کاٹ دینا۔ دنیا کی بیویوں میں کانٹے ہوتے ہیں، جنت کے بیری کے درختوں میں کانٹے نہیں ہوں گے۔ اس کا ذکر اس لیے فرمایا کہ عرب بیری سے آشنا تھے، کیونکہ ان کے ہاں یہ درخت بہت ہوتا ہے، مگر اکثر خاردار ہوتا ہے۔ بانوں میں کاشت کیے جانے والے درختوں کے کانٹے کم اور پھل لذیذ ہوتا ہے، پھر کانٹے جتنے کم ہوں پھل اتنا ہی زیادہ لذیذ اور نفیس ہوتا ہے۔ جنت کی بیویوں میں کانٹے بالکل نہیں ہوں گے اور حقیقت یہ ہے کہ جنت کے پھلوں کے صرف نام دنیا کے پھلوں والے ہیں، ان کے ذائقے، لذت اور نفاست سے دنیا کے پھلوں کی کوئی نسبت نہیں۔

وَفُرُشٍ قَرْفُوعَةٍ ﴿٣٧﴾ إِنَّكَ أَشْأَلُهُنَّ إِنشَاءً ﴿٣٨﴾ فَجَعَلْتُهُنَّ أَبْكَارًا ﴿٣٩﴾ عُرْبًا أَثْرَابًا ﴿٤٠﴾
لِأَصْحَابِ الْيَمِينِ ﴿٣٧﴾

اور اونچے بستروں میں ﴿۳۷﴾ بلاشبہ ہم نے ان (بستروں والی عورتوں) کو پیدا کیا، منہ سے نکلنے والی لہجہ رکھی ﴿۳۸﴾ پس ہم نے انھیں کنواریاں بنا دیا ﴿۳۹﴾ جو خاوندوں کی محبوب، ان کی ہم عمر ہیں ﴿۴۰﴾ دائیں ہاتھ والوں کے لئے ہے۔
والے ہیں۔“ اور اس کے پھل ہر وقت تیار ہیں اور ہر طرح کھانے والوں کی دسترس میں ہیں۔

آیت 34 ﴿وَفُرُشٍ قَرْفُوعَةٍ﴾: اونچے بستروں سے مراد عالی شان بستر ہیں۔ ترمذی وغیرہ کی ایک روایت میں رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے کہ ان کی بلندی اتنی ہے جتنی آسمان وزمین کے درمیان ہے، جو پانچ سو سال کا فاصلہ ہے، مگر ایسی کوئی روایت صحیح نہیں اور نہ ہی بظاہر ایسی بلندی سے کچھ فائدہ ہے۔

آیت 35 ﴿إِنَّكَ أَشْأَلُهُنَّ إِنشَاءً﴾: ”اَشْأَلُهُنَّ“ میں ”هُنَّ“ کی ضمیر ان عورتوں کی طرف جارہی ہے جن کا پچھلی آیت ”وَفُرُشٍ قَرْفُوعَةٍ“ کے ضمن میں ذکر ہے، کیونکہ جنتیوں کے بستروں میں ان کے ساتھ ان کی بیویاں بھی ہوں گی، جیسا کہ فرمایا: ﴿هُمُ وَأَزْوَاجُهُمْ فِي ظِلِّ عَلَى الْأَرْبَابِ مُتَكُونَ﴾ [نہر: ۵۶] ”وہ اور ان کی بیویاں گھنے سایوں میں تختوں پر تکیہ لگائے ہوئے ہوں گے۔“ ”أَنْشَأَ يُنْشِئُ إِنشَاءً“ کا معنی ”نیا پیدا کرنا“ ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی مومن عورتیں بوزہی یا بد صورت یا جیسی بھی تھیں، اللہ تعالیٰ انھیں نئے سرے سے جوان، کنواری، خوبصورت اور ان اوصاف والی بنا دے گا جن کا ان آیات میں ذکر ہے۔ اس کے علاوہ ان الفاظ میں وہ ”حور عین“ بھی شامل ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ جنتیوں ہی کے لیے پیدا فرمائے گا۔

آیت 35 ﴿فَجَعَلْتُهُنَّ أَبْكَارًا﴾: ”أَبْكَارًا“ ”بکر“ کی جمع ہے، کنواریاں۔ یعنی دنیا میں شوہر والی مومن عورتوں کو بھی اللہ تعالیٰ باکرہ بنا دے گا۔ اس کے علاوہ دنیا کی عورتیں ہوں یا جنتیوں کے لیے پیدا کی گئی نئی عورتیں، سب ہمیشہ باکرہ رہیں گی، ان کے خاوند جب بھی ان سے ملاپ کریں گے انھیں باکرہ پائیں گے۔

آیت 37، 38 ﴿عُرْبًا أَثْرَابًا﴾ لِأَصْحَابِ الْيَمِينِ: ”عُرْبًا“ ”عُرُوبٌ“ (فتح عین) کی جمع ہے، جیسے ”رَسُولٌ“ کی جمع ”رُسُلٌ“ ہے۔ یہ ”أَعْرَبَ فُلَانٌ فِي قَوْلِهِ“ سے ہے، جب کوئی شخص فصاحت اور حسن بیان سے بات کرے۔ یعنی میٹھی میٹھی باتوں اور ناز و انداز سے خاوند کا دل بھانے والی اور اس کی محبت حاصل کرنے والی عورتیں، خاوند کی محبوب عورتیں۔ ”أَثْرَابًا“ ”نَزَبٌ“ کی جمع ہے، ہم عمر جو مل کر مٹی میں کھیلتے رہے ہوں۔ ”لِأَصْحَابِ الْيَمِينِ“ ”أَثْرَابًا“ سے متعلق ہے، یعنی وہ اصحاب الیمین کی ہم عمر ہوں گی۔ ہم عمری میں جو موافقت پائی جاتی ہے وہ اس کے سوا میں حاصل نہیں ہوتی۔ واضح رہے کہ ان آیات کا یہ مطلب نہیں کہ سابقوں کو ملنے والی نعمتیں اور ہوں گی اور اصحاب الیمین کو ملنے والی دوسری، بلکہ دونوں کو ملنے والی بے شمار نعمتیں مشترک ہوں گی، مثلاً جنت کے پھل، مکانات، نہریں، بیویاں، خدام وغیرہ۔ ہاں، ان کی کیفیت میں ضرور فرق ہوگا کہ سابقوں کو ملنے والی نعمتیں اصحاب الیمین کو ملنے والی نعمتوں سے اعلیٰ درجے کی ہوں گی۔ دونوں کے لیے نعمتوں کے بیان سے

ثَلَاثَةٌ مِنَ الْأَوَّلِينَ ﴿۳۸﴾ وَ ثَلَاثَةٌ مِنَ الْآخِرِينَ ﴿۳۹﴾ وَ أَصْحَابُ الشِّبَالِ ؕ مَا أَصْحَابُ
الشِّبَالِ ﴿۴۰﴾ فِي سَنُوهِمْ وَ حَصِيْمٍ ﴿۴۱﴾ وَ ظِلٍّ مِّنْ يَحْتَوِيهِمْ ﴿۴۲﴾ لَا بَارِدٌ وَ لَا
كَرِيمٌ ﴿۴۳﴾

ایک بڑی جماعت پہلے لوگوں سے ہیں ﴿۳۸﴾ اور ایک بڑی جماعت پچھلوں سے ﴿۳۹﴾ اور بائیں ہاتھ والے، کیا (ہی) برے (ہیں) بائیں ہاتھ والے ﴿۴۰﴾ (وہ) ایک زہریلی لو اور کھولتے ہوئے پانی میں ﴿۴۱﴾ اور سیاہ دھوکے کے سائے میں ہوں گے ﴿۴۲﴾ جو نہ ٹھنڈا ہے اور نہ باعزت ﴿۴۳﴾

مقصود ترغیب اور ان کا شوق دلانا ہے۔

آیت 39، 40: ثَلَاثَةٌ مِنَ الْأَوَّلِينَ وَ ثَلَاثَةٌ مِنَ الْآخِرِينَ: یعنی اصحاب الیسین پہلی امتوں میں سے بہت بڑی جماعت ہوں گے اور آخری امت سے بھی بہت بڑی جماعت ہوں گے۔ اس میں یہ وضاحت نہیں کہ دونوں میں سے کون سی جماعت تعداد میں دوسری سے زیادہ ہوگی، یہ بات رسول اللہ ﷺ نے واضح فرمائی ہے، عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: «كُنَّا مَعَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي قَبْضَةٍ نَحْنُ مِنْ أَرْبَعِينَ رَجُلًا فَقَالَ أَرْضَوْنَ أَنْ تَكُونُوا رُبْعَ أَهْلِ النَّحْنَةِ؟ قَالَ فَنُنَا نَعَمْ، فَقَالَ أَرْضَوْنَ أَنْ تَكُونُوا ثُلُثَ أَهْلِ النَّحْنَةِ؟ فَقُلْنَا نَعَمْ. فَقَالَ وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ: إِنِّي لَأَرْجُو أَنْ تَكُونُوا نِصْفَ أَهْلِ النَّحْنَةِ وَذَلِكَ أَنَّ النَّحْنَةَ لَا يَدْخُلُهَا إِلَّا نَفْسٌ مُسْبِئَةٌ وَمَا أَنْتُمْ فِي أَهْلِ الشَّرِكِ إِلَّا كَالشَّعْرَةِ الْبَيْضَاءِ فِي جِلْدِ الثَّوْرِ الْأَسْوَدِ أَوْ كَالشَّعْرَةِ السَّوْدَاءِ فِي جِلْدِ الثَّوْرِ الْأَحْمَرِ» [مسلم، الاحسان، باب كون هذه الأمة نصف أهل الجنة: ۳۷۷/۲۲۱] ”ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک خیمہ میں تقریباً چالیس آدمی تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: ”کیا تم پسند کرتے ہو کہ تم اہل جنت کا چوتھا حصہ ہو؟“ ہم نے کہا: ”ہاں!“ پھر فرمایا: ”کیا تم پسند کرتے ہو کہ تم اہل جنت کا تیسرا حصہ ہو؟“ ہم نے کہا: ”ہاں!“ تو آپ ﷺ نے فرمایا ”قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! میں امید کرتا ہوں کہ تم اہل جنت کا نصف ہو گے اور یہ اس لیے کہ جنت میں مسلمان کے سوا کوئی نہیں جائے گا۔ اور مشرکوں کے مقابلے میں تمہاری تعداد اتنی ہی ہے جتنی سیاہ تیل کی جلد میں ایک سفید بال یا سرخ تیل کی جلد میں ایک سیاہ بال۔“

آیت 41-44: وَ أَصْحَابُ الشِّبَالِ : ”سَنُوهِمْ“ کی وضاحت کے لیے دیکھیے سورہ طور (۲۷) کی تفسیر۔ ”يَحْتَوِيهِمْ“ سیاہ دھواں۔ یہ ”حُصْمٌ“ (بروزن ”صُرْمٌ“ بمعنی کولہ) سے ”يَفْعُولُ“ کے وزن پر ہے۔ ”أَحْمٌ“ سیاہ۔ یعنی وہ دھواں جس میں سیاہی اور گرمی دونوں ہوں۔ یعنی جہنمیوں کو کہیں سایہ نہیں ملے گا، ملے گا تو سخت سیاہ اور گرم دھوکے کا، جس میں نہ کوئی ٹھنڈک ہوگی اور نہ کوئی راحت یا آسائش ہوگی۔ مزید دیکھیے سورہ مرسلات (۳۹) (۳۳)۔

إِنَّهُمْ كَانُوا قَبْلَ ذَلِكَ مُتْرَفِينَ ﴿۴۵﴾ وَكَانُوا يُصْرُونَ عَلَى الْحِنثِ الْعَظِيمِ ﴿۴۶﴾
 وَكَانُوا يَقُولُونَ لَا آيِدَا مِنَّا وَكُنَّا ثُرَاتًا وَعِظَامًا ء إِنَّا لَنَبْعُوثُونَ ﴿۴۷﴾
 أَوْ آبَاؤُنَا الْأَوَّلُونَ ﴿۴۸﴾ قُلْ إِنَّ الْأَوَّلِينَ وَالْآخِرِينَ ﴿۴۹﴾ لَنَجْمُوعُونَ لِيَوْمٍ مَّيَقَاتٍ يَوْمٍ
 مَعْلُومٍ ﴿۵۰﴾ ثُمَّ إِنَّكُمْ أَيْهَا الضَّالُّونَ الْمُكَذِّبُونَ ﴿۵۱﴾ لَأَكُونَنَّ مِنْ شَجَرٍ مِنْ زُقُومٍ ﴿۵۲﴾
 فَالَّذُونَ مِنْهَا الْبُظُونُ ﴿۵۳﴾ فَشَرِبُوا عَلَيْهِ مِنَ الْحَمِيمِ ﴿۵۴﴾ فَشَرِبُوا مِنْ هَيْمٍ ﴿۵۵﴾
 هَذَا نُزْلُهُمْ يَوْمَ الدِّينِ ﴿۵۶﴾

بے شک وہ اس سے پہلے نعمتوں میں پالے ہوئے تھے ﴿۴۵﴾ اور وہ بہت بڑے گناہ (شرک) پر اڑے رہتے تھے ﴿۴۶﴾
 اور وہ کہا کرتے تھے کیا جب ہم مر جائیں گے اور ہم مٹی اور ہڈیاں ہو جائیں گے تو کیا واقعی ہم ضرور اٹھائے جانے
 والے ہیں؟ ﴿۴۷﴾ اور کیا ہمارے پہلے باپ دادا بھی؟ ﴿۴۸﴾ کہہ دے بے شک تمام پہلے اور پچھلے ﴿۴۹﴾ ایک معلوم دن کے
 مقرر وقت پر یقیناً اکٹھے کیے جانے والے ہیں ﴿۵۰﴾ پھر بے شک تم اے گمراہوا! جھٹلانے والو! ﴿۵۱﴾ یقیناً تھوہر کے
 پودے میں سے کھانے والے ہو ﴿۵۲﴾ پھر اس سے پیٹ بھرنے والے ہو ﴿۵۳﴾ پھر اس پر کھولتے پانی سے پینے والے ہو ﴿۵۴﴾
 پھر پیاس کی بیماری والے اونٹوں کے پینے کی طرح پینے والے ہو ﴿۵۵﴾ یہ جزا کے دن ان کی مہمانی ہے ﴿۵۶﴾

آیت 45: إِنَّهُمْ كَانُوا قَبْلَ ذَلِكَ مُتْرَفِينَ: یعنی ان کا یہ انجام بد اس لیے ہوا کہ اس سے پہلے دنیا میں انہیں ہر طرح
 کی خوش حالی عطا کی گئی تھی، مگر اس خوش حالی نے ان پر اتنا اثر کیا اور وہ شکر گزار ہونے کے بجائے نافرمانی پر عمل گئے اور حلال و
 حرام کی پروا کیے بغیر اپنے نفس کی لذتوں میں منہمک ہو گئے۔

آیت 46: وَكَانُوا يُصْرُونَ عَلَى الْحِنثِ الْعَظِيمِ: بہت بڑے گناہ سے مراد شرک ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَإِنَّ
 الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ﴾ [القصص: ۱۳] ”بے شک شرک یقیناً بہت بڑا ظلم ہے۔“ یعنی ان کے عذاب کا باعث اللہ تعالیٰ کی
 عطا کردہ خوش حالی کو نافرمانی کے لیے استعمال کرنا اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک پر اصرار کرنا تھا۔ اس کے علاوہ وہ قیامت اور
 پیغمبروں کو بھی جھٹلاتے تھے، جیسا کہ آگے تفصیل آ رہی ہے۔

آیت 47-48: وَكَانُوا يَقُولُونَ.....: ان آیات کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ مؤمنون (۸۲، ۸۳) اور سورہ صافات
 (۱۲، ۱۳)۔

آیت 49-50: قُلْ إِنَّ الْأَوَّلِينَ وَالْآخِرِينَ ﴿۴۹﴾ لَنَجْمُوعُونَ.....: تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ تغابن (۹)، نساء (۸۷)،
 آل عمران (۹)، ہود (۱۰۳)، مرسلات (۳۸) اور سورہ کہف (۲۷)۔

آیت 51-56: ثُمَّ إِنَّكُمْ أَيْهَا الضَّالُّونَ الْمُكَذِّبُونَ.....: ”الْهِيمُ“ ”أُهِيمٌ“ (مذکر) اور ”هَيْمَاءُ“ (مؤنث) کی جمع

نَحْنُ خَلَقْنَاكُمْ فَلَوْلَا تُصَدِّقُونَ ﴿۵۸﴾ أَفَرَأَيْتُمْ مَا تُلْمُونَ ﴿۵۹﴾ ءَأَنْتُمْ تَخْلُقُونَهَا أَمْ
نَحْنُ الْخَالِقُونَ ﴿۶۰﴾

ہم نے ہی تمہیں پیدا کیا تو تم (دوبارہ اٹھنے کو) کیوں سچ نہیں مانتے؟ ﴿۵۸﴾ تو کیا تم نے دیکھا وہ (نطفہ) جو تم نکالتے ہو؟ ﴿۵۹﴾ کیا تم اسے پیدا کرتے ہو، یا ہم ہی پیدا کرنے والے ہیں؟ ﴿۶۰﴾

ہے، بروزن ”فُعِلَ“۔ ”ہاء“ پر اصل میں ضمہ تھا، ”یاء“ کی مناسبت سے ضمہ کو کسرہ سے بدل دیا، جیسے ”أَبْيَضُ“ اور ”بَيْضًا“ کی جمع ”بَيْضٌ“ ہے۔ وہ اونٹ جنھیں پیام (بروزن زکام) کا مرض لاحق ہو، یعنی ایسی پیاس جس سے اونٹ پانی پیتے جاتے ہیں مگر وہ بچھتی ہی نہیں، حتیٰ کہ وہ مر جاتے ہیں یا قریب الموت ہو جاتے ہیں۔ ان آیات کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ صافات (۶۲-۶۱)۔

آیت 57 ﴿۵۷﴾ نَحْنُ خَلَقْنَاكُمْ : قیامت کے دن لوگوں کے تین گروہوں میں تقسیم ہونے اور تینوں گروہوں کے ثواب و عقاب کے ذکر کے بعد یہاں سے آیت (۷۴) تک جو دلائل پیش کیے گئے ہیں ان میں آخرت اور توحید دونوں پر استدلال کیا گیا ہے، کیونکہ مشرکین ان دونوں کے منکر تھے۔ یہ دلائل محض خیالی یا فلسفی باتیں نہیں بلکہ وہ واقعی اور حقیقی چیزیں ہیں جنھیں آدمی اپنی ذات میں محسوس کرتا ہے اور آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ ان میں اس کی اپنی پیدائش کا ذکر ہے، کبھی کا ذکر ہے جسے وہ خود کاشت کرتا ہے، پانی کا ذکر ہے جسے وہ پیتا ہے اور آگ کا ذکر ہے جس سے وہ بے شمار فوائد حاصل کرتا ہے۔

﴿۵۸﴾ فَلَوْلَا تُصَدِّقُونَ : یعنی تم جاننے ہو کہ ہم ہی نے تمہیں پیدا کیا، کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں، پھر تم کیوں نہیں مانتے کہ عبادت بھی صرف ہمارا حق ہے اور اس بات کو سچ کیوں نہیں مانتے کہ جس طرح ہم نے تمہیں پہلے پیدا کیا اسی طرح دوبارہ بھی پیدا کریں گے۔

آیت 58-59 ﴿۵۸﴾ أَفَرَأَيْتُمْ مَا تُلْمُونَ : ”تُلْمُونَ“ ”أَلْمَنِي يُمْنِي بِإِنْمَاءِ“ (انفعال) (گرانا، نکانا) سے جمع مذکر حاضر مضارع معلوم ہے۔ ”أَفَرَأَيْتُمْ“ میں رویت سے مراد رویت علمی ہے، کیونکہ یہ آنکھوں سے نظر آنے والی چیز نہیں۔ (دیکھیے سورہ لیس: ۷۷) منی کے قطرے سے انسان کی پیدائش کا قیامت کی دلیل ہونا ایسی بات ہے جس پر غور کرنا ہر شخص پر واجب ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم دیا ہے، فرمایا: ﴿فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ﴿۱﴾ خُلِقَ مِنْ قَاءٍ ذَافِقٍ ﴿۲﴾﴾ [الطارق: ۷۰، ۷۱] ”بس انسان کو لازم ہے کہ دیکھے وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا۔ وہ ایک اچھلنے والے پانی سے پیدا کیا گیا ہے۔“ تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ طارق (۸۵) کی تفسیر۔

مفسر عبدالرحمن کیلانی لکھتے ہیں: ”پہلی قابل غور بات یہ ہے کہ انسان کا نطفہ بذات خود کیا چیز ہے؟ وہ کن چیزوں سے بنتا ہے؟ پھر جن چیزوں سے بنتا ہے وہ زندہ تھیں یا مردہ؟ اور اس نطفہ کے بننے یا بنانے میں تمہارا بھی کچھ عمل دخل یا اختیار تھا؟

نَحْنُ قَدَرْنَا بَيْنَكُمْ الْمَوْتَ وَ مَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ ﴿۱﴾

ہم نے ہی تمہارے درمیان موت کا وقت مقرر کیا ہے اور ہم ہرگز عاجز نہیں ہیں ﴿۱﴾

پھر اس نطفہ کو رحمِ مادر میں پکانے کی حد تک تو اختیار انسان کو ہے، اس کے بعد اس کا اختیار کلی طور پر ختم ہو جاتا ہے۔ نطفہ کا ایک قطرہ لاکھوں جراثیم، کیڑوں پر مشتمل ہوتا ہے جو صرف طاقتور خوردبین سے نظر آ سکتے ہیں۔ اسی طرح رحمِ مادر میں نسوانی بیضہ کا وجود بھی خوردبین کے بغیر نظر نہیں آ سکتا۔ نطفہ کا ایک جراثیمہ جب نسوانی بیضہ میں داخل ہوتا ہے، پھر ان دونوں کے ملنے سے ایک چھوٹا سا زندہ ظلیہ (Cell) بن جاتا ہے، یہی انسانی زندگی کا نقطہ آغاز ہے اور اسی کا نام استقرارِ حمل ہے، نطفہ پکانے کی حد تک مرد کو اختیار ہے، مگر یہ طاقت نہ مرد میں ہے نہ عورت میں اور نہ دنیا کی کسی اور ہستی میں کہ وہ نطفہ سے حمل کا استقرار کرا دے، پھر اس نقطہ آغاز سے ماں کے پیٹ کی تاریکیوں میں بچے کی درجہ بدرجہ پرورش، ہر بچے کی الگ الگ صورت گری، ہر بچے کے اندر مختلف ذہنی و جسمانی قوتوں کو ایک خاص تناسب کے ساتھ رکھنا جس سے وہ ایک امتیازی انسان بن کر اٹھے، کیا یہ ایک خالق کے سوا کسی اور کا کام ہو سکتا ہے؟ یا اس میں ذرہ برابر بھی کسی (ڈاکٹر، دلی یا پیر فقیر یا کسی) دوسرے کا کوئی دخل ہے؟ پھر یہ فیصلہ کرنا بھی اللہ کے اختیار میں ہے کہ بچہ لڑکا ہو یا لڑکی، خوش شکل ہو یا بد شکل، اس کے نقوش تیکھے ہوں یا بھرے؟ طاقتور اور قد کاٹھ والا ہو یا کمزور، نحیف اور تھوڑے وزن والا، تندرست ہو یا اندھا بہر انگڑا، ذہین ہو یا کند ذہن۔ یہ سب لہی باتیں ہیں جو خالصتاً اللہ تعالیٰ خالق کائنات کے اختیار میں ہیں، کیا ان سب باتوں کو سمجھ لینے کے بعد بھی انسان یہ تصدیق نہیں کر سکتا کہ اسے پیدا کرنے والا اکیلا رب العالمین ہے اور یہ کہ وہ جو مردہ نطفے سے ہر روز لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں انسان اور دوسرے جاندار پیدا کر رہا ہے وہ مرنے کے بعد انسانوں کے بے جان ذرات کو دوبارہ بھی زندگی بخش سکتا ہے؟“ (تیسیر القرآن) اللہ تعالیٰ نے متعدد مقامات پر پہلی دفعہ پیدا کرنے کو دوبارہ پیدا کرنے کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ دیکھیے سورہ روم (۲۷)، انبیاء (۱۰۴)، حج (۵)، یس (۷۹)، بنی اسرائیل (۵۱)، مریم (۶۷) اور سورہ قیامہ (۳۶)۔

آیت 60 ﴿۱﴾ نَحْنُ قَدَرْنَا بَيْنَكُمْ الْمَوْتَ: یعنی تمہاری پیدائش کی طرح تمہاری موت بھی ہمارے ہی اختیار میں ہے اور ہم ہی نے یہ طے کر دیا ہے کہ کس کی موت کس وقت ہوگی، ماں کے پیٹ میں مرجائے گا یا پیدا ہوتے ہی یا جوان ہو کر یا ادھیڑ عمر میں یا ارزل العمر کو پہنچ کر۔ اس سے پہلے نہ کوئی اسے مار سکتا ہے اور نہ اس کے بعد کوئی اسے زندہ رکھ سکتا ہے۔ مزید دیکھیے سورہ مؤمن (۶۷)، فاطر (۱۱)، منافقون (۱۱)، اعراف (۳۴)، نوح (۳) اور سورہ آل عمران (۴۵)۔

﴿۲﴾ ”بَيْنَكُمْ“ کے لفظ میں ایک اور معنی بھی ہے کہ موت ایسی چیز ہے جو تمہارے درمیان رکھ دی گئی ہے، سب میں تقسیم ہوگی مگر ایک وقت میں نہیں، بلکہ باری باری ہر ایک پر آئے گی، جیسے کوئی مال لوگوں میں تقسیم ہونا ہو اور انھیں اس کے لیے بلایا جائے تو وہ سب اس کے انتظار میں ہوتے ہیں کہ کب ان کے نام کی آواز آئے اور انھیں ان کا حصہ ملے، مگر کسی کو خبر نہیں ہوتی کہ

عَلَىٰ أَنْ تُبَدِّلَ أَمْثَالَكُمْ وَنُنشِئَكُمْ فِي مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿۱۱﴾ وَ لَقَدْ عَلَّمْتُمُ النَّشَأَ
 الْأُولَىٰ فَلَوْلَا تَذَكَّرُونَ ﴿۱۲﴾ أَفَرَأَيْتُمْ مَا تَحْرُثُونَ ﴿۱۳﴾ إِنَّكُمْ تَزْرَعُونَهَا أَمْ حُنَّ الزُّرْعُونَ ﴿۱۴﴾
 لَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَاهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُونَ ﴿۱۵﴾ إِنَّا لَبُغْرُومُونَ ﴿۱۶﴾ بَلْ نَحْنُ
 نَحْرُومُونَ ﴿۱۷﴾

اس بات سے کہ تمہاری جگہ تمہارے جیسے اور لوگ لے آئیں اور نئے سرے سے تمہیں ایسی صورت میں پیدا کر دیں جو تم
 نہیں جانتے ﴿۱۱﴾ اور بلاشبہ یقیناً تم پہلی دفعہ پیدا ہونے کو جان چکے ہو تو تم کیوں نصیحت حاصل نہیں کرتے؟ ﴿۱۲﴾ پھر کیا تم
 نے دیکھا جو کچھ تم بوتے ہو؟ ﴿۱۳﴾ کیا تم اسے اگاتے ہو، یا ہم ہی اگانے والے ہیں؟ ﴿۱۴﴾ اگر ہم چاہیں تو ضرور اسے ریزہ ریزہ
 کر دیں، پھر تم تعجب سے باتیں بناتے رہ جاؤ ﴿۱۵﴾ کہ بے شک، ہم تو تادان ڈال دیے گئے ہیں ﴿۱۶﴾ بلکہ ہم بے نصیب ہیں ﴿۱۷﴾
 اس کی باری کب آئے گی۔

﴿۱۱﴾ وَ مَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ: ”سابق“ جو آگے نکل جائے، غالب آجائے۔ ”مَسْبُوقٌ“ جو پیچھے رہ جائے، مغلوب ہو
 جائے، عاجز رہ جائے۔ باء نفی کی تاکید کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے ”اور ہم ہرگز عاجز نہیں۔“
آیت 61 عَلَىٰ أَنْ تُبَدِّلَ أَمْثَالَكُمْ: یعنی ہم ہرگز اس سے عاجز نہیں کہ تمہاری جگہ تمہارے جیسے اور لوگ لے
 آئیں اور تمہاری شکلیں ایسی بنا دیں جنہیں تم نہیں جانتے، مثلاً تمہاری صورتیں مسخ کر کے بندر یا خنزیر بنا دیں۔ اس میں شدید
 ڈانٹ ہے۔ مزید دیکھیے سورہ نساء (۱۳۳)، انعام (۱۳۳) اور سورہ ابراہیم (۱۹، ۲۰)۔

آیت 62 وَ لَقَدْ عَلَّمْتُمُ النَّشَأَ الْأُولَىٰ: یعنی جب تم جانتے ہو اور اس کا اقرار بھی کرتے ہو کہ تمہیں پہلی بار ہمیں
 نے پیدا کیا، جب تم کچھ تھے ہی نہیں، تو پھر یہ کیوں نہیں مانتے کہ جب تم مر جاؤ گے تو ہم تمہیں دوبارہ بھی زندہ کریں گے؟
 دوبارہ پیدا کرنا تو پہلی بار سے آسان ہوتا ہے۔ مزید دیکھیے سورہ روم (۲۷) اور سورہ مریم (۶۷)۔

آیت 63، 64 أَفَرَأَيْتُمْ مَا تَحْرُثُونَ: اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی توحید اور قیامت کی زبردست دلیل بیان ہوئی
 ہے، یعنی یہ بتاؤ کہ وہ کھیت جس کا بیج تم زمین میں دفن کر کے آجاتے ہو، کیا اسے زمین سے تم نکالتے اور بڑھاتے ہو، حتیٰ کہ
 وہ کھانے کے قابل ہو جاتا ہے، جس پر تمہاری زندگی کا دار و مدار ہے، یا اسے اگانے والے ہم ہیں؟ اس کا جواب اس کے سوا
 ہو ہی نہیں سکتا کہ اے ہمارے رب! یہ تیرا ہی کام ہے، یہ ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔ تو ہر عقل مند کہے گا کہ جس نے اس
 بیج سے جو زمین کی تہ میں گل سڑ چکا تھا، اناج سے بھرے ہوئے یہ خوشے اگا دیے، وہ تمہیں بھی مرنے کے بعد زندہ کرنے پر
 قادر ہے۔ یہ بات اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جا بجا دہرائی ہے۔ دیکھیے سورہ اعراف (۵۷)، روم (۵۰) اور حم السجدہ (۳۹)۔

آیت 65، 67 ﴿۱﴾ لَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَاهُ حُطَامًا: ”حُطَامًا“ ”حَطَمَ يَحْطِمُ حَطْمًا“ (ض) (توڑنا) سے مشتق

أَفَرَأَيْتُمُ الْمَاءَ الَّذِي تَشْرَبُونَ ﴿۵۸﴾ ءَأَنْتُمْ أَنْزَلْتُمُوهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ الْمُنزِلُونَ ﴿۵۹﴾
لَوْ نَشَاءُ جَعَلْنَاهُ أُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُونَ ﴿۶۰﴾

پھر کیا تم نے دیکھا وہ پانی جو تم پیتے ہو؟ ﴿۵۸﴾ کیا تم نے اسے بادل سے اتارا ہے، یا ہم ہی اتارنے والے ہیں؟ ﴿۵۹﴾
اگر ہم چاہیں تو اسے سخت نمکین بنا دیں، پھر تم شکر ادا کیوں نہیں کرتے؟ ﴿۶۰﴾

ہے، بمعنی "مختصوم"، جیسے "فُنَانًا" "فَيْتٌ" سے اور "جُدَادًا" "جُدَّةٌ" سے مشتق ہے۔ سب کا معنی "ریزہ ریزہ کیا ہوا" ہے۔ "فَقَلَّظْتُمْ" اصل میں باب "سَبَعٌ" سے "فَقَطَّلْتُمْ" ہے، پہلا لام تخفیف کے لیے حذف کر دیا ہے۔ (دیکھیے ط: ۹۷) "تَفَكَّهُوْنَ" اصل میں "تَتَفَكَّهُوْنَ" ہے، ایک تاء تخفیف کے لیے حذف کر دی گئی ہے۔ "تَفَكَّهُوْنَ" کا اصل معنی "ایک پھل سے دوسرے پھل کی طرف منتقل ہونا" ہے، پھر ایک بات سے دوسری کی طرف منتقل ہونے میں بھی استعمال ہونے لگا۔ یہاں کھیتن برباد ہونے کے بعد طرح طرح کی باتیں کرنا مراد ہے۔ "مُغْرَمُونَ" غرم، تاوان اور چینی کو کہتے ہیں، باب افعال سے اسم مفعول کی جمع ہے، تاوان ڈالے گئے لوگ۔

② مفسر کیلانی لکھتے ہیں: "کھیتی کو چورا چوڑا پاریزہ ریزہ کر دینے کی بھی کئی صورتیں ہیں، مثلاً جس زمین میں بیج ڈالا گیا اس میں اللہ تعالیٰ شور پیدا کر دے، فصل کزور اور زرد پیدا ہو اور پوری طرح بار آور نہ ہو، یا فصل اگنے کے بعد اسے کیزا لگ جائے، یا کسی ارضی یا ساوی آفت، مثلاً کبر اور شدید بارش وغیرہ سے فصل کی نشوونما رک جائے اور لہلہاتے کھیت زرد پڑ جائیں تو کیا تم میں سے کسی کو یہ اختیار ہے کہ فصل کو ان مصیبتوں سے بچا سکے؟ اور اگر تم خود اللہ کی مہربانی سے پیدا ہو گئے اور اللہ تعالیٰ ہی کی مہربانی سے تمہیں کھانے کو ملتا ہے تو پھر اس کے سامنے تمہاری اکڑ اور سرتابی کا کیا مطلب؟ اس صورت میں تم طرح طرح کی باتیں ہی بناتے رہ جاتے ہو کہ ہمارا تویج بھی ضائع ہو گیا، خرچے کی چینی بڑی، محنت بھی ضائع ہوئی اور آئندہ کھانے کو بھی کچھ نہ ملا، ہم تو مارے گئے۔ یہ بات تمہیں پھر بھی نصیب نہیں ہوتی کہ اللہ کی طرف رجوع کرو اور اسے اللہ کی طرف سے تشبیہ سمجھو۔" (تیسیر القرآن)

آیت 68، 70 ﴿۱﴾ أَفَرَأَيْتُمُ الْمَاءَ الَّذِي تَشْرَبُونَ : "الْمُزْنِ" اسم جمع ہے، بادل۔ مفرد اس کا "مُزْنَةٌ" ہے۔

تیسیر القرآن میں ہے: "یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ایک اور کرشمہ ہے، سطح سمندر سے سورج کی حرارت کی وجہ سے آبی بخارات اٹھتے ہیں۔ یہی بخارات بعد میں بادلوں کی شکل اختیار کر کے بارش کی صورت میں برستے ہیں۔ سمندر کا پانی جس سے بخارات اٹھتے ہیں، سخت نمکین اور چھاتی جلانے والا ہوتا ہے، مگر جو بارش برستی ہے اس میں نمکینی نام کو نہیں ہوتی۔ حالانکہ جن بڑی بوٹیوں یا دواؤں کا ہم اس طرح عرق کشید کرتے ہیں ان میں ذائقہ بھی منتقل ہوتا ہے اور بو بھی۔ مثلاً سونف یا اجوائن یا گاؤ زبان یا گلاب کے عرق میں ان اشیاء کا ذائقہ بھی منتقل ہو جاتا ہے اور بو بھی، لیکن سمندر کے پانی کی نمکینی آبی بخارات کے ساتھ منتقل نہیں ہوتی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت ہے، ورنہ اس زمین کا کوئی جاندار ایسا پانی پی کر زندہ ہی نہ رہ سکتا اور نہ

أَفْرَعَيْتُمْ النَّارَ الَّتِي تُوْرُونَ ۝ ءَأَنْتُمْ أَنْشَأْتُمْ شَجَرَتَهَا أَمْ نَحْنُ الْمُنشِئُونَ ۝ نَحْنُ
جَعَلْنَاهَا تَذْكِرَةً وَ تَنَادًا لِلْمُؤْمِنِينَ ۝ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ ۝

پھر کیا تم نے دیکھی وہ آگ جو تم سگاتے ہو؟ ۱) کیا تم نے اس کے درخت کو پیدا کیا، یا ہم ہی پیدا کرنے والے ہیں؟ ۲) ہم نے ہی اسے ایک عظیم نصیحت اور مسافروں کے لیے زندگی کا سامان بنایا ہے ۳) سو تو اپنے بہت عظمت والے رب کے نام کی تسبیح کر ۴)

ہی ایسے پانی سے پیدا اور آگ سکتی ہے جو پانی کے بعد جانداروں کی زندگی کا دوسرا بڑا سہارا ہے۔“ (بصرف)

۲) قیامت کی دلیل کے طور پر انسان کی پہلی پیدائش کا ذکر فرمایا اور زمین سے مردہ تاج سے کھیتی اگانے کا ذکر فرمایا۔ کھیتی اگانے میں پانی خصوصاً بارش کا دخل ظاہر ہے، اس لیے اس کا ذکر فرمایا۔ قیامت کے دن انسانی جسم بھی بارش سے اگیں گے۔ حدیث کے لیے دیکھیے سورہ نمل (۸۷) کی تفسیر۔ اللہ تعالیٰ نے بارش کو قیامت کے علاوہ اپنی توحید کی دلیل کے طور پر بھی جا بجا پیش فرمایا ہے، مثلاً دیکھیے سورہ بقرہ (۲۲، ۲۱)، نمل (۶۰)، عنکبوت (۶۳) اور سورہ روم (۵۱، ۲۸)۔

آیت 71-72: ”أَفْرَعَيْتُمْ النَّارَ الَّتِي تُوْرُونَ.....: ”أَوْرَى يُورِي“ (افعال) ”النَّارُ“ آگ سگانا۔ یہ چوتھی دلیل ہے جو یہاں اللہ تعالیٰ کی توحید اور قیامت کے حق ہونے کے ثبوت کے لیے لائی گئی ہے۔ (دیکھیے لیس: ۸۰) ”أَمْ نَحْنُ الْمُنشِئُونَ“ میں خبر پر الف لام سے حصر پیدا ہو رہا ہے، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے ”یا ہم ہی پیدا کرنے والے ہیں۔“

آیت 73: ”نَحْنُ جَعَلْنَاهَا تَذْكِرَةً وَ تَنَادًا لِلْمُؤْمِنِينَ: ”قَوِي يَقْوَى قِيًا وَ قَوَايَةً“ (س) ”الذَّارُ“ گھر خالی ہو گیا۔ ”وَقَوَى“ سخت بھوکا ہونا۔ ”الْمَطْرُ“ بارش رک جانا۔ ”الْقَوَاةُ“ خالی زمین، بیابان، بھوک۔ ”بَاتِ الْقَوَى“ اس نے بھوکے رات گزاری۔ ”الْمُؤْمِنِينَ“ اس مادہ کے باب افعال ”أَفْوَى يُفْوِي إِفْوًا“ سے اسم فاعل ”مُفْوِي“ کی جمع ہے، اس کا معنی قواء (جنگل بیابان) کے مسافر یا اس میں ٹھہرنے یا رہنے والے خانہ بدوش بھی ہے اور بھوکے لوگ بھی۔ کوئی شک نہیں کہ آگ کی ضرورت ہر ایک کو پڑتی ہے، مگر ان لوگوں کو اس سے بہت زیادہ کام لینا پڑتا ہے جن کا آیت میں ذکر ہے۔ آیت کا یہ مطلب نہیں کہ آگ دوسرے لوگوں کے لیے نصیحت یا زندگی کا سامان نہیں، بلکہ ان دونوں کا خصوصاً ذکر اس لیے فرمایا کہ سفر اور بھوک میں یہ احساس زیادہ واضح ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کی قدر زیادہ ہوتی ہے۔

آیت 74: ”فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ:“ تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ اعلیٰ کی پہلی آیت کی تفسیر۔ حذیفہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ”انہوں نے نبی ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی، آپ اپنے رکوع میں ”سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيمِ“ اور سجدے میں ”سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَى“ پڑھتے تھے اور کسی بھی رحمت کی آیت کے پاس سے گزرتے تو اس پر ٹھہر جاتے اور اللہ تعالیٰ سے سوال کرتے اور کسی بھی عذاب کی آیت کے پاس سے گزرتے تو اس پر ٹھہر جاتے اور اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگتے۔“ [ابوداؤد، الصلاة، باب ما

يقول الرجل في ركوعه وسجوده: ۸۷۱، وقال الألباني صحيح]

فَلَا أُقْسِمُ بِمَوْقِعِ النَّجُورِ ۗ إِنَّكَ لَنَقَسْمُ نُو تَعْلَمُونَ عَظِيمٌ ۗ إِنَّكَ لَقَرَّانٌ كَرِيمٌ ۗ فِي كِتَابٍ مَكْنُونٍ ۗ لَا يَسْتَشْأُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ ۗ تَنْزِيلٌ مِّن رَّبِّ رَبِّ

پس نہیں! میں ستاروں کے گرنے کی جگہوں کی قسم کھاتا ہوں! اور بلاشبہ یہ یقیناً ایسی قسم ہے کہ اگر تم جانو تو بہت بڑی ہے کہ بلاشبہ یہ یقیناً ایک باعزت پڑھی جانے والی چیز ہے ایک ایسی کتاب میں جو چھپا کر رکھی ہوئی ہے اسے کوئی ہاتھ نہیں لگاتا مگر جو بہت پاک کیے ہوئے ہیں تمام جہانوں کے

آیت 75-76: فَلَا أُقْسِمُ بِمَوْقِعِ النَّجُورِ.....: ”فَلَا أُقْسِمُ“ کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ قیامہ کی پہلی آیت کی تفسیر۔

”مواقع“ ”مواقع“ کی جمع ہے جو ”وقع يقع“ سے ظرف ہے یا مصدر میسی، گرنے کی جگہیں۔ اس سے مراد ستاروں کے غروب ہونے کے مقامات ہیں، یا شہاب ثاقب کی صورت میں شیطاں پر برسنے والے ستاروں کے گرنے کے مقامات۔

آیت 77-80: إِنَّكَ لَقَرَّانٌ كَرِيمٌ ۗ فِي كِتَابٍ مَكْنُونٍ.....: ”کَرِيمٌ“ ہر چیز میں سے اپنی قسم میں سب سے اعلیٰ

اور عمدہ چیز کو ”کریم“ کہتے ہیں۔ ”الْقَرَّانُ“ مصدر بمعنی اسم مفعول ہے، یعنی پڑھا جانے والا۔ یہ نام اس لیے ہے کہ یہ کتاب اتنی پڑھی گئی اور قیامت تک پڑھی جائے گی کہ پڑھے جانے میں کسی اور کتاب کو اس کے ساتھ کوئی نسبت ہی نہیں۔ یعنی یہ کتاب جو رسول اللہ ﷺ لے کر آئے ہیں، تمام پڑھی جانے والی چیزوں میں سب سے اعلیٰ ہے اور ہر قسم کی کمی بیشی سے پوری طرح محفوظ ہے۔ کسی شیطان کی مجال نہیں کہ رسول اللہ ﷺ پر نازل ہونے سے پہلے یا نازل ہونے کے دوران اس پر مطلع ہی ہو سکے، کیوں کہ یہ اس کتاب یعنی لوح محفوظ میں درج ہے جو چھپا کر رکھی ہوئی ہے، جن وانس میں سے کسی کی اس تک رسائی ہی نہیں۔ اسے پڑھنا تو درکنار، کوئی اسے ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا، سوائے اللہ تعالیٰ کے ان فرشتوں کے جنہیں ہر قسم کی خیانت اور معصیت سے ہر طرح پاک پیدا کیا گیا ہے۔ ان پاک باز فرشتوں نے رب العالمین کی طرف سے اسے رسول اللہ ﷺ کے دل پر نازل فرمایا ہے۔ یہ نہ رسول اللہ ﷺ کی اپنی تصنیف ہے، نہ یہ کسی انسان یا دوسری مخلوق کا کلام ہے اور نہ شیطاں کا اس میں کوئی دخل ہو سکتا ہے، بلکہ یہ ہر طرح کی حفاظت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والا کلام ہے۔ ”کِتَابٍ مَكْنُونٍ“ سے مراد لوح محفوظ ہونے کی دلیل یہ آیت ہے، فرمایا: ﴿بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيدٌ ۗ فِي لَوْحٍ مَّحْفُوظٍ﴾ [البروج: ۲۱، ۲۲] بلکہ وہ ایک بڑی شان والا قرآن ہے۔ اس تختی میں (لکھا ہوا) ہے جس کی حفاظت کی گئی ہے۔“ مزید دیکھیے سورہ بئیس (۱۶۳-۱۱) اور سورہ شعراء (۱۹۲-۱۹۳ تا ۲۱۰-۲۱۲)۔

۲) یہ چاروں آیات ”فَلَا أُقْسِمُ بِمَوْقِعِ النَّجُورِ“ کا جواب قسم ہیں۔ اس قسم اور جواب قسم کی مناسبت کے لیے سورہ نجم کی ابتدائی آیات کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔

۳) جیسا کہ آیت کی تفسیر بیان ہوئی، تو ”لَا يَسْتَشْأُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ“ میں حدث اصغر یا حدث اکبر کی صورت میں قرآن مجید کو ہاتھ لگانے یا نہ لگانے کا کوئی حکم بیان نہیں کیا گیا، بلکہ یہ بات بیان فرمائی گئی ہے کہ قرآن مجید جس کتاب مکنون میں ہے اسے

الْعَالَمِينَ ﴿۸۰﴾

رب کی طرف سے اتاری ہوئی ہے ﴿۸۰﴾

فرشتوں کے سوا کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ اس لیے جو اہل علم اس آیت سے یہ مسئلہ نکالتے ہیں کہ جنسی یا حائضہ یا بے وضو شخص کے لیے جائز نہیں کہ وہ قرآن مجید کو ہاتھ لگائے، ان کی بات درست نہیں، کیونکہ انسان جتنی بھی طہارت کر لے اس کے لیے فرشتوں جیسا مطہر بننا مشکل ہے۔ (الاماشاء اللہ)

④ بہت سے اہل علم نے فرمایا کہ یہ مسئلہ قرآن مجید کی اس آیت سے نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث سے ثابت ہوتا ہے۔ موطا امام مالک میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عمرو بن حزم رضی اللہ عنہما کو جو خط لکھ کر دیا اس میں یہ بھی لکھا کہ ”لَا يَمَسُّ الْقُرْآنَ إِلَّا طَاهِرٌ“ ”قرآن کو طاہر کے سوا کوئی ہاتھ نہ لگائے۔“ شیخ ناصر الدین البانی رضی اللہ عنہ نے ”ارواء الغلیل“ کی حدیث (۱۳۲) میں اس حدیث کی تمام سندوں پر مفصل کلام کے بعد لکھا ہے: ”خلاصہ یہ ہے کہ حدیث کے جتنے طرق ہیں کوئی بھی ضعف سے خالی نہیں، لیکن یہ معمولی ضعف ہے، کیونکہ ان میں سے کسی میں بھی ایسا راوی نہیں جس پر جھوٹ کی تہمت ہو، علت صرف ارسال ہے یا سوائے حفظ اور اصول حدیث میں طے ہے کہ کئی سندیں ہوں تو وہ ایک دوسری کو قوت دیتی ہیں، جب ان میں کوئی جہم شخص نہ ہو، جیسا کہ نووی نے اپنی تقریب میں، پھر سیوطی نے اس کی شرح میں قرار دیا ہے۔ اس کے مطابق دل کو اس حدیث کی صحت پر اطمینان ہوتا ہے.....“ (ارواء الغلیل) مگر یہ حدیث صحیح بھی ہو تو اس سے یہ مسئلہ ثابت نہیں ہوتا، ہمارے استاذ محمد عبدہ لکھتے ہیں: ”مگر یہ اپنے مفہوم میں صریح نہیں ہے، کیونکہ اس کے معنی ”کفر و شرک“ سے پاک ہونے کے بھی ہو سکتے ہیں، کیونکہ مسلمان تو جنابت کی حالت میں بھی پاک ہی رہتا ہے۔ ”سُبْحَانَ اللَّهِ! إِنَّ الْمُؤْمِنِينَ لَا يَنْجَسُونَ.“ (اشرف الحواشی) استاذ مرحوم نے جس حدیث کا حوالہ دیا ہے وہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں: ”مجھے رسول اللہ ﷺ مدینہ کے کسی راستے میں ملے، جب کہ میں جنابت کی حالت میں تھا۔ آپ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑا، میں آپ کے ساتھ چلتا رہا، یہاں تک کہ آپ ﷺ بیٹھ گئے تو میں کھسک گیا، گھر آیا، غسل کیا، پھر آیا تو آپ ﷺ بیٹھے ہوئے تھے، فرمایا: «أَيْنَ كُنْتَ يَا أَبَا هُرَيْرَةَ؟!» «ابو ہریرہ! تم کہاں تھے؟» میں نے آپ کو بات بتائی تو آپ ﷺ نے فرمایا: «سُبْحَانَ اللَّهِ! يَا أَبَا هُرَيْرَةَ! إِنَّ الْمُؤْمِنِينَ لَا يَنْجَسُونَ.» [بخاری، الغسل، باب الجنب يخرج.....: ۲۸۵] ”سبحان اللہ! ابو ہریرہ! مومن تو نجس نہیں ہوتا۔“ حائضہ کے لیے نماز اور روزہ کی اجازت نہیں، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کا ہاتھ نجس ہے جسے وہ قرآن کو نہیں لگا سکتی، چنانچہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «نَاوِلْنِي الْحُمْرَةَ مِنَ الْمَسْجِدِ» ”مجھے مسجد سے چٹائی پکڑاؤ۔“ میں نے کہا: ”میں تو حائضہ ہوں۔“ تو آپ ﷺ نے فرمایا: «إِنْ حَيْضَتِكَ لَيْسَتْ فِي يَدِكَ» [مسلم، الحيض، باب جواز غسل الحائض رأس زوجها.....: ۲۹۸] ”تمہارا حیض تمہارے ہاتھ میں تو نہیں ہے۔“ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا: ”ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ مسجد میں تھے، آپ نے فرمایا: «يَا عَائِشَةُ! نَاوِلْنِي الثُّوبَ» ”اے عائشہ! مجھے

أَفِيْهِذَا الْحَدِيثِ أَنْتُمْ مُدْهِنُونَ ﴿۸۱﴾ وَ تَجْعَلُونَ رِزْقَكُمْ أَكْفَمًا مُّكَذِّبُونَ ﴿۸۲﴾ فَلَوْ لَا إِذَا بَلَغَتِ الْخُلُقُومَ ﴿۸۳﴾ وَأَنْتُمْ حِينِيذٍ تَنْظُرُونَ ﴿۸۴﴾ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلَكِنْ لَا تُبْصِرُونَ ﴿۸۵﴾ فَلَوْ لَا إِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِينِينَ ﴿۸۶﴾ تَرْجِعُونَهَا إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۸۷﴾

پھر کیا اس کلام سے تم بے توجہی کرنے والے ہو؟ ﴿۸۱﴾ اور تم اپنا حصہ یہ ٹھہراتے ہو کہ بے شک تم جھٹلاتے ہو ﴿۸۲﴾ پھر کیوں نہیں کہ جب وہ (جان) طلق کو پہنچ جاتی ہے ﴿۸۳﴾ اور تم اس وقت دیکھ رہے ہوتے ہو ﴿۸۴﴾ اور ہم تم سے زیادہ اس کے قریب ہوتے ہیں اور لیکن تم نہیں دیکھتے ﴿۸۵﴾ سو اگر تم (کسی کے) محکوم نہیں تو کیوں نہیں ﴿۸۶﴾ تم اسے واپس لے آتے، اگر تم سچے ہو ﴿۸۷﴾

پکڑا پکڑاؤ۔“ انھوں نے کہا: ”میں حائضہ ہوں۔“ تو آپ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّ حَيْضَتَكَ لَيْسَتْ فِي يَدِكَ» ”تمہارا حیض تمہارے ہاتھ میں تو نہیں۔“ تو انھوں نے آپ کو وہ پکڑا پکڑا دیا۔ [مسلم، الحيض، باب جواز غسل الحائض رأس زوجها.....: ۲۹۹]

شیخ ناصر الدین البانی نے ”تمام المنة“ کے ”بَابُ مَا يَجِبُ بِهِ الْوُضُوءُ“ میں فرمایا: ”تو زیادہ قریب بات (واللہ اعلم) یہ ہے کہ اس حدیث میں ”طاهر“ سے مراد مومن ہی ہے، خواہ وہ حدیث اکبر (جنابت) کی حالت میں ہو یا حدیث اصغر (بے وضو ہونے) کی حالت میں، یا حائضہ ہو یا اس کے جسم پر کوئی نجاست لگی ہو، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّ الْمُؤْمِنَ لَا يَنْجُسُ» ”مومن نجس نہیں ہوتا۔“ اس حدیث کی صحت پر اتفاق ہے اور ”لَا يَمَسُّ الْقُرْآنَ إِلَّا طَاهِرٌ“ کا مطلب یہ ہے کہ مشرک کو اسے ہاتھ لگانے کی اجازت نہ دی جائے۔ چنانچہ یہ اس حدیث ہی کی طرح ہے جس میں ہے: «نَهَى أَنْ يُسَافَرَ بِالْقُرْآنِ إِلَى أَرْضِ الْعَدُوِّ» ”آپ ﷺ نے دشمن کی سرزمین کی طرف قرآن لے کر سفر کرنے سے منع فرمایا۔“ یہ حدیث بھی متفق علیہ ہے۔ اور شوکانی نے ”نیل الأوطار“ (بَابُ إِيْجَابِ الْوُضُوءِ لِلصَّلَاةِ وَ الطَّوَافِ وَ مَسِّ الْمُصْحَفِ) میں اس مسئلے پر تفصیل سے کلام کیا ہے، اگر زیادہ تحقیق چاہو تو اس کی طرف مراجعت کرو۔“

اور ”تمام المنة“ کے ”بَابُ مَا يَحْرُمُ عَلَى الْجُنُبِ“ میں لکھتے ہیں: «وَالْبَرَاءَةُ الْأَصْلِيَّةُ مَعَ الَّذِينَ قَالُوا بِخَوَازِمَسِّ الْقُرْآنِ مِنَ الْمُسْلِمِ الْجُنُبِ وَلَيْسَ فِي الْبَابِ نَقْلُ صَحِيحِ يُحْيِيهِ الْخُرُوجَ عَنْهَا» یعنی ”یہ قاعدہ کہ جس کام کی ممانعت نہ ہو اس میں اصل یہی ہے کہ وہ جائز ہے، ان لوگوں کی تائید میں ہے جو کہتے ہیں کہ مسلمان جنسی بھی ہو تو قرآن کو ہاتھ لگا سکتا ہے اور اس مسئلے میں کوئی صحیح حدیث نہیں جس کی وجہ سے اسے اس سے خارج کیا جاسکے۔“

آیت 81-82: ﴿۸۱﴾ أَفِيْهِذَا الْحَدِيثِ أَنْتُمْ مُدْهِنُونَ پھر کیا اس ساری تفصیل کے بعد کہ قیامت حق ہے اور اللہ تعالیٰ اکیلا معبود بحق ہے اور قسم کے ساتھ تاکید کے بعد بھی کہ یہ قرآن اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ کلام ہے، تم اس سے بے توجہی کرتے ہو اور اس پر ایمان لانے میں سستی کرتے ہو اور اتنی بڑی نعمت میں سے تم یہی حصہ حاصل کرتے ہو کہ اسے جھٹلا دیتے ہو۔

آیت 83-87: ﴿۸۳﴾ فَلَوْ لَا إِذَا بَلَغَتِ الْخُلُقُومَ ”مَدِينِينَ“ ”ذَانِ يَدِينُ دِينَنَا“ (جزا دینا، مالک ہونا، حساب لینا،

فَأَمَّا إِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِينَ ﴿۸۸﴾ فَرَوْحٌ وَرَيْحَانٌ ۖ وَجَنَّتْ نَعِيمُهُ ﴿۸۹﴾

پس لیکن اگر وہ ان لوگوں سے ہو جو قریب کیے ہوئے ہیں ﴿۸۸﴾ تو (اس کے لیے) راحت اور خوشبودار پھول اور نعمت والی جنت ہے ﴿۸۹﴾

حاکم ہونا) سے اسم مفعول ”مَدِينٌ“ کی جمع ہے جو اصل میں ”مَدِينُونَ“ تھا، بدلا دیے گئے، محاسبہ کیے گئے، محکوم، مملوک۔ ان آیات میں ”فَلَوْلَا“ دو دفعہ آیا ہے اور دونوں کی جزا ”تَرْجِعُونَهَا إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ“ ہے۔ ان آیات میں نزع کے عالم کا نقشہ کھینچ کر قیامت کے منکروں سے کہا گیا ہے کہ ایسا کیوں نہیں کہ مرتے وقت جب جان حلق تک آ پہنچتی ہے اور تم پاس بیٹھے مرنے والے کو دیکھ رہے ہوتے ہو اور ہم تم سے زیادہ اس مرنے والے کے قریب ہوتے ہیں، تو پھر اگر تم کسی کے محکوم نہیں اور نہ تم سے کوئی محاسبہ کرنے والا ہے اور تم خود ہی ہر طرح صاحب اختیار ہو، تو اگر تم سچے ہو تو نکلنے والی اس جان کو واپس کیوں نہیں لے آتے؟ تمہاری بے بسی سے ثابت ہوا کہ تم سب اللہ تعالیٰ کے مملوک اور اس کے حکم کے پابند ہو، جب وہ لے جانا چاہے گا لے جائے گا اور جب زندہ کر کے محاسبہ کے لیے اپنے سامنے کھڑا کرنا چاہے گا کر دے گا۔ اس لیے تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ اس کی توحید پر، اس کے رسول پر اور یوم قیامت پر ایمان لے آؤ، تاکہ تمہیں اس دن شرمندگی نہ اٹھانا پڑے۔ جان نکلنے کے وقت انسان کی حالت اور اس کے غم گساروں کی بے بسی کا نقشہ سورہ قیامت کی آیات (۳۰ تا ۳۶) میں بھی خوب کھینچا گیا ہے۔

آیت 88 89 فَأَمَّا إِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِينَ.....: ”فَرَوْحٌ“ اور ”رَيْحَانٌ“ پر تین تعظیم کے لیے ہے۔ ”رَوْحٌ“ کے معنی ہیں راحت، خوشی اور رحمت اور ”رَيْحَانٌ“ ہر خوشبودار پودے اور پھول کو کہتے ہیں۔ ”رَيْحَانٌ“ کا ایک معنی رزق بھی ہے۔ سورت کے آخر میں تینوں گروہوں کا جان کنی کے وقت کا حال بیان فرمایا۔ مقصد ترغیب و ترہیب ہے، یعنی اگر مرنے والا مقررین سے ہوا تو مرتے وقت اس کے لیے عظیم راحت، خوشی اور اللہ کی رحمت ہے، خوشبودار پھول ہیں اور نعمتوں سے بھری ہوئی جنت ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «الْمَيِّتُ تَحْضُرُهُ الْمَلَائِكَةُ فَإِذَا كَانَ الرَّجُلُ صَالِحًا قَالُوا اخْرُجِي أُنْفُسُ الطَّيِّبَةِ! كَانَتْ فِي الْحَسَدِ الطَّيِّبِ، اخْرُجِي حَمِيدَةً وَأُبَشِرِي بِرَوْحٍ وَرَيْحَانٍ وَرَبِّ غَيْرِ غَضْبَانَ فَلَا يَزَالُ يُقَالُ لَهَا ذَلِكَ حَتَّى تَخْرُجَ ثُمَّ يُعْرَجُ بِهَا إِلَى السَّمَاءِ فَيُفْتَحُ لَهَا فَيُقَالُ مَنْ هَذَا؟ فَيَقُولُونَ فُلَانٌ، فَيُقَالُ مَرْحَبًا بِالنَّفْسِ الطَّيِّبَةِ كَانَتْ فِي الْحَسَدِ الطَّيِّبِ اذْخُلِي حَمِيدَةً، وَأُبَشِرِي بِرَوْحٍ وَرَيْحَانٍ وَرَبِّ غَيْرِ غَضْبَانَ، فَلَا يَزَالُ يُقَالُ لَهَا ذَلِكَ حَتَّى يُنْتَهَى بِهَا إِلَى السَّمَاءِ الَّتِي فِيهَا اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ» [ابن ماجہ، الزهد، باب ذکر الموت والاستعداد له: ۴۲۶۲، وقال الألبانی صحیح] ”مرنے والے کے پاس فرشتے آتے ہیں تو جب آدمی صالح ہو تو وہ کہتے ہیں: ”نکل اے پاک جان جو پاک جسم میں تھی! نکل، تو تعریف والی ہے اور عظیم راحت کی اور خوشبودار پھولوں کی اور غصے نہ ہونے والے رب کی خوش خبری پر خوش ہو جا۔“ وہ اسے یہی کہتے رہتے

وَأَمَّا إِنْ كَانَ مِنْ أَصْحَابِ الْيَمِينِ ۖ فَسَلِّمْ لَهُ ۖ مِنْ أَصْحَابِ الْيَمِينِ ۗ وَأَمَّا إِنْ كَانَ مِنَ الْمَكْذِبِينَ ۖ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ فَسَلِّمْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُنْ مَعَهُمْ ۚ وَتِلْكَ الْآيَاتُ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ﴿۹۱﴾

اور لیکن اگر وہ دائیں ہاتھ والوں سے ہوا ﴿۹۱﴾ تو (کہا جائے گا) تجھ پر سلام (کہ تو) دائیں ہاتھ والوں سے ہے ﴿۹۱﴾ اور لیکن اگر وہ جھٹلانے والے گمراہ لوگوں سے ہوا ﴿۹۲﴾ تو اس کے لیے کھولتے ہوئے پانی کی مہمانی ہے ﴿۹۳﴾ اور جہنم میں داخل کیا جاتا ہے ﴿۹۴﴾

ہیں حتیٰ کہ وہ نکل آتی ہے۔ پھر اسے آسمان کی طرف اوپر لے جایا جاتا ہے اور اس کے لیے دروازہ کھولا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے: ”یہ کون ہے؟“ وہ کہتے ہیں: ”فلاں ہے۔“ تو کہا جاتا ہے: ”اس پاک جان کو مرحبا جو پاک جسم میں تھی، اندر آ جا، تو تعریف والی ہے اور عظیم راحت کی اور خوشبودار پھولوں کی اور غصے نہ ہونے والے رب کی خوش خبری پر خوش ہو جا۔“ پھر اسے یہی الفاظ کہتے رہتے ہیں، حتیٰ کہ اسے اس آسمان تک پہنچا دیا جاتا ہے جس میں اللہ عزوجل ہے۔“

آیت ۹۰-۹۱ وَأَمَّا إِنْ كَانَ مِنْ أَصْحَابِ الْيَمِينِ : مفسرین نے ان دونوں آیات کی ترکیب کئی طرح سے فرمائی ہے، ایک سادہ سی ترکیب یہ ہے کہ پوری عبارت اس طرح ہے: ”وَأَمَّا إِنْ كَانَ مِنْ أَصْحَابِ الْيَمِينِ فَيُقَالُ لَهُ سَلَامٌ لَكَ لِكُونِكَ مِنْ أَصْحَابِ الْيَمِينِ“ اور لیکن اگر وہ دائیں ہاتھ والوں سے ہوا تو اسے کہا جائے گا کہ تجھ پر سلام ہے، کیونکہ تو اصحاب الیمین سے ہے۔“ مطلب یہ ہے کہ اصحاب الیمین کو فوت کرتے وقت فرشتے سلام کہتے ہیں اور بشارت دیتے ہیں کہ اب تم ہر رنج و غم اور ہر خوف سے سلامت رہو گے، کیونکہ تم اصحاب الیمین میں سے ہو۔ یعنی فرشتے اسے اصحاب الیمین میں سے ہونے کی بشارت دے کر سلام کہیں گے۔ یہی بات تفصیل کے ساتھ سورہ حم السجدہ کی آیت (۳۰ تا ۳۲) میں کہی گئی ہے۔

آیت ۹۲-۹۴ وَأَمَّا إِنْ كَانَ مِنَ الْمَكْذِبِينَ ۖ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ فَسَلِّمْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُنْ مَعَهُمْ ۚ وَتِلْكَ الْآيَاتُ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ : ”نزل“ مہمانی۔ (دیکھیے کبف: ۱۰۲) ”تصلیۃ“ ”صَلِّيْ بِيْ يَضْلِي“ (ع) سے باب تفعیل کا مصدر ہے، داخل کرنا۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کا ایک حصہ آیت (۸۹، ۸۸) کی تفسیر میں گزر چکا ہے، اس میں کفار کی موت کا بھی حال بیان ہوا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «وَإِذَا كَانَ الرَّجُلُ السُّوءَ قَالَ أَخْرَجَنِي أَيْتُهَا النَّفْسُ الْخَبِيْثَةُ! كَانَتْ فِي الْحَسَدِ الْخَبِيْثِ، أَخْرَجَنِي ذَمِيْمَةً وَأَبْشِرْنِي بِحَمِيْمٍ وَعَسَاقٍ وَأَخْرَجَنِي مِنْ شَكْلِهِ أَرْوَاحٌ فَلَا يَزَالُ يُقَالُ لَهَا ذَلِكَ حَتَّى تَخْرُجَ ثُمَّ يُعْرَجُ بِهَا إِلَى السَّمَاءِ فَلَا يُفْتَحُ لَهَا فَيُقَالُ مَنْ هَذَا؟ فَيُقَالُ فُلَانٌ، فَيُقَالُ لَا مَرْحَبًا بِالنَّفْسِ الْخَبِيْثَةِ كَانَتْ فِي الْحَسَدِ الْخَبِيْثِ أَرْجَعَنِي ذَمِيْمَةً فَإِنَّهَا لَا تَفْتَحُ لِكَ أَبْوَابِ السَّمَاءِ، فَيُرْسَلُ بِهَا مِنَ السَّمَاءِ ثُمَّ تَصِيْرُ إِلَى الْقَبْرِ» [ابن ماجہ، الزهد، باب ذکر الموت والاستعداد له: ۴۲۶۲، وقال الألبانی صحیح] ”اور جب آدمی برا ہو تو اسے (فرشتے) کہتا ہے: ”نکل اے خبیث جان جو خبیث جسم میں تھی! اور بشارت سن کھولتے ہوئے پانی اور پیپ کی اور دوسری اس کی ہم شکل کئی قسموں کی۔“ پھر اسے مسلسل

إِنَّ هَذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِينِ ﴿۹۵﴾ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ ﴿۹۶﴾

بلاشبہ یقیناً یہی ہے وہ سچ جو یقینی ہے ﴿۹۵﴾ سو تو اپنے بہت عظمت والے رب کے نام کی تسبیح کر ﴿۹۶﴾

یہی کہا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ نکل آتی ہے۔ پھر اسے اوپر آسمان کی طرف لے جایا جاتا ہے، مگر اس کے لیے دروازہ نہیں کھولا جاتا اور کہا جاتا ہے: ”یہ کون ہے؟“ بتایا جاتا ہے کہ یہ فلاں ہے تو کہا جاتا ہے: ”اس خبیث جان کو جو خبیث جسم میں تھی کوئی مرحبا نہیں، مذمت کی ہوئی حالت میں واپس لوٹ جا، کیونکہ تیرے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے۔“ پھر اسے آسمان سے چھوڑ دیا جاتا ہے اور پھر وہ قبر کی طرف لوٹ جاتی ہے۔“

آیت 96.95 إِنَّ هَذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِينِ..... : ”حَقُّ“ موصوف ہے جو اپنی صفت ”الْيَقِينِ“ کی طرف مضاف ہے، یعنی یہ ایسی ثابت شدہ بات اور ایسا سچ ہے جو یقینی ہے۔ ان دونوں آیات کے لیے دیکھیے سورہ حاقہ کی آخری دو آیات کی تفسیر۔



سَبَّحَ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ①

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

اللہ کا پاک ہونا بیان کیا ہر اس چیز نے جو آسمانوں اور زمین میں ہے اور وہی سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ①

ت 1 ① سَبَّحَ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ: یعنی زمین و آسمان کی ہر چیز نے اس بات کی شہادت دی ہے کہ اس کا خالق و مالک اللہ عزوجل ہر عیب اور کمی سے پاک ہے، اس کی ذات و صفات، افعال و احکام غرض ہر چیز کسی بھی طرح کے عیب اور نقص سے پاک ہے۔ اس سورت میں اور سورہ صف اور سورہ حشر کے شروع میں ”سَبَّحَ“ (ماضی) آیا ہے، سورہ جمعہ اور سورہ تغابن میں ”يُسَبِّحُ“ (مضارع) آیا ہے، جس میں حال و استقبال دونوں شامل ہیں اور سورہ بنی اسرائیل میں ”سُبْحٰنَ“ (مصدر) آیا ہے، جس میں دوام پایا جاتا ہے۔ یعنی کائنات کا ذرہ ذرہ ہمیشہ سے اللہ تعالیٰ کا ہر عیب سے پاک ہونا بیان کرتا چلا آیا ہے، اب بھی کر رہا ہے اور آئندہ بھی کرتا رہے گا۔ سورہ اعلیٰ میں ”سُبْحٰنَ“ امر کے ساتھ بھی آیا ہے۔

② اس میں مشرکین پر چوٹ ہے کہ کائنات کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کے ہر عیب سے پاک ہونے کا اعلان کر رہی ہے اور تم ہو کہ اس کے لیے شریک اور اس کے لیے اولاد بنا کر اس پر اتنا بڑا عیب لگا رہے ہو جس سے بڑا عیب اور جس سے بڑی گالی اس کے لیے ہو ہی نہیں سکتی۔ تمہیں پیدا اس نے کیا، تمہاری پرورش وہ کر رہا ہے اور تمہاری ہر ضرورت پوری وہ کرتا ہے، تمہاری موت و حیات اس کے ہاتھ میں ہے، مگر تم اس کے بے بس بندوں میں سے کسی کو داتا کہتے ہو، کسی کو دنگیر، کسی کو مشکل کشا اور کسی کو گنج بخش، کسی کو تم نے اولاد دینے والا بنا رکھا ہے تو کسی کو حکومت دینے والا، کسی کو خزانے بخشنے والا تو کسی کو شفا دینے والا، کسی کے متعلق کہتے ہو کہ وہ اللہ کی تقدیر کا رخ پھیر دیتا ہے اور کسی کے بارے میں کہتے ہو کہ وہ کمان سے نکلا ہوا تیر راستے سے واپس لے آتا ہے۔ اب آسمان و زمین کی ہر چیز کی گواہی کو دیکھو اور اپنے طرز عمل کو دیکھو۔ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نبی ﷺ سے بیان کرتے ہیں: « قَالَ اللَّهُ كَذَّبَنِي ابْنُ آدَمَ وَ لَمْ يَكُنْ لَهُ ذَلِكَ وَ شَتَمَنِي وَ لَمْ يَكُنْ لَهُ ذَلِكَ، فَأَمَّا تَكْذِيبُهُ إِيَّايَ فَرَعَمَ أَنِّي لَا أَقْدِرُ أَنْ أُعَيْدَهُ كَمَا سَكَانَ وَ أَمَّا شَتْمُهُ إِيَّايَ فَقَوْلُهُ لِي وَ لَدَّ، فَسُبْحَانِي أَنْ أَتَّخِذَ صَاحِبَةً أَوْ وَلَدًا» [بخاری، التفسیر، سورۃ البقرۃ، باب: ﴿ وَقَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا سُبْحَانَ﴾ : ۴۴۸۲] ”اللہ تعالیٰ نے فرمایا، ابن آدم نے مجھے جھٹلا دیا، حالانکہ یہ اس کا حق نہیں تھا اور اس نے مجھے گالی دی، حالانکہ یہ اس کا حق نہیں تھا۔ اس کا مجھے جھٹلانا تو یہ ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ میں اسے دوبارہ بنانے پر قادر نہیں ہوں اور اس کا مجھے گالی دینا اس کا یہ کہنا ہے کہ میری کوئی اولاد ہے، حالانکہ میں اس سے پاک ہوں کہ میں کوئی بیوی یا اولاد بناؤں۔“ اس سورت میں اور مذکورہ بالا دوسری سورتوں کی آیات میں ”تسبیح“ کے لفظ اور اس حدیث میں ”سُبْحَانِي“ کے لفظ پر غور فرمائیں تو تسبیح کا مفہوم کافی حد تک واضح ہو جائے گا۔ یہی وجہ

لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ يُحْيِي وَيُمِيْتُ ۗ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲﴾

اسی کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے، وہ زندگی بخشتا اور موت دیتا ہے اور وہ ہر چیز پر پوری طرح

قادر ہے ﴿۲﴾

ہے کہ اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی تسبیح کے ذکر کے بعد اپنی دس سے زیادہ صفات بیان فرمائیں اور سب کے بعد کفر و شرک چھوڑ کر ایمان لانے کی دعوت دی، فرمایا: ﴿اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ وَ اَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ نُسْتَحْلِفِيْنَ فِيْهِ﴾ [الحديد: ۷] ”اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور ان چیزوں میں سے خرچ کرو جن میں اس نے تمہیں (پہلوں کا) جانشین بنایا ہے۔“

﴿۳﴾ تسبیح کا لغوی معنی کیا ہے، قرآنی آیات میں اس کا مفہوم کیا ہے، یہ تسبیح زبان حال سے ہے یا قول کے ساتھ؟ ان سب باتوں کے لیے دیکھیے سورہ بنی اسرائیل (۳۳، ۳۴) کی تفسیر۔

﴿۴﴾ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ: ”الْعَزِيْزُ“ ”عَزَّ يَعْزُّ“ (ض) سے مبالغے کا صیغہ ہے، سب پر غالب، کوئی کام ایسا نہیں جو وہ کرنا چاہے اور نہ کر سکے اور کوئی ہستی ایسی نہیں جو اسے کسی کام سے روک سکے۔ ”الْحَكِيْمُ“ کمال حکمت والا۔ اس کا ہر کام محکم ہے اور دانائی پر مشتمل ہے، اس لیے کہ وہ ماضی، حال اور مستقبل کا کامل علم رکھتا ہے۔ اس کے کسی کام میں کوئی غلطی نہیں، وہ عزیز ہے تو حکیم بھی ہے، اس کا غلبہ اندھے کی لاشی نہیں، بلکہ اس کے ساتھ کمال حکمت بھی شامل ہے۔ ”الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ“ خبر پر الف لام سے کلام میں حصر پیدا ہو گیا کہ عزیز و حکیم صرف وہ ہے، کوئی اور نہیں۔

آیت 2 ﴿۱﴾ لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ: ”لَهُ“ خبر کو پہلے لانے سے حصر پیدا ہو گیا، یعنی آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے، کسی اور کی نہیں۔ دوسرے کسی کے پاس بادشاہی اگر ہے تو سارے آسمانوں اور زمین کی نہیں، بلکہ زمین کے کسی چھوٹے سے قطعے کی تھوڑے سے وقت کے لیے اور وہ بھی اسی کی عطا کردہ اور ہر لمحے دوسروں کی محتاج۔ مزید دیکھیے سورہ ملک کی پہلی آیت کی تفسیر۔ پھر کائنات کے سارے اختیارات کے مالک کے مقابلے میں کسی اور کی عبادت کا کیا جواز ہے؟

﴿۲﴾ يُحْيِي وَيُمِيْتُ: اگرچہ یہ دونوں صفات ”لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ“ کے مضمون میں شامل ہیں، مگر انھیں خاص طور پر الگ اس لیے ذکر فرمایا کہ یہ دونوں کام زمین و آسمان میں اللہ تعالیٰ کے ان تصرفات میں سے ہیں جن کی حقیقت اس کے سوا کوئی نہیں جانتا اور مخلوق میں سے کوئی دعویٰ بھی نہیں کر سکتا کہ ان میں اس کا کوئی دخل ہے اور اس میں قیامت کے امکان کی بھی دلیل ہے جس کا مشرک انکار کرتے ہیں اور ان کے بنائے ہوئے خداؤں کے باطل ہونے کی طرف اشارہ بھی ہے، یعنی ”لَا يَبْدَلُوْنَ مَوْتًا وَّ لَا حَيٰوَةً وَّ لَا نَشُوْرًا“ کہ باطل معبود تو نہ کسی موت کے مالک ہیں اور نہ زندگی کے اور نہ اٹھائے جانے کے۔ دیکھیے سورہ فرقان (۳)۔

﴿۳﴾ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ: اس کی وضاحت کے لیے دیکھیے سورہ ملک کی پہلی آیت کی تفسیر۔

هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۗ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٣﴾

وہی سب سے پہلے ہے اور سب سے پیچھے ہے اور ظاہر ہے اور چھپا ہوا ہے اور وہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے ﴿٣﴾

آیت 3 ﴿٣﴾ هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ : ”ظَهَرَ يَظْهَرُ“ (ف) کا معنی پوشیدہ کے مقابلے میں ظاہر ہونا بھی ہے اور بلند اور غالب ہونا بھی، جیسا کہ فرمایا: ﴿لِيُظَاهِرَهُ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا﴾ [التوبة: ٣٣] ”تا کہ وہ اسے ہر دین پر غالب کر دے۔“ یہاں بھی ”هُوَ“ مبتدا کی چاروں خبروں ”الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ“ پر الف لام کی وجہ سے حصر پیدا ہو رہا ہے، یعنی وہی ہے جو سب سے پہلے ہے، اس کی کوئی ابتدا نہیں اور وہی سب سے آخر ہے، اس کے بعد کوئی نہیں، اس کی انتہا بھی کوئی نہیں، اس کے سوا سب فنا ہونے والے ہیں، اس پر فنا نہیں۔ وہی ہے جس کا وجود ظاہر ہے، جو کائنات کی ہر چیز سے ظاہر ہو رہا ہے کہ اسے بنانے والا موجود ہے، جو ہر چیز پر غالب ہے کہ اس نے جو چاہا بنا دیا اور جو چاہتا ہے بنا دیتا ہے، کوئی اس سے اوپر نہیں جو اسے روک سکے اور وہی ہے جس کی ذات پوشیدہ ہے جس کا آنکھیں ادراک نہیں کر سکتیں۔ اس کے سوا کسی میں ان چاروں صفات میں سے ایک صفت بھی نہیں پائی جاتی۔ اس آیت کی بہترین تفسیر خود رسول اللہ ﷺ سے آئی ہے، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہمیں حکم دیتے تھے کہ جب ہم اپنے بستر پر لیٹیں تو یہ کہیں: ﴿اللَّهُمَّ رَبَّ السَّمَاوَاتِ وَرَبَّ الْأَرْضِ وَرَبَّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ، رَبَّنَا وَرَبَّ كُلِّ شَيْءٍ، فَالِقَ الْحَبِّ وَالنَّوَى، وَمُنزِلَ التَّوْرَةِ وَالْإِنْجِيلِ وَالْفُرْقَانِ، أَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ كُلِّ شَيْءٍ أَنْتَ آخِذٌ بِنَاصِيَتِهِ، اللَّهُمَّ أَنْتَ الْأَوَّلُ فَلَيْسَ قَبْلَكَ شَيْءٌ وَأَنْتَ الْآخِرُ فَلَيْسَ بَعْدَكَ شَيْءٌ وَأَنْتَ الظَّاهِرُ فَلَيْسَ فَوْقَكَ شَيْءٌ وَأَنْتَ الْبَاطِنُ فَلَيْسَ دُونَكَ شَيْءٌ، أَفْضِ عَنَّا الدِّينَ وَأَغْنِنَا مِنَ الْفَقْرِ﴾ [مسلم، الذكر والدعاء، باب ما يقول عند النوم وأخذ المضجع: ٢٧١٣] ”اے اللہ! اے آسمانوں کے رب اور زمین کے رب اور عرش عظیم کے رب! ہمارے رب اور ہر چیز کے رب! دانے اور گٹھلیوں کو پھاڑ نکلانے والے اور تورات و انجیل اور فرقان کو نازل کرنے والے! میں ہر اس چیز کے شر سے تیری پناہ مانگتا ہوں جس کی پیشانی کے بالوں کو تو پکڑے ہوئے ہے۔ اے اللہ! تو ہی اول ہے، سو تجھ سے پہلے کوئی چیز نہیں اور تو ہی آخر ہے، سو تیرے بعد کوئی چیز نہیں اور تو ہی ظاہر ہے، سو تجھ سے اوپر کوئی چیز نہیں اور تو ہی باطن ہے، سو تجھ سے ”دُون“ (بعد) کوئی چیز نہیں۔ تو ہم سے قرض ادا کر دے اور ہمیں فقر سے غنی کر دے۔“

2 ﴿الْبَاطِنُ﴾ کی ایک تفسیر وہ ہے جو عام طور پر کی جاتی ہے، یعنی پوشیدہ۔ اس کے مطابق ”لَيْسَ دُونَكَ شَيْءٌ“ کا مطلب یہ ہے کہ تو ہی پوشیدہ ہے، سو تجھ سے زیادہ پوشیدہ کوئی چیز نہیں۔ یہ مفہوم ”لَا تُذْمَرُ كُهُ الْأَبْصَارُ“ میں بیان ہوا ہے، دیکھیے سورۃ انعام (۱۰۳) کی تفسیر اور ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں بھی یہی بات بیان ہوئی ہے، انھوں نے فرمایا: ﴿قَامَ فِينَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِحَمْسِ كَلِمَاتٍ فَقَالَ إِنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ لَا يَنَامُ وَلَا يَنْبَغِي لَهُ أَنْ يَنَامَ، يَحْفَظُ الْقِسْطَ وَيَرْفَعُهُ، يُرْفَعُ إِلَيْهِ عَمَلُ اللَّيْلِ قَبْلَ عَمَلِ النَّهَارِ وَعَمَلُ النَّهَارِ قَبْلَ عَمَلِ اللَّيْلِ، حِجَابُهُ النُّورُ

هُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ ۗ يَعْلَمُ

وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر بلند ہوا، وہ جانتا ہے جو چیز زمین میں

وَفِي رِوَايَةِ أَبِي بَكْرٍ النَّارُ لَوْ كَشَفَهُ لَأَحْرَقَتْ سُبْحَاتٍ وَجَهِيهِ مَا أَنْتَهَىٰ إِلَيْهِ بَصَرُهُ مِنْ خَلْقِهِ» [مسلم، الإيمان، باب في قوله عليه السلام: "إن الله لا ينام.....": ۱۷۹] "رسول اللہ ﷺ نے ہم میں کھڑے ہو کر پانچ باتیں بیان فرمائیں، چنانچہ آپ نے فرمایا: "اللہ عزوجل سوتا نہیں اور اس کے لائق نہیں کہ وہ سوئے، وہ ترازو کو جھکاتا ہے اور اسے اٹھاتا ہے، رات کا عمل دن کے عمل سے پہلے اور دن کا عمل رات کے عمل سے پہلے اس کی طرف اوپر لے جایا جاتا ہے۔ اس کا حجاب نور ہے (اور ابوبکر کی روایت میں ہے کہ نار ہے) اگر وہ اسے ہٹا دے تو اس کے چہرے کی کرنیں اس کی مخلوق میں سے ان تمام چیزوں کو جلا دیں جن تک اس کی نگاہ پہنچتی ہے۔"

③ اور "الْبَاطِنُ" کی ایک تفسیر وہ ہے جو مفسر طبری نے بیان فرمائی ہے، ان کے الفاظ یہ ہیں: "وَ الظَّاهِرُ" يَقُولُ وَهُوَ الظَّاهِرُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ دُونَهُ، وَهُوَ الْعَالِي فَوْقَ كُلِّ شَيْءٍ، فَلَا شَيْءَ أَعْلَىٰ مِنْهُ، "وَ الْبَاطِنُ" يَقُولُ وَهُوَ الْبَاطِنُ جَمِيعِ الْأَشْيَاءِ، فَلَا شَيْءَ أَقْرَبُ إِلَىٰ شَيْءٍ مِنْهُ، كَمَا قَالَ: ﴿وَ نَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ﴾ [ق: ۱۶] "یعنی "وَ الظَّاهِرُ" کا مطلب یہ ہے کہ وہی اپنے سوا ہر چیز پر ظاہر ہے اور وہی ہر چیز کے اوپر بلند ہے، کوئی چیز اس سے بلند نہیں اور "وَ الْبَاطِنُ" کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمام اشیاء سے باطن ہے، چنانچہ کوئی چیز کسی چیز سے اس سے زیادہ قریب نہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ نَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ﴾ [ق: ۱۶] "اور ہم اس کی رگ جاں سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔" خلاصہ یہ کہ ہر چیز سے زیادہ بلند بھی وہی ہے اور ہر چیز کے زیادہ قریب بھی وہی ہے۔ بہت سے اہل علم نے اس قرب سے مراد علم کے لحاظ سے قریب ہونا اور "الْبَاطِنُ" کا معنی علم کے لحاظ سے ہر چیز کے قریب کیا ہے۔ یہ بحث آگے آیت (۴) "وَ هُوَ مَعَكُمْ" میں کچھ تفصیل سے آ رہی ہے۔

آیت 4: ﴿هُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ﴾ اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ اعراف (۵۴) کی تفسیر۔

② ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ: اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ اعراف (۵۴) اور سورہ طٰ (۵) کی تفسیر۔ اس آیت میں مذکور تمام جملے لانے کا مقصد بھی یہ ہے کہ جب یہ سب کچھ اللہ واحد نے کیا ہے تو پھر اس پر ایمان کیوں نہیں لاتے اور اس کے ساتھ شریک کیوں ٹھہراتے ہو، جیسا کہ یہ بات آگے آیت (۷) "أَلَمْ نُؤَيِّدْكَ" میں صراحت کے ساتھ آ رہی ہے۔

③ يَعْلَمُ مَا يَلْبِغُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا.....: اللہ تعالیٰ نے اپنے علم سے تعلق رکھنے والی چیزوں میں سے ان چیزوں کے بجائے جو زمین پر موجود ہیں ان چیزوں کا ذکر فرمایا جو اس میں داخل ہوتی ہیں یا اس سے نکلتی ہیں۔ اسی طرح آسمان میں موجود چیزوں کے ذکر کے بجائے ان کا ذکر فرمایا جو اس سے اترتی ہیں یا اس کی طرف چڑھتی ہیں۔ کیونکہ جو زمین میں داخل

مَا يَكْبُرُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يُخْرَجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا وَهُوَ مَعَكُمْ

داخل ہوتی ہے اور جو اس سے نکلتی ہے اور جو آسمان سے اترتی ہے اور جو اس میں چڑھتی ہے اور وہ تمہارے ساتھ ہونے والی اور اس سے نکلنے والی چیزوں کو جانتا ہے وہ اس کے اوپر موجود چیزوں کو بالاولیٰ جانتا ہے اور جو آسمان سے اترنے والی اور اس میں چڑھنے والی چیزوں کو جانتا ہے وہ فضا اور خلا میں موجود نظر آنے والی اور نظر نہ آنے والی چیزوں کو اور ستاروں کی گردش اور ان کے نظام کو بالاولیٰ جانتا ہے۔

زمین میں داخل ہونے والی چیزوں میں سے بارش کا پانی ہے جو زمین کی گہرائیوں میں داخل ہوتا ہے، نباتات کے بیج ہیں اور زمین میں دفن ہونے والے اجسام وغیرہ ہیں اور اس سے نکلنے والی چیزوں میں سے نباتات، معدنیات، گیہیں اور وہ جانور ہیں جو اپنے غاروں اور ٹھکانوں سے نکلنے ہیں۔ آسمان سے اترنے والی چیزوں میں سے بارش، برف، ہوائیں، اللہ تعالیٰ کے احکام، اس کے فرشتے اور اس کی رحمت وغیرہ ہیں اور اس میں چڑھنے والی چیزوں میں سے وہ چیزیں ہیں جو فضا کے طبقات میں بلند ہوتی ہیں۔ مثلاً سمندر وغیرہ سے اٹھنے والے آبی بخارات، مٹی اور ریت وغیرہ کی آندھیاں اور گولے، فضا میں اڑنے والے پرندے، جسموں سے جدا ہو کر اوپر جانے والی ارواح اور عالم بالا سے معلومات چرٹانے کے لیے اوپر جانے والے شیاطین، بندوں کے اعمال اور فرشتے جو اترتے اور چڑھتے ہیں۔ [التحریر والتبیین فی سورۃ سبا]

﴿ وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ ﴾: ”اور وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو“ اس جملے سے پہلے اسی آیت میں یہ جملہ گزر چکا ہے: ﴿ هُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ ﴾ ”وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر بلند ہوا۔“ تو یہ آیت دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک عرش پر ہے اور وہ ہمارے ساتھ بھی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ دونوں باتیں بیک وقت کیسے درست ہو سکتی ہیں؟ اس معاملے میں بعض لوگوں نے ان دونوں کا انکار کر دیا اور یہ کہہ دیا کہ اللہ تعالیٰ نہ عرش پر ہے اور نہ کسی اور جگہ، بلکہ وہ لامکان ہے اور جو شخص یہ پوچھ بھی لے کہ اللہ تعالیٰ کہاں ہے وہ کافر ہو گیا، کیونکہ اس کے لیے مکان (جگہ) تسلیم کرنے سے اس کا اس جگہ کا محتاج ہونا لازم آتا ہے۔ ان نادانوں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ ان کا فتویٰ کس کس پر لگ رہا ہے اور نہ یہ خیال کیا کہ اللہ تعالیٰ خود فرما رہے ہیں: ﴿ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ ﴾ کہ پھر وہ عرش پر بلند ہوا۔ پھر قیامت کے دن آٹھ فرشتوں کے عرش الہی کو اٹھائے ہونے کا ذکر سورۃ حاقہ میں موجود ہے، فرمایا: ﴿ وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ سُبْحَانَكَ ﴾ [الحاقہ: ۱۷] ”اور تیرے رب کا عرش اس دن آٹھ فرشتے اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہوں گے۔“ اور قیامت کے دن فرشتوں کے عرش کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے ہونے کا ذکر سورۃ زمر میں موجود ہے، فرمایا: ﴿ وَ تَرَى الْمَلَائِكَةَ حَافِينَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ ﴾ [الزمر: ۲۷] ”اور تو فرشتوں کو دیکھے گا عرش کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے۔“ اور یہ سوال کرنا کہ اللہ کہاں ہے، خود رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے۔ چنانچہ معاویہ بن حکم السلمی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ”میری ایک لونڈی اُحد اور جوانیہ کی طرف میری بکریاں چراتی تھی،

أَيْنَ مَا كُنْتُمْ ۖ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿۳﴾

ہے، جہاں بھی تم ہو اور اللہ اسے جو تم کرتے ہو، خوب دیکھنے والا ہے ﴿۳﴾

ایک دن میں نے دیکھا تو بھیڑیا اس کی بکریوں سے ایک بکری لے جا چکا تھا، میں بھی بنی آدم سے ہوں، مجھے اسی طرح غصہ آجاتا ہے جیسے انھیں غصہ آتا ہے، تو میں نے اسے ایک تھپڑ مار دیا۔ پھر میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا تو آپ نے اسے مجھ پر بہت بڑا (گناہ) قرار دیا، میں نے کہا: ”یا رسول اللہ! کیا میں اسے آزاد نہ کر دوں؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ((اِئْتِنِي بِهَا)) ”اے میرے پاس لاؤ۔“ میں اسے لے کر آپ ﷺ کے پاس آیا تو آپ ﷺ نے اس سے کہا: ((أَيْنَ اللَّهُ؟)) ”اللہ کہاں ہے؟“ اس نے کہا: ((فِي السَّمَاءِ)) ”آسمان میں۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ أَنَا؟)) ”میں کون ہوں؟“ اس نے کہا: ((أَنْتَ رَسُولُ اللَّهِ)) ”آپ اللہ کے رسول ہیں۔“ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ((أَعْتَقَهَا فَإِنَّهَا مُؤْمِنَةٌ)) ”اے آزاد کر دو، کیونکہ یہ مومنہ ہے۔“ [مسلم، المساجد ومواضع الصلاة، باب تحريم الكلام في الصلاة...: ۱۰۳۷]

خلاصہ یہ ہے کہ یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ لامکان ہے، قرآن و حدیث کا صریح انکار ہے اور یہ عقیدہ رکھنا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک عرش پر ہے اور وہ ہمارے ساتھ بھی ہے، مگر اس طرح سے جسے وہی جانتا ہے اور جس طرح اس کی شان کے لائق ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کے عرش پر مستوی ہونے کے انکار کی ایک انتہا یہ تھی کہ وہ کسی جگہ بھی نہیں، جو درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ہستی ہی کا انکار ہے۔ دوسری انتہا ان لوگوں نے اختیار کی جنہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر جگہ موجود ہے اور ہم جہاں بھی ہوں وہ ہمارے ساتھ اس طرح ہے جس طرح ہم ایک دوسرے کے ساتھ ہوتے ہیں، مگر یہ بات بھی غلط ہے، کیونکہ اسی آیت میں ”وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ“ (اور وہ تمہارے ساتھ ہے تم جہاں بھی ہو) سے پہلے ”ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ“ میں اللہ تعالیٰ کے عرش پر مستوی ہونے کا ذکر بھی موجود ہے۔ اب اگر ”وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ“ کا مطلب یہ لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر جگہ اس طرح ہمارے ساتھ ہے جس طرح ہم ایک دوسرے کے ساتھ ہیں تو ایک ہی آیت کے دو جملے ایک دوسرے سے ٹکراتے اور متعارض ٹھہرتے ہیں، اس لیے ”وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ“ کا وہی مطلب درست ہو گا جو ”الرَّحْمَنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَىٰ“ کے خلاف نہ ہو اور کلام عرب کے بھی خلاف نہ ہو، کیونکہ جس طرح ”الرَّحْمَنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَىٰ“ پر ایمان لازم ہے اسی طرح ”وَهُوَ مَعَكُمْ“ پر ایمان بھی لازم ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کلام عرب میں معیت (ساتھ ہونے) کا معنی اگرچہ اس طرح ساتھ ہونا بھی ہے جس طرح ہم ایک دوسرے کے ساتھ ہوتے ہیں، مگر یہ لفظ مختلف مواقع کے لحاظ سے اس کے علاوہ معانی کے لیے بھی آتا ہے۔ چنانچہ معیت کا ایک معنی وہ ہے جو سورہ بقرہ کی آیت (۱۵۳): ﴿إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ﴾ (بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے) اور سورہ توبہ کی آیت (۳۰): ﴿لَا تَحْزَنُوا إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا﴾ (غم نہ کر، یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے) میں ہے۔ ظاہر ہے ان آیات کے مطابق اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے بے صبروں کے ساتھ نہیں، اسی طرح وہ ہجرت کے وقت

غارِ ثور میں اور سارے سفر میں رسول اللہ ﷺ اور ابو بکر رضی اللہ عنہما کے ساتھ تھا، مشرکین کے ساتھ نہیں۔ ”وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ“ میں یہ معنی بھی مراد نہیں، کیونکہ اس معنی میں معیت صرف اللہ کے مخلص بندوں کا نصیب ہے۔

معیت کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ ایک چیز دور ہونے کے باوجود ان چیزوں کے ساتھ بھی ہو جن سے وہ دور ہے۔ چنانچہ ”وَهُوَ مَعَكُمْ“ میں معیت سے یہی معنی مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات عرش پر ہے، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ بھی ہے۔ رہی یہ بات کہ کس طرح ہے؟ تو اس کی اصل اور پوری کیفیت وہی جانتا ہے۔ اگر مخلوق میں ایسا ہونا ممکن نہ بھی ہو تو اللہ تعالیٰ کو مخلوق پر قیاس نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ اس نے خود فرمایا ہے: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ [الشوری: ۱۱] ”اس کی مثل کوئی چیز نہیں۔“ مگر مخلوق میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں کہ ایک چیز کسی ایک جگہ ہونے کے باوجود دوسری جگہ موجود لوگوں کے ساتھ ہو۔ اس کی ادنیٰ سی مثال سورج اور چاند ہیں کہ بلندی پر ہونے کے باوجود ہم جہاں جاتے ہیں وہ ہمارے ساتھ ہوتے ہیں، حالانکہ وہ زمین پر ہمارے اندر موجود نہیں ہوتے، مگر سب کہتے ہیں کہ رات میں سفر کرتا رہا اور چاند سارے سفر میں میرے ساتھ رہا۔ معیت کا یہ معنی معروف ہے اور اپنے مقام پر حقیقی معنی ہے۔ جب سورج اور چاند کا یہ معاملہ ہے تو اللہ تعالیٰ کی صفت تو ان کی صفت سے کہیں بلند ہے، چنانچہ وہ عرش پر ہونے کے باوجود ہمارے ساتھ ہے، خواہ ہم کہیں بھی ہوں، اگرچہ اپنی صفت ”الْبَاطِنُ“ کی وجہ سے اور حجاب میں ہونے کی وجہ سے ہمیں نظر نہیں آتا۔ قیامت کے دن جب وہ اہل جنت کو اپنے دیدار کی نعمت سے سرفراز فرمانے کا ارادہ کرے گا اور اپنا حجاب کھولے گا تو تمام جنتی اپنے اپنے گھروں میں بیٹھے کسی تکلیف کے بغیر اور کسی قسم کے ہجوم یا بھیڑ کے بغیر اسے دیکھیں گے اور یہ مثال خود رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ لوگوں نے کہا: «يَا رَسُولَ اللَّهِ! هَلْ نَرَى رَبَّنَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلْ تَضَارُونَ فِي الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ؟ قَالُوا لَا يَا رَسُولَ اللَّهِ! قَالَ فَهَلْ تَضَارُونَ فِي الشَّمْسِ لَيْسَ دُونَهَا سَحَابٌ؟ قَالُوا لَا يَا رَسُولَ اللَّهِ! قَالَ فَإِنَّكُمْ تَرَوْنَهُ كَذَلِكَ» [بخاری، التوحید، باب قول اللہ تعالیٰ: ﴿وَجْهَ يَوْمَئِذٍ مُنْدٍ...﴾ [۷۴۳۷] ”یا رسول اللہ! کیا ہم قیامت کے دن اپنے رب کو دیکھیں گے؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”کیا تم چودھویں کی رات کو چاند دیکھنے میں کوئی تکلیف محسوس کرتے ہو؟“ انھوں نے کہا: ”نہیں اسے اللہ کے رسول!“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”تو کیا تم سورج کو دیکھنے میں کوئی تکلیف محسوس کرتے ہو جس کے سامنے کوئی بادل نہ ہو؟“ لوگوں نے کہا: ”نہیں یا رسول اللہ!“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”تو تم اسے اسی طرح دیکھو گے۔“

یہاں شیخ محمد بن صالح بن شمیم رضی اللہ عنہما کی تالیف ”القواعد المثلی فی صفات اللہ وأسماء الحسنی“ (الْمِثَالُ الْخَامِسُ وَالسَّادِسُ) سے ان کی ایک تحریر کا ترجمہ لکھا جاتا ہے، وہ لکھتے ہیں: ”دوسری وجہ یہ ہے کہ ”معیت“ کے معنی کی حقیقت ”عُلُوُّ“ کے مناقض اور خلاف نہیں، کیونکہ دونوں کا جمع ہونا مخلوق کے حق میں ممکن ہے (کہ ایک چیز بلندی پر بھی ہو اور ساتھ بھی ہو) کیونکہ کہا جاتا ہے کہ ہم چلتے رہے اور چاند بھی ہمارے ساتھ تھا اور اسے تاقض نہیں سمجھا جاتا اور نہ کوئی اس سے یہ سمجھتا ہے کہ چاند زمین پر اتر آیا ہے۔ تو جب یہ مخلوق کے حق میں ممکن ہے تو خالق کے حق میں تو بالادلی ممکن ہے، جو اپنے عُلُوُّ

لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۗ وَ اِلٰى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۵﴾

اسی کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے اور تمام معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں ﴿۵﴾

کے ساتھ ہر چیز کو محیط بھی ہے، کیونکہ معیت کی حقیقت کے لیے ضروری نہیں کہ دونوں ایک جگہ اکٹھے ہوں۔ اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے "الفتاویٰ الحمویة (ص ۱۰۳)" دیکھیے ابن القاسم کے مرتب کردہ "مجموع الفتاویٰ" کی جلد پنجم، میں اسی وجہ کی طرف اشارہ کیا ہے، چنانچہ انھوں نے لکھا ہے: "یہ اس لیے کہ لغت میں جب لفظ "مَع" کسی قید کے بغیر بولا جاتا ہے تو اس کا معنی لغت میں مطلق ساتھ ہونے کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا، پھر جب اسے کسی خاص معنی کے ساتھ مقید کیا جائے تو اس معنی میں ساتھ ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ہم چلتے رہے اور چاند یا ستارہ ہمارے ساتھ تھا اور کہا جاتا ہے کہ فلاں سامان میرے ساتھ ہے، کیونکہ وہ تمہارے پاس ہوتا ہے، خواہ وہ تمہارے سر کے اوپر ہو۔ سو اللہ تعالیٰ حقیقت میں اپنی مخلوق کے ساتھ ہے اور حقیقت میں اپنے عرش پر بھی ہے۔"

﴿۵﴾ سلف صالحین میں سے بہت سے اہل علم نے "وَهُوَ مَعَكُمْ" کا مطلب یہ بیان فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات عرش پر ہے اور وہ اپنے علم، رویت اور قدرت کے ساتھ ہمارے ساتھ ہے اور اس کی دلیل یہ وہی ہے کہ زیر تفسیر آیت میں "وَهُوَ مَعَكُمْ" سے پہلے ہر چیز کے علم کا ذکر ہے اور بعد میں ہر چیز کو دیکھنے کا۔ اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات عرش پر ہے اور وہ ہمارے ساتھ بھی ہے ہم جہاں بھی ہوں، مگر وہ زمین پر اپنی مخلوق کے ساتھ اس طرح نہیں جس طرح ہم ایک دوسرے کے ساتھ ہیں اور اس میں بھی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا علم رکھنے والا، اسے دیکھنے والا اور اس پر پوری قدرت اور تصرف رکھنے والا ہے۔ یہ تمام صفات حسنیٰ اس کے لیے ثابت ہیں، مگر معیت کا معنی علم یا قدرت نہیں بلکہ یہ بذات خود ایک صفت ہے جس کی اصل کیفیت اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ اس لیے اس بات پر ایمان رکھنا لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات عرش پر ہے اور وہ ہمارے ساتھ ہے ہم جہاں بھی ہوں۔ رہی یہ بات کہ کس طرح ہے؟ تو اس کی اصل کیفیت وہی جانتا ہے، چاند یا سورج کی مثالیں صرف سمجھانے کے لیے ہیں کہ باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات عرش کے اوپر ہے، وہ مخلوق کے ساتھ ہو سکتا ہے اور ہے۔ موجودہ زمانے میں اس کی ایک اور ادنیٰ سی مثال بجلی ہے کہ وہ اپنے اصل ٹھکانے میں ہونے کے باوجود ہزاروں میل دور تک موجود ہوتی ہے اور اس کا وجود سب محسوس کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی معیت اور مخلوق پر موثر ہونے کے لیے یہ مثال بھی نہایت ادنیٰ مثال ہے، جبکہ اللہ کی صفات بہت اعلیٰ ہیں، چنانچہ فرمایا: ﴿وَ اِلٰى اللّٰهِ الْمُنْکَلُ الْاَعْلٰی﴾ [النحل: ۶۰] اور اللہ کی سب سے اونچی صفت ہے۔ "اس کے لیے عرش پر رہ کر ہر ایک کے ساتھ ہونا بالکل معمولی بات ہے۔"

آیت ۵ ﴿۱﴾ لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: یہ جملہ آیت (۲) میں گزرا ہے، دوبارہ تاکید کے لیے لایا گیا ہے۔

﴿۲﴾ وَ اِلٰى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ: "اِلٰى اللّٰهِ" پہلے لانے کا مطلب یہ ہے کہ تمام معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹائے جاتے کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

يُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُؤَلِّجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ ۖ وَهُوَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿١﴾ اٰمَنُوۤا
 بِاللهِ وَرَسُوْلِهِ وَاَنْفَقُوۡا مِمَّا جَعَلَكُمْ نُسُخْلَفِيۡنَ فِيْهِ ۗ قَالِذِيۡنَ اٰمَنُوۡا بِكُمْ وَاَنْفَقُوۡا
 لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا ﴿٢﴾

وہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور وہ سینوں کی بات کو خوب جاننے والا ہے ﴿١﴾
 اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور ان چیزوں میں سے خرچ کرو جن میں اس نے تمہیں (پہلوں کا) جائشیں بتایا
 ہے، پھر وہ لوگ جو تم میں سے ایمان لائے اور انہوں نے خرچ کیا ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے ﴿٢﴾

ہیں، کسی اور کی طرف نہیں، لہذا وہی تمام اعمال کا فیصلہ فرمائے گا اور ان کی جزایا سزا دے گا۔

آیت 6 يُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ : اس آیت کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۃ آل عمران (۲۷)، حج (۶۱)، لقمان (۲۹)،
 ہود (۵) اور سورۃ رعد (۱۰)۔

آیت 7 ﴿١﴾ اٰمَنُوۤا بِاللهِ وَرَسُوْلِهِ : سورت کے شروع سے یہاں تک اس حقیقت کے اعلان کے بعد کہ آسمانوں اور زمین
 کی ہر چیز نے اللہ کا (برعیب اور کمی سے) پاک ہونا بیان کیا ہے، اللہ تعالیٰ کی دس سے زیادہ صفات بیان ہوئی ہیں جو یہ
 ہیں: "الْعَزِيْزُ، الْحَكِيْمُ، لَدُنْكَ السَّمَوٰتُ وَالْاَرْضُ، يُحْيِي وَيُمِيْتُ، وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ، هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَ
 الظَّاهِرُ وَالبَاطِنُ، وَهُوَ يُحْيِيْ شَيْءًا عَلِيْمٌ، يُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ يُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ" ان صفات کے بیان کے
 بعد اس بات کی دعوت دی ہے کہ ان صفات کے مالک اللہ تعالیٰ پر اور اس کا پیغام لے کر آنے والے پر ایمان لاؤ۔ اس کے
 مخاطب اگرچہ کفار بھی ہیں، مگر بعد میں پورے سلسلہ کلام سے ظاہر ہے کہ یہاں سے خطاب ان مسلمانوں کو ہے جو ایمان
 لا چکے تھے، مگر ایمان کے تقاضے پورے کرنے میں کوتاہی کر رہے تھے اور جہاد فی سبیل اللہ میں جان و مال کی قربانی سے گریز
 کر رہے تھے۔ یہ وہی بات ہے جو سورۃ نساء کی آیت (۱۳۶): ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا اٰمَنُوۡا بِاللهِ وَرَسُوْلِهِ﴾ (اے لوگو
 جو ایمان لائے ہو! ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر) میں بیان ہوئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے ایمان میں کجگئی پیدا کر دو
 اور اس کے تقاضوں پر عمل کرو، جن میں سے ایک بہت بڑا تقاضا اس کی راہ میں خرچ کرنا ہے۔

﴿٢﴾ وَاَنْفَقُوۡا: یہاں خرچ کرنے سے مراد عام بھلائی کے کاموں میں خرچ کرنا نہیں بلکہ جہاد فی سبیل اللہ اور مجاہدین و
 مہاجرین کی ضروریات کے لیے خرچ کرنا ہے۔ دلیل اس کی آگے آنے والی آیت (۱۰) ہے: ﴿وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَنْفِقُوۡا فِي
 سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ "اور تمہیں کیا ہے تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔" اور "فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ" کا خاص اطلاق جہاد پر ہوتا ہے۔
 دیکھیے سورۃ توبہ کی آیت (۶۰) کی تفسیر۔

﴿٣﴾ مِمَّا جَعَلَكُمْ نُسُخْلَفِيۡنَ فِيْهِ: اس میں کئی طرح سے خرچ کرنے کی ترغیب ہے، ایک یہ کہ یہ مال تمہارا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ

وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالرَّسُولِ يَدْعُوكُمْ لِتُؤْمِنُوا بِرَبِّكُمْ وَقَدْ أَخَذَ مِيثَاقَكُمْ إِنْ

كُنْتُمْ قَوْمِينَ ①

اور تمہیں کیا ہے تم اللہ پر ایمان نہیں لاتے، جب کہ رسول تمہیں دعوت دے رہا ہے کہ اپنے رب پر ایمان لاؤ اور یقیناً وہ تم سے پختہ عہد لے چکا ہے، اگر تم ایمان والے ہو ①

کا ہے جو اس نے تم سے پہلے لوگوں کو دیا تھا، اب اس نے تمہیں اس میں پہلوں کا جانشین بنا دیا ہے اور دیکھنا چاہتا ہے کہ تم اس کی مرضی کے مطابق خرچ کرتے ہو یا نہیں۔ (دیکھیے انعام: ۱۶۵) غلام کا یہ کام نہیں کہ مالک کے مال کو وہاں خرچ نہ کرے جہاں وہ اسے خرچ کرنے کے لیے کہتا ہے، بلکہ اپنی مرضی سے خرچ کرتا پھرے یا جمع کرنے لگ جائے۔ دوسرا یہ کہ پہلے لوگوں کی طرح یہ تمہارے پاس بھی نہیں رہے گا۔ اگر تم نے اسے اللہ کی راہ میں خرچ کر لیا تو یہ آخرت کے لیے تمہارا ذخیرہ بن جائے گا اور اگر تم نے خرچ نہ کیا تو کچھ اور لوگ اس میں تمہارے جانشین بن جائیں گے۔ پھر اگر انہوں نے اسے نیکی میں خرچ کیا تو وہ تم سے بہتر رہے کہ وہ مال جو تم نیکی میں خرچ نہ کر سکے انہوں نے کر دیا، تم محروم رہے اور اگر انہوں نے بدی میں خرچ کیا تو تمہاری دولت بھی ان کی بدی میں معاون ٹھہری۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «يَقُولُ الْعَبْدُ مَالِي مَالِي، إِنَّمَا لَهُ مِنْ مَالِهِ ثَلَاثٌ، مَا أَكَلَ فَأَقْنَى أَوْ لَبَسَ فَأَبْلَى أَوْ أُعْطِيَ فَأَقْتَنَى، وَمَا سِوَى ذَلِكَ فَهُوَ ذَاهِبٌ وَتَارِكُهُ لِلنَّاسِ» [مسلم، کتاب الزهد والرفائق، باب الدنيا سجن للمومن وجنة للكافر: ۲۹۵۹] ”بندہ کہتا ہے میرا مال میرا مال، اس کے مال میں سے اس کی اپنی تو صرف تین چیزیں ہیں، جو اس نے کھایا اور فنا کر دیا، یا پہنا اور بوسیدہ کر دیا، یاد دے دیا اور ذخیرہ بنا لیا اور جو اس کے علاوہ ہے تو یہ جانے والا ہے اور اسے لوگوں کے لیے چھوڑ جانے والا ہے۔“

④ **فَالَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَآمَنُوا بِكُمْ**: یہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے خرچ کیا ان میں سب سے پہلے ابو بکر رضی اللہ عنہ ہیں جو رسول اللہ ﷺ پر سب سے پہلے ایمان لائے اور تبوک کے موقع پر صدقہ کے اعلان پر سارا مال لے آئے، ان میں عمر رضی اللہ عنہ بھی ہیں جو آدھا مال لے آئے اور عثمان رضی اللہ عنہ بھی اور وہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی جنہوں نے خوش حالی میں بھی خرچ کیا اور تنگ دستی کے باوجود محنت مشقت کر کے بھی صدقہ کیا۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ توبہ (۷۹) کی تفسیر۔

⑤ **لَهُمْ أَجْرٌ كَبِيرٌ**: ”نی سبیل اللہ“ خرچ کرنے والوں کی فضیلت کے لیے دیکھیے سورہ بقرہ (۲۷۳) اور سورہ انفال (۶۰)۔

آیت 8 ① **وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ**.....: یہ خطاب بھی مسلمانوں ہی سے ہے، اس کی دلیل آیت کا آخری جملہ ”وَقَدْ أَخَذَ مِيثَاقَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ قَوْمِينَ“ (اور یقیناً وہ تم سے پختہ عہد لے چکا ہے اگر تم مومن ہو) ہے۔ اسی طرح بعد والی آیت (۱۰): ﴿لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَتْلَ﴾ بھی اس کی دلیل ہے۔ جس طرح پچھلی آیت میں ایمان والوں کو ایمان لانے اور خرچ کرنے کا حکم ہے، اسی طرح اس آیت میں بھی انہیں جھنجھوڑا جا رہا ہے کہ آخر وجہ کیا ہے کہ تم اللہ پر ایمان نہیں لاتے؟ یعنی اس پر ایمان کے تقاضوں پر عمل کرتے ہوئے اس کے راستے میں خرچ نہیں کرتے،

هُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ عَلَىٰ عَبْدِهِ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ لِّيُخْرِجَكُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ ۗ وَإِنَّ
اللَّهَ بِكُمْ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴿۹﴾

وہی ہے جو اپنے بندے پر واضح آیات اتارتا ہے، تاکہ تمہیں اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالے اور بلاشبہ اللہ تم پر
یقیناً بے حد نرمی کرنے والا، نہایت مہربان ہے ﴿۹﴾

حالانکہ رسول خود تمہارے درمیان موجود ہے اور ہر نفس نفیس تمہیں اس بات کی دعوت دے رہا ہے کہ اپنے رب پر ایمان لاؤ
اور اس پر یقین رکھتے ہوئے اس کی راہ میں خرچ کرو۔

﴿۹﴾ وَقَدْ أَخَذَ مِيثَاقَكُمْ إِن كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ: "أَخَذَ" کا فاعل "الْمُؤْمِنُونَ" کی ضمیر بھی ہو سکتی ہے اور لفظ "اللَّهُ" کی ضمیر
بھی، یعنی جب تم نے ایمان قبول کیا تھا اس وقت اللہ نے تم سے اطاعت کا پختہ عہد لیا تھا، اسی طرح کلمہ اسلام کے ساتھ تم
رسول کو بھی اپنی اطاعت کا پختہ عہد دے چکے ہو، تو اب اطاعت سے گریز اور جہاد فی سبیل اللہ میں خرچ کرنے سے دریغ
کیوں کر رہے ہو؟ اللہ تعالیٰ کے عہد لینے کا ذکر اس آیت میں ہے: ﴿وَإِذْ كُنْتُمْ لَدَى اللَّهِ عَلَىٰ عَهْدِكُمْ وَأَنْتُمْ تَسْمَعُونَ﴾ اور اپنے
اوپر اللہ کی نعمت یاد کرو اور اس کا عہد جو اس نے تم سے مضبوط باندھا، جب تم نے کہا ہم نے سنا اور ہم نے مان لیا اور
اللہ سے ڈرے، بے شک اللہ سینوں کی بات کو خوب جانتے والا ہے۔ "اور رسول اللہ ﷺ کو عہد دینے کا ذکر اس حدیث میں
ہے جو عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، انہوں نے فرمایا: «بَايَعَنَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى السَّمْعِ
وَالطَّاعَةِ فِي الْمَنْسُوقِ وَالْمَكْرُوهِ وَأَنْ لَا نُنَازِعَ الْأَمْرَ أَهْلَهُ، وَأَنْ نَقُومَ أَوْ نَقُولَ بِالْحَقِّ حَيْثُمَا كُنَّا، لَا
نَخَافُ فِي اللَّهِ لَوْمَةً لَّابِيَةً» [بخاری، الأحكام، باب كيف يبایع الإمام الناس: ۹، ۷۱۹۹، ۷۲۰۰] "ہم نے رسول اللہ ﷺ
سے بیعت کی کہ نساظ اور ناگواری دونوں حالتوں میں سماع و طاعت کریں گے اور صاحب امر سے امارت میں جھگڑا
نہیں کریں گے اور جہاں بھی ہوں گے حق کہیں گے، اللہ کے ہارے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں
ڈریں گے۔"

﴿۹﴾ بعض مفسرین نے "وَقَدْ أَخَذَ مِيثَاقَكُمْ" سے "أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ" والا عہد مراد لیا ہے، جس کا ذکر سورہ اعراف (۱۷۴)
میں ہے، مگر یہاں آیات کا سیاق اس کی موافقت نہیں کرتا، اس لیے پہلی تفسیر ہی درست ہے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ نے بھی اسی کو
ترجیح دی ہے۔

آیت ۹ ﴿۹﴾ هُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ عَلَىٰ عَبْدِهِ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ ... اس آیت کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ مائدہ (۱۶، ۱۵)
کی تفسیر۔

وَمَا لَكُمْ أَلَّا تُنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَ لِلَّهِ يَرِثُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَن أنْفَقَ مِن قَبْلِ الْفَتْحِ وَ قَتَلَ ۚ أُولَئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً ۚ فِى الَّذِينَ أَنْفَقُوا مِن بَعْدِ

اور تمہیں کیا ہے تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، جب کہ آسمانوں اور زمین کی میراث اللہ ہی کے لیے ہے۔ تم میں سے جس نے فتح (مکہ) سے پہلے خرچ کیا اور جنگ کی وہ (یہ عمل بعد میں کرنے والوں کے) برابر نہیں۔ یہ لوگ درجے میں ان لوگوں سے بڑے ہیں جنہوں نے بعد میں خرچ کیا اور جنگ کی اور ان سب سے اللہ نے اچھی

﴿ كَرُؤُفٌ رَّحِيمٌ ۖ ﴾ اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ فتح (۶۵)۔

آیت 10 ﴿ ۱ ﴾ وَمَا لَكُمْ أَلَّا تُنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَ لِلَّهِ يَرِثُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ اصل میں اس ملکیت

کو کہتے ہیں جو پچھلے مالک کے انتقال پر اس کے زندہ رہنے والے وارثوں کو ملتی ہے۔ یہ ملکیت جبری ہوتی ہے، مرنے والا چاہے یا نہ چاہے، جو وارث ہوتا ہے اس کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ ”لِلَّهِ يَرِثُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ“ میں خبر ”هُنَالِ“ کو پہلے لانے سے حصر پیدا ہو گیا کہ زمین و آسمان کی وراثت صرف اللہ کے لیے ہے، کیونکہ آخر کار سب نے فنا ہونا ہے اور جن چیزوں کے مالک تم سمجھے جاتے ہو سب اسی کی طرف لوٹ جانے والی ہیں۔ تو جب یہ مال تمہارے پاس رہنے والا ہی نہیں بلکہ اس نے تمہارے ہاتھ سے لٹکانا ہی لٹکانا ہے اور اگر تم خرچ نہیں کرو گے تو جبراً تم سے لے لیا جائے گا، تو پھر کیا وجہ ہے کہ تم اسے اللہ کی راہ میں خوشی سے خود ہی خرچ نہ کرو کہ اس صورت میں مالک بھی راضی ہو جائے گا اور جو کچھ تم دو گے اللہ کے ذمے قرض ہو جائے گا، جو بے حساب امانت کے ساتھ تمہارے لیے محفوظ رکھے گا، جیسا کہ اگلی آیت میں آ رہا ہے۔ آدمی کے مال کی طرح اس کی جان کا بھی یہی حال ہے۔ ایک فارسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

جاں بجاناں دہ، وگر نہ از تو بستاند اجل خود تو منصف باش اے دل این بکو یا آن بکو

”جان محبوب کو دے دے، ورنہ موت تجھ سے لے لے گی۔ اے دل! تو خود ہی انصاف کر کہ یہ بہتر ہے یا وہ بہتر ہے؟“

﴿ لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَن أنْفَقَ مِن قَبْلِ الْفَتْحِ وَ قَتَلَ ۚ ﴾ یہاں کچھ عبارت محذوف ہے جو بعد میں آنے والے جملے

”أُولَئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً ۚ فِى الَّذِينَ أَنْفَقُوا مِن بَعْدِ وَ قَتَلُوا“ سے واضح ہو رہی ہے۔ گویا پوری عبارت اس طرح ہے: ”لَا

يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَن أنْفَقَ مِن قَبْلِ الْفَتْحِ وَ قَاتَلَ ۚ وَمَن أنْفَقَ مِن بَعْدِ الْفَتْحِ وَ قَاتَلَ“ یعنی ”تم میں سے وہ شخص جس نے

فتح سے پہلے خرچ کیا اور جنگ کی اور وہ شخص جس نے فتح کے بعد خرچ کیا اور جنگ کی برابر نہیں ہیں۔“ ”الْفَتْحِ“ سے مراد فتح

مکہ ہے، جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَ الْفَتْحُ ﴾ [النصر: ۱] ”جب اللہ کی مدد اور فتح

آ جائے۔“ یا صلح حدیبیہ ہے، جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ إِذَا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ﴾ [الفتح: ۱] ”بے شک ہم

نے تجھے فتح دی، ایک کھلی فتح۔“ اور دونوں بھی مراد ہو سکتی ہیں۔ اس طرح صحابہ کے تین درجے ہوں گے، پہلے درجے میں صلح

وَقَاتِلُوا وَاكُلُوا وَعَدَّ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿۱۵﴾

جزا کا وعدہ کیا ہے اور اللہ اس سے جو تم کرتے ہو، خوب باخبر ہے ﴿۱۵﴾

حدیبیہ سے پہلے ایمان لا کر خراج اور قتال کرنے والے سابقین اذہلین اور مہاجرین و انصار، دوسرے درجے میں صلح حدیبیہ کے بعد اور فتح مکہ سے پہلے ہجرت و نصرت کا شرف حاصل کرنے والے صحابہ کرام اور تیسرے درجے میں فتح مکہ کے بعد مسلمان ہونے والے صحابہ کرام ہوں گے، جو ہجرت یا نصرت کا شرف حاصل نہیں کر سکے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «لَا هِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ» [بخاری، الجهاد والسير، باب فضل الجهاد والسير: ۲۷۸۳] [فتح مکہ کے بعد (اب) ہجرت نہیں رہی۔“

اس بات کی دلیل کہ صلح حدیبیہ سے پہلے خراج اور قتال کرنے والے ان لوگوں سے درجے میں بلند ہیں جو فتح مکہ سے پہلے اور صلح حدیبیہ کے بعد ایمان لائے، وہ حدیث ہے جو انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انہوں نے فرمایا: «كَانَ بَيْنَ خَالِدِ بْنِ الْوَلِيدِ، وَ بَيْنَ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ عَوْفٍ كَلَامٌ، فَقَالَ خَالِدٌ لِعَبْدِ الرَّحْمَنِ تَسْتَطِيعُونَ عَلَيْنَا بِأَيَّامٍ سَبَقْتُمُونَا بِهَا، فَبَلَّغْنَا أَنَّ ذَلِكَ ذِكْرٌ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ دَعُوا لِي أَصْحَابِي، فَوَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ! لَوْ أَنْفَقْتُمْ مِثْلَ أُحُدٍ، أَوْ مِثْلَ الْجَبَالِ ذَهَبًا مَا بَلَّغْتُمْ أَعْمَالَهُمْ» [مسند احمد: ۲۶۶/۳، ح: ۱۳۸۱۲۔ مسند احمد کے محقق نے اسے صحیح کہا ہے] ”خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے درمیان کچھ بات ہو گئی تو خالد رضی اللہ عنہ نے عبدالرحمن رضی اللہ عنہ سے کہا: ”تم ہم پر ان چند دنوں کی وجہ سے بڑھ کر باتیں بنا رہے ہو جن میں تم ہم سے پہلے اسلام لے آئے۔“ رسول اللہ ﷺ کے پاس اس بات کا ذکر ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”میرے ساتھیوں کو میری خاطر چھوڑ دو، قسم اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر تم اُحد کے برابر یا پہاڑوں کے برابر سونا خرچ کرو، تب بھی تم ان کے اعمال کو نہیں پہنچ سکتے۔“

③ فتح سے پہلے خراج اور قتال کرنے والوں کا درجہ اس لیے بڑا ہے کہ فتح سے پہلے مسلمان تعداد میں کم اور قوت میں کمزور تھے، ان کی مالی حالت بھی بہت کمزور تھی، ان حالات میں اللہ کی راہ میں خرچ کرنا اور جہاد میں حصہ لینا دونوں نہایت مشکل اور دل گردے کے کام تھے، جب کہ فتح کے بعد یہ صورت حال بدل گئی، مسلمان قوت و تعداد میں بڑھتے چلے گئے اور ان کی مالی حالت بھی پہلے سے بہت بہتر ہو گئی اور پورا جزیرہ عرب فوج در فوج اسلام میں داخل ہونے لگا۔ اس لیے فرمایا کہ پہلے مشکل کے دور اور بعد کے دور میں مسلمان ہونے والے اور جہاد میں خرچ کرنے والے اور لڑنے والے برابر نہیں ہو سکتے، بلکہ پہلوں کا درجہ بڑا ہے۔

④ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ شرف اور فضیلت میں امت کے تمام افراد سے بڑھ کر ہیں، کیونکہ ایمان لانے میں اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے اور لڑنے میں وہ تمام صحابہ سے پہلے ہیں، اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے انہیں اپنی زندگی میں نماز کے لیے آگے کیا اور اسی بنا پر مسلمانوں نے انہیں خلافت کے منصب کے لیے مقدم رکھا۔

⑤ وَاكُلُوا وَعَدَّ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ: اس میں یہ صراحت فرمادی کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان اگرچہ درجے اور فضیلت میں

مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضِعَّهُ لَهُ وَلَئِنَّ أَجْرَ كَرِيمٍ ﴿١١﴾ يَوْمَ تَكْرَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ يَسْعَى نُورُهُمْ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ بُشْرَاكُمُ الْيَوْمَ جَنَّتِ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿١٢﴾

کون ہے وہ جو اللہ کو قرض دے، اچھا قرض، تو وہ اسے اس کے لیے کئی گنا کر دے اور اس کے لیے باعزت اجر ہو ﴿۱۱﴾ جس دن تو ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں کو دیکھے گا ان کی روشنی ان کے آگے اور ان کی دائیں طرفوں میں دوڑ رہی ہوگی۔ آج تمہیں ایسے بانگوں کی خوش خبری ہے جن کے تلے نہریں چلتی ہیں، ہمیشہ ان میں رہنے والے ہو، یہی تو بہت بڑی کامیابی ہے ﴿۱۲﴾

تفاوت ہے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ بعد میں مسلمان ہونے والے صحابہ کرام کو کوئی فضیلت حاصل نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے تمام صحابہ سے اچھی جزا یعنی جنت کا وعدہ کیا ہے اور تمام اصحاب رسول ﷺ جنتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی صحبت اور زیارت میں تاثیر ہی ایسی تھی کہ جس شخص نے بھی ایمان کی حالت میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت کی اور ایمان پر فوت ہوا، بعد کا کوئی آدمی اس کے درجے کے برابر نہیں ہو سکتا۔ دیکھیے سورہ فتح کی آخری آیت کی تفسیر میں مذکور حدیث، جس میں رسول اللہ ﷺ کو دیکھنے والے آدمی کی برکت و فضیلت کا ذکر ہے۔ بڑے بد نصیب ہیں وہ لوگ جنہیں رسول اللہ ﷺ کی صحبت و رفاقت کا شرف رکھنے والی مبارک ہستیوں سے بغض اور عداوت ہے اور وہ ان کے جہاد اور انفاق فی سبیل اللہ سے آنکھیں بند کر کے ان کی معمولی لغزشوں کی وجہ سے ان پر شہرے بازی اور دشنام طرازی کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «لَا تَسُبُّوا أَصْحَابِي، قَلَّوْا أَنْ أُحَدِّثَكُمْ أَنْفَقَ مِثْلَ أُحُدٍ ذَهَبًا مَا بَلَغَ مُدًّا أُحُدِهِمْ وَلَا نُصِيفُهُ» [بخاری، فضائل الصحابة، باب قول النبي ﷺ: "لو كنت منخذًا خليلًا" : ۳۶۷۳] "میرے ساتھیوں کو برا بھلا مت کہو، کیونکہ قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر تم میں سے کوئی شخص احد کے برابر سونا بھی خرچ کرے تو ان کے کسی شخص کے ایک مد (آدھا کلو گرام) کے برابر نہیں ہو سکتا اور نہ ہی اس کے نصف کے برابر ہو سکتا ہے۔"

﴿۱۱﴾ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ: ایمان، انفاق اور قتال فی سبیل اللہ کی ترغیب کے آخر میں فرمایا کہ جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ تعالیٰ اس سے پوری طرح باخبر ہے، وہ ہر ایک کے عمل کو خوب جانتا ہے کہ کس درجے کا ہے اور اس میں کتنا اخلاص ہے اور وہ اس کے مطابق ہی اسے جزا دے گا۔

آیت 11 مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا..... اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ بقرہ (۲۲۳، ۲۲۵) اور "أَجْرُ كَرِيمٍ" کے لیے دیکھیے سورہ انفال (۷۳) اور سورہ حج (۵۰)۔

آیت 12 يَوْمَ تَكْرَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ : یعنی قیامت کے دن جب سورج لپٹ دیا جائے گا (دیکھیے مکتوبہ ۱) اور

يَوْمَ يَقُولُ الْمُنْفِقُونَ وَالْمُنْفِقَاتُ لِلَّذِينَ آمَنُوا انظُرُونَا نَقْتَسِمْ مِنْ تَوْرِكُمْ ؕ قِيلَ ازْجِعُوا وَرَاءَكُمْ فَالْتَمِسُوا نُورًا ؕ فَضُرِبَ بَيْنَهُم بِسُورٍ لَهُ بَابٌ مَّا بَاطِنُهُ فِيهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهُ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ﴿۱۳﴾

جس دن منافق مرد اور منافق عورتیں ان لوگوں سے کہیں گے جو ایمان لائے ہمارا انتظار کرو کہ ہم تمہاری روشنی سے کچھ روشنی حاصل کر لیں۔ کہا جائے گا اپنے پیچھے لوٹ جاؤ، پس کچھ روشنی تلاش کرو، پھر ان کے درمیان ایک دیوار بنا دی جائے گی جس میں ایک دروازہ ہوگا، اس کی اندرونی جانب، اس میں رحمت ہوگی اور اس کی بیرونی جانب، اس کی طرف عذاب ہوگا ﴿۱۳﴾

چاند بے نور ہو جائے گا (دیکھیے قیامہ: ۸) اور ستارے بکھر کر گر جائیں گے (دیکھیے انفطار: ۲) تو اس وقت سب لوگ سخت اندھیرے میں ہوں گے، جہنم کے اوپر صراط (پل) رکھا جائے گا جس پر سے ہر ایک کو گزرنا ہوگا، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَإِن مِّنكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلَىٰ رَبِّنَا حَتْمًا مَّقْضِيًّا﴾ [مریم: ۷۱] ”اور تم میں سے جو بھی ہے اس پر وارد ہونے والا ہے۔ یہ ہمیشہ سے تیرے رب کے ذمے قطعی بات ہے، جس کا فیصلہ کیا ہوا ہے۔“ وہاں روشنی صرف ایمان اور عمل صالح کی ہوگی، جتنا ایمان کامل ہوگا اتنی ہی روشنی تیز ہوگی۔ کافر اور منافق دنیا میں گمراہی کے اندھیرے میں رہے تو وہاں بھی وہ اندھیرے میں ہوں گے۔ مومن مردوں اور عورتوں کی روشنی ان کے ایمان و عمل کے مراتب کے مطابق ان کے آگے اور دائیں جانب دوڑ رہی ہوگی اور وہاں انہیں یہ کہہ کر جنت کی بشارت دی جائے گی: ﴿بَشِّرْكُمْ الْيَوْمَ حَتَّىٰ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ﴾ [الحديد: ۱۲] ”آج تمہیں ایسے باغوں کی خوش خبری ہے جن کے تلے نہریں چلتی ہیں، ہمیشہ ان میں رہنے والے ہو، یہی تو بہت بڑی کامیابی ہے۔“

آیت 13 ﴿يَوْمَ يَقُولُ الْمُنْفِقُونَ وَالْمُنْفِقَاتُ.....: دنیا میں مسلمانوں کے ساتھ رہنے کی طرح منافقین وہاں بھی شروع میں ایمان والوں کے ساتھ ہوں گے، مگر جب وہ اپنے ایمان کی روشنی میں جنت کی جانب روانہ ہوں گے کہ تو منافق مرد اور عورتیں ان سے کہیں گے ہمارے پاس روشنی نہیں، تم ہمیں اندھیرے میں چھوڑ کر اتنی تیزی سے نہ جاؤ، بلکہ تھوڑا انتظار کر لو اور ہمیں موقع دو کہ ہم بھی تمہاری روشنی میں جنت کی طرف چلتے جائیں۔

﴿قِيلَ ازْجِعُوا وَرَاءَكُمْ فَالْتَمِسُوا نُورًا﴾ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ ان سے کہا جائے گا کہ میدان حشر جہاں جنت یا جہنم میں بھیج جانے کا فیصلہ ہوا ہے اور جہاں سے روشنی ملتی ہے، تم وہیں واپس جاؤ اور وہاں روشنی تلاش کرو۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہ ایمان و عمل کی روشنی ہے جو یہاں حاصل نہیں ہو سکتی، اسے حاصل کرنے کی جگہ دنیا ہے، وہاں جاؤ اور وہاں سے یہ روشنی لے کر آؤ۔

يُنَادُونَهُمْ أَلَمْ نَكُنْ مَعَكُمْ ۚ قَالُوا بَلَىٰ وَ لِكُنْكُمْ فَتَنْتُمْ أَنْفُسَكُمْ وَ تَرَبَّصْتُمْ وَ ارْتَبْتُمْ وَ غَرَّتْكُمْ الْإِمَانُ حَتَّىٰ جَاءَ أَمْرُ اللَّهِ وَ غَزَّكُمْ بِاللَّهِ الْغُرُورُ ﴿۱۴﴾ ۚ قَالِيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ

وہ انہیں آواز دیں گے کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟ وہ کہیں گے کیوں نہیں اور لیکن تم نے اپنے آپ کو فتنے میں ڈالا اور تم انتظار کرتے رہے اور تم نے شک کیا اور (جھوٹی) آرزوؤں نے تمہیں دھوکا دیا، یہاں تک کہ اللہ کا حکم آ گیا اور اس دعا باز نے تمہیں اللہ کے بارے میں دھوکا دیا ﴿۱۴﴾ سو آج نہ تم سے کوئی فدیہ لیا جائے گا اور نہ ان لوگوں سے

﴿۱۳﴾ فَصُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُورٍ لَهُ بَابٌ.....: مومن و منافق یہ باتیں کر ہی رہے ہوں گے کہ ان کے درمیان ایک عظیم دیوار حائل کر دی جائے گی، (سُورٍ میں تنوین تعظیم کی ہے) جس سے انہیں دور سے دکھائی دینے والی مومنوں کی روشنی بھی نظر آنا ختم ہو جائے گی۔ اس دیوار کی اندرونی جانب رحمت ہوگی اور بیرونی جانب جدھر منافق ہوں گے، عذاب ہوگا۔ اس دیوار میں ایک عظیم دروازہ ہوگا، جس سے مومن اس کی اندرونی جانب چلے جائیں گے، پھر دروازہ بند کر دیا جائے گا اور منافق اس سے باہر عذاب میں رہ جائیں گے۔

بیت 14 ﴿۱﴾ يُنَادُونَهُمْ أَلَمْ نَكُنْ مَعَكُمْ: منافق انہیں پکار پکار کر کہیں گے کہ کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے، کیا ہم کلمہ نہیں پڑھتے تھے، کیا ہم تمہارے ساتھ نمازیں نہیں پڑھتے تھے، زکوٰۃ اور حج ادا نہیں کرتے تھے اور ہر کام میں تمہارے ساتھ نہیں ہوتے تھے؟ اب تم ہمیں ساتھ کیوں نہیں لے جاتے؟

﴿۲﴾ قَالُوا بَلَىٰ وَ لِكُنْكُمْ فَتَنْتُمْ أَنْفُسَكُمْ: یعنی تم مسلمان ہو کر بھی نہ دل سے مسلمان ہوئے اور نہ پوری طرح ایک طرف ہو کر مسلمانوں کے ساتھی بنے، بلکہ تم نے اپنے آپ کو نفاق کے فتنے ہی میں مبتلا رکھا۔

﴿۳﴾ وَ تَرَبَّصْتُمْ: اور تم انتظار میں رہے کہ کب مسلمانوں پر کوئی آفت آتی ہے۔

﴿۴﴾ وَ ارْتَبْتُمْ: یہ ”رَبِّبٌ“ سے باب افتعال ”إِرْتَابٌ يَرْتَابُ إِرْتَابًا“ کے ماضی معلوم کا صیغہ ہے، یعنی اللہ اور اس کے رسول پر ایمان و یقین کے بجائے تم شک اور تذبذب میں رہے۔

﴿۵﴾ وَ غَرَّتْكُمْ الْإِمَانُ: ”الْإِمَانُ“ ”أَمْنِيَّةٌ“ کی جمع ہے، یعنی تمہیں ان آرزوؤں نے دھوکے میں رکھا کہ بس چند دن میں مسلمان تباہ ہو جائیں گے اور اسلام کا نام و نشان مٹ جائے گا۔

﴿۶﴾ حَتَّىٰ جَاءَ أَمْرُ اللَّهِ: حتیٰ کہ تمہیں موت آگئی اور توبہ اور اخلاص عمل کا موقع ہاتھ سے نکل گیا۔

﴿۷﴾ وَ غَزَّكُمْ بِاللَّهِ الْغُرُورُ: ”الْغُرُورُ“ سے مراد شیطان ہے۔ مزید دیکھیے سورہ فاطر (۶۵)۔

بیت 15 ﴿۱﴾ قَالِيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ.....: اس سے معلوم ہوا کہ قیامت کے دن کفار و منافقین کا ٹھکانا ایک ہی

ہوگا، جو آگ ہے۔ وہاں وہ مال نہ منافقین کے کام آئے گا جس کی وجہ سے وہ نفاق کا شکار رہے، نہ کفار کے کہ اس کے ساتھ فدیہ دے کر عذاب سے چھوٹ جائیں اور نہ ہی آگ کے سوا ان کا کوئی یار و مددگار ہوگا اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔ مزید دیکھیے

مِنْكُمْ فِدْيَةٌ وَلَا مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ مَا أَوْلَكُمُ النَّارُ ۚ هِيَ مَوْلَاكُمْ ۚ وَبِئْسَ الْبَصِيرُ ﴿۱۵﴾
 أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۗ وَلَا
 يَكُونُوا كَالَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ ۗ وَكَثِيرٌ
 مِنْهُمْ فَاسِقُونَ ﴿۱۶﴾

جنہوں نے انکار کیا، تمہارا ٹھکانا ہی آگ ہے، وہی تمہاری دوست ہے اور وہ برا ٹھکانا ہے ﴿۱۵﴾ کیا ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے، وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد کے لیے اور اس حق کے لیے جھک جائیں جو نازل ہوا ہے اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جنہیں ان سے پہلے کتاب دی گئی، پھر ان پر لمبی مدت گزر گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے اور ان میں سے بہت سے نافرمان ہیں ﴿۱۶﴾

سورہ آل عمران (۹۱)۔

آیت 16 : ﴿۱۶﴾ أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا.....: ”لم یأْن“ ”اننی یأْنی انیا و انی“ (ض) ناقص یأْنی سے مجد معلوم ہے، کسی چیز کے وقت کا آجانا، جیسا کہ فرمایا: ﴿غَدْرَ نَظِيرِينَ اِنَّهُ﴾ [الأحزاب: ۵۳] ”اس (کھانے) کے (پکنے کے) وقت کا انتظار نہ کرنے والے۔“ پچھلی آیت میں قیامت کے دن مومن مردوں اور عورتوں اور منافق مردوں اور عورتوں کا حال ذکر فرمایا، جسے سن کر دل لرز اٹھتے ہیں اور خوف زدہ ہو کر عاجزی سے اپنے رب کے سامنے جھک جاتے ہیں۔ اس کے باوجود ان سے کما حقہ اثر قبول نہ کرنے پر ایمان والوں کو متنبہ فرمایا کہ کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کی نصیحت کی وجہ سے اور اس کی طرف سے نازل ہونے والے حق کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجز ہو کر جھک جائیں؟ ایمان والوں سے مراد وہ تمام ایمان والے ہیں جنہیں اس سے پہلے ایمان لانے، اللہ کی راہ میں خرچ کرنے اور لڑنے کا حکم دیا گیا ہے اور اس میں سستی اور کوتاہی پر عتاب کیا گیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آیات میں اتنا عتاب سن کر اور قیامت کے دن منافقین کا انجام بد سن کر بھی کیا ایمان والوں کے لیے اللہ کے سامنے جھکنے اور اس کے احکام پر تن دہی سے عمل کرنے کا وقت نہیں آیا؟ جب کہ ایمان کا تقاضا تو یہ ہے کہ اللہ کی آیات سن کر دل نرم ہو جائے اور اللہ کو یاد کرتے ہوئے فوراً نصیحت کا اثر قبول کرے، کیونکہ ایمان والوں کی یہی شان ہوتی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿اِنَّهَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ ۗ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهُ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا ۗ وَاَعْلٰى رَبِّهِمْ يَسْتَوِيْنَ﴾ [الأنفال: ۲] ”(اصل) مومن تو وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب ان پر اس کی آیات پڑھی جائیں تو انہیں ایمان میں بڑھا دیتی ہیں اور وہ اپنے رب ہی پر بھروسہ رکھتے ہیں۔“ اور فرمایا: ﴿اللّٰهُ نَزَلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشٰبِهًا مَثٰنٰتٍ ۙ تَشْعُرُ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۗ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ﴾ [الزمر: ۲۳] ”اللہ نے

إِعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۗ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿۱۷﴾

جان لو کہ اللہ زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرتا ہے، بلاشبہ ہم نے تمہارے لیے آیات کھول کر بیان کر دی ہیں، تاکہ تم سمجھو ﴿۱۷﴾

سب سے اچھی بات نازل فرمائی، ایسی کتاب جو آپس میں ملتی جلتی ہے، (ایسی آیات) جو بار بار دہرائی جانے والی ہیں، اس سے ان لوگوں کی کھالوں کے روٹکنے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں، پھر ان کی کھالیں اور ان کے دل اللہ کے ذکر کی طرف نرم ہو جاتے ہیں۔“

﴿۱۷﴾ وَلَا يَكُونُوا كَالَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ : ”قَسَتْ“ اصل میں ”قَسَوْتُ“ ہے، باب اس کا ”قَسَا يَقْسُوْنَ قَسْوَةً“ و ”قَسَاوَةٌ“ آتا ہے، سخت ہو جانا۔ یعنی کیا ایمان والوں کے لیے وقت نہیں آیا کہ..... اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جنہیں اس سے پہلے کتاب یعنی تورات اور اس کے بعد انجیل دی گئی کہ شروع میں ان کا یہ حال تھا کہ اللہ کی آیات سن کر ان کے دل نرم ہو جاتے اور وہ ڈر جاتے تھے اور اپنی خواہشات کے پیچھے چلنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرتے تھے، پھر جیسے جیسے انبیاء کے زمانے سے دوری ہوتی گئی وہ خواہشات اور دنیا کی لذتوں کے پیچھے پڑتے گئے اور اللہ کے احکام جاننے کے باوجود ان پر عمل چھوڑ بیٹھے، جس سے ان کے دل سخت ہو گئے اور انہوں نے دانستہ اللہ کی حرام کردہ چیزوں کو حلال کر لیا۔ شرک، زنا، قتل ناحق، چوری، سود خوری اور دوسرے گناہ عام ہو گئے۔ اللہ کی آیات سن کر دل نرم ہونے اور ان کے سامنے جھک جانے کے بجائے انہوں نے ان میں تحریف شروع کر دی، جس کے نتیجے میں وہ راہِ راست سے بہت دور چلے گئے اور باہمی ضد اور عناد میں بہت سے فرقوں میں بٹ گئے۔

﴿۱۸﴾ وَكَيْفَ مِنْهُمْ فَيَقُولُونَ : یعنی اب بھی ان کا یہی حال ہے کہ ان میں سے بہت زیادہ لوگ ناسق ہیں۔ ”فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ“ میں ان کی قلبی حالت کا بیان ہے اور ”فَيَقُولُونَ“ میں ان کی عملی حالت کا بیان ہے۔ دوسری جگہ اس قسوت قلب کا سبب اور اس کا نتیجہ کچھ تفصیل سے بیان فرمایا ہے، وہاں ان کے دوسرے عہد توڑنے کے ساتھ قرضِ حسن دینے کا عہد توڑنے کا بھی ذکر فرمایا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ مائدہ کی آیت (۱۲، ۱۳) کی تفسیر۔

آیت 17 ﴿۱۷﴾ إِعْلَمُوا : ”جان لو“ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ یہ بات نہیں جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ زمین کو مرنے کے بعد زندہ کر دیتا ہے، بلکہ یہ ایسے ہی ہے جیسے فرمایا: ﴿وَإِعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي أَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوهُ﴾ [البقرة: ۲۳۵] ”اور جان لو کہ اللہ جانتا ہے جو تمہارے دلوں میں ہے، پس اس سے ڈرو۔“ مقصد یہ ہے کہ یہ بات پوری توجہ سے سنو، اس پر غور کرو اور ہر وقت اسے پیش نظر رکھو۔

﴿۱۹﴾ أَنَّ اللَّهَ يُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا : اس میں اللہ کی طرف رجوع کی اور گزشتہ کوتاہیوں کی اصلاح کی ترغیب اور اپنی کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

إِعْلَمُوا أَنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَ لَهْوٌ وَ زِينَةٌ وَ تَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَ تَكَاثُرٌ فِي الْأَمْوَالِ وَ الْأَوْلَادِ مِثْلُ عَيْثٍ ائْتَجَبَ الْكُفَّارُ نَبَاتُهُ ثُمَّ يَهْبِيهِ فَتَرَاهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ

جان لو کہ دنیا کی زندگی اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک کھیل ہے اور دل لگی ہے اور بناؤ سنگار ہے اور تمہارا آپس میں ایک دوسرے پر بڑائی جتانہ ہے اور اموال اور اولاد میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرنا ہے، اس بارش کی طرح جس سے اگنے والی کھیتی نے کاشت کاروں کو خوش کر دیا، پھر وہ پک جاتی ہے، پھر تو اسے دیکھتا ہے کہ زرد ہے،

حصر کا مفہوم ہے، مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں صدیقین اور شہداء کے لیے جو درجے ہیں وہ ہر مدعی ایمان کو حاصل نہیں ہو جائیں گے، بلکہ یہ صرف ان لوگوں کے لیے خاص ہیں جو اللہ اور اس کے رسولوں پر سچا اور پکا ایمان لائیں گے۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ کمال ایمان کے کئی مراتب ہیں، جیسا کہ صدیقیت و شہادت کے کئی مراتب ہیں، اگرچہ سب پر صدیق یا شہید کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ جابر بن عتیک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «الْشَّهَادَةُ سَبْعُ سُبُوحٍ الْقَتْلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ الْمَطْعُونُ شَهِيدٌ، وَالْعَرِيْقِيُّ شَهِيدٌ، وَصَاحِبُ ذَاتِ الْحَنْبِ شَهِيدٌ، وَالْمَبْطُونُ شَهِيدٌ، وَصَاحِبُ الْحَرِيْقِيِّ شَهِيدٌ، وَالَّذِي يَمُوتُ تَحْتَ الْهَدْمِ شَهِيدٌ، وَالْمَرْأَةُ تَمُوتُ بِحُجْمِ شَهِيدَةٌ» [مسندك حاکم: ۳۵۲/۱، ح: ۱۳۰۰، وصححه الألبانی فی صحیح الجامع: ۳۷۳۹] "اللہ کی راہ میں قتل ہونے کے علاوہ شہادت کی سات قسمیں ہیں، طاعون سے مرنے والا شہید ہے اور غرق ہونے والا شہید ہے اور ذات الجنب والا شہید ہے اور پیٹ کی تکلیف سے مرنے والا شہید ہے اور آگ سے مرنے والا شہید ہے اور گرنے والی دیوار وغیرہ کے نیچے آ کر مرنے والا شہید ہے اور ولادت کے وقت مرنے والی عورت شہید ہے۔" ظاہر ہے کہ حدیث میں مذکور سب لوگ شہید ہیں، مگر اللہ کی راہ میں قتل ہونے والے کا درجہ سب سے بلند ہے۔

② لَهْمُ أَجْرُهُمْ وَ نُورُهُمْ: یعنی صدیقیت یا شہادت کے مراتب کے مطابق اجر اور نور اہل ایمان ہی کا حصہ ہے، کفار یا منافقین کا نہیں۔

③ وَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا.....: اس سے معلوم ہوا کہ جہنم میں ہمیشہ وہی لوگ رہیں گے جنہوں نے اللہ اور اس کے رسولوں کے ساتھ کفر کیا اور ان کی تکذیب کی، کیونکہ "أَصْحَابُ الْجَحِيمِ" (بھڑکتی آگ کے ساتھی اور اس میں رہنے والے) وہی ہیں، گناہ گار مومن جہنم میں گئے بھی تو ہمیشہ اس میں نہیں رہیں گے، اس لیے وہ "أَصْحَابُ الْجَحِيمِ" نہیں ہیں۔

آیت 20 ﴿۱﴾ إِعْلَمُوا: بچھلی آیات سے اس آیت کی مناسبت یہ ہے کہ نفاق کا سبب اور اللہ کی راہ میں جہاد سے گریز اور مال خرچ کرنے سے دریغ کا باعث دنیا کی زندگی کی محبت ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے دنیا کی زندگی کی حقیقت بیان فرمائی۔

② أَنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا: "الْحَيَاةُ الدُّنْيَا" سے مراد انسان کے وہ کام ہیں جو وہ اس زندگی میں صرف دنیا میں حاصل

يَكُونُ حُطًا مَّا وَ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيدٌ ۙ وَ مَغْفِرَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَ رِضْوَانٌ ۙ وَ مَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ ﴿۲۰﴾

پھر وہ پُورا بن جاتی ہے اور آخرت میں بہت سخت عذاب ہے اور اللہ کی طرف سے بڑی بخشش اور خوشنودی ہے اور دنیا کی زندگی دھوکے کے سامان کے سوا کچھ نہیں ﴿۲۰﴾

ہونے والے فوائد کے لیے کرتا ہے، ورنہ اس زندگی میں وہ آخرت کے لیے اعمالِ صالحہ کے ذریعے سے ہمیشہ کی سعادت بھی حاصل کر سکتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا قَبْلَ أَنْ يَأْتِيَهُ الْيَوْمُ الَّذِي فِيهِ يُنْفَخُ الْأَشْفَادُ وَ تُنْفَخُ الْأَنْفُسُ فَهُوَ مَرْغُوبٌ ۙ فَكُلِّمْنِي حَيَاتِي حَيَاةً طَيِّبَةً ۙ وَ لَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ [النحل: ۹۷] ”جو بھی نیک عمل کرے، مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہو تو یقیناً ہم اسے ضرور زندگی بخشیں گے، پاکیزہ زندگی اور یقیناً ہم انہیں ان کا اجر ضرور بدلے میں دیں گے، ان بہترین اعمال کے مطابق جو وہ کیا کرتے تھے۔“

﴿۱﴾ لَعِبٌ وَ لَهْوٌ: اس کی وضاحت کے لیے دیکھیے سورہ عنکبوت (۶۳) کی تفسیر۔

﴿۲﴾ وَ زِينَةٌ وَ تَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَ تَكَاثُرٌ فِي الْأَمْوَالِ وَ الْأَوْلَادِ: یہ سچے اور مخلص اہل ایمان یعنی صدیقین و شہداء کے مقابلے میں ایمان سے محروم دنیا دار لوگوں کا حال ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کی تمام خواہشوں اور دلچسپیوں کا ذکر ان پانچ باتوں میں فرما دیا ہے۔ شاہ عبدالقادر بریلویؒ لکھتے ہیں: ”آدمی کو اول عمر میں کھیل چاہیے، پھر تماشا، پھر بناؤ سنگار، پھر ساکھ بڑھانا اور نام و نمود حاصل کرنا اور جب مرنا قریب ہو تو مال اور اولاد کی فکر کرنا کہ میرے بعد میرا گھر بنا رہے اور اولاد آسودگی سے زندگی بسر کرے۔ یہ سب دھوکے کا سامان ہے، آگے کچھ اور کام آئے گا (ایمان اور عملِ صالح) یہ کچھ کام نہ آئے گا۔“ (موضح بتصرف)

﴿۳﴾ كَثِيرٌ غَيْثٌ غَيْثٌ أَنْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتًا.....: ”غَيْثٌ“ بارش، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ هُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْ بَعْدِ مَا قَنَطُوا﴾ [النور: ۲۸] ”اور وہی ہے جو بارش برساتا ہے، اس کے بعد کہ وہ ناامید ہو چکے ہوتے ہیں۔“ ”الْكُفَّارَ“ سے مراد یہاں کاشت کار ہیں، جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿يُغْجِبُ الزُّرَّاعَ﴾ [الفتح: ۲۹] ”کاشت کرنے والوں کو خوش کرتی ہے۔“ کیونکہ کفر کا معنی چھپانا ہے اور کاشت کار بیج کو زمین میں چھپا دیتا ہے۔ آیت کے دوسرے الفاظ اور تمثیل کی تشریح کے لیے دیکھیے سورہ یونس (۲۳)، زمر (۲۱) اور سورہ کہف (۳۵) کی تفسیر۔ اس کے علاوہ دیکھیے سورہ آل عمران (۱۵، ۱۴) کی تفسیر۔ بعض مفسرین نے ”الْكُفَّارَ“ سے مراد حقیقی کافر لیے ہیں، ان کے مطابق اگرچہ بارش سے اگنے والی کھیتی مومن و کافر سبھی کو خوش کرتی ہے، مگر کفار کا ذکر خصوصاً اس لیے فرمایا کہ وہ اس پر زیادہ خوش ہوتے ہیں، کیونکہ ان کی خوشی کا تمام سرمایہ حیات دنیا ہے۔

﴿۴﴾ وَ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيدٌ ۙ وَ مَغْفِرَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَ رِضْوَانٌ: یعنی بات صرف اتنی نہیں کہ دنیا کی زندگی ختم ہو اور جان چھوٹ جائے، بلکہ اصل معاملہ اس کے بعد آخرت کا اور اس کی ہمیشہ کی زندگی کا ہے کہ وہاں دو میں سے ایک بات سے

سَابِقُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَا أَعْدَتْ
لِلَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ﴿۱۱﴾

اپنے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف ایک دوسرے سے آگے بڑھو جس کی چوڑائی آسمان اور زمین کی چوڑائی کی طرح ہے، وہ ان لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے۔ یہ اللہ کا فضل ہے، وہ اسے اس کو دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور اللہ بہت بڑے فضل والا ہے ﴿۱۱﴾

ہر حال میں واسطہ پڑنے والا ہے، ایک طرف شدید عذاب ہو گا اور دوسری طرف اللہ کی بخشش اور اس کی زبردست رضا ہوگی۔
”رِضْوَانٌ“ مصدر میں مبالغے کا مفہوم ہے۔

﴿۷﴾ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا مَتَاعُ الْعٰزِزِۙ: یعنی جس نے ساری جدوجہد دنیا کی زندگی بنانے کے لیے کی وہ دھوکے میں پڑ گیا، کیونکہ اس نے جو کچھ کمایا دنیا کی زندگی ختم ہونے کے ساتھ ختم ہو گیا اور آخرت میں اس کے لیے کچھ باقی نہ رہا۔ البتہ ایسے لوگوں کے لیے دنیا کی زندگی دھوکا نہیں جنہوں نے اسے آخرت کے حصول کا ذریعہ بنایا، کیونکہ ان کے اعمال دنیا کے فنا ہونے کے باوجود باقی رہنے والے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿النَّالُ وَالْبُنُوْنَ زِينَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا، وَالْبَقِيٰتُ الصَّالِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ كَوٰبًا وَخَيْرًا اَمَلًا﴾ [الكهف: ۶۶] ”مال اور بیٹے دنیا کی زندگی کی زینت ہیں اور باقی رہنے والی نیکیاں تیرے رب کے ہاں ثواب میں بہتر اور امید کی رو سے زیادہ اچھی ہیں۔“

آیت 21 ﴿۱﴾ سَابِقُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ: ”سَابِقُوا“ ”سَبَقَ يَسْبِقُ سَبَقًا“ (ض، ن) سے باب مفاعلہ کا امر حاضر ہے۔ اس میں مقابلے کا مفہوم پایا جاتا ہے، یعنی ایک دوسرے کے مقابلے میں ایسے اعمال کی طرف آگے بڑھو جن سے تم مغفرت اور جنت کے مستحق بن سکو۔ مثلاً میدان قتال کی پہلی صف میں ہونا، امام کے ساتھ تکبیر تحریرہ میں شامل ہونا اور اللہ کی راہ میں دوسروں سے بڑھ چڑھ کر خرچ کرنا وغیرہ۔ یہ آیت سورہ آل عمران کی آیت (۱۳۳) سے ملتی جلتی ہے، اس کی تفسیر پر بھی نظر ڈال لیں۔

﴿۲﴾ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ: ”السَّمَاءُ“ کا لفظ یہاں بطور جنس استعمال ہوا ہے، مراد تمام آسمان ہیں۔ دلیل اس کی سورہ آل عمران کی یہ آیت ہے: ﴿وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ﴾ [آل عمران: ۱۳۳] ”اور ایک دوسرے سے بڑھ کر دوڑو اپنے رب کی جانب سے بخشش کی طرف اور اس جنت کی طرف جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین (کے برابر) ہے۔“

﴿۳﴾ اُعِدَّتْ لِلَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ: یہاں اتنا ہی ذکر ہے کہ جنت ایمان والوں کے لیے تیار کی گئی ہے، جبکہ سورہ آل عمران (۱۳۳) میں ان ایمان والوں کے چند اعمال کا بھی ذکر ہے جن کی وجہ سے وہ اللہ کے فضل کے حق دار ٹھہرتے ہیں۔

ان میں پہلا عمل خوشی اور تکلیف میں خرچ کرنا ہے، جس کا ذکر یہاں ”أَنْفَقُوا“ میں گزر چکا ہے۔

مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنْفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِنْ قَبْلِ أَنْ نُبْرَأَهَا ۗ إِنَّ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ﴿۲۷﴾

کوئی مصیبت نہ زمین پر پہنچتی ہے اور نہ تمہاری جانوں پر مگر وہ ایک کتاب میں ہے، اس سے پہلے کہ ہم اسے پیدا کریں۔ یقیناً یہ اللہ پر بہت آسان ہے ﴿۲۷﴾

﴿۲۷﴾ ذَلِكَ فَضَّلَ اللَّهُ يُؤْتِيهِ مِنْ يَشَاءُ... اس سے معلوم ہوا کہ جنت میں داخلہ محض اللہ کے فضل کے ساتھ ہوگا، کیونکہ اللہ تعالیٰ پر کسی کا کوئی حق واجب نہیں اور انسان جتنے بھی عمل کر لے وہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ایک نعمت کا بھی بدل نہیں ہو سکتے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ فرما رہے تھے: «لَنْ يُدْعَلَ أَحَدًا عَمَلُهُ الْأُخْتَىٰ، قَالُوا وَلَا أَنْتَ يَا رَسُولَ اللَّهِ؟ قَالَ لَا، وَلَا أَنَا إِلَّا أَنْ يَتَّعَمِدَنِي اللَّهُ بِفَضْلِهِ وَرَحْمَتِهِ» بخاری، المرضی، باب تمنی العریض العوب: ۵۶۷۳۔ ”کسی بھی شخص کو اس کا عمل جنت میں ہرگز داخل نہیں کرے گا۔“ لوگوں نے کہا: ”یا رسول اللہ! آپ کو بھی نہیں؟“ فرمایا: ”نہیں، مجھے بھی نہیں، الا یہ کہ اللہ مجھے فضل اور رحمت سے ڈھانپ لے۔“ البتہ اعمال صالحہ اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت کے حصول کا سبب بنتے ہیں، دیکھیے سورہ اعراف (۴۳) کی تفسیر۔

آیت 22 ﴿۱﴾ مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ... ”اَصَابَ“ کا مفعول یہ محذوف ہے: ”أُصِبْتُ مَا أَصَابَكُمْ أَوْ مَا أَصَابَ أَحَدًا مِنْ مُصِيبَةٍ...“ ”یعنی تمہیں یا کسی کو جو بھی مصیبت پہنچتی ہے خواہ زمین میں ہو یا تمہاری جانوں میں...“ سورت کی ابتدا سے جہاد میں مال و جان خرچ کرنے کی تاکید آ رہی ہے، چونکہ اس راہ میں کئی طرح کی جسمانی و ذہنی اور مالی و جانی مصیبتیں پیش آتی ہیں، مثلاً بھوک، پیاس، فقر، خوف، غم، تھکاوٹ، بیماری، زخم، چوٹ، گرفتاری اور قتل وغیرہ، اس لیے آدمی جہاد پر جانے سے گریز کرتا ہے اور اپنے آپ کو ان مصیبتوں سے بچانے کی کوشش کرتا ہے اور اگر جہاد کے لیے چلا جائے تو ان مصائب کے پیش آنے پر پریشان ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو مالی یا جانی مصیبت تمہیں پیش آتی ہے وہ ہر حال میں آکر رہے گی، تم اس سے بچنے کی جتنی بھی کوشش کر لو اس سے بھاگ نہیں سکتے۔ ہر آنے والی مصیبت یا راحت اللہ تعالیٰ نے اس کے پیدا کرنے اور تمہاری جانوں کو پیدا کرنے، بلکہ زمین کو پیدا کرنے سے بھی پہلے ایک کتاب میں لکھ دی ہے، کسی کی طاقت نہیں کہ اس لکھے ہوئے کو منادے یا بدل دے۔ مزید دیکھیے سورہ قمر (۴۹) اور سورہ توبہ (۵۱) کی تفسیر۔

﴿۲﴾ فِي الْأَرْضِ: اس سے زمین پر آنے والی عام مصیبتیں مراد ہیں، مثلاً قحط، طوفان، سیلاب، زلزلے اور وباؤں وغیرہ، جن سے انسان متاثر ہوتا ہے۔

﴿۳﴾ وَلَا فِي أَنْفُسِكُمْ: اس سے وہ مصیبتیں مراد ہیں جو انسان کی ذات پر آتی ہیں، مثلاً بیماری، زخم، بھوک، پیاس، گرفتاری، فقر، خوف، غم، بیماریوں کی موت اور اپنی موت وغیرہ۔ ”وَلَا فِي أَنْفُسِكُمْ“ میں حرف نافیہ ”لَا“ کو دوبارہ ان مصیبتوں کی اہمیت کی وجہ سے ذکر فرمایا، کیونکہ آدمی اپنی جان پر آنے والی مصیبتوں سے زیادہ متاثر ہوتا ہے، دوسروں پر آنے والی مصیبتوں سے وہ

لَيْكِلَا تَأْسُوا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ

تاکہ تم نہ اس پر غم کرو جو تمہارے ہاتھ سے نکل جائے اور نہ اس پر پھول جاؤ جو وہ تمہیں عطا فرمائے اور اللہ کسی تکبر
ذہنی طور پر متاثر ہوتا ہے، جسی طور پر نہیں۔

④ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَبْرَأَهَا: "بِرَاءً بَرَاءً بَرَاءً وَ بَرَاءً" (ف) پیدا کرنا۔ "ہا" ضمیر "مُصِيبَةً" کی طرف بھی جاسکتی ہے،
"الْأَمْرِضِ" کی طرف بھی اور "أَنْفُسِكُمْ" کی طرف بھی۔ یہ کلام الہی کی بلاغت ہے کہ تینوں مراد ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر
مصیبت کو اس مصیبت کے پیدا کرنے سے پہلے، انسان کے پیدا کرنے سے پہلے اور زمین کے پیدا کرنے سے بھی پہلے لکھ دیا ہے۔
⑤ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ: یعنی انسان کو چونکہ آئندہ کا کچھ علم نہیں، اس لیے اس کے لیے یہ بات ناممکن ہے کہ وہ آئندہ
کی بات پہلے لکھ دے، مگر اللہ تعالیٰ کے لیے یہ بالکل ہی معمولی بات ہے، کیونکہ وہ گزشتہ اور موجودہ کی طرح آئندہ کی ہر بات
کو بھی جانتا ہے۔ مزید دیکھیے سورہ قمر (۳۹) کی تفسیر۔

بیت 23 ① لَيْكِلَا تَأْسُوا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ: "لَا تَأْسُوا" "أَسِيئَ يَأْسِي أَسِيًّا" (حَشِيئَ يَحْشِيئُ) (عَمَلِينَ هُونًا)

سے نفی مضارع معلوم ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا: ﴿فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ﴾ [المائدة: ۲۶] [۲۶]
"بس تو ان نافرمان لوگوں پر غم نہ کر۔" اور شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کے ہلاک ہونے پر فرمایا: ﴿كَيْفَ أَسِي عَلَى قَوْمٍ
كُفِرِينَ﴾ [الأعراف: ۹۳] "تو میں نہ ماننے والے لوگوں پر کیسے غم کروں۔" "أَسِيئَكُمْ" "أَسِيئَ يَأْسِيئُ" (ض) آنا اور
"أَسِيئَ يُؤْسِيئُ" (افعال) دینا۔ یعنی ہم نے تمہیں یہ بات بتادی ہے، تاکہ جو چیز تمہارے ہاتھ سے نکل جائے، خواہ ملنے
کے بعد چلی جائے یا مل ہی نہ سکے، اس پر تم غم نہ کرو اور اللہ تعالیٰ تمہیں جو کچھ دے اس پر پھول نہ جاؤ، کیونکہ جب تم جان لو
گے کہ ہر چیز اللہ کی تقدیر میں لکھی ہوئی ہے تو ہاتھ سے نکلنے والی چیز پر تم زیادہ غمگین نہیں ہو گے اور ملنے والی چیز پر اتراؤ گے
نہیں، کیونکہ جسے معلوم ہو کہ جانے والی چیز نے جانا ہی تھا تو وہ اس کے جانے پر زیادہ جزع فزع نہیں کرتا، اس لیے کہ وہ ہر
وقت اپنے آپ کو اس کے لیے تیار رکھتا ہے۔ اسی طرح جب اسے معلوم ہو کہ جو فائدہ اسے حاصل ہونا ہے وہ ہونا ہی ہونا
ہے، ممکن ہی نہیں کہ حاصل نہ ہو تو وہ اس کے حاصل ہونے پر اتراے گا نہیں، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ میری بہادری سے حاصل
نہیں ہوا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ آدمی اللہ کی تقدیر سمجھ کر نقصان پر صبر کرے گا اور فائدے پر اپنی خوبی سمجھنے کے بجائے اللہ کا شکر کرے گا۔

② اس آیت کا مطلب یہ نہیں کہ کسی چیز کے حاصل کرنے کے لیے آدمی کو کوشش بھی نہیں کرنی چاہیے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ
کوشش کے بعد اگر ناکامی ہو تو غم نہیں بلکہ صبر کرنا چاہیے اور کامیابی کی صورت میں فخر و غرور نہیں بلکہ شکر بجالانا چاہیے۔ اللہ
تعالیٰ نے اسی کو تقدیر پر ایمان کا فائدہ قرار دیا ہے اور اسی عقیدہ پر کاربند رہ کر زندگی میں اعتدال رہتا ہے اور آدمی افراط و تفریط
سے محفوظ رہتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «الْمُؤْمِنُ الْقَوِيُّ خَيْرٌ وَأَحْسَبُ إِلَى اللَّهِ مِنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِيفِ وَ فِي
كُلِّ خَيْرٍ، أَحْرَصُ عَلَىٰ مَا يَنْفَعُكَ وَاسْتَعِينُ بِاللَّهِ وَلَا تَعْجَزْ وَ إِنْ أَصَابَكَ شَيْءٌ فَلَا تَقُلْ لَوْ أَنِّي فَعَلْتُ كَذَا

فُخُورٌ ﴿۳۳﴾

کرنے والے، بہت فخر کرنے والے سے محبت نہیں رکھتا ﴿۳۳﴾

كَذَّابًا وَكَذَّابًا وَلَكِنْ قُلْ قَدَرُ اللَّهِ وَمَا شَاءَ فَعَلَ فَإِنَّ لَوْ تَفْتَحُ عَمَلَ الشَّيْطَانِ ﴿۳۳﴾ [مسلم، القدر، باب في الأمر بالقوة وترك العجز ... : ۲۶۶، عن أبي هريرة رضي الله عنه] ”طاقتور مومن کمزور مومن سے بہتر اور اللہ تعالیٰ کو زیادہ محبوب ہے اور ہر ایک میں بھلائی موجود ہے۔ جو چیز تجھے نفع دے اس کی حرص کر اور اللہ سے مدد مانگ اور عاجز نہ ہو اور اگر تجھے کوئی (نقصان دہ) چیز پہنچے تو یہ مت کہہ کہ اگر میں اس طرح کرتا تو اس طرح اور اس طرح ہو جاتا، بلکہ یوں کہہ کہ اللہ نے قسمت میں (اسی طرح) لکھا تھا اور جو اس نے چاہا کر دیا، کیونکہ ”لَوْ“ (اگر) کا لفظ شیطان کا کام کھول دیتا ہے۔“

﴿۳۳﴾ یہاں ایک سوال ہے کہ مصیبت پر غم اور راحت پر خوشی انسانی فطرت ہے، پھر ہاتھ سے نکلنے والی چیز پر غم سے اور عطا ہونے والی چیز پر خوش ہونے سے کیوں منع فرمایا، جب کہ ان پر ہمارا اختیار ہی نہیں؟ جواب اس کا یہ ہے کہ منع اس غم سے کیا گیا ہے جو اس حد تک پہنچ جائے کہ آدمی جزع فزع اور اللہ تعالیٰ کا شکوہ کرنے لگے۔ اگر اللہ کی رضا پر راضی رہے تو غم پر کوئی مواخذہ نہیں، بلکہ اس پر صبر کا اجر بھی ملتا ہے۔ اگر غم ہی نہ ہو تو صبر کس بات پر ہوگا؟ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: «إِنَّ الْعَيْنَ تَدْمَعُ وَالْقَلْبَ يَحْزَنُ، وَلَا نَقُولُ إِلَّا مَا يَرْضَى رَبُّنَا وَإِنَّا بِفِرَاقِكَ يَا إِبْرَاهِيمَ! لَمَحْزُونُونَ» [بخاری، الحناظر، باب قول النبي ﷺ: ”إنا بك لمحزونون“ : ۱۳۰۳] ”آکھ آتسو بہاتی ہے اور دل غمگین ہوتا ہے اور ہم اس کے سوا جو ہمارا رب پسند فرمائے کچھ نہیں کہتے اور یقیناً تیری جدائی سے اے ابراہیم! ہم غمزدہ ہیں۔“ اسی طرح منع اس خوش ہونے سے کیا گیا ہے جو آدمی کو شکر کے بجائے فخر و غرور تک پہنچا دے۔ دلیل اس کی آیت کے آخری الفاظ ”وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ“ ہیں۔ ہر خوشی سے منع نہیں کیا گیا، کیونکہ اگر خوشی ہی نہ ہو تو شکر کس بات پر کرے گا؟

﴿۳۴﴾ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ: ”مُخْتَالٌ“ ”خ ی ل“ سے باب افتعال کا اسم فاعل ہے، جو اپنے خیال میں بڑا بننے والا ہو، متکبر۔ ”فُخُورٌ“ ”فُخِرَ“ میں سے مبالغے کا صیغہ ہے، جو دوسروں کے سامنے بہت فخر کرنے والا ہو۔ تقدیر کو مد نظر نہ رکھتے کا نتیجہ ہر کامیابی کو اپنی بہادری اور کارکردگی سمجھنا ہے، جس سے آدمی میں تکبر اور فخر پیدا ہوتا ہے، حالانکہ اگر آدمی کی اپنی کارکردگی بھی ہو تو وہ، بلکہ اس کا اپنا وجود سب اللہ تعالیٰ کی عطا ہے اور اس نے یہ سب کچھ پہلے لکھ دیا ہے، پھر جو شخص اس پر شکر کے بجائے تکبر و فخر کرتا ہے اس سے اللہ تعالیٰ محبت کیسے کر سکتا ہے؟

﴿۳۵﴾ بعض اہل علم نے فرمایا کہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے دو چیزیں بیان فرمائی ہیں، ایک ”إِغْلَبُوا أَنفُسَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لِعِبٍّ وَ لَهُمْ.....“ اور دوسری ”مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنْفُسِكُمْ.....“ پھر فرمایا: ﴿لِيَكِلَا تَأْسَوا عَلَى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ﴾ مطلب یہ ہے کہ ہم نے تمہیں دنیا کی زندگی اور اس کی زیب و زینت کا فانی ہونا مثال دے کر اس لیے سمجھایا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں جو کچھ دے اس پر پھول نہ جاؤ، بلکہ یاد رکھو کہ یہ عارضی اور فانی ہے اور

الَّذِينَ يَبْعَلُونَ وَيَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ۖ وَمَنْ يَتَوَلَّ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ الْعَنِيُّ الْحَمِيدُ ﴿۲۴﴾ لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ مَنْ يَنْصُرُهُ

وہ لوگ جو بخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بخل کا حکم دیتے ہیں اور جو منہ موڑ جائے تو یقیناً اللہ ہی ہے جو بڑا بے پروا ہے، بہت تعریفوں والا ہے ﴿۲۴﴾ بلاشبہ یقیناً ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلیلوں کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور ترازو کو نازل کیا، تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں، اور ہم نے لوہا اتارا جس میں سخت لڑائی (کا سامان) ہے اور لوگوں کے لیے بہت سے فائدے ہیں اور تاکہ اللہ جان لے کہ کون دیکھے بغیر اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے۔

ہم نے یہ بات کہ ہر مصیبت پہلے سے لکھی ہوئی ہے، اس لیے بتائی ہے کہ تم اس کے آنے پر زیادہ غم نہ کرو۔ گویا یہ لف نشر غیر مرتب ہے۔ یہ تفسیر بھی پُر لطف ہے۔

آیت 24 ﴿۱﴾ الَّذِينَ يَبْعَلُونَ وَيَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ: مراد اس سے منافقین ہیں جو کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو چکے تھے، مگر جب جہاد کا موقع آتا تو جنگ میں شرکت سے گریز کرتے اور خرچ کرنے سے بخل کرتے، بلکہ اپنے ہم نواؤں کو بھی خرچ کرنے سے منع کرتے تھے، جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿هُمُ الَّذِينَ يَقُولُونَ لَا تُنْفِقُوا عَلٰی مَنْ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ حَتّٰی يَنْفِقُوا ۗ وَ لِلّٰهِ خَزَايِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ﴾ [المنافقون: ۷] ”یہ وہی ہیں جو کہتے ہیں کہ ان لوگوں پر خرچ نہ کرو جو اللہ کے رسول کے پاس ہیں، یہاں تک کہ وہ منتشر ہو جائیں، حالانکہ آسمانوں کے اور زمین کے خزانے اللہ ہی کے ہیں اور لیکن منافق نہیں سمجھتے۔“

﴿۲﴾ وَمَنْ يَتَوَلَّ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ الْعَنِيُّ الْحَمِيدُ: ضمیر فصل ”هُوَ“ لانے سے اور خبر ”الْعَنِيُّ الْحَمِيدُ“ پر الف لام لانے سے حصر پیدا ہو رہا ہے کہ اللہ ہی غنی و حمید ہے، کوئی اور نہیں۔ یعنی جو شخص اتنی نصیحت سن کر بھی جہاد میں خرچ کرنے سے منہ موڑے اور سمجھے کہ اس کے خرچ نہ کرنے سے اسلام اور مسلمانوں کا کوئی نقصان ہو جائے گا تو اس کا یہ خیال باطل ہے، کیونکہ آسمان و زمین کے تمام خزانوں کا مالک تو صرف اللہ تعالیٰ ہے (جیسا کہ پچھلے فائدے میں گزرا) اور غنی وہ اکیلا ہی ہے، دوسرے سب اس کے محتاج ہیں، جو کوئی بھی خرچ کرتا ہے اس کے دیے میں سے خرچ کرتا ہے اور اپنے فائدے کے لیے خرچ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے خرچ کرنے سے بے نیاز ہے۔ غنی کے ساتھ حمید کی صفت بیان فرمائی، کیونکہ بہت سے اغنیاء عارضی غنی کے مالک ہونے کے باوجود اپنی غنی کو مذموم کاموں میں استعمال کرتے ہیں مگر اللہ ایسا غنی ہے کہ وہ ہر مذموم صفت اور فعل سے پاک ہے اور تمام کمالات اور خوبیوں کا مالک ہے۔

آیت 25 ﴿۱﴾ لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ.....: اوپر کی آیات میں جس خرچ کی تاکید کی گئی ہے اس کا تعلق جہاد سے

وَرُسُلَهُ بِالْغَيْبِ إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ ﴿۱۹﴾

یقیناً اللہ بڑی قوت والا، سب پر غالب ہے ﴿۱۹﴾

ہے۔ کفار اور اہل کتاب کو جب ہزاروں دوسرے مقامات پر شکستوں پر شکستیں ہوئیں تو انہوں نے پروپیگنڈا شروع کر دیا جو آج تک جاری ہے کہ محمد (ﷺ) اللہ کے رسول اور اسلام اللہ کا دین کیسے ہو سکتے ہیں؟ ان کے نزدیک تو سب سے بڑی نیکی جنگ اور خون ریزی ہے، بھلا اللہ کے رسولوں اور اس کے نیک بندوں کا خون ریزی سے کیا تعلق؟ وہ تو امن و سلامتی والے ہوتے ہیں اور دنیا کے دھندوں سے الگ تھلگ رہبانیت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں تین باتیں واضح فرمائیں، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جتنے رسول بھیجے انھیں واضح دلائل دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل فرمائی، تاکہ لوگ راہِ راست پر چل سکیں اور باہمی معاملات میں عدل و انصاف پر قائم رہیں۔ دوسری یہ کہ عدل و انصاف کا تقاضا ہے کہ ظلم و جور کا خاتمہ کیا جائے، جو قوت و سلطنت کے بغیر ممکن نہیں۔ اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے کتاب و میزان کے ساتھ لوہا اتارا، جس میں دوسرے بے شمار فائدوں کے ساتھ یہ فائدہ بھی ہے کہ اس کے ذریعے سے جہاد ہوتا ہے، جس کے ساتھ عدل و انصاف قائم ہوتا ہے اور ایمان والوں کا امتحان ہوتا ہے کہ اللہ کے دین کی مدد کرنے والے مومن کون ہیں اور اس سے جان چھڑانے والے منافق کون ہیں۔ تیسری بات یہ فرمائی کہ نوح اور ابراہیم علیہم السلام اور ان کی اولاد میں جتنے رسول آئے سب کا مقصد حق اور عدل کا قیام ہی تھا۔ عیسیٰ علیہ السلام بھی انہی کے طریقے پر تھے، یہود کی سنگ دلی کے مقابلے میں ان کے پیروکاروں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر رافت و رحمت رکھی تھی۔ اس نرمی کا بہانہ بنا کر ان کے بعض نام نیواؤں نے رہبانیت اختیار کی اور جہاد چھوڑ دیا، حالانکہ یہ ان کی اپنی ایجاد کردہ بدعت تھی، اللہ کا حکم ہرگز نہ تھا۔ مسلمانوں میں ترک جہاد کا باعث بھی نصرانیوں کی تقلید میں یہی رہبانیت بنی۔

﴿۱۹﴾ وَأَنْزَلْنَا لَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ... اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ شوریٰ کی آیت (۱۷۱) کی تفسیر۔

﴿۲۰﴾ وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ: لوہا اگرچہ زمین سے نکلتا ہے مگر اس نعمت کی عظمت کا احساس دلانے کے لیے ”أَنْزَلْنَا“ کا لفظ استعمال فرمایا ہے، جیسا کہ چوپاؤں کے متعلق فرمایا: ﴿وَأَنْزَلْنَا لَكُمْ مِنَ الْأَنْعَامِ حَدِيدًا﴾ [النمر: ۶۰] اور اس نے تمہارے لیے چوپاؤں میں سے آٹھ قسمیں (نروادہ) اتاریں۔“ اس میں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہے کہ ہر نعمت کا اصل سرچشمہ آسمان ہی ہے، جہاں سے اللہ کا حکم صادر ہوتا ہے تو ہر چیز وجود میں آتی ہے اور اس تعلیم کی طرف بھی اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ بندوں کے دلوں میں لوہے کو حاصل کرنے اور اس کے استعمال کے طریقوں کا القا فرماتا ہے۔

﴿۲۱﴾ فِيهِ نَافَعٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعٌ لِلنَّاسِ: اس میں یہ بات قابل توجہ ہے کہ لوہے کے دوسرے ”منافع“ کو بعد میں ذکر فرمایا ہے اور سخت لڑائی کا ذکر پہلے فرمایا ہے۔ اس سے جہاد اور اسلحہ کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ منافع سے مراد وہ بے شمار مشینیں، آلات اور سواریاں ہیں جو ایجاد ہو چکی ہیں اور آئندہ ہوں گی۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا وَ إِبْرَاهِيمَ وَ جَعَلْنَا فِي ذُرِّيَّتِهَا الشُّبُوكَ وَ الْكِنْبَ فَمِنْهُمْ مُّقْتَدٍ ۝
وَ كَثِيرٌ مِنْهُمْ فَسِقُونَ ﴿۲۶﴾ ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِم بِرُسُلِنَا وَ قَفَّيْنَا بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے نوح اور ابراہیم کو بھیجا اور ان دونوں کی اولاد میں نبوت اور کتاب رکھی، پھر ان میں سے کچھ سیدھی راہ پر چلنے والے ہیں اور ان میں سے زیادہ نافرمان ہیں ﴿۲۶﴾ پھر ہم نے ان کے نقش قدم پر پے در پے اپنے رسول بھیجے اور ان کے پیچھے عیسیٰ ابن مریم کو بھیجا اور اسے انجیل دی اور ہم نے ان لوگوں کے دلوں میں جنھوں نے

﴿۲۶﴾ وَ لِيَعْلَمَ اللَّهُ مَن يَنْصُرُهُ وَ رُسُلَهُ بِالْغَيْبِ: جہاد کی حکمتوں میں سے ایک حکمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہے تو ایک لمحے میں کفار کو نیست و نابود کر سکتا ہے، مگر وہ جہاد کے ذریعے سے اپنے بندوں کا امتحان کرتا ہے کہ اسے دیکھے بغیر کون اس کی خاطر لڑتا اور اس کے دین کی مدد کرتا ہے اور کون پیچھے رہتا ہے۔ ”وَ لِيَعْلَمَ اللَّهُ“ کے لیے دیکھیے سورہ آل عمران (۱۳۰ تا ۱۳۲) اور سورہ عنکبوت (۳) کی تفسیر۔

﴿۲۷﴾ إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ: یعنی اللہ تعالیٰ نے بندوں کو جہاد کا حکم اپنی کسی کمزوری کی وجہ سے نہیں دیا، بلکہ انھی کے قائد کے لیے اور امتحان کے لیے دیا ہے، کیونکہ وہ تو بڑی قوت والا اور سب پر غالب ہے۔

آیت 26 : ﴿۱﴾ وَ لَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا وَ إِبْرَاهِيمَ ۝...: اس آیت میں پہلے نوح اور ابراہیم ﷺ کی بہت بڑی فضیلت بیان ہوئی ہے کہ دوسرے تمام انبیاء علیہم السلام انھی کی اولاد سے تھے، اس کے بعد اس میں بیانات اور کتاب و میزان لے کر آنے والے تمام انبیاء کا ذکر ہے اور یہ کہ ان کی امتوں نے اپنے رسولوں کے ساتھ کیا سلوک کیا اور ان میں بگاڑ کا باعث کیا تھا۔

﴿۲﴾ فَمِنْهُمْ مُّقْتَدٍ وَ كَثِيرٌ مِنْهُمْ فَسِقُونَ: ”مِنْ“ جمع کے لیے ہے، یعنی ان میں سے بعض راہِ راست پر چلنے والے ہیں اور ان کے زیادہ لوگ نافرمان ہیں۔ یعنی ان کے بگاڑ کا اصل باعث یہ تھا کہ وہ اپنی خواہش کے خلاف کسی کا حکم ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ایمان اور عمل صالح والے لوگ کم اور نافرمان لوگ ہمیشہ زیادہ رہے ہیں۔ مزید دیکھیے سورہ بص (۲۳) کی تفسیر۔

آیت 27 : ﴿۱﴾ ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِم بِرُسُلِنَا: ”قَفَّيْنَا“ ”قَفًّا“ سے مشتق ہے، جس کا معنی گدی (گردن کا پچھلا حصہ) ہے۔ ”آثَارٌ“ ”اَثَرٌ“ کی جمع ہے، نشانِ قدم۔ مراد یہ ہے کہ پہلے رسولوں کے بعد دوسرے رسول اس طرح بھیجے جس طرح ایک کی گردن کے پیچھے دوسرا اس کے نشانِ قدم پر چلتا ہوا آ رہا ہو۔ سب کی تعلیم ایک تھی، اور سب ایک ہی راستے کے مسافر تھے۔

﴿۲﴾ وَ قَفَّيْنَا بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَ آتَيْنَاهُ الْإِنجِيلَ: عیسیٰ ﷺ کا الگ خاص طور پر ذکر فرمایا، کیونکہ نبی کریم ﷺ سے پہلے سب سے آخر میں وہی تشریف لائے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں انجیل عطا فرمائی، جس میں تورات پر عمل کی تاکید تھی اور اس کے بعض سخت احکام میں نرمی کا اعلان تھا، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ لِأَجْلِ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي حَرَّمَ عَلَيْنَا﴾ | آل عمران: ۱۵۰ | ”اور تاکہ میں تمہارے لیے بعض وہ چیزیں حلال کروں جو تم پر حرام کی گئی تھیں۔“ البتہ وہ بھی اسی راستے پر چلنے والے تھے جس پر پہلے رسول چلتے تھے، جس میں جہاد کی تعلیم بھی تھی۔

وَأَتَيْنَهُ الْإِنجِيلَ ۖ وَجَعَلْنَا فِي قُلُوبِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ رَأْفَةً وَرَحْمَةً ۗ وَرَهْبَانِيَّةً

اس کی پیروی کی نرمی اور مہربانی رکھ دی اور دنیا سے کنارہ کشی تو انھوں نے خود ہی ایجاد کر لی، ہم نے اسے ان پر نہیں
﴿ وَجَعَلْنَا فِي قُلُوبِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ رَأْفَةً وَرَحْمَةً ﴾ ”رأفة“ وہ رحمت جو کسی سے تکلیف یا نقصان دور کرنے سے
 تعلق رکھتی ہو، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۗ ﴾
 [البقرة: ۲۰] ”اور تمہیں ان کے متعلق اللہ کے دین میں کوئی نرمی نہ پکڑے، اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔“ جبکہ
 ”رَحْمَةً“ کا لفظ عام ہے، جس میں ہر طرح کا رحم شامل ہے، خصوصاً جس میں نفع پہنچانے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ دیکھیے سورہ حج
 کی آیت (۶۵): ﴿ إِنْ لَمْ يَلِكْ بِاللَّاسِ لَوْ ذُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴾ کی تفسیر۔ عیسیٰ علیہ السلام کی پیروی کرنے والوں کے دلوں میں
 رافت و رحمت رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو جو کتاب انجیل عطا فرمائی تھی وہ بنیادی طور پر احکام کی نہیں
 بلکہ وعظ و تذکیر کی کتاب تھی، جس میں انھیں خاص طور پر نرمی اور رحم کے اخلاق اختیار کرنے پر زور دیا گیا تھا۔ چنانچہ انھوں
 نے اس پر عمل کیا، پھر عیسیٰ علیہ السلام کی سیرت پر عمل نے ان میں یہ صفت مزید پختہ کر دی، چونکہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی عنایت اور
 اس کے فضل سے ہوا، اس لیے فرمایا کہ ہم نے اس کی پیروی کرنے والوں کے دلوں میں رافت و رحمت رکھ دی۔

انجیل میں رافت و رحمت پر زور دینے کی وجہ یہ تھی کہ عیسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل کے نفوس کی اصلاح کے لیے اور ان کے
 دلوں سے اس سختی کو دور کرنے کے لیے مبعوث کیا گیا تھا جو طویل مدتیں گزرنے کی وجہ سے ان کے دلوں میں پیدا ہو چکی تھی،
 جیسا کہ فرمایا: ﴿ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَابِ رَوَّافَةٌ ۗ أَؤَلَسْتُمْ أَنْتُمْ قَوْمٌ مُّشْرِكُونَ ﴾ [البقرة: ۷۴] ”پھر اس کے
 بعد تمہارے دل سخت ہو گئے تو وہ پتھروں جیسے ہیں، یا سختی میں (ان سے بھی) بڑھ کر ہیں۔“ عیسیٰ علیہ السلام کے اصحاب یہود کے
 برعکس آپس میں نہایت نرم اور مہربان تھے، ہمارے رسول ﷺ کے اصحاب میں بھی یہ وصف بہت نمایاں تھا، جیسا کہ فرمایا:
 ﴿ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ ﴾ [الفتح: ۲۹] ”اور وہ لوگ جو اس کے ساتھ ہیں کافروں پر بہت
 سخت ہیں، آپس میں نہایت رحم وال ہیں۔“

﴿ وَرَهْبَانِيَّةً ۗ لِيَتَذَكَّرَ اللَّهُ أُمَّةً رَّهْبًا ۗ ﴾ ”رہب“ ڈرنے والا۔ ”رہبان“ (بروزن فغلائق)
 بہت ڈرنے والا۔ ”رہبانیۃ“ کی نسبت اسی ”رہبان“ کی طرف ہے، یعنی رہبان کا طریقہ اختیار کرنا، جو شدت خوف سے
 شادی نہیں کرتا کہ بیوی بچے اس کی عبادت میں رکاوٹ نہ بنیں، لوگوں سے علیحدگی اختیار کرتا ہے کہ اسے عبادت سے غافل نہ
 کریں۔ کھانے پینے کی لذیذ اشیاء سے اجتناب کرتا ہے کہ دنیا کی حرص اور نفس کی خواہشوں سے بچ سکے، اس لیے وہ آبادی
 سے الگ جنگل یا بان میں کٹیا بنا کر عبادت میں مصروف ہو جاتا ہے۔ یہ طریقہ انبیاء کا طریقہ نہیں، نہ انھوں نے اس کی تعلیم
 دی ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم دیا ہے۔ ان کا طریقہ تو اللہ کی توحید اور اس کے دین کی طرف دعوت دینا اور لوہے
 کے استعمال کے ساتھ اس کی راہ میں رکاوٹ بننے والوں کا قلع قمع کرنا ہے۔ سو جن لوگوں نے ترک دنیا کا راستہ اختیار کر کے

ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَائِهَا قَاتِلْنَا

لکھا تھا مگر اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے (انھوں نے یہ کام کیا) پھر انھوں نے اس کا خیال نہ رکھا جیسے اس کا

دعوت و جہاد کا کام چھوڑ دیا، یہ طریقہ ان کی اپنی ایجاد تھی، اللہ تعالیٰ نے انھیں ایسا کرنے کا حکم نہیں دیا تھا۔ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ

کہتے ہیں: «لَمَّا كَانَ مِنْ أَمْرِ عُثْمَانَ بْنِ مَطْعُونٍ الَّذِي كَانَ مِنْ تَرْكِ النَّسَاءِ بَعَثَ إِلَيْهِ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا عُثْمَانُ! إِنِّي لَمْ أَوْمَرْ بِالرَّهْبَانِيَّةِ أُرْغِبْتَ عَنْ سُنتِي؟ قَالَ لَا يَا رَسُولَ اللَّهِ! قَالَ إِنَّ مِنْ

سُنَّتِي أَنْ أُصَلِّيَ وَأَنَامَ، وَأَصُومَ وَأَطْعَمَ، وَ أَنْكَحَ وَأَطْلَقَ، فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنتِي فَلَيْسَ مِنِّي» [سنن دارمی:

۱۷۹/۲، ح: ۲۱۶۹، قال المحقق حسين سليم أسد الداراني إسناده صحيح و الحديث منفق عليه | "جب عثمان بن

مطعون رضی اللہ عنہ کے عورتوں کو ترک کرنے والا معاملہ ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے ان کی طرف پیغام بھیجا اور فرمایا: "اے عثمان! مجھے

رہبانیت کا حکم نہیں دیا گیا، کیا تم نے میرے طریقے سے بے رغبتی اختیار کر لی ہے؟" انھوں نے کہا: "نہیں یا رسول اللہ!"

آپ ﷺ نے فرمایا: "میرے طریقے میں سے یہ ہے کہ میں نماز پڑھتا ہوں اور سوتا (بھی) ہوں اور روزہ رکھتا ہوں اور کھاتا

(بھی) ہوں اور میں نکاح بھی کرتا ہوں اور طلاق بھی دیتا ہوں، تو جو شخص میرے طریقے سے بے رغبتی کرے وہ مجھ سے نہیں۔"

انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ تین آدمی رسول اللہ ﷺ کی بیویوں کے گھروں کی طرف آئے، وہ نبی ﷺ کی عبادت

کے متعلق پوچھ رہے تھے۔ جب انھیں (اس کے بارے) بتایا گیا تو گویا انھوں نے اسے کم سمجھا اور کہنے لگے: "کہاں ہم اور

کہاں نبی ﷺ! اللہ تعالیٰ نے آپ کے تو پہلے پچھلے سب گناہ معاف فرما دیے ہیں۔" تو ان میں سے ایک نے کہا: "میں تو

ہمیشہ رات بھر نماز پڑھا کروں گا۔" دوسرے نے کہا: "میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا، کبھی روزے کے بغیر نہیں رہوں گا۔" تیسرے

نے کہا: "میں عورتوں سے الگ رہوں گا، کبھی نکاح نہیں کروں گا۔" رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو آپ نے فرمایا: «أَنْتُمْ

الَّذِينَ قُلْتُمْ كَذَا وَ كَذَا؟ أَمَا وَاللَّهِ! إِنِّي لَأُحْشَاكُمْ لِلَّهِ وَ أَتَفَاكُمُ لَهُ، لِكَيْتِي أَصُومُ وَ أَفْطِرُ، وَ أُصَلِّي وَ أُرْقُدُ

وَ أَتَزَوَّجُ النَّسَاءَ، فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنتِي فَلَيْسَ مِنِّي» [بخاری، النکاح، باب الترغيب في النکاح ۵۰۶۳] "تمھی

لوگوں نے یہ یہ باتیں کہی ہیں؟ سن لو! اللہ کی قسم! میں تم سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا ہوں اور اس کے تقویٰ والا

ہوں، لیکن میں روزہ رکھتا ہوں اور نہیں بھی رکھتا، نماز پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور میں عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، تو

جو میرے طریقے سے بے رغبتی کرے وہ مجھ سے نہیں۔"

۵ مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ: یعنی ہم نے انھیں رہبانیت کا حکم نہیں دیا تھا، بلکہ انھوں نے اسے خود ہی ایجاد کر لیا تھا۔

۶ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ: یہ استثنا منقطع ہے اور "إِلَّا" "لِکِنْ" کے معنی میں ہے: "اُی مَا كَتَبْنَا هَا عَلَيْهِمْ لِكِنْ

فَعَلُوهَا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ" یعنی ہم نے انھیں اس کا حکم نہیں دیا، مگر انھوں نے (ترک دنیا کا) یہ کام اللہ کی رضا حاصل

کرنے کے لیے کیا۔ یہ معنی بھی ہو سکتا ہے: "لِکِنْ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ" یعنی ہم نے انھیں رہبانیت کا حکم تو

الَّذِينَ آمَنُوا وَبَنُوا لَهُمْ آجْرَهُمْ ۚ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَسِقُونَ ﴿۷۵﴾

خیال رکھنے کا حق تھا، تو ہم نے ان لوگوں کو جو ان میں سے ایمان لائے ان کا اجر دے دیا اور ان میں سے بہت سے ان فرمان ہیں ﴿۷۵﴾

نہیں دیا، لیکن ہم نے انہیں اللہ کی رضا حاصل کرنے کا حکم دیا۔

﴿۷۵﴾ فَتَارَعَوْهَا حَتَّىٰ رِغَابِيهَا: رہبانیت اختیار کرنے والوں کی دو طرح سے مذمت فرمائی، ایک یہ کہ انہوں نے دین میں وہ بات ایجاد کی جس کا انہیں اللہ تعالیٰ نے حکم نہیں دیا تھا۔ دوسرا یہ کہ انہوں نے رہبانیت ایجاد کر کے اپنے آپ پر ترک دنیا کی جو پابندیاں عائد کی تھیں انہیں اس طرح نہ نبھاسکے جس طرح نبھانے کا حق تھا۔ ہمارے شیخ محمد عبدہ لکھتے ہیں: ”یعنی انہوں نے دو جرم کیے، ایک رہبانیت (درویشی) کو دین کا جزو لاینفک قرار دے لیا اور پھر اس درویشی کے حقوق و آداب کی بھی نگہداشت نہ کر سکے۔ چنانچہ انہوں نے ابتدا میں توحید اور درویشی کو ایک ساتھ نبھانے کی کوشش کی، لیکن مسیح یگانہ کے تیسری صدی بعد سے اپنے بادشاہوں کے بہکانے میں آگئے اور تثلیث کے چکر میں پھنس کر توحید کو چھوڑ دیا، پھر درویشی تو درکنار اصل ایمان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ درویشی کو جاہ و ریاست طلبی کا ذریعہ بنا لیا اور باطل طریقوں سے لوگوں کا مال کھانے لگے۔ الغرض جہاد کے فریضہ کو چھوڑ کر تصوف کی رسوم اختیار کرنا ہی رہبانیت ہے، جس کی قرآن نے مذمت کی ہے اور پھر درویشی یا دینی پیشوائی کو (اللہ کی رضا کے بجائے) جاہ و ریاست اور دنیا طلبی کا ذریعہ بنانا تو ناقابل عفو گناہ ہے، جو یہود و نصاریٰ میں عام و باک شمل اختیار کر گیا تھا۔“ (اشرف الحواشی) شاہ عبدالقادر فرماتے ہیں: ”یہ فقیری اور تارک دنیا بنانا نصاریٰ نے رسم نکالی، جنگل میں تکیہ لگا کر بیٹھے، نہ بیوی رکھتے نہ اولاد، نہ کھاتے نہ جوڑتے، محض عبادت میں رہتے، خلق سے نہ ملتے۔ اللہ نے بندوں پر یہ حکم نہیں رکھا، مگر جب اپنے اوپر نام رکھا ترک دنیا کا، پھر اس پر دے میں دنیا چاہتی بڑا وبال ہے۔“ (موضح) آج کل روزانہ اخبارات میں نصرانی چرچوں میں پادریوں اور راہبوں کے ترنا اور قوم لوط کے عمل کی خبریں اسی ”فَتَارَعَوْهَا حَتَّىٰ رِغَابِيهَا“ کی عملی تفسیر ہیں۔

﴿۷۶﴾ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ: کے فرمان ”لَتَتَّبِعَنَّ سُنَنَ مَنْ قَبْلِكُمْ“ کے مطابق امت مسلمہ میں بھی رہبانیت تصوف کی صورت میں رائج ہوگئی۔ [دیکھیے بحاری: ۳۴۵۶] دنیا میں اسلام کو غالب کرنے اور جہاد کے بجائے ترک دنیا کمال ٹھہرا، تو توحید کے بجائے چہر پرستی اور قبر پرستی پھیل گئی۔ احسان کی منزل یہ تھی کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرے گویا اسے دیکھ رہا ہے، سواگر یہ اسے نہیں دیکھتا تو وہ اسے یقیناً دیکھ رہا ہے۔ تصوف میں اس کے بجائے کمال یہ ٹھہرا کہ شیخ کا تصور اس طرح رکھو کہ ایک لمحہ بھی دل و دماغ اور آنکھوں سے جدا نہ ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے اللہ کا قرب حاصل کرنے کا کوئی طریقہ نہیں چھوڑا جو نہ بتایا ہو، یہاں ان طریقوں کو چھوڑ کر نصرانی راہبوں اور ہندو جوگیوں کے طریقے اللہ تعالیٰ کے قرب کا ذریعہ ٹھہرے۔ مثلاً روزے رکھنے کے بجائے ترک حیوانات جمالی و جلالی کیا گیا، یعنی کوئی حیوان یا اس سے نکلنے والی چیز مثلاً گوشت یا دودھ یا گھی نہ کھایا جائے۔ قرآن مجید کی تلاوت اور مستون اذکار کے بجائے سانس بند کر کے خود ساختہ وظیفوں کو، جن کے ساتھ تصور شیخ کا

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَآمِنُوا بِرَسُولِهِ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَحْمَتِهِ وَيَجْعَلْ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، وہ تمہیں اپنی رحمت سے دوہرا حصہ دے گا

شکر ہو، ولایت کے حصول کا مستند طریقہ قرار دیا گیا۔ محنت اور کمائی کے بجائے لوگوں کے نذرانوں یا گدائی کے ٹکڑوں پر گزر کرنا فقر کی منزل قرار پایا۔ قرآن کی دعوت کے ساتھ جہاد کی تلوار لے کر دنیا پر اسلام کو غالب کرنے کی جدوجہد کے بجائے جنگوں بیابانوں یا مقبروں اور خانقاہوں میں ”ہو حق“ کی ضریمیں مقصد حیات قرار پائیں۔

مسجدیں ویران ہوئیں اور مقبرے آباد ہوئے اور یہ کام کرنے والوں کی پارسائی اور روحانی اقتدار کے اتنے جھوٹے قصے مشہور کیے گئے کہ نصرانی راہبوں اور ہندو جوگیوں کی ولایت کے افسانے ان کے مقابلے میں بیچ ہو گئے۔ احبار و رہبان کے باطل طریقوں کے ساتھ لوگوں کے مال کھانے اور اللہ کی راہ سے روکنے کا کوئی طریقہ باقی نہ رہا جو یہاں اختیار نہ کیا گیا ہو۔ جو لوگ دنیاوی مصروفیت کی وجہ سے یہ کام نہ کر سکے انھوں نے بھی کتاب و سنت پر عمل کے بجائے ان خدا رسیدہ ہستیوں کی خدمت کو نجات کے لیے کافی سمجھا اور انھیں قیامت کے دن اپنا کارساز سمجھ کر عمل سے فارغ ہو گئے۔ نتیجہ کفار کے غلبے اور مسلمانوں کی ذلت اور غلامی کی صورت میں سب کے سامنے ہے۔ اس کا علاج اب بھی وہی ہے جو اس مبارک سورت میں بتایا گیا ہے کہ رہبانیت کے بجائے پوری زندگی اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے مطابق بسر کی جائے، لوگوں کے بنائے ہوئے طریقوں کے بجائے کتاب و سنت سے ثابت اعمال کی پابندی کی جائے اور اللہ کے دین کو غالب کرنے کے لیے اس کی راہ میں جہاد کیا جائے اور جان و مال کی قربانی سے کسی قسم کا دریغ نہ کیا جائے۔ کیونکہ جس طرح تورات و انجیل کی تعلیم رہبانیت کے بجائے قرآن فی سبیل اللہ تھی اسی طرح قرآن مجید کی تعلیم بھی یہی ہے، دلیل اس کی یہ آیت ہے: ﴿إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ مُبْتَاعِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيُقْتَلُونَ وَيُقْتَلُونَ وَعَدَا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرَةِ وَالْإِنْجِيلِ وَالْقُرْآنِ﴾ [التوبة: ۱۱۱] ”بے شک اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے اموال خرید لیے ہیں، اس کے بدلے کہ ان کے لیے جنت ہے، وہ اللہ کے راستے میں لڑتے ہیں، پس قتل کرتے ہیں اور قتل کیے جاتے ہیں، یہ تورات اور انجیل اور قرآن میں اس کے ذمے پکا وعدہ ہے۔“

۹ ﴿قَاتِلُوا الَّذِينَ آمَنُوا وَنَهَمُوا أَعْرَهُمْ﴾: ان میں دو قسم کے لوگ شامل ہیں، ایک وہ جو رہبانیت اور اس کے خود ساختہ عقائد و اعمال مثلاً ستلیٹ، قبر پرستی اور ترک دنیا کے بجائے صحیح ایمان و عمل پر قائم رہے، جو تورات و انجیل سے ثابت تھے، تو اللہ تعالیٰ نے انھیں ان کا اجر عطا فرما دیا اور دوسرے وہ لوگ جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کا زمانہ پایا اور آپ پر ایمان لے آئے تو اللہ تعالیٰ نے انھیں بھی ان کا اجر عطا فرما دیا۔

۱۰ ﴿وَكَبِيرٌ مِنْهُمْ فَسُفُونَ﴾: یعنی ان میں سے بہت سے لوگ وہ تھے جو اپنی خواہش کے خلاف اللہ اور اس کے رسول کا حکم ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔

آیت 28 ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَآمِنُوا بِرَسُولِهِ﴾: مفسرین نے اس آیت کی تفسیر دو طرح سے کی

لَكُمْ نُورًا تَمْشُونَ بِهِ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٢٨﴾

اور تمہارے لیے ایسی روشنی کر دے گا جس کے ذریعے تم چلتے رہو گے اور تمہیں بخش دے گا اور اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۲۸﴾

ہے، ایک یہ کہ ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا“ کے الفاظ کے مخاطب اہل کتاب ہیں جو اس سے پہلے اپنے نبی پر ایمان کا دعویٰ رکھتے تھے، انہیں حکم دیا جا رہا ہے کہ اللہ سے ڈر جاؤ اور اس کے رسول محمد ﷺ پر ایمان لے آؤ، تو اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی رحمت سے دوہرا حصہ عطا فرمائے گا۔ اس کی تائید سورہ قصص کی آیات (۵۲ تا ۵۳) سے ہوتی ہے اور اس حدیث سے بھی جو ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «ثَلَاثَةٌ لَهُمْ أُجْرَانِ رَجُلٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمَنَ بِنَبِيِّهِ، وَآمَنَ بِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالْعَبْدُ الْمَمْلُوكُ إِذَا أَذَى حَقَّ لِلَّهِ وَحَقَّ مَوْلِيَّهِ، وَرَجُلٌ كَانَتْ عِنْدَهُ أُمَّةٌ يَطْوُهَا فَأَدَّبَهَا، فَأَحْسَنَ تَأْدِيبَهَا وَعَلَّمَهَا فَأَحْسَنَ تَعْلِيمَهَا ثُمَّ اعْتَقَهَا فَتَرَوَّجَهَا فَلَهُ أُجْرَانِ» [بخاری، العلم، باب تعليم الرجل أمته واهله: ۹۷] ”تین آدمی ایسے ہیں کہ ان کے لیے دو اجر ہیں، ایک اہل کتاب میں سے کوئی آدمی جو اپنے نبی پر ایمان لایا اور محمد ﷺ پر ایمان لایا اور ایک وہ غلام جو کسی کی ملکیت میں ہو، جب وہ اللہ کا حق ادا کرے اور اپنے مالکوں کا حق ادا کرے اور ایک وہ آدمی جس کے پاس ایک لونڈی تھی، وہ اس سے صحبت کرتا تھا، تو اس نے اسے ادب سکھایا اور اچھی طرح ادب سکھایا اور اسے تعلیم دی اور اچھی طرح تعلیم دی، پھر اسے آزاد کر دیا اور اس سے نکاح کر لیا، تو اس کے لیے بھی دو اجر ہیں۔“ اس تفسیر میں جو بات بیان ہوئی ہے وہ اپنی جگہ درست ہے، مگر یہاں ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا“ سے اہل کتاب میں سے مسلمان ہونے والے مراد لینا سیاق کے خلاف ہے، کیونکہ شروع سے آخر تک خطاب ان لوگوں سے ہے جو رسول اللہ ﷺ پر ایمان لائے، انہی کو اپنے ایمان میں اخلاص پیدا کرنے اور اللہ کی راہ میں قتال اور خرچ کا حکم آرہا ہے۔ اس آیت میں بھی انہیں اللہ سے ڈرنے اور اس کے رسول پر کما حقہ ایمان لانے کا حکم اور اس کی جزا کے طور پر اپنی نعمت کا دوہرا حصہ اور نور عظیم عطا کرنے کی بشارت کا ذکر ہے۔ اس لیے صحیح تفسیر ان حضرات کی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا“ کے ساتھ خطاب ان لوگوں سے ہے جو محمد ﷺ پر ایمان لائے، خواہ وہ اہل کتاب میں سے اسلام لائے ہوں یا مشرکین میں سے، یا پیدا ہی اسلام پر ہوئے ہوں، ان سب سے کہا جا رہا ہے کہ صرف زبان سے ایمان کے اقرار اور دعویٰ پر اکتفا نہ کرو، بلکہ سچے دل کے ساتھ ایمان لاؤ، اس کا حق ادا کرو اور اس کے تقاضے پورے کرو، تو اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی رحمت کا دوہرا حصہ عطا کرے گا۔

اس دوہرے حصے سے مراد ہماری اس امت کی خصوصیت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے محض اپنے فضل سے پہلی امتوں کی بہ نسبت دوہرے اجر کا وعدہ فرمایا ہے۔ نبی ﷺ نے یہ بات ایک مثال کے ساتھ واضح فرمائی، آپ ﷺ نے فرمایا: «مَثَلُكُمْ وَمَثَلُ أَهْلِ الْكِتَابِ كَمَثَلِ رَجُلٍ اسْتَأْجَرَ أَجْرَاءَ، فَقَالَ مَنْ يَعْمَلْ لِي مِنْ غُدْوَةٍ إِلَىٰ نِصْفِ النَّهَارِ عَلَيَّ فَيُرَاطِ؟ فَعَمِلَتْ النَّهْدُ، ثُمَّ قَالَ مَنْ يَعْمَلْ لِي مِنْ نِصْفِ النَّهَارِ إِلَىٰ صَلَاةِ الْعَصْرِ عَلَيَّ فَيُرَاطِ؟ فَعَمِلَتْ

لَيْلًا يَعْلَمَ أَهْلَ الْكِتَابِ إِلَّا يَقْدِرُونَ عَلَى شَيْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللَّهِ وَأَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ

تاکہ کتاب والے یہ نہ جانیں کہ وہ اللہ کے فضل میں سے کچھ بھی حاصل نہیں کر سکتے اور (جان لیں) کہ فضل اللہ

النَّصَارَى، ثُمَّ قَالَ مَنْ يَعْمَلْ لِي مِنَ الْعَصْرِ إِلَى أَنْ تَغِيَبَ الشَّمْسُ عَلَى قِيْرَاطَيْنِ؟ فَأَنْتُمْ هُمْ، فَغَضِبَتِ الْيَهُودُ

وَالنَّصَارَى، فَقَالُوا مَا لَنَا أَكْثَرَ عَمَلًا وَأَقَلَّ عَطَاءً؟ قَالَ هَلْ نَقَضْتُمْ مِّنْ حَقِّكُمْ؟ قَالُوا لَا قَالَ فَذَلِكَ فَضْلِي

أَوْخِيهِ مَنَ أَسْأَلُ | بخاری، الإحارۃ باب الإحارۃ إلى نصف النهار: ۲۶۶۸، ۳۴۵۹، عن ابن عمر رضی اللہ عنہما | ”تمھاری مثال اور

دونوں کتابوں (تورات و انجیل) والوں کی مثال اس آدمی کی مثال کی طرح ہے جس نے کئی مزدوروں کو اجرت پر رکھا اور کہا:

”کون ہے جو میرے لیے صبح سے نصف النہار تک ایک قیراط پر کام کرے گا؟“ تو یہود نے کام کیا۔ پھر اس نے کہا: ”کون

ہے جو میرے لیے نصف النہار سے عصر تک ایک قیراط پر کام کرے گا؟“ تو نصاریٰ نے کام کیا۔ پھر اس نے کہا: ”کون ہے جو

میرے لیے عصر سے سورج غروب ہونے تک دو قیراط پر کام کرے گا۔“ تو تم وہ لوگ ہو۔ اس پر یہود و نصاریٰ ناراض ہو گئے

اور کہنے لگے: ”ہمیں کیا ہے کہ ہم نے کام زیادہ کیا اور اجرت کم لی؟“ اس نے کہا: ”کیا میں نے تمھارے حق میں کوئی کمی کی

ہے؟“ انھوں نے کہا: ”نہیں!“ اس نے کہا: ”پھر یہ میرا فضل ہے، جسے چاہتا ہوں دیتا ہوں۔“

② وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُورًا تَمْشُونَ بِهِ... : یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرنے اور رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کی بدولت اللہ تعالیٰ

تمھیں کتاب و سنت کی صورت میں وحی الہی کا ایسا عظیم نور عطا کرے گا جس کے ذریعے سے تم دنیا و آخرت میں ہر جگہ آسانی

کے ساتھ چلتے رہو گے، کسی مسکنے میں تمھیں کوئی الجھن یا اندھیرا پیش نہیں آئے گا، جیسا کہ فرمایا: ﴿اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا

يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ﴾ البقرة ۲۵۷ ”اللہ ان لوگوں کا دوست ہے جو ایمان لائے، وہ انھیں اندھیروں

سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔“ اور قیامت کے دن کے اندھیروں میں وہ نور عطا کرے گا جس میں چلتے ہوئے تم جنت

تک پہنچ جاؤ گے، جس کا ذکر اس سے پہلے ”يَوْمَ تَكْرَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ يَسْعَى نُورُهُم بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ“

میں گزر چکا ہے اور تمھیں بخش دے گا اور اللہ غفور و رحیم ہے۔

آیۃ 29 ① لَيْلًا يَعْلَمَ أَهْلَ الْكِتَابِ إِلَّا يَقْدِرُونَ عَلَى شَيْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللَّهِ: یعنی اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ

نے تمھیں اپنی رحمت میں سے دو حصے اور عظیم نور دینے کی بشارت اس لیے دی ہے تاکہ اہل کتاب تمھارے متعلق یہ نہ جانیں

کہ یہ مسلمان اللہ کے فضل میں سے کچھ بھی حاصل نہیں کر سکتے۔

② وَأَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللَّهِ... : سیاق کلام سے ظاہر ہے کہ اس سے پہلے ”وَلْيَعْلَمُوا“ (اور تاکہ وہ جان لیں) محذوف

ہے، یعنی اور تاکہ وہ جان لیں کہ فضل اہل کتاب یا کسی اور کے ہاتھ میں نہیں بلکہ اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ جسے چاہتا ہے دیتا

ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی مشیت سے اس آخری نبی پر اخلاص کے ساتھ ایمان لانے والوں کو اپنے خاص فضل کے لیے منتخب

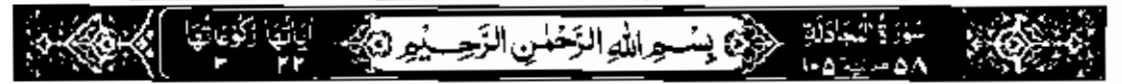
فرمایا ہے اور اللہ بہت بڑے فضل والا ہے۔

اللَّهُ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ ذُو الْقَضَى الْعَظِيمِ ﴿٧٩﴾

کے ہاتھ میں ہے، وہ اسے اس کو دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور اللہ بہت بڑے فضل والا ہے ﴿۷۹﴾

⑤ ابن جریر اور دوسرے کئی مفسرین نے فرمایا کہ ”إِنَّمَا يَعْلَمُ أَهْلَ الْكِتَابِ“ کا معنی ”لَيَعْلَمَ أَهْلَ الْكِتَابِ“ ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اپنی رحمت میں سے دو حصے اور نورِ عظیم کی بشارت اس لیے دی ہے تاکہ اہل کتاب (جو اپنے سوا کسی کو اللہ تعالیٰ کا فضل عطا ہونے کے قائل ہی نہیں) جان لیں کہ وہ اللہ کے فضل میں سے کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتے اور یہ کہ فضل سارے کا سارا اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ بہت بڑے فضل والا ہے۔ اس تفسیر پر یہ اعتراض ہے کہ اس میں ”لَا“ کو زائد مانا گیا ہے، حالانکہ اللہ کے کلام میں کوئی لفظ زائد کیسے ہو سکتا ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ یہاں ”لَا“ زائد ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بے کار ہے، بلکہ اسے بعد میں آنے والے ”أَلَّا يَقُولُونَ“ میں موجود نفی کی تاکید کے لیے لایا گیا ہے، جیسا کہ ایک جگہ فرمایا: ﴿مَا مَنَعَكَ أَنْ تَسْجُدَ﴾ [ص: ۱۷۰] ”تجھے کس چیز نے روکا کہ تو سجدہ کرے؟“ اور دوسری جگہ فرمایا: ﴿مَا مَنَعَكَ أَلَّا تَسْجُدَ﴾ [الأعراف: ۱۲] ”تجھے کس چیز نے روکا کہ تو سجدہ نہیں کرتا؟“ یہاں ”أَلَّا تَسْجُدَ“ میں ”لَا“ اس نفی کی تاکید کے لیے ہے جو ”مَنَعَكَ“ کے ضمن میں موجود ہے۔ ”إِنَّمَا يَعْلَمُ أَهْلَ الْكِتَابِ“ کی یہ تفسیر بھی درست ہے اور بہت عمدہ ہے۔





قَدْ سَمِعَ اللَّهُ قَوْلَ الَّتِي تُجَادِلُكَ فِي زَوْجِهَا وَتَشْتَكِي إِلَى اللَّهِ وَاللَّهُ يَسْمَعُ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

یقیناً اللہ نے اس عورت کی بات سن لی جو تجھ سے اپنے خاوند کے بارے میں جھگڑ رہی تھی اور اللہ کی طرف شکایت کر رہی

آیت ۱ ﴿قَدْ سَمِعَ اللَّهُ قَوْلَ الَّتِي تُجَادِلُكَ فِي زَوْجِهَا﴾: یہ آیات خولہ بنت ثعلبہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں آتیں۔

بعض روایات میں ان کا نام خویلدہ اور بعض میں جمیلہ آیا ہے۔ ان کے خاوند اوس بن صامت انصاری رضی اللہ عنہ تھے جو عبادہ بن

صامت رضی اللہ عنہ کے بھائی تھے، بوڑھے تھے اور خولہ کے ان سے بچے بھی تھے۔ انہوں نے کسی بات پر ناراض ہو کر ان سے ظہار

کر لیا۔ یعنی یہ کہہ دیا: "أَنْتِ عَلَيَّ كَظَهْرِ أُمِّي" "تو مجھ پر میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہے۔" جاہلیت میں جو شخص بیوی سے

ظہار کرتا وہ اسے ماں ہی کی طرح ہمیشہ کے لیے حرام سمجھ لیتا تھا۔ خولہ کے سامنے تو دنیا اندھیر ہو گئی، اس عمر میں کہاں رہوں

گی، بچوں کا کیا کروں گی؟ باپ کے پاس رہے تو ضائع ہو جائیں گے، میرے پاس رہے تو انہیں کہاں سے کھلاؤں گی؟ وہ یہ

شکایت لے کر رسول اللہ ﷺ کے پاس آئیں۔ سنن ابوداؤد میں ہے کہ خویلدہ بنت مالک بن ثعلبہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ میرے خاوند

اوس بن صامت رضی اللہ عنہ نے مجھ سے ظہار کر لیا تو میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی، میں آپ ﷺ کے پاس شکایت کرتی تھی اور

رسول اللہ ﷺ اس کے بارے میں مجھ سے جھگڑتے تھے اور فرماتے تھے: «إِنِّي اللَّهُ فَإِنَّهُ ابْنُ عَمَّتِي» "اس کے بارے

میں اللہ سے ذرا، کیونکہ وہ تمہارا چچا زاد ہے۔" مگر میں نہیں ملی، حتیٰ کہ "قَدْ سَمِعَ اللَّهُ قَوْلَ الَّتِي تُجَادِلُكَ فِي زَوْجِهَا"

سے لے کر کفارہ کے فرض کے بیان تک قرآن نازل ہوا، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «يَعْنِقُ رَقَبَةً» "وہ ایک گروں آزاد

کرے۔" اس نے کہا: "وہ تو اس کے پاس ہے نہیں۔" آپ ﷺ نے فرمایا: «فِيضُومُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ» "پھر دو ماہ

پے در پے روزے رکھے۔" اس نے کہا: "اے اللہ کے رسول! وہ بڑا بوڑھا ہے، روزے رکھ نہیں سکتا۔" فرمایا: «فَلْيُطْعِمِ

سِتِّينَ مَسْكِينًا» "پھر ساٹھ (۶۰) مسکینوں کو کھانا کھلائے۔" اس نے کہا: "اس کے پاس کوئی چیز نہیں جس کا صدقہ

کرے۔" کبھی ہیں کہ اس وقت کھجوروں کا ایک ٹوکرا لایا گیا، میں نے کہا: "یا رسول اللہ! میں ایک اور ٹوکرا کے ساتھ اس

کی مدد کرتی ہوں۔" آپ ﷺ نے فرمایا: «قَدْ أَحْسَنْتِ أَذْهَبِي فَأَطْعِمِي بِهَا غَنَةَ سِتِّينَ مَسْكِينًا وَارْجِعِي إِلَيَّ

ابنِ عَمَّتِي» [ابوداؤد، الطلاق، باب فی الظہار: ۲۲۱۴، وقال الألبانی حسن] "تم نے بہت اچھا کیا، جاؤ اس کی طرف

سے ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ اور اپنے چچا زاد کے پاس واپس چلی جاؤ۔"

آیت ۲ ﴿قَدْ سَمِعَ اللَّهُ﴾: حرف "قَدْ" تحقیق کے لیے آتا ہے اور اس کام کے واقع ہونے کے لیے بھی جس کی توقع کی جا رہی

ہو۔ یہاں پہلے معنی کا تو محل نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے سننے میں کسی کو شک نہیں کہ اس کا یقین دلانے کے لیے حرف تحقیق لایا

جائے، تو مطلب یہ کہ نبی ﷺ سے جھگڑا کرنے والی عورت اپنی فریاد سننے جانے کی جو توقع کر رہی تھی اللہ تعالیٰ نے پوری فرما

تَحَاوَرَكُمَا ۙ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ ①

تھی اور اللہ تم دونوں کی گفتگو سن رہا تھا۔ بے شک اللہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے ①

دی۔ سننے سے مراد یہاں صرف سن لینا ہی نہیں بلکہ سننا اور سن کر مراد پوری کرنا ہے، جیسے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دعاس لی، یعنی سن کر قبول فرمائی۔

③ تَجَادِلْكَ فِي مَرْوَجَهَا: وہ جھگڑا یہی تھا کہ وہ کہتی تھی میرے بارے میں کوئی گنجائش نکالیں، میرے خاندان نے مجھے طلاق نہیں دی، صرف ”أَنْتِ عَلَيَّ كَظْهَرِ أُمِّي“ کہا ہے۔ اب میں بڑھاپے میں کہاں جاؤں اور بچوں کا کیا کروں؟ رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی واضح حکم نہ ہونے کی وجہ سے انھیں اکٹھے رہنے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔

④ وَتَشْتَكِي إِلَى اللَّهِ: ”شَكَا يَشْكُو شَكْوَى وَشِكَايَةً“ اپنے دکھ تکلیف کا اظہار کرنا۔ ”تَشْتَكِي“ (افتعال) میں حروف زیادہ ہونے کی وجہ سے معنی میں مبالغہ ہے، یعنی وہ جھگڑنے والی اللہ تعالیٰ کی جناب میں بہت شکایت کر رہی تھی اور اپنے دکھ درد کا شدت سے اظہار کر رہی تھی۔

⑤ وَاللَّهُ يَسْمَعُ تَحَاوَرَكُمَا ۙ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ: ”إِنَّ“ تغلیل کے لیے ہوتا ہے۔ اور اللہ تم دونوں کی گفتگو سن رہا تھا، کیونکہ اللہ تو سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے۔ ”سمع“ (سننا) وہ صفت ہے جس کے ساتھ آوازوں کا علم ہوتا ہے اور ”بصر“ (دیکھنا) وہ صفت ہے جس کے ساتھ نظر آنے والی چیزوں کا علم ہوتا ہے۔ یونان کے مشرک فلاسفہ سے متاثر ہو کر بعض مسلم متکلمین نے ان کا یہ قاعدہ مان لیا کہ محل حوادث حادث ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے لیے اللہ تعالیٰ کو سمیع و بصیر ماننا ممکن نہ رہا، کیونکہ اگر مانا جائے کہ اللہ تعالیٰ تمام آوازوں کو سنتا ہے اور تمام چیزوں کو دیکھتا ہے تو سنائی دینے والی اور نظر آنے والی چیزیں تو حادث ہیں، نئی سے نئی وجود میں آتی ہیں، اگر اللہ تعالیٰ سنتا اور دیکھتا ہو تو وہ محل حوادث ہوگا اور ان کے قاعدے کے مطابق خود بھی حادث ہوگا، ہمیشہ سے اور قدیم نہیں ہوگا، اس لیے انھوں نے اللہ تعالیٰ کے سننے، دیکھنے، کلام کرنے اور ایسی تمام صفات کا یا تو انکار کر دیا جن میں حدوث پایا جاتا ہے یا ان کی ایسی تاویل کر دی جو درحقیقت انکار ہی ہے۔ اکثر مفسرین نے یہی روش اختیار کی ہے۔ تفسیر جلالین کو دیکھ لیجیے، اس میں ہے: ”إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ“ عالمہ“ حالانکہ سب جانتے ہیں کہ سننا، دیکھنا اور جاننا تینوں الگ الگ صفات ہیں، صرف عالم مان لینے سے سمیع و بصیر نہیں مانا جا سکتا اور یہ قاعدہ کہ ”محل حوادث حادث ہوتا ہے“ قرآن مجید کے صریح الفاظ سے ٹکراتا ہے، اس لیے غلط ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ رحمن کی آیت (۲۹): ﴿كُلُّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ﴾ کی تفسیر۔ اگر کوئی کہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کو سمیع و بصیر مانیں تو وہ بندوں کی مثل ٹھہرتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب ”علیم“ ماننے سے وہ بندوں جیسا نہیں ٹھہرتا، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ”علیم“ کا لفظ بندوں پر بھی بولا ہے: ﴿إِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلَامٍ عَلَيْكَ﴾ [الحجر: ۵۳] [بے شک ہم تجھے ایک علیم لڑکے کی خوش خبری دیتے ہیں] تو سمیع و بصیر ماننے سے بندوں کی مثل کیسے بن جائے گا؟ مزید دیکھیے سورہ شوریٰ کی آیت (۱۱):

الَّذِينَ يُظْهِرُونَ مِنْكُمْ مَنْ نَسَابِهِمْ مَا هُنَّ أُمَّهَاتُهُمْ ۖ إِنَّ أُمَّهَاتُهُمْ إِلَّا الْأَنبِيَاءُ
وَلَدَنَّهُمْ ۖ وَاللَّهُمَّ لَيَقُولُنَّ مُنْكَرًا مِنَ الْقَوْلِ وَ زُورًا ۖ وَإِنَّ اللَّهَ لَعَفُوفٌ غَفُورٌ ﴿۱﴾

وہ لوگ جو تم میں سے اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں وہ ان کی مائیں نہیں ہیں، ان کی مائیں ان کے سوا کوئی نہیں جنہوں نے انہیں جنم دیا اور بلاشبہ وہ یقیناً ایک بری بات اور جھوٹ کہتے ہیں اور بلاشبہ اللہ یقیناً بے حد معاف کرنے والا، نہایت بخشنے والا ہے ﴿۱﴾

﴿لَيْسَ كَيْفِيهِ شَيْءٌ، وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ کی تفسیر۔

⑥ ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: «الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي وَسِعَ سَمْعُهُ الْأَصْوَاتَ، لَقَدْ جَاءَتِ الْمُحَادِلَةُ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَنَا فِي نَاحِيَةِ الْبَيْتِ، تَشْكُو زَوْجَهَا وَمَا أَسْمَعُ مَا تَقُولُ فَأَنْزَلَ اللَّهُ: ﴿قَدْ سَمِعَ اللَّهُ قَوْلَ الَّتِي تُجَادِلُكَ فِي زَوْجِهَا﴾» [ابن ماجہ، المقدمة، باب فيما أنكرت الحميمية: ۱۸۸] "سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس کی سماعت تمام آوازوں پر وسیع ہے، وہ جھگڑنے والی عورت نبی ﷺ کے پاس آئی جب کہ میں گھر کے ایک طرف موجود تھی، وہ اپنے خاوند کی شکایت کر رہی تھی اور میں وہ نہیں سنتی تھی جو وہ کہہ رہی تھی، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں: ﴿قَدْ سَمِعَ اللَّهُ قَوْلَ الَّتِي تُجَادِلُكَ فِي زَوْجِهَا﴾ "یقیناً اللہ نے اس عورت کی بات سن لی جو تجھ سے اپنے خاوند کے بارے میں جھگڑ رہی تھی۔" اس حدیث سے ظاہر ہے کہ صحابہ کرام اللہ تعالیٰ کے سننے کا کیا مطلب سمجھتے تھے۔ اس لیے امام ابن ماجہ نے اپنی سنن کے شروع ہی میں یہ حدیث اس باب میں ذکر فرمائی ہے جس کا عنوان ہے: "بَابُ فِيمَا أَنْكَرَتِ الْحَمِيمِيَّةُ" "یہ باب ان چیزوں کو ثابت کرنے کے لیے ہے جن کا حمیمہ نے انکار کیا ہے۔" اور امام بخاری نے اپنی صحیح بخاری کی "کِتَابُ التَّوْحِيدِ" کے "بَابُ قَوْلِ اللَّهِ تَعَالَى: ﴿وَكَانَ اللَّهُ سَمِيعًا بَصِيرًا﴾" کے تحت اسے اللہ تعالیٰ کی صفت سمع و بصیرت ثابت کرنے کے لیے ذکر فرمایا ہے۔

آیت ۲: ﴿الَّذِينَ يُظْهِرُونَ مِنْكُمْ مَنْ نَسَابِهِمْ مَا هُنَّ أُمَّهَاتُهُمْ: "يُظْهِرُونَ" "ظہر" سے نکلا ہے جس کا معنی "پیٹھ" ہے۔ عرب سواری کو "ظہر" کہتے ہیں۔ یہ استعارہ ہے، جس میں بیوی سے جماع کو گھوڑے وغیرہ کی پشت پر سوار ہونے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ "أَنْتَبَ عَلَيَّ كَظْهَرِ أُمِّي" (تو مجھ پر میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہے) کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح میرے لیے اپنی ماں پر سوار ہونا اور اس سے جماع حرام ہے، اسی طرح تم بھی میرے لیے میری ماں کی طرح ہو۔ جاہلیت میں لوگ بیوی کو ماں کہہ دیتے تو اسے ماں کی طرح حرام قرار دے لیتے تھے، اللہ تعالیٰ نے اس رسم بد کو ختم کر دیا، فرمایا منہ کے ساتھ بیوی کو ماں کہنے سے وہ ماں نہیں بن جاتی، آدمی کی ماں وہی ہے جس نے اسے جنم دیا ہے۔ مزید دیکھیے سورۃ احزاب (۳) کی تفسیر۔

② وَاللَّهُمَّ لَيَقُولُنَّ مُنْكَرًا مِنَ الْقَوْلِ وَ زُورًا: "مُنْكَرًا" "أَنْكَرُ يُنْكَرُ" (افعال) سے اسم مفعول ہے، وہ بات جسے کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

وَالَّذِينَ يُظَاهِرُونَ مِنْ نِسَابِهِمْ ثُمَّ يَعُودُونَ لِمَا قَالُوا فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مِنْ قَبْلِ
أَنْ يَتِمَّ آسَاؤُكُمْ تُوَعِّدُونَ بِهِ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿۳﴾

اور وہ لوگ جو اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں، پھر اس سے رجوع کر لیتے ہیں جو انہوں نے کہا، تو ایک گردن آزاد کرنا ہے، اس سے پہلے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں، یہ ہے وہ (کفارہ) جس کے ساتھ تم نصیحت کیے جاؤ گے، اور اللہ اس سے جو تم کرتے ہو پوری طرح باخبر ہے ﴿۳﴾

انسانی طبیعت یا عقل یا شرع نہ پہچانتی ہو بلکہ اس کا انکار کرتی ہو۔ ”زُورًا“ جھوٹ۔ یعنی بیوی کو ماں کی طرح کہنے والے ایسی بات کہتے ہیں جو نہ انسانی طبیعت مانتی ہے، نہ عقل اور نہ ہی شرع، کیونکہ ماں کے ساتھ بیٹے کا رشتہ اکرام و احترام کا ہے، جبکہ بیوی کے ساتھ خاوند کا رشتہ ایک خاص تعلق کا ہے جو ماں کے ساتھ سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ پھر جس عورت نے آدمی کو جنم ہی نہیں دیا بلکہ اس کا اس کے ساتھ مباشرت کا تعلق رہا، اسے ماں کہنا بری بات اور کتنا بڑا جھوٹ ہے۔

﴿۳﴾ وَإِنَّ اللَّهَ لَعَفُوٌّ غَفُورٌ: یعنی اللہ تعالیٰ تمہاری کوتاہیوں اور غلطیوں کے باوجود ان سے بہت درگزر کرنے والا اور ان پر پردہ ڈالنے والا ہے۔ خصوصاً جب غلطی کرنے والا پلٹ آئے اور توبہ کر کے آئندہ ایسی باتوں سے باز رہے۔

﴿۴﴾ اس آیت میں کئی چیزیں ظہار کے حرام ہونے پر دلالت کر رہی ہیں، پہلی اللہ تعالیٰ کا یہ کہنا کہ ”مَا هُنَّ أُمَّهَاتِهِمْ“ (وہ ان کی مائیں نہیں)، اس میں ظہار کرنے والے کو جھوٹا قرار دیا ہے، دوسری اور تیسری یہ کہ اللہ نے ان کا نام منکر اور زور رکھا ہے اور چوتھی اللہ تعالیٰ کا فرمان ”إِنَّ اللَّهَ لَعَفُوٌّ غَفُورٌ“ ہے، کیونکہ عفو و مغفرت گناہ ہی سے ہوتی ہے۔

آیت 3 ﴿۱﴾ وَالَّذِينَ يُظَاهِرُونَ مِنْ نِسَابِهِمْ ثُمَّ يَعُودُونَ لِمَا قَالُوا.....: ”ثُمَّ يَعُودُونَ لِمَا قَالُوا“ کی تفسیر میں بعض حضرات نے فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کریں ان پر پہلی بار کوئی مواخذہ نہیں، البتہ اگر یہی بات دوبارہ کریں تو ان پر یہ کفارہ ہے، مگر یہ بات اس لیے درست نہیں کہ آیت جس واقعہ پر نازل ہوئی اس میں خاوند نے خولہ رضی اللہ عنہا کو ایک ہی بار ”أَنْتِ عَلَيَّ كَظْهَرِ أُمِّي“ کہا تھا۔ دوسری مرتبہ یا بار بار ایسا کہنے کا کہیں ذکر نہیں، اس لیے آیت کا وہی مطلب درست ہو گا جو صحیح حدیث کے مطابق ہو۔ چنانچہ ”يَعُودُونَ لِمَا قَالُوا“ کا مطلب قرآن اور بعض مفسرین نے تو یہ لیا ہے کہ یہاں ”لام“ بمعنی ”عَنْ“ ہے، یعنی پھر وہ اپنی اس بات سے رجوع کریں جو انہوں نے کہی ہے، تو ان پر یہ کفارہ ہے اور بعض نے فرمایا کہ یہاں ”لام“ ”إِلَى“ کے معنی میں ہے، کلام میں کچھ عبارت حذف بھی ہے اور ”مَا قَالُوا“ کا مطلب ”مَا حَرَّمُوا“ ہے: ”أَيُّ ثُمَّ يَعُودُونَ إِلَى تَحْلِيلِ مَا حَرَّمُوا“ یعنی پھر دوبارہ لو نہیں اس کو حلال کرنے کی طرف جسے انہوں نے حرام کہا ہے۔“ رہی یہ بات کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں الفاظ میں ابہام کیوں رکھا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ماں کہنے کے بعد پھر اس سے بیوی والا معاملہ کرنا ایک قسم کی کراہت رکھتا ہے، اس لیے اس کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے صراحت کے بجائے کنایہ سے کام لیا ہے۔

فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامَ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَتَمَاسَّ، فَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَأَطْعَمَ
سِتِّينَ سَكِينًا، ذَلِكَ لِتُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ، وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ، وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۴﴾

پھر جو شخص نہ پائے تو دو پے درپے مہینوں کا روزہ رکھنا ہے، اس سے پہلے کہ دونوں ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں، پھر جو اس کی (بھی) طاقت نہ رکھے تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔ یہ اس لیے کہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ اور یہ اللہ کی حدیں ہیں اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے ﴿۴﴾

﴿۲﴾ ظہار کا کفارہ مقرر کرنے سے ظاہر ہے کہ یہ طلاق نہیں بلکہ بیوی کو اپنے آپ پر حرام قرار دینے کے قبیل سے ہے۔ عام معاملات میں حلال کو اپنے آپ پر حرام کرنے کا کفارہ وہی ہے جو قسم کا کفارہ ہے (دیکھیے تحریم: ۲۰۱) مگر منکر و زور بات ہونے کی وجہ سے ظہار کا کفارہ سخت ہے۔ اب ظہار کرنے والے کے سامنے دو ہی صورتیں ہیں، اگر وہ بیوی سے قطع تعلق پر مٹھ رہے تو زیادہ سے زیادہ چار ماہ تک اس کا انتظار کیا جائے گا کہ کفارہ ادا کر کے دوبارہ تعلق استوار کر لے (دیکھیے بقرہ: ۲۲۶) پھر اسے کہا جائے گا کہ یا اسے طلاق دو یا کفارہ ادا کر کے اسے بیوی بنا کر رکھو۔ پھر اگر وہ اپنی بات سے رجوع پر تیار ہو تو کفارہ بالترتیب تین چیزوں میں سے ایک چیز ہے، اگر آدمی کے پاس طاقت ہو تو ہاتھ لگانے یعنی جماع سے پہلے ایک گردن آزاد کرے۔ یہ شرط اس لیے لگائی ہے کہ بیوی کے پاس جانے کی رغبت میں اس کے لیے اتنا بھاری جرمانہ آسان ہو جائے گا۔

﴿۳﴾ فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ أَنْ يَتَمَاسَّ: ”مَرَقَبَةٍ“ کا معنی گردن ہے، مراد لونڈی یا غلام ہے، یعنی جز بول کر کھل مراد لیا گیا ہے، تو ظہار کا کفارہ یہ ہے کہ اگر آدمی کے پاس طاقت ہو تو ایک دوسرے کو ہاتھ لگانے سے پہلے ایک لونڈی یا غلام آزاد کرے۔ پہلے کی شرط اس لیے لگائی ہے کہ بیوی کے پاس جانے کی رغبت میں اس کے لیے اتنا بھاری جرمانہ آسان ہو جائے گا۔ ﴿۴﴾ ذَلِكُمْ تَوْعَظُونَ بِهِ: یعنی ہاتھ لگانے سے پہلے گردن آزاد کرنے کا حکم اس لیے دیا ہے کہ اس سے تمہیں آئندہ کے لیے نصیحت ہوگی کہ ایسا کام نہیں کیا کرتے۔

﴿۵﴾ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ: یعنی اگر تم ظہار کے بعد گردن آزاد کیے بغیر ایک دوسرے کو ہاتھ لگاؤ گے تو کسی اور کو خبر ہو یا نہ ہو اللہ تعالیٰ تمہارے ہر کام سے پوری طرح باخبر ہے، تم نہ اس سے چھپ سکتے ہو اور نہ اس کی گرفت سے بچ سکتے ہو۔

﴿۶﴾ بیوی کو ماں کی طرح اپنے آپ پر حرام ٹھہرانے پر جو کفارہ ہے اگر اسے بہن یا بیٹی یا کسی بھی ایسی عورت کی طرح حرام کہہ دے جس سے نکاح حرام ہے تو اس پر بھی وہی کفارہ ہے، کیونکہ نکاح کی حرمت میں ان کے درمیان کوئی فرق نہیں، اس لیے جو حکم ماں کہنے کا ہے وہی سب کا ہوگا۔

آیت 4: ﴿۱﴾ فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامَ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَتَمَاسَّ: اس سے معلوم ہوا کہ اگر گردن آزاد کرنے کی طاقت ہے تو روزوں سے یا کھانا کھلانے سے کفارہ ادا نہیں ہوگا۔

﴿۲﴾ فَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ: پھر جو شخص ہاتھ لگانے سے پہلے دو ماہ کے پے درپے روزے رکھنے کی طاقت نہ رکھے وہ ساٹھ مسکینوں کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

إِنَّ الَّذِينَ يُحَادُّونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ كَيْشُوا كَيْمًا كَيْتَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَ قَدْ
 أَنْزَلْنَا آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ ۖ وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ مُهِينٌ ⑤

بے شک وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں، وہ ذلیل کیے جائیں گے، جیسے وہ لوگ ذلیل کیے گئے جو ان سے پہلے تھے اور بلاشبہ ہم نے واضح آیات نازل کی ہیں اور کافروں کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے ⑤

کو کھانا کھلانے۔ ظہار کرنے والا خواہ کمزوری کی وجہ سے پے در پے اتنے روزے نہ رکھ سکتا ہو یا شدت شہوت کی وجہ سے اتنے دن صبر نہ کر سکتا ہو، "فَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ" میں دونوں شامل ہیں، جیسا کہ سلمہ بن صحزریاضی جیٹو نے اپنی بیوی کو ماہ رمضان گزارنے تک کے لیے ماں کہہ دیا، پھر کسی رات اس سے جماع کر بیٹھے اور رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: «حَرِّزْ رَقَبَةً» "ایک گردن آزاد کرو۔" انھوں نے اپنی گردن پر ہاتھ مار کر کہا: "اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا! میرے پاس اس گردن کے سوا کوئی گردن نہیں۔" فرمایا: «فَضْمُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ» "پھر دو ماہ پے در پے روزے رکھ۔" انھوں نے کہا: "مجھ پر روزوں تک کی وجہ سے تو یہ مصیبت آئی ہے۔" فرمایا: «فَأَطْعِمْ وَسُقْمًا مِنْ تَعْرِ بَيْنِ سَتَيْنِ مَنْسُكِيْنَا» | ابو داؤد، کتاب الطلاق، باب فی الظہار: ۲۲۱۳ | "پھر ساٹھ مسکینوں میں ایک حق سمجھو تقسیم کر دو۔"

③ قِطَاعُ مِائَتَيْنِ مَنْسُكِيْنَا: اس سے معلوم ہوا کہ ایک ہی مسکین کو ساٹھ دن کھانا کھلانے سے یا ساٹھ دنوں کا کھانا دینے سے یہ کفارہ ادا نہیں ہوگا، بلکہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا پڑے گا، خواہ ایک وقت میں کھلا دے یا مختلف وقتوں میں۔ آیت کے الفاظ کے مطابق اس کا با تکلف مطلب یہ ہے کہ ساٹھ مسکینوں کو ایک دفعہ پیٹ بھر کر کھانا کھلا دے۔ (شوکانی)

④ ذَلِكَ يُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ: اللہ اور اس کے رسول پر ایمان سے مراد ان کے احکام کے سچا ہونے پر یقین رکھنا اور ان پر عمل کرنا ہے، کیونکہ ایمان میں تصدیق، اقرار اور عمل تینوں چیزیں شامل ہیں۔

⑤ وَ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ: یعنی ظہر کا حرام ہونا اور اس سے رجوع کی صورت میں اس پر کفارہ لازم ہونا اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود ہیں، جن سے تجاوز حرام ہے۔

⑥ وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ: "الکافرین" انکار کرنے والے۔ معلوم ہوا کہ جو لوگ اللہ کے حکموں کو نہیں مانتے وہ حقیقت میں کافر ہیں، چاہے دنیوی احکام میں اور مرد شماری کی زور سے مسلمانوں میں شمار ہوتے ہوں۔

آیت 5 ① إِنَّ الَّذِينَ يُحَادُّونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ...: "يُحَادُّونَ" "خَدَّ" سے مشتق ہے جس کا معنی جانب ہے۔ باب مفاعلة عموماً مقابلہ کے معنی کے لیے آتا ہے، یعنی جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں، اللہ اور اس کے

يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ جَنِيحًا فَيُنبِئُهُمْ بِمَا عَمِلُوا ۗ أَحْصَاهُ اللَّهُ وَنَسُوهُ ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ﴿٦﴾

جس دن اللہ ان سب کو اٹھائے گا، پھر انہیں بتائے گا جو انہوں نے کیا۔ اللہ نے اسے محفوظ رکھا اور وہ اسے بھول گئے اور اللہ ہر چیز پر گواہ ہے ﴿٦﴾

رسول ایک جانب ہوں تو وہ ان کے مقابلے میں دوسری جانب ہوتے ہیں۔ ”کَيْتُوا“ ”كَيْتُ كَيْتًا“ (ض) ذلیل کرنا، ہلاک کرنا، لعنت کرنا، دھکے دے کر نکال دینا۔ اللہ تعالیٰ نے شروع سورت سے یہاں تک ظہار کی حرمت اور اس کے کفارہ کے احکام بیان فرمائے اور بتایا کہ یہ احکام اس لیے مقرر کیے گئے ہیں کہ لوگ ظہار اور اس جیسی بری رسوم سے باز آجائیں جن کے وہ جاہلیت میں عادی تھے، تاکہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی پیروی کے خوگر ہو جائیں اور ان کے احکام پر اخلاص کے ساتھ عمل کریں۔ اس کے بعد فرمایا کہ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کریں گے، ان کے احکام کی نافرمانی کریں گے اور ان کے مقابلے پر اتر آئیں گے انہیں دنیا میں ذلیل کیا جائے گا، جس طرح ان قوموں کو ذلیل کیا گیا جنہوں نے ان سے پہلے اللہ اور اس کے رسولوں کی مخالفت کی اور یہ احکام اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں اور ان کا انکار کرنے والوں کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔

﴿٦﴾ ”كَيْتُوا“ ماضی مجہول کا صیغہ ہے، لفظی معنی ہے ”ذلیل کیے گئے۔“ مراد یہ ہے کہ ”ذلیل کیے جائیں گے۔“ آئندہ ہونے والی بات کو ماضی کے صیغے کے ساتھ اس لیے فرمایا کہ اس کا ہونا اتنا یقینی ہے کہ سمجھو یہ کام ہو ہی چکا ہے۔ اس میں کفار کے لیے وعید اور مسلمانوں کے لیے خوش خبری ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ بدر اور دوسرے معرکوں میں کفار اور ان کے مددگار یہود و منافقین بری طرح ذلیل ہوئے، انہیں شکستوں پر شکستیں ہوئیں اور انہیں قتل، قید، مال و اولاد سے محرومی، غلامی اور جلا وطنی کی ذلتیں اٹھانا پڑیں، حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی ہی میں مکہ فتح ہو گیا۔ پھر پورے جزیرہ عرب پر اسلام کے مکمل غلبے کے ساتھ کفار و منافقین پر ذلت و رسوائی کی مہر ثبت ہو گئی اور آپ ﷺ کی وفات کے بعد آپ کے خلفاء کے ہاتھوں مشرق سے مغرب تک اسلام غالب ہوا اور کفار و منافقین ذلیل و رسوا ہوئے۔

آیت 6 ﴿٦﴾ يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ جَنِيحًا : اس کا تعلق پچھلی آیت کے آخری جملے ”وَاللَّكْفَرِينَ عَذَابٌ مُّهِينٌ“ سے ہے، یعنی ان کافروں کے لیے اس دن بھی رسوا کرنے والا عذاب ہے جب اللہ تعالیٰ ان سب کو جمع فرمائے گا، پھر وہ جو کرتے رہے اس سے انہیں آگاہ کرے گا، تاکہ وہ اس کا نتیجہ بھگتتے کے لیے تیار ہو جائیں۔

﴿٦﴾ أَحْصَاهُ اللَّهُ وَنَسُوهُ : یہ اس سوال کا جواب ہے کہ ہزاروں لاکھوں سالوں کے بعد اگر سب لوگوں کو زندہ کر بھی لیا گیا تو انہوں نے جو کچھ کیا اسے مدتیں گزر چکی ہوں گی، اللہ تعالیٰ اتنی بے شمار مخلوق کے بے شمار اعمال انہیں کیسے بتائے

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مَا يَكُونُ مِنْ نَجْوَى ثَلَاثَةٍ إِلَّا هُوَ سَامِعُهُمْ وَلَا خُبْرَهُ إِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَا آذُنٌ مِنْ ذَلِكَ وَلَا أَكْثَرُ إِلَّا هُوَ مَعَهُمْ أَيُّنَ مَا كَانُوا ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٤﴾

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ جانتا ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے۔ کوئی تین آدمیوں کی کوئی سرگوشی نہیں ہوتی مگر وہ ان کا چوتھا ہوتا ہے اور نہ کوئی پانچ آدمیوں کی مگر وہ ان کا چھٹا ہوتا ہے اور نہ اس سے کم ہوتے ہیں اور نہ زیادہ مگر وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے، جہاں بھی ہوں، پھر وہ انھیں قیامت کے دن بتائے گا جو کچھ انھوں نے کیا۔ یقیناً اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے ﴿۴﴾

گا؟ فرمایا وہ اپنا کیا ہوا بے شک بھول چکے ہوں، مگر اللہ تعالیٰ نے وہ سب کچھ محفوظ کر رکھا ہے۔ مزید دیکھیے سورہ کہف (۳۹) کی تفسیر۔

﴿۳﴾ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ: کیونکہ اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز چھپی نہیں رہ سکتی، وہ ہر چیز کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ (دیکھیے مائدہ: ۱۱-۱۲) اگلی آیت میں اس کی مزید تاکید ہے۔

آیت 7 ﴿۱﴾ أَلَمْ تَرَ: اس کے لیے دیکھیے سورہ فیل کی پہلی آیت اور سورہ نور کی آیت (۴۱) کی تفسیر۔

﴿۲﴾ أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ: یعنی اللہ تعالیٰ ان کے اعمال ہی کو نہیں بلکہ آسمان و زمین کی ہر چھوٹی بڑی چیز کو جانتا ہے۔

﴿۳﴾ یہاں سے آیت (۱۹) تک مسلسل منافقین کے طرز عمل پر گرفت کی گئی ہے۔

﴿۴﴾ مَا يَكُونُ مِنْ نَجْوَى ثَلَاثَةٍ إِلَّا هُوَ سَامِعُهُمْ.....: ”نَحَا يُنْحُو نَحْوًا وَنَحْوَى وَ نَاخِي مُنَاخَاةً وَ نِخَاءً، الرَّجُلُ“ کسی آدمی سے اپنے دل کی بات دوسروں سے چھپا کر کرنا۔ ”نَجْوَى“ اس سے اسم مصدر ہے، سرگوشی۔ زیادہ تر اس کا استعمال برے کاموں کی سرگوشیوں اور سازشوں کے لیے ہوتا ہے، مثلاً چوری، ڈاکے، قتل یا کسی کو نقصان پہنچانے کے لیے خفیہ مشورہ کرنا۔ خیر کے کاموں میں اس کا استعمال کم ہوتا ہے، کیونکہ عموماً انھیں چھپانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یعنی تھوڑے سے تھوڑے یا زیادہ سے زیادہ لوگوں کی کوئی مجلس، کوئی سرگوشی اور کوئی خفیہ سے خفیہ مشورہ نہیں ہوتا جو اللہ تعالیٰ سے مخفی ہو اور اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ نہ ہو، بلکہ جو بھی تین آدمی چھپ کر مشورہ کر رہے ہوں ان کے ساتھ چوتھا اللہ تعالیٰ ہوتا ہے اور جو بھی پانچ آدمی چھپ کر مشورہ کر رہے ہوں ان کے ساتھ چھٹا اللہ تعالیٰ ہوتا ہے اور اس سے کم یا زیادہ جہاں بھی ہوں اللہ ان کے ساتھ ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو پوری طرح جاننے والا ہے۔ ”إِلَّا هُوَ مَعَهُمْ“ کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ حدید (۳) کی تفسیر۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ نُهُوا عَنِ النَّجْوَى ثُمَّ يَعُودُونَ لِمَا نُهُوا عَنْهُ وَيَتَنَجَّوْنَ بِاللَّيْلِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُولِ وَإِذَا جَاءُوكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللَّهُ وَيَقُولُونَ فِي أَنْفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللَّهُ بِمَا نَقُولُ حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ يَصَلُّونَهَا فَبِئْسَ الْمَصِيرُ ﴿۸﴾

کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں سرگوشی کرنے سے منع کیا گیا، پھر وہ اس چیز کی طرف لوٹتے ہیں جس سے انہیں منع کیا گیا اور آپس میں گناہ اور زیادتی اور رسول کی نافرمانی کی سرگوشی کرتے ہیں اور جب حیرے پاس آتے ہیں تو (ان لفظوں کے ساتھ) تجھے سلام کہتے ہیں جن کے ساتھ اللہ نے تجھے سلام نہیں کہا اور اپنے دلوں میں کہتے ہیں کہ اللہ ہمیں اس پر سزا کیوں نہیں دیتا جو ہم کہتے ہیں؟ انہیں جہنم ہی کافی ہے، وہ اس میں داخل ہوں گے، پس وہ برا ٹھکانا ہے ﴿۸﴾

آیت 8 ﴿۸﴾ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ نُهُوا عَنِ النَّجْوَى..... یہاں سے یہود اور منافقین کے طرز عمل پر گرفت کا آغاز ہو رہا ہے، جو انہوں نے اختیار کر رکھا تھا۔ یہود نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ صلح کا معاہدہ کر رکھا تھا اور آپ کی مجلسوں میں آتے جاتے تھے اور منافقین بظاہر ایمان لائے تھے اور مسلمانوں کی جماعت کے فرد تھے، مگر ان کی دوستی یہود ہی کے ساتھ تھی۔ منافقین اور یہود نے اندر ہی اندر اپنا الگ جتھا بنا رکھا تھا، انہیں جب بھی موقع ملتا خفیہ مجالس میں مسلمانوں کے اندر پھوٹ ڈالنے، فتنہ برپا کرنے اور مشرکین سے مل کر مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے منصوبے بناتے۔ اگر رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں آتے تو آپس میں کھسک پھسکرتے رہتے، جس سے مجلس کی بے وقعتی ہوتی اور اس بات کا اظہار ہوتا کہ انہیں رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ بعض اوقات وہ آپس میں سرگوشی کرتے ہوئے کسی مسلمان کو دیکھ کر آپس میں آنکھ مارتے، تاکہ وہ سمجھے کہ وہ اس کے متعلق کوئی بات کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کو ان کے اس رویے سے سخت تکلیف ہوتی۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں ایسی مجالس سے منع کیا جن میں وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف خفیہ مشورے اور سازشیں کرتے تھے اور مسلمانوں کی مجلسوں میں بیحدہ سرگوشیوں سے بھی منع کیا، مگر وہ باز نہ آئے تو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یہ آیات نازل فرما کر ان پر اپنی ناراضی کا اظہار فرمایا۔

﴿۹﴾ وَيَتَنَجَّوْنَ بِاللَّيْلِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُولِ: اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ ان کے خفیہ مشورے اور سرگوشیاں یا تو ایسے گناہوں پر مشتمل ہوتی تھیں جن کا تعلق ان کی ذات سے تھا یا ایسے گناہوں پر جن میں دوسروں پر ظلم و زیادتی ہوتی، یا پھر ان کی سرگوشیاں رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی پر مشتمل ہوتی تھیں۔

﴿۱۰﴾ وَإِذَا جَاءُوكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللَّهُ: ”حَسْبِيَ يَحْيَىٰ حَيَاةُ“ (حَسْبِيَ يَحْيَىٰ) زندہ ہونا۔ ”حَسْبِيَ يَحْيَىٰ نَجِيَّةُ“ (تفہیم) زندگی اور سلامتی کی دعا دینا، سلام کہنا۔ (دیکھیے نساء: ۸۶) یعنی جب یہ یہودی اور ان کے ہم نوا منافقین آپ ﷺ کے پاس آتے ہیں تو ایسے الفاظ کے ساتھ آپ کو سلام کہتے ہیں جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو سلام نہیں کہا۔ اللہ تعالیٰ کے آپ ﷺ کو سلام کا ذکر خاص اس آیت میں ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾

يَأْيُهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْأَثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَ مَعْصِيَتِ
الرَّسُولِ وَ تَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَ التَّقْوَىٰ ۗ وَ اتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿٩﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم آپس میں سرگوشی کرو تو گناہ اور زیادتی اور رسول کی نافرمانی کی سرگوشی نہ کرو اور
نیکی اور تقویٰ کی سرگوشی کرو اور اللہ سے ڈرو جس کی طرف تم اکٹھے کیے جاؤ گے ﴿٩﴾

[الأحزاب: ۵۶] "اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اس پر صلوة بھیجو اور سلام بھیجو، خوب سلام بھیجنا۔" اور ذکر عام اس آیت میں
ہے: ﴿قُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ وَ سَلَّمَ عَلَىٰ عِبَادِهِ الَّذِينَ اصْطَفَىٰ﴾ [النمل: ۵۹] "کہہ دے سب تعریف اللہ کے لیے ہے
اور سلام ہے اس کے ان بندوں پر جنہیں اس نے چن لیا۔" یہودی آپ کو "السَّلَامُ عَلَيْكُمْ" کے بجائے "السَّلَامُ عَلَيْكُمْ" (تم
پر موت ہو) کہتے۔ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ منافقین نے بھی یہودی دیکھا دیکھی یہ کام شروع کر دیا تھا، جیسا کہ انھوں نے
یہود سے سیکھ کر آپ ﷺ کو متوجہ کرنے کے لیے استعمال ہونے والا لفظ "رَاعِنًا" گالی کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا
تھا، جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرما دیا اور اس کے بجائے "انظُرْنَا" کہنے کا حکم دیا۔ (دیکھیے بقرہ: ۱۰۴) عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ
کچھ یہودی لوگ نبی ﷺ کے پاس آئے اور انھوں نے کہا: «السَّلَامُ عَلَيْكَ يَا أَبَا الْقَاسِمِ!» "اے ابو القاسم! تجھ پر موت
ہو۔" آپ ﷺ نے فرمایا: «وَعَلَيْكُمْ» "اور وہ تمھی پر ہو۔" عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں میں نے کہا: «بَلْ عَلَيْكُمُ السَّلَامُ وَ الدَّمَ»
"بلکہ تم پر موت اور مذمت ہو۔" تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «يَا عَائِشَةُ! لَا تَكُونِي فَاجِشَةً» "اے عائشہ! نازیبا لفاظی
کہنے والی نہ بن۔" عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: "آپ نے وہ نہیں سنا جو انھوں نے کہا ہے؟" تو آپ ﷺ نے فرمایا: «أَوْ لَيْسَ قَدْ
رَدَدْتُ عَلَيْهِمُ الَّذِي قَالُوا، قُلْتُ وَعَلَيْكُمْ» "تو کیا میں نے وہ بات انھی پر لونا نہیں دی جو انھوں نے کہی ہے؟ میں نے
کہہ دیا "وَعَلَيْكُمْ" کہ "وہ تمھی پر ہو۔" تو اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرمادی: ﴿وَ إِذَا جَاءُوكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ
يُحْيِكَ بِهِ اللَّهُ﴾ "اور جب تیرے پاس آتے ہیں تو (ان لفظوں کے ساتھ) تجھے سلام کہتے ہیں جن کے ساتھ اللہ نے
تجھے سلام نہیں کہا۔" [مسلم، السلام، باب النهي عن ابتداء أهل الكتاب بالسلام..... : ۲۱۶۵/۱۱ - مسند أحمد :
۱/۲۲۹، ۲۳۰، ح: ۲۵۹۷۸]

﴿٩﴾ وَيَقُولُونَ فِي أَنفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللَّهُ بِمَا نَقُولُ..... اور وہ اپنے دل میں یا آپس کی مجلس میں اسے رسول اللہ ﷺ
کے رسول نہ ہونے کی دلیل قرار دیتے تھے کہ اگر یہ رسول ہوتے تو یہ لفاظی کہتے ہوئے ہم پر عذاب آجاتا۔ حالانکہ رسول اللہ ﷺ
کے سچا ہونے کے لیے یہی دلیل کافی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کی اس حرکت سے آگاہ کر دیا۔ رہا عذاب، تو اللہ تعالیٰ کا یہ
طریقہ نہیں کہ وہ گناہ پر اسی وقت گرفت فرمائے، اس نے تو ان لوگوں کو بھی مہلت دے رکھی ہے جو اسے گالی دیتے ہیں، تاکہ
وہ یہ نہ کہہ سکیں کہ ہمیں مہلت نہیں ملی اور اس نے ہر کام کی طرح ان کے عذاب کے لیے بھی ایک وقت مقرر کر رکھا ہے۔ چنانچہ
مرنے کے بعد ان کے لیے جہنم کا عذاب تیار ہے اور وہ انہیں کافی ہے، اس کے ہوتے ہوئے کسی اور سزا کی ضرورت نہ رہے گی۔

يَأْيُهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَنَاجَيْتُمْ : جیسا کہ آیت (۷) کے فوائد میں گزرا کہ "نَجْوَى" کا لفظ عموماً

إِنَّمَا النَّجْوَى مِنَ الشَّيْطَانِ لِيَحْزُنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَ لَيْسَ بِصَارِهِمْ شَيْئًا إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ﴿۱۰﴾

یہ سرگوشی تو شیطان ہی کی طرف سے ہے، تاکہ وہ ان لوگوں کو غم میں مبتلا کرے جو ایمان لائے، حالانکہ وہ اللہ کے حکم کے بغیر انہیں ہرگز کوئی نقصان پہنچانے والا نہیں اور اللہ ہی پر پس لازم ہے کہ مومن بھروسہ کریں ﴿۱۰﴾

برے مقاصد کے لیے سرگوشیوں پر استعمال ہوتا ہے جو حرام ہیں، لیکن بعض اوقات ”نجوی“ (خفیہ مشورہ) اچھے مقاصد کے لیے بھی ہو سکتا ہے، اس کی اجازت ہے بلکہ اس کی ترغیب دی گئی ہے اور یہ باعث اجر ہے۔ (دیکھیے نساء: ۱۱۳) اس آیت میں ایمان کا دعویٰ کرنے والوں کو گناہ، زیادتی اور رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی والی سرگوشیوں اور خفیہ مجلسوں سے منع فرمایا، کیونکہ یہ ایمان کے دعویٰ کے خلاف ہے اور نیکی اور تقویٰ والی سرگوشیوں کی اجازت بلکہ نصیحت فرمائی۔ رسول اللہ ﷺ نے سرگوشی کی ہر ایسی صورت سے منع فرمایا جس سے کسی مسلمان کی دل آزاری ہوتی ہو۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «إِذَا كُنْتُمْ ثَلَاثَةً فَلَا يَتَنَاخَى رَجُلَانِ دُونَ الْآخَرِ حَتَّى تَحْتَلِطُوا بِالنَّاسِ، أَجَلٌ أَنْ يُحْزِنَهُ» [بخاری، الاستئذان، باب إذا كانوا أكثر من ثلاثة فلا بأس بالمسازاة المناجاة: ۶۲۹۰۔ مسلم: ۲۱۸۴] ”جب تم تین آدمی ہو تو دو آدمی تیسرے کے بغیر آپس میں سرگوشی نہ کریں، یہاں تک کہ تم دوسرے لوگوں کے ساتھ مل جاؤ، کیونکہ یہ چیز اسے غمگین کرے گی۔“ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر تین سے زیادہ آدمی ہوں تو کوئی دو آدمی آپس میں سرگوشی کر سکتے ہیں۔ البتہ چار یا پانچ یا زیادہ آدمی ایک شخص کو اکیلے چھوڑ کر الگ سرگوشی کریں تو اس اکیلے کا غمگین اور پریشان ہونا تو لازمی بات ہے، اس لیے اس حدیث کے مطابق وہ بھی ناجائز ہے۔ تین آدمیوں میں سے دو اگر ایسی زبان میں بات شروع کر دیں جو تیسرا نہیں جانتا تو اس حدیث کے مطابق وہ بھی جائز نہیں۔ ہاں، اگر دو آدمی تیسرے سے اجازت لے کر آپس میں سرگوشی کر لیں تو یہ جائز ہے، جیسا کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «إِذَا كُنْتُمْ ثَلَاثَةً فَلَا يَتَنَاخَى اثْنَانِ دُونَ الثَّالِثِ إِلَّا بِإِذْنِهِ فَإِنَّ ذَلِكَ يُحْزِنُهُ» [مسند احمد: ۱۴۶/۲، ح: ۶۳۳۸۔ مصنف عبد الرزاق، ح: ۱۹۸۰۶، وسندہ صحیح] ”جب تم تین آدمی ہو تو دو آدمی تیسرے کے بغیر سرگوشی نہ کریں، مگر اس کی اجازت کے ساتھ، کیونکہ یہ چیز اسے غمگین کرے گی۔“

آیت 10 **إِنَّمَا النَّجْوَى مِنَ الشَّيْطَانِ لِيَحْزُنَ الَّذِينَ آمَنُوا.....** : ”حَزَنٌ يُحْزِنُ“ (س) غمگین ہونا اور ”حَزَنٌ يُحْزِنُ“ (ن) غمگین کرنا۔ اس میں مسلمانوں کو تسلی دلائی ہے کہ یہود و منافقین کی یہ سرگوشیاں دراصل شیطان کی کارستانی ہے، جس سے وہ ایمان والوں کو غمگین کرنا چاہتا ہے۔ اگر تم ایسی کوئی بات دیکھو تو زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم نہ ہو تو شیطان تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور نہ ان سرگوشیوں سے تمہارا کچھ نقصان ہو سکتا ہے، اس لیے اللہ ہی پر توکل رکھو اور غمگین ہو کر شیطان کو خوش ہونے کا موقع نہ دو۔

يَأْتِيهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قِيلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوا فِي الْمَجَالِسِ فَافْسَحُوا يَفْسَحِ اللَّهُ لَكُمْ ۗ وَإِذَا

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم سے کہا جائے کہ مجلسوں میں کھل جاؤ تو کھل جاؤ، اللہ تمہارے لیے فراخی کر دے گا

آیت 11 ﴿ يَأْتِيهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قِيلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوا ﴾ : بھجلی آیات میں مجلس کے آداب میں سے سرگوشی

سے ممانعت کا ادب بیان ہوا، اس آیت میں اس کے مزید کچھ آداب بیان ہوئے ہیں۔ ان آداب کی ضرورت اس لیے پڑی کہ رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں ہر شخص آپ کے زیادہ سے زیادہ قریب رہنے کی خواہش رکھتا تھا، جس سے مجلس میں تنگی پیش آتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ ادب سکھایا کہ جب حاضرین مجلس کی سہولت کے لیے کہا جائے کہ کھل جاؤ، تاکہ سب لوگ آسانی سے کھلے ہو کر بیٹھ سکیں تو کھل جاؤ، صرف میرے مجلس کے قرب کے پیش نظر ایک دوسرے کے اوپر چڑھ کر بیٹھے رہنے پر اصرار نہ کرو۔ اسی طرح اگر مجلس میں کچھ اور لوگ آجائیں اور ان کی جگہ بنانے کے لیے کھل جانے کے لیے کہا جائے تو کھل جاؤ اور دل میں تنگی محسوس نہ کرو۔

﴿ يَفْسَحِ اللَّهُ لَكُمْ ﴾ : ”یفسح“ فعل مضارع معلوم ہے جو ”تَفَسَّحُوا“ امر کا جواب ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے، آگے

ملانے کے لیے اسے کسرہ دیا گیا ہے، یعنی تم مجلس میں کشادگی کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے لیے فراخی کر دے گا، اس فراخی میں سب سے پہلی فراخی تو دل کی فراخی ہے کہ خوش دلی سے کھل جاؤ گے تو دلوں کی تنگی دور ہوگی اور ان میں بھائیوں کے لیے

وسعت پیدا ہوگی۔ اس کے علاوہ بھی اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت کے ہر معاملے میں تمہیں فراخی عطا فرمائے گا، کیونکہ ہر عمل کا بدلا اسی جیسا ہوتا ہے، جیسا کہ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿ مَنْ بَنَى مَسْجِدًا لِلَّهِ بَنَى اللَّهُ لَهُ

فِي الْجَنَّةِ مِثْلَهُ ﴾ [مسلم، المساجد، باب فضل بناء المساجد والحث علیہا: ۵۳۳/۲۵۰۔ بخاری: ۴۵۰] ”جو شخص اللہ

کے لیے مسجد بنائے اللہ اس کے لیے اس کی مثل جنت میں (گھر) بنائے گا۔“ اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ

نے فرمایا: ﴿ مَنْ نَفَسَ عَنْ مُؤْمِنٍ كُرْبَةً مِّنْ كُرْبِ الدُّنْيَا نَفَسَ اللَّهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِّنْ كُرْبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَمَنْ يَسَّرَ عَلَى مُعْسِرٍ يَسَّرَ اللَّهُ عَلَيْهِ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَاللَّهُ فِي عَوْنِ

الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِي عَوْنِ أُخِيهِ ﴾ [مسلم، الذکر، باب فضل الاجتماع على تلاوة القرآن وعلى الذکر: ۲۶۹۹] ”جو

شخص کسی مومن سے دنیا کی مصیبتوں میں سے کوئی مصیبت دور کرے اللہ تعالیٰ اس سے قیامت کے دن کی مصیبتوں میں سے کوئی مصیبت دور فرمائے گا۔ اور جو کسی تنگی والے پر آسانی کرے اللہ تعالیٰ اس پر دنیا اور آخرت میں آسانی کرے گا اور جو

شخص کسی مسلم (کے عیبوں) پر پردہ ڈالے اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس (کے عیبوں) پر پردہ ڈالے گا اور اللہ تعالیٰ بندے کی مدد میں ہوتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں ہوتا ہے۔“

﴿ وَإِذَا قِيلَ انشُرُوا فَاَنْشُرُوا: ”نَشْرٌ نِشْرٌ نَشْرًا“ (ض، ن) ”الرَّجُلُ عَنِ مَكَانِهِ“ آدمی کا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے

ہونا۔ جب کہا جائے اٹھ کھڑے ہو جاؤ تو اٹھ کھڑے ہو جاؤ، یعنی جب مجلس کا امیر یا مجلس کے منتظمین حاضرین میں سے کسی

قَبِيلَ انْشُرُوا فَانْشُرُوا يَرْفَعُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ لَا وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ ۗ

اور جب کہا جائے اٹھ کھڑے ہو تو اٹھ کھڑے ہو جاؤ، اللہ ان لوگوں کو درجات میں بلند کرے گا جو تم میں سے ایمان کے علم و فضل اور شرف و مرتبہ کے پیش نظر اسے امیر کے قریب لانے کے لیے کسی کو اس کی جگہ سے اٹھ جانے کے لیے کہیں تو سے چاہیے کہ اٹھ جائے اور اپنے دل میں کوئی تنگی یا مال نہ لائے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «لِيَلْبِنِي مِنْكُمْ أَوْلُو الْأَحْلَامِ وَالنُّهْيِ ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ» [مسلم، الصلاة، باب تسوية الصفوف و إقامتها: ۴۳۲] ”تم میں سے میرے قریب وہ لوگ ہوں جو سمجھ اور عقل والے ہوں، پھر جو ان سے (سمجھ اور عقل میں) قریب ہوں۔“ اسی طرح اگر امیر کسی شخص سے یا کچھ لوگوں سے مشورہ کرنے کے لیے یا ان کی بات سننے کے لیے کسی کو اس کی جگہ سے اٹھ جانے کے لیے کہے تو اسے کسی مال کے بغیر اٹھ جانا چاہیے۔ یہ ادب اس لیے مقرر فرمایا کہ بعض اوقات عام سمجھ والے مسلمان رسول اللہ ﷺ سے محبت کی وجہ سے یا منافقین اپنے حبیب باطن کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کے قریب ساری جگہ گھیر لیتے، پھر کوئی بزرگ صحابی مثلاً ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما وغیرہ آتے تو ان کے لیے جگہ نہ چھوڑتے اور اگر اٹھنے کے لیے کہا جاتا تو برامنا تے۔ ظاہر ہے اگر اس ادب کا خیال نہ رکھا جائے تو کسی امیر کی کوئی مجلس صحیح طریقے سے چل ہی نہیں سکتی۔ اسی طرح اگر امیر مجلس کو برخاست کر دے اور سب کو اٹھ جانے کے لیے کہے تو انھیں اٹھ جانا چاہیے اور اس میں اپنی توہین محسوس نہیں کرنی چاہیے۔

④ يَرْفَعُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا.....: ”يَرْفَعُ“ فعل مضارع ہے جو ”فَانْشُرُوا“ امر کا جواب ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے، کسرہ اسے آگے لانے کے لیے دیا گیا ہے۔ یعنی جب تم سے کہا جائے کہ اٹھ کھڑے ہو جاؤ تو اٹھ کھڑے ہو جاؤ۔ جب تم اللہ کا حکم سمجھ کر تواضع اختیار کرو گے اور اٹھنے میں کسی طرح کی توہین یا کسرِ شان کا خیال دل میں نہیں لاؤ گے تو اللہ تعالیٰ تم میں سے ان لوگوں کو درجات میں بلند کر دے گا جو ایمان لائے، کیونکہ ایمان کا تقاضا تواضع ہے اور ایمان اور کبر کبھی جمع نہیں ہو سکتے۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ مَنْ كَبِرَ وَلَا يَدْخُلُ النَّارَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ خَرْدَلٍ مَنْ إِيْمَانٍ» | أبو داؤد، اللباس، باب ما جاء في الكبر: ۴۰۹۱، وقال الألباني صحيح | ”وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر کبر ہوگا اور وہ شخص آگ میں داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں رائی کے برابر ایمان ہوگا۔“

⑤ يَرْفَعُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ: بظاہر یہاں الفاظ یہ ہونے چاہئیں تھے کہ ”يَرْفَعُ اللَّهُ الَّذِينَ نَشَرُوا مِنْكُمْ“ یعنی ”(جب تمہیں کہا جائے کہ اٹھ کھڑے ہو جاؤ تو اٹھ کھڑے ہو جاؤ) تو اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو اٹھ کھڑے ہوں گے درجات میں بلند کر دے گا“ مگر اللہ تعالیٰ نے منافقین کو نکالنے کے لیے ”آمَنُوا مِنْكُمْ“ کی قید لگا دی کہ منافقین اس حکم پر اٹھ کھڑے ہوں تب بھی انھیں رفع درجات کا شرف حاصل نہیں ہو سکتا، ان کا ٹھکانا ”الذَّلِيلُ الْأَسْفَلُ مِنَ النَّارِ“ (آگ کا سب سے نیچلا درجہ) ہی ہے۔ دیکھیے سورہ نساء (۱۳۵)۔

وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿۱۱﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَأْتَيْتُمُ الرُّسُولَ فَتَقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيْهِ
 نَجْوَاكُمْ صَدَقَةٌ ۚ ذَلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَأَظْهَرٌ ۚ فَإِن لَّمْ تَجِدُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۲﴾

لائے اور جنہیں علم دیا گیا اور اللہ اس سے جو تم کرتے ہو، پوری طرح باخبر ہے ﴿۱۱﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب
 تم رسول سے سرگوشی کرو تو اپنی سرگوشی سے پہلے کچھ صدقہ پیش کرو، یہ تمہارے لیے زیادہ اچھا اور زیادہ پاکیزہ ہے،
 پھر اگر نہ پاؤ تو یقیناً اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے ﴿۱۲﴾

﴿۱۱﴾ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ: یہ ”الَّذِينَ آمَنُوا“ ہی کی صفت ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمام صحابہ کرام کو ایمان سے ”الَّذِينَ
 أُوتُوا الْعِلْمَ“ قرار دیا ہے۔ دیکھیے سورہ محمد (۱۶) کی تفسیر اور ایمان کا ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ بھی علم کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا،
 جیسا کہ فرمایا: ﴿فَاعْلَمُوا أَنَّمَا آتَىٰ آلَ اللَّهِ﴾ | محمد: ۱۶ | ”پس جان لے کہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود
 نہیں۔“ ہاں، علم اور ایمان کے مدارج میں کمی بیشی ہوتی ہے۔ اسی طرح جنت میں علم کے لحاظ سے اہل ایمان کے مدارج میں
 بندی ہوگی۔ عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿يُقَالُ لِمَنْ جَاءَهُ الْقُرْآنُ أَفْرَأُ وَأَزْتَجِي وَرَتَّلَ
 كَمَا سُكِّنَتْ تَرْتَلُ فِي الدُّنْيَا فَإِنَّ مِنْزِلَكَ عِنْدَ آجِرِ آيَةِ تَقْرَأُهَا﴾ | ابو داؤد، ابوداؤد، باب كيف يستحب الترتيل في القراءة: ۱۶۶۹
 دنیا میں ٹھہر ٹھہر کر پڑھتا تھا، تیرا مقام آخری آیت کے پاس ہے جسے تو پڑھے گا۔“ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿إِنَّ اللَّهَ
 يَرْفَعُ بِهَذَا الْكِتَابِ أَقْوَامًا وَيُنْزِعُ بِهِ الْآخَرِينَ﴾ | مسلم، صلاة المسافرين، باب فضل من يقوم بالقراءة ويعلمه :
 ۸۱۷، عن عمر رضی اللہ عنہما | یعنی اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنہیں علم دیا گیا درجات میں بندی عطا فرمائے گا، وہ
 جس قدر ایمان اور علم میں زیادہ ہوں گے اتنے ہی درجات میں بند ہوں گے۔ اس آیت سے علم کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔

﴿۱۲﴾ یہاں ایک سوال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ”الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ“ اور ”وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ“ کو عطف کے ساتھ ذکر
 فرمایا ہے، جو مغایرت کے لیے ہوتا ہے، تو یہ دونوں ایک ہی موصوف کی صفت کیسے ہو سکتے ہیں؟ جواب اس کا یہ ہے کہ یہاں
 موصوف میں مغایرت مراد نہیں صفات میں مغایرت مراد ہے اور بعض اوقات ایک ہی موصوف کی صفات اس طرح بھی لائی
 جاتی ہیں، جیسا کہ سورہ اہل میں ہے: ﴿سَبِّحْ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَىٰ ۚ الَّذِي خَلَقَ فَسُوَّىٰ ۚ وَ الَّذِي قَدَّرَ قَدَرًا ۚ وَ الَّذِي
 وَالَّذِي أَخْرَجَ الْمَرْعَىٰ﴾ | الاعلیٰ: ۱ تا ۴ | ”اپنے رب کے نام کی تسبیح کر جو سب سے بلند ہے۔ وہ جس نے پیدا کیا،
 پس درست بنایا۔ اور وہ جس نے اندازہ ٹھہرایا، پھر ہدایت کی۔ اور وہ جس نے چارا اُگایا۔“

﴿۱۳﴾ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ: یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے تمام اعمال سے پوری طرح باخبر ہے کہ تم اٹھنے کا حکم ملنے پر خوش دلی
 سے اٹھ کھڑے ہوتے ہو یا نفاق اور کبر کی وجہ سے مجبوراً اٹھتے ہو اور وہ تمہیں تمہارے عمل کے مطابق ہی جزا دے گا۔

آیت 12 ﴿۱﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَأْتَيْتُمُ الرُّسُولَ..... ہر مسلمان نبی ﷺ سے مناجات اور خلوت میں

ءَأَشْفَقْتُمْ أَنْ تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰكُمْ صَدَقْتُمْ ۖ فَاذْ لَمْ تَفْعَلُوا وَتَابَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ
فَأَقْبُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَاطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۗ وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿۱۳﴾

کیا تم اس سے ڈر گئے کہ اپنی سرگوشی سے پہلے کچھ صدقے پیش کرو، سو جب تم نے ایسا نہیں کیا اور اللہ نے تم پر مہربانی فرمائی تو نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانو اور اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے جو تم کرتے ہو ﴿۱۳﴾

گفتگو کی خواہش رکھتا تھا، جس سے نبی ﷺ کو مشقت اٹھانا پڑتی تھی۔ اس پر مزید منافقین کا رویہ تھا کہ انھوں نے محض اپنی بڑائی جتانے کے لیے نبی ﷺ سے سرگوشیاں شروع کر دیں۔ ایک ایک آدمی آپ کا خاصا وقت لے جاتا، اس سے دوسرے لوگوں کو تکلیف ہوتی، کیونکہ انھیں عام فائدہ اٹھانے کا موقع نہ ملتا، خود نبی ﷺ پر بھی ان کا یہ طرز عمل شاق گزرتا، مگر آپ مروت و اخلاق کی وجہ سے کسی کو منع نہ فرماتے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ جو شخص بھی آپ ﷺ سے علیحدگی میں گفتگو کرنا چاہے وہ اس سے پہلے صدقہ دے کر آئے، البتہ نادار مسلمانوں کے لیے گنجائش رکھی کہ اگر صدقہ کرنے کے لیے تمہارے پاس کچھ نہ ہو اور تمہیں علیحدگی میں گفتگو کرنا ضروری ہو تو اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے۔ منافقین عموماً مال دار تھے مگر سخت بخیل تھے، لہذا انھوں نے بخل کی وجہ سے علیحدگی میں گفتگو کر کے آپ کا وقت ضائع کرنا ترک کر دیا۔

﴿۱۳﴾ ذٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاظْهَرُ: یعنی اس حکم کا مقصد صرف رسول اللہ ﷺ سے مشقت ہٹانا نہیں بلکہ تمہاری تربیت بھی ہے کہ جب بھی تمہیں رسول اللہ ﷺ سے علیحدگی میں گفتگو کی خواہش ہوگی اور ہر بار اس سے پہلے تم صدقہ کرو گے تو اس سے فقراء کا فائدہ ہوگا اور تمہیں خرچ کرنے کی عادت پڑے گی، بخل کی کمینگی دور ہوگی، مال میں برکت ہوگی، آفات و مصائب اور جہنم سے حفاظت ہوگی اور اموال و قلوب کو طہارت حاصل ہوگی۔

آیت 13 ﴿۱﴾ ءَأَشْفَقْتُمْ أَنْ تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰكُمْ صَدَقْتُمْ: اس سے ظاہر ہے کہ اس حکم کے بعد رسول اللہ ﷺ کے ساتھ علیحدگی میں گفتگو کا رجحان، جو بہت بڑھ گیا تھا، رک گیا۔ منافقین اپنے بخل کی وجہ سے رک گئے اور مخلص مسلمان، جو نادار تھے، غربت کی وجہ سے محتاط ہو گئے۔

﴿۲﴾ فَاذْ لَمْ تَفْعَلُوا وَتَابَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حکم کے نزول کے بعد کسی نے نہ تو رسول اللہ ﷺ سے کوئی رازدارانہ بات کرنے کی جرأت کی اور نہ اس مقصد کے لیے صدقہ دینے کی نوبت آئی، بلکہ انھیں احساس ہو گیا کہ رسول اللہ ﷺ سے رازدارانہ گفتگو کے بارے میں ان کی روش اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں آئی، اس لیے وہ اس پر نادم ہوئے اور اپنے رویے سے باز آ گئے۔ ”وَتَابَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ“ یعنی اللہ تعالیٰ نے بھی ان پر مہربانی فرمائی اور آپ سے مناجات سے پہلے صدقے کا حکم منسوخ کر دیا۔

﴿۳﴾ فَاَقْبُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ.....: یعنی جب یہ وقتی حکم تم سے اٹھایا گیا تو ان احکام کی پابندی کرتے رہو جن پر

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ۗ مَا هُمْ مِنْكُمْ وَلَا مِنْهُمْ ۗ
وَيَحْلِفُونَ عَلَى الْكُذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿۱۳﴾

کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہوں نے ان لوگوں کو دوست بنا لیا جن پر اللہ غصے ہو گیا، وہ نہ تم سے ہیں اور نہ ان سے اور وہ جھوٹ پر قسمیں کھاتے ہیں، حالانکہ وہ جانتے ہیں ﴿۱۳﴾

عمل تمہارے لیے ہمیشہ لازم ہے۔ ان میں سب سے اہم نماز اور زکوٰۃ ہے، اس کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول کے ہر حکم کی اطاعت پر کار بند رہو اور یہ بات ہمیشہ پیش نظر رکھو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ہر عمل سے پوری طرح باخبر ہے۔

۱۳ یہ حکم اگرچہ منسوخ ہو گیا مگر اس سے جو مقصود تھا وہ حاصل ہو گیا، مسلمان تو آپ ﷺ سے محبت اور آپ کے ادب کی وجہ سے علیحدگی میں لمبی گفتگو سے اجتناب کرنے لگے اور منافقین اس خوف سے کہ ہم نے ایسا کیا تو ہمارا نفاق کھل جائے گا اور ہم بچان لیے جائیں گے۔

آیت ۱۴ ﴿۱۴﴾ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ۗ اس آیت میں منافقین کے تین اوصاف بیان کرتے ہوئے ان کی حالت پر تعجب کا اظہار کیا گیا ہے، ان میں سے پہلا وصف یہ ہے کہ ایمان کے دعوے کے باوجود ان کی دوستی ان لوگوں کے ساتھ ہے جو ایمان والوں کے بدترین دشمن ہیں اور جن پر اللہ کا غضب ہوا ہے۔ اگرچہ تمام کفار ہی پر اللہ کا غضب ہے اور منافقین تمام کفار سے دوستی کرتے تھے، مگر ”مَغْضُوبٌ عَلَيْهِمْ“ خاص طور پر یہود کا لقب ہے، جیسا کہ ”غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ“ کی تفسیر میں سزر چکا ہے۔ مزید دیکھیے سورہ بقرہ (۹۰، ۶۱)، آل عمران (۱۱۴)، اعراف (۱۵۲)، مائدہ (۶۰) اور سورہ ممتحنہ (۱۳) حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو یہود و نصاریٰ اور کفار کی دوستی سے صریح الفاظ میں منع فرمایا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ آل عمران (۲۸)، نساء (۱۳۳)، مائدہ (۵۱) اور سورہ توبہ (۲۳)۔

۱۴ مَا هُمْ مِنْكُمْ وَلَا مِنْهُمْ : یہ منافقین کا دوسرا وصف ہے کہ بظاہر مسلمان ہونے کے باوجود وہ واقعی واقعہ میں سے نہیں ہیں، کیونکہ اگر وہ حقیقی مومن ہوتے تو کفار کو کبھی دوست نہ بناتے۔ (دیکھیے مائدہ: ۸۱) اور اسی طرح وہ یہود میں سے بھی نہیں، کیونکہ وہ انھیں بھی حق پر نہیں سمجھتے، ان کی دوستی محض غرض کی دوستی ہے کہ اگر مسلمانوں پر کوئی گروہ آئی تو ان کی دوستی کام آئے گی۔ دیکھیے سورہ نساء (۱۳۲، ۱۳۳) کی تفسیر۔

۱۵ وَيَحْلِفُونَ عَلَى الْكُذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُونَ : یعنی یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ جھوٹ بول رہے ہیں جھوٹ بولتے ہیں اور اس پر قسمیں بھی کھاتے ہیں۔ اس جھوٹ سے مراد ایک تو مومن ہونے کا دعویٰ ہے۔ (دیکھیے منافقون: ۱۔ توبہ: ۵۶) پھر مختلف اوقات میں اللہ اور اس کے رسول اور مسلمانوں کے خلاف ان کے کسی قول یا فعل پر جب گرفت کی جاتی تو وہ جھوٹ بول دیتے کہ ہم نے یہ بات نہیں کہی، نہ یہ کام کیا ہے اور اس پر قسمیں کھا جاتے۔ (دیکھیے توبہ: ۶۲، ۷۳، ۹۵، ۹۶۔ منافقون: ۷، ۸)

أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا ۖ إِنَّهُمْ سَاءَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۵﴾ اِتَّخَذُوا آيَاتِنَاهُمْ جُنَّةً
 قَصْدًا وَعَنْ سَبِيلِ اللَّهِ فَلَهُمْ عَذَابٌ مُهِينٌ ﴿۱۶﴾ لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ
 مِنَ اللَّهِ شَيْئًا ۖ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿۱۷﴾ يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ جَنِينًا
 فَيَخْلُقُون لَهُ كَمَا يَخْلُقُونَ لَكُمْ وَيَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ ۖ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْكَذِبُونَ ﴿۱۸﴾

اللہ نے ان کے لیے بہت سخت عذاب تیار کیا ہے، بے شک یہ لوگ، برا ہے جو کچھ کرتے رہے ہیں ﴿۱۵﴾ انھوں نے اپنی قسموں کو ایک طرح کی ڈھال بنا لیا، پس انھوں نے اللہ کی راہ سے روکا، سو ان کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے ﴿۱۶﴾ ان کے اموال اللہ کے مقابلے میں ہرگز ان کے کسی کام نہ آئیں گے اور نہ ہی ان کی اولاد۔ یہ لوگ آگ میں رہنے والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ﴿۱۷﴾ جس دن اللہ ان سب کو اٹھائے گا تو وہ اس کے سامنے قسمیں کھائیں گے جس طرح تمہارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں اور گمان کریں گے کہ بے شک وہ کسی چیز پر قائم ہیں، سن لو! یقیناً وہی اصل جھوٹے ہیں ﴿۱۸﴾

سیرت کی کتابوں میں ایسے بہت سے واقعات مذکور ہیں۔

آیت 15 أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا : عذاب شدید سے مراد "الذَّلِيلُ الْأَسْفَلُ مِنَ النَّارِ" ہے۔ دیکھیے سورہ نساء (۱۳۵)۔

آیت 16 ﴿۱﴾ اِتَّخَذُوا آيَاتِنَاهُمْ جُنَّةً : یعنی ایک طرف انھوں نے اپنی جانیں اور اپنے مال بچانے کے لیے مسلمان ہونے کی جھوٹی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے اور دوسری طرف وہ مسلمانوں کے اندر رہ کر جب موقع ملتا ہے شکوک و شبہات پیدا کر کے بہت سے لوگوں کو جہاد فی سبیل اللہ سے روک دیتے ہیں۔ مزید دیکھیے سورہ آل عمران (۱۶۸، ۱۵۶)، نساء (۷۲) اور سورہ احزاب (۱۸)۔

آیت 17 ﴿۲﴾ فَلَهُمْ عَذَابٌ مُهِينٌ : دنیا میں یہ رسوائی کہ نہ مسلمانوں میں ان کی کوئی عزت ہے اور نہ کفار میں سے کوئی ان پر اعتماد کرتا ہے اور قیامت کے دن ان کے لیے "الذَّلِيلُ الْأَسْفَلُ مِنَ النَّارِ" کی شکل میں عذاب تیار ہے۔

آیت 17 لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ : نفاق کا بڑا باعث مال و اولاد کی محبت ہے، اس لیے فرمایا قیامت کے دن یہ اموال و اولاد ان کے کسی کام نہیں آئیں گے۔ مزید دیکھیے سورہ آل عمران (۱۱۶، ۱۱۷)۔

آیت 18 يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ جَنِينًا فَيَخْلُقُون لَهُ : یعنی منافقین کی جھوٹ بولنے اور اس پر قسم کھانے کی عادت اتنی پکی ہے کہ موت اور حشر و نشر کے بعد بھی نہیں جائے گی اور وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اسی طرح جھوٹی قسمیں کھا جائیں گے جس طرح دنیا میں مسلمانوں کے سامنے کھاتے ہیں اور سمجھیں گے کہ قسم کی صورت میں ان کے پاس کچھ نہ کچھ بنیاد موجود ہے، کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنۡسَهُمۡ ذِكْرَ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ حِزۡبُ الشَّيْطٰنِ ؕ اِلَّا اِنَّ حِزۡبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوۡنَ ﴿۱۹﴾ اِنَّ الَّذِيۡنَ يُحٰدِثُوۡنَ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗٓ اُولٰٓئِكَ فِي الْاٰذٰنِيۡنَ ﴿۲۰﴾ كَتَبَ اللّٰهُ لَالۡغُلِيۡبِۡنَ اَنَا وَرُسُلِيۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيۡزٌ ﴿۲۱﴾

شیطان ان پر غالب آ گیا، سو اس نے انہیں اللہ کی یاد بھلا دی، یہ لوگ شیطان کا گروہ ہیں۔ سن لو! یقیناً شیطان کا گروہ ہی وہ لوگ ہیں جو خسارہ اٹھانے والے ہیں ﴿۱۹﴾ بے شک وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں وہی سب سے زیادہ ذلیل ہونے والوں میں سے ہیں ﴿۲۰﴾ اللہ نے لکھ دیا ہے کہ ضرور بالضرور میں غالب رہوں گا اور میرے رسول، یقیناً اللہ بڑی قوت والا، سب پر غالب ہے ﴿۲۱﴾

جس پر دو قلم ہیں۔ فرمایا سن لو، وہی اصل اور کامل جھوٹے ہیں کہ علام الغیوب کے سامنے بھی جھوٹ بولنے سے باز نہیں آتے۔ دیکھیے سورۃ انعام (۲۳ تا ۲۴)۔

آیت 19 ﴿۱۹﴾ اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنۡسَهُمۡ ذِكْرَ اللّٰهِ ... : یعنی منافقین کے ان اعمال کی وجہ سے ان پر شیطان غالب آ گیا اور اس طرح مسلط ہو گیا ہے کہ اس نے انہیں اللہ کی یاد تک بھلا دی ہے۔ یہ لوگ شیطانی گروہ ہیں اور شیطان کا گروہ ہی کامل خسارے والے لوگ ہیں۔

﴿۲﴾ اس سے معلوم ہوا کہ بعض اعمال کے نتیجے میں شیطان کا آدمی پر غلبہ ہو جاتا ہے، ان اعمال میں سے ایک نماز یا جماعت کا ترک ہے۔ ابو درداء رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « مَا مِنْ ثَلَاثَةٍ فِيْ فِرْيَةٍ وَّلَا يَدُوٍّ لَّا تُقَامُ فِيْهِمُ الصَّلَاةُ اِلَّا قَدِ اسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطَانُ فَعَلَيْكَ بِالْجَمَاعَةِ فَاِنَّمَا يَأْكُلُ الذُّبُّ الْقَاصِيَةَ » (ابو داؤد، الصلاۃ، باب التشديد في ترك الجماعة: ۵۷۷) "کوئی بھی بستی یا آبادی نہیں جس میں تین آدمی (ہی) ہوں اور ان میں نماز یا جماعت نہ ہوتی ہو مگر اس پر شیطان غالب آچکا ہے، اس لیے تم جماعت کو لازم پکڑو، کیونکہ بھیڑیا صرف اسی بکری کو کھاتا ہے جو ریوڑ سے دور جانے والی ہو۔" قرآن مجید میں بھی اس کی طرف اشارہ موجود ہے، فرمایا: ﴿وَ اِذَا قَامُوۡا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوۡا كَمَاۤ اِلٰی﴾ [النساء: ۱۰۴] "اور جب وہ (منافق) نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو ست ہو کر کھڑے ہوتے ہیں۔"

آیت 20 ﴿۲۰﴾ اِنَّ الَّذِيۡنَ يُحٰدِثُوۡنَ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗٓ ... : یہ حزب الشیطان کے اس خسارے کا بیان ہے جو پھیلی آیت میں مذکور ہے اور وہ یہ ہے کہ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں وہ دنیا اور آخرت میں سب سے زیادہ ذلیل ہونے والوں میں سے ہیں۔ مزید دیکھیے اسی سورت کی آیت (۶۰۵) اور سورۃ توبہ کی آیت (۲۳) کی تفسیر۔

آیت 21 ﴿۲۱﴾ كَتَبَ اللّٰهُ لَالۡغُلِيۡبِۡنَ اَنَا وَرُسُلِيۡ : کفار کے "الَّذِيۡنَ" ہونے کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کے رسولوں اور اہل ایمان کی عزت اور ان کے نجبے کا بیان فرمایا۔ تفسیر کے لیے دیکھیے سورۃ صافات (۱۷۱ تا ۱۷۳) کی تفسیر۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ ۗ أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُم بِرُوحٍ مِّنْهُ ۗ وَيُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ

تو ان لوگوں کو جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، نہیں پائے گا کہ وہ ان لوگوں سے دوستی رکھتے ہوں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی، خواہ وہ ان کے باپ ہوں، یا ان کے بیٹے، یا ان کے بھائی، یا ان کا خاندان۔ یہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اس نے ایمان لکھ دیا ہے اور انہیں اپنی طرف سے ایک روح کے ساتھ قوت بخشی ہے اور انہیں ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے تلے نہریں بہتی ہوں گی، ان میں ہمیشہ

② إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ: یہ اللہ اور اس کے رسولوں کے غالب آنے کی علت ہے کہ اللہ تعالیٰ بہت قوت والا اور سب پر غالب ہے، پھر اس پر غالب کون آسکتا ہے؟

آیت 22: ① لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ..... یعنی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے دشمنوں سے دوستی دوالی چیزیں ہیں جو ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتیں، خواہ وہ آدمی کے کتنے قریبی رشتہ دار ہوں، اس لیے منافقین جو ایمان کے دعوے کے باوجود کفار سے دوستی رکھتے ہیں ان کا ایمان کا دعویٰ غلط ہے۔ مزید دیکھیے سورہ آل عمران (۲۸) اور سورہ توبہ (۲۳، ۲۴)۔

② أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ: یعنی یہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول سے دشمنی رکھنے والوں سے دوستی نہیں رکھتے، خواہ وہ کتنے قریبی رشتہ دار ہوں، اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں ایمان نقش کر دیا ہے۔ اس کا مصداق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں، کیونکہ انہوں نے ان تمام لوگوں سے دوستی اور دلی تعلق کا رشتہ کاٹ پھینکا تھا جو اللہ اور اس کے رسول سے مخالفت اور دشمنی رکھتے تھے، خواہ وہ ان کے باپ تھے یا بیٹے یا بھائی یا خاندان کے لوگ۔ تاریخ اور سیرت کی کتابوں میں ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کفر کی حمایت میں مسلمانوں سے لڑنے والے قریب ترین رشتہ داروں کو بھی قتل یا قید کرنے سے دریغ نہیں کیا، خواہ وہ ان کے باپ یا بیٹے یا بھائی تھے یا کوئی اور رشتہ دار۔ جنگ بدر میں جب قیدیوں کے متعلق مشورہ ہوا کہ ان کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے یا قتل کر دیا جائے، تو عمر رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا تھا کہ ان کافر قیدیوں میں سے ہر ایک کو اس کے رشتہ دار کے سپرد کیا جائے، جسے وہ خود اپنے ہاتھوں سے قتل کرے اور اللہ تعالیٰ کو عمر رضی اللہ عنہ ہی کا مشورہ پسند آیا تھا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ انفال (۶۷) کی تفسیر۔ پھر رسول اللہ ﷺ کے چچا عباس اور عقیل بن ابی طالب (رضی اللہ عنہما) اسیر ہوئے تو دوسرے قیدیوں کی طرح فدیہ دے کر رہا ہوئے۔ اسی طرح آپ کے داماد ابوالعاص اس شرط پر رہا ہوئے کہ آپ کی بیٹی زینب رضی اللہ عنہا کو واپس بھجوادیں گے۔

فِيهَا رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ أُولَئِكَ حِزْبُ اللَّهِ أَلَا إِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ

الْمُقْلِحُونَ ﴿۳۷﴾

رہنے والے ہیں، اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اس سے راضی ہو گئے۔ یہ لوگ اللہ کا گروہ ہیں، یاد رکھو! یقیناً اللہ کا گروہ ہی وہ لوگ ہیں جو کامیاب ہونے والے ہیں ﴿۳۷﴾

﴿۳﴾ وَ أَيْدَاهُمْ يَرْزُقُ مِنْهُ: یعنی انھیں اپنی طرف سے ایک عظیم روحانی قوت عطا فرما کر ان کی مدد فرمائی۔

﴿۴﴾ وَ يُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ.....: یہ ہے جنّتوں میں داخلے، اس میں ابدی قیام اور اللہ تعالیٰ کی رضا کا وہ تصدیق نامہ جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے حاصل ہوا۔ پھر ان لوگوں کی بد نصیبی کا کیا عالم ہو سکتا ہے جو ان سے دشمنی رکھتے اور ان کے بارے میں بدزبانی کرتے ہیں۔

﴿۵﴾ أُولَئِكَ حِزْبُ اللَّهِ...: ”حِزْبُ اللَّهِ“ خیر معرّفہ ہونے سے حصر کا مفہوم پیدا ہو رہا ہے، یعنی اللہ کی جماعت اور گروہ صرف یہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ کو اپنا بنا لیا اور اپنے ان عزیزوں سے بیگانہ ہو گئے جو اس سے اور اس کے رسول سے دشمنی رکھتے تھے۔ یاد رکھو! صرف اللہ کا گروہ ہی وہ لوگ ہیں جو کامیاب ہونے والے ہیں۔



سَبَّحَ لِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۗ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيْمُ ①

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

اللہ کا پاک ہونا بیان کیا ہر چیز نے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور وہی سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ①

اس سورت کا نام ”الحشر“ اس کی دوسری آیت میں مذکور لفظ ”لَا اَوْلِيَ الْحَشْرِ“ کی وجہ سے ہے۔ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے سوال ہوا کہ سورہ حشر کس کے بارے میں نازل ہوئی، تو انہوں نے فرمایا: «نَزَلَتْ فِي بَنِي النَّضْرِ» [بخاری، التفسیر، سورہ الحشر: ۴۸۸۲] ”یہ سورت (مشہور یہودی قبیلے) بنو نضیر کے بارے میں اتری۔“ صحیح بخاری ہی میں سعید بن جبیر سے مروی ہے کہ میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس (اسے) سورہ حشر کہا تو انہوں نے فرمایا: ”(اسے) سورہ نضیر کہو۔“ [بخاری، التفسیر، سورہ الحشر: ۴۸۸۳] ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بات یا تو اس لیے فرمائی کہ کوئی شخص لفظ حشر سے یہاں قیامت مراد نہ لے لے، بلکہ یہ بات پیش نظر رہے کہ اس میں مرکزی مضمون بنو نضیر کا معاملہ ہے، یا پھر انہوں نے یہ بتانے کے لیے یہ بات کہی کہ اس سورت کا نام سورہ حشر کے علاوہ سورہ نضیر بھی ہے۔

آیت 1 سَبَّحَ لِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ : اس آیت کی تفسیر سورہ حدید کی پہلی آیت اور سورہ بنی اسرائیل کی آیت (۳۴) میں گزر چکی ہے، یہاں صرف چند باتوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو اس مقام سے متعلق ہیں: ① سورہ حدید میں ”مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ“ ہے، جب کہ یہاں ”مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ“ ہے۔ ابن عاشور رضی اللہ عنہ نے اس کی توجیہ یہ فرمائی ہے کہ سورہ حدید کی ابتدا میں زمین و آسمان کی ہر چیز کے اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرنے کو بطور دلیل بیان کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کی توحید اور ان صفات کے ثبوت کے لیے جو بعد کی آیات میں بیان ہوئی ہیں۔ چونکہ وہ سب کچھ جو زمین و آسمان میں پایا جاتا ہے مجموعی طور پر اس کی دلیل ہے، اس لیے ”مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ“ میں اسے اکٹھا کر دیا ہے۔ جب کہ سورہ حشر کی ابتدا میں اللہ کی تسبیح کا ذکر مسلمانوں پر اس احسان کی یاد دلانے کے لیے ہے جو زمین پر پیش آنے والے ایک واقعہ کی صورت میں ہوا اور وہ ہے بنو نضیر کی جلا وطنی اور مسلمانوں کا ان کی اراضی اور اموال کا مالک بن جانا۔ اس لیے اس میں زمین والوں کو خاص طور پر الگ ذکر کرنے کے لیے ”مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ“ فرمایا۔ یہی معاملہ سورہ صف، سورہ جمعہ اور سورہ تغابن کا ہے، ان سب میں ”مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ“ کے بجائے ”مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ“ کہا گیا ہے، کیونکہ ان کے بعد مذکور چیزوں کا تعلق خاص طور پر زمین والوں کے ساتھ ہے۔

② بنو نضیر کے واقعہ کے ذکر سے پہلے ”سَبَّحَ لِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ“ لانے کا مقصد یہ ہے کہ اس جیسے طاقتور

هُوَ الَّذِي أَخْرَجَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِأَوَّلِ الْحَشْرِ مَا

وہی ہے جس نے اہل کتاب میں سے ان لوگوں کو جنہوں نے کفر کیا پہلے اکٹھے ہی میں ان کے گھروں سے نکال قیلے کے ساتھ جو معاملہ پیش آیا وہ مسلمانوں کی طاقت کا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا کرشمہ تھا، جو ہر عیب اور بجز سے پاک ہے۔ یہ کام جو مسلمانوں کی تعداد اور قوت کے لحاظ سے ممکن ہی نہ تھا، اللہ تعالیٰ کے لیے بالکل معمولی ہے، کیونکہ وہ سبحان ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات ”الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ“ لانے میں بھی یہی حکمت ہے کہ جب وہ کسی کو غالب کرنا چاہے تو کوئی اسے روک نہیں سکتا اور اس واقعہ میں بھی اس کی بے شمار حکمتیں ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں مسلمانوں کے لیے سبق بھی ہے کہ جب آسمانوں کی ہر چیز اور زمین کی ہر چیز اللہ کی تسبیح کرتی ہے تو تمہیں بھی اس کی بے شمار نعمتوں پر، جن میں بنو نضیر کی جلا وطنی کی نعمت بھی ہے اس کی تسبیح کرنی چاہیے۔

آیت 2 ﴿هُوَ الَّذِي أَخْرَجَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مِنْ دِيَارِهِمْ﴾ : ”هُوَ“ مبتدا کے بعد ”الَّذِي“ خبر معرف لانے سے کلام میں حصر پیدا ہو رہا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ جس کی تسبیح ہر وہ چیز کرتی ہے جو آسمانوں میں ہے اور ہر وہ چیز بھی جو زمین میں ہے اور جو اکیلا ہی عزیز و حکیم ہے، اسی نے اہل کتاب میں سے ان لوگوں کو ان کے گھروں سے نکال باہر کیا جنہوں نے کفر کیا، اس کے سوا انہیں نکالنے والا اور کوئی نہیں۔ یہ اس لیے فرمایا کہ مسلمان جنگ کے بغیر ان کے جلا وطن ہو جانے کو اپنی بہ دردی نہ سمجھیں، بلکہ اللہ کا انعام سمجھ کر اس کی تسبیح و تحمید کریں اور اسی کا شکر بجالائیں۔ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ”هُوَ الَّذِي أَخْرَجَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ“ کے متعلق فرمایا کہ اس سے مراد بنو نضیر کے یہود ہیں۔ یہ بات ابن عباس، مجاہد، زہری اور بہت سے لوگوں نے کہی ہے۔ رسول اللہ ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو آپ نے ان سے صلح کر لی اور معاہدہ کیا کہ نہ آپ ان سے لڑیں گے اور نہ وہ آپ سے لڑیں گے، مگر انہوں نے آپ کے ساتھ کیے ہوئے اس عہد کو توڑ دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنا وہ عذاب نازل فرمایا جو ہٹایا نہیں جاسکتا اور ان پر اپنا وہ فیصلہ جاری فرمایا جسے ٹالا نہیں جاسکتا۔ چنانچہ نبی ﷺ نے انہیں جلا وطن کر دیا اور انہیں ان کے ان مضبوط و محفوظ قلعوں سے نکال باہر کیا جن کے حاصل ہونے کا مسلمانوں کو کبھی طمع تک پیدا نہ ہوا تھا اور جن کے متعلق یہود یہ سمجھتے تھے کہ وہ انہیں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچا لینے والے ہیں، مگر وہ ان کے کسی کام نہ آئے اور اللہ کی طرف سے ان پر ایسی گرفت آئی جو ان کے وہم و گمان میں نہ تھی۔

حدیث اور سیرت کی کتابوں میں اس واقعہ کی تفصیلات مذکور ہیں جن میں ان کے عہد توڑنے کے متعدد واقعات کا ذکر ہے۔ ان میں سے ایک وہ ہے جو سنن ابوداؤد میں مروی ہے، عبدالرحمن بن کعب بن مالک نے نبی ﷺ کے اصحاب رضی اللہ عنہم میں سے ایک صحابی سے بیان کیا: ”رسول اللہ ﷺ مدینہ میں تھے، ابھی بدر کا معرکہ نہیں ہوا تھا کہ کفار قریش نے عبداللہ بن ابی کی طرف اور اس و خزرج میں سے اس کے بت پرست ساتھیوں کی طرف خط لکھا کہ تم نے ہمارے ساتھی کو جگہ دے رکھی ہے، ہم اللہ کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ تم ہر حال میں اس سے لڑو گے یا اسے نکال دو گے یا ہم سب اکٹھے ہو کر تم پر حملہ آور ہوں گے،

ظَنَنْتُمْ أَن يُخْرِجُوا وَظَلُّوا أَنَّهُمْ مَانِعَتُهُمْ حُصُونُهُمْ مِّنَ اللَّهِ فَأَلْتَهُمُ اللَّهُ مِّن

باہر کیا تم نے گمان نہ کیا تھا کہ وہ نکل جائیں گے اور انھوں نے سمجھ رکھا تھا کہ ان کے قلعے انھیں اللہ سے بچانے

تمہارے لڑنے والوں کو قتل کریں گے اور تمہاری عورتیں لوٹ کر لے جائیں گے۔ جب یہ خط عبد اللہ بن ابی اور اس کے

بت پرست ساتھیوں کے پاس پہنچا تو وہ رسول اللہ ﷺ سے جنگ کے لیے جمع ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ کو اطلاع ملی تو آپ

ان سے ملے اور فرمایا: «لَقَدْ بَلَغَ وَعَيْذُ قُرَيْشٍ مِّنْكُمْ الْمَبَالِغَ مَا كَانَتْ تَكِيدُكُمْ بِأَكْثَرِ مِمَّا تُرِيدُونَ أَنْ تَكِيدُوا

بِهِ أَنْفُسَكُمْ تُرِيدُونَ أَنْ تُقَاتِلُوا أَبْنَاءَكُمْ وَ إِخْوَانَكُمْ» ”قریش کی دھمکی تم پر بہت گہرا اثر کر گئی ہے، وہ تمہارے

نقصان کی اس سے زیادہ کوئی تدبیر نہیں کر سکتے تھے جتنی تم خود اپنے خلاف کر رہے ہو کہ تم اپنے ہی بیٹوں اور بھائیوں سے

جنگ کرنا چاہتے ہو۔“ جب انھوں نے نبی ﷺ سے یہ بات سنی تو وہ منتشر ہو گئے۔ کفار قریش کو بھی یہ خبر پہنچ گئی، چنانچہ انھوں

نے بدر کے واقعہ کے بعد یہود کو خط لکھا کہ تم اسلحے اور قلعوں والے لوگ ہو، تمہیں ہر حال میں ہمارے ساتھی سے لڑنا ہوگا، یا

ہم یہ کر دیں گے اور وہ کر دیں گے اور ہمارے درمیان اور تمہاری عورتوں کی پازیبوں کے درمیان کوئی چیز رکاوٹ نہیں بن سکے

گی۔ جب یہ خط بنو نضیر کو پہنچا تو انھوں نے عہد توڑنے پر اتفاق کر لیا اور رسول اللہ ﷺ کو پیغام بھیجا کہ آپ اپنے ساتھیوں

میں سے تیس آدمیوں کے ساتھ ہماری طرف آئیں، ہم میں سے بھی تیس علماء آپ کی طرف آئیں گے اور ہم ایک درمیانی جگہ

میں ملیں گے۔ وہ آپ کی بات سنیں گے، اگر انھوں نے آپ کی تصدیق کر دی اور آپ پر ایمان لے آئے تو ہم بھی آپ پر

ایمان لے آئیں گے۔ چنانچہ صحابی نے ان کا واقعہ بیان کیا کہ جب اگلا دن ہوا تو نبی ﷺ نے لشکروں کو لے جا کر ان کا

محاصرہ کر لیا اور انھیں فرمایا: «إِنَّكُمْ وَاللَّهِ ! لَا تَأْمَنُونَ عِنْدِي إِلَّا بِعَهْدِ تَعَاهِدُونِي عَلَيْهِ» ”اللہ کی قسم! تمہیں میرے

ہاں امن نہیں ہوگا جب تک تم نئے سرے سے میرے ساتھ کوئی عہد نہیں کر دو گے۔“ انھوں نے آپ کو کسی قسم کا عہد و پیمانہ

دینے سے انکار کر دیا، تو آپ ﷺ نے اس دن ان سے جنگ جاری رکھی، پھر اگلے دن لشکروں کو لے کر بنی قریظہ کی طرف

گئے اور بنو نضیر کو چھوڑ دیا اور انھیں بھی معاہدہ کرنے کی دعوت دی تو انھوں نے آپ ﷺ سے معاہدہ کر لیا۔ آپ انھیں چھوڑ کر

واپس آ گئے اور لشکر لے کر بنو نضیر کے پاس پہنچ گئے اور ان سے جنگ جاری رکھی، حتیٰ کہ وہ جلا وطنی کی شرط پر قلعوں سے اتر

آئے۔ چنانچہ بنو نضیر جلا وطن ہو گئے اور اپنے ساز و سامان، گھروں کے دروازوں اور ان کی لکڑیوں میں سے جو اونٹوں پر لاد کر

لے جا سکتے تھے لے گئے۔ بنو نضیر کے بھجوروں کے درخت صرف رسول اللہ ﷺ کے لیے خاص تھے، وہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ

کو عطا فرمائے تھے اور صرف آپ کے لیے مخصوص فرمائے تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَا آفَاءَ اللَّهِ عَلَى رَسُولِهِ

مِنْهُمْ فَمَا أَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَلَا رِهَابٍ﴾ [الحشر: ۶] ”اور جو (مال) اللہ نے ان سے اپنے رسول پر لوٹایا

تو تم نے اس پر نہ کوئی گھوڑے دوڑائے اور نہ اونٹ۔“ یعنی وہ لڑائی کے بغیر حاصل ہوئے۔ تو نبی ﷺ نے ان کا زیادہ تر حصہ

مہاجرین کو دے دیا اور اسے ان کے درمیان تقسیم کر دیا اور ان میں سے کچھ حصہ دو انصاریوں کو بھی دیا جو ضرورت مند تھے۔

حَيْثُ لَمْ يَخْتَسِبُوا ۗ وَ قَدْ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبُ يُعْرِبُونَ بِيُوتَهُمْ بِأَيْدِيهِمْ

والے ہیں۔ تو اللہ ان کے پاس آیا جہاں سے انھوں نے گمان نہیں کیا تھا اور اس نے ان کے دلوں میں رعب ڈال ان دو کے سوا انصار میں سے کسی کو اس میں سے نہیں دیا اور اس میں سے رسول اللہ ﷺ کا صدقہ باقی رہ گیا جو بنو فاطمہ کے پاس رہا۔“ [ابو داؤد، الحجاج والفضی، والإمامة، باب فی خبر النضیر: ۳۰۰۴، قال الألبانی صحیح الإسناد] اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بنو نضیر نے نہ صرف عہد توڑ دیا تھا بلکہ معاہدے کی تجدید سے بھی صاف انکار کر دیا تھا اور رسول اللہ ﷺ نے عہد توڑنے کی وجہ سے ان کا محاصرہ کیا اور آخر کار انھیں جلا وطن کر دیا۔

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے یہ حدیث نقل کرنے کے بعد فرمایا: ”اصحاب بئر ومغازی نے غزوہ بنو نضیر کا قصہ اور اس کا سبب جو بیان کیا ہے وہ اختصار کے ساتھ اس طرح ہے کہ جب بزمعونہ پر رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کو شہید کر دیا گیا، جن کی تعداد ستر (۷۰) تھی، تو ان میں سے ایک عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہ فرار ہو کر مدینہ کی طرف واپس آتے ہوئے انھوں نے موقع پا کر قبیلہ بنو عامر کے دو آدمیوں کو قتل کر دیا (اور یہ سمجھے کہ وہ بزمعونہ کے شہداء کا کچھ بدلہ لے رہے ہیں)، حالانکہ یہ قبیلہ نبی ﷺ سے معاہدہ کر چکا تھا اور آپ نے انھیں امن وامان دے رکھا تھا، لیکن اس کی خبر عمرو رضی اللہ عنہ کو نہیں تھی۔ جب وہ مدینہ پہنچے اور رسول اللہ ﷺ سے ذکر کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”تم نے انھیں قتل کر ڈالا، اب میں ہر صورت ان کی دیت دوں گا۔“ بنو نضیر اور بنو عامر میں بھی حلف وعقد اور آپس میں مصالحت تھی، اس لیے رسول اللہ ﷺ ان کی طرف چلے تاکہ کچھ وہ دیں اور کچھ آپ ﷺ دیں اور بنو عامر کو راضی کر لیا جائے۔ قبیلہ بنو نضیر کے قلعے مدینہ کے مشرق کی جانب کئی میل کے فاصلے پر تھے، جب آپ ﷺ ان کی دیت کے سلسلے میں تعاون حاصل کرنے کے لیے وہاں پہنچے تو انھوں نے کہا: ”ہاں، اے ابو القاسم! جیسے آپ پسند فرمائیں گے، ہم ہر طرح سے آپ کی مدد کریں گے۔“ ادھر آپ سے ہٹ کر انھوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اس سے بہتر موقع کب ہاتھ لگے گا، اس وقت آپ (ﷺ) قبضے میں ہیں، آؤ کام تمام کر ڈالو۔ چنانچہ یہ مشورہ ہوا کہ جس دیوار سے آپ لگے بیٹھے ہیں اس گھر پر کوئی چڑھ جائے اور وہاں سے بڑا سا پتھر آپ پر پھینک دے اور ہماری جان ان سے چھڑا دے۔ عمرو بن حجاج بن کعب نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور چھت پر چڑھ گیا۔ چاہتا تھا کہ پتھر لڑھکا دے، اتنے میں اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کو نبی ﷺ کے پاس بھیجا اور حکم دیا کہ آپ ﷺ یہاں سے اٹھ کھڑے ہوں۔ چنانچہ آپ ﷺ فوراً اٹھ گئے، آپ کے ساتھ اس وقت آپ کے صحابہ کی ایک جماعت بھی تھی، جن میں ابو بکر و عمر اور علی رضی اللہ عنہم بھی تھے۔ آپ ﷺ وہاں سے فوراً مدینہ کی طرف چل پڑے۔ ادھر جو صحابہ آپ کے ساتھ نہیں تھے اور مدینہ میں آپ کے منتظر تھے، وہ آپ کے دیر کر دینے کی وجہ سے آپ ﷺ کو ڈھونڈنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ اس دوران انھیں مدینہ سے آنے والے ایک آدمی نے بتایا کہ آپ ﷺ مدینہ پہنچ گئے ہیں، چنانچہ وہ صحابہ واپس پلٹ آئے اور رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچ گئے۔ آپ ﷺ نے انھیں اپنے ساتھ یہود کے غدر کی بات بتائی اور ان کے ساتھ جنگ کی تیاری کا حکم دے دیا اور صحابہ کو لے کر ان کی طرف چل پڑے۔ یہود لشکروں کو دیکھ کر اپنے قلعوں میں قلعہ بند ہو گئے۔ آپ ﷺ نے ان کا محاصرہ کر لیا، پھر حکم دیا کہ ان کے کھجور کے

وَ أَيْدِي الْمُؤْمِنِينَ فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِيَ الْأَبْصَارِ ﴿۵﴾

دیا، وہ اپنے گھروں کو اپنے ہاتھوں اور مومنوں کے ہاتھوں کے ساتھ برباد کر رہے تھے، پس عبرت حاصل کرو اے آنکھوں والو! ﴿۵﴾

درخت جو آس پاس ہیں، وہ کاٹ دیے جائیں۔ اب تو یہود چیخنے لگے کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ آپ تو زمین میں فساد کرنے سے اوروں کو روکتے تھے اور فساد یوں کو برا کہتے تھے، پھر یہ کیا ہونے لگا؟ پس ادھر تو درخت کٹنے کا غم اور ادھر جو مکہ آنے والی تھی اس کی طرف سے مایوسی، ان دونوں چیزوں نے ان یہودیوں کی کمر توڑ دی۔“ (ابن کثیر)

﴿۲﴾ لِأَوَّلِ الْحَشْرِ: ”الْحَشْرِ“ کا معنی ”اکٹھا کرنا“ ہے۔ ”أَوَّلُ“ صفت ہے جو اپنے موصوف کی طرف مضاف ہے۔ گویا اصل میں ”لِلْحَشْرِ الْأَوَّلِ“ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے بنو نضیر کو پہلے ہی اکٹھا پر ان کے گھروں سے نکال باہر کیا۔ یا ”أَوَّلُ“ کا لفظ ”الْحَشْرِ“ کی طرف مضاف حقیقی ہے اور معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں اکٹھا کے اول (شروع) ہی میں نکال باہر کیا، لڑنے کی نوبت ہی نہیں آئی اور اللہ تعالیٰ کی قدرت سے وہ خود ہی جلا وطنی پر آمادہ ہو گئے۔ شاہ ولی اللہ نے اس کا ترجمہ کیا ہے: ”در اول جمع کردن لشکر“ اور شاہ عبدالقادر نے ترجمہ کیا ہے: ”پہلے ہی بھیڑ (فکراؤ) ہوتے۔“

﴿۳﴾ مَا ظَلَمْتُمْ أَنْ يَخْرُجُوا: بنو نضیر مدینہ سے دو میل کے فاصلے پر آباد تھے، یہ لوگ صنعت و حرفت اور تجارت کے علاوہ سود خوری کی وجہ سے بہت مال دار تھے، ان کے پاس ہر قسم کا سامان حرب موجود تھا اور انھوں نے نہایت مستحکم قلعے بنا رکھے تھے۔ تعداد میں بھی وہ مسلمانوں سے کم نہ تھے، بنو قریظہ اور خیبر کے یہودی ان کی پشت پر تھے اور انھیں عبد اللہ بن ابی اور منافقین کی اشیر باد بھی حاصل تھی کہ ہم لڑائی میں ہر طرح سے تمھاری مدد کریں گے۔ اس لیے مسلمانوں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ مد بھیڑ ہوتے ہی لڑائی کے بغیر نکل جائیں گے۔

﴿۴﴾ وَ ظَلَمْنَا أَنْفُسَهُمْ مَا نَعْتَهُمْ حُضُونَهُمْ مِنَ اللَّهِ: ”ظَلَمْنَا“ کا معنی گمان بھی ہے اور یقین بھی، جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت (۲۶): ﴿الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلْقُوا رَبَّهُمْ﴾ میں ہے۔ یعنی یہود کو گمان بلکہ یقین تھا کہ وہ اتنے محفوظ ہیں کہ ان کے قلعے انھیں اللہ سے بھی بچا لینے والے ہیں۔

﴿۵﴾ فَأَنْتَهُمُ اللَّهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوا: ”حَسِبَ يَحْسِبُوا“ گمان کرنا۔ ”اِحْتَسَبَ“ میں حروف زیادہ ہونے کی وجہ سے مبالغہ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ ان کے پاس وہاں سے آیا جہاں سے انھیں ادنیٰ گمان بھی نہ تھا۔

﴿۶﴾ وَ قَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ: ”قَذَفَ“ کا معنی پتھر وغیرہ پھینکنا ہے، مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دفعتاً اچانک شدت کے ساتھ ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا۔ اس میں بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کہاں سے ان کے پاس آیا، یعنی وہ اپنے قلعے، ان کی دیواریں، دروازے اور چھتیں مضبوط کرتے رہے اور گلی کوچوں سے داخل ہونے کے راستے بند کرتے رہے، مگر اللہ تعالیٰ نے براہ راست ان کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب یعنی شدید خوف ڈال دیا۔ جب دل ہی قائم نہ رہا تو ان کے قلعے انھیں کیا

وَلَوْ لَا أَنْ كَتَبَ اللَّهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَاءَ لَعَذَّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا ۗ وَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ

عَذَابُ النَّارِ ⑤

اور اگر یہ نہ ہوتا کہ اللہ نے ان پر جلا وطن ہونا لکھ دیا تھا تو یقیناً وہ انہیں دنیا میں سزا دیتا اور ان کے لیے آخرت میں آگ کا عذاب ہے ⑤

پچاتے؟ جتنے حمایتی تھے سب انہی کی طرح شدید خوف زدہ ہو کر انہیں چھوڑ گئے۔ چنانچہ انہوں نے خود ہی اس شرط پر اتر آنے کی درخواست کی کہ ہمیں جان و مال کی امان دی جائے، ہم یہاں سے نکل جاتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اسلحہ کے سوا جو چیز بھی وہ لے جا سکیں ساتھ لے جانے کی اجازت دی اور انہیں جلا وطن کر دیا۔ چنانچہ ان میں سے کچھ لوگ خیبر میں جا آباد ہوئے اور کچھ شام کی طرف چلے گئے۔ دشمن کے دل میں رعب ڈال دینا اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی مدد ہے اور ہمارے نبی کریم ﷺ کی اس کے ساتھ جتنی مدد کی گئی اتنی کسی اور پیغمبر کی نہیں کی گئی۔ جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «أُعْطِيتُ حَمْسًا لَمْ يُعْطَهُنَّ أَحَدٌ قَبْلِي، نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مَسِيرَةَ شَهْرٍ» [بخاری، التسم، باب: ۲۳۵] ”مجھے پانچ چیزیں عطا کی گئی ہیں، جو مجھ سے پہلے کسی کو عطا نہیں کی گئیں (وہ یہ کہ) ایک مہینے کے فاصلے سے رعب کے ساتھ میری مدد کی گئی ہے۔“ آگے باقی چار چیزیں بیان فرمائیں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے کفار کے دلوں میں ان کے شرک کرنے کی وجہ سے رعب ڈالنے کے ساتھ مسلمانوں کی مدد کا بھی وعدہ فرمایا ہے، دیکھیے سورۃ آل عمران (۱۵۰، ۱۵۱)۔

⑦ يُخْرِبُونَ بُيُوتَهُمْ بِأَيْدِيهِمْ : جب انہیں یقین ہو گیا کہ اب جانا ہی جانا ہے تو انہوں نے اندر ہی اندر اپنے ہاتھوں سے اپنے گھروں کو گرانا شروع کر دیا۔ اس کا باعث ایک تو مسلمانوں پر حسد تھا کہ وہ ان کے کام نہ آسکیں اور دوسرا یہ کہ ان کے دروازے، کھڑکیاں، شہتیر اور بالے وغیرہ ساتھ لے جا سکیں۔

⑧ وَ أَيْدِي الْمُؤْمِنِينَ : وہ لوگ محاصرے کے اندر اپنے مکان گرا رہے تھے اور مسلمان باہر سے ان کی فصلیں، دیواریں اور مکان گرا رہے تھے، تاکہ اندر داخلے کا راستہ کھلا ہو جائے اور لڑائی ہو تو وسیع میدان میسر ہو سکے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ جتنی چیزیں لے جا سکتے تھے نکال کر لے جا رہے تھے اور مسلمان ان کے گرائے ہوئے گھروں سے باقی سامان نکالنے کے لیے انہیں مزید تروبالا کر رہے تھے۔

⑨ فَأَعْتَبُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ : تو اے آنکھوں والو! عبرت حاصل کرو کہ کفر و سرکشی اور بد عہدی کا انجام کیا ہوتا ہے، کیونکہ سعادت مند وہی ہے جو دوسروں کو دیکھ کر عبرت حاصل کر لے۔ ابن جزئی نے اپنی تفسیر ”التسهيل لعلم التنزيل“ میں فرمایا: ”جو لوگ فقہ میں قیاس کو ثابت کرتے ہیں انہوں نے اس آیت سے استدلال کیا ہے، حالانکہ ان کا اس آیت سے استدلال ضعیف ہے اور آیت کے مفہوم سے خارج ہے۔“

ت 3 ① وَلَوْ لَا أَنْ كَتَبَ اللَّهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَاءَ : ”جَلَا يُجْلُو جَلَاءً“ (ن) ”الرَّجُلُ“ آدمی کو اس کے شہر

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَاَفُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ ۗ وَمَنْ يُشَاقِقِ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۵﴾ مَا
قَطَعْتُمْ مِنْ لِّبْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمْوهَا قَائِمَةً عَلٰى اَصْوْلِهَا فَاِذْنِ اللّٰهِ وَ لِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۵﴾

یہ اس لیے کہ انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی اور جو اللہ کی مخالفت کرے تو بلاشبہ اللہ بہت سخت سزا دینے والا ہے ﴿۵﴾ جو بھی کھجور کا درخت تم نے کاٹا، یا اسے اس کی جڑوں پر کھڑا چھوڑا تو وہ اللہ کی اجازت سے تھا اور تاکہ وہ نافرمانوں کو ذلیل کرے ﴿۵﴾

سے نکال دینا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا ان کے متعلق پہلے سے فیصلہ انھیں جلا وطن کرنے پر اکتفا کا تھا، تاکہ انھیں عبرت ہو اور وہ اپنی اصلاح کر سکیں۔ اگر اس نے پہلے یہ نہ لکھا ہوتا تو انھیں دنیا ہی میں عذاب دیتا، ان کے مرد قتل کیے جاتے اور ان کی عورتوں اور بچوں کو لونڈی اور غلام بنا لیا جاتا، جیسے بعد میں بنو قریظہ کو عبرت حاصل نہ کرنے کی وجہ سے عذاب دیا گیا۔ (دیکھیے بخاری: ۴۰۳۲) یہاں ایک سوال ہے کہ جلا وطنی بھی تو عذاب ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ عذاب سے مراد جسمانی سزا ہے، جس کا احساس واضح اور شدید ہوتا ہے۔

﴿۲﴾ وَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ اَلَمٌ : یعنی اگر وہ جلا وطنی کی وجہ سے دنیا کے عذاب، قتل، اسیری اور غلامی سے بچ گئے تو بے فکر نہ ہوں، اگر وہ اسی طرح کفر پر قائم رہے تو ان کے لیے آخرت میں آگ کا عذاب تیار ہے۔

آیۃ 4 ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَاَفُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ : اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۃ انفال (۱۳) کی تفسیر۔ یہاں قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس آیت میں ”وَمَنْ يُشَاقِقِ اللّٰهَ“ کے بعد ”وَرَسُوْلَهُ“ کو حذف کر دیا ہے، اس سے یہ سمجھانا مقصود ہے کہ رسول کی مخالفت اللہ تعالیٰ ہی کی مخالفت ہے۔

آیۃ 5 ﴿۱﴾ مَا قَطَعْتُمْ مِنْ لِّبْنَةٍ : ”لِّبْنَةٍ“ کے متعلق تین قول ہیں، ایک یہ کہ اس سے مراد کھجور کا درخت ہے۔ ابن جریر نے اسے ترجیح دی ہے۔ دوسرا قول یہ کہ ”لِّبْنَةٍ“ برنی اور عجمہ کے سوا کھجور کا درخت ہے اور تیسرا قول یہ کہ ہر درخت کو ”لِّبْنَةٍ“ کہا جاتا ہے، کیونکہ جب تک وہ زندہ ہے اس میں ”لَبْوْنَةٌ“ (زری) پائی جاتی ہے۔ (شقیطی) بنو نضیر کی بستریوں کے ساتھ ان کا ایک نہایت خوب صورت باغ تھا جسے ”بُوْرہ“ کہتے تھے، اس میں کھجوروں کے بہت سے درخت تھے۔ (یہ آج کل بھی بُوْرہ کے نام سے معروف ہے جو مسجد قبا کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ شقیطی) رسول اللہ ﷺ نے ان کا محاصرہ کیا تو بعض ضرورتوں اور حکمتوں کے پیش نظر بعض درختوں کو کاٹنے کا اور بعض کو جلانے کا حکم دیا اور بعض اسی طرح رہنے دیے، جیسا کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: « حَرَّقَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَخْلَ بَنِي النَّضِيْرِ وَقَطَعَ وَهِيَ الْبُوْرَةُ فَزَلَّتْ : ﴿ مَا قَطَعْتُمْ مِنْ لِّبْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمْوهَا قَائِمَةً عَلٰى اَصْوْلِهَا فَاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ » | بخاری، المغازی، باب حدیث بنی النضیر : ۴۰۳۱ [رسول اللہ ﷺ نے بنو نضیر کے کھجوروں کے درخت جلا دیے اور کٹوا دیے۔ یہی بُوْرہ جگہ ہے (جس کا حسان بن سنان نے ذکر کیا ہے، جیسا کہ آگے آئے گا) تو یہ آیت اتری: ﴿ مَا قَطَعْتُمْ مِنْ لِّبْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمْوهَا

قَائِمَةً عَلَىٰ أَرْوَاحِهِمْ فَإِذِنَ اللَّهُ ﴿۵﴾ [الحشر: ۵] ”جو بھی کھجور کا درخت تم نے کاٹا یا اسے اس کی جڑوں پر کھڑا چھوڑا تو وہ اللہ کی اجازت سے تھا۔“

درختوں کے کاٹنے اور جلانے پر یہود اور منافقین نے شور مچایا کہ محمد (ﷺ) درختوں کو کاٹ کر ”فساد فی الارض“ کا ارتکاب کر رہے ہیں، جب کہ ان کا دعویٰ اصلاح کا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تسلی دلائی کہ تم نے جو بھی درخت کاٹا یا اسے اس کی جڑوں پر قائم رہنے دیا تو یہ سب کچھ اللہ کے اذن سے تھا، یعنی اگرچہ جنگ کے موقع پر عام حکم یہی ہے کہ درخت اور کھیت جلانے اور کاٹنے سے اجتناب کیا جائے، مگر اس موقع پر جو درخت جلائے گئے یا کاٹے گئے یا باقی رہنے دیئے گئے یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے اذن سے ہوا، اس لیے منافقین کی باتوں سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔

② وَ لِيُخْزِيَ الْفَاسِقِينَ: ”الْفَاسِقِينَ“ میں بنو نضیر کے علاوہ انھیں عہد توڑنے اور لڑائی کے لیے ابھارنے والے یہودی، مکہ کے مشرکین اور مدینہ کے منافقین سبھی شامل ہیں۔ یعنی کھجوروں کے درخت کاٹنے، جلانے یا باقی رکھنے کا عمل دوسری بہت سی مصلحتوں کے علاوہ اس لیے بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ فاسقوں کو ذلیل کرے۔ کاٹنے اور جلانے میں ان کی تذلیل تو ظاہر ہے کہ ان کی آنکھوں کے سامنے ان کی زندگی بھر کی کمائی کو جلایا اور کاٹا گیا مگر وہ کاٹنے اور جلانے والوں کا ہاتھ نہ روک سکے۔ اس میں بنو نضیر، دوسرے یہودیوں، منافقین مدینہ اور مشرکین مکہ سب کی تذلیل تھی کہ انھوں نے یہ سب کچھ ٹھنڈے پیڑوں برداشت کر لیا اور آف تک نہ کر سکے، جیسا کہ رسول اللہ (ﷺ) کے شاعر حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے مشرکین مکہ پر طنز و تشنیع کے تیر برساتے ہوئے کہا۔

وَهَانَ عَلَى سَرَاةِ بَنِي لُؤَيٍّ حَرِيقٌ بِالْبُؤَيْرَةِ مُسْتَطِيرٌ

”بنو لوی (قریش) کے سرداروں نے وہ آگ آسانی سے برداشت کر لی جو بؤیرہ کے مقام پر پھیل رہی تھی (یعنی انھیں اس پر کوئی غصہ آیا نہ غیرت اور نہ ہی وہ حسد وعدہ بنو نضیر کی مدد کو پہنچے)۔“ [بخاری، المغازی، باب حدیث بنی النضیر..... : ۴۰۳۲] اور جو درخت باقی رہے ان میں ان سب کی تذلیل یہ تھی کہ وہ مسلمانوں کے قبضے میں آئے اور کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ ان کے قبضے سے چھڑا سکیں۔

③ ”وَ لِيُخْزِيَ الْفَاسِقِينَ“ (اور تاکہ وہ نافرمانوں کو ذلیل کرے) میں حرف عطف واؤ سے ظاہر ہے کہ اس سے پہلے کچھ عبارت محذوف ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ اذن اس لیے دیا تاکہ بنو نضیر کے محاصرے کے لیے راستہ صاف ہو جائے، ان کے لیے کوئی چھپاؤ باقی نہ رہے، محاصرے میں سختی پیدا کی جائے، انھیں قلعوں سے نکل کر میدان میں آکر لڑنے پر ابھارا جائے اور تاکہ مسلمانوں کو عزت عطا فرمائے اور تاکہ نافرمانوں کو ذلیل کرے۔

④ اس واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر جنگی ضرورت کا تقاضا ہو تو درختوں اور کھیتوں کو کاٹنا، جلایا اور عمارتوں کو گرایا جاسکتا ہے، بلا ضرورت یہ کام جائز نہیں۔

وَمَا أَفَاءَ اللَّهِ عَلَى رَسُولِهِ مِنْهُمْ فَمَا أَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَلَا مَرَاكِبٍ وَلَا لَكِنَّ اللَّهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهُ عَلَى مَنْ يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ①

اور جو (مال) اللہ نے ان سے اپنے رسول پر لوٹایا تو تم نے اس پر نہ کوئی گھوڑے دوڑائے اور نہ اونٹ اور لیکن اللہ اپنے رسولوں کو مسلط کر دیتا ہے جس پر چاہتا ہے اور اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے ①

⑤ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کو قرآن کے علاوہ اور احکام بھی دیے گئے، کیونکہ یہاں جس کے متعلق فرمایا کہ ”وہ اللہ کے اذن سے تھا“ وہ ”اذن“ قرآن میں نہیں بلکہ وحی خفی کے ذریعے سے دیا گیا ہے، جسے حدیث کہتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ وحی الہی صرف قرآن تک محدود نہیں۔

بیت 6 ① وَمَا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَى رَسُولِهِ مِنْهُمْ : ”فَاءٌ يُعْنِي فَيْئًا“ (ض) لوٹنا، جیسا کہ فرمایا: ﴿حَتَّى تَقِيَّءَ إِلَى أَمْرِ اللَّهِ﴾ [الحجرات: ۹] ”یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے۔“ ”أَفَاءٌ يُعْنِي“ (افعال) لوٹانا۔ ”فے“ ان اموال کو کہا جاتا ہے جو جنگ کے بغیر دشمن سے حاصل ہوں اور جو اموال جنگ کے ساتھ حاصل ہوں انھیں غنیمت کہا جاتا ہے (بعض اوقات غنیمت پر بھی فے کا لفظ بول دیا جاتا ہے)۔ ان اموال کو ”فے“ اس لیے کہتے ہیں کہ دنیا کے تمام اموال حقیقت میں مسلمانوں کی ملکیت ہیں اور ان پر کفار کا قبضہ ناجائز ہے، جب مسلمان انھیں حاصل کرتے ہیں تو وہ اپنے اموال واپس لیتے ہیں۔ ”أَوْجَفْتُمْ“ ”وَجَفَّ يَجِفُّ وَجُفًا وَوَجِيفًا“ (ض) ”الْفَرَسُ“ گھوڑے کا دوڑنا۔ ”أَوْجَفَّ يُوجِفُّ إِيجَافًا“ دوڑانا۔ ”خَيْلٍ“ گھوڑوں کی جماعت۔ ”مَرَاكِبٍ“ سواری کے اونٹوں کے لیے اسم جمع ہے۔

② ”وَمَا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَى رَسُولِهِ مِنْهُمْ“ اس جملے کا عطف ”مَا قَطَعْتُمْ مِنْ لَيْنَةٍ“ پر ہے اور مقصد غزوہ بنی نضیر میں مسلمانوں کو عطا ہونے والی نعمتوں میں سے ایک اور نعمت کا بیان ہے۔

③ بنو نضیر اپنی جلا وطنی کے ساتھ جو مکان، باغات اور زمینیں چھوڑ گئے ان کے متعلق فرمایا کہ ان کے جو اموال اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو واپس لوٹائے ہیں ان پر تمہارا کوئی حق نہیں، کیونکہ تم نے انھیں گھوڑے یا اونٹ دوڑا کر یعنی جنگ کر کے حاصل نہیں کیا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل کے ساتھ کسی قابل ذکر لڑائی کے بغیر وہ سب اپنے رسول کو عطا فرمادے ہیں۔ یاد رہے کہ بنو نضیر کی بستیاں مدینہ سے صرف دو میل کے فاصلے پر تھیں اور مسلمانوں نے پیدل جا کر ہی ان کا محاصرہ کر لیا تھا، صرف رسول اللہ ﷺ سوار ہو کر گئے اور انھوں نے اس رعب کی وجہ سے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں ڈالا، جنگ کیے بغیر ہی ہتھیار ڈال دیے اور اپنے آپ کو نبی ﷺ کے فیصلے کے حوالے کر دیا۔

④ وَلَكِنَّ اللَّهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهُ عَلَى مَنْ يَشَاءُ : یعنی بنو نضیر کے اموال پر قبضہ تمہارے گھوڑے یا اونٹ دوڑانے کے نتیجے میں نہیں ہوا بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو اپنے دشمنوں میں سے جن پر چاہتا ہے مسلط کر دیتا ہے، وہ اس کے ڈالے ہوئے رعب کی وجہ سے لڑائی کے بغیر ہی اپنے آپ کو حوالے کر دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری طرح قدرت رکھنے والا ہے۔

⑤ یہ پہلے اموال تھے جو جنگ کے بغیر محض محاصرے کے نتیجے میں حاصل ہوئے۔ انھیں اصطلاح میں ”فے“ کہا جاتا

مَا آفَاءَ اللَّهِ عَلَىٰ رَسُولِهِ مِنْ أَهْلِ الْقُرَىٰ فَلِلَّهِ وَاللِّرْسُولِ وَلِلَّذِي الْفَرَّقَىٰ وَالْيَتَامَىٰ

جو کچھ بھی اللہ نے ان بستیوں والوں سے اپنے رسول پر لوٹایا تو وہ اللہ کے لیے اور رسول کے لیے اور قرابت دار

ہے۔ اس سے پہلے بدر میں لڑائی کے نتیجے میں جو اموال حاصل ہوئے انھیں ”غنیمت“ کہا جاتا ہے۔ ان کی تقسیم کا قاعدہ اللہ تعالیٰ نے سورہ انفال میں بیان فرمایا: ﴿وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَإِنَّ لِلَّهِ خُصْمَهُ وَ لِلرَّسُولِ وَ لِلَّذِي الْفَرَّقَىٰ وَ الْيَتَامَىٰ وَ النَّسَكِينَ وَ ابْنِ السَّبِيلِ﴾ [الأنفال: ۶۱] ”اور جان لو کہ تم جو کچھ بھی غنیمت حاصل کرو تو بے شک اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لیے اور رسول کے لیے اور قرابت دار اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔“ یعنی اس میں سے پانچواں حصہ اللہ، اس کے رسول، ذوی القربی، یتامی، مساکین اور ابن السبیل کے لیے ہوگا اور باقی چار حصے لڑنے والوں میں تقسیم کر دیے جائیں گے۔ رہے اموال فے جو بنو نضیر سے حاصل ہوئے، ان کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان پر تمہارا کوئی حق نہیں، بلکہ وہ سب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو عطا فرمائے ہیں۔ یہی معاملہ ان تمام بستیوں کا ہے جو بعد میں جنگ کے بغیر حاصل ہوئیں، مثلاً بنو قریظہ کی بستیاں اور خیبر کے وہ علاقے جو جنگ کے بغیر فتح ہوئے، مثلاً فدک وغیرہ، ان سب کو مکمل طور پر رسول اللہ ﷺ کے اختیار میں دے دیا گیا کہ آپ جس کو جتنا چاہیں دے دیں یا اپنے پاس رکھیں۔ البتہ مستحقین کی چند اقسام متعین کر دی گئیں کہ مال کی تقسیم انھی میں رہنی چاہیے۔ ان مستحقین کا بیان اگلی آیت میں فرمایا۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما نے فرمایا: «كَانَتْ أَمْوَالُ نَبِيِّ النَّضِيرِ مِمَّا آفَاءَ اللَّهِ عَلَى رَسُولِهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِمَّا لَمْ يُوجِفِ الْمُسْلِمُونَ عَلَيْهِ بِحَبْلِ وَلَا رِكَابٍ، فَكَانَتْ لِلرَّسُولِ اللَّهُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَاصَّةً، يُنْفِقُ عَلَى أَهْلِهِ مِنْهَا نَفَقَةَ سَنَتِهِ، ثُمَّ يُجْعَلُ مَا بَقِيَ فِي السَّلَاحِ وَ الْكُرَاعِ، عُدَّةً فِي سَبِيلِ اللَّهِ» [بخاری، التفسیر، باب قوله: ﴿مَا آفَاءَ اللَّهِ عَلَى رَسُولِهِ﴾: ۴۸۸۵] ”بنو نضیر کے اموال ان اموال میں سے تھے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو بطور فے عطا فرمائے تھے، جن پر مسلمانوں نے نہ گھوڑے دوڑائے تھے اور نہ اونٹ، چنانچہ وہ رسول اللہ ﷺ کے لیے خاص تھے۔ آپ ان میں سے اپنے گھر والوں کو ایک سال کا خرچ دیتے، پھر جو باقی ہوتا اسے جہاد فی سبیل اللہ کی تیاری کے لیے اسلحے اور گھوڑوں میں صرف کر دیتے تھے۔“

آیت 7 ① مَا آفَاءَ اللَّهِ عَلَى رَسُولِهِ مِنْ أَهْلِ الْقُرَى : ”الْقُرَى“ میں الف لام عہد کا ہے، اس لیے ترجمہ ”ان بستیوں“ کیا گیا ہے۔

② قَوْلُهُ وَ لِلرَّسُولِ وَ لِلَّذِي الْفَرَّقَى: اس آیت میں ایک عام اصول بیان کیا گیا ہے کہ جو اموال بھی جنگی کارروائیوں کے بغیر مسلمانوں کے ہاتھ لگ جائیں وہ بیت المال کی ملکیت تصور ہوں گے، ان میں سے مجاہدین کو کچھ نہیں ملے گا، کیونکہ یہ ان کی محنت کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ اس اجتماعی قوت کا نتیجہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ، اس کی امت اور اس کے قائم کردہ نظام کو عطا فرمائی ہے۔ لہذا یہ اموال اموال غنیمت سے بالکل جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں، انھیں اموال فے کہا جاتا ہے اور ان کا اطلاق منقولہ اور غیر منقولہ دونوں قسم کے اموال پر ہوگا۔ اموال فے میں جزیہ و خراج کی آمدنی بھی شامل ہے جو ایک اسلامی

وَالْمَسْكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ لَئِنْ لَا يَكُونُ دُولَةٌ بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ وَمَا أَتَاكُمْ

اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے، تاکہ وہ تم میں سے مال داروں کے درمیان ہی گردش کرنے والا نہ ہو ریاست کو غیر مسلموں سے حاصل ہوتی ہے۔ ان کی تقسیم کا مکمل اختیار رسول اللہ ﷺ کو عطا کیا گیا اور آپ کے بعد یہ اختیار مسلمانوں کے امیر کو حاصل ہوتا ہے، جسے وہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ مدت میں خرچ کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اموالِ فنی کی وہ مدت بھی بیان فرمادیں جہاں انھیں خرچ کیا جائے گا۔ یہ وہی مدت ہے جن میں اموالِ غنیمت کا خس خرچ کیا جاتا ہے، اموالِ فنی کا خس نہیں بلکہ وہ پورے کے پورے انھی میں خرچ کیے جائیں گے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ انفال (۴۱) کی تفسیر۔

❶ كَفَى لَا يَكُونُ دُولَةٌ بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ : "دُولَةٌ" "ذَال يَدُولُ دُولَةٌ" (ن) "الزَّمَانُ" زمانے کا ایک حالت سے دوسری حالت میں بدلنا، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ﴾ [آل عمران : ۱۴۰] "اور یہ تو دن ہیں، ہم انھیں لوگوں کے درمیان باری باری بدلتے رہتے ہیں۔" "دُولَةٌ" وہ چیز جو ایک دوسرے سے لی جائے، کبھی اس کے پاس ہو کبھی اس کے پاس۔

"تاکہ مالِ فنی تم میں سے مال داروں کے درمیان ہی گردش کرنے والا نہ ہو" ربط مضمون کے لحاظ سے تو اس کا مطلب اتنا ہی ہے کہ اموالِ فنی کو مجاہدین پر تقسیم نہ کیا جائے، جن کے اکثر پہلے ہی غنی ہو چکے ہیں، محتاج اور مسکین نہیں رہے، بلکہ انھیں نادار لوگوں تک پہنچایا جائے، تاہم اس میں اسلام کے معاشی نظام کی بنیاد بھی بیان کر دی گئی ہے کہ مسلمانوں میں دولت کا بہاؤ فقراء سے اغنیاء کی طرف نہیں ہوتا کہ دولت مند زیادہ سے زیادہ دولت مند اور غریب زیادہ سے زیادہ غریب ہوتے چلے جائیں، بلکہ دولت کا بہاؤ اغنیاء سے فقراء کی طرف ہوتا ہے اور اس سے پورے معاشرے کو فائدہ اٹھانے کا موقع ملتا ہے۔ دولت کے چند ہاتھوں میں جمع ہونے کا سب سے بڑا ذریعہ سود ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے حرام قرار دے دیا۔ دولت کی تقسیم کے لیے زکوٰۃ فرض کی گئی، اموالِ غنیمت میں سے خمس نکالنے کا حکم دیا گیا، مالِ فنی سارا ہی پانچ مدتوں میں تقسیم کرنے کا حکم دیا گیا، نقلی صدقات کی بار بار تلقین کی گئی، بہت سی فروگزاشتوں پر کفارے رکھے گئے اور میراث کا ایسا قانون بنا دیا کہ ہر مرنے والے کی دولت یکجا رہنے کے بجائے پھیل جائے۔ بخل کی شدید مذمت کی گئی اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی بار بار تاکید کی گئی اور اس کی فضیلت بیان کی گئی۔ ان احکام پر عمل کیا جائے تو دولت چند ہاتھوں میں جمع ہو ہی نہیں سکتی۔

❷ وَمَا أَتَاكُمْ الزُّسُولَ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَكُمُ عَنْهُ فَأَنْتَهُوا : سلسلہ کلام کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہے کہ اموالِ فنی میں سے رسول تمہیں جو کچھ دے وہ لے لو اور جس سے روک دے اس سے رک جاؤ۔ آپ کے فیصلے کو کسی چون چرا اور ملال کے بغیر تسلیم کر لو۔ چونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارادہ یہ تھا کہ بنو نضیر کے اموالِ مجاہدین ہی میں تقسیم کر دیے جائیں، تاکہ وہ اپنے باؤں پر کھڑے ہو جائیں، تو گویا انصار سے کہا جا رہا ہے کہ اگر رسول کسی موقع پر تمہیں نہ دے تو مطالبہ نہ کرو، یہ کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا، وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿۶﴾

اور رسول تمہیں جو کچھ دے تو وہ لے لو اور جس سے تمہیں روک دے تو رک جاؤ اور اللہ سے ڈرو، یقیناً اللہ بہت سخت سزا دینے والا ہے ﴿۶﴾

رسول کی صواب دید پر ہے کہ وہ تمام مستحقین کو دے یا بعض کو زیادہ مستحق سمجھ کر دے اور دوسروں کو نہ دے۔ سیاق کے مطابق آیت کا مطلب یہ ہے، مگر آیت کے الفاظ عام ہیں، اس لیے یہ صرف اموال کی تقسیم تک محدود نہیں بلکہ اس میں حکم دیا گیا ہے کہ ہر معاملے میں آپ ﷺ کی اطاعت کرو۔ اس کی وضاحت اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا: ”مَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا مَنَعَكُمْ فَلَا تَأْخُذُوهُ“ کہ رسول تمہیں جو دے وہ لے لو اور جو نہ دے وہ نہ لو، بلکہ فرمایا جس سے روک دے اس سے رک جاؤ، جس سے منع کر دے اس سے باز آ جاؤ۔ اس سے معلوم ہوا کہ آیت کا مقصد آپ کے حکم کی اطاعت ہے۔ چنانچہ اس آیت نے آپ ﷺ کے حکم کو مستقل قانون کی حیثیت دے دی ہے اور یہ شرط نہیں رکھی کہ وہی حکم مانو جو قرآن مجید میں ہو، اس لیے آپ ﷺ کا جو حکم بھی صحیح حدیث سے ثابت ہو واجب العمل ہے۔ اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «دَعُونِي مَا تَرَ كُنْتُمْ، إِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ بِسُؤَالِهِمْ وَاخْتِلَافِهِمْ عَلَى أَنْبِيَائِهِمْ، فَإِذَا نَهَيْتُكُمْ عَنْ شَيْءٍ فَاجْتَنِبُوهُ، وَإِذَا أَمَرْتُكُمْ بِأَمْرٍ فَأَتُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ» [بخاری، الاعتصام بالكتاب والسنة، باب الاقتداء بسنن رسول الله ﷺ: ۷۲۸۸] ”مجھے اس وقت تک رہنے دو جب تک میں تمہیں چھوڑے رکھوں، کیونکہ تم سے پہلے لوگ اپنے انبیاء سے سوال اور ان سے اختلاف کی وجہ سے ہلاک ہو گئے۔ تو جب میں تمہیں کسی چیز سے منع کر دوں تو اس سے دور رہو اور جب میں تمہیں کسی کام کا حکم دوں تو اس میں سے جتنا کر سکتے ہو کرو۔“ اور جلیل القدر صحابی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما نے بھی اس آیت سے یہی بات سمجھی ہے۔ چنانچہ ان کے شاگرد علقمہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ انھوں نے فرمایا: «لَعَنَ اللَّهُ الْوَأَشِمَاتِ وَالْمُؤْتَشِمَاتِ وَالْمُنْتَمِصَاتِ وَالْمُتَقَلِّجَاتِ لِلْحُسْنِ، الْمُعَيَّرَاتِ خَلَقَ اللَّهُ» ”اللہ تعالیٰ نے ان عورتوں پر لعنت کی ہے جو جلد میں سوئی کے ساتھ نیل بھر کر نقش و نگار بنانے والی ہیں اور جو بنوانے والی ہیں اور جو چہرے کے بال اکھاڑنے والی ہیں اور جو خوب صورتی کے لیے سامنے کے دانتوں میں فاصلہ بنانے والی ہیں، اللہ کی پیدا کردہ شکل کو بدلنے والی ہیں۔“ بنو اسد کی ایک عورت اتم یعقوب کو یہ بات پہنچی تو وہ آئی اور کہنے لگی: ”مجھے پتا چلا ہے کہ آپ نے فلاں فلاں کام کرنے والی عورتوں پر لعنت کی ہے؟“ تو انھوں نے فرمایا: ”میں اس پر لعنت کیوں نہ کروں جس پر اللہ کے رسول ﷺ نے لعنت کی ہے اور جو اللہ کی کتاب میں موجود ہے؟“ اس عورت نے کہا: ”میں نے دو تختیوں کے درمیان جتنا قرآن ہے سارا پڑھا ہے، مگر مجھے اس میں یہ بات نہیں ملی جو آپ کہہ رہے ہیں۔“ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ”اگر تم اسے پڑھتی تو تمہیں ضرور مل جاتی، کیا تم نے یہ نہیں پڑھا: ﴿وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا﴾ [الحشر: ۷] ”اور رسول تمہیں جو کچھ دے تو وہ لے لو

لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا وَيَنْصُرُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ ﴿۵﴾

(یہ مال) ان محتاج گھربار چھوڑنے والوں کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور اپنے مالوں سے نکال باہر کیے گئے۔ وہ اللہ کی طرف سے کچھ فضل اور رضا تلاش کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں، یہی لوگ ہیں جو سچے ہیں ﴿۵﴾

اور جس سے تمہیں روک دے تو رک جاؤ۔“ اس نے کہا: ”کیوں نہیں؟“ فرمایا: ”تو آپ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔“ اس نے کہا: ”میرا خیال تو یہ ہے کہ آپ کے گھر والے یہ کام کرتے ہیں۔“ فرمایا: ”جاؤ اور دیکھو۔“ وہ گئی، دیکھا مگر اسے اپنے مطلب کی کوئی چیز دکھائی نہ دی، تو (ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے) فرمایا: ”اگر وہ (میری بیوی) ایسی ہوتی تو ہمارے ساتھ نہ رہتی۔“

[بخاری، التفسیر، باب: ﴿لَوْ مَا آتَاكُمْ لِرَسُولٍ فَخَذُوهُ﴾: ۴۸۸۶]

﴿۵﴾ وَأَقْوَمُ اللَّهُ إِنْ اللَّهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ: یعنی اللہ سے ڈرتے رہو اور یاد رکھو! اگر تم نے آپ ﷺ کے حکم کی تعمیل نہ کی یا آپ کے منع کردہ سے باز نہ آئے تو اللہ کی سزا بہت سخت ہے۔

آیت 8 ﴿۱﴾ لِلْفُقَرَاءِ: یہ بھجلی آیت میں مذکور ”وَ الَّذِينَ اتَّقَوْا وَ الْيَتَامَىٰ وَ الْمَسْكِينِ وَ ابْنِ السَّبِيلِ“ سے بدل ہے۔ گویا یہ کہا جا رہا ہے کہ ان چاروں سے مراد فقراء مہاجرین ہیں اور انصار اور ان کے بعد آنے والے جو ان کے نقش قدم پر چلنے والے، ان سے محبت کرنے والے اور ان کے لیے دعا کرنے والے ہیں۔

﴿۲﴾ الْمُهَاجِرِينَ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ: یعنی ایک تو وہ فقراء ہیں پھر مہاجر ہیں۔ مراد ان سے وہ لوگ ہیں جو اس وقت مکہ معظمہ اور عرب کے دوسرے علاقوں سے صرف اس جرم میں نکال دیے گئے تھے کہ انھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ یہ لوگ اپنے وطن میں گھربار اور جائداد وغیرہ سب کچھ رکھتے تھے مگر اب خالی ہاتھ تھے، نہ ان کے پاس رہنے کے لیے گھر تھے نہ ضرورت کے لیے مال۔ بنو نضیر کا علاقہ فتح ہونے سے پہلے ان کی رہائش اور معاش کا کوئی مستقل بندوبست نہ تھا۔ انصار نے انھیں اپنے ساتھ اپنے گھروں میں رکھا ہوا تھا اور انھیں اپنے باغات اور زمینوں کی آمدنی میں بھی شریک کر رکھا تھا۔ اس آیت میں فرمایا کہ یہ لوگ مال لانے کے حق دار ہیں، تاکہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے انصار کے مشورے سے بنو نضیر کے باغات اور زمینیں فقراء مہاجرین میں تقسیم کر دیں اور ان کے پاس انصار کی جو زمینیں اور باغات تھے وہ انصار کو واپس کر دیے گئے۔ صرف دو انصار یوں کو ان اموال میں سے کچھ نہ کچھ دیا گیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مال لانے میں صرف اس زمانے کے مہاجرین کا حصہ تھا، بلکہ قیامت تک جو لوگ مسلمان ہونے کی وجہ سے اپنے ملک سے نکال دیے جائیں انھیں جگہ دینا اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل بنانا مسلمان ملکوں کا فرض ہے۔ اس کے لیے زکوٰۃ کے علاوہ اموال میں بھی خرچ کیے جائیں گے۔

﴿۳﴾ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا: یعنی ہجرت سے ان کا مقصد دنیا کی کوئی چیز نہیں، بلکہ انھوں نے محض اللہ کا فضل

وَالَّذِينَ تَبَوَّؤُا الدَّارَ وَالْإِيمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُونَ

اور (ان کے لیے) جنہوں نے ان سے پہلے اس گھر میں اور ایمان میں جگہ بنالی ہے، وہ ان سے محبت کرتے ہیں جو یعنی جنت اور اس کی رضا کی تلاش کے لیے ہجرت کی ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں سے وعدہ فرمایا ہے۔ مزید دیکھیے سورہ توبہ کی آیت (۷۲) کی تفسیر۔

④ وَيَنْصُرُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ : اور وہ اپنی جانوں اور مالوں کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول کی یعنی ان کے دین کی مدد کرتے ہیں۔

⑤ أُولَئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ : یعنی یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے عمل کے ساتھ اپنے قول میں سچے ہونے کو ثابت کر دیا۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مہاجرین کے صادق ہونے کی شہادت دی ہے، اگلی آیت میں انصار کے بھی ”الْمُفْلِحُونَ“ ہونے کی شہادت دی ہے۔ سورہ انفال میں دونوں کے متعلق فرمایا: ﴿أُولَئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا﴾ [الأنفال: ۷۳] ”وہی سچے مومن ہیں۔“ اب اس سے بڑا ظالم کون ہوگا جو ان کے صدق یا ایمان میں شک کرے یا ان کے متعلق زبان درازی کرے!؟

آیت 9 ﴿وَالَّذِينَ تَبَوَّؤُا الدَّارَ وَالْإِيمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ : ”بَوَّأَ يَبْوِئُ“ (تفعیل) جگہ دینا، ٹھکانا دینا، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَلَقَدْ بَوَّأْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ مُبَوَّأَ صَدِيقٍ﴾ [یونس: ۹۳] ”اور بلاشبہ یقیناً ہم نے بنی اسرائیل کو ٹھکانا دیا، باعزت ٹھکانا۔“ ”تَبَوَّأَ يَتَبَوَّأُ“ کسی جگہ میں ٹھکانا بنانا، مقیم ہونا۔ ”الدَّارُ“ میں الف لام عہد کا ہے، اس گھر میں جہاں مہاجرین ہجرت کر کے پہنچے۔ ”دارِ ہجرت“ مدینہ منورہ کا لقب ہے، امام مالک رضی اللہ عنہ کو اسی لیے ”إِمَامُ دَارِ الْهَجْرَةِ“ کہا جاتا ہے کہ وہ مدینہ منورہ میں رہتے تھے۔ یعنی اموال نے فقراء مہاجرین کے لیے ہیں اور ان لوگوں کے لیے جنہوں نے مہاجرین کے آنے سے پہلے ہی دارِ ہجرت اور ایمان میں جگہ بنالی تھی، یعنی پہلے ہی مدینہ میں رہتے تھے اور ایمان لے آئے تھے۔ ایمان لانے کے لیے یہاں ایمان میں جگہ اور ٹھکانا بنانے کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ یہ استعارہ ہے جس میں ایمان کو ایک مضبوط پناہ گاہ اور ٹھکانے کے ساتھ تشبیہ دی ہے، جس میں وہ پہلے ہی داخل ہو چکے تھے۔ ان لوگوں سے مراد تمام انصار ہیں جن میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو اس وقت ایمان لائے جب کوئی مہاجر مدینہ میں نہیں آیا تھا، یعنی بیعت عقبہ اولیٰ والے انصار اور وہ بھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے ایمان لا چکے تھے جب کچھ مہاجرین آچکے تھے اور کچھ آنے والے تھے اور مکہ فتح ہونے تک مسلمان ہونے والے تمام انصار بھی، کیونکہ وہ بھی کئی مہاجرین سے پہلے ایمان لے آئے تھے۔

② يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ : یہ انصار کی دوسری فضیلت ہے کہ وہ ہجرت کر کے اپنے پاس آنے والوں سے محبت رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح انصار نے ہجرت کر کے آنے والوں کو گلے لگایا اس کی مثال نہیں ملتی۔ انہوں نے مہاجرین کو اپنی جائداد، گھر بار، زمینوں اور باغوں میں شریک کر لیا اور اتنے اصرار کے ساتھ ان میں سے ہر ایک کو اپنے گھروں میں ٹھہرانے کی کوشش کی کہ مہاجرین کو قرعہ ڈال کر ان کے گھروں میں تقسیم کیا گیا، جیسا کہ ام علاء انصاریہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ﴿أُنْتَهَمُ

فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا أُوتُوا وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۗ

ہجرت کر کے ان کی طرف آئیں اور وہ اپنے سینوں میں اس چیز کی کوئی خواہش نہیں پاتے جو ان (مہاجرین) کو دی
اقتسموا المهاجرين فَرَعَةً، قَالَتْ فَطَارَ لَنَا عُثْمَانُ بْنُ مَطْعُونٍ، وَأَنْزَلْنَا فِيهِ أَيْتَانَا ۗ [بخاری، التعبير، باب رویا
النساء: ۷۰۰۳] ”انصار نے مہاجرین کو قرعہ کے ساتھ تقسیم کیا، ہمارے حصے میں عثمان بن مظعون آئے، تو ہم نے انہیں اپنے
گھروں میں ٹھہرایا۔“

اس محبت کا ایک مظہر مواخات تھی، جس کی وجہ سے سعد بن ربیع انصاری رضی اللہ عنہ نے عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کو اپنی ساری
جان و مال اور تمام مکانوں میں سے نصف کی اور دو بیویوں میں سے ایک کو طلاق کے بعد ان کے نکاح میں دینے کی پیشکش کی،
جس پر انہوں نے انہیں برکت کی دعا دی مگر یہ پیشکش قبول نہ کی۔ (دیکھیے بخاری: ۲۰۳۹) انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ
مہاجرین نے کہا: «يَا رَسُولَ اللَّهِ! مَا رَأَيْنَا مِثْلَ قَوْمٍ قَدِمْنَا عَلَيْهِمْ أَحْسَنَ مَوَاسَاةٍ فِي قَلِيلٍ، وَلَا أَحْسَنَ بَدَلًا فِي
كَثِيرٍ، لَقَدْ كَفَوْنَا الْمُتُونَةَ، وَأَشْرَكُونَا فِي الْمَهْنَاءِ، حَتَّى لَقَدْ حَسِبْنَا أَنْ يَذْهَبُوا بِالْأَجْرِ كُلِّهِ، قَالَ لَا، مَا أَتَيْتُمْ
عَلَيْهِمْ، وَدَعَوْتُمْ اللَّهَ عَزَّوَجَلَّ لَهُمْ» [مسند أحمد: ۲۰۰۳، ۲۰۱، ح: ۱۳۰۷۵، قال المحقق إسناده صحيح على
شرط الشيخين۔ ترمذی: ۲۴۸۷] ”اے اللہ کے رسول! ہم نے ان جیسے لوگ نہیں دیکھے جن کے پاس ہم آئے ہیں، جو
تھوڑے میں اچھی سے اچھی غم خواری کرتے ہوں اور زیادہ میں بہتر سے بہتر خرچ کرتے ہوں۔ وہ ہماری جگہ خود محنت مشقت
کر رہے ہیں اور انہوں نے آمدنی میں ہمیں شریک کر رکھا ہے، یہاں تک کہ ہمیں لگتا ہے کہ سارا اجر وہی لے جائیں
گے۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”نہیں، جب تک تم ان کی تعریف کرتے رہو گے اور اللہ تعالیٰ سے ان کے لیے دعا کرتے رہو
گے۔“ انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے انصار کو بلایا تاکہ بحرین کا علاقہ بطور جاگیر ان کے لیے لکھ
دیں۔ انہوں نے کہا: ”جب تک ہمارے مہاجر بھائیوں کو بھی اتنا ہی نہ دیں ہم نہیں لیں گے۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّمَا
لَا، فَاصْبِرُوا حَتَّى تَلْقَوْنِي، فَإِنَّهُ سَيُصِيبُكُمْ بَعْدِي أَثَرَةٌ» [بخاری، مناقب الأنصار، باب قول النبي ﷺ للأنصار:
”اصبروا حتى تلقوني على الحوض“: ۳۷۹۴] ”اگر تم نہیں لیتے تو صبر کرو، یہاں تک کہ مجھ سے آلو، کیونکہ میرے بعد تم پر
دوسروں کو ترجیح دی جائے گی۔“ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انصار نے نبی ﷺ سے کہا: ”اے اللہ کے رسول! ہمارے
کھجوروں کے درخت ہمارے اور ہمارے مہاجر بھائیوں کے درمیان تقسیم کر دیجیے۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”نہیں۔“ تو انصار
نے (مہاجرین سے) کہا: ”تم ہماری جگہ محنت کرو گے اور ہم تمہیں پھلوں کی پیداوار میں شریک کر لیں گے۔“ مہاجرین نے
کہا: ”ہم نے تمہاری بات سنی اور مان لی۔“ [بخاری، الحرث والمزاعة، باب إذا قال اكفني مؤونة النحل.....: ۲۳۲۵]

❶ وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا أُوتُوا: یعنی انصار کے دل میں مہاجرین کی ایسی محبت اور ہمدردی ہے کہ
مہاجرین کو کوئی چیز دی جائے تو انصار کے دل میں اپنے لیے اس کی خواہش تک پیدا نہیں ہوتی، اس کا مطالبہ تو بہت دور کی

وَمَنْ يُؤَقِّ شَخْرَ نَفْسِهِ فَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿۹﴾

جائے اور اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں، خواہ انھیں سخت حاجت ہو اور جو کوئی اپنے نفس کی حرص سے بچالیا گیا تو وہی لوگ ہیں جو کامیاب ہیں ﴿۹﴾

بات ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے بنو نضیر کی چھوڑی ہوئی تمام زمینیں اور باغات مہاجرین کو دے دیے اور انصار نے بخوشی اسے قبول کیا۔

﴿۹﴾ وَ يُؤَثِّرُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَ لَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ: "خَصَّ يَخْصُ خَصَاصَةً وَ خَصَاصًا وَ خَصَاصَاءَ (ع) "افْتَقَرَ" محتاج ہونا۔ "خَصَاصَةٌ" فقر وفاقہ۔ اپنی ضرورت سے زائد چیز خرچ کرنا بھی اگرچہ خوبی ہے، مگر وہ تھوڑا بہت جو آدمی کے پاس ہو، خود فقر وفاقہ برداشت کرتے ہوئے اسے دوسرے پر خرچ کر دینا بہت ہی اونچی بات ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے پوچھا: "یا رسول اللہ! کون سا صدق سب سے بہتر ہے؟" آپ ﷺ نے فرمایا: «جُهِدْ الْمُقْبِلَ وَ ابْدَأْ بِمَنْ تَعُولُ» [ابو داؤد، الرکاة، باب الرخصة في ذلك: ۱۶۷۷، وقال الألبانی صحیح] "کم مال والے کی کوشش اور ابتدا اس سے کرو جس کی تم پرورش کر رہے ہو۔"

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی نبی ﷺ کے پاس آیا، آپ ﷺ نے اپنی بیویوں کے پاس پیغام بھیجا، ان کی طرف سے جواب آیا کہ ہمارے پاس پانی کے سوا کچھ نہیں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «مَنْ يَضُمُّ أَوْ يُضَيِّفُ هَذَا؟» "اس مہمان کو اپنے ساتھ کون لے جائے گا؟" انصار میں سے ایک آدمی نے کہا: "میں لے جاؤں گا۔" چنانچہ وہ اسے لے کر اپنی بیوی کے پاس گیا اور اس سے کہا: "رسول اللہ ﷺ کے مہمان کی خاطر تواضع کرو۔" اس نے کہا: "ہمارے پاس بچوں کے کھانے کے سوا کچھ نہیں۔" اس نے کہا: "کھانا تیار کر لو، چراغ جلا لو اور بیچے جب کھانا مانگیں تو انھیں سلا دو۔" اس نے کھانا تیار کر لیا، چراغ جلا دیا اور بچوں کو سلا دیا۔ پھر وہ اس طرح اٹھی جیسے چراغ درست کرنے لگی ہے اور اس نے چراغ بجھا دیا۔ میاں بیوی دونوں اس کے سامنے بیٹھی ظاہر کرتے رہے کہ وہ کھا رہے ہیں، مگر انھوں نے وہ رات خالی پیٹ گزار دی۔ جب صبح ہوئی اور وہ انصاری رسول اللہ ﷺ کے پاس گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: «صَحِبْتُ اللّٰهَ اللَّيْلَةَ أَوْ عَجِبْتُ مِنْ فَعَالِكُنْمَا» "آج رات تم دونوں میاں بیوی کے کام پر اللہ تعالیٰ بس پڑا یا فرمایا کہ اس نے تعجب کیا۔" تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿۹﴾ وَ يُؤَثِّرُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَ لَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَ مَنْ يُؤَقِّ نَفْسِهِ فَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿۹﴾ [الحشر: ۱۹] "اور اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں، خواہ انھیں سخت حاجت ہو اور جو کوئی اپنے نفس کی حرص سے بچالیا گیا تو وہی لوگ ہیں جو کامیاب ہیں۔" [بخاری، مناقب الأنصار، باب قول الله عزوجل: ﴿۹﴾ وَ يُؤَثِّرُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ : ۳۷۹۸۔ مسلم: ۲۰۵۴ صحیح مسلم میں اس انصاری کا نام بھی مذکور ہے کہ وہ ابو طلحہ رضی اللہ عنہ تھے۔

﴿۹﴾ وَ مَنْ يُؤَقِّ نَفْسِهِ : "يُؤَقِّ" "وَفِي يَفِي وَ قَايَةً" (ض) (بچانا) سے فعل مضارع مجہول ہے، اصل میں

”یوفی“ تھا، ”صن“ کے جزم دینے کی وجہ سے الف گر گیا۔ راغب نے فرمایا: ”الشُّحُّ بُحْلٌ مَعَ جَرِّصٍ وَذَلِكَ فِيمَا سَكَنَتْ عَاذَةٌ.“ ”شح“ وہ بخل ہے جس کے ساتھ حص بھی ہو اور یہ آدمی کی عادت ہو۔ ”یعنی ”شح“ یہ نہیں کہ آدمی کسی وقت بخل کر جائے یا حص سے کام لے لے، بلکہ یہ دونوں چیزیں اس کی عادت ہوں۔ بعض اہل علم نے فرمایا کہ ”شح“ یہ ہے کہ جو آدمی کے پاس ہو اس پر بخل کرے اور جو نہیں اس کی حص رکھے۔ ”وَمَنْ يُؤَقِّ شُحَّهُ نَفْسِهِ“ سے ظاہر ہے کہ ہر انسان میں یہ عادت پائی جاتی ہے، بچتا وہی ہے جسے اللہ تعالیٰ بچائے اور جنہیں اس بری خصلت سے بچالیا جائے وہی کامیاب ہیں۔

آیت میں ”شح“ سے بچنے کی تاکید اور فضیلت کا بیان ہے، پھر جو کوشش کرے اللہ تعالیٰ اسے بچا لیتا ہے، جیسا کہ فرمایا:

﴿وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لِنَهْدِيَهُمْ لِمَنْ سَلْتَنَا وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ﴾ | العنكبوت: ۶۹ | ”اور وہ لوگ جنہوں نے ہمارے بارے میں پوری کوشش کی ہم ضرور ہی انہیں اپنے راستے دکھا دیں گے اور بلاشبہ اللہ یقیناً نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“ اور ابو سعید خدری رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿وَمَنْ يَسْتَعْفِفْ يُعْفُهُ اللَّهُ، وَمَنْ يَسْتَعْنِ يُعْنِهِ اللَّهُ، وَمَنْ يَتَصَبَّرْ يُصْبِرْهُ اللَّهُ، وَمَا أُعْطِيَ أَحَدٌ عَطَاءً خَيْرًا وَأَوْسَعَ مِنَ الصَّبْرِ﴾ | بخاری، الزکاة، باب الاستعفاف عن المسئلة: ۱۴۶۹ | ”اور جو (سوال سے) بچے گا اللہ تعالیٰ اسے بچالے گا اور جو غنی بننے کی کوشش کرے گا اللہ تعالیٰ اسے غنی بنا دے گا اور جو صبر کی کوشش کرے گا اللہ تعالیٰ اسے صبر عطا کر دے گا اور کسی شخص کو کوئی ایسا عطیہ نہیں دیا گیا جو صبر سے اچھا اور زیادہ وسیع ہو۔“ اور جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿اتَّقُوا الظُّلْمَ فَإِنَّ الظُّلْمَ ظُلُمَاتٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَاتَّقُوا الشُّحَّ فَإِنَّ الشُّحَّ أَهْلَكَ مَنْ سَكَنَ قَلْبُكَ، حَمَلَهُمْ عَلَيَّ أَنْ سَفَكُوا إِدْمَاءَهُمْ وَاسْتَحْلَوْا مَحَارِمَهُمْ﴾ [مسئمہ، الرواصلة، باب تحريم الظلم: ۲۵۷۸ | ”ظلم سے بچو، کیونکہ ظلم قیامت کے دن بہت سی تاریکیاں ہوگا اور ”شح“ (بخل و حص) سے بچو، کیونکہ شح نے ان لوگوں کو ہلاک کر دیا جو تم سے پہلے تھے۔ اس نے انہیں اس بات پر ابھارا کہ انہوں نے اپنے خون بہائے اور اپنے اوپر حرام چیزوں کو حلال کر لیا۔“

③ اس آیت میں انصار کی جو صفات بیان ہوئی ہیں اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ انہی کے ساتھ خاص ہیں بلکہ وہ مہاجرین میں بھی بدرجہ اتم موجود تھے۔ ان کی ہجرت ہی ان تمام صفات کی جامع ہے، کیونکہ آدمی کے لیے ممکن ہی نہیں کہ وہ اللہ، اس کے رسول اور ایمان والوں کی محبت اور انہیں اپنے جان و مال پر ترجیح دے بغیر ہجرت کر سکے۔ پھر ہر موقع پر انصار کی طرح مہاجرین نے بھی جس طرح اپنے مال و جان کو اللہ کی راہ میں قربان کیا وہ سب کے سامنے ہے۔ جنگ تبوک کے موقع پر ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہما گھر میں جو کچھ تھا سب لے آئے اور عمر رضی اللہ عنہما آدھا سامان لے آئے۔ یہ ”شح“ سے محفوظ ہونے اور انصار کی بلند ترین مثالیں ہیں۔ اسی طرح پہلی آیت میں مہاجرین کے جو اوصاف بیان ہوئے ہیں ان کا یہ مطلب نہیں کہ وہ صرف انہی کے ساتھ خاص ہیں، بلکہ وہ انصار میں بھی موجود تھے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دونوں کا ذکر اکٹھا فرمایا ہے اور دونوں کو کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

وَالَّذِينَ جَاءُوا مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ ﴿۱۰﴾

اور (ان کے لیے) جو ان کے بعد آئے، وہ کہتے ہیں اے ہمارے رب! ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو بخش دے جنہوں نے ایمان لانے میں ہم سے پہلے کی اور ہمارے دلوں میں ان لوگوں کے لیے کوئی کینہ نہ رکھ جو ایمان لائے، اے ہمارے رب! یقیناً تو بے حد شفقت کرنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۱۰﴾

ایک دوسرے کے دوست اور سچے مومن قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ أَوْوُوا وَتَصَرَّوْا أُولَٰئِكَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ﴾ [الأنفال: ۷۲] ”بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کے راستے میں جہاد کیا اور وہ لوگ جنہوں نے جہاد دی اور مدد کی، یہ لوگ! ان کے بعض بعض کے دوست ہیں۔“ اور اس کے بعد فرمایا: ﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ أَوْوُوا وَتَصَرَّوْا أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا﴾ [الأنفال: ۷۴] ”اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور وہ لوگ جنہوں نے جہاد دی اور مدد کی وہی سچے مومن ہیں۔“ غرض مہاجرین و انصار میں سے کوئی بھی فضیلت میں کم نہیں، تاہم مہاجرین کو اپنی ہجرت کی وجہ سے انصار پر ایک قسم کی برتری حاصل ہے، اس لیے ان آیات میں ان کا ذکر پہلے آیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے مومن کی غنیمتوں کی تقسیم کے موقع پر انصار کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: «أَنْتُمْ ضُونَ أَنْ يَذْهَبَ النَّاسُ بِالشَّوْقِ وَالْبَغْيِ، وَتَذْهَبُونَ بِالسَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَى رَحَابِكُمْ؟ لَوْلَا الْهَجْرَةُ لَكُنْتُ أَمْرًا مِّنَ الْأَنْصَارِ، وَلَوْ سَلَّكَ النَّاسُ وَادِيًا وَبَغِبْنَا لَسَلَّكَتُ وَادِي الْأَنْصَارِ وَبَغِبْتُمَا، الْأَنْصَارُ شِعَارُ وَالنَّاسُ دِمَارُ» [بخاری، المعازي، باب غزوة الأنصار في شواذ سنة ثمان: ۴۳۳] ”کیا تم پسند کرتے ہو کہ لوگ بھیڑ بگریں اور اونٹ لے جائیں اور تم نبی ﷺ کو اپنے گھروں کی طرف لے جاؤ؟ اگر ہجرت نہ ہوتی تو میں انصار میں سے ایک آدمی ہوتا اور اگر لوگ کسی وادی اور گھاٹی میں چلیں تو میں انصار کی وادی اور ان کی گھاٹی میں چلوں گا۔ انصار شعار (جسم کے ساتھ ملا ہوا کپڑا) ہیں اور دوسرے لوگ دیمار (ادھر لیا جانے والا کپڑا) ہیں۔“

آیت 10 ﴿۱۰﴾ وَالَّذِينَ جَاءُوا مِنْ بَعْدِهِمْ : اس کا عطف مہاجرین و انصار پر ہے جن کا ذکر پہلی دو آیات میں گزرا۔ یعنی اموال نے مہاجرین و انصار کے فقراء کے لیے ہیں اور ان فقراء کے لیے جو ان کے بعد آئے۔ یہ اموال نے کے مستحقین کی تیسری قسم ہے۔ ان میں تابعین، تبع تابعین اور قیامت تک آنے والے تمام مسلمان شامل ہیں، اگر ان میں وہ صفات موجود ہوں جن کا اس آیت میں ذکر ہے۔

﴿۱۰﴾ يَقُولُونَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ : ان میں سے پہلی صفت جو ”الَّذِينَ سَبَقُونَا

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ تَافَقُوا يَقُولُونَ لِإِخْوَانِهِمُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَئِنْ

کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہوں نے منافقت کی، وہ اپنے ان بھائیوں سے کہتے ہیں جنہوں نے اہل کتاب
پالیٹان سے ظاہر ہے، یہ ہے کہ وہ مہاجرین و انصار کو مومن مانتے ہوں اور انہی چیزوں پر ایمان رکھتے ہوں جن پر ان کا
ایمان تھا۔ دوسری صفت یہ ہے کہ وہ ان کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہوں۔ تیسری صفت یہ ہے کہ وہ مہاجرین و انصار
صحابہ اور ان کے پیروکاروں سے نہ صرف محبت رکھتے ہوں بلکہ دعا بھی کرتے ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں میں ان کے
بارے میں کوئی کینہ یا دشمنی باقی نہ رہنے دے اور نہ ہی پیدا ہونے دے۔ مفسر ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے
اس آیت سے کیا ہی خوب صورت استنباط کیا ہے کہ رافضی جو صحابہ کو گالی دیتا ہو، اس کا دل نے میں کوئی حسد نہیں، کیونکہ اس میں
وہ اوصاف نہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس فرمان ”وَ الَّذِينَ جَاءُوا مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَ لِإِخْوَانِنَا
الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَ لَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًا لِلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ“ میں ذکر فرمائے ہیں۔
ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس آیت کے مقہوم کے پیش نظر اپنے بھانجے عروہ بن زبیر سے فرمایا: « يَا زَيْنُ احْتَبِ! أَمْرُوا أَنْ
يُسْتَغْفِرُوا لِأَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَبُّهُمْ » [مسلم، التفسیر، باب فی تفسیر آیات متفرقة: ۲۲، ۲۳]
”اے میرے بھانجے! ان لوگوں کو رحم دیا گیا تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے لیے مغفرت کی دعا کریں، لیکن وہ انہیں گالیاں
دینے لگے۔“ بعض نے فرمایا، جس کے دل میں کسی صحابی کے متعلق کینہ ہو اور وہ تمام صحابہ کے لیے رحم کی دعا نہ کرتا ہو وہ ان
لوگوں میں شامل نہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ذکر فرمایا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بالترتیب ایمان والوں کے تین
مراتب بیان فرمائے ہیں، مہاجرین، انصار اور ان کے وہ پیروکار جن میں وہ اوصاف ہوں جو آیت میں مذکور ہیں، سو جو شخص
ان صفات والے پیروکاروں میں سے نہ ہو وہ مومنوں کی اقسام سے خارج ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ رافضی لوگوں سے، جو صحابہ کو گالی دیتے ہیں، یہود و نصاریٰ ہی اچھے رہے، کیونکہ یہود سے پوچھا
گیا کہ تمہاری ملت میں سب سے بہتر لوگ کون ہیں؟ انھوں نے کہا، موسیٰ علیہ السلام کے اصحاب۔ نصاریٰ سے پوچھا گیا، تمہاری
ملت میں سب سے بہتر لوگ کون ہیں؟ انھوں نے کہا، عیسیٰ علیہ السلام کے اصحاب۔ رافضیوں سے پوچھا گیا کہ تمہاری ملت میں سب
سے برے لوگ کون ہیں؟ تو انھوں نے کہا، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب۔ [نَعُوذُ بِاللَّهِ مِنْ ذَلِكَ]
③ رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ : اپنے سے پہلے ایمان والوں کے لیے مغفرت کی دعا اور اپنے سینوں کو ان کے کہنے سے
پاک رکھنے کی دعا کے آخر میں اللہ تعالیٰ کو اس کے ان وہ اسمائے حسنیٰ کا واسطہ دیا، کیونکہ یہ دونوں چیزیں اس کی رافت و رحمت
ہی سے حاصل ہو سکتی ہیں۔

آیت 11 ① أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ تَافَقُوا..... : اکثر مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ آیات عبداللہ بن ابی اور اس کے دوسرے

مناقض ساتھیوں کے بارے میں اتریں کہ انھوں نے بنو نضیر کے یہود کی طرف پیغام بھیجا کہ اپنے قلعوں میں ڈٹ جاؤ، اگر

أَخْرَجْتُمْ لِنَخْرُجَنَ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيعُ فِيكُمْ أَحَدًا أَبَدًا وَإِنْ قُوتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ
وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ۝

میں سے کفر کیا، یقیناً اگر تمہیں نکالا گیا تو ضرور بالضرور ہم بھی تمہارے ساتھ نکلیں گے اور تمہارے بارے میں کبھی کسی کی بات نہیں مانیں گے اور اگر تم سے جنگ کی گئی تو ضرور بالضرور ہم تمہاری مدد کریں گے اور اللہ شہادت دیتا ہے کہ بلاشبہ وہ یقیناً جھوٹے ہیں ۝

تمہیں نکالا گیا تو ہم تمہارے ساتھ نکلیں گے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یقیناً یہ لوگ جھوٹے ہیں، اگر انہیں نکالا گیا تو یہ ان کے ساتھ نہیں نکلیں گے۔ مفسر آلوسی نے لکھا ہے کہ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ یہ سورت بنو نضیر کے واقعہ سے پہلے اتری ہے، جب کہ محدثین اور سیرت نگاروں کے مطابق یہ سورت بنو نضیر کے واقعہ کے بعد اتری ہے، جب وہ جلا وطن کیے جا چکے تھے۔ آلوسی نے اشارے ہی پر اکتفا کیا ہے کہ ان آیات کو بنو نضیر کے متعلق سمجھنا درست نہیں۔ ابن عاشور نے اپنی تفسیر "النحریر و النسیر" میں لکھا ہے کہ منافقین نے جن کفار اہل کتاب کو یہ بات کہی تھی وہ بنو نضیر نہیں بلکہ بنو قریظہ اور خیبر کے یہودی تھے، کیونکہ بنو نضیر کا قصہ تو اس سے پہلے تمام ہو چکا تھا۔ اب وہ منافقین باقی ماندہ یہودیوں کو مسلمانوں کے مقابلے میں ڈٹ جانے کی تلقین کر رہے تھے اور انہیں یقین دلا رہے تھے کہ ہم ہر حال میں تمہارا ساتھ دیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں مسلمانوں کو حوصلہ دلایا کہ فکر مت کرو، یہ کسی صورت میں بھی ان کا ساتھ نہیں دیں گے۔

ابن عاشور کی بات ہی درست ہے۔ ان آیات کو طبری میں مذکور ابن عباس رضی اللہ عنہما کے جس قول کے مطابق بنو نضیر کے متعلق قرار دیا گیا ہے اس کی سند ثابت نہیں، اس میں طبری کے شیخ محمد بن حمید رازی ضعیف ہیں۔

② "أَلَمْ تَرَ" "أَلَمْ تَعْلَمِ" کے معنی میں ہے۔ نبی کریم ﷺ کی نبوت کے بہت سے دلائل میں سے یہ بھی ایک دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو منافقین کی اس بات سے آگاہ کر دیا جو ان کے درمیان انتہائی راز کی بات تھی۔

③ يَقُولُونَ لِأَخْوَانِهِمُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ: جیسا کہ اوپر گزرا کہ ان کفار اہل کتاب سے مراد بنو قریظہ اور خیبر کے یہودی ہیں، انہیں منافقین کے بھائی قرار دینے سے ظاہر ہے کہ جس طرح ایمان والے آپس میں دوست اور بھائی ہیں (دیکھیے حجرات: ۱۰- انفال: ۷۲) اسی طرح کفار بھی کفر میں ایک دوسرے کے دوست اور بھائی ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَالَّذِينَ كَفَرُوا بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ﴾ (انفال: ۷۳) "اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے بعض بعض کے دوست ہیں۔" بھائی ہونے سے مراد یہی اخوت نہیں ہے، کیونکہ عبد اللہ بن اہل اور دوسرے اکثر منافقین اوس و خزرج کے مشرکین میں سے تھے، اہل کتاب سے ان کی اخوت کفری میں تھی۔

④ لَئِنْ أَخْرَجْتُمْ لِنَخْرُجَنَ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيعُ فِيكُمْ أَحَدًا أَبَدًا: اس میں منافقین یہود کے دل میں آنے والے اس

لَيْنٌ أُخْرِجُوا لَا يَخْرُجُونَ مَعَهُمْ ۚ وَلَيْنٌ قُوتِلُوا لَا يَنْصُرُونَهُمْ ۚ وَلَيْنٌ نَصَرُوهُمْ لِيُوَلِّنَ
الْأَذْبَانَ ثُمَّ لَا يَنْصُرُونَ ﴿۱۲﴾ لَا أَنْتُمْ أَشَدُّ رَهْبَةً فِي صُدُورِهِمْ مِنَ اللَّهِ ۗ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ

قَوْمٌ لَا يَفْقَهُونَ ﴿۱۳﴾

یقیناً اگر انھیں نکالا گیا تو وہ ان کے ساتھ نہ نکلیں گے اور یقیناً اگر ان سے جنگ کی گئی تو وہ ان کی مدد نہ کریں گے اور یقیناً اگر انھوں نے ان کی مدد کی تو وہ ضرور بالضرور پیٹھیں پھیریں گے، پھر وہ مدد نہیں کیے جائیں گے ﴿۱۲﴾ بلاشبہ تم ان کے سینوں میں خوف کے اعتبار سے اللہ سے زیادہ سخت ہو، یہ اس لیے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو نہیں سمجھتے ﴿۱۳﴾

خطرے کا تدارک کر رہے ہیں کہ یہ لوگ اپنے قبیلوں اوس و خزرج میں سے مسلمان ہونے والوں کے رشتہ دار ہیں، ان مسلمانوں نے انھیں ہماری مدد سے منع کیا تو یہ مدد سے ہاتھ کھینچ لیں گے، اس لیے منافقین کہہ رہے ہیں کہ فکر مت کرو، ہم تمہارے بارے میں کسی کی بات نہیں مانیں گے۔

﴿۱۲﴾ وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ : اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتنی ہی بات کافی تھی کہ قسم کھا کر فرما دیا کہ بلاشبہ وہ یقیناً جھوٹے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ نے اگلی آیت میں ان کی ایک ایک بات ذکر کر کے فرمایا کہ وہ ان میں سے کوئی وعدہ پورا نہیں کریں گے۔ علم بلاغت میں اسے اطناب کہتے ہیں، یعنی کسی جگہ مختصر بات کا موقع ہوتا ہے، کسی جگہ توسط کا اور کہیں ضرورت ہوتی ہے کہ بات کو خوب لمبا کر کے بیان کیا جائے۔ یہاں منافقین کے جھوٹ کو واضح کرنے اور انھیں ذلیل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے بات کو لمبا کیا ہے۔ (ابن عاشور)

آیت ۱۲ ﴿۱﴾ لَيْنٌ أُخْرِجُوا لَا يَخْرُجُونَ مَعَهُمْ ۚ وَلَيْنٌ قُوتِلُوا لَا يَنْصُرُونَهُمْ : اور ایسا ہی ہوا جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے، بنو قریظہ سے تعلق کر دیے گئے اور خیر والوں کو آخر کار جلا وطن ہونا پڑا مگر کوئی منافق ان کی مدد کو نہ پہنچ سکا۔ ﴿۲﴾ وَلَيْنٌ نَصَرُوهُمْ لِيُوَلِّنَ الْأَذْبَانَ : یہ بات بطور فرض کہی گئی ہے۔

﴿۳﴾ ثُمَّ لَا يَنْصُرُونَ : عربوں کا عام طریقہ تھا کہ بعض اوقات وہ میدان سے بھاگ جاتے اور پلٹ کر پھر حملہ آور ہوتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر بالفرض یہ منافقین ان کی مدد کے لیے آئے بھی تو پیٹھ دے کر بھاگ جائیں گے اور ایسے بھاگیں گے کہ ان اہل کتاب کی مدد کے لیے دوبارہ کوئی نہیں آئے گا۔

آیت ۱۳ ﴿۱﴾ لَا أَنْتُمْ أَشَدُّ رَهْبَةً فِي صُدُورِهِمْ مِنَ اللَّهِ : اس میں مسلمانوں کا حوصلہ بڑھایا ہے، کیونکہ جب انھیں معلوم ہوگا کہ دشمن ان سے شدید خوف زدہ ہے تو وہ بڑھ چڑھ کر حملے کریں گے۔

﴿۲﴾ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَفْقَهُونَ : کیونکہ اگر وہ سمجھ دار ہوتے تو مخلوق کے بجائے خالق سے ڈرتے۔

لَا يُقَاتِلُونَكُمْ جَمِيعًا إِلَّا فِي قَرْيٍ مُّحَصَّنَةٍ أَوْ مِنْ وَرَاءِ جُدُرٍ بِأَسْهُمٍ بَيْنَهُمْ شَدِيدٌ
تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَقُلُوبُهُمْ شَتَّىٰ ذَلِكُمْ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَعْقِلُونَ ﴿۱۴﴾

عقل نہیں رکھتے ﴿۱۴﴾

وہ اکٹھے ہو کر تم سے نہیں لڑیں گے مگر قلعہ بند بستیوں میں، یا دیواروں کے پیچھے سے، ان کی لڑائی آپس میں بہت سخت ہے۔ تو خیال کرے گا کہ وہ اکٹھے ہیں، حالانکہ ان کے دل الگ الگ ہیں، یہ اس لیے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو

ت ۱۴ ﴿۱﴾ لَا يُقَاتِلُونَكُمْ جَمِيعًا إِلَّا فِي قَرْيٍ مُّحَصَّنَةٍ : ”حِصْنٌ“ کا معنی قلعہ ہے۔ ”مُحَصَّنَةٍ“ قلعہ بنائی ہوئی محفوظ بستیاں۔ ”جُدُرٍ“ ”جَدَارٌ“ کی جمع ہے، دیواریں۔ یعنی یہ یہودی ایسے نامرد اور بزدل ہیں کہ کبھی اکٹھے ہو کر میدان میں تمہارا سامنا نہیں کریں گے، بلکہ قلعہ بند بستیوں میں یا دیواروں کے پیچھے رہ کر ہی لڑیں گے۔ اس طرح لڑنے والے ہمیشہ ذلیل ہی ہوتے ہیں، کیونکہ جو میدان میں نکلنے کی جرأت نہیں رکھتا اسے قلعے اور دیواریں بھی نہیں بچا سکتیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ اصحاب رسول ﷺ کھلے میدان میں لڑنا پسند کرتے تھے اور چونکہ وہ شہادت کی تلاش میں لڑتے تھے، اس لیے دشمن پہلی چوٹ ہی میں پیٹھے پھیر کر بھاگ اٹھتا تھا۔ یہودی چونکہ موت سے بچتے تھے اس لیے وہ میدان میں آنے کے بجائے قلعوں اور دیواروں کی پناہ کے ذریعے سے زندگی بچانے کی کوشش میں رہتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی قلعہ بند بستیاں بھی انہیں ذلت اور موت سے نہ بچا سکیں۔

﴿۲﴾ بِأَسْهُمٍ بَيْنَهُمْ شَدِيدٌ : یعنی یہ یہودی اور منافقین تمہارے مقابلے میں تمہی آسکتے تھے جب وہ آپس میں ایک ہوتے، جبکہ ان کا حال یہ ہے کہ وہ صرف اسلام دشمنی میں اکٹھے ہیں، ورنہ ان کی آپس کی لڑائی بہت سخت ہے۔ منافقین و یہود اور مشرکین کا ایک دوسرے سے یہی معاملہ ہے۔ پھر ان میں سے ہر ایک گروہ کے افراد آپس میں بھی ایک نہیں بلکہ ایک دوسرے سے شدید دشمنی رکھتے ہیں، ایسے لوگوں میں یہ حوصلہ کہاں کہ وہ تمہارے مقابلے میں اکٹھے ہو کر میدان میں نکلیں۔

﴿۳﴾ تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَقُلُوبُهُمْ شَتَّىٰ : ”شَتَّىٰ“ ”شَتِيَّتٌ“ کی جمع ہے، جیسے ”فَتِيلٌ“ کی جمع ”فَتَلِي“ ہے، یعنی تم انہیں گمان کرو گے کہ وہ اکٹھے ہیں، حالانکہ ان کے دل الگ الگ ہیں۔

﴿۴﴾ ذَلِكُمْ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَعْقِلُونَ : اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو کام کے انجام کو نہیں سوچتے اور عقل سے کام نہیں لیتے، بلکہ اپنی خواہشوں کے پیچھے چلتے ہیں، جس کا نتیجہ باہمی اختلاف اور عداوت ہی ہے۔ ”قَوْمٌ“ کے لفظ سے ظاہر ہے کہ یہ ان کے ایک آدھ آدمی کا معاملہ نہیں بلکہ پوری قوم کا مزاج ہی یہ ہے۔

﴿۵﴾ ان آیات میں مسلمانوں کی تربیت ہے کہ وہ ایک دوسرے کی مخالفت، عناد اور دشمنی سے بہت زیادہ اجتناب کریں اور اچھی طرح سمجھ لیں کہ کوئی بھی قوم دشمن پر اسی وقت غالب ہو سکتی ہے جب ان کے دل ایک دوسرے کے کینے اور عداوت سے پاک اور ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہوں اور وہ قومی و اجتماعی مفاد کو اپنے ذاتی مفادات پر ترجیح دیتے ہوئے یک زبان و یک جان ہوں۔

كَذَلِكَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَرِيبًا ذَاتُوا وِبَالَ أَمْرِهِمْ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٥﴾
 كَذَلِكَ الشَّيْطَانُ إِذْ قَالَ لِلْإِنْسَانِ اكْفُرْ ۚ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ إِنِّي بَرِيءٌ مِّنْكَ إِنِّي
 أَخَافُ اللَّهَ رَبَّ الْعَالَمِينَ ﴿١٦﴾

ان لوگوں کے حال کی طرح جو ان سے پہلے قریب ہی تھے، انہوں نے اپنے کام کا وبال چکھا اور ان کے لیے دردناک سزا ہے ﴿۱۵﴾ شیطان کے حال کی طرح، جب اس نے انسان سے کہا کفر کر، پھر جب وہ کفر کر چکا تو اس نے کہا بلاشبہ میں تجھ سے لاتعلقی ہوں، بے شک میں اللہ سے ڈرتا ہوں، جو تمام جہانوں کا رب ہے ﴿۱۶﴾

﴿۱۶﴾ مفسر ثناء اللہ امرتسری لکھتے ہیں: ”اس آیت کے حکیمانہ مضمون کو اور مسلمانوں کی اندرونی حالت نوئی و صنفی، پھر صنفی در صنفی کو دیکھیں تو بے ساختہ منہ سے نکلتا ہے کہ یہ آیت ہمارے ہی حق میں اتری ہے۔ خواجہ حالی نے اس حالت کا نقشہ یوں کھینچا ہے۔

نہ سُتی میں اور جعفری میں ہو ملت نہ نعمانی و شافعی میں ہو الفت
 وہابی سے صوفی کی کم نہ ہو نفرت مقلد کرے نامقلد پہ لعنت
 رہے اہل قبلہ میں جنگ ایسی باہم کہ دین خدا پر بنے سارا عالم

کسی ایک غرض عام کے لیے ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے، ابتدا میں اگر ہوتے ہیں تو انتہا میں بگڑ جاتے ہیں۔ کچھ شک نہیں کہ یہ اطوار انہی لوگوں میں ہوتے ہیں جو قومی اغراض عامہ سے ناواقف ہوتے ہیں، اس لیے ان کے حق میں یہ الہی فیصلہ بالکل حق اور بجا ہے: ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ﴾ ”یہ اس لیے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو عقل نہیں رکھتے۔“ (ثانی)

آیت 15 كَذَلِكَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَرِيبًا ذَاتُوا وِبَالَ أَمْرِهِمْ : ”كَذَلِكَ الَّذِينَ“ سے پہلے مبتدا محذوف ہے: ”أَيُّ مَثَلُهُمْ“ یعنی ان بنو قریظہ کا حال جنہیں منافقین لڑنے پر ابھار رہے ہیں اور اپنی ہر طرح کی مدد کا یقین دلا رہے ہیں ان لوگوں کے حال جیسا ہے جو ان سے پہلے قریب ہی تھے۔ مراد ان سے بنو نضیر ہیں جنہوں نے اپنی بدعبدی کا وبال چکھا، وہ اپنی تمام تر قلعہ بندیوں، فوجی تیاریوں، بہادری کے دعوؤں اور منافقین و مشرکین کی امداد کے وعدوں کے باوجود پہلی چوٹ بھی نہ سہ سکے اور اپنی زمینیں، باغات اور مکانات مسلمانوں کے لیے چھوڑ کر ذلیل و رسوا ہو کر جلا وطن ہو گئے اور ان کے لیے آئندہ بھی دنیا اور آخرت میں دردناک سزا ہے۔

آیت 16 كَذَلِكَ الشَّيْطَانُ إِذْ قَالَ لِلْإِنْسَانِ اكْفُرْ : یعنی بنو قریظہ کو لڑنے پر ابھارنے والے منافقوں کا حال شیطان کے حال جیسا ہے اور وہ انہیں اسی طرح بے یار و مددگار چھوڑ دیں گے جیسے شیطان انسان کے ساتھ معاملہ کرتا ہے کہ وہ انسان کو گمراہ کرتا ہے، پھر جب وہ اس کے پیچھے لگ کر کفر کا ارتکاب کر لیتا ہے تو شیطان کہہ دیتا ہے کہ میرا تجھ سے کوئی

فَكَانَ عَاقِبَتُهُمَا أَنَّهُمَا فِي النَّارِ خَالِدِينَ فِيهَا ۖ وَذَلِكَ جَزَاءُ الظَّالِمِينَ ﴿١٧﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿١٨﴾

پس ان دونوں کا انجام یہ ہوا کہ وہ دونوں آگ میں ہوں گے، اس میں ہمیشہ رہنے والے اور یہی ظالموں کا بدلا ہے ﴿۱۷﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے ڈرو اور ہر شخص یہ دیکھے کہ اس نے کل کے لیے کیا آگے بھیجا ہے اور اللہ سے ڈرو، یقیناً اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے جو تم کر رہے ہو ﴿۱۸﴾

تعلق نہیں، میں تو اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ اس نے کتنے انسانوں کو اس طرح گمراہ کیا اور گمراہ کرنے کے بعد ان سے بری ہو گیا۔ قرآن مجید میں اس کی مثال دنیا میں بدر کے موقع پر شیطان کی کفار قریش کو اپنی حمایت کا یقین دلا کر عین موقع پر فرار اختیار کرنا اور ان سے براءت کا اظہار کرنا بیان ہوئی ہے (دیکھیے انفال: ۲۸) اور قیامت کے دن اس کا اپنے تمام پیروکاروں سے براءت کا اعلان سورہ ابراہیم (۲۴) میں مذکور ہے۔

آیت ۱۷ فَكَانَ عَاقِبَتُهُمَا أَنَّهُمَا فِي النَّارِ خَالِدِينَ فِيهَا : یعنی قیامت کے دن نہ شیطان اور دوسرے گمراہ کرنے والے آگ سے یہ کہہ کر بچ سکیں گے کہ ہم نے انھیں کفر کی صرف دعوت دی تھی، اس پر مجبور نہیں کیا تھا، اب ہمارا ان سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی کفار یہ کہہ کر بچ سکیں گے کہ ہمیں تو شیطان نے یا ان لوگوں نے گمراہ کیا تھا، اس لیے ہمارے بجائے انھیں عذاب دیا جائے، بلکہ گمراہی کی دعوت دینے والے بھی جہنم میں جائیں گے اور ان کے کہنے پر گمراہ ہونے والے سب لوگ بھی اور تمام ظالموں کی یہی جزا ہے۔ مزید دیکھیے سورہ اعراف (۳۸، ۳۹)، عنکبوت (۱۳، ۱۴)، سبأ (۳۱، ۳۲) اور سورہ ق (۲۳، ۲۴)۔

آیت ۱۸ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ﴾ : غزوہ بنو نضیر میں مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کے انعامات، یہود کی عہد شکنی کی سزا اور منافقین کی ریشہ دوانیوں اور ان کے انجام کے ذکر کے بعد تمام مسلمانوں کو نصیحت کی جا رہی ہے۔ ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا“ کے الفاظ کے ساتھ مخلص مسلمانوں کو بھی خطاب ہے اور منافق مسلمانوں کو بھی جو یہود سے دوستی رکھتے اور انھیں اپنی مدد کا یقین دلاتے تھے۔ دونوں کو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے اور قیامت کے دن کی تیاری کی نصیحت کی گئی ہے، تاکہ مخلص مسلمان دنیا میں ملنے والی فتوحات اور نعمتوں کی خوشی میں آخرت کی تیاری کو نہ بھول جائیں اور منافقین میں سے جن کے دلوں میں ایمان کی کوئی رتق باقی ہے وہ اپنی روش پر نادم ہوں اور اللہ سے ڈر کر نفاق سے باز آجائیں اور آنے والے وقت کی فکر کر لیں۔

﴿وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ﴾ : ”اتَّقُوا اللَّهَ“ پر ”وَانظُرُوا“ کے ساتھ عطف کے بجائے ”وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ“ کے ساتھ عطف یہ احساس دلانے کے لیے ڈالا گیا ہے کہ یہ حکم ہر شخص کے لیے ہے۔ ”نَفْسٌ“ کو نکرہ لانے سے بھی عموم مراد ہے۔ گویا ”نَفْسٌ“ یہاں ”كُلُّ نَفْسٍ“ کے معنی میں ہے، کیونکہ جس طرح نکرہ نفی کے سیاق میں آئے تو عموم مراد ہوتا ہے، اسی طرح اگر نکرہ امر،

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنْسَهُمْ أَنْفُسَهُمْ أُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ﴿۱۹﴾

اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اللہ کو بھول گئے تو اس نے انہیں ان کی جانیں بھلوا دیں، یہی لوگ نافرمان ہیں ﴿۱۹﴾

دعا اور ان جیسی چیزوں مثلاً شرط کے سیاق میں آئے تو وہاں بھی عموم مراد ہوتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَأِنْ أَحَدُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ﴾ [التوبة: ۱۶] "اور اگر مشرکین میں سے کوئی ایک تجھ سے پناہ طلب کرے تو اسے پناہ دے۔" (ابن عاشور)

﴿۱۹﴾ مَا قَدَّمَتْ لِعِبَادِهِ: "غَدَّ" (کل) سے مراد آخرت ہے۔ دنیا آج ہے اور آخرت کل، جو مرنے کے ساتھ ہی شروع ہو جاتی ہے۔ دور ہونے کے باوجود اسے "غَدَّ" کہنے میں یہ سبق ہے کہ اسے دور مت سمجھو، کیونکہ جو آنے والا ہے وہ قریب ہی ہے، خصوصاً جس کا علم ہی نہ ہو کہ کب آئے گا اور جو اگلے لمحے ہی آ سکتا ہو اس کے "غَدَّ" ہونے میں کیا شبہ ہے۔

﴿۲۰﴾ وَاتَّقُوا اللَّهَ - إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ: یہاں "اتَّقُوا اللَّهَ" کو دوبارہ لایا گیا ہے، اس کی تین توجیہیں یہاں ذکر کی جاتی ہیں، ایک یہ کہ تکرار کا مقصد اللہ تعالیٰ کے تقویٰ کی تاکید ہے۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ پہلے "اتَّقُوا اللَّهَ" کے ساتھ اللہ سے ڈرنے کا اور آخرت کی تیاری کا حکم دیا، اس کے بعد "إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ" کے ساتھ اس کی وجہ بیان کرنا تھی، کیونکہ "إِنَّ" تعلیل کے لیے ہوتا ہے، لیکن چونکہ پہلے "اتَّقُوا اللَّهَ" کے بعد فاصلہ زیادہ ہو رہا تھا، اس لیے "اتَّقُوا اللَّهَ" کو دوبارہ لاکر اس کی وجہ بیان فرمادی کہ اللہ سے ڈر جاؤ، کیونکہ اللہ تعالیٰ اس سے پوری طرح باخبر ہے جو تم کرتے ہو۔ تمہارا کوئی کام اس سے مخفی نہیں جس پر تم اس کی گرفت سے بچ جاؤ، یا اچھا ہے تو اس کے انعام سے محروم رہو۔ تیسری توجیہ یہ ہے کہ پہلے "اتَّقُوا اللَّهَ" سے مراد تقویٰ یعنی اللہ سے ڈرنے کا حکم ہے جس کی بدولت آدمی نیکی کرتا ہے اور گناہ سے بچتا ہے اور دوسرے "اتَّقُوا اللَّهَ" سے مراد اس پر دوام ہے، یعنی ہمیشہ اللہ سے ڈرتے رہو، کیونکہ تم جو کچھ کرتے ہو یا کرو گے اللہ تعالیٰ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔ اس معنی کی تاکید اس بات سے ہوتی ہے کہ بعد میں فرمایا: ﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ﴾ اور ان لوگوں یعنی منافقین کی طرح نہ ہو جاؤ جو (ایمان لانے کے بعد) اللہ کو بھول گئے، بلکہ ہمیشہ اللہ سے ڈرتے رہو۔

آیت 19: ﴿۱۹﴾ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ...: ایمان والوں کو اللہ کے تقویٰ اور آخرت کی تیاری کے حکم کے بعد اس کے احکام سے بے توجہی اور غفلت سے منع فرمایا، کیونکہ اس کا نتیجہ فسق اور نافرمانی ہوتا ہے اور اس کے لیے یہ اسلوب اختیار فرمایا کہ انہیں ان لوگوں کی طرح ہو جانے سے منع فرمایا جنہوں نے اللہ کے احکام پر عمل کو ترک کر دیا، تاکہ ایسے لوگ اور ان کا انجام ان کے سامنے رہے اور وہ ان کے نقش قدم پر چپنے سے بچتے رہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے "حِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ" کے بعد "غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ" فرمایا ہے۔

رہی یہ بات کہ وہ کون لوگ ہیں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں: ﴿تَسُوا اللَّهَ﴾ کہ وہ اللہ کو بھول گئے، تو قرآن مجید میں یہ الفاظ منافقین کے متعلق آئے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿الْمُنَافِقُونَ وَالْمُنَافِقَاتُ بَعْضُهُمْ مِنْ بَعْضٍ مِرْيَافُونَ

لَا يَسْتَوِي أَصْحَابُ النَّارِ وَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۗ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ الْفَائِزُونَ ﴿۲۰﴾

آگ والے اور جنت والے برابر نہیں ہیں، جو جنت والے ہیں، وہی اصل کامیاب ہیں ﴿۲۰﴾

[التوبة: ۶۷] "منافق مرد اور منافق عورتیں، ان کے بعض بعض سے ہیں، وہ برائی کا حکم دیتے ہیں اور نیکی سے منع کرتے ہیں اور اپنے ہاتھ بند رکھتے ہیں۔ وہ اللہ کو بھول گئے تو اس نے انھیں بھلا دیا۔ یقیناً منافق لوگ ہی نافرمان ہیں۔" ان کے علاوہ یہود و نصاریٰ اور مشرکین کے متعلق بھی یہ الفاظ آئے ہیں۔ چنانچہ یہود کے متعلق فرمایا: ﴿يُحْزِنُونَ الْحُكَمَاءَ عَنْ مَوَاضِعِهِمْ وَ نَسُوا حَظًّا فَمَا ذُكِّرُوا بِهِ﴾ [المائدة: ۱۳] "وہ کام کو اس کی جگہوں سے پھیر دیتے ہیں اور وہ اس میں سے ایک حصہ بھول گئے جس کی انھیں نصیحت کی گئی تھی۔" اور نصاریٰ کے متعلق فرمایا: ﴿وَ مِنَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصْرَىٰ أَحَدِنَا بَيْنَنَا لَهُمْ فَنَسُوا حَظًّا فَمَا ذُكِّرُوا بِهِ﴾ [المائدة: ۱۴] "اور ان لوگوں سے جنھوں نے کہا بے شک ہم نصاریٰ ہیں، ہم نے ان کا بچتہ عبدلیہ، پھر وہ اس کا ایک حصہ بھول گئے جس کی انھیں نصیحت کی گئی تھی۔" اور مشرکین کے متعلق فرمایا: ﴿الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَهُمْ لَهْوًا وَ لَعِبًا وَ غَرَّتْهُمْ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ نَنصِفُهُمْ كَمَا نَسُوا لِقَاءَ يَوْمِهِمْ هَذَا﴾ [الأعراف: ۵۱] "وہ جنھوں نے اپنے دین کو دل لگی اور کھیل بنا لیا اور انھیں دنیا کی زندگی نے دھوکا دیا تو آج ہم انھیں بھلا دیں گے، جیسے وہ اپنے اس دن کی ملاقات کو بھول گئے۔" اس سورت میں چونکہ اس سے پہلے بنو نضیر کے یہود کا اور انھیں بدعہدی پر ابھارنے والے منافقین کا ذکر ہے، اس لیے بظاہر یہاں "كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ" سے یہی دونوں مراد ہیں، اگرچہ الفاظ کے عموم میں ہر کافر و منافق داخل ہے۔

﴿۲۰﴾ فَأَسْهَأُ أَنفُسَهُمْ ۗ أُولَٰئِكَ هُمُ الْفٰسِقُونَ : یعنی اللہ تعالیٰ کو بھلانے اور اس کی عبادت ترک کرنے کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے انھیں ان کی اپنی جانوں کی فکر بھی فراموش کروادی۔ چنانچہ وہ اپنے اچھے بُرے کی فکر سے بھی بے پروا ہو گئے، نہ دنیا میں اپنی جانوں کی بھلائی کا اہتمام کیا اور نہ ہی آخرت کے عذاب سے انھیں بچانے کی کوشش کی، اس بنا پر گناہوں اور نافرمانیوں میں پڑے رہے۔

﴿۳﴾ نسیان سے مراد یہاں اللہ کے احکام پر عمل ترک کرنا ہے۔ دیکھیے سورہ طہ (۱۱۵، ۱۲۶)۔

آیت 20 لَا يَسْتَوِي أَصْحَابُ النَّارِ وَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ : یہ اوپر کی آیات کا خلاصہ ہے کہ اللہ سے ڈرنے والے اور آخرت کی تیاری کرنے والے جنتی ہیں اور اسے بھولنے والے اور گناہ اور نافرمانی کی زندگی بسر کرنے والے جہنمی ہیں اور جہنمی اور جنتی دونوں برابر نہیں ہیں۔ مزید دیکھیے سورہ ص (۲۸)، عجمہ (۱۸) اور سورہ جاثیہ (۲۱) کی تفسیر۔ "أَصْحَابُ النَّارِ" سے مراد کفار ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا ۗ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۗ هُمْ فِيهَا خٰلِدُونَ﴾ [القدر: ۳۹] "اور جنھوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا یہ لوگ آگ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔" اور "أَصْحَابُ الْجَنَّةِ"

لَوْ أَنْزَلْنَا هَذَا الْقُرْآنَ عَلَى جَبَلٍ لَرَأَيْتَهُ خَاشِعًا مُتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللَّهِ ۗ وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ لِنَاسٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ﴿۲۱﴾ هُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۗ عِلْمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۗ هُوَ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ ﴿۲۲﴾

اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر اتارتے تو یقیناً تو اسے اللہ کے ڈر سے پست ہونے والا، کھڑے کھڑے ہونے والا دیکھتا اور یہ مثالیں ہیں، ہم انھیں لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں، تاکہ وہ غور و فکر کریں ﴿۲۱﴾ وہ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، ہر چھپی اور کھلی چیز کو جاننے والا ہے، وہی بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے ﴿۲۲﴾

سے مراد مومن ہیں۔ (دیکھیے احزاب: ۱۳، ۱۴) ”أَضْحَبُ النَّارِ“ اور ”أَضْحَبُ الْجَنَّةِ“ دونوں کا ایک ہی جگہ ذکر دیکھنے کے لیے دیکھیے سورہ بقرہ (۸۱، ۸۲)۔

آیت 21 ﴿۱﴾ لَوْ أَنْزَلْنَا هَذَا الْقُرْآنَ عَلَى جَبَلٍ..... : یعنی یہ یہود اور منافقین قرآن مجید کی آیات سننے کے باوجود اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتے، حالانکہ وہ تو ایسی عظیم الشان اور پُر تاثیر کتاب ہے کہ اگر ہم اسے کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو وہ بھی اللہ کے ڈر سے دب جاتا اور کھڑے کھڑے ہو جاتا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذَلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَابِ رَوَّيَةٌ أَوْ أَسْدٌ فَسُودًا﴾ [البقرہ: ۷۴] ”پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے تو وہ تمہارے جیسے ہیں یا سختی میں ان سے بھی بڑھ کر ہیں۔“ اس سے معلوم ہوا کہ پہاڑوں میں بھی اللہ تعالیٰ نے ادراک اور سوجھ بوجھ رکھی ہے۔ ان کے سامنے امانت پیش کی گئی، مگر وہ اس سے ڈر گئے اور انہوں نے اسے اٹھانے سے انکار کر دیا۔ (دیکھیے احزاب: ۷۲) پہاڑوں اور جمادات میں ادراک کے وجود کے لیے سورہ بقرہ (۷۳)، بنی اسرائیل (۴۳)، نحل (۳۹، ۴۸) اور سورہ ص (۱۸) کی تفاسیر پر نظر ڈال لیں۔

﴿۲﴾ وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ لِنَاسٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ... : یعنی ہم یہ مثالیں لوگوں کے سامنے اس لیے بیان کرتے ہیں کہ وہ غور و فکر کریں کہ ایسی زبردست تاثیر والی چیز بھی ان کے دلوں پر اثر انداز نہیں ہو رہی تو اس کا سبب کیا ہے، پھر اس سبب کو دور کرنے کی کوشش کریں۔

آیت 22 ﴿۱﴾ هُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ : اس سورت میں اللہ تعالیٰ کے نام اور اس کی صفیروں اور صفات کا ذکر چالیس (۴۰) مرتبہ آیا ہے، چوبیس (۴۴) بار لفظ ”اللَّهُ“ کے ساتھ اور سولہ (۱۶) مرتبہ ضمیر ظاہر یا صفات عالیہ کے ساتھ۔ غرض پوری سورت ہی اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت اور اس کے عجیب و غریب تصرفات کے ذکر سے بھری ہوئی ہے، اس لیے اس کی ابتدا اللہ تعالیٰ کی تسبیح اور اس کی صفات عزیز و حکیم کے ساتھ ہوئی ہے اور اختتام بھی اس کی ایسی صفات کے ساتھ ہوا ہے جن کے ذکر سے ایمان والوں کے دلوں میں اس کی خشیت و محبت میں اضافہ ہو اور سرکشوں کو اس کی گرفت اور ہیبت و جلال سے خوف دلایا جائے۔ ساتھ ہی ان صفات میں توحید کے حق ہونے اور شرک کے باطل ہونے کے دلائل بھی موجود ہیں۔ اس کے علاوہ ہر صفت کا سورت میں مذکور واقعات و مضامین میں سے کسی نہ کسی کے ساتھ تعلق بھی ہے۔ (ابن عاشور، طلحہ)

هُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْمَلِكُ الْقُدُّوسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيَّبُ الْعَزِيزُ الْجَبَّارُ

وہ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، بادشاہ ہے، نہایت پاک، سلامتی والا، امن دینے والا، نگہبان، سب پر

② هُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ : اللہ تعالیٰ کی صفات میں سب سے پہلے اس کے ”الہ واحد“ ہونے کی صفت بیان فرمائی،

کیونکہ یہ دوسری تمام صفات کی اصل ہے۔ دوسری تمام صفات اس صفت کی دلیل ہیں کہ عبادت اس اکیلے کا حق ہے، اس لیے قرآن مجید میں اسم مبارک ”اللہ“ کے بعد اکثر اس صفت کا ذکر آتا ہے، جیسا کہ آیت الکرسی میں اور سورہ آل عمران کے شروع میں فرمایا:

﴿اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ﴾ ”اللہ (وہ ہے کہ) اس کے سوا کوئی معبود نہیں، زندہ ہے، ہر چیز کو قائم رکھنے والا ہے۔“

③ عِلْمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ : ”الْغَيْبِ“ اور ”الشَّهَادَةِ“ مصدر ہیں جو اسم فاعل کے معنی میں ہیں، یعنی غائب و شاہد۔

مبالغے کے لیے اسم فاعل کی جگہ مصدر کا لفظ استعمال کیا گیا، جیسا کہ ”زَيْدٌ عَادِلٌ“ کے بجائے مبالغے کے لیے ”زَيْدٌ عَدْلٌ“ کہہ دیتے ہیں کہ زید سراپا عدل ہے۔ ”الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ“ پر الف لام استغراق کا ہے، یعنی وہ ہر غائب و حاضر کو جاننے والا ہے۔ وحدانیت کے بعد دوسری صفت علم بیان فرمائی، کیونکہ معبود ہونے کا لازمی تقاضا ہے کہ وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہو اور اس کا علم

کامل ہو۔ وہ معبود کیسا جسے معلوم ہی نہیں کہ کوئی میری عبادت کر رہا ہے۔ (دیکھیے احقاف: ۶، ۵) ”الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ“ دوسروں کے اعتبار سے فرمایا، ورنہ اللہ تعالیٰ سے تو کوئی چیز غائب نہیں۔ اگر کوئی کہے کہ ”عالم الغیب“ تو واقعی صرف اللہ تعالیٰ ہے مگر ”عالم الشہادت“ تو اور لوگ بھی ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہر ”الشہادت“ کا علم بھی اس کے سوا کسی کے پاس نہیں، چند چیزیں جاننے والے کو ”عالم الشہادت“ نہیں کہا جاسکتا۔ مزید دیکھیے سورہ رعد (۱۰، ۹) اور سورہ اعلیٰ (۷) کی تفسیر۔

④ هُوَ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ : اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ فاتحہ کی تفسیر۔

بیت 23 ① هُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ : مزید صفات کے بیان کے لیے یہ جملہ دوبارہ ذکر فرمایا۔ تکرار سے

مقصود اللہ تعالیٰ کے اسم مبارک ”اللہ“ کی عظمت اور اس کی وحدانیت کا خاص اہتمام ہے۔

② الْمَلِكُ : یہ دوسری خبر ہے، اس پر الف لام کا مطلب یہ ہے کہ بادشاہ وہی ہے، کوئی اور نہیں، کیونکہ دوسرا کوئی اگر بادشاہ ہے تو چند لوگوں کا ہے، سب کا نہیں اور کچھ وقت کے لیے ہے، ہمیشہ کے لیے نہیں، جب کہ اللہ تعالیٰ سب کا بادشاہ اور ہمیشہ کے لیے بادشاہ ہے، جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے۔

سروری زبیا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے حکمران ہے اک وہی باقی بتان آزری

مزید دیکھیے سورہ ملک کی پہلی آیت کی تفسیر۔ قرآن مجید میں اکیلے اللہ تعالیٰ کی بادشاہی کا ذکر متعدد مقامات پر ہے، دیکھیے

سورہ روم (۲۶)، حدید (۵)، فرقان (۲)، لیس (۸۳) اور آل عمران (۲۶)۔

③ الْقُدُّوسُ : نہایت پاک۔ ”الْمَلِكُ“ کے بعد ”الْقُدُّوسُ“ لانے میں ایک مناسبت یہ ہے کہ بادشاہ ہونے کے باوجود وہ

دنیا کے حکمرانوں میں پائے جانے والے عیوب اور خامیوں سے بالکل پاک ہے۔

الْمُتَكَبِّرُ ۚ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۳۷﴾

غالب، اپنی مرضی چلانے والا، بے حد بڑائی والا ہے، پاک ہے اللہ اس سے جو وہ شریک ٹھہراتے ہیں ﴿۳۷﴾

۴ التَّلْمُ : سراسر سلامتی ہے، یعنی سلامتی والا ہے۔ خود ہر آفت اور مصیبت سے سالم ہے اور سب کو سلامتی دینے والا اور محفوظ رکھنے والا ہے، دوسرے صاحبِ قوت لوگوں کی طرح ناحق تباہی و بربادی پھیلانے والا نہیں۔ ایک دعائیں یہ الفاظ ہیں:

«اللَّهُمَّ أَنْتَ السَّلَامُ وَ مِنْكَ السَّلَامُ» [مسلم، المساجد، باب استحباب الذکر بعد الصلاة و بیان صفتہ : ۵۹۲]
 ”اے اللہ! تو ہی سراسر سلامتی والا ہے اور تجھی سے سلامتی ملتی ہے۔“

۵ الْمُؤْمِنُ : امن دینے والا۔ جسے بھی امن ملتا ہے اسی سے ملتا ہے۔

۶ الْمُفِينُ : نگران، نگہبان۔ تیسیر القرآن میں ہے: ”الْمُفِينُ“ کہتے ہیں: ”هَيَمَنَ الطَّائِرُ عَلَى فِرَاحِهِ“ یعنی پرندے نے اپنے پر اپنے بچوں پر بچھا دیے، جیسے مرغی خطرے کے وقت اپنے چوزوں کو اپنے پروں کے نیچے چھپالیتی ہے۔ لہذا ”الْمُفِينُ“ وہ ذات ہے جو ① کسی کو خوف سے امن دے، ② ہر وقت نگہبانی رکھے اور ③ کسی کا کوئی حق ضائع نہ ہونے دے۔ (شمسی الارب)

۷ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ : ”الْجَبَّارُ“ اپنی مرضی منوانے والا، جو دوسرے کو اپنا کام کرنے پر مجبور کر دے۔ اللہ تعالیٰ ساری مخلوق پر جبار ہے، کیونکہ ان میں سے کسی کی جرأت نہیں کہ وہ اس سے جو کر دانا چاہے وہ نہ کرے، جیسا کہ فرمایا: ﴿كُنَّ اسْتَوٰى اِلٰى السَّمَآءِ وَ هِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَ لِالْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا قَالَتَا لَا اَتَيْنَا طٰلِعِيْنَ﴾ [ختم السجدة : ۱۱] ”پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ ایک دھواں تھا تو اس نے اس سے اور زمین سے کہا کہ آؤ خوشی سے یا مجبوری سے۔ دونوں نے کہا ہم خوشی سے آگئے۔“ کوئی اس حد سے تجاوز نہیں کر سکتا جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے مقرر کر دی ہے، جیسا کہ انسان ایک ٹانگ تو اٹھا کر کھڑا ہو سکتا ہے مگر دونوں نہیں۔ جبر کا ایک معنی ٹوٹی ہوئی ہڈی جوڑنا اور نقصان پورا کرنا بھی ہے، یعنی وہی ہے جو ہر ایک کا نقصان پورا کرنے والا ہے۔

۸ الْمُتَكَبِّرُ : اس کے دو مفہوم ہیں، ایک یہ کہ کوئی شخص فی الحقیقت بڑا نہ ہو مگر بڑا بننے کی کوشش کرے، خواہ وہ کوئی جن ہو یا انسان اور یہ صفت انتہائی مذموم ہے۔ دوسرا وہ جو فی الحقیقت بڑا ہو اور بڑا ہی ہو کر رہے اور یہ صفت صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے سزاوار ہے اور اس کے حق میں یہ ایک خوبی ہے جو دوسری کسی مخلوق میں نہیں پائی جاتی۔ کائنات کی باقی تمام چیزیں خواہ جان دار ہوں یا بے جان اس کے مقابلے میں چھوٹی اور حقیر ہیں۔ (تیسیر القرآن)

۹ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ : یعنی یہ صفات دلیل ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان تمام چیزوں سے پاک ہے جنہیں مشرکین نے اس کا شریک بنا رکھا ہے۔

هُوَ اللَّهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ ۗ يُسَبِّحُ لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۗ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿۲۴﴾

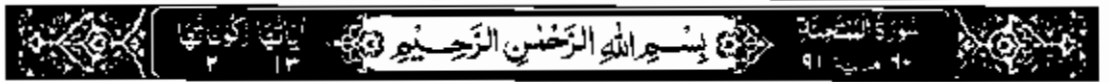
وہ اللہ ہی ہے جو خاکہ بنانے والا، گھڑنے ڈھالنے والا، صورت بنانے والا ہے، سب اچھے نام اسی کے ہیں، اس کی تسبیح ہر وہ چیز کرتی ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے اور وہی سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ﴿۲۴﴾

آیت 24 : ﴿۱﴾ هُوَ اللَّهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ: "خلق، برہ اور تصویر" پیدائش کے تین مراحل ہیں، پہلا مرحلہ یہ کہ کوئی چیز بنانے سے پہلے اس کا پورا اندازہ لگانا اور نقشہ و خاکہ بنانا ہوتا ہے، یہ مطلق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا پہلے ہی ایک اندازہ اور نقشہ طے کر دیا ہے کہ وہ کیسی ہوگی، مثلاً انسان کی کیا شکل ہوگی، درخت کیسا ہوگا وغیرہ۔ دوسرا مرحلہ ان چیزوں کو وجود میں لانا ہے جن سے اسے بنایا جانا ہے اور انہیں تراش تراش اور ڈھال کر وہ صورت قبول کرنے کے قابل بنانا جو اس کے لیے طے کی گئی ہے۔ یہ "برہ" ہے۔ مثلاً انسان کو مٹی سے بنایا، مٹی کو گارا بنایا، پھر آدم علیہ السلام کا ڈھانچہ بنایا۔ تیسرا اور آخری مرحلہ تصویر ہے جس کے ساتھ کوئی چیز مکمل ہو کر وجود میں آ جاتی ہے۔ کائنات کی ہر بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی چیز کو اللہ تعالیٰ نے تصویر عطا فرمائی ہے، زمین و آسمان ہوں یا چبوتی اور ڈرہ، ہر چیز کو پیدا کرنے کے تمام مراحل اسی کے ہاتھ میں ہیں، انسان اگر کچھ بنانا بھی ہے تو اس کے ہر کام کا خالق بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ﴾ [النصافات: ۹۶] "اور اللہ ہی نے تمہیں پیدا کیا اور اسے بھی جو تم کرتے ہو۔" ان تینوں اسماء میں سے ہر ایک مطلق بنانے اور پیدا کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ مزید دیکھیے سورہ اعراف (۱۱) کی تفسیر۔

﴿۲﴾ لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ: یعنی ان آیات میں جو اسماء اور صفات بیان ہوئی ہیں اللہ تعالیٰ صرف انہی کے ساتھ متصف نہیں، بلکہ بہترین اسم و صفت کا وہی مستحق ہے۔ دیکھیے سورہ اعراف (۱۸۰) کی تفسیر۔

﴿۳﴾ يُسَبِّحُ لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۗ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ: سورت کی ابتدا بھی اسی بات سے ہوئی ہے اور انتہا بھی۔ ابتدا میں "سَبَّحَ لِلَّهِ" ہے اور انتہا میں "يُسَبِّحُ لَهُ" ہے۔ اس میں ماضی، حال اور مستقبل تینوں زمانے آگئے۔ آیت کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ حدید کی پہلی آیت اور سورہ بنی اسرائیل (۲۳) کی تفسیر۔

﴿۴﴾ معقل بن یسار رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جو شخص صبح کے وقت تین مرتبہ "أَعُوذُ بِاللَّهِ السَّمِيعِ الْعَلِيمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ" کہے، پھر سورہ حشر کی آخری تین آیتیں پڑھے، تو اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ستر ہزار (۷۰۰۰۰) فرشتے مقرر کر دیتے ہیں جو شام تک اس کے لیے دعا کرتے رہتے ہیں۔ اگر وہ اس دن فوت ہو جائے تو شہید فوت ہوگا اور جو شام کو انہیں پڑھ لے اسے بھی یہ مرتبہ ملے گا۔" [ترمذی، فضائل القرآن، باب فی فضل قرأۃ آخر سورہ الحشر: ۲۹۲۲۔ مسند احمد: ۲۶۷۵، ج: ۲۰۳، ۶۔ مسند احمد کے محققین اور شیخ ناصر الدین البانی نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ تفصیل مسند احمد کی تحقیق میں ملاحظہ فرمائیں۔



اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

سورہ حشر میں منافقین کی کفار اہل کتاب کے ساتھ دوستی اور اس کے برے انجام کا بیان تھا، اس سورت میں مشرکین کے ساتھ دوستی سے منع فرمایا، خصوصاً ان مہاجرین کو جن کے بیوی بچے یا عزیز مکہ میں رہ گئے تھے اور وہ اس خیال سے مشرکین سے تعلق قائم رکھنا چاہتے تھے کہ مشرکین اس وجہ سے ان کے بیوی بچوں اور عزیزوں کا خیال رکھیں گے۔

۶ ہجری میں حدیبیہ کے مقام پر رسول اللہ ﷺ اور کفار قریش کے درمیان دس سال کے لیے صلح کا جو معاہدہ ہوا اس کی ایک شق یہ تھی کہ جو قبائل چاہیں رسول اللہ ﷺ کے حلیف بن جائیں اور جو چاہیں کفار قریش کے حلیف بن جائیں اور کوئی فریق دوسرے فریق کے حلیف پر نہ حملہ کرے اور نہ حملہ کرنے والوں کی مدد کرے۔ چنانچہ مکہ کے قریب رہنے والے قبائل میں سے بنو بکر قریش کے حلیف بن گئے اور بنو خزاعہ رسول اللہ ﷺ کے حلیف بن گئے۔ ابھی معاہدے کو تقریباً ڈیڑھ سال ہی گزرا تھا کہ بنو بکر نے مسلمانوں کے حلیف بنو خزاعہ پر حملہ کر دیا۔ قریش نے آدمیوں اور اسلحہ سے ان کی مدد کی، وہ بھاگ کر حرم میں آئے تو انھوں نے وہاں بھی انھیں نہیں چھوڑا بلکہ قتل کر دیا۔ بنو خزاعہ کا ایک وفد فریاد لے کر رسول اللہ ﷺ کے پاس مدینہ پہنچا۔ یہ قریش کی صریح عہد شکنی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے انھیں سزا دینے اور مکہ پر حملہ کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا اور اس کے لیے خفیہ طور پر تیاری شروع کر دی۔ مقصد یہ تھا کہ اچانک حملے میں کفار مزاحمت نہیں کر سکیں گے اور کشت و خون کی نوبت نہیں آئے گی۔ مسلمانوں کی قیمتی جانیں بھی محفوظ رہیں گی اور کفار میں سے جن کی قسمت میں سعادت لکھی ہوگی مسلمان ہو سکیں گے اور آگے چل کر اسلام کی سر بلندی میں حصہ لے سکیں گے۔ حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہما ایک مہاجر صیہبی تھے اور بدری تھے، مکہ میں ان کی اولاد اور مال اسباب تھا۔ وہ اصلاً قریش میں سے نہیں تھے، بلکہ ان کے حلیف تھے۔ انھوں نے قریش کو رسول اللہ ﷺ کے ارادے کی اطلاع دینے کے لیے ان کی طرف ایک خط لکھا اور ایک عورت کے ہاتھ بھیج دیا۔

صحیح بخاری میں اس کی تفصیل آئی ہے، چنانچہ علی رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ مجھے، زبیر اور مقداد کو رسول اللہ ﷺ نے بھیجا کہ تم چلتے جاؤ یہاں تک روضہ خاخ (خاخ نامی باغ) تک جا پہنچو، وہاں اونٹنی پر سوار ایک عورت ہوگی، اس سے خط لے آؤ۔ چنانچہ ہم گھوڑے دوڑاتے ہوئے روانہ ہو گئے، یہاں تک کہ ہم اس باغ کے پاس جا پہنچے۔ دیکھا تو اونٹنی پر سوار وہ عورت وہاں تھی، ہم نے اس سے کہا: ”خط نکال۔“ اس نے کہا: ”میرے پاس کوئی خط نہیں۔“ ہم نے کہا: ”تم ہر صورت خط نکالو گی یا ہم تمہارے کپڑے اتاریں گے۔“ چنانچہ اس نے وہ خط اپنی چوٹی سے نکال کے دے دیا۔ ہم اسے لے کر رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے۔ دیکھا تو اس میں لکھا تھا کہ یہ خط حاطب بن ابی بلتعہ کی طرف سے مکہ کے کچھ لوگوں کے نام ہے، جو مشرکین میں سے تھے۔ اس میں انھوں نے انھیں رسول اللہ ﷺ کے بعض امور کی خبر دی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((یا حاطب! ما هذا؟)) ”حاطب! یہ کیا ہے؟“ انھوں نے کہا: ”یا رسول اللہ! مجھ پر جلدی نہ کریں، میں ایسا آدمی تھا جو قریش کے ساتھ جڑا

يَأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ تُلْقُونَ إِلَيْهِم بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوا بِهَا جَاءَكُمْ مِنَ الْحَقِّ يُخْرِجُونَ الرَّسُولَ وَإِيَّاكُمْ أَنْ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ رَبِّكُمْ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! میرے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو دوست مت بناؤ، تم ان کی طرف دوستی کا پیغام بھیجتے ہو، حالانکہ یقیناً انھوں نے اس حق سے انکار کیا جو تمہارے پاس آیا ہے، وہ رسول کو اور خود تمہیں اس لیے نکالتے ہیں کہ تم اللہ پر ایمان لائے ہو، جو تمہارا رب ہے، اگر تم میرے راستے میں جہاد کے لیے اور میری رضا تلاش کرنے

ہو، ان کا حلیف تھا، اصلاً ان میں سے نہیں تھا اور آپ کے ساتھ جو مہاجرین ہیں ان کی وہاں کئی قرابتیں ہیں، جن کے ذریعے سے وہ اپنے اہل و عیال اور اموال کی حفاظت رکھتے ہیں۔ تو میں نے چاہا کہ جب میرا ان سے کوئی نسبی رشتہ نہیں تو میں ان پر ایک احسان کر دوں جس کی وجہ سے وہ میرے گھر والوں کی حفاظت رکھیں۔ میں نے یہ کام نہ اپنے دین سے مرتد ہونے کی وجہ سے کیا ہے اور نہ ہی اسلام لانے کے بعد کفر کو پسند کرنے کی وجہ سے کیا ہے۔“ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «أَمَّا إِنَّهُ قَدْ صَدَقَكُمْ» «سن لو! اس نے یقیناً تم سے سچ کہا ہے۔“ عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: «اے اللہ کے رسول! مجھے اجازت دیں، میں اس منافق کی گردن اڑا دوں۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّهُ قَدْ شَهِدَ بَدْرًا وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّ اللَّهَ أَطَّلَعَ عَلَيَّ مَنْ شَهِدَ بَدْرًا قَالَ أَعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ فَقَدْ غَفَرْتُ لَكُمْ» «یہ تو بدر میں شریک ہوا ہے اور تجھے کیا معلوم شاید اللہ نے بدر میں شریک ہونے والوں کو جھانک کر کہا ہو کہ تم جو چاہو کرو، کیونکہ میں نے تمہیں بخش دیا ہے۔“ تو اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمادی:

﴿يَأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ..... فَقَدْ صَلَ سَوَاءَ السَّبِيلِ﴾ «اے لوگو جو ایمان لائے ہو! میرے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو دوست مت بناؤ..... تو یقیناً وہ سیدھے راستے سے بھٹک گیا۔“ [بخاری، المغازی، باب

غزوة الفتح : ۴۲۷۴]

آیت ۱ ﴿يَأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ: “عَدُوٌّ” “عَدَا يَعْدُو عَدَاوَةٌ” سے “فَعُولٌ” بمعنی “فَاعِلٌ” کے وزن پر ہے، دشمن۔ “فَعِيلٌ” اور “فَعُولٌ” دونوں صیغے واحد، مشنہ، جمع اور مذکر مؤنث کے لیے ایک ہی لفظ کے ساتھ آجاتے ہیں، اس لیے ترجمہ “میرے دشمنوں” کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ کہنے کے بجائے کہ کفار اور مشرکین کو دوست نہ بناؤ، یہ فرمایا کہ میرے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔ پھر “عَدُوِّي” (میرے دشمنوں) کا ذکر پہلے کیا اور “عَدُوَّكُمْ” (اپنے دشمنوں) کا ذکر بعد میں کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کافر و مشرک کبھی مسلمانوں کے دوست نہیں ہو سکتے، کیونکہ ان کی دشمنی کی بنیاد نہ وطن ہے نہ نسب اور نہ مال، بلکہ انھوں نے مسلمانوں کی دشمنی صرف اللہ تعالیٰ کی دشمنی کی وجہ سے اختیار کر رکھی ہے۔ اللہ کی دشمنی کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کی توحید، اس کے دین اور اس کے رسول کو نہیں مانتے، اس لیے انھوں نے ان کی شدید مخالفت اور دشمنی اختیار کر رکھی ہے۔ “عَدُوِّي” کو “عَدُوَّكُمْ” سے پہلے لانے کی مناسبت یہی معلوم ہوتی ہے کہ وہ اللہ کے دین کے دشمن پہلے ہیں، پھر اس کی وجہ سے وہ مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ آیت میں

إِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِي سَبِيلِي وَابْتِغَاءَ مَرْضَاتِي ۖ تُسِرُّونَ إِلَيْهِم بِالْمَوَدَّةِ ۗ
وَإِنَّا أَعْلَمُ بِمَا أَخْفَيْتُمْ وَمَا أَعْلَنْتُمْ ۗ وَمَنْ يَفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ ①

کے لیے نکلے ہو۔ تم ان کی طرف چھا کر دوستی کے پیغام بھیجتے ہو، حالانکہ میں زیادہ جاننے والا ہوں جو کچھ تم نے چھپایا اور جو تم نے ظاہر کیا اور تم میں سے جو کوئی ایسا کرے تو یقیناً وہ سیدھے راستے سے بھٹک گیا ①

کفار و مشرکین کی عداوت کا حوالہ دے کر مسلمانوں کو ان کی دوستی سے منع فرمایا گیا ہے۔ قرآن مجید میں کئی مقامات پر کفار کی دوستی سے منع کیا گیا ہے اور ساتھ ہی دوستی سے ممانعت کی کوئی نہ کوئی وجہ بیان کی گئی ہے۔ دیکھیے سورہ آل عمران (۲۸)، نساء (۱۳۴)، مائدہ (۵۱، ۵۲) اور سورہ توبہ (۲۳، ۲۴) ان تمام وجوہات میں بنیادی بات یہی ہے کہ وہ تمہارے اور تمہارے دین کے دشمن ہیں، جب تک تم کافر نہ ہو جاؤ وہ کبھی تمہارے دوست نہیں ہو سکتے۔ دیکھیے سورہ بقرہ (۱۲۰) اور سورہ نساء (۸۹)۔

② تُلْفُونَ إِلَيْهِم بِالْمَوَدَّةِ: اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ ”الْمَوَدَّةُ“ ”تُلْفُونَ“ کا مفعول بہ ہے اور اس پر ”باء“ تاکید کے لیے آئی ہے، اس صورت میں معنی یہ ہے کہ تم ان کی طرف دوستی کا پیغام بھیجتے ہو۔ دوسرا معنی یہ کہ ”تُلْفُونَ“ کا مفعول بہ محذوف ہے: ”أَيُّ تُلْفُونَ إِلَيْهِمُ الْأَخْبَارَ بِالْمَوَدَّةِ“ ”یعنی تم دوستی کی وجہ سے ان کی طرف خبریں پہنچاتے ہو (جن کا اللہ کے دشمنوں اور تمہارے دشمنوں کو کسی صورت علم نہیں ہونا چاہیے)۔“

③ وَقَدْ كَفَرُوا بِمَا جَاءَكُمْ مِنَ الْحَقِّ: یعنی انہوں نے تو وہ حق ماننے ہی سے انکار کر دیا ہے جو تمہارے پاس آیا ہے اور تم ہو کہ ان کی طرف دوستی کے پیغام بھیجتے ہو۔

④ يُخْرِجُونَ الزُّمُورَ وَإِنَّا كُنَّا أَن تُوْمِنُوا بِاللَّهِ رَبِّكُمْ: ”أَنْ تُوْمِنُوا بِاللَّهِ رَبِّكُمْ“ سے پہلے لام محذوف ہے، یعنی انہوں نے صرف کفر اور معمولی دشمنی ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ رشتہ داری اور محبت کے تمام سلسلے قطع کر کے رسول کو اور تمہیں اتنی ایذا دی کہ تم سب کو مکہ سے نکلنے پر مجبور کر دیا، صرف اس وجہ سے کہ تم اپنے رب پر ایمان رکھتے ہو۔ اس جملے کی ہم معنی آیات کے لیے دیکھیے سورہ بروج (۸) اور سورہ حج (۴۰) ”يُخْرِجُونَ“ مضارع کا صیغہ لانے کا مطلب یہ ہے کہ نہ صرف یہ کہ انہوں نے تمہیں نکالا ہے بلکہ وہ تمہیں نکالنے پر ابھی تک قائم ہیں اور اب بھی تمہیں تمہارے گھروں میں واپس نہیں آنے دے رہے۔ اس میں مسلمانوں کو کفار کی دشمنی کے لیے ابھارا گیا ہے کہ کس قدر تعجب کی بات ہے کہ وہ تمہارے رسول کو اور تمہیں نکال رہے ہیں اور تم ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا رہے ہو۔

⑤ إِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِي سَبِيلِي: ”جِهَادًا“ اور ”ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِي“ دونوں ”خَرَجْتُمْ“ کے مفعول لا ہیں اور ”إِنْ كُنْتُمْ“ شرط کی جزا محذوف ہے جو آیت کے پہلے جملے ”لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ“ سے معلوم ہو رہی ہے، یعنی اگر تم میرے راستے میں جہاد کے لیے اور میری رضا تلاش کرنے کے لیے نکلے ہو تو میرے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو دوست مت بناؤ۔

إِنْ يَشْفِقُوكُمْ يَكُونُوا لَكُمْ أَعْدَاءً وَيَبْسُطُوا إِلَيْكُمْ أَيْدِيَهُمْ وَأَلْسِنَتَهُم بِالسُّوءِ
وَوَدَّوْا لَوْ تَكْفُرُونَ ﴿۱﴾

اگر وہ تمہیں پائیں تو تمہارے دشمن ہوں گے اور اپنے ہاتھ اور اپنی زبانیں تمہاری طرف برائی کے ساتھ بڑھائیں
گے اور پسند کریں گے کہ تم کفر کرو ﴿۱﴾

﴿۱﴾ تَسْرُونَ إِلَيْهِم بِالْمَوَدَّةِ.....: یعنی تم پر تعجب ہے کہ تم چھپ کر ان کی طرف دوستی کے پیغام بھیجتے ہو، حالانکہ میں ان باتوں
کو جو تم نے چھپائیں اور جو ظاہر کیں تم سے اور ہر ایک سے بڑھ کر جاننے والا ہوں۔ سو تمہیں یہ سوچ کر بھی ایسی حرکت سے اجتناب
کرنا چاہیے کہ تمہارا مالک تمہارے ہر کام سے پوری طرح آگاہ ہے اور تم اپنی کوئی حرکت اس سے کسی طرح بھی نہیں چھپا سکتے۔

﴿۲﴾ وَمَنْ يَفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ النَّهْلِ: یعنی یہ صرف حاطب بن علیؓ یا کسی مہاجر کی مشرکین مکہ کے ساتھ دوستی کا
معاملہ نہیں، بلکہ قیامت تک آنے والے مسلمانوں میں سے جو بھی یہ کام کرے گا وہ یقیناً سیدھے راستے سے بھٹک گیا۔

﴿۳﴾ اس آیت سے مخلصین پر اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمت کا اظہار بھی ہو رہا ہے کہ اتنی بڑی غلطی کرنے والوں کو ”يَأْتِيهَا الَّذِينَ
أَهْتُوا“ کے ساتھ خطاب ہو رہا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی معصیت اور گناہ کی وجہ سے آدمی کافر نہیں ہوتا، اس لیے
رسول اللہ ﷺ نے حاطب بن علیؓ کی غلطی سے درگزر فرمایا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی آدمی کے معاملات میں اس کی سابقہ زندگی کو
بھی مد نظر رکھا جائے گا۔

آیت ۲ ﴿۱﴾ إِنْ يَشْفِقُوكُمْ يَكُونُوا لَكُمْ أَعْدَاءً.....: اس میں کچھلی آیت کے آخری جملے کی وجہ بیان فرمائی ہے، یعنی تم
میں سے جو شخص اس توقع پر کفار و مشرکین سے دوستی رکھے اور ان کی طرف خفیہ پیغام بھیجے کہ وہ مشکل وقت میں اس کے کام
آئیں گے یا اس کے اہل و عیال کا خیال رکھیں گے، تو وہ سیدھے راستے سے بھٹک کر غلط راستے پر چل پڑا ہے، کیونکہ ان کافروں کے
دلوں میں تمہارے لیے اس قدر بغض و عناد ہے کہ وہ تمہیں زندہ دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے، کسے صرف اتنی ہے کہ ان کا بس نہیں چل
رہا اور تم ان کے قابو میں نہیں آ رہے۔ اگر کسی وقت ان کا بس چل جائے اور تم ان کے قابو میں آ جاؤ تو وہ پہلے کی طرح تمہارے
دشمن ہی ہوں گے اور اپنے ہاتھ اور اپنی زبانیں برائی کے ساتھ تمہاری طرف بڑھائیں گے، تم پر دست درازی اور زبان درازی
میں کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿كَيْفَ وَإِنْ يَظْهَرُوا عَلَيْكُمْ لَا يَرْجُبُوا فِيكُمْ إِلَّا وَاذِمَةً﴾ [النوبة: ۸] |
”مشرکین کے کسی عہد کا اعتبار، کیسے ہو سکتا ہے جبکہ وہ اگر تم پر غالب آ جائیں تو تمہارے بارے میں نہ کسی قربت کا لحاظ
کریں گے اور نہ کسی عہد کا۔“

﴿۲﴾ وَوَدَّوْا لَوْ تَكْفُرُونَ: ”لو“ مصدر یہ ہے: ”أَنَّى وَوَدَّوْا كُفْرًا“ یعنی ان کی خواہش یہی ہوگی کہ تم کافر ہو جاؤ، اس کے
بغیر وہ تم سے کسی طرح بھی راضی نہیں ہوں گے۔ مزید دیکھیے سورۃ بقرہ (۱۰۹، ۱۲۰) اور سورۃ نساء (۸۹)۔

لَنْ تَنْفَعَكُمْ أَرْحَامُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿۳﴾ قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ ۗ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَءُؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّى تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحَدَهُ ۗ إِلَّا قَوْلَ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ لَا اسْتَفْعِرَنَّ لَكَ

قیامت کے دن ہرگز نہ تمہاری رشتہ داریاں تمہیں فائدہ دیں گی اور نہ تمہاری اولاد، وہ تمہارے درمیان فیصلہ کرے گا اور اللہ اسے جو تم کرتے ہو خوب دیکھنے والا ہے ﴿۳﴾ یقیناً تمہارے لیے ابراہیم اور ان لوگوں میں جو اس کے ساتھ تھے ایک اچھا نمونہ تھا، جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ بے شک ہم تم سے اور ان تمام چیزوں سے بری ہیں جنہیں تم اللہ کے سوا پوجتے ہو، ہم تمہیں نہیں مانتے اور ہمارے درمیان اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لیے دشمنی اور بغض ظاہر ہو گیا، یہاں تک کہ تم اس اکیلے اللہ پر ایمان لاؤ، مگر ابراہیم کا اپنے باپ سے کہنا (تمہارے لیے نمونہ نہیں) کہ بے شک میں تیرے لیے بخشش کی دعا ضرور کروں گا اور میں تیرے لیے اللہ سے کسی چیز (کے دلوانے) کا مالک نہیں

آیت 3 ﴿۱﴾ لَنْ تَنْفَعَكُمْ أَرْحَامُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ "أَرْحَامُ" کی جمع ہے، رشتہ داری۔ مراد "ذُؤُوا الْأَرْحَامَ" ہے، رشتہ دار۔ یعنی وہ رشتہ دار اور اولاد جن کی خاطر تم اتنے بڑے گناہ کا ارتکاب کر رہے ہو قیامت کے دن وہ تمہیں ہرگز کوئی فائدہ نہیں دیں گے کہ تمہیں اس گناہ کی سزا سے یہ کہہ کر بچالیں کہ انہوں نے ہماری خاطر یہ غلطی کی تھی۔

﴿۲﴾ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ : اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ تمہارے درمیان فیصلہ کرے گا۔ دوسرا یہ کہ وہ قیامت کے دن تمہارے درمیان اور تمہارے ارحام و اولاد کے درمیان جدائی ڈال دے گا، کسی کو کسی کا ہوش نہ ہوگا، جیسا کہ فرمایا: ﴿يَوْمَ يَفْزُ الْمَرْءُ مِنْ أَحْيِيهِ ۗ وَأُفْوٰهُ وَآبِيهِ ۗ وَصَاحِبَتِيهِ وَبَنِيهِ ۗ لِكُلِّ فِرَاقٍ مِّنْهُمُ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ﴾ [عبس : ۳۴ تا ۳۷] "جس دن آدمی اپنے بھائی سے بھاگے گا۔ اور اپنی ماں اور اپنے باپ (سے)۔ اور اپنی بیوی اور اپنے بیٹوں سے۔ اس دن ان میں سے ہر شخص کی ایک ایسی حالت ہوگی جو اسے (دوسروں سے) بے پروا بنا دے گی۔" کچھلی آیت میں ان لوگوں کا حال بتایا جن سے دوستی کی جارہی ہے اور اس آیت میں ان لوگوں کا حال بیان کیا جن کی خاطر کفار سے دوستی کی جارہی ہے۔

﴿۳﴾ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ : اس میں فرماں برداروں کے لیے وعدہ اور نافرمانوں کے لیے وعید ہے۔

آیت 4 ﴿۱﴾ قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ : "أُسْوَةٌ" اور "قَدْؤَةٌ" کے معنی ہیں جس کی پیروی کی جائے، نمونہ (اچھا ہو یا برا)، اس لیے ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو اسوۂ حسنہ فرمایا۔ یعنی اللہ کے دشمن کفار و مشرکین کے ساتھ دوستی کے سلسلے میں تمہارے لیے ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں میں پہلے سے ایک اچھا نمونہ موجود تھا جو کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

وَمَا أَمَلِكُ لَكَ مِنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ ۖ رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَإِلَيْكَ أَنبَأْنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ ﴿۵﴾

ہوں، اے ہمارے رب! ہم نے تجھی پر بھروسا کیا اور تیری ہی طرف رجوع کیا اور تیری ہی طرف لوٹ کر آتا ہے ﴿۵﴾

تمہارے پیش نظر رہنا چاہیے تھا۔ ”وَالَّذِينَ مَعَهُ“ سے مراد ان پر ایمان لانے والے ساتھی ہیں۔

﴿۲﴾ إِذْ قَالُوا لَقَوْمِهِمْ إِذَا بَرَأُوا مِنْكُمْ ”بَرَأُوا“ ”بَرِيءٌ“ کی جمع ہے، جیسے ”سُكْرِيْمٌ“ کی جمع ”سُكْرَمَاءُ“ ہے۔ یعنی ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھی تمہارے لیے اس بات میں نمونہ ہیں کہ انہوں نے اپنی مشرک قوم سے، ان کے شرک سے اور ان کے معبودوں سے بری اور لا تعلق ہونے کا اعلان کر دیا۔ ”وَمِمَّا تَعْبُدُونَ“ میں ”مما“ مصدر یہ بھی ہو سکتا ہے اور موصولہ بھی۔

﴿۳﴾ كَفَرْنَا بِكُمْ : ہم تمہیں نہیں مانتے، نہ تمہارے دین کو، نہ تمہارے خداؤں کو اور نہ ان کی عبادت کو۔

﴿۴﴾ وَبَدَأَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ أَبَدًا یعنی ہمارے اللہ پر ایمان لانے اور تمہارے کفر پر قائم رہنے کے بعد ہمارے اور تمہارے درمیان کھلی دشمنی اور دل بغض ہمیشہ کے لیے ظاہر ہو گیا ہے، یہاں تک کہ تم اکیلے اللہ پر ایمان لے آؤ۔

﴿۵﴾ إِلَّا قَوْلَ إِبْرَاهِيمَ لِأَبْنَيْهِ لَا اسْتَغْفِرَنَّ لَكَ : یعنی ابراہیم علیہ السلام کی پوری زندگی تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے، سوائے اس بات کے جو ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے کہی کہ میں تمہارے لیے بخشش کی دعا ضرور کروں گا۔ اس بات میں وہ تمہارے لیے نمونہ نہیں ہیں اور نہ ہی اس میں ان کی بیروی جائز ہے۔ مشرکین کے لیے استغفار کی ممانعت اور ابراہیم علیہ السلام کے استغفار کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ توبہ کی آیات (۱۱۳، ۱۱۴) کی تفسیر۔

﴿۶﴾ وَ مَا أَمَلِكُ لَكَ مِنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ : یعنی میں تمہارے لیے استغفار ضرور کروں گا، مگر میں تمہارے لیے اللہ تعالیٰ سے کسی چیز کے دلوانے کا مالک نہیں، وہ چاہے گا تو تمہیں بخش دے گا، نہیں تو عذاب دے گا۔ معلوم ہوا کہ یہ اختیار پیغمبروں کے پاس بھی نہیں کہ وہ جسے چاہیں بخشوائیں، خواہ وہ ابراہیم علیہ السلام کے والد ہوں یا نوح علیہ السلام کا بیٹا یا ہمارے نبی ﷺ کے چچا ابو طالب ہوں۔

﴿۷﴾ رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا : یہ ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کا کلام ہے جو ”إِلَّا قَوْلَ إِبْرَاهِيمَ لِأَبْنَيْهِ ...“ سے پہلے کلام کے ساتھ ملا ہوا ہے اور ان چیزوں میں شامل ہے جن میں ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی بیروی کا حکم ہے۔ گویا ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں نے اپنی قوم سے یہ کہا: ﴿إِنَّا بَرَأْنَا مِنْكُمْ حَتَّى تَوَدُّوا مَا يَدْعُوهُ وَخَدَّاهُ﴾ اور اپنے رب سے یہ کہا: ﴿رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ یہ دونوں باتیں کہنے میں وہ ہمارے لیے نمونہ ہیں اور ہمیں ان کی بیروی کا حکم ہے۔

﴿۸﴾ وَإِلَيْكَ أَنبَأْنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ : ”أَنبَأْنَا“ ”أَنْبَأَ يُبَيِّنُ إِنَابَةً“ (افعال) سے جمع متکلم ماضی معلوم کا صیغہ ہے۔ ”الْمَصِيرُ“ ”ضار نصير“ سے مصدر ماضی ہے۔ ”عَلَيْكَ“ اور ”إِلَيْكَ“ پہلے آنے سے قصر کا مفہوم حاصل ہو رہا ہے کہ اے ہمارے رب! ہم نے تجھی پر بھروسا کیا، کسی اور پر نہیں اور تیری ہی طرف رجوع کیا، کسی اور کی طرف نہیں، (تو نے ہی سب کو پیدا کیا) اور (آخر کار) تیری ہی طرف واپس آتا ہے۔

رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِلَّذِينَ كَفَرُوا وَاعْفِرْ لَنَا رَبَّنَا إِنَّكَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿۵﴾
 لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيهِمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَكُن
 يَتَوَاتَرًا فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ الْعَفِيفُ الْحَيُّدُ ﴿۶﴾ عَسَى اللَّهُ أَنْ يَجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِينَ
 عَادَيْتُمْ مَوَدَّةً ۖ وَاللَّهُ قَدِيرٌ ۖ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۷﴾

اے ہمارے رب! ہمیں ان لوگوں کے لیے آزمائش نہ بنا جنہوں نے کفر کیا اور ہمیں بخش دے اے ہمارے رب!
 یقیناً تو ہی سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ﴿۵﴾ بلاشبہ یقیناً تمہارے لیے ان میں اچھا نمونہ تھا، اس شخص کے لیے
 جو اللہ اور یوم آخرت کی امید رکھتا ہے اور جو کوئی منہ پھیرے تو یقیناً اللہ ہی وہ ذات ہے جو بے پروا ہے، تمام
 تعریفوں کے لائق ہے ﴿۶﴾ قریب ہے کہ اللہ تمہارے درمیان اور ان لوگوں کے درمیان جن سے تم ان میں سے
 دشمنی رکھتے ہو، دوستی پیدا کر دے اور اللہ بہت قدرت رکھنے والا ہے اور اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۷﴾

آیت ۵ : ﴿۱﴾ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِلَّذِينَ كَفَرُوا: اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ یونس (۸۵) کی تفسیر۔

﴿۲﴾ وَاعْفِرْ لَنَا رَبَّنَا.....: پہلی تمام دعائیں حریف عطف کے بغیر ہیں اور یہ واؤ عطف کے ساتھ ہے، کیونکہ یہی تمام
 دعاؤں میں دنیوی زندگی میں اپنے دین کی اصلاح اور اس پر استقامت مانگی گئی ہے اور اس میں اخروی زندگی کی اصلاح کی
 درخواست ہے۔ دونوں کے درمیان مغایرت کی وجہ سے درمیان میں واؤ عطف لائی گئی ہے۔ (ابن عاشور)

آیت ۵ : ﴿۱﴾ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيهِمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ.....: اس سے پہلے "قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي آلِ إِبْرَاهِيمَ"

میں یہی بات ذکر ہوئی ہے، لام قسم کے ساتھ اسے دوبارہ لانے سے ایک تو اس حکم کی تاکید مقصود ہے اور ایک اس کے بعد
 "لَمَن كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ" بلا کر یہ بتانا مقصود ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھی ان لوگوں کے لیے نمونہ نہیں جن
 کی ساری جدوجہد دنیا کے لیے ہے، بلکہ وہ صرف ان لوگوں کے لیے نمونہ ہیں جو اللہ اور یوم آخرت کی امید رکھتے ہیں۔

﴿۲﴾ لَمَن كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ: اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ احزاب (۴۱) کی تفسیر۔

﴿۳﴾ وَتَن يَتَوَاتَرًا فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ الْعَفِيفُ الْحَيُّدُ: یعنی جو اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت کی امید سے منہ موڑتا ہے تو اللہ تعالیٰ کو بھی
 اس کی کوئی پروا نہیں، کیونکہ وہ تو غنی و حمید ہے اور غنی و حمید بھی ایسا کہ اس کے سوا کوئی غنی و حمید ہے ہی نہیں۔ مزید دیکھیے
 سورہ فاطر (۱۵)، حج (۶۳) اور سورہ حدید (۲۳) کی تفسیر۔

آیت ۷ : ﴿۱﴾ عَسَى اللَّهُ أَنْ يَجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِينَ عَادَيْتُمْ مَوَدَّةً: اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان کے

مشرک رشتہ داروں سے قطع تعلق کا جو حکم دیا اس کے مطابق اپنے عزیزوں سے نانا توڑنا اگرچہ نہایت مشکل کام تھا مگر انہوں
 نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کی اور کسی قرابت کی پروا نہیں کی، اللہ تعالیٰ نے ان کے صدق و اخلاص کو دیکھ کر اس آیت کے ساتھ
 کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

لَا يَنْهَكُمُ اللَّهُ عَنِ الدِّينِ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَ لَمْ يُخْرِجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ
 أَنْ تَبْزُوهُمْ وَ تَقْسِطُوا إِلَيْهِمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ﴿۸﴾

اللہ تمہیں ان لوگوں سے منع نہیں کرتا جنہوں نے نہ تم سے دین کے بارے میں جنگ کی اور نہ تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا کہ تم ان سے نیک سلوک کرو اور ان کے حق میں انصاف کرو، یقیناً اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے ﴿۸﴾

ان کی دلجوئی فرمائی اور انہیں بشارت دی کہ قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے درمیان اور ان لوگوں کے درمیان جن کے ساتھ دین کی وجہ سے تمہاری دشمنی ہے دوستی پیدا کر دے، تمہارے یہ عزیز مسلمان ہو جائیں اور دشمنی پھر محبت میں بدل جائے۔

﴿۲﴾ وَاللَّهُ قَدِيرٌ: بظاہر یہ ممکن نظر نہیں آتا تھا کہ جن لوگوں نے مسلمانوں کو مکہ سے نکالا، مدینہ میں بھی چھین نہ لینے دیا، بدر و احد، خندق اور دوسرے معرکے برپا کیے وہ دوبارہ دوست بن جائیں گے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے، اس کے لیے دلوں کو پھیر دینا کچھ مشکل نہیں۔ چنانچہ ان آیات کے نزول کے بعد تھوڑی مدت ہی گزری تھی کہ مکہ فتح ہو گیا، قریش اور دوسرے قبائل فوج در فوج اسلام میں داخل ہونے لگے اور سوائے ان کفار کے جو قتل ہو گئے تھے، آخر کار سب مسلمان ہو گئے، حتیٰ کہ جزیرہ عرب میں کوئی مشرک باقی نہ رہا۔ ابوسفیان اور دوسرے قریشی سردار جو مسلمانوں کے خلاف لڑتے آئے تھے، اب اسلام کی سر بلندی کے لیے سر بکف ہو کر لڑنے لگے۔

﴿۳﴾ وَاللَّهُ عَفْوٌ رَحِيمٌ: یعنی مشرکین نے اب تک اہل ایمان سے جو عداوت رکھی اللہ تعالیٰ اپنی مغفرت و رحمت کی وجہ سے اس سے درگزر فرما کر انہیں ایمان لانے اور مسلمانوں کے دوست بن جانے کی توفیق عطا فرماتے والا ہے۔

آیت 8 : ﴿۱﴾ لَا يَنْهَكُمُ اللَّهُ عَنِ الدِّينِ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ : اس آیت میں اور اس کے بعد والی آیت میں اللہ تعالیٰ نے کفار کو دو گروہوں میں تقسیم فرمایا ہے۔ ایک محارب جو مسلمانوں سے ضد اور عناد رکھتے تھے، انہیں ایذا دینے، ان کے گھروں سے نکالنے اور ان سے لڑنے میں سرگرم تھے، یا ایسے لوگوں کی پشت پناہی اور مدد کرتے تھے۔ دوسرے مسالم جو کافر تو تھے مگر روادار تھے، غیر جانبدار بن کر رہے، مسلمانوں کو نہ کوئی دکھ پہنچایا اور نہ ان کے خلاف کسی کارروائی میں حصہ لیا۔ ان میں مکہ کے ارد گرد رہنے والے کئی قبائل تھے، جیسے بنو خزاعہ اور بنو حارث وغیرہ جو مسلمانوں کے حلیف تھے یا کفار قریش کے مقابلے میں مسلمانوں سے ہمدردی رکھتے تھے۔ اہل مکہ میں بھی اس طرح کے کئی لوگ تھے، خصوصاً بنو ہاشم اور بنو مطلب کے اکثر لوگوں کی ہمدردیاں مسلمانوں کے ساتھ تھیں۔ مہاجرین کی بہت سی رشتہ دار عورتیں اور بچے جو مکہ میں تھے اور ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے مگر ان سے انس اور تعلق رکھتے تھے۔ مسلمانوں کی دلی خواہش ایسے لوگوں سے تعلق رکھنے کی تھی، اللہ تعالیٰ نے اس کی اجازت دے دی اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ایسے لوگوں سے نیک سلوک اور ان کے حق میں انصاف کرنے سے منع نہیں کرتا۔

اسماء بنت ابی بکرؓ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میری ماں نبی ﷺ کے زمانے میں (معاہدہ صبح کے دوران حسن سلوک کی) امید

إِنَّمَا يَنْهَكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ قَتَلُواكُمْ فِي الدِّينِ وَأَخْرَجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ وَظَهَرُوا
عَلَىٰ إِخْرَاجِكُمْ أَنْ تَوْلَوْهُمْ، وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿٩﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ
آمَنُوا إِذَا جَاءَكُمُ الْمُؤْمِنَاتُ مُهَاجِرَاتٍ فَأَمْتَحِنُوهُنَّ ۗ اللَّهُ أَعْلَمُ بِإِيمَانِهِنَّ ۗ وَإِنْ عَلِمْتُمُوهُنَّ
مُؤْمِنَاتٍ فَلَا تَرْجِعُوهُنَّ إِلَى الْكُفَّارِ ۚ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ ۗ وَآتُوهُم

اللہ تو تمہیں انہی لوگوں سے منع کرتا ہے جنہوں نے تم سے دین کے بارے میں جنگ کی اور تمہیں تمہارے گھروں
سے نکالا اور تمہارے نکالنے میں ایک دوسرے کی مدد کی کہ تم ان سے دوستی کرو۔ اور جو ان سے دوستی کرے گا تو وہی
لوگ ظالم ہیں ﴿۹﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تمہارے پاس مومن عورتیں ہجرت کر کے آئیں تو ان کی
جانچ پڑتال کرو، اللہ ان کے ایمان کو زیادہ جاننے والا ہے۔ پھر اگر تم جان لو کہ وہ مومن ہیں تو انہیں کفار کی طرف واپس
نہ کرو، نہ یہ عورتیں ان کے لیے حلال ہیں اور نہ وہ (کافر) ان کے لیے حلال ہوں گے۔ اور انہیں دے دو جو انہوں

رکھتے ہوئے میرے پاس آئی، میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: ”کیا میں اس سے حسن سلوک کروں؟“ آپ ﷺ نے فرمایا:
”ہاں!“ ابن عیینہ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں یہ آیت نازل فرمائی: ﴿لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الدّٰنِیْنَ لَمَّا
یُعٰتَبَتُوْكُمْ فِی الدِّیْنِ﴾“ اللہ تمہیں ان لوگوں سے منع نہیں کرتا جنہوں نے تم سے دین کے بارے میں جنگ نہیں کی۔“
[بخاری، الأدب، باب صلة الوالد المشرك : ۵۹۷۸] اسی طرح ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے عمر رضی اللہ عنہما کو ایک ریشمی حلہ عطا
فرمایا، انہوں نے وہ اپنے ایک مشرک بھائی کو دے دیا جو مکہ میں رہتا تھا۔ [بخاری، الأدب، باب صلة الأخ المشرك : ۵۹۸۱]
آیت ۹ إِنَّمَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الدّٰنِیْنَ قَتَلُوْكُمْ فِی الدِّیْنِ : ان لوگوں سے مراد وہ کفار ہیں جن کا تذکرہ شروع
سورت سے آ رہا ہے۔

آیت ۱۰ ﴿۱۰﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا جَاءَكُمُ الْمُؤْمِنَاتُ مُهَاجِرَاتٍ : ان آیات میں مشرکین سے قطع تعلق کی وجہ
سے پیش آنے والے کئی معاملات کا حکم بیان فرمایا، مثلاً کفار کی بیویاں جو مسلمان ہو کر ہجرت کر کے مسلمانوں کے پاس
آ جائیں، انہیں واپس کیا جائے گا یا نہیں اور میاں بیوی میں سے کسی ایک کے مسلمان ہو جانے سے ان کا باہمی نکاح باقی رہتا
ہے یا نہیں وغیرہ۔

﴿۲﴾ حدیبیہ کے موقع پر کفار کے نمائندے سمیل بن عمرو نے صلح کی جو شرائط طے کی تھیں ان میں سے ایک شرط جو مسلمانوں کو
منظور نہ تھی مگر سمیل نے اس کے بغیر صلح کرنے سے انکار کر دیا، یہ تھی: ﴿لَا يَأْتِيكَ مِنَّا أَحَدٌ وَ إِن كَانَ عَلَىٰ دِينِكَ إِلَّا
رَدَدْتَهُ إِلَيْنَا وَ حَلَّيْتَ بَيْنَنَا وَ بَيْنَهُ﴾ [بخاری، المغازی، باب غزوة الحديبية : ۴۱۸۰، ۴۱۸۱] ”ہم میں سے جو بھی آپ
کے پاس آئے گا خواہ وہ آپ کے دین پر ہو، آپ اسے ہماری طرف واپس کریں گے اور ہمارے اور اس کے درمیان کوئی دخل

فَا أَنْفَقُوا ۖ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ أَنْ تَنْكِحُوهُنَّ إِذَا آتَيْتُمُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ ۚ وَلَا تُمْسِكُوا

نے خرچ کیا ہے اور تم پر کوئی گناہ نہیں کہ ان سے نکاح کر لو، جب انھیں ان کے مہر دے دو۔ اور کافر عورتوں کی

نہیں دیں گے۔“ اللہ تعالیٰ کا عجیب تصرف دیکھیے کہ سہیل اس میں یہ صراحت نہ لکھوا سکا کہ اس میں عورتیں بھی شامل ہیں۔ صحیح بخاری کی ایک روایت میں ہے: «فَقَالَ سَهَيْلٌ وَ عَلِيٌّ أَنَّهُ لَا يَأْتِيكَ مِنَّا رَجُلٌ وَإِنْ كَانَ عَلَىٰ دِينِكَ إِلَّا رَدَدْتَهُ إِلَيْنَا» [بخاری، الشروط، باب الشروط في الجهاد و المصالحة : ۲۷۳۱، ۲۷۳۲] ”سہیل نے کہا، یہ شرط بھی کہ ہماری طرف سے جو آدمی بھی آپ کے پاس جائے گا، چاہے وہ آپ کے دین ہی پر کیوں نہ ہو، آپ اسے ہمیں واپس کر دیں گے۔“ اب اس کے بعد کفار یہ کہہ ہی نہیں سکتے تھے کہ آپ مسلمان ہونے والی عورتوں کو واپس کیوں نہیں کرتے۔ جب معاہدہ طے ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ نے تمام صحابہ کو قربانی کرنے اور سرمنڈوانے کے ساتھ احرام کھولنے کا حکم دے دیا۔ اس موقع پر سہیل کا بیٹا ابو جندل رضی اللہ عنہ مسلمان ہو کر آیا تو رسول اللہ ﷺ نے اس کے باپ کے مطالبے پر اسے واپس کر دیا، اس کے علاوہ بھی صلح کی اس مدت میں آپ کے پاس مکہ سے جو مرد آیا آپ نے اسے واپس کر دیا خواہ وہ مسلمان ہی تھا۔ اب کئی عورتیں جو ایمان لے آئی تھیں ہجرت کر کے مدینہ پہنچیں، ان میں ام کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط بھی تھیں۔ اس وقت وہ جوان تھیں، ان کے گھر والے رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور انھیں واپس کر دینے کا مطالبہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے ہدایات نازل فرمائیں۔ [بخاری، المغازی، باب غزوة الحديبية : ۴۱۸۰، ۴۱۸۱]

③ فَأَمَّتْ جُنُوهُنَّ ۚ اللَّهُ أَعْلَمُ بِإِيمَانِهِنَّ : ایمان والوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ جب مومن عورتیں ہجرت کر کے تمہارے پاس آئیں تو ان کی جانچ پڑتال کرو کہ وہ ایمان ہی کی وجہ سے ہجرت کر کے آئی ہیں یا کوئی اور وجہ ہے۔ اس جانچ پڑتال میں تم اس بات کے مکلف نہیں کہ ان کے دل میں چھپی ہوئی بات معلوم کرو، یہ اللہ تعالیٰ کا کام ہے، تمہارا کام یہ ہے کہ اگر وہ ان باتوں کا عہد کریں جو اگلی آیت (۱۲) میں آ رہی ہیں تو انھیں کفار کی طرف واپس مت کرو۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہجرت کر کے آنے والے کسی مرد کے امتحان کا حکم نہیں دیا، کیونکہ ان کے امتحان کے لیے ہجرت اور جہاد کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام مہاجرین کے صادق الایمان ہونے کی شہادت دی ہے۔ (دیکھیے حشر: ۸) جب کہ عورتوں پر جہاد فرض نہیں جس سے کھرے کھوٹے کی تیز ہوتی ہے۔ (شقیطی)

④ لَاهُنَّ جُنٌّ نَهْمٌ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ : اس میں انھیں واپس نہ کرنے کی علت بیان فرمائی ہے کہ نہ مومن عورتیں کفار کے لیے حلال ہیں اور نہ ہی کافر مرد مومن عورتوں کے لیے حلال ہیں، اس لیے اگر کوئی عورت مسلمان ہو جائے تو اسے اس کے کافر خاوند سے جدا کر لیا جائے گا۔ پھر اگر وہ اپنے خاوند کے مسلمان ہونے کا انتظار کرے اور خاوند مسلمان ہو جائے تو نکاح برقرار رہے گا، خواہ عورت پہلے ہجرت کر کے آئی ہو اور خاوند بعد میں ہجرت کرے، جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، انھوں نے فرمایا: «رَدَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ابْنَتَهُ زَيْنَبَ عَلَيَّ أَبِي الْعَاصِ بْنِ الرَّبِيعِ، بَعْدَ سِتِّ سِنِينَ

بِعَصْمِ الْكُوفِرِ وَسَأَلُوا مَا أَنْفَقْتُمْ وَلَيْسَلُوا مَا أَنْفَقُوا ۖ ذَلِكُمْ حُكْمُ اللَّهِ يَحْكُمُ
بَيْنَكُمْ ۖ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿۱۰﴾

عصمتیں روک کر نہ رکھو اور تم مانگ لو جو تم نے خرچ کیا ہے اور وہ (کفار) مانگ لیں جو انہوں نے خرچ کیا ہے۔ یہ اللہ کا فیصلہ ہے، وہ تمہارے درمیان فیصلہ کرتا ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے ﴿۱۰﴾

بِالنِّكَاحِ الْأَوَّلِ وَلَمْ يُحَدِّثْ نِكَاحًا» [ترمذی، النکاح، باب ما جاء في الزوجين المشرکین یسلم أحدهما: ۱۱۴۳، وقال الألبانی صحیح] ”رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیٹی زینب رضی اللہ عنہا کو ابوالعاص بن ربیع رضی اللہ عنہ کے ساتھ چھ سال کے بعد پہلے نکاح ہی میں واپس بھیج دیا اور نیا نکاح نہیں کیا۔“ اور اگر عورت اپنے خاوند کے مسلمان ہونے کا انتظار نہ کرے تو اسے اجازت ہے کہ کسی مسلمان کے ساتھ نکاح کر لے، جیسا کہ آگے آ رہا ہے۔

﴿۵﴾ وَأَتَوْهُمَا أَنْفَقُوا: یعنی ہجرت کر کے آنے والی مسلم عورتوں کے مشرک خاوندوں نے ان کے نکاح پر جو خرچ کیا ہے وہ انہیں واپس کر دو۔ یاد رہے کہ یہ احکام ان مشرکین کی عورتوں کے بارے میں ہیں جن کی مسلمانوں کے ساتھ صلح ہو۔

﴿۶﴾ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ أَنْ تَنْكِحُوهُنَّ إِذَا آتَيْتُمُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ: یعنی اگر وہ اپنے خاوندوں کے مسلمان ہو کر آنے کا انتظار نہ کریں اور نکاح کرنا چاہیں تو مسلمانوں کو ان سے نکاح کرنے کی اجازت ہے، جب ان شرطوں کو ملحوظ رکھا جائے جو نکاح کے لیے ضروری ہیں، مثلاً ولی کی اجازت، عدت پوری ہونا، مہر کی ادائیگی وغیرہ۔

﴿۷﴾ وَلَا تُنْسَلُوا بِعَصْمِ الْكُوفِرِ: ”عِصْمٌ“ ”عِصْمَةٌ“ کی جمع ہے، مراد نکاح ہے اور ”الْكُوفِرِ“ ”كُوفِرَةٌ“ کی جمع ہے، جیسے ”ضَارِبَةٌ“ کی جمع ”ضَوَارِبٌ“ ہے، کافر عورتیں۔ یعنی جو مرد مسلمان ہو جائیں اور ان کی بیویاں کفر پر قائم رہیں ان کے لیے انہیں اپنے نکاح میں باقی رکھنا جائز نہیں، بلکہ طلاق دے دینا لازم ہے۔ چنانچہ مسور اور مروان بن حکم سے مروی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے حدیبیہ کے دن کفار قریش سے معاہدہ کیا تو آپ کے پاس کچھ مومن عورتیں آئیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا جَاءَكُمْ الْمُؤْمِنَاتُ مُهَاجِرَاتٍ..... وَلَا تُنْسَلُوا بِعَصْمِ الْكُوفِرِ﴾

[المتحنة: ۱۰] ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تمہارے پاس مومن عورتیں ہجرت کر کے آئیں..... اور کافر عورتوں کی عصمتیں روک کر نہ رکھو۔“ تو عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اس دن اپنی دو (مشرک) عورتوں کو طلاق دے دی، جن میں سے ایک کے ساتھ معاویہ بن ابوسفیان نے اور دوسری کے ساتھ صفوان بن امیہ نے نکاح کر لیا (جو اس وقت شرک پر تھے)۔ [بخاری، الشروط، باب الشروط في الجهاد.....: ۲۷۳۱، ۲۷۳۲] ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ قریبہ بنت ابی امیہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھی، انہوں نے اسے طلاق دے دی تو اس سے معاویہ بن ابوسفیان نے نکاح کر لیا اور ام حکم بنت ابوسفیان عیاض بن غنم فہری کے نکاح میں تھی، انہوں نے اسے طلاق دے دی تو اس سے عبداللہ بن عثمان ثقفی نے نکاح کر لیا۔ [بخاری،

وَإِنْ فَاتَكُمْ شَيْءٌ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ إِلَى الْكُفَّارِ فَعَاقِبْتُمْ فَاتُوا الَّذِينَ ذَهَبَتْ أَزْوَاجُهُمْ
مِثْلَ مَا أَنْفَقُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي أَنْتُمْ بِهِ مُؤْمِنُونَ ⑩

اور اگر تمہاری بیویوں میں سے کوئی کافروں کی طرف چلی جائے، پھر تم بدلا حاصل کرو تو جن لوگوں کی بیویاں چلی گئی ہیں انہیں اتنا دے دو جتنا انہوں نے خرچ کیا ہے اور اللہ سے ڈرو جس پر تم ایمان رکھنے والے ہو ⑩

⑩ وَسَلُّوْا مَا أَنْفَقْتُمْ وَلْيَسَلُّوْا مَا أَنْفَقُوْا..... اس کا عطف ”وَآتُوهُمْ مَّا أَنْفَقُوا“ پر ہے۔ ہجرت کر کے آنے والی عورتیں یا تو ان مشرکین میں سے ہوتی تھیں جن کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی جنگ تھی، ان کے متعلق عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ”مشرکین کا تعلق رسول اللہ ﷺ اور مومنوں سے دو طرح کا تھا، ایک اہل حرب (لڑائی والے) مشرک، آپ ﷺ ان سے لڑتے اور وہ آپ ﷺ سے لڑتے تھے اور ایک اہل عہد (معاہدے والے) مشرک۔ اہل حرب مشرکین میں سے کوئی عورت جب ہجرت کر کے آتی تو اسے اس وقت تک نکاح کا پیغام نہیں دیا جاتا تھا جب تک وہ حیض آنے کے بعد پاک نہیں ہوتی تھی۔ جب پاک ہو جاتی تو اس کے لیے نکاح حلال ہو جاتا، پھر اگر اس کا خاوند اس کے نکاح کرنے سے پہلے ہجرت کر کے آ جاتا تو وہ اسے واپس کر دی جاتی اور اگر ان کا کوئی غلام یا لونڈی ہجرت کر کے آتے تو دونوں آزاد ہو جاتے اور انہیں وہ حقوق حاصل ہو جاتے جو دوسرے مہاجرین کو حاصل تھے۔ (پھر معاہدے والوں کے متعلق مجاہد کی حدیث کی طرح ذکر کیا) اور اگر معاہدے والے مشرکین کا کوئی غلام یا لونڈی ہجرت کر کے آتے تو انہیں واپس نہیں کیا جاتا تھا اور ان کی قیمتیں دے دی جاتی تھیں۔“ [بخاری المغازی، باب نکاح من المسلم من المشركات وعتدن: ۵۲۸۶]

ہجرت کر کے آنے والی مسلمان عورتوں کی دوسری قسم ان مشرکین کی بیویاں تھیں جن کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا معاہدہ صلح تھا۔ اس آیت میں ان کا حکم بیان ہوا ہے کہ انہیں مشرکین کی طرف واپس مت کرو، بلکہ انہوں نے ان کے نکاح پر جو کچھ خرچ کیا ہے وہ انہیں دے دو اور کافر عورتوں کو بھی روک کر مت رکھو، بلکہ انہیں طلاق دے دو اور چونکہ تمہاری آپس میں صلح ہے اس لیے جن مشرک عورتوں کو تم نے چھوڑا ہے ان پر کیا ہوا خرچ تم مشرکین سے مانگ لو اور وہ ان عورتوں پر کیا ہوا خرچ تم سے مانگ لیں جو ہجرت کر کے تمہارے پاس آئی ہیں۔

آیت 11 وَإِنْ فَاتَكُمْ شَيْءٌ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ إِلَى الْكُفَّارِ..... یعنی اگر کافران عورتوں کا مہر مسلمانوں کو واپس نہ کریں جو کافر ہو کر یا کافر رہ کر دارالاسلام سے کفار کے ہاں چلن جائیں تو مسلمانوں کو چاہیے کہ کافروں کا جو مال لوٹیں اس میں سے ان مسلمان شوہروں کا خرچ ادا کریں جن کی بیویاں دارالکفر کو بھاگ جائیں، یا دارالکفر سے جو عورتیں مسلمان ہو کر دارالاسلام میں آجائیں ان کے مہر کافروں کو واپس کرنے کے بجائے ان مسلمان شوہروں کو ادا کریں جن کی بیویاں دارالکفر کو بھاگ جائیں۔ ”فَعَاقِبْتُمْ“ (پھر تم بدلا حاصل کرو) کے مفہوم میں دونوں چیزیں شامل ہیں، یعنی لڑائی میں مال غنیمت حاصل کرنا یا مقابلہ میں ان کی عورتوں کا مہر ادا کرنا۔ ابن کثیر لکھتے ہیں، اس ”فَعَاقِبْتُمْ“ کے مفہوم میں وسعت ہے، اگر کفار کا مہر ادا کرنا

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعْنَكَ عَلَىٰ أَنْ لَا يُشْرِكْنَ بِاللَّهِ شَيْئًا وَلَا يَسْرِقْنَ وَلَا

اے نبی! جب تیرے پاس مومن عورتیں آئیں، تجھ سے بیعت کرتی ہوں کہ وہ نہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک باقی ہو تو مسلمانوں کو وہ دے دیا جائے، ورنہ مال غنیمت سے اس کے نقصان کی تلافی کر دی جائے۔ ابن جریر نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ (اشرف الحواشی)

آیت 12 ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعْنَكَ : عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ جو مومن عورتیں آپ ﷺ کی طرف ہجرت کر کے آئیں آپ ان کا امتحان اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے ساتھ لیتے تھے: ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعْنَكَ عَفْوُ ذَمِّ جَنِيمٍ﴾ تو ان مومن عورتوں میں سے جو اس شرط کا اقرار کر لیتی رسول اللہ ﷺ سے فرماتے: ﴿قَدْ بَايَعْتِكِ﴾ ”میں نے تم سے بیعت لے لی۔“ صرف کلام کے ساتھ اور اللہ کی قسم! آپ ﷺ کے ہاتھ نے بیعت لیتے وقت کسی عورت کے ہاتھ کو نہیں چھوا، آپ ان سے صرف ان الفاظ کے ساتھ بیعت لیتے تھے: ﴿قَدْ بَايَعْتِكِ عَلَىٰ ذَلِكَ﴾ [بخاری، التفسیر، سورة المتحنۃ، باب: ﴿إِذَا جَاءَكُمُ الْمُؤْمِنَاتُ مِهَاجِرَاتٍ﴾ : ۴۸۹۱] ”میں نے ان باتوں پر تم سے بیعت لے لی۔“

امیرہ بنت زینب رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں چند عورتوں کے ہمراہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آپ سے بیعت کرنے کے لیے آئی، تو آپ ﷺ نے ہم سے قرآن کی اس آیت کے مطابق بیعت لی: ﴿عَلَىٰ أَنْ لَا يُشْرِكْنَ بِاللَّهِ شَيْئًا﴾ اور فرمایا: ﴿فِيمَا اسْتَطَعْنَ وَأَطَقْنَ﴾ ”جتنی تم استطاعت اور طاقت رکھو۔“ ہم نے کہا: ”اللہ اور اس کا رسول ہم سے زیادہ ہم پر رحم کرنے والے ہیں۔“ ہم نے کہا: ”یا رسول اللہ! کیا آپ ہم سے مصافحہ نہیں کرتے؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿إِنِّي لَا أَصَافِحُ النِّسَاءَ إِنَّمَا قَوْلِي لِمَرْأَةٍ وَاحِدَةٍ كَقَوْلِي لِمِائَةِ امْرَأَةٍ﴾ [مسند احمد : ۳۵۷/۶، ح : ۲۷۰۰۹۔ ترمذی، السیر، باب ما جاء في بيعة النساء : ۱۵۹۷، و صححه الترمذی والألبانی] ”میں عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتا، میری بات ایک عورت سے اسی طرح ہے جیسے ایک سو عورتوں سے ہو۔“

﴿جب رسول اللہ ﷺ نے بیعت جیسے اہم موقع پر کسی عورت سے مصافحہ نہیں کیا تو کسی اور کے لیے غیر محرم عورت سے مصافحہ کیسے جائز ہو سکتا ہے؟ کفار کی تقلید میں غیر محرم عورتوں سے مصافحہ کا رواج اور تقدس کے پردے میں بیروں کا اجنبی عورتوں سے مصافحہ دونوں حرام ہیں، کیونکہ نیت کے ظلل کے ساتھ وہ زنا کا پیش خیمہ ہو سکتے ہیں اور سد ذرائع (گناہ کے ذریعوں سے روکنا) شریعت کا مسلم اصول ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿فَالْعَيْنَانِ زَنَاهُمَا النَّظَرُ وَالْأُذُنَانِ زَنَاهُمَا الْإِسْتِمَاعُ وَاللِّسَانُ زَنَاهُ الْكَلَامُ وَالْيَدُ زَنَاهَا الْبَطْشُ وَالرَّجُلُ زَنَاهَا الْحُطَا وَالْقَلْبُ يَهْوِي وَيَمْتَشِي وَيُصَدِّقُ ذَلِكَ الْفَرْجُ وَيُكْذِبُهُ﴾ [مسلم، القدر، باب قدر علی ابن آدم حظه من الزنى وغيره : ۲۶۵۷/۲۱] ”پس آنکھیں، ان کا زنا دیکھنا ہے اور کان، ان کا زنا توجہ سے سنا ہے اور زبان، اس کا زنا کلام ہے اور ہاتھ، اس کا زنا پکڑنا ہے اور پاؤں، اس کا

يَزِينَنَ وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَأْتِينَ بِبُهْتَانٍ يَفْتَرِينَهُ بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ

مظہرائیں گی اور نہ چوری کریں گی اور نہ زنا کریں گی اور نہ اپنی اولاد کو قتل کریں گی اور نہ کوئی بہتان لائیں گی جو اپنے ہاتھوں اور اپنے پاؤں کے درمیان گھڑ رہی ہوں اور نہ کسی نیک کام میں تیری نافرمانی کریں گی تو ان سے بیعت لے زنا چلنا ہے اور دل خواہش کرتا ہے اور تمنا کرتا ہے اور شرم گاہ اس کی تصدیق کر دیتی ہے یا اس کی تکذیب کر دیتی ہے۔“

③ جاہلی معاشرے میں اللہ کے ساتھ شرک، چوری، زنا، قتل اولاد اور بہتان کا رواج عام تھا، اس لیے ان کا خاص طور پر ذکر کر کے ان سے منع فرمایا، جیسا کہ وفد عبدالقیس کو خاص طور پر ان برتنوں کے استعمال سے بھی منع فرمایا جن میں شراب بنائی جاتی تھی، کیونکہ وہ مسلمان ہو چکے تھے مگر ابھی تک ان میں شراب نوشی کا رواج باقی تھا۔ رہی دوسری منع کردہ چیزیں یا وہ چیزیں جن پر عمل کا حکم دیا ہے، تو وہ سب ”وَلَا يَعْصِيَنَّكَ فِي مَعْرُوفٍ“ میں آگئی ہیں۔ یہاں چونکہ عورتوں کی آمد کا ذکر ہے اس لیے ان کا نام لیا، ورنہ رسول اللہ ﷺ مردوں سے بھی انھی باتوں پر بیعت لیتے تھے۔ عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس موقع پر جب آپ کے گرد آپ کے اصحاب کی ایک جماعت موجود تھی فرمایا: «بَايَعُونِي عَلَى أَنْ لَا تُشْرِكُوا بِاللَّهِ شَيْئًا، وَلَا تَسْرِقُوا، وَلَا تَزْنُوا، وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ، وَلَا تَأْتُوا بِبُهْتَانٍ تَفْتَرُونَهُ بَيْنَ أَيْدِيكُمْ وَأَرْجُلِكُمْ، وَلَا تَعْصُوا فِي مَعْرُوفٍ، فَمَنْ وَفَى مِنْكُمْ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ، وَمَنْ أَصَابَ مِنْ ذَلِكَ شَيْئًا فَعُوقِبَ فِي الدُّنْيَا فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَهُ، وَمَنْ أَصَابَ مِنْ ذَلِكَ شَيْئًا ثُمَّ سَتَرَهُ اللَّهُ فَهُوَ إِلَى اللَّهِ، إِنْ شَاءَ عَفَا عَنْهُ وَإِنْ شَاءَ عَاقَبَهُ، فَبَايَعْنَاهُ عَلَى ذَلِكَ» [بخاری، الإيمان، باب علامة الإيمان حب الأنصار : ۱۸] ”مجھ سے اس پر بیعت کرو کہ تم اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں کرو گے اور چوری نہیں کرو گے اور زنا نہیں کرو گے اور اپنی اولاد کو قتل نہیں کرو گے اور کوئی بہتان نہیں لاؤ گے جسے تم اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان گھڑ کر لا رہے ہو گے اور کسی نیک کام میں نافرمانی نہیں کرو گے۔ پھر تم میں سے جس نے اس عہد کو پورا کیا اس کا اجر اللہ پر ہے اور جس نے ان میں سے کوئی کام کر لیا، پھر اسے دنیا میں اس کی سزا مل گئی تو وہ اس کے لیے گناہ دور کرنے کا باعث ہے اور جس نے ان میں سے کوئی کام کیا، پھر اللہ نے اس پر پردہ ڈال دیا تو وہ اللہ کے سپرد ہے، اگر چاہے تو اسے معاف کر دے اور اگر چاہے تو اسے سزا دے۔“ تو ہم نے اس پر آپ ﷺ سے بیعت کر لی۔“

حدیبیہ اور فتح مکہ کے موقع پر ہجرت کر کے آنے والی عورتوں کے علاوہ بھی آپ ﷺ نے عورتوں سے ان باتوں پر بیعت لی ہے۔ چنانچہ ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ عید الفطر کے موقع پر مردوں کو خطبہ دینے کے بعد عورتوں کی طرف آئے اور فرمایا: «يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعَنَّكَ.....» ﴿﴾ پھر جب آپ آیت کی تلاوت سے فارغ ہوئے تو عورتوں کو مخاطب کر کے فرمایا: «أَنْتُنَّ عَلَى ذَلِكَ؟» ﴿﴾ ”کیا تم اس پر قائم ہو؟“ ان میں سے ایک عورت نے کہا، جس کے سوا کسی نے جواب نہیں دیا: «نَعَمْ» ﴿﴾ ”جی ہاں!“ [بخاری، العیدین، باب موعظة الإمام النساء يوم العيد : ۹۷۹]

وَلَا يَعْصِيَنَّكَ فِي مَعْرُوفٍ قَبَائِعُهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۱۷﴾

لے اور ان کے لیے اللہ سے بخشش کی دعا کر۔ یقیناً اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۱۷﴾

﴿۱۷﴾ وَلَا يَفْتُلَنَّ أَوْلَادَهُنَّ: اس میں حمل کرانا بھی شامل ہے، خواہ جائز ہو یا ناجائز۔

﴿۱۸﴾ وَلَا يَأْتِينَنَّ بِبُهْتَانٍ يَفْتَرِينَهُ بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ: ”بُهْتَانٌ“ کسی کے ذمے گھڑ کر لگایا ہوا جھوٹ جسے سن کر وہ مہبوت اور ششدر رہ جائے۔ اکثر مفسرین نے اس کی تفسیر یہ کی ہے کہ کوئی عورت کسی دوسری عورت کا بچہ لاکر خاوند اور دوسرے لوگوں کے سامنے یہ ظاہر کرے کہ اس کی ولادت اس کے شکم سے ہوئی ہے، خواہ وہ کوئی گرا ہوا بچہ اٹھا کر لے آئی ہو یا کسی اور طرح سے لے آئی ہو۔ ظاہر ہے یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب خاوند مدت تک غائب رہا ہو، یا خاوند کے بجائے کسی اور سے بچے کو جنم دے کر اسے خاوند کا بچہ ظاہر کرے۔ ”بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ“ (ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان) کا لفظ اس لیے استعمال فرمایا کہ بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کی ولادت عورت کے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان ہوتی ہے۔ مگر ”بُهْتَانٌ“ کو ابھی صورتوں کے ساتھ خاص کرنا مشکل ہے، کیونکہ ایک تو بہتان کا لفظ عام ہے، پھر رسول اللہ ﷺ نے مردوں سے بیعت لی تو ان کے لیے بھی یہ الفاظ استعمال فرمائے: «وَلَا تَأْتُوا بِبُهْتَانٍ تَفْتَرُونَهُ بَيْنَ أَيْدِيكُمْ وَأَرْجُلِكُمْ» [بخاری: ۱۸] اور نہ تم کوئی بہتان لاؤ گے جو اپنے ہاتھوں اور اپنے پاؤں کے درمیان گھڑ رہے ہوں۔“ جیسا کہ پچھلے فائدے میں یہ حدیث گزری ہے۔ ظاہر ہے بہتان کی یہ صورتیں مردوں سے متعلق تصور نہیں کی جا سکتیں۔ عربی زبان میں ”بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ“ کا معنی ”سامنے“ ہوتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ﴾ [النور: ۲۵۵] ”وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے سامنے ہے۔“ ”وَأَرْجُلِهِنَّ“ کا لفظ اس کی تاکید کے لیے ہے، اس لیے اس کا سادہ مفہوم یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس بات کا وجود ہی نہیں اسے گھڑ کر پوری دھٹائی کے ساتھ اپنے سامنے لاکر پیش نہ کر دیا کریں۔ اور یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ اس بات کی پروا نہ کرتے ہوئے کہ قیامت کے دن ان کے ہاتھ اور پاؤں ان کے خلاف شہادت دیں گے، وہ اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے سامنے کسی پر بہتان نہ لگا دیا کریں، بلکہ انھیں چاہیے کہ اس بات کا خیال رکھیں کہ وہ چار گواہوں کی موجودگی میں بہتان لگا رہی ہیں۔ اس مطلب کی تائید دوسری جگہ بہتان باندھنے والوں کے ملعون ہونے کے سلسلے میں ہاتھوں اور پاؤں کی شہادت کے ذکر سے ہوتی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿إِنَّ الَّذِينَ يَزُفُونَ الْمُخَضَّبَاتِ الْغُلَقَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ لَعُنُوا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۖ يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۖ يَوْمَئِذٍ يُؤْفِكُهُمُ اللَّهُ وَيَنْفَعُهُمُ الْحَقُّ وَيَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِينُ﴾ [النور: ۲۵ تا ۲۷] ”بے شک وہ لوگ جو پاک دامن، بے خبر مومن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں وہ دنیا اور آخرت میں لعنت کیے گئے اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔ جس دن ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں ان کے خلاف اس کی شہادت دیں گے جو وہ کیا کرتے تھے۔ اس دن اللہ انھیں ان کا صحیح بدلہ پورا پورا دے گا اور وہ جان لیں گے کہ اللہ تعالیٰ ہی حق ہے، جو ظاہر کرنے والا ہے۔“ الغرض آیت میں

بہتان کی ایک صورت نہیں بلکہ ہر قسم کے بہتان سے اجتناب کا عہد لیا گیا ہے۔

⑥ وَلَا يَصْنَعَنَّكَ فِي مَعْرُوفٍ: اس جملے میں پوری شریعت پر عمل کا اقرار آ گیا۔ اس اقرار میں ”فِي مَعْرُوفٍ“ کی شرط لگانے کی کئی توجیہیں ہیں، ایک یہ کہ اس سے اس بات کی صراحت مقصود ہے کہ رسول حکم ہی معروف کا دیتا ہے، پھر اس کی مصیبت کی کیا گنجائش ہو سکتی ہے۔ دوسری یہ کہ اگرچہ یہ بات ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا حکم معروف کے سوا ہو ہی نہیں سکتا، مگر اس کے ساتھ ”مَعْرُوفٍ“ (نیک) ہونے کی قید اس لیے لگائی تاکہ سب کو معلوم ہو جائے کہ مخلوق کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے کام میں جائز نہیں، یہاں تک کہ رسول کی اطاعت بھی اس شرط کے ساتھ مشروط ہے۔ تیسری یہ کہ یہاں معاملہ عورتوں کا ہے، انھیں مطلق اطاعت کے حکم سے کہ وہ آپ کے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کریں گی، شیطان کسی کے دل میں گمراہی کا دوسوہ پیدا کر سکتا تھا، اس کا راستہ روکنے کے لیے یہ قید لگا دی۔

⑦ رسول اللہ ﷺ سے بیعت کی کئی صورتیں مروی ہیں، جن میں سے ایک اسلام کی بیعت ہے، ایک جہاد کی، ایک بعض باتوں کی پابندی کی، مثلاً یہ کہ وہ کسی سے سوال نہیں کریں گے اور ایک کہاڑ سے تو بہ اور اطاعت کے عہد کی۔ آپ ﷺ کے بعد صحابہ کرام سے یہ تو ثابت ہے کہ انھوں نے لوگوں سے اسلام لانے کی بیعت لی اور امراء سے اطاعت کی بیعت کی، مگر خلیفہ یا امیر کے علاوہ کسی اور شخص کا لوگوں سے اپنا مرید بنانے کی بیعت لینا، جیسا کہ صوفیہ کا طریقہ ہے، صحابہ کرام کے دور بلکہ پورے خیر القرون میں ثابت نہیں، کیونکہ اس سے مسلمانوں میں فرقے اور گروہ پیدا ہوتے ہیں۔ پھر یہ معاملہ نقشبندی، سہروردی، چشتی اور قادری تک محدود نہیں رہتا، بلکہ ہر ایک اپنی الگ گڈی اور الگ حلقہ قائم کر لیتا ہے جو صرف اس کے حکم کا پابند ہوتا ہے اور ہر پیر و مرشد کا تقاضا ہوتا ہے کہ مرید کا علم چونکہ ناقص ہے اس لیے اگر اس کا مرشد اسے شریعت کے صریح خلاف حکم دے تو وہ بھی اس کے لیے ماننا ضروری ہے، کیونکہ اس میں بھی کوئی نہ کوئی حکمت پوشیدہ ہوتی ہے۔ ان حضرات نے ”فِي مَعْرُوفٍ“ کی قید بھی اڑادی، چنانچہ ان کے لسان الغیب حافظ شیرازی کہہ گئے ہیں۔

بے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید کہ سالک بے خبر بود ز راہ و رسم منزلہا

”اگر پیر مغاں تمہیں حکم دیتا ہے تو مصلے کو شراب سے رنگ لو، کیونکہ سالک منزلوں کے راہ و رسم سے بے خبر نہیں ہوتا۔“

حقیقت یہ ہے کہ پیری مریدی کا یہ سلسلہ امت کے کتاب و سنت سے دوری اور اس کے باہمی افتراق کا خوف ناک باعث ہے۔ آپ ﷺ قرآن و سنت سنائیں، پیر کے ہاتھ میں ہاتھ دینے والا یہی کہے گا کہ کیا ہمارے پیر کو یہ معلوم نہیں۔ رہی یہ بات کہ ہم بطور استاذ اور ہادی پیر کی بیعت کرتے ہیں، تو ایک تو اس کے لیے بیعت کی ضرورت نہیں، پھر اپنے آپ کو ایک ہی استاذ اور ہادی کے حکم کا پابند بنانا کہاں سے ثابت ہوا؟ آپ متعدد اساتذہ اور رہنماؤں سے تعلیم اور رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں اور کرنی چاہیے۔ ہاں، رسول اللہ ﷺ سے بیعت کی ہر صورت ہی درست تھی، کیونکہ وہ نبی تھے، ان کے ہوتے کسی اور کی بیعت نہ تھی اور نہ ہی اس سے افتراق یا انتشار پیدا ہونے کا خدشہ تھا۔ پھر خلیفہ اور امیر کی بیعت درست ہے، کیونکہ اللہ اور اس کے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ قَدْ يَسُؤُوا مِنَ الْآخِرَةِ كَمَا يَبْسُ الْكُفَّارُ مِنْ أَصْحَابِ الْقُبُورِ ﴿۱۳﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ان لوگوں کو دوست مت بناؤ جن پر اللہ غصے ہو گیا، جو آخرت سے اسی طرح ناامید ہو چکے ہیں جس طرح وہ کافر ناامید ہو چکے جو قبروں والوں سے ہیں ﴿۱۳﴾

رسول ﷺ نے اس کا حکم دیا ہے اور ایک خلیفہ کے ہوتے ہوئے کسی اور کی بیعت جائز نہیں۔

﴿۱۳﴾ قَبَائِعُهُمْ وَاسْتَغْفِرَ لَهُنَّ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ: یعنی اگر وہ ان باتوں کا عہد کریں تو آپ ان کی بیعت قبول کر لیں اور اس سے پہلے ان سے جو لغزشیں ہوئیں یا آئندہ بشری کمزوری کی بنا پر ہوں گی ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے استغفار کریں، کیونکہ اللہ تعالیٰ غفور ورحیم ہے۔

آیت 13 ﴿۱﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ: سورت کے شروع میں ”لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ“ میں مشرکین کی دوستی سے منع فرمایا تھا، آخر میں یہود کی دوستی سے منع فرمایا۔ قرآن مجید میں ”مغضوب علیہم“ عموماً یہود کو کہا گیا ہے۔ دیکھیے سورہ فاتحہ میں ”غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ“ کی تفسیر۔

﴿۲﴾ قَدْ يَسُؤُوا مِنَ الْآخِرَةِ كَمَا يَبْسُ الْكُفَّارُ مِنْ أَصْحَابِ الْقُبُورِ: اس آیت کی تفسیر دو طرح سے کی گئی ہے، ایک یہ کہ ”مِنَ“ بیانہ ہے اور ”أَصْحَابِ الْقُبُورِ“ ”الْكُفَّارُ“ کا بیان ہے۔ یعنی ان لوگوں کو دوست مت بناؤ جن پر اللہ تعالیٰ غصے ہو گیا، (کیونکہ انھوں نے حق کو جانتے ہوئے اور یہ پہچانتے ہوئے کہ آپ ﷺ سچے نبی ہیں، آپ پر ایمان لانے سے انکار کر دیا، اس لیے) وہ آخرت (کی ہر خیر) سے ناامید ہو چکے، جس طرح وہ کافر آخرت (کی ہر خیر) سے ناامید ہو چکے جو قبروں والوں میں سے ہیں، یعنی وہ کافر جو فوت ہو چکے اور اپنی آنکھوں سے اپنے عذاب کو دیکھ کر ہر خیر سے مایوس ہو چکے، ان کی طرح یہ یہودی بھی جان بوجھ کر حق کو جھٹلانے کی وجہ سے آخرت (کی ہر بھلائی) سے مایوس ہیں، سو انھیں دوست مت بناؤ۔ متن میں ترجمہ اسی مفہوم کے مطابق کیا گیا ہے اور طبری نے اسی معنی کو ترجیح دی ہے۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ ”مِنَ“ ابتدا سے ہے اور مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کو دوست مت بناؤ جن پر اللہ تعالیٰ غصے ہوا، جو آخرت کے واقع ہونے سے اسی طرح ناامید ہیں جس طرح کفار قبروں والوں کے واپس آنے سے ناامید ہو چکے ہیں۔ یہ دونوں تفسیریں درست ہیں۔

﴿۳﴾ بعض اہل علم نے ”مغضوب علیہم“ کو عام رکھا ہے اور فرمایا ہے کہ جس طرح ”عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ“ کے الفاظ عام ہیں، اسی طرح ”مغضوب علیہم“ کے الفاظ بھی عام ہیں، ان میں یہود و نصاریٰ اور مشرکین و منافقین سبھی شامل ہیں اور اللہ تعالیٰ نے سبھی کی دوستی سے منع فرمایا ہے اور ان سب پر اللہ کا غضب بھی ہے۔ سبھی آخرت میں کسی بھی خیر کی توقع سے محروم ہیں اور سب کافر اس بات سے بھی ناامید ہو چکے ہیں کہ مرنے والے ان کے پاس دوبارہ آئیں گے۔ قرآن مجید میں یہود کے علاوہ

دوسرے کفار کے لیے بھی ”غضب“ کا لفظ آیا ہے۔ دیکھیے سورہ اعراف (۷۱)، نحل (۱۰۶)، شوریٰ (۱۶) اور سورہ فتح (۶)۔



سَبَّحَ لِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ، وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيْمُ ① يَا أَيُّهَا الَّذِينَ
 اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ② كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ③

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

اللہ کا پاک ہونا بیان کیا ہر چیز نے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور وہی سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ① اے لوگو جو ایمان لائے ہو! کیوں کہتے ہو جو تم نہیں کرتے ② اللہ کے نزدیک سخت ناراض ہونے کے اعتبار سے بڑی بات ہے کہ تم وہ کہو جو تم نہیں کرتے ③

آیت 1 سَبَّحَ لِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ : اس سورت کا مضمون اللہ کے راستے میں جہاد و قتال ہے، ابتدا اس کی اللہ تعالیٰ کی تسبیح کے ذکر سے کی گئی ہے۔ اللہ کی تسبیح سے ابتدا کی سورت کے مضمون سے مناسبت یہ ہے کہ وہ ہستی جس کی تسبیح ہر وہ چیز کرتی ہے جو آسمانوں میں ہے اور ہر وہ چیز بھی جو زمینوں میں ہے، تو تمام مخلوق کی طرح انسان کے لیے بھی اس کی تسبیح کرنا لازم ہے۔ پھر جو لوگ تسبیح کے بجائے اس کے ساتھ کفر و شرک کرتے ہیں تو ایمان والوں پر ان کے ساتھ لڑنا فرض ہے، کیونکہ وہ ساری کائنات کے الٹ چل رہے ہیں اور تسبیح کے بجائے اللہ تعالیٰ کے لیے شریک بنا کر اس کے تمام عیوب و نقائص سے پاک ہونے کی نفی کر رہے ہیں۔ اس سے بڑھ کر تو یہ کیا ہوگی کہ وہ اللہ تعالیٰ کو وحدہ لا شریک لہ اور تمام صفات کمال کا مالک ماننے کے بجائے اس کے لیے اولاد اور شریک بنا کر اسے عاجز و محتاج ثابت کر رہے ہیں اور اس اکیلے کی عبادت کے بجائے ان چیزوں کو اس کی عبادت میں شریک بنا رہے ہیں جن کا زمین و آسمان کی پیدائش یا بقا میں کوئی حصہ ہی نہیں۔ اسی طرح ان لوگوں پر بھی چوٹ ہے جو ایمان لانے اور اللہ کی راہ میں قتال کے وعدے اور دعوے کے باوجود اس کی راہ میں لڑنے سے گریز کرتے ہیں کہ انھوں نے اللہ کی تسبیح کا حق عملاً ادا نہیں کیا۔

”سَبَّحَ لِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ“ کی تفسیر سورہ حدید اور سورہ حشر کی ابتدا میں گزر چکی ہے، اس مقام پر اللہ تعالیٰ کی صفت ”الْعَزِيزُ“ لانے میں اشارہ ہے کہ جب وہ ہر ایک پر غالب ہے تو تم اس کے دشمنوں کے ساتھ لڑنے سے کیوں ڈرتے ہو اور صفت ”الْحَكِيْمُ“ لانے میں اشارہ ہے کہ اس نے تمہیں جو حکم دیا ہے کہ کفار سے لڑو اور انھیں اور ان کے کفر و شرک کو کسی صورت غالب نہ آنے دو تو یہ حکم بے مقصد نہیں، بلکہ کمال حکمت پر مبنی ہے اور دنیا و آخرت میں تمہاری عزت اور کامیابی کا ضامن ہے۔ (ابن عاشور)

آیت 2، 3 ① يَا أَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ : ان آیات میں ان لوگوں پر تعجب اور شدید ناراضی کا اظہار ہے جو وہ بات کہتے ہیں جو کرتے نہیں۔ اس میں کئی طرح کے لوگ شامل ہیں، عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ”ہم

نے آپس میں یہ ذکر کیا کہ کون ہے جو رسول اللہ ﷺ کے پاس جائے اور آپ سے پوچھے کہ کون سائل اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب ہے، مگر ہم میں سے کوئی بھی نہ اٹھا۔ تو رسول اللہ ﷺ نے ہماری طرف ایک آدمی بھیجا اور ہمیں جمع کرنے کے بعد یہ سورت یعنی سورہ صف پوری پڑھ کر سنائی۔“ [مسند احمد: ۴۵۲/۵، ح: ۲۳۷۸۸] مسند احمد کے محققین نے فرمایا: ”إِسْنَادٌ صَحِيحٌ عَلَى شَرْطِ الشَّيْخَيْنِ.“ طبری نے علی بن ابی طلحہ کی معتبر سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ان آیات کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا: «كَانَ نَاسٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ قَبْلَ أَنْ يُفْرَضَ الْجِهَادُ يَقُولُونَ لَوْ دِدْنَا أَنَّ اللَّهَ دَلَّنَا عَلَى أَحَبِّ الْأَعْمَالِ إِلَيْهِ فَنَعْمَلُ بِهِ، فَأَخْبَرَ اللَّهُ نَبِيَّهُ أَنَّ أَحَبَّ الْأَعْمَالِ إِلَيْهِ إِيمَانٌ بِاللَّهِ لَا شَكَّ فِيهِ، وَجِهَادُ أَهْلِ مَعْصِيَتِهِ الَّذِينَ خَالَفُوا الْإِيمَانَ وَلَمْ يُقِرُّوا بِهِ فَلَمَّا نَزَلَ الْجِهَادُ، سَكَرَ ذَلِكَ أَنَسٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ، وَشَقَّ عَلَيْهِمْ أَمْرُهُ، فَقَالَ اللَّهُ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَى: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ﴾ [الصف: ۲]» [طبري: ۶۰۶/۲۲، ح: ۳۴۳۰۹] مومنوں میں سے کچھ لوگ جہاد فرض ہونے سے پہلے کہتے تھے: ”ہم چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے ہاں سب اعمال سے زیادہ محبوب عمل بتائے تو ہم وہ کریں۔“ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو بتایا کہ تمام اعمال میں سے محبوب وہ ایمان باللہ ہے جس میں کوئی شک نہ ہو اور اس کی نافرمانی کرنے والوں سے جہاد ہے جنہوں نے ایمان کی مخالفت کی اور اس کا اقرار نہیں کیا۔ پھر جب جہاد (کا حکم) نازل ہوا تو مومنوں میں سے کچھ لوگوں نے اسے ناپسند کیا اور اس کا حکم ان پر شاق گزرا، تو اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ﴾ ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! کیوں کہتے ہو جو تم نہیں کرتے۔“

اس سے معلوم ہوا کہ ان آیات سے مراد وہ لوگ ہیں جو جہاد فرض ہونے سے پہلے اس کی تمنا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اگر ہمیں معلوم ہو کہ سب سے محبوب عمل کون سا ہے تو ہم وہ کریں گے، مگر جب جہاد کا حکم نازل ہوا تو ان میں سے کچھ لوگوں نے اس سے گریز کیا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿الَّذِينَ إِذَا قِيلَ لَهُمْ كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ وَأَقْبِلُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ، فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ إِذَا قَرِينُقٌ مِنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللَّهِ أَوْ أَشَدَّ خَشْيَةً، وَقَالُوا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ، لَوْلَا أَخَّرْتَنَا إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ لَّفَلَّ مُتَاعُ الدُّنْيَا قَلْبِينَ، وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقَىٰ وَلَا يُظْلَمُونَ فَتِيلًا ۝ آيِنَ مَا تَكُونُوا يَدْرِكَكُمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِي بُرُوجٍ مُّشِيدَةٍ﴾ [النساء: ۷۷، ۷۸] ”کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن سے کہا گیا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو، پھر جب ان پر لڑنا لکھا گیا اچانک ان میں سے کچھ لوگ، لوگوں سے ڈرنے لگے، جیسے اللہ سے ڈرنا ہو یا اس سے بھی زیادہ ڈرنا اور انھوں نے کہا اے ہمارے رب! تو نے ہم پر لڑنا کیوں لکھ دیا، تو نے ہمیں ایک قریب وقت تک مہلت کیوں نہ دی۔ کہہ دے دنیا کا سامان بہت تھوڑا ہے اور آخرت اس کے لیے بہتر ہے جو متقی بنے اور تم پر دھاگے برابر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ تم جہاں کہیں بھی ہو گے موت تمہیں پالے گی، خواہ تم مضبوط قلعوں میں ہو۔“ اور فرمایا: ﴿وَيَقُولُ الَّذِينَ آمَنُوا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُورَةٌ، فَإِذَا أَنْزَلَتْ سُورَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَذُكِرَ فِيهَا الْقِتَالُ دَرَأْتِمْ﴾ کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ يَنْظُرُونَ إِلَيْكَ نَظَرَ الْعُشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ﴿﴾ [محمد : ۲۰] ”اور وہ لوگ جو ایمان لائے کہتے ہیں کوئی سورت کیوں نازل نہیں کی گئی؟ پھر جب کوئی محکم سورت نازل کی جاتی ہے اور اس میں لڑائی کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان لوگوں کو دیکھے گا جن کے دلوں میں بیماری ہے، وہ تیری طرف اس طرح دیکھیں گے جیسے اس شخص کا دیکھنا ہوتا ہے جس پر موت کی غشی ڈالی گئی ہو۔“ اسی طرح وہ لوگ بھی مراد ہیں جنہوں نے تمہیں کہا تھا کہ ہم جنگ میں پیٹھ نہیں دکھائیں گے، مگر اس عہد پر قائم نہ رہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَلَقَدْ كَانُوا عَاهِدُوا اللَّهَ مِنْ قَبْلُ لَا يُؤَلُّونَ الْأَذْبَارَ دُونَكَ وَكَانَ عَهْدُ اللَّهِ مُسْتَوْثِقًا﴾ [الأحزاب : ۱۵] ”حالانکہ بلاشبہ یقیناً اس سے پہلے انہوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ وہ پیٹھ نہ پھیریں گے اور اللہ کا عہد ہمیشہ پوچھا جانے والا ہے۔“

② ”لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ“ کے الفاظ میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو ایسے کاموں کا دعویٰ کرتے ہیں جو انہوں نے نہ کیے ہیں نہ کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ ہم نے جہاد کیا، ہم نے دشمن کا منہ موڑ دیا، ہم نے یہ کیا اور وہ کیا، حالانکہ انہوں نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا ہوتا، ان کی خواہش ان کارناموں پر اپنی تعریف کی ہوتی ہے جو انہوں نے نہیں کیے۔ ایسے لوگوں کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَفْرَحُونَ بِمَا آتَوْا وَيُحِبُّونَ أَنْ يُحْسَدُوا بِمَالِهِمْ يَقُولُوا قَلِيلًا نَحْسَبَنَّ لَهُمْ بِمَقَازٍ مِنَ الْعَذَابِ ؕ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ [آل عمران : ۱۸۸] ”ان لوگوں کو ہرگز خیال نہ کر جو ان (کاموں) پر خوش ہوتے ہیں جو انہوں نے کیے اور پسند کرتے ہیں کہ ان کی تعریف ان (کاموں) پر کی جائے جو انہوں نے نہیں کیے، پس تو انہیں عذاب سے بچ نکلنے میں کامیاب ہرگز خیال نہ کر اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔“

③ ”لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ“ میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو کسی سے کوئی بھی ایسا وعدہ کرتے ہیں جسے پورا کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دن میری امی نے مجھے بلایا، جب کہ رسول اللہ ﷺ ہمارے گھر تشریف رکھتے تھے، کہنے لگی: ”آؤ، میں تمہیں کچھ دوں۔“ رسول اللہ ﷺ نے اسے فرمایا: ﴿وَمَا أَرَدْتِ أَنْ نُعْطِيَهُ؟﴾ ”تم نے اسے کیا دینے کا ارادہ کیا ہے؟“ اس نے کہا: ”میں اسے کھجوریں دوں گی۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿أَمَا إِنَّكَ لَوْ لَمْ تُعْطِيَهُ شَيْئًا كُنَيْتِ عَلَيَّ كِدْبَةً﴾ [ابو داؤد، الأدب، باب التشديد في الكذب : ۴۹۹۱، وقال الألبانی حسن] ”یاد رکھو! اگر تم اسے کچھ نہ دیتیں تو تم پر ایک جھوٹ لکھا جاتا۔“

④ بعض حضرات اس سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ آدمی جو عمل خود نہ کرتا ہو کسی دوسرے کو بھی اس کی دعوت نہ دے، حالانکہ یہاں اس کام کے وعدے یا دعوے پر سرزنش ہے جو انسان نہ کرتا ہو، ایسے کام کی دعوت پر سرزنش نہیں۔ فرائض پر عمل اور ان کی دعوت تو ہر ایک پر لازم ہے، اگر ان کی دعوت دے مگر خود عمل نہ کرے تو اس پر واقعی گرفت ہے، مگر وہ ترک عمل پر ہے دعوت پر نہیں۔ مزید دیکھیے سورہ بقرہ کی آیت (۴۳): ﴿أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتَابَ﴾ کی تفسیر۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ اگر خود عمل نہ کرو تو دوسروں کو کہنا چھوڑ دو، بلکہ اپنی کوتاہی پر ندامت اور شرمندگی کے

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًا كَانَهُمْ بُنْيَانٌ مَرصُوصٌ ﴿۱﴾

بلاشبہ اللہ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اس کی راہ میں صف باندھ کر لڑتے ہیں، جیسے وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی عمارت ہوں ﴿۱﴾

احساس کے ساتھ دعوت و تبلیغ جاری رکھنی چاہیے اور امید کرنی چاہیے کہ اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ کوتاہی دور کرنے کی توفیق بھی عطا فرمائے گا۔ علاوہ ازیں ہر مسلمان پر دین کی ہر بات آگے پہنچانا فرض ہے۔ فرائض کے بارے میں خود عمل اور دوسروں تک پہنچانا دو کام فرض ہیں، جب کہ مستحبات و فضائل کو آگے پہنچانا فرض ہے، خود عمل کرے تو اجر ہے، نہ کر سکے تو سواخذہ نہیں، جیسا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: «بَلِّغُوا عَنِّي وَلَوْ آيَةً» | بخاری، أحداث الأسياء، باب ما ذكر عن بني إسرائيل : ۳۴۶۱، عن عبد الله بن عمرو رضي الله عنه [مجھ سے آگے پہنچا دو، خواہ ایک آیت ہو۔] اور فرمایا: «فَلْيَبْلُغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ قُرْبَ مُبَلِّغٍ أَوْطَىٰ مِنْ سَامِعٍ» | بخاری، الحج، باب الخطبة أيام منى : ۱۷۴۶، عن أبي بكر رضي الله عنه [تو جو موجود ہے وہ اس تک پہنچا دے جو موجود نہیں، کیونکہ بہت سے لوگ جنہیں پہنچایا جائے، سننے والوں سے زیادہ یاد رکھنے والے ہوتے ہیں۔] امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تاکید کے لیے دیکھیے سورہ آل عمران (۱۱۰، ۱۰۳)۔

﴿۱﴾ كِبْرُ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ : «مَقْتٌ يَمُقَّتُ مَقْتًا» (ن) «أَبْعَضُهُ بُغْضًا شَدِيدًا» ان آیات میں اس دعوے یا دعوے پر اللہ تعالیٰ نے اپنی شدید ناراضی کا اظہار کئی طرح سے فرمایا ہے جس پر عمل نہ کیا جائے۔ سب سے پہلے ڈانٹ اور ملامت کے لیے استفہام انکاری کے ساتھ فرمایا کہ ایمان لانے کے باوجود تم وہ کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں، پھر اس کا امر کی شاعت کے اظہار کے لیے اس کی خمیر لانے کے بجائے دوسری آیت میں انھی الفاظ کو دہرایا ہے، چنانچہ پہلے فرمایا: ﴿لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ﴾ پھر فرمایا: ﴿أَنْ تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ﴾ پھر ناراضی کی شدت کے اظہار کے لیے «مَقْتًا» کا لفظ استعمال فرمایا، جس کا معنی شدید بغض ہے اور اس کے ساتھ «كِبْرٌ» فرمایا کہ یہ شدید بغض «کبیر» بھی ہے۔ پھر «عِنْدَ اللَّهِ» کا لفظ ہے کہ یہ شدید بغض کسی عام شخص کا نہیں بلکہ اس عمل سے تم اللہ جل جلالہ کی شدید ناراضی کا نشانہ بن رہے ہو۔

آیت ۴ ﴿۱﴾ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ : «مَرصُوصٌ» «أَلْرَصَاصُ» سیسہ (سکہ) «رَصْرَصٌ رَصْرًا» (ن) ایک چیز کو دوسری کے ساتھ خوب جوڑ دینا، چمنا دینا۔ اس میں سیسے کے اجزا کے باہم متصل ہونے کی تشبیہ ملحوظ ہے۔ «بُنْيَانٌ» «بنی بِنْيَانٍ بِنَاءً» (ض) سے مصدر ہے بمعنی اسم مفعول، بنائی ہوئی عمارت۔ «بُنْيَانٌ مَرصُوصٌ» ایسی عمارت جس کے اجزا ایک دوسرے سے سیسے کی طرح ملے ہوئے ہوں۔

﴿۲﴾ اس جگہ اس آیت کا آنا دلیل ہے کہ پہلی آیات کا تعلق قرآن فی سبیل اللہ سے ہے۔

﴿۳﴾ اس آیت سے قرآن فی سبیل اللہ کرنے والوں کی فضیلت ظاہر ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے محبوب بندے ہیں۔ ابو سعید خدری رضي الله عنه بیان کرتے ہیں: «قِيلَ يَا رَسُولَ اللَّهِ! أَيُّ النَّاسِ أَفْضَلُ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ لِقَوْمِهِ لِمَ تُؤَدُّونَنِي وَقَدْ كُنتُمْ تَعْلَمُونَ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ فَلَمَّا زَاغُوا أَزَاغَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ⑤

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم! تم مجھے کیوں تکلیف دیتے ہو، حالانکہ یقیناً تم جانتے ہو کہ میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں۔ پھر جب وہ ٹیڑھے ہو گئے تو اللہ نے ان کے دل ٹیڑھے کر دیے اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا ⑤

مُؤْمِنٍ يُحَادِدُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِنَفْسِهِ وَمَالِهِ، قَالُوا لَنْ نَمُنَّ بِكَ مَنْ؟ قَالَ مُؤْمِنٌ فِي شُعْبٍ مِنْ الشُّعَابِ يَنْفِي اللَّهُ وَيَدْعُ النَّاسَ مِنْ شَرِّهِ | بخاری، الجهاد والسير، باب أفضل الناس مؤمن مجاهد بنفسه : ۲۷۸۶ | ”لوگوں نے کہا: ”یا رسول اللہ! لوگوں میں سے افضل (سب سے بہتر) کون ہے؟“ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”وہ مؤمن جو اللہ کے راستے میں اپنی جان اور اپنے مال کے ساتھ جہاد کرتا ہے۔“ انھوں نے کہا: ”پھر کون؟“ فرمایا: ”وہ مؤمن جو گناہوں میں سے کسی گناہی میں ہے، اللہ سے ڈرتا ہے اور لوگوں کو اپنے شر سے محفوظ رکھتا ہے۔“

④ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی محبوبیت انھی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جن میں یہ اوصاف موجود ہوں، ایک یہ کہ وہ جان بچانے والے نہ ہوں بلکہ لڑنے والے اور جان و مال قربان کرنے والے ہوں۔ دوسرا یہ کہ وہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کے دین کی سر بلندی کے لیے لڑیں۔ تیسرا یہ کہ وہ صف باندھ کر نظم و ترتیب کے ساتھ لڑیں، اس میں اطاعت امیر بھی شامل ہے کہ جہاں ان کی ذمہ داری لگا دی جائے وہاں ڈنٹے رہیں، اس کے بغیر نہ صف بنتی ہے نہ قائم رہتی ہے۔ چوتھا یہ کہ وہ عقیدہ و مقصد میں، ایک دوسرے سے محبت میں اور ایک دوسرے پر اعتماد میں پوری طرح یک جان ہوں، جس طرح ”بنیان مرصوم“ میں کوئی رخنہ نہیں ہوتا ان میں بھی کسی قسم کا کوئی رخنہ نہ پایا جائے۔ پھر جس طرح ”بنیان مرصوم“ اپنی جگہ سے نہیں ہنتی ان کے قدم بھی کسی صورت میدان سے اکھڑنے نہ پائیں، جیسا کہ اصحاب رسول ﷺ میں یہ تمام اوصاف پائے جاتے تھے۔ دیکھیے سورہ فتح کی آیت (۲۹): ﴿أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ﴾ کی تفسیر۔

آیت 5 ① وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ لِقَوْمِهِ لِمَ تُؤَدُّونَنِي... : قال فی سبیل اللہ کی فضیلت کے ذکر اور اس سے گریز پر ملامت کے بعد اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کا اپنی قوم سے خطاب ذکر فرمایا، جس میں انھوں نے ان کی اس آیت رسائی کا شکوہ اور اس پر ملامت کی جو انھوں نے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ روا رکھی کہ جب وہ انھیں اپنے لیے اللہ کا رسول جانتے اور مانتے تھے تو ان پر لازم تھا کہ وہ ان کی نگریم کرتے، ان کی اطاعت کرتے اور ان کے ساتھ مل کر دشمنان اسلام سے جہاد کرتے، مگر انھوں نے ان کے ساتھ عام رویے میں، ان کے احکام کی تعمیل میں اور جہاد کے لیے نکلنے کے معاملے میں، غرض ہر طرح سے انھیں تکلیف پہنچائی۔ یہاں جس ایذا کی طرف خصوصاً اشارہ ہے اور جس کی وجہ سے انھیں موسیٰ علیہ السلام سے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ”الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ“ کا لقب ملا وہ ان کا جہاد کے لیے نکلنے سے صاف انکار ہے۔ مقصود مسلمانوں کو ان کا طریقہ اپنانے

وَإِذْ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ بِنَتِيِّ إِسْرَائِيلَ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ مُصَدِّقًا لِمَا

اور جب عیسیٰ ابن مریم نے کہا اے بنی اسرائیل! بلاشبہ میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں، اس کی تصدیق کرنے

سے اجتناب کی تلقین ہے۔ حکم و اطاعت کے معاملے میں ان کی ایذا کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۃ احزاب (۶۹) کی تفسیر اور جہاد کے لیے نکلنے سے ان کے صاف انکار کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۃ مائدہ (۲۰ تا ۲۶) کی تفسیر۔

﴿فَلَمَّا زَاغُوا أَزَاغَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ: "زَاغُوا" "زَاغٌ يَرْيَعُ زَيْغًا" (ض) میڑھا ہونا۔ "أَزَاغَهُ" اس سے باب افعال ہے، میڑھا کر دیا۔ یعنی جب وہ اطاعت کے بجائے ہر کام میں نیزھے چلے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اسی راہ پر ڈال دیا، کیونکہ وہ نیزھی راہ پر چلنے والوں کو زبردستی سیدھی راہ پر نہیں چلا سکتا، کیونکہ اس سے آزمائش کا مقصد فوت ہو جاتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿تَوَلَّيْهِ مَا تَوَلَّى﴾ [النساء: ۱۱۵] "ہم اسے اسی طرف پھیر دیں گے جس طرف وہ پھرے گا۔"

﴿وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ﴾: جہاد سے انکار کی وجہ سے سورۃ مائدہ کی آیت (۲۵) میں موسیٰ علیہ السلام نے اور سورۃ مائدہ ہی کی آیت (۲۶) میں اللہ تعالیٰ نے قوم موسیٰ کو "الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ" کا خطاب دیا ہے۔

﴿رسول اللہ ﷺ کو کفار کے علاوہ ایمان کا دعویٰ کرنے والے منافقین سے بھی بہت اذیت پہنچی۔ زبانی اذیت کے علاوہ جہاد کے مواقع پر انہوں نے کئی دفعہ نمداری کی، جنگ احد کے موقع پر عبد اللہ بن ابی تمین سو (۳۰۰) آدمیوں کو، جو لشکر کا تقریباً تیسرا حصہ تھے، عین میدان جنگ سے نکال کر لے گیا۔ جنگ خندق میں بھی انہوں نے کفار سے مل کر سازشوں میں اور مسلمانوں کی حوصلہ شکنی میں کوئی کمی نہیں کی۔ سورۃ آل عمران (۱۵۳ تا ۱۶۸) اور سورۃ احزاب (۳۹ تا ۴۰) میں اللہ تعالیٰ نے اس کا تفصیل سے ذکر فرمایا ہے۔ زبانی اذیت کے لیے دیکھیے سورۃ توبہ (۵۸، ۶۱، ۷۴)، احزاب (۵۷) اور منافقون (۸)۔ اگرچہ آپ ﷺ کو نبوت کے اعلان ہی سے کفار کی طرف سے مسلسل اور بے پناہ تکلیفیں پہنچیں، مگر اپنی جماعت میں شامل لوگوں کی طرف سے ایذا کا احساس زیادہ ہوتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں آپ ﷺ کو تسلی دلائی ہے کہ اگر کچھ منافق قسم کے لوگ آپ کو تکلیف دیتے ہیں اور جہاد میں جانے سے پس و پیش کرتے ہیں تو آپ غم نہ کریں، آپ کے ساتھ تو پھر بھی جہاد کرنے والوں اور جان و مال قربان کرنے والوں کی عظیم جماعت موجود ہے، موسیٰ علیہ السلام کو تو ایسوں کی طرف سے اس سے بھی زیادہ تکلیف دی گئی، ان کی قوم نے جہاد کے لیے نکلنے ہی سے صاف انکار کر دیا۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے کچھ چیزیں تقسیم کیں تو ایک آدمی نے کہا: "یہ ایسی تقسیم ہے جس میں اللہ کے چہرے کا ارادہ نہیں کیا گیا۔" میں نے نبی ﷺ کو یہ بات بتائی تو آپ ﷺ ناراض ہوئے حتیٰ کہ میں نے غصے کے آثار آپ ﷺ کے چہرہ مبارک میں دیکھے، آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿يَرْحَمُ اللَّهُ مُؤَسِنِي لَقَدْ أُؤْذِي بِأَكْثَرِ مِنْ هَذَا فَصَبِرْ﴾ [بخاری، الدعوات، باب قول الله تبارك وتعالى: ﴿ووصل عليهم﴾... : ۶۳۳۶] "اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام پر رحم فرمائے، انہیں اس سے زیادہ اذیت دی گئی مگر انہوں نے صبر کیا۔" اللہ تعالیٰ نے یہاں موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ عیسیٰ علیہ السلام کا بھی ذکر فرمایا، کیونکہ ان کے ساتھ بھی چند لوگوں کے سوائے بنی اسرائیل نے ایسا ہی سلوک کیا۔

﴿يَت 6﴾ وَإِذْ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ بِنَتِيِّ إِسْرَائِيلَ.....: "مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَةِ" کے دو معنی

بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَةِ وَ مُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدٌ فَلَمَّا

والا ہوں جو مجھ سے پہلے تورات کی صورت میں ہے اور ایک رسول کی بشارت دینے والا ہوں، جو میرے بعد آئے ہیں اور دونوں ہی درست ہیں، ایک یہ کہ میں اپنے سے پہلے نازل شدہ کتاب تورات کی تردید نہیں بلکہ تصدیق کرنے والا ہوں۔ دیکھیے سورہ مائدہ (۳۶) کی تفسیر۔ دوسرا یہ کہ میرا وجود ان بشارتوں کو سچا ثابت کرنے والا ہے جو میرے متعلق تورات میں دی گئی ہیں، میں ان کا مصداق ہوں، لہذا تم پر لازم ہے کہ مجھ پر ایمان لاؤ۔

② وَ مُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدٌ: اس سے معلوم ہوا کہ عیسیٰ ﷺ نے رسول اللہ ﷺ کے اسم مبارک "أَحْمَدُ" کی صراحت کے ساتھ آپ ﷺ کی آمد کی خوش خبری دی تھی۔ جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ فرما رہے تھے: «إِنَّ لِي اسْمَاءً، أَنَا مُحَمَّدٌ وَأَنَا أَحْمَدُ وَأَنَا الْمَاجِي الَّذِي يَمْحُو اللَّهُ بِِي الْكُفْرَ، وَأَنَا الْحَاشِرُ الَّذِي يُحْشِرُ النَّاسَ عَلَى قَدَمِي، وَأَنَا الْعَاقِبُ» [بخاری، التفسیر، باب فوفه تعالیٰ: ﴿بَانِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ﴾: ۴۸۹۶] "میرے کئی نام ہیں، میں محمد ہوں اور میں احمد ہوں اور میں ماجی (منانے والا) ہوں کہ میرے ساتھ اللہ کفر کو مٹائے گا اور میں حاشر (اکٹھا کرنے والا) ہوں کہ لوگ میرے پیچھے جمع کیے جائیں گے اور میں عاقب (سب نبیوں کے بعد آنے والا) ہوں۔"

"أَحْمَدُ" (أَفْعَلُ) اسم تفصیل ہے جو اسم فاعل اور اسم مفعول دونوں کے معنی میں آتا ہے۔ اسم فاعل کے معنی میں ہو تو مطلب ہوگا "بہت زیادہ حمد کرنے والا" اور حقیقت یہ ہے کہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کی بہت زیادہ حمد کرنے والے اور آپ کی امت کے لوگ "حَمَادُونَ" (بہت زیادہ حمد کرنے والے) ہیں۔ اگر اسم مفعول کے معنی میں ہو تو معنی ہے "جس کی بہت زیادہ تعریف کی گئی"۔ اس صورت میں یہ اسم مبارک "محمد" کا ہم معنی ہے۔ اسم تفصیل کے اسم مفعول کے معنی میں آنے کی مثال قرآن مجید میں ملتی ہے فرمایا: ﴿اللَّهُ تَكْرَأِي الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يُؤْمِنُونَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوتِ وَيَقُولُونَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا هَؤُلَاءِ أَهْدَى مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا سَبِيلًا﴾ [النساء: ۵۱] "کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کا ایک حصہ دیا گیا، وہ جنوں اور باطل معبود پر ایمان لاتے ہیں اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ ان سے زیادہ سیدھے راستے پر ہیں جو ایمان لائے ہیں۔" اس آیت میں "أَهْدَى" اسم فاعل کے معنی میں (زیادہ ہدایت دینے والے) نہیں بلکہ اسم مفعول کے معنی میں ہے، یعنی "زیادہ ہدایت دیے گئے"۔ اسی طرح سورہ فاطر (۴۲) میں بھی "أَهْدَى" اسم مفعول کے معنی میں ہے۔

عیسیٰ رضی اللہ عنہ کی اس بشارت میں وہ چیزیں خاص طور پر قابل توجہ ہیں، ایک رسول اللہ ﷺ کی آمد کے زمانے کی تعیین کہ وہ مسیح رضی اللہ عنہ کے بعد آئے گا، دوسرا اسم مبارک "أَحْمَدُ" کی صراحت، تاکہ آپ کے متعلق کوئی ابہام یا پوشیدگی نہ رہے۔ جہاں تک نام کا تعلق ہے تو قرآن کے بیان کے مطابق یہ بات یقینی ہے کہ انجیل میں یہ نام موجود تھا۔ اس کی بڑی دلیل یہ ہے کہ اگر قرآن کا یہ بیان غلط ہوتا تو نزول قرآن کے زمانے کے نصرانی ضرور اس کی تردید کرتے۔ موجودہ انجیلوں میں اس نام کا مذکور

جَاءَهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ قَالُوا هَذَا سِحْرٌ مُّبِينٌ ①

گا، اس کا نام احمد ہے۔ پھر جب وہ ان کے پاس واضح نشانیاں لے کر آیا تو انہوں نے کہا یہ کھلا جادو ہے ①

نہ ہونا اس کی نفی کی دلیل نہیں بن سکتا، کیونکہ اس وقت اصل انجیل دنیا میں موجود ہی نہیں۔ ہمارے سامنے جو انجیلیں عربی، انگریزی یا اردو میں ہیں یہ سب ترجمہ در ترجمہ ہیں۔ ان ترجموں میں باہمی اختلاف اس قدر ہے جتنا خود ان انجیلوں میں ہے۔ یہ ترجمہ کرنے والے حضرات ہر لفظ کا ترجمہ کرتے جاتے ہیں خواہ وہ کسی کا نام ہو، حالانکہ نام میں تبدیلی یا اس کا ترجمہ نہیں کیا جاتا۔ پھر جب کتمان حق اور تحریف کی عادت بھی ہو تو بات کہاں سے کہاں جا پہنچے گی۔ اس کے باوجود زمانے کی تعین کے ساتھ اور رسول اللہ ﷺ کے اوصاف کے ساتھ انجیل میں یہ بشارت کئی جگہ موجود ہے جو آپ کے سوا کسی اور پر منطبق نہیں ہوتی۔ یہاں انجیل یوحنا سے چند حوالے نقل کیے جاتے ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ کی آمد کی بشارت دی گئی ہے۔ مسیح یحییٰ نے فرمایا: ”اور میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمہیں دوسرا مدگار بخشے گا کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے، یعنی سچائی کا روح۔“ [یوحنا، باب ۱۴، فقرہ: ۱۶، ۱۷] ”لیکن مدگار یعنی روح القدس جسے باپ میرے نام سے بھیجے گا وہی تمہیں سب باتیں سکھائے گا اور جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے وہ سب تمہیں یاد دلائے گا۔“ [یوحنا، باب ۱۴، فقرہ: ۲۶] ”اس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا، کیونکہ دنیا کا سرواڑا آتا ہے اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں۔“ [یوحنا، باب ۱۴، فقرہ: ۳۰] ”لیکن جب وہ مدگار آئے گا جس کو میں تمہارے پاس باپ کی طرف سے بھیجوں گا، یعنی سچائی کا روح جو باپ سے صادر ہوتا ہے تو وہ میری گواہی دے گا۔“ [یوحنا، باب ۱۵، فقرہ: ۲۶] ”مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہیں مگر تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے لیکن جب وہ یعنی سچائی کا روح آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا۔ اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا، لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا۔“ [یوحنا، باب ۱۶، فقرہ: ۱۳، ۱۴] یہ حوالے یوحنا کی انجیل سے نقل کیے گئے ہیں جو نصرائیوں کے تمام فرقوں کے ہاں مسلم ہے۔ انجیل یرنباں میں آپ ﷺ کے نام ”محمد“ کی صراحت بار بار آئی ہے، مگر موجودہ نصرانی جو پال کے پیروکار ہیں وہ چونکہ اسے نہیں مانتے، اس لیے یوحنا کی انجیل کے حوالے نقل کیے گئے ہیں۔ ان میں رسول اللہ ﷺ کی بشارت ایسی صفات کے ساتھ دی گئی ہے جو آپ کے سوا کسی اور پر صادق ہی نہیں آتیں۔ مثلاً ”وہ تمہیں دوسرا مدگار بخشے گا کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے۔“ اور ”وہی تمہیں سب باتیں سکھائے گا۔“ اور ”دنیا کا سرواڑا آتا ہے اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں۔“ غور کیجیے! مسیح یحییٰ کے بعد رسول اللہ ﷺ کے سوا اور کون ہے جس پر یہ صفات صادق آتی ہوں۔

③ فَلَمَّا جَاءَهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ: بعض حضرات نے فرمایا کہ اس سے مراد مسیح علیہ السلام ہیں، کیونکہ آیت کے شروع میں ان کے خطاب کا ذکر ہے، مگر راجح بات یہ ہے کہ اس سے مراد نبی ﷺ ہیں، یعنی پھر جب وہ ”احمد“ جس کی بشارت عیسیٰ علیہ السلام نے دی تھی واضح نشانیاں لے کر ان کے پاس آیا تو انہوں نے اسے پہچاننے کے باوجود کھلا جادو کہہ کر جھٹلایا، جیسا کہ فرمایا: ﴿لَقَدْ آتَيْنَا

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ الْكُذِبَ وَهُوَ يُدْعَىٰ إِلَى الْإِسْلَامِ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿۷﴾ يُرِيدُونَ لِيُظْفِقُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ﴿۸﴾ هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ ﴿۹﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنْجِيكُمْ مِنْ عَذَابِ أَلِيمٍ ﴿۱۰﴾

اور اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے، جب کہ اسے اسلام کی طرف بلا یا جا رہا ہو اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا ﴿۷﴾ وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے مونہوں کے ساتھ بجا دیں اور اللہ اپنے نور کو پورا کرنے والا ہے، اگرچہ کافر لوگ ناپسند کریں ﴿۸﴾ وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا، تاکہ اسے تمام دینوں پر غالب کر دے، اگرچہ مشرک لوگ ناپسند کریں ﴿۹﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! کیا میں تمہاری ایسی تجارت کی طرف رہنمائی کروں جو تمہیں دردناک عذاب سے بچالے؟ ﴿۱۰﴾

جَاءَهُمْ فَأَعْرَفُوا كَفْرَؤِهَا فَلَعَنَهُ اللَّهُ عَلَى الْكَافِرِينَ ﴿۱۰﴾ [البقرة: ۸۹] ”پھر جب ان کے پاس وہ چیز آگئی جسے انھوں نے پہچان لیا تو انھوں نے اس کے ساتھ کفر کیا، پس کافروں پر اللہ کی لعنت ہے۔“ ابن جریر طبری نے یہی معنی کیا ہے اور ابن کثیر اور بہت سے مفسرین نے اسی معنی پر اکتفا کیا ہے، اس کی تائید بعد کی آیت میں ”وَهُوَ يُدْعَىٰ إِلَى الْإِسْلَامِ“ کے الفاظ سے بھی ہوتی ہے، کیونکہ اس سورت کے نزول کے وقت اسلام کی دعوت دینے والے احمد ﷺ تھے نہ کہ مسیح علیہ السلام۔

﴿۱۰﴾ قَالُوا هَذَا إِسْحَارٌ مُّؤْمِنِينَ: یعنی آپ جو نشانیاں اور معجزات لے کر آئے ان کے متعلق انھوں نے کہہ دیا کہ یہ کھلا جادو ہے، یا سہانے کے لیے انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو جادوگر کے بجائے مجسم جادو کہہ دیا، جیسے ”زَيْدٌ عَجَائِلٌ“ کے بجائے ”زَيْدٌ عَذْلٌ“ کہہ دیتے ہیں۔

آیت 7 ﴿۷﴾ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ الْكُذِبَ وَهُوَ يُدْعَىٰ ... : یعنی اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جسے اسلام میں داخل ہونے کی اور اللہ کا فرمان بردار بن جانے کی دعوت دی جا رہی ہو تو وہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھ دے۔ اللہ پر جھوٹ یہ ہے کہ اس کے بھیجے ہوئے رسول کو، جس کی بشارت اس سے پہلے ان کے نبی عیسیٰ و موسیٰ علیہ السلام دے چکے تھے، انھوں نے جادوگر اور اس کی لائی ہوئی بیانات کو جادو کہہ دیا۔ ویدہ و دانستہ جھوٹ باندھنے والے ایسے ظالم لوگوں کو اللہ تعالیٰ ہدایت نہیں دیتا۔ یہی مضمون سورۃ الانعام (۲۱، ۲۰) میں بیان ہوا ہے۔

آیت 8، 9 ﴿۸، ۹﴾ يُرِيدُونَ لِيُظْفِقُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ : ان آیات کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۃ توبہ (۲۳، ۲۲) کی تفسیر۔

آیت 10 ﴿۱۰﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنْجِيكُمْ مِنْ عَذَابِ أَلِيمٍ : یہی مضمون ایک اور انداز میں سورۃ توبہ (۱۱) میں بیان

تُوْمُنُونَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۗ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۱﴾ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنَّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ وَمَسْكِنٍ ظَلِيْمَةٍ فِيْ جَنَّٰتٍ عَدْنٍ ۗ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۲﴾

تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کرو، یہ تمہارے لیے بہتر ہے، اگر تم جانتے ہو ﴿۱۱﴾ وہ تمہیں تمہارے گناہ معاف کر دے گا اور تمہیں ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے تلے نہریں بہتی ہیں اور رہنے کی پاکیزہ جگہوں میں، جو ہمیشہ رہنے کے باغوں میں ہیں، یہی بہت بڑی کامیابی ہے ﴿۱۲﴾

ہوا ہے، تفسیر وہاں ملاحظہ فرمائیں۔ یہاں ایمان و جہاد پر عذاب الیم سے نجات کی بشارت سنائی ہے، جب کہ سورہ توبہ میں ترک جہاد پر عذاب الیم کی وعید سنائی ہے۔ (۳۹، ۲۸)

آیت 11 تُوْمُنُونَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ وَتُجَاهِدُوْنَ..... : یہ اس تجارت کی تفسیر ہے، یعنی وہ تجارت یہ ہے کہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کرو۔ ”تُوْمُنُونَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ“ فعل مضارع فعل امر کے معنی میں ہے، اسے مضارع لانے سے امر کی تاکید مقصود ہے، جیسا کہ کسی کام کی تاکید مقصود ہو تو یہ کہنے کے بجائے کہ یہ کام کرو، کہا جاتا ہے کہ تم یہ کام کرو گے۔

آیت 12 ﴿۱﴾ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنَّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ : ”يَغْفِرْ“ اور ”يُدْخِلْ“ پر جزم ”تُوْمُنُونَ“ اور ”تُجَاهِدُوْنَ“ کا جواب ہونے کی وجہ سے آئی ہے، کیونکہ وہ امر کے معنی میں ہیں اور امر کے جواب میں مضارع آئے تو اس پر جزم آتی ہے۔

﴿۲﴾ وَ مَسْكِنٍ ظَلِيْمَةٍ فِيْ جَنَّٰتٍ عَدْنٍ : ”مَسْكِنٍ ظَلِيْمَةٍ“ کا خاص طور پر اس لیے ذکر فرمایا ہے کہ آدمی کی پسندیدہ ترین چیزوں میں اس کا مسکن بھی ہے جسے چھوڑے بغیر جہاد ممکن نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پسندیدہ مسکن چھوڑنے کے عوض ”مَسْكِنٍ ظَلِيْمَةٍ“ کی بشارت سنائی، جن میں دوام کی خوبی بھی ہے، جب کہ دنیا کے مسکن کسی کے پاس رہنے والے نہیں۔ سورہ توبہ میں فرمایا: ﴿۱﴾ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَاؤُكُمْ وَاَبْنَاؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالٌ اٰتَمْتُمْوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسْكِنٌ تَرْضَوْنَهَا حَبَّ اِلَيْكُمْ مِنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهِ فَتَرْبَضُوا حَتّٰى يَأْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرٍ ۗ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۱﴾ [التوبہ: ۲۴] ”کہہ دے اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارا خاندان اور وہ اموال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس کے مندا پڑنے سے تم ڈرتے ہو اور رہنے کے مکانات، جنہیں تم پسند کرتے ہو، تمہیں اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو

وَأُخْرَى تُحِبُّونَهَا نَصْرٌ مِنَ اللَّهِ وَفَتْحٌ قَرِيبٌ وَبَشِيرٌ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۱۳﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا أَنْصَارَ اللَّهِ كَمَا قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِثِ مَنْ أَنْصَارِي إِلَى

اور ایک اور چیز جسے تم پسند کرتے ہو اللہ کی طرف سے مدد اور قریب فتح ہے اور ایمان والوں کو خوش خبری سنا دے ﴿۱۳﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کے مددگار بن جاؤ، جس طرح عیسیٰ ابن مریم نے حواریوں سے کہا اللہ کی طرف انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لے آئے اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔“

﴿۱۳﴾ ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ: خبر ”الْفَوْزُ الْعَظِيمُ“ پر الف لام سے حصر کا مفہوم پیدا ہو رہا ہے، یعنی فوزِ عظیم صرف یہ ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جنت کے سوا کوئی اور چھوٹی کامیابی بھی ہے، بلکہ ”الْعَظِيمُ“ کا لفظ صرف اس کامیابی کی عظمت کے بیان کے لیے آیا ہے، ورنہ کامیاب صرف وہ ہے جو آخرت میں کامیاب ہے، کوئی دوسرا حقیقت میں کامیاب ہے ہی نہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿فَمَنْ ذُخِرَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْعُرُودِ﴾ [آل عمران: ۱۸۵] ”پھر جو شخص آگ سے دور کر دیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا تو یقیناً وہ کامیاب ہو گیا اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کے سامان کے سوا کچھ نہیں۔“

آیت 13 وَأُخْرَى تُحِبُّونَهَا.....: ”أُخْرَى“ محذوف موصوف ”بِعَمَّة“ کی صفت ہے جو مبتدا ہے، خبر اس کی ”لَكُمْ“ محذوف ہے: ”أُنِي وَلَكُمْ بَعْمَةُ أُخْرَى“ یعنی اور تمہارے لیے مغفرتِ ذنوب اور دخولِ جنت کے علاوہ ایک اور نعمت ”نَصْرٌ مِنَ اللَّهِ وَفَتْحٌ قَرِيبٌ“ بھی ہے جو تمہیں پسند ہے۔ آخرت کی نعمتوں کے ساتھ دنیوی نعمتوں کا ذکر کر کے جہاد کی ترغیب دلائی ہے، دنیا میں فتح و کامرانی بھی اگرچہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، مگر یہ مومن کے لیے اصل مقصود نہیں۔ اس لیے پہلے حاصل ہونے کے باوجود اس کا ذکر بعد میں فرمایا اور آخرت میں حاصل ہونے والی نعمتوں کا ذکر پہلے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کے ساتھ اپنی نصرت اور فتحِ قریب کا یہ وعدہ پورا فرمایا، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی ہی میں مکہ فتح ہو گیا، پھر پورا جزیرہ عرب مشرکین سے پاک ہو گیا۔ اس کے بعد اتنی تھوڑی مدت میں اسلام کا جھنڈا پوری دنیا پر لہانے لگا جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی، چنانچہ مسلمان قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کے مالک بن گئے اور انھوں نے ایسے عمدہ طریقے سے کاروبار سلطنت چلایا جس کی خوبی دشمن بھی تسلیم کرتے ہیں۔

آیت 14 ﴿۱﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا أَنْصَارَ اللَّهِ.....: ”الْحَوَارِثِ“ ”حَارَ يَحُورُ حَوْرًا“ (ن) ”الثَّوْبُ“ کپڑے کو دھونا اور خوب سفید کرنا۔ دھوئی کو اسی لیے حواری کہتے ہیں کہ وہ کپڑے کو دھو کر سفید کر دیتا ہے۔ ”حَوَارِثِ“ صاف سفید میدے کو کہتے ہیں جس سے چھان نکال دیا گیا ہو۔ خالص دوست اور بے غرض مددگار کو اسی لیے حواری کہتے ہیں کہ اس کا دل ہر قسم کے کھوٹ سے پاک صاف اور خیر خواہی اور محبت میں خالص ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿إِنَّ لِكُلِّ نَبِيٍّ حَوَارِثًا وَإِنَّ حَوَارِثَ الزُّبَيْرِ بْنِ الْعَوَّامِ﴾ [بخاری، فضائل الصحابة، باب مناقب الزبير بن العوام: ۳۷۱۹]

ظَاهِرُهُ، فَأَيَّدْنَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَىٰ عَدُوِّهِمْ فَأَصْبَحُوا ظَاهِرِينَ ﴿۱۷﴾

اور ایک گروہ نے کفر کیا، پھر ہم نے ان لوگوں کی جو ایمان لائے تھے، ان کے دشمنوں کے خلاف مدد کی تو وہ غالب ہو گئے ﴿۱۷﴾

یہ بات معلوم ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو دشمنوں سے قتال کا مرحلہ پیش نہیں آیا، اس وقت کے یہود نے انھیں پہچان لینے کے باوجود اتنا ستایا اور تنگ کیا کہ ان کے لیے دعوت دینا بھی مشکل ہو گیا۔ اس وقت انھوں نے یہ کہا کہ اللہ کی طرف دعوت دینے میں اور اس کے راستے پر چلنے میں میرے مددگار کون ہیں؟ حواریوں نے کہا، ہم اللہ کے مددگار ہیں۔ اس وقت بنی اسرائیل کے دو گروہ ہو گئے، ایک وہ جو ان پر ایمان لے آئے اور ان کے فرمان ”مَنْ أَنْصَرَئِي إِلَى اللَّهِ“ پر ”مَنْ أَنْصَرَ اللَّهُ“ کہہ کر لبیک کہا، پھر جان و مال کے ساتھ ہر طرح سے ان کی مدد کی اور اس راستے میں دشمنوں کی طرف سے دی جانے والی تکلیفوں پر صبر کیا۔ دوسرے وہ جنہوں نے انھیں رسول ماننے سے انکار کر دیا، انھیں جھوٹا کہا اور ان کی ماں پر ہتھتیں لگائیں، حکومت وقت سے مل کر انھیں گرفتار کروایا اور اپنے گمان کے مطابق انھیں سولی پر چڑھا کر دم لیا، اگرچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس گمان کی تردید فرمائی ہے۔ دیکھیے سورہ آل عمران (۵۵۲-۵۵۳) اور سورہ نساء (۵۷-۵۸)۔

ہمارے نبی کریم ﷺ کو بھی سب سے پہلے یہی مرحلہ پیش آیا۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوت سے سرفراز فرمایا اور آپ نے اسلام کی دعوت کا آغاز کیا تو کفار مکہ کی طرف سے شدید مزاحمت کی گئی اور آپ کو اور آپ کے ساتھ مسلمان ہونے والے مردوں اور عورتوں کو سخت تکلیفیں دی گئیں، جس کی وجہ سے بہت تھوڑے لوگ ایمان لانے کی جرأت کر سکے۔ پھر کئی حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے اور کئی مکہ ہی میں ظلم و ستم سہتے رہے۔ آزمائشوں اور تکلیفوں کا یہ سلسلہ کئی سال جاری رہا، حتیٰ کہ کفار قریش نے آپ کو دعوت سے مطلق روک دیا۔ آپ ہر سال حج کے لیے آنے والے قبائل کے پاس جا کر ایک ایک قبیلہ کو کہتے کہ کون ہے جو مجھے اپنے ساتھ لے جا کر اللہ کا پیغام پہنچانے میں میری مدد کرے۔ کئی سال کے بعد وہ موقع آیا کہ اللہ تعالیٰ نے مدینہ کے کچھ لوگوں کو آپ کی دعوت پر انصار اللہ بننے کی توفیق عطا فرمائی۔ جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

«كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعْرِضُ نَفْسَهُ عَلَى النَّاسِ بِالْمَوْقِفِ فَيَقُولُ هَلْ مِنْ رَجُلٍ يَحْمِلُنِي إِلَى قَوْمِهِ، فَإِنْ قُرَيْشًا قَدْ مَنَعُونِي أَنْ أَبْلُغَ كَلَامَ رَبِّي عَزَّوَجَلَّ، فَأَتَاهُ رَجُلٌ مِنْ هَمْدَانَ فَقَالَ مِمَّنْ أَنْتَ؟ فَقَالَ الرَّجُلُ مِنْ هَمْدَانَ، قَالَ فَهَلْ عِنْدَ قَوْمِكَ مِنْ مَنَعَةٍ؟ قَالَ نَعَمْ، ثُمَّ إِنَّ الرَّجُلَ حَشِيَّيَ أَنْ يَخْفِرَهُ قَوْمُهُ، فَأَتَانِي رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ آتَيْهِمْ، فَأَخْبِرْهُمْ، ثُمَّ آتَيْكَ مِنْ عَامٍ قَابِلٍ، قَالَ نَعَمْ، فَأَنْطَلَقَ وَجَاءَ وَفَدَّ الْأَنْصَارِ فِي رَجَبٍ» [مسند أحمد: ۳/۳۹۰، ح: ۱۵۱۹۲، قال المحقق إسناده صحيح على شرط البخاري]

”نبی ﷺ اپنے آپ کو حج کے موقع پر موقف میں لوگوں کے سامنے پیش کرتے اور کہتے تھے: ”کیا کوئی آدمی ہے جو مجھے اپنے ساتھ اپنی قوم کے پاس لے جائے؟ کیونکہ قریش نے مجھے میرے رب کا کلام پہنچانے سے منع کر دیا ہے۔“ تو ہمدان کا ایک آدمی آپ کے پاس آیا، آپ نے فرمایا: ”تم کن لوگوں سے ہو؟“ اس آدمی نے کہا: ”ہمدان سے۔“ آپ نے فرمایا: ”تو کیا

تیری قوم کے پاس کچھ حفاظت اور وقار مل سکتا ہے؟“ اس نے کہا: ”ہاں!“ پھر وہ آدمی ڈر گیا کہ کہیں اس کی قوم اس کا کیا ہوا عہد پورا نہ کرے، چنانچہ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا: ”میں ان کے پاس جاؤں گا اور انھیں بتاؤں گا، پھر آئندہ سال آپ کے پاس آؤں گا۔“ آپ نے فرمایا: ”ٹھیک ہے۔“ چنانچہ وہ چلا گیا اور انصار کا وفد جب میں آ گیا۔“

④ **قَالِیْذَنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلٰی عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا مُّطَهَّرِیْنَ**: یعنی عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت پر بنی اسرائیل کا ایک گروہ ایمان لے آیا اور ایک گروہ نے انھیں رسول ماننے سے انکار کر دیا۔ انکار کرنے والے یہودی تھے اور ایمان لانے والے نصرانی۔ ایمان لانے والے قلیل تھے اور کفر کرنے والے بہت زیادہ تھے۔ ان یہودیوں نے مسیح علیہ السلام کو اللہ کا پیغام پہنچانے سے روکنے کی ہر کوشش کی اور مسیح علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں پر بدترین مظالم کیے، مگر نہ عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ کی طرف دعوت کو ترک کیا اور نہ ہی ان کے ساتھیوں نے ان کا ساتھ دینے سے کوئی کوتاہی کی، حتیٰ کہ جب اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی طرف اٹھایا تو اس وقت بھی ایمان والوں کی استقامت میں کمی نہیں آئی، وہ بدستور ڈنڈے رہے اور اسلام کی طرف دعوت دیتے رہے، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں کفار کے ساتھ قتال کی توفیق عطا فرمائی۔ پھر جب وہ قلت تعداد کے باوجود میدان میں ڈٹ گئے تو اللہ تعالیٰ نے انھیں قوت بخشی اور ان کی مدد فرمائی، تو وہ اپنے دشمن پر غالب آ گئے اور ان کے دشمن یہودی مغلوب ہو گئے جو آج تک مغلوب چلے آ رہے ہیں۔ پھر جب عیسیٰ علیہ السلام کے نام کیو اشک میں جلا ہو گئے اور انھیں رب تعالیٰ یارب کا جینا کہنے لگے تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کو، جو عیسیٰ علیہ السلام پر صحیح ایمان لانے والی تھی، ان پر غالب کر دیا۔

⑤ ہمارے نبی کریم ﷺ اور آپ کے ساتھی بھی کفار کے ظلم و ستم سہتے رہے اور سہ رہے تھے، اس میں ان کے لیے بشارت ہے کہ اگر تم عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کی طرح اللہ تعالیٰ کے انصار ہو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں بھی تمہارے دشمنوں پر غالب کرے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں کفار پر غلبہ عطا فرما دیا، اس فرق کے ساتھ کہ مسیح علیہ السلام اپنے ساتھیوں کا غلبہ دیکھنے سے پہلے اٹھالیے گئے، جب کہ ہمارے نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے وہ نظارہ آنکھوں سے دکھا دیا، جس کا ذکر سورہ نعر میں ہے، فرمایا: ﴿اِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَأٰی النَّاسَ یَذْحِکُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝﴾ النور: ۲۰، ۱۔ ”جب اللہ کی مدد اور فتح آ جائے۔ اور تو لوگوں کو دیکھے کہ وہ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہو رہے ہیں۔“ ہاں، عیسیٰ علیہ السلام جب دوبارہ تشریف لائیں گے تو وہ بغض نفیس اس فتح اور غلبے میں شریک ہوں گے جو اللہ تعالیٰ ان کے ساتھی مسلمانوں کو ان کے دشمنوں اور دجال پر عطا فرمائے گا۔



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ﴿١﴾

يُسَبِّحُ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوسِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ ﴿١﴾ هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمَمِينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

اللہ کا پاک ہونا بیان کرتی ہے ہر وہ چیز جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے، (جو) بادشاہ ہے، بہت پاک ہے، سب پر غالب ہے، کمال حکمت والا ہے ﴿۱﴾ وہی ہے جس نے ان پڑھوں میں ایک رسول انہی میں سے بھیجا، جو ان کے سامنے اس کی آیات پڑھتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے، حالانکہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جمعہ کی نماز میں سورہ جمعہ اور سورہ منافقون پڑھا کرتے تھے۔ [مسلم،

الجمعة، باب ما یقرأ فی صلاة الجمعة: ۸۷۷]

آیت ۱ ﴿١﴾ يُسَبِّحُ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ : اس آیت کے معانی سورہ حدید (۱) اور سورہ حشر (۲۴، ۱) میں گزر چکے ہیں۔ اس سے پہلے تمام سورتوں کی ابتدا میں ”سَبِّحْ“ ماضی کے صیغے کے ساتھ آیا ہے، یہاں مضارع کا صیغہ استعمال ہوا ہے جو حال اور استقبال کے لیے ہے، جس میں تجدد اور استمرار پایا جاتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ کائنات کی ہر چیز برعرب اور کمی سے اللہ تعالیٰ کے ہمیشہ پاک ہونے کی شہادت دے رہی ہے اور ہمیشہ دیتی رہے گی۔

﴿۲﴾ اس آیت میں بیان کردہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا آئندہ آیت کے ساتھ تعلق اسی کی تفسیر میں آ رہا ہے۔

آیت ۲ ﴿٢﴾ هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمَمِينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ : اس آیت کو دلیل بنا کر بعض اہل کتاب کہتے ہیں کہ محمد (ﷺ) صرف عربوں کے لیے رسول تھے، کیونکہ ”الْأُمَمِينَ“ عرب قوم کو کہتے ہیں، لہذا آپ غیر عرب لوگوں اور یہود و نصاریٰ کے لیے رسول نہیں تھے۔ لیکن ان کی یہ بات درست نہیں، کیونکہ قرآن مجید میں ”الْأُمَمِينَ“ کا لفظ ایک معنی میں نہیں بلکہ مختلف مواقع پر مختلف معانی کے لیے آیا ہے۔ کہیں وہ اہل کتاب کے مقابلے میں ان لوگوں کے لیے استعمال کیا گیا ہے جن کے پاس کوئی آسمانی کتاب نہیں ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَقُلْ لِلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْأُمَمِينَ أَسَلْتُمْ﴾ [آل عمران: ۲۰] ”اور ان لوگوں سے جنہیں کتاب دی گئی ہے اور امتیوں (ان پڑھ لوگوں) سے کہہ دے کیا تم تابع ہو گے؟“ یہاں امتیوں سے مراد مشرکین عرب ہیں، انہیں اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) سے الگ گروہ قرار دیا گیا ہے۔ کہیں یہ لفظ خود اہل کتاب کے ان پڑھ لوگوں کے لیے استعمال ہوا ہے، جیسے فرمایا: ﴿وَمِنْهُمْ أُمِّيُونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمْثَانًا﴾ [البقرة: ۷۸] ”اور ان میں سے کچھ اُمّی (ان پڑھ) ہیں، جو کتاب کا علم نہیں رکھتے سوائے چند آرزوؤں کے۔“ اور کسی جگہ یہ لفظ خالص یہودی اصطلاح کے طور پر استعمال ہوا ہے، جس کے مطابق اس سے مراد وہ سب لوگ ہیں جو یہودی نہیں ہیں، جیسا کہ فرمایا:

وَالْحِكْمَةُ ۚ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلِ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝

بلاشبہ وہ اس سے پہلے یقیناً کھلی گمراہی میں تھے ۝

﴿ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيَّةِ سَبِيلٌ﴾ [آل عمران: ۷۵] ”یہ اس لیے کہ انہوں نے کہا ہم پر ان پڑھوں کے بارے میں (گرفت کا) کوئی راستہ نہیں۔“ یعنی ان کے اندر غیر یہود کا مال مارکھانے کی بددیانتی پیدا ہونے کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے کہا کہ امیوں کے بارے میں ہم پر گرفت کا کوئی راستہ نہیں۔ یہود کی اس اصطلاح کا پس منظر یہ ہے کہ وہ اپنے سوا کسی کے متعلق تسلیم کرنے کے لیے تیار ہی نہ تھے کہ ان میں کوئی نبی مبعوث ہو سکتا ہے، یا انہیں آسمانی کتاب مل سکتی ہے۔ (دیکھیے آل عمران: ۷۳) وہ اپنے سوا تمام اقوام کو ناشائستہ، بد مذہب اور حقیر و ذلیل سمجھتے تھے۔

زیر تفسیر آیات میں ”الْأُمِّيَّةِ“ سے مراد صرف عرب نہیں، یہودی اصطلاح کے مطابق وہ سب لوگ ہیں جو یہودی نہیں، کیونکہ یہاں ”الْأُمِّيَّةِ“ کے تحت دو قسم کے لوگوں کا ذکر ہے، یعنی ”هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيَّةِ رَسُولًا مِّنْهُمْ“ میں عرب ”امیین“ کا ذکر ہے، جنہیں یہ شرف حاصل ہے کہ رسول اللہ ﷺ نسا ان میں سے تھے اور اس سے اگلی آیت میں غیر عرب امیین کا ذکر ہے جو بعد میں اسلام لانے والے تھے، اس میں فرمایا: ﴿وَأَخْرَجْنَا مِنْهُمْ لَنَأْيِلْحَقُوا بِهِمْ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ ”اور ان (امیین) میں سے کچھ اور لوگوں میں بھی (اس رسول کو بھیجا) جو ابھی تک ان سے نہیں ملے اور وہی سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے۔“ اس کی دلیل کہ ان امیین سے مراد غیر عرب ہیں، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے، وہ فرماتے ہیں: ﴿كُنَّا جُلُوسًا عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَنْزَلَتْ عَلَيْهِ سُورَةُ الْجُمُعَةِ: ﴿وَأَخْرَجْنَا مِنْهُمْ لَنَأْيِلْحَقُوا بِهِمْ﴾ قَالَ قُلْتُ مَنْ هُمْ يَا رَسُولَ اللَّهِ!؟ فَلَمْ يُرَاجِعْهُ حَتَّى سَأَلْنَا ثَلَاثًا، وَفِينَا سَلْمَانَ الْفَارِسِيُّ، وَضَعَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَدَهُ عَلَى سَلْمَانَ ثُمَّ قَالَ لَوْ كَانَ الْإِيمَانُ عِنْدَ الثُّرَيَّا لَنَالَهُ رَجَالٌ أَوْ رَجُلٌ مِنْ هَؤُلَاءِ﴾ [بخاری، التفسیر، سورة الجمعة: ۴۸۹۷] ”ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے تھے تو آپ پر سورہ جمعہ نازل ہوئی: ﴿وَأَخْرَجْنَا مِنْهُمْ لَنَأْيِلْحَقُوا بِهِمْ﴾ میں نے پوچھا: ”یا رسول اللہ! یہ کون لوگ ہیں؟“ آپ نے جواب نہ دیا، یہاں تک کہ میں نے تین مرتبہ سوال کیا۔ ہم میں سلمان فارسی رضی اللہ عنہما بھی موجود تھے، رسول اللہ ﷺ نے اپنا ہاتھ سلمان پر رکھا، پھر فرمایا: ”اگر ایمان ثریا کے پاس بھی ہوتا تو ان لوگوں میں سے کچھ آدمی یا (فرمایا) ایک آدمی اسے ضرور حاصل کر لیتا۔“ دراصل اس سورت میں یہود پر چوٹ ہے کہ وہ لوگ جنہیں تم اُمّی کہتے ہو اور اپنے مقابلے میں ذلیل اور حقیر سمجھتے ہو انہی میں اس اللہ نے ایک رسول مبعوث کیا ہے جو ”الْمَلِكِ الْقُدُّوسِ“ اور ”الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ“ ہے اور یہ اللہ کا فضل ہے، جسے وہ چاہتا ہے عطا کر دیتا ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ تمہیں اس کا ٹھیکیدار کس نے اور کب بنایا ہے کہ جسے تم چاہو اسی کو یہ فضل عطا ہو، دوسرے کو عطا نہ ہو؟ رہی یہ بات کہ اگر مان بھی لیں کہ رسول اللہ ﷺ کو عرب و عجم کے امیین کی طرف مبعوث کیا گیا ہے، تو اس سے آپ کا یہود و نصاریٰ کی طرف مبعوث ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آیت کے الفاظ سے یہ ظاہر ہے کہ آپ یہود

کے سوا سب لوگوں کی طرف رسول ہیں، مگر اس میں یہ صراحت نہیں کہ آپ یہود و نصاریٰ کی طرف رسول نہیں۔ یہ مطلب اس آیت کا مفہوم مخالف ہے جو حجت نہیں ہوتا، مثلاً اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَا كُنْتَ تَتْلُوا مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتَابٍ وَلَا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكَ﴾ [العنکبوت: ۴۸] ”اور تو اس سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھتا تھا اور نہ اسے اپنے دائیں ہاتھ سے لکھتا تھا۔“ اب اس کا مطلب یہ لیا جائے کہ آپ ﷺ دائیں ہاتھ سے نہیں لکھتے بلکہ بائیں ہاتھ سے لکھتے تھے تو یہ غلط ہے۔ خصوصاً یہاں تو مفہوم مخالف مراد لیا ہی نہیں جاسکتا، کیونکہ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے متعدد مقامات پر اس بات کی صراحت فرمادی ہے کہ آپ کو تمام لوگوں کے لیے رسول بنا کر بھیجا گیا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ﴾ [سبا: ۲۸] ”اور ہم نے تجھے نہیں بھیجا مگر تمام لوگوں کے لیے اس حال میں کہ خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا ہے اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔“ اور فرمایا: ﴿قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَبِينًا﴾ [الأعراف: ۱۵۸] ”کہہ دے اے لوگو! بے شک میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔“ ان دونوں آیات کی تفسیر میں مزید دلائل ملاحظہ فرمائیں۔

② سورت کی پہلی آیت ”يُسَبِّحُ لِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ“ میں مذکور اللہ تعالیٰ کی صفات کی اس آیت میں مذکور رسول اللہ ﷺ کی صفات کے ساتھ مناسبت یہ ہے کہ کائنات کی ہر چیز اس اللہ کی تسبیح کر رہی ہے اور اس کے ہر عیب اور کمی سے پاک ہونے کی شہادت دے رہی ہے جو ”الْمَلِكِ“ (بادشاہ) ہے۔ (دیکھیے حشر: ۲۳) اپنی سلطنت کا انتظام کرنے والا، اس میں اپنے احکام بھیجتے والا ہے اور اپنے احکام پہنچانے کے لیے جسے چاہتا ہے منتخب فرماتا ہے۔ اس نے اپنے شہنشاہی اختیار کے تحت ان لوگوں میں سے رسول بھیجنے کے بجائے جو اپنے آپ کو اہل کتاب، پڑھے لکھے اور مہذب سمجھتے تھے اور دوسروں کو حقیر جانتے تھے، اُسی لوگوں میں ایک رسول انہی میں سے بھیج دیا۔ ”يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ“ جو اس کے احکام پر مشتمل آیات انہیں مسلسل پڑھ کر سنانا ہے۔ ”الْقُدُّوسِ“ وہ بادشاہ قدوس ہے (دیکھیے حشر: ۲۳) اس نے ان میں ایسا رسول بھیجا جو انہیں ہر قسم کے کفر و شرک اور تمام قباحتوں اور آلودگیوں سے پاک کرتا ہے۔ ”الْعَزِيزِ“ (سب پر غالب) ہے، اس کا رسول انہیں اس کی کتاب کی تعلیم دیتا ہے جو اس کے کامل غلبے کی دلیل اور ترجمان ہے۔ ”الْحَكِيمِ“ (کمال حکمت والا) ہے، اس کا رسول انہیں اس کی عطا کردہ حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

③ قرآن مجید میں رسول اللہ ﷺ کی یہ صفات چار مقامات پر آئی ہیں، سورہ بقرہ کی آیت (۱۲۹) میں اہل عرب کو اپنا احسان یاد دلاتے ہوئے فرمایا کہ ان صفات والا پیغمبر وہ ہے جس کے لیے ابراہیم اور اسماعیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے دعائیں کرتے رہے کہ وہ اسے ان کی اولاد میں مبعوث فرمائے، سو تمہیں اس کی قدر کرنی چاہیے۔ سورہ بقرہ ہی کی آیت (۱۵۱) میں فرمایا کہ ان اوصاف والا پیغمبر عطا کرنے پر میری نعمت کو پہچانو، مجھے یاد رکھو، میرا شکر ادا کرو اور میری ناشکری مت کرو۔ سورہ آل عمران (۱۶۳) میں یہ احسان یاد دلا یا کہ اتنی اعلیٰ صفات کا رسول اس نے خود ان میں مبعوث فرمایا، جس پر وہ سب احوال گزرتے ہیں جو بطور انسان ان سب پر گزرتے ہیں۔ اُحد اور دوسرے مقامات پر دوسروں کی طرح اسے بھی زخم کھانا پڑتے

ہیں، سو وہ ان کے لیے ایک کامل نمونہ ہے۔ چوتھا مقام یہ آیت ہے جس میں یہود کے زعم کو باطل کرنا مقصود ہے، اس لیے بعد میں ”مَثَلُ الَّذِينَ حُمِلُوا الثَّوْلَةَ“ سے ان کی نالائقیوں کا تذکرہ فرمایا ہے۔

④ اگرچہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت تمام انسانوں کے لیے ہے، مگر آپ ﷺ کو عرب امین میں پیدا کرنے اور انھیں اسلام کی دعوت کے اولین مخاطب بنانے میں اللہ تعالیٰ کی حکمت کاملہ کار فرما تھی۔ تفسیر قاسمی میں یہ بات نہایت خوبصورت اور جامع الفاظ میں بیان کی گئی ہے، وہ لکھتے ہیں: ”وَ إِنَّمَا أُوتِرَتْ بِعَثْتِهِ صَلَوَاتُ اللَّهِ عَلَيْهِ فِي الْأُمِّيِّينَ، لِأَنَّهُمْ أَحَدُ النَّاسِ أَذْهَانًا، وَأَقْوَاهُمْ جَنَانًا، وَأَصْفَاهُمْ فِطْرَةً، وَأَفْصَحُهُمْ بَيَانًا، لَمْ تَفْسُدْ فِطْرَتُهُمْ بِغَوَايِشِ الْمُتَحَضِّرِينَ وَلَا بِأَفَانِيهِ تَلَاعِبِ أَوْلِيَاكَ الْمُتَمَدِّنِينَ، وَلِذَا انْقَلَبُوا إِلَى النَّاسِ بَعْدَ الْإِسْلَامِ بِلِغَمٍ عَظِيمٍ وَحِكْمَةٍ بَاهِرَةٍ، وَسِيَاسَةٍ عَادِلَةٍ، فَادُّوا بِهَا مُعَظَّمَ الْأُمَمِ وَدَوَّخُوا بِهَا أَعْظَمَ الْمَمَالِكِ“ ”امی لوگوں میں آپ ﷺ کی بعثت کو اس لیے ترجیح دی گئی کہ وہ ذہن کے لحاظ سے سب لوگوں سے تیز، دل کے لحاظ سے سب سے قوی، فطرت کے لحاظ سے سب سے صاف اور بیان میں سب سے زیادہ فصیح تھے۔ ان کی فطرت شہری لوگوں کی آلودگیوں سے بگڑی نہیں تھی اور نہ ہی ان نام نہاد تمدن و تہذیب والوں کے مختلف کھیل تماشوں سے فاسد ہوئی تھی۔ اسی لیے اسلام لانے کے بعد وہ لوگوں کے پاس ایسا عظیم علم، حیران کن حکمت و دانائی اور عدل پر مبنی سیاست لے کر آئے جس کے ساتھ انھوں نے دنیا کی بڑی بڑی اقوام کی قیادت کی اور عظیم ترین ممالک کو اپنا زیر فرمان بنا کر چھوڑا۔“

⑤ ”وَ إِن كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ: ”إِن“ اصل میں ”إِنَّهُمْ“ ہے، تخفیف کے لیے ”إِنْ“ کو ”إِنْ“ کر دیا اور اس کے اسم ”هُمْ“ ضمیر کو حذف کر دیا اور اس بات کی دلیل کہ یہ ”إِنْ“ نافیہ یا شرطیہ نہیں وہ ”لَا مُمْ“ ہے جو ”لَفِي ضَلَالٍ“ پر آیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے امتی لوگ کس طرح کی کھلی گمراہی میں تھے اس کا حال رسول اللہ ﷺ کے چچا زاد جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے نجاشی کے دربار میں بیان کیا، جب اس بادشاہ نے کفار قریش کے وفد کی شکایت پر انھیں ساتھیوں سمیت بلا کر حقیقت حال دریافت کی۔ انھوں نے فرمایا: «أَيُّهَا الْمَلِكُ! كُنَّا قَوْمًا أَهْلَ جَاهِلِيَّةٍ نَعْبُدُ الْأَصْنَامَ، وَنَأْكُلُ الْمَيْتَةَ وَنَأْتِي الْفَوَاحِشَ، وَنَقْطَعُ الْأَرْحَامَ، وَنُسِيءُ الْجَوَارِ، يَاكُلُ الْقَوِيُّ مِنَّا الضَّعِيفَ، فَكُنَّا عَلَى ذَلِكَ حَتَّى بَعَثَ اللَّهُ إِلَيْنَا رَسُولًا مِّنَّا نَعْرِفُ نَسَبَهُ، وَصِدْقَهُ، وَآمَانَتَهُ، وَعَفَافَهُ، فَذَعَانَا إِلَى اللَّهِ لِنُوحِدَهُ، وَنَعْبُدَهُ، وَنَخْلَعُ مَا كُنَّا نَعْبُدُ نَحْنُ وَآبَاؤُنَا مِنْ دُونِهِ مِنَ الْحِجَارَةِ وَالْأَوْثَانِ» [مسند احمد: ۲۰۲/۱، ج: ۱۷۴۰، قال المحقق إسناده حسن] ”اے بادشاہ! ہم جاہلیت والے لوگ تھے، بتوں کی عبادت کرتے تھے، مردار کھاتے تھے، فواحش کا ارتکاب کرتے تھے، قطع رحمی کرتے تھے، پڑوسیوں سے بدسلوکی کرتے تھے اور ہم میں سے قوت والا کمزور کو کھا جاتا تھا۔ ہم اسی حال میں تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم میں ایک رسول بھیجا جس کے نسب، صدق، امانت اور پاک دامنی کو ہم جانتے تھے۔ اس نے ہمیں اللہ کی طرف دعوت دی کہ ہم اسے ایک مانیں، اس کی عبادت کریں اور ان پتھروں اور تھانوں سے یکسر علیحدگی اختیار کریں جن کی عبادت اللہ کو چھوڑ کر ہمارے آباؤ اجداد کرتے تھے (اس کے بعد جعفر رضی اللہ عنہ نے انھیں اسلام کے احکام بیان فرمائے)۔“

وَآخِرِينَ مِنْهُمْ لَنَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿۳﴾ ذَلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ
مَنْ يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ﴿۴﴾ مَثَلُ الَّذِينَ حَبَلُوا التَّوْرَةَ ثُمَّ لَمْ يَحْبِلُوهَا
كَمَثَلِ الْجَمَارِ يَحْبُلُ اسْفَارًا ۚ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ

اور ان میں سے کچھ اور لوگوں میں بھی (آپ کو بھیجا) جو ابھی تک ان سے نہیں ملے اور وہی سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ﴿۳﴾ یہ اللہ کا فضل ہے، وہ اسے اس کو دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور اللہ بہت بڑے فضل والا ہے ﴿۴﴾ ان لوگوں کی مثال جن پر تورات کا بوجھ رکھا گیا، پھر انہوں نے اسے نہیں اٹھایا، گدھے کی مثال کی سی ہے جو کئی کتابوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے، ان لوگوں کی مثال بری ہے جنہوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلا دیا اور

آیت 3 وَآخِرِينَ مِنْهُمْ لَنَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ : "آخِرِينَ" کا عطف "فِي الْأَمْتِينَ" پر ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے اس رسول کو عرب اُمیوں میں بھیجا جن کی وہ نسل میں سے ہے اور اسے غیر عرب اُمیوں میں بھی بھیجا جو ابھی مسلمان ہو کر عربوں کے ساتھ نہیں ملے، مگر آئندہ مسلمان ہو کر ان کے ساتھ ملنے والے ہیں۔ تفصیل کے لیے اسی سورت کی آیت (۲) کی تفسیر کا پہلا فائدہ ملاحظہ فرمائیں۔ شاہ عبد القادر لکھتے ہیں: "یعنی یہی رسول دوسرے ان پڑھوں کے واسطے بھی ہے، وہ فارس کے لوگ (ہیں)، وہ بھی نبی کی کتاب نہ رکھتے تھے۔ حق تعالیٰ نے اول عرب پیدا کیے اس دین کو تھانے والے، پیچھے جم میں ایسے کامل لوگ اٹھے۔" (موضح)

آیت 4 ذَلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ : یعنی اُمیوں میں نبی مبعوث کرنا اور اسے بعد میں قیامت تک آنے والے تمام لوگوں کے لیے رسول بنانا اللہ کا فضل ہے، وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے، وہ یہود یا کسی اور کی خواہش کا پابند نہیں کہ اسی کو اپنے فضل سے نوازے جسے وہ چاہیں اور نہ ہی یہ کسی کی محنت و کوشش پر موقوف ہے کہ کوئی ریاضت اور محنت کے ساتھ نبوت کا منصب حاصل کر لے، بلکہ یہ سراسر اللہ کے انتخاب اور اس کی مرضی پر موقوف ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿اللَّهُ يَضْطَرُّ مِنَ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا وَمِنَ النَّاسِ﴾ [الحج: ۷۵] "اللہ فرشتوں میں سے پیغام پہنچانے والے پختا ہے اور لوگوں سے بھی۔" اور فرمایا: ﴿اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ﴾ [الأنعام: ۱۲۴] "اللہ زیادہ جاننے والا ہے جہاں وہ اپنی رسالت رکھتا ہے۔" اور فرمایا: ﴿وَاللَّهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ﴾ [البقرة: ۱۰۵] "اور اللہ اپنی رحمت کے ساتھ جسے چاہتا ہے خاص کر لیتا ہے اور اللہ بہت بڑے فضل والا ہے۔"

آیت 5 ﴿۱﴾ مَثَلُ الَّذِينَ حَبَلُوا التَّوْرَةَ ثُمَّ لَمْ يَحْبِلُوهَا : "اسْفَارًا" "سَفَر" کی جمع ہے، بڑی کتاب۔ "سَفَر" "سَفَر" (ن) "الْكِتَاب" لکھتا۔ "السَّفَرُ أَيُّ الْكُتَابِ" جمع اس کی "سَفَرَةٌ" ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿بِأَيْدِي سَفَرَةٍ ۝ كِرَامٍ بَرَرَةٍ﴾ [عس: ۱۶، ۱۵] "ایسے لکھنے والوں کے ہاتھوں میں ہیں۔ جو معزز ہیں، نیک ہیں۔"

﴿۲﴾ بعض اہل علم نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے تین باتوں میں یہود کا رد فرمایا، انہوں نے فخر کیا کہ وہ اہل کتاب ہیں جب کہ

لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ⑤

اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا ⑤

عرب امی ہیں، تو اس کی تردید کرتے ہوئے انھیں اس گدھے کے ساتھ تشبیہ دی جو بڑی بڑی کتابیں اٹھائے ہوئے ہو۔ انھوں نے فخر کیا کہ وہ اللہ کے دوست اور محبوب ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَتَمَنَّوْا الْمَوْتَ﴾ [الجمعة: ۶] ”(اگر ایسا ہے) تو موت کی تمنا کرو۔“ تیسرا یہ کہ ان کے ہاں ”سبت“ (بفتح کا ون) ہے جو مسلمانوں کے پاس نہیں، تو اللہ تعالیٰ نے یوم جمعہ کی صورت میں مسلمانوں پر اپنے احسان کا ذکر فرمایا، جس سے یہود اپنی نادانی کی وجہ سے محروم رہ گئے۔ (الکشاف)

③ تورات کا بوجھ رکھا جانے کا مطلب یہ ہے کہ اس پر عمل کی ذمہ داری ڈالی گئی، جیسا کہ فرمایا: ﴿إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ﴾ [الأحزاب: ۷۲] ”بے شک ہم نے امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو انھوں نے اس کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اسے اٹھا لیا۔“ ﴿ثُمَّ لَمَّا يَخِضُّوْهَا﴾ پھر انھوں نے اس پر عمل نہیں کیا، یعنی جس طرح گدھے پر عمل کتابیں لدی ہوں اور وہ نہیں جانتا کہ اس کی پیٹھ پر کیا ہے، اسی طرح وہ لوگ ہیں جن پر تورات کا بوجھ ڈالا گیا کہ اس پر عمل کریں، مگر انھوں نے پرواہی نہیں کی کہ اس میں کیا ہے اور وہ ان سے کیا چاہتی ہے۔

④ بِشَسِّ مَثَلِ الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا اللَّهُ: اللہ کی آیات کو جھٹلانے سے مراد ان بشارتوں کو جھٹلانا ہے جو اللہ تعالیٰ نے تورات میں رسول اللہ ﷺ کے متعلق نازل فرمائیں۔ (دیکھیے اعراف: ۱۵۷) ”بِشَسِّ“ فعل ذم ہے، ”مَثَلِ الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا اللَّهُ“ اس کا قائل ہے اور اس کا مخصوص بالذم محذوف ہے، یعنی ”هَذَا الْمَثَلُ“ یعنی ان لوگوں کی یہ مثال جنھوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا یا بری مثال ہے، جس کا مصداق ایمان والوں کو نہیں بننا چاہیے۔ جیسا کہ کسی مسلمان کو کتے کی مثال کا مصداق بھی نہیں بننا چاہیے کہ اس پر کتے کی مثال صادق آئے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿لَيْسَ لَنَا مَثَلُ السُّوءِ ، الَّذِي يُعْوَدُ فِي هَيْبَتِهِ كَالْكَلْبِ يَرْجِعُ فِي قَيْبِهِ﴾ [بخاری، الہبة وفضلها، باب لا يحل لأحد أن يرجع في هبته وصدفته: ۲۶۲۲] ”یہ بری مثال ہمارے لیے نہیں ہے، وہ شخص جو اپنے ہبہ میں لوٹتا ہے اس کتے کی مانند ہے جو اپنی تے میں لوٹتا ہے۔“

⑤ استاد محمد عبدہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”کیا وجہ ہے کہ ان علماء کا حال اس سے مختلف ہو جو قرآن و حدیث کا علم رکھتے ہیں لیکن اس پر عمل نہیں کرتے، یا یہودیوں کی طرح ان کی من مانی تاویلیں کرتے ہیں۔“ شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ”یہود کے عالم ایسے تھے کتاب پڑھی اور دل میں کچھ اثر نہ ہوا، اللہ ہم کو پناہ دے۔“ (موضح)

⑥ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ: یعنی جاننے کے باوجود نہ ماننا صریح ظلم ہے اور ایسے ظالموں کو اللہ بھی راہ راست پر چلنے کی توفیق نہیں دیتا، کیونکہ نہ چاہنے والوں کو زبردستی راہ راست پر چلانا اس کا دستور نہیں۔

قُلْ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ هَادَوْا إِن زَعَمْتُمْ أَكْثَمَ أَوْلِيَاءِ اللَّهِ مِنْ دُونِ النَّاسِ فَتَبَتُوا أَلْمُوتَ
 إِن كُنْتُمْ صَادِقِينَ ① وَلَا يَتَمَتَّوْنَ أَبَدًا بِمَا قَدَّمْتُمْ أَيْدِيَهُمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ
 بِالظَّالِمِينَ ② قُلْ إِنَّ أَلْمُوتَ الَّذِي تَتَّقُونَ مِنْهُ فَإِنَّهُ مُلَقِيكُمْ ثُمَّ تُرَدُّونَ إِلَىٰ عِلْمِ
 الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ③ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تُودِيَ لِلصَّلَاةِ

کہہ دے اے لوگو جو یہودی بن گئے ہو! اگر تم نے گمان کر رکھا ہے کہ تم ہی اللہ کے دوست ہو (دوسرے) لوگوں
 کے سوا تو موت کی تمنا کرو، اگر تم سچے ہو ① اور وہ کبھی اس کی تمنا نہیں کریں گے، اس کی وجہ سے جو ان کے ہاتھوں
 نے آگے بھیجا اور اللہ ظالموں کو خوب جاننے والا ہے ② کہہ دے بلاشبہ وہ موت جس سے تم بھاگتے ہو، سو یقیناً وہ
 تم سے ملنے والی ہے، پھر تم ہر پوشیدہ اور ظاہر چیز کو جاننے والے کی طرف لوٹائے جاؤ گے تو وہ تمہیں بتائے گا جو کچھ تم
 آیت 6-8 قُلْ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ هَادَوْا إِن زَعَمْتُمْ ... : ان آیات کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ بقرہ (۹۳-۹۲) کی تفسیر۔

آیت 9 ① يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تُودِيَ لِلصَّلَاةِ : اہل کتاب کی شقاوت اور ایمان کی سعادت میں سے ایک
 یہ بھی ہے کہ یہود و نصاریٰ پر جمعہ کا دن فرض کیا گیا تو انہوں نے اسے قبول کرنے میں اختلاف کیا۔ یہود نے اپنے لیے ہفتے
 کا دن اور نصاریٰ نے اتوار کا دن عبادت کے لیے مقرر کر لیا، جبکہ اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کو جمعہ کے دن کی ہدایت عطا فرما
 دی، جس سے انہیں یہود و نصاریٰ دونوں پر سبقت حاصل ہوگی۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ نحل کی آیت (۱۲۳) : ﴿إِنَّمَا
 جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ﴾ کی تفسیر۔

② يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا : یہ آیت واضح دلیل ہے کہ جمعہ ان تمام لوگوں پر فرض ہے جو ایمان لا چکے ہیں، خواہ وہ شہر میں
 رہتے ہوں یا کسی بستی یا باد یہ میں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں باب قائم کیا ہے: "بَابُ الْجُمُعَةِ فِي الْفُرَى وَالْمُدُنِ"
 (بستیوں اور شہروں میں جمعہ کا باب) اور اس میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث لائے ہیں، انہوں نے فرمایا: ﴿إِنَّ أَوَّلَ جُمُعَةٍ
 جُمِعَتْ بَعْدَ جُمُعَةٍ فِي مَسْجِدِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي مَسْجِدِ عَبْدِ الْقَيْسِ بِجُوَانِي مِنْ
 الْبَحْرَيْنِ﴾ [بخاری، الجمعة، باب الجمعة في الفري والمدن: ۸۹۲] "پہلا جمعہ جو رسول اللہ ﷺ کی مسجد میں جمعہ کے
 بعد ادا کیا گیا عبد القیس قبیلے کی مسجد میں ہوا جو بحرین کے جوانی مقام پر تھی۔" ابو داؤد میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اس روایت میں
 یہ الفاظ بھی ہیں: ﴿بِجُوَانَاءَ قَرْيَةٍ مِنْ فُرَى الْبَحْرَيْنِ﴾ [ابو داؤد، الصلاة، باب الجمعة في الفري: ۶۸-۱] "جو
 بحرین کی بستیوں میں سے ایک بستی ہے۔" آیت میں جمعہ کے دن صلاۃ کی نداء پر اللہ کے ذکر کی طرف سعی کا حکم ہے اور
 باجماعت صلاۃ ادا کرنا صرف شہر میں نہیں بلکہ ہر بستی اور باد یہ میں فرض ہے۔

ابو درداء رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو سنا، آپ فرما رہے تھے: ﴿مَا مِنْ ثَلَاثَةٍ فِي قَرْيَةٍ وَلَا بَلَدٍ

مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ۗ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن

کیا کرتے تھے ① اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب جمعہ کے دن نماز کے لیے اذان دی جائے تو اللہ کے ذکر کی لَاتَقَامُ فِيهِمُ الصَّلَاةُ إِلَّا قَدْ اسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطَانُ فَعَلَيْكَ بِالْجَمَاعَةِ فَإِنَّمَا يَأْكُلُ الذَّنْبَ الْقَاصِيَةَ» [ابوداؤد، الصلاة، باب في التشديد في ترك الجماعة: ۵۴۷] ”کوئی تین آدمی نہیں جو کسی بستی یا بادیہ میں ہوں، جن میں نماز قائم نہ کی جاتی ہو مگر ان پر شیطان غالب آچکا ہوتا ہے۔ سو جماعت کو لازم پکڑو، کیونکہ بھڑیا صرف اس بکری کو کھاتا ہے جو ریوز سے دور ہو۔“ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ لوگوں نے عمر (بن خطاب رضی اللہ عنہ) کو خط لکھ کر جمعہ کے متعلق سوال کیا، انھوں نے لکھا: «جَمِعُوا حَيْثُمَا كُنْتُمْ» [مصنف ابن ابی شیبہ: ۱۰۱/۲، ح: ۵۱۰۸] ”تم جہاں بھی ہو جمعہ ادا کرو۔“ اس کی سند بخاری و مسلم کی شرط پر ہے۔ جن لوگوں نے جمعہ کے لیے شہر یا حاکم وغیرہ کی شرط لگائی ہے ان کے پاس قرآن و سنت کی کوئی دلیل نہیں اور مشہور روایت ”لَا جُمُعَةَ وَلَا تَشْرِيْقَ إِلَّا فِي مِصْرَ جَامِعٍ“ (جمعہ اور عید جامع شہر کے سوائے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں۔ یہ علی رضی اللہ عنہ کا قول مشہور ہے، جو عمر رضی اللہ عنہ کے صحیح سند کے ساتھ مروی قول کے خلاف ہے، جب صحابہ میں اختلاف ہو تو اصل کتاب و سنت کی طرف رجوع واجب ہے (دیکھیے نساء: ۵۹) اور کتاب و سنت کے مطابق تمام مسلمانوں پر ہر جگہ جمعہ فرض ہے، جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، البتہ چند لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ طارق بن شہاب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «الْجُمُعَةُ حَقٌّ وَاجِبٌ عَلَىٰ كُلِّ مُسْلِمٍ فِي جَمَاعَةٍ إِلَّا أَرْبَعَةً عَبْدٌ مَمْلُوكٌ أَوْ امْرَأَةٌ أَوْ صَبِيٌّ أَوْ مَرِيضٌ» [ابوداؤد، الصلاة، باب الجمعة للمملوك والمرأة: ۱۰۶۷، قال الألبانی صحیح] ”جمعہ ہر مسلم پر جماعت کے ساتھ ادا کرنا واجب حق ہے سوائے چار کے، غلام جو کسی کی ملکیت میں ہو یا عورت یا بچہ یا مریض۔“ اور عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «لَيْسَ عَلَىٰ مُسَافِرٍ جُمُعَةٌ» [المعجم الأوسط للطبرانی: ۲۴۹/۱، ح: ۸۱۸، وقال الألبانی صحیح۔ دیکھیے الجامع الصغير: ۵۴۰۵] ”مسافر پر جمعہ نہیں ہے۔“

جن لوگوں پر جمعہ فرض نہیں اگر وہ جمعہ کے لیے آئیں تو اجر کا باعث ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عورتیں بھی جمعہ کے لیے آتی تھیں، اس سے اجر کے علاوہ قرآن کی آیات سن کر انھیں یاد کرنے کا موقع ملتا، قرآن و سنت سن کر علم میں اضافہ ہوتا اور فصاحت سن کر اصلاح ہوتی تھی۔ ام ہشام بنت حارثہ بن نعمان رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: «مَا أَخَذْتُ ﴿قَدْ﴾ وَالْقُرْآنَ التَّجِيدِ﴾ إِلَّا عَنْ لِسَانِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَفْرُوْهَا كُلَّ يَوْمٍ جُمُعَةٍ عَلَى الْمِنْبَرِ إِذَا خَطَبَ النَّاسُ» [مسلم، الجمعة، باب تخفيف الصلاة والخطبة: ۸۷۳/۵۲] ”میں نے سورہ ﴿قَدْ﴾ وَالْقُرْآنَ التَّجِيدِ﴾ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے سن کر یاد کی، آپ اسے ہر جمعہ کے دن خطبہ دیتے ہوئے منبر پر پڑھا کرتے تھے۔“ صحیح مسلم کے اسی باب کی ایک روایت (۸۷۳) میں ام ہشام رضی اللہ عنہا ہی کے الفاظ ہیں: «مَا حَفِظْتُ ﴿قَدْ﴾ إِلَّا مِنْ فِي رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَخْطُبُ بِهَا كُلَّ جُمُعَةٍ» مطلب اوپر گزر چکا ہے۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مردوں کو منع فرمایا کہ وہ عورتوں کو اس بات سے روکیں کہ وہ مسجد میں آکر اجر اور قرآن و سنت کے علم سے اپنا حصہ حاصل کریں۔

کُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ①

طرف لپکا اور خرید و فروخت چھوڑ دو، یہ تمہارے لیے بہتر ہے، اگر تم جانتے ہو ①

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « لَا تَمْنَعُوا النِّسَاءَ حُطُوظَهُنَّ مِنَ الْمَسَاجِدِ إِذَا اسْتَأْذَنُوكُمْ » [مسلم، الصلاة، باب خروج النساء إلى المساجد : ۴۴۲/۱۴۰] ”عورتوں کو مساجد میں سے ان کے حصے میں آنے والی چیزوں سے مت روکو، جب وہ تم سے اجازت مانگیں۔“

جمع کے دن کی بدعات میں سے ایک بدعت ظہر احتیاطی ہے۔ کچھ لوگ جن کا خیال ہے کہ اسلامی حاکم کے بغیر جمع نہیں ہوتا اور دیہات میں بھی جمع نہیں ہوتا، شہروں اور گاؤں میں جمع کی دو رکعتیں پڑھانے کے بعد احتیاطاً ظہر کی چار رکعتیں بھی پڑھتے ہیں، یہ بدترین بدعت ہے، کیونکہ اس کی بنیاد شک پر ہے جو کفار کا معمول ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿بَلْ هُمْ فِي شَكٍّ يَلْعَبُونَ﴾ [الدخان: ۹] ”بلکہ وہ ایک شک میں کھیل رہے ہیں۔“

③ إِذَا تَوَدَّى لِّلصَّلَاةِ مِنَ يَوْمِ الْجُمُعَةِ: ”الصلوة“ پر ”الف لام“ عہد کا ہے، مراد وہ نماز ہے جو جمع کے دن کے ساتھ خاص ہے اور سب جانتے ہیں کہ وہ نماز جمع ہے جو اس دن ظہر کی جگہ ادا کی جاتی ہے اور ندا سے مراد اذان ہے۔ دیکھیے سورہ مائدہ کی آیت (۵۸) کی تفسیر۔ آج کل عام طور پر جمع کے دن خطبے سے پہلے دو اذانیں کہی جاتی ہیں، رسول اللہ ﷺ، ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے زمانے میں یہ دو اذانیں نہیں بلکہ ایک ہی اذان تھی۔ سائب بن یزید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں: « كَانَ النَّدَاءُ يَوْمَ الْجُمُعَةِ أَوَّلُهُ إِذَا جَلَسَ الْإِمَامُ عَلَى الْمِنْبَرِ عَلَى عَهْدِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَبِي بَكْرٍ وَعُمَرُ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا فَلَمَّا كَانَ عُثْمَانُ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ وَكَثُرَ النَّاسُ زَادَ النَّدَاءَ الثَّلَاثَ عَلَى الرَّوْرَاءِ » [بخاری، الجمعة، باب الأذان يوم الجمعة: ۹۱۲] ”جمع کے دن پہلی اذان اس وقت ہوتی تھی جب امام منبر پر بیٹھتا تھا۔ نبی ﷺ، ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے عہد میں یہی معمول تھا۔ پھر جب عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے اور لوگ زیادہ ہو گئے تو انہوں نے (بازار میں ایک مقام) زوراء پر تیسری اذان کا اضافہ کر دیا۔“ یاد رہے کہ اس تیسری اذان سے مراد وہ اذان ہے جو آج کل خطبے سے پندرہ منٹ یا آدھ گھنٹہ پہلے کہی جاتی ہے، اس کے بعد کی دو اذانوں سے مراد اذان اور اقامت ہیں۔ یہ تیسری اذان رسول اللہ ﷺ، ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے دور میں نہیں کہی جاتی تھی، عثمان رضی اللہ عنہ نے لوگوں کی کثرت کے پیش نظر اس کا اضافہ کیا، مگر ان کے زمانے میں یہ اذان مسجد میں نہیں کہی جاتی تھی بلکہ بازار میں کہی جاتی تھی، تاکہ لوگوں کو اطلاع ہو جائے۔ آج کل نہ اس اذان کا اہتمام مسجد سے الگ بازار میں کیا جاتا ہے، نہ لاؤڈ سپیکر کی وجہ سے اس کی ضرورت باقی ہے اور نہ ہی مسجد میں خطبے سے پہلے دو اذانیں عثمان رضی اللہ عنہما کا طریقہ ہے۔ اس لیے خطبے سے پہلے مسجد میں ایک ہی اذان کہی جانی چاہیے جو رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا طریقہ ہے اور عثمان رضی اللہ عنہما کا عمل بھی یہی ہے۔

④ فَاسْعَوْا إِلَى ذِكْرِ اللَّهِ: ”سَعَى يَسْعَى سَعْيًا“ (ف) کا معنی دوڑنا بھی ہے اور کوشش کرنا بھی، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَأَنْ لَّيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى﴾ [النجم: ۳۹] ”اور یہ کہ انسان کے لیے صرف وہی ہے جس کی اس نے کوشش کی۔“ یہاں دوسرا

فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ وَاذْكُرُوا

اللَّهُ كَثِيرًا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿۱۰﴾

پھر جب نماز پوری کر لی جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کے فضل سے (حصہ) تلاش کرو اور اللہ کو بہت یاد کرو، تاکہ تم فلاح پاؤ۔ ﴿۱۰﴾

معنی مراد ہے، یعنی نہایت کوشش اور اہتمام کے ساتھ آؤ، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے نماز کے لیے دوڑ کر آنے سے منع فرمایا ہے۔ ﴿۱۰﴾ وَذُرُوا الْبَيْعَ: اگرچہ جمعہ کے لیے پہلے آنا بہت فضیلت کا باعث ہے اور اس کے متعلق احادیث مشہور و معروف ہیں، مگر آخری حد جس کے بعد جمعہ کی طرف روانگی یا اس کے لیے درکار کام کے سوا ہر کام حرام ہو جاتا ہے وہ جمعہ کی اذان ہے۔ یہاں ”الْبَيْعَ“ کا ذکر اس خاص واقعہ کے پیش نظر آیا ہے جو اگلی آیت میں آ رہا ہے، ورنہ اللہ کے ذکر کی طرف سعی جس طرح بیع ترک کرنے کے سوا نہیں ہو سکتی دوسرے تمام کام ترک کرنے کے بغیر بھی نہیں ہو سکتی اور ظاہر ہے کہ جب سعی فرض ہے تو ہر وہ کام حرام ہے جو اس سے روکنے والا ہے۔

﴿۱۱﴾ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ: ظاہر ہے آخرت کے ثواب کے مقابلے میں دنیا کے فائدوں کی کوئی حیثیت نہیں۔ ﴿۱۲﴾ جمعہ کے دن غسل کرنا، اچھے کپڑے پہننا، خوشبو لگانا، پہلے آنا، خاموشی کے ساتھ خطبہ سننا اور دوسرے متعلقہ احکام و فضائل کتب احادیث میں تفصیل سے مذکور ہیں۔

آیت 10 ﴿۱۰﴾ فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ.....: یہاں ایک سوال ہے کہ آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ جمعہ کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو، تو کیا نماز کے بعد مسجد سے نکلنا ضروری ہے اور کیا کاروبار بھی ضروری ہے یا گھر میں آرام بھی کیا جاسکتا ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ اگرچہ اصل یہی ہے کہ جس کام کا حکم دیا جائے وہ فرض ہوتا ہے، مگر قرینہ موجود ہو تو امر استحباب کے لیے بھی ہوتا ہے اور بیان جواز کے لیے بھی۔ یہاں اذان کے بعد بیع سے منع فرمایا تھا، اب اس ممانعت کی حد بیان فرمادی کہ یہ ممانعت نماز پوری ہونے تک ہے، اس کے بعد بیع کی اجازت ہے اور تمہیں اختیار ہے کہ مسجد سے نکل کر کاروبار میں مصروف ہو جاؤ، لیکن اگر کوئی مسجد میں رہے یا گھر چلا جائے، کاروبار نہ کرے تو مضائقہ نہیں۔ یہ ایسے ہی ہے کہ اللہ نے احرام کی حالت میں شکار سے منع فرمایا، جیسا کہ فرمایا: ﴿لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَأَنْتُمْ حُرُمٌ﴾ [المائدة: ۹۵] ”شکار کو مت قتل کرو، اس حال میں کہ تم احرام والے ہو۔“ پھر فرمایا: ﴿وَإِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوا﴾ [المائدة: ۲] ”اور جب تم احرام کھول دو تو شکار کرو۔“ یہاں شکار کا حکم دینے کا یہ مطلب نہیں کہ احرام کھولنے والے شخص پر شکار کرنا فرض ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ احرام کھولنے کے بعد شکار کی اجازت ہے۔

﴿۱۱﴾ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ: اللہ کے فضل سے مراد یہاں روزی تلاش کرنا ہے، یعنی جس طرح یہود کے لیے یوم السبت (ہفتہ) کو سارا دن شکار منع تھا تم پر ایسی کوئی پابندی نہیں، صرف اذان سے لے کر نماز سے فراغت تک خطبہ اور نماز میں حاضری کے سوا ہر کام منع ہے، اس کے بعد جس حلال طریقے سے روزی کما سکتے ہو کماد۔

وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انْفَضُّوا إِلَيْهَا وَتَرَكُوكَ قَائِمًا ۗ قُلْ مَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ مِّنْ

اور جب انھوں نے کوئی تجارت دیکھی یا تماشہ تو اٹھ کر اس کی طرف چلے گئے اور انھوں نے تجھے کھڑا چھوڑ دیا، کہہ

③ **وَإِذْكُرُوا اللَّهَ كَيْبَرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ**: یعنی روزی کی تلاش میں مصروفیت کے دوران بھی اللہ کی یاد سے غافل نہ ہو جاؤ، بلکہ اسے بہت زیادہ یاد کرتے رہو۔ اللہ کی یاد دل سے بھی ہوتی ہے، زبان سے بھی اور ہر کام اللہ تعالیٰ کو یاد رکھتے ہوئے اس کے حکم کے مطابق ادا کرنے کے ساتھ بھی۔ مزید دیکھیے سورۃ احزاب (۴۱، ۴۲) کی تفسیر۔

آیت 11 ① **وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انْفَضُّوا إِلَيْهَا**.....: اس سے پہلے عام تراجم کے مطابق اس آیت کا ترجمہ ”اور جب وہ کوئی تجارت یا تماشہ دیکھتے ہیں تو اٹھ کر اس کی طرف چلے جاتے ہیں اور تجھے کھڑا چھوڑ جاتے ہیں“ کیا گیا تھا۔ اس ترجمہ کی وجہ یہ ہے کہ لفظ ”إِذَا“ عموماً مستقبل کے لیے آتا ہے، حالانکہ اس مقام پر یہ لفظ مستقبل نہیں بلکہ ماضی کے معنی میں استعمال ہوا ہے، لہذا آیت کا مذکورہ بالا ترجمہ درست نہیں، بلکہ درست ترجمہ یہ ہے: ”اور جب انھوں نے کوئی تجارت دیکھی یا تماشہ تو اٹھ کر اس کی طرف چلے گئے اور انھوں نے تجھے کھڑا چھوڑ دیا۔“ قرینہ اس کا یہ ہے کہ یہ فعل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے صرف ایک دفعہ سرزد ہوا ہے، اس کے بعد انھوں نے کبھی ایسا نہیں کیا، اس لیے یہ کہنا کہ وہ جب بھی کوئی تجارت یا تماشہ دیکھتے تھے تو اٹھ کر چلے جاتے تھے اور رسول اللہ ﷺ کو کھڑا چھوڑ جاتے تھے، ہرگز درست نہیں، بلکہ یہاں ماضی میں ہونے والے معاملے کا ذکر ہے جو صرف ایک دفعہ واقع ہوا ہے۔

مفسر ابراہیم میر سیالکوٹی نے ”شہادۃ القرآن“ (جلد دوم) میں اس کے متعلق بہت عمدہ بحث لکھی ہے، وہ فرماتے ہیں: ”إِذْ“ اور ”إِذَا“ دو کلمے ظروف زمانیہ میں سے ہیں۔ ”إِذْ“ ماضی کے لیے آتا ہے اور کبھی بمعنی مستقبل بھی ہوتا ہے، جیسا کہ ”إِذَا“ مستقبل کے لیے اور کبھی ماضی کے لیے بھی آتا ہے، چنانچہ معنی (معنی اللیب) میں ”إِذَا“ کی بحث میں لکھا ہے: ”أَحَدُهُمَا أَنْ تَجِيءَ لِلْمَاضِي كَمَا تَجِيءُ إِذْ لِلْمُسْتَقْبَلِ.“ ”إِذَا“ بمعنی ”إِذْ“ کی مثال یہ آیت ہے: ﴿وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انْفَضُّوا إِلَيْهَا وَتَرَكُوكَ قَائِمًا﴾ [الجمعة: ۱۱] ”اور جس وقت انھوں نے تجارت یا کھیل کا سامان دیکھا تو اس کی طرف اٹھ گئے اور تجھے کھڑا چھوڑ دیا۔“ اور یہ آیت: ﴿حَتَّىٰ إِذَا صَافَتْ عَلَيْهِمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَصَافَتْ عَلَيْهِمُ أَنْفُسُهُمْ﴾ [التوبة: ۱۱۸] ”یہاں تک کہ جس وقت زمین ان پر باوجود فراخ ہونے کے تنگ ہو گئی اور ان کی جانیں بھی ان کو گراں معلوم ہوئیں۔“ اور ”إِذْ“ بمعنی ”إِذَا“ یعنی مستقبل کی مثال یہ آیت ہے: ﴿فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ﴾ [إِذَا الْأَعْلَىٰ فِي أَعْنَاقِهِمْ﴾ [المومن: ۷۰، ۷۱] ”پس یہ لوگ اس وقت ضرور جان لیں گے، جب ان کی گردنوں میں طوق پڑیں گے۔“ کیونکہ ”سَوْفَ“ جو خاص استقبال کے لیے موضوع ہے، قرینہ موجود ہے۔“ اس کے بعد مولانا میر سیالکوٹی نے اشعار عرب سے اس کی مثالیں ذکر فرمائی ہیں۔

② **وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انْفَضُّوا إِلَيْهَا**.....: ”فَضُّ يَفْضُ فَضًّا“ (ن) ”الشَّيْءُ“ کسی چیز کو توڑ کر ریزہ ریزہ کر دینا۔ ”انْفَضُّ“ (انفعال) بکھر جانا، منتشر ہو جانا۔ مدینہ میں ایک تجارتی قافلے کی آمد پر صحابہ کے اٹھ کر چلے جانے پر

اللَّهُوْ وَمِنَ التِّجَارَةِ ۗ وَاللَّهُ خَيْرُ الرَّزُقِينَ ۝۱۱

دے جو اللہ کے پاس ہے وہ تماشے سے اور تجارت سے بہتر ہے اور اللہ سب رزق دینے والوں سے بہتر ہے ۝۱۱

ناراضی کا اظہار ہو رہا ہے۔ جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ جمعہ کے دن ایک قافلہ آیا جب کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے، تو بارہ آدمیوں کے سوا سب اس کی طرف اٹھ کر چلے گئے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انفَضُّوا إِلَيْهَا﴾ [بخاری، التفسیر، باب: ﴿وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا﴾: ۴۸۹۹ | جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما

ہی سے روایت ہے کہ جمعہ کے دن رسول اللہ ﷺ خطبہ دے رہے تھے، اس دوران مدینہ میں ایک قافلہ آیا تو رسول اللہ ﷺ کے اصحاب جلدی سے اٹھ کر چلے گئے، حتیٰ کہ آپ کے پاس صرف بارہ آدمی رہ گئے، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ! لَوْ تَتَابَعْتُمْ حَتَّى لَا يَبْقَى مِنْكُمْ أَحَدٌ لَسَأَلْتُ بِكُمْ الْوَادِي النَّارَ، فَفَزَلْتُ هَذِهِ الْآيَةَ: ﴿وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انفَضُّوا إِلَيْهَا وَتَرَكُوكَ قَائِمًا﴾ وَقَالَ فِي الْأَثْنِ عَشَرَ الَّذِينَ نَبَتُوا مَعَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَبُو بَكْرٍ وَعُمَرُ » [مسند أبي يعلى: ۳/۴۶۸، ح: ۱۹۷۹، قال المحقق حسين سليم أسد إسناده صحيح] [اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر تم سب ایک دوسرے کے پیچھے چلے جاتے، حتیٰ کہ تم میں سے

ایک بھی باقی نہ رہتا تو یہ وادی تمہیں آگ کے ساتھ بہا کر لے جاتی۔“ اس پر یہ آیت اتری: ﴿وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انفَضُّوا إِلَيْهَا وَتَرَكُوكَ قَائِمًا﴾ جابر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ”ان باقی رہنے والے بارہ آدمیوں میں ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما بھی تھے۔“

۳ اس آیت سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کھڑے ہو کر خطبہ دیتے تھے، اس لیے عذر کے بغیر بیٹھ کر خطبہ نہیں دینا چاہیے۔

عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ”رسول اللہ ﷺ جمعہ کے دن کھڑے ہو کر خطبہ دیتے، پھر بیٹھ جاتے، پھر کھڑے ہو جاتے، جیسا کہ

آج کل کرتے ہیں۔“ [مسلم، الجمعة، باب ذكر الخطبتين قبل الصلاة وما فيهما من الجلسة: ۸۶۱]

۴ جابر بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: «كَانَتْ لِنَبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حُطْبَتَانِ يَجْلِسُ بَيْنَهُمَا يَقْرَأُ الْقُرْآنَ وَ يُذَكِّرُ النَّاسَ» [مسلم، الجمعة، باب ذكر الخطبتين قبل الصلاة وما فيهما من الجلسة: ۸۶۲] ”نبی ﷺ دو خطبے دیا

کرتے تھے، ان دونوں کے درمیان بیٹھتے تھے، آپ قرآن پڑھتے اور لوگوں کو نصیحت کرتے۔“ اس حدیث سے کئی باتیں ثابت ہوئیں، ایک یہ کہ جمعہ کے دو خطبے ہیں، جو کھڑے ہو کر دیے جاتے ہیں اور ان کے درمیان بیٹھا جاتا ہے۔ دوسری یہ کہ

جمعہ کے خطبے میں یہ دو چیزیں ہوں تو وہ رسول اللہ ﷺ والا خطبہ ہے ورنہ نہیں، ایک یہ کہ اس میں قرآن مجید ضرور پڑھا جائے خواہ ایک آیت ہی ہو اور دوسری یہ کہ اس میں نصیحت کی جائے، اگر کسی خطبے میں تذکیر (نصیحت) نہیں تو وہ رسول اللہ ﷺ والا خطبہ نہیں۔ ظاہر ہے کہ نصیحت کا مقصد یہی ہے کہ لوگ اسے سمجھیں اور اس پر عمل کریں اور یہ مقصد تمہی حاصل ہو سکتا ہے

جب لوگوں کو ان کی زبان میں سمجھایا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ جمعہ مسلمانوں کی ہفتہ وار عید ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے ذکر، اس کی حمد و ثنا، قرآن و سنت کی تعلیم اور

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا اہتمام ہوتا ہے اور وہ آئندہ سات دنوں کے لیے نئے سرے سے معروف عمل ہو جاتے ہیں۔ چونکہ یہ مذہبی شعار ہے اس لیے کوئی حکومت بھی اس اجتماع کو ختم نہیں کر سکتی۔ مسلمانوں کو عمل کے اندر کوتاہی یا وین حق سے انحراف یا کفار سے جہاد میں غفلت کی صورت میں ان کے علماء انھیں ان کا فریضہ یاد دلاتے ہیں، مگر جس طرح دوسرے کئی شعار کا حال خراب ہوا جمعہ کے متعلق بھی بعض لوگوں نے اپنے پاس سے ایسی کئی پابندیاں لگا دیں جن کی وجہ سے مسلمان عملاً اس کے فوائد سے محروم ہو گئے۔ ہر جمعہ کو تمام مسلمان قرآن و سنت کا جو علم حاصل کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ کے احکام سے آگاہ ہوتے تھے، اب اپنے مسائل کے لیے ان علماء کے محتاج ہو گئے جو قرآن و حدیث سے مسائل لینے کے بجائے کسی ایک فقہی مکتب کے مقلد تھے، ان علماء کے مطابق قرآن مجید کا ترجمہ عام آدمی کے لیے پڑھنا ہی درست نہ تھا۔ مدت تک برصغیر میں قرآن مجید کے فارسی یا اردو ترجمے کی کسی کو جرأت ہی نہیں ہوئی۔ ان کے مطابق عام مسلمان کا کام یہ ہے کہ وہ خود قرآن یا حدیث دیکھنے کے بجائے عالم سے مسئلہ پوچھے اور اس عالم کا کام یہ ہے کہ قرآن یا حدیث میں سے مسئلہ بتانے کے بجائے اپنے امام کا قول بیان کرے۔ اس جمعہ میں قرآن یا حدیث کے بیان کا جو امکان تھا وہ انھوں نے اس طرح ختم کیا کہ اس کے لیے شہر اور حاکم کی شرط لگا دی، تو چند مقامات کے سوا باقی ہر جگہ جمعہ ویسے ہی بند ہو گیا، جبکہ عورتوں کے لیے مسجد میں آنا سرے سے ممنوع قرار دیا۔ پھر یہ شرط لگائی کہ جمعہ کا خطبہ صرف عربی میں ہوگا، تاکہ کوئی شخص قرآن و سنت سے واقف نہ ہو سکے، حالانکہ جس امام کے وہ مقلد ہیں ان کے نزدیک نماز میں بھی قرآن کی تلاوت فارسی یا کسی اور زبان میں کی جاسکتی ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں مدتوں یہی سلسلہ جاری رہا، آخر کار جب عمل بالحدیث کا غلغلہ بلند ہوا اور تھلید کی پابندیوں سے آزاد علماء نے اردو میں خطبہ شروع کیا اور لوگوں کو اصل قرآن و سنت سننے کا موقع ملا تو بجائے اس کے کہ وہ حضرات بھی اردو میں خطبہ دیتے، انھوں نے اذان کے بعد والے دو خطبے عربی میں ضروری قرار دینے پر اصرار جاری رکھا، مگر اس کے ساتھ اپنے مذہب کے دفاع کے لیے اردو میں ایک خطبے کا اضافہ کر دیا اور اس کا نام تقریر رکھ دیا، حالانکہ خطبہ ہو یا خطاب یا تقریر، ایک ہی چیز ہے۔ ان حضرات نے یہ خیال نہیں فرمایا کہ اس طرح انھوں نے اردو میں خطبہ دے کر ایک تو وہی کام کیا جس سے وہ دوسروں کو روکتے تھے اور ایک یہ کہ انھوں نے دو خطبوں کے بجائے تیسرے خطبے کی بدعت ایجاد کر لی۔ یاد رکھیں کہ اگر ہم رسول اللہ ﷺ والا خطبہ جمعہ دینا چاہتے ہیں تو اس میں تذکیر (نصیحت) ضروری جز ہے، بلکہ یہ خطبے کا اصل مقصود ہے اور وہ لوگوں کو ان کی زبان میں سمجھائے بغیر ممکن نہیں۔ اس لیے خطبے صرف دو ہونے چاہئیں اور عربی کے ساتھ ساتھ اسے مخاطب لوگوں کی زبان میں بھی سمجھانے کا اہتمام ہونا چاہیے۔

www.KitaboSunnat.com

﴿كُلُّ مَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ مِنَ اللَّهْوِ وَ مِنَ السِّجَارَةِ.....﴾ یعنی اللہ کی خاطر تم جس لہو (کھیل تماشے) اور تجارت کو چھوڑو گے اللہ کے پاس اس سے کہیں بہتر بدلہ دینا اور آخرت دونوں میں موجود ہے۔

● صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے نادانی میں یہ عمل ہوا اور اللہ تعالیٰ نے اس پر تنبیہ فرمائی، اس کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جس طرح اللہ کے ذکر اور نماز کو تجارت وغیرہ پر ترجیح دی اس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورہ نور (۳۶، ۳۷) میں فرمایا ہے۔



إِذَا جَاءَكَ الْمُنْفِقُونَ قَالُوا نَشْهَدُ إِنَّكَ لَرَسُولُ اللَّهِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِنَّكَ لَرَسُولُهُ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

جب منافق تیرے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں ہم شہادت دیتے ہیں کہ تو یقیناً اللہ کا رسول ہے اور اللہ جانتا ہے کہ تو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جمعہ کی نماز میں سورہ جمعہ اور سورہ منافقون پڑھا کرتے تھے۔

[مسلم، الجمعة، باب ما يقرأ في صلاة الجمعة : ۸۷۷]

آیت 1 : ① إِذَا جَاءَكَ الْمُنْفِقُونَ: "الْمُنْفِقُونَ" "النَّافِقَاءُ" سے مشتق ہے جو "یربوع" (جو بے سے ملتے جلتے ایک جنگلی جانور) کے بل کا ایک منہ ہوتا ہے، وہ اسے اس طرح بتاتا ہے کہ اس جگہ مٹی کی صرف اتنی تیر رہنے دیتا ہے کہ سر مارے تو کھل جائے، اس منہ کو وہ چھپا کر رکھتا ہے اور دوسرا منہ ظاہر کر دیتا ہے۔ منافق بھی چونکہ اپنا کفر چھپاتا اور ایمان ظاہر کرتا ہے، اس لیے اس کا یہ نام رکھا گیا ہے۔ یہ ایک خالص اسلامی اصطلاح ہے، مراد اس سے عبد اللہ بن ابی اور اس کے ساتھی ہیں۔

② رسول اللہ ﷺ کی مدینہ تشریف آوری سے کچھ عرصہ پہلے اس اور خزرج کے درمیان ہونے والی جنگ بعاث میں ان کے بڑے بڑے سردار مارے گئے، ابھی وہ سوچ ہی رہے تھے کہ وہ اپنا ایک متفقہ سردار مقرر کر لیں، بلکہ طے کر چکے تھے کہ عبد اللہ بن ابی کی باقاعدہ تاج پوشی کر کے اسے اپنا سردار بنا لیں۔ اسی اثنا میں چند سعادت مند حج کے لیے مکہ گئے اور رسول اللہ ﷺ کی دعوت پر مسلمان ہو گئے۔ اگلے دو سالوں میں مزید لوگوں نے جا کر بیعت کی اور آخری بار انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو مدینہ آنے کی دعوت دی۔ ان سالوں میں مدینہ کے ہر گھر میں اسلام پہنچ چکا تھا، رسول اللہ ﷺ کی آمد پر اس اور خزرج کے بااثر لوگوں سمیت ان کی اکثریت مسلمان ہو گئی۔ آپ ﷺ کی وجہ سے عبد اللہ بن ابی اور اس کے حامیوں کی سرداری کی امید ناکام ہوئی تو وہ آپ ﷺ کے شدید دشمن بن گئے۔ کچھ مدت تک تو وہ کھلم کھلا عداوت کا اظہار کرتے رہے، مگر بدر کی عظیم الشان فتح کے بعد ان کے پاس مدینہ میں رہنے کے لیے مسلمان ہونے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا تو وہ مسلمان ہو گئے، حتیٰ کہ عبد اللہ بن ابی بھی مسلمان ہو گیا، مگر ان کا اسلام صرف جان بچانے کے لیے اور وہ فوائد حاصل کرنے کے لیے تھا جو مسلمانوں کو عزت و قوت اور فتح و غنیمت کی صورت میں حاصل تھے۔ یہ لوگ نمازیں پڑھتے، روزے رکھتے، زکوٰۃ دیتے اور جہاں غنیمت کی امید ہوتی جہاد میں بھی جاتے تھے، مگر دل سے اب بھی ایمان نہیں لائے تھے بلکہ ہر موقع پر انھوں نے مسلمانوں کو دھوکا دیا اور نقصان پہنچایا۔ جنگ احد میں یہ لوگ لشکر کا تیسرا حصہ لے کر میدان جنگ سے واپس چلے گئے۔ بنو نضیر، بنو قریظہ اور خیبر والوں کو جنگ پر اور مسلمانوں کے خلاف ڈٹ جانے پر ابھارتے رہے، خندق اور دوسرے مواقع پر انھوں نے کفار کے ساتھ ساز باز رکھی اور جب موقع ملتا رسول اللہ ﷺ، مسلمانوں اور

وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ①

یقیناً اس کا رسول ہے اور اللہ شہادت دیتا ہے کہ یہ منافق یقیناً جھوٹے ہیں ①

اسلام کے متعلق گستاخانہ باتیں کرتے، جیسا کہ اگلی آیات میں آرہا ہے۔ لیکن جب ایسی باتیں سامنے آنے پر ان سے باز پرس کی جاتی تو وہ قسمیں کھا جاتے کہ ہم مسلمان ہیں اور آپ ﷺ کو اللہ کا رسول مانتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ ان کی گستاخوں سے درگزر فرماتے رہے، کیونکہ یہ لوگ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو چکے تھے اور مخلص مسلمانوں کے عزیز اور رشتہ دار بھی تھے۔ اگر آپ انھیں قتل کرتے تو بہت سی بدگمانیاں پیدا ہونے کا اندیشہ تھا، اس لیے آپ سب کچھ برداشت کرتے رہے، حتیٰ کہ آخر کار آپ ﷺ کے صبر و ضبط اور غفور و حلیم کی وجہ سے ان کی حقیقت کھل کر سب کے سامنے آگئی اور وہ مخلص مسلمانوں کی نگاہ میں بالکل بے قدر و قیمت ہو کر رہ گئے، ان کا کوئی اعتبار باقی نہ رہا۔ ان کا کچھ حال سورہ بقرہ (۲۰ تا ۲۸)، آل عمران، نساء، مائدہ، توبہ، سورہ احزاب اور دوسرے مقامات پر گزر چکا ہے۔

③ قَالُوا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُولُ اللّٰهِ: ”اِنِّ“ اور ”لام تاکید“ عموماً قسم کے جواب میں آتے ہیں اور قسم جیسی تاکید کا فائدہ دیتے ہیں۔ شہادت اس بات کی خبر دینے کو کہتے ہیں جس کا دل سے یقین ہو۔ منافقین کی عادت تھی کہ وہ قسمیں کھا کر اپنی وفاداری کا یقین دلانے کی کوشش کرتے رہتے تھے، جب کہ مخلص مسلمانوں کو اس کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔ مزید دیکھیے سورہ نساء (۶۲)، توبہ (۶۴، ۶۵، ۶۶، ۷۳، ۷۴، ۷۵) اور سورہ مجادلہ (۱۸) کی تفسیر۔

④ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اَنَّكَ لَرَسُولُ اللّٰهِ..... : یہ منافقین کا قول نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے، اس لیے اگر وقف کرنا ہو تو ”اِنَّكَ لَرَسُولُ اللّٰهِ“ پر کرنا چاہیے، آیت شروع کر کے ”اِنَّكَ لَرَسُولُ اللّٰهِ“ پر وقف سے وہم پڑھتا ہے کہ یہ دونوں جملے منافقین کا قول ہیں۔ یہاں ایک سوال ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس بات کی تصدیق فرمائی کہ آپ یقیناً اللہ کے رسول ہیں تو یہ کیوں فرمایا کہ اللہ شہادت دیتا ہے کہ بلاشبہ یہ منافق یقیناً جھوٹے ہیں اور منافق جھوٹے کس طرح ہوئے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ ان کا یہ کہنا جھوٹ نہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، بلکہ یہ سچ ہے اور اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر اس کی تصدیق فرمائی کہ ”وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اَنَّكَ لَرَسُولُ اللّٰهِ“ یعنی اللہ جانتا ہے کہ بلاشبہ آپ یقیناً اس کے رسول ہیں، منافقین کو جھوٹا اس لیے فرمایا کہ انھوں نے کہا کہ ہم شہادت دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، حالانکہ وہ اس بات کی شہادت نہیں دیتے بلکہ یہ بات صرف زبان سے کہہ رہے ہوتے ہیں، دل سے وہ آپ کو اس کا رسول نہیں مانتے۔ شہادت میں سچے وہ تب ہوتے جب وہ دل اور زبان دونوں سے آپ کی رسالت کا اقرار کرتے۔

زمخشری نے فرمایا کہ اگر درمیان میں جملہ ”وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اَنَّكَ لَرَسُولُ اللّٰهِ“ نہ ہوتا تو کلام اس طرح ہوتا تھا: ”اِذَا جَاءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُولُ اللّٰهِ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ“ ”جب تیرے پاس منافق آتے ہیں تو کہتے ہیں ہم شہادت دیتے ہیں کہ بلاشبہ تو یقیناً اللہ کا رسول ہے اور اللہ شہادت دیتا ہے کہ بلاشبہ یہ منافق یقیناً

إِتَّخَذُوا أَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ إِنَّهُمْ سَاءَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱﴾ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا فَطُبِعَ عَلَى قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُونَ ﴿۲﴾ وَإِذَا رَأَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ

انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا لیا، پس انہوں نے اللہ کی راہ سے روکا۔ یقیناً یہ لوگ جو کچھ کرتے رہے ہیں برا ہے ﴿۱﴾ یہ اس لیے کہ وہ ایمان لائے، پھر انہوں نے کفر کیا تو ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی، سو وہ نہیں سمجھتے ﴿۲﴾ اور جب تو انہیں دیکھے تجھے ان کے جسم اچھے لگیں گے اور اگر وہ بات کریں تو تو ان کی بات پر کان لگائے گا، گویا وہ جھوٹے ہیں“ لیکن اس سے وہم پڑ سکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس بات میں جھوٹا کہہ رہے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، اس لیے درمیان میں یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ آپ یقیناً اللہ کے رسول ہیں، پھر فرمایا اور اللہ تعالیٰ شہادت دیتا ہے کہ یہ منافق جھوٹے ہیں، یعنی ان کا یہ کہنا جھوٹ ہے کہ ہم شہادت دیتے ہیں۔

آیت 2 : إِتَّخَذُوا أَيْمَانَهُمْ جُنَّةً اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ مجادلہ کی آیت (۱۶) کی تفسیر۔ ”سَبِيلِ اللَّهِ“ سے مراد اسلام بھی ہے اور جہاد بھی۔

آیت 3 : ﴿۱﴾ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا: ”ذَلِكَ“ کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کا مومن ہونے کی جھوٹی قسمیں کھانا اور اللہ کی راہ سے روکنا وغیرہ اس لیے ہے کہ وہ ایمان لائے، پھر انہوں نے کفر کیا۔ ایمان لا کر کفر تین طرح سے ہے، ایک یہ کہ وہ ظاہر میں ایمان لائے اور مسلمان ہو گئے مگر دل میں کافر ہی رہے۔ ایک یہ کہ مسلمانوں کے پاس آئے تو ایمان کی شہادت دی، پھر کفار کے پاس گئے تو انہیں اپنے کفر کا یقین دلایا، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَإِذَا نَالُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا بِهِ إِذَا حَلَّوْا إِلَىٰ شَيْطَانِهِمْ قَالُوا لَآ إِلَهَ إِلَّا مَا نَعْبُدُ﴾ [البقرة: ۱۷۴] ”اور جب وہ ان لوگوں سے ملتے ہیں جو ایمان لائے تو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے اور جب اپنے شیطانوں کی طرف اکیلے ہوتے ہیں تو کہتے ہیں بے شک ہم تمہارے ساتھ ہیں۔“ منافقین کی اکثریت ایسی ہی تھی اور ایک یہ کہ ان میں سے بعض شروع میں تو صحیح ایمان لائے، پھر دنیوی اغراض کی وجہ سے کافر ہو گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ منافقین میں سے جو لوگ تائب ہوئے اور ان کا اسلام خالص ہوا وہ اس گروہ سے تھے۔

آیت 4 : ﴿۲﴾ فَطُبِعَ عَلَى قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُونَ: یعنی ان کے ایمان لانے کے بعد کفر کرنے کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر کر دی گئی تو وہ نہ دنیا اور آخرت میں نفاق کے نقصان کو سمجھتے ہیں نہ انہیں اس پر کوئی شرمندگی ہوتی ہے اور نہ ہی توبہ کی توفیق ملتی ہے۔

آیت 4 : ﴿۱﴾ وَإِذَا رَأَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ أَجْسَافُهُمْ: اکثر منافقین خوش حال، صاحبِ حیثیت، تیز طرار اور ہوشیار لوگ تھے، ان کی خوش حالی اور مال کی حرص ہی ان کے نفاق کا باعث تھی۔ ان کا سردار عبد اللہ بن ابی معاشی لحاظ سے بھی رئیس تھا اور دیکھنے میں بھی بڑا خوب صورت، لمبے قد والا اور جسم تھا۔ زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے اس کے اور اس کے ساتھیوں کے متعلق فرمایا:

أَجْسَامُهُمْ ۖ وَإِنْ يَقُولُوا تَسْمَعُ لِقَوْلِهِمْ ۖ كَانَتْهُمْ حُشْبٌ مُّسْتَدَّةٌ ۖ يَحْسَبُونَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ۖ هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ ۖ قَاتَلَهُمُ اللَّهُ ۖ أَنْى يُؤْفَكُونَ ﴿۵﴾

ایک لگائی ہوئی لکڑیاں ہیں، ہر بلند آواز کو اپنے خلاف گمان کرتے ہیں۔ یہی اصل دشمن ہیں، پس ان سے ہوشیار رہ۔ اللہ انہیں ہلاک کرے، کہاں بہکائے جا رہے ہیں ﴿۵﴾

« كَانُوا رَجَالًا أَجْمَلُ شَيْءٍ » [بخاری: ۴۹۰۳] ”وہ بہت خوبصورت آدمی تھے۔“ مزید تفصیل آگے آیت (۷) کی تفسیر میں دیکھیے۔ جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ (بدر کے قیدیوں میں سے) عباس مدینہ میں تھے، انصار نے انہیں پہنانے کے لیے کپڑا تلاش کیا مگر انہیں عبداللہ بن ابی کی قیص کے علاوہ کوئی قیص نہ ملی جو ان کے جسم پر پوری آتی ہو، چنانچہ انہوں نے وہی ان کو پہنا دی۔ [نسائی، الجنائز، باب القمیص فی الکفن: ۱۹۰۳، وقال الألبانی صحیح] اہل علم فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن ابی کی وفات پر آپ ﷺ نے اسے اپنی قیص جو پہنائی اس پر دوسری مصلحتوں کے علاوہ اس احسان کا بدلا اتارنا بھی مقصود تھا۔ اللہ تعالیٰ نے بھجلی آیت میں ”فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ“ کے الفاظ کے ساتھ منافقین کی ناسمجھی بیان کرنے کے ساتھ ہی فرمایا کہ اے مخاطب! جب تو انہیں دیکھے تو ذیل ڈول اور خوبصورتی کی وجہ سے ان کے جسم تجھے بہت اچھے دکھائی دیں گے اور اگر وہ بات کریں تو ایسے فصیح و بلیغ ہیں کہ تو ان کی بات سنتا ہی رہ جائے۔ ان کی چرب زبانی کا ذکر سورہ بقرہ (۲۰۳) میں بھی آیا ہے۔ یہاں بعض مفسرین نے ”وَإِذَا رَأَيْتَهُمْ تُنْجِبُكَ أَجْسَامُهُمْ“ میں مخاطب رسول اللہ ﷺ کو قرار دیا ہے، مگر بہتر ہے کہ اسے ہر مخاطب کے لیے عام رکھا جائے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ تو شروع سے انہیں دیکھتے آرہے تھے۔ ﴿۵﴾ ظاہر ہے کہ ”إِذَا رَأَيْتَهُمْ“ (جب تو انہیں دیکھے) سے عبداللہ بن ابی اور اس جیسے منافق مراد ہیں، کیونکہ تمام منافق تو حسین و جمیل نہیں تھے اور نہ ہی ایسے فصیح و بلیغ تھے۔ (التہلیل)

﴿۵﴾ كَانَتْهُمْ حُشْبٌ مُّسْتَدَّةٌ: ”حُشْبٌ“ کی جمع ہے، لکڑیاں۔ اس وزن کی یہ جمع بہت کم آتی ہے۔ مفسرین نے اس کی نظیر ”نَمْرَةٌ“ کی جمع ”نُمُرٌ“ لکھی ہے۔ ”مُسْتَدَّةٌ“ باب تفعیل سے اسم مفعول ہے، دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر رکھی ہوئی۔ یعنی جیسے لکڑیوں میں طول و عرض اور خوبصورتی کے باوجود عقل اور سمجھ نہیں ہوتی اسی طرح یہ بھی عقل اور سمجھ سے عاری ہیں۔ جب یہ آپ کی مجلس میں دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھے ہوں تو یہ مت سمجھیں کہ یہ آدمی ہیں، بلکہ یوں سمجھیں کہ لکڑیاں ہیں جو ٹیک لگا کر دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی ہیں، گو بظاہر خوبصورت نظر آتے ہیں۔ زمخشری نے فرمایا کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ حسین و جمیل اور جسیم و عریض ہونے کے باوجود ان سے کسی نفع کی امید نہیں، جس طرح کارآمد لکڑی چھت، دروازے یا کھڑکیوں میں یا کہیں نہ کہیں استعمال ہوتی ہے، مگر بے کار لکڑیوں کو دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر رکھ دیا جاتا ہے۔ ﴿۵﴾ يَحْسَبُونَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ: اس میں ان کی بزدلی کا نقشہ کھینچا ہے کہ جوں ہی کوئی آواز بلند ہوتی ہے یا شور اٹھتا ہے

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُولُ اللَّهِ لَوَّوْا رُءُوسَهُمْ وَرَأَيْتَهُمْ يَصُدُّونَ
وَهُمْ مُسْتَكْبِرُونَ ⑤ سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ أَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۗ لَنْ يَغْفِرَ
اللَّهُ لَهُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ⑥

اور جب ان سے کہا جائے آؤ اللہ کا رسول تمہارے لیے بخشش کی دعا کرے تو وہ اپنے سر پھیر لیتے ہیں اور تو انہیں دیکھے گا کہ وہ منہ پھیر لیں گے، اس حال میں کہ وہ تکبر کرنے والے ہیں ⑤ ان پر برابر ہے کہ تو ان کے لیے بخشش کی دعا کرے، یا ان کے لیے بخشش کی دعا نہ کرے، اللہ انہیں ہرگز معاف نہیں کرے گا، بے شک اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا ⑥

تو وہ اسے اپنے آپ پر پڑنے والی افتاد ہی سمجھتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کفار کا حملہ ہو گیا ہو جس میں ہمیں لڑنا پڑے اور اس میں ہماری موت ہو۔ (دیکھیے احزاب: ۱۹) یا رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کو ہمارے خبیث باطن کا پتا چل گیا ہو اور ہمارے خلاف کارروائی کا حکم آ گیا ہو، یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیں رسوا کرنے والی یا ہمارے قتل کے حکم والی کوئی آیت یا سورت اتری ہو۔ (دیکھیے توبہ: ۶۴)

⑤ هُمْ الْعَدُوُّ فَاحْذَرُوهُمْ: "الْعَدُوُّ" خبر پر الف لام لانے سے کلام میں حصر پیدا ہو رہا ہے کہ تمہارے اصل دشمن یہی ہیں، کیونکہ کھلم کھلا کفار کی عداوت ظاہر ہے جس سے بچاؤ آسان ہے، یہ گھر کے بھیدی اور آستین کے سانپ ہیں جو مسلمان بن کر ہر وقت تمہارے ساتھ ہیں۔ ان کی عداوت زیادہ خطرناک ہے اور اس سے بچنا بہت مشکل ہے، اس لیے ان سے ہوشیار رہیں۔

⑥ قَاتِلُوهُمْ اللَّهُ: یہ بد دعا کا کلمہ ہے، اللہ انہیں ہلاک کرے۔ یہاں ایک سوال ہے کہ اللہ تعالیٰ کو دعا یا بد دعا کی کیا ضرورت ہے، وہ تو جو چاہے کر سکتا ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ یہاں ان کے حق میں لوگوں کی زبان پر آنے والی بد دعا نقل کی گئی ہے۔ مراد ان کی مذمت ہے۔

⑦ اَنۡیۡ یُّؤۡفَکُوۡنَ: یعنی اتنے واضح دلائل کے باوجود ایمان چھوڑ کر یہ لوگ کہاں بہکائے جا رہے ہیں۔

آیت 5 ﴿۱﴾ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ : "لَوَّوْا" "لَوَّى يَلْوِي لِيًا" (ض) (پھیرنا) سے باب تفعیل ہے، جس سے مر پھیرنے میں سبالغہ یا اس کا تکرار مقصود ہے۔ آیت (۷) میں اس کا سبب نزول آ رہا ہے۔

② وَرَأَيْتَهُمْ يَصُدُّونَ وَهُمْ مُسْتَكْبِرُونَ: "صَدَّ يَصُدُّ صَدًّا وَصُدُّوْا" (ان) "صَدًّا" (متعدی) روکنا اور "وَصُدُّوْا" (لازم) اعراض کرنا، منہ پھیر لینا۔ یعنی رسول اللہ ﷺ کے پاس جا کر معذرت کر لینے کی ترغیب پر تم انہیں دیکھو گے کہ وہ تکبر کرتے ہوئے منہ پھیر لیں گے۔

آیت 6 ﴿۲﴾ سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ أَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ : "أَسْتَغْفَرْتَ" اصل میں "عَسْتَغْفَرْتَ" ہے،

هُمُ الَّذِينَ يَقُولُونَ لَا تُنْفِقُوا عَلٰی مَنْ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ حَتَّىٰ يَنْفَضُوا ۗ وَ لِلَّهِ
خَزَائِنُ السَّمَوٰتِ وَ الْأَرْضِ وَ لَكِنَّ السُّفٰهِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝

یہ وہی ہیں جو کہتے ہیں کہ ان لوگوں پر خرچ نہ کرو جو اللہ کے رسول کے پاس ہیں، یہاں تک کہ وہ منتشر ہو جائیں، حالانکہ آسمانوں کے اور زمین کے خزانے اللہ ہی کے ہیں اور لیکن منافق نہیں سمجھتے ۝

ہمزہ تسویہ آنے کے بعد ہمزہ وصل کی ضرورت نہ رہی، اس لیے وہ گر گیا۔ اس میں ہمزہ استفہام کا نہیں ہے، بلکہ اسے ہمزہ تسویہ کہتے ہیں۔ (دیکھیے بقرہ: ۶) آیت کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ توبہ (۸۰) کی تفسیر۔ اس سے مقصود آپ ﷺ کی ان کے لیے معافی کی امید کو ختم کرنا ہے، کیونکہ منافقوں کی تمام شرارتوں اور بے ادبیوں کے باوجود آپ ﷺ اپنی طبعی رحمت و شفقت کی بنا پر چاہتے تھے کہ ان کے لیے معافی کی دعا فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان کے لیے معافی کی دعا سے منع فرمادیا، کیونکہ ان کا فسق حد سے بڑھ چکا تھا۔

آیت 7 ۝ ۱ ۝ هُمُ الَّذِينَ يَقُولُونَ لَا تُنْفِقُوا عَلٰی مَنْ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ... اس آیت میں اور اس سے اگلی آیت

میں ان منافقین کے فسق کے نمونے کے طور پر ان کے کچھ گستاخانہ جملے ذکر فرمائے ہیں، جن سے ان کی اسلام اور مسلمانوں سے شدید نفرت اور دلی بغض کا اظہار ہو رہا ہے۔ گویا بتایا جا رہا ہے کہ یہ ہے ان کا بدترین فسق جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ انھیں ہدایت نہیں دیتا اور جس کی وجہ سے ان کے حق میں رسول اللہ ﷺ کے استغفار کا بھی کوئی فائدہ نہیں۔

زید بن ارقم رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: «عَرَجْنَا مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي سَفَرٍ أَصَابَ النَّاسَ فِيهِ شِدَّةٌ، فَقَالَ عِنْدَ اللَّهِ بْنِ أَبِي لَاصْحَابِهِ لَا تُنْفِقُوا عَلٰی مَنْ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ حَتَّىٰ يَنْفَضُوا مِنْ حَوْلِهِ وَقَالَ لَيْنٌ رَّحَعْنَا إِلَى الْمَدِينَةِ لِيُخْرِجَنَّ الْأَعَزُّ مِنْهَا الْأَذَلَّ فَأَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأُخْبِرْتُهُ فَأَرْسَلَ إِلَيَّ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ أَبِي فَسَأَلَهُ، فَأَحْتَدَىٰ بِيَمِينِهِ مَا فَعَلَ، قَالُوا كَذَبَ زَيْدُ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَوَقَعَ فِي نَفْسِي مِمَّا قَالُوا شِدَّةٌ، حَتَّىٰ أَنْزَلَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ تَصْدِيقِي فِي: ﴿إِذَا جَاءَكَ السُّفٰهِيْنَ﴾ فَدَعَاَهُمُ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِيَسْتَغْفِرَ لَهُمْ فَلَوَّأُوا رُؤُوسَهُمْ وَقَوْلُهُ: ﴿خُشِبَ قَسَدًا﴾ قَالَ سَكَنُوا رِجَالًا أَحْمَلُ شَيْءًا» (بخاری، التفسیر، باب: ﴿وَإِذَا رَأٰهُمْ تَمَجَّكْ أَجْسَامَهُمْ﴾: ۴۹۰۳) ”ہم ایک سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے، اس سفر میں لوگوں کو بہت سخت حالات کا سامنا کرنا پڑا تو عبد اللہ بن ابی نے اپنے ساتھیوں سے کہا: ”ان لوگوں پر خرچ نہ کرو جو اللہ کے رسول کے پاس ہیں، یہاں تک کہ وہ اس کے گرد سے منتشر ہو جائیں۔“ اور اس نے کہا: ”اگر ہم مدینہ واپس پہنچے تو جو زیادہ عزت والا ہے وہ ذلیل تر کو اس میں سے ضرور نکال باہر کرے گا۔“ یہ سن کر میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور آپ کو یہ بات بتائی۔ آپ ﷺ نے عبد اللہ بن ابی کی طرف پیغام بھیج کر اسے بلایا اور اس سے یہ بات پوچھی تو اس نے بہت

يَقُولُونَ لَئِنْ رَجَعْنَا إِلَى الْمَدِينَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْأَعَزُّ مِنَّا الْأَذَلَّ ۗ وَ لِلَّهِ الْعِزَّةُ
و لِرَسُولِهِ وَ لِلْمُؤْمِنِينَ وَ لَكِنَّ الْمُنْفِقِينَ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٨﴾

وہ کہتے ہیں یقیناً اگر ہم مدینہ واپس گئے تو جو زیادہ عزت والا ہے وہ اس میں سے ذلیل تر کو ضروری نکال باہر کرے گا، حالانکہ عزت تو صرف اللہ کے لیے اور اس کے رسول کے لیے اور ایمان والوں کے لیے ہے اور لیکن منافق نہیں جانتے ﴿۸﴾

پکی قسم کھا کر کہا کہ اس نے ایسا نہیں کیا۔ لوگوں نے کہا: ”زید نے رسول اللہ ﷺ سے جھوٹ کہا ہے۔“ تو میرے دل میں ان کی بات سے بہت تکلیف پہنچی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ”إِذَا جَاءَكَ الْمُنْفِقُونَ“ میں میری تصدیق نازل فرمادی۔ تو رسول اللہ ﷺ نے انھیں بلایا، تاکہ ان کے لیے استغفار کریں تو انھوں نے اپنے سر پھیر لیے۔“ اور (زید بن حنیظہ نے) اللہ کے فرمان ”خُشِبَ مُسْتَدَلًّا“ کے متعلق فرمایا: ”وہ بہت خوبصورت آدمی تھے۔“

﴿۲﴾ وَ لِلَّهِ عِزَّتِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ : ”یٰلہ“ کو پہلے لانے کا مطلب یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین کے خزانوں کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے، اور کوئی نہیں۔ منافقین نے خود تو کیا خرچ کرنا تھا، وہ تو پرلے درجے کے حریص اور بخیل تھے، وہ مخلص مسلمانوں کو بھی مہاجرین پر خرچ کرنے سے روک رہے تھے اور سمجھ رہے تھے کہ اگر وہ ان پر خرچ نہیں کریں گے تو وہ بھوک سے مر جائیں گے۔ حالانکہ سارے خزانوں کا مالک تو اللہ تعالیٰ ہے، وہ جس طرح چاہے انھیں رزق دے سکتا ہے، مگر یہ منافقین کی بے سمجھی ہے کہ وہ مہاجرین کا رزق اپنے ہاتھ میں سمجھ رہے ہیں، اس لیے یہاں ”لَا يَفْقَهُونَ“ کا لفظ فرمایا کہ ایسا سمجھنے والا بے سمجھ ہے۔

آیت 8 ﴿٨﴾ يَقُولُونَ لَئِنْ رَجَعْنَا إِلَى الْمَدِينَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْأَعَزُّ مِنَّا الْأَذَلَّ ۗ جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: «كُنَّا فِي غَزَاةٍ قَالَ سَفِيَانٌ مَّرَّةً فِي حَيْشٍ فَكَسَعَ رَجُلٌ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ رَجُلًا مِنَ الْأَنْصَارِ فَقَالَ الْأَنْصَارِيُّ يَا لَأَنْصَارٍ وَقَالَ الْمُهَاجِرِيُّ يَا لَلْمُهَاجِرِينَ فَسَمِعَ ذَلِكَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ مَا بَالُ دَعْوَى جَاهِلِيَّةٍ؟ قَالُوا يَا رَسُولَ اللَّهِ! كَسَعَ رَجُلٌ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ رَجُلًا مِنَ الْأَنْصَارِ فَقَالَ دَعْوَاهَا قَابَهَا مُنْتَبَةً، فَسَمِعَ بِذَلِكَ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ أُبَيٍّ فَقَالَ فَعَلُوا هَذَا؟ أَمَا وَاللَّهِ! لَئِنْ رَجَعْنَا إِلَى الْمَدِينَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْأَعَزُّ مِنَّا الْأَذَلَّ فَبَلَغَ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَامَ عَمْرٌ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ! دَعْنِي أُضْرِبُ عُنُقَ هَذَا الْمُنَافِقِ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَعْنِي لَا يَتَحَدَّثُ النَّاسُ أَنَّ مُحَمَّدًا يَقْتُلُ أَصْحَابَهُ وَكَانَتْ الْأَنْصَارُ أَكْثَرَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ حِينَ قَدِمُوا الْمَدِينَةَ، ثُمَّ إِنَّ الْمُهَاجِرِينَ كَثُرُوا بَعْدُ» | بخاری، التفسیر، باب قَوْلِهِ: ﴿سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ﴾ : ۴۹۰۵ | ”ایک بار ہم ایک لشکر میں تھے تو ایک مہاجر آدمی نے ایک انصاری کو اس کے پیچھے کی جانب

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ ۚ وَمَنْ يَفْعَلْ
ذَلِكَ فَأُولَئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ①

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تمہارے مال اور تمہاری اولاد تمہیں اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں اور جو ایسا کرے تو وہی لوگ خسارہ اٹھانے والے ہیں ①

لات ماردی۔“ تو انصاری نے کہا: ”او انصاریو!“ اور مہاجر نے کہا: ”او مہاجر!“ رسول اللہ ﷺ نے سنا تو فرمایا: ”جاہلیت کی اس پکار کا کیا معاملہ ہے؟“ لوگوں نے بتایا کہ ایک مہاجر نے ایک انصاری کے پیچھے کی جانب لات ماردی ہے، تو آپ نے فرمایا: ”اس (جاہلیت کی پکار) کو چھوڑ دو، کیونکہ یہ بہت بدبودار ہے۔“ یہ بات عبد اللہ بن ابی نے سنی تو کہنے لگا: ”انہوں نے ایسا کیا ہے؟ یاد رکھو! اگر ہم مدینہ واپس پہنچے تو جو زیادہ عزت والا ہے وہ ذلیل تر کو اس سے ضرور نکال باہر کرے گا۔“ یہ بات نبی ﷺ کو پہنچی تو عمر رضی اللہ عنہما کھڑے ہو گئے اور کہا: ”یا رسول اللہ! مجھے اجازت دیں کہ میں اس منافق کی گردن اڑا دوں۔“ تو نبی ﷺ نے فرمایا: ”اسے رہنے دو، لوگ یہ بات نہ کریں کہ محمد اپنے ساتھیوں کو قتل کرتا ہے۔“ اور انصاری مہاجرین سے زیادہ تھے جب وہ مدینہ میں آئے، پھر بعد میں مہاجرین زیادہ ہو گئے۔“

② وَاللَّهُ الْعَزِيزُ وَالرَّسُولُ وَاللُّمُونِينَ وَلَكِنَّ الْمُنْفِقِينَ لَا يَعْلَمُونَ: یعنی یہ منافقین جو کہہ رہے ہیں کہ زیادہ عزت والا ذلیل تر کو نکال باہر کرے گا، تو انہیں معلوم نہیں کہ زیادہ عزت والا بلکہ ساری عزت کا مالک کون ہے۔ سو انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ عزت کا اصل مالک تو اللہ تعالیٰ ہے، پھر وہ ہے جسے وہ عزت عطا فرمائے۔ (دیکھیے نساء: ۱۳۹۔ آل عمران: ۲۶) اور اس نے عزت اپنے رسول اور مومن بندوں کے لیے مقرر فرمائی ہے۔ سو یہ سوچ لیں کہ اگر عزت والے نے ذلیل تر کو مدینہ سے نکالنے کا ارادہ کر لیا تو اس فیصلے کی زد بھی انہی منافقین پر پڑے گی، مگر ان جاہلوں کو علم ہی نہیں۔

③ جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے جو حدیث اوپر نقل کی گئی ہے، ترمذی میں اس کے آخر میں یہ الفاظ ہیں: «فَقَالَ لَهُ ابْنُهُ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ: وَاللَّهِ! لَا تَنْقَلِبُ حَتَّى تَقْرَأَ أَنَّكَ الدَّلِيلُ وَرَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْعَزِيزُ فَفَعَلَ» [ترمذی، تفسیر القرآن، سورۃ المنافقون: ۳۳۱۵، وقال الألبانی صحیح] ”تو اس (عبد اللہ بن ابی) کے بیٹے عبد اللہ بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما نے اس سے کہا: ”اللہ کی قسم! تم واپس نہیں جاؤ گے حتیٰ کہ اقرار کرو کہ تم ہی ذلیل ہو اور رسول اللہ ﷺ ہی عزیز ہیں۔“ چنانچہ اس نے ایسے ہی کیا۔“

ت 9: ① يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ: ”لَا تُلْهِ“ ”لَهُو“ میں سے باب افعال ”أُلْهِی“ يُلْهِی“ کا نہی مؤنث غائب کا صیغہ ہے، ”كُم“ اس کا مفعول بہ اور ”أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ“ فاعل ہے۔ فاعل جمع کسر ہونے کی وجہ سے فعل واحد مؤنث کا صیغہ لایا گیا ہے۔

② منافقین کے برے اعمال کا حال بیان کرنے کے بعد تمام ایمان لانے والوں کو خواہ وہ مخلص ہیں یا منافق، ان دو چیزوں سے

وَأَنْفَقُوا مِنْ مَّا رَزَقْنَاهُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُولَ رَبِّ لَوْلَا
أَخَّرْتَنِي إِلَىٰ آجَلٍ قَرِيبٍ ۚ فَأَصَّدَّقَ ۚ وَأَكُنْ مِنَ الصَّالِحِينَ ﴿۱۰﴾

اور اس میں سے خرچ کرو جو ہم نے تمہیں دیا ہے، اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی کو موت آجائے، پھر وہ کہے اے میرے رب! تو نے مجھے قریب مدت تک مہلت کیوں نہ دی کہ میں صدقہ کرتا اور نیک لوگوں میں سے ہو جاتا ﴿۱۰﴾

ہوشیار رہنے کی نصیحت فرمائی جو انسان کے لیے فتنہ ہیں اور نفاق کا باعث بنتی ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ﴾ [التغابن: ۱۰] ”تمہارے مال اور تمہاری اولاد تو تمہیں ایک آزمائش ہیں۔“ اور فرمایا، دیکھنا! تمہارے اموال اور تمہاری اولاد تمہیں اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں کہ ان کی وجہ سے نماز چھوڑ دو، یا اللہ کی راہ میں خرچ کرنا یا جہاد کے لیے نکلنا چھوڑ دو، یا ان کی وجہ سے جھوٹ اور خیانت کا ارتکاب کرنے لگو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر آدمی کو اس کے اموال و اولاد اللہ کے ذکر سے غافل نہ کریں تو وہ قابل مذمت نہیں ہیں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اموال و اولاد کے علاوہ کوئی اور چیز اللہ کے ذکر سے غافل کرتی ہے تو وہ بھی مذموم ہے، مثلاً کھیل تماشے، دوستوں کی مجلس اور نام و نمود کی خواہش وغیرہ۔ کعب بن عیاض رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا: ﴿إِنَّ لِكُلِّ أُمَّةٍ فِتْنَةً، وَإِنَّ فِتْنَةَ أُمَّتِي الْمَالُ﴾ [مسند احمد: ۱۶۰/۴، ح: ۱۷۴۷۱، قال المحقق حديث صحيح] ”ہر امت کے لیے کوئی نہ کوئی فتنہ ہے اور میری امت کا فتنہ مال ہے۔“ یعلیٰ عامری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حسن اور حسین رضی اللہ عنہما دوڑتے ہوئے نبی ﷺ کی طرف آئے، آپ نے انہیں اپنے ساتھ چٹا لیا اور فرمایا: ﴿إِنَّ الْوَلَدَ مَبْخَلَةٌ مَحَبَّةٌ﴾ [ابن ماجہ، الأدب، باب بر الوالد و الإحسان إلی البنات: ۳۶۶۶] ”بے شک اولاد بخیل بننے اور بزدل بننے کا باعث ہے۔“ مزید دیکھیے سورہ کہف کی آیت (۳۶): ﴿الْمَالُ وَالْبَنُونَ زِينَةُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا﴾ کی تفسیر۔

③ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ: ”ذِكْرُ اللَّهِ“ سے صرف نماز، روزہ اور زبانی ذکر مراد نہیں، بلکہ ہر کام کے وقت اپنے رب کو یاد رکھنا مراد ہے کہ اگر مالک کی اجازت ہے تو وہ کام کرے، اگر نہیں تو نہ کرے۔ اسی طرح ہر وہ کام کرنے کی حتی الوسع کوشش کرے جس کا اس نے حکم دیا ہے اور اس سے رک جائے جس سے اس نے منع فرمایا ہے۔

④ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَيْرُونَ: ”الْخَيْرُونَ“ پر الف لام لانے اور اس سے پہلے ضمیر فصل سے تاکید اور حصر کا مفہوم پیدا ہو گیا کہ اصل خسارے والے صرف وہ لوگ ہیں جنہیں ان کے اموال و اولاد اللہ کی یاد سے غافل کر دیں۔ اگر اللہ کی یاد پر قائم رہنے کی وجہ سے اموال و اولاد کا نقصان ہو جائے تو اللہ تعالیٰ نے اسے خسارہ تسلیم ہی نہیں فرمایا، کیونکہ اموال و اولاد فانی ہیں اور اللہ کی یاد باقی ہے۔ جو باقی کو چھوڑ کر فانی میں مشغول ہو جائے اصل خسارے میں پڑنے والا وہ ہے۔

آیت 10 ﴿۱۰﴾ وَأَنْفَقُوا مِنْ مَّا رَزَقْنَاهُمْ : ”مِنْ مَّا رَزَقْنَاهُمْ“ کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ بقرہ کی تیسری آیت و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

وَلَنْ يُؤَخِّرَ اللَّهُ نَفْسًا إِذَا جَاءَ أَجَلُهَا ۗ وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿۱۱﴾

اور اللہ کسی جان کو ہرگز مہلت نہیں دے گا جب اس کا وقت آ گیا اور اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے جو تم کر رہے ہو ﴿۱۱﴾

آیت کی تفسیر۔ نفاق سے محفوظ رہنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں میں سے جتنا ہو سکے مرنے سے پہلے خرچ کرنے کا حکم دیا۔

﴿۱۲﴾ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُولُ..... : یعنی مرتے وقت یہ دعا اور تمنا کرنا بے کار ہے، عقل مند کا کام یہ ہے کہ مہلت سے فائدہ اٹھائے اور مرنے سے پہلے آخرت کا سامان تیار کرے۔ دیکھیے سورہ ابراہیم (۴۳) اور سورہ مومنون (۱۰۰، ۹۹)۔

﴿۱۳﴾ فَأَصْدَقَ وَ أَكُنْ مِنَ الصَّالِحِينَ: ”فَأَصْدَقَ“ اصل میں ”فَأَتَصَدَّقُ“ ہے، اس پر نصب اس لیے آیا ہے کہ یہ ”لَوْلَا“ کے جواب میں ہے جو تخصیص کے لیے ہے اور اس میں طلب اور شرط کا مفہوم پایا جاتا ہے اور اس پر ”فَاء“ آ رہی ہے جس کے بعد ”أَنْ“ ناصبہ مقدر ہے اور ”أَكُنْ“ مجزوم اس لیے ہے کہ اس کا عطف جواب شرط کے محل پر ہے اور اس پر ”فَاء“ نہیں آ رہی، گویا اصل کلام اس طرح ہے: ”رَبِّ أَخَّرْنِي إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ فَإِنْ أَخَّرْتَنِي أَتَصَدَّقُ وَ أَكُنْ مِنَ الصَّالِحِينَ.“

آیت 11 ﴿۱۱﴾ وَلَنْ يُؤَخِّرَ اللَّهُ نَفْسًا إِذَا جَاءَ أَجَلُهَا: اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ یونس کی آیت (۴۹) کی تفسیر۔

﴿۱۲﴾ وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ: اس میں تنبیہ ہے کہ ہر کام کرتے وقت یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ کو تمہارے ہر عمل کی پوری خبر ہے۔ اس کے علاوہ اس میں نیک عمل والوں کے لیے وعدہ ہے اور برے عمل والوں کے لیے وعید ہے۔



سورة التغابن
۱۰۸ آیت
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ ۗ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ① هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ②

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

اللہ کا پاک ہونا بیان کرتی ہے ہر وہ چیز جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے۔ اسی کی بادشاہی ہے اور اسی کی سب تعریف ہے اور وہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے ① وہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا، پھر تم میں سے کوئی کافر ہے اور تم میں سے کوئی ایمان دار ہے اور اللہ اسے جو تم کر رہے ہو، خوب دیکھنے والا ہے ②

آیت 1 : ① يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ : اس کی وضاحت کے لیے دیکھیے سورہ حدید (۱) اور سورہ حشر (۱) کی تفسیر۔ ”يُسَبِّحُ“ (مضارع) کی وضاحت کے لیے دیکھیے سورہ جمعہ کی پہلی آیت کی تفسیر اور تسبیح کے مفہوم کے لیے دیکھیے سورہ نبی اسرائیل کی آیت (۲۳) کی تفسیر۔

② ”لَهُ الْمُلْكُ“ کے لیے دیکھیے سورہ ملک کی پہلی آیت کی تفسیر اور ”وَلَهُ الْحَمْدُ“ کے لیے دیکھیے سورہ فاتحہ کی پہلی آیت کی تفسیر۔
③ فرمایا آسمان و زمین میں جو بھی چیز ہے وہ زبانِ قول و حال سے شہادت دے رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر عیب اور ہر کمی سے پاک ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی متعدد صفات خلق، قدرت اور علم وغیرہ اور ان کے مظاہر بیان فرمائے جن سے اللہ تعالیٰ کے وجود، اس کی توحید، تسبیح، قیامت اور رسالت کا حق ہونا ثابت ہوتا ہے، پھر کفار کے قیامت اور رسولوں کے انکار کا رد فرمایا اور انہیں اللہ، اس کے رسول اور اس پر نازل کردہ وحی پر ایمان لانے کا حکم دیا۔

آیت 2 : ① هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ : یعنی اتنی صفات کے مالک ہی نے تمہیں پیدا کیا اور دوسری مخلوقات کی طرح تمہیں بھی ہر بات میں اپنے نیکوئی حکم کا پابند کر دینے کے بجائے ایمان و کفر دونوں راستے واضح فرما کر تمہیں ان میں سے کسی ایک پر چلنے کا اختیار بخشا۔ اب حق تو یہ تھا کہ تم اپنے پیدا کرنے والے کا شکر ادا کرتے ہوئے اس پر ایمان لاتے، مگر اس کے بجائے تم و دگر وہوں میں بٹ گئے۔ چنانچہ تم میں سے کچھ کفر کرنے والے ہیں اور کچھ ایمان لانے والے۔ اب یہ خیال مت کرنا کہ تمہارے اس کفر پر تم سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی، یا ایمان لانے پر کوئی جزا نہیں ملے گی، بلکہ تم جو کچھ کر رہے ہو اللہ تعالیٰ اسے پوری طرح دیکھنے والا ہے، وہ ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق سزا یا جزا دے گا۔ یہاں ”فَمِنْكُمْ كَافِرٌ“ کا ذکر پہلے اس لیے فرمایا کہ مقصود ناراضی کا اظہار ہے کہ اتنی صفات کے مالک اور اپنے خالق کے ساتھ بھی تم میں سے کئی کفر کرنے والے ہیں۔ اس کے علاوہ اس بات کا اظہار بھی ہے کہ کفر کرنے والے زیادہ ہیں۔ (دیکھیے نبی اسرائیل: ۸۹۔ سبأ: ۲۰) اس آیت میں وہی بات بیان ہوئی ہے جو تفصیل کے ساتھ کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ صُوَرَكُمْ ۗ وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ ﴿۱﴾

اس نے آسمانوں کو اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا اور اس نے تمہاری صورتیں بنائیں تو تمہاری صورتیں اچھی بنائیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے ﴿۱﴾

سورہ دہر کی ان آیات میں ہے، فرمایا: ﴿إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ نُطْفَةٍ أَنشَأَ ۖ لِنَبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا ﴿۱﴾ إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا ۖ وَإِمَّا كَفُورًا ﴿۲﴾ إِنَّا أَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ سَلْسِلًا ۖ وَأَغْلَالًا ۖ وَسِعِيرًا ﴿۳﴾ إِنَّ الْأَبْرَارَ يَفْرَحُونَ مِنْ مَا هُمْ كَانُوا يَرْجُوهَا كَأَنفُسِهِمْ ﴿۴﴾ [الذمر: ۲ تا ۵] "بلاشبہ ہم نے انسان کو ایک ملے جلے قطرے سے پیدا کیا، ہم اسے آزماتے ہیں، سو ہم نے اسے خوب سننے والا، خوب دیکھنے والا بنا دیا۔ بلاشبہ ہم نے اسے راستہ دکھا دیا، خواہ وہ شکر کرنے والا بنے اور خواہ ناشکرا۔ یقیناً ہم نے کافروں کے لیے زنجیریں اور طوق اور بھڑکتی ہوئی آگ تیار کی ہے۔ بلاشبہ نیک لوگ ایسے جام سے پئیں گے جس میں کافور ملا ہوا ہوگا۔"

﴿۱﴾ اس آیت سے معلوم ہوا کہ خلق کے وقت کوئی کافر نہیں ہوتا، بلکہ پیدا ہوتے وقت ہر انسان فطرت پر ہوتا ہے، پھر بعد میں کفر اختیار کرتا ہے یا ایمان پر قائم رہتا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ روم (۳۲: ۳۰) کی تفسیر۔

﴿۲﴾ یہ بھی معلوم ہوا کہ تمام لوگوں کی دو ہی قسمیں ہیں، یا تو مومن ہیں جو اللہ تعالیٰ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر، یوم آخرت پر اور تقدیر پر ایمان رکھتے ہیں یا پھر کافر ہیں، تیسری کوئی قسم نہیں جو نہ مومن ہوں نہ کافر۔ مومن گناہ کرے تو اس کی وجہ سے اسے ایمان سے خارج یا کافر قرار نہیں دیا جائے گا اور نہ ہی یہ کہا جائے گا کہ یہ نہ مومن ہے نہ کافر، بلکہ وہ ناقص ایمان والا مومن ہے اور اسے اس وقت تک مومن ہی کہا جائے گا جب تک وہ ان چیزوں پر ایمان رکھتا ہے جن کا دین ہونا سب کو معلوم ہے۔ اگر وہ ان میں سے کسی چیز کا انکار کرے یا ایسا کام کرے جو مرتد ہونے کی علامت ہے تو پھر وہ مومن نہیں بلکہ کافر ہے۔

آیت ۳ ﴿۱﴾ خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ: حق سے مراد یہاں حکمت و مصلحت ہے اور ان کی پیدائش کی بے شمار حکمتوں میں سے ایک یہ ہے کہ انسان کی پیدائش سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے ایسی تمام چیزیں پیدا فرمادیں جو انسان کی بقا کے لیے ضروری تھیں اور انہیں انسان کی خدمت پر مامور کر دیا، جیسا کہ فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ۖ﴾ [الغفرہ: ۲۹] "وہی ہے جس نے زمین میں جو کچھ ہے سب تمہارے لیے پیدا کیا۔" مزید دیکھیے سورہ زمر (۵)۔

﴿۲﴾ وَصَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ صُوَرَكُمْ: اللہ تعالیٰ نے جو چیز پیدا فرمائی اچھی پیدا فرمائی۔ (دیکھیے سجدہ: ۷) یہاں فرمایا کہ اس نے تمہاری صورت بنائی تو تمہاری صورتیں اچھی بنائیں۔ (دیکھیے مومن: ۶۳)۔ انظار: ۶: ۸۲) دوسری جگہ فرمایا کہ ہم نے انسان کو (اچھی ہی نہیں بلکہ) سب سے اچھی بنا دیا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ﴾ [الین: ۴] "بلاشبہ یقیناً ہم نے انسان کو سب سے اچھی بنا دیا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔" ظاہری شکل و صورت میں بھی اور

يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُسْرُونَ وَمَا تُعْلِنُونَ ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ
بِدَاتِ الصُّدُورِ ﴿۵﴾ أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَبَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَبْلُ ۖ فَذَاقُوا وَبَالَ أَمْرِهُمْ
وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۵﴾

وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو اور جو ظاہر کرتے ہو اور اللہ سینوں والی بات کو خوب جاننے والا ہے ﴿۵﴾ کیا تمہارے پاس ان لوگوں کی خبر نہیں آئی جنہوں نے اس سے پہلے کفر کیا، پھر اپنے کام کا وبال چکھا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے ﴿۵﴾

ذہنی اور عقلی استعداد کے لحاظ سے بھی انسان کو بہترین بناوٹ عطا ہوئی ہے، کسی دوسری مخلوق میں ایسی عقلی استعداد نہیں ہے۔ کوئی انسان کتنا بھی بد صورت ہو، کبھی نہیں چاہے گا کہ اسے کسی اور مخلوق کی شکل میں تبدیل کر دیا جائے، خواہ وہ کتنی خوبصورت ہو۔

﴿۳﴾ وَ إِلَيْهِ النُّصَيْرُ: یعنی ساری کائنات کی پیدائش خصوصاً انسان کو اتنی بہترین بناوٹ میں پیدا کرنا بے مقصد نہیں بلکہ تمہاری آزمائش کے لیے ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا﴾ [ہود: ۷] ”تاکہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل میں زیادہ اچھا ہے۔“ اور اس کے لیے تمہیں مرنے کے بعد قیامت کے دن دوبارہ زندہ ہو کر اس کی طرف واپس جانا ہے۔

آیت 4: يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَيَعْلَمُ.....: یہ اس سوال کا جواب ہے کہ جب انسان کے جسم کا ہر ذرہ منتشر ہو جائے گا اور اس نے جو کچھ کیا وہ معدوم ہو چکا ہوگا تو اسے دوبارہ کیسے زندہ کیا جائے گا اور اس کے اعمال کی کسی کو کیا خبر ہوگی کہ ان کے مطابق اسے جزایا سزا دی جائے۔ فرمایا وہ ہر اس چیز کو جانتا ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے (اور وہ ہر جاندار کے زندگی میں ٹھکانے کو جانتا ہے اور اس بات کو بھی کہ مرنے کے بعد وہ کہاں ہے۔ دیکھیے ہود: ۶) اس لیے اسے کچھ مشکل نہیں کہ جو جہاں بھی ہے اسے دوبارہ زندہ کر دے اور وہ تمہارے تمام اعمال سے واقف ہے خواہ تم انہیں چھپاتے ہو یا ظاہر کرتے ہو۔ (دیکھیے رعد: ۹، ۱۰) بلکہ وہ سینوں کی بات اور نیتوں کو بھی خوب جاننے والا ہے، سو اس کے لیے تمہارے اعمال کا محاسبہ کچھ مشکل نہیں۔ پچھلی آیات میں مذکور صفات خصوصاً خلق میں اس کی کامل قدرت کا بیان تھا، اس آیت میں اس کے کامل علم کا بیان ہے، پھر جو عظیم بھی ہے اور قدر بھی اور جس نے پہلے ہر چیز کو پیدا کیا اور ہر چیز کا پورا علم رکھتا ہے، وہ تمہیں دوبارہ پیدا کیوں نہیں کر سکتا اور محاسبہ کیوں نہیں کر سکتا؟

آیت 5: ﴿۱﴾ أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَبَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَبْلُ ۖ فَذَاقُوا وَبَالَ أَمْرِهُمْ: یعنی اگر تم اپنے اس خالق پر ایمان نہ لائے اور اس کے ساتھ کفر پر ڈٹے رہے جو ان صفات کا مالک ہے اور جس کی طرف تمہیں واپس جانا ہے، تو کیا تمہیں ان لوگوں کی خبر نہیں پہنچی جنہوں نے اس سے پہلے اپنے خالق و مالک کے علاوہ اس کے رسولوں اور آخرت کا بھی انکار کیا، مثلاً قوم نوح، عاد و ثمود اور آل فرعون وغیرہ جو مال و دولت اور قوت و شوکت میں تم سے کہیں زیادہ تھے۔ (دیکھیے روم: ۹) قریش مکہ کا

ذٰلِكَ بِاَنَّهُ كَانَتْ تَأْتِيهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَقَالُوْا اَبَشْرٌ يَّهْدُوْنَنا ر فَاكْفَرُوْا
وَ تَوَلَّوْا وَ اسْتَغْنَى اللّٰهُ وَ اللّٰهُ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ①

یہ اس لیے کہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے پاس ان کے رسول واضح دلیلیں لے کر آتے تھے تو انھوں نے کہا کیا کوئی بشر ہماری رہنمائی کریں گے؟ پس انھوں نے انکار کر دیا اور منہ پھیر لیا اور اللہ نے پروانہ کی اور اللہ بے پروا ہے، تمام خوبیوں والا ہے ①

گزر اکثر شام اور یمن کی طرف سفر میں ان کی برباد شدہ بستیوں پر ہوتا تھا اور عرب میں ان کے واقعات مشہور تھے۔

② قَدْ اٰتَوْا وَاَبَالَ اَمْرِهِمْ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ : یعنی انھوں نے دنیا ہی میں اپنے کفر اور سرکشی کا وبال چکھ لیا، مگر یہ ان کی پوری اور اصل سزا نہ تھی بلکہ یہ صرف دنیا میں ان کے اعمالِ بد کا نتیجہ تھا جو دوسروں کو عبرت دلانے کے لیے دکھایا گیا تھا، جس سے تمہیں بھی عبرت حاصل کرنی چاہیے۔ اصل سزا کے طور پر ان کے لیے نہایت دردناک عذاب تیار ہے۔

یت 6 ① ذٰلِكَ بِاَنَّهُ كَانَتْ تَأْتِيهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ : ”بِاَنَّهُ“ میں ”ہ“ ضمیر کو ضمیر شان کہا جاتا ہے، اس کا مقصد اس بات کی اہمیت کا اظہار ہوتا ہے جو بعد میں آ رہی ہوتی ہے۔ ”بیانات“ کا لفظی معنی واضح اور روشن چیزیں ہے۔ رسول جو بیانات لے کر آئے ان میں وہ معجزے بھی شامل ہیں جو ان کی رسالت کی واضح دلیل تھے اور اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ آیات اور عقلی دلائل بھی جو بالکل واضح اور روشن تھے، جنہیں سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں تھی، ان بیانات کو دیکھ اور سن کر ان کے رسول ہونے کا یقین حاصل ہوتا تھا۔

② فَاكْفَرُوْا اَبَشْرٌ يَّهْدُوْنَنا : ”بَشْرٌ“ اسم جنس ہے جو جمع پر بھی بولا جاتا ہے، جیسا کہ یہاں ”يَّهْدُوْنَنا“ سے ظاہر ہے اور واحد پر بھی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اَبَشْرًا فَايْتًا وَاٰجِدًا نَّتَّبِعُهُ ﴾ [القمر : ۲۴] ”کیا ایک آدمی جو ہمیں سے ہے اکیلا، ہم اس کے پیچھے لگ جائیں؟“ کفار کے قول میں ”بَشْرٌ“ کو تحقیر کے لیے بطور نکرہ استعمال کیا گیا ہے، گو یا وہ کہہ رہے ہیں ”کیا یہ عام سے بشر ہماری رہنمائی کریں گے؟“ وہ کسی بشر کو رسول ماننے کے لیے تیار نہیں تھے، خواہ اس کی رسالت ہر طرح سے ثابت ہو جائے۔ ان کے خیال میں رسول فرشتہ ہونا چاہیے یا خود اللہ تعالیٰ کو ان کے پاس آنا چاہیے۔ (دیکھیے فرقان : ۲۱) یہی دوسرا پہلے تمام انبیاء کے منکرین کا تھا اور یہی کفار قریش نے اختیار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے متعدد مقامات پر ان کے اس باطل خیال کا ذکر کیا اور اس کا رد فرمایا۔ دیکھیے بنی اسرائیل (۹۳، ۹۵)، ابراہیم (۱۱، ۱۰)، کہف (۱۱۰)، مومنون (۳۳)، شعراء (۸۶)، یس (۱۵) اور سورۃ النعام (۹۱)۔

③ فَاكْفَرُوْا وَ تَوَلَّوْا وَ اسْتَغْنَى اللّٰهُ : جب انھوں نے بشر کی رسالت کو محال قرار دیا تو اس کا واضح نتیجہ یہی تھا کہ انھوں نے رسولوں پر ایمان لانے سے انکار کر دیا اور منہ پھیر لیا اور اللہ تعالیٰ نے بھی کچھ پروانہ کی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی کا محتاج نہیں، وہ ساری کائنات سے مستغنی اور بے پروا ہے۔ وہ اکیلا تمام خوبیوں کا مالک ہے، کسی کے کفر سے اسے کوئی نقصان نہیں

زَعَمَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنْ لَنْ يُبْعَثُوا قُلْ بَلَىٰ وَرَبِّي لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتَأْتُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ۗ

وَذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ﴿٦﴾

وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا انہوں نے گمان کیا کہ وہ ہرگز اٹھائے نہیں جائیں گے۔ کہہ دے کیوں نہیں؟ میرے رب کی قسم! تم ضرور بالضرور اٹھائے جاؤ گے، پھر تمہیں ضرور بالضرور بتایا جائے گا جو تم نے کیا اور یہ اللہ پر بہت آسان ہے ﴿٦﴾

اور نہ ہی کسی کے ایمان سے اس کا کوئی فائدہ ہے۔ ایمان کا فائدہ اور کفر کا نقصان خود انسان ہی کو ہے۔ مزید دیکھیے سورہ آل عمران (۹۷) اور سورہ زمر (۷۷) کی تفسیر۔

﴿٤﴾ کفار کا معاملہ عجیب ہے، وہ بشر کو رسول ماننے کے لیے تیار نہیں مگر پتھر، لکڑی اور دھات کے بتوں کو رب مانتے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ بینات دیکھ کر بھی یہ کہہ کر ایمان نہیں لاتے کہ ”کیا کوئی بشر ہماری رہنمائی کریں گے؟“ گویا انہیں کسی بشر کی رہنمائی قبول نہیں، خواہ وہ کتنی درست اور کتنی عمدہ ہو، جبکہ وہ اپنے بڑوں کی غلط راہ پر اندھا دھند چل رہے ہیں، حالانکہ وہ بھی بشر تھے، جیسا کہ فرمایا: ﴿كَأَلْوَانًا لِّبَاطِنًا أَعْيُنُهُمْ كَتُمٌ وَإِنَّهَا غِيظٌ كَثِيرَةٌ وَفِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّمَنْ يَعْقِلُ﴾ [الزحرف: ۲۲] ”انہوں نے کہا کہ بے شک ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک راستے پر پایا ہے اور بے شک ہم انہی کے قدموں کے نشانوں پر راہ پانے والے ہیں۔“ اگر کسی بشر کی راہ پر چلنا انہیں منظور نہیں تو بڑوں کی راہ پر کیوں چلتے ہیں؟ اصل بات یہ ہے کہ وہ اللہ کی راہ پر چلنے کے لیے تیار نہیں، کیونکہ شیطان نے انہیں اور ان کے بڑوں کو اپنی راہ پر لگا رکھا ہے۔

آیت 7 ﴿١﴾ زَعَمَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنْ لَنْ يُبْعَثُوا: ”زَعَمَ“ کا لفظ گمان کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے، کسی بات کا دعویٰ کرنے کے معنی میں بھی اور جھوٹ کہنے کے معنی میں بھی۔ اللہ تعالیٰ نے کفار کا دعویٰ حرف تاکید ”لَنْ“ کے ساتھ ذکر فرمایا، مگر یہ دعویٰ کرنے کو زعم قرار دیا۔ گویا ان کا تاکید کے ساتھ کہنا کہ انہیں ہرگز اٹھایا نہیں جائے گا، سراسر گمان اور جھوٹ ہے۔ گمان اس لیے کہ ان کے پاس کوئی ایسا ذریعہ علم نہیں جس کی بنیاد پر وہ یقین سے کہہ سکیں کہ دوبارہ زندگی نہیں ہو سکتی۔ انسان کے پاس ایسا ذریعہ علم نہ کبھی آج سے پہلے تھا، نہ آج ہے اور نہ ہی آئندہ ہو سکتا ہے، پھر اس دعویٰ کو اس زور شور سے بیان کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ انسان زیادہ سے زیادہ یہی کچھ کہہ سکتا ہے کہ مرنے کے بعد جی اٹھنے اور نہ اٹھنے کے دونوں احتمال موجود ہیں، لیکن جی اٹھنے کی تردید میں وہ کوئی دلیل پیش نہیں کر سکتا۔

﴿٢﴾ قُلْ بَلَىٰ وَرَبِّي لَتُبْعَثُنَّ: یعنی جب وہ محض گمان کی بنیاد پر اتنی تاکید کے ساتھ قیامت کا انکار کر رہے ہیں تو آپ ان کے رد میں اس سے زیادہ تاکید کے ساتھ کہیں کہ میں تمہارے اس دعوے کے مقابلے میں اللہ کی طرف سے وحی کے علم کی بنیاد پر پورے یقین کے ساتھ اپنے رب کی قسم اٹھا کر کہتا ہوں کہ تم ضرور بالضرور اٹھائے جاؤ گے۔ رسول اللہ ﷺ کے مخاطب مانتے

فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالنُّورِ الَّذِي أَنْزَلْنَا وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿۸﴾

سو تم اللہ اور اس کے رسول اور اس نور پر ایمان لاؤ جو ہم نے نازل کیا اور اللہ اس سے جو تم کرتے ہو، خوب باخبر ہے ﴿۸﴾

تھے کہ آپ ﷺ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو قسم کے ساتھ یہ بات کہنے کا حکم دیا، تاکہ انھیں اس کا یقین ہو جائے، کیونکہ انسان کی عادت ہے کہ قسم کھا کر بات کی جائے تو اسے یقین ہو جاتا ہے۔ یہ تیسری جگہ ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو قسم کھا کر قیامت کا یقین دلانے کا حکم دیا ہے۔ پہلے سورہ یونس میں فرمایا: ﴿وَيَسْتَأْذِنُكَ أَحَىٰ هُوَ قُلْ إِي وَرَبِّي إِنَّكَ لَحَقِيٌّ وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ﴾ [یونس: ۵۳] ”اور وہ تجھ سے پوچھتے ہیں کیا یہ سچ ہی ہے؟ تو کہہ ہاں! مجھے اپنے رب کی قسم! یقیناً یہ ضرور سچ ہے اور تم ہرگز عاجز کرنے والے نہیں ہو۔“ پھر سورہ سبأ میں فرمایا: ﴿وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَأْتِينَا السَّاعَةُ قُلْ بَلَىٰ وَ مَرَجَىٰ لِنَأْتِيَكُمْ﴾ [سبأ: ۳] ”اور ان لوگوں نے کہا جنھوں نے کفر کیا ہم پر قیامت نہیں آئے گی۔ کہہ دے کیوں نہیں، قسم ہے میرے رب کی! وہ تم پر ضرور ہی آئے گی۔“

﴿۳﴾ ثُمَّ لَنَسْتَبِئَنَّهُ بِمَا عَمِلْتُمْ: اس میں دوبارہ زندہ کیے جانے کا مقصد بیان فرمایا کہ ساری کائنات کو تمھارے فائدے کے لیے مسخر کرنے اور تمھیں ایمان و کفر میں اختیار دینے کے بعد یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم سے کوئی باز پرس ہی نہ کی جائے؟ اس لیے اٹھائے جانے کے بعد تمھیں وہ سب کچھ ضرور بالضرور بتایا جائے گا جو تم نے کیا۔ بتانے سے مراد محاسبہ اور سزا دینا ہے، جیسا کہ دھمکی دیتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ میں بہت جلد تمھیں بتاؤں گا کہ تم نے کیا کیا۔

﴿۴﴾ وَ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ: یعنی تمھیں دوبارہ زندہ کرنا اللہ تعالیٰ کے لیے بہت آسان اور بالکل معمولی بات ہے، کیونکہ جس نے تمھیں پہلی دفعہ بنا لیا اس کے لیے دوبارہ بنا لینا تو زیادہ آسان ہے۔ حزید دیکھیے سورہ لیس (۷۸، ۷۹)، لقمان (۲۸) اور سورہ روم (۲۷) کی تفسیر۔ کفار مکہ جیسا کہ متعدد آیات سے ظاہر ہے، اس بات کے قائل تھے کہ انسانوں کو اللہ تعالیٰ ہی نے پیدا کیا ہے۔

آیت ۸ ﴿۱﴾ فَاآمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالنُّورِ الَّذِي أَنْزَلْنَا: اس ”فَاء“ کو نصیحہ کہتے ہیں، کیونکہ وہ اس شرط کا اظہار کر رہی ہوتی ہے جو وہاں مقدر ہے، یعنی جب تم یہ سب کچھ جان چکے تو اللہ اور اس کے رسول اور اس نور پر ایمان لے آؤ جو ہم نے نازل کیا ہے، یعنی دل اور زبان سے انھیں سچا مان کر ان کے احکام کی پیروی کرو۔ ”النُّور“ سے مراد اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ وحی ہے، کیونکہ اسی سے اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا راستہ روشن ہوتا ہے، اس میں قرآن و سنت دونوں شامل ہیں۔ دیکھیے سورہ شوریٰ (۵۲) کی تفسیر۔

﴿۲﴾ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ: خبیر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمھیں تمھارے اعمال کی جزا دے گا۔ اس میں ایمان لانے والوں کے لیے وعدہ اور ایمان نہ لانے والوں کے لیے وعید ہے۔

يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذَلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ ۚ وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا
يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّئَاتِهِ وَيُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا
أَبَدًا ۚ ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿٩﴾ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ
خَالِدِينَ فِيهَا ۚ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ﴿١٠﴾ مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ وَمَنْ

التغابن
۱۵

جس دن وہ تمہیں جمع کرنے کے دن کے لیے جمع کرے گا، وہی ہار جیت کا دن ہے اور جو اللہ پر ایمان لائے اور نیک عمل
کرے وہ اس سے اس کی برائیاں دور کر دے گا اور اسے ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے تلے نہریں بہتی ہیں، ہمیشہ
ان میں رہنے والے ہیں ہمیشہ، یہی بہت بڑی کامیابی ہے ﴿۹﴾ اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا، وہ
آگ والے ہیں، اس میں ہمیشہ رہنے والے اور وہ لوٹ کر جانے کی بری جگہ ہے ﴿۱۰﴾ کوئی مصیبت نہیں پہنچی مگر

آیت ۹ ﴿۹﴾ يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ: یہ "تَتَّبَعُونَ" کا ظرف ہے، قیامت کے دن کو "يَوْمَ الْجَمْعِ"
اس لیے کہا گیا ہے کہ اس دن تمام پہلے اور پچھلے ایک میدان میں جمع کیے جائیں گے۔ (دیکھیے ہود: ۱۰۳- صافات: ۵۰، ۴۹-
شوریٰ: ۷- مرسلات: ۳۸) "يَوْمَ الْجَمْعِ" کا معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس دن انسان کے جسم کی ہر ہڈی اور ہر ذرہ جو منتشر
ہو چکا ہوگا جمع کر دیا جائے گا، جیسا کہ فرمایا: ﴿يَجْمَعُ الْإِنْسَانَ لَأَنْ يُجَمَعَ عِظَامُهُ﴾ [القیامہ: ۳] "کیا انسان گمان
کرتا ہے کہ ہم کبھی اس کی ہڈیاں اکٹھی نہیں کریں گے۔"

﴿۲﴾ ذَلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ: "عَيْنَ" (ن) "فَلَانًا فِي السَّبْعِ" بیچ میں دوسرے کو نقصان پہنچا کر خود فائدہ حاصل کر لینا۔ طبری
نے علی بن ابی طلحہ کی معتبر سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل فرمایا ہے، انہوں نے "ذَلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ" کے متعلق
فرمایا: ﴿هُوَ اسْمٌ مِنْ أَسْمَاءِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَذَلِكَ أَنَّ أَهْلَ الْجَنَّةِ يَغْتَبُونَ أَهْلَ النَّارِ﴾ "یعنی یوم التغابن قیامت کے
ناموں میں سے ایک نام ہے اور یہ نام اس لیے ہے کہ اس دن جنتی جنہیوں کو نقصان میں رکھ کر خود فائدہ حاصل کریں گے۔"
ابن کثیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس نفع نقصان کی تفصیل خود اللہ تعالیٰ نے آگے بیان فرمادی ہے کہ ایمان اور عمل صالح والوں کو کیا
حاصل ہوگا اور کفر و تکذیب والوں کے حصے میں کیا آئے گا۔

﴿۳﴾ وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا : یہ اس دن کی ہار جیت میں سے جیت والوں کے حصے کا بیان ہے۔

آیت ۱۰ ﴿۱۰﴾ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا : یہ اس دن کی ہار والوں کے حصے کا بیان ہے۔

آیت ۱۱ ﴿۱۱﴾ مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ : اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ حدید کی آیت (۲۲) کی تفسیر۔

﴿۲﴾ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ: اس سے پہلی آیات میں اللہ کی توحید، رسولوں کی رسالت اور قیامت کا بیان تھا، اس آیت میں تقدیر پر
ایمان کا بیان ہے جس سے آدمی کے دل میں تکلیفیں برداشت کرنے اور ان پر صبر کرنے کی ہمت پیدا ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ

تُؤْمِنُ بِاللَّهِ يَهْدِي قَلْبَهُ ۗ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿۱۱﴾

اللہ کے اذن سے اور جو اللہ پر ایمان لے آئے وہ اس کے دل کو ہدایت دیتا ہے اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے ﴿۱۱﴾

اس آیت میں ایمان والوں کے لیے تسلی اور کفار کے اس اعتراض کا جواب بھی ہے کہ ایمان والوں پر مصیبتیں کیوں آتی ہیں۔ فرمایا جو مصیبت بھی آتی ہے اللہ کے اذن سے آتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہاں پہلے سے مقدر ہو چکی ہوتی ہے۔ یہ دنیا میں مومن و کافر سب پر آتی ہے، کیونکہ اس کے بغیر امتحان اور آزمائش کا مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ البتہ مومن و کافر پر اس کا اثر اور نتیجہ مختلف ہوتا ہے، مومن اپنے رب پر راضی رہتا ہے جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ اس کے دل کو ہدایت کی روشنی، یقین اور اطمینان کی نعمت اور آخرت میں جنت عطا فرماتا ہے اور کافر اپنے رب پر ناراض ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں وہ دنیا کے اندر ہر وقت پریشان اور سراپا شکوہ بنا رہتا ہے اور آخرت میں اس کے لیے جہنم ہے۔

﴿۱۱﴾ یعنی جو بھی مصیبت پہنچتی ہے اللہ کے حکم سے اور اس کے طے شدہ فیصلے اور تقدیر کے مطابق پہنچتی ہے۔

﴿۱۲﴾ وَ مَنْ يُؤْمِن بِاللَّهِ يَهْدِي قَلْبَهُ: یعنی جسے کوئی مصیبت پہنچے اور وہ جان لے کہ یہ اللہ کے فیصلے اور اس کی تقدیر سے ہے، پھر اس پر صبر کرے، ثواب کی نیت رکھے اور اپنے آپ کو پوری طرح اللہ کے فیصلے کے سپرد کر دے تو اللہ تعالیٰ اس کے دل کو ہدایت دیتا ہے اور دنیا میں اس کے ہاتھ سے جو کچھ نکلا یعنی اس سے جو کچھ لیا گیا اس کے بدلے میں اس کے دل میں سیدھی راہ پر چلنے کی توفیق اور سچا یقین عطا فرماتا ہے اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو کچھ اس سے لیا گیا اس کی جگہ وہی یا اس سے بہتر چیز عطا فرما دیتا ہے۔ اس آیت کی طرح سورہ بقرہ (۱۵۵ تا ۱۵۷) میں مصیبت پر صبر کرنے والوں کو ”الْمُهْتَدُونَ“ (ہدایت والے) قرار دیا ہے۔

طبری نے علی بن ابی طلحہ کی معتبر سند کے ساتھ ”وَ مَنْ يُؤْمِن بِاللَّهِ يَهْدِي قَلْبَهُ“ کے متعلق ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل فرمایا ہے: «يُعْنِي يَهْدِي قَلْبَهُ لِلْيَقِينِ فَيَعْلَمُ أَنَّ مَا أَصَابَهُ لَمْ يَكُنْ لِيُخْطِئَهُ وَمَا أَخْطَأَهُ لَمْ يَكُنْ لِيُصِيبَهُ» [طبری: ۱۲/۲۳، ج: ۱، ص: ۳۴۵، ۹] یعنی (آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو اللہ پر ایمان رکھے) اللہ تعالیٰ اس کے دل کو یقین کی ہدایت دیتا ہے اور وہ جان لیتا ہے کہ اس پر جو مصیبت آئی وہ کسی صورت اس سے خطا کرنے والی نہیں تھی اور جو خطا کر گئی وہ کسی صورت اس پر آنے والی نہیں تھی۔ اور اعمش نے ابوظہیان سے بیان کیا کہ ہم علقمہ کے پاس تھے، ان کے پاس یہ آیت پڑھی گئی: ﴿وَ مَنْ يُؤْمِن بِاللَّهِ يَهْدِي قَلْبَهُ﴾ اور اس کا مطلب پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا: ”اس سے مراد وہ آدمی ہے جسے کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ جان لیتا ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، اس پر راضی ہو جاتا ہے اور اسے تسلیم کر لیتا ہے۔“ (ابن جریر و ابن ابی حاتم صحیح)

صہیب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «عَجَبًا لِأَمْرِ الْمُؤْمِنِ إِنَّ أَمْرَهُ كُلَّهُ خَيْرٌ وَلَيْسَ ذَلِكَ لِأَحَدٍ إِلَّا لِلْمُؤْمِنِ إِنَّ أَصَابَتْهُ سَرَاءٌ شَكَرَ، فَكَانَ خَيْرًا لَهُ وَإِنْ أَصَابَتْهُ ضَرَاءٌ صَبَرَ، فَكَانَ خَيْرًا لَهُ» [مسلم،

وَاطِيعُوا اللَّهَ وَاطِيعُوا الرَّسُولَ ۚ فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَإِنَّمَا عَلَىٰ رَسُولِنَا الْبَلْغُ الْمُبِينُ ﴿۱۲﴾

اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۚ وَعَلَىٰ اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ﴿۱۳﴾

اور اللہ کا حکم مانو اور رسول کا حکم مانو، پس اگر تم پھر جاؤ تو ہمارے رسول کے ذمے تو صرف کھلم کھلا پہنچا دینا ہے ﴿۱۲﴾
اللہ (وہ ہے کہ) اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور اللہ ہی پر پس لازم ہے کہ مومن بھروسا کریں ﴿۱۳﴾

الزهد والرقائق، باب المؤمن أمره كله خير: ۲۹۹۹] ”مومن کے معاملے پر تعجب ہے، کیونکہ اس کا سارا معاملہ ہی خیر ہے اور یہ بات مومن کے سوا کسی کو حاصل نہیں، اگر اسے کوئی خوشی ملتی ہے تو شکر کرتا ہے اور وہ اس کے لیے خیر ہوتا ہے اور اگر اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو صبر کرتا ہے اور وہ بھی اس کے لیے خیر ہوتا ہے۔“

﴿۱۲﴾ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ: یعنی اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا پوری طرح علم ہے، وہ خوب جانتا ہے کہ کون اس کی تقدیر پر ایمان رکھ کر صبر و شکر کرتا ہے اور کون نہیں کرتا، پھر وہ ہر ایک کو اس کے مطابق جزا و سزا دے گا۔

آیت 12 ﴿۱۲﴾ وَاللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۚ وَعَلَىٰ اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ: سلسلہ کلام کے مطابق مطلب یہ ہے کہ مصیبت آنے پر اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت سے منہ نہ موڑو، بلکہ تمام حالات میں، اچھے ہوں یا برے، اللہ کا حکم مانو اور اس کے رسول کا حکم مانو۔ ”اطِيعُوا“ کو ”الرَّسُولَ“ کے ساتھ دوبارہ لانے سے ظاہر ہے کہ جس طرح اللہ کا حکم مستقل شریعت ہے اسی طرح رسول کا حکم بھی مستقل شریعت ہے، دونوں میں سے کسی کی مخالفت کی گنجائش نہیں۔ دوسرے لوگ جن کا حکم مانا جاتا ہے وہ یہ مقام نہیں رکھتے، ان کا وہی حکم مانا جائے گا جو کتاب و سنت کے خلاف نہ ہو۔ اس نکتے کی وضاحت سورہ نساء کی آیت (۵۹): ﴿۵۹﴾ اَطِيعُوا اللَّهَ وَاطِيعُوا الرَّسُولَ وَاولي الامر منكم ﴿۵۹﴾ سے ہوتی ہے کہ ”اولي الامر“ کے ساتھ ”اطِيعُوا“ کو دوبارہ نہیں لایا گیا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ نساء (۵۹) کی تفسیر۔

﴿۱۳﴾ فَإِن تَوَلَّيْتُمْ فَإِنَّمَا عَلَىٰ رَسُولِنَا الْبَلْغُ الْمُبِينُ: پھر اگر مصیبتوں سے گھبرا کر تم نے اطاعت سے منہ موڑ لیا تو اپنا ہی نقصان کرو گے، ہمارے رسول کے ذمے صرف یہ ہے کہ وہ اللہ کے احکام صاف صاف تم تک پہنچا دیں، سو وہ اس نے پہنچا دیے۔

آیت 13 اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ ۚ وَعَلَىٰ اللَّهِ: یعنی جس طرح تقدیر اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور جو بھی مصیبت یا راحت ہے اسی کے حکم سے آتی ہے، اسی طرح یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ ہی وہ ہستی ہے جو ہر عبادت کی مستحق ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اس لیے رنج ہو یا راحت ہر حال میں اسی کو پکارو اور اسی پر توکل رکھو، کیونکہ پکارنا بھی عبادت ہے اور توکل بھی عبادت ہے اور جو اللہ پر ایمان رکھتا ہو اس کے پاس اس اکیلے پر بھروسا کرنے کے سوا کوئی راستہ نہیں، کیونکہ کسی دوسرے کے ہاتھ میں رنج یا راحت میں سے کچھ ہے ہی نہیں کہ اس پر بھروسا کیا جاسکے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ وَأَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَكُمْ فَاحْذَرُوهُمْ، وَإِنْ تَعَفَوْا
وَ تَصَفَّحُوا وَ تَغْفِرُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۱۴﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! بے شک تمہاری بیویوں اور تمہارے بچوں میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں، سو ان سے
ہوشیار رہو اور اگر تم معاف کرو اور درگزر کرو اور بخش دو تو بے شک اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۱۴﴾

آیت 14: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ وَأَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَكُمْ : "عَدُوًّا" "فَعُولًا" کا وزن ہے،
واحد اور جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے، "فَأَحْذَرُوهُمْ" سے ظاہر ہے کہ یہاں جمع کے لیے استعمال ہوا ہے۔ "مِنْ
أَزْوَاجِكُمْ" میں "مِنْ" جمع کے لیے ہے، یعنی بعض بیویاں اور اولادین دشمن ہوتی ہیں سب نہیں، بلکہ بعض دین میں
مددگار اور آنکھوں کی ٹھنڈک بھی ہوتی ہیں۔ اس سے پہلی آیات میں اللہ کی اطاعت اور اس کے رسول کی اطاعت کا حکم دیا
ہے، اب ایک ایسی چیز سے ہوشیار رہنے کا حکم دیا جو عموماً اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے اور
وہ آدمی کی بیوی اور اس کی اولاد ہے۔ اللہ تعالیٰ کو کسی صورت گوارا نہیں کہ اس کا مومن بندہ اس سے بڑھ کر اور اس کے رسول
سے بڑھ کر کسی سے محبت کرے، یا کسی عزیز سے عزیز شخص کے تقاضے کو اللہ اور اس کے رسول کے تقاضے پر ترجیح دے۔
(دیکھیے توبہ: ۲۳) یہاں خاص طور پر بعض بیویوں اور بعض اولاد کا ذکر فرمایا، کیونکہ آدمی ہر وقت ان کے ساتھ رہتا ہے اور طبی
طور پر ان سے محبت ہوتی ہے، اس لیے بعض اوقات وہ ان کی محبت میں آ کر اللہ اور اس کے رسول کے احکام کو پس پشت
پھینک دیتا ہے اور ان کے آرام و آسائش کی خاطر حلال و حرام میں تمیز نہیں کرتا۔ ان کے اصرار پر کئی فرائض ترک کر دیتا ہے،
کئی ناجائز کاموں کا ارتکاب کر لیتا ہے اور اس طرح اپنی آخرت تباہ کر لیتا ہے، ظاہر ہے جو اہل و عیال آخرت کی بربادی کا
باعث بنیں ان سے بڑھ کر آدمی کا کوئی دشمن نہیں ہو سکتا۔ بعض بیویاں اور اولاد ناموافقیت یا سرکشی کی وجہ سے فی الواقع بھی
اپنے خاوند یا باپ کے ساتھ دشمنی رکھتے ہیں، مگر یہ ایسے دشمن ہیں کہ آدمی ان سے مسلسل دشمنی نہیں رکھ سکتا اور نہ ہی ان سے
علیحدگی اختیار کر سکتا ہے، بلکہ ان کے ساتھ گزارا ہی کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے فرمایا کہ ان کی دشمنی کا یہ علاج نہیں کہ انھیں
مارو بیٹو، خرچہ بند کر دو یا ان سے علیحدگی اختیار کر لو، بلکہ مارنے پینے اور سختی کرنے کے بجائے اگر انھیں معاف کر دو، ان سے
درگزر کرو اور ان کی غلطیوں پر پردہ ڈال دو تو تمہارے لیے بہتر اور اللہ کو پسند ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ بے حد پردہ ڈالنے والا اور
نہایت رحم والا ہے۔ البتہ اس غنودرگزر کے باوجود جتنی طاقت ہے اللہ کے تقویٰ پر قائم رہو اور انھیں اس کی تلقین کرتے رہو۔
اللہ تعالیٰ کے اس حکم میں یقیناً بہت سی حکمتیں ہیں، کیونکہ بعض اوقات آدمی کی سختی کی وجہ سے اولاد بغاوت پر اتر آتی ہے،
جب کہ غنودرگزر، مسلسل نصیحت اور خود تقویٰ پر قائم رہنے سے ان کی اصلاح کی توقع زیادہ ہوتی ہے۔

عکرمہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ وَأَوْلَادِكُمْ

إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۗ وَاللَّهُ عِنْدَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ ﴿۱۵﴾ فَأَتَقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ
وَأَسْعُوا وَاطِيعُوا وَانْفِقُوا خَيْرًا لِّأَنْفُسِكُمْ ۗ وَمَنْ يُوقِ شَحْرَ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ

الْمُقْلِحُونَ ﴿۱۶﴾

تمہارے مال اور تمہاری اولاد تو محض ایک آزمائش ہیں اور جو اللہ ہے اسی کے پاس بہت بڑا اجر ہے ﴿۱۵﴾ سو اللہ سے ڈرو جتنی طاقت رکھو اور سنو اور حکم مانو اور خرچ کرو، تمہارے اپنے لیے بہتر ہوگا اور جو اپنے نفس کے نخل سے پچالے جائیں سو وہی کامیاب ہیں ﴿۱۶﴾

عَدُوًّا لَّكُمْ فَأَخَذَ زَوْهُمُ“ کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے فرمایا: ”یہ اہل مکہ میں سے کچھ لوگ تھے جو مسلمان ہو گئے اور انھوں نے نبی ﷺ کے پاس آنے کا ارادہ کر لیا (یاد رہے کہ ان دنوں ہر مسلمان ہونے والے کے لیے مدینہ کی طرف ہجرت کرنا فرض تھا) مگر انھیں ان کی بیویوں اور بچوں نے نہیں چھوڑا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آتے۔ پھر جب وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے تو انھوں نے دوسرے لوگوں کو دیکھا کہ وہ دین کی سمجھ حاصل کر چکے تھے تو انھوں نے ارادہ کیا کہ اپنے بیوی بچوں کو سزا دیں تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔“ [ترمذی، التفسیر، سورۃ التغابن: ۳۳۱۷ وقال الألبانی حسن]

آیت 15 ﴿۱۵﴾ إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ : اس کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورۃ آل عمران (۱۳)، انفال (۲۸)، کہف (۳۶) اور سورۃ منافقون (۹)۔

آیت 15 ﴿۱۵﴾ ﴿۱﴾ فَأَتَقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ : مال و اولاد کے فتنے سے بچنے کے لیے چند چیزوں کی تاکید فرمائی، جن میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کا حسب استطاعت تقویٰ ہے، پھر سب سے آخر میں فتنہ بننے والے اس مال کو خرچ کرنا ہے اور اس میں نخل سے گریز کرنا ہے۔

﴿۲﴾ مَا اسْتَطَعْتُمْ: اس سے معلوم ہوا کہ آدمی کے لیے اللہ کے احکام پر اتنا عمل ہی فرض ہے جتنی اس میں طاقت ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَا يَكْتَلِفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾ [البقرہ: ۲۸۶] ”اللہ کسی جان کو تکلیف نہیں دیتا مگر اس کی گنجائش کے مطابق۔“ جہاں آدمی بے بس ہو جائے وہاں مواخذہ نہیں۔ (دیکھیے بقرہ: ۱۷۳، انعام: ۱۱۹، نحل: ۱۰۶) مواخذہ اسی صورت میں ہے جب آدمی استطاعت کے باوجود اللہ کی اطاعت نہ کرے۔ رہی یہ بات کہ آدمی بہانہ بنا لے اور فرض کر لے کہ فلاں کام میری استطاعت سے باہر ہے، حالانکہ وہ اس کی استطاعت میں ہو تو اس پر اس کا ضرور مواخذہ ہوگا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کو ہر بات کا علم ہے۔

﴿۳﴾ وَأَسْعُوا وَاطِيعُوا: یعنی اللہ اور اس کے رسول کے احکام سنو اور ان کی اطاعت کرو۔ رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے سب سے پہلے کی بیعت لیا کرتے تھے، عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی بیعت والی حدیث کے الفاظ ہیں: ((بَايَعَنَا رَسُولُ اللَّهِ كِتَابٌ وَسُنَّةٌ فِي رُشْنِي مِثْلَ لَهْفِي))

إِنْ تَقْرَضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا يُضْعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۖ وَاللَّهُ شَكُورٌ حَلِيمٌ ﴿۱۷﴾

اگر تم اللہ کو قرض دو گے، اچھا قرض تو وہ اسے تمہارے لیے کئی گنا کر دے گا اور تمہیں بخش دے گا اور اللہ بڑا قدر دان، بے حد بردبار ہے ﴿۱۷﴾

صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِي الْمَنْسُطِ وَالْمَكْرُهِ [بخاری، الأحكام، باب كيف يبايع الإمام الناس ۷ :

۷۱۹۹] ”ہم نے رسول اللہ ﷺ سے خوش ولی اور ناگواری (ہر حال) میں سننے اور فرماں برداری کرنے پر بیعت کی۔“

﴿۱۷﴾ وَأَنْفِقُوا خَيْرًا لِأَنْفُسِكُمْ : ”خَيْرًا“ ”بِخَيْرٍ“ کی خبر ہونے کی وجہ سے منصوب ہے جو یہاں ”أَنْفِقُوا“ کے جواب میں

مقتدر ہے۔ یعنی خرچ کرو یہ تمہارے لیے بہتر ہوگا۔ یہ مال کے فتنے کا تریاق ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ خرچ کیا جائے، جمع

کر کے نہ رکھا جائے۔ ابو ذر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں، میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا، آپ اس وقت کعبہ کے سائے میں تھے اور

فرما رہے تھے : ﴿ هُمْ الْأَخْسَرُونَ وَ رَبُّ الْكُفَّةِ، هُمْ الْأَخْسَرُونَ وَ رَبُّ الْكُفَّةِ ﴾ ”وہی سب سے زیادہ خسارے

والے ہیں رب کعبہ کی قسم! وہی سب سے زیادہ خسارے والے ہیں رب کعبہ کی قسم!“ میں نے کہا: ”میرا کیا معاملہ ہے، کیا مجھ

میں کوئی (خسارے والی) چیز دکھائی دے رہی ہے، میرا معاملہ کیا ہے؟“ خیر میں آپ کے پاس بیٹھ گیا اور آپ یہی فرماتے

رہے۔ مجھ میں خاموش رہنے کی سکت نہ رہی، اللہ کو جو منظور تھا (یعنی بے قراری اور اضطراب) وہ مجھ پر طاری ہو گیا، تو میں

نے پوچھا: ”وہ کون ہیں یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿ هُمْ الْأَكْثَرُونَ أَمْوَالًا إِلَّا

مَنْ قَالَ هَكَذَا وَ هَكَذَا وَ هَكَذَا ﴾ [بخاری، الأيمان والنذور، باب كيف كانت بين النبي ﷺ : ۶۶۳۸۔ مسلم

۹۹۰] ”وہ لوگ جو بہت زیادہ اموال والے ہیں، سوائے اس کے جو اس طرح اور اس طرح اور اس طرح (بے دریغ)

خرچ کرے۔“

﴿۱۷﴾ ”أَنْفِقُوا“ (خرچ کرو) کا مصرف ذکر نہیں فرمایا، تاکہ عام رہے اور فرض و نفل ہر قسم کا خرچ کرتے رہنے کی تاکید ہو

جائے۔ اس میں اپنی ذات پر، اہل و عیال پر اور ان لوگوں پر خرچ کرنا بھی شامل ہے جن کی پرورش اس کے ذمے ہے۔

ضرورت کی دوسری جگہوں پر بھی، صدقات کے ان آٹھ مصارف میں بھی جن کا سورہ توبہ کی آیت (۶۰) ”إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ

لِلْفُقَرَاءِ.....“ میں ذکر ہے اور ان میں سے بھی خاص طور پر ان لوگوں پر جو جہاد فی سبیل اللہ کے لیے وقف ہیں۔ دیکھیے

سورہ بقرہ (۲۴۳) کی تفسیر۔

﴿۱۷﴾ وَ تَنْ يُؤْتَى شَعْرَ نَفْسِهِ... : اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ حشر کی آیت (۹) کی تفسیر۔ ”شع“ سے بچنے کی تاکید

سے ظاہر ہے کہ اہل و عیال پر خرچ بھی اللہ کے ساتھ قرض حسن کے معاملے میں شامل ہے۔

آیت ۱۷ : ﴿۱۷﴾ إِنَّ تَقْرَضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا يُضْعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ : اس کی وضاحت کے لیے دیکھیے سورہ بقرہ

(۲۳۵) کی تفسیر۔

عِلْمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿۱۸﴾

ہر پوشیدہ اور ظاہر کو جاننے والا، سب پر غالب، کمال حکمت والا ہے ﴿۱۸﴾

﴿۱۸﴾ وَاللَّهُ شَكُورٌ حَلِيمٌ: اللہ ”شکُور“ (بڑا قدر دان) ہے کہ تھوڑا سا خرچ کرنے پر اسے بے حساب بڑھاتا ہے اور گناہ بھی بخشتا ہے اور ”حَلِيمٌ“ (بے حد بردباد) ہے کہ بڑی بڑی غلطیوں پر بھی فوراً نہیں پکڑتا، بلکہ مہلت پر مہلت دیتا چلا جاتا ہے۔ اس میں ازواج و اولاد کے ساتھ معاملے میں ”شکر و حلم“ اختیار کرنے کی طرف بھی اشارہ ہے کہ میاں بیوی اور والد و اولاد دونوں ایک دوسرے کے معمولی حسن سلوک کی بھی قدر کریں اور ایک دوسرے کی کوتاہیوں پر بردباری سے کام لیں۔

آیت 18 ﴿۱۸﴾ عِلْمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ: یہ صفات یہاں ذکر کرنے سے یہ احساس دلانا مقصود ہے کہ میاں بیوی اور والد و اولاد کے باہمی معاملات سے پوری طرح واقف اللہ تعالیٰ ہی ہے، لوگوں کو اس کی خبر نہیں ہو سکتی، کیونکہ وہ ان سے الگ رہتے ہیں۔ اس لیے ان میں سے ہر ایک کو ہر وقت اس عالم الغیب والشہادہ کو اپنے سامنے رکھنا چاہیے اور اس کی گرفت سے ڈرتے رہنا چاہیے، کیونکہ وہ عزیز بھی ہے اور حکیم بھی۔





اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

سورۃ تغابن میں بیویوں کے ساتھ رہن سہن میں کشادہ دلی اور عفو و درگزر کے ساتھ مدارات اور گزارا کرنے کی تعلیم دی گئی ہے، لیکن اگر میاں بیوی کا اختلاف حد سے بڑھ جائے اور گزارے کی کوئی صورت نہ رہے تو اللہ تعالیٰ نے طلاق کی بھی اجازت دی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح زنا کو حرام قرار دینا اور نکاح کا حکم دینا اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے، کیونکہ اس سے نسب اور نسل کی حفاظت ہوتی ہے اور معاشرے میں فسق و فجور اور قتل و غارت کے بجائے پاکیزگی اور امن و امان کا دور دورہ ہوتا ہے، اسی طرح زوجین میں موافقت نہ رہے تو مرد کو طلاق کی اور عورت کو خلع کی اجازت بھی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی رحمت ہے، جس سے وہ ایسی زندگی سے نکل آتے ہیں جو ہر لمحہ ان کے لیے شدید اذیت کا باعث تھی اور دونوں کو نیا نکاح کر کے آئندہ کے لیے خوشگوار زندگی گزارنے کا موقع مل جاتا ہے۔ اسی صورت میں اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے سے جدا ہونے والے مرد اور عورت میں سے ہر ایک کو اپنی وسعت کے ساتھ غنی کر دینے کا وعدہ فرمایا ہے اور اسے اپنی وسعت و حکمت کا ایک مظہر قرار دیا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَإِنْ يَتَفَرَّقَا يُغْنِ اللَّهُ كُلًّا مِمَّا سَعَتِهِمْ ۚ وَكَانَ اللَّهُ وَاسِعًا حَكِيمًا﴾ [النساء: ۱۳۰]

”اور اگر وہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں تو اللہ ہر ایک کو اپنی وسعت سے غنی کر دے گا اور اللہ ہمیشہ سے وسعت والا، کمال حکمت والا ہے۔“ جن اقوام نے طلاق پر پابندی لگائی اور اسے ناجائز قرار دیا ہے یا اس پر نامناسب پابندیاں لگائی ہیں، مثلاً یہ کہ طلاق دینے والا مرد ساری عمر اپنی مطلقہ کے نان و نفقہ کا ذمہ دار ہوگا وغیرہ، انہوں نے ایک دوسرے سے موافقت نہ رکھنے والے میاں بیوی پر شدید ظلم کیا ہے اور ساری عمر ان پر دل کی اس خوشی کا دروازہ بند کر دیا ہے جو میاں بیوی کو نکاح سے حاصل ہوتی ہے۔ کفار کے اس اقدام کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے نکاح کرنا ہی چھوڑ دیا، کیونکہ اس صورت میں وہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکیں گے، یا جدا ہوئے تو انہیں ناقابل برداشت پابندیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اب ان میں کم ہی کوئی نکاح کرتا ہے، مردوں اور عورتوں کی اکثریت نکاح کے بغیر ایک دوسرے کے ساتھ رہ کر حرام اولاد کو جنم دے رہی ہے اور جس کا دوسرے سے دل بھر جاتا ہے وہ اسے چھوڑ کر آگے روانہ ہو جاتا ہے۔

طلاق صرف ایک دوسرے سے جدا ہونے کا ذریعہ نہیں بلکہ میاں بیوی کے بگڑے ہوئے معاملات کو درست کرنے کا آخری ذریعہ بھی ہے، کیونکہ جب اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ طریقے کے مطابق طلاق دی جائے تو عدت کی صورت میں مرد کے پاس رجوع کا اور عورت کے پاس خاوند کو منالینے کا موقع موجود ہوتا ہے اور تین حیض یا وضع حمل تک ایک گھر میں اکٹھے رہنے کی وجہ سے امید ہوتی ہے کہ جدائی کا باعث بننے والی کشیدگی ختم ہو جائے اور وہ دونوں آپس میں صلح کر لیں۔ سورۃ طلاق کی پہلی آیت ”لَعَلَّ اللَّهُ يُخْدِتُ بَعْدَ ذَلِكَ أَمْرًا“ میں یہی بات بیان ہوئی ہے۔

رسول اللہ ﷺ جس طرح ہر کام میں ہمارے لیے نمونہ ہیں نکاح و طلاق میں بھی نمونہ ہیں۔ آپ ﷺ نے نکاح بھی کیے ہیں اور بعض کو طلاق بھی دی ہے، جیسا کہ آپ ﷺ نے بنت الجحون کو ”أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنْكَ“ کہنے پر طلاق دے دی۔ [دیکھیے

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوهُنَّ لِعَدَّتِهِنَّ وَأَحْصُوا الْعِدَّةَ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ

اے نبی! جب تم عورتوں کو طلاق دو تو انہیں ان کی عدت کے وقت طلاق دو اور عدت کو گنو اور اللہ سے ڈرو جو تمہارا بخاری، الطلاق، باب من طلق وهل يواجه الرجل امرأته بالطلاق؟ : ۵۲۵۴] اور آپ ﷺ نے طلاق دے کر رجوع بھی کیا ہے، چنانچہ ابن عباس رضی اللہ عنہما عمر رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں: «أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ طَلَّقَ حَفْصَةَ ثُمَّ رَاجَعَهَا» [أبو داؤد، الطلاق، باب في المراجعة : ۲۲۸۳، وقال الألباني صحيح] ”نبی ﷺ نے حفصہ (رضی اللہ عنہا) کو طلاق دے دی، پھر ان سے رجوع کر لیا۔“

آیت ۱ ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ.....﴾ : یہاں ایک سوال ہے کہ پہلے ”يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ“ کے ساتھ صرف نبی ﷺ کو خطاب کیا، پھر ”إِذَا طَلَقْتُمُ“ میں جمع کے صیغے کے ساتھ خطاب کیوں کیا گیا ہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ چونکہ طلاق کے احکام میں آپ ﷺ اور آپ کی امت دونوں مشترک ہیں، اس لیے آپ کو اور آپ کی امت دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے ”إِذَا طَلَقْتُمُ“ فرمایا، مگر پہلے خاص طور پر آپ کو خطاب آپ کی تعظیم کے لیے ہے، جیسے کسی قوم کے سردار سے کہا جاتا ہے، اے فلاں! تم ایسا کرو، یعنی تم اور تمہاری قوم ایسا کرو۔ گویا یوں فرمایا کہ اے نبی! جب تم لوگ طلاق دو، یعنی آپ اور آپ کی امت طلاق دے۔

آیت ۲ ﴿إِذَا طَلَقْتُمُ﴾ (جب تم طلاق دو) سے مراد یہ ہے کہ جب تم طلاق کا ارادہ کرو، جیسا کہ سورہ مائدہ کی آیت (۶) ”إِذَا طَلَقْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ“ میں ہے۔

آیت ۳ ﴿النِّسَاءَ﴾ سے مراد صرف وہ عورتیں ہیں جن کے ساتھ نکاح کے بعد دخول ہو چکا ہو، کیونکہ جن عورتوں کو دخول سے پہلے طلاق دے دی جائے ان کی کوئی عدت نہیں۔ (دیکھیے سورہ احزاب: ۴۹)۔

آیت ۴ ﴿فَطَلِّقُوهُنَّ لِعَدَّتِهِنَّ﴾ : جب تم عورتوں کو طلاق دینا چاہو تو یہ نہیں کہ جب چاہو طلاق دے دو، بلکہ ان کی عدت کے وقت طلاق دو، یعنی جب عورت حیض سے پاک ہو تو طہر کی حالت میں جماع کے بغیر طلاق دو، تاکہ اس کی عدت کسی کی یا زیادتی کے بغیر پوری ہو، کیونکہ اگر تم حالت حیض میں طلاق دو گے تو اگر اس حیض کو عدت میں شمار کرو تو عدت تین حیض سے کم رہ جائے گی اور اگر شمار نہ کرو تو تین حیض سے زیادہ ہو جائے گی، کیونکہ بعد میں آنے والے تین حیضوں کے ساتھ اس حیض کے وہ ایام بھی شامل ہوں گے جو طلاق کے بعد باقی ہوں گے۔ اسی طرح اگر تم انہیں ایسے طہر میں طلاق دو گے جس میں ان کے ساتھ جماع کیا ہے تو ممکن ہے کہ حمل قرار پا جائے، اس صورت میں معلوم نہیں ہو سکے گا کہ اس کی عدت کے لیے تین حیض کا اعتبار ہوگا یا وضع حمل کا۔ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنی بیوی کو طلاق دی جب وہ حیض کی حالت میں تھی، عمر رضی اللہ عنہ نے اس کا ذکر رسول اللہ ﷺ سے کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: «مُرَةٌ فَلَيْرَاجِعَهَا، ثُمَّ لِيُمْسِكَهَا حَتَّى تَطْهَّرَ ثُمَّ تَجِيضُ، ثُمَّ تَطْهَّرَ، ثُمَّ إِنْ شَاءَ أَمْسَكَ بَعْدَ وَ إِنْ شَاءَ طَلَّقَ قَبْلَ أَنْ يَمَسَّ، فَلَيْتُكَ الْعِدَّةُ النَّبِيُّ أَمَرَ اللَّهُ أَنْ تَطْلُقَ

رَبِّكُمْ ۚ لَا تَخْرُجُوهُنَّ مِنْ بُيُوتِهِنَّ وَلَا يُخْرَجُنَّ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبِينَةٍ ۗ

رب ہے، نہ تم انہیں ان کے گھروں سے نکالو اور نہ وہ نکلیں مگر یہ کہ کوئی کھلی بے حیائی (عمل میں) لائیں۔ اور یہ اللہ

لَهَا النِّسَاءُ» [بخاری، الطلاق، باب قول اللہ تعالیٰ: ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ...﴾: ۵۲۵۱] ”اسے حکم دو کہ وہ اس سے رجوع کرے، پھر اسے اپنے پاس رکھے یہاں تک کہ وہ پاک ہو، پھر اسے حیض آئے، پھر پاک ہو، پھر اگر چاہے تو اپنے پاس رکھے اور اگر چاہے تو چھوٹنے سے پہلے طلاق دے دے، کیونکہ یہ ہے وہ عدت جس کے وقت اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو طلاق دینے کا حکم دیا ہے۔“ اگر عورت حاملہ ہو تو اسے کسی بھی وقت طلاق دی جاسکتی ہے، کیونکہ اس کی عدت وضع حمل معلوم اور واضح ہے، جیسا کہ آگے ”وَأُولَاتُ الْأَحْمَالِ أَجَلُهُنَّ أَنْ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ“ میں آرہا ہے۔

۵) اللہ تعالیٰ نے طلاق کے لیے یہ وقت اس لیے مقرر فرمایا ہے کہ جہاں تک ہو سکے میاں بیوی کا تعلق قائم رہے، اگر کبھی آدمی کو غصہ آئے تو فوراً طلاق نہ دے بلکہ اس وقت کا انتظار کرے جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ اتنی دیر میں غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا اور حیض سے فراغت کے بعد خاندان کو بیوی کی طرف جو رغبت ہوتی ہے وہ طلاق سے باز رکھنے کا باعث ہوگی۔ اسی طرح حمل کی حالت خاندان کو طلاق سے روکنے کا باعث ہے، کیونکہ آنے والے مہمان کی امید اسے اس اقدام سے باز رکھنے والی ہے۔ ان دونوں وقتوں میں طلاق دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ طلاق کسی وقتی اشتعال کی وجہ سے نہیں بلکہ خوب سوچ سمجھ کر دی جا رہی ہے، اس کے بعد عدت کی صورت میں ایک خاصی مدت تک دونوں کو ایک گھر میں رہنے کا حکم دیا گیا، ہو سکتا ہے کہ ان کا تعلق باقی رہنے کی کوئی صورت نکل آئے۔ افسوس! مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی پروا ہی نہیں کی، (إلا ما شاء اللہ) حالانکہ اگر وہ طلاق کے لیے اس وقت کا انتظار کرتے جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے تو طلاق کی نوبت ہی بہت کم آتی، پھر عدت کی برکت سے دوبارہ رجوع کی بھی بہت امید تھی۔

۶) ایک وقت میں صرف ایک طلاق دینا ہی جائز ہے، اس سے زیادہ دینا حرام ہے۔ اگر کوئی شخص ایک وقت میں ایک سے زیادہ طلاقیں دے دے تو صرف ایک طلاق ہوگی۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ بقرہ (۲۲۹، ۲۳۰) کی تفسیر۔

۷) وَأَخْضُوا الْوَدَّاءَ: ”أَخْضَى يُخْضِي“ اچھی طرح شمار کرنا، گننا۔ یہ ”خَصِي“ (کنکریاں) سے مشتق ہے۔ عرب امی تھے، جب انہیں ایسی چیز گننا ہوتی جو تعداد میں زیادہ ہوتی تو ہر ایک کے لیے ایک کنکری رکھتے جاتے، آخر میں کنکریوں کو گن لیتے۔ ”الْوَدَّاءُ“ (بروزنِ فِعْلَةٌ) بمعنی ”مَعْدُودٌ“ ہے، گنے ہوئے دن، جیسے ”طِخْنٌ“ بمعنی ”مَطْخُونٌ“ (پسا ہوا آٹا) ہے۔ یعنی وہ دن جن کے گزر جانے کے بعد کسی اور شخص سے نکاح حلال ہو جاتا ہے۔ اس پر ”الف لام“ عہد کا ہے، یعنی وہ عدت جو دوسری آیات میں بتائی گئی ہے۔ (دیکھیے بقرہ: ۲۲۸۔ طلاق: ۴) عدت کو اچھی طرح گننے کا حکم اس لیے دیا کہ ایسا نہ ہو کہ عدت گزرنے کے بعد بھی تم رجوع کر لو یا عدت گزرنے سے پہلے عورت کسی اور مرد سے نکاح کر لے، جب کہ یہ دونوں کام ناجائز ہیں۔

۸) وَأَتَقُوا اللَّهَ رَبِّكُمْ: ذاتی نام ”اللہ“ اور وصفی نام ”رَبُّ“ کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ سے، جو ہر لمحے انسان کی پرورش کر رہا

وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ لَا تَدْرِي لَعَلَّ اللَّهَ

يُحَدِّثُ بَعْدَ ذَلِكَ أَمْرًا ①

کی حدیں ہیں اور جو اللہ کی حدوں سے آگے بڑھے تو یقیناً اس نے اپنے آپ پر ظلم کیا۔ تو نہیں جانتا شاید اللہ اس کے بعد کوئی نئی بات پیدا کر دے ①

ہے، ڈرنے کا حکم دیا، یعنی ان ایام میں طلاق دینے سے اللہ سے ڈرتے رہو جن میں طلاق دینا ممنوع ہے، کیونکہ اس میں اللہ کی نافرمانی بھی ہے اور عورت کو اذیت رسانی بھی۔ اسی طرح عدت کے ایام میں عورتوں کو گھروں سے نکالنے سے بھی ڈرو۔

⑨ لَا تَخْرُجُوهُنَّ مِنْ بُيُوتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ : ”بُيُوتِهِنَّ“ سے مراد خاوندوں کے گھر ہیں جن میں عورتیں رہ رہی ہیں، ان میں رہنے کی وجہ سے انہیں ان کے گھر فرمایا ہے۔ یعنی عورت کے لیے عدت کے ایام خاوند کے گھر میں گزارنا ضروری ہے، نہ خاوندوں کو انہیں ان کے گھروں سے نکالنے کی اجازت ہے نہ انہیں خود ان سے نکل جانے کی۔ اس کی حکمت آگے ”لَعَلَّ اللَّهَ يُحَدِّثُ بَعْدَ ذَلِكَ أَمْرًا“ میں بیان فرمائی کہ اتنی مدت ایک گھر میں اکٹھے رہنے سے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی باہمی صلح اور رجوع کی کوئی صورت پیدا فرمادے گا۔ اگر وہ دونوں ایک دوسرے سے اسی وقت الگ ہو گئے اور ملاقات کا موقع ہی نہ رہا تو رجوع کا معاملہ بہت مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا خوف دلا کر نہایت تاکید کے ساتھ یہ حکم دیا ہے، مگر مسلمانوں نے کم ہی اس کی پروا کی ہے، شاید ہی کوئی ایسا مرد ہو جو طلاق کے بعد عورت کو اپنے گھر میں رہنے دے یا کوئی ایسی عورت ہو جو وہاں رہے۔

⑩ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبِينَةٍ : ”فَاحِشَةٍ“ کوئی بھی قول یا فعل جس میں بہت بڑی قباحت ہو۔ ”مُبِينَةٍ“ کھلی اور واضح۔ ”بِفَاحِشَةٍ مُّبِينَةٍ“ میں زنا، چوری وغیرہ کے علاوہ عورت کا خاوند سے یا اس کے اہل خانہ سے بدزبانی اور گالی گلوچ کرنا بھی شامل ہے۔ طبری نے محمد بن ابراہیم کی حسن سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل فرمایا ہے، انہوں نے فرمایا: «الْفَاحِشَةُ أَنْ تَبْدُو عَلَى أَهْلِهَا» ”فاحشہ یہ ہے کہ گھر والوں پر زبان درازی کرے۔“

⑪ وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ : یعنی وہ مرد جو عورت کو اس وقت طلاق دیتا ہے جب طلاق دینے کا وقت نہیں، یا عدت میں عورت کو گھر سے نکال دیتا ہے، یا وہ عورت جو خود ہی نکل جاتی ہے، یہ نہ سمجھیں کہ وہ معمولی خطا کر رہے ہیں، بلکہ وہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں پھلانگ رہے ہیں اور جو اللہ کی حدیں پھلانگتا ہے یقیناً وہ اپنی جان پر ظلم کر رہا ہے۔

⑫ لَا تَدْرِي لَعَلَّ اللَّهَ يُحَدِّثُ بَعْدَ ذَلِكَ أَمْرًا : یعنی طلاق کے بعد عورت کو عدت کے دوران خاوند کے گھر میں رہنے کا حکم اس لیے ہے کہ شاید اللہ تعالیٰ اس کے بعد ان کی باہمی موافقت کی کوئی صورت پیدا فرمادے اور خاوند اس سے رجوع

فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ فَارِقُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَأَشْهَدُوا ذَوَىٰ

پھر جب وہ اپنی میعاد کو پہنچے لگیں تو انہیں اچھے طریقے سے روک لو، یا اچھے طریقے سے ان سے جدا ہو جاؤ اور اپنوں

کر لے۔ اس سے معلوم ہوا کہ خاوند کے گھر میں رہ کر عدت گزارنے کا حکم اس طلاق میں ہے جس سے رجوع ہو سکتا ہو اور وہ صرف پہلی اور دوسری طلاق ہے، ان دونوں کو رجعی طلاق کہتے ہیں، ان کی عدت کے دوران عورت کی رہائش اور نفقہ خاوند کے ذمے ہے۔ رہی تیسری طلاق کی عدت، تو اگرچہ عورت اس کے دوران آگے نکاح نہیں کر سکتی مگر خاوند رجوع بھی نہیں کر سکتا، اس لیے اس کے دوران اس کی رہائش نہ صرف یہ کہ خاوند کے ذمے نہیں بلکہ اس کا خاوند کے ساتھ اس کے گھر میں رہنا ہی ٹھیک نہیں، کیونکہ اس میں سابقہ بے تکلفی کی وجہ سے ان کے حد سے تجاوز کا خطرہ ہے جب کہ وہ عورت اس کے لیے حلال نہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّىٰ تَتَّكِمَ زَوْجًا غَيْرَهَا﴾ [البقرة: ۲۳۰] ”پھر اگر وہ اسے (تیسری) طلاق دے دے تو اس کے بعد وہ اس کے لیے حلال نہیں ہوگی، یہاں تک کہ اس کے علاوہ کسی اور خاوند سے نکاح کرے۔“ اگرچہ بہت سے ائمہ نے اس کی رہائش خاوند کے ذمے قرار دی ہے، مگر اس آیت کے مطابق اور رسول اللہ ﷺ کی صحیح حدیث کے مطابق تیسری طلاق کے بعد اس کی رہائش خاوند کے ذمے نہیں ہے۔ فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: «أَنَّهُ طَلَّقَهَا زَوْجَهَا فِي عَهْدِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَ أَنْفَقَ عَلَيْهَا نَفَقَةَ دُونَ، فَلَمَّا رَأَتْ ذَلِكَ قَالَتْ وَاللَّهِ! لَأُعْلِمَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَإِنْ كَانَ لِي نَفَقَةٌ أَخَذْتُ الَّذِي يُضِلُّحَنِي وَإِنْ لَمْ تُكُنْ لِي نَفَقَةٌ لَمْ أَخُذْ مِنْهُ شَيْئًا، قَالَتْ فَذَكَرْتُ ذَلِكَ لِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَا نَفَقَةَ لَكَ وَلَا سُكْنَى» [مسلم، الطلاق، باب المطلقة البائن لا نفقة لها: ۱۴۸۰، ۳۷] ”نبی ﷺ کے زمانے میں ان کے خاوند نے انہیں طلاق دے دی اور انہیں معمولی خرچہ دیا۔ جب انہوں نے یہ دیکھا تو کہا: ”اللہ کی قسم! میں یہ بات رسول اللہ ﷺ کے علم میں لاؤں گی، پھر اگر میرے لیے خرچہ ہوا تو اتنا لوں گی جو میری حالت درست رکھ سکے اور اگر میرے لیے خرچہ نہ ہوا تو میں اس سے کچھ بھی نہیں لوں گی۔“ فرماتی ہیں، میں نے یہ بات رسول اللہ ﷺ سے ذکر کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ”تیرے لیے نہ خرچہ ہے نہ رہائش۔“ یاد رہے کہ صحیح مسلم کے اسی باب کی ایک روایت میں صراحت ہے کہ ان کے خاوند نے انہیں تیسری طلاق دے دی تھی۔

آیت ۲ ① فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ : یعنی جب ان کی عدت ختم ہونے کے قریب پہنچ جائے، کیونکہ عدت ختم ہونے کے بعد تو رجوع ہو نہیں سکتا۔

② فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ فَارِقُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ : یعنی جب عورتوں کی عدت ختم ہونے کے قریب ہو، صرف اتنی باقی ہو جس میں ان سے رجوع ہو سکتا ہو تو انہیں معروف (اچھے طریقے) کے ساتھ روک لو یا معروف کے ساتھ ان سے جدا ہو جاؤ۔ معروف کے ساتھ روکنے کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ اچھے طریقے سے ان کے ساتھ رہنے کی نیت سے ان سے رجوع

عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَاقْبُوا الشَّهَادَةَ لِلَّهِ ۗ ذَلِكُمْ يُوعَظُ بِهِ فَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ

میں سے دو صاحب عدل آدمی گواہ بنا لو اور شہادت اللہ کے لیے قائم کرو۔ یہ وہ (حکم) ہے جس سے اس شخص کو

کر کے حسب سابق بیوی بنا کر رکھ لو اور اس رجوع پر گواہ بناؤ اور معروف طریقے سے جدا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان سے رجوع نہ کرو بلکہ انہیں ان کے حال پر رہنے دو، تاکہ عدت ختم ہو جائے اور وہ خود بخود تم سے جدا ہو جائیں، پھر کسی لڑائی جھگڑے یا برا بھلا کہنے کے بغیر انہیں رخصت کر دو۔ اس میں اچھائی یہ ہے کہ اگرچہ عدت گزرنے کی وجہ سے وہ آزاد ہیں کہ جس مرد سے چاہیں شادی کر لیں، مگر انہیں پہلے خاوندوں سے شادی کا بھی اختیار ہے۔

③ سورہ بقرہ میں اور یہاں پہلی یا دوسری طلاق کے بعد وہی صورتیں بیان فرمائی ہیں، ایک یہ کہ عدت ختم ہونے سے پہلے رجوع کر لو، دوسری یہ کہ اچھے طریقے سے چھوڑ دو، یعنی رجوع نہ کرو بلکہ عدت ختم ہونے دو اور اچھے طریقے سے جدا ہو جاؤ، عدت ختم ہونے سے پہلے دوسری یا تیسری طلاق دینے کا حکم نہیں دیا۔ جس عورت کو حیض آتا ہو اس کے لیے طلاق سنت یہی ہے۔ بعض حضرات طلاق کا سنت طریقہ یہ بیان کرتے ہیں کہ جب عورت حیض سے پاک ہو تو جماع کے بغیر اسے ایک طلاق دو، اگلے طہر میں دوسری طلاق دو اور تیسرے طہر میں تیسری طلاق دو، حالانکہ یہ ہرگز طلاق سنت نہیں ہے۔ یہ طلاق کیسے ہو سکتی ہے جب کہ ابھی پہلی طلاق کی عدت جاری ہے، نہ وہ آخر کو پہنچی ہے نہ اس سے رجوع ہوا ہے، تو دوسری اور تیسری طلاق کا کیا مطلب؟ پھر اس میں بلا ضرورت عورت کو ہمیشہ کے لیے حرام کرنے کی تلقین کی گئی ہے جو شریعت کے مقصد ہی کے خلاف ہے۔ طلاق سنت صرف دو ہی ہیں، ایک وہ جو آیت میں مذکور ہے اور عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کی ہے کہ عورت حیض سے پاک ہو تو جماع کے بغیر اسے طلاق دی جائے، پھر اگر اسے بسانے کی نیت ہو تو عدت ختم ہونے سے پہلے رجوع کر لے، یا عدت ختم ہو جانے دے، جس سے وہ خود بخود جدا ہو جائے گی۔ طلاق سنت کی دوسری صورت یہ ہے کہ حمل کی حالت میں طلاق دے، پھر وضع حمل سے پہلے یا تو رجوع کر لے یا عدت ختم ہونے پر علیحدگی اختیار کر لے۔

ہر طہر میں طلاق کو سنت قرار دینے والے دلیل میں عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کا قول بیان کرتے ہیں، سنن نسائی میں ہے: «أَخْبَرَنَا مُحَمَّدُ بْنُ يَحْيَى بْنِ أَيُّوبَ قَالَ حَدَّثَنَا حَفْصُ بْنُ غِيَاثٍ قَالَ حَدَّثَنَا الْأَنْعَشِيُّ، عَنْ أَبِي إِسْحَاقَ، عَنْ أَبِي الْأَخْوَصِ، عَنْ عَبْدِ اللَّهِ أَنَّهُ قَالَ طَلَاقُ السُّنَّةِ تَطْلِيْقَةٌ وَهِيَ طَاهِرَةٌ فِي غَيْرِ جِمَاعٍ فَإِذَا حَاضَتْ وَطَهَّرَتْ طَلَّقَهَا أُخْرَى فَإِذَا حَاضَتْ وَطَهَّرَتْ طَلَّقَهَا أُخْرَى ثُمَّ تَعَدَّتْ بَعْدَ ذَلِكَ بِحَيْضَةٍ» [نسائی، الطلاق، باب طلاق السنة: ۳۴۲۳] "عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "طلاق سنت یہ ہے کہ عورت کو طہر کی حالت میں جماع کے بغیر ایک طلاق دے، پھر جب اسے حیض آئے اور وہ پاک ہو تو اسے دوسری طلاق دے، پھر جب اسے حیض آئے اور وہ پاک ہو تو اسے تیسری طلاق دے، پھر اس کے بعد ایک حیض عدت گزارے۔" مگر اس روایت میں طلاق سنت کی جو تفصیل آئی ہے درست نہیں، کیونکہ یہ قرآن کی آیت کے خلاف ہے اور خود عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے طلاق کا طریقہ آیت کے مطابق اس سند

الْآخِرَةُ وَ مَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا ﴿۱﴾

صحیح کی جاتی ہے جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتا ہے اور جو اللہ سے ڈرے گا وہ اس کے لیے نکلنے کا کوئی راستہ بنا دے گا ﴿۱﴾

سے بہتر سند کے ساتھ ثابت ہے۔ ابن ابی شیبہ رض فرماتے ہیں: « حَدَّثَنَا وَكِيعٌ، عَنْ ابْنِ إِسْرَائِيلَ، عَنْ أَبِي إِسْحَاقَ، عَنْ أَبِي الْأَخْوَصِ، عَنْ عَبْدِ اللَّهِ قَالَ مَنْ أَرَادَ الطَّلَاقَ الَّذِي هُوَ الطَّلَاقُ فَلْيَطْلُقْهَا تَطْلِيفَةً، ثُمَّ يَدْعُهَا حَتَّى تَجِيْضُ ثَلَاثَ جِيْضٍ » | مصنف ابن ابی شیبہ، الطلاق، باب ما يستحب من طلاق السنة: ۴/۵، ج: ۱۸۰۳۶ |
 ”عبداللہ بن مسعود رض نے فرمایا: ”جو شخص طلاق دینا چاہے، جو اصل طلاق ہے، وہ عورت کو ایک طلاق دے، پھر اسے اس کے حال پر چھوڑ دے یہاں تک کہ اسے تین جیض آجائیں۔“

واضح رہے کہ عبداللہ بن مسعود رض سے مروی دونوں روایتوں کی سند ابواسحاق سے عبداللہ بن مسعود رض تک ایک ہی ہے، پھر نسائی کی روایت میں ابواسحاق سے بیان کرنے والے اعمش ہیں جو مشہور مدلس ہیں، جب کہ ابن ابی شیبہ کی سند میں ابواسحاق سے بیان کرنے والے ان کے پوتے اسرائیل بن یونس بن اسحاق ہیں جن کے متعلق ابوحاتم نے فرمایا: ”هُوَ مِنْ أَتَقِي أَصْحَابِ أَبِي إِسْحَاقَ“ ”وہ ابواسحاق کے سب سے پختہ شاگردوں میں سے ہیں۔“ یاد رہے کہ اسرائیل پر تدلیس کی تہمت بھی نہیں، اس لیے انہی کی روایت معتبر ہوگی۔ نسائی میں ابن مسعود رض سے طلاق سنت کی جو تعریف اعمش نے روایت کی ہے وہ صحیح نہیں۔

﴿۱﴾ وَ أَشْهَدُ وَأَذُوْنِي عَدْلِي وَمَنْ تَقَى اللَّهَ: یعنی جب رجوع کا ارادہ کرو تو دو صاحب عدل آدمی گواہ بنا لو، تاکہ بعد میں کسی قسم کے جھگڑے کا یا گناہ میں مبتلا ہونے کا خطرہ باقی نہ رہے۔ مثلاً اگر خاوند نے رجوع کر لیا ہو مگر گواہ نہ بنائے ہوں اور فوت ہو جائے تو اس کے وارث اس کی بیوی کو اس کی میراث سے یہ کہہ کر محروم کر سکتے ہیں کہ تمہیں تو طلاق ہو چکی تھی اور رجوع کا کوئی گواہ نہیں، اس لیے تم نہ اس کی بیوی رہی ہو اور نہ میراث میں تمہارا حق ہے۔ اسی طرح اگر خاوند گواہوں کے بغیر رجوع کر لے اور عورت اللہ سے تہ ذرتی ہو اور کہیں اور نکاح کرنا چاہتی ہو تو عدت ختم ہونے پر کہہ سکتی ہے کہ خاوند نے مجھ سے رجوع نہیں کیا، اب میں آزاد ہوں اور جہاں چاہوں نکاح کروں۔ اسی طرح اگر گواہی کی شرط نہ ہو تو عدت ختم ہونے کے بعد بھی خاوند دعویٰ کر سکتا ہے کہ میں نے عدت ختم ہونے سے پہلے رجوع کر لیا تھا۔ رجوع کی طرح عدت کے خاتمے پر ایک دوسرے سے علیحدگی کی صورت میں بھی گواہ بنانے کا حکم ہے، تاکہ اس طرح کی قباحتوں میں سے کوئی قباحت پیدا نہ ہو جن کا اوپر ذکر ہوا۔

واضح رہے کہ سنت یہی ہے کہ طلاق اور رجوع دونوں پر گواہ بنائے جائیں، مطرف بن عبداللہ کہتے ہیں: « أَنَّ عُمَرَ بْنَ حُصَيْنٍ سَأَلَ عَنِ الرَّجُلِ يُطَلِّقُ امْرَأَتَهُ ثُمَّ يَقَعُ بِهَا وَلَمْ يُشْهَدْ عَلَى طَلَاقِهَا وَلَا عَلَى رَجْعَتِهَا فَقَالَ طَلَّقْتَ بِغَيْرِ سُنَّةٍ وَرَجَعْتَ بِغَيْرِ سُنَّةٍ أَشْهَدُ عَلَى طَلَاقِهَا وَعَلَى رَجْعَتِهَا وَلَا تَعُدُّ » | ابو داؤد، الطلاق، باب الرجل يراجع

ولایشهد: ۲۱۸۶] ”عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے اس آدمی کے بارے میں سوال کیا گیا جو اپنی بیوی کو طلاق دے دیتا ہے پھر اس سے جماع کر لیتا ہے، لیکن نہ اس نے اس کی طلاق پر کوئی گواہ بنایا ہے اور نہ اس کے رجوع پر؟ تو انھوں نے فرمایا: ”تم نے سنت کے خلاف طلاق دی اور سنت کے خلاف ہی رجوع کیا۔ اس کی طلاق پر گواہ بناؤ اور اس کے رجوع پر بھی گواہ بناؤ اور دوبارہ ایسا نہ کرنا۔“

⑤ **وَاقْبُوا الشَّهَادَةَ لِلَّهِ**: یہ گواہوں کو حکم ہے کہ اللہ کی رضا کے لیے شہادت دو۔ یہ حکم اس لیے دیا کہ گواہی دینے میں آدمی کو کئی مشکلات درپیش ہوتی ہیں، اسے اپنے نہایت اہم کام ترک کرنا پڑتے ہیں، حاکم کے پاس حاضری دینا پڑتی ہے اور بعض اوقات دور دراز سے آنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ کئی لوگوں کی ناراضی کا خطرہ مول لینا پڑتا ہے اور کئی اور موانع بھی ہوتے ہیں، صرف اللہ کی رضا ایسی چیز ہے جس کی خاطر آدمی ہر مشقت برداشت کرتے ہوئے شہادت دیتا ہے اور سچی شہادت دیتا ہے۔

⑥ **ذَلِكُمْ يُوعَظُ بِهِ**.....: بعض حضرات نے یہاں یہ نکتہ بیان فرمایا ہے کہ اوپر طلاق کا وقت مقرر کرنے یا اس کا شمار کرنے، عدت کے دوران گھر سے نہ نکلنے، عدت ختم ہونے سے پہلے رجوع کر لینے یا علیحدگی اختیار کرنے اور گواہ بنانے کے جو احکام دیے گئے ہیں ان کی حیثیت وعظ و نصیحت کی ہے، قانون کی نہیں۔ ان حضرات کی یہ بات درست نہیں، حقیقت یہ ہے کہ یہ احکام بھی قانون کی حیثیت رکھتے ہیں، طلاق یا رجوع یا جو بھی عمل ان کے خلاف ہوگا اس کا کچھ اعتبار نہیں، مثلاً کوئی شخص عدت کا شمار ہی نہیں کرتا تو اس کا رجوع یا فراق کیسے معتبر ہو سکتا ہے؟ ہاں اگر کسی دوسری دلیل سے ثابت ہو جائے کہ ان میں سے فلاں حکم استحباب کے لیے ہے تو الگ بات ہے۔ قرآن مجید کی اصطلاح میں وعظ کا لفظ نہایت تاکید والے احکام کے لیے آتا ہے، جن کے قانون ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں۔ دیکھیے سورہ مجادلہ (۳)، بقرہ (۲۳۱)، نحل (۹۰) اور سورہ نور (۱۷)۔

⑦ **وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لِنَا مَخْرَجًا**: میاں بیوی کے باہمی معاملات کو ان کے سوا یا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا، اگر ان میں سے کوئی ظلم، زیادتی یا خیانت کے بعد غلط بیانی پر اتر آئے تو دنیا میں اسے کوئی جھٹلا نہیں سکتا، صرف اللہ تعالیٰ کا ڈر ہی ایسی چیز ہے جو انھیں ہر قسم کے گناہ سے باز رکھ سکتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ہر معاملے کی طرح نکاح و طلاق کے معاملے میں بھی اپنے تقویٰ کی تاکید فرمائی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نکاح کے موقع پر جو تین آیات پڑھتے تھے ان تینوں میں تقویٰ کی تاکید فرمائی ہے۔ یہاں اس بات کی طرف توجہ دلائی کہ گھریلو جھگڑوں میں آدمی اپنے آپ کو حق پر ثابت کرنے کے لیے غلط کام یا غلط بات کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس طرح میرے مسائل حل ہو جائیں گے اور اگر میں اللہ سے ڈر کر صحیح کام کروں گا یا صحیح بات کروں گا تو پھنس جاؤں گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آسان یا مشکل ہر موقع پر تم اللہ سے ڈرتے رہو اور وہی کام کرو جو اس کے تقویٰ کا تقاضا ہے۔ پھنسنے سے مت گھبراؤ، جو بھی اللہ سے ڈرے گا اللہ تعالیٰ اس کے لیے نکلنے کا راستہ بنا دے گا اور تقویٰ اختیار کرنے میں اگر کوئی نقصان ہوتا ہے، بیوی ساتھ نہیں رہتی یا مال کا نقصان ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی تلافی کے لیے اس سے بھی بہتر چیز وہاں سے دے گا جہاں سے اس کا گمان بھی نہیں ہوگا۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے بگڑے ہوئے

وَيَزُرُّقُهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۚ وَ فَن يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ بِالْغَيْبِ

اور اسے رزق دے گا جہاں سے وہ گمان نہیں کرتا اور جو کوئی اللہ پر بھروسا کرے تو وہ اسے کافی ہے، بے شک اللہ معاملات کو درست کرنے کے لیے چالاکی اختیار کرنے اور جھوٹ فریب سے اپنے آپ کو حق پر ثابت کرنے کے بجائے اللہ سے ڈرنے اور سیدھی اور صاف بات کہنے کا حکم دیا اور اس پر تمام گزے ہوئے معاملات کو درست کر دینے اور گزشتہ غلطیوں پر پردہ ڈال دینے کا وعدہ کیا، فرمایا: ﴿يَأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَ قُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ۙ يُصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ وَ يُغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۗ وَ مَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَ رَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا﴾ [الاحزاب: ۷۱، ۷۰] "اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے ڈرو اور بالکل سیدھی بات کہو۔ وہ تمہارے لیے تمہارے اعمال درست کر دے گا اور تمہارے لیے تمہارے گناہ بخش دے گا اور جو اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برواری کرے تو یقیناً اس نے کامیابی حاصل کر لی، بہت بڑی کامیابی۔"

⑧ "وَ مَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهٗ مَخْرَجًا ۙ وَ يَزُرُّقُهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ" کی جو تفسیر اوپر کی گئی ہے وہ اس مقام کی مناسبت سے ہے، ورنہ آیت کے الفاظ عام ہیں۔ اس لیے صرف نکاح و طلاق ہی نہیں، کسی مسئلے میں بھی جو شخص اللہ سے ڈرے گا اور مشکل سے مشکل حالات میں بھی اس کی نافرمانی سے بچے گا اللہ تعالیٰ جلدی یا دیر سے اس کے لیے نکلنے کا راستہ ضرور نکال دے گا اور اسے وہاں سے رزق دے گا جہاں سے اسے گمان بھی نہیں ہوگا۔ اسی طرح جو اللہ سے ڈرتا رہے گا اللہ تعالیٰ اس کے لیے دنیا کے غم، آخرت کی فکر اور موت اور قیامت کی سختیوں سے نکلنے کا راستہ بھی بنا دے گا۔

⑨ ابن کثیر نے ابن ابی حاتم کے حوالے سے عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کا قول ذکر کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا: «إِنَّ أَجْمَعَ آيَةٍ فِي الْقُرْآنِ: ﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْإِحْسَانِ﴾ [النحل: ۹۰] وَ إِنَّ أَكْبَرَ آيَةٍ فِي الْقُرْآنِ قُرْآنًا: ﴿وَ مَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهٗ مَخْرَجًا﴾ [الطلاق: ۲]» "قرآن کی سب سے جامع آیت "إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْإِحْسَانِ" ہے اور قرآن کی مشکل سے نکلنے کی سب سے بڑی آیت "وَ مَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهٗ مَخْرَجًا" ہے۔" ابن کثیر کے محقق حکمت بن بشیر نے فرمایا کہ اس کی سند جید ہے۔

⑩ واضح رہے کہ اس مقام پر ابن کثیر نے مالک بن اشجیہ رضی اللہ عنہما کے بیٹے عوف بن مالک رضی اللہ عنہما کا واقعہ ذکر کیا ہے جو دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا اور انھوں نے اسے ہاندھ رکھا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس کی طرف پیغام بھیجو کہ وہ "لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ" کثرت سے پڑھے، جس کے نتیجے میں اس کی جھٹھکیاں گر گئیں اور وہ دشمن کے اونٹ سمیٹ کر خیریت سے واپس آ گیا۔ اس پر یہ آیت اتری: ﴿وَ مَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهٗ مَخْرَجًا ۙ وَ يَزُرُّقُهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور قدرت کے لحاظ سے ایسا ہونا کچھ مشکل نہیں، مگر تفسیر ابن کثیر کے محقق حکمت بن بشیر نے لکھا ہے کہ اس کی سببیں مرسل یا منقطع ہونے کی وجہ سے ضعیف ہیں۔

آیت 3 ﴿وَ يَزُرُّقُهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾: مفسر عبد الرحمن کیلانی لکھتے ہیں: "اس مقام پر رزق کا ذکر اس لیے کیا

أَمْرِهِ ۱ قَدْ جَعَلَ اللَّهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ۝

اپنے کام کو پورا کرنے والا ہے، یقیناً اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک اندازہ مقرر کیا ہے ۝

گویا کہ انسان دوران عدت مطلقہ عورت پر خرچ کرنے اور اس کو بھلے طریقے سے رخصت کرنے میں بخل سے کام نہ لے، بلکہ اس سے جتنا بہتر سلوک کر سکتا ہے کرے۔ نیز بعض دفعہ صورت حال یہ ہوتی ہے کہ میاں بیوی کی آپس میں ٹھنی رہتی ہے، مگر عورت صاحب جاگدا ہوتی ہے یا اچھا کما سکتی ہے تو خاوند اس کو چھوڑنے ہی پر آمادہ نہیں ہوتا، مگر اس سے اچھا سلوک کرنے میں بھی ناکام ثابت ہوتا ہے، لہذا وہ عورت کو اپنے ہاں لٹکائے رکھتا ہے۔ ایسی سب صورتوں میں اللہ سے ڈرتے ہوئے وہی کام کرنا چاہیے جو اللہ کا حکم ہو، تنگ دستی سے نہیں ڈرنا چاہیے، کیونکہ اللہ کا وعدہ ہے کہ جو شخص اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے اس سے ڈر کر اسی کے حکم کے مطابق چلے گا تو اس کی تنگ دستی کو دور کرنا اللہ کے ڈر سے ہے، وہ اس کو ایسی جگہ سے رزق پہنچانے کا انتظام فرمادے گا جو پہنچنے اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔“ (تیسیر القرآن)

۝ وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ... : یعنی جو شخص غلط کام سے بچتے ہوئے حق پر قائم رہے اور اپنا معاملہ اور نفع و نقصان اللہ کے سپرد کر دے تو اللہ تعالیٰ اسے کافی ہو جائے گا، کیونکہ ہر قسم کے ظاہری اور باطنی اسباب اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں، جب کہ انسان کی نظر صرف چند ظاہری اسباب تک محدود ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ جس طرح چاہے اپنے ڈرنے والے کے لیے پریشانیوں سے نجات کی راہ پیدا کر سکتا ہے اور وہ پریشانی اور تنگ دستی دور کرنے کے لیے نئے اسباب بھی پیدا فرما سکتا ہے اور اسباب کے بغیر بھی جو چاہے کر سکتا ہے، کیونکہ اس کی قدرت اسباب کی پابندی نہیں بلکہ اسباب اس کی مشیت کے تابع ہیں۔ وہ ظاہری اسباب سے بھی ایسے نتائج ظاہر کر سکتا ہے جو انسانی عقل کے برعکس ہوں، وہ نہ چاہے تو مجرب دوا بھی شفا کے بجائے بیماری کا باعث بن جاتی ہے اور چاہے تو مضر صحت چیز شفا کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

۝ قَدْ جَعَلَ اللَّهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا : یعنی اگر کسی شخص کو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کے باوجود نکلنے کی راہ نہیں ملی اور نہ ہی اللہ پر توکل کے باوجود اس کی پریشانی دور ہوئی ہے تو اسے گھبرانا نہیں چاہیے بلکہ صبر اور حوصلے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور کشادگی کا منتظر رہنا چاہیے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا اسے ہر حال میں پورا کرنے والا ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا ایک اندازہ اور وقت اپنے کامل علم کے ساتھ شروع سے مقرر فرمایا ہے، اس مقرر وقت پر اس کا توکل کرنے والوں کے لیے کافی ہو جانے کا وعدہ ضرور پورا ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ تقدیر پر ایمان ہی انسان کو مشکلات میں صبر اور حوصلہ دلاتا ہے، فرمایا: ﴿قُلْ لَنْ يُصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا هُوَ مَوْلَانَا وَ عَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ﴾ [التوبة: ۵۱] ”کہہ دے ہمیں ہرگز نہیں پہنچے گا مگر وہی جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ دیا، وہی ہمارا مالک ہے اور اللہ ہی پر پس لازم ہے کہ ایمان والے بھروسہ کریں۔“ مزید دیکھیے سورہ قمر (۳۹)، فرقان (۲)، رعد (۸) اور سورہ حجر (۲۱)۔

وَأَيُّ يَسِّنَ مِنَ النِّحْيِ مِنْ نِسَائِكُمْ إِنْ اذْتَبْتُمْ فَعَدَّتْهُنَّ ثَلَاثَةُ أَشْهُرٍ وَالْأَيُّ

اور وہ عورتیں جو تمہاری عورتوں میں سے حیض سے ناامید ہو چکی ہیں، اگر تم شک کرو تو ان کی عدت تین ماہ ہے اور

آیت 4 ﴿وَأَيُّ يَسِّنَ مِنَ النِّحْيِ مِنْ نِسَائِكُمْ : "الْأَيُّ" "الَّتِي" کی طرح "الَّتِي" کی جمع ہے، وہ

عورتیں۔ "اِذْتَبْتُمْ" "رَبِّتْ" (شک) میں سے باب افتعال ماضی مطلق معروف جمع مذکر حاضر کا صیغہ ہے، اصل میں "اِذْتَبْتُمْ" تھا۔ یعنی وہ عورتیں جو حیض سے ناامید ہو چکی ہیں اور وہ عورتیں جنہیں حیض آیا ہی نہیں، اگر انہیں دخول کے بعد طلاق ہو تو ان کی عدت تین قمری مہینے ہے، جب کہ دخول کے بغیر طلاق ہو تو ان پر کوئی عدت نہیں۔ دیکھیے سورہ احزاب (۳۹)۔

﴿إِنْ اذْتَبْتُمْ﴾ (اگر تمہیں شک ہو) کے تین مطلب ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ اگر تمہیں شک ہو کہ عدت تو حیض سے شمار

ہوتی ہے اور ان عورتوں کا حیض بند ہے یا آیا ہی نہیں تو ان کی عدت کا کیا کیا جائے، تو ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ ان کی عدت تین قمری مہینے ہے۔ ابن کثیر نے فرمایا کہ یہ سعید بن جبیر سے مروی ہے اور ابن جریر نے یہی معنی پسند فرمایا ہے اور معنی کے لحاظ سے زیادہ ظاہر یہی ہے۔ ابن جریر نے اس پر ابی بن کعب رضی اللہ عنہما کی روایت بطور دلیل ذکر فرمائی ہے کہ انہوں نے عرض کیا:

"یا رسول اللہ! کئی طرح کی عورتوں کی عدت کا ذکر قرآن میں نہیں آیا، یعنی چھوٹی عمر کی عورتیں، عمر رسیدہ عورتیں اور حاملہ عورتیں۔ تو اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿وَأَيُّ يَسِّنَ مِنَ النِّحْيِ مِنْ نِسَائِكُمْ﴾" اور وہ عورتیں جو تمہاری عورتوں میں سے حیض سے ناامید ہو چکی ہیں۔" ابن کثیر نے اس کے علاوہ ابن ابی حاتم کی سند کے ساتھ اسی مفہوم کی مفصل روایت ذکر کی ہے، مگر تفسیر ابن کثیر کے محقق حکمت بن بشیر نے فرمایا کہ ان دونوں کی سند میں عمرو بن سالم (ابو عثمان انصاری)

راوی ہے جسے تقریب میں مقبول کہا گیا ہے، یعنی اس کی متابعت ہو تو اس کی روایت قبول ہے ورنہ کمزور ہے اور یہاں اس کی متابعت نہیں کی گئی، لہذا اس کی سند ضعیف ہے۔ اس تفسیر کے مطابق "إِنْ اذْتَبْتُمْ" کے الفاظ کا کوئی خاص فائدہ نظر نہیں آتا۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگر ایسی عورتوں کو جو حیض سے مایوس ہو چکی ہیں، بیماری کا خون (استحاضہ) شروع ہو جائے اور تم

فیصلہ نہ کر سکو کہ یہ حیض ہے یا استحاضہ تو ان کی عدت تین قمری مہینے ہے۔ یہ مجاہد اور زہری کا قول ہے۔ [طبری: ۶۹/۲۳، ح:

۳۴۶۱۷، ۳۴۶۱۸، بسند صحیح | اس سے ظاہر ہے کہ جب شک کی صورت میں ان کی عدت تین ماہ ہے تو اگر انہیں کسی قسم کا خون آتا ہی نہیں اور ان کے حیض سے مایوس ہونے میں کوئی شک ہی نہیں تو ان کی عدت بالاولیٰ تین ماہ ہے۔

تیسرا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ عام قاعدہ یہی ہے کہ جن عورتوں کا حیض بند ہو گیا ہو یا شروع ہی نہ ہوا ہو انہیں حمل نہیں

ہوتا، مگر شاذ و نادر ایسی عورتوں کو بھی حمل ہو جاتا ہے اور یہاں مسئلہ ان عورتوں کا بیان ہو رہا ہے جنہیں دخول کے بعد طلاق دی گئی ہے، اس میں حمل کا امکان بہر حال رہتا ہے۔ سو اگر تمہیں آثار سے ان کے حاملہ ہونے کا شک پڑ جائے تو ان کی عدت تین ماہ ہے، اتنی عدت میں ان کا حاملہ ہونا یا نہ ہونا واضح ہو جائے گا۔ اگر حاملہ نہ ہوں تو عدت تین ماہ ہی ہے اور اگر حمل ظاہر

لَمْ يَحْضَنْ ۚ وَأُولَاتُ الْأَخْضَالِ أَجْلُهُنَّ أَنْ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۚ وَفَن يَشَقَّ اللَّهُ يَجْعَلْ
لَهُ مِنْ أَمْرِهِ يُسْرًا ۝

ان کی بھی جنھیں حیض نہیں آیا اور جو حمل والی ہیں ان کی عدت یہ ہے کہ وہ اپنا حمل وضع کر دیں اور جو کوئی اللہ سے
ڈرے گا وہ اس کے لیے اس کے کام میں آسانی پیدا کر دے گا ۝

ہو جائے تو ان کی عدت وضع حمل ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَأُولَاتُ الْأَخْضَالِ أَجْلُهُنَّ أَنْ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ﴾ کہ حمل والی
عورتوں کی عدت وضع حمل ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اگر حیض سے اپوس عمر رسیدہ عورت یا ایسی عورت جسے حیض آیا ہی نہیں اور
ان کے متعلق حمل کا کوئی شک بھی نہ ہو تو ان کی عدت بالادلی تین ماہ ہے۔

۱۰) وَأَلْفٍ لَمْ يَحْضَنْ: یعنی وہ عورتیں جنھیں حیض آیا ہی نہیں ان کی عدت بھی تین ماہ ہے۔ اس میں چھوٹی عمر کی لڑکیاں بھی
شامل ہیں جنھیں ابھی حیض نہ آیا ہو اور بڑی عمر کی عورتیں بھی جنھیں کسی وجہ سے حیض شروع ہی نہیں ہو سکا۔ اس آیت سے معلوم
ہوا کہ چھوٹی عمر کی لڑکی سے نکاح ہو سکتا ہے اور اس کا خاوند اس سے جماع بھی کر سکتا ہے۔ کفار کے کہنے پر چھوٹی عمر کی شادی
پر پابندی لگانا یا بالغ ہو جانے والی لڑکیوں کی شادی پر اٹھارہ سال کی یا کسی مخصوص عمر کی پابندی لگانا اللہ تعالیٰ کے احکام کی
صریح مخالفت ہے۔

۱۱) وَأُولَاتُ الْأَخْضَالِ أَجْلُهُنَّ أَنْ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ: "أُولَاتُ" کی جمع ہے جیسا کہ "أُولُو" "ذُو" کی جمع
ہے۔ "أُولَاتُ الْأَخْضَالِ" حمل والیاں۔ آیت کے الفاظ عام ہیں، اس لیے حاملہ عورت کی عدت وضع حمل ہی ہے، خواہ اس
کے خاوند نے اسے طلاق دی ہو یا اس کا خاوند فوت ہو جائے۔ صحیح احادیث سے بھی یہی بات ثابت ہے کہ حاملہ عورت کا خاوند
فوت ہو جائے تو بچہ پیدا ہونے کے ساتھ اس کی عدت ختم ہو جائے گی، خواہ خاوند فوت ہونے کے فوراً بعد بچہ پیدا ہو جائے یا
کئی ماہ کے بعد پیدا ہو۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ سیدہ اسمیہ کے ہاں ان کے خاوند کے قتل ہونے کے چالیس دن بعد بچہ
پیدا ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ نے انھیں نکاح کرنے کی اجازت دے دی۔ [بخاری، التفسیر، باب: ﴿وَأُولَاتُ الْأَخْضَالِ
أَجْلُهُنَّ﴾: ۹۹، ۹۹] رہی وہ عورتیں جو حاملہ نہ ہوں اور ان کے خاوند فوت ہو جائیں تو ان کی عدت چار ماہ دن دن ہے۔
دیکھیے سورہ بقرہ (۲۳۳)۔

۱۲) وَفَن يَشَقَّ اللَّهُ يَجْعَلْ لَهُ مِنْ أَمْرِهِ يُسْرًا: اس سورت میں بار بار اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنے کی تاکید کی گئی ہے، وجہ یہ
ہے کہ میاں بیوی کے مسائل بھی کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ جب تک آدمی ہر وقت اللہ سے ڈرتا نہ رہے وہ اپنی بیوی کے معاملہ
میں بے راہ رو ہو جاتا ہے، اس لیے کتاب و سنت میں اپنی بیویوں سے حسن سلوک کی بار بار تاکید آئی ہے۔ (کیلانی) اس
مقام کی مناسبت سے اس کے کام میں آسانی پیدا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جو اللہ سے ڈرے گا اول تو طلاق کے وقت کے
انتظار کی وجہ سے طلاق کی نوبت ہی نہیں آئے گی اور اگر اللہ کے مقرر کردہ طریقے کے مطابق طلاق دے گا تو عدت کے اندر
کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

ذٰلِكَ اَمْرُ اللّٰهِ اَنْزَلَهُ اِلَيْكُمْ ۚ وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَكْفِرْ عَنْهُ سَيِّئَاتِهِ وَيُعْظِمْ لَهُ اَجْرًا ۝
 اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِنْ وُجُوْدِكُمْ وَلَا تَضَارُوْهُنَّ لِيُضْمِتُوْا عَلَيْنَ ۚ
 وَاِنْ كُنَّ اُولَاتٍ حَمِلٌ فَانْفِقُوْا عَلَيْنَهُنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۚ فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ
 فَارْتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ۚ وَاْتِمُوْا بَيْنَكُمْ بِعُرُوْفٍ ۚ وَاِنْ تَعَاَسَرْتُمُ فَسَتَرْضِعْ لَكُمْ اُخْرٰى ۝

یہ اللہ کا حکم ہے جسے اس نے تمہاری طرف نازل کیا ہے اور جو کوئی اللہ سے ڈرے گا وہ اس سے اس کی برائیاں دور کر دے گا اور اسے بڑا اجر دے گا ④ انہیں وہاں سے رہائش دو جہاں تم رہتے ہو، اپنی طاقت کے مطابق اور انہیں اس لیے تکلیف نہ دو کہ ان پر تنگی کرو اور اگر وہ حمل والی ہوں تو ان پر خرچ کرو، یہاں تک کہ وہ اپنا حمل وضع کر لیں، پھر اگر وہ تمہارے لیے دودھ پلائیں تو انہیں ان کی اجرتیں دو اور آپس میں اچھے طریقے سے مشورہ کرو اور اگر تم آپس میں تنگی کرو تو عنقریب اسے کوئی اور عورت دودھ پلا دے گی ⑤

اسے رجوع کا حق حاصل رہے گا اور اگر عدت ختم ہو جائے تو دوبارہ نکاح کا موقع باقی رہے گا۔

آیت 5 ① ذٰلِكَ اَمْرُ اللّٰهِ اَنْزَلَهُ اِلَيْكُمْ : اس میں طلاق اور عدت کے احکام کی اہمیت بیان کرنا مقصود ہے۔

② وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَكْفِرْ عَنْهُ سَيِّئَاتِهِ : اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کے پانچ فائدے بیان فرمائے ہیں، سب سے پہلا فائدہ یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کے لیے مشکلات سے نکلنے کا راستہ بنا دے گا، دوسرا یہ کہ اسے وہاں سے رزق دے گا جہاں سے اسے گمان نہیں ہوگا، تیسرا یہ کہ اس کے لیے اس کے معاملات میں آسانی پیدا فرما دے گا، چوتھا یہ کہ اس کے گناہ معاف فرما دے گا اور پانچواں یہ کہ اسے اجر عظیم عطا فرمائے گا۔

آیت 6 ① اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِنْ وُجُوْدِكُمْ : اس میں ان عورتوں کا حکم بیان فرمایا ہے جنہیں پہلی یا دوسری طلاق دی گئی ہو۔ پہلے ان کے متعلق فرمایا تھا کہ عدت پوری ہونے تک انہیں ان کے گھروں سے نہ نکالو اور نہ ہی وہ خود نکلیں، اب اسی کی تفصیل ہے۔ ”مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ“ میں ”مِنْ“ جمعیت کے لیے ہے، یعنی جہاں تم رہتے ہو اس کے کسی حصے میں انہیں بھی رہنے کے لیے جگہ دو۔ ”مِنْ وُجُوْدِكُمْ“ اپنی وسعت کے مطابق، یعنی مکان ذاتی ہے یا کرائے کا یا خیمہ وغیرہ ہے، جہاں رہتے ہو وہیں انہیں رکھو۔ اس کا مقصد اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے بیان فرمایا ہے کہ اتنی مدت ایک جگہ رہنے کی وجہ سے ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ دوبارہ موافقت کی صورت پیدا فرما دے اور رجوع ہو جائے، اس دوران ان کا نفقہ بھی خاوند کے ذمے ہے۔ تیسری طلاق کے بعد چونکہ رجوع کی گنجائش نہیں، اس لیے خاوند کے ساتھ رہائش کا حکم بھی نہیں اور نہ ہی ان کا خرچ خاوند کے ذمے ہے، جیسا کہ پہلی آیت کے فائدہ (۱۳) میں قاطعہ بنت قیسؓ کی صحیح حدیث میں گزر چکا ہے۔

② وَلَا تَضَارُوْهُنَّ لِيُضْمِتُوْا عَلَيْنَ : یعنی انہیں نفقہ میں کمی یا نامناسب رہائش یا بدزبانی یا مار پیٹ کے ساتھ تکلیف

لِيُنْفِقَ ذُو سَعَةٍ مِّن سَعَتِهِ ۖ وَمَن قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنْفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللَّهُ ۚ
لَا يَكْلِفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا مَا آتَاهَا ۚ سَيَجْعَلُ اللَّهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُسْرًا ﴿٦﴾

لازم ہے کہ وسعت والا اپنی وسعت میں سے خرچ کرے اور جس پر اس کا رزق تنگ کیا گیا ہو تو وہ اس میں سے خرچ کرے جو اللہ نے اسے دیا ہے۔ اللہ کسی شخص کو تکلیف نہیں دیتا مگر اسی کی جو اس نے اسے دیا ہے، عنقریب اللہ تنگی کے بعد آسانی پیدا کر دے گا ﴿٦﴾

پہنچا کر تنگ نہ کر دے وہاں رہیں تو تنگی میں مبتلا رہیں یا پھر مکان چھوڑ کر چلی جائیں یا مہر چھوڑ دیں۔

﴿٦﴾ وَإِن لَّنْ أَوْلَاتٍ حَمَلْنَ فَانْفِقُوا عَلَيْهِنَّ.....: مطلقہ عورت اگر حاملہ نہیں تو رجعی طلاق کی صورت میں اس کا نفقہ اور رہائش خاوند کے ذمے ہے، تیسری طلاق کی صورت میں اس کا نفقہ یا رہائش خاوند کے ذمے نہیں، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ البتہ اگر وہ حاملہ ہے تو رجعی طلاق کی صورت میں بچہ پیدا ہونے تک اس کا نفقہ اور رہائش دونوں خاوند کے ذمے ہیں اور اگر تیسری طلاق ہے تو وضع حمل تک صرف اس کا خرچہ خاوند کے ذمے ہے۔

﴿٧﴾ فَإِن أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ: اس جملے سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق بچہ باپ کا ہوتا ہے ماں کا نہیں، کیونکہ ماں اس بچے کے باپ کے لیے دودھ پلا رہی ہے اور اجرت لے رہی ہے، اگر بچہ ماں کا ہو تو اجرت لینے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ دوسرا یہ کہ عورت اپنے دودھ کی خود مالک ہے، وہ طلاق دینے والے خاوند سے بھی اسی طرح اجرت لے سکتی ہے جیسے دوسروں سے۔

﴿٨﴾ وَاتَّبِعُوا بَيْنَكُمْ يَسْعُرُوفٍ: ”وَآتُوا“ ”اتَّبِعُوا“ ”اتَّبِعُوا“ (افتعال) مشورہ کرنا، جیسا کہ سورہ قصص میں فرمایا: ﴿يُنُوسَىٰ إِنَّ النَّالَ يَا تُؤْمِرُونَ بِكَ يَفْعَلُوكَ﴾ [القصص: ۲۰] ”اے موسیٰ! بے شک سردار تیرے بارے میں مشورہ کر رہے ہیں کہ تجھے قتل کر دیں۔“ طلاق کے بعد عموماً میاں بیوی کی باہمی ناچاقی اور ناراضی کی وجہ سے کشیدگی پیدا ہو چکی ہوتی ہے، ایسی صورت میں میاں بیوی دونوں کو اور ان کے تعلق والوں کو حکم دیا کہ بچے کو دودھ پلانے، اس کے علاج و تربیت اور اس کی بہتری کے لیے آپس میں اچھے طریقے سے مشورہ کرتے رہو، ایسا نہ ہو کہ تمہاری کشیدگی بچے کو نقصان پہنچانے کا باعث بن جائے۔

﴿٩﴾ وَإِن تَعَاَسَزْتُمْ فَسْتَرْضِعُوا لَهَا أُخْرَىٰ: یعنی اگر ماں کسی بیماری یا کمزوری کی وجہ سے دودھ پلانے سے انکار کر دے، یا اجرت اتنی زیادہ مانگے جو خاوند کی استطاعت یا معروف رواج سے زیادہ ہو، یا خاوند اس کی طلب کردہ اجرت دینے پر تیار نہ ہو، یا کسی اور وجہ سے آپس میں ضد پیدا ہو جائے اور ماں دودھ نہ پلائے تو ضروری نہیں کہ ہر حال میں ماں ہی دودھ پلائے، بلکہ کوئی اور عورت اسے دودھ پلا دے گی۔

﴿١٠﴾ لِيُنْفِقَ ذُو سَعَةٍ مِّن سَعَتِهِ.....: اس سے معلوم ہوا کہ نفقہ میں بیوی کی حالت کا اعتبار نہیں کیا جائے

وَكَأَيِّنْ مِنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ أَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهِ فَحَاسَبْنَاهَا حِسَابًا شَدِيدًا
وَ عَذَبْنَاهَا عَذَابًا نَكْرًا ۝ فذَاقَتْ وَبَالَ أَمْرِهَا وَ كَانَ عَاقِبَةُ أَمْرِهَا خُسْرًا ۝

اور کتنی ہی بستیاں ہیں جنہوں نے اپنے رب اور اس کے رسولوں کے حکم سے سرکشی کی تو ہم نے ان کا محاسبہ کیا، بہت سخت محاسبہ اور انہیں سزا دی، ایسی سزا جو دیکھنے سننے میں نہ آئی تھی ۝ تو انہوں نے اپنے کام کا وبال چکھا اور ان کے کام کا انجام خسارہ تھا ۝

گا، بلکہ خاندان کی حالت کے مطابق نفقہ واجب ہوگا۔ اگر خاوند وسعت والا اور مال دار ہے تو اس کے مطابق خرچ کرے گا اور اگر وہ تنگ دست ہے تو اللہ نے اسے جو کچھ دیا ہے اس میں سے اپنی طاقت کے مطابق خرچ کرے۔

۲ سَيَجْعَلُ اللَّهُ بَعْدَ عُنْزٍ يُسْرًا : اس میں اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ جو خاوند حسب مقدور وہ خرچے پورے کرتے ہیں جو ان کے ذمے ہیں اور ان میں بخل نہیں کرتے، تو اللہ تعالیٰ ان کے لیے تنگی کے بعد آسانی کی کوئی نہ کوئی صورت ضرور پیدا فرما دے گا۔ ”سَيَجْعَلُ“ میں ”سین“ استقبال کے علاوہ تاکید کا مفہوم بھی رکھتا ہے۔ ”عُنْزٍ“ اور ”يُسْرًا“ دونوں میں تنوین تکبیر کے لیے ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے پاس آسانی پیدا کرنے کی بے شمار صورتیں ہیں، تنگی خواہ کسی قسم کی ہو اللہ تعالیٰ اس میں آسانی کی کوئی نہ کوئی صورت پیدا فرما سکتا ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ تنگی میں اپنی طاقت کے مطابق درلغ نہ کرے، اللہ تعالیٰ نے جو کچھ دیا ہے اس میں سے خرچ کرتا رہے، تو اللہ تعالیٰ تنگی کے بعد خواہ کوئی ہو ضرور ہی آسانی کی کوئی نہ کوئی صورت پیدا فرما دے گا، جیسا کہ فرمایا: ﴿قَالَ مَعَ الْعُنْزِ يُسْرًا ۝ إِنَّ مَعَ الْعُنْزِ يُسْرًا﴾ [الانشراح: ۶۰] ”پس بے شک ہر مشکل کے ساتھ ایک آسانی ہے۔ بے شک اسی مشکل کے ساتھ ایک اور آسانی ہے۔“

آیت 98 ۝ وَكَأَيِّنْ مِنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ أَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهِ : ”عَتَتْ“ ”عَتَا يَعْتُو عَتُوًا“ (ن) سے ماضی معلوم ہے، اصل میں ”عَتَوَتْ“ ہے۔ ”نُكْرًا“ اجنبی، نہ پہچانا ہوا، جو نہ دیکھا ہو نہ سنا۔ اب تک اللہ تعالیٰ نے طلاق وغیرہ کے متعلق اپنے احکام کا ذکر فرمایا تھا، یہاں سے بتایا جا رہا ہے کہ پچھلی جن بستیوں نے اللہ اور اس کے رسولوں کے احکام سے سرکشی اختیار کی ان کا انجام کیا ہوا۔ مقصد مسلمانوں کو ان احکام کی اہمیت بتانا اور ان کی پابندی کی تلقین کرنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پہلی اقوام کی بربادی میں شرک و کفر کے ساتھ ساتھ اللہ اور اس کے رسولوں کے ان تفصیلی احکام کی مخالفت بھی تھی جو زندگی کے ہر شعبے میں انہوں نے دیے، جس کی وجہ سے ان کے اندر حد سے بڑھی ہوئی سرکشی اور فساد پیدا ہوا۔ مثلاً جب انہوں نے شرک و کفر پر اصرار کے ساتھ نکاح و طلاق کے ضابطوں کی پابندی سے سرکشی اختیار کی تو زنا اور قوم لوط کا عمل عام ہوا، جس کی وجہ سے قتل و غارت کا بازار گرم ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا بہت سخت محاسبہ کیا اور انہیں ایسی سزا دی جو کسی نے نہ دیکھی تھی نہ سنی تھی۔ آج کے دور میں کفار نے شرک و کفر پر اصرار کے ساتھ ساتھ ان ضابطوں کی بھی شدید مخالفت اختیار کر رکھی ہے، جس کے نتیجے میں ان کا معاشرہ بے پناہ بد اخلاقی، بد امنی اور قتل و غارت کا شکار ہو چکا ہے اور بری طرح ٹوٹ پھوٹ چکا

أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا ۖ فَاتَّقُوا اللَّهَ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ ۗ الَّذِينَ آمَنُوا ۗ قَدْ أَنزَلَ اللَّهُ إِلَيْكُمْ ذِكْرًا ۖ رَسُولًا يَتْلُوا عَلَيْكُمْ آيَاتِ اللَّهِ مُبَيِّنَاتٍ لِيُخْرِجَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ ۚ وَمَنْ يُؤْمِن بِاللَّهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُدْخِلْهُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۗ قَدْ أَحْسَنَ اللَّهُ لَهُ رِزْقًا ۝

اللہ نے ان کے لیے بہت سخت عذاب تیار کیا ہے، سو اللہ سے ڈرو اے عقلوں والو جو ایمان لائے ہو! یقیناً اللہ نے تمہاری طرف عظیم نصیحت نازل کی ہے ۱۰ جو ایسا رسول ہے کہ تمہارے سامنے اللہ کی واضح بیان کرنے والی آیات پڑھتا ہے، تاکہ وہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے، اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آئے اور جو اللہ پر ایمان لائے اور نیک عمل کرے وہ اسے ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے تلے نہریں بہتی ہیں، ان میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ہمیشہ، بلاشبہ اللہ نے اس کے لیے اچھا رزق بتایا ہے ۱۱

ہے۔ اب ان کی کوشش یہ ہے کہ مسلمان بھی ان احکام سے آزاد ہو جائیں اور ان میں بھی زنا، قوم لوط کا عمل اور قتل و غارت پھیل جائے۔ اللہ تعالیٰ نے پہلی امتوں کے عذاب کا حوالہ دے کر مسلمانوں کو ان کے انجام سے ڈرایا ہے۔

آیت 10 ۱۰ اَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا: کچھلی آیات میں دنیا کے عذاب کا ذکر تھا، اس میں آخرت کے عذاب کا ذکر ہے۔

۲۰ فَاتَّقُوا اللَّهَ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ ۗ الَّذِينَ آمَنُوا : یہ ”فأ“ فیصح ہے جو محذوف شرط کا اظہار کر رہی ہے، یعنی جب تم ان بستیوں کا حال سن چکے جنہوں نے اللہ اور اس کے رسولوں کے احکام سے سرکشی اختیار کی تو اے عقلوں والو جو ایمان لا چکے ہو! تم اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی نافرمانی سے بچ جاؤ۔

۳۰ قَدْ أَنزَلَ اللَّهُ إِلَيْكُمْ ذِكْرًا : ”ذکرًا“ پر تین تعظیم کی ہے، عظیم نصیحت۔

آیت 11 ۱۱ رَسُولًا يَتْلُوا عَلَيْكُمْ آيَاتِ اللَّهِ مُبَيِّنَاتٍ: ”رَسُولًا“ کچھلی آیت میں مذکور ”ذکرًا“ سے بدل ہے، یعنی یقیناً اللہ تعالیٰ نے تمہاری طرف عظیم ذکر نازل کیا ہے جو رسول ہے، یعنی رسول ﷺ کا وجود و سراپا نصیحت ہے کہ اس کا قول، فعل، حال اور تقریر سب نصیحت ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سورہ حجر (۹) میں اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا ہے: ﴿إِنَّا نَحْنُ نُزِّلْنَا بِالذِّكْرِ وَإِنَّا لَهٗ لَمُحِطُونَ﴾ (بے شک ہم نے ہی یہ نصیحت نازل کی ہے اور بے شک ہم اس کی ضرور حفاظت کرنے والے ہیں) اس میں ”الذِّكْرُ“ سے مراد صرف قرآن مجید نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ پر نازل شدہ ساری وحی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی بھی حفاظت فرمائی ہے اور رسول اللہ ﷺ کے اقوال و افعال اور احوال و تقریرات کی بھی حفاظت فرمائی ہے۔

۲۲ لِيُخْرِجَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ..... : اس کی وضاحت کے لیے دیکھیے سورہ بقرہ

اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ وَمِنَ الْأَرْضِ مِثْلَهُنَّ يَتَنَزَّلُ الْأَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوا أَنَّ

اللہ ہی ہے جس نے سات آسمان پیدا کیے اور زمین سے بھی ان کی مانند۔ ان کے درمیان حکم نازل ہوتا ہے، تاکہ تم (۲۵۷) کی تفسیر۔

آیت 12 ① اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ.....: سورت کے آخر میں اس کے اندر مذکور احکام کی عظمت کی طرف توجہ

دلانے کے لیے آسمان و زمین کی پیدائش، ان میں اپنے اوامر کے نزول اور اپنے علم و قدرت کا ذکر فرمایا، تاکہ یہ بات مد نظر رہے کہ یہ احکام دینے والا کون ہے۔ بارہ (۱۲) آیات پر مشتمل اس سورت میں اللہ تعالیٰ کا ذکر اس کے تقویٰ کے ساتھ شروع ہوا ہے جو اس کے نام، اس کی ضمیر اور اس کی طرف نسبت کی صورت میں تقریباً تیس (۳۰) مرتبہ آیا ہے اور آخر میں پھر اس عظیم ہستی کا تعارف ان صفات کے ساتھ دہرایا ہے۔ (ابن عاشور)

② خَلَقَ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ : سات آسمانوں کی کیفیت تو اللہ تعالیٰ نے خود بیان فرمائی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے اوپر تہ بہ تہ ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿الَّذِينَ تَرَوُا كَيْفَ خَلَقَ اللَّهُ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ طِبَاقًا﴾ [نوح: ۱۰] ”کیا تم نے نہیں دیکھا کہ کس طرح اللہ نے سات آسمانوں کو اوپر تلے پیدا کیا۔“

③ وَمِنَ الْأَرْضِ مِثْلَهُنَّ : قرآن مجید میں آسمان کا ذکر واحد کے صیغے ”السَّمَاءُ“ کے ساتھ بھی آیا ہے اور جمع کے صیغے ”سَمَاوَاتٍ“ کے ساتھ بھی، مگر زمین کا ذکر واحد کے صیغے کے ساتھ ہی آیا ہے، آسمانوں کی طرح اوپر تلے سات زمینیں ہونے کا ذکر نہیں فرمایا۔ یہاں فرمایا کہ اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان پیدا کیے اور زمین سے بھی ان کی مثل یعنی مانند۔ مانند ہونے کا ایک مطلب تو یہ ہو سکتا ہے کہ زمین بھی اپنی عظمت، برکت، آبادی اور کثرت (گول ہونے) میں آسمانوں کی طرح ہے۔ دوسرا مطلب جو اکثر مفسرین نے مراد لیا ہے، یہ ہے کہ سات آسمانوں کی طرح زمینیں بھی اوپر تلے سات ہیں۔ اس کی دلیل میں وہ صحیح حدیث پیش کی ہے جو عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان فرمائی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «مَنْ أَحَدَّ مِنَ الْأَرْضِ شَيْئًا بِغَيْرِ حَقِّهِ حُسِفَ بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِلَى سَبْعِ أَرْضِينَ» [بخاری، المظالم، باب إثم من ظلم شيئاً من الأرض: ۲۴۵۴] ”جو شخص زمین میں سے کچھ بھی اس کے حق کے بغیر لے گا اسے قیامت کے دن سات زمینوں تک دھنسا یا جائے گا۔“

حدیث میں مذکور سات زمینوں سے مراد تو ظاہر ہے کہ اسی زمین کے سات طبقات ہیں جس پر ہم رہتے ہیں، لیکن کیا آیت میں مذکور سات زمینوں سے بھی یہی طبقات مراد ہیں یا ہماری زمین جیسی اور چھ زمینیں ہیں، یہ بات اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ کائنات کی بے پناہ وسعتوں کو دیکھیں تو کچھ بعید نہیں کہ ہماری زمین جیسی اور زمینیں بھی ہوں جو ہماری زمین ہی کی طرح آباد ہوں، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَمَا يَعْلَمُ جُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ﴾ [المدثر: ۳۱] ”اور تیرے رب کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔“ اور اللہ تعالیٰ نے اکیلے ہی آسمان و زمین کو پیدا فرمایا، کوئی اس وقت موجود نہ تھا کہ ان کے اسرار سے پوری طرح واقف ہو، جیسا کہ فرمایا: ﴿مَا أَشْهَدُهُمْ خَلْقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ﴾ [الکہف: ۵۱] ”میں نے انھیں آسمانوں اور

اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۚ وَ أَنَّ اللَّهَ قَدْ أَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا ﴿۱۷﴾

جان لو کہ اللہ ہر چیز پر خوب قدرت رکھنے والا ہے اور یہ کہ اللہ نے یقیناً ہر چیز کو علم سے گھیر رکھا ہے ﴿۱۷﴾ زمین کے پیدا کرنے میں حاضر نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایجاد کا جو سلسلہ عطا فرمایا ہے جس سے بڑی بڑی طاقتور دور نہیں ایجاد ہوئی ہیں، ہیئت دان ان کے ساتھ کائنات کا مشاہدہ کرتے ہیں تو ہر دن نئے سے نیا انکشاف ہوتا ہے۔ ہمارے لیے اتنی بات ہی کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سات آسمانوں کی طرح زمینیں بھی سات پیدا فرمائی ہیں۔ رہی ان کی کیفیت اور متعین مراد، تو وہ اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ اس نے اسے جمل رکھا ہے تو اس میں ہماری بہتری ہے، کیونکہ اگر اس کی واقعی کیفیت بیان ہوتی تو اپنی ذہنی نارسائی کی وجہ سے ممکن تھا کہ کئی لوگ انکار ہی کر دیتے۔

﴿۱۷﴾ يَتَنَزَّلُ الْأَنْصَارُ بَيْنَهُمْ : اللہ تعالیٰ کا امر دو قسم کا ہے، ایک امر کوئی ہے، یعنی وہ جس چیز کا ارادہ کرتا ہے اسے ”شئ“ (ہو جا) کہتا ہے تو وہ ہو جاتی ہے اور ایک امر شرعی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ فرشتوں کے ذریعے سے اپنے احکام نازل فرماتا رہتا ہے، یعنی آسمانوں اور زمینوں کے درمیان اللہ تعالیٰ کے اوامر کوئی اور امر شرعی اترتے رہتے ہیں۔ اس میں بھی اس سورت میں مذکور احکام کی اہمیت کا اظہار ہو رہا ہے کہ وہ ان عظیم الشان آسمانوں اور زمینوں کے خالق و مالک کے احکام ہیں۔

﴿۱۸﴾ لِيَتْلُوَ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۚ وَ أَنَّ اللَّهَ قَدْ أَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا : یعنی زمین و آسمان کی پیدائش کی یہ بات تمہیں اس لیے بتائی ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی ہر چیز پر پوری قدرت کو اور اس کے ہر چیز پر علم کے ساتھ احاطے کو جان لو۔ پھر جب تم اس کی قدرت اور علم سے واقف ہو جاؤ گے تو اس کے احکام کی نافرمانی کی جرأت نہیں کرو گے۔



يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ ، تَبَتَّعِي مَرْضَاتِ أَزْوَاجِكَ ، وَاللَّهُ عَفْوٌ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

اے نبی! تو کیوں حرام کرتا ہے جو اللہ نے تیرے لیے حلال کیا ہے؟ تو اپنی بیویوں کی خوشی چاہتا ہے، اور اللہ بہت

آیت 1 ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ﴾ : وہ چیز کیا تھی جو رسول اللہ ﷺ نے اپنے آپ پر حرام کی اور یہ

آیات نازل ہوئیں؟ اس کے متعلق ایک تو وہ مشہور واقعہ ہے جو صحیح بخاری و صحیح مسلم وغیرہ میں نقل ہوا ہے، عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی

ہیں: «كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَشْرَبُ عَسَلًا عِنْدَ زَيْنَبِ ابْنَةِ جَحْشٍ وَ يَمْسُكُ عِنْدَهَا

فِرَاطَاتُهَا وَأَنَا وَ حَفْصَةُ عَنْ أُثَيْمِيَا دَخَلْنَا عَلَيْهَا فَلَمَّا قُلْنَا لَهُ أَكَلْتَ مَغْفِيرًا، إِنِّي أَجِدُ مِنْكَ رِيحَ مَغْفِيرٍ، قَالَ لَا وَ لَكِنِّي

شَكْتُ أَشْرَبُ عَسَلًا عِنْدَ زَيْنَبِ ابْنَةِ جَحْشٍ فَلَمَّا أَعْوَدَ لَهُ وَ قَدْ خَلَفْتُ لَا تُخْبِرِي بِذَلِكَ أَحَدًا» [بخاری،

التفسیر، باب: ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ نَحَرَمُ﴾ : ۴۹۱۲-۴۹۱۳، مسند: ۱۱۷۴] "رسول اللہ ﷺ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے پاس شہد

بیا کرتے تھے اور ان کے پاس ٹھہر جاتے تھے، تو میں نے اور حفصہ نے آپس میں اس بات پر اتفاق کر لیا کہ آپ ﷺ ہم میں

سے جس کے پاس بھی آئیں وہ آپ سے یہ کہے کہ آپ نے مغفیر کھائی ہے، کیونکہ مجھے آپ سے مغفیر کی بو آ رہی ہے۔

(جب آپ ﷺ کے آنے پر یہ بات کہی گئی تو) آپ ﷺ نے فرمایا: "نہیں، لیکن میں زینب بنت جحش کے پاس شہد بیا کرتا تھا،

دوبارہ کبھی نہیں پیوں گا اور میں نے (اس بات کی) قسم کھالی ہے، تم یہ بات کسی کو نہ بتانا۔" امام بخاری رضی اللہ عنہ نے "کتاب الطلاق" میں

یہ بھی یہ حدیث نقل فرمائی ہے، اس میں یہ الفاظ بھی ہیں: «فَنَزَلَتْ: ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ﴾» [بخاری،

الطلاق، باب: ﴿لِمَ نَحَرَمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ﴾ : ۵۲۶۷] "یعنی اس واقعہ پر یہ آیت اتری: ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا

أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ﴾ "اے نبی! تو کیوں حرام کرتا ہے جو اللہ نے تیرے لیے حلال کیا ہے؟" واضح رہے کہ مغفیر ایک بدبو دار

میٹھی گوند ہوتی ہے جو عرط نامی پودے پر پیدا ہوتی ہے۔ عائشہ اور حفصہ رضی اللہ عنہما کا مطلب یہ تھا کہ آپ کو بدبو سے بہت نفرت

ہے، آپ یہ سوچ کر شہد پینا چھوڑ دیں گے کہ مغفیر کی بو شہد ہی سے آ رہی ہوگی، کیونکہ ممکن ہے شہد کی کھبیوں نے اس کے

پودے عرط کا رس چوس کر شہد بنایا ہو۔

دوسرا وہ واقعہ ہے جو امام نسائی نے انس رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے: «أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَتْ لَهُ أَمَةٌ

يَطْوُهَا فَلَمَّا نَزَلَتْ بِهِ عَائِشَةُ وَ حَفْصَةُ حَتَّى خَرَمَهَا عَنْ نَفْسِهِ فَأَنْزَلَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ: ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا

أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ﴾ [ابن ماجہ، باب النسا، باب الغيرة: ۳۴۱۱] "رسول اللہ ﷺ کی ایک لونڈی تھی جس

سے آپ صحبت کیا کرتے تھے، تو عائشہ اور حفصہ رضی اللہ عنہما مسلسل آپ سے اصرار کرتی رہیں، حتیٰ کہ آپ نے اسے اپنے آپ پر

ترجمہ ①

بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ①

حرام کر لیا، تو اللہ عزوجل نے یہ مکمل آیت نازل فرمائی: ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ﴾ ”اے نبی! تو کیوں حرام کرتا ہے جو اللہ نے تیرے لیے حلال کیا ہے؟“ علامہ البانی نے فرمایا: ”إِسْنَادُهُ صَحِيحٌ“ اور حافظ ابن حجر نے ”كِتَابُ الطَّلَاقِ، بَابُ: ﴿لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ﴾“ کی شرح کرتے ہوئے اس حدیث کی سند کو صحیح کہا ہے۔ یہ لوٹدی ماریہ قطبیہ رضی اللہ عنہا تھیں، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیٹے ابراہیم کی ماں تھیں۔ ضیاء مقدسی نے ”الْأَحَادِيثُ الْمُخْتَارَةُ“ میں روایت کی ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: ﴿قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِحَفْصَةَ لَا تُحَدِّثِي أَحَدًا وَ إِنَّمَا إِبْرَاهِيمَ عَلَيَّ حَرَامٌ فَقَالَتْ أُتَحَرَّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ؟ قَالَ فَوَاللَّهِ! لَا أَقْرَبُهَا، قَالَ فَلَمْ يَفْرَبْهَا، حَتَّى أُخْبِرَتْ عَائِشَةُ فَأَنْزَلَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ: ﴿قَدْ قَرَضَ اللَّهُ لَكُمْ تَحَلَّةَ أَيْمَانِكُمْ﴾﴾ [الأحاديث المختارة: ۱۸۹] ”نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حفصہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ تم کسی کو نہ بتانا یہ کہ ام ابراہیم مجھ پر حرام ہے۔“ انھوں نے کہا: ”کیا آپ وہ چیز حرام کر رہے ہیں جو اللہ نے آپ کے لیے حلال کی ہے؟“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اللہ کی قسم! میں اس کے قریب نہیں جاؤں گا۔“ تو آپ اس کے قریب نہیں گئے، حتیٰ کہ اس (حفصہ رضی اللہ عنہا) نے یہ بات عائشہ رضی اللہ عنہا کو بتادی تو اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرمادی: ﴿قَدْ قَرَضَ اللَّهُ لَكُمْ تَحَلَّةَ أَيْمَانِكُمْ﴾ ”بے شک اللہ نے تمہارے لیے تمہاری قسموں کا کفارہ مقرر کر دیا ہے۔“ ضیاء مقدسی نے حدیث کے آخر میں فرمایا: ”إِسْنَادُهُ صَحِيحٌ“ اور ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں ہشیم بن کلیب کی مسند کے حوالے سے اسے نقل کر کے فرمایا، یہ اسناد صحیح ہے اور کتب ستہ میں سے کسی نے اسے روایت نہیں کیا اور ضیاء مقدسی نے اپنی ”الْمُسْتَحْرَجُ“ میں اس کا انتخاب کیا ہے۔

اس سلسلے میں کچھ اور واقعات بھی بیان کیے گئے ہیں مگر ان میں سے کسی کی سند صحیح نہیں۔ ان دونوں واقعات میں سے شہد والے واقعہ کی سند زیادہ صحیح ہے، کیونکہ وہ صحیحین میں ہے، اس لیے بعض مفسرین نے صرف اسی کو ان آیات کا سبب نزول قرار دیا ہے۔ چنانچہ قرطبی کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ ان تمام اقوال میں سب سے صحیح پہلا ہے اور صحیح یہ ہے کہ آپ نے حرام شہد کو کیا تھا جو آپ زینب رضی اللہ عنہا کے ہاں پیا کرتے تھے اور ابن کثیر نے اس کے متعلق بہت سی روایات نقل کرنے کے بعد فرمایا: ”صحیح یہ ہے کہ یہ معاملہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے شہد کو حرام کرنے کی وجہ سے ہوا تھا۔“ اور آلوسی نے فرمایا: ”نووی نے مسلم کی شرح میں کہا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ یہ آیت شہد کے واقعہ کے بارے میں ہے نہ کہ ماریہ قطبیہ رضی اللہ عنہا کے واقعہ کے بارے میں، جو صحیحین کے علاوہ کتابوں میں آیا ہے اور ماریہ قطبیہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ کسی صحیح سند کے ساتھ نہیں آیا۔“ مگر جیسا کہ اوپر گزرا کہ ماریہ قطبیہ رضی اللہ عنہا کے قصے کی سند کو ضیاء مقدسی، ابن کثیر، ابن حجر اور البانی رضم نے صحیح کہا ہے، شہد والے واقعہ سے اس کا کوئی تعارض بھی نہیں اور ایک آیت کا سبب نزول کئی واقعات بھی ہو سکتے ہیں، اس لیے صحیح بات یہی ہے کہ یہ دونوں واقعات ان آیات کا سبب نزول ہیں، شوکانی نے بھی یہی فیصلہ فرمایا ہے۔

قَدْ قَرَضَ اللَّهُ لَكُمْ تَحَلَّةَ أَيْمَانِكُمْ ۖ وَاللَّهُ مَوْلَاكُمْ ۖ وَهُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ﴿۱﴾

بے شک اللہ نے تمہارے لیے تمہاری قسموں کا کفارہ مقرر کر دیا ہے اور اللہ تمہارا مالک ہے اور وہی سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے ﴿۱﴾

② احادیث سے ظاہر ہے کہ آپ ﷺ نے شہد کو امت کے لیے حرام قرار نہیں دیا تھا، بلکہ صرف خود اسے نہ پینے کی قسم کھائی تھی۔ اسی طرح امت کے لیے ان کی لونڈیوں کو حرام قرار نہیں دیا، بلکہ صرف اپنی ایک لونڈی کو اپنے آپ پر حرام قرار دیا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اس پر بھی ناراضی کا اظہار فرمایا، کیونکہ آپ کے ایسا کرنے سے آپ کا ان نعمتوں سے محروم ہونا لازم آتا تھا جو اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے حلال کی تھیں۔ اس کے علاوہ اندیشہ تھا کہ آپ کو دیکھ کر امت کے لوگ، جن کے لیے نبی ﷺ اسوۂ حسنہ و کاملہ ہیں، شہد کے قریب نہیں جائیں گے اور یہ دونوں باتیں اللہ تعالیٰ کو گوارا نہیں تھیں۔

③ اس سے معلوم ہوا کہ صوفی حضرات جو ترک حیوانات جلائی و جمالی کرتے ہیں، یعنی اپنے چلوں اور وظیفوں کے درمیان کوئی جاندار چیز یا اس سے نکلنے والی چیز مثلاً گوشت، مچھلی، انڈا، دودھ، گھی اور شہد وغیرہ نہیں کھاتے، ان کا یہ عمل اللہ تعالیٰ کی اس تنبیہ کے خلاف ہے۔ حقیقت میں یہ عمل ہندو جوگیوں یا نصرانی راہبوں سے لیا گیا ہے، اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔

④ ”يَأْتِيهَا النَّبِيُّ“ کے الفاظ کے ساتھ خطاب کا مقصد یہ ہے کہ آپ کا کام وحی الہی پر چلنا اور اسے آگے پہنچانا ہے، آپ کو اپنی مرضی سے کچھ بھی کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

⑤ اس آیت سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کے ہر قول، فعل اور تقریر پر وحی الہی کی مہر ہے اور وہ سب کا سب دین ہے، کیونکہ اگر آپ کا کوئی اجتہاد درست نہیں ہوتا تھا تو اللہ تعالیٰ فوراً اس کی اصلاح فرمادیتا تھا۔ آپ ﷺ کے معصوم ہونے کا یہی مطلب ہے، انبیاء کے علاوہ کسی کو یہ چیز حاصل نہیں کہ وحی کے ذریعے سے ان کی خطا کی اصلاح ہوتی ہو۔ اس لیے کسی صحابی یا امام یا پیر فقیر کی بات امت کے لیے حجت نہیں، کیونکہ وہ درست بھی ہو سکتی ہے اور غلط بھی۔

⑥ تَبَتَّغِي فَرَصَاتِ أَرْوَاحِكَ: اس میں نبی ﷺ اور امت کو تعلیم ہے کہ بیویوں کو خوش رکھنا اگرچہ اچھی بات ہے، مگر اس وقت تک جب وہ اللہ تعالیٰ کے احکام پر قائم رہ کر ہو، رب تعالیٰ کو ناراض کر کے انھیں راضی کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔

⑦ وَاللَّهُ عَفُوفٌ مَّرْحِيمٌ: یہ اللہ تعالیٰ کا اپنے نبی کریم ﷺ پر خاص انعام و فضل ہے کہ عتاب کرتے ہوئے ساتھ ہی معافی اور مغفرت و رحمت کی خوش خبری بھی سنادی، جیسا کہ فرمایا: ﴿عَفَا اللَّهُ عَنْكَ لِمَ أَذِنْتُ لَكُم﴾ [التوبة: ۴۳] ”اللہ نے تجھے معاف کر دیا، تو نے ان (منافقین) کو پیچھے رہنے کی اجازت کیوں دی؟“

آیت 2: ① قَدْ قَرَضَ اللَّهُ لَكُمْ تَحَلَّةَ أَيْمَانِكُمْ: ”تَحَلَّة“ ”حَلَل“ (تفعیل) کا مصدر ”تَحْلِيل“ اور ”تَحَلَّة“ دونوں آتے ہیں، جیسے ”سَكَّرَم“ کا مصدر ”تَكْرِيم“ اور ”تَكْرِمَة“ دونوں آتے ہیں۔ معنی ہے حلال کرنا، مراد قسم کا کفارہ ہے جس کے ادا کرنے کے بعد وہ چیز حلال ہو جاتی ہے جو قسم کھا کر حرام کی تھی، یعنی آپ نے قسم کھا کر جو شہد اور ماریہ کو حرام کیا

وَإِذْ أَسْرَ السَّيِّئِ إِلَى بَعْضِ أَرْوَاحِهِ حَدِيثًا ۖ فَلَمَّا نَبَّأَتْ بِهِ وَأَظْهَرَهُ اللَّهُ عَلَيْهِ عَرَفَ بَعْضَهُ
وَأَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ ۖ فَلَمَّا نَبَّأَهَا بِهِ قَالَتْ مَنْ أَنْبَأَكَ هَذَا ۖ قَالَ نَبَّأَنِي الْعَلِيمُ الْخَبِيرُ ①

اور جب نبی نے اپنی کسی بیوی سے پوشیدہ طور پر کوئی بات کہی، پھر جب اس (بیوی) نے اس بات کی خبر دے دی اور اللہ نے اس (نبی) کو اس کی اطلاع کر دی تو اس (نبی) نے (اس بیوی کو) اس میں سے کچھ بات جتلائی اور کچھ سے اعراض کیا، پھر جب اس (نبی) نے اسے یہ (راز فاش کرنے کی) بات بتائی تو اس نے کہا تجھے یہ کس نے بتایا؟ کہا مجھے اس نے بتایا جو سب کچھ جاننے والا، ہر چیز سے باخبر ہے ①

ہے، اس قسم کا کفارہ دے دیں۔ قسم کا کفارہ اللہ تعالیٰ نے سورہ مائدہ (۸۹) میں بیان فرما دیا ہے۔ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «وَإِنِّي وَاللَّهِ! إِنْ شَاءَ اللَّهُ لَا أُحْلِفُ عَلَى يَمِينِ فَارِي غَيْرَهَا خَيْرًا مِّنْهَا إِلَّا كَفَرْتُ عَنْ يَمِينِي، وَأَتَيْتُ الَّذِي هُوَ خَيْرٌ» [بخاری، الأيمان والندور، باب قول الله تعالى: ﴿لَا يَأْخُذُكُمْ اللَّهُ...﴾: ۶۶۲۳] اور اللہ کی قسم! میں، اگر اللہ نے چاہا تو کسی بھی بات پر قسم کھاؤں گا، پھر اس کے خلاف کو اس سے بہتر دیکھوں گا تو اپنی قسم کا کفارہ دوں گا اور وہ کام کروں گا جو بہتر ہے۔ "ناجائز کام کی قسم کھالے تو اسے توڑنا اور اس کا کفارہ دینا ضروری ہے۔ ② وَاللَّهُ مَوْلَاكُمْ وَهُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ: "مُولٰی" کا معنی ہے مالک، دوست، مددگار۔ یعنی اللہ تعالیٰ تمہارا مالک، تمہارا مددگار اور تم پر بے حد مہربان ہے، اسی لیے اس نے تمہیں ایسی چیزوں سے منع فرمایا ہے جو تمہیں مشکل میں مبتلا کر دیں اور اگر قسم کھا کر ایسی کسی مشکل میں پڑ جاؤ تو اس سے نکلنے کا طریقہ بھی بتا دیا ہے، کیونکہ: ﴿يُرِيدُ اللَّهُ يَخْرُجُكُمُ الْعُسْرَ﴾ [البقرة: ۱۸۵] "اللہ تمہارے ساتھ آسانی کا ارادہ رکھتا ہے اور تمہارے ساتھ تنگی کا ارادہ نہیں رکھتا۔" اور وہی ہے جو سب کچھ جاننے والا اور کمال حکمت والا ہے، اس لیے اس کے کسی حکم میں کوئی خطا نہیں، کیونکہ اس کے تمام احکام کامل علم و حکمت پر مبنی ہیں۔

آیت 3 ① وَإِذْ أَسْرَ السَّيِّئِ إِلَى بَعْضِ أَرْوَاحِهِ حَدِيثًا: اس بیوی سے مراد حفصہ رضی اللہ عنہا ہیں، جیسا کہ اس سے پہلے شہد اور ماریہ قطیبہ رضی اللہ عنہا والے واقعات میں گزر چکا ہے کہ آپ نے ان سے کہا تھا کہ یہ بات کسی کو نہ بتانا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے علاوہ بھی کوئی بات فرمائی ہو جس کا اللہ تعالیٰ نے ذکر نہیں فرمایا۔

② فَلَمَّا نَبَّأَتْ بِهِ وَأَظْهَرَهُ اللَّهُ عَلَيْهِ عَرَفَ بَعْضَهُ: پھر جب حفصہ رضی اللہ عنہا نے وہ بات جس کے راز رکھنے کی انہیں رسول اللہ ﷺ نے تاکید فرمائی تھی، عائشہ رضی اللہ عنہا کو بتادی اور اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو اس بات کی اطلاع دے دی۔

③ عَرَفَ بَعْضَهُ وَأَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ: تو آپ ﷺ نے حفصہ رضی اللہ عنہا کو اس میں سے کچھ بات جتلائی کہ تم نے یہ بات آگے بتادی ہے اور کچھ سے اعراض کیا۔ آپ نے انہیں کیا جتلیا اور کیا نہیں جتلیا اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر نہیں فرمایا، اس لیے

إِنْ تَتُوبَا إِلَى اللَّهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا وَإِنْ تَظَاهَرَا عَلَيْهِ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ مَوْلَاهُ

اگر تم دونوں اللہ کی طرف توبہ کرو تو یقیناً تمہارے دل مائل ہو گئے ہیں اور اگر تم اس کے خلاف ایک سلامتی اسی میں ہے کہ اسے اسی طرح مبہم رہنے دیا جائے۔

④ اس سے رسول اللہ ﷺ کا کمال حسن خلق اور حلم و کرم ظاہر ہے کہ ناراضی کا اظہار کرتے وقت ایک ایک بات کا ذکر کر کے طعن و تشنیع نہیں فرمائی، بلکہ کچھ بات کا ذکر کیا اور کچھ سے اعراض فرمایا۔

⑤ قَالَتْ مَنْ أَنْبَأَكَ هَذَا قَالَ نَبَأَنِي الْعَلِيُّمُ الْخَبِيرُ: حصصہ بیچھا نے خیال کیا کہ آپ کو یہ بات عائشہ بیچھا نے بتائی ہوگی، اس لیے پوچھ لیا کہ آپ کو یہ بات کس نے بتائی ہے؟ آپ نے فرمایا، مجھے اس نے بتائی ہے جو سب کچھ جاننے والا اور ہر چیز سے باخبر ہے۔

بیت 4 ① إِنْ تَتُوبَا إِلَى اللَّهِ اس آیت میں خطاب عائشہ اور حفصہ بیچھا سے ہے۔ عبد اللہ بن عباس بیچھا

نے فرمایا: «لَمْ أَرَلْ حَرِيصًا أَنْ أَسْأَلَ عُمَرَ عَنِ الْمَرَاتَيْنِ مِنْ أَرْوَاجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اللَّتَيْنِ قَالَ اللَّهُ تَعَالَى: ﴿إِنْ تَتُوبَا إِلَى اللَّهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا﴾ حَتَّى حَجَّ عُمَرُ وَحَجَّحْتُ مَعَهُ، فَلَمَّا كُنَّا بِبَعْضِ الطَّرِيقِ عَدَلَ عُمَرُ وَعَدَلْتُ مَعَهُ بِالْإِدَاوَةِ فَتَبَرَّرْتُ ثُمَّ أَنَا نَبِيٌّ فَسَكَبْتُ عَلَى يَدَيْهِ فَنَوَّضًا فَقُلْتُ يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ! مِنَ الْمَرَاتَيْنِ مِنْ أَرْوَاجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اللَّتَانِ قَالَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ لَهُمَا: ﴿إِنْ تَتُوبَا إِلَى اللَّهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا﴾؟ قَالَ عُمَرُ وَاعْتَجِبًا لَكَ يَا ابْنَ عَبَّاسٍ! هِيَ حَفْصَةُ وَعَائِشَةُ» [مسلم، الطلاق، باب في الإيلاء،]

۱۴۷۹۳۴ ”مجھے ہمیشہ خواہش رہی کہ میں عمر بن خطاب بیچھا سے نبی ﷺ کی بیویوں میں سے ان دو عورتوں کے بارے میں پوچھوں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿إِنْ تَتُوبَا إِلَى اللَّهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا﴾ یہاں تک کہ انھوں نے حج کیا اور میں نے بھی ان کے ساتھ حج کیا، ایک جگہ وہ راستے سے ہٹ کر (قضائے حاجت کے لیے) ایک طرف کو گئے تو میں بھی پانی کا لوٹا لے کر ان کے ساتھ اس طرف کو چلا گیا۔ پھر وہ فارغ ہو کر آئے تو میں نے ان کے ہاتھوں پر پانی ڈالا، انھوں نے وضو کیا تو میں نے کہا: ”اے امیر المؤمنین! نبی ﷺ کی بیویوں میں سے وہ دو عورتیں کون ہیں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿إِنْ تَتُوبَا إِلَى اللَّهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا﴾؟“ انھوں نے فرمایا: ”ابن عباس! تم پر تعجب ہے، وہ دونوں حفصہ اور عائشہ (بیچھا) ہیں۔“

② فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا: ”صَغَا يَصْغُو صَغْوًا“ (ن) اور ”صَغِي يَصْغِي صَغْيًا“ (س) مائل ہونا، ایک طرف جھک

جانا۔ اس سے پہلے رسول اللہ ﷺ کی ان دو بیویوں کا ذکر عائشہ کے صغی کے ساتھ تھا، جن کی وجہ سے آپ ﷺ نے شہد اور ماریہ بیچھا سے اجتناب کی قسم کھائی تھی، اب انھیں مخاطب کر کے توبہ کی تلقین فرمائی ہے۔ اس آیت کی تفسیر تقریباً تمام قدیم مفسرین نے یہ کی ہے کہ اگر تم دونوں اللہ کی طرف توبہ کرو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے اور تمہیں توبہ کرنی ہی چاہیے، کیونکہ

وَجِبْرِيلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِينَ ۚ وَالْبَلَّيْكَةُ بَعْدَ ذَلِكَ ظَهِيْرٌ ﴿۳۰﴾

دوسرے کی مدد کرو تو یقیناً اللہ خود اس کا مددگار ہے اور جبریل اور صالح مومن اور اس کے بعد تمام فرشتے مددگار ہیں ﴿۳۰﴾

تمہارے دل درست بات سے دوسری طرف مائل ہو گئے ہیں اور تم نے رسول اللہ ﷺ کو ان کی پسندیدہ چیزوں شہد اور ماریہ ۱؎ سے اجتناب کی قسم تک پہنچا کر درست کام نہیں کیا۔ لفظوں کے تھوڑے بہت اختلاف کے ساتھ آیت کا یہی مفہوم طبری، قرطبی، رازی، ابن جزئی، ابن عطیہ، ابوالسعود، بغوی، ابن جوزی، سمرقندی اور دوسرے حلیل القدر مفسرین نے بیان فرمایا ہے اور ظاہر بھی یہی ہے، کیونکہ ان ازواج مطہرات کی دلی خواہش کہ رسول اللہ ﷺ زینب ۱؎ کے ہاں شہد نہ ہمیں اور اپنی ام ولد ماریہ ۱؎ کے پاس نہ جائیں، کسی طرح بھی درست قرار نہیں دی جاسکتی۔ خود اللہ تعالیٰ نے ان کی خواہش کو پورا کرنے کی وجہ سے نبی ﷺ پر محبت آمیز عتاب فرمایا۔

موجودہ دور کے بعض حضرات نے اس معنی کو ان ازواج مطہرات کی توہین قرار دے کر اس کا انکار کر دیا، ان کے خیال میں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان ازواج مطہرات کے دل حق سے ہٹے ہوئے تھے، حالانکہ کسی ایک بات میں کسی شخص کے دل کا میلان نادرست بات کی طرف ہو جائے تو اسے پورے راہ صواب سے ہٹا ہوا نہیں کہہ سکتے اور نہ ہی کسی مفسر کے کسی حاشیہ خیال میں امہات المؤمنین کے متعلق کوئی ایسی بات ہے اور یہاں تو امہات المؤمنین نے اللہ تعالیٰ کے حکم پر سر تسلیم خم کیا اور سچے دل سے توبہ کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا اور آخرت میں ان کے لیے ازواج رسول ہونے کا شرف برقرار رکھا، پھر ان کے متعلق کون کہہ سکتا ہے کہ ان کے دل راہ صواب سے ہٹے ہوئے تھے؟!

ایک مطلب آیت کا یہ ہے اور بعض حضرات نے اسی کو درست اور دوسرے ہر مطلب کو غلط قرار دیا ہے کہ ”اگر تم اللہ کی طرف توبہ کرو تو تم سے کچھ بعید نہیں، کیونکہ تمہارے دل پہلے ہی توبہ کی طرف مائل ہو چکے ہیں۔“ مفسر قرطبی نے پہلے معنی کے علاوہ اس معنی کا ذکر بھی کیا ہے۔ مگر اسی کو درست اور دوسرے معنی کو غلط اور لغت عرب سے ناواقفیت قرار دینا اہل علم کا شیوہ نہیں۔ اہل علم کا شیوہ تو وہ ہے جو قرطبی نے اختیار فرمایا ہے کہ دونوں معنی ذکر فرمادے، جو راجح تھا اسے پہلے ذکر فرمایا مگر دوسرے کا انکار نہیں کیا۔ یہ بات تسلیم کہ ”صَغَا يَصْغُو“ اور ”صَغِي يَصْغِي“ کے الفاظ کسی چیز کی طرف مائل ہونے کے لیے آتے ہیں، مگر اس سے یہ کیسے ثابت ہوا کہ یہ حق ہی کی طرف مائل ہونے کے لیے آتے ہیں، ناحق کی طرف مائل ہونے کے لیے نہیں آتے۔ ناحق کی طرف مائل ہونے کا مفہوم حق سے ہٹنے کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟ سورۃ انعام کی آیت (۱۱۳):

﴿وَلِتَصْغَىٰ إِلَيْهِ أَفِئَّةُ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ﴾ میں جن لوگوں کا ذکر ہوا ہے اس میں ان کے دل حق کی طرف مائل ہونے کا نہیں بلکہ ناحق ہی کی طرف مائل ہونے کا ذکر ہے۔ اس لیے شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالقادر، شاہ رفیع الدین، احمد علی لاہوری، فتح محمد جالندھری اور دوسرے مترجمین نے پہلے مفہوم والا ترجمہ ہی کیا ہے، حتیٰ کہ ایک مترجم صاحب جو رسول اللہ ﷺ

کی محبت کا بہت بلند بانگ دعویٰ رکھتے ہیں اور اہل توحید کو گستاخ اور بے ادب قرار دیتے نہیں تھکتے، انھوں نے بھی یہ ترجمہ کیا ہے: ”نبی کی دونوں بیویو! اگر اللہ کی طرف تم رجوع کرو تو ضرور تمہارے دل راہ حق سے کچھ ہٹ گئے ہیں۔“ تو کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کے نزدیک ازواج مطہرات کے دل راہ حق سے کچھ ہٹے ہوئے تھے؟

③ وَإِنْ تَظَهَّرَا عَلَيْهِ: ”تَظَهَّرَا“ باب تفاعل سے فعل مضارع ہے جو اصل میں ”تَتَّظَاهَرَانِ“ تھا، ایک تاء تخفیف کے لیے حذف کر دی گئی اور حرف شرط ”إِنْ“ کی وجہ سے نون اعرابی گر گیا۔ اس کا مادہ ”ظَهَرَ“ (پشت) ہے۔ باب تفاعل میں تشارک کا معنی ہوتا ہے، ایک دوسرے کی پشت پناہی کرنا، ایک دوسرے کی مدد کرنا۔ ”تَظَهَّرَا“ کے بعد ”عَلَيْهِ“ کا معنی ہے، اس کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کرو۔

④ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ مَوْلَاهُ: ”مَوْلَى“ کا معنی مالک بھی ہے اور مددگار بھی۔ اگر مالک معنی کریں تو یہ جملہ ”مَوْلَاهُ“ پر مکمل ہو گیا اور ”جَبْرِئِلُ“ سے ”ظَهِيذٌ“ تک الگ جملہ ہے، کیونکہ مالک صرف اللہ ہے اور کوئی مالک نہیں، جب کہ مدد اللہ کی طرف سے بھی ہوتی ہے اور بندوں کی طرف سے بھی، جیسا کہ فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِي آتَاكَ بِبَصَرِهِ وَبِالْمُؤْمِنِينَ﴾ [الأنفال: ۶۲] ”وہی ہے جس نے تجھے اپنی مدد کے ساتھ اور مومنوں کے ساتھ قوت بخشی۔“ اور فرمایا: ﴿إِلَّا تَنْصُرُوهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللَّهُ﴾ [النوبة: ۴۰] ”اگر تم اس کی مدد نہ کرو تو بلاشبہ اللہ نے اس کی مدد کی۔“ اور فرمایا: ﴿وَيَنْصُرُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ﴾ [الحشر: ۸] ”اور وہ اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں۔“ اور فرمایا: ﴿مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ﴾ [آل عمران: ۵۲] ”کون ہیں جو اللہ کی طرف میرے مددگار ہیں؟“ یعنی اگر تم دونوں اللہ کی طرف توبہ کرو تو بہتر ہے اور اگر تم دونوں رسول اللہ ﷺ کے خلاف ایک دوسری کی مدد کرو تو ہمارے رسول کو تمہاری کچھ پروا نہیں، کیونکہ اللہ اس کا مالک ہے اور جبریل اور صالح مومنین اور اس کے بعد تمام فرشتے اس کے مددگار اور پشت پناہ ہیں۔ اور اگر ”مَوْلَى“ کا معنی مددگار کریں تو پہلا جملہ ”صَالِحُ الْمُؤْمِنِينَ“ پر پورا ہوگا اور دوسرا جملہ ”وَالْمَلَائِكَةُ“ (مبتدا) سے شروع ہو کر ”ظَهِيذٌ“ پر ختم ہوگا، یعنی اگر تم دونوں اس کے خلاف ایک دوسری کی مدد کرو تو یقیناً اللہ اور جبریل اور صالح مومنین اس کے مددگار ہیں اور اس کے بعد تمام فرشتے اس کے پشت پناہ اور مددگار ہیں۔ یہ دوسرا معنی راجح ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ مالک تو ہر ایک کا ہے، صرف نبی ﷺ کا نہیں، ہاں! خاص نصرت اس کی اپنے رسولوں اور ایمان والوں کے ساتھ ہے، کفار کے ساتھ نہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿إِنَّا لَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ﴾ [المؤمن: ۵۱] ”بے شک ہم اپنے رسولوں کی اور ان لوگوں کی جو ایمان لائے ضرور مدد کرتے ہیں دنیا کی زندگی میں اور اس دن بھی جب گواہ کھڑے ہوں گے۔“

● صَالِحُ الْمُؤْمِنِينَ: ”صَالِحٌ“ اسم جنس ہے جو واحد و جمع سب پر بولا جاتا ہے، اس لیے جمع کا لفظ ”صَالِحُو الْمُؤْمِنِينَ“ بولنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔

● وَالْمَلَائِكَةُ بَعْدَ ذَلِكَ ظَهِيرٌ: یہاں ایک مشہور سوال ہے کہ مبتدا ”وَالْمَلَائِكَةُ“ جمع کی خبر ”ظَهِيذٌ“ واحد کیوں ہے؟

عَسَىٰ سَرَبَةٌ إِنْ طَلَّقْتَنَ أَنْ يُبْدِلَهُ أَرْوَاجًا خَيْرًا مِنْكَ مَسْلَمَتٍ مَوْمِنَةٍ قَتَلْتِ

اس کا رب قریب ہے، اگر وہ تمہیں طلاق دے دے کہ تمہارے بدلے اسے تم سے بہتر بیویاں دے دے، جو اسلام جو اب اس کا یہ ہے کہ "فَعِبَلٌ" کا وزن واحد، مشنہ، جمع اور مذکر و مؤنث سب کے لیے یکساں استعمال ہوتا ہے۔

آیت 5: ﴿عَسَىٰ سَرَبَةٌ إِنْ طَلَّقْتَنَ أَنْ يُبْدِلَهُ أَرْوَاجًا خَيْرًا مِنْكَ﴾ : اس آیت میں عائشہ اور حفصہ رضی اللہ عنہما

کے ساتھ دوسری بیویوں کو بھی خطاب میں شامل فرمایا ہے، کیونکہ بعض باتوں خصوصاً خرچے میں اضافے کے مطالبے کے ساتھ انہوں نے بھی رسول اللہ ﷺ کو اتنا پریشان کیا کہ آپ نے ایک ماہ کے لیے ان کے پاس نہ جانے کی قسم کھائی، جس کے کھل ہونے پر اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو حکم دیا کہ اپنی بیویوں کو اختیار دیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ احزاب (۲۹، ۲۸) کی تفسیر۔ انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: «اجْتَمَعَ نِسَاءُ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْغَيْزَةِ عَلَيْهِ فَقُلْتُ لَهُنَّ عَسَىٰ رَبُّهُ إِنْ طَلَّقْتَنَ أَنْ يُبْدِلَهُ أَرْوَاجًا خَيْرًا مِنْكَ فَزَلْتُ هَذِهِ الْآيَةَ» | بخاری، التفسیر، باب: عَسَىٰ رَبُّهُ إِنْ طَلَّقْتَنَ..... ۱: ۱۹۱۶ | "نبی ﷺ کی بیویاں غیرت (رشک و رقابت) میں آپ کے خلاف اکٹھی ہو گئیں تو میں نے ان سے کہا کہ اگر آپ ﷺ تمہیں طلاق دے دیں تو آپ کا رب قریب ہے کہ آپ ﷺ کو تم سے بہتر بیویاں دے دے، تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔"

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ مجھے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما نے بیان کیا: "جب رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیویوں سے علیحدگی اختیار کی تو میں مسجد میں داخل ہوا، دیکھا کہ لوگ (متحکم بیٹھے ہوئے) کنگریوں کے ساتھ زمین پر کھتے بنا رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی عورتوں کو طلاق دے دی ہے اور یہ حجاب کا حکم نازل ہونے سے پہلے کی بات ہے۔ تو میں نے کہا، میں آج یہ بات ضرور معلوم کر کے رہوں گا۔" خیر عمر رضی اللہ عنہما نے اپنے عائشہ اور حفصہ رضی اللہ عنہما کے پاس جانے اور انہیں نصیحت کا ذکر فرمایا۔ اس کے بعد فرمایا: "میں داخل ہوا تو دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کا غلام رباح (رضی اللہ عنہ) بالا خانے کی دلہیز پر موجود ہے، (جس بالا خانے میں آپ نے ایک ماہ بیویوں سے علیحدہ رہ کر گزارا) میں نے اسے آواز دی اور کہا اے رباح! میرے لیے رسول اللہ ﷺ سے آپ کے پاس جانے کی اجازت مانگو۔" مختصر یہ کہ عمر رضی اللہ عنہما اجازت ملنے پر اندر گئے اور آپ کو مانوس کرنے کے لیے کچھ باتیں کہیں۔ فرماتے ہیں: "میں نے کہا، یا رسول اللہ! آپ پر عورتوں کے معاملے میں کیا مشکل پیش آئے گی؟ سو اگر آپ نے انہیں طلاق دے دی ہے تو اللہ آپ کے ساتھ ہے اور اس کے فرشتے اور جبریل اور میں اور ابو بکر اور تمام مومن آپ کے ساتھ ہیں۔ اور میں نے کم ہی کبھی کوئی بات کی اور میں اللہ کی حمد بیان کرتا ہوں، مگر یہ امید رکھی کہ اللہ تعالیٰ میری بات کو سچا کر دے گا، تو یہ آیت یعنی آیت خمیر اتری: ﴿عَسَىٰ سَرَبَةٌ إِنْ طَلَّقْتَنَ أَنْ يُبْدِلَهُ أَرْوَاجًا خَيْرًا مِنْكَ﴾ | التحريم: ۵ | "اس کا رب قریب ہے، اگر وہ تمہیں طلاق دے دے کہ تمہارے بدلے اسے تم سے بہتر بیویاں دے دے" اور یہ آیت اتری: ﴿وَإِنْ تَطَهَّرَا عَلَيْهِمَا فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ مَوْلَاهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمَلَائِكَةُ بَعْدَ ذَلِكَ

ثَبَّتْ عِدَّتِ سَبَّحَتْ ثَبَّتَتْ وَ أَبْكَارًا ⑤

والیاں، ایمان والیاں، اطاعت کرنے والیاں، توبہ کرنے والیاں، عبادت کرنے والیاں، روزہ رکھنے والیاں ہوں، شوہر دیدہ اور کنواریاں ہوں ⑤

ظہیر ﴿ التحريم : ۴ ﴾ ” اور اگر تم اس کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کرو تو یقیناً اللہ خود اس کا مددگار ہے اور جبریل اور صالح مومن اور اس کے بعد تمام فرشتے مددگار ہیں۔“ [مسلم، الطلاق، باب فی الإیلاء و اعتزال النساء و تحبیرهن : ۱۴۷۹] اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ”صَالِحُ الْمُؤْمِنِينَ“ سے مراد سب سے پہلے ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما ہیں، پھر ان کے ساتھ تمام مومن شامل ہیں اور یہ آیت بھی موافقات عمر رضی اللہ عنہما میں سے ہے، یعنی وہ آیات جو ان باتوں کے موافق اتریں جو عمر رضی اللہ عنہما نے کہی تھیں۔ ان میں بدر کے قیدیوں کا معاملہ، حجاب کا معاملہ، مقام ابراہیم کو جائے نماز بنانے کا معاملہ اور دوسری کئی باتیں شامل ہیں۔

② اس آیت میں نبی ﷺ کی بیویوں کو تنبیہ ہے کہ تم اس خیال میں نہ رہنا کہ نبی ﷺ کو تم سے بہتر بیویاں نہیں مل سکتیں، اس لیے تم جس طرح چاہو نبی ﷺ پر دباؤ ڈالتی رہو، بلکہ اگر آپ نے تمہیں طلاق دے دی تو آپ کا رب قریب ہے کہ آپ کو تم سے کہیں بہتر بیویاں عطا فرمادے۔

③ مُسَلِّمَاتٌ مُؤْمِنَاتٌ ثَبَّتَتْ : ان صفات کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے۔ (دیکھیے احزاب : ۳۵) ”ثَبَّتَتْ عِدَّتِ سَبَّحَتْ“ کے لیے دیکھیے سورہ توبہ (۱۱۲)۔

④ ثَبَّتَتْ وَ أَبْكَارًا : ”ثَبَّتَتْ“ کی جمع ہے، طلاق یافتہ یا بیوہ عورت۔ یہ ”ثَبَّتَتْ يَتَوَّبُ نَوْبًا“ (ان) سے مشتق ہے، اسے ”ثَبَّتَتْ“ اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ خاوند سے واپس لوٹ آتی ہے اور پھر اسی طرح خاوند کے بغیر رہ جاتی ہے جیسے پہلے تھی۔ ”أَبْكَارًا“ ”بِكَرٌ“ کی جمع ہے، کنواری۔ اسے ”بِكَرٌ“ اس لیے کہتے ہیں کہ یہ ابھی اپنی اسی پہلی حالت پر ہوتی ہے جس پر پیدا ہوئی تھی اور ہر جنس میں سب سے پہلی چیز کو بکر کہتے ہیں۔ پہلی صفات کے درمیان واؤ عطف نہیں لائی گئی، کیونکہ وہ سب ایک وقت میں جمع ہو سکتی ہیں، مگر کسی عورت میں ان دونوں میں سے ایک وقت میں ایک ہی صفت ہو سکتی ہے، اس لیے واؤ عطف لائی گئی۔ بے شک رسول اللہ ﷺ نے کنواری عورتوں کے ساتھ نکاح کی ترغیب دلائی مگر بعض اوقات ثببات میں علم و عقل اور تجربے وغیرہ کی ایسی صفات ہوتی ہیں جو انھیں ابکار پر ترجیح دینے کا باعث ہوتی ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو دونوں طرح کی بیویاں عطا فرمائیں۔

⑤ اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو آپ کی ازواج سے بہتر ازواج عطا کرنے کی امید اس شرط پر دلائی تھی کہ آپ موجودہ بیویوں کو طلاق دے دیں، مگر نہ آپ ﷺ نے انھیں طلاق دی اور نہ اللہ تعالیٰ نے ان سے بہتر بیویاں آپ کو دیں، بلکہ انھی کو بہتر ہونے کا اور دنیا اور آخرت میں آپ ﷺ کی ازواج رہنے کا شرف عطا فرمایا۔

⑥ اس آیت سے معلوم ہوا کہ آدمی کو بیوی کے انتخاب کے وقت ان صفات کی حامل عورت کو ترجیح دینی چاہیے جو اس آیت

يَأْتِيهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُلُوبًا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلَائِكَةٌ
غُلَاطٌ شِدَادٌ لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ ﴿٦﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہیں، اس پر سخت دل، بہت مضبوط فرشتے مقرر ہیں، جو اللہ کی نافرمانی نہیں کرتے جو وہ انھیں حکم دے اور وہ کرتے ہیں جو حکم دیے جاتے ہیں ﴿۶﴾

میں مذکور ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «تُنكح المرأة لأربع: لجمالها ولحسبها وجمالها ولدينها، فأظفر بذات الدين تربت يداك»؛ بخاری، النکاح، باب الأکفا، فی الدین: ۵۰۹۰، عن أبي هريرة رويته | "عورت سے چار چیزوں کی وجہ سے نکاح کیا جاتا ہے، اس کے مال کی وجہ سے، اس کے حسب اور اس کے جمال کی وجہ سے اور اس کے دین کی وجہ سے، سو تو دین والی عورت کے ساتھ نکاح میں کامیابی حاصل کر، تیرے ہاتھ خاک آلود ہوں۔"

۷) اس مقام پر بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ "حیب" سے مراد آسیہ زوجہ فرعون ہیں اور "بکر" سے مراد مریم بنت عمران ہیں، ان دونوں کا نکاح جنت میں نبی ﷺ سے کیا جائے گا، مگر ایک تو اس بات کا اس آیت سے کوئی تعلق نہیں، کیونکہ اس میں پہلی بیویوں کو طلاق دینے کی صورت میں ان کے بدلے میں ان سے بہتر شیات و اباکار بیویاں عطا کرنے کا ذکر ہے اور جب آپ نے پہلی بیویوں کو طلاق ہی نہیں دی تو ان کے بدلے میں اور بیویوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ جنت میں ان دونوں عظیم خواتین کا نکاح رسول اللہ ﷺ سے کر دے تو یہ ناممکن نہیں، مگر یہ ثابت ہونا تو ضروری ہے، جب کہ کسی صحیح دلیل سے یہ بات ثابت نہیں۔

آیت 6 ﴿يَأْتِيهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُلُوبًا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا﴾: پچھلی آیات میں امہات المؤمنین کی تربیت اور ان کے اعمال و اخلاق کی اصلاح کا بیان تھا، اب تمام ایمان والوں کو اس کا حکم دیا جا رہا ہے۔ "ناراً" میں توین تعظیم کے لیے ہے، یعنی اس عظیم آگ سے بچ جاؤ۔ "قُلُوبًا" (بچاؤ) "وَقِيًا بَقِيًا وَقِيًا وَ قِيًا" (ض) سے امر حاضر جمع مذکر ہے۔ اس میں ایمان والوں کو ایک نہایت اہم ذمہ داری کی طرف توجہ دلائی ہے کہ وہ اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچائیں اور اس کے ساتھ اپنے گھر والوں کی تعلیم و تربیت اور ان کے اعمال و اخلاق کی اصلاح کا اہتمام کر کے انھیں بھی جہنم کی آگ سے بچائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْتَوْفٍ عَنْ رَعِيَّتِهِ» | بخاری، الجمعة، باب الجمعة في القرى والمدن: ۸۹۳ | "تم میں سے ہر ایک راعی (جسمبان) ہے اور تم میں سے ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال کیا جائے والا ہے۔" قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے نبی مکرم ﷺ اور امت کے ہر فرد کو اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دینے اور اس پر پابند رہنے کا حکم دیا، فرمایا: ﴿وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلَاةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا﴾ | طہ: ۱۳۲ | "اور اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ ۚ إِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٦﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ كَفَرُوا
 آمِنُوا تَوْبًا إِلَى اللَّهِ تَوْبَةً نَّصُوحًا ۚ عَلَىٰ رَأْسِكُمْ أَنْ يَكْفُرَ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمُ

اے لوگو جنہوں نے کفر کیا! آج بہانے مت بناؤ، تم صرف اسی کا بدلہ دیے جاؤ گے جو تم کیا کرتے تھے ﴿۶﴾ اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کی طرف توبہ کرو، خالص توبہ، تمہارا رب قریب ہے کہ تم سے تمہاری برائیاں دور کر دے اور

اور اس پر خوب پابند رہو۔“ اس مقصد کے لیے بچپن ہی سے انہیں نماز روزے اور اسلام کے دوسرے احکام پر عمل کی عادت ڈالنی چاہیے اور سمجھ دار ہونے پر اس کے لیے سختی کی ضرورت ہو تو وہ بھی کرنی چاہیے، خواہ ابھی بالغ نہ ہوئے ہوں اور سن تیز شروع ہونے کے ساتھ ہی انہیں جنسی بے راہ روی سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «مُرُوا أَوْلَادَكُمْ بِالصَّلَاةِ وَهُمْ أَبْنَاءُ سِنِينَ وَاصْرِبُوا لَهُمْ عَلَيْهَا وَهُمْ أَبْنَاءُ عَشْرِ سِنِينَ وَفَرِّقُوا بَيْنَهُمْ فِي الْمَضَاجِعِ» [ابو داؤد، الصلاة، باب متى يومر الغلام بالصلاة: ۴۹۵، وقال الألبانی حسن صحیح] ”اپنے بچوں کو نماز کا حکم دو جب وہ سات برس کے ہوں اور اس پر انہیں مارو جب وہ دس برس کے ہوں اور بستروں میں انہیں ایک دوسرے سے الگ کر دو۔“

﴿۲﴾ وَقُوذُهَا النَّاسُ وَالْجِبَارَةُ: اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورۃ بقرہ (۲۳) کی تفسیر۔

﴿۳﴾ عَلَيْهَا تَلْبِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ...: ”غِلَاظٌ“ ”غَيْظٌ“ کی جمع ہے، سخت دل والے، بے رحم اور ”شِدَادٌ“ ”شَدِيدٌ“ کی جمع ہے، سخت قوت والے، نہایت مضبوط۔ یہاں جہنم پر مقرر فرشتوں کے چار اوصاف بیان ہوئے ہیں: ﴿۱﴾ وہ نہایت سخت دل ہیں، انہیں کسی پر رحم نہیں آئے گا۔ ﴿۲﴾ سخت قوت والے ہیں، کوئی ان کی گرفت سے نکل نہیں سکے گا۔ ﴿۳﴾ اللہ تعالیٰ انہیں جو حکم بھی دے اس کی نافرمانی نہیں کرتے۔ ﴿۴﴾ اور وہ کوئی کام اپنی مرضی سے نہیں کرتے، بلکہ وہی کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے۔ مزید دیکھیے سورۃ انبیاء (۲۷)۔

آیت 7: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ...: یعنی جب وہ سخت دل اور سخت قوت والے فرشتے جہنمیوں کو جہنم میں ڈالیں گے تو وہ مختلف عذر کریں گے اور بہانے بنائیں گے، اللہ تعالیٰ نے ان کے مختلف بہانے قرآن مجید میں ذکر فرمائے ہیں۔ (دیکھیے اعراف: ۳۸۔ انعام: ۲۳، ۲۴، ۲۷) مگر انہیں کہا جائے گا کہ آج کوئی عذر بہانہ نہ کرو، کیونکہ تمہیں اس سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا، تمہیں انہی اعمال کی جزا دی جا رہی ہے جو تم کرتے رہے ہو۔ مزید دیکھیے سورۃ روم (۵۷) اور سورۃ مؤمن (۵۲)۔

آیت 8: ﴿۱﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ...: ”تَوْبَةً“ ”تَوْبٌ“ ”تَوْبَةٌ“ (ن) پلٹ آنا۔ ”نَصُوحًا“ ”نَصُوحٌ“ ”نَصُوحًا“ (ف) سے ”فَعُولٌ“ کے وزن پر مبالغے کا صیغہ ہے، بہت خالص۔ یہ وزن مذکر مؤنث اور واحد، جمع وثنیہ سب کے لیے اسی طرح استعمال ہوتا ہے، اس لیے ”نَصُوحًا“ مذکر ہونے کے باوجود ”تَوْبَةٌ“ (مؤنث) کی صفت ہے۔ ”نَصُوحُ الشَّيْءِ“ اس وقت کہتے ہیں جب کوئی چیز خالص ہو، اس میں کھوٹ نہ ہو۔ شہد یا کوئی اور چیز جب

جَدَّتْ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۖ يَوْمَ لَا يُخْزِي اللَّهُ النَّبِيَّ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ ۖ نُورُهُمْ يَسْعَى بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَنْتُمْ لَنَا نُورٌ نَا وَاعْفُرْ لَنَا ۖ إِنَّكَ عَلَىٰ

كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۸﴾

تسبب ایسے بانگوں میں داخل کرے جن کے تلے نہریں بہتی ہیں، جس دن اللہ نبی کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے، رسوا نہیں کرے گا، ان کا نور ان کے آگے اور ان کی دائیں طرفوں میں دوڑ رہا ہوگا، وہ کہہ رہے ہوں گے اے ہمارے رب! ہمارے لیے ہمارا نور پورا کر اور ہمیں بخش دے، یقیناً تو ہر چیز پر خوب قادر ہے ﴿۸﴾

خالص ہو تو اسے ”النُّصْحُ“ کہتے ہیں۔ ”النُّصْحُ“ خالص ہونا، ”الْعَشُّ“ (کھوٹا ہونے) کا متضاد ہے۔

اس آیت میں جہنم سے بچنے کا طریقہ بتلایا ہے، فرمایا اے ایمان والو! اللہ کی طرف پلٹ آؤ، خالص اور سچا پلٹنا۔ یعنی اگر نافرمانی کر کے اللہ تعالیٰ سے دور ہو گئے ہو تو اسے ترک کر کے واپس اس کی طرف پلٹ آؤ۔ تو بہ نصوح کی پہلی شرط یہ ہے کہ محض اللہ کے خوف کی وجہ سے آدمی گناہ پر نادم ہو، کسی دنیاوی نقصان کی وجہ سے ندامت تو بہ نہیں۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «الَّذِي تَوْبَةً» [ابن ماجہ، الزهد، باب ذكر التوبة: ۴۲۵۲، وقال الألبانی صحیح] ”ندامت تو بہ ہے۔“ دوسری شرط یہ ہے کہ گناہ چھوڑ دے اور فوراً چھوڑ دے۔ (دیکھیے نساء: ۱۷۔ اعراف: ۲۰۱) تیسری شرط یہ ہے کہ آئندہ نہ کرنے کا پختہ ارادہ کرے، گناہ پر قائم نہ رہے۔ (دیکھیے آل عمران: ۱۳۵) اور چوتھی شرط یہ ہے کہ اگر اس کا تعلق بندوں کے حقوق سے ہے تو جہاں تک ممکن ہو انہیں ادا کرے یا معافی مانگ لے۔

﴿۲﴾ عَلَىٰ رَأْسِكُمْ أَنْ يَكْفُرَ عَنْكُمْ سِيَأْتِكُمْ : اس میں تو بہ نصوح پر گناہوں کی معافی اور جنتوں میں داخلے کی خوش خبری سنائی ہے۔

﴿۳﴾ يَوْمَ لَا يُخْزِي اللَّهُ النَّبِيَّ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ : ”يَوْمَ“ کا لفظ ”يُذْخِلُكُمْ“ کا ظرف ہے، یعنی گناہوں کی معافی اور جنت میں داخلہ اس دن ہوگا جس دن اللہ تعالیٰ نبی کو اور اس کے ساتھ ایمان لانے والوں کو رسوا نہیں کرے گا۔ اس کے ساتھ ایمان لانے والوں میں صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین اور ان کے بعد قیامت تک آنے والے تمام مسلمان شامل ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ فتح کی آخری آیت کی تفسیر۔ ان میں ازواج مطہرات بالادلی شامل ہیں، کیونکہ وہ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لائیں، اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے نبی ﷺ کی زوجیت کا شرف بخشا اور جب انہیں اللہ، اس کے رسول اور آخرت اور دنیا میں سے کسی ایک چیز کو قبول کرنے کا اختیار دیا گیا تو انہوں نے اللہ، اس کے رسول اور آخرت کو قبول کیا۔ (دیکھیے احزاب: ۲۸ تا ۳۳) اور ان کے ایثار اور صبر کی وجہ سے ان کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو مزید عورتوں کے ساتھ یا ان کو بدل کر دوسری عورتوں کے ساتھ نکاح سے منع فرمادیا۔ (دیکھیے سورہ احزاب: ۵۲)۔

اس دن کی رسوائی سے دنیا میں بھی انبیاء اور مومن بندے پناہ مانگتے رہے تھے۔ (دیکھیے آل عمران: ۱۹۳۔ شعراء: ۸۷)

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۚ وَمَأْوَهُمْ جَهَنَّمُ ۚ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ﴿٩﴾
 ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا لِلَّذِينَ كَفَرُوا امْرَأَتَ نُوحٍ وَامْرَأَتَ لُوطٍ ۚ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ
 مِنْ عِبَادِنَا صَالِحِينَ فَخَانَتَهُمَا فَلَمْ يُعْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللَّهِ شَيْئًا وَقِيلَ ادْخُلَا النَّارَ
 مَعَ الدَّٰخِلِينَ ﴿١٠﴾

اے نبی! کفار اور منافقین سے جہاد کرو اور ان پر سختی کرو اور ان کی جگہ جہنم ہے اور وہ برا ٹھکانا ہے ﴿۹﴾ اللہ نے ان لوگوں کے لیے جنہوں نے کفر کیا نوح کی بیوی اور لوط کی بیوی کی مثال بیان کی، وہ ہمارے بندوں میں سے دو نیک بندوں کے نکاح میں تھیں، پھر انہوں نے ان دونوں کی خیانت کی تو وہ اللہ سے (بچانے میں) ان کے کچھ کام نہ آئے اور کہہ دیا گیا کہ داخل ہونے والوں کے ساتھ تم دونوں آگ میں داخل ہو جاؤ ﴿۱۰﴾

سوال اللہ تعالیٰ انہیں اس رسوائی سے بچالے گا۔

﴿۹﴾ تُوْهُمۡ یَسْعٰی بَیۡنَ اَیۡدِیۡهِمۡ وَبَاۡیۡتَانِہُمۡ : اس کے لیے دیکھیے سورہ حدید کی آیت (۱۲) کی تفسیر۔

﴿۱۰﴾ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اٰتِنۡہُمْ لَنَا نُوْرًا : حشر کے میدان میں جب ایمان والوں اور منافقین کے درمیان دیوار حائل ہونے پر منافقین اندھیرے میں کھڑے رہ جائیں گے تو ایمان والے اس خوف سے کہ منافقین کی طرح ہماری روشنی بھی نہ بچھ جائے اللہ تعالیٰ سے اپنے نور کو پورا کرنے اور پورا رکھنے کی دعا کریں گے، تاکہ اس روشنی میں وہ جنت تک پہنچ جائیں۔ مزید دیکھیے سورہ حدید (۱۳ تا ۱۵)۔

آیت ۹: يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ: پچھلے آیات میں ایمان والوں کا ٹھکانا بتایا تھا، اب دنیا اور آخرت میں کفار کے معاملے کا ذکر فرمایا کہ دنیا میں ان کے ساتھ جہاد کرنا ہے اور ان پر سختی کرنی ہے، کسی قسم کی مدافعت یا چشم پوشی سے کام نہیں لینا، تاکہ اسلام کا کلمہ سر بلند رہے اور یہ لوگ اس کے سامنے سر جھکا کر زندگی بسر کریں اور آخرت میں ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔ منافقین کے ساتھ جہاد سے کیا مراد ہے، اس کے لیے دیکھیے سورہ توبہ (۷۳) کی تفسیر۔

آیت ۱۰: ﴿۱۰﴾ ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا لِلَّذِينَ كَفَرُوا امْرَأَتَ نُوحٍ وَامْرَأَتَ لُوطٍ: کفار اور منافقین کے ساتھ جہاد کے حکم کے بعد کفر کی نحوست اور ایمان کی برکت بیان فرمائی کہ قیامت کے دن کافر کو کسی مسلمان کے ساتھ کسی طرح کی قرابت کام نہیں آئے گی، حتیٰ کہ اگر پیغمبر کی بیوی کا کافر ہے تو وہ پیغمبر سے بھی جہنم میں جانے سے نہیں بچا سکے گا۔ اس سے پہلے قرآن مجید میں نوح علیہ السلام کے بیٹے اور ابراہیم علیہ السلام کے والد کی صورت میں نسبی قرابت کی مثالیں گزر چکی ہیں۔ یہاں نوح علیہ السلام کی بیوی اور لوط علیہ السلام کی بیوی کو کافر لوگوں کی مثال کے طور پر ذکر فرمایا۔ بعض لوگوں نے کہا کہ یہ قصہ ازواج مطہرات کو سنایا گیا ہے، مگر یہ بات غلط اور بے دلیل ہے، کیونکہ اس آیت میں کافر عورتوں کا ذکر ہے جن کے کفر کی وجہ سے ان کے خاوندان کے کچھ کام

وَصَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا لِلَّذِينَ آمَنُوا انزَلَتْ فِرْعَوْنَ مِاذُ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِي عِنْدَكَ بَيْتًا
فِي الْجَنَّةِ وَخَجِّنِي مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهِ وَخَجِّنِي مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ①

اور اللہ نے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے فرعون کی بیوی کی مثال بیان کی، جب اس نے کہا اے میرے رب! میرے لیے اپنے پاس جنت میں ایک گھر بنا اور مجھے فرعون اور اس کے عمل سے بچالے اور مجھے ظالم لوگوں سے نجات دے ①

نہ آئے اور انھیں آگ میں داخل کر دیا گیا۔ امہات المؤمنین کو ان پر کیسے قیاس کیا جا سکتا ہے جن کے ایمان، تقویٰ اور پاکیزگی کی شہادت قرآن مجید نے دی ہے؟! حقیقت یہ ہے کہ ازواجِ مطہرات کا قصہ اوپر ختم ہو چکا ہے اور اس آیت کے مضمون کا تعلق ”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ“ کے ساتھ ہے، کیونکہ ایمان والوں کا اپنے ایمان والے قرابت داروں کو فائدہ پہنچانا قرآن مجید (طور: ۲۱) اور احادیثِ شفاعت میں ثابت ہے۔

② کتبِ تقاسیر میں نوح اور لوط علیہم السلام کی ان بیویوں کے نام مختلف آئے ہیں، مگر صحیح سند سے کوئی بھی ثابت نہیں۔

③ فَخَاتَمَهُنَّ: اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں بتایا کہ وہ خیانت کیا تھی اور نہ ہی کسی صحیح طریق سے اس خیانت کا ذکر آیا ہے۔ اگر اس کی ضرورت ہوتی تو اللہ تعالیٰ اسے ضرور ذکر فرما دیتے، اسے مبہم رکھنے میں یہ حکمت معلوم ہوتی ہے کہ بندہ ہر قسم کی خیانت سے ڈرتا رہے۔

آیت 11 ① وَصَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا لِلَّذِينَ آمَنُوا انزَلَتْ فِرْعَوْنَ: یہ ایمان کی برکت کی مثال ہے کہ ”رب اعلیٰ“ ہونے

کا دعویٰ کرنے والے ”کافر اعظم“ کی بیوی جب ایمان لے آئی تو خاوند کی فرعونیت نہ اسے ایمان لانے سے روک سکی اور نہ ہی آخرت کے معاملے میں اس کا کوئی نقصان کر سکی۔ اس عظیم خاتون کا نام آسہ ہے، وہ موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئی تو فرعون نے ایک طرف اسے عالی شان محلات اور ہر قسم کی دنیوی آسائشوں کا لالچ دیا اور دوسری طرف ایمان سے باز نہ آنے پر سب کچھ چھین لیا اور اسے بے پناہ اذیتیں دینے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس پر اس نے اللہ تعالیٰ سے فرعون کے محلات اور آسائشوں کے بدلے میں اپنے پڑوس میں جنت کے اندر گھر عطا کرنے اور فرعون اور اس کے مشرکانہ اور ظالمانہ کاموں سے اور اس کی ظالم قوم سے نجات عطا کرنے کی دعا کی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی دعا قبول فرما کر اس کی روح قبض کر لی اور اس نے جو مانگا تھا عطا فرما دیا۔ ابن جریر صاحب التفسیر لکھتے ہیں: ”وَرُوِيَ فِيهِ فَضِيصُهَا غَيْرُ هَذَا مِمَّا يَطُولُ وَهُوَ غَيْرُ صَحِيحٍ“ اس کے قصے میں اس کے علاوہ کئی طویل چیزیں ذکر کی گئی ہیں مگر وہ ثابت نہیں ہیں۔“

② اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِي عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ: اہل علم فرماتے ہیں کہ آسہ بیٹوں نے جنت میں گھر بنانے کی دعا سے پہلے سب سے بہتر ہمسائگی ملنے کی دعا کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اچھی جگہ اچھے مکان کی دعا سے پہلے اچھی ہمسائگی کی دعا

وَفَرِيْمَ ابْنَتِ عِمْرَانَ الَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهِ مِنْ رُوحِنَا وَصَدَقْتَ بِكَلِمَاتِ رَبِّهَا وَكُتِبَ عَلَيْهَا مِنَ الْعَمَلَاتِ ١٢

اور عمران کی بیٹی مریم کی (مثال دی ہے) جس نے اپنی شرم گاہ کی حفاظت کی تو ہم نے اس میں اپنی ایک روح پھونک دی اور اس نے اپنے رب کی باتوں کی اور اس کی کتابوں کی تصدیق کی اور وہ اطاعت کرنے والوں میں سے تھی ﴿۱۲﴾

کرتی چاہیے اور آخرت میں وہ جنت الفردوس ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «فَإِذَا سَأَلْتُمُ اللَّهَ فَاسْأَلُوهُ الْبِرَّ دُونَ، فَإِنَّهُ أَوْسَطُ الْخَيْرِ وَأَعْلَى الْخَيْرِ، أَرَاهُ قَالَ قَوْفَهُ عَرْشُ الرَّحْمَنِ، وَمِنْهُ تَفْخَرُ أَنْهَارُ الْخَيْرِ» [بخاری، التحيات، باب درجات المحاهدين من سبيل الله: ۲۷۹۰] "جب تم اللہ تعالیٰ سے سوال کرو تو اس سے فردوس کا سوال کرو، کیونکہ وہ جنت کا سب سے افضل اور سب سے بلند حصہ ہے اور اس کے اوپر رحمان کا عرش ہے اور اسی سے جنت کی ٹہریں نکلتی ہیں۔"

﴿۱۳﴾ ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «كَمُلَ مِنَ الرِّجَالِ سَكْبِيْرٌ، وَلَمْ يَكْمُلْ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا أَسِيْبَةُ فِرْعَوْنَ، وَفَرِيْمُ بِنْتُ عِمْرَانَ، وَإِنْ فَضَّلَ عَائِشَةُ عَلَى النِّسَاءِ كَفَضَّلَ الشَّرِيْدُ عَلَى سَائِرِ الطَّلْعَامِ» [بخاری، أحاديث الأبياء، باب قول الله تعالى: ﴿وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا...﴾: ۳۴۶۶] "مردوں میں سب سے بہت سے کامل ہوئے ہیں، مگر عورتوں میں سے آسیہ زوجہ فرعون اور مریم بنت عمران کے سوا کوئی کامل نہیں ہوئی اور عائشہ کی فضیلت عورتوں پر ایسے ہے جیسے شرید کی فضیلت تمام کھانوں پر ہے۔"

آیت ۱۲ وَفَرِيْمَ ابْنَتِ عِمْرَانَ الَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا... : یعنی اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کے لیے مثال کے طور پر فرعون کی بیوی آسیہ اور مریم بنت عمران کا بیان فرمایا ہے کہ دونوں انہی درجے کے ایمان والی تھیں۔ قرآن مجید میں مریم بنت عمران کا نام صرف اس مقام پر نہیں بلکہ کئی جگہ آیا ہے اور یہ واحد خاتون ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے قرآن میں نام لیا ہے۔ آیت کے اکثر الفاظ کی تشریح سورہ انبیاء (۹۱) میں اور دوسرے الفاظ کی تشریح مختلف آیات کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔



تَبَارَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿١﴾

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

بہت برکت والا ہے وہ کہ تمام بادشاہی صرف اس کے ہاتھ میں ہے اور وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے ﴿١﴾

اس سورت کی فضیلت میں کئی روایات آتی ہیں، جن میں سے چند صحیح یا حسن احادیث درج ذیل ہیں: ﴿١﴾ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّ سُورَةَ مِنَ الْقُرْآنِ ثَلَاثُونَ آيَةً شَفَعَتْ لِرَجُلٍ حَتَّىٰ عُفِرَ لَهُ وَهِيَ سُورَةُ: ﴿تَبَارَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ﴾» [ترمذی، فضائل القرآن، باب ما جاد فی فضل سورة الملك: ۲۸۹۱۔ ابو داؤد: ۱۷۰۰، و حسنہ الألبانی] "قرآن کی ایک سورت نے جس کی تیس آیات ہیں، ایک آدمی کے لیے سفارش کی یہاں تک کہ اسے بخش دیا گیا اور وہ سورت ﴿تَبَارَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ﴾ ہے۔" ﴿٢﴾ انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «سُورَةُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هِيَ إِلَّا ثَلَاثُونَ آيَةً خَاصَمَتْ عَنْ صَاحِبِهَا حَتَّىٰ أُذْخِلَتْهُ الْجَنَّةَ، وَهِيَ سُورَةُ تَبَارَكَ ﴿المعجم الصغير للطبراني: ۲۹۶/۱، ح: ۷۹۰، و صححه الألبانی۔ صحيح الجامع الصغير: ۳۶۷۴﴾ | "قرآن کی ایک سورت نے، جس کی صرف تیس آیات ہیں، اپنے پڑھنے والے کی طرف سے جھگڑا کیا یہاں تک کہ اسے جنت میں داخل کروا دیا اور وہ سورت "تَبَارَكَ" (الملك) ہے۔" ﴿٣﴾ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ سوتے نہیں تھے یہاں تک کہ ﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ﴾ اور ﴿تَبَارَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ﴾ پڑھتے۔ | سلسلة الأحاديث الصحيحة، ح: ۱۱۷۰ | ﴿٤﴾ جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ سوتے نہیں تھے یہاں تک کہ ﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ﴾ اور ﴿تَبَارَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ﴾ پڑھتے۔ | ترمذی، فضائل القرآن، باب ما جاد فی فضل سورة الملك: ۲۸۹۲، و صححه الألبانی |

آیت 1 ﴿١﴾ تَبَارَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ : "تَبَارَكَ" "تَبَارَكَ" سے باب تفاعل ہے۔ اس میں مبالغہ پایا جاتا ہے، اسی مناسبت سے ترجمہ "بہت برکت والا" کیا گیا ہے۔ "تَبَارَكَ" کے معنی ہیں زیادہ ہونا، بڑھا ہونا۔ "تَبَارَكَ" یعنی وہ خیر اور بھلائی میں ساری کائنات سے بے انتہا بڑھا ہوا ہے اور بلندی، بڑائی اور احسان، غرض ہر لحاظ سے اس کی ذات بے حد و حساب خوبیوں اور بھلائیوں کی جامع ہے۔ مزید دیکھیے سورہ فرقان کی پہلی آیت کی تفسیر۔

﴿٢﴾ "بِيَدِهِ" پہلے لانے سے کلام میں حصر پیدا ہو گیا، اس لیے ترجمہ "صرف اس کے ہاتھ میں ہے" کیا گیا ہے۔

﴿٣﴾ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ دنیا میں بادشاہ تو بہت ہیں، پھر اللہ تعالیٰ نے یہ کیسے فرما دیا کہ تمام بادشاہی صرف اس کے ہاتھ میں ہے؟ جواب یہ ہے کہ دنیا کا سارا نظام ایک دوسرے کی محتاجی پر چل رہا ہے، رعایا اپنی ضروریات مثلاً جان و مال، عزت و آبرو اور دین و ایمان کی حفاظت کے لیے بادشاہ کی محتاج ہے اور بادشاہ اپنے کام چلانے کے لیے رعایا کا محتاج ہے، اگر وہ اس کا ساتھ نہ دیں اور اسے ٹکس نہ دیں تو وہ ایک لمحہ کے لیے بادشاہ نہیں رہ سکتا۔ سورہ زخرف میں یہی نکتہ بیان کیا گیا

الذی خلق الموت والحیوة لیبلوکم ایکم احسن عملاً ۱ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْغَفُورُ ۝

وہ جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا، تاکہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل میں زیادہ اچھا ہے اور وہی سب پر غالب، بے حد بخشنے والا ہے ۲

ہے، فرمایا: ﴿لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُرِّيًّا﴾ [الزحرف: ۳۲] ”تاکہ ان کا بعض بعض کو تابع بنالے۔“ ایک شاعر نے دنیوی بادشاہوں کی محتاجی کا کیا خوب نقشہ کھینچا ہے۔

مانگنے والا گدا ہے، صدقہ مانگے یا خراج کوئی مانے یا نہ مانے میر و سلطان سب گدا

اس کے علاوہ دنیا میں کوئی بادشاہ ہے یا محکوم، ایک دوسرے کے محتاج ہونے کے باوجود دونوں میں سے کسی کے بھی ہاتھ میں فی الحقیقت کچھ بھی نہیں۔ ان کی اپنی دولت و فقر، صحت و بیماری، عزت و ذلت، فتح و شکست، جوانی و بڑھاپا، نفع و نقصان اور موت و حیات، غرض سب کچھ اللہ مالک الملک کے ہاتھ میں ہے، تو پھر یہ کہنے میں کیا مبالغہ ہے کہ تمام بادشاہی صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے؟ دوسرا کوئی بادشاہ ہے بھی تو نام کا ہے۔ حقیقت میں بادشاہ ایک ہی ہے، باقی سب گدا ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ﴾ [فاطر: ۱۵] ”اے لوگو! تم ہی اللہ کی طرف محتاج ہو۔“

۴ ﴿وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ ”شئیء“ ”شَاءَ يَشَاءُ“ کا مصدر بمعنی اسم مفعول ہے، چاہت۔ یعنی وہ اپنی ہر چاہت اور ہر چیز پر قادر ہے، جو چاہے کر سکتا ہے۔ دنیا کے بادشاہوں کی طرح نہیں کہ جن کی بے شمار چاہتیں پوری ہونے کے بجائے حسرتیں بن کر ان کے ساتھ ہی قبر میں دفن ہو جاتی ہیں۔

آیت ۲ : ۱ الذی خلق الموت والحیوة لیبلوکم : یہاں سے اللہ تعالیٰ نے اپنی پیدا کی ہوئی چند چیزوں کا ذکر فرمایا جو مخلوق کی قدرت سے باہر ہیں، تاکہ انسان کے دل میں اللہ کی قدرت کا پورا یقین جم جائے۔ اس مقام پر اپنی قدرتوں میں سے پہلی چیز موت و حیات ذکر فرمائی، کیونکہ موت اور زندگی میں انسان کے تمام احوال پورے پورے آجاتے ہیں۔ ۲ اللہ تعالیٰ نے انسان کی دنیا میں آنے سے پہلے کی حالت کو موت قرار دیا اور دنیا میں آنے کے بعد یہاں سے جانے کو بھی موت قرار دیا۔ اسی طرح دنیا میں آنے کو زندگی قرار دیا، پھر موت کے بعد اٹھنے کو زندگی قرار دیا، جیسا کہ فرمایا: ﴿كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَكُنْتُمْ أَفْوَاجًا فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ﴾ [البقرة: ۲۸] ”تم کیسے اللہ کا انکار کرتے ہو، حالانکہ تم بے جان تھے تو اس نے تمہیں زندگی بخشی، پھر تمہیں موت دے گا، پھر تمہیں زندہ کرے گا، پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔“

یہاں فرمایا کہ اللہ نے موت و حیات کو پیدا فرمایا۔ معلوم ہوا کہ موت بھی ایک مخلوق ہے، یہ عدم محض (بالکل نہ ہونے) کا نام نہیں، کیونکہ دنیا میں آنے سے پہلے بھی انسان اللہ کے علم اور اس کی تقدیر میں موجود تھا اور اس کے دنیا میں آنے کا

وقت مقرر تھا مگر روح و جسم کا اتصال نہیں تھا، اسے موت قرار دیا، پھر دنیا میں آنے کے بعد روح جسم سے جدا ہوئی تو اسے بھی موت قرار دیا۔ قیامت کے دن موت ایک مینڈھے کی شکل میں لائی جائے گی۔ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «يُؤْتَى بِالْمَوْتِ كَهَيْئَةِ كَبْشٍ أَمْلَحَ فِينَادِي مُنَادٍ يَا أَهْلَ الْحَنَّةِ! فَيَسْرَبُونَ وَيَنْظُرُونَ فَيَقُولُ هَلْ تَعْرِفُونَ هَذَا؟ فَيَقُولُونَ نَعَمْ، هَذَا الْمَوْتُ، وَكُلُّهُمْ قَدْ رَأَاهُ، ثُمَّ يُنَادِي يَا أَهْلَ النَّارِ! فَيَسْرَبُونَ وَيَنْظُرُونَ، فَيَقُولُ هَلْ تَعْرِفُونَ هَذَا؟ فَيَقُولُونَ نَعَمْ هَذَا الْمَوْتُ، وَكُلُّهُمْ قَدْ رَأَاهُ، فَيَذْبَحُ ثُمَّ يَقُولُ يَا أَهْلَ الْحَنَّةِ! خُلُودٌ فَلَا مَوْتَ، وَ يَا أَهْلَ النَّارِ! خُلُودٌ فَلَا مَوْتَ، ثُمَّ قَرَأَ: ﴿وَأَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ إِذْ قُضِيَ الْأَمْرُ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ﴾ وَهَؤُلَاءِ فِي غَفْلَةِ أَهْلِ الدُّنْيَا ﴿وَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ﴾» [بخاری، التفسیر، باب قوله عز وجل: ﴿وَأَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ﴾: ۴۷۳۰] ”موت کو ایک چستکبرے مینڈھے کی شکل میں لایا جائے گا، پھر ایک اعلان کرنے والا اعلان کرے گا: ”اے اہل جنت!“ وہ گردن اٹھا کر دیکھیں گے تو وہ کہے گا: ”اسے پہچانتے ہو؟“ وہ کہیں گے: ”ہاں! یہ موت ہے۔“ وہ سب اسے دیکھ چکے ہوں گے، پھر وہ اعلان کرے گا: ”اے اہل نار!“ وہ گردن اٹھا کر دیکھیں گے تو وہ کہے گا: ”اسے پہچانتے ہو؟“ وہ کہیں گے: ”ہاں! یہ موت ہے۔“ وہ سب اسے دیکھ چکے ہوں گے۔ تو اسے ذبح کر دیا جائے گا، پھر کہے گا: ”اے اہل جنت! (اب تمہارے لیے) ہمیشہ زندہ رہنا ہے، موت نہیں اور اے اہل نار! (تمہارے لیے بھی) ہمیشہ زندہ رہنا ہے، موت نہیں۔“ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿وَأَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ إِذْ قُضِيَ الْأَمْرُ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ﴾ (اور انہیں پچھتاوے کے دن سے ڈرا جب ہر کام کا فیصلہ کر دیا جائے گا اور وہ سراسر غفلت میں ہیں) یعنی یہ دنیا والے سراسر غفلت میں ہیں ”اور وہ ایمان نہیں لارہے۔“

① زندگی اور موت دونوں اس امتحان کے لیے پیدا کی گئی ہیں کہ انسانوں میں سے اچھے عمل کون کرتا ہے؟ اگر موت اور موت کے بعد والی زندگی نہ ہوتی تو آدمی اچھے اعمال کے لیے جدوجہد اور برے اعمال سے پرہیز کیوں کرتا؟ اور موت اور حیات بعد الموت نہ ہوتی تو اچھے اور برے اعمال کا بدلا کہاں ملتا اور اگر دنیا میں انسان کو زندگی نہ ملتی اور نہ عمل کا موقع ملتا تو جزا و سزا کس چیز پر ہوتی؟

② وَهُوَ الْعَزِيزُ الْعَقُورُ: وہ عزیز ہے، ایسا زبردست ہے کہ اعمال کی جزا و سزا پر پورا اختیار رکھتا ہے اور ایسا غالب کہ کوئی اس پر غالب نہیں، مگر اتنی قوت و عزت کے باوجود ظالم یا سخت گیر نہیں بلکہ مغفور ہے اور ایسا مغفور کہ کوئی توبہ کرے تو جتنے بھی گناہ کیے ہوں بخش دیتا ہے۔ توبہ کے بغیر بھی اگر اس کے ساتھ شرک نہ کیا ہو تو جسے چاہے گا بخش دے گا، فرمایا: ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ﴾ [النساء: ۱۱۶] ”بے شک اللہ اس بات کو نہیں بخشنے گا کہ اس کا شریک بنایا جائے اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے جسے چاہے گا بخش دے گا۔“ اور شرک اس لیے معاف نہیں کرے گا کہ یہ اس کے عزیز ہونے کے خلاف ہے۔

الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ طِبَاقًا ۚ مَا تَرَىٰ فِي خَلْقِ الرَّحْمَنِ مِن تَفَوُّتٍ ۚ فَارْجِعِ
الْبَصَرَ ۗ هَلْ تَرَىٰ مِن فُطُورٍ ﴿۳﴾ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنقَلِبْ إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا
وَهُوَ حَسِيبٌ ﴿۴﴾

وہ جس نے سات آسمان اوپر نیچے پیدا فرمائے۔ رحمان کے پیدا کیے ہوئے میں تو کوئی کمی بیشی نہیں دیکھے گا۔ پس
نگاہ کو لوٹا، کیا تجھے کسی طرح کی کوئی کٹی پھٹی جگہیں نظر آتی ہیں؟ ﴿۳﴾ پھر بار بار نگاہ لوٹا، نظر ناکام ہو کر تیری طرف
پلٹ آئے گی اور وہ تھکی ہوئی ہوگی ﴿۴﴾

بیت 3 : ﴿۱﴾ الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ طِبَاقًا: ”طِبَاقًا“ یعنی تہ بہ تہ اوپر نیچے بنایا، یہ باب مفاد کا مصدر ہے۔ حدیث
معراج سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر آسمان ایک دوسرے سے جدا ہے، چنانچہ ہر آسمان میں رسول اللہ ﷺ کی ملاقات کسی نہ کسی
رسول سے ہوئی۔ [دیکھیے بخاری، الصلاة، باب کیف فرضت الصلاة في الإسراء: ۳۴۹]

﴿۲﴾ مَا تَرَىٰ فِي خَلْقِ الرَّحْمَنِ مِن تَفَوُّتٍ: رحمان کے (آسمانوں کو) پیدا کرنے میں تم کوئی تفاوت نہیں دیکھو گے۔ جب
تم آسمانوں جیسی عظیم الشان مخلوق میں کوئی تفاوت نہیں نکال سکتے تو دوسری مخلوق جو اس سے کہیں چھوٹی ہے، اس میں تم کس
طرح تفاوت نکال سکو گے؟ ”تَفَوُّتٍ“ کا معنی ہے کہ تم اتنے بڑے آسمان یا کسی بھی مخلوق کی کوئی چیز دوسری چیز سے بے جوڑ یا
بے ترتیب نہیں پاؤ گے، بلکہ سب میں ایک توازن و ترتیب اور یکسانی پاؤ گے، جس سے معلوم ہوگا کہ یہ ایک ہی خالق کی پیدا
کی ہوئی ہیں۔ ”مِن تَفَوُّتٍ“ کا ایک مطلب یہ ہے کہ تم کسی چیز میں کوئی عیب یا کمی نہیں پاؤ گے کہ کہہ سکو کہ اگر اس طرح
ہوتا تو بہتر تھا۔ (قاموس) ”خَلْقِ الرَّحْمَنِ“ کے لفظ سے توجہ دلائی کہ اتنے عظیم الشان آسمان اور دوسری ساری مخلوق اللہ تعالیٰ
کی صفت رحمان کا نتیجہ ہے۔

﴿۳﴾ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۗ هَلْ تَرَىٰ مِن فُطُورٍ: ”فُطُورٍ“ ”فَطَرَ“ کی جمع ہے، جیسے ”فَلَسَ“ کی جمع ”فُلُوسٌ“ ہے، پھٹی
ہوئی جگہ، دراڑ، شکاف۔ یعنی پہلی دفعہ اگر تمہیں رحمان کے پیدا کیے ہوئے آسمان میں کوئی عیب یا کمی بیشی نظر نہیں آئی تو
دوبارہ نظر دوڑا کر دیکھ لو، کیا کوئی دراڑیں یا کٹی پھٹی ہوئی جگہیں نظر آتی ہیں؟ مطلب یہ کہ پوری کائنات میں ذروں سے لے
کر آسمانوں تک اور ستاروں سے لے کر بڑی بڑی کہکشاؤں تک ہر چیز مستحکم اور مربوط ہے، جتنا چاہو تلاش کر لو تمہیں ایک
رخنہ بھی نہیں ملے گا۔

بیت 4 : ﴿۴﴾ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنقَلِبْ إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا: ”كَرَّتَيْنِ“ کا لفظی معنی دو مرتبہ ہے، مگر یہاں مراد صرف دو مرتبہ
نہیں بلکہ یہ ہے کہ (دوبارہ غور کرنے سے بھی کوئی خلل نہ ملے تو) بار بار دیکھ! جیسا کہ ”لَبَيْكَ“ کا لفظ تثنیہ ہے مگر اس کا معنی
یہ نہیں کہ ”میں دو دفعہ حاضر ہوں“ بلکہ یہ ہے کہ ”میں بار بار حاضر ہوں۔“ ”خَاسِئًا“ کسی چیز کو طلب کرنے والا جو اس سے

وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَجَعَلْنَهَا رُجُومًا لِلشَّيْطَانِ وَاعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيرِ ﴿۵﴾ وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ﴿۶﴾ إِذَا أَلْقَا فِيهَا

سَبَعُوا لَهَا شَهِيقًا وَهِيَ تَفُورُ ﴿۷﴾

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے قریب کے آسمان کو چراغوں کے ساتھ زینت بخشی اور ہم نے انہیں شیطانوں کو مارنے کے آلے بنایا اور ہم نے ان کے لیے بھڑکتی ہوئی آگ کا عذاب تیار کر رکھا ہے ﴿۵﴾ اور خاص ان لوگوں کے لیے جنہوں نے اپنے رب کا انکار کیا، جہنم کا عذاب ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے ﴿۶﴾ جب وہ اس میں ڈالے جائیں گے، اس کے لیے گدھے کے زور سے چیخے جیسی آوازیں گے اور وہ جوش مار رہی ہوگی ﴿۷﴾

دور ہٹا دیا جائے۔ ”حَسِيرٌ“ جو تھک کر عاجز رہ جائے۔ بار بار دیکھنے کا حکم ان کی بے بسی واضح کرنے کے لیے ہے۔

آیت 5 وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ..... : ”الدُّنْيَا“ ”ذَنَّا يَذُنُو“ میں سے ”أَذُنِي“ کی مؤنث ہے، سب سے قریب۔ اگرچہ سات آسمانوں میں سے ہر آسمان خالق کی کارگیری کا عظیم الشان نمونہ ہے، مگر زمین کے سب سے قریب آسمان کی زینت و حفاظت کا جو اہتمام ہم نے کیا ہے وہ تو کچھ کچھ تمہیں بھی نظر آ رہا ہے، اس کے لیے تو کسی خاص آلے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں ستاروں کے تین فائدے بیان فرمائے ہیں، پہلا فائدہ زینت ہے، رات کو چھوٹے بڑے لاتعداد ستاروں کے ساتھ آسمان جس قدر مڑتین ہوتا ہے اور حسین و جمیل نظر آتا ہے اگر ستارے نہ ہوتے تو اتنا ہی بد صورت دکھائی دیتا اور بے زیب ہوتا۔ دوسرا فائدہ روشنی ہے جو ”مَصَابِيحُ“ (چراغوں) کے لفظ سے معلوم ہو رہا ہے۔ اگر یہ چراغ نہ ہوتے تو ہر رات انتہائی تاریک ہوتی۔ تیسرا فائدہ یہ ہے کہ ان ستاروں کے ذریعے سے ان شیطانوں کو مار بھگایا جاتا ہے جو فرشتوں کی باتیں سن کر کاہنوں تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں، تاکہ وہ لوگوں کو غیب دانی کے دعویٰ سے گمراہ کر سکیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ صافات (۱۰ تا ۶) کی تفسیر۔ چوتھا فائدہ دوسری جگہ بیان فرمایا: ﴿وَالنَّجْمُ هُمْ يَهْتَدُونَ﴾ | النحل: ۱۶ [”اور ستاروں کے ساتھ وہ راستہ معلوم کرتے ہیں۔“ یعنی ستارے بحر و بر میں راستہ اور سمت معلوم کرنے کے کام آتے ہیں۔ ان کے علاوہ ستاروں میں سعادت یا نحوست سمجھنا یا انہیں کسی اختیار کا مالک سمجھنا شرک ہے۔

آیت 5 وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ..... : پہلی پانچ آیات میں اللہ تعالیٰ نے توحید اور قیامت کے دلائل بیان فرمائے ہیں، اب ان لوگوں کا انجام ذکر ہو رہا ہے جنہوں نے اکیلے اللہ کو اپنا رب نہیں مانا کہ ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے۔ ”الَّذِينَ كَفَرُوا“ خبر پہلے آنے کی وجہ سے ترجمہ ”خاص ان لوگوں کے لیے“ کیا گیا ہے۔

آیت 7 إِذَا أَلْقَا فِيهَا سَبَعُوا لَهَا شَهِيقًا وَهِيَ تَفُورُ: ”شہیق“ گدھے کے ہینکے کے آخری آواز اور ”زَفِيرٌ“ شروع کی آواز۔ (قاموس) سورہ فرقان (۱۲) میں فرمایا کہ جہنم جب انہیں دور سے دیکھے گی تو وہ جہنم کے سخت غصے کی اور گدھے کی

سَكَادَ تَمَيِّزٌ مِنَ الْغَيْظِ ۖ كُلَّمَا أُلْقِيَ فِيهَا فَوْجٌ سَأَلَهُمْ خَزَنَتُهَا أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَذِيرٌ ۗ قَالُوا بَلَىٰ قَدْ جَاءَنَا نَذِيرٌ ۗ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللَّهُ مِنْ شَيْءٍ ۗ إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا فِي ضَلَالٍ

كَبِيرٍ ۗ ۝۹ وَقَالُوا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ ۝۱۰

قریب ہوگی کہ غصے سے پھٹ جائے۔ جب بھی کوئی گروہ اس میں ڈالا جائے گا، اس کے نگران ان سے پوچھیں گے کیا تمہارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا؟ ۹ وہ کہیں گے کیوں نہیں؟ یقیناً ہمارے پاس ڈرانے والا آیا تو ہم نے جھٹلا دیا اور ہم نے کہا اللہ نے کوئی چیز نہیں اتاری، تم تو ایک بڑی گمراہی میں ہی پڑے ہوئے ہو ۱۰ اور وہ کہیں گے اگر ہم سنتے ہوتے یا سمجھتے ہوتے تو بھڑکتی ہوئی آگ والوں میں نہ ہوتے ۱۰

طرح چلانے کی آوازیں سنیں گے۔ ساتھ ہی جنہیوں کے چیخنے چلانے کی جو آوازیں آرہی ہوں گی وہ بھی گدھے کی آوازوں جیسی ہوں گی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿قَالَمَا الَّذِينَ شَقُوا فَعَى النَّارِ لَقَدْ فِيهَا زَفِيرٌ وَشَهِيْقٌ﴾ [ہود: ۱۰۶] ”تو وہ لوگ جو بد بخت ہوئے سو وہ آگ میں ہوں گے، ان کے لیے گدھے کی طرح آواز کھینچنا اور نکالنا ہے۔“

آیت 9 8 سَكَادَ تَمَيِّزٌ مِنَ الْغَيْظِ: ”تَمَيِّزٌ“ اصل میں ”تَمَيِّزٌ“ (تفعل) ہے، ایک تاء تخفیف کے لیے حذف کر دی گئی۔ ”قریب ہے کہ غصے سے پھٹ جائے“ اس سے آگ کا صاحب شعور ہونا اور کفار پر سخت غصے ہونا ظاہر ہو رہا ہے۔ جہنم کے اس وقت کے سخت غصے اور جوش و خروش کا نقشہ اس سے بہتر الفاظ میں نہیں کھینچا جاسکتا۔ جہنم میں جب بھی کسی نئے گروہ کے لوگ پھینکے جائیں گے تو جہنم کے نگران فرشتے ان سے پوچھیں گے، کیا تمہارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا؟ یہ سوال ہر گروہ سے ہوگا اور اس لیے نہیں ہوگا کہ فرشتوں کو معلوم نہیں کہ ان کے پاس ڈرانے والے آئے تھے یا نہیں، بلکہ ایک تو تعجب کے اظہار کے لیے ہوگا کہ اللہ کی طرف سے پیغمبروں اور دین کی دعوت دینے والوں کے ڈرانے کے باوجود تم ایمان نہ لائے اور جان بوجھ کر جہنم کا ایندھن بنے، دوسرا ان پر حجت تمام کرنے کے لیے اور خود ان کے منہ سے نکلوانے کے لیے کہ انہیں نہ تو بے خبری میں جہنم میں پھینکا جا رہا ہے اور نہ بلا جرم، بلکہ وہ فی الواقع اس کے حق دار ہیں۔ چنانچہ وہ خود کہیں گے، کیوں نہیں، ہمارے پاس ڈرانے والے آئے اور انہوں نے اللہ کی اتاری ہوئی پوری تعلیم بھی ہم تک پہنچائی، مگر ہم نے انہیں جھٹلا دیا اور اس بات سے برے سے انکار کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز نازل کی ہے، بلکہ انہیں کو بڑی گمراہی میں مبتلا قرار دیا۔

آیت 10 ۱۰ وَقَالُوا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ: اب وہ حسرت و افسوس سے کہیں گے کہ ہم جس گمراہی میں مبتلا رہے، اس سے نکلنے کی دو ہی صورتیں تھیں، پہلی یہ کہ ہم رسولوں اور اہل ایمان کی باتیں سن لیا کرتے تو ایمان کی نعمت مل جاتی، دوسری یہ کہ خود کچھ عقل سے کام لیا کرتے تو توحید و رسالت اور آخرت کے عقائد تک آسانی سے پہنچ سکتے تھے۔ دونوں صورتوں میں آج جنہیوں میں شامل نہ ہوتے، مگر ہم اپنی مرضی اور آباؤ اجداد کے طریقے کے خلاف کوئی بات نہ سنا کرتے تھے اور نہ سمجھنے کی

فَاعْتَرَفُوا بِذَنبِهِمْ ۖ فَسُحِقًا لِأَصْحَابِ السَّعِيرِ ۝۱۱ إِنَّ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ ۝۱۲ وَأَسْرُوا قَوْلَكُمْ أَوِ اجْهَرُوا بِهِ ۗ إِنَّكُمْ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝۱۳

بِسْ وَہ اپنے گناہ کا اقرار کریں گے، سو دوری ہے بھڑکتی ہوئی آگ والوں کے لیے ۱۱ یقیناً جو لوگ اپنے رب سے بغیر دیکھے ڈرتے ہیں، ان کے لیے بڑی بخشش اور بڑا اجر ہے ۱۲ اور تم اپنی بات کو چھپاؤ، یا اسے بلند آواز سے کرو (برابر ہے)، یقیناً وہ سینوں والی بات کو خوب جاننے والا ہے ۱۳

کوشش کیا کرتے تھے۔ واضح رہے کہ رسولوں کی بات دلیل سمعی ہے اور اسے سمجھنا دلیل عقلی ہے، جبکہ اپنی مرضی پر چلانا یا آبا و اجداد کی تقلید نہ دلیل سمعی ہے اور نہ دلیل عقلی، بلکہ دلیل ہے ہی نہیں۔

آیت 11 فَاعْتَرَفُوا بِذَنبِهِمْ : وہ اپنے گناہ کا اقرار کریں گے، یہ نہیں فرمایا کہ وہ اپنے گناہوں کا اقرار کریں گے، کیونکہ ان کو جہنم میں لے جانے والا اصل گناہ ایک ہی تھا، یعنی رسولوں کو جان بوجھ کر جھٹلانا دینا، مگر ایسے اقرار کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا، بلکہ جانتے بوجھتے جہنمی بننے والوں کو یہی کہا جائے گا کہ جہنمی اللہ کی رحمت سے دور ہو جائیں۔ ”سُحِقًا“ ”سَجِقًا“ (س، ک) کا مصدر ہے، دور ہونا اور ”سَجِقًا“ بعید۔

آیت 12 إِنَّ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ : پچھلی آیات میں جہنمیوں کا ذکر تھا جو نہ اپنے رب سے ڈرتے تھے نہ انھیں قیامت کا یا اپنی بد اعمالیوں کی سزا کا خوف تھا، کیونکہ نہ وہ ان دیکھی چیزوں پر ایمان لانے پر تیار تھے اور نہ ان سے ڈرنے پر۔ ان کے مقابلے میں اب ان لوگوں کا ذکر ہے جو عقل سلیم کے تقاضے اور اللہ تعالیٰ کے رسولوں اور برگزیدہ بندوں کے بتانے سے دیکھے بغیر اللہ تعالیٰ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کے رسولوں اور یوم آخرت پر ایمان لائے اور دیکھے بغیر اپنے رب سے ڈرتے رہے۔ ان سے اگر کوئی غلطی ہو بھی گئی تو ان کے بن دیکھے ڈرتے رہنے کے صلے میں اللہ تعالیٰ انھیں معاف فرما دے گا اور اسی خشیت بالغیب کی وجہ سے انھوں نے جو نیکیاں کیں ان کا انھیں بہت بڑا اجر عطا فرمائے گا۔ خشیت کا معنی شدت خوف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر نیکی کی اصل ایمان بالغیب اور خشیت بالغیب ہے اور گناہ سے بچنے کا اصل باعث بھی یہی ہے۔

آیت 13 وَأَسْرُوا قَوْلَكُمْ أَوِ اجْهَرُوا بِهِ : شروع سورت سے اللہ تعالیٰ کی ان قدرتوں کا بیان ہو رہا تھا جو مخلوق کی استطاعت سے باہر ہیں، درمیان کی سات آیات میں ان سے کفر کرنے والوں اور ان پر ایمان رکھنے والوں کا انجام ذکر فرمایا، اب دوبارہ اللہ کی قدرتوں کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ فرمایا تم اپنی بات چھپا کر کرو یا بلند آواز سے کرو اللہ تعالیٰ سب جانتا ہے، بلکہ وہ اس سے بڑھ کر دلوں کے ارادے اور نیتیں جو زبان پر آ کر قول بننے کی منزل تک نہیں پہنچیں، انھیں بھی جانتا ہے۔ مخلوق بے چاری نہ چھپی بات کو جانتی ہے اور نہ ایک وقت میں بہت سے لوگوں کی اونچی آواز سے کی ہوئی باتوں کو جان سکتی ہے،

﴿الَّا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ۗ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ ﴿۱۴﴾ هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ ذَلُولًا فَاقْشُرُوا فِي مَنَاطِبِهَا وَكُلُوا مِنْ رِزْقِهِ ۗ وَإِلَيْهِ النُّشُورُ ﴿۱۵﴾ ءَأَمِنْتُمْ مَن فِي السَّمَاءِ أَن يَخْسِفَ بِكُمْ

کیا وہ نہیں جانتا جس نے پیدا کیا ہے اور وہی تو ہے جو نہایت باریک بین ہے، کامل خبر رکھنے والا ہے ﴿۱۴﴾ وہی ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو تابع بنا دیا، سو اس کے کندھوں پر چلو اور اس کے دیے ہوئے میں سے کھاؤ اور اسی کی طرف (دوبارہ) اٹھ کر جانا ہے ﴿۱۵﴾ کیا تم اس سے بے خوف ہو گئے ہو جو آسمان میں ہے کہ وہ تمہیں زمین میں

دلوں کی بات جاننے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مزید دیکھیے سورہ اعلیٰ (۷۷) کی تفسیر۔

آیت 14 ﴿الَّا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ.....﴾ : یہ ”عَلِيمٌ“ ہونے کی دلیل ہے کہ جو دل کا خالق اور دل میں چھپی ہوئی چیزوں کا خالق ہے، زبان کا اور اس سے ادا ہونے والے اقوال کا خالق ہے، کیا وہ اپنے ہی پیدا کیے ہوئے اسرار و اقوال نہیں جانے گا؟ ”اللَّطِيفُ“ کے مفہوم میں باریک سے باریک چیز جاننے کے ساتھ ساتھ نہایت مہربان ہونا بھی شامل ہے۔ اس میں ان لوگوں کا بھی رد ہے جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کلمات کو جانتا ہے جزئیات کو نہیں جانتا۔

آیت 15 ﴿هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ ذَلُولًا.....﴾ : ”ذَلُولًا“ جو تمہارے تابع ہو جائے، سرکشی نہ کرے۔ یہاں زمین کو اس چوپائے کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو پوری طرح انسان کے تابع ہوتا ہے، خواہ اس پر سواری کرے یا بل میں جوت لے۔ یعنی تم اس پر چل پھر سکتے ہو اور اسے کام میں لا سکتے ہو۔ اللہ تعالیٰ نے زمین میں پیناز گاڑ کر اسے ہر وقت زلزلے کی حالت میں رہنے سے محفوظ کر دیا، تاکہ تم سکون سے رہ سکو۔ اسے لوہے کی طرح سخت نہیں بنایا، ورنہ نہ اس سے کچھ اگتا، نہ عمارتیں بنتیں، نہ نہریں یا کنویں کھودے جا سکتے اور نہ انسان اور جانوروں کے رزق کا انتظام ہوتا اور اسے ضرورت سے زیادہ نرم بھی نہیں بنایا، ورنہ سب کچھ اس کے اندر حضن جاتا۔ مشرک اقوام کی کم عقلی دیکھیے کہ اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو انسان کے تابع کیا، انھوں نے اسے دھرتی ماتا کے نام سے اپنا معبود بنا لیا۔ ”مَنَاكِبُ“ کا لفظی معنی کندھے ہے۔ جس طرح بالکل مطیع جانور پیٹھ کے علاوہ کندھوں پر بھی سواری کر لینے دیتا ہے، زمین بھی تمہارے لیے ایسے ہی مسخر ہے، اس پر جہاں چاہو چلو پھرو۔

﴿وَكُلُوا مِنْ رِزْقِهِ.....﴾ : اس کے دیے ہوئے میں سے کھاؤ، مگر آزادی سے نہیں بلکہ یہ سمجھتے ہوئے کہ اس کا دیا ہوا کھا رہے ہو اور آخر کار تمہیں اپنے رب کے سامنے حاضر ہونا ہے جو تم سے ایک ایک چیز کا حساب لے گا کہ اسے کن ذرائع سے حاصل کیا اور کہاں خرچ کیا؟ (اشرف الموحاشی)

آیت 16 ﴿ءَأَمِنْتُمْ مَن فِي السَّمَاءِ أَن يَخْسِفَ بِكُمْ الْأَرْضَ.....﴾ : ”تَنْوُرٌ“ حرکت کرنے لگے، یعنی زبردست زلزلے سے لرزے لگے۔ (دیکھیے طور: ۹) پچھلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے انعامات کا ذکر فرمایا تھا اور اس آیت میں اپنی شانِ تہارت کا اظہار کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ زمین اگرچہ تمہارے تابع کر دی گئی ہے کہ تم جیسے چاہو اس میں تصرف کر سکو،

الْأَرْضُ فَإِذَا هِيَ تَمُورُ ﴿١٦﴾

وہنسا دے، تو اچانک وہ حرکت کرنے لگے؟ ﴿١٦﴾

لیکن یاد رکھو کہ یہ اسی آسمان والے کی ملکیت ہے، وہ چاہے تو تمہیں اس کے اندر دھنسا دے (جس طرح قارون کو دھنسا دیا۔ دیکھیے قصص: ٨١) اور چاہے تو بھونچال سے لرزنے لگے۔ لہذا اس پر سرکش و خود مختار ہو کر نہیں بلکہ فرماں برداروں کی طرح ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرو۔ (اشرف الموحاشی) اس آیت کا اور اس کے بعد والی آیت کا مفہوم سورۃ انعام (٦٥) اور سورۃ کہف (٦٨، ٦٩) میں بیان ہوا ہے۔

﴿١٦﴾ **ءَاۤءَانْتُمْۢ مَنۢ فِي السَّمَآءِ : السَّمَآءِ** ”سَمُو“ سے مشتق ہے، جس کا معنی بلندی ہے۔ ہر وہ چیز جو اوپر ہو اسے ”سَمَاءُ“ کہہ لیتے ہیں۔ ان دونوں آیات سے صاف ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اوپر کی طرف ہے۔ قرآن مجید نے کئی مقامات پر رحمان کا عرش پر ہونا بیان فرمایا ہے۔ معاویہ بن حکم سلمیؓ نے رسول اللہ ﷺ سے اپنی لونڈی کے متعلق پوچھا کہ کیا میں اسے آزاد کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: «الْبُنْتِي بَهَا» ”اسے میرے پاس لاؤ۔“ میں اسے آپ کے پاس لے کر آیا تو آپ نے اس سے پوچھا: «أَيُّنَ اللّٰهُ؟» ”اللہ کہاں ہے؟“ اس نے کہا: «فِي السَّمَآءِ» ”آسمان میں۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: «مَنْ أَنَا؟» ”میں کون ہوں؟“ اس نے کہا: «أَنْتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ» ”آپ اللہ کے رسول ہیں۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: «أَعْبَدُهَا فَإِنِّهَا مُؤْمِنَةٌ» [مسلم، المساجد، باب تحريم الكلام في الصلاة : ٥٣٧] ”اسے آزاد کر دو، یہ مومنہ ہے۔“ تمام سلف صالحین کا یہی عقیدہ ہے، بعد کے لوگ جو یونانی فلسفے سے متاثر ہو گئے انہوں نے اللہ تعالیٰ کی صفت علو (اوپر ہونے کی صفت) کا انکار کر دیا، کسی نے کہا وہ لامکان ہے، کسی نے کہا وہ ہر جگہ ہے اور قرآن و حدیث کی صاف نصوص کی تاویل کی۔ بعض لوگ تو یہاں تک پہنچ گئے کہ اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ سوال ہی کفر ہے کہ اللہ تعالیٰ کہاں ہے؟ انہوں نے یہ خیال نہ کیا کہ یہ سوال تو خود رسول اللہ ﷺ نے کیا ہے اور اس کے جواب میں بھی اللہ تعالیٰ کے آسمانوں پر ہونے کے عقیدے کو آپ نے ایمان قرار دیا ہے، (دیکھیے مسلم: ٥٣٧) تو کیا نعوذ باللہ یہ فتویٰ رسول اللہ ﷺ پر بھی لگایا جائے گا؟

قرآن مجید ”ءَاۤءَانْتُمْۢ مَنۢ فِي السَّمَآءِ“ میں اللہ تعالیٰ کا آسمان پر ہونا فرما رہا ہے اور یہ بات انسان کی فطرت میں رکھ دی گئی ہے کہ وہ دعا کرتا ہے تو آسمان کی طرف نگاہ اٹھاتا ہے، مگر فلسفے کے مارے ہوئے یہ حضرات کبھی کہتے ہیں کہ اس کا مطلب تو پھر یہ ہوا کہ وہ آسمانوں پر بیٹھا ہوا ہے، کبھی کہتے ہیں کہ پھر کیا وہ آسمان میں رہتا ہے؟ اس طرح تو وہ آسمان کا محتاج ہوا جبکہ آسمان و زمین خود اس نے پیدا کیے ہیں۔ حالانکہ سلف صالحین کے عقیدہ کے مطابق وہ لفظ اللہ تعالیٰ کے متعلق استعمال کرنا جائز نہیں جو اس نے خود اپنے متعلق استعمال نہ کیا ہو۔ اب یہ کس نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کھڑا ہے یا بیٹھا ہے؟ قرآن و حدیث سے اللہ تعالیٰ کا بلندی کی جانب ہونا اور عرش پر ہونا ثابت ہے، اس کی کیفیت کسی کو معلوم نہیں اور وہ عرش کا یا بلندی کا محتاج نہیں بلکہ اس کے عرش پر ہونے کے باوجود عرش خود اس کا محتاج ہے اور اس نے عرش اور آسمان و

أَمْرًا مِّنْ فِي السَّمَاءِ أَنْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ۖ فَسَتَعْلَمُونَ كَيْفَ نَذِيرٍ ﴿۱۷﴾ وَ لَقَدْ كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ ﴿۱۸﴾ أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى الظَّيْرِ فَوَقَّعْمُ صَفَّتٍ وَ يَفْبِضْنَ ۗ مَا يُسْكِنُ إِلَّا الرَّحْمَنُ ۗ إِنَّهُ يُخْلِ شَيْءٌ بِصِيدٍ ﴿۱۹﴾

یا تم اس سے بے خوف ہو گئے ہو جو آسمان میں ہے کہ وہ تم پر پتھر ادا والی آندھی بھیج دے، پھر عنقریب تم جان لو گے کہ میرا ڈرانا کیسا ہے؟ ﴿۱۷﴾ اور بلاشبہ یقیناً ان لوگوں نے (بھی) جھٹلایا جو ان سے پہلے تھے، پھر کس طرح تمہارا سزا دینا؟ ﴿۱۸﴾ اور کیا انہوں نے اپنے اوپر پرندوں کو اس حال میں نہیں دیکھا کہ وہ پڑ پھیلائے ہوئے ہوتے ہیں اور کبھی ٹکیز لیتے ہیں۔ رحمان کے سوا انہیں کوئی تھام نہیں رہا ہوتا۔ یقیناً وہ ہر چیز کو خوب دیکھنے والا ہے ﴿۱۹﴾

زمین کو تھام رکھا ہے۔ مخلوق میں کئی چیزیں ہیں جو اوپر ہیں، مگر ان کے نیچے کی چیزیں اپنے قیام میں ان کی محتاج ہیں، اللہ تعالیٰ کی مثال تو اس سے بہت بلند ہے۔ مومن جب بھی اللہ تعالیٰ کا تصور کرتا ہے یا اس سے دعا کرتا ہے، تو اسے یقین ہوتا ہے کہ اس کا پروردگار آسمانوں کے اوپر عرش پر ہے اور اسے اپنے رب سے تعلق جوڑنے میں کوئی الجھن نہیں ہوتی۔ تادیلوں کی مصیبت میں چھٹے ہوئے لوگ یہ فیصلہ ہی نہیں کر پاتے کہ ان کا رب کہاں ہے جس کی طرف وہ توجہ کریں۔ وہ لامکان کے چکر ہی سے نہیں نکل سکتے۔ اسلام کے فطری اور سادہ عقائد کو چھوڑ کر فلسفی بھول بھلیاں اختیار کرنے کا یہی انجام ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ فجر (۲۲) کی تفسیر۔

آیت ۱۷: ﴿۱۷﴾ أَمْرًا مِّنْ فِي السَّمَاءِ أَنْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ۖ جیسا کہ قوم لوط کے ساتھ ہوا، فرمایا: ﴿۱۷﴾ إِنَّكَ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا إِلَّا آلَ لُوطٍ ۗ نَّجَّيْنَاهُمْ بِسَحَرٍ ﴿۱۸﴾ [الفرع: ۳۴] ”بے شک ہم نے ان پر پتھر برسائے والی ایک ہوا بھیجی، سوائے لوط کے گھر والوں کے، انہیں صبح سے کچھ پہلے بچا کر نکال لیا۔“

﴿۱۸﴾ ”نذیر“ مصدر ہے، اصل میں ”نذیر“ تھا، میرا ڈرانا۔ یا حذف کردی اور راء پر کسرہ باقی رہنے دیا، ورنہ اس پر رفع ہونا تھا۔

آیت ۱۸: ﴿۱۸﴾ وَ لَقَدْ كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ : تاریخ سے عبرت حاصل کرنے کے لیے پہلے لوگوں کا حال دیکھ لو۔ عرب میں عاد و ثمود، فرعون و قارون اور قوم لوط و شعیب کے واقعات معروف تھے۔

آیت ۱۹: ﴿۱۹﴾ ﴿۱﴾ أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى الظَّيْرِ فَوَقَّعْمُ صَفَّتٍ : اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ایک اور قدرت بیان فرمائی کہ عام مشاہدے میں مادی چیزیں جو وزن رکھتی ہیں وہ نیچے کی طرف میلان رکھتی ہیں، مگر پرندے وزن رکھنے کے باوجود فضا میں اڑتے پھرتے ہیں۔ اڑتے وقت اکثر وہ پڑ پھیلائے ہوئے ہوتے ہیں، کبھی ٹکیز بھی لیتے ہیں، انہیں تھانے والا اس رحمان (بے حد مہربان) کے علاوہ کوئی نہیں۔ ”صَفَّتٍ“ اسم فاعل ہے جو دوام پر دلالت کرتا ہے اور ”يَفْبِضْنَ“ فعل مضارع

أَمَّنْ هَذَا الَّذِي هُوَ جُنْدٌ لَكُمْ يَنْصُرُكُمْ مِنْ دُونِ الرَّحْمَنِ ۗ إِنَّ الْكُفْرَانَ إِلَّا فِي
عُرُورٍ ۗ أَمَّنْ هَذَا الَّذِي يَزُوقُكُمْ إِنْ أَمْسَكَ رِيقَهُ ۗ بَلْ لَجُّوا فِي عُتُوٍّ وَنُفُورٍ ﴿۲۱﴾

یا کون ہے وہ جو تمہارا لشکر ہو، تمہاری مدد کرے، رحمان کے مقابلے میں؟ کافر دھوکے کے سوا کسی کھاتے میں نہیں
ہیں ﴿۲۱﴾ یا وہ کون ہے جو تمہیں رزق دے، اگر وہ اپنا رزق روک لے؟ بلکہ وہ سرکشی اور بدکنے پر اڑے ہوئے ہیں ﴿۲۱﴾

ہے جو تجھ پر دلالت کرتا ہے۔ فضا کی بلندی میں اڑنے والے پرندے اکثر پر پھیلانے ہوئے اڑ رہے ہوتے ہیں،
کبھی پر مار بھی لیتے ہیں۔

﴿۲﴾ إِنَّهُ يَكْنُ سَمِيحٌ بَصِيرٌ: یقیناً وہ ہر چیز کو خوب دیکھنے والا ہے۔ فضا میں اڑتے ہوئے پرندوں کو وہی تھامے ہوئے ہے،
ہوا میں مُعلق زمین کو گرنے سے بچانے والا وہی ہے اور آسمانوں کو ستونوں کے بغیر ان کی جگہ قائم رکھنے والا بھی وہی ہے۔ غرض
اس کائنات کی ہر چیز کی مسلسل نگرانی اور دیکھ بھال وہی کر رہا ہے اور وہی اسے تھامے ہوئے ہے، اگر وہ ایک لمحہ کے لیے توجہ
ہٹالے تو سب کچھ فنا ہو جائے، جیسا کہ فرمایا: ﴿إِنَّ اللَّهَ يُنْسِكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ أَنْ تَزُولَا ۗ وَلَئِن زَالَتَا إِنْ أَمْسَكَهُمَا
مِنْ أَحَدٍ مِّنْ بَعْدِهِ ۗ إِنَّهُ كَانَ حَلِيمًا غَفُورًا﴾ [فاطر: ۴۱] ”بے شک اللہ ہی آسمانوں کو اور زمین کو تھامے رکھتا ہے،
اس سے کہ وہ اپنی جگہ سے ہٹیں اور اگر فی الواقع وہ ہٹ جائیں تو اس کے بعد کوئی نہیں جو انہیں تھام لے گا، بے شک وہ ہمیشہ
سے نہایت بردبار، بے حد بخشنے والا ہے۔“

آیت 20 أَمَّنْ هَذَا الَّذِي هُوَ جُنْدٌ لَكُمْ: بھلا یہ تو بتاؤ کہ اگر اتنی قدرتوں والا رحمان تمہیں پکڑنے پر آجائے تو
وہ کون ہے جو تمہارا لشکر بن کر اس کے مقابلے میں تمہاری مدد کر سکے؟ کوئی نہیں، بالکل نہیں۔ کافر لوگ جن کے دلوں میں یہ
بات بیٹھی ہوئی ہے کہ فلاں ہستی اور فلاں مشکل کُشا اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں ان کی مدد کریں گے اور زبردستی سفارش کر کے
چھڑا لیں گے، محض دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں، جس میں انہیں شیطان نے بتلا کر رکھا ہے۔ ”مِنْ دُونِ الرَّحْمَنِ“ کا ایک
معنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ رحمان کے علاوہ وہ کون ہے جو کسی مصیبت میں لشکر بن کر تمہاری مدد کر سکے؟

آیت 21 أَمَّنْ هَذَا الَّذِي يَزُوقُكُمْ إِنْ أَمْسَكَ رِيقَهُ: یعنی اگر اللہ تعالیٰ بارش ہی روک لے تو وہ کون ہے جو
بارش برسا دے؟ یا زمین کو پیداوار سے روک دے یا کسی بھی طریقے سے تمہاری روزی روک دے تو وہ کون ہے جو تمہیں
روزی مہیا کر دے؟ صحیح بخاری میں عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب قریش مکہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں
نافرمانی کی حد کر دی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر یوسف علیہ السلام جیسی قحط سالی کی بددعا فرمائی تو ان پر ایسا قحط آیا کہ وہ ہڈیاں تک کھا
گئے۔ خلاصہ یہ ہے کہ وہ قحط اس وقت دور ہوا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائی۔ [دیکھیے
بخاری، التفسیر، باب: ﴿يَغْشَى النَّاسَ هَذَا عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾: ۴۸۲۱] لات و منات کے بت بلکہ ابراہیم اور اسماعیل علیہم السلام کے جو

أَقْنَنَ يَنْشِي مِكْبًا عَلَى وَجْهِهِ أَهْدَى أَمَّنْ يَنْشِي سَوِيًّا عَلَى صِرَاطٍ قُسْتَقِيمٍ ﴿۲۲﴾ قُلْ
هُوَ الَّذِي أَنْشَأَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ ﴿۲۳﴾

تو کیا وہ شخص جو اپنے منہ کے بل الٹا ہو کر چلتا ہے زیادہ ہدایت والا ہے، یا وہ جو سیدھا ہو کر درست راستے پر چلتا ہے؟ ﴿۲۲﴾ کہہ دے وہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا اور تمہارے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنائے، تم کم ہی شکر کرتے ہو ﴿۲۳﴾

بت انھوں نے بنائے ہوئے تھے، ان کے کسی کام نہ آسکے۔

آیت 22 ﴿أَقْنَنَ يَنْشِي مِكْبًا عَلَى وَجْهِهِ.....﴾: ”مِكْبًا“ ”أَقْنَنَ يَنْشِي“ (ان) متعدی ہے، جس کا معنی کسی کو اوندھا کرنا۔ مزید یہ ہونے کے باوجود یہ باب لازم ہے، اس کا مجرد ”كَبَّ يَكْبُ كَبًّا“ (ن) متعدی ہے، جس کا معنی کسی کو اوندھا کرنا ہے۔ ”أَهْدَى“ ”هَدَى يَهْدِي هِدَايَةً“ (ض) سے اسم تفضیل ہے جو عموماً اسم فاعل کے معنی میں آتا ہے، مگر کبھی کبھی اسم مفعول کے معنی میں بھی آجاتا ہے اور یہاں یہ اسم مفعول کے معنی میں ہے، اس لیے اس کا معنی زیادہ ہدایت دینے والا نہیں بلکہ زیادہ ہدایت یافتہ ہے۔ یہ موجد مومن اور مشرک کافر کی مثال ہے۔ کافر سیدھے راستے پر چلنے کے بجائے گراہی کے گڑھوں میں پڑ جانے کی وجہ سے منہ کے بل گرتا پڑتا چلا جا رہا ہوتا ہے۔ ایسا شخص منزل مقصود پر کیسے پہنچ سکتا ہے؟ اس کے برعکس مومن توحید و سنت کے صراطِ مستقیم پر سیدھا ہو کر چل رہا ہوتا ہے، اسے دائیں بائیں اور سامنے ہر طرف سے اپنا راستہ اور اس کا گرد و پیش نظر آ رہا ہوتا ہے۔ وہ یقیناً اپنی منزل مقصود تک پہنچ جائے گا جو جنت ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ کافروں کے متعلق فرمایا: ﴿وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ عُنُقًا وَزَكَاةً مَّاؤُهُمْ جَهَنَّمَ﴾ [بنی اسرائیل: ۹۷] ”اور قیامت کے دن ہم انھیں ان کے چہروں پر اندھے اور گونگے اور بہرے اٹھائیں گے، ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔“ اور حقیقت یہ ہے کہ آخرت میں ان کے اوندھے منہ اٹھائے جانے کا سبب یہی ہے کہ دنیا میں بھی وہ لٹے ہی چلتے تھے، سیدھے ہو کر راہِ راست پر چلنا انھیں گوارا نہ تھا۔

آیت 23 ﴿قُلْ هُوَ الَّذِي أَنْشَأَكُمْ.....﴾: اللہ تعالیٰ ہی نے تمہیں پیدا فرمایا اور تمہیں کان، آنکھیں اور دل عطا فرمائے۔ اب پیدا کرنے کا شکر تو یہ تھا کہ صرف اسی کی عبادت کرتے اور کان، آنکھیں اور دل عطا فرمانے کا شکر یہ تھا کہ انھیں وہیں استعمال کرتے جہاں یہ نعمتیں دینے والے کی رضا تھی اور ان کے ذریعے سے اس کی خوشنودی کا راستہ تلاش کرتے، مگر تم نے نہ کانوں سے حق بات سنی، نہ آنکھوں سے اللہ کی قدرتیں دیکھ کر عبرت پکڑی اور نہ دل سے اس کی توحید سمجھنے کی کوشش کی۔ بے شمار نعمتوں میں سے یہ تین نعمتیں اس لیے ذکر فرمائیں کہ یہ تینوں علم کے ذرائع ہیں، انھی کے ذریعے سے آدمی حق تک پہنچ سکتا ہے۔ اس آیت میں خطاب کفار سے ہے اور ”قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ“ (تم کم ہی شکر کرتے ہو) سے مراد یہ ہے کہ تم بالکل

قُلْ هُوَ الَّذِي ذَرَأَكُمْ فِي الْأَرْضِ وَإِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿٣٣﴾ وَ يَقُولُونَ مَتَى هَذَا الْوَعْدُ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿٣٤﴾ قُلْ إِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللَّهِ وَإِنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُبِينٌ ﴿٣٥﴾ فَلَمَّا سَأَوْهُ زُلْفَةً سَيِّئَتْ وُجُوهُ الَّذِينَ كَفَرُوا وَقِيلَ هَذَا الَّذِي كُنْتُمْ بِهِ تَدَّعُونَ ﴿٣٦﴾ قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ

کہہ دے وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں پھیلا یا اور تم اسی کی طرف اکٹھے کیے جاؤ گے ﴿٣٣﴾ اور وہ کہتے ہیں یہ وعدہ کب (پورا) ہوگا، اگر تم سچے ہو؟ ﴿٣٤﴾ کہہ دے یہ علم تو اللہ ہی کے پاس ہے اور میں تو بس ایک کھلا ڈرانے والا ہوں ﴿٣٥﴾ پس جب وہ اس کو قریب دیکھیں گے تو ان لوگوں کے چہرے بگڑ جائیں گے جنہوں نے انکار کیا اور کہا جائے گا یہی ہے وہ جو تم مانگا کرتے تھے ﴿٣٦﴾ کہہ دے کیا تم نے دیکھا اگر اللہ مجھے اور ان کو جو میرے ساتھ ہیں ہلاک کر دے، یا شکر ادا نہیں کرتے۔

آیت 24 ﴿ قُلْ هُوَ الَّذِي ذَرَأَكُمْ فِي الْأَرْضِ ﴾: جو تمہیں روئے زمین پر پھیلا سکتا ہے وہ تمہیں دوبارہ اکٹھا بھی کر سکتا ہے اور کرے گا۔

آیت 25 ﴿ وَ يَقُولُونَ مَتَى هَذَا الْوَعْدُ ﴾: ان کا یہ پوچھنا معلوم کرنے کے لیے نہیں تھا، وہ تو یہ ماننے کو تیار ہی نہ تھے کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ مسلمانوں سے ان کا یہ پوچھنا صرف طنز و استہزا کے لیے تھا۔

آیت 26 ﴿ قُلْ إِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللَّهِ ﴾: یعنی قیامت کا علم صرف اللہ کے پاس ہے، میں نہ قیامت لانے کا اختیار رکھتا ہوں اور نہ مجھے اس کے وقت کا علم ہے، میرا کام صرف یہ ہے کہ وقت سے پہلے تمہیں قیامت کے متعلق آگاہ کر دوں اور اس کی ہولناکیوں سے ڈرا دوں، سو یہ کام میں نے کر دیا ہے۔ قیامت کے علاوہ بھی بہت سی چیزیں ہیں جن کا آنا یقینی ہے مگر وقت معلوم نہیں۔ موت ہی کو دیکھ لو، تو کیا اس لیے قیامت یا موت کی تیاری نہ کی جائے کہ بے شک اس نے آنا ہے مگر اس کا وقت معلوم نہیں؟

آیت 27 ﴿ فَلَمَّا سَأَوْهُ زُلْفَةً سَيِّئَتْ ﴾: ”زُلْفَةٌ“ ”زُلْفَ يَزْلِفُ“ (ان) سے اسم مصدر بمعنی اسم فاعل ہے، قریب۔ ”تَدَّعُونَ“ ”دَعَا يَدْعُو“ کے باب افتعال سے فعل مضارع ہے، جس میں تائے افتعال کو وال سے بدل کر وال کو وال میں ادغام کر دیا ہے۔ اب وہ جس قیامت کو مذاق سمجھ رہے ہیں اور جس کا مطالبہ بڑے دھڑلے سے بار بار کر رہے ہیں، جب قریب آتی ہوئی دیکھیں گے تو سب ہنسی مذاق اور شنی شنی بھول جائیں گے، خوف اور دہشت سے ان کے چہرے بگڑ جائیں گے اور کہا جائے گا یہی ہے وہ قیامت جس کا تم مطالبہ کیا کرتے تھے۔

آیت 28 ﴿ قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَهْلَكَنِيَ اللَّهُ ﴾: ”يُجِيدُ“ ”أَجَارَ يُجِيرُ إِجَارَةً“ افعال اجوف واوی۔ کفار مکہ اسلام کے پھیلنے سے پریشان ہو کر رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کے خلاف اپنی تمام کوششوں کا ناکام ہونا دیکھ کر اس

أَهْلَكَنِي اللَّهُ وَفَنَّمَعِي أَوْ رَحِمَنَا ۚ فَمَنْ يُجِزُّ الْكٰفِرِينَ مِنْ عَذَابِ آيَةِ ۱۸
 قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنًا بِهِ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۱۹
 قُلْ اَرٰءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَاؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ ۲۰

ہم پر رحم فرمائے تو کون ہے جو کافروں کو دردناک عذاب سے پناہ دے گا؟ ۱۸) کہہ دے وہی بے حد رحم والا ہے، ہم اس پر ایمان لائے اور ہم نے اسی پر بھروسہ کیا، تو تم عنقریب جان لو گے کہ وہ کون ہے جو کھلی گمراہی میں ہے ۱۹) کہہ دے کیا تم نے دیکھا اگر تمہارا پانی گہرا چلا جائے تو کون ہے جو تمہارے پاس بہتا ہوا پانی لائے گا؟ ۲۰)

امید پر ہی رہے تھے کہ کبھی نہ کبھی زمانے کی گردش ان کا کام تمام کر دے گی۔ (دیکھیے طور: ۳۰) اس پر حکم ہوا کہ ان سے کہو کہ مجھے اور میرے ساتھیوں کو اللہ تعالیٰ ہلاک کر دے یا ہم پر رحم کرے، تو تمہیں اس سے کیا غرض ہے؟ تم اپنی فکر کرو کہ کفر کے نتیجے میں جو عذاب الیم تم پر آنے والا ہے، تمہیں اس سے کون بچائے گا؟

آیت 29 : قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنًا بِهِ ... : یعنی وہ ہمیں ہلاک کرے یا ہم پر رحم کرے، دونوں صورتوں میں ہماری امیدیں اسی سے وابستہ ہیں، وہی رحمان ہے، کوئی اور نہیں جو ہم پر رحم کر سکے۔ ہمارا اس پر ایمان اور اسی پر بھروسہ ہے، تم جو اس کے علاوہ بھی کسی سے رحم کے امیدوار اور طلب گار ہو، بہت جلد آنکھیں بند ہوتے ہی جان لو گے کہ ہم میں سے صریح گمراہ کون تھا۔

آیت 20 : ۱) قُلْ اَرٰءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَاؤُكُمْ غَوْرًا : "غَوْرًا" "غَوْرٌ يُّغُوْرًا" (ن) گہرا چلا جانا۔ مصدر بمعنی اسم فاعل ہے۔ "مَعِيْنٍ" کے لیے دیکھیے سورہ صافات (۴۵)۔

۲) اس آیت سے تعلق رکھنے والا ایک عجیب واقعہ صاحب کشف نے ذکر کیا ہے کہ ایک لُحْد کے پاس یہ آیت پڑھی گئی تو اس نے کہا کہ (اگر وہ پانی گہرا چلا جائے تو) کیا اور نیچے اسے نکال لائیں گے، تو اس کی آنکھوں کا پانی خشک ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی اور اپنی آیات کی گستاخی سے اپنی پناہ میں رکھے۔ (آمین) بچھلی آیات میں فرمایا تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ اپنا رزق روک لے اور بارش نہ برسائے تو کون ہے جو تمہیں بارش عطا فرمائے؟ قحط کے وقت اپنے خداؤں کی بے بسی تم دیکھ ہی چکے ہو۔ اب حکم ہوتا ہے ان سے پوچھو کہ یہی پانی جس پر تمہاری زندگی کا دار و مدار ہے، اگر گہرا ہو جائے اور تمہاری دسترس سے باہر ہو جائے تو کون ہے جو بہتا ہوا پانی تمہارے پاس لے آئے؟ ظاہر ہے کہ اللہ کے علاوہ کسی کے پاس یہ قوت نہیں ہے۔



ن وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ ﴿١﴾

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

ن۔ قسم ہے قلم کی! اور اس کی جو وہ لکھتے ہیں! ﴿١﴾

آیت 1 ﴿١﴾ ”ن“ حروف تہجی میں سے ایک حرف ہے۔ مختلف سورتوں کی ابتدا میں آنے والے ان حروف سے اصل مراد اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے، سب سے قریب بات یہ ہے کہ ان حروف کے ذکر سے تمام دنیا کو چیلنج کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید ان حروف تہجی ہی میں اتارا ہے، اگر تمہیں اس کے منزل من اللہ ہونے میں شک ہے تو حروف تہجی تمہارے بھی علم اور استعمال میں ہیں، تم بھی اس جیسی کوئی سورت بنا کر لے آؤ۔ اس کا قرینہ یہ ہے کہ عموماً یہ حروف جہاں بھی آتے ہیں ان کے بعد قرآن مجید، کتاب یا وحی کا ذکر آیا ہے۔ (واللہ اعلم)

بعض مفسرین نے فرمایا ”ن“ کا معنی مچھلی ہے اور یہاں اس عظیم مچھلی کی قسم کھائی گئی ہے جس کی پشت پر ساتوں زمینیں رکھی ہوئی ہیں، لیکن یہ بات درست نہیں۔ ایک تو اس لیے کہ کسی صحیح حدیث سے ایسی کسی مچھلی کا وجود ہی ثابت نہیں، دوسرا اس لیے کہ بے شک کلام عرب میں ”نون“ کا معنی مچھلی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَذَٰلِ النُّونِ إِذْ ذُكِبَ مُعَاضِبًا﴾ [الانبیاء: ۸۷] ”اور مچھلی والے کو جب وہ غصے میں بھرا ہوا چلا گیا۔“ مگر یہاں یہ لفظ ”ن“ کی شکل میں ہے، ”نون“ کی شکل میں نہیں۔ علاوہ ازیں اگر اس سے مراد مچھلی ہوتی تو اس پر رفع، نصب یا جر کا اعراب ہونا چاہیے تھا اور آخر میں تنوین آنی چاہیے تھی، جب کہ یہاں اس کے آخر میں وقف ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ دوسرے حروف مقطعات مثلاً ”الھم“ کی طرح حرف تہجی ہی ہے۔ بعض نے ”ن“ کا معنی دوات بتایا ہے، مگر یہ لغت میں غیر معروف ہے اور اس پر اعراب اور تنوین نہ ہونے سے بھی اس کی تردید ہوتی ہے۔

2 وَالْقَلَمِ: ”القلم“ سے مراد لوح محفوظ پر لکھنے والا قلم بھی ہو سکتا ہے، جس کے متعلق ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿إِنَّ أَوَّلَ شَيْءٍ خَلَقَهُ اللَّهُ تَعَالَى الْقَلَمَ وَ أَمْرَهُ أَنْ يَكْتُبَ كُلَّ شَيْءٍ يَكُونُ﴾ [سلسلة الأحادیث الصحيحة للالبانی: ۱/ ۲۵۷، ح: ۱۳۳] ”سب سے پہلی چیز جو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمائی وہ قلم ہے اور اسے حکم دیا کہ ہر وہ چیز لکھ دے جو آئندہ ہوگی۔“ یہ حدیث ترمذی (۳۳۱۹)، ابوداؤد (۴۷۰۰) اور مسند احمد (۳۱۷۵) میں بھی عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اور وہ قلم بھی مراد ہو سکتا ہے جس سے لوگ لکھتے ہیں۔ لفظ عام ہے، اس لیے اسے کسی ایک قلم کے ساتھ خاص نہیں کیا جا سکتا۔ ”وَمَا يَسْطُرُونَ“ میں لوح محفوظ میں لکھے ہوئے آسمانی صحیفے، قرآن مجید اور ابتدائے خلق سے لکھی ہوئی تمام کائنات کی تقدیر بھی شامل ہے اور انسان یا فرشتے جو کچھ لکھتے ہیں وہ سب کچھ بھی شامل ہے۔

مَا أَنْتَ بِنِعْمَةٍ رَبِّكَ بِمَجْنُونٍ ﴿۲﴾ وَإِنَّ لَكَ لَأَجْرًا غَيْرَ مَمْنُونٍ ﴿۱﴾ وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ ﴿۳﴾

کہ تو اپنے رب کی نعمت سے ہرگز دیوانہ نہیں ہے ﴿۲﴾ اور بے شک تیرے لیے یقیناً ایسا اجر ہے جو منقطع ہونے والا نہیں ﴿۳﴾ اور بلاشبہ یقیناً تو ایک بڑے خلق پر ہے ﴿۱﴾

آیت 4:2 ﴿۱﴾ مَا أَنْتَ بِنِعْمَةٍ رَبِّكَ بِمَجْنُونٍ : اللہ تعالیٰ نے قلم کی اور اس چیز کی قسم کھائی جو لکھنے والے لکھے

ہیں اور اس کے جواب میں تین باتیں ارشاد فرمائیں، پہلی یہ کہ آپ اللہ کے فضل سے مجنون (دیوانے) نہیں ہیں، دوسری یہ کہ آپ کے لیے ایسا اجر ہے جو منقطع ہونے والا نہیں اور تیسری یہ کہ یقیناً آپ خلق عظیم پر ہیں۔ قسم جواب قسم کی تاکید کے لیے کھائی جاتی ہے اور عام طور پر اس کے لیے شاہد اور دلیل ہوتی ہے، یہاں قسم اور جواب قسم میں مناسبت یہ ہے کہ قلم اور قلم سے لکھنے والوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ کفار کا یہ کہنا غلط ہے کہ آپ دیوانے ہیں۔ تقدیر کے قلم نے لوح محفوظ میں ہزاروں سال پہلے آپ کی قسمت میں جو صدق و امانت، نبوت و رسالت اور دنیا و آخرت میں کامیابی اور عزت و رفعت لکھ دی ہے اور پہلے صحائف میں آپ کے متعلق جو پیش گوئیاں اور فضائل لکھے ہوئے ہیں، کرانا کا تین آپ کے اعمال نامے میں جو کچھ لکھ رہے ہیں اور کسی بھی شخص کے اعمال نامے میں جو کچھ لکھا جا رہا ہے، قرآن مجید میں جو عقائد، احکام، قصص اور گزشتہ و آئندہ کی خبریں لکھی ہوئی ہیں، جن کا ایک شوشہ بھی نہ غلط ثابت ہوا ہے نہ ہوگا اور جس کی مثل چھوٹی سے چھوٹی سورت کوئی شخص پیش کر سکا ہے نہ کر سکے گا۔ آپ ﷺ کے منہ سے نکلنے والے الفاظ، آپ کے افعال و احوال اور آپ کا بعض مواقع پر خاموش رہنا، یہ سب کچھ جو یاد کرنے والوں نے یاد کیا اور لکھنے والوں نے لکھا ہے اور قیامت تک یاد کرتے اور لکھتے چلے جائیں گے، اگر کوئی ان تمام لکھی ہوئی چیزوں پر غور کرے اور اس کے ساتھ ساتھ دنیا بھر کے بڑے بڑے عقل مندوں کی تحریروں کا موازنہ کرے اور سارے جہاں کے دیوانوں، یاود گو شاعروں، گپ بازوں اور افسانہ نویسوں کی لکھی ہوئی فضولیات کا بھی جائزہ لے تو وہ اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ لوح محفوظ میں جس کی قسمت میں اتنی سعادتیں لکھ دی گئی ہیں، جس کی پیش گوئیاں پہلے آسمانی صحائف میں لکھی ہوئی ہیں، جو امی ہونے کے باوجود قرآن مجید عظیم کتاب لے کر آیا ہے، جس کے اقوال و احوال اور افعال و تقریرات میں سے ہر چیز بے حد محبت و عقیدت سے لکھی گئی ہے اور قیامت تک محفوظ ہے اور تمام جہانوں کے لیے ہدایت کی روشنی مینا کرتی ہے، اس کے متعلق کفار کا کہنا "إِنَّكَ لَمَجْنُونٌ" کہ آپ دیوانے ہیں (دیکھیے حجر: ۶) بالکل غلط ہے، آپ اللہ کے فضل سے ہرگز دیوانے نہیں ہیں۔

کفار کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ زمانے کی گردش کے ساتھ آپ کا سلسلہ ختم ہو جائے گا۔ (طور: ۳۰) اور یہ کہ آپ ابتر ہیں (کوثر: ۳) اور یہ کہ آپ کے بعد آپ کا نام لینے والا بھی کوئی نہ ہوگا۔ نہیں، بلکہ یقین رکھو کہ آپ کے لیے وہ اجر ہے جو کبھی

فَسْتَبْصِرُ وَ يُبْصِرُونَ ﴿۵﴾ بِأَيْتِكُمُ الْفُتُونُ ﴿۱﴾

پس جلد ہی تو دیکھ لے گا اور وہ بھی دیکھ لیں گے ﴿۵﴾ کہ تم میں سے کون فتنے میں ڈالا ہوا ہے ﴿۱﴾

منقطع نہیں ہوگا۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کی امت کے اعمال حسنہ بھی آپ کے نامہ اعمال میں لکھے جاتے رہیں گے، کیونکہ وہ آپ کی تعلیم ہی سے کیے گئے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «مَنْ ذَلَّ عَلَىٰ خَيْرٍ فَلَهُ مِثْلُ أُجْرٍ فَاعِلِهِ» [مسلم، الإمامة، باب فضل إمامة الغازي في سبيل الله.....: ۱۸۹۳] «جو کسی نیکی کی طرف رہنمائی کرے تو اسے وہ نیکی کرنے والے کی طرح اجر ملے گا۔» اور کفار کا آپ کے متعلق یہ کہنا بھی غلط ہے کہ آپ شاعر ہیں یا کاہن ہیں یا نعوذ باللہ کذاب یا متکبر ہیں۔ (دیکھیے قمر: ۲۵) نہیں، بلکہ آپ خلق عظیم پر ہیں۔ ان تینوں آیات میں مخاطب اگرچہ رسول اللہ ﷺ ہیں، مگر اصل میں یہ باتیں کفار کو سمجھائی جا رہی ہیں۔

﴿۲﴾ وَ إِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقِي عَظِيمٍ: ”خُلُقِي“ کے لفظی معنی ہیں وہ عادتیں جو پیدائشی طور پر انسان میں پائی جاتی ہیں، یعنی وہ خصلتیں جو طبیعت میں پختہ ہو جائیں اور اس طرح عادت بن جائیں کہ بغیر سوچے سمجھے خود بخود سرزد ہوتی رہیں ”خُلُقِي“ کہلاتی ہیں۔ عام طور پر خلق سے مراد لوگوں سے اچھا برتاؤ کرنا اور انھیں خندہ پیشانی سے ملنا لیا جاتا ہے، اگرچہ خلق کے مفہوم میں یہ بھی شامل ہے مگر یہ خلق کا محدود مفہوم ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ”خُلُقِي عَظِيمٍ“ کی تفسیر دین سے کی ہے۔ (طبری) اور عائشہ رضی اللہ عنہا سے آپ ﷺ کے خلق کے متعلق پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا: «كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ» [مسند أحمد: ۹۱/۶، ح: ۲۴۶۰۱۔ مسلم: ۷۴۶: ۷۴۶] ”آپ کا خلق قرآن تھا۔“

یعنی ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر کے مطابق دین اسلام کی ہر بات پر آپ کا اس طرح عمل تھا جیسے وہ آپ کی طبعی عادت ہو اور بقول عائشہ رضی اللہ عنہا قرآن مجید آپ کا خلق یعنی آپ کی طبیعت بن گیا تھا۔ وہ سب کچھ جو قرآن میں ہے آپ سے بلا تکلف خود بخود عمل میں آتا تھا، جیسے وہ آپ کی طبعی خصلت ہے۔ قرآن میں جو حکم دیا گیا اس پر آپ کا عمل تھا اور جس سے منع کیا گیا اس سے مکمل اجتناب تھا، جو خوبیاں اختیار کرنے کی تلقین کی گئی آپ ان سے پوری طرح آراستہ تھے اور جن صفات کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا ان کے قریب بھی نہیں پھٹکتے تھے۔ الغرض، آپ میں تمام انسانی خوبیاں جمع ہو گئی تھیں، مثلاً شرف نسب، کمال عقل، درستی فہم، کثرت علم، شدت حیا، کثرت عبادت، سخاوت، صدق، شجاعت، صبر، شکر، مروت، دوستی و محبت، میانہ روی، زہد، تواضع، شفقت، عدل، عفو، برداشت، صلہ رحمی، حسن معاشرت، حسن تدبیر، فصاحت لسان، قوت حواس، حسن صورت وغیرہ، جیسا کہ آپ کی زندگی کے حالات و واقعات میں مذکور ہے۔

آیت 6، 5: ﴿۵﴾ فَسْتَبْصِرُ وَ يُبْصِرُونَ : آپ کے خلق عظیم کا تقاضا یہی ہے کہ ان کے مجنون کہنے اور دوسری تکلیف دہ باتوں پر صبر کریں۔ ”جلد ہی“ سے مراد وہ مواقع ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی مختلف طریقوں سے مدد کی، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ آخر کار آپ کے جانی دشمن فوج در فوج آپ پر ایمان لا کر آپ کے جاں نثار دوست بن گئے اور جو مخالف

إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ ۖ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ﴿۷﴾ فَلَا تُطِيعُ
الْمُكْذِبِينَ ﴿۸﴾ وَذُو لَوْ تُذْهِنُ فَيُذْهِتُونَ ﴿۹﴾

یقیناً تیرا رب ہی زیادہ جاننے والا ہے اس کو جو اس کی راہ سے بھٹک گیا اور وہی زیادہ جاننے والا ہے ان کو جو سیدھی راہ پر ہیں ﴿۷﴾ پس تو ان جھٹلانے والوں کا کہنا مت مان ﴿۸﴾ وہ چاہتے ہیں کاش! تو نرمی کرے تو وہ بھی نرمی کریں ﴿۹﴾

رہے وہ بدر واحد اور خندق و فتح مکہ وغیرہ میں مردار ہوئے یا ذلیل و خوار ہوئے اور تمام جزیرہ عرب پر اسلام کی حکومت قائم ہوگئی۔ پھر قیامت تک آپ کی امت کے ہاتھوں ہونے والی فتوحات اور اسلام کی سر بلندی سے بھی واضح ہو گیا کہ پاگل کون تھا؟ اس کے علاوہ ”جلد ہی“ سے مراد قیامت کا دن بھی ہے جب رسول اللہ ﷺ مقام محمود پر تشریف فرما ہوں گے، آپ کے ہاتھ میں ”لِوَاءُ الْخُسُفِ“ (حمہ کا جھنڈا) ہوگا اور جب آپ حوض پر اپنے امتیوں کو پانی پلا رہے ہوں گے اور آپ کو جھٹلانے والے مجرم جنم کی طرف دھکیلے جائیں گے، تب آپ بھی دیکھ لیں گے اور وہ بھی کہ دیوانہ کون ہے؟

آیت 8 **فَلَا تُطِيعُ الْمُكْذِبِينَ** : اس آیت میں اور آئندہ آنے والی آیات میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ جھٹلانے والوں کا کہنا مت مان اور نہ کسی ایسے شخص کا کہنا مان جو بہت قسمیں کھانے والا ذلیل ہے۔ معلوم ہوا یہ کام کرنے والے اللہ تعالیٰ کی نظر میں اتنے برے ہیں کہ وہ کوئی بات بھی کہیں مسلمان کے لیے ان کے کہنے پر چلنا جائز نہیں تو اللہ تعالیٰ کو یہ کس طرح گوارا ہو سکتا ہے کہ مسلمان خود ان جیسے کام کرنے لگیں۔ گویا جب ان صفات والوں کی اطاعت سے منع کیا گیا تو خود یہ صفات اختیار کرنے سے توجہ دینا اولیٰ منع کر دیا۔ ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ کافر جو بات بھی مسلمان سے منوانا چاہتے ہیں، بظاہر وہ کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ ہو، اس کے پیچھے ان کا کوئی نہ کوئی خبیث مقصد ضرور ہوتا ہے، اس لیے ان کا کہنا کسی صورت میں بھی نہیں ماننا چاہیے۔

آیت 9 **وَذُو لَوْ تُذْهِنُ فَيُذْهِتُونَ** : ”تُذْهِنُ“ ”ذْهِنُ“ (تیل) سے مشتق ہے۔ جس طرح چمڑے وغیرہ کو تیل لگا کر نرم کیا جاتا ہے اس طرح بات کو نرم کر دینا۔ یعنی ان کی خواہش ہے کہ آپ اسلام کی تبلیغ میں اپنی سرگرمیاں کم کر دیں تو وہ بھی آپ کو ستانے میں کمی کر دیں، آپ اپنے دین میں کچھ ترمیم کر کے اس میں ان کے شرک اور دوسری گمراہیوں کی کچھ منجائش نکال لیں تو وہ بھی آپ کے ساتھ صلح کر لیں گے۔ آپ خود جو چاہیں کریں، مگر تمام لوگوں کی زندگی کے ہر شعبہ مثلاً ان کے عقائد، معیشت اور معاشرت و صورت وغیرہ میں اللہ کے حکم کی تنفیذ پر اصرار چھوڑ دیں تو وہ بھی آپ کے نماز روزے کو برداشت کر لیں، جیسا کہ ہیٹ کی طرح آج بھی سیکولر لوگوں کا کہنا ہے کہ دین ذاتی مسئلہ ہے، حکومت میں اس کا کوئی دخل نہیں ہونا چاہیے۔ یاد رہے! جس چیز سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے وہ بات کو نرم کر دینا ہے، لہجہ میں نرمی نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کو آگاہ کیا جا رہا ہے کہ خلقِ عظیم پر ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ کفار کو نرم کرنے کے لیے آپ اپنے موقف اور عقیدے میں نرمی

وَلَا تُطْعَمُ كُلُّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ ﴿۱۰﴾ هَبَّازٍ مَشَّاءٍ بِمِئْمٍ ﴿۱۱﴾ مَنَاعٍ لِلْخَيْرِ مُعْتَدٍ أَيْثِيمٍ ﴿۱۲﴾

اور تو کسی بہت قسمیں کھانے والے ذلیل کا کہنا مت مان ﴿۱۰﴾ جو بہت طعنہ دینے والا، چغلی میں بہت دوڑ دھوپ کرنے والا ہے ﴿۱۱﴾ خیر کو بہت روکنے والا، حد سے بڑھنے والا، سخت گناہ گار ہے ﴿۱۲﴾

کردیں۔ رہی انداز اور لہجے میں نرمی تو وہ آپ کے خلق عظیم کا بھی تقاضا ہے اور اللہ کا حکم بھی۔ گویا آپ کو مدائنت سے منع کیا جا رہا ہے، مدارات سے نہیں۔

آیت ۱۰ ﴿۱۰﴾ وَلَا تُطْعَمُ كُلُّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ: ”حَلَّافٍ“ ”حَلَفَ يَحْلِفُ“ (ض) سے مبالغہ ہے، بہت قسمیں کھانے والا۔ ”مَّهِينٍ“ ”مَهْنٌ يَمُهِنُ مَهَانَةً“ (ک) (حقیر، ذلیل ہونا) سے ”فَعِيلٌ“ کے وزن پر ہے، حقیر، ذلیل۔ یہ دونوں صفتیں ایک دوسرے کو لازم ہیں، زیادہ قسمیں کھانے سے آدمی لوگوں کی نظر میں ذلیل ہو جاتا ہے اور لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل اور بے اعتبار ہونے ہی کی وجہ سے وہ زیادہ قسمیں کھاتا ہے، تاکہ اپنی بات کا یقین دلائے، کیونکہ وہ خود سمجھتا ہے کہ لوگوں کے دل میں نہ اس کی عزت ہے نہ اعتبار۔

﴿۱۰﴾ ان چھ آیات (۱۵ تا ۱۰) میں مذکور بری خصلتوں والے شخص سے بعض مفسرین نے ایک خاص شخص مراد لیا ہے، مگر آیت کے الفاظ عام ہیں: ﴿وَلَا تُطْعَمُ كُلُّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ﴾ کہ ”ایسی خصلتوں والے کسی شخص کا کہنا مت مان“ اس لیے ان خصلتوں والا ہر شخص آیت کا مصداق ہے۔ اس سے پہلی آیات میں مکذبین کی اطاعت سے منع فرمایا تھا، اب انھی جھٹلانے والوں کا ذکر ان خصلتوں کے ساتھ کیا ہے جو دین کو جھٹلانے کی وجہ سے عام طور پر آدمی میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہ سب کفر کی صفات ہیں، آدمی کو کوشش کرنی چاہیے کہ ان میں سے کوئی بھی خصلت اس کے اندر پیدا نہ ہونے پائے۔

آیت ۱۱ ﴿۱۱﴾ هَبَّازٍ مَشَّاءٍ بِمِئْمٍ: ”هَبَّازٍ“ ”هَمَزٌ يَهْمُزُ هَمَزًا“ (ن) سے مبالغے کا صیغہ ہے، بہت طعنہ دینے والا، عیب لگانے والا۔ ”مَشَّاءٍ“ ”مَشَى يَمْشِي مَشْيًا“ (ض) (چلنا) سے مبالغے کا صیغہ ہے، بہت چلنے والا، بہت دوڑ دھوپ کرنے والا۔ ”بِمِئْمٍ“ چغلی، خرابی ڈالنے کی نیت سے کسی کی بات دوسرے شخص تک پہنچانا۔ ان دونوں صفتوں کا خلاصہ دوسروں پر عیب لگانا ہے۔ ”هَبَّازٍ“ وہ جو دوسرے کے منہ پر عیب لگاتا اور طعنہ دیتا ہے۔ ”مَشَّاءٍ بِمِئْمٍ“ وہ جو پیٹھ پیچھے چغلی کرتا ہے۔ یعنی بس چلے تو جرات سے منہ پر طعنہ زنی اور عیب جوئی کرتا ہے اور بس نہ چلے تو پیٹھ پیچھے دوڑ دھوپ جاری رکھتا ہے۔

آیت ۱۲ ﴿۱۲﴾ مَنَاعٍ لِلْخَيْرِ مُعْتَدٍ أَيْثِيمٍ: ظلم کی دو قسمیں ہیں، پہلی قسم کسی کا حق جو آدمی کے ذمے ہو روک لینا، ادا نہ کرنا اور دوسری قسم کسی پر زیادتی کرنا۔ ”مَنَاعٍ لِلْخَيْرِ“ میں پہلی قسم مبالغے کے ساتھ پائی جاتی ہے اور ”مُعْتَدٍ“ میں دوسری۔ ”أَيْثِيمٍ“ کا ذکر اس کے ساتھ اس طرح ہے جس طرح ”وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ“ (اور گناہ اور زیادتی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو) میں ہے۔ (دیکھیے مائدہ: ۲)

عُشْرٍ بَعْدَ ذَلِكَ زَيْنِيمٌ ﴿۱۳﴾ أَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَبَنِينَ ﴿۱۴﴾ إِذَا تُثْلِي عَلَيْهِ أَيْمَانًا قَالَ
 أَسَاطِيرَ الْأَوْلِيَيْنِ ﴿۱۵﴾ سَنَسِبُهُ عَلَى الْغُرْطُومِ ﴿۱۶﴾ إِنْكَابُوا بَلُونًا كَمَا بَلُونَا أَصْحَابَ الْجَنَّةِ إِذْ
 أَقْسَمُوا لَيَصْرِمُنَّهَا لِصَبْحَيْنَ ﴿۱۷﴾

سخت مزاج ہے، اس کے علاوہ بدنام ہے ﴿۱۳﴾ اس لیے کہ وہ مال اور بیٹوں والا رہا ہے ﴿۱۴﴾ جب اس پر ہماری آیات
 پڑھی جاتی ہیں تو کہتا ہے پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں ﴿۱۵﴾ جلد ہی ہم اسے تھوٹھی پر داغ لگائیں گے ﴿۱۶﴾ یقیناً ہم نے
 انہیں آزمایا ہے، جیسے ہم نے باغ والوں کو آزمایا، جب انہوں نے قسم کھائی کہ صبح ہوتے ہوتے اس کا پھل
 ضرور ہی توڑ لیں گے ﴿۱۷﴾

آیت 13 : عُشْرٍ بَعْدَ ذَلِكَ زَيْنِيمٌ : ”عُشْرٍ“ (عُشْرٌ يَعْتُلُ) (ن، ض) سختی سے گھسینا، جیسے فرمایا: ﴿عُدُوهُ فَاعْتَلُوا
 إِلَىٰ سَوَاءِ الْجَحِيمِ﴾ [الذحان: ۸] ”اسے پکڑو، پھر سختی سے کھینچتے ہوئے اسے بھڑکتی آگ کے درمیان تک لے جاؤ۔“
 ”عُشْرٍ“ موٹے جسم، موٹے داغ اور سخت مزاج والا۔ ”زَيْنِيمٌ“ کے دو معنی ہیں، ایک یہ کہ جو کسی قوم سے نہ ہو مگر اس میں سے
 ہونے کا دعویٰ کرے اور دوسرا معنی نسیم، جو کینگی اور شرارت میں مشہور ہو۔ ”بدنام“ کے لفظ میں دونوں مفہوم ادا ہو رہے ہیں۔

آیت 14 : أَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَبَنِينَ : ”أَنْ كَانَ“ سے پہلے لام محذوف ہے، یعنی ”إِنْ كَانَ“ یہ ”لَا تُطْعَمُ“ کے متعلق
 ہے، یعنی محض اس لیے آپ اس کا کہنا نہ مانیں کہ وہ مال اور بیٹوں والا ہے۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ وہ ہماری آیات کو پہلے لوگوں
 کی کہانیاں کہہ کر محض اس لیے جھٹلاتا ہے کہ وہ مال اور بیٹوں والا ہے، اگر ہم اسے مال اور بیٹے عطا نہ کرتے تو ایسا تکبر اور ایسی
 سرکشی اختیار نہ کرتا۔ اس صورت میں یہ بعد والی آیت سے متعلق ہے۔

آیت 16 : سَنَسِبُهُ عَلَى الْغُرْطُومِ : ”الْغُرْطُومِ“ کا لفظ اصل میں درندوں کی ناک (تھوٹھی) یا ہاتھی کی سونڈ کے لیے
 استعمال ہوتا ہے۔ ان بد خصلتوں والے انسان کی ناک کو تحقیر و مذمت کے لیے ”غرطوم“ کہا گیا ہے۔ سرکش آدمی چونکہ اپنی
 ناک اونچی رکھنے ہی کے لیے حق سے انکار کرتا ہے، اس لیے قیامت کے دن اسی ناک پر داغ لگایا جائے گا جو اس کی ذلت کا
 نشان ہوگا۔ ”وَسَنَسِبُهُ“ (ض) کا معنی داغ اور نشان لگانا ہے۔

آیت 17 : إِنْكَابُوا بَلُونًا كَمَا بَلُونَا أَصْحَابَ الْجَنَّةِ : اہل مکہ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی بے شمار نعمتوں سے نوازا تھا۔ تمام
 لوگ حج کے لیے ان کے پاس آتے اور اپنی ضروریات کے لیے ان کے گاہک بنتے تھے، وہ جہاں جاتے اہل حرم ہونے کی وجہ
 سے انہیں کوئی کچھ نہ کہتا۔ ہر قسم کا میوہ ان کے شہر پہنچ جاتا، ان کی تجارت خوب چمکی ہوئی تھی اور وہ نہایت مال دار اور مکمل دامن کی
 نعمت سے بہرہ ور تھے۔ ان نعمتوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان پر یہ انعام بھی کیا کہ ان میں اپنا آخری رسول ﷺ مبعوث فرمایا، مگر
 انہوں نے اس نعمت کی قدر نہ کی بلکہ آپ ﷺ کو جھٹلایا، تو اللہ تعالیٰ نے ان پر بھوک اور خوف کا عذاب مسلط کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ

وَلَا يَسْتَفْتُونَ ۱۸

اور وہ کوئی استفتا نہیں کر رہے تھے ۱۸

کے مدینہ چلے جانے کے بعد قریش نے آپ کے ساتھ جنگوں کا سلسلہ شروع کر دیا، جس سے وہ خود بھی غیر محفوظ ہو گئے اور ان کی تجارت بھی برباد ہو گئی۔ رسول اللہ ﷺ کی بددعا سے ان پر قحط مسلط ہو گیا، یہاں تک کہ وہ مردار تک کھا گئے۔ | دیکھیے بخاری: ۴۸۲۱، ۴۸۰۹ | اللہ تعالیٰ نے اہل مکہ کی اس حالت کا ذکر ان آیات میں بھی بیان کیا ہے: ﴿وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ أُمَّةً مُّطْمَئِنِّةً يَأْتِيهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ مَّكَانٍ مَّكَانٍ فَكَفَّرَتْ بِأَنْعَمِ اللَّهِ فَأَذَقَهَا اللَّهُ لِيَاسَ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ ۝ وَلَقَدْ جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوهُ فَأَخَذَهُمُ الْعَذَابُ وَهُمْ ظَالِمُونَ﴾ [النحل: ۱۱۲، ۱۱۳] اور اللہ نے ایک ہستی کی مثال بیان کی جو امن والی، اطمینان والی تھی، اس کے پاس اس کا رزق کھلا ہر جگہ سے آتا تھا، تو اس نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی تو اللہ نے اسے بھوک اور خوف کا لباس پہنا دیا، اس کے بدلے جو وہ کیا کرتے تھے۔ اور بلاشبہ یقیناً ان کے پاس انھی میں سے ایک رسول آیا تو انھوں نے اسے جھٹلا دیا، تو انھیں عذاب نے اس حال میں آچکڑا کہ وہ ظالم تھے۔“

یہاں اہل مکہ کی ناشکری اور اس پر سزا کے لیے بطور مثال ایک باغ والوں کا قصہ بیان کیا اور فرمایا: ﴿إِنَّا بَلَوْنَهُمْ كَمَا بَلَوْنَا أَصْحَابَ الْجَنَّةِ﴾ ”بے شک ہم نے مکہ دین کو نعمت دے کر آزمایا جس طرح باغ والوں کو نعمت دے کر آزمایا تھا۔“ یہ چند بھائی تھے جنھیں اللہ تعالیٰ نے بہت شاندار باغ عطا فرمایا تھا، مگر بجائے اس کے کہ وہ اسے اللہ کی نعمت سمجھ کر اس میں سے اللہ تعالیٰ کا حصہ نکالتے، انھوں نے قسم کھالی کہ صبح ہوتے ہی اس کا پھل توڑ لیں گے، کسی مسکین کو نہ آنے دیں گے اور نہ انھیں کچھ دیں گے، مگر اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان کے جانے سے پہلے ہی آگ لگنے یا کسی اور آسمانی آفت سے باغ برباد ہو گیا۔ صبح گئے تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔

② ”بَلَوْنَهُمْ“ ”بَلَا يَبْلُو“ (ن) آزمانا، مصیبت میں مبتلا کرنا، انعام کرنا۔ ”لِيَصْرِمْنَهَا“ ”صَرِمَ يَصْرِمُ“ (ض) کاٹنا، کٹنا۔ ”صَرِيمٌ“ کٹا ہوا۔ یہ باغ کہاں تھا اور باغ والے کون تھے؟ قرآن نے ذکر نہیں فرمایا، کیونکہ قرآن واقعات کو بطور تاریخ نہیں بلکہ بطور عبرت بیان کرتا ہے اور اس کے لیے نفس واقعہ ہی کافی ہے۔ اس مقام پر سورہ کہف کی آیات (۲۳۲ تا ۲۴۳) بھی دیکھ لیں، وہاں بھی عبرت دلانے کے لیے دو باغ رکھنے والے کی مثال بیان کی گئی ہے۔

آیت 18 وَلَا يَسْتَفْتُونَ: ”الْإِسْتِفْتَاءُ“ کسی چیز کو عام حکم سے علیحدہ کرنا، ان شاء اللہ کہنا۔ آیت کے دو معنی ہیں، ایک یہ کہ انھیں اپنے منصوبے کی کامیابی کا اتنا یقین تھا کہ انھوں نے ان شاء اللہ بھی نہیں کہا اور وہ اللہ کی قدرت و مشیت کو بھی بھول گئے۔ دوسرا یہ کہ انھوں نے سارا پھل اتار لینے کی قسم کھائی۔ عام طور پر پھل چننے وقت کچھ پھل مساکین کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے، لیکن انھوں نے اس کا استفتا بھی نہیں کیا۔

فَطَافَ عَلَيْهَا طَافٌ مِّن رَّبِّكَ وَ هُمْ نَائِبُونَ ﴿۱۹﴾ فَأَصْبَحَتْ كَالضَّرِيمِ ﴿۲۰﴾ فَتَنَادُوا نُصْحِينَ ﴿۲۱﴾ أَنْ ائْتُوا عَلٰى حَرْشِكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَرِيمِينَ ﴿۲۲﴾ فَأَنْطَلَقُوا وَ هُمْ يَتَخَفَتُونَ ﴿۲۳﴾ أَنْ لَا يَدْخُلَهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ مَسْكِينٌ ﴿۲۴﴾ وَ عَدُوا عَلٰى حَزْبٍ فَدِيرِينَ ﴿۲۵﴾ فَلَمَّا رَأَوْهَا قَالُوا إِنَّا لَصَّالُونَ ﴿۲۶﴾ بَلْ نَحْنُ مَحْرُومُونَ ﴿۲۷﴾ قَالَ أَوْسَطُهُمْ أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُونَ ﴿۲۸﴾ قَالُوا سُبْحٰنَ رَبِّنَا إِنَّا كُنَّا ظَالِمِينَ ﴿۲۹﴾

پس اس پر تیرے رب کی طرف سے ایک اچانک عذاب پھر گیا، جب کہ وہ سوئے ہوئے تھے ﴿۱۹﴾ تو صبح کو وہ (باغ) کئی ہوئی بھیتی کی طرح ہو گیا ﴿۲۰﴾ پھر انھوں نے صبح ہوتے ہی ایک دوسرے کو آواز دی ﴿۲۱﴾ کہ صبح صبح اپنے کھیت پر جا پہنچو، اگر تم پھل توڑنے والے ہو ﴿۲۲﴾ چنانچہ وہ چل پڑے اور وہ چپکے چپکے آپس میں باتیں کرتے جاتے تھے ﴿۲۳﴾ کہ آج اس (باغ) میں تمہارے پاس کوئی مسکین ہرگز داخل نہ ہونے پائے ﴿۲۴﴾ اور وہ صبح سویرے پختہ ارادے کے ساتھ اس حال میں نکلے کہ (اپنے خیال میں پھل توڑنے پر) قادر تھے ﴿۲۵﴾ پس جب انھوں نے اسے دیکھا تو انھوں نے کہا بلاشبہ ہم یقیناً راستہ بھولے ہوئے ہیں ﴿۲۶﴾ بلکہ ہم بے نصیب ہیں ﴿۲۷﴾ ان میں سے بہتر نے کہا کیا میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ تم تسبیح کیوں نہیں کرتے ﴿۲۸﴾ انھوں نے کہا ہمارا رب پاک ہے، بلاشبہ ہم ہی ظالم تھے ﴿۲۹﴾

آیت 20-19 فَطَافَ عَلَيْهَا طَافٌ مِّن رَّبِّكَ ... : "طَافٌ" پھر جانے والا، چکر لگانے والا۔ مراد اللہ کی طرف سے اچانک عذاب ہے جس کے ایک ہی چکر سے باغ کا نام و نشان مٹ گیا، یعنی رات باغ کو آگ لگ گئی اور صبح زمین صاف تھی، جس طرح بھیتی کھٹنے کے بعد ہوتی ہے۔

آیت 22-21 فَتَنَادُوا نُصْحِينَ : "عَلٰى حَرْشِكُمْ" اپنے کھیت پر۔ معلوم ہوا کہ باغ کے ساتھ بھیتی بھی تھی۔

آیت 25 وَ عَدُوا عَلٰى حَزْبٍ فَدِيرِينَ : "حَزْبٌ" کا ایک معنی ہے قصد و ارادہ، یعنی وہ پختہ ارادے کے ساتھ نکلے کہ کسی مسکین کو باغ میں گھسنے نہیں دیں گے اور دوسرا معنی ہے شدید غصہ، یعنی وہ مساکین پر سخت غصے کے عالم میں نکلے۔ دونوں صورتوں میں "فَدِيرِينَ" کا معنی ہے "اس حال میں کہ وہ اپنے خیال میں باغ کے پھل پر قادر تھے۔" "حَزْبٌ" کا تیسرا معنی ہے روکنا، یعنی وہ صبح صبح اس حال میں نکلے کہ (اپنے خیال میں) مساکین کو روکنے پر قادر تھے۔

آیت 27-26 فَلَمَّا رَأَوْهَا قَالُوا إِنَّا لَصَّالُونَ : جب باغ نظر نہ آیا تو پہلے تو یہ سمجھے کہ ہم بھول گئے ہیں، پھر جب یقین ہو گیا کہ یہ صاف زمین ہمارا ہی باغ ہے تو کہنے لگے ہماری قسمت پھوٹ گئی۔

آیت 29-28 قَالَ أَوْسَطُهُمْ أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ : "أَوْسَطُهُمْ" کا معنی ان کے درمیان والا بھی ہے اور ان میں سے

فَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ يَتَلَامُؤْنَ ﴿۳۰﴾ قَالُوا يَٰوَيْلَنَا إِنَّا كُنَّا طَٰغِيْنَ ﴿۳۱﴾ عَلَى رَبِّنَا
أَنْ يُبَدِّلَنَا خَيْرًا مِّنْهَا إِنَّا إِلَى رَبِّنَا رَاغِبُونَ ﴿۳۲﴾ كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ۚ وَالْعَذَابُ الْاٰخِرَةُ

اَكْبَرُ مَرَلَوْ كَاٰنُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۳﴾

۲۸

پھر ان کا ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوا، آپس میں ملامت کرتے تھے ﴿۳۰﴾ انھوں نے کہا ہائے ہماری ہلاکت! یقیناً ہم ہی حد سے بڑھے ہوئے تھے ﴿۳۱﴾ امید ہے کہ ہمارا رب ہمیں اس کے بدلے میں اس سے بہتر عطا فرمائے گا۔ یقیناً (اب) ہم اپنے رب ہی کی طرف راغب ہونے والے ہیں ﴿۳۲﴾ اسی طرح (ہوتا) ہے عذاب۔ اور یقیناً آخرت کا عذاب کہیں بڑا ہے، کاش! وہ جانتے ہوتے ﴿۳۳﴾

افضل بھی، جیسے فرمایا: ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا﴾ [البقرة: ۱۴۳] ”اور اسی طرح ہم نے تمہیں سب سے بہتر امت بنایا۔“ تو ان میں سے جو بہتر تھا اس نے انہیں ان کے خبیث ارادے کے وقت نصیحت کی تھی ”لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ“ کہ تم اللہ کی تسبیح کیوں نہیں کرتے اور اس بری نیت سے توبہ کیوں نہیں کرتے؟ مگر انھوں نے اس کی بات نہیں مانی تھی، اب اس نے انہیں وہ بات یاد دلائی۔ ”لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ“ کا معنی بعض نے یہ کیا ہے کہ ”تم ان شاء اللہ کیوں نہیں کہتے؟“ مگر سارا پھل توڑنے کا ارادہ کر کے ”ان شاء اللہ“ پڑھ بھی لیتے تو کچھ فائدہ نہ تھا، اس لیے یہی معنی درست معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کہا تم اپنے رب کو یاد کیوں نہیں کرتے، اس کا ہر عیب سے پاک ہونا خصوصاً اس قسم کے نخل سے اور مسکینوں کو محروم کرنے کے ارادے سے پاک ہونا کیوں یاد نہیں کرتے کہ تم بھی اس نخل اور کینگی سے بچ جاؤ۔ اس معنی کے درست ہونے کا ایک قرینہ یہ ہے کہ جب ان کے بھائی نے انہیں اپنی بات یاد دلائی تو انھوں نے ”سُبْحٰنَ رَبِّنَا“ کہہ کر اس وقت ”سبحان اللہ“ نہ کہنے کی تلائی کی کوشش کی۔

آیت 30، 32: فَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ : ”يَتَلَامُؤْنَ“ ”لَا مَ يَلُوْمُ“ سے باب تفاعل ہے جس کے معنی میں تشارک ہوتا ہے، ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے۔ ”طَٰغِيْنَ“ ”طَغَى يَطْغَى“ (ف) سے اسم فاعل کی جمع ہے۔ اب ان میں سے ہر ایک نے دوسرے کو ملامت شروع کر دی، کوئی کسی کو قصور وار ٹھہراتا تو کوئی کسی کو، پھر خود ہی کہنے لگے کہ ہائے ہماری بربادی! ہم ہی حد سے بڑھ گئے تھے کہ اللہ کے مال کو اپنا مال سمجھ بیٹھے اور حق دار کو محروم کرنے کے منصوبے بنانے لگے۔ اب ہم توبہ کرتے ہیں، اپنے رب کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اپنے رب سے امید رکھتے ہیں کہ وہ ہمیں اس کے بدلے میں اس سے بہتر عطا فرمائے گا۔

آیت 33: كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ۚ وَالْعَذَابُ الْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ : اہل مکہ کو یاد دلایا جا رہا ہے کہ نعمت کی ناشکری پر عذاب اس طرح ہوتا ہے جس طرح باغ والوں پر آیا اور آخرت کا عذاب تو اس سے کہیں بڑا ہے، کیونکہ دنیا کے عذاب کے بعد تو

إِنَّ لِلْمُتَّقِينَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّاتٍ النَّعِيمِ ﴿۳۷﴾ أَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِينَ كَالْمُجْرِمِينَ ﴿۳۸﴾ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ﴿۳۹﴾ أَمْ لَكُمْ كِتَابٌ فِيهِ تَدْرُسُونَ ﴿۴۰﴾ إِنَّ لَكُمْ فِيهِ لَمَا تَخَيَّرُونَ ﴿۴۱﴾

بلاشبہ ڈرنے والوں کے لیے ان کے رب کے ہاں نعمت والے باغات ہیں ﴿۳۷﴾ تو کیا ہم فرماں برداروں کو جرم کرنے والوں کی طرح کر دیں گے؟ ﴿۳۸﴾ کیا ہے تمہیں، تم کیسے فیصلے کرتے ہو؟ ﴿۳۹﴾ یا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے، جس میں تم (یہ) پڑھتے ہو ﴿۴۰﴾ کہ تمہارے لیے آخرت میں یقیناً وہی ہوگا جو تم پسند کرو گے ﴿۴۱﴾

توبہ و استغفار کی گنجائش ہے، جیسا کہ اس باغ والوں نے توبہ کر لی اور توبہ کے بعد عذاب سے ہونے والے نقصان کی تلافی کی بھی امید ہے، جیسا کہ باغ والوں نے بہتر باغ ملنے کی امید رکھی، مگر آخرت کے عذاب کے بعد ان میں سے کسی چیز کی گنجائش نہیں۔

آیت 34 : إِنَّ لِلْمُتَّقِينَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّاتٍ النَّعِيمِ: پچھلی آیات میں بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے نہ ڈرنے کی پاداش میں کس طرح باغ والوں کا باغ برباد ہوا اور آخرت کا عذاب تو اس سے بھی بڑا ہے۔ دنیا کے باغ کے بعد آخرت کے باغات کا ذکر کیا اور فرمایا کہ رب تعالیٰ سے ڈرنے والوں کے لیے ان کے رب کے پاس ایک نہیں بلکہ نعمت والے کئی باغ ہیں۔

آیت 35 : أَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِينَ : مشرکین کہا کرتے تھے کہ اول تو مرنے کے بعد زندگی کی بات ہی غلط ہے، اگر یہ سچ ہے اور مرنے کے بعد عذاب یا ثواب ہونا ہے تو ہم یہاں مسلمانوں کی بہ نسبت خوش حال ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کے ہم پر راضی ہونے کی دلیل ہے، آخرت میں بھی وہ نعمتیں اور باغات ہمیں کوملیں گے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کی اس بات کی تردید کی اور فرمایا کہ اللہ کے ہاں اندھیر نہیں کہ حکم ماننے والوں سے اور مجرموں سے ایک جیسا سلوک کیا جائے۔

آیت 37 : ﴿۱﴾ أَمْ لَكُمْ كِتَابٌ فِيهِ تَدْرُسُونَ : کفار جو کہتے تھے کہ ہمیں آخرت میں بھی جنت و نعمت ملے گی، اس بات کی تردید ایک اور طرح سے ہے، فرمایا تمہیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟ اگر کہو کہ تمہیں خود اللہ تعالیٰ نے بتائی ہے تو بتاؤ تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی کون سی کتاب ہے جس میں تم نے پڑھا ہے کہ آخرت میں تمہیں تمہاری پسند ہی کی چیزیں ملیں گی؟ صحاف ظاہر ہے کہ نہ تمہارے پاس ایسی کوئی کتاب ہے اور نہ تمہارا یہ گمان کچھ حقیقت رکھتا ہے۔

﴿۲﴾ ”تَخَيَّرُونَ“ باب تفاعل میں سے ”تَخَيَّرُونَ“ ہے، ایک تاء حذف کر دی ہے۔ ”إِنَّ لَكُمْ فِيهِ لَمَا تَخَيَّرُونَ“ جملہ بن کر ”تَدْرُسُونَ“ کا مفعول بہ ہے۔ ”إِنَّ“ کا ہمزہ مفتوح ہونا چاہیے تھا، لیکن ”تَخَيَّرُونَ“ پر لام آنے کی وجہ سے کمزور ہو گیا۔ ترجمہ یہ ہوگا ”کیا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے جس میں تم یہ بات پڑھتے ہو کہ تمہارے لیے آخرت میں وہی ہوگا جو تم پسند کرو گے؟“

أَمْرٌ لَكُمْ آيَاتُنَا عَلَيْنَا بِاللَّغَةِ ۖ إِنَّ لَكُمْ لِمَا تَحْكُمُونَ ﴿۳۹﴾ سَلَامُهُمْ
 أَيُّهُمْ بِذَلِكَ زَعِيمٌ ﴿۴۰﴾ أَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ ۖ فَلْيَأْتُوا بِشُرَكَائِهِمْ إِنْ كَانُوا صَادِقِينَ ﴿۴۱﴾ يَوْمَ
 يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَيُدْعَوْنَ إِلَى السُّجُودِ فَلَا يَسْتَطِيعُونَ ﴿۴۲﴾

یا تمہارے پاس ہمارے ذمے کوئی حلیہ عہد ہیں، جو قیامت کے دن تک جا بچنے والے ہیں کہ تمہارے لیے یقیناً
 وہی ہوگا جو تم فیصلہ کرو گے ﴿۳۹﴾ ان سے پوچھ ان میں سے کون اس کا ضامن ہے؟ ﴿۴۰﴾ یا ان کے کوئی شریک ہیں؟ تو
 وہ اپنے شریک لے آئیں، اگر وہ سچے ہیں ﴿۴۱﴾ جس دن پنڈلی کھولی جائے گی اور وہ سجدے کی طرف بلائے جائیں
 گے تو وہ طاقت نہیں رکھیں گے ﴿۴۲﴾

آیت 39 : أَمْرٌ لَكُمْ آيَاتُنَا بِاللَّغَةِ : "آيَاتُنَا" "يَمِينٌ" کی جمع ہے، قسم، حلیہ عہد۔ فرمایا، یا پھر تمہارے
 پاس ہمارے کوئی حلیہ عہد ہوں جو قیامت تک کے لیے ہوں کہ تمہیں وہی ملے گا جو تم فیصلہ کرو گے۔ ظاہر ہے ہمارا عہد اگر
 ہے بھی تو ان سے ہے جو ایمان اور عمل صالح سے متصف ہیں، مجرموں اور ظالموں سے تو ہمارا کوئی عہد ہے ہی نہیں، جیسا کہ
 فرمایا: ﴿لَا يَتَأَلَّ عَهْدِي الظَّالِمِينَ﴾ [البقرة: ۱۲۴] "میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچتا۔"

آیت 40 : سَلَامُهُمْ أَيُّهُمْ بِذَلِكَ زَعِيمٌ : ان سے پوچھیے! ان میں سے کون اس کا ذمہ لیتا ہے کہ آخرت میں انہیں وہی
 ملے گا جو وہ کہیں گے۔

آیت 41 : أَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ : یا اگر یہ خود ضمانت نہیں دے سکتے تو کیا ان کے پاس ایسی ہستیاں ہیں جو اللہ کے شریک
 ہوں اور انہیں آخرت میں اللہ تعالیٰ کے عذاب سے زبردستی چھڑوا کر جنت دلوانے کا ذمہ دے سکیں؟ اگر سچے ہیں تو وہ شریک
 سامنے لائیں۔

آیت 42 : ① يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ : "يَوْمَ" یا تو پچھلی آیت "فَلْيَأْتُوا بِشُرَكَائِهِمْ" کے متعلق ہے، یعنی
 دنیا میں تو ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے جھوٹے شریک گنوا دیں جو ان کی رہائی کے ذمہ دار بننے کا دعویٰ کریں، مگر اس
 کا کوئی فائدہ نہیں۔ اگر سچے ہیں تو اس دن اپنے شریک سامنے لائیں جس دن پنڈلی سے پردہ ہٹایا جائے گا اور لوگوں کو سجدے
 کے لیے بلایا جائے گا تو یہ لوگ سجدہ نہیں کر سکیں گے۔ یا یہ "إِنَّ لِلْمُتَّقِينَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَدَّتِ النَّعِيمُ" کے متعلق ہے،
 یعنی متقین کو نعمت والی جنتیں اس دن ملیں گی جب پنڈلی سے پردہ ہٹایا جائے گا۔

② "يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ" کا ایک معنی تو وہ ہے جو ان لفظوں کا سادہ ترجمہ ہے اور خود بخود ظاہر ہو رہا ہے اور ایک وہ
 ہے جو ان لفظوں کے سادہ ترجمہ سے ہٹ کر کیا گیا ہے اور جو لغت عرب کا ایک محاورہ ہے۔ وہ معنی جو لفظوں کا سادہ ترجمہ ہے
 کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

اور خود بخود ظاہر ہو رہا ہے یہ ہے کہ ”جس دن پنڈلی کھول جائے گی۔“ یعنی اللہ تعالیٰ اپنی پنڈلی ظاہر فرمائے گا اور لوگوں کو سجدے کے لیے بلایا جائے گا۔ خود رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کا یہی مطلب بیان فرمایا ہے اور صحیح سند کے ساتھ آپ سے یہی مروی ہے، چنانچہ صحیح بخاری میں ابو سعید خدری رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «يَكْشِفُ رَبُّنَا عَنْ سَاقِهِ فَيَسْجُدُ لَهُ كُلُّ مُؤْمِنٍ وَ مُؤْمِنَةٍ وَ يَبْقَى مِنْ كَنَانٍ يَسْجُدُ فِي الدُّنْيَا رَبَّاءَ وَ سَمْعَةَ فَيَدْعُبُ لِيَسْجُدَ فَيَعُوذُ ظَهْرُهُ طَبَقًا وَاجِدًا» | بخاری، التفسیر، باب: ﴿يَوْمَ يَكْشِفُ عَنْ سَاقٍ﴾: [۴۹۱۹] ”ہمارا رب اپنی پنڈلی کھولے گا تو ہر مومن مرد اور مومن عورت اس کو سجدہ کریں گے اور وہ شخص باقی رہ جائے گا جو دنیا میں دکھانے اور سنانے کے لیے سجدہ کرتا تھا، وہ سجدہ کرنے لگے گا تو اس کی پیٹھ ایک طبق ہو جائے گی (یعنی دوہری نہیں ہو سکے گی)۔“ اس حدیث میں صاف الفاظ موجود ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی پنڈلی کھولے گا، بلکہ صحیح بخاری میں ایک اور مقام پر ہے کہ ہر قوم جس کسی کی پرستش کرتی تھی اس کے پیچھے چلی جائے گی، صلیب والے صلیب کے پیچھے، بتوں والے بتوں کے پیچھے اور دوسرے معبودوں والے اپنے اپنے معبودوں کے پیچھے چلے جائیں گے، صرف وہ لوگ رہ جائیں گے جو صرف اللہ کی عبادت کرتے تھے، خواہ نیک ہوں یا بد وہ اللہ تعالیٰ کا انتظار کر رہے ہوں گے، اللہ ان سے پوچھے گا: «هَلْ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُ آيَةٌ تَعْرِفُونَهُ؟ فَيَقُولُونَ السَّاقِ فَيَكْشِفُ عَنْ سَاقِهِ فَيَسْجُدُ لَهُ» | بخاری، التوحید، باب قول اللہ تعالیٰ: ﴿يَوْمَ يَكْشِفُ عَنْ سَاقٍ﴾: [۷۴۳۹] ”کیا تمہارے اور تمہارے رب کے درمیان کوئی نشانی ہے جسے تم پہچانتے ہو؟“ وہ کہیں گے: ”پنڈلی ہے۔“ تو اللہ تعالیٰ اپنی پنڈلی کھولے گا اور ہر مومن اسے سجدہ کرے گا۔“ اس سے معلوم ہوا کہ پنڈلی کھولنے سے مراد یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی پنڈلی کھولے گا اور یہ اللہ تعالیٰ کے درمیان اور اہل ایمان کے درمیان طے شدہ نشانی ہوگی اور اس نشانی کو دیکھ کر اہل ایمان رب تعالیٰ کے سامنے سجدے میں گر جائیں گے۔ یہ حدیث صحیح بخاری کے علاوہ حدیث کی دوسری بہت سی کتابوں میں بھی موجود ہے۔ اتنی اعلیٰ درجے کی صحیح سند کے ساتھ خود رسول اللہ ﷺ سے آیت کی تفسیر آنے کے بعد کسی اور تفسیر کی نہ ضرورت رہتی ہے اور نہ گنجائش، مگر چونکہ بہت سے مفسرین نے اس آیت کی ایک اور تفسیر کی ہے اس لیے وہ بھی ذکر کی جاتی ہے۔

ان مفسرین کا کہنا یہ ہے کہ ”کشف ساق“ لغت عرب کا ایک محاورہ ہے، جو شدت سے کنایہ ہے، یعنی ”يَوْمَ يَكْشِفُ عَنْ سَاقٍ“ کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کا دن بہت سخت ہوگا، کیونکہ جب کوئی سختی یا مشکل پیش آتی ہے تو آدمی پنڈلی سے کپڑا اٹھ کر کمر کس لیتا ہے۔ یہ تفسیر ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے اور بعض تابعین جیسے مجاہد، عکرمہ اور ابراہیم نخعی رضی اللہ عنہم وغیرہ سے بھی آئی ہے۔ یہ تفسیر اگرچہ درست ہے اور لغت عرب میں یہ محاورہ استعمال بھی ہوتا ہے، مگر پہلی تفسیر (یعنی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اپنی پنڈلی کھولے گا) میں قرآن کے صریح الفاظ کو ملحوظ رکھا گیا ہے اور یہ تفسیر اس ذات گرامی نے کی ہے جس پر قرآن نازل ہوا تھا، اس لیے یہی مقدم ہے۔ البتہ دونوں تفسیروں میں کوئی تضاد نہیں، اس دن اللہ تعالیٰ کی پنڈلی بھی ظاہر ہوگی اور اس دن کی شدت میں بھی کوئی شبہ نہیں۔ خود ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اللہ تعالیٰ کی پنڈلی ظاہر ہونے کا کبھی انکار نہیں فرمایا اور

حَاشِعَةً أَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۚ وَقَدْ كَانُوا يُدْعَوْنَ إِلَى السُّجُودِ وَهُمْ سَلِيمُونَ ﴿۴۳﴾

ان کی نگاہیں نیچی ہوں گی، ذلت انھیں گھیرے ہوئے ہوگی، حالانکہ انھیں سجدے کی طرف بلایا جاتا تھا، جب کہ وہ صحیح سالم تھے ﴿۴۳﴾

نہ دیگر صحابہ میں سے کسی نے ان الفاظ کا انکار کیا ہے جو اللہ تعالیٰ کے متعلق اس سلسلے میں قرآن یا حدیث میں آئے ہیں۔ قرآن مجید میں چونکہ یہ صراحت نہیں کہ اللہ کی پنڈلی ظاہر ہوگی بلکہ صرف پنڈلی کا لفظ ہے، اس لیے ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کا مفہوم یہ لیا کہ کشفِ ساق سے اس دن کی شدت مراد ہے اور یہ مراد لینا لغت عرب کے بالکل مطابق ہے، مگر ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے صراحت نقل فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کی پنڈلی ظاہر ہوگی، اس لیے مقدم وہی مفہوم ہوگا جو خود رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا، اگرچہ قیامت کے دن کی شدت بھی اپنی جگہ حقیقت ہے۔

افسوس تو ان لوگوں پر ہے جنہوں نے صاف کہہ دیا کہ اللہ تعالیٰ کی پنڈلی ظاہر نہیں ہوگی، نہ اس کی پنڈلی ہے۔ ان لوگوں نے اس سے بڑھ کر اس قسم کے ان تمام الفاظ کا انکار کر دیا جو قرآن میں آئے ہیں، مثلاً ہاتھ، چہرہ، آنکھ، پاؤں وغیرہ اور کہا کہ اگر ہم یہ مانیں تو اللہ تعالیٰ کا جسم لازم آتا ہے اور اس کا ہمارے جیسا ہونا لازم آتا ہے، جب کہ اس نے خود فرمایا: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ [الشورى: ۱۱] ”اس کی مثل کوئی چیز نہیں۔“ یہ لوگ ان تمام الفاظ کی کوئی نہ کوئی تاویل کرتے اور ان صفات کے ماننے والوں کو ”مشبہ“ قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ ان کی اس بات کا جواب خود اسی آیت میں موجود ہے جسے وہ اپنی دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں، فرمایا: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ [الشورى: ۱۱] ”اس کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ دیکھنے والا ہے۔“ یعنی یہ بھی مانو کہ اللہ کی مثل کوئی چیز نہیں اور یہ بھی مانو کہ وہ سمیع بھی ہے اور بصیر بھی۔ یہ خیال کر کے اس کے سمیع و بصیر ہونے کا انکار نہ کر دینا کہ ہم بھی سمیع اور بصیر ہیں، اگر اسے سمیع و بصیر مانا تو اس کا ہمارے مشابہ ہونا لازم آئے گا۔ نہیں، اس کا سمیع و بصیر ہونا تمہارے سمیع و بصیر ہونے کے مشابہ نہیں ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی پنڈلی، اس کا چہرہ، اس کا قدم اور جو کچھ اس نے خود اپنے متعلق بتایا سب برحق ہے، مگر اس کی پنڈلی مخلوق کی پنڈلی کے مشابہ نہیں، نہ کوئی اور صفت مخلوق کی صفت کے مشابہ ہے، وہ اسی طرح ہے جس طرح اس کی شان کے لائق ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ صفاتِ الہی والی آیات و احادیث کے متعلق سلف صالحین کا طریقہ یہی ہے کہ ان کے ظاہر الفاظ پر ایمان لانا چاہیے اور ان کی کیفیت اللہ کے سپرد کر دینی چاہیے۔ جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی ان صفات کا انکار کیا ہے درحقیقت وہ خود تشبیہ میں مبتلا ہیں کہ انھوں نے اللہ کی پنڈلی، اس کے چہرے اور دوسری صفات کو اپنے اعضا جیسا سمجھا اور یہ سمجھ کر ان سے انکار کر دیا۔ اگر وہ ان صفات کو اپنی صفات کی مثل خیال نہ کرتے تو کبھی انکار نہ کرتے۔

آیت 43 ﴿وَقَدْ كَانُوا يُدْعَوْنَ إِلَى السُّجُودِ وَهُمْ سَلِيمُونَ﴾: گویا آخرت میں ان کی پیٹھ کا تختہ بن جانا اور ان کا سجدے کے قابل نہ رہنا اس بات کی سزا ہے کہ انھوں نے دنیا میں صحیح سالم ہوتے ہوئے ایک اللہ کو سجدہ کرنے کی دعوت قبول نہ کی۔

فَذَرْنِي وَمَنْ يُكَذِّبُ بِهَذَا الْحَدِيثِ ۖ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۳۳﴾
 وَأُمْلِي لَهُمْ ۖ إِنَّ كَيْدِي فَتِينٌ ﴿۳۴﴾ أَمْ تَسْأَلُهُمْ أَجْرًا فَهُمْ مِنْ مَغْرَمٍ مُثْقَلُونَ ﴿۳۵﴾ أَمْ
 عِنْدَ هُمْ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتَبُونَ ﴿۳۶﴾ قَاضِيًا لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْخُوْتِ ۖ
 إِذْ نَادَىٰ وَهُوَ مَكْظُومٌ ﴿۳۷﴾

پس چھوڑ مجھے اور اس کو جو اس بات کو جھٹلاتا ہے، ہم ضرور انھیں آہستہ آہستہ (ہلاکت کی طرف) اس طرح سے لے جائیں گے کہ وہ نہیں جانیں گے ﴿۳۳﴾ اور میں انھیں مہلت دوں گا، یقیناً میری خفیہ تدبیر بہت مضبوط ہے ﴿۳۴﴾ یا تو ان سے کوئی مزدوری طلب کرتا ہے کہ وہ تاوان سے بوجھل ہیں ﴿۳۵﴾ یا ان کے پاس غیب کا علم ہے، تو وہ لکھتے جاتے ہیں ﴿۳۶﴾ پس اپنے رب کے فیصلے تک صبر کر اور مچھلی والے کی طرح نہ ہو، جب اس نے پکارا، اس حال میں کہ وہ غم سے بھرا ہوا تھا ﴿۳۷﴾

آیت 45.44 : فَذَرْنِي وَمَنْ يُكَذِّبُ بِهَذَا الْحَدِيثِ : یعنی جھٹلانے والوں کو سزا دینے میں اگر تاخیر ہو رہی ہے تو آپ فکر مت کریں، انھیں ہمارے سپرد کر دیں، پھر ہم جانیں اور وہ۔ ”سَنَسْتَدْرِجُهُمْ“ ہم انھیں درجہ بدرجہ ہلاکت کی طرف لے جائیں گے، یعنی ہم انھیں عمر، صحت اور دوسری نعمتیں مسلسل دیتے جائیں گے، وہ شکر کے بجائے کفر میں بڑھتے جائیں گے اور انجام کار جہنم میں پہنچ جائیں گے۔ کفر و فسق کے باوجود نعمتیں بڑھتی جائیں تو یہ اللہ کی طرف سے استدراج اور اس کی خفیہ تدبیر ہے۔ دیکھیے سورہ مومنون (۵۶)، انعام (۲۴) اور سورہ اعراف (۱۸۳)۔

آیت 46 : أَمْ تَسْأَلُهُمْ أَجْرًا : ان کے اسلام قبول نہ کرنے کا ایک عذر یہ ہو سکتا ہے کہ آپ ان سے کوئی اجرت مانگتے ہوں جو ان کے لیے خواہ مخواہ کی چنی اور بوجھ ہو، ظاہر ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔

آیت 47 : أَمْ عِنْدَ هُمْ الْغَيْبُ : یا یہ عذر ہو سکتا ہے کہ ان کے پاس غیب کا علم ہے اور وہ خود کتاب الہی لکھ سکتے ہیں تو انھیں آپ پر ایمان لانے کی کیا ضرورت ہے؟ یا انھوں نے غیب سے معلوم کر کے لکھ دیا ہے کہ آپ اللہ کے سچے رسول نہیں ہیں، یا انھوں نے اپنے متعلق غیب سے معلوم کر کے لکھ رکھا ہے کہ انھیں آخرت میں بھی دنیا جیسی نعمتیں ملتی رہیں گی، ظاہر ہے کہ ایسا بھی ہرگز نہیں ہے۔

آیت 48 : قَاضِيًا لِحُكْمِ رَبِّكَ : مچھلی والے سے مراد یونس علیہ السلام ہیں۔ آپ ﷺ کو تلقین کی جارہی ہے کہ آپ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے فیصلے کا انتظار صبر سے کریں، عذاب آنے میں دیر سے پریشان نہ ہوں اور انھیں دی ہوئی مہلت کو لمبا سمجھ کر جلد بازی اور اکتاہٹ میں کوئی ایسا کام نہ کریں جیسا مچھلی والے (یونس علیہ السلام) سے سرزد ہوا کہ وہ اجازت کے بغیر قوم کو چھوڑ کر چلے گئے۔ یونس علیہ السلام کے واقعہ کے لیے دیکھیے سورہ یونس (۹۸)، انبیاء (۸۷، ۸۸) اور صافات (۱۳۹ تا ۱۴۸)۔

لَوْ لَا أَنْ تَذَرَكَهُ نِعْمَةٌ مِنْ رَبِّهِ لَنِيدَ بِالْعَرَءِ وَهُوَ مَذْمُومٌ ﴿۴۹﴾ فَاجْتَبَاهُ رَبُّهُ
فَجَعَلَهُ مِنَ الصَّالِحِينَ ﴿۵۰﴾ وَإِنْ يَكَادُ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُزْلِقُونَكَ بِأَبْصَارِهِمْ لِنَا سَبْعُوا

الذِّكْرَ وَيَقُولُونَ إِنَّهُ لَمَجْنُونٌ ﴿۵۱﴾

اگر یہ نہ ہوتا کہ اسے اس کے رب کی نعمت نے سنبھال لیا تو یقیناً وہ چمیل زمین پر اس حال میں پھینکا جاتا کہ وہ مذمت کیا ہوا ہوتا ﴿۴۹﴾ پھر اس کے رب نے اسے چن لیا، پس اسے نیوں میں شامل کر دیا ﴿۵۰﴾ اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا یقیناً قریب ہیں کہ تجھے اپنی نظروں سے (گھور گھور کر) ضرور ہی پھلادیں، جب وہ ذکر کو سنتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یقیناً یہ تو دیوانہ ہے ﴿۵۱﴾

یونس علیہ السلام کی عدا یہ تھی: ﴿لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ﴾ [الانبیاء: ۸۷] ”تیرے سوا کوئی سچا معبود نہیں، تو پاک ہے، یقیناً میں ظلم کرنے والوں میں سے تھا۔“ ”وَهُوَ مَكْظُومٌ“ (غم سے بھرے ہوئے ہونے) کا مطلب یہ ہے کہ اس دن ان کے دل میں کئی غم اور صدمے اکٹھے ہو گئے تھے، ایک قوم کے ایمان نہ لانے کا غم، دوسرا صریح اجازت کے بغیر اپنے چلے آنے کا، تیسرا سمندر میں پھینک دیے جانے کا اور چوتھا مچھلی کے پیٹ میں قید ہو جانے کا۔ ان سب غموں اور صدموں کا علاج انھوں نے بارگاہ الہی میں دعا، تسبیح اور استغفار سے کیا اور اللہ تعالیٰ نے انھیں ہر غم سے نجات عطا فرمادی۔

آیت 49: لَوْ لَا أَنْ تَذَرَكَهُ نِعْمَةٌ مِنْ رَبِّهِ: اگر یونس علیہ السلام تسبیح و استغفار نہ کرتے تو قیامت کے دن تک مچھلی کے پیٹ میں رہتے۔ (دیکھیے صافات: ۱۳۳، ۱۳۴) تسبیح کے بعد دائمی قید کا فیصلہ ختم ہو گیا، مگر مرتبے میں جو کئی ہوئی اور اپنی خطا کی وجہ سے جس ملامت کے سزاوار ٹھہرے، اگر ان کے رب کی نعمت انھیں نہ سنبھالتی اور ان کی خطا معاف نہ کر دی جاتی اور اسی حالت میں عراء (چمیل زمین) میں پھینک دیے جاتے تو اس حالت میں وہ مذموم ہوتے، مگر نعمت الہی سے تمام کوتاہیوں کی تلافی کے بعد عراء میں پھینکے گئے تو وہ مذموم نہ تھے بلکہ محمود تھے۔

آیت 50: فَاجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَجَعَلَهُ مِنَ الصَّالِحِينَ: چنے ہوئے تو پہلے بھی تھے، اب ان کا مرتبہ اور بڑھا دیا اور انھیں اعلیٰ درجے کے نیک اور صالح بندوں میں داخل کر دیا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «مَا يَنْبَغِي لِعَبْدٍ أَنْ يَقُولَ إِنِّي خَيْرٌ مِنْ يُونُسَ بْنِ مَثْنَى» [بخاری، الانبیاء، باب قول الله تعالى: ﴿وَإِنْ يونس...﴾: ۳۴۱۳] ”کسی بندے کو لائق نہیں کہ وہ کہے میں یونس بن مثنیٰ سے بہتر ہوں۔“

آیت 51: وَإِنْ يَكَادُ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُزْلِقُونَكَ: اس آیت میں ”إِنْ“ اصل میں ”إِنْ“ (نون مشدّد کے ساتھ) تھا، کیونکہ بعد میں ”لِيُزْلِقُونَكَ“ پر لام آ رہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ جب کفار کو اللہ تعالیٰ کی آیات سناتے اور بت پرستی کی کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

وَمَا هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ ﴿۵۲﴾

حالانکہ وہ تمام جہانوں کے لیے نصیحت کے علاوہ کچھ بھی نہیں ﴿۵۲﴾

ذمت کرتے تو وہ سخت غصے میں آ کر آپ کو قہر کی نظر سے گھور گھور کر دیکھتے اور آپ کو دیوانہ قرار دیتے۔ سورہ حج (۷۲) میں ہے کہ قریب ہے کہ وہ ہماری آیات پڑھنے والوں پر حملہ ہی کر دیں۔ ”لِيُزِلُّوكُمْ“ ”أَزَلُّنَا يُزِلُّنَا“ (افعال) پھسلانا۔ اس کا معنی ”ہلاک کرنا“ بھی آتا ہے، کیونکہ پھسل کر گرنے سے آدمی ہلاک بھی ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کافر لوگ جب ذکر سنتے ہیں تو آپ کو اتنے غصے اور اتنی تیز نظروں سے گھور گھور کر دیکھتے ہیں جیسے آپ کو آپ کے موقف ہی سے پھسلا دیں گے۔ دوسرا معنی ہے جیسے آپ کو ہلاک ہی کر دیں گے۔ یہ اسی طرح ہے جس طرح کہا جاتا ہے، فلاں شخص نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے مجھے کھا ہی جائے گا۔

بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ بعض قبیلے ایسے تھے کہ جن کی نظر بہت جلد لگ جاتی تھی، اس لیے وہ آپ ﷺ کو بری نظروں سے دیکھتے تھے، تاکہ آپ کو نظر لگ جائے۔ اگرچہ نظر کا حق ہونا صحیح احادیث سے ثابت ہے، لیکن یہاں اس تفسیر کا موقع نہیں، کیونکہ اگر کوئی کسی چیز کو اچھا سمجھ کر دیکھے تو نظر لگا کرتی ہے، غصے کی نظر سے نہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ آیت میں ان کے دیکھنے کو ”لَتَأْسَبُوا الذِّكْرَ“ سے متفید کیا ہے، یعنی جب وہ ذکر سنتے ہیں تو آپ کو ایسی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ ایسے غصے کے وقت نظر لگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور وہ روایتیں بھی مضبوط نہیں ہیں۔ [كَذَا قَالَ صَاحِبُ أَحْسَنِ التَّفَاسِيرِ وَابْنُ الْحَوْزِيِّ فِي زَادِ الْمَسْبُورِ]

آیت 52 : وَمَا هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ: یعنی قرآن کی آیات میں تو وہ نصیحتیں ہیں جن کے اثر سے ایک دو نہیں بلکہ بے شمار جہان راہ راست پر آنے والے ہیں، ایسی نصیحت کے سنانے والے کو جو دیوانہ بتاتا ہے وہ خود دیوانہ ہے۔





الْحَاقَّةُ ۱ مَا الْحَاقَّةُ ۱ وَمَا أَذْرِكُ مَا الْحَاقَّةُ ۱ كَذَّبَتْ ثَمُودُ وَعَادٌ بِالْقَارِعَةِ ۱ فَأَمَّا ثَمُودُ فَأَهْلِكُوا بِالطَّاغِيَةِ ۱

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

وہ ہو کر رہنے والی ① کیا ہے وہ ہو کر رہنے والی؟ ② اور تجھے کس چیز نے معلوم کروایا کہ وہ ہو کر رہنے والی کیا ہے؟ ③ ثمود اور عاد نے اس کھلکھانے والی (قیامت) کو جھٹلادیا ④ سو جو ثمود تھے وہ حد سے بڑھی ہوئی (آواز) کے ساتھ ہلاک کر دیے گئے ⑤

آیت 1-3: الْحَاقَّةُ ۱ مَا الْحَاقَّةُ: "الْحَاقَّةُ" "حَقٌّ يَحِقُّ" (ض، ن) (ثابت ہونا، واجب ہونا) سے "فَاعِلَةٌ" کے وزن پر ہے، ہو کر رہنے والی، واجب ہونے والی، جس کا ہونا حق ہے۔ مراد قیامت ہے، کیونکہ وہ ہو کر رہے گی، اسی لیے اس کا نام "الْوَاقِعَةُ" (واقع ہونے والی) بھی ہے۔ (دیکھیے حاقہ: ۱۵) قیامت کا ذکر استفہامیہ فقروں سے شروع کیا گیا ہے، یہ اہل بلاغت کا خاص اسلوب ہے۔ اس سے ایک تو سننے والے کو متوجہ کرنا اور شوق دلانا مقصود ہوتا ہے، دوسرا قیامت کی عظمت اور ہولناکی بیان کرنا مقصود ہے کہ وہ اتنی عظیم الشان ہے کہ نہ تمہاری سمجھ میں پوری طرح آ سکتی ہے اور نہ کوئی اور ایسا ہے جو تمہیں معلوم کرنا سکے کہ وہ کیا ہے؟

آیت 4: كَذَّبَتْ ثَمُودُ وَعَادٌ بِالْقَارِعَةِ: "الْقَارِعَةُ" "قَرَعٌ" (ف) کھلکھانا، کسی سخت چیز پر دوسری چیز سے ضرب لگانا۔ یہ قیامت کے ناموں میں سے ایک نام ہے، کیونکہ وہ بھی اسی طرح ایک سخت چیز سے لگائی گئی جیسے کوئی آنے والا زور سے دروازہ آ کھلکھاتا ہے اور آدمی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا ہے۔ کفار کو یاد دلایا جا رہا ہے کہ قیامت کا انکار کرنے والے پہلے لوگ تم ہی نہیں، بلکہ تم سے پہلے عاد و ثمود نے، جو قوت و شوکت میں تم سے کہیں بڑھ کر تھے، اس کھلکھانے والی (قیامت) کو جھٹلایا، پھر ان کا انجام کیا ہوا؟ ثمود جو عرب کے شمال مغرب اور عاد جو عرب کے جنوب مشرق کی تمدن ترین قومیں تھیں، توحید کے انکار کے بعد ان کا سب سے بڑا جرم قیامت اور آخرت کا انکار تھا، جس نے انہیں سرکش بنا دیا تھا اور جس کی پاداش میں آخر کار انہیں تباہ و برباد کر دیا گیا۔ موجودہ زمانے کی مادہ پرست بزمِ خویش مہذب قوموں کی سرکشی کا اصل باعث بھی قیامت اور جزا و سزا کا انکار ہے۔

آیت 5: فَأَمَّا ثَمُودُ فَأَهْلِكُوا بِالطَّاغِيَةِ: "الطَّاغِيَةُ" "طَغَى يَطْغَى" (ف) سے اسم فاعل ہے، یہ "غَافِيَةٌ" کی طرح مصدر بھی ہو سکتا ہے۔ اسم فاعل ہو تو "الطَّاغِيَةُ" کا معنی "حد سے بڑھنے والی" ہے اور یہ "الزَّجْفَةُ" یا "الصَّيْحَةُ" یا "الضَّحِقَةُ" کی صفت ہوگی، یعنی ثمود اس زلزلے سے یا آواز سے یا بجلی کی کڑک سے ہلاک کر دیے گئے جو آوازوں کی حد سے کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

وَأَمَّا عَادٌ فَأَهْلِكُوا بِرِيحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ۖ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَثَلَاثِينَ أَيَّامًا
حُسُومًا ۖ فَتَرَى الْقَوْمَ فِيهَا صَرْعَىٰ ۖ كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ خَلْوِيَةٍ ۝

اور جو عادتے وہ سخت ٹھنڈی، تند آندھی کے ساتھ ہلاک کر دیے گئے، جو قابو سے باہر ہونے والی تھی ۝ اس نے اسے ان پر سات راتیں اور آٹھ دن مسلسل چلائے رکھا۔ سو تو ان لوگوں کو اس میں اس طرح (زمین پر) گرے ہوئے دیکھے گا جیسے وہ گری ہوئی کھجوروں کے تئیں ہوں ۝

بہت بڑھی ہوئی تھی۔ یہ فرشتے کی آواز تھی یا بجلی کی کڑک تھی جس کے ساتھ زلزلہ بھی تھا، یا زلزلے کے ساتھ آنے والی خوفناک آواز تھی۔ ”الرَّحِقَةُ“ کے لیے دیکھیے سورہ اعراف (۷۸)، ”الصَّيْحَةُ“ کے لیے دیکھیے سورہ ہود (۶۷) اور ”الصَّعِقَةُ“ کے لیے دیکھیے حم جہدہ (۱۷)۔

صدر ہو تو معنی ”حد سے بڑھنا“ ہے، ”باء“ سبب ہوگی: ”أَيُّ يَطْعَانِيهِمْ“ یعنی شمو اپنے حد سے بڑھ جانے کی وجہ سے ہلاک کر دیے گئے، جیسے فرمایا: ﴿كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِطَغْوَيْهَا﴾ | الشمس: ۱۱ | ”قوم شمو نے اپنی سرکشی کی وجہ سے (صالح علیہ السلام کو) جھٹلایا۔“

آیت 6 وَأَمَّا عَادٌ فَأَهْلِكُوا...: ”ریح“ ہوا، ”صَرْصَرٍ“ ”صِرٌّ“ سے مشتق ہے، جس کا معنی سخت ٹھنڈک اور تیزی ہے، یعنی سخت ٹھنڈی اور تند آندھی، یا یہ ”صَرْصَرٌ يُفْرِصُ صَرْصَرًا“ (چین، سخت آواز نکالنا) سے مشتق ہے، یعنی سخت آواز والی آندھی۔ ”عَاتِيَةٍ“ ”عَنَا يَفْتُو عُنُوًا“ (ان) قابو سے باہر ہونا، سرکشی کرنا۔ یعنی وہ ہوا اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی بھی قابو کرنے والے کے قابو سے باہر تھی۔

آیت 7 سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ.....: ”حُسُومًا“ کا معنی ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ”پے در پے“ کیا ہے۔ (ابن جریر) اس صورت میں یہ ”حَسَمْتُ الذَّابَّةَ“ (میں نے جانور کو پے در پے داغ لگائے) سے مشتق ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے وہ آندھی ان پر سات راتیں اور آٹھ دن مسلسل چلائے رکھی، ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں رکی۔ ”حَسَمَ يَحْسِمُ“ (ض) کا معنی ”جز سے کاٹنا“ بھی ہے۔ اس صورت میں یہ ”حَابِسَةٌ“ کی جمع ہے، جیسے ”شَاهِدٌ“ کی جمع ”شُهُودٌ“ ہے، معنی ہوگا ”ان پر وہ آندھی جز سے کاٹ ڈالنے والی سات راتوں اور آٹھ دنوں تک چلائے رکھی۔“ ”حُسُومًا“ مصدر بھی ہو سکتا ہے، جیسے ”شُكُوْرٌ“ اور ”شُكُوفٌ“ ہے، اس صورت میں یہ مفعول لڑ ہوگا، یعنی ان پر وہ آندھی سات راتیں اور آٹھ دن جز سے کاٹ ڈالنے کے لیے چلائے رکھی۔ مزید تراکیب کے لیے دیگر کتب تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔ ”صَرْعَىٰ“ ”صَرْعٍ“ کی جمع ہے، پھچاز کر گرائے ہوئے، ہلاک کیے ہوئے۔ ”أَعْجَازٌ“ ”عَجَزٌ وَ عَجَزٌ“ کی جمع ہے، کسی چیز کا آخری حصہ، درخت کا تانا۔ ”خَلْوِيَةٍ“ ”خَلْوَىٰ يَخْوِي“ (ض) گر پڑنا، خالی ہونا۔

اللہ تعالیٰ نے قوم عاد سے ان کی نافرمانی کی وجہ سے ایک عرصہ تک بارش روک رکھی، ادھر وہ پیغمبر کو زچ کرنے کے لیے

فَهَلْ تَرَى لَهُمْ مِنْ بَاقِيَةٍ ۝۸ وَجَاءَ فِرْعَوْنُ وَمَنْ قَبْلَهُ وَالْمُؤْتَفِكْتُ بِالْخَطِئَةِ ۝۹
فَعَصَوْا رَسُولَ رَبِّهِمْ فَأَخَذَهُمْ أَخْذَةً رَابِيَةً ۝۱۰ إِنَّا لَنَّا طَعْنَا الْمَاءَ حَمَلْنَاكُمْ فِي الْجَارِيَةِ ۝۱۱

تو کیا تو ان کا کوئی بھی باقی رہنے والا دیکھتا ہے؟ ۸ اور فرعون نے اور اس سے پہلے لوگوں نے اور الٹ جانے والی بستیوں نے گناہ کا ارتکاب کیا ۹ پس انھوں نے اپنے رب کے رسول کی نافرمانی کی تو اس نے انھیں ایک سخت گرفت میں پکڑ لیا ۱۰ بلاشبہ ہم نے ہی جب پانی حد سے تجاوز کر گیا، تمھیں کشتی میں سوار کیا ۱۱

بار بار عذاب کا مطالبہ کر رہے تھے، جب عذاب بادل کی صورت میں نمودار ہوا اور انھوں نے اسے اپنی وادیوں کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا تو خوش ہو گئے کہ اب بارش ہوگی، مگر تھوڑی ہی دیر میں عذاب شروع ہو گیا، جو مغرب کی طرف سے آنے والی تیز ٹھنڈی آندھی کی صورت میں تھا، جس نے ہر چیز کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ احقاف (۲۶۳-۲۶۲)۔ سات راتیں اور آٹھ دن مسلسل چلنے کے بعد آندھی تھمی تو ان کی لاشیں اس طرح گری ہوئی تھیں جیسے کھجور کے کھوکھلے تنے۔ اہل ایمان کے علاوہ ایک شخص بھی باقی نہ بچا۔ اس تشبیہ سے اس قوم کا مضبوط جسامت اور لمبے قدوں والا ہونا صاف معلوم ہو رہا ہے۔ سورہ احقاف (۲۶) اور سورہ فجر (۱۰ تا ۸) میں ان کی قوت و شوکت کا کچھ حال بیان ہوا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «نُصِرْتُ بِالصَّبَا، وَأُهْلِكْتُ عَادًا بِالذُّبُورِ» [بخاری، أحاديث الأنبياء، باب قول الله تعالى ﴿وَأَمَّا عَادُ...﴾ ۳۳۴۳: مسلم: ۹۰۰] [خندق کے موقع پر (میری مدد صبا یعنی مشرق سے آنے والی ہوا کے ساتھ کی گئی اور عاد کو دبور یعنی مغرب سے آنے والی ہوا کے ساتھ ہلاک کیا گیا۔]

آیت 9: 10 وَجَاءَ فِرْعَوْنُ وَمَنْ قَبْلَهُ.....: «الْمُؤْتَفِكْتُ» (انتكف) (انتعال) سے اسم فاعل ہے اور محذوف لفظ «الْقُرَى» (بستیوں) کی صفت ہے، یعنی الٹ جانے والی بستیاں۔ مراد لوط علیہ السلام کی قوم کی بستیاں ہیں جن کا اوپر کا حصہ نیچے اور نیچے کا اوپر کر دیا گیا اور پھر ان پر کھنگر کے پھروں کی بارش برسا دی گئی۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ ہود (۸۳ تا ۷۷) اور سورہ حجر (۷۶ تا ۷۷)۔ «الْخَاطِئَةُ» «عَافِيَةٌ» کے وزن پر مصدر ہے، گناہ، خطا۔ «رَابِيَةً» «رَبَابِيَةً» (ن) (زیادہ ہونا، بڑھنا) سے اسم فاعل ہے، یعنی وہ گرفت اپنی شدت میں دوسری گرفتوں سے بہت بڑھی ہوئی تھی، یعنی فرعون نے اور اس سے پہلے کے لوگوں نے اور قوم لوط نے گناہ کا ارتکاب کیا تو اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنی سخت گرفت میں پکڑ لیا۔ گناہ کیا تھا؟ یہ کہ «فَعَصَوْا رَسُولَ رَبِّهِمْ» انھوں نے اپنے رب کے رسول کی نافرمانی کی۔

آیت 11 إِنَّا لَنَّا طَعْنَا الْمَاءَ.....: نوح علیہ السلام کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے اپنے احسان کا ذکر کیا ہے، فرمایا نوح (علیہ السلام) کی قوم کے کفر و شرک پر اصرار کی وجہ سے جب پانی اتنا بڑھا کہ عام حدوں سے کہیں اونچا ہو گیا تو ہمیں تھے جنھوں نے تمھیں اس سے پہلے ہی کشتی میں سوار کر لیا اور پھر اتنے بے حساب پانی میں اس کشتی کو محفوظ رکھا، ورنہ اس

لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَتَعِيَهَا أُذُنٌ وَاعِيَةٌ ﴿۱۳﴾ فَإِذَا نَفَخَ فِي الصُّورِ نَفْحَةً وَاحِدَةً ﴿۱۴﴾
 وَحِيلَتِ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَاحِدَةً ﴿۱۵﴾ فَيَوْمَئِذٍ وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ﴿۱۶﴾

تاکہ ہم اسے تمہارے لیے ایک یاد دہانی بنا دیں اور یاد رکھنے والا کان اسے یاد رکھے ﴿۱۳﴾ پس جب صور میں پھونکا جائے گا، ایک بار پھونکنا ﴿۱۴﴾ اور زمین اور پہاڑوں کو اٹھایا جائے گا، پس دونوں ٹکرا دیے جائیں گے، ایک بار ٹکرا دینا ﴿۱۵﴾ تو اس دن ہونے والی ہو جائے گی ﴿۱۶﴾

طوفان سے بچنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ یہاں اگرچہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے بعد کے زمانے کے لوگوں سے خطاب ہو رہا ہے، مگر مراد یہی ہے کہ تمہارے آباء کو سوار کیا، وہ سوار ہوئے تو تم بھی سوار ہوئے، کیونکہ تم ان کی پشتوں میں تھے۔ اگر وہ اس کشتی میں سوار ہو کر طوفان سے نجات نہ پاتے تو آج تمہارا وجود بھی نہ ہوتا۔

آیت 12 لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً: ”لِنَجْعَلَهَا“ میں ”ہا“ ضمیر اس واقعہ کی طرف جارہی ہے، یعنی ”تاکہ ہم اس واقعہ کو تمہارے لیے ایک نصیحت اور یادگار بنا دیں۔“ نوح علیہ السلام کی قوم کا یہ واقعہ پشت در پشت نقل ہو کر آ رہا تھا اور عرب کے لوگ اچھی طرح اس سے واقف تھے۔ بعض مفسرین نے اس ضمیر ”ہا“ سے مراد ”الْجَارِيَةِ“ (کشتی) بھی لیا ہے، مگر اس کے بعد آنے والے الفاظ ”وَتَعِيَهَا أُذُنٌ وَاعِيَةٌ“ (اور اسے یاد رکھنے والا کان یاد رکھے) سے ظاہر ہو رہا ہے کہ ضمیر سے مراد ”واقعہ“ ہے، کیونکہ ”وَعِيَ يَعْنِي“ کا معنی سوچ سمجھ کر سننا اور یاد رکھنا ہوتا ہے۔ ”أُذُنٌ“ (کان) سے مراد کانوں والے انسان ہیں، جو واقعہ کو سنیں تو اس سے عبرت پکڑیں کہ آخرت کے انکار اور اللہ کے رسولوں کو جھٹلانے کا انجام کتنا ہولناک ہوتا ہے۔

آیت 13، 14 فَإِذَا نَفَخَ فِي الصُّورِ نَفْحَةً وَاحِدَةً.....: قرآن مجید میں بعض مقامات پر پہلے نَفْحَہ کے وقت پیش آنے والے واقعات ذکر کیے گئے ہیں، بعض پر دوسرے نَفْحَہ کے وقت اور بعض مقامات پر انہیں اکٹھا ہی ذکر کر دیا گیا ہے۔ ان آیات میں بھی پہلے نَفْحَہ سے لے کر دوسرے نَفْحَہ کے بعد تک کے حالات بیان ہوئے ہیں، زمین اور پہاڑوں کے ٹوٹنے کا سلسلہ تو پہلے نَفْحَہ کے وقت کا ہے اور آسمان کا پھٹنا، فرشتوں کا اس کے کناروں پر ہونا، عرش الہی کو آٹھ فرشتوں کا اٹھائے ہوئے ہونا، اللہ تعالیٰ کا میدان محشر میں نزول فرمانا اور سب بندوں کا حساب کتاب کے لیے پیش کیا جانا، یہ سب کچھ دوسرے نَفْحَہ کے بعد کا ہے۔

آیت 15 فَيَوْمَئِذٍ وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ: ”الْوَأَقِعَةُ“ واقع ہونے والی۔ یعنی قیامت کے منکروں کا دنیا میں انجام ذکر کرنے کے بعد اب اس کے واقع ہونے کی کیفیت بیان ہوتی ہے کہ صور میں اچانک ایک پھونک ماری جائے گی، اس کے ساتھ ہی زمین اور پہاڑوں کو اٹھا کر ایک ہی بار ٹکرا کر ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا اور تمام زندہ لوگ مرکز گر جائیں گے۔ یہ واقعہ یک لخت ہوگا، اس کے وقت کا کسی کو بھی علم نہیں، حتیٰ کہ صور میں پھونکنے والے کو بھی نہیں۔ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہما سے روایت

وَأَنْشَقَّتِ السَّمَاءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَاهِيَةٌ ﴿١٦﴾ وَالْمَلَكُ عَلَى أَرْجَائِهَا ۗ وَيَخْبِلُ عَرْشُ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ شَلْبِيَةٌ ﴿١٧﴾ يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُونَ لَا تَخْفَى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ ﴿١٨﴾

اور آسمان پھٹ جائے گا، پس وہ اس دن کمزور ہوگا ﴿۱۶﴾ اور فرشتے اس کے کناروں پر ہوں گے اور تیرے رب کا عرش اس دن آٹھ (فرشتے) اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہوں گے ﴿۱۷﴾ اس دن تم پیش کیے جاؤ گے، تمہاری کوئی چھپی ہوئی بات چھپی نہیں رہے گی ﴿۱۸﴾

ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « كَيْفَ أَنْعَمُ وَصَاحِبُ الْقُرْنِ قَدِ النَّقَمَ الْقُرْنِ وَاسْتَمَعَ الْأُذُنَ مَتَى يُؤْمَرُ بِالنَّفْحِ فَيَنْفُخُ » [ترمذی، صفة القيامة والرفائق، باب ماجاء في شأن الصور : ۲۴۳۱، و صححه الألبانی، أنظر صحيح الجامع الصغير : ۴۵۹۲] ”میں کیسے خوش حال ہو کر رہوں جب کہ صور والا (فرشتے) صور منہ میں لیے ہوئے اور کان لگائے ہوئے ہے (اور پیشانی جھکا کر انتظار کر رہا ہے) کہ اسے صور میں پھونکنے کا حکم کب ہوتا ہے، تو وہ (صور میں) پھونکے۔“

آیت 17، 16: ﴿١٦﴾ وَأَنْشَقَّتِ السَّمَاءُ.....: ”وَاهِيَةٌ“ ”وَهِيَ يَهِي وَهْيًا“ (ض، س، ف) (کمزور ہونا، بودا ہونا) سے اسم فاعل ہے۔ دوسرے نفع کے ساتھ یہ مضبوط آسمان جس میں لاکھوں کروڑوں سال سے ایک شگاف بھی نہیں پڑا، بالکل کمزور ہو کر پھٹ جائے گا اور فرشتے اس کے کناروں پر چلے جائیں گے۔ اس دن آٹھ فرشتے عرش الہی کو اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہوں گے، پھر اللہ تعالیٰ اور فرشتے صف در صف زمین پر تشریف لائیں گے۔ ادھر ایک طرف جہنم لائی جائے گی (دیکھیے فجر: ۲۳ تا ۲۴)، دوسری طرف جنت قریب لائی جائے گی۔ (دیکھیے شعراء: ۹۰، ۹۱) اس وقت سب لوگ اپنے اعمال کی جزا و سزا کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کیے جائیں گے، کسی شخص کا کوئی عمل چھپا نہیں رہ سکے گا۔

﴿٢﴾ یہ آیت اللہ تعالیٰ کے عرش کے وجود کی زبردست دلیل ہے۔ جو لوگ عرش الہی کے منکر ہیں اور کہتے ہیں کہ اس سے مراد صرف حکومت ہے، قیامت کے دن آٹھ فرشتوں کا عرش الہی کو اٹھائے ہوئے ہونا ان کی تردید کرتا ہے۔ یہ حضرات نہ عرش کے وجود کے قائل ہیں، نہ اللہ تعالیٰ کا عرش پر ہونا مانتے ہیں، نہ اللہ تعالیٰ کا قیامت کے دن زمین پر آنا مانتے ہیں اور نہ اس کا اوپر کی جانب ہونا مانتے ہیں، حالانکہ یہ سب کچھ قرآن مجید میں واضح الفاظ میں موجود ہے۔ ایک بزرگ جنہوں نے ہر جگہ عرش الہی کی تاویل حکومت و فرماں روائی سے کی ہے، اس مقام پر آٹھ فرشتوں کے عرش الہی کو اٹھانے کے صریح الفاظ کی کوئی تاویل نہیں کر سکے تو انہوں نے اسے آیات متشابہات میں سے قرار دے کر تسلیم کیا ہے کہ ”ہم نہ یہ جان سکتے ہیں کہ عرش کیا چیز ہے اور نہ سمجھ سکتے ہیں کہ قیامت کے روز آٹھ فرشتوں کے اس کو اٹھانے کی کیفیت کیا ہوگی۔“ کیا یہی بہتر ہوتا کہ اسی طرح وہ اللہ کے عرش کے اوپر ہونے کو بھی مانتے اور اس کے زمین پر آنے کو بھی مانتے اور اس کی کیفیت اللہ کے سپرد کر دیتے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر کس طرح ہے اور وہ زمین پر کس طرح اترے گا، کیونکہ قرآن و حدیث کی نصوص اور سلف صالحین کا یہی طریقہ ہے۔ مزید دیکھیے سورہ فجر (۲۲) کی تفسیر۔ تفسیر ماجدی میں ہے: ”یہ کہنا کہ فرشتوں کا حامل عرش ہونا حق تعالیٰ کی شانِ قیومیت

فَإِنَّمَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ، فَيَقُولُ هَذَا وَمُ أَقْرَأُ وَكِتَابِيهِ ۝۱۹ إِنِّي ظَنَنْتُ أَنِّي مُلْقٍ

حَسَابِيهِ ۝۲۰ فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَاضِيَةٍ ۝۲۱ فِي جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ۝۲۲

سو جسے اس کا اعمال نامہ اس کے دائیں ہاتھ میں دیا گیا تو وہ کہے گا لو پکڑو، میرا اعمال نامہ پڑھو ۝۱۹ یقیناً میں نے سمجھ لیا تھا کہ میں اپنے حساب سے ملنے والا ہوں ۝۲۰ پس وہ ایک خوشی والی زندگی میں ہوگا ۝۲۱ ایک بلند جنت میں ۝۲۲ کے منافی ہے، محض اپنی سطحیت کا اظہار کرنا ہے، اگر قیومیت کے یہ معنی لے لیے جائیں تو ایک اس مسئلہ پر کیا موقوف ہے، ملائکہ کو واسطہ بنا کر ان سے کام لیتے رہنے کا سارا نظام ہی باطل ہو جاتا ہے۔“

آیت 19 : ”فَإِنَّمَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ.....“ : ”هَذَا وَمُ“ اسم فعل ہے، ابن عطیہ نے فرمایا: ”اس کا معنی ہے، آؤ!“ زبختی نے فرمایا: ”هَذَا وَمُ“ ایک آواز ہے جس سے ”حُدُ“ یعنی ”لو پکڑو“ کا مفہوم سمجھا جاتا ہے۔ (التسهیل) ”كِتَابِيهِ“ اصل میں ”کِتَابِي“ ہے، اس میں ”ہ“ وقف کے لیے ہے، ضمیر نہیں ہے، جیسے ”مَاهِيَةٌ“ میں ہے۔ (دیکھیے قارعہ: ۱۰) ”حَسَابِيهِ“، ”مَالِيَةٍ“ اور ”سُلْطَنِيَّة“ میں بھی ایسے ہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس شخص کو دائیں ہاتھ میں اعمال نامہ ملے گا وہ اتنا خوش ہوگا کہ دوسروں کو بلا بلا کر دکھاتا پھرے گا، جیسے دنیا میں بھی انسان کوئی بڑی خوشی ملنے پر پکار پکار کر دوسروں کو اس میں شریک کرتا ہے۔

آیت 20 : ”إِنِّي ظَنَنْتُ أَنِّي مُلْقٍ حَسَابِيهِ“ : ”إِنِّي ظَنَنْتُ“ یقیناً میں نے سمجھ لیا تھا۔ ”ظن“ کا لفظ وہم، گمان اور یقین تینوں چیزوں کے لیے آتا ہے، کیونکہ یہ اصل میں علامات اور نشانیوں کے ذریعے سے حاصل ہونے والی چیز کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ نشانیاں کمزور ہوں تو وہم یا گمان تک معاملہ رہتا ہے، اگر مضبوط ہوں تو غالب گمان اور علم و یقین کا معنی دیتا ہے۔ خصوصاً جب اس کے ساتھ ”إِنْ“ بھی ہو۔ (مفردات) یہاں ”ظَنَنْتُ“ کا لفظ غالب گمان کے معنی میں ہے، جو دن بدن دلائل کے ساتھ یقین میں بدلتا جاتا ہے، اسی غالب گمان ہی کی وجہ سے انسان قیامت کے دن کے حساب سے ڈر کر اللہ کی نافرمانی سے بچتا ہے۔ اگر مکمل یقین کے بغیر وہ اللہ کی نافرمانی چھوڑنے پر تیار نہ ہو تو مکمل یقین تو قیامت سامنے آنے ہی پر ہوگا اور اس وقت اس یقین کا کوئی فائدہ نہیں۔ صاحب احسن التفسیر فرماتے ہیں: ”قرآن شریف میں یقین کی جگہ ظن کا لفظ عقلمندی کی باتوں میں اس لیے بولا گیا ہے کہ ان باتوں کا پورا یقین مرنے کے بعد ہوگا۔“ خلاصہ آیت کا یہ ہے کہ وہ اپنی خوش قسمتی کی وجہ یہ بتائے گا کہ اس نے دنیا میں یہ سمجھ کر زندگی بسر کی کہ آخر ایک دن اس کا حساب ہونا ہے۔

آیت 21 22 : ”فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَاضِيَةٍ.....“ : جنت میں کوئی فکر و غم ہوگا نہ مرض، نہ موت، نہ تھکاوٹ، نہ بڑھاپا، نہ کوئی نقص، نہ عیب اور نہ کمزوری۔ ہر نعمت جو دل چاہے گا بلکہ جو خیال کی رسائی سے بھی بلند ہے، ملے گی۔ ان تمام باتوں کو ”عِيشَةٍ رَاضِيَةٍ“ کے لفظ سے ادا فرما دیا ہے۔

قُطُوْفَهَا دَانِيَةً ﴿۲۷﴾ كُلُّوْا وَاشْرَبُوْا هَبِيْتًا بِمَا اَسْلَفْتُمْ فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ ﴿۲۸﴾ وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهُ بِشِمَالِهٖ فَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُوْتِ كِتٰبِيْهِ ﴿۲۹﴾ وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهُ بِرِجْلَيْهِ فَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ كَانَتْ الْقَاضِيَةُ ﴿۳۰﴾ مَا اَعْطٰنِيْ عَنِّيْ مَالِيْهِ ﴿۳۱﴾ هٰلِكَ عَنِّيْ سُلْطٰنِيَّةٌ ﴿۳۲﴾

جس کے میوے قریب ہوں گے ﴿۲۷﴾ کھاؤ اور پو مزے سے، ان اعمال کی وجہ سے جو تم نے گزرے ہوئے دنوں میں آگے بھیجے ﴿۲۸﴾ اور لیکن جسے اس کا اعمال نامہ اس کے بائیں ہاتھ میں دیا گیا تو وہ کہے گا اے کاش! مجھے میرا اعمال نامہ نہ دیا جاتا ﴿۲۹﴾ اور میں نہ جانتا میرا حساب کیا ہے ﴿۳۰﴾ اے کاش کہ وہ (موت) کام تمام کر دینے والی ہوتی ﴿۳۱﴾ میرا مال میرے کسی کام نہ آیا ﴿۳۲﴾ میری حکومت مجھ سے برباد ہوگئی ﴿۳۲﴾

آیت 23 قُطُوْفَهَا دَانِيَةً : "قُطِفَ يَقُطِفُ" (ض) پھل توڑنا۔ "قُطُوْفٌ" "قُطِفٌ" (قاف کے کسرہ کے ساتھ) کی جمع ہے، وہ پھل جو توڑے جائیں۔ "دَانِيَةً" قریب۔ یعنی وہ خوشے اور پھل جھکے ہوئے ہوں گے کہ آدمی کھڑے، بیٹھے اور لیٹے ہر حال میں انہیں لے سکے گا۔

آیت 24 كُلُّوْا وَاشْرَبُوْا هَبِيْتًا : "هَبِيْتًا" "هَبُوْا يَهَبُوْنَ" (ک) سے "فَعِيْلٌ" کے وزن پر ہے، جس کے حاصل ہونے میں کوئی مشقت ہو نہ کھانے کے بعد معدے پر کوئی بوجھ ہو، اور کھایا ادھر ہضم ہوا۔ "بِمَا اَسْلَفْتُمْ" ان اعمال کی وجہ سے جو تم نے آگے بھیجے۔ معلوم ہوا نیک اعمال جنت میں داخل ہونے کا سبب ہیں۔

آیت 25، 29 وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهُ بِشِمَالِهٖ : جن لوگوں کو بائیں ہاتھ میں اعمال نامہ دیا جائے گا وہ نہایت پریشانی میں یہ باتیں کہیں گے جو ان آیات میں ذکر ہوئی ہیں۔ یہ بائیں ہاتھ میں اعمال نامے والے لوگ کافر ہوں گے، اس کی دلیل آگے آنے والی آیت (۳۳) ہے: ﴿اِنَّ كِتٰبَ كٰنَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ﴾ "وہ عظمت والے اللہ پر ایمان نہیں رکھتا تھا۔" ایمان والوں کو دائیں ہاتھ میں اعمال نامہ ملے گا، البتہ وہ ایمان والے جو کچھ عرصہ آگے میں رہیں گے ان کے بارے میں اختلاف ہے کہ انہیں اعمال نامہ آگے میں جانے سے پہلے ملے گا یا آگے سے نکلنے کے بعد، راجح یہ ہے کہ آگے سے نکلنے کے بعد ملے گا، کیونکہ اعمال نامہ ملنے کے بعد اگر انہیں آگے میں بھیجا جا رہا ہو تو ان کے منہ سے "هٰذَا وَاَقْرَبُ وَاَكْتَبِيَّةٌ" کے خوشی کے الفاظ نہیں نکل سکتے۔ (التسهيل)

"يٰلَيْتَنِيْ كَانَتْ الْقَاضِيَةُ" یعنی موت میرا کام تمام کر دیتی، اور مجھے دوبارہ نہ اٹھایا جاتا۔ "مَا اَعْطٰنِيْ عَنِّيْ مَالِيْهِ" هٰلِكَ عَنِّيْ سُلْطٰنِيَّةٌ مال اور سرداری کی حرص کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿مَا ذُنُوبَانِ خَابِعَانِ اَوْسِلَا فِيْ غَنَمٍ يُّفْسَدُ لَهَا مِنْ جَرَحِ الْمَرْءِ عَلٰى الْمَالِ وَالشَّرَفِ يَدِيْنِهِ﴾ [ترمذی، الترغیب، باب ما دہیان خابعان : ۲۳۷۶، قال الذہبی صحیح] "دو بھوکے بھیرے جو بھیر بھیروں میں چھوڑ دیے جائیں، وہ انہیں اس سے زیادہ تباہ و برباد کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

حُدُوهُ فَعَلُوهُ ﴿۳۳﴾ ثُمَّ الْجَحِيمِ صَلْوُهُ ﴿۳۴﴾ شَمَّ فِي سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُونَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوهُ ﴿۳۵﴾ إِنَّهُ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ الْعَظِيمِ ﴿۳۶﴾ وَلَا يَحْضُ عَلَىٰ طَعَامِ الْمَسْكِينِ ﴿۳۷﴾ فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هُنَا حَبِيبٌ ﴿۳۸﴾

اسے پکڑو، پس اسے طوق پہنا دو ﴿۳۳﴾ پھر اسے بھڑکتی ہوئی آگ میں جھونک دو ﴿۳۴﴾ پھر ایک زنجیر میں، جس کی پیمائش ستر ہاتھ ہے، پس اسے داخل کر دو ﴿۳۵﴾ بلاشبہ وہ بہت عظمت والے اللہ پر ایمان نہیں رکھتا تھا ﴿۳۶﴾ اور نہ مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیتا تھا ﴿۳۷﴾ سو آج یہاں نہ اس کا کوئی دلی دوست ہے ﴿۳۸﴾

نہیں کرتے جتنا آدمی کی مال اور سرداری کی حرص اس کے دین کو تباہ و برباد کرتی ہے۔ "تمام عمر انھی دو چیزوں کو حاصل کرنے کی تگ دو میں گزار دینے کے بعد اس وقت افسوس سے کہے گا کہ میرا مال میرے کسی کام نہ آیا اور میری سرداری بھی برباد ہو گئی۔ "سُلْطَانِيَّةٌ" "سُلْطَانٌ" سے مراد دلیل و حجت ہو تو مطلب یہ ہے کہ میرے سارے دلائل اور حجت بازیاں، جن سے میں حق والوں کو لاجواب کرتا تھا، آج بے کار ہو گئے اور سرداری و حکومت ہو تو مطلب یہ ہے کہ آج میرا سارا اقتدار ختم ہو گیا۔ وہ جتنے اور پارٹیاں، وہ فوج اور پولیس کے دستے، وہ اہل خانہ، وہ نوکر چاکر جن پر میرا حکم چلتا تھا سب غائب ہو گئے۔ دوسروں پر اقتدار تو دور کی بات ہے اپنے ہی اعضا نے میری سرداری ماننے سے انکار کر دیا ہے، بلکہ میرے خلاف شہادتیں دے رہے ہیں۔ "سُلْطَانِيَّةٌ" سے حجت و دلیل اور حکومت و سرداری دونوں بھی مراد ہو سکتے ہیں۔

آیت 30-32: حُدُوهُ فَعَلُوهُ..... حکم ہوگا اسے پکڑو اور اس کی گردن میں طوق ڈال دو، پھر اسے بھڑکتی ہوئی آگ میں جھونک دو، پھر اسے ایک زنجیر میں جکڑ دو جو ستر (۷۰) ہاتھ لمبی ہے۔ جہنمیوں کو جہنم میں طوقوں اور زنجیروں سے جکڑ کر لمبے لمبے ستونوں سے باندھ دیا جائے گا تاکہ وہ حرکت نہ کر سکیں، کیونکہ حرکت سے بھی عذاب میں کچھ تخفیف ہوتی ہے، فرمایا: ﴿إِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّوَصَّدَةٌ﴾ ﴿۳۳﴾ فِي عَمَدٍ مُّثَدَّدَةٍ ﴿۳۴﴾ | المیزہ: ۹۰۸ | "یقیناً وہ ان پر (ہر طرف سے) بند کی ہوئی ہے۔ لمبے لمبے ستونوں میں۔" ستر ہاتھ سے مراد یہ پیمائش بھی ہو سکتی ہے اور بہت زیادہ لمبائی بھی، کیونکہ عربوں کے ہاں ستر کا عدد کثرت کے لیے بھی آتا ہے۔ پھر ہو سکتا ہے کہ یہ زنجیر ہر مجرم کے لیے الگ الگ ہو اور یہ بھی کہ ایک ہی زنجیر میں سب کو پروتے چلے جائیں۔ (التسہیل)

آیت 33-34: إِنَّهُ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ..... عذاب کا باعث یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ اس کا معاملہ یہ تھا کہ اس پر ایمان ہی نہیں رکھتا تھا، یعنی اسے مانتا ہی نہیں تھا، یا اس کے ساتھ کچھ شریک بنا رکھے تھے اور بندوں کے ساتھ معاملہ یہ تھا کہ مسکین کو خود کھانا تو دور کی بات ہے، کسی دوسرے کو اسے کھلانے کی ترغیب بھی نہیں دیتا تھا۔ اس نے اللہ کا حق پہچانا نہ بندوں کا۔

آیت 35: فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هُنَا حَبِيبٌ: "حَبِيبٌ" دوست یا رشتہ دار، جسے اس کی خاطر گرمی آئے۔ "حَمَّةٌ" چشمے سے نکلنے والا گرم پانی۔ "حَبِيبٌ" گرم پانی کو بھی کہتے ہیں۔

وَلَا طَعَامٌ إِلَّا مِنْ غَسْلَيْنِ ﴿۳۶﴾ لَا يَأْكُلُهُ إِلَّا الْخَاطِئُونَ ﴿۳۷﴾ فَلَا أُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُونَ ﴿۳۸﴾
وَمَا لَا تُبْصِرُونَ ﴿۳۹﴾ إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ﴿۴۰﴾ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيلًا مَّا تَأْتُمُونُ ﴿۴۱﴾

اور نہ اس کے لیے زخموں کے دھوون کے سوا کوئی کھانا ہے ﴿۳۶﴾ جسے گناہ گاروں کے سوا کوئی نہیں کھاتا ﴿۳۷﴾ پس نہیں! میں قسم کھاتا ہوں اس کی جسے تم دیکھتے ہو! ﴿۳۸﴾ اور جسے تم نہیں دیکھتے! ﴿۳۹﴾ بلاشبہ یہ (قرآن) یقیناً ایک معزز پیغام لانے والے کا قول ہے ﴿۴۰﴾ اور یہ کسی شاعر کا قول نہیں، تم بہت کم ایمان لاتے ہو ﴿۴۱﴾ اور نہ کسی کا ہن کا قول

آیت 36 وَلَا طَعَامٌ إِلَّا مِنْ غَسْلَيْنِ: "غَسْلَيْنِ" سے "غَسْلٌ يَغْسِلُ" (ض) سے "فِعْلَيْنِ" کا وزن ہے، زخم یا کوئی گندی چیز دھونے سے نکلنے والا پانی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "اس سے مراد جہنمیوں کے زخموں سے نکلنے والا لہو اور پیپ ہے۔" [طبری بسند حسن]

آیت 37 لَا يَأْكُلُهُ إِلَّا الْخَاطِئُونَ: "الْخَاطِئُونَ" کی جمع ہے، جو جان بوجھ کر نادرست کام کرے، جیسے فرمایا: ﴿إِنَّ تَتْلُوهُمْ كَانَ خِطَاً كَبِيراً﴾ [بنی اسرائیل: ۳۱] "بے شک ان کا قتل ہمیشہ سے بہت بڑا گناہ ہے۔" اگر کسی سے قصد و ارادہ کے بغیر نادرست کام ہو جائے تو وہ "مخطئی" ہے۔ (المفردات والتسیل)

آیت 38 39 فَلَا أُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُونَ.....: کفار رسول اللہ ﷺ کو کبھی شاعر کہتے، کبھی کاہن، کبھی یہ کہتے کہ اس نے یہ کلام اپنے پاس سے بنا کر اللہ تعالیٰ کے ذمے لگا دیا ہے، کبھی کہتے کسی دوسرے آدمی نے اسے بنا کر دیا ہے، کبھی کہتے یہ پریشان خواب و خیال ہیں، کبھی آپ کو دیوانہ قرار دیتے۔ دیکھیے سورۃ انبیاء (۵)، صافات (۳۶)، طور (۲۹) اور سورۃ نحل (۱۰۳) ان تمام باتوں کا اللہ تعالیٰ نے الگ الگ جواب بھی دیا ہے، مگر ان آیات میں ایک ہی جگہ دلیل کے ساتھ سب باتوں کی تردید فرمادی ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿فَلَا أُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُونَ ﴿۳۸﴾ وَمَا لَا تُبْصِرُونَ ﴿۳۹﴾﴾ "پس نہیں! میں قسم کھاتا ہوں اس کی جسے تم دیکھتے ہو! اور جسے تم نہیں دیکھتے!" قسم سے پہلے "لا" کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ درست نہیں۔ قسم کا مقصد کسی بات کی تاکید ہوتا ہے اور عام طور پر قسم اس بات کے لیے دلیل اور شاہد ہوتی ہے، یہاں جس چیز کی قسم کھائی گئی ہے اس میں خالق و مخلوق، ماضی، حال و مستقبل، زمین و آسمان اور دنیا و آخرت، غرض سب کچھ آجاتا ہے۔ قرآن میں مذکور قسموں میں یہ سب سے جامع قسم ہے، یعنی جو کچھ تم دیکھتے ہو اور جو نہیں دیکھتے، میں ان سب کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔

آیت 40: 43 إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ.....: یہ چار آیات جواب قسم ہیں، پہلی یہ کہ یہ قرآن ایک معزز پیغام لانے والے کا قول ہے، دوسری یہ کہ یہ کسی شاعر کا قول نہیں، تیسری یہ کہ یہ کسی کاہن کا قول بھی نہیں اور چوتھی یہ کہ یہ رب العالمین کی طرف سے اتارا گیا ہے۔ اس قسم اور جواب قسم میں مناسبت یہ ہے کہ جو کچھ تم دیکھ رہے ہو وہ ان چاروں چیزوں کے حق ہونے کی شہادت دے رہا ہے اور جو کچھ تم نہیں دیکھ رہے اس کی شہادت بھی یہی ہے۔ جو کچھ وہ دیکھ رہے تھے وہ یہ بات

وَلَا يَقُولُ كَاهِنٌ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ ﴿۳۷﴾ تَنْزِيلٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۳۸﴾

ہے، تم بہت کم نصیحت پکڑتے ہو ﴿۳۷﴾ (یہ) جہانوں کے رب کی طرف سے اتارا ہوا ہے ﴿۳۸﴾

جاننے کے لیے کافی تھا کہ یہ قرآن جس شخص کی زبان سے ادا ہو رہا ہے وہ نہ شاعر ہے نہ کاہن، نہ جھوٹا ہے نہ اپنے پاس سے بات گھڑنے والا اور نہ کسی ذاتی مفاد یا عہدے کا طالب، بلکہ وہ اللہ کا معزز رسول ہے۔ یہی بات ہر قل نے کہی تھی، جب اس نے ابوسفیان سے آپ کے متعلق سوال کیے اور ابوسفیان کو آپ کے اوصاف حمیدہ کی شہادت دینا پڑی۔ (دیکھیے بخاری: ۷) اور یہی بات آپ نے اللہ کے حکم سے اہل مکہ سے کہی تھی: ﴿فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِمْ أَفَلَا تَعْقِلُونَ﴾ (یوسف: ۱۰۰) "اطمان نبوت سے پہلے میں نے (چالیس سال کی) ایک عمر تم میں گزارا ہے، کیا تم عقل نہیں کرتے؟" وہ رسول اللہ ﷺ کے اعلیٰ اخلاقی، صدق و امانت، ایفائے عہد اور لوگوں کے ساتھ ہمدردی کو بھی دیکھ رہے تھے اور شاعروں کے جھوٹ، مبالغے، قول و فعل کے تضاد اور خوشامد و تملق جیسی کمینگیوں کو بھی جانتے تھے۔

۲ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی کہی ہوئی باتوں کا بھی مشاہدہ کیا تھا کہ نہ ماضی کے متعلق آپ کی بتائی ہوئی کوئی بات خلاف واقعہ نکلی نہ آئندہ کے متعلق آپ کی کوئی پیش گوئی غلط ثابت ہوئی اور کائناتوں کی غیب کے متعلق بتائی باتوں کا بھی تجربہ کیا تھا کہ ان کی ملامتی سے چرائی ہوئی کوئی ایک بات اگر درست نکلتی ہے تو سو باتیں جھوٹ بھی نکلتی ہیں۔ شاعروں اور کاتبوں کے مقابلے میں آپ کے احوال کا مشاہدہ اس بات کے یقین کے لیے کافی تھا کہ آپ نہ شاعر ہیں نہ کاہن۔ انھیں اپنی فصاحت و بلاغت پر ناز تھا، مگر وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ قرآن مجید کے چیلنج کے باوجود وہ اس کے مقابلے میں ایک چھوٹی سی سورت بھی نہیں آسکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو کچھ تم دیکھتے ہو وہ بھی شہادت دے رہا ہے کہ یہ قرآن ایک معزز رسول کی زبان سے پہنچایا جا رہا ہے۔ یہ نہ کسی شاعر کا کلام ہے، نہ کاہن کا اور جو کچھ تم نہیں دیکھتے خواہ وہ عقل سے سمجھ میں آنے والی چیزیں ہوں، جو حواس خمسہ کی دسترس سے باہر ہیں یا عقل سے بھی ماورا ہوں، سب کی شہادت وہی ہے جو تمہاری دیکھی ہوئی چیزوں کی ہے۔ میں ہر چیز کو پیدا کرنے والا اس بات پر تمہاری دیکھی ہوئی اور تمہاری نہ دیکھی ہوئی تمام چیزوں کی قسم اٹھاتا ہوں۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس مقام پر قرآن کو رسول اللہ ﷺ کا قول قرار دیا گیا ہے، جب کہ سورہ مدثر (۲۵) میں اس شخص کو جنہم کی وعید سنائی گئی ہے جس نے کہا تھا: ﴿إِن هَذَا إِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ﴾ کہ یہ قرآن تو بشر کا قول ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ سورہ مدثر میں جنہم کی وعید اس لیے سنائی گئی کہ اس شخص نے قرآن کو بشر کا اپنا قول قرار دیا تھا، جب کہ زیر تفسیر آیت میں اسے بشر کا یا انسان کا اپنا قول نہیں کہا گیا بلکہ اسے رسول کریم، یعنی ایک معزز پیغام لانے والے کا قول کہا گیا ہے۔ ظاہر ہے پیغام لانے والے کی بات اپنی نہیں ہوتی بلکہ اسے جو پیغام دے کر بھیجا جاتا ہے وہ اسے آگے پہنچا دیتا ہے۔ اگر وہ اپنی بات کرتا ہے تو وہ رسول نہیں۔ اس کی ایک اور دلیل بعد میں آنے والی آیت "تَنْزِيلٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ" (یہ رب العالمین کی طرف سے اتارا گیا ہے) بھی ہے۔ بشر کی اپنی بات میں اور قاصد ہونے کی حیثیت سے پہنچائی ہوئی بات میں جو فرق ہے

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ ﴿۳۳﴾ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ﴿۳۴﴾ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ
الْوَتِينَ ﴿۳۵﴾ فَمَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ ﴿۳۶﴾

اور اگر وہ ہم پر کوئی بات بنا کر لگا دیتا ﴿۳۳﴾ تو یقیناً ہم اس کو دائیں ہاتھ سے پکڑتے ﴿۳۴﴾ پھر یقیناً ہم اس کی جان کی
رگ کاٹ دیتے ﴿۳۵﴾ پھر تم میں سے کوئی بھی (ہمیں) اس سے روکنے والا نہ ہوتا ﴿۳۶﴾

وہ بالکل واضح ہے۔ سورہ ہنکویر میں جو قرآن مجید کو ”رسول کریم“ کا قول قرار دیا گیا ہے، وہاں اس سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں، کیونکہ
وہاں انہی کی صفتیں بیان ہوئی ہیں، مثلاً: ﴿ذِي قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ ﴿۲۰﴾ مُطَاعٍ ثُمَّ أَمِينٍ ﴿۲۱﴾﴾ [النکویر: ۲۰، ۲۱]
”بڑی قوت والا ہے، عرش والے کے ہاں بہت مرتبے والا ہے۔ وہاں اس کی بات مانی ہوئی ہے، امانت دار ہے۔“
بعض مفسرین نے یہاں بھی جبریل علیہ السلام مراد لیے ہیں مگر یہاں نبی ﷺ مراد لینا زیادہ مناسب ہے، کیونکہ یہاں قرآن کو
رسول کریم کا قول قرار دینے کے بعد فرمایا، یہ کسی شاعر یا کاہن کا قول نہیں۔ ظاہر ہے کہ کفار مکہ جبریل علیہ السلام کو نہیں بلکہ نبی
کریم ﷺ کو شاعر و کاہن قرار دیتے تھے۔ بہر حال اسے جبریل علیہ السلام کا قول قرار دیا جائے یا رسول اللہ ﷺ کا، دونوں صورتوں
میں ان کا قول اس حیثیت سے ہے کہ وہ رسول تھے اور انہوں نے وہی آگے پہنچایا جو دے کر انہیں بھیجا گیا تھا۔ ”کاہن“
ستاروں وغیرہ کا حساب لگا کر یا جنوں سے سن کر غیب کی خبریں بتانے والا۔

آیت 44: 47 وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ ان آیات میں کفار کی اس بات کا رد ہے کہ یہ باتیں
رسول اللہ ﷺ نے اپنے دل سے بنا کر اللہ کے ذمے لگا دی ہیں۔ فرمایا جب یہ ثابت ہو گیا کہ آپ اللہ کے سچے رسول ہیں
اور آپ کی کہی ہوئی ہر بات اللہ کی بات ہے تو اب اگر اللہ تعالیٰ انہیں اپنے ذمے باتیں لگانے دے اور اس پر انہیں کچھ نہ
کہے تو وہ سب باتیں اللہ کی باتیں سمجھی جائیں گی، اللہ تعالیٰ اس کی اجازت کس طرح دے سکتا ہے؟ فرمایا، اگر ہمارا یہ سچا رسول
کوئی بات گھڑ کر ہمارے ذمے لگا دیتا تو اس جعل سازی کے جرم میں ہم اس کا دایاں ہاتھ پکڑ کر اس کی جان کی رگ کاٹ
دیتے اور کوئی شخص رستے میں رکاوٹ نہ بن سکتا۔

بعض لوگوں نے اس آیت سے غلط استدلال کیا ہے کہ اگر کسی مدعی نبوت کی جان کی رگ دعوائے نبوت کرتے ہی نہ
کاٹ دی جائے تو یہ اس کے نبی ہونے کی دلیل ہے، حالانکہ اس آیت میں جو بات فرمائی گئی ہے وہ سچے نبی کے بارے میں
ہے، نبوت کے جھوٹے مدعیوں کے بارے میں نہیں ہے۔ جھوٹے مدعی تو نبوت ہی نہیں خدائی تک کے دعوے کرتے ہیں اور
مدتوں زمین پر دندناتے رہتے ہیں، یہ ان کے سچے ہونے کا ثبوت نہیں۔ اس کی مثال یوں سمجھیں کہ جس طرح بادشاہ کسی شخص
کو کسی منصب پر مقرر کر کے سند وغیرہ دے کر کسی طرف روانہ کرتے ہیں، اب اگر وہ کوئی بات جھوٹ گھڑ کر بادشاہ کے ذمے لگا
دے تو فوراً بادشاہ کی طرف سے اس کی تردید کی جاتی ہے اور ایسا کرنے والے کو سخت سزا دی جاتی ہے، لیکن اگر کوئی سزک
کوٹنے والا مزدور یا صفائی کرنے والا بھنگی اعلان کرتا پھرے کہ بادشاہ نے یہ حکم جاری کیا ہے تو نہ سننے والے اس کی پروا کرتے

وَإِنَّهُ لَتَذِكْرٌ لِّلْمُتَّقِينَ ﴿۴۸﴾ وَإِنَّا لَنَعْلَمُ أَنَّ مِنكُم مُّكَذِّبِينَ ﴿۴۹﴾ وَإِنَّهُ لَحَسْرَةٌ عَلٰی
الْكَافِرِينَ ﴿۵۰﴾

اور بے شک یہ (قرآن) ڈرنے والوں کے لیے یقیناً ایک نصیحت ہے ﴿۴۸﴾ اور بلاشبہ یقیناً ہم جانتے ہیں کہ
بے شک تم میں سے کچھ لوگ جھٹلانے والے ہیں ﴿۴۹﴾ اور بے شک وہ یقیناً کافروں کے لیے حسرت (کا باعث) ہے ﴿۵۰﴾

میں اور نہ حکومت فوراً اس سے قرض کرتی ہے۔ ہمارے زمانے کے دجال قادیانی کا اس آیت سے استدلال اور خود اس کے
کلام میں سے اس کا رد دیکھنے کے لیے تفسیر ثنائی ملاحظہ فرمائیں۔ [فَإِنَّهُ كَفَرِيٌّ وَشَفِيٌّ رَّحِمَةُ اللَّهِ تَعَالَى رَحْمَةً وَاسِعَةً]
”تَقْوَل“ کا معنی ہے، کسی کے ذمے وہ بات لگانا جو اس نے نہیں کہی۔ ”الْأَقَاوِيلِ“ ”أَقْوُونَة“ کی جمع ہے، جس طرح
”أَعْمُونَةُ“ اور ”أَضْحُونَةُ“ کی جمع ”أَعْجَابُ“ اور ”أَصْحَابُ حَيْثُ“ ہے۔ ”لَا تَهْدِنَا رَبَّنَا بِالْيَمِينِ“ سے مراد یا تو یہ ہے کہ
ہم اس کا دایاں ہاتھ پکڑ کر اس کی گردن کی رگ کاٹ دیتے۔ یہ سزا کی ہولناکی دکھانے کے لیے قتل کی تصویر کشی ہے، کیونکہ
جب قتل کرنے والا کسی مجرم کو تلوار مارنے لگتا ہے تو اس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ خود اپنے دائیں
ہاتھ سے پکڑ کر اس کی رگ جاں کاٹ دیتے۔ بعض مفسرین نے ”الْيَمِينِ“ کا معنی قوت کیا ہے، یعنی ہم اسے پوری قوت سے
پکڑ کر اس کی رگ جاں کاٹ دیتے۔ عرب کے محاورہ میں یہ معنی بھی استعمال ہوتا ہے، مگر یہ معنی کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے
ہاتھوں کا انکار کر دینا درست نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿بَلْ يَدُّكَ مَبْسُوطَةٌ﴾ [شعراء: ۶۱] ”بلکہ اللہ کے دونوں
ہاتھ کھلے ہوئے ہیں۔“ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿بَلَّغْنَا يَدَيْ رَبِّي نِيْمِينَ مُبَارَكَةً﴾ [ترمذی، تفسیر القرآن، باب:
۲۳۶۸، مسند: ۱۸۲۷] ”میرے رب کے دونوں ہاتھ دائیں اور برکت والے ہیں۔“ البتہ اس بات میں شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ
کے ہاتھ ہمارے ہاتھوں جیسے نہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ [الشوری: ۱۱] ”اس کی مثل کوئی چیز نہیں۔“ بلکہ
اس طرح ہیں جس طرح اس کی شان کے لائق ہیں۔ ”الْوَتِينَ“ گردن کی وہ رگ جو دل سے ملتی ہے، جس کے کٹنے سے
آدی فوراً مر جاتا ہے۔ (اشرف المحاشی)

آیت 48 وَإِنَّهُ لَتَذِكْرٌ لِّلْمُتَّقِينَ : یعنی اس نصیحت سے فائدہ وہی اٹھائیں گے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے ہیں۔

آیت 49 وَإِنَّا لَنَعْلَمُ : ”إِنَّا لَنَعْلَمُ“ (ہم جانتے ہیں) کا مطلب یہ ہے کہ ہم ان جھٹلانے والوں کو سزا دیں گے،
جیسے فسادیوں کو ڈانٹنے کے لیے کہا جاتا ہے کہ تم جو کچھ کر رہے ہو سب ہمیں معلوم ہے۔

آیت 50 وَإِنَّهُ لَحَسْرَةٌ ... : یعنی یہ جھٹلانا کفار کے لیے باعث حسرت ہو گا یا یہ قرآن کفار کے لیے باعث حسرت و
افسوس ہو گا کہ انھوں نے اسے کیوں جھٹلایا۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿رَبِّمَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ كَانُوا مُسْلِمِينَ﴾ [نحسہ:
۲] ”بہت بار کافر آرزو کریں گے کہ کاش! وہ کسی طرح کے مسلم ہوتے۔“

وَ إِنَّكَ لَحَقُّ الْيَقِينِ ﴿٥١﴾ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ ﴿٥٢﴾

اور بلاشبہ وہ یقیناً ثابت شدہ یقین ہے ﴿٥١﴾ پس اپنے بہت عظمت والے رب کے نام کی تسبیح کر ﴿٥٢﴾

آیت 51 **وَ إِنَّكَ لَحَقُّ الْيَقِينِ**: ”حَقُّ“ جو ثابت ہو اور ”الْيَقِينِ“ وہ بات جس میں کوئی شک نہ ہو۔ قرآن مجید سے یقین کے تین درجے معلوم ہوتے ہیں، پہلا علم الیقین، وہ یقین جو خبر وغیرہ سے معلوم ہو جائے، جیسے فرمایا: ﴿كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عَالِمُ الْيَقِينِ ﴿٥١﴾ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ ﴿٥٢﴾﴾ [النکات: ٦٠، ٥] ”ہرگز نہیں، کاش! تم یقینی جاننا جان لیتے کہ تم ضرور جہنم کو دیکھو گے۔“ دوسرا عین الیقین، وہ یقین جو آنکھوں کے دیکھنے سے حاصل ہو۔ آنکھوں سے دیکھی ہوئی بات کا یقین سنی ہوئی بات کے یقین سے قوی ہوتا ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿لَيْسَ الْعَجْبُ كَالْمَعَانِيَةِ﴾ [مسند احمد: ٢١٥/١، ج: ١٨٤٢۔ صحیح الجامع الصغیر: ٥٣٧٣] ”سننا دیکھنے کی طرح نہیں۔“ ابراہیم علیہ السلام نے ”رَبِّ ارْنِي كَيْفَ تُنْجِي النُّوْتِي“ کہہ کر یقین کے اس مرتبہ کی درخواست کی تھی۔ (دیکھیے بقرہ: ٢٦٠) تیسرا حق الیقین، وہ یقین جو کسی چیز کو خود استعمال کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ اس وقت وہ ہر طرح سے پختہ اور ثابت ہو جاتا ہے۔ یہ پہلے دونوں درجوں سے بڑھ کر ہے۔ ان تینوں درجوں کی مثال یہ ہے کہ اہل ایمان کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے بتانے سے جنت کا یقین ہے، یہ علم الیقین ہے۔ جب میدانِ محشر میں جنت قریب لائی جائے گی (دیکھیے شعراء: ٩٠) اور وہ اپنی آنکھوں سے اسے دیکھ لیں گے تو یہ عین الیقین ہے۔ پھر جب اس میں داخل ہوں گے اور اس کی نعمتوں سے لذت اٹھائیں گے تو انھیں حق الیقین حاصل ہوگا۔ فرمایا یہ قرآن حق الیقین ہے، یعنی قرآن میں جو علوم و معارف اور حقائق بیان ہوئے ہیں، جو شخص ان کی لذت سے آشنا ہو جائے اس کے لیے یہ ہر طرح سے ثابت شدہ یقین ہے۔ (خلاصہ بدائع التفسیر و تفسیر عبدالرحمن السعدی)

آیت 52 **فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ**: یعنی یہ مائیں یا نہ مائیں، آپ اپنے عظمت والے رب کے نام کی، جس کا یہ کلام ہے، تسبیح بیان کرتے رہیں۔ اس کی برکت سے آپ کے لیے ہر مشکل آسان ہو جائے گی۔ اس آیت کے بعد بھی اور رکوع میں بھی ”سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيمِ“ پڑھنا چاہیے۔ حذیفہ رضی اللہ عنہما ایک دفعہ رات رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز میں کھڑے ہو گئے، آپ ﷺ نے ایک ہی رکعت میں سورہ بقرہ، نساء اور آل عمران پڑھیں۔ حذیفہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ آپ ٹھہر ٹھہر کر قرآن پڑھتے رہتے، جب آپ کسی ایسی آیت پر سے گزرتے جس میں تسبیح کا ذکر ہوتا تو آپ تسبیح پڑھتے، جب کسی سوال والی آیت پر سے گزرتے تو سوال کرتے، جب پناہ مانگنے کی آیت پر سے گزرتے تو پناہ مانگتے۔ پھر آپ نے رکوع کیا اور آپ ”سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيمِ“ پڑھتے رہے، آپ کا رکوع قیام کی مثل تھا۔ پھر آپ نے ”سَمِعَ اللَّهُ لِمَنْ حَمِدَهُ“ کہا، پھر آپ رکوع کے قریب دیر تک کھڑے رہے پھر آپ نے سجدہ کیا اور سجدہ میں ”سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَى“ پڑھتے رہے۔ [مسلم، صلاة المسافرين، باب استحباب تطويل القراءة في صلوة الليل: ٧٧٢]



سَأَلَ سَائِلٌ بِعَذَابٍ وَاقِعٍ ۝۱ لِّلْكَافِرِينَ لَيْسَ لَهُ دَافِعٌ ۝۲ مِّنَ اللَّهِ ذِي الْمَعَارِجِ ۝۳

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

ایک سوال کرنے والے نے اس عذاب کے متعلق سوال کیا جو واقع ہونے والا ہے ① کافروں پر، اسے کوئی ہٹانے

والا نہیں ② اللہ کی طرف سے، جو سیرھیوں والا ہے ③

آیت 2.1 ① سَأَلَ سَائِلٌ بِعَذَابٍ وَاقِعٍ..... : اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ ایک پوچھنے والے نے عذاب کے متعلق سوال کیا ہے (کہ وہ کب آئے گا؟) اس صورت میں ”باء“ بمعنی ”عَنْ“ ہوگی اور مراد وہ کفر یہ سوال ہے جو وہ بار بار عذاب کو جھٹلانے اور مذاق کرنے کے لیے کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هٰذَا الْوَعْدُ إِن كُنْتُمْ صٰدِقِينَ﴾ [الملك: ۲۵] ”اور وہ کہتے ہیں کہ وہ (عذاب کا) وعدہ کب پورا ہوگا، اگر تم سچے ہو؟“ دوسرا معنی یہ ہے کہ ایک مانگنے والے نے عذاب مانگا ہے۔ اس سے مراد کفار کے سرکش لوگوں کی وہ دعا ہے جس میں انھوں نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی تھی کہ اے اللہ! محمد (ﷺ) جو کچھ لے کر آئے ہیں اگر یہ حق ہے تو تو ہم پر آسمان سے پتھر برسسا، یا ہم پر کوئی درد ناک عذاب لے آ۔ (دیکھیے انفال: ۳۲) اور کفار کا وہ مطالبہ بھی مراد ہے جو وہ رسول اللہ ﷺ سے کرتے رہتے تھے کہ ہم پر جلد از جلد عذاب لے آؤ، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ﴾ [العنكبوت: ۵۲] ”اور یہ لوگ آپ سے جلدی عذاب لانے کا سوال کرتے ہیں۔“

اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا، پوچھنے والا عذاب کے متعلق پوچھتا ہے کہ وہ کب آئے گا؟ مانگنے والا مطالبہ کرتا ہے کہ عذاب لے آؤ، تو سن لو کہ وہ عذاب کافروں پر ضرور آ کر رہے گا اور کوئی اسے ہٹا نہیں سکے گا، مگر وہ اپنے وقت پر آئے گا۔ آپ ان کے مطالبے پر نہ اس کے جلدی آنے کا سوال کریں اور نہ ان کے مذاق اڑانے پر کسی قسم کی بے صبری کا مظاہرہ کریں، وہ اسے دور خیال کر رہے ہیں اور ہمیں وہ بالکل قریب نظر آ رہا ہے۔

② لِّلْكَافِرِينَ لَيْسَ لَهُ دَافِعٌ : ”لِّلْكَافِرِينَ“ یا تو ”وَاقِعٍ“ کے متعلق ہے، یعنی وہ عذاب کافروں پر واقع ہونے والا ہے، کوئی اسے ہٹا نہیں سکتا، یا ”دَافِعٌ“ کے متعلق ہے، یعنی کافروں سے اسے کوئی ہٹانے والا نہیں۔

آیت 3 مِّنَ اللَّهِ ذِي الْمَعَارِجِ : ”الْمَعَارِجِ“ ”عَرَجٌ يَعْرُجُ“ (ن) سے ”مِعْرَجٌ“ کی جمع ہے، چڑھنے کا آلہ، سیرھی، زینہ۔ یعنی اس عذاب کو معمولی نہ سمجھو، بلکہ وہ اس اللہ کی طرف سے ہوگا جو سیرھیوں والا ہے، یعنی اس کی ذات بہت ہی بلند ہے۔ فرشتوں کو اس کے حضور پیش ہونے کے لیے کئی سیرھیوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ ”الْمَعَارِجِ“ (سیرھیوں) سے مراد آسمان ہیں، کیونکہ فرشتے آسمانوں پر چڑھتے ہوئے سدرۃ المنتہیٰ کے پاس اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہوتے ہیں۔

تَعْرُجُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ إِلَيْهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ ۝

فرشتے اور روح اس کی طرف چڑھتے ہیں، (وہ عذاب) ایک ایسے دن میں (ہوگا) جس کا اندازہ پچاس ہزار سال ہے ۝

آیت 4: ① تَعْرُجُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ إِلَيْهِ: فرشتے اور روح اس کی طرف چڑھتے ہیں۔ یہاں ”الرُّوحُ“ سے مراد یا تو جبریل علیہ السلام ہیں، کیونکہ قرآن میں ان کا نام ”الرُّوحُ“ ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿نَزَّلْنَا بِهِ الرُّوحَ الْأَمِينُ لِيُخَبِّرَكَ عَلَى قَلْبِكَ﴾ [الشعراء: ۱۹۳، ۱۹۴] ”اس قرآن کو روح الامین نے تمہارے دل پر نازل کیا ہے۔“ اور دوسری جگہ فرمایا: ﴿قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَى قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ﴾ [البقرة: ۹۷] ”کہہ دو جو جبریل کا دشمن ہے (وہ اس کا کیا بگاڑ سکتا ہے؟) کیونکہ بلاشبہ اس نے تو اسے تمہارے دل پر اللہ کے حکم سے نازل کیا ہے۔“ دونوں آیتیں ملانے سے ثابت ہوتا ہے کہ ”الرُّوحُ“ سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں۔ فرشتوں سے ان کا الگ ذکر ان کی عظمت شان کی وجہ سے ہے۔ یا مراد مومنوں کی ارواح ہیں، کیونکہ نیک لوگ جب فوت ہوتے ہیں تو فرشتے ان کی ارواح کو آسمان کی طرف لے کر جاتے ہیں تو آسمانوں کے دروازے ان کے لیے کھلتے چلے جاتے ہیں، جیسا کہ ابو ہریرہ اور براء بن عازب رضی اللہ عنہما کی صحیح حدیث میں آیا ہے۔ ا دیکھیے سنن ابی داؤد، باب ما نطق به المومن . : ۱۸۳۴۔ ابوداؤد : ۴۷۵۳ | البتہ اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھٹلانے والوں کی ارواح کو لے کر فرشتے چڑھتے ہیں تو ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جاتے۔ دیکھیے سورہ اعراف (۴۰) اور مذکورہ بالا احادیث۔

اس آیت سے اللہ تعالیٰ کی ذات کا بلندی پر ہونا اور فرشتوں اور روح کا اس کی طرف چڑھنا صاف ثابت ہو رہا ہے۔ وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے اوپر کی جانب ہونے اور عرش پر ہونے کے منکر ہیں وہ قرآن مجید کی صریح آیات سن کر بھی یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے کہ ان کا رب اوپر کی جانب ہے۔ دلیل یہ دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ زمان و مکان کی قیود سے منزہ ہے، حالانکہ یہ کسی نے کہا ہی نہیں کہ بلندی یا عرش اس کے لیے قید ہے یا وہ ان کا محتاج ہے۔

② ”فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ“ (ایک ایسے دن میں جس کا اندازہ پچاس ہزار سال ہے) کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک تو یہ کہ فرشتے اور روح اس کی طرف چڑھتے ہیں ایک ایسے دن میں جس کا اندازہ پچاس ہزار سال ہے، یعنی وہ اتنی بلندی پر ہے کہ فرشتوں اور روح کو اس کی بارگاہ میں پہنچنے کے لیے اتنی بلندیوں پر چڑھنا پڑتا ہے کہ کوئی اور چڑھے تو اسے پچاس ہزار سال لگ جائیں، مگر فرشتے اور روح وہ فاصلہ ایک دن میں طے کر لیتے ہیں۔ (ابن جریر) واضح رہے کہ پچاس ہزار سال کا عدد بھی صرف فاصلے کی دوری بیان کرنے کے لیے ہے، کیونکہ انسان کی محدود نظروں نے آلات کی مدد سے جو کچھ دیکھا ہے اس سے آسمان کے نیچے ہی اتنی وسیع کہکشائیں معلوم ہوئی ہیں کہ زمین سے ان کے ستاروں کے فاصلے ماپنے کے لیے ”نوری سال“ کی اصطلاح وضع کرنا پڑی۔ عربی زبان میں پچاس، سو، ہزار وغیرہ کا عدد کثرت کے بیان کے لیے عام استعمال ہوتا ہے، اس سے مراد گنتی نہیں ہوتی۔ فرشتے اور روح اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی قوت و سرعت کی بدولت

قَاصِدٌ صَبْرًا جَمِيلًا ⑤ إِنَّهُمْ يَرَوْنَكَ بَعِيدًا ⑥ وَ تَرَاهُ قَرِيبًا ⑦

پس تو صبر کر، بہت اچھا صبر ⑤ بے شک وہ اسے دور خیال کر رہے ہیں ⑥ اور ہم اسے قریب دیکھ رہے ہیں ⑦

تحت الثریٰ سے لے کر ساتوں آسمانوں کے اوپر تک پچاس ہزار سال کا یہ فاصلہ ایک ہی دن میں طے کر لیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس کی قدرت سے ہر کام سات آسمانوں پر سے اتنی جلدی ہو جاتا ہے تو ان عذاب مانگنے والوں پر عذاب کے آنے میں کیا دیر لگتی ہے، بس تھوڑا سا صبر کریں۔ آیت کے الفاظ کی رو سے یہ معنی قریب ہے، کیونکہ ”فی یومہ“ سے متصل پہلے ہی ”تَعْرُجُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ إِلَيْهِ“ آیا ہے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ عذاب ایک ایسے دن میں واقع ہونے والا ہے جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے، اس دن سے مراد قیامت کا دن ہے۔ اس صورت میں ”فی یومہ“ کا لفظ ”واقع“ کے متعلق ہے۔ یہ معنی زیادہ صحیح ہے، کیونکہ قرآن مجید سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے اور صحیح حدیث سے بھی۔ اس لیے حافظ ابن کثیر اور اکثر مفسرین نے اسی کو راجع قرار دیا ہے۔ سورہ طور کے شروع میں فرمایا: ﴿إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ﴿۱﴾ مَا لَئِمَ مِنْ دَافِعٍ ﴿۲﴾ يَوْمَ تَمُوتُ الْمَنَاتُ ﴿۳﴾ وَ تَسِيرُ الْجِبَالُ سَيْرًا ﴿۴﴾ [طور: ۱-۷] ”یقیناً تیرے رب کا عذاب ضرور ہو کر رہے والا ہے۔ اسے کوئی بٹانے والا نہیں۔ جس دن آسمان لرزے گا سخت لرزنا اور پہاڑ چلیں گے، بہت چلنا۔“ ان آیات میں بھی رب تعالیٰ کا عذاب، جسے کوئی بٹانے والا نہیں، قیامت کے دن واقع ہونا بیان فرمایا گیا ہے۔ زیر تفسیر آیات میں بھی ”فی یومہ کان مقداره خمسين ألف سنة“ کے چند آیات بعد فرمایا: ﴿يَوْمَ تَكُونُ الْمَنَاتُ كَالْمُهْلِ ﴿۱﴾ وَ تَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ ﴿۲﴾ [المعارج: ۹۱، ۹۲] ”یہ پچاس ہزار سال والے دن کا عذاب اس دن ہو گا، جس دن آسمان گھلے ہوئے تانبے کی طرح ہو جائے گا اور پہاڑ رنگین اون کی طرح ہو جائیں گے۔“ جس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ اس سے مراد قیامت کا دن ہے۔ ”إِنَّهُمْ يَرَوْنَكَ بَعِيدًا“ سے بھی یہی ثابت ہو رہا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے زکوٰۃ نہ دینے والے کو قیامت کے دن ہونے والے عذاب کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿حَسْبِيَ بَعْدَكُمْ اللَّهُ تَبَّانِ عِبَادِهِ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ مِمَّا تَعْلَمُونَ﴾ [ابو داؤد، الزکاة، باب فی حقوق النعمان: ۱۶۵۸، مسلم: ۹۸۷] ”(زکوٰۃ نہ دینے والے کو عذاب ہوتا رہے گا) یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے درمیان فیصلہ فرمائے، ایک ایسے دن میں جس کی مقدار تمہاری گنتی سے پچاس ہزار سال ہے۔“ قیامت کے دن کی یہ درازی کفار کے لیے ہوگی اور یہ دوسرے عذاب کے ساتھ بجائے خود ایک عذاب ہوگی، ویسے بھی مصیبت کے دن لمبے ہوتے ہیں۔ رہے اہل ایمان تو وہ اس دن بالکل بے فکر ہوں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ [یونس: ۶۲] ”نہ ان پر کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔“ اور فرمایا: ﴿لَا يَحْزَنُهُمُ الْفَزَعُ الْأَكْبَرُ وَ تَتَلَقَّهُمُ الْمَلَائِكَةُ﴾ [الانبیاء: ۱۰۳] ”انہیں سب سے بڑی گھبراہٹ غمگین نہیں کرے گی اور انہیں فرشتے لینے کے لیے آئیں گے۔“ اور فرمایا: ﴿وَهُمْ مِنْ قَوْمٍ يَوْمِيهِمْ أُولُونَ﴾ [النس: ۸۹] ”اور وہ اس دن گھبراہٹ سے امن میں ہوں گے۔“ خوشی کے دن گزرنے میں دیر بھی نہیں لگتی۔

تہ 7:5 قَاصِدٌ صَبْرًا جَمِيلًا . . . یعنی آپ کفار کی طرف سے عذاب کے مطالبے اور مذاق پر صبر کریں۔ ”صَبْرًا

يَوْمَ تَكُونُ السَّمَاءُ كَالْهَيْلِ ۝ وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ ۝ وَلَا يَسْئَلُ حَبِيمٌ حَبِيْبًا ۝ يُبْصِرُونَهُمْ ۝ يَوْمَ النُّجُومِ لَوْ يَفْتَدِي مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ بِبَنِيهِ ۝ وَصَاحِبَتُهُ وَآخِيهِ ۝ وَفَصِيلَتِهِ الَّتِي تُؤْوِيهِ ۝ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ يُنْجِيهِ ۝ كَلَّا ۝ إِنَّهَا لَكُنْى ۝ نَزَّاعَةٌ لِّلشَّوْىِ ۝

جس دن آسمان پھلے ہوئے تانبے کی طرح ہو جائے گا ۝ اور پہاڑ رنگین اون کی طرح ہو جائیں گے ۝ اور کوئی دلی دوست کسی دلی دوست کو نہیں پوچھے گا ۝ حالانکہ وہ انھیں دکھائے جا رہے ہوں گے۔ مجرم چاہے گا کاش کہ اس دن کے عذاب سے (بچنے کے لیے) فدیے میں دے دے اپنے بیٹوں کو ۝ اور اپنی بیوی اور اپنے بھائی کو ۝ اور اپنے خاندان کو، جو اسے جگہ دیا کرتا تھا ۝ اور ان تمام لوگوں کو جو زمین میں ہیں، پھر اپنے آپ کو بچالے ۝ ہرگز نہیں! یقیناً وہ (جہنم) ایک شعلہ مارنے والی آگ ہے ۝ منہ اور سر کی کھال کو اتار کھینچنے والی ہے ۝

بجیلاً۔ جس میں نہ تنگدلی ہو نہ گھبراہٹ، نہ جلد بازی ہو، نہ شکوہ اور نہ شکایت۔ یہ لوگ اس عذاب کو بعید سمجھ رہے ہیں، کیونکہ ان کا اس پر ایمان نہیں اور ہم اسے قریب دیکھ رہے ہیں، کیونکہ اس کا آنا یقینی ہے اور تمہارے پچاس ہزار سال ہمارے ہاں ایک دن شمار ہوتے ہیں۔

آیت 9.8 : يَوْمَ تَكُونُ السَّمَاءُ كَالْهَيْلِ : ”کالْهَيْلِ“ یعنی آسمان پھلے ہوئے تانبے کی طرح (سرخ اور گرم ہو کر پھٹ جائے گا)۔ (دیکھیے رحمان: ۳۷) ”الْعِهْنُ“ اون، یعنی پہاڑ دھنی ہوئی اون کی طرح بالکل ہلکے ہو کر اڑنے لگیں گے۔ دیکھیے سورہ طہ (۱۰۵)۔ قارہ (۵)۔

آیت 10-14 : وَلَا يَسْئَلُ حَبِيمٌ حَبِيْبًا : کوئی دوست کسی دوست کو نہیں پوچھے گا، اس لیے نہیں کہ وہ دکھائی نہیں دے رہا ہوگا، بلکہ ”يُبْصِرُونَهُمْ“ ہر شخص کو اس کے عزیز دوست دکھائے جا رہے ہوں گے اور آنکھوں کے سامنے ہوں گے۔ نہ پوچھنے کی وجہ یہ ہوگی کہ ہر ایک کو اپنی پڑی ہوگی، مجرم دنیا میں جن جن پر اپنی جان قربان کرتا تھا اس دن سب کو، بلکہ تمام دنیا کے لوگوں کو اپنی جان بچانے کے لیے عذاب الہی کے حوالے کر دینا پسند کرے گا۔ اس مقام پر رشتہ داروں کی ترتیب میں پہلے ان کا ذکر کیا جو سب سے زیادہ محبوب ہیں، یعنی بیٹے، بیوی، بھائی، خاندان اور سورہ عیس (۳۳ تا ۳۶) میں اس کا الٹ ہے۔ ”فَصِيلَتِهِ“ خاندان، کنبہ، کیونکہ وہ قبیلے سے جدا ہوتا ہے۔ ”تُؤْوِيهِ“ ”اُوِيُّ يُوْوِي“ (افعال) جگہ دینا، پناہ دینا۔

آیت 15 : كَلَّا ۝ إِنَّهَا لَكُنْى ۝ نَزَّاعَةٌ لِّلشَّوْىِ ۝ : ”كَلَّا“ یعنی ایسا ہرگز نہیں ہوگا کہ وہ اپنے فدیے میں کسی اور کو عذاب کے حوالے کر کے بچ جائے، بلکہ وہ جہنم ایک شعلہ مارنے والی آگ ہے۔ ”لَكُنْى“ ”لَكُنْى يَلْكُنْى لَكُنْى“ (ع) آگ کا بھڑکنا، شعلے مارنا۔ مصدر بمعنی اسم فاعل برائے مبالغہ ہے۔

آیت 16 : نَزَّاعَةٌ لِّلشَّوْىِ : ”نَزَّاعَةٌ“ مبالغے کا صیغہ ہے، بہت اتار کھینچنے والی۔ ”الشَّوْىِ“ ”شَوَاةُ“ کی جمع ہے،

تَدْعُوا مَنْ أَدْبَرَ وَتَوَلَّى ۱۶ وَ جَمَعَ فَأَوْعَى ۱۷ إِنَّ الْإِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا ۱۸ إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا ۱۹ وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا ۲۰

وہ (ہر) اس شخص کو پکارے گی جس نے پیٹھ پھیری اور منہ موڑا ۱۶ اور (مال) جمع کیا اور اسے بند رکھا ۱۸ بلاشبہ انسان تھڑدلا بنایا گیا ہے ۱۹ جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو بہت گھبرا جانے والا ہے ۲۰ اور جب اسے بھلائی ملتی ہے تو بہت روکنے والا ہے ۲۱

سر اور چہرے کی کھال۔ جمع کا لفظ اس کے اجزا کی وجہ سے لایا گیا ہے۔ مبالغے کے مفہوم میں یہ بھی شامل ہے کہ اس کے شعلے کی لیٹ فوراً ہی سر اور چہرے کی کھال جلا کر اتار کھینچے گی اور یہ بھی کہ وہ کھال بار بار درست ہوتی رہے گی اور آگ کا شعلہ اسے بار بار جلاتا رہے گا، البتہ دل قائم رہے گا تا کہ عذاب کی تکلیف برقرار رہے۔ دیکھیے سورہ نساء (۵۶)۔

آیت 17-18 ① تَدْعُوا مَنْ أَدْبَرَ وَتَوَلَّى: یعنی جن لوگوں نے دنیا میں ایمان کی طرف بلائے جانے پر پیٹھ پھیر لی اور منہ موڑ لیا تھا اب جہنم انہیں اپنی طرف بلائے گی اور اس طرح نہیں بلائے گی کہ چاہیں تو جائیں اور چاہیں تو نہ جائیں۔ ② وَ جَمَعَ فَأَوْعَى: ”اَوْعَى“ ”وَعَاءٌ“ برتن کو کہتے ہیں، یعنی برتن میں بند رکھا۔ پچھلی آیت اور اس آیت سے معلوم ہوا کہ کفار کے جہنم میں جانے کے دو بڑے اسباب ہیں، ایک ایمان نہ لانا بلکہ حق بات سن کر منہ پھیر لینا اور دوسرا شدید بغل۔ دیکھیے سورہ حاقہ (۳۳، ۳۴)۔

③ جہنم کا کلام کرنا ان آیات سے بھی ثابت ہوتا ہے اور سورہ ق کی آیت (۳۰): ﴿وَتَقُولُ هَلْ مِنْ فَرْدٍ﴾ سے بھی۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «يَخْرُجُ عُنُقُ مِنَ النَّارِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ لَهُ عَيْنَانِ تُبْصِرَانِ وَأُذُنَانِ تَسْمَعَانِ وَ لِسَانٌ يَنْطِقُ يَقُولُ إِنِّي وَكُلْتُ بِثَلَاثَةِ بَكُلٍّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ وَبِكُلٍّ مَنْ دَعَا مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ وَبِالْمُصَوِّرِينَ» [ترمذی، صفة جہنم، باب ما جاء فی صفة النار: ۲۵۷۴، وصححه الألبانی] ”قیامت کے دن آگ سے ایک گردن نکلے گی جس کی دو آنکھیں ہوں گی جو دیکھتی ہوں گی اور دو کان ہوں گے جو سنتے ہوں گے اور ایک زبان ہوگی جو بولتی ہوگی۔ وہ کہے گی کہ مجھے تین (قسم کے آدمیوں) پر مقرر کیا گیا ہے، ہر جبار عنید پر اور ہر اس شخص پر جو اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود بنائے اور مصوروں پر۔“ اسی طرح صحیح مسلم میں رسول اللہ ﷺ سے جنت اور دوزخ کی بحث کی حدیث سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے، اس لیے جہنم کے کلام کا انکار کرنا یا اس کی تاویل کرنا درست نہیں۔ قرآن مجید کے مطابق قیامت کے دن زمین بھی بات کرے گی اور ہاتھ پاؤں اور چہرے بھی گفتگو کریں گے، پھر جنت یا جہنم کے بولنے میں کیا تعجب ہے؟

آیت 19-21 ④ إِنَّ الْإِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا.....: یعنی انسان میں پیدائشی طور پر یہ کمزوری رکھی گئی ہے کہ وہ تھڑدلا ہے، بے صبر ہے۔ تکلیف پہنچتی ہے تو بہت گھبرا جاتا ہے، مال یا کوئی اور نعمت ملتی ہے تو روک کر بیٹھ جاتا ہے اور حق داروں کو نہیں دیتا، مگر یہ کمزوری ایسی نہیں کہ انسان اس پر قابو نہ پاسکے۔ اہل ایمان نہ مصیبت میں گھبراتے ہیں اور نہ خوش حالی میں

إِلَّا الْمُصَلِّينَ ﴿۳۳﴾ الَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ ﴿۳۴﴾ وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ ﴿۳۵﴾ لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ﴿۳۶﴾

سوائے نماز ادا کرنے والوں کے ﴿۳۳﴾ وہ جو اپنی نماز پر ہمیشگی کرنے والے ہیں ﴿۳۴﴾ اور وہ جن کے مالوں میں ایک مقرر حصہ ہے ﴿۳۵﴾ سوال کرنے والے کے لیے اور (اس کے لیے) جسے نہیں دیا جاتا ﴿۳۶﴾

اترتے ہیں۔ صحیب رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «عَجَبًا لِأَمْرِ الْمُؤْمِنِ إِنَّ أَمْرَهُ كُلَّهُ خَيْرٌ وَلَيْسَ ذَلِكَ لِأَحَدٍ إِلَّا لِلْمُؤْمِنِ إِنْ أَصَابَتْهُ سَرَاءٌ شَكَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهُ وَ إِنْ أَصَابَتْهُ ضَرَاءٌ صَبَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهُ» [مسلم، الزهد، باب المؤمن أمره كله خير: ۲۹۹۹] "مومن کا معاملہ عجیب ہے کہ اس کے سب کام ہی (اس کے لیے) خیر ہیں اور مومن کے علاوہ یہ چیز کسی کو حاصل نہیں، (اس طرح کہ) اسے کوئی خوشی پہنچتی ہے تو شکر کرتا ہے، سو وہ اس کے لیے خیر ہوتی ہے اور اگر تکلیف پہنچتی ہے تو صبر کرتا ہے، سو وہ (بھی) اس کے لیے خیر ہوتی ہے۔" مگر اس کے لیے کوشش یقیناً کرنا پڑتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «وَمَنْ يَسْتَعِفَّ يُعْفَهِ اللَّهُ وَ مَنْ يَسْتَغْنِ يُغْنِهِ اللَّهُ وَ مَنْ يَصْبِرْ يُصْبِرْهُ اللَّهُ» [مسلم، الزكاة، باب فضل العفف والصبر.....: ۱۰۵۳] "جو شخص سوال سے بچے گا اللہ اسے بچالے گا، جو اللہ سے غنا مانگے گا اللہ اسے غنی کر دے گا اور جو صبر کی کوشش کرے گا اللہ اسے صابر بنا دے گا۔"

آیت 23، 22 إِلَّا الْمُصَلِّينَ..... : مگر نمازی بے صبرے اور تھوڑے نہیں ہوتے، وہ نہ مصیبت پر شکوہ شکایت کرتے ہیں اور نہ نعمت ملنے پر بخل کرتے ہیں۔ نماز کی صحیح ادائیگی سے آدمی میں وہ عزم اور ہمت پیدا ہوتی ہے کہ وہ ایسی تمام کمزوریوں پر قابو پالیتا ہے، کیونکہ روزانہ پانچ وقت دنیا کے کسی لالچ کے بغیر پورے شروط و آداب کے ساتھ نماز ادا کرنا بہت ہی مشکل کام ہے جو اللہ کے خوف اور آخرت پر ایمان کے بغیر ادا ہو ہی نہیں سکتا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ وَأِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْغَاشِقِينَ﴾ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلْقَوْنَ رَبَّهُمْ وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ رُجْعُونَ ﴿۱﴾ البقرة: ۴۵-۴۶ "اور صبر اور نماز کے ساتھ مدد طلب کرو اور بے شک وہ بہت بڑی ہے مگر عاجزی کرنے والوں پر۔ جو سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے رب سے ملنے والے ہیں اور یہ کہ وہ اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔"

آیات (۲۳) تا (۳۳) میں وہ صفات بیان فرمائی ہیں جن کے بغیر نمازی بھی "بلوغ" (تھوڑا) ہی رہتا ہے۔ ان میں سے پہلی صفت اپنی نماز پر ہمیشگی ہے، یہ نہیں کہ کبھی پڑھ لی کبھی چھوڑ دی، کیونکہ جو نبی نماز ترک کرے گا، تو صرف بے صبری اور بخل ہی واپس نہیں آئیں گے بلکہ کفر بھی دوبارہ اس میں پلٹ آئے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «بَيْنَ الْعَبْدِ وَ بَيْنَ الْكُفْرِ تَرْكُ الصَّلَاةِ» [ابو داؤد، السنن، باب في رد الإرجاء: ۴۶۷۸- مسلم: ۸۲] "بندے اور کفر کے درمیان نماز ترک کرنے کی دیر ہے۔"

آیت 25، 24 وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ..... : اس آیت سے معلوم ہوا کہ صدقہ و زکوٰۃ مکہ میں بھی فرض تھے اور وہاں بھی اہل ایمان اپنے اموال میں سے ایک مقرر حصہ نکالتے تھے، کیونکہ یہ سورت مکی ہے، بلکہ مشرکین بھی اپنی کھیتی اور

وَالَّذِينَ يُصَدِّقُونَ بِيَوْمِ الدِّينِ ۗ وَالَّذِينَ هُمْ مِنْ عَذَابٍ مَرْئِيهِمْ مُشْفِقُونَ ﴿٢٦﴾
 إِنَّ عَذَابَ مَرْئِيهِمْ غَيْرُ مَأْمُونٍ ﴿٢٧﴾ وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ ﴿٢٨﴾ إِلَّا عَلَىٰ
 أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ﴿٢٩﴾ فَمَنْ ابْتغَىٰ وَرَاءَ ذَلِكَ
 فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعُدُونَ ﴿٣٠﴾ وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمْتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ ﴿٣١﴾

اور وہ جو جزا کے دن کو سچا مانتے ہیں ﴿۲۶﴾ اور وہ جو اپنے رب کے عذاب سے ڈرنے والے ہیں ﴿۲۷﴾ یقیناً ان کے رب کا عذاب ایسا ہے جس سے بے خوف نہیں ہوا جاسکتا ﴿۲۸﴾ اور وہ جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں ﴿۲۹﴾ مگر اپنی بیویوں پر، یا جس کے مالک ان کے دائیں ہاتھ ہیں، تو یقیناً وہ ملامت کیے ہوئے نہیں ﴿۳۰﴾ پھر جو اس کے علاوہ کوئی راستہ ڈھونڈے تو وہی حد سے گزرنے والے ہیں ﴿۳۱﴾ اور وہ جو اپنی امانتوں کا اور اپنے عہد کا لحاظ رکھنے والے ہیں ﴿۳۲﴾

موشیوں میں سے بتوں کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کا ایک مقرر حصہ نکالتے تھے۔ (دیکھیے انعام: ۱۳۶) اس سے بہت پہلے اسماعیل نبیؑ بھی اپنے اہل کو نماز اور زکوٰۃ کا علم دیا کرتے تھے۔ (دیکھیے مریم: ۵۵) ہاں زکوٰۃ کا موجودہ مخصوص نصاب مدینہ میں مقرر ہوا، اتنے فرض کی ادائیگی کے بغیر تو آدمی مسلمان ہی نہیں ہوتا۔ البتہ اہل ایمان کی کوشش ہوتی ہے کہ اس کے علاوہ بھی اللہ کی راہ میں خرچ کریں، یہ ہر شخص کی اپنی صوابدید ہے کہ وہ اس کی راہ میں کتنا حصہ مقرر کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرتا ہے۔ صحیح مسلم میں ایک شخص کا واقعہ مذکور ہے جس کا نام لے کر بادلوں کو حکم ہوا کہ اس کے باغ کو پانی پلائیں۔ وہ شخص اپنے باغ کی آمدنی کے تین حصے کرتا تھا، جس میں سے ایک حصہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتا تھا۔ دیکھیے مسلم: ۲۹۸۱ | حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کیے بغیر بے صبری اور بخل کی کمینگی دور ہو ہی نہیں سکتی۔ ”الْمَخْرُوفُ“ میں وہ بھی شامل ہے جس کا کوئی ذریعہ معاش نہیں یا کسی آفت کی وجہ سے اپنے سرمایہ سے محروم ہو گیا ہے اور وہ بھی جسے ضرورت مند ہونے کے باوجود سوال نہ کرنے کی وجہ سے کچھ نہیں دیا جاتا۔

آیت ۲۶، ۲۸ وَالَّذِينَ يُصَدِّقُونَ بِيَوْمِ الدِّينِ یعنی ان کے اعمال کا اصل محرک قیامت پر ایمان اور رب تعالیٰ کے عذاب کا خوف ہے۔

آیت ۲۹، ۳۱ وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ ان آیات سے بیوی اور لونڈی کے علاوہ جنسی خواہش پوری کرنے کے تمام ذرائع مثلاً زنا، حد، لڑکوں یا جانوروں سے بد فعلی اور استمناء بالید وغیرہ کی حرمت ثابت ہوئی، بلکہ ان اسباب کی حرمت بھی معلوم ہوئی جو آدمی کو ان چیزوں کی طرف لے جاتے ہیں۔ مثلاً عریانی، غیر محرموں سے میل جول، گناہ پر ابھرنے والے گیت، ناول، افسانے اور فلمیں وغیرہ۔ مزید دیکھیے سورہ مومنون (۵ تا ۷)۔

آیت ۳۲ وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمْتِهِمْ امانت و عہد کی حفاظت ایمان کی اور خیانت و بد عہدی نفاق کی علامت ہے، جیسا کہ نفاق کی علامات والی مشہور حدیث میں ہے۔ (دیکھیے بخاری: ۳۳ - مسلم: ۵۸ | ”أَمَانَاتُ“ کو جمع لانے سے مراد

وَالَّذِينَ هُمْ بِشَهَادَتِهِمْ قَائِمُونَ ﴿٣٣﴾ وَالَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ ﴿٣٤﴾ أُولَٰئِكَ فِي جَنَّةٍ مُّكْرَمُونَ ﴿٣٥﴾ فَمَالِ الَّذِينَ كَفَرُوا قِبَلَكَ مُهْطِعِينَ ﴿٣٦﴾ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِينَ ﴿٣٧﴾ أَيُطْعَمُ كُلُّ امْرِئٍ مِنْهُمْ أَنْ يُدْخَلَ جَنَّةً نَّعِيمٍ ﴿٣٨﴾ كَلَّا ۚ إِنَّا خَلَقْنَاهُمْ مِمَّا يَعْلَمُونَ ﴿٣٩﴾

اور وہ جو اپنی گواہیوں پر قائم رہنے والے ہیں ﴿٣٣﴾ اور وہ جو اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں ﴿٣٤﴾ یہی لوگ جنتوں میں عزت دیے جانے والے ہیں ﴿٣٥﴾ پھر ان لوگوں کو جنہوں نے کفر کیا، کیا ہے کہ تیری طرف دوڑتے چلے آنے والے ہیں ﴿٣٦﴾ دائیں اور بائیں طرف سے ٹولیاں بن کر ﴿٣٧﴾ کیا ان میں سے ہر آدمی طمع رکھتا ہے کہ اسے نعمت والی جنت میں داخل کیا جائے گا؟ ﴿٣٨﴾ ہرگز نہیں! یقیناً ہم نے انہیں اس چیز سے پیدا کیا ہے جسے وہ جانتے ہیں ﴿٣٩﴾

یہ ہے کہ وہ صرف مال ہی نہیں بلکہ ہر اس امانت کی حفاظت کرتے ہیں جس کی ادائیگی اللہ تعالیٰ یا بندوں کی طرف سے ان کے ذمے ہے۔ اس میں نماز، روزہ اور دوسری فرض عبادات اور واجب حقوق العباد سب شامل ہیں۔

آیت 33 : وَالَّذِينَ هُمْ بِشَهَادَتِهِمْ قَائِمُونَ : شہادتوں پر قائم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ حق کی شہادت نہ چھپاتے ہیں، نہ ادا کرنے سے انکار کرتے ہیں، نہ جھوٹی شہادت دیتے ہیں اور نہ شہادت کی ادائیگی کے وقت اس میں کوئی ہیرا پھیری کرتے ہیں، کیونکہ یہ سب کام نفاق و کفر کے کام ہیں۔ ”شہادات“ میں ایمان، توحید و رسالت اور لوگوں کے باہمی معاملات، غرض ہر حق بات کی شہادت شامل ہے۔

آیت 34 : وَالَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ : نمازیوں کے اوصاف کا آغاز نماز پر بیشکی سے کیا اور ان کا اختتام نماز پر محافظت سے کیا ہے۔ اس سے نماز کی اہمیت صاف واضح ہو رہی ہے۔ محافظت سے مراد اس کے اوقات کا خیال رکھنا اور اس کے شروط و ارکان کی صحیح ادائیگی کا خیال رکھنا ہے۔ منافق نہ صحیح وقت پر نماز پڑھتا ہے اور نہ اطمینان و سکون سے اس کے ارکان کو درست طریقے سے ادا کرتا ہے۔ اُس ﷺ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ فرما رہے تھے : « تِلْكَ صَلَاةُ الْمُنَافِقِ يَجْلِسُ يَرْقُبُ الشَّمْسَ حَتَّىٰ إِذَا سَكَتَتْ بَيْنَ قَرْنَيْ الشَّيْطَانِ قَامَ فَنَفَرَهَا أُرْبَعًا لَا يَذْكُرُ اللَّهَ فِيهَا إِلَّا قَلِيلًا » [مسلم، المساجد، باب استحباب التكبیر بالصبح بالعصر : ٦٢٢] ”یہ منافق کی نماز ہے کہ بیٹھ کر سورج کا انتظار کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ شیطان کے دو سینگوں کے درمیان ہو جاتا ہے (یعنی غروب ہونے کے قریب ہو جاتا ہے) تو اٹھ کر اس کے لیے چار ٹھونگے مار لیتا ہے، اس میں اللہ کا ذکر نہیں کرتا مگر کم۔“

آیت 35 : أُولَٰئِكَ فِي جَنَّةٍ مُّكْرَمُونَ : یہی لوگ ہیں جو تھمڑ دی، بے صبری اور شدید نجل سے محفوظ ہیں اور انہی کو جنتوں میں عزت عطا ہوگی۔

آیت 36-39 : فَمَالِ الَّذِينَ كَفَرُوا : ”مُهْطِعِينَ“ ”أَهْطَعَ يَهْطَعُ“ (افعال) سے اسم قائل ہے، تیزی سے کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

فَلَا أُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ إِنَّا لَقَدِرُونَ ﴿۴۰﴾ عَلَىٰ أَنْ تُبَدِّلَ خَيْرًا مِنْهُمْ ﴿۴۱﴾
وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ ﴿۴۱﴾

پس نہیں! میں قسم کھاتا ہوں مشرقوں اور مغربوں کے رب کی! کہ بے شک ہم یقیناً قدرت رکھنے والے ہیں ﴿۴۰﴾ اس پر کہ ان کی جگہ ان سے بہتر لوگ لے آئیں اور ہم ہرگز عاجز نہیں ہیں ﴿۴۱﴾

دوڑنے والے۔ ”عِزَّةٌ“ جمع ہے ”عِزَّةٌ“ کی، جو اصل میں ”عِزَّةٌ“ یا ”عِزَّةٌ“ تھا، نولیاں، گردہ۔ کفار رسول اللہ ﷺ کو مذاق کرنے کے لیے نولیاں بنا بنا کر کبھی دائیں طرف سے دوڑے چلے آتے، کبھی بائیں طرف سے، وہ رسول اللہ ﷺ کی تکذیب کرتے، آخرت کو بھی جھٹلاتے اور مذاق سے کہتے کہ اگر بالفرض کوئی جنت ہے بھی تو وہ بھی ہمارے ہی لیے ہے، کیونکہ دنیا میں بھی ہمیں ہی زیادہ نعمتیں ملی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس طرح آنے پر تعجب کا اظہار فرمایا اور فرمایا، کیا ان میں سے ہر شخص اپنے آپ کو اتنا اونچا سمجھنے لگ گیا ہے کہ وہ نعمت والی جنت میں داخل ہونے کی طمع رکھتا ہے؟ ہرگز نہیں! ہم نے انہیں جس چیز سے پیدا کیا ہے اسے وہ خود بھی جانتے ہیں، حقیر قطرے سے پیدا ہونے والے انسان کو یہ تکبر بھلا زیب دیتا ہے؟ اس مضمون کے لیے دیکھیے سورہٴ مرسلات (۲۰-۲۳) اور سورہٴ طارق (۵-۷)۔

ان آیات سے تین باتیں مقصود ہیں، ایک انسان کو تکبر سے باز رکھنا اور یہ یاد دلانا کہ تم منی جیسی حقیر چیز سے پیدا ہو کر اتنے بڑے بن رہے ہو کہ جنت میں داخل ہونے کو اپنا حق سمجھ رہے ہو، حالانکہ جنت کے قابل تو رسول کی اطاعت سے ہو گے جس پر نولیاں بنا کر حملہ آور ہو رہے ہو۔ دوسری کفار کے اس طمع کا رد کہ وہ جنت میں جائیں گے، گویا بتایا جا رہا ہے کہ ہم نے تمہیں بھی اسی چیز سے پیدا کیا جس سے دوسروں کو پیدا کیا ہے، جب سب کی پیدائش ایک جیسی ہے تو تم عمل کے بغیر جنت میں داخل ہونے کے امیدوار کیسے بن گئے؟ تیسری بات دوبارہ زندہ کرنے کی دلیل پیش کرنا ہے کہ جب ہم نے اس حقیر پانی سے تمہیں بنالیا تو دوبارہ بنانا کون سا مشکل کام ہے؟ جیسے فرمایا: ﴿لَوْلَا نَفْثُكَ لَنُظِفْنَا فَمِنْ قَبْلِي يُنْفِئُ﴾ [انعامہ: ۳۷] ”کیا وہ منی کا ایک قطرہ نہیں تھا جو گرایا جاتا ہے۔“

آیت 40-41 . فَلَا أُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشْرِقِ : سورج مشرق سے ہر روز نئی جگہ سے طلوع ہوتا ہے اور مغرب میں نئی جگہ غروب ہوتا ہے۔ وہ جگہیں بھی ہر شہر اور ہر جگہ کے لحاظ سے الگ الگ ہوتی ہیں، اس لحاظ سے مشرقوں اور مغربوں کی تعداد کا اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔ قسم سے پہلے ”لا“ کہہ کر منکرین کے قول کی نفی کی گئی ہے، پھر مشرق و مغرب کے رب کی قسم کھا کر فرمایا کہ ہم اس بات پر قادر ہیں کہ انہیں ختم کر کے ان سے بہتر لوگ لے آئیں اور ہم کچھ عاجز نہیں ہیں۔ قسم کی مناسبت یہ ہے کہ ہم مشرق و مغرب کے رب ہیں، آسمان و زمین اور سورج وغیرہ سب ہمارے قبضے میں ہیں، کوئی شخص ہمیں عاجز کر کے ہماری گرفت سے نکل نہیں سکتا۔ ہم جب چاہیں انہیں ہلاک کر سکتے ہیں اور ان کی جگہ ان سے بہتر لوگ لاسکتے ہیں، مگر ہم نے اپنی حکمت کی وجہ سے انہیں مہبت دے رکھی ہے۔ اس قسم اور جواب قسم سے ایک اور بات بھی نکل رہی ہے کہ

فَذَرَهُمْ يَخْضُوعًا وَيَلْعَبُوهَا حَتَّىٰ يُلَاقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي يُوْعَدُونَ ﴿۳۷﴾ يَوْمَ يَخْرُجُونَ
مِنَ الْأَجْدَاثِ سِرَاعًا كَأَنَّهُمْ إِلَىٰ نُصُبٍ يُوفِضُونَ ﴿۳۸﴾ خَاشِعَةً أَبْصَارُهُمْ تَرْهُهُمْ
ذَلَّةُ ذٰلِكَ الْيَوْمِ الَّذِي كَانُوا يُوعَدُونَ ﴿۳۹﴾

پس انھیں چھوڑ دے کہ وہ بے ہودہ باتوں میں لگے رہیں اور کھیلتے رہیں، یہاں تک کہ اپنے اس دن کو جانچیں جس کا وہ وعدہ دیے جاتے ہیں ﴿۳۷﴾ جس دن وہ قبروں سے تیز دوڑتے ہوئے نکلیں گے، جیسے وہ کسی گاڑے ہوئے نشان کی طرف دوڑے جا رہے ہیں ﴿۳۸﴾ ان کی آنکھیں جھکی ہوں گی، ذلت انھیں گھیرے ہوئے ہوگی، یہی وہ دن ہے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا تھا ﴿۳۹﴾

جب ہم ان سے بہتر ایک بالکل نئی مخلوق پیدا کر سکتے ہیں تو انھیں دوبارہ کیوں پیدا نہیں کر سکتے؟

آیت 42 فَذَرَهُمْ يَخْضُوعًا وَيَلْعَبُوهَا..... : مراد قیامت کا دن ہے، کیونکہ اس کے بعد ”يَوْمَ يَخْرُجُونَ“ اس سے بدل ہے۔ دنیا کے کھیل کود کی مہلت موت تک ہے اور موت قیامت کا دروازہ ہے۔

آیت 43، 44 يَوْمَ يَخْرُجُونَ مِنَ الْأَجْدَاثِ..... : ”الْأَجْدَاثُ“ ”جَدَثٌ“ (جیم اور وال کے فتح کے ساتھ) کی جمع ہے، قبریں۔ ”سِرَاعًا“ ”سَرِيعٌ“ کی جمع ہے، دوڑنے والے۔ قیامت کے دن قبروں سے اتنی تیزی سے نکل کر دوڑیں گے جس طرح وہ لوگ تیزی سے دوڑتے ہیں جو نشانہ بازی کے وقت ایک نشان گاڑ لیتے ہیں، پھر تیر چلا کر تیزی سے دوڑتے ہیں، تاکہ جا کر دیکھیں کہ نشانہ درست لگا ہے یا نہیں۔ ”نُصُبٍ“ ان پتھروں کو بھی کہتے ہیں جو عبادت کے لیے نصب کیے جاتے ہیں۔ مشرکین دنیا میں بتوں اور آستانوں کی طرف تیزی سے جایا کرتے تھے۔ قیامت کے دن ایسے ہی قبروں سے نکل کر حشر کے میدان کی طرف تیزی سے دوڑتے ہوئے جائیں گے۔



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

إِنَّا أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ أَنْ أَنْذِرْ قَوْمَكَ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ قَالَ يَقَوْمِ إِنِّي لَكُمْ نَذِيرٌ مُبِينٌ ۝ أَنْ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاتَّقُوهُ وَاطِيعُونَ ۝

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

بے شک ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا کہ اپنی قوم کو ڈرا، اس سے پہلے کہ ان پر ایک دردناک عذاب آجائے ① اس نے کہا اے میری قوم! بلاشبہ میں تمہیں کھلم کھلا ڈرانے والا ہوں ② کہ اللہ کی عبادت کرو اور اس سے ڈرو اور میرا کہنا مانو ③

ابو امامہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: ”آدم اور نوح علیہما السلام کے درمیان کتنی مدت تھی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: «عَشْرَةُ قُرُونٍ» «دس قرن۔» [صحیح ابن حبان، التاريخ، باب ذكر الإخبار عما كان : ۶۱۹۰ حافظ ابن کثیر نے اسے مسلم کی شرط پر صحیح کہا ہے۔ [البدایة والنہایة، جلد : ۱، قصة نوح] ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، انھوں نے فرمایا: «كَانَ بَيْنَ نُوحٍ وَآدَمَ عَشْرَةُ قُرُونٍ كُلُّهُمْ عَلَى شَرِيعَةٍ مِنَ الْحَقِّ فَاخْتَلَفُوا فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَ مُنذِرِينَ» [مسندك حاکم : ۵۴۶/۲، ح : ۴۰۰۹] ”آدم اور نوح کے درمیان دس قرن تھے اور وہ سارے کے سارے دین حق پر قائم تھے، پھر جب انھوں نے اختلاف کیا تو اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو بھیجا (جو انھیں جنت کی) خوش خبری دیتے اور (عذاب سے) ڈراتے تھے۔“ محقق حکمت بن بشیر نے ابن کثیر میں سورہ بقرہ کی آیت (۲۱۳) کے تحت کہا کہ یہ حدیث طبری میں بھی ہے اور اس کی سند صحیح ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ شروع میں سب لوگ اللہ کی توحید پر قائم تھے اور شرک و بت پرستی کا وجود نہیں تھا، پھر جیسا کہ زیر تفسیر سورت کی آیت (۲۳) کی تشریح میں آ رہا ہے کہ شیطان کے سکھانے سے بت پرستی شروع ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے انھیں شرک سے منع کرنے اور اللہ واحد کی عبادت کی تبلیغ کے لیے نوح علیہ السلام کو بھیجا، آپ اللہ تعالیٰ کے پہلے رسول ہیں جو زمین والوں کی طرف بھیجے گئے، جیسا کہ حدیث شفاعت میں ہے۔ [دیکھیے بخاری، الأنبياء، باب : ذرية من حملنا : ۴۷۱۲] رسالت ملنے کے بعد آپ ﷺ ساڑھے نو سو (۹۵۰) سال اپنی قوم کو سمجھاتے رہے، جب وہ نافرمانی سے باز نہ آئے تو انھیں پانی کے طوفان سے غرق کر دیا گیا۔ (دیکھیے عنکبوت : ۱۳) یہ پوری سورت نوح علیہ السلام کی دعوت، اس کے جواب میں قوم کے طرز عمل اور ان کے انجام کی تفصیل پر مشتمل ہے اور اس کا نام بھی اسی جلیل القدر پیغمبر کے نام پر ہے۔

آیت ۱ إِنَّا أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ : نوح علیہ السلام کی قوم جس شرک اور بت پرستی میں گرفتار تھی اس کا لازمی نتیجہ دنیا اور آخرت میں عذاب الیم تھا، لیکن اللہ تعالیٰ کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ آگاہ کرنے اور ڈرانے کے بغیر عذاب نہیں دیتا۔ (دیکھیے بنی اسرائیل : ۱۵) سو اس عذاب الیم سے ڈرانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کو ان کی قوم کی طرف بھیجا۔

آیت ۲ قَالَ يَقَوْمِ إِنِّي لَكُمْ نَذِيرٌ مُبِينٌ : نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو تین باتوں کا حکم دیا، پہلی یہ کہ بت پرستی اور

يَغْفِرْ لَكُمْ فَنَ دُنُوبِكُمْ وَيُؤَخِّرْكُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسْتَمَيٍّ إِنَّ أَجَلَ اللَّهِ إِذَا جَاءَ لَا يُؤَخَّرُ مَلُو

كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۴﴾ قَالَ رَبِّ إِنِّي دَعَوْتُ قَوْمِي لَيْلًا وَ نَهَارًا ﴿۵﴾

وہ تمہیں تمہارے گناہ معاف کر دے گا اور ایک مقرر وقت تک تمہیں مہلت دے گا۔ یقیناً اللہ کا مقرر کردہ وقت جب آجائے تو مؤخر نہیں کیا جاتا، کاش کہ تم جانتے ہوتے ﴿۴﴾ اس نے کہا اے میرے رب! بلاشبہ میں نے اپنی قوم

کورات اور دن بلایا ﴿۵﴾

ہر قسم کا شرک چھوڑ کر اکیلے اللہ کی عبادت کرو۔ دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو، یعنی ہر کام کرتے وقت اللہ تعالیٰ کا خوف دل میں رکھو۔ اس کے بھیجے ہوئے احکام کی پابندی کرو۔ تیسری بات یہ کہ میرا حکم مانو، کیونکہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ اللہ کی عبادت بھی وہی قبول ہے جو میرے بتائے ہوئے طریقے پر ہوگی۔ تینوں کا خلاصہ توحید، شریعت الہی کی پابندی اور اطاعت رسول ہے۔

آیت 4 : ﴿۱﴾ يَغْفِرْ لَكُمْ فَنَ دُنُوبِكُمْ : ”مَنْ“ کا معنی عام طور پر ”بعض“ ہوتا ہے، اس صورت میں معنی ہوگا ”اور وہ

تمہارے کچھ گناہ معاف کر دے گا۔“ مگر اس پر یہ سوال وارد ہوتا ہے کہ کچھ گناہ تو پھر بھی باقی رہ گئے، ان کا کیا بنے گا؟ اس کا ایک جواب وہ ہے جو امام ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ نے دیا ہے کہ یہاں ”مَنْ“ ”عَنْ“ کی جگہ آیا ہے اور ”جَمِيعٌ“ کا معنی دے رہا ہے، گویا ”يَغْفِرُ“ کے ضمن میں ”يَصْفَحُ“ اور ”يَغْفُو“ کا معنی ملحوظ ہے: ”أَيُّ يَغْفُو لَكُمْ عَنْ جَمِيعِ دُنُوبِكُمْ“ ”یعنی وہ تمہارے سب گناہ معاف کر دے گا۔“ دوسرا یہ ہے کہ ”مَنْ“ ”بَعْضٌ“ ہی کے معنی میں ہے اور مراد یہ ہے کہ اگر تم میری دعوت قبول کر کے ایمان لے آؤ گے تو تمہارے پہلے گناہ معاف ہو جائیں گے، کیونکہ اسلام پہلے سب گناہ مٹا دیتا ہے، البتہ آئندہ کے لیے گناہوں سے بچتے رہنا، یہ نہ سمجھنا کہ ایمان لانے سے پہلے پچھلے سب گناہ معاف ہو جائیں گے۔

﴿۲﴾ وَ يُؤَخِّرْكُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسْتَمَيٍّ : یعنی طبعی موت کا ایک وقت مقرر ہے، وہ کفر کی وجہ سے یا ایمان نہ لانے کی وجہ سے نہیں آتی بلکہ ہر مومن و کافر پر آتی ہے۔ وہ تو اپنے مقرر وقت پر آ کر رہے گی، البتہ ایمان لے آؤ گے تو اللہ تعالیٰ اس عذاب سے جو کفر کے نتیجے میں آتا ہے، تمہیں محفوظ رکھے گا۔

﴿۳﴾ إِنَّ أَجَلَ اللَّهِ إِذَا جَاءَ لَا يُؤَخَّرُ : اس مقرر وقت سے مراد وہ وقت ہے جو اللہ تعالیٰ کے علم میں کسی قوم پر عذاب کے لیے مقرر ہوتا ہے۔ کاش! تمہیں اس بات کا یقین ہو جائے کہ وہ وقت آنے پر مہلت ختم ہو جائے گی، پھر ایمان لانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا تو تم اس سے پہلے پہلے ایمان لے آؤ۔

آیت 5 : قَالَ رَبِّ إِنِّي دَعَوْتُ قَوْمِي لَيْلًا وَ نَهَارًا : نوح عليه السلام اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اپنی قوم کو اللہ کا پیغام پہنچاتے رہے۔ سیکڑوں برس کی تبلیغ کے باوجود جب چند قلیل آدمیوں کے علاوہ کسی نے ایمان قبول نہ کیا اور نوح عليه السلام ان سے ہر طرح سے مایوس ہو گئے تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور یہ درخواست پیش کی۔ اے میرے رب! میں نے اپنی قوم کو رات دن دعوت

فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَائِي إِلَّا فِرَارًا ۝۱ وَ إِنِّي كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوا أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ وَاسْتَعْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَاصْرُؤُوا وَاسْتَكْبَرُوا وَاسْتَكْبَارًا ۝۲ ثُمَّ إِنِّي دَعَوْتُهُمْ جَهَارًا ۝۳ ثُمَّ إِنِّي أَعْلَنْتُ لَهُمْ وَأَسْرَرْتُ لَهُمْ إِسْرَارًا ۝۴

تو میرے بلانے نے دور بھاگنے کے سوا ان کو کسی چیز میں زیادہ نہیں کیا ۱ اور بے شک میں نے جب بھی انہیں دعوت دی، تاکہ تو انہیں معاف کر دے، انہوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ڈال لیں اور اپنے کپڑے اوڑھ لیے اور اڑ گئے اور تکبر کیا، بہت بڑا تکبر کرنا ۲ پھر بے شک میں نے انہیں بلند آواز سے دعوت دی ۳ پھر بے شک میں نے انہیں کھلم کھلا دعوت دی اور میں نے انہیں چھپا کر دعوت دی، بہت چھپا کر ۴

دی، یعنی کوئی وقت نہیں چھوڑا جس میں دعوت نہ دی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ نوح علیہ السلام نے جتنا لمبا عرصہ مسلسل دعوت میں گزارا اس کی کوئی مثال نہیں ملتی، ہر داعی اور عالم کو اسی جذبے اور محنت سے دعوت دینی چاہیے۔

آیت 6: فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَائِي إِلَّا فِرَارًا: مگر ان پر الٹا اثر ہوا، وہ ایمان قبول کرنے کے بجائے اور زیادہ دور بھاگنے لگے۔

آیت 7: ۱ وَ إِنِّي كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ : اس آیت میں تھوڑا سا حصہ حذف ہے، یعنی میں نے جب بھی انہیں دعوت دی کہ (ایمان لے آئیں، تاکہ اس کے نتیجے میں) تو انہیں معاف فرمادے تو انہوں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں، منہ سر کپڑوں میں لپیٹ لیے اور اپنی بات پراڑ گئے یعنی ان کے پاس نوح علیہ السلام کی دعوت کو رد کرنے کا کوئی جواز نہ تھا اور نہ ہی آپ کے دلائل کا سامنا کرنے کی ہمت تھی، ادھر وہ شرک چھوڑنے پر بھی تیار نہیں تھے اور نہ اپنی بڑائی سے دستبردار ہونے پر تیار تھے۔ نوح علیہ السلام کی بات ماننے میں ان کی سرداری، بڑائی اور چودھراہٹ میں فرق آتا تھا، اس لیے ان کی کوشش یہ تھی کہ نہ نوح علیہ السلام کی بات کانوں میں پڑے اور نہ ان کی نظر ان پر پڑے۔ غرض کسی صورت بھی ان سے آنا سامنا نہ ہونے پائے، مبادا وہ پھر تبلیغ شروع کر دیں، اس لیے جیسے بھی ہو سکے ہر صورت منہ سر چھپا کر ان کے پاس سے نکل جائیں۔

آیت 2: وَاسْتَكْبَرُوا وَاسْتَكْبَارًا: نوح علیہ السلام کی قوم کا تکبر یہ تھا کہ انہوں نے حق بات ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِّنْ كِبَرٍ، قَالَ رَجُلٌ إِنَّ الرَّجُلَ يُحِبُّ أَنْ يَكُونَ تُوبَةً حَسَنًا وَنَعْلَةً حَسَنَةً، قَالَ إِنَّ اللَّهَ جَمِيلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ الْكِبَرُ بَطْرُ الْحَقِّ وَغَمَطُ النَّاسِ» [مسلم، الإيمان، باب تحريم الكبر وبيانہ: ۹۱] "جس کے دل میں ایک ذرے کے برابر تکبر ہو وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔" ایک آدمی نے کہا: "آدمی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کا کپڑا اچھا ہو اور اس کا جوتا اچھا ہو (تو کیا یہ بھی تکبر ہے؟)" آپ ﷺ نے فرمایا: "(یہ تکبر نہیں) اللہ خوبصورت ہے، خوبصورتی کو پسند کرتا ہے۔ تکبر تو حق سے انکار کر دینا اور لوگوں کو حقیر جانا ہے۔"

آیت 8, 9: ثُمَّ إِنِّي دَعَوْتُهُمْ جَهَارًا : جب ان کے کانوں میں انگلیاں لے لینے اور منہ سر کپڑوں میں چھپا لینے تک

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا ﴿۱۰﴾ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا ﴿۱۱﴾ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مَائِدًا مِّنَ السَّمَاءِ مِن تَحْتِهَا نَاقُاتٌ مِّمَّا يَخْتَارُونَ ﴿۱۲﴾

بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ وَبِجَعَلٍ لَّكُمْ جَدَّتٍ وَبِجَعَلٍ لَّكُمْ أَنْهَرًا ﴿۱۳﴾

تو میں نے کہا اپنے رب سے معافی مانگ لو، یقیناً وہ ہمیشہ سے بہت معاف کرنے والا ہے ﴿۱۰﴾ وہ تم پر بہت برسی ہوئی بارش اُتارے گا ﴿۱۱﴾ اور وہ مالوں اور بیٹوں کے ساتھ تمہاری مدد کرے گا اور تمہیں باغات عطا کرے گا اور تمہارے لیے نہریں جاری کر دے گا ﴿۱۲﴾

نوبت پہنچ گئی تو پھر بھی میں نے انہیں سمجھانا نہیں چھوڑا، بلکہ پھر انہیں مزید بلند آواز سے دعوت دی۔ پھر انہیں کھلم کھلا مجمع عام میں بھی سمجھایا اور لوگوں سے چھپا کر ایک ایک کو نجی طور پر بھی سمجھایا، غرض جس طرح دن رات ہر وقت دعوت دی جا سکتی تھی، اسی طرح ہر طریقے سے دعوت دی۔

آیت 10 فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ : چنانچہ میں نے ان سے کہا کہ اپنے رب سے بخشش مانگو، (ظاہر ہے ایمان لانے کے بعد ہی بخشش مانگنے کا مرحلہ آتا ہے) یقیناً وہ بہت ہی بخشنے والا ہے۔ ”مَنَّان“ دوام اور استمرار کے لیے ہے، یعنی بخشش اور معاف کرنا ہمیشہ سے اس کی صفت رہی ہے، پھر کسی واسطے یا دیلے سے مانگنے کی کیا ضرورت ہے، اپنے رب سے خود ہی معافی مانگ لو، وہ تمہیں بخش دے گا۔ جب معافی مل گئی تو آخرت میں سزا سے بچ جاؤ گے۔

آیت 11-12 يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا : نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو بتایا کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لا کر اس سے بخشش مانگنے سے صرف تمہاری آخرت ہی درست نہیں ہوگی بلکہ اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی بے شمار نعمتیں عطا فرمائے گا، وہ تم پر موسلا دھار بارشیں برسائے گا، قسم قسم کے مالوں کے ساتھ اور بیٹوں کے ساتھ تمہاری مدد کرے گا اور تمہیں باغات اور نہریں عطا فرمائے گا۔ نوح علیہ السلام کے علاوہ ہمارے نبی کریم ﷺ اور دوسرے انبیاء علیہم السلام نے بھی اپنی اپنی قوم کو ایمان و استغفار سے آخرت میں حاصل ہونے والی نعمتوں کے علاوہ ان سے حاصل ہونے والی دنیوی برکتیں بھی بتائیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ ہود (۱۰۴، ۱۰۳)، مائدہ (۶۶) اور سورہ اعراف (۹۶)۔ ان آیات سے معلوم ہوا کہ بارش کی ضرورت ہو یا مال و اولاد کی یا کسی بھی نعمت کی ضرورت ہو تو اللہ تعالیٰ سے استغفار کرنا چاہیے۔ اس مقام پر تفسیر طبری اور تفسیر ابن کثیر میں عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما کا واقعہ لکھا ہوا ہے کہ وہ استغفار کے لیے نکلے تو انہوں نے استغفار سے زیادہ کچھ نہیں کیا اور واپس آ گئے۔ لوگوں نے پوچھا: ”امیر المؤمنین! ہم نے آپ کو بارش کی دعا کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔“ تو فرمایا: ”میں نے آسمان کو حرکت دینے والی ان چیزوں کے ذریعے سے بارش طلب کی ہے جن کے ذریعے سے بارش کا سوال کیا جاتا ہے۔“ پھر یہ آیت اور سورہ ہود کی آیت (۵۲): ﴿وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مَائِدًا مِّنَ السَّمَاءِ مِن تَحْتِهَا نَاقُاتٌ مِّمَّا يَخْتَارُونَ﴾ پڑھی۔ تفسیر طبری میں عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما کا یہ واقعہ شعبی سے روایت کیا گیا ہے، جن کی ملاقات عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما سے ثابت نہیں، اس لیے یہ واقعہ پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتا اور امیر المؤمنین سے امید بھی نہیں کہ وہ بارش کی دعا کے لیے نکلے ہوں اور مسنون طریقہ پر نماز اور دعا کے بغیر صرف استغفار کر کے واپس آ گئے ہوں۔ صحیح بخاری (۱۰۱۰) میں عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما کا

مَا لَكُمْ لَا تَرْجُونَ لِلَّهِ وَقَارًا ﴿۱۳﴾ وَقَدْ خَلَقَكُمْ أَطْوَارًا ﴿۱۴﴾ أَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللَّهُ سَبْعَ سَلَوَاتٍ طِبَاقًا ﴿۱۵﴾ وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِيهِنَّ نُورًا وَجَعَلَ الشَّمْسُ سِرَاجًا ﴿۱۶﴾ وَاللَّهُ أَنْبَتَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ نَبَاتًا ﴿۱۷﴾ ثُمَّ يُعِيدُكُمْ فِيهَا وَيُخْرِجُكُمْ إِخْرَاجًا ﴿۱۸﴾ وَاللَّهُ جَعَلَ لَكُمْ الْأَرْضَ بِسَاطًا ﴿۱۹﴾ لِتَسْلُكُوا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا ﴿۲۰﴾

تمہیں کیا ہے کہ تم اللہ کی عظمت سے نہیں ڈرتے ﴿۱۳﴾ حالانکہ یقیناً اس نے تمہیں مختلف حالتوں میں پیدا کیا ﴿۱۴﴾ کیا تم نے دیکھا نہیں کہ کس طرح اللہ نے سات آسمانوں کو اوپر تلے پیدا فرمایا ﴿۱۵﴾ اور اس نے ان میں چاند کو نور بنایا اور سورج کو چراغ بنا دیا ﴿۱۶﴾ اور اللہ نے تمہیں زمین سے اُگایا، خاص طریقے سے اُگانا ﴿۱۷﴾ پھر دوبارہ وہ تمہیں اس میں لوٹائے گا اور تمہیں نکالے گا، خاص طریقے سے نکالنا ﴿۱۸﴾ اور اللہ نے تمہارے لیے زمین کو ایک فرش بنا دیا ﴿۱۹﴾ تاکہ تم اس کے کھلے راستوں پر چلو ﴿۲۰﴾

بارش کی دعا کرنا اور عباس رضی اللہ عنہما سے دعا کروانا موجود بھی ہے۔ ہاں، یہ بات درست ہے کہ دعائے استسقا میں بھی استغفار زیادہ سے زیادہ کرنا چاہیے، مگر ہر مقام پر استغفار اس طریقے سے کیا جائے گا جس طریقے سے رسول اللہ ﷺ نے کیا ہے۔

آیت 13 مَا لَكُمْ لَا تَرْجُونَ لِلَّهِ وَقَارًا : "لَا تَرْجُونَ" "رَجَا يَرْجُو رَجَاءً" (ن) امید رکھنا۔ اس کا معنی عقیدہ رکھنا اور ڈرنا بھی آتا ہے، کیونکہ یہ دونوں چیزیں اور امید آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ امید اسی چیز کی ہوتی ہے جس کے موجود ہونے کا عقیدہ ہو اور امید کا مطلب ہی یہ ہے کہ خوف بھی موجود ہے۔ "وَقَارًا" کا معنی عظمت ہے۔ آیت کا معنی یہ ہوگا کہ تمہیں کیا ہے کہ اپنے بتوں کی عظمت تو تمہارے دلوں میں بہت ہے، مگر تم اللہ تعالیٰ کی عظمت کا عقیدہ نہیں رکھتے؟ دوسرا معنی ہے کہ تم اللہ کی عظمت سے نہیں ڈرتے۔ اگر تم اس کے وقار و عظمت کے معتقد ہوتے اور تمہیں اس کا خوف ہوتا تو اس کے ساتھ ایسی ہستیوں کو کبھی شریک نہ بناتے جو اس کے مقابلے میں کوئی وقار اور کوئی عظمت نہیں رکھتیں۔

آیت 14 وَقَدْ خَلَقَكُمْ أَطْوَارًا : یعنی حقیقت حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت کے دلائل خود تمہاری ذات میں موجود ہیں، اس نے تمہیں مختلف اطوار میں پیدا فرمایا ہے۔ پہلے مٹی، پھر نطفہ، پھر علقہ، پھر مضغہ، پھر ہڈیاں، پھر ان پر گوشت، پھر بہترین شکل و صورت کا انسان، جس کا ہر روز نئے سے نیا طور (انداز) ہوتا ہے، بچپن، جوانی، بڑھاپا، پھر موت، اتنے اطوار کے بعد دوبارہ پیدا کرنا اس کے لیے کیا مشکل ہے؟! اگر تم ایسے خالق کی عظمت کا خیال نہ کرو اور اس کے حضور پیش ہونے کو محال سمجھتے رہو تو کتنے تعجب کی بات ہے۔ یہی بات تفصیل کے ساتھ سورہ حج (۶، ۵) اور سورہ مومنون (۱۶۳، ۱۴) میں بھی بیان ہوئی ہے۔

"خَلَقَكُمْ أَطْوَارًا" کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ تمہیں مختلف انداز میں پیدا فرمایا کہ کوئی ایک شخص بھی شکل و صورت، قد و قامت، رنگ روپ، آواز اور ذہنی صلاحیت، غرض کسی بھی چیز میں دوسرے سے نہیں ملتا۔ یہی مفہوم سورہ روم (۲۲) میں بیان ہوا ہے۔

آیت 15-20 أَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللَّهُ : نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو ان کی پیدائش میں توحید اور قیامت کے دلائل کی

قَالَ نُوحٌ رَبِّ إِنَّهُمْ عَصَوْنِي وَاتَّبَعُوا مَنْ لَمْ يَزِدْهُ مَالَهُ وَوَلَدَهُ إِلَّا خَسَارًا ﴿٢١﴾ وَمَكَرُوا مَكْرًا كَبِيرًا ﴿٢٢﴾

نوح نے کہا اے میرے رب! بے شک انھوں نے میری بات نہیں مانی اور اس کے پیچھے چل پڑے جس کے مال اور اولاد نے خسارے کے سوا اس کو کسی چیز میں زیادہ نہیں کیا ﴿٢١﴾ اور انھوں نے خفیہ تدبیر کی، بہت بڑی خفیہ تدبیر ﴿٢٢﴾

طرف توجہ دلانے کے بعد ان چیزوں پر غور و فکر کی دعوت دی جو اللہ تعالیٰ نے ان کے گرد و پیش ان کی ضرورتوں کے لیے پیدا فرمائی ہیں۔ فرمایا، کیا تم نے غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اوپر تلے سات آسمان، ان میں روشنی پھیلانے والا چاند اور جلتا ہوا چراغ یعنی سورج کس طرح پیدا فرمایا؟ زمین کو بچھونے کی طرح نرم کر دیا اور تمھاری سہولت کے لیے اس میں گھائیاں اور کشادہ رستے بنا دیے۔ یہ تمام انتظام اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ سب کچھ بے کار اور بے مقصد پیدا نہیں کیا، بلکہ جس طرح اس نے تمھیں پہلے زمین سے پیدا کیا ہے اسی طرح زمین میں دفن کرنے کے بعد تمھیں دوبارہ زندہ کرے گا۔ اس کے علاوہ تمھاری ضرورت کی یہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمائی ہیں، تمھارے معبودانِ باطلہ نے تو کچھ بھی پیدا نہیں کیا، تم نے دونوں کو برابر کیسے سمجھ لیا؟

آیت 21 قَالَ نُوحٌ رَبِّ إِنَّهُمْ عَصَوْنِي : یہ نوح علیہ السلام کی دوسری شکایت ہے کہ اے میرے رب! انھوں نے میرا کہا نہیں مانا اور ان سرداروں اور مال داروں کے پیچھے لگ گئے جنھیں تو نے مال اور اولاد عطا فرمائی، مگر وہ مال و اولاد انھیں کوئی فائدہ پہنچانے کے بجائے ان کے لیے اور زیادہ خسارے کا باعث بن گئے، کیونکہ اس مال و اولاد کے غرور ہی کی وجہ سے انھوں نے حق کو ٹھکرایا اور اسی مال و اولاد کو اللہ تعالیٰ کے راضی ہونے کی دلیل کے طور پر پیش کر کے قوم کو بہکایا اور یہی مال خرچ کر کے لوگوں کو اللہ کی راہ سے ہٹایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں کافروں کو جتنا مال و اولاد یا نعمتیں ملیں درحقیقت ان کے لیے عذاب ہی کا سامان ہے، کیونکہ اس سے وہ مزید غفلت و سرکشی اختیار کر کے جہنم کا ایسٹین بنتے ہیں۔

آیت 22 وَمَكَرُوا مَكْرًا كَبِيرًا : ”کَبِيرًا“ (بہا کی تشدید کے ساتھ) میں ”کَبِيرًا“ (بہا کی تشدید کے بغیر) سے زیادہ مبالغہ ہے اور ”کَبِيرًا“ میں ”کَبِيرًا“ سے زیادہ مبالغہ ہے، یعنی انھوں نے بہت ہی بڑی بڑی خفیہ تدبیریں کیں۔ ”مَكْرًا“ جنس ہے، اس سے صرف ایک ہی مکر مراد نہیں۔ یہ اسی قسم کے حربے تھے جو ہمیشہ کسی قوم کے چودھری اور مال دار لوگ اپنے اقتدار کی خاطر اہل حق کے خلاف استعمال کرتے ہیں۔ قرآن میں ان میں سے کئی حربے مذکور ہیں، مثلاً یہ کہ اگر نوح (علیہ السلام) اللہ کا نبی ہوتا تو فرشتہ ہوتا، یہ تو ہمارے جیسا انسان ہے۔ اس کے پیروکار بچ لوگ ہیں، اگر یہ رسول ہوتا تو اس کے پاس خزانے ہوتے، بڑے بڑے لوگ اس کے ساتھ ہوتے، یہ غیب جانتا ہوتا، یہ تو بس سرداری چاہتا ہے، یہ دیوانہ ہے وغیرہ۔ مزید تفصیل کے لیے سورہ اعراف، سورہ ہود اور سورہ مومنون وغیرہ میں نوح علیہ السلام کے واقعات ملاحظہ فرمائیں۔ ہمارے نبی ﷺ کے خلاف بھی یہی حربے استعمال کیے گئے۔

وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَلَا سُوَاعًا وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا ﴿۳۱﴾

اور انھوں نے کہا تم ہرگز اپنے معبودوں کو نہ چھوڑنا اور نہ کبھی وڈ کو چھوڑنا اور نہ سواع کو اور نہ یغوث اور یعوق اور نسر کو ﴿۳۱﴾

آیت 23 ﴿۱﴾ وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ ساڑھے نو سو سال میں اللہ بہتر جانتا ہے کتنی ہی نسلیں ختم ہوئیں اور کتنی نئی پیدا ہوئیں، مگر ہر پہلا پچھلے کو جیتے جی اور مرتے وقت یہی تاکید کرتا رہا کہ دیکھنا! نوح کے کہنے پر وڈ، سواع، یغوث، یعوق اور نسر کی عبادت ہرگز ہرگز نہ چھوڑنا۔ یہ وہ پانچ بت تھے جن کی عبادت قوم نوح کرتی تھی۔ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ”یہ پانچوں نوح علیہ السلام کی قوم کے صالح لوگوں کے نام ہیں، جب وہ فوت ہو گئے تو شیطان نے ان کی قوم کے دلوں میں یہ بات ڈالی کہ (بطور یادگار) جن مجلسوں میں وہ بیٹھتے تھے وہاں ان کے بت نصب کر دو اور ان کے وہی نام رکھ دو، چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا تو اس وقت ان کی عبادت نہیں کی گئی، یہاں تک کہ جب وہ (بطور یادگار بت نصب کرنے والے) فوت ہو گئے اور (کسی کو اس بات کا) علم نہ رہا تو ان بتوں کی عبادت ہونے لگی۔“ [بخاری، التفسیر، باب: ﴿وَدًّا وَلَا سُوَاعًا﴾.....] ۴۹۲۰ اس روایت سے معلوم ہوا کہ بت پرستی کا اصل باعث اکابر کی محبت میں غلو اور ان کے مجتہد بننا کر انھیں نصب کرنا تھا۔ شریعت میں تصویر کی حرمت کے دیگر اسباب کے علاوہ ایک بہت بڑا سبب یہ بھی ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اسی روایت میں جو ادھر گزری ہے، مذکور ہے کہ یہی بت جو قوم نوح میں تھے، بعد میں عرب کے اندر آ گئے۔ ”وڈ“ دومتہ الجندل میں کلب قبیلے کا بت تھا، ”سواع“ ہذیل کا تھا، ”یغوث“ مراد قبیلے کا پھر (اس کی شاخ) بنو غطفین کا تھا، جو سب کے قریب وادی جرف میں (آباد) تھے۔ ”یعوق“ ہمدان کا اور ”نسر“ حمیر کا تھا جو ذوالکراع کی آل تھے۔ [بخاری، أيضًا]

یہاں ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اتنے بڑے طوفان کے بعد جس میں تمام مشرک غرق کر دیے گئے، وہ بت کیسے باقی رہ گئے اور دوبارہ ان کی پرستش کیسے شروع ہو گئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انسان قدرتی طور پر اپنے سے پہلے لوگوں کے حالات جاننے کا شوق رکھتا ہے، چنانچہ علم تاریخ اسی شوق کا نتیجہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ نوح علیہ السلام کے ساتھ باقی بچنے والے اہل ایمان سے بعد والی نسلوں نے ان بزرگوں کی نیکی اور کرامتوں کے واقعات سنے، وقت گزرنے کے ساتھ جب جہالت کا غلبہ ہوا تو شیطان نے ان کے ہاتھوں آثار قدیمہ کے طور پر وہی بت نکلو کر یا ان سے ان اکابر کے فرضی مجتہد بنوا کر، جیسا کہ نصرانیوں نے مسیح اور مریم علیہما السلام کے فرضی مجتہد بنا رکھے ہیں، دوبارہ ان کی عبادت شروع کروادی۔ بہر حال یہ بات ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ان پانچوں بتوں کی پرستش ہوتی تھی اور باقاعدہ ان کے آستانے موجود تھے، جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں گزرا ہے۔ عرب میں عبد وڈ اور عبد یغوث وغیرہ نام بھی ملتے ہیں۔

② حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا: ”واقعی کا بیان ہے کہ ”وڈ“ ایک آدمی کی شکل میں، ”سواع“ عورت کی شکل میں، ”یغوث“ شیر کی صورت میں، ”یعوق“ گھوڑے کی شکل میں اور ”نسر“ ایک پرندے کی صورت میں تھا، مگر یہ شاذ ہے۔ مشہور یہی ہے کہ یہ سب انسانی شکل میں تھے اور ان کی عبادت کے آغاز کا جو سبب بیان ہوا ہے اس کا تقاضا بھی یہی ہے۔“ (فتح الباری) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی بات نوح علیہ السلام کے زمانے کے بتوں کے متعلق تو یقیناً درست ہے، مگر بعد میں جب فرضی بت بنائے گئے تو

وَقَدْ أَضَلُّوا كَثِيرًا ۗ وَلَا تَزِدِ الظَّالِمِينَ إِلَّا ضَلَالًا ﴿۲۴﴾ وَمِنَّا خَطِئْتَهُمْ أُغْرُقُوا فَأَدْخَلُوا
نَارًا ۗ فَلَمْ يَجِدُوا لَهُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَنْصَارًا ﴿۲۵﴾

اور بلاشبہ انھوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا اور تو ان ظالموں کو گمراہی کے سوا کسی چیز میں نہ بڑھا ﴿۲۴﴾ اپنے
گناہوں ہی کی وجہ سے وہ غرق کیے گئے، پس آگ میں داخل کیے گئے، پھر انھوں نے اللہ کے سوا اپنے لیے کوئی مدد
کرنے والے نہ پائے ﴿۲۵﴾

ممکن ہے کہ ان جانوروں کی شکل پر بنائے گئے ہوں، جیسا کہ مشرک قوموں میں عام طور پر پایا جاتا ہے۔ (واللہ اعلم)
﴿۲۴﴾ رسول اللہ ﷺ نے امت مسلمہ کو شرک سے بچانے کے لیے ان دروازوں کو بھی بند کرنے کا حکم دیا جہاں سے شرک داخل
ہو سکتا ہے۔ قبر پرستی کے فتنے کی ابتدا قبروں پر عمارتیں اور مسجدیں بنانے سے ہوتی ہے اور بت پرستی کی ابتدا تصویریں اور مجسمے
بنانے سے، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں چیزوں سے منع فرمایا اور اونچی قبروں کو (دوسری قبروں کے) برابر کر دینے
اور ہر تصویر کو مٹا دینے کا حکم دیا۔ ابوالبیاج اسدی فرماتے ہیں کہ مجھے علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا: «الْأُبْعَثُنَّ عَلِيَّ مَنَا
بَعَثْنِي عَلَيْهِ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ أَمْ لَا تَدْعُ بَمَثَلِ الْأَظْمَسْتَهُ وَلَا قَبْرًا مُشْرِفًا إِلَّا سَوَيْتَهُ» [مسند،
الحنبل، باب الأمر بنسوبة القبر: ۹۶۹] ”کیا میں تمہیں اس کام پر مقرر کر کے نہ بھیجوں جس پر مجھے رسول اللہ ﷺ نے مقرر
فرمایا تھا؟ وہ یہ تھا کہ کوئی مورتی نہ چھوڑو گمراہ سے مٹا دو اور نہ کوئی اونچی قبر گمراہ سے برابر کر دو۔“

آیت 24 : وَقَدْ أَضَلُّوا كَثِيرًا یعنی قوم کے ان سرداروں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا۔ ”وَلَا تَزِدِ الظَّالِمِينَ إِلَّا
ضَلَالًا“ (اور ان ظالموں کو گمراہی کے علاوہ کسی چیز میں نہ بڑھا) یہ دعا اور حقیقت عذاب کے لیے ہے، کیونکہ گمراہی پر قائم رہنے
اور اس میں مزید بڑھتے چلے جانے کا نتیجہ یہی ہے کہ وہ عذاب الہی کے مستحق ہو جائیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے آل فرعون کے حق میں
یہی بد دعا کی تھی: ﴿رَبَّنَا اظْمِسْ عَلَيَّ أَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلَى قُلُوبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوا حَتَّىٰ يَرَوْا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ﴾
[یونس: ۸۸] ”اے ہمارے رب! ان کے مالوں کو مٹا دے اور ان کے دلوں پر سخت گرہ لگا دے، پس وہ ایمان نہ لائیں،
یہاں تک کہ دردناک عذاب دیکھ لیں۔“ ضمیر کی جگہ ”الظَّالِمِينَ“ کے لفظ کی صراحت سے ان لوگوں کے عذاب کی بد دعا کے
مستحق ہونے کا سبب بیان ہوا ہے۔

آیت 25 : ﴿۱﴾ وَمِنَّا خَطِئْتَهُمْ أُغْرُقُوا یہ نوح علیہ السلام کا کلام نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں۔ جد مجرور پہلے لانے سے
کلام میں حصر پیدا ہو گیا ہے، یعنی صرف اپنے گناہوں (کفر و معصیت) کی وجہ سے انھیں غرق کیا گیا۔ ان کے غرق ہونے کا
تفصیل واقعہ سورہ ہود، سورہ مومنون اور سورہ عنکبوت وغیرہ میں مذکور ہے۔ ”فَأَدْخَلُوا نَارًا“ پس وہ آگ میں داخل کیے گئے،
”نار“ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ غرق ہوتے ہی انھیں آگ میں داخل کر دیا گیا، یعنی قیامت کے دن جہنم میں جانے سے پہلے
برزخ و قبر ہی میں وہ آگ میں داخل کر دیے گئے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے آل فرعون کے متعلق فرمایا: ﴿وَحَاقَ بِآلِ فِرْعَوْنَ

وَقَالَ نُوحٌ رَبِّ لَا تَذُرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ﴿۲۷﴾ اِنَّكَ اِنْ تَذَرَهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْا اِلَّا فٰجِرًا كَفَّارًا ﴿۲۸﴾ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَ لِوَالِدِيْ وَ لِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيْ مُؤْمِنًا وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَ لَا تَزِدِ الظٰلِمِيْنَ اِلَّا تَبٰرًا ﴿۲۹﴾

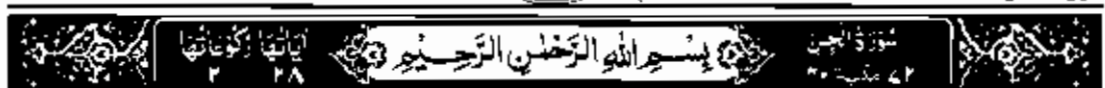
اور نوح نے کہا اے میرے رب! زمین پر ان کافروں میں سے کوئی رہنے والا نہ چھوڑ ﴿۲۷﴾ بے شک تو اگر انہیں چھوڑے رکھے گا تو وہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور کسی نافرمان، سخت منکر کے سوا کسی کو نہیں جنس کے ﴿۲۸﴾ اے میرے رب! مجھے بخش دے اور میرے ماں باپ کو اور اس کو جو مومن بن کر میرے گھر میں داخل ہو اور ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں کو اور ظالموں کو ہلاکت کے سوا کسی چیز میں نہ بڑھا ﴿۲۹﴾

سُوء الْعَذَابِ ﴿۱﴾ الْقَالُ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَعَشِيًّا، وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ اذْخَلُوْا اِلٰ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ﴿۲﴾ [المومن: ۴۵، ۴۶] ”اور آل فرعون کو برے عذاب نے گھیر لیا جو آگ ہے، اس پر صبح و شام پیش کیے جاتے ہیں اور جس دن قیامت قائم ہوگی، آل فرعون کو سخت ترین عذاب میں داخل کرو۔“ خلاصہ یہ کہ نوح علیہ السلام کی قوم اور آل فرعون کو پہلے پانی میں غرق کیا گیا، پانی کے عذاب کے بعد اس کا الٹ یعنی آگ کا عذاب قبر ہی میں شروع ہو گیا، پھر قیامت کے دن جہنم کے ”اَشَدَّ الْعَذَابِ“ میں داخل کیے جائیں گے۔ یہ آیت اور سورہ مؤمن کی آیت عذابِ قبر کی زبردست دلیلیں ہیں۔

﴿۲﴾ قَلَمٌ يَّجِدُّ وَالْهُمَزُ مِنْ ذُوْنَ اللّٰهِ اَنْصَارًا : یعنی اللہ کے عذاب سے نہ انہیں کوئی سردار بچا سکا اور نہ ان کے پاک بیچتوں میں سے کوئی ان کی مدد کر سکا۔

آیت 26 27 ﴿۲۷﴾ وَقَالَ نُوحٌ رَبِّ لَا تَذُرْ.....: یہاں سے نوح علیہ السلام کی دعا کا بقیہ حصہ ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نوح علیہ السلام کو کیسے معلوم ہوا کہ اگر یہ لوگ زندہ رہے تو ان کی پشت سے کافر ہی پیدا ہوں گے؟ جواب یہ ہے کہ یہ بات اللہ تعالیٰ نے خود نوح علیہ السلام کو بتا دی تھی کہ آپ کی قوم میں سے جو لوگ ایمان لا چکے ہیں ان کے علاوہ اب کوئی شخص ایمان قبول نہیں کرے گا۔ (دیکھیے ہود: ۳۶) یہ بات معلوم ہونے کے بعد نوح علیہ السلام نے دعا کی کہ یا اللہ! زمین پر ان کافروں میں سے ایک ”دیار“ بھی باقی نہ چھوڑ۔ ”دَيَّارًا“ ”فَيَعَالٌ“ کے وزن پر ہے، یہ ”دَارٌ يَدْخُرُ دَوْرًا“ (گھومنا) سے ہو تو معنی ہوگا، ایک پھرنے والا بھی نہ چھوڑ اور اگر ”دَارٌ“ (گھر) سے مشتق ہو تو معنی ہے، گھر میں بسنے والا ایک فرد بھی باقی نہ چھوڑ۔

آیت 28 ﴿۲۸﴾ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَ لِوَالِدِيْ.....: اس آیت میں نوح علیہ السلام کی اس دعائے مغفرت کا ذکر ہے جو انہوں نے اپنے لیے، اپنے والدین کے لیے اور ان اہل ایمان کے لیے کی جو عذاب کی پیش گوئی سچ مان کر اس سے بچنے اور کشتی میں سوار ہونے کے لیے ان کے گھر جمع ہو گئے تھے، اس کے ساتھ ہی انہوں نے پہلے تمام مومن مردوں اور عورتوں کے لیے مغفرت کی دعا کی اور کافروں کے لیے مزید ہلاکت کی بددعا کی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نوح علیہ السلام کے والدین موحد تھے۔



قُلْ أُوحِيَ إِلَيَّ إِنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوا إِنَّا سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا ۝ يَهْدِي إِلَى

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

کہہ دے میری طرف وحی کی گئی ہے کہ جنوں کی ایک جماعت نے کان لگا کر سنا تو انھوں نے کہا کہ بلاشبہ ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے ① جو سیدھی راہ کی طرف لے جاتا ہے تو ہم اس پر ایمان لے آئے اور (اب) ہم

ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنے اصحاب کی ایک جماعت کے ساتھ سوق عکاظ کی طرف جانے کے ارادے سے روانہ ہوئے، (یہ اس وقت کی بات ہے جب) شیاطین اور آسمان کی خبروں کے درمیان رکاوٹ ڈال دی گئی اور (جب وہ اوپر خبریں سننے کے لیے گئے تو) ان پر انگارے پھینکے گئے۔ وہ شیطان (جب آسمان سے خبریں سن سکے اور) اپنی قوم کی طرف واپس آئے تو انھوں نے پوچھا: ”کیا معاملہ ہے؟“ انھوں نے کہا: ”ہمارے اور آسمان کی خبروں کے درمیان رکاوٹ ڈال دی گئی ہے اور ہم پر انگارے پھینکے گئے ہیں۔“ انھوں نے کہا: ”تمہارے اور آسمان کی خبروں کے درمیان رکاوٹ کی وجہ کوئی نئی پیدا ہونے والی چیز ہی ہو سکتی ہے، اس لیے تم زمین کے مشارق ومغارب کا سفر کر کے دیکھو کہ وہ کون سی چیز ہے جو تمہارے اور آسمان کی خبروں کے درمیان رکاوٹ بنی ہے۔“ تو وہ لوگ جو تہماہر کی طرف روانہ ہوئے تھے وہ نبی ﷺ کے پاس اس وقت پہنچے جب آپ نخلہ میں تھے اور سوق عکاظ کا ارادہ رکھتے تھے۔ آپ اس وقت اپنے اصحاب کو صبح کی نماز پڑھا رہے تھے، جب انھوں نے قرآن سنا تو کان لگا کر سننے لگے اور کہنے لگے: ”اللہ کی قسم! یہی وہ چیز ہے جو تمہارے اور آسمان کی خبروں کے درمیان رکاوٹ بنی ہے۔“ اس موقع پر جب وہ اپنی قوم کی طرف واپس آئے تو انھوں نے کہا: ”اے ہماری قوم! ﴿إِنَّا سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا﴾ يَهْدِي إِلَى الزُّهْدِ فَأَمَّا بِهٖ • وَ لَنْ نُفْرِكَ بِرَبِّنَا أَحَدًا ﴿﴾ [الحج: ۲۰۱] بلاشبہ ہم نے ایک عجیب قرآن سنا، جو سیدھی راہ کی طرف لے جاتا ہے تو ہم اس پر ایمان لے آئے اور ہم کبھی کسی کو اپنے رب کے ساتھ شریک نہیں کریں گے۔“ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پر یہ آیات نازل فرمائیں: ﴿قُلْ أُوحِيَ إِلَيَّ﴾ اور آپ ﷺ پر جنوں کی گفتگو وحی کی گئی تھی۔ [بخاری، الأذان، باب الحہر بقراءة صلاة الصبح: ۷۷۳۔ مسند: ۱۴۴۹]

آیت 2۰1 ﴿قُلْ أُوحِيَ إِلَيَّ إِنَّهُ اسْتَمَعَ.....﴾ اس آیت سے معلوم ہوا کہ جنوں کا قرآن سن کر ایمان لانا اور ان کی آپس کی ساری گفتگو رسول اللہ ﷺ کو وحی کے ذریعے سے معلوم ہوئی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ﴿مَا قَرَأَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى الْجِنِّ وَمَا رَأَاهُمْ﴾ [مسلم، الصلاة، باب النجھر بالقرأة فی الصبح: ۱۴۴۹] ”رسول اللہ ﷺ نے نہ جنوں کے سامنے قرآن پڑھا اور نہ انھیں دیکھا (وہ تو آپ کے پاس اس وقت آئے جب آپ نخلہ میں تھے اور انھوں نے اس موقع پر قرآن سنا)۔“ ہاں، اس کے بعد کئی دفعہ آپ ﷺ کی جنوں سے ملاقات ہوئی اور آپ نے انھیں قرآن سنایا

الرُّشْدِ قَامَتَا بِهِ، وَ لَكِنْ شَرِكٌ بَرِيئًا أَحَدًا ﴿۷﴾

اپنے رب کے ساتھ کسی کو بھی شریک نہیں کریں گے ﴿۷﴾

اور پڑھایا، جیسا کہ صحیح مسلم میں عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ سے غائب رہے، صحابہ نے وہ رات سخت پریشانی میں گزاری، تلاش کرتے کرتے وہ آپ سے اس وقت ملے جب آپ حرا کی طرف سے آرہے تھے۔ پوچھنے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا: «أَتَانِي دَاعِي الْجَنِّ فَذَهَبْتُ مَعَهُ فَفَرَّاتُ عَلَيْهِمُ الْقُرْآنُ» «میرے پاس جنوں کا دعوت دینے والا آیا تھا، چنانچہ میں اس کے ساتھ گیا اور انھیں قرآن پڑھ کر سنایا۔» ابن مسعود رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: «پھر آپ ہمیں لے گئے اور ہمیں ان کے نشان اور ان کی آگوں کے نشان دکھائے۔» [مسلم، الصلاة، باب الجهر بالقراءة في الصبح..... : ۴۵۰] اسی طرح ایک دفعہ آپ نے جنوں کے سامنے سورہ رحمان پڑھی اور وہ: ﴿قَبَّأْتِي الْآلَةَ رَبِّكُمْ تَاكُذِّبِينَ﴾ (تو تم دونوں اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے) پر جواب دیتے رہے: «لَا بَشِيءٌ مِّنْ يَّعْمَلُ رَبَّنَا تُكْذِبُ فَلَكِ الْحَمْدُ» [ترمذی، التفسیر، باب ومن سورة الرحمن : ۳۲۹۱، وقال الألبانی صحیح] «ہم تیری کسی بھی نعمت کو نہیں جھٹلاتے اے ہمارے رب! اور تیرے ہی لیے سب تعریف ہے۔»

② ان آیات میں کفار قریش کو شرم دلانی گئی ہے کہ دیکھو اتنی مدت تک سننے کے باوجود تم پر قرآن کا کچھ اثر نہیں ہوا، نہ تم شرک کی نجاست سے پاک ہو سکے، جب کہ یہ اتنی اعلیٰ، مؤثر اور عجیب کتاب ہے کہ جنوں کی اس جماعت نے اسے سنتے ہی ایمان قبول کر لیا اور ہمیشہ کے لیے شرک چھوڑنے کا اعلان کر دیا، حالانکہ جنوں کی سرکشی مشہور و معروف ہے۔

③ یہ بھی معلوم ہوا کہ جن وہ زبانیں جانتے ہیں جو انسانوں میں بولی جاتی ہیں، کم از کم وہ جن تو عربی زبان کی فصاحت و بلاغت کی باریکیوں تک کو اتنا سمجھتے تھے کہ انھوں نے قرآن کو عجیب قرار دیا اور فوراً اس پر ایمان لے آئے۔

④ جن بھی انسانوں کی طرح شریعت کے مخاطب ہیں اور ان کے رسول بھی وہی ہیں جو انسانوں کے ہیں۔ قرآن مجید یا حدیث میں جنوں میں سے کسی پیغمبر کا ذکر نہیں آیا، اس کے برعکس زیر تفسیر سورت میں صاف ذکر ہے کہ جن قرآن پر ایمان لائے اور سورہ احقاف میں ہے کہ انھوں نے کہا، ہم نے ایک ایسی کتاب سنی جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد نازل کی گئی ہے۔ (دیکھیے احقاف : ۳۰) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ موسیٰ علیہ السلام کو اپنا رسول مانتے تھے۔ سورہ رحمان کی تمام آیات، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جنوں کے سامنے انھیں پڑھنا اور ان کا جواب دینا بھی اس بات کی دلیل ہے۔ سورہ انبیاء (۸، ۷) سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔

⑤ جنوں میں شرک کرنے والے بھی موجود ہیں، جیسا کہ یہ جن شرک تھے اور انھوں نے قرآن مجید سننے کے بعد شرک چھوڑا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسی آیات پڑھ رہے تھے جس سے انھیں شرک کی خرابی معلوم ہوئی۔

وَأَنَّكَ تَعْلَىٰ جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَلَا وَلَدًا ۗ وَأَنَّكَ كَانَ يَقُولُ سَفِيهُنَا عَلَى اللَّهِ شَطَطًا ۗ وَأَنَا ظَنَنَّا أَنْ لَنْ نَقُولَ الْإِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا ۗ وَأَنَّكَ كَانَ رِجَالًا مِّنَ الْإِنْسِ يَعُوذُونَ بِرِجَالِ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوهُمْ رَهَقًا ۗ

اور یہ کہ بات یہ ہے کہ ہمارے رب کی شان بہت بلند ہے، اس نے نہ کوئی بیوی بنائی ہے اور نہ کوئی اولاد ⑤ اور یہ کہ بات یہ ہے کہ ہمارا بے وقوف اللہ پر زیادتی کی بات کہتا تھا ④ اور یہ کہ ہم نے گمان کیا کہ انسان اور جن اللہ پر ہرگز کوئی جھوٹ نہیں بولیں گے ⑤ اور یہ کہ بات یہ ہے کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ جنوں میں سے بعض لوگوں کی پناہ پکڑتے تھے تو انھوں نے ان (جنوں) کو سرکشی میں زیادہ کر دیا ⑥

آیت 3 وَأَنَّكَ تَعْلَىٰ جَدُّ رَبِّنَا.....: ”اور یہ کہ ہمارے رب کی شان بہت بلند ہے“ یعنی ہم اس پر بھی ایمان لے آئے کہ ہمارے رب کی شان بہت بلند ہے۔ یہ جن تثلیث کو ماننے والے نصرانی تھے یا کسی ایسے مذہب کو ماننے والے تھے جس میں اللہ تعالیٰ کی بیوی اور اولاد مانی جاتی ہے۔ اب انھیں معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی شان تو اس سے بہت بلند ہے کہ اس کی بیوی ہو یا اولاد ہو۔ بیوی ماننے سے وہ بلند شان والا نہیں بلکہ محتاج ٹھہرتا ہے، کیونکہ خاندان شہوت کے ہاتھوں اس کا محتاج ہوتا ہے اور اولاد بھی اسی شہوت کا نتیجہ ہے جو اسے بیوی کے پاس جانے پر مجبور کرتی ہے، تو پھر شان کیا بلند رہی۔ (طبری)

آیت 4 وَأَنَّكَ كَانَ يَقُولُ سَفِيهُنَا.....: ”سَفِيهُنَا“ (ہمارا بے وقوف) سے مراد ایک فرد بھی ہو سکتا ہے اور ایک گروہ بھی۔ فرد ہو تو ابلیس یا ان جنوں کا سردار مراد ہے۔ گروہ ہو تو مطلب یہ ہے کہ ہم میں سے کئی بے وقوف اور احمق لوگ اللہ تعالیٰ پر ایسی زیادتی کی باتیں توہمپا کرتے تھے کہ اس کا کوئی شریک ہے یا اس کی اولاد اور بیوی ہے۔

آیت 5 وَأَنَا ظَنَنَّا أَنْ لَنْ نَقُولَ الْإِنْسُ وَالْجِنُّ.....: یعنی ہم یہی سمجھتے تھے کہ انسان اور جن کم از کم اللہ پر تو ہرگز جھوٹ نہیں باندھ سکتے، اس لیے ہم نے ان سے سن کر مان لیا کہ اللہ کے کچھ شریک ہیں اور اس کی اولاد اور بیوی بھی ہے۔ اب معلوم ہوا کہ یہ ظالم جھوٹے تھے۔

آیت 5 وَأَنَّكَ كَانَ رِجَالًا مِّنَ الْإِنْسِ.....: عرب کے بعض مشرک جب کسی خوفناک جگہ یعنی جنگل وغیرہ میں جاتے تو کہتے کہ ہم اس علاقے میں جو جنوں کا سردار ہے اس کی پناہ میں آتے ہیں۔ اس سے جنوں کی سرکشی اور بڑھ گئی، کیونکہ وہ جان گئے کہ انسان ہم سے ڈرتے ہیں، اس لیے انھوں نے اپنے ماننے والوں کو اور زیادہ ڈرانا شروع کر دیا۔ معلوم ہوا آدمی کو نہ جنوں سے ڈرنا چاہیے، نہ ان کی پناہ مانگنی چاہیے اور نہ کسی غیر اللہ کی دہائی دینی چاہیے، کیونکہ یہ شرک ہے، بلکہ صرف اور صرف اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے۔ کسی بھی چیز کے شر سے پناہ مانگنے کے لیے قرآن مجید کی آخری دو سورتوں جیسی کوئی چیز نہیں۔ مزید وضاحت کے لیے ان دو سورتوں کی تفسیر دیکھیں۔

وَ أَنَّهُمْ ظَنُّوا كَمَا ظَنَنْتُمْ أَن لَّنْ يَبْعَثَ اللَّهُ أَحَدًا ۖ ﴿٦﴾ وَ أَكَا لَسْنَا السَّمَاءَ فَوَجَدْنَهَا
 مُلْتَأَمَةٌ حَرَسًا شَدِيدًا وَ شُهَبًا ۙ ﴿٧﴾ وَ أَكَا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّبْعِ ۖ فَسَنَ يَسْتَبْعِ
 الْآنَ يَجِدُ لَهُ شِهَابًا رَّصَدًا ۙ ﴿٨﴾

اور یہ کہ ان (انسانوں) نے گمان کیا جس طرح تم نے گمان کیا کہ اللہ کسی کو بھی نہیں اٹھائے گا ﴿۶﴾ اور یہ کہ ہم نے
 آسمان کو ہاتھ لگایا تو ہم نے اسے اس حال میں پایا کہ وہ سخت پہرے اور چمکدار شعلوں سے بھر دیا گیا ہے ﴿۷﴾ اور یہ
 کہ ہم اس کی کئی جگہوں میں سننے کے لیے بیٹھا کرتے تھے تو جواب کان لگاتا ہے وہ اپنے لیے ایک چمکدار شعلہ
 گھات میں لگا ہوا پاتا ہے ﴿۸﴾

خولہ بنت حکیمؓ نے فرمایا کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ فرما رہے تھے: «إِذَا نَزَلَ أَحَدُكُمْ مَنْزِلًا
 فَلْيَقُلْ أَعُوذُ بِكَلِمَاتِ اللَّهِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ، فَإِنَّهُ لَا يَضُرُّهُ شَيْءٌ حَتَّى يَرْتَجِلَ مِنْهُ» [مسلم، الذکر
 و الدعاء، باب في التعوذ من سوء الفضا، ... : ۲۷۰۸/۵۵] ”جب تم میں سے کوئی شخص کسی منزل میں اترے تو اسے یہ کلمات
 کہنے چاہئیں، تو اسے وہاں سے کوچ کرنے تک کوئی چیز نقصان نہیں پہنچائے گی: «أَعُوذُ بِكَلِمَاتِ اللَّهِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ
 مَا خَلَقَ» ”میں اللہ کے کامل کلمات کی پناہ پکڑتا ہوں ہر اس چیز کے شر سے جو اس نے پیدا کی۔“

آیت 7 وَ أَنَّهُمْ ظَنُّوا كَمَا ظَنَنْتُمْ : جن اپنی قوم کے لوگوں کو کافر انسانوں کے متعلق بتا رہے ہیں کہ شرک کے
 علاوہ ان انسانوں کا عقیدہ تمھاری طرح یہ بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ کسی کو قیامت کے دن دوبارہ نہیں اٹھائے گا۔ یہ معنی بھی ہو سکتا
 ہے کہ ان کا عقیدہ یہ بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ کسی کو (نبی بنا کر) نہیں بھیجے گا۔ کفار میں ہمیشہ، خواہ وہ انسان ہوں یا جن، توحید،
 آخرت اور رسالت تینوں کا انکار پایا جاتا رہا ہے۔

آیت 8 9.8 ﴿١﴾ وَ أَكَا لَسْنَا السَّمَاءَ فَوَجَدْنَهَا مُلْتَأَمَةٌ : اللہ تعالیٰ نے ستاروں کو آسمان کی زینت کے علاوہ ان شیاطین
 سے حفاظت کا ذریعہ بھی بنایا ہے جو آسمان کے قریب جا کر فرشتوں کی باتیں سننے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کو ہٹانے کے لیے ہر
 طرف سے ان پر شہابوں (انگاروں) کی بارش ہوتی ہے۔ (دیکھیے صافات: ۱۰ تا ۱۶) عائشہؓ نے فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ
 نے فرمایا: «إِنَّ الْمَلَائِكَةَ تَنْزِلُ فِي الْعَنَابِ وَ هُوَ السَّحَابُ فَتَذْكُرُ الْأُمَرَ فُضِي فِي السَّمَاءِ، فَتَسْتَرْقِي الشَّيَاطِينَ
 السَّمْعَ، فَتَسْمَعُهُ فَنُوحِيهِ إِلَى الْكُفَّانِ، فَيَكْذِبُونَ مَعَهَا مِائَةَ كَذْبَةٍ مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِهِمْ» [بخاری، بدء الخلق، باب
 ذكر الملائكة صلوات الله عليهم : ۳۲۱۰] ”فرشتے عنان یعنی بادل میں اترتے ہیں اور (آپس میں) اس بات کا ذکر کرتے
 ہیں جس کا آسمان میں فیصلہ کیا گیا ہوتا ہے، تو شیطان چوری سے وہ بات سننے کی کوشش کرتے ہیں اور اسے سن لیتے ہیں، پھر
 وہ یہ بات کابھوں کو چپکے سے پہنچا دیتے ہیں، پھر کابھن اس میں اپنی طرف سے سوجھوٹ ملا دیتے ہیں۔“

وَأَنكَ لَا تَدْرِي أَشَرُّ أَرِيدَ يَمَنَ فِي الْأَرْضِ أَمْ أَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا ۖ وَأَنكَ وَمِنَّا
الضَّالِّحُونَ وَمِنَّا دُونَ ذَلِكَ ۚ كُنَّا طَرَائِقَ قَدَدًا ۖ ﴿۱۰﴾

اور یہ کہ ہم نہیں جانتے کیا ان لوگوں کے ساتھ جو زمین میں ہیں، کسی برائی کا ارادہ کیا گیا ہے، یا ان کے رب نے ان کے ساتھ کسی بھلائی کا ارادہ فرمایا ہے ﴿۱۰﴾ اور یہ کہ ہم میں سے کچھ نیک ہیں اور ہم میں کچھ اس کے علاوہ ہیں، ہم مختلف گروہ چلے آئے ہیں ﴿۱۱﴾

﴿۱۰﴾ مِلَّتْ حَرَسًا شَدِيدًا وَ شُهَبًا : رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے بھی عالم بالا کی حفاظت کا انتظام تھا، مگر جن کوئی نہ کوئی بات سن لیتے تھے اور انھیں بالائی فضا میں چھپ کر بیٹھنے کی بھی کوئی نہ کوئی جگہ مل جاتی تھی، اب (آپ ﷺ کی بعثت کے بعد) جب وہ سننے کے لیے اوپر گئے تو ساری بالائی فضا سخت پہرے اور مسلسل شہابوں کی بارش سے بھری ہوئی تھی۔ ”مِلَّتْ“ سے معلوم ہو رہا ہے کہ اب پہرے کا نظام پہلے سے بہت سخت ہو گیا تھا۔ اس سے انھیں پریشانی ہوئی اور وہ تلاش میں نکلے کہ اس بندوبست کا باعث کیا ہے؟ جیسا کہ اس سورت کی شان نزول میں گزر چکا ہے۔

﴿۱۱﴾ قرآن مجید کی بہت سی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جن انسانوں سے الگ مخلوق ہیں جو مٹی سے نہیں بلکہ آگ سے پیدا کیے گئے ہیں اور جو انسان کی پیدائش سے پہلے موجود تھے۔ جن آسمان کے قریب جا سکتے ہیں اور بعض اوقات عالم بالا کی ایک آدھ بات چرا سکتے ہیں، انھیں انسانوں ہی میں سے سرکش قوم یا چھپے ہوئے جراثیم قرار دے کر ان کا انکار کر دینا قرآن و حدیث کا انکار ہے۔ کسی چیز کے انکار کی یہ بنیاد کہ اگر وہ موجود ہوتی تو نظر آتی، بے حد کمزور بنیاد ہے۔ مزید دیکھیے سورہ اعراف (۳۸، ۲۷)، ہود (۱۱۹)، حم سجدہ (۲۹، ۲۵) اور سورہ اتحاف (۱۸، ۲۹، ۳۲)۔ آدم اور ابلیس کا قصہ جو قرآن مجید میں سات مقامات پر بیان ہوا ہے اور سورہ رحمان پوری اس بات کی شاہد ہے کہ جن اور انسان الگ الگ مخلوق ہیں۔

آیت 10 ﴿۱۰﴾ وَأَنكَ لَا تَدْرِي أَشَرُّ أَرِيدَ اتنے سخت پہرے دیکھ کر جنوں نے سمجھ لیا کہ دو باتوں میں سے ایک ضرور ہے، یا تو اہل زمین کے ساتھ شر کا ارادہ کیا گیا ہے، یعنی کسی قوم پر اچانک عذاب آنے کا فیصلہ ہو چکا ہے اور خبروں پر پہرا لگ گیا ہے، تاکہ اس قوم کو وقت سے پہلے اطلاع نہ ہو جائے، یا اللہ تعالیٰ نے ان کی بھلائی اور ہدایت کا ارادہ کیا ہے، یعنی کوئی رسول مبعوث ہوا ہے جس کی طرف بھیجی جانے والی وحی کی حفاظت کے لیے یہ انتظام کیا گیا ہے، تاکہ شیطان نہ اس میں کوئی دخل دے سکیں اور نہ پہلے معلوم کر سکیں کہ پیغمبر کی طرف کیا وحی کی جا رہی ہے۔ جب وہ اس جستجو کے لیے نکلے کہ ان دو باتوں میں سے کون سی بات حق ہے تو انھیں رسول اللہ ﷺ کو قرآن پڑھتے ہوئے سن کر معلوم ہو گیا کہ یہ بندوبست اسی رسول کی وجہ سے ہے۔ اس آیت میں جنوں کے اس گروہ کا حسن ادب ملاحظہ ہو کہ ارادہ رشد کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی ہے اور ارادہ شر کی نسبت اس کی طرف نہیں کی۔

آیت 11 ﴿۱۱﴾ وَأَنكَ وَمِنَّا الضَّالِّحُونَ وَمِنَّا دُونَ ذَلِكَ ”طَرَائِقَ“ ”طَرِيفَةً“ کی جمع اور ”قَدَدًا“ ”قِدَّة“ بروزن کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

وَأَنَا ظَنَنَّا أَنْ لَنْ نُعْجِزَ اللَّهَ فِي الْأَرْضِ وَلَنْ نُعْجِزَهُ هَرَبًا ﴿۱۳﴾ وَأَنَا لَنَا سَبْعَ الْهُدَى
 أَمَّا بِهِ ۚ فَمَنْ يُؤْمِنُ بِرَبِّهِ فَلَا يَخَافُ بَخْسًا وَلَا رَهَقًا ﴿۱۴﴾ وَأَنَا مِنَّا الْمُسْلِمُونَ وَمِنَّا
 الْقَاسِطُونَ ۚ فَمَنْ أَسْلَمَ فَأُولَئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا ﴿۱۵﴾ وَأَنَا الْقَاسِطُونَ فَكُلُوا مِنَّا لِيحْبَبُوا حَبَابًا ﴿۱۶﴾

اور یہ کہ ہم نے یقین کر لیا کہ بے شک ہم کبھی اللہ کو زمین میں عاجز نہیں کر سکیں گے اور نہ ہی بھاگ کر کبھی اسے
 عاجز کر سکیں گے ﴿۱۳﴾ اور یہ کہ ہم نے جب ہدایت سن لی، ہم اس پر ایمان لے آئے، پھر جو کوئی اپنے رب پر ایمان
 لائے گا تو وہ نہ کسی نقصان سے ڈرے گا نہ کسی زیادتی سے ﴿۱۴﴾ اور یہ کہ ہم میں سے کچھ فرماں بردار ہیں اور ہم میں
 سے کچھ ظالم ہیں، پھر جو فرماں بردار ہو گیا تو وہی ہیں جنہوں نے سیدھے راستے کا قصد کیا ﴿۱۵﴾ اور جو ظالم ہیں تو وہ
 جنہم کا ایندھن ہوں گے ﴿۱۶﴾

”قِطْعَةٌ“ کی جمع ہے، ٹکڑے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ جنوں میں صالح اور غیر صالح ہر قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ ان
 میں اچھے عقائد، اچھے اعمال اور اچھے اخلاق کے لوگ بھی ہیں اور اس کے برعکس بھی، ان میں موجد بھی ہیں اور مشرک بھی،
 متبع سنت بھی ہیں اور بدعتی بھی، خوش اخلاق بھی ہیں اور بد اخلاق بھی، وہ بھی ہیں جو آسمان سے کوئی خبر سن کر اس میں سو جھوٹ
 ملاتے ہیں اور وہ بھی ہیں جو ایسا نہیں کرتے۔ مومن جنوں کا اپنی قوم کے لوگوں کو یہ بات کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم سب کے
 سب راہ راست پر نہیں بلکہ ہم میں بھی غیر صالح لوگ موجود ہیں، جنہیں حق بات سمجھانا اور ان کا اسے قبول کرنا ضروری ہے۔

آیت 13، 12: ﴿وَأَنَا ظَنَنَّا أَنْ لَنْ نُعْجِزَ اللَّهَ.....﴾: مشرک قومیں جنوں کو خدائی اختیارات کا مالک سمجھتی ہیں اور انہیں
 غیب دان جانتی ہیں مگر جن خود اقرار کر رہے ہیں کہ ہم نے سمجھ لیا کہ اگر اللہ تعالیٰ ہمیں پکڑنا چاہے تو نہ ہم زمین میں کہیں چھپ
 کر اسے عاجز کر سکتے ہیں کہ وہ ہمیں پکڑ نہ سکے اور نہ کہیں بھاگ کر، غرض پھر کسی صورت ہم اس سے بچ نہیں سکتے۔ اللہ تعالیٰ
 کے سامنے بالکل بے بس ہونے کے اسی عقیدے کا نتیجہ ہے کہ جو نبی ہم نے ہدایت کی بات سنی تو فوراً ایمان لے آئے۔ ”بَخْسًا
 وَلَا رَهَقًا“ نقصان یہ کہ جو نیکیاں کی ہیں ان میں کمی کر دی جائے اور زیادتی یہ کہ جو گناہ نہیں کیے وہ تھوپ دیے جائیں۔ ان آیات
 میں بھی مومن جن اپنے بھائیوں کو نصیحت کر رہے ہیں کہ جس ذات عالی سے نہ بھاگ سکتے ہو اور نہ چھپ سکتے ہو اس پر ایمان لے
 آؤ، اسی میں تمہاری خیریت ہے، پھر وہ ایسا مہربان ہے کہ جو اس پر ایمان لے آئے اسے نہ نقصان کا خوف ہے نہ زیادتی کا۔

آیت 15، 14: ﴿وَأَنَا وَمِنَّا الْمُسْلِمُونَ وَمِنَّا الْقَاسِطُونَ.....﴾: ”الْقَاسِطُونَ“ ظلم کرنے والے، راہ حق سے ہٹنے
 والے۔ ”قَسَطَ يَقْسِطُ“ (ض) ”قَسَطًا“ (قاف کے فتح کے ساتھ) ظلم کرنا، سیدھی راہ سے ہٹنا۔ ”الْقَسِطُ“ (قاف کے
 کسرہ کے ساتھ) انصاف۔ ”أَقْسَطَ يُقْسِطُ“ (افعال) انصاف کرنا۔ یعنی ہدایت سننے کے بعد ہم میں سے کچھ وہ ہیں جو
 تابع فرمان ہو گئے۔ یہ وہ ہیں جن کا ارادہ ہے کہ پوری کوشش کے ساتھ سیدھی راہ پر چلیں۔ ”تَحَرَّيْ يَتَحَرَّيْ تَحَرَّيًّا“ قصد
 کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

وَأَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوا عَلَى الطَّرِيقَةِ لَأَسْقَيْنَهُمْ مَاءً غَدَقًا ۖ لِنُقَذِهِمْ فِيهِ ۖ وَ مَنْ يُعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِ يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا ﴿۱۶﴾

اور (یہ وحی کی گئی ہے) کہ اگر وہ راستے پر سیدھے رہتے تو ہم انہیں ضرور بہت وافر پانی پلاتے ﴿۱۶﴾ تاکہ ہم اس میں ان کی آزمائش کریں اور جو کوئی اپنے رب کی یاد سے منہ موڑے گا وہ اسے سخت عذاب میں داخل کرے گا ﴿۱۶﴾

کرنا، کوشش کے ساتھ ظن سے یقین تک پہنچنا۔ اور جو راہ حق سے ہٹے ہوئے ہیں وہ جہنم کا ایندھن بنیں گے۔

﴿۱۶﴾ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ جن آگ سے پیدا کیے گئے ہیں، وہ جہنم کا ایندھن کیسے بنیں گے؟ جواب یہ ہے کہ جس طرح انسان مٹی سے بنا ہے مگر مٹی کا ڈھیلا مارا جائے تو اسے تکلیف ہوتی ہے اور ہر زندہ چیز پانی سے پیدا ہوئی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ﴾ [الانبیاء: ۳۰] (اور ہم نے پانی سے ہر زندہ چیز بنائی) مگر یہی پانی اسے غرق کر دیتا ہے۔ پانی آگ کو بجھا دیتا ہے، مگر یہی پانی جنوں کے لیے جو آگ سے بنے ہیں نعمت ہے، جیسا کہ سورہ رحمن کی آیات (۲۶، ۵۰) میں ہے اور اسی سورہ جن کی آیت (۱۶) میں آرہا ہے۔ اصل یہ ہے کہ آگ سے پیدا کیے جانے کے باوجود جنوں کی ایک الگ شکل و صورت ہے جو آگ سے متاثر ہوتی ہے، جس طرح گوشت پوست کا انسان مٹی سے پیدا ہونے کے باوجود مٹی سے الگ شکل و صورت رکھتا ہے۔ یہاں سے جنوں کی تقریر جو اللہ تعالیٰ نے نقل فرمائی ہے ختم ہوئی، آئندہ آیات میں دوبارہ اللہ تعالیٰ کا خطاب شروع ہوتا ہے۔

آیت 16 : وَأَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوا عَلَى الطَّرِيقَةِ اس کا عطف ”أَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِنَ الْجِنِّ.....“ پر ہے اور ”وَأَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوا“ کا اصل ”وَأَنَّهُمْ لَوِ اسْتَقَامُوا“ ہے، یعنی کہہ دے میری طرف وحی کی گئی ہے کہ جنوں کی ایک جماعت نے قرآن سنا..... اور میری طرف یہ وحی کی گئی ہے کہ اگر یہ لوگ (یعنی قریش مکہ یا تمام بنی آدم اور جن) اصل راستے پر سیدھے چلتے رہتے تو ہم انہیں وافر پانی پلاتے۔ ”عَدَقًا“ کا معنی کثیر ہے۔ وافر پانی سے مراد وافر رزق ہے، کیونکہ زمین سے حاصل ہونے والی تمام برکات بارش ہی سے حاصل ہوتی ہیں۔ یہ وہی بات ہے جو اللہ تعالیٰ نے ایک اور مقام پر بیان فرمائی ہے: ﴿وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ﴾ [الأعراف: ۹۶] ”اور اگر ان بستیوں والے ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکات کھول دیتے۔“ سورہ نوح (۱۲ تا ۱۰) اور سورہ مائدہ (۶۶) میں بھی یہی بات بیان ہوئی ہے۔

آیت 17 : لِنُقَذِهِمْ فِيهِ ۖ وَ مَنْ يُعْرِضْ : یعنی پانی کی کثرت اور رزق کی فراوانی کا مقصد بھی ان کی آزمائش ہے کہ وہ خوش حالی میں اللہ کا شکر ادا کرتے اور اس کی توحید و اطاعت پر قائم رہتے ہیں یا بدست ہو کر سرکشی پر اتر آتے ہیں۔ معلوم ہوا مصیبت کی طرح نعمت بھی اللہ کی طرف سے آزمائش ہے۔ سورہ انبیاء (۳۵)، اعراف (۱۶۸) اور سورہ قلم (۱۷ تا ۱۶)

(۲۰) میں بھی یہ مضمون بیان ہوا ہے۔ ”صَعَدًا“ ”صَعِدًا يَصْعَدُ“ (ع) کا مصدر ہے۔ لفظی معنی چڑھائی ہے، مراد ایسا سخت

قُلْ إِنَّمَا أَدْعُوا رَبِّي وَلَا أُشْرِكُ بِهِ أَحَدًا ﴿۲۰﴾ قُلْ إِنِّي لَا أَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا رَشَدًا ﴿۲۱﴾
 قُلْ إِنِّي لَنْ يُجِيرَنِي مِنَ اللَّهِ أَحَدٌ ۚ وَلَنْ أجدَ مِنْ دُونِهِ مُلْتَحَدًا ﴿۲۲﴾ إِلَّا بَلَاغًا مِنَ
 اللَّهِ وَرِسَالَةً ۗ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَإِنَّ لَهُ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيهَا أَبَدًا ﴿۲۳﴾

کہہ دے میں تو صرف اپنے رب کو پکارتا ہوں اور میں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا ﴿۲۰﴾ کہہ دے بلاشبہ میں تمہارے لیے نہ کوئی نقصان پہنچانے کا اختیار رکھتا ہوں اور نہ کسی بھلائی کا ﴿۲۱﴾ کہہ دے یقیناً میں، مجھے اللہ سے کوئی بھی کبھی پناہ نہیں دے گا اور میں اس کے سوا کبھی پناہ کی کوئی جگہ نہیں پاؤں گا ﴿۲۲﴾ مگر (میں تو صرف) اللہ کے احکام پہنچانے اور اس کے پیغامات کا (اختیار رکھتا ہوں) اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا تو یقیناً اسی کے لیے جہنم کی آگ ہے، ہمیشہ اس میں رہنے والے ہیں ہمیشہ ﴿۲۳﴾

آیت 20 ﴿ قُلْ إِنَّمَا أَدْعُوا رَبِّي ﴾: یعنی تمہیں جتنا بھی ناگوار ہو اور تم روکنے کے لیے جتنے بھی جمع ہو جاؤ، میں تو صرف اپنے رب ہی کو پکاروں گا، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کروں گا۔ ندائے غیر اللہ کی حرمت کی آیات کے لیے دیکھیں گزشتہ آیت (۱۸) کی تفسیر۔

آیت 21 ﴿ قُلْ إِنِّي لَا أَمْلِكُ لَكُمْ ﴾: اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو صاف اعلان کرنے کا حکم دیا کہ آپ ﷺ دوسروں کے لیے نفع کے مالک ہیں نہ نقصان کے اور نہ ہی ہدایت اور گمراہی کا اختیار رکھتے ہیں۔ ”ضَرًّا“ کے مقابلے میں ”نَفْعًا“ اور ”رَشَدًا“ کے مقابلے میں ”غَيًّا“ حذف کر دیا ہے، کیونکہ وہ الفاظ خود بخود معلوم ہو رہے ہیں۔

ایک اور مقام پر یہ اعلان کرنے کا حکم دیا کہ آپ ﷺ خود اپنے نفع یا نقصان کا بھی اختیار نہیں رکھتے۔ (دیکھیے اعراف: ۱۸۸) اور کئی مقامات پر واضح فرمایا کہ اللہ کے علاوہ جن لوگوں کو بھی پکارا جاتا ہے وہ ذرہ برابر چیز کا بھی اختیار نہیں رکھتے۔ (مثلاً دیکھیے سبأ: ۲۲۔ فاطر: ۱۳) اتنی صراحت کے بعد بھی کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کو یا دوسرے انبیاء و اولیاء کو اپنے نفع و نقصان کا مالک سمجھے تو اسے خود ہی سوچنا چاہیے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی اور اس کے فرمان کی کیا قدر کی۔

آیت 22 ﴿ قُلْ إِنِّي لَنْ يُجِيرَنِي مِنَ اللَّهِ أَحَدٌ ﴾: یعنی آپ انھیں کہہ دیں کہ اگر میں اللہ کے ساتھ کسی اور کو پکاروں یا اس کی نافرمانی کروں تو اللہ کی گرفت سے مجھے کوئی نہیں بچا سکے گا اور نہ مجھے اس کے علاوہ کوئی جانے پناہ مل سکے گی، تو تم اس کی گرفت سے کیسے بچ سکو گے اور کس کی پناہ میں جاؤ گے؟

آیت 22 ﴿ إِلَّا بَلَاغًا مِنَ اللَّهِ وَرِسَالَةً ﴾: یہ ”لَا أَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا رَشَدًا“ سے استثناء ہے اور درمیان والی آیت پہلی آیت ہی کی مزید وضاحت ہے، یعنی میں تو صرف اللہ کے احکام پہنچانے کا اور اس کے پیغامات کا اختیار رکھتا ہوں، میرا کام بس اتنا ہی ہے، پیغام پہنچ جانے کے بعد جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اس کے لیے جہنم کی آگ ہے جس

حَتَّىٰ إِذَا رَأَوْا مَا يُوعَدُونَ فَيَسْئَلُونَ مَنْ أضعفُ ناصِرًا وَ أَقَلُّ عَدَدًا ﴿۲۴﴾ قُلْ إِنْ أَدْرِيٓ
أَقْرَبُ قَاتُوعَدُونَ أَمْ يَجْعَلُ لَهُ رَبِّيٓ أَمَدًا ﴿۲۵﴾ عَلِمَ الْغَيْبُ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا ﴿۲۶﴾

(یہ اسی طرح غفلت میں رہیں گے) یہاں تک کہ جب وہ چیز دیکھ لیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے تو ضرور جان لیں گے کہ کون ہے جو مددگار کے اعتبار سے زیادہ کمزور ہے اور جو تعداد میں زیادہ کم ہے؟ ﴿۲۴﴾ کہہ دے میں نہیں جانتا آیا وہ چیز قریب ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے، یا میرا رب اس کے لیے کچھ مدت رکھے گا؟ ﴿۲۵﴾ (وہ) غیب کو جاننے والا ہے، پس اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا ﴿۲۶﴾

میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ نافرمانی سے مراد اس جگہ اللہ تعالیٰ کی توحید پر ایمان نہ لانا ہے، کیونکہ کچھلی آیات میں یہی مضمون آ رہا ہے۔ ابدی جہنمی صرف کفار ہیں، یہ مطلب نہیں کہ ہر گناہ اور نافرمانی کی سزا ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہنا ہے۔

آیت 24 : حَتَّىٰ إِذَا رَأَوْا مَا يُوعَدُونَ..... یعنی کفار اپنی تعداد کی کثرت اور اپنے مددگاروں کی قوت پر فخر اور مسلمانوں کی قلت تعداد اور کمزوری پر طعن کرتے ہیں تو کرتے رہیں، یہ سب کچھ تھوڑے وقت کے لیے ہے، یہاں تک کہ جب یہ لوگ وہ چیز (اپنی آنکھوں سے) دیکھ لیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے تو اس وقت انھیں معلوم ہوگا کہ مددگاروں کے لحاظ سے کمزور اور تعداد میں کم کون ہے؟ وہ چیز جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے اس سے مراد اسلام کا غلبہ اور کفار کی شکست بھی ہے، جیسے کہ بدر، خندق، فتح مکہ اور حنین میں انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا، کفار پر خوف اور قہر کا مسلط ہونا بھی ہے اور مرتے وقت فرشتوں کا ان کے مونہوں اور پیشوں پر مارنا بھی، قبر کا عذاب بھی ہے، قیامت کی ہولناکی اور جہنم کی آگ بھی۔ درجہ بدرجہ یہ سب کچھ دیکھتے جانے کے ساتھ ہی ان پر اپنی تعداد کی کثرت اور حمایتوں کی قوت کی حقیقت کھلتی جائے گی۔

آیت 25 : قُلْ إِنْ أَدْرِيٓ أَقْرَبُ..... یعنی یہ لوگ جو جلدی چاہتے اور پوچھتے ہیں کہ اسلام کا وہ غلبہ، کفار پر عذاب اور قیامت کا معاملہ کب ہوگا؟ تو آپ ان سے کہہ دیں کہ میرا کام تمہیں آگاہ کرنا ہے، وقت بتانا میرا کام نہیں اور نہ ہی مجھے معلوم ہے کہ وہ وقت بالکل قریب آچکا ہے یا میرا رب اس کے لیے کوئی اور مدت مقرر کرتا ہے۔

آیت 25 : عَلِمَ الْغَيْبُ فَلَا يُظْهِرُ..... یعنی یہ جانتا کہ کل کیا ہوگا اور قیامت کب آئے گی غیب میں شامل ہے اور غیب جاننے والا صرف اور صرف میرا رب ہے، چنانچہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ قَدْ آتَتْكَ مَوَدَّةٌ وَلَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَنْتَوِي ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ﴿۲۵﴾﴾ انفسان : ۳۴ | بے شک اللہ ہی ہے جس کے پاس قیامت کا علم ہے اور وہی بارش برساتا ہے اور وہی جانتا ہے جو کچھ ماؤں کے پیٹوں میں ہے اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کمائی کرے گا اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ کس زمین میں مرے گا، بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا، پوری خبر رکھنے والا ہے۔“

إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِنْ رَسُولٍ فَإِنَّهُ يَسْلُكُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مِنْ خَلْفِهِ رَصَدًا ﴿٢٧﴾ لِيَعْلَمَ
 أَنْ قَدْ أَبْلَغُوا رَسُولَ رَبِّهِمْ وَأَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَأَحْصَىٰ كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا ﴿٢٨﴾

مگر کوئی رسول، جسے وہ پسند کر لے تو بے شک وہ اس کے آگے اور اس کے پیچھے پہرا لگا دیتا ہے ﴿٢٧﴾ تاکہ جان لے کہ انھوں نے واقعی اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیے ہیں اور اس نے ان تمام چیزوں کا احاطہ کر رکھا ہے جو ان کے پاس ہیں اور ہر چیز کو گن کر شمار کر رکھا ہے ﴿٢٨﴾

آیت 27 : ﴿إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِنْ رَسُولٍ﴾.....: ”اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا“، لیکن اگر وہ اپنے غیب کی کوئی بات بتانا چاہے تو ہر ایک کو نہیں بتاتا بلکہ صرف اسی کو بتاتا ہے جسے وہ رسول کے طور پر پسند کر لے۔ ”رَسُولٍ“ کا معنی ہے وہ شخص جسے پیغام پہنچانے کے لیے بھیجا گیا ہو، یعنی وہ غیب کی بات کسی کو عالم الغیب بنانے کے لیے نہیں بلکہ اسے لوگوں تک پہنچانے کے لیے بتاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس پنے ہوئے رسول کو بھی جب غیب کی کسی بات کی اطلاع دیتا ہے تو اس کے چاروں طرف شہابِ ثاقب اور فرشتوں کا زبردست پہرا لگا دیتا ہے، تاکہ شیطان اس وحی میں نہ اپنی کوئی بات داخل کر سکیں اور نہ وقت سے پہلے معلوم کر کے کاہنوں کو اطلاع دے سکیں، بلکہ کلامِ الہی محفوظ طریقے سے رسول تک اور رسول کے ذریعے سے لوگوں تک پہنچے۔

آیت 28 ﴿لِيَعْلَمَ أَنْ قَدْ أَبْلَغُوا﴾.....: اس سارے انتظام کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جان لے کہ رسولوں نے اپنے رب کے پیغام پہنچا دیے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ہر اس چھوٹی اور بڑی چیز کا احاطہ کر رکھا ہے جو ان کے پاس ہے اور ہر چیز کو گن کر شمار کر رکھا ہے۔ رسولوں کی مجال نہیں (خواہ وہ فرشتے ہوں جیسے جبریل علیہ السلام یا انسان ہوں جیسے تمام رسول ﷺ) کہ اللہ کے پیغامات میں ایک لفظ کی بھی کمی بیشی کر سکیں۔ یہاں ایک سوال ہے کہ اللہ تعالیٰ تو پہلے ہی ہر چیز کا علم رکھتا ہے، پھر ”لِيَعْلَمَ“ (تاکہ وہ جان لے) فرمانے کا کیا مطلب ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک وہ پہلے ہی سب کچھ جانتا ہے کہ اس طرح ہوگا، مگر اللہ تعالیٰ نے یہ سب انتظام اس لیے کیا ہے تاکہ رسول اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیں اور اللہ تعالیٰ جان لے کہ انھوں نے اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیے ہیں۔

2 بعض لوگ ان آیات سے استدلال کرتے ہیں کہ رسول بھی عالم الغیب ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ انھیں غیب پر مطلع کرتا ہے، فرق صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم غیب ذاتی ہے اور انبیاء کا علم غیب عطائی یعنی اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے، مگر یہ بات درست نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے صاف فرمایا ہے: ﴿قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ [النمل: 60] ”کہہ دیجیے کہ آسمانوں میں اور زمین میں جو بھی ہے اللہ کے علاوہ غیب نہیں جانتا۔“ یعنی عالم الغیب صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اگر وہ کسی رسول کو کوئی بات بتا دے تو اس سے وہ عالم الغیب نہیں بن جاتا، کیونکہ ایک تو رسولوں کو صرف اتنی بات معلوم ہوتی ہے جتنی بتائی جاتی ہے، وہ ہر بات نہیں جانتے اور یہ عالم الغیب کی شان کے خلاف ہے کہ اسے کچھ خبریں معلوم ہوں اور کچھ معلوم نہ ہوں۔ دوسرے جب کسی کو غیب کی کوئی بات بتانے سے معلوم ہو تو وہ عالم الغیب نہیں ہوتا، ورنہ ہم سب عالم الغیب

يَا أَيُّهَا الْمَرْمَلُ ①

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

اے کپڑے میں لپٹنے والے! ①

ہو جائیں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو غیب کی جو باتیں بتائیں وہ لوگوں کو پہنچانے کے لیے بتائیں، قیامت، جنت، دوزخ اور حوض کوثر وغیرہ یہ سب غیب کی باتیں ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے بتانے سے ہمیں معلوم ہیں، تو کیا ہم بھی عالم الغیب ہیں؟ ظاہر ہے ایسا نہیں، سو حق یہی ہے کہ عالم الغیب صرف اللہ تعالیٰ ہے، دوسرا کوئی عالم الغیب نہیں، نہ ذاتی نہ عطائی۔

سورة المزمّل

آیت ۱ ① يَا أَيُّهَا الْمَرْمَلُ: ”الْمَرْمَلُ“ اصل میں ”الْمُتَمَرِّمِلُ“ تھا، تاء کو زاء سے بدل کر زاء میں ادغام کر دیا، کپڑے میں لپٹنے والا۔ یہ باب لازم ہے۔

② يَا أَيُّهَا الْمَرْمَلُ: ”اے کپڑے میں لپٹنے والے!“ ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ ان آیات کے اترنے کے وقت رسول اللہ ﷺ کپڑے میں لپٹ کر لیٹے ہوئے تھے۔ اس خطاب میں رسول اللہ ﷺ سے بہت لطف و کرم اور محبت کا اظہار ہے، کیونکہ اہل عرب کا طریقہ ہے کہ وہ مخاطب سے نرمی اور محبت سے بات کرنا چاہتے ہوں تو ایسے لفظ سے مخاطب کرتے ہیں جو مخاطب کی اس وقت کی حالت پر دلالت کر رہا ہو، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے علی رضی اللہ عنہ کو مسجد میں زمین پر لیٹے ہوئے دیکھا تو فرمایا: ﴿فَمُ أَبَا تُرَابٍ!﴾ [بخاری، الصلاة، باب نوم الرجال في المسجد: ۴۴۱] ”مٹی والے! اٹھ کھڑا ہو۔“

③ آپ ﷺ کے چادر میں لیٹنے کی وجہ کیا تھی؟ اس میں تین قول ہیں، پہلا یہ کہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ پہلی وحی: ﴿اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ﴾ کے نزول کے موقع پر جب فرشتے نے آپ کو تین مرتبہ زور سے دایا تو آپ گھر میں خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے اور فرمایا: ﴿زَمَلُونِي زَمَلُونِي﴾ [بخاری، الوحي، باب كيف كان بدء الوحي: ۳] ”مجھے چادر اوڑھا دو، مجھے چادر اوڑھا دو۔“ اسی طرح جابر بن عبد اللہ انصاری رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ کچھ عرصہ تک وحی بند رہنے کے بعد رسول اللہ ﷺ پر جب وحی اتری تو آپ نے اس کے متعلق بیان فرمایا: ”میں چلا جا رہا تھا کہ میں نے آسمان سے ایک آواز سنی، میں نے نظر اٹھائی تو وہی فرشتہ جو حرا میں میرے پاس آیا تھا، آسمان و زمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ میں اس سے ڈر گیا اور واپس آ کر کہا: ﴿زَمَلُونِي زَمَلُونِي﴾ تو اللہ عزوجل نے ”يَا أَيُّهَا الْمَرْمَلُ“ سے لے کر ”وَ الْوَجْزُ فَاهْجُرْ“ تک آیات اتاریں۔“ [بخاری، الوحي، باب كيف كان بدء الوحي: ۴] ان دونوں موقعوں پر ”زَمَلُونِي“ کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ پر فرشتے کی ملاقات اور وحی کے اترنے سے جو رعب اور خوف طاری ہوتا تھا اس کی وجہ سے آپ کپڑا لپیٹ لیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے وحی

قُمْ الْيَلَّ إِلَّا قَلِيلًا ۝ نِصْفَةً أَوْ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا ۝ أَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا ۝

رات کو قیام کر مگر تھوڑا ۱۲ آدمی رات (قیام کر)، یا اس سے تھوڑا سا کم کر لے ۱۳ یا اس سے زیادہ کر لے اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھ ۱۴

کے اس بارگراں کو اٹھانے کے لیے تیار کرنے کی خاطر آپ کو قیام اللیل کا حکم دیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیام اللیل کے ساتھ آپ کو وحی کا بوجھ اٹھانے کے لیے تیار کیا جا رہا ہے، چنانچہ بعد میں وحی تسلسل اور کثرت سے اترنے لگی۔

دوسرا قول یہ ہے کہ ”اے چادر میں لپٹ کر سونے والے! سستی اور سونے کا وقت گیا، رات کو قیام کر.....“ تیسرا قول یہ ہے کہ قریش مکہ دارالندوہ میں جمع ہوئے اور رسول اللہ ﷺ کے لیے کوئی ایسا نام طے کرنے لگے جسے سن کر لوگ آپ کے پاس آنے سے باز رہیں۔ کسی نے کہا کاہن ہے، کچھ دوسرے کہنے لگے کاہن نہیں ہے۔ کسی نے دیوانہ کہا، اس کی بھی تردید ہو گئی۔ کچھ بولے جادوگر ہے، دوسروں نے کہا جادوگر نہیں ہے۔ غرض مشرکین اس قسم کی باتیں کر کے چلے گئے۔ رسول اللہ ﷺ کو یہ باتیں پہنچیں تو آپ کو بہت صدمہ ہوا اور اس پریشانی اور غم کی حالت میں آپ چادر لپیٹ کر لیٹ گئے۔ جبریل علیہ السلام آئے اور فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا الْمُرْسَلُ﴾ ”اے پڑھے میں لپٹنے والے!“ اور فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ﴾ ”اے کبل میں لپٹنے والے!“ مقصد یہ ہے کہ آپ ان کی باتوں سے بد دل اور رنجیدہ ہو کر چادر لپیٹ کر نہ لیٹ جائیں بلکہ رات کو قیام کریں، اس سے آپ میں یہ بارگراں اٹھانے کی قوت پیدا ہوگی، ان لوگوں کی باتوں پر صبر کریں اور ان سے اچھے طریقے سے علیحدگی اختیار کریں۔ ابن کثیر نے یہ قول جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما کی روایت سے مسند بزار سے نقل کیا ہے، مگر اس کی سند میں ایک راوی معطلی بن عبد الرحمن ہے جس کے متعلق تقریب میں ہے: ”مَنْهُمْ بِالْوَضْعِ وَ قَدْ زُمِيَ بِالرَّقُصِ“ ”اس پر احادیث گھڑنے کی تہمت ہے اور رافضیت کا الزام بھی ہے۔“

آیت 2:4 ﴿قُمْ الْيَلَّ إِلَّا قَلِيلًا.....﴾ : تھوڑا حصہ چھوڑ کر ساری رات کا قیام کر۔ ”نِصْفَةً“ ”الْيَلَّ“ سے بدل ہے، مگر اس ”الْيَلَّ“ سے جس میں سے ”قَلِيلًا“ کا استثناء ہو چکا ہے۔ ”قَلِيلًا“ کا لفظ چونکہ مجمل ہے، اس لیے اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ رات کا تھوڑا حصہ چھوڑ کر جس حصے کا قیام کرنا ہے وہ کتنا ہونا چاہیے۔ فرمایا رات کا نصف قیام کریں یا نصف سے کچھ کم کر لیں یا نصف سے زیادہ کر لیں۔ اس سورت کی آخری آیت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام ان آیات کے نزول کے بعد رات کی دو تہائی کے قریب اور رات کے نصف اور رات کی تہائی کے برابر قیام کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ”نصف سے کچھ کم“ کا مطلب ثلث اور ”نصف سے زیادہ“ کا مطلب دو ثلث کے قریب ہے۔ ”مِنْهُ“ اور ”عَلَيْهِ“ کی ضمیریں ”نِصْفَةً“ کی طرف لوٹ رہی ہیں۔ اس تقریر سے وہ سوال حل ہو جاتا ہے کہ ”إِلَّا قَلِيلًا“ کے بعد ”أَوْ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا“ میں تکرار ہے۔ اس سوال کا ایک اور حل یہ ہے کہ ”قُمْ الْيَلَّ إِلَّا قَلِيلًا“ کا ترجمہ یہ کیا جائے کہ ”رات کا قیام کر مگر کسی رات رہ جائے تو مضائقہ نہیں۔“ ”نِصْفَةً“ سے یہ بیان شروع ہوتا ہے کہ رات کا کتنا حصہ قیام میں گزارنا ہے، یہ

تفسیر بھی درست ہے۔

② ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو قیام اللیل کا حکم دے کر اس کی تاکید فرمائی ہے۔ تہجد، وتر، قیام رمضان اور تراویح سب قیام اللیل ہی کے نام ہیں۔ اہل علم میں اختلاف ہے کہ یہ نماز فرض ہے یا سنت اور اگر فرض ہے تو صرف رسول اللہ ﷺ پر فرض تھی یا پوری امت پر فرض ہے؟ قرطبی میں ہے کہ حسن اور ابن سیرین اس بات کے قائل ہیں کہ رات کو نماز ہر مسلم پر فرض ہے خواہ بکری کا دودھ دوہنے کے برابر پڑھے، مگر اکثر علماء فرماتے ہیں اور صحیح بھی یہی ہے کہ قیام اللیل امت پر فرض نہیں بلکہ یہ ایسی سنت ہے جس کی بہت تاکید کی گئی۔ سورہ مزمل کے آخر میں فرمایا: ﴿لَإِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُومُ أَدْنَىٰ مِنْ ثُلُثَيِ اللَّيْلِ وَنِصْفَهُ وَثُلُثَهُ وَطَآئِفَتُهُ مِنَ اللَّيْلِ مَعَكَ﴾ [المزمل: ۲۰] یعنی آپ کے ساتھیوں کی ایک جماعت بھی آپ کے ساتھ اتنا قیام کرتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کے علاوہ صحابہ کی صرف ایک جماعت قیام کرتی تھی، اگر یہ فرض ہوتا تو ایک جماعت کے بجائے تمام صحابہ قیام کرتے۔

صحیحین میں طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک سال کو ارکان دین بتائے اور نمازوں میں سے دن رات میں صرف پانچ نمازیں فرض بتائیں، اس نے پوچھا: ”کیا مجھ پر اس کے علاوہ بھی کچھ فرض ہے؟“ تو آپ نے فرمایا: ﴿لَا، إِلَّا أَنْ تَطَّوَّعَ﴾ [بخاری، الإیمان، باب الزکاة من الإسلام: ۴۶۔ مسلم: ۱۱] ”نہیں، (الآیہ کہ تم اپنی خوشی سے پڑھو۔“ صحیحین ہی میں عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ایک رمضان میں تین راتیں لوگ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جماعت کی صورت میں قیام میں شریک ہوتے رہے۔ چوتھی رات آپ باہر تشریف نہیں لائے اور فرمایا: ﴿أَنِّي حَشِيْتُ أَنْ تُفَرَّضَ عَلَيْكُمْ﴾ [بخاری، التہجد، باب تحریض النبی ﷺ: ۱۱۲۹۔ مسلم: ۷۶۱] ”میں اس بات سے ڈرا کہ تم پر (یہ نماز) فرض نہ ہو جائے۔“ اگر قیام اللیل فرض ہوتا تو آپ اس کے ان پر (یہ نماز) فرض ہو جانے سے کیوں ڈرتے؟ رہی یہ بات کہ رسول اللہ ﷺ پر قیام اللیل فرض تھا یا نہیں تو اس کے لیے دیکھیے سورہ بنی اسرائیل کی آیت (۷۹) کی تفسیر۔

فرض نہ ہونے کے باوجود قیام اللیل کی تاکید و فضیلت قرآن و حدیث میں بہت آئی ہے، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿أَفْضَلُ الصَّلَاةِ بَعْدَ الصَّلَاةِ الْمَكْتُوبَةِ الصَّلَاةُ فِي جَوْفِ اللَّيْلِ﴾ [مسلم، الصیام، باب فضل صوم المحرم: ۱۱۶۳/۲۰۳] ”فرض نماز کے بعد سب سے افضل نماز رات کی نماز ہے۔“ اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن اور متقی بندوں کی شان میں فرمایا: ﴿تَتَجَافَىٰ جُنُوبُهُمْ عَنِ النَّضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا ۚ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ﴾ [السجدة: ۱۶] ”ان کے پہلو بستروں سے جدا رہتے ہیں، اپنے رب کو ڈرتے ہوئے اور امید کرتے ہوئے پکارتے ہیں اور ہم نے انہیں جو کچھ دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔“ اور فرمایا: ﴿كَانُوا قَلِيلًا مِّنَ النَّاسِ﴾ [الذاریات: ۱۷] ”وہ رات کے تھوڑے حصے میں سویا کرتے تھے۔“ اور فرمایا: ﴿وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَجَدَ لَهُمْ تَأْفُؤًا ۚ لَكَ عَنَّا أَن نَّيَعْبُكَ رَبَّنَا نَقَامًا تَحْمُودًا﴾ [بنی اسرائیل: ۷۹] ”اور رات کے کچھ حصے میں پھر اس کے ساتھ بیدار رہے، اس حال میں

کہ تیرے لیے زائد ہے۔ قریب ہے کہ تیرا رب تجھے مقام محمود پر کھڑا کرے۔“ عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «مَنْ قَامَ بِعَشْرِ آيَاتٍ لَمْ يُكْتَبْ مِنَ الْعَافِينَ وَمَنْ قَامَ بِعِشْرَةِ آيَاتٍ كُتِبَ مِنَ الْقَائِمِينَ وَمَنْ قَامَ بِأَلْفِ آيَةٍ كُتِبَ مِنَ الْمُقْتَدِرِينَ» [ابو داؤد، ترمذی، معجم، باب نزول القرآن، ۱۳۹۸، وقال الألبانی صحیح] ”جو شخص دس آیات کے ساتھ قیام کرے وہ عافین میں نہیں لکھا جاتا، جو سو آیات کے ساتھ قیام کرے وہ قائمین (عبادت گزاروں) میں لکھا جاتا ہے اور جو ہزار آیات کے ساتھ قیام کرے وہ مقتدرین (خزانے والوں) میں لکھا جاتا ہے۔“ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «رَجِمَ اللَّهُ رَجُلًا قَامَ مِنَ اللَّيْلِ فَصَلَّى وَأَيَّظَ امْرَأَتَهُ فَإِنْ أَبَتْ نَضَحَ فِي وَجْهِهَا الْمَاءَ، رَجِمَ اللَّهُ امْرَأَةً قَامَتْ مِنَ اللَّيْلِ فَصَلَّتْ وَأَيَّظَتْ زَوْجَهَا فَإِنْ أَبَتْ نَضَحَتْ فِي وَجْهِهَا الْمَاءَ» [ابو داؤد، الطحاوی، معجم، باب قیام اللیل، ۱۳۰۸، وقال الألبانی صحیح] ”اللہ تعالیٰ اس آدمی پر رحم کرے جو رات کو اٹھا، نماز پڑھی اور اپنی بیوی کو جگایا (اور اس نے بھی نماز پڑھی)، اگر اس نے انکار کیا تو اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ اللہ تعالیٰ اس عورت پر رحم کرے جو رات کو اٹھی اور نماز پڑھی، خاتوند کو جگایا (اور اس نے بھی نماز پڑھی)، اگر اس نے انکار کیا تو اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔“

رات کے اوقات میں سے بھی رات کے آخری حصے میں قیام کی فضیلت زیادہ ہے۔ عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «أَقْرَبُ مَا يَكُونُ الرَّبُّ مِنَ الْعَبْدِ فِي حَوْفِ اللَّيْلِ الْأَجْرُ فَإِنْ اسْتَضَعْتَ أَنْ تَكُونَ مَعَهُ يَذْكُرُ اللَّهُ فِي تِلْكَ السَّاعَةِ فُكُنْ» [ترمذی، الدعوات، باب : ۳۵۷۹، و صححه الألبانی فی صحیح النعمان] ”رب تعالیٰ بندے کے سب سے زیادہ قریب رات کے آخری حصے میں ہوتا ہے، اگر تو یہ کر سکے کہ اس وقت اللہ کا ذکر کرنے والوں میں سے ہو تو یہ کام کر۔“ قیام اللیل کا سب سے بہتر طریقہ داؤد علیہ السلام کا طریقہ ہے۔ عبد اللہ بن عمرو بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «أَحَبُّ الصَّلَاةِ إِلَى اللَّهِ صَلَاةُ دَاوُدَ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَكَانَ يَنَامُ نِصْفَ اللَّيْلِ وَيَقُومُ ثُلُثَهُ وَيَنَامُ سُدُسَهُ» [بخاری، التہجد، باب من نام عند السحر : ۱۱۳۱] ”اللہ تعالیٰ کو نمازوں میں سے سب سے محبوب نماز داؤد علیہ السلام کی نماز ہے، وہ رات کا نصف سو جاتے اور اس کا تیسرا حصہ قیام کرتے اور چھٹا حصہ سو جاتے۔“

③ ”وَرَتَّلِ الْقُرْآنَ“ اور قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھ۔ ”تَرْتِيلًا“ مصدر تاکید کے لیے ہے، خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھ۔ اس میں بتایا ہے کہ رات کے قیام میں پڑھنا کیا ہے؟ سو حکم ہوا کہ قرآن پڑھیں اور خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں۔ ترتیل میں کئی چیزیں شامل ہیں، ان میں سے پہلی یہ ہے کہ ٹھہر ٹھہر کر پورے غور و فکر کے ساتھ تلاوت کی جائے۔ رسول اللہ ﷺ اس حکم کے مطابق خوب ٹھہر ٹھہر کر تلاوت کیا کرتے تھے۔ حصہ پڑھنا فرماتی ہیں: «وَكَانَ يَقْرَأُ بِالسُّورَةِ فَيُرْتِّلُهَا حَتَّى تَكُونَ أَطْوَلَ مِنْ أَطْوَلِ مِنْهَا» [مسلم، صلاة المسافرين، باب جواز النفاذة فائضا و فاعدا، ... : ۷۳۳] ”اور آپ ﷺ سورت کی تلاوت کرتے اور اسے اتنا ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے کہ وہ اس سے لمبی سورت سے بھی لمبی ہو جاتی۔“ دوسری چیز جو ترتیل میں شامل ہے، یہ ہے کہ ہر لفظ کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

إِنَّا سَأَلْنَاكَ قَوْلًا ثَقِيلًا ⑤

یقیناً ہم ضرورتاً پر ایک بھاری کلام نازل کریں گے ⑤

الگ الگ سمجھ میں آئے، چنانچہ یعلیٰ بن مملک نے ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت اور نماز کے متعلق سوال کیا، انھوں نے پہلے آپ کی رات کی نماز کا حال بیان کیا: «ثُمَّ نَعَتُ قِرَاءَتَهُ فَإِذَا هِيَ تَنَعَتْ قِرَاءَةً مُفَسَّرَةً حَرْفًا حَرْفًا» [ترمذی، فضائل القرآن، باب ماجاء کیف كانت قراءة النبي صلی اللہ علیہ وسلم: ۲۹۲۳] ”پھر ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت کی صفت بیان کی تو انھوں نے ایسی قراءت بیان کی جس کا ایک ایک حرف واضح کیا گیا تھا۔“

تیسری چیز ہر آیت پر ٹھہرنا ہے، بعض لوگ ایک ہی سانس میں وقف کے بغیر آیت کے ساتھ آیت ملائے جاتے ہیں اور اسے کمال سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ سنت کے خلاف ہے، جیسا کہ ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: «كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقَطُّعُ قِرَاءَتَهُ [وَ فِي رِوَايَةِ أَبِي دَاوُدَ : يَقَطُّعُ قِرَاءَتَهُ آيَةً آيَةً] يَقْرَأُ: ﴿ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴾ ثُمَّ يَقِفُ ﴿ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ﴾ ثُمَّ يَقِفُ» [ترمذی، القراءات، باب في فاتحة الكتاب: ۲۹۲۷- أبو داؤد: ۴۰۰۱، وصححه الألباني في صحيح الجامع الصغير] ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قراءت الگ الگ کر کے پڑھتے تھے۔“ اور ابو داؤد کی روایت میں ہے: ”آپ اپنی قراءت ایک ایک آیت الگ کر کے پڑھتے تھے۔“ آپ ”الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ“ پڑھتے اور ٹھہر جاتے، پھر ”الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ“ پڑھتے اور ٹھہر جاتے۔“ چوتھی چیز یہ ہے کہ حروف مدہ کو لمبا کر کے پڑھا جائے۔ قتادہ فرماتے ہیں: «سُئِلَ أَنَسٌ كَيْفَ كَانَتْ قِرَاءَةُ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ فَقَالَ كَانَتْ مَدًّا ثُمَّ قَرَأَ: ﴿ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ﴾ بِمَدٍّ بِبِسْمِ اللَّهِ وَ يَمُدُّ بِالرَّحْمَنِ وَ يَمُدُّ بِالرَّحِيمِ» [بخاری، فضائل القرآن، باب مد القراءة: ۱۰۴۶] ”انس رضی اللہ عنہ سے سوال کیا گیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت کیسی تھی؟ تو انھوں نے فرمایا: ”آپ کی قراءت کھینچ کھینچ کر ہوتی تھی۔“ پھر انھوں نے ”بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ“ پڑھی۔ وہ ”بِسْمِ اللَّهِ“ کو لمبا کر کے پڑھتے تھے اور ”الرَّحْمَنِ“ کو لمبا کر کے پڑھتے اور ”الرَّحِيمِ“ کو لمبا کر کے پڑھتے تھے۔“ پانچویں یہ کہ قرآن کو خوب صورت لہجے اور خوش آوازی سے پڑھا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «لَيْسَ مِثْلًا مَنْ لَمْ يَتَعَنَّ بِالْقُرْآنِ» [بخاری، التوحيد، باب قول الله تعالى: ﴿وَأَسْرُوا فَوَلَكُمْ...﴾ ۱۷۵۲۷] ”جو شخص قرآن کو خوبصورت لہجے اور خوش آوازی سے نہ پڑھے وہ ہم میں سے نہیں۔“ غرض ترتیل کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کو خوب غور و فکر کے ساتھ، ٹھہر ٹھہر کر، الفاظ کی واضح ادائیگی کے ساتھ اور حروف مدہ کو لمبا کر کے جس قدر خوش آوازی کے ساتھ ہو سکے پڑھا جائے۔

آیت 5 ﴿ ① إِنْ سَأَلْنَاكَ عَلَيْكَ : اس آیت میں اور اس کے بعد والی دو آیتوں میں رات کے قیام کے حکم کی حکمت بیان فرمائی گئی ہے کہ وحی الہی کا بھاری بوجھ اٹھانے کی استعداد پیدا کرنے کے لیے رات کا قیام اور اس میں پورے غور و فکر کے ساتھ قرآن کی تلاوت نہایت ضروری ہے۔

إِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ وَطْأً وَأَقْوَمُ قِيلاً ①

بلاشبہ رات کو اٹھنا (نفس کو) کچلنے میں زیادہ سخت اور بات کرنے میں زیادہ درستی والا ہے ①

② ”قَوْلًا قَبِيلاً“ (بھاری کلام) سے مراد وحی الہی ہے جو اترتے وقت بھی بھاری ہے، ہر کلام اور ہر چیز سے بھاری ہے، اس پر عمل بھاری ہے اور اسے تمام دنیا تک پہنچانے کا فریضہ بھی بہت بھاری ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے: ① نزول وحی کے وقت آپ ﷺ پر بہت بوجھ پڑتا تھا، جسے برداشت کرنا آپ پر بہت بھاری تھا۔ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ سخت سردی کے دن آپ پر وحی نازل ہوتی اور جب وہ حالت ختم ہوتی تو آپ کی پیشانی سے پسینا ٹپک رہا ہوتا۔ ۱- بخاری، بد، الوحي، باب كيف كان بدء الوحي : ۲۰ [۲۰] زید بن ثابت رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ نبی ﷺ پر وحی نازل ہوئی تو آپ کی ران میری ران پر تھی، آپ کی ران کا اتنا بوجھ تھا، قریب تھا کہ وہ میری ران کو کچل دے۔ ۱- دیکھیے بخاری: ۲۸۳۲ [عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ اونٹنی پر سوار ہوتے، آپ پر وحی اترتی تو اونٹنی زمین پر گردن رکھ دیتی۔ ۱- دیکھیے مسند احمد: ۱۱۸/۶، ح: ۲۶۹۲۱] ① یہ کلام دوسرے تمام کلاموں سے بھاری ہے، باقی سب کلام اس کے مقابلے میں ہیچ ہیں۔ ② اس کے احکام پر عمل کرنا بھاری ہے۔ فرائض پنجگانہ اور دوسرے احکام بجالانا اور اس کی منع کردہ چیزوں سے اجتناب کرنا نفس پر بہت بھاری ہے۔ ③ یہ اس لیے بھی بھاری ہے کہ اسے تمام دنیا کے لوگوں تک پہنچانے کا حکم ہے جو نہایت دشوار کام ہے۔ اس کے لیے آپ کو لوگوں کی مخالفت، طعن و ملامت، ٹھٹھا و مذاق، گالی گلوچ، جسمانی ایذا، قتل کی سازشیں اور ہجرت و جہاد سب کچھ برداشت کرنا ہوگا۔

آیت 6 ① إِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ : ”نَاشِئَةَ اللَّيْلِ“ (رات کا اٹھنا) ”نَشَأٌ نَشْأً“ (ف، ک) کا مصدر بروزن ”عَافِيَةٌ“ اور ”كَاذِبَةٌ“ ہے۔ ”نَشَأٌ مِنْ مَّكَانِهِ“ وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ ”وَطْأٌ“ ”وَطْأٌ يَطْأُ“ (س) کا مصدر ہے، پاؤں سے روندنا، کچلنا۔ ”أَقْوَمُ“ زیادہ سیدھا، زیادہ درست۔ ”قَبِيلاً“ ”قَوْلًا“ کی طرح مصدر ہے۔

② یعنی رات کا اٹھنا طبیعت پر بہت بھاری اور نفس کو کچلنے میں دوسری تمام چیزوں سے بڑھ کر ہے۔ واضح رہے کہ جو لوگ زیادہ سے زیادہ جسمانی ایذا برداشت کر لیتے ہیں بے خوابی کی ایذا کے سامنے ان کے حوصلے بھی جواب دے جاتے ہیں۔ نیند جیسی مرغوب چیز چھوڑ کر قیام کا مشکل ترین عمل کرنے سے نفس میں مشقت اٹھانے کی اتنی قوت پیدا ہوگی کہ وہ وحی الہی کو اٹھانے اور تبلیغ رسالت کے بھاری بوجھ کو برداشت کرنے کے قابل ہو جائے گا۔ ”أَقْوَمُ قَبِيلاً“ رات کو جب ہر طرف خاموشی ہوتی ہے اور لوگ سوئے ہوئے ہوتے ہیں اس وقت اٹھ کر آدمی اپنے پروردگار کے سامنے کھڑا ہوتا ہے تو اس مبارک وقت میں کوئی بھی چیز ایسی نہیں ہوتی جو اس کی توجہ خراب کرے، اس وقت منہ سے نکلنے والے الفاظ زبان اور دل دونوں سے نکل رہے ہوتے ہیں اور اس عمل میں کسی دکھاوے یا سناوے کی آمیزش بھی نہیں ہوتی، کیونکہ کوئی دوسرا نہ دیکھتا ہے نہ سن رہا ہوتا ہے، اس لیے اسے بات کرنے میں زیادہ درست قرار دیا۔ پھر رات کا آخری حصہ خاص قبولیت کا وقت بھی ہے، جیسا کہ

إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْعًا طَوِيلًا ۖ وَادْكُرْ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبْتَئِلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلاً ۝

بلاشبہ تیرے لیے دن میں ایک لہا کام ہے ۷ اور اپنے رب کا نام ذکر کر اور ہر طرف سے منقطع ہو کر اسی کی طرف متوجہ ہو جا ۸

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «يَنْزِلُ رَبُّنَا تَبَارَكَ وَتَعَالَى كُلَّ لَيْلَةٍ إِلَى السَّمَاءِ الدُّنْيَا حِينَ يَبْقَى ثُلُثُ اللَّيْلِ الْآخِرِ يَقُولُ مَنْ يَدْعُونِي فَأَسْتَجِيبَ لَهُ؟ مَنْ يَسْأَلُنِي فَأُعْطِيهِ؟ مَنْ يَسْتَغْفِرُنِي فَأَغْفِرَ لَهُ؟» [بخاری، النهجد، باب الدعاء والصلاة من آخر الليل: ۱۱۴۵-۱۱۴۶، مسلم: ۷۵۸] "ہمارا رب تبارک و تعالیٰ ہر رات آسمان دنیا پر اترتا ہے، جب رات کا آخری ثلث باقی ہوتا ہے، فرماتا ہے: "کون ہے جو مجھے پکارے اور میں اس کی دعا قبول کروں؟ کون ہے جو مجھ سے مانگے اور میں اسے عطا کروں؟ کون ہے جو مجھ سے بخشش کی درخواست کرے اور میں اسے بخشوں؟"

آیت 7 إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْعًا طَوِيلًا: اور "سَبْحًا" اور "سَبَّاحَةً" (ف) کا اصل معنی تیرنا ہے، جیسے فرمایا: ﴿وَالسَّحَابِ سَبْحًا﴾ [النازعات: ۳] "اور جو تیرنے والے ہیں! تیزی سے تیرنا۔" مراد ادھر ادھر آنا جانا، کام کاج اور مشغولیت ہے، یعنی دن کے وقت آپ کو گھر کے کام، فکر معاش، تبلیغ دین، مہمان نوازی، مسلمانوں کے معاملات کی اصلاح اور جہاد فی سبیل اللہ، غرض بے شمار مصروفیات ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جتنا مشغول وقت گزارا ہے ایسا مشغول وقت گزارنے والا کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ ایسی مشغولیت میں دن کے وقت ذکر الہی، قیام اور تلاوت کے لیے الگ وقت نکالنا ممکن نہیں تھا، اس لیے خاص ان کاموں کے لیے رات کو اٹھنے کی تاکید فرمائی۔

آیت 8 وَادْكُرْ اسْمَ رَبِّكَ.....: "بَتَّلْ يَتَّبِلْ" (ن،ض) قطع کرنا۔ "تَبْتَلْ" منقطع ہونا۔ اس آیت کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ رات کو خاص طور پر اٹھ کر قیام، تلاوت اور ذکر الہی کے علاوہ دن رات کے ہر وقت میں بھی اللہ کا ذکر جاری رکھ اور اپنی تمام تر توجہ مخلوق سے ہٹا کر اپنے رب ہی کی طرف رکھ۔ اس مطلب کا قرینہ یہ ہے کہ اس میں ذکر و تبتل کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں فرمایا، عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: «كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَذْكُرُ اللَّهَ عَلَى كُلِّ أَحْيَانِهِ» [مسلم، الحيض، باب ذكر الله تعالى في حال الجنابة وغيرها: ۳۷۲] "رسول اللہ ﷺ اپنے تمام اوقات میں اللہ کا ذکر کیا کرتے تھے۔" دوسرا مطلب یہ ہے کہ دن کی لمبی چوڑی مصروفیات سے فارغ ہو کر رات کو خاص طور پر اپنے رب کا ذکر کر اور ہر کام سے کلی طور پر منقطع ہو کر اپنے رب کی طرف متوجہ ہو جا، جیسا کہ سورہ انشراح میں فرمایا: ﴿فَإِذَا فَرَغْتَ فَانصَبْ ۖ وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَانصَبْ﴾ [الانشراح: ۸۰۷] "جب تو فارغ ہو تو محنت کر اور اپنے رب ہی کی طرف رغبت کر۔" اس مطلب کا قرینہ شروع سورت سے آیات کا سیاق ہے۔ دونوں مطلب ہی درست ہیں، پہلے مطلب کی صورت میں عام ذکر و تبتل مراد ہوگا، جو دوسرے اشغال کے ساتھ بھی جاری رہتا ہے اور دوسرے میں خاص، جو دوسرے کام چھوڑ کر رات کی تنہائی میں یکسوئی

رَبِّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا ﴿٩﴾ وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ
وَاهْبِطْهُمْ هَبْرًا جَمِيلًا ﴿١٠﴾ وَذُرِّيًّا وَالتَّكْذِبِينَ أُولِي النَّعْمَةِ وَهَمَلْتُمْ قَلِيلًا ﴿١١﴾

مشرق و مغرب کا رب ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، سو اس کو کارساز بنا لے ﴿۹﴾ اور اس پر صبر کر جو وہ کہتے ہیں اور انھیں چھوڑ دے، خوبصورت طریقے سے چھوڑنا ﴿۱۰﴾ اور چھوڑ مجھے اور ان جھٹلانے والوں کو جو خوش حال ہیں اور انھیں تھوڑی سی مہلت دے ﴿۱۱﴾

سے ادا ہوتا ہے۔

آیت 9 رَبِّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ..... : یعنی مشرق و مغرب کا مالک و مربی وہی ہے، ہر وقت اسی کا ذکر کرو، عبادت بھی اسی کی کرو اور بھروسا بھی اسی پر رکھو، جب وہ معبود اور وکیل ہے تو تمام دنیا سے بے پروا ہو جانے میں فکر کس بات کی؟ عبادت و توکل دونوں کو اللہ کے لیے خاص کرنے کا حکم کلی آیات میں آیا ہے، جیسے فرمایا: ﴿فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ﴾ | ہود: ۱۶۳ | ”سو اسی کی عبادت کر اور اسی پر بھروسا رکھ۔“ اور فرمایا: ﴿إِنَّا كُنَّا نَعْبُدُ وَإِنَّا كُنَّا نَسْتَعِينُ﴾ | العنكبوت: ۱۷ | ”ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ سے مدد مانگتے ہیں۔“ ”وَكَيْلًا“ ”وَتَوَكَّلْ بِكُلِّ“ (رض) سپرد کرنا۔ وکیل وہ ہے جس کے سپرد کوئی کام کر دیا جائے، یعنی اپنی پوری جد و جہد کے باوجود اعتماد صرف اللہ تعالیٰ پر رکھو اور اپنے تمام کام اسی کے سپرد کرو۔

آیت 10 وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ..... : یعنی ایک اللہ کو اپنا سہارا بنانے، ان کے معبودوں کو یکسر چھوڑنے اور اس عمل کی دعوت و تبلیغ پر یہ آپ کو جو کچھ بھی کہیں آپ صبر کریں، خواہ یہ آپ کو جھوٹا کہیں یا دیوانہ یا کابن یا شاعر، یا محمد کے بجائے مذموم کہیں، غرض کچھ بھی کہیں یا جو بھی بہتان باندھیں آپ صبر کریں، انتقام کے پتھر میں نہ پڑیں، نہ ان کی بدسلوکی کا شکوہ کریں۔ خوبصورت طریقے سے الگ ہو جانے کا مطلب یہ ہے کہ لڑ جھگڑ کر اور بدزبانی کر کے نہیں بلکہ نہایت حسن سلوک، صبر اور شرافت کے ساتھ ان سے کنارہ کشی اختیار کریں۔ دوسری بات یہ کہ ایسی غلطی نہ ہو کہ ان سے بائیکاٹ کر دیں اور بول چال ختم کر کے دعوت ہی سے کنارہ کش ہو جائیں۔ تیسری یہ کہ ظاہری کنارہ کشی کے باوجود ان کی خیر خواہی و بہرہ رسانی اور ہدایت و رہنمائی میں کسی قسم کی کمی نہ کریں۔

آیت 11 وَذُرِّيًّا وَالتَّكْذِبِينَ..... : یعنی جب تم نے مجھے اپنا وکیل بنا لیا اور اپنا سب کچھ میرے سپرد کر دیا تو ان خوش حال جھٹلانے والوں کا معاملہ بھی مجھ پر چھوڑ دو جن کی نعمت و خوش حالی ایمان لانے کے بجائے ان کے انکار کا باعث بن گئی ہے، میں خود ان سے نمٹ لوں گا، آپ انھیں تھوڑی مہلت دیں۔ تھوڑی مہلت سے مراد دنیا ہی میں تھوڑی مہلت ہے، جیسا کہ کفار مکہ کو جھٹلانے کی سزا جلد ہی میدان بدر میں مل گئی۔ اس کے علاوہ اگر زیادہ سے زیادہ مہلت بھی ہو تو دنیا میں زندہ

إِنَّ لَدَيْنَا أَنْكَالًا وَجَحِيمًا ﴿۱۷﴾ وَطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ ﴿۱۸﴾ وَعَذَابًا أَلِيمًا ﴿۱۹﴾ يَوْمَ تَرْجُفُ الْأَرْضُ
وَالجِبَالُ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيبًا مَهِيلاً ﴿۲۰﴾ إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَا
أَرْسَلْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا ﴿۲۱﴾ فَعَصَىٰ فِرْعَوْنُ الرَّسُولَ فَأَخَذْنَاهُ أَخْذًا وَبَيْلًا ﴿۲۲﴾
فَكَيْفَ تَتَّقُونَ إِن كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيبًا ﴿۲۳﴾ النَّسَاءُ مُنْفَطِرٌ بِهِ ۗ كَانَ
بلاشبہ ہمارے پاس بیڑیاں ہیں اور سخت بھڑکتی ہوئی آگ ﴿۱۷﴾ اور گلے میں پھنس جانے والا کھانا اور دردناک عذاب ﴿۱۸﴾
جس دن زمین اور پہاڑ کا نہیں گے اور پہاڑ گرائی ہوئی ریت کے نیلے ہو جائیں گے ﴿۱۹﴾ بلاشبہ ہم نے تمہاری طرف ایک
پیغام پہنچانے والا بھیجا جو تم پر گواہی دینے والا ہے، جس طرح ہم نے فرعون کی طرف ایک پیغام پہنچانے والا بھیجا ﴿۲۰﴾ سو
فرعون نے اس پیغام پہنچانے والے کی نافرمانی کی تو ہم نے اسے پکڑ لیا، نہایت سخت پکڑنا ﴿۲۱﴾ پھر تم کیسے بچو
گے اگر تم نے کفر کیا، اس دن سے جو بچوں کو بوڑھے کر دے گا ﴿۲۲﴾ اس میں آسمان پھٹ جانے والا ہے، اس کا وعدہ

رہنے تک ہے جو یقیناً بالکل کلم ہے، پھر اس کے بعد میں جانوں اور یہ جائیں، آپ ایک طرف ہو جائیں۔

آیت 12-13 إِنَّ لَدَيْنَا أَنْكَالًا . . . : "اَنْكَالًا" بگُل " (نون کے کسرہ کے ساتھ) کی جمع ہے، جانور کے پاؤں کی
زنجیر اور لکام کے لوہے والے حصے کو کہتے ہیں۔ "جَحِيمًا" "خُصْفَةً" (آگ کا سخت بھڑکنا) سے مشتق ہے۔ (راغب)
"ذَا غُصَّةٍ" جو گلے میں پھنس جائے، نہ نکل سکے نہ اگل سکے۔

آیت 14 يَوْمَ تَرْجُفُ الْأَرْضُ . . . : "كَثِيبًا" ریت کا ٹیلہ۔ "مَهِيلاً" (گرایا ہوا) "هَالًا يَهِيْلُ هَيْلًا" سے اسم
مفعول ہے۔ "هَالُ الشَّرَابِ أَوْ الرَّمْلِ" اس نے مٹی یا ریت کو گرایا۔ یعنی وہ عذاب اس دن ہوگا جب سخت زلزلے سے پہاڑ
لرز اٹھیں گے، پھر اس زلزلے کی شدت سے ان کی تختی اور ذرات کی باہمی بندش ختم ہو جائے گی اور وہ ٹھوس پہاڑوں کے
بجائے ریت کے ٹیلوں کی صورت میں بدل جائیں گے، جو خود بخود اس طرح نیچے گر رہی ہوگی جیسے کوئی اسے گرا رہا ہو۔ قرآن
مجید میں دوسرے مقامات پر پہاڑوں پر اس کے بعد گزرنے والی کیفیات بھی ذکر ہوئی ہیں کہ وہ دھنسی ہوئی اُردن کی طرح ہو
جائیں گے، پھر بادلوں کی طرح اڑنے لگیں گے، پھر زمین چھیل میدان بن جائے گی۔ مزید دیکھیے سورہ نبا (۲۰) کی تفسیر۔

آیت 15-19 ① إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا . . . : ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے کفار کو دو طرح سے ڈرایا ہے، ایک
فرعون کا قصہ یاد دلا کر کہ اگر تمہاری سرکشی فرعون کی طرح جاری رہی تو تمہارا انجام بھی فرعون اور اس کے لشکروں جیسا ہوگا،
دوسرا یہ کہ اگر تم دنیا کے عذاب سے بچ بھی گئے تو قیامت کے اس عذاب سے کیسے بچو گے جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا؟

② شَاهِدًا عَلَيْكُمْ : رسول اللہ ﷺ اس بات کی شہادت دیں گے کہ انھوں نے حق تعالیٰ کا پیغام ان لوگوں تک پہنچا دیا تھا
اور یہ بھی کہ اُس نے اسے مانا اور کس نے انکار کیا۔ یاد رہے کہ آپ انھی لوگوں کے متعلق یہ شہادت دیں گے جو آپ کی زندگی

وَعَدَةُ مَفْعُولًا ﴿۱۸﴾ إِنَّ هَذِهِ تَذَكُّرَةٌ ۖ فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا ﴿۱۹﴾

ہمیشہ سے (پورا) ہو کر رہنے والا ہے ﴿۱۸﴾ یقیناً یہ ایک نصیحت ہے، تو جو چاہے اپنے رب کی طرف راستہ بنا لے ﴿۱۹﴾

میں موجود تھے، جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّهُ يُعَاءِدُ بِرِحَالٍ مِّنْ أُمَّنِي فَيُؤْخَذُ بِهِمْ ذَاتَ السَّمَالِ، فَيَقُولُ يَا رَبِّ! أَصْحَابِي، فَيَقَالُ إِنَّكَ لَا تَدْرِي مَا أُحْدِثُوا بَعْدَكَ فَأَقُولُ كَمَا قَالَ الْعَبْدُ الصَّالِحُ: ﴿ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَا دُمْتُ فِيهِمْ ۖ فَلَمَّا تَوَلَّيْتَنِي كُنْتُ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ ﴾ فَيَقَالُ إِذْ هُوَ لَاءِ

لَمْ يَزَالُوا مُرْتَدِّينَ عَلَيَّ أَغْفَابِهِمْ مُنْذُ فَارَقْتَهُمْ » [بخاری، التفسیر، باب: ﴿وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا﴾ : ۱۹۶۲۵]

”میری امت کے کچھ آدمی لائے جایں گے اور انھیں بائیں طرف لے جایا جائے گا تو میں کہوں گا: ”اے میرے رب! یہ تو

میرے ساتھی ہیں۔“ کہا جائے گا: ”آپ نہیں جانتے کہ انھوں نے آپ کے بعد کیا نیا کام کیا تھا۔“ تو میں وہی کہوں گا جو

عبد صالح (عیسیٰ علیہ السلام) کہیں گے: ﴿ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَا دُمْتُ فِيهِمْ ۖ فَلَمَّا تَوَلَّيْتَنِي كُنْتُ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ

وَ أَنْتَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ﴾ [العنقود: ۱۱۷] ”میں ان پر اس وقت تک شہادت دینے والا تھا جب تک میں ان میں

موجود تھا، پھر جب تو نے مجھے اٹھایا تو تو خود ہی ان کا نگہبان تھا اور تو ہر چیز پر شہادت دینے والا ہے۔“ کہا جائے گا کہ

جب سے آپ ان سے جدا ہوئے یہ لوگ اس وقت سے اپنی ایزویوں پر پھرے رہے۔“ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ

”شَاهِدًا عَلَيْهِمْ“ سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ تمام لوگوں کے تمام احوال دیکھتے، سنتے اور جانتے ہیں،

کیونکہ اس کے بغیر شہادت ہو نہیں سکتی، ان لوگوں کا استدلال درست نہیں۔ علاوہ ازیں شہادت کے لیے خود دیکھنا اور سنا بھی

ضروری نہیں، بلکہ اگر ایسے ذریعے سے کوئی بات معلوم ہو جس میں شک کی کوئی گنجائش نہ ہو تو اس پر بھی شہادت دی جاسکتی

ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ بقرہ کی آیت (۱۳۳) کی تفسیر۔

﴿۱۹﴾ ”يَشِينًا“ ”أَشِيْبٌ“ کی جمع ہے، سفید بالوں والا۔ ”شَابٌ يَشِيْبُ شَيْبًا“ (ض) سفید بالوں والا ہونا۔ ”الْوَالِدَانِ“

”وَالْيَتَامَىٰ“ کی جمع ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن کی ہولناکی سے بچے بوڑھے ہو جائیں گے۔ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے

روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « يَقُولُ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَا آدَمُ! يَقُولُ لَبِيكَ رَبَّنَا وَ سَعْدِيكَ،

فَيَنَادِي بِصَوْتٍ إِذْ اللَّهُ بِأَمْرِكَ أَنْ تَخْرُجَ مِنْ دُرَّتِكَ بَعْنَا إِلَى النَّارِ قَالَ يَا رَبِّ! وَمَا بَعَثَ النَّارَ إِلَّا قَالَ مِنْ كُلِّ

أَلْفٍ، أَرَاهُ قَالَ، نَسَعَ مَائَةً وَ تِسْعَةً وَ تِسْعِينَ فَجِيئُكَ تُصْعِقُ الْحَامِلُ حَمَلَهَا وَيَشِيْبُ الْوَالِدُ ﴿ وَ تَرَى النَّاسَ

سُكْرَى وَ مَا هُمْ بِسُكْرَى وَ لَكِنَّ عَذَابَ اللَّهِ شَدِيدٌ ﴾ فَسَقَّ ذَلِكَ عَلَى النَّاسِ حَتَّى تَغَيَّرَتْ وَجُوهُهُمْ، فَقَالَ

النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ يَأْجُوجَ وَ مَا جُوجَ وَ تِسْعَةً وَ تِسْعِينَ، وَ مِنْكُمْ وَاجِدٌ، ثُمَّ أَنْتُمْ فِي

النَّاسِ كَالشَّمْعَةِ السُّودَاءِ فِي حَنْبِ الثُّورِ الْأَبْيَضِ، أَوْ كَالشَّمْعَةِ الْبَيْضَاءِ فِي حَنْبِ الثُّورِ الْأَسْوَدِ » [بخاری، التفسیر، باب قوله: ﴿ وَ تَرَى النَّاسَ سُكْرَى ﴾ : ۱۷۶۱] ”اللہ عزوجل قیامت کے دن آدم علیہ السلام سے کہیں گے: ”اے آدم! وہ

إِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُومُ أَدْنَىٰ مِنْ ثُلُثِي اللَّيْلِ وَنِصْفَهُ وَثُلُثَهُ وَطَائِفَةٌ مِّنَ
الَّذِينَ مَعَكَ ۗ وَاللَّهُ يُقَدِّرُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۗ عَلِمَ أَن لَّنْ نُحْصِيَهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ

بلاشبہ تیرا رب جانتا ہے کہ تو رات کے دو تہائی کے قریب اور اس کا نصف اور اس کا تیسرا حصہ قیام کرتا ہے اور ان
لوگوں کی ایک جماعت بھی جو تیرے ساتھ ہیں اور اللہ رات اور دن کا اندازہ رکھتا ہے۔ اس نے جان لیا کہ تم ہرگز

عرض کریں گے: "اے ہمارے پروردگار! میں بار بار حاضر ہوں تیری فرماں برداری کے لیے۔" پھر (انھیں) آواز دی جائے
گی: "اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ اپنی اولاد میں سے جہنم کی جماعت نکالو۔" وہ پوچھیں گے: "اے میرے رب! جہنم کی جماعت
کیا ہے؟" اللہ تعالیٰ فرمائے گا: "ہر ہزار میں سے نو سو ننانوے۔" تو اس وقت حمل والی اپنا حمل گرا دے گی اور بچے بوڑھے
ہو جائیں گے ﴿وَتَرَى النَّاسَ سُكَارَىٰ وَمَا هُمْ بِسُكَارَىٰ وَلَٰكِنَّ عَذَابَ اللَّهِ شَدِيدٌ﴾ | الحج: ۲۰ | "اور تو لوگوں کو
دیکھے گا کہ بے ہوش ہیں، حالانکہ وہ بے ہوش نہیں ہوں گے لیکن اللہ کا عذاب سخت ہے۔" یہ بات لوگوں پر بہت گراں گزری،
حتیٰ کہ ان کے چہروں کے رنگ بدل گئے تو نبی ﷺ نے فرمایا: "یا جوج ماجوج میں سے نو سو ننانوے اور تم میں سے ایک ہوگا۔
لوگوں کے مقابلے میں تمہاری تعداد اس طرح ہے جیسے سفید بتل کے پہلو میں ایک سیاہ بال یا سیاہ بتل کے پہلو میں ایک سفید
بال ہوتا ہے۔" آیت اور حدیث میں بچوں کے بوڑھے ہونے کے ذکر سے اس دن کی بے پناہ سختی اور ہولناکی کا اظہار ہو رہا
ہے، کیونکہ عام غم سے آدمی کے بال فوراً سفید نہیں ہوتے۔ یقیناً وہ انتہائی غیر معمولی شدت اور ہولناکی ہوگی جو بچوں کے بالوں
کو بھی سفید کر دے گی۔

① التَّيَّامُ مَنَفَطْرٌ بِهِ: "پاؤں" "فنی" کے معنی میں ہے، یعنی اس دن میں آسمان پھٹ جائے گا، یا "پاؤں" سیوہ ہے، یعنی اس
دن کی وجہ سے آسمان پھٹ جائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ اس دن کی شدت سے آسمان جیسی عظیم مخلوق پھٹ جائے گی تو دوسری
چیزوں کا کیا حال ہوگا اور اگر کفر پر قائم رہے تو تم اس دن سے کس طرح بچو گے؟ آسمان کے مقابلے میں تمہاری تو کوئی
حیثیت ہی نہیں۔

آیت 20 ① إِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ أَنَّكَ : سعد بن ہشام فرماتے ہیں کہ میں نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا: "آپ مجھے
رسول اللہ ﷺ کے قیام کے متعلق بتائیں؟" انھوں نے فرمایا: "تم "يَأْتِيهَا الْمَوْقِلُ" نہیں پڑھتے؟" میں نے کہا: "کیوں
نہیں!" تو انھوں نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے اس سورت کے شروع حصے میں قیام اللیل فرض فرمایا تو نبی ﷺ اور آپ کے صحابہ
ایک سال قیام کرتے رہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کا آخری حصہ بارہ ماہ تک آسمان میں روک رکھا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے
اس سورت کے آخری حصے میں تخفیف نازل فرمائی اور قیام اللیل فرض ہونے کے بعد نفل ہو گیا۔" | مسلم، صلاة المسافرين و
قصرها، باب جامع صلاة اللیل | ۷۴۶ | سورہ مزمل کے اول اور آخر کے نزول کے متعلق سند کے لحاظ سے یہی بات سب
سے زیادہ صحیح ہے۔ صحیح مسلم کی اسی روایت کے آخر میں ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی عائشہ رضی اللہ عنہا کی بات کو درست قرار دیا،

فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ ۗ عَلِمَ أَنْ سَيَكُونُ مِنْكُمْ مَرْضَىٰ ۖ وَأَخْرُونَ ۚ يَضْرِبُونَ
فِي الْأَرْضِ ضِلَالًا ۖ فَاقْرَءُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ ۖ وَأَخْرُونَ ۚ يَقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ فَاقْرَءُوا

اس کی طاقت نہیں رکھو گے، سو اس نے تم پر مہربانی فرمائی تو قرآن میں سے جو میسر ہو پڑھو۔ اس نے جان لیا کہ یقیناً تم میں سے کچھ بیمار ہوں گے اور کچھ دوسرے زمین میں سفر کریں گے، اللہ کا فضل تلاش کریں گے اور کچھ اس لیے بعض روایات میں آٹھ ماہ یا سولہ ماہ کا جو ذکر آیا ہے وہ روایات مرجوح ہیں اور سعید بن جبیر (تابعی) کا قول کہ سورہ مزمل کا آخری حصہ دس سال بعد نازل ہوا، یہ عائشہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما جیسے جلیل القدر صحابہ کے ثابت شدہ فرمان کے مقابلے میں کچھ حیثیت نہیں رکھتا۔

ہمارے دور کے بعض لوگوں نے عائشہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کے صحیح قول کو چھوڑ کر ایک تابعی سعید بن جبیر کے قول کو زیادہ صحیح قرار دیا ہے اور وجہ یہ بیان کی ہے کہ سورہ مزمل کے آغاز کے مضمون سے معلوم ہو رہا ہے کہ یہ مکہ کے ابتدائی دور میں نازل ہوئی، جب کہ آخری آیت میں جہاد اور زکوٰۃ کا ذکر ہے جو مدینہ میں فرض ہوئے، اس لیے اس کے ازل و آخر میں دس سال کی مدت کا فاصلہ ہی ہونا چاہیے۔ حالانکہ یہ بات ہی غلط ہے کہ کئی سورتوں میں جہاد یا زکوٰۃ کا ذکر نہیں، اگرچہ عملاً جہاد مدینہ میں شروع ہوا اور زکوٰۃ کا نصاب وغیرہ مدینہ میں مقرر ہوا مگر کئی سورتوں میں جہاد کا ذکر بھی ہے اور زکوٰۃ کا بھی۔ مزید دیکھیے اسی آیت کا فائدہ (۷) اور (۸)۔

② رسول اللہ ﷺ ایک سال تک تقریباً دو تہائی رات یا نصف یا ثلث قیام کرتے رہے اور صحابہ کی ایک جماعت بھی آپ کے اتباع میں اتنا قیام کرتی رہی، گھڑیاں موجود نہیں تھیں، اسی خیال سے کہ حکم کی تعمیل میں کوتاہی نہ ہو جائے زیادہ سے زیادہ قیام کی کوشش کرتے مگر رات کے نصف یا ثلث کا صحیح اندازہ ان کے بس کی بات نہیں تھی، اس لیے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جو دن رات کا خالق ہے اور جسے دن رات کا خوب اندازہ ہے کہ رات کبھی لمبی ہوتی ہے کبھی چھوٹی، کبھی گرمی میں آتی ہے کبھی سردی میں، وہ خوب جانتا ہے کہ تم ہمیشہ یہ عمل ہرگز نہیں کر سکو گے، اس لیے اس نے مہربانی فرما کر آسانی فرمادی، اب جتنا آسانی سے قیام کر سکتے ہو کرو۔

③ جب رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہرگز یہ طاقت نہیں رکھتے کہ ہمیشہ رات کا دو ٹکٹ یا نصف یا ثلث قیام کر سکیں تو پھر بعض بزرگوں کے متعلق جو حکایات بیان کی جاتی ہیں کہ انھوں نے چالیس (۴۰) سال تک عشاء اور فجر کی نماز ایک وضو سے پڑھی، ان کے متعلق غور کرنا چاہیے کہ جس کام کی طاقت رسول اللہ ﷺ اور صحابہ میں بھی ہرگز نہیں وہ ان لوگوں میں کیسے آگئی؟ پھر رسول اللہ ﷺ تو رات کو گیارہ یا تیرہ رکعات پڑھتے تھے، مگر ان بزرگوں کا کمال بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ہر رات ہزار ہزار رکعات پڑھتے تھے۔ اب یا تو ان حکایات کو جھوٹا ماننا پڑے گا یا ماننا پڑے گا کہ ان بزرگوں کی پوری کوشش تھی کہ ہر کام میں رسول اللہ ﷺ سے آگے بڑھ کر دکھائیں۔

مَا تَيْسَّرَ مِنْهُ ۖ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَاقْرَأُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا ۚ وَمَا

دوسرے اللہ کی راہ میں لڑیں گے، پس اس میں سے جو میسر ہو پڑھو اور نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دو اور اللہ کو قرض دو،

④ **فَأَقْرءُوا مَا تَيْسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ**: ”اے فصلو! ما تیسر لکم من قیام اللیل“ ”یعنی رات کا قیام جتنا آسانی سے ہو سکتا ہے اتنی نماز پڑھو۔“ قراءت کا لفظ بول کر نماز مراد لی گئی ہے، جیسا کہ اس کے دوسرے ارکان مثلاً قیام، رکوع اور سجدہ بول کر نماز مراد لی جاتی ہے۔ تو مطلب یہ کہ جتنا قیام آسانی سے کر سکتے ہو کرو۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ ”جتنا قرآن آسانی سے پڑھ سکو پڑھ لو“ کا مطلب یہ ہے کہ نماز میں ضروری نہیں کہ سورۃ فاتحہ ہی پڑھی جائے، آسانی سے جو آیت بھی پڑھ سکتا ہے پڑھ لے، نماز ہو جائے گی، مگر یہ بات درست نہیں۔ یہاں یہ ذکر ہی نہیں کہ نماز میں آسانی سے جتنا قرآن پڑھ سکو پڑھ لو، بلکہ آیت کے سیاق سے صاف ظاہر ہے کہ ”مِنَ الْقُرْآنِ“ سے مراد رات کا قیام ہے، یعنی تم اتنا لبا قیام نہیں کر سکتے تو آسانی سے جتنا قیام کر سکتے ہو کرو۔ نماز کے متعلق جُز بول کر کُل مراد لینا عام ہے۔ مثلاً قیام، رکوع، سجدہ سب نماز کے اجزا ہیں، مگر ان میں سے ہر لفظ بول کر پوری نماز مراد لی جاتی ہے۔ ”فَأَقْرءُوا مَا تَيْسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ“ میں بھی قرآن بول کر نماز مراد لی گئی ہے۔ صاحب روح المعانی آلوسی حنفی لکھتے ہیں: ”اے فصلو! ما تیسر لکم من قیام اللیل عبیر عن الصلوة بالقرآءة کما عبیر عنها بسائر أركانها“ ”یعنی تم جتنا آسانی سے رات کا قیام کر سکتے ہو کرو، یہاں قراءت بول کر نماز مراد لی گئی ہے، جس طرح باقی ارکان نماز بول کر نماز مراد لی جاتی ہے۔“ اگر صرف الفاظ کو لیا جائے تو یہ معنی ہوگا کہ تم اتنے لمبے قیام کی طاقت ہرگز نہیں رکھتے، اب جتنا قرآن آسانی سے پڑھ سکتے ہو، خواہ نماز میں یا نماز کے بغیر، اتنا ہی رات کو پڑھ لیا کرو۔ صاحب روح المعانی نے اس معنی کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، مگر پہلا معنی ہی زیادہ درست ہے۔

رہ گئی یہ بات کہ کوئی بھی آیت پڑھ لیں تو نماز ہو جاتی ہے، رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کے بعد اس کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہ جاتی جو عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے صحیحین میں اور تقریباً حدیث کی ہر کتاب میں موجود ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَمْ يَفْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ» [بخاری، الأذان، باب وجوب القراءة.....: ۷۵۶ - مسلم: ۳۹۴] ”جو شخص سورۃ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز ہی نہیں ہے۔“ ہاں، اگر کسی شخص کو سورۃ فاتحہ بھی یاد نہیں تو وہ ”سُبْحَانَ اللَّهِ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَاللَّهُ أَكْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ“ پڑھتا رہے اور رکوع میں چلا جائے۔ [دیکھیے ابو داؤد، الصلاة، باب ما يجزئ الأمی.....: ۸۲۲ و حسنہ الألبانی]

⑤ **عَلِمَ أَنْ سَيَكُونُ مِنْكُمْ مَرْضًى**..... : قیام اللیل میں تخفیف کی وجہ پہلے یہ بیان فرمائی تھی کہ رات کے دو ٹمٹ، نصف یا ٹمٹ کے اندازے کے ساتھ ہمیشہ اتنا لبا قیام کرنا تمہاری طاقت سے باہر ہے، اس لیے جتنا قیام آسانی سے کر سکتے ہو کرو۔ اب طاقت سے باہر ہونے کی تین وجہیں بیان فرمائیں جو ہر شخص کو پیش آ سکتی ہیں، پہلی وجہ بیماری ہے، اس میں بڑھاپا اور ہر قسم کی جسمانی معذوری شامل ہے۔ دوسری وجہ اللہ کا فضل یعنی رزق تلاش کرنے کے لیے سفر ہے، اس میں طلب علم، زیارت

تُقَدِّمُوا لِأَنْفُسِكُمْ مَنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِنْدَ اللَّهِ هُوَ خَيْرٌ وَأَعْظَمَ أَجْرًا ۖ وَاسْتَغْفِرُوا

اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۵۰﴾

اچھا قرض دینا اور جو نیکی بھی تم اپنی جانوں کے لیے آگے بھیجو گے اسے اللہ کے ہاں پاؤ گے کہ وہ بہتر اور ثواب میں کہیں بڑی ہے اور اللہ سے بخشش مانگو، بلاشبہ اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے ﴿۵۰﴾

احباب اور دوسرے تمام جائز مقاصد کے لیے سفر شامل ہے۔ تیسری وجہ اللہ کی راہ میں لڑائی ہے، اس میں جنگ کے علاوہ اس کی تیاری اور پہرا سبھی کچھ شامل ہے۔ یہ اسباب بیان کرنے کے بعد دوبارہ فرمایا: ﴿فَأَقْرُؤْ مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ﴾ یعنی ان عذروں کی وجہ سے جتنا قیام آسانی سے کر سکو کرو۔

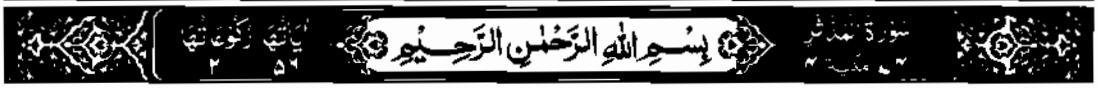
﴿۵۰﴾ ”تَيَسَّرَ مِنْهُ“ کی تعین میں وہ حدیث بہت مناسب معلوم ہوتی ہے جو عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: «مَنْ قَامَ بَعَشْرَ آيَاتٍ لَمْ يُكْتَبْ مِنَ الْغَافِلِينَ وَ مَنْ قَامَ بِعَائَةِ آيَةِ كُتُبِ مِنَ الْقَانِنِينَ وَ مَنْ قَامَ بِأَلْفِ آيَةٍ كُتِبَ مِنَ الْمُقْنَطِرِينَ» [ابو داؤد، تفریح أبواب شهر رمضان، باب تحزيب القرآن: ۱۳۹۸، وصححه الألبانی] ”جو شخص دس آیات کے ساتھ قیام کرے وہ غافلوں سے نہیں لکھا جاتا، جو سو آیات کے ساتھ قیام کرے وہ قانتین (عبادت گزاروں) میں لکھا جاتا ہے اور جو ہزار آیات کے ساتھ قیام کرے وہ بڑے خزانے والوں میں لکھا جاتا ہے۔“ اس آیت اور حدیث سے تخفیف کے باوجود کم از کم دس آیات کے ساتھ قیام اللیل کی تاکید صاف ظاہر ہو رہی ہے۔

﴿۷۰﴾ ”وَ آخِرُونَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ“ (اور کچھ دوسرے لوگ اللہ کی راہ میں لڑائی کر رہے ہوں گے) کے متعلق حافظ ابن کثیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس میں نبی ﷺ کی نبوت کی ایک بہت بڑی دلیل ہے، کیونکہ یہ آیت بلکہ ساری سورت مکہ میں اتری جب کہ جہاد شروع نہیں ہوا تھا، اس وقت یہ پیش گوئی غیب کی ایک خبر ہے جو ایک نبی ہی کے ذریعے سے دی جاتی ہے۔ ﴿۸۰﴾ ”وَ أَقْبُوا الصَّلَاةَ وَ آتُوا الزَّكَاةَ“ سے معلوم ہوا کہ زکوٰۃ مکہ میں فرض ہو چکی تھی، اگرچہ مختلف چیزوں کے نصاب کی تعین مدینہ میں جا کر ہوئی۔ مطلب یہ ہے کہ قیام اللیل جتنا آسانی سے ہو سکے کرو، مگر فرض نماز اور زکوٰۃ کی ادائیگی میں کوتاہی ہرگز نہ کرو۔

﴿۹۰﴾ ”وَ أَقْرِضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا.....“ زکوٰۃ کے بعد قرض حسنہ سے مراد نفعی صدقات ہیں، پھر زکوٰۃ ہو یا نفعی صدقات یا خیر کا کوئی بھی عمل وہ قیامت کے دن گنا سے لے کر سات سو گنا بلکہ اس سے بھی زیادہ کی صورت میں واپس ملیں گے۔

﴿۱۰۰﴾ ”وَ اسْتَغْفِرُوا اللَّهَ“ یعنی کوئی بھی عمل ہو اس کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ سے معافی مانگو، عمل پر پھول مت جاؤ۔ سورۃ ذاریات میں متقین کے متعلق فرمایا: ﴿كَانُوا قَلِيلًا مِّنَ الَّذِينَ آمَنُوا مَا يَجْعَلُونَ﴾ ﴿۱۰۰﴾ ”وَ بِالْإِسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُونَ“ [الذاریات: ۱۷، ۱۸] ”وہ رات کو بہت کم سوتے تھے اور سحریوں کے وقت استغفار کرتے تھے۔“ ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

رسول اللہ ﷺ جب نماز سے سلام پھیرتے تو تین دفعہ استغفار کرتے۔ [مسلم، المساحد و مواضع الصلاة، باب استحباب



يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۱ قُمْ فَأَنْذِرْ ۲ وَرَبِّكَ فَكَذِّبْ ۳

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

اے کبل میں لپٹنے والے! ① اٹھ کھڑا ہو، پس ڈرا ② اور اپنے رب ہی کی پس بڑائی بیان کر ③

رسول اللہ ﷺ پر سب سے پہلی وحی ﴿اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ﴾ نازل ہوئی، اس کے بعد وحی کچھ عرصہ کے لیے رک گئی اور رسول اللہ ﷺ غمگین رہنے لگے۔ جابر بن عبد اللہ انصاری رضی اللہ عنہما نے وحی رک جانے کے اس عرصہ کے متعلق ذکر کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ سے بیان کیا کہ آپ نے فرمایا: «بَيْنَا أَنَا وَأُمِّي إِذْ سَمِعْتُ صَوْتًا مِنَ السَّمَاءِ، فَرَفَعْتُ بَصْرِي فَإِذَا الْمَلَكُ الَّذِي جَاءَنِي بِحِرَاءِ جَالِسٍ عَلَى كُرْسِيِّ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ، فَرَعَبْتُ مِنْهُ، فَرَجَعْتُ فَقُلْتُ زَمَلُونِي زَمَلُونِي فَأَنْزَلَ اللَّهُ عَزَّوَجَلَّ: ﴿يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۱ قُمْ فَأَنْذِرْ ۲﴾ إِلَى قَوْلِهِ: ﴿وَالزُّجْرَ ۳ فَاهْجُرْ﴾ فَحَمِي الْوَحْيِ وَتَوَاتَرَ» [بخاری، بد، الوحي، باب كيف كان بدء الوحي..... : ۴ - مسلم : ۱۶۱] "اس حالت میں کہ میں چلا جا رہا تھا میں نے آسمان کی طرف سے ایک آواز سنی، نگاہ اٹھائی تو دیکھا کہ وہ فرشتہ جو حرام میں میرے پاس آیا تھا زمین اور آسمان کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا تھا، میں اس سے ڈر گیا اور واپس آ کر کہا: "مجھے کبل اوڑھا دو، مجھے کبل اوڑھا دو۔" پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں: ﴿يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۱ قُمْ فَأَنْذِرْ ۲﴾ سے ﴿وَالزُّجْرَ فَاهْجُرْ﴾ تک، پھر وحی گرم ہو گئی اور مسلسل آنے لگی۔" اس سے معلوم ہوا کہ سب سے پہلے سورہ علق کی آیات نازل ہوئیں اور وحی رک جانے کے بعد سب سے پہلے سورہ مدثر نازل ہوئی۔

آیت 1 : يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ : "الْمُدَّثِّرُ" اصل میں "الْمُتَدَثِّرُ" تھا "تاء" کو دال سے بدل کر دال میں ادغام کر دیا گیا۔ جو کپڑا جسم کے ساتھ ملا ہوا ہو اسے "شعار" اور جو اس کے اوپر پہنا جائے اسے "دثار" کہتے ہیں۔ اس خطاب کی وجہ کے لیے دیکھیے سورہ مزمل کی پہلی آیت کی تفسیر۔

آیت 2 : قُمْ فَأَنْذِرْ : اس آیت میں اور اس کے بعد والی آیات میں رسول اللہ ﷺ کو دعوت کے آغاز کا حکم ہوا۔ سورہ علق کے شروع میں آپ کو وہ وحی پڑھنے کا حکم ہوا تھا جو آپ پر نازل ہوئی، اب وحی کے احکام کے مطابق لوگوں کو نصیحت کرنے اور ڈرانے کا حکم ہوا اور وہ اوصاف اختیار کرنے کا حکم دیا گیا جو داعی کے لیے ضروری ہیں۔ ان میں سے پہلی چیز سستی اور غفلت چھوڑ کر کمر ہمت باندھنا اور اللہ کے علاوہ دوسری چیزوں کی پرستش کرنے والوں کو اس کے وبال سے ڈرانا ہے۔

آیت 3 : وَرَبِّكَ فَكَذِّبْ : "رَبِّكَ" کو پہلے لانے سے یہ معنی پیدا ہو گیا کہ صرف اپنے رب کی بڑائی بیان کر۔ "فَكَذِّبْ" میں "فاء" پہلے "قُمْ" کے جواب ہی میں ہے، یعنی "قُمْ فَكَبِّرْ رَبَّكَ" اسی طرح "وَيُحْيِيكَ فَطَهِّرْ" اور "وَالزُّجْرَ"

وَشَيْبَانَكَ فَطَهَّرُ ﴿٥﴾ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرُ ﴿٤﴾

اور اپنے کپڑے پس پاک رکھ ﴿٥﴾ اور پلیدی کو پس چھوڑ دے ﴿٤﴾

فَاهْجُرُ "میں بھی "فاء" اسی "فُحْر" کے جواب میں ہے۔ "وَرَبِّكَ فَكْفِرْ" کے الفاظ میں "صرف اپنے رب کو بڑا جان" اور "صرف اپنے رب کی بڑائی بیان کر" دونوں معنی موجود ہیں، یعنی دعوت دیتے وقت کوئی کتنا بڑا سردار یا مال دار یا بادشاہ یا بد معاش ہو اس کی بڑائی تمہاری دعوت کے لیے رکاوٹ نہ بنے، بلکہ صرف اپنے رب کو بڑا جانو۔ جب تمہارے دل و دماغ میں اور تمہاری آنکھوں کے سامنے صرف وہی بڑا ہوگا تو ساری مخلوق تمہاری نظروں میں ہیج ہوگی اور تمہیں اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کے احکام پہنچانے میں کسی کی بڑائی مانع نہیں ہوگی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کا وصف بیان فرمایا: ﴿الَّذِينَ يُبَلِّغُونَ رِسَالَاتِ اللَّهِ وَيَخْشَوْنَهُ وَلَا يَمْنَحُونَ أَحَدًا إِلَّا اللَّهَ﴾ [الأحزاب: ۳۹] "وہ لوگ جو اللہ کے پیغامات پہنچاتے ہیں اور صرف اسی سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے علاوہ کسی سے نہیں ڈرتے۔"

دوسرے معنی ہیں "صرف اپنے رب کی بڑائی بیان کر" یعنی جاہل اور مشرک لوگ جن جن کی بڑائی مان رہے ہیں ان سب کی نفی کر دو اور صاف اعلان کر دو کہ اس کائنات میں بڑائی صرف اللہ کی شان ہے، اس کے علاوہ بڑا بننا کسی کا حق ہی نہیں ہے، اس لیے عبادت کے لائق بھی صرف اسی کی ہستی ہے۔

آیت 4 ﴿٤﴾ وَشَيْبَانَكَ فَطَهَّرُ: کافر لوگ کتنے بھی صاف ستھرے ہوں اپنے کپڑے پاک نہیں رکھتے، نہ انھیں پیشاب سے پرہیز ہوتا ہے نہ استنجاء کی فکر اور نہ غسلِ جنابت کا خیال۔ حکم ہوا کہ آپ اپنے کپڑے پاک رکھیں۔ جب کپڑے پاک رکھنا ضروری ہے تو جسم پاک رکھنا تو بدرجہ اولیٰ ضروری ہوا۔ آیت کے ظاہری الفاظ کا تقاضا یہی ہے اور سب سے پہلے مراد بھی یہی ہے۔ ہاں، محاورہ میں پاک دامنی سے مراد گناہوں کی آلودگی سے پاک ہونا بھی ہوتا ہے، اس لیے یہ معنی بھی ہے کہ اپنے آپ کو گناہوں سے بچا کر رکھو۔ طبری نے پہلا معنی زیادہ ظاہر قرار دیا ہے۔

آیت 5 ﴿٥﴾ وَشَيْبَانَكَ فَطَهَّرُ: (اپنے کپڑے پاک رکھو) میں منحنے سے اوپر کپڑا اٹھا کر رکھنے کا حکم بھی داخل ہے، کیونکہ لٹکانے کی صورت میں اس کے پلید ہونے کا خطرہ بالکل ظاہر ہے۔

آیت 5 ﴿٥﴾ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرُ: اس کا لفظی معنی ہے "اور پلیدی کو پس چھوڑ دے۔" مطلب یہ ہے کہ ہر قسم کی پلیدی سے علیحدہ رہو۔ "رجز" اور "رجس" ایک ہی چیز ہے، اس کا سب سے پہلا مصداق بت اور غیر اللہ کے آستانے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّورِ﴾ [الحج: ۳۰] "پس بتوں کی گندگی سے بچو اور جھوٹی بات سے بچو۔" یعنی پلیدی سے بچو، جو بت ہیں۔ علاوہ ازیں "الرُّجْزُ" (پلیدی) میں ہر قسم کے فاسد اعتقاد، برے اخلاق، جھوٹے اقوال، قبیح اخلاق اور نظر آنے والی اور نظر نہ آنے والی تمام نجاستیں شامل ہیں۔ ان دونوں آیتوں میں داعی کو خود کو ہر لحاظ سے پاک صاف رکھنے کی تاکید ہے، کیونکہ اگر وہ خود ہی ناپاک یا آلودہ ہوگا تو اس کی دعوت کیا اثر کرے گی؟

وَلَا تَنْتُنْ تَسْكَئِرُ ۝ وَ لِرَبِّكَ فَاصِئِرُ ۝ فَإِذَا نَقَرْنَا فِي النَّاقُورِ ۝ فَذَلِكَ يَوْمَئِذٍ
يَوْمٌ عَسِئِرٌ ۝ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ غِيْرٌ يَّسِيْرٌ ۝

اور (اس نیت سے) احسان نہ کر کہ زیادہ حاصل کرے ۶ اور اپنے رب ہی کے لیے پس صبر کر ۷ سو جب صور
میں پھونکا جائے گا ۸ تو وہ اس دن، ایک مشکل دن ہے ۹ کافروں پر آسان نہیں ۱۰

آیت 6 وَلَا تَنْتُنْ تَسْكَئِرُ: ”مَنْ يَمُنُّ“ احسان کرنا۔ ”اِسْتَكْتَرَ“ (استفعال) زیادہ طلب کرنا۔ ”اِسْتَكْتَرُ
النَّسِيءُ“ کا معنی کسی چیز کو زیادہ سمجھنا بھی آتا ہے۔ یعنی آپ کسی پر احسان کریں تو اس نیت سے نہیں کہ مجھے اس سے زیادہ
ملے گا۔ نہ راہ حق کی طرف رہنمائی کے احسان پر کسی سے کوئی توقع رکھیں، نہ کسی کو کچھ دے کر اس سے زیادہ حاصل ہونے کی
طلب رکھیں، توقع اور طلب صرف اپنے پروردگار سے رکھیں۔ اس کے علاوہ یہ معنی بھی درست ہے کہ آپ کسی پر جتنا بھی
احسان کریں اسے زیادہ نہ سمجھیں۔ اس آیت میں داعی کو ہر قسم کی طمع اور لالچ سے اجتناب کا حکم ہے، کیونکہ یہ چیز دعوت
الی اللہ کے لیے سخت نقصان دہ ہے۔

آیت 7 وَ لِرَبِّكَ فَاصِئِرُ: یعنی آپ کسی پر جو احسان کریں یا کسی کو جو عطیہ دیں اس کی جزا صرف اپنے رب ہی سے
لینے کے لیے صبر کریں۔ ”وَ لِرَبِّكَ فَاصِئِرُ“ میں یہ معنی بھی داخل ہے کہ آپ کو حق کا پیغام پہنچانے میں بہت سے مصائب و
مشکلات کا سامنا ہوگا، عرب و عجم سے لڑائی درپیش ہوگی، آپ ان تمام مصائب پر صبر کریں اور یہ صبر صرف اور صرف اپنے
رب کو راضی کرنے کے لیے ہو، اس ہمت اور اولوالعزمی کے بغیر دعوت کا کام سرانجام نہیں دیا جاسکتا۔ لقمان نے اپنے بیٹے کو
فرمایا تھا: ﴿ وَأَمُرُّ بِالْمَعْرُوفِ وَأَنْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأَصْبِرْ عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ إِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْوِ الْأُمُوْرِ ﴾ [لقمان: ۱۷]
”اور نیکی کا حکم کر اور برائی سے منع کر اور جو تکلیف تجھے پہنچے اس پر صبر کر، یقیناً یہ ہمت کے کاموں سے ہے۔“

آیت 8، 9 فَإِذَا نَقَرْنَا فِي النَّاقُورِ.....: ”النَّاقُورُ“ ”نَقَرٌ يَنْقُرُ“ (ن) سے ”فَاعْوَلُ“ کے وزن پر ہے جس کا معنی
ہے پھونکنا، ایسی ضرب لگانا کہ سوراخ ہو جائے، مراد صور ہے۔ شروع سورت میں ڈرانے کا حکم ہے، اب اس کی تفصیل ہے کہ
جس دن صور میں پھونکا جائے گا اور ہر چیز فنا ہونے کے بعد دوبارہ سب لوگ قبروں سے نکل کر اللہ کے حضور پیش ہوں گے تو
وہ ایک مشکل دن ہوگا۔

آیت 10 عَلَى الْكٰفِرِيْنَ غِيْرٌ يَّسِيْرٌ: پہلے: ”يَوْمٌ عَسِئِرٌ“ (وہ ایک مشکل دن ہے) فرمایا، پھر فرمایا: ﴿ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ
غِيْرٌ يَّسِيْرٌ ﴾ ”جو کافروں پر آسان نہیں ہے۔“ اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ مشکل ہوتا ہی وہ ہے جو آسان نہ ہو، تو اس
صراحت کا مطلب کیا ہے؟ جواب یہ ہے کہ یہ نہ سمجھا جائے کہ اس مشکل دن میں کوئی نہ کوئی آسانی بھی ہو سکتی ہے، یا
مکن ہے شروع میں مشکل ہو مگر پھر آسانی ہو جائے، اس لیے فرمایا کفار کے لیے تو اس دن کوئی آسانی نہیں، نہ شروع میں نہ
بعد میں۔ ہاں، اہل ایمان کے لیے آسانی ہوگی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ لَا يَحْزَنُهُمُ الْقَرْعُ الْكَبِيْرُ ﴾ [الانبیاء: ۱۰۳] ”وہ سب

ذَرْنِي وَ مَن خَلَقْتُ وَحِيدًا ۝ وَ جَعَلْتُ لَهُ مَالًا مَمْدُودًا ۝ وَ بَنِينَ شُهُودًا ۝
وَ مَهَدْتُ لَهُ تَهْنِيدًا ۝

چھوڑ مجھے اور اس شخص کو جسے میں نے اکیلا پیدا کیا ۝ اور میں نے اسے لمبا چوڑا مال عطا کیا ۝ اور حاضر رہنے والے بیٹے (عطا کیے) ۝ اور میں نے اس کے لیے سامان تیار کیا، ہر طرح تیار کرنا ۝

سے بڑی گھبراہٹ انھیں غمگین نہیں کرے گی۔“ اور اگر شروع میں کچھ شدت محسوس ہوئی بھی تو بعد میں آسانی ہو جائے گی۔

آیت 11 : ① ذَرْنِي وَ مَن خَلَقْتُ وَحِيدًا: رسول اللہ ﷺ کی دعوت کو جھٹلانے میں سب سے پیش پیش مکہ کے بڑے بڑے سردار تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی خوش حالی اور دنیوی نعمتیں عطا فرمائی ہوئی تھیں، مگر انھوں نے مال و اولاد، جاہ و حشمت اور اقتدار پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے بجائے اس کے رسول ﷺ کو جھٹلا دیا اور اس کی کتاب پر ایمان لانے کے بجائے اسے جادو اور انسانی کلام قرار دیا۔ ان لوگوں کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ ان لوگوں کے معاملے کو مجھ پر چھوڑ دیں، میں جانوں اور یہ جانیں، ان کا بندوبست میں خود کروں گا۔

ان آیات سے اکثر مفسرین نے اگرچہ ایک خاص شخص ولید بن مغیرہ مراد لیا ہے، مگر ”مَن خَلَقْتُ وَحِيدًا“ میں ”مَن“ کا لفظ واحد ہونے کے باوجود معنی کے لحاظ سے عام ہے اور آیت میں مذکور مال و دولت اور اولاد و اقتدار صرف ولید ہی کے پاس نہ تھا اور نہ ہی وہ اکیلا قرآن کو جادو اور انسانی کلام قرار دیتا تھا، بلکہ رسول اللہ ﷺ کو جھٹلانے والے اکثر متکبرین کا یہی حال تھا، اس لیے ان آیات میں ان سب کو تشبیہ کی گئی ہے۔ ہاں، یہ درست ہے کہ یہ آیات ولید بن مغیرہ پر بھی صادق آتی ہیں اور وہ بھی ان لوگوں میں شامل ہے جو ان آیات سے مراد ہیں اور ان آیات کے اس کے متعلق نازل ہونے کا مطلب بھی یہی ہے، مگر وہ اکیلا ان آیات کا مصداق نہیں بلکہ ان سے ولید بن مغیرہ کے علاوہ ان صفات والے تمام متکبر مراد ہیں، خواہ وہ مکہ کے رہنے والے ہوں یا دنیا کے کسی دوسرے خطے میں رہنے والے ہوں۔

② ”خَلَقْتُ وَحِيدًا“ کے دو معانی ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ میں نے اسے اس حال میں پیدا کیا کہ وہ اکیلا تھا، نہ اس کی خدمت میں حاضر رہنے والے بیٹے تھے اور نہ کوئی مال و متاع۔ ہر انسان ماں کے پیٹ سے اکیلا آتا ہے، مال و اولاد، فوج و لشکر اور سامان وغیرہ کچھ ساتھ نہیں لاتا، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَلَقَدْ جِئْتُمُونَا فَرَادَىٰ كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ﴾ [الأنعام: ۹۴] ”اور بے شک تم ہمارے پاس اکیلے اکیلے آگے، جیسے ہم نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا تھا۔“ دوسرا یہ کہ میں نے اکیلے ہی اسے پیدا کیا اور اسے یہ سب کچھ عطا کیا، اسے پیدا کرنے میں یا یہ مال و اولاد عطا کرنے میں کوئی دوسرا میرے ساتھ شریک نہ تھا۔

آیت 12: 14 : ③ وَ جَعَلْتُ لَهُ مَالًا ”مَمْدُودًا“ ”مَدَّ يَمُدُّ“ (ن) سے اسم مفعول ہے، پھیلا یا ہوا۔ یعنی مال موسیٰ، کھیت، باغات، کاروبار اور تجارت وغیرہ ہر قسم کا لمبا چوڑا مال عطا کیا۔ ”شُهُودًا“ ”شَاهِدٌ“ کی جمع ہے، ہر وقت خدمت میں حاضر بیٹے عطا کیے۔ بیٹے اللہ کی نعمت ہیں اور پاس رہ کر سارا کام سنبھال لیں اور خدمت کے لیے مستعد رہیں تو مزید نعمت کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

ثُمَّ يَطْعُهُ أَنْ أَزِيدَ ﴿١٥﴾ كَلَّا إِنَّهُ كَانَ لِإِيْتِنَا عَنِيدًا ﴿١٦﴾ سَأَرْهَقُهُ صُعُودًا ﴿١٧﴾ إِنَّهُ فَكَّرَ
وَقَدَّرَ ﴿١٨﴾ فَفَقِيلَ كَيْفَ قَدَّرَ ﴿١٩﴾ ثُمَّ قِيلَ كَيْفَ قَدَّرَ ﴿٢٠﴾ ثُمَّ نَظَرَ ﴿٢١﴾ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ﴿٢٢﴾
ثُمَّ أَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ﴿٢٣﴾ فَقَالَ إِنَّ هَذَا إِلَّا سِحْرٌ يُؤْتَرُ ﴿٢٤﴾ إِنَّ هَذَا إِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ﴿٢٥﴾

پھر وہ طع رکھتا ہے کہ میں اسے اور زیادہ دوں ﴿١٥﴾ ہرگز نہیں! یقیناً وہ ہماری آیات کا سخت مخالف رہا ہے ﴿١٦﴾ عنقریب
میں اسے ایک دشوار گھائی چڑھنے کی تکلیف دوں گا ﴿١٧﴾ بے شک اس نے غور و فکر کیا اور بات بنائی ﴿١٨﴾ پس وہ مارا
جائے، اس نے کیسی بات بنائی! ﴿١٩﴾ پھر مارا جائے، اس نے کیسی بات بنائی! ﴿٢٠﴾ پھر اس نے دیکھا ﴿٢١﴾ پھر اس نے
تیوری چڑھائی اور برا منہ بنایا ﴿٢٢﴾ پھر اس نے پیٹھ پھیری اور تکبر کیا ﴿٢٣﴾ پھر اس نے کہا یہ جادو کے سوا کچھ نہیں، جو نقل
کیا جاتا ہے ﴿٢٤﴾ یہ انسان کے قول کے سوا کچھ نہیں ﴿٢٥﴾

ہیں۔ ”مَقْدَثٌ“ (تفعیل) بچھانا، مہیا کرنا۔ یعنی مال و اولاد کے ساتھ جاہ و شہرت اور سرداری کے تمام اسباب اس کے لیے
ہموار کر دیے۔

آیت 15 ﴿١٥﴾ ثُمَّ يَطْعُهُ أَنْ أَزِيدَ: پھر وہ طع رکھتا ہے کہ میں اسے اور دوں گا، یعنی اتنا کچھ ملنے کے باوجود دنیا میں اس کی
حرص ختم نہیں ہوئی بلکہ آخرت میں اسے مزید ملنے کی توقع ہے۔ کفار کا کہنا تھا کہ اگر واقعی قیامت قائم ہوئی تو مال و اولاد وہاں
بھی ہمیں کوملیں گے۔ وہ دنیا میں ملنے والے مال و اولاد اور جاہ و شہرت کو آزمائش کے بجائے اللہ تعالیٰ کے ان پر راضی ہونے
کی دلیل قرار دیتے تھے۔ دیکھیے سورہ مریم (۸۰ تا ۷۷)۔

آیت 16 ﴿١٦﴾ كَلَّا إِنَّهُ كَانَ لِإِيْتِنَا عَنِيدًا: (نہض) حق کو پہچانتے ہوئے ضد کی وجہ سے مخالفت کرنے والا۔
”کَلَّا“ سے بیشکی کا مفہوم نکل رہا ہے، ”کَلَّا“ ہرگز نہیں۔ یعنی اس کی یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہوگی، مزید نوازش و مہربانی کا
حق دار تو تب تھا جب وہ ہماری بات مانتا، وہ تو ہمیشہ سے ہماری آیات کا شدید مخالف رہا ہے۔

آیت 17 ﴿١٧﴾ سَأَرْهَقُهُ صُعُودًا: ”سَأَرْهَقُهُ“ ”أَرْهَقَ يَرْهَقُ“ (افعال) کسی کو ایسے کام کی تکلیف دینا جس کی وہ طاقت
نہ رکھتا ہو۔ ”صُعُودًا“ ”صَعِدَ يَصْعَدُ“ (س) (چڑھنا) سے، سخت دشوار گھائی۔ یعنی میں اسے قیامت کے دن ایک دشوار
گزار گھائی پر چڑھنے کے لیے مجبور کروں گا۔ قیامت کے دن کی اور جہنم کی مصیبتیں جھیلے پر مجبور کرنے کو دشوار چڑھائی کی تکلیف
دینے کے الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ ترمذی میں ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ”صعود“ آگ کا ایک پہاڑ ہے جس پر
کافر ہمیشہ ستر (۷۰) برس چڑھتا رہے گا اور اتنا عرصہ ہی اترتا رہے گا۔ (دیکھیے ترمذی: ۲۵۷۶، ۳۳۲۶) مگر اس کی سند کمزور ہے۔

آیت 18-25 ﴿٢٥﴾ إِنَّهُ فَكَّرَ وَقَدَّرَ کفار کو مشکل یہ درپیش تھی کہ وہ لوگوں کو قرآن مجید سے دور رکھنے کے لیے اس
کے متعلق جو کچھ بھی کہتے کوئی اسے ماننے کے لیے تیار نہیں تھا، خود ان کے دل اس سے انکار کرتے تھے۔ وہ قرآن کو شعر،

سَأَصْلِيهِ سَقَرٌ ۝ وَمَا أَدْرَاكَ مَا سَقَرٌ ۝ لَا تُبْقِي وَلَا تَذَرُ ۝

میں اسے جلد ہی سقر (جہنم) میں داخل کروں گا ۱۵ اور تجھے کس چیز نے معلوم کروایا کہ سقر (جہنم) کیا ہے؟ ۱۶ وہ نہ باقی رکھتی ہے اور نہ چھوڑتی ہے ۱۷

کہانت اور جادو کہہ کر اس سے متنفر کرتے تھے، مگر جانتے اور مانتے تھے کہ نہ اس میں شاعروں کے شعر کا مبالغہ یا جھوٹ ہے، نہ کابھوں کی تک بندی ہے اور نہ جادوگروں کے ٹونے ٹونکے۔ اس لیے ان کے بڑے بڑے سرداروں نے، جن میں ولید بن مغیرہ بھی شامل تھا، اپنے دماغ کی ساری صلاحیتیں صرف کر کے جو نتیجہ نکالا وہ دو باتوں پر مشتمل تھا، ایک یہ کہ یہ وہی جادو ہے جو ہمیشہ سے چلا آیا ہے، کیونکہ یہ قرآن اتنا پر تاثیر ہے کہ بھائی کو بھائی سے اور باپ کو بیٹے سے جدا کر دیتا ہے، حالانکہ وہ جادو اور جادوگروں سے خوب واقف تھے اور جانتے تھے کہ ہر موثر کلام جادو نہیں ہوتا۔ دوسرا نتیجہ قرآن کی عظمت گھٹانے کے لیے یہ نکالا کہ یہ ربانی کلام نہیں بلکہ انسان کا کلام ہے، حالانکہ ان کے سامنے یہ چیلنج موجود تھا کہ اگر یہ انسانی کلام ہے تو تم اس جیسی ایک سورت ہی بنا کر لے آؤ۔ آج بھی یورپ و امریکہ اور دوسرے ممالک کے تحقیقی ادارے مسلمان طالب علموں کو بھاری وظیفے دے دے کر اپنے اداروں میں اس موضوع پر پی ایچ ڈی کرواتے ہیں کہ کسی طرح یہ ثابت ہو جائے کہ قرآن محمد ﷺ کی اپنی تصنیف ہے، حالانکہ اتنی محنت کے بجائے یہی کافی تھا کہ وہ تین آیات ہی کی کوئی ایک سورت پیش کر دیتے جو وہ نہیں کر سکے اور نہ کر سکتے ہیں۔

”إِنَّهَا فَكْرٌ وَقَدَرٌ“ سے ”ثُمَّ أَدْبَرَ وَاشْتَكَبَ“ تک ان کیفیات کا ذکر ہے جن کا اظہار کر کے وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ وہ اپنے دماغ کی آخری قوت تک صرف کر کے یہ نتیجہ نکال رہے ہیں، حالانکہ ان کے تیوری چیز ہانے، براہ منہ بنانے اور تکبر سے پیٹھ پھیر کر بات کرنے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ یہ بات انصاف سے نہیں کہہ رہے، بلکہ اس کا باعث صرف اور صرف عناد اور تکبر تھا۔

آیت 26، 27: سَأَصْلِيهِ سَقَرٌ ... : ”سَقَرٌ“ جہنم کا ایک نام ہے، علم اور مَوْنُث ہونے کی وجہ سے غیر منصرف ہے۔

آیت 28: لَا تُبْقِي وَلَا تَذَرُ : ”لَا تُبْقِي“ ”أَبْقَى يُبْقِي“ (افعال) باقی رکھنا۔ ”أَبْقَى عَلَيْهِ“ ”رَحِمْنَا“ یعنی وہ ان کی کوئی چیز جلانے سے باقی نہیں رکھے گی، اس پر بھی انھیں چھوڑے گی نہیں کہ ان کا قصہ تمام ہو جائے، بلکہ انھیں دوبارہ پہلے کی طرح بنا دیا جائے گا اور جہنم پھر انھیں جلائے گی، جیسا کہ فرمایا: ﴿كُلَّمَا نَضْجَتْ جُلُودُهُمْ بِدَانِهِمْ جُلُودُهُمْ أُغْيِرْنَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ﴾ النساء: ۵۶۔ ”جب بھی ان کی کھالیں پیک جائیں گی ہم انھیں ان کے علاوہ اور کھالیں بدل دیں گے، تاکہ وہ عذاب چکھیں۔“ اور فرمایا: ﴿ثُمَّ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَى﴾ [الأعلى: ۱۳] ”پھر وہ نہ اس میں مرے گا اور نہ زندہ رہے گا۔“ اگر ”لَا تُبْقِي“ کے بعد ”عَلَيْهِمْ“ ”مقدور مانیں تو معنی ہوگا ”نہ وہ ان پر رحم کرے گی اور نہ انھیں چھوڑے گی۔“ یہ معنی بھی درست ہے۔

لَوَاحِئٍ لِّلْبَشَرِ ۗ عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ۗ وَمَا جَعَلْنَا أَصْحَابَ النَّارِ إِلَّا مَلَائِكَةً ۗ وَمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ إِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِينَ كَفَرُوا ۗ لِيَسْتَيَقِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَ يَزِدَادَ الَّذِينَ آمَنُوا إِيمَانًا ۗ وَلَا يَرْتَابَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْمُؤْمِنُونَ ۗ وَ لِيَقُولَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ قَرُصٌ وَ الْكُفْرُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَذَا مَثَلًا ۗ كَذَلِكَ يُضِلُّ اللَّهُ مَن يَشَاءُ

چڑے کو جہنم دینے والی ہے (۱۹) اس پر انیس (مقرر) ہیں (۲۰) اور ہم نے جہنم کے محافظ فرشتوں کے سوا نہیں بنائے اور ان کی تعداد ان لوگوں کی آزمائش ہی کے لیے بنائی ہے جنہوں نے کفر کیا، تاکہ وہ لوگ جنہیں کتاب دی گئی ہے اچھی طرح یقین کر لیں اور وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں ایمان میں زیادہ ہو جائیں اور وہ لوگ جنہیں کتاب دی گئی ہے اور ایمان والے شک نہ کریں اور تاکہ وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے اور جو کفر کرنے والے ہیں کہیں اللہ نے اس کے ساتھ مثال دینے سے کیا ارادہ کیا ہے؟ اسی طرح اللہ گمراہ کرتا ہے

آیت 29: لَوَاحِئٍ لِّلْبَشَرِ: ”لَوَاحِئٌ“ ”لَا حَ يَلُوحُ“ (ن) اور ”لَوَاحٍ يَلُوحُ“ (تفعیل) کا معنی جلانا، متغیر کرنا بھی آتا ہے اور ظاہر ہونا اور چمکنا بھی آتا ہے۔ ”الْبَشَرُ“ ”بَشَرَةٌ“ کی جمع ہے، کھالیں، یا ”الْبَشَرُ“ بمعنی آدمی ہے۔ پہلی صورت میں مطلب یہ ہے کہ وہ کھالوں کو جلا کر سیاہ کر دینے والی ہے (کھالوں کا ذکر خاص طور پر اس لیے کیا کہ آدمی کو اپنے جس حسن و جمال پر ناز ہوتا ہے وہ اسی کھال ہی کی وجہ سے ہوتا ہے) یا وہ آدمیوں کو جلا دینے والی ہے۔ دوسری صورت میں معنی یہ ہے کہ وہ جسم پر چمکتی ہوئی نظر آئے گی۔ شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں: ”جیسے لوہا دکھتا سرخ نظر آتا ہے، آدمی کے پنڈے پر وہ سرخ نظر آئے گی۔“ (موضح)

آیت 30-31: ① عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ : اللہ تعالیٰ نے جب جہنم پر مامور اشخاص کی تعداد انیس (۱۹) بتائی تو ساتھ ہی اس شخصے اور مذاق کا جواب بھی ذکر کر دیا جو کافر اڑا سکتے تھے اور انہوں نے اڑایا بھی کہ انیس (۱۹) شخص ہم ہزاروں لاکھوں کا کیا بگاڑ سکتے ہیں؟ فرمایا، ہم نے جہنم پر جن لوگوں کو مقرر کیا ہے وہ فرشتے ہیں اور فرشتہ تو ایک بھی ہو تو تم سب کے لیے کافی ہے۔ ② جہنم کے فرشتوں کی تعداد بتانے کی حکمت یہ بیان فرمائی کہ کافروں کی آزمائش ہو جائے گی، انہوں نے اپنے نجس باطن کا جو اظہار کرنا ہے کر لیں گے، جو مذاق اڑانا ہے اڑالیں گے اور اہل کتاب کو اس کے حق ہونے کا یقین ہو جائے گا، کیونکہ یہ تعداد ان کی کتاب کے مطابق ہے، یا وہ اپنی کتابوں کی وجہ سے فرشتوں کی غیر معمولی قوتوں کو جانتے ہیں اور ایمان والوں کا ایمان مزید بڑھ جائے گا اور اہل کتاب اور ایمان والوں کو اس کے حق ہونے میں کوئی شک نہیں رہے گا۔ ہاں کفار اور وہ لوگ جن کے دلوں میں حسد اور بغض کا مرض ہے، یہی کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ مثال بیان کرنے سے کیا مقصد ہے؟ فرمایا دیکھ لو

يَشَاءُ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ ۚ وَمَا يَعْلَمُ جُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ ۚ وَمَا هِيَ إِلَّا ذِكْرَىٰ لِلْبَشَرِ ۝

جسے چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور تیرے رب کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا اور یہ باتیں بشر کی نصیحت ہی کے لیے ہیں ﴿۲۹﴾

ایک ہی بات ہے، مگر کسی کے حصے میں اس سے انکار آیا اور کسی کو ایمان و یقین کی دولت نصیب ہوگئی۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے مچھر اور اس سے بڑھ کر کسی چیز کی مثال بیان کرنے پر ایمان والے تو اس کے حق ہونے کی تصدیق کریں گے اور کافر یہی کہیں گے کہ اس قسم کی مثال بیان کرنے سے اللہ تعالیٰ کا کیا مقصد ہے؟ (دیکھیے بقرہ: ۲۶) اور اہل ایمان تو قرآن کی محکم و متشابہہ ہر قسم کی آیات پر بلا چون و چرا ایمان لائیں گے، مگر جن کے دلوں میں کجی ہے وہ فتنہ جوئی کے لیے تشابہات کے پیچھے لگے رہیں گے۔ دیکھیے سورہ آل عمران (۷)۔

معلوم ہوا اللہ تعالیٰ کا تقاضا ہم سے یہ ہے کہ جو بات اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے آئے اس پر ہم یقین کریں اور ایمان لائیں خواہ اس کی حکمت ہمیں معلوم ہو یا نہ ہو، جب یہ اعتراض فضول ہے کہ انسان کو مٹی سے کیوں بنایا؟ جنوں کو آگ سے کیوں بنایا؟ بچہ ماں کے پیٹ میں نو ماہ کیوں رہتا ہے؟ اٹھ سے بچہ اکیس دنوں میں کیوں نکلتا ہے؟ کچھوے کی عمر طویل کیوں ہوتی ہے؟ وغیرہ وغیرہ، تو یہ اعتراض کیوں کہ جہنم پر انیس (۱۹) فرشتے کیوں مقرر کیے ہیں؟ ایمان والوں کے پاس اس قسم کی تمام باتوں کا ایک ہی جواب ہے کہ مالک کی مرضی ہے جو چاہے کرے۔ اس مقام پر بعض مفسرین نے جہنم پر مامور فرشتوں کی تعداد انیس ہونے کی حکمت اپنی عقلی موشگافیوں سے بیان کی ہے جو سراسر تکلف ہے۔ یہ آیت اس بات کی بھی دلیل ہے کہ اہل ایمان کا ایمان آیات الہی سننے سے بڑھ جاتا ہے۔ تعجب ہے ان لوگوں پر جو قرآن کی واضح آیات کے باوجود کہتے ہیں کہ ایمان نہ زیادہ ہوتا ہے نہ کم۔ اب قرآن کی صاف آیات کے بعد انہیں قائل کرنے کے لیے کون سی چیز پیش کی جائے۔

﴿۳۰﴾ وَمَا يَعْلَمُ جُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ ۚ : یہ اس لیے فرمایا کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ اللہ تعالیٰ کے پاس کارکنوں کی کمی ہے، یعنی فرشتے تو اس کے لشکروں میں سے ایک لشکر ہیں، اللہ کے پاس اتنے لشکر ہیں کہ اس کے علاوہ کوئی انہیں جانتا ہی نہیں، پھر ان لشکروں میں سے ہر ایک کی تعداد بھی وہی جانتا ہے۔ حدیث معراج میں ساتویں آسمان کا ذکر کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «فَرَفَعَ لِي الْبَيْتَ الْمَعْمُورُ، فَسَأَلْتُ جِبْرِيلَ فَقَالَ هَذَا الْبَيْتُ الْمَعْمُورُ يُصَلِّي فِيهِ كُلُّ يَوْمٍ سَبْعُونَ أَلْفَ مَلَكٍ، إِذَا خَرَجُوا لَمْ يَعُودُوا إِلَيْهِ أَحْرَمًا مَا عَلَيْهِمْ» [بخاری، بدء الخلق، باب ذكر الملائكة..... : ۳۲۰۷] ”پھر بیت معمور میرے سامنے ظاہر کیا گیا، میں نے جبریل سے پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ یہ بیت معمور ہے، اس میں روزانہ ستر ہزار فرشتے نماز پڑھتے ہیں، جب نکل جاتے ہیں تو اپنے آخری وقت تک دوبارہ یہاں نہیں آسکتے۔“ ”وَمَا هِيَ“ سے مراد وہ آیات ہیں جن میں ”سَقَر“ کی تفسیر بیان کی گئی ہے۔

كَلَّا وَالْقَمَرَ ﴿۳۲﴾ وَالْيَلِيلَ إِذْ أَدْبَرَ ﴿۳۳﴾ وَالصُّبْحَ إِذَا أَسْفَرَ ﴿۳۴﴾ إِنَّهَا لَإِخْدَى الْكُبْرِ ﴿۳۵﴾ نَذِيرًا
لِّلْبَشَرِ ﴿۳۶﴾ لِمَنْ شَاءَ مِنْكُمْ أَنْ يَتَّقَدَّمَ أَوْ يَتَأَخَّرَ ﴿۳۷﴾

ہرگز نہیں، چاند کی قسم! ﴿۳۲﴾ اور رات کی، جب وہ جانے لگے! ﴿۳۳﴾ اور صبح کی، جب وہ روشن ہوا! ﴿۳۴﴾ بلاشبہ وہ (جہنم) یقیناً بہت بڑی چیزوں میں سے ایک ہے ﴿۳۵﴾ بشر کے لیے ڈرانے والی ہے ﴿۳۶﴾ اس کے لیے جو تم میں سے چاہے کہ آگے بڑھے، یا پیچھے ہٹے ﴿۳۷﴾

آیت 32-37: كَلَّا وَالْقَمَرَ "كَلَّا" ہرگز نہیں، یعنی جہنم یا اس پر مامور فرشتوں کی تعداد سے انکار ہرگز درست نہیں۔

اس کے بعد تین چیزوں کی قسم کھا کر فرمایا کہ جہنم یقیناً بہت ہی بڑی چیز ہے۔ ان قسموں کی مناسبت جو اب قسم سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ جہنم کا انکار کرنے والوں کا انکار اس لیے ہے کہ وہ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہے اور ان کے خیال میں اتنی بڑی ہونک اور عظیم الشان چیز کا موجود ہونا ممکن نہیں۔ فرمایا اس کائنات میں چاند کو دیکھو، وہ ہلال سے بدر اور بدر سے ہلال ہونے تک روزانہ جن مراحل سے گزرتا ہے ان پر غور کرو، رات کو دیکھو جب وہ رخصت ہوتی ہے اور کائنات میں روزانہ ایک عظیم انقلاب رونما ہوتا ہے، پھر صبح کو دیکھو جب روشن ہوتی ہے تو رات کی ظلمت اپنا بوریا بستر سمیت لیتی ہے۔ ان میں سے ہر چیز اللہ کی قدرت کی بہت بڑی نشانی ہے، ان میں سے کوئی بھی چیز اگر تم نے دیکھی نہ ہوتی اور تمہیں اس کے متعلق بتایا جاتا تو تم اس کا اسی طرح انکار کر دیتے جس طرح جہنم کا انکار کر رہے ہو؟ جب اتنی بڑی بڑی حقیقتیں تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو اور تمہیں ان کے موجود ہونے میں کوئی شک نہیں تو ان چیزوں کا پیدا کرنے والا تمہیں بتا رہا ہے کہ یقیناً جہنم بھی اس کی بہت بڑی نشانیوں میں سے ایک ہے، اس میں تمہیں شک کیوں ہے؟

ایک مناسبت یہ بھی ہے کہ تمہارا یہ جلدی چمانا بھی بے محل ہے کہ اگرچے ہو تو ابھی لاؤ وہ قیامت اور جہنم جس سے ڈراتے ہو۔ فرمایا چاند کا ہلال سے بدر اور بدر سے ہلال تک پہنچنا، رات کا جانا اور صبح کا روشن ہونا اور کائنات کے بڑے بڑے انقلابات میں سے ہر انقلاب اپنے مقرر وقت پر آتا ہے، کبھی وقت سے پہلے نہیں آتا، اسی طرح تم یقیناً درجہ قیامت کی طرف جا رہے ہو اور بہت جلد جہنم تمہارے سامنے آجائے گی۔ سورہ اشقاق کی آیات (۱۶ تا ۱۹) میں یہ مضمون بیان ہوا ہے، تفصیل کے لیے ان آیات کی تفسیر ملاحظہ کریں۔

"الْكُبْرُ" "كُبْرَى" کی جمع ہے، جو "كُتِبَ" کی مؤنث ہے۔ "نَذِيرًا" ڈرانے والی، "فَعِيلٌ" کا وزن مذکر مؤنث اور واحد، شنیہ و جمع سب کے لیے آجاتا ہے۔ یعنی یہ انسانوں کو ڈرانے والی ہے، ان انسانوں کو جنہیں اختیار ہے کہ یہ جہنم سے ڈرانے والی آیات سن کر چاہیں تو ایمان قبول کر کے جنت کی طرف بڑھ جائیں اور چاہیں تو پیچھے رہ کر جہنم کے سزاوار بن جائیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَفَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ﴾ [الکھوف: ۲۶] | پھر جو چاہے سو ایمان لے آئے اور جو چاہے سو کفر کرے۔" یعنی ایمان و کفر دونوں کا اختیار ہے، ہاں، کفر کی اجازت نہیں اور نہ وہ اللہ کو پسند ہے، جیسا کہ فرمایا:

كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ۗ اِلَّا اَصْحَابَ الْيَمِيْنِ ۗ فِيْ جَدَّتِ ۗ يَتَسَاءَلُوْنَ ۗ عَنِ
الْمُجْرِمِيْنَ ۗ مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرٍ ۗ

ہر شخص اس کے بدلے جو اس نے کمایا، گردی رکھا ہوا ہے ﴿۳۸﴾ مگر دائیں طرف والے ﴿۳۹﴾ جنتوں میں سوال کریں گے ﴿۴۰﴾ مجرموں سے ﴿۴۱﴾ تمہیں کس چیز نے ستر میں داخل کر دیا؟ ﴿۴۲﴾

﴿وَلَا يَرْضٰۤى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ﴾ [الزمر: ۷] ”اور وہ اپنے بندوں کے لیے کفر کو پسند نہیں کرتا۔“

آیت 38، 39: كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ : یعنی جس طرح کوئی گردی رکھی ہوئی چیز اس وقت تک نہیں چھوٹی جب تک وہ حق ادا نہ کر دیا جائے جس کے بدلے اسے گردی رکھا گیا ہے، اسی طرح ہر شخص اپنے عمل کے عوض گردی اور گرفتار ہوگا، جب تک وہ عمل پیش نہ کرے جس کی ادائیگی اس پر واجب تھی، رہائی نہیں پاسکتا۔ ہاں جنہیں دائیں ہاتھ میں اعمال نامہ ملے گا وہ گرفتار نہیں ہوں گے بلکہ اعمالِ صالحہ کی وجہ سے رہا ہو جائیں گے، جس طرح حق ادا کرنے سے گردی چھوٹ جاتی ہے۔

آیت 40، 42: ﴿۱﴾ فِيْ جَدَّتِ ۗ يَتَسَاءَلُوْنَ : یعنی اصحاب الیمین جنتوں میں ایک دوسرے سے مجرموں کے بارے میں سوال کریں گے کہ فلاں مجرم کا کیا بنا اور فلاں کدھر گیا؟ ذرا جہنم ہی میں انھیں تلاش کریں، پھر جہنم میں جھانک کر دیکھیں گے اور وہ انھیں وہاں نظر آئیں گے تو ان سے کہیں گے: ﴿مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرٍ﴾ ”تمہیں جہنم میں کس چیز نے داخل کیا؟“ آیات کی یہ تفسیر ”يَتَسَاءَلُوْنَ“ (تفاعل) اور ”عَنِ“ کے اس ترجمے کے مطابق ہے جو اکثر استعمال ہوا ہے۔ ”مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرٍ“ سے پہلے ”يَقُوْلُوْنَ لَهُمْ“ مقدر ہے۔ سورہ صافات میں اس سے ملتا جلتا منظر مذکور ہے، فرمایا: ﴿فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰی بَعْضٍ يَتَسَاءَلُوْنَ ۗ قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ اِنِّىْ كَانَ لِىْ قَرِيْنٌ ۗ يَقُوْلُ اِنَّكَ لِنِىْ الضَّالِّیْنَ ۗ اِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّ عِظَامًا ۗ اِنَّا لَمَدِّيُوْنَ ۗ قَالَ هَلْ اَنْتُمْ قٰطِلُوْنَ ۗ قَالَتَلَمَّ فَرَاۤءَ فِىْ سَوَآءِ الْجَحِيْمِ ۗ قَالَ تَاللّٰهِ اِنْ كِدْتَ لَتُرْدِيْنَ ۗ وَ لَوْ اَنْعَمْتُ رَبِّىْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ۗ اَفَمَا نَحْنُ بِمَبْتَلٰیْنَ ۗ اِلَّا مَوْتَتَنَا الْاُولٰٓئِىْ وَ مَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ۗ اِنَّ هٰذَا لَهٰٓؤُلَآءِ الْفٰوِزُ الْعَظِيْمُ ۗ لِيَسْئَلْ هٰذَا فَلْيُعْبَلِ الْغٰلِيُوْنَ﴾ [الصافات: ۵۰ تا ۶۱] ”پھر ان کے بعض بعض کی طرف متوجہ ہوں گے، ایک دوسرے سے سوال کریں گے۔ ان میں سے ایک کہنے والا کہے گا بے شک میں، میرا ایک ساتھی تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ کیا واقعی تو بھی ماننے والوں میں سے ہے۔ کیا جب ہم مر گئے اور ہم مٹی اور ہڈیاں ہو گئے تو کیا واقعی ہم ضرور جزا دیے جانے والے ہیں؟ کہے گا کیا تم جھانک کر دیکھنے والے ہو؟ پس وہ جھانکے گا تو اسے بھڑکتی آگ کے وسط میں دیکھے گا۔ کہے گا اللہ کی قسم! یقیناً تو قریب تھا کہ مجھے ہلاک ہی کر دے۔ اور اگر میرے رب کی نعمت نہ ہوتی تو یقیناً میں بھی ان میں ہوتا جو حاضر کیے گئے ہیں۔ تو کیا ہم کبھی مرنے والے نہیں ہیں۔ مگر ہماری پہلی موت اور نہ ہم کبھی عذاب دیے جانے والے ہیں۔ یقیناً یہی تو بہت بڑی کامیابی ہے۔ اس جیسی (کامیابی) ہی کے لیے پس لازم ہے کہ عمل کرنے والے عمل کریں۔“

آیات کی دوسری تفسیر یہ ہے کہ ”يَتَسَاءَلُوْنَ“ ”يَسْأَلُوْنَ“ کے معنی میں ہے اور ”عَنِ“ زائد ہے: ”اِنِّىْ يَسْأَلُوْنَ“

قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ ﴿۳﴾ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمِ الْبَسِيفِينَ ﴿۴﴾ وَكُنَّا نَحْوُصُّ مَعَ الْخَائِضِينَ ﴿۵﴾
وَ كُنَّا نَكْذِبُ بِيَوْمِ الدِّينِ ﴿۶﴾

وہ کہیں گے ہم نماز ادا کرنے والوں میں نہیں تھے ﴿۳﴾ اور نہ ہم مسکین کو کھانا کھلاتے تھے ﴿۴﴾ اور ہم بے ہودہ بحث کرنے والوں کے ساتھ مل کر فضول بحث کیا کرتے تھے ﴿۵﴾ اور ہم جزا کے دن کو جھٹلایا کرتے تھے ﴿۶﴾

المُجْرِمِينَ“ یعنی اصحاب الیمین مجرموں سے سوال کریں گے کہ تمہیں کس چیز نے جہنم میں داخل کر دیا؟ اصحاب الیمین کا جہنیموں سے یہ سوال پوچھنے کے لیے نہیں بلکہ انہیں ذلیل و خوار اور شرمندہ کرنے کے لیے ہوگا۔

② ان آیات سے معلوم ہوا کہ جنت و جہنم کے درمیان بے حساب دوری کے باوجود جنتی جہنیموں کو دیکھیں گے اور ان سے سوال و جواب بھی کریں گے۔

آیت 46۳-43 ① قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ..... : جنہی اپنے جہنم میں جانے کے چار اسباب بیان کریں گے، پہلا یہ کہ وہ نماز ادا کرنے والوں میں شامل نہ ہوئے، دوسرا یہ کہ وہ مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے، تیسرا یہ کہ دین کی باتوں کو مذاق کرنے اور جھٹلانے کے لیے وہ مجلسوں میں بیٹھ کر فضول بحث کیا کرتے تھے اور چوتھا یہ کہ وہ روز جزا کو جھٹلاتے تھے۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے: ① نماز ایمان کے ان ارکان میں سے ہے جن کے بغیر کوئی شخص اسلامی برادری میں شامل ہی نہیں ہو سکتا اور نہ ہی اسے ”إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ“ والی اخوت دینی حاصل ہو سکتی ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿فَإِن تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ﴾ [التوبة: ۱۱] ”پھر اگر وہ (کفر سے) توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو دین میں تمہارے بھائی ہیں۔“ بلکہ جب تک کوئی شخص ایمان قبول کر کے صلوٰۃ و زکوٰۃ ادا نہ کرے اس سے جنگ کا حکم ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿أُمِرْتُ أَنْ أَقَاتِلَ النَّاسَ حَتَّى يَشْهَدُوا إِلَّا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ فَإِذَا فَعَلُوا ذَلِكَ عَصَمُوا مِنِّي دِمَائِهِمْ وَأَمْوَالَهُمْ إِلَّا بِحَقِّ الْإِسْلَامِ وَحَسَابَتِهِمْ عَلَى اللَّهِ﴾ [بخاری، الإيمان، باب: ﴿فَإِن تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ.....﴾ : ۲۵] ”مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے لڑتا رہوں یہاں تک کہ وہ اس بات کی شہادت دیں کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ پھر جب وہ یہ کام کریں تو انہوں نے اپنے خون اور مال مجھ سے محفوظ کر لیے، مگر اسلام کے حق کے ساتھ اور ان کا حساب اللہ کے ذمے ہے۔“

② جہنیموں کا یہ اقرار کہ وہ مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام میں مسکین کو کھانا کھلانا کس قدر ضروری ہے۔ ③ اللہ کی آیات سے مذاق کرنا اور ان کے متعلق فضول بحث کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ان پر ایمان نہیں رکھتا تھا۔ اگر کوئی مسلمان اس کا ارتکاب کرے تو وہ بھی کافر ہو جاتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلَيْن سَأَلْتَهُمْ لَيَقُولُنَّ إِنَّمَا كُنَّا نَخُوضُ وَ نَلْعَبُ قُلْ أَبِاللَّهِ وَ آيَاتِهِ وَ رَسُولِهِ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُونَ﴾ لَا تَعْتَذِرُوا قَدْ كَفَرْتُمْ

حَتَّىٰ آتَيْنَا الْيَقِيْنَ ۝ فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّفِيعِيْنَ ۝

یہاں تک کہ ہمارے پاس یقین آ گیا ۝ پس انھیں سفارش کرنے والوں کی سفارش نفع نہیں دے گی ۝

بَعْدَٰٓ اِيْمَانِيْكُمْ ﴿ [التوبة: ۶۵، ۶۶] ”اگر آپ ان سے پوچھیں تو کہیں گے ہم تو صرف بحث اور دل لگی کر رہے تھے۔ کہہ دے کیا اللہ کے ساتھ، اس کے رسول اور اس کی آیات کے ساتھ ہی تمہیں ہنسی مذاق کرنا تھا؟ بہانے مت بناؤ، یقیناً تم ایمان کے بعد بے ایمان ہو گئے ہو۔“ ۝ قیامت پر یقین ایمان کی بنیادی شرط ہے، اس کے بغیر آدمی مسلمان ہی نہیں ہوتا۔ حدیث جبریل میں رسول اللہ ﷺ نے ایمان کی تعریف یہ فرمائی: «أَنْ تُؤْمِنَ بِاللَّهِ وَ مَلَائِكَتِهِ وَ كُتُبِهِ وَ رُسُلِهِ وَ الْيَوْمِ الْآخِرِ وَ تُؤْمِنَ بِالْقَدْرِ خَيْرِهِ وَ شَرِّهِ» [مسلم، ایمان، باب بیان الإيمان والإسلام.....: ۸۱] ”(ایمان یہ ہے) کہ تم اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر اور یومِ آخرت پر ایمان لاؤ اور تقدیر پر، خواہ اچھی ہو یا بری، ایمان لاؤ۔“

۲ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ کفار اسلام کے تفصیلی احکام کے مخاطب نہیں ہیں اور نہ اللہ کی طرف سے انھیں اسلام کے احکام مثلاً نماز و زکوٰۃ وغیرہ بجالانے کا حکم ہے، بلکہ ان سے مطالبہ ایمان کا ہے اور مؤاخذہ بھی اسی پر ہوگا، کیونکہ ایمان کے بغیر وہ کوئی عمل کریں بھی تو بے فائدہ ہے، مگر ان آیات سے معلوم ہوا کہ کفار کے جہنم میں جانے کا باعث اعمال کا ترک بھی ہے اور وہ اسلام کے تمام اعمال بجالانے کے مکلف ہیں۔ ایمان لانے سے پہلے انھیں اعمال سے مستثنیٰ قرار دینا ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص کہے کہ وضو کے بغیر چونکہ نماز قبول نہیں ہوتی، اس لیے جب تک کوئی شخص وضو نہ کر لے وہ ”أَقْبِنُوا الصَّلَاةَ“ کا مخاطب ہی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح بے وضو شخص ”أَقْبِنُوا الصَّلَاةَ“ کا مخاطب ہے اور اسے حکم ہے کہ وضو کر کے نماز ادا کرے، اسی طرح کفار بھی ”أَقْبِنُوا الصَّلَاةَ وَ آتُوا الزَّكَاةَ“ اور دوسرے تمام احکام کے مخاطب ہیں اور انھیں حکم ہے کہ ایمان لا کر یہ تمام احکام ادا کریں۔

آیت 47 : حَتَّىٰ آتَيْنَا الْيَقِيْنَ : ”الْيَقِيْنَ“ سے مراد موت ہے، کیونکہ اس کے آنے پر تمام شکوک و شبہات دور ہو کر حقیقت سامنے آجائے گی۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّىٰ يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنَ﴾ [الحجر: ۹۹] ”اور اپنے رب کی عبادت کر، یہاں تک کہ تیرے پاس یقین آجائے۔“ اس سے مراد بھی موت ہے۔ دنیا میں کسی کو آخرت پر کتنا بھی یقین ہو وہ اس یقین کے برابر نہیں ہو سکتا جو موت آنے پر حاصل ہوگا۔

آیت 48 : ۱ ﴿فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّفِيعِيْنَ﴾ : کیونکہ کفار کے حق میں سفارش کی اجازت ہی نہیں ہوگی، اگر کوئی کرے گا بھی تو کافر کے حق میں قبول نہیں ہوگی، جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام اپنے والد کے حق میں سفارش کریں گے تو قبول نہیں ہوگی۔ یاد رہے کہ کفار کو سفارش شیوں کی سفارش کا فائدہ نہ دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس سفارش سے جہنم سے نہیں نکل سکیں گے، البتہ تخفیف عذاب کا فائدہ ہو سکتا ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کی وجہ سے ابوطالب کے عذاب میں تخفیف ہوگی۔

۲ اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو لوگ مومن موجد ہیں مگر اپنے گناہوں کی وجہ سے جہنم میں جائیں گے انھیں سفارش فائدہ کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكَرَةِ مُعْرِضِينَ ۗ كَانَهُمْ حُرٌّ مُسْتَنْفِرَةٌ ۗ فَزَتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ ۗ
بَلْ يُرِيدُ كُلُّ الْفَرِيقِ مِنْهُمْ أَنْ يُؤْتَىٰ صُحُفًا مُنشَرَةً ۗ كَلَّا ۗ بَلْ لَا يَخَافُونَ الْآخِرَةَ ۗ

تو انہیں کیا ہے کہ نصیحت سے منہ موڑنے والے ہیں ﴿۳۹﴾ جیسے وہ سخت بدکنے والے گدھے ہیں ﴿۴۰﴾ جو شیر سے بھاگے ہیں ﴿۴۱﴾ بلکہ ان میں سے ہر آدمی یہ چاہتا ہے کہ اسے کھلے ہوئے صحیفے دیے جائیں ﴿۴۲﴾ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا، بلکہ وہ آخرت سے نہیں ڈرتے ﴿۴۳﴾

دے گی۔ اللہ تعالیٰ کی اجازت سے انبیاء، شہداء اور صلحاء ان کی سفارش کریں گے اور وہ ان کی سفارش سے جہنم سے نکل آئیں گے، جیسا کہ صحیح احادیث میں آیا ہے۔

آیت 49-51: ﴿فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكَرَةِ.....﴾: ”مُسْتَنْفِرَةٌ“ باب استفعال سے اسم فاعل بمعنی ”نَافِرَةٌ“ ہے، جیسے ”عَجَبٌ“ اور ”اسْتَعْجَبَ“ اسی طرح ”سَخِرَ“ اور ”اسْتَسَخَرَ“ ہم معنی ہیں۔ حروف زیادہ ہونے سے معنی میں مبالغہ پیدا ہو گیا، سخت بدکنے والے۔ ”قَسْوَرَةٌ“ ”قَسَرَ“ سے ہے جس کا معنی غلبہ اور قہر ہے، چونکہ شیر اپنے شکار کو مغلوب و مقہور کرتا ہے اس لیے اسے ”قَسْوَرَةٌ“ کہتے ہیں۔ شکاریوں کی جماعت کو بھی ”قَسْوَرَةٌ“ کہتے ہیں اور لوگوں کے شور و غل کو بھی ”قَسْوَرَةٌ“ کہتے ہیں۔ کفار کے نصیحت اور آیات قرآنی سننے سے بھاگنے کو ان جنگلی گدھوں کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو شیر کی آہٹ یا شکاریوں کے خطرے سے بڑک کر بے تحاشا بھاگتے ہیں۔

آیت 52: ﴿بَلْ يُرِيدُ كُلُّ الْفَرِيقِ مِنْهُمْ.....﴾: یعنی قرآن مجید اور رسول اللہ ﷺ کا حق ہونا واضح ہو جانے کے باوجود ان میں سے ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اسے تازہ لکھی ہوئی تحریر دی جائے جو ابھی تازہ بھی نہ کی گئی ہو اور ان کے ہر شخص کو باقاعدہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خط آئے کہ محمد ﷺ ہمارے رسول ہیں، انہیں مان لو۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے خیال میں اتنے بڑے بن رہے ہیں کہ یہ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے اور ان کی اطاعت کے لیے تیار ہی نہیں، بلکہ ان کی خواہش اور تقاضا یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو نبی بنا دیا جائے، اسے کتاب عطا ہو اور وہ بھی خرق عادت کے طور پر کاغذ پر لکھی ہوئی سب کے سامنے کھلی ہوئی حالت میں ان پر نازل ہو۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہر شخص ہی کو نبوت و کتاب عطا ہو جائے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَإِذَا جَاءَهُمْ آيَةٌ قَالُوا لَنْ نُؤْمِنَ بِحَتَّىٰ نُؤْتَىٰ مِثْلَ مَا أُوتِيَ رُسُلُ اللَّهِ ۗ اللَّهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ﴾ [الأنعام: ۱۲۴] ”اور جب ان کے پاس کوئی آیت آتی ہے، کہتے ہیں ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے جب تک ہمیں اس جیسی چیز نہ دی جائے جو اللہ کے رسولوں کو دی گئی۔ اللہ بہتر جانتا ہے اس جگہ کو جہاں وہ اپنی رسالت رکھے۔“ اس سے ملتا جلتا مضمون سورہ فرقان (۲۱) میں بھی بیان ہوا ہے۔

آیت 53: ﴿كَلَّا ۗ بَلْ لَا يَخَافُونَ الْآخِرَةَ ۗ﴾: ”كَلَّا“ یعنی ایسا تو ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ان میں سے ہر ایک کو کتاب دی جائے

كَلَّا إِنَّكَ تَذَكِّرُهُ ۖ فَمَنْ شَاءَ ذَكَرْهُ ۗ وَمَا يُدْكَرُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ ۗ هُوَ أَهْلُ
التَّقْوَىٰ وَأَهْلُ الْمَغْفِرَةِ ﴿۵۶﴾

ہرگز نہیں! یقیناً یہ ایک یاد دہانی ہے ﴿۵۶﴾ تو جو چاہے اس سے نصیحت حاصل کرے ﴿۵۷﴾ اور وہ نصیحت حاصل نہیں کریں گے مگر یہ کہ اللہ چاہے، وہی لائق ہے کہ (اس سے) ڈرا جائے اور لائق ہے کہ بخش دے ﴿۵۸﴾

اور ان کے انکار کی وجہ بھی یہ نہیں، بلکہ ان کے نصیحت سے بھاگنے کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان کا آخرت پر ایمان نہیں اور تمام خرابیوں کی جڑ یہی ہے۔ جب تک یہ لوگ دنیا کی زندگی کو سب کچھ سمجھتے رہیں گے آپ ان کو ان کے تقاضوں کے مطابق کوئی معجزہ بھی دکھادیں تو وہ اسے جادو قرار دے کر ماننے سے انکار کریں گے۔ دیکھیے سورہ انعام (۷)۔

آیت 54-55 كَلَّا إِنَّكَ تَذَكِّرُهُ : یعنی ان مشرکین نے جو قرآن کو جادو یا انسانی کلام قرار دیا ہے یہ بات ہرگز درست نہیں، بلکہ یہ قرآن تو اللہ کی طرف سے اپنے بندوں کے لیے ایک یاد دہانی ہے، اب جو چاہے اس سے نصیحت حاصل کرے۔

آیت 56 وَمَا يُدْكَرُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ : یعنی انسان کو اگرچہ اختیار ہے کہ وہ نیکی کی راہ اختیار کرے یا برائی کی، مگر اس کا یہ اختیار بھی اللہ تعالیٰ کے چاہنے کے تحت ہے۔ یہ نہیں کہ وہ ہدایت حاصل کرنا چاہے مگر اللہ کا ارادہ نہ ہو تو اسے ہدایت حاصل ہو ہی جائے گی، یا گمراہ ہونا چاہے مگر اللہ کی مشیت نہ ہو تو ضرور گمراہ ہو کر ہی رہے گا۔ پھر جب سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے تو وہی اس لائق ہے کہ ہر وقت اس سے ڈرا جائے اور اسی کی یہ شان ہے کہ جو اس سے ڈرے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے وہ اسے بخش دے۔



لَا أَقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيَمَةِ ۝ وَلَا أَقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۝

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

نہیں، میں قیامت کے دن کی قسم کھاتا ہوں! ① اور نہیں، میں بہت ملامت کرنے والے نفس کی قسم کھاتا ہوں! ②

آیت 2.1 ① لَا أَقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيَمَةِ: ”الْقِيَمَةُ“ ”قِيَامٌ“ مصدر ہے، کھڑا ہونا، تاہم ”ایک دفعہ“ کا معنی ادا کرنے کے لیے ہے، یعنی آدمی کا ایک دفعہ کھڑا ہونا۔ یہاں یہ سمجیے کہ ”یَوْمِ الْقِيَامَةِ“ کا معنی ہوگا۔ (راغب) ”يَوْمُ الْقِيَامَةِ“ کا معنی ہوگا ایک ہی دفعہ اٹھ کھڑے ہونے کا دن۔ ”اللَّوَّامَةُ“ ”لَا مَ يَلُومُ“ سے مبالغہ کا صیغہ ہے، یعنی بہت ملامت کرنے والا، جیسے ”عَلَّامَةٌ“ اور ”فَهَّامَةٌ“ ہے۔

② ”لَا أَقْسِمُ“ کا معنی یہ نہیں کہ میں قسم نہیں کھاتا، بلکہ ”لَا“ الگ ہے اور ”أَقْسِمُ“ الگ۔ معنی یہ ہے کہ نہیں، میں قیامت کے دن کی قسم کھاتا ہوں۔ عرب کے ہاں یہ محاورہ عام ہے ”لَا وَاللَّهِ“ یعنی جب کوئی شخص انکار کر رہا ہو تو پہلے اس کے انکار کی نفی ”لَا“ سے کی جاتی ہے، پھر اپنی بات کی تاکید کے لیے قسم ذکر کی جاتی ہے۔ اردو میں بھی محاطب کے غلط خیال کی تردید کے لیے ایسے ہی کہا جاتا ہے کہ نہیں، اللہ کی قسم! بات اس طرح ہے۔ کئی مفسرین نے فرمایا کہ ”لَا“ زائدہ ہے اور معنی یہ ہے کہ میں قسم کھاتا ہوں۔ مگر زائدہ ماننے کے بجائے باعنی قرار دینا بلاغت قرآن کے زیادہ لائق ہے، جب کہ معنی بھی درست ہو رہا ہے اور پر زور ہو رہا ہے۔

③ قرآن میں انسانی نفس کی تین قسموں کا ذکر کیا گیا ہے، ایک وہ جو اسے گناہ پر ابھارتا ہے، اس کا نام ”امارہ“ ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ﴾ (یوسف: ۵۳) ”نفس تو برائی کا حکم دینے والا ہے۔“ دوسرا وہ نفس جو آدمی کو برائی پر ملامت کرتا ہے، اس کا نام ”لوامہ“ ہے۔ کوئی بھی شخص خواہ نیک ہو یا بد، نیک کام میں کوتاہی اور برے کام کے ارتکاب پر خود اس کا نفس اسے ملامت کرتا ہے کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ اسے عام طور پر اردو میں ضمیر کہتے ہیں۔ تیسرا وہ جسے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی تمام باتوں پر یقین ہو اور ان کے حق ہونے پر اسے پورا اطمینان اور تسلی ہو، منافقین کی طرح شک و شبہ میں مبتلا نہ ہو، یہ ”نفس مطمئنة“ ہے۔ بعض اہل علم نے فرمایا کہ یہ ایک ہی نفس کی مختلف وقتوں میں تین حالتیں ہیں۔

④ ”يَوْمِ الْقِيَمَةِ“ اور ”بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ“ کی قسم جس بات پر کھائی گئی ہے وہ یہاں لفظوں میں مذکور نہیں، مگر بعد میں آنے والی آیات سے وہ بات خود بخود سمجھ میں آ رہی ہے کہ وہ یہ ہے کہ ہم یقیناً انسان کی بدیاں اکٹھی کر کے اسے دوبارہ زندہ کریں گے۔

⑤ قسم سے مراد اس بات کی تاکید ہوتی ہے جس کے لیے قسم کھائی جاتی ہے، پھر بعض اوقات تاکید کی صورت یہ ہوتی ہے کہ وہ چیز نہایت عظیم الشان ہوتی ہے جس کی قسم کھائی گئی ہے اور اس کی عظمت ہی بات کی تاکید کے لیے کافی سمجھی جاتی ہے اور

اَيْحَسِبُ الْاِنْسَانُ اَنْ نَّجْعَعَ عِظَامَهُ ﴿۱﴾ بَلَىٰ قَدْرَيْنَ عَلٰى اَنْ نُّسَوِيَ بَنَاتَكَ ﴿۲﴾

کیا انسان گمان کرتا ہے کہ ہم کبھی اس کی ہڈیاں اکٹھی نہیں کریں گے ﴿۱﴾ کیوں نہیں؟ (ہم انھیں اکٹھا کریں گے) اس حال میں کہ ہم قادر ہیں کہ اس (کی انگلیوں) کے پورے درست کر کے بنا دیں ﴿۲﴾

بعض اوقات قسم اپنے جواب قسم کی دلیل ہوتی ہے جس سے اس کی تاکید ہوتی ہے۔ یہاں قیامت کے دن کی قسم قیامت کے حق ہونے کی تاکید کے لیے اٹھائی گئی ہے، اس کی وجہ قیامت کی عظمت بھی ہے اور یہ بھی کہ روز قیامت اپنی دلیل خود ہے، جیسا کہ سورہ ص میں قرآن کے حق ہونے کے لیے خود قرآن کی قسم کھائی ہے، فرمایا: ﴿ص وَالْقُرْآنِ ذِي الذِّكْرِ﴾ [ص: ۱] ”ص۔ اس نصیحت والے قرآن کی قسم۔“ اور نفس لوامہ کی قسم اس لیے کہ یہ بات انسان کی فطرت میں رکھ دی گئی ہے کہ اس کا نفس برے کام پر اسے ملامت کرتا ہے، قطع نظر اس سے کہ اس کے نزدیک اچھائی یا برائی کا معیار کیا ہے اور قطع نظر اس سے کہ وہ ضمیر کی اس ملامت کی پروا کرتا ہے یا نہیں؟ ملامت کرنے والا یہ نفس اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان پر حجت ہے کہ جس طرح تمہارا اپنا نفس خود تم سے باز پرس کر رہا ہے لازم ہے کہ ایک ایسا وقت آئے جب تمہارا پیدا کرنے والا تم سے باز پرس کرے۔

آیت 3، 4 ﴿۱﴾ اَيْحَسِبُ الْاِنْسَانُ اَنْ نَّجْعَعَ عِظَامَهُ : ”قَدْرَيْنَ“ حال ہے، اس سے پہلے فعل محذوف ہے: ”اَيُّ بَلَىٰ نَجْمَعُهَا قَادِرَيْنَ“ ”یعنی کیوں نہیں ہم انھیں جمع کریں گے، اس حال میں کہ ہم اس بات پر قادر ہیں“ ﴿۲﴾ قیامت کے منکرین یہ ماننے کے لیے تیار نہ تھے کہ جب ان کی ہڈیاں تک بوسیدہ ہو کر ذرات کی صورت میں بکھر جائیں گی تو انھیں پھر دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ (انسان اگر یہ خیال کرے کہ اس کی ہڈیاں خود بخود جمع نہیں ہو سکتیں یا مخلوق میں سے کوئی انھیں دوبارہ جمع نہیں کر سکتا تو اسے یہ سمجھنے کا حق ہے، مگر) کیا وہ ہمارے متعلق گمان کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیاں جمع نہیں کر سکیں گے؟ پہلی دفعہ جب اس کا نام و نشان تک نہ تھا، ہم نے اسے پیدا کر دیا تو اب اس کی ہڈیاں کیوں جمع نہیں کر سکتے؟ یقیناً ہم انھیں جمع کریں گے اور بڑی ہڈیاں ہی نہیں بلکہ ہم یہ بھی قدرت رکھتے ہیں کہ اس کے پورے، جو نہایت باریک اور نازک ہڈیوں پر مشتمل ہیں، دوبارہ درست کر کے بنا دیں۔ سورہ لیس (۷۷ تا ۷۹) اور سورہ بنی اسرائیل (۵۱ تا ۵۹) میں یہ مضمون تفصیل سے بیان ہوا ہے۔

﴿۳﴾ ان آیات سے صاف ظاہر ہے کہ قیامت کے دن جسم دوبارہ زندہ کیے جائیں گے اور وہ بھی حساب، عذاب اور ثواب میں روح کے ساتھ شریک ہوں گے۔ صحیح بخاری (۳۲۸۱) میں بنی اسرائیل کے ایک آدمی کا ذکر آیا ہے جس کے بیٹوں نے اس کے کہنے کے مطابق اسے مرنے کے بعد جلا کر اور ہڈیوں کو چسپ کر کچھ راکھ ہوا میں اڑا دی اور کچھ پانی میں بہا دی، تو اللہ تعالیٰ نے ہوا اور پانی کو حکم دے کر اس کے ذرات اکٹھے کر کے اسے دوبارہ زندہ کر دیا۔ اگر روح ہی سے باز پرس ہو تو ذرات جمع کر کے اسے دوبارہ سامنے کھڑا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

بَلْ يُرِيدُ الْإِنْسَانُ لِيَفْجُرَ أَمَانَةً ۗ يَسْئَلُ أَيَّانَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ فَإِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۗ
وَحَسَفَ الْقَمَرُ ۗ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۗ يَقُولُ الْإِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ أَيْنَ الْمَقَرُّ ۗ كَلَّا
لَا وَمَرَدٌ ۗ إِلَىٰ رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمُسْتَقَرُّ ۗ

بلکہ انسان چاہتا ہے کہ اپنے آگے (آنے والے دنوں میں بھی) نافرمانی کرتا رہے ۷ وہ پوچھتا ہے اٹھ کھڑے ہونے کا دن کب ہوگا؟ ۸ پھر جب آنکھ پتھر اچانے کی ۹ اور چاند گہنا جائے گا ۱۰ اور سورج اور چاند اکٹھے کر دیے جائیں گے ۱۱ انسان اس دن کہے گا کہ بھاگنے کی جگہ کہاں ہے؟ ۱۲ ہرگز نہیں، پناہ کی جگہ کوئی نہیں ۱۳ اس دن تیرے رب ہی کی طرف جا ٹھہرنا ہے ۱۴

آیت 6.5: بَلْ يُرِيدُ الْإِنْسَانُ ... "لِيَفْجُرَ" "فَجُرًا فُجُورًا" (ن) جھوٹ بولنا، گناہ کرنا، زنا کرنا۔ یعنی قیامت کے انکار کی کوئی اور وجہ نہیں، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ انسان چاہتا ہے کہ اپنے آگے یعنی آنے والے دنوں میں بھی نافرمانی اور گناہ کرتا رہے۔ اب اگر وہ قیامت پر ایمان لائے تو اس کا تقاضا ہے کہ گناہ چھوڑ دے جسے چھوڑنے پر وہ آمادہ نہیں۔ گویا وہ عقل کی وجہ سے قیامت کا انکار نہیں کر رہا بلکہ ہوس نے اسے اندھا کر رکھا ہے، اس لیے وہ تیاری کے لیے نہیں بلکہ مذاق اڑانے اور جھٹلانے کے لیے پوچھتا ہے کہ وہ دفعتاً اٹھ کھڑے ہونے کا وقت کب ہوگا؟

آیت 7: فَإِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ: "بَرِقًا وَبُرُوقًا" آنکھ کا حیرت سے کھلا رہ جانا یا دہشت زدہ ہو کر کچھ نہ دیکھ سکتا۔ (قاموس) اللہ تعالیٰ نے قیامت کی تاریخ اور قیامت کے متعلق بتانے کے بجائے اس دن واقع ہونے والی چند چیزیں بیان فرمادیں۔ "فَإِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ" یعنی قیامت کے دن کے عجیب و غریب حوادث و واقعات کو دیکھ کر آنکھیں حیرت سے کھلی رہ جائیں گی اور خوف و دہشت کے مارے ان سے کچھ دکھائی نہ دے گا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَا تَحْسَبَنَّ اللَّهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظَّالِمُونَ ؕ إِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيهِ الْأَبْصَارُ ۚ مُنْظِعِينَ مُقْسِعِينَ رُءُوسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ إِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ ۗ وَأَفْئِدَتُهُمْ هَوَاءٌ ﴿۶۶﴾ | براہیم، ۶۶، ۶۳ | اور تو ہرگز خیال نہ کر کہ اللہ ان کاموں سے بے خبر ہے جو ظالم لوگ کر رہے ہیں، وہ تو انہیں صرف اس دن کے لیے مہلت دے رہا ہے جس میں آنکھیں کھلی رہ جائیں گی۔ حال یہ ہوگا کہ سر اٹھائے ہوئے تیز بھاگ رہے ہوں گے، ان کی نگاہیں ان کی طرف لوٹ کر نہیں آئیں گی اور ان کے دل خال ہوں گے۔

آیت 8: وَحَسَفَ الْقَمَرُ: چاند گہنا جائے گا، یعنی بے نور ہو جائے گا۔

آیت 9: وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ: یعنی یہ نظامِ فلکی جس میں چاند سورج سے لاکھوں میل کے فاصلے پر ہے، درہم برہم ہو جائے گا اور سورج اور چاند اکٹھے کر دیے جائیں گے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «الْشَّمْسُ وَالْقَمَرُ مُكْوَرَانِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ» | بحاری، بد، الحنفی، باب صفة الشمس والقمر: ۳۲۰۰ | "قیامت کے دن سورج اور چاند لپیٹے ہوئے ہوں گے۔"

آیت 12.10: يَقُولُ الْإِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ: یہ انسان جو آج پوچھتا ہے کہ قیامت کا دن کب ہوگا، اس دن ایسا حیران

يُنَبِّئُوا الْإِنْسَانَ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَأَخَّرَ ﴿۱۴﴾ بَلِ الْإِنْسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ ﴿۱۵﴾ وَلَوْ
أَلْقَىٰ مَعَاذِيرَهُ ﴿۱۶﴾

اس دن انسان کو بتایا جائے گا جو اس نے آگے بھیجا اور جو پیچھے چھوڑا ﴿۱۴﴾ بلکہ انسان اپنے آپ کو خوب دیکھنے والا ہے ﴿۱۵﴾ اگرچہ وہ اپنے بہانے پیش کرے ﴿۱۶﴾

اور خوف زدہ ہوگا کہ بھاگنے کے لیے جگہ تلاش کرے گا، مگر اس دن کوئی جائے پناہ نہیں ملے گی اور سب لوگوں کو اپنے رب کے سامنے پیش ہونا پڑے گا۔

آیت 13 : يُنَبِّئُوا الْإِنْسَانَ يَوْمَئِذٍ: ”جو آگے بھیجا“ سے مراد وہ اعمال ہیں جو اس نے موت سے پہلے کیے اور ”جو پیچھے چھوڑا“ سے مراد وہ اچھے یا برے اعمال ہیں جو اس کے مرنے کے بعد بھی جاری رہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « إِذَا مَاتَ الْإِنْسَانُ انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ إِلَّا مِنْ ثَلَاثَةٍ إِلَّا مِنْ صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ أَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُو لَهُ » [مسلم، الوصیة، باب ما يلحق الإنسان من الثواب بعد وفاته: ۱۶۳۱، عن أبي هريرة رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ] ”جب انسان فوت ہوتا ہے تو اس کا عمل منقطع ہو جاتا ہے مگر تین عمل جاری رہتے ہیں، صدقہ جاریہ، وہ علم جس سے فائدہ اٹھایا جائے اور صالح اولاد جو اس کے لیے دعا کرے۔“ اور فرمایا: « مَنْ سَنَّ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةً حَسَنَةً فَعَمِلَ بِهَا بَعْدَهُ كُتِبَ لَهُ مِنْ أَجْرِ مَنْ عَمِلَ بِهَا وَلَا يَنْقُصُ مِنْ أَجْرِهِمْ شَيْءٌ وَمَنْ سَنَّ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةً سَيِّئَةً فَعَمِلَ بِهَا بَعْدَهُ كُتِبَ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرِ مَنْ عَمِلَ بِهَا وَلَا يَنْقُصُ مِنْ أَجْرِهِمْ شَيْءٌ » [مسلم، العلم، باب من سن سنة حسنة أو سيئة.....: ۱۰۱۷، بعد الحدیث: ۲۶۷۳] ”جو شخص اسلام میں کوئی اچھا طریقہ جاری کرے پھر اس کے بعد اس طریقے پر عمل کیا جائے، تو اس کے لیے ان لوگوں کی مثل اجر لکھا جائے گا جو اس پر عمل کریں گے اور ان کے ثواب سے بھی کچھ کم نہیں ہوگا اور جو شخص اسلام میں کوئی برا طریقہ جاری کرے، پھر اس کے بعد اس پر عمل کیا جائے، تو اس پر ان لوگوں کے گناہ کی مثل لکھا جائے گا جو اس پر عمل کریں گے اور ان کے گناہ میں سے بھی کچھ کم نہیں ہوگا۔“

”بِمَا قَدَّمَ وَأَخَّرَ“ کا دوسرا معنی یہ ہے کہ اسے وہ سب کچھ بتا دیا جائے گا جو اس نے کیا اور جو کرنا تھا مگر نہیں کیا۔ تیسرا معنی یہ ہے کہ جو کچھ اس نے پہلے وقت میں کیا اور جو بعد میں کیا سب تاریخ اور وقت کے ساتھ اسے بتایا جائے گا۔

آیت 14-15 : بَلِ الْإِنْسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ: ”بَصِيرَةٌ“ ”بَصْرٌ“ (ک) سے صفت کا صیغہ ہے۔ ”تاء“ مزید مبالغے کے لیے ہے، جیسے ”عَلَامَةٌ“ میں ہے، یہ تائے تانیث نہیں ہے، خوب دیکھنے والا۔ ”مَعَاذِيرٌ“ ”مَعْدِرَةٌ“ کی جمع ہے، یعنی اس دن انسان کو پہلے اور پچھلے اعمال بتائے جانے کا مطلب یہ نہیں کہ اسے معلوم نہیں کہ وہ کیا کرتا رہا ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انسان کو اپنے متعلق خوب معلوم ہے کہ وہ اچھا کام کر رہا ہے یا برا۔ پھر دوسروں کے سامنے اپنے کفر و شرک، خالق کی

لَا تُحَرِّكُ بِهِ لِسَانَكَ لِتَتَّعَلَ بِهِ ۖ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ﴿۱۷﴾ فَإِذَا قَرَأَهُ فَاتَّبِعْ
قُرْآنَهُ ﴿۱۸﴾ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ﴿۱۹﴾

تو اس کے ساتھ اپنی زبان کو حرکت نہ دے، تاکہ اسے جلدی حاصل کر لے ﴿۱۷﴾ بلاشبہ اس کو جمع کرنا اور (آپ کا)
اس کو پڑھنا ہمارے ذمے ہے ﴿۱۸﴾ تو جب ہم اسے پڑھیں تو تو اس کے پڑھنے کی پیروی کر ﴿۱۸﴾ پھر بلاشبہ اسے واضح
کرنا ہمارے ذمے ہے ﴿۱۹﴾

نافرمانی، اس کی مخلوق پر ظلم و ستم اور اپنی خواہش پرستی کے جواز کے لیے مجبوری یا مصلحت کے لاکھ بہانے گھڑے، مگر خود اسے اچھی
طرح معلوم ہے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے اور بہانہ بازی کر رہا ہے۔ اس کے نفس کی ملامت بھی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنے
کرتوتوں سے آگاہ ہے۔ نامہ اعمال پیش کیے جانے کا مطلب تو اس پر حجت تمام کرنا ہے اور یہ حجت صرف نامہ اعمال کے ذریعے
سے نہیں بلکہ اس کے ہر عضو کو بلوا کر اور زمین کے ہر اس حصے کو بلوا کر جس پر اس نے نافرمانی کی تھی، پوری کی جائے گی۔

آیت 16-19 ﴿۱۷﴾ لَا تُحَرِّكُ بِهِ لِسَانَكَ: ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ قرآن مجید اترتے وقت بہت
تکلیف محسوس کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ ساتھ ساتھ ہونٹ ہلاتے جاتے تھے، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری:
﴿لَا تُحَرِّكُ بِهِ لِسَانَكَ لِتَتَّعَلَ بِهِ ۖ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ﴾ ”تو اس کے ساتھ اپنی زبان کو حرکت نہ دے کہ اسے
جلدی حاصل کرے۔ بلاشبہ اس کو جمع کرنا اور (آپ ﷺ کا) اس کو پڑھنا ہمارے ذمے ہے۔“ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا، اس
کا مطلب یہ ہے کہ اسے آپ کے سینے میں جمع کرنا اور آپ کا اسے پڑھنا ہمارے ذمے ہے۔ ”فَإِذَا قَرَأَهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ“
تو جب ہم اسے پڑھیں تو کان لگا کر سنو اور خاموش رہو۔ ”ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ“ پھر یہ ہمارے ذمے ہے کہ آپ اسے
پڑھیں گے۔ اس کے بعد جب جبریل علیہ السلام آپ کے پاس آتے تو آپ کان لگا کر سنتے رہتے، جب وہ چلے جاتے تو نبی ﷺ
اسی طرح پڑھ لیتے جیسے جبریل علیہ السلام نے پڑھا تھا۔ [بخاری، بدء الوحي، باب كيف كان بدء الوحي: ۵] ”جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ“
سے اولین مراد یہی ہے جو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان فرمائی، مگر لفظ عام ہونے کی وجہ سے قرآن جمع کرنے اور اسے پڑھنے کی
تمام صورتیں اس میں شامل ہیں اور اس کے جمع و نشر کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے خود لیا ہے۔ چنانچہ خلفاء کا قرآن مجید کو جمع کرنا، لکھوانا
اور تحفا کا حفظ کرنا، ریڈیو، ٹیلی وژن، پریس اور کمپیوٹر کے ذریعے سے قرآن کا جمع اور نشر ہونا بھی اس میں شامل ہے۔

﴿ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ﴾ سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید کی وضاحت کا ذمہ بھی اللہ تعالیٰ نے خود اٹھایا ہے اور یہ وضاحت
رسول اللہ ﷺ کے ذریعے سے فرمائی ہے، جو حدیث و سنت کی صورت میں ہمارے پاس محفوظ ہے۔ مثلاً قرآن میں اللہ تعالیٰ
نے نماز قائم کرنے کا حکم دیا تو اس کی تشریح رسول اللہ ﷺ کے عمل اور فرمان کے ساتھ کر دی کہ نمازوں کے اوقات کیا ہیں اور
نمازیں کتنی ہیں۔ ان کی رکعات، قیام، رکوع، سجود وغیرہ کی ترتیب اور ان میں پڑھے جانے والے اذکار، غرض یہ سب کچھ
قرآن کا بیان ہے جو رسول اللہ ﷺ کے ذریعے سے کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ الَّذِي نُبَيِّنُ لِلنَّاسِ مَا

كَلَّا بَلْ تُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ ﴿۲۰﴾ وَ تَذُرُونَ الْآخِرَةَ ﴿۲۱﴾

ہرگز نہیں، بلکہ تم جلدی ملنے والی کو پسند کرتے ہو ﴿۲۰﴾ اور بعد میں آنے والی کو چھوڑ دیتے ہو ﴿۲۱﴾

نَزَلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ﴿﴾ [النحل: ۴۴] ”اور (اے رسول!) ہم نے تیری طرف یہ ذکر نازل کیا ہے، تاکہ تو لوگوں کے لیے اس (ذکر) کی وضاحت اور تشریح کر دے جو ان کی طرف نازل کیا گیا اور تاکہ وہ غور و فکر کریں۔“ معلوم ہوا کہ حدیث قرآن ہی کا بیان ہے، اس لیے اس پر عمل کرنا بھی اسی طرح واجب ہے جس طرح قرآن پر عمل کرنا واجب ہے۔

﴿۳﴾ ”فَإِذَا قَرَأْتَهُ“ (جب ہم اسے پڑھیں) سے مراد یہ ہے کہ جب جبریل علیہ السلام پڑھ رہے ہوں، کیونکہ ان کا پڑھنا اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہے، اس لیے اس کی نسبت اللہ تعالیٰ نے خود اپنی طرف فرمائی۔

﴿۴﴾ سورت کے شروع میں منکرین حشر اور منکرین قیامت کا ذکر ہے، سورت کے آخر میں بھی یہی ذکر ہے، درمیان میں یہ آیات ہیں جن کا بظاہر ماقبل اور مابعد سے کوئی ربط نہیں۔ اس لیے بعض شیعہ مفسرین نے یہاں تک لکھ دیا کہ اس سورت میں کچھ آیات رہ گئی ہیں، مگر یہ بات غلط ہے، کیونکہ اس کا رد خود ان آیات میں موجود ہے کہ قرآن کا جمع کرنا اللہ کے ذمے ہے، پھر اس میں سے آیات کس طرح رہ سکتی ہیں؟ اور یہ بات بھی صحیح سندوں سے ثابت ہے کہ قرآن مجید کی آیات کی یہ ترتیب

خود رسول اللہ ﷺ کی بتائی ہوئی ہے، جیسا کہ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ پر ایک وقت میں کئی سورتیں نازل ہو رہی ہوتی تھیں، جب کوئی چیز نازل ہوتی تو آپ کسی وحی لکھنے والے کو بلا کر فرماتے کہ یہ آیات اس سورت میں لکھو

جس میں فلاں فلاں بات کا ذکر ہے اور جب آپ پر کوئی آیت اترتی تو فرماتے اسے اس سورت میں لکھ دو جس میں فلاں فلاں بات کا ذکر ہے۔ [ترمذی، التفسیر، باب سورة التوبة: ۳۰۸۶] ابوداؤد، نسائی، مسند احمد، مستدرک حاکم اور صحیح ابن حبان

میں بھی یہ حدیث موجود ہے۔ اگرچہ بعض مفسرین نے ان آیات کا ربط ماقبل اور مابعد کے ساتھ بنانے کی کوشش کی ہے مگر ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر کے بعد جو بہترین سندوں کے ساتھ امام بخاری رضی اللہ عنہما نے نقل فرمائی ہے، خود ساختہ ربط کی تکلیف اٹھانا سراسر تکلف ہے۔ صحیح بات یہی ہے کہ اس سورت کے نازل ہونے کے وقت اور سورہ طہ کی آیت (۱۱۳): ﴿وَلَا تَجْعَلْ

بِالْقُرْآنِ مِنْ قَبْلِ أَنْ يُقْضَىٰ إِلَيْكَ وَحْيُهُ﴾ نازل ہونے کے وقت رسول اللہ ﷺ کو جبریل علیہ السلام کے ساتھ پڑھنے کا موقع پیش آیا اور اس وقت ممانعت کا یہ حکم نازل ہوا اور اس مقام پر قرآن میں لکھ دیا گیا۔ اس کی مثال ایسے ہی سمجھیں جیسے کوئی

استاذ شاگرد کو کوئی چیز پڑھا رہا ہو اور درمیان میں اس کی کسی حرکت کی اصلاح کے لیے کہے ”ایمانت کرو“ اور پہلا سلسلہ کلام جاری کر دے تو ٹیپ ریکارڈر میں یہ بات بھی ریکارڈ ہو جائے گی اور لفظ بلفظ تحریر میں بھی اسی طرح نقل ہوگی۔ درمیان میں آنے والی اس بات کا معنوی ربط و تعلق ماقبل و مابعد سے جوڑنا تکلف ہوگا، مگر اس بات کو بے محل نہیں کہہ سکتے، یقیناً اس موقع پر یہی بات ضروری تھی اور یہ بھی ربط کی ایک صورت ہے کہ موقع و محل کے تقاضے سے یہ الفاظ درمیان میں آگئے۔

آیت 20 21 ﴿كَلَّا بَلْ تُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ.....﴾: یہاں سے پھر وہی سلسلہ کلام شروع ہوتا ہے جو ”لَا تُحِزُّكَ بِهِ لِسَانُكَ“

وَجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَّاصِرَةٌ ﴿۳۱﴾ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿۳۲﴾

اس دن کئی چہرے تر و تازہ ہوں گے ﴿۳۱﴾ اپنے رب کی طرف دیکھنے والے ﴿۳۲﴾

سے پہلے چل رہا تھا۔ فرمایا تمہارے قیامت کا انکار کرنے کی وجہ کوئی اور نہیں بلکہ یہ ہے کہ تم دنیا سے محبت کرتے ہو اور اس کی محبت میں آخرت کو چھوڑ ہی بیٹھے ہو، کیونکہ دنیا جلدی ملنے والی اور نقد ہے جب کہ آخرت بعد میں آئے گی اور ادھار ہے، حالانکہ اس نقد کی راحتیں اور رنج عارضی ہیں اور آخرت ہمیشہ رہنے والی اور کہیں بہتر ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿بَلْ تُؤْثِرُونَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ خَيْرًا وَآبِقٰی﴾ [الأعلى : ۱۶، ۱۷] ”بلکہ تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو۔ حالانکہ آخرت کہیں بہتر اور زیادہ باقی رہنے والی ہے۔“

آیت 22، 23 : ﴿وَجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَّاصِرَةٌ.....: "نَّاصِرَةٌ" نَصَرَ الْوَجْهَ وَالشَّجَرَ وَاللَّوْنَ " (ن، ک، ہ) چہرے یا درخت یا رنگ کا تر و تازہ، خوبصورت اور بارونق ہونا۔ معلوم ہوا کہ قیامت کے دن نیک بندوں کو اللہ تعالیٰ کا دیدار نصیب ہوگا اور اس خوشی میں ان کے چہرے تر و تازہ اور چمک رہے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں انسان ہوں یا حیوان، نباتات ہوں یا جمادات، ایسا ایسا حسن و جمال ہے جسے دیکھ کر خوشی سے چہروں پر تازگی اور رونق آ جاتی ہے۔ جب حسن و جمال کے خالق کی ذات کو دیکھیں گے تو ان کی خوشی اور ان کے چہروں کی تازگی کا کیا ٹھکانا ہوگا!! حقیقت یہ ہے کہ جنت کی سب سے بڑی نعمت ہی یہ ہوگی کہ جنتی اپنی آنکھوں سے اپنے رب تعالیٰ کا دیدار کریں گے۔ صحیب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿إِذَا دَخَلَ أَهْلُ الْحَنَّةِ الْجَنَّةَ قَالَ يَقُولُ اللَّهُ تَبَارَكَ وَتَعَالَىٰ تَرِيدُونَ شَيْئًا أَزِيدُكُمْ؟ فَيَقُولُونَ أَلَمْ نَبِيضْ وَجُوهُنَا؟ أَلَمْ تَدْخِلْنَا الْجَنَّةَ وَتَنْجِنَا مِنَ النَّارِ؟ قَالَ فَيَكْشِفُ الْحِجَابَ فَمَا أُعْطُوا شَيْئًا أَحَبَّ إِلَيْهِمْ مِنَ النَّظَرِ إِلَىٰ رَبِّهِمْ عَزَّ وَجَلَّ، ثُمَّ نَلَآ هٰذِهِ الْآيَةَ: ﴿لِّلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ﴾﴾ [مسلم، الإيمان، باب إنبات روية المؤمنین ... : ۱۸۱] ”جب اہل جنت جنت میں داخل ہوں گے تو اللہ تبارک و تعالیٰ فرمائے گا: ”تمہیں کوئی چیز چاہیے جو میں تمہیں مزید عطا کروں؟“ وہ کہیں گے: ”کیا تو نے ہمارے چہروں کو سفید نہیں کیا؟ کیا تو نے ہمیں جنت میں داخل نہیں کیا اور آگ سے نجات نہیں دی؟“ فرمایا: ”پھر اللہ تعالیٰ پردہ ہٹا دے گا اور انہیں کوئی بھی چیز نہیں دی گئی ہوگی جو انہیں اپنے رب کو دیکھنے سے زیادہ پیاری ہو۔“ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: ﴿لِّلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ﴾ [یونس : ۲۶] ”جن لوگوں نے اچھے اعمال کیے ان کے لیے اچھا اجر ہے اور مزید بھی (مزید سے رب تعالیٰ کا دیدار مراد ہے)۔“

جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿إِنَّكُمْ سَتَرُونَ رَبَّكُمْ عَيْنَانَا﴾ [بخاری، التوحید، باب قول الله تعالى : ﴿وجوه يومئذ ناصرة.....﴾ : ۷۴۳۵] ”تم اپنے رب کو اپنی آنکھوں سے صاف دیکھو گے۔“ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ لوگوں نے پوچھا: ”یا رسول اللہ! کیا ہم قیامت کے دن اپنے رب کو دیکھیں گے؟“ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿هَلْ تَضَارُونَ فِي الْقَمْرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ؟ قَالُوا لَا يَا رَسُولَ اللَّهِ! قَالَ فَهَلْ تَضَارُونَ فِي الشَّمْسِ لَيْسَ

وَجُوهٌ يَوْمَئِذٍ بِأَسْرَةٍ ﴿۳۳﴾ تَطَّلُنُ أَنْ يُفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ﴿۳۴﴾ كَلَّا إِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ﴿۳۵﴾
وَقِيلَ مَنْ رَاقٍ ﴿۳۶﴾ وَظَنَّ أَنَّهُ الْفِرَاقُ ﴿۳۷﴾ وَالتَّمَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ﴿۳۸﴾ إِلَىٰ رَبِّكَ

يَوْمَئِذٍ السَّاقُ ﴿۳۸﴾

اور کئی چہرے اس دن بگڑے ہوئے ہوں گے ﴿۳۳﴾ وہ یقین کریں گے کہ ان کے ساتھ کھڑے والی (سختی) کی جائے گی ﴿۳۴﴾ ہرگز نہیں، (وہ وقت یاد کرو) جب (جان) ہنسلوں تک پہنچ جائے گی ﴿۳۵﴾ اور کہا جائے گا کون ہے دم کرنے والا؟ ﴿۳۶﴾ اور وہ یقین کر لے گا کہ یہ جدائی ہے ﴿۳۷﴾ اور پنڈلی، پنڈلی کے ساتھ لپٹ جائے گی ﴿۳۸﴾ اس دن تیرے رب ہی کی طرف روانگی ہے ﴿۳۹﴾

دُونَهَا سَحَابٌ؟ قَالُوا لَا يَا رَسُولَ اللَّهِ! قَالَ فَإِنَّكُمْ تَرَوْنَهُ كَذَلِكَ ﴿۱﴾ [بخاری، التوحيد، باب قول الله تعالى: ﴿وجوه يومئذ ناظرة...﴾: ۷۴۳۷- مسلم: ۱۸۲] ”کیا تمہیں چودھویں کا چاند دیکھنے میں کوئی تکلیف ہوتی ہے؟“ انہوں نے کہا: ”نہیں، اے اللہ کے رسول!“ فرمایا: ”کیا تمہیں سورج دیکھنے میں کوئی تکلیف ہوتی ہے جس کے سامنے بادل کی رکاوٹ بھی نہ ہو؟“ انہوں نے کہا: ”نہیں، اے اللہ کے رسول!“ فرمایا: ”(یقین رکھو کہ) تم اپنے رب کو اسی طرح دیکھو گے۔“ قرآن مجید میں فاجر لوگوں کے متعلق فرمایا: ﴿كَلَّا إِنَّهُمْ عَنْ رَبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَمَحْجُوبُونَ﴾ [المطففين: ۱۵] ”ہرگز نہیں، بے شک وہ اس دن اپنے رب سے حجاب میں رکھے جائیں گے۔“ اللہ تعالیٰ نے ان کے دیدار الہی سے محروم رکھے جانے کا خاص طور پر ذکر فرمایا۔ اگر ابرار کو بھی اس دن رب کا دیدار نہ ہو تو ان میں اور فجار میں کیا فرق رہا؟ بہت بد نصیب ہیں وہ لوگ جو اتنی واضح آیات و احادیث کے باوجود قیامت کے دن دیدار الہی کے منکر ہیں۔ اس انکار کا بدلا یہی ہے کہ انہیں قیامت کے دن اس سب سے بڑی نعمت سے محروم ہی رکھا جائے۔

آیت 24، 25: ﴿وَجُوهٌ يَوْمَئِذٍ بِأَسْرَةٍ.....: ”بِأَسْرَةٍ“ ”بَسْرٌ يَبْسُرُ بَسُورًا“ (ن) تیوری چڑھانا، منہ بگاڑنا۔ ”فَاقِرَةٌ“ وہ سختی جو کھڑے ہوئے۔ یہ ”فَقْرَاتُ الظَّهْرِ“ سے نکلا ہے جس کے معنی ”پیٹھ کے مہرے“ ہیں۔ کہا جاتا ہے: ”فَقَرْتُ الرَّجُلَ“ ”میں نے اس آدمی کی پیٹھ کے مہرے توڑ دیے۔“

آیت 26، 30: ﴿كَلَّا إِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ.....: ”بَلَغَتْ“ کا فاعل ”نَفْسٌ“ ہے جو محذوف ہے، یعنی جان ہنسلوں تک پہنچ جائے گی۔ ”التَّرَاقِي“ ”تَرْمُوهُ“ کی جمع ہے، سینے کی اوپر والی ہڈی جو گلے کے ساتھ ہے، ہنسل۔ ”رَاقٍ“ ”رَفِي بَرَقِي“ (ض) سے اسم فاعل ہے، دم کرنے والا۔ ”ظَنَّ“ کا معنی گمان کرنا ہے، اگر اس کے بعد ”أَنَّ“ ہو تو یقین کے معنی میں بھی آتا ہے۔ ”السَّاقِي“ ”سَاقٍ يَسُوقِي سَوْفًا“ (ن) سے مصدر میسی ہے، ہانکنا، چلانا۔

﴿كَلَّا﴾ ”نہیں نہیں، یعنی تمہارا جلدی حاصل ہونے والی دنیا سے محبت کرنا اور آخرت کو چھوڑ دینا ہرگز درست نہیں،

فَلَا صَدَقَ وَلَا صَلَّى ۝ وَلَٰكِن كَذَّبَ وَتَوَلَّى ۝ ثُمَّ ذَهَبَ إِلَىٰ أَهْلِهِ يَتَمَطَّى ۝ أَوْلَىٰ لَكَ فَأَوْلَىٰ ۝ ثُمَّ أَوْلَىٰ لَكَ فَأَوْلَىٰ ۝

سو نہ اس نے سچ مانا اور نہ نماز ادا کی ۱۱ اور لیکن اس نے جھٹلایا اور منہ پھیرا ۱۲ پھر اڑتا ہوا اپنے گھر والوں کی طرف چلا ۱۳ یہی تیرے لائق ہے، پھر یہی لائق ہے ۱۴ پھر تیرے لائق یہی ہے، پھر یہی لائق ہے ۱۵

تمہارے سامنے کتنے لوگ دنیا سے رخصت ہوئے، ان کا آخری وقت یاد کرو جب جان پیروں سے اور تمام جسم سے نکل کر ہنسیوں تک پہنچ جاتی ہے اور حکیموں ڈاکٹروں سے مایوس ہو کر کسی دم کرنے والے کی تلاش شروع ہوتی ہے کہ شاید دم ہی سے اچھا ہو جائے۔ ادھر بیمار کو زندگی سے ناامیدی ہو گئی اور مرنے کا گمان قوی ہو گیا۔ بچے دنیا داروں کو جان بہت پیاری ہوتی ہے، وہ مرنا نہیں چاہتے، آخری وقت تک ان کو زندگی کی توقع رہتی ہے، اس لیے یقین کی جگہ گمان کا لفظ فرمایا، لیکن آخر یہ گمان یوں یقین کے درجے کو پہنچ گیا کہ پاؤں کا دم نکل گیا۔ پنڈلیاں سوکھ کر ایک دوسرے سے لپٹ گئیں، یہاں تک کہ ناگوں کو کوئی دوسرا آدمی سیدھا نہ کرے تو کئی ہوئی رہ جائیں، آخر سارے جسم میں سے کھنچ کر جو جان حلق میں آ گئی تھی اس نے بھی جسم کو چھوڑ دیا اور پھر اس کی روانگی اس رب تعالیٰ کی طرف ہو گئی جس نے پہلے جسم میں وہ جان ڈالی تھی۔ (خلاصہ احسن التفسیر)

آیت 31، 35: ۱. فَلَا صَدَقَ وَلَا صَلَّى : "يَتَمَطَّى" "م ط و" سے "تَمَطَّى" کا مضارع ہے۔ "مَطًا" کا معنی پیٹھ ہے، یعنی اڑتا ہوا۔ "أَوْلَىٰ" "ول ی" سے اسم تفضیل ہے، زیادہ لائق، زیادہ حق دار، زیادہ قریب۔

۲. "فَلَا صَدَقَ" (سو نہ اس نے سچ مانا) میں ضمیر "الإنسان" کی طرف جارہی ہے جس کا اوپر "أَيَحْسَبُ الْإِنْسَانُ أَلَّنْ نَجْمَعُ عِظَامَهُ" میں ذکر ہے۔ یعنی یہ دیکھنے کے بعد کہ موت کے وقت انسان پر کیا گزرتی ہے اور کس طرح بے بس ہو کر اسے اپنے رب کی طرف روانہ ہونا پڑتا ہے، حق تو یہ تھا کہ وہ آخرت کو سچ مانتا اور اس دن کی نجات کے لیے نماز ادا کرتا اور اللہ کی زمین پر عجز و بندگی اختیار کرتا، مگر اس نے نہ عقیدہ کی اصلاح کی اور نہ عمل کی اور نہ لوگوں کے ساتھ اپنی روش درست کی، بلکہ آخرت کو اور پیدا کرنے والے کو جھٹلایا اور ماننے کے بجائے منہ پھیر کر چلا گیا اور عجز و بندگی اختیار کرنے کے بجائے گھر کو گیا تو اڑتا ہوا گیا۔

۳. أَوْلَىٰ لَكَ فَأَوْلَىٰ: اس آیت کی سب سے بہتر تفسیر وہ ہے جو حافظ ابن کثیر نے فرمائی ہے کہ اس کافر کو جس نے اپنے خالق سے کفر کیا اور مستکبرانہ چال چلا، اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے طنز اور دھمکی کے طور پر کہا جا رہا ہے کہ جب تو نے جھٹلا دیا اور اپنے خالق سے کفر کی جرأت کر چکا تو تیرا حق بنتا ہے کہ یہ چال چلے اور یہی چال تیرے لائق ہے۔ ہم تمہاری چال دیکھ رہے ہیں اور تمہیں اس کا تہویل جائے گا، جیسا کہ فرمایا: ﴿كُلُّوْا وَتَسْتَعُوْا قَلِيْلًا اِنَّكُمْ فُجْرَمُوْنَ﴾ [المرسلات: ۴۶] "کھاؤ اور فائدہ اٹھاؤ، تمہارا، یقیناً تم مجرم ہو۔" اور فرمایا: ﴿فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ مِنْ دُوْنِهٖ﴾ [الزمر: ۱۵] "اس اللہ کے علاوہ جس کی چاہو عبادت کرتے رہو۔" اور فرمایا: ﴿اِعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ﴾ [المومن: ۴۰] "تم جو چاہو کرو۔" "أَوْلَىٰ لَكَ فَأَوْلَىٰ ۝ ثُمَّ أَوْلَىٰ لَكَ فَأَوْلَىٰ ۝"

أَيْحَسْبُ الْإِنْسَانُ أَنْ يُتْرَكَ سُذَى ۝ أَلَمْ يَكْ نُظْفَةً مِنْ مَنِي يُونَى ۝ ثُمَّ كَانَ
عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوَّى ۝ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنثَى ۝ أَلَيْسَ ذَلِكَ
بِقَدْرِ عَلَى أَنْ يُحْيِيَ الْمَوْتَى ۝

کیا انسان گمان کرتا ہے کہ اسے بغیر پوچھے ہی چھوڑ دیا جائے گا؟ ۱۳۱ کیا وہ منی کا ایک قطرہ نہیں تھا جو گرایا جاتا ہے ۱۳۲ پھر وہ جما ہوا خون بنا، پھر اس نے پیدا کیا، پس درست بنا دیا ۱۳۳ پھر اس نے اس سے دو قسمیں نر اور مادہ بنائیں ۱۳۴ کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ مردوں کو زندہ کر دے؟ ۱۳۵

میں نکر امر مزید وعید کے لیے ہے۔ یہ معنی اس لیے بھی بہتر ہے کہ ”اُولٰٓئِی“ کا معنی ”زیادہ لائق، زیادہ حق دار“ معروف ہے۔
④ بہت سے مفسرین نے ”اُولٰٓئِی لَکَ“ کا معنی ”خرابی ہے تیرے لیے، افسوس ہے تیرے لیے، ہلاکت ہے تیرے لیے“ کیا ہے، کیونکہ ”اُولٰٓئِی لَکَ“ کلام عرب میں ”وَلِیْلَ لَکَ“ کے معنی میں بھی آتا ہے۔ مگر یہ معنی ”اُولٰٓئِی لَکَ“ کا لفظی معنی نہیں ہے، لفظی معنی ”زیادہ لائق، زیادہ حق دار“ ہی ہے، کیونکہ ”اُولٰٓئِی“ کے حروف اصلی ”ول ی“ ہیں، ”وی ل“ نہیں، بلکہ یہ معنی مراد ہے اور اس کی توجیہ یہ ہے کہ موقع محل کے مطابق ”اُولٰٓئِی لَکَ“ کا مبتدا ”اَلْهٰلَکُ“ یا ”النَّارُ“ محذوف مانا جائے، یعنی ہلاکت ہی تیرے زیادہ لائق ہے، یا آگ ہی تیرے زیادہ لائق ہے۔

آیت 36 تا 40 ① أَيْحَسْبُ الْإِنْسَانُ أَنْ يُتْرَكَ سُذَى : ”سُدَى“ وہ اونٹ جو کھلے چھوڑ دیے جائیں، انھیں ”اِبِلٌ سُذَى“ کہتے ہیں، یعنی کھلا چھوڑا ہوا، جس سے کوئی باز پرس نہ ہو۔ ”یُونَى“ ”أَمْنَى یُونَى“ (افعال) سے مضارع مجہول ہے، گرایا جاتا ہے، پٹکایا جاتا ہے۔

② حشر و نشر کے منکر اس بات کو ناممکن قرار دیتے تھے کہ بوسیدہ ہڈیاں دوبارہ زندہ ہوں گی اور ان کا محاسبہ ہوگا۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو دوبارہ زندہ کر کے اس سے حساب لینے کی دلیل بیان فرمائی ہے کہ کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ اسے پوچھے بغیر ہی رہنے دیا جائے گا؟ نہیں، یہ غلط سوچ ہے، جس قادر مطلق نے پانی جیسی پتلی چیز کی ایک بوند کو رحم مادر میں جھے ہوئے خون میں بدلنے کے بعد گوشت، ہڈیاں اور تمام اعضا مکمل کر کے روح پھونک کر مرد یا عورت کی صورت والا زندہ انسان بنا دیا، تو اس کے لیے اسی کی منی کو دوبارہ اصل شکل میں لے آنا کیا مشکل ہے؟

اس کے علاوہ اگر انسان اپنی اصل پر غور کرے کہ وہ ایک حقیر قطرہ تھا جو باپ کے ان اعضا سے ماں کے ان اعضا میں گرایا گیا جن کا نام بھی شرم و حیا کی وجہ سے نہیں لیا جاتا، پھر وہاں مختلف مراحل سے گزار کر اس کی مکمل صورت گری کے بعد اسے اسی راستے سے واپس لایا گیا جس کا ذکر ہی موجب حیا ہے۔ اب کیا انسان کو یہ زیب دیتا ہے کہ اپنے پیدا کرنے والے کے سامنے سرکشی کرے اور اکڑ کر چلے اور یہ سمجھے کہ اسے کوئی پوچھنے والا ہی نہیں؟

هَلْ آتَى عَلَى الْإِنْسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّا كُوِّنًا ①

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

کیا انسان پر زمانے میں سے کوئی ایسا وقت گزرا ہے کہ وہ کوئی ایسی چیز نہیں تھا جس کا (کہیں) ذکر ہوا ہو؟ ①

اس سورت کو ”سُورَةُ الْإِنْسَانِ“ اور ”سُورَةُ هَلْ آتَى“ بھی کہا جاتا ہے۔ (قاسمی) ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

«كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرَأُ فِي الْجُمُعَةِ فِي صَلَاةِ الْفَجْرِ: ﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي تَنْزِيلُ﴾ [السجدة: ۲۰۱] وَ ﴿هَلْ آتَى عَلَى الْإِنْسَانِ﴾ [الإنسان: ۱۰]» [بخاری، الجمعة، باب ما يقرأ في صلاة الفجر يوم الجمعة: ۸۹۱] [رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن فجر کی نماز میں سورہ سجدہ اور سورہ دہر کی تلاوت کیا کرتے تھے۔]

آیت 1 ① هَلْ آتَى عَلَى الْإِنْسَانِ: ”هَلْ“ (کیا) پوچھنے کے لیے آتا ہے۔ یہ پوچھنا کبھی تو کوئی خبر معلوم کرنے کے لیے ہوتا ہے، جیسے ”هَلْ فِي الدَّارِ زَيْدٌ“ ”کیا گھر میں زید ہے؟“ اللہ تعالیٰ کو اس کی ضرورت ہی نہیں۔ کبھی یہ سوال کسی بات کی نفی کے لیے ہوتا ہے، جیسے: ”وَ هَلْ يَسْتَطِيعُ ذَلِكَ أَحَدٌ“ ”بھلا یہ کام کوئی کر سکتا ہے؟“ یعنی کوئی نہیں کر سکتا۔ عربی میں اسے نفی کے علاوہ حمد بھی کہتے ہیں۔ بعض اوقات یہ پوچھنا بات منوانے کے لیے ہوتا ہے، اسے عربی میں تقریر کہتے ہیں، جیسے آپ نے کسی کو کچھ دیا ہو یا اس کی عزت کی ہو تو اسے کہیں ”هَلْ أُعْطِيتُكَ“ ”کیا میں نے تمہیں دیا؟“ اور ”هَلْ أَكْرَمْتُكَ“ ”کیا میں نے تمہاری عزت کی؟“ اس وقت یہ ”هَلْ“ بمعنی ”قَدْ“ ہوتا ہے، یعنی یقیناً میں نے تمہیں دیا اور یقیناً میں نے تمہاری عزت کی۔ اس آیت میں ”هَلْ“ اسی آخری معنی کے لیے آیا ہے۔ بہت سے مفسرین نے اس کا ترجمہ ”یقیناً“ یا ”تحقیق“ کیا ہے، لیکن ”هَلْ“ کا معنی اپنی اصل پر (کیا) ہو تب بھی مراد یہی ہے کہ یقیناً اس پر ایسا وقت گزرا ہے۔

② بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ انہیں مرنے کے بعد دوبارہ زندہ نہیں کیا جائے گا، ان کے خیال میں یہ ممکن ہی نہیں کہ انسان کے خاک ہو جانے کے بعد اسے دوبارہ پیدا کیا جاسکے۔ یہاں ایسے لوگوں کو قائل کرنے کے لیے سوال ہے کہ کیا انسان پر زمانے میں سے کوئی ایسا وقت گزرا ہے جب وہ کوئی ایسی چیز ہی نہ تھا جس کا ذکر ہوتا ہو؟ صاف ظاہر ہے کہ ان کا جواب یہ ہوگا کہ یقیناً انسان پر ایسا وقت گزرا ہے۔ تو جب اللہ تعالیٰ نے اسے اس وقت بنا لیا جب یہ کچھ بھی نہ تھا بلکہ کہیں اس کا ذکر بھی نہ تھا تو پیدا کرنے کے بعد دوبارہ وہ کیوں نہیں بنا سکتا؟ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَيَقُولُ الْإِنْسَانُ إِذَا مَا مِثٌ لَسَوْفَ أَخْرِجُ حَيًّا ۝ أَوْلَا يَذْكُرُ الْإِنْسَانُ أَنَا خَلَقْتُهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا﴾ [مریم: ۶۶، ۶۷] ”اور انسان کہتا ہے کہ جب میں مر جاؤں گا تو کیا مجھے زندہ کر کے (قبر سے) نکالا جائے گا؟ کیا اسے یاد نہیں کہ ہم نے اس سے پہلے اسے پیدا کیا جب وہ کوئی چیز ہی نہ تھا۔“

إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ نُطْفَةٍ أَمْشَاجٍ ۖ نَبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَبِيحًا بَصِيرًا ﴿۱﴾ إِنَّا هَدَيْنَاهُ
السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا ﴿۲﴾

بلاشبہ ہم نے انسان کو ایک طے جلے قطرے سے پیدا کیا، ہم اسے آزما تے ہیں، سو ہم نے اسے خوب سننے والا،
خوب دیکھنے والا بنا دیا ﴿۱﴾ بلاشبہ ہم نے اسے راستہ دکھا دیا، خواہ وہ شکر کرنے والا بنے اور خواہ ناشکرا ﴿۲﴾

﴿۱﴾ ”الإنسان“ سے مراد یہاں صرف آدم علیہ السلام نہیں بلکہ نسل انسانی ہے، کیونکہ آئندہ آیت میں انسان کے نطفہ سے پیدا
ہونے کا ذکر ہے۔

آیت 2 ﴿۱﴾ إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ نُطْفَةٍ أَمْشَاجٍ: یعنی انسان کی پیدائش صرف مرد یا صرف عورت کے نطفہ سے نہیں
ہوئی بلکہ دونوں کے طے جلے نطفہ سے ہوئی ہے، کیونکہ دونوں کے ملنے ہی سے حمل منعقد ہوتا ہے۔ ام سلیم رضی اللہ عنہا سے روایت
ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّ مَاءَ الرَّجُلِ غَلِيظٌ أبيضٌ وَمَاءَ الْمَرْأَةِ رَفِيقٌ أَصْفَرٌ فَمِنْ أُبَيْهِمَا عَلَا أَوْ سَبَقَ
يَكُونُ مِنْهُ الشَّبَهُ» [مسلم، الحوض، باب وجوب الغسل على المرأة.....: ۱۳۱۱] ”مرد کا پانی سفید گاڑھا اور عورت کا پانی
پتلا زرد ہوتا ہے، ان میں سے جو غالب آجائے یا سبقت کر جائے اسی سے مشابہت ہوتی ہے۔“

﴿۲﴾ نَبْتَلِيهِ: ہم اسے آزما تے ہیں، یعنی انسان کو پیدا کرنے کا مقصد اس کی آزمائش ہے کہ اچھے عمل کرتا ہے یا برے، جیسے
فرمایا: ﴿لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا﴾ [الملك: ۲] ”(اللہ تعالیٰ نے موت و حیات کو اس لیے پیدا فرمایا) تاکہ تمہاری
آزمائش کرے کہ تم میں سے کون عمل میں بہتر ہے۔“

﴿۳﴾ فَجَعَلْنَاهُ سَبِيحًا بَصِيرًا: ”ہم نے اسے سننے والا، دیکھنے والا بنایا“ اگرچہ جانور بھی سنتے اور دیکھتے ہیں مگر انھیں ”سبح و
بصیر“ نہیں کہا جاتا، کیونکہ وہ عقل کی نعمت سے محروم ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو سننے اور دیکھنے کی ایسی قوتیں دی ہیں جن سے
وہ اچھے برے میں تمیز کر سکتا ہے اور بہت دور تک سوچ سکتا ہے۔ گویا دوسرے جانور اس کے مقابل بہرے اور اندھے ہیں۔

آیت 3 ﴿۱﴾ إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ: یعنی ہم نے انسان کی آزمائش کرتے ہوئے اسے صرف سع و بصیر اور عقل کی نعمت عطا
کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اسے صحیح اور غلط راستہ بتانے کا اہتمام بھی کیا ہے۔ نیکی و بدی کی یہ تمیز اس کی فطرت میں بھی
رکھی ہے، جس کی وجہ سے اچھے کام اس کے لیے معروف (جانے پہچانے) اور برے کام منکر (نہ پہچانے ہوئے) ہیں اور
انبیاء علیہم السلام کے ذریعے سے بھی اسے نیکی و بدی کا راستہ بتایا ہے۔

﴿۲﴾ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا: سع و بصیر، عقل و فہم، فطرت انسانی اور انبیاء علیہم السلام کے ذریعے سے ملنے والی آسمانی رہنمائی کے
بعد انسان کے لیے صحیح راستہ بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ اب اس کی مرضی ہے کہ اس راستے پر چل کر اس کی نعمتوں کا شکر ادا
کرنے والا بن جائے، یا وہ سیدھا راستہ ترک کر کے اس کی نعمتوں کی ناشکری اور کفر کرنے والا بن جائے۔

إِنَّمَا أَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ سَلْسِلًا وَأَغْلَالًا وَسَعِيرًا ۝ إِنَّ الْأَبْرَارَ يَشْرَبُونَ مِنْ كَأْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُورًا ۝ عَيْنًا يَشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللَّهِ يُفَجِّرُونَهَا تَفْجِيرًا ①

یقیناً ہم نے کافروں کے لیے زنجیریں اور طوق اور بھڑکتی ہوئی آگ تیار کی ہے ⑤ بلاشبہ نیک لوگ ایسے جام سے پئیں گے جس میں کافور ملا ہوا ہوگا ⑥ وہ ایک چشمہ ہے جس سے اللہ کے بندے پئیں گے، وہ اسے بہا کر لے جائیں گے، خوب بہا کر لے جانا ①

آیت 4: "سَلْسِلًا" "سَلْسِلَةٌ" کی جمع ہے، زنجیریں۔ "أَغْلَالًا" "عُلٌّ" کی جمع ہے، طوق۔ انسان کی پیدائش کی ابتدا اور راہ حق کی طرف اس کی رہنمائی ذکر کرنے کے بعد ہدایت قبول کرنے سے انکار کرنے والوں کا اور نیک لوگوں کا انجام ذکر فرمایا کہ ہم نے کفار کے لیے زنجیریں، طوق اور بھڑکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے۔ کفار کے لیے اغلال اور سلاسل کا ذکر سورہ حاقہ (۳۰ تا ۳۳) اور سورہ مومن (۶۹ تا ۷۲) میں دیکھیے۔

آیت 5: ① "إِنَّ الْأَبْرَارَ يَشْرَبُونَ مِنْ كَأْسٍ.....": "الْأَبْرَارَ" "بَارٌّ" یا "بِرٌّ" کی جمع ہے، نیکی کرنے والے۔ "كَأْسٍ" وہ برتن جس سے پیا جائے۔ عام طور پر "كَأْسٌ" کا لفظ اس برتن پر بولتے ہیں جس میں شراب موجود ہو۔ "مِزَاجٌ" آمیزش، طوبی، وہ چیز جو لذت یا خوشبو میں اضافے کے لیے مشروب میں ملائی جائے۔ "كَافُورًا" ایک خوشبودار پودا، اس پودے سے نکلنے اور حاصل ہونے والی خوشبو جو تاثیر میں نہایت ٹھنڈی ہوتی ہے۔

② کفار کے لیے بھڑکتی ہوئی آگ کا ذکر کرنے کے بعد نیک لوگوں کے متعلق فرمایا کہ وہ شراب کے ایسے جام پئیں گے جن میں کافور کی آمیزش ہوگی، یعنی بھڑکتی ہوئی آگ کے بجائے انھیں ایسی شراب ملے گی جس میں ٹھنڈی تاثیر اور خوشبودار کافور کی آمیزش ہوگی۔ واضح رہے کہ دنیا کے کافور اور جنت کے کافور میں صرف نام کی مشابہت ہے، جیسا کہ دنیا کی شراب اور جنت کی شراب میں صرف نام کی مشابہت ہے کہ جنت کی شراب میں سرور و نشاط وغیرہ کی وہ خوبیاں تو ہوں گی جو دنیا کی شراب میں ہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ ہوں گی، مگر وہ دنیا کی شراب کی خرابیوں مثلاً بد بو، زوالِ عقل، شمار اور اعضا شکنی وغیرہ سے پاک ہوگی۔ اسی طرح جنت کے کافور میں وہ ٹھنڈک، لطافت اور خوشبو تو ہوگی جو دنیا کے کافور میں ہے بلکہ اس سے بڑھ کر ہوگی، مگر وہ دنیوی کافور کی خرابیوں مثلاً اس کی زہریلی تاثیر اور بو میں ایک ناگوار سے احساس سے پاک ہوگا۔ "مِزَاجٌ" کا مطلب یہ ہے کہ ابرار کو ملنے والی شراب میں خوشبو اور لذت کے اضافے کے لیے کافور کے چشمے سے آمیزش کی جائے گی، جس سے اس کی تیزی اور حرارت اعتدال پر آجائے گی۔

آیت 6: "عَيْنًا يَشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللَّهِ.....": "عِبَادُ اللَّهِ" اگرچہ سب لوگ ہی اللہ کے بندے ہیں مگر یہاں مراد اللہ کے خاص بندے ہیں، جیسا کہ "عِبَادُ الرَّحْمَنِ" (رحمان کے بندے)، "نَاقَةُ اللَّهِ" (اللہ کی اونٹنی) اور "بَيْتُ اللَّهِ" (اللہ کا گھر)

يُؤْفُونَ بِالذَّنْرِ وَ يَخَافُونَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهُ مُسْتَطِيرًا ﴿٧﴾ وَ يُطْعَمُونَ الطَّعَامَ عَلَى حُبِّهِ

جو اپنی نذر پوری کرتے ہیں اور اس دن سے ڈرتے ہیں جس کی مصیبت بہت زیادہ پھیلی ہوئی ہوگی ﴿۷﴾ اور وہ کھانا میں خصوصیت پیدا ہوگئی ہے۔ یعنی اللہ کے یہ خاص بندے ابرار کا فور کی آمیزش والا شراب کا جو جام ہمیں گے وہ ایک جام ہی نہیں ہوگا بلکہ کا فور کی آمیزش والا ایک چشمہ ہوگا جس سے مومن جہاں چاہے گا شاخ نکال کر لے جائے گا۔

بعض مفسرین نے ”الْأَكْبَارُ“ اور ”عِبَادُ اللَّهِ“ کو الگ الگ قرار دے کر یہ معنی کیا ہے کہ ابرار یعنی نیک لوگوں کو پلائے جانے والے شراب کے جام میں کا فور نامی چشمے میں سے کچھ ملاوٹ ہوگی، جس طرح کسی کے شربت میں کوئی خوشبودار شربت مثلاً روح افزا ملا دیا جائے، جب کہ ”عباد اللہ“ یعنی اللہ کے مقرب بندوں کو کا فور کے چشمے کی صرف آمیزش ہی نہیں بلکہ اس کا خالص پانی بقتا وہ چاہیں گے ملے گا۔ مجھے پہلا معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ (واللہ اعلم)

آیت 7 : ”يُؤْفُونَ بِالذَّنْرِ“ ... : ”الذَّنْرُ“ اپنے آپ پر وہ چیز واجب کر لینا جو واجب نہیں ہے۔ ”مُسْتَطِيرًا“ ”طَارَ يَطِيرُ“ اڑنا اور ”اسْتَطَارَ يَسْتَطِيرُ“ باب استفعال میں الفاظ زیادہ ہونے کی وجہ سے معنی میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے، یعنی بہت زیادہ اڑنے والا، مراد ہے بہت زیادہ پھیلنے والا، جیسے آگ یا صبح کی روشنی خوب پھیل جائے تو کہا جاتا ہے: ”اسْتَطَارَ الْخَبْرِيُّ“ یا ”اسْتَطَارَ الْفَخْرُ“ کہ آگ بہت زیادہ پھیل گئی ہے، یا صبح کی روشنی خوب پھیل گئی ہے۔

اس آیت میں اور اس کے بعد کی تین آیات میں اللہ تعالیٰ کے ان خاص بندوں کی چند صفات بیان کی گئی ہیں، ایک صفت یہ ہے کہ وہ اپنی نذر پوری کرتے ہیں، یعنی جو کام ان پر واجب نہیں جب اللہ کی رضا کے لیے اپنے آپ پر واجب کر لیتے ہیں تو انہیں پورا کرتے ہیں، پھر جو کام اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہلے ہی واجب ہیں ان پر کتنے اہتمام سے عمل کرتے ہوں گے۔ نذر کے مسائل کے لیے دیکھیے سورہ بقرہ (۲۷۰) اور سورہ حج (۲۹) کی تفسیر۔ ان لوگوں کے نذر پوری کرنے کا باعث یہ ہے کہ وہ قیامت کے دن سے ڈرتے ہیں جس کی مصیبت ہر طرف پھیلی ہوئی ہوگی۔ اس سے ان صوفیوں کا رد ہوتا ہے جو کہتے ہیں کہ جنت کے طمع یا جہنم کی خوف سے عبادت نہیں کرنی چاہیے۔

آیت 8 : ﴿١﴾ وَ يُطْعَمُونَ الطَّعَامَ عَلَى حُبِّهِ : اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں اور دونوں ہی درست ہیں، ایک یہ کہ خود کھانے کی خواہش و ضرورت کے باوجود وہ دوسرے مستحقین کو کھلا دیتے ہیں، دوسرا یہ کہ اللہ کی محبت کی وجہ سے ان لوگوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔ یہاں پہلا معنی زیادہ موزوں ہے، کیونکہ دوسرا معنی تو اگلی آیت : ﴿٢﴾ إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ ﴿٢﴾ (ہم تو تمہیں صرف اللہ کی رضا کے لیے کھلاتے ہیں) میں آ ہی رہا ہے، لہذا تکرار سے بہتر ہے کہ الگ الگ مفہوم مراد لیا جائے۔ مزید دیکھیے سورہ حشر کی آیت (۹) : ﴿٩﴾ وَيُؤْتُونَ عَلَى أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ﴿٩﴾ کی تفسیر۔

﴿٢﴾ مسکین، یتیم اور اسیر کو کھانا کھلانا ان اہم ترین مواقع میں سے ہے جہاں صدقہ کرنے کا حق ہے، کیونکہ مسکین وہ ہے جس کی کمائی سے اس کی ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں، یتیم اس سے بھی عاجز ہے، کیونکہ اس کا کمانے والا فوت ہو چکا ہے اور وہ کم عمر

بِسْكِينًا وَ يَتِيمًا وَ اَيْسِرًا ①

کھلاتے ہیں اس کی محبت پر مسکین اور یتیم اور قیدی کو ①

ہونے کی وجہ سے کئی نہیں کر سکتا اور قیدی ان دونوں سے زیادہ عاجز ہے، کیونکہ اسے کسی چیز کا اختیار ہی نہیں، وہ کلیتاً دوسروں کے رحم و کرم پر ہے۔

③ زمانہ جاہلیت میں اسیروں سے بہت برا سلوک کیا جاتا تھا، انھیں بیڑیاں لگا کر ہر روز باہر نکالا جاتا تاکہ وہ گدائی کے ذریعے سے اپنی ضرورت کی چیزیں لوگوں سے حاصل کریں۔ اللہ تعالیٰ نے اسیروں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا اور ”ابرار“ کی صفت بیان فرمائی کہ وہ خود ضرورت مند ہونے کے باوجود مسکین، یتیم اور اسیر کو کھانا کھلاتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے بدر کے قیدیوں کے متعلق صحابہ کو تاکید فرمائی کہ ان کا اکرام کریں۔ چنانچہ وہ کھانے کے وقت انھیں اپنے آپ پر مقدم رکھتے۔ (ابن کثیر) رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں مسلمانوں کے ہاں اسیر کافر لوگ ہی تھے جو جنگوں میں گرفتار ہو کر آتے تھے، آپ کے زمانے میں مسلمان اسیر نہیں رکھے جاتے تھے، مگر آیت کے الفاظ عام ہیں، اس لیے کوئی مشرک اسیر ہو یا کسی جرم یا مطالبے میں گرفتار مسلم اسیر، سب سے حسن سلوک لازم ہے، بلکہ مسلمان اسیروں سے احسان بالاولیٰ لازم ہے۔ اس کے علاوہ غلام بھی اسیر میں شامل ہے، رسول اللہ ﷺ نے آخری وصیت میں فرمایا: «الْصَّلَاةُ وَ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ» [ابن ماجہ، ابوصابیہ، اب ہل اوصی رسول اللہ ﷺ: ۲۶۹۸۔ أبو داؤد: ۵۱۵۶، وقال الألبانی صحیح] ”نماز اور اپنے غلاموں کا خیال رکھنا۔“

④ اس آیت کی شان نزول میں علی و فاطمہ رضی اللہ عنہما اور ان کی لونڈی فہمہ کے حسین و جمیل کی صحت کے لیے تین روزوں کی نذر ماننے اور افطار کے وقت قرض لائے ہوئے جو سے تیار کردہ پانچ روٹیاں سب کی سب ایک دن مسکین، دوسرے دن یتیم اور تیسرے دن اسیر کو دے دینے کی جو روایت بیان کی جاتی ہے وہ بالکل من گھڑت اور موضوع ہے۔ ابن جوزی نے اسے ”الموضوعات“ میں ذکر کیا ہے اور قرطبی نے تفصیل سے اس پر جرح کی ہے۔ اہل بیت نبوت کے فضائل کا ثبوت اس قسم کی موضوع روایات کا محتاج نہیں اور نہ ہی یہ کوئی نیکی ہے کہ مسکین کو ایک کے بجائے پانچوں روٹیاں دے دی جائیں اور تین دن رات بچوں کو بھوکا رکھا جائے۔

⑤ اس آیت سے معلوم ہوا کہ یتیموں، مسکینوں اور اسیروں کو، خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم، کھانا کھلانے سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ ہاں، فرض زکوٰۃ صرف مسلمانوں پر خرچ ہوگی، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِيَابِهِمْ فَتُرَدُّ عَلٰی فُقَرَائِهِمْ» [بخاری، الزکاة، باب اخذ الصدقة من الاغنياء... : ۱۹۹۶] ”(فرض صدقہ) مسلمانوں کے اغنیاء سے لیا جائے گا اور ان کے فقراء پر خرچ کیا جائے گا۔“

إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكْرًا ① إِنْ خِفْنَا مِنْ رَبِّنَا يَوْمًا عَبُوسًا قَتَطِرِيًّا ② فَوَقَّهْمُ اللَّهُ شَرَّ ذَلِكَ الْيَوْمِ وَلَقَّهْمُ نَصْرَةً وَ سُرُورًا ③

(اور کہتے ہیں) ہم تو صرف اللہ کے چہرے کی خاطر تمہیں کھلاتے ہیں، نہ تم سے کوئی بدلہ چاہتے ہیں اور نہ شکر یہ (اور) یقیناً ہم اپنے رب سے اس دن سے ڈرتے ہیں جو بہت منہ بنانے والا، سخت تیوری چڑھانے والا ہوگا ② پس اللہ نے انہیں اس دن کی مصیبت سے بچالیا اور انہیں انوکھی تازگی اور خوشی عطا فرمائی ③

آیت 9 إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ : "شُكْرًا" مصدر ہے، بروزن "ذُخُولًا" اور "حُرُوجًا" یعنی وہ کھانا کھلاتے ہوئے یہ بات دل میں کہتے ہیں یا زبان سے انہیں اطمینان دلانے کے لیے کہتے ہیں کہ ہم تمہیں صرف اللہ کی رضا کے لیے کھانا کھلا رہے ہیں، تم سے نہ یہ خواہش ہے کہ تم اس کا بدلہ دو اور ہمارے کسی کام آؤ، نہ یہ کہ ہمارا شکر یہ ادا کرو اور لوگوں کے سامنے ہماری سخاوت کا ذکر کرو، تاکہ وہ اپنے آپ پر احسان کا بوجھ محسوس نہ کریں۔

آیت 10 ① إِنْ خِفْنَا مِنْ رَبِّنَا : "عَبُوسًا" تیوری چڑھانے والا، منہ بنانے والا۔ "قَتَطِرِيًّا" سخت تیوری چڑھانے والا۔ سوال یہ ہے کہ اس دن کو "عَبُوسًا" اور "قَتَطِرِيًّا" کیوں کہا گیا، جبکہ تیوری چڑھانا اور منہ بگاڑنا آدمی کا کام ہے؟ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ اس دن کی بیعت اور سختی کی منظر کشی کے لیے اسے ایک ایسے شخص کی صورت میں پیش کیا ہے جس کے منہ اور ماتھے پر غصے کی وجہ سے سخت تیوری چڑھی ہوئی ہو۔ دوسرا یہ کہ جس طرح "نہارۃ صائتہ" (اس کا دن روزہ دار ہے) اور "لَيْلۃ قَابِئہ" (اس کی رات قیام کرنے والی ہے) میں صیام و قیام کی نسبت دن اور رات کی طرف کردی ہے، حالانکہ روزہ رکھنا اور قیام کرنا آدمی کا کام ہے، اسی طرح یہاں بھی اگرچہ دن کو تیوری چڑھانے والا کہا ہے مگر مراد یہ ہے کہ اس دن میں کافر کا چہرہ سخت تیوری والا اور بگڑا ہوا ہوگا، جیسے فرمایا: ﴿وَجُودًا يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا﴾ [نفسیہ: ۲۹] "کئی چہرے اس دن بگڑے ہوئے ہوں گے۔"

② "إِنْ خِفْنَا مِنْ رَبِّنَا يَوْمًا عَبُوسًا قَتَطِرِيًّا" (یقیناً ہم اپنے رب سے اس دن سے ڈرتے ہیں جو بہت منہ بنانے والا، سخت تیوری چڑھانے والا ہوگا) میں ان جاہل صوفیوں کا رد ہے جو قیامت یا جہنم کے خوف کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کو اخلاص کے خلاف سمجھتے ہیں۔

آیت 11 فَوَقَّهْمُ اللَّهُ شَرَّ ذَلِكَ الْيَوْمِ : اللہ تعالیٰ اخلاص اور خوف کے ساتھ مذکورہ اعمال کرنے والے اہل راہ و عباد اللہ کو اس دن کی برائی سے بچالے گا اور انہیں تازگی اور خوشی عطا فرمائے گا۔ تازگی چہرے کی اور خوشی دل کی۔ دل میں خوشی ہو تو چہرے پر تازگی آ جاتی ہے۔ (دیکھیے بحسب: ۳۹، ۲۸) ان کے برعکس کفار و فجار کے چہرے بگڑے ہوئے اور دل غم و فکر سے بھرے ہوں گے۔ دیکھیے سورہ بحسب (۳۲ تا ۴۰)۔

وَجَزَاهُمْ بِمَا صَبَرُوا جَنَّةً وَحَرِيمًا ﴿۱۲﴾ مُتَّكِنِينَ فِيهَا عَلَى الْأَرْبَابِ ۗ لَا يَرَوْنَ فِيهَا شَمْسًا
وَلَا زَهْرًا نِيرًا ﴿۱۳﴾ وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلُّهَا وَذُلَّتْ قُطُوفُهَا تَذْلِيلًا ﴿۱۴﴾

اور انھیں ان کے صبر کرنے کے عوض جنت اور ریشم کا بدلا عطا فرمایا ﴿۱۲﴾ وہ اس میں تختوں پر تکیہ لگائے ہوئے ہوں گے، نہ اس میں سخت دھوپ دیکھیں گے اور نہ سخت سردی ﴿۱۳﴾ اور اس کے سائے ان پر جھکے ہوئے ہوں گے اور اس کے خوشے تابع کر دیے جائیں گے، خوب تابع کیا جانا ﴿۱۴﴾

آیت 12 : وَجَزَاهُمْ بِمَا صَبَرُوا جَنَّةً وَحَرِيمًا: اور انھیں اللہ تعالیٰ ان کے صبر کے عوض جنت اور ریشم لباس عطا فرمائے گا۔ صبر کا مفہوم بہت وسیع ہے، اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی پر صبر، اس کی حرام کردہ چیزوں سے صبر، اس کے دین کی دعوت پر صبر، آزمائشوں اور تکلیفوں پر صبر، خود بھوکا رہ کر دوسروں کو کھلانے پر صبر، غرض مومن کی زندگی ازل تا آخر صبر ہی صبر ہے۔

آیت 13 : مُتَّكِنِينَ فِيهَا عَلَى الْأَرْبَابِ..... : ”شَمْسًا“ سے مراد سخت دھوپ اور گرمی اور ”زَهْرًا نِيرًا“ سے مراد سخت سردی ہے، یعنی جنت کا موسم نہایت خوش گوار اور معتدل ہوگا، اس میں نہ تکلیف دہ گرمی ہوگی نہ سردی۔ اس کے برعکس جہنم میں شدید گرمی یعنی آگ کا عذاب بھی ہوگا اور شدید سردی (زمہریر) کا بھی، بلکہ دنیا میں شدید گرمی اور شدید سردی کا اصل بھی جہنم ہی سے ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «وَأَشْنَكِبَ النَّارُ لِجَنَّتِهَا فَقَالَتْ يَا رَبِّ! أَكُلُ بَعْضِي بَعْضًا فَأَذِنَ لَهَا يَنْفَسِينَ، نَفْسٌ فِي السَّمَاءِ، وَنَفْسٌ فِي النَّصِيفِ، فَهِيَ أَشَدُّ مَا نَجِدُونَ مِنَ الْحَرِّ، وَأَشَدُّ مَا نَجِدُونَ مِنَ الزَّمْهَرِيرِ» [بخاری، موافقت الصلاة، باب الإبراد بالظھر فی شدۃ الحر: ۵۳۷] ”آگ نے اپنے رب کے پاس شکایت کی اور کہا: ”اے میرے رب! میرے بعض حصے بعض کو کھا گئے۔“ تو اللہ تعالیٰ نے اسے دوسانس نکالنے کی اجازت دے دی، ایک سانس گرمی میں اور ایک سردی میں۔ یہ وہی ہے جو تم سخت گرمی محسوس کرتے ہو اور جو تم سخت زمہریر (سردی) محسوس کرتے ہو۔“

آیت 14 : وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلُّهَا، : ”دَانِيَةً“ ”ذَنَا يَذْنُو“ (ن) سے اسم فاعل ہے، قریب۔ ”ذُلَّتْ“ تابع کیے جائیں گے، جھکا دیے جائیں گے۔ ”تَذْلِيلًا“ تاکید ہے، خوب جھکانا۔ ”قُطُوفُ“ ”قُطُفُ“ کی جمع ہے، خوش، چٹا ہوا پھل، یعنی جنت کے درختوں کے سائے نہایت گھنے اور جھکے ہوئے ہوں گے اور اس کے پھلوں کے خوشے جنتیوں کے تابع اور ان کی دسترس میں ہوں گے جو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے جس طرح چاہیں گے توڑ سکیں گے۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّ فِي الْحَنَةِ لَشَجَرَةً يُسَبِّرُ الرَّأْسُ فِي ظِلِّهَا مِائَةَ عَامٍ لَا يَقْطَعُهَا» [بخاری، بد، الخلق، باب ما حارفی صفة الحنة : ۳۲۵۱] ”جنت میں ایک درخت ہے جس کے سائے میں سوار سو برس تک چلتا رہے گا مگر اسے طے نہیں کر سکے گا۔“

وَيُطَافُ عَلَيْهِمْ بِأَنْبِيَاءٍ مِّنْ فَضَّةٍ وَأَنْكُوبٍ كَانَتْ قَوَارِيرًا ۝۱۵ قَوَارِيرًا مِّنْ فَضَّةٍ قَدَرُوهَا تَقْدِيرًا ۝۱۶ وَيُنْقُونَ فِيهَا كَأْسًا كَانَ فِزَاجُهَا زَنْجَبِيلًا ۝۱۷ عَيْنًا فِيهَا تُسْمَىٰ سَلْسَبِيلًا ۝۱۸

اور ان پر چاندی کے برتن اور آنخورے پھرائے جائیں گے، جو شیشے کے ہوں گے ۝۱۵ ایسا شیشہ جو چاندی سے بنا ہوگا، انھوں نے ان کا اندازہ رکھا ہے، خوب اندازہ رکھنا ۝۱۶ اور اس میں انھیں ایسا جام پلایا جائے گا جس میں سوٹھلی ہوگی ۝۱۷ وہ اس میں ایک چشمہ ہے جس کا نام سلسیل رکھا جاتا ہے ۝۱۸

آیت 15 16 : وَيُطَافُ عَلَيْهِمْ بِأَنْبِيَاءٍ "أَنْبِيَاءٌ" "إِنَاءٌ" کی جمع ہے، بروزن "أَفْعَلَةٌ" اور "أَنْكُوبٍ" "سُكُوبٌ" کی جمع ہے، برتن جس کی نہ نوئی ہو نہ دہی، آنخورے۔ یعنی ان کی مجلس میں چاندی کے ایسے برتنوں اور آنخوروں کا دور چلے گا جو شیشے کے ہوں گے، ایسا شیشہ جو چاندی سے بنا ہوگا۔ ایسے برتنوں کا دنیا میں کہیں وجود نہیں، کیونکہ دنیا کی چاندی کو کوٹ کر پھھر کے پر کے برابر باریک بھی کر دیا جائے تب بھی وہ شیشے کی طرح شفاف نہیں ہو سکتی۔ برتنوں کی یہ قسم جنت ہی میں ہوگی جو چاندی کی طرح سفید اور شیشے کی طرح شفاف ہوگی۔ "قَدَرُوهَا تَقْدِيرًا" یعنی وہ پینے والوں کی ضرورت کے عین اندازے کے مطابق بنے ہوئے ہوں گے، نہ کم نہ زیادہ۔

آیت 17 18 : وَيُنْقُونَ فِيهَا كَأْسًا ... : "كَأْسًا" وہ پیالہ جس میں شراب ہو، خالی پیالے کو کاس نہیں کہتے۔ "فِزَاجٌ" آمیزش، بلوئی، یعنی وہ چیز جو لذت یا خوشبو میں اضافے کے لیے ملائی جائے۔ "زَنْجَبِيلًا" اورک، سوٹھ۔ "سَلْسَبِيلًا" کے تین معانی ہیں: ① آسانی سے طلق میں اتر جانے والا۔ ② تیزی سے بہنے والا۔ ③ آسانی سے تابع ہونے والا کہ جدھر لے جانا چاہیں لے جائیں۔ عرب لوگ شراب کی لذت، حرارت، تخی اور خوشبو میں اضافے کے لیے اس میں سوٹھ کی آمیزش کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جنتیوں کو جو جام شراب پلایا جائے گا اس میں زنجبیل کی آمیزش ہوگی۔ گویا جنت میں ایک وہ شراب ہوگی جو ٹھنڈی ہوگی، جس میں کافور کی آمیزش ہوگی اور ایک گرم ہوگی جس میں سوٹھ ملی ہوگی۔ واضح رہے کہ جنت کی نعمتوں کے ذکر کے وقت دنیا کی جن چیزوں کا ذکر آیا ہے ان سے بعینہ وہی چیزیں مراد نہیں بلکہ ان سے بے حد حساب اعلیٰ چیزیں مراد ہیں۔ دیکھیے سورہ سجدہ (۱۷) کی تفسیر۔ صاحب احسن التفسیر لکھتے ہیں: "اگرچہ جنت میں کھانے پینے اور برتنوں کی جتنی چیزیں ہیں ان کے نام دنیا کی چیزوں سے ملتے ہیں، لیکن جنت کی چیزوں اور دنیا کی چیزوں میں بڑا فرق ہے۔ مثلاً دنیا میں ایسا دودھ کہاں ہے جس کی ہمیشہ نہر بہتی ہو اور پھر دوسرے دن ہی وہ کھانا ہو جائے؟ وہ شہد کہاں ہے جس کی نہر بہتی ہو اور کھیلوں کی بھنگاراں میں جم جم کر نہ مرے اور ہوا سے خاک اور کوڑا کرکٹ اس پر نہ پڑے؟ اور وہ شراب کہاں ہے جس کی نہر ہو اور بدبو کے سبب سے اس نہر کے آس پاس کا راستہ پچھ دنوں میں بند نہ ہو جائے۔" (احسن التفسیر)

وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُونَ إِذَا رَأَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا تَنْثُورًا ﴿۱۹﴾ وَإِذَا رَأَيْتَ

ثُمَّ رَأَيْتَ نَعِيمًا وَمُلَكًا كَبِيرًا ﴿۲۰﴾

اور ان کے ارد گرد لڑکے گھوم رہے ہوں گے، جو ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے، جب تو انہیں دیکھے گا تو انہیں بکھرے ہوئے موتی گمان کرے گا ﴿۱۹﴾ اور جب تو وہاں دیکھے گا تو نعمت ہی نعمت اور بہت بڑی بادشاہی دیکھے گا ﴿۲۰﴾

”عَيْنًا“ ”كَلِمًا“ سے بدل ہے یا منصوب بہ نزع الخافض ہے، یعنی ”يُسْفَوْنَ كَأَسَا مِنْ عَيْنٍ“. مطلب یہ کہ انہیں وہ جامِ شراب جس میں زنجبیل کی آمیزش ہوگی، ایسے چشمے سے پلایا جائے گا جس کا نام سلسبیل ہے۔ یہ نام رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کا پانی نہایت خوش گوار، رقیق اور آسانی سے حلق سے اترنے والا ہوگا اور اس چشمے سے نکلنے والی نالیاں نہایت تیز رفتار اور اہل ایمان کے لیے نہایت تابع ہوں گی کہ وہ جدھر چاہیں گے انہیں لے جائیں گے۔

آیت ۱۹ وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُونَ : یعنی جنتیوں کی مجلس میں خدمت کے لیے ایسے لڑکے گردش کرتے رہیں گے جن میں دو وصف نمایاں ہوں گے، ایک تو یہ کہ وہ ہمیشہ بچے ہی رہیں گے، کیونکہ خدمت کے لیے بڑی عمر کے آدمی کے بجائے بچے زیادہ مستعد اور موزوں ہوتے ہیں اور انہیں خدمت کے لیے کوئی کام کہنے میں حجاب نہیں ہوتا۔ دوسرا یہ کہ وہ اتنے خوبصورت ہوں گے کہ جب تم انہیں آتے جاتے دیکھو گے تو گمان کرو گے کہ وہ بکھرے ہوئے موتی ہیں۔ ان کی خدمت کے لیے ہر طرف پھیلے ہوئے ہونے کو موتیوں کے بکھرنے سے تشبیہ دی ہے۔ یہ لڑکے کوئی الگ مخلوق ہوگی، جو اللہ تعالیٰ اہل جنت کی خدمت کے لیے پیدا فرمائے گا یا جنتیوں کے اپنے لڑکے ہوں گے؟ اگرچہ پہلی بات بھی ممکن ہے، مگر سورہ طور سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جنتیوں کے اپنے بچے ہی ہوں گے، فرمایا: ﴿وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ لَهُمْ كَأَنَّهُمْ لُؤْلُؤًا مَّكْنُونٌ﴾ [الطور: ۲۴] ”اور ان پر پھریں گے ان کے لڑکے، گویا وہ چھپائے ہوئے موتی ہیں۔“ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لڑکے ان کے اپنے ہی بچے ہوں گے جو دنیا میں فوت ہو گئے یا جنت میں اگر کسی کو اولاد کی خواہش ہوئی، تو وہ بچے انہیں عطا کیے جائیں گے۔ یہ بچے خدمت کے لیے ان کے ارد گرد پھریں گے اور ان کے لیے مزید راحت و مسرت کا باعث ہوں گے۔ (واللہ اعلم) ابوسعید خدری رضی اللہ عنہما نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «الْمُؤْمِنُ إِذَا اشْتَهَى الْوَلَدَ فِي الْجَنَّةِ، كَانَ حَمَلُهُ وَوَضَعُهُ وَسِنُّهُ فِي سَاعَةٍ وَاحِدَةٍ، كَمَا يَسْتَهِي» [ابن ماجہ، الزهد، باب صفة الجنة: ۴۳۳۸، وقال الألبانی صحیح] ”مومن جب جنت میں اولاد چاہے گا تو اس کا حمل اور وضع حمل اور اس کا بڑا ہونا ایک گھڑی میں ہو جائے گا، اس کی خواہش کے مطابق۔“

آیت ۲۰ وَإِذَا رَأَيْتَ ثُمَّ رَأَيْتَ نَعِيمًا وَمُلَكًا كَبِيرًا: اور نعمت کا حال کیا ہوگا؟ ابوہریرہ رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «أَوَّلُ زُمْرَةٍ تَدْخُلُ الْجَنَّةَ عَلَى صُورَةِ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ، وَالَّذِينَ عَلَى إِبْرَاهِيمَ كَأَشَدَّ كَوَاقِبِ إِضَاءَةٍ، قُلُوبُهُمْ عَلَى قَلْبِ رَجُلٍ وَاحِدٍ، لَا اخْتِلَافَ بَيْنَهُمْ وَلَا تَبَاعُضَ، لِكُلِّ امْرَأَةٍ مِنْهُمْ

عَلَيْهِمْ ثِيَابٌ سُنْدِيں خُضْرٌ وَاسْتَبْرَقٌ ۚ وَحُلُوًا اَسَاوِرٌ مِّنْ فِضَّةٍ ۚ وَسَقَمُهُمْ رَبُّهُمْ
شَرَابًا طَهُورًا ﴿۲۱﴾

ان کے اوپر باریک ریشم کے سبز کپڑے اور گاڑھا ریشم ہوگا اور انھیں چاندی کے نگین پہنائے جائیں گے اور ان کا
رب انھیں نہایت پاک شراب پلائے گا ﴿۲۱﴾

زُوجَاتٍ ، كُلُّ وَاحِدَةٍ مِنْهُمَا يُرَى مَخَّ سَاقِيهَا مِنْ وَّرَائِ لَحْمِيهَا مِنَ الْحُسْنِ ، يُسَبِّحُونَ اللَّهَ بُكْرَةً وَعَشِيًّا ، لَا
يَسْقَمُونَ وَلَا يَمْتَحِطُونَ ، وَلَا يَبْصُقُونَ ، آيِنُهُمُ الذَّهَبُ وَالْفِضَّةُ ، وَأَمْسَاطُهُمُ الذَّهَبُ ، وَوَقُودُ مَحَامِرِهِمْ
الْأَلْوَةُ قَالَ أَبُو الْيَمَانِ يَعْنِي الْعُودَ وَرَشْحُهُمُ الْمِسْكُ ﴿ [بخاری، بدء الخلق، باب ما جاء في صفة الجنة..... :

۳۲۴۶] ”پہلے گروہ کے لوگ جو جنت میں داخل ہوں گے، چودھویں رات کے چاند کی طرح ہوں گے، ان کے بعد جو لوگ
جائیں گے وہ سب سے زیادہ روشن ستارے کی طرح چمک رہے ہوں گے۔ ان کے دل ایک ہی آدمی کے دل کی طرح
ہوں گے، ان میں نہ کوئی اختلاف ہوگا اور نہ بغض۔ ان میں ہر ایک آدمی کی دو بیویاں ہوں گی، حسن کی وجہ سے ان عورتوں کی
پنڈلی کا مغز گوشت کے پیچھے سے دکھائی دے گا۔ وہ صبح و شام اللہ کی تسبیح کریں گے۔ وہ نہ بیمار ہوں گے، نہ ناک سٹکیں گے اور
نہ تھوکیں گے۔ ان کے برتن سونے چاندی کے ہوں گے، ان کی کنگھیاں سونے کی، ان کی انگلیٹھیوں کا ایندھن ”اَلْوَةُ“ (ایک
خوشبودار لکڑی عود) ہوگی اور ان کا پینا کستوری ہوگا۔“ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ
نے سب سے آخر میں جہنم سے نکل کر جنت میں جانے والے شخص کا حال بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس سے کہیں گے:

﴿ فَإِنَّ لَكَ مِثْلَ الدُّنْيَا وَعَشْرَةَ أَمْثَالِهَا ﴾ [مسلم، الإیمان، باب آخر أهل النار حروجا : ۱۸۶] ” تجھے دنیا اور دنیا کے دس
گنا کے برابر دیا جاتا ہے۔“ جب آخری جنتی کے ملک و سلطنت کا یہ حال ہے تو دوسروں کے عظیم الشان ملک کا کہنا ہی کیا ہے۔

پھر دوستوں کی ملاقاتیں، فرشتوں کی آمد و رفت، سلام اور اللہ تعالیٰ کا اہل جنت سے ہم کلام ہونا، سلام کہنا اور دیدار عطا
فرمانا مزید نعمتیں ہیں۔ الغرض، جنت میں وہ نعمتیں ہیں جو نہ کسی آنکھ نے دیکھیں، نہ کسی کان نے سنیں اور نہ کسی بشر کے دل
میں ان کا خیال آیا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اپنے فضل و کرم سے اہل جنت میں شامل فرمائے۔ (آمین)

بیت 21 : ﴿ عَلَيْهِمْ ثِيَابٌ سُنْدِيں خُضْرٌ وَاسْتَبْرَقٌ : ”سُنْدِيں“ باریک ریشم۔ ”اسْتَبْرَقٌ“ گاڑھا ریشم۔
”حُلُوًا“ ”جَلِيَّةٌ“ سے ”فُعَلُوًا“ کے وزن پر ہے، اصل میں ”حُلِيُوًا“ تھا، زیور پہنائے جائیں گے۔ ”اَسَاوِرٌ“ ”سِوَارٌ“
کی جمع ہے، نگین۔ ”شَرَابًا“ مشروب، پینے کی چیز، ”طَهُورًا“ جو پاک ہو اور پاک کرنے والی ہو، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَأَنْزَلْنَا
مِنَ السَّمَاءِ مَاءً طَهُورًا ﴾ [الفرقان : ۴۸] ”اور ہم نے آسمان سے پاک کرنے والا پانی اتارا۔“

﴿ عَلَيْهِمْ ” (ان کے اوپر) کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک تو یہ کہ وہ جن نشستوں پر بیٹھے ہوں گے ان کے اوپر باریک
سبز ریشم اور گاڑھے ریشم کے پردے لگ رہے ہوں گے۔ جب پردے اتنے قیمتی ہوں گے تو ان کے لباس کا کیا کہنا۔ دوسرا یہ

إِنَّ هَذَا كَانَ لَكُمْ جَزَاءً وَكَانَ سَعْيَكُمْ مَشْكُورًا ﴿۲۲﴾

بلاشبہ یہ تمہارے لیے ہمیشہ کا بدلہ ہے اور تمہاری کوشش ہمیشہ قدر کی ہوئی ہے ﴿۲۲﴾

کہ انھوں نے باریک سبز ریشم اور گاڑھے ریشم کا لباس پہن رکھا ہوگا، جیسا کہ سورہ کہف میں فرمایا: ﴿وَيَذُنُونَ لِيَابَابًا خَضْرَاءً مِّنْ سُندُسٍ وَّاسْتَبْرَقٍ﴾ [الکہف: ۳۱] ”اور وہ باریک اور گاڑھے سبز ریشم کے کپڑے پہنیں گے۔“ یہ معنی زیادہ درست ہے، کیونکہ سورہ کہف کی آیت سے اس کی تائید ہو رہی ہے۔ انس بن مالک، مجاہد اور قتادہ کی قراءت میں ”عَلَيْهِمْ“ ہے۔ [دیکھئے زاد المسیر لابن الجوزی | اس قراءت سے بھی دوسرے معنی کی تائید ہوتی ہے، اگرچہ پہلا معنی بھی غلط نہیں۔

﴿سورہ کہف میں فرمایا: ﴿يُعَلِّقُونَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ﴾ [الکہف: ۳۱] ”ان میں انھیں کچھ کنگن سونے کے پہنائے جائیں گے۔“ جبکہ یہاں چاندی کے کنگن پہنائے جانے کا ذکر ہے، دونوں میں تطبیق کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہاں کئی جنتیں ہیں، جیسا کہ سورہ رحمان میں الگ الگ دو دو جنتوں کا ذکر ہے اور جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿حَسْتَانِ مِنْ فِضَّةٍ آتِيَتْهُمَا وَ مَا فِيهِمَا، وَ حَسْتَانِ مِنْ ذَهَبٍ آتِيَتْهُمَا وَ مَا فِيهِمَا﴾ [بخاری، التوحید، باب قول اللہ تعالیٰ: ﴿وَهُوَ يَوْمَئِذٍ مُّظَاهِرٌ...﴾ | ۷۴۴۴] ”دو باغ ایسے ہیں کہ ان کے برتن اور ان میں جو کچھ ہے چاندی کا ہے اور دو باغ ایسے ہیں کہ ان کے برتن اور ان میں جو کچھ ہے سونے کا ہے۔“ اب جنتی کی مرضی ہے کہ سونے کے کنگن پہننے یا چاندی کے یا دونوں پہننے اور بعض اہل عم نے فرمایا کہ شاید اہل جنت کے درجات کے لحاظ سے سونے کے کنگن مقررین کے لیے اور چاندی کے اصحاب الیمین کے لیے ہوں گے۔ (التسبیح) مگر یہ بات جزم سے نہیں کہی جاسکتی، اس لیے پہلی بات ہی زیادہ درست ہے۔

﴿۲۲﴾ یہاں ایک سوال یہ ہے کہ کنگن وغیرہ عام طور پر عورتیں پہنتی ہیں، جنت میں مردوں کو کنگن پہنانے کا کیا مقصد ہے؟ جواب یہ ہے کہ ریشمی لباس اور سونے چاندی کے کنگنوں سے مراد اہل جنت کی شاہانہ شان و شوکت بیان کرنا ہے۔ دنیا میں قدیم زمانے سے بادشاہ سونے چاندی کے کنگن پہنتے رہے ہیں، جیسا کہ فرعون نے موسیٰ علیہ السلام پر طعن کیا تھا: ﴿فَلَوْلَا أَلْقَىٰ عَلَيْهِ آسُورَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ﴾ [زعر: ۵۲] ”اے سونے کے کنگن کیوں نہیں پہنائے گئے؟“

﴿۲۳﴾ وَ سَقَّوْهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُورًا: آیت کے اس کلامے میں جنتیوں کے لیے کئی بشارتیں ہیں، ایک یہ کہ انھیں ان کا رب خود شراب طہور پلائے گا۔ اس سے بڑی عزت افزائی اور کیا ہو سکتی ہے۔ دوسری یہ کہ وہ مشروب دنیا کے تمام سرور اور مشروبات کی ظاہری و باطنی نجاستوں سے اور ہر قسم کی خرابیوں سے پاک ہوگا۔ نہ اس میں نشہ ہوگا نہ دوسرے، نہ مٹی نہ تے، نہ اعضا شکنی، نہ زوال عقل، وہ سراسر لذت و سرور ہوگا۔ تیسری یہ کہ ”طَهُورًا“ کے لفظ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ اس کے پینے سے اہل جنت کے دل پاک ہو جائیں گے اور ان سے حسد، بغض اور تمام کدورتیں دور ہو جائیں گی۔

آیت 22 إِنَّ هَذَا كَانَ لَكُمْ جَزَاءً : ”یہ سب کچھ تمہارے اعمال کا بدلہ ہے اور تمہاری کوشش قدر کی ہوئی ہے“ یہ بات جنتیوں سے کہی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ انھیں تھوڑی سی عمر کے اعمال کے بدلے میں ابد الابد کی یہ نعمتیں عطا فرمائے گا۔ اس سے بڑھ کر قدر دانی کیا ہو سکتی ہے؟

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ تَنْزِيلًا ﴿۲۳﴾ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَطِعْ مِنْهُمْ آيَاتًا أَوْ كُفُورًا ﴿۲۴﴾ وَادْكُرْ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ﴿۲۵﴾ وَمِنَ اللَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهُ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيلًا ﴿۲۶﴾

طَوِيلًا ﴿۲۶﴾

یقیناً ہم نے ہی تجھ پر یہ قرآن اتارا، تھوڑا تھوڑا کر کے اتارنا ﴿۲۳﴾ پس اپنے رب کے فیصلے تک صبر کر اور ان میں سے کسی گناہ گار یا بہت ناشکرے کا کہنا مت مان ﴿۲۴﴾ اور اپنے رب کا نام صبح اور پچھلے پہر یاد کیا کر ﴿۲۵﴾ اور رات کے کچھ حصہ میں پھر اس کے لیے سجدہ کر اور لمبی رات تک اس کی تسبیح کیا کر ﴿۲۶﴾

آیت 23 : إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ تَنْزِيلًا : سورت کے شروع سے یہاں تک کفار و ابرار کے انجام کا ذکر فرمانے کے بعد رسول اللہ ﷺ کو کفار کے اعتراضات کے جواب میں تسلی دی جا رہی ہے اور صبر و استقامت اور ذکر و تسبیح اور جہاد کا حکم دیا جا رہا ہے۔ کفار رسول اللہ ﷺ کو جھٹلانے کے لیے کہا کرتے تھے کہ آپ قرآن مجید اپنے پاس ہی سے بنا کر سنا رہتے ہیں، ورنہ یہ اکٹھا ہی کیوں نازل نہیں ہوا۔ قرآن مجید میں مختلف مقامات پر اس کا جواب مذکور ہے (مثلاً دیکھیے فرقان: ۳۲) مگر یہاں نہایت زور دار لہجے میں فرمایا کہ یقیناً ہم ہی نے یہ قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے آپ پر نازل کیا ہے، یعنی ہمارے علاوہ کوئی ایسا کلام بنا ہی نہیں سکتا، ورنہ تم سب مل کر ایک سورت ہی بنا کر دکھاؤ اور ہم ہی جانتے ہیں کہ حکمت کا تقاضا سے تھوڑا تھوڑا کر کے اتارنا ہے، اس لیے آپ ان کے اعتراضات کی پروا نہ کریں۔

آیت 24 : فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ : یعنی وہ وقت آ رہا ہے جب آپ کا رب حق و باطل کے درمیان فیصلہ فرمادے گا، آپ اس وقت کا انتظار کرتے ہوئے صبر کریں۔ یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ آپ جہاد کے لیے اپنے رب کا حکم آنے تک صبر کریں، یعنی خود بھی اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرتے رہیں، لوگوں کو بھی اسلام کی دعوت دیتے رہیں اور اس راہ میں آنے والی ہر آزمائش پر بھی صبر کریں اور اس سے روکنے والے کسی شخص کے کہنے پر، خواہ وہ کوئی گناہ گار یعنی بد عمل ہو یا ناشکر یعنی بد عقیدہ ہو، نہ اپنا عمل چھوڑیں، نہ عقیدہ اور نہ اس کی دعوت۔

آیت 25 26 : وَادْكُرْ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ﴿۲۵﴾ وَمِنَ اللَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهُ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيلًا ﴿۲۶﴾ : دعوت کے راستے میں پیش آنے والی مشکلات کو برداشت کرنے کے لیے قرآن مجید اللہ کے ذکر، نماز اور تسبیح کا حکم دیتا ہے، کیونکہ انھی چیزوں سے انسان ثابت قدم اور حوصلہ مند رہتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ﴾ [البقرة: ۱۵۰] "اور نماز اور صبر کے ساتھ مدد طلب کرو۔" اور سورہ مزمل میں کلام الہی کی بھاری ذمہ داری اٹھانے کی استعداد کے لیے تہجد اور ذکر کا حکم دیا۔ یہاں بھی قرآن کی دعوت و تبلیغ کے راستے میں صبر کی تلقین کے ساتھ حکم دیا کہ صبح اور پچھلے پہر اپنے رب کا نام یاد کر اور رات کے کچھ حصے میں بھی اس کے لیے سجدہ کر۔ ذکر کی اعلیٰ ترین صورت نماز ہے۔ اوقات کی تعیین کے ساتھ ذکر کے حکم سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ نماز کا بھی حکم

إِنَّ هَؤُلَاءَ يُجِبُونَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُونَ وَرَاءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيلًا ﴿۲۷﴾ نَحْنُ خَلَقْنَاهُمْ وَشَدَدْنَا
أَسْرَهُمْ ۚ وَإِذَا شِئْنَا بَدَلْنَا بَدَلًا أَكْثَرَ لَهُمْ تَبْدِيلًا ﴿۲۸﴾ إِنَّ هَذِهِ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ
رَبِّهِ سَبِيلًا ﴿۲۹﴾

یقیناً یہ لوگ جلد ملنے والی چیز سے محبت کرتے ہیں اور ایک بھاری دن کو اپنے پیچھے چھوڑ رہے ہیں ﴿۲۷﴾ ہم نے ہی
انہیں پیدا کیا اور ہم نے ان (کے اعضا) کا بندھن مضبوط باندھا اور ہم جب چاہیں گے بدل کر ان جیسے اور
لوگ لے آئیں گے، بدل کر لانا ﴿۲۸﴾ یقیناً یہ ایک نصیحت ہے، تو جو چاہے اپنے رب کی طرف (جانے والا) راستہ
اختیار کر لے ﴿۲۹﴾

دیا جا رہا ہے، چنانچہ ”بُكَرَةٌ“ میں صبح کی نماز اور ”أَصِيلًا“ میں ظہر و عصر کی نمازیں اور ”مِنَ اللَّيْلِ“ (رات کے کچھ حصے)
میں مغرب و عشاء کی نمازیں آجاتی ہیں اور ”سَبَّخَهُ لَيْلًا طَوِيلًا“ سے مراد تہجد کی نماز ہے۔ یہ پانچوں نمازیں اگرچہ ان
رکعات و متعین اوقات کے ساتھ معراج کی رات فرض ہوئیں، مگر ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے بھی ذکر و صلوة
کے اوقات یہی تھے۔

آیت 27 ﴿۲۷﴾ إِنَّ هَؤُلَاءَ يُجِبُونَ الْعَاجِلَةَ : اس آیت میں کفار و فجار کے کفر و فسوق کا اصل سبب بیان فرمایا کہ ان
کے نصیحت قبول نہ کرنے کا سبب حسیب دنیا ہے۔ دنیا چونکہ جلد ہاتھ آنے والی چیز ہے، اس لیے یہ اسی کو چاہتے ہیں اور قیامت
کے بھاری دن سے غافل ہیں، بلکہ اس کے آنے کا یقین ہی نہیں رکھتے اور سمجھتے ہیں کہ جب مرنے کے بعد گل سڑ گئے تو کون
دوبارہ زندہ کرے گا؟ آگے اس کا جواب ہے۔

آیت 28 ﴿۲۸﴾ نَحْنُ خَلَقْنَاهُمْ وَشَدَدْنَا أَسْرَهُمْ : ”أَسْرَهُمْ“ کا معنی باندھنا ہے، اسیر بھی اسی سے نکلا ہے،
یعنی ہم نے ان کے اعضا کا بندھن مضبوطی سے باندھا ہے، ہڈیوں اور پٹھوں کے جوڑ نہایت مضبوط بنائے ہیں، یعنی یہ لوگ
مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کو عقل کے خلاف سمجھتے ہیں، لیکن اتنا نہیں سوچتے کہ ہم نے انہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا، ان کے
نرم و نازک رگ و ریشے، گوشت پوست، جوڑوں اور ہڈیوں کو مضبوطی سے باندھ دیا تو ہم دوبارہ انہیں کیوں زندہ نہیں کر سکتے؟ ہم تو
جب چاہیں انہیں ختم کر کے ان کی جگہ ان جیسے اور لوگ لا سکتے ہیں، تو ان کا بنانا ہمیں کیا مشکل ہے؟ دوسری جگہ فرمایا: ﴿إِنْ يَشَاءُ
يُذْهِبْكُمْ أَيُّهَا النَّاسُ وَيَأْتِ بِآخَرِينَ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ ذَٰلِكَ قَدِيرًا﴾ [النساء: ۱۳۳] ”اگر وہ چاہے تو تمہیں لے
جائے اور دوسرے لوگوں کو لے آئے اور اللہ اس پر خوب قدرت رکھنے والا ہے۔“ مزید دیکھیے سورہ ابراہیم (۱۹، ۲۰)۔

آیت 29 ﴿۲۹﴾ إِنَّ هَذِهِ تَذْكِرَةٌ : یعنی یہ سورت یا موعظت نصیحت ہے، اس سے صحیح راستہ واضح ہو گیا، کوئی شک و شبہ
باقی نہیں رہا، اب جو چاہے اپنے رب کی طرف جانے کا راستہ اختیار کر لے۔

وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿۳۰﴾ يُدْخِلُ مَنْ يَشَاءُ فِي رَحْمَتِهِ ۗ وَالظَّالِمِينَ أَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿۳۱﴾

اور تم نہیں چاہتے مگر یہ کہ اللہ چاہے، یقیناً اللہ ہمیشہ سے سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے ﴿۳۰﴾ وہ اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور ظالم لوگ، اس نے ان کے لیے دردناک عذاب تیار کیا ہے ﴿۳۱﴾

آیت 30 ﴿۳۰﴾ وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ مگر تمہارا چاہنا اللہ کے چاہنے کے تابع ہے، وہ نہ چاہے تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے تقدیر کے منکروں کو اسی آیت سے لاجواب کیا تھا۔ خوارج کا ایک گروہ ان کے پاس آیا اور تقدیر کے انکار کی دلیل کے طور پر اسی سورت کی ابتدا میں سے یہ آیت پڑھی: ﴿إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا﴾ [الدھر: ۳] ”یعنی ہم نے انسان کو راستہ بتا دیا ہے، اب چاہے تو شکر کرنے والا بن جائے اور چاہے تو کفر کرنے والا“ عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے فرمایا، آگے پڑھتے جاؤ، آخر میں یہ آیت آئی تو فرمایا، بے شک انسان جو راستہ چاہے اختیار کرے، مگر یہ اختیار بھی اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تابع ہے۔ اللہ تعالیٰ سے زبردست ہو کر کوئی شخص نہ نیک بن سکتا ہے نہ بد۔ ”إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا“ یعنی اللہ تعالیٰ کی یہ مشیت اندھی مشیت نہیں ہے، بلکہ وہ علیم و حکیم ہے اور اس کی مشیت اس کے علم و حکمت پر مبنی ہے۔ وہ انھی لوگوں کو ہدایت دیتا ہے جو اس کے علم و حکمت کے مطابق اس کے اہل ہیں۔

آیت 31 ﴿۳۱﴾ يُدْخِلُ مَنْ يَشَاءُ فِي رَحْمَتِهِ: ”وہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کر لیتا ہے“ یہ اس سوال کا جواب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب لوگوں کو ہدایت کیوں نہیں دی؟ فرمایا ہدایت و رحمت کا مالک اللہ تعالیٰ ہے، مالک اپنی چیز جسے چاہے دے جسے چاہے نہ دے، کوئی اسے پوچھ نہیں سکتا، جیسا کہ فرمایا: ﴿لَا يُسْأَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْأَلُونَ﴾ [الانبیاء: ۲۳] ”اس سے نہیں پوچھا جاتا اس کے متعلق جو وہ کرے اور ان سے پوچھا جاتا ہے۔“

آیت 32 ﴿۳۲﴾ وَالظَّالِمِينَ أَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا: یعنی اس نے ظالموں کے لیے عذاب الیم تیار کر رکھا ہے۔ یہاں ”الظالمین“ سے مراد مشرک ہیں، کیونکہ سب سے بڑے ظالم وہی ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ﴾ [القصص: ۱۳] ”بے شک شرک یقیناً بہت بڑا ظلم ہے۔“ معلوم ہوا اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے محروم انھی کو رکھتا ہے جو ظالم ہیں، جیسے فرمایا: ﴿يُضِلُّ مَن يَشَاءُ ۗ وَيَهْدِي مَن يَشَاءُ ۗ وَهُوَ يُضِلُّ مَن يَشَاءُ ۗ وَهُوَ يُهْدِي مَن يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ يَفْعَلُ مَا يُنْقِضُونَ﴾ [البقرہ: ۲۶، ۲۷] ”وہ اس (قرآن) کے ساتھ بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیتا ہے اور بہت سے لوگوں کو ہدایت دیتا ہے اور اس کے ساتھ گمراہ نہیں کرتا مگر نافرمانوں کو۔ وہ لوگ جو اللہ کے عہد کو، اسے پختہ کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور اس چیز کو قطع کرتے ہیں جس کے متعلق اللہ نے حکم دیا کہ اسے ملایا جائے اور زمین میں فساد کرتے ہیں، یہی لوگ خسارہ اٹھانے والے ہیں۔“ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہمیں بھی اپنی رحمت میں داخل فرمائے اور عذاب الیم سے محفوظ رکھے۔ (آمین)

فَإِذَا النُّجُومُ طُبِسَتْ ۙ ۸) وَإِذَا السَّمَاءُ فُرِجَتْ ۙ ۹) وَإِذَا الْجِبَالُ سُفَّتْ ۙ ۱۰) وَإِذَا النُّسُلُ
أَقْتَتْ ۙ ۱۱) لِأَيِّ يَوْمٍ أُحِلَّتْ ۙ ۱۲) لِيَوْمِ الْفُضْلِ ۙ ۱۳) وَمَا أَدْرَاكَ مَا يَوْمَ الْفُضْلِ ۙ ۱۴) وَيُنْزَلُ

يُؤَيِّدُ لِلْمُكذَّبِينَ ۙ ۱۵)

پس جب ستارے مٹا دیے جائیں گے ۸) اور جب آسمان کھولا جائے گا ۹) اور جب پہاڑ اڑا دیے جائیں گے ۱۰) اور جب (وہ وقت آجائے گا) جو رسولوں کے ساتھ مقرر کیا گیا ۱۱) (یہ سب چیزیں) کس دن کے لیے مؤخر کی گئی ہیں؟ ۱۲) فیصلے کے دن کے لیے ۱۳) اور تجھے کس چیز نے معلوم کروایا کہ فیصلے کا دن کیا ہے؟ ۱۴) اس دن جھٹلانے والوں کے لیے بڑی ہلاکت ہے ۱۵)

”عُرْفُ“ کہتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں ایک سطر میں یکے بعد دیگرے ہوتی ہیں، اس لیے ان کی مشابہت سے پے در پے آنے والی چیزوں پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے، مثلاً: ”جَاوُوا عُرْفًا وَاحِدًا“ ”وہ سب پے در پے آگئے۔“ ”عُرْفًا“ کا معنی اگر جانی پہچانی چیز کریں تو اس سے پہلے ”بَاء“ مقدر ہوگی: ”أَيُّ وَالْمُرْسَلَاتِ بِالْعُرْفِ“ ”یعنی ان ہواؤں کی قسم جو جانے پہچانے معمول کے مطابق چھوڑی جاتی ہیں!“ اگر اس کا معنی بھلائی کریں تو اس سے پہلے ”لام“ مقدر ہوگا اور یہ مفعول لڑ ہوگا: ”أَيُّ وَالْمُرْسَلَاتِ لِلْعُرْفِ“ ”یعنی ان ہواؤں کی قسم جنھیں (لوگوں کی) بھلائی کے لیے چھوڑا جاتا ہے!“ اور اگر معنی پے در پے کریں تو ”عُرْفًا“ حال ہوگا، یعنی ”ان ہواؤں کی قسم جو پے در پے چھوڑی جاتی ہیں!“ تینوں معنی درست ہیں۔

قرآن مجید میں مذکور تسمیہ عام طور پر اس دعویٰ کی دلیل ہوتی ہیں جو بعد میں مذکور ہوتا ہے۔ ان آیات کا مطلب یہ ہے کہ ان پانچ صفات والی ہواؤں میں زبردست شہادت ہے کہ قیامت جس کا وعدہ دیا جاتا ہے، ضرور آنے والی ہے۔ آپ دیکھیں! ہوائیں کبھی نرم رفتار سے چلتی ہیں، پھر کبھی تند و تیز ہو کر آندھیاں بن جاتی ہیں، پھر بادلوں کو اٹھا کر لاتی اور پھیلا دیتی ہیں، پھر ان کے قطعے جدا جدا کر کے بارش برسانا شروع کر دیتی ہیں اور کہیں ایک قطرہ برسائے بغیر ہی آگے گزر جاتی ہیں۔ ہواؤں کے یہ مختلف اطوار کہ کبھی آہستہ چلنا، کبھی تند و تیز آندھی بن جانا، پھر بادلوں کو اٹھانا، انھیں پھیلا کر برسانا اور منتشر کر دینا، کہیں خوف ناک طوفان کی صورت میں عذاب بن کر آنا وغیرہ، یہ سب کچھ دیکھ کر اللہ تعالیٰ یاد آ جاتا ہے۔ اسی طرح یہ ہوائیں دلوں میں اللہ کے ذکر کا القا کرتی ہیں اور اللہ کی طرف توجہ مبذول کرواتی ہیں، کبھی ترغیب کے ساتھ اور کبھی ترہیب کے ساتھ۔ ہوائیں اگر خوشگوار اور نفع بخش ہیں تو اللہ کی نعمت ہیں اور ان کا اثر بندے پر یہ پڑنا چاہیے کہ وہ شکر ادا کرے اور اپنے عمل کی کوتاہی کا عذر پیش کرے اور اگر اس کے برعکس خوف ناک طوفان اور بجلیوں کی صورت میں ہیں تو ان کا اثر بندے پر یہ ہونا چاہیے کہ وہ ڈر کر گناہوں سے توبہ کی طرف متوجہ ہو۔ ان مختلف اطوار والی ہواؤں کو پیدا کرنے والے اور ان کا بندوبست کرنے والے پروردگار کے لیے قیامت برپا کرنا اور تمام فوت شدہ لوگوں کو زندہ کر کے ان سے باز پرس کرنا کون سا مشکل کام ہے؟

آیت 8 : 15) فَإِذَا النُّجُومُ طُبِسَتْ : ”أَقْتَتْ“ اصل میں ”وَقْتَتْ“ تھا۔ ”أَلْتَوَقَيْتُ“ وقت مقرر کرنا۔ یہاں سے کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

أَلَمْ تُهْلِكِ الْأَوَّلِينَ ﴿۱۱﴾ ثُمَّ نُنْبِئُهُمُ الْآخِرِينَ ﴿۱۲﴾ كَذَلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِينَ ﴿۱۳﴾
 وَيْلٌ لِّيَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ ﴿۱۴﴾ أَلَمْ تَخْلُقْنَا مِنْ مَّاءٍ مَّهِينٍ ﴿۱۵﴾ فَجَعَلْنَاهُ فِي قَرَارٍ
 مَّكِينٍ ﴿۱۶﴾ إِلَىٰ قَدَرٍ تَعْلَمُونَ ﴿۱۷﴾ فَقَدَرْنَا ۖ فَنِعْمَ الْقَدِيرُونَ ﴿۱۸﴾ وَيْلٌ لِّيَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ ﴿۱۹﴾

کیا ہم نے پہلوں کو ہلاک نہیں کیا؟ ﴿۱۱﴾ پھر ہم ان کے پیچھے دوسروں کو بھیجتے رہتے ہیں ﴿۱۲﴾ ہم مجرموں کے ساتھ اسی طرح کرتے ہیں ﴿۱۳﴾ اس دن جھٹلانے والوں کے لیے بڑی ہلاکت ہے ﴿۱۴﴾ کیا ہم نے حصیوں کو ایک حقیر پانی سے پیدا نہیں کیا؟ ﴿۱۵﴾ پھر ہم نے اسے ایک مضبوط ٹھکانے میں رکھا ﴿۱۶﴾ ایک معلوم اندازے تک ﴿۱۷﴾ پس ہم نے اندازہ کیا تو ہم اچھے اندازہ کرنے والے ہیں ﴿۱۸﴾ اس دن جھٹلانے والوں کے لیے بڑی ہلاکت ہے ﴿۱۹﴾

اس دن کی کچھ نشانیاں بیان فرمائیں کہ اس دن تاروں کی روشنی جاتی رہے گی۔ (دیکھیے حکویر: ۲۔ انفطار: ۲) آسمان کھول دیا جائے گا اور اس میں دروازے ہی دروازے نمودار ہو جائیں گے۔ (دیکھیے انشاق: ۱۔ انفطار: ۱۔ نبا: ۱۸، ۱۹۔ فرقان: ۲۵) اور پہاڑوں کو اڑا دیا جائے گا۔ (دیکھیے طہ: ۱۰۵۔ واقف: ۶۳۱۔ حاقہ: ۱۵۶، ۱۵۷۔ مزمل: ۱۳۔ قارعہ: ۵) اور وہ وقت آجائے گا جو رسولوں کے ساتھ مقرر کیا گیا تھا کہ ایک دن انھیں جمع کیا جائے گا اور وہ اپنی اپنی امت کو دین حق پہنچانے کی شہادت دیں گے۔ (دیکھیے نساء: ۳۱۔ مائدہ: ۱۰۹) یہ سب چیزیں کس دن کے لیے مؤخر کی گئی ہیں؟ فیصلے کے دن کے لیے۔ پھر اس دن کی عظمت و ہیبت بیان کرنے کے لیے فرمایا: ”اور تجھے کس چیز نے معلوم کروایا کہ فیصلے کا دن کیا ہے؟“ مطلب یہ ہے کہ کوئی اندازہ ہی نہیں کر سکتا کہ وہ دن کتنا عظیم ہے کہ آپ کو بتا سکے۔ ہاں، اللہ تعالیٰ خود کچھ بتا دے تو الگ بات ہے۔ مختصر یہ کہ وہ دن اتنا خوف ناک ہے کہ جھٹلانے والوں کے لیے اس دن ”وَيْلٌ“ یعنی خرابی اور بربادی ہے۔ اس سورت میں ”وَيْلٌ لِّيَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ“ دس مرتبہ آیا ہے، مگر اس سے مقصود اس دن سے زیادہ سے زیادہ ڈرانا ہے۔

آیت 16: 19: أَلَمْ تُهْلِكِ الْأَوَّلِينَ رسول اللہ ﷺ کے زمانے سے پہلے کے کفار کو ”الْأَوَّلِينَ“ فرمایا، جن میں نوح علیہ السلام کے زمانے کے کفار سے لے کر عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے کے تمام کفار شامل ہیں اور رسول اللہ ﷺ اور آپ کے بعد تمام زمانوں کے کفار کو ”الْآخِرِينَ“ فرمایا۔ پہلے لوگوں کی بربادی کا سبب بھی یہ تھا کہ وہ آخرت پر یقین نہیں رکھتے تھے اور اس دنیا کی زندگی ہی کو اصل زندگی سمجھتے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لوگ آخر کار تباہ و برباد ہو گئے۔ اب بھی یہی قانون ہے کہ جو قوم آخرت کا انکار کرے گی تباہ و برباد ہوگی۔ قیامت کے دن ایسے لوگوں پر جو ہلاکت آئے گی وہ اس دنیاوی بربادی کے علاوہ ہے اور ان کی اصل بربادی کا دن وہی ہوگا۔

آیت 20: 24: ﴿۱﴾ أَلَمْ تَخْلُقْنَا مِنْ مَّاءٍ مَّهِينٍ... : اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک حقیر پانی یعنی منی کے قطرے سے پیدا فرمایا، پھر اسے ایک محفوظ ٹھکانے یعنی ماں کے رحم میں رکھا، جو تین اطراف سے ہڈیوں سے گھرا ہوا ہے۔ حمل قرار پاتے ہی بیچ کو آبی مضبوطی سے رحم میں جمایا جاتا ہے اور اس کی حفاظت کا اتنا انتظام ہوتا ہے کہ شدید حادثے کے بغیر اس کا اسقاط نہیں ہو سکتا۔

أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ كِفَاتًا ۝٢٥ أَحْيَاءَ ۝ وَأَمْوَاتًا ۝ وَجَعَلْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ شِهِبٍ
وَأَسْقَيْنَكُم مَّاءً فَرَاتًا ۝ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ ۝٢٦ إِنظَلِقُوا إِلَىٰ مَا كُنتُمْ بِهِ
تُكذِّبُونَ ۝٢٧ إِنظَلِقُوا إِلَىٰ ظِلٍّ ذِي ثَلَاثِ شُعَبٍ ۝ لَا ظَلِيلٍ وَلَا يُغْنِي مِنَ

کیا ہم نے زمین کو سمیٹنے والی نہیں بنایا؟ ۲۵) زندوں کو اور مردوں کو ۲۶) اور ہم نے اس میں بلند پہاڑ بنائے اور ہم نے تمہیں نہایت میٹھا پانی پلانے کے لیے دیا ۲۷) اس دن جھٹلانے والوں کے لیے بڑی ہلاکت ہے ۲۸) اس چیز کی طرف چلو جسے تم جھٹلاتے تھے ۲۹) ایک سائے کی طرف چلو جو تین شاخوں والا ہے ۳۰) نہ سایہ کرنے والا ہے

② إِلَىٰ قَدَرٍ مَّعْلُومٍ: ”اس اندازے تک جو معلوم ہے“ یعنی نو ماہ یا اس سے کم یا زیادہ، جس کا علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے کہ وہ اتنے مہینوں، دنوں، گھنٹوں یا منٹوں میں پیدا ہوگا، کسی دوسرے کو اس کا علم نہیں۔

③ فَجَعَلْنَا قَدْرًا مَّعْلُومًا الْقَدِيرُونَ: یعنی ہم نے ایک ایسی مدت مقرر کی جس میں بچے کی ساخت مکمل ہو جاتی ہے، نہ کوئی چیز ضرورت سے زائد بنتی ہے اور نہ کوئی ضروری چیز رہ جاتی ہے۔ جب تک اس کے لیے رحم کے اندر رہنا ضروری ہوتا ہے وہ اس میں رہتا ہے اور جب باہر آنا ضروری ہوتا ہے تو وہ باہر آ جاتا ہے۔ یہ مدت ہم نے مقرر کی ہے اور ہم کتنا ٹھیک اندازہ کرنے والے ہیں۔ ”فَجَعَلْنَا“ کا دوسرا ترجمہ ”ہم قادر ہوئے“ بھی ہو سکتا ہے، یعنی ہم نے پانی کی ایک بوند کو بتدریج ترقی دیتے دیتے کامل و عاقل انسان بنا دیا، اس سے تم سمجھ سکتے ہو کہ ہم کیا خوب قدرت رکھنے والے ہیں۔ (اشرف الموحاشی)

④ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ: ایک حقیر قطرے سے اپنی تخلیق کو دیکھنے کے بعد جو لوگ آخرت کے دن کو ناممکن قرار دے کر جھٹلاتے ہیں ان کے لیے اس دن بڑی ہلاکت اور بربادی ہے۔

آیت 25-28: ① أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ كِفَاتًا.....: ”كِفَاتًا“ ”كَفَفَتْ يَكْثِفْتُ“ (ض) (سمیٹنا، جمع کرنا) سے مصدر بمعنی اسم فاعل ہے، یعنی سمیٹنے والی۔ ”رَوَاسِيَ“ ”رَاسِيَّةٌ“ کی جمع ہے اور ”رَسَا يَرْسُو“ (ن) زمین میں گڑا ہوا ہونا، مراد پہاڑ ہیں۔ ”شِهِبٍ“ بلند۔ ”فَرَاتًا“ بہت ہی میٹھا۔ زمین زندوں کو سمیٹتی ہے، وہ اسی پر زندگی گزارتے ہیں، وہ ان کی غلاظتیں سنبھالتی ہے اور مردوں کو بھی اپنی آغوش میں لے لیتی ہے، اگر زمین مرنے والے انسانوں اور دوسرے جانداروں کو نہ سمیٹتی تو بعض سے زندگی دشوار ہو جاتی۔ اس آیت سے مردوں کو سنبھالنے کے لیے ذنن کی دلیل ملتی ہے، جو تو میں اپنے مردوں کو جلاتی ہیں ان کی راکھ اور ہڈیاں بھی زمین ہی کے سپرد ہوتی ہیں۔

② وَجَعَلْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ.....: زمین بجائے خود اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ایک بہت بڑا نشان ہے، پھر اس پر بلند و بالا پہاڑ اور انسان کے پینے کے لیے نہایت میٹھا پانی اللہ کی قدرت کے اتنے بڑے عجائب ہیں کہ ان کو دیکھ کر بھی جو لوگ آخرت کو جھٹلاتے اور کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے لیے مخلوق کو دوبارہ بنانا ممکن نہیں، ان لوگوں کے لیے قیامت کے دن بہت بڑی خرابی اور ہلاکت ہے۔

آیت 29-34: ③ إِنظَلِقُوا إِلَىٰ مَا كُنتُمْ بِهِ تُكذِّبُونَ.....: ”شُعَبٍ“ ”شُعْبَةٌ“ کی جمع ہے، شاخیں۔ ”جَعَلْنَا“

اللَّهِبِ ۞ اِنَّهَا تَرْمِي بِشَرِّهَا كَالْقَصْرِ ۞ كَاَنَّهُ جِنَلْتُ صَفْرًا ۞ وَيْلٌ لِّيَوْمِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۞
 هٰذَا يَوْمٌ لَا يَنْطِقُوْنَ ۞ وَلَا يُؤَدُّنْ لَهُمْ فِعْلَتَدْرُوْنَ ۞ وَيْلٌ لِّيَوْمِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۞
 هٰذَا يَوْمُ الْفَضْلِ ۞ جَمَعْنٰكُمْ وَّ الْاَوَّلِيْنَ ۞ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ فَكَيْدُوْنَ ۞ وَيْلٌ
 لِّيَوْمِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۞

اور نہ وہ شعلے سے کسی کام آتا ہے ۳۱ بلاشبہ وہ (آگ) محل جیسے شرارے پھینکے گی ۳۲ جیسے وہ زرد اونٹ ہوں ۳۳ اس دن جھلانے والوں کے لیے بڑی ہلاکت ہے ۳۴ یہ دن ہے کہ وہ نہیں بولیں گے ۳۵ اور نہ انہیں اجازت دی جائے گی کہ وہ عذر کریں ۳۶ اس دن جھلانے والوں کے لیے بڑی ہلاکت ہے ۳۷ یہ فیصلے کا دن ہے، ہم نے تمہیں اور پہلوں کو اکٹھا کر دیا ہے ۳۸ تو اگر تمہارے پاس کوئی خفیہ تدبیر ہے تو میرے ساتھ کر لو ۳۹ اس دن جھلانے والوں کے لیے بڑی ہلاکت ہے ۴۰

”حمل“ کی جمع ہے، جیسے ”ججازة“ ”خحر“ کی جمع ہے۔ یہ بات قیامت کے دن جھلانے والوں سے کہی جائے گی، اس دن جب متقی لوگوں کو عرش الہی کا اور جنت کے گھنے درختوں کا سایہ ملے گا، تو جھلانے والوں کو ایسے سائے کی طرف جانے کا حکم ہوگا جو جہنم سے نکلے والے دھوئیں کا ہوگا، جو پھیل کر تین تین شاخوں میں تقسیم ہو جائے گا، جس میں نہ سایہ ہوگا نہ ٹھنڈک۔ جہنم سے اتنی بڑی بڑی پنکھاریاں اڑیں گی جیسے گل ہوں اور اس طرح دکھائی دیں گی جیسے زرد رنگ کے اونٹوں کی جماعت۔ اس دن جھلانے والوں کے لیے بہت بڑی بربادی ہے۔

آیت 35، 37 هٰذَا يَوْمٌ لَا يَنْطِقُوْنَ..... : یہاں فرمایا کہ جھلانے والے لوگ قیامت کے دن نہ بولیں گے نہ انہیں عذر کرنے کی اجازت ہوگی، جبکہ قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر مذکور ہے کہ وہ اپنے عذر پیش کریں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ قیامت کا دن پچاس ہزار سال کا ایک طویل دن ہے، و توخ قیامت کے وقت وہ بیہوش سے بول نہیں سکیں گے، پھر اپنی جان بچانے کے لیے جھوٹے عذر بہانے پیش کرنے لگیں گے، اپنے مجرم ہونے ہی سے انکار کر دیں گے اور قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہم نے کبھی شرک نہیں کیا، بلکہ مطالبہ کریں گے کہ ہمارے خلاف کوئی ثبوت ہو تو پیش کیا جائے۔ جب ان کے اعمال نامے پیش ہوں گے، ان کو حق پہنچانے والوں کی شہادتیں پیش ہوں گی اور ان کی زبانوں پر مہر لگا کر انہی کے اعضا کی گواہی پیش کر دی جائے گی تو پھر ان کا بولنا بند ہو جائے گا اور اب اجازت نہیں ہوگی کہ خواہ مخواہ عذر گھڑتے جائیں۔

آیت 38، 40 هٰذَا يَوْمُ الْفَضْلِ..... : مجرموں کو ذلیل و خوار کرنے کے لیے کہا جائے گا کہ آج فیصلے کا دن ہے، جس میں ہم نے تمہیں اور تم سے پہلے سب جھلانے والوں کو جمع کر دیا ہے۔ دنیا میں تم زبردست چالیں چلتے اور سازشیں کرتے تھے، اب سب مل کر اپنے بچاؤ کی کوئی خفیہ تدبیر کر سکتے ہو تو کر لو۔ جسمانی عذاب کے ساتھ یہ ذہنی عذاب ہوگا۔

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي ظِلِّ وَعُيُونٍ ﴿۳۱﴾ وَفَوَاكِهِ مِمَّا يَشْتَهُونَ ﴿۳۲﴾ كُلُّوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيئًا
بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۳۳﴾ إِنْ كَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿۳۴﴾ وَيَلِيْ يَوْمَئِذٍ لِلنَّكَدِيِّنَ ﴿۳۵﴾ كُلُّوْا
وَ تَشْتَبُوْا قَلِيْلًا إِنْ كُمْ تُجْرِمُوْنَ ﴿۳۶﴾ وَيَلِيْ يَوْمَئِذٍ لِلنَّكَدِيِّنَ ﴿۳۷﴾ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ
ازْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَيَلِيْ يَوْمَئِذٍ لِلنَّكَدِيِّنَ ﴿۳۹﴾ فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَهُ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۴۰﴾

یقیناً پرہیزگار لوگ اس دن سایوں اور چشموں میں ہوں گے ﴿۳۱﴾ اور پھلوں میں، جس قسم میں سے وہ چاہیں گے ﴿۳۲﴾ مزے سے کھاؤ اور پیو، اس کے عوض جو تم کیا کرتے تھے ﴿۳۳﴾ یقیناً ہم نیکی کرنے والوں کو اسی طرح بدلا دیتے ہیں ﴿۳۴﴾ اس دن جھلانے والوں کے لیے بڑی ہلاکت ہے ﴿۳۵﴾ (اے جھلانے والو!) کھا لو اور تھوڑا سا فائدہ اٹھا لو، یقیناً تم مجرم ہو ﴿۳۶﴾ اس دن جھلانے والوں کے لیے بڑی ہلاکت ہے ﴿۳۷﴾ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جھک جاؤ تو وہ نہیں جھکتے ﴿۳۸﴾ اس دن جھلانے والوں کے لیے بڑی ہلاکت ہے ﴿۳۹﴾ پھر اس کے بعد وہ کس بات پر ایمان لائیں گے؟ ﴿۴۰﴾

آیت 41 تا 45: إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي ظِلِّ وَعُيُونٍ..... اب جھلانے والوں کے مقابلے میں متقین کو ملنے والی نعمتوں کا ذکر ہوتا ہے کہ وہ دھوپ کے سائے کے بجائے گھنے درختوں اور جنت کے مکانوں کے ٹھنڈے سایوں، چشموں اور اپنی پسند کے پھلوں میں عیش کر رہے ہوں گے۔ انھیں کہا جائے گا کہ مزے سے کھاؤ پیو، اس عمل کے بدلے میں جو تم کیا کرتے تھے۔ "وَيَلِيْ يَوْمَئِذٍ لِلنَّكَدِيِّنَ" جھلانے والوں کے لیے اس دن بڑی ہلاکت ہے کہ ان کی آنکھوں کے سامنے وہ لوگ عیش و آرام میں ہوں گے جنھیں وہ تمام عمر مذاق کرتے رہے اور یہ خود ان کے سامنے آگ میں جل رہے ہوں۔ "هَنِيئًا" جو کسی مشقت کے بغیر حاصل ہو جائے اور اسے کھانے کے بعد کسی قسم کی گرانی یا بدبھمی نہ ہو۔ (راغب) دنیا کے پھل مشقت سے ملتے ہیں اور کبھی موافق ہوتے ہیں، کبھی ناموافق، جبکہ جنت کے پھل سب موافق ہوں گے۔

آیت 46 تا 47: كُلُّوْا وَ تَشْتَبُوْا قَلِيْلًا.....: سورت کے آخر میں قیامت کو جھلانے والوں کو پھر خطاب ہے کہ دنیا میں کھا لو اور فائدہ اٹھا لو، یہ سامان بالکل قلیل ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿كُلُّ مَتَاعِ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ﴾ [النساء: ۷۷] "کہہ دے دنیا کا سامان بہت تھوڑا ہے۔" یقیناً تم مجرم ہو، قیامت کے دن تمہارے جیسے جھلانے والوں کے لیے بہت بڑی خرابی اور بربادی ہے۔

آیت 48 تا 49: وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ اَرْكَعُوْا.....: رکوع کا معنی جھکنا یعنی اللہ کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا ہے اور رکوع بول کر نماز بھی مراد لی جاتی ہے، کیونکہ رکوع اس کا ایک حصہ ہے، یعنی ان مکذبین کے جھلانے کا اصل سبب یہ ہے کہ وہ اللہ کے احکام کے سامنے جھکنے کے لیے تیار نہیں اور نہ ہی وہ نماز پڑھنے پر آمادہ ہیں، یہی کبر ان کے انکار کا باعث بن گیا ہے، جس طرح شیطان کے لیے بنا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایمان کا اصل اللہ کے سامنے جھک جانا ہے اور کفر کا اصل اللہ کے سامنے جھکنے سے انکار ہے اور ایسے لوگوں کے لیے قیامت کے دن بہت بڑی خرابی اور بربادی ہے۔

آیت 50: فَبِأَيِّ.....: یعنی قرآن جو اللہ کا اپنا کلام ہے اور جس کا انداز انتہائی مؤثر اور دل نشیں ہے، جس کی چھوٹی سے چھوٹی سورت کا جواب کوئی پیش کر سکا ہے نہ کر سکے گا، اس پر یہ کفار ایمان نہیں لاتے تو پھر وہ کون سی بات پر ایمان لائیں گے؟

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ ۝۱ عَنِ النَّبِیِّ الْعَظِیْمِ ۝۲ الَّذِیْ هُمْ فِیْهِ مُخْتَلِفُونَ ۝۳ كَلَّا سِیَعْلَمُونَ ۝۴
ثُمَّ كَلَّا سِیَعْلَمُونَ ۝۵ اَلَمْ یَجْعَلِ الْاَرْضَ مِیْثَاقًا ۝۶

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

کس چیز کے بارے میں وہ آپس میں سوال کر رہے ہیں؟ ① (کیا) اس بڑی خبر کے بارے میں؟ ② وہ کہ جس میں وہ اختلاف کرنے والے ہیں ③ ہرگز نہیں، عنقریب وہ جان لیں گے ④ پھر ہرگز نہیں، عنقریب وہ جان لیں گے ⑤ کیا ہم نے زمین کو فرش نہیں بنایا ⑥

آیت 1-3: ① عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ..... : اس سورت میں قیامت کے حق ہونے کے دلائل اور اس کے کچھ احوال بیان کیے گئے ہیں۔ جب رسول اللہ ﷺ نے توحید و رسالت پر ایمان لانے کی دعوت کے ساتھ ساتھ یہ بتایا کہ ایک دن تمہیں زندہ ہو کر اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے اور تمہیں تمام نیک و بد اعمال کی جزا ملنی ہے تو سننے والوں نے آپس میں سوال شروع کر دیے کہ کیا واقعی قیامت ہوگی؟ آیا یہ ممکن بھی ہے؟ پھر وہ قیامت کس طرح ہوگی؟ وغیرہ، اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

② ”النَّبِیِّ الْعَظِیْمِ“ سے مراد قیامت ہے۔ اس میں اختلاف یہ ہے کہ کوئی تو مانتا ہی نہیں کہ قیامت ہوگی، کوئی مانتا ہے مگر اسے یقین نہیں، کوئی کہتا ہے مٹی ہو جانے کے بعد دوبارہ کیسے زندہ ہو سکتے ہیں؟ یہ تو عقل ہی کے خلاف ہے اور کوئی کہتا ہے کہ جسم زندہ نہیں ہوں گے بلکہ سب خوشی اور غم روح ہی پر گزرے گا، وغیرہ وغیرہ۔

آیت 4-5: ① كَلَّا سِیَعْلَمُونَ..... : ”کَلَّا“ کا لفظ عربی میں عموماً اپنے سے پہلے والے کلام کو غلط اور بعد والے کلام کو صحیح قرار دینے کے لیے آتا ہے۔ مطلب یہ کہ قیامت کے متعلق اختلاف ڈالنا، انکار کرنا یا شک کرنا بالکل غلط ہے اور اس کا آنا بالکل یقینی ہے۔

② سِیَعْلَمُونَ: ”عنقریب وہ جان لیں گے“، یعنی اگر ان کی عقل قیامت کو نہیں مانتی اور اس میں یہ لوگ اختلاف کر رہے ہیں تو مرنے سے تو نہ یہ انکار کر سکتے ہیں، نہ شک کر سکتے ہیں اور نہ ہی اس میں کسی کا اختلاف ہے، تو بس مرنے کی دیر ہے، اس کے ساتھ ہی قیامت اور دوسری تمام حقیقتیں جنہیں یہ لوگ خلاف عقل قرار دے رہے ہیں، سب ان کی آنکھوں کے سامنے آ جائیں گی۔ تاکید کے لیے دوبارہ ”ثُمَّ كَلَّا سِیَعْلَمُونَ“ فرمایا ہے۔

آیت 6: ① اَلَمْ یَجْعَلِ الْاَرْضَ مِیْثَاقًا : اللہ تعالیٰ نے قیامت کا یقین دلانے کے لیے اور ان کی عقلوں کو جنموڑنے کے لیے اپنی قدرت کے چند عجائب پیش فرمائے ہیں کہ عقل سے پوچھو کہ اتنے بڑے بڑے کام کرنے والے کے لیے تمہیں دوبارہ زندہ کرنا کیا مشکل ہے؟ اور وہ عجائب بھی خود تمہارے گرد و پیش اور تمہاری ذات میں موجود ہیں۔

وَأَنْزَلْنَا مِنَ السُّعِيرِ مَاءً ثَجَاجًا ﴿۱۴﴾ تَنْخَرِجَ بِهِ حَبًّا وَ نَبَاتًا ﴿۱۵﴾ وَ جِئْتِ الْفَلَاقَا ﴿۱۶﴾
 إِنَّ يَوْمَ الْفُضْلِ كَانَ مِيقَاتًا ﴿۱۷﴾ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّورِ فَتَأْتُونَ أَفْوَاجًا ﴿۱۸﴾ وَ فُتِحَتْ
 السَّمَاءُ فَكَانَتْ أَبْوَابًا ﴿۱۹﴾ وَ سُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ﴿۲۰﴾

اور ہم نے بدلیوں سے کثرت سے برسنے والا پانی اتارا ﴿۱۴﴾ تاکہ ہم اس کے ساتھ غلہ اور پودے اگائیں ﴿۱۵﴾ اور گھنے باغات ﴿۱۶﴾ یقیناً فیصلے کا دن ایک مقرر وقت ہے ﴿۱۷﴾ جس دن صور میں پھونکا جائے گا، تو تم فوج در فوج چلے آؤ گے ﴿۱۸﴾ اور آسمان کھولا جائے گا تو وہ دروازے دروازے ہو جائے گا ﴿۱۹﴾ اور پہاڑ چلائے جائیں گے تو وہ سراب بن جائیں گے ﴿۲۰﴾ مسلسل دیکھنے کی حماقت کر بیٹھے تو نظر ہی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

آیت 14-16: وَأَنْزَلْنَا مِنَ السُّعِيرِ مَاءً ثَجَاجًا...: "السُّعِيرِ" وہ بادل جو پانی سے بھرے ہوئے ہوں۔ "ثَجَجٌ" شدت اور کثرت سے بہنا یا بہانا۔ یہ لازم و متعدی دونوں معنوں میں آتا ہے۔ "ثَجَاجًا" کثرت سے برسنے والا۔ "الْفَلَاقَا" ابو عبیدہ نے فرمایا: "یہ" تَفِيفٌ "کی جمع ہے، جیسا کہ "شَرِيفٌ" کی جمع "أَشْرَافٌ" ہے۔" (المرآفی) اس کا معنی ہے گھنے، ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے، جن میں کوئی قاصد نہیں۔

آیت 17: إِنَّ يَوْمَ الْفُضْلِ كَانَ مِيقَاتًا: یعنی ہم نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا بنانے سے لے کر آخر آیات تک مذکور جو کچھ بنایا ہے، اگر دنیا کی پیدائش سے لے کر اس کے ختم ہونے تک اس میں جو نیکی یا بدی کی گئی ہے اس کی جزا و سزا کسی وقت بھی نہ ہو، نہ ظالم سے باز پرس ہو اور نہ مظلوم کی وادری ہو تو یہ سب کچھ تو بے نتیجہ رہا۔ اس لیے یقین رکھو کہ دنیا میں کیے گئے تمام اعمال کے فیصلے کے لیے ایک دن مقرر ہے۔ اسی مضمون کو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمایا ہے: ﴿وَحَلَقَ اللَّهُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ وَ يُبْجِزُ كُلَّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُونَ﴾ (احزابہ: ۲۲) "اور اللہ نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا فرمایا اور تاکہ ہر جان کو اس کی کمائی کا بدلہ دیا جائے اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔"

آیت 18: يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّورِ فَتَأْتُونَ أَفْوَاجًا: یہاں صور میں دوسری دفعہ پھونکے جانے کا ذکر ہے، جس سے تمام لوگ قبروں سے نکل کر گروہ در گروہ میدانِ محشر میں آجائیں گے۔

آیت 19: وَ فُتِحَتْ السَّمَاءُ فَكَانَتْ أَبْوَابًا: آسمان میں اب بھی دروازے موجود ہیں، جیسا کہ سورہ اعراف (۳۰) میں ہے اور حدیث معراج میں بھی اس کا ذکر ہے، مگر اس وقت آسمان اس طرح پھٹے گا جیسے وہ سارے کا سارا دروازوں کی شکل اختیار کر گیا ہے اور یہ پھٹنا فرشتوں کے اتارے جانے کے لیے ہوگا، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ يَوْمَ تُنْفَخُ السَّمَاءُ بِأَنْعَامٍ وَ نُزُلِ الْمَلَائِكَةِ تَنْزِيلًا﴾ (المرقاہ: ۲۰) "جس دن آسمان بادل کے ساتھ پھٹ جائے گا اور فرشتے لگاتار اتارے جائیں گے۔"

آیت 20: ۱: وَ سُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا: "سَرَابًا" جو دوپہر کے وقت دور سے دیکھنے والے کو پانی کی طرح نظر

إِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا ۖ لِلظَّالِمِينَ مَأْبَأًا ۖ لِيُثَبِّتَ فِيهَا أَحْقَابًا ۖ

یقیناً جہنم ہمیشہ سے ایک گھات کی جگہ ہے ۱۸ سرکشوں کے لیے ٹھکانا ہے ۱۹ وہ مدتوں اسی میں رہنے والے ہیں ۲۰ آتا ہے مگر حقیقت میں کچھ نہیں ہوتا، اسی طرح پہاڑ ریت بن جائیں گے جو دور سے پانی کی طرح نظر آتی ہے مگر حقیقت میں ایسا کچھ بھی نہیں ہوتا۔

۲۱ قرآن میں قیامت کے دن پہاڑوں پر گزرنے والے مختلف احوال بیان ہوئے ہیں، سب سے پہلے صور کی آواز کے ساتھ زمین اور پہاڑ ایک چوٹ سے توڑ دیے جائیں گے، فرمایا: ﴿ وَحِيلَتِ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَاحِدَةً ۖ ﴾ [الحاقة: ۱۴] "اور زمین اور پہاڑوں کو اٹھایا جائے گا اور دونوں ایک ہی بار ٹکرا دیے جائیں گے۔" پھر بھر بھری ریت ہو جائیں گے جو خود بخود گرتی جا رہی ہو، فرمایا: ﴿ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيبًا مَّهِيلًا ۖ ﴾ [المزمل: ۱۴] "اور پہاڑ گرائی ہوئی ریت کے ٹیلے ہو جائیں گے۔" پھر ڈھکی ہوئی اون کی طرح ہو جائیں گے، فرمایا: ﴿ وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوشِ ۖ ﴾ [القارعة: ۵] "اور پہاڑ ڈھکی ہوئی رنگین اون کی طرح ہو جائیں گے۔" پھر بکھرا ہوا غبار بن جائیں گے، فرمایا: ﴿ فَكَانَتْ هَبَاءً مُّطْبَقًا ۖ ﴾ [الواقعة: ۶] "پس وہ پھیلا ہوا غبار بن جائیں گے۔" پھر بادلوں کی طرح چلیں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَهِيَ تَكْمُرُ الْوَجْهَ ۖ ﴾ [النمل: ۸۸] "حالانکہ وہ بادلوں کے چلنے کی طرح چل رہے ہوں گے۔" پھر سراب بن جائیں گے، جیسے یہاں فرمایا ہے، پھر ان میں سے کچھ بھی نہیں رہے گا، فقط چٹیل زمین رہ جائے گی جس میں کوئی بلندی یا پستی نہیں ہوگی، جیسا کہ فرمایا: ﴿ فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ۖ لَا تَرَى فِيهَا عِوَجًا وَلَا أَمْتًا ۖ ﴾ [طہ: ۱۰۶، ۱۰۷] "پھر وہ اسے ایک چٹیل میدان بنا کر چھوڑے گا، جس میں تو نہ کوئی کجی دیکھے گا اور نہ کوئی ابھری ہوئی جگہ۔"

آیت 22-21: ﴿ إِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا ﴾ : یہاں سے جہنم اور اہل جہنم کا کچھ حال بیان ہوتا ہے۔ "مِرْصَادًا" (گھات) اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں کسی دشمن یا شکار پر قابو پانے کے لیے تاک لگائی جاتی ہے، تاکہ وہ بے خبری میں آکر پھنس جائے۔ یعنی سرکش لوگ اللہ سے بے خوف ہو کر دنیا میں فساد مچا رہے ہیں، مگر انھیں یاد نہیں کہ جہنم ان کے لیے ایک ایسی چھپی ہوئی گھات ہے جس میں وہ اچانک پھنسیں گے اور پھر وہی ان کے لیے ہمیشہ کا ٹھکانا ہوگی۔

آیت 23: ﴿ لِيُثَبِّتَ فِيهَا أَحْقَابًا: "أَحْقَابًا" "حُفْب" (حاء کے ضمہ اور قاف کے سکون کے ساتھ) کی جمع ہے، اسٹی (۸۰) سال یا اس سے زیادہ مدت، زمانہ، سال۔ (قاموس) یعنی مدتوں، کئی زمانے، سالہا سال اس میں پڑے رہیں گے، ایک مدت ختم ہونے پر دوسری مدت شروع ہو جائے گی، ایسی مدتیں جن کی کوئی انتہا نہیں ہوگی۔ یہ مطلب نہیں کہ کچھ مدتوں کے بعد عذاب کم یا ختم ہو جائے گا، کیونکہ اسی سلسلہ کلام میں آگے چل کر فرمایا: ﴿ فَذُوقُوا فَلَئِنْ تَزِيدَكُمْ إِلَّا عَذَابًا ۖ ﴾ [النبا: ۳۰] "پس چکھو کہ ہم تمہیں عذاب کے سوا ہرگز کسی چیز میں زیادہ نہیں کریں گے۔"

لَا يَذُوقُونَ فِيهَا بَرْدًا وَلَا شَرَابًا ۗ إِلَّا حَسِيئًا وَّعَسَاۗفًا ۗ جَزَاءً وَّفَاقًا ۗ إِنَّهُمْ كَانُوا
لَا يَرْجُونَ حِسَابًا ۗ وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا كِذَابًا ۗ وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ كِتَابًا ۗ فَذُوقُوا
فَلَنْ نَزِيدَكُمْ إِلَّا عَذَابًا ۗ إِنَّ لِلْمُتَّقِينَ مَقَازًا ۗ حَدَآئِقَ وَّاعْتَابًا ۗ وَكَوَاعِبَ
أَشْرَابًا ۗ وَكَأْسًا دِهَاقًا ۗ

نہ اس میں کوئی ٹھنڈ چمکیں گے اور نہ کوئی پینے کی چیز ۲۷ مگر گرم پانی اور بہتی پیپ ۲۸ پورا پورا بدلا دینے کے لیے ۲۹ بلاشبہ وہ کسی حساب کی امید نہیں رکھتے تھے ۳۰ اور انھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا، بری طرح جھٹلانا ۳۱ اور ہر چیز، ہم نے اسے لکھ کر محفوظ کر رکھا ہے ۳۲ بس چکھو کہ ہم تمہیں عذاب کے سوا ہرگز کسی چیز میں زیادہ نہیں کریں گے ۳۳ یقیناً پرہیزگاروں کے لیے ایک بڑی کامیابی ہے ۳۴ باغات اور انگور ۳۵ اور ابھری چھاتیوں والی ہم عمر لڑکیاں ۳۶ اور چھلکتے ہوئے پیالے ۳۷

آیت 24، 26: لَا يَذُوقُونَ فِيهَا بَرْدًا.....: ”حَسِيئًا“ اور ”عَسَاۗفًا“ کی تشریح کے لیے دیکھیے سورہ ص (۵۷) کی تفسیر۔
”بَرْدًا“ سے مراد خوش گوار ٹھنڈک ہے۔ جہنم میں ایک طبقہ زمہریر بھی ہے جہاں بے انتہا سردی ہے، اسے مزے کی ٹھنڈک نہیں کہہ سکتے۔ (وحیدی)

آیت 27، 28: إِنَّهُمْ كَانُوا لَا يَرْجُونَ.....: ان کے جہنم میں جانے کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ انہیں اعمال کے حساب کی امید نہ تھی، ورنہ وہ اپنے اعمال کو درست کر لیتے اور دوسری یہ کہ انھوں نے ہماری آیات کو بری طرح جھٹلادیا۔ ”كَذَّبُوا“ مصدر ہے ”كَذَّبُوا“ کا، اس کے ساتھ ”كَذَّبُوا“ کی تاکید فرمائی ہے۔ ترجمے میں اس تاکید کو ”بری طرح“ کے لفظ سے ادا کیا گیا ہے۔

آیت 30: فَذُوقُوا فَلَنْ نَزِيدَكُمْ إِلَّا عَذَابًا: یعنی جس طرح تم کفر و تکذیب میں برابر بڑھتے چلے گئے اسی طرح ہم بھی تمہارا عذاب برابر بڑھاتے رہیں گے اور کسی لمحہ اس میں تخفیف نہیں کریں گے۔ دیکھیے سورہ نساء (۵۶) اور سورہ نبی اسرائیل (۹۷)۔

آیت 31: إِنَّ لِلْمُتَّقِينَ مَقَازًا: جہنم اور جہنمیوں کے بعد جنت اور جنتیوں کا ذکر ہے۔ یہاں متقین کا ذکر ان لوگوں کے مقابلے میں آیا ہے جنہیں کسی حساب کی توقع نہ تھی اور جنہوں نے اللہ کی آیات کو بالکل جھٹلادیا تھا، یعنی اعمال کے حساب سے ڈرنے والوں اور کفر و تکذیب سے ڈرنے والوں کے لیے ایک بڑی کامیابی ہے۔ ”مَقَازًا“ مصدر ہو تو معنی ہے ”کامیابی“ اور ظرف ہو تو معنی ہے ”کامیابی کا مقام۔“ ”مَقَازًا“ میں توین ”ایک بڑی“ کا مفہوم ادا کر رہی ہے۔

آیت 32، 34: حَدَآئِقَ وَّاعْتَابًا.....: ”حَدَآئِقَ“ کی جمع ہے، وہ باغ جس کے گرد چار دیواری ہو۔

لَا يَسْعُونَ فِيهَا لَعْوًا وَلَا كِذْبًا ۖ جَزَاءً مِّن رَّبِّكَ عَطَاءٌ حِسَابًا ۝ رَبِّ السَّمَوَاتِ
وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الرَّحْمَنُ لَا يَمْلِكُونَ مِنْهُ خِطَابًا ۝ يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلَائِكَةُ
صَفًّا ۖ لَا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَنُ وَقَالَ صَوَابًا ۝

وہ اس میں نہ کوئی بے ہودہ بات سنیں گے اور نہ (ایک دوسرے کو) جھٹلانا ۱۵ تیرے رب کی طرف سے بدلے میں ایسا عطیہ ہے جو کافی ہوگا ۱۶ (اس رب کی طرف سے) جو آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی ہر چیز کا رب ہے، بے حد رحم والا، وہ اس سے کوئی بات کرنے کی قدرت نہیں رکھیں گے ۱۷ جس دن روح اور فرشتے صف بنا کر کھڑے ہوں گے، وہ کلام نہیں کریں گے، مگر وہی جسے رحمان اجازت دے گا اور وہ درست بات کہے گا ۱۸

”اَعْتَابًا“ ”عَنْبٌ“ کی جمع ہے۔ انکو کو پھلوں میں ایک خصوصیت حاصل ہے، اس لیے اس کا ذکر خاص طور پر فرمایا۔ ”اَعْتَابًا“ جمع لانے کا مطلب ہے کہ انکو کی بہت سی اقسام ہوں گی۔ ”كَوَاعِبٌ“ ”كَاعِبٌ“ کی جمع ہے، وہ نوجوان لڑکی جس کا سینہ ایسے ابھرا ہوا ہو جیسے کعب یعنی ٹخنہ۔ ”اَثْرَابًا“ ”بُرْبٌ“ (تاء کے کسرہ کے ساتھ) کی جمع ہے، مٹی میں ساتھ کھینے والے ہم عمر۔ آپس میں ہم عمر ہوں گی یا اپنے خاوندوں کی ہم عمر ہوں گی۔

آیت 35 لَا يَسْعُونَ فِيهَا لَعْوًا وَلَا كِذْبًا: جنت کی نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت یہ ہے کہ آدمی کے کان وہاں نہ کوئی بے ہودہ بات سنیں گے اور نہ یہ سنیں گے کہ کوئی کسی کو جھوٹا کہہ رہا ہے۔ کوئی کسی سے جھگڑے گا ہی نہیں کہ اس کی بات کو جھٹلائے۔ گالی گلوچ اور دنگا فساد کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس نعمت کی قدر وہی جانتا ہے جسے ان کاموں سے نفرت ہو، پھر اس کا واسطہ بے ہودہ جتنے والوں اور ایک دوسرے کو جھٹلانے والے بدتمیزوں سے رہتا ہو۔

آیت 36 37 ① جَزَاءً مِّن رَّبِّكَ عَطَاءٌ حِسَابًا : یہ سب کچھ ان کے رب کی طرف سے ان کے اعمال کا بدلا ہے۔ بدلا دینے والا رب تعالیٰ ہو تو بدلا کتنا عظیم ہوگا، پھر برابر بدلا ہی نہیں، دس گنا سے لے کر سات سو گنا بلکہ اس سے بھی بڑھا کر لامحدود گنا عطیہ ملے گا۔ البتہ گناہ کا بدلا اتنا ہی ہوگا جتنا گناہ ہے۔

② عَطَاءٌ حِسَابًا: اس کے دو معنی ہیں، پہلا یہ کہ وہ عطیہ حساب سے ہوگا، یعنی ان کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا عمل بھی ایسا نہ ہوگا جو حساب میں نہ آئے۔ دوسرا معنی ہے ”کافی عطیہ۔“ جیسے ”حَسْبِيَ اللَّهُ“ کا معنی ہے مجھے اللہ کافی ہے، یعنی اتنا بدلا ہوگا جس سے زیادہ کی خواہش نہیں ہوگی۔

③ لَا يَمْلِكُونَ مِنْهُ خِطَابًا: یعنی انتہائی لطف و رحمت کے باوجود قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کا جلال اس قدر ہوگا کہ کوئی اس کے سامنے لب کشائی نہیں کر سکے گا۔ (اشرف المحاشی)

آیت 35 ① يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلَائِكَةُ صَفًّا: ”الرُّوحُ“ سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿نَزَّلَ بِهِ

ذَلِكَ الْيَوْمِ الْحَقِّ ۚ فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِ مَا بَاءً ﴿۳۹﴾

یہی دن ہے جو حق ہے، پس جو چاہے اپنے رب کی طرف لوٹنے کی جگہ بنا لے ﴿۳۹﴾

الرُّؤُوفِ الْأَمِينِ ﴿﴾ [الشعراء: ۱۹۳] ”اس (قرآن) کو امانت دار روح لے کر اتر رہے۔“ ان کا الگ ذکر ان کی شان کی عظمت کے اظہار کے لیے کیا گیا ہے، جیسا کہ سورہ بقرہ میں ہے: ﴿مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَرُسُلِهِ وَجِبْرِيلَ وَمِيكَالَ فَإِنَّ اللَّهَ عَدُوٌّ لِلْكَافِرِينَ﴾ [البقرة: ۹۸] ”جو کوئی اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبریل اور میکال کا دشمن ہو تو بے شک اللہ سب کافروں کا دشمن ہے۔“ دوسرا معنی جو لفظ سے ظاہر ہے بنو آدم کی ارواح ہیں۔

﴿۳۹﴾ صحیح احادیث کے مطابق یہ اس وقت کا ذکر ہے جب اللہ تعالیٰ نیک و بد کے فیصلے کے لیے آسمان سے زمین پر میدان محشر میں نزول فرمائے گا اور لوگ سورج کی گرمی اور پسینے سے گھبرا جائیں گے اور وہ آدم علیہ السلام سے لے کر عیسیٰ علیہ السلام تک سب انبیاء کے پاس جائیں گے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے سفارش کریں کہ حساب کتاب شروع ہو، لیکن کسی نبی کی جرأت اور طاقت اللہ تعالیٰ سے بات کرنے کی نہ ہوگی۔ آخر کار خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ کو بات کرنے کا حکم ہوگا اور آپ کی شفاعت سے سب لوگوں کا حساب شروع ہوگا۔ (احسن التفسیر) دیکھیے صحیح بخاری (۷۴۳۰، ۷۵۱۰)۔

﴿۳۹﴾ لَا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ : قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے بات (سفارش) کرنے والے کے لیے دو شرطیں ہیں، پہلی یہ کہ رحمان اسے بات (سفارش) کرنے کی اجازت دے، جیسا کہ فرمایا: ﴿مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ﴾ [البقرة: ۲۵۵] ”کون ہے جو اس کے پاس اس کی اجازت کے بغیر سفارش کرے؟“ دوسری یہ کہ وہ درست بات کرے، سفارش کرنے میں غلطی نہ کرے۔ مثلاً غیر مستحق کی سفارش نہ کر بیٹھے، جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام اپنے والد آزر کے لیے سفارش نہیں کر سکیں گے۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ جس کے حق میں اللہ تعالیٰ سے بات کی جائے اس کے لیے دو شرطیں ہیں، پہلی یہ کہ رحمان اس کے حق میں سفارش کرنے کی اجازت دے، جیسا کہ فرمایا: ﴿لَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنْ ارْتَضَىٰ﴾ [الانبیاء: ۲۸] ”وہ فرشتے صرف اسی کے لیے سفارش کرتے ہیں جسے رحمان پسند کرے۔“ دوسری یہ کہ ”قَالَ صَوَابًا“ یعنی دنیا میں اس نے درست بات کہی ہو، یعنی کلمہ توحید کہا ہو، مسلمان ہو۔ کافر و مشرک نے دنیا میں درست بات نہیں کہی ہوتی، اس لیے اس کے حق میں سفارش کی اجازت نہیں ملے گی۔ (جامع البیان)

﴿۳۹﴾ ذٰلِكَ الْيَوْمِ الْحَقِّ : یہ وہ دن ہے جو حق ہے، یعنی آ کر رہے گا۔ تو جب اس دن کا آنا یقینی ہے تو آدمی کو چاہیے کہ اپنے مولا کو منہ دکھانے کے قابل بننے اور اس کے پاس ٹھکانا بنانے کے لیے ابھی تیاری کر لے، مرنے کے بعد اس کا موقع نہیں ملے گا۔

إِنَّا أَنْذَرْنَاكُمْ عَذَابًا قَرِيبًا ۖ يَوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدَاهُ وَيَقُولُ الْكَافِرُ
يَلَيْتَنِي كُنْتُ تُرَابًا ﴿٤٠﴾

بلاشبہ ہم نے تمہیں ایک ایسے عذاب سے ڈرا دیا ہے جو قریب ہے، جس دن آدمی دیکھ لے گا جو اس کے دونوں ہاتھوں نے آگے بھیجا اور کافر کہے گا اے کاش کہ میں مٹی ہوتا ﴿۴۰﴾

آیت 40 ﴿٤٠﴾ إِنَّا أَنْذَرْنَاكُمْ عَذَابًا قَرِيبًا..... : آخرت کے عذاب کو قریب فرمایا، کیونکہ عمر خواہ کتنی بھی ہو ختم ہونے والی ہے اور ہر آنے والا وقت قریب ہی ہوتا ہے۔ قیامت کو جب انھیں گے تو انھیں دنیا میں قیام کا وقت ایسے معلوم ہوگا جیسے دن کا ایک پہر گزرا ہو۔ (دیکھیے نازعات: ۴۶) بلکہ قیامت کے دن مجرم قسم اٹھا کر کہیں گے کہ ہم دنیا میں ایک گھڑی سے زیادہ نہیں رہے۔ دیکھیے سورہ روم (۵۵)۔

﴿٤١﴾ يَلَيْتَنِي كُنْتُ تُرَابًا : اے کاش کہ میں مٹی ہوتا، یعنی پیدا ہی نہ ہوا ہوتا، نہ حساب ہوتا نہ کتاب۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ کاش! میں مر کر مٹی ہو جاتا تو نہ حساب ہوتا نہ عذاب۔ بعض مفسرین نے ایک عجیب معنی کیا ہے کہ ”الْكَافِرُ“ سے مراد یہاں ابلیس ہے۔ جب آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد کو ان کے اعمال کا ثواب ملے گا تو ابلیس کہے گا کاش! میں مٹی ہوتا، آگ سے بنا ہوا نہ ہوتا، کیونکہ اس نے آگ سے بنا ہوا ہونے کی وجہ سے آدم کو سجدہ کرنے کا حکم ٹھکرا دیا تھا۔ [زاد المسیر لابن جوزی] پہلے معنوں کے ساتھ یہ بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔





وَالذُّرْعَتِ غَرْقًا ۱ وَالنَّشِطِ نَشْطًا ۲ وَالشَّيْحَتِ سَبْحًا ۳ فَالشَّيْبَتِ سَبْحًا ۴

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

ان (فرشتوں) کی قسم جو ڈوب کر سختی سے (جان) کھینچ لینے والے ہیں! ① اور جو بند کھولنے والے ہیں! آسانی سے کھولنا ② اور جو تیرنے والے ہیں! تیزی سے تیرنا ③ پھر جو آگے نکلنے والے ہیں! آگے بڑھ کر ④

آیت 2.1 وَالذُّرْعَتِ غَرْقًا.....: "الذُّرْعَتِ" اور "النَّشِطِ" سے مراد سختی اور آسانی کے ساتھ جان نکالنے والے فرشتے

ہیں۔ اگرچہ ان الفاظ کی تفسیریں اور بھی کی گئی ہیں، مگر تفسیر طبری میں حسن سندوں کے ساتھ ابن عباس اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے یہی تفسیر مروی ہے اور صحیح احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، جیسا کہ مسند احمد میں براء بن عازب رضی اللہ عنہما سے ایک طویل حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «وَإِنَّ الْعَبْدَ الْمُؤْمِنَ إِذَا كَانَ فِي انْقِطَاعٍ مِنَ الدُّنْيَا..... ثُمَّ يَجِيءُ مَلَكُ الْمَوْتِ عَلَيْهِ السَّلَامُ حَتَّى يَجْلِسَ عِنْدَ رَأْسِهِ فَيَقُولُ أَيَّتُهَا النَّفْسُ الطَّيِّبَةُ! أَخْرَجِي إِلَى مَغْفِرَةٍ مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانٍ قَالَ فَتَخْرُجُ تَسِيلٌ كَمَا تَسِيلُ الْقَطْرَةُ مِنْ فِي السَّمَاءِ..... وَإِنَّ الْعَبْدَ الْكَافِرَ إِذَا كَانَ فِي انْقِطَاعٍ مِنَ الدُّنْيَا..... ثُمَّ يَجِيءُ مَلَكُ الْمَوْتِ حَتَّى يَجْلِسَ عِنْدَ رَأْسِهِ فَيَقُولُ أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْحَبِيبَةُ! أَخْرَجِي إِلَى سَخَطٍ مِنَ اللَّهِ وَغَضَبٍ قَالَ فَتَفْرُقُ فِي حَسَدِهِ فَيَنْزِعُهَا كَمَا يُنْزِعُ السَّفُودَ مِنَ الصُّوفِ الْمَبْلُولِ» [مسند احمد: ۲۸۷/۴، ۲۸۸، ح: ۱۸۵۶۱] "اور مومن آدمی جب دنیا سے رخصت ہونے کو ہوتا ہے..... تو ملک الموت علیہ السلام اس کے سر کے پاس آ کر بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے: "اے پاکیزہ جان! اللہ کی مغفرت اور رضا کی طرف نکل آ۔" تو وہ اس طرح نکل آتی ہے جس طرح مشکیزے سے پانی کا قطرہ نکلتا ہے..... اور کافر جب دنیا سے رخصت ہونے کو ہوتا ہے..... تو ملک الموت اس کے سر کے پاس آ کر بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے: "اے خبیث جان! اللہ کی ناراضی اور غصے کی طرف نکل آ۔" تو وہ جسم میں بکھر جاتی ہے تو وہ اسے اس طرح سختی سے کھینچ کر نکالتا ہے جس طرح بھیگی ہوئی اون سے گرم سلاخ کھینچ کر نکالی جاتی ہے۔" مشکوٰۃ میں شیخ البانی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔

"الذُّرْعَتِ" سختی سے کھینچ کر نکالنے والے۔ "غَرْقًا" "ڈوب کر۔" یعنی ان فرشتوں کی قسم جو کفار کی جان ڈوب کر یعنی ان کے بدن کے ہر حصے میں پہنچ کر سختی سے کھینچ کر نکالتے ہیں، جب کہ وہ نکلنا نہیں چاہتی۔ "النَّشِطِ" "نَشْطُ الْعِقَالِ" (ن) ربی کی گرہ کھولنا۔ فرشتے مسلمان کی روح گرہ کھول کر نکالتے ہیں اور وہ خوشی سے اللہ کی مغفرت اور جنت کی طرف دوڑتی ہے۔ کافر اور مومن کا یہ فرق روح کی حالت میں ہے، بدن کی تکلیف الگ ہے، اس میں مسلمان اور کافر برابر ہیں۔ (خلاصہ موضح)

آیت 4.3 وَالشَّيْحَتِ سَبْحًا.....: "سَبَحَ يَسْبُحُ سَبْحًا" (ف) تیرنا۔ "الشَّيْحَتِ" تیرنے والے۔

قَالُمَدَّبَرَاتٍ أَمْرًا ۝ يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ۝ تَتَّبِعَهَا الِّزَادِقَةُ ۝ قُلُوبٌ يُّوْمِيذٍ
وَاجِفَةُ ۝ أَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ ۝

پھر جو کسی کام کی تدبیر کرنے والے ہیں! ۝ جس دن ہلا ڈالے گا سخت ہلانے والا (زلزلہ) ۝ اس کے بعد ساتھی
پچھے آنے والا (زلزلہ) آئے گا ۝ کئی دل اس دن دھڑکنے والے ہوں گے ۝ ان کی آنکھیں جھکی ہوئی ہوں گی ۝
”سَبِيحًا“ مصدر تاکید کے لیے ہے، ترجمہ میں یہ مفہوم ”خوب تیزی سے“ کے الفاظ سے ادا کیا گیا ہے۔ مراد وہ فرشتے
ہیں جو احکام الہی کی تعمیل کے لیے تیزی سے آسمان میں تیرتے ہوئے جاتے ہیں اور ایک دوسرے سے آگے بڑھتے
جاتے ہیں۔

آیت 5 .. قَالُمَدَّبَرَاتٍ أَمْرًا : پھر دین و دنیا کے جس کام کا انھیں حکم دیا ہوتا ہے اس کی تدبیر کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں
جن چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے یا تو ان کی ٹڈت کی طرف توجہ دلانا مقصود ہوتا ہے یا انھیں بعد میں آنے والے جو آپ قسم کی
شہادت کے طور پر ذکر کیا جاتا ہے۔ یہاں جو آپ قسم صاف لفظوں میں مذکور نہیں مگر قیامت کے احوال ذکر کرنے سے خود بخود
سمجھ میں آ رہا ہے کہ یہ قسمیں اس بات کا یقین دلانے کے لیے کھائی گئی ہیں کہ قیامت قائم ہو کر رہے گی۔ اہل عرب فرشتوں
کا اللہ کی طرف سے قبض ارواح اور دوسرے معاملات کی تدبیر پر مامور ہوتا مانتے تھے۔ فرشتوں کے یہ اوصاف ذکر کر کے ان
کی قسم اس بنا پر کھائی گئی ہے کہ فرشتے جس اللہ کے حکم سے روح قبض کر سکتے ہیں، نہایت تیزی سے کائنات میں نقل و حرکت
کر سکتے ہیں اور کائنات کے معاملات کی تدبیر کر سکتے ہیں، اسی اللہ کے حکم سے صور میں پھونک کر اس کائنات کو فنا بھی کر سکتے
ہیں اور دوبارہ پھونک کر اسے نوزندہ بھی کر سکتے ہیں۔

آیت 7.6 : يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ : قاموس میں ہے: ”رَجَفَ حَرَكًا وَ نَحْرًا وَ اضْطَرَبَ شَدِيدًا“ یعنی
”رَجَفَ“ کا معنی سخت حرکت کرنا اور حرکت دینا دونوں آتے ہیں۔ یہاں حرکت دینا زیادہ مناسب ہے۔ ”الرَّاجِفَةُ“ سے
مراد پہلی دفعہ صور میں پھونکنے جانے سے برپا ہونے والا زلزلہ ہے جس سے ہر چیز نئی ہو جائے گی۔ ”الزَّادِقَةُ“ سے مراد
دوسرے دفعہ سے برپا ہونے والا زلزلہ ہے جس سے تمام لوگ زندہ ہو کر اسے نوزندہ ہوں گے۔ سورہ زمر
(۶۸) میں بھی انہیں دونوں نفلوں کا ذکر ہے۔

آیت 9.8 : قُلُوبٌ يُّوْمِيذٍ وَاجِفَةُ : کئی دل اس دن دھڑک رہے ہوں گے، یعنی سخت خوف زدہ ہوں گے۔ ”کئی
دل“ اس لیے فرمایا کہ صالح مومن اس دن کی گھبراہٹ سے محفوظ رہیں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿لَا يَحْزَنُهُمُ الْقَرْعُ الْاَلْكَبْرُ﴾
[الانبیاء: ۱۰۳] ”(اس دن) سب سے بڑی گھبراہٹ انھیں غمگین نہیں کرے گی۔“ دلوں اور آنکھوں کا حال بیان کرنے
سے اس دن کفار کی ظاہری اور باطنی پریشانی کی مکمل تصویر سامنے آگئی۔

يَقُولُونَ ءَاِنَّا لَمَزْدُوذُونَ فِي الْحَافِرَةِ ۝۱۱ ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّجِرَةً ۝۱۱ قَالُوا تِلْكَ اِذَا
 كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ۝۱۲ فَاِنَّمَا هِيَ رُجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ۝۱۳ فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ ۝۱۴ هَلْ اَتَتْكَ حَدِيثُ
 مُوسَى ۝۱۵ اِذْ نَادَاهُ رَبُّهُ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝۱۶ اِذْ هَبَّ اِلَى فِرْعَوْنَ اِنَّهُ طَغَى ۝۱۷
 فَقُلْ هَلْ لَكَ اِلَى اَنْ تَزْكٰى ۝۱۸ وَاَهْدِيْكَ اِلَى رَبِّكَ فَتَعْبُدْهُ ۝۱۹

یہ لوگ کہتے ہیں کیا بے شک ہم یقیناً پہلی حالت میں لوٹائے جانے والے ہیں؟ ۱۱ کیا جب ہم بوسیدہ ہڈیاں ہو جائیں گے ۱۱ انہوں نے کہا یہ تو اس وقت خسارے والا لوٹنا ہوگا ۱۲ پس وہ تو صرف ایک ہی ڈانٹ ہوگی ۱۳ پس ایک لخت وہ زمین کے اوپر موجود ہوں گے ۱۴ کیا تیرے پاس موسیٰ کی بات سچھی ہے؟ ۱۵ جب اس کے رب نے اسے مقدس وادی طویٰ میں پکارا ۱۶ فرعون کے پاس جا، یقیناً وہ حد سے بڑھ گیا ہے ۱۷ پس کہہ کیا تجھے اس بات کی کوئی رغبت ہے کہ تو پاک ہو جائے؟ ۱۸ اور میں تیرے رب کی طرف تیری راہ نمائی کروں، پس تو ڈر جائے ۱۹

آیت 10-11: ﴿يَقُولُونَ ءَاِنَّا لَمَزْدُوذُونَ فِي...﴾: ”کیا جب ہم بوسیدہ ہڈیاں ہو جائیں گے تو دوبارہ پہلی حالت میں لوٹائے جائیں گے؟“ یہ کہنا رسول اللہ ﷺ کے زمانے کے منکرین قیامت کا تھا، آج کے مادہ پرست بھی یہی کہتے ہیں، ان کے خیال میں ہڈیاں بوسیدہ ہونے کے بعد انسان کا دوبارہ زندہ ہونا ناممکن ہے۔

آیت 12: ﴿قَالُوا تِلْكَ اِذَا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ﴾: ان کا یہ کہنا بطور مذاق ہے، یعنی اگر نبی ﷺ کے کہنے کے مطابق ہم دوبارہ پہلی حالت میں آئے تو ان کے مطابق تو ہمارے لیے یہ بہت خسارے کا اٹھنا ہوگا۔

آیت 13-14: ﴿فَاِنَّمَا هِيَ رُجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ...﴾: یعنی تمہارا دوبارہ اٹھنا یا جانا تمہیں کتنا ہی ناممکن دکھائی دے، اللہ کے لیے کوئی مشکل نہیں۔ اس کی طرف سے ایک ڈانٹ یعنی صور میں ایک پھونک پڑنے کی دیر ہے کہ سب زندہ ہو کر قبروں سے نکل کر سطح زمین پر موجود ہوں گے۔ ”سنہر“ (س) جاگنا اور ”السنہرۃ“ زمین کا اوپر کا حصہ، کیونکہ اسی پر انسانوں کا جاگنا اور سوتا ہے۔ چمنیل میدان اور صحرا کو ”السنہرۃ“ اس لیے کہتے ہیں کہ وہاں خوف کی وجہ سے انسان بیدار رہتا ہے۔ (فتح القدير)

آیت 15: ﴿هَلْ اَتَتْكَ حَدِيثُ مُوسَى﴾: ”کیا تیرے پاس موسیٰ کی بات سچھی ہے؟“ قیامت اور اس کا انکار کرنے والوں کے ذکر کے ساتھ ہی موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا ذکر فرمایا۔ اس سے ایک تو منکرین کو ڈراتا مقصود ہے کہ حق کا انکار کرنے والوں کا انجام کیا ہوتا ہے، دوسرا نبی ﷺ کو تسلی دینا مقصود ہے کہ آپ ان کافروں کے جھٹلانے پر نجیدہ نہ ہوں، آپ سے پہلے لوگوں نے بھی رسولوں کو جھٹلایا تو ان کا یہ انجام ہوا۔

آیت 16: ﴿اِذْ نَادَاهُ رَبُّهُ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى﴾: ”طویٰ“ طور سینا کے دامن میں واقع ایک وادی کا نام ہے۔ موسیٰ علیہ السلام پر مدین سے واپسی پر پہلی وحی میں اتری۔ دیکھیے سورہ طہ (۱۴)۔

آیت 17-19: ﴿اِذْ هَبَّ اِلَى فِرْعَوْنَ...﴾: فرعون کے پاس جانے کا حکم دینے کے ساتھ اسے دی جانے والی دعوت

فَأَرَاهُ الْآيَةَ الْكُبْرَىٰ ﴿٢٠﴾ فَكَذَّبَ وَعَصَىٰ ﴿٢١﴾ ثُمَّ أَذْبَرَ يَسْعَىٰ ﴿٢٢﴾ فَحَشَرَ فَنَادَىٰ ﴿٢٣﴾
 فَقَالَ أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ ﴿٢٤﴾ فَأَخَذَهُ اللَّهُ نَكَالَ الْأَخْجِرَةِ وَالْأُولَىٰ ﴿٢٥﴾ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَعِبْرَةً
 لِّمَن يَخْشَىٰ ﴿٢٦﴾ ءَأَنْتُمْ أَشَدُّ حَلَقًا أَمِ السَّمَاءُ بَنَاهَا ﴿٢٧﴾ رَفَعَهَا سَنَكهَا فَسَوَّاهَا ﴿٢٨﴾
 وَاعْطَشَ لَيْلَهَا وَأَخْرَجَ ضُحَاهَا ﴿٢٩﴾

چنانچہ اس نے اسے بہت بڑی نشانی دکھائی ﴿۲۰﴾ تو اس نے جھٹلا دیا اور نافرمانی کی ﴿۲۱﴾ پھر واپس پلٹا، دوڑ بھاگ کرتا تھا ﴿۲۲﴾ پھر اس نے اکٹھا کیا، پس پکارا ﴿۲۳﴾ پس اس نے کہا میں تمہارا سب سے اونچا رب ہوں ﴿۲۴﴾ تو اللہ نے اسے آخرت اور دنیا کے عذاب میں پکڑ لیا ﴿۲۵﴾ بے شک اس میں اس شخص کے لیے یقیناً بڑی عبرت ہے جو ڈرتا ہے ﴿۲۶﴾ کیا پیدا کرنے میں تم زیادہ مشکل ہو یا آسمان؟ اس نے اسے بنایا ﴿۲۷﴾ اس کی چھت کو بلند کیا، پھر اسے برابر کیا ﴿۲۸﴾ اور اس کی رات کو تاریک کر دیا اور اس کے دن کی روشنی کو ظاہر کر دیا ﴿۲۹﴾

بھی سکھائی، دعوت کے الفاظ میں اختصار کے باوجود نرمی اور ترغیب و ترہیب واضح طور پر نمایاں ہیں۔ سورہ طٰ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو فرمایا تھا: ﴿فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا لِّعَلَّاهُ يَنْتَكِرُ أَوْ يَخْشَىٰ﴾ [طہ: ۴۴] ”فرعون سے نرم بات کرنا، شاید وہ نصیحت قبول کر لے یا ڈر جائے۔“

﴿٢٠﴾ إِنَّهُ طَغَىٰ: ”یقیناً وہ حد سے بڑھ گیا ہے۔“ فرعون کا حد سے بڑھنا ایک تو بندگی کی حد سے بڑھ کر یہ کہنا تھا کہ میں تمہارا رب اعلیٰ ہوں، دوسرا غلط خدا پر اس کی طغیانی یہ تھی کہ اس نے قوم کو طباقوں میں تقسیم کر کے اپنا غلام بنا رکھا تھا۔ خصوصاً بنی اسرائیل کے بیٹے ذبح کرتا اور عورتیں زندہ رکھتا تھا۔

﴿٢١﴾ فَقُلْ هَلْ أَلِدُكُمْ أَمْ أَسْمَىٰ: ”تو سنی“ پاک ہو جائے، یعنی شرک و کفر کی گندگی سے پاک ہو جائے۔ ”فَتَحْشَىٰ“ پس تو ڈر جائے، یعنی اپنے رب کا راستہ معلوم ہو جانے کے بعد تو ڈر جائے کہ پروردگار اپنی دی ہوئی حکومت چھین کر نعمتوں کی جگہ اپنی گرفت ہی میں نہ لے لے، چنانچہ تو اس ڈر سے اس کا شریک بننے اور بندوں پر ظلم کرنے سے بچ جائے، کیونکہ دل میں ڈر علم ہی سے پیدا ہوتا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ﴾ [فاطر: ۲۸] ”اللہ سے صرف اس کے علم والے بندے ہی ڈرتے ہیں۔“

آیۃ 20 ﴿فَأَرَاهُ الْآيَةَ الْكُبْرَىٰ﴾: بڑی نشانی سے مراد لائھی کا سانپ بن جانا ہے۔ ”الآیۃ“ کو واحد کے بجائے جنس مان لیں تو عصائے موسیٰ اور ید بیضا دونوں مراد ہو سکتے ہیں، بلکہ موسیٰ علیہ السلام کو عطا کیے جانے والے ”تسع آیات مینات“ (۹ معجزے) بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ دیکھیے سورہ بنی اسرائیل (۱۰۱)۔

آیۃ 25 ﴿فَأَخَذَهُ اللَّهُ نَكَالَ الْأَخْجِرَةِ وَالْأُولَىٰ﴾: یعنی آخرت کو آگ میں جلے گا اور دنیا میں غرق ہوا۔

آیۃ 27، 29 ﴿ءَأَنْتُمْ أَشَدُّ حَلَقًا﴾: شروع سورت میں قیامت حق ہونے کی دلیل کے طور پر فرشتوں کا اور ان چند کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

وَالْأَرْضِ بَعْدَ ذَلِكَ دَحَاهَا ﴿۳۰﴾ أَخْرَجَ مِنْهَا مَاءَهَا وَمَرْعَهَا ﴿۳۱﴾ وَالْجِبَالَ أَرْسَقًا ﴿۳۲﴾ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ ﴿۳۳﴾

اور زمین، اس کے بعد اسے بچھا دیا ﴿۳۰﴾ اس سے اس کا پانی اور اس کا چارہ نکالا ﴿۳۱﴾ اور پہاڑ، اس نے انھیں گاڑ دیا ﴿۳۲﴾ تمہاری اور تمہارے چوپاؤں کی زندگی کے سامان کے لیے ﴿۳۳﴾

امور کا ذکر فرمایا جو وہ سرانجام دیتے ہیں، یعنی ان فرشتوں کے رب کے لیے تمہیں دوبارہ زندہ کرنا کون سا مشکل کام ہے؟ یہاں سے پھر قیامت کے دلائل کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ آیت (۲۷) سے (۳۳) تک اللہ تعالیٰ نے اپنی کئی عظیم الشان مخلوقات کا ذکر فرمایا کہ اتنی قدرتوں والے پروردگار کے لیے تمہیں دوبارہ زندہ کرنے میں کیا دشواری ہو سکتی ہے؟

آیت 30-33 وَالْأَرْضِ بَعْدَ ذَلِكَ دَحَاهَا.....: یہاں ایک سوال ہے کہ اس جگہ آسمان بنانے کے بعد زمین بچھانے کا ذکر فرمایا ہے، جب کہ سورہ بقرہ کی آیت (۲۹) اور حم سجدہ کی آیات (۱۲ تا ۹) سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے زمین پیدا کی گئی پھر آسمان، ان دونوں کے درمیان تطبیق کیا ہوگی؟ اہل علم نے اس کے متعدد جوابات ذکر فرمائے ہیں: ① بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ پہلے زمین بنی پھر آسمان، البتہ زمین کو بچھانے، اس کا پانی اور چارہ نکالنے اور اس میں پہاڑ گاڑنے کا کام بعد میں ہوا۔ گویا زمین کی خلق (پیدائش) آسمان سے پہلے ہے، البتہ ”ذخو“ (بچھانا) بعد میں ہے۔ طبری نے یہ تفسیر علی بن ابی طلحہ کی معتبر سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے اور اسے ترجیح دی ہے۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں: «قَوْلُهُ حَيْثُ ذَكَرَ خَلْقَ الْأَرْضِ قَبْلَ السَّمَاءِ، ثُمَّ ذَكَرَ السَّمَاءَ قَبْلَ الْأَرْضِ، وَذَلِكَ أَنَّ اللَّهَ خَلَقَ الْأَرْضَ بِأَقْوَاتِهَا مِنْ غَيْرِ أَنْ يَدْخُوهَا قَبْلَ السَّمَاءِ، ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمَوَاتٍ، ثُمَّ دَحَا الْأَرْضَ بَعْدَ ذَلِكَ، فَذَلِكَ قَوْلُهُ: ﴿وَالْأَرْضِ بَعْدَ ذَلِكَ دَحَاهَا﴾» | ضبري: ۹۲/۲۵، ج: ۳۶۶۳۲ | ”یعنی اللہ تعالیٰ نے زمین کو اس میں موجود روزیوں سمیت اسے بچھائے بغیر آسمان سے پہلے پیدا کیا، پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور انھیں درست کر کے سات آسمان بنا دیا، پھر زمین کو اس کے بعد بچھا دیا، یہی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا مطلب ہے: ﴿وَالْأَرْضِ بَعْدَ ذَلِكَ دَحَاهَا﴾ | النزاعات: ۳۰ | ”اور زمین کو اس کے بعد بچھا دیا۔“ ابن کثیر نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ”وَالْأَرْضِ بَعْدَ ذَلِكَ دَحَاهَا“ کی تفسیر بعد والی آیات: ﴿أَخْرَجَ مِنْهَا مَاءَهَا وَمَرْعَهَا﴾ کے ساتھ فرمائی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ سب کچھ زمین میں پہلے پیدا کر دیا تھا، مگر انھیں آسمانوں کو پیدا کرنے کے بعد زمین سے نکالا۔ ② بعض مفسرین نے سورہ نازعات کی زیر تفسیر آیات اور حم سجدہ کی آیات (۱۲ تا ۹) کو ملا کر خلاصہ یوں نکالا ہے: ”اللہ تعالیٰ نے پہلے آسمان پیدا کیا، اس حال میں کہ وہ دھوکے کی مانند تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے زمین کو پیدا کیا، پھر اس پر پہاڑوں کو رکھ دیا، پھر زمین میں بہریاں اور درخت وغیرہ کی پیدائش کا اندازہ مقرر کیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آسمان کو، جو اب تک دھوکے کی شکل میں تھا، سات آسمانوں میں تبدیل کیا اور آسمان کی چھت کو بلند کیا، پھر زمین کو بچھا دیا، اس میں سے پانی اور چارہ نکالا اور پہاڑوں کو زمین میں مضبوطی سے گاڑ دیا۔“ (تفسیر قرآن عزیز،

فَإِذَا جَاءَتِ الطَّامَّةُ الْكُبْرَىٰ ﴿٣٤﴾ يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْإِنْسَانُ مَا سَعَىٰ ﴿٣٥﴾ وَبُرِزَتِ الْجَحِيمُ لِمَن يَرَىٰ ﴿٣٦﴾ فَأَمَّا مَنْ طَغَىٰ ﴿٣٧﴾ وَآثَرَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ﴿٣٨﴾ فَإِنَّ الْجَحِيمَ هِيَ الْبَأْوَىٰ ﴿٣٩﴾ وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ ﴿٤٠﴾

پھر جب وہ ہر چیز پر چھا جانے والی سب سے بڑی مصیبت آجائے گی ﴿٣٤﴾ جس دن انسان یاد کرے گا جو اس نے کوشش کی ﴿٣٥﴾ اور جہنم (ہر) اس شخص کے لیے ظاہر کر دی جائے گی جو دیکھتا ہے ﴿٣٦﴾ پس لیکن جو حد سے بڑھ گیا ﴿٣٧﴾ اور اس نے دنیا کی زندگی کو ترجیح دی ﴿٣٨﴾ تو بے شک جہنم ہی (اس کا) ٹھکانا ہے ﴿٣٩﴾ اور رہا وہ جو اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈر گیا اور اس نے نفس کو خواہش سے روک لیا ﴿٤٠﴾

سورۃ النازعات ﴿٣٤﴾ تیسری تطبیق یہ ہے کہ یہاں سورۃ نازعات میں زمین و آسمان پیدا کرنے کی ترتیب زمانی بیان کرنا مقصود ہی نہیں، وہ تو وہی ہے جو سورۃ بقرہ اور سورۃ حم سجدہ میں ہے، بلکہ یہاں اللہ تعالیٰ کے انسان کو دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہونے کی دلیل کے طور پر پہلے آسمان کو ذکر کیا گیا ہے پھر زمین کو۔ واضح رہے کہ بعد کا لفظ ہر جگہ زمانے کی ترتیب کے لیے نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات ترتیب ذکر کے لیے ہوتا ہے، یعنی موقع کی مناسبت سے زیادہ اہم چیز پہلے ذکر ہوتی ہے اور دوسری بعد میں، جیسا کہ فرمایا: ﴿عُشْرًا بَعْدَ ذَلِكَ لِنُنَبِّئُكَ﴾ [القلم: ۱۷۳] ”سخت مزاج اس کے بعد بدنام۔“ ایسے موقع پر زمانی ترتیب کچھ بھی ہو لفظ بعد کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ پہلی چیز کے بعد اس کی خبر دی جا رہی ہے، اس کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ ایسے موقع پر عموماً بعد کا معنی ”مع“ (ساتھ) ہوتا ہے، یعنی سخت مزاج ہونے کے ساتھ وہ بدنام بھی ہے۔ اسی طرح سورۃ بلد کی آیات (۱۱ تا ۱۷) کی تفسیر بھی دیکھ لیں، جن میں ”فَلَمَّا رَقِبْتَهُ.....“ کے بعد فرمایا: ﴿فَتَمَّ كَمَنْ مِنَ الَّذِينَ أَهْمُوا.....﴾ یہاں بھی ”فَتَمَّ“ ترتیب زمانی کے لیے نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ گردن چھڑانے اور کھانا کھلانے کے ساتھ ساتھ ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ یہ تطبیق تقریباً تمام مفسرین نے ذکر کی ہے اور سب سے بہتر ہے، کیونکہ پہلی دونوں تطبیقوں میں چھ دن میں زمین و آسمان کی پیدائش کی تفصیل اور ترتیب پوری طرح واضح نہیں ہوتی اور نہ اصل اشکال دور ہوتا ہے۔

آیت 34 : فَإِذَا جَاءَتِ الطَّامَّةُ الْكُبْرَىٰ: ”الطَّامَّةُ“ اس مصیبت کو کہتے ہیں جو ہر چیز پر چھا جائے، مراد قیامت ہے۔ مزید ہولناکی بیان کرنے کے لیے فرمایا ”الْكُبْرَىٰ“ کہ جو سب سے بڑی (مصیبت) ہے۔

آیت 36 : وَبُرِزَتِ الْجَحِيمُ لِمَن يَرَىٰ: یعنی گمراہ لوگوں کے لیے جہنم سامنے کر دی جائے گی کہ یہ تمہارا ٹھکانا ہے، البتہ متقی لوگوں کے لیے جنت قریب کی جائے گی، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَأُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِينَ﴾ وَبُرِزَتِ الْجَحِيمُ لِلْغَوِينَ ﴿﴾ [الشعراء: ۹۱، ۹۰] ”جنت متقی لوگوں کے قریب کر دی جائے گی۔ اور جہنم گمراہوں کے لیے ظاہر کر دی جائے گی۔“ یہ معنی بھی درست ہے کہ مومن ہو یا کافر جہنم ہر دیکھنے والے کے سامنے ہوگی، مومن اس سے بچائے جانے پر اللہ کا شکر ادا کریں گے اور کافر شدید حسرت و افسوس میں مبتلا ہوں گے۔ میدانِ محشر میں جہنم لائے جانے کے متعلق دیکھیے سورۃ فجر (۲۳) کی تفسیر۔

فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَىٰ ۗ يُسْتَلَوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسِمًا ۗ فِيمَ أَنْتَ مِنْ
ذِكْرِهَا ۗ إِلَىٰ رَبِّكَ مُنْتَهَمًا ۗ إِنَّمَّا أَنْتَ مُنذِرٌ مِّنْ يَّخْشَاهَا ۗ كَانَهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا
لَمْ يَلْبَثُوا إِلَّا عَشِيَّةً أَوْ ضُحًى ۗ

تو بے شک جنت ہی (اس کا) ٹھکانا ہے ① وہ تجھ سے قیامت کے متعلق پوچھتے ہیں کہ اس کا قیام کب ہے؟ ②
اس کے ذکر سے تو کس خیال میں ہے؟ ③ میرے رب ہی کی طرف اس (کے علم) کی انتہا ہے ④ تو تو صرف اسے
ڈرانے والا ہے جو اس سے ڈرتا ہے ⑤ گویا وہ جس دن اسے دیکھیں گے وہ (دنیا میں) نہیں ٹھہرے، مگر دن کا
ایک پچھلا حصہ یا اس کا پہلا حصہ ⑥

آیت 42 یَسْتَلَوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسِمًا: ”اُرْسِیْ مُرْسِمًا“ (افعال) سے مصدر ہو تو معنی ہوگا ”اس
کا توغ یا قیام“ اور اگر ظرف ہو تو معنی ہے ”اس کے قیام کا وقت۔“ کافر لوگ یہ سوال بار بار کرتے تھے، اس سے ان کا مقصد
قیامت کا وقت اور تاریخ معلوم کرنا نہیں تھا بلکہ اسے جھٹلانا اور اس کا مذاق اڑانا ہوتا تھا۔

آیت 43 فِیْمَ أَنْتَ مِنْ ذِكْرِهَا: یعنی جب آپ کو خود ہی اس کا مقرر وقت معلوم نہیں تو آپ انھیں کیا بتائیں گے اور
آپ کا اس کے ذکر سے کیا تعلق؟

آیت 44 إِلَىٰ رَبِّكَ مُنْتَهَمًا: ”مُنْتَهَمًا“ اس کی انتہا، جہاں جا کر بات ختم ہوتی ہے وہ رب تعالیٰ ہے، یعنی جس کسی
سے قیامت کے متعلق پوچھو وہ بے خبر ہوگا، کسی دوسرے سے پوچھنے کو کہے گا تو وہ بھی بے خبر ہوگا، پوچھتے پوچھتے آخر میں جہاں
بات ختم ہوگی اور جو بتا سکتا ہے وہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہے، درمیان میں سب بے خبر ہیں۔ (موضح القرآن)

آیت 45 إِنَّمَّا أَنْتَ مُنذِرٌ مِّنْ يَّخْشَاهَا: یعنی آپ کا کام اس کا وقت بتانا نہیں ہے بلکہ اس سے ڈرانا ہے اور اگر چہ آپ
کا فریضہ تمام دنیا کو اس سے ڈرانا ہے مگر اس کا فائدہ صرف اس کو ہوگا جس کے دل میں اس کا خوف ہے اور وہ آپ کی تبلیغ
سن کر تیار کرے گا۔ جس کے دل میں قیامت پر ایمان اور اس کا خوف ہی نہیں اسے آپ کے ڈرانے سے کوئی فائدہ نہیں
ہوگا، وہ اس کا وقت ہی پوچھتا رہ جائے گا۔

آیت 46 كَانَهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا..... یعنی وہ قیامت جسے یہ بہت دور سمجھ رہے ہیں جب آئے گی تو انہیں ایسے معلوم
ہوگا جیسے وہ دنیا میں صرف دن کا پچھلا حصہ یا پہلا حصہ ہی رہے ہیں، پورا ایک دن بھی نہیں رہے۔ مثال سمجھنے کے لیے اپنی
گزشتہ زندگی پر نظر ڈال کر دیکھ لیں۔



عَبَسَ وَ تَوَلَّى ۱۱ أَنْ جَاءَهُ الْأَعْمَى ۝

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

اس نے تیوری چڑھائی اور منہ پھیر لیا ۱۱ اس لیے کہ اس کے پاس اندھا آیا ۱۲

مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہ سورت نابینے صحابی عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کے بارے میں اتری۔ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کے پاس مشرکین میں سے ایک بڑا آدمی بیٹھا تھا کہ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ آئے اور کچھ مسائل پوچھنے لگے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کی طرف سے منہ پھیر لیا اور توجہ اس دوسرے کی طرف رکھی، اس پر یہ سورت اتری۔ [ترمذی، تفسیر القرآن، باب ومن سورۃ عبس: ۳۳۳۱] البانی رضی اللہ عنہ نے اسے صحیح کہا ہے۔ انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ یہ مشرک اُبی بن خلف تھا اور اس میں یہ بھی ہے کہ یہ سورت اترنے کے بعد رسول اللہ ﷺ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کا اکرام (عزت) کیا کرتے تھے۔ [مسند ابی بعلی: ۴۳۱/۵، ج: ۳۱۲۳] اس کی سند صحیح ہے۔ صاحب احسن التفسیر نے لکھا ہے کہ جن روایات میں ابی بن خلف کے بجائے ابو جہل اور عتبہ بن ربیعہ وغیرہ کا نام لکھا ہے ان کی سند صحیح نہیں۔ عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ سکی، قرشی، مہاجرین اولین میں سے ہیں اور ام المومنین خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ماموں کے بیٹے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ انھیں اپنے اکثر غزوات میں مدینہ میں اپنا نائب مقرر فرمایا کرتے تھے۔

آیت ۱ ۱۱ عَبَسَ وَ تَوَلَّى: اس میں رسول اللہ ﷺ کو غائب کے صیغے سے ذکر فرمایا، اگرچہ بعد میں ”وَمَا يُذِرُكَ“ سے مخاطب فرمایا۔ اس میں نکتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نابینے صحابی سے بے توجہی کی تو اللہ تعالیٰ نے بطور عتاب آپ کے خطاب سے بے توجہی فرمائی۔ موضح القرآن میں ہے: ”یہ کلام گویا اوروں کے پاس گلہ ہے رسول کا۔ آگے رسول کو خطاب فرمایا۔“ بعض اہل علم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے اکرام کی وجہ سے آپ کو مخاطب کر کے اظہار ناراضی نہیں فرمایا۔

آیت ۲ بعض حضرات نے ”تیوری چڑھانے والا“ اس مشرک کو قرار دیا ہے جو رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھا تھا، مگر اس کے بعد آنے والی آیات میں صاف رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا: ﴿فَأَنْتَ عَنْتَهُ تَلْهَى﴾ یعنی آپ اس آنے والے (نابینے صحابی) سے بے توجہی کرتے ہیں۔ اس لیے مذکورہ تفسیر درست نہیں۔

آیت ۲ ۱۲ أَنْ جَاءَهُ الْأَعْمَى: (اس لیے تیوری چڑھائی) کہ اس کے پاس نابینا آیا، حالانکہ نابینا تو زیادہ لطف و کرم کا مستحق تھا۔ پھر اگر اس کے دین کی بات پوچھنے سے کسی چودھری کے ساتھ کلام قطع ہوا ہے، جس کے اسلام لانے کی آپ کو امید تھی اور اس وجہ سے تیوری پڑی ہے تو اس میں اس کا کیا قصور؟ وہ تو نابینا ہے، اسے کیا پتا کہ آپ کس سے بات کر رہے ہیں؟

وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهٗ يَزْكٰى ۝ اَوْ يَذْكُرُ فِتْنَعَهُ الذِّكْرٰى ۝ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۝ فَاَنْتَ
 لَهٗ تَصَدٰى ۝ وَمَا عَلَيْكَ اِلَّا يَزْكٰى ۝ وَاَمَّا مَنِ جَاءَكَ يَسْعٰى ۝ وَهُوَ يَخْشٰى ۝
 فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهٰى ۝ كَلَّا اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝ فَمَنْ شَاءَ ذَكَرْهَا ۝ فِىْ صُحُفٍ نُّكَرَمَةٍ ۝
 تَرْفُوعًا مُّطَهَّرَةٍ ۝

اور تجھے کیا چیز معلوم کرواتی ہے شاید وہ پاکیزگی حاصل کر لے ۶ یا نصیحت حاصل کرے تو وہ نصیحت اسے فائدہ
 دے ۷ لیکن جو بے پروا ہو گیا ۸ سو تو اس کے پیچھے پڑتا ہے ۹ حالانکہ تجھ پر (کوئی ذمہ داری) نہیں کہ وہ پاک
 نہیں ہوتا ۱۰ اور لیکن جو کوشش کرتا ہوا تیرے پاس آیا ۱۱ اور وہ ڈر رہا ہے ۱۲ تو تو اس سے بے توجہی کرتا ہے ۱۳
 ایسا ہرگز نہیں چاہیے، یہ (قرآن) تو ایک نصیحت ہے ۱۴ تو جو چاہے اسے قبول کر لے ۱۵ ایسے صحیفوں میں ہے جن
 کی عزت کی جاتی ہے ۱۶ جو بلند کیے ہوئے، پاک کیے ہوئے ہیں ۱۷

آیت 4.3: وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهٗ يَزْكٰى ... : آپ نے جو یہ سمجھا کہ یہ نابینا تو مسلمان ہی ہے، کسی اور وقت مسئلہ پوچھ
 لے گا، مجھے کافر کو مسلمان بنانے پر زیادہ توجہ دینی چاہیے تو یہ بات اگرچہ ایک حد تک درست ہے، مگر آپ کو اس بات کا خیال
 بھی ضروری تھا کہ وہ کافر تو آپ کی ہدایت سے فائدہ اٹھانے پر تیار ہی نہیں۔ خوف ناک بیماری میں مبتلا شخص کا علاج مقدم
 ہونا چاہیے مگر وہ دوا لینے پر آمادہ ہی نہ ہو تو اس کی امید میں آپ اپنے ساتھیوں سے کیوں بے توجہی کریں، جو دوائے دل کے
 طالب ہیں کہ آپ توجہ فرمائیں تو وہ بہل اور گناہ سے خوب پاک صاف ہو جائیں۔ ”یَزْكٰى“ میں مبالغہ ہے، یا آپ کی نصیحت
 سے انھیں نفع حاصل ہو جائے۔

آیت 10:5 اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ... : ”تَصَدٰى“ اصل میں ”تَضَلٰى“ اور ”تَلَهٰى“ اصل میں ”تَلَهٰى“ فعل مضارع
 مخاطب ہیں۔ یعنی جسے اپنی دولت اور سرداری کی وجہ سے آپ کی پروا ہی نہیں آپ اس کے پیچھے پڑ رہے ہیں، حالانکہ اگر وہ
 کفر کی نجاست سے پاک نہیں ہوتا تو آپ پر کچھ اثر نہیں اور جو کوشش کر کے آیا ہے اور وہ اللہ سے ڈرتا ہے تو آپ اس سے بے توجہی
 کرتے ہیں، حالانکہ آپ کی توجہ کا اصل حق دار وہ ہے جو طلب رکھتا ہے گو نادر ہے، وہ نہیں جو بے پروا ہے خواہ سرمایہ دار ہے۔
 آیت 11-12: كَلَّا اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ... : ”كَلَّا“ ہرگز نہیں، یعنی جو ہوا سو ہوا، آئندہ ہرگز اس طرح نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ
 یہ قرآن تو ایک نصیحت ہے جو ہر خاص و عام کے لیے ہے، اس میں کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جانی چاہیے، پھر جو
 چاہے نصیحت قبول کر لے، اس کا اپنا فائدہ ہے اور کوئی تنکیر اگر نصیحت سن لینے کے باوجود اسے قبول نہیں کرتا تو آپ کو بھی قبول
 کرنے والوں کو چھوڑ کر اس کے پیچھے پڑنے کی ضرورت نہیں۔

آیت 13-14: فِىْ صُحُفٍ نُّكَرَمَةٍ ... : ان آیات میں قرآن مجید کی عظمت بیان کی گئی ہے کہ یہ ایسے اوراق میں لکھا ہوا

بِأَيْدِي سَفَرَةٍ ۱۵ ﴿ كِرَامٍ بَرَرَةٍ ۱۶ ﴾ قُتِلَ الْإِنْسَانُ مَا أَكْفَرَهُ ۱۷

ایسے لکھنے والوں کے ہاتھوں میں ہیں ۱۵ ﴿ جو معزز ہیں، نیک ہیں ۱۶ ﴿ مارا جائے انسان! وہ کس قدر ناشکرا ہے ۱۷ ﴿

ہے جن کی عزت کی جاتی ہے، جو بلند شان والے اور پاک ہیں۔ اس سے قرآن مجید کے وہ اوراق مراد ہیں جن میں سے فرشتوں نے لوح محفوظ سے نقل کر کے لکھا، وہ بھی جن میں قرآن کے کاتب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ سے سن کر لکھا اور وہ بھی جن میں ان سے نقل کر کے لکھا گیا اور قیامت تک لکھا جائے گا۔ قرآن مجید کی جس طرح تکریم کی جاتی ہے اور جس طرح یہ شیاطین اور ملحدوں کی ذل اندازی سے محفوظ، ہر قسم کی تحریف اور رد و بدل سے مامون اور ہر قسم کے خلاف عقل اور خلاف حیا مضامین سے مطہر ہے، وہ سب کے سامنے ہے۔ اس کی ان خصوصیات کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب اس کا موازنہ دوسری آسمانی یا غیر آسمانی کتابوں سے کیا جائے۔ ہمیں بھی قرآن مجید کی زیادہ سے زیادہ تکریم کرنی چاہیے اور اسے اٹھاتے وقت رکھتے وقت اور تلاوت کرتے وقت، غرض ہر موقع پر اس کا بے حد ادب ملحوظ رکھنا چاہیے، اس کی بات آجائے تو پھر کسی کی بات اس پر مقدم نہیں کرنی چاہیے۔

آیت 16، 15 ﴿ بِأَيْدِي سَفَرَةٍ : ”سَفَرَةٍ“ ”سَافِرٍ“ کی جمع ہے، لکھنے والا۔ ”سَافِرٌ“ کتاب، اس کی جمع ”أَسْفَارٌ“ ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ كَمَثَلِ الْجِبَالِ يَجْعَلُ أَسْفَارًا ﴾ [الجمعة: ۱۰] ”(بے عمل یہود کی مثال) گدھے کی طرح ہے جو کتابیں اٹھائے ہوئے ہوں۔“ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید لکھنے والوں کی تعریف فرمائی ہے، خواہ وہ فرشتے ہوں یا کاتبین وحی، صحابہ ہوں یا دوسرے، فرمایا یہ لوگ اللہ کے ہاں بہت عزت والے اور نہایت نیک ہیں۔ اس طرح کتابت کے علاوہ اس کا پڑھنا پڑھانا بھی سب سے بہتر اور نیک ہونے کی دلیل ہے، عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ﴿ خَيْرٌ كُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ ﴾ [بخاری، فضائل القرآن، باب خیر کم من تعلم..... : ۱۰۲۷] ”تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے۔“

2 ﴿ ”سَفَرَةٍ“ ”سَافِرَةٍ“ (سفارت) سے بھی مشتق ہو سکتا ہے، تو اس سے مراد فرشتے ہیں، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں کے درمیان سفیر کی حیثیت رکھتے ہیں کہ ان کے پاس وحی الہی لے کر آتے ہیں۔

آیت 17 ﴿ قُتِلَ الْإِنْسَانُ مَا أَكْفَرَهُ : پچھلی آیات میں ان منکبر لوگوں کا ذکر گزرا ہے جو حق بات سننے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں، اب انھی کافروں پر بددعا کی گئی ہے، فرمایا: ﴿ قُتِلَ الْإِنْسَانُ ﴾ ”انسان مارا جائے“ یہ سخت سے سخت بددعا ہے جو کسی کے لیے کی جاسکتی ہے، کیونکہ دنیا میں سب سے آخری سزا یہ ہے کہ کسی کو ختم ہی کر دیا جائے۔ (زمخشری)

2 سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تو بددعا کرنے کی ضرورت ہی نہیں، تو اس طرح کیوں فرمایا؟ جواب یہ ہے کہ یہ عرب کے اسلوب پر فرمایا ہے جو ان الفاظ میں بددعا کرتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ اتنی نعمتوں کے باوجود یہ انسان جس طرح ناشکری کر رہا ہے اس پر کوئی بھی غور کرے گا تو اس کے منہ سے یہ بددعا نکلے گی۔

مِنْ أَمِي شَيْءٍ خَلَقَهُ ۝ ۱۸ مِنْ نُطْفَةٍ دَخَلَقَهُ فَقَدَّرَهُ ۝ ۱۹ ثُمَّ السَّبِيلَ يَسْرَهُ ۝ ۲۰ ثُمَّ
أَمَاتَهُ فَأَقْبَرَهُ ۝ ۲۱ ثُمَّ إِذَا شَاءَ أَنْشَرَهُ ۝ ۲۲

اس نے اسے کس چیز سے پیدا کیا ۱۸ ایک قطرے سے، اس نے اسے پیدا کیا، پس اس کا اندازہ مقرر کیا ۱۹ پھر اس کے لیے راستہ آسان کر دیا ۲۰ پھر اسے موت دی، پھر اسے قبر میں رکھوایا ۲۱ پھر جب وہ چاہے گا اسے اٹھائے گا ۲۲

۳ "مَا أَكْفَرَهُ" کا معنی ہے "وہ کس قدر ناشکرا ہے!" دوسرا معنی ہے "اتنی نعمتوں کے باوجود وہ کون سی چیز ہے جس نے اسے ناشکرا بنا دیا ہے؟" (ابن جریر)

آیت 18-19: مِنْ أَمِي شَيْءٍ خَلَقَهُ یعنی اس شخص کو تکبر اور ناشکری کس طرح زیب دیتی ہے جسے اس کے بنانے والے نے منی کے ایک حقیر قطرے سے پیدا فرمایا؟ پیدا کرنے کے دوران اس کی ہر چیز کا اندازہ مقرر فرمایا کہ اتنی مدت اُٹھ رہے گا، پھر خلق، پھر مضغ، پھر جاندار اور خوبصورت انسان بنے گا۔ پھر اس کی ہر چیز کا اندازے کے ساتھ بنائی، کوئی چیز بے ذہب نہیں۔ پھر ماں کے شکم ہی میں وہ سب کچھ فرشتے کو لکھوایا جو اس نے زندگی بھر کرنا تھا۔ "فَقَدَّرَهُ" میں تینوں چیزیں شامل ہیں۔

آیت 20: ثُمَّ السَّبِيلَ يَسْرَهُ: پھر اس کے لیے راستہ آسان کر دیا۔ اس کے تین معانی ہو سکتے ہیں، پہلا یہ کہ ماں کے پیٹ سے نکلنے کا راستہ آسان کر دیا، ورنہ ان تنگ ہڈیوں کے حصار سے نکل ہی نہ سکتا اور وہیں خود بھی مر جاتا اور ماں کی موت کا بھی باعث بنتا۔ دوسرا یہ کہ خیر و شر میں سے جس راستے پر چلنا چاہے وہی اس کے لیے آسان کر دیا اور تیسرا یہ کہ صحیح راستے کی بچون اس کے لیے آسان کر دی، جس سے وہ اپنے پیدا کرنے والے پر ایمان لا سکتا ہے۔ تینوں معانی درست ہیں، مگر "مِنْ نُطْفَةٍ دَخَلَقَهُ فَقَدَّرَهُ" کی مناسبت سے پہلا معنی زیادہ صحیح ہے۔ (التبہیل)

آیت 21: ثُمَّ أَمَاتَهُ فَأَقْبَرَهُ: پھر اسے موت دی جو آخرت کی مصلحت کے تحت ضروری تھی، پھر اسے قبر میں رکھوایا، اگر وہ یہ احسان نہ کرتا تو یہ جانوروں کی طرح زمین پر پڑا رہتا، متعفن ہو کر اللہ کی حقوق کے لیے باعث آزار بنتا۔ اس کی بے حسرتی ہوتی، بے پردہ ہوتا اور اسے درندے نوچتے۔ "قَبْرَهُ" قبر میں رکھا اور "أَقْبَرَهُ" قبر میں رکھوایا۔ کوئی جل جائے، خرق ہو جائے یا اسے درندے کھا جائیں تو اس کے اجزا جہاں بھی ہیں وہ اس کے لیے قبر ہے۔ اگر کسی کو دفن نہ کیا جاسکے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسے قبر نہیں ملی۔

آیت 22: ثُمَّ إِذَا شَاءَ أَنْشَرَهُ: ان تمام قدرتوں کو دیکھ کر کیا یہ تمہاری سمجھ میں نہیں آتا کہ دنیا میں آدمی جو بھی کام کرتا ہے اس کا کوئی نہ کوئی انجام ضرور سوچتا ہے، تو پروردگار نے اتنا بڑا سلسلہ کیا اس لیے پیدا فرمایا ہے کہ کوئی اس اکیلے کی پرستش کرے، کوئی اس کی نعمتوں کو بھول کر بتوں کی پرستش کرتا رہے اور کوئی ظلم کرے یا کسی پر ظلم ہو، مرنے کے بعد سب برابر

كَلَّا لَنَا يَفِضُ مَا أَمَرَهُ ﴿۳۳﴾ فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ إِلَى طَعَامِهِ ﴿۳۴﴾ أَتَا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا ﴿۳۵﴾ ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا ﴿۳۶﴾ فَأَنْبَتْنَا فِيهَا حَبًّا ﴿۳۷﴾ وَعَبَبْنَا وَ قَضَبًا ﴿۳۸﴾

ہرگز نہیں، ابھی تک اس نے وہ کام پورا نہیں کیا جس کا اس نے اسے حکم دیا ﴿۳۳﴾ تو انسان کو لازم ہے کہ اپنے کھانے کی طرف دیکھے ﴿۳۴﴾ کہ ہم نے پانی برسایا، خوب برسانا ﴿۳۵﴾ پھر ہم نے زمین کو پھاڑا، ایک عجیب طریقے سے پھاڑا ﴿۳۶﴾ پھر ہم نے اس میں اناج اگایا ﴿۳۷﴾ اور اگور اور ترکاری ﴿۳۸﴾

ہو جائیں؟ نہ اللہ تعالیٰ دوبارہ زندہ کر کے باز پرس فرمائے اور نہ کسی کو اس کے عمل کا بدلہ ملے۔ نہیں، اللہ کے بارے میں یہ سوچنا ہی بے ادبی اور کفرانِ نعمت ہے۔ ان آیات میں اس بے ادبی پر اللہ تعالیٰ نے ”قَبِيلَ الْإِنْسَانِ مَا أَكْفَرَهُ“ کہہ کر نگلی کا اظہار فرمایا اور سورہ مومنوں میں فرمایا: ﴿أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَدًا وَ أَتَّكُمُ الْإِنْبَانَا لَا تُرْجَعُونَ﴾ ﴿فَتَعَلَى اللَّهِ الْمَلِئُكَ الْعَقْبَىٰ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيمِ﴾ [المؤمنون: ۱۱۵، ۱۱۶] ”تو کیا تم نے سمجھ لیا کہ ہم نے تمہیں بے مقصد ہی پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف نہیں لوٹائے جاؤ گے؟ پس اللہ بہت بلند ہے جو سچا بادشاہ ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، عزت والے عرش کا رب ہے۔“

آیت 23 كَلَّا لَنَا يَفِضُ مَا أَمَرَهُ: ”کَلَّا“ ہرگز نہیں۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ کافر انسان جو سمجھتا ہے کہ اس کے مال و جان پر اللہ کا جو حق تھا وہ اس نے ادا کر دیا ہے، یہ ہرگز درست نہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کسی انسان نے بھی ابھی تک وہ فرائض ہی پورے ادا نہیں کیے جن کا اللہ تعالیٰ نے اسے حکم دیا تھا، حق کا ادا کرنا تو بہت دور ہے۔ ”لَمْ يَفِضْ“ پورا نہیں کیا۔ ”لَنَا يَفِضُ“ ابھی تک پورا نہیں کیا۔ مجاہد رحمہ اللہ نے فرمایا: ”لَا يَفِضُنِي أَحَدٌ مَا أَمَرَ بِهِ“ [بخاری، التفسیر، باب سورہ عبس، بعد ح: ۴۹۳۶] ”کوئی بھی شخص وہ کام پورا نہیں کرتا جس کا اسے حکم دیا گیا ہے (کمی رہ ہی جاتی ہے)۔“

آیت 24 25 فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ.....: پہلے آیت (۱۷) سے (۲۲) تک ان نعمتوں کا ذکر فرمایا جو انسان کی پیدائش اور اس کی ذات سے تعلق رکھتی تھیں، اب ان نعمتوں کا ذکر ہے جو اس کی ذات سے تو تعلق نہیں رکھتیں مگر ان کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ فرمایا اپنی قریب ترین چیز کھانے ہی کو دیکھ لو کہ اس کی تیاری کے لیے ہم نے کائنات کی کتنی قوتوں کو مصروف کار کر رکھا ہے۔ ”أَتَا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا“ میں مصدر کے ساتھ فعل کی تاکید فرمائی۔ ترجمہ میں اس تاکید کو ”خوب برسانا“ کے الفاظ سے ادا کیا گیا ہے۔

آیت 23 ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا: ”شَقًّا“ ایک قسم کا پھاڑنا، یعنی زمین کو ہم نے عجیب طریقے سے پھاڑا۔ دانے سے نمودار ہونے والی کوئل خود کبھی زمین سے باہر نہیں نکل سکتی تھی، زمین میں ضرورت کے مطابق نرمی و دلی اور سچ میں یہ طاقت ہم نے رکھی کہ وہ زمین پھاڑ کر باہر نکل آئی۔

آیت 27 28 فَأَنْبَتْنَا فِيهَا حَبًّا.....: ”قَضَبًا“ ”قَضَبٌ يَفِضُ“ (ض) (کاننا) کا مصدر بمعنی اسم مفعول ہے،

وَزَيْبُونَا وَفَخْلًا ﴿۲۹﴾ وَحَدَائِقِ غُلْبًا ﴿۳۰﴾ وَفَاكِهَةً وَأَبًّا ﴿۳۱﴾ مَتَاعًا لَكُمْ وَلِإِنْعَامِكُمْ ﴿۳۲﴾
فَإِذَا جَاءَتِ الصَّاخَّةُ ﴿۳۳﴾ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ ﴿۳۴﴾ وَأُمُّهُ وَأَبْنَاهُ ﴿۳۵﴾ وَصَاحِبَتَهُ
وَبَيْنَهُ ﴿۳۶﴾

اور زینون اور کھجور کے درخت ﴿۲۹﴾ اور گھنے باغات ﴿۳۰﴾ اور پھل اور چارا ﴿۳۱﴾ تمہارے لیے اور تمہارے مویشیوں کے لیے زندگی کا سامان ﴿۳۲﴾ پس جب کانوں کو بہرا کرنے والی (قیامت) آجائے گی ﴿۳۳﴾ جس دن آدمی اپنے بھائی سے بھاگے گا ﴿۳۴﴾ اور اپنی ماں اور اپنے باپ (سے) ﴿۳۵﴾ اور اپنی بیوی اور اپنے بیٹوں سے ﴿۳۶﴾
یعنی زمین کی وہ پیداوار جو سال میں کئی مرتبہ کاٹی جاتی ہے، مراد ترکاری ہے۔ وہ چارے بھی اس میں آجاتے ہیں جو بار بار کاٹے جاتے ہیں۔

آیت 29: "وَزَيْبُونَا وَفَخْلًا" کھجور کے درخت۔ کھجور کے پھل کے لیے دوسرے الفاظ ہیں، مثلاً "شمر" وغیرہ۔

آیت 30: "وَحَدَائِقِ غُلْبًا" "حَدَائِقُ" کی جمع ہے، پھل دار درختوں کا باغ جس کے گرد دیوار ہو۔ "حَدَقٌ يَحْدِقُ" (ض) گھیرنا۔ "غُلْبًا" اور "غُلْبًا" کی جمع ہے۔ "غُلْبٌ يَغْلُبُ" (س) موٹی گردن والا ہونا، مراد گھنے باغ۔

آیت 31: "وَفَاكِهَةً وَأَبًّا" "فَاكِهَةٌ" زمیں سے اگنے والی وہ نباتات جسے جانور کھاتے ہیں، لوگ نہیں کھاتے۔ (طبری عن ابن عباس وغیرہ) یہ "أَبٌ" (ان) (قصہ کرنا) سے مصدر بمعنی اسم مفعول ہے، یعنی "قصہ کیا ہوا" کیونکہ جانور اس کی طرف پکتے ہیں۔

آیت 32: "مَتَاعًا لَكُمْ وَلِإِنْعَامِكُمْ" کائنات کا یہ عظیم الشان سلسلہ اور یہ تمام چیزیں تمہاری اور تمہارے ہی کام آنے والے جانوروں کی زندگی کے سامان کے لیے بنائی گئی ہیں۔ اب اپنے کفرانِ نعمت کو دیکھو کہ میں تمہاری خاطر یہ سب کچھ بنا سکتا ہوں مگر تمہارے خیال میں تمہیں مرنے کے بعد زندہ نہیں کر سکتا۔ نہیں، میں تمہیں ضرور دوبارہ زندہ کروں گا۔ آگے قیامت کا ذکر فرمایا۔

آیت 33: "فَإِذَا جَاءَتِ الصَّاخَّةُ" یعنی کانوں کو بہرا کر دینے والی نوحِ صورت کی ہولناک آواز جس سے قیامت قائم ہو جائے گی۔

آیت 34: ﴿۳۶﴾ "يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ" : اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن آدمی کے ان لوگوں سے بھاگنے کا ذکر فرمایا جن سے محبت ہوتی ہے اور ترتیب میں محبت کے درجات کو ملحوظ رکھا، پہلے اس کا ذکر فرمایا جس کے ساتھ کم محبت ہوتی ہے، بڑھتے بڑھتے آخر میں بیٹوں کا ذکر فرمایا جن کے ساتھ مقدم الذکر تمام لوگوں سے زیادہ محبت ہوتی ہے۔ (التسہیل) جب اپنے پیاروں سے بھاگے گا تو دوسروں کا کیا ذکر؟

﴿۳۶﴾ سورہ معارج میں اس کے برعکس بیٹوں سے شروع کیا اور فرمایا کہ مجرم کی ولی خواہش ہوگی کہ اس دن کے عذاب سے بچنے

لِكُلِّ امْرِئٍ مِنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ ﴿٣٧﴾ وَجُودًا يَوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةً ﴿٣٨﴾ ضَاحِكَةً مُّسْتَبْشِرَةً ﴿٣٩﴾ وَ جُودًا يَوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ﴿٤٠﴾ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ﴿٤١﴾ اُولَئِكَ هُمُ الْكٰفِرَةُ الْفَجْرَةُ ﴿٤٢﴾

اس دن ان میں سے ہر شخص کی ایک ایسی حالت ہوگی جو اسے (دوسروں سے) بے پروا بنا دے گی ﴿٣٧﴾ کچھ چہرے اس دن روشن ہوں گے ﴿٣٨﴾ بہت خوش ﴿٣٩﴾ اور کچھ چہرے، اس دن ان پر ایک غبار ہوگا ﴿٤٠﴾ ان کو سیاہی ڈھانپتی ہوگی ﴿٤١﴾ یہی ہیں جو کافر ہیں، نافرمان ہیں ﴿٤٢﴾

کے لیے اپنے بیٹوں کو، اپنی بیوی کو، اپنے بھائی کو اور اپنے پناہ دینے والے قبیلے بلکہ تمام دنیا کے لوگوں کو فدیہ میں دے کر اپنی جان بچالے۔ دیکھیے سورہ معارج (۱۰ تا ۱۳)۔

﴿٣٧﴾ بھاگنے کی وجہ وقوع قیامت کی وجہ سے پیدا ہونے والی گھبراہٹ اور بدحواسی ہے، حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ کو چھوڑ کر باقی انبیاء ﷺ بھی ”نَفْسِيْ نَفْسِي“ کہیں گے۔ اس کے علاوہ یہ خوف ہوگا کہ رشتہ دار کوئی حق نہ مانگ لے، اس کے خلاف کوئی شہادت نہ پیش کر دے اور ظلم کے بدلے میں اس کے گناہ نہ اٹھانے پڑ جائیں وغیرہ۔

آیت 37 لِكُلِّ امْرِئٍ مِنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ : عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «نُحْشِرُونَ حُفَاةَ عُرَاةٍ عُرُلًا، قَالَتْ عَائِشَةُ فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ! الرَّجَالُ وَالنِّسَاءُ يَنْظُرُ بَعْضُهُمْ إِلَى بَعْضٍ؟ فَقَالَ الْأَمْرُ أَشَدُّ مِنْ أَنْ يُهَمَّهُمْ ذَلِكَ» [بخاری، الرقاق، باب كيف الحشر: 6527] ”تم ننگے پاؤں، ننگے جسم، بغیر خندہ کی حالت میں اٹھائے جاؤ گے۔“ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں، میں نے کہا: ”اے اللہ کے رسول! پھر تو مرد اور عورتیں ایک دوسرے کو دیکھیں گے؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”معاملہ اس سے سخت ہوگا کہ یہ بات ان کی سوچ میں بھی آئے۔“ ترمذی میں عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی اس حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے اس موقع پر یہ آیت پڑھی: ﴿لِكُلِّ امْرِئٍ مِنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ﴾ [عس: 37] ”اس دن ان میں سے ہر آدمی کی ایک ایسی حالت ہوگی جو اسے دوسروں سے بے پروا بنا دے گی۔“ [ترمذی،

تفسیر القرآن، باب ومن سورہ عس: 3322، قال الشيخ الألباني حسن صحيح]

آیت 38 39 وَجُودًا يَوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةً : چہروں کی یہ روشنی اور خوشی اعمال نامے دائیں ہاتھ میں دیے جانے کے بعد ہوگی، جیسا کہ فرمایا: ﴿فَأَمَّا مَنْ أُوْتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ ﴿٣٨﴾ فَسَوْفَ يُحَاسِبُ حَسَابًا يَسِيرًا ﴿٣٩﴾ وَيُنْقَلِبُ إِلَىٰ أَهْلِهِ مَسْرُورًا ﴿٤٠﴾ [الانشقاق: 927] ”تو اس وقت جس شخص کا اعمال نامہ اس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اس کا حساب آسان لیا جائے گا اور وہ خوش خوش اپنے گھر والوں کی طرف واپس آئے گا۔“

آیت 40: 42 وَوَجُودًا يَوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ : کافر اور فاجر لوگوں کے چہروں پر سیاہی کی تفصیل کے لیے دیکھیے

سورہ یونس کی آیت (25) کی تفسیر۔ کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۝ وَإِذَا النُّجُومُ انْكَدَرَتْ ۝ وَإِذَا الْجِبَالُ سُدِرَتْ ۝

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

جب سورج لپیٹ دیا جائے گا ① اور جب ستارے بے نور ہو جائیں گے ② اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے ③

ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «مَنْ سَرَّهٗ أَنْ يَنْظُرَ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ كَأَنَّهُ رَأَى عَيْنٍ فَلْيَقْرَأْ: ﴿إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ﴾ [التکویر: ۱] و ﴿إِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ﴾ [الانفطار: ۱] و ﴿إِذَا السَّمَاءُ انشَقَّتْ﴾ [الانشقاق: ۱]» [مسند أحمد: ۲۷/۲، ح: ۴۸۰۶۔ ترمذی: ۳۳۳۳، سندہ صحیح] جسے یہ بات پسند ہو کہ وہ قیامت کے دن کی طرف ایسے دیکھے جیسے آنکھ سے دیکھتا ہے تو وہ سورہ تکویر، سورہ انفطار اور سورہ انشقاق پڑھ لے۔

اس سورت کی ابتدائی آیات میں قیامت کو واقع ہونے والی بارہ چیزیں ذکر فرمائی ہیں، پہلی چھ چیزیں پہلے نغمہ کے وقت ہوں گی اور آخری چھ چیزیں دوسرے نغمہ کے وقت۔ ان کے بعد تیرھویں آیت میں وہ بات بیان فرمائی جو ان سب چیزوں کے ذکر سے مقصود ہے، یعنی اس وقت ہر جان جو کچھ لے کر آئی ہے اسے جان لے گی۔

آیت 1 إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ: ”كُوِّرُ الْعِمَامَةِ وَ تَكْوِيرُهَا“ گھڑی لپینا۔ ”تَكْوِيرُ الْمَتَاعِ“ سامان جمع کر کے باندھ دینا۔ (خلاصہ قاموس) ”كُوِّرَتْ“ یعنی اتنی وسعت والے سورج، اس کی شعاعوں اور روشنی کو لپیٹ دیا جائے گا اور وہ بالکل بے نور ہو جائے گا۔ چاند کا بھی یہی حال ہوگا، چنانچہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ مُكْوَرَانِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ» [بخاری، بدء الخلق، باب صفة الشمس والقمر: ۳۲۰۰] ”سورج اور چاند قیامت کے دن لپیٹ دیے جائیں گے۔“

آیت 2 وَإِذَا النُّجُومُ انْكَدَرَتْ: ”انْكَدَرَتْ“ طبری نے اس کے دو معانی نقل فرمائے ہیں، پہلا ”تَنَاءَرَتْ“ یعنی بکھر کر جائیں گے اور دوسرا ”تَغَيَّرَتْ“ یعنی متغیر ہو جائیں گے۔ کدورت صفائی کی ضد ہے۔ دونوں معانی ملحوظ رکھے جائیں تو مطلب یہ ہوگا کہ ستارے بکھر کر جائیں گے، ان کی روشنی اور صفائی ختم ہو جائے گی اور وہ بے نور ہو جائیں گے۔

آیت 3 وَإِذَا الْجِبَالُ سُدِرَتْ: اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کو زمین کے اندر گاڑ رکھا ہے اور زمین میں وہ ککش رکھی ہے جو انہیں باندھ کر رکھے ہوئے ہے۔ اللہ کے حکم سے قیامت کے دن وہ ککش ختم ہو جائے گی اور یہ جامد پہاڑ ڈھنی ہوئی آون کی طرح ڈزہ ڈزہ ہو کر بادلوں کی طرح چل پڑیں گے، حتیٰ کہ سراب کی طرح ہو جائیں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَسُدِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا﴾ [النبا: ۲۰] ”اور پہاڑ چلائے جائیں گے تو وہ سراب بن جائیں گے۔“ مزید تفصیل کے لیے سورہ نبا کی اسی آیت کی تفسیر دیکھیے۔

وَإِذَا الْعُشَارُ عُظِلَّتْ ۖ وَإِذَا الْوُحُوشُ حُشِرَتْ ۖ وَإِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۖ وَإِذَا
النُّفُوسُ زُوِّجَتْ ۖ وَإِذَا الْمَوْءِدَةُ سُيِّلَتْ ۖ بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ ۖ

اور جب دس ماہ کی حاملہ اونٹنیاں بے کار چھوڑ دی جائیں گی ۛ اور جب جنگلی جانور اکٹھے کیے جائیں گے ۛ اور جب سمندر بھڑکائے جائیں گے ۛ اور جب جانیں ملائی جائیں گی ۛ اور جب زندہ دفن کی گئی (لڑکی) سے پوچھا جائے گا ۛ کہ وہ کس گناہ کے بدلے قتل کی گئی؟ ۛ

آیت 4 ۖ وَإِذَا الْعُشَارُ عُظِلَّتْ: ”الْعُشَارُ“ ”عُشْرَاءُ“ کی جمع ہے، دس ماہ کی حاملہ اونٹنیاں جو عربوں کے ہاں نہایت عزیز ہوتی تھیں۔ صور پھونکے جانے کی ابتدا میں جو گھبراہٹ پیدا ہوگی اس میں اتنی نفیس اور عزیز چیزوں کو بھی کوئی نہیں سنبھالے گا، ہر ایک کو اپنی پڑی ہوگی۔

آیت 5 ۖ وَإِذَا الْوُحُوشُ حُشِرَتْ: جنگلی جانور جو ایک دوسرے سے بھاگتے ہیں، اس گھبراہٹ میں جمع ہو جائیں گے، کوئی کسی کو کچھ نہیں کہے گا۔

آیت 4 ۖ وَإِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ: ”سَجَرَ السُّجُورُ“ اس نے تور جلا یا۔ ”سَجَرَ“ میں مبالغہ ہے، خوب بھڑکایا۔ سمندروں کے بھڑکائے جانے کی ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ زمین کے نیچے جو بے پناہ حرارت اور آگ ہے، جو آتش فشاں پہاڑوں کے بیدار ہونے کی صورت میں کبھی کبھی ظاہر ہوتی رہتی ہے، وہ اللہ کے حکم سے سمندروں کو بھڑکا کر انھیں بھاپ بنا کر اڑا دے گی۔ پھر پہاڑوں کی بلندی اور سمندروں کی گہرائی ختم ہو کر زمین ایک چھینل میدان بن جائے گی۔ ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ پانی آکسیجن اور ہائیڈروجن دو گیسوں کا مرکب ہے، جن میں سے ایک جلانے والی اور دوسری جلنے والی ہے اور یہ اللہ تعالیٰ ہی کی عجیب قدرت ہے کہ ان دونوں کو ملا کر آگ بجھانے والا پانی بنا دیا ہے۔ قیامت کے وقت اللہ کے حکم سے ان دونوں کا ملاپ ختم ہو جائے گا اور وہ اپنے اصل کی طرف لوٹ کر بھڑکانے اور بھڑکنے لگیں گی، جس سے سمندروں کا یہ بے حساب پانی چشم زدن میں اڑ جائے گا۔ بہر حال اللہ کا حکم ہوگا تو سمندر آگ سے بھڑکنے لگیں گے۔

آیت 7 ۖ وَإِذَا النُّفُوسُ زُوِّجَتْ: ”اور جب جانیں ملائی جائیں گی“ اس کی دو تفسیریں ہیں، پہلی یہ کہ جانیں جسوں کے ساتھ ملائی جائیں گی۔ یہاں سے دوسرے نفع کے بعد کے حالات ہیں، تو سب دوبارہ زندہ ہو جائیں گے۔ دوسری یہ کہ جانوں کی قسمیں بنا دی جائیں گی، نیکوں کو نیکوں کے ساتھ اور گناہ گاروں کو گناہ گاروں کے ساتھ ملا دیا جائے گا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿أَحْشُرُوا الَّذِينَ ظَلَمُوا وَأَزْوَاجَهُمْ وَمَا كَانُوا يَعْبُدُونَ﴾ [الصافات: ۲۲] ”جمع کرو ان لوگوں کو جنہوں نے ظلم کیا اور ان کے ہم شکلوں کو اور ان کو جن کی وہ عبادت کیا کرتے تھے۔“ دوسری تفسیر عمر رضی اللہ عنہ نے فرمائی ہے۔

[دیکھئے بخاری، التفسیر، باب: ﴿إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ﴾، بعد ح: ۴۹۳۷]

آیت 8.9 ۖ 1 ۖ وَإِذَا الْمَوْءِدَةُ سُيِّلَتْ.....: ”الْمَوْءِدَةُ“ وہ لڑکی جسے زندہ دفن کر دیا گیا ہو۔ جاہلیت میں بعض عرب عار

وَإِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ﴿۱۰﴾ وَإِذَا السَّمَاءُ كُشِطَتْ ﴿۱۱﴾

اور جب اعمال نامے پھیلانے جائیں گے ﴿۱۰﴾ اور جب آسمان کی کھال اتاری جائے گی ﴿۱۱﴾

سے بچنے کے لیے لڑکیاں زندہ دفن کر دیتے تھے کہ دشمن کے ہاتھ نہ لگ جائیں یا کوئی ان کا داماد نہ بنے۔ بعض فقر کی وجہ سے ایسا کرتے تھے اور بعض تو فقر کی وجہ سے لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کو قتل کر دیتے تھے۔ ہندوستان کے راجپوتوں اور بعض دوسری قوموں میں بھی یہ رواج رہا ہے، آج کل برتھ کنٹرول کے نام سے حکومتیں منظم طریقے سے یہ کام کر رہی ہیں۔ چین میں شہروں میں ایک بچے اور دیہاتوں میں صرف دو بچوں کی اجازت ہے۔ چونکہ اکثر لوگوں کو لڑکے مرغوب ہوتے ہیں، اس لیے لڑکی پیدا ہونے کی صورت میں کئی مائیں دودھ ہی نہیں پلاتیں اور اس طرح قتل کا ارتکاب کرتی ہیں۔ مسلمان ملکوں کے بعض حکمران بھی کفار کی ترغیب سے رزق کے وسائل کی کمی (الملاق) کا بہانہ بنا کر تحدید نسل بلکہ مسلمانوں کی نسل کشی کی پوری کوشش کر رہے ہیں اور اس کے لیے ایسے طریقے پھیلا رہے ہیں جن سے بچہ پیدا ہونے کا امکان ہی ختم ہو جاتا ہے۔ مثلاً جرثومے اور بیضے کی رگ ہی کاٹ دینا اور دوسرے ناقابل بیان طریقے اور یہ کام اس رسول ﷺ کی امت کے لوگ کر رہے ہیں جس نے عزل (جماع کرتے ہوئے انزال کے وقت بیوی سے علیحدہ ہو جانے) کو بھی ناپسند فرمایا، حالانکہ عزل کی صورت میں حمل کا امکان رہتا ہے، کیونکہ منی کے جرثومے انزال سے پہلے بھی مذی کے ذریعے سے رحم میں داخل ہو سکتے ہیں اور خود رسول اللہ ﷺ نے اس حقیقت کا اظہار فرمایا کہ عزل کرو یا نہ کرو، جو بچہ پیدا ہونا ہے ہو کر رہے گا۔ اس کے باوجود ایک مرتبہ جب لوگوں نے آپ سے عزل کے متعلق سوال کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: « ذَلِكَ الْوَأْدُ الْخَفِيْ وَهِيَ : ﴿وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ﴾ [التکویر: ۱۸] [مسلم، النکاح، باب حوازل الغيلة..... : ۱۴۴۲/۱۴۱] ”یہ پوشیدہ طریقے کا زندہ دفن کرنا ہے اور یہ فعل اللہ تعالیٰ کے اس قول کی وعید کے تحت آتا ہے کہ جب زندہ دفن کی ہوئی لڑکی سے سوال کیا جائے گا۔“ مقصد یہ ہے کہ عزل میں امکان حمل کے باوجود اس کے تسلسل کا نتیجہ نسل انسانی کی ہلاکت ہے۔ اس حدیث سے منع حمل کے دوسرے ظالمانہ طریقوں کی وعید خود بخود سمجھ میں آرہی ہے۔

آیت ۱۰ ﴿وَإِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ﴾: اعمال نامے جو بند تھے، پھیلا کر سامنے کر دیے جائیں گے، تاکہ ہر عمل کرنے والا اپنے عمل خود پڑھ لے۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ لوگوں میں ان کے اعمال نامے دائیں یا بائیں ہاتھوں میں پھیلا دیے جائیں گے۔

آیت ۱۱ ﴿وَإِذَا السَّمَاءُ كُشِطَتْ﴾: ”كُشِطَ“ (ض) ”الشَّيْءُ“ کسی چیز سے وہ چیز اتار دینا جس نے اسے ڈھانپ رکھا ہو۔ ”كُشِطَ الْبَعِيْرُ“ اونٹ کی کھال اتارنا۔ عالم بالا پر آسمان کا پردہ جو کھال کی طرح چڑھا ہوا ہے اسے اتار کر تہ کر دیا جائے گا۔ (طبری) جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿يَوْمَ نَطْوِي السَّمَاءَ كَطَيِّ السِّجِلِ لِلْكَتٰبِ﴾ [الانبیاء: ۱۰۴] ”جس دن ہم آسمان کو یوں لپیٹ دیں گے جیسے طومار میں اوراق لپیٹ دیے جاتے ہیں۔“ کھال اتار دیے جانے کے بعد عالم بالا سب کے سامنے آشکار ہو جائے گا۔

وَإِذَا الْجَحِيمُ سُعِرَتْ ﴿۱۱﴾ وَإِذَا الْجَنَّةُ أُزْلِفَتْ ﴿۱۲﴾ عَلِمْتُ نَفْسٌ مَّا أَحْضَرْتُ ﴿۱۳﴾ فَلَا أُقِيمُ بِالْحُنَّسِ ﴿۱۵﴾ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ ﴿۱۶﴾ وَاللَّيْلِ إِذَا عَسْعَسَ ﴿۱۷﴾ وَالصُّبْحِ إِذَا تَنَفَّسَ ﴿۱۸﴾
إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ﴿۱۹﴾

اور جب جہنم بھڑکائی جائے گی ﴿۱۱﴾ اور جب جنت قریب لائی جائے گی ﴿۱۲﴾ ہر جان، جان لے گی جو لے کر آئی ﴿۱۳﴾ پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں ان (ستاروں) کی جو پیچھے ہٹنے والے ہیں! ﴿۱۵﴾ جو چلنے والے ہیں، چھپ جانے والے ہیں! ﴿۱۶﴾ اور رات کی جب وہ جانے لگتی ہے! ﴿۱۷﴾ اور صبح کی جب وہ سانس لیتی ہے! ﴿۱۸﴾ بے شک یہ یقیناً ایک ایسے پیغام پہنچانے والے کا قول ہے جو بہت معزز ہے ﴿۱۹﴾

آیت 12، 13: ﴿وَإِذَا الْجَحِيمُ سُعِرَتْ﴾ : یہ دونوں چیزیں میدانِ محشر میں ہوں گی۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ فجر (۲۳) اور سورہ شعراء (۹۰، ۹۱) کی تفسیر۔

آیت 14: ﴿عَلِمْتُ نَفْسٌ مَّا أَحْضَرْتُ﴾ : شروع سورت سے یہاں تک کل بارہ چیزوں کا ذکر ہوا ہے، جب یہ بارہ چیزیں ہو جائیں گی تو کیا ہوگا؟ اس کا جواب ہے: ﴿عَلِمْتُ نَفْسٌ مَّا أَحْضَرْتُ﴾ کہ ہر جان جو کچھ لے کر آئی ہے اسے جان لے گی۔ ”نَفْسٌ“ کی تکمیرِ عموم کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ ”ہر جان“ کیا گیا ہے۔

آیت 15، 16: ﴿فَلَا أُقِيمُ بِالْحُنَّسِ﴾ : ”الْحُنَّسُ“ ”حُنَّسٌ“ (ض) (پیچھے ہٹنا) سے ”حُنَّسٌ“ کی جمع بروزن ”حُنَّسٌ“ ہے۔ ”حُنَّسٌ“ بھی اسی سے ہے۔ اسی طرح ”الْكُنَّسِ“ ”كُنَّسٌ“ کی جمع ہے۔ ”كُنَّسٌ“ ہرن وغیرہ کی درختوں میں بنائی ہوئی جگہ، جہاں وہ چھپ جاتے ہیں۔ ”كُنَّسٌ“ (ض) چھپنے کی جگہ میں داخل ہو گیا، چھپ گیا۔ ”الْجَوَارِ“ ”بَحْرَى يَجْرِي“ سے ”بَحْرِيَّةٌ“ کی جمع ہے۔ مراد سورج، چاند اور ستارے ہیں۔ انہیں ”الْحُنَّسُ“ (پیچھے ہٹنے والے) اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ سب مغرب میں غروب ہونے کے بعد پھر پیچھے یعنی مشرق کی طرف آنا شروع ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ مشرق سے دوبارہ نمودار ہو جاتے ہیں۔ ”الْجَوَارِ“ چلنے والے، یعنی ان کا کام ہی چلتے رہنا ہے، مغرب سے واپس مشرق کی طرف اور وہاں سے دوبارہ مغرب کی طرف۔ ”الْكُنَّسِ“ چھپنے والے، یعنی مغرب سے مشرق کی طرف چلتے ہوئے نظر نہیں آتے۔

آیت 17، 18: ﴿وَاللَّيْلِ إِذَا عَسْعَسَ﴾ : ”عَسْعَسَ“ آنے اور جانے دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے، یہاں دوسرا معنی زیادہ مناسب ہے۔ ”تَنَفَّسَ“ سانس لیتے ہوئے چھاتی پھیلتی ہے، صبح کی روشنی پھیلنے کی کیفیت کی نقشہ کشی انسان کے سانس لینے کی کیفیت کے ساتھ کی ہے۔

آیت 19: ﴿إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ﴾ : یہ ان قسموں کا جواب ہے، یعنی امرا الہی کے پابند یہ سیارے، روزانہ جاتی ہوئی

ذِي قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ ﴿۲۰﴾ مُطَاعٍ ثَمَّ أَمِينٍ ﴿۲۱﴾ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِبَجُنُونٍ ﴿۲۲﴾ وَلَقَدْ رَآهُ بِالْأُفُقِ الْمُبِينِ ﴿۲۳﴾

بڑی قوت والا ہے، عرش والے کے ہاں بہت مرتبے والا ہے ﴿۲۰﴾ وہاں اس کی بات مانی جاتی ہے، امانت دار ہے ﴿۲۱﴾ اور تمہارا ساتھی ہرگز کوئی دیوانہ نہیں ہے ﴿۲۲﴾ اور بلاشبہ یقیناً اس نے اس (جبریل) کو (آسمان کے) روشن کنارے پر دیکھا ہے ﴿۲۳﴾

رات اور پھیلتی ہوئی صبح کا یہ مستحکم نظام زبردست شہادت ہے کہ یہ وحی رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک نہایت معزز اور ان عظیم صفات والا فرشتہ (جبریل علیہ السلام) ہی لے کر آیا ہے۔ دن رات، سورج چاند اور ستاروں کے نظام کی طرح یہاں بھی کسی شیطان کا دخل نہیں ہو سکتا۔

اس آیت میں ”رَسُولٍ“ سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں، کیونکہ مشرکین مکہ کبھی کہتے: ﴿إِنَّمَا يُعَلِّمُهُ بَشَرٌ﴾ [النحل: ۱۰۳] ”اسے کوئی بشر ہی سکھاتا ہے۔“ کبھی کہتے: ﴿أَفْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَمْ بِهِ جِنَّةٌ﴾ [سبا: ۸] ”کیا اس نے اللہ پر جھوٹ باندھا یا یہ دیوانہ ہے؟“ تو اللہ تعالیٰ نے ان مشرکین کے قول کے جھٹلانے کو یہ آیات نازل فرمائیں اور فرمایا کہ نہ اللہ کے رسول مجنون اور دیوانے ہیں، نہ انھوں نے اپنی طرف سے اس قرآن کو بنایا ہے اور نہ کسی انسان نے انھیں یہ قرآن سکھایا ہے۔ یہ ایسا کلام نہیں ہے جس طرح شیاطین چوری سے آسمان کی کچھ باتیں سن کر کانہوں سے کہہ دیتے ہیں، بلکہ پیغام کے طور پر اللہ کی طرف سے ایک صاحب قوت، معتبر اور امانت دار فرشتے نے یہ قرآن اللہ کے نبی کو پہنچایا ہے۔ (احسن التفسیر)

آیت 20 ذِي قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ: ”ذِي قُوَّةٍ“ کی تین تعظیم کے لیے ہے، بڑی قوت والا۔ سورہ نجم میں بھی جبریل علیہ السلام کا یہ وصف بیان ہوا ہے، فرمایا: ﴿عَلَّمَكَ شَدِيدُ الْقُوَىٰ ﴿۱﴾ ذُو هَرَّةٍ ﴿۲﴾﴾ [النجم: ۶۰۵] ”اسے نہایت مضبوط قوتوں والے (فرشتے) نے سکھایا۔ جو بڑی طاقت والا ہے۔“ جبریل علیہ السلام کی قوت کا ذکر یہاں اس لیے فرمایا ہے کہ ان کی قوت کے سبب سے شیطان ان سے بھاگتا ہے، جیسا کہ بدر میں انھیں دکھ کر بھاگا تھا۔ (دیکھیے انفال: ۴۸) مطلب یہ ہے کہ جبریل علیہ السلام کی قوت کی وجہ سے ان کی پیغام رسانی میں نہ شیطان کا کچھ دخل ہے اور نہ ان کی امانت داری کے سبب اس پیغام رسانی میں کسی خیانت کا دخل ہے، اس لیے کسی شک و شبہ کے بغیر یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ (خلاصہ احسن التفسیر)

آیت 21 مُطَاعٍ ثَمَّ أَمِينٍ: وہاں اس کی بات مانی ہوئی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے مقرب فرشتوں میں سے ہے، جیسا کہ حدیث معراج میں ہے کہ جبریل علیہ السلام کے کہنے پر آسمان کے دروازے کھلے۔

آیت 23 وَلَقَدْ رَآهُ بِالْأُفُقِ الْمُبِينِ: روشن کنارے سے مراد آسمان کا مشرقی کنارہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے جبریل علیہ السلام کو ان کی اصل صورت میں دو مرتبہ دیکھا ہے، ایک دفعہ زمین پر اور دوسری دفعہ آسمان پر۔ (دیکھیے نجم: ۱۸۳۱) یہاں پہلی مرتبہ کا ذکر ہوا ہے، آپ ﷺ نے جبریل علیہ السلام کو ان کی اصل صورت میں دیکھا، ان کے چہ سو پر تھے اور پورا افق ان سے بھرا ہوا

وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ ﴿۲۷﴾ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطَانٍ رَجِيمٍ ﴿۲۸﴾ فَأَيْنَ تَذَهَبُونَ ﴿۲۹﴾
 إِنَّ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ ﴿۳۰﴾ لَئِن شَاءَ مِنكُم أَن يَسْتَقِيمَ ﴿۳۱﴾ وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا
 أَن يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ ﴿۳۲﴾

اور وہ غیب کی باتوں پر ہرگز بخل کرنے والا نہیں ﴿۲۷﴾ اور وہ ہرگز کسی مردود شیطان کا کلام نہیں ﴿۲۸﴾ پھر تم کہاں جا رہے ہو؟ ﴿۲۹﴾ یہ اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ جہانوں کے لیے صیحت ہے ﴿۳۰﴾ اس کے لیے جو تم میں سے چاہے کہ سیدھا چلے ﴿۳۱﴾ اور تم نہیں چاہتے مگر یہ کہ اللہ چاہے، جو سب جہانوں کا رب ہے ﴿۳۲﴾

تھا۔ [دیکھیے بخاری، بندہ الخلق، باب إذا قال أحدكم آمین..... : ۳۲۳۲ و ۳۲۳۵]

آیت 24 ﴿ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ ﴾: "ضَنِينٌ" بخیل، یعنی اللہ تعالیٰ انھیں غیب کی جو بات بتاتے ہیں وہ اسے اپنے پاس ہی نہیں رکھ لیتے بلکہ امت تک پہنچا دیتے ہیں۔ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: « مِنْ حَدِّثِكَ أَنَّ مُحَمَّدًا صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كُنْتُمْ شَيْئًا مِّمَّا أَنْزَلَ عَلَيْهِ، فَقَدْ كَذَبَ، وَاللَّهِ يَقُولُ: ﴿يَأْتِيهَا الرُّسُودُ بَلِّغْ مَا أَنْزَلَ إِلَيْكَ مِنَ رَبِّكَ﴾ » [بخاری، التفسیر، باب: ﴿يَأْتِيهَا الرُّسُودُ بَلِّغْ﴾ : ۶۱۶] "جو شخص تمہیں بتائے کہ محمد ﷺ نے آپ پر نازل ہونے والی کوئی بات چھپائی ہے، تو اس نے یقیناً جھوٹ بولا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿يَأْتِيهَا الرُّسُودُ بَلِّغْ مَا أَنْزَلَ إِلَيْكَ مِنَ رَبِّكَ﴾ [العنادة: ۶۷] "اے رسول! پہنچا دے جو کچھ تیری طرف تیرے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے۔"

بعض لوگوں نے اس آیت سے یہ مطلب نکالا ہے کہ رسول اللہ ﷺ غیب جانتے تھے، کیونکہ بخل وہی رکھتا ہے جس کے پاس کوئی چیز موجود ہو۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے صاف فرمایا ہے: ﴿قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللَّهُ﴾ [النمل: ۶۵] "اے نبی! کہہ دے، اللہ کے سوا آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہے غیب نہیں جانتا۔" اس سے صاف ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو غیب کی جو باتیں بتائی گئی ہیں وہ لوگوں کو بتانے میں آپ بخل نہیں کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو غیب کی کچھ باتیں بتادی جائیں تو وہ اس سے عالم الغیب نہیں بن جاتا، کیونکہ وہ صرف اتنی بات جانتا ہے زیادہ نہیں۔ ورنہ اگر اس وجہ سے رسول اللہ ﷺ کو عالم الغیب مانا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو غیب کی کئی باتیں بتائی ہیں تو امت کو بھی عالم الغیب ماننا پڑے گا، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کو جو کچھ بتایا گیا تھا آپ نے اللہ کے حکم کے مطابق وہ سب کچھ امت کو بتا دیا۔

آیت 29 ﴿ وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ ﴾: یعنی تمہارا چاہنا بھی اللہ کے چاہنے اور توفیق دینے پر موقوف ہے۔ مزید دیکھیے سورۃ یونس (۱۰۰)، انعام (۱۱۲)، قصص (۵۶) اور سورۃ دہر (۳۰)۔



سُورَةُ الْاِنْفِطَارِ ۸۲-۸۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴿۱﴾

۱۹ یٰۤاِنْسَانُ ۚ كُنْتَ تَابًا

اِذَا السَّمَاءُ اِنْفَطَرَتْ ﴿۱﴾ وَ اِذَا الْكُوْكُبُ اِنْتَثَرَتْ ﴿۲﴾ وَ اِذَا الْبِحَارُ فُجِعَتْ ﴿۳﴾ وَ اِذَا
الْقُبُوْرُ بُعِثَتْ ﴿۴﴾ عَلِمْتَ نَفْسٌ مَا قَدَّمَتْ وَ اَخَّرَتْ ﴿۵﴾ يٰۤاِنْسَانُ مَا عَزَرَكَ
بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ﴿۶﴾ الَّذِي خَلَقَكَ فَسُوِّكَ فَعَدَلَكَ ﴿۷﴾ فِیْ اٰیِ صُوْرَةٍ مَّا شَاءَ رَكَّبَكَ ﴿۸﴾
كَلَّا بَلْ تُكَدِّبُوْنَ بِالذِّیْنِ ﴿۹﴾

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

جب آسمان پھٹ جائے گا ① اور جب ستارے بکھر کر گر جائیں گے ② اور جب سمندر پھاڑ دیے جائیں گے ③ اور جب قبریں الٹ دی جائیں گی ④ ہر شخص جان لے گا جو اس نے آگے بھیجا اور جو پیچھے چھوڑا ⑤ اے انسان! تجھے تیرے نہایت کرم والے رب کے متعلق کس چیز نے دھوکا دیا؟ ⑥ وہ جس نے تجھے پیدا کیا، پھر تجھے درست کیا، پھر تجھے برابر کیا ④ جس صورت میں بھی اس نے چاہا تجھے جوڑ دیا ⑧ ہرگز نہیں، بلکہ تم جزا کو جھلاتے ہو ⑨

آیت 3 وَ اِذَا الْبِحَارُ فُجِعَتْ : یہاں فرمایا کہ سمندر پھاڑ دیے جائیں گے، کچھلی سورت میں فرمایا بھڑکائے جائیں گے، تو دونوں باتیں ہی حق ہیں، پہلے قیامت کے شدید زلزلوں سے ساری زمین جا بجا پھٹ جائے گی، سمندر درمیان میں حائل رکاوٹیں ختم ہونے سے ایک ہو جائیں گے، پھر ان میں آگ لگ جائے گی۔

آیت 4 وَ اِذَا الْقُبُوْرُ بُعِثَتْ : دوسرے نغزے سے قبریں پھٹیں گی اور مردے زندہ ہو کر باہر نکل آئیں گے۔

آیت 5 عَلِمْتَ نَفْسٌ مَا قَدَّمَتْ وَ اَخَّرَتْ : جو اچھے یا برے اعمال موت سے پہلے کیے، یا جو اچھے یا برے طریقے پیچھے چھوڑ گیا، جن کے ثواب و عذاب کا سلسلہ اس کے مرنے کے بعد بھی جاری رہا، وہ سب سامنے آ جائیں گے۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جو عمل شروع عمر میں کیے اور جو آخر عمر میں کیے۔

آیت 5 يٰۤاِنْسَانُ مَا عَزَرَكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ : اتنی مہربانیوں والے رب کے متعلق دھوکا کھانے اور کفر کرنے کی تو کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔

آیت 7 الَّذِي خَلَقَكَ فَسُوِّكَ ... : وہ تجھے بے ڈھب بنا سکتا تھا، بندر، خنزیر یا کوئی اور جانور بھی بنا سکتا تھا۔ اتنی اچھی ترکیب سے جب پہلے بنا دیا تو جزائے اعمال کے لیے دوبارہ کیوں نہیں بنا سکتا؟

آیت 9 كَلَّا بَلْ تُكَدِّبُوْنَ بِالذِّیْنِ : یعنی دھوکا کھانے کا سبب یہ نہیں کہ تمہیں رب کریم کی مہربانیوں پر بہت اعتماد ہے، بلکہ یہ باطل خیال ہے کہ ہمیں نہ دوبارہ زندہ ہونا ہے اور نہ اعمال کا بدلا ملنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام بد اعمالیوں کا اصل

وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَافِظِينَ ۝ كِرَامًا كَاتِبِينَ ۝ يَعْلَمُونَ مَا تَفْعَلُونَ ۝ إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ ۝ وَإِنَّ الْفَجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ ۝ يَصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّينِ ۝ وَمَا هُمْ عَنْهَا

بِغَائِبِينَ ۝

حالانکہ بلاشبہ تم پر یقیناً نگہبان (مقرر) ہیں ۱۵ جو بہت عزت والے ہیں، لکھنے والے ہیں ۱۱ وہ جانتے ہیں جو تم کرتے ہو ۱۴ بے شک نیک لوگ یقیناً بڑی نعمت میں ہوں گے ۱۳ اور بے شک نافرمان لوگ یقیناً بھڑکتی آگ میں ہوں گے ۱۲ وہ اس میں جزا کے دن داخل ہوں گے ۱۵ اور وہ اس سے کبھی غائب ہونے والے نہیں ہیں ۱۶

سب روز جزا کو جھٹلاتا ہے اور اسی کو تم جھٹلا رہے ہو۔

آیت 10-11: ﴿وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَافِظِينَ.....﴾ : حالانکہ تم پر نگہبان مقرر ہیں، یعنی فرشتے۔ ”حَافِظِينَ“ یعنی کوئی عمل ان کی نگرانی سے باہر نہیں۔ ”کِرَامًا“ عزت والے، اس لیے کہ وہ لکھنے میں کوئی خیانت نہیں کرتے، نہ کوئی بات لکھنے سے چھوڑتے ہیں اور نہ زیادہ لکھتے ہیں۔

آیت 12: ﴿يَعْلَمُونَ مَا تَفْعَلُونَ﴾ : تمہارا کوئی مخفی سے مخفی کام حتیٰ کہ تمہاری نیتیں اور ارادے بھی ان سے پوشیدہ نہیں۔ لہذا تمہارا یہ سمجھنا کہ تمہارے چھپا کر کیے ہوئے گناہ ریکارڈ میں نہیں آئیں گے اور تم ان کی سزا سے بچ جاؤ گے، زبردست نادانی ہے۔ ان فرشتوں کا مزید ذکر سورہ ق (۱۷، ۱۸) میں دیکھیے۔

آیت 13-14: ﴿إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ.....﴾ : فرشتوں کے تیار کردہ اعمال ناموں کا نتیجہ یہ ہے کہ نیک لوگ نعمت میں اور نافرمان بھڑکتی ہوئی آگ میں ہوں گے۔ ”الْأَبْرَارَ“ ”بِرَّ“ کی جمع ہے، وہ شخص جس میں ”بِرَّ“ (نیکی) پائی جائے۔ نیکی کیا ہے اور نیک کون ہے اس کی تفصیل سورہ بقرہ کی آیت (۱۷۷) یعنی ”آیت بر“ میں ملاحظہ فرمائیں۔ ”الْفَجَّارَ“ ”فَاجِرَ“ کی جمع ہے، یہاں مراد کافر ہیں، کیونکہ مومن ہمیشہ جہنم میں نہیں رہے گا۔

آیت 15-16: ﴿يَصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّينِ.....﴾ : ”بِغَائِبِينَ“ پر باء نفی کی تاکید کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ ”کبھی غائب ہونے والے نہیں۔“ کیا گیا ہے۔ فاجر لوگ قیامت کے دن جہنم میں داخل ہوں گے اور ہمیشہ اس میں رہیں گے، کبھی اس سے نہیں نکلیں گے۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ اگرچہ وہ قیامت کے دن جہنم میں داخل ہوں گے مگر اس سے پہلے قبر میں بھی وہ آگ سے غائب نہیں ہیں، جیسا کہ آل فرعون کے متعلق فرمایا: ﴿وَحَاقَ بِآلِ فِرْعَوْنَ سُوءُ الْعَذَابِ ۝ النَّارُ يُعْرَضُونَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَعَشِيًّا ۝ وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ ۝ أَدْخِلُوا آلَ فِرْعَوْنَ أَشَدَّ الْعَذَابِ﴾ [المومن: ۴۵، ۴۶] ”اور آل فرعون کو بدترین عذاب نے گھیر لیا جو آگ ہے۔ اس پر صبح اور شام پیش کیے جاتے ہیں اور جس دن قیامت قائم ہوگی (کہا جائے گا کہ) آل فرعون کو سخت ترین عذاب میں داخل کرو۔“

وَمَا أَدْرَاكَ مَا يَوْمُ الدِّينِ ﴿۱۷﴾ ثُمَّ مَا أَدْرَاكَ مَا يَوْمُ الدِّينِ ﴿۱۸﴾ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِنَفْسٍ شَيْئًا ۚ وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِلَّهِ ﴿۱۹﴾

اور تجھے کس چیز نے معلوم کروایا کہ جزا کا دن کیا ہے؟ ﴿۱۷﴾ پھر تجھے کس چیز نے معلوم کروایا کہ جزا کا دن کیا ہے؟ ﴿۱۸﴾ جس دن کوئی جان کسی جان کے لیے کسی چیز کا اختیار نہ رکھے گی اور اس دن حکم صرف اللہ کا ہوگا ﴿۱۹﴾

آیت 18، 17 : وَمَا أَدْرَاكَ مَا يَوْمُ الدِّينِ ... : قیامت کی عظمت و اہمیت ذہن میں بٹھانے کے لیے سوال اور پھر تکرار سوال ہے۔

آیت 19 : يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِنَفْسٍ شَيْئًا : دنیا میں بظاہر لوگوں کی کچھ ملکیت بھی ہے اور ایک حد تک نفع و ضرر کا اختیار بھی ہے، مگر قیامت کے دن اللہ کے علاوہ نہ کسی کا اختیار رہے گا، نہ ملکیت اور نہ حکومت، جیسا کہ فرمایا: ﴿لَيْسَ الْمَالُ الْيَوْمَ إِلَّا لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾ [المومن: ۱۶] ”آج کے دن بادشاہی کس کی ہے؟ صرف اللہ کی جو ایک ہے، زبردست ہے۔“ رہ گئی شفاعت تو وہ بھی کسی کے اختیار میں نہیں ہوگی، بلکہ صرف وہی کر سکے گا جسے اللہ تعالیٰ اجازت دے گا، فرمایا: ﴿مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ﴾ [البقرہ: ۲۵۵] ”کون ہے جو اس کے پاس اس کی اجازت کے بغیر سفارش کرے۔“ مزید دیکھیے سورہ نیا کی آیت (۳۸) کی تفسیر۔



سُورَةُ الطُّفَّيْنِ
۸۲
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَيْلٌ لِّلطُّفَّيْنِ ۝۱ الَّذِيْنَ اِذَا اُكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝۲ وَاِذَا كَالُوْهُمْ
اَوْ وَزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۝۳ اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنْهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۝۴ لَّيَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝۵ يَوْمَ
يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۶

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

بڑی ہلاکت ہے ماپ تول میں کمی کرنے والوں کے لیے ① وہ لوگ کہ جب لوگوں سے ماپ کر لیتے ہیں تو پورا لیتے ہیں۔ ② اور جب انھیں ماپ کر یا انھیں تول کر دیتے ہیں تو کم دیتے ہیں ③ کیا یہ لوگ یقین نہیں رکھتے کہ وہ اٹھائے جانے والے ہیں ④ ایک بہت بڑے دن کے لیے ⑤ جس دن لوگ رب العالمین کے لیے کھڑے ہوں گے ⑥

آیت 1 وَيْلٌ لِّلطُّفَّيْنِ: "الطُّفَّيْفُ" ماپ یا تول میں کمی کرنا۔ ماپ تول کے علاوہ لین دین کے جتنے بھی دیگر

بیانے ہیں ان میں کمی بھی "الطُّفَّيْفُ" ہے۔ "الطُّفَّيْفُ" بالکل تھوڑی سی چیز کو کہتے ہیں۔ "صاع" بھرا ہوا ہو، مگر پورا بھرنے سے کم ہو تو اس کی کو "صَفَّ الصَّاعُ" کہتے ہیں۔ چونکہ ماپ تول میں کمی کرنے والا کوئی بڑا مال نہیں چراتا بلکہ تھوڑی سی چیز چراتا ہے، اس لیے اسے "الْمُطَفَّفُ" کہتے ہیں۔ یہ فعل کمینگی کی انتہا ہے اور اس بات کی دلیل ہے کہ اتنی تھوڑی تھوڑی چیز کی چوری کرنے والا شخص بڑا مال اڑانے سے بھی پرہیز کرنے والا نہیں، صرف اپنی کم ہمتی یا کچھ بے جا خوف سے اتنی چوری پر صبر کیے بیٹھا ہے، ورنہ اس کی طبیعت کے فاسد ہو جانے اور امانت سے خالی ہو جانے میں کوئی کمی باقی نہیں رہی۔

اللہ تعالیٰ نے اس فعل شنع کا ارتکاب کرنے والوں کو "وَيْلٌ" کی وعید سنائی ہے، جس کا معنی ہلاکت ہے۔ آخرت میں ہونے والی ہلاکت کا تو کچھ شمار ہی نہیں، اس کی کچھ تفصیل اسی سورت میں آ رہی ہے، اگرچہ وہ مکذبین (جھلانے والوں) کے لیے ہے، مگر یہ فعل بھی آخرت کی تکذیب ہی سے سرزد ہوتا ہے، جبکہ دنیا میں اس سے ہونے والی ہلاکت رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمائی، حدیث لمبی ہے، اس کا ایک فقرہ یہ ہے: «وَلَمْ يَنْقُصُوا الْمِكْيَاتِ وَالْمِيزَانَ، اِلَّا اُجِدُوا بِالنَّسِيْبِ، وَشِدَّةِ الْمَوْزُونَةِ، وَخَوْرِ السُّلْطَانِ عَلَيْهِمْ» [اس ماجہ، لفتن، باب العقرات: ۱۹، ۲۰] "جو قوم بھی ماپ تول میں کمی کرتی ہے اسے قسط سالیوں، سخت مشقت اور حکمرانوں کے ظلم کے ساتھ پکڑ لیا جاتا ہے۔" شیخ البانی رحمۃ اللہ علیہ نے مستدرک حاکم کی سند کی وجہ سے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔ [دیکھیے سننہ الاحادیث الصحیحة: ۱۰۶، شعیب رحمۃ اللہ علیہ کی قوم پر عذاب کا ایک سبب یہ بھی تھا۔

تنبیہ: ترمذی کی روایت کہ "ویل جنہم کی ایک وادی ہے..." صحیح نہیں۔ [دیکھیے صغیر ترمذی، سورۃ الانبیاء: ۳۳۸۹]

آیت 1 اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ : یعنی اگر وہ سمجھتے کہ ہمیں ایک دن عیش ہو کر حساب دینا ہے تو کبھی ماپ تول میں کمی نہ کرتے۔

آیت 6.5 لَّيَوْمٍ عَظِيْمٍ : "ایک بڑے دن کے لیے" بڑا دن اس لیے کہ اس کی مقدار ہی پچاس ہزار سال ہے۔

(دیکھیے معارج: ۴) اور اس لیے بھی بڑا ہے کہ عیش عام عدالت میں بھی گھبراہٹ کا باعث ہوتی ہے، اس دن تو رب العالمین کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

كَلَّا إِنَّ كِتَابَ الْفُجَّارِ لَفِي سِجِّينٍ ﴿٤﴾ وَمَا أَدْرَاكَ مَا سِجِّينٌ ﴿٥﴾ كِتَابٌ مَرْقُومٌ ﴿٦﴾ وَيَلُوكُ
يَوْمَئِذٍ اللَّامِكُذِّبِينَ ﴿٧﴾ الَّذِينَ يُكَذِّبُونَ بَيِّنَاتٍ مِنَ الدِّينِ وَأَمْثَلُ النَّاسِ كُفْرًا إِلَّا كَلْبًا
مُعْتَدٍ آثِيمًا ﴿٨﴾ إِذَا تَنَالَى عَلَيْهِ آيَاتُنَا قَالَ أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ﴿٩﴾

ہرگز نہیں، بے شک نافرمان لوگوں کا اعمال نامہ یقیناً دائی سخت قید کے دفتر میں ہے ﴿۴﴾ اور تجھے کس چیز نے معلوم
کر دیا کہ دائی سخت قید کا دفتر کیا ہے؟ ﴿۵﴾ ایک کتاب ہے، واضح لکھی ہوئی ﴿۶﴾ اس دن جھٹلانے والوں کے لیے بڑی
ہلاکت ہے ﴿۷﴾ جو جزا کے دن کو جھٹلاتے ہیں ﴿۸﴾ اور اسے کوئی نہیں جھٹلاتا مگر ہر حد سے نکل جانے والا، سخت
گناہ گار ﴿۹﴾ جب اس کے سامنے ہماری آیات پڑھی جاتی ہیں تو کہتا ہے یہ پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں ﴿۱۰﴾

کے سامنے پیش ہونا ہوگا۔ مقداد بن اسود رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ نے فرمایا: «تُدْنِي
السُّنْسُنُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنَ الْخَلْقِ حَتَّى تَكُونَ مِنْهُ كَمَقْدَارِ مِيلٍ فَيَكُونُ النَّاسُ عَلَيَّ قَدْرَ أَعْمَالِهِمْ فِي الْعَرْقِ،
فَبَنَّهُمْ مَنْ يَكُونُ إِلَيَّ سَعْيِيهِ وَمِنْهُمْ مَنْ يَكُونُ إِلَيَّ رُكْبَتِيهِ وَمِنْهُمْ مَنْ يَكُونُ إِلَيَّ حَقْوِيهِ وَمِنْهُمْ مَنْ يُلْجِمُهُ
الْعَرْقُ إِتْحَامًا قَالَ وَأَشَارَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِيَدِهِ إِلَى فِيهِ» [مسلم، الحنة و صفة نعمتها، باب في
صفة يوم القيامة ... : ۳۸۶۹] "قیامت کے دن سورج مخلوق کے قریب ہو جائے گا یہاں تک کہ ان سے ایک میل کی مقدار
کی طرح ہوگا۔ تو لوگ اپنے اعمال کے اندازے کے مطابق پسینے میں بیوں گے، جو ان میں سے بعض کے گھٹنوں تک ہوگا، بعض
کے گھٹنوں تک، بعض کی کمر تک اور بعض کو پیمنا لگام کی طرح لگام ڈال لے گا۔" اور رسول اللہ ﷺ نے اپنے ہاتھ کے ساتھ
اپنے منہ کی طرف اشارہ فرمایا: "ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس دن کانوں کے نصف تک پسینے کا
ذکر کرتے ہوئے یہ آیت پڑھی: ﴿يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ "جس دن لوگ رب العالمین کے لیے کھڑے
ہوں گے۔" [بخاری، التفسیر، باب: ﴿يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ﴾ ... : ۴۹۳۸]

آیت ۱۱: ۷ : كَلَّا إِنَّ كِتَابَ الْفُجَّارِ لَفِي سِجِّينٍ ... : "كَلَّا" یعنی یہ بات ہرگز نہیں کہ تم جس طرح چاہو اللہ کے احکام
کی نافرمانی کرتے ہوئے ماب تول میں کمی کرتے رہو اور وہ وقت ہی نہ آئے کہ تم سے اس ظلم کے متعلق باز پرس ہو۔ نہیں،
بلکہ نافرمان لوگوں کا اعمال نامہ سحین میں ہے۔ "سِجِّينٌ" "سِجِّينٌ" سے مبالغہ ہے، جس کا معنی قید خانہ ہے۔ تاملوس میں
ہے: "السِّجِّينُ الدَّاخِمُ الشَّدِيدُ" یعنی دائی سخت قید۔ یہ وہ کتاب ہے جس میں ہمیشہ جہنم میں رہنے والوں کے نام اور ان
کے اعمال محفوظ ہیں (گویا یہ دائی قید والوں کا رجسٹر ہے)، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خود "سِجِّينٌ" کی وضاحت کی ہے کہ وہ "كِتَابٌ
مَرْقُومٌ" یعنی ایک واضح لکھی ہوئی کتاب ہے، جس میں کوئی کمی بیشی یا رد و بدل نہیں ہو سکتا کہ کوئی نام یا عمل داخل کر دیا
جائے یا مٹا دیا جائے۔ "وَيَلُوكُ يَوْمَئِذٍ اللَّامِكُذِّبِينَ" سے معلوم ہوا کہ ماب تول میں کمی کرنے والے درحقیقت قیامت کے
دن پر ایمان نہ رکھنے کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں۔

كَلَّا بَلْ سَخَّرَ مَرَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿۱۴﴾ كَلَّا إِنَّهُمْ عَنْ رَبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَمَجْجُونُونَ ﴿۱۵﴾ ثُمَّ إِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيمِ ﴿۱۶﴾ ثُمَّ يُقَالُ هَذَا الَّذِي كُنْتُمْ بِهِ تُكَذِّبُونَ ﴿۱۷﴾

ہرگز نہیں، بلکہ زنگ بن کر چھا گیا ہے ان کے دلوں پر جو وہ کماتے تھے ﴿۱۴﴾ ہرگز نہیں، بے شک وہ اس دن یقیناً اپنے رب سے حجاب میں ہوں گے ﴿۱۵﴾ پھر بے شک وہ بھڑکتی ہوئی آگ میں یقیناً داخل ہونے والے ہیں ﴿۱۶﴾ پھر کہا جائے گا یہی ہے جسے تم جھٹلایا کرتے تھے ﴿۱۷﴾

آیت 14 ﴿۱﴾ كَلَّا بَلْ سَخَّرَ مَرَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ.....: ”کَلَّا“ ”ہرگز نہیں“ مطلب یہ ہے کہ اس جھٹلانے والے کے آیات کو جھٹلانے کی وجہ یہ نہیں کہ یہ پہلوں کی کہانیاں ہیں یا ان کے حق ہونے میں کوئی شبہ ہے، بلکہ اس کی بد اعمالیاں سیاہ زنگ کی صورت میں اس کے دل پر غالب آچکی ہیں، اسے نہ حق نظر آتا ہے نہ باطل باطل۔ مستشرقین اور منکرین حدیث کی طرح پہلے منکرین کا بھی یہی حال تھا کہ اگر قرآن میں کوئی نئی بات آتی تو کہتے: ﴿مَا سَمِعْنَا بِهَذَا فِي آيَاتِ الْاَوَّلِينَ﴾ | القصص: ۳۶ | ”ہم نے تو یہ بات اپنے پہلے باپ دادا میں سنی ہی نہیں۔“ اور اگر وہ بات پہلی کتابوں میں موجود ہوتی تو کہتے یہ وہاں سے سرقہ کیا گیا ہے، یعنی ”أَسَاطِيرُ الْاَوَّلِينَ“ کہ یہ تو پہلوں کی کہانیاں ہیں۔ ﴿قَتَلْتَهُمُ اللّٰهُ أَىٰ يُوَفِّكُوْنَ﴾ | التوبة: ۳۰ | ”اللہ انھیں مارے، کدھر بہکائے جا رہے ہیں۔“

﴿۲﴾ مَرَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ: ”أَي رَكِبَهَا كَمَا يَرَكِبُ الصَّدَأُ وَعَلَبَهَا“ (زمخشری) ”یعنی ان کے دلوں پر چڑھ گیا ہے اور غالب آ گیا ہے جیسے زنگ چڑھ جاتا ہے۔“ ”مَرَانَ“ کا فاعل ”مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ“ ہے، یعنی جو کچھ وہ کمایا کرتے تھے وہ زنگ بن کر ان کے دلوں پر چھا گیا ہے۔ گناہ کا خاصہ ہے کہ اگر بار بار کیا جائے اور تو بہ نہ کی جائے تو پورے دل کو گھیر لیتا ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا أَخْطَأَ خَطِيئَةً نُكِنَتْ فِي قَلْبِهِ نُكْنَةٌ سَوْدَاءٌ فَإِذَا هُوَ نَزَعَ وَاسْتَعْفَرَ وَتَابَ سَقِلَ قَلْبُهُ وَإِنْ عَادَ زِيدَ فِيهَا حَتَّى تَعْلُوَ قَلْبُهُ وَهُوَ الرَّأْسُ الَّذِي ذَكَرَ اللّٰهُ: ﴿كَلَّا بَلْ سَخَّرَ مَرَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾﴾ [ترمذی، تفسیر القرآن، باب و من سورة وبل للمطففين: ۳۳۳۴] ”بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ داغ لگ جاتا ہے، جب باز آ جائے اور معافی مانگ لے تو اس کا دل صاف ہو جاتا ہے اور اگر دوبارہ گناہ کرے تو داغ بڑھا دیا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ سیاہ داغ اس کے پورے دل پر غالب آ جاتا ہے۔ یہی وہ ”ران“ ہے جو اللہ عزوجل نے ذکر فرمایا ہے: ﴿كَلَّا بَلْ سَخَّرَ مَرَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾ ”ہرگز نہیں، بلکہ زنگ بن کر چھا گیا ہے ان کے دلوں پر، جو وہ کماتے تھے۔“ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

آیت 15-17 ﴿۱۷﴾ كَلَّا إِنَّهُمْ عَنْ رَبِّهِمْ.....: یہ کافر جو کہتے ہیں کہ اگر قیامت ہوئی بھی تو دنیا کی طرح وہاں بھی پروردگار کی نوازشیں ہمیں پر ہوں گی، ان کا یہ کہنا ہرگز درست نہیں، انھیں تو پروردگار کے قریب تک نہیں آنے دیا جائے گا، بلکہ وہ حجاب میں رکھے جائیں گے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اس دن نافرمان اللہ تعالیٰ سے محجوب ہوں گے اور اہل ایمان کو وہ نظر

كَلَّا إِنَّ كِتَابَ الْأَبْرَارِ لَفِي عِلِّيِّينَ ﴿۱۸﴾ وَمَا أَدْرَاكَ مَا عِلِّيُّونَ ﴿۱۹﴾ كِتَابٌ قَرُورٌ ﴿۲۰﴾
يَشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُونَ ﴿۲۱﴾ إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ ﴿۲۲﴾ عَلَى الْأَرَآئِكِ يَنْظُرُونَ ﴿۲۳﴾ تَعْرِفُ فِي

ہرگز نہیں، بے شک نیک لوگوں کا اعمال نامہ یقیناً بہت ہی اونچے لوگوں کے دفتر میں ہے ﴿۱۸﴾ اور تجھے کس چیز نے معلوم کر دیا کہ بہت ہی اونچے لوگوں کا دفتر کیا ہے؟ ﴿۱۹﴾ ایک کتاب ہے، واضح لکھی ہوئی ﴿۲۰﴾ جس کے پاس مقرب (فرشتے) حاضر رہتے ہیں ﴿۲۱﴾ بے شک نیک لوگ یقیناً بڑی نعمت میں ہوں گے ﴿۲۲﴾ تختوں پر بیٹھے (دیکھ رہے ہوں گے) ﴿۲۳﴾ تو ان کے

آئے گا۔ اگر دیدار الہی کے مکروں کے کہنے کے مطابق اللہ تعالیٰ کسی کو بھی نظر نہیں آئے گا تو یہ آیت بے معنی ہو جاتی ہے۔ دوسری جگہ صریح الفاظ میں فرمایا: ﴿وَجُودًا يُؤْتُونَكَ صِرَاطًا ﴿۱۸﴾ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿۱۹﴾﴾ [القیامۃ: ۲۲، ۲۳] ”کئی چہرے اس دن تروتازہ ہوں گے۔ اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔“ حقیقت یہ ہے کہ آخرت کی نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت اللہ تعالیٰ کا دیدار ہے جو ایمان والوں کو حاصل ہوگی۔ (اللہ اپنے فضل سے ہمیں بھی اپنا دیدار نصیب فرمائے) اس کے ساتھ انھیں کھانے پینے، نکاح وغیرہ یعنی جنت کی دوسری نعمتیں بھی میسر ہوں گی۔ نافرمانوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے پہلا عذاب یہ ذکر فرمایا کہ وہ اپنے رب سے حجاب میں رکھے جائیں گے۔ دوسرا یہ کہ پھر وہ بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے۔ [أَعَاذَنَا اللَّهُ مِنْهُمَا] **آیت 18، 21:** كَلَّا إِنَّ كِتَابَ الْأَبْرَارِ.....: ”کَلَّا“ یعنی یہ بات ہرگز نہیں کہ نافرمانوں کا یہ حال ہوگا تو نیکیوں سے

بھی یہی سلوک ہو۔ ”عِلِّيِّينَ“ اور ”عِلِّيُّونَ“ ”علیٰ“ کی جمع ہیں جو ”علو“ سے مبالغے کا صیغہ ہے۔ اس کا معنی ہے ”بہت ہی اونچا شخص“ اور ”عِلِّيُّونَ“ کا معنی ہے ”بہت ہی اونچے لوگ۔“ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق یہ ایک کتاب ہے جس میں نیک لوگوں کے نام اور ان کے اعمال واضح طور پر لکھے ہوئے ہیں، ان میں کوئی رد و بدل یا کمی بیشی ممکن نہیں۔ ”يَشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُونَ“ یعنی اس کی گرائی کے لیے مقرب فرشتے حاضر رہتے ہیں۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ چونکہ وہ نیک لوگوں کا دفتر ہے، اس لیے اس کو دیکھنے کے لیے انھی مقرب لوگوں کو وہاں حاضر ہونے کی اجازت ہے جن کا وہ دفتر ہے۔ اس صورت میں ابراہیم مقرب ہیں۔

آیت 22، 23: إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ.....: یہاں سے نیک لوگوں کو ملنے والی نعمتوں کا تذکرہ ہے۔ تختوں پر بیٹھے کبھی دوزخیوں کو دیکھ کر خوش ہو رہے ہوں گے کہ رب تعالیٰ نے انھیں کتنی بڑی مصیبت سے بچایا ہے، کبھی جنت کی نعمتوں کا نظارہ کرتے ہوں گے اور کبھی دیدار الہی سے آنکھوں کو شاد کام کر رہے ہوں گے۔

آیت 24: تَعْرِفُ فِي وَجْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيمِ: دنیا میں خوش حال لوگوں کے چہروں کی تازگی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ صاحب آسائش لوگ ہیں، اسی طرح جنتی لوگوں کے چہرے جنت کی نعمتوں سے ایسے تروتازہ، پُر رونق اور خوش و خرم ہوں گے کہ دیکھنے والا دیکھتے ہی پہچان لے گا کہ وہ کس قدر نعمت اور عیش و آرام میں ہیں۔

وَجُوهِهِمْ نَضْرَةَ التَّعِيمِ ﴿۳۳﴾ يُسْقَوْنَ مِنْ رَحِيقٍ مَخْتُومٍ ﴿۳۴﴾ خِثْمُهُمْ مِنْكَ دَوْقِي ذَلِكَ
فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ ﴿۳۵﴾ وَ مِرَاجُهُ مِنْ تَسْنِينٍ ﴿۳۶﴾ عَيْنًا يَشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُونَ ﴿۳۷﴾ إِنَّ
الَّذِينَ أَجْرَمُوا كَانُوا مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا يَضْحَكُونَ ﴿۳۸﴾

چہروں میں نعمت کی تازگی پہچانے گا ﴿۳۳﴾ انھیں ایسی خالص شراب پلائی جائے گی جس پر مہر لگی ہوگی ﴿۳۴﴾ اس کی مہر کستوری ہوگی اور اسی (کو حاصل کرنے) میں ان لوگوں کو مقابلہ کرنا لازم ہے جو (کسی چیز کے حاصل کرنے میں) مقابلہ کرنے والے ہیں ﴿۳۵﴾ اور اس کی ملاوٹ تسنیم سے ہوگی ﴿۳۶﴾ جو ایک چشمہ ہے، جس سے مقرب لوگ پینیں گے ﴿۳۷﴾ بے شک وہ لوگ جنہوں نے جرم کیے، ان لوگوں پر جو ایمان لائے، ہنسا کرتے تھے ﴿۳۸﴾

آیت 25، 26: يُسْقَوْنَ مِنْ رَحِيقٍ مَخْتُومٍ: ”رَحِيقٍ“ خالص شراب جس میں کھوٹ نہ ہو۔ ”مَخْتُومٍ“ اگرچہ جنت میں شراب کی نہریں موجود ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَأَنْهَرُ مِنْ خَيْرٍ لَذًا لِلشَّرِيبِينَ﴾ [محمد: ۱۵] ”اور شراب کی کئی نہریں ہیں جو پینے والوں کے لیے لذیذ ہیں“ مگر یہ ایک خاص شراب ہوگی، جو برتنوں میں بند ہوگی، جن پر مہر مٹی یا راکھ کے بجائے کستوری کی ہوگی۔ ”خِثْمُهُمْ مِنْكَ“ کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ پیتے وقت آخری گھونٹ کے ساتھ کستوری جیسی خوشبو آئے گی نہ کہ دنیا کی شراب کی طرح بدبو کا بھھوکا اٹھے گا۔

آیت 27، 28: وَ مِرَاجُهُ مِنْ تَسْنِينٍ: ”مِرَاجُ“ آمیزش، ملونی، وہ چیز جو دوسری چیز میں لذت بڑھانے یا خوشبو پیدا کرنے یا تیزی کم کرنے کے لیے ملاتے ہیں، مثلاً کسی پھل کا جوس یا روح کیوڑا، الابچی، گلاب، کستوری وغیرہ یا ٹھنڈا میٹھا پانی یا دودھ وغیرہ، یہ صرف مثال ہے، جنت کی نعمتوں کی کیفیت اور لذت اللہ تعالیٰ جانتا ہے، یا وہ جانیں گے جنہیں وہ حاصل ہوں گی۔ ”تَسْنِينٍ“ باب تفعیل کا مصدر ہے۔ ”تَسْنِمَ“ (س) ”تَسْنَمَ، تَسْنَمَ أَي تَرَفَّعَ“ بلند ہونا، اونچی جگہ سے گرنا۔ یہ ”تَسْنِينٍ“ (ہموار ہونے) کی ضد ہے۔ (قاموس) ”تَسْنِينٍ“ جنت کے ایک چشمے کا نام ہے، جس کا پانی اہل جنت پر اوپر سے گر رہا ہوگا، یعنی وہ رَحِيقٍ مَخْتُومٍ میں اس چشمے کا پانی ملا کر عینیں گے جو اوپر سے گر رہا ہوگا۔ (طبری) یا اس چشمے کا نام تسنیم اس لیے ہے کہ وہ جنت کا سب سے اعلیٰ اور اونچے درجے کا مشروب ہے جو مقربین کو برابر پینے کے لیے ملے گا اور ابرار کو رَحِيقٍ مَخْتُومٍ میں آمیزش کے لیے دیا جائے گا۔

آیت 29: إِنَّ الَّذِينَ أَجْرَمُوا: ”يَضْحَكُونَ“ ”ہنسا کرتے تھے“ کہ ان پر کیا پاگل پن سوار ہے کہ دنیا کی نقد لذتوں کو چھوڑ کر کل کی ان دیکھی خیالی لذتوں کے وعدوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ ”كَانُوا“ اور ”يَضْحَكُونَ“ کے الفاظ سے معلوم ہوا کہ یہ ان کا ہمیشہ کا مشغلہ تھا۔ یہ صرف مکہ کے مشرکین کی بات نہیں، آج کے ٹھڈ اور بے دین بھی مسلمانوں کو رجعت پسند، دقیانوسی، تنگ نظر، تاریک خیال اور اس قسم کے طنزیہ خطابات دے کر خوش ہوتے اور اپنے دل کا بخار نکالتے رہتے ہیں۔ بہت سے شاعروں نے بھی جنت اور اہل جنت پر چوٹیں کی ہیں، ان سب کو ان آیات کے مضمون سے ڈرنا چاہیے۔

وَإِذَا نَزَّوْا بِهِمْ يَتَغَامِرُونَ ﴿۳۰﴾ وَإِذَا انْقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِمْ انْقَلَبُوا فَكِهِينَ ﴿۳۱﴾ وَإِذَا رَأَوْهُمْ قَالُوا إِنَّ هَؤُلَاءِ لَضَالُّونَ ﴿۳۲﴾ وَمَا أُرْسِلُوا عَلَيْهِمْ حَفِظِينَ ﴿۳۳﴾ فَالْيَوْمَ الَّذِينَ آمَنُوا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُونَ ﴿۳۴﴾ عَلَى الْأَرْكَامِ يُنظَرُونَ ﴿۳۵﴾ هَلْ تُؤْتِبُ الْكُفَّارَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ﴿۳۶﴾

اور جب وہ ان کے پاس سے گزرتے تو ایک دوسرے کو آنکھوں سے اشارے کیا کرتے تھے ﴿۳۰﴾ اور جب اپنے گمراہوں کے پاس واپس آتے تو خوش گپیاں کرتے ہوئے واپس آتے تھے ﴿۳۱﴾ اور جب انہیں دیکھتے تو کہا کرتے تھے بلاشبہ یہ لوگ یقیناً گمراہ ہیں ﴿۳۲﴾ حالانکہ وہ ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے ﴿۳۳﴾ سو آج وہ لوگ جو ایمان لائے، کافروں پر ہنس رہے ہیں ﴿۳۴﴾ تختوں پر (بیٹھے) نظارہ کر رہے ہیں ﴿۳۵﴾ کیا کافروں کو اس کا بدلہ دیا گیا جو وہ کیا کرتے تھے؟ ﴿۳۶﴾

آیت 30 "وَإِذَا نَزَّوْا بِهِمْ يَتَغَامِرُونَ": "یَتَغَامِرُونَ" "غَمَرٌ" ابروؤں اور پلکوں کے ساتھ اشارہ کرنا، یعنی یہ مجرم لوگ اہل ایمان کی کتاب و سنت کے مطابق بیعت و لباس، طرز گفتگو، دنیا سے بے رغبتی اور آخرت کے حصول کے لیے محنت دیکھ کر ان کی تحقیر کرنے اور مذاق اڑانے کے لیے ایک دوسرے کو آنکھیں مارتے تھے کہ یہی وہ سر پھرے لوگ ہیں جنہوں نے خیالی جنت کے لیے اپنے آپ کو دنیا کی لذتوں سے محروم رکھا ہوا ہے۔

آیت 31 32 "وَإِذَا انْقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِمْ": "فَكَهِينَ" "فَكَهَىٰ" کی جمع بروزن "فَرَحٌ" ہے، ہنسنے ہنسانے کے لیے باتیں بنانے والے، خوش پیاں کرنے والے، یعنی گمراہ واپس آتے ہوئے بھی اہل ایمان کو موضوع بنا کر خوب باتیں بناتے، خوش پیاں کرتے تھے اور انہیں گمراہ قرار دیتے تھے۔

آیت 33 "وَمَا أُرْسِلُوا عَلَيْهِمْ حَفِظِينَ": یہ ان لوگوں کی حماقت کی طرف اشارہ ہے کہ انہیں تو اپنے انجام کی فکر ہونی چاہیے تھی، اہل ایمان پر طعنے پڑھنے اور مذاق اڑانے کا انہیں کیا حق تھا اور کس نے انہیں ان کی گمراہی پر مقرر کیا تھا؟

آیت 30 "فَالْيَوْمَ الَّذِينَ آمَنُوا...": یعنی قیامت کے دن معاملہ الٹ ہو جائے گا، اب اہل ایمان کفار پر ہنستے ہوں گے کہ یہ لوگ کس درجہ احمق تھے کہ خود گمراہ ہونے کے باوجود ہمیں گمراہ کہتے تھے اور واضح دلائل کے باوجود نہ انہوں نے پیدا کرنے والے کا حق پہچانا اور نہ آخرت کی فکر کی اور یہ جانتے ہوئے بھی دنیا کی لذتوں میں مست رہے کہ یہ عارضی ہیں۔

آیت 35 "عَلَى الْأَرْكَامِ يُنظَرُونَ": جنہیوں کی بری حالت دیکھ رہے ہوں گے۔ مزید وضاحت کے لیے اس سورت کی آیت (۲۳) کی تفسیر بھی ملاحظہ فرمائیں۔

آیت 36 "هَلْ تُؤْتِبُ الْكُفَّارَ...": کافر جو جو کچھ کرتے تھے جہنم میں انہیں ہر چیز کا بدلہ لیا گیا، ایک مسلمانوں سے مذاق رہ گیا تھا، آج مسلمانوں کے ان سے جوابی مذاق کے ساتھ وہ بدلہ بھی پورا ہو گیا۔ "هَلْ تُؤْتِبُ الْكُفَّارَ" میں سوال بھی کافروں کو ذلیل کرنے کے لیے ہے، پوچھنے کے لیے نہیں۔ ان آیات سے ملتی جلتی آیات کے لیے دیکھیے سورۃ مومنوں کی آیات (۱۱۴-۱۰۸)۔

إِذَا السَّمَاءُ انشَقَّتْ ۝۱ وَ أَدْنَتْ لِرَبِّهَا وَ حُقَّتْ ۝۲ وَ إِذَا الْأَرْضُ مُدَّتْ ۝۳ وَ أَلْقَتْ مَا فِيهَا وَ تَخَلَّتْ ۝۴ وَ أَدْنَتْ لِرَبِّهَا وَ حُقَّتْ ۝۵

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

جب آسمان پھٹ جائے گا ۱ اور اپنے رب کے حکم پر کان لگائے گا اور یہی اس کا حق ہے ۲ اور جب زمین پھیلا دی جائے گی ۳ اور اس میں جو کچھ ہے اسے باہر پھینک دے گی اور خالی ہو جائے گی ۴ اور اپنے رب کے حکم پر کان لگائے گی اور یہی اس کا حق ہے ۵

آیت 1 إِذَا السَّمَاءُ انشَقَّتْ : دوسری جگہ فرمایا: ﴿ وَ قُتِحَتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ أَبْوَابًا ﴾ [النبأ: ۱۹] ”اور آسمان کھولا جائے گا تو وہ دروازے دروازے ہو جائے گا۔“ اور فرمایا: ﴿ يَوْمَ تَشَقُّقُ السَّمَاءُ بِالْعَنَابِ وَ نُزِلَ الْمَلَكُ تَنْزِيلًا ﴾ [الفرقان: ۲۵] ”جس دن آسمان بادلوں کے ساتھ پھٹے گا اور فرشتے گروہ درگروہ اتارے جائیں گے۔“ یہ نفقہ ثانیہ کے ساتھ ہوگا، آگے زمین سے مردوں کے نکلنے کے ذکر سے بھی یہی معلوم ہو رہا ہے۔

آیت 2 وَ أَدْنَتْ لِرَبِّهَا وَ حُقَّتْ : ”أَدْنَتْ“ (س) کان لگانا، غور سے سنا، یعنی غور سے سن کر اطاعت کرے گا۔ اسی طرح زمین حکم سنتے ہی وہ سب کچھ باہر پھینک دے گی جو اس میں ہے۔ ”حُقَّتْ“ ”هُوَ حَقِيقٌ بِكَذَا أَوْ مَحْقُوقٌ بِكَذَا“ سے ماخوذ ہے، یعنی وہ اس چیز کے لائق ہے۔ اس کا نائب فاعل ”السَّمَاءُ“ کی ضمیر ہے۔ بیضاوی نے فرمایا: ”حُقَّتْ“ ”أَيُّ جُعِلَتْ حَقِيقَةً بِالْإِسْتِمَاعِ وَالْإِنْقِيَادِ.“ زحشری نے فرمایا: ”وَ هِيَ حَقِيقَةٌ بِأَنْ تَنْقَادَ وَ لَا تَمْتَنِعَ.“ زمین و آسمان کو اللہ کا حکم سن کر اطاعت سے انکار کی جرأت ہی نہیں، یہ صرف انسان ہی ہے کہ اللہ کے احکام نہ کان لگا کر سنتا ہے اور نہ اطاعت کرتا ہے۔

آیت 3 وَ إِذَا الْأَرْضُ مُدَّتْ : ”مُدَّتْ“ ”مُدَّ يُمُدُّ“ (ن) کھینچنا، پھیلانا، یعنی جس طرح چمڑے کو کھینچا جائے تو اس کی اونچ نیچ اور تمام شکلیں ختم ہو جاتی ہیں اور وہ طول و عرض میں پھیل جاتا ہے، اسی طرح زمین سے پہاڑ، سمندر اور ہر قسم کی بلندی و پستی ختم ہو جائے گی، جس سے وہ ہموار ہو کر پھیل جائے گی اور اس میں آدمیوں کے کھڑے ہونے کی گنجائش بہت زیادہ ہو جائے گی۔

آیت 4 وَ أَلْقَتْ مَا فِيهَا وَ تَخَلَّتْ : یعنی تمام فوت شدہ لوگوں کو حشر کے لیے باہر پھینک دے گی اور وہ خزانے اور بنی آدم کے اعمال کی شہادتیں جو اس کے بطن میں ہیں سب نکال باہر پھینکے گی۔ ”تَخَلَّتْ“ ”تَخَلَّتْ“ ”تَخَلَّتْ“ (ن) (خالی ہونا) سے باب تفعّل ہے جس میں مبالغہ ہوتا ہے، یعنی بالکل خالی ہو جائے گی۔

آیت 3 وَ أَدْنَتْ لِرَبِّهَا وَ حُقَّتْ : تفصیل کے لیے دیکھیے اسی سورت کی آیت (۲) کی تفسیر۔

يَأْتِيهَا الْإِنْسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلْقِيهِ ۖ فَأَمَّا مَنْ أُوْتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ ۖ
فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَسِيرًا ۖ وَيَنْقَلِبُ إِلَىٰ أَهْلِهِ مَسْرُورًا ۖ

اے انسان! بے شک تو مشقت کرتے کرتے اپنے رب کی طرف جانے والا ہے، سخت مشقت، پھر اس سے ملنے والا ہے ① پس لیکن وہ شخص جسے اس کا اعمال نامہ اس کے دائیں ہاتھ میں دیا گیا ② سو عنقریب اس سے حساب لیا جائے گا، نہایت آسان حساب ③ اور وہ اپنے گھر والوں کی طرف خوش خوش واپس آئے گا ④

آیت 6 : ﴿يَأْتِيهَا الْإِنْسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ : "كَادِحٌ" "كَدْحًا" "كَدْحًا" (ف) خوب کوشش کرنا، مشقت جھیلنا، زحمت کرنا۔ "إِلَىٰ" کے لفظ سے اس میں رب تعالیٰ کی طرف جانے کا مفہوم ادا ہو رہا ہے، یعنی اے انسان! تو زندگی بھر کسی نہ کسی کام کی مشقت میں مبتلا رہ کر آخر کار اچھے یا برے اعمال لے کر اپنے رب کے حضور پیش ہونے والا ہے۔

آیت 7، 9 : ﴿فَأَمَّا مَنْ أُوْتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ : آسان حساب کا مطلب یہ ہے کہ گریڈ ٹریڈ کر اصلی حساب نہیں ہوگا،

فقط اعمال نامہ پیش ہوگا اور غلطیاں بھی سامنے لائی جائیں گی، پھر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے معاف فرمادے گا۔ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿لَيْسَ أَحَدٌ يُحَاسَبُ إِلَّا هَلَكٌ قَالَتْ يَا رَسُولَ اللَّهِ! جَعَلَنِي اللَّهُ فِدَاكَ، لَيْسَ يَقُولُ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ: ﴿فَأَمَّا مَنْ أُوْتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ ۖ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَسِيرًا﴾﴾ | الانشقاق :

۸۰۷ | قال ذاك العرَضُ يُعْرَضُونَ، وَمَنْ تُوقِشَ الْجِسَابَ هَلَكٌ | | بحاري، التفسیر، باب : ﴿فسوف يحاسب حسابا يسيرا﴾ : ۹۳۹ | "جس کسی کا بھی حساب لیا گیا وہ ہلاک ہو گیا۔" عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی: "یا رسول اللہ! اللہ مجھے آپ پر فدا کرے! کیا اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرماتے کہ جس کا اعمال نامہ اس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اس کا حساب آسان ہوگا؟" آپ نے فرمایا: "یہ صرف پیشی ہے (جس میں صرف اس کے اعمال) پیش کیے جائیں گے اور جس سے حساب میں پڑتال کی گئی وہ ہلاک ہو گیا۔"

جن بندوں پر اللہ کی نظر عنایت ہوگی ان کے آسان حساب کی ایک صورت وہ ہوگی جو ابن عمر رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ ﷺ سے سنی کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿يَذُوقُوا أَحَدًا مِنْكُمْ مِنْ رَبِّهِ حَتَّىٰ يَضَعَ كِفْفَهُ عَلَيْهِ فَيَقُولُ عَمِلْتَ كَذَا وَكَذَا؟ فَيَقُولُ نَعَمْ، وَيَقُولُ عَمِلْتَ كَذَا وَكَذَا؟ فَيَقُولُ نَعَمْ، فَيَقْرَأُ ثُمَّ يَقُولُ إِنِّي سَتَرْتُ عَلَيْكَ فِي الدُّنْيَا، فَأَنَا أَعْفِرُ هَذَا لَكَ الْيَوْمَ﴾ | | بحاري، الأدب، باب ستر المؤمن على نفسه : ۶۰۷ | "تم میں سے ایک (بندہ) اپنے رب کے قریب ہوگا، یہاں تک کہ وہ اپنا دامن اس پر رکھے گا (کہ کسی اور کو خبر نہ ہو)، پھر فرمائے گا: "تو نے یہ یہ کام کیے؟" وہ کہے گا: "ہاں!" اور فرمائے گا: "تو نے یہ یہ کام (بھی) کیے؟" وہ کہے گا: "ہاں!" پس اللہ تعالیٰ اس سے اقرار کروالے گا، پھر فرمائے گا: "میں نے دنیا میں تجھ پر پردہ ڈالا، سو آج میں تمہیں وہ گناہ معاف کرتا ہوں۔" آسان حساب کی ایک صورت یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ

وَأَمَّا مَنْ أُوْتِيَ كِتَابَهُ وَرَاءَ ظَهْرِهِ ۖ فَسَوْفَ يَدْعُوا ثُبُورًا ۝ وَيَصْلِي سَعِيرًا ۝ إِنَّكَ كَانَ فِي أَهْلِهِ مَسْرُورًا ۝

اور لیکن وہ شخص جسے اس کا اعمال نامہ اس کی پیٹھ کے پیچھے دیا گیا ۱۰ تو عنقریب وہ بڑی ہلاکت کو پکارے گا ۱۱ اور بھڑکتی آگ میں داخل ہوگا ۱۲ بلاشبہ وہ اپنے گھر والوں میں خوش تھا ۱۳

جسے چاہے گا تھوڑی نیکی کا ثواب بہت زیادہ عطا فرمادے گا، جیسا کہ عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ کی امت کے ایک آدمی کے گناہوں کے حدنگاہ تک پھیلے ہوئے نانوے (۹۹) دفتر کاغذ کے ایک پرزے کے مقابلے میں ہلکے ہو جائیں گے جس پر ”أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَ أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ“ لکھا ہوگا۔ [دیکھیے ترمذی، الإیمان، باب ما جاء فيمن يموت وهو يشهد أن لا إله إلا الله : ۲۶۳۹، و صححه الألبانی] غرض اللہ تعالیٰ جس طرح چاہے گا حساب آسان کر دے گا، مگر شرط یہ ہے کہ آدمی ہر طرح کے شرک ظاہری اور شرک باطنی یعنی ریا سے پاک ہو، پھر اگر گناہ گار توبہ کے بغیر بھی مر گیا تو اللہ کی ذات سے رحمت اور آسانی حساب کی توقع ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ﴾ [النساء : ۴۸] ”بے شک اللہ اس بات کو نہیں بخشنے گا کہ اس کا شریک بنایا جائے اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے جسے چاہے گا بخش دے گا۔“ مشرک کے لیے معافی نہیں، دوسروں کی مغفرت اللہ کی مشیت پر ہے۔ اس لیے نہ اس کے غضب سے بے خوف ہونا چاہیے اور نہ اس کی رحمت سے مایوس ہونا چاہیے۔

آیت 10 : وَأَمَّا مَنْ أُوْتِيَ كِتَابَهُ: یہاں پیٹھ کے پیچھے اعمال نامے ملنے کا ذکر ہے اور سورہ قاتہ (۲۵) میں بائیں ہاتھ میں، غور کریں تو صاف سمجھ میں آ رہا ہے کہ ان مجرموں کے ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے ہوں گے، جہاں انھیں بائیں ہاتھ میں اعمال نامہ ملے گا۔

آیت 11 : فَسَوْفَ يَدْعُوا ثُبُورًا : یعنی عذاب کے ڈر سے ہلاکت کو پکارے گا، تاکہ وہ مر کر عذاب سے نجات پا جائے۔

آیت 12 13 : وَيَصْلِي سَعِيرًا ۝ إِنَّكَ كَانَ فِي أَهْلِهِ مَسْرُورًا : اسے دنیا میں آخرت کا کوئی خوف نہ تھا، وہ اپنے بیوی بچوں اور دنیا کی نعمتوں میں ایسا گمن اور خوش تھا کہ پروردگار کے پاس حاضری کو بھول ہی گیا۔ نتیجہ یہ کہ آج جہنم کی بھڑکتی آگ میں داخل ہوگا۔ اس کے برعکس اہل ایمان اپنی دنیا میں گزری ہوئی زندگی کو یاد کر کے کہیں گے: ﴿إِنَّا كُنَّا قَبْلَ فِي أَهْلِنَا مُشْفِقِينَ﴾ [الطور : ۲۶] ”ہم اس سے پہلے اپنے گھر والوں میں ڈرنے والے تھے (کہ انجام کیا ہوگا)؟“ آج وہ اپنے گھر خوش خوش لوٹیں گے، فرمایا: ﴿وَيَنْقَلِبُ إِلَى أَهْلِهِ مَسْرُورًا﴾ [الانشقاق : ۹] ”اور وہ اپنے گھر کی طرف خوش خوش واپس لوٹے گا۔“

إِنَّهُ ظَنَّ أَنْ لَنْ يَحُورَ ۗ بَلَىٰ إِنَّ رَبَّهُ كَانَ بِهِ بَصِيرًا ۝ فَلَا أُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ۝
وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ۝ وَالْقَمَرِ إِذَا اتَّسَقَ ۝ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ۝

یقیناً اس نے سمجھا تھا کہ وہ کبھی (اپنے رب کی طرف) واپس نہیں لوٹے گا ۱۴ کیوں نہیں! یقیناً اس کا رب اسے
خوب دیکھنے والا تھا ۱۵ یس نہیں، میں شفق کی قسم کھاتا ہوں! ۱۶ اور رات کی اور اس چیز کی جسے وہ جمع کرتی ہے! ۱۷
اور چاند کی، جب وہ پورا ہوتا ہے! ۱۸ کہ تم ضرور ہی ایک حالت سے دوسری حالت کو چڑھتے جاؤ گے ۱۹

آیت 14, 15: إِنَّهُ ظَنَّ أَنْ لَنْ يَحُورَ ... : "خَارَ يَحُورُ حَوْرًا" (ان) لوٹنا۔ پیچھے کے پیچھے اعمال نامہ ان لوگوں کو
ملے گا جن کا خیال تھا کہ وہ دوبارہ زندہ نہیں ہوں گے اور نہ کوئی حساب کتاب ہوگا۔ فرمایا، کیوں نہیں! یقیناً تمہارا حساب ضرور
ہونا تھا، تمہارا رب تمہارے اعمال و اقوال اور احوال سب کچھ خوب دیکھ رہا تھا اور تمہارا اعمال نامہ بھی تیار کروا رہا تھا، مگر اس
نے اپنی حکمت باللہ کے تحت تمہیں مہلت دے رکھی تھی، اب وہ مہلت ختم ہوگئی، اب اپنے انکار اور بے فکری کا نتیجہ بھگتو۔

آیت 16: فَلَا أُقْسِمُ بِالشَّفَقِ: قسم سے پہلے "لا" کا مطلب منکرین کی بات کی نفی ہے۔ "الشَّفَقُ" سورج غروب
ہونے کے بعد آسمان کے کنارے کی سرخی جو عشاء تک رہتی ہے۔

آیت 17: وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ: "وَسَقَ" (ض) جمع کرنا اور اٹھا لینا۔ ساٹھ (۶۰) صاع غلے کا ایک وزن ہوتا ہے، اسے
وزن کہنے کی وجہ سے ہے کہ وہ غلے کی خاصی مقدار جمع کیے ہوتا ہے۔ "وَمَا وَسَقَ" کے عموم میں تمام آدمی اور جانور آجاتے
ہیں، کیونکہ وہ سب دن بھر چلنے پھرنے کے بعد رات کو آرام کے لیے اپنے اپنے ٹھکانے پر جمع ہو جاتے ہیں۔

آیت 18: وَالْقَمَرِ إِذَا اتَّسَقَ: "اتَّسَقَ" اوپر مذکور "وَسَقَ" سے باب افتعال ہے، جمع ہونا، یعنی چودھویں رات کا پورا
چاند بن جائے۔

آیت 19: لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ: قرآن مجید میں مذکور قسمیں بعد میں آنے والے جواب قسم کی تاکید کے لیے
آتی ہیں اور عام طور پر اس کے یقینی ہونے کی دلیل ہوتی ہیں۔ یہاں جس بات کو ثابت کرنے کے لیے قسمیں کھائی گئی ہیں وہ
یہ حقیقت ہے کہ تم ضرور ہی ایک حال سے دوسرے حال میں منتقل ہوتے جاؤ گے۔ اب قسموں پر غور کیجیے! تینوں آیات میں
مذکور چیزوں کا ایک حال سے دوسرے حال میں منتقل ہونا صاف واضح ہے، یعنی دن بھر کی دھوپ کے بعد سورج غروب ہو کر
شفق پھیل جاتی ہے، پھر رات چھا جاتی ہے۔ اللہ کی مخلوق دن کو پھیل جاتی ہے اور رات کو جمع ہو جاتی ہے۔ اسی طرح چاند پہلی
رات خنجر نما شکل میں ہوتا ہے، پھر ہدلتے ہدلتے مہ کامل بن جاتا ہے، پھر دوبارہ گھٹنے لگتا ہے۔ یہ سب کچھ اس بات کی دلیل
ہے کہ تمہیں بھی ایک حالت پر دوام نہیں ہے، بلکہ ان اشیاء کی طرح تمہارا ایک حال سے دوسرے حال میں منتقل ہوتے چلے
جانا بھی یقینی ہے۔ اسی طرح زندگی کے بعد موت، پھر زندگی اور ہر عمل کی جزا و سزا کا ہونا بھی یقینی ہے۔

2 رسول اللہ ﷺ نے "طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ" کی تفسیر فرمائی: «حَالًا بَعْدَ حَالٍ» | بخاری، التفسیر، باب: ﴿نَرَكِبُ طَبَقًا﴾

فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿۲۰﴾ وَإِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْآنُ لَا يَسْجُدُونَ ﴿۲۱﴾ بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا يَكْذِبُونَ ﴿۲۲﴾ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يُوعُونَ ﴿۲۳﴾ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿۲۴﴾ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ﴿۲۵﴾

تو انھیں کیا ہے کہ وہ ایمان نہیں لاتے ﴿۲۰﴾ اور جب ان کے سامنے قرآن پڑھا جاتا ہے تو وہ سجدہ نہیں کرتے ﴿۲۱﴾ بلکہ وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا جھٹلاتے ہیں ﴿۲۲﴾ اور اللہ زیادہ جاننے والا ہے جو کچھ وہ جمع کر رہے ہیں ﴿۲۳﴾ پس انھیں ایک دردناک عذاب کی خوش خبری دے دے ﴿۲۴﴾ مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، ان کے لیے نہ ختم ہونے والا اجر ہے ﴿۲۵﴾

عن طبق ﴿۱: ۹۹۰﴾ ”یعنی ایک حالت کے بعد دوسری حالت میں۔“ آدمی ہر لمحے نئی سے نئی حالت میں منتقل ہوتا جائے گا۔ بڑے بڑے تغیرات یہ ہیں، مٹی سے پیدا ہو کر نطفہ، پھر ماں کے پیٹ کی مختلف حالتیں، پھر پیدائش، بچپن، جوانی، بڑھاپا، تندرستی، بیماری، فقر، غنا، پھر موت، قبر اور قیامت، غرض انسان بے شمار احوال سے گزرتا ہوا جنت یا دوزخ کو پہنچ جائے گا۔

آیت 20 ﴿فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ﴾: یعنی جب ایک حالت پر قرار نہیں تو یہ لوگ دوبارہ زندہ ہونے پر ایمان کیوں نہیں لاتے؟ انھیں یہ ضد کیوں ہے کہ ہمیں مگر اسی حال میں رہنا ہے؟

آیت 21 ﴿وَإِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْآنُ﴾: اور پیدا کرنے والے کا کلام سن کر بھی نہیں جھکتے۔

آیت 22 ﴿بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا﴾: یعنی یہ بات نہیں کہ قرآن کے دلائل میں کوئی کمی ہے یا اس کی آوازاں کے دلوں کی گہرائی تک نہیں پہنچی، بلکہ انھوں نے طے کر رکھا ہے کہ ہم نے ماننا ہی نہیں۔ چنانچہ یہ کفر و عناد ہی تکذیب کا باعث ہے۔

آیت 23 ﴿وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يُوعُونَ﴾: ”یُوعُونَ“ ”وَعَاءٌ“ سے مشتق ہے، جس کا معنی برتن ہے، ”أُوَعِيَ الْمَالُ“ اس نے مال جمع کیا۔ یہاں مراد یہ ہے کہ جو اعمال وہ آخرت کے لیے جمع کر رہے ہیں، زبانی جھٹلانے کے ساتھ ساتھ انھوں نے دلوں میں جو کبر و عناد جمع کر رکھا ہے اور آپ کے خلاف جو جو سازشیں انھوں نے تیار کر رکھی ہیں وہ اللہ کو ان سے بھی زیادہ معلوم ہیں۔

آیت 24 ﴿فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ﴾: بشارت اس خوشی کی خبر کو کہتے ہیں جس کا اثر ”بَشْرَةٌ“ (جلد) پر ظاہر ہو جائے، یہاں عذاب الیم کے لیے بشارت کا لفظ بطور استہزا ہے۔

آیت 24 ﴿إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ﴾: ”عَمِيرٌ مَمْنُونٌ“ ”مَنَّ يُمْنُ“ (ن) (قطع کرنا) سے اسم مفعول ہے، کہا جاتا ہے: ”مَنَّتُ الْحَبْلُ“ ”میں نے رسی کاٹ دی۔“ یعنی ایسا اجر جو کبھی قطع نہیں کیا جائے گا۔ مراد جنت ہے، جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے، جس کی کوئی نعمت نہ کم ہوگی اور نہ ختم ہوگی۔



وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْبُرُوجِ ۝۱ وَالْيَوْمِ الْمَوْعُودِ ۝۲ وَشَاهِدٍ ۝۳ وَشَهُودٍ ۝۴ قُبُلٍ أَصْحَابُ
الْأَخْدُودِ ۝۵ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُودِ ۝۶

قسم ہے بروجوں والے آسمان کی! ۱ اور اس دن کی جس کا وعدہ دیا گیا ہے! ۲ اور حاضر ہونے والے کی اور جس کے پاس حاضر ہوا جائے! ۳ مارے گئے اس خندق والے ۴ جو سراسر آگ تھی بہت ایندھن والی ۵

یہ سورت مسلمانوں کو اہل مکہ کی ایذا رسانی پر صبر و استقامت کی تلقین کے لیے نازل ہوئی۔ اس مقصد کے لیے پہلی امتوں کے مسلمانوں کو پیش آنے والے شدید ترین امتحان اور اس پر ان کے صبر و ثبات اور انہیں ستانے والوں کے انجام بد کا تذکرہ فرمایا، تاکہ ان کے حالات سن کر انہیں تسلی ہو اور یقین ہو جائے کہ جس طرح اصحاب الاخدود مارے گئے اسی طرح وہ لوگ بھی مارے جائیں گے جو اب مسلمانوں کو امتحان میں ڈال رہے ہیں۔

آیت 1 وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْبُرُوجِ: ”الْبُرُوجُ“ کی جمع ہے، اس کا اصل معنی ہے ”نمایاں اور ظاہر ہونے والی چیز۔“ ”بُرُوجُ“ کا معنی بے پردہ ہونا، ظاہر ہونا ہے۔ اس لیے بلند محل کو بُرج کہتے ہیں، شہر کی تفصیل کے بلند حصوں کو بھی بُرج کہتے ہیں اور آسمان پر ستاروں کے اجتماع سے جو صورتیں نظر آتی ہیں انہیں بُرج کہتے ہیں۔ وہ آسمانی ٹھکانے بھی بُرج کہلاتے ہیں جن میں شیطانوں سے آسمان کی حفاظت کے لیے فرشتے پہرہ دیتے ہیں۔ سورج اور چاند کی منزلوں کو بھی بُرج کہا جاتا ہے۔

آیت 2 وَالْيَوْمِ الْمَوْعُودِ: قیامت کا دن، جس کا جزا و سزا کے لیے وعدہ کیا گیا ہے۔

آیت 2 وَشَاهِدٍ وَشَهُودٍ: ”شَاهِدٍ“ حاضر ہونے والا۔ ”شَهُودٍ“ جس کے پاس حاضر ہوا جائے۔ لفظوں کے لحاظ سے اس میں وہ سب لوگ شامل ہیں جو کہیں حاضر ہو سکتے ہیں اور مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ اسی طرح وہ تمام چیزیں بھی شامل ہیں جن کا مشاہدہ ہو سکتا ہے یا جن کے پاس کوئی حاضر ہو سکتا ہے۔ اہل علم نے ”شَاهِدٍ“ اور ”شَهُودٍ“ کی تفسیر کرتے ہوئے جس چیز کو زیادہ اہم یا معروف یا مناسب سمجھا اس کے ساتھ تفسیر کر دی۔ چنانچہ بہت سے صحابہ و تابعین نے ”شَاهِدٍ“ سے مراد یوم جمعہ اور ”شَهُودٍ“ سے مراد یوم عرفہ لیا ہے۔ الفاظ کے عموم سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد ہر وہ فرد ہے جو کہیں حاضر ہوتا ہے اور حاضری کا ہر وہ موقع ہے جس میں کوئی فرد حاضر ہوتا ہے۔

آیت 4 قُبُلٍ أَصْحَابُ الْأَخْدُودِ: ”أَخْدُودٌ“ (ن) ”أَخْدُودٌ“ وَ فِي الْأَرْضِ“ زمین میں لہبا گڑھا کھودنا۔ ”الْأَخْدُودِ“ لہبا گڑھا۔ خندق، کھائی۔ اس کی جمع ”أَخْدَانِدٌ“ ہے۔ یعنی عظیم الشان بروجوں والا آسمان، قیامت کا دن، کسی بھی مقام پر حاضر ہونے والے لوگ اور کوئی بھی موقع جس میں لوگ حاضر ہوتے ہیں، یہ سب چیزیں اگر اپنا وجود رکھتی ہیں اور یقیناً ان کے وجود میں کوئی شبہ نہیں تو یہ بات بھی یقینی سمجھو کہ جن لوگوں نے بڑی بڑی خندقیں کھدوا کر انہیں آگ سے بھرا،

إِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُودٌ ۖ وَهُمْ عَلَىٰ مَا يَفْعَلُونَ بِالْمُؤْمِنِينَ شُهُودٌ ۗ وَمَا نَقَمُوا
مِنْهُمْ إِلَّا أَنْ يُؤْمِنُوا بِاللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ ۝

جب وہ اس کے اوپر بیٹھے ہوئے تھے ۶ اور وہ اس پر جو وہ ایمان والوں کے ساتھ کر رہے تھے، گواہ تھے ۷ اور انہوں نے ان سے اس کے سوا کسی چیز کا بدلہ نہیں لیا کہ وہ اس اللہ پر ایمان رکھتے ہیں جو سب پر غالب ہے، ہر تعریف کے لائق ہے ۸ پھر جو اہل ایمان اپنے ایمان پر ڈٹے رہے اور مرتد نہ ہوئے انہیں اس آگ میں پھینک کر ان کے جلنے کا تماشا دیکھتے رہے، وہ مارے گئے، کیونکہ وہ زبردست ہستی جو ان برجوں والے آسمان کو تھامے ہوئے ہے، جس نے انصاف کے لیے قیامت کا دن مقرر کر رکھا ہے اور جس کی نگاہ سے نہ کسی جگہ کوئی حاضر ہونے والا غائب ہے اور نہ حاضری کا کوئی موقع، وہ ان سنگ دل ظالموں کو ان کے ظلم کی سزا ضرور دے گا اور وہ نہ اس کی نگاہ سے غائب ہو سکیں گے اور نہ عذاب سے بچ سکیں گے۔

۲ دنیا میں ایسے کئی واقعات ہوئے جن میں اہل ایمان کو خندق کھود کر آگ میں جلا دیا گیا، سند کے لحاظ سے سب سے صحیح ایک کافر بادشاہ کا وہ طویل واقعہ ہے جو صحیح مسلم میں صہیب رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے۔ حدیث لمبی ہے، اس کے آخر میں ہے کہ اس کافر بادشاہ کی رعایا کے لوگ مسلمان ہو گئے تو اس نے گلیوں کے کناروں پر گڑھے کھدوا کر ان میں آگ بھڑکائی اور حکم دیا کہ جو شخص اسلام نہ چھوڑے اسے آگ میں پھینک دو، چنانچہ اہل ایمان کو ان گڑھوں میں پھینک دیا گیا۔ مفصل واقعہ کے لیے دیکھیے صحیح مسلم میں ”بَابُ فِصَّةِ أَصْحَابِ الْأُخْدُودِ (۳۰۰۵)۔“ تفسیر ابن کثیر میں مومنوں کو آگ میں جلائے جانے کے مزید واقعات بھی موجود ہیں۔

آیت 7.6 : إِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُودٌ یعنی کنارے پر بیٹھ کر ان کے جلنے کا تماشا دیکھ رہے تھے، انہیں جلتے ہوئے دیکھ کر بھی ان کے دلوں میں کوئی نرمی پیدا نہیں ہوئی۔ اس طرح کے واقعات کافر قوتوں کے زیر سایہ آج بھی ہو رہے ہیں، مثلاً انڈیا، برما اور افریقہ وغیرہ میں مسلمانوں کو زندہ جلانے کی خبریں تو اتار سے آ رہی ہیں، ان کا انجام بھی اصحاب الاخدود کی طرح ہوگا۔ (ان شاء اللہ) مگر ان مظلوم مسلمانوں کو کفار کے ظلم و ستم سے بچانا دنیا کے تمام مسلمانوں پر فرض ہے، جس کی ادائیگی میں کوتاہی اور جہاد ترک کرنے ہی کی وجہ سے کفار کو یہ جرأت ہو رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالنَّسْتَضْعَفِينَ مِنَ الزَّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانَ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا ۗ وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ نَصِيرًا﴾ [النساء: ۷۵] ”اور تمہیں کیا ہے کہ تم اللہ کے راستے میں اور ان بے بس مردوں اور عورتوں اور بچوں کی خاطر نہیں لڑتے جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں اس ہستی سے نکال لے جس کے رہنے والے ظالم ہیں اور ہمارے لیے اپنے پاس سے کوئی حمایتی بنا دے اور ہمارے لیے اپنے پاس سے کوئی مددگار بنا۔“

آیت 8 : ۱ وَمَا نَقَمُوا مِنْهُمْ ان اہل ایمان نے ان ظالموں پر یا کسی دوسرے پر کوئی زیادتی نہیں کی تھی جس

الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ۝۱۰ إِنَّ الَّذِينَ قَتَلُوا
الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوبُوا فَلَهُمْ عَذَابٌ جَهَنَّمَ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلْحَرِيقِ ۝۱۱
إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۚ ذَٰلِكَ

وہ کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی صرف اس کی ہے اور اللہ ہر چیز پر گواہ ہے ⑩ یقیناً وہ لوگ جنہوں نے مومن مردوں اور مومن عورتوں کو آزماتش میں ڈالا، پھر انہوں نے توبہ نہیں کی تو ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے اور ان کے لیے جلنے کا عذاب ہے ⑪ بلاشبہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے ان کے لیے ایسے باغات ہیں جن کے تلے نہریں بہ رہی ہیں، یہی بہت بڑی کامیابی ہے ⑫

کا وہ بدلے رہے ہوں، ان کا جرم صرف اللہ پر ایمان لا کر اس پر قائم رہنا تھا۔ آیت میں ”إِلَّا أَنْ يُؤْمِنُوا“ فرمایا ہے جو حال و استقبال پر دلالت کرتا ہے، ”إِلَّا أَنْ يُؤْمِنُوا“ نہیں فرمایا جو باطنی کا صیغہ ہے، یعنی ان کا جرم یہی نہ تھا کہ وہ ایمان لے آئے تھے، بلکہ یہ تھا کہ وہ اب بھی ایمان پر قائم تھے۔

بِأَنَّهُ الْعَزِيزُ الْحَمِيدُ: یعنی ان کا اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنا کوئی جرم یا غلط کام نہ تھا، بلکہ وہ اس اللہ پر ایمان رکھتے تھے جو عزیز و حمید ہے اور آئندہ آیت میں مذکور صفات کا مالک ہے اور ان صفات کی وجہ سے اس کا حق ہے کہ اس پر ایمان رکھا جائے۔ یہ قرآن مجید کا خاص اسلوب ہے کہ واقعات بیان کرتے ہوئے بھی وہ عقائد کی درستی اور احکام کی وضاحت کا اہتمام جاری رکھتا ہے۔ اس کی ایک مثال یہ آیت ہے۔

آیت 10 إِنَّ الَّذِينَ قَتَلُوا الْمُؤْمِنِينَ...: ”فَنَنْتُهُ“ کا معنی ہے، کھرے کھوٹے کی آزمائش کے لیے سونے کو آگ میں ڈالنا۔ پھر یہ لفظ جلانے، ستانے، عذاب دینے اور حق سے برگشتہ کرنے کی کوشش کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہونے لگا۔ ”إِنَّ الَّذِينَ قَتَلُوا“ سے مراد اصحاب الاخذہ بھی ہیں، جنہوں نے اہل ایمان کو آگ کی خندقوں میں ڈالا اور کفار قریش اور بعد میں آنے والے وہ تمام ظالم بھی جو انواع و اقسام کے عذاب دے دے کر اہل ایمان کو ایمان سے ہٹانے کی کوشش کرتے رہے۔ ”فَلَهُمْ عَذَابٌ جَهَنَّمَ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلْحَرِيقِ“ جہنم میں کئی طرح کا عذاب ہے، سب سے سخت عذاب جلنے کا ہے، اس لیے اس کا ذکر خاص طور پر فرمایا، اس کے علاوہ اہل ایمان کو جلانے والوں کے حسب حال جلنے ہی کا عذاب ہے۔ ”فَنَنْتُهُ لَمْ يَتُوبُوا“ (پھر توبہ نہیں کی) اللہ کی شان کریمی دیکھیے کہ اہل ایمان کو جلانے والوں کو بھی جہنم کی سزا تیب سنائی جب وہ توبہ کے بغیر مریں، کیونکہ توبہ کرنے سے گزشتہ تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اس سے توبہ کی ترغیب بھی نکل رہی ہے۔

آیت 11 إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ...: یہاں ایمان و عمل صالح والے لوگوں کے لیے جنت کی بشارت کے ذکر کی دو مناسبتیں ہیں، ایک تو یہ کہ اگر مسلمانوں کو ستانے والے لوگ بھی ایمان لا کر صالح عمل والے بن جائیں تو ان کے لیے بھی وہ باغات ہیں جن کے تلے نہریں بہتی ہیں۔ دوسری یہ کہ ایمان اور عمل صالح کے حامل جن مسلمانوں کو آزماتش کی

الْفَوْزُ الْكَبِيرُ ۝۱۱ إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ ۝۱۲ إِنَّهُ هُوَ يُبْدِي وَيُعِيدُ ۝۱۳ وَهُوَ الْغَفُورُ
الْوَدُودُ ۝۱۴ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيدُ ۝۱۵ فَعَالٌ لَمَّا يُرِيدُ ۝۱۶

بے شک تیرے رب کی پکڑ یقیناً بہت سخت ہے ۝۱۲ بے شک وہی پہلی بار پیدا کرتا ہے اور (وہی) دوبارہ پیدا کرے گا ۝۱۳ اور وہی ہے جو بے حد بخشنے والا، نہایت محبت کرنے والا ہے ۝۱۴ عرش کا مالک ہے، بڑی شان والا ہے ۝۱۵ کر گزرنے والا ہے جو چاہتا ہے ۝۱۶

بھٹیوں میں جھونکا جا رہا ہے وہ غم نہ کریں، یہ وقت گزر جانے والا ہے، آخرت میں ان کے لیے وہ عظیم الشان باغات تیار ہیں جن کے تلے نہریں بہ رہی ہیں اور سب سے بڑی کامیابی یہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایمان والوں کو آزمائشوں اور مصیبتوں میں ثابت قدم رکھنے والی چیز اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ انہیں جنت دے گا۔ کس قدر ظالم ہیں وہ لوگ جو روحانیت کا لبادہ اوڑھ کر جنت کا مذاق اڑاتے اور اسے بے وقعت قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ سجدہ کی آیت (۱۶) کی تفسیر۔

آیت 12 إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ: ”بطش“ وہ پکڑ جس میں تیزی اور سختی پائی جائے۔ رب تعالیٰ کی بطش جسے وہ خود شدید بتا رہا ہے، کس قدر سخت ہوگی؟ اہل ایمان کو ایذا پہنچانے والوں کو ڈرایا جا رہا ہے کہ رب تعالیٰ کی پکڑ بہت سخت ہے، اس سے بچ جاؤ۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَكَذَلِكَ أَخْذُ رَبِّكَ إِذَا أَخَذَ الْقُرَىٰ وَهِيَ ظَالِمَةٌ إِنَّ أَخْذَهُ أَلِيمٌ شَدِيدٌ﴾ [ہود: ۱۰۲] ”اور تیرے رب کی پکڑ ایسی ہی ہوتی ہے، جب وہ بستیوں کو اس حال میں پکڑتا ہے کہ وہ ظلم کرنے والی ہوتی ہیں، یقیناً اس کی پکڑ بڑی دردناک ہے، بہت سخت ہے۔“

آیت 12 إِنَّهُ هُوَ يُبْدِي وَيُعِيدُ: یہ نہ سمجھنا کہ دنیا میں تمہارے ظلم دستم پر باز پرس نہیں ہوتی تو مرنے کے بعد بھی نہیں ہوگی، جس نے تمہیں پہلے پیدا کیا وہی دوبارہ زندہ کر کے تمہیں تمہارے اعمال کی جزا دے گا۔

آیت 14 وَهُوَ الْغَفُورُ الْوَدُودُ: اللہ تعالیٰ کے قہر و جلال کے ذکر کے ساتھ ہی اس کی صفات رحمت کا تذکرہ ہے کہ اگر تم توبہ کرو تو وہ بے حد بخشنے والا ہے۔ ”الْوَدُودُ“ ”وَدَّ يُوَدُّ وَوَدًّا“ (س) سے ”فَعُولٌ“ کے وزن پر مبالغے کا صیغہ ہے، بہت محبت کرنے والا، یعنی وہ بندوں کا دشمن نہیں بلکہ ان سے بہت محبت کرنے والا ہے، سزا صرف اس کو دیتا ہے جو سرکشی پر اتر آئے۔

آیت 15-16 ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيدُ.....: وہ تمہاری طرح معمولی اور عارضی اقتدار والا نہیں، بلکہ اس عرش عظیم کا مالک ہے جو زمین و آسمان اور ان کے مابین سے بھی بڑا ہے، نہ وہ تمہاری طرح کم ظرف ہے کہ معمولی سی قدرت ملے تو ظلم پہ اتر آئے، بلکہ وہ بڑی شان والا ہے اور نہ وہ تمہاری طرح بے بس ہے کہ مجبور ہو کر اسے اپنے ارادے ترک کرنا پڑیں، بلکہ وہ جو چاہے کر گزرنے والا ہے۔ ایسے زبردست قوت والے پروردگار سے تمہیں ہر وقت ڈرتے رہنا چاہیے اور اس کی رحمت کا کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ الْجُنُودِ ﴿۱۷﴾ فِرْعَوْنَ وَثَمُودَ ﴿۱۸﴾ بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي تَكْذِيبٍ ﴿۱۹﴾
وَاللَّهُ مِنْ وَرَائِهِمْ مُحِيطٌ ﴿۲۰﴾ بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَجِيدٌ ﴿۲۱﴾ فِي لَوْحٍ مَحْفُوظٍ ﴿۲۲﴾

کیا تیرے پاس ان لشکروں کی خبر پہنچی ہے؟ ﴿۱۷﴾ جو فرعون اور ثمود تھے ﴿۱۸﴾ بلکہ وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، جھٹلانے میں لگے ہوئے ہیں ﴿۱۹﴾ اور اللہ ان کے پیچھے سے (انہیں) گھیرنے والا ہے ﴿۲۰﴾ بلکہ وہ ایک بڑی شان والا قرآن ہے ﴿۲۱﴾ اس سختی میں (لکھا ہوا) ہے جس کی حفاظت کی گئی ہے ﴿۲۲﴾

طلب گارر ہونا چاہیے۔ یاد رہے کہ یہاں ”ذُو الْعَرْشِ“ کے بعد ”الْمَجِيدُ“ بھی اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، اس لیے اس پر رفع ہے، یہ ”الْعَرْشِ“ کی صفت نہیں، ورنہ یہ مجرور ہوتا۔

آیت 17-18: هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ الْجُنُودِ..... : یہ جو فرمایا تھا کہ اللہ کی پکڑ بڑی سخت ہے، اسے دلوں میں جمادینے کے لیے ثمود اور فرعون کے دو تھے جو عرب میں زیادہ مشہور تھے، وہ اہل مکہ کو یاد دلائے، تاکہ وہ ان قصوں سے عبرت پکڑیں۔ (احسن التفسیر) اس کے علاوہ نبی ﷺ اور مسلمانوں کو تسلی دلانا بھی مقصود ہے۔

آیت 19-20: بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا..... : حق تو یہ تھا کہ پہلے سرکشوں کا انجام دیکھ کر یہ لوگ ایمان لے آتے، مگر یہ اُلٹا خواہ مخواہ جھٹلانے میں لگے ہوئے ہیں، حالانکہ انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ انہیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے، وہ جب چاہے پکڑ لے۔

آیت 21-22: بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَجِيدٌ..... : اور اگر ان کا جھٹلانا اس خیال سے ہے کہ یہ کلام الہی نہیں یا اس میں شیطان کا کچھ دخل ہے تو ان کی یہ بات بھی غلط ہے، بلکہ یہ بڑی شان والا قرآن ہے، اس لوح میں سے اتارا گیا ہے جس کی فرشتوں کے ذریعے سے حفاظت کی جاتی ہے، کسی شیطان کا اس میں دخل نہیں ہو سکتا۔ اس کے کلام الہی ہونے میں کوئی شبہ نہیں، اگر انہیں شبہ ہے تو وہ بھی اس جیسی کوئی سورت بنا کر لے آئیں، جب یہ نہیں کر سکتے تو اس کے کلام الہی ہونے میں کیا شبہ رہ گیا؟ (ماخوذ از احسن التفسیر)



سُورَةُ الطَّارِقِ
بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
لَيْلَاتِنَا لَكَ وَانْتِهَا

وَالسَّمَاءِ وَالطَّارِقِ ۝ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الطَّارِقُ ۝ النَّجْمُ الثَّاقِبُ ۝ إِنَّ كُلُّ نَفْسٍ لَنَا عَلَيْهَا حَافِظٌ ۝ فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۝ خُلِقَ مِنْ نَآءٍ دَافِقٍ ۝ يَخْرُجُ مِنْ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ ۝

قسم ہے آسمان کی اور رات کو آنے والے کی! ① اور تجھے کس چیز نے معلوم کروایا کہ رات کو آنے والا کیا ہے؟ ② وہ چمکتا ہوا ستارہ ہے ③ نہیں کوئی جان مگر اس کے اوپر ایک حفاظت کرنے والا ہے ④ پس انسان کو لازم ہے کہ دیکھے وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ⑤ وہ ایک اُچھلنے والے پانی سے پیدا کیا گیا ہے ⑥ جو پیٹھ اور پسلیوں کے درمیان سے نکلتا ہے ⑦

آیت 1-4 ① وَالسَّمَاءِ وَالطَّارِقِ: ”طَرَقَ يَطْرُقُ“ (ن) کا اصل معنی زور سے مارنا ہے جس سے آواز پیدا ہو۔ ”مَطْرَقَةٌ“ (ہتھوڑا) اور ”طَرِيقٌ“ (راستہ) اسی سے مشتق ہیں، کیونکہ راستے پر چلنے والوں کے قدم زور سے پڑتے ہیں تو آواز دیتے جاتے ہیں۔ ”الطَّارِقُ“ رات کو آنے والے کو کہتے ہیں، کیونکہ عام طور پر اسے دروازہ کھٹکھٹانا پڑتا ہے۔ ”النَّجْمُ الثَّاقِبُ“ میں الف لام جنس کے لیے ہے، اس لیے اگرچہ لفظ واحد ہے مگر اس میں تمام ستارے آجاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ستاروں کو پیدا کرنے کا ایک مقصد یہ بیان فرمایا ہے کہ وہ شیطانوں سے آسمان دنیا کی حفاظت کا ذریعہ ہیں۔ (دیکھیے صفات: ۷، ۶) ”ان“ نفی کے معنی میں ہے اور ”لَنَا“ بمعنی ”إِلَّا“ ہے۔

② قسم کسی بات کی تاکید کے لیے اٹھائی جاتی ہے اور عموماً اس بات کی شہادت ہوتی ہے جس کے لیے قسم اٹھائی گئی ہے۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے آسمان اور چمک دار ستارے کی قسم اٹھا کر فرمایا کہ ہر جان کے اوپر ایک حفاظت کرنے والا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آسمان اور ستاروں کا یہ عظیم الشان سلسلہ جو بغیر کسی سہارے کے قائم ہے اور جس میں کوئی خرابی یا حادثہ پیش نہیں آتا، اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ جس قادر مطلق نے ان کی حفاظت کا انتظام کر رکھا ہے وہی ہر جان کی بھی حفاظت کر رہا ہے اور ہر چیز کا اصل حافظ وہی ہے، اگر وہ ایک لمحہ کے لیے اپنی توجہ ہٹالے تو سب کچھ فنا ہو جائے۔ جس طرح اس نے شیطانوں سے آسمانوں کی حفاظت ستاروں کے ذریعے سے کی ہے، اسی طرح آفات سے حفاظت کے لیے ہر شخص پر باری باری آنے والے فرشتے مقرر کیے ہیں (دیکھیے رعد: ۱۱) اور اس کے اعمال کو لکھ کر محفوظ کرنے کے لیے کرانا کا تین مقرر کیے ہیں۔ سورہ انفطار (۱۰ تا ۱۳)۔

آیت 5-7 ① فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ: ایک مقرر وقت تک انسان کی ذات کی حفاظت اور اعمال کی نگہداشت

إِنَّكَ عَلَىٰ رَجْعِهِ لَقَادِرٌ ۝ يَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ ۝

بے شک وہ اسے لوٹانے پر یقیناً قادر ہے ۝ جس دن چھپی ہوئی باتوں کی جانچ پڑتال کی جائے گی ۝

یوم حساب کے لیے ہے، اگر اسے اپنا دوبارہ زندہ کیا جانا محال معلوم ہوتا ہے تو اپنی پیدائش پر غور کر لے کہ کس چیز سے ہوتی ہے؟ ایک اچھلنے والے پانی سے۔ جب اللہ تعالیٰ نے پانی جیسی مائع چیز پر صورت گری کر کے ایک کامل انسان پیدا کر دیا، جس میں مکمل اعضائے جسم، حیات، قوت، عقل اور ادراک سب کچھ موجود ہے تو یقیناً وہ اس انسان کو اس کی مٹی سے دوبارہ پہلی صورت میں پیدا کرنے پر بھی قادر ہے۔ بتاؤ، انسان کو پانی سے بنانا مشکل ہے یا اسی کی خاک سے دوبارہ بنا دینا؟ اور پہلی دفعہ بغیر نمونے کے پیدا کرنا مشکل ہے یا پہلے نمونے پر دوبارہ بنا دینا؟

۲ منی اگرچہ بظاہر خُصیوں میں بنتی ہے، مگر جب پیدا کرنے والے نے بتا دیا کہ اس کا اصل مرکز پیٹھ کی ہڈی اور پسلیوں کے درمیان ہے تو اس حقیقت میں شک کی کوئی گنجائش نہ رہی۔ بعض اہل علم کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ جدید طب نے بھی تسلیم کیا ہے کہ جنین کے خُصیے ریڑھ کی ہڈی اور پسلیوں کے درمیان گردوں کے قریب ہوتے ہیں، پھر ولادت سے پہلے اور بعض اوقات ولادت سے کچھ دیر بعد فوطوں میں اتر آتے ہیں، مگر پھر بھی ان کے اعصاب اور رگوں کا مقام وہی ”بَيْنِ الصُّلْبِ وَ التَّرَائِبِ“ رہتا ہے، بلکہ ان کی شریان بھی پیٹھ کے قریب شہ رگ (أَوْرَظِي) سے نکلتی ہے اور پورے پیٹھ سے گزرتی ہوئی ان کو خون مہیا کرتی ہے۔ گویا خصیتیں بھی اصل میں پیٹھ کا جز ہیں جو جسم کا زیادہ درجہ حرارت برداشت نہ کر سکنے کی وجہ سے باہر فوطوں میں منتقل کر دیے گئے ہیں۔ اب مادہ منویہ اگرچہ خصیتین میں پیدا ہوتا اور کیسہ منی میں جمع ہوتا ہے، مگر اسے خون پہنچانے اور حرکت دینے والا مرکز ”بَيْنِ الصُّلْبِ وَ التَّرَائِبِ“ ہی ہے۔ دماغ سے اعصاب کے ذریعے سے جب اس مرکز کو حکم پہنچتا ہے تو اس مرکز کی تحریک سے کیسہ منی سکڑتا ہے اور ماءِ داخل پچکاری کی طرح اچھل کر نکلتا ہے۔ الحمد للہ، جدید طب بھی اس حقیقت کو معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ بالفرض اگر وہ اس حقیقت تک نہ پہنچ پاتی تو قرآن کا بیان پھر بھی اہل حقیقت تھا۔ قصور انسانی تجربات و مشاہدات کا تھا جو اپنی نارسائی کی وجہ سے خالق کی بیان کردہ حقیقت تک نہ پہنچ سکے۔

آیت 9.8 إِنَّكَ عَلَىٰ رَجْعِهِ لَقَادِرٌ ۝ يَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ : ”تُبْلَى“ ”بَلَا يَبْلُو“ (ن) آزمائش کرنا، جانچ پڑتال کرنا، یہاں ظاہر کیا جانا مراد ہے، کیونکہ جانچ پڑتال بھی ہوگی جب چھپے ہوئے اعمال ظاہر ہوں گے۔ ”السَّرَائِرُ“ ”سَرِيْرَةٌ“ کی جمع ہے۔ ”سِرٌّ“ اور ”سَرِيْرَةٌ“ اس چیز کو کہتے ہیں جو چھپائی جائے۔ (قاموس) اس سے مراد وہ ارادے، نیتیں اور عقائد ہیں جن کا علم خود آدمی کے علاوہ کسی کو نہیں ہوتا اور وہ اعمال بھی جن کا علم کسی دوسرے کو نہیں ہو سکتا۔ ”يَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ“ ”رَجْعِهِ“ کا ظرف ہے، یعنی اللہ تعالیٰ انسان کو اس دن دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہے جس دن چھپی ہوئی باتوں کی جانچ پڑتال کی جائے گی۔

فَمَا لَهُ مِنْ قُوَّةٍ وَلَا نَاصِرٍ ﴿۱۰﴾ وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ﴿۱۱﴾ وَالْأَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ﴿۱۲﴾ إِنَّكَ لَقَوْلٌ فَضْلٌ ﴿۱۳﴾ وَمَا هُوَ بِالنَّهْزِلِ ﴿۱۴﴾

تو اس کے پاس نہ کوئی قوت ہوگی اور نہ کوئی مددگار ﴿۱۰﴾ تم ہے آسمان کی جو بار بار بارش برسانے والا ہے! ﴿۱۱﴾ اور زمین کی جو چھٹنے والی ہے! ﴿۱۲﴾ کہ بے شک یہ یقیناً ایک دو ٹوک بات ہے ﴿۱۳﴾ اور یہ ہرگز مذاق نہیں ہے ﴿۱۴﴾

آیت 10 فَمَا لَهُ مِنْ قُوَّةٍ وَلَا نَاصِرٍ: آدمی گرفتار ہو جائے تو اپنی قوت سے چھوٹ جاتا ہے یا کسی کی مدد سے، مگر اس دن اس میں نہ خودیج نکلنے کی قوت ہوگی اور نہ کوئی اس کی مدد کو آنے والا ہوگا۔

آیت 11-12 وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الرَّجْعِ...: ”الرَّجْعُ“ کی تفسیر مجاہد نے بارش کی ہے۔ (دیکھیے بخاری، التفسیر، باب سورۃ الطارق، مدح: ۴۹۴) اکثر مفسرین نے یہی معنی کیا ہے۔ ”الرَّجْعُ“ کا لفظی معنی لوٹنا یا لوٹانا ہے، چونکہ بارش بار بار پلٹ کر برتی ہے، اس لیے اسے ”رجع“ کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ سمندر کا پانی بھاپ بنتا ہے، وہ بھاپ پلٹ کر پھر بارش کی صورت میں برتی ہے، پھر وہ پانی اڑتا ہے پھر برستا ہے، اس لیے اسے ”رجع“ کہا ہے۔ ”الصَّدْعُ“ کا معنی پھٹنا ہے۔

آیت 13 إِنَّكَ لَقَوْلٌ فَضْلٌ: بعض مفسرین نے اس کی تفسیر یہ کی ہے کہ یہ قرآن قولِ فضل ہے، اس میں شک نہیں کہ قرآن قولِ فضل ہے، مگر پچھلی آیات اور قسموں کی مناسبت کو مد نظر رکھیں تو یہاں مراد یہ معلوم ہوتی ہے کہ قولِ فضل سے مراد قیامت بپا کرنے اور انسان کو دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہونے کی بات ہے، یعنی آسمان سے بار بار برسنے والی بارش اور اس کی نئی سے پھٹ کر بج کر باہر لے آنے والی زمین شاہد ہے کہ تمہارے دوبارہ زندہ کیے جانے کی بات دو ٹوک بات ہے، قیامت کے دن تم بھی اسی طرح زندہ ہو کر زمین سے نکل آؤ گے۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «مَا بَيْنَ النَّفْخَتَيْنِ يُرْعَوُونَ..... ثُمَّ يُنَزَّلُ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَيَنْثُونَ كَمَا يَنْثُ الثَّقَلُ، لَيْسَ مِنَ الْإِنْسَانِ شَيْءٌ إِلَّا يَتَلَى إِلَّا عَظْمًا وَاجْتِدًا وَهُوَ عَجَبُ الدُّنْبِ وَمِنْهُ يُرْكَبُ الْخَلْقُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ» | بخاری، التفسیر، باب: ۴۹۳۵۔ مسلم: ۶۹۵۵ | ”وہ نفخوں کے درمیان چالیس کا فاصلہ ہوگا پھر آسمان سے بارش برے گی تو لوگ اس طرح آگیں گے جس طرح سبزی اُگتی ہے اور انسان کا کوئی حصہ نہیں جو بوسیدہ نہ ہو، سوائے ایک ہڈی کے اور وہ دم کی ہڈی ہے، قیامت کے دن اسی سے مخلوق کو جوڑا جائے گا۔“

آیت 14 وَمَا هُوَ بِالنَّهْزِلِ: یعنی دوبارہ زندہ ہونے کی بات تم سے مذاق کے ساتھ نہیں کہی جا رہی، یہ حکیم و عظیم کا قول ہے، کسی جاہل کا نہیں جو مذاق کر رہا ہو۔ موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے گائے ذبح کرنے کے حکم پر ان سے کہا کہ کیا آپ ہمیں مذاق کر رہے ہیں تو انھوں نے فرمایا: ﴿أَعُوذُ بِاللَّهِ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ﴾ | البقرہ: ۶۷ | ”میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں کہ میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں۔“

إِنَّهُمْ يَكِيدُونَ كَيْدًا ۝۱۵ وَ أَكِيدُ كَيْدًا ۝۱۶ فَمَهْلُ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهَلُهُمْ رُوَيْدًا ۝۱۷

بے شک وہ خفیہ تدبیر کرتے ہیں، ایک خفیہ تدبیر ۱۵ اور میں بھی خفیہ تدبیر کرتا ہوں، ایک خفیہ تدبیر ۱۶ سو کافروں کو مہلت دے، مہلت دے انھیں تھوڑی سی مہلت ۱۷

آیت 15-17: إِنَّهُمْ يَكِيدُونَ كَيْدًا: ”رُوَيْدًا“ مختار الصحاح میں ہے: ”فَلَا نَ يَمْشِي عَلَى رُوْدٍ يَوْزَنَ عُوْدٍ أَيْ عَلَى مَهْلٍ وَ تَصْغِيرُهُ رُوَيْدٌ“ یعنی ”رُوَيْدٌ“ ”رُوْدٌ“ بروزن ”عُوْدٌ“ کی تصغیر ہے جس کا معنی مہلت ہے۔ گویا ”رُوَيْدًا“ کا معنی تھوڑی سی مہلت ہے۔ آیت میں یہ ”اَمْهَلُهُمْ“ کے مصدر محذوف ”اَمْهَلًا“ کی صفت ہے۔ یہ لوگ قیامت کو جھٹلانے اور حق کو مٹانے کے لیے خفیہ تدبیریں کر رہے ہیں اور میں خفیہ طور پر ان کے توڑ کے لیے ان سے بھی بڑی تدبیر کر رہا ہوں۔ آپ نہ ان کی مخالفت سے گھبرائیں، نہ جلد عذاب کی دعا کریں اور میرے کہنے پر انھیں تھوڑی سی مہلت دیں، آخر انھوں نے میرے ہی پاس آنا ہے، پھر میں جانوں اور یہ جانیں۔





سَبِّحْ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى ۝ الَّذِي خَلَقَ فَسَوَّى ۝ وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَى ۝

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

اپنے رب کے نام کی تسبیح کر جو سب سے بلند ہے ① وہ جس نے پیدا کیا، پس درست بنایا ② اور وہ جس نے اندازہ ٹھہرایا، پھر ہدایت کی ③

آیت 1 ① سَبِّحْ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى: "تَسْبِيح" کا معنی ہے "ہر برائی سے پاک کرنا۔" رب الاعلیٰ کے نام کو پاک کرنے کے علم کے مفہوم میں کئی چیزیں شامل ہیں، پہلی یہ کہ "سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَى" کہو۔ چنانچہ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب "سَبِّحْ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى" پڑھتے تو کہتے: «سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَى» ابو داؤد، الصلاة، باب الدعاء في الصلاة: ۸۸۳، وصححه الألبانی | "پاک ہے میرا رب جو سب سے بلند ہے۔" اس کے علاوہ آپ ﷺ مجھ سے اس علم پر عمل کے لیے "سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَى" کم از کم تین دفعہ پڑھتے تھے۔ | دیکھئے حسانی، التطنيق، باب نوع اخر: ۱۱۳۴، صحیح | دوسری یہ کہ اپنے رب کو ہر قسم کے نقص، عیب، کمزوری اور کسی بھی شریک سے پاک سمجھو اور اس کا اعلان کرتے رہو، تاکہ مشرکین اور باطل عقیدہ لوگوں کے کانوں میں یہ آواز پڑتی رہے۔ تیسری یہ کہ رب تعالیٰ کے نام کی تعظیم کرتے رہو، اسے ایسے طریقے سے یا ایسی جگہ یا ایسے الفاظ میں یاد نہ کرو جو اس کی شان کے لائق نہ ہو، یا جس سے اس کی بے ادبی ہوتی ہو یا استہزاء کا پہلو نکلتا ہو یا اس کے ساتھ کسی کے شریک ٹھہرانے جانے کا اندیشہ ہو۔ اس کے لیے سب سے زیادہ سلامتی کی راہ یہ ہے کہ اس کے لیے وہی نام استعمال کیے جائیں جو خود اس نے اپنے لیے استعمال کیے ہیں۔ چوتھی یہ کہ اللہ کا نام کسی مخلوق پر نہ بولو، مثلاً عبد الرحمن کو رحمان مت کہو۔ اگر لفظ مشترک ہو تو مخلوق پر اس انداز سے نہ بولو جس سے خالق کو یاد کرنا چاہیے۔

② "اپنے رب کے نام کی تسبیح کر" یا "اپنے رب کی تسبیح کر" دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے، کیونکہ "رب" بھی اس کا نام ہے۔ لفظ "نام" اس لیے بڑھایا کہ تم اللہ تعالیٰ کی حقیقت اور کُنُوت تک تو پہنچ ہی نہیں سکتے، تمہاری رسائی اس کے نام تک ہے، سو اس کی تسبیح کرتے رہو۔ بعض نے فرمایا کہ جب نام کی تسبیح ضروری ٹھہری تو اس کی ذات تو بالاولیٰ تسبیح کی حق دار ہے۔

آیت 2 ② الَّذِي خَلَقَ فَسَوَّى: "الَّذِي خَلَقَ" (جس نے پیدا کیا) اس کا مفعول بہ محذوف ہے، یعنی یہ بتانے کی ضرورت ہی نہیں کہ کسے پیدا کیا، کیونکہ پیدا کرنا کام اسی کا ہے اور سب اسی کی مخلوق ہیں۔ "فَسَوَّى" "پس درست بنایا" یعنی ہر چیز کو ٹھیک، متوازن اور عمدہ ترین شکل میں بنایا، کوئی چیز بے ڈھب اور غیر متوازن نہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿الَّذِي أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلْقًا﴾ | السجدة: ۷ | "وہ جس نے جو چیز پیدا کی خوب صورت پیدا کی۔" اس آیت میں اور اس کے بعد کی آیات میں رب تعالیٰ کی بعض وہ صفات بیان ہوئی ہیں جن کی وجہ سے وہ تسبیح کا مستحق ہے۔

آیت 3 ③ وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَى: یعنی اس نے ہر چیز کے متعلق اندازہ لگا کر پہلے ہی لکھ دیا کہ وہ کیا کرے گا؟ اس کا کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

وَالَّذِي أَخْرَجَ الْمَرْعَىٰ ۖ فَجَعَلَهُ غُثَاءً أَحْوَىٰ ۖ سَنَفْرُكَ فَلَا تَنْسَىٰ ۗ إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ ۗ إِنَّكَ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفَىٰ ۗ

اور وہ جس نے چارا اگایا ۴ پھر اس نے اسے سیاہ کوڑا کرکٹ کر دیا ۵ ہم ضرور تجھے پڑھائیں گے تو تو نہیں بھولے گا ۶ مگر جو اللہ چاہے یقیناً وہ کھلی بات کو جانتا ہے اور اس بات کو بھی جو چھپی ہوئی ہے ۷

رزق، عمر، سعادت یا شقاوت سب کچھ لکھ دیا۔ اسی کا نام تقدیر ہے، اللہ تعالیٰ کا اندازہ ہمارے اندازے کی طرح نہیں کہ غلط ہو جائے۔ ”فہذی“ پھر جس نے جو کچھ کرنا تھا اسے اس راہ پر لگا دیا۔ ایک معنی یہ ہے کہ ہر جاندار کو پیدا کر کے اس کی ضرورتوں کا اندازہ مقرر کر دیا کہ اسے کیا کیا ضرورت ہوگی، پھر اسے اس کی ضروریات و مصالح حاصل کرنے کا راستہ بتا دیا، مثلاً بچے کو پستان چوسنے کا اور نر و مادہ کو بقائے نسل کا راستہ بتا دیا اور اس پر چلا دیا۔ پرندوں کو شام کے وقت اپنے گھونٹوں کی طرف واپسی کا اور شہد کی مکھی کو اپنے چھتے کا راستہ بتا دیا اور اس پر چلا دیا۔

آیت 5.4: وَالَّذِي أَخْرَجَ الْمَرْعَىٰ : حیوانوں کی ایک بڑی ضرورت چارائھی، جو اس نے اگایا، پھر بتدریج اسے سیاہ کوڑا بنا دیا۔ یہ اشارہ ہے ہر چیز کے کمال کے بعد زوال کی طرف۔

آیت 6: سَنَفْرُكَ فَلَا تَنْسَىٰ: اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ قیامہ کی آیات (۱۶ تا ۱۹) کی تفسیر۔ یہ پیشین گوئی ابتدائے اسلام میں مکہ کے اندر ہوئی، پھر سب لوگوں نے دیکھا کہ واقعی رسول اللہ ﷺ کو صرف ایک دفعہ جبریل علیہ السلام سے سن کر کسی کتابت یا تکرار کے بغیر اتنا بڑا قرآن حفظ ہو گیا۔ یہ قرآن کا بھی معجزہ ہے کہ اس کی پیشین گوئی پوری ہوئی اور رسول اللہ ﷺ کا بھی جنھیں قرآن یاد ہوا اور پھر بھولا نہیں۔

آیت 7: ۱ إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ: یعنی اللہ تعالیٰ جو چاہے بھلا دے۔ بعض اوقات کچھ آیات اس طرح بھی منسوخ کی جاتی تھیں کہ وہ آپ ﷺ کو بھلا دی جاتیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ فَغَنَّا أَوْ مِثْلَهَا﴾ ۱ البقرة: ۱۰۶ ”جو آیت ہم منسوخ کرتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں اس سے بہتر یا اس جیسی آیت لے آتے ہیں۔“

۲ إِنَّكَ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفَىٰ: ”وہ کھلی اور چھپی سب باتیں جانتا ہے“ یہ بات اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کئی جگہ بیان فرمائی ہے کہ وہ کھلی اور چھپی سب باتیں جانتا ہے، کوئی بات اونچی آواز سے کی گئی ہو یا آہستہ یا بالکل مخفی ہو وہ سب کچھ جانتا ہے۔ (دیکھیے رعد: ۱۰۔ ط: ۷۔ انعام: ۳۔ انبیاء: ۱۱۰۔ ملک: ۱۳) ابن جوزی کے استاذ وزیر ابن ہبیرہ فرماتے ہیں کہ میں نے اس بات پر بہت غور کیا کہ چھپی ہوئی باتوں کو تو واقعی صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے، مگر بلند آواز سے کی گئی باتیں تو ہم بھی جانتے اور سمجھتے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ ان باتوں کے جاننے کو اپنی خاص صفت کے طور پر کیوں بیان فرما رہے ہیں؟ پھر میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ بلند آواز کے ساتھ اگر ایک وقت میں کئی آدمی بولنا شروع کر دیں تو ہمیں کچھ پتا نہیں چلتا، یہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کی شان ہے کہ وہ ساری مخلوق کی بلند آواز سے کی ہوئی باتیں سنتا ہے اور چھپی ہوئی باتیں بھی۔ اس مقام پر یہ صفت بیان

وَنِيْسِرْكَ لِلْيُسْرَىٰ ۝ فَذَكِّرْ إِن نَّفَعَتِ الذِّكْرَىٰ ۝ سَيَذَكِّرْ مَنْ يَخْشَىٰ ۝ وَيَتَجَدَّبُهَا الْأَشْقَىٰ ۝

اور ہم تجھے آسان راستے کے لیے سہولت دیں گے ۸ سو تو نصیحت کر، اگر نصیحت کرنا فائدہ دے ۹ عنقریب نصیحت حاصل کرے گا جو ڈرتا ہے ۱۰ اور اس سے علیحدہ رہے گا جو سب سے بڑا بد نصیب ہے ۱۱

کرنے کی حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو حکم ہو رہا ہے کہ جب جبریل علیہ السلام پڑھیں تو آپ یاد کرنے کے لیے ساتھ ساتھ نہ پڑھیں، ان کے ساتھ ساتھ پڑھیں گے تو سمجھنا مشکل ہوگا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں، یہ اللہ ہی کی شان ہے کہ بلند آواز سے کی گئی باتیں ہوں، خواہ کروڑوں لوگوں کی ہوں یا چھپی ہوئی، وہ سب جانتا ہے۔

آیت 8 وَنِيْسِرْكَ لِلْيُسْرَىٰ: یعنی ہم آپ کے لیے یہ آسانی فرمائیں گے کہ آپ کے خاموش رہ کر سنتے جانے سے آپ کو وحی الہی یاد ہو جائے گی۔

آیت 9، 11 فَذَكِّرْ إِن نَّفَعَتِ الذِّكْرَىٰ...: ”تو نصیحت کر اگر نصیحت کرنا فائدہ دے“ اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر نصیحت فائدہ نہ دے تو کیا نصیحت چھوڑ دی جائے؟ جواب یہ ہے کہ ہرگز نہیں، بلکہ نصیحت کرتے رہنا لازم ہے۔ تو پھر آیت کا مطلب کیا ہے؟ آیت کی مختلف تفاسیر میں سے تین تفسیریں زیادہ قریب ہیں: ① تفسیر ثنائی میں ہے کہ اس آیت کی بنا پر بعض لوگ گمراہ لوگوں کو وعظ و نصیحت کرنا چھوڑ دیتے ہیں، کہتے ہیں کہ نصیحت کے نفع و نینے کی صورت میں نصیحت کرنے کا حکم ہے ورنہ نہیں، یہ ان کی غلطی ہے۔ آیت میں ”ان“ ہے کہ جب تک انسان کو کسی قطعی دلیل سے یہ معلوم نہ ہو جائے کہ فلاں شخص کو نصیحت فائدہ نہ دے گی ”ان“ کا محل رہتا ہے اور قطعی دلیل صرف وحی الہی ہے۔ وحی کے بغیر ہر حال میں نصیحت کے مفید ہونے کا امکان باقی ہے، اس لیے جب تک تمہیں وحی الہی سے معلوم نہ ہو جائے کہ فلاں کو نصیحت نفع نہ دے گی وعظ و نصیحت کرتے جاؤ۔ ظاہر ہے کہ تمہارے پاس وحی الہی نہیں، اس لیے تم ہمیشہ نصیحت کرتے رہو۔ (مختصراً)

② دوسری تفسیر یہ ہے کہ ”فَذَكِّرْ إِن نَّفَعَتِ الذِّكْرَىٰ“ (نصیحت کر، اگر نصیحت فائدہ دے) کا یہ مطلب نہیں کہ جسے نصیحت فائدہ دے اسے نصیحت کر دوسرے کو نہ کر، کیونکہ یہ تو معلوم ہی نہیں ہو سکتا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ نصیحت کر اگر کسی ایک کو بھی نصیحت فائدہ دے۔ گویا ”نَفَعَتْ“ کا مفعول محذوف ہے، یعنی ”إِن نَّفَعَتِ الذِّكْرَىٰ أَحَدًا“ اور ظاہر ہے کہ کسی نہ کسی کو تو فائدہ ہوتا ہی ہے، اس لیے آپ ہر شخص کو نصیحت کرتے جائیں۔ ”سَيَذَكِّرْ مَنْ يَخْشَىٰ...“ پھر ڈرنے والا قبول کر لے گا اور بد بخت اجتناب کرے گا، آپ کا کام نصیحت کرتے چلے جانا ہے اس امید پر کہ نصیحت کسی کو تو فائدہ دے گی۔

③ تیسری تفسیر یہ ہے کہ ”ان“ حرف شرط ”إِذَا“ کے معنی میں ہے، یعنی نصیحت کر جب نصیحت کرنا فائدہ دے۔ موقع و محل کا خیال رکھو، بے موقع بات مؤثر نہیں ہوتی۔ جب دیکھو کہ سننے کی طرف مائل ہیں تو نصیحت کرو اور جب ضد اور سرکش پر اترے ہوئے ہوں تو کنارہ کشی اختیار کرو، یہ نہیں کہ نصیحت ہی چھوڑ دو۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو، نوح اور دوسرے انبیاء علیہم السلام نے اپنی

الَّذِي يَصَلِّي النَّارَ الْكُبْرَى ۱۴ ثُمَّ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَى ۱۳ قَدْ أَفْلَحَ مَنْ
تَزَكَّى ۱۳ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّى ۱۵ بَلْ تُؤَثِّرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ۱۶ وَالْآخِرَةَ خَيْرًا
وَأَبْقَى ۱۷ إِنَّ هَذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُولَى ۱۸ صُحُفِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَى ۱۹

وہ جو سب سے بڑی آگ میں داخل ہوگا ۱۴ پھر وہ نہ اس میں مرے گا اور نہ زندہ رہے گا ۱۳ بے شک وہ کامیاب
ہو گیا جو پاک ہو گیا ۱۳ اور اس نے اپنے رب کا نام یاد کیا، پس نماز پڑھی ۱۵ بلکہ تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو ۱۶
حالانکہ آخرت کہیں بہتر اور زیادہ باقی رہنے والی ہے ۱۷ بے شک یہ بات یقیناً پہلے صحیفوں میں ہے ۱۸ ابراہیم اور
موسیٰ کے صحیفوں میں ۱۹

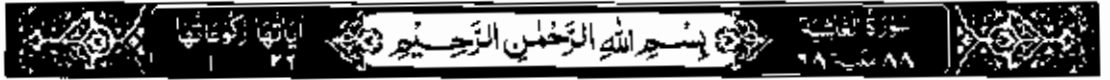
اپنی اقوام کو ان پر عذاب آنے تک نصیحت ترک نہیں کی۔

آیت 12-13 - الَّذِي يَصَلِّي النَّارَ الْكُبْرَى : سب سے بڑی آگ اس لیے کہ جہنم کی آگ دنیا کی آگ سے اُنہتر
(۶۹) گنا بڑھی ہوئی ہے۔ (دیکھیے بخاری: ۳۲۶۵) ”ثُمَّ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَى“ یعنی نہ مرے گا کہ جان چھوٹ جائے
اور نہ ایسی زندگی ہوگی کہ کوئی راحت ہو۔

آیت 14-15 - قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّى : یعنی کفر و شرک اور گناہوں سے پاک ہو کر اللہ اکبر کہہ کر پانچوں نمازیں پڑھیں۔

آیت 16-17 - بَلْ تُؤَثِّرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا : فرمایا، آخرت کی بھلائی کے کاموں میں تم اس لیے کوتاہی کرتے ہو
کہ دنیا کے مشغلوں کو چھوڑنا تمہیں شاق گزرتا ہے، حالانکہ تم اسے نہ بھی چھوڑو گے تو وہ تمہیں چھوڑ دے گی، کیونکہ وہ باقی
رہنے والی نہیں ہے اور اگر آخرت کو اختیار کر لو گے تو وہ تمہیں کبھی نہیں چھوڑے گی، پھر سوچ لو کسے ترجیح دینی چاہیے۔
(خلاصہ احسن التفاسیر)





هَلْ أَتَكَ حَدِيثُ الْغَاشِيَةِ ① وَجُودٌ يَوْمِيذٍ خَاشِعَةٌ ② عَائِلَةٌ نَاصِبَةٌ ③ تَصَلِّي نَارًا
حَامِيَةً ④ تُشْفِي مِنْ عَيْنِ أَيْبَةٍ ⑤

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

کیا تیرے پاس ڈھانپ لینے والی کی خبر پہنچی؟ ① اس دن کئی چہرے ذلیل ہوں گے ② محنت کرنے والے، تھک جانے والے ③ گرم آگ میں داخل ہوں گے ④ وہ ایک کھولتے ہوئے چشمے سے پلائے جائیں گے ⑤

آیت 21 هَلْ أَتَكَ حَدِيثُ الْغَاشِيَةِ : "الغَاشِيَةِ" "عَيْشِي يَغْشِي" (س) سے اسم فاعل ہے، ڈھانپ لینے والے۔ مراد قیامت ہے جو ہر چیز پر چھا جائے گی۔

آیت 43 ① عَائِلَةٌ نَاصِبَةٌ : کافر دنیا میں جتنی محنت بھی کرے وہ قیامت کے دن گردوغبار کی طرح ازا دی جائے گی۔ (دیکھیے فرقان: ۲۳) یہی حال دکھاوا کرنے والے اور سنت کو چھوڑ کر خود ساختہ عمل کرنے والے کا ہے کہ سخت محنت کے باوجود جہنم میں جائے گا۔ (دیکھیے سورۃ کہف کا آخری رکوع مع تفسیر) اسی مفہوم کے پیش نظر ابن عباس رضی اللہ عنہما نے "عَائِلَةٌ نَاصِبَةٌ" سے مراد نصاریٰ لیے ہیں۔ [دیکھیے بحاری، التفسیر، سورۃ: ﴿هَلْ أَتَكَ حَدِيثُ الْغَاشِيَةِ﴾ بعد ح: ۱۹۹۱] نصرائی راہوں کی شدید ریاضتیں مشہور ہیں، مگر وہ قیامت کے دن ان کے کسی کام نہیں آئیں گی۔

اسی طرح جو لوگ خود ساختہ ورد و ظنیے یا عبادتیں کرتے ہیں یا اپنے بنائے ہوئے طریقوں پر عبادت کرتے ہیں، خواہ ایک ناگہ پر کھڑے ہو کر کریں یا لٹلے لٹک کر یا سانس بند کر کے کریں یا مشرکین کی طرح کسی مخلوق کا تصور باندھ کر کریں یا ضربیں لگا کر، اتنی سخت مشقتوں کے باوجود وہ قیامت کے دن ذلیل ہوں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿يَرُدُّ عَلَيَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ رَحْطًا مِّنْ أَصْحَابِي فَيُحَلُّونَ عَنِ الْخَوْضِ فَأَقُولُ يَا رَبِّ! أَصْحَابِي، فَيَقُولُ إِنَّكَ لَا عِلْمَ لَكَ بِمَا أُحْدِثُوا بَعْدَكَ، إِنَّهُمْ ارْتَدُّوا عَلَيَّ أَذْبَابِهِمْ فَالْفَهْرِيُّ فَأَقُولُ سَحْفًا سَحْفًا لِمَنْ غَيْرِ بَعْدِي﴾ [بحاری، الرفاق، باب فی الخوض: ۶۵۸۴، ۶۵۸۵] "قیامت کے دن میرے ساتھیوں میں سے ایک جماعت مجھ پر پیش کی جائے گی، پھر انھیں حوض سے روک دیا جائے گا تو میں کہوں گا: "اے میرے رب! یہ تو میرے ساتھی ہیں۔" تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا: "آپ نہیں جانتے کہ انھوں نے آپ کے بعد کیا کیا نئی چیزیں شروع کر دی تھیں، بلاشبہ یہ لوگ اریڑیوں کے بل اٹلے لوٹ گئے تھے۔" تو میں کہوں گا: "پھر جس نے میرے بعد تبدیلی کر دی اسے مجھ سے دور لے جاؤ، اسے مجھ سے دور لے جاؤ۔"

② تَصَلِّي نَارًا حَامِيَةً: "حَامِيَةً" "حَمِي يَحْمِي حَمِيًا" (س) "النَّارُ" (آگ کا سخت گرم ہونا) سے اسم فاعل مؤنث ہے، سخت گرم۔

آیت 5 تُشْفِي مِنْ عَيْنِ أَيْبَةٍ: "أَيْبَةٍ" "أُنِي يَأْتِي أَيْبِي" (ض) سے اسم فاعل مؤنث ہے۔

لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ إِلَّا مِنْ ضَرِيحٍ ① لَا يَسْنَنُ وَلَا يُغْنِي مِنْ جُوعٍ ② وَجُودًا يُؤْمِنُونَ ③
 تَاعِبَةً ④ لَسَعِبَهَا رَاضِيَةً ⑤ فِي جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ⑥ لَا تَسْمَعُ فِيهَا لَآغِيَةً ⑦ فِيهَا عَيْنٌ ⑧
 جَارِيَةٌ ⑨ فِيهَا سُرُرٌ مَرْفُوعَةٌ ⑩ وَآكُوبَاتٌ مَوْضُوعَةٌ ⑪ وَتَنَارِقُ مَصْفُوفَةٌ ⑫ وَزَرَابِيُّ ⑬
 مَبْنُوتَةٌ ⑭ أَفَلَا يَنْظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ⑮ وَإِلَى السَّمَاءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ⑯ وَإِلَى
 الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ⑰ وَإِلَى الْأَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ⑱

ان کے لیے کوئی کھانا نہیں ہوگا مگر ضریح سے ① جو نہ موٹا کرے گا اور نہ بھوک سے کچھ فائدہ دے گا ② کئی چہرے اس دن تروتازہ ہوں گے ③ اپنی کوشش پر خوش ④ بلند جنت میں ہوں گے ⑤ وہ اس میں بے ہودگی والی کوئی بات نہیں سنیں گے ⑥ اس میں ایک بننے والا بڑا چشمہ ہے ⑦ اس میں اونچے اونچے تخت ہیں ⑧ اور رکھے ہوئے آنخورے ہیں ⑨ اور قطاروں میں لگے ہوئے گاؤں کیے ہیں ⑩ اور بچھائے ہوئے محلی قالین ہیں ⑪ تو کیا وہ اونٹوں کی طرف نہیں دیکھتے کہ وہ کیسے پیدا کیے گئے ⑫ اور آسمان کی طرف کہ وہ کیسے بلند کیا گیا ⑬ اور پہاڑوں کی طرف کہ وہ کیسے نصب کیے گئے ⑭ اور زمین کی طرف کہ وہ کیسے بچھائی گئی ⑮

آیت 6 لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ إِلَّا مِنْ ضَرِيحٍ: "ضریح" ایک خاردار پودا ہے جو تازہ ہو تو اہل حجاز اسے "شبنوق" کہتے ہیں اور خشک ہو تو "ضریح" جو سخت زہریلا ہوتا ہے۔ [دیکھیے بحاری، التفسیر، سورۃ: ﴿هل أتانا﴾، بعد: ۱۹۹۱]

آیت 11 لَا تَسْمَعُ فِيهَا لَآغِيَةً: اس کی وضاحت کے لیے دیکھیے سورۃ نبا کی آیت (۳۵) کی تفسیر۔

آیت 12 فِيهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ: "عین" (چشمہ) یہ یا تو اسم جنس ہے اور لفظ واحد ہونے کے باوجود بے شمار بننے والے چشمے مراد ہیں، یا واحد ہے اور نون تعلیم کے لیے ہے، ترجمہ اسی کے مطابق ہے۔

آیت 12 فِيهَا سُرُرٌ مَرْفُوعَةٌ: جہاں سے وہ گرد و پیش والی ہر چیز کا نظارہ کر رہے ہوں گے۔

آیت 14 وَآكُوبَاتٌ مَوْضُوعَةٌ: "آکوبات" "کُوب" کی جمع ہے، وہ پیالے جن کی نہ ذائقہ ہونے لگتی۔

آیت 17-20 ① أَفَلَا يَنْظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ...: قیامت اور قیامت کے دن جہتیسوں اور جہتیسوں کا حال ذکر کرنے

کے بعد ان چیزوں کو دیکھنے کی دعوت کا مقصد یہ ہے کہ اگر یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ دوبارہ زندہ ہونا ممکن نہیں اور نہ کسی نے جنت یا جہنم میں جانا ہے تو ان چار چیزوں کو دیکھ لیں۔ اتنی عظیم الشان چیزیں پیدا کرنے والا پروردگار کیا ان لوگوں کو دوبارہ نہیں بنا سکتا؟

② عرب کا بادیہ نشین تمام شہری مکلفات سے دور اونٹ پر سوار ہو کر سفر کر رہا ہو اور فطرت اپنی اصل صورت میں اس کے سامنے جلوہ گر ہو تو تھوڑا سا غور کرنے پر بھی ہر چیز میں اسے اللہ تعالیٰ کی زبردست قدرت نظر آئے گی۔ اوپر دیکھیے سورج یا

فَذَكِّرْ شَ إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ ﴿۲۱﴾ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِبُصِيرٍ ﴿۲۲﴾ إِلَّا مَنْ تَوَلَّى وَكَفَرَ ﴿۲۳﴾
فَيُعَذِّبُهُ اللَّهُ الْعَذَابَ الْأَكْبَرَ ﴿۲۴﴾ إِنَّ إِلَيْنَا إِيَابَهُمْ ﴿۲۵﴾ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ ﴿۲۶﴾

پس تو نصیحت کر، تو صرف نصیحت کرنے والا ہے ﴿۲۱﴾ تو ہرگز ان پر کوئی مسلط کیا ہوا نہیں ہے ﴿۲۲﴾ مگر جس نے منہ موڑا اور انکار کیا ﴿۲۳﴾ تو اسے اللہ عذاب دے گا، سب سے بڑا عذاب ﴿۲۴﴾ یقیناً ہماری ہی طرف ان کا لوٹ کر آنا ہے ﴿۲۵﴾ پھر بے شک ہمارے ہی ذمے ان کا حساب ہے ﴿۲۶﴾

چاند ستاروں سے بھرا ہوا لامحدود محکم آسمان، نیچے دیکھے تو صفائی سے کچھی ہوئی وسیع زمین، دائیں بائیں دیکھے تو زمین میں گڑے ہوئے بلند و بالا پہاڑ اور اپنی سواری کو دیکھے تو صحرا کے مطابق بناوٹ رکھنے والا ہفتوں بھوک اور پیاس برداشت کرنے والا اونٹ، کوئی چیز بھی تو اس کی اپنی بنائی ہوئی نہیں۔ اتنی عظیم مخلوق کے مالک کے لیے اس حقیر انسان کو دوبارہ زندہ کرنا کیا مشکل ہے جسے پہلے بھی اسی نے پیدا کیا ہے؟

آیت 21، 22 ﴿فَذَكِّرْ شَ إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ﴾ : آپ کا کام نصیحت کرنا ہے، زبردستی مسلمان کرنا نہیں، جیسا کہ فرمایا:

﴿لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ﴾ [البقرة: ۲۵۶] ”دین میں کوئی زبردستی نہیں۔“

آیت 23، 24 ﴿إِلَّا مَنْ تَوَلَّى وَكَفَرَ﴾ : مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ جو منہ موڑ کر کفر پر اصرار کرتا ہے اسے پوچھا ہی نہ جائے، بلکہ اگر وہ کافر ہی رہنا چاہتا ہے تو رہے، مگر مسلمانوں کی حکومت تسلیم کرے، اپنے ہاتھوں سے انہیں جزیہ دے اور اپنی ذلت کا اقرار کرے (یہ دنیا کا عذاب ہے) ورنہ لڑنے کے لیے تیار رہے۔ (دیکھیے توبہ: ۲۹) اور قیامت کو اس کے لیے جہنم کا عذاب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں غلامی سے بڑی ذلت کوئی نہیں اور آخرت میں آگ سے بڑا عذاب کوئی نہیں، دونوں عذاب اکبر ہیں۔

آیت 25 ﴿إِنَّ إِلَيْنَا إِيَابَهُمْ: ”إِيَابٌ“ ”آبٌ يُّؤُوبٌ“ (ن) کا مصدر ہے، لوٹنا۔



سورۃ الفجر
۸۹ آیت ۱۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴿۱﴾

وَالْفَجْرِ ﴿۱﴾ وَ لَيَالٍ عَشْرٍ ﴿۲﴾ وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ ﴿۳﴾ وَ الْاَيْلِ اِذَا يَسِرُّ ﴿۴﴾ هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍ ﴿۵﴾

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

قسم ہے فجر کی! ﴿۱﴾ اور دس راتوں کی! ﴿۲﴾ اور جفت اور طاق کی! ﴿۳﴾ اور رات کی جب وہ چلتی ہے! ﴿۴﴾ یقیناً اس میں عقل والے کے لیے بڑی قسم ہے ﴿۵﴾

آیت 1 وَالْفَجْرِ: "الفجر" سے مراد صبح ہے۔ سورۃ نکور میں بھی یہ قسم مذکور ہے: ﴿وَالضُّحٰی اِذَا تَنَفَّسُ﴾ [النکور: ۱، ۸] "اور قسم ہے صبح کی جب وہ سانس لیتی ہے۔" ضروری نہیں کہ اس سے کسی خاص دن کی صبح ہی مراد لی جائے، ہر صبح ہی قیامت کی دلیل ہے، جس کے ساتھ سوئی ہوئی مخلوق بیدار ہو جاتی ہے اور موت کے بعد اٹھنے کا منظر سامنے آ جاتا ہے۔

آیت 2 وَ لَيَالٍ عَشْرٍ: بہت سے مفسرین نے "وَلَيَالٍ عَشْرٍ" سے ذوالحجہ کی پہلی دس راتیں مراد لی ہیں۔ اہل عرب حج کے ایام کی بہت تعظیم کرتے تھے، ان دنوں میں ہر طرف سے لوگوں کا مکہ میں اجتماع قیامت کے دن کے اجتماع کی یاد دلاتا ہے، مگر لفظ عام ہیں تو بہتر ہے مفہوم بھی عام ہی رکھا جائے۔ چاند کی راتوں کا ہر عشرہ نئے انقلاب کی نشاندہی کرتا ہے، پہلے عشرے میں چاند بڑھتا جاتا ہے، آخری میں گھٹتا جاتا ہے اور درمیانی عشرہ عروج و زوال کا جامع ہونے کے باوجود تقریباً روشن ہوتا ہے۔ یہ انقلاب قیامت قائم ہونے کی دلیل ہے۔

آیت 1 وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ: جفت وہ عدد ہے جو دو برابر حصوں میں تقسیم ہو جائے، جیسے دو، چار، چھ وغیرہ اور طاق وہ عدد ہے جو اس طرح تقسیم نہیں ہوتا، مثلاً ایک، تین، پانچ وغیرہ۔ کائنات کی کوئی بھی چیز گنتی کے وقت ان دو حالتوں سے خالی نہیں۔ تمام چیزیں بڑھتے وقت بھی طاق سے جفت اور جفت سے طاق ہوتی چلی جاتی ہیں اور گھٹتے وقت بھی۔ مثلاً ایک سے دو، پھر تین، پھر چار و علیٰ ہذا القیاس اور دس سے نو، پھر آٹھ سے سات و علیٰ ہذا القیاس۔

آیت 4 وَالْاَيْلِ اِذَا يَسِرُّ: "یسر" اصل میں "یسری" ہے، آیات کے فواصل کی مطابقت کے لیے یاء حذف کر کے را، پر کسرہ باقی رکھا گیا ہے۔ "سری یسری سوری" (ض) رات کا چلنا۔ سورۃ مدثر میں فرمایا: ﴿وَالْاَيْلِ اِذَا اُذْبَرُ﴾ [المدثر: ۱۳۳] "اور قسم ہے رات کی، جب وہ جانے لگے۔" یعنی رخصت ہوتی ہوئی رات قیامت قائم ہونے کی بہت بڑی دلیل ہے۔

آیت 5 : ﴿۱﴾ هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍ: "هل" کے معنی کے لیے دیکھیے سورۃ دہر کی پہلی آیت۔ "حجر بنحو" (ن) منع کرنا، روکنا۔ عقل کو "حجیر" اس لیے کہتے ہیں کہ وہ آدمی کو ہر غلط کام سے روکتی اور منع کرتی ہے۔

﴿۲﴾ قرآن مجید میں مذکور قسمیں عام طور پر کسی نہ کسی بات کی شہادت اور دلیل کے لیے آتی ہیں، سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ قسمیں کہا کر عقل والوں کو کیا پاور کر دیا جا رہا ہے؟ جواب اگرچہ لفظوں میں موجود نہیں مگر آئندہ آیات سے صاف واضح ہے، یعنی ان

الْمَ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۖ إِرْمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۗ الَّتِي لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي
الْبِلَادِ ۗ وَشَمُودَ الَّذِينَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ۗ وَفِرْعَوْنَ ذِي الْأَوْتَادِ ۗ الَّذِينَ
طَعَنُوا فِي الْبِلَادِ ۗ

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے رب نے عاد کے ساتھ کس طرح کیا ۱ (وہ عاد) جو ارم (قبیلہ کے لوگ) تھے،
ستونوں والے ۲ وہ کہ ان جیسا کوئی شہروں میں پیدا نہیں کیا گیا ۳ اور شمود کے ساتھ (کس طرح کیا) جنھوں نے
وادی میں چٹانوں کو تراشا ۴ اور میخوں والے فرعون کے ساتھ (کس طرح کیا) ۵ وہ لوگ جو شہروں میں حد سے
بڑھ گئے ۱۱

سب چیزوں پر غور کرو تو تمہیں یقین ہو جائے گا کہ اتنے زبردست تغیرات لانے والا پروردگار اس بات پر قادر ہے کہ تمہیں
دوبارہ زندہ کر کے تمہیں تمہارے اعمال کی جزا و سزا دے اور اگر تم سرکشی پر اڑے رہے تو عاد و شمود اور قوم فرعون کی طرح دنیا
میں بھی تم پر عذاب کا کوڑا برسا دے۔

آیت 7.6 : الْمَ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ : "الْعِمَادِ" اسم جنس ہے جو واحد و جمع سب پر آتا ہے، ستون۔ "إِرْمَ"
نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے ایک آدمی کا نام ہے جس کی نسل سے عاد ارم تھے۔ عاد ارم سے مراد عاد اولیٰ ہیں جن کی طرف
ہود علیہ السلام بھیجے گئے تھے اور عاد ثانیہ یا عاد اُمّریٰ شمود کو کہتے ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ ارم خاص اس جگہ کا نام تھا جہاں عاد رہتے
تھے۔ (واللہ اعلم) البتہ حافظ ابن کثیر رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کی باتوں کو خرافات قرار دیا ہے جنھوں نے ارم ایک ایسا شہر بیان کیا
ہے جس کی ایک اینٹ سونے کی اور ایک چاندی کی تھی۔ "ذَاتِ الْعِمَادِ" کا لفظی معنی ہے "ستونوں والے"۔ ان کا یہ لقب
اس لیے ہے کہ وہ بڑے قد آور تھے (جس طرح کھجوروں کے تنے۔ دیکھیے حاقہ: ۷) اور اس لیے بھی کہ وہ بڑے بڑے ستونوں
والی عمارتیں بناتے تھے اور محض شان و شوکت کے اظہار کے لیے اونچی سے اونچی یادگاریں بناتے تھے۔ دیکھیے سورہ شعراء (۱۲۸)۔

آیت 9 : وَشَمُودَ الَّذِينَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ : "جَابُوا" "جَابَ يَجُوبُ جَوْبًا" (ن) کا ثناء۔ "الصَّخْرَ" اسم جنس
ہے، چٹانیں۔ مفسرین کہتے ہیں کہ شمود پہلے لوگ ہیں جنھوں نے پہاڑوں کو کاٹ کر گھر بنائے۔ (شکافی) آج کل اس "وادی
القرنی" کا نام "الطاء" ہے جو سعودی عرب میں ہے اور وہ مدائن صالح (جو شمود کا مرکزی شہر تھا) سے تقریباً بیس میل کے
فاصلے پر واقع ہے۔ (دیکھیے سورہ حجر: ۸۲) (اشرف الحواشی)

آیت 10 : وَفِرْعَوْنَ ذِي الْأَوْتَادِ : "الْأَوْتَادِ" "وَتَدَّ" کی جمع ہے، لکڑی یا لوہے وغیرہ کی میخیں۔ "ذِي الْأَوْتَادِ"
"میخوں والا" یعنی بڑے لشکروں والا، جن کے خیمے گاڑنے کے لیے بہت بڑی تعداد میں میخیں مہیا رہتی تھیں، یا سخت ظالم کہ
جس پر ناراض ہوتا اس کے ہاتھ پاؤں میں میخیں ٹھکوا دیتا تھا۔

فَاكْثُرُوا فِيهَا الْفَسَادَ ﴿۱۳﴾ فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ ﴿۱۴﴾ إِنَّ رَبَّكَ لِبِالْمُرْصَادِ ﴿۱۵﴾
 فَأَمَّا الْإِنْسَانُ إِذَا مَا ابْتَلَاهُ رَبُّهُ فَأَكْرَمَهُ وَ نَعَّمَهُ ۚ فَيَقُولُ رَبِّي أَكْرَمَنِ ﴿۱۵﴾ وَ أَمَّا
 إِذَا مَا ابْتَلَاهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهُ ۚ فَيَقُولُ رَبِّي أَهَانَنِ ﴿۱۶﴾ كَلَّا بَلْ لَّا تَكْفُرُونَ الْبَيْتِيمَ ﴿۱۷﴾
 وَلَا تَحْضُونَ عَلَى طَعَامِ الْمُسْكِينِ ﴿۱۸﴾ وَ تَأْكُلُونَ الثَّرَاثَ أَكْلًا لُبًّا ﴿۱۹﴾ وَ تَحْبُونَ
 الْمَالَ حُبًّا جَنًّا ﴿۲۰﴾

پس انھوں نے ان میں بہت زیادہ فساد پھیلادیا ﴿۱۳﴾ تو تیرے رب نے ان پر عذاب کا کوزا برسایا ﴿۱۴﴾ بے شک تیرا رب یقیناً گھات میں ہے ﴿۱۵﴾ پس لیکن انسان جب اس کا رب اسے آزمائے، پھر اسے عزت بخشے اور اسے نعمت دے تو کہتا ہے میرے رب نے مجھے عزت بخشی ﴿۱۵﴾ اور لیکن جب وہ اسے آزمائے، پھر اس پر اس کا رزق تنگ کر دے تو کہتا ہے میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا ﴿۱۶﴾ ہرگز ایسا نہیں، بلکہ تم یتیم کی عزت نہیں کرتے ﴿۱۷﴾ اور نہ تم آپس میں مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیتے ہو ﴿۱۸﴾ اور تم میراث کھا جاتے ہو، سب سمیٹ کر کھا جانا ﴿۱۹﴾ اور مال سے محبت کرتے ہو، بہت زیادہ محبت کرنا ﴿۲۰﴾

آیت 12 فَاكْثُرُوا فِيهَا الْفَسَادَ: یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر و شرک اور اس کی مخلوق پر ظلم و ستم۔ (اشرف الموحثی)

آیت 13 فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ سَوْطَ عَذَابٍ: ان میں سے کسی پر ہم نے پتھر برسانے والی آندھی بھیجی، کسی کو چیخنے پڑایا، کسی کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا اور کسی کو غرق کر دیا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ عنکبوت کی آیت (۴۰) کی تفسیر۔

آیت 14 إِنَّ رَبَّكَ لِبِالْمُرْصَادِ: "رَصَدٌ يَرُصِدُ رَصْدًا" (ان کسی کے راستے میں اس پر حملے کے انتظار میں بیٹھنا۔ "المُرْصَادُ" گھات، چھپ کر بیٹھنے کی جگہ جس میں بیٹھ کر دشمن پر حملے کا انتظار کیا جاتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ ان کے لیے مقرر کردہ وقت کے انتظار میں ہے، جب مقرر وقت آتا ہے پکڑ لیتا ہے۔

آیت 15: 20 فَأَمَّا الْإِنْسَانُ إِذَا مَا ابْتَلَاهُ.....: قیامت کے منکرین کے نزدیک چونکہ سبھی کچھ دنیا ہے اس لیے ان کا خیال یہ ہے کہ دنیا میں جو آسودہ حال ہے اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہے اور جو تنگ حال ہے اللہ تعالیٰ اس پر ناراض ہے۔ فرمایا یہ بات ہرگز درست نہیں، فرعون اور دوسرے لوگوں کے واقعات ابھی تم نے سنے، ان کی خوش حالی اور پھر ان پر آنے والے عذاب کو یاد کرو تو سمجھ لو گے کہ دنیا کی آسودہ حالی یا بد حالی اللہ کی طرف سے آزمائش ہے کہ کافر خوش حالی میں سرکشی اور تنگی میں شکوہ و ناشکری کر کے ناکام ہو جاتے ہیں اور مومن نعمت پر شکر کے ساتھ اور مصیبت میں صبر کے ساتھ کامیاب ہو جاتے ہیں۔ تمہارا حال تو یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ خوش حالی کی نعمت کا شکر ادا کرو اور بطور شکر مستحقین پر خرچ کرو، تم اتنا بھی نہیں

كَلَّا إِذَا دُكَّتِ الْأَرْضُ دَكًّا دَكًّا ﴿٢١﴾ وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ﴿٢٢﴾

ہرگز نہیں، جب زمین کوٹ کوٹ کر ریزہ ریزہ کر دی جائے گی ﴿۲۱﴾ اور تیرا رب آئے گا اور فرشتے جو صف در صف ہوں گے ﴿۲۲﴾

کرتے کہ یتیم کے ساتھ عزت کا برتاؤ ہی کر لو، یا مسکین کو کھلاتے نہیں تو کسی دوسرے کو ترغیب ہی دے دو۔ تم تو میراث کا مال بھی جو تمہیں بغیر محنت کے مل گیا ہے، عطا فرمانے والے کا شکر ادا کرتے ہوئے اپنے حصے پر قناعت کے بجائے سارا ہی لپیٹ جاتے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ تم مال عطا فرمانے والے کے بجائے مال سے محبت کرتے ہو اور حد سے بڑھ کر کرتے ہو۔

آیت 21 كَلَّا إِذَا دُكَّتِ الْأَرْضُ دَكًّا دَكًّا: ”كَلَّا“ ہرگز نہیں، یعنی تمہیں ہرگز ایسے نہیں کرنا چاہیے، بلکہ وہ وقت سامنے رکھنا چاہیے جب قیامت کے پہلے نفع کے ساتھ زمین ریزہ ریزہ کر کے ہموار چٹیل میدان بنا دی جائے گی۔

آیت 22 ۱ وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا: اور دوسرے نفع کے ساتھ تمام لوگ زندہ ہو کر اس چٹیل میدان میں کھڑے ہو کر انتظار کر رہے ہوں گے، اس وقت رب تعالیٰ جس طرح اس کی شان کے لائق ہے نزول فرمائے گا۔ ساتھ ہی فرشتے صف در صف آئیں گے، زمین اپنے رب کے نور سے چمک اٹھے گی اور اعمال نامے پیش کیے جائیں گے۔ انبیاء اور گواہوں کو لایا جائے گا اور لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلے کیے جائیں گے اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ دیکھیے سورہ زمر (۶۹) کی تفسیر۔

۲ اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے خود صاف الفاظ میں اس دن اپنے آنے کا ذکر فرمایا ہے۔ بعض لوگوں نے اس کا انکار کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے آنے کے عجیب عجیب مطلب نکالے ہیں۔ چنانچہ کسی نے کہا رب کا حکم آئے گا، کسی نے کہا یہ صرف تمثیلی انداز ہے، مطلب صرف یہ ہے کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کا رعب اس طرح طاری ہوگا جس طرح بادشاہوں کے آنے کے وقت ہوتا ہے۔ بعض بزرگوں نے ترجمے میں تبدیلی کر کے حاشیہ لکھا ہے: ”اصل الفاظ ہیں ”وَجَاءَ رَبُّكَ“ جن کا لفظی ترجمہ ہے ”اور تیرا رب آئے گا“ لیکن ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ان بزرگوں کی غلطی کی اصل وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کو اپنے جیسا سمجھا کہ انسان ایک جگہ سے دوسری جگہ جائے تو اس کا پہلی جگہ سے منتقل ہونا لازم ہوتا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ کے آسمان دنیا پر اترنے یا زمین پر آنے کا یہ مطلب ہے ہی نہیں کہ وہ عرش پر نہیں رہا۔ اب تو اللہ کی مخلوق میں بھی اس کے عجائبات ظاہر ہو رہے ہیں کہ بجلی اپنے مستقر میں ہونے کے باوجود ریسیوٹ کے ذریعے سے بغیر تار کے کہاں تک پہنچ جاتی ہے، خالق کی صفت تو مخلوق سے بہت ہی برتر ہے۔ پھر اس میں صرف یہی خرابی نہیں کہ اللہ کے آنے کی صفت کا انکار کیا، بلکہ اسے مخلوق سے بھی عاجز جانا کہ مخلوق جہاں چاہے آ جاسکتی ہے، مگر خالق میدانِ محشر میں فیصلے کے لیے بھی نہیں آ سکتا۔ مومن کا کام یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے خود فرمادیا کہ وہ قیامت کے دن آئے گا تو وہ اس پر ایمان رکھے اور یہ بات اللہ کے سپرد کر دے کہ وہ کس طرح آئے گا۔ یقیناً وہ اسی طرح آئے گا جس طرح اس

وَجَائِءٌ يَوْمَئِذٍ بِجَهَنَّمَ ۗ يَوْمَئِذٍ يَتَذَكَّرُ الْإِنْسَانُ وَأَنَّى لَهُ الذِّكْرَى ۚ يَقُولُ
 يَلَيْتَنِي قَدَّمْتُ لِحَيَاتِي ۗ فَيَوْمَئِذٍ لَا يُعَذِّبُ عَذَابَهُ أَحَدٌ ۗ وَلَا يُوثِقُ وِثْقَاهُ
 أَحَدٌ ۗ يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمُنْتَهِيَةُ ۗ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَرْضِيَّةً ۗ فَادْخُلِي
 فِي عِبْدِي ۗ وَادْخُلِي جَنَّتِي ۗ

اور اس دن جہنم کو لایا جائے گا، اس دن انسان نصیحت حاصل کرے گا اور (اس وقت) اس کے لیے نصیحت کہاں (۳۳) کہے گا اے کاش! میں نے اپنی زندگی کے لیے آگے بھیجا ہوتا (۳۴) پس اس دن اس کے عذاب جیسا عذاب کوئی نہیں کرے گا (۳۵) اور نہ اس کے باندھنے جیسا کوئی باندھے گا (۳۶) اے اطمینان والی جان! (۳۷) اپنے رب کی طرف لوٹ آ، اس حال میں کہ تو راضی ہے، پسند کی ہوئی ہے (۳۸) پس میرے (خاص) بندوں میں داخل ہو جا (۳۹) اور میری جنت میں داخل ہو جا (۴۰)

کی شان کے لائق ہے اور جس کی تفصیل سمجھنا عاجز حقوق کے بس کی بات ہی نہیں ہے۔

آیت 23 وَجَائِءٌ يَوْمَئِذٍ بِجَهَنَّمَ: عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «يُؤْتَى بِجَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ نَهَا سَبْعُونَ أَلْفَ زَمَامٍ، مَعَ كُلِّ زَمَامٍ سَبْعُونَ أَلْفَ مَلَكٍ يُحْرُقُونَهَا» [مسلم، الحنة وصفة نعيمها، باب حبه، لعادنا الله منها ۲۸۴۶] "اس دن جہنم اس حال میں لائی جائے گی کہ اس کی ستر ہزار لگا میں ہوں گی، ہر لگام کے ساتھ ستر ہزار فرشتے ہوں گے جو اسے کھینچ کر لائیں گے۔"

آیت 23 يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمُنْتَهِيَةُ: "النَّفْسُ الْمُنْتَهِيَةُ" اطمینان والی جان، جسے اللہ اس کے رسول اور ان کے احکام کے حق ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں، بلکہ پوری تسلی ہے۔



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴿۱﴾ بِانْتَابِ الْكُفٰتِ ﴿۲﴾ سُوْرَةُ الْبَلَدِ ۳۵ اَیَاتِ ۴۰

لَا اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ﴿۱﴾ وَ اَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ ﴿۲﴾ وَ وَالِدٍ وَ مَا وَلَدٌ ﴿۳﴾ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ كَبَدٍ ﴿۴﴾ اَيْحَسِبُ اَنْ لَّنْ يَّقْدِرَ عَلَيْهِ اَحَدٌ ﴿۵﴾ يَقُوْلُ اَهْلَكَتُمْ مَّا لَمْ لَبَدًا ﴿۶﴾

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

نہیں، میں اس شہر کی قسم کھاتا ہوں! ﴿۱﴾ اور تو اس شہر میں رہنے والا ہے ﴿۲﴾ اور جننے والے کی قسم! اور اس کی جو اس نے جنا! ﴿۳﴾ بلاشبہ یقیناً ہم نے انسان کو بڑی مشقت میں پیدا کیا ہے ﴿۴﴾ کیا وہ خیال کرتا ہے کہ اس پر کبھی کوئی قادر نہیں ہوگا؟ ﴿۵﴾ کہتا ہے میں نے ڈھیروں مال برباد کر ڈالا ﴿۶﴾

آیت 4-1 لَا اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ.....: قسم سے پہلے ”لَا“ (نہیں) فرما کر ان لوگوں کی بات کی نفی کی گئی ہے جو قسم کے بعد آنے والی بات کا انکار کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے چند قسموں کے بعد فرمایا، یقیناً ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے، اگر وہ سمجھے کہ میں دنیا میں عیش و آرام کے لیے آیا ہوں تو اس کا خیال غلط ہے۔ اس حقیقت کا یقین دلانے کے لیے پہلی قسم شہر مکہ کی کھائی، جو اس دعوے کی دلیل بھی ہے، کیونکہ اس شہر کی آبادی کی ابتدا، اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ کی زندگی، ان کے بعد کی تاریخ، خصوصاً اس شہر میں رہتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی زندگی، آپ کی تیبی اور بے سرو سامانی، نبوت کی ذمہ داری کے بعد اپنی ہی قوم کا جان لینے کے درپے ہو جانا، یہ سب چیزیں اس بات کی شاہد ہیں کہ انسان یقیناً مشقت میں پیدا کیا گیا ہے۔ اس کے بعد جننے والے ماں باپ اور ان کے جنم دیے ہوئے بچے کی قسم ہے۔ ماں باپ کو اولاد کے حصول کی جستجو سے لے کر ان کی پرورش تک جن مصائب سے گزرنا پڑتا ہے اور ان کے جنم دیے ہوئے بچے پر نطفہ ہونے سے لے کر ولادت تک، پھر ولادت سے بچپن، جوانی اور بڑھاپے تک جو کچھ گزرتا ہے، وہ سب کچھ اس حقیقت کو ثابت کرتا ہے۔ اس تمام عرصے میں وہ شروع سے آخر تک سختیاں اور مصیبتیں ہی جھیلتا رہتا ہے، کبھی بیماری میں گرفتار ہے، کبھی رنج میں، کبھی فقر و فاقہ میں، کبھی کسی اور فکر میں۔ اگر کبھی کسی خوشی یا راحت کا کوئی لمحہ آتا بھی ہے تو اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی مصیبت ضرور ہوتی ہے، کوئی اور نہ ہو تو اس کے زوال کی فکر ہی اسے مکرر کرنے کے لیے کافی ہے۔

آیت 5 اَيْحَسِبُ اَنْ لَّنْ يَّقْدِرَ عَلَيْهِ اَحَدٌ: جن سختیوں اور مصیبتوں میں آدمی زندگی بسر کرتا ہے ان کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ اپنی حقیقت کو پہچانتا اور اس میں عاجزی اور انکسار کا جذبہ پیدا ہوتا، لیکن اس کی حالت یہ ہے کہ اکثر فون دکھاتا ہے اور سمجھتا ہے مجھ پر کون قابو پاسکتا ہے؟ (اشرف الموحاشی)

آیت 6 يَقُوْلُ اَهْلَكَتُمْ مَّا لَمْ لَبَدًا: یعنی دین حق کی مخالفت یا جاہلانہ رسم و رواج میں روپیہ لانے کو بڑا کمال سمجھتا

أَيَحْسَبُ أَنْ لَمْ يَرَهُ أَحَدٌ ۚ أَلَمْ تَجْعَلْ لَهُ عَيْنَيْنِ ۙ وَ لِسَانًا وَ شَفَتَيْنِ ۙ وَ هَدَيْنَاهُ
الطَّجْدَيْنِ ۙ فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۙ وَ مَا أَدْرَاكَ مَا الْعَقَبَةُ ۙ فَكُنْ رَقَبَةً ۙ

کیا وہ خیال کرتا ہے کہ اسے کسی نے نہیں دیکھا؟ ۴ کیا ہم نے اس کے لیے دو آنکھیں نہیں بنائیں ۵ اور ایک
زبان اور دو ہونٹ ۶ اور ہم نے اسے دو واضح راستے دکھادیے ۷ پھر (بھی) وہ مشکل گھائی میں نہ گھسا ۸ اور تجھے
کس چیز نے معلوم کروایا کہ وہ مشکل گھائی کیا ہے؟ ۹ (وہ) گردن چھڑاتا ہے ۱۰

ہے اور اسے فخر یہ بیان کرتا ہے۔ (اشرف الموحاشی)

آیت 7 : أَيَحْسَبُ أَنْ لَمْ يَرَهُ أَحَدٌ : کیا وہ خیال کرتا ہے کہ جب وہ فخر و ریا کے لیے مال لٹا رہا تھا تو کسی نے اسے
نہیں دیکھا؟ یقیناً ہم سب کچھ دیکھ رہے ہیں۔

آیت 8 : 10 : أَلَمْ تَجْعَلْ لَهُ عَيْنَيْنِ . . . : "نَحَدٌ" کا لغوی معنی "بلند جگہ" ہے۔ "الطَّجْدَيْنِ" دو بلند جگہوں سے مراد
مال کی چھاتیاں ہیں۔ بچہ پیدا ہوتے ہی اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہدایت کے مطابق ماں کی چھاتیوں کی طرف لپکتا ہے، انھیں منہ
میں ڈال کر دودھ چوستا ہے جس پر اس کی زندگی کا دار و مدار ہے، اگر اللہ تعالیٰ اس کی یہ رہنمائی نہ کرے تو کوئی بچہ زندہ نہیں رہ
سکتا۔ آنکھوں، زبان اور ہونٹوں کے الفاظ کے ساتھ ماں کی چھاتیوں کی مناسبت واضح ہے۔ اکثر مفسرین نے "الطَّجْدَيْنِ"
سے مراد خیر و شر کے دو واضح راستے لیے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس نے اللہ کی بغاوت کرتے ہوئے اور بے تحاشا مال لٹاتے
ہوئے یہ گمان کیسے کر لیا کہ اسے کسی نے نہیں دیکھا اور نہ کوئی اس سے پوچھنے والا ہے؟ حالانکہ جن آنکھوں سے وہ دیکھ
رہا ہے وہ ہم نے بنائی ہیں، زبان اور ہونٹ جن سے ڈینگئیں مار رہا ہے وہ بھی ہم نے پیدا کیے ہیں، پھر ہم نے اسے خیر و
شر کے راستے کا شعور بھی عطا فرمایا ہے۔ تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اسے آنکھیں عطا کرنے والا خود ہی دیکھ نہ رہا ہو، اسے
زبان اور ہونٹ دینے والا اسے پوچھ بھی نہ سکتا ہو اور خیر و شر کا شعور عطا فرمانے والا اس سے اس شعور کے استعمال کے متعلق
باز پرس ہی نہ کرے؟

آیت 11 : فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ : اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو مال کی نعمت عطا فرمائی ہے اس کا تقاضا یہ نہ تھا کہ اسے تاحق
اڑتا، بلکہ یہ تھا کہ وہ بلندیاں جو سخت جدوجہد سے حاصل ہوتی ہیں انھیں سر کرنے کے لیے مشکل گھائی میں بے دریغ گھس
جاتا، مگر اس نے اس مشکل گھائی میں گھسنے کی جرأت ہی نہیں کی۔ مشکل گھائی اس لیے فرمایا کہ نفس کو ان کاموں کا سراں سجا دینا
دشوار ہوتا ہے۔ "الْعَقَبَةُ" کے معنی ہیں گھائی، پہاڑ پر چڑھنے کا مشکل راستہ۔

آیت 12 : 13 : وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْعَقَبَةُ : . . . : مال دار کے لیے بلند یوں پر لے جانے والا مشکل راستہ کیا ہے؟ وہ گردن
چھڑانا ہے، کیونکہ غلامی سے بڑی ذلت کوئی نہیں اور آزادی دلانے سے بڑھ کر کسی کے ساتھ کوئی حسن سلوک نہیں۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: « لَا يَحْزِي وَ لَدَّ وَ الْبِدَا بِالْأَنْ يَجِدَهُ مَمْلُوكًا فَيَسْتَبْرِيَهُ

أَوْ إِطْعَمٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ ﴿۱۳﴾ يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ﴿۱۵﴾ أَوْ مِسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ ﴿۱۶﴾ ثُمَّ
كَانَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالرِّحْمَةِ ﴿۱۷﴾

یا کسی بھوک والے دن میں کھانا کھلانا ہے ﴿۱۳﴾ کسی قرابت والے یتیم کو ﴿۱۵﴾ یا مٹی میں طے ہوئے کسی مسکین کو ﴿۱۶﴾ پھر (یہ کہ) ہو وہ ان لوگوں میں سے جو ایمان لائے اور جنھوں نے ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کی اور ایک دوسرے کو رحم کرنے کی وصیت کی ﴿۱۷﴾

﴿فِيُعْتِقَهُ﴾ (مسلم، العتق، باب فضل عتق الوالد : ۱۵۱۰) ”کوئی اولاد اپنے والد کا بدلہ نہیں دے سکتی سوائے اس کے کہ اسے غلامی کی حالت میں پائے اور خرید کر اسے آزاد کر دے۔“ گردن چھڑانے کی ایک اور فضیلت بھی ہے، ابوہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «مَنْ أَعْتَقَ رَقَبَةً مُؤْمِنَةً أَعْتَقَ اللَّهُ بِكُلِّ عَضْوٍ مِنْهُ عَضْوًا مِنَ النَّارِ حَتَّى يُعْتِقَ فَرَجَهُ بِفَرَجِهِ» (مسلم، العتق، باب فضل العتق : ۱۵۰۹/۲۳) ”جو شخص مومن گردن کو آزاد کرے اللہ تعالیٰ اس کے ہر عضو کے بدلے اس کا ایک عضو آگ سے آزاد کرے گا، حتیٰ کہ اس کی شرم گاہ کے بدلے اس کی شرم گاہ کو آزاد کر دے گا۔“ گردن چھڑانے میں غلام آزاد کرنے کے ساتھ کسی ناحق گرفتار کو رہائی دلوانا اور کسی مقروض کی گردن قرض سے چھڑانا بھی شامل ہے۔

آیت 16-14 أَوْ إِطْعَمٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ : یوں تو قحط اور بھوک کے وقت کسی بھی یتیم کو کھانا کھلانا ثواب کا کام ہے، لیکن جو یتیم رشتہ دار بھی ہو اس کی خبر گیری کرنا مزید اجر کا باعث ہے۔ اسی معنی میں سلمان بن عامر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «الْصَّدَقَةُ عَلَى الْمَسْكِينِ صَدَقَةٌ، وَإِنِّهَا عَلَى ذِي الرَّحِمِ اثْنَانِ، صَدَقَةٌ وَصِلَةٌ» (مسند احمد : ۲۱۴/۴، ح : ۱۷۸۹۱ - ترمذی : ۶۵۸ - ابن ماجہ : ۱۸۴۴، و صحیحہ الألبانی | ”مسکین پر صدقہ کرنا (صرف) صدقہ ہے اور رشتہ دار مسکین پر صدقہ کرنا صدقہ بھی ہے اور صلہ رحمی بھی۔“

آیت 17 ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا : جنت کی بلندیوں پر پہنچنے کے لیے یہی کافی نہیں کہ گردنیں آزاد کرے یا یتیم اور مسکین کو کھانا کھلائے، بلکہ ان کے ساتھ ساتھ ایمان بھی ضروری ہے، اگر ایمان نہیں تو کوئی عمل قبول نہیں۔ (دیکھیے نساء : ۱۳۳ - نحل : ۹۷ - بنی اسرائیل : ۱۹) پھر ایمان اور عمل صالح کے ساتھ ایک دوسرے کو صبر اور رحم کرنے کی وصیت اور تاکید بھی ضروری ہے۔ سورہ عصر میں بھی یہی مضمون بیان ہوا ہے۔

”ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا“ کے الفاظ کا تقاضا یہ ہے کہ مشکل گھائی کی چڑھائی کے لیے جو امور ضروری ہیں ان میں پہلے گردن چھڑانا اور یتیم یا مسکین کو کھانا کھلانا ہے، پھر اس کے بعد ایمان لانا اور حق و مرحمت کی وصیت کرنا ہے، مگر اہل علم فرماتے ہیں کہ ”ثُمَّ“ ہمیشہ ترتیب زمانی کے لیے نہیں ہوتا، بعض اوقات ترتیب ذکر کی کے لیے بھی ہوتا ہے، یعنی موقع کی

أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ ۖ وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا هُمْ أَصْحَابُ الشِّمَالِ ۗ عَلَيْهِمُ
نَارٌ مُّوَصَّدَةٌ ۖ

یہی لوگ دائیں ہاتھ والے ہیں (۱۸) اور جن لوگوں نے ہماری آیات کا انکار کیا وہی بائیں ہاتھ والے ہیں (۱۹) ان پر
(ہر طرف سے) آگ بند کی ہوئی ہوگی (۲۰)

مناسبت سے بعد کی ایک چیز پہلے ذکر کر دی جاتی ہے۔ یہاں مال داروں کے لیے خرچ کرنا چونکہ بہت مشکل کام ہے
اس لیے پہلے اس کا ذکر فرمایا، پھر ایمان اور تو اسی بالحق والرحمہ کا ذکر اس لیے فرمایا کہ ایمان کے بغیر گردن چھڑانا، کھانا
کھلانا یا نیکی کا کوئی بھی کام بے ثبوت ہے۔

آیت 18، 19: أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ : دائیں ہاتھ والے سے مراد یہ ہے کہ انھیں ان کا اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں
ملے گا، اسی طرح بائیں ہاتھ والوں کو ان کا اعمال نامہ بائیں ہاتھ میں ملے گا۔ ”أَصْحَابُ الْمَيْمَنَةِ“ کا دوسرا معنی ہے برکت
والے، خوش نصیب اور ”أَصْحَابُ الشِّمَالِ“ کا معنی نحوست والے، بدنصیب بھی ہے۔





وَالشَّمْسِ وَضُحَاهَا ۝۱ وَالْقَمَرِ إِذَا تَلَّهَا ۝۲ وَالتَّهَارِ إِذَا جَلَّهَا ۝۳ وَالنَّيْلِ إِذَا يَغْشَاهَا ۝۴
وَالسَّمَاءِ وَمَا بَنَاهَا ۝۵

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

قسم ہے سورج کی! اور اس کی دھوپ کی! ① اور چاند کی جب وہ اس کے پیچھے آئے! ② اور دن کی جب وہ اس (سورج) کو ظاہر کر دے! ③ اور رات کی جب وہ اس (سورج) کو ڈھانپ لے! ④ اور آسمان کی اور اس ذات کی جس نے اسے بنایا! ⑤

آیت 1 وَالشَّمْسِ وَضُحَاهَا: پہلی آیت سے لے کر آٹھویں آیت تک تمام قسموں کا جواب قسم یہ ہے کہ ”جس شخص نے اپنے نفس کو پاک کر لیا وہ کامیاب ہوا اور جس نے اسے مٹی میں دبا دیا وہ ناکام ہوا۔“ ان قسموں اور جواب قسم کی مناسبت یہ ہے (واللہ اعلم) کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ نے انسان کے فائدے کے لیے پیدا فرمایا، جیسا کہ فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا﴾ [البقرة: ۲۹] ”وہ ذات کہ زمین میں جو کچھ ہے اس نے سب تمہارے لیے پیدا فرمایا۔“ حتیٰ کہ آسمان کی چھت، زمین کا فرش، سورج اور اس کی دھوپ، اس کے بعد چاند اور اس کی چاندنی اور دن کو آفتاب کا اجالا، پھر رات کا اس کو ڈھانپ لینا اسی کے فائدے کے لیے ہے، فرمایا: ﴿وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَائِبَيْنِ﴾ وَسَخَّرَ لَكُمْ النَّيْلَ وَالتَّهَارَ﴾ [ابراہیم: ۳۳] ”اور اس نے تمہارے لیے سورج اور چاند کو مسخر کر دیا جو مسلسل چلنے والے ہیں اور تمہارے لیے رات اور دن کو مسخر کر دیا۔“ پھر اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی عبادت کے لیے پیدا فرمایا اور نفس انسانی کو بہترین شکل و صورت میں بنا کر اسے نیکی اور بدی کی پہچان بھی کرادی۔ ہر آدمی ان سب چیزوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا اور شعور سے محسوس کرتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جو شخص ان عظیم الشان مخلوقات کو اور ان کے خالق کے احسانات کے تقاضوں کو مد نظر رکھ کر اپنے آپ کو کفر و شرک اور ظلم و زیادتی سے پاک کر لیتا ہے یقیناً وہ اپنا مقصد تخلیق پورا کر دینے کی وجہ سے کامیاب ہے اور جو شخص ان سب چیزوں سے آنکھیں بند کر کے اپنے نفس کو شہوت، غضب اور شرک و کفر کے کچھڑ میں دبا دیتا ہے وہ ناکام ہے۔

آیت 2 وَالْقَمَرِ إِذَا تَلَّهَا: ”تَلَّا يَتَلَوُ“ (ن) پیچھے آنا۔ اور چاند کی قسم جب وہ سورج کے پیچھے آتا ہے! یعنی سورج غروب ہونے کے بعد جب چاند کی روشنی پھیلتی ہے۔

آیت 3 وَالتَّهَارِ إِذَا جَلَّهَا: ”جَلَّى يُجَلِّي تَجَلِيَةً“ (تفعیل) ظاہر کرنا، روشن کرنا۔ اور دن کی قسم جب وہ اس سورج کو ظاہر کرتا ہے! یعنی جب اس میں سورج پوری روشنی اور گرمی کے ساتھ چمکتا ہے۔

آیت 4 وَالنَّيْلِ إِذَا يَغْشَاهَا: جب رات سورج کی روشنی کو مکمل طور پر چھپا کر خوب اندھیری ہو جاتی ہے۔

آیت 2 وَالسَّمَاءِ وَمَا بَنَاهَا: ”بَنَى يَبْنِي بِنَاءً“ (ض) بنانا۔ واضح رہے کہ عام طور پر ”مَنْ“ علم والوں، مثلاً اللہ تعالیٰ،

وَالْأَرْضِ وَمَا طَحَّهَا ۖ وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّيْنَاهَا ۖ فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا ۗ قَدْ أَفْلَحَ مَنْ رَزَقْنَاهَا ۖ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّهَا ۖ كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِطَغْوَاهَا ۗ

اور زمین کی اور اس ذات کی جس نے اسے بچھایا! ۶ اور نفس کی اور اس ذات کی جس نے اسے ٹھیک بنایا! ۷ پھر اس کی نافرمانی اور اس کی پرہیزگاری (کی پہچان) اس کے دل میں ڈال دی ۸ یقیناً وہ کامیاب ہو گیا جس نے اسے پاک کر لیا ۹ اور یقیناً وہ نامراد ہو گیا جس نے اسے مٹی میں دبا دیا ۱۰ (قوم) ثمود نے اپنی سرکشی کی وجہ سے جھٹلایا ۱۱

فرشتوں اور انسانوں کے لیے آتا ہے، جبکہ ”مَا“ ان کے علاوہ کے لیے آتا ہے، مگر بعض اوقات کسی خاص مقصد کی وجہ سے اس کا الٹ بھی ہو جاتا ہے اور ”مَا“ علم والوں کے لیے بھی آجاتا ہے، جیسا کہ ”مَا“ یہاں اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال ہوا ہے۔ یعنی اور قسم ہے آسمان کی اور اس ذات کی جس نے اسے بنایا! یہاں ”مَنْ“ کے بجائے ”مَا“ اس لیے لایا گیا ہے کہ وہ یہاں ”الَّذِي“ کے معنی میں ہے اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ قرآن مجید میں ”مَا“ کا لفظ علم والوں کے لیے متعدد مقامات پر آیا ہے، مثلاً: ﴿وَلَا أَنْتُمْ عِبُدُونَ مَا أَعْبُدُ﴾ [الکافرون: ۳] ”اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔“ اور فرمایا: ﴿فَأَنْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ﴾ [النساء: ۳] ”سوعورتوں میں سے جو تمہیں پسند ہوں ان سے نکاح کرلو۔“

آیت 6 وَالْأَرْضِ وَمَا طَحَّهَا: ”طَحًا يَطْغُو طَحْوًا“ (ن) اور ”دَحًا يَدْحُو دَحْوًا“ (ن) کا ایک ہی معنی ہے، بچھانا۔ اور زمین کی قسم اور اس ذات کی جس نے اسے بچھایا!

آیت 6 فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا: ”لَهُمْ يُلْهَمُ لَهُمَا“ (س) ”الْشَّيْءُ“ کسی چیز کو ایک ہی بار نکل جانا۔ ”أَلْهَمَ اللَّهُ يُلْهَمُ لَهُمَا“ (افعال) اللہ تعالیٰ کا دل میں کوئی بات ڈال دینا، سمجھا دینا، اس کی توفیق دے دینا۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے دل میں اس کی نیکی اور بدی کی پہچان رکھ دی ہے۔ یہ پہچان پہلے عقل و فطرت میں رکھی گئی، پھر انبیاء پیغمبر کے ذریعے سے دوبارہ یاد دہانی کروائی گئی، تاکہ لوگ نافرمانی سے بچیں اور پرہیزگاری اختیار کریں۔ دیکھیے سورہ دہر (۳) اور سورہ بلد (۱۰)۔

آیت 10 وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّهَا: ”دَسَّ يَدْسُ دَسًّا“ (ن) سے مبالغے کے لیے باب تفعیل ہے، معنی ہے مٹی میں دبا دینا، یہ اصل میں ”دَسَسَ“ تھا، دوسرے سین کو الف کر دیا، جیسے ”تَقَضَّضَ الْبَارِي“ (باز شکار پر ٹوٹ پڑا) کو ”تَقَضَّى الْبَارِي“ کہہ دیتے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿أَمْرٌ يُدْسُهُ فِي الثَّرَابِ﴾ [النحل: ۵۹] ”یا اسے مٹی میں دبا دے۔“

آیت 11 كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِطَغْوَاهَا: ”طَغَوَى“ (سرکشی) ”طَغَا يَطْغُو“ (ن) کا مصدر ہے، جیسا کہ ”دَعَا يَدْعُو“ کا مصدر ”دَعَوَى“ ہے۔ بطور مثال تاریخ میں سے ایک قوم کا ذکر فرمایا، جس نے سرکشی کی وجہ سے اپنے آپ کو مٹی میں دبا دیا۔

إِذِ انْتَبَعَتْ أَشْقَاهَا ﴿١٤﴾ فَقَالَ لَهُمْ رَسُولُ اللَّهِ نَاقَةَ اللَّهِ وَسُقْيَاهَا ﴿١٥﴾ فَكَذَّبُوهُ
فَعَقَرُوهَا ۖ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذُنُوبِهِمْ فَحَسَوهَا ﴿١٦﴾ وَلَا يَخَافُ عُقْبَاهَا ﴿١٧﴾

جب اس کا سب سے بڑا بد بخت اٹھا ﴿۱۴﴾ تو ان سے اللہ کے رسول نے کہا اللہ کی اونٹنی اور اس کے پینے کی باری (کا خیال رکھو) ﴿۱۵﴾ تو انھوں نے اسے جھٹلادیا، پس اس (اونٹنی) کی کوچیوں کاٹ دیں، تو ان کے رب نے انھیں ان کے گناہ کی وجہ سے پھین کر ہلاک کر دیا، پھر اس (بستی) کو برابر کر دیا ﴿۱۶﴾ اور وہ اس (سزا) کے انجام سے نہیں ڈرتا ﴿۱۷﴾

شمس صالح علیہ السلام کی قوم تھی، ان کے معجزہ طلب کرنے پر انھیں ایک اونٹنی دی گئی اور انھیں کہا گیا کہ ایک دن اس کے پینے کی باری ہوگی اور ایک دن تم سب کے پانی لینے کی۔ دیکھیے سورہ شعراء (۱۵۵)۔

آیت 12: إِذِ انْتَبَعَتْ أَشْقَاهَا: جن لوگوں کے موسیٰ زیادہ تھے ان پر یہ پابندی بہت شاق گزری اور انھوں نے اس اونٹنی کو کاٹ ڈالنے پر اتفاق کر لیا، مگر اس کام کا بیڑا ان کے سب سے بڑے بد بخت نے اٹھایا۔ تاریخ اور شعر عرب میں اس کا نام ثدار بن سالف بیان کیا گیا ہے۔

آیت 12: فَقَالَ لَهُمْ رَسُولُ اللَّهِ نَاقَةَ اللَّهِ وَسُقْيَاهَا: ”ناقۃ اللہ“ (اللہ کی اونٹنی) فعل محذوف ”انقوا“ کی وجہ سے منصوب ہے۔ یہ نسبت اس اونٹنی کے شرف اور خصوصیت کی وجہ سے ہے، (جیسے ”بیٹ اللہ“ میں ہے) ورنہ سب اونٹنیاں اللہ ہی کی ہیں۔

آیت 14: ۱ فَكَذَّبُوهُ فَعَقَرُوهَا: اگرچہ ایک آدمی نے کوچیوں کاٹ کر اسے ہلاک کیا تھا، لیکن چونکہ ساری قوم اس کے ساتھ تھی بلکہ انھی کے کہنے پر اس نے یہ کام کیا تھا، اس لیے ان سب کو مجرم قرار دیا گیا اور فرمایا کہ ”انھوں نے اس کی کوچیوں کاٹ دیں۔“

۲ قَدَمَدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذُنُوبِهِمْ فَحَسَوهَا: قاموس میں ہے: ”ذَمُّ الْمَقُومِ كَذَمَمْتَهُمْ وَ ذَمَمْتُمْ عَلَيْهِمْ، طَحَنْتَهُمْ فَأَهْنَكْتَهُمْ.“ ”ذَمَمْتُمْ عَلَيْهِمْ“ اس نے انھیں پھین کر ہلاک کر دیا۔ اونٹنی کو مار ڈالنے کے تین دن بعد ان پر ایک زبردست نہیں چیخ کے ساتھ عذاب آیا اور وہ اس طرح نابود ہو گئے جیسے کبھی وہاں تھے ہی نہیں، صرف صالح علیہ السلام اور اہل ایمان بچے۔ سورہ ہود (۶۲، ۶۸، ۶۹)، اعراف (۷۳، ۷۴) اور سورہ شعراء (۱۳۱، ۱۵۹) میں یہ واقعہ تفصیل سے گزر چکا ہے۔

آیت 15: وَلَا يَخَافُ عُقْبَاهَا: ”ہا“ ضمیر کا مرجع وہ ”ذَمَمْتُمْ“ ہے جو ”قَدَمَدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ“ کے ضمن میں موجود ہے۔ یعنی دنیا کے بادشاہ کسی کو قتل کرتے ہیں تو ڈرتے ہیں کہ نامعلوم اس کا انجام کیا ہوگا؟ مقتول کا کوئی وارث بدلا لینے کے لیے نہ اٹھ کھڑا ہو یا ملک میں بغاوت نہ ہو جائے، لیکن اللہ تعالیٰ کو ایسا کوئی خطرہ نہیں۔



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَأَيْلٍ إِذَا يَغْشَىٰ ① وَالنَّهَارِ إِذَا تَجَلَّىٰ ② وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ ③ إِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتَّىٰ ④ فَأَمَّا مَنْ أَعْطَىٰ وَاتَّقَىٰ ⑤ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَىٰ ⑥ فَسَنِيَرُهُ لِلْيُسْرَىٰ ⑦ وَأَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنَىٰ ⑧ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنَىٰ ⑨ فَسَنِيَرُهُ لِلْعُسْرَىٰ ⑩

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

قسم ہے رات کی جب وہ چھا جائے! ① اور دن کی جب وہ روشن ہوا! ② اور اس کی جو اس نے پیدا کیا نر اور مادہ! ③ بے شک تمہاری کوشش یقیناً مختلف ہے ④ پس لیکن وہ جس نے دیا اور (نافرمانی سے) بچا! ⑤ اور اس نے سب سے اچھی بات کوچ مانا! ⑥ تو یقیناً ہم اسے آسان راستے کے لیے سہولت دیں گے ④ اور لیکن وہ جس نے بخل کیا اور بے پروا ہوا! ⑧ اور اس نے سب سے اچھی بات کو جھٹلا دیا! ⑨ تو یقیناً ہم اسے مشکل راستے کے لیے سہولت دیں گے! ⑩

آیت 3:1 وَأَيْلٍ إِذَا يَغْشَىٰ: یعنی ان چیزوں کی قسم جو اس نے پیدا کیں، نر ہیں یا مادہ! "الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ" "مَا خَلَقَ" سے بدل ہے۔ ایک ترجمہ یہ بھی ہے کہ اس ذات کی قسم جس نے نر اور مادہ کو پیدا کیا! تیسرا ترجمہ ہے، نر اور مادہ کو پیدا کرنے کی قسم!

آیت 4 إِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتَّىٰ: یعنی جس طرح رات دن اور نر و مادہ مخلوقات میں باہمی اختلاف اور تضاد ہے اسی طرح تمہاری کوششوں اور تمہارے اعمال میں بھی اختلاف ہے، پھر ان کا نتیجہ اور جزا سزا بھی الگ الگ ہے۔

آیت 5:7 فَأَمَّا مَنْ أَعْطَىٰ.....: "الْحُسْنَىٰ" "أَحْسَنُ" کی مؤنث ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا فَمَنْ دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ إِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِينَ﴾ [خاتمة السجدة: 33] "اور اس شخص سے زیادہ اچھی بات کس کی ہے جو اللہ کی طرف دعوت دے اور نیک عمل کرے اور کہے کہ بے شک میں فرماں برداروں سے ہوں؟" جس شخص میں بھی بھلائی کے یہ تین جامع اوصاف ہیں کہ وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے فراخ دل ہے، اللہ سے ڈرتا ہے اور اس کی نافرمانی اور ہر حرام کام سے بچتا ہے اور سب سے اچھی بات یعنی اللہ کے ایک ہونے کو اور اس کی نازل کی ہوئی ہر بات کوچ مان کر اس کا تابع ہو جاتا ہے، تو اس کے اس میلان اور رجحان کے مطابق ہم بھی اس کے لیے نیکی اور جنت کے راستے پر چلنا آسان کر دیں گے، یعنی اس کے لیے نیکی کرنا آسان ہو جائے گا اور گناہ کرنا مشکل۔

آیت 8:10 وَأَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنَىٰ.....: یعنی جس میں شر کے یہ تین جامع اوصاف ہیں کہ وہ بخل کرتا ہے، اخروی انجام اور حلال و حرام کی پر دہی نہیں کرتا اور سب سے اچھی بات یعنی اللہ کے ایک ہونے اور اس کی نازل کردہ باتوں کو جھٹلاتا ہے، تو ہم بھی اسے اس کی خواہش کے مطابق اس راستے پر چلنے دیتے ہیں جو مشکلات و مصائب کا راستہ ہے اور جہنم کی طرف

وَمَا يُغْنِي عَنْهُ مَالُهُ إِذَا تَرَدَّى ۝ إِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدَىٰ ۝ وَإِنَّ لَنَا لَلْآخِرَةَ وَالْأُولَىٰ ۝
فَأَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظَّى ۝ لَا يَصْلَاهَا إِلَّا الْأَشْقَى ۝ الَّذِي كَذَّبَ وَتَوَلَّى ۝

اور اس کا مال اس کے کسی کام نہ آئے گا جب وہ (گڑھے میں) گرے گا ۱۱ بلاشبہ ہمارے ہی ذمے یقیناً راستہ بتانا ہے ۱۲ اور بلاشبہ ہمارے ہی اختیار میں یقیناً آخرت اور دنیا ہے ۱۳ پس میں نے تمہیں ایک ایسی آگ سے ڈرا دیا ہے جو شعلے مارتی ہے ۱۴ جس میں اس بڑے بد بخت کے سوا کوئی داخل نہیں ہوگا ۱۵ جس نے جھٹلایا اور منہ موڑا ۱۶

لے جانے والا ہے، یعنی اس کے لیے نیکی کرنا مشکل اور گناہ کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

آیت 11 وَمَا يُغْنِي عَنْهُ مَالُهُ إِذَا تَرَدَّى جب جہنم میں گرے گا تو وہ مال جو اس نے بخل کر کے جمع کیا تھا اس کے کسی کام نہ آئے گا۔

آیت 12 إِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدَىٰ: دوسری جگہ فرمایا: ﴿قُلْ إِنَّ هُدَى اللَّهِ هُوَ الْهُدَىٰ﴾ [البقرة: ۱۲۰] ”کہہ دے اللہ کی ہدایت ہی اصل ہدایت ہے۔“ یعنی جو راستے لوگوں نے اپنی مرضی سے یا آبا و اجداد کو دیکھ کر یا غیر قوموں کی نقل کرتے ہوئے اختیار کیے ہیں وہ چونکہ اللہ کی طرف سے نہیں ہیں، اس لیے کتنے بھی خوش نما ہوں ہدایت نہیں، ضلالت ہیں۔ اللہ کی ہدایت وہ ہے جو خود اس کی طرف سے آئی ہو اور وہ صرف قرآن مجید ہے یا حدیث رسول ﷺ۔

آیت 12 وَإِنَّ لَنَا لَلْآخِرَةَ وَالْأُولَىٰ: راستہ بتانا صرف ہمارے ذمے کیوں ہے؟ اس لیے کہ دنیا اور آخرت دونوں کے بنانے والے اور ان کے مالک ہمیں ہیں، تو ان کا راستہ بھی ہم ہی جانتے ہیں۔

آیت 14 فَأَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظَّى: ”تَلَظَّى“ اصل میں ”تَلَظَّى“ ہے جو ”لَظَى“ سے باب تفعّل کا مضارع ہے، شعلے مارتی ہے۔ میرا کام راستہ بتانا ہے، وہ میں نے بتا دیا اور نہ ماننے والوں کو زبردست شعلے مارتی ہوئی آگ سے ڈرا دیا، اب ماننا یا نہ ماننا تمہارا کام ہے، سب کو زبردستی مسلمان بنا دینا میری حکمت کے خلاف ہے۔

آیت 15. 16 لَا يَصْلَاهَا إِلَّا الْأَشْقَى.....: اسی آیت سے مر جیہ (ایک باطل فرقہ جس کے نزدیک ایمان صرف دل کی تصدیق کا نام ہے) نے استدلال کیا ہے کہ جہنم میں صرف کافر ہی جائیں گے، کوئی مسلمان خواہ کتنا ہی گناہ گار ہو وہ جہنم میں نہیں جائے گا۔ لیکن یہ عقیدہ ان صریح آیات و احادیث کے خلاف ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے مسلمان بھی جن کو اللہ تعالیٰ کچھ سزا دینا چاہے گا، کچھ عرصہ کے لیے جہنم میں جائیں گے، پھر وہ نبی ﷺ، ملائکہ اور دیگر صالحین کی شفاعت یا محض اللہ کی رحمت سے نکال لیے جائیں گے۔ اس کی دلیل یہ آیت ہے: ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ﴾ [النساء: ۱۱۶] ”بے شک اللہ یہ بات معاف نہیں کرے گا کہ اس کے ساتھ شریک ٹھہرایا جائے اور اس کے علاوہ جسے چاہے گا معاف کر دے گا۔“ اب اگر وہ شخص جو شرک نہیں کرتا بلکہ مسلمان ہے، وہ جہنم میں جائے گا ہی نہیں تو ”يَغْفِرُ“

وَسَيَجْزِيهَا الْأَنْفَى ۙ (۱۷) الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّى ۙ (۱۸) وَمَا لِأَحَدٍ عِنْدَهُ مِنْ نِعْمَةٍ تُجْزَى ۙ (۱۹) إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَى ۙ (۲۰) وَلَسَوْفَ يَرْضَى ۙ (۲۱)

اور عنقریب اس سے وہ بڑا پرہیزگار دور رکھا جائے گا (۱۷) جو اپنا مال (اس لیے) دیتا ہے کہ پاک ہو جائے (۱۸) حالانکہ اس کے ہاں کسی کا کوئی احسان نہیں ہے کہ اس کا بدلا دیا جائے (۱۹) مگر (وہ تو صرف) اپنے اس رب کا چہرہ طلب کرنے کے لیے (دیتا ہے) جو سب سے بلند ہے (۲۰) اور یقیناً عنقریب وہ راضی ہو جائے گا (۲۱)

مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ“ (اس کے علاوہ جسے چاہے گا معاف کر دے گا) بالکل بے معنی کلام بن جائے گا، پھر تو یوں کہنا چاہیے کہ اس کے علاوہ وہ سب کچھ معاف کر دے گا، ”لِمَنْ يَشَاءُ“ (جسے چاہے گا) کی شرط کی ضرورت ہی نہیں۔ صحیح بخاری میں مذکور احادیث شفاعت سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔

اس آیت میں جو کہا گیا ہے کہ جہنم میں صرف بڑے بد بخت داخل ہوں گے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ کچے کافر اور نہایت بد بخت ہیں جہنم دراصل انہی کے لیے بنائی گئی ہے، جس میں وہ لازمی اور حتمی طور پر اور ہمیشہ کے لیے داخل ہوں گے۔ اگر کچھ نافرمان قسم کے مسلمان جہنم میں جائیں گے تو وہ لازمی اور حتمی طور پر اور ہمیشہ کے لیے نہیں جائیں گے، بلکہ بطور سزا داخل ہوں گے اور ان کا یہ دخول عارضی ہوگا۔

آیت 17، 18: وَسَيَجْزِيهَا الْأَنْفَى: جہنم سے وہی شخص دور رہے گا جو اپنا مال اس لیے دیتا ہے کہ وہ خود بھی پاک ہو جائے اور اس کا مال بھی۔

آیت 19، 20: وَمَا لِأَحَدٍ عِنْدَهُ مِنْ نِعْمَةٍ تُجْزَى: وہ مال اس لیے خرچ نہیں کرتا کہ کسی کے احسان کا بدلا اتارنا چاہتا ہے، بلکہ خرچ کرنے سے اس کی نیت یہ ہے کہ رب تعالیٰ کی رضا اور جنت میں اس کا دیدار نصیب ہو جائے۔

آیت 21: وَلَسَوْفَ يَرْضَى: یعنی جنت کی بے بہا نعمتیں اور بلند مراتب پا کر ضرور خوش ہوگا۔ اکثر مفسرین نے صحیح احادیث و آثار کی رو سے کہا ہے کہ اس سورت میں خرچ کرنے والے سے مراد ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں کہ وہ کمزور مسلمان غلاموں کو کفار کے مظالم سے بچانے کے لیے خرید کر آزاد کر دیتے اور نیکی کا ہر کام خوشی خوشی محض رضائے الہی کے لیے کرتے تھے۔ یقیناً ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ان آیات کا اولین مصداق ہیں مگر الفاظ عام ہیں، اس لیے ان میں ہر وہ مسلمان داخل ہے جو ان صفات کا حامل ہے۔



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سُوْرَةُ الضَّحٰی
۹۳ مَبْرُورٌ

وَالضُّحٰی ۱ وَالْاٰیِلَ اِذَا سَجٰی ۲ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰی ۳ وَلَلْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لِّكَ مِنَ
الْاٰوَلٰی ۴ وَ لَسَوْفَ یُعْطِیْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰی ۵

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

قسم ہے دھوپ چڑھنے کے وقت کی! ① اور رات کی جب وہ چھا جائے! ② نہ تیرے رب نے تجھے چھوڑا اور نہ وہ ناراض ہوا ③ اور یقیناً پیچھے آنے والی حالت تیرے لیے پہلی سے بہتر ہے ④ اور یقیناً عنقریب تیرا رب تجھے عطا کرے گا، پس تو راضی ہو جائے گا ⑤

آیت 1-3 ① وَالضُّحٰی ۱ وَالْاٰیِلَ اِذَا سَجٰی: "الضحیٰ" سورج طلوع ہونے کے بعد جب پوری طرح روشن ہو جاتا ہے۔ "سجی" "سَجَا یَسْجُو سَجْوًا" (ان پر سکون ہونا۔ "وَدَّعَكَ" "وَدَّعَ بَدَّعٌ" (چھوڑنا) سے باب تفعیل ہے جو چھوڑنے میں مہارت کا معنی رکھتا ہے۔ "قَلٰی" "قَلٰی یَقْلٰی قَلٰی وَ قَلَاةٌ" (ض میں) "الرَّجُلُ اَبْغَضُنَا" کسی سے بغض رکھنا۔ ② جُنْدُب بن سفیانؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ بیمار ہو گئے تو دو یا تین راتیں (تہجد کے لیے) نہ اٹھے۔ ایک عورت آئی اور کہنے لگی: "اے محمد! مجھے امید ہے کہ تمہارا شیطان تمہیں چھوڑ گیا ہے، دو تین راتوں سے میں نے اسے تمہارے پاس آتے نہیں دیکھا۔" اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی۔ [بخاری، التفسیر، باب قولہ: ﴿مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰی﴾: ۹۹۵۰] جُنْدُبؓ انصاری سے مروی دوسری روایت میں ہے کہ ایک دفعہ جبریلؑ نے آنے میں دیر کر دی، یہاں تک کہ مشرکین کہنے لگے کہ محمد ﷺ کو اس کے رب نے چھوڑ دیا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی۔ [طبری: ۴۸۷/۲۴: ح: ۳۷۸۵۷] قسم اور جو اب قسم میں مناسبت یہ ہے کہ دو پہر کو سورج خوب روشن ہوتا ہے، اس کے بعد سیاہ رات چھا جاتی ہے تو کوئی بھی نہیں سمجھتا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے ناراض ہونے کی وجہ سے ہے، تو وحی کی روشنی کے بعد کچھ دیر اگر وقفہ ہو گیا تو کیوں سمجھا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں چھوڑ دیا ہے؟ ایسا ہرگز نہیں ہے! بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح دن بھر آفتاب کی روشنی و گرمی کے بعد انسانی جسم کو آرام اور سکون کے لیے رات کی ضرورت ہے، اسی طرح وحی کے بارگراں کے بعد طبیعت کو سکون اور مزید وحی کے تحمل کے لیے وقفہ کی ضرورت ہے۔

آیت 4 ④ وَ لَلْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لِّكَ مِنَ الْاٰوَلٰی: اس میں آپ کو تسلی دلائی کہ ہر آنے والا لحو آپ کے لیے پہلے لحو سے بہتر آ رہا ہے۔ اسی طرح آئندہ بھی بعد کی ہر حالت آپ کے لیے پہلی سے بہتر ہوگی۔ نبوت کے بعد کی زندگی آپ کے لیے پہلے سے بہتر اور آخرت کی زندگی دنیا سے بہتر ہوگی۔

آیت 5 ⑤ وَ لَسَوْفَ یُعْطِیْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰی: یہ مزید تسلی ہے، اس میں اللہ کی فتح و نصرت، لوگوں کا نوح در نوح اسلام میں

اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَآوَىٰ ۝ وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ ۝ وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَىٰ ۝

کیا اس نے تجھے یتیم نہیں پایا، پس جگہ دی ① اور اس نے تجھے راستے سے ناواقف پایا تو راستہ دکھا دیا ② اور اس نے تجھے تنگ دست پایا تو غنی کر دیا ③

داخل ہونا، زمین کے مشارق و مغارب کا آپ کی امت کے قبضے میں آنا، قیامت کو آپ کے ہاتھ میں ”بِوَاءِ الْحَمْدِ“ ہونا، مقام محمود مانا، شفاعت کبریٰ، امت کی مغفرت، غرض وہ سب کچھ شامل ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو دیا اور دے گا۔

آیت 6 اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَآوَىٰ: ”آوی بُوَوِي اِيْوَاءُ“ (افعال) جگہ دینا۔ اس میں آپ کے ابتدائی حالات کا بیان ہے، آپ ماں کے پیٹ میں تھے کہ والد فوت ہو گئے۔ والدہ نے آپ کو پالا۔ چھ برس کے تھے کہ والدہ فوت ہو گئیں، پھر دادا نے پرورش کی۔ آٹھ برس کے تھے کہ وہ بھی فوت ہو گئے، پھر چچا ابوطالب نے بیٹوں سے بڑھ کر پالا۔ یہ سب اسباب اللہ تعالیٰ ہی نے اپنے فضل سے مہیا کیے۔

آیت 7 وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ: نبوت سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی برائی سے آپ کی حفاظت فرمائی، حتیٰ کہ فرمایا: ﴿فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِۦٓ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ [یونس: ۱۶] ”(انہیں کہہ دو کہ) یقیناً میں نے نبوت سے پہلے ایک عمر تم میں گزاری ہے، کیا تم عقل نہیں کرتے؟“ مگر اللہ تعالیٰ کی عبادت کا صحیح طریقہ کیا ہے، یہ آپ کو معلوم نہ تھا، یہ اس وقت معلوم ہوا جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوت عطا فرمائی، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ اَمْرًاۗ مَا كُنْتَ تَدْرِيۡ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمٰنُ﴾ [النسوری: ۲۰] ”اور اسی طرح ہم نے تیری طرف اپنے حکم سے ایک روح کی وحی کی، تو نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے اور نہ یہ کہ ایمان کیا ہے۔“ اس آیت میں اس احسان کا ذکر ہے کہ قرآن راستے سے ناواقف تھے، تو وہ تمہیں ہم نے بتایا۔ اس کے علاوہ دیکھیے سورہ ہود (۴۹)، عجبوت (۴۸) اور سورہ قصص (۸۶)۔

آیت 8 وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَىٰ: ”عَالٌ يَّعْبُلُ عَيْلًا وَ عَيْلَةٌ“ (ض) فقیر ہونا۔ ”عَائِلًا“ فقیر۔ سورہ توبہ میں فرمایا: ﴿وَ اِنْ حِفْظُهُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمْ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهِۦ﴾ [التوبہ: ۲۸] ”اور اگر تم کسی قسم کے فقر سے ڈرتے ہو تو اللہ جلد ہی تمہیں اپنے فضل سے غنی کر دے گا۔“ رسول اللہ ﷺ کے والد آپ کی پیدائش سے پہلے ہی فوت ہو گئے، انہوں نے اپنی میراث میں ایک لونڈی ام ایمن کے علاوہ کوئی زیادہ مال نہیں چھوڑا۔ بچپن میں اپنے فقر کا حال رسول اللہ ﷺ نے خود بیان فرمایا، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ﴿مَا بَعَثَ اللّٰهُ نَبِيًّا اِلَّا رَعَى الْغَنَمَ، فَقَالَ اَصْحَابُهُ وَاَنْتَ؟ فَقَالَ نَعَمْ، كُنْتُ اُرْعَاهَا عَلٰى فَرَاتٍ يَطُّ لِاهْلِ مَكَّةَ﴾ [بخاری، الإجازة، باب رعي الغنم عنی فرربط: ۱۲۶۶] ”اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی نہیں بھیجا جس نے بھیڑ بکریاں نہ چرائی ہوں۔“ آپ کے صحابہ نے کہا: ”اور آپ نے بھی (چرائی ہیں)؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”میں انہیں مکہ والوں کے لیے چند قیراطوں پر چرایا کرتا تھا۔“ ظاہر ہے اگر آپ ﷺ کے پاس اپنی یا ابوطالب کی بھیڑ بکریاں ہی ہوتیں تو آپ کو اہل مکہ کی بھیڑ بکریاں اجرت پر چرانے کی کیا ضرورت تھی۔ اتنے

فَأَمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝ وَأَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۝ وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ

فَحَدِّثْ ۝

پس لیکن یتیم، پس (اس پر) سختی نہ کر ۝ اور لیکن سائل، پس (اسے) مت جھڑک ۝ اور لیکن اپنے رب کی نعمت، پس (اسے) بیان کر ۝

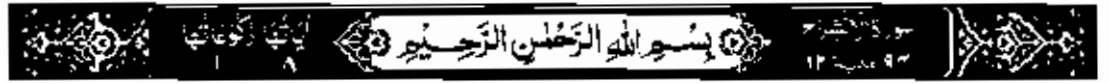
افلاس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس طرح غنی کر دیا کہ مکہ کی سب سے مال دار خاتون خدیجہ بیچھانے پہلے آپ کو تجارت میں شریک کیا، پھر آپ ﷺ سے نکاح کر لیا اور اپنا تمام مال آپ کے حوالے کر دیا۔ پھر وہ وقت بھی آیا کہ آپ کے پاس بنو نضیر، بنو قریظہ، خیبر، بحرین اور یمن وغیرہ کی غنیمتوں اور خراج کے ڈھیر لگ گئے۔ یہ مالی غنا تھا، اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسا قلبی غنا بھی عطا فرمایا تھا کہ آپ اس طرح بے دریغ خرچ کرتے تھے جیسے آپ کو فقر کا کوئی خوف ہی نہ ہو۔

آیت 9 : فَأَمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْ : آپ نے یتیمی اور اس کی تلخی اور بے چارگی دیکھی ہے اور یہ بھی دیکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح آپ کو جگہ دی اور آپ پر بے پناہ مہربانیاں فرمائیں، اب دونوں چیزوں کا تقاضا ہے کہ یتیم پر سختی نہ کرو بلکہ زیادہ سے زیادہ حسن سلوک کرو۔

آیت 10 : وَأَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ : اسی طرح آپ نے تنگ دستی دیکھی ہے اور اللہ تعالیٰ کا غنی کرنا بھی، ان دونوں کا تقاضا ہے کہ سائل کی ضرورت پوری کرو۔ اگر نہیں کر سکتے تو لطف و کرم سے پیش آؤ، جھڑکی نہ دو اور آپ نے کتاب اور ایمان سے ناواقف کا زمانہ دیکھا ہے، پھر اللہ نے آپ کو یہ نعمتیں دیں، اب اگر کوئی علم کے متعلق سوال کرے یا کسی چیز کا سوال کرے تو اسے ڈانٹنا ہرگز نہیں! بلکہ کوئی علم کا طالب ہو یا مال کا، اس سے حسن خلق کے ساتھ پیش آئیں، اس کی حاجت پوری کریں یا اچھے طریقے سے عذر پیش کر دیں۔

آیت 11 : وَأَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ : اور شکر ادا کرنے کے لیے اپنے رب کی نعمتوں کا تذکرہ کرتے رہو۔





الْمُ نَشْرَخُ لَكَ صَدْرَكَ ① وَ وَضَعْنَا عَنْكَ وَزْمَكَ ② الَّذِي أَنْقَضَ ظَهْرَكَ ③

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

کیا ہم نے تیرے لیے تیرا سینہ نہیں کھول دیا ① اور ہم نے تجھ سے تیرا بوجھ اتار دیا ② وہ جس نے تیری کمر توڑ دی ③

آیت 1 الْمُ نَشْرَخُ لَكَ صَدْرَكَ: سینہ کھول دینے سے مراد اسلام کے حق ہونے پر اطمینان، دل کا نور ہدایت سے روشن ہونا اور ذکر الہی سے نرم ہونا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَمَنْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ﴾ [الأنعام: ۱۲۵] "تو جسے اللہ ہدایت دینے کا ارادہ کرتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے۔" اور فرمایا: ﴿فَمَنْ شَرَحَ اللَّهُ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ فَهُوَ عَلَى نُورٍ مِنْ رَبِّهِ - قَوْلٌ لَلْقَسِيَةِ فَعَلُوهُمْ مِنْ ذِكْرِ اللَّهِ - أُولَئِكَ فِي صُلْحٍ مُبِينٍ﴾ [الزمر: ۲۲] "تو کیا وہ شخص جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا ہے، سو وہ اپنے رب کی طرف سے نور پر ہے (وہ اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو ایسا نہیں؟) پس ویل ہے ان لوگوں کے لیے جن کے دل اللہ کی یاد کی طرف سے سخت ہیں، یہ لوگ کھلی گمراہی میں ہیں۔" اس کے علاوہ شرح صدر سے مراد طبیعت کا رسالت کی ذمہ داریاں اٹھانے کے لیے خوش دلی کے ساتھ آمادہ ہونا بھی ہے، جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے پاس جانے کا حکم ہوا تو انھوں نے کہا: ﴿وَ يَضِيقُ صَدْرِي﴾ [الشعراء: ۱۳] "اور میرا سینہ اس سے تنگ ہوتا ہے۔" اور دوسری: ﴿رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي﴾ [ص: ۲۵] "اے میرے رب! میرے لیے میرا سینہ کھول دے۔"

شرح صدر میں آپ ﷺ کے بچپن میں اور نزول وحی کے آغاز میں اور معراج کی رات شق صدر کے بعد آپ کے سینے کو ایمان و حکمت سے بھر دینا بھی شامل ہے، جیسا کہ صحیحین اور دوسری کتب احادیث میں آیا ہے۔

آیت 2:3 وَ وَضَعْنَا عَنْكَ وَزْمَكَ: بوجھ اتار دینے سے مراد وحی الہی برداشت کرنے کی استعداد پیدا کرنا ہے، جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿إِنَّا سَأَلْنَا عَلَيْكَ قَالَ قَوْلًا ثَقِيلًا﴾ [الزمر: ۵] "یقیناً ہم تجھ پر ایک بھاری بات نازل کریں گے۔" حدیث میں ہے کہ جب آپ ﷺ پر وحی اترتی تو اس کے بوجھ سے وہ اونچی جس پر آپ سوار ہوتے بیٹھ جاتی۔ [مسند أحمد: ۱۱۸/۶، ج: ۱، ۲۴۸/۶، سنہ صحیح] اس کے علاوہ نبوت کی ذمہ داریوں کا بوجھ بھی مراد ہے، جسے آپ بہت شدت سے محسوس کرتے تھے، جیسا کہ فرمایا: ﴿لَعَلَّكَ بِأَخَعٍ نَفْسِكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ﴾ [الشعراء: ۱۳] "شاید آپ اپنے آپ کو اس لیے ہلاک کر لیں گے کہ یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لاتے۔" اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر یہ بوجھ بھی اتار دیا: ﴿لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ﴾ [البقرة: ۲۷۲] "تیرے ذمے انھیں ہدایت دینا نہیں اور لیکن اللہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔"

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۖ فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۗ إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۖ

اور ہم نے تیرے لیے تیرا ذکر بلند کر دیا (۳) پس بے شک ہر مشکل کے ساتھ ایک آسانی ہے (۴) بے شک اسی مشکل کے ساتھ ایک اور آسانی ہے (۵)

آیت 4 ﴿وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ﴾ یعنی دنیا اور آخرت میں آپ کا نام بلند کیا، زمین کے مشرق و مغرب تک آپ کی امت کی حکومت پھیلا دی، کلمہ شہادت، اذان، اقامت اور خطبہ و تشہد وغیرہ میں اللہ کے نام کے ساتھ آپ کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ اللہ کی اطاعت کے ساتھ آپ کی اطاعت فرض ہے، کوئی وقت ایسا نہیں جس میں کہیں نہ کہیں آپ کا ذکر خیر نہ ہو رہا ہو۔ قیامت کو اولاد آدم کی سیادت، کوثر، لواء الحمد، مقام محمود اور شفاعت کبریٰ کے ساتھ آپ کا ذکر بلند ہوگا۔

2 یہاں تین نعمتوں کا ذکر ہے، شرح صدر، وضع وزر اور رفع ذکر، تینوں کو بیان کرتے ہوئے ”لَكَ“ یا ”عَنْكَ“ فرمایا، اس میں آپ ﷺ کی عزت افزائی کا اظہار ہو رہا ہے کہ یہ سب کچھ آپ کی خاطر کیا گیا ہے۔

آیت 5.6 ﴿فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا.....﴾ اس میں آپ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کے لیے بشارت ہے کہ مشکلات کے دن تھوڑے ہیں، ہر مشکل کے بعد بلکہ اس کے ساتھ ہی آسانی شروع ہو جاتی ہے۔ ”إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا“ کا یہی مطلب ہے۔ دوسری بشارت یہ ہے کہ ایک ایک مشکل کے ساتھ دو دو آسانیاں ہیں۔ ابن کثیر نے ابن ابی حاتم کے حوالے سے ان کی سند کے ساتھ حسن بھری رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے، انہوں نے فرمایا: ”كَانُوا يَقُولُونَ لَا يَغْلِبُ عُسْرٌ وَاحِدٌ يُسْرَيْنِ“ وہ (صحابہ) کہا کرتے تھے کہ ایک مشکل دو آسانوں پر غالب نہیں آسکتی۔ ابن کثیر کے محقق حکمت بن بشر نے اس کی سند کو حسن کہا ہے۔ ابن کثیر نے اس کی تفصیل یہ بیان فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دہرا کر یہ بات فرمائی ہے: ﴿فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۖ إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۖ﴾ اور عربی زبان کا قاعدہ ہے کہ اگر کوئی اسم دوسری دفعہ معرفہ ہو کر آئے تو اس سے مراد پہلا اسم ہی ہوتا ہے اور اگر وہ پہلے نکرہ آئے اور دوبارہ بھی نکرہ ہو کر آئے تو وہ پہلے نکرہ سے الگ ہوتا ہے۔ یہاں دوسری دفعہ ”الْعُسْرُ“ معرفہ آیا ہے جب کہ ”يُسْرًا“ دوسری دفعہ بھی نکرہ ہو کر آیا ہے، تو معنی یہ ہوا کہ ”اسی پہلی مشکل کے ساتھ ایک اور آسانی ہے۔“ یعنی ایک مشکل کے ساتھ دو آسانیاں ہیں۔ اس قاعدے کی ایک مثال سورہ مزمل میں ہے، فرمایا: ﴿إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا ۗ فَعَصَىٰ فِرْعَوْنُ الرَّسُولَ﴾ [المزمل: ۱۶، ۱۵] ”ہم نے تمہاری طرف ایک رسول بھیجا جو تم پر شہادت دینے والا ہے، جس طرح ہم نے فرعون کی طرف ایک رسول بھیجا، تو فرعون نے اس رسول کی نافرمانی کی۔“ پہلے ”رَسُولًا“ سے مراد ہمارے نبی کریم ﷺ ہیں، دوسرے سے موسیٰ علیہ السلام اور تیسرا ”الرَسُولُ“ معرفہ آیا ہے اور اس سے مراد وہی رسول ہے جو اس سے پہلے مذکور ہے اور وہ موسیٰ علیہ السلام ہیں۔

2 یاد رہے کہ نکرہ کو دوبارہ نکرہ کی صورت میں لانے کا یہ قاعدہ اکثر مفسرین نے بیان کیا ہے، مگر یہ قاعدہ کلیہ نہیں بلکہ مشہور نحوی ابن ہشام نے ”معنی اللیب“ میں اسے خطا قرار دیا ہے، کیونکہ کئی دفعہ ایسا نہیں ہوتا۔ اس لیے ابن عاشور نے

فَإِذَا فَرَغْتَ فَانصَبْ ۖ وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ ﴿۸﴾

تو جب تو فارغ ہو جائے تو محنت کر ﴿۷﴾ اور اپنے رب ہی کی طرف پس رغبت کر ﴿۸﴾

”التحریر والتبوير“ میں اور زمخشری نے ”کشاف“ میں حسن بصری اور قوادہ کے اقوال اور بعض منزل روایات میں آنے والی بات کہ ”لَنْ يَغْلِبَ عُسْرُ يُسْرَيْنِ“ (ایک مشکل دو آسانوں پر ہرگز غالب نہیں آئے گی) کے متعلق فرمایا کہ آیت سے یہ بات اس کے تکرار کی وجہ سے نکلتی ہے، اس قاعدے کی وجہ سے نہیں، پھر دونوں مفسروں نے اپنے اپنے انداز سے اس کی تفصیل بیان فرمائی ہے۔

آیت 8.7 ﴿۱﴾ فَإِذَا فَرَغْتَ فَانصَبْ.....: آپ کے دنیا کے کام ہوں یا تبلیغ دین یا جہاد فی سبیل اللہ، اگرچہ یہ سب

عبادات اور نیکیاں ہیں مگر ان میں پھر بھی مخلوق سے کچھ نہ کچھ رابطہ رہتا ہے، جب بھی ان کاموں سے کچھ فراغت ملے، تو ہر چیز سے منقطع ہو کر اپنے رب سے تعلق جوڑ کر ذکر الہی، تلاوت قرآن، قیام اور رکوع و سجود کی محنت کریں اور اپنی تمام رغبت اپنے رب ہی کی طرف رکھیں۔ یہ وہی بات ہے جو سورہ منزل کے شروع میں کہی گئی ہے، فرمایا: ﴿إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْعًا طَوِيلًا ۖ وَادْكُرُ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبْتَئِلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا﴾ [النہر من: ۱۸۰۷] ”یقیناً تجھے دن میں بہت لمبی مصروفیت ہے اور اپنے رب کا نام ذکر کر اور ہر طرف سے کٹ کر اسی کی طرف متوجہ ہو جا۔“

﴿۲﴾ فَانصَبْ: ”نصب بنصب نصباً“ (س) کے مفہوم میں محنت و مشقت کے ساتھ حکم بھی شامل ہے، یعنی صرف راحت کے وقت ہی نہیں، طبیعت کے نہ چاہتے ہوئے بھی عبادت اور ذکر الہی کی مشقت جاری رکھ۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ رات کے وقت اتنا قیام کرتے کہ آپ کے پاؤں پر درم آجاتا، جیسا کہ صحیحین میں عاکشہ جو حنا سے مروی ہے۔



سورۃ التین
۹۵ مآب ۲۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَالَّتِیْنِ وَالزَّیْتُونِ ۱ وَ طُورِ سِیْنِیْنِ ۲ وَ هَذَا الْبَلَدِ الْاَمِیْنِ ۳ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ
فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۴ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنِ ۵

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

قسم ہے انجیر کی! اور زیتون کی! ۱ اور طور سینین کی! ۲ اور اس امن والے شہر کی! ۳ بلاشبہ یقیناً ہم نے انسان کو سب سے اچھی بناوٹ میں پیدا کیا ہے ۴ پھر ہم نے اسے لوٹا کر نیچوں سے سب سے نیچا کر دیا ۵

آیت 1 وَالَّتِیْنِ وَالزَّیْتُونِ: انجیر اور زیتون دو ایسے پھل ہیں جو اپنی جامعیت اور فوائد کی کثرت میں انسان کے جامع الفضائل ہونے کے ساتھ مشابہت رکھتے ہیں، اس لیے انھیں انسان کے احسن تقویم میں پیدا کیے جانے کے شاہد کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اکثر مفسرین نے انجیر اور زیتون سے مراد سر زمین شام لی ہے جہاں یہ کثرت سے ہوتے ہیں اور جہاں عیسیٰ علیہ السلام اور اللہ کے بہت سے پیغمبر پیدا ہوئے ہیں اور یہی بات راجح ہے، کیونکہ اس کے بعد طور سینا اور بلد امین کا ذکر ہے۔

آیت 2 وَ طُورِ سِیْنِیْنِ: طور سینا جہاں اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام سے ہم کلام ہوئے۔ مزید دیکھیے سورۃ مومنون (۲۰)۔

آیت 3 وَ هَذَا الْبَلَدِ الْاَمِیْنِ: شہر مکہ جو ابراہیم اور اسماعیل علیہم السلام نے آباد کیا اور جہاں رسول اللہ ﷺ پیدا ہوئے۔ اسے بلد امین اس لیے فرمایا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اس کے لیے دعا کی تھی: ﴿ رَبِّ اجْعَلْ هَذَا بَلَدًا اٰمِنًا ﴾ [البقرہ: ۱۲۶] "اے میرے رب! اس (جگہ) کو ایک امن والا شہر بنا دے۔"

آیت 4 لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ : قسم اور جواب قسم میں مناسبت یہ ہے کہ سر زمین شام میں پیدا ہونے والے جلیل القدر پیغمبروں اور طور سینا اور شہر مکہ کی شہرت کا باعث بننے والے پیغمبروں کی زندگی اس بات کی شاہد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین بناوٹ میں پیدا کیا ہے۔

آیت 5 ثُمَّ رَدَدْنَاهُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنِ: اس بہترین بناوٹ میں اس کی شکل و صورت کا حسن، اس کی عقل، اس کی فطرت پر پیدائش اور وہ سب کچھ شامل ہے جو کسی حیوان کو حاصل نہیں۔ پھر اگر وہ اس عقل اور فطرت کے تقاضوں پر عمل نہ کرے بلکہ انسانیت سے اتر کر حیوانیت میں جا گرے اور شہوت و غضب اور دوسری حیوانی صفات سے مغلوب ہو جائے، تو اس سے زیادہ نیچا اور ذلیل کوئی نہیں، کیونکہ پھر وہ اس حد تک گر جاتا ہے کہ کوئی حیوان نہیں بھی گرتا، حتیٰ کہ وہ اپنے مالک و خالق کو بھی بھول جاتا ہے، اس کے ساتھ شریک بنانے لگتا ہے اور زمین میں ایسا فساد برپا کرتا ہے جو کوئی حیوان بھی نہیں کر سکتا۔ ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ آگ ہے اور اس میں گرنے والوں سے نیچا اور ذلیل کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ انھی کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اُوْلٰئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلٰی هُمْ اَصْلٰنَ ﴾ [الأعراف: ۱۷۹] "یہ لوگ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی گزرے ہیں۔"

إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ۖ فَمَا يُكَذِّبُكَ
بَعْدُ بِالذِّينِ ۚ أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَحْكَمَ الْحَاكِمِينَ ۝

مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے تو ان کے لیے ختم نہ ہونے والا اجر ہے ۱ پس اس کے بعد کون سی چیز تجھے جزا کے بارے میں جھٹلانے پر آمادہ کرتی ہے؟ ۲ کیا اللہ سب حاکموں سے بڑا حاکم نہیں ہے؟ ۳

آیت 6: إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ : اور اگر یہ حسن تقویم کے مطابق ایمان لا کر عمل صالح کرے تو اس کو ایسا اجر ملے گا جو کبھی منقطع نہیں ہوگا۔

آیت 7: فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالذِّينِ: اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین ساخت میں پیدا کیا، پھر بعض نے تو اس ساخت کے تقاضوں کے مطابق ایمان اور عمل صالح اختیار کیا اور بعض نافرمانی کی وجہ سے "اسفل السافلین" ٹھہرے۔ ان دونوں کے عمل کا لازمی نتیجہ ہے کہ ایک دن ایسا ہو جس میں ہر ایک کو نیکی اور بدی کی جزا و سزا دی جائے۔ اتنی واضح دلیل کے بعد اے انسان! تجھے کون سی چیز آمادہ کر رہی ہے کہ تو جزا کو جھٹلا دے؟ اس کا دوسرا ترجمہ یہ ہے: "اے نبی! اس کے بعد کون ہے جو تجھے جزا کے بارے میں جھٹلائے؟"

آیت 8: أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَحْكَمَ الْحَاكِمِينَ: کوئی معمولی سا انصاف کرنے والا ہو وہ بھی اپنے اختیار میں جزا و سزا کا اہتمام کیے بغیر نہیں رہے گا، تو اللہ جو سب حاکموں سے بڑا حاکم ہے، وہ اس کا اہتمام کیوں نہیں کرے گا؟

ترمذی وغیرہ میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے ایک روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جب تم میں سے کوئی سورت "وَالَّذِينَ وَالَّذِينَ" پڑھے اور "أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَحْكَمَ الْحَاكِمِينَ" پر پہنچے تو کہے: «بَلَىٰ وَ أَنَا عَلَىٰ ذَٰلِكَ مِنَ الشَّاهِدِينَ» [ترمذی، تفسیر القرآن، باب و من سورة والنین: ۳۳۴۷] "کیوں نہیں! اور میں اس پر شہادت دینے والوں میں سے ہوں۔" مگر یہ روایت صحیح نہیں، کیونکہ ترمذی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے ایک اعرابی نے یہ روایت بیان کی ہے جس کا نام ہی معلوم نہیں۔



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

إِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ إِقْرَأْ وَرَبُّكَ
الْأَكْرَمُ ۝ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

اپنے رب کے نام سے پڑھ جس نے پیدا کیا ① اس نے انسان کو ایک جے ہوئے خون سے پیدا کیا ② پڑھ اور تیرا
رب ہی سب سے زیادہ کرم والا ہے ③ وہ جس نے قلم کے ساتھ سکھایا ④

یہ قرآن مجید کی پہلی وحی ہے جو رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی۔ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک لمبی حدیث میں وحی کے آغاز کا
ذکر ہے کہ وہ سچے خوابوں سے ہوا، پھر آپ ﷺ غار حرا میں کئی کئی راتیں خلوت اختیار کرنے لگے۔ وہیں آپ کے پاس
فرشتہ آیا اور آپ سے کہا: ﴿إِقْرَأْ﴾ ”پڑھ“۔ آپ نے کہا: ﴿مَا أَنَا بِقَارِئٍ﴾ ”میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔“ جبریل علیہ السلام نے
آپ کو زور سے دبا یا اور پھر وہی لفظ ”إِقْرَأْ“ کہا۔ آپ وہی جواب ”مَا أَنَا بِقَارِئٍ“ دیتے رہے۔ تیسری دفعہ زور سے دبانے
کے بعد فرشتے نے کہا: ﴿إِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ إِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ۝
الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ﴾ [العلق: ۱ تا ۵] دیکھیے بخاری، التفسیر، باب: ۴۹۵۳ |

آیت 1 ① **إِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ:** پہلی وحی میں پڑھنے کا حکم دینے سے پڑھنے کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔
② اللہ تعالیٰ نے پڑھنے کا حکم دیتے وقت اپنے رب ہونے اور پیدا کرنے کی نعمت کا ذکر فرمایا، کیونکہ سب سے پہلی اور بڑی
نعمت پیدا کرنا ہے، باقی تمام نعمتیں اس کے بعد ہیں، خلق ہی نہ ہو تو کچھ بھی نہیں۔ دوسری نعمت رب ہونا، یعنی پرورش کرنا ہے۔
یعنی ان نعمتوں والی ہستی کے نام کی برکت سے پڑھ، اس کی برکت سے تو قاری بھی بن جائے گا۔

③ ”الَّذِي خَلَقَ“ (جس نے پیدا کیا) کا مفعول حذف کر دیا گیا ہے کہ کسے پیدا کیا؟ یعنی جب پیدا کرنا اسی کا کام ہے، تو
پھر یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ کسے پیدا کیا۔

آیت 2 ② **خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ:** رحم میں قرار پکڑنے کے بعد نطفہ سب سے پہلے ”علقہ“ کی شکل اختیار کرتا ہے۔
”عَلَقٌ يَلْعَقُ“ (س) چمکنے کو کہتے ہیں۔ ”عَلَقَةٌ“ جما ہوا خون، جو رحم کی دیوار کے کسی حصے سے چپک جاتا ہے۔ ”علقہ“ کا دوسرا
معنی جو تک ہے، وہ بھی کسی نہ کسی کو چٹ جاتی ہے۔ خون کی وہ پھسکی شکل و صورت میں جو تک سے ملتی جلتی ہوتی ہے، اس میں
نہ جان ہوتی ہے نہ شعور اور نہ عقل و علم۔ پھر اللہ تعالیٰ اس حقیر سی پھسکی سے انسان جیسی عظیم مخلوق پیدا فرما دیتا ہے۔

آیت 3 ③ **إِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ:** رسول اللہ ﷺ کے دہشت زدہ ہو جانے کی وجہ سے دوبارہ فرمایا، پڑھ!
تجھے وہ پڑھا رہا ہے جس سے زیادہ کرم والا کوئی نہیں۔

④ یہ اس کے کرم کی انتہا ہے کہ اتنی حقیر چیز سے پیدا ہونے والے انسان کو علم جیسی بلند ترین صفت سے نواز دیا، بلکہ قلم کے
ساتھ علم سکھایا، جس سے علم محفوظ ہوتا اور ایک آدمی سے دوسرے آدمی اور ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچتا ہے، یہ نہ ہوتا تو

عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝ كَلَّا إِنَّ الْإِنْسَانَ لَيْطَعِي ۝۱ أَنْ زَاكًا اسْتَغْنَى ۝۲ إِنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الرُّجْعَى ۝۳ أَمْ أَرَأَيْتَ الَّذِي يَنْهَى ۝۴ عَبْدًا إِذَا صَلَّى ۝۵ أَرَأَيْتَ إِنْ كَانَ عَلَىٰ الْهُدَىٰ ۝۶ أَوْ أَمَرَ بِالتَّقْوَىٰ ۝۷ أَمْ أَرَأَيْتَ إِنْ كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ ۝۸ أَلَمْ يَعْلَمْ بِأَنَّ اللَّهَ يَرَىٰ ۝۹

اس نے انسان کو وہ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا ۝۱ ہرگز نہیں، بے شک انسان یقیناً حد سے نکل جاتا ہے ۝۲ اس لیے کہ وہ اپنے آپ کو دیکھتا ہے کہ غنی ہو گیا ہے ۝۳ یقیناً تیرے رب ہی کی طرف لوٹنا ہے ۝۴ کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جو منع کرتا ہے ۝۵ ایک بندے کو جب وہ نماز پڑھتا ہے ۝۶ کیا تو نے دیکھا اگر وہ ہدایت پر ہو ۝۷ یا اس نے پرہیزگاری کا حکم دیا ہو ۝۸ کیا تو نے دیکھا اگر اس (منع کرنے والے) نے جھٹلایا اور منہ موڑا ۝۹ تو کیا اس نے یہ نہ جانا کہ اللہ دیکھ رہا ہے ۝۱۰

علم محدود اور پھر معدوم ہو جاتا۔

آیت 5 عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ: انسان پیدا ہوتا ہے تو کچھ بھی نہیں جانتا (دیکھیے نحل: ۷۸) اللہ تعالیٰ ہی اسے آہستہ آہستہ سب کچھ سکھاتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ ہی اپنے ایک آن پڑھ بندے کو عالم بلکہ عالموں کا استاذ بنائے گا۔

آیت 8:6 ۱ كَلَّا إِنَّ الْإِنْسَانَ لَيْطَعِي...: "كَلَّا" کا معنی "ہرگز نہیں"، "خبردار" اور "حق یہ ہے" میں سے موقع کی مناسبت سے کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ "الرُّجْعَى" "رُجِعَ يُرْجَعُ" (ض) سے "بُشْرَى" کے وزن پر مصدر ہے۔

۲ یہ آیات پہلی پانچ آیات کے بعد وقفہ سے نازل ہوئیں، جب ابو جہل نے آپ کو نماز پڑھنے سے روکا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نماز پڑھ رہے تھے کہ ابو جہل آیا اور کہنے لگا: "کیا میں نے تمہیں اس سے منع نہیں کیا؟" یہ بات اس نے تمہیں بارگاہی۔ نبی ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو اسے ڈانٹا، اس پر ابو جہل کہنے لگا: "تم جانتے ہو اس شہر میں مجلس کے ساتھی مجھ سے زیادہ کسی کے نہیں۔" تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات اتاریں ﴿فَلْيَذُكَّرْ نَادِيَةً ۚ سَنَذَعُ الرِّبَابِيَّةَ﴾ [العلق: ۱۸، ۱۷] "پس وہ اپنی مجلس کو بلا لے۔ ہم عنقریب جہنم کے فرشتوں کو بلائیں گے۔" [ترمذی، تفسیر القرآن، مات ومن سورۃ بقرۃ باسم ربنا: ۳۳، ۳۴] ترمذی اور البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے صحیح کہا ہے۔

۳ سورت کی ابتدائی پانچ آیات کے ساتھ ان آیات کی مناسبت یہ ہے کہ انسان اتنی نعمتیں جو اوپر ذکر ہوئیں، ملنے کے باوجود احسان ماننے اور شکر کرنے کے بجائے سرکشی اختیار کرتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ اسے ضرورت کی ہر چیز دے کر دوسروں سے غنی کر دیتا ہے تو وہ بندگی کی حد سے نکل کر مقابلے پر آ جاتا ہے۔ فرمایا، بندے! جتنی چاہے سرکشی کر لے، یقیناً تجھے اپنے رب کے پاس واپس آنا ہے۔

آیت 9:14 أَمْ أَرَأَيْتَ الَّذِي يَنْهَى.....: ان آیات میں ابو جہل کے رویے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ فرمایا،

كَلَّا لَئِن لَّمْ يَنْتَهَ ۙ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ ۝۱۵ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ۝۱۶ فَلْيَدْعُ
نَادِيَهُ ۝۱۷ سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ۝۱۸

ہرگز نہیں، یقیناً اگر وہ باز نہ آیا تو ہم ضرور اسے پیشانی کے بالوں کے ساتھ گھسیٹیں گے ۝۱۵ پیشانی کے ان بالوں کے ساتھ جو جھوٹے ہیں، خطا کار ہیں ۝۱۶ پس وہ اپنی مجلس کو بلا لے ۝۱۷ ہم عنقریب جہنم کے فرشتوں کو بلا لیں گے ۝۱۸

اے مخاطب! بھلا تو نے اس شخص کو دیکھا جو اللہ کے بندے یعنی رسول اللہ ﷺ کو نماز پڑھنے سے منع کرتا ہے؟ بھلا یہ بھی کوئی جرم ہے جس سے وہ منع کر رہا ہے؟ پھر تو نے دیکھا، اگر یہ نماز پڑھنے والا راہ راست پر ہو یا امر بالمعروف کر رہا ہو تو کیا اس سے یہ سلوک ہونا چاہیے؟ پھر کیا تو نے دیکھا کہ اگر یہ منع کرنے والا جھٹلا رہا ہو اور منہ موڑ رہا ہو تو کیا اسے معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے؟ آیت: ﴿ اَرَأَيْتَ اِنْ كَانَ عَلَى الْهُدٰى ۙ اَوْ اَمَرَ بِالْتَقْوٰى ۙ ﴾ کی ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ کیا تو نے دیکھا کہ یہ نماز سے منع کرنے والا نماز سے روکنے کے بجائے ہدایت پر ہوتا یا نیکی کا حکم دیتا تو کیا ہی اچھا ہوتا۔

آیت 15، 18 ① كَلَّا لَئِن لَّمْ يَنْتَهَ ۙ لَنَسْفَعًا.....: "لَمْ يَنْتَهَ" (وہ باز نہ آیا) "اِنَّهٗي يَنْتَهِي اِنْتِهَاءً" (انتقال) سے محمد معلوم ہے۔ "يَنْتَهَى" اصل میں "يَنْتَهِي" تھا، حرف جزم "لَمْ" کی وجہ سے یا، گر گئی۔ "لَنَسْفَعًا" اصل میں "لَنَسْفَعْنَ" ہے، جو "سَفَعٌ يَسْفَعُ" (ف) (زور سے کھینچ کر گھیننا) سے جمع منکلم مضارع معلوم بانون تاکید خفیفہ ہے۔ چونکہ وقف کی حالت میں نون تاکید خفیفہ "الف" کے ساتھ بدل جاتا ہے، جیسا کہ نون تنوین "الف" کے ساتھ بدل جاتا ہے، اس لیے نون تنوین "حَبِيْرًا" اور "بَصِيْرًا" کی طرح اسے بھی "لَنَسْفَعْنَ" کے بجائے "لَنَسْفَعًا" کی صورت میں لکھا گیا ہے اور اس میں مصحف عثمانی کی پیروی کی گئی ہے۔ "وَلَيَكُوْنَنَّ مِنَ الضَّعِيْفِيْنَ" بھی ایسے ہی ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ یوسف کی آیت (۳۲) کی تفسیر۔

"النَّاصِيَةُ" سر کے اگلے حصے کے بالوں کو "ناصیہ" کہا جاتا ہے۔ "الزَّبَانِيَةُ" "زَبَانِيَةُ" کی جمع ہے۔ عرب پولیس کے سپاہی کو "زَبَانِيَةُ" کہتے ہیں۔ یہ "زَبَنٌ يَزْبِنُ زَبْنًا" (ض) سے مشتق ہے جس کا معنی "ہٹانا، دھکا دینا" ہے۔ چونکہ افسر جس سے ناراض ہو سپاہی اسے دھکے مار کر نکال دیتے ہیں، اس لیے انھیں "زبانیه" کہا جاتا ہے۔ یہاں جہنم کے فرشتے مراد ہیں کہ اگر یہ باز نہ آیا تو وہ اسے دھکے دے کر نکال دیں گے، بلکہ اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے۔

② ابوہریرہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ابو جہل نے کہا: "کیا محمد (ﷺ) تمہارے ہوتے ہوئے اپنا چہرہ زمین پر رکھتا ہے؟" کہا گیا: "ہاں!" ابو جہل نے کہا: "لات اور عزریٰ کی قسم! اگر میں نے اسے ایسا کرتے ہوئے دیکھ لیا تو اس کی گردن روند ڈالوں گا، یا اس کے چہرے کو مٹی سے لت پت کر دوں گا۔" چنانچہ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا، آپ اس وقت نماز پڑھ رہے تھے۔ اس کا ارادہ آپ کی گردن کو روندنے کا تھا، اچانک لوگوں نے دیکھا کہ وہ ایڑیوں پر واپس پلٹ رہا ہے اور دونوں ہاتھوں کے

كَلَامٌ لَا تُطْعُهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ﴿۱۹﴾

ہرگز نہیں، اس کا کہنا مت مان اور سجدہ کر اور بہت قریب ہو جا ﴿۱۹﴾

ساتھ کسی چیز سے بچ رہا ہے۔ اس سے پوچھا گیا: ”تجھے کیا ہوا؟“ اس نے کہا: ”میرے اور اس کے درمیان آگ کی ایک خندق، بڑا ہولناک منظر اور پرہیز ہیں۔“ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿لَوْ دَنَا مِنِّي لَا خُتَطَفْتُهُ الْمَلَائِكَةُ عُضْوًا عُضْوًا﴾ [مسلم، صفات المنافقین، باب قوله: ﴿إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنَاجٍ﴾: ۲۷۹۷] ”اگر وہ میرے قریب آتا تو فرشتے اسے ایک ایک عضو کر کے اچک لیتے۔“

آیت ۱۹ ﴿۱۹﴾ كَلَامٌ لَا تُطْعُهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ: فرمایا، وہ آپ کو نماز سے روکتا ہے تو آپ اس کا کہنا ہرگز نہ مانیں، بلکہ آپ نماز پڑھتے، سجدہ کرتے اور اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرتے رہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿أَقْرَبُ مَا يَكُونُ الْعَبْدُ مِنْ رَبِّهِ وَهُوَ سَاجِدٌ فَأَكْثِرُوا الدُّعَاءَ﴾ [مسلم، الصلاة، باب ما يقال في الركوع والسجود؟: ۴۸۲] ”بندہ اللہ کے سب سے زیادہ قریب اس وقت ہوتا ہے جب وہ سجدے میں ہو، تو تم (سجدے میں) دعا زیادہ کیا کرو۔“ صحیح مسلم ہی میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس آیت پر سجدہ کرتے تھے۔ [دیکھیے مسلم، المساجد، باب سجود النلاوة: ۱۰۸/۱۵۷۸]

﴿۲﴾ اگرچہ ان آیات کا اولین مصداق ابو جہل ہے، مگر الفاظ عام ہونے کی وجہ سے ہر وہ شخص ان کا مصداق ہے جس میں یہ صفات پائی جائیں، خواہ کوئی ہو اور کسی زمانے کا ہو اور ہر مومن کو حکم ہے کہ ایسے سرکش آدمی کا کہنا نہ مانے اور اللہ کے سامنے سجدہ کرتا رہے اور اس کا قرب تلاش کرتا رہے۔





إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ ①

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

بلاشبہ ہم نے اسے قدر کی رات میں اتارا ①

آیت 1 ① **إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ**: ”ہم نے اسے قدر کی رات میں نازل کیا“ یعنی قرآن مجید کو۔ جب کوئی چیز اتنی

مشہور ہو کہ خود بخود ذہن میں آجاتی ہو تو اس کی عظمت واضح کرنے کے لیے نام لینے کے بجائے اس کی خمیر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

② ”القدر“ کا معنی تقدیر ہے، یعنی تقدیر کی رات۔ اس معنی کی تائید اس آیت سے ہوتی ہے: ﴿فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ

حَكِيمٍ﴾ [الدخان: ۴] ”اس رات میں ہر حکم کام کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔“ یعنی سال بھر میں جو کام ہونا ہوتا ہے اس رات

میں لوح محفوظ سے نقل کر کے ان فرشتوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے جو اسے سرانجام دیتے ہیں۔ ”القدر“ کا دوسرا معنی عظمت

ہے، یعنی عظمت والی رات۔ اس کے بعد اس کی عظمت پر ولادت کرنے والی چیزیں بیان کی ہیں، یعنی اس کا ہزار سینے سے بہتر

ہونا، اس میں ملائکہ اور جبریل علیہ السلام کا اتنا اور اس کا سراسر سلامتی والی ہونا۔ لیلۃ القدر کے مفہوم میں یہ معنی بھی شامل ہے۔

③ لیلۃ القدر میں قرآن مجید اتارنے کا مطلب عبداللہ بن عباس مجتہد نے یہ بیان فرمایا ہے کہ لیلۃ القدر میں پورا قرآن ایک

ہی دفعہ آسمان دنیا پر نازل کیا گیا، پھر وہاں سے تھوڑا تھوڑا کر کے کئی سالوں میں رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا۔ تفسیر ابن کثیر کے

محقق حکمت بن بشر نے سورہ نبی اسرائیل کی آیت (۱۰۶): ﴿وَقُرْآنًا كَرِيمًا فَتَنَّاهُ وَلِتُفَرِّدَ عَلَى النَّاسِ عَلَىٰ فُكُكٍ﴾ کی تفسیر کی

تحقیق میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اس قول کے متعلق فرمایا ہے کہ اسے طبری، نسائی (سنن کبریٰ، تفسیر سورہ فرقان)، حاکم (مشترک:

۳۶۸/۲) اور بیہقی (دلائل النبوة: ۱۳۱/۷) نے روایت کیا ہے اور سب نے اسے ”ذَاوُدُ بْنُ أَبِي هِنْدٍ عَنْ عِكْرِمَةَ عَنِ

ابن عباس“ کی سند سے بیان کیا ہے۔ حاکم نے اسے صحیح کہا اور ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے اور حافظ ابن حجر نے بھی

فتح الباری (۲۹۹) میں ان کی موافقت کی ہے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر قرآن مجید کے نزول کی ابتدا لیلۃ القدر میں ہوئی۔ یہ معنی شعبی رحمہ اللہ نے کیا ہے۔

(طبری) اور زمین پر قرآن مجید کے لیلۃ القدر میں اتارنے کا معنی اس کے سوا ہو بھی نہیں سکتا۔

④ اس رات کے رمضان میں ہونے کی تصریح خود قرآن میں ہے، فرمایا: ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ﴾

[البقرة: ۱۸۵] ”رمضان کا مہینا وہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا۔“ اور صحیح احادیث میں ہے کہ وہ رمضان کے آخری عشرے

کی کوئی ایک طاق رات (۲۱، ۲۳، ۲۵، ۲۷، ۲۹) ہے۔ متعین نہ کرنے میں یہ حکمت ہے کہ مسلمان ان راتوں میں زیادہ سے

زیادہ عبادت کر لیں۔ رسول اللہ ﷺ پورے آخری عشرے ہی میں شب بیداری، اعتکاف اور گھروالوں کو جگانے کا اہتمام

کرتے تھے۔ [دیکھیے بحاری، فضل لیلۃ القدر، باب العمل فی العشر الاواخر من رمضان: ۲۴، ۲۵]

وَمَا أَدْرَاكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ﴿۱﴾ لَيْلَةُ الْقَدْرِ حَيَّرُ مَنْ أَلْفِ شَهْرٍ ﴿۲﴾ تَنْزَلُ الْمَلَائِكَةُ
وَالرُّوحُ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ مِنْ كُلِّ أَمْرٍ ﴿۳﴾

اور تجھے کس چیز نے معلوم کروایا کہ قدر کی رات کیا ہے؟ ﴿۱﴾ قدر کی رات ہزار مہینے سے بہتر ہے ﴿۲﴾ اس میں فرشتے اور روح اپنے رب کے حکم سے ہر امر کے متعلق اترتے ہیں ﴿۳﴾

آیت 2 وَمَا أَدْرَاكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ: یہ سوال اس رات کی عظمت کے بیان کے لیے ہے، یعنی مخلوق میں سے کوئی ایسا ہے ہی نہیں جو اس رات کی عظمت جان سکے اور بتا سکے، یہ جاننا اور بتانا اللہ ہی کا کام ہے۔

آیت 2 لَيْلَةُ الْقَدْرِ حَيَّرُ مَنْ أَلْفِ شَهْرٍ: یعنی لیلۃ القدر اپنی برکتوں اور عبادت کے اجر و ثواب کے لحاظ سے ہزار مہینوں سے بہتر ہے، جن میں یہ رات نہ ہو۔ پھر ہزار ماہ سے یا تو یہ عدد مراد ہے یا عربوں کے عام دستور کے مطابق کثرت مراد ہے جو اس عدد سے بھی زیادہ ہو سکتی ہے۔ یہاں بعض مفسرین نے بنو امیہ کے ایام حکومت (جو ایک ہزار ماہ تھے) کی ذمت میں ایک روایت لکھی ہے، حالانکہ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے روایت کر کے خود ہی ضعیف قرار دیا ہے۔ [دیکھیے ترمذی، تفسیر القرآن، باب ومن سورۃ لیلۃ القدر: ۳۳۵۰] اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ بنو امیہ کا عہد اگرچہ خلفائے راشدین کے عہد کا مقابلہ نہیں کر سکتا، مگر وہ بھی اسلام کے عروج کا عہد ہے جس میں اسلام کا پھر یا مشرق سے مغرب تک لہرایا۔ انھی کے عہد تک پورا عالم اسلام ایک خلیفہ کے تحت رہا اور اسلام غالب، سر بلند اور محفوظ رہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «لَا يَزَالُ هَذَا الدِّينُ عَزِيْزًا مَبِيْعًا اِلَى اٰتِنِيْ عَشْرَ خَلِيْفَةٍ، كُلُّهُمْ مِنْ قُرَيْشٍ» [مسلم، الإمارة، باب الناس تبع لقريش: ۱۸۲۱/۹، عن جابر بن سمرة رضی اللہ عنہ] ”یہ دین بارہ خلفاء تک غالب و محفوظ رہے گا، جو سب قریش سے ہوں گے۔“ ابوداؤد میں انھی جابر ابن سمرة رضی اللہ عنہ سے مروی الفاظ یہ ہیں: «لَا يَزَالُ هَذَا الدِّينُ قَائِمًا حَتَّى يَكُوْنَ عَلَيْكُمْ اٰتِنَا عَشْرَ خَلِيْفَةٍ، كُلُّهُمْ نَحْتَمِعُ عَلَيْهِ الْاُمَّةُ، كُلُّهُمْ مِنْ قُرَيْشٍ» [أبو داؤد، كتاب المهدي: ۴۲۷۹، وقال الألباني صحيح] ”یہ دین قائم رہے گا حتیٰ کہ بارہ خلفاء ہوں، جن سب پر امت جمع ہوگی، سب کے سب قریش سے ہوں گے۔“ روانفص اور ان سے متاثر لوگ اسلام کے اس شہرے دور کے متعلق فضول باتیں کرتے رہتے ہیں، حالانکہ اس کے بعد نہ امت مسلمہ کو ایک خلیفہ پر جمع ہونے کی سعادت حاصل ہوگی اور نہ اسلام اس طرح غالب رہا جس طرح ان کے عہد میں غالب تھا۔

آیت 4 ﴿۱﴾ تَنْزَلُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ فِيهَا: ”الرُّوحُ“ سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿تَنْزَلُ بِهٖ الرُّوحُ الْأَمِيْنُ﴾ | الشعراء: ۱۹۳ | ”یہ قرآن روح الامین لے کر اترے ہیں۔“ ملائکہ میں شامل ہونے کے باوجود ان کے شرف کی وجہ سے ان کا الگ ذکر فرمایا، جس طرح سورہ بقرہ کی اس آیت میں فرشتوں کے ذکر کے بعد ان کے شرف کی وجہ سے ان کا خاص طور پر الگ ذکر فرمایا: ﴿مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَرُسُلِهِ وَجِبْرِيلَ وَمِيكَائِيلَ فَإِنَّ اللَّهَ عَدُوٌّ

سَلَامٌ تَهَيَّ حَتَّىٰ تَطْلُعَ الْفَجْرُ ۝

وہ رات فجر طلوع ہونے تک سراسر سلامتی ہے ۝

لِّلْكَافِرِينَ ﴿البقرة: ۹۸﴾ ”جو کوئی اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبریل اور میکال کا دشمن ہو تو بے شک اللہ سب کافروں کا دشمن ہے۔“

② یعنی ملائکہ اور جبریل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہر امر کے متعلق آئندہ سال میں جو کچھ ہونے کا فیصلہ ہو چکا ہوتا ہے وہ لے کر زمین پر اترتے ہیں۔

آیت 5 : ① سَلَامٌ تَهَيَّ حَتَّىٰ تَطْلُعَ الْفَجْرُ: ”سَلَامٌ“ خبر مقدم اور ”تَهَيَّ“ مبتدا مؤخر ہے، یعنی وہ رات طلوع فجر تک سراسر سلامتی ہے۔ مغرب سے فجر تک رات بھر اس میں اہل ایمان شیطان کے شر اور ہر قسم کے فتنے سے سلامت رہتے ہیں اور اپنے دلوں میں عجیب الطمینان و سکون اور سلامتی محسوس کرتے ہیں۔

② لیلۃ القدر، اس کی تلاش اور اعکاف کے مسائل و فضائل کے لیے کتب احادیث کا مطالعہ فرمائیں۔



سُورَةُ الْبَيْتَةِ
۱۰۰ آيَاتٍ
بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
آيَاتُ كُرْآنِهِمَا

لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالشُّرَكِيِّنَ مُنْفَكِينَ حَتَّى تَأْتِيَهُمُ
الْبَيْتَةُ ① رَسُولٌ مِّنَ اللَّهِ يَشْلُؤُاْ صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ② فِيهَا كُتِبَ قَبِيَّةٌ ③

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

وہ لوگ جنہوں نے اہل کتاب اور مشرکین میں سے کفر کیا باز آنے والے نہ تھے، یہاں تک کہ ان کے پاس کھلی دلیل

آئے ① اللہ کی طرف سے ایک رسول، جو پاک صحیفے پڑھ کر سنائے ② جن میں لکھے ہوئے مضبوط احکام ہوں ③

انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے فرمایا: «إِنَّ اللَّهَ أَمَرَنِي أَنْ أَقْرَأَ عَلَيْكَ: ﴿لَمْ يَكُنِ
الَّذِينَ كَفَرُوا﴾ قَالَ وَسَمَانِي؟ قَالَ نَعَمْ، فَبَكِي» [معاري، التفسیر، سورۃ: ﴿لَمْ يَكُنِ﴾: ۴۹۵۹] ”اللہ تعالیٰ نے
مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہیں ”لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا“ پڑھ کر سناؤں۔“ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا: ”اور کیا اللہ نے میرا نام بھی لیا
ہے؟“ آپ نے فرمایا: ”ہاں!“ تو ابی بن کعب رضی اللہ عنہ (یہ سن کر خوشی سے) رونے لگے۔“

آیت 1 لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا.....: ”مُنْفَكِينَ“ ”فَكَتَّ يَفُكُّ فَكًا“ (ن) ”الشَّيْءُ“ کسی چیز کو دوسری سے

جدا کرنا، ”العُقْدَةُ“ گرہ کھولنا اور ”الْحَتَمُ“ مہر توڑنا۔ ”انْفَكَّ يَنْفُكُّ“ (انفعال) ایک چیز کا دوسری چیز سے الگ ہونا جس
کے ساتھ وہ خوب جڑی ہوئی تھی، جیسے ”انْفَكَّ الْعَظْمُ“ ”ہڈی اپنے جوڑ سے الگ ہو گئی۔“ ”مُنْفَكِينَ“ اسم فاعل
ہے، (اپنے کفر سے) باز آنے والے، الگ ہونے والے۔ یعنی پیغمبر آخرا الزماں اور قرآن بھیجنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی

کہ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) اور مشرکین عرب کو راقح پر لایا جائے، کیونکہ یہ لوگ اس قدر بگڑے ہوئے تھے کہ ان کا راہ حق پر
آنا اس کے بغیر ممکن نہ تھا کہ ایک پیغمبر آئے جو ایک مقدس آسمانی کتاب لائے جس میں عمدہ و دل نشیں مضامین ہوں اور وہ
انہیں پڑھ کر سنائے، کسی حکیم یا صوفی یا عادل بادشاہ کے بس کی بات نہ تھی کہ انہیں راہ راست پر لے آتا۔ (اشرف المحاشی)

آیت 3.2 رَسُولٌ مِّنَ اللَّهِ يَشْلُؤُاْ صُحُفًا مُّطَهَّرَةً.....: قرآن مجید کو ”صُحُفًا مُّطَهَّرَةً“ اور اس میں موجود احکام

اور سورتوں کو ”قَبِيَّةٌ“ (نہایت مضبوط) قرار دیا ہے کہ ان میں کسی قسم کی ناپاک بات یا کمزور اور بے بنیاد قصہ یا حکم نہیں۔
اگر کسی شخص کو رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے پاک صحیفوں اور ان میں لکھے ہوئے مضبوط احکام کی پاکیزگی اور مضبوطی معلوم

کرنے کا شوق ہو تو وہ قرآن مجید کا بائبل کے مجموعے میں موجود پہلے صحیفوں کے ساتھ موازنہ کر لے، جن میں صحیح باتوں
کے ساتھ عقل و اخلاق سے گری ہوئی باتیں، واضح تحریف شدہ احکام اور اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی اور انبیائے کرام کی
توہین اور ان پر تہمتوں کی نجاست صاف نظر آتی ہے، مثلاً لوط اور سلیمان علیہ السلام پر بے بنیاد تہمتیں، جن سے وہ ہر طرح سے
پاک اور بری ہیں۔

وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمْ الْبَيِّنَةُ ۗ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيُعْبَدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۚ حُنَفَاءَ يُرِيضُوا اللَّهَ لَعَلَّ يُرِيثُوا الْمَالِ الْكَافِرِينَ ۗ

دینِ القینة ۝

اور وہ لوگ جنہیں کتاب دی گئی، جدا جدا نہیں ہوئے مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس کھلی دلیل آگئی ۝ اور انہیں اس کے سوا حکم نہیں دیا گیا کہ وہ اللہ کی عبادت کریں، اس حال میں کہ اس کے لیے دین کو خالص کرنے والے، ایک طرف ہونے والے ہوں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور یہی مضبوط ملت کا دین ہے ۝

آیت 4 : ﴿ وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ... ﴾ : اس آیت میں اہل کتاب کے ایک جرم کا ذکر فرمایا، مشرکین کا نام نہیں لیا، کیونکہ جب پڑھے لکھوں کا یہ حال ہے تو جاہل مشرکین کی ضد اور عناد کا اندازہ خود کریں۔ اہل کتاب کا یہ جرم ان کا باہمی تفرقہ تھا اور اس جرم کا ارتکاب انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے بھی کیا اور آپ کی آمد پر بھی۔ آپ کی تشریف آوری سے پہلے وہ بہتر (۷۲) فرقوں میں بٹ چکے تھے۔ اس آیت میں وضاحت فرمائی کہ ان کے الگ الگ بہتر (۷۲) فرقے بننے کی وجہ یہ نہ تھی کہ انھیں اللہ کے حکم کا طم نہ تھا، نہیں! بلکہ ”الْبَيِّنَةُ“ (کھلی دلیل اور واضح حکم) موجود ہونے کے باوجود باہمی ضد اور عناد کی وجہ سے کسی نے احبار و رہبان میں سے کسی ایک کے اقوال کو حجت مان کر اس کے نام پر فرقہ بنا لیا اور کسی نے دوسرے کے نام پر۔ یہی حال مسلمانوں کا ہوا، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿ تَفَرَّقَتِ الْيَهُودُ عَلَى إِحْذَى وَسَبْعِينَ فِرْقَةً، أَوْ اثْنَتَيْنِ وَسَبْعِينَ فِرْقَةً، وَالنَّصَارَى مِثْلَ ذَلِكَ، وَتَفَرَّقَتْ أُمَّتِي عَلَى ثَلَاثٍ وَسَبْعِينَ فِرْقَةً ﴾ [ترمذی، الإیمان، باب ماجاء فی افتراق هذه الأمة، ۲۶۴۱، وقال ترمذی و الألسانی حسن صحیح] ”یہود اکہتر (۷۱) یا بہتر (۷۲) فرقوں میں بٹ گئے، نصرانیوں کا بھی یہی حال ہوا اور میری امت بہتر (۷۳) فرقوں میں بٹ جائے گی۔“ اس افتراق کا حل پہلے بھی یہ تھا اور اب بھی یہی ہے کہ تمام امت اللہ کے نازل کردہ احکام پر متفق ہو جائے، علماء کے اقوال سے کتاب و سنت سمجھنے میں مدد لی جائے مگر ان میں سے کسی کے قول کو شرع سمجھ کر فرقہ نہ بنایا جائے، بلکہ جہاں اس کی بات وحی الہی کے خلاف ہو، خواہ کتنا ہی بڑا آدمی کیوں نہ ہو، اسے یکسر ترک کر دیا جائے۔

آیت 5 : رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری کے بعد آپ پر اہل کتاب کے ایمان نہ لانے کی وجہ یہ ہرگز نہ تھی کہ انھیں آپ کے سچا ہونے میں کوئی شک تھا، بلکہ پہلی کتابوں میں آپ ﷺ کی واضح بشارت اور نشانیاں موجود ہونے کی وجہ سے وہ آپ کو اپنے بیٹوں کی طرح بلکہ اس سے بھی بڑھ کر پہچانتے تھے، مگر محض حسد اور عناد کی وجہ سے آپ کے بارے میں جدا جدا ہو گئے، کوئی ایمان لے آیا اور کوئی کفر پر ڈنار رہا۔ حسد اور عناد ایک تو یہ تھا کہ آپ بنی اسرائیل کے بجائے بنی اسماعیل سے کیوں ہیں اور دوسرا یہ کہ وہ اپنی مذہبی سرداری چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھے۔

آیت 5 : ﴿ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيُعْبَدُوا اللَّهَ... ﴾ : ”الْقِيَمَةُ“ ”قَامَ يَوْمٌ“ سے ”قِيَمَةُ“ کے وزن پر صفت کا صیغہ ہے، کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالشُّرَكِيِّنَ فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا أُولَئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ① إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ② جَزَاءُ هُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّاتٌ عَدْنٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا

بے شک وہ لوگ جنہوں نے اہل کتاب اور مشرکین میں سے کفر کیا، جہنم کی آگ میں ہوں گے، اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں، یہی لوگ مخلوق میں سب سے بُرے ہیں ① بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے، وہی مخلوق میں سب سے بہتر ہیں ② ان کا بدلہ ان کے رب کے ہاں ہمیشہ رہنے کے باغات ہیں، جن

جس میں تاء مبالغے کے لیے ہے، نہایت مضبوط، سیدھی جس میں کوئی کچی نہیں: ”أَيُّ ذَلِكَ دِينُ الْمِلَّةِ الْقَيْمَةِ“ یعنی یہی مضبوط ملت کا دین ہے۔ ”حُنْفَاءَ“ ”حَنِيفٌ“ کی جمع ہے جو ”حَنْفٌ يَحْنِفُ حَنْفًا“ (ض) (حاء کے ساتھ) سے ”فَعِيلٌ“ بمعنی اسم فاعل ہے، اس کا لفظی معنی ”ایک طرف مائل ہونا“ ہے۔ اس کا اکثر استعمال ”تمام راستوں سے ہٹ کر سیدھے راستے کی طرف آنے“ کے معنی میں ہوتا ہے، جب کہ ”حَنْفٌ“ (جیم کے ساتھ) کا مطلب ”سیدھے راستے سے ہٹ کر ادھر ادھر ہو جانا“ ہوتا ہے۔ اس آیت میں دین کا خلاصہ بیان فرمادیا کہ پہلی امتیں ہوں یا یہ امت، سب میں ایک ہی حکم ہے کہ ایک اللہ کی عبادت کریں، جو ہر قسم کے شرک اور ریا سے پاک اور خالص اللہ کے لیے ہو اور باطل پر چلنے والے تمام گروہوں سے ہٹ کر ایک اللہ کی طرف یک سو ہو جائیں، جس طرح ابراہیم علیہ السلام ہو گئے تھے اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں، یہی مضبوط ملت کا دین ہے۔ جب اس امت میں بھی وہی پہلا ہی حکم ہے اور پہلی امتوں کا اور اس امت کا دین قیام ایک ہی ہے، تو انہیں ماننے سے انکار کیوں ہے؟

آیت 6 إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ.....: ”الْبَرِيَّةِ“ ”بَرًّا يَبْرَأُ بَرًّا وَ بُرُوءًا“ (ف) (پیدا کرنا) سے ”فَعِيلَةٌ“ کے وزن پر اسم مفعول کے معنی میں ہے، مخلوق۔ یعنی یہ لوگ تمام مخلوق حتیٰ کہ جانوروں سے بھی بدتر ہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿أُولَئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ﴾ [الأعراف: ۱۷۹] ”یہ لوگ جانوروں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔“ کیونکہ وہ جان بوجھ کر حق کی مخالفت کر رہے ہیں۔

آیت 7 إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ.....: جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں اور تمام کتابوں پر ایمان لائے اور انہوں نے صالح اعمال کیے ان کے لیے تین بڑی بڑی بشارتیں ہیں، پہلی یہ کہ وہ مخلوق میں سب سے بہتر ہیں، کیونکہ اپنے اختیار سے گناہ چھوڑ کر ایمان اور عمل صالح کرنے والوں کا درجہ یقیناً ان لوگوں سے بلند ہے جن میں نافرمانی کی استعداد ہی نہیں، دوسری یہ کہ ان کے لیے ہمیشہ رہنے کے لیے باغات ہیں، جن کے تلے نہریں بہتی ہیں اور تیسری یہ کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہوگی جو آخرت کی نعمتوں میں سے سب سے بڑی نعمت ہے، فرمایا: ﴿وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللَّهِ أَكْبَرُ﴾ [التوبة:

رَضِيَ اللهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ۚ ذَلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهُ ۝

کے تلے نہریں بہتی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہنے والے ہیں ہمیشہ۔ اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اس سے راضی ہو گئے، یہ اس شخص کے لیے ہے جو اپنے رب سے ڈر گیا ۝

[۷۲] ”اور اللہ کی رضامندی سب سے بڑی چیز ہے۔“ ”اور وہ اللہ سے راضی ہوں گے“ یعنی بے شمار نعمتوں کے بعد بھی اگر ان کا دل ہی خوش نہ ہوا تو کیا فائدہ؟ یہ نعمتیں اس کے لیے ہیں جو اپنے رب سے ڈر گیا۔ خالی بے روح کلمہ پڑھنے، بلا خشیت نماز اور بوجھل دل کے ساتھ زکوٰۃ ادا کرنے اور بطور رسم عبادات ادا کرنے سے یہ مرتبہ نہیں ملتا، بلکہ اس کا مدار اللہ کے ڈر پر ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ جَنَّاتٌ﴾ [الرحمن: ۴۶] ”اور جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈر گیا اس کے لیے دو باغ ہیں۔“



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا ۝۱ وَ أَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا ۝۲ وَقَالَ الْإِنْسَانُ مَا لَهَا ۝۳ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا ۝۴

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

جب زمین سخت ہلا دی جائے گی، اس کا سخت ہلایا جانا ① اور زمین اپنے بوجھ نکال باہر کرے گی ② اور انسان کہے گا اے کیا ہے؟ ③ اس دن وہ اپنی خبریں بیان کرے گی ④

انس بن مالک اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سورہ زلزال کو قرآن کے نصف کے برابر قرار دیا ہے، مگر شیخ ناصر الدین البانی رحمۃ اللہ علیہ نے ان روایات کو منکر اور ضعیف قرار دیا ہے۔ [دیکھیے سلسلۃ الأحادیث الضعیفۃ و الموضوعۃ: ۱۳۴۲]

آیت 1 إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا: "زُلْزِلَ يُزْلزلُ زِلْزَلَةً وَ زِلْزَالًا" (فعلہ) سخت ہلانا۔ یہاں "زِلْزَالٌ" مصدر مفعول کے معنی میں ہے، یعنی سخت ہلایا جانا۔ اس سے مراد دوسرے نفع کے ساتھ آنے والا زبردست زلزلہ ہے، کیونکہ دوسرے نفع کے ساتھ ہی مردے قبروں سے نکلیں گے، فرمایا: ﴿ثُمَّ نُفَخَ فِيهِ أُخْرَىٰ فَإِذَا هُمْ قِيَامٌ يَنْظُرُونَ﴾ [الزمر: ۶۸] "پھر اس میں دوسری دفعہ پھونکا جائے گا تو یک لخت وہ کھڑے ہو کر دیکھ رہے ہوں گے۔" "زِلْزَالَهَا" (اپنے زلزلے) سے مراد یہ ہے کہ زمین کو سخت ہلا دینے کے لیے جتنا زبردست زلزلہ ہونا چاہیے اس قسم کے زلزلے کے ساتھ وہ سخت ہلا دی جائے گی۔

آیت 2 وَ أَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا: "أَثْقَالٌ" "نُقُلٌ" کی جمع ہے، مسافر کا سامان اور نفیس چیزیں جن کی وہ حفاظت کرتا ہے، یعنی زمین نے جو کچھ سنبھال کر رکھا ہوا ہے اسے باہر نکال دے گی۔ یا "نُقُلٌ" کی جمع ہے جو حمل کو کہتے ہیں، جیسے فرمایا: ﴿فَلَمَّا أَثْقَلَتْ﴾ [الأعراف: ۱۸۹] "پس جب وہ (عورت) بھاری ہو گئی۔" اس صورت میں زمین کو حاملہ کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے، یعنی اتنا شدید زلزلہ ہوگا کہ زمین پھٹ جائے گی اور اس میں جو فوت شدہ لوگ ہیں یا جو کچھ بھی زمین نے سنبھال کر رکھا ہوا ہے باہر نکال کر خالی ہو جائے گی، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَأَلْقَتْ مَا فِيهَا وَ تَخَلَّتْ﴾ [الانشقاق: ۱۴] "اور اس میں جو کچھ ہے باہر پھینک دے گی اور خالی ہو جائے گی۔"

آیت 2 وَقَالَ الْإِنْسَانُ مَا لَهَا: ہر انسان ہی اچانک پیش آنے والے واقعات سے دہشت زدہ ہو کر یہ الفاظ کہے گا۔ خصوصاً کافر جو قیامت کا منکر تھا، اس کے لیے تو یہ بات حد سے بڑھ کر تعجب انگیز ہوگی۔

آیت 4 يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا: یعنی زمین وہ سب کچھ بیان کرے گی جو اس پر کیا گیا اور بتائے گی کہ کس نے کس وقت کیا نیکی یا کیا بدی کی۔

کیا اسے حاضر پائیں گے اور تیرا رب کسی پر ظلم نہیں کرتا۔“ البتہ اعمال کی جزا اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے اصول کے مطابق ہوگی۔ چنانچہ کافروں کے اعمال ضائع کر دیے جائیں گے، انھیں آخرت کے بجائے دنیا ہی میں بدلا دے دیا جائے گا۔ (دیکھیے اعراف: ۱۳۷۔ احقاف: ۲۰) اور انھیں کوئی سفارش فائدہ نہیں دے گی۔ دیکھیے سورہ مدثر (۲۸)۔

قرآن مجید اور صحیح احادیث کی روشنی میں ان کے اعمال ضائع ہونے اور سفارش کے مفید نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ جہنم سے نہیں نکل سکیں گے، ان پر جنت حرام ہے۔ البتہ بعض اعمال یا کسی شفاعت کی وجہ سے عذاب میں تخفیف ہو سکتی ہے، جیسا کہ ابوطالب کو صرف آگ کا جوتا پہنایا جائے گا اور کفار اپنے اپنے اعمال کے لحاظ سے جہنم کے مختلف درجات میں ہوں گے۔ منافقین آگ کے سب سے نچلے حصے میں ہوں گے۔ (دیکھیے نساء: ۱۳۵) اہل ایمان کو ان کی برائیوں کی سزا تپ ملے گی جب یہ شرطیں موجود ہوں: ① گناہ کبیرہ ہوں۔ (دیکھیے نساء: ۳۱) ② ان سے تو یہ کیے بغیر فوت ہو جائیں۔ ③ ان کی نیکیاں میزان میں بھاری نہ ہو سکیں۔ ④ ان کے حق میں کوئی سفارش قبول نہ ہو۔ ⑤ ان کا کوئی عمل ایسا نہ ہو جس سے وہ مغفرت کے مستحق ہو چکے ہوں، مثلاً اہل بدر۔ ⑥ اللہ تعالیٰ نے وہ گناہ معاف نہ کیا ہو، کیونکہ گناہ گار مومن اللہ کی مرضی پر ہے، وہ چاہے تو اسے عذاب دے، چاہے تو بخش دے۔

⑦ رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کو جامع اور بے نظیر آیت قرار دیا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے گھوڑوں کے متعلق فرمایا: «الْخَيْلُ بِلَاثَةِ: الرَّجُلِ الْأَعْرَبِ وَالرَّجُلِ الْمَسْرُورِ وَالرَّجُلِ الْوَزْرُ» ”گھوڑے تین طرح کے لوگوں کے لیے ہیں، ایک آدمی کے لیے اجر ہیں اور ایک آدمی کے لیے پردہ ہیں اور ایک آدمی پر بوجھ ہیں۔“ اس پر آپ ﷺ سے گدھوں کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: «مَا أَنْزَلَ اللَّهُ عَلَيَّ فِيهَا إِلَّا هَذِهِ الْآيَةَ الْفَاذَةَ الْخَامِعَةَ: ﴿مَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ﴾ وَ مَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ﴾» [بخاری، التفسیر، باب فوله: ﴿مَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ﴾: ۱۴۹۶۲] ”اللہ نے اس کے متعلق اس بے نظیر و جامع آیت کے علاوہ مجھ پر کچھ نازل نہیں فرمایا: ”تو جو شخص ایک ذرہ برابر نیکی کرے گا اسے دیکھ لے گا اور جو شخص ایک ذرہ برابر برائی کرے گا اسے دیکھ لے گا۔“



إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُودٌ ۝ وَإِنَّهُ عَلَىٰ ذَلِكٍ لَّشَهِيدٌ ۝ وَإِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ ۝
 أَفَلَا يَعْلَمُ إِذَا بُعِثَ رَافٍ الْقُبُورِ ۝

بے شک انسان اپنے رب کا یقیناً بہت ناشکرا ہے ① اور بے شک وہ اس بات پر یقیناً (خود) گواہ ہے ② اور بے شک وہ مال کی محبت میں یقیناً بہت سخت ہے ③ تو کیا وہ نہیں جانتا جب قبروں میں جو کچھ ہے باہر نکال پھینکا جائے گا ④

آیت 7.6 إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُودٌ.....: "كُنُودٌ يَكْنُودُ" (ن) "كُنُودًا" (کاف کے ضمہ کے ساتھ) "الْبَغْمَةُ"

نعت کا انکار کرنا، ناشکری کرنا۔ "كُنُودٌ" (کاف کے فتح کے ساتھ) بروزن "فَعُولٌ" بمعنی فاعل برائے مبالغہ ہے، بہت ناشکری کرنے والا۔ یہ مذکر و مؤنث دونوں کے لیے آتا ہے۔ اصل میں "كُنُودٌ" اس زمین کو کہتے ہیں جو کوئی چیز نہ اگاتی ہو۔

اس سورت میں پہلی پانچ آیات میں قسمیں اٹھانے کے بعد چھٹی آیت میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ انسان یقیناً اپنے رب کا ناشکرا ہے۔ یہ پانچوں قسمیں اس دعوے کی دلیل اور شاہد کے طور پر لائی گئی ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ گھوڑے اپنے مالک کے ایسے وفادار اور شکر گزار ہیں کہ رات جب وہ انھیں لے کر نکلتے ہیں تو وہ بلا چون و چرا چل پڑتے ہیں، نہ اپنے آرام کی پروا کرتے ہیں اور نہ رات کی تاریکی کی، پھر وہ مالک کے کہنے پر صدق نیت کے ساتھ اس طرح سر پیٹ دوتے ہیں کہ ان کے جوف سے آواز نکلنے لگتی ہے اور تیزی سے دوڑتے ہوئے ان کے سُم جہاں پڑتے ہیں ان کی ٹھوکر اور رگڑ کے ساتھ پتھروں سے چنگاریاں نکلتی جاتی ہیں۔ پھر صبح کے وقت جب ہر چیز آرام کر رہی ہوتی ہے، ان کے مالک انھیں لے کر دشمن کو لوٹنے کے لیے دھاوا بولتے ہیں تو اس وقت بھی وہ غبار اڑاتے ہوئے دوڑتے چلے جاتے ہیں، خواہ غبار کے ساتھ سانس گھٹ رہا ہو، یا آگے دشمن کی تواریں، تیر اور نیزے ان کے سینے چھید رہے ہوں، یہ کسی بھی چیز کی پروا نہ کرتے ہوئے اسی حالت میں دشمن کی جماعت کے وسط میں جا گھستے ہیں۔ گھوڑے اپنے اس مالک کے لیے اتنی لگ و دو کرتے ہیں جو ان کی تھوڑی بہت خدمت کرتا ہے، جس نے نہ انھیں پیدا کیا ہے اور نہ ان کا حقیقی رازق ہے، تو کیا انسان اللہ تعالیٰ کے کہنے پر جو اس کا خالق بھی ہے، مالک اور رازق بھی اتنی لگ و دو کرنے اور قربانی دینے پر تیار ہے؟ وہ خود مانے گا کہ یقیناً نہیں، تو پھر اس کے ناشکرا ہونے میں کیا شک ہے؟

آیت 8 وَ إِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ: یعنی اس ناشکری کا سبب مال کی شدید محبت اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی

حرص، طمع اور بخل کی بد عادتیں ہیں جن کی وجہ سے یہ اپنے منعم حقیقی کو بھلا دیتا ہے۔

آیت 9 أَفَلَا يَعْلَمُ إِذَا بُعِثَ رَافٍ الْقُبُورِ: یعنی انسان اپنے رب کی ناشکری کرتا ہے اور مال سے شدید محبت کی وجہ

سے اپنے مالک کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہے، تو کیا وہ اس وقت کو نہیں جانتا جب وہ سب کچھ نکال دے اور پھینکا جائے گا جو قبروں میں ہے اور ان میں موجود تمام مردوں کو زندہ کر کے قبروں سے نکال باہر کیا جائے گا؟ "أَفَلَا يَعْلَمُ" (تو

کیا وہ اس وقت کو نہیں جانتا) کا مطلب یہ ہے کہ کیا وہ اس وقت سے نہیں ڈرتا کہ اپنے مالک کو کیا جواب دے گا؟

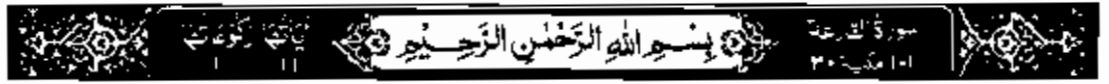
وَحُضِلَ مَا فِي الصُّدُورِ ۝ إِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيرٌ ۝

اور جو کچھ سینوں میں ہے ظاہر کر دیا جائے گا ۝ بے شک ان کا رب اس دن ان کے متعلق یقیناً خوب خبر رکھنے والا ہے ۝

آیت 10 : وَحُضِلَ مَا فِي الصُّدُورِ: دوسرے اعمال تو پہلے ہی ظاہر ہو چکے تھے، مگر دل کی نیت اور ارادے کے متعلق خیال ہو سکتا تھا کہ اسے کون جانتا ہے، تو اس وقت وہ بھی ظاہر کر دیے جائیں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿يَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ﴾ (الطارق: ۹) ”جس دن پوشیدہ راز ظاہر کیے جائیں گے۔“

آیت 11 : إِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيرٌ: اس آیت پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ رب تعالیٰ تو ہمیشہ ہی بندوں کے حالات سے باخبر ہے، پھر اس دن کو خاص کیوں فرمایا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس دن جب ظاہری اعضا سے سرزد ہونے والے اعمال کے علاوہ دلوں کے اعمال ظاہر کر کے ان کی بھی جزا و سزا دی جائے گی، تو اگر پہلے کسی کو شک تھا تو اس دن وہ بھی دور ہو جائے گا کہ یقیناً ان کا رب ان کے متعلق خوب خبر رکھنے والا ہے۔





القَارِعَةُ ۱ مَا الْقَارِعَةُ ۲ وَمَا أَذْرُكَ مَا الْقَارِعَةُ ۳ يَوْمَ يَكُونُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ

المَبْتُوثِ ۴

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

وہ کھٹکھٹانے والی ① کیا ہے وہ کھٹکھٹانے والی؟ ② اور تجھے کس چیز نے معلوم کروایا کہ وہ کھٹکھٹانے والی کیا ہے؟ ③ جس دن لوگ بکھرے ہوئے پروانوں کی طرح ہو جائیں گے ④

یہ سورت مکی ہے اور اس میں قیامت کے احوال، اعمال کے وزن اور ان کی جزا و سزا کا بیان ہے۔

آیت 1: الْقَارِعَةُ: "قَرَعٌ يَفْرَعُ قَرَعًا" (ف) شدت کے ساتھ دروازہ کھٹکھٹانا۔ "الْقَارِعَةُ" "الظَّامَةُ، الضَّاحَةُ، الْعَاثِيَةُ، الْغَاشِيَةُ" اور "الْوَاقِعَةُ" کی طرح قیامت کا ایک نام ہے، کیونکہ صور کی آواز کانوں اور دلوں بلکہ ہر چیز کے ساتھ شدت سے ٹکرائے گی، حتیٰ کہ اس آواز کی وجہ سے زمین اور پہاڑ بھی ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَحُمِلَتِ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَاحِدَةً﴾ [الحاقة: ۱۶] "اور زمین اور پہاڑوں کو اٹھایا جائے گا، پس دونوں ٹکرا دیے جائیں گے، ایک بار ٹکرا دینا۔"

آیت 3.2: مَا الْقَارِعَةُ ۲ وَمَا أَذْرُكَ مَا الْقَارِعَةُ ۳ یعنی وہ "القارعة" کیا ہے؟ کس قدر عجیب اور ترقی خوف ناک ہے؟ تجھے کس چیز نے معلوم کروایا کہ وہ "قارعة" کیا چیز ہے؟ یعنی وہ اتنی عظیم الشان اور عجیب و غریب ہے کہ مخلوق میں سے کوئی اس کی شدت و عظمت جانتا ہی نہیں کہ تجھے بتائے۔ ہاں، اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتا ہے، اس لیے اس نے خود ہی اگلی آیت میں اپنے فضل سے اس کا کچھ حال بیان فرمادیا۔

آیت 4: يَوْمَ يَكُونُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْتُوثِ ۴: "الْفَرَاشُ" اسم جنس ہے، مفرد کے لیے "فَرَّاشَةٌ" آتا ہے، پروانے۔ یعنی جس طرح پروانے بے شمار تعداد میں ایک دوسرے کے گرد اڑتے، گھومتے اور آپس میں ٹکراتے ہوئے آگ کی طرف تیزی سے جا رہے ہوتے ہیں اسی طرح سب لوگ ایسی ہی پریشانی اور تیزی کے ساتھ میدان محشر میں بلانے والے کی طرف جائیں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿نَحْنُ نَعْمَاءٌ ابْصَارُهُمْ تَخِرُّونَ مِنَ الْآجِدَاتِ كَمَا تَخِرُّونَ مِنَ الْبُرُوقِ فَتَطْعِنُونَ إِلَيْنَا فَنَنْزِلُكُمْ هُنَّاءً﴾ [الفرس: ۸۰.۷] "ان کی نظریں جھکن ہوں گی، وہ قبروں سے نکلیں گے جیسے وہ پھلی ہوئی مڑیاں ہوں۔ پکارنے والے کی طرف گردن اٹھا کر دوڑنے والے ہوں گے۔" اور فرمایا: ﴿فَمُهْطِعِينَ مُقْنِبِينَ زُؤُوبِهِمْ لَا يَبْتَئِدُوا إِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ ۚ وَ أَقْبَدْتُهُمْ هَوَاءً﴾ [زمر: ۴۳] "اس حال میں کہ تیز دوڑنے والے، اپنے سروں کو اوپر اٹھانے والے ہوں گے، ان کی نگاہ ان کی طرف نہیں لوٹے گی اور ان کے دل خالی ہوں گے۔" اور فرمایا: ﴿يَوْمَ يَصِفُّونَ الدَّاعِيَ لَا يَجْعَلُونَ لَهُ خُفًا﴾

وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوشِ ۝ فَأَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ ۖ فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَاضِيَةٍ ۝ وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ ۖ فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ ۝

اور پہاڑ دھکی ہوئی رنگین اون کی طرح ہو جائیں گے ۝ تو لیکن وہ شخص جس کے پلڑے بھاری ہو گئے ۝ تو وہ خوشی کی زندگی میں ہوگا ۝ اور لیکن وہ شخص جس کے پلڑے ہلکے ہو گئے ۝ تو اس کی ماں ہاویہ ہے ۝

۱۰۸] ”اس دن وہ پکارنے والے کا پیچھا کریں گے، جس کے لیے کوئی کچی نہ ہوگی۔“ اور وہاں پہنچ کر بھی انہیں قرار نہیں ہوگا، بلکہ اسی طرح بے قرار و بے تاب بھاگتے پھریں گے، فرمایا: ﴿يَوْمَ يَفْزُ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ..... لِكُلِّ امْرِئٍ مِنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ﴾ [عبس: ۳۴ تا ۳۷] ”جس دن آدمی اپنے بھائی سے بھاگے گا.... اس دن ان میں سے ہر شخص کی ایک ایسی حالت ہوگی جو اسے (دوسروں سے) بے پروا بنا دے گی۔“

آیت 5 وَ تَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوشِ: ”الْعِهْنُ“ اون یا رنگین اون۔ ”الْمَنْفُوشُ“ دھکی ہوئی۔ قیامت کے دن پہاڑ دھنک کر اون یا روئی کے گالوں کی طرح کر دیے جائیں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّي نَسْفًا﴾ [طہ: ۱۰۵] ”اور وہ تجھ سے پہاڑوں کے متعلق سوال کرتے ہیں، تو کہہ دے کہ میرا رب انہیں خوب اچھی طرح دھنک کر رکھ دے گا۔“ چونکہ پہاڑ سرخ، سیاہ، سفید اور بے شمار رنگوں والے ہیں، اس لیے جب وہ دھنکے جائیں گے تو رنگی اور دھکی ہوئی اون کی طرح ہو جائیں گے۔ قیامت کے دن پہاڑوں پر گزرنے والے مختلف احوال کے لیے دیکھیے سورہ نبا (۲۰) کی تفسیر۔

آیت 6 فَأَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ: ”مَوَازِينُ“ ”مِيزَانُ“ کی جمع ہے، ترازو۔ مراد ترازو کے پلڑے ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے سورہ اعراف (۹، ۸) کی تفسیر۔ اس کے بعد اعمال کا وزن ہوگا۔ ”مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ“ (جس کے پلڑے بھاری ہو گئے) سے مراد نیکوں کے پلڑے ہیں۔

آیت 7 فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَاضِيَةٍ: ”عَاشٌ يَعِيشُ عَيْشًا وَمَعَاشًا وَعِيشَةً وَمَعِيشَةً“ (ض) زندگی والا ہونا۔ ”عِيشَةٌ“ ”فِعْلَةٌ“ کے وزن پر مصدر ہے، جو حالت اور کیفیت پر دلالت کرتا ہے، تو ”عِيشَةٌ“ زندگی کی حالت۔ ”رَاضِيَةٌ“ ”رَضِيٌّ يَرْضَى رَضًا“ (س) سے ہے، یہاں ”رَاضِيَةٌ“ بمعنی ”ذَاتُ الرِّضَا“ ہے، یعنی خوشی والی زندگی، جیسے ”تَامِرٌ“ کھجور والے کو اور ”لَابِنٌ“ دودھ والے کو کہا جاتا ہے۔

آیت 98 وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ.....: ”هَوَىٰ هَوِيًّا“ (ض) گرنا۔ ”هَوِيَّةٌ“ کا لفظی معنی گڑھا ہے جس میں گرا جائے، مراد جہنم ہے۔ ”فَأُمُّهُ“ ”اس کی ماں“ مراد اس کا ٹھکانا ہے، جس طرح ماں اپنے بچے کو گود میں جگہ دیتی ہے۔

وَمَا أَدْرَاكَ مَا هَيْبَةُ ۙ نَارِ حَامِيَةٍ ۝۱۱

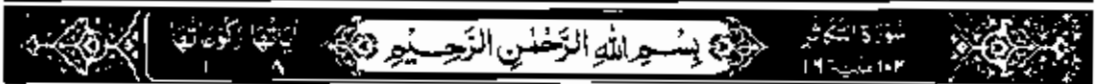
اور تجھے کس چیز نے معلوم کروایا کہ وہ کیا ہے؟ ۱۱ ایک سخت گرم آگ ہے ۱۱

آیت 10 ۱۰. وَمَا أَدْرَاكَ مَا هَيْبَةُ: "مَا أَدْرَاكَ" کے ساتھ سوال اس کی ہولناکی نمایاں کرنے کے لیے ہے۔

۱۱ "مَا هَيْبَةُ" اصل میں "ماہبی" ہے، وہ کیا ہے؟ یا، کے فتح کی حفاظت کے لیے وقف کے وقت اس کے بعد ساکن ہاء لگا دیتے ہیں، اسے ہائے وقف کہتے ہیں جو ملا کر پڑھیں تو گر جاتی ہے۔ بعض قراء ملا کر پڑھنے کی صورت میں بھی اسے باقی رکھتے ہیں۔

آیت 11 ۱۱. نَارِ حَامِيَةٍ: "حَامِيَةٍ" "حَمِي يَحْمِي حَمِيًّا" (س) (گرم ہونا) سے اسم فاعل ہے، یعنی وہ ہاویہ صرف ایک بے انتہا گہرا گڑھا ہی نہیں بلکہ سراسر آگ ہے، جو سخت گرم ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «نَارُكُمْ جُزْءٌ مِّنْ سَبْعِينَ جُزْءًا مِّنْ نَّارِ جَهَنَّمَ» | بخاری، بدء الخلق، باب صفة النار وانها مخلوقة: ۱۳۶۶۵ | "تمہاری آگ جہنم کی آگ کے سز (۷۰) حصوں میں سے ایک حصہ ہے۔" اللہ ہمیں اس سے محفوظ رکھے۔ (آمین)





أَلْهَكُمُ التَّكَاثُرُ ① حَتَّى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ②

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا نہایت مہربان ہے۔

تھیں ایک دوسرے سے زیادہ حاصل کرنے کی حرص نے غافل کر دیا ① یہاں تک کہ تم نے قبرستان جا دیکھے ②

ابو مطرف رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، آپ ”أَلْهَكُمُ التَّكَاثُرُ“ تلاوت فرما رہے تھے۔ آپ نے فرمایا: «يَقُولُ ابْنُ آدَمَ مَاتِي، مَاتِي، قَالَ وَهَلْ لَكَ يَا ابْنَ آدَمَ! مِنْ مَالِكَ إِلَّا مَا أَكَلْتَ فَأَنْفَيْتَ أَوْ لَبَسْتَ فَأَلْبَيْتَ أَوْ تَعَدَّدْتَ فَأَمْضَيْتَ؟» [مسند، الزهد، الرافعي، باب الدنيا سجن للمؤمن : ۲۹۵۸] ”ابن آدم کہتا ہے میرا مال، میرا مال، حالانکہ اے آدم کے بیٹے! تیرے مال میں سے تیرا مال تو صرف وہی ہے جو تو نے کھایا اور فنا کر دیا، یا پہنا اور پرانا کر دیا، یا صدق کیا اور آگے بھیج دیا۔“

آیت 1 ① أَلْهَكُمُ التَّكَاثُرُ: ”الہی یلہی“ ”لہو“ سے ہے، جس کا معنی ہے ”کسی چیز کے ساتھ اتنا لگاؤ اور دلچسپی جو اسے اہم چیزوں سے غافل کر دے۔“ ”التکاثُرُ“ ”تکثُرُة“ سے یا ب تفاعل کا مصدر ہے، جس میں تشارک کا معنی پایا جاتا ہے، یعنی ایک دوسرے سے زیادہ حاصل کرنے کی کوشش۔ مال و اولاد اور چاہ و شرف، الغرض دنیا کی ہر چیز دوسرے تمام لوگوں سے زیادہ حاصل کرنے کی حرص اور پھر حاصل ہو جانے پر دوسروں پر فخر کرنا۔

② اس حرص کی حد کیا ہے؟ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «لَوْ سَكَانَ لِابْنِ آدَمَ وَآدِيَانِ مِنْ مَالٍ لَا يَنْفَعِي ثَابِتًا، وَلَا يَنْفَعِي خَوْفَ ابْنِ آدَمَ إِلَّا التُّرَابُ، وَيَتَوَبُّ اللَّهُ عَلَى مَنْ تَابَ» [بخاری، الرافعي، باب ما ينفع من فضة المال : ۶۴۳۶] ”اگر ابن آدم کے پاس مال کی بھری ہوئی دو وادیاں ہوں تو وہ تیسری وادی تلاش کرے گا اور آدم کے بیٹے کے پیٹ کو مٹی کے علاوہ کوئی چیز نہیں بھرتی اور اللہ اس کی طرف پلٹ آتا ہے جو واپس پلٹ آئے۔“ سب سے زیادہ نقصان دہ حرص دو چیزوں کی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «مَا ذُنُوبَانِ جَاءَتَانِ أُرْسِلَانِ أُرْسِلًا قَبِي غَنِيمٍ يَأْفَسِدُنِي لَهَا مِنْ جِرَاصِ الْمَرْءِ عَلَى الْمَالِ وَالشَّرَفِ لِدِينِهِ» [ترمذی، الزهد، باب حديث ما ذلجان جالغان : ۲۳۷۶، وصححه الألبانی] ”دو بھوکے بھیڑیے جو بھیڑ بھریوں میں چھوڑ دیے جائیں، وہ انھیں اتنا خراب نہیں کرتے جتنا آدمی کے مال اور شرف (اونچا ہونے) کی حرص اس کے دین کو خراب کرتی ہے۔“

③ کس چیز سے غافل کر دیا؟ اللہ کے احکام سے، اس کے دین سے اور آخرت سے۔

آیت 2 ② حَتَّى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ: ”زُرْتُمُ“ ”زَارَ يَزُورُ زِيَارَةً“ (ن) (منے کے لیے جانا) سے ماضی معلوم ہے۔ ”الْمَقَابِرُ“ ”مَقْبَرَةٌ“ کی جمع ہے جو ”قَبْرٌ يَقْبُرُ قَبْرًا“ (ن) (دفن کرنا) سے اسم ظرف ہے، دفن کی جگہیں، قبرستان۔ ”زُرْتُمُ“

كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ ﴿٥﴾ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ ﴿٦﴾ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ ﴿٧﴾

لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ ﴿٨﴾ ثُمَّ لَتَرَوْهَا عَيْنَ الْيَقِينِ ﴿٩﴾ ثُمَّ لَتَسْأَلُنَّ يَوْمَئِذٍ النَّعِيمَ ﴿١٠﴾

ہرگز نہیں، تم جلدی جان لو گے ﴿۵﴾ پھر ہرگز نہیں، تم جلدی جان لو گے ﴿۶﴾ ہرگز نہیں، کاش! تم جان لیتے، یقین کا جاننا ﴿۷﴾ کہ یقیناً تم ضرور جہنم کو دیکھو گے ﴿۸﴾ پھر یقیناً تم ضرور اسے یقین کی آنکھ سے دیکھ لو گے ﴿۹﴾ پھر یقیناً تم اس دن نعمتوں کے بارے میں ضرور پوچھے جاؤ گے ﴿۱۰﴾

التَّعَابُرُ“ (قبرستان جا دیکھ) کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری موت آگئی، یعنی موت آنے تک یہ غفلت طاری رہی، بلکہ جیسے جیسے موت قریب آتی گئی غفلت کا یہ نشہ بڑھتا گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «يَكْبُرُ ابْنُ آدَمَ، وَ يَكْبُرُ مَعَهُ التَّنَانِ حُتُّ النَّعَالِ، وَ طَوْلُ النَّعْمِ» | بخاری، الترقا، باب من بلغ سنين سنه..... : ۶۶۲۱ | ”آدمی بڑا ہوتا جاتا ہے اور اس کے ساتھ دو چیزیں بڑی ہوتی جاتی ہیں، مال کی محبت اور لمبی عمر کی محبت۔“

آیت 43 : كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ یعنی اپنی غفلت کا انجام جان لو گے۔ تاکید کے لیے بات دہرائی ہے۔

آیت 75 : كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ : ”لَتَرَوُنَّ“ ”زای یزی رُوِيَّة“ (ف) (دیکھنا) سے جمع حاضر فعل مضارع معلوم بانون تاکید ثقیلہ ہے، تم ضرور بالضرور دیکھو گے۔ ان آیات کی تفسیر کے لیے دیکھیے سورہ حاقہ کی آیت (۵۱) کی تفسیر۔ مسلمان اور کافر سبھی جہنم کو دیکھیں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَإِنْ مِنْكُمْ آلَا وَآرِدْهَا﴾ | مرید: ۱۷۱ | ”تم میں سے ہر کوئی اس پر وارد ہوگا۔“ پھر اسے یقین کی آنکھ سے دیکھ لیں گے، کوئی شک و شبہ نہیں رہے گا۔

آیت 8 : ثُمَّ لَتَسْأَلُنَّ يَوْمَئِذٍ النَّعِيمَ : یعنی صحت و عافیت، کھانے پینے اور دوسری تمام نعمتوں کے بارے میں

سوال ہوگا کہ ان کا کہاں تک شہر ادا کیا؟ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی چھوٹی سے چھوٹی لذت اور معمولی سے معمولی عافیت ایسی نہیں جس کے بارے میں سوال نہ ہو۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک دن نبی ﷺ اور ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما بھوک کی وجہ سے گھر سے نکلے اور ایک انصاری کے گھر آئے، اس نے مہمانی میں کھجوریں اور کبری کا گوشت پیش کیا۔ آپ نے گوشت اور کھجوریں کھائیں اور اوپر سے شیریں پانی پیا۔ جب خوب سیر ہو چکے تو آپ ﷺ نے فرمایا: «وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ! لَتَسْأَلُنَّ عَنْ هَذَا النَّعِيمِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ» | مسلم، الأشراف، باب جواز استناعه غيره : ۲۰۳۸ | ”اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! تم سے قیامت کے دن اس نعمت کے بارے میں (بھی) سوال ہوگا۔“



وَالْعَصْرِ ۱ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ ۝ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَّصُوا

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

زمانے کی قسم! ① کہ بے شک ہر انسان یقیناً گھٹائے میں ہے ② سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور انھوں نے

یہ سورت قرآن مجید کی مختصر ترین سورتوں میں سے ایک ہے، مگر نہایت جامع سورت ہے۔ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے ”مفتاح دار السعادة“ میں فرماتے ہیں کہ شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ”اگر لوگ اس سورت میں غور و فکر کریں تو یہی ان کے لیے کافی ہے۔“

آیت 1-3 ① وَالْعَصْرِ ۱ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ: قرآن مجید میں مذکور قسمیں عام طور پر اس دعویٰ کی دلیل

ہوتی ہیں جو قسموں کے بعد مذکور ہوتا ہے۔ اس سورت کا مفہوم سمجھنے کے لیے خسارے کا مفہوم ذہن میں لانا ضروری ہے۔ خسارہ یا نفع کسی نہ کسی تجارت اور بیع میں ہوتا ہے جس میں آدمی اپنا راس المال (سرمایہ) لگاتا ہے، اگر راس المال فروخت ہو جائے اور راس المال اور محنت سے بڑھ کر آمدنی ہو جائے تو یہ نفع ہے، ورنہ خسارہ۔ اس سورت میں زمانے کی قسم کھا کر یہ حقیقت مدلل کی گئی ہے کہ چار صفات والے لوگوں کو چھوڑ کر ہر انسان ہی خسارے میں ہے، کیونکہ انسان کے پاس راس المال صرف اور صرف زمانے کا کچھ حصہ یعنی اس کی عمر ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿أَوَلَمْ نَعْتَدْكُمْ فَنَاطِلًا كُرْفِيهِ فَن تَذَكَّرُوْا جَاءَكُمْ التَّذْيِيْرُ﴾ [فاطر: ۳۷] ”اور کیا ہم نے تمہیں اتنی عمر نہیں دی کہ اس میں جو نصیحت حاصل کرنا چاہتا حاصل کر لیتا اور تمہارے پاس خاص ڈرانے والا بھی آیا۔“ اور یہ سرمایہ ایسا ہے جو بہت تیزی سے خود بخود ختم ہو رہا ہے، اگر ختم ہونے سے پہلے پہلے اس سے قیمتی چیز، یعنی وہ چاروں صفات حاصل کر لیں تو نفع ہے ورنہ خسارہ ہی خسارہ ہے۔ جس طرح برف بیچنے والا اس کے پھلنے سے پہلے پہلے اسے فروخت کر لے اور اس کی اچھی قیمت حاصل کر لے تو نفع ہے، ورنہ برف اس کا انتظار نہیں کرے گی بلکہ کچھ دیر کے بعد خود بخود تحلیل ہو جائے گی، پھر اس کے خسارے میں کیا شک ہے؟

② إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ: حقیقت یہ ہے کہ انسان کا خسارے سے بچنا بہت ہی مشکل ہے، کیونکہ خسارہ راس المال ضائع کرنے کا نام ہے اور انسان کا راس المال عمر ہے اور ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ آدمی اپنی عمر ضائع نہ کر رہا ہو، کیونکہ آدمی پر جو گھڑی گزرتی ہے اگر اللہ کی نافرمانی میں گزری تو خسارے میں کوئی شک ہی نہیں، اگر مباح اور جائز کاموں میں گزری پھر بھی خسارہ ہے، کیونکہ اس گھڑی سے آدمی آخرت کے لیے کچھ حاصل نہ کر سکا اور اگر اطاعت اور نیکی میں گزری تو یہی نیکی اس سے بہتر طریقے پر یا اس سے بہتر کوئی اور نیکی بھی کر سکتا تھا، کیونکہ نیکی کے درجات کی کوئی انتہا نہیں اور اللہ کے جلال و قہر کے مراتب کی بھی کوئی انتہا نہیں۔ اب جس قدر کسی شخص کو ان درجات کا علم ہوگا، ان پر عمل کرے گا اور دوسروں کو ان کی تعلیم دے گا اور خود صبر اور دوسروں کو صبر کی تلقین کرے گا، تو اسی قدر خسارہ کم ہوتا جائے گا، ورنہ اعلیٰ درجے کو چھوڑ کر ادنیٰ درجے پر اکتفا تو ایک قسم کا خسارہ ہی ہے۔ خلاصہ یہ کہ انسان کسی نہ کسی قسم کے خسارے سے ضرور ہی دوچار رہتا ہے۔ (خلاصہ از رازی)

بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝

نیک اعمال کیے اور ایک دوسرے کو حق کی وصیت کی اور ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کی ۝

۳ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ: بعض لوگوں نے اس سورت سے ثابت کیا ہے کہ اعمال ایمان سے الگ ہیں، اس میں داخل نہیں ہیں، وہ نہ ہوں تب بھی ایمان کامل ہے، کیونکہ دونوں کو عطف کے ساتھ الگ الگ ذکر کیا گیا ہے۔ مگر یہ بات درست نہیں، بلکہ ایمان دل، زبان اور ارکان تینوں کے اعمال کا نام ہے۔ اگر عطف کی وجہ سے یہ دونوں الگ الگ ہیں تو پھر ماننا پڑے گا کہ حق کی وصیت عمل صالح میں شامل نہیں، بلکہ عمل صالح سے الگ کوئی چیز ہے۔ اسی طرح صبر کی وصیت حق کی وصیت اور عمل صالح دونوں سے الگ کوئی چیز ہے، جب کہ یہ تینوں باتیں ہی درست نہیں۔ حق یہ ہے کہ ایمان کے بعد عمل صالح کو الگ اس لیے ذکر کیا کہ ایمان کے اس جز کو کوئی شخص معمولی سمجھ کر اس سے بے اعتنائی نہ کر بیٹھے اور عمل صالح میں سے حق کی وصیت اور صبر کی وصیت کو الگ اس لیے ذکر فرمایا کہ کوئی شخص اپنی ذات کی حد تک عمل صالح کر کے یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ میں اب خسارے سے محفوظ ہوں۔ نہیں، بلکہ اسے یہ علم و عمل اور اس پر صبر دوسروں کو بھی سکھانا ہوگا۔

۴ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ: خسارے سے بچنے کے لیے عمل سے خالی ایمان کافی نہیں اور نہ صرف خود عمل کر لینا کافی ہے، بلکہ ایک دوسرے کو حق بات کی تاکید کرنا بھی ضروری ہے۔ حق سے مراد وہ ہدایت ہے جو وحی کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی، جس میں قرآن و حدیث دونوں شامل ہیں۔ پھر ان تینوں چیزوں یعنی حق پر ایمان لانے، اس پر عمل کرنے اور اسے دوسروں تک پہنچانے میں بے شمار مصائب و تکالیف پیش آ سکتی ہیں، ان پر خود صبر کرنا ہوگا اور تمام مسلمانوں پر لازم ہوگا کہ وہ ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کریں۔ یہاں ”تَوَاصَوْا“ (ایک دوسرے کو وصیت کریں) فرمایا ہے، ”أَوْصَوْا“ (وصیت کریں) نہیں فرمایا، جس کا مطلب یہ ہے کہ سب مسلمان ایک دوسرے کو حق اور صبر کی وصیت کرتے ہیں۔ چند آدمیوں کے ادا کرنے سے یہ فرض ادا نہیں ہوتا۔

۵ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ: صبر کا معنی باندھنا اور روکنا ہے۔ یہ تین قسم کا ہے: ① حق پر صبر اور اس کی مسلسل پابندی، مثلاً توحید، اتباع سنت اور نماز روزہ پر پابند رہنا۔ ② برائی سے صبر، مثلاً شرک، زنا، قتل ناحق اور جھوٹ وغیرہ سے صبر۔ ③ مصیبت پر صبر اور ہر قسم کے جزع فزع سے پرہیز۔



وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۝ ١ الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ ۝

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

بڑی ہلاکت ہے ہر بہت طعنہ دینے والے، بہت عیب لگانے والے کے لیے ① وہ جس نے مال جمع کیا اور اسے گن گن کر رکھا ②

آیت 1 : وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ : ”هُمَزَةٌ لُّمَزَةٌ“ ”هُمَزٌ يَهُمَزُ هُمَزًا“ (نض) اور ”لُمَزٌ يَلْمُزُ لُمَزًا“ (نض) سے مبالغے کے صیغے ہیں، دونوں کے معنی آپس میں اس قدر ملتے ہیں کہ بعض نے انہیں ہم معنی قرار دیا ہے اور بعض نے فرق کیا ہے۔ دونوں کے مفہوم میں ”اشارہ بازی، طعن اور عیب لگانا“ شامل ہے۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَلَا تَطْعَمُ كُلَّ حَلَاظٍ مَّهِينٍ ۝ هَذَا مَثَلٌ بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ﴾ [القلم: ۱۱، ۱۰] ”ہر بہت قسمیں کھانے والے حقیر کی اطاعت نہ کر۔ جو بہت طعنہ مارنے والا (یا عیب لگانے والا)، چغلی میں بہت دوڑ دھوپ کرنے والا ہے۔“ اور فرمایا: ﴿وَلَا تَلْمِزُوا أَنْفُسَكُمْ﴾ [الحجرات: ۱۱] ”اور تم آپس میں عیب نہ لگاؤ۔“

آیت 2 : ① الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ : یعنی لوگوں کی عیب جوئی، ان پر طعنہ زنی اور ان کی تحقیر کا اصل باعث اس کی مال جمع کرنے کی حد سے بڑھی ہوئی خواہش اور شدید بخل ہے۔ اس بخل نے چونکہ اس میں فراخ دلی یا ہمدردی وغیرہ کی کوئی خوبی باقی نہیں چھوڑی، اس لیے وہ اپنی حسرت و کمینگی پر پردہ ڈالنے کے لیے ہر صاحب خیر پر طعن کرتا اور اس کی عیب جوئی کرتا ہے، تاکہ کوئی اس کے بخل و حرص کی مذمت کی طرف متوجہ ہی نہ ہو سکے۔ منافقین بھی یہی کام کرتے تھے، فرمایا: ﴿الَّذِينَ يَلْمِزُونَ الْمُطَّوِّعِينَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ فِي الصَّدَقَاتِ وَالَّذِينَ لَا يَجِدُونَ إِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُونَ مِنْهُمْ﴾ [التوبة: ۷۹] ”یہ وہ لوگ ہیں جو خوشی سے صدقہ کرنے والے مومنوں پر طعنہ زنی کرتے ہیں اور ان پر بھی جن کے پاس اپنی محنت کی کمائی کے علاوہ کچھ نہیں، سو یہ ان سے مذاق کرتے ہیں۔“ اس کے علاوہ وہ زیادہ سے زیادہ مال جمع کرنے کے لیے دوسروں کی بدگوئی اور عیب جوئی کرتا ہے اور اپنے آپ کو صاف ستھرا ظاہر کرتا ہے، تاکہ لوگ ہر سودے اور ہر کام میں کسی اور سے معاملہ کرنے کے بجائے صرف اس سے معاملہ کریں اور اس کا مال بڑھتا رہے۔ اگر ”هُمَزَةٌ لُّمَزَةٌ“ کا واضح نقشہ دیکھنا ہو تو جمہوری انتخابات میں کھڑے ہونے والے امیدواروں کے بیانات پڑھ لیں کہ وہ سیٹ کے حصول کے لیے اپنے حریفوں پر کس قدر طعن اور بہتان تراشی کرتے ہیں۔

② یعنی مال جو انسان کی ضرورت پوری کرنے اور آسائش حاصل کرنے کا ذریعہ تھا، وہ اس کے لیے اصل مطلوب بن گیا۔ اب وہ اسی کو جمع کرنے اور گن گن کر رکھنے کی ذہن میں لگا ہوا ہے۔

يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ ۖ كَلَّا لَيُنْبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۗ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْحُطَمَةُ ۗ
تَارَ اللَّهُ الْمُوقَدَةَ ۖ

وہ گمان کرتا ہے کہ اس کے مال نے اسے ہمیشہ رہنے والا بنا دیا ۵ ہرگز نہیں، یقیناً وہ ضرور حُطْمہ میں پھینکا جائے گا
۶ اور تجھے کس چیز نے معلوم کر دیا کہ وہ حُطْمہ کیا ہے؟ ۷ اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے ۸

آیت 3 يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ: "خَلَدٌ يَخْلُدُ خُلُودًا" (ن) ہمیشہ رہنا اور "أَخْلَدُ يُخْلِدُ إِخْلَادًا" (افعال) ہمیشہ رہنے والا بنا دیتا۔ "أَخْلَدَهُ" ماضی کا صیغہ ہے، اس لیے آیت کا ترجمہ کیا گیا ہے: "وہ گمان کرتا ہے کہ اس کے مال نے اسے ہمیشہ رہنے والا بنا دیا۔" اس کا طرز عمل بتاتا ہے کہ وہ مال کو موت سے بچانے والا سمجھتا ہے، کیونکہ اتنی عمر ہونے کے باوجود وہ مال جمع ہی کرتا جاتا ہے، نہ اللہ کا حق ادا کرتا ہے نہ بندوں کا، تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ یہ جمع کیا ہوا مال اسے مرنے نہیں دے گا بلکہ ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ ورنہ ساٹھ ستر برس کی عمر میں اپنے لیے کروڑوں اربوں روپے جمع کرنے اور سیکڑوں برس باقی رہنے والی پختہ اور مضبوط عمارتیں بنانے کا اس کے سوا کیا مطلب ہے کہ یہ مال اور عمارتیں اسے ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔ ہود علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا تھا: ﴿أَتَبْنُونَ بِكُلِّ رِيعٍ آيَةً تَعْبَثُونَ ۖ وَتَتَّخِذُونَ فَصَائِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُونَ﴾ [الشعراء: ۱۶۲۸، ۱۶۲۹] "کیا تم ہر اونچی جگہ پر ایک یادگار بناتے ہو؟ اس حال میں کہ لا حاصل کام کرتے ہو۔ اور بڑی بڑی عمارتیں بناتے ہو، شاید کہ تم ہمیشہ رہو گے۔"

آیت 4 كَلَّا لَيُنْبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ: "نَبَذَ يَنْبِذُ نَبْذًا" (ض) (کسی چیز کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے پھینک دینا) سے واحد مذکر غائب مضارع مجہول بانون تاکید تھیلہ ہے جو قسم کا مفہوم ادا کرتا ہے، یعنی یہ خیال ہرگز درست نہیں، بلکہ قسمیہ بات یہ ہے کہ اسے ہر حال میں اس دنیا سے جانا ہے۔ پھر اسے اس کے بُرے اعمال کی پاداش میں "حُطْمہ" میں پھینک دیا جائے گا۔ پھینکنے کے لفظ سے اس کی تذلیل و تحقیر نمایاں ہو رہی ہے۔

آیت 5 وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْحُطَمَةُ: یہ سوال اس کی ہولناکی بیان کرنے کے لیے ہے، یعنی تم جان ہی نہیں سکتے کہ وہ کس قدر خوف ناک چیز ہے۔ "الْحُطَمَةُ" "حَطَمَ يَحْطِمُ" (ض) سے مبالغے کا صیغہ ہے، یعنی بہت ہی زیادہ توڑ پھوڑ دینے والی۔ اس میں جو چیز ڈالی جائے گی اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دے گی، بلکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿لَقَدْ رَأَيْتُ جَهَنَّمَ يَحْطِمُ بَعْضُهَا بَعْضًا﴾ [بحاری، العمل فی الصلاة، باب إذا اغلقت آذاناً فی الصلاة: ۱۶۱۲] "یقیناً میں نے جہنم کو دیکھا کہ اس کے اپنے حصے ایک دوسرے کو توڑ رہے تھے۔"

آیت 6 تَارَ اللَّهُ الْمُوقَدَةَ: "تَارَ اللَّهُ" (اللہ کی آگ) اور "الْمُوقَدَةُ" (بھڑکائی ہوئی) کہنے میں اس آگ کی جو ہولناکی بیان ہوئی ہے وہ کسی اور لفظ میں بیان ہو ہی نہیں سکتی۔

الَّتِي تَظَلُّعُ عَلَى الْأَفِيدَةِ ۖ إِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّوَصَّدَةٌ ۗ فِي عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ۗ

وہ جو دلوں پر جھانکتی ہے ۛ یقیناً وہ ان پر (ہر طرف سے) بند کی ہوئی ہے ۛ لے لے ستونوں میں ۛ

آیت 7: "الَّتِي تَظَلُّعُ عَلَى الْأَفِيدَةِ": "تَظَلُّعٌ" "إِطَّلَعَ يَطْلَعُ إِطْلَاعًا" (افتعال) جھانکتا۔ "الْأَفِيدَةُ" "فُوَادٌ" کی جمع ہے، دل۔ "جو دلوں پر جھانکتی ہے" یعنی وہ صاحبِ شعور ہے، دلوں میں جو کفر و نفاق اور بخل و کینگی ہے یا ایمان اور سخاوت و کرم ہے سب دیکھ لیتی ہے اور جلاتی اسی کو ہے جو جلانے کے قابل ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی آگ بھی اگرچہ ہر چیز کو جلا ڈالتی ہے، مگر یہ آگ دل تک پہنچنے سے پہلے ہی آدمی کی موت واقع ہو جاتی ہے، جبکہ جہنم کی آگ جسم کو جلاتے ہوئے دل تک پہنچ جائے گی مگر آدمی مرے گا نہیں۔ دلوں تک آگ اس لیے پہنچے گی کہ دل ہی گندے عقائد، خبیث نیتوں اور کفر و نفاق کا مرکز ہے۔

آیت 9.8: "إِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّوَصَّدَةٌ.....": "أَوْصَدَ يُوْصِدُ إِوْصَادًا" (افعال) "الْأَبَابُ" دروازہ بند کر دینا۔ "مُّوَصَّدَةٌ" اسم مفعول ہے، بند کی ہوئی۔ "عَمَدٍ" "عَمُوْدٌ" کی جمع ہے، یعنی انھیں جہنم میں لے لے ستونوں کے ساتھ باندھ کر چاروں طرف سے بند کر دیا جائے گا، حتیٰ کہ کوئی دروازہ یا کھڑکی بلکہ کوئی شکاف یا درز بھی باقی نہیں چھوڑی جائے گی۔ "أَعَاذَنَا اللَّهُ مِنْهَا" [دوسرا معنی یہ ہے کہ اس آگ کے شعلے لے لے ستونوں کی شکل میں ہوں گے۔





اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحَابِ الْفِيلِ ۝۱

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

کیا تو نے نہیں دیکھا تیرے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کس طرح کیا ۝۱

اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے اہل مکہ پر اپنا احسان ذکر فرمایا ہے کہ اس نے کس معجزانہ طریقے سے بیت اللہ کی حفاظت فرمائی اور اس کو گرانے کے لیے آنے والوں کو تباہ و برباد کر دیا۔ اگر اللہ تعالیٰ اس بادشاہ کو برباد نہ کرتا تو اہل مکہ جس امن و چین اور آزادی کے ساتھ بیٹھے ہیں یہ امن و چین انھیں کہاں نصیب ہوتا؟ سیرت کی کتابوں میں لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس واقعہ کے پچاس یا پچپن روز بعد پیدا ہوئے۔

آیت 1 ۝۱ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ : ”اَلَمْ تَرَ“ کا لفظی معنی ہے ”کیا تو نے نہیں دیکھا؟“ مگر مجاہد فرماتے: (جو

ابن عباس رضی اللہ عنہما کے شاگرد ہیں) نے اس کا معنی کیا ہے: ”اَلَمْ تَعْلَمَ“ ”کیا تجھے معلوم نہیں؟“ [بخاری، التفسیر، باب سورۃ الفیل، قبل ح: ۱۹۶۴] جب قرآن اترا اس وقت یہ واقعہ اتنا معروف تھا گویا لوگوں کا آنکھوں دیکھا واقعہ ہو۔ بعض لوگوں نے اس لفظ سے یہ کشید کرنے کی کوشش کی ہے کہ نبی ﷺ نے یہ واقعہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور یہ کہ آپ عالم الغیب تھے۔ درحقیقت یہ کہنا کلام عرب اور اسلوب قرآن سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اَوْ لَمْ يَرِ الْاِنْسَانُ اَنَّا

خَلَقْنَاهُ مِنْ نُطْفَةٍ اِذْ اَهُوَ حَٰصِيْمٌ مُّؤَيِّنٌ﴾ [نہس: ۷۷] ”اور کیا انسان نے دیکھا نہیں کہ ہم نے اسے ایک نطفہ سے پیدا

کیا تو اچانک وہ کھلا جھگڑا لو ہے۔“ اب کیا کسی انسان نے اپنے آپ کو نطفہ سے پیدا ہوتے ہوئے دیکھا ہے؟ یہاں بھی یہی

مطلب ہے کہ ”کیا تجھے معلوم نہیں کہ تیرے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟“ ”اَلَمْ تَعْلَمَ“ (کیا تو نے نہیں جانا) کے

بجائے ”اَلَمْ تَرَ“ (کیا تو نے نہیں دیکھا) کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ اتنا یقینی واقعہ ہے کہ سمجھو تم نے اسے آنکھوں سے دیکھا ہے۔

② ”ہاتھی والوں“ سے مراد یمن کا ایک نصرانی حاکم ابرہہ اور اس کا لشکر ہے۔ ابرہہ نے ایک عظیم الشان گرجا بنا کر یہ چاہا کہ

لوگ کعبہ کی طرح اس کی زیارت کے لیے آیا کریں۔ جب وہ اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہو سکا تو وہ ایک بہت بڑا لشکر جس

کے ساتھ ہاتھی بھی تھے، اپنے ہمراہ لے کر بیت اللہ کو ڈھانے کی نیت سے مکہ پہنچا۔ جب مزدلفہ اور منیٰ کے درمیان اس وادی

میں پہنچا جس کا نام بعد میں وادی محشر پڑا تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے گروہ در گروہ پرندے نمودار ہوئے، جن کے پنجوں اور چونچوں

میں کنکر تھے، انھوں نے اس لشکر پر وہ کنکریاں پھینکیں جن سے ابرہہ اور اس کا لشکر ہلاک ہو گیا۔ یہ سیرت اور تاریخ میں مذکور

واقعے کا خلاصہ ہے۔ (دیکھیے سیرت ابن ہشام اور تفسیر ابن کثیر)

صحیح اسانید کے ساتھ رسول اللہ ﷺ سے بھی اس واقعے کا مختصر ذکر موجود ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ حَبَسَ

الْمُ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِي تَضْلِيلٍ ﴿٦﴾ وَ أَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا أَبَابِيلَ ﴿٧﴾ تَزْمِيهِمْ بِجَارِةٍ قَيْنٍ سَاجِدٍ ﴿٨﴾ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ فَأَنْقُولُ ﴿٩﴾

کیا اس نے ان کی تدبیر کو بے کار نہیں کر دیا؟ ﴿۶﴾ اور ان پر جُنُذ کے جُنُذ پرندے بھیج دیے ﴿۷﴾ جو ان پر کھگر (کھا ہوئی مٹی) کی پھریاں پھینکتے تھے ﴿۸﴾ تو اس نے انہیں کھائے ہوئے بھس کی طرح کر دیا ﴿۹﴾

عَنْ مَكَّةَ الْفَيْلِ ، وَ سَلَطَ عَلَيْهَا رَسُولُهُ وَ الْمُؤْمِنِينَ ، فَإِنَّهَا لَا تَحِلُّ لِأَحَدٍ كَانَ قَبْلِي ، وَ إِنَّمَا أُحِلَّتْ لِي سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ ، وَ إِنَّمَا لَنْ تَحِلَّ لِأَحَدٍ بَعْدِي » [بخاری، اللقطة، باب كيف تعرف لقطه أهل مكة ٤ : ٢٤٣٤] "اللہ تعالیٰ نے مکہ سے ہاتھیوں کو روک دیا اور اس پر اپنے رسول اور ایمان والوں کو غلبہ عطا فرما دیا، تو یہ مجھ سے پہلے کسی کے لیے حلال نہیں ہوا اور میرے لیے بھی دن کی ایک گھڑی کے لیے حلال ہوا ہے۔ اب میرے بعد کسی کے لیے (اس میں لڑنا) حلال نہیں ہوگا۔" دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ حدیبیہ کے زمانے میں نکلے، جب اس گھاٹی پر پہنچے جہاں سے مکہ میں اترا جاتا تھا تو آپ کی اونٹنی بیٹھ گئی، لوگوں نے (اسے اٹھانے کے لیے) کہا: «حَلِّ حَلِّ» لیکن وہ بیٹھی رہی۔ لوگوں نے کہا: "قصواء آڑ گئی، قصواء آڑ گئی۔" تو نبی ﷺ نے فرمایا: «مَا خَلَّاتِ الْقُصُوءَاءُ، وَمَا ذَاكَ لَهَا بِخُلُقٍ ، وَلَكِنْ حَبَسَهَا حَابِسُ الْفَيْلِ» [بخاری، الشروط، باب الشروط في الجهاد : ٢٧٣١، ٢٧٣٢] "قصواء آڑی نہیں اور نہ یہ اس کی عادت ہے، اسے تو ہاتھیوں کو روکنے والے نے روک دیا ہے۔" ان احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ ہاتھی والے جب مکہ پر حملے کے لیے آئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں روک دیا تھا۔

آیت 2 الْمُ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِي تَضْلِيلٍ: کا لفظی معنی گمراہ کرنا ہے، یعنی ان کی تدبیر اس طرف نہیں جانے دی جس طرف وہ لے جانا چاہتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں ان کی تدبیر سیدھی نہیں پڑنے دی۔

آیت 2 : وَ أَرْسَلَ عَلَيْهِمْ: "أَبَابِيلَ" عام طور پر ایک خاص قسم کی چڑیوں کو "ابابیل" کہا جاتا ہے، مگر یہ درست نہیں۔ "أَبَابِيلَ" ان گھوڑوں یا پرندوں کو کہا جاتا ہے جو گروہ درگروہ اور جُنُذ کے جُنُذ آئیں۔ یہ لفظ جمع ہی استعمال ہوتا ہے، بعض نے اس کی واحد "إِبَابِلَةٌ" بیان کی ہے۔

آیت 4 تَزْمِيهِمْ بِجَارِةٍ قَيْنٍ سَاجِدٍ: "سَاجِدٍ" کی تفسیر میں ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: «هِيَ سَنَكٌ وَ كَبَلٌ» [بخاری، التفسیر، باب سورة : ﴿هَلْ أَلَمْتُ﴾، قبل ح : ٤٩٦٤] "اس سے مراد سنگ و گل ہے۔" یعنی کچی ہوئی مٹی جسے کھگر کہا جاتا ہے۔ لاوا اگلنے والے پہاڑوں کے ارد گرد اس قسم کے جلے ہوئے سخت سنگریزے عام ملتے ہیں۔

آیت 5 : ﴿١﴾ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ فَأَنْقُولُ: "عَصْفٌ" اناج کے دانوں سے جو چھلکا اترتا ہے، بھوسا، توڑی۔ "فَأَنْقُولُ" "أَكَلُ يَأْكُلُ أَكَلًا" (ن) سے اسم مفعول ہے، کھایا ہوا، کھائے ہوئے بھس سے مراد جانور کی لید ہے، کیونکہ جانور بھس کھا کر لید کرتا ہے اور پھر وہ خشک ہو کر ادھر ادھر بکھر جاتی ہے۔ سنگریزوں کے عذاب سے ان کے اعضا کے بکھر جانے کو اس کے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ قُرَيْشٌ ۝۱ الْفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ ۝۲ فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هَذَا
الْبَيْتِ ۝۳ الَّذِي أَطَعَهُمْ مِنْ جُوعٍ ۝۴ وَآمَنَهُمْ مِنْ خَوْفٍ ۝۵

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

قریش کے دل میں محبت ڈالنے کی وجہ سے ① ان کے دل میں سردی اور گرمی کے سفر کی محبت ڈالنے کی وجہ سے ② تو ان پر لازم ہے کہ اس گھر کے رب کی عبادت کریں ③ وہ جس نے انھیں بھوک سے (بچا کر) کھانا دیا اور خوف سے (بچا کر) امن دیا ④

ساتھ تشبیہ دی ہے۔ (طبری) اللہ تعالیٰ الفاظ کے استعمال میں اعلیٰ درجے کی شائستگی اختیار فرماتے ہیں، اس مفہوم کو ”لید“ کے بجائے ”کھائے ہوئے ٹھس“ کے الفاظ میں ادا کیا ہے، اس سے ان کی زبوں حالی بھی نمایاں ہو رہی ہے۔ (قاسمی بحوالہ شہاب) یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ جانوروں کے کھانے کے بعد جو بھوسا بچ جاتا ہے اسے وہ پاؤں میں روند دیتے ہیں اور وہ ادھر ادھر بکھر جاتا ہے، وہ اس بھوسے کی طرح ہو گئے۔

سورة القریش

بیت 4-1 ① لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ قُرَيْشٌ: ”أَلِفٌ يَأْلَفُ الْأَلْفَا“ (س) ” ء “ کسی سے مانوس ہونا، اس سے محبت کرنا۔ ”الْفَ يُوْلَفُ الْإِنْفَا“ (افعال) کسی کو کسی چیز سے مانوس کر دینا، اس کے دل میں اس کی محبت ڈال دینا۔ ”قُرَيْشٌ“ ”قُرَشٌ“ کی تصغیر ہے۔ ”قُرَشٌ يَفْرَشُ قُرَشًا“ (ض، ن) جمع کرنا۔ قریش مشہور قبیلہ ہے جس میں رسول اللہ ﷺ پیدا ہوئے۔ یہ نام ان کے حرم میں جمع ہونے کی وجہ سے رکھا گیا۔ یہ لوگ مختلف جگہوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ نضی بن کلاب (رسول اللہ ﷺ کے جد اعلیٰ) کو خیال آیا کہ اپنے سارے قبیلے کو مکہ میں اکٹھا کرنا چاہیے، چنانچہ انھوں نے سارے قبیلے کو مکہ میں جمع کر دیا، اس لیے ان کا نام ”مُحَمَّدٌ“ پڑ گیا، اس طرح کعبہ کی تولیت بھی ان کے ہاتھ آ گئی۔ یا یہ نام سمندر کی ایک مچھلی کے نام پر رکھا گیا ہے جسے ”قریش“ کہتے ہیں۔ المنجد میں ہے کہ اس مچھلی کو ”كَلْبُ الْبَحْرِ“ کہا جاتا ہے، یہ سمندر کے جانوروں کو دانتوں سے اس طرح کاٹتی ہے جس طرح تلوار کاٹتی ہے، سمندر کے تمام جانور اس سے ڈرتے ہیں۔

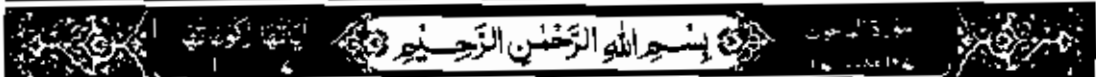
ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے قریش پر اپنے کئی احسانات ذکر فرمائے ہیں۔ قریش مکہ معظمہ میں رہتے تھے اور کعبہ کے مشکوٹی تھے، یہ لوگ سال میں دو تجارتی سفر کرتے تھے، گرمی کے موسم میں شام کی طرف، کیونکہ وہ سرد علاقہ ہے اور سردی کے موسم میں یمن کی طرف، کیونکہ وہ گرم علاقہ ہے۔ پہلا احسان تو یہ کہ ان کے دل میں سفر کی محبت ڈال دی، نہ انھیں سردی کے سفر میں مشقت محسوس ہوتی ہے نہ گرمی میں اور سفر ہی دنیا میں وسیلہ ظفر ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کو سفر سے مانوس نہ کرتا تو وہ

بھی اپنے گھروں میں بیٹھے رہتے اور سفر سے جو مال و دولت، تجربہ و علم اور دنیا بھر کے لوگوں اور علاقوں سے واقفیت حاصل ہوتی ہے وہ کبھی حاصل نہ ہوتی۔ سفر سے مانوس ہونے کی یہی نعمت قریش کو آگے چل کر ہجرت کے سفر میں کام آئی، پھر کفار کے ساتھ لڑائی میں اور اس کے بعد روم و شام، عراق و فارس، ہند و سندھ، مصر و افریقہ بلکہ مشرق و مغرب کی فتوحات میں کام آئی۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلم قوم کے دنیا پر غالب آنے اور غالب رہنے کے لیے پہلا قدم یہ ہے کہ وہ سفر سے نہ گھبرائیں اور جب نکلنے کا موقع ہو زمین ہی سے نہ چمٹ جائیں۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ کافر اقوام ہی بڑی، بحری اور فضائی سفروں کی اجارہ دار ہیں، مسلمان اکثر و بیشتر یہ سبق بھول چکے ہیں۔

دوسرا احسان یہ کہ اس وقت تمام عرب میں سخت بد امنی تھی، کسی کو خبر نہ تھی کہ کب اس پر حملہ ہو جائے اور اسے قتل کر دیا جائے، یا اٹھایا جائے یا مال لوٹ لیا جائے اور عورتیں اور بچے غلام بنا لیے جائیں۔ ایسے حالات میں صرف اہل مکہ ہی کو یہ امن حاصل تھا کہ کوئی ان کی طرف میلی آنکھ سے بھی نہیں دیکھتا تھا، جیسا کہ فرمایا: ﴿أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا مَّأْنًا وَ يُتَخَفُّ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ﴾ [النکبوت: ۶۷] ”اور کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ایک امن والا حرم بنا دیا ہے، جبکہ لوگ ان کے ارد گرد سے اچک لیے جاتے ہیں۔“ تیسرا احسان یہ کہ حرم کے باشندے ہونے کی وجہ سے تجارتی سفروں میں کوئی نہ ان کا قافلہ لوٹا، نہ ان سے وہ ٹیکس لیے جاتے جو ہر قبیلہ اور ہر قوم اپنے علاقے سے گزرنے والوں سے لیتی تھی اور نہ انھیں کہیں جانے سے روکا جاتا تھا۔ چوتھا یہ کہ تمام دنیا کے لوگ حج و عمرہ کے لیے مکہ میں آتے اور دنیا بھر کا سامان تجارت یہاں پہنچتا۔ اس کے علاوہ ہر قسم کے پھل ابراہیم علیہ السلام کی دعا کے نتیجے میں یہاں پہنچتے، فرمایا: ﴿أَوَلَمْ نُكِنِّ لَهُمْ حَرَمًا مَّا هُمْ يَجْتَبِي إِلَيْهِ مَكْرَهُ كُلِّ شَيْءٍ زُرْقًا مِّنْ لَّدُنَّا﴾ [الفصص: ۵۷] ”اور کیا ہم نے انھیں ایسے امن والے حرم میں جگہ نہیں دی جس کی طرف ہر چیز کے پھل کھینچ کر لائے جاتے ہیں، یہ ہماری طرف سے رزق ہے۔“

ان تجارتی سفروں اور مکہ کی تجارت کے مالک ہونے کی وجہ سے قریش نہایت مال دار تھے اور حرم کی برکت سے امن و امان سے بھی بہرہ ور تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام نعمتیں اللہ کے گھر کی برکت سے تھیں اور صرف اور صرف رب تعالیٰ کا عطیہ تھیں، پھر جب یہ تمام نعمتیں اس گھر کے مالک نے دی ہیں تو تم اس اکیلے کی عبادت کیوں نہیں کرتے اور کیوں دوسروں کو اس کا شریک بنا کر ان کے آگے سجدے کرتے، ان کے آستانوں پر نذریں دیتے اور پڑھاوے پڑھاتے ہو؟

② ”إِلَيْهِ قُرَيْشٌ“ (قریش کے دل میں محبت ڈالنے کی وجہ سے) ترکیب کے اعتبار سے کیا ہونا چاہیے؟ یہ جار مجرور کس کے متعلق ہے؟ جواب یہ ہے کہ یہ ”فَلْيَعْبُدُوا“ کے متعلق ہے، یعنی اس وجہ سے انھیں اس گھر کے رب کی عبادت کرنی چاہیے۔ یہ نحو کے مشہور امام خلیل بن احمد کا قول ہے، مگر اس پر یہ اعتراض لازم آتا ہے کہ پھر ”فاء“ کیوں آئی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں شرط محذوف ہے، جس کے جواب میں فاء آئی ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر ان دوسری بے شمار نعمتوں کی وجہ سے یہ لوگ ایک اللہ تعالیٰ کی عبادت نہیں کرتے تو اس گھر کا رب ہونے ہی کی وجہ سے اس کی عبادت کریں جس گھر کی برکت



أَرَأَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالذِّينِ ۚ فَذَلِكَ الَّذِي يَدْعُ الْيَتِيمَ ۖ وَلَا يَحْضُ عَلَىٰ
طَعَامِ الْمَسْكِينِ ۚ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جو جزا کو جھٹلاتا ہے ① تو یہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے ② اور مسکین کو کھانا دینے کی ترغیب نہیں دیتا ③

سے انھیں سردی و گرمی میں سفر کرنے، دائمی امن و امان اور وافر رزق کی نعمتیں میسر ہیں۔ (زمخشری)

کسی بھی جگہ میں امن اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ ہمیں بھی رزق کی فراخی اور امن جیسی نعمت پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے اور اسی کی عبادت کرنی چاہیے، غیر اللہ کی عبادت اور شرک سے بچنا چاہیے اور شرک کے اذوں کی تعمیر و ترقی کے بجائے توحید کے مراکز کی تعمیر و ترقی کرنی چاہیے۔ اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو رزق کی تنگی اور بد امنی و فساد کا سامنا کرنا پڑے گا، جیسا کہ کرنا پڑ رہا ہے۔

سورة الماعون

اس سورت کے کئی یاد دہانی ہونے میں مفسرین کا اختلاف ہے، مگر دکھاوے کے لیے نماز پڑھنے والوں کے تذکرے سے صاف ظاہر ہے کہ یہ مدنی ہے، کیونکہ مکہ میں کسی کو دکھانے کے لیے نماز پڑھنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اوپر سورت کے نام کے ساتھ معروف قول کے مطابق کئی لکھا گیا ہے۔

آیت 3: 1 أَرَأَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالذِّينِ "ذَّخْ يَدْعُ ذَعًا" (ن) دھکے دیتا۔ "کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جو جزا کو جھٹلاتا ہے۔" "یہ اؤا رسول اللہ ﷺ سے خطاب ہے، اس کے بعد ہر شخص اس کا مخاطب ہے۔ ان آیات میں قیامت کے دن اعمال کی جزا کو جھٹلانے کی وجہ سے کسی شخص میں جو سنگ دلی اور شقاوت پیدا ہوتی ہے اس کا ذکر فرمایا ہے۔ اس کے سامنے چونکہ دنیا ہی سب کچھ ہوتی ہے، اس لیے اسے کسی یتیم سے ہمدردی اور مسکین کی غم خواری پر کسی فائدے کی توقع ہوتی ہے نہ ان کے حقوق غصب کرنے پر کسی باز پرس اور سزا کا خوف ہوتا ہے، لہذا وہ ان بے بس لوگوں کے معاملے میں نہایت بے رحم ہوتا ہے۔ یتیم اپنے باپ کی وراثت مانگے یا اپنا کوئی اور حق وہ اسے دھکے مار کر باہر نکال دیتا ہے۔ مسکین پر رحم کرتے ہوئے اسے خود کھانا کھلانا تو دور کی بات ہے وہ کسی دوسرے کو اس کے لیے کہنے پر بھی تیار نہیں ہوتا۔ یتیموں اور مسکینوں سے ہمدردی صرف وہ شخص کر سکتا ہے جو جزا و سزا پر ایمان رکھتا ہو۔

قَوْلٌ لِلْمُصَلِّينَ ۝ الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ ۝

پس ان نمازیوں کے لیے بڑی ہلاکت ہے ۲ وہ جو اپنی نماز سے غافل ہیں ۳ وہ جو دکھاوا کرتے ہیں ۴

آیت 6۲4 قَوْلٌ لِلْمُصَلِّينَ.....: "سَاهُونَ" "سَهَا يَسْهُو سَهْوًا" (ن) (غافل ہونا) سے اسم فاعل "سَاهٍ"

(بروزن قاض) کی جمع ہے۔ "يُرَاءُونَ" "رَأَى يُرَاءِي مُرَاءَةً وَرِيَاءً" (مفاعله) سے فعل مضارع جمع مذکر غائب

ہے، دکھاوا کرنا۔ آیات کی باہمی مناسبت یہ ہے کہ پہلی آیات میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو کھلم کھلا قیامت کو جھٹلاتے اور اس کا

انکار کرتے تھے اور ان آیات میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو بظاہر مسلمان ہیں مگر دل سے قیامت کو نہیں مانتے۔ یہ منافقین تھے

جو آخرت پر ایمان نہ ہونے کی وجہ سے نماز پڑھنا نہیں چاہتے تھے، مگر اپنے آپ کو مسلمان ثابت کرنے کے لیے انھیں پڑھنا

پڑتی تھی۔ حقیقت میں وہ اپنی نماز سے غافل تھے، یہ غفلت کئی طرح سے تھی: ① طبری نے علی بن ابی طلحہ کی معتبر سند کے

ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل فرمایا ہے کہ ان نمازیوں سے مراد منافقین ہیں جو صرف دکھاوے کے لیے نماز پڑھتے تھے، یعنی

لوگوں کے سامنے ہوتے تو پڑھ لیتے ورنہ چھوڑ ہی دیتے۔ ② اور پڑھتے بھی تو وقت ضائع کر کے پڑھتے، رسول اللہ ﷺ نے

فرمایا: «تِلْكَ صَلَاةُ الْمُنَافِقِ يَجْلِسُ يَرْقُبُ الشَّمْسَ حَتَّى إِذَا كَانَتْ بَيْنَ قَرْنَيْ الشَّيْطَانِ قَامَ فَتَنَقَّرَهَا أَرْبَعًا لَا يَذْكُرُ

اللَّهِ فِيهَا إِلَّا قَلِيلًا» [مسلم، المساجد و مواضع الصلاة، باب استحباب التكبیر بالعصر: ۶۲۲] "یہ نماز منافق کی نماز ہے کہ وہ

بیٹھا ہوا سورج کو دیکھتا رہتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ شیطان کے دو سنگوں کے درمیان ہو جاتا ہے تو اٹھ کر چار ٹھونگے مارتا ہے،

اس میں اللہ کو یاد نہیں کرتا مگر تھوڑا۔" ③ ان کا نماز ادا کرنے کا انداز بتاتا تھا کہ انھیں اپنی نماز سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ

نے ان کی نماز کے متعلق فرمایا: ﴿إِنَّ الْمُنَافِقِينَ يُخَدِّعُونَ اللَّهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ وَإِذَا قَامُوا إِلَى الصَّلَاةِ قَامُوا كَسَالٍ

يُرَاءُونَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُونَ اللَّهَ إِلَّا قَلِيلًا﴾ [النساء: ۱۴۲] "بے شک منافق لوگ اللہ کو دھوکا دیتے ہیں، حالانکہ

وہ (اللہ) ان کو دھوکا دینے والا ہے اور جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو ست ہو کر کھڑے ہوتے ہیں۔ لوگوں کو دکھاوا

کرتے ہیں اور اللہ کو یاد نہیں کرتے، مگر بہت کم۔" ④ نماز میں بھول تو مخلص مسلمان سے بھی ہو سکتی ہے، رسول اللہ ﷺ سے

بھی ہو گئی تھی جب آپ ﷺ نے ظہر کی دو رکعتیں پڑھا کر سلام پھیر دیا تھا، مگر نماز ہی سے بھول ہو جائے، یہ نفاق ہے۔ اس

لیے "هُم فِي صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ" (ان سے ان کی نماز میں بھول ہو جاتی ہے) نہیں فرمایا، بلکہ فرمایا: ﴿هُم عَنْ

صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ﴾ یعنی وہ اپنی نماز ہی سے بھولے ہوئے ہیں، انھیں خیال ہی نہیں کہ ہمیں نماز پڑھنی ہے۔ پڑھتے ہیں تو

یاد ہی نہیں کہ ہم کہاں کھڑے ہیں، نہ خشوع ہے نہ خضوع، ڈاڑھی اور کپڑوں سے کھیل رہے ہیں، جمائیاں لے رہے ہیں،

ادھر ادھر دیکھ رہے ہیں، غرض ساری نماز پڑھ جاتے ہیں مگر کچھ پتا نہیں کہ کیا پڑھا؟

وَيَسْتَعِينُ الْمَاعُونَ ۝

اور عام برتنے کی چیزیں روکتے ہیں ۝

آیت 7: وَيَسْتَعِينُ الْمَاعُونَ: آخرت پر ایمان نہ ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کا معاملہ تو ان کی نمازوں ہی سے ظاہر ہے، لوگوں سے بھی ان کا معاملہ درست نہیں۔ وہ معمولی چیز کے ساتھ بھی کسی کو فائدہ پہنچانے پر تیار نہیں ہیں، جب اس کے عوض انھیں دنیا میں کچھ ملنے کی توقع نہ ہو۔ ”الْمَاعُونَ“ ”مَعْنُ“ سے ہے، جس کا معنی ”مُسْتَعِينٌ قَلِيلٌ“ (تھوڑی سی چیز) ہے۔ ”تفسیر الوسيط للطنطاوي“ میں ہے: ”الْمَاعُونَ“ کی اصل ”مَعُونَةٌ“ ہے جس کا مادہ ”عَوَّنَ“ (مدد ہے، اس کا ”الف“ ”جاء“ کے بدلے میں لایا گیا ہے جو آخر سے حذف کر دی گئی ہے۔ گویا ”الْمَاعُونَ“ سے مراد وہ چیزیں ہیں جن سے عام ضرورتوں میں مدد لی جاتی ہے۔“ (الوسيط) غنی بیروت اور بعض مفسرین نے اس سے مراد زکوٰۃ لی ہے، کیونکہ وہ کل مال کے مقابلے میں بالکل قلیل یعنی اڑھائی فیصد ہوتی ہے، یعنی یہ لوگ اتنا معمولی صدقہ کرنے پر بھی تیار نہیں۔ ابو ہریرہ، ابن مسعود اور ابن عباس رضی اللہ عنہم اور بہت سے مفسرین نے اس سے گھروں میں برتنے کی وہ چیزیں مراد لی ہیں جو ہر وقت ہر گھر میں نہیں ہوتیں بلکہ ضرورت کے وقت ایک دوسرے سے مانگ لی جاتی ہیں، مثلاً سوئی، ہانڈی، کلباڑی، پیالہ، آگ اور پانی وغیرہ اور عام طور پر ”ماعون“ کا اطلاق انہی چیزوں پر ہوتا ہے۔ یعنی وہ معمولی سے معمولی چیز جو استعمال کے بعد انھیں واپس مل جائے گی، وہ بھی کسی کو دینے پر تیار نہیں، کیونکہ آخرت میں اس کے ثواب کی انھیں امید نہیں اور دنیا میں انھیں اس کا کوئی فائدہ نظر نہیں آ رہا۔ اللہ تعالیٰ نے آخرت کو جھٹلانے والے ایسے لوگوں کے لیے تباہی اور بربادی کی وعید ذکر فرمائی ہے۔



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِنَّا اَعْطَيْنَاكَ الْكُوْثَرَ ①

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

بلاشبہ ہم نے تجھے کوثر عطا کی ①

مکہ میں رسول اللہ ﷺ کے دعوتِ اسلام دینے کے بعد آپ پر بہت مشکل حالات گزرے، سب لوگ دشمن بن گئے، ہر طرف مخالفت، مالی پریشانیاں الگ، ایمان لانے والے بالکل تھوڑے سے، مزید یہ کہ نرینہ اولاد جو ہوئی وہ فوت ہو گئی، اس پر دشمن کا خوش ہونا اور آپ کا ٹمگن اور پریشان ہونا ایک فطری امر تھا۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح سورہ صفا میں آپ ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا: ﴿وَلَلْآخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْأُولَىٰ ۗ وَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ﴾ [الصفا: ۴، ۵] (اور یقیناً پیچھے آنے والی حالت تیرے لیے پہلی سے بہتر ہے اور عنقریب تیرا رب تجھے ضرور اتنا عطا کرے گا کہ تو خوش ہو جائے گا) اور سورہ انشراح میں فرمایا: ﴿وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ﴾ [الانشراح: ۴] (اور ہم نے تیرے لیے تیرا ذکر بلند کر دیا) اسی طرح اس سورت میں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے انعامات کا تذکرہ فرما کر آپ کو تسلی دی ہے۔

آیت 1 ① اِنَّا اَعْطَيْنَاكَ الْكُوْثَرَ: ”الکُوثر“ ”مَنْكُرَةٌ“ سے ”فَوْعَلٌ“ کا وزن ہے جو مبالغے کا معنی دے رہا ہے، بے انتہا کثرت۔ یعنی دشمن تو یہ سمجھ رہے ہیں کہ آپ کے پاس کچھ نہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ ہم نے آپ کو بے انتہا دیا ہے۔ ”الکُوثر“ میں وہ ساری خیر کثیر شامل ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمائی، مثلاً اسلام، نبوت، اخلاقِ حسنہ، بہترین تابع دار امت، جنت اور دوسری نعمتیں جو شمار نہیں ہو سکتیں۔ لغت کے لحاظ سے ”الکُوثر“ کا معنی یہی ہے، البتہ بہت سی صحیح احادیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کوثر جنت میں ایک نہر ہے جو اللہ نے مجھے عطا فرمائی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ محشر میں آپ ﷺ کو جو حوض عطا کرے گا اس کا نام بھی آپ ﷺ نے کوثر بتایا۔ اس لحاظ سے یہ تفسیر مقدم ہے، مگر ترجیح کی ضرورت تب ہے جب دونوں تفسیروں میں تعارض ہو، جو یہاں ہے ہی نہیں۔ چنانچہ صحیح بخاری میں ہے کہ سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی کہ انھوں نے ”الکُوثر“ کے متعلق فرمایا: ”اس سے مراد وہ خیر ہے جو اللہ نے آپ ﷺ کو عطا فرمائی۔“ راوی کہتا ہے کہ میں نے سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ لوگ کہتے ہیں کہ وہ جنت میں ایک نہر ہے؟ تو سعید رضی اللہ عنہ نے کہا: ”جنت میں جو نہر ہے وہ بھی اس خیر میں شامل ہے جو اللہ نے آپ کو عطا فرمائی۔“ [بخاری، التفسیر، سورہ: ﴿إِنَّا أَعْطَيْنَاكَ الْكُوْثَرَ﴾: ۴۹۶۶]

② نہر کوثر جنت میں ہے اور حوضِ کوثر محشر کے میدان میں ہوگا، بعض اوقات اس پر بھی نہر کوثر کا لفظ آتا ہے، کیونکہ اس حوض میں بھی جنت کے دو پر نالوں سے پانی گر رہا ہوگا۔ گویا حوض کا اصل بھی جنت والی نہر کوثر ہے۔ (فتح الباری) انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ﴿يَبْنَعْنَا أَنَا أَسْبَبُ فِي الْجَنَّةِ إِذَا أَنَا بَنَاهُ حَافَتَاهُ قِيَابُ الدَّرِّ الْمُخَوِّفِ، قُلْتُ مَا

هَذَا يَا جِبْرِيلُ!؟ قَالَ هَذَا الْكُوثرُ الَّذِي أُعْطَاكَ رَبُّكَ فَإِذَا طَيَّبُهُ أَوْ طَيَّبْتَهُ مِسْكٌ أَذْفَرُ» [بخاری، الرقاق، باب فی الحوض: ۱۶۵۸۱] ”میں جنت میں چلا جا رہا تھا تو اچانک ایک نہر آگئی جس کے کنارے کھوکھلے موتیوں کے تپتے تھے۔ میں نے کہا: ”اے جبریل! یہ کیا ہے؟“ تو انھوں نے فرمایا: ”یہ کوثر ہے جو اللہ نے آپ کو عطا فرمائی ہے۔“ پھر دیکھا تو اس کی خوشبو یا مٹی مہکنے والی کستوری کی طرح تھی۔“

③ حوض کوثر میدانِ محشر میں ہے، جہاں رسول اللہ ﷺ اپنی امت کا استقبال کریں گے اور انھیں پانی پلائیں گے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فتح الباری میں فرماتے ہیں کہ حوض کوثر کی روایات میں (۳۰) سے زیادہ صحابہ سے آئی ہیں، جن میں سے بیس (۲۰) صحابہ کی احادیث صحیحین میں ہیں، باقی دوسری کتابوں میں ہیں۔ ان کی نقل صحیح ہے اور ان کے راوی مشہور ہیں۔ [دیکھئے فتح الباری، کتاب الرقاق، باب الحوض |

④ ابو ذر رضی اللہ عنہ حوض کوثر میں جنت کے پرنا لوں کا گرنا اور حوض کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کی: ”اے اللہ کے رسول! حوض کے برتن کیسے ہوں گے؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ! لَا يَنْتَهُ أَكْثَرُ مِنْ عَدَدِ نُجُومِ السَّمَاءِ وَكَوَاكِبِهَا، إِلَّا فِي اللَّيْلَةِ الْمُظْلَمَةِ الْمُصْحِحَةِ، آيَةٌ الْحَنَّةِ مَنْ شَرِبَ مِنْهَا لَمْ يَظْمَأْ آخِرَ مَا عَلَيْهِ، يَشْحَبُ فِيهِ مِيزَانَانِ مِنَ الْحَنَّةِ مَنْ شَرِبَ مِنْهُ لَمْ يَظْمَأْ غَرَضُهُ مِثْلُ طُولِهِ مَا بَيْنَ عَمَّانَ إِلَى أَيْلَةَ مَاوَةَ أَشَدُّ بَيَاضًا مِنَ اللَّبَنِ وَ أَحْلَى مِنَ الْعَسَلِ﴾ [مسلم، الفضائل، باب إثبات حوض نبينا ﷺ وصفاته: ۲۳۰۰]

”اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد ﷺ کی جان ہے! اس کے برتن آسمان کے تاروں سے زیادہ ہیں، یاد رکھو! تارے بھی اس رات کے جو تار یک ہو اور بادل کے بغیر ہو۔ جنت کے برتن ایسے ہیں کہ جو ان سے پیے گا کبھی پیاسا نہ ہوگا، اس وقت کے آخر تک جو اس پر گزرے گا۔ اس حوض میں جنت سے دو پرنا لے گرتے ہیں، جو اس سے پیے گا کبھی پیاسا نہ ہوگا، اس کا عرض اس کے طول کے برابر ہے، جتنا عمان سے ایلہ تک فاصلہ ہے۔ اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ مینھا ہے۔“

www.KitaboSunnat.com

⑤ کوثر کا ایک اور معنی بھی کیا گیا ہے، مشہور امام فقہ ابن جنی نے آیت: ﴿إِنَّ شَأْنَيْكَ هُوَ الْأَبْتَرُ﴾ کی مناسبت سے ”الکُوثر“ کا معنی ”ذُرِّيَّةٌ كَثِيرَةٌ“ (کثیر اولاد) کیا ہے۔ کفار قریش اور آپ سے دشمنی رکھنے والے کہتے تھے کہ آپ ”ابتر“ (بے اولاد) ہیں، فوت ہو گئے تو ہماری جان چھوٹ جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، ہم نے آپ کو کوثر یعنی اولاد کثیر عطا فرمائی۔ مراد اولادِ فاطمہ ہے، کیونکہ بیٹی کی اولاد بھی قرآن کی رو سے اولاد ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِ دَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ﴾ [الأنعام: ۸۴] ”اور اس (ابراہیم) کی اولاد میں سے داؤد اور سلیمان کو (ہدایت دی)۔“ اس کے بعد کئی پیغمبروں کا نام لے کر فرمایا: ﴿وَذَكَرْنَا وَيْحَىٰ وَعِيسَىٰ وَالْيَاسَ﴾ [الأنعام: ۸۵] ”یعنی اس (ابراہیم) کی اولاد میں سے زکریا، یحییٰ، عیسیٰ اور الیاس کو بھی ہدایت دی۔“ معلوم ہوا عیسیٰ رضی اللہ عنہ بھی ابراہیم رضی اللہ عنہ کی اولاد ہیں، حالانکہ ان کا باپ

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ۝

پس تو اپنے رب کے لیے نماز پڑھ اور قربانی کر ۝ یقیناً تیرا دشمن ہی لا ولد ہے ۝

بالا تفاق تھا ہی نہیں، بلکہ وہ ابراہیم علیہ السلام کی بیٹی مریم کی اولاد ہیں۔ معلوم ہوا کہ آدمی کی بیٹی کی اولاد بھی اس کی اولاد ہوتی ہے۔ (قاسمی) یہ معنی یعنی اولاد کثیر بھی ”الکؤثر“ کے اس معنی میں شامل ہے جو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کیا ہے، یعنی خیر کثیر اور اس کی ”الکؤثر“ کے ساتھ مناسبت بھی ہے۔

آیت 2 ① **فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ**: عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ اس آیت میں نماز پڑھنے اور قربانی کرنے کا حکم دیا گیا ہے، حالانکہ یہاں اصل مفہوم یہ ہے کہ نماز پڑھو تو صرف اپنے رب کے لیے اور قربانی کرو تو وہ بھی اسی کے لیے، کسی غیر کے لیے نہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی سے کہا جائے، کھڑے ہو کر نماز پڑھو، تو اس سے مراد نماز پڑھنے کا حکم دینا نہیں ہوتا بلکہ مراد یہ حکم ہوتا ہے کہ نماز کھڑے ہو کر پڑھو، بیٹھ کر نہ پڑھو۔ یہی مفہوم سورہ انعام میں بھی ادا ہوا ہے، فرمایا: ﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ لَا شَرِيكَ لَهٗ ۝ وَ بِذٰلِكَ اُمِرْتُ ۝ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ ۝﴾ [الأنعام: ۱۶۲، ۱۶۳] ”کہہ دے بلاشبہ میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت اللہ رب العالمین کے لیے ہے، جس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلا فرماں بردار ہوں۔“

② اللہ تعالیٰ نے کؤثر عطا فرمانے کا احسان ذکر کر کے صرف رب تعالیٰ ہی کے لیے نماز اور قربانی کا حکم دیا۔ ”الکؤثر“ (خیر کثیر) کے لفظ میں وہ سب کچھ آ گیا جو اللہ نے آپ کو عطا فرمایا، کوئی چیز ایسی نہیں جو اس میں شامل نہ ہو۔ ”فَصَلِّ“ کی فاء کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے آپ کو خیر کثیر عطا فرمائی ہے تو اس کے شکر کا طریقہ یہ ہے کہ آپ کی ہر عبادت (بدنی ہو یا مالی) صرف اسی کے لیے ہونی چاہیے، کسی غیر کے لیے نہیں۔ یہ انتہائی ناشکری ہے کہ ہر نعمت اللہ نے دی ہو اور بدنی یا مالی بندگی کسی اور کی ہو۔

③ بظاہر کہنا تو یہ چاہیے تھا کہ ہم نے تجھے کؤثر عطا کی، پس تو ہمارے ہی لیے نماز پڑھ اور قربانی کر، مگر فرمایا: ”تو اپنے رب ہی کے لیے نماز پڑھ اور قربانی کر۔“ اسے ”الْبِنْفَاتُ مِّنَ الْمُتَنَكِّلِمِ اِلَى الْغَايِبِ“ کہتے ہیں۔ مقصد توجہ دلانا ہے کہ رب ہونے کی وجہ سے ہمارا حق ہے کہ ہماری ہی عبادت کرو، کسی اور کی نہیں۔

④ بعض روایات میں علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ”وَانْحَرْ“ کا معنی نماز میں سینے پر ہاتھ باندھنا ہے، مگر وہ روایات صحیح نہیں۔ البتہ سینے پر ہاتھ باندھنے کا مسئلہ دوسری صحیح احادیث سے ثابت ہے۔

آیت 3 ① **اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ**: ”شَانِئٌ“ ”شَنِئَهُ شَنْئًا“ (س، ف) (بروزن فَلَسٌ) ”وَشَنْئَانَا“ (نون کے فتنہ اور سکون کے ساتھ) سے اسم فاعل ہے، اس کا معنی ”دشمنی رکھنے والا“ ہے۔ ”الْاَبْتَرُ“ جس کی اولاد نہ ہو۔ اصل میں یہ ”بْتَرَةٌ“ سے مشتق ہے، جس کا معنی ہے ”قَطْعَةٌ“ اس نے اسے کاٹ دیا۔ ”جَمَارٌ اَبْتَرٌ“ وہ گدھا جس کی دُم کٹی ہوئی ہو۔ دُم کٹے سانپ کو بھی ”ابتر“ کہتے ہیں۔

﴿وَلَا أَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُمْ﴾ ۴ ﴿وَلَا أَنْتُمْ عِبُدُونَ مَّا أَعْبُدُ﴾ ۵ ﴿لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ﴾ ۶

والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں ﴿۴﴾ اور نہ میں اس کی عبادت کرنے والا ہوں جس کی عبادت تم نے کی ﴿۵﴾ اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں ﴿۵﴾ تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین ہے ﴿۶﴾ سمجھوتے کی کوئی گنجائش نہیں۔

۴ تکرار کی حکمت: ﴿۱﴾ بہت سے اہل علم نے فرمایا کہ آیات میں تکرار تاکید کے لیے ہے کہ مسلمان کسی صورت بھی توحید کے متعلق کفار سے سمجھوتہ نہیں کر سکتے اور یہ کلام عرب اور قرآن مجید کا عام اسلوب ہے، جیسے فرمایا: ﴿كَلَّا سَيَعْلَمُونَ﴾ ۱ ﴿كَلَّا سَيَعْلَمُونَ﴾ [النبا: ۴، ۵] ”ہرگز نہیں، عنقریب وہ جان لیں گے۔ پھر ہرگز نہیں، عنقریب وہ جان لیں گے۔“ اور رسول اللہ ﷺ نے فاطمہ رضی اللہ عنہا کی موجودگی میں علی رضی اللہ عنہ کو دوسرے نکاح کی اجازت کے متعلق فرمایا: ﴿فَلَا أَذْنُ، ثُمَّ لَا أَذْنُ، ثُمَّ لَا أَذْنُ﴾ [بخاری، النکاح، باب ذب الرجل عن ابنته في.....: ۵۲۳۰] ”میں اس کی اجازت نہیں دیتا، پھر اس کی اجازت نہیں دیتا، پھر میں اس کی اجازت نہیں دیتا۔“ اسی طرح سورہ رحمان اور مرسلات میں آیات کا بار بار تکرار ہے۔ یہاں تکرار کا مقصد یہ ہے کہ یہ کبھی ممکن ہی نہیں کہ میں توحید کا راستہ چھوڑ کر شرک کا راستہ اختیار کر لوں اور نہ یہ ممکن ہے کہ تم کافر رہتے ہوئے غیر اللہ کی عبادت کو یکسر ترک کر کے ایک اللہ کی عبادت پر قانع ہو جاؤ۔ شوکانی نے تکرار تاکید کے لیے ہونے کے علاوہ دوسری توجیہات کو تکلف قرار دیا ہے۔

۵ بخاری رضی اللہ عنہ نے (ابو عبیدہ سے) یہ تفسیر نقل فرمائی ہے کہ آیت: ﴿لَا أَعْبُدُ مَّا تَعْبُدُونَ﴾ کا مطلب ہے کہ میں اب موجودہ وقت میں اس کی عبادت نہیں کرتا جس کی تم کرتے ہو اور آیت: ﴿وَلَا أَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُمْ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ بھی جب تک میں زندہ ہوں کبھی اس کی عبادت نہیں کروں گا جس کی تم نے عبادت کی ہے۔ اسی طرح کفار کے متعلق فرمایا کہ نہ اب زمانہ حال میں تم اس (اکیلے اللہ) کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں اور نہ آئندہ زمانہ استقبال میں۔ اس پر ایک سوال ہے کہ کافروں کے متعلق کیسے فرمایا کہ وہ آئندہ ایک اللہ کی عبادت نہیں کریں گے، ہو سکتا ہے آئندہ وہ مسلمان ہو جائیں اور فی الواقع بے شمار کافر مسلمان ہوئے بھی ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کافر رہتے ہوئے یہ ممکن نہیں کہ وہ ایک اللہ کی عبادت کریں، مسلمان ہو جائیں تو الگ بات ہے۔ دوسرا جواب بخاری رضی اللہ عنہ نے ذکر فرمایا ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں کہ آیات سن کر ان کے کفر میں اضافہ ہی ہوتا ہے، ایمان ان کی قسمت میں نہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿وَلَيَزِيدَنَّ كَيْدًا مِنْهُمْ قَا أَنْزَلَ إِلَيْكَ مِنَ رَبِّكَ طُغْيَانًا وَكُفْرًا﴾ [المائدہ: ۶۸] ”اور یقیناً جو کچھ تیری طرف تیرے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے وہ ان میں سے بہت سے لوگوں کو سرکشی اور کفر میں ضرور بڑھا دے گا۔“ بخاری رضی اللہ عنہ کے الفاظ یہ ہیں: ”وَقَالَ غَيْرُهُ: ﴿لَا أَعْبُدُ مَّا تَعْبُدُونَ﴾ الْآنَ وَلَا أُحِبُّكُمْ فِيمَا بَقِيَ مِنْ عُمْرِي ﴿وَلَا أَنْتُمْ عِبُدُونَ مَّا أَعْبُدُ﴾ وَهُمْ الَّذِينَ قَالَ: ﴿وَلَيَزِيدَنَّ كَيْدًا مِنْهُمْ قَا أَنْزَلَ إِلَيْكَ مِنَ

زَيْدًا طَغِيًّا وَكُفْرًا ﴿۱﴾ [المائدہ: ۶۷] [بخاری، تفسیر، سورۃ: ﴿فَلْيَأْيِهَا الْكٰفِرُوْنَ﴾، قبل ج: ۴۹۶۷ | مطلب وہی ہے جو اوپر بیان ہوا۔

⑤ حافظ ابن کثیرؒ نے اس معنی کو ترجیح دی ہے کہ پہلی دو آیات میں ”مَا“ موصولہ ہے اور دوسری دو میں مصدر یہ۔ معنی یہ ہوگا کہ میں اس چیز کی عبادت نہیں کرتا جس کی تم کرتے ہو (یعنی معبودانِ باطلہ کی) اور تم اس کی عبادت نہیں کرتے جس کی میں کرتا ہوں (یعنی ایک اللہ کی) اور نہ میں وہ عبادت کرنے والا ہوں جو تم کرتے ہو (یعنی جس طرح تم تالیاں اور سیٹیاں بجا کر ذکر کرتے ہو اور کپڑے اتار کر ننگے ہو کر طواف کرتے ہو، میں اس طرح عبادت نہیں کرتا) اور نہ تم وہ عبادت کرنے والے ہو جو میں کرتا ہوں، یعنی صرف اللہ کے بتائے ہوئے طریقے پر عبادت کرو، تم ایسا کرنے کے لیے تیار نہیں۔

⑥ حافظ ابن تیمیہؒ نے فرمایا ”لَا اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ“ جملہ فعلیہ ہے، اس کا معنی ہے کہ نہ میں اس کی عبادت کرتا ہوں جس کی تم کرتے ہو اور ”وَلَا اَنَا عَابِدٌ مَا عَبَدْتُمْ“ جملہ اسمیہ ہے، جس میں نفی کی تاکید زیادہ ہے، یعنی میری شان ہی نہیں اور نہ کسی وقت مجھ سے ممکن ہے کہ (رسول ہوتے ہوئے) شرک کا ارتکاب کروں۔ یعنی نہ مجھ سے یہ فعل واقع ہوا ہے اور نہ مجھ سے اس کا شرعی امکان ہے۔ ”مَا عَبَدْتُمْ“ ماضی شاید اس لیے فرمایا کہ میری نبوت سے پہلے بھی تم نے جو شرک کیا اس وقت بھی وہ میرے لائق نہیں تھا، نہ میں نے اس وقت یا بعد میں کسی غیر کی پرستش کی۔ کفار کا حال دونوں جملہ اسمیہ ”وَلَا اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَا اَعْبُدُ“ سے بیان فرمایا، یعنی تم میں استعداد ہی نہیں اور نہ تم سے ممکن ہے کہ تم بلا شریک غیر سے اللہ واحد کی پرستش کرو۔

⑦ لَكُمْ دِينَكُمْ وَاِلٰی دِيْنِ: اس کے متعلق بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ آیت آیات جہاد سے منسوخ ہے، مگر یہ درست نہیں۔ اب بھی کسی کافر کو زبردستی مسلمان بنانا جائز نہیں، جیسا کہ فرمایا: ﴿لَا اِكْرَاهُ فِي الدِّيْنِ﴾ [البقرہ: ۲۵۶] ”دین میں زبردستی نہیں۔“ اگر وہ کفر پر قائم رہنا چاہتے ہیں تو جزیہ ادا کر کے کفر پر رہ سکتے ہیں، ہاں فیصلہ قیامت کے دن ہوگا۔

اس آیت سے ان لوگوں کے نظریے کی تردید ہوتی ہے جو اسلام، موجودہ نصرانیت، یہودیت، ہندو ازم اور تمام مذاہب کو ایک ہی حقیقت کے مختلف مظاہر قرار دے کر سب کو درست قرار دیتے ہیں۔

⑧ ”وَاِلٰی دِيْنِ“ اصل ”وَاِلٰی دِيْنِي“ ہے، چونکہ دوسری آیات تون پر فخر ہو رہی ہیں اس لیے آخر سے ”یاء“ حذف کر دی، مگر اس پر کسرہ باقی رکھا ہے۔



سُورَةُ النَّصْرِ
إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ

إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ ① وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا ② فَسَبِّحْ

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

جب اللہ کی مدد اور فتح آجائے ① اور تو لوگوں کو دیکھے کہ وہ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہو رہے ہیں ② تو اپنے

آیت 3:1 ① إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ : ابن کثیر نے فرمایا کہ ”الْفَتْحُ“ سے مراد یہاں فتح مکہ ہے، اس پر اتفاق ہے۔ عرب کے قبائل اسلام قبول کرنے کے لیے فتح مکہ کا انتظار کر رہے تھے، ان کا کہنا تھا کہ اگر یہ اپنی قوم پر غالب آ گیا تو بلاشبہ وہ نبی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے ہاتھوں سے مکہ فتح فرمادیا تو وہ فوج در فوج اسلام میں داخل ہو گئے۔ اس کے بعد دو سال نہیں گزرے تھے کہ سارا عرب مسلمان ہو گیا اور تمام قبائل میں کوئی ایسا شخص نہ تھا جو اسلام کا اقرار نہ کرتا ہو۔ (الحمد للہ) بخاری رضی اللہ عنہ نے اپنی صحیح میں عمرو بن سلمہ رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا، جب مکہ فتح ہوا تو ہر قوم نے چاہا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہو کر پہلے اسلام قبول کر لے اور تمام قبائل اپنے مسلمان ہونے کے لیے فتح مکہ کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اسے اور اس کی قوم کو چھوڑ دو، اگر یہ ان پر غالب آ گیا تو بلاشبہ وہ نبی ہے۔ [بخاری، المغازی، باب : ۴۳۰۲]

② ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک دن عمر رضی اللہ عنہ نے شیوخ بدر کی موجودگی میں مجھے بلوایا اور حاضرین سے پوچھا: ”اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿ إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ ﴾ کے متعلق تم کیا کہتے ہو؟“ تو ان میں سے بعض نے کہا کہ اس میں ہمیں حکم ہوا ہے کہ جب ہمیں فتح و نصرت حاصل ہو تو اللہ کی حمد اور استغفار کریں اور بعض خاموش رہے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ”ابن عباس! تم بھی یہی کہتے ہو؟“ میں نے کہا: ”نہیں!“ فرمایا: ”تو تم کیا کہتے ہو؟“ میں نے کہا: ”اس سے مراد رسول اللہ ﷺ کی موت کا وقت ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کی اطلاع دی ہے، فرمایا: ﴿ إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ ﴾ ”جب اللہ کی نصرت اور فتح آگئی۔“ یہ (فتح و نصرت) آپ ﷺ کی موت کی علامت ہے، لہذا اب آپ اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کیجیے اور اس سے استغفار کیجیے، یقیناً وہ ثواب ہے۔“ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”جو کچھ تم کہہ رہے ہو اس سورت کے متعلق مجھے بھی یہی معلوم ہے۔“ [بخاری، التفسیر، باب قوله: ﴿ فسبح بحمد ربك ﴾ : ۴۹۷۰]

③ حافظ ابن کثیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ شیوخ بدر نے جو تفسیر کی ہے وہ بھی بہت خوب صورت مفہوم ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے بعد آٹھ رکعات ادا فرمائیں۔ اس لیے امیر لشکر کے لیے مستحب ہے کہ کوئی شہر فتح کرنے کے بعد اس میں داخل ہو تو آٹھ رکعات (نوافل) پڑھے۔ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے مدائن فتح کیا تو ایسے ہی کیا تھا۔ البتہ عمر بن خطاب اور ابن عباس رضی اللہ عنہما نے جو مفہوم سمجھا ہے کہ اس میں آپ ﷺ کو آپ کی موت کی اطلاع دی گئی ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کا کام مکمل ہو چکا، اب آپ کو ہمارے پاس آنے کی تیاری کرنی چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی یہی سمجھا، اس لیے اس کے

بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرُكَ وَإِنَّكَ كَانَ تَوَّابًا ﴿۶﴾

رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کر اور اس سے بخشش مانگ، یقیناً وہ ہمیشہ سے بہت توبہ قبول کرنے والا ہے ﴿۶﴾

بعد آپ ﷺ تسبیح و تحمید اور استغفار کثرت سے کرنے لگے۔

④ اس سورت کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ نے پہلے سے بھی زیادہ آخرت کی تیاری شروع کر دی اور زیادہ سے زیادہ تسبیح و تحمید اور استغفار کرنے لگے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ”إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ“ نازل ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے کوئی نماز نہیں پڑھی جس میں یہ نہ پڑھا ہو: «سُبْحَانَكَ رَبَّنَا وَبِحَمْدِكَ، اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِي» [بخاری، التفسیر، سورۃ ﴿إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ﴾ : ۴۹۶۷] ”تو (ہر عیب سے) پاک ہے، اے ہمارے پروردگار! ہم تیری تعریف اور پاکی بیان کرتے ہیں، اے اللہ! مجھے بخش دے۔“ بخاری کی اس سے بعد والی روایت بھی عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے مروی ہے کہ آپ ﷺ اپنے رکوع اور سجدے میں کثرت سے یہ دعا پڑھتے تھے: «سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ رَبَّنَا وَبِحَمْدِكَ، اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِي» [بخاری، التفسیر، سورۃ ﴿إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ﴾ : ۴۹۶۸] ”اے ہمارے اللہ! اے ہمارے پروردگار! تو (ہر عیب سے) پاک ہے، ہم تیری تعریف اور پاکی بیان کرتے ہیں، اے اللہ! مجھے بخش دے۔“ آپ ﷺ یہ دعا قرآن پر عمل کرتے ہوئے پڑھتے تھے۔

⑤ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «مَنْ جَلَسَ فِي مَجْلِسٍ فَكَثُرَ فِيهِ لَغَطُهُ فَقَالَ قَبْلَ أَنْ يَقُومَ مِنْ مَجْلِسِهِ ذَلِكَ: سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ، إِلَّا غُفِرَ لَهُ مَا كَانَ فِي مَجْلِسِهِ ذَلِكَ» [ترمذی، الدعوات، باب ما يقول إذا قام من مجلسه : ۳۴۳۳، وقال الألبانی صحیح] ”جو شخص کسی مجلس میں بیٹھے اور اس میں شور وغل زیادہ کر بیٹھے، پھر اس مجلس سے اٹھنے سے پہلے یہ پڑھ لے تو اس مجلس میں اس سے جو کچھ ہوا وہ معاف کر دیا جاتا ہے: «سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ» ”اے اللہ! تو پاک ہے اور تیری حمد کے ساتھ (ہم تیری تعریف کرتے ہیں)، میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں، میں تجھ سے بخشش مانگتا ہوں اور تیری طرف توبہ کرتا ہوں۔“

⑥ ”إِنَّكَ كَانَ تَوَّابًا“ میں ”كَانَ“ استمرار کے لیے ہے، اس لیے ترجمہ کیا گیا ہے: ”یقیناً وہ ہمیشہ سے بہت توبہ قبول کرنے والا ہے۔“





تَبَّتْ يَدَا ابْنِي لَهَبٍ وَ تَبَّ ①

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

ابولہب کے دونوں ہاتھ ہلاک ہو گئے اور وہ (خود) ہلاک ہو گیا ①

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جب (سورہ شعراء کی) آیت: ﴿وَ أَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ﴾ (اے نبی! اپنے سب سے قریبی خاندان والوں کو ڈرا) اتری تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم صفا پر چڑھے اور آواز دی: «یا بنی فہر! یا بنی عدی! لبطلون قریش حتی اجتمعوا، ففعل الرجل إذا لم يستطع أن يخرج أرسل رسولا لينظر ما هو، فحاء أبو لهب وقریش فقال أرايتكم لو أخبرتكم أن خيلاً بالوادي تريد أن تغير عليكم، أكنتم مصدقي؟ قالوا نعم، ما جربنا عليك إلا صدقا، قال فإني نذير لكم بين يدي عذاب شديد، فقال أبو لهب تباً لك سائر اليوم، ألهذا جمعنا؟ فنزلت: ﴿تَبَّتْ يَدَا ابْنِي لَهَبٍ وَ تَبَّ ۖ مَا أَغْنَىٰ عَنْهُ مَالُهُ وَ مَا كَسَبَ ۖ﴾ (بخاری، التفسیر، باب: ﴿وَ أَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ﴾: ۴۷۷۰) [”اے بنی فہر! اے بنی عدی!“ اور قریش کے قبیلوں کے نام لے لے کر پکارا، یہاں تک کہ وہ جمع ہو گئے۔ کوئی آدمی خود نہ آسکا تو اس نے کسی کو بھیج دیا تاکہ دیکھے کہ کیا بات ہے۔ ابولہب اور قریش کے دوسرے لوگ آگئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”یہ بتاؤ کہ اگر میں تمہیں اطلاع دوں کہ وادی میں ایک لشکر تم پر حملہ کرنا چاہتا ہے تو کیا تم مجھے سچا سمجھو گے؟“ انھوں نے کہا: ”ہاں! ہم نے آپ سے سچ کے علاوہ کبھی کوئی اور تجربہ نہیں کیا (یعنی آپ کو ہمیشہ سچا ہی پایا)۔“ آپ نے فرمایا: ”تو پھر میں تمہیں ایک سخت عذاب سے پہلے ڈرانے والا ہوں۔“ ابولہب کہنے لگا: ”سارا دن تیرے لیے ہلاکت ہو! تو نے ہمیں اسی لیے جمع کیا ہے؟“ تو یہ سورت اتری: ﴿تَبَّتْ يَدَا ابْنِي لَهَبٍ وَ تَبَّ ۖ مَا أَغْنَىٰ عَنْهُ مَالُهُ وَ مَا كَسَبَ ۖ﴾ ”ابولہب کے دونوں ہاتھ ہلاک ہو گئے اور وہ (خود) ہلاک ہو گیا۔ نہ اس کے کام اس کا مال آیا اور نہ جو کچھ اس نے کمایا۔“

آیت 1 ① تَبَّتْ يَدَا ابْنِي لَهَبٍ وَ تَبَّ: ابولہب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا تھا، نام عبدالعزیٰ بن عبدالمطلب تھا۔ ”لہب“ شعلے کو کہتے ہیں، ”ابنی لہب“ شعلے کا باپ یا شعلے والا۔ رخساروں کی خوب صورتی اور سرخی کی وجہ سے یا طبیعت کی تیزی اور جوش کی وجہ سے ابولہب کے نام سے مشہور ہوا، پھر جنمی ہونے کی وجہ سے فی الواقع شعلے والا ہی بن گیا۔ اس شخص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سخت عداوت تھی۔ باوجود اس کے کہ چچا باپ کی طرح ہوتا ہے، یہ ہر موقع پر آپ کی مخالفت کرتا اور ایذا پہنچانے کی کوشش کرتا۔ آپ کے دشمنوں میں سے یہ واحد شخص ہے جس کے نام سے قرآن میں اس کے برے انجام کی پیش گوئی کی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام میں نسب اور خاندان کی بنیاد پر نہیں بلکہ ایمان اور کفر کی بنیاد پر اپنے اور غیر کا فیصلہ ہوتا ہے۔

② رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سخت مخالفت اور آپ کو ہلاکت کی بددعا دینے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ”تَبَّتْ يَدَا ابْنِي لَهَبٍ وَ تَبَّ“

مَا أَغْنَىٰ عَنْهُ مَالُهُ وَمَا كَسَبَ ۖ ﴿۲﴾

نہ اس کے کام اس کا مال آیا اور نہ جو کچھ اس نے کمایا ﴿۲﴾

فرمایا۔ اس کے دو معانی ہو سکتے ہیں، پہلا یہ کہ ابولہب کے دونوں ہاتھ ہلاک ہو گئے اور وہ خود ہلاک ہو گیا۔ یہ معنی تو ظاہر ہے۔ دوسرا یہ کہ ابولہب کے دونوں ہاتھ ہلاک ہو جائیں اور وہ (فی الواقع) ہلاک ہو گیا۔ یہ معنی فزاء نے کیا ہے، یعنی اس کی بددعا کے مقابلے میں اہل ایمان کی بددعا کی جگہ اللہ تعالیٰ نے یہ الفاظ فرمادئے کہ ابولہب کے دونوں ہاتھ ہلاک ہو جائیں، پھر بتایا کہ وہ ہلاک ہو چکا۔

﴿۳﴾ ”ابولہب کے دونوں ہاتھ ہلاک ہو گئے“ یہاں ہاتھوں کا ذکر خاص طور پر اس لیے کیا گیا کہ ایذا رسانی میں ہاتھوں کا حصہ دوسرے تمام اعضا سے زیادہ موثر ہوتا ہے اور ان کے ساتھ زیادہ تکلیف پہنچائی جاسکتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ہاتھوں سے مراد اولاد اور ساتھی ہیں، جو مددگار ہوتے ہیں اور دست و بازو بنتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق ایسا ہی ہوا، اس کے مددگار جنگ بدر میں برباد ہو گئے، وہ خود جنگ میں نہیں گیا، شکست کی خبر آئی تو اسی صدمے سے مر گیا۔

آیت 2 مَا أَغْنَىٰ عَنْهُ مَالُهُ وَمَا كَسَبَ: ”نہ اس کے کام اس کا مال آیا اور نہ جو کچھ اس نے کمایا“ کمائی سے مفسرین نے اس کے بیٹے مراد لیے ہیں، علاوہ ازیں اس نے اپنے خیال میں جو اعمال نیکی سمجھ کر کیے تھے وہ اس کے کسی کام نہ آئے۔ صحیح بخاری میں ہے: « قَالَ عُرْوَةُ: وَ تُوَيْبَةُ مُوَلَّاةٌ لِأَبِي لَهَبٍ وَ سَكَّانُ أَبُو لَهَبٍ أُعْتَقَهَا فَأَرْضَعَتْ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَلَمَّا مَاتَ أَبُو لَهَبٍ أُرِيَهُ بَعْضُ أَهْلِهِ بَشْرَ حَبِيبَةَ (بَشْرَ حَبِيبَةَ) قَالَ لَهُ مَاذَا لَقِيتِ، قَالَ أَبُو لَهَبٍ لِمَ أُلِقَ بَعْدَكُمْ غَيْرٌ (لَمْ أُلِقْ بَعْدَكُمْ غَيْرًا غَيْرٌ) أَنِّي سُقِيتُ فِي هَذِهِ بَعَثَاتِي تُوَيْبَةَ » [بخاری، النکاح، باب: وَأَمَّا نَهْكَه الْاِتْرَ اَرْضَعَكَ ۴: ۱۵۱۰۱] ”عروہ نے کہا کہ تُوئیبہ ابولہب کی لونڈی تھی جسے ابولہب نے آزاد کیا تھا، پھر اس نے نبی ﷺ کو دودھ پلایا۔ جب ابولہب فوت ہوا تو اس کے گھر والوں میں سے کسی کو خواب میں ابولہب بہت بری حالت میں دکھایا گیا، اس نے اس سے پوچھا: ”تم کس چیز کو ملے؟“ ابولہب نے کہا: ”میں تمہارے بعد (کسی خیر کو) نہیں ملا سوائے اس کے کہ میں اپنی اس (انگلی اور انگوٹھے کی درمیانی جگہ) سے پلایا گیا ہوں، میرے تُوئیبہ کو آزاد کرنے کی وجہ سے۔“ فتح الباری میں ہے کہ تمیمی نے ذکر کیا کہ عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ”جب ابولہب فوت ہوا تو میں نے اسے ایک سال بعد خواب میں بہت بری حالت میں دیکھا تو اس نے کہا: ”میں تمہارے بعد کسی راحت کو نہیں ملا مگر اتنا ہے کہ ہر سوموار کو میرا عذاب ہلکا کر دیا جاتا ہے۔“ کہا: ”اس کی وجہ یہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ سوموار کے دن پیدا ہوئے تھے اور تُوئیبہ نے ابولہب کو آپ کے پیدا ہونے کی خوش خبری دی تو اس نے اسے آزاد کر دیا۔“ (فتح الباری) نبی ﷺ کا میلاد منانے والے حضرات نے اس سے دلیل پکڑی ہے کہ نبی ﷺ کا یوم میلاد منانا جائز ہے۔ ان حضرات نے خیال نہیں فرمایا کہ یہ عباس رضی اللہ عنہما کا خواب ہے جو اس وقت ابھی کافر تھے، مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ اب ایک طرف اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ نہ ابولہب کا مال اس کے کام آیا اور نہ جو اس نے کمایا اور ایک طرف ایک شخص کے زمانہ کفر کا خواب ہے کہ تُوئیبہ کا آزاد کرنا اس کے کام آیا۔ یہ بات مسلم ہے کہ نبی ﷺ کا

سَيَصِلِي نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ﴿٤٣﴾ وَأَمْرَأَتُهُ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ﴿٤٤﴾ فِي جِيدِهَا حَبْلٌ مِّن مَّسَدٍ ﴿٤٥﴾

عقرب وہ شعلے والی آگ میں داخل ہوگا ﴿٤٣﴾ اور اس کی بیوی (بھی آگ میں داخل ہوگی) جو ایندھن اٹھانے والی ہے ﴿٤٤﴾ اس کی گردن میں مضبوط بٹی ہوئی رسی ہوگی ﴿٤٥﴾

خواب شریعت میں حجت ہے کیونکہ وہ وحی الہی ہے، نبی کے سوا کسی مسلمان کا خواب بھی حجت نہیں، چہ جائے کہ کسی غیر مسلم کا خواب شرعی دلیل بنایا جائے، جب کہ وہ خواب صریح طور پر قرآن مجید کے خلاف ہے، کیونکہ قرآن نے ابو لہب کے ہاتھوں کا نام لے کر ان کے ہلاک ہونے کی وعید سنائی ہے۔ پھر ان حضرات نے یہ بھی خیال نہیں فرمایا کہ میلاد منانے کی اگر کوئی اصل ہوتی تو اس نیکی سے رسول اللہ ﷺ، خلفائے راشدین، صحابہ کرام اور اہل بیت ہر سال محروم نہ رہتے۔ رہی یہ بات کہ بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں اسے کیوں ذکر فرمایا ہے؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اسے ”کِتَابُ النِّكَاحِ“ میں ذکر فرمایا ہے اور ان کا مقصد اس سے یہ ثابت کرنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو ابو لہب کی لونڈی ثویبہ نے دودھ پلایا تھا اور اسی نے ابوسلمہ جناب کو بھی دودھ پلایا تھا، اس لیے ابوسلمہ جناب کی بیٹی سے نکاح نبی ﷺ کے لیے جائز نہ تھا، کیونکہ وہ آپ کی رضاعی بھتیجی تھی۔ بخاری رحمہ اللہ نے اسے میلاد منانے کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ ہی کوئی صاحب عقل کسی غیر مسلم کے خواب سے شریعت اخذ کرتا ہے، خصوصاً جب وہ صاف قرآن مجید کے خلاف بھی ہو۔ قرآن کی اس صریح آیت کی رو سے ابو لہب کو ثویبہ لونڈی کا آزاد کر دینا کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکے گا۔

آیت 4.3 ① سَيَصِلِي نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ: ”أَمْرَأَتُهُ“ کا عطف ”سَيَصِلِي“ میں ابو لہب کی طرف لوٹنے والی ضمیر پر ہے، یعنی وہ اور اس کی بیوی شعلے مارتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے۔ ابو لہب کی بیوی ام جمیل کا نام اردوئی بنت حرب بن امیہ تھا، یہ قریش میں اونچے نسب والی عورت تھی، ابوسفیان بن حرب جناب کی بہن اور معاویہ بن ابی سفیان کی اپنے خاوند کی طرح رسول اللہ ﷺ سے سخت عداوت رکھتی تھی۔ (ابن کثیر)

② ”حَمَّالَةَ الْحَطَبِ“ ”أَمْرَأَتُهُ“ سے حال ہے، یعنی اس کی بیوی ایندھن اٹھائے ہوئے آگ میں داخل ہوگی۔ مفسرین نے اس کے تین معانی بیان فرمائے ہیں، ایک یہ کہ وہ گناہوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے جہنم میں داخل ہوگی، جو جہنم کو بھڑکانے کے لیے ایندھن ہے، دوسرا یہ کہ وہ لوگوں میں رسول اللہ ﷺ کے خلاف عداوت کی آگ بھڑکانی رہتی ہے اور تیسرا یہ کہ اپنی پیٹھ پر ایندھن لاکر آپ کی راہ میں کانٹے بچھاتی رہتی ہے۔

آیت 5 ﴿٥﴾ فِي جِيدِهَا حَبْلٌ مِّن مَّسَدٍ: ”جِيدٌ“ گردن۔ ”مَسَدٌ“ کھجور کی چھال کی رتی یا گولگل کے درخت کی چھال کی رسی یا کسی بھی چیز کی بنی ہوئی رسی یا خوب مضبوط بٹی ہوئی رسی۔ لوہے کی رسی کو بھی ”مَسَدٌ“ کہتے ہیں، یعنی جہنم میں اس حال میں داخل ہوگی کہ اس کی گردن میں مضبوط بٹی ہوئی رسی ہوگی۔ صحیح بخاری میں مجاہد سے منقول ہے کہ اس سے مراد وہ زنجیر ہے جو آگ میں ہوگی، جس میں مجرم پروئے جائیں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿شَحْرَفِي سِلْسِلَةً ذَرَعُهَا سَبْعُونَ ذِرَاعًا فَاسْتَكْوَهُ﴾ [الحاقة: ۲۲] ”پھر ایک زنجیر میں جس کی پیمائش ستر ہاتھ ہے، اسے داخل کر دو۔“

قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ ①

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

کہہ دے وہ اللہ ایک ہے ①

ابی بن کعب رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ”مشرکین نے کہا، اے محمد! ہمارے لیے اپنے رب کا نسب بیان کیجیے تو اللہ عزوجل نے ”قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ“ نازل فرمائی۔“ [مسند ابن حاکم: ۲/۵۴۰، ح: ۳۹۸۷] اس سورت کے صحیح احادیث میں بہت سے فضائل آئے ہیں، اختصار کی وجہ سے چند حدیثیں درج کی جاتی ہیں: ① ابو سعید خدری رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک شخص نے ایک آدمی کو (قیام اللیل میں) ”قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ“ بار بار پڑھتے ہوئے سنا (اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں پڑھ رہا تھا)۔ صبح ہوئی تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ سے اس کا ذکر کیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اسے کم سمجھ رہا ہے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «وَأَبَدَيْتِي نَفْسِي بِنِدْوَاهُ إِنَّهَا لَتَعْبُدُنِي تُكَلِّمُنِي أَلْتَمَلُنِي أَلْتَمَلُنِي» [بخاری، فضائل القرآن، باب فضل: ﴿قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ﴾: ۵۰۱۳، ۵۰۱۴، ۵۰۱۳] ”تم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! یہ سورت قرآن کے ایک تہائی حصے کے برابر ہے۔“ ② عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو ایک لشکر کا امیر بنا کر بھیجا، وہ نماز میں اپنی قراءت کو ”قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ“ کے ساتھ پڑھتا تھا۔ جب وہ لوگ واپس آئے تو انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات کا ذکر کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «سَلُّوْهُ لِأَيِّ شَيْءٍ يُصْنَعُ ذَلِكَ؟» [اس سے پوچھو وہ ایسا کیوں کرتا ہے؟] ”لوگوں نے اس سے پوچھا تو اس نے کہا: «لِأَنَّهَا صِفَةُ الرَّحْمٰنِ وَأَنَا أَحِبُّ أَنْ أَقْرَأَ بِهَا» [اس لیے کہ یہ رحمان کی صفت ہے اور مجھے اس کے پڑھنے سے محبت ہے۔] ”تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «أَحْبَبُ وَهُوَ أَنْ اللّٰهَ يُحِبُّهُ» [بخاری، التوحيد، باب ما جاء في دعاء النبي ﷺ أمه: ۱۷۳۷۵] ”اسے بتا دو کہ اللہ تعالیٰ اس سے محبت رکھتا ہے۔“ سوتے وقت اور دوسرے اوقات میں معوذتین کے ساتھ ملا کر یہ سورت پڑھنے کی احادیث معوذتین کے شروع میں آئیں گی۔ (ان شاء اللہ)

تنبیہ: بعض روایات میں اس سورت کو روزانہ دو سو مرتبہ یا سو مرتبہ یا پچاس مرتبہ پڑھنے کی مختلف فضیلتیں آئی ہیں، مگر ان روایات کی سندیں صحیح نہیں ہیں۔ شوکانی نے فتح القدر میں وہ روایات درج کر کے ان کا ضعف واضح کیا ہے۔ ابن کثیر نے بھی ان روایات پر کلام کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس سورت کو تین سے زیادہ کسی عدد میں مسنون سمجھ کر پڑھنا درست نہیں۔ ہاں! اپنی سہولت کے لیے کوئی شخص کوئی عدد مقرر کر لے، اسے مسنون نہ سمجھے تو درست ہے۔

آیت 1 ① قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ: اس کی ترکیب کئی طرح سے کی گئی ہے، زیادہ واضح دو ہیں: ① ”هُوَ“ مبتدا ہے، لفظ ”اللَّهُ“ پہلی خبر اور ”أَحَدٌ“ دوسری خبر۔ معنی یہ ہوگا: ”(ہمارے) جس رب کا نسب پوچھ رہے ہو (وہ اللہ ہے) (وہ) ایک ہے۔“ ② ”هُوَ“ مبدل منہ اور لفظ ”اللَّهُ“ بدل، دونوں مل کر مبتدا اور ”أَحَدٌ“ خبر ہے۔ معنی یہ ہوگا: ”وہ اللہ (جس کے متعلق تم

پوچھ رہے ہو، ایک ہے۔“

② کائنات کے خالق اور پروردگار کے بے شمار ناموں میں سے لفظ ”اللہ“ بطور علم یعنی اصل نام کے طور پر استعمال ہوتا ہے، باقی نام اس کی کسی نہ کسی صفت کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ اس کی اصل ”الْإِلَٰه“ ہے، ”إِلَٰه“ کا معنی معبود ہے۔ تو لفظ ”اللہ“ کا معنی یہ ٹھہرا کہ وہ خاص ہستی جو عبادت کے لائق ہے، کیونکہ اس میں کمالات کی تمام صفات پائی جاتی ہیں۔ ”هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ“ کا معنی یہ ہے کہ وہ رب جس کے متعلق تم پوچھ رہے ہو وہ کوئی نئی یا نامعلوم ہستی نہیں، بلکہ وہ اللہ ہے جسے تم بھی جانتے اور مانتے ہو، وہی جو معبود برحق ہے اور وہ اللہ ایک ہے۔

③ اللّٰهُ اَحَدٌ: اللہ تعالیٰ کے ایک ہونے کے تین معانی ہو سکتے ہیں اور تینوں یہاں درست ہیں، پہلا، یہ کہ وہ ایک ذات ہے، دو یا تین یا زیادہ نہیں اور اس کی ذات میں تعدد نہیں، دوسرا یہ کہ وہ معبود برحق ہونے میں اکیلا ہے، اس کا کوئی ثانی یا شریک نہیں اور تیسرا یہ کہ وہ ایک ہے، اس کی تقسیم نہیں ہو سکتی اور نہ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو سکتا ہے۔ اس ایک ہی آیت سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی بھی قسم کا شریک بنانے والوں کی تردید ہو گئی، خواہ وہ مجوس (آتش پرست) ہوں، جو وہ خالق مانتے ہیں، ایک خیر کا خالق (یزدان) اور دوسرا شر کا خالق (ابریمن)، خواہ ”شیث“ (تین خداؤں) کو ماننے والے ہوں، خواہ بندہ ہوں جو کروڑوں دیوتوں کو خدائی میں حصے دار مانتے ہیں اور خواہ وہ وحدت الوجود کے قائل ہوں جو ہر چیز ہی کو اللہ مانتے ہیں، کیونکہ اگر ہر چیز ہی اللہ ہے یا ہر چیز میں اللہ ہے تو اللہ ایک تو نہ رہا، جبکہ اللہ تعالیٰ کا تعارف ہی یہ ہے کہ وہ ایک ہے، اس میں تعدد اور شریک نہیں۔

اسی طرح ان لوگوں کے عقیدہ کی بھی تردید ہو گئی جو اللہ کے علاوہ کسی کو عالم الغیب یا اختیارات کا مالک سمجھ کر مدد کے لیے پکارتے ہیں اور انھیں خدائی اختیارات میں اللہ کا شریک بناتے ہیں۔

اسی طرح ان لوگوں کی بھی تردید ہو گئی جو اللہ کی ذات سے ٹکڑوں کے جدا ہونے کے قائل ہیں، کوئی کہتا ہے جیسی علیہ اللہ کے بیٹے ہیں، کوئی کہتا ہے عزیر علیہ اللہ کے بیٹے ہیں، کوئی کہتا ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نور میں سے پیدا ہوئے ہیں، کیونکہ ان تمام صورتوں میں کوئی نہ کوئی ہستی اللہ کی شریک ٹھہرتی ہے اور وہ ایک نہیں رہتا۔ میں نے ایک صاحب کی تقریر سنی، وہ کہہ رہے تھے: ”نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نور میں سے نور ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اللہ کے نور میں سے نور کس طرح جدا ہو سکتا ہے؟ میں آپ کو مثال سے سمجھاتا ہوں، دیکھیے! یہ ایک موم بتی جل رہی ہے، اس میں سے ایک اور موم بتی جلا لیں تو کیا پہلی کے نور میں کوئی کمی واقع ہوگی؟ ہرگز نہیں، اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نور میں سے نور ہیں اور اللہ نے نور میں بھی کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔“ اس بے چارے نے یہ نہ سمجھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے مثالیں بیان کرنے سے منع کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿فَلَا تَقْرُبُوا اللّٰهَ الْاَمْثَالَ ۗ اِنَّ اللّٰهَ يَعْزَمُ ۗ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ | الاحقاف: ۷۹ | ”پس قرآن اللہ کے لیے مثالیں مت بیان کرو، کیونکہ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔“ اور نہ یہ سمجھا کہ پہلی موم بتی میں کوئی کمی ہو یا نہ ہو، دو موم بتیاں تو بن گئیں، سب کہ اللہ ایک ہے اور نہ یہ سمجھا کہ اللہ کا نور نہ کسی سے نکلا ہے اور نہ اس سے کوئی نکلتا ہے۔ یہ عقیدہ تو اہلینہ وہی عقیدہ

اللَّهُ الصَّمَدُ ①

اللہ ہی بے نیاز ہے ②

ہے جو انصاریوں نے مسیحی مذہب کے متعلق اختیار کیا۔

اسی طرح ”اللَّهُ أَحَدٌ“ سے ان لوگوں کی بھی تردید ہو گئی جو کہتے ہیں کہ بندہ و جب زیادہ عبادت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ ان میں اتر آتا ہے، پھر وہ اللہ ہی بن جاتا ہے اور دلیل میں صحیح بخاری کی وہ حدیث پیش کرتے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ کا فرمان نقل ہوا ہے کہ میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے۔ ان لوگوں نے سورہ اخلاص پر غور نہ کیا کہ اس صورت میں اللہ ایک تو نہ رہا، جبکہ اس کا سب سے پہلا تعارف ہی یہ ہے کہ وہ ایک ہے اور نہ اس حدیث کے آخر پر غور کیا جس میں واضح الفاظ ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرا وہ بندہ اگر مجھ سے مانگے تو میں اسے دوں گا اور اگر مجھ سے پناہ طلب کرے تو میں اسے پناہ دوں گا۔ ”الرُّمَّانُ تَوْشَدُمُ تَوْشَدُمُ شُدِّي“ کے مطابق اللہ اور بندہ ایک ہو گئے تو پھر مانگے گا کون اور دے گا کون؟ پناہ مانگنے والا کون ہوگا اور پناہ دینے والا کون؟

اسی طرح ان لوگوں کی بھی تردید ہو گئی جو کہتے ہیں کہ بندہ عبادت کرتے کرتے اللہ کے ساتھ اس طرح واصل ہو جاتا ہے کہ وہ وہی بن جاتا ہے، جس طرح لوہا گرم ہوتے ہوتے آگ بن جاتا ہے۔ اس غلطی کی بنیادی وجہ بھی اللہ کے لیے مخلوق کی مثالیں بیان کرنا ہے، جبکہ اللہ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ اس کے ماوراء ان بے چاروں نے یہ نہ دیکھا کہ آیت ۱۰ اللَّهُ أَحَدٌ ۱۰ (اللہ ایک ہے) اس کی نفی کر رہی ہے، بندہ تو اللہ سے الگ ایک ذات ہے۔ مخلوق اور خالق وہ ہیں ایک نہیں، جبکہ اللہ تعالیٰ ایک ہے، وہ ایک کیسے بن گئے؟ یہ تو وہی انصاریوں والا عقیدہ ہے کہ باپ خدا، بیٹا خدا، روح القدس خدا، مگر تمہیں نہیں بلکہ ایک خدا، اللہ کے بندو! دو یا تین ایک کیسے بن گئے؟ الغرض، یہ ایسی مبارک سورت ہے کہ اللہ کی توحید کے خلاف جتنے عقیدے ہیں اور ان کی جتنی بھی توجیہ ہمیں کی جاتی ہیں، یہ اکیلی سورت بلکہ اس کی ایک آیت ہی ان کی تردید کئے لیے کافی ہے۔ پھر اگر رسول اللہ ﷺ نے اسے قرآن کا ثبوت (ایک تہائی) قرار دیا ہے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟

آیت 2 ① اللَّهُ الصَّمَدُ: "الصَّمَدُ" کی تفسیر میں سلف کے کئی اقوال ہیں، ان کا خلاصہ تین اقوال میں آ جاتا ہے

① "الصَّمَدُ" وہ سروار ہے جس کی طرف لوگ قصد کر کے جائیں، جس سے بڑا کوئی سروار نہ ہو۔ یہ "صمد" (لفظ اللہ) (قصد کرنا) سے مشتق ہے۔ گویا "الصَّمَدُ" بمعنی "مطمئنہ" ہے۔ اس سلف نے یہی معنی لیا ہے۔ ② وہ گنہگار پتھر ہے۔ جو جس کا پت نہ ہو، جو کھولھا نہ ہو، جس سے پتھر اٹھا نہ ہو۔ اس لیے یہ گنہگار مومن صدیق آتے ہیں۔

② عربی زبان کا قاعدہ ہے کہ جب خبر پر الف لام آئے تو علامتیں اس پر پڑا جاتا ہے۔ اس لیے "الصَّمَدُ" ہونا تو صحیح ہے تھا کہ اللہ صمد ہے۔ اب "اللَّهُ الصَّمَدُ" فرمایا، تو معنی یہ ہے کہ اللہ ہی "صمد" ہے، کوئی اور صمد نہیں۔ اس سے پہلی آیت میں "اللَّهُ أَحَدٌ" فرمایا، جس کا معنی ہے اللہ ایک ہے۔ وہاں "اللَّهُ الْأَحَدُ" نہیں فرمایا کہ اللہ ہی ایک ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ

لَمْ يَلِدْهُ وَ لَمْ يُولَدْ ۝

نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ وہ جنا گیا ۝

وہاں حصر کی ضرورت ہی نہیں تھی، کیونکہ وہ ہستی جو ایک ہے وہ صرف اللہ تعالیٰ ہے، کسی اور کو آحد کہہ ہی نہیں سکتے۔ ہر ایک کا ثانی کسی نہ کسی طرح موجود ہے، کسی اور چیز میں اس کا ثانی نہ ہو تو مخلوق ہونے میں اس کے بے شمار ثانی موجود ہیں، اس لیے اس کائنات میں ایک ہستی صرف اللہ کی ہے، اس لیے وہاں حصر کی ضرورت ہی نہیں، جبکہ صمد ہونے کے دعوے دار بے شمار ہیں، جن کے پاس لوگ اپنی ضرورتوں کے لیے جاتے ہیں۔ اس لیے فرمایا اصل صمد صرف وہ ہے، کیونکہ دوسرے لوگ کتنے بھی بڑے سردار ہوں، لوگ ان کے پاس اپنی حاجتوں کے لیے جاتے ہوں، مگر وہ خود کسی نہ کسی کے محتاج ہیں۔ یہ صرف اللہ کی ہستی ہے کہ وہ کسی کا محتاج نہیں، باقی سب اس کے محتاج ہیں، وہ سب کو کھلاتا ہے، خود کھانے کا محتاج نہیں، جیسا کہ فرمایا:

﴿ وَ هُوَ يُطْعَمُ وَلَا يُطْعَمُ ﴾ [الأنعام : ۱۴] ” حالانکہ وہ کھلاتا ہے اور اسے نہیں کھلایا جاتا۔“ پھر نہ اس سے کوئی پیدا ہوا اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا۔ ”الضمد“ کے اس مفہوم کو ”بے نیاز“ کا لفظ کافی حد تک ادا کرتا ہے۔

بیت 3 ① لَمْ يَلِدْهُ وَ لَمْ يُولَدْ: ”نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ کسی نے اس کو جنا“ اس آیت میں نصرانیوں کا رد ہے جو عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا مانتے ہیں، یہودیوں کا رد ہے جو عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا مانتے ہیں، مشرکین عرب کا رد ہے جو فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں مانتے ہیں، فلاسفہ کا رد ہے جو کہتے ہیں کہ عقول عشرہ اللہ سے نکلے ہیں اور اب کائنات کا نظام وہ چلا رہی ہیں، ہندوؤں کا رد ہے جو کروڑوں کی تعداد میں مخلوق کو خدا مانتے ہیں اور ان مسلمان کہلانے والوں کا بھی رد ہے جو کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ اور ائمہ اہل بیت اللہ تعالیٰ کے ذاتی نور سے پیدا ہوئے ہیں۔

② اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اپنے لیے اولاد کی نفی کے بہت سے دلائل بیان فرمائے ہیں، ان میں سب سے واضح چار ہیں، پہلی دلیل یہ ہے کہ اولاد لازماً باپ کی جنس سے ہوتی ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی جنس ہی نہیں۔ اس آیت میں اسی دلیل کی طرف اشارہ ہے: ﴿ مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَّكَ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَأُمَّهُ صَدِيقَةٌ كَانَا يَأْكُلِنِ الطَّعَامَ ﴾ [المائدة : ۷۵] ”نہیں ہے مسیح ابن مریم مگر ایک رسول، اس سے پہلے کئی رسول گزر گئے اور اس کی ماں صدیقہ ہے۔ وہ دونوں کھانا کھایا کرتے تھے۔“ یعنی مسیح ابن مریم ﷺ سے پہلے کئی رسول گزرے، وہ پہلے نہیں تھے، پھر پیدا ہوئے، وہ حادث تھے جب کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے ہے۔ باپ اور اولاد کی جنس ایک ہوتی ہے جب کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے ہے اور عیسیٰ علیہ السلام حادث ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کھاتا نہیں اور وہ دونوں کھاتے تھے۔ جنس ایک نہ رہی تو اولاد کیسے بن گئی؟ دوسری دلیل یہ کہ والد اولاد اس لیے حاصل کرتا ہے کہ وہ اس کا محتاج ہوتا ہے اور اللہ کو کسی کی کوئی حاجت نہیں۔ اس آیت میں یہی فرمایا ہے: ﴿ قَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهُ هُوَ الْغَنِيُّ ﴾ [یونس : ۶۸] ”انھوں نے کہا کہ اللہ نے اولاد پکڑی ہے، وہ پاک ہے، وہی تو غنی ہے۔“ یعنی وہی تو ہے جو غنی ہے، جسے کسی کی حاجت نہیں، وہ اولاد کیوں بنائے گا؟ تیسری دلیل یہ کہ تمام مخلوق اللہ

وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ ﴿۴﴾

اور نہ کبھی کوئی ایک اس کے برابر کا ہے ﴿۴﴾

کے بندے اور غلام ہیں اور بندہ ہونا بیٹا ہونے کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا، فرمایا: ﴿وَمَا يَنْبَغِي لِلرَّحْمَنِ أَنْ يَتَّخِذَ وَلَدًا ۗ إِنْ كُلُّ نَفْسٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّا اُنۡى الرَّحْمٰنِ عَبۡدًا﴾ [مریم: ۹۲، ۹۳] "اور رحمان کے لائق ہی نہیں کہ وہ اولاد پکڑے، آسمانوں میں اور زمین میں جو کوئی بھی ہے رحمان کے پاس بندہ (غلام) بن کر آنے والا ہے۔" یعنی رحمان کی اولاد کس طرح ہو سکتی ہے، جب کہ زمین و آسمان میں جو کوئی بھی ہے وہ رحمان کے پاس غلام اور بندہ بن کر پیش ہونے والا ہے؟ بیٹا ہو اور غلام بھی ممکن ہی نہیں۔ چوتھی دلیل یہ کہ اولاد اسی کی ہوتی ہے جس کی بیوی ہو اور اللہ تعالیٰ کی بیوی ہی نہیں تو اولاد کیسے ہوگی؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اِنۡى يَكُوۡنُ لَهٗ وَاٰلِهٖٓ وَوَلَدًا ۗ وَلَمْ يَكُنْ لَهٗ صٰلِحِيۡنَ﴾ [الانعام: ۱۰۱] "اس کی اولاد کیسے ہوگی جب کہ اس کی بیوی ہی نہیں۔" ﴿۳﴾ ابوہریرہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿كَذٰبِيۡ اِنْ اٰذَمۡ وَاَنْتَ بَكْرٌ لِّهٖ ذٰلِكَ ۗ وَشَتَمِيۡ وَاَنْتَ بَكْرٌ لِّهٖ ذٰلِكَ ۗ فَاَمَّا نَكٰذِبِيۡهٖ اِبٰنِيۡ فَقُوۡتُهٗ لَنْ يُعٰدِيۡنِيۡ كَمَا بَدَاۡنِيۡ ۗ وَلَيْسَ اَوَّلُ الْاٰخِلٰى بِاٰهَوٰى عَلٰى مِيۡنِ اِعَاذِيۡهٖ ۗ وَاَمَّا شَتْمُهٗ اِبٰنِيۡ فَقُوۡتُهٗ اَتَّخِذُ اللّٰهَ وَاٰلِهٖٓ وَوَلَدًا ۗ وَاِنَا اِلَّا اَخٰذُ الضَّمٰدِ لِمَ اَبَدُ وَاَنْتَ اَوَّلُذِ وَاَنْتَ بَكْرٌ لِّىۡ كُفُوًا اٰخِذُ﴾ [بخاری، التفسیر، سورۃ ہود، قولہ اٰخِذُ: ۹۷، ۹۸] "ابن آدم نے مجھے جھٹلایا حالانکہ یہ اس کا حق نہ تھا اور اس نے مجھے گالی دی حالانکہ یہ اس کا حق نہ تھا۔ اس کا مجھے جھٹلانا تو اس کا یہ کہنا ہے کہ جس طرح اس نے مجھے پہلی مرتبہ پیدا کیا ہے دوبارہ نہیں بنائے گا۔ حالانکہ پہلی دفعہ پیدا کرتا مجھے دوبارہ بنانے سے آسان نہیں ہے اور اس کا مجھے گالی دینا یہ ہے کہ وہ کہتا ہے اللہ نے اولاد بنائی ہے، حالانکہ میں احد ہوں، صمد ہوں۔ میں نے نہ کسی کو جنا، نہ کسی نے مجھے جنا اور نہ ہی کوئی میرے برابر کا ہے۔"

﴿۴﴾ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ: "اور وہ جتنا نہیں گیا" یعنی کسی نے اس کو نہیں جنا، اس کا کوئی باپ نہیں ہے۔ یہ ان لوگوں کے سوال کا جواب ہے جنہوں نے کہا تھا کہ ہمیں اپنے رب کا نسب بیان کیجیے، کیونکہ جو پیدا ہوگا وہ حادث ہوگا، ہمیشہ سے نہیں ہوگا اور اللہ تعالیٰ تو ہمیشہ سے ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿سَكَانَ اللّٰهُ وَاَنْتَ بَكْرٌ شَيْءٌ قَلِيْلٌ﴾ [بخاری، التفسیر، باب: ﴿وَمَا كَانَ عَرْشُهٗ عَلٰى السَّمٰوٰتِ﴾: ۷۴، ۷۵] "اللہ تعالیٰ تھا اور اس سے پہلے کوئی چیز نہیں تھی۔" معلوم ہوا کہ جو ولادت کے مرحلے سے گزرا ہو یا خلق کے مرحلے سے گزرا ہو وہ اللہ نہیں ہو سکتا۔ غلط کہتے ہیں جو کہتے ہیں کہ کس اللہ کا بیٹا ہے اور ازلی (یعنی ہمیشہ سے) ہے، یا نبی ﷺ اللہ کے نور سے جدا ہوئے ہیں، مگر درحقیقت وہی ہیں اور ہمیشہ سے ہیں۔ غور کرنا چاہیے کہ جو پیدا ہوا وہ ہمیشہ سے کیسے ہو گیا؟

آیت ۴ ﴿۴﴾ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ: ہم مثل، جوڑ، جو برابر کا ہو۔ "قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ" کہنے سے اولاد اور کفو کی خود بخود نئی ہو جاتی ہے مگر ان کو پھر انگ بھی ذکر فرمایا، جیسا کہ سورۃ بقرہ کی آیت (۹۸): ﴿فَمَنْ كَانَ عَدُوًّا لِیۡنِیۡ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

سورۃ الفلق
۱۳ آیتیں
۲۰ کلمات

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

کسی بھی قسم کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنے کے لیے سورۃ الفلق اور سورۃ ناس جیسی کوئی چیز نہیں۔ ان سورتوں میں تمام جسمانی و روحانی آفات سے بچنے اور انھیں دور کرنے کی زبردست تاثیر موجود ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں سورتوں کی بہت فضیلت بیان فرمائی ہے، خصوصاً پناہ کے باب میں ان کو بے مثل قرار دیا ہے۔ یہاں چند احادیث درج کی جاتی ہیں:

① عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «أَلَمْ تَرَ آيَاتِ اللَّيْلِ لَمْ يَرُ مِثْلَهُنَّ قَطُّ : ﴿قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ﴾ وَ ﴿قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ﴾» [مسند۔ صلاۃ۔ جامعین، باب فصل قراءة المعوذتين : ۱۵۱ : ۱۵۲]

”کیونکہ تم نے وہ آیات نہیں دیکھیں جو آج رات نازل کی گئی ہیں، جن کی مثل کبھی دیکھی ہی نہیں گئی؟ وہ سورۃ الفلق اور سورۃ ناس ہیں۔“

② ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا: «أَلَا أُحْبِبُّكَ بِأَفْضَلِ مَا يُتَعَوَّذُ بِهِ الْمُتَعَوَّذُونَ؟» قَالَ بَلَى يَا رَسُولَ اللَّهِ! قَالَ: ﴿قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ﴾ وَ ﴿قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ﴾ هَاتَيْنِ السُّورَتَيْنِ [سنن، الاستعاذہ، باب ما جاء في سورتي المعوذتين : ۵۴۳ : ۵۴۴] ”کیا میں تمھیں سب سے بہتر وہ چیز نہ بتاؤں جس کے ساتھ پناہ پکڑنے والے پناہ پکڑتے ہیں؟“ انھوں نے کہا: ”کیوں نہیں، اے اللہ کے رسول!“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ“ اور ”قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ“ یہ دو سورتیں۔“

③ عبداللہ بن حبیب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: «خَرَجْنَا فِي لَيْلَةِ مُطَبَّرَةٍ وَظُلْمَةٍ شَدِيدَةٍ فَظَلَبَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّي لَنَا، قَالَ فَأَذْرَكْنَاهُ، فَقَالَ قُلْ، فَتَمَّ أَقْلُ شَيْئًا، ثُمَّ قَالَ قُلْ، فَلَمْ أَقْلُ شَيْئًا، قَالَ قُلْ، فَقُلْتُ مَا أَقُولُ؟ قَالَ قُلْ : ﴿قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ﴾ وَ الْمُعَوَّذَتَيْنِ جِئْتُ نَمْسِي وَ تُصْبِحُ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ تَكْفِيكَ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ» [ترمذی، الدعوات، باب الدعاء عند النوم : ۳۵۷۵، وقال الأمامي ح۔] ”ایک بارش اور سخت اندھیرے والی رات میں نکلے، ہم رسول اللہ ﷺ کو تلاش کر رہے تھے، تاکہ آپ ہمیں نماز پڑھائیں۔ چنانچہ میں آپ سے جا ملا، تو آپ نے فرمایا: ”کہو۔“ میں نے کچھ نہ کہا، آپ نے پھر فرمایا: ”کہو۔“ میں نے کہا: ”میں کیا کہوں؟“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ“ اور ”مُعَوَّذَتَيْنِ“ صبح و شام تین تین مرتبہ کہو، یہ تجھے ہر چیز سے کافی ہو جائیں گی۔“

④ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: ”مُعَوَّذَتَيْنِ“ نازل ہونے سے پہلے رسول اللہ ﷺ جنوں سے اور انسان کی نظر سے پناہ مانگا کرتے تھے، جب ”مُعَوَّذَتَيْنِ“ اتریں تو آپ نے ان دونوں کو معمول بنا لیا اور ان کے علاوہ کو چھوڑ دیا۔“ [ترمذی، الاستعاذہ، باب ما جاء في الرقية بالمعوذتين : ۲۰ : ۵۸] ترمذی نے اسے حسن صحیح اور البانی نے صحیح کہا ہے۔

⑤ عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے ”مُعَوَّذَتَيْنِ“ کے متعلق پوچھا۔ عقبہ فرماتے ہیں کہ (ہم نے یہ سوال کیا تو) رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ان دونوں سورتوں کے ساتھ صبح کی جماعت کروائی۔ [سنن، الاستعاذہ، باب ما

قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ①

تو کہہ میں مخلوق کے رب کی پناہ پکڑتا ہوں ①

جاء فی سورتی المعوذتین: ۵۴۳۶. وصحیحہ الأثناسی | اس سے معلوم ہوا کہ ان کا نام معوذتین معروف تھا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ نے لمبی سورتوں کی جگہ انھیں کافی قرار دیا۔ [دیکھیے ترمذی، الاستعاذۃ، باب ما جاء فی النرفیۃ بالمعوذتین: ۲۰۵۸] ① عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ”رسول اللہ ﷺ ہر رات جب اپنے بستر پر آتے تو دونوں ہتھیلیوں کو جمع کرتے پھر ان میں پھونکتے۔ دونوں میں ”قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ“، ”قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ“ اور ”قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ“ پڑھتے، پھر دونوں ہتھیلیوں کو اپنے جسم پر جہاں تک ہو سکتا پھیرتے۔ پھیرنے کی ابتدا سر، چہرے اور جسم کے سامنے والے حصے سے کرتے۔ آپ اس طرح تین مرتبہ کرتے۔“ [بخاری، فضائل القرآن، باب فصل المعوذات: ۵۰۱۷] ② عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے روایت ہے: ”رسول اللہ ﷺ جب بیمار ہوتے تو اپنے آپ پر معوذات پڑھ کر پھونکتے تھے۔ جب آپ کا درد بہت بڑھ گیا تو میں آپ پر پڑھتی اور آپ ہی کا ہاتھ اس ہاتھ کی برکت کی امید سے (آپ کے جسم پر) پھیرتی تھی۔“ [بخاری، الاستعاذۃ، باب ما جاء فی المعوذات: ۵۰۱۶] ان احادیث سے معلوم ہوا کہ ان تینوں سورتوں کو مذکورہ اوقات میں روزانہ پڑھنا چاہیے، یہ ہر قسم کی روحانی اور جسمانی بیماریوں سے بھی محفوظ رکھتی ہیں اور جن و انس میں سے شیاطین کے شرور و آفات سے بھی اللہ کی پناہ میں رکھتی ہیں۔

تعبیر: جب ہم ”أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ“ یا معوذات پڑھتے ہیں تو ان کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنے کا مطلب یہ نہیں کہ صرف زبان سے یہ الفاظ ادا کر دیے جائیں، بلکہ ضروری ہے کہ وہ تمام خیالات، خواہشات اور اعمال ترک کرنے کی کوشش کی جائے جو شیطان کو پسند ہیں۔ جس طرح کسی شخص پر کوئی زندہ حملہ آور ہو تو اس کا صرف یہ کہنا کافی نہیں کہ میں فلاں قلعہ میں پناہ لیتا ہوں، بلکہ اسے اس قلعہ میں پہنچنے کی جدوجہد بھی کرنا ہوگی۔ اسی طرح دشمن کے حملے سے اللہ کی پناہ طلب کرنے والے اور اس پر فتح و نصرت کی دعا کرنے والے کے لیے پناہ اور دعا کے الفاظ ہی منہ سے ادا کر دینا کافی نہیں، بلکہ دشمن کے خلاف تیاری، میدان میں نکلنا اور قتل و قتل کے لیے تیار رہنا بھی ضروری ہے۔ اس کے ساتھ دعا بھی کی جائے تو واقعی اللہ تعالیٰ کی پناہ بھی حاصل ہوتی ہے اور اس کی حفاظت بھی۔ اسی طرح اگر کوئی شخص عملاً تو ہر بات میں شیاطین الانس والجن کی پیروی کرے، مگر منہ سے اللہ کی پناہ طلب کرتا رہے تو یہ پناہ طلب کرنا اسے شیاطین سے اور ان کے موسموں سے نہیں بچا سکتا۔ اس کی ایک جامع مثال یہ ہے کہ ”لا الہ الا اللہ“ کہنے والا شخص یقیناً جنت میں جائے گا، اس پر جہنم کی آگ حرام ہے، مگر کیا صرف یہ الفاظ ادا کرنے والا جہنم سے اللہ کی پناہ میں چلا جاتا ہے؟ نہیں، بلکہ وہ جو ”صَادِقًا مِنْ قَلْبِهِ“ ہو، یعنی سچے دل سے صرف اللہ کو معبود برحق مانے اور اسی کی عبادت کرے، اس کے لیے یہ فضیلت ہے۔ اگر وہ کسی غیر کو یا اپنی خواہش نفس ہی کو اپنا معبود بنالے تو پھر کر دوزخ دفعہ بھی ”لا الہ الا اللہ“ پڑھتا رہے تو جہنم سے نہیں بچ سکتا۔ (مخلص از قاسمی)

آیت ۱ ① قُلْ أَعُوذُ : ”أَعُوذُ“ ”عَاذُ يَعُوذُ عَوْدًا وَمَعَاذًا“ (ان) پناہ پکڑنا۔ پناہ لینے کا مطلب یہ ہے کہ

مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ①

اس چیز کے شر سے جو اس نے پیدا کی ①

آدمی کسی چیز سے خوف محسوس کرے اور سمجھے کہ میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تو اس سے بچنے کے لیے وہ کسی دوسرے کی حفاظت میں چلا جائے یا کسی چیز کی آڑ لے لے۔ ظاہر ہے پناہ اسی کی لی جاتی ہے جس کے متعلق سمجھا جائے کہ وہ اس خوف ناک چیز سے بچا سکتا ہے۔ پناہ بعض اوقات ایسی چیزوں کی لی جاتی ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے بعض خوف ناک چیزوں سے بچنے کا سبب بنا دیا ہے، مثلاً دشمن سے بچنے کے لیے کسی قلعہ یا خندق یا مورچے وغیرہ کی پناہ لینا اور کسی ظالم سے بچنے کے لیے کسی طاقتور آدمی یا قوم کی پناہ لینا، یہ پناہ کسی بھی چیز کی لی جاسکتی ہے اور بعض اوقات یہ سمجھ کر پناہ لی جاتی ہے کہ وہ خطرات جن میں دنیا کے بچاؤ کے تمام ذرائع و اسباب بے کار ہو جائیں ان میں فلاں ہستی بچا سکتی ہے۔ سورہ فلق اور سورہ ناس میں جس پناہ کا ذکر ہے، بلکہ قرآن و حدیث میں جہاں بھی اللہ سے پناہ مانگی گئی ہے اس سے مراد پناہ کی دوسری قسم ہے۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی دوسرے سے یہ پناہ مانگنا شرک ہے۔ مشرک لوگ اپنے تحفظ کے لیے اللہ کو چھوڑ کر دیوی دیوتاؤں، جنوں، فرشتوں یا پیروں، پیغمبروں کی پناہ لیتے اور ان کو مدد کے لیے پکارتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان سورتوں میں تعلیم دی کہ ایسے تمام خطرات سے بچنے کے لیے میری ان صفات کی پناہ لو جن سے ثابت ہو رہا ہے کہ ایسے تمام خطرات سے میں ہی تمہیں بچا سکتا ہوں۔

② **بِرَبِّ الْفَلَقِ:** ”فَلَقٌ يَفْلُقُ فَلَقًا“ (ض) پھاڑنا۔ یہاں مصدر ”الْفَلَقُ“ مفعول ”مَفْلُوقٌ“ کے معنی میں ہے۔ اس کی تفسیر میں معتبر اقوال دو ہیں، پہلا قول جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما کا ہے جو ابن ابی حاتم نے حسن سند کے ساتھ بیان کیا ہے، ان کے علاوہ کئی تابعین کا بھی یہی قول ہے کہ ”الْفَلَقُ“ کا معنی صبح ہے، کیونکہ صبح رات کی تاریکی کو پھاڑ کر نمودار ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَالِقِ الْأُصْبَاحِ﴾ [الأنعام: ۹۶] ”یعنی وہ رات کی تاریکی کو پھاڑ کر صبح لانے والا ہے۔“ صبح کے رب کی پناہ لینے کا مطلب یہ ہے کہ جو رات کی تاریکی کو دور کر کے روشن صبح لانے والا ہے میں ساری مخلوق کے شر سے اس کی پناہ مانگتا ہوں، کیونکہ جب وہ رات کی تاریکی کو دور کر دیتا ہے، جس میں بے شمار شرور پائے جاتے ہیں تو اس کے لیے دوسرے شرور کو دور کرنا اور ان سے بچانا تو معمولی بات ہے۔ دوسرا قول ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے جو طبری نے علی بن ابی طلحہ کی معتبر سند کے ساتھ بیان کیا ہے اور ضحاک کا قول بھی یہی ہے کہ ”الْفَلَقُ“ سے وہ تمام چیزیں مراد ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے کسی چیز کو پھاڑ کر نکالا ہے، مثلاً زمین سے نباتات، پہاڑوں سے چشمے، بادلوں سے بارش اور رحم مادر اور انڈوں سے حیوانات۔ ان کے علاوہ جہاں بھی پیدائش کا معاملہ ہے اکثر میں اشتقاق (پھیننے) کا سلسلہ موجود ہے۔ گویا ”الْفَلَقُ“ کا معنی مخلوق ہے، مطلب یہ ہوگا کہ میں ساری مخلوق کے مالک کی پناہ پکڑتا ہوں کہ وہ مجھے اپنی مخلوق کے شر سے بچالے۔ یہ معنی زیادہ جامع ہے، اس لیے ترجمہ میں اسی کو اختیار کیا گیا ہے۔

آیت 2 : ① **مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ:** ”اس چیز کے شر سے جو اس نے پیدا کی“ اس میں ہر مخلوق کے ہر شر سے پناہ مانگ لی

وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ إِذَا وَقَبَ ۝

اور اندھیری رات کے شر سے جب وہ چھا جائے ۝

گئی ہے۔ کوئی نقصان، تکلیف یا پریشانی باقی نہیں رہی جو اس میں نہ آگئی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ پناہ مانگنے کے لیے یہ بہت ہی جامع سورت ہے، کیونکہ جب بندہ ساری مخلوق کے ہر شر سے بچنے کے لیے اس کے رب کی پناہ میں چلا گیا تو پھر مخلوق میں سے کون ہے جو اسے نقصان پہنچا سکے اور اگر وہ مالک ہی اپنی مخلوق کو نقصان پہنچانے سے نہ روکے تو مخلوق کے شر سے کون بچ سکتا ہے؟

۲ اس آیت میں مخلوق کے اس شر سے بھی پناہ مانگ لی گئی جو پہنچ چکا ہے، تاکہ اللہ تعالیٰ اسے دور کر دے اور اس سے بھی جس کا خوف ہے۔

آیت 3 ۱ وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ إِذَا وَقَبَ: اگرچہ ساری مخلوق کے شر سے پناہ مانگنے کے بعد کوئی چیز باقی نہیں رہی جس کے شر سے پناہ مانگی جائے، مگر مخلوق میں سے چند چیزوں کے شر سے خاص طور پر پناہ مانگنے کا سبق دیا گیا، کیونکہ یہ بہت ہی خوف ناک ہیں اور ان کے شر سے پناہ مانگنے کی تو بہت ہی ضرورت ہے۔

۲ "غَاسِقٍ" کا معنی ہے تاریک، سخت اندھیرے والی۔ قاموس میں ہے: "عَسَقَ اللَّيْلُ أَيِ اسْتَدَّتْ ظِلْمَتُهُ" یعنی "عَسَقَ اللَّيْلُ" کا معنی یہ ہے کہ رات کی تاریکی بہت سخت ہوگئی۔" سورہ بنی اسرائیل میں فرمایا: ﴿إِلَىٰ عَسَقِ اللَّيْلِ﴾ [یہی اسرائیل: ۸۷] "رات کے سخت تاریک ہونے تک۔" "وَقَبَ" (ض) داخل ہونا، غائب ہونا۔ فراء نے "غَاسِقٍ إِذَا وَقَبَ" کا معنی کیا ہے: "الْلَّيْلُ إِذَا دَخَلَ كُلُّ شَيْءٍ وَأَظْلَمَ" "رات جب ہر چیز پر چھا جائے اور تاریک ہو جائے۔" تاریک رات کے شر سے خاص طور پر پناہ مانگنے کی تلقین اس لیے کی گئی ہے کہ اندھیری رات میں بے شمار شرور و خطرات ہوتے ہیں، اکثر مجرم، چور، ڈاکو، زانی، قاتل اور شب خون مارنے والے رات ہی کو نکلتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کو رات ہی میں قتل کرنے کے منصوبے بنائے گئے، تاکہ نہ آپ بچاؤ کر سکیں اور نہ قاتل کا پتا چل سکے۔ جنگلی جانوروں مثلاً شیر، چیتے، بھیڑیے وغیرہ اور حشرات الارض مثلاً سانپ، بچھو وغیرہ کا خطرہ رات کو زیادہ ہو جاتا ہے اور مچھر، کھل وغیرہ رات کو جو تکلیف دیتے ہیں سب جانتے ہیں۔ ذائقوں کی تحقیق کے مطابق اکثر بیماریوں کے جراثیم اندھیرے میں پیدا ہوتے ہیں اور سورج کی روشنی میں ہلاک ہو جاتے ہیں۔ اندھیرے میں وہی چیزوں کا خوف مزید بڑھ جاتا ہے۔ ان سب پر مزید یہ کہ ان سب شرور کے اندھیرے میں واقع ہونے کی وجہ سے انسان ان سے اپنا بچاؤ بھی نہیں کر سکتا، اس لیے اندھیری رات کی برائیوں سے پناہ مانگنے کی تعلیم دی گئی۔

۳ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے چاند دیکھا تو فرمایا: «يَا عَائِشَةُ! اسْتَعِيذِي بِاللَّهِ مِنْ شَرِّ هَذَا، فَإِنَّ هَذَا هُوَ الْغَاسِقُ إِذَا وَقَبَ» [ترمذی، تفسیر القرآن، باب ومن سورة المعوذتين: ۳۳۶۶، وصححه الترمذی والألبانی]

وَمِنْ شَرِّ النَّفَثَاتِ فِي الْعُقَدِ ۝ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ ۝

اور گروہوں میں پھونکنے والیوں کے شر سے ۝ اور حسد کرنے والے کے شر سے جب وہ حسد کرے ۝

”اے عائشہ! اس کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگو، کیونکہ یہی ”غَاسِقِ إِذَا وَقَبَ“ ہے۔“ اس صورت میں ”غَاسِقِ“ کا معنی ”اندھیرے والا“ اور ”إِذَا وَقَبَ“ کا معنی ”إِذَا غَابَ“ ہے، یعنی ”جب غائب ہو جائے۔“ شاہ رفیع الدین نے ترجمہ یوں کیا ہے: ”اور برائی اندھیرا کرنے والے کی سے، جب وہ چھپ جائے۔“ یعنی چاند غروب ہو کر اندھیرا پھیلا دیتا ہے۔ بعض مفسرین نے ”غَاسِقِ إِذَا وَقَبَ“ سے سورج مراد لیا ہے، کیونکہ سورج غائب ہو کر سخت تاریکی پھیلنے کا باعث بنتا ہے۔ بہر حال ان تفسیروں اور پہلی تفسیر میں کوئی تضاد نہیں، کیونکہ مراد تاریکی کے شر سے پناہ مانگنا ہی ہے۔

آیت 4 وَمِنْ شَرِّ النَّفَثَاتِ فِي الْعُقَدِ: ”نَفَاثَةٌ“ کی جمع ہے جو ”نَفَثٌ يَنْفُثُ نَفْثًا“ (ن، ض) (پھونک مارنا، جس کے ساتھ تھوڑی سی تھوک ہو) سے مشتق ہے، بہت پھونکیں مارنے والی عورتیں یا جماعتیں۔ اگر ”نَفَاثَةٌ“ میں تا، ”عَلَامَةٌ“ کی طرح مبالغے کے لیے ہو یا ”النَّفَثَاتِ“ سے مراد نفوس ہوں تو عورتوں کے علاوہ بہت پھونکیں مارنے والے مرد بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ ”الْعُقَدِ“ ”عُقْدَةٌ“ کی جمع ہے، گرہیں۔ ابن جریر اور مفسرین سلف کے مطابق گرہوں میں پھونکیں مارنے والیوں سے مراد جادو کرنے والی عورتیں یا لوگ ہیں، کیونکہ انھوں نے جس پر جادو کرنا ہوتا ہے اس کے بال یا کوئی چیز حاصل کر کے اس پر جادو کرتے ہوئے کسی تانت یا دھاگے میں گرہیں ڈالتے جاتے اور منتر پڑھ پڑھ کر ان میں پھونکیں مارتے جاتے ہیں۔ ان کے شر سے خاص طور پر پناہ مانگنے کی تلقین اس لیے کی گئی کہ وہ چھپ کر وار کرتے ہیں۔ آدمی کو خبر ہی نہیں ہوتی کہ اسے تکلیف کیوں ہے، وہ بیماری سمجھ کر علاج معالجہ میں لگا رہتا ہے اور تکلیف بڑھتی جاتی ہے۔

بعض لوگوں نے کہا کہ ”الْعُقَدِ“ (گرہوں) سے مراد مردوں کے پختہ عزم اور ارادے ہیں اور ”النَّفَثَاتِ“ سے مراد یہ ہے کہ جس طرح تھوک کے ساتھ رسی کی گرہیں نرم کی جاتی ہیں اس طرح عورتیں اپنی پچکنی چڑی باتوں سے مردوں کے پختہ ارادوں کو بدل دیتی ہیں، اس آیت میں ان عورتوں کے شر سے پناہ مانگنے کی تلقین فرمائی گئی۔ یہ معنی پر لطف ہونے کے باوجود سلف کی تفسیر کے خلاف ہے اور اکثر یہ معنی کرنے والے وہ لوگ ہیں جو جادو سے نقصان پہنچنے کے قائل نہیں اور انھیں اپنے اس موقف پر اس قدر اصرار ہے کہ وہ بخاری و مسلم اور حدیث کی بہت سی دوسری کتابوں میں مروی حدیث کو ماننے ہی سے انکار کر دیتے ہیں جس میں مذکور ہے کہ لیبید بن اعصم نے رسول اللہ ﷺ پر جادو کیا تھا اور آپ اس جادو کی وجہ سے کچھ عرصہ بیمار اور پریشان رہے تھے۔ [دیکھیے بخاری، کتاب الطب، باب هل يستخرج السحر؟ ۵۷۶۳، ۵۷۶۵]

آیت 5 ۝ وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ: ”حَسَدٌ“ کا معنی ہے کسی شخص پر اللہ کی نعمت سے جانا کہ یہ نعمت اسے کیوں ملی اور اس کے زوال کی تمنا کرنا۔ پھر خواہ یہ خواہش یا کوشش ہو کہ وہ حسد کرنے والے کو ملے یا نہ ہو۔ قباحت کے لحاظ سے حسد کے کئی درجے ہیں، سب سے بدتر یہ ہے کہ کسی شخص کو اللہ نے جو نعمت دی ہے اس سے چھین جانے کی تمنا کے ساتھ

ساتھ قول و عمل کے ذریعے سے یہ کوشش بھی کرے کہ وہ نعمت اس سے چھن جائے۔ پھر بعض کی کوشش ہوتی ہے کہ اس سے چھن کر مجھے مل جائے اور بعض کو اس سے غرض نہیں ہوتی، بلکہ وہ اسی پر خوش ہوتے ہیں کہ اس کے پاس یہ نعمت نہیں رہی۔ دوسرا یہ کہ عملی طور پر تو اسے نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کرے، لیکن دل میں یہ خواہش رکھے کہ اس کے پاس سے یہ نعمت نہ رہے۔ یہ دونوں صورتیں حرام ہیں۔

② سوال پیدا ہوتا ہے کہ حاسد کے شر سے پناہ مانگتے وقت "إِذَا حَسَدَ" (جب وہ حسد کرے) کی تید کیوں لگائی؟ جواب یہ ہے کہ حاسد کے حسد کا نقصان دوسرے شخص کو اسی وقت ہوتا ہے جب وہ اپنے حسد کے تقاضے کے مطابق قول یا فعل سے اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کرے، یا حسد کے تقاضے کے مطابق یہ خواہش رکھے کہ اس سے وہ نعمت چھن جائے۔ حسد کی ایک صورت یہ ہے کہ دل میں خیال آتا ہے کہ فلاں شخص کو یہ نعمت کیوں ملی، مگر آدمی اس خیال کو بنا دیتا ہے، نہ اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہے اور نہ ایسا ارادہ یا خواہش رکھتا ہے کہ اس سے وہ نعمت چھن جائے، اس پر مواخذہ نہیں۔ ایسے خیالات آ ہی جاتے ہیں، کیونکہ انسان کی طبیعت میں یہ بات رکھ دی گئی ہے کہ وہ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ اس کا کوئی ہم جنس کسی خوبی میں اس سے بڑھ کر ہو، تو جو شخص حسد کے تقاضے پر عمل نہ کرے بلکہ ایسے خیال آنے پر انہیں دور کرنے کی کوشش کرے اور محمود (جس کے ساتھ حسد ہو) کے ساتھ احسان کرے، اس کے لیے دعا کرے اور اس کی خوبیاں عام بیان کرنا شروع کر دے، تاکہ دل میں اس بھائی کے ساتھ حسد کے بجائے محبت پیدا ہو جائے تو اس کے شر سے پناہ مانگنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس کا حسد کے تقاضے پر عمل کرنے کے بجائے اس سے مقابلہ کرنا اور اسے دور کرنے کی کوشش کرنا تو ایمان کے اعلیٰ درجے کی علامت ہے اور حسد سے نجات پانے کا طریقہ بھی یہی ہے۔

③ حسد کے حرام ہونے کی وجہ یہ ہے کہ حاسد دراصل اللہ تعالیٰ پر ناراض ہوتا ہے کہ اس نے اسے وہ نعمت کیوں دی۔ پھر بندے پر اس کے کسی جرم کے بغیر ناراض ہوتا ہے، کیونکہ اس نعمت کے حصول میں اس کا کچھ اختیار نہیں۔ تو حاسد دراصل اللہ کا بھی دشمن ہے اور اللہ کے بے گناہ بندوں کا بھی۔

④ حسد کا علاج یہ ہے کہ بندہ سوچے کہ حسد کا نقصان دین و دنیا میں حسد کرنے والے ہی کو ہے، محمود کو کوئی نقصان نہیں، نہ دنیا میں نہ دین میں، بلکہ اسے دین و دنیا میں حاسد کے حسد سے فائدہ ہی حاصل ہوتا ہے۔ دین میں فائدہ یہ ہے کہ وہ مظلوم ہے، خصوصاً جب حاسد قول یا عمل سے اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کرے، تو قیامت کو اسے ظلم کا بدلہ ملے گا اور ظالم حاسد نیکیوں سے مفلس رہ جائے گا اور دنیاوی فائدہ یہ ہے کہ لوگوں کی دلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ ان کے دشمن غم و فکر اور عذاب میں مبتلا رہیں اور حاسد جس عذاب اور مصیبت میں گرفتار ہے اس سے بڑی مصیبت اور کیا ہو سکتی ہے؟ وہ ہر وقت حسد کی آگ میں جل رہا ہوتا ہے اور اطمینان اور دلی سکون سے محروم ہوتا ہے۔

⑤ حسد آدمی کو اللہ کی نافرمانی کی طرف لے جاتا ہے، اہل علم فرماتے ہیں کہ آسمان میں اللہ تعالیٰ کی سب سے پہلی نافرمانی

حسد کی وجہ سے واقع ہوئی کہ ابلیس نے آدم علیہ السلام پر حسد کی وجہ سے اسے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا اور زمین پر پہلی نافرمانی، یعنی آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں میں سے ایک کے دوسرے کو قتل کرنے کا باعث بھی یہی حسد تھا۔ برادرانِ یوسف نے یوسف علیہ السلام اور ان کے والدین پر جو ظلم کیا اس کا باعث بھی حسد تھا۔ یہودی لوگ یہ جانتے ہوئے بھی کہ محمد ﷺ رسولِ برحق ہیں، ایمان نہ لائے تو اس کا باعث بھی یہی حسد تھا اور یہی حسد تھا جس کی بنا پر انھوں نے رسول اللہ ﷺ پر جادو کر دیا۔ گریہوں میں پھونکنے والیوں کے شر کے پیچھے بھی عموماً حسد ہی کا جذبہ چھپا ہوتا ہے، اس لیے ان کے شر کے بعد حاسد کے شر سے پناہ مانگنے کی تلقین فرمائی۔

⑥ بعض اوقات حسد کا لفظ ”بغیضة“ (رشک اور رئیس) کے معنی میں بھی آجاتا ہے، یعنی کسی شخص پر اللہ تعالیٰ کی نعمت دیکھ کر یہ خواہش کرنا کہ مجھے بھی یہ نعمت مل جائے، لیکن یہ خواہش نہ ہو کہ اس سے وہ نعمت چھین جائے۔ یہ خواہش حرام نہیں، مگر صرف وہ چیزوں میں رشک کرنا پسندیدہ ہے، ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «لَا حَسَدَ إِلَّا فِي اثْنَتَيْنِ، رَجُلٌ آتَاهُ اللَّهُ الْقُرْآنَ فَهُوَ يَتْلُوهُ بِهِ آتَاءَ اللَّيْلِ وَآتَاءَ النَّهَارِ وَرَجُلٌ آتَاهُ اللَّهُ مَالًا فَهُوَ يُنْفِقُهُ آتَاءَ اللَّيْلِ وَآتَاءَ النَّهَارِ» | مسلم، صلاة، المسافرين و قصرها، باب فصل من يقوم بالقرآن ... ۸۱۵: ۱۰۰ | بخاری: ۵۰۶۵ | ”حسد (رشک کرنا) نہیں مگر دو چیزوں میں، ایک وہ آدمی جسے اللہ نے قرآن دیا تو وہ رات کی گھڑیوں اور دن کی گھڑیوں میں اس کے ساتھ قائم رہتا ہے اور ایک وہ آدمی جسے اللہ نے مال دیا ہے تو وہ رات اور دن کی گھڑیوں میں اس میں سے (نیک کاموں میں) خرچ کرتا رہتا ہے۔“



قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝۱ مَلِكِ النَّاسِ ۝۲ إِلَهِ النَّاسِ ۝۳

اللہ کے نام سے جو بے حد رحم والا، نہایت مہربان ہے۔

تو کہہ میں پناہ پکڑتا ہوں لوگوں کے رب کی ① لوگوں کے بادشاہ کی ② لوگوں کے معبود کی ③

آیت 3۰۱ ① قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ ... پناہ کا مطلب پھیل سورت میں گزر چکا ہے۔ آدمی جب کسی سے خطرہ محسوس کرتا ہے تو سب سے پہلے اپنے کسی مُرتبی (پرورش کرنے والے)، مثلاً ماں یا باپ کی پناہ لیتا ہے، ان سے چمٹ جاتا ہے، تاکہ وہ اسے بچالیں۔ اگر وہ کمزور ہوں اور نہ بچا سکتے ہوں تو بادشاہ سے بچانے کی درخواست کرتا ہے اور اس کی پناہ لیتا ہے، کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ بادشاہ اپنی قوت اور فوج کے ذریعے سے اسے بچا سکتا ہے۔ اگر نظر آ رہا ہو کہ اس خطرے سے بچانا بادشاہ کے بس کی بات بھی نہیں تو پھر اس ہستی کی پناہ لیتا ہے جسے وہ ٹھیک تو توں کا مالک سمجھتا اور جس کی عبادت کرتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ دنیوی اسباب ختم ہونے کے بعد اسے اس کے علاوہ کہیں سے پناہ نہیں مل سکتی۔

اس سورت میں دوسرے ڈالنے والے کے شر سے پناہ لینے کے لیے اللہ تعالیٰ کی تین صفات کے ساتھ پناہ پکڑنے کی تعلیم دی گئی ہے کہ اگر اپنے کسی پرورش کرنے والے کی پناہ پکڑنا چاہو تو بجائے اس کے کہ کسی ایسے شخص کی پناہ پکڑو جو کسی ایک آدھ یا چند آدمیوں کی پرورش کر رہا ہو اور حقیقت میں وہ خود محتاج ہو، تم اس کی پناہ پکڑو جو سب لوگوں کا رب اور سب کی پرورش کرنے والا ہے، جو کسی کا محتاج نہیں اور سب اس کے محتاج ہیں۔ اگر کسی صاحبِ قوت بادشاہ کی پناہ پکڑنا چاہو تو بجائے اس کے کہ ان بادشاہوں کی پناہ پکڑو جو فوجوں کے محتاج ہیں، جن کا اقتدار محدود اور عارضی ہے اور جن کی اپنی زندگی اور اپنے نفع و نقصان ان کے ہاتھ میں نہیں، تم اس کی پناہ پکڑو جو تمام لوگوں کا بادشاہ ہے اور اس کی قوت اور بادشاہی کسی فوج یا سالار کی محتاج نہیں اور اگر کسی ایسی ہستی کی پناہ لینا چاہو جسے ٹھیک تو توں کا مالک ہونے کی وجہ سے تم عبادت کا حق دار سمجھتے ہو تو وہ صرف اور صرف ایک ہی ہے، جو تمام لوگوں کا معبود برحق ہے اور صرف وہی تمہیں ان خطرات میں پناہ دے سکتا ہے جن کے سامنے تمام مُرتبی اور تمام بادشاہ بے بس ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ نہ کوئی ٹھیک تو توں کا مالک ہے، نہ کائنات کی کسی چیز میں کسی دوسرے کا دخل ہے اور نہ کسی کا حق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے۔

② سورۃ فلق میں اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ”پرَبِّ الْفَلَقِ“ کے ساتھ ساری مخلوق کے شر سے عموماً اور مخلوق میں سے تین چیزوں کے شر سے خصوصاً پناہ مانگی گئی ہے، یعنی اندھیری رات، گرہوں میں پھونکنے والیوں اور حاسد کے شر سے اور اس سورت میں صرف ایک چیز یعنی ہٹ ہٹ کر دوسرے ڈالنے والے کے شر سے اللہ تعالیٰ کی تین صفات کے ساتھ پناہ مانگی گئی، کیونکہ پہلی تینوں چیزیں انسان کے جسم و جان کو نقصان پہنچانے والی ہیں، جب کہ دوسرے اس کے ایمان کو نقصان پہنچانے والا ہے اور ایمان کی حفاظت کی فکر جسم و جان سے بھی اہم ہے۔

مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ۝

دوسرے ڈالنے والے کے شر سے، جو ہٹ ہٹ کر آنے والا ہے ۝

۳ پہلی تین آیات میں ”النَّاسِ“ کا لفظ بار بار لایا گیا ہے، حالانکہ ”بِرَبِّ النَّاسِ“ کے بعد والی آیات میں ”النَّاسِ“ کی ضمیر بھی لائی جاسکتی تھی۔ اس میں حکمت یہ معلوم ہوتی ہے (واللہ اعلم) کہ لوگوں کے وسوسے کا شر اتنا خوف ناک ہے کہ بندہ بار بار اس کا حوالہ دیتا ہے کہ یا اللہ! لوگوں کا رب بھی تو ہے، لوگوں کا بادشاہ بھی تو ہے اور لوگوں کا الہ بھی تو ہے، اس لیے لوگوں کے شر سے پناہ بھی تو ہی دے سکتا ہے۔ اس سورت میں ان تینوں صفات کی پناہ پڑتے وقت ضمناً بھی بار بار لوگوں کے شر سے پناہ مانگی گئی ہے، پھر ”مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ“ کے ساتھ صاف لفظوں میں بھی لوگوں کے وسوسے کے شر سے پناہ مانگی گئی ہے۔ تفسیر قاسمی میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور شیخ ناصر سے ایک اور حکمت نقل کی گئی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ پناہ مانگنے والے بھی چونکہ لوگ ہیں، اس لیے پناہ مانگتے وقت بار بار ان نسبتوں کا حوالہ دیا جا رہا ہے جو اللہ تعالیٰ کے درمیان اور لوگوں کے درمیان موجود ہیں کہ یا اللہ! تو لوگوں کا رب بھی ہے، لوگوں کا بادشاہ بھی اور لوگوں کا معبود برحق بھی، تو جب لوگوں کا سبھی کچھ تو ہی ہے تو تیرے علاوہ انھیں پناہ دینے والا اور کون ہو سکتا ہے؟ (قاسمی)

آیت 4 ① مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ: ”الْوَسْوَاسِ“ واؤ کے کسرہ کے ساتھ ہو تو یہ ”وَسْوَسَ يُوَسْوِسُ“ کا مصدر ہے، وسوسہ ڈالنا، جیسے ”زَلْزَلًا“ (زاء کے کسرہ کے ساتھ) ہے، سخت ہلانا۔ (زمخشری) یہاں ”الْوَسْوَاسِ“ واؤ کے فتح کے ساتھ ہے، یہ مصدر نہیں بلکہ صفت ہے، جو اسم فاعل کے معنی میں ہے، بہت وسوسہ ڈالنے والا، جس طرح ”تَرْتَرًا“ (بہت باتیں کرنے والا) اور ”دَحْدَاحًا“ (بہت چھوٹے قد والا) وغیرہ ہیں۔ (تفسیر ابن قیم)

② ”الْوَسْوَاسِ“ مضاعف رباعی ہے، اس کے مفہوم میں تکرار (بار بار وسوسہ ڈالنا) شامل ہے، جس طرح ”زَلْزَلًا“ کے مفہوم میں بار بار ہلانا اور ”تَرْتَرًا“ میں بولتے چلے جانا شامل ہے۔ ”الْوَسْوَاسِ“ کا معنی بہت وسوسہ ڈالنے والا جو بار بار وسوسہ ڈالتا ہے۔

③ ”وَسْوَسَ“ کا اصل معنی وہ ہلکی یا دہلی ہوئی حرکت یا آواز ہے جو عام طور پر محسوس نہ ہوتی ہو۔ اس سے مراد وہ بات بھی ہوتی ہے جو بالکل آہستہ آواز سے کسی کے کان میں کہی جائے اور صرف اسی کو سنائی دے اور وہ بھی جو آواز کے بغیر کسی کے دل میں ڈال دی جائے، جیسے شیطان انسان کے دل میں وسوسہ ڈالتا ہے۔

④ ”الْخَنَّاسِ“ ”خَنَّسٌ يَخْنَسُ“ (ض، ن) پیچھے ہٹنا، ہٹانا۔ سورہ تکویر میں ستاروں کو ”الْخَنَّسُ“ فرمایا ہے، کیونکہ وہ روزانہ مغرب میں غروب ہوتے ہیں، پھر پیچھے ہٹتے ہوئے دوبارہ مشرق سے نمودار ہو جاتے ہیں۔ ”الْخَنَّاسِ“ مبالغے کا صیغہ ہے، یعنی بہت پیچھے ہٹنے والا۔ اس سے یہ بات خود بخود سمجھ میں آ رہی ہے کہ وہ ایک دفعہ ہی وسوسہ ڈال کر پیچھے نہیں ہٹ جاتا، بلکہ بار بار وسوسہ ڈالتا، بار بار پیچھے ہٹتا اور پھر ہٹ کر وسوسہ ڈالتا ہے۔ شیطان کو ”الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ“ اس

الَّذِي يُوسُوسُ فِي صُدُورِ النَّاسِ ۝

وہ جو لوگوں کے سینوں میں وسوسہ ڈالتا ہے ۝

لیے کہا گیا ہے کہ وہ آدمی کے دل میں بُرے خیالات ڈالتا ہے، جب وہ اللہ کا ذکر کرے تو پیچھے ہٹ جاتا ہے، جب ذکر سے غافل ہو تو دوبارہ لوٹ کر وسوسہ ڈالنا شروع کر دیتا ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ أَدْبَرَ الشَّيْطَانُ وَلَهُ ضُرَاطٌ، حَتَّى لَا يَسْمَعَ التَّائِبِينَ، فَإِذَا قُضِيَ النَّدَاءُ أَقْبَلَ، حَتَّى إِذَا تَوَبَّ بِالصَّلَاةِ أَدْبَرَ، حَتَّى إِذَا قُضِيَ التَّوْبُ أَقْبَلَ حَتَّى يَخْطُرَ بَيْنَ الْمَرْءِ وَنَفْسِهِ، يَقُولُ أَذْكَرُ كَذَا، أَذْكَرُ كَذَا، لِمَا لَمْ يَكُنْ يَذْكَرُ، حَتَّى يَظَلَّ الرَّجُلُ لَا يَدْرِي كَمْ صَلَّى» [بخاری، الأذان، باب فضل التَّائِبِينَ: ۶۰۸] ”جب نماز کے لیے اذان ہوتی ہے تو شیطان گوز مارتا ہوا پیٹھ دے کر بھاگ جاتا ہے، تاکہ اذان نہ سنے۔ جب اذان پوری ہوتی ہے تو آ جاتا ہے، پھر جب نماز کی اقامت ہوتی ہے چلا جاتا ہے، جب اقامت مکمل ہوتی ہے تو واپس آ کر آدمی اور اس کے دل کے درمیان خیالات ڈالنا شروع کر دیتا ہے۔ کہتا ہے فلاں چیز یاد کر، فلاں چیز یاد کر، وہ چیزیں جو اسے یاد نہیں تھیں، یہاں تک کہ آدمی کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ اسے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ اس نے کتنی نماز پڑھی ہے۔“ معلوم ہوا کہ آدمی نماز میں دل سے حاضر نہ ہو تو شیطان اپنا کام جاری رکھتا ہے۔ وہ صرف اس ذکر سے پیچھے ہٹتا ہے جس میں زبان کے ساتھ دل بھی شریک ہو۔

آیت 5 ① **الَّذِي يُوسُوسُ فِي صُدُورِ النَّاسِ**: وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے پناہ مانگنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اس بات سے اللہ کی پناہ مانگے کہ وہ اس کے دل میں کوئی وسوسہ ڈال دے اور اسے راہِ حق سے ہٹا دے اور اس بات سے بھی کہ وہ لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈال کر انہیں اس کے خلاف بھڑکا دے، جس کے نتیجے میں دین پر عمل کرنے اور اس کی دعوت دینے کے راستے میں وہ اس کے لیے رکاوٹ بن جائیں۔ دونوں صورتوں میں اللہ تعالیٰ ہی اس کے شر سے بچا سکتا ہے، اس لیے اسی کی پناہ مانگنے کی تعلیم دی گئی ہے۔

② آدمی کوئی نیکی کرے یا برائی اس کا آغاز دل میں اس کا خیال پیدا ہونے سے ہوتا ہے، خیال جمار ہے تو وہ خواہش کو ابھارتا ہے، خواہش سے ارادہ بنتا ہے، ارادہ پختہ ہو جائے تو عزم بنتا ہے، عزم نیت کا باعث ہوتا ہے، نیت اعضا کو عمل کے لیے حرکت میں لے آتی ہے اور آخری مرحلہ اس نیکی یا بدی پر عمل کا ہوتا ہے۔ دل میں پیدا ہونے والا یہ خیال اگر نیکی کا ہو تو رحمان کے مقرر کیے ہوئے فرشتے کی طرف سے ہوتا ہے اور الہام کہلاتا ہے، اگر بدی کا ہو تو وسوسہ کہلاتا ہے اور یہ شیطان کی طرف سے ہوتا ہے۔ ان دونوں کا فرق اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ خیال کتاب و سنت کی رُو سے نیکی کا کام ہے تو الہام ہے، ورنہ وسوسہ۔ وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے پناہ مانگنے کی تعلیم اس لیے دی گئی کہ جہاں سے برائی شروع ہوتی ہے وہیں تم اللہ کی پناہ میں چلے جاؤ، تاکہ اللہ تعالیٰ شروع ہی میں تمہیں اپنی پناہ میں لے لے۔ جس سے نہ وہ وسوسہ دل میں جگہ پکڑے گا

مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۝

جنوں اور انسانوں میں سے ۝

اور نہ بعد کے مراحل کی نوبت آئے گی۔

۳ دوسرے ڈالنے والوں کا شرف ایک ہی قسم کا نہیں ہوتا، بلکہ وہ کئی طرح سے آدمی کو راہِ حق سے ہٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ اور دوسرے اہل علم نے اس کی کئی صورتیں بیان کی ہیں۔ سب سے پہلے تو وہ آدمی کو صریح کفر و شرک اور اللہ اور اس کے رسول کی بغاوت اور دشمنی پر آمادہ کرتے ہیں، اگر اس میں ناکام ہوں اور آدمی ایمان پر قائم رہے تو وہ اسے دوسرے شرعی بدعت میں پھنسانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بدعت میں مبتلا کرنا انھیں آدمی کو بڑے سے بڑے گناہ میں مبتلا کرنے سے بھی زیادہ پسند ہے، کیونکہ یہ ایسا گناہ ہے جسے آدمی نیکی سمجھ کر کرتا ہے۔ اگر وہ سنت پر قائم رہے تو اسے کسی نہ کسی کبیرہ گناہ سے آلودہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، خصوصاً اگر وہ دینی عالم ہو، تاکہ بدنام ہو کر دین کا کام نہ کر سکے۔ اگر اس میں بھی کامیاب نہ ہوں تو چھوٹے گناہوں کی رغبت دلاتے ہیں، تاکہ وہ انھیں معمولی سمجھ کر ان کے بوجھ تلے دب جائے۔ یہ بھی نہ کر سکیں تو نیکی کے کاموں سے ہٹا کر ان کاموں میں لگانے کی کوشش کرتے ہیں جن میں نہ ثواب ہے نہ عذاب اور اس طرح اس کی عمر برباد کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اگر وہ اپنے وقت کو بے کار کاموں میں لگانے پر کسی صورت آمادہ نہ ہو تو نیکی کے بڑے کام سے ہٹا کر چھوٹے کام میں لگانے کی کوشش کرتے ہیں، مثلاً دعوت و جہاد سے ہٹا کر نظمی نماز روزے میں لگا دیتے ہیں۔ یہ بھی نہ ہو سکے تو دل میں ریایا اپنے عمل پر غرور پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر وہ کسی صورت ان کے قابو میں نہ آئے تو شیطان اور اس کے وہ چیلے بے شمار طریقوں سے اسے بدنام کرنے اور تکلیف پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کچھ نہ ہو سکے تو اسے غصہ دلا کر فہم و شعور سے بیگانہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس وقت بھی اگر وہ اللہ کی پناہ میں چلا جائے تو ان کی تمام کوششیں ناکام ہو جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَإِنَّمَا يَنْزِعَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْعٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ﴾ [الأعراف: ۲۰۰] ”اور اگر تجھے شیطان کی طرف سے کوئی چوکا لگے (یعنی شیطان تجھے غصہ دلائے) تو اللہ کی پناہ مانگ۔“ غرض موت تک یہ دشمن اپنی دشمنی سے باز نہیں آتے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں آخر وقت تک اپنی پناہ میں رکھے۔ (آمین)

آیت 6 مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ: لوگوں کے سینوں میں دوسرے ڈالنے والے شیطان جن بھی ہوتے ہیں اور انسان بھی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَكَذَلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيْطَانِ الْإِنْسِ وَالْجِنِّ يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُورًا﴾ [الأنعام: ۱۱۲] ”اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے انسانوں اور جنوں کے شیاطین کو دشمن بنا دیا، ان کا بعض بعض کی طرف طمع کی ہوئی بات دھوکا دینے کے لیے دل میں ڈالتا رہتا ہے۔“ اللہ تعالیٰ نے ہر آدمی کے ساتھ ایک جن شیطان اور ایک فرشتہ مقرر کر رکھا ہے، شیطان کا کام برائی کا دوسرے ڈالنا اور فرشتے کا کام بھلائی کا الہام کرنا ہے۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿مَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا وَقَدْ وَكَّلَ اللَّهُ بِهِ قَرِينَهُ مِنَ الْجِنِّ، قَالُوا

وَإِنَّاكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ! قَالَ وَ إِنِّي إِلَّا أَنَّ اللَّهَ أَعَانَنِي عَلَيْهِ فَأَسْلَمَ فَلَا يَأْمُرُنِي إِلَّا بِحَيْرٍ ۝۱ مسلم، صفة القيامة، باب تحريش الشيطان.....: [۲۸۱۴] ”تم میں سے ہر ایک کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے جنوں میں سے اس کا ایک قرین (ساتھی) مقرر کر رکھا ہے۔“ صحابہ نے پوچھا: ”یا رسول اللہ! اور آپ کے ساتھ بھی وہ مقرر ہے؟“ آپ نے فرمایا: ”ہاں، میرے ساتھ بھی ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے اس کے مقابلے میں میری مدد کی ہے تو وہ تابع ہو گیا ہے اور وہ مجھے خیر کے علاوہ کوئی حکم نہیں دیتا۔“ صحیح مسلم کی اسی حدیث میں سفیان سے مروی یہ الفاظ ہیں: «وَقَدْ وَكَّلَ بِهِ قَرِينُهُ مِنَ الْجِنَّ وَ قَرِينُهُ مِنَ الْمَلَائِكَةِ ۝۱ ۱ مسلم، صفة القيامة، باب تحريش الشيطان.....: [۲۸۱۴] ”(ہر آدمی کے ساتھ) جنوں سے اس کا قرین (ساتھی) اور فرشتوں سے اس کا قرین (ساتھی) مقرر کیا گیا ہے۔“ رسول اللہ ﷺ نے دو انصار صحابہ سے فرمایا: «إِنَّ الشَّيْطَانَ يَحْرِئِي مِنَ الْإِنْسَانِ مُحَرَّى الدَّمِ، وَ إِنِّي خَشِيتُ أَنْ يَقْدِفَ فِي قَلْبِي كَمَا سُوءًا أَوْ قَالَ شَيْئًا ۝۱ بخاری، بدء الخلق، باب صفة إبليس و جنوده: [۳۲۸۱] ”شیطان انسان میں خون کی طرح گردش کرتا ہے اور میں ڈرا کہ وہ تمہارے دلوں میں کوئی وسوسہ، یا فرمایا کوئی چیز ڈال دے گا۔“ شیطان اور اس کا جتنی قبیلہ انسانوں کی نگاہوں سے مخفی رہ کر فتنہ انگیزی کر سکتا ہے اور کرتا ہے۔ (دیکھیے انعام: ۲۷) رہے انسانی شیطان تو وہ ہمیشہ چھپ کر تو حملہ آور نہیں ہو سکتے، مگر اپنی باتوں اور طرز عمل سے وسوسہ ڈالتے اور دل میں برائی کا بیج بو دیتے ہیں۔

دوسرے وسوسہ ڈالنے والوں کے علاوہ انسان کا اپنا نفس بھی وسوسہ ڈالتا ہے۔ اس کی غلط خواہشات اور بد اعمالیاں اسے برائی کے لیے اُکساتی اور ابھارتی ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: «وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَ تَعَلَّمَ مَا تَوْسُوْسُ بِهِ نَفْسُهُ ۝۱ ۱۶: ”اور بلاشبہ یقیناً ہم نے انسان کو پیدا کیا اور ہم ان چیزوں کو جانتے ہیں جن کا وسوسہ اس کا نفس ڈالتا ہے۔“ رسول اللہ ﷺ اپنے خطبے میں فرمایا کرتے تھے: «وَنَعُوذُ بِاللَّهِ مِنْ شُرُورِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا ۝۱ ابن ماجہ، النکاح، باب خطبة النکاح: ۱۸۹۲۔ ترمذی: ۱۱۰۵، وصححه الألبانی [”اور ہم اپنے نفس کی برائیوں سے اور اپنے اعمال کی برائیوں سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔“ ان تمام وسوسہ ڈالنے والوں سے، خواہ وہ شیاطین الجن ہوں یا شیاطین الانس یا خود آدمی کا نفس ہو، اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنی چاہیے، کیونکہ وہی ان کے شر سے بچا سکتا ہے۔





4- لیک روڈ چوہدری لاہور | قزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
+92-42-37242314 | 042-37230549
Head Off: +92-42-35062910 Cell: +92-322-4006412

دارالاندلس